فی ظلال القرآن

سید قطب شہید

ترجمہ

سید معروف شاہ شیرازی

جلد دوم

پارہ ------ ۵ --- تا --- ۸

ادارہ منشورات اسلامی

بالمقابل منصورہ ملتان روڈ، لاہور

تفسیر	-------	فی ظلال القرآن
مصنف	-------	سید قطب شہید ؒ
مترجم	-------	سید معروف شاہ شیرازی
ناشر	-------	سید عارف شیرازی
جلد دوم	-------	پارہ ۵ تا ۸
مطبع	-------	دین محمد پرنٹرز لاہور
ھدیہ	-------	۳۷۵ روپے
طبع اول	اکتوبر ۱۹۹۵ ء	۵۰۰
طبع دوم	جنوری ۱۹۹۷ ء	۱۰۰۰

شہید اسلام سید قطب ؒ اور تفسیر فی ظلال القرآن

شہید اسلام سید قطب کا شمار امت مسلمہ کی ان چند برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے تاریک ادوار میں روشنی کے چراغ جلائے اور اسلامی نظام زندگی کی کھیتی کو اپنے خون سے سینچا۔

سید قطب ؒ ۱۹۰۶ء میں مصر کے ایک صوبہ "اسیوط" کے ایک گاؤں "موشاء" میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ دونوں عربی النسل تھے۔ سید قطب ؒ اپنے والدین کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔

آپ نے ثانوی تعلیم "تجہیزیہ دارالعلوم" نامی ایک اسکول میں حاصل کی۔ اس اسکول میں طلباء کو دارالعلوم میں داخلہ کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہوکر آپ ۱۹۲۹ء میں قاہرہ کے دارالعلوم میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں آپ نے بی۔ اے کی ڈگری اور ڈپلومہ ان ایجوکیشن حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے محکمہ تعلیم میں بحیثیت انسپکٹر تعلیم ملازمت اختیار کرلی اور ۱۹۵۲ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران ۱۹۵۳ء میں آپ اخوان المسلمون سے متعارف ہوئے۔ اور ۴ جولائی ۱۹۵۴ء میں آپ کو اخوان کے شعبہ نشرواشاعت نے اخبار "الاخوان المسلمون" کا ایڈیٹر مقرر کیا۔

شہید اسلام سید قطب ؒ ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک جیل میں رہے اور اگست ۱۹۶۴ء میں مرحوم عبدالسلام عارف صدر عراق کی کوشش سے رہا ہوئے۔ رہا ہوتے ہی پوری دنیا کے نوجوانوں نے آپ کی طرف رجوع کیا' اور آپ کا لٹریچر جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیلنے لگا۔ چنانچہ لادین مغرب پرست کمیونسٹ اور سوشلسٹ عناصر چیخ اٹھے اور بیک وقت ماسکو اور واشنگٹن سے ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ چنانچہ آپ کو ایک سال بعد اگست ۱۹۶۵ء میں دوبارہ گرفتار کرلیا گیا اور ایک سال بعد ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء میں آپ کو شہید کر دیا گیا۔

سید قطب اخوان المسلمون میں آنے سے پہلے خالص ادبی کام کرتے رہے۔ لیکن تحریک اخوان المسلمون میں شامل ہونے کے بعد اسلامی انقلاب' اور تحریک اسلامی' ان کا خاص موضوع رہا۔

مصنف نے فی ظلال القرآن میں قرآن پاک کی اثر انگیزی' جس نے عرب کی کایا پلٹ دی تھی' کی راہ میں حائل پردوں کو چاک کر دیا ہے۔ اس کے ذریعے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والا اس تحریک کے ساتھ جا کھڑا ہوتا ہے جو ہبوط آدم علیہ السلام کے وقت سے روئے زمین پر برپا ہوئی اور انبیا علیہم السلام کی قیادت میں چلتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک آ پہنچی۔ آپ ؐ کے بعد بھی یہ تحریک زندہ ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ قاری توحید و رسالت اور آخرت کے عقیدے کو قافلے کے ایک رفیق اور تحریک کے ایک کارکن کی حیثیت سے سنتا اور سمجھتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان کو امت کے ایک فرد کی حیثیت سے پڑھ کر اس سے سبق لیتا ہے۔

فی ظلال القرآن میں علمی موشگافیوں اور فقہی باریکیوں سے ہٹ کر قرآن پاک کے اصل مقصد اور دعوتی رنگ کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے لئے جو زبان استعمال کی گئی ہے۔ وہ سید کا ہی حصہ ہے اور اسے بلاشبہ الہامی زبان کہا جا سکتا ہے۔ اپنے اس رنگ میں یقیناً یہ ممتاز ترین تفسیر ہے۔ تفسیر کیا ہے ایک دعوت عمل اور دعوت انقلاب ہے' الفاظ اور معنی کا دریا ہے۔ جس میں تحقیق' علمی' وجدانی' اور ادبی نکات جابجا موجود ہیں۔ پورے ذخیرہ تفاسیر میں یہ پہلی تفسیر ہے۔ جو خود قرآن کے اسلوب بیان میں لکھی گئی ہے۔ دوسری تفاسیر بالعموم منطقی انداز بیان میں لکھی گئی ہیں اور فی ظلال القرآن قرآنی اور انقلابی انداز بیاں میں ہے۔ اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ یہ اختلافی مسائل اور اسرائیلیات سے خالی ہے۔ اسلام کا جامع تصور لئے ہوئے' اس کے احیاء کا طریقہ کار نمایاں کرتی ہے۔ غرض اخلاص' روح ایمان' عمل صالح اور دعوت انقلاب اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ پندرہ پارے جیل سے باہر اور بقیہ جیل میں لکھے گئے ہیں۔ عربی میں اب تک کئی ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

اردو ترجمہ کی تکمیل کے بعد اب فی ظلال القرآن کی دوسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس سلسلہ کی مزید ۴ جلدیں' جلد شائع کرنے کی توفیق نصیب فرمائے آمین ثم آمین (ادارہ)

جلد دوم

سورۃ النساء	آیات	۲۴ -- تا -- ۱۴۷
سورۃ المائدہ	آیات	۱ -- تا -- ۱۲۰
سورۃ الانعام	آیات	۱ -- تا -- ۱۶۵
سورۃ الاعراف	آیات	۱ -- تا -- ۹۳

---OOO---

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

فہرست جلد دوم

پارہ نمبر- ۵------- سورۃ النساء

پارہ نمبر- ۶ ....سورۃ النساء

..... سورۃ المائدہ ......

پارہ نمبر- ۷ .... سورۃ المائدہ

......سورۃ الانعام.......

پارہ نمبر- ۸ ....سورۃ الانعام

...... سورۃ الاعراف ......

---OOO---

فی ظلال القرآن

پارہ نمبر ------ ۵

سورۃ النساء

آیات ۲۴ --- تا --- ۱۴۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پارہ نمبر ۵ ایک نظر میں

پارۂ پنجم میں بھی ہم سورہ نساء کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس پارے میں سورہ نساء کے اہم موضوعات اور اہداف زیر بحث ہیں' جن کی طرف اجمالی اشارہ پارۂ چہارم کے آغاز میں کیا گیا تھا۔ پارۂ پنجم میں بھی یہی اساسی مقاصد ہیں۔ ان عقائد و مقاصد کے ضمن میں پھر متعدد موضوعات پر بحث چلی ہے۔

اس پارے کے پہلے سبق میں خاندانی معاملات کی تنظیم کے باقی ماندہ امور لئے گئے ہیں اور ان تمام معاملات میں خاندان کی تنظیم' نظام فطرت کے رجحانات اور تقاضوں کے مطابق کی گئی ہے۔ خاندانی زندگی میں جو عارضی مشکلات ہو جایا کرتی ہیں ان میں خاندان اور عائلی زندگی کو بچانے کی تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ اس طرح خاندانی نظام کو بچانے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ معاشرے میں فحاشی اور بے حیائی نہ پھیلے اور خاندانی نظام کو اور عائلی تعلقات کے تقدس کو ہر مضر اثر سے بچایا جائے.... اس کے ساتھ ساتھ' اس سبق میں بعض اجتماعی اور اقتصادی امور کی ضابطہ بندی بھی کی گئی ہے۔ مثلاً بعض مالی اور تجارتی امور پر بحث اور نظام وراثت کی ضابطہ بندی جس میں حقوق کا تعلق ایک خاندان پر منحصر ہوتا ہے۔ نیز مرد اور عورت کے لئے عائلی زندگی کے دوران میں اپنے اپنے حقوق ملکیت محفوظ کئے گئے ہیں۔

یہ تمام امور اور موضوعات' جس طرح کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں' وہ انتظامات ہیں' جن کے ذریعے سے اسلامی معاشرے کو تجارتی اور اقتصادی میدان میں نظام جاہلیت سے نکال کر اسلامی نظام حیات کے اندر لانا مطلوب ہے۔ نیز بتدریج جاہلی معاشرے کے رہے سہے نشانات کو مٹانا بھی مطلوب ہے' جو ابھی تک باقی تھے اور ان کی جگہ اسلامی معاشرے کے خدوخال کو اجاگر کر کے جماعت مسلمہ کو عمومی طور پر اس مقام مرتفع تک پہنچانا مقصود ہے جس میں وہ پورے عالم میں ممتاز نظر آئے۔ چنانچہ اسلامی نظام اس امت کو جاہلیت کی سطح سے بلند کرتا ہے اور اسے مزید بلندیوں پر اٹھاتا چلا جاتا ہے۔

دوسرے سبق میں دوبارہ اسلامی تصور حیات کے اصول طے کئے گئے ہیں۔ ان میں ایمان کی تعریف اور ایمان کی شرائط بیان کی گئی ہیں اور ایمان کے ان اصول کو دوبارہ اس لئے بیان کیا گیا ہے تاکہ جماعت مسلمہ کے اندر' اجتماعی کفالت کے بعض دوسرے ضابطے وضع کئے جائیں۔ اجتماعی کفالت کا یہ نظام پہلے خاندان کے محدود دائرے سے شروع ہوتا ہے اور پھر اس کی حدود پوری جماعت مسلمہ تک وسیع ہو جاتی ہیں۔ اس اجتماعی کفالت اور انفاق کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ بخل اور کنجوسی کی مذمت بھی کی گئی ہے' نیز دولت پر گھمنڈ کرنے' اللہ کی نعمت کو چھپاتے اور انفاق فی سبیل اللہ

کے مقابلے میں ریاکاری کی مذمت کی گئی ہے۔ نیز اس سبق میں عبادت الہی کے ذریعے تہذیب نفس کا طریقہ بھی سکھایا گیا ہے' عبادت گزاری کے وقت جسمانی پاکیزگی کے احکام اور اسی طرح یہ حکم کہ عبادت کے وقت مسکرات سے مکمل پرہیز کی ضرورت ہے اس لئے کہ شراب نوشی اور عبادت میں تضاد ہے۔ شراب نوشی کے متعلق یہ ابتدائی حکم تھا' بعد میں شراب نوشی پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی اور یہ قرآن مجید کا خاص منہاج ہے جو وہ اصلاح کے لئے اختیار کرتا ہے یعنی تدریجی اصلاح کا طریقہ۔

تیسرے سبق میں بتایا گیا ہے کہ اہل کتاب کی نسبت تمہارا موقف کیا ہونا چاہئے۔ یہ بھی اس سورہ کے اہم موضوعات میں سے ایک ہے' جس میں مسلمانوں کے حوالے سے ان کی نیت کے کھوٹ اور ان کے برے منصوبوں کو طشت ازبام کیا گیا ہے۔ ان کے اس طرز عمل پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے ان کی مکاری اور کینہ پروری کو واضح کیا گیا ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے دشمن ہیں اور انہیں خبردار کیا گیا ہے کہ انجام کار وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں۔

چوتھے سبق میں اسلام کی تعریف' دین کا مفہوم اور ایمان کی شرائط کو بیان کیا گیا ہے اور یہ بات نہایت ہی فیصلہ کن اور حتمی الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی نظام زندگی کا مزاج کیا ہے' اس نظام میں کس طرح مسلمان صرف اللہ وحدہ کی اطاعت' صرف اسی کی عبادت اور صرف اسی سے ہدایت اخذ کرتے ہیں اور اپنی زندگی کے تمام تنازعات کے فیصلے بھی اللہ کی کتاب اور رسول خدا کے احکام کے مطابق کرتے ہیں' نیز اس سبق میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ وہ امانت' اس کے حقداروں تک پہنچائیں اور اگر انصاف کا مسئلہ درپیش ہو تو عدل کے ساتھ حکم دیں اور لوگوں کی زندگیوں میں اسلامی منہاج کو رائج کریں' یہ مضامین اس انداز میں بیان کئے گئے ہیں کہ گویا یہ ایمان کی شرائط ہیں اور ساتھ ساتھ اس بات پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ایمان کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن وہ ایمان کی شرط اول بھی پوری نہیں کرتے یعنی اپنی پوری زندگی کے تنازعات کا فیصلہ مکمل تسلیم و رضا کے ساتھ خدا اور رسول کے احکام کے مطابق نہیں کراتے۔ پھر بار بار تاکید سے بتایا جاتا ہے کہ اگر اس شرط کو پورا نہیں کیا جاتا تو ایمان نہیں ہے' چاہے جس قدر دعوائے ایمان زبانی طور پر کیا جائے اس لئے کہ یہ صریح طور پر شرط ایمان کی خلاف ورزی ہے۔

چنانچہ درس پنجم میں اسلامی جماعت کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اسلامی نظام کی جماعت میں جہاد بالقتال کے لئے تیار ہو جائے اور ان لوگوں پر سخت تنقید کی گئی ہے جو منافق ہیں اور جہاد کے خلاف رکاوٹیں ڈالتے ہیں یا مومن ہیں اور جہاد سے سستی کرتے ہیں اور اس سبق میں جہاد و قتال کا اصل مقصد اور اس کی ضرورت کا بیان کرتے ہوئے قلوب اہل ایمان کو جوش دلایا جاتا ہے کہ جہاد اور قتال اس لئے ضروری ہے کہ ضعیف اہل اسلام اور ان کے بال بچوں کو دارالکفر سے نجات دلا کر دارالاسلام میں داخل کیا جائے اور اس ارفع و اعلیٰ اسلامی نظام زندگی کے زیر سایہ لا کر انہیں زندگی کی خوشیاں عطا کی جائیں۔ اس سبق میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے لئے ایک دن مقرر ہے جس میں اس نے اس دنیا کو چھوڑنا ہے' اس لئے اسے چاہئے کہ مشکل سے مشکل حالات و معاملات میں خوف نہ کھائے۔ سبق کے آخر میں حضور اکرم ؐ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ جہاد شروع کر دیں' اگرچہ اکیلے ہوں' اس لئے کہ اس دین کو غالب کرنے اور

اسلامی نظام زندگی کو مستحکم اور متمکن کرنے کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

مضمون جہاد فی سبیل اللہ کی مناسبت سے پھر چھٹے سبق میں بے شمار بین الاقوامی ضوابط کا ذکر بھی کیا گیا ہے یعنی ایک طرف اسلامی کیمپ ہے اور دوسری جانب اس کا دشمن کیمپ ہے' تیسری طرف غیر جانبدار کیمپ ہے' یا وہ لوگ ہیں جن سے اسلامی کیمپ کے معاہدے ہیں۔ معاملہ صرف طاقت' غلبے اور پکڑ دھکڑ کا ہی نہیں ہے بلکہ واقعیت پسندی کے ساتھ' قانون و اخلاق کی حدود کے اندر' انسانی تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور مختلف الخیال بین الاقوامی کیمپوں کے رجحانات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے عمل جہاد کو جاری رکھنا ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کے مضمون کے ساتھ' جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کی اقسام کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ یہ ساتواں سبق ہے اور اس میں ان لوگوں پر سخت تنقید کی گئی ہے جو دارالکفر میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ہجرت کر کے معرکہ حق و باطل میں شریک نہیں ہوتے حالانکہ دارالکفر میں ان کا دین محفوظ نہیں ہے' جبکہ دارالاسلام قائم ہو گیا ہے اور اس میں اسلامی جھنڈے بڑی عزت اور عدل سے لہرا رہے ہیں۔ اس سبق کے آخر میں مسلمانوں کو قتال فی سبیل اللہ پر ابھارا جاتا ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ دشمن کا پیچھا کرو اور دشمن کے تتبع اور تلاش میں ذرہ بھر سستی نہ کرو اور آخر میں واضح کر دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا موقف کیا ہے اور دشمنان اسلام کا موقف کیا ہے؟ اہل ایمان کا انجام کیا ہونے والا ہے او اہل کفر کس خوفناک انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔

آٹھویں سبق میں ہم اسلامی نظام عدل کی معراج تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ ایک یہودی پر ناجائز الزام لگایا جاتا ہے' شہادت اس کے خلاف آ جاتی ہے' ملاء اعلیٰ سے قرآن کریم نازل ہوتا ہے اور اس یہودی کو بری کر دیا جاتا ہے۔ یہ انصاف ایسے حالات میں کیا جاتا ہے' جبکہ ہر طرف سے یہودی اہل اسلام کے خلاف رات اور دن سازشوں میں مصروف ہیں۔ لیکن اسلامی نظام عدل میں انصاف نہ کسی کی دوستی سے متاثر ہوتا ہے اور نہ کسی کی دشمنی اسے انصاف سے محروم کر سکتی ہے۔ یہ عدل و انصاف کا وہ معیار ہے جس پر انسانیت کبھی پوری نہیں اتر سکی۔ ہاں انسانیت اس مقام تک صرف اسلام کے ارفع اور بے مثال نظام زندگی کے سایہ ہی میں پہنچ سکی۔

اب نواں سبق آتا ہے جس میں شرک اور مشرکین کے ساتھ پنجہ آزمائی کی جاتی ہے۔ شرکیہ خرافات اور ان کے اثرات' گمراہ کن شعائر دینی اور کھوٹے اور از کار رفتہ شرکیہ تصورات پر بحث ہوتی ہے' اور اللہ تعالیٰ کے نظام عدل کے بارے میں' نفسانی خواہشات اور کھوٹے خیالات اور اوہام کی تصحیح کی جاتی ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے ہاں جزا و سزا اعمال پر ہے' اوہام اور اچھی خواہشات پر نہیں ہے۔ اور آخر میں بتایا جاتا ہے کہ اسلام واحد مقبول دین ہے اور یہی ملت ابراہیمی ہے۔

نویں سبق میں پھر عورتوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کے حقوق' خصوصاً یتامی اور ضعفاء کے حقوق سے بحث کی جاتی ہے بالخصوص بچوں کے بارے میں۔ اس سورہ کا آغاز بھی اسی مضمون سے ہوا تھا۔ یہ بیان کیا گیا کہ خاوند کی طرف سے بیوی کے بائیکاٹ اور بیوی کی جانب سے نافرمانی کے موقعہ پر کیا انتظامات اور کارروائیاں ہوں گی۔ عورتوں کے ساتھ عادلانہ معاشرت کے احکام' جس کے بغیر عائلی نظام درست ہی نہیں ہو سکتا اور اگر اصلاح نہ ہو سکے تو بہتر یہ ہوتا ہے کہ فریقین کے درمیان جدائی ہو جائے۔

خاندان کے متعلق جو احکام آئے ہیں' ان کا اختتامیہ یوں آتا ہے کہ عائلی احکام اور معاشرے کے اندر عدل و انصاف کے قیام کے مقصد کو اللہ کی ذات سے مربوط کر دیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ زمیں اور آسمانوں کا مالک ہے ۔ وہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ تمام موجود مخلوق کو ختم کر دے اور ان کی جگہ بالکل ایک نئی مخلوق پیدا کر دے ۔ لہٰذا اللہ کے احکام و ہدایات پر عمل کا حکم کوئی معمولی بات نہیں ہے ۔ اور ان احکام کا تعلق ذات باری کے ساتھ ہے' جو ایک عظیم ذات ہے ۔ چنانچہ قدرتی طور پر دلوں میں خدا کا خوف پیدا ہو جاتا ہے اور وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں ان کے لئے اپنے معاملات میں عدل و انصاف کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور اپنے پورے معاملات میں خدا کا خوف ان پر غالب ہوتا ہے ۔ جس طرح قرآن کریم کا انداز ہے کہ وہ ایک مخصوص و محدود موضوع کو بھی عام اور وسیع تر دائرے کے اندر لا کر بیان کرتا ہے ۔

اب اس پارے کا آخری سبق آتا ہے جو تقریباً نفاق اور منافقین پر تنقید تک محدود ہے ۔ اہل ایمان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ سچے مسلم ہو جائیں اور صراط مستقیم پر گامزن ہوں ۔ انہیں اس بات پر متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ جماعت مسلمہ اور اس کی قیادت کے سوا کسی اور حلقے سے دوستانہ روابط قائم نہ کریں اور نہ منافقین اور دشمنان دین کی وجہ سے اور اجتماعی تعلقات' اور ذاتی مصلحتوں کی خاطر دین کے معاملے میں سستی یا نرمی کریں ۔ کیونکہ ایسا کرنا بھی درحقیقت نفاق ہو گا ۔ اور منافقین قیامت میں جہنم کی نچلی تہوں میں ہوں گے اور منافقین درحقیقت کافروں کے دوست ہیں ۔ اس سبق کا خاتمہ صفات الٰہی کے بیان سے ہوتا ہے ۔ اور یہ کہ اللہ کا اس کے بندوں کے ساتھ تعلق کیا ہے اور یہ کہ گمراہی اور انحراف کرنے والوں کو سزا دینے میں حکمت کیا ہے؟ اگر وہ ایمان لے آئیں اور شکرگزار ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کو خواہ مخواہ عذاب دینے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے ۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا (۴:۱۴۷)

(آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے' اگر تم شکرگزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو ۔ اللہ بڑا قدردان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے ۔)

یہ عجیب انداز کلام ہے ۔ دل پر رحمت کی بارش ہو جاتی ہے ۔ اللہ کو کیا پڑی ہے کہ وہ سزا دے ۔ وہ تو غنی بادشاہ ہے بشرطیکہ لوگ سیدھی راہ پر آ جائیں ۔ اللہ تو شاکر ہے یعنی قدردان ہے ۔ وہ اپنے فضل اور احسان کی بارش کرتا ہے بشرطیکہ وہ شکرگزار بنیں ۔ لیکن غلطی خود ان کی ہے کہ وہ اللہ کا عذاب خود خریدتے ہیں ۔ اپنے کفر اور انکار کی وجہ سے اور اس فساد فی الارض کی وجہ سے جو زمین پر اور نفس انسانی اور حیات انسانی کے اندر ان کے اس کفر اور انکار کی وجہ سے برپا ہوتا ہے ۔

یوں اس پارے نے اپنے پر پھیلا کر بے شمار مقاصد اور موضوعات کو اپنے اندر چھپا رکھا ہے ۔ غرض بڑی طویل و عریض بحثیں ہیں ۔ یہاں اس تبصرے میں صرف مجمل اشارات مطلوب ہیں ۔ ان شاء اللہ ان موضوعات کو ہم جلد ہی تفصیل کے ساتھ لیں گے ۔

پارہ نمبر ۵

درس نمبر ۳۲ ایک نظر میں

یہ سبق ان مضامین کا تکملہ ہے' جو عائلی زندگی کی تنظیم اور قواعد فطرت کے مطابق اس کی تشکیل کے سلسلے میں اس سورت میں بیان ہوئے تھے ۔ اور اس سبق کے بعد' اس اہم موضوع پر صرف دو جگہ تکمیلی بحث ہوگی ۔ یہ موضوع اسلام کی نظر میں اہم اس لئے ہے کہ اس کی درستی پر پوری انسانی زندگی کی درستی اور استواری موقوف ہے ۔ کسی معاشرے میں اگر یہ درست ہو جائے تو پوری انسانی زندگی بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ جاری رہتی ہے اور اس کی تعمیر صحت مند بنیادوں پر ہوتی ہے ۔ اور اگر عائلی زندگی تباہ ہو جائے اور صراط مستقیم سے ہٹ جائے تو اس سے اس کرۂ ارض پر ایک عظیم اور ہمہ جہت فساد رونما ہو جاتا ہے ۔

اس سبق میں عورتوں کی وہ تکمیلی فہرست دی جارہی ہے' جن سے نکاح حرام ہے ۔ اس کے بعد وہ منہاج وضع کیا جاتا ہے جس کی اساس پر ایک پاک خاندان کی صورت میں' عورت اور مرد کا اجتماع جائز کیا گیا ہے ۔ اور یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس منہاج کی پابندی سے پاکیزگی اور طہارت کے علاوہ' لوگوں کے لئے بڑی آسانیاں اور سہولتیں پیدا ہوتی ہیں اور پھر وہ تنظیمی قواعد وضع کئے جاتے ہیں جن کی اساس پر ادارۂ خاندان کی عمارت استوار ہوتی ہے' اور اس ادارے میں زوجین کے کاندھوں پر جو ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں یا انہیں جو حقوق دیئے گئے ہیں ان کی توضیح ہے ۔ خاندان کی اس تنظیم کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے میں بعض مالی حقوق کے بارے میں احکام دیئے جاتے ہیں' چاہے ان کا تعلق حقوق مکتسبہ سے ہو یا حقوق موروثی سے ہو ۔ ان حقوق کا تعلق اجتماعی تعلقات سے بھی ہے اور ایک خاندان میں مرد اور عورتوں کے حقوق وراثت سے بھی ہے ۔ اسی طرح وہ مسائل بھی بیان ہوئے ہیں جن کا تعلق قرابت کے علاوہ' بطور ولایت موروثی حقوق سے ہے ۔

یہ بات عمومی طور پر قابل لحاظ ہے کہ ان تمام ضابطہ بندیوں اور احکام کے درمیان ایک لطیف ربط پایا جاتا ہے ۔ اور یہ ربط دراصل وہ پہلا اصول ہے کہ یہ تمام احکام اور ضابطہ بندیاں اللہ جل شانہ' کی طرف سے صادر ہوئی ہیں اور یہ اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کا ذاتی مقتضاء ہیں کیونکہ اللہ کی ذات کے ساتھ مخصوص ترین صفات میں سے ایک صفت اس کی حاکمیت ہے اور اس حاکمیت کا مظہر انسان کے لئے قانون سازی ہے ۔ اور وہ اجتماعی نظام ہے' جس کی اساس پر وہ اپنی زندگی کو استوار کریں گے' اور اپنے اجتماعی تعلقات قائم کریں گے ۔

اس لطیف ربط کا سیاق کلام میں بار بار ذکر کیا جاتا ہے اور بار بار اللہ کی اس ذاتی خصوصیت کا ذکر کیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ ان تمام احکام کا نزول اور صدور ذات باری کی طرف سے ہو رہا ہے جو علیم و حکیم ہے ۔ یہ اشارہ ایک حکیمانہ اور معانی سے پر اشارہ ہے اس لئے کہ اسلامی نظام زندگی میں' جس ذات کی طرف سے اوامر و نواہی صادر ہوتے

ہیں' وہ علم کامل اور علم شامل رکھنے والی ذات کی طرف سے ہوتے ہیں' وہ ایسی ذات ہے جو حکمت و دانائی کی حامل ہے یہ وہ خدائی خصوصیات ہیں جو انسان میں نہیں پائی جاتیں' اس لئے کہ انسان اس بات کی صلاحیت نہیں رکھتا کہ وہ انسانی زندگی کے لئے کوئی ضابطہ خود وضع کرے۔یہی وجہ ہے کہ جب بھی انسان علیم و خبیر خدا کے بنائے ہوئے ضابطے سے منحرف ہوا' اس پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور وہ بے آب و گیاہ میدان میں گم گشتہ راہ ہو گیا اور بلا کسی مرشد و ہادی کے سرگرداں رہا۔لیکن اپنی جہالت اور اپنی ہٹ دھرمی اور اپنی نفسانی خواہشات کی وجہ سے یہی سمجھتا رہا کہ وہ اس دشت کو عبور کر لے گا' اور اپنے لئے اور اپنی نجات کے لئے اس راہ سے اچھی راہ تلاش کر لے گا' جس کی طرف اسے اللہ بلا رہا ہے۔

سیاق کلام سے جس دوسری حقیقت کی طرف بار بار اشارہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی منہاج حیات انسان کے لئے نہایت ہی سہل' نہایت ہی حقیقت پسندانہ اور فطری رجحانات کے عین مطابق ہے' بمقابلہ ان نظامہائے زندگی کے جو انسان خود اپنے لئے بناتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ اس کے لئے آسان ہیں حالانکہ انسان کی ناتوانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی نظام اللہ کی عین رحمت اور مہربانی ہے کہ اس نے انسان کے لئے یہ نظام اور منہاج وضع کیا جو ایسا معتدل ہے کہ اس سے ذرہ بھر ادھر ادھر ہونے سے توازن اور اعتدال ختم ہو جاتا ہے اور انسان پر عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے اور وہ ایسی مشقت اور سختی میں مبتلا ہو جاتا ہے جسے جھیلنے کی اس میں قوت ہی نہیں ہے۔علاوہ ازیں اس خود ساختہ نظام کی وجہ سے انسان اپنے انسانی مقام کو کھو دیتا ہے اور گندگی کے گڑھے میں اوندھے منہ جا گرتا ہے۔

جب ہم نصوص قرآن پر آئندہ صفحات میں تفصیلی بحث کریں گے تو موقعہ بموقعہ انسان کے تاریخی مراحل کی روشنی میں' اس حقیقت کے مصداق کی طرف اشارہ کریں گے اس لئے کہ یہ ایک تاریخی سچائی ہے۔ہاں جب جاہلیت دلوں پر پردے ڈال دیتی ہے اور آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے تو پھر آنکھوں کی روشنی ختم ہو جاتی ہے اور دل بے نور ہو جاتے ہیں اور انسان کسی بھی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا چاہے وہ بہت ہی روشن کیوں نہ ہو۔

---○○○---

درس نمبر ۳۲ تشریح آیات

آیات ۲۴ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۳۵

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاۗءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ
وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَاۗءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۭ فَمَا
اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا
تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾ وَمَنْ لَّمْ
يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ
مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ
بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ
لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ
مَا عَلَي الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۭ وَاَنْ

تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ
سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾ وَاللّٰهُ
يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۣ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا
مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾

"اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں' جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں' البتہ ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو جنگ میں تمہارے ہاتھ آ جائیں ۔ یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازم کر دی گئی ہے ۔ ان کے سوا جتنی عورتیں ہیں انہیں اپنے اموال کے ذریعے سے حاصل کرنا تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے' بشرطیکہ حصار نکاح میں ان کو محفوظ کرو' نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو ۔ پھر جو ازدواجی زندگی کا لطف تم ان سے اٹھاؤ اس کے بدلے ان کے مہر بطور فرض کے ادا کرو' البتہ مہر کی قرارداد ہو جانے کے بعد آپس کی رضامندی سے تمہارے درمیان اگر کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں' اللہ علیم و دانا ہے ۔ اور جو شخص تم میں سے اتنی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکے' اسے چاہیے کہ تمہاری ان لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہوں اور مومنہ ہوں ۔ اللہ تمہارے ایمان کا حال خوب جانتا ہے' تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو' لہٰذا ان کے سرپرستوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کر لو اور معروف طریقے سے ان کے مہر ادا کر دو' تاکہ وہ حصار نکاح میں محفوظ ہو کر رہیں' نہ آزاد شہوت رانی کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں ۔ پھر جب وہ حصار نکاح میں محفوظ ہو جائیں اور اس کے بعد کسی بدچلنی کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے جو ان عورتوں (محصنات) کے لئے مقرر ہے ۔ یہ سہولت تم میں سے ان لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے جن کو شادی نہ کرنے سے بند تقویٰ کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو ۔ لیکن اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے ۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان طریقوں کو واضح کرے اور انہی طریقوں پر تمہیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحاء کرتے تھے ۔ وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی ۔ ہاں' اللہ تو تم پر رحمت کے ساتھ توجہ کرنا چاہتا ہے مگر جو لوگ خود اپنی خواہشات نفس کی پیروی کر رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ راست سے ہٹ کر دور نکل جاؤ ۔ اللہ تم پر سے پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے ۔"

اس سے قبل پارۂ چہارم کے آخر میں ان عورتوں کی فہرست دی گئی تھی 'جو ابدی اور ذاتی حرمت کی بنا پر حرام قرار دی گئی تھیں۔ یہاں مناسب ہے کہ وہ فہرست دوبارہ پیش نظر رکھی جائے۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا وَسَآءَ سَبِيْلًا (۲۲) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۲۳) (۴: ۲۲-۲۳)

"اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں ان سے ہرگز نکاح نہ کرو' مگر جو پہلے ہو چکا' سو ہو چکا۔ درحقیقت یہ ایک بے حیائی کا فعل ہے' ناپسندیدہ ہے اور برا چلن ہے۔ تم پر حرام کی گئیں تمہاری مائیں' بیٹیاں' بہنیں' پھوپھیاں' خالائیں' بھتیجیاں' بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہو' اور تمہاری دودھ شریک بہنیں' اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری بیویوں کی لڑکیاں جنہوں نے تمہاری گودوں میں پرورش پائی ہے۔ ان بیویوں کی لڑکیاں جن سے تمہارا تعلق زن و شو قائم ہو چکا ہو۔ ورنہ اگر صرف نکاح ہوا ہو اور تعلق زن و شو نہ ہوا ہو تو (انہیں چھوڑ کر ان کی لڑکیوں سے نکاح کر لینے میں) تم پر کوئی حرج نہیں ہے.... اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہارے صلب سے ہوں اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا ہے کہ ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرو مگر جو پہلے ہو گیا' سو ہو گیا۔ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" غرض پارۂ پنجم کی یہ آیات پارۂ چہارم کی آخری آیات کا تکملہ ہیں۔ (وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ "وہ عورتیں جو دوسروں کے نکاح میں ہوں۔"

ان کو محرمات میں اس لئے شامل کیا گیا ہے کہ یہ دوسرے مردوں کے حصار نکاح میں ہیں' اس لئے وہ اپنے خاوندوں کے علاوہ دوسروں پر حرام ہیں اور ان کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہے۔ اسلام کے اجتماعی نظام کی اساس چونکہ خاندان پر رکھی گئی ہے' اس لئے نکاح اور نکاح کے اوپر نکاح کی حرمت اسلامی نظام کی تعمیر میں خشت اول کا درجہ رکھتی ہے۔ گویا اسلامی نظام میں خاندان پہلی اکائی ہے اور خاندان کو ہر قسم کے اختلاط خصوصاً نسب کے اختلاط سے محفوظ رکھنا ضروری ہے' جو عموماً بے قید جنسی تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے' جس سے فحاشی پھیلتی ہے اور پورا معاشرہ اس میں ملوث ہو جاتا ہے۔

اسلامی معاشرے کی اکائی سے جو خاندان بنتا ہے ' وہ اعلانیہ نکاح پر استوار ہوتا ہے 'جس میں ایک عورت ایک مرد کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے ۔ اس طرح وہ اس مرد کے حصار میں آ جاتی ہے اور محصن ہو جاتی ہے یعنی محفوظ اور مامون ۔ اور یہ نظام وہ مکمل ترین نظام ہے ' جو انسانی فطرت اور انسان کی حقیقی ضروریات کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے ' وہ حاجات و ضروریات جو انسان کے لئے بحیثیت انسان ضروری ہیں ۔ یہ بات یہاں نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ انسانی زندگی کے بعض ایسے مقاصد ہیں جو اس کے حیوانی مقاصد سے زیادہ اہم ' بڑے اور وسیع ہیں ۔ اگرچہ ان کے ضمن میں حیوانی مقاصد بھی پورے ہو جاتے ہیں ۔ غرض اسلام کا معاشرتی نظام انسانی سوسائٹی کے مقاصد عالیہ کو بطور اتم پورا کرتا ہے اور وہ اس معاشرے کے لئے امن و اطمینان کے پورے اسباب فراہم کرتا ہے ۔ انسانی نفس اور ضمیر کا امن ' انسانی گھرانے اور ان کے ذریعے انسانی سوسائٹی کا امن و سکون ۔

یہ بات ایک کھلا مشاہدہ ہے کہ انسان کے بچے کو 'کسی بھی اور حیوان کے مقابلے میں زیادہ عرصے تک دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اور طفولیت کے بعد اس کی علمی اور اخلاقی تربیت کے لئے پھر مزید طویل عرصہ درکار ہوتا ہے تاکہ وہ انسان کی اجتماعی زندگی کے مقتضیات کا ایسا ادراک کر سکے جس کی وجہ سے انسان اور حیوان کے درمیان امتیاز کیا جا سکے ۔

حیوانات کے درمیان جب جنسی اتصال ہوتا ہے اور توالد و تکاثر کا مقصد پورا ہو جاتا ہے تو ان کے جنسی مقاصد پورے ہو جاتے ہیں ' لیکن انسان کا کیس یہ ہے کہ اس کے مقاصد صرف ان امور کے پورے ہونے سے پورے نہیں ہو جاتے ' اس کے مقاصد اس سے آگے ہیں ۔ ان میں مرد اور عورت کا دائمی ہم سفر ہونے اور میاں بیوی کے درمیان ایک دائمی رشتے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ پیدا ہونے والے بچے کو حفظ ذات ' حفظ حیات انسانی ' اور اس کی ضروریات خورد و نوش کی فراہمی کے لئے تربیت دی جائے اور تیار کیا جائے ۔ اس کے علاوہ سب سے اہم مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک انسانیت نے اس دنیا میں علم اور ٹیکنالوجی کے میدان میں جو تجربات کئے ہوتے ہیں ' انہیں بھی اس کی طرف منتقل کیا جائے تاکہ وہ انسانی معاشرے میں بھرپور حصہ لے سکے اور انسانی ترقی کے اس مسلسل عمل میں ' جو صدیوں سے جاری ہے خود اپنے دور میں جس میں یہ بچہ پیدا ہوا اپنا فریضہ ادا کر سکے ۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں تک جنس انسانی کا تعلق ہے ' اس کے معاملے میں جنسی لذت کا مقام ایک مرد اور عورت کے باہمی تعلقات میں بہت نیچے آتا ہے ۔ جنسی لذت قدرت الٰہی نے مرد اور عورت میں محض اس لئے ودیعت فرمائی ہے تاکہ وہ خوشی اور دلچسپی سے باہم ملیں اور اس طرح بقائے بنی نوع انسان کے فریضہ کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کریں ۔ مرد اور عورت کے باہمی میل کی تہہ میں صرف جنسی لذتیت عامل اول نہیں ہے بلکہ اس میں اصل فیکٹر فرائض نوع کی ادائیگی ہے ' یعنی اس ناتواں آنے والی نسل کی دیکھ بھال جو اس جنسی ملاپ کی وجہ سے وجود میں لائی جاتی ہے ۔ نیز اس سوسائٹی کے حقوق کی ادائیگی جس پر اس موجود نسل کی تربیت کی ذمہ داری ہوتی ہے ' تاکہ یہ نسل اپنے انسانی اور اجتماعی فرائض ادا کر سکے اور یوں وہ انسانی وجود کے اصلی مقاصد پورے کر سکے ۔

یہ تمام مقاصد یوں پورے ہوتے ہیں کہ جنسی تعلق کو ایک خاندان کی صورت میں منظم کیا جائے اور یہی وہ طریق کار ہے جو انسانی تجربات کے نتیجے میں صحیح ثابت ہوا ہے ۔ اس طریق کار میں ایک عورت ایک مرد کے لئے مخصوص کر دی جاتی ہے اور یوں یہ تعلق دائماً مستحکم بنیادوں پر استوار ہوتا ہے ۔ خاندان کی تشکیل میں صرف جنسی لذت ہی اصل فیکٹر

نہیں اور نہ صرف جنسی بے راہ روی ہی اصل اور فیصلہ کن عنصر ہوتا ہے' نہ اس تعلق کے برقرار رہنے میں اور اس کے قیام اور دوام میں پیش آنے والی مشکلات کے حل میں صرف یہی عامل کام کرتا ہے اور نہ ہی خاندان کے توڑنے کے عمل کی پشت پر صرف یہی جنسی عمل کام کرتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ خاندان کے مقدس نظام کی اس سے زیادہ اور کوئی توہین نہیں ہو سکتی کہ اسے ادائے فرض کے مقدس عامل کے بجائے صرف شہوت رانی' عارضی جنسی خواہشات کی تسکین اور محض لذتیت کی اساس پر منظم کیا جائے' جبکہ یہ سب عوامل بہت ہی عارضی ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا تصور پیش کرنا انسان اور انسانیت کے خلاف ایک مجرمانہ کوشش ہے۔ اس لئے کہ اس طرح معاشرے میں فحاشی' طوائف الملوکی' معاشرتی بے راہ روی' اور معاشرتی شتر بے مہاری جیسی خرابیاں طوفان کی طرح پھیل جاتی ہیں اور اس طرح پورا معاشرہ منہدم ہو جاتا ہے اور اس کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔

اس وقت دنیا میں بعض اہل قلم خاندانی نظام کے خلاف لکھ رہے ہیں۔ ایک وسیع میڈیا اس کے خلاف لگا دیا گیا ہے' جو نکاح اور خاندانی نظام کے خلاف مسلسل نشر و اشاعت میں مصروف ہے اور ان تعلقات کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے جو صرف جنسی لذتیت اور خوش وقتی پر مبنی ہوتے ہیں' جبکہ مستقل خاندانی نظام کی تحقیر کی جاتی ہے۔ اس بحث سے اچھی طرح معلوم ہو گا کہ ان خطوط پر کام کرنے والے اہل قلم انسانیت کے خلاف کس قدر عظیم جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ان حضرات کی کوششوں سے خاندانی نظام کی شکل بگڑ گئی ہے اور اس کی اہمیت ختم ہو گئی ہے۔

اس موضوع پر حضرت عمر ابن خطاب ؓ کے ایک قول میں بڑی گہرائی پائی جاتی ہے۔ ایک شخص اپنی بیوی کو محض اس لئے طلاق دینا چاہتا تھا کہ اب اسے اس کے ساتھ کوئی محبت نہیں رہی۔ حضرت عمر ؓ نے فرمایا! "کیا خاندان کی اساس صرف محبت پر ہے؟ اگر یہی ہے تو پھر بچوں کی پرورش کا کیا بنے گا اور پھر ذمہ داریاں کون سنبھالے گا۔" اور حضرت عمر ؓ نے یہ نظریہ زندگی قرآن کریم کی ہدایت اور تربیت سے اخذ کیا تھا۔ قرآن کریم نے اللہ کے ان مختار بندوں کی تربیت یوں کی تھی۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (٤:١٩)

"ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو' مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔" اور یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ ممکن حد تک ایک گھرانے کو قائم رکھا جائے' اور قلبی جذبات اور میلانات کا مقابلہ کیا جائے اور ان کو کنٹرول میں رکھا جائے اور مرد و زن کے اس مقدس تعلق کو اس وقت تک نہ توڑا جائے جب تک اسے قائم رکھنے کی آخری کوششیں فیل نہ ہو جائیں۔ یہ کوشش اسلامی نظام نے اس لئے کی ہے کہ اس خاندان میں پیدا ہونے والے چھوٹے بچوں کا مستقبل تباہ نہ ہو جائے۔ وہ آنے والے طوفان کے تھپیڑوں اور سرکش جذبات کی رو' اور خواہشات نفسانیہ کی آندھیوں کی زد میں نہ آ جائیں۔

اس بلند اور گہرے نقطہ نظر کی روشنی میں' اس یاوہ گوئی کی سطحیت ازخود ظاہر ہو جاتی ہے جو خاندانی نظام کے سلسلے میں آبرو باختہ لوگ کرتے ہیں - یہ لوگ مرد و زن کے ہر اس تعلق کے خلاف ہیں جو زوجین پر کچھ فرائض اور حقوق عائد کرتا ہو' جن کا تعلق انسانیت کی قیمتی جنس یعنی نوخیز نسل سے ہو یا اس نوخیز نسل کی ایسی تربیت سے ہو جس میں اس کو جدید ترقی یافتہ زندگی میں اپنے انسانی فرائض سرانجام دینے کے فطری وظیفہ سے ہو اور جس میں تمام نسلوں کے مفادات کو پیش نظر رکھا گیا ہو' جبکہ یہ لوگ ہر اس تعلق کی تعریف اور تمجید کرتے ہیں جس کی اساس وقتی جذبات اور زائل ہونے والی لذتیت پر ہو' اور جسے یہ لوگ ترقی کی علامت سمجھتے ہیں -

آج کے اس دور میں گندی اور سستی فلمیں اور گندے گم کردہ راہ میڈیا کے ذرائع' ہر منکوحہ عورت کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ جب بھی اس کا دل خاوند سے اچاٹ ہو جائے وہ فوراً اپنے لئے دوست تلاش کر لے اور یہ ذرائع ابلاغ ایسی عورت کے فعل کو ایک مقدس فعل تصور کرتے ہیں' جبکہ اپنے حقیقی خاوند کے تعلق کو وہ "معاہدۂ بیع جسم" کہتے ہیں' حالانکہ اللہ تعالیٰ بیان محرمات کے سلسلے میں فرماتے ہیں - (وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ) "وہ عورتیں جو حصار نکاح میں بند ہیں" اور انہیں حصار نکاح میں بند ہونے کی وجہ سے دوسرے مردوں کے لئے حرام قرار دیتے ہیں - یہ تو ہے اللہ کا فرمان اور وہ ہے فرمان ان آبرو باختہ لوگوں کا جنہیں اس مقدس حصار کے توڑنے کے لئے دشمنان اسلام نے قابو کر لیا ہے اور وہ حصار نکاح کو توڑ کر اسلامی معاشرے میں فحاشی پھیلانا چاہتے ہیں -

(وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ) "اللہ ہی حق کہتا ہے اور صرف وہی سیدھا راستہ بتلاتا ہے -"

اس دنیا میں نہایت ہی منظم کوششیں اس لئے صرف کی جا رہی ہیں کہ اللہ جل شانہ کی مرضی کے خلاف اقدار حیات' اخلاقی پیمانے اور تصورات ایجاد کئے جائیں اور انسانی زندگی میں ایسے اجتماعی روابط اور ایسی عمرانی بنیادیں رکھی جائیں جو ان روابط اور بنیادوں سے مختلف ہوں جنہیں اللہ نے رائج کیا - اور جو حضرات ان مساعی نامشکور میں رات دن مصروف ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مقصد صرف اسلامی ممالک کے اندر اسلامی معاشرے کی بنیادیں منہدم کرنے تک محدود ہے تاکہ وہ اسلامی ممالک میں اجتماعی زندگی کے نظام کو درہم برہم کر کے ان تمام رکاوٹوں کو ختم کر دیں جو ان ممالک میں ان کے مخصوص مقاصد کی راہ میں حائل ہوں ان اہداف کے تحت وہ مسلمانوں کے عقائد' ان کے اخلاق اور ان کے اجتماعی نظام کو تباہ کر رہے ہیں لیکن وہ سوچتے نہیں کہ ان کی ان غلط مساعی کے نقصانات خود ان کے حق میں کس قدر دور رس ہیں - وہ فقط اسلامی نظام معاشرت ہی کو تباہ نہیں کر رہے بلکہ وہ دراصل پورے عالم انسانیت کی اقدار کو تباہ کر رہے ہیں' وہ اقدار جن پر پوری انسانیت کی اعلیٰ اجتماعی قدریں استادہ ہیں - ان لوگوں نے اپنی اس پالیسی کی وجہ سے پوری انسانیت کو ان عناصر سے محروم کر دیا ہے جن کی وجہ سے انسانیت نے اپنے کاندھوں پر امانت کبریٰ کا بوجھ اٹھا رکھا تھا - یعنی اس کرۂ ارض پر بہترین اور ترقی یافتہ نسل کو پروان چڑھانا - ان لوگوں کی اس پالیسی کی وجہ سے انسانیت تربیت یافتہ بچوں کی دولت سے محروم ہو گئی ہے' جنہوں نے ماں کی گود میں تربیت پائی ہو - یاد رہے کہ بچے کے لئے ماں کی گود ہی نرم' مطمئن اور پرامن گہوارہ ہوتی ہے اور اس تربیت میں بچہ بے لگام شہوانی جذبات سے مامون ہوتا ہے - نیز وہ

بدلتے ہوئے میلانات اور خواہشات کا شکار نہیں ہوتا اور نہ وہ ایسی خواہشات کا کھلونا بنتا ہے جو ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ رخ بدلتی رہتی ہیں۔ ماں کی گود میں تربیت یافتہ بچہ ہی بنی نوع انسان کی اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے اور یہ اہداف محض شہوت رانی کی خاطر دو افراد کے ملاپ اور مخصوص نسل کشی کی کافر نرسریوں میں بچوں کی پرورش کے اہداف سے بالکل جدا اور مقدس ہیں اور یہ اہداف مستقل، پرسکون اور دور رس انسانی فرائض پر مبنی ہیں۔

اس صورت حال میں پوری انسانی نسل لعنت اور ملامت کی مستحق ہو جاتی ہے' اس لئے کہ انسانیت کا ایک عضو' دوسرے اعضاء کو تباہ کر رہا ہے' اور جس میں موجودہ نسل انسانی' آنے والی نسلوں کے مستقبل کو تباہ و برباد کر رہی ہے' محض اس لئے کہ خود اس کی ذات کا بھلا ہو جائے' اس کی ذاتی اور موجود خواہشات کماحقہ پوری کر دی جائیں چاہے مستقبل میں آنے والی نسلوں کی قسمت میں تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ رہے۔ اور اللہ کا عذاب ان نسلوں کے لئے قضائے مبرم بن جائے جو اللہ کے احکام کی نافرمان ہو رہی ہیں' جو اس کی تخلیق کردہ فطرت کے خلاف روش رکھتی ہیں اور جو اس کی صریح ہدایات کے خلاف جا رہی ہیں۔ اور جن کی وجہ سے پورا بنی نوع انسان ان مصائب میں گرفتار ہے۔ ہاں اس وبال اور عذاب الٰہی سے وہ مٹھی بھر مومن ضرور محفوظ رہیں گے جو اللہ کے احکام کا اقرار کرتے ہیں' جو اس زمین پر اللہ کی مملکت کے قیام کے لئے کوشاں ہیں اور لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اس کی دعوت دے رہے ہیں اور ان کو اس مٹا دینے والے فساد سے بچانا چاہتے ہیں' جسے انسانیت خود اپنے لئے تیار کر رہی ہے اور وہ یہ سمجھتی ہے کہ یہ سازش وہ صرف اسلامی ممالک کے خلاف کر رہی ہے تاکہ وہ رکاوٹیں دور ہوں جو ان کی راہ میں حائل ہیں۔ اور جس کے لئے انہوں نے خود عالم اسلام کے اصحاب قلم اور میڈیا میں کام کرنے والوں کو لگا رکھا ہے اور وہ اپنی ان مساعی کو صرف عالم اسلام کے اندر محدود تصور کرتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

(وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ) "اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو دوسروں کے حصار نکاح میں ہوں' البتہ ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو جنگ میں تمہارے ہاتھ آئیں۔" اس فقرے میں استثناء ان قیدی عورتوں کے بارے میں ہے جو اسلامی جنگوں میں گرفتار ہو کر آتی تھیں' لیکن وہ دارالحرب اور دارالکفر میں دوسرے لوگوں کے نکاح میں ہوتی تھیں۔ اس صورت میں ان کا تعلق نکاح' ان کے سابقہ خاوندوں کے ساتھ منقطع ہو جاتا تھا' کیونکہ دارالکفر سے دارالاسلام میں آجانے کی وجہ سے ان کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے' لہٰذا اس تبدیلی سے وہ محصنات نہیں رہتیں۔ اور دارالاسلام میں ان کا کوئی خاوند ہوتا نہیں اور ایک حیض کے آنے ہی سے ان کا رحم سابقہ خاوند کے آثار سے پاک تصور ہو گا۔ یعنی یہ نتیجہ اخذ کر لیا جائے گا کہ ان کا رحم حمل سے پاک ہے۔ اگر اب وہ اسلام میں داخل ہوتی ہیں تو ان کے ساتھ نکاح جائز ہو گا' یا جس شخص کے حصے میں وہ آجائیں' اس کے لئے بھی ان کے ساتھ مباشرت جائز ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اس کی مملوکہ ہو جاتی ہیں۔ اس صورت میں چاہے وہ اسلام لائیں یا نہ لائیں مباشرت جائز ہو گی۔

ظلال القرآن کے پارۂ دوئم میں' ہم تفصیل کے ساتھ مسئلہ غلامی کے بارے میں اسلام کے موقف پر بحث کر آئے ہیں۔ اس طرح اس سلسلے میں ایک تفصیلی بحث سورۂ محمد کی آیت

(حَتّٰى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (٤٧ : ٤)

"یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو' اس کے بعد تمہیں اختیار ہے' احسان کر دیا فدیے کا معاملہ کرو' تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے۔" کے تحت کی گئی ہے۔ وہاں ملاحظہ ہو۔

یہاں اس قدر کافی ہے کہ اسلامی کیمپ اس وقت غلامی کے معاملے میں اپنے مخالف کیمپ کے ساتھ وہی معاملہ کر رہا تھا' جو خود وہ کیمپ اس کے ساتھ کر رہا تھا۔ جبکہ اسلامی کیمپ بمقابلہ مخالفین کے غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کر رہا تھا۔ اسلامی کیمپ کا سلوک انسانی اخلاق کریمانہ پر مبنی تھا۔ اور اس کے سوا اسلامی کیمپ کے پاس کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا' اس لئے کہ غلام سازی کا قانون ایک بین الاقوامی مروجہ قانون تھا' اور اسلام کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ یکطرفہ طور پر اس قانون کو ختم کر دینے کا اعلان کرتا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو مسلمانوں میں سے جو لوگ غلام ہوتے وہ ہمیشہ کے لئے غلام رہ جاتے اور اہل کفر میں سے جو غلام ہوتے وہ آزاد ہو جاتے۔ یوں دشمن کے کیمپ کا پلڑا اسلامی کیمپ کے مقابلے میں بھاری ہو جاتا اور مخالف کیمپ کے حوصلے اسلامی کیمپ پر حملہ آور ہونے کے لئے بڑھ جاتے کیونکہ وہ ان حملوں کے نتائج سے ہر طرح مطمئن ہو جاتے بلکہ مخالف کیمپ کو ہر حال میں فائدہ ہوتا۔

اب یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام کے لئے بامر مجبوری کافر غلام عورتوں کو اپنے معاشرے میں رکھنا ضروری ہو گیا تھا' تو پھر ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا۔ ان عورتوں کے لئے محض کھانے پینے کے انتظام پر اکتفاء نہ کیا جا سکتا تھا' اس لئے کہ اس کے علاوہ ان کے ساتھ ایک دوسری فطری ضرورت بھی لگی ہوئی تھی۔ اس ضرورت کا سامان کرنا بھی ضروری تھا' اگر یہ سامان نہ کیا جاتا تو وہ یہ ضرورت غیر قانونی ذرائع سے پورا کرتیں اور یوں پورا اسلامی معاشرہ فحاشی کے سیلاب سے دوچار ہو جاتا اور یہ گندگی پھیل جاتی۔ پھر حالت شرک میں ہونے کی وجہ سے اہل اسلام کے لئے ان کے ساتھ نکاح جائز نہ تھا' نہ زبردستی انہیں اسلام میں داخل کرنا جائز تھا' اس لئے یہی ایک صورت رہ جاتی تھی کہ وہ جن لوگوں کی مملوکہ ہوں ان کے لئے ان کے ساتھ حالت شرک میں بھی مجامعت کرنا جائز ہو' جب تک وہ مشرکہ ہوں' بشرطیکہ ان میں سے جو دارالحرب میں منکوحہ تھیں ان کے رحم کی پاکیزگی کی شرط کو پورا کیا جائے اور دارالکفر میں ان کے خاوندوں کے ساتھ ان کے تعلق کو ختم کر دیا جائے۔

---ooo---

ان محرمات کے بعد' دوسری محرمات کے بیان سے پہلے اور باقی تمام عورتوں کی حلت کے اعلان سے پہلے' یہاں یاد دہانی کرنا ضروری ہے کہ اسلامی نظام حیات میں حرام قرار دینے اور حلال قرار دینے کے اختیارات صرف اللہ کے لئے ہیں۔ اللہ کے سوا یہ اختیارات اور کسی کے پاس نہیں ہیں۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ انسانوں کے لئے ان کی زندگی کے امور کے بارے میں قانون سازی کرے۔

(كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ) "یہ اللہ کا قانون ہے' جس کی پابندی تم پر لازم کی گئی ہے۔" یہ تمہارے ساتھ اللہ

کا عہد اور میثاق ہے جو اس کے اور تمہارے درمیان پختہ طور پر طے ہوا ہے' اور اس پر یہ اس کا فرمان ہے۔ معاملہ محض کسی خواہش کا نہیں ہے کہ اس کے پیچھے دوڑیں' نہ یہ کسی رسم و رواج کا معاملہ ہے جس کا اتباع کیا جاتا ہو اور نہ یہ خاندانی رواج کا معاملہ ہے جس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہو بلکہ یہ اللہ کے میثاق' اس کے عہد اور اس کی کتاب کا تقاضا ہے اور یہی وہ سرچشمہ ہے جس سے اہل ایمان قوانین حلت اور حرمت اخذ کرتے ہیں' اور جو کچھ وہ فرض کر دے اس پر عمل ضروری ہے' وہ جو لکھ دے وہ حرف آخر ہے' اور اس کے بعد یہ کہ اس نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر تم سے مواخذہ بھی ہو گا اور عمل پیرا ہونے کا مطالبہ بھی ہو گا۔

یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ قرآن کریم نے جن عورتوں کو محرمات کی فہرست میں داخل کیا ہے' ان میں سے اکثریت ایام جاہلیت میں بھی حرام تھی' اور ان میں سے ایام جاہلیت میں صرف باپ کی منکوحہ حرام نہ تھی' نیز دو بہنوں کے درمیان بیک وقت نکاح جائز تھا' البتہ "منکوحہ اب" کے ساتھ نکاح کو بھی ناپسند ہی کیا جاتا تھا۔ اس نکاح کو ان کے عرف میں نکاح "مقیت" کہتے تھے یعنی برا فعل۔ اسلام نے تقریباً انہی محرمات کو حرام قرار دیا جو جاہلیت میں حرام تھیں۔ اسلام نے علت تحریم یہ نہ بتائی کہ ایام جاہلیت میں بھی یہ حرام تھیں بلکہ قرآن کریم نے بصراحت یہ حکم دیا کہ "یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر واجب ہے۔"

اس مقام پر ہمیں قدرے توقف کر کے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اسلام میں تصورات اور عقائد اور افکار و نظریات کی اساس کیا ہے' نیز اسلام میں فقہ و قانون کے مصادر اور مآخذ کیا ہیں؟ یہ غور و فکر کرتے ہوئے اللہ کا یہ بیان ہمارے لئے بہت سے امور میں مفید ہے۔

اسلام اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ قانون سازی کا اصل الاصول اللہ کا امر اور اس کی اجازت ہے۔ اس اعتبار سے اللہ کی ذات ہی اس معاملے میں مقتدر اعلیٰ ہے اور اقتدار کا پہلا اور آخری مآخذ بھی وہی ہے اس لئے جو نظام زندگی بھی اس اصول اور بنیاد پر قائم نہ ہو گا وہ بنیادی طور پر باطل تصور ہو گا اور اس کی نہ تصحیح ہو سکتی ہے اور نہ اس کا اعادہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ جاہلیت بنیادی طور پر باطل (Void) ہے۔ اور جاہلیت ہر اس نظام کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ صحیح اور حقیقی سرچشمہ سے ماخوذ نہ ہو۔ اور اس جاہلیت کے تمام تصورات باطل ہیں' اس کے حسن و قبح کے تمام پیمانے باطل ہیں' اس کے تمام رسم و رواج باطل ہیں اور اس کے تمام ضابطے اور قوانین باطل ہیں۔ اسلام کو جب بھی اس زندگی کے نظام پر غلبہ حاصل ہوتا ہے وہ اسے مکمل طور پر تبدیل کر دیتا ہے۔ وہ اس زندگی کو مجموعی طور پر لیتا ہے' اور سب سے پہلے وہ اس سے جاہلیت کے تمام آثار کو ختم کرتا ہے' جاہلیت کی تمام اقدار' تمام پیمانے' تمام رسوم اور تمام قوانین کو کالعدم کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ یہ تمام قوانین باطل (Void) ہیں' نہ ان کی تصحیح ہو سکتی ہے اور نہ ان کو از سر نو جاری رکھا جا سکتا ہے۔ اگر اسلام دور جاہلیت کے کسی عرف' رسم و رواج کو بحال رکھتا ہے' تو وہ اس لئے برقرار نہیں رکھتا کہ وہ دور جاہلیت کے باقیات صالحات میں سے ہے یا یہ کہ وہ دور جاہلیت کا کوئی اچھا نمونہ ہے۔ بلکہ اسلام اسے اللہ کے امر اور اللہ کی اجازت سے برقرار رکھتا ہے اور اسے قانونی حیثیت اور جواز فراہم کرتا ہے۔ رہی وہ حیثیت جو اسے دور جاہلیت میں حاصل تھی' تو وہ ختم ہو چکی۔ اب اس کا اعادہ ممکن نہیں۔

اسلامی نظام قانون میں' بعض امور کو جو عرف کی تحویل میں دیا گیا ہے یا عرف پر موقوف کیا گیا ہے تو ان معاملات

میں خود اسلام اس عرف کو معروف ہونے کی وجہ سے قانونی حیثیت دیتا ہے اور یہ بھی اللہ کے فرمان (Ordinance) کے ذریعے ' یوں ان موضوعات میں عرف اور رواج کو قانونی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے لیکن یہ عرف اسلامی نظام میں اپنے لئے قوت نافذہ خدا اور رسول سے اخذ کرتا ہے ۔ ان لوگوں کے عرف سے اپنی قانونی حیثیت اخذ نہیں کرتا ہے ' جن میں وہ متعارف تھا' نہ اس معاشرے سے لیتا ہے جس میں وہ رائج تھا' اس لئے کہ لوگوں کی جانب سے کسی عرف اور رواج کی اطاعت کرتے رہنا اسلام میں اسے کوئی قانونی جواز فراہم نہیں کر سکتا ۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ۔ عرف اور رسم و رواج کو بعض مسائل میں جو قانونی حیثیت حاصل ہوتی ہے وہ اسے قرآن وسنت نے دی ہوئی ہوتی ہے ۔ اگر کسی عرف اور رسم و رواج کو اسلام بحال نہ رکھے اور اسے شارع قانونی حیثیت نہ دے تو وہ اصلیت کے اعتبار سے باطل ہو جائے گا ۔ اس لئے کہ اسلامی قانونی نظام کا اصل الاصول یہ ہے کہ ہر قسم کی قانون سازی کا مرجع اور منبع خدا اور رسول ہیں اور اسلام نے جاہلیت کے ایسے رسوم اور رواجات کے بارے میں جسے وہ بحال رکھنا نہیں چاہتا' یہ کہا ہے کہ ان امور کی اجازت (Sanction) اللہ نے نہیں دی ۔

(اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ (۴۲ : ۲۱) "کیا ان کے ہاں ایسے شریک خدا ہیں جنہوں نے ان کے لئے دین کی حیثیت رکھنے والا قانونی نظام مقرر کیا ہے' جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا۔"

اس آیت میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک قانون ساز ہے ۔ اگر ان کے پاس کسی اور ایسے قانون ساز کا پتہ ہے جو اللہ کے مقابلے میں خود مختارانہ قانون سازی کر سکتا ہو تو وہ بتائیں تو...؟

یہ ایک عظیم قاعدہ ہے' جس کی طرف 'ایک چٹکی سے ' ان الفاظ میں اشارہ کر دیا گیا ہے ۔ ہر قانون سازی کے موقعہ و محل پر قرآنی نصوص نے اس کے بارے میں فیصلہ کیا ہے اور اس کی تاکید کی ہے ۔ اس لئے کہ قرآن کریم نے جہاں بھی کوئی قانون سازی کی ہے' ہر جگہ اس قوت اور اس اتھارٹی کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے' جس کی جانب سے یہ قانون صادر ہوا ہے' لیکن اسلام جب دور جاہلیت کے قوانین اور رسوم و رواجات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ان کو منسوخ کرتا ہے تو وہاں کہا جاتا ہے ۔ (مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ) "اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کوئی قانونی جواز (Authority) نازل نہیں فرمایا۔" تاکہ ابتداء ہی سے ان رسوم کے قانونی اثرات کو ختم کر دیا جائے اور ان کے باطل ہونے کی وجہ بھی بتلا دے کہ وہ محض اس لئے باطل ہیں کہ انہیں اسلامی نظام کے شارع اور مصدر قانون سے کوئی قانونی حیثیت فراہم نہیں کی گئی ۔

یہاں ہم جس قانونی اصول کا ذکر کر رہے ہیں' وہ اس دوسرے عام قاعدے سے بالکل ایک علیحدہ چیز ہے' جو اسلامی قانونی نظام میں مسلم ہے یعنی یہ کہ تمام امور میں اصل جواز ہے ۔ الا یہ کہ کسی امر کی حرمت کے لئے کوئی نص آ جائے اس لئے کہ اپنی اصل کے اعتبار سے تمام اشیاء کے حلال ہونے والا اصول بھی تو اللہ میاں نے وضع کیا ہے ۔ اور وہ اللہ کے اذن (Ordinance) سے وضع شدہ ہے ۔ لہٰذا اس کی قانونی حیثیت بھی اسی مصدر (Source) کی طرف راجع ہے جس کی بابت ہم یہاں بحث کر رہے ہیں ۔ یہاں بات ان جاہلی اصول قانون سے ہو رہی ہے جنہیں جاہلیت نے

اللہ کی نازل کردہ شریعت سے علیحدہ مستقل قانونی درجہ دے دیا ہو' ان امور میں' اصل الاصول یہ ہے کہ جاہلیت کے تمام امور کالعدم (Void) ہیں۔ الا یہ کہ اللہ اور رسول نے ان کے برقرار رکھے جانے کے بارے میں کوئی حکم' اذن (Ordinance) نافذ کیا ہو۔ اگر کیا ہو تو پھر وہ از سرنو نافذ ہونے والے قانون بن جاتے ہیں۔ اور اس وقت سے یہ از سرنو اسلامی شریعت سے اپنا قانونی جواز اکتساب کر لیتے ہیں۔

---ooo---

بیان محرمات کی تکمیل کے بعد اور یہ طے کرنے کے بعد کہ یہ تحریم محض حکم الٰہی کی وجہ سے ہے' اب یہاں موضوع سخن اس میدان میں داخل ہوتا ہے' جس میں لوگوں کے لئے یہ ضابطہ بندی کی گئی ہے کہ وہ اپنے فطری تقاضے نکاح کر کے پورے کریں' اس طریقے کے مطابق جو اللہ تعالیٰ نے مرد و زن کے درمیان' ایک خاندان کی تشکیل کے لئے' تعلقات قائم کرنے کے لئے پسند فرمایا ہے' تاکہ وہ ایک خاندان پر مشتمل ابتدائی ادارہ قائم کر دیں اور اس میں مرد و زن باہم مل کر خوشی حاصل کریں لیکن پاکیزگی' صفائی اور سنجیدگی کے ساتھ اور اس شان کے ساتھ جو اس عظیم مقصد کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۴:۲۴)

"ان کے علاوہ جتنی عورتیں ہیں انہیں اپنے اموال کے ذریعے سے حاصل کرنا تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے' بشرطیکہ حصار نکاح میں ان کو محصور کرو' نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرتے لگو۔ پھر ازدواجی زندگی کا جو لطف ان سے اٹھاؤ اس کے بدلے ان کے مہر بطور فرض کے ادا کرو' البتہ مہر کی قرارداد ہو جانے کے بعد آپس کی رضامندی سے تمہارے درمیان اگر کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں' اللہ علیم اور دانا ہے۔"

غرض محرمات مذکورہ کے علاوہ تمام عورتوں سے نکاح جائز ہے اور جو لوگ نکاح کرنا چاہتے ہیں وہ اپنا مال خرچ کر کے ان کا مہر ادا کریں اور نکاح کے بعد ان سے فائدہ اٹھائیں یہ جائز نہیں ہے کہ وہ صرف دولت خرچ کر کے عیاشی کریں۔ چنانچہ اس بات کی تصریح کر دی گئی (مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ) "حصار نکاح میں لاتے ہوئے' نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرو۔"

مال خرچ کر کے عورتوں کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ یہ شرط عائد کی گئی کہ ان کے ساتھ نکاح کرو اور فقرہ ختم کرنے سے پہلے یہ بھی شرط عائد کی گئی تاکہ یہ شرط اس دفعہ کی جزء بن جائے بلکہ یہ مثبت شرط یعنی شرط نکاح عائد کرنے کے ساتھ ساتھ بطور تاکید منفی اس کی متبادل صورت کو متصلا بعد حرام کر دیا گیا اور (مُّحْصِنِيْنَ) کے بعد (غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ) کا لفظ بطور تاکید مزید اضافہ کیا گیا۔ کیونکہ ان فقروں میں قانون سازی ہو رہی تھی' اور اس میں کسی قسم کی

جھول مناسب نہ تھی تاکہ اسلام جس تعلق زن و شو کو نکاح کی اساس پر جائز کرتا ہے' اس کی پوری تصویر سامنے آجائے اور جس دوسری صورت کو وہ ناپسند کرتا ہے' وہ بھی واضح ہو جائے یعنی فحاشی اور ذاتی دوستی کے تحت مرد و زن کے تعلقات' اور یہ دونوں قسم کے تعلقات ایام جاہلیت میں معروف و مروج تھے ۔ اور اس معاشرے میں ازروئے قانون جائز تصور ہوتے تھے ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں آیا ہے :۔

"دور جاہلیت میں نکاح کی چار اقسام مروج تھیں ۔ ایک نکاح تو وہ تھا جو آج کل دور اسلام میں مروج ہے ۔ ایک شخص دوسرے شخص کی لڑکی یا اس کے زیر ولایت لڑکی کا پیغام دیتا' اس کو مہر ادا کرتا اور نکاح کر لیتا ۔ اور دوسرا نکاح یہ ہوتا کہ جب کسی شخص کی بیوی ایام ماہواری سے پاک ہو جاتی وہ اسے حکم دیتا کہ وہ فلاں شخص کے پاس پیغام دے اور اس کے ساتھ جماع کرے ۔ وہ خود اس سے علیحدہ رہتا' اور اسے چھوتا بھی نہ' یہاں تک کہ اس کا حمل اس شخص سے واضح ہو جاتا' جس سے وہ مباشرت کا مطالبہ کرتے تھے' اور جب حمل ظاہر ہو جاتا تو خاوند پھر اگر چاہتا تو اس کے ساتھ مباشرت کرتا' اور یہ حرکت وہ اس لئے کرتے تھے کہ بچے اچھے اور صحت مند پیدا ہوں ۔ اس نکاح کو نکاح استبضاع (حمل طلب کرنا) کہتے تھے ۔ ایک دوسری قسم یہ تھی کہ دس سے کم افراد جمع ہوتے' وہ ایک عورت کے ہاں آتے جاتے' ان میں سے ہر ایک اس کے ساتھ مباشرت کرتا' جب اس کا حمل ہو جاتا اور بچہ پیدا ہو جاتا اور کچھ راتیں گزر جاتیں یعنی بچے کی پیدائش پر' تو وہ سب کو بلاتی' کسی کو اس بات کی اجازت نہ ہوتی تھی کہ وہ غیر حاضر ہو' وہ سب اس کے پاس جمع ہوتے ۔ وہ ان سے کہتی تم جانتے ہو جو معاملہ ہمارے درمیان تھا' اب میرا بچہ پیدا ہوا ہے' اے فلاں یہ تیرا بیٹا ہے ۔ اور وہ جس شخص کا چاہتی نام لے لیتی ۔ اس طرح اس شخص کا وہ بیٹا قرار پاتا اور کوئی شخص پھر اس بچے کا انکار نہ کر سکتا ۔ اور چوتھا نکاح یہ تھا کہ بہت سے لوگ ایک عورت کے پاس آتے جاتے' یہ عورت کسی کو بھی روکتی نہ تھی ۔ یہ عورتیں جسم فروش ہوا کرتی تھیں ۔ وہ اپنے دروازوں پر خاص جھنڈے نصب کیا کرتی تھیں' جو ان کی خاص علامت ہوتے تھے ۔ ان میں سے جو بھی چاہتا ان کے ہاں آتا جاتا ۔ اور جب ان میں سے کوئی حاملہ ہو جاتی اور بچہ پیدا ہو جاتا تو سب لوگ جمع ہوتے اور قیافہ دان بلایا جاتا' اب وہ اس بچے کو جس کا بیٹا قرار دیتا یہ اس کا ہو جاتا ۔ اور اس کا بیٹا پکارا جاتا ۔ کوئی بھی اس کا انکار نہ کر سکتا ۔" (بخاری کتاب النکاح)

ان میں سے تیسرا اور چوتھا نکاح زنا ہے جس کی حرمت آیات میں منصوص ہے ۔ چاہے وہ دوستی ہو یا پیشہ ورانہ حرام کاری ہو ۔ دوسرا نکاح ایک ایسی بدکاری ہے اور ایسی گھٹیا حرکت ہے جس کے لئے ہمارے پاس کوئی لفظ نہیں ہے ۔ ہاں پہلا نکاح ہے جسے اسلام احصان قرار دیتا ہے اور اس نے اسے قانونی شکل دے دی ہے ۔

قرآن کریم جس قسم کے نکاح کی اجازت دیتا ہے اس کی نوعیت کی اچھی تصویر کشی کر دیتا ہے ۔ اس کی تعبیر لفظ "احصان" سے کی جاتی ہے جس کے مفہوم میں حفاظت اور بچاؤ داخل ہے ۔ یعنی انسان کو برائیوں اور بدکاریوں سے بچانا ۔ یہ نکاح مرد کے لئے بھی احصان ہے اور عورت کے لئے بھی احصان ہے ۔ ایک قرات کے مطابق لفظ محصنین اسم فاعل کے مفہوم میں وارد ہے اور دوسری قراۃ میں محصنین اسم مفعول کے صیغے میں پڑھا گیا ہے ۔ اور اسلامی طریقہ نکاح میں دونوں مفہوم متحقق ہو جاتے ہیں جو پاک' صاف اور عفت مآب طریقہ ہے ۔ وہ ایک گھر کے لئے بھی احصان ہے ایک خاندان کے لئے بھی احصان ہے بچوں کے لئے بھی احصان ہے ۔ اور خاندان کے ابتدائی انسانی اداروں کے لئے بھی

احسان ہے کیونکہ اس سے اس ادارے کی بنیاد مضبوط' پختہ اور گہری ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ دوسرے جس قدر طریقے ہیں ان کے لئے مسفاح کا لفظ استعمال ہوا' یعنی سفح سے باب مفاعلہ۔ یعنی جس میں عورتیں اور مرد شریک ہوں اور دونوں اپنا اپنا پانی گرائیں۔ مسافحہ کے معنی ہوتے ہیں نشیبی تنگ جگہ میں پانی گرانا۔ اور ان صورتوں میں مرد اور عورت ماء حیات کو گراتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے تسلسل اور ترقی کے لئے پیدا کیا ہے تاکہ مرد اور عورت مل کر نئی نسلیں پیدا کریں۔ ان کی پرورش کریں اور تربیت کریں لیکن وہ اس کے برعکس اس آب حیات کو محض وقتی لذت کے لئے گراتے ہیں جو وقتی میلان پر مبنی ہوتی ہے۔ وہ اسے نشیبی جگہ میں گراتے ہیں اس لئے وہ ان دونوں کو گندگی سے نہیں بچاتا۔ اور اس طرح بچے تلف ہونے سے محفوظ نہیں رہتے اور خاندان تباہ ہونے سے نہیں بچتا۔

قرآن کریم زندگی گزارنے کے دو طریقوں کی تصویر کشی کرتا ہے اور صرف دو الفاظ میں (محصنین و غیر مسافحین)' یہ الفاظ اس طرح استعمال ہوئے ہیں کہ اللہ کے پسندیدہ طریق زندگی کو تو بہترین انداز میں پیش کیا جاتا ہے اور ناپسندیدہ طریق نکاح کو نہایت ہی توہین آمیز الفاظ میں۔ جبکہ دونوں صورتوں کے بارے میں فیصلہ واقعی زندگی کے اندر ہوتا ہے اور یہ قرآن کریم کی بالکل منفرد اور انوکھا طرز تعبیر ہے۔ (دیکھیے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن فصل۔ التناسق اور فصل۔ طریقۃ القرآن) جب یہ حکم دیا جا چکا کہ تم ان عورتوں کے ساتھ نکاح کے سلسلے میں اپنا مال خرچ کرو تو یہاں غلط فہمی دور کرنے کے لئے بتا دیا کہ مال کس طرح خرچ کرو گے۔

(فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً (٤ : ٢٤)) "پھر جو ازدواجی زندگی کا لطف تم ان سے اٹھاؤ' اس کے بدلے ان کے مہر بطور فرض ادا کرو۔"

اسلامی قانون مہر کو عورت کا ایک فرض شدہ حق قرار دیتا ہے اور یہ حق لطف اندوزی کے عوض مقرر کیا گیا ہے۔ جو شخص کسی عورت سے جنسی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ اسے اپنے حصار نکاح میں لے' اور وہ عورت ان عورتوں میں سے نہ ہو' جن کو حرام قرار دیا گیا ہے اور جن کی فہرست اوپر دے دی گئی ہے۔ یعنی کوئی شخص صرف نکاح کے ذریعے کسی عورت کو زوجیت میں لے کر ہی اس سے تعلق قائم کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ تمام دوسرے طریقے ممنوع ہیں۔ اور نکاح کی صورت میں بھی خاوند پر مہر کی ادائیگی حتمی فرض ہے۔ یہ کوئی نفلی اور غیر لازمی شرط نہیں ہے۔ نہ عورت پر احسان ہے بلکہ یہ اس کا حق ہے اور از روئے شریعت فریضہ ہے۔ نیز مرد کے لئے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ دور جاہلیت کے بعض رواجوں کی طرح' عورت کو موروثی طور پر کسی طرح اور کسی صورت میں اپنی زوجیت میں لے لے۔ اور نہ ہی وہ نکاح شغار کی طرح عورت پر عورت کے بدلے قبضہ کر سکتا ہے۔ نکاح شغار یوں ہوتا تھا کہ ایک شخص ایک لڑکی دے اور اس کے بدلے دوسرے سے لڑکی حاصل کرے یوں کہ گویا دو جانوروں کا باہم تبادلہ ہو رہا ہے یا دو اشیاء کا تبادلہ ہو رہا ہے۔

عورت کے لئے مہر فرض کرنے کے بعد' معاملہ زوجین پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ ادائیگی اور معافی کے سلسلے میں باہم رضامندی سے کوئی بھی معاملہ طے کر سکتے ہیں۔ یعنی مشترکہ زندگی کے تقاضوں کے مطابق' ایک دوسرے کے ساتھ

موجود جذبات اور میلانات کے مطابق (وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ (٤: ٢٤)) ''اور البتہ مہر کی قرار داد ہو جانے کے بعد آپس کی رضامندی سے تمہارے درمیان اگر کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ۔''

اس لئے اگر عورت اپنا حق معاف کرتی ہے تو اس پر کوئی پابندی نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ قبول کرے ۔ وہ پورا معاف کر دے یا بعض حصہ معاف کر دے وہ ایسا کر سکتی ہے لیکن یہ معافی یا کمی مہر کے مقرر ہونے کے بعد ہو سکے گی ۔ یعنی جب یہ مہر اس کا حق بن جائے گا اور وہ اس میں اپنے دوسرے مملوکات کی طرح ہر قسم کے تصرف میں آزاد اور خود مختار ہوگی ۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ خاوند مقررہ مہر میں اضافہ کر دے یا مہر سے زیادہ ادائیگی کر دے ۔ یہ بہرحال اس کا اپنا مقام اور مرتبہ ہوگا اور دونوں کی جانب سے فریق آخر کے ساتھ آزادی کے ساتھ احسان اور نرمی ہو سکے گی ۔

اب پھر اس پر ایک اختتامیہ اور تعقیب آتی ہے اور ان تمام احکام کو ان کے مصدر سے وابستہ کر دیا جاتا ہے اور بتا دیا جاتا ہے کہ جس منبع سے یہ احکام صادر ہو رہے ہیں وہ وسیع علم رکھتا ہے اور اس کی بصیرت دور رس ہے ۔ (اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (٤: ٢٤)) ''اللہ علیم اور دانا ہے ۔'' وہی ہے جس نے ان احکام کو قانونی شکل دی اور اس نے یہ قانون سازی علم و حکمت کی اساس پر کی ۔ یوں ایک مسلم اچھی طرح یہ شعور رکھتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر موڑ پر کہاں سے احکام و ہدایات حاصل کر رہا ہے ۔ اور یہ ہدایات یعنی میاں بیوی کے تعلقات کے بارے میں تو مخصوص اور شخصی ہیں ۔ اس پر وہ اچھی طرح مطمئن ہوتا ہے' اس لئے کہ اللہ کی جانب سے جو احکام بھی دیئے جا رہے ہیں وہ علم و حکمت کی بنا پر دیئے جا رہے ہیں ۔ اس لئے کہ وہ ''علیم و دانا ہے ۔''

---○○○---

اب اگر بعض عارضی حالات میں صورت حال یہ ہو گئی کہ کوئی مومن' اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے کسی آزاد مومن عورت کے ساتھ عقد نکاح کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے' جسے وہ اپنے حصار نکاح میں رکھ سکے اور وہ اس کے لئے سبب عفت بنے' تو اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات میں غیر آزاد عورت یعنی لونڈیوں سے بھی نکاح کی اجازت دے دی ہے' اگر وہ اس وقت تک انتظار نہیں کر سکتا کہ اس کے حالات درست ہو جائیں اور وہ آزاد عورت سے نکاح کرے یعنی اسے زیادہ مشکلات کا ڈر ہو یا اسے یہ ڈر ہو کہ وہ کسی اخلاقی فتنے کا شکار ہو جائے گا ۔

(وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ

الْعَذَابِ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٤:٢٥))

"اور جو شخص تم میں سے اتنی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں (محصنات) سے نکاح کر سکے' اسے چاہئے کہ وہ تمہاری ان لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کر لے' جو تمہارے قبضہ میں ہوں' اور مومنہ ہوں' اللہ تمہارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے۔" تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو' لہٰذا ان کے سرپرستوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کر لو' اور معروف طریقے سے ان کے مہر ادا کر دو' تاکہ وہ حصار نکاح میں محفوظ (محصنات) ہو کر رہیں اور آزاد شہوت رانی نہ کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں۔ پھر جب وہ حصار نکاح میں محفوظ ہو جائیں اور اس کے بعد کسی بدچلنی کی مرتکب ہوں' تو ان پر اس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے جو محصنات عورتوں کے لئے مقرر ہے۔ یہ سہولت تم میں سے ان لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے جن کے شادی نہ کرنے سے بند تقویٰ ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو' لیکن اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے' اور اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

اسلامی نظام زندگی' انسان کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کرتا ہے' جو اس کے فطری حدود کے اندر ہو' اس کی وسعت اور طاقت کے مطابق ہو' اس کی واقعی صورت حال کے متناسب ہو' اور اس کی حقیقی ضروریات اور حاجات سے ہم آہنگ ہو۔ اسلام کسی گمراہ انسان کو ہاتھ سے پکڑ کر گمراہی کے گڑھوں سے نکالتا ہے اور اسے اسلامی نظام حیات کی رفعت اور بلندی عطا کرتا ہے اور اس پورے عمل میں وہ اس کی فطرت' اس کی قوت' اس کے واقعی حالات' اور اس کی حقیقی ضروریات کو ہر حال میں پیش نظر رکھتا ہے۔ بلکہ وہ ان تمام دواعی کے تقاضے بھی پورے کرتا ہے اور اسے تدریج کے ساتھ مقام بلند تک بھی لے جاتا ہے۔ البتہ یہ بات ایک حقیقت ہے کہ اسلام جاہلیت کی صورت کو کسی حالت میں بھی ایسی صورت حال تسلیم نہیں کرتا جس کے سوا چارۂ کار ہی نہ ہو' اس لئے کہ جاہلیت تو نام ہی گراوٹ کا ہے اور یہ انسان کو بھی گراتی ہے جبکہ اسلام کا مقصد وجود ہی یہ ہے کہ وہ اس گراوٹ سے انسانیت کو اٹھا کر مقام بلند تک لے جائے۔ ہاں اسلام انسان کی فطرت اور حقیقت کا اعتبار کرتے ہوئے واقعیت پسند ضرور ہے۔ اور حقیقت واقعہ یہ ہے کہ انسان بلندی اور برتری کے مقام تک چڑھنے کی قدرت بھی رکھتا ہے اور فطری داعیہ بھی۔ واقعیت پسندی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر انسان جاہلیت کی گندگی کے اندر لت پت ہے تو اسے ایسا ہی رہنے دیا جائے۔ (چاہے وہ کوئی جاہلیت بھی ہو) بلکہ واقعیت یہ ہے کہ انسان کی قدرت و وسعت میں یہ بات ہے کہ سربلندی حاصل کرے اور ترقی کرے اور اس کا فطری داعیہ بھی ہے اور اللہ تعالیٰ انسان کے واقعات سے اچھی طرح باخبر ہے کیونکہ وہ انسان کا خالق ہے' اور اس کی حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے۔

اللہ ہی وہ ذات ہے جو ان تمام باتوں کو جانتا ہے جو انسانوں کے دلوں میں کھٹکتی ہیں۔ (اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (٦٧: ١٤)) "کیا وہ ذات نہیں جانتی جس نے پیدا کیا اور حال یہ ہے کہ وہ نہایت ہی باریک بین

اور خبردار ہے۔"

اسلام کے ابتدائی معاشرے میں غلام موجود تھے' یہ غلام مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ہونے والی لڑائیوں کے نتیجے میں پیدا ہوتے تھے اور اس وقت تک غلام رہتے تھے جب تک ان کی غلامی کا معاملہ بین الاقوامی طور پر طے نہ ہو جائے' یعنی یا ان جنگی قیدیوں کو بطور احسان مفت رہا کر دیا جائے' یا ان کا تبادلہ مسلمان قیدیوں کے ساتھ ہو جائے یا مالی تاوان حاصل کر کے جنگی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے یعنی جس طرح کے حالات اہل اسلام اور ان کے مقابل دشمن قوت کے مابین پائے جائیں۔ جب تک قیدیوں اور غلاموں کا مستقل فیصلہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک اسلام ان غلاموں کا مسئلہ یوں حل کرتا ہے کہ وہ قیدی اور غلام عورت کے ساتھ اس کے مالک کی مباشرت کو جائز قرار دیتا ہے۔جس کی تشریح ہم سابقہ آیت میں کر آئے ہیں تاکہ مملوکہ عورتوں کے فطری تقاضوں کو ایک ضابطے کے مطابق پورا کیا جائے' اور دوسری صورت یہ ہے کہ ان غلام عورتوں کو کسی مومن کے نکاح میں دے دیا جائے بشرطیکہ وہ اسلام قبول کر چکی ہوں اور ان دونوں صورتوں میں ان کے ساتھ مجامعت دارالحرب سے دارالاسلام تک منتقل ہونے کے بعد' ایک حیض آنے کے بعد ان کے رحم کی پاکی کی پوری تحقیق کے بعد ہو سکے گی۔ لیکن ان لونڈیوں کے مالکان کے سوا دوسرے لوگوں کے لئے ان کے ساتھ مباشرت کی صرف ایک ہی صورت ہے' وہ یہ کہ ان کے ساتھ نکاح کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ ان کے لئے اس بات کا جواز نہیں ہے کہ معاشرے میں جسم فروشی کریں اور اجرت لیں۔ اور نہ ان کے لئے یہ جائز ہے کہ مالکان ان کو آزاد کر دیں اور وہ ان مالکان کے لئے جسم فروشی کرتی پھریں۔ اس آیت میں ایسی عورتوں کے ساتھ نکاح کا یہ طریقہ وضع کیا گیا ہے۔

(وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (۴:۲۵))

"اور جو شخص تم میں سے اتنی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں (محصنات) سے نکاح کر سکے اسے چاہئے کہ تمہاری ان لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرے جو تمہارے قبضے میں ہوں اور مومنہ ہوں۔"

اسلام اس بات کو ترجیح دیتا ہے کہ نکاح آزاد عورت کے ساتھ کیا جائے' بشرطیکہ کسی شریف زادی سے نکاح کرنے کی استطاعت ہو' اس آزاد عورت کو محصنہ اس لئے کہا گیا کہ وہ حصار آزادی میں محفوظ ہوتی ہے۔ حریت اور آزادی اسے یہ آداب سکھاتی ہے کہ وہ اپنی عفت اور پاکدامنی کی حفاظت کس طرح کرے گی۔ نیز آزادی اور شرافت اسے یہ بھی سکھاتی ہے کہ خاوند کی عزت کی حفاظت کیسے کی جائے گی۔ اس لئے یہاں شریف زادیوں اور آزاد عورتوں کے لئے محصنات کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں محصنات سے مراد وہ عورتیں نہیں جو شادی شدہ ہوں اور کسی کے حصار نکاح میں ہوں۔ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ دوسروں کی بیویاں یعنی محصنات سب مردوں پر حرام ہیں۔ اور یہاں آزاد عورتوں کے لئے لفظ محصنات اس لئے استعمال کیا گیا کہ وہ حصار آزادی میں بند ہوتی ہیں۔ آزادی اور شرافت کی وجہ سے انسانی ضمیر اور شعور میں عزت نفس کا احساس ہوتا ہے اور زندگی میں آزاد عورتوں کو کچھ حقوق حاصل ہوتے

ہیں ۔ آزاد عورت کا ایک خاندان ہوتا ہے' ایک فیملی ہوتی ہے' اس کی شہرت ہوتی ہے' اس کے محافظ ہوتے ہیں اور وہ بھی اپنے خاندان کی عزت کا خیال رکھتی ہے ۔ پھر اس کی عزت نفس بھی اسے گھٹیا حرکات سے روکتی ہے ۔ اس لئے وہ بدکاری اور زناکاری سے اجتناب کرتی ہے اور یہ موانع اور رکاوٹیں عام بازاری عورتوں یا غلام عورتوں کے لئے نہیں ہوتیں' یہی وجہ ہے کہ وہ محصنہ نہیں ہوتیں ۔ اگر وہ نکاح بھی کریں تب بھی غلامی کے زمانے کے آثار ان کے اندر پائے جاتے ہیں' لٰہذا ایک آزاد عورت کی طرح اس کے کردار میں عزت نفس' عفت اور خودداری نہیں ہوتی ۔ اس کے علاوہ اس کے دل و دماغ پر خاندانی شرافت کا بھی کوئی احساس چھایا ہوا نہیں ہوتا' جس کے داغدار ہونے کا اسے کوئی خوف ہو' علاوہ ازیں اس میں آنے والی نسل کے جذبات کا بھی خیال رکھا گیا ہے اس لئے کہ غلام عورت کی اولاد کو ایک آزاد اور شریف زادی کی اولاد کے مقابلے میں فروتر سمجھا جاتا تھا ۔ اس طرح غلامی کا داغ ان کے ساتھ کسی نہ کسی صورت میں لگا رہتا تھا اور یہ تصورات عرب معاشرے میں بالعموم موجود تھے' جس میں قرآن کریم نازل ہو رہا تھا ۔ یہ تھے وہ اسباب جن کی وجہ سے اسلام نے اس بات کو ترجیح دی کہ جہاں تک ہو سکے مسلمان آزاد اور شریف زادیوں کے ساتھ نکاح کریں ۔ اور غیر محصنہ عورتوں یعنی لونڈیوں سے شادی کی اجازت اس شرط پر دی کہ جب حرہ اور آزاد عورت سے نکاح ممکن نہ ہو یا اس کی طاقت نہ ہو یا اس کے لئے انتظار کی جانکاہ گھڑیاں گزارنا پڑ رہی ہوں اور مزید انتظار نہ کیا جا سکتا ہو ۔

جب یہ مشکلات بھی ہوں اور ایک مرد کے لئے بے راہ روی کا بھی خطرہ ہو اور مرد کے لئے انتظار مشکل ہو تو اسلام اس کی راہ نہیں روکتا بلکہ اجازت دیتا ہے کہ آسانی' اطمینان اور آرام سے لونڈیوں سے نکاح کر لے اور نکاح کی اجازت بہرحال ان غلام عورتوں سے ہے جو ایمان لا چکی ہوں اور جو کسی دوسرے کی ملکیت میں ہوں ۔ ایمان کی شکل کو یہاں بھی متعین طور پر ثبت کیا گیا ہے جس طرح اس سے قبل آزاد اور محصنہ عورتوں کے ساتھ نکاح میں ایمان کو شرط قرار دیا گیا تھا ۔ اس طرح کسی کافرہ لونڈی سے بھی کسی طور نکاح جائز نہیں ہے ۔ اس لئے پہلے یہ لازمی شرط لگائی جاتی ہے کہ وہ مومنات ہوں ۔ (فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (۴: ۲۵)) "جو تمہارے قبضے میں ہوں اور مومنہ عورتیں ہوں ۔" اور دوسری شرط یہ ہے کہ انہیں ان کے مہر ادا کئے جائیں جو فرض ہیں اور ان کی وصولی کا حق ان کے مالکان کو نہیں ہے ۔ یہ ان کا اپنا خالص حق ہے ۔ (وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ (۴: ۲۵)) "پس دو انہیں ان کے مہر" تیسری شرط یہ ہے کہ ان کا معاوضہ بطور مہر ہو' اور ان سے لطف اندوزی بطور نکاح ہو نہ کہ بطور دوستی یا بطور زن بازاری ۔ مخادنہ کا مفہوم ہے ایک مرد یا عورت سے دوستی اور سفاح کے معنی ہیں زن بازاری کا پیشہ جو ہر کسی کے لئے کھلا ہوتا ہے ۔ (مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (۴: ۲۵)) "تاکہ وہ حصار نکاح میں محصور ہو کر رہیں اور آزادانہ شہوت رانی یا چوری چھپے آشنائیاں نہ کرتی پھریں ۔"

جب اسلام آیا تو عرب معاشرے میں آزاد عورتوں کے اندر بھی اس قسم کی بے راہ روی متعارف تھی جیسا کہ اس سے پہلے بیان کردہ حدیث عائشہ میں آپ پڑھ چکے ہیں ۔ نیز اس دور میں غلام عورتوں میں جسم فروشی کا رواج بھی عام تھا ۔ اس وقت کے رؤساء اپنی لونڈیوں کو بازاروں میں چھوڑ دیتے تھے اور وہ ان کے لئے روپیہ کما کر لاتی تھیں ۔ عبداللہ بن ابی ابن سلول رئیس المنافقین نے مدینہ طیبہ میں اس مقصد کے لئے چار لونڈیاں رکھی ہوئی تھیں' حالانکہ وہ اپنی قوم کا رئیس تھا' اور وہ پیشہ کر کے اس کے لئے روپیہ کماتی تھیں ۔ جاہلیت کی گندگی کے یہ آثار مدینہ تک میں باقی تھے ۔ اسلام

نے عربوں پر احسان کر کے اس رسم کی بیخ کنی کر دی 'عربوں کا مقام بلند کر دیا انہیں اس گندگی سے پاک و صاف کر دیا اور عربوں کے بعد تمام انسانیت کو اس نجاست سے پاک کیا۔

اسلام نے مردوں اور ان نوجوان مومنہ عورتوں کے درمیان مباشرت کا صرف ایک ہی طریقہ جائز قرار دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک عورت کے لئے ایک مرد مخصوص کیا جائے یعنی طریقہ نکاح اور اس طرح ایک خاندان پر مشتمل دو افراد زندگی بسر کریں۔ اور یہ صورت نہ ہو کہ اس میں جانوروں کی طرح محض شہوت رانی ہو۔ چونکہ دولت مردوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس لئے عورت کے لئے مہر مقرر فرمایا ہے جو ازروئے شریعت فرض ہے تاکہ مرد و زن کا یہ تعلق محض دوستی اور پیشہ ورانہ اجرت پر مبنی نہ ہو۔ اسی طرح غلاموں کی دنیا میں بھی اسلام نے اس تعلق کو جاہلیت کی گندگیوں سے پاک کیا۔ انسان نے جب بھی جاہلیت کو اپنایا وہ اس گندگی میں مبتلا ہوا۔ آج اس دور جدید میں انسان چونکہ جاہلیت کے جھنڈے اٹھائے ہوئے ہے 'اور اس نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے اس لئے وہ اس گندگی میں پوری طرح لت پت ہے۔

اس آیت کے تحت اس موضوع پر بحث ختم کرنے سے پہلے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کے اس انداز تعبیر پر بھی ذرا غور کریں جس میں قرآن کریم نے غلاموں اور آزاد لوگوں کے درمیان 'اسلامی معاشرے میں انسانی تعلقات کے قیام کی نسبت سے بات کی ہے۔ قرآن کریم غلام عورتوں کے لئے 'رفیقات' جواری اور امہ کا لفظ استعمال نہیں کرتا جو اس وقت مروج تھے' اسلام ان کے لئے "فتیات" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ (فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (۴: ۲۵)) "جو تمہارے قبضے میں ہوں اور مومنہ جوان عورتیں ہوں۔"

اسلام آزاد عورتوں اور غلام عورتوں کے درمیان ایسا فرق نہیں کرتا جس سے وہ الگ الگ فرقے تصور ہوں۔ حالانکہ اس وقت جو تصورات رائج تھے 'ان کے مطابق غلام لوگوں کی ایک الگ دنیا تھی اور وہ دوسرے درجے کے شہری تصور ہوتے تھے۔ اسلام سب انسانوں کو ایک اصل و نسل کا حامل تصور کرتا ہے۔ جن کے درمیان ایک رابطہ ہے یعنی انسانیت اور ایمان کا رابطہ جو اجتماعی تعلقات کے لئے اسلام میں اساس بنتا ہے۔ (وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ (۴: ۲۵)) "اللہ تمہارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے 'تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو۔"

اسی طرح اسلام ان کے مالکان کے لئے لفظ سید یا مالک استعمال نہیں کرتا بلکہ ان کے لئے "اہل" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

(فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ (۴: ۲۵)) "لہذا ان کے سرپرستوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کرو۔" اور اس کے بعد پھر اسلام مہر کا حقدار ان کے مالکوں کو قرار نہیں دیتا بلکہ مہر صرف عورت کا حق ہوتا ہے لہذا مہر اس قاعدہ کلیہ سے خارج ہو جاتا ہے جس کے مطابق غلاموں کی ہر قسم کی کمائی ان کے مالکوں کی ملکیت ہوتی تھی 'اس لئے کہ مہر کی رقم کمائی کی تعریف میں نہیں آتی بلکہ مہر تو مرد و زن کے رابطے کا ایک مقدس فریضہ ہے۔ (وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۴: ۲۵)) "اور معروف طریقے سے ان کے مہر ادا کرو۔"

اسلام غلام عورتوں کو یہ اعزاز دیتا ہے کہ وہ عام طور پر جسم فروشی نہ کرتی پھریں اور معروف طریقے کے مطابق نکاح کر کے جنسی تعلقات قائم کریں۔ (مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (۴: ۲۵)) "تاکہ وہ

حصار نکاح میں محفوظ ہو کر رہیں 'آزاد شہوات رانی نہ کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں ۔"

یہ تمام خدوخال اور تمام پہلو ان غلام نوجوان عورتوں کے لئے شان اعزاز اور کرامت لئے ہوئے ہیں 'اور جس طرح وقت کا تقاضا تھا 'ان کے اصل مقام انسانیت میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں کی گئی ۔

اس اعزاز اور عزت افزائی کا موازنہ 'اگر نزول قرآن کے وقت رائج اور مروج حالات کے ساتھ کیا جائے جن میں غلاموں کو بری نظروں سے دیکھا جاتا تھا 'اور جس طرح انہیں اعلیٰ انسانی شرف سے محروم کیا جاتا تھا اور اس انسانی شرف کی بنا پر ملنے والے تمام انسانی حقوق سے محروم کیا جاتا تھا 'تو معلوم ہو گا کہ اسلام نے اس سلسلے میں کس قدر دور رس تبدیلی کی ۔اسلام نے ان عورتوں کو انسانی شرافت سے مشرف کیا 'ہر حال میں ان کے مقام انسانیت کا لحاظ رکھا 'قطع نظر اس سے کہ یہ مخلوق عارضی طور پر قید غلامی میں مقید ہے جسے اسلام محض ایک عارضی اور عبوری صورت حال تصور کرتا تھا۔

آج کے جدید اور مہذب دور میں بھی فاتح افواج مفتوح اقوام کی عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ جو سلوک کرتی ہیں 'اگر اس کا مطالعہ کیا جائے اور اس کا تقابل اسلام کے اس پروقار سلوک کے ساتھ کیا جائے جو اس نے اس وقت کے حالات میں غلام عورتوں کے ساتھ کیا تو اس سے معلوم ہو گا کہ اس وقت اسلام نے غلامی کے عارضی طور پر موجود ادارے کے اندر کس قدر دور رس اصلاحات کیں ۔ہمیں جدید دور کی فاتح افواج کے "جنسی ملاپ" اور اس گندگی کے قصے اور رپورٹیں اچھی طرح معلوم ہیں جن میں جاہلیت جدیدہ کے یہ فرزند ہر اس جگہ ملوث ہوئے جہاں بھی انہوں نے فتح حاصل کی ۔اور جب یہ مفتوحہ علاقوں کو چھوڑ کر گئے تو انہوں نے اپنے پیچھے اس قدر گندگی چھوڑی جس سے وہ علاقے سالہا سال تک عہدہ برآ نہ ہو سکے ۔

اس طرح ان نوجوان عورتوں کی جانب سے اس نکاح کے بعد اگر کسی فحاشی اور بدکاری کا ارتکاب ہو تو ان پر آزاد اور شریف زادیوں کے مقابلے میں خفیف سزا تجویز کی گئی ہے 'اس لئے کہ ان غلام عورتوں کے حالات اور واقعات ایسے ہوتے ہیں جن میں ان کے لئے فحاشی اور بدکاری کے ارتکاب کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں اور یہ عورتیں آزاد عورتوں کے مقابلے میں کم قوت دفاع رکھتی ہیں اس لئے کہ غلامی میں ایک شخص کا ضمیر بدل جاتا ہے اور اسے عزت نفس کا کم احساس ہوتا ہے ۔اسے کسی خاندان کی عزت و آبرو برباد ہونے کا احساس بھی نہیں ہوتا 'اس لئے کہ ذاتی عزت و آبرو اور خاندانی عزت و آبرو کا احساس ہی آزاد عورتوں کے اندر اپنے ناموس کی حفاظت کا جذبہ بیدار رکھتا ہے ۔نیز ایک شخص کا معاشرتی مقام اور اس کی اقتصادی حالت بھی فحاشی و بدکاری میں مبتلا ہونے یا نہ ہونے کے معاملے میں ایک اہم فیکٹر ہوتا ہے اور آزاد عورت کے مقابلے میں غلام عورت کا سوشل سٹیٹس اور اقتصادی حالت بہرحال کم ہوتی ہے ۔اس وجہ سے غلام عورت اس معاملے میں بہرحال بڑی آسانی سے ورغلائی جا سکتی ہے ۔یعنی مال اور نسب کی کمی کی وجہ سے ۔ ان وجوہات اور اسباب کی بنا پر اسلام نے غلام عورتوں کے لئے سزائے حد 'جبکہ وہ شادی شدہ ہوں 'ان آزاد عورتوں کی حد کے نصف کے برابر رکھی جبکہ ان کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہوتی ہے ۔فرماتے ہیں :

(فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ

الْعَذَابِ (۴ : ۲۵) "پھر اگر وہ حصار نکاح میں محفوظ ہو جائیں اور اس کی بعد کسی بدچلنی کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا کی نسبت آدھی سزا ہے جو آزاد عورتوں کے لئے مقرر ہے۔"

اس کا مفہوم یہ ہے کہ آزاد عورتوں کی اس سزا کا نصف جو تقسیم ہو سکتی ہو' اور وہ کوڑوں کی سزا ہے اور رجم کی سزا میں تقسیم ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اس سزا سے مراد رجم کی سزا نہ ہوگی' لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ جب کوئی شادی شدہ لونڈی زنا کا ارتکاب کرے تو اس پر آزاد عورت' (جو شادی شدہ نہ ہو)' کی سزا کا نصف حصہ لازم ہو گا۔ رہی اس لونڈی کی سزا جو شادی شدہ نہ ہو' تو اس بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا اس پر یہی حد جاری ہوگی یعنی غیر شادی شدہ آزاد عورت کی نصف سزا یا اسے محض تادیبی سزا دی جائے گی اور یہ تادیب صرف اس کا مالک کرے گا اور نصف حد نہ ہوگی۔ اس اختلاف کی تفصیلات کتب فقہ سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔

ہم یہاں فی ظلال القرآن میں' صرف یہ نکتہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اسلامی نظام زندگی لوگوں کے حالات اور ظروف و احوال کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور اس طرح ان کے حقیقی حالات میں ترقی اور پاکیزگی کی طرف ان کی راہنمائی کرتا ہے۔ وہ لوگوں کو بے کسی کی اس گری ہوئی حالت میں یہ فرض کر کے نہیں چھوڑتا کہ ان کے جو ظروف و احوال ہیں یہ ان کی تقدیر ہے اور وہ اس میں ہمیشہ کے لئے گم گشتہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو خوب جانتا تھا کہ اسلام کے دور اول میں غلام لوگ کن برے حالات سے گزر رہے ہیں' ان پر کیا کیا دباؤ ہیں اور ان حالات میں ایک لونڈی کو کس سہولت کے ساتھ بدکاری اور فحاشی کے لئے آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اسلام نے ان ظروف و احوال کو نظرانداز نہ کیا اور ان لونڈیوں کے لئے وہ سزا تجویز نہ کی جو اس نے آزاد عورتوں کے لئے تجویز کی تھی' اور نہ ہی اسلام نے اس حقیقی اور واقعی صورت حال کو تسلیم کیا بایں معنی کہ ان حالات میں غلام عورتوں کے لئے سرے سے کوئی تادیبی سزا ہی نہ مقرر کی جائے۔ غرض اسلام نے نصف سزا رکھ کر ان حالات کا لحاظ بھی رکھا جو اس وقت اہم فیکٹر تھے۔ سزا بھی تجویز کی اور یوں ایک عادلانہ طریق اختیار کیا۔

ہاں یہ بات بھی ملاحظہ ہو کہ اسلام نے غلاموں کو کم درجہ سمجھ کر ان کی سزا میں سختی بھی روا نہیں رکھی۔ جس طرح اسلام سے قبل دور جاہلیت میں مروجہ قوانین ان طبقات کے لئے بہت سخت ہوتے تھے جو مرتبہ و مقام کے اعتبار سے گرے پڑے ہوں' اور جو طبقات ترقی یافتہ ہوں' ان کے لئے یہ جاہلی قوانین نہایت ہی نرم ہوتے تھے جبکہ اسلامی قوانین ضعفاء اور کمزوروں کے لئے نرم اور شرفاء کے لئے سخت ہوتے ہیں۔

روم کے قوانین میں یہ رویہ اختیار کیا گیا تھا کہ جس قدر ملزم گرے ہوئے اور کم تر درجے کے طبقات سے ہوتا' اسی قدر سزا میں شدت کی جاتی۔ یہ قانون کہتا ہے "اگر کوئی شخص کسی پاک دامن بیوہ یا کسی کنواری کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب کرے گا' اگر وہ شخص کسی معزز خاندان کا فرد ہے تو اس کی نصف جائیداد ضبط ہوگی اور اگر وہ گھٹیا خاندان سے تعلق رکھتا ہو تو اس کی سزا کوڑے اور جلاوطنی ہوگی۔ (دیکھئے مدونہ جسٹینائن ترجمہ عبدالعزیز فہمی) منو نے جو قانون ہند میں پاس کیا تھا' جسے منو شاستر کہا جاتا ہے اس میں یہ درج ہے کہ اگر کوئی برہمن واجب القتل ہو جائے تو اسے قتل نہ کیا جائے گا' حاکم صرف اس قدر سزا دے سکے گا کہ اس کا سر منڈوا دے۔ ہاں اگر واجب القتل شخص برہمنوں کے علاوہ کوئی ہو' تو اسے قتل کیا جائے گا۔ معمولی اور گرے ہوئے طبقات میں سے کوئی اگر برہمن پر ہاتھ اٹھائے گا

تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔" (ماذا خسر العالم ۔۔۔۔۔ ندوی) اور یہودیوں کا قانون یہ تھا کہ ان میں سے کوئی شریف چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کم درجے کا انسان چوری کرتا تو وہ اس پر حد جاری کرتے۔

ان حالات میں اسلامی نظام نازل ہوا' اس نے سچائی کو اپنی جگہ پر کھڑا کیا۔ اس نے مجرم پر سزا نافذ کی لیکن نفاذ سزا میں اس نے حالات جرم کو مدنظر رکھا۔ اس نے شادی شدہ لونڈی کی سزا' اس شریف زادی کی سزا کے نصف کے برابر رکھی جس کی ابھی تک شادی نہ ہوئی ہو۔ اس نے اسے بالکل معاف بھی نہیں کیا کہ اس کے ارادۂ گناہ کا کوئی لحاظ ہی نہ رکھا جائے اور اسے حالات سے مجبور تصور کیا جائے' اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ بالکل خلاف واقعہ اور خلاف حقیقت ہوتا۔ اور نہ اس کے حالات جرم کو نظرانداز کرتے ہوئے' اس کے لئے آزاد اور شریف زادی عورتوں کے مساوی سزا تجویز کی۔ جبکہ اس کے حالات جرم شریف زادی کے حالات جرم سے بالکل مختلف تھے۔ اور نہ اسلام نے وہ جاہلانہ قوانین جاری رکھے جن میں اشراف کو تو معاف کر دیا جاتا تھا اور کم تر درجے کے لوگوں پر سزائے حد جاری ہوتی تھی۔

امریکہ' جنوبی افریقہ اور ان جیسے دوسرے ممالک میں آج تک یہ طبقاتی امتیاز مجرمین کے ساتھ' اس ترقی یافتہ دور میں بھی' روا رکھا جاتا ہے جہاں سفید فام اشراف کو معاف کر دیا جاتا ہے' جبکہ رنگ دار ضعیف اور ناتواں لوگوں کے لئے کوئی معافی نہیں ہوتی۔ یہ ہے جاہلیت اور جاہلیت جہاں بھی ہو اور جب بھی ہو اور جیسے بھی ہو وہ جاہلیت ہی ہے۔

لونڈیوں کے ساتھ آزاد لوگوں کا نکاح محض رخصت ہے' اس شخص کے لئے جو فتنے میں پڑنے سے ڈرتا ہو' یا جسے بہت زیادہ مشقت اٹھانی پڑ رہی ہو۔ جو شخص بغیر کسی مشقت یا بغیر کسی بدکاری میں پڑنے کے احتمال کے صبر کر سکتا ہو تو اس کے لئے یہ بہتر ہے اس لئے کہ غلام عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے سے بہرحال خاندان کا ماحول خراب ہو سکتا ہے۔

(لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۴:۲۵)) "یہ سہولت ان لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے جن کو شادی نہ کرنے سے بند تقویٰ ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو' لیکن اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر حد سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا' نہ انہیں مشقت میں ڈالتا ہے' اور نہ انہیں فتنے میں ڈالتا ہے۔ بے شک اللہ کا وہ نظام زندگی جو اس نے ان لوگوں کے لئے پسند کیا ہے' ان لوگوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ ترقی کریں' بلند ہوں اور عالی شان ہوں' مگر وہ سب تقاضے انسان کے فطری حدود و قیود کے اندر کرتا ہے۔ یہ تقاضے ان کی حدود و استطاعت کے اندر ہوتے ہیں اور ان کی حقیقی ضروریات کے دائرے کے اندر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی ایک سہل نظام زندگی ہے۔ وہ انسانی فطرت کو پیش نظر رکھتا ہے' وہ انسان کی حقیقی ضروریات سے بھی باخبر ہے' اور وہ انسانی ضرورت کی مقدار سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ ہاں اسلام یہ طرز عمل بہرحال اختیار نہیں کرتا کہ وہ ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کرے اور وہ گندگیوں میں گرتے چلے جائیں اور یہ بھی وہ برداشت نہیں کرتا کہ اس کے سامنے لوگ گندگی میں لت پت پڑے ہوں اور وہ اس گندگی پر ان کی تعریف کرے یا مبارکباد دے اور حوصلہ افزائی کرے۔ بلکہ وہ ان پر یہ فریضہ عائد کرتا ہے کہ وہ اس گندگی سے نکلنے کی سعی کریں اور سربلند ہونے کی کوشش کریں' یا وہ ان نتائج سے بری الذمہ ہوں جن تک وہ اس گراوٹ اور دھوکے خوری کا مقابلہ نہ کرنے کی وجہ سے پہنچے ہوں۔

یہاں مسلمانوں کو یہ تلقین بھی کی جا رہی ہے کہ وہ صبر کریں یہاں تک کہ انہیں آزاد عورتوں کے ساتھ نکاح پر قدرت حاصل ہو جائے۔ اس لئے کہ حصن نکاح میں آزاد عورتوں کو لانا ان کا پہلا حق ہے ۔وہ اس بات کی حقدار ہیں کہ خاندان کی تعمیر شریف زاویوں پر ہو' اور وہ شریف زادوں کو جنم دیں اور نوخیز نسلوں کے ساتھ یہ شریف زادیاں احسان کریں' اور اپنے خاوندوں کی عزت محفوظ رکھیں ۔ہاں اگر کسی کو یہ خطرہ ہو کہ وہ بدکاری میں مبتلا ہو جائے گا اور مقابلہ نہ کر سکے گا اور یہ کہ وہ صبر و انتظار کی مشقت برداشت نہیں کر سکتا تو اس کے لئے رخصت ہے کہ وہ لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرے اور اس رخصت میں بھی یہ کوشش کی گئی ہے کہ لونڈیوں کی حیثیت کو اونچا کیا جائے ۔ اور ان کو پھر یہ اعزاز بخشا گیا ہے کہ وہ تمہاری جوان عورتیں ہیں اور تم ہی ان کے اہل ہو اور تم ایک ہی گروہ ہو' اور تمہارے درمیان ایمان کا مضبوط رشتہ موجود ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان کی ایمانی حالت کا اچھی طرح علم ہے' اور یہ کہ ان لونڈیوں کے لئے پھر مہر لازم اور فرض ہے' اور لونڈیوں کے ساتھ بھی تمہیں نکاح ہی کرنا ہو گا' نہ آزاد شہوت رانی ہو گی اور نہ ہی خفیہ دوستی اور اگر نکاح کے بعد یہ لونڈیاں بدکاری کا ارتکاب کریں تو وہ بھی مسئول ہوں گی ۔ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی سزا' ان کے ظروف و احوال کے لحاظ سے ذرا ہلکی ہو گی اس لئے کہ (وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۴: ۲۵)) "اللہ بخشنے والا اور رحم والا ہے۔" یعنی وہ غفور و رحیم ہے کہ اس نے تمہیں مجبوری کی حالت میں غلام عورتوں کے ساتھ نکاح کی اجازت دے دی اور پھر وہ رحیم ہے کہ اس نے لونڈیوں کی سزائیں ان کے ظروف و احوال کی وجہ سے تخفیف کی ۔جہاں بھی کسی غلطی کے ارتکاب کا ذکر ہو' یا جہاں بھی انسان کی ذاتی کمزوری اور مجبوری کے کسی امر کا تذکرہ ہو وہاں آخر میں غفور و رحیم کی تعقیب آتی ہے ۔

---ooo---

اس کے بعد ان تمام مباحث اور احکام پر ایک جامع اختتامیہ آتا ہے' یعنی وہ تمام احکام جو اللہ تعالیٰ نے اسلامی نظام حیات میں ایک خاندان کی تنظیم سے متعلق صادر کئے' تاکہ وہ اس نوخیز اسلامی سوسائٹی کو جاہلیت کے نشیب سے نکال کر بلند کر دے' اس کی نفسیاتی' اخلاقی اور اجتماعی سطح کو بلند کر کے ایک روشن' پاک اور ممتاز مقام تک پہنچا دے ۔تو اب یہ جامع اختتامیہ آتا ہے' جس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کے لئے' اسلامی نظام زندگی میں ان احکام کے ذریعے کیا چاہتے ہیں' وہ اس کی تنظیم اور ضابطہ بندی کیوں کرتے ہیں اور اس کے مقابلے میں جو لوگ آزاد شہوات رانی (Free Sex) کے داعی ہیں ان کے مقاصد کیا ہیں؟

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۲۶) وَاللّٰهُ يُرِيدُ اَنْ يَّتُوبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا (۲۷) يُرِيدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيفًا (۲۸)

"اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان طریقوں کو واضح کرے اور انہی طریقوں پر تمہیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے

ہوئے صلحاء کرتے تھے ـ وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے ' اور وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی ـ ہاں ' اللہ تو تم پر رحمت کے ساتھ توجہ کرنا چاہتا ہے مگر جو لوگ اپنی خواہشات ' نفس کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ راست سے ہٹ کر دور نکل جاؤ ـ اللہ تم پر پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے ـ کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے ـ" اللہ جل شانہ اپنے بندوں کے ساتھ بہت ہی نرمی برتتے ہیں ' اس لئے وہ ان کے سامنے اپنی حکمت قانون سازی بھی کھول کر بیان فرماتے ہیں ـ وہ ان کو بتاتے ہیں کہ اپنے بندوں کے لئے وہ جو نظام زندگی تجویز کرتے ہیں اس میں ان کے لئے خیر ہی خیر ہے اور سہولت ہی سہولت ہے ـ وہ ان کو اس ممتاز اور بلند مقام پر فائز کر کے ان کی عزت افزائی کر رہے ہیں ' وہ بلند مقام جس میں وہ خود ان سے ہمکلام ہوتے ہیں ' اور ان کو اپنی حکمت تشریع بتاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ وہ ان کے سامنے اظہار خیال کرتے ہیں ـ (يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ (٤: ٢٦)) "اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان طریقوں کو واضح کرے ـ" اس کا ارادہ ہے کہ وہ تم پر اپنی حکمت و دانائی کا انکشاف کرے ـ وہ چاہتا ہے کہ تم اس حکمت کو بچشم سر دیکھو ' اس پر غور کرو ' اور اسے اس حال میں قبول کرو کہ تمہاری آنکھیں کھلی ہوں ' تمہارے دل آمادہ ہوں اور تمہاری عقل انہیں تسلیم کر رہی ہو ' اس لئے کہ اسلامی نظام حیات کے احکام معموں اور پہیلیوں پر مبنی نہیں ہیں ـ وہ محض آمرانہ احکام نہیں جن کی نہ حکمت ہو اور نہ ہی ان کے کچھ مقاصد ہوں ـ تم تو ان احکام کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہو ' تم اس حکمت اور فلسفے کو بھی پا سکتے ہو جو ان احکام کی تہہ میں کارفرما ہے ـ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اللہ حکیم ہے ' یہ انسان کے لئے ایک بڑا اعزاز ہے اور اس کی حقیقت کو وہی شخص جانتا ہے جو حقیقت الوہیت اور حقیقت بندگی کو اچھی طرح جان سکتا ہو ' غرض جو شخص یہ ادراک رکھتا ہو ' وہی اللہ کی اس شان کریمی اور مقام لطف و کرم کو سمجھ سکتا ہے ـ

(وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (٤: ٢٦) اور انہی طریقوں پر تمہیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحاء کرتے تھے ـ" تو گویا یہی وہ منہاج حیات ہے جسے اللہ نے تمام مومنین کے لئے جاری کیا ہے ـ وہ ایک ایسا منہاج ہے جس کی بنیادیں بہت ہی مستحکم ہیں ' جس کے اصول ایک ہیں ' جس کے مقاصد اور اہداف ہم آہنگ ہیں ' اور یہی منہاج جماعت مومنہ کا نظام زندگی ہے ' زمانہ ماضی میں بھی اور زمانہ مستقبل میں بھی ' اور یہی امت مسلمہ کا منہاج ہے جو صدیوں سے ایک امت چلی آرہی ہے ـ

یوں وہ تمام لوگ ' قرآن کریم کی نظروں میں ایک ہیں ' جنہوں نے راہ ہدایت کو پایا چاہے وہ جس دور میں ہوں اور جس جگہ ہوں اور پھر قرآن کریم یہ قرار دیتا ہے کہ ہر دور میں اور ہر جگہ اسلامی نظام زندگی بھی ایک رہا ہے ـ اسی طرح زندگی کی طویل شاہراہ پر وہ قافلہ ایمان بھی ایک ہی ہے جو مسلسل حرکت میں ہے ـ یہ وہ جھلک ہے ' جو ایک مسلمان کو یہ شعور عطا کرتی ہے کہ اس کی اصلیت کیا ہے ' اس کی امت اور پارٹی کیا ہے ' اس کا منہاج اور طریقہ زندگی کیا ہے ؟ ایک مومن یہ شعور پاتا ہے کہ وہ اس امت کا فرد ہے جو مومن باللہ ہے ' اس امت کا باہم رابطہ "الٰہی منہاج" زندگی ہے ـ زمان و مکان کے بڑے اختلاف کے باوجود یہ رابطہ قائم رہتا ہے ' رنگوں اور ملکوں کے اختلاف اور دوری کے باوجود یہ تعلق قائم و دائم رہتا ہے اور ہر قوم اور ہر قبیلے کے مومنین کے درمیان یہ سنت الٰہی ایک مستحکم رابطے کا کام کرتی ہے ـ

(وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ) "وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔" وہ اللہ جل شانہ 'تمہیں ہر بات کی تفصیلات بتاتے ہیں' ان اچھے راستوں کی نشاندہی کرتے ہیں' جن پر تم جیسے پہلے لوگ چل چکے ہیں۔ یہ کام وہ اس لئے کرتا ہے کہ وہ رحیم ہے' اس لئے کرتا ہے کہ تم واپس آجاؤ' تم راہ معصیت کو ترک کر دو' اور زندگی کی اس کھلی شاہراہ پر آجاؤ جو اس نے تمہارے لئے خوبصورتی کے ساتھ تیار کی ہے' اور اس راہ پر چلانے کے لئے وہ تمہارا معاون بھی ہے۔

(وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (٤ : ٢٦)) "وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی۔" اس لئے وہ تمہارے لئے جو قانون سازی کر رہا ہے وہ علم و حکمت پر مبنی ہے' وہ جو ہدایات دے رہا ہے' وہ علم و حکمت پر مبنی ہیں۔ وہ تمہاری نفسیات سے بھی آگاہ ہے اور تمہارے حالات بھی اس کی نظر میں ہیں۔ وہ ان تدابیر سے بھی باخبر ہے جن کے ذریعے تمہاری اصلاح بھی ہو سکتی ہے اور وہ تمہارے لئے مفید بھی ہیں۔ وہ اسلامی نظام کے مزاج سے بھی واقف ہے اور اسے اس کے نفاذ کا طریقہ کار بھی اچھی طرح معلوم ہے۔

---ooo---

(وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا (٤ : ٢٧)) "اللہ تو تم پر رحمت کے ساتھ توجہ کرنا چاہتا ہے' مگر جو لوگ اپنی خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ راست سے ہٹ کر دور نکل جاؤ۔"

اس مختصر اور ایک ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے لئے کیا چاہتے ہیں اور کیسے نظام کے ذریعے چاہتے ہیں' کس طریقے سے چاہتے ہیں؟ اور جو لوگ نظام زندگی کو صرف جنسی تعلقات (Sex) پر استوار کرنا چاہتے ہیں اور جو انسانوں کو اسلامی نظام زندگی سے ہٹانا چاہتے ہیں وہ انسان کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بھی اسلامی منہاج سے ہٹ کر کسی دوسرے منہاج کو اختیار کرتے ہیں' ان کا نظام شہوات پر مبنی ہوتا ہے۔ صرف ایک اسلامی نظام زندگی ہی ہے جو سنجیدگی' سچائی' راستی اور احساس ذمہ داری پر مبنی ہے۔ باقی جس قدر نظام ہیں وہ اتباع نفس' اطاعت شہوت اور فسق و فجور اور کج روی و گمراہی پر مبنی ہیں۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنے منہاج سے اچھی طرح آگاہ کر رہا ہے۔ اپنے طریقے تشریح کے ساتھ بیان کرتا ہے تو اس سے اس کی غرض کیا ہے؟ صرف یہ کہ وہ انسانوں پر رحمت اور شفقت کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ تمہیں راہ راست کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ تمہیں آگاہ کرتا ہے کہ زندگی کی راہوں میں فلاں فلاں مقامات ہیں جہاں پھسلنے کا خطرہ ہے۔ وہ سربلندی اور ترقی میں تمہاری امداد کرنا چاہتا ہے' تاکہ تم بلندی کی انتہاؤں کو چھو سکو۔ اس کے مقابلے میں جو لوگ اپنے نظاموں کو صرف شہوات کی تلاش پر رکھتے ہیں اور وہ لوگوں کے لئے شہوت پر مبنی نظامہائے زندگی تجویز کرتے ہیں اور انہیں خوب سجاتے ہیں' جن کی اسلامی نظام حیات کی رو سے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ نے ان کی اجازت دی ہے نہ اسے جائز قرار دیا ہے۔ یہ لوگ صرف یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان راہ راست سے ہٹ کر دور تک گمراہی کی راہوں پر نکل

جائیں اور اسلامی نظام زندگی اور اس کی انتہائی بلندیوں سے محروم ہو جائیں ۔

زندگی کے اس شعبے میں جس کی سابقہ آیات میں ہدایات دی گئیں 'یعنی خاندان کی شیرازہ بندی' سوسائٹی کی طہارت ' مرد و زن کے باہمی تعلقات کے لئے واحد پاک و صاف طریقہ کار کے تعین اور اس کے سوا تمام طریقوں کے ساتھ جنسی ملاپ کی حرمت 'ان کی مذمت اور مسلمانوں کی فکر ونظر میں ان کی گراوٹ و قباحت کا شعور پیدا کرنے کے لئے اس شعبے میں اللہ تعالیٰ کا منصوبہ کیا ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور ان لوگوں کا منصوبہ کیا ہے جو صرف شہوت رانی پر انسانی سوسائٹی کو استوار کرنا چاہتے ہیں؟

اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا جو منصوبہ ہے 'اس کا بیان تو سابقہ آیات میں تفصیل کے ساتھ کر دیا گیا 'جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرد و زن کے اس تعلق کو منظم کرنا چاہتے ہیں ۔ اس تعلق کو پاک و صاف اور مقدس بنانا چاہتے ہیں اور اسے اس طرح استوار کرنا چاہتے ہیں کہ وہ جماعت مسلمہ کے لئے ہرحال میں خیر ہی خیر ہو ۔

رہے وہ لوگ جو صرف شہوت رانی چاہتے ہیں تو وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ یہ فطری میلانات ہرطرح سے بے قید ہو جائیں ۔ ان پر نہ کوئی دینی پابندی ہو 'نہ اخلاقی پابندی ہو اور نہ کوئی اجتماعی پابندی ہو ۔ وہ چاہتے ہیں کہ شہوت کی یہ بھٹی بلاروک وٹوک گرم سے گرم تر ہوتی چلی جائے 'اس پر کسی قسم کا قدغن نہ ہو 'اور وہ اس قدر گرم ہو کہ ہردل بے قرار ہو جائے ' اعصاب پر کوئی کنٹرول نہ رہے اور اس طرح کوئی گھر مطمئن نہ ہو ۔ کسی کی عزت محفوظ نہ رہے 'کسی خاندان کا وجود باقی نہ رہے اور انسانوں کی حالت یہ ہو جائے کہ وہ جانوروں کا گلہ بن جائیں اور پھر ان کے نر (Male) جانور مادہ (Female) جانوروں کو دیکھتے ہی ان پر ٹوٹ پڑیں ' ان کے لئے قوت ' وسائل اور تدبیر کے سوا کوئی ضابطہ نہ ہو ' یوں پورا معاشرہ بل جائے ۔ ہر طرف فساد ہی فساد ہو ' آزادی کے نام پر ہرطرف شر و فساد برپا ہو آزادی کا اگر صرف یہ ہی مفہوم ہے تو وہ صرف آزادی شہوات ہے اور اس پر مبنی نظام صرف شہوانی نظام ہے ۔

یہ ہے وہ گمراہی اور کج روی جس سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ڈراتا ہے ' وہ انہیں متنبہ کرتا ہے کہ اس شہوانی نظام حیات کے داعی انہیں کس چیز کی طرف بلا رہے ہیں ۔ شہوانی نظام کے داعی اس وقت یہ جدوجہد کر رہے تھے کہ نوخیز اسلامی معاشرے کو پلٹا کر دوبارہ اخلاقی بے راہ روی کے نظام کی طرف لے جائیں جس میں وہ بہت دور جا نکلے تھے ' اور اسلام کے پاک و صاف اور مستحکم معاشرتی نظام کی وجہ سے وہ اس میں اکیلے رہ گئے تھے ' اور یہی وہ ہدف ہے جس کی طرف آج کے یہ بے راہ فکار اور ادیب دعوت دے رہے ہیں اور جس میں آج کے تمام ذرائع ابلاغ و تفریح رات دن مصروف ہیں ۔ وہ چاہتے ہیں کہ آج اسلامی معاشرے میں ' حیوانی شہوت رانی کی راہ میں جو تھوڑی بہت رکاوٹیں ہیں ' انہیں بھی ختم کر دیں ۔ یہ حقیقت ہے کہ اس حیوانیت سے انسان کو صرف اسلامی نظام زندگی ہی نجات دے سکتا ہے جب اسلام کی انقلابی قوتیں 'اگر اللہ نے چاہا' اس نظام کو دنیا میں نافذ کر دیں گی ۔

---ooo---

اس اختتامیہ کی آخری جھلک میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انسان ایک ضعیف مخلوق ہے اور اس کی ان کمزوریوں ہی کی وجہ سے اللہ کو اس پر رحم آتا ہے ۔ اس لئے اللہ اس کے لئے جو منہاج حیات وضع کرتا ہے اور جو قانون بناتا ہے اس میں وہ اس ضعف کو ملحوظ رکھتا ہے ' اس لئے ہلکے پھلکے احکام نازل کرتا ہے ' اس کے لئے مشکلات پیدا کرنے کے بجائے

اس کے لئے آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ حرج 'مشقت 'مضرت سے بچاتا ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (۴:۲۸) "اللہ تم پر عائد شدہ پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔"

گزشتہ آیات میں خاندانی نظام کے بارے میں جو احکام دیئے گئے ہیں اور قانون سازی کی گئی ہے اور جو ہدایات دی گئی ہیں ان میں تو تخفیف بالکل واضح نظر آتی ہے۔ مثلاً انسان کے فطری میلانات اور جنسی خواہش کو تسلیم کیا گیا ہے۔ صرف اس جذبے کو منظم کر کے اس کا رخ تعمیری خطوط کی طرف موڑ دیا گیا ہے 'جس کے استعمال کے لئے پاک وصاف دائرہ کار مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس کے لئے پاک وصاف اور بہترین ماحول بنایا گیا ہے 'اور یہ حکم نہیں دیا گیا کہ انسان اپنی اس فطری خواہش کو دبائے یا اس کا قلع قمع کر دے یا اسے اس طرح آزاد چھوڑ دے کہ وہ حیوانی سطح تک گر جائے اور اس کے لئے کوئی حد اور قید نہ ہو۔

خاندانی زندگی کے علاوہ اسلامی نظام زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی قانون سازی کے سلسلے میں تخفیف اور آسانی ہر جگہ صاف نظر آتی ہے۔ انسانی فطرت کا لحاظ رکھا گیا ہے ' انسان کی طاقت اور وسعت کو پیش نظر رکھا گیا ہے ' انسانی حاجات اور ضروریات کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور انسان کی تمام تعمیری قوتوں کو آزاد چھوڑا گیا ہے۔ تاہم ان کے استعمال کے لئے ایسے حدود و قیود رکھے ہیں جن کی وجہ سے ان کے غلط استعمال کی نوبت ہی نہیں آتی۔

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ مرد و زن کے جنسی تعلقات پر اسلام نے جو قیود عائد کی ہیں ان کی پابندی بہت ہی دشوار ہے اور جو لوگ آزاد شہوت رانی کے اصول پر چلتے ہیں ان کے ساتھ چلنا آسان اور فرحت بخش ہے۔ یہ ایک عظیم غلط فہمی ہے اس لئے کہ جنسی تعلق کو بالکل آزاد چھوڑنا ' مرد و زن کے تعلق میں صرف لذت اندوزی کو اختیار کرنا ' اور عالم انسانیت میں جنسی ملاپ کو اس سطح تک لے آنا جس طرح حیوانوں میں جنسی ملاپ ہوتا ہے ' اور اس طرح ان تمام فرائض اور واجبات اور اجتماعی ذمہ داریوں کو ختم کر دینا اور مرد و زن کے اس تعلق کو ہر قسم کے قید و بند سے آزاد کر دینا خواہ وہ اخلاقی قید ہو یا اجتماعی ' یہ تمام باتیں بظاہر تو بہت آسان ' پر کیف اور خوش کن تصور کی جائیں گی لیکن اپنے حقیقی نتائج کی روشنی میں وہ بہت ہی بھاری ' جان توڑ اور تباہ کن ہیں اور ایک فرد اور ایک معاشرے پر اس کے جو برے اثرات پڑتے ہیں ان کے نتائج سخت اذیت ناک 'مہلک اور تباہ کن ہوتے ہیں۔ وہ معاشرے 'جنہوں نے جنسی آزادی کی اس بے راہ روی کو اپنایا ہے ' اور دینی اخلاق اور شرم و حیا کے قیود سے آزاد ہو گئے ہیں ' ان کے حالات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے دل کانپ اٹھتا ہے بشرطیکہ دل میں زندگی کی رمق باقی ہو۔

دنیا میں جو جو قدیم تہذیبیں نیست و نابود ہوئیں ' ان کی بربادی کا عامل اساسی ان کی جنسی بے راہ روی ہی تھی۔ خواہ یہ تہذیب یونانی تہذیب ہو ' رومی تہذیب ہو یا قدیم ایرانی تہذیب ہو ' ان سب کے زوال کا اساسی سبب ان کی جنسی بے راہ روی ہی تھی۔ آج ہمارے دور میں مغربی تہذیب میں جو شکست و ریخت ہو رہی ہے وہ بھی اسی جنسی انارکی کی وجہ سے ہے۔ خصوصاً آج کے فرانسیسی معاشرے کی تباہی کے آثار تو بالکل ظاہر ہیں 'جس نے اس جنسی انارکی کو سب سے پہلے اپنایا۔ تہذیب جدید کے دیگر ممالک ' امریکہ ' سویڈن ' برطانیہ اور دوسری نام نہاد ترقی یافتہ مغربی سوسائٹیوں

میں اس شکست و ریخت کے آثار نمودار ہوگئے ہیں ۔فرانس میں اس جنسی انارکی کے آثار بہت پہلے نمودار ہوئے تھے ۔ ۱۸۷۰ کے بعد فرانس نے جس قدر جنگوں میں بھی حصہ لیا' ان میں اسے دشمن کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے ۔تمام آثار و شواہد اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ فرنچ سوسائٹی مکمل طور پر تباہی کے کنارے کھڑی ہے اور پہلی عالمی جنگ کے بعد یہ آثار اچھی طرح کھل کر سامنے آگئے ہیں ۔مولانا مودودی ﷫ لکھتے ہیں :

””شہوانیت کے اس تسلط کا اولیں نتیجہ یہ ہے کہ فرانسیسیوں کی جسمانی قوت رفتہ رفتہ جواب دیتی چلی جا رہی ہے' دائمی جنسی ہیجانات نے ان کے اعصاب کمزور کر دیئے ہیں ۔خواہشات کی بندگی نے ان میں ضبط اور برداشت کی طاقت کم ہی باقی چھوڑی ہے ۔امراض خبیثہ کی کثرت نے ان کی صحت پر نہایت مہلک اثر ڈالا ہے ۔بیسویں صدی کے آغاز سے یہ کیفیت ہے کہ فرانس کے فوجی حکام کو مجبوراً ہر چند سال کے بعد نئے رنگروٹوں کے لئے جسمانی اہلیت کے معیار کو گھٹا دینا پڑتا ہے کیونکہ اہلیت کا جو معیار پہلے تھا اب اس معیار کے نوجوان قوم میں کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں ۔یہ ایک معتبر پیمانہ ہے جو تھرمامیٹر کی طرح قریب قریب یقینی صحت کے ساتھ بتاتا ہے کہ فرنچ قوم کی جسمانی قوتیں کتنی تیزی کے ساتھ بتدریج گھٹ رہی ہیں ۔امراض خبیثہ اس تنزل کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہیں ۔جنگ عظیم اول کے ابتدائی دو سالوں میں جن سپاہیوں کو محض آتشک کی وجہ سے رخصت دے کر ہسپتالوں میں بھیجنا پڑا ان کی تعداد ۷۵۰۰۰ تھی ۔ صرف ایک متوسط درجے کی فوجی چھاؤنی میں بیک وقت دو سو بیالیس سپاہی اس مرض میں مبتلا ہوئے ۔ایک طرف اس وقت کی نزاکت کو دیکھئے کہ فرانسیسی قوم کی موت و حیات کا فیصلہ درپیش تھا اور اس کے وجود و بقا کے لئے ایک ایک سپاہی کی جانفشانی درکار تھی ۔ایک ایک فرانک بیش قیمت تھا' اور وقت 'قوت' وسائل' ہر چیز کی زیادہ سے زیادہ مقدار دفاع میں خرچ ہونے کی ضرورت تھی' دوسری طرف اس قوم کے جوانوں کو دیکھئے کہ کتنے ہزار افراد عیاشی کی بدولت نہ صرف خود کئی کئی مہینوں کے لئے بیکار ہوئے بلکہ انہوں نے اپنی قوم کی دولت اور وسائل کو بھی اس آڑے وقت میں اپنے علاج پر ضائع کرایا ۔

ایک فرانسیسی ماہر فن ڈاکٹر لیریڈ کا بیان ہے کہ فرانس میں ہر سال آتشک اور اس کی پیدا کردہ امراض کی وجہ سے تیس ہزار جانیں ضائع ہوتی ہیں اور دق کے بعد یہ مرض سب سے زیادہ ہلاکتوں کا باعث ہوتا ہے ۔یہ صرف ایک مرض خبیث کا حال ہے ۔اور امراض خبیثہ کی فہرست صرف اسی ایک مرض پر مشتمل نہیں ہے ۔“

””فرانس میں سالانہ صرف سات آٹھ فی ہزار کا اوسط ان مردوں اور عورتوں کا ہے جو ازدواج کے رشتے میں منسلک ہوتے ہیں ۔یہ اوسط خود اتنا کم ہے کہ اسے دیکھ کر آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آبادی کا کتنا کثیر حصہ غیر شادی شدہ ہے ۔پھر اتنی قلیل تعداد جو نکاح کرتی ہے' ان میں بھی بہت کم لوگ ایسے ہیں جو باعصمت رہتے ہیں اور پاک اخلاقی زندگی بسر کرنے کی نیت سے نکاح کرتے ہیں ۔اس ایک مقصد کے سوا ہر دوسرا ممکن مقصد ان کے پیش نظر ہوتا ہے ۔حتیٰ کہ عامتہ الورود مقاصد میں ایک یہ بھی ہے کہ نکاح سے پہلے ایک عورت نے جو بچہ ناجائز طور پر جنا ہے نکاح کر کے اس مولود کو جائز بنا دیا جائے ۔چنانچہ پول بیورو لکھتا ہے کہ فرانس کے کام پیشہ لوگوں (Working Class) کا یہ عام دستور ہے کہ نکاح سے پہلے عورت اپنے ہونے والے شوہر سے اس بات کا وعدہ لے لیتی ہے کہ وہ اس کے بچہ کو اپنا بچہ تسلیم کرے گا ۔ ۱۹۱۷ میں سین (Seine) کی عدالت دیوانی کے سامنے ایک عورت نے بیان دیا کہ میں نے شادی

کے وقت ہی اپنے شوہر کو اس بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ اس شادی سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے قبل از نکاح آزادانہ تعلقات سے جو بچے پیدا ہوئے ہیں ان کو "حلالی" بنا دیا جائے۔ باقی رہی یہ بات کہ میں اس کے ساتھ بیوی بن کر زندگی گزاروں تو یہ بات نہ اس وقت میرے ذہن میں تھی نہ اب ہے۔ اس بناء پر جس روز شادی ہوئی اسی روز ساڑھے پانچ بجے میں اپنے شوہر سے الگ ہو گئی اور آج تک میں اس سے نہیں ملی کیونکہ میں فرائض زوجیت ادا کرنے کی کوئی نیت نہ رکھتی تھی۔"

"پیرس کے ایک مشہور کالج کے پرنسپل نے پول بیورو سے بیان کیا کہ عموماً نوجوان نکاح میں صرف یہ مقصد پیش نظر رکھتے ہیں کہ گھر پر بھی ایک داشتہ کی خدمات حاصل کر لیں۔ دس بارہ سال تک وہ ہر طرف آزادانہ مزے چکھتے پھرتے ہیں۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ اس قسم کی بے ضابطہ آوارہ زندگی سے تھک کر وہ ایک عورت سے شادی کر لیتے ہیں تاکہ گھر کی آسائش بھی کسی حد تک بہم پہنچے اور آزادانہ ذواقی کا لطف بھی حاصل کیا جاتا رہے۔" ((دیکھئے الحجاب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ؒ امیر جماعت اسلامی پاکستان ص ۱۱۳-۱۱۴ (سید قطب ؒ) دیکھئے پردہ طبع اسلامک پبلیکیشنز لاہور - طبع ۲۷ ص ۹۱ تا ۹۵ لاہور جون ۱۹۸۵)) یوں فرانس تباہ ہوا اور اس کے نتیجے میں فرانس نے ہر اس جنگ میں ہزیمت اٹھائی جس میں وہ شریک ہوا۔ اور اب اس کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ وہ تہذیب و تمدن کے اسٹیج سے آہستہ آہستہ غائب ہو رہا ہے اور کسی بھی وقت اپنے وجود ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا اور یوں سنت الہیہ کا ظہور نہایت ہی دھیمی رفتار سے ہوتا ہے۔ اور انسان اگرچہ ہر معاملے میں جلد بازی سے کام لیتا ہے لیکن سنت الہیہ کی اپنی رفتار ہوتی ہے۔

رہے وہ ممالک جو ابھی تک پر شوکت نظر آتے ہیں یا ان میں تباہی اور ہلاکت کے آثار ابھی تک ظاہر ہو کر سامنے نہیں آئے ہیں تو ان کے نمونے یہ ہیں :

ایک صحافی جنہوں نے حال ہی میں سوئٹزرلینڈ کا دورہ کیا ہے۔ وہ اس ملک کے اشتراکی معاشرے، اس کی اجتماعی سہولتوں اور اس کی مادی ترقیات اور خوشحالیوں سے بحث کرتے ہوئے اس میں آزادی محبت کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

"اگر ہمارے خواب یہی ہوں کہ ہم اپنی قوم کے لئے وہی ممتاز اقتصادی مقام چاہتے ہیں جو ان مغربی ممالک میں ہے، اور ان کامیاب اشتراکی رجحانات کے مطابق، معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان امتیازات کو ختم کر دیں اور ہم اپنے اس ملک مصر کے ہر شہری کی راہ سے وہ تمام مشکلات حیات ختم کر دیں جن کے ختم کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اگر ہم اپنے اس خوش کن خواب تک پہنچ جائیں جس کے حقیقت بنانے میں ہم اپنی پوری قوت اور پوری امکانیت کو ختم کر رہے ہیں، تو پھر یہ اہم سوال پیدا ہو گا کہ ہم اس مادی ترقی کے تمام دوسرے نتائج کو بھی اپنے ہاں قبول کر لیں گے کیا ہم اس مثالی معاشرے کے تاریک پہلو کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔ کیا ہم آزادانہ تعلق مرد و زن کو قبول کر لیں گے اور خاندانی نظام پر پڑنے والے اس کے برے اثرات کو بھی قبول کر لیں گے۔"

"آیئے ذرا اعداد و شمار کی زبان میں بات کریں۔ زندگی کے اندر قرار و سکون پیدا کرنے کی موجودہ حوصلہ افزائیوں اور تشکیل خاندان کی حالیہ مساعی کے باوجود، سویڈن کی آبادی کا گراف مسلسل گر رہا ہے۔ باوجود اس کے کہ موجودہ حکومت عورت کو شادی کرنے کے لئے بہت امداد دے رہی ہے۔ پھر عورت کے بچے کی مفت کفالت کی جاتی ہے، یہاں

تک کہ وہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو جائے۔ان سہولیات کے باوجود سویڈن کا ہر خاندان بچے پیدا کرنے سے مکمل احتراز کر رہا ہے۔

"اس کے برعکس صورت حال یہ ہے کہ شادی کرنے والوں کی تعداد میں مسلسل کمی واقع ہو رہی ہے اور ناجائز بچوں کی پیدائش میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے بیس فیصدی بالغ لڑکے اور لڑکیاں سرے سے شادی ہی نہیں کرتے۔سویڈن میں صنعتی دور ۱۸۷۰ میں شروع ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ اشتراکی دور بھی ۱۸۷۰ میں شروع ہوتا ہے۔۱۸۷۰ میں غیر شادی شدہ ماؤں کی تعداد سات فیصدی تھی' جبکہ ۱۹۲۰ میں یہ تعداد سولہ فیصدی ہو گئی۔اس کے بعد کے اعداد و شمار مجھے نہیں مل سکے' البتہ ان میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔علمی اداروں نے جو اعداد و شمار شائع گئے ہیں' اس کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ مرد اٹھارہ سال کی عمر میں جنسی تعلقات قائم کر لیتے ہیں اور عورت پندرہ سال کی عمر میں جنسی تعلقات قائم کر لیتی ہے۔اور اکیس سال کی عمر میں پچانوے فیصد نوجوانوں کے جنسی تعلقات قائم ہو چکے ہوتے ہیں۔مزید تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۷ فیصدی تعلقات ان لڑکیوں سے ہوتے ہیں جن کی منگنی ہو چکی ہوتی ہے' پینتیس فیصدی دوستوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور اٹھاون فیصدی ایسی عورتوں کے ساتھ ہوتے ہیں جو وقتی طور پر شناسا ہوتی ہیں۔اب ذرا عورتوں کے تعلقات جنسی کے اعداد و شمار ملاحظہ فرمائیں۔صرف تین فیصدی عورتوں کے تعلقات اپنے خاوند سے ہوتے ہیں' اٹھائیس فیصدی عورتوں کے تعلقات اپنے منگیتر سے ہوتے ہیں اور چونسٹھ فیصد عورتوں کے تعلقات صرف چالو دوستوں سے ہوتے ہیں۔مزید بتایا جاتا ہے کہ اسی فیصد عورتیں شادی سے قبل جنسی تعلقات قائم کر لیتی ہیں اور بیس فیصدی ایسی ہیں جو شادی کا تکلف ہی نہیں کرتیں۔""ان حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ اس جنسی آزادی کی وجہ سے بالعموم شادی بہت ہی لیٹ کی جاتی ہے' اور منگنی ہو جائے تو اس میں شادی کی میعاد بہت ہی طویل ہوتی ہے اور اس کے ساتھ غیر قانونی بچوں کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے۔"

ان سب حالات کے نتیجے میں خاندانی نظام کے بندھن ٹوٹ گئے۔سویڈن کے باشندے محبت کی آزادی کے حق میں درج ذیل دلائل پیش کرتے ہیں: یہ کہ سویڈن کا معاشرہ شادی کے بعد تمام دوسرے متمدن معاشروں کی نسبت خیانت کو بہت ہی بری نظروں سے دیکھتا ہے۔اور یہ بات درست ہے اور ہم اس کا انکار نہیں کرتے۔لیکن وہ اس بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے اور اس جنسی بے راہ روی کی وجہ سے نسلی تنزل اور طلاق کے اعداد و شمار میں بے حد اضافے کا کوئی تشفی بخش سبب نہیں بتا سکتے۔

اس وقت سویڈن میں طلاق کی شرح پوری دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔چھ سات شادیوں میں سے ایک طلاق پر منتج ہوتی ہے۔اور یہ اعداد و شمار سویڈن کی اجتماعی امور کی وزارت کے شائع کردہ ریکارڈ سے لئے گئے ہیں۔یہ نسبت ابتداء میں کم تھی مگر آہستہ آہستہ بڑھ گئی اور ۱۹۲۶ میں صورت حال یہ تھی کہ ایک ہزار شادیوں میں سے چھبیس طلاق پر منتج ہوئی تھیں۔۱۹۵۲ میں یہ تعداد ایک سو چار ہو گئی۔۱۹۵۴ میں ایک سو چودہ ہو گئی۔ ان واقعات کا سبب یہ ہے کہ ۳۰ فیصدی شادیاں محض ضرورت کے تحت مجبوری کے حالات میں ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسی شادیاں اصلی شادیوں کی طرح طویل المیعاد نہیں ہوتیں اور مجبوری یہ ہوتی ہے کہ ایک نوجوان عورت حاملہ ہو جاتی ہے۔عموماً ایسی شادیوں میں بعد میں طلاق ہو جاتی ہے' اس لئے کہ سویڈن کے قانون میں طلاق کی راہ مین کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔جب بھی زوجین

درخواست کریں کہ وہ طلاق پر راضی ہیں تو قانون طلاق کی اجازت دے دیتا ہے اور اگر زوجین میں سے کوئی ایک فریق ہی طلاق کی درخواست کرے تو ایک معمولی بہانے پر طلاق ہو جاتی ہے۔"

"سویڈن میں ایک تو جنسی بے راہ روی کی پوری پوری آزادی ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو ایک دوسری آزادی بھی حاصل ہے۔ وہ یہ کہ ہر شخص کو دہری ہونے کی آزادی ہے۔ سویڈن کے باشندوں کی اکثریت منکر خدا ہے۔ سویڈن میں ایک وسیع تحریک چل رہی ہے اور لوگ کنیسہ سے پوری پوری آزادی حاصل کر رہے ہیں۔ ناروے اور ڈنمارک میں بھی انکار خدا عام ہے۔ مدارس اور یونیورسٹیوں میں انکار خدا کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اور نوجوانوں میں انکار خدا کے عقائد ایک منصوبے سے پھیلائے جاتے ہیں۔"

"سویڈن اور سکنڈے نیویا کے دوسرے ممالک کے لوگ پوری طرح اخلاق باختہ ہو چکے ہیں' یہ لوگ اپنے عقیدۂ انکار خدا اور خدا کا خوف نہ رکھنے کی وجہ سے ہر قسم کی اخلاقی قید وبند سے آزاد ہو گئے ہیں اور آخر کار یہاں کے نوجوان شراب نوشی اور دوسری تباہ کن منشیات کے عادی ہو گئے ہیں۔ ایسے بچوں کی تعداد ۱۷۵ ہزار ہے جن کے والدین منشیات کا استعمال کرتے ہیں اور یہ تعداد خاندانی بچوں کا دس فیصد بنتی ہے۔ مراہق بچوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے جو خود نشہ کرتے ہیں۔ جن نوجوانوں کو شدید نشہ کی حالت میں گرفتار کیا جاتا ہے ان کی تعداد گزشتہ پندرہ سالوں میں تین گنا زیادہ ہو گئی ہے اور پندرہ سے سترہ سال کی عمر کے نوجوانوں کے اندر شراب نوشی کی عادت بد سے بد تر ہی جا رہی ہے اور اس کے بہت برے نتائج بر آمد ہو رہے ہیں۔"

"سویڈن میں بالغ ہونے والوں میں ہر دسواں بچہ دماغی اور نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہوتا ہے۔ سویڈن کے ڈاکٹروں کا یہ کہنا ہے کہ ان نفسیاتی بیماروں کا پچاس فیصد وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی دماغی بیماری' ان کی جسمانی بیماری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انکار خدا کی آزادی اور اخلاقی قیود سے آزادی کا یہی نتیجہ ہو سکتا ہے کہ آبادی نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو اور خاندان نظام کی چولیں ڈھیلی پڑ جائیں اور اس کے نتیجے میں گھٹیا درجے کی نسل وجود میں آئے۔"

یہ تو حال تھا سویڈن کا' لیکن امریکہ کا بھی یہی حال ہے۔ اور برائی کے آثار خطرناک طور پر ظاہر ہو رہے ہیں' لیکن امریکی قوم کو اس طرف التفات ہی نہیں ہے۔ امریکی قوم کے وجود میں تباہی کے آثار در آئے ہیں' اگرچہ بظاہر وہ تروتازہ ہے۔ ظاہری قوت اور توانائی کے مظاہر کے باوجود یہ قوم بھی جسمانی اور اخلاقی انحطاط کی طرف جا رہی ہے اور اس کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ امریکہ میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اپنے ملک کے حساس فوجی راز اپنے دشمنوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں' اس لئے نہیں کہ انہیں روپے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ محض اس لئے کہ وہ جنسی بے راہ روی میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان کی یہ بے راہ روی اس عام جنسی آزادی اور بے راہ روی کا نتیجہ ہوتی ہے جو ان کے ملک میں رائج ہے۔ امریکہ میں بعض ریاستوں میں ازروئے قانون طلاق کے لئے یہ شرط ہے کہ خاوند یا بیوی میں سے کوئی زنا کی حالت میں پکڑا جائے۔ اس غرض کے لئے بعض وکلاء اور ڈاکٹروں نے ایک ایسی تنظیم بنائی تھی کہ جو ایسے مقدمات میں مرد یا عورت کو زناکاری میں پھانسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حال ہی میں امریکی پولیس نے ایک ایسی تنظیم کا پتہ چلایا جس کے شعبے کئی شہروں میں تھے۔ حالانکہ وکلاء اور ڈاکٹر مہذب ترین لوگ ہوتے ہیں۔ کئی جوڑے جو طلاق چاہتے تھے' پہلے ایسے اداروں کی خدمات حاصل کر کے اپنے شریک حیات کو زناکاری میں پھانستے اور پھر مقدمہ دائر کر

دیتے - امریکہ میں ایسے دفتر عام ہیں جو بھاگی ہوئی عورتوں اور بھاگے ہوئے خاوندوں کی تلاش میں تعاون فراہم کرتے ہیں اس لئے کہ کسی خاوند کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ جب وہ شام کو گھر آئے گا تو اس کی بیوی موجود ہو گی اور اپنے کسی محبوب کے ساتھ چلی نہ گئی ہو گی - نیز بیوی کو بھی یہ یقین نہیں ہوتا کہ اس کا خاوند شام کو واپس آئے گا یا اس سے زیادہ جاذبیت رکھنے والی کسی دوشیزہ نے اسے سنبھال لیا ہو گا - ایسے معاشرے جن میں خاندانوں کی حالت یہ ہو' ان میں کسی کے اعصاب کیسے مضبوط اور درست رہ سکتے ہیں - اور ایسے حالات میں امریکہ کے ایک صدر اعلان کرتے ہیں کہ ہر سات نوجوانوں میں سے چھ فوجی خدمات کے لئے نا اہل ہو چکے ہیں اس لئے کہ یہ سب جنسی بے راہ روی میں مبتلا ہوتے ہیں -
مولانا مودودی ﷺ لکھتے ہیں :

"ایک امریکی رسالے میں ان اسباب کو جن کی وجہ سے وہاں بداخلاقی کی غیر معمولی اشاعت ہو رہی ہے' اس طرح بیان کیا گیا ہے - تین شیطانی قوتیں ہیں جن کی تثلیث آج ہماری دنیا پر چھا گئی ہے اور یہ تینوں ایک جہنم تیار کرنے میں مشغول ہیں - فحش لٹریچر جو جنگ عظیم کے بعد حیرت انگیز رفتار کے ساتھ اپنی بے شرمی اور کثرت اشاعت میں بڑھتا چلا جا رہا ہے - متحرک تصویریں جو شہوانی محبت کے جذبات کو نہ صرف بھڑکا رہی ہیں بلکہ عملی سبق بھی دیتی ہیں - عورتوں کا گرا ہوا اخلاقی معیار جو ان کے لباس ' اور بسا اوقات ان کی برہنگی اور سگریٹ کے روز افزوں استعمال اور مردوں کے ساتھ ان کے ہر قید و بند سے نا آشنا اختلاط کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے - یہ تین چیزیں ہمارے ہاں بڑھتی چلی جا رہی ہیں اور ان کا نتیجہ مسیحی تہذیب و معاشرے کا زوال اور آخر کار تباہی ہے - اگر ان کو نہ روکا گیا تو ہماری تاریخ بھی روم اور ان دوسری قوموں کے مماثل ہو گی جن کو یہی نفس پرستی اور شہوانیت ان کی شراب اور عورتوں اور ناچ رنگ سمیت فنا کے گھاٹ اتار چکی ہے -"

((الحجاب ' سید ابوالاعلیٰ مودودی ﷺ ' ص ۱۲۹ - ۱۳۰☆☆☆ اردو ایڈیشن صفحات ۵.۱-۶.۱ طبع ۲۷ جون ۱۹۸۵ اسلامک پبلیکیشنز لاہور))

لیکن واقعات کی دنیا میں جو کچھ ہوا' وہ یہ ہے کہ امریکہ اس مثلث کے سیلاب سے نہ بچ سکا بلکہ اس نے اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے - وہ اسی راہ پر چل نکلا ہے جس پر روم چلا - ایک دوسرے صحافی امریکہ ' برطانیہ اور فرانس کے نوجوانوں میں جنسی بے راہ روی کے سیلاب کے بارے میں لکھتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ہاں نوجوانوں کی بے راہ روی ان ممالک کی طرح شدید نہیں ہے -

"امریکہ کے نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان بے راہ روی کا ایک سیلاب آیا ہوا ہے - نیویارک کے گورنر نے اعلان کیا کہ اس بے راہ روی کا علاج ' اس ریاست میں ' عنقریب قومی اصلاح کے مسائل میں سرفہرست آ جائے گا - گورنر نے مشورہ دیا ہے کہ اصلاحی نرسریاں اور تہذیب اخلاق کی مجالس اور جسمانی تربیت کے اداروں کا قیام ازبس ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ اس نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء اور طالبات کے درمیان منشیات یعنی چرس اور کوکین کے رواج کو ختم کرنا ان کے پروگرام میں شامل نہیں ہے اور یہ معاملہ ہم محکمہ صحت عامہ کے حوالے کر رہے ہیں -"

''آخری دو سالوں کی رپورٹ کے مطابق انگلستان میں عورتوں اور نوجوان' چھوٹی نابالغ خواتین پر دست درازی کے واقعات میں بے حد اضافہ ہوا ہے خصوصاً دیہاتی راستوں میں۔اکثر واقعات میں دست درازی کرنے والے مراہق یا نوجوان تھے اور ان واقعات میں سے بعض واقعات میں بچی یا لڑکی کا گلا گھونٹ کر اسے قتل بھی کر دیا گیا تھا اور اسے ٹھنڈی اور منجمد لاش کی شکل میں چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ بدکرداری کا راز فاش نہ ہو یا یہ کہ شناخت پریڈ کے وقت شناخت نہ ہو سکے۔''

''دو ماہ کا عرصہ ہوا ہے کہ ایک بوڑھا شخص اپنے گاؤں جا رہا تھا۔اس نے راہ گزر پر ایک درخت کے نیچے ایک نوجوان کو ایک لڑکی کے ساتھ مباشرت کرتے ہوئے دیکھا۔یہ بوڑھا ان کے قریب گیا۔اس نے لڑکے کو اپنے عصا سے مارا۔اور زجر و توبیخ کی اور اسے کہا کہ جس فعل کا وہ ارتکاب کر رہا ہے وہ سرعام جائز نہیں ہے۔لڑکا اٹھا اور اس نے بوڑھے کے پیٹ میں ایک لات رسید کی۔بوڑھا گرا۔اس کے بعد وہ اپنے بوٹوں کے ساتھ اسے سر پر مارتا رہا یہاں تک کہ اس کا سر پھوڑ دیا۔اس لڑکے کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔اور لڑکی کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔''

امریکہ کی ''انجمن چہاردہ'' جو ملک کی اخلاقی صورت حال کی نگران ہے' نے بتایا ہے کہ امریکہ کی نوے فیصد آبادی مہلک خفیہ جنسی امراض کا شکار ہے اور یہ صورت حال اس وقت تھی جبکہ جدید جراثیم کش ادویہ پنسلین اور سٹرپٹومائیسین ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔

ڈنفر کے ایک جج لکھتے ہیں کہ ہر دو نکاحوں میں سے ایک طلاق پر منتج ہوتا ہے اور مشہور عالمی ڈاکٹر الکسیس کاریل اپنی مشہور کتاب ''انسان نامعلوم'' میں لکھتے ہیں :۔

''ہم بچوں کے اسہال' سل' دق اور ٹائی فائیڈ جیسی بیماریوں کی بیخ کنی کے تو بالکل قریب جا پہنچے ہیں لیکن ان بیماریوں کی جگہ اخلاقی بے راہ روی اور اخلاقی بگاڑ کی بیماریوں نے لے لی ہے جس کے نتیجے میں اعصابی اور دماغی بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں امریکہ کی بعض ریاستوں میں عام مریضوں کے مقابلے میں دماغی مریضوں کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے۔جنون کے علاوہ اعصابی اور جسمانی ناتوانی کی بیماریوں میں بھی بے حد اضافہ ہو رہا ہے۔ان کے نتیجے میں ہر فرد معصیت زدہ ہو گیا ہے۔اور خاندانی نظام قریب الاختتام ہے۔ماہرین کا خیال ہے کہ متعدی بیماریوں کے مقابلے میں امریکی تہذیب کے لئے عقلی انحطاط زیادہ مضر ثابت ہو رہا ہے۔جبکہ ماہرین طب نے اپنی سرگرمیاں ان متعدی بیماریوں کے انسداد تک محدود کر رکھی ہیں۔

یہ ان مصائب اور تکلیفات کی معمولی سی جھلک ہے جو اس گمراہ انسانیت نے اپنے اوپر اس لئے لاد لئے ہیں کہ اس نے ان لوگوں کی پیروی شروع کر دی جو صرف شہوت کے پیروکار بن گئے تھے انہوں نے خدا کے بنائے ہوئے طریقہ زندگی کی پیروی ترک کر کے جدید جاہلیت کو اپنا لیا تھا۔حالانکہ اسلامی نظام زندگی وہ منہاج تھا جس میں انسان کے ضعف اور کمزوری کو ملحوظ رکھ کر قانون سازی کی گئی تھی' اور اس نظام میں اسے اپنی خواہشات نفس اور شہوانی میلانات کی بندگی سے بچا کر ایک ایسے راستے کی طرف ہدایت دی گئی تھی جو پر امن بھی تھا اور اس پر چل کر انسان کے گناہوں سے رجوع آسان ہو جاتا تھا اور وہ راہ طہارت اختیار کر سکتا تھا۔

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا
عَظِيْمًا (۲۷) يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (۲۸)

"ہاں اللہ تو تم پر رحمت کے ساتھ توجہ کرنا چاہتا ہے' مگر جو لوگ خود اپنی خواہشات نفس کی پیروی کر رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ راست سے ہٹ کر دور نکل جاؤ۔ اللہ تم پر سے پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔"

اس سبق کا دوسرا حصہ اسلامی معاشرے کے مابین بعض مالی معاملات پر بحث کرتا ہے' تاکہ باہم معاملات کے طریقے طے کر دیے جائیں اور اسلامی معاشرے کے ممبران کے درمیاں باہمی معاملات پاک و صاف رہیں۔ نیز اس میں مالی حقوق عورتوں کو بھی ویسے ہی دیئے جائیں جس طرح مردوں کو دیئے گئے ہیں۔ ہر شخص کو اس کا مقرر کردہ حصہ ملے۔ نیز وہ مالی حقوق جو ولایت پر مبنی تھے اور جو دور جاہلیت میں عام طور پر مروج رہے' اور اسلام کے آنے کے بعد بھی ابتدائی دنوں میں وہ مروج تھے' ان کو ختم کر دیا جائے تاکہ اس سابقہ نظام کا تصفیہ کر دیا جائے اور اسلامی نظام میراث کے لئے راہ ہموار ہو جائے جس میں میراث صرف قریبی رشتہ داروں کا حق بنتی ہے اور آئندہ کے لئے قدیم موروثی ولایت کے نظام کو ختم کر دیا جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ
تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۟ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝۲۹
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ
عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۳۰ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ
وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۝۳۱ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ
عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ

وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ﴿۳۲﴾ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا
مَوَالِیَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ
نَصِیْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدًا ﴿۳۳﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ۔لین دین ہونا چاہئے آپس کی رضامندی سے اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے۔جو شخص ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا اس کو ہم ضرور آگ میں جھونکیں گے اور یہ اللہ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے' اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو تمہاری چھوٹی موٹی برائیوں کو ہم تمہارے حساب سے ساقط کر دیں گے اور تم کو عزت کی جگہ داخل کریں گے۔اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی نسبت تمنا نہ کرو' جو کچھ مردوں نے کمایا ہے' اس کے مطابق ان کا حصہ ہے' اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے۔ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو' یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔اور ہم نے ہر اس ترکے کے حقدار مقرر کر دیئے ہیں جو والدین اور رشتہ دار چھوڑیں' اب رہے وہ لوگ جن سے تمہارے عہد و پیمان ہوں تو ان کا حصہ انہیں دو' یقیناً اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔"

آیات کا یہ سلسلہ اسلامی معاشرے کی تربیت کے ساتھ بھی متعلق ہے ور اسلامی نظام کے شعبہ قانون سے بھی اس کا تعلق ہے۔اسلامی نظام زندگی میں تربیت' اصلاح اور قانون ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں' وہ ایک دوسرے کے ساتھ تکمیلی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ایک کے سوا دوسرا مکمل نہیں ہو سکتا۔قانون سازی سے غرض یہ ہوتی ہے کہ اسلامی معاشرے کی تربیت اور اصلاح کی جائے اور لوگوں کی زندگی کے معاملات کو ایک ضابطے کے تحت لایا جائے۔ قانون سازی کے اندر ایسی ہدایات بھی دی جاتی ہیں جن میں انسانی ضمیر کی تربیت مطلوب ہوتی ہے۔پھر اس قانون سازی میں اس بات کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ قانون کا نفاذ بھی اچھی طرح ہو سکے اور خود اسلامی معاشرے کا شعور قانون کے نفاذ کے لئے تیار ہو اور معاشرہ یہ سمجھتا ہو کہ اس قانون کے توڑنے میں نہیں بلکہ اس کے نفاذ میں ہماری مصلحت ہے۔اسی لئے اسلامی نظام حیات میں قانون سازی اور اصلاح و ہدایت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔دلوں کو اللہ سے جوڑا جاتا ہے اور ان میں یہ بات ڈالی جاتی ہے کہ یہ ضابطہ اور یہ قانون اسی رب ذوالجلال کی طرف سے ہے جو ہمیں ہدایت دے رہا ہے۔یہ صرف اسلامی نظام زندگی کا خاصہ ہے کہ اس میں اجتماعی نظام کی اطاعت از خود کی جاتی ہے۔اور اسلامی نظام کی یہ جامعیت انسان کی واقعی اور عملی زندگی کے لئے نہایت ہی مفید ہے۔اس سے انسانی ضمیر کی اصلاح بھی ہوتی رہتی ہے اور قانون پر عمل بھی۔

آیات کے اس حصے میں ہمیں حکم دیا جاتا ہے کہ اہل ایمان آپس میں ایک دوسرے کے مال ناجائز طور پر نہ کھائیں اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ دوسروں کا مال باہم رضامندی سے تجارتی لین دین کے ذریعے ہی لیا جاسکتا ہے اور دوسروں کے مال کو ناجائز طور پر کھانے کے فعل کو انسان کے قتل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ فعل ہلاکت اور تباہی ہے۔ اس کے ساتھ لوگوں کو عذاب آخرت سے بھی ڈرایا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ جو شخص ظالمانہ طور پر دوسروں کا مال کھائے گا وہ آگ کو ضرور چھوئے گا۔ اس وعید کے ساتھ ہی امید کی کرن بھی چمکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نرمی اور عفو و درگزر کا وعدہ بھی فرماتے ہیں اور انسان کی کمزوری اور اس کی تقصیرات کو معاف کرنے کی راہ بھی بتلاتے ہیں۔ نیز دنیا میں احساس محرومی کو کم کرنے کے لئے خودی کا سبق دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر معاشرے میں کچھ لوگ خوش حال ہیں تو ان کی طرف للچائی ہوئی نظروں کے ساتھ نہ دیکھو۔ ذات باری کو ہدف نظر بناؤ اس لئے کہ وہی تو ہے جو ان کو دینے والا ہے۔ اس لئے تمہیں بھی جو کچھ مانگنا ہے اسی سے مانگو۔ یہاں یہ بات بھی صاف کی جاتی ہے کہ اللہ سے مرد و عورت دونوں مانگ سکتے ہیں۔ مردوں نے جو کچھ کمایا تو وہ انہی کا ہو گا اور عورتوں نے جو کچھ کمایا وہ انہی کا ہو گا۔ اور مردوں اور عورتوں دونوں کی کمائی کے بارے میں اللہ کو خوب علم ہے۔ اسی طرح اگر لوگوں نے ایک دوسرے کے ساتھ "ولایت ارث" کے معاہدے کر رکھے ہیں تو ان معاہدوں پر اچھی طرح عمل کیا جائے اس لئے کہ دوسرے گواہوں کے ساتھ ان پر اللہ بذات خود بھی گواہ ہے۔ یہ ہیں موثر وجدانی اشارے اور جھلکیاں جن کے اندر قانون سازی بھی موجود ہے یہ ہیں وہ ہدایات جو انسان کی تربیت کے لئے اللہ علیم و خبیر نے بھیجی ہیں جو انسان کی جسمانی تخلیق سے بھی باخبر ہے۔ اور اس کے نفسیاتی میلانات سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ جو انسان کی ذہنی راہوں اور نشیب و فراز سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (۲۹) وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (۳۰)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے مت کھاؤ' اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو' یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے۔ جو شخص ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا' اس کو ہم روز آخرت آگ میں جھونکیں گے اور اللہ کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

یہ پکار اہل ایمان کے لئے ہے' انہی کو منع کیا گیا ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھائیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ　اے لوگو جو ایمان لائے ہو' آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے مت کھاؤ" (۴ : ۲۹)

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی معاشرے کو جاہلیت کی باقی ماندہ گراوٹوں سے پاک و صاف کیا جا رہا ہے۔ اور "اے لوگو جو ایمان لائے ہو" کے الفاظ میں خطاب کر کے اہل اسلام کے ضمیر کو جگایا جاتا ہے اور انہیں جوش دلایا جاتا ہے کہ وہ جاہلیت کے تمام کاموں کو چھوڑ دیں۔ یوں ایمانی تقاضوں کو بیدار کیا جاتا ہے' ان تقاضوں کو جو ان کے لقب "اہل ایمان" کے تقاضے ہیں تاکہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے اموال ناجائز طریقوں سے نہ کھائیں۔

باطل طور پر ایک دوسرے کے اموال کھانے میں وہ تمام طریقے شامل ہیں جن کے ذریعے دولت ایک دوسرے کی طرف منتقل ہوتی ہے اور جن کے استعمال کی اجازت اللہ کی جانب سے نہ ہو یا یہ کہ اللہ نے بصراحت اس سے منع کیا ہو مثلاً دوسرے کا مال دبانا' رشوت لینا' قمار بازی کے ذریعے مال کھانا' ضروریات زندگی کا ذخیرہ کرنا تاکہ مہنگے داموں پر انہیں بیچا جائے اور خرید و فروخت کے وہ تمام طریقے استعمال کرنا جو ممنوع ہیں اور ربا ان سب میں سرفہرست ہے۔ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ آیت تحریم ربا سے پہلے نازل ہوئی ہے یا بعد میں۔ اگر یہ پہلے نازل ہوئی تو یہ تحریم ربا کے لئے بطور تمہید ہو گی' اس لئے کہ سود خواری باطل طریقوں میں سرفہرست ہے۔ اور اگر یہ آیت تحریم ربا کے بعد نازل ہوئی ہے تو اس میں ربا بھی شامل ہے اور ربا کے علاوہ دوسرے وہ تمام طریقے بھی شامل ہیں جن سے دوسروں کی دولت ناجائز طور پر حاصل کر لی جاتی ہے۔

ہاں یہاں یہ بتانا بھی ضروری سمجھا گیا کہ باہم رضامندی سے جو تجارتی لین دین ہوتا ہے' اس میں اگر دوسرے کی دولت بطور منافع آ جائے تو وہ جائز ہے۔

(اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (۴: ۲۹)) "الا یہ کہ باہم رضامندی سے تجارتی لین دین ہو۔"

یہ استثناء منقطع ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اگر معاملہ باہم رضامندی پر مبنی لین دین کا ہو تو وہ صورت سابق آیت میں داخل نہیں ہے۔ یہاں تجارت کو استثنائی شکل میں اس لئے لایا گیا ہے کہ تجارت کے لین دین اور باقی باطل طریقوں کے لین دین میں بظاہر مماثلت پائی جاتی ہے۔ جو طریقے شریعت کے قانون میں ممنوع ہیں ان کے ذریعہ جو مال لیا جاتا ہے وہ باطل طریقے سے کھایا جاتا ہے۔ یہ مشاکلت اس وقت ظاہر ہو جاتی ہے جب سورۂ بقرہ میں آیت الرباء کا مطالعہ کیا جاتا ہے جہاں سود خواروں کا یہ اعتراض نقل کیا گیا ہے۔ (اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا) (۲: ۲۷۵) "بے شک بیع اور ربا ایک ہی جیسے ہیں۔" اور ان کے اس اشکال کو یوں رد کیا گیا تھا۔ (وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا) (۲: ۲۷۵) "اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربا کو حرام قرار دیا ہے۔" سود خوار یہ مغالطہ ڈالتے تھے' اور اپنے زیر رواج سودی کاروبار کا دفاع یوں کرتے تھے کہ بیع بھی تجارت ہے اور اس میں انسان کی دولت میں بذریعہ منافع اضافہ ہوتا ہے جبکہ ربا میں بھی مال میں بذریعہ منافع اضافہ ہوتا ہے' اس لئے اس کا کوئی خاص سبب سامنے نہیں آتا کہ تجارت کو جائز کیا جائے اور سود کو حرام قرار دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ تجارتی لین دین اور سودی کاروبار میں بہت بڑا فرق ہے۔ وہ بدترین نتائج بھی ہمارے سامنے ہیں جو سودی کاروبار کی وجہ سے تجارت و صنعت اور عوام کو درپیش ہوتے ہیں اور وہ خوشگوار اثرات بھی جو صاف ستھری

تجارت اور صنعت کی وجہ سے عوام الناس پر مرتب ہوتے ہیں ۔

تجارت میں ایک تاجر ایک ضرورتمند اور خریدار اور ایک صنعت کار کے درمیان ایک ایسا واسطہ ہوتا ہے جو دونوں کے لئے مفید ہوتا ہے ۔ تاجر اشیائے صرف کے لئے مارکیٹ تلاش کرتا ہے اور مصنوعات کو رواج دیتا ہے ۔ وہ ان کو خوبصورتی کے ساتھ اہل ضرورت کے لئے مہیا کرتا ہے اور ان کے لئے سہولت فراہم کرتا ہے ۔ یوں گویا وہ دونوں فریقوں کے لئے مفید ہوتا ہے اور اپنی خدمات کا صلہ لیتا ہے ۔ اور اس کا صلہ اپنی جدوجہد اور اس کی مہارت کا بھی عوض ہوتا ہے ۔ پھر تاجر ہروقت نفع اور نقصان دونوں کے لئے تیار رہتا ہے جبکہ سود خواری کا نظام اس صورت حال سے بالکل مختلف اور متضاد نظام ہے اس لئے کہ اس نظام میں مصنوعات پر اصل اخراجات کے علاوہ سودی واجبات کا اضافہ کیا جاتا ہے اور یہ اضافہ پھر تاجر اور خریدار' ضرورتمند سے وصول کیا جاتا ہے ۔ یوں پورے معاشی نظام پر بوجھ پڑ جاتا ہے ۔ اور جس طرح مغربی صنعتی ممالک میں عملاً یہ نتائج نکلے' یہ منحوس نظام آخرکار نہ تو بذات خود صنعت کے لئے مفید ہوتا ہے اور نہ خریداروں (Customers) کے لئے مفید ہوتا ہے اور نہ وہ ان دونوں کے مفادات کو پیش نظر رکھتا ہے' بلکہ اس کا ہدف صرف یہ ہوتا ہے کہ صنعتی قرضوں پر زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کیا جائے اور سرمایہ کار کو فائدہ دیا جائے ۔ جمہور عوام کو ضروریات زندگی دستیاب ہوں یا نہ ہوں لیکن سامان تعیش کی فراوانی ہو اور ان چیزوں کی پیداوار میں اضافہ کر دیا جائے جو انسانی جذبات کو مشتعل کرنے والی ہوں' خواہ یہ انسانی جسم اور صحت کے لئے سخت مضر ہوں ۔ نیز یہ کہ سرمایہ کے لئے دائما" منافع متعین کر دینا اور سرمایہ دار کے لئے کسی صورت میں بھی خسارہ میں شریک نہ ہونا' جیسا کہ تجارت میں ہوتا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں انسانی جدوجہد پر اعتماد نہ کرنا' جو تجارتی نظام کی جان ہوتی ہے ۔ یہ اور اس طرح کے دوسری وہ وجوہات جو اس سودی نظام کے کھاتے میں آتی ہیں اس بات کے لئے کافی ہیں کہ اس نظام کو ختم ہونا چاہئے جس طرح اسلام نے اسے ختم کیا ہے ۔

(تفصیلات کے لئے دیکھیے فی ظلال القرآن ج سوئم صفحات ..... نیز تفصیلات کے لئے دیکھیے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ؒ' امیر جماعت اسلامی پاکستان کی کتاب "الربا" (سید قطب))

نظام ربا اور نظام تجارت میں بعض پہلوؤں سے چونکہ یکرنگی نظر آتی تھی اس لئے قرآن کریم کو بطور استدراک یہ نوٹ دینا پڑا (اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (٤ : ٢٩)) "الا یہ کہ تمہارے درمیان باہم رضامندی سے تجارتی لین دین ہو ۔" لوگوں کے اموال باطل طریقے سے کھانے کی ممانعت کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ ایک دوسرے کو قتل نہ کرو' اگرچہ نحویوں کی رائے کے مطابق یہ استثنائے منقطع ہے ۔ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (٤ : ٢٩)) "اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو' یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے ۔"

یہ فقرہ ایک دوسرے کے اموال ناجائز طور پر کھانے کی ممانعت کے بعد آتا ہے جس میں یہ اشارہ ہے کہ اگر تم ایک دوسرے کے اموال باطل طریقوں سے کھاتے ہو تو گویا تم ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہو' اور سودی نظام کے آثار تباہ کن ہوں گے ۔ اور اللہ تعالیٰ اس سودی نظام کی ممانعت کر کے تم پر ظلم نہیں کر رہا ہے بلکہ یہ نہایت ہی رحیمانہ حکم ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ یہ اللہ کی جانب سے انسانیت پر بہت بڑا رحم ہے ۔

جس سوسائٹی میں بھی ان امور کا رواج ہو جائے' مثلاً سود خواری' چور بازاری' قمار بازی' ذخیرہ اندوزی' دھوکہ بازی' چوری' چھینا جھپٹی' سرقہ' رشوت' ناقابل فروخت اشیاء کی فروخت' مثلاً عزت و ناموس' ضمیر و اخلاق' ذمہ داری اور فرض منصبی' اور مذہب اور دین وغیرہ جیسا کہ یہ چیزیں قدیم جاہلی سوسائٹی میں بھی جاری تھیں اور آج کی جدید جاہلیت میں بھی یہ کام جاری ہیں۔ غرض یہ امور جس سوسائٹی میں بھی پائے جائیں گے' وہ خود اس کی جانب سے خودکشی کے مترادف ہوں گے اور وہ سوسائٹی اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھے میں جانتے بوجھتے گرا رہی ہوگی۔

اور اللہ کا منشاء یہ ہے کہ وہ اس تباہ کن خودکشی سے اہل ایمان کو بچائے اور ان پر رحم کرے۔ یہ بھی دراصل اللہ کی جانب سے انسانیت پر ایک تخفیف ہے اور اس کے لئے ایک رعایت ہے انسان کی ضعیفی کا ایک علاج ہے اس لئے کہ انسان اپنی اس کمزوری کی وجہ سے اللہ کی ہدایات سے نکل کر ان لوگوں کی راہنمائی میں آجاتا ہے جو اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔

عذاب آخرت کی دھمکی کے بعد' اب ان لوگوں کو دھمکی دی جا رہی ہے جو لوگوں کے مال ناجائز طریقے سے کھاتے ہیں۔ جو حدود سے تجاوز کرتے ہیں اور دوسروں کے حقوق مارتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو عذاب آخرت کی دھمکی دی جاتی ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ دنیا میں دوسروں کا مال کھانے سے ایک سوسائٹی تباہ و برباد ہوگی بلکہ آخرت میں بھی ایسے ظالموں کو عذاب سے دوچار ہونا ہوگا۔ دنیا میں جو تباہی ہے' وہ تمام لوگوں پر آئے گی' جو ظالم ہے اس پر تو اس لئے کہ اس نے ظلم کیا اور مظلوم پر اس لئے کہ اس نے ظلم کے خلاف کام نہ کیا اس لئے کہ دنیا میں انسان برائی کے نتائج کے لئے اجتماعی طور پر ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس لئے جس سوسائٹی میں دوسرے کے حقوق مارے جاتے ہیں وہ سوسائٹی دنیا و آخرت دونوں میں برے نتائج بھگتے گی۔ یہی سنت الٰہی ہے اور یہی اللہ کا فیصلہ ہے۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۚ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (٤ : ٣٠) "اور جو شخص ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا' اس کو ہم ضرور آگ میں جھونکیں گے اور یہ اللہ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

اسلامی نظام حیات نفس انسانی کو اس کے ایک وسیع دائرے تک لے جاتا ہے' یعنی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دونوں جہانوں کو پیش نظر رکھ کر اس کے لئے ضابطہ بندی کی جاتی ہے اور اسے ہدایات دی جاتی ہیں۔ نفس انسانی کے اندر ایک بیدار اور محتاط چوکیدار بٹھایا جاتا ہے جو ہر ہدایت کو بسر و چشم قبول کرتا ہے اور ہر اسلامی قانون کو بطیب خاطر نافذ کرتا ہے۔ پھر اسلامی سوسائٹی میں بھی ہر شخص کو دوسرے کے لئے نگران بنایا جاتا ہے اس لئے کہ وہ اجتماعی طور پر بھی مسئول ہیں۔ اگر ظلم ہوگا تو سوسائٹی کے تمام افراد گویا قتل ہوں گے اور ان پر تباہی آئے گی۔ یعنی اس دنیا میں اور آخرت میں تمام ان لوگوں سے محاسبہ ہوگا جنہوں نے اپنی سوسائٹی کو ظالمانہ روش پر رہنے دیا اور اس کے باطل طور طریقوں کے بدلنے کے لئے جدوجہد نہ کی۔ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (٤ : ٣٠)

"اور یہ اللہ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔" اسے دنیاوی تباہی لانے اور آخری محاسبہ کرنے سے کوئی نہیں

روک سکتا۔ نہ اس کی راہ میں کوئی حائل ہو سکتا ہے اور جب تباہی کے اسباب مہیا ہو جائیں تو اللہ کی سنت یہی ہے کہ پھر وہ آکر رہتی ہے۔

لیکن اگر تم لوگ ممنوعات میں سے بڑی بڑی ممنوعہ چیزوں سے اجتناب کرو' جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگوں کے اموال کو ظالمانہ طریقے سے کھانا اور ان کا استحصال کرنا چھوڑ دو' تو اس کے نتیجے میں اللہ کی رحمت تمہارے شامل حال رہے گی۔ تمہارے ساتھ نرم سلوک کیا جائے گا' تمہارے دلوں کے اطمینان کے لئے اور آگ سے تمہیں بچانے کے لئے' تمہارے وہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے جو کبائر نہیں ہیں بشرطیکہ تم ارتکاب ظلم اور ارتکاب فواحش سے اجتناب کرو۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا (٤ : ٣١) "اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو' جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو تمہاری چھوٹی موٹی برائیوں کو ہم تمہارے حساب سے ساقط کر دیں گے اور تمہیں عزت کی جگہ داخل کریں گے۔"

ذرا دیکھئے تو سہی! کس قدر فیاض ہے یہ دین اور اس نظام میں کس قدر سہولتیں دی گئی ہیں۔ بانگ دہل دعوت دی جا رہی ہے کہ انسانو! آؤ بلندیوں کی طرف' علوشان کی طرف' پاکیزگی کی طرف اور ڈسپلن کی طرف۔ یاد رکھو کہ تم پر جو فرائض عائد کئے جاتے ہیں' تمہارے لئے جو حدود بھی مقرر ہوتے ہیں' اور اوامر ونواہی کے جو جو احکام دیئے جاتے ہیں' ان سب کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس جہان میں پاک وصاف نفوس پیدا کئے جائیں اور پھر ان نفوس طیبہ سے ایک پاک وصاف معاشرہ وجود میں لایا جائے۔

لیکن یہ دعوت دیتے وقت اور یہ حدود وقیود عائد کرتے وقت انسان کی ضعیفی اور اس کی فطری کوتاہیاں بھی پیش نظر رکھی گئی ہیں۔ یہ فرائض وواجبات اس کی فطری طاقت کے دائرے کے اندر اندر ہیں۔ ان میں اس کی فطرت' اس کی طاقت کے حدود' اور اس کے رجحانات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ نیز انسانی زندگی کی راہوں کے نشیب وفراز کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی میں' فرائض وواجبات عائد کرتے وقت ان فرائض اور انسانی مقدرت کے اندر ایک حسین امتزاج اور توازن رکھا گیا ہے۔ انسانی ضروریات اور انسانی خواہشات کے درمیان بھی توازن موجود ہے' میلانات اور رکاوٹوں کے درمیان بھی توازن ہے' اوامر اور نواہی کے درمیان بھی توازن ہے۔ ترغیب اور ترہیب کے درمیان توازن ہے' اور اسی طرح ایک طرف عذاب الہی سے سخت ڈراوا ہے۔ اگر معصیت کا ارتکاب کیا گیا اور دوسری جانب اگر کوئی پشیمان ہو جائے اور واپس لوٹنا چاہئے تو اس کے لئے بھی معافی کا دروازہ بند نہیں کیا گیا۔

دین اسلام کا حقیقی مطلوب ومقصود صرف یہی ہے کہ وہ نفس انسانی کا قبلہ درست کر کے اس کا رخ اللہ کی طرف موڑ دے' اور اس قبلہ رخی میں اسے مخلص ہونا چاہئے۔ وہ حتی المقدور اپنے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے۔ اس کے بعد اللہ کی رحمت کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ اللہ کی رحمت ضعیف وناتواں سب کے شامل حال رہتی ہے' وہ

تقصیرات سے درگزر کرتی ہے ' وہ توبہ قبول کرتی ہے 'کمزوریوں سے صرف نظر کرتی ہے 'گناہ معاف کرتی ہے اور واپس آنے والوں کے لئے اپنے دروازے کھول دیتی ہے اور بڑے انس و محبت سے آنے والوں کا استقبال کرتی ہے۔

اس آیت میں حکم یہ دیا گیا ہے کہ تم کبائر سے اجتناب کرو۔ گناہ کبیرہ ہمیشہ واضح 'کھلے اور عظیم ہوتے ہیں' اس لئے کوئی شخص یہ عذر نہیں کر سکتا کہ اس نے ان گناہوں کا ارتکاب کیا جن کا اسے علم نہ تھا کہ یہ گناہ ہیں' یا وہ سمجھا ہی نہیں ہے اور گناہ کا ارتکاب ہو گیا ہے' اس لئے کہ جو شخص ان گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے' وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے گناہ سے بچنے اور اجتناب کرنے کی سعی کی ہے' یا اس نے اس کے ارتکاب کے خلاف پورا مقابلہ کیا ہے' لیکن ان گناہوں کے ارتکاب کے بعد بھی اگر ایک شخص صحیح طرح پورے اخلاص کے ساتھ توبہ کرے تو بھی اللہ کے ہاں معافی ہو سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

(وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۳:۱۳۵))

"اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً" اللہ انہیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں..... کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو..... اور وہ دیدہ و دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزاء ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کے گناہ معاف کر دے گا" اور ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے متقیوں میں شمار فرمایا ہے۔

یہاں کبائر سے توبہ کی بحث نہیں' یہاں مدعا یہ ہے کہ اگر کوئی کبائر سے اجتناب کرے تو اس کے چھوٹے گناہ براہ راست اللہ تعالیٰ معاف فرماتے ہیں' یہاں اسی کا وعدہ کیا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو خوشخبری دی جا رہی ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کبائر کیا ہیں جن کے ارتکاب سے بچنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے' احادیث میں ان کا ذکر ہوا ہے' لیکن کسی حدیث میں ان کی پوری تعداد کا ذکر نہیں ہوا' بلکہ موقعہ و محل کے اعتبار سے جن گناہوں سے ممانعت کی زیادہ ضرورت تھی ان کا ذکر کر دیا گیا' اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی حدیث میں کبائر کی پوری فہرست دے دی گئی ہے۔ ہاں مختلف احادیث میں مختلف نوعیت اور مختلف تعداد کو کبائر کہا گیا ہے اور یہ جرائم مختلف معاشروں اور مختلف سوسائٹیوں میں مختلف ہو سکتے ہیں۔

یہاں ہم حضرت عمر بن خطاب ﷺ کا واقع نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں' حضرت عمر ﷺ معصیت کے معاملے میں بے حد حساس اور متشدد تھے اور وہ معاصی سے سخت اجتناب فرماتے تھے۔ اس واقعے سے معلوم ہو گا کہ اسلام نے ان کے اس تیز احساس کو کس طرح سیدھے راستے پر ڈال دیا تھا' اور ان کے ہاتھ میں یہ ترازو' حساس ہونے کے باوجود کس قدر اعتدال پر تھا' خصوصاً جبکہ ان کا واسطہ اجتماعی امور اور انسان کے نفسیاتی معاملات سے پڑا کرتا تھا۔

ابن جریر نے یعقوب ابن ابراہیم' ابن علیہ' ابن عون اور حسین کے واسطے سے نقل کیا ہے کہ مصر میں بعض لوگوں نے عبداللہ ابن عمرو سے پوچھا کہ ہم اللہ جل شانہ کی کتاب میں بعض احکام پاتے ہیں کہ ان کے بارے میں حکم دیا گیا

ہے کہ ان پر عمل کیا جائے ' لیکن ان پر عمل نہیں کیا جاتا' اس لئے ہم نے ارادہ کیا ہے کہ اس سلسلے میں امیرالمومنین سے ملیں ۔ چنانچہ عبداللہ بن عمرو مدینہ آئے اور وہ لوگ بھی ان کے ساتھ آئے 'اور حضرت عمرؓ سے ملے ۔ انہوں نے پوچھا تم کب آئے ہو؟ انہوں نے کہا میں فلاں فلاں تاریخ کو آیا ہوں' حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا تم اجازت لے کر آئے ہو؟ راوی کہتے ہیں کہ مجھے یاد نہیں کہ اس سوال کا حضرت عبداللہ ابن عمرو نے کیا جواب دیا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ امیرالمومنین! مجھے مصر میں بعض لوگ ملے تھے' انہوں نے سوال کیا تھا کہ ہم قرآن کریم میں بعض احکام پاتے ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے مگر ان پر عمل نہیں کیا جاتا' تو ان لوگوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتے ہیں ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا : آپ ان لوگوں کو میرے لئے جمع کریں ۔ انہوں نے ان لوگوں کو جمع کیا ۔ ابو عون نے کہا : "میرا خیال ہے کہ اس نے کہا بیٹھک میں جمع کیا۔ اس پر انہوں نے ان میں سے ادنیٰ تر آدمی سے بات کی اور کہا : میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اور اسلام کا آپ پر جو حق اس کو مدنظر رکھتے ہوئے تم سے پوچھتا ہوں : "کیا تم نے پورے قرآن مجید کو پڑھ لیا ہے؟" اس نے جواب دیا :"ہاں ۔" اس پر انہوں نے فرمایا :"کیا وہ پورا تمہارے ذہن میں ہے؟" اس نے جواب دیا :"خدا جانتا ہے نہیں ۔" اگر یہ شخص کہتا ہاں سب قرآن میرے ذہن میں ہے تو حضرت عمر بھی اس کے ساتھ مباحثہ شروع کر دیتے ۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا : "کیا سب قرآن تمہارے پیش نظر ہے؟" کیا سب قرآن لفظاً تمہیں یاد ہے؟ کیا سب قرآن پر تم عمل پیرا ہو؟ غرض ایسے ہی سوالات انہوں نے سب سے کئے اور آخری شخص تک وہ سب سے یہ سوالات کرتے چلے گئے ۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا :"تمہیں تمہاری ماں روئے : کیا تم عبداللہ بن عمرو کو اس بات کا مکلف بناتے ہو کہ وہ لوگوں کو مکمل طور پر قرآن کریم کے مطابق استوار کر دے ۔ ہمارے اللہ کو یہ معلوم تھا کہ ہم میں گناہ گار بھی ہوں گے ۔" اس کے بعد حضرت عمر ؓ نے یہ آیت تلاوت فرمائی ۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (٤ : ٣١) "اگر تم ان کبائر سے اجتناب کرو جن سے تمہیں روکا جا رہا ہے تو ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے ۔"

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا :"کیا اہل مدینہ جانتے ہیں ۔" یا فرمایا :"کیا کسی ایک شخص کو معلوم ہے کہ تم یہاں کس لئے آئے ہو؟" تو انہوں نے کہا :"نہیں ۔" تو فرمایا اگر اہل مدینہ کو علم ہوتا تو میں تمہیں ضرور وعظ کرتا ۔"

(لفظ احصیتہ فی اثرک کا مفہوم یہ ہے کہ کیا تم نے اپنی پوری زندگی میں قرآن کو نافذ کر دیا ہے ۔ اور ابن کثیر نے اسے نقل کیا ہے اور کہا ہے :"اسناد صحیح ہے 'متن حسن ہے ۔ اگرچہ یہ عمر سے حسن نے روایت کی ۔ اس میں انقطاع ہے ۔ بہرحال یہ مشہور ہے اور مشہور ہونے کی وجہ سے ہم اسے نقل کر رہے ہیں ۔)

حضرت عمر جیسے حساس اور سخت گیر شخص بھی اس حکمت کے ساتھ معاشرے کی اصلاح کر رہے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے شعور کو قرآن کریم نے استوار کر دیا تھا' اور ان کو گہری حکمت و دانائی عطا کر دی تھی ۔ انہوں نے کیا خوب کہا : "ہمارے اللہ کو پیشگی علم تھا کہ ہم سے گناہوں کا صدور ہو گا ۔" اور ہم ظاہر ہے کہ اللہ کے علم کے خلاف تو ہو نہیں سکتے ' اس لئے مدار فیصلہ اس پر ہو گا کہ ہم نے کیا ارادہ کیا؟ ہم نے کس قدر اپنے آپ کو درست کرنے کی نیت کی 'کس

قدر کوشش کی ؟کس قدر خواہشمند رہے ؟کس قدر ہم نے پابندی شریعت کرنے کی سعی کی ؟کس قدر جدوجہد اور وفاداری کرنے کی کوشش کی ؟ یہ ہے اسلامی نظام زندگی کا توازن 'سنجیدگی' اعتدال اور ہر معاملے میں آسانی پیدا کرنے کی کوشش ۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۳۲) وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا

(۳۳) (۴ : ۳۲ ـ ۳۳) "اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے ' اس کی تمنا نہ کرو ' جو کچھ مردوں نے کمایا ہے ' اس کے مطابق ان کا حصہ ہے ' اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے ' ہاں اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو ۔ یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے ۔ اور ہم نے ہر اس ترکے کے حقدار مقرر کر دیئے ہیں جو والدین اور رشتہ دار چھوڑیں ۔ اب رہے وہ لوگ جن سے تمہارے عہد و پیمان ہوں تو ان کا حصہ انہیں دو ' یقیناً اللہ ہر چیز پر نگران ہے ۔"

اللہ تعالیٰ نے دوسرے لوگوں کو جو فضیلت دی ہے اس کی تمنا کرنے سے اہل اسلام کو منع کیا گیا ہے اور یہ نص اس بارے میں عام ہے کہ یہ فضیلت کیسی بھی ہو ' مثلاً عہدہ و مرتبہ میں فضیلت ' صلاحیت و قابلیت میں فضیلت ' مال و اسباب میں فضیلت ' غرض اس زندگی میں نصیبہ کے اعتبار سے جو بھی فرق و امتیاز موجود ہو ' اس بارے میں دوسروں کے مقابلے میں تمنائیں نہیں کرنی چاہئیں ۔ جو کچھ مانگنا ہے ' اللہ سے مانگا جائے اور ہر امر کی طلب براہ راست اللہ سے ہونی چاہئے اور یہ نہ ہونا چاہئے کہ دوسروں کی فضیلتوں پر خواہ مخواہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ کر دل کو حسرتوں کی آماجگاہ بنا لے ' اور اس کے بعد اس غلط تمنا کے ساتھ حسد و کینہ اور بغض و انتقام کے برے جذبات اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ انسانوں پر حملہ آور ہوں ' یا ان کے اندر محرومیت ' ہلاکت اور تباہی کے جذبات اور مہلک احساسات پیدا ہوں ۔ ان جذبات کے بعد پھر ہر کسی کے خلاف بدظنی پیدا ہو ' اور پھر خدا اور مخلوق دونوں سے یہ شکایت پیدا ہو کہ انہیں کم دیا گیا ہے ۔ یہ صورت حال اس قدر تباہ کن ہوگی کہ معاشرے میں امن و سکون کا نام و نشان نہ رہے گا ' ہر شخص ذہنی پریشانی اور قلق کا شکار ہو گا ' انسانی قوتیں غلط رجحانات اور بدی کی راہوں میں صرف ہو کر ضائع ہوں گی جبکہ اس کے مقابلے میں یہ رجحان کہ سب کچھ عطا کرنے والا اللہ ہے ' وہی فضل و کرم اور داد و دہش کا منبع ہے کیا خوب ہے ۔ اور یہ عقیدہ کہ عطا اور داد و دہش سے اس کے خزانوں میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی ' اور اس کی درگاہ اس قدر وسیع ہے کہ اگر تمام کائنات کے سوالی اس پر اژدہام کر لیں تب بھی اس میں تنگی نہیں آتی ' امن و اطمینان بھی اس کی درگاہ سے ملتا ہے ' امید و آسرا بھی وہیں سے دستیاب ہے ۔ اسباب کی تلاش اور جدوجہد میں وہی مثبت راہ بتلاتا ہے ' جس راستے میں ایک دوسرے کے خلاف

عداوت، جلن، اختلاف اور دشمنی بھی پیدا نہیں ہوتی۔

ایک عام ہدایت دیتے ہوئے یہ آیت اپنے مفہوم میں عام ہے لیکن سیاق کلام میں اس کا مفہوم خاص ہو جاتا ہے اور اس کے اسباب نزول کے سلسلے میں بعض روایات بھی وارد ہیں جن کی وجہ سے آیت کا مفہوم عمومی کسی قدر خاص ہو کر اس میں فرق آ جاتا ہے اور بعض امور کی فضیلت متعین ہو جاتی ہے۔ یہ آیت انہی امور کو متعین کرتی ہے۔ مثلاً مردوں اور عورتوں کے حصے میں فرق ہے۔ مردوں کا حصہ میراث میں زیادہ متعین ہوا ہے، جس کا اظہار اس آیت سے بھی ہوتا ہے اور سیاق کلام سے بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ پہلو یعنی بعض امور میں مرد و زن کے درمیان مقام و مرتبہ میں خصوصی تفاوت اس آیت کی عمومیت پر اثرانداز نہیں ہوتی، اس لئے کہ مرد و زن کے تعلقات کی درستی اور ان کے درمیان باہم مکمل تعاون اور تکافل اور اسلامی معاشرے میں ایک خاندان کی تشکیل اور افراد معاشرہ کی باہم رضامندی اور پورے معاشرے کے درمیان نظم کے قیام کے لئے اس تفاوت کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے کہ اس تفاوت اور فرق مراتب کی وجہ سے فریقین کے فرائض اور ذمہ داریاں متعین ہو جاتی ہیں لیکن اس خصوصی تفاوت کے باوجود آیت کی عمومیت متاثر نہیں ہوتی، اس لئے روایات میں جو خاص اسباب نزول بیان ہوئے ہیں وہ آیت کے عمومی مفہوم کو متاثر نہیں کرتے۔

امام احمد نے سفیان، ابونجیح، مجاہد کی سند کے ساتھ حضرت ام سلمہ سے یہ روایت کی ہے کہ ام سلمہ نے حضور ؐ کے سامنے یہ عرض کی کہ حضور! مرد جہاد کرتے ہیں لیکن ہم عورتیں جہاد میں شریک نہیں ہوتیں، اور میراث میں بھی ہمارا حصہ نصف ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی "اور جو اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسرے کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو۔"

امام ابو حاتم، ابن جریر، ابن مردویہ اور حاکم نے مستدرک میں امام ثوری کی حدیث بروایت ابن نجیح، مجاہد حضرت ام سلمہ سے یوں روایت کی ہے کہ انہوں نے حضور سے کہا کہ ہم عورتیں جنگ میں حصہ نہیں لیتیں تاکہ ہم شہید ہوں اور میراث میں بھی ہمارا پورا حصہ نہیں ہے تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (اِنِّیْ لَا اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی) "میں تم میں کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا، مرد ہو یا عورت۔"

حضرت سدی اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے یہ کہا تھا کہ ہمارے لئے عورتوں کے ثواب کے مقابلے میں دوگنا ثواب ہونا چاہئے جس طرح میراث کے حصے میں ہمارے لئے دوگنا ہے۔ اور عورتوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہمارے لئے بھی شہداء کے ثواب جیسا ثواب ہونا چاہئے، اس لئے کہ ازروئے فطرت ہم جنگ نہیں لڑ سکتیں لیکن اگر اللہ نے ہم پر جہاد فرض کیا ہوتا تو ہم جنگ میں حصہ لیتیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان خیالات کی تردید فرمائی اور حکم دیا کہ وہ میرے فضل کے بارے میں دعا کریں، اور یہ فضل دنیا جیسا عارضی نہیں ہے...... ایسی ہی روایت قتادہ سے بھی مروی ہے۔ بعض دوسری روایات بھی ہیں جو اس آیت کے مفہوم کی عمومیت کو ظاہر کرتی ہیں۔

علی ابن ابو طلحہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: "کوئی شخص یہ تمنا نہ کرے کہ فلاں شخص کا مال اور اس کی عورت اسے ملیں۔ اللہ نے اس سے منع کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ وہ اللہ کے فضل کے طلبگار

ہوں۔ حسن ' محمد بن سیرین ' عطاء اور ضحاک سے بھی ایسی ہی تفسیر مروی ہے۔

مرد و زن کے درمیان زمانہ جاہلیت میں جو تعلقات پائے جاتے تھے ' ان کے حوالے سے دیکھا جائے تو محولہ بالا پہلے اقوال میں آثار جاہلیت کا پرتو نظر آتا ہے جبکہ دوسری جانب مرد و زن کے درمیان جذبہ مسابقت اور تنافس اس بات کا نتیجہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق عطا کئے اور جو آزادیاں عنایت کیں اس کے نتیجے میں اس قسم کے تنافس کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا' اس لئے کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق عطا کئے وہ اصول کرامت انسانی اور ہر جنس اور ہر گروہ کے ساتھ منصفانہ سلوک پر مبنی تھے۔ اور یہ منصفانہ رویہ ہر شخص کو یوں سکھایا گیا کہ اس نے خود اپنی ذات کے ساتھ بھی انصاف کرنا تھا۔

اسلام کے اہداف یہ ہیں کہ وہ اپنے متکافل اور معاون نظام زندگی کو...... نافذ کرنا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد نہ مردوں کی حمایت ہے اور نہ عورتوں کی حمایت کرنا ہے۔ بلکہ اس کے پیش نظر انسان من حیث الانسان ہے۔ اور اسلامی معاشرہ کی تخلیق ہے۔ اسلام علی الاطلاق اور علی العموم انسانیت کی اصلاح اور بھلائی کے لئے کام کرتا ہے۔ وہ اس دنیا میں عمومی اور بے قید عادلانہ نظام چاہتا ہے ' جو ہمہ جہت اور ہمہ پہلو عادلانہ اسباب پر مبنی ہو۔

اسلامی نظام زندگی ' فرائض و واجبات کے تعین میں راہ فطرت پر چلتا ہے۔ اسی طرح وہ مرد و زن کے حصہ رسدی کے تعین میں بھی دونوں کی فطری صلاحیتوں کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اور فطرت نے ابتدائے تخلیق سے مرد کو مرد عورت کو عورت قرار دیا۔ ان میں سے ہر ایک کے اندر متعین صلاحیتیں پیدا کیں۔ اور ان خاص صلاحیتوں کے مطابق ان کے فرائض متعین کئے۔ ان فرائض کے تعین میں کسی مخصوص مقصد کو سامنے نہیں رکھا گیا' نہ کسی ایک جنس کو دوسری پر ترجیح دی گئی ہے۔ بلکہ انسان کی پوری زندگی کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ جس کا قیام اور تنظیم اور جس کی خصوصیات کی تکمیل اور جس کے مقاصد کی تکمیل اسی صورت میں ممکن ہے کہ مرد و زن کے درمیان فرق و امتیاز ہو ' اور یہ فرق و امتیاز ان دونوں کی خصوصیات اور صلاحیتوں اور فرائض و واجبات کے درمیان فرق و امتیاز کے مطابق ہو تاکہ وہ خلافت فی الارض اور اللہ کی بندگی کے اعلیٰ مقاصد پورے کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے حیات انسانی کے عظیم ادارے کی تنظیم اور تکمیل کے لئے مرد و زن کے درمیان تنوع پیدا کیا۔ ان کو مختلف صلاحیتیں دیں۔ ان کے لئے مختلف فرائض منصبی مقرر کئے۔ اور ان کے لئے مختلف حقوق متعین کئے اور جدا جدا دائرہ کار کا تعین کیا۔ تاکہ کاروان زندگی صحیح سمت پر سفر جاری رکھ سکے۔

انسان جب غیر جانبداری سے مکمل اسلامی نظام زندگی کا مطالعہ کرے ' خصوصاً اس نظام میں مرد و زن کے باہمی تعلقات کی نوعیت کا گہرا جائزہ لے تو نہ اس نزاع کا کوئی موقعہ رہتا ہے جو قدیم روایات میں پایا جاتا ہے اور نہ ان جدید مجادلات اور نزاعات کی کوئی حقیقت رہتی ہے ' جو آج کل کے دور میں مردوں اور عورتوں کے درمیاں بے فائدہ ہو جاتے ہیں اور جس کا شور و غوغا بھی اس قدر بلند ہو جاتا ہے جس میں سنجیدہ مردوں اور عورتوں کی آواز دب کر رہ جاتی ہے۔

یہ ایک عبث کوشش ہوگی کہ ہم صورت حال کی تصویر کشی یوں کریں کہ گویا مرد اور عورت کے درمیان ایک معرکہ کارزار گرم ہے۔ اس میں ہر شخص اپنا اپنا موقف بیان کر رہا ہے۔ ہر شخص جنگ کو جیتنے کی سعی میں لگا ہوا ہے۔ کچھ سنجیدہ اہل قلم بھی بعض اوقات ایسا موقف اختیار کرتے ہیں کہ وہ عورت کی ذات میں نقائص نکالتے ہیں' اس سے

کمالات کی نفی کرتے ہیں اور اس کی طرف ہر عیب کی نسبت کرتے ہیں۔ یہ کام وہ علمی بحث و مباحثہ کے طور پر کریں یا اسلامی نقطہ نظر سے کریں۔ دونوں صورتیں حقیقت نفس الامری سے دور ہیں۔ مسئلہ دراصل دونوں فریقوں کے درمیان معرکہ آرائی کا نہیں ہے بلکہ مسئلہ دونوں اصناف کی نوعیت اور تقسیم کار کا ہے۔ ایک، دوسرے کے ساتھ تکافل اور تعاون کا ہے۔ اور اسلامی نظام زندگی کے مطابق ان کے درمیان قیام عدل کا ہے۔

یہ ممکن ہے کہ جاہلی معاشروں کے اندر مرد و زن کے درمیان کوئی معرکہ آرائی ہو۔ اس لئے کہ جاہلی معاشرت اپنے لئے نظام حیات از خود تجویز کرتے ہیں۔ ان جاہلی معاشروں کا نظام خالص ذاتی اور نبوی اغراض و مقاصد پر مبنی ہوتا ہے یا ان نظاموں میں بعض غالب طبقات کے مفادات کو مد نظر رکھا گیا ہوتا ہے یا بعض خاندانوں اور بعض افراد کے مفادات کی حفاظت مطلوب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان جاہلی نظاموں میں انسان کی اصلیت اور جاہلیت کی نسبت جہالت کی وجہ سے عورتوں کے حقوق کو غصب کیا گیا ہوتا ہے یا ان میں مرد و زن کے فرائض طبیعی کو نظرانداز کر کے ان کے حقوق و فرائض متعین کئے ہوتے ہیں یا ان میں کام کرنے والی عورت کے حقوق اس ہی جیسے کام کرنے والے مرد کے حقوق کے مقابلے میں کم رکھے گئے ہوتے ہیں۔ اور یہ کی محض اقتصادی وجوہات سے ہوتی ہے یا مثلاً تقسیم میراث کے میدان اور مالی تصرفات کے شعبے میں عورتوں کے حقوق کم رکھے گئے ہوتے ہیں جس طرح جدید جاہلی معاشروں میں بھی صورت حال ایسی ہی ہے۔

رہا اسلامی نظام زندگی تو اس میں کہیں بھی ایسی صورت حال نہیں ہے۔ اس میں اولاً مرد و زن کے درمیاں کوئی معرکہ برپا نہیں ہوتا۔ اس میں دنیاوی مفادات کی بنا پر ایک دوسرے کے مقابلے میں کوئی دشمنی نہیں ہوتی۔ اس میں نہ مرد عورت کے مفادات پر حملہ آور ہو کر اسے لوٹتا ہے اور نہ عورت مرد کے مفادات پر حملہ آور ہو کر اسے لوٹتی ہے۔ نہ وہ ایک دوسرے کی کمزوریوں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں اور انہیں اجاگر کرتے ہیں۔ اسلامی نظام میں اس قسم کے افکار کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ مرد و زن کے درمیان طبیعی خصائص میں اس بین فرق و امتیاز کے باوجود مرد و زن کے درمیان فرائض اور واجبات کا کوئی فرق نہیں ہے اور یہ کہ ان فرائض واجبات کی وجہ سے مرد و زن کے منصب اور حیثیت پر کوئی اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ اس قسم کے افکار غلط فہمی پر مبنی ہیں' اور اپنی جگہ از کار رفتہ بھی ہیں۔ اسلامی نظام کے بارے میں یہ افکار جہالت پر مبنی ہیں' اور مرد و زن کی فطری ساخت اور طبیعی وظائف کے بارے میں گہری لاعلمی کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں ---

ذرا جہاد کے معاملے پر غور فرمایئے! جہاد اور شہادت فی سبیل اللہ' اس میں عورت کی شرکت اور حصول ثواب کے مسائل کے معاملے میں دور اول کی صالح عورتوں کے دل میں تشویش تھی۔ ان صالح عورتوں کی تشویش کا تعلق صرف اخروی نقطہ نظر سے تھا۔ اس کا تعلق اس دنیا میں حیثیت یا برتری سے ہرگز نہ تھا۔ بعض اوقات اس فرق و امتیاز کا تعلق دنیاوی امور سے بھی تھا' مثلاً وراثت میں مرد کا حصہ عورت کے مقابلے میں زیادہ رکھا گیا تھا' زمانہ قدیم سے مردوں اور عورتوں کے دلوں میں اس امتیاز کے بارے میں تشویش تھی۔ آج کے دور جدید میں بھی یہ اور اس قسم کے دوسرے مسائل دلوں میں کھٹکتے ہیں۔

<u>حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فعل جہاد نہ عورت پر فرض کیا ہے اور نہ ہی اس کے لئے جہاد میں شرکت کو حرام</u>

قرار دیا ہے ۔ نیز اگر فریضہ جہاد میں عورت کی ضرورت ہو اور مرد آبادی اس کے لئے کفایت نہ کرتی ہو تو عورت کو اس سے منع بھی نہیں کیا گیا۔ نیز تاریخ اسلام سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض عورتیں جہاد میں شریک بھی ہوئیں ۔ انہوں نے تیمارداری اور باربرداری کے علاوہ جہاد میں بھی حصہ لیا لیکن ایسے واقعات قلیل اور نادر ہیں اور انتہائی ضرورت کے اوقات میں پیش آئے ۔ عمومی اصول اور معمول یہ نہ تھا۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح مردوں پر جہاد فرض قرار دیا' اس طرح عورتوں پر اسے فرض نہیں کیا گیا۔

عورتوں پر جہاد اس لئے نہیں فرض کیا گیا کہ وہ مجاہدین کو پیدا کرنے کا ذریعہ (Producer) ہیں ۔ عورت کی تخلیق ہی اس لئے ہوئی ہے کہ وہ مردوں کو پیدا کرے ۔ اس کی عضویاتی ساخت اور نفسیاتی میلان ہی اس طرف ہے کہ وہ مجاہدین پیدا کرے اور انہیں جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیار کرے ' انہیں اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کرے ۔ اس میدان میں عورت زیادہ قوت اور خوش اسلوبی سے کام کر سکتی ہے اور اس کا کام زیادہ نفع بخش بھی ہو سکتا ہے ۔ اس میدان میں وہ زیادہ قوت سے اس لئے کام کر سکتی ہے کہ اس کی عضویاتی اور نفسیاتی تشکیل ہی اس مقصد کے لئے ہوئی ہے ۔ یہ بات صرف عورت کی عضویاتی ساخت کی بنا پر ہی نہیں کی جا رہی بلکہ علی الخصوص اس کے اندرونی نظام میں خلیات کی پیوند کاری یعنی ۔ یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی سے مرد ہے یا عورت ہے عورت پیدائش کے وقت سے ہی اس فریضہ کے لئے واحد ذمہ دار ہے ۔ (دیکھئے فصل المراۃ وعلاقۃ الجنسین ۔ جو کتاب الاسلام و مشکلات الحضارہ کا حصہ ہے ۔) ظاہری اعضاء کے افعال تو بعد میں یکے بعد دیگرے کام کرتے ہیں اور اس عرصہ کے بعد عظیم نفسیاتی اثرات حاملہ عورت پر مرتب ہوتے ہیں لہٰذا اس کی جانب سے امت مسلمہ کے لئے جہاد میں شرکت کے مقابلے میں یہ عظیم فریضہ سرانجام دینا زیادہ نفع بخش ہے ۔ اس لئے کہ جب جنگ کا طوفان بڑی تعداد میں مردوں کو فنا کر دیتا ہے تو عورت مزید آبادی کی پیداوار کے ذریعے کے طور پر اپنا فرض ادا کرتی ہے ۔ اور وہ مزید مرد پیدا کر کے خلا کو پر کرتی ہے ۔ لیکن اگر جنگ کا بھوت مرد اور عورت دونوں ہی کو کھا لے یا وہ مردوں کو چھوڑ کر صرف عورتوں کو اچک لے اور مردوں کو باقی رکھے تو یہ صورت باقی نہیں رہتی ۔ اس لئے کہ اسلامی نظام زندگی میں اگر ایک مرد ہے اور وہ پوری رخصت کو کام میں لائے تو وہ بیک وقت چار عورتوں سے شادی کر سکتا ہے ۔ اور بیک وقت وہ چار عورتیں آبادی میں اضافہ کر سکتی ہیں ۔ اور یوں وہ کمی پوری ہو سکتی ہے (اگرچہ ایک عرصہ بعد) جو جہاد و قتال کی وجہ سے واقع ہوا کرتی ہے ۔ لیکن اگر ایک ہزار افراد بھی ایک عورت کے ساتھ ہمبستری کریں تو بھی وہ عورت اسی مقدار میں بچے دے سکتی ہے جو ایک مرد کی ہمبستری سے دے سکتی ہے ۔ عورتوں کی کمی کی صورت میں آبادی کی کمی ہرگز پوری نہ ہو سکے گی ۔ اور یہ تو اللہ تعالیٰ کی بے پناہ حکمتوں میں سے ایک ہی نکتہ ہے جو اس حکم کی تہہ میں پوشیدہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو جہاد سے معاف رکھا ۔ اس حکم کے بے شمار منافع ہیں ۔ مثلاً اسلامی معاشرہ میں اخلاقی پاکیزگی کا اہتمام ' اسلامی معاشرے کے مزاج کو مدنظر رکھنا ' انسان کے دونوں اصناف کے لئے علیحدہ علیحدہ دائرہ کار کی نشاندہی وغیرہ جن کے بارے میں تفصیلات بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے ۔ اس لئے کہ اس نکتے پر خاص اور طویل بحث کی ضرورت ہے ۔ (دیکھئے کتاب "نحو مجتمع اسلامی" کی فصل "نظام عائلی")

رہا معاملہ اجر و ثواب کا تو اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت دونوں کو اس کی پوری پوری یقین دہانی کرائی ہے ' بشرطیکہ وہ اپنے فرائض و واجبات کو خدا خوفی سے بحسن و خوبی سرانجام دیں اور ان میں وہ درجہ احسان تک پہنچ جائیں ۔

رہا مسئلہ حصص میراث کا تو بادی النظر میں "مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر حصہ ہو گا" کے اصول سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورت پر مرد کو ترجیح دی گئی ہے ۔ لیکن مرد اور عورت کے پورے فرائض اور واجبات پر اگر ایک نظر دوڑائی جائے تو بہت جلد اس رائے کی سطحیت آشکارا ہو جاتی ہے ۔ آمدن اور حصص کا تعین ذمہ داریوں کو دیکھ کر کیا گیا ہے ۔ اسلامی نظام زندگی کا یہ ایک مستقل اصول ہے کہ اس میں مفادات کا تعین ذمہ داریوں کی نسبت سے کیا جاتا ہے ۔ مرد پر یہ بات فرض کی گئی ہے کہ وہ عورت کو مہر ادا کرے جبکہ اگر کوئی امیر سے امیر عورت بھی ہو تو اس پر مرد کے لئے مہر واجب نہیں کیا گیا ۔ پھر مرد پر عورت اور اس کی اولاد دونوں کے اخراجات عائد کئے گئے ہیں جبکہ عورت پر یہ ذمہ داری عائد نہیں کی گئی اگرچہ وہ مالدار ہو ۔ مرد اگر ان فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو اسے سزائے قید دی جا سکتی ہے ۔ پھر مرد پر مختلف قسم کی دیات اور تاوان بھی عائد ہوتے ہیں (یعنی زخموں کے تاوان) اور یہ تاوان اسے اجتماعی طور پر خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے ادا کرنے ہوتے ہیں جبکہ دیات اور ارش کے تاوانوں سے عورت کو معاف رکھا گیا ہے ۔ مرد پر اپنے خاندان کے ناداروں اور مساکین کا نفقہ بھی واجب ہے خواہ مرد ہوں یا عورتیں ہوں بشرطیکہ وہ کمانے پر قادر نہ ہوں ۔ یہ فریضہ قریب سے قریب رشتہ داروں سے شروع ہوتا ہے اور عورت اس قسم کے عام خاندانی فرائض سے مستثنیٰ ہے ۔ یہاں تک کہ جس خاوند سے اس کی اولاد پیدا ہوتی ہے ' اس کے ساتھ بھی اگر اس کا معاشی اشتراک نہ ہو یا طلاق ہو گئی ہو تو بچے کی پرورش کے انتظامات بھی اس مرد پر عائد ہوتے ہیں اور وہ خود اس عورت کے اخراجات کے ساتھ اسے ادا کرنے کا پابند ہے ۔ غرض اسلامی نظام ایک مکمل اور جامع نظام ہے اور اس میں تقسیم میراث کے وقت مرد و عورت کی مالی ذمہ داریوں کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے ۔ یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ شریعت نے ذمہ داریوں کا جو بھاری بوجھ مرد پر ڈالا ہے ' اس کی نسبت سے میراث میں مرد کا حصہ کوئی زیادہ نہیں ہے ۔ ان تمام امور میں مرد کی معاشی سرگرمیوں کی زیادہ قدرت اور مہارت کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے ۔ اور عورت کے زیادہ سے زیادہ آرام اور اطمینان کو پیش نظر رکھا گیا ہے تاکہ وہ دلجمعی کے ساتھ انسان کے قیمتی سرمائے یعنی بچوں کی نگہداشت کر سکے ' جو ہر قسم کے مال ' ہر قسم کے ساز و سامان اور ہر قسم کی مفید عام ہنرمندی سے زیادہ قیمتی ہے ۔

اس غور و فکر کے نتیجے میں معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی ' جس کی تشکیل ایک حکیم و علیم ذات نے فرمائی ہے ۔ اس میں وسیع توازن اور گہری حکمت پوشیدہ ہے اور اسلام نے اس آیت میں عورت کو انفرادی ملکیت کا حق ان الفاظ میں دیا ہے ۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (۴ : ۳۲) "جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے ۔" .... اور یہ وہ حق ہے جو عربی جاہلیت تمام دوسری جاہلیتوں کی طرح ' عورت کو عطا کرنے میں ہمیشہ ہچکچاتی رہی ہے اور کبھی بھی عورت کے اس حق کو کھلے دل سے تسلیم نہیں کیا گیا ۔ شاذ و نادر ہی کبھی عورت کو یہ حق دیا گیا اور آج بھی عورت کے اس حق کو مارنے کے حیلے کئے جاتے ہیں جبکہ خود عورت ذات کو اسی طرح وراثت میں پکڑا جاتا ہے اور میراث کی طرح تقسیم کیا جاتا ہے ۔

یہ وہ حق ہے جو جاہلیت جدیدہ آج بھی عورت کو دینے میں ہچکچا رہی ہے ' حالانکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس نے عورت کو وہ حقوق عطا کئے جو اس کو کبھی عطا نہ کئے گئے تھے ۔ جاہلیت جدیدہ میں بعض قوانین ایسے ہیں کہ سب سے بڑے مرد وارث کو تمام میراث کا حقدار سمجھتے ہیں اور بعض قوانین یہ لازم کرتے ہیں کہ عورت جو مالی معاہدہ بھی کرے اس کی منظوری ولی کی طرف سے ازروئے قانون ضروری ہے ۔ اور یہ قوانین بیوی کی جانب سے خاص اپنی جائیداد کے بارے میں بھی کسی قسم کا تصرف صرف اس وقت جائز کرتے ہیں جب خاوند اس کی منظوری دے ۔ اور یہ ناقص حقوق جاہلیت جدیدہ نے اسے تب دیئے جب اس نے ان کے حصول کے لئے تحریکات چلائیں ۔ عظیم انقلابات برپا کئے اور اس کے نتیجے میں عورت کی زندگی کا نظم برباد ہوا' خاندانی نظام ختم ہو گیا' اور عام اخلاقی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی ۔

لیکن اسلام نے ابتداء ہی سے عورت کو یہ حقوق از خود دے دیئے ۔ بغیر اس کے کہ وہ ان کے حصول کے لئے کوئی چارٹر آف ڈیمانڈ تیار کرے ۔ قبل اس کے کہ وہ بغاوت پر اتر آئے' قبل اس کے کہ وہ ان کے حصول کے لئے عورتوں کی تنظیمیں قائم کرے اور قبل اس کے کہ وہ پارلیمنٹ کی ممبری تک پہنچ کر ان کا مطالبہ کرے ۔ یہ حقوق اسلام نے اسے محض انسانیت کے احترام میں عطا کئے ۔ یہ اسے محض اس لئے دیئے گئے کہ نفس انسانی کے دو اصناف ہیں مرد اور عورت' اور اس لئے دیئے گئے کہ اسلام نے اپنے اجتماعی نظام کی اکائی ایک خاندان کو قرار دیا ہے ۔ اور اس خاندانی نظام کو باہم محبت' باہم الفت کے ساتھ مرد و عورت کے درمیاں مساوات کے اصول پر مربوط کر دیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کسب و کمائی اور ملکیت کے نقطہ نظر سے اسلام نے مرد اور عورت دونوں کو ازروئے اصول مکمل طور پر مساوی حقوق دیئے ہیں ۔

ڈاکٹر عبدالواحد وافی اپنی کتاب "انسانی حقوق" میں ' اسلام اور جدید مغربی ممالک میں عورت کے حقوق کے بارے میں تقابلی مطالعہ یوں پیش کرتے ہیں "اسلام نے مرد اور عورت کو قانون کے نقطہ نظر سے مساوی حقوق دیئے' اور تمام شہری حقوق میں مرد اور عورت کو برابر قرار دیا' اور اس سلسلے میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے درمیان کوئی فرق امتیاز نہیں برتا گیا ۔ اسلام اور پوری مسیحی دنیا کے درمیان شادی کی نوعیت میں بہت بڑا اختلاف پایا جاتا ہے ۔ اسلامی قانون کے مطابق شادی کی وجہ سے نہ عورت کا نام ختم ہوتا ہے نہ اس کی شخصیت ختم ہوتی ہے' نہ اس کے معاملات طے کرنے کی حیثیت میں کوئی فرق آتا ہے' اور نہ اس کا حق ملکیت محدود ہوتا ہے بلکہ ایک مسلمان عورت کا شادی کے بعد نام بھی وہی رہتا ہے' اس کی قانونی اور شہری حیثیت بھی اپنی جگہ بحال رہتی ہے اور تمام قانونی حقوق اسے حاصل رہتے ہیں ۔ اس پر وہ تمام ذمہ داریاں عائد رہتی ہیں جو پہلے اس پر عائد تھیں ۔ وہ اپنے معاملات میں ہر قسم کے فیصلے اور معاہدے کر سکتی ہے ۔ مثلاً خرید و فروخت' رہن' ہبہ اور وصیت وغیرہ ۔ وہ جن چیزوں کی مالک ہوتی ہے' نکاح کی وجہ سے اس کے حق ملکیت پر کوئی قید عائد نہیں ہوتی ۔ غرض اسلام میں شادی کے بعد بھی عورت کو مستقل قانونی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور وہ مستقل شخصیت کی مالک ہوتی ہے' اس کی جائیداد اس کے شوہر کی جائیداد سے علیحدہ خود اس کی ملکیت ہوتی ہے ۔ خاوند کو کوئی قانونی اختیار نہیں ہوتا کہ وہ کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر حاصل کرے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ ہو ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

(وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا

مِنْهُ شَيْـًٔا اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا (۲۰) وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ

اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (۲۱) (۴: ۲۰-۲۱))

"اور اگر تم بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کر لو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو' اس میں سے کچھ واپس نہ لینا' کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے؟ اور آخر تم اسے کس طرح لے لو گے جب کہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو۔ اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔" اگر کسی خاوند کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی مطلقہ بیوی سے وہ دولت واپس لے جو اس نے خود اسے عطا کی تھی تو اس کے لئے خود اس عورت کی مملوکہ دولت کا ہڑپ کر لینا بطریق اولیٰ جائز نہیں ہے الا یہ کہ یہ سب کچھ اس کی مرضی سے ہو' اور وہ کوئی چیز اپنی خوشی سے عطا کر رہی ہو اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے۔

(وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا

مَّرِيْٓـًٔا (۴: ۴) "اور عورتوں کو ان کے مہر خوشدلی کے ساتھ ادا کرو' البتہ اگر وہ خود اپنی مرضی سے مہر کا کوئی حصہ تمہیں معاف کر دیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔"

اور مرد اپنی بیوی کی دولت میں کسی قسم کا تصرف بھی نہیں کر سکتا' الا یہ کہ وہ اسے اس کی اجازت دے دے یا اس نے اپنے خاوند کو کسی قسم کے تصرف اور معاہدے کی اجازت دے دی ہو۔ لیکن ایسے حالات میں بھی اس کو اجازت ہے کہ وہ اپنے دیئے ہوئے ان اختیارات کو واپس لے لے اور جس دوسرے شخص کو چاہے وہ اختیارات دے دے۔"

"یہ وہ مقام بلند ہے جس تک عورت آج کے جدید دور جمہوریت میں ان ممالک میں بھی نہیں پہنچ سکی جو اس کرۂ ارض پر انتہائی ترقی یافتہ ممالک ہیں۔ فرانس میں ماضی قریب تک عورتوں کی حالت یہ تھی کہ گویا وہ باندیاں اور لونڈیاں ہیں' بلکہ ابھی تک یہ صورت حال موجود ہے۔ قانون نے کئی شہری معاملات میں اس کے حقوق سلب کئے ہوئے ہیں۔ مثلاً فرانس کے سول کوڈ کی دفعہ ۲۱۷ میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ "شادی شدہ عورت' چاہے نکاح کی شرائط میں یہ طے کر دیا گیا ہو کہ عورت اور مرد کی ملکیت علیحدہ علیحدہ ہو گی اس کے باوجود وہ اپنی جائیداد ہبہ نہیں کر سکتی نہ اس کی ملکیت منتقل کر سکتی ہے' نہ رہن کر سکتی ہے' نہ وہ بالعوض یا بلاعوض تملیک کر سکتی ہے' الا یہ کہ اس کا شوہر کسی معاہدے میں اس کے ساتھ شریک ہو' یا یہ کہ وہ تحریری طور پر ان امور میں سے کسی امر کی اجازت دے دے۔"

"بعد کے ادوار میں اس دفعہ میں متعدد ترمیمیں اور تبدیلیاں کی گئیں لیکن اس قانون کے کافی آثار ابھی تک باقی ہیں اور فرانسیسی عورت پر قانونی پابندیاں عائد ہیں۔ مغربی عورت پر یہ قانونی غلامی مسلط کرنے کے بعد مغربی معاشرت کا رسم و رواج بھی اس پر یہ پابندی عائد کرتا ہے کہ عورت شادی ہوتے ہی اپنا اور اپنے خاندان کا نام کھو دیتی ہے' اس

کے بعد اس کا نام فلاں بنت فلاں نہیں لیا جاتا بلکہ اسے بیگم فلاں سے پکارا جاتا ہے یا اس کے نام کے ساتھ اس کے خاوند کا نام لگ جاتا ہے ۔ لیکن اس کے نام کے ساتھ اس کے باپ اور اس کے خاندان کا نام نہیں لیا جاتا ۔ اس طرح عورت کا نام ختم ہونے سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ شادی کے بعد عورت کی شہری اور قانونی حیثیت ختم ہو گئی ہے اور وہ اپنے خاوند کی شخصیت میں گم ہو گئی ہے ۔"

"مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے اکثر خواتین ان مغربی خواتین کے ساتھ یک جہتی کے طور پر اپنے لئے بھی اس کم تر اور ثانوی حیثیت کو قبول کر لیتی ہیں اور اپنا نام لینے کے بجائے اپنے آپ کو بیگم فلاں ظاہر کرتی ہیں' یا اپنے نام کے ساتھ اپنے خاوند اور اس کے خاندان کا نام چسپاں کر لیتی ہیں اور اپنے نام کے ساتھ اپنے باپ اور اپنے خاندان کا نام لینا پسند نہیں کرتیں' جیسا کہ اسلامی نظام زندگی کی خواہش اور مزاج ہے ۔ اس کو کہتے ہیں بھونڈی نقل یا اندھی تقلید ۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ جو خواتین مغربی عورت کی غلامی کی بھی نقالی کرتی ہیں' ہمارے ہاں وہ عورت کی آزادی اور حقوق کا مطالبہ کرتی ہیں' اور عورتوں کو مردوں کے ساتھ تشبہ کرنے پر ابھارتی اور حقوق کا مطالبہ کرتی ہیں' حالانکہ درحقیقت وہ ان بہترین حقوق سے دستبردار ہو رہی ہوتی ہیں جو اسلام نے انہیں عطا کیے تھے حالانکہ اسلام نے ان کی قدر و منزلت میں اضافہ کیا تھا' اور ان حقوق میں انہیں مردوں کے برابر حیثیت دی تھی ۔" (صفحات ۵۹ تا ۶۱)

---ooo---

اب ہم اس سبق کی آخری آیت کی طرف آتے ہیں ۔ اس میں ان معاہدوں کے احکام بتائے گئے ہیں جو احکام میراث کے آنے سے پہلے ہوئے تھے ۔ اسلام کے نظام وراثت کو رشتہ داری اور قرابت کے اساس پر مرتب کیا گیا' جبکہ دوستی اور ولایت کے یہ معاہدے قرابت داری کے دائرے سے باہر بھی ہوا کرتے تھے جیسا کہ تفصیلات آ رہی ہیں ۔

(وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا (۴ : ۳۳))

"اور ہم نے ہر اس ترکے کے حقدار مقرر کر دیے ہیں جو والدین اور رشتہ دار چھوڑیں ۔ اب رہے وہ لوگ جن سے تمہارے عہد و پیمان ہوں تو ان کا حصہ انہیں دو' یقیناً اللہ ہر چیز پر نگراں ہے ۔"

اس کلیہ کے بعد کہ مردوں نے جو کمایا ان کا ہے اور عورتوں نے جو کمایا ان کا ہے اور اس حوالے کے بعد کہ قانون میراث کے مطابق مردوں اور عورتوں کے حصص بھی مقرر ہو چکے ہیں اب فرماتے ہیں کہ ہر شخص کے رشتہ داروں میں سے ہم نے اس کے وارث مقرر کر دیے ہیں' جو اس کی میراث پائیں گے اور یہ وارث اس شخص کے اس ترکے کے حقدار ہوں گے جو اسے اپنے والدین اور اقرباء سے ملا ۔ یہ مال اس نظام میراث کے مطابق نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا رہے گا ۔ وراثت پانے والے پائیں گے پھر وہ اپنے اس موروثی مال میں مزید اپنی کمائی جمع کریں گے اور اس کے بعد جب وہ فوت ہوں گے تو ان کی اگلی نسل میں آنے والے اقرباء ان کی وراثت حاصل کریں گے ۔ یہ ایک ایسی تصویر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں دولت کی گردش کس طرح عمل میں آتی ہے ۔ یہ گردش کسی نسل میں نہیں

رکتی اور نہ یہ دولت کسی ایک گھرانے اور ایک فرد کے پاس جمع اور مرتکز ہوتی ہے بلکہ نظام میراث ہمیشہ اپنا کام کرتا رہتا ہے ۔ ایک مسلسل تقسیم ہے جو جاری و ساری ہے ۔ اموال کے مالک اس میں کوئی ترمیم نہیں کر سکتے ۔ نہ وارثوں کے حصص میں کمی بیشی کی جا سکتی ہے ۔ وقفے وقفے کے بعد تقسیم کا یہ خود کار عمل جاری رہتا ہے ۔

اس کے بعد ان سابقہ معاہدوں کی بات ہوئی جن کو شریعت اسلامیہ نے برقرار رکھا ہے اور جن کے مطابق میراث کے حقدار کبھی کبھار غیر اقرباء بھی ہو جاتے تھے ۔ ان معاہدوں کو عقود موالات کہا جاتا تھا ۔ جب اسلامی معاشرے کا آغاز ہوا تو اس میں ان میں سے بعض پائے جاتے تھے مثلاً :

۱۔ معاہدۂ موالات عتق ' جو شخص غلام کو آزاد کرتا وہ اس کی جانب سے دیت بھی ادا کرتا ' اگر کسی وقت اس پر عائد ہو جائے یعنی جب وہ کوئی جرم کرتا جیسا کہ اپنے اہل نسب کے درمیان دیت کی ادائیگی ہوا کرتی تھی ۔ اور اگر کوئی شخص مرجاتا تو اگر اس کے عصبات نہ ہوتے تو پھر یہ مالک اس کی میراث کا بھی حقدار ہوتا ۔

۲۔ دوسرا عقد موالات ' وہ یوں کہ ایک غیر عربی کسی عربی کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کر لیتا جبکہ اس کے اقرباء عرب میں نہ ہوتے ' اس معاہدے کے نتیجے میں یہ غیر عربی کسی بھی عرب خاندان کا ایک فرد ہو جاتا ۔ ولی بھی اس کی جانب سے دیت ادا کرتا اگر اس سے کوئی جرم سرزد ہو جاتا اور یہ شخص جب مرجاتا تو اس کی میراث کا حقدار وہ ولی ہوتا ۔

۳۔ وہ معاہدہ جو ابتدائے ہجرت کے ایام میں حضور ؐ نے انصار و مہاجرین کے درمیان کرایا تھا ۔ اس طرح مہاجرین اور انصار ایک دوسرے کے وارث بھی ہوتے ' اگر انصار کے اہل مسلمان ہوتے ورنہ ان کے درمیان وراثت نہ ہوتی ۔

۴۔ ایسے معاہدے جاہلیت میں ہوتے تھے کہ دو شخص ایک دوسرے کے ساتھ معاہدہ کرتے کہ ہم ایک دوسرے کی وراثت کے حقدار ہوں گے ۔

اسلام نے ان تمام معاہدوں کو کالعدم کر دیا ' خصوصاً تیسرے اور چوتھے معاہدے کو اور یہ قرار دیا کہ وراثت کے اندر حقیقی عامل قرابت اور صرف قرابت ہے لیکن اسلام نے اول الذکر دو معاہدوں کو بحال رکھا اور یہ حکم دیا کہ آئندہ ایسے معاہدے نہ کیے جائیں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ۔ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ (٤: ٣٣)

(وہ لوگ جن سے تمہارے عہد و پیمان ہوں ان کا حصہ انہیں دو) اور اس بارے میں سخت تاکید بھی کی گئی اور ان معاہدوں اور ان کے تصرفات کے بارے اپنی شہادت تحریر فرمائی ۔ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا (٤: ٣٣)

(یقیناً اللہ ہر چیز پر نگران ہے) رسول اللہ ؐ نے فرمایا ۔ لاحلف فی الاسلام ایما حلف فی الجاهلیه لم یزده الاسلام الاشده (اسلام میں کوئی معاہدۂ ولا نہ ہو گا لیکن جو معاہدے جاہلیت کے دور میں ہوئے ہیں اسلام ان کو مزید پختہ کرتا ہے ۔ احمد و مسلم)

اسلام نے ان معاہدوں کے خاتمہ میں وہی پالیسی اختیار فرمائی جو وہ تمام مالی قوانین کے سلسلے میں ہمیشہ اپناتا ہے ۔ جب بھی وہ کوئی قانون مالی اصلاحات کے طور پر نافذ کرتا ہے ' اسلام کی پالیسی وہی ہوتی ہے یعنی اسلام مالی اصلاحات کا کوئی قانون موثر بماضی (Retropective) نافذ نہیں کرتا ۔ مثلاً جب حرمت ربا کا قانون نافذ ہوا تو اس کا نفاذ اس تاریخ

سے ہوا' جس تاریخ کو حکم آیت کے اندر نازل ہوا۔ اور اس سے پہلے جو سود لیا جا چکا تھا' اسے نہ چھیڑا گیا۔ اور یہ حکم نہ دیا کہ جن لوگوں نے منافع لئے ہیں وہ واپس کریں۔ اگرچہ سابقہ معاہدے بھی منسوخ کر دیئے البتہ جنھوں نے معاہدوں کے مطابق قرض وصول کر لئے تھے وہ ان کے پاس رہنے دیئے تھے۔ یہاں ولایت کے معاملے میں معاہدوں کو منسوخ نہیں کیا گیا' البتہ یہ حکم دیا گیا کہ جدید معاہدے نہ کئے جائیں اس لئے کہ ان معاہدوں کی رو سے مالی ذمہ داریوں کے علاوہ معاہدہ کرنے والے اجنبی افراد اس خاندان کے فرد بن جاتے تھے۔ اور ان کے درمیان مختلف قسم کے پیچیدہ روابط قائم ہو جاتے تھے جن کا کاٹنا مناسب نہ تھا۔ البتہ جدید معاہدے کرنے سے منع کر دیا گیا اور سابقہ معاہدوں کے بارے میں حکم دیا کہ انہیں نافذ کیا جائے۔ جدید معاہدوں کو اس لئے منع کر دیا گیا تاکہ ان کی وجہ سے ایسے آثار اور مسائل پیدا نہ ہوں جن کا حل ضروری ہو جائے۔

اس فیصلے کی وجہ سے ایک تو لوگوں کو ایک سہولت دی گئی دوسرے یہ کہ اس کے اندر ان مسائل کا حل پایا جاتا ہے جو اس وقت اس معاشرے کے لئے اہم تھے۔ اور یہ حل زیادہ گہرائی' حکمت اور پورے حالات کے تقاضے پر مبنی تھا۔ خصوصاً ان حالات میں جن میں اسلام جدید اسلامی معاشرے کے خدوخال وضع کر رہا تھا' اور سابق جاہلی معاشرے کے نشانات ایک ایک کر کے مٹائے جا رہے تھے اور ہر قانون سازی کے عمل میں یہ کام ذرا اور آگے بڑھتا تھا۔ (حضرت ابن عباس ﷺ سے اس آیت کی تشریح میں یہ بات منقول ہے کہ وہ وراثت کو قانون وراثت کے مطابق دیتے' البتہ جن لوگوں کے ساتھ معاہدے تھے ان کی امداد' اعانت اور ان کے ساتھ ہمدردی کا حکم دیتے تھے۔)

---○○○---

اس سبق کا آخری موضوع اسلام کے نظام خاندان کی تنظیم اور اس کے امور اور معاملات کی ضابطہ بندی ہے۔ خاندان کے اندر کس کی کیا حیثیت ہوگی اور یہ کہ خاندان کے اندر کس کی کیا ڈیوٹی ہوگی۔ اور وہ انتظامات جن کے ذریعے اس اہم ادارے کے امور کی ضابطہ بندی کی گئی ہے۔ اور یہ کہ اس ادارے کو اختلافات اور ذاتی خواہشات کے جھٹکوں سے کس طرح محفوظ کرنا ہے۔ نیز اسے ان عناصر سے کس طرح بچانا ہے جو اس کو منہدم کرنے اور اس کی جڑیں اکھاڑنے کا باعث بنتے ہیں۔ اس سلسلے میں پوری پوری کوشش کی گئی ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ
وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ
اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ
وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ

عَلِيًّا كَبِيرًا ﴿٣٤﴾

"مرد عورتوں پر قوام ہیں' اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے' اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت اور نگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو تو انہیں سمجھاؤ' خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو اور مارو' پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لئے بہانے تلاش نہ کرو' یقین رکھو کہ اوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالا تر ہے۔اور تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو' وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت پیدا کر دے گا' اللہ سب کچھ جانتا اور باخبر ہے۔"

ان قرآنی نصوص کی تفسیر اور تشریح شروع کرنے سے پہلے اور ان کی نفسیاتی اور اجتماعی اغراض کے بیان سے پہلے' اس بات کی ضرورت ہے کہ خاندان کے بارے میں اسلام کا اجمالی نقطہ نظر بیان کر دیا جائے۔اور یہ بتا دیا جائے کہ اسلام خاندان کی تعمیر کس منہاج پر کرتا ہے اور پھر اس کے بچاؤ کے لئے کیا تدابیر اختیار کرتا ہے۔اور پھر یہ کہ اس انتظام سے اسلام کے پیش نظر کیا اہداف اور مقاصد ہیں۔یہ بیان ہم حتی الوسع اجمالی طور پر کریں گے' اس لئے کہ اس موضوع پر مفصل بحث کے لئے زیادہ صفحات درکار ہوں گے۔

جس ذات نے انسان کو پیدا کیا' اس نے اس کے اندر وہی ازدواجی فطرت ودیعت کی جو اس نے تمام چیزوں کے اندر رکھی ہے جو اس نے پیدا کیں۔

(وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ) (اور جو چیزیں ہم نے پیدا کیں ان کے ہم نے جوڑے بنائے تاکہ تم نصیحت پکڑو) انسان کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے جوڑا پیدا کیا لیکن اس جوڑے کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا۔

(يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (٤ : ١)) "لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا۔" اس جوڑے کے ملاپ کے اندر اللہ تعالیٰ نے زندگی کے تمام راز رکھ دیئے ہیں۔اس ملاپ کے اندر نفسیاتی سکون' اعصابی ٹھہراؤ' روحانی اطمینان اور جسمانی راحت اور آرام کا انتظام کیا۔پھر اس ملاپ کے اندر دونوں کا پردہ' عفت مابی اور گناہوں سے بچاؤ کا سامان رکھا ہے۔اس کے علاوہ یہ ملاپ نسل کے لئے کھیت کا کام بھی دیتا ہے۔اور اس کے ذریعے زندگی کے اندر تسلسل قائم ہوتا ہے اور اس کے بعد طریقہ ہائے زندگی کی ترقی کا راز بھی اسی میں ہے لیکن

اسلام نے اس پورے نظام کو ایک تربیت گاہ' ایک نرسری' ایک باپردہ اور پرسکون خاندان کی شکل میں بنایا جس کی ابتداء زوجین سے ہوتی ہے۔

(وَمِنْ اٰیٰتِهٖ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (۳۰ : ۲۱))

"اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تمہارے لئے تمہارے جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کی ۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں) (هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ) (وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو)

(نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ)

"تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو' جاؤ اور اپنے مستقبل کا بھی سروسامان کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو)

(یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ)

"اے لوگو' جو ایمان لائے ہو اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے ۔"

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ) (اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کرتی رہی ان کی اس اولاد کو بھی ہم ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ہم ان کے اعمال کے صلے میں سے کچھ کم نہ کریں گے)

نفس انسانی کے دونوں اطراف مرد و زن کا مقام اللہ کے ہاں کیا ہے؟ انسانیت میں وہ دونوں برابر ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے نفس انسان کو مکرم بنایا جس میں عورت بھی شامل ہے اور مرد بھی ۔ اللہ تعالیٰ مرد و عورت دونوں کو اپنے اپنے اعمال پر پوری جزاء دے گا ۔ اللہ کے قانون میں جس طرح مرد ملکیت رکھ سکتا ہے' اسی طرح عورت بھی ملکیت رکھ سکتی ہے ۔ مرد حق میراث رکھتا ہے تو عورت بھی حق میراث رکھتی ہے ۔ مرد ایک قانونی شخصیت ہے تو عورت علیحدہ قانونی شخصیت ہے اور ان تمام نکات پر بحث ہم اس سبق میں اس سے پہلے کر آئے ہیں ۔

چونکہ ادارہ خاندان کو وجود میں لانے کے لئے نفس انسانی کے دونوں اجزاء کا باہم ملاپ ضروری تھا اور اس کے نتیجے میں فرائض اور واجبات پیدا ہوتے تھے' اس لئے شریعت نے اس ادارے کے معاملات کے ہر جزء کے بارے میں تفصیلی ہدایات دیں ۔ مقصد یہ تھا کہ مرد و زن کو سکون' اطمینان' پردہ پوشی اور برائی اور فحاشی سے بچنے کے لئے مواقع

حاصل ہوں۔ دوسرے یہ کہ اس خاندانی نظام کے ذریعے زندگی کو تسلسل حاصل ہو اور وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔ اس سورہ کے بڑے حصے میں خاندان کی شیرازہ بندی کی گئی ہے' جس کا ایک حصہ ہم نے اس پارے کی ابتداء میں دیا تھا۔ اور پارہ چہارم میں بھی اس کے تکمیلی احکام دیئے گئے تھے۔ اسی طرح سورۂ بقرہ میں بھی یہ احکام بیان ہوئے تھے جس کی تشریح ہم نے دوسرے پارے میں پیش کی تھی۔ قرآن کریم کی کئی دوسری سورتوں میں بھی خاندانی نظام کے بارے میں تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں۔ مثلاً اٹھارہویں پارے میں سورۂ نور اور سورۂ احزاب (پارہ ۲۱-۲۲) سورۂ طلاق' سورۂ تحریم (پارہ ۲۸) اور بعض دوسری سورتوں کے متفرق مقامات پر۔ ان تمام مقامات پر جو مباحث کئے گئے ہیں ان میں اسلام کے خاندانی نظام کا ایک مکمل دستور موجود ہے۔ ان طویل و عریض مباحث اور متنوع اور مفصل احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام انسانی زندگی کی تعمیر ایک خاندانی نظام کے مطابق کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ان سورتوں میں خاندانی زندگی کے ایک ایک گوشے کو لیا گیا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ اس صفحے کے پڑھنے والے ان تمام تفصیلات کو ذہن میں رکھیں گے جو ہم نے اس سلسلے میں پیش کی ہیں۔ مثلاً انسان کے بچوں کا طویل بچپن' اس کے دوران بچوں کی طویل پرورش اور نگہداشت کی ضرورت' اور پھر ان بچوں کے لئے ایک خاندان کی ضرورت تاکہ بچہ اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو کر' زندگی کی معاشی جدوجہد میں داخل ہو سکے اس معاشی جدوجہد سے بھی زیادہ اہم بچے کی وہ تربیت ہے جو اسے اجتماعی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے تیار کرتی ہے اور معاشرے کا ایک اچھا فرد بننے کے اہل بناتی ہے تاکہ وہ انسانی ترقی کی رفتار میں اپنے فرائض سرانجام دے سکے۔ اور جب وہ اس معاشرے کو چھوڑے تو اس حالت سے بہتر کر کے چھوڑے جس میں اس نے اسے پایا تھا۔ غرض خاندانی نظام کے صحیح فہم کے لئے مذکورہ بالا نکات پر غور کرنا نہایت ہی ضروری ہے۔ نیز خاندان کے مقاصد' خاندان کے فرائض' خاندان کے بچاؤ اور تباہی اور بربادی کے ہر اثر سے اسے محفوظ اور مامون رکھنے نیز خاندان کی نشوونما کے سلسلے میں اسلامی نظام زندگی کے موقف اور پالیسی کو سمجھنے کے لئے یہ امور نہایت ہی اہم ہیں۔

اسلام کی نظر میں خاندان کی جو اہمیت ہے اور جس کے بارے میں ہم نے اوپر تفصیلی اشارات دیئے ہیں ان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک خاندانی نظام کے قیام' اس کے استحکام اور اس کے اندر سکون اور ٹھہراؤ پیدا کرنے کے لئے اسلام نے جتنا زور دیا ہے اس کا تصور بھی دوسرے نظاموں میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ اسلام نے عورت کو بھی پہلی مرتبہ ایک باعزت مقام اور باعزت شخصیت عطا کی۔ عورت کو جو حقوق اسلام نے دنیا میں پہلی بار عطا کئے' یہ وہ حقوق نہیں جن کے ذریعے وہ صرف محبت اور لذت حاصل کرے بلکہ وہ حقوق ہیں جن کے ذریعے عورت حیات انسانی کے حوالے سے اپنے بلند ترین فرائض سرانجام دے۔

ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اب اس سبق کی آخری آیت پر کلام کرتے ہیں جو اس سلسلے کی بہت سی اہم آیت ہے اور اسی وجہ سے اس کی تشریح سے پہلے ہم نے درج بالا تمہیدی اشارات دیئے ہیں۔

یہ آیت زوجین کے درمیان قائم ادارے کی تنظیم اور اس ادارے کے افراد کے درمیان اختیارات کی وضاحت کرتی ہے اور افراد خاندان کے درمیان تعلقات کی کشیدگی کو دور کرنے کی خاطر ان کو ہدایات دیتی ہے کہ تمام مسلمان خواہشات نفسانیہ اور ذاتی تاثرات و میلانات کے تابع ہونے کے بجائے اللہ جل شانہ کے احکام کی اطاعت کریں اور اللہ کا حکم یہ ہے کہ

خاندان کے اندر قوام اور سربراہ مرد ہو گا اور یہ کہ مرد کو سربراہ بنانے کے اسباب یہ ہیں کہ ایک تو مرد کو اللہ نے فضیلت دی ہے اور اس کے اندر وہ تنظیمی صلاحیتیں زیادہ رکھی گئی ہیں، جن صلاحیتوں پر خاندانی نظام کا چلنا موقوف ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد پر یہ ڈیوٹی عائد کی ہے کہ وہ خاندان کی معاشی ضروریات کا کفیل ہو گا۔ چونکہ خاندان کا قیم مرد کو بنایا گیا ہے' اس لئے مرد کو وہ خصوصی اختیارات بھی دیئے گئے ہیں جن سے وہ اس ادارے کو بچا سکے اور محض عارضی جذبات اور شہوات نفسانیہ اسے تباہ نہ کر سکیں اور یہ بھی بتایا گیا کہ ان وقتی شہوات سے بچاؤ کی تدابیر کیا ہوتی ہیں۔ علاج کی حدود بھی متعین کر دی گئی ہیں اور اگر داخلی علاج نہ ہو سکے تو پھر خارجی علاج بھی بتایا گیا ہے۔ خصوصاً ان حالات میں جبکہ اس ادارے کو شدید خطرات لاحق ہوں اور نہ صرف یہ خطرہ ہو کہ اس کے دو اہم اطراف اور فریق ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں بلکہ ان کی جدائی کے نتیجے میں معصوم بچوں اور نوخیز نسل کی تربیت کو بھی خطرات درپیش ہوں بلکہ ان کے وجود تک کو خطرہ لاحق ہو گیا ہو۔ ذرا غور سے دیکھئے کہ ہر اقدام اور تدبیر کی پشت پر کس قدر گہری حکمت ہے۔ اور اس کی کس قدر ضرورت ہے۔

(الرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (٤ : ٣٤)) (مرد عورتوں پر قوام ہیں' اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔)

جیسا کہ ہم نے کہا خاندان انسانی زندگی کا ابتدائی ادارہ ہے۔ ابتدائی ادارہ اس طرح کہ یہ ایک نکتہ آغاز ہے جو انسان کی پوری زندگی پر اثرانداز ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ نکتہ آغاز ہے کہ خاندان ہی سے آئندہ زندگی کے عناصر پیدا ہوتے ہیں اور اسلامی نقطہ نظر سے انسان اس کائنات کا اہم ترین عنصر ہے۔

دنیا میں خاندان کے ادارے کے مقابلے میں کم اہم اداروں کی ادارت اور انتظام (Management) اہل ترین افراد کے سپرد کیا جاتا ہے مثلاً مالی ادارے بینک وغیرہ' صنعتی ادارے اور کارخانے اور دوسرے تجارتی ادارے اور کمپنیاں۔ ان اداروں کا انتظام و انصرام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں دیا جاتا ہے جو اپنے شعبے میں اچھی مہارت رکھتے ہوں اور انہوں نے اس شعبے میں وافر معلومات حاصل کر رکھی ہوں اور ان کے اندر تجربہ اور صلاحیت موجود ہو۔

یہ تو ہے رواج ان اداروں کے انتظام کا جن کا مقام و مرتبہ اور اہمیت انسانی ادارے سے بہت ہی کم تر ہے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ خاندان کا انتظام اور انصرام سپرد کرنے میں بھی اسی اصول کو مدنظر رکھا جائے اس لئے کہ خاندان کا ادارہ اس کائنات کی اہم ترین پیداوار یعنی نسل انسانی کی افزائش کا ذمہ دار ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کے نقطہ نظر سے انسان اہم ترین پیداوار ہے۔

اسلامی نظام حیات اس اصول کو مدنظر رکھتا ہے۔ وہ انسان کی فطرت کو بھی مدنظر رکھتا ہے اور پھر خاندان کے اجزاء یعنی مرد و زن دونوں کی صلاحیتوں کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔ وہ ان فرائض و واجبات پر بھی نظر رکھتا ہے جو مرد اور عورت پر ازروئے فطرت عائد کیے گئے ہیں۔ اسلامی نظام نے مرد و زن دونوں پر فرائض عائد کرتے وقت دونوں کے ساتھ عدل

و انصاف کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور یہ عدل یعنی تقسیم وظائف ' مرد و زن کی فطرت کو دیکھ کر کی گئی ہے ـ یہ بات تو ناقابل انکار ہے کہ مرد اور عورت دونوں ہی اللہ کی مخلوق ہیں اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے کسی پر ظلم نہیں کرتا ـ جبکہ وہ ہر ایک کو اس کی مخصوص فطری ڈیوٹی کے لئے تیار کرتا ہے اور اسے اس کی ڈیوٹی کے لائق استعداد بھی عطا کرتا ہے ـ یہ امور نہایت ہی بدیہی اور مسلم ہیں ـ

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو مرد اور عورت کی شکل میں پیدا کیا اور پھر ان کا جوڑا بنایا جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس پوری کائنات کو جوڑے جوڑے بنایا ہے ـ یعنی اس کائنات کے اندر جمادات تک میں جوڑے ہیں ـ اب عورت کا فطری فریضہ یہ ہے کہ وہ حاملہ بنے ' پھر وضع حمل ہو ' پھر وہ بچے کو دودھ پلائے اور مرد اور عورت کے ملاپ کا جو ثمرہ نکلے اس کی پوری طرح وہ ذمہ دار ہو ـ اس فطری نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو عورت پر یہ ایک عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو ایک نہایت ہی اہم ذمہ داری ہے ـ یہ کوئی معمولی اور آسان ذمہ داری نہیں ہے ـ اور یہ ذمہ داری بغیر جسمانی 'نفسیاتی ' اور گہری عقلی تیاری اور استعداد کے ادا بھی نہیں کی جا سکتی ـ یہ سب خوبیاں عورت کی ذات کے اندر پائی جانی ضروری ہیں ـ اس لئے یہ بات عین ترین انصاف تھی کہ اس شراکت کے دوسرے ساتھی کے ذمہ بھی ایک اہم ڈیوٹی لگائی جائے اور وہ یہ کہ خاندان کی تمام ضروریات کا کفیل وہی ہو اور اس طرح وہ والدہ ہو ـ بچے دونوں کی حمایت اور بچاؤ کا بھی ذمہ دار ہو تاکہ عورت اپنی نہایت ہی اہم اور قیمتی ڈیوٹی کے لئے من کل الوجوہ فارغ ہو ـ اس پر یہ زیادتی نہ ہو کہ وہ حمل بھی برداشت کرے ' وضع حمل کی تکلیفات بھی برداشت کرے ' اور بچے کی رضاعت اور کفالت بھی کرے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ مزدوری اور محنت بھی کرے اور اپنے بچے کے لئے اور اپنی ذاتی ضروریات کے لئے جاگتی بھی رہے ـ بیک وقت دونوں ڈیوٹیاں اس پر عائد کر دی جائیں ـ اس لئے یہ نہایت ہی منصفانہ تقسیم کار تھی کہ عورت کے لئے اس کی جسمانی اور فطری صلاحیتوں کے مطابق میدان کار وضع کیا جائے اور مرد کے لئے اس کے جسمانی 'نفسیاتی اور فطری صلاحیتوں کے مطابق میدان کار تجویز کیا جائے اور اسلام نے عملاً یہی کچھ کیا ' اس لئے کہ اسلام کسی پر ظلم نہیں کرتا ـ رب ذوالجلال کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرتا ـ

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو جو صلاحیتیں دی ہیں ان میں نرمی ' مہربانی ' جلدی متاثر ہو جانا ' جلدی جواب دینا ' اور بچوں کی فوری ضروریات کے لئے تمام ضروری صفات فطرت نے ماں میں ودیعت کر دیں اور یہ ایسی صفات ہیں جو عورت کے اندر تعلیم و تربیت کے ذریعے پیدا نہیں کی گئیں بلکہ ان افعال کا ارتکاب عورت بے سوچے سمجھے کرتی ہے ـ اس لئے کہ انسان کی اہم ضروریات یہاں تک کہ ایک فرد واحد کی اہم ضروریات کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس بات پر موقوف نہیں رکھا کہ کوئی سوچے ' غور کرے اور وقت گزارنے کے بعد فطری ضروریات کو پورا کرے ـ جبکہ فطری ضروریات کا مطالبہ بھی غیر ارادی ہوتا ہے اور انہیں پورا بھی غیر ارادی طور پر کیا جاتا ہے تاکہ مطالبہ ہوتے ہی ان ضروریات کو پورا کر دیا جائے بلکہ بعض حالات میں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید ان فطری مطالبات کے پورا کرنے کا نظام کوئی جبری نظام ہے ـ ہاں اگر اس میں جبر کا کوئی عنصر ہے تو وہ داخلی عنصر ہے ' خارج سے کوئی جبر نہیں ہے ـ بعض اوقات تو یہ مطالبہ مستحب اور لذیذ ہوتا ہے تاکہ انسان جلدی اس مطالبہ فطرت کے پورا کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے ـ وہ انسان کے لئے فرحت بخش ہو ' اگرچہ اس میں طویل مشقت اور بے بہا قربانی ہو ـ یہ اللہ کی ساخت ہے جس نے ہر چیز کو بہت ہی اچھا کر

کے بنایا ہے۔

فطرت انسانی کے اندر ان خصوصیات کا پایا جانا کوئی سطحی چیز نہیں ہے۔ فطرت کے یہ دوائی عورت کی عضویاتی، اعصابی، شعوری اور نفسیاتی ساخت کے اندر نہایت ہی عمق کے ساتھ ودیعت کیے گئے ہیں۔ اس بارے میں ماہرین فن کا یہ کہنا ہے کہ یہ اوصاف اس خلیے کے اندر موجود ہوتے ہیں جن سے انسان پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے خلیے کی گہرائیوں کے اندر ان خصوصیات کو پیدا کر دیا تھا اور اس خلیے کی تقسیم اور بڑھوتری سے پھر بچہ نشوونما پاتا ہے اور اس کے اندر وہ تمام اساسی خصائص موجود ہوتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں مرد کو جو خصوصیات دی گئیں ان میں سے اہم ترین خصوصیت مرد کی سخت جانی اور مضبوطی ہے۔ مرد جلدی متاثر نہیں ہوتا اور کسی بھی صورت حال کو جلد قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ ہر کام سوچ سمجھ کر کرتا ہے اور کوئی اقدام کرنے سے پہلے اس کے نتائج پر بھی غور کرتا ہے۔ کیونکہ آغاز حیات میں اس کی زندگی کا فریضہ یہ تھا کہ وہ شکار کر کے لائے اور اپنے بچوں اور بیوی کے بچاؤ کے لئے مرنے مارنے پر اتر آئے۔ بیوی بچوں کی معیشت کا انتظام کرے اور زندگی کے تمام فرائض سرانجام دے۔ اس کے تمام فرائض اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ہر اقدام سے پہلے اچھی طرح سوچا جائے۔ غور و فکر سے کام لیا جائے اور اگر کوئی کسی بات کی دعوت دے تو اسے بہت سوچ کر قبول کیا جائے۔ یہ سب خصوصیات مرد کی شخصیت کی ساخت کے اندر پائی جاتی ہیں جس طرح عورت کی خصوصیات اس کی شخصیت کی ساخت کے اندر موجود ہوتی ہیں۔

مرد کی یہ فطری خصوصیات اسے اس بات کا مستحق بنا دیتی ہیں کہ وہ گھرانے کا نگراں ہو اور مرتبے کے اعتبار سے خاندان میں سینئر ہو۔ مزید یہ کہ چونکہ پورے خاندان کے اخراجات کا ذمہ دار بھی مرد ہی ہوتا ہے اس لئے اس کی نگرانی ضروری ہے کیونکہ وہی ہے جو پورے خاندانی ادارے کی معاشی ضروریات کا کفیل ہے۔ چونکہ وہی خرچ کرنے والا ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہی مدیر ہو۔ یہی دو خصوصیات ہیں جن کو قرآن کریم کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے اور انہی کی بنا پر اسلامی معاشرے میں مرد کو قوام بنایا گیا ہے۔

مرد کی نگرانی کے بعض اسباب تکوینی اسباب ہیں یعنی صلاحیت کے اعتبار سے اور بعض اسباب ذمہ داریوں کے حوالے سے ہیں۔ نیز ذمہ داریوں کی تقسیم میں انصاف اور عدل کے حوالے سے بھی مرد نگراں بن جاتا ہے اور پھر شریعت نے مرد اور عورت پر ذمہ داریاں ڈالتے وقت اس امر کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ کس کے لئے کیا ذمہ داری باعث سہولت ہے اور کس کی فطرت کیا ذمہ داری چاہتی ہے اور کس ذمہ داری کے لئے معاون ہے۔

عورت کے مقابلے میں نگرانی کے لئے مرد کی افضلیت کے اپنے اسباب ہیں، جو صلاحیت اور تجربے کے حوالے سے ہیں اور نگرانی کے ان تمام اسباب کو لے کر ذمہ داریاں ادا ہوں گی۔ اس لئے کہ کوئی ادارہ بھی منیجر اور نگراں کے بغیر نہیں چل سکتا یعنی وہ تمام ادارے جو خاندان کے ادارے کے مقابلے میں بہت کم اہم اور بہت کم قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ پھر مزید یہ کہ انسانیت کا ایک حصہ بعض خاص ڈیوٹیوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ از روئے فطرت ان ڈیوٹیوں کی ادائیگی اس کے لئے سہل ہے اسی لئے یہ ڈیوٹیاں اس پر عائد کی گئی ہیں۔ اور انسانیت کا دوسرا حصہ از روئے فطرت ان کے لئے تیار نہیں کیا گیا۔ ان ڈیوٹیوں کی ادائیگی اس کے لئے سہل نہیں ہے اور اگر اس پر وہ ڈیوٹیاں عائد کر دی جائیں تو

یہ اس پر صریح ظلم ہو گا۔ لیکن اگر اسے ان فرائض کی ادائیگی کے لئے تیار بھی کیا جائے' اسے ان کی ٹریننگ بھی دی جائے' علمی اور عملی تربیت بھی دی جائے پھر وہ انہیں سرانجام بھی دے پائے تو اس سے اس کی وہ صلاحیت بری طرح متاثر ہو گی جس کے لئے اسے پیدا اور تیار کیا گیا ہے۔ مثلاً عورت کے حوالے اس کی مادرانہ ذمہ داریں۔ یعنی اگر عورت پر دوسری تمدنی ذمہ داریاں عائد کر دی جائیں تو وہ مادرانہ فرائض کی ادائیگی کے قابل نہ رہے گی جو اس کی فطرت کا تقاضا ہیں اور جس کی اصل استعداد ہے سرعت انفعال اور سرعت قبولیت۔ یہ عورت کی فطرت کے اندر مرکوز ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ عورت کی عضویاتی اور اعصابی ساخت کے اندر مادرانہ صلاحیتیں رکھی گئی ہیں اور ان کے اثرات عورت کے طرز عمل اور اس کی طرف سے بچے کی ضروریات کے لئے تڑپ رکھنے کا جذبہ وغیرہ۔

یہ نہایت ہی اہم مسائل ہیں' اس قدر اہم کہ ان کے بارے میں ٹھوس فیصلہ صرف انسانی خواہشات کے زاویے سے نہیں کیا جا سکتا اور یہ اس قدر خطرناک ہیں کہ ان کے جوابات محض تیر تکے چلانے سے نہیں دیئے جا سکتے۔ جب قدیم اور جدید جاہلیتوں نے ان اہم مسائل کے فیصلے انسان کی گھٹیا خواہشات کے زاویے سے کئے تو انہوں نے انسان کے وجود تک کو خطرے میں ڈال دیا۔ انسان کے اندر انسانی خصائص کا باقی رہنا مشکل ہو گیا' جن انسانی خصائص پر انسان کی زندگی قائم ہے اور جن سے اسے امتیازی شان ملی ہے۔

اس پر ایک دلیل تو یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ لوگ اس حقیقت کا انکار کر دیں اسے ترک کر دیں اور اسے بالکل انوکھا سمجھنے لگیں' انسان کے وجود کے اندر ان قوانین فطرت کو مکمل کنٹرول حاصل ہے اور انسانی فطرت اس کی طرف واضح اشارات کرتی ہے۔

پھر یہ بھی ایک دلیل ہے کہ جب بھی انسانیت نے اس اصول کی خلاف ورزی کی ہے' اس کی وجہ سے انسانی زندگی کے اندر بے چینی' فساد اور اخلاقی گراوٹ پیدا ہوئی ہے اور انسانی زندگی سخت خلفشار سے دوچار ہوئی ہے۔ خاندان کے اندر نظم و نسق تباہ ہوا ہے۔ انسانی زندگی کے نشانات اور امتیازات ختم ہو گئے ہیں اور وہ اپنے فطری اور اصلی مقام سے ہٹ گئی ہے۔

اس پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ خود عورت کی یہ نفسیاتی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے اوپر کوئی مرد قوام اور حکمران ہو اس لئے کہ خاندان کے اندر مرد کی حاکمیت اور برتری ایک فطری امر ہے۔ اگر عورت کو مرد کی سرپرستی حاصل نہ ہو تو وہ اپنے آپ کو محروم' ناقص اور بدحال سمجھتی ہے۔ یہ صورت حال اس وقت مشاہدے میں آتی ہے جب وہ کسی ایسے مرد کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہو جس کے اندر سرپرستی اور قوام ہونے کی صلاحیت نہ ہو اور وہ یہ حیثیت عورت کے سپرد کر دے۔ دور جدید کی گم کردہ راہ اور بے راہ رو عورتیں بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہیں کہ عورت کی فطرت میں ہے کہ اس کا کوئی سرپرست اور حاکم ہو۔

مزید یہ دلیل بھی ہے کہ ایسا خاندانی ادارہ جس میں باپ کی قوامیت نہ ہو' اس خاندان کے اندر بچوں کی پرورش صحیح نہیں ہوتی۔ مثلاً اس صورت میں کہ مرد کی شخصیت کمزور ہو اور بچوں پر والدہ کی شخصیت چھا جائے۔ یا ایسی صورتوں میں جہاں باپ موجود ہی نہ ہو' فوت ہو چکا ہو یا ایسے خاندان جن میں اولاد کا کوئی قانونی سرپرست اور باپ ہوتا ہی نہیں۔ ایسے خاندانوں میں بچے بداخلاق اور ناقص شخصیت کے مالک ہوتے ہیں اور کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ انحراف اور

بے راہ روی سے بچ نکلیں ۔ نیز ایسے بچے اعصابی اور نفسیاتی اعتبار سے اور اخلاقی اور عملی اعتبار سے کامل شخصیت کے مالک ہرگز نہیں ہوتے ۔

مرد کی نگرانی اور سرپرستی کے جواز پر یہ بعض اہم دلائل ہیں ' جن کی طرف خود انسانی فطرت ہماری رہنمائی کرتی ہے ۔ مرد کی فطرت کے اندر یہ سرپرستی موجود ہوتی ہے اور انسان کے اندر اس کے اصول و قواعد پوری قوت کے ساتھ جاری ہیں ۔ اگرچہ لوگ انکار کریں ' اسے ترک کر دیں اور اسے انوکھا سمجھیں ۔

اس سے زیادہ مرد کی قوامیت پر یہاں بحث ممکن نہیں ہے ۔ یہاں مرد کی سرپرستی ' نگرانی اس کے جواز اور اس کی معاشرتی ضرورت اور فطری تقاضوں پر اتنی ہی بحث کافی ہے ۔ لیکن یہاں ہمارے لئے اس قدر کہنا مناسب ہے کہ مرد کی اس قوامیت اور نگرانی کا معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی خاندان یا معاشرے کے اندر عورت کی شخصیت کی نفی کر دی جائے ۔ نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت کی شہری حیثیت کو ختم کیا جا رہا ہے جیسا کہ اس سے قبل ہم کہہ آئے ہیں بلکہ مرد کی یہ نگرانی خاندانی نظام کے اندر ' اس کی ایک ذمہ داری ہے ' جو اس اہم ادارے کے چلانے ' اس کی حفاظت اور اس کے بچاؤ کے لئے اس پر عائد کی گئی ہے ۔ یہ بات عقل میں آنے والی ہے کہ کسی ادارے کا نگران مقرر کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ اس ادارے کے وجود کو ختم نہ کرے گا ۔ اس کے کسی رکن کی شخصیت کو ختم نہ کرے گا ' نہ اس ادارے کے شرکاء کے حقوق تلف کرے گا اور نہ اس ادارے میں کام کرنے والوں کے فرائض کو ختم کرے گا ۔ دوسرے مقامات پر اسلام نے مرد کی نگرانی کی حدود و قیود کو اچھی طرح بیان کیا ہے ۔ اس پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ نہایت ہی نرمی اور اور نہایت ہی شفقت اور رحمت کے ساتھ اس فرض کو ادا کرے گا ۔ نیز دوسرے مقامات پر مرد کے مالی اور جانی فرائض بھی بیان کئے گئے ہیں اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بیوی اور بچوں کے ساتھ مرد کا طرز عمل کیا ہونا چاہیے؟ (اس موضوع پر مزید وضاحت کے لئے درج ذیل مراجع زیر نظر رہیں ۔ نحو مجتمع اسلامی کی فصل معاشرہ اور خاندان ——— فصل "عورت اور زوجین کے باہم تعلقات " از کتاب اسلام اور مشکلات تہذیب ' کتاب پردہ از مولانا مودودی ؒ ——— کتاب "خاندان اور معاشرہ" اور کتاب حق الانسان از عبد الواحد وافی ۔ انسان ' مادیت اور اسلام کے درمیان ۔ مصنفہ محمد قطب وغیرہ) ۔

---ooo---

مرد کے حقوق اور فرائض کے بیان کے بعد اور اس عام نگرانی کے حوالے سے اس پر عائد شدہ پابندیوں اور اس کے فرائض کے بیان کے بعد ' اب صالح اور مومن عورت کی صفات کا بیان ہوتا ہے اور خاندان کے دائرے کے اندر اس کے طرز عمل خصوصاً اس کے ایمانی طرز عمل کا بیان شروع ہوتا ہے ۔

(فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ(٤ : ٣٤) (پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت اور نگرانی میں ' ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں ۔)

مومنہ اور صالحہ عورت کا فطری مزاج اور اس کی لازمی خصلت یہ ہونی چاہیے کہ وہ اطاعت شعار ہو ' مطیع فرمان ہو اور یہ اس کے صاحب ایمان اور اس کے صالح ہونے کا عین تقاضا ہوتا ہے ۔ القنوت کے معنی ہوتے ہیں توجہ ' ارادہ '

رغبت اور دلی چاہت سے اطاعت کرنا۔ جس میں کوئی جبر نہ ہو' کوئی دباؤ نہ ہو' اور جس میں کمزوری اور سستی نہ ہو۔ اس لئے قرآن کریم نے قانتات کہا اور طائعات نہیں کہا۔ اس لئے کہ پہلے لفظ کا مفہوم نفسیاتی ہے اور اس کے اوپر نرمی اور تازگی کا پرتو موجود ہے۔ یہ لفظ میاں بیوی کے محبت بھرے پرائیویٹ اور پرسکون تعلق کے عین مناسب ہے۔ ایک ایسے گہوارے کے لئے جس میں بچوں نے پرورش پائی ہے اور جس کی فضا' جس کے سائے' جس کے سانس اور جس کی تمام حرکات بچے کی زندگی پر اثرانداز ہوتی ہیں۔

- ایک صالح اور مومن عورت کا یہ بھی مزاج ہوتا ہے اور یہ بھی اس کی لازمی صفت ہوتی ہے کہ وہ اپنے خاوند کی عزت اور اس کے حقوق کی محافظ ہوتی ہے۔ خاوند کی عدم موجودگی میں اس کے مقدس گھرانے کی حفاظت کرتی ہے اور یہ صفات بھی اس کے ایمان اور اس کی ذاتی اصلاح کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جب ایک مومنہ عورت صالحہ مرد کی عدم موجودگی میں اس کی عزت کی محافظ ہوتی ہے تو اس کی موجودگی میں وہ بطریق اولی اس کی عزت کی محافظ ہوگی۔ اس طرح وہ اپنی ذات کو کسی کی نظروں کا شکار ہونے بھی نہیں دیتی اور نہ ہی وہ اپنی عصمت اور عزت کو مٹاتی ہے' جو کچھ بھی شوہر کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے جائز نہ ہو اس لئے کہ مرد و عورت دونوں ہی ایک ذات ہیں اور ایک ہی نفس سے دونوں کو پیدا کیا گیا ہے۔

اور جو چیزیں شوہر کے سوا دوسروں کے لئے حرام ہیں' اس کا فیصلہ نہ عورت کر سکتی ہے اور نہ مرد کر سکتا ہے' یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ (بِمَا حَفِظَ اللَّهُ (٤ : ٣٤)) (اس چیز کی جس کی اللہ نے حفاظت کی ہے) یعنی معاملہ ایسا نہیں ہے کہ مرد عورت کو اس کی ذات کے بارے میں کسی فعل کے ارتکاب کی اجازت دیتا ہے یا نہیں اس کی موجودگی میں یا اس کے پس پشت۔ ایسے افعال جس پر مرد برا نہیں مناتا یا کوئی معاشرہ ایسے افعال کے ارتکاب کے لئے اس مرد یا اس عورت کو آمادہ کرتا ہے۔ ایسے حالات میں جب معاشرہ اخلاقی انحطاط کا شکار ہو اور اسلامی نظام سے دور ہو چکا ہو۔

اس حفظ کے میدان میں ایک ہی حکم ہے' وہ یہ کہ عورت پر فرض ہے کہ وہ اللہ کے حفظ کی حدود میں اپنی حفاظت کرے۔ یہاں عورت کے حفظ ذات کے لئے قرآن کریم نے امر کا صیغہ استعمال نہیں کیا بلکہ ایسا انداز بیان اختیار کیا ہے جو صیغہ امر سے بھی زیادہ موکد ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ حفاظت ان ذرائع کے ساتھ ہے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ حفاظت فرماتے ہیں اور یہ انداز حفاظت صالحات کے مزاج اور صلاح و تقویٰ کا عین تقاضا ہے۔

یہاں آکر ذہنی طور پر شکست خوردہ مسلمان مردوں اور خواتین کے تمام حیلے اور بہانے کافور ہو جاتے ہیں' جنہوں نے جدید بے راہ معاشرے کے دباؤ کے مقابلے میں اپنے آپ کو ڈال دیا ہے۔ اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صالحات کے لئے حفظ ذات کی کیا حدود و قیود مقرر کی ہیں یعنی یہ کہ وہ نہایت ہی اطاعت شعاری اور دلی آمادگی سے مطیع فرمان ہوتی ہیں۔

رہیں وہ عورتیں جو صالحات نہیں ہیں تو وہ سرکش ہیں۔ (ناشزات کے معنی یہ ہیں کہ کوئی "نشز" پر کھڑا ہو' یعنی اونچے مقام پر جو ہر طرف سے نظر آتا ہو) اس لفظ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے نفسیاتی صورت حال کی حسی تعبیر کی ہے۔ ناشز دراصل اپنی نافرمانی کو جائز سمجھتا ہے' علی الاعلان گناہ کا ارتکاب کرتا ہے' اور سرکشی اختیار کرتا ہے۔

اسلامی نظام زندگی اس وقت تک انتظار نہیں کرتا کہ عملاً سرکشی کا ارتکاب ہو جائے' نافرمانی اور بغاوت کے علم بلند

ہو جائیں ' مرد کی نگرانی کا رعب اور ڈر ختم ہو جائے اور خاندان دو کیمپوں میں تقسیم ہو جائے ' اس لئے کہ اگر حالات اس مقام تک آ پہنچیں تو پھر علاج کا کوئی فائدہ ہی نہیں رہتا ۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ سرکشی کا خطرہ محسوس ہوتے ہی اور اس کے خطرناک حد تک بڑھ جانے سے پہلے ہی اس کا تدارک کیا جائے ' کیونکہ سرکشی کے انجام میں اس اہم ادارے کی ٹوٹ د پھوٹ ہوتی ہے جس کے بعد معاشرے کا امن اور سکون تباہ ہوتا ہے ۔ پھر اس ادارے کے ختم ہونے کے ساتھ ہی نئی نسل کی تربیت اور تیاری کا کام بھی ختم ہو جاتا ہے کیونکہ خاندان ہی نئی نسل کے لئے ایک بہترین گہوارہ ہوتا ہے ۔ اس ادارے کے باہر اگر کسی نسل کی تربیت ہوگی تو وہ نسل نفسیاتی امراض ' اعصابی امراض اور دوسرے جسمانی امراض کا شکار ہوگی اور نتیجتاً " ایک اخلاق باختہ نسل تیار ہوگی ۔

چنانچہ خاندان کے بچاؤ کا معاملہ چونکہ بہت ہی اہم معاملہ ہے ' لہٰذا اس سلسلے میں جلد از جلد اقدامات کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ سرکشی کے آثار نمودار ہوتے ہی ان پر حملہ کیا جائے ۔ اسی لئے اس ادارے کو شر و فساد سے بچانے کی خاطر یا اسے بالکل تباہ ہونے سے بچانے کی خاطر اس ادارے کے ڈائریکٹر کو اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ بعض تادیبی اقدامات کر سکے جو اکثر اوقات نہایت ہی مفید ثابت ہوتے ہیں ۔ یہ اقدامات محض انتقام ' توہین یا جسمانی اذیت کے لئے نہیں روا رکھے گئے بلکہ یہ اصلاحی اقدامات ہیں اور ابتدائی مراحل میں اصلاح کے لئے اور سرکشی کو ختم کرنے کے لئے ہیں ۔

(وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا (۴ : ۳۴)

" اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو ' انہیں سمجھاؤ ' خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو اور مارو ' پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لئے بہانے تلاش نہ کرو ۔ یقین رکھو کہ اوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالا تر ہے)

جیسا کہ اس سے قبل ہم کہہ آئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکرم بنایا ہے اور اس میں مرد و زن دونوں شامل ہیں ' عورت کو وہی انسانی حقوق دیئے جو اس کی صفت انسانیت کے حوالے سے تھے ' اور ایک مسلمان عورت کو وہ تمام شرعی اور قانونی حقوق دیئے جو مرد کو دیئے گئے تھے ۔ نیز اگرچہ مرد کو اس کا نگران بنایا گیا ہے لیکن مرد کی نگرانی عورت کو اپنے شوہر کے انتخاب کے حق سے محروم نہیں کرتی ۔ اس سلسلے میں وہ مکمل طور پر خود مختار ہے ۔ نیز وہ اپنے مال اور دولت میں بھی ہر قسم کا تصرف کر سکتی ہے ۔ وہ تمام دوسرے اختیارات جو اسلامی نظام زندگی میں بنیادی عناصر ہیں اور بنیادی حقوق ہیں ' اسے حاصل ہیں ۔

اگر یہ سب امور ہمارے ذہن نشین رہیں اور پھر وہ بحث بھی ذہن میں مستحضر رہے جو ہم نے ادارۂ خاندان کی اہمیت کے سلسلے میں سابقہ صفحات میں کی ہے ' تو ہمارے لئے یہ سمجھنا کوئی مشکل امر نہیں ہے کہ شریعت نے عورت کی تادیب اور خاندان کے بچاؤ کے لئے یہ اقدامات کیوں جائز رکھے ہیں اور وہ طریق کار کیوں تجویز کیا ہے جس کے مطابق یہ

تادیب کی جائے گی' بشرطیکہ ہمارے دل خواہشات نفسانیہ کی پیروی میں فاسد نہ ہو گئے ہوں اور ہمارے دماغ کبرو غرور سے پھر نہ گئے ہوں۔

یہ حقیقت ہے کہ شریعت اسلامی نے یہ اقدامات محض انسدادی تدابیر کے طور پر کئے ہیں۔یہ اقدامات اس لئے کئے جاتے ہیں کہ ادارہ خاندان کے اندر انتظامیہ کو امن و امان کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور انتظامیہ پہلے ہی نفوس کی اصلاح کر کے حالات کو درست کر دیتی ہے تاکہ دلوں کا یہ فساد خطرناک صورت اختیار نہ کرلے اور میاں بیوی کے درمیان بغض اور نفرت زیادہ نہ ہو جائے اور دل ہی دل میں میاں بیوی کا تعلق ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر ختم نہ ہو جائے۔

خاندان کے اندر صرف مرد اور عورت کے درمیان معرکہ ہی نہیں ہوتا اور ان اقدامات سے یہ مقصود نہیں ہے کہ مرد اٹھے اور عورت کو کچل کر رکھ دے' جب بھی وہ عورت کی جانب سے نافرمانی کا خطرہ محسوس کرے اسے خوب پیٹے اور اسے پھر واپس لا کر ایک کتے کی طرح زنجیر سے جکڑ دے۔

اسلام میں ایسے طرز عمل کی اجازت ہرگز نہیں دی گئی۔اگرچہ انسانوں میں بعض خاندانوں کے اندر ایسی عادات پائی جاتی ہیں لیکن مرد و زن کے مابین ایسا سلوک اور ایسا تعلق محض اس لئے پیدا ہوا کہ پوری انسانیت نے اپنے اصل مقام کو چھوڑ دیا۔یہ اس لئے نہ تھا کہ مرد و زن میں سے کوئی ایک غلطی پر تھا۔لیکن جب اسلامی معاشرہ صحیح طرح قائم ہو گا تو اس میں صورت حال بالکل مختلف ہو گی اور اس میں تادیب کے اغراض و مقاصد بھی مختلف ہوں گے۔

(وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَهُنَّ (۴:۳۴)) "اور عورتیں جن سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ۔"

اسلام میں یہ پہلا اقدام ہے کہ ایسی عورت کو سمجھانے کی کوشش کی جائے گی۔کسی خاندان کے سربراہ اور ڈائریکٹر کا یہ پہلا فریضہ ہے کہ وہ سمجھائے۔ ہر حالت میں اس سے توقع یہ ہے کہ وہ نہایت ہی مہذب انداز میں بیوی کو سمجھائے گا۔دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

یایها الذین امنوا قوا انفسکم و اهلیکم نارا" وقودها الناس و الحجارة "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔"

اپنے بچوں اور اہل و عیال کو بچانا تو ہر حال میں مطلوب ہے لیکن ایسے حالات میں جہاں نشوز کا خطرہ ہو وہاں اہل و عیال کو ایک متعین بیماری یعنی سرکشی سے بچانا مطلوب ہوتا ہے' قبل اس کے کہ وہ حد سے تجاوز کر جائے۔

لیکن بعض اوقات صرف وعظ بھی مفید نہیں ہوتا' کبھی عورت پر ہوائے نفس غالب ہوتی ہے اور وہ خود سر تاثرات کی زد میں ہوتی ہے' کبھی یوں ہوتا ہے کہ اسے اپنی خوبصورتی پر ناز ہوتا ہے' کبھی اپنی دولتمندی کا گھمنڈ ہوتا ہے' کبھی اپنے خاندانی مرتبہ کی وجہ سے وہ خاوند کو خاطر میں نہیں لاتی یا بعض دوسری اقدار و اوصاف کی وجہ سے وہ تعلی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس بات کو بھول جاتی ہے کہ وہ ایک ادارے میں مرد کے ساتھ برابر کی ذمہ دار ہے۔وہ مرد کے مقابلے میں اس کے مقابل قوت آزمائی کے لئے نہیں آئی ہے اور نہ یہاں کوئی موقعہ افتخار اور تعلی کا ہے اس لئے یہاں اس کے خلاف ایک دوسرا اقدام تجویز ہوتا ہے۔وہ یہ کہ مرد عورت کی جاذبیت' اس کی خوبصورتی اور تمام دوسری چیزوں کو جن پر وہ تعلی کرتی ہے' روندتا چلا جائے اور نفسیاتی طور پر ثابت کر دے کہ وہ اس عورت سے برتر ہے۔اور یہ کہ وہ اس

ادارے کا مدیر اور ڈائریکٹر ہے۔ حکم ہوتا ہے کہ (وَ اهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ (٤ : ٣٤)) (خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو)۔ خواب گاہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں عورت اپنی فطری کشش کی وجہ سے مرد کو دھوکہ دیتی ہے' جہاں عورت انتہائی علوشان کے ساتھ اپنا حکم منواتی ہے۔ جب ایک مرد اپنی خواہشات پر قابو پاکر عورت کی اس فطری کشش کا مقابلہ کرلے تو وہ عورت کے موثر ترین ہتھیار کو کند کر دیتا ہے جو ہتھیار وہ مرد کے خلاف استعمال کرتی ہے۔ جب مرد اپنے اس موقف میں ڈٹ جاتا ہے اور اپنی شخصیت کی قوت کا اظہار کرتا ہے تو اکثر اوقات عورت ہتھیار ڈال دیتی ہے' البتہ عورتوں کو خواب گاہ سے علیحدہ کرنے کے اپنے مخصوص قواعد اور آداب ہیں۔ وہ یہ کہ خوابگاہ کے علاوہ عورت کے ساتھ دوسرے تعلقات بحال رہیں۔ مرد صرف خوابگاہ میں اس سے علیحدہ رہے۔ نیز بچوں پر میاں بیوی کے درمیان ہونے والی یہ کشیدگی ظاہر نہ ہو تاکہ ان پر نفسیاتی طور پر برے اثرات نہ پڑیں۔ نیز غیر لوگوں کے سامنے کوئی جدائی یا کشیدگی نہ ہو' جس کے نتیجے میں عورت کی تذلیل ہو یا اس کی عزت نفس مجروح ہو اور وہ زیادہ سرکشی اختیار کرے کیونکہ مقصد تو یہ ہے کہ وہ سرکشی سے باز آجائے۔ اصل مقصد عورت کی تذلیل نہیں ہے اور نہ بچوں کو خلجان کا شکار کر کے انہیں خراب کرنا مطلوب ہے۔ اس دوسرے اقدام میں ان دونوں امور کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

لیکن بعض اوقات یہ دوسرا اقدام بھی کامیاب نہیں رہتا۔ تو پھر کیا اب ادارۂ خاندان کی تحلیل کر دی جائے۔ نہیں ایک کوشش مزید بھی ہے۔ اگرچہ یہ آخری تدبیر قدرے سخت ہے لیکن ایک خاندان کی تحلیل اور بربادی کے مقابلے میں وہ بہت ہی آسان اور معمولی ہے۔

(وَ اضْرِبُوهُنَّ) "اور انہیں مارو" اس سے پہلے ہم نے جو مطالب بیان کئے ہیں اور ان اقدامات کے جو اہداف سامنے رکھے ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مار سے مقصود عورت کو سزا دینا نہیں ہے اور نہ اس سے انتقام لینا مطلوب ہے' نہ محض غصے کو ٹھنڈا کرنا مطلوب ہے' اور نہ اس بات کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ یہ مار محض تذلیل' توہین اور تحقیر کے لئے ہو۔ اور نہ اس سے مقصود یہ ہے کہ عورت کو ایک ایسے خاندان میں زندہ رہنے پر مجبور کیا جائے جس پر وہ کسی صورت میں بھی راضی نہیں ہے۔ بلکہ یہ مار محض اصلاح کی خاطر ہو اور اس مار کے اندر بھی مرد کی جانب سے ہمدردی اور محبت ہو۔ مثلاً جس طرح باپ اپنی اولاد کو مارتا ہے' یا جس طرح استاد اپنے شاگردوں کو سزا دیتا ہے۔

اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ اگر ادارۂ خاندان کے دونوں فریقوں کے درمیان مکمل یک جہتی ہو تو پھر اس مار کی ضرورت ہی کیا ہوسکتی ہے۔ البتہ ان اقدامات کی ضرورت اس وقت لاحق ہوسکتی ہے جب خاندان کے اندر فساد اور توڑ پھوڑ کا خطرہ ہو اور یہ تب ہی ہوتا ہے جب کسی نہ کسی خرابی کا آغاز ہوگیا ہو اور اسے ان اقدامات کے ذریعے دور کرنا مطلوب ہو۔

جب وعظ و نصیحت بھی کام نہ دے اور خواب گاہوں کے اندر تفریق بھی مفید نہ رہے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ انحراف اور فساد خطرناک نوعیت اختیار کر گیا ہے اور خطرناک سطح تک پہنچ گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایسے حالات میں وسیلہ ضرب تادیبی کامیاب ہو جائے۔

بعض عملی واقعات اور بعض نفسیاتی کیسوں سے معلوم ہوتا ہے اور ماہرین نفسیات اس بات کو مانتے ہیں کہ بعض

اوقات عورت کی سرکشی کے لئے اسے تادیبی مار دینا ہی اس کے لئے مفید ہوتا ہے۔ اس سے عورت کا نفسیاتی علاج ہوتا ہے اور وہ فوراً راہ راست پر آ جاتی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عورت کو سرکشی کی ایک نفسیاتی بیماری لاحق ہوتی ہے اور علمائے نفسیات اسے ایک نام بھی دیتے ہیں۔ لیکن علم النفس نے جو نتائج اب تک پیش کئے ہیں وہ علمی اور سائنسی نتائج نہیں ہیں کہ انہیں علمی لحاظ سے ثابت شدہ حتمی نتائج کہا جا سکے' جیسا کہ ڈاکٹر ایلکنیس کہتے ہیں۔ البتہ اکثر اوقات ایسا ضرور ہوتا ہے کہ بعض عورتیں مرد کی قوت کو محسوس نہیں کرتیں جبکہ ان کا نفس یہ چاہتا ہے کہ جو مرد ان کا نگران اور خاوند ہو وہ قوی تر ہو اور وہ اسے تب تسلیم کرتی ہیں جب مرد جسمانی طور پر ایسی عورت کو قابو میں رکھے۔ لیکن ہر عورت کا نہ یہ مزاج ہوتا ہے اور نہ ہی نفسیاتی خواہش ہوتی ہے۔ البتہ عورتوں میں سے بعض ایسی ضرور ہوتی ہیں جو خاوند کی طرف سے جبر اور قہر کی طالب ہوتی ہیں اور یہ ضرب کا اقدام ایسے ہی کیسوں کے لئے تجویز کیا گیا ہے تاکہ خاندان جیسا اہم ادارہ صحیح طرح استواری کے ساتھ کام کر سکے' امن و سکون کے ساتھ۔

بہرحال یہ اقدامات جس ذات نے تجویز کئے ہیں' وہی تو ہمارا خالق ہے اور وہ اپنی مخلوقات کے حال سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اور اللہ علیم و خبیر کی بات کے بعد اس میں قیل و قال کرنا نہایت گستاخی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں کسی قسم کی سرکشی اور کسی قسم کا انکار انسان کو دائرہ ایمان سے خارج کر سکتا ہے۔ اس بارے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے.....

جب اللہ تعالیٰ ان اقدامات کا فیصلہ فرماتا ہے تو اس کے لئے مناسب وقت اور حالات اور حدود کا تعین بھی فرماتا ہے۔ یہ بھی متعین فرماتا ہے کہ یہ اقدامات کرنے کے مقاصد کیا ہیں اور ان کی پشت پر اسباب کیا ہوتے ہیں تاکہ اسلامی نظام حیات پر ان مظالم اور بدسلوکیوں کا الزام عائد نہ کیا جا سکے' جو دور جاہلیت میں عورتوں کے ساتھ روا رکھی جاتی تھیں۔ یہ نہ ہو کہ مرد جلاد بن جائے اور یہ کام وہ اسلامی عنوان سے کرے۔ عورت غلام بن جائے اور اس غلامی کا جواز اسلام سے لیا جائے یا یہ کہ مرد عورت بن جائے اور عورت مرد بن جائے یا دونوں ایک تیسری شکل اختیار کر لیں کہ نہ مرد' مرد رہے اور نہ عورت' عورت۔ اور یہ کام وہ دین کے ترقی یافتہ تصور کے عنوان سے کریں۔ یہ تمام ایسی شکلیں ہیں جنہیں اہل ایمان بڑی خوبی اور سہولت سے صحیح اسلام سے متمیز اور جدا کر سکتے ہیں۔

یہ اقدامات اسلام نے اس لئے روا رکھے ہیں کہ سرکشی کی بیماری کا علاج کیا جائے' قبل اس کے کہ یہ بیماری حد سے گزر جائے۔ اس علاج کے استعمال میں بھی سخت احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ یہ علاج تجویز کر کے اس کے استعمال میں حضور ؐ نے اپنے گھر میں اور اپنی عائلی زندگی میں اس پر عمل کر کے مسلمانوں کو اس کا انداز بھی سمجھایا ہے۔ حضور ؐ نے اپنے عمل اور اپنے احکام و فرامین کے ذریعے اس سلسلے میں متعدد ہدایات دی ہیں۔

سنن اور مسانید میں روایت ہے۔ حضرت معاویہ ابن حیدہ القشیری روایت فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضور ؐ سے دریافت کیا کہ عورت کا حق مرد پر کیا ہے تو آپ نے فرمایا یہ کہ اگر اسے کھانے کی ضرورت ہو تو اسے دیا جائے' کپڑے کی ضرورت ہو تو پہنایا جائے اور اسے چہرے پر نہ مارا جائے اور نہ چہرے کو بگاڑا جائے اور اس کو صرف گھر کے اندر خوابگاہ سے علیحدہ کیا جائے۔

ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے۔ نبی ؐ نے فرمایا: "اللہ کی باندیوں کو نہ مارو۔" حضرت عمر تشریف لائے تو انہوں نے رسول اللہ ؐ سے عرض کیا: حضور ؐ عورتیں تو مردوں پر جری ہو گئی ہیں تو حضور ؐ نے انہیں مارنے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد حضور ؐ کی ازواج مطہرات کے پاس بہت سی عورتیں آئیں اور اپنے مردوں کے خلاف شکایت کی، اس پر حضور ؐ نے فرمایا: "محمد کی ازواج کے پاس بہت سی عورتیں اپنے شوہروں کے خلاف شکایت لے کر آتی ہیں جو لوگ یہ کام کرتے ہیں وہ تم میں سے اچھے لوگ نہیں ہیں۔"

ایک دوسری روایت میں حضور ؐ نے فرمایا، کسی کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنی عورت کو گدھے کی طرح مارے، وہ صبح کو تو اسے کوڑے مارے اور رات کو اس کے ساتھ ایک خوابگاہ میں سوئے۔ (مصابیح السنہ)

اور ایک دوسری روایت میں ہے "تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہو۔" (ترمذی، وطبرانی)

ایسی روایات اور ہدایات اور وہ حالات جو ان ہدایات کے وقت موجود تھے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں اسلامی نظام زندگی کی ہدایات اور جاہلی عادات و رسوم کے درمیان مسلسل کشمکش برپا تھی اور یہ کشمکش اسی طرح تھی جس طرح زندگی کے تمام دوسرے میدانوں میں اسلام اور جاہلیت کے درمیان برپا تھی۔ لیکن یہ کشمکش صرف اس وقت تک تھی جب تک اسلامی عادات اور رسومات زور نہ پکڑ گئی تھیں اور جب تک اسلامی ہدایات کی جڑیں، اہل ایمان کے دلوں اور اسلامی معاشرے کے اندر گہری نہ ہو گئی تھیں۔

بہرحال ان تمام باتوں کے باوجود شریعت نے ان اقدامات اور تدابیر کے لئے بھی ایک حد متعین کر دی تھی اور اب بھی حکمت یہی ہے کہ اگر ابتدائی مرحلے میں ہی مقاصد پورے ہو جائیں اور اصلاح ہو جائے تو ضروری نہیں ہے کہ اگلے مرحلے میں قدم رکھا جائے۔

(فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا (٤ : ٣٤)) "پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لئے بہانے تلاش نہ کرو۔"

جب مقصد پورا ہو جائے تو ذرائع اپنی جگہ رک جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مقصد اطاعت ہے اور یہ اطاعت ایسی ہے کہ جس کے لئے عورت خود آمادہ ہو جائے۔ ایسی نہیں ہے کہ ڈنڈا سر پر رکھ کر اطاعت کرائی جائے۔ اس لئے کہ ڈنڈے کے ذریعے اطاعت سے کوئی مضبوط خاندان وجود میں نہیں آسکتا، جو اسلامی سوسائٹی کی پہلی اکائی ہوتی ہے اور اسلام میں جس کی بہت بڑی اہمیت ہے۔

یہ آیت اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اگر عورت بطیب خاطر مطیع فرمان ہو جائے تو اس کے بعد ان اقدامات میں سے کوئی اقدام کرنا صراحتاً زیادتی، تجاوز اور خود سری ہو گی۔ (فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا (٤: ٣٤)) (ان پر دست درازی کے بہانے تلاش نہ کرو) لیکن بات یہاں ختم نہیں ہو جاتی، بتایا جاتا ہے کہ اگر کسی کے دماغ میں ایسا کوئی بخار اٹھے تو اللہ کو یاد رکھو جو علی اور کبیر ہے۔ اس معاملے میں وہ بھی فریق ہے تاکہ دل محفوظ اور مامون ہو جائیں، سر جھک جائیں اور بغاوت اور سرکشی کے رجحانات نرم پڑ جائیں۔ اور یہ قرآن کریم کا ترغیب اور ترہیب کا مخصوص انداز ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا (٤: ٣٤)) (بے شک اوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالا تر ہے ۔)

---ooo---

یہ تو وہ اقدامات ہیں جو عورتوں کی جانب سے سرکشی کے آغاز یا خطرے کے آغاز کے موقعہ پر تجویز کیے گئے تھے ۔ لیکن اگر سرکشی واقع ہو جائے تو اس صورت میں وہ اقدامات نہ کیے جائیں جن کا اعلان ہوا۔ اس لئے کہ سرکشی اور کشیدگی واقع ہو جانے کی صورت میں ان اقدامات کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ کشیدگی جب واقعہ ہو جائے تو پھر دو دشمنوں کے درمیان گویا جنگ اور مقابلہ شروع ہو جاتا ہے ۔ پھر ہر ایک یہ کوشش کرتا ہے کہ دوسرے کا سرکچل دے ۔ اور یہ شریعت کا نہ مقصود ہے اور نہ مطلوب ۔

خصوصاً جب یہ معلوم ہو گیا کہ ان اقدامات سے اصلاح حال ممکن نہیں ہے بلکہ ایسے اقدامات سے حالات مزید ابتر ہو جائیں گے اور فریقین ایک دوسرے سے مزید دور ہو جائیں گے ۔ عورت کی جانب سے نشوز مزید کھل کر سامنے آ جائے گا ۔ وہ روابط بھی ٹوٹ جائیں گے جو ابھی تک قائم تھے ' یا یہ کہ خاوند نے یہ اقدامات عملاً کیے اور کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ایسے حالات میں اسلام کا حکیمانہ نظام زندگی ایک دوسرا طریقہ استعمال کرتا ہے تاکہ اس نہایت ہی اہم ادارے کو مکمل تباہی سے بچانے کی آخری کوشش کی جائے اور اسے صرف بحالت مجبوری ہی ٹوٹنے دیا جائے ۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

"اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات صاف ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتے داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو' وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا' اللہ سب کچھ جانتا ہے اور باخبر ہے ۔"

اسلام یہ مشورہ نہیں دیتا کہ عورت کی جانب سے سرکشی شروع ہوتے ہی تم اس سرکشی اور نفرت کے سامنے ہتھیار ڈال دو اور نہ اسلام یہ مشورہ دیتا ہے کہ بس فوراً معاہدۂ نکاح کو ختم کر دو اور خاندان کی ہنڈیا ان لوگوں کے سر پر لا کر پھوڑ دو جن کا اس معاملے میں کوئی قصور نہیں ہے ' جن میں کم عمر بھی ہیں اور بڑے بھی ہیں ۔ اس لئے کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے ادارۂ خاندان بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے ۔ اس لئے اسلام اس کی اہمیت کی خاطر اسے از سرنو جدید اینٹوں کی مدد سے تعمیر کرتا ہے تاکہ وہ دوبارہ نشوونما حاصل کر سکے ۔

اب اسلامی نظام ادارہ نکاح کے ٹوٹنے کا خطرہ لاحق ہوتے ہی اپنی آخری کوشش شروع کر دیتا ہے ۔ حکم دیا جاتا ہے کہ ایک ثالث مرد کی مرضی کا مقرر ہو اور ایک ثالث عورت کی مرضی کا مقرر ہو اور وہ دونوں ان کے درمیان مصالحت کرانے کی سعی کریں ۔ یہ لوگ نہایت ہی ٹھنڈے ماحول میں جمع ہوں ۔ وہ اپنے ذاتی میلانات کو سامنے نہ رکھیں ' اپنے شعور اور احساس کے بوجھ سے الگ ہو جائیں اور معاشی حالات و مفادات کو نظرانداز کر دیں ' جن کی وجہ سے زوجین کے درمیان

تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی۔ یہ حکم ان حالات سے ہٹ کر سوچیں جن کی وجہ سے زندگی کے ماحول میں کدورت پیدا ہوئی یا جن کی وجہ سے فریقین کے درمیان پیچیدگی پیدا ہوئی' اور جن کی وجہ سے زوجین کے درمیان مشترکہ زندگی کے اچھے عوامل غیر موثر ہو گئے۔ ان ثالثوں کو کوشش کرنا چاہئے کہ وہ زوجین کے دونوں خاندانوں کی شہرت اور عزت کا بھی خیال رکھیں اور زوجین کے چھوٹے بچے ہوں تو ان کے مستقبل کا بھی خیال رکھیں اور وہ اپنے دل سے یہ خواہش نکال دیں کہ ان میں سے کوئی فریق کامیاب رہتا ہے یا ناکام۔ کیونکہ ایسے حالات میں زوجین میں سے ہر ایک اپنی بات منوانا اپنے لئے باعث عزت سمجھتا ہے۔ بلکہ ان ثالثوں کو زوجین کے مفادات' ان کے بچوں کے مفادات اور اس ادارے کے مفادات کا خیال رکھنا چاہئے جو ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ یہ زوجین کے رازوں کے بھی امین ہوں گے کیونکہ یہ دونوں حکم' دونوں خاندانوں اور زوجین کے نمائندے ہوں گے۔ فریقین کو یہ خوف نہ ہو گا کہ ان سے ان کے راز افشا ہوں گے اور نہ ہونا چاہئیں' کیونکہ رازوں کی تشہیر میں دونوں کی مصلحت نہیں ہوتی بلکہ دونوں کی مصلحت تو اس میں ہوتی ہے کہ ان کے راز پس پردہ ہی رہیں۔

ان ثالثوں کا اجتماع زوجین کے درمیاں اصلاح کی خاطر ہو گا بشرطیکہ زوجین کے درمیان اصلاح احوال کی حقیقی خواہش ہو' اور یہ خواہش اصلاح محض غصے کے نیچے دب گئی ہو۔ اگر ثالثوں کے دلوں میں حقیقی خواہش ہو اور وہ مخلص ہوں تو اللہ تعالیٰ زوجین کو اصلاح احوال کی توفیق دے دے گا۔

(اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا (۴ : ۳۵)) "اگر وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا۔"۔۔۔۔ چونکہ وہ صدق دل سے اصلاح چاہتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو قبولیت بخشتا ہے اور اصلاح کی توفیق دیتا ہے۔

یہ ہے لوگوں کی سعی اور ان کے دلوں کا رابطہ اللہ کی تقدیر اور اس کی مشیت کے ساتھ۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی قضا ہی لوگوں کی زندگیوں میں موثر ہوتی ہے۔ لیکن اللہ کی تقدیر نے لوگوں کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ کوشش کریں اور اصلاح احوال کی سعی کریں۔ ان کی اس کوشش کے جو نتائج نکلیں گے وہ اللہ کی تقدیر کے مطابق ہی ہوں گے۔

جو نتائج بھی نکلیں گے وہ گہرے علم اور دور اندیشانہ مصلحت پر مبنی ہوں گے۔ (اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا (۴: ۳۵)) (اللہ سب کچھ جانتا ہے اور باخبر ہے)

غرض اس سبق میں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ اسلام زوجین کے درمیان اس تعلق کے نتیجے میں وجود میں آنے والے ادارۂ خاندان کو بہت ہی اہمیت دیتا ہے۔ ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اسلام انسانی زندگی کے اس پہلو کی تنظیم پر کس قدر زور دیتا ہے۔ پھر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ابتدائی دور کی تحریک اسلامی میں زندگی کے اس پہلو کو بہتر سے بہتر کرنے میں کس قدر کوششیں کیں اور تحریک اسلامی کا ہاتھ پکڑ کر اسے جاہلیت کی گندگیوں سے نکالا۔ اسے راہ ترقی پر ڈال کر بتدریج بلند ترین مقام اور مرتبہ تک اللہ کی ہدایات کے مطابق پہنچایا اس لئے کہ اللہ کی ہدایت کے سوا کوئی اور ہدایت انسان کے مفید مطلب نہیں ہے۔

---ooo---

درس ۳۲ ایک نظر میں

اس سبق کے ابتدائی حصے اور پوری سورت کے موضوع و مضامین کے درمیان کئی ربط ہیں ۔ نیز اس سبق اور سابق درس کے مضامین کے درمیاں بھی ربط پایا جاتا ہے ۔

اس سبق کے ذریعے اس مہم کا آغاز ہوا' جس کو پیش نظر رکھ کر' اسلامی معاشرے کی اجتماعی زندگی کی تنظیم کی گئی تھی اور اسے جاہلیت کی تمام آلائشوں سے پاک کر کے اس کے اندر جدید اسلامی خدوخال کو واضح اور مستحکم کرنے کا بیڑا اٹھایا گیا تھا ۔ اس مہم کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو ان اہل کتاب کی سازشوں سے خبردار رکھا جائے جو یہودیوں کی صورت میں مدینہ کے ارد گرد اپنے پورے شر اور سازشوں کے ساتھ پھیلے ہوئے تھے' اور وہ ہروقت اسلامی معاشرے کے خلاف اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھے ۔ وہ رات دن اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ اس معاشرے کی تشکیل و تکمیل کی راہ میں ممکن حد تک رکاوٹیں پیدا کریں ۔ خصوصاً وہ مسلمانوں کی اخلاقی قدروں سے بہت ہی خائف تھے اور ان کی سعی تھی کہ وہ اخلاقی کمال حاصل نہ کریں ۔ نیز وہ مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق اور باہم تعاون و تکافل سے بھی خائف تھے' اس لئے کہ اخلاقی اقدار اور معاشرتی اتحاد و تکافل ہی کسی سوسائٹی کی اصل قوت ہوا کرتے ہیں ۔

یہ نیا سبق' دراصل ایک نئی مہم ہے اور اس کا آغاز اس اساسی اصول سے ہوا ہے جس کے اوپر اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھی گئی ہے' اور جس سے اسلامی نظام زندگی تشکیل پاتا ہے ۔ وہ اصول ہے خالص نظریہ توحید ۔ اسی اصول پر اسلامی نظام زندگی مبنی ہے ۔ اسلامی زندگی کا ہر پہلو اور اس کا ہر رخ اسی اصول سے پھوٹنے والی شاخ ہے ۔

اس سبق سے پہلے عائلی زندگی کی تنظیم پر متعدد پہلوؤں سے بات ہو چکی ہے ۔ اور اسی طرح اجتماعی زندگی کے معاملات بھی زیر بحث آ چکے ہیں ۔ اس سے پہلے گزرنے والے سبق میں خاندانی زندگی' اس کی تنظیم اور اس کے بچاؤ کی تدابیر کو زیر بحث لایا گیا تھا ۔ اور ان روابط سے بحث کی گئی تھی جو خاندان کو مستحکم اور مضبوط بناتے ہیں ۔ اب اس سے ذرا آگے بڑھ کر اس سبق میں پورے انسانی تعلقات اور روابط سے بحث کی گئی ہے ۔ یعنی وہ تعلقات جو اسلامی معاشرے میں خاندان کے محدود دائرے سے ذرا آگے بڑھ کر انسانی بنیادوں پر استوار ہوتے ہیں ۔ لیکن ان کا خاندانی نظام سے بھی تعلق ہوتا ہے ۔ مثلاً آغاز ہوتا ہے والدین کے متعلق ہدایات سے جس کا تعلق خاندان سے بھی ہے ۔ والدین کے علاوہ پھر مزید روابط کو بیان کیا گیا ہے اور یہ روابط اس پاکیزہ محبت کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں جو خاندان کے اندر پائی جاتی ہے اور جس کے اثرات دوسرے انسانی روابط تک وسیع ہو جاتے ہیں ۔ ان خوشگوار روابط کا لطف انسان کو سب سے پہلے خود اپنے خاندان کے اندر آتا ہے ۔ یہاں وہ اچھے تعلقات رکھنا سیکھتا ہے ۔ یوں اس کے لئے یہ تعلقات ایک محدود خاندان سے وسیع انسانی خاندان تک پھیل جاتے ہیں جبکہ پہلے ان خوشگوار تعلقات کو خاندان کے اندر بویا جاتا ہے ۔

زیر بحث سبق میں بعض ہدایات تو محدود عائلی خاندان کے بارے میں ہیں اور بعض ہدایات ایک وسیع تر انسانی خاندان کے بارے میں ہیں۔اس زاویے سے اقدار اور پیمانوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔یعنی خرچ کرنے والوں کے کیا مراتب ہیں اور کنجوسوں کے کیا مراتب ہیں؟ درس کا آغاز اس اساسی قاعدے سے ہوا جس پر تمام اقدار اور پیمانے مبنی ہیں،جس طرح زندگی کی تمام تفصیلی ہدایات بھی اسی اساسی اصول پر مبنی ہیں۔یعنی عقیدۂ توحید۔مسلمانوں کی ہر حرکت اور ہر سرگرمی، ان کا ہر تصور اور ہر تاثر عقیدۂ توحید پر مبنی ہوتا ہے اور یہی اللہ کی بندگی ہے۔اس کا مقصود اللہ کی پرستش ہے۔انسان کی تمام سرگرمیوں کا منتہائے مقصود اللہ کی اطاعت اور بندگی ہے اور ایک مسلم اپنے عقیدے اور عمل کے اعتبار سے اللہ کا بندہ ہوتا ہے۔

چونکہ ہم نے اپنی پوری زندگی میں اللہ کی بندگی اور عبادت کرنی ہے، اس نسبت سے اللہ کی مخصوص پرستش اور عبادت یعنی نماز اور طہارت کے سلسلے میں بعض احکام بھی بیان کیے گئے۔اور نماز چونکہ ایک مرحلہ تھی جس میں شراب کو حرام قرار دیا گیا تھا، اس سے قبل نماز کی حالت میں بھی یہ ممکن تھا کہ کوئی شراب پیے ہوئے ہو۔اس لحاظ سے حکم دیا گیا کہ مدہوشی کی حالت میں نماز میں شریک نہ ہوا کرو۔یہ اسلام کے ہمہ گیر تربیتی اقدامات میں سے ایک اقدام تھا جو نماز کی مناسبت سے دیا گیا۔غرض اس سبق کی تمام کڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔درس سابق سے بھی تمام مضامین مناسبت رکھتے ہیں اور پھر اس سورہ کے پورے محور کے ساتھ بھی متناسب ہیں۔

---ooo---

درس ۳۳ تشریح آیات

۳۶ ۔۔ تا ۔۔ ۴۲

وَ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ لَا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا وَّ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا
وَّ بِذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَ الۡجَارِ ذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡجَارِ الۡجُنُبِ
وَ الصَّاحِبِ بِالۡجَنۡۢبِ وَ ابۡنِ السَّبِیۡلِ ۙ وَ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا
یُحِبُّ مَنۡ کَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرَا ۣ۳۶ الَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ وَ یَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ
بِالۡبُخۡلِ وَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا
مُّہِیۡنًا ۳۷ وَ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ
بِاللّٰہِ وَ لَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ وَ مَنۡ یَّکُنِ الشَّیۡطٰنُ لَہٗ قَرِیۡنًا فَسَآءَ
قَرِیۡنًا ۳۸ وَ مَا ذَا عَلَیۡہِمۡ لَوۡ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ اَنۡفَقُوۡا مِمَّا
رَزَقَہُمُ اللّٰہُ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ بِہِمۡ عَلِیۡمًا ۳۹ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ ۚ
وَ اِنۡ تَکُ حَسَنَۃً یُّضٰعِفۡہَا وَ یُؤۡتِ مِنۡ لَّدُنۡہُ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ۴۰ فَکَیۡفَ اِذَا

جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍۭ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰٓؤُلَآءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾ يَوْمَئِذٍ
يَوَدُّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ وَعَصَوُا۟ ٱلرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ ٱلْأَرْضُ وَلَا
يَكْتُمُونَ ٱللَّهَ حَدِيثًا ﴿٤٢﴾

"اور تم سب اللہ کی بندگی کرو' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ' ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو' قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ' اور پڑوسی رشتہ دار سے' اجنبی ہمسایہ سے' پہلو کے ساتھی اور مسافر سے اور ان لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضے میں ہوں' احسان کا معاملہ رکھو' یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔ ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں ہیں جو کنجوسی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اسے چھپاتے ہیں' ایسے کافر نعمت لوگوں کے لئے ہم نے رسواکن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنے مال محض لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور درحقیقت نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ روز آخر پر' سچ تو یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہوا اسے بہت ہی بری رفاقت میسر آئی۔ آخر ان لوگوں پر کیا آفت آجاتی اگر یہ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے اور اگر یہ ایسا کرتے تو اللہ سے ان کی نیکی کا حال چھپا نہ رہ جاتا۔ اللہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اگر کوئی ایک نیکی کرے تو اللہ اسے دوچند کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔ پھر سوچو کہ اس وقت یہ لوگ کیا کریں گے جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر تمہیں (یعنی آپ کو اے محمدؐ) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔ اس وقت وہ سب لوگ جنہوں نے رسول کی بات نہ مانی اور اس کی نافرمانی کرتے رہے' تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔ وہاں یہ اپنی کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے۔"

یہ پیراگراف اس حکم سے شروع ہوتا ہے کہ صرف اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور یہ حکم واؤ کے ساتھ شروع ہوتا ہے جو حرف عطف ہے۔ حرف عطف اس امر اور نہی کو سابقہ احکام کے ساتھ مربوط کر دیتا ہے جو ادارۂ خاندان کی تنظیم اور شیرازہ بندی سے متعلق ہیں اور جن کا ذکر سابقہ سبق کے آخر تک ہوا۔ واو عطف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دین کا ایک ہی کلیہ اور اصول ہے اور وہی تمام امور کے درمیان رابطہ ہے یعنی پوری زندگی میں بندگی صرف اللہ کی' کی جانی چاہئے اور یہ کہ اسلام صرف عقیدے اور چند نظریات کا نام نہیں ہے جو کسی انسان کے ضمیر میں پختہ طور پر بیٹھے ہوں نہ اسلام چند مراسم عبودیت کا نام ہے جو مسجد میں سرانجام دیئے جاتے ہوں اور نہ اسلام صرف دنیوی کاروبار کا نام ہے جس کا تعلق عقیدے اور رسوم پرستش سے بالکل نہ ہو' بلکہ وہ ایک ایسا مکمل نظام ہے جس کے اندر یہ سب چیزیں موجود ہیں پھر اس کے تمام اجزاء بھی ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اور پھر یہ سب اجزاء اپنے اصل الاصول یعنی نظریہ

توحید کے ساتھ مربوط ہیں ـ ان تمام سرگرمیوں میں صرف اللہ سے ہدایت حاصل کرنا اور اس کے سوا کسی سے کوئی ہدایت نہ لینا یعنی مراسم عبادت میں اللہ کو الہ و معبود سمجھنا اور اسی طرح حاکیت اور قانون سازی میں بھی اسے الہ و حاکم سمجھنا یہ دونوں چیزیں نظریہ توحید میں شامل ہیں ـ ان دونوں میں توحید اسلام کا جزء ہے اور یہی خدا کا دین ہے ـ

توحید کے حکم اور شرک کی نفی کے ساتھ ہی حکم دیا جاتا ہے کہ احسان کرو اور یہ حکم ایک خاندان کو بھی دیا جاتا ہے اور پورے انسانی خاندان یعنی معاشرے کو بھی دیا جاتا ہے ـ بخل' فخر اور تکبر کی مذمت کی جاتی ہے' نیز لوگوں کو بخل پر آمادہ کرنے کی بھی مذمت کی جاتی ہے ـ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اللہ کے فضل کو چھپانا بھی ایک مذموم حرکت ہے ـ اللہ کا فضل عام ہے' چاہے مالی فضل ہو یا اخلاقی اور دینی فضل ہو ـ پھر شیطان کی اطاعت سے ڈرایا جاتا ہے ـ اب روئے سخن آخرت کی طرف پھر جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ وہ دن نہایت ہی شرمندہ کرنے والا اور توہین آمیز ہو گا ـ ان سب امور کو عقیدہ توحید سے مربوط کر دیا جاتا ہے اور وہ مصدر و منبع متعین کر دیا جاتا ہے جس سے ان لوگوں نے ہدایت لینی ہے جو اللہ کی بندگی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے اور وہ مصدر ہے بھی یکتا' اس میں تعدد ممکن نہیں ہے ـ ہدایت لینے کا ذریعہ بھی وہ ہے اور قانون سازی بھی وہ ہے ـ اس کی حاکیت میں بھی کوئی شریک نہیں ہے اور اس کی بندگی اور عبادت میں بھی کوئی شریک نہیں ہے ـ

(وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (٤:٣٦))

"اور تم سب اللہ کی بندگی کرو' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ' ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو' قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ' اور پڑوسی رشتہ دار سے' اجنبی ہمسایہ سے' پہلو کے ساتھی اور مسافر سے' اور ان لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضے میں ہوں ـ

اسلامی نظام حیات میں پرستش کے بارے میں ہدایات اور قانون سازی کے بارے میں ہدایات ایک ہی مرجع Source سے اخذ ہوتی ہیں اور وہ ایک ہی محور کے ارد گرد گھومتی ہیں ـ یہ سب چیزیں ایمان باللہ سے اخذ ہوتی ہیں اور ایمان باللہ کا ارتکاز نقطہ توحید پر ہے اس لئے اسلام میں تمام ہدایات اور تمام تشریعات LawMaking باہم جڑی ہوئی اور ہم آہنگ ہیں ـ اسلامی نظام میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کے ایک جزء کو دوسرے سے علیحدہ کر دیا جائے ـ اور اگر کوئی شخص اسلام کے کسی جزء کو اس کے نقطہ ارتکاز یعنی عقیدہ توحید سے علیحدہ کر کے سمجھنے کی سعی کرے گا تو اس کی سمجھ ناقص ہوگی ـ اسی طرح عملی میدان میں بھی اسلام کے ایک جزئیہ پر عمل کرنے اور دوسری جزئیات کو ترک کرنے سے بھی اسلام پوری طرح نافذ اور قائم نہیں ہو سکتا اور نہ انسانی زندگی میں اس طرح کے جزئی اسلام کے ثمرات نکل سکتے ہیں ـ

اس کائنات' زندگی اور انسانی تعلقات کے اساسی تصورات صرف ایمان باللہ کے سرچشمے سے پھوٹتے ہیں اور ان

تصورات کے اوپر پھر اجتماعی طریقہ ہائے کار' اقتصادی نظام' سیاسی نظام' اخلاقی نظام' قانونی نظام اور عالمی روابط کا نظام استوار ہوتا ہے ۔ ان تصورات کا اس کرۂ ارض پر لوگوں کی زندگی کی تمام سرگرمیوں میں ان کے باہم روابط پر بھی اثر ہوتا ہے اور یہ تصورات ایک فرد کے ضمیر اور ایک معاشرے کی واقعی صورت حال کی کیفیات کا تعین بھی کرتے ہیں ۔ یہ تصورات معاملات دنیا کو عبادت میں منتقل کر دیتے ہیں ۔ اگر یہ معاملات خدا و رسول کی اطاعت کرتے ہوئے سرانجام دیئے جائیں تو یہ عبادات کو معاملات کی اساس قرار دیتے ہوئے ان میں ضمیر کی پاکیزگی اور عمل کی صفائی پیدا کرتے ہیں اور آخر کار یہ تصورات زندگی کو ایک اکائی بنا دیتے ہیں' جو اسلامی نظام حیات سے پھوٹتی ہے ۔ اس میں ہدایات صرف رب واحد سے لی جاتی ہیں اور پوری زندگی دنیا اور آخرت میں اللہ کی طرف ہی لوٹتی ہے ۔

اسلامی نظریہ حیات' اسلامی نظام حیات اور اللہ کے صحیح دین کی یہ خصوصیت کس بات سے معلوم ہوتی ہے؟ یہ اس اصول سے معلوم ہوتی ہے کہ اس آیت میں والدین کے ساتھ احسان' رشتہ داروں کے ساتھ احسان اور تمام لوگوں کے ساتھ احسان کرنے کے احکام سے پہلے یہ کہا گیا ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرو ۔ اس کے بعد والدین کی رشتہ داری اور دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلقات کو ایک ہی لڑی میں پرویا گیا ہے اور دونوں امور کو اللہ کی توحید اور بندگی کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے جبکہ اس سے ماقبل درس کے خاتمے پر نظریہ توحید اور اللہ کی بندگی کو خاندان کے اندر باہم تعلقات کے لئے دستور بنایا گیا تھا ۔ اس درس میں نظریہ توحید اور اللہ کی بندگی کو تمام انسانوں کے درمیان تعلقات کے لئے اساس بنایا گیا ہے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے تاکہ ان تمام امور میں یہ نظریہ مستحکم ہو اور رابطہ بن جائے اور تمام معاشرتی روابط اور قانون سازی کا مصدر ایک ہو جائے ۔

(وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا (٤ : ٣٦)) "اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو"..... پہلا حکم یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کرو اور دوسرا حکم یہ ہے کہ اللہ کی بندگی میں اللہ کے سوا کسی اور کو شریک نہ کرو ۔ یہ قطعی اور عمومی ممانعت ہے اور اس کا اطلاق ان تمام معبودوں پر ہوتا ہے جو انسانی تاریخ میں ریکارڈ ہیں ۔ (اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ) کسی بھی چیز کو' چاہے وہ مادہ اور جمادات سے ہو' حیوان ہو' انسان ہو' فرشتہ ہو اور یا شیطان ہو ۔ یہ تمام چیزیں (شئ) کے مفہوم میں داخل ہیں ۔ جب اس کا استعمال اس طرز پر ہو ۔

اس کے بعد حکم دیا جاتا ہے کہ والدین کے ساتھ احسان کرو ۔ والدین کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے اور اقرباء کا ذکر عموماً کیا گیا ہے ۔ زیادہ احکام اس بارے میں ہیں کہ اولاد اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے ۔ اگرچہ والدین کو بھی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے بچوں کا خیال رکھیں ۔ اللہ تعالیٰ چھوٹے بچوں پر ہر حال میں ان کے ماں باپ سے بھی زیادہ رحم فرمانے والے ہیں ۔ اولاد اس بات کی زیادہ محتاج ہے کہ اسے والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کی ہدایت کی جائے' اس لئے کہ والدین اس دنیا سے جانے والے ہیں ۔ ایک ایسی نسل سے ان کا تعلق ہوتا ہے جو پس پشت اور پس منظر میں جا رہی ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ اولاد بالعموم اپنی شخصیت' اپنے جذبات' اپنے رجحانات اور اپنے اہتمامات کے اعتبار سے ان بچوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے جو ان کے بعد میں آنے والے ہوتے ہیں ۔ وہ اس نسل کی طرف متوجہ نہیں ہوتے جو اس سے قبل گزر رہی ہے ۔ زندگی کی دوڑ میں ان لوگوں کا رخ آگے کی طرف ہوتا ہے اور پیچھے مڑ کر دیکھنے میں

وہ غفلت کرتے ہیں۔اس لئے اس اللہ رحمن و رحیم سے انہیں یہ ہدایات ملتی ہیں جو والدین کو بھی ہدایات دیتے ہیں اور بچوں کے لئے بھی ہدایات دیتے ہیں۔نہ اولاد کو بھلاتے ہیں اور نہ والدین کو بھلاتے ہیں اور جو اپنے بندوں کو یہ ہدایت دیتے ہیں کہ وہ آپس میں نہایت ہی مہربانی سے پیش آئیں خواہ والدین ہوں یا اولاد ہوں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے جیسا کہ دوسری متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نیکی کے سلسلے میں یوں ہدایات دیتا ہے کہ نیکی کا آغاز اپنے خاص اور عام رشتہ داروں سے کیا جائے اور اس کے بعد اس کا دائرہ بتدریج وسیع کیا جائے اور اسے ان تمام محتاجوں تک پھیلایا جائے جن کا تعلق وسیع تر انسانی خاندان کے ساتھ ہے۔یہ حکم انسانی فطرت کے مطابق اور انسانی فطرت کی سمت پر چلنے والا حکم ہے۔اس لئے کہ رحم' دکھ اور درد میں شرکت کے جذبات سب سے پہلے گھر سے شروع ہوتے ہیں' جو ایک چھوٹا خاندان ہوتا ہے۔جس شخص نے گھر کے اندر نیکی' رحم اور محبت نہیں سیکھی یا اس کا تجربہ نہیں کیا اس سے ایسے جذبات کی توقع کسی غیر کے حق میں ہرگز نہیں کی جا سکتی۔طبیعت اور فطرت کے اعتبار سے بھی نفس انسانی اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔اس جذبے میں کوئی برائی اور حرج نہیں ہے بشرطیکہ یہ جذبہ خیر خاندان کے محدود دائرے اور متعین نقطے سے آگے بھی بڑھے۔اس کے بعد پھر یہ منہاج' اسلام کی اجتماعی تنظیم کے ساتھ متفق ہے کہ باہم تعاون اور کفالت کا نظام گھر سے شروع کیا جائے اور پھر اسے جماعت اور سوسائٹی کے دائرے تک پھیلایا جائے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام اپنے سوشل سیکورٹی کے نظام کو حکومت کے وسیع نظام کے ہاتھ میں دینا نہیں چاہتا' الا یہ کہ گھر یا گاؤں کے لوگ ناکام ہو جائیں اس لئے کہ مقامی انتظام زیادہ موثر ہو سکتا ہے۔مقامی انجمن بہ نسبت حکومت کے غریبوں کے بارے میں سہولت کے ساتھ تحقیقات کر سکتی ہے اور بروقت امداد نہایت سہولت اور آسانی کے ساتھ مستحقین تک پہنچا سکتی ہے۔اس کی وجہ سے لوگوں کے اندر محبت اور باہم رابطہ بھی پیدا ہوتا ہے جو ایک انسانی سوسائٹی کے لئے ضروری ہے۔

یہاں بات کا آغاز اس طرح ہوا ہے کہ والدین کے ساتھ احسان کرو' اس کے بعد اسے رشتہ داروں تک وسعت دی گئی ہے۔اس کے بعد پھر یتیموں اور مسکینوں کا ذکر ہے چاہے یہ یتیم اور مساکین دور رہتے ہیں اس لئے کہ ان کی ضرورت بھی زیادہ اہم ہوتی ہے اور ان کا خیال رکھنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔اس کے بعد قریبی پڑوسی' پھر اجنبی پڑوسی' اس کے بعد پہلو میں رہنے والے ساتھی' اس لئے کہ قرابت دار پڑوسی ہمیشہ ملتا ہے جبکہ پہلو میں رہنے والے ساتھی کبھی کبھار ملتے ہیں' صاحب بالجنب کی تفسیر میں آیا ہے کہ اس سے مراد وہ دوست اور ہمنشین ہے جو ساتھ رہتا ہو' حضر اور سفر دونوں میں۔پھر وہ مسافر جو اپنے اہل و عیال سے دور ہو اور پھر ان غلاموں کا حق ہے جنہیں حالات نے غلام بنا دیا ہے لیکن ہیں تو وہ بہرحال انسان۔

احسان کے حکم کے بعد' دوسرا حکم یہ آتا ہے۔فخر و غرور بری خصلت ہے۔بخل اور دعوت بخل اور اللہ کی نعمت اور فضل کو چھپانا یہ بری خصلتیں ہیں۔اسی طرح انفاق فی سبیل اللہ میں ریاکاری کی بھی ممانعت کی گئی اور بتایا گیا کہ جو لوگ یہ کام کرتے ہیں درحقیقت ان کا اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں ہوتا۔اور وہ شیطان کے مطیع اور ہمنشین ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا (۳۶) اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ

بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا (۳۷) وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا (۳۸) (٤ : ٣٦ تا ٣٨)

''یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے ۔ اور ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں ہیں' جو کنجوسی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اسے چھپاتے ہیں ۔ ایسے کافر نعمت لوگوں کے لئے ہم نے رسواکن عذاب مہیا کر رکھا ہے ۔ اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنے مال محض لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور وہ درحقیقت نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں' نہ روز آخر پر ۔ سچ یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہوا اسے بہت ہی بری رفاقت میسر آئی ۔

یہاں اگر دوبارہ اسلامی نظام حیات کی یہ خصوصیت ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس میں تمام معاملات' تمام طرز ہائے عمل 'عقل و شعور کے تمام رجحانات اور سوسائٹی کے اندر پائے جانے والے تمام تعلقات کا ربط عقیدے اور تصور حیات کے ساتھ ہوتا ہے ۔ جب انسان صرف اللہ کا بندہ بن جاتا ہے اور تمام ہدایات اللہ سے لیتا ہے تو وہ لوگوں پر احسان کرنا خود بخود شروع کر دیتا ہے' اللہ کی رضا کے حصول اور آخرت کے اجر کی امیدواری کے لئے ۔ وہ یہ کام نہایت ہی عاجزی' نہایت ہی نرمی کے ساتھ کرتا ہے اور یہ مانتے ہوئے کرتا ہے کہ وہ جو کچھ دے رہا ہے وہ اللہ ہی کے دیئے سے دے رہا ہے ۔ وہ خود اپنے رزق اور مال و دولت کا خالق نہیں ہے ۔ اسے تو اللہ کے ہاں سے سب کچھ ملتا ہے ۔ اور اللہ کے انکار اور یوم آخرت سے انکار کے نتیجے میں فخر اور غرور پیدا ہوتا ہے اور بخل اور دعوت بخل پیدا ہوتے ہیں ۔ اور اللہ کے فضل کو چھپایا جاتا ہے کہ اس کے آثار بصورت داد و دہش ظاہر نہ ہوں اور اگر انفاق ہو بھی تو وہ ریاکاری کے لئے ہوتا ہے اور اس کے بعد لوگوں کے سامنے فخر و مباہات کا اظہار ہوتا ہے اس لئے کہ ایسے شخص کے سامنے نہ رضائے الٰہی ہوتی ہے اور نہ جزائے آخرت کی امیدواری ۔ بس لوگوں کے سامنے فخر اور غرور کا اظہار مطلوب ہوتا ہے ۔

اس طرح ایمانی اخلاقیات اور کفر کی اخلاقیات کے حدود کا تعین بسہولت ہو جاتا ہے ۔ مومنین کے نزدیک اچھے اعمال اور اچھے اخلاق کا باعث ایمان باللہ اور جزائے آخرت ہوتے ہیں ۔ اور اللہ کی رضامندی کے حصول پر آنکھیں لگی ہوتی ہیں اور یہ ایک ایسا بلند داعیہ ہوتا ہے کہ انفاق کرنے والا لوگوں سے کسی بدلے کا منتظر نہیں ہوتا' اور نہ وہ عمل لوگوں کے عرف و رواج سے سیکھتا ہے ۔ اگر کسی کے دل میں ایک خدا کا یقین نہ ہو جس کی رضامندی وہ چاہتا ہو اور اس رضامندی کے حصول کے لئے وہ جدوجہد کر رہا ہو اور اسی طرح یوم آخرت کا عقیدہ اور جزائے آخرت کا کوئی لالچ نہ ہو' تو ایسے لوگ اگر نیکی کا کوئی کام کرتے بھی ہیں تو وہ رسم و رواج کے مطابق دنیاوی اقدار کے لئے کرتے ہیں ۔ ایسے شخص کے لئے پھر کسی نسل میں بھی کوئی ایک ضابطہ نہیں ہوتا چہ جائیکہ اس کے لئے ہر زمان و مکان میں کوئی ناقابل تغیر ضابطہ ہو' اس کے لئے پھر نیکی کرنے کا داعیہ وہی باتیں ہوں گی جن کا ذکر ہوا یعنی فخر و مباہات اور یہ داعیہ بھی ہمیشہ غیر مستقل اور غیر یقینی ہو گا اور لوگوں کی اقدار اور ان کی اغراض کے ساتھ ساتھ تغیر پذیر ہو گا ۔ اور ہمیشہ یہ مذموم صفات انفاق کے

ساتھ پیوستہ رہیں گی۔ فخر' غرور' بخل اور بخل کی دعوت' لوگوں کو دکھاوا۔ کبھی بھی انفاق فی سبیل اللہ اخلاص اور بے لوثی سے نہ ہو گا۔

قرآن کریم کہتا ہے اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کراہیت اور محبت کے انفعالات سے پاک ہے اس لئے ان الفاظ سے مراد یہاں کراہیت اور محبت کے اثرات ہیں۔ یعنی اللہ ان کو دھتکارے گا' اذیت دے گا اور انہیں ان کاموں پر سزا دی جائے گی۔ (وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا (۴:۳۷)) (اور ایسے کافروں کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسواکن عذاب تیار کیا ہے)۔ یہاں فخر و غرور پر ان کے لئے رسواکن عذاب دیئے جانے کا ذکر ہے جو ان اوصاف بد کے مقابل ہے۔ قرآن کریم کا انداز تعبیر ایسا ہے کہ وہ معانیے مقصود کے علاوہ بھی اپنا پرتو ڈالتا ہے۔ اور قرآن کے یہ اشارات بھی بذات خود مقصود و مطلوب ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے زیر بحث اوصاف بد اور افعال مکروہہ کے خلاف کراہیت اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ان چیزوں کو حقیر سمجھ کر انسان ان سے دور رہتا ہے خصوصا اس صورت میں کہ اللہ تعالیٰ نے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اس قسم کے لوگ شیطان کے ساتھی ہیں اور جن لوگوں کا ساتھی شیطان ہو جائے تو سمجھ لیں کہ وہ بہت ہی برا ساتھی ہے۔ (وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا (۴:۳۸)) بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ آیات مدینہ کے بعض یہودیوں کے بارے میں وارد ہوئی ہیں کیونکہ ان میں جو صفات مذکور ہیں وہ یہودیوں پر پوری طرح منطبق ہوتی ہیں' جیسا کہ وہ منافقین پر منطبق ہوتی ہیں۔ جس دور میں یہ آیات نازل ہوئیں اس دور میں اللہ نے ان پر جو فضل و کرم کیا تھا' وہ اسے چھپاتے تھے۔ نیز اس سے مراد یہ بھی' ہو سکتا ہے کہ وہ سچائی ہو جو انہیں دی گئی تھی انہوں نے اسے چھپا لیا تھا۔ یعنی حضور اکرم ؐ کی رسالت اور دین اسلام کے بارے میں جو پیشن گوئیاں ان کے ہاں تھیں۔ لیکن آیت کی عبارت عام ہے اور بات یہاں مال اور فعل کے ذریعے احسان کی ہو رہی ہے' لہٰذا مناسب ہے کہ آیت کے مفہوم کو عام ہی رہنے دیا جائے' کیونکہ سیاق کلام کے ساتھ اس آیت کا عام مفہوم ہی زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

جب ان لوگوں کے نفوس کا سر چاک ہوا' جب ان لوگوں کے عمل کی فضیحت ظاہر ہو گئی اور ان کے اسباب یعنی انکار خدا' انکار آخرت اور شیطان کی ہم نشینی اور اس کا اتباع بھی بیان کر دیئے گئے اور اس کے بعد یہ بھی بتا دیا گیا کہ ان برائیوں کی سزا توہین آمیز عذاب ہے' تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ استفہام انکاری کے انداز پوچھتے ہیں۔

وَمَا ذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا (۳۹) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا (۴۰) (۴:۳۹-۴۰))

"آخر ان لوگوں پر کیا آفت آ جاتی اگر یہ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے اور جو کچھ اللہ نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے۔ اگر یہ ایسا کرتے تو اللہ سے ان کی نیکی کا حال چھپا نہ رہ جاتا۔ اللہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اگر

کوئی ایک نیکی کرے تو اللہ اسے دوچند کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔"

ہاں' انہیں کیا ہو جاتا۔ وہ کیا نقصان ہے' جس کی بابت وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے سے ڈرتے ہیں۔ جس کی بابت وہ انفاق کرنے سے ڈرتے ہیں' یعنی اللہ کا دیا ہوا' اللہ کے راستے میں' اللہ تو اس چیز کو بھی جانتا ہے جو وہ خرچ کرتے ہیں اور ان اسباب اور دواعی سے بھی باخبر ہے جن کی وجہ سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو ذرہ برابر کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ اس لئے اس بات کا ڈر نہیں ہے کہ اللہ کو ان کے ایمان اور ان کے انفاق کے بارے میں علم نہ ہو سکے گا۔ اس لئے اللہ انہیں جو جزاء دے گا اس میں ظلم نہ ہو گا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے اس میں خاص اضافہ فرمائے گا۔ نیکیاں زیادہ کر دی جائیں گی اور اللہ اپنی جانب سے بلاحساب دے گا۔

ایمان کا راستہ ہر صورت میں محفوظ اور مفید ہے۔ یعنی مادی مفادات و نقصانات کے نقطہ نظر سے بھی۔ اگر خالص مادی نقطہ نظر سے بھی دیکھا جائے تو ایمان پھر بھی مفید اور محفوظ راستہ ہے۔ اس لئے پوچھا جاتا ہے کہ انہیں کیا نقصان ہو گا اگر وہ اللہ پر ایمان لائیں اور یوم آخرت پر یقین رکھیں اور انہیں اللہ نے جو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کریں۔ اس لئے کہ وہ جو کچھ خرچ کر رہے ہیں' اس میں سے کوئی چیز ان کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ بطور بر و احسان خرچ کرنے والوں کو کئی گنا اجر دیتا ہے' اور اس پر اس کا فضل و کرم مستزاد ہو گا' حالانکہ وہ جو کچھ خرچ کر رہے ہیں وہ اللہ کے دیئے ہوئے سے خرچ کر رہے ہیں۔ کیا ہی عظیم ہے اللہ کا فضل و کرم۔ کیا ہی بہترین سودا ہے یہ۔ اس سے تو کوئی جاہل ہی باز رہ سکتا ہے۔

آخر میں اوامر و نواہی اور ترغیب اور تحریک کا خاتمہ مشاہد قیامت میں سے ایک منظر پر ہوتا ہے۔ یہاں ان کے موقف کو مجسم شکل میں اور حرکت کرتے ہوئے زندہ کرداروں میں پیش کیا جاتا ہے' جس طرح قرآن کریم ہمیشہ مشاہدات قیامت کو زندہ اور متحرک شکل میں پیش کرتا ہے۔

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا (٤١)
يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ
اللَّهَ حَدِيثًا (٤٢) ((٤: ٤١ - ٤٢))

"پھر سوچو کہ اس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر تمہیں (یعنی اے محمد ﷺ آپ کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔ اس وقت وہ سب لوگ جنہوں نے رسول کی بات نہ مانی اور اس کی نافرمانی کرتے رہے' تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔ وہاں یہ اپنی کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے۔"

پہلی آیت میں بطور تمہید کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا' اس لئے قیامت میں مکمل عدالت ہو گی اور اللہ کے ترازو میں بال برابر بھی کھوٹ نہ ہو گا۔ اور یہ کہ اللہ حسنات کو کئی گنا کر دے گا اور اس پر مستزاد اللہ کی

جانب سے اہل ایمان پر فضل و کرم ہو گا۔ اللہ کی رحمت ہوگی مگر ان لوگوں پر جو رحمت کے مستحق ہوں گے اور وہاں اللہ کا فضل بھی ہو گا مگر صرف ان لوگوں پر ہو گا جو اپنے ایمان کے ذریعے اللہ کے فضل کے امیدوار ہوں گے۔

مگر ان دوسرے لوگوں کا حال کیا ہو گا جنہوں نے ایمان کی پونجی پیش نہیں کی اور انہوں نے عمل کا سرمایہ جمع نہیں کیا۔ انہوں نے کفر اور بداعمالیاں جمع کیں۔ اس دن پھر ان کا حال کیا ہو گا؟ اس وقت جب ہم ہر قوم سے اس قوم کے خلاف ایک گواہ لائیں گے اور اے محمد تمہیں امت مسلمہ پر گواہ لائیں گے۔

یہاں آکر قیامت کا منظر صاف صاف آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ یہ ایک وسیع میدان ہے۔ تمام امتیں جگہ جگہ موجود ہیں اور ہر امت کے اعمال پر ایک گواہ پیش ہو گا۔ یہ لوگ جنہوں نے کفر کیا' فخر کیا' غرور کیا' بخل کیا' بخل کے داعی رہے۔ اللہ کے فضل کو چھپاتے رہے اور دکھاوا کرتے رہے اور کوئی کام رضائے الٰہی کے لئے نہ کرتے تھے۔ یہ منظرکشی ایسی ہے کہ الفاظ کے اندر سے قریب ہے کہ ہم انہیں دیکھ لیں۔ وہ میدان میں کھڑے ہیں' ہر امت کے رسول کو شہادت کے لئے بلایا جاتا ہے اور ہمارے رسول ﷺ کو بھی بلایا جاتا ہے اور یہ لوگ اپنے پورے کفر کے ساتھ' اپنے تمام پوشیدہ اور ظاہری اعمال کے ساتھ' اپنے پورے تکبر اور غرور کے ساتھ' اپنی پوری کنجوسی اور دعوت بخل کے ساتھ' اپنے خالق کی درگاہ میں کھڑے ہوں گے۔ اس رازق کی عدالت میں ہوں گے جس کے فضل کو انہوں نے چھپایا اور اس کے دیئے ہوئے سے خرچ نہ کیا۔ اب ان کے سامنے وہ دن (قیامت) ہے جس پر ان کا یقین نہ تھا۔ پھر اسی رسول کی موجودگی میں انصاف ہو گا جس کا انہوں نے انکار کیا تھا' پھر ان کا کیا حال ہو گا؟

بے شک یہ لوگ عظیم شرمندگی اور ذلت سے دوچار ہوں گے۔ شرمندگی اور ندامت سے انکے سر جھکے ہوں گے۔ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے کیونکہ انکار سے انہیں فائدہ ہی کیا ہو گا۔

قرآن کریم کی عبارت ان مضامین کو محض ظاہری انداز میں بیان نہیں کرتی بلکہ اسے ایک نفسیاتی تصویرکشی کے انداز میں بیان کیا جاتا ہے اور ان لوگوں کے اوپر شرمندگی' ذلت اور ندامت کے سائے صاف نظر آ رہے ہیں۔ ذرا الفاظ ملاحظہ کریں۔

(يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ وَ لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا (٤ : ٤٢)) "اس وقت جنہوں نے رسول کی بات نہ مانی اور نافرمانی کی تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔ وہاں یہ اپنی کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے۔"

اس زندہ اور متحرک انداز تعبیر کی جھلکیوں کے درمیان سے ہم ان تمام معانی کو پاتے ہیں اور یہ سب تاثرات کو چشم تصور سے دیکھ لیتے ہیں جو حشر میں کھڑے ان لوگوں کے چہروں سے عیاں ہوں گے۔ یہ تاثرات ہم نہایت ہی ٹھہرے ادراک کے ساتھ زندہ اور متحرک پاتے ہیں۔ دنیا کے تمام ادب پاروں کو کھنگال لیجئے! آپ کو کسی بھی بیانیہ کلام یا تجزیہ نگاری میں یہ تاثر نہ ملے گا۔ قیامت کے مناظر بیان کرتے ہوئے قرآن بطور خاص یہ انداز اختیار کرتا ہے اور قرآن میں بعض دوسرے مقامات پر بھی اس کے نمونے ملتے ہیں۔

---○○○---

اس درس کا آغاز اس مضمون سے ہوا تھا کہ اللہ کی بندگی اور عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ کرو' نماز چونکہ اللہ کی بندگی اور عبادت کی محسوس ترین شکل ہے' اس لئے اگلی آیت میں نماز کے بعض احکام کو بیان کیا جاتا ہے۔ نیز نماز کی تیاری کے لئے طہارت کے بعض احکام بھی بیان ہوتے ہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ نماز اس وقت پڑھنی چاہئے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔ اور اسی طرح جنابت کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک غسل نہ کر لو' الا یہ کہ راستے سے گزرتے ہو۔ اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم بیمار ہو' یا سفر میں ہو' یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے' یا تم نے عورتوں سے لمس کیا ہو' اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو' بے شک اللہ نرمی سے کام لینے والا اور بخشش فرمانے والا ہے۔"

یہ بھی جماعت مسلمہ کی تربیت کی ایک اہم کڑی ہے جسے اسلامی نظام حیات نے جاہلیت کی پستیوں سے سربلند کیا۔ شراب نوشی جاہلی معاشرے کی ایک عام اور بنیادی عادت تھی بلکہ قدیم اور جدید جاہلیتوں کی یہ امتیازی خصوصیت رہی ہے۔ رومی معاشرہ جب اپنی ترقی کے انتہائی عروج پر تھا تو شراب نوشی اس کی ممتاز ترین خصوصیات میں سے ایک تھی۔ اسی طرح فارس کے جاہلی معاشرے کی اہم خصوصیات میں سے شراب نوشی ایک اہم خصوصیت تھی۔ آج امریکی اور یورپین تہذیب اور جاہلیت اپنے عروج پر ہیں اور شراب نوشی ان کی ممتاز ترین صفت ہے۔ افریقہ میں جو ترقی یافتہ معاشرے گزرے ہیں ان کی خصوصیات میں بھی یہ اہم خصوصیت رہی ہے۔

سویڈن آج کے ترقی یافتہ جاہلی ممالک میں سب زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ گزشتہ صدی کے نصف آخر میں اس کا حال یہ تھا کہ اس کا ہر خاندان اپنے لئے مخصوص شراب استعمال کرتا تھا۔ اور ان میں سے ہر فرد اوسطاً" بیس لیٹر شراب پیتا تھا۔

حکومت سویڈن کو ان اعداد سے تشویش لاحق ہوئی کیونکہ اس کی وجہ سے لوگ نشے کے خطرناک حد تک عادی بنتے جا رہے تھے ۔ حکومت نے یہ پالیسی اختیار کی کہ شراب خرید کر اسے سٹور کیا جائے اور انفرادی استعمال کے اعداد و شمار کی حد کو کم کرنے کی سعی کی جائے ۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت نے عام مقامات پر شراب نوشی کی ممانعت کر دی ۔ لیکن حکومت نے جلدی اپنے اقدامات سے رجوع کر لیا ہے اور عائد شدہ پابندیوں میں تخفیف کر دی گئی ۔ ہوٹلوں میں شراب نوشی کی اجازت دے دی گئی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اگر کوئی کھانا کھائے تو شراب پی سکتا ہے ۔ اس کے بعد پبلک مقامات میں سے بعض مقامات پر اجازت دے دی گئی اور یہ اجازت بھی نصف رات تک دی گئی ۔ نصف رات کے بعد نبیذ اور بیر کے استعمال کی اجازت دی گئی لیکن نوجوانوں کے اندر شراب نوشی کی عادت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے ۔

امریکہ میں ایک دفعہ حکومت نے اس بری عادت کو ختم کرنے کا ارادہ کیا ۔ ۱۹۱۹ء میں اس نے قانون تحریم شراب نوشی پاس کیا ۔ اس قانون کو خشکی کا قانون کہا گیا ۔ اس لئے کہ اس نے شراب نوشی کے ذریعے آبپاشی کو منع کر دیا ۔ یہ قانون صرف ۱۴ سال تک چل سکا اور حکومت نے اسے ۱۹۳۳ء میں منسوخ کر دیا ۔ اس قانون کی حمایت میں حکومت امریکہ نے ریڈیو' سینما' تقاریر اور نشرواشاعت اور پروپیگنڈے کے جدید ترین وسائل استعمال کئے ۔ صرف شراب نوشی کے خلاف نشرواشاعت پر حکومت نے اس وقت ۶۰ ملین ڈالر خرچ کئے ۔ اور جو کتابیں' رسالے اور پمفلٹ شائع کیے گئے وہ دسیوں بلین صفحات پر مشتمل تھے ۔ اس قانون کے پاس کرنے کی وجہ سے حکومت کو ۲۵۰ بلین پونڈ کے اخراجات بشکل تاوان دینے پڑے ۔ تین سو افراد لقمہ اجل بنے ۵۳۳۳۵ء ۲۲ افراد قید ہوئے' ۱۶ ملین پونڈ جرمانے ہوئے' چار بلین اور ۴۰۰ ملین پونڈ مالیت کی جائیدادیں ضبط ہوئیں ۔ لیکن ان اقدامات کے باوجود حکومت اس قانون کو منسوخ کرنے پر مجبور ہوئی اور اس نے پسپائی اختیار کی ۔

جاہلیت میں شراب نوشی ایک عام عادت تھی لیکن اسلام نے چند آیات نازل کر کے اس کا خاتمہ کر دیا ۔ یہ ہے وہ فرق نفس انسانی اور انسانی معاشرے کے ساتھ اسلامی طرز عمل اور جاہلی طرز عمل اور طریقہ تربیت کا ۔ اور قدیم زمانے میں بھی یہ فرق تھا اور آج بھی یہ فرق اپنی جگہ قائم ہے ۔

سوال یہ ہے کہ اسلام سے قبل دور جاہلیت میں شراب نوشی کا کیا حال تھا؟ اس کی حقیقی صورت حال اس شخص کو معلوم ہوگی جو دور جاہلیت کے اشعار کا قدرے گہرا مطالعہ کرے گا ۔ ادبی موضوعات میں سے شراب اہم ترین موضوع رہا ہے جیسا کہ جاہلی زندگی میں یہ ایک اہم خصوصیت تھی ۔ شراب اس قدر فروخت ہوتی تھی کہ تجارت کا لفظ عام تجارت کے بجائے شراب کی فروخت کے ساتھ مخصوص ہو گیا ۔ مشہور شاعر لبید کہتا ہے ۔

قد بت سامرها و غایه تاجر

وافیت اذ رفعت وعز مدامها

(عیش و عشرت کی کئی ایسی راتیں میں نے قصہ گوئی میں بسر کیں اور ان میں شراب ایسے تاجروں کے پاس پہنچی جنہوں نے اپنی کالونی پر نئے نئے جھنڈے لگائے تھے اور پرانی شراب کے دام بہت ہی چڑھ گئے ۔) عمرو ابن قمیہ کہتا ہے ۔

اذا اسحب الربط و المروط الي
ادنی تجاری وانفض اللمما

(اس جوانی کے وقت کو یاد کرو جب ریشم کے قیمتی کپڑے پہن کر اپنے قریب ترین شراب فروش کے پاس پہنچ جاتا تھا اور اپنے سر کے لمبے لمبے بالوں کو سر کی حرکت کی وجہ سے جھاڑتا تھا نشہ 'شراب اور غرور کی وجہ سے۔)

مجالس شراب نوشی کا بیان اور شراب نوشی پر فخر کے مضامین سے جاہلیت کے اشعار بھرے ہوئے ہیں اور یہ ان کی اہم ترین خصوصیات میں سے ایک ہے۔امراء القیس کہتے ہیں۔

۱۔ واصحبت ودعت الصباغیر انني اراقب حلات من العيش اربعا
۲۔ فمنهن قولي للندامی ترفقوا یداجون نشاجا من الخمر مترعا
۳۔ ومنهن رکض الخیل ترجم بالقنا یبادرون سربا آمنا ان یفزعا

(۱) صبح ہوئی اور اس نے شراب کو الوداع کہہ دیا' لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو زندگی کی چار صفات کو بہت پسند کرتا ہوں۔

(۲) پہلی یہ کہ میں اپنے ہم پیالہ می خواروں کو یہ

(۳) ان میں سے ایک یہ کہ میں گھوڑا ایڑھی لگاؤں اور تیر پھینکتے ہوئے نیل گایوں کے ایسے گلے پر جھپٹ کر خوفزدہ کر دوں جو نہایت ہی امن و سکون سے چر رہا تھا۔

اور طرفہ بن العبد کہتے ہیں:

فلولا ثلاث هن من عيسة الفتيٰ
وجدك لم احفل متي قام عودی

اگر تین چیزیں نہ ہوتیں جو ایک نوجوان کے لئے سامان عیش ہیں تو تیرے سر کی قسم میں اپنی پوری زندگی میں کسی محفل میں شریک نہ ہوتا۔

فمنهن سبق العاذلات بشربة
كميت متي ما تعل بالما تزبد

ان میں سے ایک یہ ہے کہ شرمسار کنندہ عورتوں سے بھی آگے بڑھ کر کلیجی رنگ کا جام اٹھالیتا ہوں جس میں اگر پانی ڈالا جائے تو کف آجائے۔

ومازال تشرب الخمور ولذتي
وبذلي وانفاقي طريفي وتالدی

میں ہمیشہ شراب نوشی اور لذت نوشی کا عادی ہوں اور مسلسل اپنی جدی دولت اور تازہ جمع کردہ مال کو خرچ کرتا رہتا ہوں۔

الی ان تحامتني العشیرہ کلھا
و افردت افراد البعیر المعبد

یہاں تک کہ ہر قبیلہ میری دشمنی پر اتر آیا اور میں اس طرح اکیلا ہو گیا ہوں جس طرح خارش زدہ اونٹ علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔

اور اعشی کہتے ہیں:

فقدً شرب الراح تعلمین
یوم المقام دیومالظعن

(میں شراب پیتا ہوں اور تمہیں خوب خبر ہے قیام کے دن بھی اور سفر کے دن بھی۔

واشرب بالریف حتی یقا
ل قدطال بالریف ما قد دجن

اور میں سرسبزی اور شادابی میں بہت پیتا ہوں یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ اب کے موسم بہار کی بارشوں میں بہت عوانت ہوگئی ہے۔

منخل لیشکری کہتے ہیں:

(۱) لقد شربت من المدامة بالصغیر وبالکبیر
(۲) فاذاسکرت فانني رب الخورنق و السدیر
(۳) و اذاصحوت فانني رب الشویة و البعیر

(۱) میں ہمیشہ شراب نوشی کرتا ہوں، چھوٹوں کے ساتھ بھی اور بڑوں کے ساتھ بھی۔ (یعنی ہر محفل میں)

(۲) اگر میں بے ہوش ہو جاؤں تو خورنق اور سدیر نامی قلعوں کا مالک ہوں۔ (یعنی ان قلعوں میں داد عیش دیتا ہوں اور اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتا ہوں)

(۳) اور اگر میں ہوش میں ہوا تو پھر میں بکریوں اور اونٹوں کا مالک ہوں۔ (یعنی بکریاں اور اونٹ ذبح کرتا ہوں اور چراتا ہوں)۔

—○○○—

تحریم شراب کے مختلف مراحل میں جو واقعات پیش آئے اور ان واقعات کا تعلق جن لوگوں سے ہے ' مثلاً حضرت عمرؓ ' علیؓ 'حمزہؓ عبدالرحمٰنؓ ابن عوف اور ان جیسے دوسرے مشہور صحابہؓ ' ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریم شراب سے قبل اس کا رواج کس قدر زیادہ تھا ' خصوصاً دور جاہلیت میں بعض واقعات مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر کافی ہیں ۔

حضرت عمرؓ اپنے قصہ اسلام میں بیان فرماتے ہیں :"میں جاہلیت میں شراب نوشی کا عادی تھا ۔ میں نے سوچا کہ فلاں شراب فروش کے پاس جاؤں اور شراب پی لوں......" اسلام میں بھی حضرت عمر شراب استعمال کرتے رہے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی :

(یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲ : ۲۱۹)) "لوگ آپ سے جوئے اور شراب کے بارے میں سوال کرتے ہیں؟ کہہ دیں ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہیں اور ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے ۔" تو حضرت عمرؓ نے دعا کی :"اے اللہ ہمارے لئے شراب کے بارے میں کافی و شافی بیان نازل فرما دے ۔" اور آپ نے شراب نوشی کا سلسلہ جاری رکھا یہاں تک کہ شراب کی حرمت کا صریح حکم نازل ہوا :

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۹۰) اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (۹۱) (۵ : ۹۰ - ۹۱)) (شراب ' جوا اور آستانے اور پانسے شیطان کے ناپاک اعمال ہیں ' لہٰذا ان سے اجتناب کرو ' امید ہے کہ تم فلاح پا لوگے ' بے شک شیطان صرف یہ چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان شراب اور جوئے کے ذریعے بغض و عداوت پیدا کر دے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے ۔ کیا تم اس سے باز آؤ گے ؟) اس پر حضرت عمرؓ نے کہا :ہاں ہم باز آگئے ' باز آگئے اور اس کے بعد وہ شراب نوشی سے رک گئے ۔ اور آیت

(یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰی (۴ : ۴۳)) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو ' اس وقت تک نماز کے قریب مت جاؤ جب تک تم نشے کی حالت میں ہو) کے بارے میں دو روایات وارد ہیں ۔ جن میں مہاجرین میں سے حضرت علی اور عبدالرحمٰن بن عوف اور انصار میں سے سعد بن معاذ شریک واقعہ ہیں ۔

ابن ابی حاتم ' یونس ابن حبیب ' ابو داؤد ' مصعب ابن سعد وہ اپنے والد سعد سے روایت کرتے ہیں کہ میرے بارے میں چار آیات نازل ہوئیں ۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک انصاری نے دعوت طعام تیار کی ۔ اس نے کچھ لوگ مہاجرین کے اور کچھ انصار کے بلائے ۔ ہم نے کھایا پیا یہاں تک کہ ہم مدہوش ہوگئے ' پھر اپنے اپنے بارے میں مفاخر بیان کرنے لگے ' ایک شخص نے اونٹ کے جبڑے کی ہڈی لی اور سعد کی ناک پر دے ماری ۔ چنانچہ سعد مغروز الانف تھے ۔ یہ واقعہ شراب

نوشی کی حرمت سے پہلے کا ہے۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی (٤ : ٤٣)) یہ ایک طویل حدیث ہے جو امام مسلم نے شعبہ سے نقل کی ہے۔

ابن ابی حاتم' ابن عمار' عبدالرحمٰن ابن عبداللہ دشتکی ابو جعفر' عطا' ابو عبدالرحمٰن کی سند سے حضرت علی ﷺ سے روایت ہے کہ عبدالرحمٰن ابن عوف نے ہمارے لئے کھانا تیار کیا۔اس نے ہمیں دعوت دی اور شراب پلائی' شراب نے ہمیں لے لیا' اور نماز کا وقت ہو گیا۔لوگوں نے فلاں کو آگے کیا۔ اس نے پڑھا۔ (یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ مَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَنَحْنُ نَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ) اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ آیت نازل ہوئی۔

(یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ

(٤ : ٤٣)) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' نماز کے قریب مت جاؤ' جب تم نشے میں ہو یہاں تک کہ تم جو کچھ پڑھتے ہو اسے سمجھو۔'' میں سمجھتا ہوں کہ دور جاہلیت میں شراب نوشی کی کثرت اور وسیع استعمال کے ثبوت کے لئے اس سے زیادہ روایات کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔یہ روایات کافی ہیں۔شراب نوشی اور جوئے بازی کا رواج نہایت ہی وسیع تھا اور دور جاہلیت کی عادات و تقالید میں سے یہ دونوں عادتیں نہایت ہی ممتاز تھیں۔

سوال یہ ہے کہ ربانی نظام حیات نے اس ممتاز اور نہایت ہی گہری صفت اور عادت کا علاج کس طرح کیا اور اس مصیبت کا دفعیہ کس طرح ہو گیا جس کے ہوتے ہوئے کوئی سنجیدہ استوار' صالح اور دانشمند معاشرہ اٹھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس قدیم اور بری لت کو اسلام نے کس طرح یکلخت ختم کر دیا جس کے بعض پہلو قومی اجتماعی عادات سے وابستہ تھے اور بعض پہلو قومی و ذاتی اقتصادیات سے وابستہ تھے۔

قرآن کریم نے اس بری عادت کو صرف چند آیات کے ذریعے جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ نہایت نرمی' نہایت ہمدردی کے ساتھ اور نہایت ہی تدریج کے ساتھ۔ بغیر اس کے کہ کوئی جنگ لڑی جائے' بغیر اس کے کہ اس کے لئے کوئی معرکہ آرائی کرنا پڑے اور بغیر اس کے کہ اس کے لئے کوئی بڑی قربانی دی جائے یا خونریزی کی جائے۔اس سلسلے میں اگر کوئی قربانی دی گئی تو صرف یہ تھی کہ شراب کے مٹکے اور جام و سبو ٹوٹ گئے یا شراب کے وہ گھونٹ جو پینے والوں کے منہ میں تھے اور انہوں نے تھوک دیئے تھے اور کوئی جانی یا مالی نقصان نہیں ہوا۔یاد رہے کہ بعض لوگوں نے جب آیت تحریم شراب کے بارے میں سنا اور وہ شراب پی رہے تھے انہوں نے وہ گھونٹ بھی نہ پیا جو ان کے منہ میں تھا۔تفصیلات آگے آرہی ہیں۔

مکہ جہاں اسلامی حکومت نہ تھی' اور نہ مسلمانوں کو اقتدار حاصل تھا' وہاں شراب کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کی طرف ایک سرسری اشارہ کیا گیا تھا۔یہ اشارہ سیاق کلام کے اندر ضمنی طور پر کیا گیا تھا لیکن صرف اشارہ ہی تھا مثلاً سورت نحل میں آیا تھا۔

(وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا (١٦ : ٦٧))

"اور پھلوں میں سے کھوریں اور انگور جس سے تم شراب اور رزق حسن حاصل کرتے ہو)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب کو' جو وہ کھوروں اور انگوروں سے بناتے تھے' رزق حسن کے بالمقابل بیان کیا۔ گویا شراب رزق حسن نہ تھی' یا رزق حسن سے کوئی علیحدہ شے تھی۔ یہ دور سے ایک اشارہ تھا۔ اور اس کے ذریعہ ایک بات ایک تو خیز مسلمان کے شعور کے اندر غیر محسوس طور پر بٹھا دی گئی۔ لیکن شراب نوشی کی عادت ایک انفرادی بدعملی نہ تھی بلکہ یہ تو اس سے زیادہ بڑا اور گہرا معاشرتی جرم تھا اور عادت بد تھی جبکہ اس کا تعلق اقتصادی امور سے بھی تھا۔ اس لئے اس کا قلع قمع ایسے بالواسطہ اشارات کے ذریعے نہ کیا جاسکتا تھا۔

مدینہ طیبہ میں جہاں ایک اسلامی حکومت قائم ہوگئی تھی اور اسلام کی پشت پر اقتدار بھی تھا' تب بھی اسلام نے شراب کی حرمت کے احکام محض قانون کے ڈنڈے کے ذریعے بشکل فرمان حکومت نافذ نہیں کیے۔ اس میں سب سے زیادہ کام قرآن کی قوت تاثیر نے کیا۔ یہ کارروائی نہایت ہی نرمی اور محبت کے انداز میں شروع کی گئی اور انسانی نفسیات کے گہرے مطالعے کی اساس پر شروع کی گئی۔ نیز اجتماعی امور کے بعد بصیرت افروز حقیقی تقاضوں کے مطابق کی گئی۔ سب سے پہلے اس سلسلے میں سورہ بقرہ کی یہ آیت آئی ہے:

(يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲ : ۲۱۹)) (آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں' کہہ دیں ان میں بہت بڑا گناہ بھی ہے اور لوگوں کے لئے منافع بھی ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے نفع سے بہت بڑا ہے)۔ یہ ایک سوال کا جواب تھا جس کے ذریعے شراب اور جوئے کے خلاف مسلمانوں کے ضمیر اور شعور کو بیدار کرنا شروع کیا گیا۔

یہ پہلی گھنٹی تھی جو اسلامی معاشرے میں شراب نوشی کے خلاف سنی گئی۔ اسلامی احساس اور اسلامی شعور کے اندر ایک ارتعاش پیدا ہوا۔ اور اسلامی فہم اور ادراک کو شراب نوشی اور جوئے کے خلاف بیدار کیا گیا۔ یہ بتایا گیا کہ اسلام میں حلت اور حرمت کا مدار گناہ اور ثواب پر ہے۔ اگر اس کے منافع کے مقابلے میں نقصان بہت زیادہ ہے اور گناہ بہت بڑا ہے تو اب راستہ یہی ہے کہ اسے حرام ہونا چاہئے۔

لیکن یہ معاملہ نہایت ہی گہرا تھا' حضرت عمرؓ جیسے لوگ شراب کے عادی تھے' اس آیت کے نزول پر آپ نے دعا کی: "اے اللہ شراب کے بارے میں ہمیں کافی اور شافی بیان دے دے۔" یہ دعا حضرت عمرؓ کی طرف سے تھی اور اس سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ شراب نوشی عربوں کے رگ وپے میں کس قدر سرایت کر گئی تھی۔ اس کے بعد وہ واقعات پیش آئے جن کا ذکر ہم نے اوپر کر دیا ہے اور ان کے بعد میں یہ آیت آئی۔

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (۴ : ۴۳)) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو' نماز کے قریب مت جاؤ' اس حال میں کہ تم نشے کی حالت میں ہو) اور یہ بصیرت افروز اور حکیمانہ نظام زندگی اپنا کام کرتا رہا' نہایت ہی نرمی کے ساتھ۔ یہ ایک درمیانی مرحلہ تھا' پہلے تو اس فعل شنیع کے خلاف نفرت پیدا کی گئی کہ یہ ایک گناہ اور ناپاک عمل ہے' لیکن اب ایک محدود پابندی عائد کر دی گئی اور نشے کے اوقات کے اندر تحدید کر دی

گئی - اس لئے کہ نماز کے اوقات ایک دوسرے کے بہت ہی قریب ہوتے ہیں - اور یہ پورے دن پر پھیلے ہوئے ہیں اور دو نمازوں کے درمیان اس قدر طویل وقفہ نہیں ہوتا کہ کوئی شراب پئے اور اس کا نشہ ٹوٹ جائے اور وہ نماز باجماعت پڑھ سکے اور اس حال میں واپس آجائے کہ وہ نماز میں جو کچھ پڑھے اسے اس کا اچھی طرح علم و شعور ہو - جبکہ یہ بات معلوم ہے کہ شراب نوشی کے لئے خاص اوقات ہوتے ہیں یعنی صبح و شام - صبح ہوتے ہی نماز کا وقت ہوتا ہے اور شام کے وقت بھی تین نمازوں کے اوقات جمع ہوتے ہیں - اس لئے ایک مسلمان کے ضمیر کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا تھا کہ وہ شراب پئے یا نماز پڑھے - اور نماز چونکہ ان کے نزدیک دین کا مرکزی ستون بن چکی تھی' اس لئے وہ نماز کے حق میں ہی فیصلہ کرتے تھے 'لیکن اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے شافی و کافی بیان کی ضرورت محسوس کی -

وقت اسی طرح آگے بڑھتا رہا - کچھ مزید واقعات درپیش ہوئے اور وقت آگیا کہ شراب نوشی کو قطعاً "حرام کر دیا اجائے - یہ قرآنی نظام حیات کے عین مطابق کیا گیا اور نہایت ہی موزوں موقعہ پر شراب نوشی کی عادت پر یہ فیصلہ کن وار کیا گیا -

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۹۰) اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (۹۱) (۵: ۹۰ - ۹۱) (بے شک شراب اور جوا' آستانے اور پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں' ان سے پرہیز کرو' امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی - شیطان تو چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہوگے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ (۵: ۹)) تمام مسلمان ان چیزوں سے باز آگئے - شراب کے مٹکیرے انڈیل دیئے گئے اور ہر جگہ شراب کے خم توڑ دیئے گئے - یہ کام صرف آیت سنتے ہی عمل میں لایا گیا اور جن لوگوں کے منہ میں شراب کے گھونٹ تھے وہ بھی انہوں نے تھوک دیئے' عین اس وقت جب وہ شراب پی رہے تھے اور ان کے منہ کے ساتھ پیالہ تھا - یہ تھی قرآن کریم کی فتح و کامرانی اور اسلامی نظام زندگی کی کامیابی - نہ کوئی جبر ہوا اور نہ کوئی تشدد -

لیکن یہ کام کیونکر ہو گیا؟ یہ معجزہ کس طرح رونما ہوا' جس کی کوئی نظیر انسانی تاریخ کے اندر نہیں ملتی - قانون سازی' ضابطہ بندی اور حکومت کے اقدامات کے اندر اس کی کوئی مثال نہیں ہے - کسی زمانے میں بھی اور کسی دور میں بھی - بہرحال یہ معجزہ رونما ہوا' اس لئے کہ ربانی نظام حیات نے انسانی نفس کا علاج کیا' اپنے مخصوص انداز میں' نفس انسانی پر ربانی اقتدار نافذ کیا - اس پر خدا ترسی کا نگران بٹھایا اور اللہ کا خوف ایک ایسا خوف ہوتا ہے کہ جس کے دل میں بیٹھ گیا وہ کسی وقت کسی جگہ ایک لمحے کے لئے بھی اس سے غافل نہیں ہو سکتا - یہ ربانی نظام تربیت انسان کو بحیثیت مجموعی لیتا ہے اور اس کی تربیت نہایت ہی فطری انداز میں کرتا ہے -

شراب نوشی کی حرمت کی وجہ سے ان کی اجتماعی زندگی کے اندر جو خلا پیدا ہو گیا تھا' اسلام نے اس خلا کو بعض اونچے مقاصد عطا کر کے پر کر دیا اور ان کو اپنے خالی اوقات میں شراب کی مدہوشی اور جاہلانہ فخر و مباہات کے اظہار کے مواقع ہی نہ چھوڑے اور محافل میں کبرو غرور کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہنے دی۔

وہ بلند مقاصد کیا تھے؟ مثلاً یہ کہ اسلام نے اس گم کردہ راہ اور دھتکاری ہوئی انسانیت کو جاہلیت کے بے آب و گیاہ صحراء اور اس کی تپتی ہوئی دوپہر اور اس کے تاریک ترین اندھیروں اور اس کی حقارت آمیز غلامی اور تنگ راہوں کی گھٹن سے نکالا اور اسے اسلام کے تروتازہ گلستان 'اس کی گھنی چھاؤں' اس کے روشن دنوں' اور اس کی عزت آب آزادیوں اور دنیا اور آخرت کی وسعتوں کے اندر داخل کر دیا۔

اسلام نے عربوں کی زندگی کے اس خلاء کو تروتازہ ایمان سے بھر دیا۔ عربوں کے دل میں ایک تازہ اور نوخیز شعور پیدا ہوا جو ان کے لئے نہایت ہی پیارا تھا۔ اس سے انہیں شراب نوشی کی آغوش میں پناہ لینے کی ضرورت ہی نہ رہی کہ وہ جھوٹے تخیلات میں گم ہو کر سکون پائیں' ان کے قلوب مشعل ایمان کے ساتھ ملاء اعلیٰ کی روشن دنیا کی طرف محو پرواز ہوں اور اللہ جل شانہ کے نور میں اور اللہ کے وصال اور اس کی معرفت میں زندگی بسر کر رہے ہوں۔ وصال باری تعالیٰ سے لذت آشنا ہوں اور اس لذت کی وجہ سے وہ اپنے منہ کے اندر موجود جرعہ شراب کو بھی زمین پر پھینک رہے ہوں۔ اور اس کے نشے اور مزے کو نظرانداز کر رہے ہوں' اور آخرکار اس کے جوش اور اس کے سکون دونوں سے نفرت کر رہے ہوں۔

اسلام نے ایک مسلمان کی شخصیت کو جاہلیت کی دبیز تہوں سے نکال دیا۔ اس کے لئے ایسی راہیں کھول دیں جو اسلام کی کنجی کے بغیر کھل ہی نہ سکتی تھیں۔ وہ اس کے میلانات اور رجحانات کے ساتھ چلا اور اسلام کے طریقوں اور راہوں پر چل کر پسندیدہ روش اختیار کی۔ نور پھیلاتے ہوئے' حیات نو عطا کرتے ہوئے' نظافت اور پاکیزگی پھیلاتے ہوئے' ہمت اور بیداری پیدا کرتے ہوئے' بھلائی کے لئے آگے بڑھتے ہوئے اور اللہ کے ساتھ عہد اور شرائط ایمان کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔

شراب جوئے کی طرح ہے اور یہ دونوں لہو و لعب کے جدید مظاہر و مشاہد کی طرح ہیں۔ مثلاً جمناسٹک کے جنونی طور طریقے' اور ان کے سٹیڈیم اور دوسرے اخراجات' دوڑوں کے مقابلے' سینما اور مرد و زن کے درمیان اختلاط' بیلوں کے مقابلے اور لہو و لعب کے وہ تمام نئے انداز جو جدید جاہلیت کے لوازمات ہیں' جسے صنعتی جاہلیت کہنا زیادہ مناسب ہے۔

یہ تمام مظاہر دراصل روحانی خلا کے مظاہر ہیں۔ یہ ایمان کی کمی کو پورا کرنے کی سعی لاحاصل ہے۔ بلند مقاصد اور بلند نصب العین کو پیش نظر نہ رکھنے کا نتیجہ ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ تہذیب جدید ایک مفلس اور تہی دامن تہذیب ہے اور اس جدید کلچر کے اندر انسان کی تمام ضروریات کا سازوسامان موجود نہیں ہے اور یہ روحانی خلا اور یہ بلند مقاصد کی تہی دامنی ہی ہے جس کی وجہ سے لوگ جوئے اور شراب کی گود میں پناہ لیتے ہیں۔ اس خلا کو جوئے' شراب اور دوسرے لہو و لعب سے بھرنے کی سعی کی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ مغربی کلچر اس خلا کو ہر قسم کے لہو و لعب اور غیر فطری سرگرمیوں سے بھر رہا ہے۔ جیسا کہ اوپر ہم نے تفصیلاً بتایا۔ یہ دو امور ایسے ہیں جن کی وجہ سے انسان بے شمار نفسیاتی

امراض میں مبتلا ہوتا ہے اور اخلاقی بے راہ روی اختیار کرتا ہے۔

یہ چند الفاظ تھے جن کے نتیجے میں شراب کے قلع قمع کرنے کا معجزہ صادر ہوا۔ یہ تو ایک نظام حیات تھا' یہ ایک منہاج تھا اور یہ منہاج ان کلمات کے اندر بیان ہوا تھا اور یہ منہاج اللہ رب العالمین کا بنایا ہوا تھا۔ یہ انسانوں کا بنایا ہوا نہ تھا اور یہ وہ نکتہ امتیاز ہے ان نظامہائے زندگی کے درمیان جو لوگوں کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں اور اس نظام کے درمیان جو اللہ کا بنایا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی نظام کامیاب نہیں ہوتے۔

یہ محض کلام اور طریقہ اظہار مقصد کا مسئلہ نہیں ہے۔ اظہار مافی الضمیر کے لئے تو بے شمار اسلوب ہیں۔ بعض فلاسفہ بہت ہی اچھا لکھتے ہیں' شعراء میں سے فلاں بہت ہی اچھا شعر کہتا ہے یا مفکرین میں سے فلاں بہت ہی اعلیٰ درجے کا فنکار ہے۔ یا فلاں بادشاہ ادب ہے اور ایسا لکھتا ہے کہ وہ صاحب طرز ہے' صاحب نظریات ہے اور فلسفے کی ایک نئی شاخ کا بانی ہے۔ لیکن لوگوں کے ضمیر پر اس کے الفاظ کا اثر نہیں ہوتا اس لئے کہ اس کلام پر اللہ کی جانب سے کوئی قوت القا نہیں ہوتی۔ (مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهٖ مِنْ سُلْطٰنٍ) حقیقت یہ ہے کہ ہر بات کے پیچھے ایک مقصد ہوتا ہے جو اسے قوت اور گرفت عطا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسانی منہاج حیات ضعیف' جہالت پر مبنی' نقائص سے بھرپور اور بنانے والے انسان کی ذاتی خواہشات پر مبنی ہوتا ہے۔

معلوم نہیں کہ اس حقیقت کو وہ لوگ کب پاسکیں گے جو لوگوں کی زندگیوں کے لئے خود نظام تجویز کرتے ہیں' جو اللہ علیم و خبیر کے نظام سے بالکل علیحدہ ہوتا ہے۔ اور وہ ایسے قوانین بناتے ہیں جو حکیم و خبیر نے نہیں بنائے اور وہ لوگوں کے لئے ایسے نشانات نصب کرتے ہیں جو خالق ارض و سما نے نصب نہیں کئے۔

معلوم نہیں کب یہ لوگ عقل کے ناخن لیں گے۔ وہ اپنے اس کبر و غرور سے کب باز آئیں گے؟ اب ہم اس آیت کریمہ کے متن کی طرف آتے ہیں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِىْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا (٤ : ٤٣)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ نماز اس وقت پڑھنی چاہئے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔ اور اسی طرح جنابت کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جاؤ' جب تک غسل نہ کر لو الا یہ کہ راستہ سے گزرتے ہو۔)

آیت میں اہل ایمان کو جس طرح شراب نوشی کی حالت میں نماز سے روکا گیا ہے' اسی طرح جنابت کی حالت میں بھی نماز سے روکا گیا ہے الا یہ کہ راستہ سے گزرتے ہو۔ جنابت کی حالت میں غسل ضروری ہے۔ لفظ (عابری سبیل) کے مفہوم میں مختلف اقوال ہیں۔ اسی طرح نماز کے قریب مت جاؤ کے مفہوم میں بھی اختلاف ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ جنابت کی حالت میں مسجد میں نہیں جانا چاہئے نہ مسجد میں ٹھہرنا چاہئے یہاں تک کہ ایک شخص غسل کرے۔ الا یہ کہ کوئی مسجد سے محض گزر رہا ہو۔ بعض لوگوں کے دروازے مسجد نبوی میں کھلتے تھے' اور ان کے گھر

کے آنے اور جانے کا راستہ مسجد ہی سے ہو کر گزرتا تھا' ایسے لوگوں کو مسجد سے حالت جنابت میں صرف گزرنے کی اجازت دے دی گئی تھی مگر ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی گئی اور نماز تو بہرحال ممنوع تھی' جب تک غسل نہ کرتے۔

ایک قول کے مطابق مفہوم یہ ہے کہ اس سے مراد نماز ہے۔یعنی یہ ممانعت کی گئی ہے کہ حالت جنابت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔جب تک غسل نہ کر لو' ہاں اگر تم مسافر ہو تو پھر بغیر غسل کے تم مسجد میں جاکر نماز ادا کر سکتے ہو مگر تیمم کے بعد' جو غسل کے قائم مقام ہو گا جس طرح پانی نہ ہونے کی شکل میں وضو کی جگہ تیمم جائز ہوتا ہے۔

پہلا قول زیادہ ظاہر اور قریب الفہم ہے۔اس لئے کہ دوسرے قول کے مطابق جو تفسیر بیان ہوئی اس میں بیان شدہ صورت کو خود اگلی آیت میں واضح کیا گیا ہے۔اگر (عابری سبیل) کی تفسیر یہ کی جائے کہ اس سے مراد مسافر ہیں تو اس صورت میں تکرار لازم ہو گا اور ایک ہی آیت میں تکرار بلاضرورت ہو گا۔

(وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا (٤ : ٤٣))

"اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم بیمار ہو' یا سفر میں ہو' یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے' یا تم نے عورتوں سے لمس کیا ہو' اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو' بے شک اللہ نرمی سے کام لینے والا اور بخشش فرمانے والا ہے۔"

اس آیت میں مسافر کی حالت کے بارے میں احکام بیان ہوئے ہیں' کہ جب کسی کو حاجت غسل لاحق ہو جائے' یا وضو کی ضرورت لاحق ہو جائے' اور وہ نماز ادا کرنا چاہتا ہو.... اسی طرح کوئی مریض ہو' اور اسے وضو کی یا غسل کی ضرورت پیش آ جائے یا کوئی قضائے حاجت سے فارغ ہو کر آیا ہو اور اسے وضو کی ضرورت ہو' یا اس نے عورتوں سے لمس کیا ہو.... ان سب صورتوں میں اگر پانی نہ ملے تو وہ پاک مٹی سے تیمم کر کے نماز پڑھے۔

الغائط کا مفہوم ہے' نشیبی جگہ۔چونکہ دیہاتی لوگ قضائے حاجت کے لئے نشیبی جگہ کو جاتے ہیں' اس لئے فعل قضائے حاجت کی تعبیر مکان فعل سے کر دی گئی۔اور (لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ) کی تفسیر میں بھی کئی اقوال ہیں :ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد مباشرت ہے' جس کی وجہ سے غسل واجب ہوتا ہے۔دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے حقیقی لمس مراد ہے یعنی چھونا۔یعنی مرد کے جسم کا کوئی حصہ عورت کے جسم سے مس کرے۔بعض فقہی مذاہب کے مطابق اس سے وضو لازم آتا ہے لیکن بعض کے نزدیک یہ ناقض وضو نہیں ہے' اس کی تفصیلات تو کتب فقہ میں پائی جاتی ہیں۔ہم یہاں اجمالاً بعض نتائج کا ذکر کرتے ہیں۔

(الف) لمس سے مطلقاً وضو واجب ہے۔

(ب) لمس سے اس وقت وضو واجب ہو گا جس لامس کے جسم میں اشتہاء پیدا ہو جائے اور اس طرح یہ بھی

شرط ہے کہ جس عورت کے ساتھ لمس ہو وہ بھی شہوت انگیزی کے قابل ہو۔

(ج) لمس سے وضو اس وقت واجب ہو گا جب لامس یہ محسوس کرے کہ اس لمس کی وجہ سے اس کا نفس متحرک ہو گیا ہے۔

(د) لمس سے مطلقاً" وضو واجب نہیں ہے اور نہ ہی بیوی سے معانقہ کرنے یا بوسہ لینے سے وضو واجب ہو گا۔

ان اقوال میں سے ہر قول کے قائلین نے نبی ؐ کے اقوال اور افعال سے استدلال کیا ہے جس طرح فقہی مسائل کے استدلال میں بالعموم کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں (لَمَسْتُمُ النِّسَآءَ) سے بطور کنایہ وہ فعل مراد ہے جس سے غسل لازم آتا ہے اس لئے ان اختلافات کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں ہے جو وضو کے سلسلے میں کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

ان تمام حالات میں' چاہے غسل واجب ہو یا وضو واجب ہو اور پانی دستیاب ہو یا پانی دستیاب نہ ہو لیکن اس کا استعمال موجب مضرت ہو اور انسان کے لئے اس کا استعمال ممکن نہ ہو تو وضو کرنے یا غسل کرنے کے بجائے انسان کے لئے تیمم جائز ہے۔ اور تیمم کا ذکر آیت کے الفاظ (فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا (٤: ٤٣)) (پس پاک مٹی سے تیمم کرو) میں آتا ہے۔ تیمم کے لفظی معنی قصد کرنے کے ہیں یعنی پاک مٹی کا ارادہ کر لو۔ صعید ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو مٹی کی قسم سے ہو مثلاً مٹی' پتھر' دیوار' اگرچہ مٹی سواری کی پشت پر ہو' یا فرش اور دوسری چیزوں پر جن پر غبار ہو اور جب ہاتھ مارا جائے تو غبار اڑ رہا ہو۔

تیمم کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھوں سے پاک مٹی کو تھپکی دے' پھر ہاتھوں کو جھاڑ دے اور چہرے پر مل دے۔ پھر دوسری تھپکی دے' ہاتھوں کو جھاڑ دے اور ان کو دونوں ہاتھوں پر کہنیوں تک مسح کر دے۔ اور یا صرف ایک ہی تھپکی سے چہرے اور دونوں ہاتھوں کو مسح کر دے۔ (مطابق اختلاف فقہاء) اس سے زیادہ مزید فقہی اختلافات کے لئے یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے کہ تیمم شروع ہی لوگوں کی آسانی کے لئے ہوا ہے اور یہ آسانی پیدا کرنے کی واضح مثال ہے۔

(اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا (٤: ٤٣)) (بے شک اللہ نرمی سے کام لینے والا اور معاف کرنے والا ہے۔) اس اختتامیہ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ اپنے بندوں کے ساتھ نرمی کرنے والا ہے۔ وہ ضعیف پر رحم دلی فرماتا ہے' قصوروں کو معاف فرماتا ہے' اور کوتاہیوں کو بخش دیتا ہے۔

---ooo---

اس سے پہلے کہ ہم اس آیت پر کلام ختم کریں یہاں چند امور پر نظر دوڑانا ضروری ہے۔ آیت نہایت ہی مختصر ہے لیکن اس پر غور ضروری ہے۔ مثلاً تیمم کی حکمت پر غور ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے دین میں کس قدر نرمی فرمائی ہے۔

بعض لوگ اسلامی شریعت کی حکمت اور اسلامی عبادات کے اسرار پر جب کلام کرتے ہیں تو وہ اس قدر آگے چلے جاتے ہیں اور احکام کے علل اور حکم بیان کرتے وقت یہ تاثر دیتے ہیں کہ گویا انہوں نے شریعت کے تمام رازوں کا استقصاء کر لیا ہے اور اب ان احکام اور عبادات کے پیچھے مزید کسی حکمت کی تلاش کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآنی آیات' شرعی احکام اور اسلامی عبادات پر کلام کرنے کا یہ انداز نہایت ہی غیر صحت مندانہ ہے۔ ہاں یہ اور بات کہ کسی شرعی حکم کی

علت اور حکمت خود منصوص ہو اور اس کی صراحت خود شارع نے کر دی ہو ۔ مناسب یہ ہے کہ ہم کہیں کہ یہ ہے وہ بات جسے ہم بطور حکمت حکم یا بطور علت حکم سمجھ سکے ہیں ۔ ایسے مزید اسرار بھی ہو سکتے ہیں کہ ابھی تک اللہ تعالیٰ نے ہم پر ان کو منکشف نہ کیا ۔ صرف اسی طرح ہم عقل انسانی کو اپنے صحیح مقام تک محدود رکھ سکتے ہیں شرعی نصوص کے حوالے سے بغیر افراط اور تفریط کے اور اپنے دائرے اور حدود کے اندر رہتے ہوئے ۔

میں یہ کہوں گا کہ بعض اہل اسلام لوگوں کے سامنے آیات و احادیث پیش کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ان کی متعین حکمت بھی بیان کرتے ہیں ' ان لوگوں میں بعض مخلصین بھی شامل ہیں ۔ یہ حکمت انسانی علم یا دور جدید کے سائنسی انکشافات پر مبنی ہوتی ہے ۔ یہ بات بذات خود کوئی بری بات نہیں ہے لیکن اس حکمت کو اپنے حدود کے اندر رہنا چاہئے ۔ وہ حدود یہ ہیں جس کی طرف گزشتہ سطور میں ہم نے اشارہ کیا ہے ۔

اکثر اوقات اس بات کا ذکر کیا جاتا ہے کہ نماز سے پہلے وضو اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ یہ صفائی کا ایک ذریعہ ہے ۔ یہ مقصد بھی پیش نظر ہو سکتا ہے لیکن یہ کہنا کہ وضو سے مقصود صرف صفائی ہی ہے اور کچھ نہیں تو یہ نہج کلام غیر صحت مندانہ ہو گا اور ویسے بھی یہ کوئی صحیح طرز استدلال نہیں ہے ۔ اس لئے کہ اب ایسا وقت بھی آگیا ہے کہ بعض نام نہاد دانشور یہ کہنے لگے ہیں کہ صفائی حاصل کرنے کا یہ نہایت ہی ابتدائی تصور اور طریقہ تھا ' اب اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ آج کل صحت و صفائی کے دوسرے ذرائع بہت ہی عام ہیں ۔ آج لوگ صفائی و صحت کو اپنے روز مرہ کے پروگرام کا حصہ بنا رہے ہیں ۔ اگر وضو کا مقصد صرف حصول صفائی ہے تو اب وضو کی ضرورت کیا ہے بلکہ اب تو نماز کی ضرورت بھی نہیں ہے ۔

اکثر لوگ نماز کی حکمت کے سلسلے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ ورزش کی حرکات ہیں جس سے پورا جسم حرکت کرتا ہے ۔ بعض لوگوں نے یہ لکھا ہے کہ نماز کی وجہ سے انسان کی زندگی منظم ہو جاتی ہے اور وہ ایک منظم زندگی گزارنے کا عادی ہو جاتا ہے کیوں کہ نماز مقررہ وقت پر ادا ہوتی ہے اور اس کے اندر مقررہ انداز میں رکوع اور سجود ہوتے ہیں ۔ اس میں صفیں اور امامت ہوتی ہے ۔ یہ حکمت بھی ہوتی ہے کہ نماز کے ذریعے انسان خدا تک پہنچتا ہے اور اللہ کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں ۔ یہ تمام حکمتیں مقصود ہو سکتی ہیں لیکن ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ان میں سے کونسی حکمت مراد ہے یا یہی حکمت مقصود ہے ؟ اگر ہم کوئی بات متعین کر کے کہیں تو یہ انداز غیر صحت مندانہ ہو گا اس لئے کہ ایک ایسا وقت بھی آیا کہ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ نماز کی ورزشی حرکات کی اب کیا ضرورت ہے ۔ اب تو ورزش ایک فن بن چکی ہے اور ہر شخص اس پر عمل کر سکتا ہے ۔

اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اب محض زندگی کو منظم کرنے کے لئے ہمیں نماز کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ نماز سے بھی زیادہ فوجی نظام کے ذریعے زندگی کو منظم اور باقاعدہ بنایا جا سکتا ہے ۔

بعض لوگ تو ایسے پیدا ہوگئے جنہوں نے یہ قرار دیا ہے کہ تعلق باللہ کے لئے بھی نماز کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اتصال باللہ بذریعہ تنہائی اور مراقبہ بھی ممکن ہے اور اب نماز جیسی ورزشی حرکات کی ضرورت نہیں ہے ' اس لئے کہ جسمانی حرکات بعض اوقات روحانی تصور اور مراقبے کی راہ میں حائل ہوتی ہیں ۔

ان خطوط پر اگر ہم ہر عبادت اور ہر حکم کے اسرار و رموز متعین کرتے جائیں اور ہر حکم کی علت اپنے فہم و ادراک

سے متعین کرنے لگیں یا جدید سائنسی انکشافات کے اندر حکمتوں کی تلاش کریں اور پھر یہ اعلان کریں کہ یہی وہ حکمت ہے جو اس حکم کے اندر پنہاں ہے یا اس حکم کا یہی سبب اور علت ہے تو یقیناً ہم صحت مند لائن سے ہٹ جائیں گے اور ان لوگوں کے لئے راہ کھول دیں گے جو نام نہاد دانشور ہیں' اور پھر خود ہماری یہ قرار دادیں اور فیصلے' ضروری نہیں ہے کہ درست ہوں۔ ان میں غلطی بھی ممکن ہے خصوصاً جب ہم ان حکمتوں کو سائنسی انکشافات سے مربوط کر دیں' اس لئے کہ سائنسی علوم و نظریات آئے دن بدلتے رہتے ہیں اور ہر وقت یہ نظریات تصیح اور تبدیلی کے قابل ہوتے ہیں اور ان میں ترمیم و تنسیخ کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔

یہاں زیر بحث موضوع تیمم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وضو اور غسل کی حکمت صرف نظافت ہی نہیں ہے۔ اگر یہی بات ہوتی تو ان دونوں کی جگہ تیمم نہ لیتا۔ کیونکہ اس سے کوئی صفائی حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم نظافت کے علاوہ بھی وضو اور غسل کی کوئی حکمت تلاش کریں جو وضو اور غسل کی طرح تیمم میں بھی ہو۔

ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہم خود اس غلطی کا ارتکاب کریں جس کی نشاندہی ہم خود کر رہے ہیں۔ لیکن ہم یہ کہیں گے کہ ہو سکتا ہے کہ حکمت یہ ہو کہ انسان اپنے آپ کو نفسیاتی اعتبار سے نماز کے لئے تیار سمجھے۔ اور یہ تیاری کسی سگنل پر مبنی ہو اور اس سگنل کے ذریعہ انسان اپنی روز مرہ کی حرکات و سکنات کو ترک کر کے اللہ کے دربار میں حاضری اور ملاقات کی فضا میں داخل ہو جائے اور وضو' غسل اور تیمم اس داخلہ کے لئے سگنل ہوں اور اگر وضو اور غسل نہ ہو تو تیمم ہی سگنل ہو جائے۔

اصل حقیقت تو اللہ تعالیٰ کے کامل اور ہرچیز پر حاوی علم ہی میں ہے' جو انسان کی اندرونی پوشیدہ باتوں پر بھی محیط ہے۔ انسان کے طور طریقوں اور خفیہ راہوں سے وہی باخبر ہے' جو لطیف و خبیر ہے۔ ہمارا فرض تو یہ ہے کہ ہم اللہ کے احکام کی اطاعت نہایت ہی ادب و احترام سے کریں جو نہایت ہی برتر اور بالا ہے اور عظیم اور بزرگ ہے۔

یہاں ہمارے لئے دوسرا لمحہ فکریہ یہ ہے کہ اسلامی نظام میں نماز کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اسلام ہر قسم کے عذر اور رکاوٹ کو دور کرنے کی سعی کرتا ہے۔ تیمم اس سلسلے کی ایک واضح مثال ہے کہ وضو اور غسل کی جگہ اس کی اجازت دی گئی جبکہ مشکلات ہوں۔ یہ ایک واضح مثال ہے جس سے معلوم ہوتا کہ اسلام ہر معاملے میں آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ مثلاً اگر پانی نہ ہو یا بیماری ہو یا پانی کم ہو اور پینے کی ضروریات سے زیادہ نہ ہو۔ سفر میں بعض اقوال کے مطابق پانی موجود ہونے کے باوجود تیمم جائز ہے۔

یہ باتیں ذہن میں رکھتے ہوئے اور اسی سورت میں صلوۃ الخوف کی کیفیات کا مطالعہ کرتے ہوئے' خصوصاً میدان جنگ میں' یہ بات بڑی سہولت سے معلوم ہو جاتی ہے کہ اسلامی نظام حیات نماز کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ مسلمان نماز سے کسی صورت میں بھی اور کسی وجہ سے بھی جدا نہیں ہو سکتا۔ مرض میں بھی نماز کی ادائیگی کے لئے یہ سہولت پیدا کی گئی ہے کہ بیٹھ کر پڑھا جائے۔ بصورت معذوری ایک پہلو پر لیٹ کر بھی پڑھی جا سکتی ہے اور اگر حرکت ممکن ہی نہ ہو تو آنکھوں کے اشارے سے بھی نماز ادا ہو سکتی ہے۔

یہ خدا اور بندے کے درمیان ایک رابطہ ہے۔ ایک ایسا رابطہ کہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتے کہ کسی طرح بھی ایک مومن کا خدا کے ساتھ یہ رابطہ ٹوٹ جائے اس لئے کہ اللہ کو معلوم ہے کہ خود بندے کو اس رابطے کی ضرورت ہے۔ اللہ تو

دونوں جہانوں سے مستغنی ہے۔ لوگوں کی نماز و عبادت سے اس کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ فائدہ اگر ہے تو بندے کا ہے کہ وہ نماز سے سلجھ جاتا ہے۔ یہ بھی بندوں کا فائدہ ہے کہ وہ اللہ سے رابطہ قائم کرلیں اور اپنی مشکلات میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کریں۔ ان کو دلی خوشی نصیب ہو' ان کے جسم اور شخصیت میں نورانیت پیدا ہو' ان کو یہ شعور اور احساس ہو کہ وہ اللہ کی حفاظت میں ہیں' اس کے قریب ہیں' اس کی نگہبانی میں ہیں اور وہ ایسی راہ پر ہیں جو ان کی فطرت کے عین مطابق ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی فطرت کا سب سے زیادہ علم ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہ بھی علم ہے کہ ان کے لئے اور ان کی فطرت کے لئے کیا کیا مفید ہے اور کیا کیا غیر مفید ہے؟ اس لئے کہ وہ خالق اور صانع ہے اور اپنی مصنوعات اور مخلوقات سے وہ اور لوگوں کے مقابلے میں زیادہ خبردار ہے۔ وہ نہایت ہی باریک بین اور بصیر ہے۔

اس آیت کی بعض دیگر تعبیرات میں بھی ہمارے لئے ایک سبق ہے۔ اگرچہ یہ نہایت ہی مختصر آیت ہے لیکن اس میں بہترین انداز تعبیر کے ساتھ معانی کا سیل رواں نظر آتا ہے۔ قضائے حاجت کے عمل کے لئے (اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ (۴: ۴۳)) (تم میں سے کوئی نشیبی جگہ سے آیا ہو) کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ نہ کہا کہ تم نے یہ فعل کیا ہو' صرف یہ کہا کہ تم نشیبی جگہ سے واپس آئے ہو۔ اشارہ و کنایہ اس طرف ہے کہ تم قضائے حاجت سے آئے ہو۔ اس میں بھی مخاطبوں سے نہیں کہا کہ تم آئے ہو بلکہ تم میں سے کوئی شخص آیا ہو (اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ (۴: ۴۳)) کہا ہے۔ یہ نہیں کہا (جِئْتُمْ مِنَ الْغَآئِطِ) قرآن کے الفاظ زیادہ ادیبانہ اور مہذبانہ ہیں اور ان میں کنایہ لطیف ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو اپنے درمیان اسی طرح کی سلجھی ہوئی گفتگو کرنا چاہئے۔

مرد اور عورت کے باہم تعلقات کے بارے میں کس قدر مہذب انداز گفتگو ہے۔ (اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (۴: ۴۳)) (یا تم نے بیویوں کے ساتھ لمس کیا ہو) تعلق زن و شو کی تعبیر چھونے کے لفظ سے زیادہ نرم' زیادہ پرکیف اور مہذبانہ محسوس ہوتی ہے۔ ملامست تو کبھی اصل فعل کے لئے مقدمہ یا آغاز ہے یا فعل ہی کو ملامست کہا جاتا ہے۔ بہرحال یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تعلیم تہذیب ہے کہ ایسے معاملات کے اندر یہ انداز گفتگو ہونا چاہئے' جبکہ ننگی زبان استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

پھر مٹی کے ساتھ صفت پاک (صَعِيْدًا طَيِّبًا) کا اضافہ کیا گیا۔ اشارہ یہ ہے کہ پاک چیز طیب ہوتی ہے اور ناپاک چیز خبیث ہوتی ہے۔ یہ نہایت ہی باریک اشاریت ہے اور لطیف مفہوم ہے جو ذہن کے اندر بہت جلد داخل ہوجاتا ہے۔ پاک ہے وہ ذات جو نفس انسانی کی خالق ہے اور ان کے بارے میں سب سے زیادہ جاننے والی ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۳۴ ایک نظر میں

اس سبق کے ساتھ ہی اس معرکہ آرائی کا آغاز ہو جاتا ہے ' جو قرآن کریم نے جماعت مسلمہ اور اس جاہلیت کے درمیان برپا کرادی تھی جو مدینہ کے گرد و نواح میں پھیلی ہوئی تھی ۔ خصوصا مدینہ کے یہودی قبائل اور امت مسلمہ کے درمیان ۔ یہ وہی معرکہ ہے جسے اس سے پہلے سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران میں تفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں ' وہی میدان کارزار یہاں بھی ہے اور یہ وہی دشمن کیمپ ہیں ' جن کے بارے میں آغاز سورہ بقرہ ' سورہ آل عمران کے مقدمے اور اس سورہ کے مقدمے میں بھی ہم بیان کر آئے ہیں ۔

اس سبق سے اب اہل ایمان اور ان کے خارجی دشمنوں میں معرکہ آرائی شروع ہوتی ہے ۔ یہ دشمن مدینہ کی اسلامی ریاست اور اسلامی جماعت کے اردگرد پھیلے ہوئے تھے لیکن خارجی معرکے کا آغاز ان معنوں میں نہیں ہے کہ پہلے جو مضامین گزر گئے ان کا ان دشمنوں کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا بلکہ اس سے قبل جو اجتماعی ' اقتصادی ' خاندانی اور اخلاقی کارروائیاں کی گئیں اور جدید اسلامی معاشرے کے جو خدوخال متعین کئے گئے تھے اور اس کے لئے جو خطوط کھینچے گئے تھے یہ سب امور تحریک اسلامی کے خارجی دشمنوں اور مخالف کیمپوں سے لاتعلق نہ تھے ۔ یہ کیمپ مدینہ کے اردگرد اور جزیرۃ العرب میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے تھے ۔ یہ تمام اقدامات ان کیمپوں کے ساتھ بھرپور اور فیصلہ کن معرکے کے لئے بطور اخلاقی تیاری کے کئے گئے تھے اور اس کے لئے تمہید تھے ۔ اس سورہ کے اندر ذکر شدہ تنظیمی امور دراصل جدید اسلامی خطوط پر اس جدید معاشرے کی تعمیر کے لئے تھے تاکہ وہ ان کیمپوں کے ساتھ اچھی طرح مقابلہ اور معرکہ آرائی کر سکے ۔

سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کے مطالعے کے دوران ہم نے بتایا تھا کہ ان سورتوں میں اسلامی معاشرے کو داخلی طور پر مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی گئی تھی ۔ خصوصا اسلام کے نظریاتی تصورات کا بیان ' اسلام کے اخلاقی نقطہ نظر کی وضاحت ' اسلامی نظام قانون اور اسلامی معاشرے کا عام طرز عمل اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی جماعت کو دشمنوں کے بارے میں علمی اور تاریخی مواد سے مسلح کرنا وغیرہ وغیرہ ۔ یہ بھی بتایا گیا کہ وہ سچائی کے مقابلے میں کیا کیا ہتھیار لے کر آتے ہیں ۔ وہ کیا کیا مکاریاں کرتے رہے ہیں اور یہ کہ جماعت مسلمہ کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ ان دشمنوں کے مقابلے میں نہایت ہی اطمینان قلب ' نہایت ہی ہشیاری اور نہایت ہی پختہ عزم اور نہایت ہی بصیرت و عزیمت کے ساتھ میدان میں آئے ۔ وہ اس مقابلے کی نوعیت سے بھی باخبر ہو اور جن لوگوں کے ساتھ اس کا واسطہ ہے ان سے بھی باخبر ہو ۔ یہی مضامین اس سورہ میں بھی بیان ہوئے ہیں ۔

دشمنوں کے ان تمام کیمپوں میں گھری ہوئی تحریک اسلامی ' قرآن کریم کے زیر کمان ان کے ساتھ ہمہ جہت معرکہ آرائی میں مشغول تھی ۔ یہ معرکہ آرائی انسان کے ضمیر اور شعور میں بھی برپا تھی ' جہاں یہ تحریک ایک جدید عقیدے اور

اپنے رب کی ایک جدید معرفت اور پہچان پیدا کر رہی تھی اور انسانی فطرت کو جاہلیت کے افکار غلط کی گرد و غبار کے نیچے سے نکال رہی تھی۔ نفس انسانی اور شعور انسانی سے جاہلی خدوخال مٹا کر ان کی جگہ اسلام کے روشن اور خوبصورت خدوخال اجاگر کر رہی تھی۔ اس کے بعد پھر داخلی اور خارجی معرکے ان مخالف کیمپوں کے ساتھ برپا تھے' یہودی کیمپ ' منافقین کے کیمپ اور پورے جزیرۃ العرب کے مشرکین کے کیمپ۔ داخلی تطہیر افکار کے بعد تحریک اسلامی ان کیمپوں کے ساتھ پنجہ آزمائی کے لئے اچھی طرح تیار تھی' بلکہ یہ ان پر فوقیت حاصل کر چکی تھی' کیونکہ داخلی طور پر اس نے جدید اسلامی کیمپ کو اخلاقی' نظریاتی' اجتماعی اور تنظیمی اعتبار سے نہایت ہی پختہ اور متین کر دیا تھا۔

اسلامی معاشرے کو مدینہ میں قائم اپنے ارد گرد جاہلی معاشروں پر' جن میں مدینہ کا یہودی معاشرہ بھی شامل تھا' روحانی' اخلاقی' اجتماعی اور تنظیمی برتری حاصل تھی جو قرآنی اور ربانی تربیت کے نتیجے میں حاصل ہوئی تھی۔ یہ برتری اسلامی معاشرے کو عسکری' مادی اور اقتصادی اعتبار سے ان جاہلی معاشروں کے برتری حاصل کرنے سے قبل حاصل ہو گئی تھی۔

تحریک اسلامی مخالف کیمپوں پر عسکری اور مادی و اقتصادی ترقی کبھی بھی حاصل نہ کر سکتی تھی کیونکہ مخالف اسلام کیمپ ہمیشہ تعداد عساکر' مقدار اسلحہ اور مالی وسائل کے اعتبار سے اسلامی محاذ سے اکثر و بیشتر برتر رہا۔ جزیرۃ العرب کے اندر بھی یہی صورت حال رہی اور جزیرۃ العرب کے باہر کی عظیم فتوحات کے اندر بھی یہی کیفیت رہی۔ اسلامی کیمپ کو اگر برتری حاصل تھی تو وہ فقط روحانی' اخلاقی اور اجتماعی نظم و نسق کے اعتبار سے تھی۔ یہی بہتری اس کی سیاسی فتح کا سبب تھی اور یہ برتری تحریک اسلامی کو ربانی نظام تربیت کی وجہ سے حاصل ہوئی جو قرآن کی زیر نگرانی تھا۔

اس روحانی' اخلاقی اور اجتماعی برتری ہی کے نتیجے میں پھر سیاسی قیادت کی برتری تھی جس کی وجہ سے اسلام نے اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی جاہلیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ پہلے اسلام نے جزیرۃ العرب سے جاہلیت کا استیصال کیا۔ اس کے بعد وقت کی دو عظیم سلطنتوں قیصر اور کسریٰ کو نیست و نابود کیا اور پھر پورے کرۂ ارض کے اطراف و جوانب میں گھوڑے دوڑائے۔ یہ تاخت و تاراج کبھی تو تلوار و سنان سے تھی اور کبھی اذان اور قرآن سے تھی۔

اگر یہ صریح برتری' تحریک اسلامی کو حاصل نہ ہوتی تو یہ معجزہ ہرگز برپا نہ ہوتا جس کی انسانی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ تاریخ کی مشہور فتوحات بھی اس کی نظیر نہیں ہیں۔ مثلاً تاتاریوں کی تاخت و تاراج اور جدید تاریخ میں ہٹلر کی فتوحات' اس لئے کہ اسلامی فتوحات محض فوجی فتوحات ہی نہ تھیں۔ اسلام نے نظریاتی اور ثقافتی فتح بھی حاصل کی اور لوگوں کی زبان اور تہذیب و تمدن کو بھی بدل ڈالا۔ اس اعتبار سے اسلامی فتوحات کو واضح برتری حاصل ہے۔ بغیر اس کے کہ کسی قوم پر کوئی جبر کیا گیا ہو' لوگوں کی زبانیں اور ان کے رسم و رواج بدل گئے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی کوئی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی' نہ قدیم میں اور نہ ہی جدید میں۔

اسلامی فتوحات دراصل ہمہ گیر انسانی برتری تھی' کیونکہ اس میں مکمل انسانی خصوصیات اور انسانی عناصر موجود تھے۔ اس کی وجہ سے گویا انسان کو دوسرا جنم ملا تھا۔ یہ ایک ایسا انسان تھا' جس سے یہ کرۂ ارض یقینی طور پر ناآشنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاں تک رسائی حاصل کی اس نے لوگوں کو اپنے رنگ میں رنگ دیا اور ان معاشروں پر اپنی پختہ چھاپ لگا دی۔ اسلامی نظریاتی اور سماجی تحریک نے ان سماجوں کو بھی بالکل نابود کر دیا جو صدیوں سے قائم تھے۔ مثلاً مصر میں

فرعونی تہذیب' بابل اور اشوریا کے قدیم معاشرے جو عراق میں قائم تھے' شام میں فنیقی اور سریانی سماج جو صدیوں سے قائم تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلام کے سماجی تصورات انسانی فطرت میں نہایت ہی گہرائی تک پیوستہ تھے اور نفس انسانی کے اندر وہ دور تک رچے بسے تھے۔ اس کے اصول عظیم اور اس کے رجحانات نہایت ہی وسیع تھے اور انسان کی زندگی کے لئے اسلامی نظام تمام نظریات اور تہذیبوں سے زیادہ اصولی تھا۔

اسلام جہاں گیا' لوگوں کی زبان تک بدل گئی اور پھر عربی ان علاقوں کی مادری زبان بن گئی۔ یہ ایک عجیب اور بے مثال انقلاب تھا۔ اس سلسلے میں جس قدر علمی تحقیقات کی ضرورت تھی اور جس قدر غور و فکر کی ضرورت تھی' مسلمانوں نے یہ ابھی تک نہیں کیا ہے۔ میرے خیال میں عقائد و نظریات کی وسعت اور پھیلاؤ کے مقابلے میں یہ امر نہایت ہی حیرت انگیز ہے۔ اس لئے کہ زبان انسان کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے۔ انسان کے اجتماعی سماجی تعلقات زبان کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں اور زبان کا ایسا تغیر ہمیشہ ایک معجزہ تصور ہوتا ہے۔ یہ معجزہ صرف عربی زبان کا معجزہ نہیں ہے۔ عربی زبان پہلے سے جزیرۃ العرب میں قائم تھی لیکن اسلام سے پہلے یہ زبان اس کرۂ ارض کے کسی خطے میں یہ معجزہ نہ دکھا سکی۔ یہی وجہ ہے کہ میں عربی کو اسلامی زبان کہتا ہوں اس لئے کہ عربی زبان میں قرآن کریم کے بعد جو قوت پیدا ہوئی اور جو اسلام کے ہاتھوں اس کرۂ ارض پر پھیل گئی تو یہ معجزہ عربی زبان کا نہ تھا بلکہ اسلامی نظام کا معجزہ تھا۔

ایک دوسرا معجزہ جو اسلامی فتوحات نے دکھایا وہ یہ تھا کہ ممالک مفتوحہ کے اندر خفتہ صلاحیتوں کو جگایا' ان صلاحیتوں کا اظہار اس جدید زبان میں ہونے لگا۔ ان مفکرین نے اپنی اصلی زبانوں کو استعمال نہ کیا۔ انہوں نے دین اسلام کی زبان کو یعنی عربی زبان کو استعمال کیا' اور ان مفکرین نے زندگی کے ہر شعبے میں وہ علمی اور ثقافتی ذخیرہ پیدا کیا جس کے اندر پوری اصلیت (Orignality) پائی جاتی ہے۔ حالانکہ ان مفکرین نے اپنی اصلی زبان کو چھوڑ کر جدید عربی زبان کو استعمال کیا' ان لوگوں کی زبان میں عربی زبان کی مشکلات کے باوجود کوئی تعقید نہیں ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ ان مفتوحہ علاقوں کے مفکرین اور ذہین لوگوں کی اصلی مادری زبان ہی عربی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی فتوحات کا مقصد حریت' آزادی اور نئی روشنی کو پھیلانا تھا' دوسرے عربی زبان کے اندر جو سرمایہ تھا وہ عظیم تھا' وہ انسانی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ فکری سرمایہ تھا' وہ لوگوں کے قلب اور ذہن کے بالکل قریب تھا۔ اس کے مقابلے میں قدیم ثقافتوں اور سماجوں کے اندر کچھ نہ تھا اور قدیم زبانیں تہی دامن تھیں۔

یہ سرمایہ بھی کیا تھا' جو زبان عرب کو ملا؟ یہ روحانی' عقلی' اخلاقی اور اجتماعی تعمیر و تربیت کا سرمایہ تھا جو اسلامی نظام حیات نے اس زبان کو عطا کیا تھا اور نہایت ہی مختصر عرصے میں۔ یہ سرمایہ اس قدر عظیم تھا' اس قدر گہرا تھا' فطرت انسانی کے ساتھ اس قدر پیوست تھا کہ اس نے اسلامی عساکر کی تاخت و تاراج کے ساتھ اسلامی زبان کو بھی فتوحات بخشیں اور اس زبان کے مقابلے میں کوئی زبان ٹھہر نہ سکی۔ یہ ہے وہ حقیقی وجہ اور اس کے بغیر ہم اس تاریخی معجزے کی تشریح نہیں کر سکتے۔ بہرحال یہ ایک طویل اور وسیع موضوع ہے۔ اور ظلال القرآن کے اس مقام پر ہمارے لئے بس اسی قدر کہنا کافی ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۳۴ تشریح آیات

۴۴ -- تا -- ۵۷

مدینہ کی نوخیز تحریک اسلامی کا جو گھیراؤ مخالف اسلام کیمپوں نے کر رکھا تھا' اس سبق کے ساتھ ان کیمپوں کے خلاف یہاں معرکہ آرائی شروع ہو رہی ہے ۔ اس سبق کے اندر اس بات پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے کہ مدینہ کے یہودی اس دین جدید اور جماعت مسلمہ کے خلاف کیا کیا اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں ۔ اس سے اگلے سبق میں بتایا گیا ہے کہ جماعت مسلمہ کے فرائض کیا ہیں اور یہ کہ اسلامی نظام کا مزاج کیا ہے' اسلام کی تعریف کیا ہے اور ایمان کی شرائط کیا ہیں جس کی وجہ سے اسلامی زندگی اور اسلامی نظام حیات دوسرے لوگوں کی زندگی اور نظام سے متمیز ہوتا ہے ۔ اس سے پھر اگلے سبق میں جماعت مسلمہ کو خبردار کیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ وہ اسلامی نظام کے نفاذ' اپنی صورت حالات کی درستی اور اپنے وجود کو بچانے کے اقدامات کرے ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اس کے منافق دشمن اس کے خلاف خفیہ سازشوں میں مصروف ہیں ۔ جماعت مسلمہ کو بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے اندرونی اختلافات کی طرف بھی متوجہ ہو اور ان دفاعی اقدامات پر بھی غور کرے جو اسے اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے دشمن کیمپوں کے مقابلے میں کرنے ہیں ۔ اس میں قانون بین الاقوام کے سلسلے میں بعض ہدایات بھی ہیں ۔ اس کے اگلے سبق میں ایک یہودی کا معاملہ آتا ہے جس کے ساتھ اسلامی معاشرے میں' تمام دشمنیوں سے بلند ہو کر معاملہ کیا گیا ۔ اس سے اگلے سبق میں شرک اور مشرکین کے ساتھ دو دو ہاتھ کئے گئے ہیں اور ان بنیادوں کو حقارت آمیز انداز میں بیان کیا گیا ہے جن کے اوپر مشرک معاشرہ قائم تھا ۔ اس معرکے کے درمیان بعض ہدایات داخلی تنظیم کے بارے میں بھی دی گئی ہیں جن کا تعلق' ابتدائے سورہ کے مضامین بابت خاندانی نظام کے ساتھ ہے ۔ اب اس پارے کا آخری سبق آتا ہے جو نفاق اور منافقین کے ساتھ خاص ہے ۔ یہ سبق فیصلہ کرتا ہے کہ منافقین آگ میں سب سے نیچے درجے میں ہوں گے ۔

ان سرسری اشارات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت تحریک اسلامی کو داخلی اور خارجی محاذوں پر کس قدر ہمہ جہت لڑائی کا سامنا تھا ۔ اور پہلی تحریک اسلامی کو کس طرح بیک وقت داخلی اور خارجی محاذوں پر کام کرنا پڑ رہا تھا ۔ اس لئے کہ داخلی محاذ اور خارجی محاذ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک اور پیوستہ تھے ۔ اور یہی معرکہ آج بھی عالمی تحریک اسلامی کو درپیش ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا ۔ اس لئے کہ اسلامی تحریک کی اساس اور حقیقت ایک ہے ۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يَشْتَرُونَ
الضَّلَالَةَ وَيُرِيدُونَ أَن تَضِلُّوا السَّبِيلَ ﴿٤٤﴾ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَائِكُمْ ۚ
وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَلِيًّا وَكَفَىٰ بِاللَّهِ نَصِيرًا ﴿٤٥﴾ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا
يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ
غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا
سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَقْوَمَ وَلَٰكِن
لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٤٦﴾

”تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جنہیں کتاب کے علم کا کچھ حصہ دیا گیا ہے؟ وہ خود ضلالت کے خریدار بنے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ گم کر دو۔ اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور تمہاری حمایت و مددگاری کے لئے اللہ ہی کافی ہے جن لوگوں نے یہودیت کا طریقہ اختیار کیا ہے ان میں کچھ لوگ ہیں جو الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دیتے ہیں اور دین حق کے خلاف نیش زنی کر کے اپنی زبانوں کو توڑ موڑ کر کہتے ہیں۔

(سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا) اور (وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ) اور (رَاعِنَا) حالانکہ اگر وہ کہتے۔ (سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا) اور (وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا) تو یہ انہی کے لئے بہتر تھا اور زیادہ راست بازی کا طریقہ تھا۔ مگر ان پر تو ان کی باطل پرستی کی بدولت اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں“

اس سورہ میں جن متعدد جگہ تعجب کا اظہار کیا گیا ان میں سے پہلی جائے تعجب تو یہ ہے کہ اس کا خطاب رسول اللہ ؐ کو ہے اور اہل کتاب سے مراد یہودی ہیں جبکہ مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو ایسا موقف اختیار کرتے ہیں جو انوکھا اور تعجب خیز ہو۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يَشْتَرُونَ الضَّلَالَةَ وَيُرِيدُونَ أَن تَضِلُّوا السَّبِيلَ (٤٤) ”تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جنہیں کتاب کے علم کا کچھ حصہ دیا گیا ہے؟ وہ خود ضلالت کے

خریدار بنے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ گم کر دو۔"

چونکہ ان کو کتاب دی گئی تھی اس لئے ان کے شایان شان تو یہ تھا کہ وہ فوراً ہدایت قبول کرتے ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے بڑے پیغمبر تھے اللہ نے انہیں تورات دی تھی ۔ تاکہ انہیں وہ ان کی ضلالت سے نکالے اور ان کے لئے نور اور ہدایت ہو۔ لیکن وہ اپنی اس قسمت سے انکاری ہیں اور ہدایت چھوڑ کر ضلالت کے خریدار بن گئے ہیں ۔ خریداری سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے ضلالت لینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے ' ان کی نیت ہی یہ ہے اسی لئے انہوں نے ہدایت کو ترک کر کے گمراہی کو پسند کیا ہے ۔ ہدایت ان کے ہاتھوں میں ہے لیکن وہ اسے چھوڑ کر گمراہی اخذ کر رہے ہیں ۔ گویا وہ قصد و ارادہ سے یہ سودا کر رہے ہیں ' جہل اور خطا سے ایسا نہیں کر رہے ۔ اس لئے ایک عقلمند آدمی سے ایسی حرکت تعجب خیز اور بالکل انوکھی ہے اور قابل استکراہ ہے ۔

لیکن اس قابل تعجب صورت حال میں ہوتے ہوئے بھی وہ سمجھتے ہیں کہ وہ نگران بنے ہوئے ہیں ' حالانکہ الٹا وہ اس سعی میں لگے ہوئے ہیں کہ ہدایت یافتہ لوگ گمراہ ہو جائیں ' اہل اسلام جو صحیح راہ پر ہیں ان کو وہ گمراہ کر دیں ۔ وہ اسی مقصد کے لئے متعدد ذرائع اور وسائل اختیار کر رہے ہیں ' جن کی تفصیلات سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران میں گزر چکی ہیں ۔ اور ان کے کچھ نمونے اس سورہ میں بھی آگے آ رہے ہیں ۔ انہوں نے خود جو گمراہی خریدی ہوئی ہے وہ اس پر اکتفا نہیں کر رہے بلکہ ان کے ارد گرد جو شمع ہدایت روشن ہو چکی ہے وہ اسے بھی بجھانا چاہتے ہیں اور اس کے آثار تک مٹانے کے درپے ہیں کہ نہ ہدایت رہے اور نہ ہدایت پانے والے ۔

اس پہلی اور دوسری جھلکی میں اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کو متنبہ کیا ہے کہ یہودی تمہارے خلاف کیا کھیل کھیلنا چاہتے ہیں اور یہ کہ اسلام کے خلاف وہ کیا کیا تدابیر اختیار کرنا چاہتے ہیں ۔ کیا ہی اچھی تدبیر ہے یہ کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے خلاف اہل ایمان کے دلوں میں نفرت بٹھانا چاہتے ہیں ' جو مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے تھے ۔ اس وقت مسلمان اس ہدایت پر فخر کرتے تھے اور وہ ان لوگوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے جو ان کو اس قابل فخر و عزت پوزیشن سے لوٹا کر پھر جاہلیت کی طرف لے جانا چاہتے تھے ' جس کو وہ خوب جانتے تھے اور اسلام بھی اس جاہلیت سے اچھی طرح واقف تھا اور جو شخص بھی انہیں جاہلیت کی طرف لوٹا رہا تھا ' وہ اسے بہت ہی برا سمجھتے تھے ۔ اس دور میں قرآن ان لوگوں سے مخاطب تھا ' اللہ کے علم کے مطابق نازل ہو رہا تھا ۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں اس کی وقعت اور اہمیت تھی ۔

اس لئے اس کے بعد قرآن صراحتاً" بتاتا ہے کہ یہودیوں کی یہ سازش ہے اور تصریح کر دی جاتی ہے کہ یہ یہودی مسلمانوں کے دشمن ہیں ۔ اہل ایمان کو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ان کی اس مذموم کوشش کے مقابلے میں اللہ کی ہدایت اور نصرت پر ہی بھروسہ کریں ۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآءِكُمْ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا (٤٥) "اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور تمہاری حمایت و مددگاری کے لئے اللہ ہی کافی ہے ...." یوں صراحت کے ساتھ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ مدینہ میں جماعت مسلمہ اور یہودیوں کے درمیان دشمنی ہے ۔ اور ان کے درمیان متوازی خطوط متعین ہو جاتے ہیں .... اگرچہ تعجب کا اظہار تمام اہل کتاب کے بارے میں ہے لیکن اس آیت میں مدینہ کے یہودی ہی مراد ہیں ۔

کلام الٰہی نے فقط اشارے پر اکتفا نہ کیا بلکہ یہودیوں کا ذکر صراحت کے ساتھ کیا اور اس کے بعد ان کی سرگرمیوں اور سازشوں اور رسول اللہ ؐ کے بارے میں ان کی گستاخیوں کا تفصیلاً ذکر کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات ہجرت کے ابتدائی دور کے تھے اور ابھی تک مدینہ طیبہ میں اسلام کو اس قدر شوکت اور غلبہ نصیب نہ ہوا تھا۔

(مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا وَ اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ (٤ : ٤٦))

”جن لوگوں نے یہودیت کا طریقہ اختیار کیا ہے ان میں کچھ لوگ ہیں جو الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دیتے ہیں اور دین حق کے خلاف نیش زنی کر کے اپنی زبانوں کو توڑ موڑ کر کہتے ہیں۔ (سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا) اور (وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ) اور (رَاعِنَا) کلام الٰہی کے اندر توڑ پھوڑ کرتے ہوئے وہ حد سے گزر گئے تھے۔ وہ اللہ کی شان میں بھی گستاخی کرتے تھے اور اس طرح وہ کلام الٰہی کا سیدھا مفہوم کچھ سے کچھ بنا دیتے تھے۔ اس آیت کے مفہوم میں راجح بات یہ ہے کہ وہ تورات کی عبارتوں کو اس طرح بدلتے تھے کہ اس کے الفاظ کا مفہوم بدل جاتا۔ اور اس تحریف کا بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ حضور اکرم ؐ کی رسالت کے بارے میں تورات میں جو دلائل تھے ' ان کو تبدیل کر دیں اور ان احکام اور قوانین کو بدل دیں جن کو اسلامی شریعت نے بحال رکھا اور جن سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جس منبع سے تورات نازل ہوئی ہے ' اسی سے قرآن کریم نازل ہو رہا ہے۔ اور نتیجۃً یہ بات ثابت ہو رہی تھی کہ نبی اکرم ؐ کی رسالت برحق ہے۔ اور وہ ان باتوں کو اپنے مدلول سے اس طرح بدل دیتے کہ ان کی خواہشات کے مطابق مفہوم بن جاتا اور یہ صفت ان تمام لوگوں میں پائی جاتی ہے جو اپنے دین سے منحرف ہو جاتے ہیں اور ایسی تحریفات کرتے ہیں کہ جس سے اقتدار پر قابض لوگوں کو خوش کریں ' یا ان عوام الناس کو خوش کریں جو دین سے اپنے آپ کو چھڑانا چاہتے ہیں۔ یہودی ہمیشہ اس کام میں ماہر رہے ہیں اگرچہ ہمارے دور میں مسلمانوں کے اندر بھی بعض لوگوں نے یہ کام شروع کر دیا ہے اور یہ لوگ اس خصلت میں یہودیوں سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔

پھر یہ لوگ رسول خدا ؐ کی خدمت میں گستاخی کرتے ہوئے اس قدر آگے بڑھ گئے تھے کہ وہ کہتے ”ہم نے سنا اور نافرمانی کی“ اس لئے ہم نہ ایمان لاتے ہیں اور نہ اتباع کرتے ہیں اور نہ اطاعت کرتے ہیں۔ اس سے بھی اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ آیات مدینہ کے ابتدائی ایام میں نازل ہوئیں جہاں یہودیوں کو حضور ؐ کے مقابلے میں اس قدر بے باکانہ جرات ہو سکتی تھی۔ اس ظاہری انکار کے بعد وہ نہایت ہی بے ادبی ' نہایت ہی بداخلاقی پر اتر آئے اور حضور اکرم ؐ کی شان میں گستاخی کرنے لگے۔

بظاہر کہتے۔ (اسْمَعْ) (سنئے) (غَيْرَ مُسْمَعٍ) آپ کو کوئی یہ حکم نہیں دے سکتا کہ آپ (سنئے)۔ بظاہر تو یہ کلمہ تادیب تھا اور (رَاعِنَا) کا مفہوم یہ تھا کہ آپ ہماری رعایت کریں ' ہمارے حال کو مدنظر رکھیں۔ یعنی یہ کہ وہ اہل کتاب ہیں اور ان کو اسلام کی طرف اس طرح دعوت نہیں دی جانی چاہئے جس طرح عام مشرکین کو دی جاتی ہے۔ ان

اصل معنوں کو وہ زبان کے ہیر پھیر سے اس طرح بگاڑتے کہ (غَیْرَ مُسْمَعٍ) کا معنی یوں بن جاتا کہ آپ کی بات کوئی نہ سنے اور نہ آپ سن سکیں۔ (اللہ ان کو ذلیل کرے) اور (رَاعِنَا) کے لفظ کا اشتقاق وہ رعونت سے کرتے۔ یہ تھی ان کی بے شرمی اور بے حیائی اور بے ادبی اور ہیر پھیر اور مداہنت اور بات کا مفہوم بدلنا اور لفظ کا محل بدلنا وغیرہ۔

قرآن کریم یہودیوں کی ان کمزوریوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ بتاتا ہے کہ یہودی چونکہ اہل کتاب اور اہل ثقافت ہیں اور ان کا فرض یہ تھا کہ ان کا رویہ شریفانہ ہوتا اور تہذیب کے دائرے کے اندر وہ بات کرتے اس لئے کہ جن لوگوں کو کتاب کا حصہ ملا ہے' ان کو غیر اہل کتاب کے مقابلے میں نہایت ہی سلجھا ہوا ہونا چاہئے۔ یہ کہنے کے بعد ان کو یہ امید دلائی جاتی ہے کہ وہ ہدایت پاکر اچھی جزاء' اللہ کی جانب سے بھلائی اور فضل و کرم کے مستحق ہوں گے بشرطیکہ وہ سیدھے راستے پر آ جائیں۔ لیکن ان کا مزاج ہی ایسا نہیں رہا ہے اور ان پر اللہ کی لعنت ہوگئی ہے اور ان کی حالت یہ ہے۔

(وَلَوْ اَنَّھُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اسْمَعْ وَ انْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ وَ اَقْوَمَ وَلٰكِنْ لَّعَنَھُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِھِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۴ : ۴۶))

"حالانکہ اگر وہ کہتے۔ (سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا) اور (وَاسْمَعْ) اور (وَانْظُرْنَا) تو یہ انہی کے لئے بہتر تھا اور زیادہ راست بازی کا طریقہ تھا۔ مگر ان پر تو ان کی باطل پرستی کی بدولت اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔"

لیکن وہ سچائی کے مقابلے میں صاف اور قطعی بات نہیں کرتے اور اگر وہ صفائی کے ساتھ اس سچائی کو قبول کرتے اور صاف صاف بات کرتے اور کہتے "ہم نے سنا اور اطاعت کی" یا کہتے "سنئے اور ذرا ہمارا انتظار کیجئے" تو ان کے لئے یہ بہتر ہوتا اور ان کے مزاج اور ان کی نفسیات اور حالات کے زیادہ مطابق ہوتا۔ لیکن وہ اپنے کفر کی وجہ سے ہدایت سے دور بھاگتے ہیں' کم لوگ ان میں سے ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔

اللہ کی بات بہت ہی سچی ہے۔ اسلامی نظام حیات کو یہودیوں میں سے بہت ہی کم لوگوں نے قبول کیا اور اسلام کی طویل تاریخ اس پر گواہ ہے اور یہ قلیل تعداد بھی وہ تھی جس کی قسمت میں اللہ نے یہ بھلائی لکھ دی تھی' اور یہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ راہ ہدایت پالیں۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے سچائی تک پہنچنے کے لئے جدوجہد کی۔ انہوں نے ہدایت پانے کے لئے سعی کی۔ رہا یہودی فرقہ تو وہ چودہ سو سال سے اسلام کے خلاف بر سر جنگ ہے۔ جب سے مدینہ میں' ان کے پڑوس میں اسلام نازل ہوا ہے' اس وقت سے لے کر آج تک' اسلام کے خلاف ان کی سازشیں غیر منقطع ہیں اور اسلام کے ساتھ انہیں جو بغض ہے وہ آج تک ختم نہیں ہوا۔ ہاں اس کی شکل' اس کا رنگ اور اس کا فنی انداز بدلتا رہا ہے۔ اور آج تک اسلام کے خلاف جو سازشیں بھی کی گئیں' جس میں صلیبی جنگیں اور جدید استعماریت بھی شامل ہے' اس کے پیچھے یہودیوں ہی کا ہاتھ رہا ہے' اور یہ سازشیں مختلف شکلوں میں رہی ہیں۔ اگر براہ راست نہیں تو اس میں یہودیوں کا حصہ اور ہاتھ ضرور رہا ہے۔

---ooo---

اس کے بعد خطاب اہل کتاب یہودیوں سے ہے ۔ انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اس کتاب کو قبول کر لیں جو اس کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے جو تمہارے ہاں موجود ہے ۔ انہیں سخت دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر بلاوجہ وہ قبول حق سے روگردانی کریں گے تو ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے اللہ انہیں مسخ کر کے ان کے چہرے پھیر دے گا اور ان پر اسی طرح لعنت ہوگی جس طرح سبت کی خلاف ورزی کرنے والوں پر ہوئی تھی ۔ ارتکاب شرک سے انہیں منع کیا جاتا ہے اور خالص توحید کو قبول کرنے کی دعوت دی جاتی ہے جس کی اساس پر خود ان کا دین بھی استوار ہوا ہے ۔ اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرماتے جبکہ اس کے علاوہ تمام گناہ معاف ہو سکتے ہیں ' شرک بہرحال گناہ عظیم ہے ۔

يَاَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾

”اے وہ لوگو جنہیں کتاب دی گئی تھی ' مان لو اس کتاب کو جو ہم نے اب نازل کی ہے اور جو اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی ۔ اس پر ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں یا ان کو اسی طرح لعنت زدہ کر دیں جس طرح سبت والوں کے ساتھ ہم نے کیا تھا اور یاد رکھو کہ اللہ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے ۔ اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا ' اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے ۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھہرایا ۔ اس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی ۔“

اہل کتاب کو ان کی صفت اہل کتاب سے پکارا گیا ' اس لئے کہ اس صفت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے دعوت اسلامی کو قبول کرتے اور سب سے پہلے مسلمان بن جاتے ۔

(يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (۴ : ۴۷) ”اے وہ لوگو جنہیں کتاب دی گئی تھی ' مان لو اس کتاب کو جو ہم نے اب نازل کی ہے اور جو اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی ۔“

چونکہ ان کو کتاب دی گئی ہے ' اس لئے ان کے لئے ہدایت قبول کرنا کوئی انوکھی بات نہیں ہے اس لئے کہ جس اللہ

نے انہیں کتاب دی ہے وہی اب انہیں دعوت ایمان دے رہا ہے کہ اس کتاب پر بھی ایمان لاؤ جو تمہارے پاس موجود کتاب کی تصدیق کر رہی ہے ۔ یہ ان کے لئے تو کوئی انوکھی بات نہیں 'جبکہ یہ کتاب ان کی کتابوں کی مصدق بھی ہے ۔

اگر ایمان دلائل پر موقوف ہوتا' یا ظاہری اسباب پر موقوف ہوتا تو یہودی سب سے پہلے مومنین میں سے ہوتے ۔ لیکن یہودی اپنے مخصوص مفادات اور مصلحتوں کا شکار ہوگئے ۔ نیز وہ کینہ اور عناد کی وجہ سے ایمان نہ لا سکے ۔ یہ لوگ اپنے مزاج کے اعتبار سے بھی نہ ماننے والے تھے ۔ مزاج میں اکڑ تھی ۔ تورات نے ان کے لئے "اکڑی ہوئی گردن رکھنے والی قوم" کے الفاظ استعمال کیے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ایمان نہ لائے ۔ اللہ کی طرف سے بھی ان کے حق میں سخت اور خوفناک تہدید آئی ۔

(مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (٤:٤٧))

"اس پر ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں یا ان کو اسی طرح لعنت زدہ کر دیں جس طرح سبت والوں کے ساتھ ہم نے کیا تھا' اور یاد رکھو کہ اللہ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے ۔

طمس الوجوہ 'کا مفہوم یہ ہے کہ چہرے کے وہ خدوخال مٹا دیئے جائیں 'جن کی وجہ سے انسان انسان بنتا ہے اور چہروں کو بگاڑ کر پیچھے کی طرف موڑ دیا جانا' اس طرح کہ وہ پیچھے کی طرف چلے ۔ اس سے مراد انہیں خوفناک عذاب سے ڈرانا ہے جس میں ان کے چہروں کو پیٹھ کی طرف موڑ کر پیچھے کی طرف چلنے پر مجبور کرنا شامل ہے ۔ اس عذاب میں وہ لعنت بھی شامل ہے جو اصحاب السبت پر وارد ہوئی ۔ (یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے سبت کے دن شکار کرنے کی کوشش کی حالانکہ ان کی شریعت کے مطابق ان پر یہ شکار حرام تھا) اس جرم پر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو عملاً بندر اور خنزیر بنا دیا تھا ۔ نیز اس سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے تصورات اور دل و دماغ سے ہدایت اور بصیرت کے آثار مٹا دے اور ان کو دوبارہ کفر اور جاہلیت کی طرف لوٹا دے ۔ یعنی اس حالت کی طرف جب ان کے پاس کوئی کتاب ہدایت نہ تھی اور پھر یہ ایمان کے بعد کفر کی حالت میں چلے جائیں ۔ ایمان کے بعد دوبارہ کفر میں چلا جانا' ہدایت کے بعد گمراہی میں چلا جانا ہی دراصل چہروں کا بگاڑ دینا ہے ۔ اور انسان کا الٹے پاؤں پھرنا ہر قسم کے ارتداد سے برا ہے ۔

چاہے یہ مفہوم ہو یا وہ مفہوم ہو بہرحال یہ ایک خوفناک تہدید اور ڈراوا ہے جو یہودیوں کے کرخت اور متکبرانہ مزاج کے لئے مناسب سزا ہے ۔ اسی طرح ان کے برے اور خبیث اعمال کے لئے بھی یہی مناسب سزا ہے ۔

اس تہدید سے ڈر کر کعب الاحبار مسلمان ہو گئے تھے ۔ ابن ابی حاتم نے روایت نقل کی ہے اپنے والد' ابن نفیل' عمر ابن واقد' یونس ابن جلیس' ابو ادریس' عائذ الخولانی کی سند سے ۔ انہوں نے کہا کہ ابو مسلم خلیلی کعب کے استاد تھے اور وہ انہیں رسول خدا ؐ سے ملنے میں دیر کرنے پر ملامت کرتے تھے ۔ کہتے ہیں ابو مسلم نے کعب کو بھیجا کہ وہ حضور کو دیکھیں کہ آیا حضرت محمد "وہی ہیں ۔" کعب کہتے ہیں میں نے سواری کی اور مدینہ پہنچ گیا ۔ اچانک میں نے ایک تلاوت کرنے والے کو یہ تلاوت کرتے سنا ۔

(یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ (٤:٤٧))

(اے وہ لوگو جنہیں کتاب دی گئی تھی ' مان لو اس کتاب کو جو ہم نے اب نازل کی ہے اور جو اس کتاب کی تائید و تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی ۔ اس پر ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں ۔) میں بھاگا اور پانی سے غسل کیا اور میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر دیکھا کہ کہیں میرا چہرہ مسخ تو نہیں ہو گیا ہے ' اس کے بعد میں مسلمان ہو گیا ۔

اور اس تہدید پر آخری وعید وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (اور یاد رکھو کہ اللہ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے) ہے ۔ یہ مکرر تہدید اور ڈراوا ہے اور یہودیوں کے مزاج کے عین مطابق ہے ۔

اس کے بعد ایک اور تہدید آمیز اختتامیہ آتا ہے اور یہ آخرت کے متعلق ہے اور تنبیہ اور ڈراوا اس مقصد کے لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کے جرم کو کبھی معاف نہیں کرتا ' جبکہ اس کے سوا جس قدر اور جس قسم کے جرائم ہیں ان کی مغفرت کا دروازہ کھلا ہے ' بشرطیکہ اللہ کی مشیت ہو ۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِیْمًا (٤٨)

"اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا ' اس کے ماسوائے دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے ۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھہرایا اس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی ۔"

سیاق کلام سے یہ بات ضمناً ثابت ہوتی ہے کہ یہودی بھی شرک میں مبتلا تھے اس لئے ان کو بھی دعوت دی جاتی ہے کہ وہ توحید خالص کو اپنائیں اور شرک کا ارتکاب نہ کریں ۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے کسی شرکیہ قول یا فعل کا ذکر نہیں کیا ۔ البتہ قرآن کریم کے دوسرے مواقع پر بعض تفصیلات موجود ہیں ۔ قرآن کریم نے ان کے اس عقیدے کا ذکر کیا ہے کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں جیسا کہ نصاریٰ مسیح کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ شرک ہے ۔ اسی طرح قرآن کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ دونوں طبقے یہود و نصاریٰ "کہ انہوں نے اپنے احبار اور رہبان کو اللہ کے سوا رب بنا رکھا ہے ۔" یہ لوگ احبار اور رہبان کو قانون سازی کا حق دیتے تھے ۔ ان کو حلال و حرام کے اختیارات بھی دیتے تھے ' حالانکہ یہ حقوق ایسے ہیں کہ یہ اللہ کے مخصوص حقوق ہیں اور یہ اللہ کی حاکمیت کا مخصوص ترین دائرہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اہل کتاب کو بھی قرآن نے مشرکین تصور کیا ۔ اس نقطہ نظر کو اسلامی تصور حیات میں بہت اہمیت حاصل ہے کیونکہ ایمان کی تعریف اور اس کی شرائط کی اس سے وضاحت ہوتی ہے جیسا کہ اس سورہ میں اس کی تفصیلات

آگے آرہی ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ حضور کے دور میں جو یہودی جزیرۃ العرب میں رہتے تھے' ان کے نظریات میں کئی پہلوؤں سے بت پرستی داخل ہو چکی تھی اور ان کے اعمال بت پرستی سے بھرے پڑے تھے۔ یہ لوگ توحید سے منحرف ہوگئے تھے اس لئے یہاں ان کو سختی سے ڈرایا جاتا ہے کہ اللہ شرک کو ہرگز معاف نہیں کرتا اگرچہ شرک سے کم تر درجے کے ہر قسم کے گناہ وہ معاف کرتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے معافی کی کوئی صورت نہیں ہے جس نے دنیا میں شرک کیا ہو اور پھر توبہ کے بغیر مر گیا ہو۔

شرک اس لئے جرم عظیم ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ اور بندے کے درمیان ربط ٹوٹ جاتا ہے۔ اور مشرک کو یہ امید نہیں ہوتی کہ اللہ اسے معاف کر دے گا۔ اگر ایسے لوگ اس دنیا سے اس حال میں جائیں کہ وہ مشرک ہوں اور ان کا اللہ تعالیٰ کی ذات سے کوئی رابطہ نہ ہو۔ ان کی مغفرت نہیں ہو سکتی۔ جو شخص بھی شرک کرے اور اسی شرکیہ حالت میں دنیا سے چلا جائے' جبکہ اس کے سامنے دلائل توحید مظاہر کائنات اور رسولوں کی تعلیمات میں موجود ہوں تو وہ جہنمی ہو گا۔ اگر اس میں بھلائی کا ذرہ برابر عنصر بھی موجود ہوتا تو وہ ایسا ہرگز نہ کرتا۔ اس جرم کا ارتکاب وہی شخص کرتا ہے جو اس قدر فساد میں ڈوب گیا ہو' جس سے واپسی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس کی وہ فطرت سلیمہ تلف ہو چکی ہوتی ہے جو اللہ نے اسے دی تھی۔ اور وہ شخص سب سے نچلے درجے میں چلا گیا ہے اور اس نے اپنے آپ کو گویا جہنم کی آگ کے لئے تیار کر لیا ہے۔

رہے وہ جرائم جو اس واضح' ظاہر' عظیم' گندے اور کھلے ظلم سے کم درجے کے ہیں تو یہ تمام گناہ اگرچہ وہ کبائر ہی کیوں نہ ہوں ان کی مغفرت کا دروازہ اللہ کے ہاں کھلا ہے بشرطیکہ اللہ کی مشیت ہو۔ یہ جرائم حدود مغفرت کے اندر داخل ہیں۔ چاہے اس نے توبہ کی ہو اور اللہ معاف کر دے یا بغیر توبہ کے قیامت میں معاف ہوں۔ جس طرح بعض روایات میں آیا ہے' بشرطیکہ بندہ اللہ کے فضل کا شعور اپنے اندر پاتا ہو۔ وہ اللہ کی مغفرت کا امیدوار ہو اور اسے یقین ہو کہ اللہ مغفرت کر سکتا ہے اور یہ کہ اللہ کی مغفرت اس کے گناہوں سے بہت زیادہ ہے۔ یہ ہے امیدواری اللہ کی رحمت کے بارے میں' جو ختم نہیں ہوتی اور نہ محدود ہوتی ہے۔ وہ ایسی رحمت ہے جس کے آگے دروازے بند نہیں ہوتے اور نہ ہی ان دروازوں پر دربان ہوتے ہیں۔

امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے قتیبہ' جریر ابن عبدالحمید' عبدالعزیز ابن رفیع' زید ابن وہب کی سند کے ذریعے حضرت ابوذر سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں ایک رات نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضور ؐ اکیلے جا رہے ہیں اور آپ کے ساتھ کوئی انسان نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سوچا کہ شاید حضور ؐ یہ پسند نہیں کرتے کہ ان کے ساتھ کوئی جائے۔ تاہم میں چاند کے سائے میں چلتا رہا۔ آپ نے میری طرف مڑ کر دیکھا اور مجھے دیکھ لیا۔ آپ ؐ نے فرمایا "کون ہو تم؟" میں نے عرض کیا "ابوذر۔" مجھے اللہ آپ پر فدا کرے۔ آپ ؐ نے فرمایا! "ابوذر آؤ۔" کہتے ہیں میں آپ کے ساتھ کچھ دیر کے لئے چلا۔ آپ ؐ نے مجھ سے کہا! "بہت لوگ قیامت کے دن تہی دامن ہوں گے مگر وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور وہ اسے دائیں بائیں' سامنے اور پیچھے پھیلاتے رہے اور اس میں اچھا تصرف کیا۔" اس کے بعد مزید کچھ دیر میں ان کے ساتھ چلا۔ اس کے بعد آپ ؐ مجھ سے کہا! "ادھر بیٹھ جاؤ۔" مجھے اس کھلی جگہ بٹھایا جس کے ارد گرد پتھر

تھے ۔ مجھ سے کہا "تم ادھر بیٹھ جاؤ یہاں تک کہ میں لوٹ آؤں ۔" اس کے بعد آپ وادی میں آگے چلے گئے یہاں تک کہ آپ مجھے نظر نہ آرہے تھے ۔ آپ کافی دیر تک نہ آئے یہاں تک کہ انتظار طویل ہو گیا ۔ اس کے بعد مجھے آپ کے آنے کی آواز آئی اور آپ یہ فرمارہے تھے! "اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور اگرچہ اس نے چوری کی ہو ۔" جب آپ ؐ واپس آگئے تو میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا : "اے رسول ؐ مجھے اللہ آپ پر قربان کر دے ' آپ اس وادی میں کس کے ساتھ باتیں کر رہے تھے ؟" میں نے تو کسی کو سنا کہ وہ آپ کے ساتھ بات کر رہا تھا ۔ آپ ؐ نے فرمایا! "یہ جبریل تھے ' یہ وادی کی طرف مجھے ملے اور مجھ سے کہا " آپ اپنی امت کو خوشخبری دے دیں کہ اس میں سے کوئی بھی اس حال میں مرا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر رہا ہو وہ جنت میں داخل ہو گا ۔ میں نے کہا کہ "اے جبریل اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری کی ہو ۔ تو انہوں نے کہا (ہاں) میں نے پھر کہا کہ اگرچہ اس نے چوری کی ہو اور زنا کیا ہو؟" تو انہوں نے کہا : "اگرچہ اس نے چوری کی ہو ' زنا کیا ہو اور شراب پی ہو ۔"

ابن ابی حاتم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر ابن عبداللہ سے روایت کی ہے : حضور نے فرمایا ' جو شخص بھی مرجائے اس حال میں کہ وہ اللہ کے ساتھ شریک نہ کر رہا ہو تو اس کے لئے مغفرت جائز ہو جائے گی ' اگر اللہ نے چاہا تو اسے عذاب دے گا اور اگر اللہ نے چاہا تو اسے بخش دے گا ۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر ہرگز مغفرت نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے ۔ اس کے سوا جسے چاہے گا بخش دے گا ۔

ابن ابو حاتم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عمر سے روایت کی ہے ۔ وہ کہتے ہیں : "ہم اصحاب رسول ؐ زندہ جان کے قاتل ' یتیم کا مال کھانے والے ' بے گناہ عورتوں پر تہمت لگانے والے ' جھوٹی شہادت دینے والے میں شک نہ کرتے تھے (کہ وہ جہنمی ہیں) یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی : "اللہ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا وہ جس کی چاہے مغفرت کر دے گا ۔" اس کے بعد اصحاب رسول ؐ نے شہادت دینا چھوڑ دیا ۔

طبرانی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عکرمہ ' حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ نبی ؐ نے فرمایا : "اللہ تعالیٰ نے کہا ہے ' جو شخص یہ جانتا ہو کہ میں گناہوں کی مغفرت کرنے پر قادر ہوں تو میں اس کے گناہ معاف کر دوں گا ۔ اور میں کوئی پرواہ نہیں کرتا جب تک وہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کر دے ۔"

اور اس آخری حدیث میں ہمارے لئے ایک بصیرت افروز لمحہ فکریہ ہے ۔ اصل اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ بھلائی ' امید ' خوف اور حیا کے پس پردہ دل کے اندر اللہ کا حقیقی شعور ہونا چاہئے ۔ اگر انسان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کا یہ شعور اور اس پر مبنی بھلائی کا جذبہ ' امید ' خوف اور حیاء انسان کے اندر خدا ترسی پیدا کرتے ہیں اور انسان مغفرت کا اہل ہو جاتا ہے ۔

اب قرآن مجید ذرا آگے بڑھتا ہے اور جماعت مسلمہ کو یہودیوں پر مزید آگے بڑھا کر حملہ آور کرتا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کا ایک اور تعجب خیز پہلو سامنے لاتا ہے ۔ یہ کہ یہ یہودی لوگ اپنے آپ کو اب بھی اللہ کی برگزیدہ قوم سمجھتے ہیں ' اپنی تعریفیں کرتے ہیں ' اپنی پاکی داماں کی حکایتیں سناتے ہیں ' جبکہ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ بات کو اپنے اصل مفہوم و مراد سے بدل دیتے ہیں اور اللہ اور رسول کے مقابلے میں گستاخی کرتے ہیں ' جبکہ وہ خود جبت (ہر قسم کے وہمیات) اور طاغوت پر ایمان لاتے ہیں جیسا کہ آگے آتا ہے اور اپنی پاکی بیان کر کے اور اپنے آپ کو اللہ کا مقرب کہہ

کر، اگرچہ وہ بدعمل ہوں، اللہ پر افتراء باندھتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝۴۹ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۵۰ع ۸

"تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جو بہت اپنی پاکیزگی نفس کا دم بھرتے ہیں؟ حالانکہ پاکیزگی تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اور (انہیں جو پاکیزگی نہیں ملتی تو درحقیقت) ان پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جاتا۔ دیکھو تو سہی، یہ اللہ پر بھی جھوٹے افتراء گھڑنے سے نہیں چوکتے۔ اور ان کے صریحا "گناہ گار ہونے کے لئے یہی ایک گناہ کافی ہے۔"

یہودیوں کا یہ قدیمی دعویٰ ہے کہ وہ اللہ کے مختار اور برگزیدہ لوگ ہیں۔ ایک وقت تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس امانت کے اٹھانے اور فرائض رسالت اور دعوت کے لئے چنا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی خاطر فرعون اور ان کے ساتھیوں کو ہلاک کیا تھا۔ بنی اسرائیل کو ارض مقدس کا وارث بنایا تھا، لیکن اس کے بعد آنے والے ادوار میں انہوں نے سرے سے اسلامی نظام ہی کو ترک کر دیا۔ اور انہوں نے اس کرۂ ارض پر عظیم نافرمانیوں اور کبیرہ گناہوں کا ارتکاب شروع کر دیا۔ ان گناہوں سے زمین بھی کانپنے لگی۔ ان کے لئے ان کے احبار، علماء نے ان چیزوں کو حلال کر دیا جسے اللہ نے حرام کیا تھا، اور ان پر ان چیزوں کو حرام کر دیا جو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دی تھیں۔ انہوں نے ان غلط کاموں میں ان احبار کی پیروی شروع کر دی تھی۔ اور ان احبار نے اس طرح جو خدائی کا دعویٰ کیا تھا، اس کا انہوں نے انکار نہ کیا حالانکہ حلال و حرام کا تعین تو اللہ کا کام تھا۔ ان احبار نے اللہ کی شریعت میں تبدیلیاں کر دیں تاکہ بادشاہوں اور شرفاء کو خوش کریں اور جمہور عوام کے رجحانات اور میلانات کی پیروی و چاپلوسی کریں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے گویا ان کو اپنا رب بنا لیا تھا۔ پھر انہوں نے سود کھانا شروع کر دیا۔ ان کا تعلق اپنے دین اور اپنے رب کے ساتھ کمزور ہو گیا، ان جرائم اور ان کے ساتھ بے شمار دوسرے جرائم کے باوجود وہ بدستور اس زعم میں مبتلا ہیں کہ وہ اللہ کی برگزیدہ قوم ہیں، اور یہ کہ ان کو آگ فقط چند دن تک چھوئے گی اور یہ کہ اللہ کے نزدیک صرف یہودی ہی نجات کے مستحق ہیں۔ گویا دین صرف رشتہ داری تک محدود ہو گیا ہے یا دین میں بھی ذاتی تعلقات اور دوستیاں کام کرتی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند ہے۔ اس لئے کہ اللہ کو اپنے بندوں میں سے کسی کے ساتھ نہ قرابت داری ہے اور نہ نسبت ہے۔ اللہ کے ساتھ اس کے بندوں کا تعلق صرف درست عقائد کی وجہ سے قائم رہ سکتا ہے۔ عمل صالح کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے اور اسلامی نظام حیات پر ثابت قدمی سے رہ سکتا ہے۔ جس شخص نے اس تعلق میں خلل ڈالا، اس پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ اور اللہ کا غضب اس وقت بہت ہی جوش میں آتا ہے جب اللہ ایک گمراہ قوم کو ہدایت بخشے مگر وہ قوم ہدایت کے مقابلے میں انحراف کی راہ اختیار کرلے۔ ان یہودیوں کے حالات آج کے نام نہاد مسلمانوں سے مختلف نہیں ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ امت محمدیہ میں سے ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ لازماً ان کی مدد کرے

گا اور یہودیوں کو ان کی سرزمین سے نکالے گا' جبکہ وہ مکمل طور پر اسلام سے نکل گئے ہیں' حالانکہ اسلام ان کا دین اور نظام زندگی ہے لیکن انھوں نے اسے اپنی زندگیوں سے نکال دیا ہے اور وہ اللہ کی کتاب کے مطابق کوئی فیصلہ نہیں کرتے ۔ نہ اپنے مقدمات میں نہ اپنے اقتصادی مسائل میں ۔ نہ اپنے اجتماعی معاملات میں اور نہ اپنے آداب و عادات میں ۔ ان کا اسلام صرف مسلمانوں جیسے نام رکھنے تک محدود رہ گیا ہے ۔ اور یہ کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں پیدا ہوئے ہیں' جس میں وہ کبھی زندہ رہ رہے تھے اور کبھی انھوں نے اس میں دین اسلام قائم کیا تھا اور اسلامی نظام کے مطابق تمام فیصلے کیا کرتے تھے ۔

اللہ تعالیٰ رسول خدا ؐ کے سامنے تعجب کا اظہار فرما رہے ہیں کہ یہ یہودی بھی عجیب ہیں کہ وہ اپنے آپ کو بہت ہی پاک قوم سمجھتے ہیں ۔ لیکن آج کے مسلمانوں کا معاملہ تو اس تعجب انگیز صورت حالات سے بھی زیادہ تعجب انگیز ہے کیوں کہ ان کی اخلاقی حالت اس زمانے کے یہودیوں سے بھی زیادہ پست ہو چکی ہے ۔

یہ لوگوں کا کام نہیں ہے کہ وہ میاں مٹھو بن کر اپنی پاک دامنی کا ڈھنڈورا پیٹیں اور یہ شہادت خود اپنے حق میں دیں کہ وہ نیک ہیں' اللہ کے قریبی ہیں اور شعب مختار ہیں ۔ بلکہ یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ فیصلہ دے کہ اللہ کے نزدیک پاک اور برگزیدہ کون ہے ۔ اس لئے کہ وہ دلوں اور عملوں کو خوب جانتا ہے اور لوگوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ۔ اگر وہ اللہ کی طرف صحیح معنوں میں متوجہ ہو جائیں' نیک عمل کریں اور یہ تیر تکے چلانا چھوڑ دیں ۔ اگر وہ ادعاء چھوڑ دیں اور عمل کرتے رہیں نہایت ہی خاموشی' نہایت ہی تواضع کے ساتھ اور نہایت ہی ادب اور حیاء کے ساتھ اور بغیر پاکی دامن کے پروپیگنڈے کے اور بغیر فخر و غرور کے تو اللہ کے ہاں ان کے کسی عمل کا غبن نہ ہو گا' کوئی عمل بھول چوک کی وجہ سے حساب سے ساقط نہ ہو گا اور نہ ان کا کوئی حق مارا جائے گا ۔

اللہ تعالیٰ خود یہودیوں کے خلاف شہادت دیتے ہیں کہ وہ جو دعوے کر رہے ہیں کہ وہ برگزیدہ لوگ ہیں اور ان سے اللہ بہرحال راضی ہے تو یہ لوگ اللہ پر بہت بڑا افتراء باندھ رہے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس دعوائے باطل کی مذمت کرتے ہوئے اس طرح اسے لوگوں کی نظروں میں ساقط کر دیتے ہیں ۔

(انْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَكَفَى بِهِ إِثْمًا مُبِينًا (٤ : ٥٠)) "دیکھو تو سہی' یہ اللہ پر بھی جھوٹے افتراء گھڑنے سے نہیں چوکتے اور ان کے صریحاً گناہ گار ہونے کے لئے یہی ایک گناہ کافی ہے ۔"

ذرا سوچئے تو سہی' ہم لوگ جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں' اس لئے کہ ہمارے نام مسلمانوں جیسے ہیں اور ہم ایسی سرزمینوں میں بستے ہیں جہاں کبھی مسلمان بسا کرتے تھے تو یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے ۔ ہم لوگ اسلام کو اپنی زندگی کے کسی بھی شعبے میں نافذ نہیں کرتے لیکن اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں ۔ اپنی سیرت اور صورت میں ہم اسلام کی شکل کو مسخ کر رہے ہیں اور اپنی عملی زندگی سے اسلام کے خلاف شہادت دے رہے ہیں اور پھر بھی ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم برگزیدہ لوگ ہیں اور نبی ؐ کے امتی ہیں اگرچہ ہم نے اپنی عملی زندگی سے اسلام کو مکمل طور پر بے دخل کر دیا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری صورت حال بھی اس صورت حالات سے مختلف نہیں ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ حضرت محمد ؐ کو تعجب کے ساتھ متوجہ فرماتے ہیں اور ایسے دعوے کرنے والوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ اللہ پر افتراء باندھتے ہیں اور ایک عظیم گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں

نعوذ باللہ۔

یاد رکھئے! کہ اللہ کا دین ایک نظام حیات ہے۔ اور اللہ کی اطاعت کے معنی یہ ہیں کہ پوری زندگی میں اس نظام کی حکمرانی قائم کی جائے۔ اللہ کا قرب اس وقت نصیب ہو گا جب اللہ کی اطاعت کی جائے۔ ذرا غور کیجئے کہ ہم اللہ' اس کے دین اور اس کے نظام زندگی سے کس قدر دور ہیں۔ پھر یہ بھی غور کیجئے کہ ہمارا اور یہودیوں کا حال بالکل ایک جیسا ہے جن کے حال پر اللہ اور رسول تعجب کرتے ہیں۔ ان کے بے بنیاد دعوے کو اللہ پر افتراء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لئے یہودیوں کے خلاف ضابطہ ہمارے خلاف ضابطہ ہو گا۔ ان کا حال اور ہمارا حال ایک جیسا ہو گا۔ اور یاد رکھئے کہ اللہ کی کسی کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہیں ہے اور نہ کسی کے ساتھ دوستی ہے۔

---ooo---

سلسلہ کلام بدستور انہی لوگوں کے بارے میں جاری ہے جو لوگ اپنے آپ کو برگزیدہ سمجھتے ہیں' حالانکہ وہ حق کے مقابلے میں باطل پر ایمان لاتے ہیں۔ ایسے احکام کو تسلیم کرتے ہیں جو ازروئے شریعت مستند نہیں ہیں اور ان احکام کے لئے کوئی ایسا ضابطہ نہیں ہے جو ان کو ظلم اور زیادتی سے باز رکھ سکے۔ یہ ہے ایمان بالجبت و الطاغوت جبکہ وہ شرک اور مشرکین کے حق میں یہ گواہی بھی دے رہے ہیں کہ یہ لوگ مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں حالانکہ اہل ایمان اللہ کی کتاب' اللہ کی شریعت اور اس کے نظام حیات پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے حال پر اس تعجب خیزی اور ان کی ذلالتوں کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر شدید تنقید فرماتے ہیں اور ان کو ذلیل و خوار قرار دیتے ہیں۔ ان کے مزاج کے خفیہ گوشے کھولتے ہیں کہ وہ سخت حاسد اور بخیل ہیں۔ ان کی طرف سے دین ابراہیمی سے منحرف ہو کر موجودہ موقف اپنانے کے اسباب بتائے جاتے ہیں' حالانکہ وہ دین ابراہیمی پر بے حد فخر کرتے تھے اور حضرت ابراہیم پر اپنے شجرۂ نسب ختم ہونے پر بھی وہ نہایت ہی فخر کرتے تھے۔ یہ تنقید اسی حتمی فیصلے پر اختتام پذیر ہوتی ہے کہ ان کے لئے جہنم کی دہکتی ہوئی آگ کافی ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَٰبِ يُؤْمِنُونَ
بِالْجِبْتِ وَالطَّٰغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ
ءَامَنُوا سَبِيلًا ﴿٥١﴾ أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ
لَهُ نَصِيرًا ﴿٥٢﴾ أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ﴿٥٣﴾
أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَآ ءَاتَىٰهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ ءَاتَيْنَآ ءَالَ

إِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا۝ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا۝

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کر دے پھر تم اس کا کوئی مدد گار نہیں پاؤ گے۔ کیا حکومت میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو دوسروں کو ایک پھوٹی کوڑی تک نہ دیتے۔ پھر کیا یہ دوسروں سے اس لئے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا؟ اگر یہ بات ہے تو انہیں معلوم ہو کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی اور ملک عظیم بخش دیا، مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا' اور منہ موڑنے والوں کے لئے تو بس جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے۔"

جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی وہ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ اس آخری کتاب قرآن پر ایمان لے آئیں اور شرک سے باز آ جائیں جو ان لوگوں کا شیوہ ہے جن کو اللہ کی طرف سے کوئی کتاب و ہدایت نہیں ملی۔ وہ اپنی زندگیوں میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کریں اور طاغوت کی اطاعت نہ کریں (طاغوت ہر وہ قانون ہے' جو اللہ کی طرف سے نہیں ہے اور ہر وہ حکم ہے جس کی پشت پر کوئی شرعی سند نہیں ہے)۔ لیکن یہودی جو ہر وقت پاکی داماں کے قصہ خواں تھے اور اس امر پر فخر کرتے تھے کہ وہ اللہ کے محبوب بندے ہیں' ان دعاوی کے ساتھ ساتھ وہ باطل اور شرک کے پیرو کار تھے۔ وہ کاہنوں کی تابع داری کرتے تھے اور اپنے احبار کی اطاعت کرتے تھے جو ان کے لئے ایسے قوانین بناتے تھے جن پر اللہ کی جانب سے کوئی سند نہ ہوتی تھی۔ وہ طاغوت پر ایمان لاتے تھے (طاغوت وہ نظام حکومت اور قانونی نظام ہے جو شریعت پر مبنی نہ ہو) اسے طاغوت اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں طغیان اور دست درازی پائی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی انسان اپنے لئے ان خصوصیات کا مدعی ہو جاتا ہے جو اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کی اہم خصوصیات ہیں اور یہ انسان اپنے آپ کو شریعت کے ضابطے کی اطاعت سے باہر نکال لیتا ہے' جس کے مطابق عدل کرنا اس پر لازمی تھا۔ یہ عمل ہے طغیان کا اور ایسا شخص طاغوت ہے اور اس طاغوت کے مطیع اور اس پر ایمان لانے والے مشرک ہیں یا کافر ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ تعجب کا اظہار فرماتے ہیں کہ وہ یہ فعل مکروہ اس کے باوجود کرتے ہیں کہ ان کو اس سے قبل کتاب دی گئی تھی' لیکن انہوں نے اس کتاب کی پیروی نہ کی۔

جبت (ہر قسم کی وہمیات) اور طاغوت پر ایمان لانے پر مزید انہوں نے یہ کیا کہ کفار اور مشرکین کی صف میں جا کھڑے ہوئے اور ان مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو گئے جن کو اللہ نے کتاب دی ہے۔

(وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا (٤: ٥١)) "اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں ۔"

ابن اسحاق نے بواسطہ محمد ابن ابی محمد، عکرمہ اور سعید ابن جبیر، حضرت ابن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے کہ قریش، غطفان، بنی قریظہ کے جن لوگوں نے جنگ احزاب میں تمام پارٹیوں اور احزاب کو جمع کیا تھا ان میں حیی ابن اخطب، سلام ابن الحقیق، ابو رافع، ربیع ابن الحقیق، ابو عامر، وحوح ابن عامر اور ہوذہ ابن قیس تھے ۔ جب یہ لوگ قریش کے پاس آئے تو انہوں نے کہا: "یہ لوگ یہودیوں کے احبار اور علماء ہیں اور یہ لوگ پہلی کتاب کے ماہرین علماء ہیں آپ لوگ ان سے جو پوچھنا چاہیں پوچھ لیں کہ تمہارا دین اچھا ہے یا محمد ؐ کا دین اچھا ہے ۔ قریش نے ان سے پوچھا انہوں نے جواب دیا: تمہارا دین محمد کے دین سے بہتر ہے اور جو لوگ محمد کے تابع ہوگئے ہیں تم ان سے زیادہ ہدایت پر ہو ۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ۔

(أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ) سے لے کر (وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا (٤: ٥٤)) اور یہ ان لوگوں پر لعن طعن ہے اور اس بات کا اعلان ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں ان کا کوئی ناصر اور مددگار نہ ہوگا، اس لئے کہ یہ لوگ اب مشرکین سے امداد چاہتے ہیں ۔ انہوں نے مشرکین کو زیادہ ہدایت یافتہ اس لئے کہا تاکہ ان کو اپنی امداد کے لئے مائل کرلیں ۔ چنانچہ انہوں نے ان کی دعوت قبول کرلی اور یوم الاحزاب میں یہ لوگ لشکر لے کر آگئے ۔ اس جنگ میں حضور ؐ اور آپ کے صحابہ کرام نے مدینہ کے اردگرد خندق کھودی اور ان لوگوں کے اس عظیم شر کا دفعیہ صرف اللہ نے کیا اور (اللہ نے ان لوگوں کو بھاری غم و اندوہ کے ساتھ لوٹا دیا جنہوں نے کفر کیا تھا، اور وہ کچھ خیر نہ پاسکے اور اللہ تعالیٰ مومنین کی مدد کے لئے کافی تھا ۔ وہ تو بہت قوی اور غالب تھا) ۔

یہ بات تعجب انگیز تھی کہ یہودی یہ کہنے پر اتر آئیں کہ مشرکین کا دین، دین محمد ؐ اور آپ کے ساتھیوں کے دین سے بہتر ہے ۔ اور مشرکین ان لوگوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں جو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول حضرت محمد ؐ پر ایمان لائے ہیں لیکن یہودیوں کی جانب سے یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے ۔ حق و باطل کے درمیان انہوں نے ہمیشہ باطل کو ترجیح دی ہے اور اہل حق اور اہل باطل میں سے ان کو ہمیشہ اہل باطل اچھے لگتے ہیں ۔ یہ اس قدر لالچی ہیں جس کی کوئی انتہا نہیں ہے ۔ وہ اس قدر نفسانیت میں مبتلا ہوگئے ہیں کہ ان کے مزاج میں اعتدال کا آنا ممکن ہی نہیں ہے ۔ ان کے سینے بغض سے بھرے ہوئے ہیں جو کبھی صاف نہیں ہوسکتے ۔ وہ اہل حق کے ہاں، اپنی خواہشات، اپنے لالچ اور اپنے کینے کا سامان نہیں پاتے ۔ انہیں اگر کچھ ملتا ہے تو ہمیشہ اہل باطل سے ملتا ہے ۔ اس لئے وہ ہمیشہ شہادت حق کے مقابلے میں شہادت زور کے عادی ہیں اور اہل حق کے مقابلے میں اہل باطل کے لئے شہادت دیتے ہیں ۔

یہ ان کے دائمی حالات و عادات ہیں ۔ ان حالات کی پشت پر جو اسباب تھے وہ اب بھی قائم ہیں اس لئے کہ یہ فعل ان کا طبعی اور منطقی فعل تھا کہ وہ کافروں کے متعلق یہ شہادت دیں، کہ وہ اہل ایمان مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ ہدایت پر ہیں ۔

آج یہودی برملا کہتے ہیں کہ وہ اپنی اس قوت سے جو میڈیا کے حوالے سے ان کے قبضے میں ہے، اس کرۂ ارض پر

کامیاب ہونے والی ہر تحریک کو ناکام کر سکتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ اہل باطل کے ساتھ پوری پوری معاونت کرتے ہیں تاکہ وہ ہر تحریک اسلامی کو بدنام اور نیست و نابود کر سکیں۔ بعینہ اسی طرح انہوں نے قریش سے مدد لے کر دنیا کی پہلی تحریک اسلامی کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن یہ لوگ بعض اوقات اپنی ماہرانہ مکاری اور تجربہ کاری سے ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ جدید زمانے کے حالات و تصورات کی وجہ سے اہل باطل کی حمایت اگر کھل کر نہ کر سکیں تو وہ خفیہ طریقوں سے باطل کی حمایت کرتے ہیں تاکہ وہ اہل حق کو نیست و نابود کر دے۔ اور یہ راز داری وہ اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ اگر یہ کھل کر سامنے آتے ہیں تو دور جدید میں ان کے فریب کا پردہ چاک ہوتا ہے اور ان کے ایجنٹ عوام الناس میں بدنام ہوتے ہیں' جو درحقیقت ان کے اشاروں پر کام کرتے ہیں اور ہر جگہ اسلامی تحریکات کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے رات دن کام کرتے ہیں۔

بلکہ بعض اوقات ان کی مکاری اور ہشیاری اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ بظاہر اپنے ایجنٹوں کے ساتھ اپنی دشمنی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے ساتھ لڑتے نظر آتے ہیں لیکن دراصل وہ ان لوگوں کے مددگار ہوتے جو اسلامی تحریکات کا قلع قمع کرنے میں لگے ہوئے ہوتے ہیں اور سچائی کو مٹا رہے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اپنے ان ایجنٹوں کے ساتھ جھوٹی لڑائی شروع کر دیتے ہیں جو صرف زبان و کلام تک محدود رہتی ہے تاکہ ان کے یہ مخلص ایجنٹ عوام الناس کے اندر پاک و صاف ہو جائیں اور ان کے مفادات کے لئے کام کر کے ان کے دور رس مقاصد پورے کرتے رہیں۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کی شکل بگاڑنے کے کام کو کبھی نہیں چھوڑتے اس لئے کہ انہیں اصل بغض تو اسلامی نظریہ حیات سے ہے اور ان کی اصل دشمنی احیائے اسلام کی ہر اس تحریک کے ساتھ ہے' جو انہیں دور سے نظر آئے اور وہ اسے دھوکے میں نہ ڈال سکتے ہوں۔

یہ ایک ہی فطرت ہے' ایک ہی منصوبہ ہے اور ایک ہی مقصد ہے یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کو اللہ کی جانب سے مردود اور ملعون ہونے کا اعلان ہوتا ہے۔ ان کو راندہ درگاہ قرار دیا جاتا ہے اور یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ ان کے لئے کوئی نصرت نہ ہوگی اور نہ ان کا کوئی مددگار ہوگا۔

(أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا (٤ : ٥٢)) "ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کر دے پھر تم اس کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔"

آج یہ بات ہمیں ہولناک نظر آتی ہے کہ تمام مغربی ممالک یہودیوں کے ناصر و مددگار ہیں۔ اس لئے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اللہ کا یہ وعدہ کہاں گیا کہ اللہ نے یہودیوں پر لعنت کی اور جس کو اللہ نے ملعون قرار دے دیا' اس کا کوئی مددگار نہ ہوگا؟

حقیقت یہ ہے کہ حقیقی مددگار صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ حقیقی مددگار لوگ نہیں ہیں اور نہ حکومتیں ہیں۔ اگرچہ ان کے پاس ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم ہوں اور میزائل ہوں۔ حقیقی ناصر اللہ ہے اور وہ اپنے تمام بندوں کے اوپر کنٹرول کرنے والا ہے اور بم اور میزائل ان لوگوں کے پاس ہیں جو اللہ تعالیٰ کے مکمل کنٹرول میں ہیں۔ اللہ ہی حقیقی مددگار ہے ان لوگوں کا جو اس کی مدد کرتے ہیں۔ (وَيَنصُرُونَ اللَّهَ مَن يَنصُرُهُ) اور اللہ صرف ان لوگوں کی معاونت کرتا ہے جو

اللہ پر اس طرح ایمان لے آئیں جس طرح ایمان لانے کا حق ہے اور وہ اس کے نظام کی اس طرح اطاعت کرتے ہیں جس طرح اطاعت کا حق ہوتا ہے اور جو تسلیم و رضا کے ساتھ اپنے تمام فیصلے اسلامی منہاج اور اسلامی شریعت کے مطابق کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے ذریعے ایک ایسی امت کو خطاب کیا تھا جو صحیح معنوں میں اللہ پر ایمان لا چکی تھی۔ وہ اسلامی نظام زندگی کی مطیع تھی۔ وہ اپنے تمام فیصلے شریعت کے مطابق کرتی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس مومن امت کے مقابلے میں اس کے دشمنوں یعنی یہودیوں کو کمزور بنایا تھا اور اس وقت اہل ایمان کو یہودیوں پہ نصرت ملتی تھی اور فتح حاصل ہوتی تھی اس لئے کہ ان کا مددگار کوئی نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کئے ہوئے وعدے کو عملی شکل دے دی تھی اور اللہ کا وعدہ عملی شکل صرف ان لوگوں کے ذریعے اختیار کرتا ہے جو صحیح معنوں میں مومن ہوں۔

ہمیں اس وقت تمام ملحدین 'مشرکین اور اہل صلیب کی جانب سے بالاتفاق یہودیوں کی پشت پناہی سے خائف نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ وہ تو ہر دور میں اسلام کے خلاف یہودیوں کے ناصر و مددگار رہے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن ہمیں یہ بات دھوکے میں بھی نہ ڈال دے۔ نصرت کا وعدہ صرف مومنین کے ساتھ ہے۔ جب بھی ہم مومن بن جائیں گے فتح ہمارے قدم چومے گی۔

اہل اسلام کو چاہئے کہ وہ تجربہ کر لیں 'ایک بار تجربہ کریں کہ وہ صحیح مسلمان بن جائیں پھر دیکھیں کہ آیا یہودیوں کے لئے کوئی مددگار اس دنیا میں رہتا ہے اور کیا یہودیوں کو ان مشرکین اور اہل صلیب کی نصرت کوئی فائدہ دیتی ہے؟

اہل کتاب کے حالات 'ان کے موقف اور ان کی باتوں پر تعجب کا اظہار کرنے اور ان کو ذلیل اور ملعون قرار دینے کے بعد 'اس بات پر نکیر کی جاتی ہے کہ ان لوگوں کا موقف حضرت محمد ؐ اور مسلمانوں کے بارے میں قابل مواخذہ ہے۔ نیز یہ کہ وہ اس بات پر سیخ پا ہیں کہ اللہ نے حضور اکرم ؐ اور مسلمانوں پر یہ احسان کیوں فرمایا کہ ان کو دین 'نصرت اور فتح سے ہمکنار کیا اور پھر اللہ نے ان پر فضل و کرم کی جو بارش کی اس پر بھی وہ جل بھن گئے۔ حالانکہ اہل اسلام کو کوئی خیر یا بھلائی ان سے چھین کر نہ دی گئی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر سخت مزاج اور کس قدر لالچی تھے۔ وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے علاوہ بھی کسی کو کچھ ملے۔ حالانکہ اللہ نے ان پر بھی فیضان رحمت فرمایا۔ ان کے آباء پر بھی احسان کیا اور ان کو فیاضی اور رواداری سے منع نہ کیا تھا اور نہ ان کو یہ بغض اور حسد سکھایا تھا۔

اَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا (۵۳) اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِه فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (۵۴) (۴: ۵۳-۵۴)

"کیا حکومت میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو یہ دوسروں کو ایک پھوٹی کوڑی تک نہ دیتے۔ پھر کیا یہ دوسروں سے اس لئے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا؟ اگر یہ بات ہے تو انہیں معلوم ہو کہ ہم

نے تو ابراہیم ﷺ کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی اور ملک عظیم بخش دیا۔

یہ نہایت ہی تعجب انگیز بات ہے کہ یہ لوگ یہ برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ اللہ اپنے خزانوں سے کسی اور پر فضل و کرم کرے۔ کیا یہ لوگ اللہ کے ساتھ اس کے نہ ختم ہونے والے خزانوں میں شریک ہیں۔ کیا یہ لوگ اللہ کے اقتدار میں اس کے شریک ہیں۔ یہ تو اللہ ہی ہے جو دیتا ہے اور وہی ہے جو روکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگ اپنی کنجوسی اور سختی کی وجہ سے کسی کو پھوٹی کوڑی بھی نہ دیتے۔ نقیر سے مراد وہ چھلی ہے جو گٹھلی کی پشت پر ہوتی ہے۔ اور یہودیوں کی کنجوسی اور ان کا بخل اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اتنا بھی کسی کو دے دیں اگر اللہ کی بادشاہی میں ان کا کوئی حصہ ہوتا۔ یہ خدا کا شکر ہے کہ خدائی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اگر تمام لوگ بھی بھوک سے ہلاک ہو جاتے تو وہ کسی کو گٹھلی کا چھلکا تک نہ دیتے۔

شاید انہیں رسول خدا ؐ سے اس بات پر حسد ہے کہ اللہ نے ان کو اپنے فضل سے نوازا ہے کہ ان کو یہ دین دیا جس سے ان عربوں کو جدید جنم نصیب ہوا اور وہ از سرنو ترقی کرنے لگے اور ان جاہل عربوں کو صاحب امتیاز قوم اور انسان بنا دیا۔ ان کو روشنی یقین ' اطمینان اور اعتماد عطا کیا۔ ان کو پاکیزگی اور صفائی اور دنیا کے اندر اقتدار عطا کیا۔ یقیناً یہ صورت حال ان یہودیوں کے حسد کی وجہ ہے۔ وہ اس بات پر مرگئے تھے کہ جاہل ' متفرق ' باہم متصادم عربوں پر ان کی ادبی اور ثقافتی اور اقتصادی برتری اب ختم ہونے والی ہے۔ یہ برتری اس وقت قائم تھی جب ان کے پاس کوئی دینی پیغام نہ تھا۔

یہ لوگ اس بات پر کیوں حسد کرتے ہیں کہ اللہ کسی قوم کو نبوت اور زمین پر اقتدار اعلیٰ عطا فرمائے حالانکہ ان پر تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے ہی یہ فضل و کرم ہوتا رہا ہے جن کو اللہ نے کتاب اور حکمت (نبوت) عطا کی تھی۔ ان کی آل و اولاد میں نبوت جاری رہی تھی اور ان کو حکومت اور اقتدار اعلیٰ بھی دیا گیا تھا لیکن انہوں نے اس فضل و کرم کی کچھ قدر نہ کی۔ نہ اس نعمت کو سنبھالا ' نہ انہوں نے اس عہد قدیم کا پاس رکھا جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا ' بلکہ ان میں سے کئی لوگ تو سرے سے مومن ہی نہ تھے۔ جن لوگوں پر اس قدر فضل عظیم کیا گیا ہو ' ان کے لئے یہ تو مناسب نہیں ہے کہ ان میں منکر اور کافر پیدا ہوں۔

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (٥٤) فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا (٥٥) (٤: ٥٤ - ٥٥)

"ہم نے ابراہیم ﷺ کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی اور ملک عظیم بخشا ' مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا ' اور منہ موڑنے والوں کے لئے تو بس جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے۔"

حسد کا درد کس کے حصے میں آتا ہے۔ اگر کوئی نادار شخص کسی مالدار صاحب نعمت سے حسد کرے تو یہ حسد بھی فعل بد ہے۔ لیکن اگر کوئی مالدار صاحب نعمت کسی پر حسد کرنے لگے تو یہ رذالت سے بھی آگے نہایت گہرا شر ہے اور اس قسم کا شر و فساد صرف یہودیوں کا حصہ ہے ' یہی وجہ ہے کہ ان کو جہنم کی آگ کی دھمکی دی گئی ہے ' جو اس رذالت کے لئے نہایت ہی مناسب جزاء ہے۔ (وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا (٤: ٥٥)) (ان کے لئے جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے)۔

---○○○---

جب بات یہاں تک پہنچی کہ آل ابراہیم میں سے بعض لوگ مومن ہوئے اور بعض نے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا تو اس کے بعد ضروری ہو گیا کہ اہل ایمان کا انجام بھی بتا دیا جائے اور ان لوگوں کا انجام بھی بتا دیا جائے جو راہ ایمان سے روکتے ہیں ۔ یہ سزا و جزاء ہر دین میں ہمیشہ اسی طرح رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں نہایت ہی شدید اور خوفناک مناظر قیامت کی صورت میں اس کا ذکر کرتے ہیں ۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ۖ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿٥٦﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ لَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ ۖ وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ﴿٥٧﴾

"جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے انہیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ خوب عذاب کا مزا چکھیں ' اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا اور نیک عمل کئے ان کو ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ' جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور ان کو پاکیزہ بیویاں ملیں گی اور انہیں ہم گھنی چھاؤں میں رکھیں گے ۔"

(نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا (٤ : ٥٦)) "اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے ۔"

یہ ایک ایسا منظر ہے جو مسلسل چلتا ہے ۔ ایک ایسا منظر جو نظروں کے سامنے ہے اور بار بار دہرایا جا رہا ہے ۔ نظریں اس کے اوپر جم جاتی ہیں ۔ خیال ایک جگہ مرکوز ہو جاتا ہے ۔ اور اس سے ادھر ادھر نہیں ہوتا ۔ یہ یقیناً ایک خوفناک منظر ہے ' اس کی خوفناکی فکر و نظر کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے ۔ اس مسلسل اور خوفناک منظر کو صرف ایک لفظ اسکرین پر لاتا ہے یہ لفظ (كُلَّمَا) ہے ۔ اور یہ منظر صرف فقرے کے ایک حصے کے ذریعہ خوفناک اور ہولناک بن جاتا ہے ۔ (كُلَّمَا

نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ) "جب ان کی کھال گل جائے گی۔" اس کے بعد جملے کے دوسرے حصے میں اس عمل کو خارق عادت عمل اور تعجب انگیز کر دیا جاتا ہے۔ (بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا) "تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے۔" اور یہ تمام ہولناک مناظر اور خوفناک عمل اور عجیب اور معجزانہ منظر صرف ایک جملہ شرطیہ کے اندر تمام ہوتا ہے ' صرف ایک جملہ میں۔

یہ کفار کے لئے مناسب اور منصفانہ جزاء ہے۔ "تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں۔" (لِيَذُوْقُوْا الْعَذَابَ) اللہ تعالیٰ ہر سزا دینے پر قادر ہے اور سزا سنانے میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ (اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا) اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔

کفار کے لئے اس بھڑکتی ہوئی خوفناک جہنم کے مقابلے میں مومنوں کا انعام کیا ہے۔ ان جلتی ہوئی کھالوں ' بھونی جانے والی کھالوں کے مقابلے میں کہ جب وہ گل جائیں تو بدل جائیں اور از سرنو جلنے لگیں اور از سرنو تعذیب شروع ہو۔ اس خوفناک منظر اور اس کربناک مشاہدے کے مقابلے میں مومنوں کا انعام واکرام کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں۔

(وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ) "اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا اور نیک عمل کئے۔" وہ تروتازہ باغات میں ہوں گے۔ (جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ) "جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔" اور یہ منظر نہایت پرسکون ' دائمی اور اطمینان بخش ہو گا۔ (خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا) "جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"..... ان باغات میں ان کو پاکیزہ بیویاں میسر ہوں گی۔ (اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ) اور ان باغات میں گھنی چھاؤں نظر آتی ہے نہایت ہی خوشگوار (وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا) "اور ہم انہیں گھنی چھاؤں میں رکھیں گے۔"..... ایک پہلے تھا جزاء کا منظر' ایک یہ جزاء کا منظر ہے۔ اور یہ منظر مشاہدات میں بھی ' تصاویر میں بھی اور اثرات میں بھی پہلے منظر کا عین مقابل ہے۔ مناظر قیامت کے بیان میں قرآن کا یہی انداز ہوتا ہے کہ اس میں گہرے اشارے ہوتے ہیں اور موثر اور گہرے اثرات ہوتے ہیں ' جو ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

---ooo---

درس ۳۵ ایک نظر میں

یہ سبق نہایت ہی اہم موضوع پر مشتمل ہے اور یہ موضوع امت مسلمہ کی زندگی کا اساسی موضوع ہے۔ اس میں ایمان کی شرائط اور ایمان کی تعریف بیان کی گئی ہے وہ ایمان جو اس امت کے نظام اساسی کی صورت میں ظاہر ہو' اس موضوع کی اہمیت ایک تو اس کے نفس مضمون کی وجہ سے ہے اور دوسرے نظام اساسی کے ساتھ اپنے طریقہ ارتباط اور امتزاج کی وجہ سے بھی یہ اہم ہے۔

قرآن کریم نے اس امت کو وجود بخشا اور اس کی تربیت کی۔ اس امت کو پوشیدگی سے نکالا گیا' یا عدم سے وجود کی طرف نکالا گیا اور قرآن کریم نے اس کے لئے نہایت ہی جامع انداز تعبیر استعمال کیا۔ (کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳: ۱۱۰)) "تم خیر امت تھے اور تمہیں لوگوں کے لئے نکالا گیا۔"

غرض قرآن نے اس امت کو وجود بخشا' اس لئے کہ وہ قرآن سے پہلے موجود نہ تھی۔ پھر اس نے اس کی تربیت کی تاکہ وہ تاریخ انسانیت میں بے مثال امت بن جائے۔ وہ خیر امت ہو اور (اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ) "اسے لوگوں کے لئے نکالا گیا۔" بات آگے بڑھانے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اس حقیقت کی ذرا وضاحت کر دیں کہ قرآن نے اس امت کو کس طرح پیدا کیا اور کیسے تربیت دی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس امت کا پیدا کیا جانا اور پھر اس کو تربیت دیا جانا' اس کے لئے ایک نیا جنم تھا۔ بلکہ یہ پوری انسانیت کے لئے ایک نیا جنم تھا۔ اس امت کے آنے کے بعد' انسانیت بالکل ایک نئی شکل میں سامنے آئی۔ یہ امت ترقی کی راہ میں ایک مرحلہ نہ تھی' نہ ارتقاء کی منازل میں سے ایک منزل تھی۔ نہ یہ ترقیاتی عمل میں ایک لانگ جمپ تھی بلکہ یہ امت دراصل امت عربیہ اور پھر پوری انسانیت کے لئے ایک نیا جنم تھی۔

جب ہم جاہلیت کے دور کے اشعار پر نظر ڈالتے ہیں اور جاہلیت کے دور کے اکا دکا آثار کا مطالعہ کرتے ہیں جو درحقیقت عربوں کا دیوان ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں عربوں کا نظریہ حیات' ان کا نظریہ کائنات' ان کا نظریہ اخلاق اور سماجی طرز عمل ریکارڈ ہوا ہے۔ اور یہ ان کے دائمی اور بنیادی تصورات ہیں۔ ان اشعار میں ان کی زندگی کے نشانات' ان کے قومی جذبات اور ان کے تصورات کا کل اثاثہ موجود ہے۔ ان کی تہذیب و تمدن کا خلاصہ بھی ان کے اندر ریکارڈ شدہ ہے۔ غرض عربوں کی مکمل شخصیت ان جاہلی اشعار اور دوسرے اکا دکا آثار میں موجود ہے۔

ہم عربوں کے اس دیوان میں ان کے تصورات اور ان کے علم و ثقافت کا مجموعہ دیکھتے ہیں اور ان کے اس دیوان میں موجود ان کی اقدار کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں لیتے ہیں' پھر ہم' وجود' زندگی' کائنات اور انسان کے بارے میں ان کے نقطہ نظر کو دیکھتے ہیں اور ان کے نظام معاشرت اور وجود انسانی کے مقاصد کے بارے میں ان کے تصورات' اور ان تصورات کی اساس پر ان کی عملی تنظیم کو دیکھتے ہیں' پھر ہم عربوں کی عملی صورت حال کا جائزہ قبل از اسلام اور بعد از اسلام

لیتے ہیں اور یہ تقابلی جائزہ ان تصورات کی روشنی میں لیتے ہیں جو ان کے اس دیوان کے اندر پائے جاتے ہیں اور پھر اس کا تقابل ان حالات سے کرتے ہیں جو قرآنی تصورات کے تحت عربی معاشرے میں پیدا ہوئے تو ہمیں نہایت ہی قطعیت کے ساتھ معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآنی تصورات کے تحت یہ جدید معاشرہ عربوں کے لئے ایک جدید جنم تھا۔ یہ ترقی نہ تھی' نہ ترقی کا کوئی مرحلہ تھا' نہ یہ کوئی برق رفتار ترقی تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی صنعت کاری سے اس قوم کا ظہور ہوا' اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے جنم دیا گیا۔ قرآن کریم نے اس کے لئے (اُخْرِجَتْ) کا لفظ بالکل صحیح استعمال کیا ہے۔ اور یہ نشاۃ جدیدہ نہایت ہی حیران کن اور تعجب انگیز تھی اس لئے کہ یہ اس قوم کا پہلا اور آخری ظہور تھا۔ اور دنیا میں یہ واحد مثال ہے کہ ایک کتاب کے دوتوں وقایوں کے درمیان سے ایک قوم جنم لیتی ہے۔ ایک امت پیدا ہو جاتی ہے اور ایک کتاب کے الفاظ سے اسے زندگی ملتی ہے لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ یہ کلمات اللہ کے احکامات ہیں۔

اس نکتے پر اگر کوئی ہم سے بحث و مباحثہ کرتا ہے تو بتائے کہ تاریخ کے جس موڑ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے ذریعے اس امت کو برپا کیا' اس سے پہلے یہ امت کہاں تھی۔ جب قرآن کریم نے اسے پیدا کیا اور یہ نکالی گئی تو یہ کہاں تھی؟

ہم جانتے ہیں کہ یہ جزیرۃ العرب میں تھی لیکن کیا اس کا کوئی انسانی وجود تھا؟ انسانی تمدن کے رجسٹر میں اس کا کیا ریکارڈ تھا۔ عالمی تاریخ میں اس کے بارے میں کتنے اوراق موجود تھے۔ انسانیت کے عالمی دسترخوان پر اس کا مقام کہاں تھا۔ اور اس دسترخوان پر اس کی جانب سے کیا تحفہ تھا تاکہ تاریخ یاد کرتی اور یہ ان کی پہچان ہوتی کہ یہ ہے عربوں کا تحفہ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس امت کی نشوونما صرف اس دین کے ذریعے ہوئی اور اس کی تربیت اسلامی نظام زندگی کے زیر سایہ ہوئی۔ اس نے اپنے نفس اور اپنی ذات کی قیادت اور پھر پوری انسانیت کی قیادت اس کتاب کے ذریعے سے کی جو اس کے ہاتھ میں تھی اور اس کتاب کے نظام حیات کے مطابق اس کی زندگی پر چھاپ پڑی۔ صرف قرآن اور صرف قرآن سے وہ وجود میں آئی۔ اس پر تاریخ گواہ ہے۔ اور اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔ (وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْہِ ذِکْرُکُمْ ..... اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ) (بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی جس میں تمہارا تذکرہ ہے.... کیا تم عقل نہیں رکھتے۔)

غرض اس کرۂ ارض پر امت عربیہ کا تذکرہ صرف اس کتاب کی وجہ سے ہوا اور تاریخ میں اس کا اہم کردار رہا۔ سب سے پہلے اس نے اپنا ایک انسانی وجود قائم کیا' اس کے بعد اس نے ایک عالمی تمدن و تہذیب کو وجود بخشا۔ لیکن بعض احمق اب یہ چاہتے ہیں کہ وہ امت عربیہ پر اللہ کے اس احسان کا انکار کر دیں اور اس بات کی ناشکری کی جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے انسانوں کے لئے اپنا آخری کلام عربی زبان میں نازل فرمایا اور عربوں کو اس کے اولین مخاطب قرار دیا۔ اس کلام کی وجہ سے ان کو ایک انسانی وجود بخشا' ان کو شہرت اور تاریخ اور تمدن عطا کئے۔ یہ احمق دراصل اس خلعت کو اتارنا چاہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے امت عربیہ کو پہنائی اور وہ اس جھنڈے کو پھاڑنا چاہتے ہیں' جس کی وجہ سے ان کو عزت اور شہرت نصیب ہوئی بلکہ ان کو ایک وجود ملا' جب اللہ نے ان کو بحیثیت امت اٹھایا۔

ہم کہتے ہیں کہ جب اسلام اس امت کی تخلیق کر رہا تھا اور اس کی تربیت کر رہا تھا' جماعت مسلمہ کے اندر اسلام کے جدید خدوخال کے خطوط کھینچ کر ان کو مستحکم کر رہا تھا' اسے جاہلیت کی گہری کھائی سے نکال کر اس کے وجود سے جاہلیت

کے تمام خدوخال مٹارہا تھا' اس کی زندگی' ان کے نفوس اور اس کے معاشرے کو پاک کر رہا تھا' اس کو منظم کر رہا تھا' اسے از سرنو کھڑا کر کے اسے جدید جنم دے رہا تھا اس جدید جماعت کو ایک معرکہ کار زار میں اتار رہا تھا اور وہ اپنے نفوس' اپنے اوضاع و اطوار سے سابقہ معاشرتی آثار جاہلیت مٹا رہا تھا۔ اور جس وقت قرآن جماعت کے اندر سے اور اس کے ماحول سے مدینہ منورہ کے اندر منافقین' مشرکین اور یہودیوں کی شکل میں پائے جانے والی جاہلیت کو ختم کر رہا تھا جاہلیت کے ساتھ یہ معرکے رات دن جاری تھے' ہر زمان و مکان میں جاری تھے۔ یہ سب کچھ کرتے ہوئے اس دوران میں قرآن نے سب سے پہلے اس امت کو ایک صحیح تصور حیات دیا۔ اس کے لئے ایمان کی شرائط و حدود وضع کیں' پھر اس تصور کے مطابق اسلام نے اس کے لئے ایک دستوری نظام تجویز کیا جس کی وجہ سے اس کے وجود اور اس کے اردگرد جاہلیت کے وجود کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیا گیا ان کے لئے وہ خصائص و مقاصد متعین کئے گئے جن کے لئے اسے برپا کیا گیا تھا تاکہ وہ لوگوں کے سامنے ان کی تبلیغ کرے اور ان کو اللہ اور اللہ کے ربانی نظام کی طرف دعوت دے۔

اس درس میں اس اساسی نظام کا بیان ہے۔ یہ نظام اس اساسی تصور حیات سے پھوٹتا ہے اور اس پر قائم ہے۔ اور انہی شرائط ایمان اور حدود اسلام کے مطابق ہے۔

پھر اس سبق میں وہ تجدید عہد ہے جس سے یہ امت اپنا نظام حیات لیتی ہے۔ وہ طریقہ بھی بتایا گیا ہے جس کے مطابق وہ اپنا نظام اخذ کرے گی۔ وہ نظام بھی بتایا گیا ہے جس کے مطابق وہ اس چیز کا ادراک کرے گی جسے وہ اخذ کر رہی ہے یا زندگی کے مسائل اور اس کی مشکلات میں اس نظام کی طرف رجوع کرے گی' ان امور میں جن کے بارے میں کوئی نص اور صریح حکم نہیں ہے اور جن میں رائے کا اختلاف ممکن ہے۔ پھر یہ بھی بتایا گیا کہ وہ انتظامیہ کون سی ہے جس کی اطاعت ہوگی اور اس انتظامیہ کی قوت کا مرجع کونسی چیز ہے اور یہ تمام امور ایمان کی شرائط اور تعریفات ہیں۔

یہاں آکر اس امت کا دستوری نظام اس کے نظریہ حیات کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے' یہ اتحاد پھر تحلیل نہیں ہوتا اور نہ ان کے عناصر ترکیبی ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔

یہ ہے وہ اہم موضوع جس کا حق یہ سبق ادا کرتا ہے۔ اس بارے میں مکمل ہدایات دی جاتی ہیں اور اس سے متعلق تمام سوالوں کا جواب دیا جاتا ہے۔ اس سبق کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ اس قدر واضح اور بدیہی ہے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس بارے میں کوئی مسلمان کس طرح مجادلہ کر سکتا ہے.... یہ درس امت کو واضح طور پر بتاتا ہے کہ رسولوں کو بھیجا ہی اس لئے گیا ہے کہ ان کی اطاعت کی جائے اور یہ اطاعت اللہ کے حکم سے ہے اور یہ کہ رسولوں کو محض تبلیغ یا لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا کہ وہ لوگوں کو مسکت دلائل سنا دیں بلکہ (وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ) (اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے وہ صرف اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔)

یہ سبق واضح کرتا ہے کہ لوگ مومن ہی نہ ہوں گے اگر وہ اپنے فیصلے اس نظام قانون کے مطابق نہیں کرتے جو اللہ نے اتارا ہے۔ یہ منہاج رسول اللہ ؐ کی عملی زندگی اور آپ کے احکام میں پایا جاتا ہے اور جو قرآن و سنت کی شکل میں قیامت تک باقی ہے۔ اور یہ بات بھی کافی نہیں ہے کہ وہ اس قانون کے مطابق اپنے فیصلے کرائیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے

کہ وہ دلی رضامندی سے ان فیصلوں کو قبول بھی کریں۔

(فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِي اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (٤ : ٦٥))

(نہیں' اے محمد ﷺ تمہارے رب کی قسم 'یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں' پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دل میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں' بلکہ سر تسلیم خم کر لیں۔)

اس سبق میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جو لوگ طاغوت کے پاس اپنے فیصلے لے جاتے ہیں یعنی اللہ کی شریعت کے سوا کسی اور قانون کے مطابق فیصلے کراتے ہیں تو ان سے ان کا یہ دعویٰ قبول نہ ہو گا کہ وہ اللہ کے کلام اور رسول اللہ ﷺ کے احکام پر ایمان لانے والے ہیں' یا وہ پہلی کتابوں پر ایمان لانے والے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے اور اس پر دلیل ان کا یہ فعل ہے کہ وہ اپنے فیصلے طاغوت کے پاس لے جاتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (٤ : ٦٠))

(اے نبی! تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں' اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں۔ حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان تمہیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔)

اور اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نفاق کی علامت یہ ہے کہ لوگوں کو اس قانون کے مطابق فیصلے کرنے سے روکا جائے جو اللہ نے نازل فرمایا ہے اور جو سنت رسول ﷺ میں ہے۔

(وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (٤ : ٦١)) (اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسول کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں)

یہ سبق کہتا ہے کہ ایمانی طریق کار اور اس کا دستور اساسی یہ ہے کہ تم لوگ اللہ کی نازل کردہ کتاب کی پیروی کرو

اور رسول خدا ؐ کی سنت کی پیروی کرو اور ان اہل ایمان کی اطاعت کرو جو اولوالامر ہیں۔

(یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (۴:۵۹))

(اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ؐ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں)۔

یہ سبق بتاتا ہے کہ جہاں نقطہ نظر مختلف ہو' اور مسائل بالکل نئے ہوں اور ان میں منصوص احکام موجود نہ ہوں تو پھر اللہ و رسول کی طرف رجوع کرو اور قرآن و سنت کی روشنی میں ان کا حل تلاش کرو۔ (فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ (۴:۵۹)) "اگر تم کسی چیز میں تنازع ہو جاؤ تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔" اس طریقے سے اسلامی نظام حیات ان مسائل اور حالات کا حل دریافت کر لیتا ہے جو بالکل پہلی مرتبہ نمودار ہوئے ہوں۔ اس قاعدے کے ذریعے اسلام ابدی طور پر نئے نئے مسائل کے حل کی تدبیر کرتا ہے۔ چونکہ اسلام کا دستوری قاعدہ یہ ہے کہ اس وقت تک کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے مسائل اسلامی نظام کے مطابق حل نہ کرے اس لئے اسلامی نظام زندگی کی وسعت کے ساتھ ان کے حل کا یہ طریقہ وضع کرتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ مسائل کو اللہ اور رسول اللہ کی طرف لوٹایا جائے 'کیونکہ یہاں اطاعت شرط ایمان ہے۔ ایمان واضح طور پر مشروط ہے۔ (اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (۴:۵۹)) "اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔"

ہمیں اس سے قبل بیان کردہ یہ فرمان الٰہی نہیں بھولنا چاہئے۔ (اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (۴:۴۸)) اللہ اس بات کو تو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کا ارتکاب کیا جائے اور اس کے سوا جس گناہ کو چاہے بخش دے۔" یہودیوں کو مشرک قرار دیا گیا 'محض اس لئے کہ وہ اپنے احبار کو اللہ کے علاوہ رب قرار دیتے تھے 'اس لئے نہیں کہ وہ اپنے ارباب کی عبادت اور بندگی کرتے تھے بلکہ اس لئے کہ انہوں نے ارباب کو حلال و حرام قرار دینے کے اختیارات دے رکھے تھے۔ انہوں نے احبار کو حق حاکمیت اور حق قانون سازی دونوں عطا کر دیئے اور یہ کام انہوں نے اپنی جانب سے کیا تھا۔ اس لئے انہوں نے ان کو اللہ کا شریک بنا لیا تھا جو ناقابل معافی جرم ہے اور اس کے علاوہ تمام جرائم معاف ہو سکتے ہیں۔ حضور ؐ فرماتے ہیں۔ (وَاِنْ زَنَا وَاِنْ سَرَقَ وَاِنْ شَرِبَ الْخَمْرَ) (اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری کی اور شراب نوشی کی)۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے عقیدے کی بات کو اس میں منحصر کر دیا ہے کہ اللہ کے ساتھ حاکمیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس میں وہ منفرد ہے اس لئے کہ الوہیت کی صفات میں سے یہ مخصوص ترین صفت ہے۔ اس کے اندر رہ کر ہی ایک مومن' مومن اور مسلم 'مسلم رہ سکتا ہے اور وہ امید رکھ سکتا ہے کہ اس کے گناہ معاف ہوں' چھوٹے ہوں یا بڑے۔ اس سے باہر نکل جائیں تو شرک ہے' جسے اللہ کبھی بھی معاف نہیں فرماتے۔ اس لئے کہ یہ ایمان کی شرط اور اسلام کی تعریف (Definition) ہے۔ (اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (۴:۵۹)) (اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے ہو۔)

یہ ہے وہ اہم موضوع جو اس سبق میں زیر بحث ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کرۂ

ارض پر ایک مسلم امت کے فرائض کیا ہیں ۔ مثلاً یہ کہ انہوں نے اللہ کے درست نظام زندگی کے مطابق عدل و انصاف قائم کرنا ہے ۔

(اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰى اَهْلِهَا وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (٤:٥٨))

(مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو' اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو' اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے ۔

یہ ہے اس سبق کا اجمالی خاکہ ۔ اب ذرا نصوص پر تفصیلی بحث دیکھئے ۔

---ooo---

درس ۳ ۔ تشریح آیات

۵۸ ــ تا ــ ۷۰

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ
بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ
كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿٥٨﴾

"مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو' اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو' اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔"

یہ ہیں امت مسلمہ کے فرائض اور یہ ہے اس کا ضابطہ اخلاق۔وہ امانتوں کو ان لوگوں کے سپرد کرتی ہے جو اس کے اہل ہوں۔ اور اگر وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے تو عدل پر کرے گی اور اس نظام اور قانون کے مطابق کرے گی جو اللہ نے سکھایا ہے۔

امانتوں کا آغاز امانت کبریٰ سے ہوتا ہے۔یہ وہ امانت ہے جس سے فطرت انسان مربوط ہے اور یہ امانت وہی ہے جس کے اٹھانے سے آسمان' زمین اور پہاڑوں نے معذوری کا اظہار کیا تھا'لیکن اسے انسان نے اٹھالیا تھا۔انسان نے جس بار امانت کو اٹھایا' وہ ہدایت 'معرفت اور ایمان باللہ کی امانت تھی۔یہ ایمان باللہ' بالقصد' بالارادہ اور کمال توجہ کے لائق ایمان ہے۔ یہ امانت انسان کی فطرت کا تقاضا بھی ہے۔انسان کے سوا اور جس قدر مخلوق خدا ہے' اس کی جانب سے خدا پر ایمان' ہدایت 'معرفت طہارت اور اطاعت بلاقصد و ارادہ اور بلاتوجہ ہوتی ہے۔اور وہ طوعاً" وکرہاً" ناموس الہٰی کے فرمان بردار ہوتے ہیں۔ انسان وہ واحد مخلوق ہے کہ اللہ نے اس کی فطرت' اس کی عقل' اس کی معرفت' اس کے ارادے اور اس کی توجہ پر ایمان کو موقوف کر دیا ہے اور اس پر فرض قرار دیا ہے کہ وہ ایمان کی منزل تک پہنچنے کی جدوجہد کرے۔وہ یہ جدوجہد کرے گا تب اللہ اسے راستہ دکھائے گا۔

(وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا) (جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کی

راہنمائی اپنے راستوں کی طرف کریں گے)۔ ... یہ ہے وہ پہلی امانت جسے انسان نے دوسری امانتوں کے ساتھ اٹھایا ہے۔

اور پھر اس امانت کبریٰ سے دوسری ماتحت امانتیں اور ذمہ داریاں انسان پر عائد ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ان میں سے اہم امانت شہادت حق کی امانت ہے اور یہ شہادت انسان نے اس دین کی سچائی پر دینی ہے۔ سب سے پہلے مومن کا نفس یہ شہادت دے گا کہ وہ مومن ہے اسے ایمان اور اسلام کا عکاس ہونا چاہئے۔ ایک مومن اپنے شعور و تصورات اور اپنے سلوک اور عمل میں اسلام اور دین کا ترجمان ہو۔ لوگ دیکھتے ہی یہ کہیں کہ یہ ہے نمونہ اسلام اور دین اسلام کا۔ دیکھتے ہی لوگ کہیں کہ یہ دین و ایمان بہت ہی اچھا دین و ایمان ہے جس کے پیروکار ایسے اچھے ہیں' جس کے ماننے والے اس قدر اخلاق و کمالات کے مالک ہیں۔ یہ دین کی شہادت حق ہے جس سے تمام دیکھنے والے متاثر ہوں گے اور یہ بھی ایک امانت ہے۔ دوسری شہادت یہ ہے کہ ایک مومن دین کی دعوت لوگوں کو دے اور لوگوں کے سامنے دین کے فضائل بیان کرے جبکہ خود داعی کے اندر وہ پورے فضائل زندہ موجود ہوں۔ کسی مومن کی ذاتی پاکیزگی اور طہارت کی شہادت کافی نہیں ہے جب تک وہ لوگوں کو اس طرف دعوت نہ دے۔ اگر دعوت نہ دے تو اس نے امانت دعوت ادا نہ کی جو بذات خود امانت ہے۔ اس کے بعد اس دین کی شہادت قیام دین ہے اور اس امانت کی ادائیگی پورے کرۂ ارض پر فرض ہے۔ اس طرح کہ یہ جماعت مومنہ کا بھی منہاج ہو اور تمام بشریت کا بھی منہاج ہو اور اس کام کے لئے ایک مومن انسان کا فرض ہو گا کہ وہ اپنے پورے وسائل اس راہ میں جھونک دے۔ جماعت مسلمہ کے پاس جس قدر وسائل و ذرائع ہوں' وہ اس راہ میں صرف کر دے اور اس نظام کو انسانوں کی زندگی میں قیام کے مرحلے تک پہنچائے۔ اور یہ بھی ایک عظیم امانت ہے جسے ادا کرنا ہے۔ اور یہ ایک شخص کے ذاتی ایمان کی وسعت ہے اور یہ فریضہ اقامت دین نہ کسی فرد کے لئے معاف ہے اور نہ کسی جماعت کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ کہا گیا۔ (اَلْجِھَادُ مَاضٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ) (جہاد قیامت تک جاری رہے گا) اور یہ جہاد بھی امانات میں سے ایک اہم امانت ہے۔

ان امانات میں سے وہ امانتیں بھی ہیں جو لوگوں کے باہم معاملات میں پیش آتی ہیں۔ یہ فرض ہے کہ لوگوں کی امانتیں ان کو لوٹائی جائیں۔ معاملات کی امانت اور وہ مالی امانت جو کسی کے پاس رکھی گئی ہو' حکام اور رعایا کو نصیحت کرنے کی امانت' چھوٹے بچوں کی پرورش کی امانت' جماعت کی عزت کی حفاظت کی امانت' اجتماعی اموال کی امانت اور سرحدوں کی حفاظت کی امانت۔ غرض وہ تمام مناصب' فرائض اور تمام سروسز امانت ہیں اور یہ ان لوگوں کے سپرد کر دی جائیں جو ان کے اہل ہوں۔ یہ سب امانتیں ہیں اور اس آیت میں ان کا اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے۔

رہا یہ حکم کہ لوگوں کے درمیان عدل کرو' تو یہ عام ہے اور تمام لوگوں کے لئے ہے۔ یہ حکم نہیں ہے کہ اہل اسلام کے درمیان عدل کرو۔ یہ حکم بھی نہیں ہے کہ اور لوگوں کو چھوڑ کر صرف اہل کتاب کے ساتھ عدل کرو۔ انصاف ہر انسان کا حق ہے اور بحیثیت انسان اسے ملنا چاہئے۔ اسلامی نظام حیات کے اندر عدل کا تعلق اس صفت یعنی صفت الناس کے ساتھ ہوتا ہے اور اسی صفت الناس پر تمام لوگ متحد ہوتے ہیں۔ مومن ہیں تو وہ بھی الناس ہیں' کافر ہیں تو وہ بھی الناس ہیں۔ دوست ہیں یا دشمن' کالے ہیں یا گورے' عربی ہیں یا عجمی' سب کے سب الناس ہیں اور امت مسلمہ کو یہ نگرانی سپرد کی گئی ہے کہ وہ الناس کے درمیان عدل قائم کرے۔ جب بھی اسے لوگوں کے امور کے فیصلے کا موقع ملے۔ یہ

انصاف انسانیت کو اس صورت میں صرف اسلام کے ہاتھوں ملا' صرف مسلمانوں کی حکومت میں ملا' صرف اسلامی قیادت کے دور میں ملا۔ اس دور سے پہلے اور بعد میں انسانیت نے اسے گم پایا۔ اسے کبھی بھی اس کا چکھنا تک نصیب نہ ہوا۔ ایسی شریفانہ اور باعزت صورت میں کہ وہ سب انسانوں کے لئے مہیا ہو' اس لئے کہ وہ انسان ہیں۔ وہ صرف ان طبقات تک محدود نہ ہوں جو الناس کی صفت کے ساتھ کوئی اور صفت بھی رکھتے ہوں۔

یہ ہے اسلام میں نظام عدالت کی اساس۔ جس طرح امانت اس کے حقدار تک پہنچانا' اسلامی معاشرے کی اساس اور اس کا اصل الاصول ہے۔ ((تفصیلات کے لئے دیکھئے کتاب ''نحو مجتمع اسلامی'' کا فصل ''مجتمع عادل)) اور ان دو احکام یعنی امانت اس کے مستحق کو دینا اور لوگوں کے درمیان عدل کرنا' کے بعد جو تعقیب اور تبصرہ آتا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ یاد رکھو کہ یہ اللہ کی جانب سے ایک نصیحت ہے اور یہ اسی کی ہدایات ہیں' اور کیا ہی اچھی نصیحت اور کیا ہی اچھی ہدایات ہیں یہ۔ (انَّ اللّٰهَ نعمّا یعظُکُمْ بہ (٤ : ٥٨)) (اللہ تم کو نہایت ہی اچھی نصیحت کرتا ہے۔)

اب ذرا یہاں توقف کیجئے۔ ذرا دیکھیں کہ اس فقرے کا انداز اور اسلوب کیا ہے۔ اصل بات اس جملے کی ساخت ہے۔ اصل ہے۔ (انَّهُ نَعِمَ ما یَعِظُکُمْ اللّٰه بہ) لیکن اس فقرے میں لفظ اللہ کو مقدم کرکے اسے ان کا اسم بنا دیا گیا۔ اور (نِعِمَ ما) یعنی (نعمّا) کو مع متعلقات (Propositions) خبر کی جگہ رکھا گیا اور اصل خبر کو محذوف کر دیا گیا۔ اس طرح طرز ادا سے یہ ثابت ہوا کہ اللہ کی ذات اور اس وعظ و نصیحت کے درمیان ایک مضبوط تعلق ہے۔

یہ وعظ تو تھا نہیں بلکہ یہ حکم تھا لیکن امر کا اظہار بلفظ وعظ و نصیحت کیا گیا اس لئے کہ نصیحت اور وعظ کے الفاظ کے ساتھ بات کو انسان جلدی اخذ کرتا ہے اور انسانی وجدان اسے جلدی قبول کر لیتا ہے اور اس طرح یہ بات جلدی نافذ ہوتی ہے کیونکہ اس کے نفاذ میں اختیار' رغبت اور حیاء سب شامل ہوتے ہیں۔

اس کے بعد آیت میں آخری تعقیب اور نتیجہ آتا ہے اور اس میں تمام معاملے کو اللہ کی نگرانی' اس کی خشیت اور اس سے امید کرم کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ (انَّ اللّٰهَ کَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا (٤ : ٥٨)) ''اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔'' یہاں مامور بہ' یعنی ادائیگی امانات اور قیام عدل بین الناس اور اس بات میں کہ اللہ سمیع و بصیر ہے ایک نہایت ہی لطیف اور واضح مناسبت ہے۔ اللہ سنتا اور دیکھتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ تم امانت صحیح ادا کرتے ہو۔ تم عدل صحیح طرح قائم کرتے ہو۔ عدالت کے عمل کو بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ اچھی طرح سنا جائے' اچھی طرح اندازہ کیا جائے اور حالات اور بادی النظر امور کے پیچھے عمیق اسباب کی تلاش کی جائے اور اس کے بعد تمام فیصلے بصیرت افروز سماعت کے بعد ہوں اور سامع صاحب بصیرت و بصارت ہو۔

---ooo---

اب' امانت داری اور عدل کا معیار کیا ہے؟ امانت و عدل کا طریق اور تصور کیا ہے؟ عدل و امانت کی تعریف کیا ہے اور ان کا نفاذ کیسے ہو گا؟ یعنی زندگی کی ہر سرگرمی اور ہر معاملے میں۔ کیا ہم امانت اور عدل کا مفہوم اور ان کے نفاذ و رواج کے طریقے اور وسائل کو عوام الناس میں مروج رسم و رواج اور اصطلاحات پر چھوڑ دیں اور ان کی عقل جو فیصلہ کرے اسے عدل قرار دیں یا ان کی خواہشات پر چھوڑ دیں۔

بے شک انسانی عقل و خرد کی اپنی قدر و قیمت ہے اور انسان کی ہدایت اور علم و معرفت کے لئے وہ ایک مسلم ذریعہ

ہے - یہ بات بالکل درست ہے - لیکن یہ انسانی عقل بہرحال افراد اور جماعتوں کی عقل ہوتی ہے اور یہ افراد کسی مخصوص معاشرے کے فرد ہوتے ہیں اور ان پر متعدد چیزیں اثر ڈالتی ہیں - انسانی عقل نام کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا کوئی مطلق اور بے قید مفہوم ہو - اصل چیز یہ ہے کہ میری عقل ہوتی ' فلاں فلاں کی عقل ہوتی اور پھر ان عقلوں کا مجموعہ انسانی عقل ہوتی ہے اور یہ مجموعہ عقل زمان و مکان کے اندر محدود ہوتی ہے - اس لئے یہ عقول مختلف موثرات سے تاثر لیتی ہیں اور کبھی اس طرف مائل ہو جاتی ہیں اور کبھی اس طرف مائل ہو جاتی ہیں۔

لہٰذا کسی ایسے معیار اور میزان کی ضرورت ہے جو نہ بدلے اور نہ تاثر لے - ان تمام عقول کو اس میزان پر تولا جائے اور اس معیار پر پرکھا جائے اور معلوم کیا جائے کہ ان میں سے کون سی عقل ٹھیک ہے اور کون سی غلط ہے؟ کون سے احکام ٹھیک اور کون سے غلط ہیں؟ کون سا تصور ٹھیک اور کون سا غلط ہے؟ اور ان احکام اور تصورات میں کہاں کہاں غلو' تقصیر' کوتاہی اور انحراف کیا گیا ہے - یہاں عقل کی قدر و قیمت یہ ہے کہ وہ انسان کی بھلائی کے لئے ایک آلہ پیدا کیا گیا ہے - تاکہ وہ اس کے ذریعے اپنے احکام اور تصورات کو اس میزان کے مطابق درست کرتا رہے - اس لئے کہ یہ میزان ایک ایسا میزان ہے جو انسان کی خواہشات نفس سے متاثر نہیں ہوتا اور نہ دنیا کے موثرات اس پر اثرانداز ہو سکتے ہیں۔

رہے وہ اوزان اور پیمانے جو خود انسانوں نے وضع کیے ہیں تو ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے کیونکہ بعض اوقات ان انسانی پیمانوں کے اندر غلطی ہوتی ہے اس لئے ان پیمانوں کے ساتھ ناپی ہوئی اقدار میں بھی غلطی واقع ہو جاتی ہے - یہ غلطی اس وقت تک دہرائی چلی جاتی ہے جب تک لوگ اس اصل معیار اور پیمانے کی طرف واپس نہیں لوٹتے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ میزان انسانوں کے لئے نصب کیا ہے تاکہ اس کے اوپر وہ امانتوں اور نظام عدالت کو استوار کریں اور تمام دوسری اقدار کو بھی اس پر تولیں - اپنے تمام احکام اور تمام حالات زندگی کو اس پر پرکھیں' زندگی کے ہر میدان میں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿٥٩﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں' پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو - اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو - یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے -"

اس مختصر آیت میں اللہ تعالیٰ ایمان کی شرط اور اسلام کی تعریف بیان کرتے ہیں' اور اس میں امت مسلمہ کا اساسی دستور بھی آ جاتا ہے - یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام میں حاکمیت اور اقتدار کا منبع کونسا ہے - یہ سب کام اللہ سے شروع ہوتے ہیں اور اللہ کی ذات پر ہی ان کا اختتام ہوتا ہے - اگر شریعت میں کسی حکم کے بارے میں تفصیلات نہ ہوں تو پھر لازماً اسلام اس

دستوری اصول کی طرف رجوع کر کے اپنے تمام جزئی مسائل میں جواب حاصل کر سکتے ہیں اور قیامت تک یہ اساسی دستوری اصول قائم و دائم ہے۔ اس میں لوگوں کی آراء اور ان کی عقلی کاوشوں کے لئے اختلاف کی گنجائش بھی چھوڑی گئی ہے۔

انسانوں کی زندگی پر حاکیت کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے' چاہے ظاہری امر ہو یا پوشیدہ ہو' چاہے بڑا معاملہ ہو یا چھوٹا۔ ان معاملات میں اللہ تعالیٰ نے شریعت کا حکم مقرر فرمایا ہے۔ اور رسول خدا ؐ کی سنت اس کے بارے میں موجود ہے اس لئے کہ حضور ؐ نے محض ہوائی باتیں نہیں کیں۔ آپ کی تمام باتیں وحی پر مبنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے جو قانون بنائے وہ بھی اللہ کے قوانین ہیں۔

اللہ واجب الاطاعت ہے۔ اللہ کی الوہیت کا اہم خاصہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کے لئے شریعت بنائے۔ اس لئے اس کی شریعت واجب النفاذ ہے اور جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کریں۔ اور پھر وہ رسول اللہ کی اطاعت کریں اس لئے کہ رسول جو کچھ کہتا ہے وہ بھی اللہ کے حکم سے کہتا ہے۔ رسول کی اطاعت میں اللہ کی اطاعت ہے کیونکہ اللہ ہی نے رسول کو یہ شریعت دے کر بھیجا ہے۔ اس نے اپنی سنت میں شریعت کو لوگوں کے لئے بیان کیا ہے اس لئے آپ کی سنت اور آپ کے فیصلے اس زاویے سے شریعت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ لوگوں کے ایمان کا تعلق شریعت کے اس نفاذ سے ہے "وجودا" اور "عدما" اس لئے کہ اللہ کا حکم ہے کہ (اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (٤ : ٥٩)) (اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔)

یہاں (وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ) (یعنی تم میں جو صاحب امر ہوں) سے مراد بھی متعین کر دی جاتی ہے۔ یعنی وہ تم میں سے ہوں' یعنی وہ لوگ جن کے اندر شرط ایمان اور اسلام کی تعریف (Definition) پائی جاتی ہو۔ یعنی وہ لوگ جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں جو حق قانون سازی اور حق اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کو دیتے ہیں اور ان معاملات میں صرف اللہ تعالیٰ سے ہدایات اخذ کرتے ہوں۔ ان حالات میں جن میں منصوص ہدایات آگئی ہیں نیز جن معاملات میں انسانوں کے فہم و ادراک میں اختلاف رائے ہو اور جن میں کوئی نص وارد نہ ہوئی ہو ان میں بھی وہ اللہ اور رسول اللہ ؐ کی طرف رجوع کریں اور ان مسائل میں ان اصولی احکام کو منطبق کریں جو وارد ہیں اور منصوص ہیں۔

اس نص میں بطور اصلیت اللہ کی اطاعت کو لازم کیا گیا ہے' نیز اس میں رسول اللہ ؐ کی اطاعت کو بھی اصل اطاعت قرار دیا گیا ہے۔ اس حیثیت سے کہ یہ اللہ کے فرستادہ ہیں (وَ اُولِي الْاَمْرِ) کی اطاعت اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کے تابع اطاعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ (وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ) کے ساتھ لفظ (اَطِيْعُوا) کو تیسری بار نہیں لایا گیا۔ جیسا کہ اللہ اور رسول اللہ ؐ کے ساتھ لفظ (اَطِيْعُوا) دہرایا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ (وَ اُولِي الْاَمْرِ) کی اطاعت اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت سے ماخوذ ہے۔ جبکہ (وَ اُولِي الْاَمْرِ) کے ساتھ (مِنْكُمْ) کے لفظ کے مطابق ان کا اہل ایمان میں سے ہونا ضروری ہے۔ یہ اولی الامر کے لئے شرط ہے۔

ان تمام تاکیدوں کے ساتھ ساتھ اولی الامر کی اطاعت ان اوامر میں سے ہے جو اللہ کی طرف سے منصوص اور مشروع ہوں اور حدود اللہ کے اندر ہوں اور ان اوامر کے خلاف کوئی نص وارد نہ ہو۔ نیز یہ اوامر اور احکام اصول شریعت کی روشنی میں بھی شریعت کے خلاف نہ ہوں۔ حضور ؐ کی سنت میں علی وجہ الیقین ان حدود و قیود کا تعین کر دیا گیا ہے جن کے مطابق اُولی الامر کی اطاعت کی جاتی ہے۔

صحیحین میں حضرت اعمش ﷺ کی حدیث میں ہے (اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی مَعْرُوْف) (اطاعت صرف معروف طور پر جائز کاموں میں)۔

صحیحین میں یحییٰ القطان کی حدیث ہے۔ (السمع و الطاعة علی المراء المسلم فیما احب او کرہ ما لم یومر بمعصیة و اذا امر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة)

(سمع اور اطاعت ہر مسلم شخص پر لازم ہے ایسے امور میں بھی جو وہ پسند کرے اور ایسے امور میں بھی جنہیں وہ ناپسند کرے' اس وقت تک جب تک اسے معصیت کا حکم نہ دیا گیا ہو۔ اگر اسے معصیت کا حکم دیا گیا تو اس پر نہ سمع لازم ہے اور نہ اطاعت)۔

مسلم نے ام الحصین کی حدیث نقل کی ہے۔

(ولو استعمل علیکم عبد یقود کم بکتاب اللہ اسمعوا لہ و اطیعوا) (اگر تم پر کوئی غلام مقرر کر دیا جائے جو تمہاری قیادت کتاب اللہ کے مطابق کرے تو اس کی بات بھی سنو اور اطاعت بھی کرو)۔

اس طرح اسلام نے ہر شخص کو اللہ کی شریعت اور سنت رسول اللہ ؐ پر امین اور نگہبان بنا دیا ہے۔ اس کے ایمان اور اس کے دین پر اسے نگران مقرر کر دیا ہے۔ اس کے نفس اور اس کی عقل کا اسے نگران مقرر کر دیا ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں میں اس کے معاملات کا اسے نگران مقرر کر دیا ہے۔ اسلام نے انسان کو اس طرح نہیں چھوڑا ہے جس طرح کسی گلے میں ایک جانور ہوتا ہے کہ اسے یہاں سے روکا جائے اور وہاں سے روکا جائے اور وہ سمع و اطاعت نہ کرے اور ہروقت اسے ہش کہنے کی ضرورت ہو' اس لئے کہ اسلامی نظام واضح ہے۔ اطاعت کی حدود واضح ہیں۔ اسلامی قانون و شریعت اور قرآن و سنت واضح ہیں اور ایک ہیں۔ ان میں تعدد نہیں ہے' ان میں کوئی تفریق نہیں ہے اور کوئی فرد اس میں شکوک و شبہات کا شکار نہیں ہوتا۔

یہ تو ان امور کا معاملہ ہے جس میں نص صریح وارد ہو۔ لیکن وہ معاملات جن میں قرآن و سنت کی واضح نصوص وارد نہیں ہیں' اور مشکلات اور مسائل کی وجہ سے کوئی بالکل نیا معاملہ درپیش ہو' بعد میں آنے والے ادوار میں حالات کے اختلاف میں اور سوسائٹیوں کے اختلاف میں اور بدلتے ہوئے حالات ہوں اور ان میں کوئی نص قطعی نہ ہو یا بالکل کوئی نص ہی نہ ہو' جس میں مختلف لوگوں کے آراء اور اندازے مختلف ہوں' اور ہر شخص اپنی عقل کے مطابق رائے رکھتا ہو تو ایسے مسائل کو بھی بالکل آزادانہ نہیں چھوڑ دیا گیا' ان کو بھی بغیر کسی اصول اور قاعدے کے نہیں چھوڑا گیا۔ نہ اس طرح چھوڑ دیا گیا کہ ان میں اجتہاد و استنباط کے لئے کوئی ضابطہ نہیں ہے بلکہ اس مختصر نص میں اس کے لئے ایک شاندار منہاج رکھ دیا گیا ہے اور اس کے لئے بھی حدود مقرر کر دیئے گئے ہیں اور یہ آیت وہ اصول بتا دیتی ہے جس کے مطابق اجتہاد ہو سکتا ہے۔

(فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (۴ : ۵۹)) (پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو)۔ یعنی ان کو ان نصوص کی طرف لوٹا دو' جن پر یہ

نصوص ضمناً" منطبق ہوتی ہیں ۔ اگر ایسی نصوص نہ ملیں جن کا انطباق ان مسائل پر ہوتا ہو تو اسلامی شریعت میں جو بنیادی اصول اور عام قواعد ہیں ان کی روشنی میں ان کا حل نکالو' ان مسائل کو افراتفری کے عالم میں بے لگام نہیں چھوڑ دیا گیا' اور نہ یہ مسائل ان نامعلوم امور کی طرح ہیں جن میں انسانی عقول سرگرداں رہتی ہیں جیسا کہ بعض دھوکہ باز اس طرح سمجھانے کی سعی کرتے ہیں ۔ اسلامی نظام میں بعض اساسی اور بنیادی اصول ہیں اور یہ اصول بالکل واضح اور منقح ہیں ۔ انسانی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہیں ۔ یہ اصول زندگی کے لئے ایسی باڑ اور ایسا دائرہ تجویز کرتے ہیں جن کے اندر رہ کر ہر وہ شخص جس کا ضمیر مسلم ہو سچائی تک بڑی سہولت کے ساتھ پہنچ سکتا ہے ۔

(اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (٤ : ٥٩)) (اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو)۔ یہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے ۔ یہ اولی الامر کی اطاعت ہے جو مومن ہوں اور اللہ کی شریعت پر قائم ہوں اور سنت رسول کے مطابق کام کر رہے ہوں ۔ یہ متنازع امور کا اللہ اور رسول اللہ کی طرف رد کرنا' یہ تمام امور شرائط ایمان باللہ اور یوم آخرت میں سے ہیں اور یہ سب امور ایمان باللہ اور ایمان بالاخرت کا تقاضا بھی ہیں ۔ اگر یہ شرائط مفقود ہوں تو سرے سے ایمان ہی نہ ہو گا ۔ اسی طرح ایمان اس صورت میں بھی موجود نہ ہو گا اگر ایمان کے لازمی تقاضے پورے نہ ہوں ۔

جب اس آیت نے اس مسئلے کو اس طرح قانونی انداز میں ہمارے سامنے رکھ دیا تو اس کے بعد پھر اسے بطور وعظ و نصیحت بھی دوبارہ لایا جاتا ہے اور محبت کے انداز میں انہیں آمادہ کیا جاتا ہے 'جس طرح امانت اور عدالت کے احکام کے ذکر کے بعد یہی رویہ اختیار کیا گیا تھا ۔

ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (٤ : ٥٩)) (یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے)۔ یہ طریق کار اور دستور العمل تمہارے لئے بہت ہی اچھا ہے ۔ دنیا میں بھی خیر ہے اور آخرت میں بھی خیر ہے ۔ دنیا میں بھی اس کا انجام اچھا ہو گا اور آخرت میں بھی اس کی جزاء اچھی ہوگی ۔ مسئلہ صرف یہ نہیں ہے کہ اس دستور العمل پر عمل کرنے کی وجہ سے اللہ راضی ہو گا اور آخرت میں ثواب ملے گا ۔ اگرچہ یہ بھی ایک عظیم اور اہم بات ہے لیکن اس کے علاوہ اس دستور العمل کو اختیار کرنے کی وجہ سے دنیا میں بھی بہتری ہے ۔ ایک فرد کی' ایک سوسائٹی کی اور اس پوری دنیاوی زندگی کی بھی اس میں بہتری ہے ۔

اسلامی نظام حیات ایک ایسا نظام ہے کہ اس کے زیر سایہ جن لوگوں کو زندگی بسر کرنے کا موقعہ ملتا ہے وہ خوش و خرم زندگی بسر کرتے ہیں کیونکہ یہ ایک ایسا نظام ہے جسے اس اللہ نے بنایا ہے ۔ وہ صانع 'حکیم 'علیم 'خبیر اور بصیر ہے ۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جو انسان کی جہالتوں سے پاک ہے' جو انسان کی خواہشات سے پاک ہے 'جو انسان کے نقائص سے پاک ہے ۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں کسی فرد کے ساتھ کوئی خصوصی برتاؤ نہیں کیا گیا' نہ کسی طبقے' نہ کسی قوم' نہ کسی نسل اور نہ کسی خاص قبیلے کی رو رعایت اس میں ملحوظ رکھی گئی ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کے رب ہیں 'اور اللہ تعالیٰ کسی کی محبت میں مبتلا نہیں ہوتے کسی طبقے' نہ کسی رنگ و نسل اور نہ کسی قوم قبیلے کی محبت میں ۔

یہ ایک ایسا نظام ہے جس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا بنانے والا پوری کائنات کو بنانے والا ہے جو انسان کی فطرت کی ماہیت سے واقف ہے۔ وہ انسان کے نفس کے رجحانات و میلانات سے بھی واقف ہے۔ انسان کے ذرائع خطاب اور اس کے طریقہ اصلاح سے بھی واقف ہے اس لئے اللہ تعالیٰ سے کسی معاملے میں غلطی صادر نہیں ہو سکتی۔ نہ اسے یہ ضرورت ہے کہ وہ کسی نظام کا تجربہ کر کے اس کی غلطیوں کو دور کرے اور نہ وہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ لوگوں پر نظاموں کے تجربے کر کے انہیں مشکلات سے دوچار کرے اور وہ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں اور پریشان ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ قانونی اور اخلاقی نظام دے کر مادی ایجادات کا ایک وسیع میدان ان کے لئے چھوڑ دیا ہے کہ وہ اس میں تجربے کرتے رہیں۔ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جو انسانی عقل کی جولانیوں کے لئے بہت ہی کافی ہے۔ عقل کے لئے بس یہی کافی ہے کہ وہ اس نظام کو نافذ اور مسائل پر منطبق کرنے کا کام جاری رکھے اور اس میں جہاں جہاں قیاس اور اجتہاد کی ضرورت ہے وہاں کام کرتی رہے۔

پھر اسلامی نظام کی واضع وہی ذات ہے جو اس کائنات کی خالق ہے اس لئے اس نے انسان کو ایک ایسا منہاج دیا ہے جو اس کائنات کے نوامیس فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ یہ نظام فطرت کے ساتھ معرکہ آراء نہیں ہوتا بلکہ وہ فطرت کی ساتھ ہم نوا ہوتا ہے' اس کو مانتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ نظام اس کی راہنمائی بھی کرتا ہے اور اس کو بچاتا بھی ہے۔

اس نظام کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ انسانیت کی ہدایت اور حمایت کے ساتھ ساتھ یہ اس کا اکرام اور احترام بھی کرتا ہے۔ اس نظام میں عقل انسانی کے لئے ایک وسیع دائرہ کار رکھا گیا ہے اور اس میں قرآن و سنت کی نصوص وہدایات کے اندر تشریح و اجتہاد کی گنجائش موجود ہے۔ پھر وہ معاملات جن میں واضح نصوص وارد نہیں ہیں ان کو اصول عامہ کے مطابق حل کرنے کی سعی کی گنجائش ہے۔ اس کے علاوہ وہ اصل میدان کار بھی ہے جو اس نظام نے عقل کی بہتری کے لئے خالی رکھا ہے' جس پر اس کا مکمل کنٹرول ہے یعنی علمی تحقیقات اور سائنس کے میدان میں اکتشافات اور مادی ایجادات۔ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (٤: ٥٩)) (یہ بہتر ہے اور اچھا طریقہ کار ہے)

---ooo---

اس سبق میں اس قاعدہ کلیہ کے بیان کے بعد نیز ایمان کی شرط اور اسلام کی تعریف کرنے کے بعد' امت کا دستور اساسی (GrundNorm) وضع کرنے کے بعد' امت کے لئے طریقہ قانون سازی اور اس کی اصل بتانے کے بعد' اب روئے سخن ان لوگوں کی طرف پھر جاتا ہے جو اس دستوری اساس سے انحراف کرتے ہیں اور پھر بھی وہ یہ زعم رکھتے ہیں کہ وہ مومن ہیں حالانکہ وہ ایمان کی شرط اور اسلام کی تعریف (Definition) کے خلاف جا رہے ہیں وہ اپنی عدالتوں میں فیصلے ایسے قانون کے مطابق کرتے ہیں جو اللہ کی شریعت کے مطابق نہیں ہے۔ (اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ) (وہ اپنے فیصلے طاغوتی قانون کے مطابق کراتے ہیں حالانکہ ان کو حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ اس کا انکار کریں۔)

روئے سخن اس طرف پھرتے ہی ایسے لوگوں پر سخت تعجب کیا جاتا ہے' ان لوگوں کو سخت ڈرایا جاتا ہے کہ وہ زرا سوچیں کہ شیطان انہیں کس طرف لے جا رہا ہے۔ یہاں ایسے لوگوں کا حال بتایا جاتا ہے کہ جب انہیں اسلامی قانون کو نافذ کرنے اور اس کے مطابق فیصلے کرنے کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ نہایت ہی منافقانہ روش کے مطابق اسے روکنے کی سعی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی روش کو روش نفاق بتاتے ہیں۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ شیطانی قانون کے مطابق فیصلے کرانے کا ارادہ کرتے ہی انسان ایمان سے فارغ ہو جاتا ہے بلکہ یہ لوگ ابتداء ایمان میں داخل ہی تصور نہیں ہوتے۔ یہاں یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ ان کے عذرات کس قدر بورے ہیں اور کس قدر واہیات اور جھوٹے ہیں اور ان کا یہ منصوبہ نہایت ہی قابل نکیر و مذمت ہے اور اس کے نتیجے میں ان پر وبال آنے ہی والا ہے۔ اس کے باوجود حضور ؐ کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ دعوت و موعظت جاری رکھیں۔ پھر بات کو اس پر ختم کیا جاتا ہے کہ رسولوں کو بھیجا ہی اس لئے گیا ہے کہ ان کی اطاعت کی جائے۔ اس کے بعد صریح اور قطعی الفاظ میں' ایک بار پھر ایمان کی شرط اور اسلام کی تعریف (Diffinition) بیان کی جاتی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ
قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ
وَ يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۶۰﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى
مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾
فَكَيْفَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ
بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّاۤ اِحْسَانًا وَّ تَوْفِيْقًا ﴿۶۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا
فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ عِظْهُمْ وَ قُلْ لَّهُمْ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا
بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾ وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لَوْ اَنَّهُمْ
اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ

لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ﴿٦٤﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾

"اے نبی ؐ تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں، حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسول کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں۔ پھر اس وقت کیا ہوتا ہے جب ان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوئی مصیبت ان پر آپڑتی ہے؟ اس وقت یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کی قسم ہم تو صرف بھلائی چاہتے تھے اور ہماری نیت تو یہ تھی کہ فریقین میں کسی طرح موافقت ہو جائے ..... اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ ان سے تعرض مت کرو، انہیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو جو ان کے دلوں میں اتر جائے۔ (انہیں بتاؤ کہ) ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ اذن خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔ اگر انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے تو تمہارے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے، اور رسول بھی ان کے لئے معافی کی درخواست کرتا، تو یقیناً اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔ نہیں، اے محمد ؐ تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سربسر تسلیم کر لیں۔"

بعض لوگوں کی یہ تصویر جو ان آیات میں کھینچی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات ہجرت کے ابتدائی ایام میں نازل ہوئی تھیں۔ اس دور میں جس میں نفاق کا بہت زور تھا اور یہودی منافقین کے ساتھ مل کر ایک زور آور قوت تھے۔

یہ لوگ جو یہ ارادہ رکھتے تھے کہ قانونی فیصلے طاغوت کے مطابق ہوں، یہ لوگ منافقین تھے جیسا کہ آیات کے اس مجموعے کی دوسری آیت میں اس کی تصریح بھی کر دی گئی ہے۔ ان سے مراد یہودی بھی ہو سکتے ہیں اس لئے کہ جب ان کو یہ دعوت دی جاتی تھی کہ وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرانا تسلیم کریں تو وہ انکار کر دیتے تھے اور اس بات کی خواہش رکھتے تھے کہ اس قانون کے مطابق فیصلے کرائیں جو دور جاہلیت میں رائج تھا۔ (اس لئے کہ یہودیوں کے آپس کے فیصلے تورات کے مطابق ہوتے تھے۔ یہاں کتاب سے تورات مراد ہو گا اور بعض اوقات یہودیوں کے فیصلے بھی رسول اللہ ؐ کرتے جیسا کہ بعض فیصلوں سے معلوم ہوتا ہے) لیکن یہاں صرف پہلی صورت ہی مراد ہے یعنی کتاب اللہ سے مراد قرآن کریم ہے کیونکہ

آیت۔ (یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ (٤ : ٦٠)) (جن کا زعم یہ ہے کہ وہ ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور اس پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی ہے) لہٰذا یہاں مراد منافقین ہی ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ یہودیوں نے کبھی اپنے اس زعم کا اظہار نہیں کیا کہ وہ رسول ؐ خدا پر نازل کردہ کلام کو مانتے ہیں۔ یہ اظہار منافقین ہی کرتے تھے کہ وہ نبی ؐ اور آپ سے پہلے نازل ہونے والی تمام کتابوں پر ایمان لائے ہیں۔ یعنی ایسا ایمان جیسا کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ہم تمام رسل پر ایمان لاتے ہیں۔

اور یہ بات صرف ہجرت کے ابتدائی ایام ہی میں ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے کہ بنی قریظہ اور خیبر میں یہودیوں کی قوت کو توڑ دیا جائے اور قبل اس کے کہ یہودیوں کی قوت کو توڑنے سے خود منافقین کی قوت بھی ٹوٹ جائے۔

بہرحال ان آیات میں ہمیں شرائط ایمان کی ایک قطعی، مکمل اور جامع مانع شرط اور اسلام کی مکمل تعریف مل جاتی ہے اور ہمیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ شہادت مل جاتی ہے کہ جو لوگ طاغوت کے مطابق فیصلہ کرنے کا ارادہ بھی کریں، وہ مومن نہیں ہیں، اس لئے کہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ طاغوت کا انکار کریں۔ (وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِه) اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس مجموعہ آیات میں ہمیں ایک حلفیہ بیان ملتا ہے اور ذات باری خود اپنی ذات کی قسم کھاتے ہیں کہ یہ لوگ اس وقت تک ایمان میں داخل نہیں ہو سکتے اور اس وقت تک مومن شمار نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ رسول اللہ ؐ کو اپنے مقدمات کے اندر حکم نہ بنائیں اور پھر آپ ؐ کے حکم کی اطاعت نہ کریں، آپ کے فیصلے کو نافذ نہ کریں اور یہ اطاعت کامل تسلیم و رضا کے ساتھ نہ ہو اور دل کی خوشی کے ساتھ نہ ہو یعنی ایسی حالت میں تسلیم کرنا کہ اس میں عجز و اضطرار نہ ہو بلکہ مکمل اطمینان و رضا ہو۔

(اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِه وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًا بَعِیْدًا (٤ : ٦٠))

"اے نبی ؐ تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں، حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔"

کیا آپ نے ایسی عجیب و غریب قوم کے لوگوں کو نہیں دیکھا جن کا زعم یہ ہے کہ وہ مومن ہیں اور پھر وہ آن واحد میں اپنے اس زعم کو باطل قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ (یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ (٤ : ٦٠)) یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان لائے ہیں جو تیری طرف نازل ہوئی ہے اور اس پر بھی جو تجھ سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اس دعویٰ ایمان کے بعد وہ اپنے فیصلے اس کتاب کے مطابق نہیں کراتے جو آپ پر

نازل ہوئی ہے ' نہ وہ اس کتاب کے مطابق فیصلے کراتے ہیں جو تم سے پہلے نازل ہوئی اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی اور چیز کے مطابق فیصلے کرائیں 'کسی اور نظام کے مطابق فیصلے کرائیں ۔ کسی اور حکم کے مطابق فیصلے کرائیں ۔ بلکہ وہ یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ طاغوت کے مطابق فیصلے کرائیں اور طاغوت وہ ہے جو اس کتاب سے ماخوذ نہ ہو جو آپ کی طرف نازل ہوئی یا اس کتاب سے ماخوذ نہ ہو جو آپ سے پہلے نازل ہوئی اور اس کا ضابطہ اور معیار تم پر نازل کردہ کتاب یا کتب سابقہ سے اخذ نہ ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ طاغوت ' طاغوت ہے اور طاغوت اس لئے ہے کہ وہ اللہ کے خاصہ حاکمیت اور تشریع کا دعویٰ کرتا ہے اور وہ طاغوت اس لئے ہے کہ وہ کسی مستقل معیار پر قائم نہیں ہے ۔ یہ لوگ محض جہالت کی وجہ سے یہ حرکت نہیں کرتے نہ کسی شبہ کی بنا پر کرتے ہیں ۔ وہ اچھی طرح جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں حالانکہ اس طاغوت کے پاس اپنے فیصلے لے جانا حرام ہے ۔ (وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ (٤ : ٦٠))

ان کو حکم تو یہ دیا گیا ہے کہ وہ اس کا انکار کریں ۔ یہ لوگ جہالت یا شبہ کی وجہ سے ایسا نہیں کرتے ۔ بلکہ یہ لوگ قصداً ایسا کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ گمان درست نہیں ہے ' یہ زعم درست نہیں ہے کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان لائے ہیں اور آپ سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں پر بھی ایمان لائے ہیں ۔ یہ تو شیطان ہے جو ان کو گمراہ کرنا چاہتا ہے ' اس طرح کہ وہ اس سے باز نہ آسکیں ۔

(وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (٤ : ٦٠)) (اور شیطان انہیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے) یہ وہ خفیہ سبب ہے جس کی وجہ سے وہ لوگ طاغوت کے مطابق فیصلہ کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور یہی وہ داعیہ ہے جو ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ایمان کی حدود اور ایمان کی شرائط سے نکل جائیں اور ارادہ کرلیں کہ وہ طاغوت کے مطابق فیصلے کرائیں گے ۔ یہی وہ سبب ہے جس کا اللہ تعالیٰ انکشاف فرماتے ہیں تاکہ وہ اپنے اس ارادے سے باز آجائیں ۔ اور جماعت مسلمہ کو بھی بتایا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی پشت پر کون ہے؟ اور اس کا اصل محرک کیا ہے؟

اب آگے کے مضمون میں وہ حالات بتائے جاتے ہیں جب ایسے لوگوں کو اس طرف بلایا جاتا ہے کہ آؤ اس قانون کی طرف جو اللہ نے حضرت محمد ؐ کی طرف نازل کیا ہے یا اس قانون کی طرف جو آپ ؐ سے پہلے نازل ہوا ہے ' تو یہ لوگ جو زعم ایمان رکھتے ہیں ' کھٹکتے ہیں ۔

(وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (٤ : ٦١)) "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسول کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں ۔"

سبحان اللہ ' نفاق خود اپنے آپ کو آشکارا کر رہا ہے ۔ وہ اس بات پر تلا ہوا ہے کہ فطری سوچ کی واضح ترین باتوں کا بھی انکار کردے ۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ نفاق کی صورت حال نہ ہوتی ۔

ایمان کا فطری اور واضح تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان اس قانون کے مطابق اپنے فیصلے کرے جس پر اس کا ایمان ہے

اور اپنے فیصلے اس عدالت میں لے جائے جس پر وہ ایمان لایا ہو۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لایا ہے اور جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس پر بھی ایمان لایا ہے' رسول پر ایمان لایا ہے اور جو کچھ اس پر نازل ہوا ہے اس پر بھی ایمان لایا ہے ' پھر ایسے شخص کو اگر بلایا جاتا ہے کہ وہ اپنے فیصلے اس حکم اور قانون کے مطابق کرائے جس پر وہ ایمان لایا ہے تو اس دعوت کا بدیہی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ اس کو تسلیم کرے اور یہی تقاضائے فطرت ہے۔ لیکن اگر وہ انکار کرتا ہے اور اس راہ پر آنے سے لوگوں کو روکتا ہے تو وہ بالکل ایک واضح 'فطری اور بدیہی امر سے انکار کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ منافق ہے اور اس نے جو دعوائے ایمان کیا ہے ' وہ جھوٹا ہے۔

یہی وہ فطری اور بدیہی صورت حال ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ آیت انہی لوگوں کے بارے میں ہے جو دعوائے ایمان کرتے ہیں اور پھر اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے بلکہ ان کو کوئی بلائے بھی تو اس طرح فیصلے کرانے سے کتراتے ہیں۔

اس کے بعد ان کے طرز عمل سے ایک اور منافقانہ چال کو ظاہر کیا جاتا ہے 'کہ جب ایسے لوگ کسی مشکل میں پڑتے ہیں یا ان کی غلط پالیسی کی وجہ سے کوئی حادثہ ہو جاتا ہے (اور یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی حاکمیت کی طرف نہیں آتے یا اس وجہ سے کہ وہ طاغوت کے مطابق کوئی فیصلہ کرانا چاہتے ہیں اور اس وجہ سے ان کی پوزیشن خراب ہو جاتی ہے) تو پھر یہ لوگ اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے عذرہائے لنگ سے کام لیتے ہیں۔

(فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَآءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيقًا (٤ : ٦٢)) "پھر اس وقت کیا ہوتا ہے جب ان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوئی مصیبت ان پر آپڑتی ہے؟ اس وقت یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کی قسم ہم تو صرف بھلائی چاہتے تھے اور ہماری نیت تو یہ تھی کہ فریقین میں کسی طرح موافقت ہو جائے۔

یہ لوگ مصیبت میں یوں پڑ جاتے تھے کہ بہت سے لوگوں کے مجمع میں ان کا راز کھل جاتا تھا۔ اور اسلامی معاشرہ میں ان کا مقاطعہ ہو جاتا تھا' یا اسلامی معاشرے میں ان کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس طرح یہ لوگ بڑی مشکل میں پھنس جاتے تھے 'اس لئے کہ اسلامی معاشرہ ایسے لوگوں کو دیکھ ہی نہ سکتا تھا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہوں کہ وہ اللہ اور اس کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ اور اس پر نازل شدہ کلام پر ایمان لائے ہیں اور پھر وہ اللہ کے قانون کے سوا کسی اور قانون پر فیصلے کراتے ہوں۔ ایسے لوگوں کو ان معاشروں میں قبولیت حاصل ہوتی ہے جو نہ مومن ہوتے ہیں اور نہ مسلم۔ اور جو اس قسم کے لوگوں کی طرح نام نہاد مسلمان ہوتے ہیں اور ان کا اسلام اور ایمان صرف دعوے اور نام تک محدود ہوتا ہے۔

بعض اوقات وہ مصیبت میں یوں پڑتے ہیں کہ وہ طاغوتی عدالت میں جاتے ہیں اور ان پر ظلم ہو جاتا ہے اس لئے کہ وہاں اللہ کے قانون کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلے کر دیئے جاتے ہیں۔ اب انہیں شرمندگی ہوتی ہے اور افسوس کے ساتھ لوٹتے ہیں کہ کیوں وہ طاغوت کی عدالت میں گئے اور ان پر ظلم ہوا۔ اگر وہ اپنا مقدمہ اسلامی عدالت میں لاتے تو انصاف ہوتا۔

بعض اوقات ان پر یہ مصیبت اللہ کی جانب سے بطور ابتلاء آتی ہے تاکہ وہ غور و فکر کر کے ہدایت قبول کر لیں ۔ بہرحال جو صورت بھی ہو' قرآن کریم استفہام انکاری کی صورت میں سوال کرتا ہے کہ اس وقت ان کا حال کیا ہوتا ہے کہ یہ لوگ پھر لوٹ کر رسول اللہ ؐ کے پاس آتے ہیں ۔

(يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا (٤ : ٦٢)) "خدا کی قسم ہم تو بھلائی چاہتے تھے' ہماری نیت تو یہ تھی کہ فریقین میں کسی طرح موافقت ہو جائے ۔"

یہ نہایت ہی شرمناک صورت حال ہے ۔ وہ لوٹتے ہیں اور ان کو شعور ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت ہی برا راستہ اختیار کیا ۔ ان کی حالت شرمندگی سے ایسی ہوتی ہے کہ حضور ؐ کا سامنا نہیں کر سکتے ۔ لیکن قسمیں کھا کر اپنے اندرونی جھوٹے ارادوں کو چھپاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ درحقیقت طاغوت کی عدالت میں تو جانا نہیں چاہتے تھے مگر رواج کے مطابق فیصلے کرا کے فریقین کے درمیان صلح صفائی چاہتے تھے ۔ یہ ان تمام لوگوں کا دعویٰ ہوتا ہے جو اسلامی نظام حیات سے پہلوتہی کرنا چاہتے ہیں ۔ ایسے لوگ کہتے ہیں کہ وہ مشکلات سے بچنا چاہتے ہیں ۔ اگر شریعت کے قانون کو نافذ کر دیا گیا تو ایک مصیبت آ جائے گی ۔ لوگوں کے درمیان مخالفت پیدا ہو جائے گی حالانکہ یہ لوگ تمام طبقات کے درمیان توازن چاہتے ہیں ۔ یہ حیلے بہانے ان لوگوں کے ہوتے ہیں جو دعوائے ایمان تو کرتے ہیں لیکن مومن نہیں ہوتے ۔ اس قسم کے دلائل تو منافقین کے ہوتے ہیں اور ہر دور میں منافقین نے یہی کہا ہے ۔ اللہ تعالیٰ ان کے اوپر سے ان کو چھپانے والی اس چادر کو اتار پھینکتے ہیں اور حضرت نبی کریم ؐ کو اطلاع فرماتے ہیں کہ اللہ ان جیسے لوگوں کی حقیقت قلبی اور ان کے اندرون سے واقف ہے ۔ لیکن اس کے باوجود اللہ کا حکم یہی ہے کہ ان جیسے لوگوں کے ساتھ سختی نہ برتی جائے بلکہ ان کو نصیحت کی جائے کہ وہ اس قسم کے ہیر پھیر سے باز آ جائیں ۔

(اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا (٤ : ٦٣)) "اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے' ان سے تعرض مت کرو' انہیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو جو ان کے دلوں میں اتر جائے ۔"

یہ لوگ وہ ہیں جو اپنی نیتوں اور اپنے اندرونی ارادوں کو چھپانا چاہتے ہیں اور جھوٹے دلائل اور غلط عذر پیش کرتے ہیں لیکن اللہ ان کے دلوں کی پوشیدہ باتوں سے بھی واقف ہے اور ان کے ضمیر کے اندرونی حالات سے بھی باخبر ہیں ۔ لیکن جو پالیسی اس وقت طے شدہ تھی وہ یہ تھی کہ منافقین سے چشم پوشی کی جائے' ان کے ساتھ نرمی برتی جائے اور وعظ و نصیحت اور تعلیم و تربیت سے کام لیا جائے .... اس مقصد کے لئے عجیب انداز کلام اختیار کیا گیا ہے ۔ (وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا (٤:٦٣)) "اور ان کو اس قدر بلیغانہ انداز میں سمجھاؤ کہ بات ان کے دل میں اتر جائے ۔" یہ نہایت ہی مصورانہ انداز تعبیر ہے ۔ گویا بات براہ راست ان کے دل میں رکھی جا رہی ہے اور وہ بات وہاں بیٹھتی جا رہی ہے ۔

اللہ تعالیٰ ان کو توبہ کی طرف مائل کرتے ہیں تاکہ وہ سیدھی راہ پر آ جائیں اور اللہ اور رسول کی پناہ میں امن وسکون کی زندگی بسر کریں۔ اگرچہ انہوں نے یہ کوشش کی کہ وہ طاغوت کی عدالت سے فیصلے کرائیں اور یہ بات ان سے ظاہر بھی ہو گئی۔ انہوں نے حضور سے فیصلہ کرانے سے پہلوتہی اختیار کی حالانکہ ان کو اس کی جانب بلایا گیا تھا۔ لیکن ان سب کوتاہیوں کے باوجود توبہ کا دروازہ کھلا ہے' اور واپسی کا وقت ختم نہیں ہوا ہے اور وہ اب بھی اللہ اور رسول اللہ ؐ سے معافی طلب کرسکتے ہیں۔ رسول اللہ کی جانب سے ان کے لئے استغفار قابل قبول ہے لیکن یہ استغفار تب قابل قبول ہوگی جب اصولی بات مان لی جائے اور وہ بات یہ ہے کہ رسولوں کو محض اس لئے بھیجا جاتا ہے کہ لوگ ان کی اطاعت کریں ورنہ پھر رسالت کا مطلب کیا ہوا۔ نیز یہ کہ رسول محض واعظ نہیں ہوتا اور نہ محض مرشد ہوتا ہے۔

(وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا

" (انہیں بتاؤ کہ) ہم نے جو رسول بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ اذن خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔ اگر انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے تو تمہارے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے' اور رسول بھی ان کے لئے معافی کی درخواست کرتا' تو یقیناً اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے (٤ : ٦٤))

یہ ایک وزن دار حقیقت ہے۔ رسول محض واعظ نہیں ہوتا کہ وہ ایک تقریر کرے اور چلا جائے اور اس کی تقریر ہوا میں تحلیل ہو جائے۔ اس کی بات کے اندر اور اس کی پشت پر کوئی قوت نافذہ نہ ہو جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں جو اس دین کے مزاج اور رسالت کے مزاج کو دھوکے سے بدلنا چاہتے ہیں یا جس طرح ان لوگوں کی رائے ہے جو سرے سے الدین کے لفظ کا مفہوم تک ہی نہیں جانتے۔

بے شک دین نظام حیات کا نام ہے' واقعی اور عملی نظام حیات کا نام' جس کی اپنی انتظامی' عملی اور قانونی ہیئت ہوتی ہے اور جس کے اپنے انداز اور اپنی اقدار ہوتی ہیں۔ اس کے اپنے اخلاق و آداب ہوتے ہیں اور اس کے اندر مراسم عبودیت اور دینی شعائر ہوتے ہیں۔

یہ تمام باتیں یہ تقاضا کرتی ہیں کہ رسالت کے ساتھ حاکمیت بھی ہو۔ ایک نظام مملکت بھی ہو جو اس نظام اور دین کو نافذ کرے اور عوام الناس اس حکومت کے مطیع فرمان ہوں جن کے اندر یہ نظام نافذ ہو۔ یہ اللہ کا وہ نظام ہے جس کے تصرف میں اللہ نے پوری زندگی دینے کا ارادہ کیا ہے اس لئے کہ اللہ نے جتنے رسول بھی بھیجے ہیں صرف اس لئے بھیجے ہیں کہ اللہ کے حکم سے ان کی اطاعت کی جائے' پس ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت شمار ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو اس لئے نہیں بھیجا کہ لوگ ان سے کچھ وجدانی تاثرات لیں اور بعض امور کا عقیدہ رکھیں یا ان سے کچھ مراسم عبودیت سیکھ لیں اور بس۔ فہم دین کے بارے میں یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ دین کا یہ فہم اس حکمت کے مطابق نہیں ہے جس کے مطابق اللہ نے رسولوں کو بھیجا ہے اور وہ حکمت اور مقصد صرف یہ ہے کہ واقعی اور عملی زندگی کے اندر اسلامی نظام نافذ کیا جائے۔ ورنہ وہ "دین" تو کس قدر آسان دین ہے جس میں رسولوں کے فرائض صرف اس قدر ہوں کہ وہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر تقریر

کریں اور چلے جائیں ۔جس سے مذاق کرنے والے مذاق کریں اور حقیر سمجھنے والے حقارت کی نظر سے دیکھیں ۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ اس حکمت کا مظہر رہی ہے ۔اس میں دعوت و تبلیغ تھی' وہ نظام زندگی اور اسلامی حکومت تھی' اور رسول اللہ ؐ کے بعد تاریخ خلافت تھی ۔یہ خلافت شریعت کی قوت اور نظام کے بل بوتے پر قائم تھی اور اس نظام کا قیام مقصد اصلی تھا اور شریعت کا نفاذ اس خلافت کا مقصد تھا تاکہ رسول اللہ ؐ کی اطاعت دائماً ہوتی رہے اور اللہ کا وہ ارادہ پورا ہو جس کے لئے اس نے رسول مبعوث فرمائے ۔اس کے سوا کوئی اور صورت حال نہیں ہے جسے ہم اسلام کہہ سکیں یا اسے ہم دین کہہ سکیں ۔اگر اسلام اور دین ہوگا تو اس میں رسول کی اطاعت بشکل نظام زندگی ہوگی' چاہے اس اطاعت کی صورتیں قدرے مختلف کیوں نہ ہو جائیں لیکن اصلیت ایک ہونا چاہئے ۔اس کے بغیر اسلام اور دین کی حقیقت نہیں پائی جا سکتی ۔اسلامی نظام کی اطاعت' رسول اللہ ؐ کے نظام کو بروئے کار لانے' اللہ کی شریعت کے مطابق عدالت کرنے اور رسول نے اللہ کی جانب سے جس چیز کی تبلیغ کی اس کی اطاعت کرنے اور صرف اللہ وحدہ کو حاکم سمجھنے مطابق مفہوم ۔(لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ) اللہ کے سوا کسی اور کو حاکمیت میں اللہ کا شریک نہ کرنے میں ہے جس میں قانون سازی کا حق اہم ترین حق ہے ۔پھر طاغوت کی عدالت میں مقدمات نہ لے جانا چاہئیں خواہ معمولی مقدمہ ہو یا بڑا ہو' اور جن مسائل میں کوئی نص نہ ہو' ان میں اللہ اور رسول اللہ ؐ کی طرف رجوع کرنا ۔خصوصاً ایسے حالات میں جو دور جدید میں نئے نئے درپیش ہوں اور ان میں اختلاف رائے ہو ۔

جن لوگوں نے طاغوت کے پاس جاکر اپنے مقدمات کے فیصلے کرانے کی سعی کی ہے اور اسلامی منہاج سے دور ہو گئے ہیں' ان کے لئے اب بھی موقع ہے کہ وہ واپس آجائیں جس طرح حضور اکرم ؐ کے دور میں منافقین کے لئے موقع تھا اور ان کو اللہ تعالیٰ ترغیب دے رہے تھے ۔

(وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (٤ : ٦٤))

"اگر انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھتے تھے تو تمہارے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لئے معافی کی درخواست کرتا' تو یقیناً اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے ۔"

کوئی جس وقت بھی توبہ کرے اللہ بخشنے والا ہے 'کوئی کسی وقت بھی لوٹے اللہ رحیم و کریم ہے ۔یہ صفات اللہ تعالیٰ اپنے لئے ذکر کرتے ہیں' جو لوگ اس کی بارگاہ تک واپس آجاتے ہیں' اس سے معافی مانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرتے ہیں اور ان پر رحمت فرماتے ہیں ۔ابتداء میں اس آیت کا اطلاق جن لوگوں پر تھا' ان کو رسول خدا ؐ کی طرف سے طلب مغفرت کے مواقع حاصل تھے ۔اگرچہ اب یہ مواقع نہیں ہیں لیکن اللہ کی جانب سے توبہ و مغفرت کا دروازہ اب بھی کھلا ہے ۔اللہ کا وعدہ قائم ہے ۔اللہ کبھی اپنے وعدے کو نہیں توڑتے ۔پس جس شخص کا ارادہ ہو وہ آگے بڑھے 'جس کا عزم ہے وہ آگے آئے ۔

اب آخری اور فیصلہ کن انداز کی بات آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قسم اٹھاتے ہیں' اپنی ذات کی قسم کہ کوئی مومن اس وقت تک مومن نہیں بن سکتا جب تک وہ رسول اللہ ؐ کے پاس اپنے مقدمات فیصلے کے لئے نہیں لے جاتا۔ اس کے بعد' جب رسول فیصلہ کر دے تو وہ اس فیصلے کو تسلیم کر کے اس پر دل سے راضی نہیں ہو جاتا اور اس کی حالت یہ نہیں ہو جاتی کہ اس کے دل میں نہ تو کوئی تلخی ہے اور نہ اس کے دل میں کوئی تردد ہے۔

(فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (٤: ٦٥))

"اے محمد ؐ تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں' پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں' بلکہ سربسر تسلیم کر لیں۔"

ایک بار پھر ہم شرط ایمان کے سامنے کھڑے ہیں' ایمان کی حدود ہمارے سامنے ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود فیصلہ فرماتے ہیں اور اس فیصلے پر اپنی ذات پاک کا حلف اٹھاتے ہیں' اس کے بعد اب کسی کے لئے کلام کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ اسلام کی شرط اور ایمان کی حدود کی نشاندہی کر دی جاتی ہے۔ اور اس کے جن الفاظ میں یہ نشاندہی کی گئی ہے ان میں کسی قسم کی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ہاں اگر کوئی خواہ مخواہ جھگڑا کرے تو اور بات ہے۔ اس کی بات میں کوئی وزن نہ ہو گا اور وہ بات یہ ہو سکتی ہے کہ یہ حکم حضور کے زمانے کے لئے تھا۔ اور صرف صحابہ کرام کے لئے تھا..... اگر کوئی یہ تاویل کرتا ہے تو معلوم ہو گا کہ اس شخص کو اسلام کا کوئی پتہ نہیں ہے اور وہ قرآن کے انداز کلام سے واقف نہیں ہے' حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے جسے حلفیہ بیان کے ساتھ بتاکید مزید لایا گیا ہے' جس کے اندر زمان و مکان کی کوئی تحدید نہیں ہے۔ نہ اس واہمہ کے لئے کوئی گنجائش ہے کہ رسول اللہ ؐ کے فیصلوں سے مراد آپ کی شریعت کے فیصلے ہیں۔ اگر یہی مفہوم لے لیا جائے تو حضور ؐ کے بعد آپ کی سنت اور آپ کی شریعت کا کوئی مقام نہ رہے گا۔ اور یہ قول تو ان لوگوں کا تھا جو عہد ابوبکر ؓ میں مرتد ہو گئے تھے۔ اور حضرت ابوبکر ؓ نے ان سے اس طرح جہاد کیا جس طرح مرتدین سے کیا جاتا ہے۔ بلکہ ان کے ساتھ مرتدین سے بھی سخت رویہ اختیار کیا گیا اس لئے کہ انہوں نے صرف زکوٰۃ کے معاملے میں انکار کیا تھا اور آپ کی وفات کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی بند کر دی تھی۔

اگر اسلام کے لئے یہ کافی ہے کہ لوگ اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے کرائیں تو ایمان کے لئے اس سے بھی زیادہ شرائط ہیں مثلاً یہ کہ وہ ان فیصلوں پر دل سے راضی ہوں اور دل سے انہیں قبول کریں اور خوشی اور اطمینان سے ان پر راضی ہوں۔

یہ ہے اسلام اور یہ ہے ایمان۔ ہر کسی کو اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ وہ اسلام سے کس قدر دور ہے اور اس کے ایمان کا کیا حال ہے اور اس کے بعد وہ اسلام اور ایمان کا دعویٰ کرے۔

پارہ نمبر ۵

یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ رسول اللہ ؐ سے اپنے فیصلے کرائے ' اور پھر آپ جو فیصلہ فرمائیں اس کو بطیب خاطر قبول کرنے کے بعد اب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نظام جس کی طرف تمہیں دعوت دی جارہی ہے ' اور یہ شریعت جس کے مطابق تمہیں اپنے فیصلے کرانے کا حکم دیا جاتا ہے (اور اس کے سوا کسی اور قانون کے مطابق فیصلے کی اجازت نہیں ہے) اور یہ فیصلے جس پر راضی برضا ہونا ضروری ہے ' یہ نظام دراصل نہایت ہی آسان ' سیدھا اور منصفانہ اور رحیمانہ نظام ہے - یہ نظام تمہیں تمہاری طاقت سے زیادہ کسی چیز کا حکم نہیں دیتا ' اور نہ تم پر کوئی ایسی مصیبت لاتا ہے جو تمہارے لئے ناقابل برداشت ہو ' اور نہ تم سے کسی ایسی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے جو تم سے نہ دی جاسکے - اس لئے کہ انسان کی ضیفی اللہ کی نظر میں ہے - وہ ان کی کمزوری کی وجہ سے ان پر بہت ہی رحم فرماتا ہے - اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ اگر انسانوں پر بھاری فرائض عائد کئے گئے تو وہ انہیں ادا نہ کرسکیں گے - اس لئے اللہ نے یہ ارادہ ہی نہیں کیا کہ انسانون پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالے اور نہ اللہ کا ارادہ تھا کہ لوگ معصیت کا ارتکاب کریں - اس لئے اللہ تعالیٰ نے بھاری احکام ان پر فرض ہی نہیں کئے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ زیادہ لوگ معصیت پر اتر آئیں - اگر لوگ ان آسان فرائض پر عمل پیرا ہوتے جو اللہ نے ان پر فرض کئے تھے ' اور اس نصیحت سے فائدہ اٹھاتے جو اللہ تعالیٰ ان کے لئے نازل کر رہے ہیں تو وہ دنیا اور آخرت دونوں میں عظیم بھلائی جمع کرلیتے - اللہ تعالیٰ راہ ہدایت پر آنے میں ان کی امداد فرماتے ' اور یہ اللہ کی سنت ہے کہ جو شخص بھی اپنے عمل ' ارادہ اور عزم بالجزم سے اللہ کی راہ میں سعی کرے اپنی طاقت کے حدود کے اندر ' تو اللہ اس کی پوری پوری معاونت کرتا ہے -

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿۶۶﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۶۷﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾

”اگر ہم نے انہیں حکم دیا ہوتا کہ اپنے آپ کو ہلاک کر دو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو ان میں سے کم ہی آدمی اس پر عمل کرتے ' حالانکہ جو نصیحت انہیں کی جاتی ہے اگر یہ اس پر عمل کرتے تو یہ ان کے لئے زیادہ بہتری اور زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا اور جب یہ ایسا کرتے تو ہم انہیں اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتے اور انہیں سیدھا راستہ دکھا دیتے -“

اسلام ایک ایسا نظام زندگی ہے جس پر ہر وہ شخص عمل کرسکتا ہے جو مستقیم اور سلیم الفطرت ہو ' اس پر عمل کرنے کے لئے کسی خارق العادت عزم اور کسی بڑے اولوالعزم شخص کی ضرورت نہیں ہے - ایسے لوگ تو دنیا میں چند ایک ہوتے ہیں اور اسلامی نظام حیات ان چند لوگوں کے لئے نہیں بھیجا گیا - یہ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے بھیجا گیا ہے ' اور دنیا میں ہر قسم

کے لوگ پائے جاتے ہیں جو مختلف درجات کے ہوتے ہیں۔ بعض کی طاقتیں اور صلاحیتیں زیادہ ہوتی ہیں اور بعض کی کم۔ یہ دین لوگوں کی اوسط تعداد کو مدنظر رکھ کر بھیجا گیا ہے' جو احکام پر عمل کر سکتے ہیں اور معاصی سے رک سکتے ہیں۔

قتل نفس اور جلاوطن دو ایسے احکام ہیں جو نہایت ہی شاق ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر یہ چیزیں بطور احکام و فرائض عائد کر دیتا تو ان احکام پر لوگوں کے لئے عمل کرنا مشکل ہو جاتا۔ لیکن اللہ نے یہ احکام اس لئے عائد نہیں کئے گئے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو شکست دینا نہیں چاہتا تھا اور یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ لوگ ان احکام سے انکار کر دیں بلکہ مقصد یہ تھا کہ سب لوگ احکام الٰہی پر عمل کریں۔ احکام ایسے ہوں جو سب کے دائرہ قدرت میں ہوں۔ قافلہ ایمان کے اندر تمام اوسط درجے کے لوگ بھی شامل ہوں اور یہ کہ اسلامی سوسائٹی میں مختلف طبقات کے لوگ' مختلف ہمتوں کے لوگ' مختلف استعدادوں اور صلاحیتوں کے لوگ شامل ہوں۔ یہ سب لوگ مل کر اسلامی سوسائٹی کو ترقی دیں۔ اور ایک ایسے کثیر التعداد قافلے کی شکل میں جو طویل و عریض ہو۔

ابن جریج' اسحاق ابوالازھر' اسماعیل' ابو اسحاق کی سند سے ابو الحاق کہتے ہیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ (وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ (٤: ٦٦)) تو ایک شخص نے کہا اگر اللہ حکم دیتا تو ہم ضرور ایسا کرتے لیکن اللہ کی بڑی مہربانی ہے کہ اس نے ہمیں معاف کر دیا۔ یہ بات حضرت نبی اکرم ؐ تک پہنچی تو آپ ؐ نے فرمایا: "میری امت میں ایسے لوگ ہیں کہ ان کے دل میں ایمان ان پہاڑوں سے بھی زیادہ بیٹھا ہوا ہے جو نہایت ہی اونچے ہیں۔"

ایک دوسری روایت ابن ابو حاتم نے حضرت مصعب سے روایت کی ہے۔ انہوں نے اپنے چچا عامر بن عبید ابن زبیر سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔

(وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ (٤: ٦٦))

رسول اللہ ؐ نے فرمایا: "اگر یہ حکم نازل ہوتا تو ابن ام عبد ان میں سے ہوتا۔" انہوں نے ایک روایت شریح ابن عبید سے نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں' جب حضور ؐ نے یہ آیت پڑھی۔ (وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ (٤: ٦٦)) تو رسول اللہ ؐ نے عبداللہ ابن رواحہ ﷺ کی طرف اشارہ فرمایا: "اگر اللہ تعالیٰ یہ فرائض عائد کرتا تو یہ ان قلیل لوگوں میں سے ہوتے۔"

رسول اللہ ؐ اپنے ساتھیوں کو نہایت ہی گہرائی سے اور نہایت ہی اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے خصائص اور صلاحیتیں آپ ؐ کی نظر میں اس قدر درست تھیں کہ وہ خود بھی اپنے بارے میں اس قدر نہ جانتے تھے۔ حضور اکرم ؐ کی سیرت میں ایسے بے شمار واقعات ہیں جن سے حضور اکرم ؐ کی یہ صلاحیت اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ آپ اپنے ساتھیوں کے بارے میں گہری معلومات رکھتے تھے۔ نیز حضور کو ان قبائل کی صلاحیتوں کا بھی علم تھا جن سے آپ برسرپیکار تھے۔ آپ ایک بصیرت افروز قائد کی طرح اپنے ماحول سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور بعض اوقات یہ معلومات

نہایت ہی معجزانہ ہوتی تھیں ۔ کیونکہ یہ لدنی علم پر مبنی تھیں ۔

اس جگہ ہمارا یہ موضوع نہیں ہے' یہاں ہم جو کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ حضور اکرم ؐ کو معلوم تھا کہ آپ کے ساتھیوں میں اور آپ کی امت میں ایسے لوگ ہوں گے' جو ناقابل برداشت مشکلات کو برداشت کریں گے ۔ اگر یہ مشکلات ان پر فرض کر دی جائیں لیکن آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ آپ صرف ان چند ممتاز لوگوں کی طرف رسول بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے ۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے پیدا کئے ہوئے انسان کی فطرت کے بارے میں اچھی طرح علم تھا' اس کی محدود طاقت کا بھی اسے علم تھا' اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس دین کے احکام میں وہی کچھ فرض کیا جس پر سب لوگ عمل کر سکتے تھے' اس لئے کہ یہ دین سب کے لئے آیا تھا' بشرطیکہ کسی کے اندر عزم ہو' اس کی فطرت معتدل ہو' اور اس کے اندر اطاعت کا داعیہ ہو اور وہ اس دین کو مذاق اور غیر ضروری نہ سمجھتا ہو ۔

اس حقیقت کا ذہن نشین کرنا بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے ۔ خصوصاً ان تخریبی تحریکات کے حوالے سے جن کی دعوت یہ ہے کہ انسان مرتبہ حیوانیت تک اتر آئے اور وہ نفسانیت کے کیچڑ میں کیڑے کی طرح لت پت ہو ۔ اس کے لئے یہ لوگ دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہی انسان کی حقیقی صورت حالات ہے اور یہی اس کی طبیعت 'فطرت اور اس کی طاقت ہے اور یہ کہ دین تو اس مقام کی طرف دعوت دیتا ہے جو ایک مثالی مقام ہے' جس کا اس کرۂ ارض پر حقیقت کا روپ اختیار کرنا نہایت ہی مشکل ہے ۔ اگر کوئی ایک فرد دین کے فرائض پر عمل پیرا ہو بھی جائے تو سو عمل پیرا نہیں ہو سکتے ۔

یہ نہایت ہی جھوٹا دعویٰ ہے ۔ یہ فریب پر مبنی ہے ۔ یہ جہالت پر مبنی ہے ۔ اس لئے کہ یہ مدعی انسان کو اس طرح نہیں سمجھ سکتا جس طرح اس کو خالق رب العالمین سمجھتا ہے ۔ جس نے اس کے لئے دینی فرائض مقرر کئے ۔ وہ ذات خالق یہ جانتی ہے کہ یہ احکام اس کے دائرہ خدمت میں ہیں ۔ اس لئے کہ دین چند ممتاز لوگوں کے لئے تو نہیں بھیجا گیا ۔

یہ تو صرف عزم کی بات ہے' ایک عام آدمی کی عزیمت' اخلاص نیت اور کام کے آغاز کی بات ہے اور جب عزم' نیت اور آغاز ہو جائے تو ۔

(وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَشَدَّ تَثْبِيْتًا (٦٦) وَّ اِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا (٦٧) وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا (٦٨)

"حالانکہ جو نصیحت انہیں کی جاتی ہے اگر یہ اس پر عمل کرتے تو یہ ان کے لئے زیادہ بہتری اور زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا اور جب یہ ایسا کرتے تو ہم انہیں اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتے اور انہیں سیدھا راستہ دکھا دیتے ۔"

صرف کام کے آغاز ہی سے اللہ کی طرف سے امداد شروع ہو جاتی ہے اور اس راہ پر گامزن ہونے کے لئے ثابت قدمی نصیب ہوتی ہے جس کے بعد اجر عظیم نصیب ہوتا ہے ۔ اس کے بعد صحیح راستے کی طرف راہنمائی نصیب ہوتی ہے ۔ (صدق اللہ العظیم) کیا اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو دھوکہ دے رہے ہیں؟ کیا وہ ان سے وہ وعدہ کر رہے ہیں جو پورا نہ ہو؟ بلکہ اللہ تو ان سے بہت ہی سچی بات فرماتے ہیں ۔ (وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا) (اللہ سے زیادہ سچا اور کون ہے)

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اس دین میں آسانی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو چھوٹ دے دی جائے ۔ یہ دین ایسا نہیں ہے کہ اس میں ہر طرف سے چھوٹ دی جاتی رہے اور پھر بھی وہ نظام حیات ہو ۔ اس میں عزیمت بھی ہے اور رخصت بھی ہے ۔ عزیمت تو اصل دین ہے اور رخصت بعض عارضی حالات کی وجہ سے ہے ۔ ہمارے بعض مخلص لوگ جو لوگوں کو اس دین کی طرف بلاتے ہیں وہ ان کے سامنے رخصتیں پیش کرتے ہیں ۔ وہ ایک ایک رخصت تلاش کرتے اور اسے لوگوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہے دین اور پھر وہ لوگوں کو کہتے ہیں دیکھو اس دین میں یہ یہ سہولتیں ہیں ۔ بعض لوگ شیطان کی خواہشات یا عوام الناس کی خواہشات پوری کرنا چاہتے ہیں ' وہ ایک سوراخ تلاش کرتے ہیں جہاں سے نکلا جا سکے اور پھر وہ کہتے ہیں کہ یہ ہے دین ۔

یہ دین درحقیقت نہ رخصتوں کا نام ہے اور نہ ہی عزیمتوں کا نام ہے ۔ اس میں مجموعی طور پر دونوں چیزیں موجود ہیں اور یہ دین ایسا ہے کہ اگر ایک عام انسان اس پر عمل کے لئے عزم کر لے تو وہ اس پر عمل کر سکتا ہے ۔ وہ اپنی حدود بشریت کے اندر رہتے ہوئے اس کے اندر ذاتی کمال حاصل کر سکتا ہے ۔ جیسے ایک ہی باغ میں وہ انگور ' شہتوت ' انجیر ' خربوزہ ' تربوز اور دوسرے پھل پیدا ہوتے ہیں اور سب کے ذائقے جدا ہوتے ہیں ۔ کسی کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پختہ نہیں ہے ۔ بشرطیکہ وہ پک گیا ہو ' اگرچہ ایک کا ذائقہ دوسرے سے کم درجے کا ہو ۔

اس دین کے باغ میں ساگ ' ترکاری اور کھیرے ککڑی پیدا ہوتے ہیں ۔ کینو اور انار پیدا ہوتے ہیں ۔ سیب اور اخروٹ بھی پیدا ہوتے ہیں ۔ انگور اور انجیر پیدا ہوتے ہیں اور سب کے سب پکتے ہیں ۔ سب کے ذائقے مختلف ہوتے ہیں اور سب پختہ ہوتے ہیں ۔ اپنے اپنے درجے میں کمال کو پہنچ جاتے ہیں ۔ دنیا اللہ کا کھیت ہے ۔ اس میں انسان ' اللہ کی تربیت میں اللہ کی نگرانی میں سہولت کے ساتھ آگے بڑھتے رہتے ہیں ۔

اب آخر میں ' اس سبق کے خاتمے پر ترغیب دی جاتی ہے ' دلوں کے اندر جوش پیدا کیا جاتا ہے اور لوگوں کو محبوب مال و متاع کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے ۔ یہ دولت نبیوں ' صدیقین ' صالحین اور شہداء کے ساتھ ہم نشینی کی متاع ہے ۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾

"جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین ۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں ۔ یہ حقیقی فضل ہے جو اللہ کی طرف سے ملتا ہے اور حقیقت جاننے کے لئے بس اللہ ہی کا علم کافی ہے ۔"

یہ ایک ایسا چ ہے جس سے تمام قلبی احساسات جاگ اٹھتے ہیں بشرطیکہ کسی دل میں بھلائی کا کوئی ذرہ موجود ہو ' بشرطیکہ

نیکی کا کوئی بیج موجود ہو بشرطیکہ اس میں کسی باعزت مقام اور اللہ کے جوار رحمت میں داخل ہونے اور اللہ کی شان کریمی کی تلاش کا کوئی داعیہ ہو۔ یہ مجلس ایسے ہی اولوالعزم اور بلندیوں کے متلاشیوں کے لئے ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے اور اس فضل وکرم کے مقام تک کوئی شخص صرف اپنی اطاعت شعاری اور اپنے عمل کے ذریعے نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ یہ تو صرف اللہ کا وسیع اور عمیق اور بھرپور فضل وکرم ہوتا ہے اور اس کا عمومی فیضان ہوتا ہے اور جس کی قسمت ہو اسے ڈھانپ لیتا ہے۔

یہاں مناسب ہے کہ ہم چند لمحے نبی ؐ کے صحابہ کی محفل میں گزاریں۔ یہ لوگ دنیا و آخرت دونوں میں حضور ؐ کی محفل کے مشتاق تھے۔ ان حضرات میں سے بعض تو ایسے تھے کہ وہ آپ کی جدائی کے تصور ہی سے پریشان ہو جاتے تھے' حالانکہ آپ ؐ اس وقت ان کے درمیان موجود تھے۔ اسی لئے یہ آیات نازل ہوئیں' جس سے ان کی محبت تروتازہ ہو گئی اور ان کا پاکیزہ جذبہ جوش میں آگیا۔ اور ان کی پاک و شفاف محبت اور پاک ہو گئی۔

ابن جریر نے حضرت سعید ابن جبیر سے روایت کی ہے۔ انصار میں سے ایک شخص آیا جو بہت ہی پریشان تھا۔ حضور ؐ نے فرمایا "اے فلاں تم پریشان کیوں ہو؟ اس نے جواب دیا اللہ کے نبی میں ایک معاملے میں سوچ رہا تھا۔ آپ نے دریافت کیا کہ کیا تھا وہ؟ اس نے کہا وہ یہ تھا کہ ہم صبح و شام آپ سے آکر ملتے ہیں' آپ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہیں اور آپ کی مجلس میں بیٹھتے ہیں۔ کل آپ نبیوں کے ہاں چلے جائیں گے تو ہم آپ سے ملاقات نہ کر سکیں گے۔ حضرت نبی اکرم ؐ نے اس شخص کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں حضرت جبرائیل یہ آیت لے کر آئے۔

(وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ

(٤ : ٦٩)) نبی ؐ نے اس شخص کے لئے پیغام بھیجا اور اسے خوشخبری دی۔ حضرت ابوبکر ابن مردویہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے کہ ایک شخص نبی ؐ کے پاس آیا اور عرض کیا حضور آپ میرے لئے میری جان سے زیادہ محبوب ہیں' آپ میرے لئے میرے اہل خاندان سے زیادہ محبوب ہیں اور آپ میرے لئے میری بیٹیوں سے زیادہ محبوب ہیں اور جب میں گھر پہ ہوتا ہوں تو میں آپ کو یاد کرتا ہوں اور اٹھ کر آجاتا ہوں اور آپ کو دیکھ لیتا ہوں' صبر نہیں کر سکتا۔ جب میں اپنی موت اور آپ کی موت کے بارے میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ آپ جنت میں داخل ہو کر نبیوں کے گروہ میں داخل ہو جائیں گے اور میں اگر جنت میں چلا بھی جاؤں تو شاید آپ کو دیکھ نہ سکوں۔ اس شخص کے ان خدشات کا آپ نے کوئی جواب نہ دیا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

(وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (٤ : ٦٩))

"جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں۔"

صحیح مسلم نے ربیعہ کی حدیث نقل کی ہے' فرماتے ہیں میں ایک رات نبی ؐ کے پاس تھا۔میں نے آپ کو وضو کے لئے پانی اور دوسری ضروریات فراہم کیں تو حضور ؐ نے فرمایا: مانگو جو مانگتے ہو تو میں نے کہا کہ اے رسول خدا ؐ میں تو جنت میں آپ کی رفاقت چاہتا ہوں۔آپ نے فرمایا اس کے سوا کچھ اور؟ تو اس نے کہا بس صرف یہی۔تو حضور ؐ نے فرمایا آپ کثرت سجود کے ذریعے اپنے نفس کے خلاف میری معاونت کریں۔

بخاری شریف میں متعدد طریقوں سے یہ روایت آئی ہے کہ ایک شخص ایک گروہ کو پسند کرتا ہے مگر ان سے ملاقات نہیں ہوتی تو اس کیا حال ہو گا؟ آپ نے فرمایا آدمی انہی لوگوں کے ساتھ ہو گا جن کو وہ محبوب سمجھتا ہے۔یہی بات تھی' جس میں ان کے دل و دماغ ہروقت مشغول تھے۔محبت رسول اور آخرت میں صحبت رسول.... انہوں نے دنیا میں بھی صحبت رسول کا مزہ چکھا ہوا تھا۔اور آج اس کا مزہ صرف وہی دل چکھ سکتا ہے جس کے اندر محبت رسول موجود ہو اور ہم لوگوں کے لئے اس آخری حدیث میں روشنی کی کرن' اطمینان کا سامان اور امید کی شمع نظر آتی ہے۔

---ooo---

درس ۳۶ ایک نظر میں

میں اس بات کو ترجیح دیتا ہوں کہ اس سبق میں آیات کا جو مجموعہ دیا گیا ہے' وہ مدینہ کے ابتدائی دور میں غزوۂ احد کے بعد اور غزوہ خندق سے پہلے نازل ہوا ہو گا کیونکہ اس میں اسلامی سوسائٹی کی جو تصویر کشی کی گئی ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابھی تک پختگی کے مقام تک نہ پہنچی تھی۔ اس سوسائٹی میں مختلف قسم کے گروہ موجود تھے' جن میں بعض ناپختہ تھے اور بعض ایسے لوگ بھی موجود تھے جو ایمان ہی نہ لائے تھے اور محض منافقت کر رہے تھے۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی سوسائٹی کو اپنی تعلیم و تربیت کی مزید ضرورت تھی اور اس سلسلے میں عظیم جدوجہد اور گہری توجہ کی ضرورت تھی۔ اسے اس عظیم مقصد کے لئے تیار کرنے اور وہ بوجھ اٹھانے کا اہل بنانے کی ضرورت تھی جو اسلام نے اس کے کاندھوں پر ڈال دیا گیا تھا' نیز اسلامی انقلاب کے لئے جس سطح کے لوگوں کی ضرورت تھی' اس سطح تک اس سوسائٹی کو بلند کرنا ضروری تھا۔ چاہے یہ تربیت اور اصلاح عقائد و تصورات کے میدان میں ہو' یا مخالف کیمپوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کے میدان میں ہو۔

اور یہ جو ہم کہہ رہے ہیں کہ بعض لوگ ناپختہ تھے' اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سوسائٹی میں نہایت ہی بلند معیار کے لوگوں کی کمی تھی۔ یہاں ہم اس وقت کی اسلامی سوسائٹی کو مجموعی طور پر لے رہے ہیں۔ اس سوسائٹی میں مختلف عناصر موجود تھے' لیکن سب ایک جیسے نہیں تھے۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت تھی کہ اس سوسائٹی کے تمام عناصر کو بلند سطح تک لانے کی سعی کی جائے تاکہ اس کے افراد کے درمیان مکمل ہم آہنگی پیدا ہو۔ اس بات کا اظہار ان آیات و ہدایات سے اچھی طرح ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ ان ہدایات کے گہرے مطالعے سے ہمیں اس وقت کی مسلم سوسائٹی کا جائزہ لینے کا موقع ملتا ہے اور جماعت مسلمہ کے ایسے خدوخال سامنے آتے ہیں جن میں یہ سوسائٹی ایک انسانی سوسائٹی نظر آتی ہے۔ اس کا یہ پہلو ہم اکثر اوقات نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس سوسائٹی میں ہمیں اعلیٰ معیار کی تربیت اور قوت بھی نظر آتی ہے اور اس میں بعض کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں۔ یہ بھی نظر آتا ہے کہ قرآن کریم انسانی کمزوریوں' جاہلیت کے باقی ماندہ آثار اور اسلام کے مخالف کیمپ کے ساتھ کس طرح معرکہ آرائی کرتا ہے اور یہ سب کام بیک وقت ہوتا ہے۔ ہم قرآن کریم کے انداز تربیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو قرآن عالم واقعہ میں زندہ انسانوں کے ساتھ معاملہ کرتا دکھائی دیتا ہے اور یہ بھی نظر آتا ہے کہ تربیت کے میدان میں قرآن کریم نے کس قدر کامیاب جدوجہد کر کے ایک ایسی سوسائٹی تخلیق کی جس کو جاہلیت کے معاشرہ سے لیا گیا تھا' جس میں مختلف درجات اور مختلف طبقات کے لوگ موجود تھے اور جس میں مختلف خصوصیات کے لوگ موجود تھے' قرآن نے انہیں اس قدر ہم آہنگ' اس قدر بلند' اس قدر متحد بنا دیا جس کا کامل رنگ حضور

ؐ کے آخری دور میں صاف نظر آتا ہے اور یہ اس قدر بلند اور کامل و مکمل سوسائٹی تھی جس سے آگے جانا انسانوں کے لئے ممکن نہیں ہے۔

کسی انسانی سوسائٹی' کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسانی نفس کے اندر کیا کیا صلاحیتیں ہیں' اور دنیا کی بہترین جماعت اور سوسائٹی میں ان کا ظہور کس شکل میں ہوتا ہے۔ وہ جماعت جس کی تربیت خود حضور ؐ نے فرمائی تھی اور یہ تربیت تھی بھی قرآنی منہاج کے مطابق۔

اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا منہاج تربیت کیا تھا اور یہ کہ قرآن کریم انسانی نفوس کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتا تھا۔ اس کا رویہ اس کے ساتھ کس قدر پر لطف تھا اور جماعت کے اندر مختلف سطح کے لوگوں کو اس نے کس طرح باہم متحد اور منسلک کر دیا تھا۔ ہم قرآن کریم کا مزاج تربیت دیکھتے ہیں اور ہمیں عالم واقعہ میں انسانی طبیعت کے مطابق یہ تربیتی نظام کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

اس سے ایک فائدہ ہمیں یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ ہم اپنے حالات اور دوسری انسانی سوسائٹیوں کے حالات کا مقابلہ اس انسانی جماعت سے کریں جو اللہ نے برپا کی ہے۔ اس کے بعد ان سوسائٹیوں کی انسانی اعتبار سے جو اصل صورت حال تھی اس کا مطالعہ کریں تاکہ اپنی کوتاہیوں کو دیکھ کر دور جدید میں اصلاح حال سے مایوس نہ ہو جائیں اور اپنی اصلاح کے لئے کوشش کرنا ترک نہ کر دیں۔ یہ بھی نہ ہو کہ اسلام کی یہ پہلی سوسائٹی ہمارے تصورات میں کہیں محض خیالی سوسائٹی ہی نہ بن جائے اور ہم کہیں یہ سعی ترک نہ کر دیں کہ اس جماعت کے نقش قدم پر ہمیں چلنا ہے اور دور جدید میں ان جدید سوسائٹیوں کو موجودہ گراوٹ سے اونچا کر کے مقام بلند تک پہنچانا ہے۔

یہ عبرتوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ اور ظلال القرآن میں زندگی بسر کر کے جب ہم یہ ذخیرہ اخذ کریں گے تو یہ ہمارے لئے بھلائی کا ایک عظیم سامان ہو گا۔

اس سبق میں دی گئی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی صفوں میں اس وقت درج ذیل قسم کے لوگ موجود تھے۔

(الف) ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے آپ کو جہاد میں پیچھے رکھتے تھے۔ اس سے دوسرے لوگوں میں بھی سستی پیدا ہوتی تھی۔ اور اگر وہ جہاد کو نہ جاتے اور گھروں میں صحیح و سالم رہتے تو اسے اپنے لئے کامیابی سمجھتے تھے جبکہ جہاد میں شریک ہونے والے مسلمانوں کو اس جہاد میں مشکلات اور تکالیف پیش آئیں۔ اسی طرح یہ لوگ اگر جہاد میں نہ جاتے اور مسلمانوں کو مال غنیمت مل جاتا تو ایسے لوگ محسوس کرتے کہ ان کو خسارہ ہو گیا کہ مال غنیمت میں سے ان کو حصہ نہ ملا۔ اس طرح یہ لوگ آخرت کے مقابلے میں دنیا کو خریدتے تھے۔

(ب) ان لوگوں میں بعض مہاجرین بھی تھے جب یہ لوگ مکہ میں تھے اور ان پر مظالم ہوتے تھے تو وہ جوش دفاع اور بہادری کے جذبے سے یہ کہتے تھے کہ کاش انہیں جہاد کرنے اور جنگ کرنے کی اجازت ہوتی لیکن وہاں ان کے لئے جنگ کرنا بالکل بند کر دیا گیا تھا۔ اب مدینہ طیبہ میں جب جہاد کا حکم آگیا اور یہ کہا گیا کہ کفار کے ساتھ جنگ شروع کر دو تو یہ لوگ تمنا کرنے لگے کہ کاش ابھی اور مہلت ملتی اور جنگ کا حکم نہ آیا ہوتا۔

(ج) ان میں ایسے لوگ بھی تھے کہ اگر کوئی بھلائی نصیب ہوتی تو کہتے کہ یہ اللہ کا فضل ہے اور مصیبت آتی تو کہتے کہ

یہ مصیبت نبی ؐ کی ذات کی وجہ سے ہے۔ یہ بات وہ اس لئے نہ کہتے تھے کہ ان کا خدا تعالیٰ کی ذات پر پختہ ایمان اور بھروسہ تھا بلکہ وہ یہ باتیں اسلامی قیادت پر تنقید کرتے ہوئے کرتے تھے۔

(د) بعض ایسے لوگ بھی تھے کہ جو حضور ؐ کے سامنے اپنے آپ کو نہایت مطیع فرمان ظاہر کرتے مگر جب آپ کے پاس سے چلے جاتے تو مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے اور اپنے ہم نشینوں کے ساتھ کوئی اور بات کرتے۔

(ہ) بعض ایسے لوگ تھے جو افواہوں پر کان دھرتے تھے اور اسلامی صفوں میں انہیں پھیلاتے تھے۔ اس طرح وہ اسلامی محاذ میں بے چینی پیدا کر دیتے تھے حالانکہ انہیں چاہئے تھا کہ وہ بات کو ثبوت تک پہنچاتے یا خود اسلامی قیادت کی طرف رجوع کرتے۔

(ر) بعض لوگ ایسے بھی تھے جن کو اس بارے میں شک تھا کہ آیا ان ہدایات کا مصدر اور منبع اللہ کی ذات ہے یا نہیں، وہ یہ سمجھتے تھے کہ بعض باتیں نبی ؐ اپنی جانب سے کرتے ہیں۔

(ز) بعض ایسے تھے جو منافقین کی جانب سے مدافعت کیا کرتے تھے جیسا کہ اگلے سبق کے شروع میں بعض نمونے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی کہ منافقین کے بارے میں جماعت مسلمہ دو گروہوں میں بٹ جائے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے اسلامی تصور اور تنظیم میں ابھی تک مکمل ہم آہنگی نہ تھی اور یہ لوگ قیادت کے فرائض اور ایسے معاملات میں قیادت کے ساتھ رابطے کی ضرورت کو اچھی طرح نہ سمجھتے تھے۔

یہ تمام عناصر جو اسلامی صفوں میں موجود تھے یہ منافقین کے گروہ تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ایک ہی گروہ سے متعلق ہوں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مدینہ کی سوسائٹی میں یہ لوگ منافقین کے کئی گروہوں سے تعلق رکھتے ہوں یا ان لوگوں میں بعض ضعیف الایمان مسلمان بھی ہوں جن کی ایمانی حالت ابھی پختہ نہ ہوئی ہو۔ ان میں سے کچھ لوگ مہاجرین بھی ہو سکتے ہیں۔ بہرحال ایسے کئی گروپ اسلامی جماعت کے اندر موجود تھے اور یہ جماعت اس وقت مدینہ کے یہودیوں میں گھری ہوئی تھی، جبکہ مکہ میں وہ مشرکین کے نرغے میں تھی اور پورے جزیرۃ العرب میں یہ جماعت متربصین کے نرغے میں تھی جو انتظار کر رہے تھے کہ اس تحریک کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ یہ جماعت مسلسل مسلمانوں کی صفوں کے اندر بے چینی پیدا کر رہی تھی۔ لہٰذا اندرونی صفوں میں تربیت و تطہیر کی ضرورت تھی اور لوگوں کو جہاد پر ابھارنے کی ضرورت تھی۔

ان آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے یہ داخلی جہاد اور تربیت کس نہج پر کی۔ قرآن نے مسلمانوں کی صفوں سے مایوسی کو دور کیا اور جماعت کے ہر فرد کو مطمئن کر دیا۔ نہایت ہی گہرائی، دقت اور صبر کے ساتھ اور اس تحریک کے قائد حضرت محمد ؐ نہایت ہی صبر آزما حالات میں یہ تربیت فرما رہے تھے۔ ذرا اس کے نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

(الف) حکم دیا جاتا ہے کہ ہر وقت محتاط رہو۔ مجاہدین اور مومنین اکیلے نہ پھریں اور مہمات اور سرایا میں اکٹھے جائیں۔ یعنی سرایا اور دستوں کی شکل میں یا سب کے سب فوج کی شکل میں نکلیں۔ اس لئے کہ ان کے ارد گرد کے علاقے میں مختلف قسم کی دشمنیاں ہیں اور دشمن گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں جن کے اندر منافقین ہیں یا ایسے دشمن ہیں جن کو منافقین پناہ دے رہے ہیں۔ نیز یہودی بھی پورے جزیرۃ العرب کے دشمنوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں جو موقع کے انتظار میں ہیں۔

(ب) بعض لوگ جو جہاد میں پیچھے رہ جاتے تھے ان کی بھی یہاں ایک قابل نفرت تصویر نظر آتی ہے۔ ان کی ہمت

جواب دے گئی ہے وہ مفاد پرست ہیں اور نہایت ہی متلون مزاج ہیں اور حالات کے ساتھ بہت جلد یہ لوگ بدل جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے حال پر تعجب ہوتا ہے کہ مکہ میں تو بہت ہی پرجوش تھے مگر اب جبکہ مدینہ میں جہاد فرض ہو گیا ہے تو وہ جزع و فزع کرتے ہیں۔

(ج) یہاں اللہ کی راہ میں مقاتلین کے لئے اللہ کی جانب سے وعدہ بھی صاف نظر آتا ہے کہ اللہ انہیں اجر عظیم عطا کرے گا اور انہیں دو اچھے انجاموں میں سے ایک ضرور ملے گا۔ یعنی ”اور جو شخص اللہ کی راہ میں قتال کرتا ہے اور مارا جاتا ہے ' یا غالب ہو جاتا ہے تو دونوں صورتوں میں اللہ اسے اجر عظیم دے گا۔“

(د) قرآن کریم مقاصد کی بلندی ' اہداف کی پاکیزگی ' اور کامرانی کے مقاصد کی نشاندہی بھی کرتا ہے جس کی وجہ سے جہاد و قتال فرض کیا گیا ہے کہ یہ ”اللہ کے راستے میں 'ضعیف مردوں ' عورتوں اور بچوں کی حمایت میں ہے ' جو ہر وقت یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس گاؤں سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی جانب سے کوئی ولی مقرر کر اور اپنی جانب سے ہمارے لئے کوئی مددگار بنا۔“

(ہ) پھر قرآن مجید ان مقاصد کی سچائی کو بھی ریکارڈ پر لاتا ہے اور یہ طے کرتا ہے کہ ان کی پشت پر سند قوی ہے۔ اور ان مقاصد کا بر سر باطل ہونا بھی بتاتا ہے جن کے لئے کافر لڑتے ہیں اور ان کی سند بھی ضعیف ہے۔ ”وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں 'پس تم شیطان کے دوستوں کے ساتھ لڑو ' بے شک شیطان کا مکر کمزور ہے۔“

(و) ان آیات میں قرآن کریم ان تصورات فاسدہ کا علاج بھی کرتا ہے جن کی وجہ سے دل و دماغ میں فاسد احساسات اور کردار میں فاسد اور ضعیف طرز عمل جنم لیتا ہے۔ اور یہ کام وہ غلط عقائد کی ...ن کے ذریعے کرتا ہے۔ ایک تو حقیقت دنیا اور حقیقت آخرت کے بیان کے ذریعے کرتا ہے۔ ”کہہ دیجئے دنیا کا سامان بہت ہی قلیل ہے اور آخرت ان لوگوں کے لئے بہت ہی خیر ہے جو متقی ہیں اور تم پر ذرہ برابر ظلم نہ ہو گا۔“ اور دوسری حقیقت موت اور مقررہ وقت کے اٹل ہونے کے بارے میں کہ انسان جس قدر بھی احتیاط کرے اور جس قدر بھی جہاد سے دور بھاگے ' موت بہرحال اپنے وقت پر آپہنچتی ہے۔ ”جہاں بھی تم ہو گے ' موت تمہیں پالے گی اگرچہ تم پختہ محلات میں بیٹھے ہو۔“ پھر ان کے تصورات مسئلہ تقدیر کے بارے میں درست کئے جاتے ہیں کہ انسان کے عمل اور قضا و قدر کا تعلق کیا ہے۔ ”اگر ان کو کوئی بھلائی نصیب ہو تو کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کی جانب سے ہے اور اگر کوئی برائی پہنچے تو وہ کہتے ہیں یہ تمہاری جانب سے ہے۔ کہو سب کچھ اللہ کی جانب سے آتا ہے۔ لیکن ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ بات کو سمجھنے والے نہیں۔ اگر تمہیں کوئی بھلائی ملے تو یہ اللہ کی جانب سے ہے اور اگر کوئی برائی تمہیں ملے تو یہ تمہارے نفس کی وجہ سے ہے۔“

(ز) قرآن کریم اللہ اور رسول ؐ کے درمیان گہرے تعلق کی نشاندہی کرتا ہے اور یہ کہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت تصور ہوتی ہے۔ پورے کا پورا قرآن مجید اللہ کی جانب سے ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ اس کے اندر پائی جانے والی مکمل وحدت فکر پہ غور کرو 'جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن ایک ہی منبع سے آیا ہے۔ ”جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔“ .... کیا وہ قرآن کریم پر غور نہیں

کرتے 'اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کی جانب سے آتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف فکر پاتے۔"

(ح) ان آیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ مدینہ میں افواہیں پھیلانے والوں کو صحیح طریق کار اپنانے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ وہ طریق کار کسی بھی صحت مند جماعت کی قیادت اور تنظیم کے لئے مناسب ہے اور وہ یہ ہے کہ "اگر وہ کسی واقعہ کو رسول اللہ ؐ اور ان لوگوں کے پاس لاتے جن کے ہاتھ میں امور مملکت تھے تو جو لوگ اس سے صحیح نتائج اخذ کر سکتے تھے وہ ان کے علم میں آ جاتا۔"

(ط) ان آیات میں اس غلط طریق کار سے انہیں ڈرایا جاتا ہے اور ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ اللہ نے اپنا کرم کیا کہ ان کو ہدایت سے نوازا "اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو تم لوگ شیطان کے تبع ہوتے مگر کم لوگ۔

مدینہ کی اسلامی جماعت اور سوسائٹی کے جو حالات ان آیات میں بیان ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی وجہ سے اس جماعت کے اندر کس قدر انتشار اور بے چینی پیدا کر دی گئی تھی۔ان حالات میں جب نبی ؐ کو جہاد و قتال کا حکم ہوا تو آپ کو کس قدر ہمہ جہت اور مختلف قسم کی جدوجہد کرنا پڑی ہوگی۔جب ہم یہ سنتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نبی ؐ سے کہتے کہ وہ جہاد کریں اگرچہ وہ اکیلے ہوں اور یہ کہ اہل ایمان کو جہاد پر اکسائیں۔ آپ اپنی ذات ہی سے مسئول ہوں گے اور اللہ خود ہی معرکے میں حصہ لے گا۔"پس اے نبی ؐ تم اللہ کی راہ میں لڑو، تم اپنی ذات کے سوا کسی اور کے ذمہ دار نہیں ہو۔ البتہ اہل ایمان کو لڑنے کے لئے اکساؤ، بعید نہیں کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے۔ اللہ کا زور سب سے زیادہ زبردست اور اس کی سزا سب سے زیادہ سخت ہے۔" اس انداز گفتگو سے اہل ایمان کے اندر بہت ہی زیادہ جوش پیدا ہوتا، اور ان کی ہمتیں بلند ہو جاتیں کیونکہ اس میں فتح و نصرت کی پوری امید بھی تھی، اور اللہ کی تائید اور اس کی قوت پر پورا یقین بھی۔

قرآن کریم اس جماعت کو لے کر متعدد میدانوں میں بر سرپیکار تھا۔ پہلا معرکہ نفس انسانی کے اندر برپا تھا۔ یہ معرکہ وساوس، خواہشات نفسانی، بدظنی، غلط افکار، جاہلی تصورات اور انسانی اخلاق کی کمزوریوں کے خلاف تھا۔ اگرچہ یہ کمزوریاں نفاق کی وجہ سے نہ ہوں بلکہ بشری کمزوریاں ہوں۔ قرآن کریم اس جماعت کو ایسی پالیسی کے ساتھ چلا رہا تھا کہ وہ قوت اور شوکت کے مقام تک پہنچ جائے۔ پھر اس کے اندر ہر قسم کی ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا ہو جائے۔ اور یہ نہایت ہی دور رس اغراض و مقاصد تھے۔ اس لئے کہ اگر کسی جماعت کے اندر زور آور لوگ بھی ہوں تو بھی اسے بے فکر نہ ہونا چاہئے۔ اگر اس کی صفوں میں کمزور لوگ موجود ہوں۔ تو جماعت کے اندر مختلف سطح کے لوگوں کے اندر مکمل تناسق اور مکمل یک جہتی کی ضرورت ہوتی ہے۔ خصوصاً جب اسے مختلف قسم کے معرکوں سے سابقہ درپیش ہو۔

اس تبصرہ کے بعد اب مناسب یہ ہے کہ ہم اس سبق کی آیات پر تفصیلی بات چیت کریں۔

---ooo---

درس ۳۶ تشریح آیات

۷۱ -- تا -- ۸۶

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوا ثُبَاتٍ أَوِ انْفِرُوا جَمِيعًا ﴿٧١﴾ وَإِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَيُبَطِّئَنَّ فَإِنْ أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَالَ قَدْ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيَّ إِذْ لَمْ أَكُنْ مَعَهُمْ شَهِيدًا ﴿٧٢﴾ وَلَئِنْ أَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِنَ اللَّهِ لَيَقُولَنَّ كَأَنْ لَمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُ مَوَدَّةٌ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ مَعَهُمْ فَأَفُوزَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴿٧٣﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۚ وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٧٤﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' مقابلہ کے لئے ہروقت تیار رہو' پھر جیسا موقع ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔ ہاں' تم میں کوئی کوئی آدمی ایسا بھی ہے جو لڑائی سے جی چراتا ہے' اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو کہتا ہے اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ گیا' اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر فضل ہو تو کہتا ہے........ اور اس طرح کہتا ہے کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا تو کوئی تعلق تھا ہی نہیں........ کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑا کام بن جاتا۔"

یہ اہل ایمان کو نصیحت ہے۔ یہ عالم بالا کی قیادت سے ان کے لئے ہدایات ہیں' جن کے اندر ان کے لئے منہاج عمل درج کیا گیا ہے۔ مستقبل کا راستہ متعین کیا گیا ہے۔ جب انسان قرآن مجید کا مطالعہ کرتا ہے' تو اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کتاب اہل ایمان کے لئے معرکہ جہاد کی عمومی اسکیم بھی تیار کرتی ہے۔ جنگ کی اسٹریٹیجی بھی قرآن میں درج کی جا رہی ہے۔ ایک دوسری آیت میں ہے۔

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا ... كُمْ مِّنَ ... كُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ان لوگوں کے ساتھ قتال کرو جو کفار میں سے تمہارے قریب ہیں۔ اور چاہئے کہ وہ تم میں سختی پائیں۔" اسلامی تحریک کے لئے یہ ایک عام منصوبہ ہے۔ اس آیت میں اہل ایمان کو کہا جاتا ہے۔

(يٰٓاَيُّهَا ... ذِيْنَ ... مَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا (۴ : ۷۱))

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' مقابلہ کے لئے ہروقت تیار رہو' پھر جیسا موقع ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔" یہ عملی اقدام کی اسکیم کا ایک حصہ ہے جسے ٹیکٹکس کہتے ہیں۔ اور سورہ انفال میں بھی بعض ایسی ہدایات دی گئی ہیں جو میدان جنگ کے بارے میں ہیں۔

(فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ) "پس اگر تم انہیں لڑائی میں پاؤ تو انہیں ایسی سزا دو کہ جو لوگ ان کے پس پشت ہیں ان کو بھاگتے دیکھ کر خود بھی بھاگ کھڑے ہوں اور شاید وہ بدعہدی کے انجام سے عبرت پکڑیں۔"

یہ ہے قرآن مجید' اس میں مسلمانوں کو صرف عبادات اور مراسم عبودیت ہی نہیں سکھائے گئے اور نہ اس میں صرف انفرادی اسلامی آداب اور اخلاق ہی سکھائے گئے ہیں۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا اس دین کے بارے میں ایسا فقیرانہ تصور ہے بلکہ یہ قرآن کریم لوگوں کی زندگی کو پورے طور پر (As a Whole) لیتا ہے۔ یہ زندگی کے عملی واقعات میں سے ہر ایک واقعہ پر اپنا فیصلہ دیتا ہے۔ اور پوری زندگی کے لئے مکمل ہدایات دیتا ہے۔ یہ کتاب ایک مسلمان فرد اور ایک مسلمان معاشرے سے' اس سے کم کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتی کہ ان کی پوری پوری زندگی اس کتاب کے مطابق بسر ہو۔ اس کتاب کے تصرف میں ہو' اس کی ہدایات کے مطابق بسر ہو۔ خصوصاً یہ کتاب کسی مسلمان فرد اور سوسائٹی کو یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنی زندگی کے لئے متعدد نظام اختیار کرلیں جن

کے اصول مختلف ہوں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ذاتی نظام ' عبادات اور اخلاق و آداب کا نظام تو وہ کتاب اللہ سے لے لیں ' اور اقتصادی ' اجتماعی ' سیاسی اور بین الاقوامی معاملات میں ہدایات کسی دوسری کتاب یا کسی انسان کے دیئے ہوئے تصورات سے اخذ کر لیں ۔ اس کتاب کے مطابق انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی فکر اور تصورات اس کتاب اور اس کے منہاج سے اخذ کرے اور اپنی زندگی کے لئے تفصیلی احکام اس کتاب سے لے کر زندگی کے واقعات پر ان کا انطباق کرے ۔ اس لئے کہ زندگی کے اندر مسلسل نئے نئے مسائل اور حالات پیش آتے رہتے ہیں اور یہ احکام وہ اس طرح مستنبط کرے جس طرح اس سبق سے پہلے سبق میں اس کی تفصیلات خود اس کتاب نے دی ہیں ۔ اس کے سوا کوئی اور راستہ اس کتاب نے کھلا نہیں چھوڑا ور نہ ' نہ ایمان ہو گا اور نہ اسلام ۔ سرے سے اسلام اور ایمان ہو گا ہی نہیں اس لئے کہ جو لوگ اس کتاب کا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کرتے وہ ایمان اور اسلام میں داخل ہی نہیں ہوتے اور گویا انہوں نے ارکان اسلام کا اعتراف ہی نہیں کیا ہے ۔ ان ارکان میں سے پہلا کلمہ شہادت (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے اور اللہ کے سوا کوئی شارع نہیں ہے ۔

یہ ہے قرآن کریم جو اس معرکے میں مسلمانوں کے لئے میدان جنگ کا منصوبہ بناتا ہے جو اس وقت ان کے موقف کے ساتھ شامل تھا ' اور جو ان کے وجود کے لئے ضروری تھا کیونکہ ان کے ارد گرد ہر طرف بے شمار مخالفتیں تھیں ' جن میں وہ گھرے ہوئے تھے ۔ اسلامی مملکت کے اندر یہودی اور منافقین مسلمانوں کے خلاف گہری سازشیں کر رہے تھے ۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ مومنین کو خبردار کرتے ہیں ۔

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا (۴ : ۷۱))

"اے لوگو ' جو ایمان لائے ہو ' مقابلے کے لئے ہروقت تیار رہو ' پھر جیسا موقعہ ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر ۔" ثبات ثبت کی جمع ہے ' یعنی مجموعہ ' حکم یہ ہے کہ جہاد کے لئے اکیلے نکلنا جائز نہیں ہے ۔ جہاد کے لئے یا تو چھوٹے چھوٹے دستوں کی شکل میں نکلو یا بڑے لشکر اور فوج کی شکل میں نکلو ' جس طرح کا معرکہ درپیش ہو ' اس لئے کہ افراد کو دشمن سہولت سے پکڑ سکتا ہے ' اور اس وقت دشمن ہر طرف پھیلا ہوا تھا ۔ اس وقت بالخصوص یہ حکم تھا ' اس لئے کہ اس دور میں دشمن اسلام کے مرکز میں پھیلے ہوئے تھے ۔ اور مدینہ میں یہودیوں اور منافقین کی صورت میں کھلے پھرتے تھے ۔

(وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا (۷۲) وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا (۷۳) (۴ : ۷۲ ـ ۷۳)) ۔

"ہاں تم میں کوئی کوئی آدمی ایسا بھی ہے جو لڑائی سے جی چراتا ہے ' اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو کہتا ہے کہ اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ گیا ' اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر فضل ہو تو کہتا ہے ...... اور اس طرح

کہتا ہے کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا تو کوئی تعلق تھا ہی نہیں..... کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا یا بڑا کام بن جاتا۔"

منظم دستوں کی شکل میں نکلو یا سب کے سب نکلو' یہ نہ ہو کہ تم میں بعض لوگ تو نکلیں اور بعض لوگ سستی کریں۔ جیسا کہ بعض لوگ سستی کر رہے ہیں' اور ہروقت تیار رہو۔ صرف خارجی دشمن کے مقابلے میں نہیں بلکہ ان اندرونی دشمنوں کے مقابلے میں بھی' ان لوگوں کے مقابلے میں بھی تیار رہو جو پہلوتہی کرتے ہیں' لڑائی سے جی چراتے ہیں اور جو شکست خوردہ ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو جہاد سے روکتے اور سستی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی جنگ سے روکتے ہیں شکست خوردہ ذہنیت کے لوگوں کی عادت بالعموم ایسی ہی ہوتی ہے۔

(لَّيُبَطِّئَنَّ) کا لفظ جو یہاں استعمال ہوا ہے اس کے اندر ایک قسم کا بھاری پن اور پھسلن پائی جاتی ہے۔ اس کے حروف کی ادائیگی اور صوتی حرکت کے اندر بھی ایک قسم کی پھسلن پائی جاتی ہے۔ اور جب زبان اس کے آخری اور مشدد حرف کو ادا کرتی ہے تو اس میں بھی کھچاؤ ہے۔ ایک لفظ کے ساتھ اس پوری نفسیاتی کشمکش کو ادا کر دیا گیا جو ایسے لوگوں کے ذہن میں ہوتی تھی اور خود لفظ جو اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے استعمال کیا گیا ہے پوری کشمکش اپنے اندر رکھتا ہے۔ جس طرح مفہوم بھاری ہے اس طرح لفظ بھی بھاری استعمال کیا گیا ہے اور یہ وہ کمال درجے کا اسلوب ادا ہے جو صرف قرآن کا خاصہ ہے۔ ((دیکھئے التصویر الفنی فی القرآن' فصل تناسق)) اس لفظ کے بعد پھر (وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ (۴: ۷۲)) کے پورے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح سست روی کا شکار ہیں' یہ لوگ معدودے چند ہیں اور ان کو اس پہلوتہی پر پوری طرح اصرار ہے۔ وہ اس میں سخت کوشاں ہیں اور یہ بات ان تاکیدی حروف سے معلوم ہوتی ہے جو اس فقرے میں استعمال ہوئے ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گروہ اپنے رویے پر مصر ہے اور اسلامی محاذ پر اس کا اثر پڑ رہا ہے اور بہت برا اثر ہو رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ان کے بارے میں تفصیلی وضاحتیں کرتا ہے۔ ان کے دلوں کے اندر پوشیدہ رازوں کا انکشاف کرتا ہے۔ ان کی قابل نفرت حقیقت کی خوب تصویر کشی کرتا ہے اور یہ قرآن کریم کا عجیب معجزانہ انداز ہے۔

یہ لو' یہ لوگ تمہارے سامنے ہیں' اپنے پورے ارادوں کے ساتھ' اپنے مکمل مزاج اور اپنے اقوال و افعال کے ساتھ' بالکل سامنے' آنکھوں کے سامنے بالکل ننگے کھڑے ہیں۔ گویا انہیں مائیکرواسکوپ کے نیچے کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اور یہ اندرونی مائیکرواسکوپ ان کے دلی رازوں کا انشا کر رہا ہے اور ان کے تمام اغراض و مقاصد اس سے واضح ہو رہے ہیں۔

دیکھو یہ لوگ ہیں' جو عہد رسول اللہ ؐ میں نظر آتے ہیں اور آپ کے عہد کے بعد ہر زمان و مکان میں یہ قسم یوں ہی باقی رہے گی۔ یہ کیا ہیں؟ کمزور' منافق اور آئے دن بدلنے والے' جن کے مقاصد نہایت ہی چھوٹے ہیں' نہایت پیش پا افتادہ' جو اپنے ذاتی مفادات اور شخصی فائدے سے اعلیٰ کسی اور فائدے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ اپنی شخصیت سے اونچے افق کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے' یہ لوگ پوری دنیا کو ایک ہی محور کے گرد گھماتے ہیں اور یہ محور ان کی ذات اور ذاتی مفادات کا محور ہے' اسے وہ کبھی نہیں بھولتے۔

یہ لوگ سست اور ڈھیلے ہیں اور آگے بڑھنے والے نہیں ہیں کہ اپنے اصل مقام پر جا کھڑے ہوں' اور نفع و نقصان

کے بارے میں ان کا جو تصور ہے وہ گھٹیا درجے کے منافقین کے لائق ہے ۔

یہ لوگ معرکہ جہاد سے پیچھے رہنے والے ہیں' اگر مجاہدین پر مصیبتیں آ جائیں اور وہ مبتلائے مشکلات ہو جائیں جس طرح اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے تو یہ پسماندہ لوگ بہت ہی خوش ہوتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ جہاد سے ان کا فرار اور مشکلات سے ان کا بچ نکلنا ان کے لئے مفید ہے ۔

(فَاِنْ اَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیَّ اِذْ لَمْ اَکُنْ مَّعَھُمْ شَھِیْدًا (۴ : ۷۲)) (اگر تم پر کوئی مصیبت آ جائے تو کہتا ہے اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ گیا)

ایسے لوگوں کو اس بات سے شرم نہیں آتی کہ وہ بزدلی کی اس زندگی کو اللہ کی نعمت تصور کرتے ہیں اور پھر وہ اسے اس اللہ کا فضل کہتے ہیں جس کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہ لوگ پیچھے بیٹھ گئے ہیں ۔ ایسے حالات میں اگر کوئی بچ بھی نکلے تو وہ کبھی نعمت خداوندی نہیں پا سکتا کیونکہ اللہ کی نعمت اللہ کے حکم کی خلاف ورزیاں کر کے نہیں ملتی اگرچہ بظاہر وہ صاحب نجات نظر آئیں ۔

یہ بے شک ایک نعمت ہو گی مگر ان لوگوں کے نزدیک جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ نہیں کرتے ۔ یہ ان لوگوں کے نزدیک بچنا ہے جو یہ نہیں سمجھتے کہ ان کا مقصد تخلیق کیا ہے ؟ اور وہ اطاعت کر کے اور جہاد کر کے اللہ کی غلامی نہیں کرتے تاکہ وہ اسلامی نظام حیات کو دنیا میں قائم کریں ۔ یہ ان لوگوں کے نزدیک نعمت ہے جن کی نظریں اپنے قدموں کے آگے بلند آفاق پر نہیں پڑ سکتیں ۔ یہ چیونٹیوں کی طرح کے لوگ ہیں' یہ نجات ان لوگوں کے نزدیک نعمت ہے جو اس بات کا احساس نہیں رکھتے کہ اللہ کے راستے میں جہاد کی مشکلات برداشت کرنا اسلامی نظام کے قیام کے لئے اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ہے ۔ یہ اللہ کا فضل ہے اور یہ اللہ کا خصوصی انتخاب ہے جس کے ذریعے وہ جسے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے منتخب کر لیتا ہے تاکہ وہ دنیا کی اس زندگی میں بشری کمزوریوں پر قابو پائیں ۔ اس طرح وہ انہیں دنیا کی قید سے رہائی دلاتا ہے ۔ وہ ایک برگزیدہ زندگی پر فائز ہو جاتے ہیں' وہ زندگی کے مالک ہو جاتے ہیں اور زندگی ان کی مالک نہیں ہوتی ۔ تاکہ یہ آزادی اور یہ سربلندی ان کو ان بلندیوں تک لے جائے جو آخرت میں شہداء کے لئے مقرر ہیں ۔ بے شک سب لوگ مرتے ہیں لیکن اللہ کی راہ میں جان دینے والے ہی شہید ہوتے ہیں اور یہ اللہ کا فضل عظیم ہے ۔

اگر صورت حال دوسری پیش آجائے اور مجاہدین کامیاب ہو جائیں' وہ جو یہ تیاری کر کے نکلے تھے کہ اللہ کی راہ میں انہیں جو پیش آتا ہے' آئے اور انہیں اللہ کا فضل نصیب ہو جائے' فتح اور غنیمت کی صورت میں تو یہ پیچھے رہنے والے لوگ سخت نادم ہوتے ہیں کہ وہ کیوں نہ اس نفع بخش معرکے میں شریک ہوئے ۔ اس فائدے میں ان کے نزدیک نہایت ہی گھٹیا معیار ہوتا ہے' خالص دنیاوی معیار ۔

(وَلَئِنْ اَصَابَکُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰہِ لَیَقُوْلَنَّ کَاَنْ لَّمْ تَکُنْ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَہٗ مَوَدَّۃٌ یّٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَھُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا (۴ : ۷۳))

(اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر فضل ہو تو کہتا ہے .... اور اس طرح کہتا ہے کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا کوئی تعلق تھا ہی نہیں .... کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑا کام بن جاتا۔)

یہ نہایت ہی گھٹیا خواہش ہے محض مال غنیمت کی خواہش ' اور اسے یہ شخص فوز عظیم سے تعبیر کرتا ہے ۔ مومن بھی مال غنیمت کے ساتھ واپسی کو برا تو نہیں سمجھتا بلکہ اس سے توقع تو یہی ہے کہ وہ بھی اللہ سے ایسی کامیابی مانگے ۔ اور مومن سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ مشکلات کی طلب کرے بلکہ مطلوب تو یہ ہے کہ وہ عافیت کی دعا کرے ۔ مومن کا مجموعی تصور ان متخلفین کے تصور سے بالکل جدا ہوتا ہے ۔ اس لئے ان لوگوں کے تصور کو قرآن کریم نہایت ہی مکروہ صورت میں پیش کرتا ہے جو قابل نفرت ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ مومن بھی مشکلات اور مصائب کی تمنا نہیں کرتا بلکہ عافیت کا طلبگار ہوتا ہے لیکن اسے جب جہاد کی طرف بلایا جائے تو وہ بوجھل قدموں کے ساتھ آگے نہیں بڑھتا۔ جب وہ نکلتا ہے تو وہ دو اچھے انجاموں میں سے ایک کا طالب ہوتا ہے یا نصرت و کامرانی کا یا شہادت فی سبیل اللہ کا اور یہ دونوں ہی اللہ کے فضل میں سے ہیں اور دونوں ہی فوز عظیم ہیں ۔ اہل ایمان کی قسمت میں یا تو شہادت آجاتی ہے تو پھر بھی وہ راضی برضا ہوتے ہیں اور اس گروہ میں جاتے ہیں جو شہادت کے مقام پر فائز ہوا۔ یا وہ زندہ مال غنیمت کے ساتھ واپس آتا ہے تو اس صورت میں وہ اللہ کے فضل پر شکر گزار ہوتا ہے اور اس کی جانب سے آئی ہوئی فتح پر خوش ہوتا ہے مگر یہ خوشی محض زندہ بچ جانے کی وجہ سے نہیں ہوتی ۔

یہ ہے وہ اعلیٰ افق جس کے بارے میں اللہ کا ارادہ ہے کہ اہل ایمان اپنی نظریں اس پر رکھیں ۔ اللہ تعالیٰ ان اہل ایمان میں سے اس فریق کی تصویر ان کے سامنے کھینچتے ہیں اور یہ انکشاف فرماتے ہیں کہ تمہاری صفوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو جہاد سے پہلوتہی کرنے والے ہیں اور یہ انکشاف اس لئے کیا جاتا ہے کہ اہل ایمان ان سے چوکنے رہیں جس طرح وہ ظاہری دشمنوں سے چوکنے رہتے ہیں ۔

اس طرح متنبہ کرنے اور اس دور میں جماعت مسلمہ کو مواقع عبرت فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن کریم ایک ایسے انسانی ماڈل کا ایک عام نمونہ یہاں منقش کرتا ہے ' جو ہر دور اور ہر جگہ بار بار سامنے آتا رہتا ہے اور یہ تصویر کشی قرآن مجید چند الفاظ کے اندر کرتا ہے ۔

یہ حقیقت جماعت مسلمہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے اس لئے کہ اسلامی حلقوں کے اندر ہمیشہ ایسے لوگ پائے جا سکتے ہیں ۔ جماعت کو ایسے لوگوں کی حرکات سے مایوس نہیں ہونا چاہئے بلکہ اپنی تیاری کو ہر حال میں مکمل رکھنا اور آگے بڑھنا چاہئے ۔ ہر وقت تربیت ہدایت اور جہد مسلسل کے لئے تیار رہنا چاہئے تاکہ جماعت تمام نقائص سے پاک ہو۔ اپنی کمزوریوں کا مداوا ہر وقت ہوتا رہے اور جماعت کے عملی اقدامات ' اس کے نظریات اور اس کی تمام حرکات کے درمیان باہم ربط ہو۔

---ooo---

اب اگلی آیت میں یہ سعی کی جاتی ہے کہ یہ سست رو ' پہلوتہی کرنے والوں اور دنیاوی گندگیوں میں آلودہ لوگوں کو قدرے اٹھایا جائے اور ان کے حس و شعور میں اس دنیا سے آگے آخرت کا شعور پیدا کیا جائے ۔ ان کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ دنیا کو فروخت کر کے آخرت کو خریدنے والے بنیں ' اور اس کام میں انہیں دو اچھے انجاموں میں سے ایک

ضرور نصیب ہو گا یا تو فتح و نصرت سے ہمکنار ہوں گے یا شہادت ان کو نصیب ہو گی۔

(فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ اَجْرًا عَظِيمًا (٤ : ٧٤))

"(ایسے لوگوں کو معلوم ہو کہ) اللہ کی راہ میں لڑنا چاہئے ان لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو فروخت کر دیں' پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اسے ضرور ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔"

اس لئے مومنین کو اللہ کی راہ میں لڑنا چاہئے' اسلام ماسوائے اس کے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کی جائے' کسی اور جنگ کا قائل ہی نہیں ہے۔ اس لئے جنگ نہ کی جائے کہ مصنوعات کے لئے خام مال فراہم کیا جائے' نہ اسلام غنیمت کے لئے جنگ کی اجازت دیتا ہے' نہ اقتدار کے حصول کے لئے اجازت دیتا ہے' نہ وہ ذاتی اور قومی برتری کے لئے جنگ کی اجازت دیتا ہے' نہ ملکوں کو فتح کرنے کے لئے جنگ کی اجازت دیتا ہے' نہ لوگوں کو غلام بنانے کے لئے اجازت دیتا ہے' اور نہ اسلام' کسی ایسی جنگ کی اجازت دیتا ہے جو منڈیوں کے حصول کے لئے لڑی جائے' اور نہ اسلام کی جنگ اس بات کے لئے ہے کہ نو آبادیاتی علاقوں میں سرمایہ لگاکر مفادات حاصل کئے جائیں۔

اسلام ذاتی برتری کے لئے جنگ کی اجازت نہیں دیتا اور نہ کسی خاندان کی برتری کے لئے جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ نہ کسی طبقے اور کسی حکومت کی برتری کے لئے اسلام جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ نہ کسی قوم اور نہ کسی نسل کی برتری کے لئے اسلام لڑتا ہے۔ اسلام صرف اللہ کی راہ میں جنگ کی اجازت دیتا ہے' اور زمین پر اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے اسلام جنگ کی اجازت دیتا ہے اور یہ اس لئے کہ اس کرۂ ارض پر تمام انسانوں کی زندگی کو اللہ کا نظام کنٹرول کرے۔ انسانیت اس نظام کی برکات سے لطف اندوز ہو اور یہ نظام تمام انسانوں کے درمیان بے قید عدل و انصاف جاری کرے لیکن اس نظام کے تحت ہر شخص کو عقیدے اور نظریے کی مکمل آزادی ہو۔ یوں اس ربانی' انسانی اور عالمی نظام حیات کے تحت لوگ زندہ رہیں۔

جب ایک مسلمان اللہ کے راستے میں لڑنے کے لئے نکلتا ہے' اور یہ لڑائی وہ صرف اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے کرتا ہے اور زندگی میں اسلامی نظام حیات کی حکمرانی کے لئے لڑتا ہے اور پھر وہ قتل ہو جاتا ہے تو وہ شہید ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے نزدیک مقام شہداء پر فائز ہوتا ہے۔ اور اگر وہ اس مقصد کے سوا کسی اور مقصد کی خاطر لڑتا ہے تو وہ کسی صورت میں بھی شہید نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے لئے کوئی اجر اور صلہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا صلہ ان مقاصد کے زعماء کے پاس ہوتا ہے۔ جو لوگ ایسے لوگوں کو شہداء کہتے ہیں وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو اس چیز کے ساتھ تقدس دیتے ہیں جس کی ساتھ اللہ کسی کو مقدس نہیں بناتا۔ یہ اللہ پر ایک افتراء کے سوا کچھ نہیں ہے۔

لہذا اللہ کے راستے میں صرف اس ایک مقصد کے لئے لڑنا جائز ہے۔ اور یہ لڑائی وہ لوگ کرتے ہیں جو دنیا فروخت کر کے آخرت خریدتے ہیں اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم انتظار میں ہے۔ دونوں حالتوں میں ان پر فضل ہے۔ اگر وہ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں تو بھی فضل ہے اور اگر وہ اللہ کی راہ میں غالب ہو جائیں تو بھی اللہ کا فضل ہے۔

(وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (۴: ۷۴))

"پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اسے ضرور ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔"

اس طرح قرآنی نظام حیات ان نفوس قدسیہ کو بلند کرتا ہے اور وہ دونوں حالتوں میں اللہ کے عظیم فضل کے امیدوار ہو جاتے ہیں۔ ان پر اللہ کی راہ میں موت اور جان دینا آسان ہو جاتا ہے۔ وہ اس دنیا کے مال غنیمت کے حصول کی امید سے بھی بالا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ پوری کی پوری زندگی اور مال غنیمت کے بڑے بڑے ڈھیر بھی اللہ کے فضل عظیم کے مقابلے میں کچھ نہیں ہیں۔ اسی طرح یہ مختصر ٹچ' انسان کے دلوں میں اس سودے کے خلاف نفرت پیدا کر دیتا ہے جس میں کوئی شخص آخرت کے مقابلے میں دنیا کو خریدتا ہے۔ لفظ یشرون متضاد الفاظ میں سے ہے جو خرید کے معنی میں بھی آتا ہے اور فروخت کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن زیادہ تر یہ فروخت کے معنی میں آتا ہے' تو یہ سودا نہایت ہی خسارے کا ہو گا چاہے انہیں دنیا میں مال غنیمت ملے یا نہ ملے اس لئے کہ دنیا کا آخرت سے کیا مقابلہ ہے اور مال غنیمت کے حقیر مال کا اللہ کے فضل عظیم کے ساتھ کیا مقابلہ ہے۔ اللہ کے فضل میں مال بھی شامل ہے اور مال کے علاوہ دوسرے اکرام اور انعام بھی شامل ہیں۔

اب روئے سخن مسلمانوں کی طرف پھر جاتا ہے۔ جنگ سے پہلوتہی کرنے والوں اور جی چرانے والوں کی تصویر کشی کے انداز کو اب چھوڑ کر مسلمانوں سے خطاب کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی مروت اور جوانمردی کو ابھارا جاتا ہے۔ ان کے دلوں کے اندر احساس فرض پیدا کیا جاتا ہے۔ اس دنیا اور جزیرۃ العرب میں زیر دست لوگوں کے حالات پر غور کرو۔ مرد' عورتیں اور بچے جو مکہ مکرمہ میں مشرکین کے ہاتھوں مظالم سہ رہے ہیں اور ان کے اندر اس قدر قوت بھی نہیں ہے کہ وہ دارالاسلام کی طرف ہجرت کر آئیں اور فرار اختیار کر کے اپنے دین اور نظریات کو بچالیں۔ وہ آزادی کی آس لئے ہوئے ہیں اور ہر وقت دست بدعاء رہتے ہیں کہ اے پروردگار ہمیں اس گاؤں سے نکال جہاں کے رہنے والے ظالم ہیں۔ اس صورت حال کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کر کے انہیں بتاتا ہے کہ تمہاری جنگ بلند مقاصد کے لئے ہے۔ تمہارے اہداف بلند ہیں' اور یہ جنگ جس کے لئے تمہیں نکلنے کا حکم دیا جارہا ہے اس کے مقاصد نہایت ہی اونچے مقاصد ہیں۔ اس لئے انہیں اس کی طرف بوجھل قدموں سے نہ نکلنا چاہئے۔ یہ پکار نہایت ہی تاکیدی اور برانگیختہ کرنے کے انداز میں ہے۔ اور سستی اور پیچھے رہنے کو بہت ہی برا سمجھا گیا ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝

"آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں' عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پاکر دبالئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔"

قتال فی سبیل اللہ میں سستی کرنے کا تمہارے لئے کیا موقعہ ہے جبکہ ان مجبور اور ضعیف مردوں' عورتوں اور بچوں کا آزاد کرانا تمہارے فرائض میں سے ہے۔ یہ لوگ جو قابل رحم حالت میں ہیں اور جن کی تصویر کشی قرآن کریم نہایت ہی اثر آفریں الفاظ میں کرتا ہے جس پر مسلمانوں کی حمیت جوش میں آتی ہے۔ مسلمانوں کی عزت نفس جوش میں آتی ہے اور انسانی رحم اور ہمدردی کے جذبات جاگ اٹھتے ہیں' اس لئے کہ یہ لوگ شدید سے شدید تر مظالم کے شکار ہو رہے ہیں۔ اس لئے بھی کہ ان پر یہ مظالم محض ان کے نظریات کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ ان کے دین کی وجہ سے انہیں مبتلائے مصیبت کیا جارہا ہے۔ اس کے سوا ان کا اور کوئی جرم نہیں ہے۔ غرض نظریات اور دین کی وجہ سے جو مصائب آتے ہیں وہ جان و مال کی وجہ سے آنے والے مصائب سے زیادہ شدید اور سخت ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ مصائب انسان پر انسانی خصوصیات کی وجہ سے آتے ہیں۔ اور انسان کی عزت نفس' اس کی عزت اور اس کے حق ملکیت وغیرہ کے حوالے سے مصائب کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔

ایسی عورت کی تصویر جو ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو' ایسے بچوں کے مناظر جو نحیف و ناتواں ہوں' ایک ایسا منظر ہے جو جذبات کے اندر تلاطم پیدا کر دیتا ہے' خصوصاً وہ ضعیف لوگ اور بوڑھے جو اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے اور خصوصاً ایسے حالات میں جب اس دفاع کا تعلق دین اور عقیدے سے ہو۔ یہ منظر ایسے وقت میں دکھایا جاتا ہے جس میں جہاد کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے حالات میں جہاد کے لئے نہ اٹھنا نہایت ہی مکروہ فعل ہو گا' جبکہ مظلوموں کی یہ چیخ و پکار سنی جا رہی ہو۔ یہ ایک ایسا اسلوب بیان ہے جو دلوں کو پگھلا دیتا ہے اور انسانی شعور اور احساس کے اندر گہرائی تک اتر جاتا ہے۔

لہذا ایک نظر اس پہلو پر بھی ڈالیں کہ اسلامی تصور کے مطابق ملک و وطن کی حیثیت کیا ہے۔ یہاں ملک اور بلدہ کی تعریف یوں کی جاتی ہے۔ (الظَّالِمِ اَهْلُهَا) جس کے لوگ ظالم ہیں' یہ اسلام کے نزدیک دارالحرب ہے۔ اور مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس ملک کے ساتھ کمزور مسلمانوں اور ان کے بیوی بچوں کو چھڑانے کے لئے جنگ کریں۔ اور یہ وطن مکہ ہے جو مہاجرین کا اصلی وطن تھا اور ان مہاجرین کو پرجوش دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اس ملک کے خلاف جنگ کریں اور ضعیف مسلمانوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ موقعہ پاتے ہی اس ظالم ملک سے نکل آئیں۔

یہاں اس علاقے اور ملک کا مہاجرین کا وطن اصلی ہونا کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور اس وجہ سے اسلامی نقطہ نظر سے اس کی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی' جب کہ اس میں اللہ کی شریعت بھی نافذ نہیں ہے۔ وہ اسلامی نظام حیات کے تحت نہیں ہے جس میں مومنین کو ان کے ایمان کی وجہ سے فتنوں اور مصیبتوں میں ڈالا جاتا ہے اور ان پر محض ان کے عقیدے کی وجہ سے مظالم ڈھائے جاتے ہیں بلکہ خود ان اصلی باشندوں کے نقطہ نظر سے یہ ملک دارالحرب بن گیا ہے۔ وہ اپنے اس اصل وطن کی مدافعت نہیں کرتے بلکہ یہ لوگ خود اپنے اصل ملک کے خلاف اس لئے جنگ کرتے ہیں کہ وہاں سے اپنے مومن بھائیوں کو نکال لیں۔ غرض مسلمان کا جھنڈا وہ ہوتا ہے جو اس کے عقیدے کا جھنڈا ہوتا ہے اور ایک مسلمان صرف ایک جھنڈے کی حمایت کرتا ہے۔ اس کا وطن جس کے لئے وہ لڑتا ہے وہ وطن ہے جس میں اسلامی نظام

تربیت نافذ ہو' اور اس کی وہ سرزمیں جس کا وہ دفاع کرے گا وہ سرزمین ہے جو دارالاسلام ہے اور جس میں اسلامی شریعت اور اسلامی نظام جاری و ساری ہو۔ اس کے علاوہ کسی وطن کے بارے میں جس قدر تصورات ہیں وہ غیراسلامی اور جاہلی تصورات میں اور اسلام ان تصورات کو ہرگز نہیں پہچانتا۔

اب ایک دو سرانچ اس موضوع کو دیا جاتا ہے' ہمتوں کو تازہ کرنے کا ایک اور موقع ہے' عزائم میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک نئ راہ میں روشنی کے قمقمے چمک اٹھتے ہیں۔ مقاصد' مفادات اور اقدار حیات کی ایک نئ تعریف (Definition) سامنے آتی ہے۔ ہرایک گروہ اپنی اقدار کے لئے کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿۷۶﴾

"جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے' وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے' وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں' پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں۔" اچانک تمام انسان ایک دوراہے پر آکھڑے ہوتے ہیں' اہداف و مقاصد متعین ہو جاتے ہیں' خطوط واضح ہو جاتے ہیں اور لوگ دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں' دو ممتاز جھنڈوں کے نیچے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

(اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۴ : ۷۶)) "جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے' وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔" اور (وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ (۴ : ۷۶)) "اور جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے' وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔"

اہل ایمان کی صف آرائی اللہ کی راہ میں ہے اور وہ اللہ کا نظام حیات نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اللہ کی شریعت کا نفاذ چاہتے ہیں' وہ اللہ کے نام پر لوگوں کے درمیان قیام عدل چاہتے ہیں' وہ اللہ کے سوا کسی اور نام اور عنوان سے بات نہیں کرتے۔ وہ اس بات کا اعتراف کر چکے ہوتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی اور الہ نہیں ہے اس لئے وہی حاکم ہے۔

اور اہل کفر طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں' یہ مختلف قسم کے طاغوتی نظامہائے زندگی کے دلدادہ ہیں۔ اور یہ تمام طاغوتی نظام خدائی نظام زندگی کے متضاد ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ایسا قانونی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جو شریعت کے خلاف ہو۔ وہ ایسی اقدار کو رائج کرنا چاہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے جائز نہ ہوں۔ وہ ایسے پیمانوں سے اقدار حیات کو ناپتے ہیں جو اللہ کی میزان میں کوئی وزن نہیں پاتے۔

وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں وہ اللہ کی حمایت اور رعایت اور نگہبانی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ طاغوت سے مدد لیتے ہیں۔ ان کا مددگار شیطان ہوتا ہے اور شیطان کے جھنڈے مختلف ہوتے ہیں' طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ قوانین مختلف ہوتے ہیں' اقدار اور پیمانے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ سب لوگ شیطان کے ساتھی

ہوتے ہیں۔

(فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا (٤ : ٧٦)) ''پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں۔''

یوں مسلمانوں کا موقف ایک پختہ جگہ پر ہوتا ہے اور ان کا تکیہ بھی مضبوط ہوتا ہے۔ وہ مضبوط اساس پر کھڑے ہوتے ہیں اور ایک مضبوط سہارا لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا وجدان اور شعور پختہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں لڑ رہے ہیں۔ وہ صرف اللہ کی جنگ ہے اور اس میں ان کی ذات کا کوئی حصہ بھی نہیں ہے۔ نہ اس میں ان کا کوئی ذاتی مفاد مضمر ہے۔ نہ اس میں ان کی قوم' ان کی نسل' ان کے رشتہ داروں اور ان کے خاندان کا کوئی مفاد ہے۔ یہ صرف اللہ کے لئے ہے' اس کے نظام کے لئے ہے اور اس کی شریعت کے لئے ہے۔ پھر ان کا یہ شعور بھی پختہ ہوتا ہے کہ ان کا مقابلہ اہل باطل سے ہے' اور ان کے مقابل باطل کو حق پر غالب کرنا چاہتے ہیں' اس لئے کہ وہ انسانوں کے جاہلی معاشروں کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اور یہ کہ تمام انسانی نظام جاہلی نظام ہوتے ہیں۔ صرف اللہ کی شریعت برحق نظام ہے۔ جبکہ وہ شریعت کو مغلوب کر کے انسانی قانونی نظام رائج کرتے ہیں اور انسانی قانون کے مطابق فیصلے کرانا چاہتے ہیں۔ ہر وہ فیصلہ ظلم ہے جو انسانی قانون کے مطابق ہو۔ یہ اللہ کے قانون کے ساتھ ظلم ہے' کیونکہ اللہ کا حکم تو یہ ہے کہ فیصلے اس کی شریعت کے مطابق ہوں۔

یہ اہل ایمان جب میدان جنگ میں اترتے ہیں تو اس یقین کے ساتھ اترتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کا ساتھی اور مددگار رہے۔ وہ یہ شعور رکھتے ہیں کہ وہ ایک ایسی قوت سے لڑنے جا رہے ہیں جس کا مددگار شیطان ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ شیطان کی تمام چالیں بمقابلہ رحمان ضعیف ہوتی ہیں۔

یہاں آکر ایک مومن کے احساس اور شعور میں اس معرکے کا فیصلہ ہو جاتا ہے اور اس کا انجام متعین ہو جاتا ہے تو اس کے بعد ایک مومن اس معرکے میں قدم رکھتا ہے۔ اب اگر مومن اس معرکے میں شہید ہو جاتا ہے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ اچھا رہے گا اور اگر وہ نصرت پاتا ہے اور اس معرکے میں اسے غلبہ نصیب ہوتا ہے تو اسے پختہ یقین ہوتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ اجر عظیم سے نوازے گا۔

اس مسئلے کے اس حقیقی فہم و ادراک ہی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام کی جماعت کے ہاتھوں وہ معجزات سرزد ہوئے جو اسلامی تاریخ کا حصہ ہیں اور صحابہ کرام کے بعد بھی مختلف نسلوں میں جابجا اس کے نمونے نظر آتے ہیں۔ یہاں اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم ان کے کچھ نمونے پیش کریں' کیونکہ یہ تو بہت ہی مشہور ہیں۔ یہی تصور تھا جس کے نتیجے میں اسلام کو وہ حیران کن پھیلاؤ نصیب ہوا' اور یہ پھیلاؤ تاریخ کے مختصر ترین عرصے کے اندر واقعہ ہوا۔ یہ تصور اس برتری کا ایک پہلو تھا' جو اسلامی نظام حیات کی وجہ سے امت مسلمہ کو نصیب ہوئی اور یہ برتری اسے اس وقت کے برسرپیکار دونوں بلاکوں کے مقابلے میں نصیب ہوئی اور اس برتری کی طرف ہم اس سے قبل اشارہ کر چکے ہیں۔ اس تصور اور ادراک کی نشوونما اس مہم کا ایک حصہ تھا جو قرآن کریم کے پیش نظر تھی۔ یہ مہم اہل ایمان کی نفسیاتی دنیا میں بھی جاری تھی اور ان دشمنوں کے ساتھ میدان جنگ میں بھی جاری تھی' جس میں اہل ایمان' اپنے مقابلے میں آنے والی فوجوں کی

تعداد اور سازوسامان کے حوالے سے بہت ہی زیادہ قوت کے ساتھ بر سرپیکار تھے۔ دشمن کو اس عظیم تعداد اور سازوسامان کے باوجود شکست ہوئی۔ اس لئے کہ وہ تصور حیات کے لحاظ سے تہی دامن تھا۔

ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ قرآن کریم نے اس تصور کی نشوونما اور اس کی پختگی کے لئے کس قدر جدوجہد کی۔ یہ کام کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ صرف ایک بات نہ تھی جو زبانی طور پر کہہ دی جاتی۔ یہ تو جہد مسلسل تھی۔ اس میں انسان کی ذاتی تنگ دلی، ہرقیمت پر زندہ رہنے کی حرص اور نفع و نقصان کے بارے میں غلط تصورات کے خلاف مسلسل جدوجہد کی گئی۔ اس سبق میں اس جہد مسلسل کے کچھ نمونے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

---ooo---

اس کے بعد سیاق کلام میں، مسلمانوں کے کئی طبقات کے طرز عمل پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے۔ (کہا گیا ہے کہ ان میں سے بعض لوگ مہاجرین تھے) یہ لوگ جب مکہ میں تھے تو وہ کفار کے مقابلے کے لئے اپنے اندر جوش و خروش رکھتے تھے، اس لئے کہ مکہ میں ان پر ناقابل برداشت مظالم ہو رہے تھے۔ اس جوش و خروش کے نتیجے میں وہ مکہ میں جہاد و قتال کی اجازت چاہتے تھے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجازت نہ تھی۔ لیکن جب مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی اور ان پر جہاد و قتال من جانب اللہ فرض ہو گیا اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم تھا کہ اب ان کے لئے جہاد و قتال میں نہایت خیروبرکت ہے تو اب ان کی تصویر کشی قرآن نے ان الفاظ میں کی "تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ تھا کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا کہ خدا سے ڈرنا چاہئے یا کچھ اس سے بڑھ کر، کہتے ہیں خدایا یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی؟" اور یہ لوگ وہ تھے کہ اگر ان کو کوئی بھلائی نصیب ہوتی تو کہتے یہ اللہ کی جانب سے ہے اور اگر کوئی مصیبت درپیش ہوتی تو رسول اللہ ؐ سے کہتے کہ یہ آپ کی جانب سے ہے۔ اور ان میں سے ایسے بھی تھے کہ جب رسول اللہ کے سامنے ہوتے تو جی ہاں کہتے، لیکن جب آپ سے علیحدہ ہوتے تو یہ لوگ اپنی مجلسوں میں کچھ اور باتیں کرتے۔ اور بعض ایسے تھے کہ اگر کوئی اطمینان بخش یا خوفناک بات سنتے تو اسے فوراً پھیلا دیتے۔

قرآن کریم ایسے لوگوں کے طرز عمل پر تعجب کا اظہار کرتا ہے اور یہ قرآن کریم کا اپنا مخصوص اسلوب اظہار ہے، جس کے اندر انسان کی لطیف نفسیات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان اندرونی نفسیات کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ گویا چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ ایسے لوگوں کی سوچ میں موت و حیات، قضا و قدر، خیروشر، نفع و ضرر، فائدے اور خسارے، اقدار و پیمانوں کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں جو غلطی اور کجی تھی اسے درست کیا گیا۔ اور قرآن کے مخصوص اور نہایت ہی موثر اور اشاراتی انداز اور اسلوب میں اسے بیان کیا گیا۔ ذرا ملاحظہ ہو۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ

وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا

فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوا
رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۗ قُلْ
مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۚ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿٧٧﴾
أَيْنَ مَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۗ
وَإِن تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِ اللَّهِ ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ
سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِكَ ۚ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۖ فَمَالِ هَٰؤُلَاءِ
الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا ﴿٧٨﴾ مَّا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ
اللَّهِ ۖ وَمَا أَصَابَكَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفْسِكَ ۚ وَأَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ
رَسُولًا ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ﴿٧٩﴾ مَّن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ
اللَّهَ ۖ وَمَن تَوَلَّىٰ فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ﴿٨٠﴾ وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا
بَرَزُوا مِنْ عِندِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۖ وَاللَّهُ يَكْتُبُ
مَا يُبَيِّتُونَ ۖ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿٨١﴾
أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ
اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴿٨٢﴾ وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا

بِهٖ ۭ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٨٣﴾

تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟ اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہئے یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر۔ کہتے ہیں خدایا' یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی؟ ان سے کہو' دنیا کا سرمایہ زندگی تھوڑا ہے' اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لئے زیادہ بہتر ہے' اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر بھی نہ کیا جائے گا۔ رہی موت' تو جہاں بھی تم ہو وہ بہرحال تمہیں آکر رہے گی خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو۔ اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے' اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ اے نبی' یہ آپ کی بدولت ہے۔ کہو' سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اے انسان' تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے' اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب و عمل کی بدولت ہے۔

اے محمدؐ ہم نے تم کو لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی۔ اور جو منہ موڑ گیا' تو بہرحال ہم نے تمہیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔

وہ منہ پر کہتے ہیں کہ ہم مطیع فرمان ہیں مگر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ راتوں کو جمع ہو کر تمہاری باتوں کے خلاف مشورے کرتا ہے۔ اللہ ان کی یہ ساری سرگوشیاں لکھ رہا ہے۔ تم ان کی پروانہ کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو' وہی بھروسہ کے لئے کافی ہے۔ کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔

یہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش یا خوفناک خبر سن پاتے ہیں اسے لے کر پھیلا دیتے ہیں' حالانکہ اگر یہ اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں۔ تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو (تمہاری کمزوریاں ایسی تھیں کہ) معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے۔"

آیات کے ان چار پیروں میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں نشاندہی کی گئی ہے اور ممکن ہے کہ یہ وہی لوگ ہوں جن کے بارے میں اس سبق کے سابقہ پیراگراف میں یہ کہا گیا تھا۔ (وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ (۴: ۷۲)) اور یہ لوگ منافق تھے' اور ممکن ہے کہ یہ تمام ریمارکس ان منافقین کے بارے میں ہوں' جن سے یہ افعال سرزد ہوتے تھے اور وہ

ایسی باتیں بھی کیا کرتے تھے۔

ہم اسی تفسیر کو ترجیح دیتے ہیں' اس لئے کہ ان آیات میں جن لوگوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان میں نفاق کے خدوخال زیادہ نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں کی صفوں میں منافق موجود تھے اور ایسے افعال اور اس قسم کے اقوال صرف منافقین ہی سے صادر ہونا قریب الفہم ہے جو ان کے مزاج اور سابقہ کردار کے مطابق ہے۔ اگرچہ ان پیراگرافوں کے انداز بیان باہم دگر گڈمڈ ہے..... تاہم ان میں سے پہلا پیراگراف جس میں کہا گیا ہے۔ (قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ (۴: ۷۷)) ہمیں تردد میں ڈال دیتا ہے کہ آیا یہ تمام پیراگراف صرف منافقین کے بارے میں ہیں۔ اگرچہ منافقین کے اندر بھی یہ صفات موجود تھیں اور اس کے باوجود کہ یہ آیات دوسری آیات سے ملی جلی ہیں اور طرز ادا بھی ایک ہی نظر آتا ہے۔ تاہم میرا میلان اس طرف ہے کہ یہ پیراگراف مہاجرین کے ایک ایسے گروہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو منافق تو نہ تھا مگر ضعیف الایمان تھا۔ اور ضعف ایمانی کا آخری درجہ بہرحال نفاق کے قریب ہو جاتا ہے۔ رہے دوسرے تین پیراگراف تو غالب یہی ہے کہ ان میں منافقین کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ لوگ اسلامی صفوں کے اندر گھسے ہوئے تھے' لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تمام پیراگراف منافقین ہی کے بارے میں ہوں جو ایسے کام اور ایسی باتیں کیا کرتے تھے۔

ہم نے یہ موقف کیوں اختیار کیا ہے کہ ان آیات کے پہلے پیراگراف سے مراد یا تو ضعیف الایمان مہاجرین ہیں اور یا ایسے لوگ ہیں جو ایمان کے اعتبار سے پختہ کار نہ تھے اور ان کے دلوں کے اندر ایمان کے نشانات اچھی طرح واضح اور پختہ نہ ہوئے تھے؟ اور ان کی ایمانی فکر مضبوط نہ ہوئی تھی؟

اس موقف کی وجہ یہ ہے کہ مہاجرین کے بعض گروہ مکہ مکرمہ میں لڑنے کے لئے نہایت ہی پرجوش تھے اور اس وقت لڑائی کی اجازت نہ تھی اور حکم یہ تھا۔ (كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (۴: ۷۷))

بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر جن ۷۲ افراد نے حضور ؐ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ انہوں نے حضور ؐ کو پیش کش کر دی تھی کہ اگر آپ چاہیں تو ہم آج ہی منیٰ میں موجود کفار پر ٹوٹ پڑیں۔ اس پر حضور اکرم ؐ نے ان کو جواب دیا تھا کہ: "مجھے ابھی تک جنگ کی اجازت نہیں دی گئی۔" اس واقعہ کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو پھر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ پہلے پیراگراف سے جو لوگ مراد ہیں وہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں اگلے تین پیراگراف آتے ہیں یعنی منافقین۔ کیا یہ بیعت عقبہ ثانیہ والے لوگ ضعیف الایمان ہو سکتے ہیں' جیسا کہ پہلا پیرا بیان کر رہا ہے؟ ہرگز نہیں اس لئے کہ ان سابقین انصار سے بھی اسلامی تاریخ میں کسی کمزوری کا صدور منقول نہیں ہے۔ نہ کمزوری' نہ نفاق اس لئے کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا تھا۔

اس لئے اقرب الی الذہن یہی ہے کہ اس پہلے مجموعہ سے مراد ضعیف مہاجرین ہی ہیں۔ یہ لوگ مدینہ جاکر پرامن زندگی کے خوگر ہو گئے تھے۔ ان سے مشکلات دور ہو گئی تھیں اور جب جہاد و قتال فرض ہو گئے تو وہ ان مشکلات کے برداشت میں کمزوری دکھانے لگے۔ اور یہ بات بھی اقرب الی الذہن ہے کہ دوسرے تین پیراگرافوں کے اندر بیان کردہ اوصاف ان کمزور اہل ایمان مہاجرین کے نہ ہوں بلکہ وہ منافقین کے اوصاف ہوں۔ اس لئے کہ اگرچہ انسان بشری

کمزوریوں سے پاک نہیں ہوتا پھر بھی ہمارے لئے یہ مشکل ہے کہ ہم کسی مہاجر مومن کی طرف یہ بات منسوب کریں کہ وہ اگر مشکلات سے دوچار ہوں تو ان کو حضرت نبی اکرم ؐ کی جانب منسوب کرے اور بھلائی آپ ؐ کی طرف منسوب نہ کرے اور یہ کہ کوئی مہاجر مومن منہ پر حضور ؐ کی اطاعت کا دم بھرے اور گھر جاکر سازشیں کرے۔ہاں اگرچہ یہ ممکن تھا کہ کوئی نافہمی کی وجہ سے اچھی اور بری خبر کو پھیلا دے لیکن اس سے بھی اس بات کا اظہار ہو گا کہ یہ لوگ نظام جماعت کو اچھی طرح نہیں سمجھے 'لیکن اس اشاعت پر بھی کسی کو منافق نہیں کہا جاسکتا۔

بہرحال ان آیات پر غور کرنے سے حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان آیات کی تفسیر میں جو روایات وارد ہیں ان میں بھی کوئی حتمی بات نہیں کی گئی حتیٰ کہ پہلے پیراگراف کے بارے میں بھی کوئی حتمی رائے وارد نہیں ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ اس سے مہاجرین کا ایک گروہ مراد ہے۔اور بعض میں ہے کہ اس سے مراد بھی منافقین تھے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم ان کے بارے میں محتاط موقف اختیار کرتے ہیں اس لئے کہ ہم مہاجرین کو جنگ میں پہلوتہی کرنے اور مسلمانوں کو پہنچنے والے مصائب سے دامن بچانے کے اوصاف سے متصف نہیں کر سکتے جس طرح ان پیراگرافوں سے سابق آیات میں آیا ہے۔ نیز ہم ان پر یہ الزام بھی عائد نہیں کر سکتے کہ وہ رسول اللہ ؐ کی طرف برائی کی نسبت کر سکتے ہیں' اور بھلائی کی نسبت وہ اللہ کی طرف کرتے ہیں اور یہ کہ وہ رات کو حضور ؐ کے خلاف کوئی مشورہ کر سکتے ہیں 'اگرچہ سیاق کلام اور قرآن کریم کے عمومی انداز بیان سے کسی واقف شخص کے لئے ان پیراگرافوں کا اس انداز سے تجزیہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔یہ تجزیہ وہی شخص کر سکتا ہے جس نے ایک عرصے تک قرآن کریم پر غور و خوض کیا ہو۔اور قرآن کریم کے اسلوب بیان سے خوب واقف ہو۔

(اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (۷۷) اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (۴:۷۷-۷۸))

"تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوۃ دو؟ اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہئے یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر 'کہتے ہیں خدایا' یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی؟ ان سے کہو' دنیا کا سرمایہ زندگی تھوڑا ہے اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لئے بہت زیادہ بہتر ہے۔اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر بھی نہ کیا جائے گا۔رہی موت 'تو جہاں بھی تم ہو وہ بہرحال تمہیں آکر رہے گی خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو"۔

ان لوگوں کے حال پر اللہ تعالیٰ تعجب کا اظہار فرماتے ہیں۔ یہ لوگ جب مکہ میں تھے تو لڑنے کے لئے پر جوش تھے، وہ بہت جلد جہاد شروع کرنے والے تھے۔ اس وقت مشرکین کی طرف سے ان کے خلاف مظالم ڈھائے جا رہے تھے، وہ فتنوں میں گھرے ہوئے تھے اور اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی مصلحت کی خاطر جہاد کی اجازت نہ دی تھی۔ لیکن جب مناسب وقت آگیا، جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مقرر کیا ہوا تھا اور حالات ساز گار ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر جہاد فرض کر دیا۔ (اور یہ جہاد فی سبیل اللہ تھا) تو ان میں سے ایک فریق جزع و فزع کرنے لگا اور یہ فریق ان لوگوں سے ڈرنے لگا جن کے ساتھ انہیں لڑنے کا حکم دیا گیا تھا، حالانکہ وہ لوگ بھی انہی جیسے انسان تھے اور یہ ڈر اس قدر شدید تھا جس طرح اللہ تعالیٰ کا ڈر شدید ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید ڈر تھا، حالانکہ اللہ جیسا شدید عذاب کوئی نہیں دے سکتا۔

اور نہ اللہ کی پکڑ جیسی اور کسی کی پکڑ ہو سکتی ہے۔ ایسے لوگ نہایت ہی حسرت آمیز الفاظ میں اور سخت جزع و فزع کی حالت میں یہ کہتے ہیں۔ (رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ (٤: ٧٧)) (اے ہمارے رب، تو نے ہم پر قتال کیوں فرض کر دیا؟) ایک مومن کی جانب سے یہ سوال عجیب و غریب لگ رہا ہے۔ اس سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فریق کے نقطہ نظر میں اس دین کے فرائض و واجبات کی نوعیت پوری طرح واضح نہ تھی اور یہ فریق اس سوال کے بعد جس خواہش کا اظہار کرتا ہے وہ نہایت ہی حقیر اور فقیرانہ خواہش ہے۔ (لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (٤: ٧٧)) (کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی) ہمیں تھوڑا سا وقت اور مل جاتا۔ اور ہم اس خوفناک اور بھاری فریضہ سے دوچار نہ ہوتے۔

بعض اوقات اس طرح ہوتا ہے کہ بہادری اور تہور اور تیزی سے کسی معاملے کے اندر گھس جانے والے لوگ نہایت تیزی سے جزع و فزع اور خوف و ہراس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہ حالت اس وقت ہو جاتی ہے جب وہ واقعات کے اندر گھس جاتے ہیں اور معاملہ اپنی حقیقی شکل میں سامنے آتا ہے بلکہ یہ صورت حال عموماً قاعدہ کلیہ کی شکل میں پیش آتی رہتی ہے۔ اور یہ اس وجہ سے کہ یہ جوش اور جرأت اور تہور اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ایسے شخص نے مصیبتوں اور مشکلات کا حقیقی اندازہ نہیں لگایا ہوتا۔ یہ جوش و خروش حقیقی بہادری، مشکلات کے انگیز کرنے اور ثابت قدمی کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ کبھی یہ اس وجہ سے بھی ہوتا ہے کہ مشکلات تنگی اور تکالیف کے واقع ہونے کے احتمالات کم ہوتے ہیں اور ایسے شخص کو شکست اور ہزیمت نظر نہیں آتی۔ اس وجہ سے ایسے لوگوں کے اندر جوش و خروش زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ آگے بڑھتے ہیں، جلدی حرکت میں آتے ہیں اور ہر قیمت پر فتح حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنی اس حرکت، اقدام اور فتح کی راہ میں حائل مشکلات کا اچھی طرح اندازہ نہیں لگایا ہوتا۔ چنانچہ جب ان کا سامنا ان تکالیف سے ہوتا ہے تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ان کے اندازوں سے زیادہ مشکل ہیں۔ وہ ان کے تصور سے زیادہ شدید ہوتی ہیں تو وہ الٹے پاؤں پھرنے والوں اور جزع و فزع کرنے والوں کی پہلی صف میں ہوتے ہیں، لیکن جن لوگوں کی طبیعت میں ٹھہراؤ ہوتا ہے اور جو لوگ مشکلات کو انگیز کر سکتے ہیں، سختی و نرمی برداشت کر سکتے ہیں وہ ان مشکلات کے لئے قبل از وقت تیاری کرتے ہیں۔ حرکت اور اقدام کی مشکلات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ ان کے نفوس ان مشکلات کو کہاں تک برداشت کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ صبر و ثبات سے کام لیتے ہیں اور کسی معرکے میں تیاری کے بعد کودتے ہیں۔ یہ پر جوش، سر تیز اور آگے بڑھنے والے ایسے لوگوں کو کمزور سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کی سنجیدگی اور متوازن شخصیت ان کو

متاثر نہیں کرتی لیکن حقیقی معرکے کے وقت یہ بات نظر آتی ہے کہ ان میں سے کون زیادہ مشکلات کو انگیز کر سکتا ہے اور کون ہے جس کی نظر دور رس ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ ان آیات میں جس فریق کا ذکر ہے' وہ اس قسم لوگوں پر مشتمل تھا' کہ جن کو مکہ میں مشکلات اور اذیت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہ لوگ ان مشکلات پر صبر نہ کر سکتے تھے اور یہ لوگ اپنی توہین بھی برداشت نہ کر سکتے تھے' اس لئے کہ یہ شریف لوگ تھے' اس وجہ سے وہاں یہ لوگ جوش میں آکر حضور ؐ سے یہ اجازت طلب کرتے تھے کہ آپ ان کو ان اذیتوں پر مدافعت کرنے کی اجازت دیں تاکہ وہ اپنی عزت و آبرو کے بچانے کے لئے کوئی اقدام کریں۔ اور حضور ؐ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ان لوگوں کو مشورہ دیتے تھے کہ وہ ذرا انتظار کریں' ہر کام اپنے وقت پر ہو گا۔ ہر کام کے لئے تربیت اور تیاری کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر اقدام وقت پر کیا جاتا ہے اور وقت آنے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے لوگ مدینہ میں امن و امان سے رہنے لگے' نہ وہاں ان کی تذلیل ہوتی اور نہ ہی وہاں اذیت ہوتی اور یہ حالت ان ذاتی اور شخصی نیش زنیوں کے بعد انہیں نصیب ہوئی تھی جو مکہ میں معمول تھا' اس لئے ایسے لوگ جنگ میں دلچسپی نہ رکھتے تھے اور نہ ہی اس کے لئے کوئی جواز پاتے تھے' یا کم از کم یہ لوگ چاہتے تھے کہ اس بارے میں کسی شتابی کی ضرورت نہیں ہے۔

(فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (٤:٧٧)

(اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہئے یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر۔ کہتے ہیں خدایا' یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں کچھ اور مہلت دی؟) یہ فریق غالباً مومنین تھے۔ اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ یہ لوگ نہایت ہی عاجزی سے اور غمگین انداز میں اللہ کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ ان کی اس عاجزی اور غم اندوز لہجے کو ہمیں مدنظر رکھنا چاہئے۔ لیکن ان لوگوں کا ایمان ابھی پختہ معلوم نہیں ہوتا' اور ان کے تصور حیات کے نشانات ابھی تک واضح نہ تھے۔ اس پیراگراف میں جس فریق کا ذکر ہے ان کے ذہن میں اسلامی نظام حیات کے اصل مقاصد ابھی تک واضح نہ تھے۔ یہ مقاصد چند لوگوں کی ذات کو بچانے یا کسی قوم کو بچانے اور یا کسی وطن کو بچانے سے زیادہ بڑے اور اونچے تھے۔ اسلامی نظام حیات کے مقاصد کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ اس پورے کرۂ ارض پر اسلامی نظام حیات کو قائم اور غالب کیا جائے اس کا بنیادی مقصد اس پورے کرۂ ارض پر ایک عادلانہ نظام کا قیام اور ایک ایسی سلطنت کا قیام ہے جو پوری قوت سے ان رکاوٹوں کو دور کر سکتی ہو' جو دعوت اسلامی کے پھیلاؤ کی راہ میں کھڑی ہیں اور جو لوگوں کو اس بات سے روکتی ہیں کہ دعوت اسلامی کی طرف کان دھریں۔ یہ حکومت اپنے اندر اتنی طاقت بھی رکھتی ہو کہ دنیا میں اگر کوئی اپنی خوشی اور اپنے اختیار سے کوئی عقیدہ اپنالے تو وہ اسے ہر قسم کے تشدد اور دباؤ سے بچا سکے۔ چاہے یہ تشدد کسی قسم کا بھی ہو۔ مثلاً یہ کہ کسی کو محنت و مزدوری سے نہ محروم کیا جائے اور معاشرے کے اندر اپنی مرضی کی تگ و دو سے محروم نہ کیا جائے۔ غرض یہ وہ اونچے مقاصد ہیں جو کسی کو ذاتی

اور شخصی طور پر اذیت پہنچانے یا نہ پہنچانے کے مقابلے میں بہت زیادہ اہم ہیں - یہی وجہ ہے کہ مدینہ میں نصیب ہونے والا امن و سکون (اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ کسی وقت تھا) اس قدر اہم نہ تھا کہ مسلمانوں کو اس مہم اور تحریک جہاد سے مزید کچھ عرصے کے لئے محروم رکھا جاتا۔

ابھی تک اس فریق کا ایمان اس قدر پختہ نہ ہوا تھا کہ وہ اپنی ذات کو بیچ میں سے نکال دیں - وہ اللہ کے احکام کو سنیں اور انہی احکام کو علت و معلول اور اسباب و اثرات قرار دیں - ان کو قول فیصل قرار دیں' چاہے کوئی اور گہری حکمت ان کی سمجھ میں نہ آئے' لیکن ابھی تک اس فریق کا تصور دین اس قدر پختہ نہ ہوا تھا کہ یہ لوگ اس دین کی اصل مہم اور مقصد کو سمجھ سکتے - مومن بحیثیت مومن اللہ کا دست قدرت ہے اور اللہ تعالیٰ اس دنیا کے انسانوں کی زندگی میں اس کے ذریعے جو رسم و رواج چاہتا ہے' نافذ کرا دیتا ہے - چنانچہ سیاق کلام سے ایسے لوگوں کے موقف کی تصویر کشی کی جاتی ہے اور ان کے اس موقف پر تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے اور اسے ناپسند کیا جاتا ہے -

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ میں اہل اسلام کو' ان پر ہونے والے مظالم کے انتقام کی اجازت کیوں نہ دی ؟ انہوں نے اس دست درازی کو کیوں برداشت کیا اور قوت کے استعمال کی وجہ سے انہوں نے ان نیش زنیوں کا علاج کیوں نہ کیا حالانکہ مسلمانوں میں سے اکثر لوگ ایسا کر سکتے تھے - کیونکہ تمام لوگ نہ تو کمزور تھے اور نہ بزدل - وہ تو اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے تھے اور نہ مسلمان مکہ میں قلت قلیلہ تھے - وہ اس انتقام سے باز رہنے اور صرف اقامت صلوۃ' ادائیگی زکوۃ اور صبر و برداشت پر اکتفاء کیوں کرتے تھے - حالانکہ بعض مسلمانوں پر ایسا تشدد ہو رہا تھا جو ناقابل برداشت تھا - بعض ایسے تھے جو برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے اپنے دین کے بارے میں فتنے میں پڑ جاتے تھے - اور بعض ایسے بھی تھے جو ان تکالیف کی وجہ سے جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے -

اس کی کیا حکمت تھی؟ تو حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے میں ہم کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتے کیونکہ جو حکمت ہم بیان کریں گے اسے گویا ہم اللہ کی طرف منسوب کریں گے جبکہ اللہ نے خود وہ حکمت بیان نہیں کی - اس طرح ہم اللہ کے احکام و فرائض کے وہ اسباب و علل بھی بیان کر سکتے ہیں جو درحقیقت ان احکام کے اسباب نہیں ہیں - یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے بیان کردہ اسباب بھی وہی ہوں لیکن ان کے علاوہ اور اسباب اور حکمتیں بھی ہوں' جن کا علم اللہ تعالیٰ نے ہمیں نہیں دیا - اسی میں ہمارے لئے خیر اور بھلائی تھی کہ ہمیں اس کا علم نہ ہو - یہ ہے ایک مومنانہ موقف جو کوئی اللہ کے احکام اور شریعت کے قوانین کے سامنے اختیار کر سکتا ہے' جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے متعین اور مخصوص حکمت اور علت خود حتمی طور پر بیان نہیں کی' چاہے ہمارے ذہن میں اس کی جو علت بھی آئے اور جو حکمت بھی ظاہری طور پر نظر آئے - چاہے کسی حکم کی جو کیفیت تنفیذ بھی ہمارے ذہن میں آئے یا اس فرض کی ادائیگی کا جو طریقہ بھی ہمارے فہم میں آئے جہاں تک عقل اس کا ادراک کر سکتی ہو' لیکن اچھا موقف یہی ہے کہ انسان مختلف احتمالات میں سے اسے ایک احتمال ہی سمجھے اور بالجزم یہ نہ کہے کہ یہی ہے وہ حکمت جو اللہ تعالیٰ کے پیش نظر تھی اور اس کے سوا کوئی اور حکمت نہیں ہے - اگرچہ کسی کو اپنے علم و خرد پر پورا پورا اعتماد ہو اور اگرچہ اس نے احکام الہی میں نہایت ہی گہرا غور و خوض کیا ہو' اس لئے کہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے پیش نظر ہونے والی تمام حکمتوں کا احاطہ کر لیا ہے - یہ محتاط انداز جس کو ہم تجویز کر رہے ہیں بارگاہ ایزدی کے آداب سے زیادہ قریب ہے - اور احتیاط کا بھی تقاضا ہے کہ اللہ

کے علم اور انسان کے علم کے درمیان طبیعت اور حقیقت کا امتیاز رہے۔

بارگاہ ایزدی کے ان آداب کا خیال رکھتے ہوئے' میں اس موضوع پر اب بات کرتا ہوں کہ مکہ مکرمہ میں جہاد کیوں فرض نہ ہوا اور مدینہ میں جاکر کیوں فرض ہوا؟ اس موضوع پر میں وہ باتیں بیان کروں گا جو ہمیں نظر آتی ہیں کہ شاید یہی سبب اور حکمت ہو' لیکن یہ سبب و حکمت دونوں بطور احتمال بیان کئے جارہے ہیں اور اصل حقیقت کیا ہے اسے ہم اللہ پر چھوڑتے ہیں۔ ہم اپنی جانب سے اللہ کے احکام کے لئے اسباب اور حکمتیں فرض نہیں کرتے۔ اصل حقیقت کا علم صرف اللہ جل شانہ کو ہے اور اس نے نص صریح کے ذریعے اس کی اطلاع ہمیں نہیں دی........ یہ اسباب جو ہم بیان کر رہے ہیں محض اجتہادی ہیں' ان میں صحت کا بھی احتمال ہے' اور غلطی کا بھی۔ زیادہ بھی ہو سکتے ہیں اور ان میں کمی بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں ان اسباب کے ذکر سے صرف یہ مقصد ہے کہ ہم اللہ کی آیات میں تدبر کریں اور یہ سمجھیں کہ ہمارے دور میں غور و فکر کے بعد ہم پر یہ اسباب واضح ہوئے۔

(الف) یہ سبب بھی ہو سکتا ہے کہ مکی زمانہ تربیت اور تیاری کا زمانہ تھا۔ یہ تیاری ایک متعین خاندان میں' ایک مخصوص قوم میں اور متعین ظروف و احوال میں ہو رہی تھی۔ اس تربیت اور تیاری کے اہداف یہ تھے کہ ایک عرب کی شخصیت کو ایسے حالات میں صبر کرنے پر تیار کیا جائے جن میں وہ کبھی صبر نہ کر سکتا تھا۔ مثلاً یہ کہ اس کی ذات یا اس کے زیر کفالت لوگوں پر زد پڑے اور وہ اس پر صبر کرے۔ تاکہ وہ عرب شخصیت اپنی قبائلی شناخت اور اپنی ذات کو بھول جائے اور اس کی زندگی کا محور اس کی ذات اور اس کے زیر کفالت لوگ ہی نہ ہوں اور وہ اپنی زندگی صرف اپنی ذات کے لئے متحرک نہ کرے۔ نیز ایک عرب مزاج کو یہ تربیت دینا مقصود تھا کہ وہ اپنے اعصاب پر قابو پا سکے۔ یہ نہ ہو کہ پہلے تاثر پر ہی وہ جوش میں آجائے اور پہلی ہیجان انگیز حرکت پر ہی آپے سے باہر نہ ہو جائے اس کی حرکت اور اس کے مزاج کے اندر اعتدال پیدا ہو جائے۔ اس کو یہ تربیت بھی دینا مقصود تھا کہ وہ ایک منظم سوسائٹی کا فرد ہو اور اس کی ایک قیادت ہو جس کی طرف وہ اپنی زندگی کے تمام امور میں رجوع کرنے کا عادی ہو جائے اور وہ کوئی کام بھی نہ کرے مگر اس قیادت کے اشارے کے مطابق اگرچہ یہ اوامر اس کی عادی زندگی کے خلاف اور متضاد ہوں۔ ایک عرب شخصیت کی تربیت کے باب میں یہ نہایت ہی بنیادی باتیں تھیں۔ اس سے ایک اسلامی سوسائٹی کی تشکیل مقصود تھی جو ایک قیادت کے تابع ہو' جو ترقی پذیر اور مہذب سوسائٹی ہو اور قبائلی اور غیر مہذب (Barbarian) سوسائٹی نہ ہو۔

(ب) اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قریش کے ماحول میں پرامن دعوت زیادہ موثر ہو سکتی تھی' اس لئے کہ یہ سوسائٹی شرفاء کی سوسائٹی تھی اور اگر اس سوسائٹی کے اندر مسلمان جنگ شروع کر دیتے تو اس کی وجہ سے یہ لوگ بغض و عناد میں اور تیز ہو جاتے۔ ایسے حالات میں جو مکہ میں اس وقت تھے' خونریز لڑائیاں شروع ہو جاتیں اور جنگ داحس' جنگ بسوس اور جنگ غبراء کی طرح قتل و مقاتلے کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ یہ جنگیں عربوں کی مشہور جنگیں تھیں اور سالہا سال تک مسلسل لڑی جاتی رہیں۔ اس جدید جنگ کا تعلق اسلام سے ہوتا اور تمام واقعات اسلام کے حوالے سے یاد کئے جاتے۔ ان جنگوں کا کبھی خاتمہ نہ ہوتا اور اسلام بجائے اس کے کہ ایک دعوت ہوتی' وہ جنگ و جدال کی طویل داستان ہوتا اور ان داستانوں کے نتیجے میں اسلام کی

اصل دعوت پس منظر میں چلی جاتی۔ اس دعوت کا یہ حال ابتدائی مرحلے ہی میں ہو جاتا اور کچھ عرصے کے بعد یہ ختم ہی ہو جاتی۔

(ج) یہ اس لئے بھی تھا کہ اگر مکہ میں جہاد کی اجازت دی جاتی تو گھر گھر میں جنگ شروع ہو جاتی۔ اس لئے کہ مکہ مکرمہ کے اندر کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی جو لوگوں پر کنٹرول کر سکتی۔ نیز وہاں کوئی ایسی حکومت نہ تھی جو مسلمانوں کو تکلیفات دیتی تھی، بلکہ مسلمانوں کو جو اذیتیں دی جاتی تھیں وہ ہر مسلمان کے اپنے رشتہ داروں ہی کے ذریعے دی جاتی تھیں۔ خود رشتہ دار ہی مسلمان ہونے والے لوگوں پر تشدد کرتے، انہیں اذیت دیتے اور اپنے خیال کے مطابق ان کی تربیت کرتے۔ اگر مکہ میں جنگ کی اجازت دے دی جاتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ گھر گھر میں جنگ شروع ہو جاتی اور لوگ کہتے دیکھو یہ ہے اسلام، حالانکہ اسلام پر فتنہ ڈالنے کا الزام اس وقت بھی لگایا گیا تھا جب مسلمانوں کو حکم یہ تھا کہ ہاتھ روکے رکھو۔ لیکن قریش حج اور عمرہ کے لئے آنے والوں اور تجارتی بازاروں کے اندر اسلام کے خلاف یہی پروپیگنڈا توکرتے رہتے تھے۔ وہ کہتے کہ محمد باپ بیٹے کے درمیان اور ایک شخص اور اس کے قبیلے کے درمیان عداوت ڈال دیتے ہیں۔ اگر اسلام لڑکوں اور غلاموں کو یہ اجازت دے دیتا کہ وہ والدین کو اور اپنے آقاؤں اور اپنے سرپرستوں کو قتل کر دیں اور ہر گھر اور محلہ میں یہ جنگ شروع ہو جاتی تو قریش کے پروپیگنڈے کا عالم کیا ہوتا؟

(د) اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو لوگ اپنی اولاد پر بوجہ اسلام مظالم ڈھا رہے تھے، جو لوگ اپنے غلاموں کو اذیت دیتے تھے اور جو لوگ اپنے زیر سرپرستی لوگوں پر تشدد کرتے تھے، اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ یہ لوگ آگے جا کر اسلام کے حق میں عظیم خدمات سرانجام دینے والے ہیں، یہ اسلام کے سپاہی ہوں گے، مخلصین اور قائدین بنیں گے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ حضرت عمرؓ بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔

(ہ) ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عربوں کی خود داری اور شرافت کا تقاضہ تھا کہ یہ لوگ ہمیشہ مظلوم کے حق میں آواز اٹھاتے تھے۔ ایسا مظلوم جس پر ناحق تشدد کیا جا رہا ہو لیکن وہ اپنی بات کا اس قدر پکا ہو کہ وہ کسی قیمت پر بھی باز نہ آ رہا ہو۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ نہایت ہی شریف لوگوں پر تشدد ہو رہا ہو اور ایسے کئی واقعات ہوئے جن سے اس نظریے کی صحت کا ثبوت ملتا ہے۔ ابن الدغنہ اس کے لئے تیار نہ ہوئے کہ وہ حضرت ابوبکر کا ساتھ چھوڑ دیں اور وہ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کریں۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات عربوں کے لئے نہایت ہی شرم کی بات ہے۔ انہوں نے حضرت ابوبکر کو پیشکش کی کہ وہ ان کی حمایت کریں گے۔ اس کی ایک دوسری مثال شعب ابی طالب میں بنی ہاشم کا محاصرہ ہے۔ یہ محاصرہ اس قدر طویل ہو گیا کہ لوگ بھوک سے مرنے لگے اور ان پر سخت مصائب ٹوٹ پڑے۔ اگر قدیم زمانوں کی اور سوسائٹیوں میں یہ واقعہ ہوا ہوتا تو لوگ مظلوموں کو حقیر سمجھتے اور ان کے ساتھ مذاق کرتے اور ظالموں کو عزت اور وقار کی نظروں سے دیکھا جاتا (لیکن وہاں کچھ جو ہوا وہ تاریخ عرب کی زریں مثال ہے)۔

(و) اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مکہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم تھی، اور وہ مکہ مکرمہ ہی میں زندہ رہ سکتے تھے۔ اس لئے کہ جزیرۃ العرب کے دوسرے علاقوں تک دعوت پہنچی ہی نہ تھی۔ اگر پہنچی تھی تو اس کے

بارے میں کچی پکی خبریں ہی جابجا پہنچی تھیں ۔لوگ یہ سمجھتے تھے کہ تحریک اسلامی اور قریش کے اندر بعض لوگوں کے درمیان داخلی اختلافات ہیں اور اگر جنگ شروع ہوگئی ہوتی تو وہ غیر جانبدار ہوتے اور دیکھتے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے ۔ایسے حالات میں ممکن تھا کہ یہ معرکہ مسلمانوں کی اس قلیل تعداد کے مارے جانے کے بعد ختم ہی ہو جاتا۔ اگرچہ یہ قلیل تعداد اپنے مقابلے میں دوگنا کفار کو قتل کر دیتی 'لیکن ان کے ختم ہونے کے بعد شرک اپنی جگہ مزید مضبوط ہو جاتا اور اسلام کی یہ مختصر فوج صفحہ ہستی سے مٹ جاتی۔ اسلامی نظام حیات دنیا میں حقیقی روپ اختیار نہ کر سکتا حالانکہ اسلام ایک ایسا دین تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ دنیا میں بطور نظام زندگی قائم ہو اور عملاً لوگوں کی زندگیوں میں نافذ ہو۔

(ز) ان تمام امور کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مکی دور میں اس بات کی حقیقی ضرورت تھی ہی نہیں کہ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی جائے کہ وہ مقاتلہ کر کے تشدد کی مدافعت کریں۔اس لئے کہ دعوت اسلامی کا بنیادی کام ہو رہا تھا اور دعوت مسلسل جاری تھی ۔حضرت محمد ؐ کی ذات بابرکات موجود تھی اور بنی ہاشم کی تلواریں آپ کی حفاظت کے لئے ہروقت بے نیام تھیں ۔اگر کوئی شخص آپ پر ہاتھ اٹھاتا تو اسے یہ خطرہ لاحق تھا کہ اس کا ہاتھ کٹ جائے گا اور اس وقت کا قبائلی نظام موجود تھا جس میں ہر قبیلہ اس بات سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ خواہ مخواہ بنی ہاشم کے ساتھ لڑائی میں الجھ نہ جائے اور یہ خطرہ ہر اس صورت میں بالکل موجود تھا اگر کسی قبیلے کا کوئی فرد حضور ؐ پر ہاتھ اٹھاتا۔چونکہ داعی کی شخصیت محفوظ تھی اور اس کی حفاظت ہو رہی تھی 'اور داعی بنی ہاشم کی امداد سے اور اس وقت کے موجودہ قبائلی نظام کے رسم و رواج کے مطابق شب و روز دعوت دے رہا تھا۔ داعی نہ دعوت کو خفیہ رکھ رہا تھا اور نہ اپنی بات کسی سے چھپاتا تھا کہ کسی شخص میں یہ جرأت نہ تھی کہ وہ آپ کو دعوت پھیلانے سے روک سکے ۔ آپ قریش کی مجالس میں 'خانہ کعبہ میں 'جبل صفا پر اور عمومی اجتماعات میں دعوت اسلامی کا کام کر رہے تھے اور کسی شخص کی یہ جرأت نہ تھی کہ وہ آپ ؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ سکے ۔کوئی شخص یہ جرأت نہ کر سکتا تھا کہ آپ کو اغواء کر سکے 'آپ کو قید کر سکے 'اور آپ کو قتل کر سکے 'اور کوئی آپ کو اس کی مرضی کی بات کہنے پر مجبور نہ کر سکتا تھا کہ آپ اپنے دین کی بعض باتیں کہہ سکتے اور بعض باتوں پر خاموش رہتے ۔ایک بار جب انہوں نے آپ کو یہ پیشکش کی کہ وہ ان کے خداؤں اور الہوں کو برا بھلا نہ کہیں اور ان کی بدگوئی نہ کریں تو آپ نے ان کی اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔ نیز جب انہوں نے یہ پیشکش کی کہ کچھ نرمی وہ کریں اور کچھ نرمی قریش کریں گے تو آپ ؐ نے اس کو بھی رد کر دیا۔ یعنی کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اپنانے سے انکار کر دیا۔پیشکش یہ تھی کہ بعض باتیں حضور ؐ ان کی مان لیں اور بعض باتیں وہ اسلام کی مان لیں گے تو حضور نے اس کا بھی انکار کر دیا۔ غرض دولت اسلامی کا وجود قائم تھا۔ حضور اکرم ؐ موجود تھے اور بنی ہاشم بطور محافظ کام کر رہے تھے اور حضور ؐ ہر شکل و صورت میں اور تمام ذرائع سے اپنی دعوت پھیلانے میں آزاد تھے ۔ایسے حالات میں جنگ اور جہاد کی فی الواقعہ کوئی حقیقی ضرورت بھی نہ تھی کہ قبل از وقت جہاد و قتال شروع کر دیا جائے اور سب سے اہم وجہ یہی تھی کہ قریش کا خاندان اس دعوت کے لئے سازگار تھا اور اس کے اچھے نتائج نکلنے والے تھے ۔

یہ تمام پہلو' جہاں تک ہم سمجھتے ہیں' اس حکمت کے بعض پہلو ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے مکہ میں جہاد و قتال کا آغاز نہ ہوا اور وہاں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ ہاتھ روکے رکھیں' نماز قائم کریں' زکوٰۃ ادا کریں۔ ان کاموں کی وجہ سے ان کی تیاری اور تربیت مکمل ہو جائے گی اور دعوت اسلامی کا مکی منصوبہ بھی اپنے اختتام تک پہنچ جائے گا۔ مسلمان اپنی قیادت کے احکام کا انتظار کریں گے اور جب وقت آئے گا تو اپنے آپ کو اس فریضہ سے عہدہ بر آ کر سکیں گے اس لئے کہ اس فرض کی ادائیگی میں اب ان کی کوئی ذاتی غرض و غایت نہ ہوگی اور ان کا جہاد و قتال اب صرف اللہ کے لئے ہو گا۔ فی سبیل اللہ ہو گا اور فی الوقت دعوت اپنی رفتار سے بہرحال جاری تھی' اس کی حمایت ہو رہی تھی۔ اور اس سے محبت کرنے والے موجود تھے اور نگہبان تھے۔

اس منصوبے کی جو حکمت بھی ہو بہرحال اس وقت ایسے پرجوش لوگ موجود تھے جو بظاہر اس گھڑی کا بڑی شدت سے انتظار کر رہے تھے کہ انہیں جنگ کی اجازت دی جائے۔

(فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (٤:٧٧)

(جب ان پر جنگ فرض کر دی گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈر رہا ہے جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہئے یا اس سے بھی زیادہ اور کہتا ہے: ہمارے پروردگار' تو نے کیوں ہم پر قتال فرض کر دیا' کیوں نہ ہمیں کچھ اور مہلت دی؟)

اسلامی صفوں میں ایک ایسے گروہ کی موجودگی جو جہاد و قتال سے کتراتا ہو' ایک قسم کی بے چینی پیدا کرتی تھی اس طرح اسلامی صفوف میں ایک طرف یہ گروہ تھا جو جزع و فزع کرتا تھا۔ دوسری طرف سچے اور کامل مومنین تھے جو پورے طور پر ثابت قدم تھے اور اپنے نصب العین پر مطمئن تھے اور راہ حق میں آنے والی بے چینیوں کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے تھے اور اس راہ کی مشقتوں کو برداشت کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دو گروہوں کے اندر ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ اس فریق مومن کے اندر بھی سچائی کے لئے جوش و خروش پایا جاتا تھا' یہ عزم اور ارادے والے تھے' انہیں یقین و ثبات حاصل تھا' مگر یہ لوگ ہر جذبے کا اظہار اپنی جگہ کیا کرتے تھے۔ اس لئے کہ جب جنگ شروع ہی نہ ہوئی ہو اور اس کے احکامات ہی نہ دیئے گئے ہو تو وہ محض تہور اور خالی نعرہ بازی ہوگی اور جب حقیقی خطرے کا سامنا ہو تو یہ بخار ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت حال کا علاج قرآن کریم نے اپنے انداز میں کیا:

(قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (٧٧) اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (٧٨) (٤:٧٧-٧٨))

(کہو دنیا کا سرمایہ زندگی تھوڑا ہے' اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لئے بہتر ہے' اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر

بھی نہ کیا جائے گا' موت تو جہاں بھی تم ہو بہرحال آکر رہے گی' خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو۔) یہ لوگ موت سے ڈرتے ہیں' اور زندگی چاہتے ہیں اور نہایت ہی عاجزانہ حسرت کے انداز میں تمنا کرتے ہیں کہ انہیں کچھ مزید مہلت مل جاتی اور ان کے سرمایہ زندگی میں کچھ مزید اضافہ ہو جاتا۔

قرآن کریم کا کمال یہ ہے کہ ایسے جذبات جہاں سے پیدا ہوتے ہیں' وہیں سے ان کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور موت اور زندگی کی حقیقت واضح کر دیتا ہے۔ (قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ (٤: ٧٧) (کہہ دو زندگی کا سرمایہ تو بہت ہی تھوڑا ہوتا ہے) زندگی کا تمام سروسامان' بلکہ پوری زندگی کی حقیقت کیا ہے' چند دن' چند ہفتے' چند مہینے یا چند سال؟ اگر قدرے مہلت مل بھی جائے تو اس کی حقیقت کیا ہے؟ اگر پوری زندگی ہی ایک مختصر وقت ہے تو اس مختصر وقت میں وہ کیا سازوسامان جمع کریں گے۔ اس لئے کہ زندگی تو دنوں' ہفتوں اور مہینوں اور سالوں ہی کے اندر محدود ہے۔ اس لئے اس مختصر زندگی کا طول بھی مختصر ہے۔

(وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى (٤: ٧٧)) (اور آخرت ہی ایک خدا ترس انسان کے لئے بہتر ہے) ایک تو اس لئے کہ معاملہ دنیا ہی میں ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ دنیا اس انسانی سفر کی آخری منزل نہیں ہے۔ یہ تو ایک مرحلہ ہے اور اس مرحلے کے بعد آخرت ہے اور سرمایہ وہی ہے جو آخرت کے لئے جمع ہو۔ پھر یہ کہ آخرت کا دور طویل ہے اور لا انتہا ہے' اور اس کا سرمایہ خیر ہے اور بہتر ہے۔ جو لوگ خدا ترس ہوں وہ اسے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہاں بات خوف اور ڈر کی ہو رہی تھی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا ذکر کیا جو اگرچہ ڈر ہی ہے لیکن خدا کا ڈر۔ یعنی اگر کوئی ڈرتا ہے تو اسے اللہ سے ڈرنا چاہئے' انسان سے کیا ڈرنا؟ لیکن ایک گروہ مسلمانوں کے اندر ایسا موجود ہے جو لوگوں سے اس طرح ڈرتا ہے جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہئے۔ ہاں جو خدا سے ڈرتا ہے تو پھر وہ لوگوں سے نہیں ڈرتا۔ جس کے دل میں خوف خدا بس جائے پھر اس دل میں کسی اور کے خوف کے لئے جگہ ہی نہیں رہتی۔ اس لئے کہ اگر اللہ نہ چاہے تو اس کا کوئی بھی کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتا۔

(وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيلًا (٤: ٧٧)) (اور تم پر شمہ برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا) تمہارے اجر میں کوئی غبن نہ ہو گا' کوئی نقصان نہ ہو گا اور کوئی کمی نہ کی جائے گی۔ اگر دنیا میں ان سے کوئی چیز رہ گئی تو دار آخرت تو آنے ہی والا ہے۔ وہاں وہ کمی پوری کر دی جائے گی جہاں کوئی ظلم نہ ہو گا اور حساب و کتاب میں کوئی کمی نہ ہو گی اور دنیا و آخرت کا فائنل بل مل جائے گا۔

ان حقائق کے باوجود بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے نفوس کے اندر یہ شدید خواہش ہوتی ہے کہ ان کو اسی زمین پر کچھ دن اور مہلت مل جائے۔ اس کے باوجود کہ یہ لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور آخرت میں جزائے خیر کے بھی امیدوار ہیں' تاہم وہ ایسی خواہش دل میں رکھتے ہیں' خصوصاً وہ لوگ جو ایمان کے ایسے درجے میں ہوں جس میں یہ فریق زیر بحث تھا۔

یہاں اب بات کو ایک آخری جھلکی میں دوبارہ پیش کیا جاتا ہے اور ایک ہی فقرے میں غلط تصور اور غلط سوچ کو

درست کر دیا جاتا ہے ـ موت و حیات اور تقدیر اور اجل کے بارے میں سوچ کو درست کر دیا جاتا ہے ' نیز جہاد و قتال کے زاویے سے موت و حیات کو ایک نچ دیا جاتا ہے ـ اس فریق کا یہ جزع و فزع اسی لئے تو تھا کہ یہ سمجھتے تھے کہ موت قتال کے نتیجے میں آتی ہے حالانکہ (اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ ------ (٤: ٧٨)) (موت تو جہاں بھی تم ہو بہرحال تمہیں آکر رہے گی خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو)۔ موت تو ایک مقرر وقت پر آتی ہے ـ اس کا تعلق قتال اور امن سے نہیں ہے ـ اس کا تعلق جائے رہائش کی پختگی اور ناپختگی سے بھی نہیں ہے ـ نیز اگر کوئی فریضہ جنگ سے پہلوتہی کرے تو بھی موت مؤخر نہیں ہو سکتی اور نہ فرائض جنگ اور جہاد کی وجہ سے موت وقت سے پہلے آتی ہے ـ

موت کا ایک وقت مقرر ہے اور یہ معاملات اس سے بالکل جدا ہیں ـ ان کے درمیان کوئی تعلق سبب و مسبب نہیں ہے ـ بلکہ موت کا ایک وقت مقرر ہے اور جب وہ وقت پہنچ جائے تو سبب کوئی بھی فراہم ہو جاتا ہے ـ وقت کے سوا اور کوئی سبب مرگ نہیں ہے ـ اس لئے کہ یہ تمنا کرنا کہ قتال کا فرض ہوتا اگر قدرے مؤخر ہو جاتا ایک لغو تمنا ہے ـ نیز قتال اور غیر قتال کے حالات میں اللہ کے سوا کسی اور سے ڈرنے کے بھی کچھ معانی نہیں ہیں ـ

قرآن کریم ایک لطیف نچ کے ساتھ دل کی دنیا بدل دیتا ہے ـ موت و حیات کے بارے میں ایک انسان کی سوچ ہی بدل جاتی ہے ـ اور انسان کی سوچ اور شعور میں جو خوف و ہراس ہوتا ہے وہ یک لخت دور ہو جاتا ہے ـ

لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ انسان احتیاطی تدابیر اختیار ہی نہ کرے اور اس کے دائرہ اختیار میں بچاؤ اور نگہداشت کے لئے جو تدابیر ہیں ' انہیں کام میں نہ لائے ـ ابھی ابھی یہ بات گزری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ـ (خُذُوْا حِذْرَکُمْ) تم بہت ہی محتاط رہو ـ اور صلوٰۃ الخوف کے مسائل کے بیان کے موقعہ پر بھی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ـ ایک دوسری جگہ (وَاَعِدُّوْا) کا حکم دیا گیا کہ خوب تیاریاں کرو ـ یہ تمام احکام اپنی جگہ درست ہیں ' البتہ ان تیاریوں کے ساتھ موت و حیات کا کوئی تعلق نہیں ہے ـ احتیاطی تدابیر اور جنگی سازوسامان کی فراہمی کی اپنی جگہ پر ایک حکمت ہے اور ان احکام کی پیروی ضروری ہے ـ یہ اللہ کی تدابیر ہیں جن کا اللہ نے حکم دیا ہے ـ لیکن موت بہرحال اپنے مقررہ وقت پر آتی ہے اور یہ بالکل ایک دوسرا عقیدہ اور حکم ہے اور اس پر یقین رکھنا بھی فرض ہے ـ اگرچہ احتیاطی تدابیر بھی فرض ہیں اور جنگی تیاریوں کی بھی ظاہری اور باطنی حکمتیں ہیں ـ لہٰذا دونوں احکام کی پیروی ضروری ہے ' پورے توازن اور پورے اعتدال کے ساتھ ـ تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے .... یہ ہیں اسلام کی ہدایات اور صحیح اسلامی پالیسیاں ـ افراد اور جماعت کی تربیت کا یہ اسلامی منہاج ہے ـ

---ooo---

غالباً یہاں آکر مہاجرین کے اس گروہ کی بات ختم ہو جاتی ہے اور اب اسلامی صفوں میں پھیلے ہوئے ایک دوسرے عنصر کی بات شروع ہوتی ہے ـ اس دور میں اسلامی سوسائٹی کا دوسرے عناصر کے ساتھ یہ بھی ایک موجود عنصر ترکیبی تھا ـ اگرچہ سابقہ بات کے اندر انقطاع اور نئی بات کا آغاز یہاں نظر نہیں آتا ' نہ کوئی فصل ہے ' نہ کوئی وقف ہے ' جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ آنے والی بات ایک دوسرے عنصر کے بارے میں ہے ـ الا یہ کہ پہلے فریق کی بات ختم ہو گئی ہے لیکن اس

بارے میں اس سے قبل ہم جو نکات بیان کر آئے ہیں وہ ہمارے پیش نظر ہیں۔

(وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا (۷۸) مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (۷۹) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا (۸۰)(۴:۷۸ تا ۸۰))

"اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے' اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ اے نبی' یہ آپ کی بدولت ہے۔ کہو' سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی؟ اے انسان' تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب و عمل کی بدولت ہے۔

اے محمد ؐ' ہم نے تم کو لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔ جس نے رسول ؐ کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی اور جو منہ موڑ گیا' تو بہرحال ہم نے تمہیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔"

جن لوگوں کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں جو بھلائی پیش آتی ہے اس کی نسبت وہ اللہ کی طرف کرتے ہیں اور جو برائی انہیں درپیش ہوتی ہے' اس کی نسبت نبی کریم ؐ کی طرف کرتے ہیں ان کے اس فعل کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ نبی ؐ کے بارے میں بدفالی کا خیال کرتے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ نبی ؐ کی وجہ سے ان پر مصائب نازل ہوئے۔ اگر خشک سالی ہو جائے' اگر مویشی نسل کشی نہ کریں یا اگر کسی موقعہ پر ان پر مصیبت آ جائے تو وہ ان چیزوں کی نسبت حضور ؐ کی طرف کرتے۔ اور اگر انہیں کوئی بھلائی اور کامیابی ہوتی تو کہتے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ جان بوجھ کر نبی ؐ کی قیادت پر الزام تراشی کرتے تھے۔ اور یہ کام وہ اس لئے کرتے تھے کہ حضور ؐ ان پر جو فرائض عائد فرماتے تھے' ان سے گلوخلاصی کرا لیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ قتال فی سبیل اللہ کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوں۔ تو بجائے اس کے کہ وہ صاف صاف کہہ دیتے کہ بھائی ہم تو ضعیف ہیں اور بزدل ہیں اور جنگ سے ڈرتے ہیں' انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ حضور کی قیادت پر جرح و قدح کرنے لگے۔ اور اگر بھلائی نصیب ہو تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا فضل ہے اور اگر برائی نصیب ہو تو اس کی نسبت نبی ؐ کی طرف کرتے ہیں یا حضور ؐ

کے احکام کی طرف کرتے ہیں کہ حضور ؐ کے ان احکامات کی وجہ سے یہ مصیبت پڑی اور خیر سے ان کی مراد اس دنیا کی بھلائی ہوتی ہے اور شر سے مراد ان کی اس دنیا کا نقصان ہوتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس دنیا میں اللہ کی مشیت کے مطابق لوگوں کو جو حادثات اور واقعات پیش آتے ہیں اس کے بارے میں ان کا نقطہ نظر بہت ہی غلط ہے۔ نیز ان کا رسول اللہ اور خدا تعالیٰ کے درمیان پائے جانے والے تعلق کے بارے میں بھی بہت ہی گھٹیا تصور ہے۔

اگر یہ تیسری وجہ ہو تو یہ ان مہاجرین کی طرف سے ہو سکتی ہے جن کا موت وحیات کے بارے میں ابھی عقیدہ صاف نہ ہوا تھا اور اپنے اس تصور موت وحیات کی وجہ سے یہ لوگوں سے اس طرح ڈرتے تھے جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہئے۔ اور یہ لوگ کہتے تھے (رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (۴:۷۷)) (اے ہمارے رب تو نے ہم پر قتال کو کیوں فرض کر دیا' کیا ہی اچھا ہوتا اگر تو اسے قریب وقت تک مؤخر کر دیتا) لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اس آیت سے مراد وہ لوگ نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد کچھ دوسرے لوگ ہیں جن میں ان چہروں کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی شامل تھے۔

یہ مسئلہ جو اس آیت میں لیا گیا ہے۔ یہ ایک عظیم اور مشکل مسئلہ کا ایک پہلو ہے اور وہ مسئلہ تاریخ ادیان اور تاریخ فلسفہ کا نہایت ہی مشکل مسئلہ ہے۔ یعنی مسئلہ جبر و قدر اور مسئلہ تقدیر۔ یہ مسئلہ یہاں بعض لوگوں کے حالات کے بیان میں ضمناً" آگیا ہے۔ ان لوگوں کے غلط تصورات کا رد یہاں کیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے اس فریق زیر بحث کی فکری غلطی کو درست کرتے ہوئے اس مسئلے کو نہایت ہی سادگی اور بغیر کسی پیچیدگی کے بیان کر دیا۔ ذرا قرآن کریم کے الفاظ میں سنئے۔

(وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا (۴:۷۸))

(اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے' اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ تمہاری بدولت ہے۔ کہو سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔) بے شک اللہ ہی فاعل حقیقی اور فاعل اول ہے۔ وہی فاعل ہے جو کچھ اس کائنات میں وقوع پذیر ہوتا ہے وہ اسی سے ہے۔ لوگوں کے لئے جو کچھ ہوتا ہے یا لوگوں سے جو کچھ ہوتا ہے یہ سب کچھ اللہ سے ہے۔ لوگوں کا اختیار صرف اس قدر ہے کہ وہ توجہ کریں اور سعی کریں لیکن کسی فعل کا تحقق صرف اللہ کے ارادے اور تقدیر سے ہی ہو سکتا ہے۔

اس لئے کہ نیکی کی نسبت یا برائی کو وجود میں لانے کی نسبت اور برائی کو کسی کے اوپر لے آنے کی نسبت حضور ؐ کی طرف کرنا' حالانکہ آپ ایک انسان اور مخلوق ہیں اور ہم جیسے ہیں' یہ ایک غیر حقیقی نسبت ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس موضوع پر بات کو سمجھتے ہی نہیں۔

کبھی یہ ہوتا ہے کہ انسان ایک کام کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اپنے لئے بھلائی سمیٹنے کی سعی کرتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ

نے وسائل خیر کو استعمال کرنے کا جو فہم دیا ہے وہ اسے استعمال کرتا ہے لیکن اس کے باوجود کسی کو اگر بھلائی نصیب ہوتی ہے تو وہ ارادۂ الٰہی سے ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ اللہ کی تقدیر کے علاوہ کوئی اور تقدیر تو ہے نہیں جو اشیاء' حادثات اور اس کائنات کے اندر وقوع پذیر ہونے والے حوادث کو پیدا کر سکتی ہو ۔ اب بھلائی بھی اگر کسی کو نصیب ہوتی ہے تو ان وسائل کی مدد سے نصیب ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس بھلائی کے لئے مقرر کئے ہیں ۔ اس لئے عملاً یہی تصور ہو گا کہ یہ بھلائی اللہ ہی کی وجہ سے نصیب ہوئی اور اسی کی تقدیر کا نتیجہ ہے ۔

بعض اوقات انسان ایک برائی کے ارتکاب کی طرف متوجہ ہوتا ہے یا وہ کوئی ایسا عمل کرتا ہے جس کے نتیجے میں برائی وجود میں آتی ہے ۔ لیکن عملاً برائی کا وارد ہونا اور وجود میں آنا محض اللہ کی قضا و قدر کے تحت ہوتا ہے' اس لئے کہ اس کائنات میں اشیاء کے پیدا کرنے اور حادثات کو وقوع پذیر کرنے کی طاقت اللہ کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہے ۔

دونوں صورتوں میں 'خیر و شر میں کسی چیز کا وقوع پذیر ہونا من جانب اللہ ہوتا ہے اور اس آیت میں اسی حقیقت کا فیصلہ کیا گیا ہے ۔ رہی دوسری آیت یعنی (مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (٤ : ٧٩)) (تمہیں جو بھلائی نصیب ہوتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور تمہیں جو برائی نصیب ہوتی ہے وہ تمہارے نفس کی طرف سے ہوتی ہے) تو اس میں ایک دوسری حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے ۔ اس کا پہلی آیت میں بیان کردہ حقیقت سے نہ تعلق ہے اور نہ وہ اس سابقہ حقیقت قضا و قدر میں داخل ہے ۔ لہٰذا اس کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھنا ضروری ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق ایک منہاج کار وضع کیا ہے اور اس نے ہر کام کے لئے ایک طریقہ کار وضع کیا ہے ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو شر کے بارے میں اچھی طرح متنبہ کیا ہے ۔ جب انسان اس منہاج پر کاربند ہوتا ہے اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلتا ہے' بھلائی کے لئے کوشاں ہوتا ہے اور شر سے لرزاں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ راہ ہدایت پر چلنے کے لئے اس کی مدد کرتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ۔ (وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا) (جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں تو ہم ان کی راہنمائی اپنی راہوں کی طرف کر دیتے ہیں) تب انسان بھلائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے ۔ بظاہر ایک شخص کسب اور محنت کرتے ہوئے نظر آتا ہے لیکن اس انسانی کسب و عمل کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ کسب و عمل کا منہاج تو خود اللہ نے متعین کیا ہے اس لئے انسان کی سعی میں ہی بھلائی ہوتی ہے' وہ اللہ کے ترازو میں ہوتی ہے اور اللہ کی جانب سے ہوتی ہے اس لئے کہ بھلائی کا طریق کار وضع کرنے والا اور منہاج عمل متعین کرنے والا تو اللہ ہی ہے ۔ اسی نے تو بھلائی کی طرف راہنمائی فرمائی اور وہی تو ہے جس نے بھلائی کی توفیق دی اور برائی سے ڈرایا ۔ کوئی انسان جب اس منہاج پر نہیں چلتا جو اللہ نے متعین کیا ہے اور اس راہ کو نہیں اپناتا جسے اللہ نے مشروع قرار دیا' وہ بھلائی کے لئے سعی نہیں کرتا اور جس برائی سے اسے ڈرایا گیا ہے اس سے نہیں ڈرتا' تو یقیناً اسے برائی سے دوچار ہونا پڑے گا اور یہ ایک حقیقی برائی ہو گی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور یہ برائی خود اس کے نفس کی کمائی ہو گی اس لئے کہ وہ اپنے اختیار سے اللہ کے پسندیدہ منہاج عمل سے نکل گیا ۔ (یہ ہے اس کا کسب) ۔ یہ مفہوم پہلے مفہوم سے مختلف ہے اور دونوں کا دائرہ بھی الگ الگ ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نکتہ اب واضح ہو گیا ہے ۔

اس دوسرے مفہوم کے اعتبار سے نظریہ تقدیر پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اچھائی اور برائی دونوں کا تعلق اللہ کی مرضی اور تقدیر سے ہے۔ اللہ ہی تمام مخلوقات کا پیدا کرنے والا ہے۔ ہر حادث کا پیدا کرنے والا وہی ہے۔ ہر ہونے والے واقعے کا موجد وہی ہے' چاہے اس بارے میں انسان کا ارادہ اور عمل جو ہو' سو ہو اور ہونے والے جیسے حالات میں بھی ہو۔

وہ اصل مسئلہ کیا ہے جو ان نصوص میں بیان کیا گیا ہے یا اس کا ایک پہلو لیا گیا ہے۔ وہ مسئلہ جبر و اختیار ہے۔ یہ کہ انسان سے جن افعال کا صدور ہوتا ہے' اس میں اس کے اپنے ارادے کا کس قدر دخل ہے یا اس کے لئے جو فائدے یہاں واقع ہوتے ہیں ان میں اس کے اپنے ارادے کا کس قدر دخل ہے اور یہ کہ اس کے افعال ارادی پر جزا و سزا کس طرح مرتب ہوگی جبکہ ہم کہتے ہیں کہ تمام افعال کا اصل خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ خود انسان کے ارادے' انسان کی توجہ' انسان کے عمل اور تمام دوسرے محدثات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ اور اس قسم کے تمام سوالات جن کا تعلق مسئلہ جبر و قدر کے ساتھ ہے۔ قرآنی آیات اس بات کی تصریح کرتی ہیں کہ ہر حادث اللہ کے ارادے سے حادث بنتا ہے۔ قرآن کریم سب کا سب اللہ کا کلام ہے اور قرآن کریم کی آیات ایک دوسرے کے ساتھ متعارض نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے ان دونوں امور کے درمیان ایک نقطہ اتصال ضروری ہے۔ انسان کے ارادے اور عمل کا ایک دائرہ ایسا ہے جس کے اندر وہ ذمہ دار ہے اور مسئول ہے' اور اسے سزا و جزاء کا سامنا کرنا ہو گا۔ اس دائرہ اختیار کا تعارض بھی تقدیر الٰہی اور ارادۂ ربانی کے دائرے کے ساتھ نہ ہو تو یہ دائرے کس طرح متعین ہوں گے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا بیان اور توضیح ممکن نہیں ہے' اس لئے کہ اللہ کا ارادہ اور اس کی قدرت کس طرح کام کرتی ہے اس کی کیفیات کا ادراک انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔

بہرحال اس کے بعد اللہ تعالیٰ حضور ؐ کے دائرۂ کار اور حدود ذمہ داری کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ کہ آپ لوگوں کے حوالے سے کیا موقف اختیار کریں گے اور لوگوں کا تعلق آپ کے ساتھ کس طرح ہو گا۔ اور تمام معاملہ انجام کار اللہ کی طرف لوٹ جائے گا۔

(مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (۷۹) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا (۸۰)(۴:۷۹ – ۸۰))

(اے محمد' ہم نے تجھے لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی اور جو منہ موڑ گیا' تو بہرحال ہم نے تمہیں لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے) رسول کا فریضہ یہ ہے کہ وہ رسالت کی ذمہ داری ادا کرے۔ اس کی ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ وہ خیر پیدا کرے یا کوئی شر پیدا کرے۔ یہ تخلیق کا کام تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اور اللہ اس پر گواہ ہے کہ اس نے حضرت محمد ؐ کو محض ادائے فریضہ رسالت کے لئے بھیجا ہے۔ (وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا) (اور خدا کی گواہی کافی ہے)۔

اور لوگوں کا معاملہ حضرت محمد ؐ کے ساتھ یہ ہے کہ جس شخص نے آپ کی اطاعت کی تو گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ لہٰذا اطاعت کے معاملے میں اللہ اور رسول کے درمیان کوئی جدائی نہیں ہے۔ نہ اللہ کے قول اور رسول اللہ کے قول کے درمیان کوئی فرق و امتیاز ہے۔ پس جو شخص منہ پھیرتا ہے اور رسول اللہ کی تکذیب کرتا ہے تو اس کا حساب و کتاب اور اس کی سزا و جزا کا کام اللہ کے سپرد ہے۔ اللہ نے رسول اللہ کو اس لئے نہیں بھیجا کہ آپ لوگوں کو ہدایت پر مجبور کر دیں یا انہیں دین کے اندر داخل ہونے پر مجبور کر دیں۔ نہ رسولوں کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ لوگوں کی اس طرح حفاظت کریں کہ وہ گناہوں میں مبتلا نہ ہوں۔ نہ یہ بات رسولوں کی قدرت میں دی گئی ہے کہ وہ لوگوں کے پاسبان بن جائیں۔

اس بیان کے ذریعے ان کے تصورات اور خیالات کو اس بارے میں درست کیا جاتا ہے کہ جو واقعات انہیں پیش آتے ہیں ان کا تعلق اور وجود اللہ کے ارادے سے ہے اور اللہ کی تقدیر کے عین مطابق ہے اور انہیں جو بھلائی اور برائی پیش آتی ہے، چاہے بھلائی اور برائی کو کسی معنی میں بھی لیا جائے، چاہے ظاہری بھلائی ہو یا حقیقی بھلائی ہو، یہ سب کچھ اللہ کی جانب سے ہے۔ اللہ کے سوا کوئی کسی چیز کو پیدا کر سکتا ہے، نہ اسے وجود میں لا سکتا ہے، نہ اسے باقی رکھ سکتا ہے اور نہ کسی چیز کو صنعت میں لا سکتا ہے۔ اللہ کے ہاں جو حقیقی بھلائی ہے وہ اللہ ہی سے ہے اور جو حقیقی برائی انہیں نصیب ہوتی ہے اس میں ان کے نفوس کا دخل ہوتا ہے۔ یہ برائی انہیں اس لئے نصیب ہوتی ہے کہ یہ لوگ اسلامی نظام زندگی سے منہ موڑتے ہیں اور اللہ کی ہدایات کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

رسول کی پہلی اور آخری ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ رسول ہے۔ وہ نہ منشی ہے، نہ خالق ہے اور نہ کسی حادثہ کو لا سکتا ہے۔ یہ اللہ کی خصوصیات ہیں اور ان میں رسول، اللہ کے ساتھ شریک نہیں ہوتا۔ وہ بس اللہ کے احکام پہنچانے والا ہے، تب اس کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ اللہ کی اطاعت کے لئے ماسوائے رسول اللہ کی اطاعت کے اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ رسول اس بات کا مکلف نہیں ہے کہ وہ ان لوگون کے لئے ہدایت کا سامان کرے جو اعراض کرنے والے ہیں اور نہ رسول انہیں اعراض اور نافرمانی سے روک سکتا ہے۔ وہ البلاغ اور بیان کے بعد اور کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ ہیں فیصلہ کن اور تسلی بخش حقائق۔ واضح اور صریح حقائق۔ ان سے تصورات کی تعمیر اور شعور کی پختگی ہوتی ہے۔ اور یہ حقائق جماعت مسلمہ کو عظیم منصب اور ڈیوٹی کے لئے تیار کرنے کی جدوجہد کا ایک حصہ ہیں۔ اس کے بعد سیاق کلام ایک دوسرے گروہ کی طرف مڑ جاتا ہے۔ یہ گروہ اسلامی صفوف کے اندر گھسا ہوا ہے اور شاید یہ منافقین کا کوئی گروہ ہے۔ قرآن کریم ان کے کردار کو علیحدہ اور نئے عنوان کے ساتھ ذکر کرتا ہے لیکن انداز بیان کے اندر اس کردار سے نفرت بھی جھلکتی ہے۔ اس نفرت کے ساتھ ساتھ جماعت مسلمہ کی تعلیم، راہنمائی بھی کی گئی ہے۔

(وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا (۸۱) أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (۸۲) (۴: ۸۱ - ۸۲))

(وہ منہ پر کہتے ہیں کہ ہم مطیع فرمان ہیں مگر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ راتوں کو جمع ہو کر تمہاری باتوں کے خلاف مشورے کرتا ہے ۔ اللہ ان کی یہ ساری سرگوشیاں لکھ رہا ہے ۔ تم ان کی پروانہ کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو ' وہی بھروسہ کے لئے کافی ہے ۔ کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے ؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس مین بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی) ۔

یہ گروہ ایسا تھا کہ جب یہ رسول اللہ ؐ کے پاس موجود ہوتا اور آپ سے قرآن سنتا اور قرآنی فرائض کو سمجھتا تو کہتا کہ ہم مطیع فرمان ہیں ' وہ اس طرح جامع اور مانع اطاعت کا اعلان کرتے ' بے قید اطاعت کا اقرار کرتے ۔ اس میں نہ وہ کوئی اعتراض کرتے ' نہ کسی قسم کی توضیحات طلب کرتے ' نہ کوئی استثناء رکھتے ' لیکن جونہی وہ حضور کی مجلس سے اٹھتے ' ان میں سے ایک گروہ راتوں کو جمع ہو کر آپ کی باتوں کے خلاف مشورے کرنے لگ جاتا ۔ اور یہ فیصلہ کرتا کہ حضور نے جو کچھ فرمایا ہے اس پر عمل نہ کیا جائے اور کوئی ایسا منصوبہ اپنایا جائے کہ اس پر عمل نہ ہو اور گلوخلاصی ہو جائے ۔

اس کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت من حیث الجماعت تو یہ کہتی ہے کہ ہم اطاعت کریں گے لیکن ان میں سے ایک گروہ رات کے وقت نکل کر وہ سازش کرتا ہے جو جماعت مسلمہ کے قول کے خلاف ہوتی ہے ۔ اور اس گروہ منافقین کا مقصد اس جماعت کے اندر افراتفری اور بے چینی پیدا کرنا ہوتا ہے ۔ بہرحال دونوں صورتوں میں یہ گروہ منافقین سازش کر رہا ہوتا ہے ۔ ان کی سرگرمیاں اسلامی صفوں کے اندر بے چینی پیدا کرتی ہیں جبکہ جماعت مسلمہ ان سازشوں کے خلاف ہر میدان میں معرکہ آرا ہوتی ہے اور اپنی پوری قوت ان کے مقابلے میں صرف کرتی ہے ۔

اللہ تعالیٰ اہل ایمان اور حضور نبی کریم ؐ کو یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ اللہ کی نظروں سے یہ سازشی ٹولہ اوجھل نہیں ہے اور اس کی مکاری سے اللہ اچھی طرح باخبر ہے ۔ یہ شعور اور احساس کہ ان سازشیوں کی سازشوں سے اللہ اچھی طرح خبردار ہے اہل ایمان کے دلوں کے اندر اطمینان اور قوت پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے ۔ ان کے اندر یہ سکون پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی نظر ہوتے ہوئے یہ سازشیں ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتیں ۔ دوسری جانب سے ان سازشیوں کو بھی یہ سخت تنبیہ ہے کہ وہ ان سازشوں میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے ۔

(وَ اللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ) (اور اللہ ان کی یہ تمام سرگوشیاں لکھ رہا ہے) ۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ؐ کو منافقین کے ساتھ معاملہ کرنے کا جو منصوبہ دیا تھا وہ یہ تھا کہ آپ ان کے ساتھ ان کی ظاہری حالت کے مطابق معاملہ کریں گے اور ان کے ساتھ ان کی نیتوں کے مطابق سلوک نہ ہو گا ۔ ان کی خفیہ سازشوں سے اغماض برتا جائے گا اور اعراض کیا جائے گا ۔ یہ ایک ایسا منصوبہ تھا جس کے مطابق آخر کار وہ منتشر ہو گئے 'کمزور ہو گئے اور ان میں سے جو باقی رہ گئے تھے وہ تتر بتر ہو گئے اور چھپ گئے ۔ اس منصوبے کا ایک حصہ یہ تھا ۔ (فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ) (آپ ان کی پرواہ نہ کریں) ان سے چشم پوشی کرنے کے ساتھ ساتھ رسول کو مطمئن کیا جاتا ہے کہ اللہ کی حفاظت اور پاسبانی پر مکمل بھروسہ رکھو ۔ (وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا) (اور اللہ پر بھروسہ رکھو ' اللہ بھروسے کے لئے کافی ہے) بالکل درست ' اللہ بھروسے کے لئے کافی ہے 'جس کا وکیل اللہ ہو اسے کوئی بھی گزند نہیں پہنچا سکتا ۔ نہ اسے کوئی سازش گزند پہنچا سکتی ہے ' نہ خفیہ سازش ان کے خلاف چل سکتی ہے ' اور نہ ظاہری سازش ۔

سوال یہ ہے کہ پھر گروہ حضور ؐ کے سامنے اقرار اطاعت کرتا اور واپس ہو کر رات کو سازش کرنے میں لگ جاتا۔ وہ ایسا کیوں کرتا تو دراصل یہ گروہ یہ رویہ اس لئے اختیار کرتا تھا کہ اسے اس بات میں شبہ تھا کہ آیا حضور اکرم ؐ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ اللہ کی جانب سے ہے یا نہیں۔ جب ایک لمحہ کے لئے اس قسم کا شک پیدا ہو جائے تو بات کی قوت اور شوکت ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن اور کلام رسول کے اندر قوت اور شوکت اسی شعور سے پیدا ہوتی ہے کہ یہ کلام باری تعالیٰ کی طرف سے آرہا ہے اگرچہ عبداللہ کے حلقوم سے سنا جا رہا ہے۔ اور یہ کہ آپ ہوائی باتیں نہیں کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو توکل علی اللہ کرنے کے بارے میں دو ٹوک حکم دیا گیا اور مکرر تاکید مزید کی گئی۔

یہاں اللہ تعالیٰ ان کے سامنے ایک نکتہ پیش فرماتے ہیں۔ اور یہ نکتہ عزت و شرف کی وہ انتہا ہے جس تک قرآن کریم انسان کو پہنچانا چاہتا ہے کہ وہ عقل سے کام لے اور یہ سمجھ لے کہ وہ ایک ذی شرف مخلوق ہے۔ وہ صاحب عقل و ادراک ہے' اور یہ عقل و ادراک اللہ ہی نے انسان کو عطا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کے بارے میں فیصلہ ان کے شعور اور ان کی عقل و ادراک پر چھوڑتا ہے۔ اللہ ان کے لئے بصارت و بصیرت کا ایک منہاج متعین فرماتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اگر وہ اس منہاج کے مطابق معاملات پر غور کریں تو وہ کبھی بھی ٹھوکر نہ کھائیں گے۔ یہ منہاج فہم و ادراک قرآن میں نہایت ہی واضح طور پر متعین کیا گیا ہے۔ اور خود انسانی فہم و ادراک بھی اس منہاج تک پہنچ سکتا ہے۔ اور اس طرح انسان اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے کہ قرآن کریم اللہ کی جانب سے ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

(اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا

(٤ : ٨٢) (کیا یہ لوگ قرآن مجید پر غور نہیں کرتے' اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت کچھ خلاف بیانی پاتے) اس بیان اور ہدایت کے اندر انسانیت کے لئے انتہائی عز و شرف کا مقام پوشیدہ ہے۔ اس میں انسان کے ادراک پر مکمل بھروسہ کیا گیا ہے۔ اور اس کی شخصیت کو بہت ہی اہمیت دی گئی ہے۔ نیز اس میں عدالت عقل میں فیصلہ لے جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی ایک ایسے مظہر میں جس کا سمجھنا انسانی عقل کے لئے زیادہ دشوار نہیں ہے۔

قرآن کے اندر پائی جانے والی مکمل' جامع اور بے قید ہم آہنگی ایک ایسا مظہر ہے جو اس شخص کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا جو اس کتاب پر تدبر کرے۔ اس مظہر کی سطح اور اس کا دائرہ مختلف لوگوں کی فہم کے مطابق وسیع اور تنگ ہو سکتا ہے۔ مختلف نسلوں اور مختلف قسم کے ذہین لوگوں کے نتائج فکر مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ہر عقل اور ہر نسل اور ہر دور کے لوگوں کو اپنی بساط کے مطابق اس سے کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے اور یہ کمی بیشی لوگوں کے فہم' ان کی عقل اور ان کے علم و ثقافت کے اعتبار سے ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں مختلف لوگوں کا نتیجہ فکر ان کے تجربے' صلاحیت اور تقویٰ کے مطابق محدود یا لامحدود ہو سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر شخص اس آیت کا مخاطب ہے' ہر نسل اس کی مخاطب ہے' اور درست منہاج فکر و تدبر کے مطابق وہ اس مظہر کا ادراک کر سکتا ہے۔ یعنی یہ وصف کہ قرآن کے اندر خلاف بیانی نہیں ہے اور اس کے اندر مکمل ہم آہنگی اور تناسق پایا جاتا ہے۔ البتہ جس طرح ہم نے کہا' یہ فہم انسان کی صلاحیت' اس کے علمی مقام' تجربے اور تقویٰ

کے حدود کے اندر رہتا ہے - یہ گروہ ' جسے اس وقت کی موجود نسل کی صورت میں مخاطب کیا گیا تھا ' ایک ایسے کلام سے مخاطب کیا جا رہا تھا ' جسے وہ خوب سمجھتا تھا - اور اپنے فہم و ادراک کے ذریعے وہ اسے عمل میں لاتا تھا ' جس قدر اس کی طاقت کے حدود میں ہوتا تھا -

یہ مظہر اور یہ صفت یعنی مکمل اتحاد فکر اور ہم آہنگی کی صفت کا اظہار سب سے پہلے قرآن کریم کے انداز تعبیر میں ہوتا ہے - قرآن کی طرز ادا اور فنی طریقہ اظہار مدعا کے اندر مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے - انسانی کلام ہمارے سامنے ہیں ' بڑے سے بڑے ادب پاروں میں نشیب و فراز بھی ہوتے ہیں ' ہم آہنگی بھی ہوتی ہے اور لغزش کلام بھی ہوتی ہے - ایک حصہ اگر پر زور ہوتا ہے تو دوسرے میں جھول ہوتی ہے - ایک میں اگر فکری تخلیق ہے تو دوسرا حصہ پیش پا افتادہ ہوتا ہے ' ایک حصہ اگر رواں ہوتا ہے تو دوسرا نہایت ہی گنجلک ہوتا ہے - ایک اگر نہایت ہی روشن ہے تو دوسرا حصہ تاریک ہے ' غرض کلام کی فصاحت و بلاغت اور نقص کے سلسلے میں جو اوصاف ہوتے ہیں ان کے اعتبار سے انسانی کلام میں نشیب و فراز ہوتا ہے - نقائص کلام میں سے اہم نقص کلام کے اندر روانی اور ہم آہنگی کا فقدان ہوتا ہے جس میں بات جلدی جلدی ایک معیار سے گرتی ہے یا گرے ہوئے معیار سے اوپر کو اٹھتی ہے - ہر انسانی کلام کے اندر یہ مظہر قدم قدم پر سامنے آتا ہے ' کسی ایک ادیب کے اگر ادبی کردار کو لیں ' یا اس کے افکار کو لیں ' یا کسی ایک ہی ادیب کے فن پاروں کو لیں یا کسی ایک سیاست دان کی پالیسیوں کو لیں ' یا کسی ایک جرنیل کی جنگی چالوں ' یا کسی ایک شخص کی صنعت کاری کو لیں ' اس میں معیار کا یہ تفاوت قدم قدم پر نظر آئے گا - معیار تعبیر کے اندر زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا -

قرآن کریم کے اندر یہ صفت نہایت ہی واضح ہے اور پوری طرح منعکس ہے ' یعنی کلام میں پختگی اور ہم آہنگی - پورے قرآن کے اندر یہ صفت ملحوظ رکھی گئی ہے - ہم یہاں جو بات کر رہے ہیں وہ صرف لفظی اور تعبیر کی ہم آہنگی کے زاویے سے ہے - اس پوری کتاب کے اندر کلام اور اسلوب اظہار کا ایک ہی معیار ہے ' اسی وجہ سے یہ کتاب معجزانہ شان لئے ہوئے ہے - یہ کتاب جن موضوعات پر کلام کرتی ہے ' مضمون کے اعتبار سے اس کے رنگ مختلف ضرور ہوتے ہیں لیکن فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اس کا معیار ایک ہی رہتا ہے - اسلوب ادا میں اس کا کمال قائم رہتا ہے ' اور کسی جگہ کلام اپنی معیاری سطح سے گرنے نہیں پاتا - کسی جگہ اس کی حالت ایسی نہیں ہوتی جس طرح انسانی کلام کی حالت ہوتی ہے کہ کبھی معیار کچھ ہوتا ہے اور کبھی کچھ - یہ کتاب اللہ کی شان کاریگری لئے ہوئے ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بات کے کہنے والا متغیر نہیں ہے اور وہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف متغیر نہیں ہوتا - اور نہ اس پر ایک حالت کے بعد دوسرا حال طاری ہوتا ہے - (دیکھئے ' التصویر الفنی فی القرآن)

اس کے فنی اسلوب کے بعد پھر یہ عدم اختلاف کی صفت اور مکمل ہم آہنگی اور عام وحدت فکر اس نظام کے اندر بھی پائی جاتی ہے جس کا اظہار و بیان قرآن کریم کی ان عبارات کے اندر کیا گیا ہے اور جس کا مفہوم ان ہم آہنگ عبارتوں کی اندر بیان ہوا ہے - یعنی وہ نظام فکر جس کے اوپر نفس انسانی کی تربیت کی گئی ہے یا انسانی معاشرے کی تربیت کی گئی ہے - نیز اس نظام زندگی کے تمام اجزاء اور اس کے تمام پہلوؤں کے اندر مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے - اسی طرح ایک فرد کی زندگی کی تمام سرگرمیوں اور پھر ایک معاشرے کے اندر فرد کی تمام سرگرمیوں اور نسلاً بعد نسل ایک فرد اور معاشرے کی زندگی کے اندر جو تغیر و تبدل ہوتا ہے اس کے تمام پہلوؤں کے اندر مکمل توافق اور توازن پایا جاتا ہے - پھر

انسان کی قوت مدرکہ کے لئے ایک منہاج اور تقویم ہے' جس کے کئی پہلو ہیں اور انسان کے فہم و ادراک کی کئی قوتیں اور عمل اوراک میں کام آنے والی مختلف قوتیں۔ پھر خود حضرت انسان کی ذات اور اس کے تمام معاشروں' تمام نسلوں اور تمام سطحوں کے اندر بھی ایک مکمل ہم آہنگی رکھی گئی ہے۔ انسان اور اس کائنات کے اندر بھی مکمل آہنگی ہے جس کے اندر یہ انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر انسان کی دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی کے اندر بھی مکمل توافق اور ہم آہنگی ہے۔ پھر اس کتاب نے اس انسان اور اس پوری کائنات کے اندر اس کی زندگی بسر کرنے میں بھی پوری ہم آہنگی رکھی ہے۔

جب ایک انسان اور اللہ کی کاریگری کے اندر باعتبار اسلوب کلام اور لفظی تعبیر فرق ہے تو فکری ،نظریاتی اور قانون سازی کے میدانوں میں بھی' ظاہر ہے کہ انسانی کام اور ربانی کام کے اندر نہایت ہی واضح فرق و امتیاز ہو گا۔ تمام انسانی نظریات' تمام انسانی مذاہب و مکاتب کے اوپر انسانی چھاپ بالکل واضح نظر آتی ہے۔ اور نقطہ نظر کے اندر جزئی اور انفرادی پن واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ان تمام پہلوؤں کے اندر وقتی حالات اور مشکلات سے انسان متاثر نظر آتا ہے۔ اور انسان اس بات کا ادراک نہیں کر سکتا کہ اس کے نظریے' اس کے مذھب و مکتب کے اندر اور اس کے منصوبوں کے اندر کوئی نہ کوئی تناقض موجود ہوتا ہے جو اس نظام فکر و عمل کے اندر کشمکش شروع کر دیتا ہے اور یہ کشمکش یا تو بہت جلد شروع ہو جاتی ہے یا کچھ عرصے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ پھر یہ انسانی مکاتب فکر و عمل انسان کی بعض خصوصیات کو بالکل دبا دیتے ہیں جبکہ خود انسان کو ان کا نہ علم ہوتا ہے اور نہ انسان انہیں پیش نظر رکھ سکتا ہے۔ یا پھر بعض شخصیات کے اندر ایسے اوصاف ہوتے ہیں جن کے بارے میں انسان سوچ ہی نہیں سکتا۔ خود انسانی ادراک کے اندر ہزاروں کمزوریاں اپنی جگہ ہوتی ہیں اور جس کا دائرہ عمل نہایت ہی محدود ہوتا ہے۔ چونکہ انسانی ادراک کا دائرہ محدود ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے بنائے ہوئے منصوبے سے آگے نہیں دیکھ سکتا بلکہ وہ خود اپنے موجود منصوبے کے (مَالَهُ وَمَا عَلَيْهِ) سے بھی اچھی طرح واقف نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس قرآنی منصوبہ چونکہ علیم و خبیر کا بنایا ہوا ہوتا ہے اس لئے قرآنی مندرجات و مفہومات ان تمام نقائص سے پاک ہوتے ہیں۔ یہ مفہومات اور منصوبے مستقل ہوتے ہیں اور پوری کائنات کے اندر مروج نوامیس فطرت کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ یہ نوامیس فطرت مستقل اور ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ مسلسل حرکت میں بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح قرآنی نظریات بیک وقت متحرک بھی ہوتے ہیں' اور ثابت بھی ہوتے ہیں۔

ان آفاق و حدود کے اندر قرآن کریم کی اس صفت پر غور و فکر سے بعض اوقات انسانی ادراک اس کے پورے آفاق کو نہیں پا سکتا اور نہ ہی بعض اوقات ایک پوری نسل اس کا مکمل ادراک کر سکتی ہے بلکہ تمام نسلوں کے ادراک میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہو گا۔ اس لئے کہ قرآن کریم سے ہر نسل اپنا حصہ پاتی ہے اور آنے والی ترقی یافتہ نسلوں کے لئے بھی کچھ نہ کچھ آفاق رہتے ہیں۔ بہرحال اس صفت کے ادراک میں مختلف درجات کے اعلیٰ انسانوں سے کچھ نہ کچھ ضرور باقی رہ جاتا ہے جس طرح دوسری چیزوں کے اندر کسی نہ کسی حد تک اختلاف موجود ہوتا ہے۔ اور اس باقی آفاق سے اگلی نسلیں بھی اپنا حصہ حاصل کرتی رہتی ہیں اس لئے کہ اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں اور انسان کی بنائی ہوئی چیزوں میں فرق ہے۔ اور اللہ کی بنائی ہوئی چیز میں نہ کوئی اختلاف ہوتا ہے اور نہ تفاوت اور فرق۔ اس میں مکمل اتحاد اور تناسق ہوتا ہے۔ ہاں لوگوں کی فہم و ادراک کے حدود میں ضرور فرق ہوتا ہے اور بعض لوگ اس تناسق کو بہت ہی اچھی طرح سمجھتے ہیں اور بعض ذرا کم سمجھتے ہیں۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے التصور الاسلامی خصائصہ و مقوماتہ۔ نحو مجتمع اسلامی' الاسلام و

مشکلات الحضارہ اور ھذا الدین وغیرہ)۔

لیکن جس قدر ایک عام انسان سمجھ سکتا ہے یا ایک گروہ سمجھ سکتا ہے یا ایک متعین نسل سمجھ سکتی ہے ' اللہ تعالیٰ لوگوں کے فہم و ادراک کے سامنے 'جس قدر ان کو حاصل ہے ' قرآن کریم کو پیش کرتے ہیں اور ان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ سوچیں کہ یہ قرآن کریم اللہ کا کلام ہے اور اگر غیراللہ کا کلام ہوتا تو لوگ اس میں بہت کچھ اختلافات پاتے ۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک مختصر سا توقف کریں اور یہ متعین کرلیں کہ اس مخصوص معالمے میں یا پورے دین کے معالمے میں انسانی ادراک کی حدود کار کیا ہیں؟ کوئی انسان اس بات سے غرے میں مبتلا نہ ہو جائے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ معاملہ خود انسانی ادراک کے سامنے فیصلے کے لئے پیش کیا ہے اس لئے گویا انسانی ادراک کوئی بہت ہی بڑی شئی ہے ۔ انسانی غوروفکر اور ادراک کو بھی اپنی محفوظ حدود کے اندر رہنا چاہئے کہیں وہ اپنے محدود محفوظ دائرے سے باہر بھول بھلیاں میں پھنس نہ جائے ۔

قرآن کریم کی ان ہدایات کو اچھی طرح نہیں سمجھا گیا اور نہ ہی ان کی حدود کو اچھی طرح سمجھا گیا ہے ۔ ازمنہ قدیمہ اور دور جدید دونوں میں ایسے اسلامی اہل فکر رہے ہیں جنہوں نے عقل وقیاس کو شریعت کے مساوی درجہ دیا ہے بلکہ یہ لوگ عقل و ادراک کو شریعت کا پاسباں بناتے ہیں ..... لیکن حقیقت ایسی نہیں ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ فہم و ادراک کا یہ آلہ بہرحال انسانی قوت مدرکہ ہے اگرچہ اپنی جگہ یہ نہایت ہی اہم ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے کلام الہی ہونے کے مسئلے کو بارگاہ عقل وتدبر میں پیش کیا ہے لیکن عقل کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کرے کہ یہ قرآن اور اس کے اندر وضع کردہ پورے کا پورا دین من جانب اللہ ہے ۔ اس لئے کہ قرآن کے اندر ایسے اوصاف و مظاہر ہیں جنہیں عقل بشری بڑی سہولت سے سمجھ سکتی ہے ۔ اور وہ مظاہر اور علامات اس بات کے ادراک کے لئے کافی ہیں کہ یہ دین من جانب اللہ ہے ۔ جب یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ یہ دین من جانب اللہ ہے تو اس ادراک کا منطقی نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ اس دین کے اندر جو احکام ہیں انہیں انسان تسلیم کرے چاہے ان کی حکمت انسان کی سمجھ میں آرہی ہو یا نہ آرہی ہو ' اس لئے کہ جب ہم نے یہ بات تسلیم کرلی کہ یہ دین اور قرآن من جانب اللہ ہے تو یہ بات ازخود تسلیم ہو جاتی ہے کہ اس کے اندر حکمت موجود ہے پھر یہ بات اہم نہیں رہتی کہ حالات حاضرہ کے اندر لوگوں کی مصلحت اس دین سے پوری ہوتی ہے یا نہیں ہوتی ۔ جب دین اللہ کی طرف سے ہے تو گویا مصلحت اس کے اندر موجود اور متحقق ہے ۔ انسانی عقل شریعت کے مساوی نہیں ہوتی چہ جائیکہ کہ وہ شریعت پر حاکم اور متقدر ہو جائے ۔ اس لئے کہ خود شریعت کی حکمتوں کا ادراک ہر عقل نہایت ہی محدود پیمانے پر کرپاتی ہے اور یہ بات محال ہے کہ عقل شریعت کے تمام زاویوں اور تمام مصلحتوں کا احاطہ کرسکے ۔ نہ ایک لمحہ میں نہ پوری انسانی تاریخ میں ۔ جبکہ اللہ کی شریعت کی نظر ایک ایک لمحے کی مصلحتوں پر بھی ہوتی ہے اور زمان و مکان کے مصالح پر بھی ہوتی ہے ۔ اس لئے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ شریعت کا کوئی ثابت شدہ حکم صرف انسانی عقل وقیاس کے حوالے کر دیا جائے ۔ اس سلسلے میں عقل انسانی کا کام صرف یہ ہے کہ وہ نصوص شرعیہ کے ادراک اور ان نصوص کی دلالت اور مفہومات کے اخذ پر غور کرے ۔ یہ اجازت عقل کو نہیں دی جاسکتی کہ وہ احکام کی مصلحتوں پر بھی کلام کرے ۔ اس لئے کہ جب اللہ کی جانب سے کوئی آیت نازل ہوتی ہے تو اس میں لازماً کوئی مصلحت ہوتی ہے تب ہی تو وہ آتی ہے ۔ عقل کا کام تو ان مسائل میں ہوتا ہے جن میں کوئی نص نہ

ہو' جدید مسائل ہوں۔ایسے مسائل کے بارے جو طریقہ کار اختیار کیا جائے گا اس کے بارے میں ہم اس سے پہلے کہہ آئے ہیں کہ ایسے مسائل کو اللہ اور رسول اللہ کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔اور یہی وہ دائرہ کار ہے جو حقیقی اجتہاد کے لئے کھلا چھوڑا گیا ہے جبکہ نصوص قرآنی کا فہم و ادراک بہرحال ہروقت عقل ہی کے ذریعے ہو گا۔جب کسی نص کا مفہوم سمجھ لیا جائے تو بس اب وہاں توقف ہی بہتر ہوتا ہے اور عقل کو اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ فیصلہ دے کہ آیا اس مفہوم میں مصلحت ہے یا نہیں ہے۔عقل انسانی کا اصل دائرہ کار کائنات کے قوانین قدرت ہیں اور یہ نہایت ہی وسیع دائرہ کار ہے۔

ہمیں چاہئے کہ ہم عقل انسانی کو اسی قدر مقام و منزلت دیں جو اسے اللہ نے دیا ہے اور جو اس کے لئے مناسب ہے اور اس دائرے کے اندر اسے رکھا جائے جو اللہ نے عقل کے لئے رکھا ہے۔اس دائرے کے حدود سے تجاوز نہ کیا جائے تاکہ وہ بھول بھلیاں میں جاکر پھنس نہ جائے اور اسے کوئی رہبر کامل نہ ملے۔اور اگر کوئی رہبر ملے بھی تو وہ ایسے راستوں پر پڑ جائے جن کا اسے خود علم نہ ہو۔یہ صورت حال ایک ایسے انسان کے لئے زیادہ خطرناک ہے جو صراط مستقیم کا متلاشی ہو۔

---○○○---

اب سیاق کلام ذرا آگے بڑھتا ہے اور ایک دوسرے گروہ کو لیا جاتا ہے جو اسلامی معاشرے میں پایا جاتا ہے۔

وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا (۸۳)

(یہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش یا خوفناک خبر سن لیتے ہیں' اسے لے کر پھیلاتے ہیں' حالانکہ اگر یہ اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آ جائے جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں۔تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو (تمہاری کمزوریاں ایسی تھیں کہ) معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے۔)

یہاں جس گروہ کے بارے میں کہا گیا ہے یہ بھی اسلامی کیمپ میں موجود ایک گروہ ہے لیکن یہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو ابھی تک اسلامی نظام کے راہ و رسم سے اچھی طرح واقف نہیں ہے۔اور اس گروہ کو ابھی تک اس بات کی سمجھ نہ تھی کہ اسلامی کیمپ میں بے چینی پھیلنے کے نتائج کس قدر خطرناک اور کس قدر تباہ کن ہو سکتے ہیں۔اس لئے کہ افواہیں افواہیں ہوتی ہیں' واقعات نہیں ہوتے۔حالات بعض اوقات ایسے سنجیدہ ہوتے ہیں کہ ایک سرسری بات کے خطرناک نتائج بر آمد ہو سکتے

ہیں۔ کسی ایک شخص کے بارے میں کسی گروہ یا جماعت کے بارے میں بعض ایسے نتائج رونما ہوتے ہیں کہ سرسری ریمارک پاس کرنے والا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگر یہ واقعات و نتائج بر آمد ہو جائیں تو پھر ان کا تدارک اور تلافی کسی صورت میں بھی نہیں کی جاسکتی اور یہ لوگ یہ باتیں اس لئے کرتے ہیں کہ اسلامی کیمپ کے افراد کے اندر پیدا ہونے والی اخوت اور بھائی چارے کا تصور ابھی تک ان کے ذہن میں واضح نہ تھا۔ یہ لوگ اس بات کو اہمیت نہ دیتے تھے کہ آخر کار ایسی غیر ذمہ دارانہ گفتگوؤں کے کیا نتائج نکلنے والے ہیں اور ایسی باتوں کی اشاعت سے نقصان کیا ہوتا ہے کہ جب یہ باتیں ایک منہ سے دوسرے منہ میں چلتی رہتی ہیں' چاہے یہ باتیں امن کے حالات سے متعلق ہوں یا بے چینی اور خوف کے حالات سے متعلق ہوں۔ دونوں حالات کے اندر بعض خبروں کا پھیل جانا نہایت ہی مہلک اور فساد انگیز ہوتا ہے۔ مثلاً ایک چوکنے' تیار اور محتاط کیمپ کے اندر دشمن کی سرگرمیوں کو کم کر کے دکھانا غفلت کا باعث ہو سکتا ہے اور اس میں دشمن متحرک ہو سکتا ہے۔ ایسے حالات میں امن کے بارے میں لوگوں کو مطمئن کر دینا لوگوں کو غافل اور ست بنا سکتا ہے اگرچہ متعلقہ ذمہ داران کی طرف سے بار بار احتیاط کی تنبیہ کی جاتی رہے۔ اس لئے کہ اگر خطرہ سروں پر ہو تو ایک انسان کا دشمن کے مقابلے میں چوکنا ہو جانا' ایسی صورت حال سے بالکل مختلف ہوتا ہے کہ محض ذمہ داران کے احکام کی اساس پر احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس قسم کی سستی اور لاپرواہی بعض اوقات معاملے کا حتمی فیصلہ کر دیتی ہے۔ اسی طرح اگر ایک کیمپ اپنی قوت پر مطمئن ہو اور اپنے اطمینان کی وجہ سے ثابت قدم ہو اس کے اندر خوف پھیلایا جائے' تو ایسے کیمپ میں خوفناک خبروں کی اشاعت سے بے چینی' افراتفری پیدا ہوتی ہے اور لوگ ایسی حرکات کرتے ہیں جن کی ضرورت نہیں ہوتی اور جن کی وجہ سے لوگوں میں خواہ مخواہ خوف و ہراس پیدا ہوتا ہے اور بعض اوقات ایسی چیزیں نہایت ہی برے نتائج پیدا کر دیتی ہیں۔

بہرحال یہ ایک ایسے کیمپ کی خصوصیت ہے جس کا نظم و نسق ابھی تک مکمل نہیں ہوا یا اس کیمپ کے افراد کے اندر اپنی قیادت کے ساتھ وفاداری ابھی تک مکمل نہیں ہوئی' یا یہ دونوں کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اسلامی معاشرے میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی تھیں اس لئے کہ اس ابتدائی دور میں اسلامی معاشرے میں ایمان کے اعتبار سے مختلف سطح کے لوگ موجود تھے۔ مختلف فہم و ادراک کے حامل لوگ موجود تھے اور محبت و وفاداری میں بھی یہ لوگ مختلف سطحوں اور درجوں کے تھے۔ غرض اس قسم کی افراتفری اور بے چینی کو قرآن کریم اپنے خالص ربانی منہاج کے مطابق دور کر رہا تھا۔

(وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ (۴ : ۸۳)) (اگر یہ اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کریں)۔

یعنی اگر یہ لوگ امن اور خوف کی خبریں رسول اللہ ﷺ کے گوش گزار کرتے' اس دور میں جب حضور موجود تھے' یا اہل ایمان میں سے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے' جبکہ حضور موجود نہ تھے' تو ان خبروں کی حقیقت یہ لوگ معلوم کر لیتے کیونکہ یہ ایسی چیزوں کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ان متضاد خبروں کے درمیان سے وہ حقیقت کو اخذ کر لیتے ہیں یا مختلف قسم کے حالات سے وہ بات سمجھ لیتے ہیں۔

ایک مسلم سپاہی کا فریضہ یہ ہے کہ اگر وہ کوئی ایسی خبر سنے تو وہ اسے اپنے افسر تک پہنچا دے بشرطیکہ وہ بھی صحیح افسر ہو'

وہ اس خبر کو اپنے نبی تک پہنچائے اگر وہ موجود ہے اور اگر نبی کا دور ختم ہے تو اپنے اوپر تک پہنچائے ۔ یہ رویہ درست نہ ہو گا کہ وہ یہ خبر صرف اپنے ساتھیوں کے اندر پھیلاتا پھرے یا ایسے لوگوں کے درمیان پھیلائے جن پر اسلامی جماعت کی ذمہ داری نہیں ہے اس لئے کہ اسلامی قیادت ہوتی ہی وہ ہے جو حقیقت کو سمجھ سکے ۔ اور کسی خبر کے نشر کرنے کے صحیح موقع کو بھی سمجھے ۔ یہاں تک کہ اگر ثابت بھی ہو جائے تو بھی بعض اوقات کسی خبر کا نشر کرنا مناسب نہیں ہوتا اور اس کا نشر نہ کرنا ہی اچھا ہوتا ہے ۔

یہ تھی قرآن کی تربیت ' قرآن کریم مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کی پختگی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی قیادت کے ساتھ وفاداری بھی پیدا کر رہا تھا ۔ قرآن نے صرف ایک آیت میں اسلامی فوجی نظام کے تمام اصول جمع کر دیئے بلکہ آیت کے بھی صرف ایک ٹکڑے میں ۔ یہ آیت یہ سکھلاتی ہے کہ ایک فوجی مسلسل امن اور خطرے کی خبریں لیتا ہے اور اپنے افسران بالا تک پہنچاتا ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے ۔ اس ایک آیت کی ابتداء میں ایک ایسے فوجی کی تصویر کشی کی گئی ہے جو خبریں لیتا ہے ' امن کی بھی اور خوف کی بھی ' اور وہ اسے مسلسل شائع کر رہا ہے بغیر سنجیدگی کے اور بغیر کسی تحقیق کے اور بغیر اس کے کہ اپنی قیادت کے سامنے پیش کر کے ہدایات لے لے ۔ آیت کے وسطی حصے میں ایک فوجی کو یہ ہدایت دی جاتی ہے اور آخری حصے میں فوجیوں کے دلی تعلق کو اللہ سے جوڑ دیا جاتا ہے ۔ اللہ کے فضل کا ذکر کیا جاتا ہے اور اسے آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کا شکر بجالائے ۔ اسے شیطان کی اطاعت سے ڈرایا جاتا ہے ' جو گھات میں بیٹھا ہوا ہے اور اگر اللہ کا فضل و کرم نہ ہو تو وہ فوراً دلوں کے اندر فساد پیدا کر دے ۔

(وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۴ : ۸۳)) (اگر تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے) ۔

یہ ایک آیت ہے اور اس کے اندر علم و معرفت کی وافر مقدار ثبت کر دی گئی ہے ۔ اس قضیہ کے تمام پہلوؤں کا ذکر کر دیا گیا ' یہ آیت ضمیر کے خفیہ ترین گوشوں تک اتر گئی اور دلوں کے اندر ہدایت اور علم بھر دیا گیا ۔ یہ اس لئے کہ یہ کتاب اللہ کی جانب سے ہے ۔ اور اگر یہ اللہ کی جانب سے نہ ہوتی ۔ (لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا) (یہ لوگ اس میں بہت کچھ خلاف بیانیاں پاتے) ۔

---ooo---

جب بات یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو اسلامی صفوں کی کمزوریوں کی نشاندہی کر دی جاتی ہے ' ایسی کمزوریاں جو اسلامی معاشرے کی زندگی پر اور عمل جہاد پر اثر انداز ہو سکتی ہیں یہ غلطیاں اور ان کی درستی کا کام اس سبق کے آغاز ہی سے چل رہا ہے ۔ اب مسلمانوں کو جہاد و قتال پر ابھارا جاتا ہے جس کا ذکر اس سبق میں ہوتا رہا ہے ۔ یہاں آکر حضور اکرم ؐ کو ذاتی طور پر قتال فی سبیل اللہ کا مکلف بنایا جاتا ہے ۔ اب اس ذاتی ذمہ داری کے بعد کوئی شخص اس سے پیچھے نہیں رہ سکتا ۔ نہ اسلامی جماعت میں پائے جانے والے کسی خلل اور نقص کی وجہ سے نہ راستے کی مشکلات کی وجہ سے ۔ اس لئے کہ خطاب صرف ذات رسول ؐ کو ہے کہ آپ اٹھیں اور لڑیں اگرچہ اکیلے ہوں اس لئے کہ جہاد ہر شخص پر ذاتی طور پر فرض ہے ۔ آپ بھی اپنی ذات کے ذمہ دار ہیں ' ہاں اپنی ذات کے ساتھ آپ ؐ اہل ایمان کو بھی قتال پر ابھاریں ۔ اللہ تعالیٰ

یہاں اہل ایمان اور آپ ؐ کو فتح و نصرت کی امید دلاتے ہیں اس لئے کہ یہ معرکہ خود اللہ کا معرکہ ہے اور اللہ تعالیٰ بہت ہی زبردست ہے ـ

فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ ۚ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ ۖ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنْكِيلًا ﴿٨٤﴾

"پس اے نبی ؐ تم اللہ کی راہ میں لڑو، تم اپنی ذات کے سوا کسی اور کے ذمہ دار نہیں ہو ـ البتہ اہل ایمان کو لڑنے کے لئے اکساؤ، بعید نہیں کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے، اللہ کا زور سب سے زیادہ زبردست اور اس کی سزا سب سے زیادہ سخت ہے ـ"

اس آیت اور اس سے ماقبل کی آیت کے اندر ہمیں اس وقت کی موجود جماعت مسلمہ کے خدوخال اچھی طرح نظر آتے ہیں، جس طرح ہر دور میں پائے جانے والے انسانی نفوس کے خدوخال نظر آتے ہیں ـ

(الف) ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت اسلامی صفوں کے اندر سخت بے چینی پائی جاتی تھی اور مکمل اتحاد نہ تھا ـ جنگ سے پہلوتہی، اس کی راہ میں رکاوٹیں اور جنگ سے پیچھے رہنے کی کمزوریاں ابھی تک اسلامی صفوں میں موجود تھیں ـ یہاں تک کہ لوگوں کو جہاد پر ابھارنے اور جوش دلانے کی خاطر یہاں نبی ؐ کی ذات مبارک کو حکم دیا گیا کہ آپ جہاد کریں اگرچہ آپ اکیلے ہوں ـ آپ خود اپنے نفس کے ذمہ دار ہیں ـ ہاں اس کے ساتھ ساتھ آپ مسلمانوں کو بھی ابھاریں لیکن آپ کی ذات کی طرف سے جہاد میں شرکت اس پر موقوف نہیں ہے کہ دوسرے لوگ اس کام کے لئے اٹھتے ہیں یا نہیں ـ اگرچہ عملاً یہ ممکن نہ تھا کہ اہل ایمان نبی ؐ کی پکار کو سب کے سب رد کر دیتے لیکن یہاں اس انداز میں کلام کرنے کا مقصد یہ تھا کہ فریضہ بنیادی طور پر آپ پر عائد ہوتا ہے، جس طرح اسلامی تصور حیات کا یہ ایک اساسی اصول ہے کہ ہر شخص اپنی ذات کا ذمہ دار ہے ـ کسی ایک کی ذمہ داری کسی دوسرے پر نہ ہوگی ـ ہاں دوسروں کو جنگ کے لئے ابھارنا اپنی جگہ پر ہے ـ

(ب) اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مشرکین کے ساتھ جنگ چھیڑنے میں لوگ کس قدر خطرات محسوس کرتے تھے اور اس راہ میں کس قدر مشکلات تھیں ـ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خود مسلمانوں کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ وہ کافروں کا زور توڑ دے گا اور اس طرح مسلمان خود اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحفظ کے زیر سایہ ہوں گے ـ ساتھ ساتھ یہ یقین بھی دلایا جاتا ہے کہ اللہ زبردست قوت والا ہے اور جب وہ کسی کو سزا دیتا ہے تو اس کی سزا بہت ہی سخت ہوتی ہے ـ یہ الفاظ کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے گا، اس بات کا مظہر ہیں کہ اس وقت اہل کفر زور آور تھے ـ

ان کی قوت کی وجہ سے اسلامی صفوں میں خوف محسوس کیا جاتا تھا اور یہ حالات احد اور خندق کے درمیانی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ احد سے لے کر خندق تک کا دور وہ دور ہے جس میں مدینہ طیبہ کے اندر مسلمان نہایت ہی مشکلات اور خطرات سے دوچار تھے۔ ان کے اندر منافقین گھسے ہوئے تھے' ان کے اردگرد یہودی پھیلے ہوئے تھے اور ہر وقت مشرکین کو فساد پر آمادہ کرتے رہتے تھے۔ اور اسلامی صفوں کے اندر اسلامی تصور حیات ابھی تک جاگزیں اور واضح نہ تھا۔

(ج) اس سے ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جب انسان کو مشکلات میں قدم رکھنا ہوتا ہے تو اس کا سارا صرف ذات باری ہوتی ہے اور اللہ کا سایہ عاطفت ہی باعث اطمینان ہوتا ہے۔ اس وقت صرف اللہ کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور اللہ ہی پر بھروسہ کام دیتا ہے۔ جب خطرات اپنی آخری انتہاؤں کو چھوتے ہیں اور تمام وسائل کام نہیں کرتے تو پھر ذات باری ہی کام دیتی ہے اور یہ تمام حقائق ایسے ہیں جن کو اسلامی نظام پیش نظر رکھتا ہے۔ اس لئے کہ نفس انسانی کا خالق اللہ ہے اور اللہ اپنے پیدا کردہ نفس انسانی کو اچھی طرح جانتا ہے کہ کس طرح اس کی تربیت کی جائے گی اور کس طرح اسے بچایا جائے گا اور کس طرح اسے جوش دلایا جائے گا۔ اور کس طرح وہ مشکلات کو انگیز کرنے کے لئے تیار ہو گا۔

اس سبق کے آخر میں حضور ؐ کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ اہل ایمان کو جنگ پر ابھاریں۔ جنگ سے پہلوتہی کرنے والوں اور پیچھے رہنے والوں کا ذکر بھی ہوا تھا۔ اب یہاں ایک عام اصول بتا دیا جاتا ہے کہ ہر شخص نیکی اور بھلائی کے کام کے لئے سفارش کرے اور لوگوں کو نصیحت کرے۔ لوگوں کو بھلائی کی ہدایات دے' نصیحت کرے اور بھلائی پر تعاون کی تلقین کرے۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

"جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور جو برائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا' اور اللہ ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے۔" اب جو شخص لوگوں کو قتال پر ابھارتا ہے' اس مقصد کے لئے حوصلہ افزائی کرتا ہے اور دعوت جہاد دیتا ہے' اسے اس دعوت اور اس کے نتیجے میں ہونے والے کام کا پورا پورا اجر ملے گا۔ اور جو شخص پہلوتہی کرتا ہے اور پیچھے رہتا ہے اور اس کے اگر برے نتائج نکلتے ہیں تو یہ شخص بھی ذمہ دار ہے۔ "کفل" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیچھے رہنے والا نتائج بد کا ذمہ دار ہو گا۔

اسی اصول کا اطلاق ہر اچھی سفارش پر ہو گا اور بری سفارش پر بھی یہی اصول منطبق ہو گا۔ اگرچہ یہ اصول خاص حالات کے اندر ذکر ہوا ہے لیکن یہ قرآن کریم کا انداز بیان ہے کہ وہ ایک مخصوص واقعہ کے ضمن میں ایک کلی قاعدہ بیان کر دیتا ہے اور اس جزئی واقعہ کو بھی اس قاعدہ کلیہ کے ایک جزو کے طور پر پیش کرتا ہے اور پھر تمام امور کو ذات باری سے مربوط کر دیتا ہے جو ہر چیز کا نگہبان اور رازق ہے۔ جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور لفظ (مقیت) میں یہ مفاہیم داخل ہیں۔

(وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا (٤: ٨٥) (اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے) اچھے کاموں کی سفارش کے بعد یہ کہا جاتا ہے اگر کوئی تمہیں سلام کرے تو یا تو اس سلام جیسا جواب دو یا اس سے اچھا جواب دو۔ کسی بھی معاشرے میں سلام ایک ایسا فعل ہے جس سے زندگی کی گاڑی نہایت ہی سکون اور سہولت کے ساتھ چلتی ہے اگر دآداب سلام کو اچھی طرح ملحوظ رکھا جائے۔ سلام اور اچھائی کی سفارش کے درمیان گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ اگر کسی معاشرے میں دو فرد ایک دوسرے کو سلام ہی نہیں کرتے تو وہ ایک دوسرے کو مزید کیا ہدایت دیں گے۔

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿٨٦﴾

"اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمہیں سلام کرے تو اس سے بہتر طریقے سے جواب دو یا کم از کم اسی طرح لوٹا دو' اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔"

اسلام نے اپنا ایک خاص سلام اسلامی معاشرے کو دیا۔ جس سے ایک مسلمان اور مسلمان معاشرہ غیر مسلم اور غیر مسلم معاشروں سے ممتاز ہو گیا۔ یہ سلام ایک مسلمان کو بالکل منفرد اور متمیز بنا دیتا ہے' وہ اپنی روز مرہ کی زندگی میں ممتاز صفات کا مالک بن جاتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے دوسرے معاشروں میں مدغم اور گھل مل نہیں جاتا' نہ کان نمک میں نمک بن جاتا ہے۔

اسلام نے تین الفاظ دیئے ہیں۔ السلام علیکم' السلام علیکم ورحمۃ اللہ اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' اور جواب سلام یا تو ویسا ہو گا یا اس سے زیادہ ہو گا ماسوائے تیسرے لفظ کے۔ مثلاً السلام علیکم کا جواب یا تو وعلیکم السلام ہے یا اس سے بہتر وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ دوسرے لفظ پر وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ہو گا۔ اور تیسرے کا جواب ویسا ہی ہو گا۔ اس لئے کہ اس میں الفاظ پورے استعمال ہو گئے۔ اس لئے تیسرے کا جواب ویسا ہی ہو گا۔ حضور ؐ سے ایسی ہی روایت ہے۔

اس میں ایک تو وہ انفرادیت ہے' جو اسلامی معاشرے کا خاص رنگ ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ اس کے ماننے والوں کے خاص خدوخال ہوں' ان کی خاص عادات ہوں' جس طرح اسلام نے ایک مخصوص قانونی تنظیمی نظام دیا ہے۔ اس موضوع پر ہم تحویل قبلہ کے موقعے پر بات کر آئے ہیں کہ اسلام نے اس امت کو جس طرح ایک نظریہ حیات دیا ہے' اسی طرح اسے ایک مخصوص قبلہ بھی دیا ہے۔ (دیکھئے سورت بقرہ پارہ دوئم)

دوسری یہ کہ اسلام نے امت مسلمہ کے افراد کے اندر نہایت پختہ محبت اور بھائی چارہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً سلام کا عام کرنا' اور سلام کا جواب سلام سے زیادہ اچھا ہو اور دوسرے تعلقات جن کی وجہ سے اسلامی سوسائٹی کے اندر نہایت ہی پختہ روابط اخوت و مودت پیدا ہوئے۔ حضور ؐ سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل اچھا ہے؟ تو آپ ؐ نے جواب دیا "یہ کہ تم کھانا کھلاؤ اور چاہے جانتے والا ہو یا نہ جانتے والا ہو' اسے سلام کرو۔" یہ تو حکم ہے کہ جماعت مسلمہ کے اندر سلام کرو' اور یہ سنت ہے' رہا سلام کا جواب تو وہ اس آیت کی رو سے فرض ہے۔ اسلامی معاشرے میں سلام کرنے کی عادت کے اثرات کا اندازہ عملاً اس وقت ہوتا ہے جب سلام کے ذریعے غیر متعارف لوگ باہم متعارف ہو کر ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور جو لوگ ایک دوسرے کو علیک سلیک کرتے رہتے ہیں ان کے باہم روابط قائم ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جو ہر اس شخص پر ظاہر ہو جاتی ہے جو اس عادت کے آثار کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کے نتائج پر غور کرتا ہے۔

تیسرے یہ کہ آیات قتال کے درمیان میں باہم دوستانہ تعلقات کے لئے یہ آیت بادنسیم ہے اور اس میں اسلام کے اصل الاصول کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ ملک کے اندر امن و امان قائم ہو' اس لئے کہ اسلام دین امن ہے۔ اسلام کی جنگ بھی دراصل امن کے لئے ہے یعنی کرۂ ارض پر امن قائم کرنا۔ اور یہ امن وسیع معنوں میں مطلوب ہے۔ ایسا امن جو اسلامی نظام حیات پر مبنی ہو۔

---000---

درس نمبر ۳۷ ایک نظر میں

اس سبق میں اسلامی تصور حیات کے ایک بنیادی اصول کا تذکرہ کیا گیا ہے یعنی عقیدۂ توحید اور اللہ تعالیٰ کو اس کی حاکمیت میں وحدہ لاشریک سمجھنا ۔ پھر اس اصول کے مطابق اسلامی سوسائٹی اور اسلامی معاشرے کے تعلقات دوسرے کیمپوں کے ساتھ متعین کئے گئے ہیں لیکن دوسرے معاشروں کے ساتھ اسلامی معاشرے کے تعلق کی نوعیت کے تعین سے بھی پہلے اس سبق میں خود مسلمانوں پر سخت تنقید کی گئی ہے کہ وہ منافقین کے بارے میں دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گروہ منافقین مدینہ میں رہنے والے منافقین سے کوئی علیحدہ گروہ تھا۔ یہ احکام اسلام کے اصل الاصول پر قائم ہیں اور یہ تنقید بھی اسی اصول کے مطابق ہے جس پر اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام قائم ہے ۔ اس اصول کا ذکر ہروقت ہوتا رہتا ہے جب بھی اسلامی نظام کوئی ہدایت دیتا ہے یا کوئی قانون سازی کی جاتی ہے ۔

یہ احکام مختلف کیمپوں کے بارے میں ہیں اور یہ احکام ان اصول و قوانین کا حصہ ہیں جسے انسانی تاریخ میں سب سے پہلے اسلام نے متعارف کرایا ۔ ان قوانین کا تعلق قانون 'بین الاقوام سے ہے ۔ اسلام نے سب سے پہلے بین الاقوامی معاملات میں تلوار کے فیصلے سے ہٹ کر کچھ قواعد بنائے ۔ قوت کی دلیل اور جنگل کے قانون پر مشتمل بین الاقوامی رولز میں اسلام نے سب سے پہلے مہذب ضابطے پیش کئے ۔

یورپ کے اندر قانون بین الاقوام کا آغاز صرف سترھویں صدی عیسوی (مطابق گیارھویں صدی ہجری) میں ہوا لیکن یہ قانون ماسوائے کاغذ اور سیاہی کے اور کچھ حیثیت نہ رکھتا تھا اور جو بین الاقوامی ادارے تشکیل دیئے گئے تھے' وہ محض بین الاقوامی استعماری قوتوں کے خفیہ مقاصد کو قانونی مشکل دینے کے آلہ کار تھے ۔ نیز یہ ادارے سرد جنگ کے لئے میدان کارزار تھے ۔ ان کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ حق حقدار تک پہنچے ۔ نہ یہ ادارے صحیح معنوں میں انصاف کرتے تھے ۔ یہ ادارے وجود میں محض اس لئے لائے گئے تھے کہ اس دنیا میں بعض بڑے اور طاقت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ہم پلہ ممالک کے درمیان کچھ جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور جونہی ان ممالک کے مابین طاقت کا توازن ختم ہوا تو نہ ان بین الاقوامی قوانین کی کوئی حیثیت رہی اور نہ ہی ان بین الاقوامی اداروں کی کوئی قیمت رہی ۔

جب اسلام آیا' جو انسانوں کے لئے رب ذوالجلال کا نظام زندگی ہے تو اس نے ساتویں صدی عیسوی میں بین الاقوامی معاملات کے اندر قانون سازی کی' یعنی پہلی صدی ہجری میں ۔ یہ قانون اسلام نے ازخود وضع کیا اور اس قانون کے بنانے کے لئے کسی ہم پلہ حکومت کی طرف سے کوئی دباؤ نہ تھا ۔ یہ قانون اسلام نے ازخود بنایا اور ازخود اس پر عمل کیا تاکہ اسلامی معاشرہ اس کی بنیاد پر دوسرے کیمپوں کے ساتھ اپنے تعلقات قائم کرے' انسانیت کے لئے انصاف کے جھنڈے بلند کرے اور اس کے لئے نشانات راہ متعین کرے ۔ اگرچہ اس دور کے جاہلی دشمن کیمپ مسلمانوں کے ساتھ ان اسلامی بین الاقوامی

قوانین کو سامنے رکھتے ہوئے معاملہ نہ کرتے تھے اس لئے کہ یہ اصول اور قوانین اسلام نے پہلی مرتبہ متعارف کرائے تھے ـ یہ بین القوامی قوانین قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کو یکجا کیا جائے تو بین الاقوامی قانون کا ایک مکمل ضابطہ سامنے آتا ہے ـ اس کے اندر ان تمام حالات کا حل موجود ہے جو کسی بھی وقت اسلامی مملکت اور دوسرے ممالک کو پیش آسکتے تھے ـ چاہے یہ ممالک بر سرجنگ اور محارب ہوں' پرامن ہوں' مخالف ہوں' غیر جانبدار ہوں' محارب کے حلیف ہوں' پرامن معاہد کے حلیف یا مخالف اور غیر جانبدار کے حلیف ہوں ـ

یہاں ان اصولوں اور احکام کی تفصیلات کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے ـ اس قسم کی تفصیلی بحث تو بین الاقوامی قوانین کے ماہرین کا کام ہے ـ البتہ ان آیات کے اندر جو اصول آئے ہیں ہم ان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں ـ اس سبق میں درج ذیل لوگوں کے ساتھ معاملہ کیا گیا ہے ـ

(الف) وہ منافقین جو مدینہ میں مقیم نہ تھے ـ

(ب) وہ لوگ جو ایسی قوم سے متعلق ہیں' جس کے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی میثاق ہے ـ

(ج) وہ غیر جانبدار لوگ جو مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑنا بھی پسند نہیں کرتے اور خود اپنی قوم کے ساتھ مل کر بھی لڑنا پسند نہیں کرتے لیکن وہ ہیں اپنے سابق دین پر ـ

(د) وہ لوگ جو اسلامی نظریہ حیات کے ساتھ کھیلتے ہیں ـ جب مدینہ آتے ہیں تو اپنے اسلام کا اظہار کرتے ہیں اور جب مکہ کو جاتے ہیں تو کفر کا اعلان کرتے ہیں ـ

(ہ) مسلمانوں کے اندر قتل خطا اور مختلف لوگوں یعنی مختلف شہریت کے مالک لوگوں کے مابین قتل عمد کے واقعات میں ضابطہ ـ ان تمام حالات میں ہمیں واضح احکام ملتے ہیں جو اپنے موضوع پر بالکل صریح ہیں ـ اور تمام حالات پر ان کا انطباق ہوتا ہے ـ اور یہ اصول بین الاقوامی معاملات کی ضابطہ بندی کا ایک حصہ ہیں اور ان کا حکم وہی ہے جو اس موضوع پر دوسرے احکام بین الاقوام کا ہے ـ

---ooo---

درس نمبر ۳۷ تشریح آیات
۸۷ -- تا -- ۹۴

اس سبق کا آغاز اس اصول سے ہوتا ہے جس کے اوپر اسلامی نظام کی عمارت استوار ہے اور اس کے تمام پہلو اس اصول سے ماخوذ ہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾

”اللہ کے سوا کوئی اور حاکم نہیں ہے۔وہ تم کو قیامت کے دن جمع کرے گا جس میں شک نہیں ہے اور اللہ سے سچی کس کی بات ہے۔“ اسلامی نظام زندگی کا پہلا قدم عقیدۂ توحید ہے اور عقیدۂ توحید کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ وحدہ حاکم ہے۔ اس قدم سے آگے چاہے آپ نفس انسانی کی تربیت کے میدان میں جائیں یا اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے آگے بڑھیں یا اسلامی قانون وضع کریں' یا اسلامی انتظامیہ قائم کریں۔ قانون نظام کا تعلق اسلامی معاشرے کے داخلی امور سے ہو یا بین الاقوامی قانون سے ہو' جس کے مطابق اسلامی سوسائٹی دوسری سوسائٹیوں کے ساتھ برتاؤ کرتی ہے۔چنانچہ زیر بحث آیت بعض داخلی اور بین الاقوامی قوانین کا افتتاحیہ ہے۔

نفس انسانی کی تربیت کا سفر اس عقیدے سے شروع ہوتا ہے کہ تمام بندوں کو ایک دن اللہ میدان حشر میں اپنے سامنے کھڑا کرے گا اور اس دنیا میں اس نے انسانوں کو جو اختیارات دیئے تھے ان کے صحیح استعمال کے سلسلے میں باز پرس کرے گا۔ وہاں اس بات کی پرسش بھی ہوگی کہ اللہ کی ہدایات اور اس کے قوانین پر تم نے کس حد تک عمل کیا اور دنیا میں اپنی زندگی کے چھوٹے بڑے معاملات کے اندر کس حد تک تم نے اسلامی ضوابط کی پابندی کی کیونکہ تمہیں بہرحال وہاں اسی آزمائش اور امتحان کے لئے تو بھیجا گیا تھا۔ آخرت میں صغیر و کبیر ہر معاملے کا حساب و کتاب ہو گا۔حساب و کتاب اور جواب دہی کا یہی اخروی تصور ہے جو شریعت کے انتظامی اور قانونی ضابطوں پر عمل پیرا ہونے کا ضامن ہے اس لئے کہ ہر شخص کے ضمیر کے اندر ایک جیتا جاگتا چوکیدار بیٹھا ہوا ہوتا ہے اور اس وقت بھی نگران و نگہبان ہوتا ہے جب حکومت کے چوکیدار سو جاتے ہیں۔

اور یہ بات اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔(وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا (٤: ٨٧)) (اور اللہ سے زیادہ سچی کس کی بات ہے) اور یہ آپ کا وعدہ ہے جس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

---○○○---

مسلمانوں کے دلوں کو یہ احساس دینے کے بعد اب اصل بات شروع ہوتی ہے ۔ یہ احساس دلانا اسلامی منہاج تربیت کا ایک عام طریق کار ہے اور اس سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی کی پوری نظریاتی اور عملی عمارت اس عقیدے پر قائم ہے ۔ غرض یہ احساس دلانے کے بعد اب اس بات پر تعجب کا اظہار کیا جارہا ہے کہ مسلمان نفاق اور منافقین کے بارے میں یکسو نہیں ہیں ۔ وہ ان کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز اختیار نہیں کرتے حالانکہ حالات کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ فیصلہ کن اور دو ٹوک بات کی جائے ۔یکسوئی تو اور بات ہے ' مسلمان ان کے بارے میں واضح طور پر دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں اور ہر ایک کی اپنی رائے ہے ۔ یہ اختلاف رائے مدینہ سے باہر بسنے والے بعض منافقین کے بارے میں پیدا ہو گیا تھا۔جس کی تفصیلات آگے آرہی ہیں ۔ استفہام انکاری کا صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان معاملات کے بارے میں فکری ہم آہنگی کیوں نہیں ہے ۔اس سے اس بات کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ اسلام کی پالیسی یہ ہے کہ معاملات کے اندر فیصلہ کن اور دو ٹوک موقف اختیار کیا جائے اور منافقین کے ساتھ تعلق اور ان کی نسبت نقطہ نظر رکھنے میں یکسوئی اختیار کی جائے اور ان کے ظاہری امور کو دیکھ کر ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے بشرطیکہ کوئی منصوبہ طے شدہ ہو اور اس کے مطابق نرمی کی ضرورت ہو۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا
كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ
تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿٨٨﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا
تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ
وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿٨٩﴾

" پھر تم کو کیا ہوا کہ منافقوں کے بارے میں دو فریق ہو رہے ہیں ' اور اللہ نے تو ان کو ان کے اعمال کے سبب الٹ دیا ہے ' کیا تم ان لوگوں کو راہ پر لانا چاہتے ہو جن کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہے اور جس کو اللہ نے گمراہ کیا تم اس کے لئے کوئی راہ نہ

پاؤ گے' وہ تو چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کافر ہو جاؤ جس طرح وہ کافر ہوئے ہیں' اس طرح تم سب برابر ہو جاؤ۔ لہٰذا تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر لیں۔ پھر اگر یہ اس شرط کو قبول نہ کریں تو ان کو پکڑو' مار ڈالو' جہاں بھی پاؤ اور ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ۔" یہ لوگ کون تھے' ان کے بارے میں کئی روایات آتی ہیں جن میں سے دو روایتیں اہم ہیں۔

امام احمد نے بہز' شعبہ' عدی ابن ثابت' عبداللہ ابن زید کی سند سے زید ابن ثابت ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اکرم ؐ احد کی طرف نکلے' کچھ لوگ جو آپ کے ساتھ نکلے تھے وہ واپس ہو گئے' ان کے بارے میں حضور ؐ کے ساتھی دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ ان لوگوں کو قتل کر دیا جانا چاہئے اور ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ قتل تو جائز نہیں ہے' اس لئے کہ وہ مومن ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ (٤: ٨٨)) اس پر حضور ؐ نے فرمایا: "یہ پاک ہے اور یہ ناپاک لوگوں کو اس طرح نکال پھینکے گا جس طرح بھٹی لوہے کے میل کو نکال دیتی ہے۔ (صحیحین نے اسے شعبہ سے روایت کیا ہے)۔

عوفی نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ یہ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے اور مکہ میں مشرکین کی امداد بھی کرتے تھے۔ یہ لوگ مکہ سے اپنی کسی ضرورت کے لئے نکلے۔ وہ دل میں کہہ رہے تھے کہ اگر ہمیں حضرت محمد ؐ کے ساتھی مل گئے تو ہمیں ان کا کوئی ڈر نہ ہو گا' جب مسلمانوں کو اس بات کی اطلاع ہوئی کہ یہ لوگ سفر پر ہیں تو مسلمانوں کے ایک گروہ نے یہ کہا کہ نکلو اور ان بزدلوں کو قتل کر دو اس لئے کہ یہ لوگ ہمارے دشمن مشرکین کی امداد کرتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے ایک دوسرے گروہ نے کہا: سبحان اللہ (یا جس طرح انہوں نے کہا) کیا تم ایسے گروہ کو قتل کرتے ہو کہ انہوں نے وہ الفاظ ادا کیے جو تم نے ادا کیے ہیں؟ محض اس لئے کہ انہوں نے ہجرت نہیں کی اور اپنے وطن کو نہیں چھوڑا ہم ان کی جان و مال کو حلال کر لیں۔ اس طرح اس مسئلے پر مسلمانوں کے دو فریق بن گئے۔ حضور ؐ موجود تھے۔ آپ نے دونوں میں سے کسی کی رائے کی تردید نہ کی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ (٤: ٨٨)) (روایت ابن ابو حاتم) ابو سلمہ' عکرمہ' مجاہد اور ضحاک وغیرہ سے ایسی ہی روایات منقول ہیں۔

اگرچہ سند اور روایت کے اعتبار سے پہلی روایت زیادہ قوی ہے' لیکن ہم دوسری روایت کے مضمون کو ترجیح دیتے ہیں اس لئے کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ منافقین مدینہ کے خلاف کسی وقت بھی قتال کا حکم صادر نہیں ہوا۔ رسول اللہ ؐ نے نہ ان کے ساتھ جنگ کی ہے اور نہ انہیں قتل فرمایا ہے۔ ان کے ساتھ معاملہ کرنے کا ایک دوسرا منصوبہ تھا۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ ان کی سرگرمیوں سے چشم پوشی کی جائے اور خود مدینہ کی اسلامی سوسائٹی کو یہ موقعہ دیا جائے کہ وہ ان کو الگ کر رکھ دے۔ حضور ؐ جو کچھ کر رہے تھے وہ یہ تھا کہ مدینہ کے اردگرد منافقین کے جو رابطے تھے انہیں کاٹ دیں۔ مثلاً یہودی جو ان منافقین کو ورغلاتے تھے اور ان کے حامی تھے ان کو مدینہ اور پھر پورے جزیرۃ العرب سے جلاوطن کر دیا جائے۔ رہی آیت زیر بحث تو اس میں تو حکم دیا جا رہا ہے کہ زیر بحث منافقین کو قید کیا جائے' جہاں ملیں انہیں قتل کر دیا جائے' لہٰذا یہ منافقین مدینہ کے اندر رہنے والے منافقین کے علاوہ کوئی اور گروہ ہو گا۔ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان

کی پکڑ دھکڑ کا حکم ہجرت تک موقوف و مشروط ہے کیونکہ آیت میں ہے۔

(فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (۸۹:۴)) (لہٰذا ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں' اگر وہ ہجرت سے منہ موڑیں تو ان کو پکڑو اور جہاں بھی ان کو پاؤ' قتل کرو)۔ یہ تہدید ان لوگوں کے حق میں اس لئے آئی تاکہ وہ اس صورت حال سے نکل آئیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے حالات سے نکل آئے ہوں' اس لئے رسول اللہ ؐ نے ان کے بارے میں یہ حکم نافذ نہیں فرمایا تھا' لیکن (يُهَاجِرُوْا) کے لفظ سے یہ بات تو قطعاً ثابت ہو جاتی ہے کہ زیر بحث منافقین اہل مدینہ سے نہ تھے۔ مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ مدینہ کو ہجرت کر کے آ جائیں۔ یہ واقعہ لازماً فتح مکہ سے پہلے کا ہو گا اور ہجرت تھی بھی فتح مکہ سے پہلے کیونکہ ہجرت کی تعریف یہ ہے کہ دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کی جائے۔ لوگ تحریک اسلامی سے آکر ملتے رہیں اور اسلامی نظام کے تحت آتے رہیں۔ ورنہ ان کی زندگی یا تو کفر میں گزرے گی یا نفاق میں۔ اسی سورت میں اس سبق کے بعد دوسرے سبق میں ایسے لوگوں پر سخت تنقید وارد ہے جو ابھی تک مکہ کے دارالکفر میں مقیم تھے بغیر کسی عذر یا ضعف کے اور تھے مسلمان۔ اس وقت ان کے لئے مکہ دارالکفر اور دارالحرب تھا اگرچہ وہ ان کا اصلی وطن تھا اور وہ اس میں مقیم تھے۔ یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر ہم دوسری روایت کو ترجیح دیتے ہیں اور یہ کہ منافقین کا گروہ زیر بحث مکہ میں مقیم تھا' یا مکہ کے اردگرد کسی آبادی میں تھا۔ یہ لوگ اپنے منہ سے تو اسلام کا اقرار کرتے تھے اور اپنے عمل سے کافروں کی حمایت کرتے تھے۔ غرض آیت زیر بحث کو ایک بار پھر پڑھئے :

(فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا (۸۸) وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۸۹) (۴:۸۸-۸۹))

"پھر تم کو کیا ہوا کہ منافقوں کے بارے میں دو فریق ہو رہے ہو' اور اللہ نے تو ان کو ان کے اعمال کے سبب الٹ دیا ہے' کیا تم ان لوگوں کو راہ پر لانا چاہتے ہو جن کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہے اور جس کو اللہ نے گمراہ کیا تم اس کے لئے کوئی راہ نہ پاؤ گے' وہ تو چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کافر ہو جاؤ جس طرح وہ کافر ہوئے ہیں' اس طرح تم سب برابر ہو جاؤ۔ لہٰذا تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر لیں۔ پھر اگر یہ اس شرط کو قبول نہ کریں تو ان کو پکڑو' مار ڈالو' جہاں بھی پاؤ اور ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ۔"

ان آیات میں اس بات پر سخت نکیر ہے کہ منافقین کے بارے میں اختلاف رائے واقعہ کیوں ہوا اور ان کے بارے میں یہ حیرت انگیز موقف ہر فریق نے کیوں اپنایا؟ اس لئے کہ اس موقف میں ایک فریق کی جانب سے بہت نرمی تھی اور اس بات کا اظہار ہو رہا تھا کہ ابھی مسلمانوں کا شعور اسلام کے بارے میں پختہ نہیں ہے۔ان میں سے بعض لوگوں نے یہ کہا کہ تم ایسے لوگوں کو قتل کرتے ہو جنہوں نے وہی الفاظ ادا کئے ہیں جو تم نے ادا کئے ہیں اور محض اس لئے کہ انہوں نے اپنا وطن چھوڑ کر ہجرت نہیں کی؟ کیا یہی بات ان کی مال و جان کو مباح کرنے کے لئے کافی ہے؟ ان لوگوں کا تصور اسلام پختہ اس لئے نہ تھا کہ وہ صرف یہ بات پیش نظر رکھ رہے تھے کہ منافقین زیر بحث نے بھی اسی طرح کلمہ پڑھا ہے جس طرح ہم نے پڑھا ہے حالانکہ اس گروہ منافقین کے خلاف شواہد موجود تھے۔ ایک تو ان کا اپنا قول کہ محمد کے ساتھی ہمیں کچھ بھی نہ کہیں گے' دوسرے یہ کہ اہل ایمان کے ایک گروہ نے بھی ان کے بارے میں یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے دشمنوں کی امداد کرتے ہیں۔ ان شواہد کے باوجود ان لوگوں کا موقف ان منافقین کے بارے میں کمزور موقف تھا حالانکہ انہیں فیصلہ کن اور دو ٹوک موقف اختیار کرنا چاہئے تھا اس لئے کہ زبانی طور پر کلمہ شہادت پڑھنا اور عمداً کفار کی امداد کرنا منافقت کی بین دلیل تھی۔ایسے لوگوں کے ساتھ کسی نرمی اور چشم پوشی کی ضرورت ہی نہ تھی۔یہ معمولی غلطی نہ تھی بلکہ اس سے تصور اسلام میں کمزوری کا اظہار ہو رہا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے اندر سخت تعجب کا اظہار کیا گیا اور سخت تنبیہ کی گئی۔

رہے مدینہ کے منافقین تو ان کے بارے میں مسلمان فکری طور پر بالکل یکسو تھے کہ یہ منافق ہیں۔لیکن ان کے ساتھ چشم پوشی اس لئے اختیار کی گئی تھی کہ ایک خاص منصوبے کے تحت ایسا ہو رہا تھا' وہ یہ کہ ان کے ظاہری حالات پر ہی ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے اور ایک وقت تک انہیں مہلت دی جائے۔

لیکن یہ ایک دوسری صورت حال تھی کہ اہل اسلام میں سے ایک گروہ ان کی طرف سے اس لئے مدافعت کر رہا تھا کہ انہوں نے بھی وہی کلمہ پڑھا ہے جو ہم نے پڑھا ہے اور زبان سے انہوں نے بھی شہادت دی ہے کہ اللہ ایک ہے اور محمد رسول اللہ ؐ ہیں حالانکہ یہ لوگ مسلمہ طور پر دشمنان اسلام کے امداد کنندہ تھے۔مسلمانوں کی اس فکری کمزوری کی وجہ سے اور ان کے درمیان اختلاف رائے کی وجہ سے (جبکہ منافقین کا نفاق بالکل واضح تھا) اس آیت میں شدید تنبیہ کی گئی۔اور پھر تنبیہ کے بعد اس بات کی وضاحت بھی کر دی گئی کہ۔(وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا) (اللہ نے ان کو ان کے اعمال کی وجہ سے الٹ دیا ہے)۔تم ان کے بارے میں جھگڑتے ہو اور اللہ نے ان کی بداعمالیوں اور ان کی بدنیتی کی وجہ سے انہیں ایسے حالات میں ڈال دیا ہے جن میں وہ الٹے نظر آ رہے ہیں۔ اللہ کی جانب سے ان کے خلاف یہ گواہی ہے کہ وہ اپنی سوچ اور اپنے عمل کی وجہ سے ناقابل رشک صورت حال میں پڑے ہیں۔

اس تنبیہ کے بعد ایک دوسری تنبیہ یہ کی گئی۔(اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ) (کیا تم ان لوگوں کو راہ پر لانا چاہتے ہو جن کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہے)۔یعنی مسلمانوں میں سے جو فریق ان کے ساتھ نرم رویہ اختیار کر رہا ہے اس کی منشا یہ تھی کہ انہیں راہ راست پر آ جانے کا موقعہ دیا جائے تاکہ یہ منافقانہ رویہ اختیار کرنا چھوڑ دیں۔اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے موقف کو نامناسب سمجھا اور منافقین کو ایسے حالات میں ان کے اعمال اور برے ارادوں کی وجہ سے ڈال دیا ہے لہذا ان کے ہدایت پانے کی امید فضول ہے۔

(وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا) (جن کو اللہ نے گمراہ کیا تم ان کے لئے کوئی راہ نہ پاؤ گے)۔اور اللہ لوگوں کو گمراہ اس لئے کر دیتا ہے کہ وہ اپنی نیت و ارادے سے گمراہی کی راہ اپناتے ہیں ۔پھر وہ گمراہی کے لئے سعی کرتے ہیں اور اس راستے میں بہت ہی دور چلے جاتے ہیں ۔اتنے دور کہ ان کے لئے راہ ہدایت بند ہو جاتی ہے کیونکہ انہوں نے الٹ راہ اختیار کی ہوتی ہے اور ہدایت کے لئے اللہ کی امداد کے وہ طالب ہی نہیں رہے اور انہوں نے نشانات راہ کو گم کر دیا۔

اب ایک قدم آگے چلئے! ان منافقین کے اصل موقف کا اظہار یوں ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ خود گمراہ ہو گئے ہیں اور اپنی نیت اور عمل کی وجہ سے وہ اس پوزیشن کے مستحق ہو گئے ہیں جس میں وہ پڑے ہیں بلکہ وہ تو خود اہل اسلام کے بارے میں یہ خواہش رکھتے ہیں کہ وہ بھی کفر ہی کا راستہ اختیار کر لیتے تو اچھا ہوتا۔ (وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً) (وہ تو چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کافر ہو جاؤ جس طرح وہ کافر ہوئے ہیں ۔اس طرح تم سب برابر ہو جاؤ) بے شک انہوں نے کفر کا راستہ اختیار کر لیا ہے 'اگرچہ انہوں نے بھی وہی کلمہ پڑھا ہے جو مسلمان پڑھتے ہیں اور انہوں نے دونوں باتوں کی شہادت دے دی ہے لیکن اس شہادت کو ان کا عمل جھٹلاتا ہے جس کے ذریعے یہ لوگ دشمنان اسلام کی امداد کرتے ہیں ۔لیکن وہ اس حد پر بھی بس نہیں کرتے اس لئے کہ جو شخص کفر کو اپناتا ہے وہ کسی حد پر نہیں رکتا۔وہ اس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھتا جب تک اس پورے کرۂ ارض پر سے اسلام اور مسلمان مٹ نہیں جاتے ۔اس مذموم مقصد کو لئے وہ سعی مسلسل میں مصروف رہتا ہے ۔وہ اس مقصد کے لئے جدوجہد کرتا ہے ' سازشیں کرتا ہے تاکہ موجودہ اہل اسلام بھی لوٹ کر کافر ہو جائیں اور اس طرح تمام لوگ برابر ہو جائیں ۔

زیر تبصرہ منافقین کے اس موقف کی یہ پہلی وضاحت ہے اور یہ وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ اس سے ان کے بارے میں اہل اسلام کی سوچ سے ہر قسم کی جھول دور ہو جاتی ہے ۔یہ سوچ ان کے قول و عمل کی واضح شہادت پر قائم ہو جاتی ہے اور اب یہ سوچ تضاد سے خالی ہوتی ہے ۔ زبانی اظہار اسلام کی حقیقت کچھ نہیں رہتی جب تمام قرائن یہ بتاتے ہوں کہ ان لوگوں کا موقف منافقانہ ہے ۔

قرآن کریم مسلمانوں کے شعور کو ایک چٹکی بھرتا ہے 'جس سے ان کے شعور میں ایک خوفناک احساس ابھرتا ہے اور یہ احساس قرآن کے ان الفاظ سے ابھرتا ہے ' (وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً) (وہ تو چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کافر ہو جاؤ جس طرح وہ کافر ہوئے ہیں ' اسی طرح تم سب برابر ہو جاؤ)۔یہ خوف اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اہل اسلام نے حال ہی میں کفر کو ترک کر کے اسلام کا مزہ چکھا تھا' اور ابھی تک انہیں اس بات کا شعور تھا کہ ان کی زندگی میں کس قدر عظیم تبدیلی پیدا ہوئی ہے ۔ان کا شعور کس قدر بلند ہوا' ان کی عام سطح کس قدر بلند ہوئی اور جاہلیت کے مقابلے میں ان کی سوسائٹی کو اسلام میں کس قدر سربلندی نصیب ہوئی ۔یہ فرق و امتیاز' ان کے شعور میں بھی تھا اور حقیقت واقعہ میں بھی 'اور یہ اشارہ ہی کافی تھا کہ وہ اس شخص کے دشمن بن جائیں جو انہیں دوبارہ ان سابقہ پستیوں کی طرف لے جانے کی تدابیر کر رہا تھا۔یعنی اس جاہلیت کی پستیوں کی طرف جس سے انہیں اسلام نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تھا۔ پھر انہیں ایک عام سطح پر ہی نہ چھوڑ دیا تھا بلکہ انہیں عمومی ترقی کے ذریعے بلند ترین چوٹی پر پہنچا دیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنی نظام تربیت اس حقیقت کا سہارا لے کر خطرناک حالات کے مقابلے میں اور آگے بڑھنے کے

حالات میں مسلمانوں کو دشمن سے اس طرح خبردار کر کے سخت تاکیدی احکام دیتا ہے ۔

(فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (٤ : ٨٩))

(لہذا تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ ' یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر لیں پھر اگر یہ شرط قبول نہ کریں تو ان کو پکڑو ' مار ڈالو ' جہاں بھی پاؤ اور ان میں سے کسی کو دوست و مدد گار نہ بناؤ ۔)

اللہ تعالیٰ نے یہاں جو یہ کہا کہ ان میں سے کسی کو دوست اور مدد گار نہ بناؤ ' تو اس سے محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان خاندانی ' قبائلی روابط اور تعلقات باقی تھے ' اور مسلمانوں کے دلوں میں ان روابط کی وقعت تھی اور ہو سکتا ہے کہ یہ روابط ابھی تک بعض اقتصادی مفادات کی خاطر بھی ہوں ۔ اسلام کا یہ طریقہ تربیت جاہلیت کے تمام رہے سہے آثار و روابط کو بھی پوری طرح جڑ سے اکھاڑ کر پھینک رہا تھا ۔ اور جس طرح قرآن کریم تطہیر افکار کر رہا تھا ' اسی طرح امت مسلمہ کے لئے بین الاقوامی روابط کے اصول بھی طے کر رہا تھا ۔

قرآن کریم امت کو بتا رہا تھا کہ کوئی امت کبھی بھی صرف خاندانی اور قبائلی روابط پر وجود میں نہیں آسکتی اور نہ خون اور رشتے کے روابط ' ایک ہی ملک اور علاقے میں رہائش کے روابط ' تجارتی اور دوسرے اقتصادی مفادات کے روابط کی اساس پر کوئی امت وجود میں آسکتی ہے ۔ امت ہمیشہ ایک مخصوص نظریہ حیات اور اس نظریہ حیات کی اساس پر اٹھنے والی سوسائٹی اور اجتماعی نظام کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ دارالاسلام کے باشندوں اور دارالحرب کے باشندوں کے درمیان دوستی اور ولایت کے تعلقات قائم نہیں رہ سکتے ۔ اس وقت دارالحرب مکہ تھا جو مہاجرین کا وطن اصلی تھا اس لئے مکہ کے لوگوں ' حتیٰ کہ زبانی طور پر اسلام کا اقرار کرنے والوں اور مدینہ کے مسلمانوں کے درمیان بھی دوستی اس وقت تک نہ ہو سکتی تھی جب تک وہ ہجرت نہ کرتے جو صرف اللہ کے لئے اور اللہ کی راہ میں ہو اور اس کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لئے نہ ہو ' یعنی صرف ایسے معاشرے کے قیام کے لئے ہو جو اسلامی نظام حیات کے مطابق زندگی گزار رہا ہو اور اس کے سوا کوئی غرض نہ ہو ۔ نہایت ہی پاک ' نہایت ہی فیصلہ کن اور نہایت ہی متعین مقصد کے ساتھ ' جس میں کوئی ملاوٹ نہ ہو ' کوئی خلط ملط نہ ہو ' اسلامی نظام حیات کے سوا کوئی ہدف نہ ہو اور نہ کوئی اور مصلحت ہو ۔

اگر یہ زبانی طور پر کلمہ اسلام پڑھنے والے یہ شرط پوری کر دیں ' اپنے اہل و عیال کو چھوڑ دیں ' اپنے ملک اور مصلحتوں کو خیرباد کہہ دیں اور دارالاسلام کی طرف ہجرت کر آئیں تاکہ یہاں وہ اسلامی نظام کے تحت زندگی بسر کریں ' جو اسلامی نظریہ حیات پر مبنی ہے ' جس کے اندر اسلامی شریعت جاری ہے تو پھر وہ اسلامی معاشرے کے ممبر بن جائیں گے ۔ وہ امت مسلمہ کے ہم وطن ہوں گے ۔ اگر وہ یہ شرط تسلیم نہ کریں ' ہجرت کا انکار کر دیں تو پھر انہوں نے زبانی طور پر جو کلمہ پڑھا ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے ۔ اگر وہ یہ شرط قبول نہ کریں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ۔ (فَخُذُوْهُمْ) انہیں پکڑ کر قید کر دو اور جہاں بھی تمہیں ملیں انہیں ۔ (وَاقْتُلُوْهُمْ) قتل کر دو اور ان میں سے کسی کو نہ دوست بناؤ اور نہ مدد گار ۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے بارے میں یہ دو احکام جو دیئے ہیں' یہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ لوگ مدینہ کے منافقین نہ تھے' اس لئے کہ مدینہ کے منافقین کے ساتھ اسلامی انقلاب نے بالکل مختلف پالیسی اختیار کی تھی۔

اسلام کی یہ پالیسی ہے کہ وہ اسلام کے مخالف عقائد رکھنے والے لوگوں کے ساتھ نہایت ہی فیاضانہ پالیسی اختیار کرتا ہے۔ اسلام مخالف اسلام لوگوں کو ہرگز اس امر پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ اسلامی نظریہ حیات کو قبول کرلیں بلکہ اسلام مخالف اسلام مذاہب کے پیروکاروں کو یہ اجازت بھی دیتا ہے کہ وہ اپنے عقائد کا اظہار کریں' اسلام کے بارے میں اپنے مخالفانہ نظریات کا بھی اظہار کریں اور خود دارالاسلام میں ایسا کریں۔ ہاں ان کو یہ اجازت نہ ہوگی کہ وہ مسلمانوں کے اندر اپنے نظریات پھیلائیں یا اسلام کو برا بھلا کہیں۔ اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ مسلمان اہل کتاب کو برا بھلا نہ کہیں۔ لہٰذا یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے کہ اسلام خود دارالاسلام کے اندر موجود اقلیتوں کو یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ خود اسلام کے بارے میں لعن طعن کریں۔ اگرچہ ہمارے دور کے بعض لوگوں نے اس قدر توسع اور ڈھیل سے کام لیا ہے کہ وہ مخالف اسلام لوگوں کو دارالاسلام میں اسلام پر لعن طعن کرنے کی اجازت دینا چاہتے ہیں۔ بہرحال اسلام کی یہ بھی بڑی فیاضی ہے کہ وہ انہیں اسلامی نظریہ حیات قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا اور دار الاسلام میں ان کو جان و مال اور آبرو کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ انہیں اس بات کی بھی اجازت دیتا ہے کہ عمومی نظام (Civil code) کے علاوہ اپنے مخصوص معاملات میں اپنی شریعت کے مطابق فیصلے بھی کریں۔

اسلام اپنے مخالفین کو کھلے بندوں اپنے نظریات پر قائم رہنے کی اجازت دیتا ہے' لیکن اسلام یہ رعایت منافقین کو نہیں دیتا جو زبانی طور پر تو اظہار اسلام کرتے ہیں لیکن ان کا عمل اسلام کے مخالف ہوتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی نرمی نہیں برتتا جو اللہ کی توحید کے قائل تو ہیں' اور کلمہ شہادت پڑھتے ہیں' لیکن اس کے بعد اللہ کی خاص صفت' صفت حاکمیت میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتے ہیں' مثلاً عوام کو حق قانون سازی دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے احبار و رہبان اور حضرت مسیح کو اللہ کے سوا رب بنایا ہے اس لئے نہیں کہ وہ ان لوگوں کی عبادت کرتے ہیں بلکہ اس لئے کہ انہوں نے ان کو حلال و حرام مقرر کرنے کے اختیارات دے رکھے ہیں اور یہ اہل کتاب اس معاملے میں ان کی مکمل اطاعت کرتے ہیں۔

نیز اسلام منافقین کے اس گروہ کے ساتھ بھی رواداری نہیں برتتا جو یہ شہادت دیتے ہیں کہ اللہ ایک ہے' حضرت محمد ؐ اللہ کے رسول ہیں اور اس کے بعد وہ دارالکفر اور دارالحرب میں مقیم ہیں اور مسلمانوں کے دشمنوں کی امداد بھی کرتے ہیں۔ یہ بات رواداری نہ ہوگی بلکہ یہ بدکرداری ہوگی۔ اسلامی نظریہ حیات رواداری کا نظریہ ہے لیکن وہ بدکرداری اور عدم حمیت کا نظریہ نہیں ہے۔ یہ ایک سنجیدہ تصور حیات اور ایک سنجیدہ نظام حیات ہے اور سنجیدگی اور حقیقت پسندی اور رواداری میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ البتہ حقیقت پسندی اور بدکرداری کے درمیان تضاد ضرور ہے۔ یہ نکتے پہلی تحریک اسلامی کے لئے بھی قابل توجہ اور قابل غور تھے اور آج بھی ان میں تحریک اسلامی کے لئے اہم پیغام ہے۔

---○○○---

إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ أَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَن يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوكُمْ ۚ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ﴿٩٠﴾

(اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے۔ لہٰذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لئے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے)۔ ایسے لوگوں کو قید کرنے اور انہیں قتل کرنے کے حکم میں ایک استثنائی صورت بھی ہے۔ اگر یہ منافقین جو دشمنان اسلام کی معاونت کرتے ہیں اگر کسی ایسی مملکت یا ایسی سرزمین کے اندر رہائش پذیر ہیں جن کا اسلامی تحریک یا اسلامی حکومت کے ساتھ عہد و پیمان ہو چکا ہے' چاہے یہ عہد معاہدۂ امن ہو یا معاہدۂ تحالف ہو' تو اس صورت میں ان کے ساتھ وہی معاملہ ہو گا جو ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن سے عہد طے پا چکا ہے۔

(اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ) (البتہ وہ منافق اس سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے جا ملیں جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے)۔ اس حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر امن کے مواقع ہوں اور کوئی معاہدۂ امن اسلام کے اساسی نظریات کے ساتھ متعارض نہ ہو' اس کی وجہ سے اسلام کو قبول کرنے کی آزادی اور اسلام کی تبلیغ کی آزادی سلب نہ ہو رہی ہو اور دعوت اسلامی کی راہ میں بذریعہ قوت رکاوٹیں کھڑی نہ کی جاتی ہوں' اور اس کے ساتھ مسلمانوں کو امن نصیب ہو رہا ہو اور وہ فتنوں اور مشکلات سے بچ رہے ہوں اور دعوت اسلامی کو جمود کا خطرہ بھی نہ ہو تو ایسی صورتوں میں اسلام معاہدۂ امن کر سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو دشمن بھی کسی ایسی قوم کے ساتھ مل جائے جس کے ساتھ معاہدۂ امن ہے یا معاہدہ دوستی ہے تو ایسی صورت میں ان معاہدات کا اطلاق اس شخص پر بھی ہو گا۔ ان کے ساتھ ویسا ہی معاملہ ہو گا اور وہ لوگ ویسے ہی امن میں رہیں گے۔ ایسے احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر امن اور سلامتی اور صلح کی روح نہایت ہی واضح ہے۔

اسی طرح قیدی بنائے جانے اور قتل کر دیئے جانے کے حکم سے وہ منافق لوگ بھی مستثنیٰ ہیں جن کا تعلق ایسے لوگوں' ایسے قبائل اور ایسے گروہ کے ساتھ ہے جو اسلامی مملکت کے بارے میں غیر جانبدار ہیں۔ وہ نہ مسلمانوں کا ساتھ دیتے ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کے ساتھ محاربے کے وقت اپنی اقوام کی امداد کرتے ہیں یعنی یہ لوگ اپنی قوم کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑنا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ دونوں فریقوں کے ساتھ بھی نہیں ملتے۔ نہ ان کے ساتھ اور نہ ان کے ساتھ۔

(اَوْ جَآءُ وْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ) (اسی طرح وہ منافق بھی مستثنیٰ ہیں جو تمہارے پاس آتے ہیں اور لڑائی سے دل برداشتہ ہیں نہ تم سے لڑنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم سے)۔

اس حکم سے بھی اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اسلام ہر صورت میں قتل و مقاتلے سے اجتناب چاہتا ہے بشرطیکہ دوسرے لوگ لڑنا نہ چاہیں' دعوت اسلامی کے راستے میں روڑے نہ اٹکائیں اور تحریک اسلامی اور اس کے مخالفین کے درمیان غیر جانبدار ہو جائیں ۔ایسے لوگ جو نہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑنا چاہتے تھے اور نہ ہی اپنی قوم کے ساتھ مل کر لڑنا چاہتے تھے 'جزیرۃ العرب میں اس وقت موجود تھے بلکہ خود قریش کے اندر بھی موجود تھے ۔ایسے لوگوں پر اسلام نے یہ پابندی عائد نہیں کی کہ وہ اسلامی کیمپ کے ساتھ مل کر لڑیں یا مخالف کیمپ کے ساتھ مل کر لڑیں۔ اسلام کے لئے یہ بات بھی کافی تھی کہ وہ اسلام کے خلاف جنگ نہ کریں۔ (فتح مکہ کے بعد جب سورہ توبہ نازل ہوئی تو عملی تجربے نے یہ ثابت کر دیا کہ مرکز اسلام جزیرۃ العرب میں اسلام کے مقابلے میں کسی دوسرے دین کا موجود رہنا درست نہیں ہے ۔اس لئے ان احکام کے اندر معمولی تبدیلی کی گئی تھی) نیز یہ توقع تھی کہ اگر مشکلات دور ہو جائیں تو یہ لوگ اسلامی کیمپ میں آ جائیں گے جیسا کہ بعد میں عملاً ایسا ہی ہوا۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھاتے ہیں کہ ان غیر جانبدار لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ تمہارے لئے بہت ہی مفید ہے ۔اگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے تو وہ فرض کر لیں کہ اس سے بہتر دوسری صورت کیا ہو سکتی ہے ۔ظاہر ہے کہ دوسری صورت یہی ہو سکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ برسرپیکار دشمنوں کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے 'مسلمانوں کے خلاف عملاً جنگ شروع کر دیں' جو کسی صورت میں بھی مسلمانوں کے لئے بہتر نہیں ہے' تو ایسے لوگوں کو اللہ نے جو غیر جانبدار بنا دیا ہے تو یہ تمہارے مفاد میں ہے لہٰذا وہ جس حال میں ہیں انہیں ان کے حال پر چھوڑنا ہی بہتر ہے۔

(اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا (۹۰)

(اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے ۔لہٰذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لئے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے)۔

اس طرح قرآن مجید کا حکیمانہ منہاج تربیت پرجوش مسلمانوں کو بڑی حکمت سے ایسے منافقین کے بارے میں غیر جانبداری اختیار کرنے پر مائل کر دیتا ہے حالانکہ وہ اس موقف کو بسہولت قبول نہ کر سکتے تھے ۔لیکن اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھاتے ہیں کہ اس میں تمہاری بہتری ہے ۔یہ اللہ کا تم پر فضل ہے کہ کچھ لوگ تمہارے بارے میں غیر جانبدار ہو گئے ہیں ۔اگر وہ غیر جانبدار نہ ہوتے تو مسلمانوں پر عائد ہونے والی جنگی ذمہ داریوں میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو بتاتے ہیں کہ اگر تمہیں کسی جانب سے کوئی خیر آتی ہے تو اس کو مسترد نہ کریں اور اگر کوئی شر تم سے پہلوتہی کر کے گزرتا ہے تو

خواہ مخواہ اسے نہ چھیڑیں۔ ان لوگوں کی غیر جانبداری کا کوئی اثر تمہارے دین پر نہیں پڑتا۔ تمہارے نظریہ حیات کے اندر اس کے ذریعے کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوتی' اور نہ ہی تم کوئی بھاری قیمت دے کر امن حاصل کرتے ہو۔

بے شک اللہ نے مسلمانوں کو بھاری قیمت ادا کر کے امن کے حصول سے منع فرمایا ہے اس لئے کہ مقاصد اسلام میں سے کوئی مقصد ترک کر کے امن خریدنے کی اجازت ہرگز نہیں ہے۔ اسلام جو امن چاہتا ہے وہ ایسا امن ہے جس سے دعوت اسلامی کے حقوق میں سے کوئی حق ضائع نہ ہو' نہ مسلمانوں کے حقوق میں سے کوئی حق ضائع ہو' (مسلمانوں کے ذاتی اور شخصی حق نہیں) بلکہ مسلمانوں کے وہ حقوق جن کا تعلق ان کے منہاج حیات سے ہے اور جس کی وجہ سے وہ مسلمان کہلاتے ہیں۔

اسلام کا حق یہ ہے کہ اس کے راستے سے تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے' جو دعوت و تبلیغ کی راہ میں حائل ہیں' کیونکہ دعوت و تبلیغ کی راہ میں اسلام اس کرۂ ارض پر کسی بھی جگہ میں کوئی رکاوٹ برداشت نہیں کرتا۔ اسلام اس بات کا بھی قائل ہے کہ دنیا میں اسلام کی پشت پر ایسی سیاسی قوت موجود ہو جس سے وہ تمام قوتیں خائف ہوں جو دعوت اسلامی کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہیں' چاہے وہ اس کے لئے جو صورت بھی اختیار کریں' یا جو اسلام کو قبول کرنے والوں کو کسی نہ کسی طرح نقصان پہنچاتی ہیں۔ اگر ایسی باتیں نہ ہوں تو پھر امن و سلامتی اسلام کی متاع گم گشتہ ہے۔ لیکن حضور ؐ کا یہ فرمان بھی ہمارے پیش نظر رہے کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔

---○○○---

اب ایک دوسرا گروہ سامنے آتا ہے اور اس کے ساتھ اسلام اس قسم کی رواداری کا رویہ اختیار نہیں کرتا جو مکمل طور پر غیر جانبدار لوگوں کے ساتھ اختیار کرتا ہے' اس لئے کہ یہ اصل منافقین کا گروہ ہے اور نفاق کے ساتھ ساتھ شریر بھی ہے۔ اور یہ فریق نہ کسی ایسی قوم سے ملا ہوا ہے جس کے ساتھ مسلمانوں کا عہد ہے اور نہ کسی حلیف قبیلے کے ساتھ ملحق ہے۔ اس گروہ کے بارے میں اسلامی مملکت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہی سلوک ہو گا جو اصل منافقین کے ساتھ ہو گا۔

سَتَجِدُونَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَ يَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَ يُلْقُوْۤا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَ يَكُفُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَ اُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾

(ایک اور قسم کے منافق تمہیں ایسے ملیں گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی' مگر جب

کبھی فتنہ کا موقعہ پائیں گے اس میں کود پڑیں گے۔ایسے لوگ اگر تمہارے مقابلے سے باز نہ رہیں اور صلح و سلامتی تمہارے آگے پیش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو جہاں وہ ملیں انہیں پکڑو اور مارو' ان پر ہاتھ اٹھانے کے لئے ہم نے تمہیں کھلی حجت دے دی ہے)

ابن جریر نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ یہ آیت اہل مکہ میں سے ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے' یہ لوگ حضور اکرم ؐ کے پاس آتے تھے اور ریاکاری کے طور پر مسلمان ہو جاتے تھے اور پھر قریش کے پاس واپس ہوتے تو الٹے پاؤں پھر کر دوبارہ بتوں کی پوجا شروع کر دیتے تھے۔ان کا مقصد اس پالیسی کے اختیار کرنے سے یہ تھا کہ ادھر بھی امن سے رہیں اور ادھر بھی امن سے رہیں۔تو اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے بارے میں یہ حکم دیا کہ اگر وہ اپنی یہ پالیسی چھوڑ کر اصلاح پذیر نہیں ہوتے تو انہیں قتل کر دیا جائے۔اس طرح اللہ کا یہ فرمان کہ اگر وہ تمہارے مقابلے سے باز نہ آئیں اور تمہارے سامنے مکمل صلح و سلامتی پیش نہ کریں اور تمہارے ساتھ جنگ سے ہاتھ نہ روکیں تو تمہیں اختیار ہے کہ تم انہیں پکڑ کر قید کر دو' اور جہاں بھی تمہیں ملیں وہاں پر انہیں قتل کر دو' اس لئے کہ ان پر حجت تمام ہو گئی ہے۔

یہ اسلام کا ایک حقیقت پسندانہ اور دو ٹوک پہلو ہے' جبکہ اس سے قبل کی دفعہ میں رواداری اور چشم پوشی سے کام لینے کی تلقین کی گئی تھی۔ ہر پالیسی اپنی جگہ پر مناسب اور ضروری تھی۔واقعات اور حالات کے تقاضوں کے مطابق مختلف موقف اور پالیسیاں اختیار کی گئیں۔

اس انداز میں اسلام کی بین الاقوامی پالیسی کے ان دو صفحات کے مطالعے سے ایک مسلم کے شعور میں بہت ہی اچھی طرح توازن پیدا ہوتا ہے۔نیز اس سے اسلامی نظام زندگی کے اندر بھی توازن پیدا ہوتا ہے اور یہ توازن اور ہم آہنگی اسلامی نظام زندگی کی اساسی اور امتیازی صفت ہے۔لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں ایک طرف سخت متشدد اور پر جوش لوگ ہیں جو ہر وقت مرو اور مارو کے لئے تیار رہتے ہیں حالانکہ یہ اسلام کی پالیسی نہیں ہے۔دوسری جانب نہایت ہی کمزور کردار کے پگھلنے والے لوگ ہیں جو سرے سے اسلام میں جہاد ہی کے قائل نہیں۔یہ لوگ اسلام کے بارے میں اس انداز سے بات کرتے ہیں گویا اسلام ایک ملزم ہے جو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہے اور یہ لوگ اس خطرناک ملزم کا مقدمہ لڑ رہے ہیں۔یہ لوگ اسلام میں صرف رواداری' امن' چشم پوشی اور عفو و درگزر ہی پاتے ہیں اگر اسلام میں کوئی جنگ ہوئی ہے تو یہ لوگ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ جنگ اسلامی حکومت اور اسلامی تحریک کے لئے ایک دفاعی جنگ تھی اور یہ اس مقصد کے لئے نہ تھی کہ دعوت اسلامی کی راہ سے رکاوٹیں دور ہوں اور اس کی تبلیغ دنیا کے چپے چپے پر بلا روک ٹوک کی جا سکے۔ان لوگوں کے نزدیک یہ مقصد بھی نہ تھا کہ اس کرۂ ارض کے کونے کونے پر وہ تمام لوگ پرامن زندگی بسر کریں' جنہوں نے اسلامی نظریہ حیات کو قبول کر لیا ہے۔نیز ان لوگوں کے نزدیک اس پالیسی کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ دنیا کے اندر ایک ایسا نظام مملکت ہو اور ایک ایسا قانونی اور دستوری نظام ہو جس کے تحت لوگ مکمل نظریاتی آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں' جو عقیدہ چاہیں اختیار کر سکیں' حالانکہ ایسے لوگوں کی سوچ ہرگز اسلامی سوچ نہیں ہے اور نہ یہ اسلام کی حقیقی پالیسی ہے....

اسلام نے جو درج بالا بین الاقوامی اصول دیئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی حقیقی پالیسی کیا ہے؟

---OOO---

یہ تو تھے مسلمانوں کے تعلقات دوسرے بین الاقوامی ممالک اور کیمپوں کے ساتھ۔ رہے مسلمانوں کے باہم تعلقات

امت مسلمہ کے اندر، تو اگرچہ وہ بالکل مختلف ممالک کے باشندے ہوں اور اس وقت صورت حال ایسی تھی کہ مسلمان مختلف ممالک میں رہتے تھے، جس طرح آج وہ مختلف ممالک میں رہتے ہیں، تو ان کے درمیان قتل و مقاتلہ قطعاً" حرام ہے۔ کسی مسلمان کو صرف حد یا قصاص ہی میں قتل کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ دنیا میں ایسی کوئی چیز یا سبب نہیں ہے جو مسلمانوں کے عقیدے اور نظریے سے زیادہ اہم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مسلمان کو کسی صورت میں یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ دوسرے مسلم کو ناحق کو قتل کرے اس لئے کہ ان کے درمیان نظریہ حیات اور عقیدے کے اتحاد کا زبردست تعلق پایا جاتا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مسلم کے ہاتھوں دوسرے مسلمان کا قتل خطا کے طور پر ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں قتل خطا کے بارے میں قانون سازی کو ضروری سمجھا گیا۔ رہا قتل عمد تو اس کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسلام مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کے ناحق قتل کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ فعل حدود اسلام سے باہر کا فعل ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ
مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ
يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ
مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ
اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ
مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾ وَمَنْ يَّقْتُلْ
مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ
لَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

(کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسرے مومن کو قتل کرے، الا یہ کہ اس سے چوک ہو جائے۔ اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کر دے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے، الا یہ کہ وہ خون بہا معاف کر دیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم سے تھا جس سے تمہاری دشمنی ہو تو اس کا کفارہ ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے اور اگر وہ کسی ایسی غیر مسلم قوم کا فرد تھا جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس کے

وارثوں کو خون بہا دیا جائے گا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہو گا۔ پھر جو غلام نہ پائے وہ پے در پے دو مہینے روزے رکھے ۔ یہ اس گناہ پر اللہ سے توبہ کرنے کا طریقہ ہے اور اللہ علیم و دانا ہے ۔ رہا وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لئے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے)۔

ان احکام کا تعلق چار قسم کے حالات سے ہے ۔ تین کا تعلق جرم قتل خطا سے ہے ۔ یہ قتل دار الاسلام کے اندر بھی وقوع پذیر ہو سکتا ہے اور بین الاقوامی طور پر بھی ایسے افراد کے درمیان ہو سکتا ہے جو مختلف ممالک کے شہری ہوں ۔ چوتھی حالت کا تعلق قتل عمد بین المسلمین سے ہے جسے اسلام بالکل بعید الوقوع سمجھتا ہے ۔ اسلام مسلمانوں سے یہ توقع کرتا ہے کہ یہ جرم واقع ہی نہ ہو۔ اس لئے کہ اگر پوری دنیا کے مفادات کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دوسری جانب ایک بے گناہ مسلم کا خون رکھا جائے تو دم مسلم کا پلڑا بھاری ہو گا۔ اسلام اس دنیا میں کسی ایسی حالت کا تصور نہیں کرتا جس میں ایک مسلمان کی جانب سے مسلمان کے قتل کا جواز پیدا ہوتا ہو۔ اسلام ایک مسلمان اور دوسرے مسلمان کے درمیان اس قدر سنجیدہ' اس قدر گہرے' اس قدر عظیم' اس قدر قیمتی' اس قدر عزت و احترام کے تعلقات پیدا کرتا ہے کہ وہ یہ فرض ہی نہیں کرتا کہ ان کے درمیان تعلقات اس قدر خراب بھی ہو سکتے ہیں کہ نوبت قتل مقاتلے تک پہنچ جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید سب سے پہلے قتل خطا سے بات شروع کرتا ہے ۔

(وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا (۴ : ۹۲)) (مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ دوسرے مومن کو قتل کرے' الا یہ کہ اس سے چوک ہو جائے)۔ اسلامی شعور میں صرف اس صورت کا تصور آسکتا ہے کہ بھول چوک سے یہ جرم واقع ہو سکتا ہے ۔ یہی حقیقی احتمال ہے' اس لئے کہ کسی مسلمان کا دوسرے مسلمان کے پڑوس میں رہنا ایک عظیم بات ہے ۔ یہ ایک عظیم نعمت ہے' بہت ہی عظیم ۔ لہٰذا اسلامی شعور اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کوئی مسلم دوسرے مسلم کو اپنے پڑوس سے علیحدہ کر دے اور یہ تو بہت ہی بری بات ہوگی کہ وہ قصداً" وارادتاً" ایک مسلمان کے خلاف قتل کے لئے ہاتھ اٹھائے اس لئے کہ یہ اس کرۂ ارض پر ایک مسلمان کے لئے ایک نہایت ہی قیمتی سرمایہ ہے ۔ اس قیمتی سرمائے کے بارے میں صرف مسلمان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس کی قدر و قیمت کو جانے ۔ اس لئے اسلامی اخلاقیات میں یہ بات بہت ہی مشکل ہے کہ ایک مسلم' مسلم کو قتل کر دے ۔ یہ وہ معاملہ ہے جسے صرف اہل اسلام اور اسلام دوست ہی سمجھ سکتے ہیں ۔ وہ اپنے نفس اور اپنے شعور کے اندر اس کا احساس رکھتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی بھائی چارے کے ذریعے اہل اسلام کو یہ اخوت سکھائی ہے ۔ یہی وہ برادری ہے جس کی وجہ سے وہ سب رسول اللہ ؐ کے گرد جمع ہیں ۔ رسول اللہ ؐ کے بعد یہ نظریہ ان کو اللہ کے نام پر جمع اور متحد رکھتا ہے ۔ ان کے درمیان اسلامی اخوت اور محبت پیدا ہوتی ہے اور یہ سب کچھ زبانی ہدایات کی وجہ سے ہے ۔

اگر قتل خطا واقعہ ہو جائے تو اس کی تین حالتیں ہیں اور تینوں کے احکام یہاں بیان ہو گئے ہیں ۔

پہلی حالت یہ ہے کہ کسی مومن کے ہاتھوں غلطی سے دار الاسلام کے اندر دوسرا مومن قتل ہو جائے اور اس کا خاندان بھی مسلمان ہو۔ اس صورت مین اسے ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہو گا اور پوری دیت اس مسلمان کے خاندان کو

ادا کرنی ہوگی۔ایک مومن غلام کو آزاد کرنے کا تاوان گویا اسلامی معاشرے کو اس کے نقصان کی تلافی کے طور پر ادا کرے گا۔ اس لئے غلام کو آزاد کر کے اس نے ایک مردہ انسان کو آزادی دلا کر زندہ کر دیا۔اس طرح گویا وہ کئی غلاموں کو آزاد کر دے گا۔رہی دیت تو اس کی وجہ سے مقتول کے ورثا کے جذبات ٹھنڈے ہوں گے۔لیکن اس معاوضے کے فرض کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام مقتول کے خاندان کو یہ اشارہ بھی دیتا ہے کہ اگر وہ دیت معاف کر دیں تو یہ ان کے حق میں اچھا ہے بشرطیکہ ان کے دل برضا اس کے لئے تیار ہوں۔ اسلامی معاشرے اور اسلامی اخوت کے لئے عفو و درگزر نہایت ہی مفید عمل ہے۔حکم ہوتا ہے۔

(وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا

(٤ : ٩٢)) (اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کر دے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے الا یہ کہ وہ خون بہا معاف کر دیں)۔

دوسری صورت یہ ہے کہ قتل خطا کا جرم ایک مومن پر واقع ہو اور اس کے وارث دارالاسلام کے ساتھ محارب ہوں۔اس حالت میں دارالاسلام کے نقصان کا معاوضہ یہ ہو گا کہ قاتل کو ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہو گا لیکن اس کے محارب خاندان کو دیت ادا نہ ہوگی کیونکہ اس صورت میں وہ اس دیت کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کریں گے اور یہاں یہ صورت بھی نہیں ہے کہ مقتول کے اہل و عیال کی دلجوئی مطلوب ہے یا ان کے ساتھ محبت کے رشتوں کی بحالی مطلوب ہے اس لئے کہ وہ مسلمانوں کے دشمن ہیں اور ان سے برسرپیکار ہیں۔

تیسری حالت یہ ہے کہ مقتول کے وارث معاہد ہوں' ان کے ساتھ معاہدۂ امن ہو یا معاہدۂ دوستی ہو' ایسے حالات میں قرآن کریم نے مقتول کے مومن ہونے کی شرط عائد نہیں کی۔اس لئے بعض فقہاء اور مفسرین نے اس حالت میں آیت کے حکم کو مطلق رکھا ہے اور حکم دیا ہے کہ ایسے حالات میں بھی قاتل کو ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہو گا اور مقتول کے وارثوں کو دیت ادا کرنی ہوگی اگرچہ یہ مقتول مومن نہ ہو' اس لئے کہ مومنین کے ساتھ معاہدہ کرنے کی وجہ سے ان کے جان و مال کو بھی مومنین کی جان و مال کے ساتھ مساوی درجہ حاصل ہو گا۔

لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ آغاز کلام سے بات ایک مومن کے قتل کے بارے میں چلی ہے۔آیت ہے "مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ مومن کو قتل کرے' الا یہ کہ اس سے چوک ہو جائے۔" اس کے بعد وہ حالات بیان ہوئے ہیں جن میں مقتول مومن ہو اور دوسری حالت میں جب مقتول کا تذکرہ ہوا پھر کہا گیا۔ (فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ) (اگر وہ ایسی قوم کا فرد ہو جو تمہاری دشمن ہے لیکن ہو مومن) یہاں (وَهُوَ مُؤْمِنٌ) اس لئے کہا گیا کہ اس سے پہلے (مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ) کے الفاظ آئے تھے۔اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ تیسری حالت کی دیت میں بھی (رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ) کی شرط ہے۔اگر مقتول میں مومن شرط نہ ہوتی تو رقبہ میں بھی مومن شرط نہ ہوتی صرف تحریر رقبہ کا لفظ ہوتا۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقتول یہاں بھی مومن ہے' ورنہ کفارہ میں بھی ایمان کی شرط نہ ہوتی۔

روایات میں آتا ہے کہ اہل معاہدہ میں سے بعض لوگوں کی دیت حضور اکرم ؐ نے ادا فرمائی مگر آپ نے یہ حکم نہیں

دیا کہ مومن غلاموں کو آزاد کیا جائے (ایسی کوئی روایت نہیں ہے) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مقتول معاہد مومن نہ ہو تو صرف دیت واجب ہے اور یہ دیت اس آیت کی رو سے ثابت نہیں بلکہ حضور ؐ کے عمل سے ثابت ہے۔ اور اس آیت میں جن تین صورتوں کا ذکر ہوا ہے وہ تمام صورتیں قتل مومن سے متعلق ہیں چاہے وہ مومن دارالاسلام کا باشندہ ہو یا کسی محارب قوم کا باشندہ ہو اور دارالحرب میں ہو یا ان کے درمیان معاہدہ ہو۔ چاہے امن کا معاہدہ ہو یا حلیف ہونے کا معاہدہ ہو۔ یہ تفسیر سیاق کلام کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

---ooo---

یہ تو تھا حکم قتل خطا کا، رہا قتل عمد تو یہ قتل اس قدر بڑا گناہ ہے کہ ایمان کے ساتھ اس کے ارتکاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کا کفارہ نہ دیت سے ہوتا ہے اور نہ غلام آزاد کرنے سے یہ گناہ معاف ہو سکتا ہے۔ اس شخص کی سزا یہ ہے کہ وہ اللہ کے عذاب کے حوالے ہو گا۔

(وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (٤ : ٩٣)) (وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لئے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے)۔

یہ جرم قتل ہے، لیکن صرف کسی جان کے خلاف ہی نہیں بلکہ یہ ایک عظیم، مکرم، محبوب ترین اور عزیز ترین اخوت اسلامی کا بھی قتل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ایک مومن اور دوسرے مومن کے درمیان پیدا کیا تھا۔ یہ قتل ناحق، ہی نہیں نظریہ حیات اور ایمان کی بھی نفی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے کئی مقامات کے اندر اسے شرک کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اور بعض سلف نے یہ رائے اختیار کی ہے کہ یہ توبہ کے ذریعے بھی معاف نہ ہو گا۔ حضرت ابن عباس کی رائے یہی ہے۔ البتہ بعض دوسرے علماء کی رائے یہ ہے کہ معافی ہو سکتی ہے اور انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ (اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ) (اللہ تعالیٰ اس بات کو معاف نہیں کرتے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اور اس کے سوا وہ جسے چاہے بخشتا ہے) اس لئے قاتل اگر توبہ کرے تو اس کی مغفرت کی امید کی جا سکتی ہے۔ ایسے لوگوں نے خلود کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ اس سے مراد طویل زمانہ ہے۔

وہ لوگ جنہوں نے پہلے اسلامی مدرسہ میں تربیت پائی تھی وہ اپنے آباء و اجداد، بیٹوں اور بھائیوں کے ان قاتلوں کو بچشم سر دیکھ رہے تھے، جنہوں نے یہ قتل اسلام سے پہلے کئے تھے اور اب اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض کے دلوں میں وہ تلخیاں دوبارہ تازہ ہو جاتی تھیں لیکن وہ ان لوگوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچتے بھی نہ تھے۔ وہ کبھی بھی انتقام کے بارے میں نہ سوچتے تھے اور نہایت ہی سخت حالات اور سخت چبھن کے وقت بھی ان کے دل میں قتل کا خیال تک نہ آتا تھا۔ بلکہ ایسے لوگوں کو اسلام نے جو حقوق دیئے تھے، وہ ان میں سے کسی حق کو بھی مارنے کی کوشش نہ کرتے تھے۔

کسی مومن... کر... سے بچنے کی خاطر اگرچہ چوک سے ہو، ور مسلمانوں کے ...لوں کو تمام خواہشات سے پاک کرنے

کی خاطر اور ان کے سامنے صرف فی سبیل اللہ جہاد کرنے کے مقصد کو اچھی طرح اجاگر کرنے کی خاطر مسلمانوں کو اب حکم دیا جاتا ہے کہ اگر وہ جہاد و قتال کے لئے نکلیں تو جنگ شروع کرنے سے پہلے یہ بات معلوم کرلیں کہ آیا لوگ مسلمان ہیں یا نہیں اور اگر کوئی بظاہر اظہار اسلام کر دے اور السلام علیکم کہہ دے تو حملہ نہ کریں۔ اس لئے کہ جنگ کے حالات میں وہ تفتیش نہیں کر سکتے کہ آیا یہ اظہار اسلام حقیقت پر مبنی ہے یا نہیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ كَذَلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿۹۴﴾

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلو تو دوست دشمن میں تمیز کرو اور جو تمہاری طرف سلام سے تقدیم کرے اسے فوراً نہ کہہ دو کہ تو مومن نہیں ہے۔ اگر تم دنیوی فائدہ چاہتے ہو تو اللہ کے پاس تمہارے لئے بہت سے اموال غنیمت ہیں۔ آخر اسی حالت میں تم خود بھی تو اس سے پہلے مبتلا رہ چکے ہو' پھر اللہ نے تم پر احسان کیا' لہٰذا تحقیق سے کام لو' جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے)۔

اس آیت کے نزول کے بارے میں کئی روایات وارد ہوئی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے گشتی دستے کو ایک شخص ملا جس کے ساتھ اس کی بکریاں بھی تھیں۔ اس شخص نے اس فوجی دستے کو السلام علیکم کہا۔ مقصد یہ تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ اس نے السلام علیکم محض اپنے آپ کو بچانے کے لئے کہا ہے۔ اس لئے انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس طرح نہ کریں۔ یوں ان کے دلوں سے تمام مفادات کا تصور ہی نکال دیا۔ ان کو یہ تاثر دیا گیا کہ وہ کسی فیصلے میں جلد بازی نہ کریں۔ اسلام ان دونوں باتوں کو پسند نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو یاد دلاتے ہیں کہ وہ دور اور وہ زمانہ دور تو نہیں ہے کہ تم بھی اسی جاہلیت کے اندھیروں میں تھے جس میں تمہارے فیصلے نہایت ہی جلد بازی اور سرکشی پر مبنی ہوتے تھے' تم صرف دولت کے متلاشی تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جتلاتے ہیں کہ یہ اسی کا احسان تھا کہ اس نے تمہارے دلوں کو پاک کر دیا اور تمہارا نصب العین بلند ہو گیا۔ اور اب وہ جاہلیت کی طرح دنیاوی مفادات کے لئے جہاد نہیں کر رہے اور یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے قانونی حدود اور ضابطے مقرر کئے اور اب یہ صورت نہیں ہے کہ پہلا اشتعال ہی آخری فیصلے صادر کر دے جس طرح جاہلیت میں ہوا کرتا تھا۔

اس آیت میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ دیکھو ایک وقت تھا کہ تم خود اپنی قوم سے اپنے ایمان کو چھپاتے تھے اس لئے کہ تم کمزور تھے اور خوفزدہ تھے۔ صرف مسلمانوں کو پتہ ہوتا تھا کہ کون مسلمان ہے اور کون نہیں۔ یہ مقتول اپنی قوم سے

اسلام کو چھپا رہا تھا اور جب وہ مسلمانوں سے ملا تو اس نے اپنا اسلام ظاہر کر دیا اور السلام علیکم کہا۔

(كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا

(۴ : ۹۴) (اسی حالت میں تم خود بھی تو اس سے پہلے مبتلا رہ چکے ہو' پھر اللہ نے تم پر احسان کیا' لہذا تحقیق سے کام لو' جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے)۔

یوں اسلام دل کی دنیا کو جھنجوڑتا ہے تاکہ دل زندہ ہوں' محتاط ہوں اور اللہ کی نعمت عظیمہ کا احساس کریں۔ اور اس احساس 'خدا ترسی کے سائے میں اللہ کے احکام و قوانین کو نافذ کریں اور حالات کی اچھی طرح چھان بین کرنے کے بعد فیصلے کریں۔ آپ نے دیکھا کہ اس سبق میں بعض مقامی اور بین الاقوامی معاملات کو کس قدر شرح و بسط اور تفصیل سے لیا گیا ہے اور بالکل نئے میدان میں یہ قانون سازی کی گئی ہے۔ کس قدر پاکیزہ جذبے اور پاکیزہ اہداف کے ساتھ اور یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے یہ کام ہوا تھا جبکہ دنیا میں قانون بین الاقوام کا وجود ہی نہ تھا۔

---ooo---

درس نمبر ۳۸ ایک نظر میں

یہ سبق درس سابق اور اس سے بھی پہلے ایک سبق کے ساتھ گہری وابستگی رکھتا ہے اور اسی کے ساتھ پیوستہ ہے۔ گویا یہ ان دونوں اسباق کا تکملہ ہے۔ اگر بین الاقوامی معاملات اور قانون بین الاقوام کا پہلو پیش نظر نہ ہوتا' جس طرح اسلام نے پہلی بار اس شعبے میں قانون سازی کی تو ہم ان تینوں درسوں کو ایک درس شمار کرتے۔ کیونکہ ان کا موضوع اور مضمون ایک ہی ہے۔ اس سبق کا اساسی مضمون یہ ہے کہ تمام مسلمان ہجرت کر کے دارالاسلام میں جمع ہو جائیں۔ ابھی تک جو لوگ دارالحرب اور دارالکفر میں رہ گئے ہیں وہ فوراً ہجرت کریں اور دارالاسلام میں پہنچ کر جان و مال سے جہاد کریں اور مکہ میں انہیں نسبتاً جو آرام ہے اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے ہیں اور وہاں انہیں جو سہولتیں حاصل ہیں' انہیں چھوڑ دیں۔ اور یہی مقصد اس سبق کے افتتاحی کلمات میں ہے جن میں کہا گیا ہے :

(لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا (۹۵)

(مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہ نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے' اگرچہ ہر ایک کے لئے اللہ نے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے 'مگر اس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے۔) مدینہ میں تو کوئی بیٹھنے والا نہ تھا۔ مدینہ میں جہاد سے رکنے والے یا تو منافقین تھے یا وہ لوگ تھے جو روڑے اٹکاتے تھے اور دونوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے درس سابق میں بات کی ہے۔

ہاں اس آیت کے متصلاً بعد دوسری آیت میں ان لوگوں کو سخت تنبیہ کی گئی ہے جو ابھی تک دارالکفر میں بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ ہجرت کر کے مدینہ منتقل ہونے کی پوری پوری قدرت رکھتے ہیں اور ایسے ہی حالات میں وہ فوت ہو جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے جو بہت ہی بری جگہ ہے۔

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ضمانت دیتا ہے جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرتے ہیں اور یہ اسی وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب وہ گھر سے نکل پڑتے ہیں بشرطیکہ وہ یہ ہجرت خالصتہً اللہ کے لئے کرتے ہوں۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے ان کے وہ تمام خدشات دور کر دیئے ہیں جو یہ اقدام کرنے سے پہلے ان کو لاحق ہوتے ہیں' نیز اس وقت جو خطرات درپیش تھے اور جو

خوفناک حالات تھے ان حالات میں ہمت کرنا مشکل اور تشویش کا باعث تھا۔

ہجرت اور جہاد پر بات مزید آگے بڑھتی ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ دار الہجرت میں مسلمانوں کا باہم معاملہ کیا ہو گا اور دار الہجرت سے باہر دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا تعلق ہو گا۔ خصوصاً ان مسلمانوں کا انجام کیا ہو گا جو ہجرت نہیں کرتے ۔

اس سبق میں حالت خوف میں نماز کی کیفیات کا بھی ذکر ہے ۔ مثلاً ہجرت کے سفر کے دوران نماز اور میدان جنگ میں نماز' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی اسلام میں کس قدر اہمیت ہے کہ ایسے خطرناک حالات میں بھی اس کی معافی نہیں ہے ۔ نیز مسلمانوں کے اندر ایسی حالت پیدا کی جاتی ہے کہ وہ ذہنی طور پر ہروقت جنگ کے لئے تیار رہیں کیونکہ حالات ایسے ہیں کہ معمولی غفلت اور لاپرواہی سے دشمن سخت فائدہ اٹھا سکتا ہے ۔

آخر میں یہ سبق نہایت ہی موثر لیچ دیتا ہے اور مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ابھارتا ہے کہ ٹھیک ہے کہ تم کو نہایت ہی المناک مصائب کا سامنا ہے لیکن دشمنوں کی حالت بھی کوئی اچھی نہیں ہے اور ان کے نصب العین اور تمہارے نصب العین اور ان کی امیدوں اور تمہاری امیدوں میں فرق ہے ۔

(وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ (٤ : ١٠٤) (اس گروہ کے تعاقب میں کمزوری نہ دکھاؤ ۔ اگر تم تکلیف اٹھا رہے ہو تو تمہاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں اور تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں) ۔

اس تصویر کشی کے ساتھ ہی دونوں گروہوں کے راستے علیحدہ ہو جاتے ہیں ۔ دونوں کے منہاج علیحدہ ہو جاتے ہیں ۔ ہر دکھ اور ہر تکلیف مسلمانوں کے لئے آسان ہو جاتی ہے ۔ مسلمانوں کے دلوں سے سستی اور تھکاوٹ کا احساس ہی ختم ہو جاتا ہے اس لئے کہ آخر مخالف کیمپ کو بھی تو مشکلات کا سامنا ہے جبکہ ان کو اللہ کی جانب سے وہ امید نہیں ہے جو مسلمانوں کو ہے ۔

اس سبق میں جن موضوعات پر بات ہوئی ہے اور جو اسلوب تربیت اپنایا گیا ہے اس کے اندر یہ بتایا گیا ہے کہ جماعت مسلمہ کی تکوین و تشکیل کے اندر جو تغیرات ہو رہے تھے اور جماعت کی عملی تشکیل میں جو مشکلات پیش آ رہی تھیں اور جو نظریاتی اور عملی رکاوٹیں تھیں ان سے تحریک اسلامی کس طرح نمٹ رہی تھی ۔ لوگوں کے ذہنوں میں جو خدشات پیدا ہو رہے تھے اور جس طرح وہ کمزوری کا باعث بن رہے تھے یا سوسائٹی اور افراد جماعت کے نفوس کے اندر جاہلیت کے جو آثار باقی تھے اور وہ جس طرح مشکلات کا باعث بن رہے تھے نیز تحریک اسلامی کی راہ میں آنے والی نئی نئی مشکلات اور مصیبتوں کے باعث ذات انسانی کے قدرتی طور پر متاثر ہو جانے کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہو رہے تھے اور ان مشکلات کے باوجود جو لوگ وفاداری بشرط استواری پر اپنے آپ کو قائم رکھے ہوئے تھے' ایسے تمام مناظر و مشاہد کی تصویر کشی اس سبق میں کی گئی ہے ۔ ان تمام مسائل کو قرآن کے حکیمانہ منہاج نے لیا ہے اور انسانی ضمیر کو آمادہ کیا ہے اور جوش دلایا ہے کہ وہ ان مشکلات سے عہدہ برآ ہو۔

یہ تمام باتیں اصل صورت حال کا صحیح نقشہ کھینچ کر بتائی گئی ہیں ۔ اور ان کا اظہار حوصلہ افزائی اور جوش دلانے کے موثر انداز سے بھی ہوتا ہے اور اس علاج سے بھی ہوتا ہے جو فطری خدشات اور عملی مشکلات کے حل کے طور پر تجویز کیا گیا ہے ۔ نیز عین میدان کارزار میں نماز پر جم جانے کے عمل سے بھی اس کا اندازہ اچھی طرح ہو جاتا ہے جبکہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عین نماز کے

وقت بھی وہ دشمن پر نظر رکھیں ۔ پھر مہاجرین کو ثواب دارین کی ضمانت دی گئی ہے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں نکلتے ہیں ان کے لئے اجر اور کافروں کے لئے سخت دردناک عذاب کے اعلان کے ذریعے ان تمام آلام و مشکلات کی تصویر سامنے آتی ہے ۔

اس سبق سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی نفس کے ساتھ 'اس کی کمزوری کی حالت میں اور اس کی قوت کی حالت میں کس طرح برتاؤ فرماتا ہے ۔ نیز ایک انسانی جماعت کی تشکیل اور تربیت کس طرح کی جاتی ہے اور اس اسٹیج پر اس کے ساتھ معاملہ کس طرح کیا جاتا ہے ۔ اس سلسلے میں ایک ہی آیت میں متعدد خطوط سامنے آتے ہیں ۔ چند لفظوں میں جماعت کے دلوں کے اندر اس کی قوت اور برتری کا احساس اور شعور بھر دیا جاتا ہے اور اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اسے اپنا دشمن حقیر نظر آنے لگتا ہے اور ساتھ ساتھ اسے خطرے کے مقابلے میں احتیاط' بیداری اور بروقت تیاری کا حکم بھی دیا جاتا ہے جبکہ اسی آیت میں ان مقامات کی نشاندہی بھی کر دی جاتی ہے جہاں کمزوری ہے ۔ اور مقامات کمزوری کے بارے میں شدید اور نہایت ہی سخت ہدایات بھی دی جاتی ہیں ۔

یہ ایک عجیب منہاج ہے 'نہایت ہی مکمل اور انسانی نفسیات کے عین مناسب ۔ نفس انسانی کی لوح پر نئے خطوط کھینچے جاتے ہیں اور مختلف نقاط کے درمیان نئے وتر قائم ہوتے ہیں اور یہ تمام تاریں زمزمہ آرا ہیں اور ہر تار مضراب ربانی کی ضرب پر فوراً حرکت میں آتی ہے ۔

واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ تمام موجودہ سوسائٹیوں سے مدینہ کی اسلامی سوسائٹی اپنے منہاج تربیت کے اعتبار سے اور اپنی اجتماعی تنظیم کے اعتبار سے بہت بڑی فوقیت رکھتی ہے اور اس تفوق کا مشاہدہ اس وقت کی پوری انسانیت بچشم سر کر رہی تھی اور یہ دیکھ رہی تھی کہ یہ نوخیز سوسائٹی ان مشکل حالات میں ایک طرف تو اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا علاج کر رہی ہے اور دوسری جانب اپنے اردگرد پھیلی ہوئی جاہلی سوسائٹیوں کو کھاتی چلی جاتی ہے ۔ وہ بتدریج ان پر غالب ہوتی جا رہی ہے اور یہ غلبہ محض جنگی غلبہ نہیں بلکہ یہ ایک تہذیبی غلبہ ہے جس طرح جوان تہذیب بوڑھی اور ازکار رفتہ تہذیبوں کو کھاتی چلی جاتی ہے ۔ ایک نیا نظام ہے جو پرانے نظاموں پر غالب ہو رہا ہے ۔ زندگی کا ایک نیا ماڈل دنیا کے سامنے شوروم میں سجایا گیا ہے ۔ ایک جدید دور اور ایک جدید انسان پیدا ہو رہا ہے ۔ اس قدر تبصرے کے بعد اب آیات و نصوص کا سامنا کریں ۔

---○○○---

درس نمبر ۳۸ تشریح آیات

۹۵ -- تا -- ۱۰۴

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي
الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ
الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ
الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ
مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾

(مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں' دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے ۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہ نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے ۔ اگرچہ ہر ایک کے لئے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے' مگر اس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے ۔ ان کے لئے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے' اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)۔

اس آیت میں' اسلامی معاشرے کی ایک خاص صورت حال پر بحث کی گئی ہے ۔ اس وقت مسلمانوں کی صفوں میں بعض لوگوں کی طرف سے سستی پیدا ہو رہی تھی ۔ وہ اسلامی انقلاب کی راہ میں جان اور مال کی قربانی نہ دے رہے تھے ۔ یہ لوگ وہ تھے جو مکہ میں اپنی دولت بچانے کے لئے ہجرت میں تاخیر کر رہے تھے' اس لئے کہ اہل مکہ کسی مہاجر کو اپنے ساتھ کوئی چیز لے جانے کی اجازت نہ دے رہے تھے ۔ یہ سستی اس وجہ سے بھی پیدا ہو رہی تھی کہ ہجرت کی راہ میں سخت مشکلات' مصائب اور خطرات تھے' اس لئے کہ مشرکین کمزور لوگوں کو سرے سے ہجرت کی اجازت ہی نہ دیتے تھے ۔ وہ انہیں پکڑ کر قید

کر دیتے' اذیت دیتے یا اگر پہلے سے اذیت دی جارہی ہوتی تھی تو جس کے بارے میں انہیں شبہ ہو جاتا کہ یہ بھاگنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اسے مزید سخت اذیت دی جاتی' چاہے ان آیات کا مدلول وہ لوگ ہوں جو دارالاسلام کو ہجرت کر کے منتقل نہ ہو رہے تھے ۔ (میں اسی رائے کو ترجیح دیتا ہوں) یا اس سے مراد خود دارالاسلام کے اندر موجود بعض لوگ ہو سکتے ہیں جو مالی اور جانی جہاد میں زیادہ پرجوش نہ تھے ۔ یہ لوگ ان لوگوں سے علیحدہ تھے جو جہاد کے معاملے میں سست رو اور پہلوتہی کرنے والے تھے اور جن کا ذکر سابقہ سبق میں ہو چکا ہے ۔ ہو سکتا ہے ان آیات کے معنی میں وہ سب لوگ شامل ہوں جو دارالاسلام میں تھے اور جہاد سے پہلوتہی کر رہے تھے اور منافق تھے' یا مسلمان تھے مگر سست تھے یا وہ تھے جو سرے سے ہجرت ہی نہ کر رہے تھے کہ جہاد کریں ۔ بہرحال بعض حلقے ایسے تھے جو سستی کر رہے تھے اور یہ آیت ایسی ہی صورت حال سے بحث کر رہی ہے ۔ البتہ قرآن اس آیت میں مراد لوگوں کی تخصیص نہ کرتے ہوئے ایک عام قاعدے کے طور پر اصولی بات کرتا ہے' جس کو زمان و مکان اور کسی ایک خاندان کی قید کے اندر مقید نہیں کیا جاتا اور بتاتا ہے کہ یہ اصول ہے کہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ اس کا اطلاق اہل اسلام پر کرے گا' کہ جو لوگ بغیر عذر بیماری اور لاچاری کے جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ نہیں لیتے' چاہے مالی جہاد ہو یا جانی اور اس کے لئے اگر ہجرت کی ضرورت ہو تو ہجرت نہیں کرتے اور اس کے مقابلے میں جو لوگ ہجرت کرتے ہیں اور جانی اور مالی قربانی دیتے ہیں وہ اللہ کے نزدیک ایک ہی مقام و مرتبہ کے نہیں ہو سکتے ۔ یہ ایک عام قاعدہ اور عام اصول ہے اور ہر زمان و مکان میں اس کا اطلاق ہو گا ۔

(لَا يَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ (۴:۹۵)) (مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں' دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے) ۔

اللہ تعالیٰ بات کو یہاں مجمل اور مبہم نہیں چھوڑتے بلکہ اس کی بھرپور وضاحت فرماتے ہیں اور یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ جانی اور مالی جہاد کرنے والوں کا درجہ بہت ہی بڑا ہے ۔

(فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَی الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً (۴:۹۵)) (اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہ نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے) ۔

مجاہدین کا جو درجہ اس آیت میں بیان ہوا ہے' رسول اللہ ؐ نے جنت میں ان کے مقام کی تفصیلات کو بتا کر واضح کیا ہے ۔ صحیحین میں ابو سعید الخدری کی حدیث میں ہے ۔ حضور ؐ نے فرمایا کہ جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کے لئے تیار فرمائے ہیں اور ہر ایک درجے ——— کے درمیان اس قدر مسافت ہے کہ جس طرح زمین اور آسمانوں کے درمیان فاصلہ ہے ۔

اعمش نے عمرو ابن مرہ سے روایت کی' جنہوں نے ابوعبیدہ کے واسطے سے حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت فرمائی ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ جس نے ایک تیر مارا اسے ایک درجے کا اجر ملے گا ۔ تو ایک شخص نے پوچھا کہ حضور ایک درجہ کس قدر ہو گا تو آپ ؐ نے فرمایا کہ یہ تمہاری ماں کے چوکھٹ یا سیڑھی کے مقدار کے برابر بہرحال نہ ہو گا ۔ دو

،، جوں کے درمیان سو سال کے سفر کا فاصلہ ہو گا۔حضور ؐ نے جس مسافت کا ذکر کیا ہے' آج کے دور جدید میں ہم اس کا تصور بڑی سہولت سے کر سکتے ہیں۔اس لئے کہ اس کائنات کے اندر ہمارا علم بڑی دوری تک جا پہنچا ہے۔ایک سیارے سے دوسرے سیارے تک روشنی کی رفتار سے بھی فاصلہ کئی نوری سالوں میں طے ہوتا ہے۔جو لوگ رسول خدا ؐ کی بات اس وقت سنتے تھے وہ تو (اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا) کہتے تھے لیکن ہم دور جدید کے لوگ تو ان فاصلوں کو ناپ چکے ہیں اور اس کائنات کے دور دراز فاصلوں کو قریب لا چکے ہیں اور عجیب و غریب معلومات سامنے آگئی ہیں۔

البتہ قرآن مجید میں مجاہدین فی سبیل اللہ کے درجات بلند کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ یہ بھی بتاتے ہیں کہ بغیر کسی عذر و مجبوری کے بیٹھنے والوں کے مقابلے میں اگرچہ مال و جان کے ساتھ جہاد کرنے والوں کے درجے بلند ہیں لیکن (وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى) (ہر ایک کے لئے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے) محروم کوئی بھی نہیں ہے۔بہرحال ایمان کا اپنی جگہ ایک بنیادی درجہ ہے۔ایمان کے تقاضے پورے کرنے والوں کے درجات حسب جدوجہد اور جہاد زیادہ ہیں۔خصوصاً جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کرنے والوں کے درجات سب سے بلند ہیں۔ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ درج بالا آیات میں بیٹھنے والوں سے مراد وہ منافقین نہیں ہیں جو جہاد سے پہلوتہی کرتے تھے یعنی (لمبطئین) البتہ یہ کچھ دوسرے لوگ تھے جو نہایت ہی صالح اور مخلص تھے لیکن جہاد فی المال اور جہاد فی النفس کے پہلو میں کمزور تھے۔ قرآن کریم کی ان آیات میں روئے سخن انہی لوگوں کی جانب ہے۔ان کو جوش دلایا جاتا ہے کہ وہ اپنی ان کوتاہیوں کی تلافی کریں۔چونکہ ان لوگوں میں بھلائی کا مادہ موجود ہے اس لئے ان سے لبیک کہنے کی امید کی جاسکتی ہے۔

یہ نوٹ اب ختم ہوتا ہے اور پہلے اصولی قاعدے کو اب پھر دہرایا جاتا ہے۔بہت ہی تاکید کے ساتھ' ذرا مزید کھول کر اسے بیان کیا جاتا ہے تاکہ اس کے بدلے میں جو عظیم اجر ہے لوگ اس کے لوٹنے کے لئے دوڑیں۔

(--- وَفَضَّلَ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا (۹۵) دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۹۶) (۴: ۹۵-۹۶))

(مگر اس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے' ان کے لئے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے' اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)۔

یہ عظیم تاکید' یہ خوبصورت وعدے' مجاہدین کی یہ عظیم قدردانی اور بیٹھنے والوں کے مقابلے میں برتری درجات اور اجر عظیم کے اعلیٰ مراتب کا ذکر جن کے لئے قلوب مومنین مشتاق رہتے ہیں۔پھر اللہ کی جانب سے تقصیرات اور گناہوں کی معافی کا یہ اعلان عام' غرض ان تمام باتوں سے دو امور کا اظہار ہوتا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہ آیات ایسے حالات میں نازل ہوئیں جو اس وقت اسلامی معاشرے میں عملاً موجود تھے اور یہ آیات ان کا مداوا کر رہی تھیں۔اس سے ہمیں ایک عمدہ سبق ملتا ہے وہ یہ کہ ہم انسانی فطرت کا صحیح طرح ادراک کر لیتے ہیں اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ انسانی جماعتوں کا مزاج کیا ہوتا ہے۔کوئی انسانی جماعت ایمان و عمل میں' تقویٰ و برتری کے

جس مقام پر بھی جا پہنچی ہو بہرحال اس پر ضعف ' حرص 'بخل اور کمزوریوں کے جو حالات بھی طاری ہوں اور فرائض اور خصوصاً جہاد کے فریضے میں اس سے جہاں بھی کوتاہی صادر ہو خواہ یہ کوتاہی جہاد بالمال کی ہو' جہاد بالنفس کی ہو یا فی سبیل اللہ جہاد میں خلوص کی کمی ہو تو ان کوتاہیوں کے ظہور کے وقت اسے تربیت اور اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اسے ضعف ' حرص ' بخل اور تقصیرات سے پاک کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے ۔ یہ پالیسی مناسب نہیں ہے کہ ہم مایوس ہو کر اصلاح کے کام کو چھوڑ دیں اور سوسائٹی اپنی موجودہ گراوٹ سے مزید پستی میں گرتی چلی جائے ۔ اور ہم یہ کہہ دیں کہ سوسائٹی کی یہ واقعی صورت حال ہے اور ہمیں چاہئے کہ اسے قبول کر لیں اور معاشرے کے اندر جو ضعف ' حرص ' لالچ اور کوتاہیاں ہیں انہیں جوں کا توں چھوڑ دیں ۔ اور یہ نعرہ لگائیں کہ یہ تو معاشرے کے اندر موجود صورت حال ہے ۔ معاشرہ گرا ہوا ہے اور اسے اسی حالت میں رکھ کر اس کے ساتھ معاملہ کرنا چاہئے اصل بات یہ ہے کہ ہم معاشرے کے اندر اصلاح کی دعوت جاری رکھیں اور قرآنی منہاج کے مطابق معاشرے کو بلند سے بلند تر کرنے کی سعی کریں ۔

دوسری جو بات ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کی کیا قدر و قیمت ہے ۔ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام زندگی کے مزاج کے اندر جہاد فی سبیل اللہ کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ اقامت دین کے طریقوں میں جہاد کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ۔ ہر دور میں دین کے مخالفین کا مقابلہ جہاد ہی کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے ۔ اس کے سوا اور کوئی کامیاب طریقہ نہیں ہے ۔

جہاد فی سبیل اللہ حضور اکرم ؐ کے دور تک ہی محدود نہیں ہے ۔ جس دور میں بھی دعوت اسلامی کا کام شروع ہو گا ' جہاد ضروری ہو گا ۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا نہایت ہی غلط ہے کہ آغاز اسلام کے وقت دنیا میں دو بڑی شہنشاہتیں تھیں ' اس لئے اس وقت اہل اسلام نے اپنے ماحول سے متاثر ہو کر یہ سوچا کہ ان کے زندہ رہنے کے لئے قوت قاہرہ کی ضرورت ہے تاکہ طاقت کا توازن قائم ہو ۔

جو لوگ یہ خیالات رکھتے ہیں 'معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اسلام کو اچھی طرح نہیں سمجھا ہے اور ان کے یہ خیالات محض ظن و تخمین پر مبنی ہیں ۔ لیکن اگر اسلام میں فریضہ جہاد اسی طرح عارضی حالات کی وجہ سے ہوتا تو کتاب اللہ میں اس کا اس انداز سے بار بار ذکر نہ کیا جاتا اور سنت رسول اللہ میں اس کی بار بار تاکید نہ کی جاتی ۔

اگر جہاد اسی طرح ایک وقتی بات تھی تو حضور اکرم ؐ یہ نہ فرماتے کہ "جو شخص مر جائے اور غزانہ کرے اور اس کے دل میں قتال فی سبیل اللہ کی خواہش بھی پیدا نہ ہو تو یہ شخص نفاق کی مختلف حالتوں پر سے ایک حالت میں مرے گا ۔" حضور ؐ کا یہ فرمان نہایت ہی عام اور کامل و شامل ہے ۔ جامع اور مانع ہے ۔

ہاں یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ حضور اکرم ؐ نے بعض انفرادی حالات میں بعض لوگوں کو جہاد کی اجازت نہیں دی اور وہ بھی محض ان کے مخصوص خاندانی حالات کی وجہ سے ۔ صحیحین میں یہ حدیث موجود ہے کہ ایک شخص جہاد میں شمولیت کی غرض سے آیا تو حضور اکرم ؐ نے سوال کیا 'کیا تمہارے والدین زندہ ہیں تو اس نے کہا ہاں ۔ تو حضور اکرم ؐ نے فرمایا تم ان دونوں میں جہاد کرو ۔"

یہ ایک شخص کے لئے اس کے انفرادی حالات کے مطابق فیصلہ تھا ۔ اس سے عام قاعدہ مخصوص نہیں ہوتا ۔ پھر لاتعداد مجاہدین کے ہوتے ہوئے ایک شخص کی بعض اوقات ضرورت نہیں ہوتی ۔ ایک فرد سے قلت پیدا نہیں ہوتی ۔ نیز حضور اکرم ؐ

ایک ایک شخص کے حالات سے باخبر رہتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم ؐ کو معلوم ہوا ہو کہ اس شخص کے والدین کو سہارے کی بہت زیادہ ضرورت ہے اس لئے آپ ؐ نے اسے یہ ہدایت فرمائی۔

لہٰذا اس ایک شخص کی وجہ سے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جہاد ایک وقتی عمل تھا۔ اور حضور ؐ کے دور کے ظروف و احوال کے مطابق ضروری تھا اور اب حالات بدل گئے ہیں اس لئے اب جہاد کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاد اس لئے فرض نہیں کیا گیا کہ اسلام کی پالیسی ہی یہ ہے کہ ننگی تلوار لے کر نکلو اور کفار سامنے آئیں ان کے سر گاجر مولی کی طرح کاٹتے چلے جاؤ۔ لیکن لوگوں کی عملی زندگی اور اس دعوت اور تحریک کا مزاج یہی ہے کہ تلوار ہمارے ہاتھ میں ہو اور ہم ہر وقت جہاد کے لئے تیار اور محتاط رہیں۔

اللہ تعالیٰ کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ اسلامی نظام حکومت ایک ایسا نصب العین ہے جسے بادشاہ لوگ پسند نہیں کرتے۔ اللہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ بر سر اقتدار لوگ ہمیشہ اسلام کی راہ روکیں گے اس لئے کہ اسلام ان کے طریق زندگی اور ان کے نظام زندگی کے خلاف ہے۔ یہ بات صرف کل تک محدود نہیں ہے۔ کل بھی اقتدار پر براجمان لوگ اسلامی نظام کو پسند نہ کرتے تھے اور آج بھی پسند نہیں کرتے اور کل بھی اسے پسند نہیں کریں گے۔ ہر زمان اور ہر مکان میں ایسا ہی ہو گا اور ایسا ہی ہو رہا ہے۔

اللہ کو علم تھا کہ شر اور بدی ہمیشہ خود سر اور بے حیا ہوتی ہے۔ بدی کبھی منصف نہیں ہوتی۔ بدی کا مزاج یہ ہے کہ وہ خیر اور نیکی کو پنپنے نہیں دیتی چاہے نیکی انتہائی پر امن اور دوستانہ طریقہ کار کیوں نہ استعمال کرے اس لئے کہ بھلائی کا پھیلنا ہمیشہ شر کے لئے خطرناک ہوتا ہے۔ حق کا وجود ہی باطل کے لئے خطرہ ہوتا ہے اور شر دست درازی کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا باطل کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ سچائی کا گلا گھونٹ دے اور اسے قوت کے بل بوتے پر ختم کر دے۔ یہ شر کی فطرت ہے اور شر پر یہ حالت عارضی طور پر طاری نہیں ہوتی..... یہ شر کی حقیقی فطرت اور طبیعت ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جہاد فرض کیا گیا ہے۔ ہر حالت میں جہاد فرض ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ جہاد انسان سب سے پہلے نفس کے خلاف شروع کرے۔ اس کے بعد اس کا میدان جنگ وسیع ہو اور اس ظاہری دنیا کے واقعات و حالات کے اندر عملاً بھی جہاد جاری ہو اور نظر آئے۔ یاد رہے کہ مسلح شر کے مقابلے میں مسلح خیر کی ضرورت ہے اور اگر باطل کے پاس دفاعی قوت ہے تو حق کو بھی مکمل طور پر تیار ہونا ضروری ہے۔ اگر باطل کے مقابلے میں تیاری نہ ہو گی تو سچائی خودکشی کرے گی اور اگر خودکشی نہ ہو گی تو محض گپ شپ ہو گی جو مومنین کے شایان شان نہیں ہے۔

اسلام کی راہ میں جان و مال کی قربانی ضروری ہے۔ یہی اللہ کا مطالبہ ہے' اور اللہ نے تو اہل ایمان کے مال اور جان کو جنت کے بدلے خرید لیا ہے۔ یا تو وہ غالب رہیں گے یا درجہ شہادت پائیں گے۔ یہ ہے اللہ کا حکم اور اسی میں حکمت پوشیدہ ہے۔ رہے اہل ایمان تو ان کے لئے ان کے رب کے پاس دو اچھے انجام ہیں۔ لوگ سب کے سب مرتے ہیں جب وقت پورا ہوتا ہے' لیکن شہادت حق وہی ادا کرتے ہیں جو شہید ہوتے ہیں۔

اس نظریہ حیات میں ایک مرکزی نکتہ ہے' اور اسی نکتے کے اوپر اس کا عملی نظام قائم ہے' اور یہ عملی نظام اپنے مقررہ خطوط پر آگے بڑھتا ہے۔ اس خط اور مومن کا ایک مزاج ہے اور اس کی دو ٹوک فطرت ہے اور اس کے اندر ظروف و احوال کے لحاظ سے اور زمان و مکان کے اعتبار سے کوئی تغیر نہیں ہوتا۔

یہ وہ نکتے ہیں جنہیں ایک حقیقی مومن کے تصور کے اندر روشن رہنا چاہئے چاہے حالات جیسے بھی ہوں۔ انہی بنیادی نکتوں سے جہاد کا عمل شروع ہوتا ہے' جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات کہی ہے کہ یہ جہاد صرف اللہ کی راہ میں ہے' صرف اللہ کے جھنڈے تلے ہے' اس جہاد کے عمل میں جو مارے جاتے ہیں وہ شہداء ہوتے ہیں اور عالم بالا میں ان کا جنازہ بڑے دھوم سے اٹھتا ہے۔

---ooo---

اب جہاد کے عمل کے مقابلے میں بیٹھ جانے والوں میں سے ایک دوسرے فریق کو اسکرین پر لایا جاتا ہے۔ یہ لوگ ابھی تک مکہ کے دارالکفر میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ہجرت نہیں کرتے۔ ان کے کچھ مالی مفادات ہیں' کچھ مصلحتیں ہیں' یا ان کی فطری کمزوری انہیں بٹھائے ہوئے ہے۔ یہ ہجرت کی مشکلات اور راستے کی تکالیف کے مقابلے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتے۔ اگر وہ قربانی اور مشکلات کو برداشت کرنے کا عزم کر لیں تو وہ ہجرت کر سکتے ہیں۔ اسکرین پر یہ مکہ' دارالحرب مکہ' کی جگہوں میں یونہی پھرتے ہیں کہ حضرت عزرائیل آکر ان سے ان کا متاع عزیز چھین لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی حالت قرآن مجید کے اسکرین پر نہایت ہی خستہ حالت ہے' نہایت ہی قابل نفرت ہے' ہر وہ شخص جو جہاد سے دور بیٹھا ہے۔ وہ یہ چاہے گا کہ وہ اپنے دین' اپنے نظریہ حیات اور اللہ کے ہاں انجام بد کی اس صورت حال سے دور بھاگے اور اس نہایت ہی کریہہ منظر میں وہ ہرگز کھڑا نظر نہ آئے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿٩٧﴾ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿٩٨﴾ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَن يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٩٩﴾

(جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں

مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا' کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔ ہاں جو مرد' عورتیں اور بچے' واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے' بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے)

یہ آیت جزیرۃ العرب میں بطور واقعہ موجود صورت حال سے بحث کرتی ہے اور یہ صورت حال مکہ وغیرہ میں حضور اکرم ﷺ کی ہجرت کے بعد عملاً موجود تھی' جبکہ مدینہ میں اسلامی مملکت قائم ہوگئی تھی۔ ابھی تک مکہ میں ایسے مسلمان موجود تھے جنہوں نے ہجرت نہ کی تھی۔ یہ لوگ وہاں اپنی کچھ مصلحتوں اور اپنی جائیداد کی وجہ سے رہ گئے تھے۔ حالات ایسے تھے کہ مشرکین مکہ کسی ایسے شخص کو جو ہجرت کر رہا ہوتا' اپنے ساتھ کچھ لے جانے نہیں دیتے تھے' یا یہ لوگ ہجرت کی تکالیف کی وجہ سے بیٹھے ہوئے تھے' اس لئے کہ جو بھی ہجرت کرتا تھا اہل مکہ اس کی راہ روکتے اور اسے منع کرتے۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے جو حقیقتاً ہجرت کرنے پر قادر ہی نہ تھے۔ بعض بوڑھے تھے' بعض عورتیں تھیں اور بعض بچے تھے۔ ان لوگوں کے لئے ہجرت کرنے اور بھاگنے کی کوئی راہ سرے سے نہ تھی۔

مسلمانوں میں جو لوگ مکہ میں رہ گئے تھے ان پر مکہ والوں نے بڑی سختیاں شروع کر دی تھیں کیونکہ وہ لوگ حضور اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر ؓ کو گرفتار کرنے میں ناکام ہوگئے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے مدینہ میں حکومت قائم کر کے قریش کے قافلوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا تھا اور پھر جنگ بدر میں مسلمانوں کو زبردست فتح نصیب ہوگئی جس کی وجہ سے اہل مکہ بپھرے ہوئے تھے۔ وہ مکہ میں رہنے والے مسلمانوں پر سخت مظالم ڈھا رہے تھے' ان کو مختلف قسم کی اذیتوں میں مبتلا کر رہے تھے۔ اور سخت بوکھلاہٹ میں ظلم کر رہے تھے۔

بعض لوگوں کو انہوں نے عملاً تشدد کر کے دین اسلام سے پھیر دیا تھا' بعض لوگ تقیہ کر کے کفر کا اظہار کر رہے تھے اور مشرکین کے ساتھ شرکیہ عبادات میں بظاہر شریک ہوتے تھے۔ یہ تقیہ اس وقت ان کے لئے جائز تھا جب اسلامی حکومت نہ تھی اور ہجرت کرنے کے مواقع نہ تھے۔ لیکن جب اسلامی مملکت کا قیام مدینہ طیبہ میں ہوگیا تو پھر ان کا اس طرح فتنوں کے اندر قیام کرنا یا اپنے آپ کو تقیہ پر مجبور کرنا جائز اور معقول نہ تھا جبکہ وہ ہجرت بھی کر سکتے تھے اور دارالاسلام میں امن کی زندگی بھی بسر کر سکتے تھے۔

ان حالات میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ یہ لوگ محض دولت اور مصلحت کی وجہ سے ہجرت نہ کر رہے تھے' یا وہ ہجرت کی تکالیف و مشکلات کی وجہ سے مکہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسے حالات میں اگر ان کی موت واقعہ ہوگئی تو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ ظالم کا نام دیتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے آپ پر ظلم کر رہے تھے اس لئے کہ انہوں نے اپنے آپ کو دارالاسلام کی آزادانہ زندگی سے محروم رکھا' جہاں وہ پاک و صاف اور شریفانہ اور اپنی مرضی کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ جبکہ دارالکفر میں وہ ذلیل و خوار' کمزور اور مظلوم ہو کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور ان پر مظالم ہو رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جہنم میں رہیں گے جو بہت برا ٹھکانا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں کے لئے وعید ہے جنہوں نے فی الواقعہ ڈر کر کفر اختیار کر لیا تھا۔

لیکن ایسے لوگوں کی تعبیر قرآن مجید نہایت ہی زندہ اور متحرک انداز میں کرتا ہے۔ ان کے اور فرشتوں کے درمیان

مکالمہ ہو رہا ہے اور یہ مکالمہ گویا زندہ افراد کے درمیان ایک اسٹیج پر ہو رہا ہے ۔

(اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا (۴:۹۷))

(جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین پر کمزور و مجبور تھے ۔ فرشتوں نے کہا کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟)

قرآن انسانوں کی تربیت کر رہا تھا' اس لئے اس کے پیش نظر یہ ہدف تھا کہ وہ ان کے بھلائی اور عزت و شرف کے جذبے کو جوش میں لائے اور ان کے اندر ضعف 'بخل' حرص اور سستی کے پائے جانے والے اوصاف کو ختم کرنے کی سعی کرے ۔ چنانچہ اس منظر کی تصویر کشی میں قرآن کریم نے نہایت ہی حقیقی صورت حال کو پیش کیا ہے ۔ لیکن قرآن کریم اس تصویر کشی کو لوگوں کی اصلاح کے لئے استعمال کرتا ہے اور اس کے ذریعے نفوس انسانی کی اصلاح کی جاتی ہے ۔

موت کا وقت ہر انسان کے لئے خوفناک ہوتا ہے ۔ حالت نزع میں جو کچھ پیش آتا ہے انسان کے ذہن میں وہ تمام حالات بہت ہی تیزی کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں اور پھر اس منظر میں فرشتوں کا اسٹیج پر آنا مزید خوفناک صورت حال پیدا کر دیتا ہے اور انسان کے حواس بڑی تیزی سے کام کرتے ہیں ۔

یہ لوگ مکہ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور نظر آتا ہے کہ یہ لوگ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں اور ایسے ہی حالات میں فرشتے آ پہنچتے ہیں اور ان کی روح قبض کرنے لگتے ہیں ۔ چونکہ یہ لوگ اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں' اس صورت حال سے ہر زندہ شخص متاثر ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ ایسے مظلومانہ حالات میں بیٹھے ہوئے ہیں اور فرشتے ان کی روح قبض کر رہے ہیں ۔ اب ان کے لئے کوئی موقعہ نہیں رہا ہے کہ وہ اپنے ساتھ انصاف کرتے ہوئے ہجرت کر لیں کیونکہ زندگی کا موقعہ تو ایک ہی بار آتا ہے ۔

اور یہ فرشتے ان کی روح کو خاموشی کے ساتھ قبض نہیں کرتے بلکہ وہ ان کے ماضی کو بھی سامنے لاتے ہیں اور نہایت ہی ناپسندیدہ انداز میں پوچھتے ہیں کہ تم نے اپنی زندگی کے قیمتی ایام کن کاموں میں ضائع کئے؟ دنیا میں ان کا شغل کیا تھا' وہ کیا بلند مقاصد تھے جن کے لئے وہ دوڑ دھوپ کر رہے تھے؟ (قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ (۴:۹۷)) (تم کن حالات میں رہے)

کیونکہ یہ لوگ جن حالات میں رہے تھے ایسا رہنا تو نقصان ہی نقصان تھا ۔ یعنی ان کے لئے وقت ضائع کرنے کے سوا کوئی اور مشغلہ ہی نہ تھا اور یہ لوگ جن پر حالت نزع طاری تھی حالت نزع میں جواب دیتے ہیں اور نہایت ہی ناپسندیدہ صورت حالات میں نہایت ہی ذلت کے ساتھ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ ان کے لئے معذرت ہو حالانکہ وہ ذلت ہے ۔

(قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ (۴:۹۷)) (ہم تو زمین میں کمزور لوگ تھے)

ہم کمزور تھے' طاقتور لوگوں نے ہمیں دبا رکھا تھا ۔ ہم ذلیل و خوار تھے ۔ ہمارے ہاتھ میں کچھ نہ تھا ۔ ہر شخص اس بات سے نفرت کرے گا کہ حالت نزع میں اس کے ساتھ یہ مکالمہ پیش آئے اس لئے کہ اس سے ان لوگوں کی انتہائی

بے بسی کا اظہار ہوتا ہے اور یہ کہ وہ پوری زندگی اس طرح بے بس ہو کر گزار گئے اور پھر بھی ملائکہ نے انہیں نہ چھوڑا۔ جب وہ حالت نزع سے دوچار ہوئے تو ان کو یہ کہا گیا کہ تم نے موقعہ سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

(اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا (۴ : ۹۷)) (کیا اللہ کی زمین بہت وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے۔) حقیقت یہ ہے کہ اس ذلت، مسکنت، فتنے اور کمزوری میں اپنے آپ کو وہ اس لئے مبتلا نہ کر رہے تھے کہ وہ فی الواقعہ ایسے حالات میں تھے اور لاچار تھے بلکہ کچھ اور اسباب تھے جن کی وجہ سے انہوں نے اس ذلت کو قبول کر رکھا تھا۔ وہ لالچی تھے۔ اور دنیاوی مصلحتوں کی وجہ سے وہ ہجرت نہ کر رہے تھے اور اسی وجہ سے وہ دارالکفر میں جمے ہوئے تھے جبکہ دارالاسلام موجود تھا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو تنگی میں رکھ رہے تھے حالانکہ اللہ کی سرزمین وسیع تھی۔ ہجرت وہ کر سکتے تھے اور مشکلات کو وہ برداشت کر سکتے تھے۔

(فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (۴ : ۹۷)) (یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔)

اس کے بعد مذکورہ بالا انجام سے ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے جو فی الواقعہ مجبور ہیں اور ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ وہ اس صورت حال سے نکل آئیں اور دارالاسلام تک پہنچ جائیں۔ یہ لوگ بچوں، ضعیف بوڑھوں اور عورتوں پر مشتمل ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگوں کے کیسوں پر غور کیا جا سکتا ہے شاید یہ معاف ہو جائیں کیونکہ بظاہر ان کا عذر معقول ہے اور وہ مکہ سے مدینہ منتقل نہیں ہو سکتے۔

(اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا (۹۸) فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا (۹۹) (۴ : ۹۸ - ۹۹)) (ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے، بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے) یہ حکم ابدالآباد تک رہے گا۔ یہ احکام ان حالات تک ہی محدود نہیں ہیں جو اس وقت ایک متعین سوسائٹی میں مکہ مکرمہ میں پائے جاتے تھے بلکہ یہ عام احکام ہیں۔ جس ملک میں بھی کوئی مسلمان اپنے دین کے معاملے میں مشکلات میں مبتلا ہو اور محض اپنی دولت اور جائیداد کی وجہ سے یا رشتہ داروں اور دوستوں کی وجہ سے وہ رہ رہا ہو اور محض اس ڈر سے رہ رہا ہو کہ اگر وہ اس ملک سے نقل مکانی کرے گا تو اسے مشکلات پیش آئیں گی بشرطیکہ دنیا کے کسی حصے میں دارالاسلام قائم ہو۔ اس میں لوگ امن سے رہ رہے ہوں اور اس ملک میں ایسا شخص اپنے عقیدے کا اظہار کھلے بندوں کر سکتا ہو، وہاں وہ اللہ کے احکام اچھی طرح بجا لا سکتا ہو اور اسلامی شریعت کے مطابق پاک زندگی بسر کر سکتا ہو اور شریفانہ اور معزز زندگی گزار سکتا ہو ورنہ وہ مجبور تصور ہو گا۔

---ooo---

سیاق کلام انسانی نفوس کی تربیت کرتے ہوئے مزید آگے بڑھتا ہے۔ وہ لوگ جو ہجرت کی مشکلات سے ڈرتے ہیں اور اس وجہ سے ہجرت کی ہمت نہیں کرتے ایسے لوگوں کے بارے میں آیات سابقہ میں تو ایک نہایت ہی مؤثر اور خوفناک منظر پیش کیا گیا تھا اور مسلمانوں کو اس صورت حال سے متنفر کیا گیا تھا۔ اگلی آیات میں امید کی کرن دکھائی جاتی ہے۔ کوئی ہجرت کرے چاہے دار الاسلام تک پہنچے یا راستے میں مرجائے اور حالت ہجرت میں اس کی موت واقع ہو جائے تو فرماتے ہیں کہ گھر سے نکلتے ہی' اس کا اجر اس کا حق بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اسے بڑی وسعت نصیب ہوگی' وہ آزادی سے زندگی بسر کرے گا اور اسے تنگی اور ترشی سے نجات ملے گی۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۰۰

(جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لئے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لئے بڑی گنجائش پائے گا' اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لئے نکلے' پھر راستہ ہی میں اسے موت آجائے اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا' اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے۔)

اس آیت میں قرآن کریم حیات نفس انسانی کے اندر پیدا ہونے والے متنوع وسوسوں کا مداوا کرتا ہے۔ اس وقت کے موجود حالات میں ہجرت کرنے میں مشکلات نظر آتی تھیں اور ایسے ہی وسوسے ہر وقت لوگوں کے سامنے آتے رہتے ہیں' جب بھی کوئی شخص اللہ کی خاطر نکلتا مصائب کا شکار ہو جاتا۔

قرآن کریم ایسے نفوس کی تربیت نہایت ہی واضح طور پر کرتا ہے۔ ان کو صاف صاف بتایا جاتا ہے اور کوئی بات چھپائی نہیں جاتی۔ یہ نہیں کیا جاتا کہ اگر کوئی اقدام کرے تو اس سے پیش آنے والے خطرات کو چھپایا جائے بلکہ سب کچھ بتا دیا جاتا ہے' جن میں موت اور جان تک قربان کرنے کے خطرات شامل ہیں' لیکن قرآن کریم بعض دوسرے حقائق کے ذریعے اہل ایمان کو مطمئن بھی کرتا ہے اور ان حقائق کی ضمانت اللہ تعالیٰ خود دیتے ہیں۔

یہاں کہا جاتا ہے کہ یہ ہجرت فی سبیل اللہ ہے اور اس کے علاوہ کسی اور غرض کے لئے نہیں ہے اور اسلام میں یہی ہجرت معتبر ہے۔ یہ دولت کے لئے نہیں ہے' یہ مشکلات سے بھاگنے کے لئے نہیں ہے' یہ لذات و شہوات حاصل کرنے کے لئے بھی نہیں ہے۔ غرض یہ دنیاوی مقاصد میں سے کسی مقصد کے لئے نہیں ہے اور جو شخص بھی اللہ کی راہ میں اور صرف اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا' اسے دنیا میں بہت بڑی کشادگی ملے گی۔ زمین اس پر تنگ نہ ہوگی۔ رزق کی فراہمی کے معاملے میں بھی اس کے وسائل اور ذرائع محدود نہ ہوں گے اور ایمان اور اخروی نجات تو بہرحال حاصل ہو گی۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً (۴ : ۱۰۰)) (جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لئے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لئے بڑی گنجائش پائے گا)

یہ محض نفس انسانی کی کمزوری' اس کا لالچ اور بخل ہے جو اس کے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا کرتا ہے کہ وسائل رزق دنیا کی کسی ایک جگہ کے اندر محدود ہیں اور بعض حالات تک محدود ہیں۔ اگر ان حالات اور ظروف سے کوئی نکل گیا تو اس کا رزق بند ہو جائے گا۔

یہ دراصل رزق اور وسائل حیات کے سلسلے میں ایک نہایت ہی جھوٹا تصور ہے۔ یہی وہ سوچ ہے جس کی وجہ سے انسان ذلت' زیر دستی اور دین اور ایمان کے فتنے کو قبول کرتا ہے اور پھر اس کا وہ انجام' وہ برا انجام ہوتا ہے جو ان آیات میں مذکور ہے کہ ملائکہ ایسے لوگوں کی جان لے لیتے ہیں اور وہ اس حال میں ہوتے ہیں کہ اپنے اوپر ظلم کر رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرتے ہیں اچھے انجام کی یقین دہانی کراتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو آزادی ملے گی اور وہ اللہ کی اس دنیا میں بہت ہی وسعت پائیں گے۔ وہ یقیناً دیکھ لیں گے کہ وہ جہاں بھی جائیں گے اللہ انہیں زندہ رکھے گا' رزق دے گا اور آخرت میں نجات دے گا۔

لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ دوران ہجرت ہی داعی اجل کو لبیک کہتے ہیں۔ موت تو ایک برحق واقعہ ہے اور اس کا تعلق اسباب ظاہرہ سے نہیں ہے۔ جب مقررہ وقت آتا ہے تو موت حتماً آتی ہے۔ چاہے کوئی قیام کرے یا ہجرت کرے۔ وہ نہ مقدم ہوتی ہے اور نہ مؤخر۔

ہاں یہ اور بات ہے کہ انسانی سوچ ظاہری ظروف واحوال کے اندر ہی رہتی ہے۔ اس کی نظر میں موت کے ظاہری اسباب ہوتے ہیں۔ اسلامی نظام ان کو بھی سامنے رکھ کر بات کرتا ہے' چنانچہ کہا جاتا ہے کہ راہ خدا میں گھر سے نکلتے ہی اللہ پر اجر لازم ہو جاتا ہے اور ایسے شخص کو مکمل ثواب ملے گا۔

(وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (۴ : ۱۰۰)) (اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لئے نکلے' پھر راستہ ہی میں اسے موت آجائے اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا) ایسے شخص کو پوری تنخواہ ملے گی' ہجرت کا اجر' سفر کا اجر' دار الاسلام میں پہنچنے اور تمام مشکلات جو وہاں تھیں ان سب کا اجر اسے ملے گا۔ اس کا ضامن اللہ ہے' لیکن اس اجر کی ایسی ضمانت کے ساتھ یہ اشارہ بھی دیا جاتا ہے کہ اس کے گناہ بھی بطور پنشن اور الاؤنس معاف ہو سکتے ہیں اور مزید انعامات بھی مل سکتے ہیں۔ یہ تمام مراعات اصل تنخواہ کے علاوہ ہیں۔

(وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۴ : ۱۰۰)) (اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے) بے شک یہ نہایت ہی نفع بخش سودا ہے۔ اس میں ایک مہاجر فی سبیل اللہ پوری قیمت وصول کر لیتا ہے۔ جونہی وہ قدم رکھتا ہے اور اللہ کی راہ میں نکلتا ہے اسے اجر ملتا ہے۔ موت تو موت ہے اس کا جب وقت آتا ہے تو اس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔ ہجرت کرنے اور کسی جگہ جمے رہنے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ایک ہی جگہ جم جائے تو بھی موت آئے گی

اور سودے میں اسے نقصان ہو گا۔اسے کوئی اجر اور بخشش نہ ملے گی' بلکہ ملائکہ اسے ظالم سمجھتے ہوئے اس کی روح قبض کر لیں گے..... دونوں حالتوں اور دونوں سودوں کے درمیان کس قدر فرق ہے؟ اور دونوں کا انجام کس قدر مختلف ہے؟۔

اس پورے سبق سے نتائج کیا نکلتے ہیں؟ اس سے ہمیں مختلف نتائج حاصل ہوتے ہیں۔اس سے پہلے کہ اس سبق کے دوسرے موضوعات پہ کلام ہو ذرا ان نتائج پر غور و فکر مکمل کر لیا جائے تو اچھا ہے۔

۱۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت نہ کرنے کو بہت ہی برا سمجھتا ہے۔نیز اسلام اسلامی جماعت سے علیحدہ اور دور رہنے کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا' الا یہ کہ کوئی عذر ہو اور عذر یہ ہو کہ کوئی ہجرت کے سفر پر قادر نہ ہو یا اس کے لئے کوئی راستہ نہ ہو۔

۲۔ اس سبق سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظریہ حیات کے اندر جہاد فی سبیل اللہ کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔اور اسلامی نظام کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ عمل جہاد کو جاری رکھے۔شیعہ مکتب فکر تو جہاد کو ارکان اسلام میں سے ایک رکن شمار کرتا ہے کیونکہ اس کے حق میں بڑے قوی قرآنی دلائل ہیں' جس سے ان کے مسلک کی توضیح اور تفسیر ہوتی ہے۔اگر یہ حدیث نہ ہوتی جس کا مضمون ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے تو ان کا مسلک درست ہوتا۔اس کے خلاف کوئی دلیل نہ ہوتی۔لیکن اسلام میں جہاد پر بہت زور دیا گیا ہے۔اسلامی زندگی کے خطرات کے وقت اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔ہر دور اور ہر جگہ اس کی ضرورت پڑتی رہتی ہے اور اس کی ضرورت اسلام کا نہایت ہی فطری تقاضا ہے۔محض وقتی حالات کی وجہ سے نہیں ہے اس لئے کہ تمام دلائل و شواہد یہ بتاتے ہیں کہ اسلام میں جہاد ایک اساسی اور بنیادی فریضہ ہے۔

۳۔ اس سبق سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان بہرحال انسان ہی ہوتا ہے۔نفس انسانی کے سامنے بعض اوقات مشکلات کا ہجوم ہو جاتا ہے۔کبھی انسان خطرات سے ڈر جاتا ہے' کبھی وہ مشکلات کو دیکھ کر سست ہو جاتا ہے اور یہ کمزوریاں انسان سے نہایت ہی صالح ترین سوسائٹیوں اور خیر القرون میں بھی صادر ہوتی رہتی ہیں۔لہٰذا کمزوریوں کا مداوا کرنے کے معاملے میں کبھی بھی ہمیں مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس معاملے میں جہد مسلسل جاری رہنی چاہئے۔لوگوں کو آمادہ کرنا چاہئے۔ان کو انجام کار کامیابی کے امکانات بھی دکھانے چاہئیں۔وعظ و ارشاد ہر وقت جاری رہنا چاہئے اور یہ کام قرآن کے حکیمانہ اسلوب کے مطابق ہونا چاہئے۔

۴۔ سب سے آخر میں اس سبق سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم اس زندگی کی اصلاح کے لئے کس طرح جدوجہد کر رہا تھا۔اور اس کے سامنے کس قدر واقعی مشکلات تھیں اور ان مشکلات میں قرآن نے اسلامی معاشرے کی قیادت کس طرح کی۔قرآن کو جس معرکے کا سامنا تھا وہ ہر میدان میں جاری تھا۔پہلا میدان نفس انسانی تھا۔اس کی فطرت' اس کا مزاج اور اس کے اندر موجود جاہلی دور کی کمزوریاں وغیرہ' تو ہمیں یہ بھی غور کرنا چاہئے کہ ہم قرآن کا مطالعہ کس اسلوب کے ساتھ کریں اور جب ہم انسانی نفس اور زندگی کے واقعی حالات و مشکلات کے اندر دعوت الی اللہ دیں تو کس طرح دیں۔

اس کے بعد مہاجرین اور دوسرے مسافروں کے لئے نماز کے اندر قصر کرنے کی اجازت کا بیان آتا ہے۔سفر چاہے جہاد کے لئے ہوں یا تجارتی سرگرمیوں کے لئے ہوں' نیز حالت خوف میں بھی قصر کی اجازت ہے' یعنی ایسے حالات میں دشمن حملہ

کر کے انہیں قید نہ کر لے اور اس طرح وہ فتنے میں مبتلا نہ ہو جائیں - یہ قصر اس قصر سے علیحدہ ہے جو محض سفر کی وجہ سے ہوتی ہے - یہ خاص قصر ہے اور حالت خوف سے متعلق ہے -

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا ﴿١٠١﴾

(اور جب تم لوگ سفر کے لئے نکلو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر نماز میں اختصار کر دو (خصوصاً) جبکہ تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے کیونکہ وہ کھلم کھلا تمہاری دشمنی پر تلے ہوئے ہیں)۔

جو شخص مسافر ہو' اسے اپنے رب کے ساتھ دائمی تعلق کی ضرورت ہے' تاکہ اللہ اس پر سفر کی مشکلات میں آسانیاں پیدا کر دے - اس کی تیاریوں میں اس کی امداد ہو' سامان سفر فراہم ہو اور راستے کی مشکلات اللہ اس کے لئے آسان کر دے - نماز تعلق باللہ کا مؤثر ترین ذریعہ ہے - اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ مشکلات اور تکالیف میں نماز سے امداد حاصل کریں - جب خوف کا مقام ہو اور جب زندگی کی مشقتوں کا سامنا ہو تو حکم ہے کہ نماز سے معاونت حاصل کرو - (وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ) (نماز اور صبر کے ذریعے اللہ کی امداد طلب کرو)۔

یہی وجہ ہے کہ سفر و جہاد کے اس موضوع کے متصلاً بعد اللہ تعالیٰ نے نماز کا ذکر کیا - ایسے حالات میں نماز ایک مومن کا نہایت ضروری ہتھیار ہوتی ہے - اگر کسی کو راستے میں خوف اور خطرے کے حالات درپیش ہوں تو ایسے حالات میں اسے صرف اللہ کی یاد سے اطمینان ہوتا ہے - جو شخص اپنے ملک کو چھوڑتا ہے اس کے لئے اللہ کی درگاہ میں پہنچ جانا ہی باعث اطمینان ہوتا ہے - ہاں یہ بات اپنی جگہ ہے کہ کامل نماز اور پورے رکوع اور سجود کے ساتھ نماز کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ ایک مومن پر دشمن حملہ آور ہو جائیں جو کہیں قریب ہی چھپے ہوں - اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دشمن اسے پہچان لیں - اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ طویل رکوع اور سجود میں اسے پکڑ لیں' چنانچہ جو لوگ جہاد کے لئے نکلیں ان کے لئے جائز ہے کہ وہ خوف کے وقت نماز کو مختصر کر دیں -

یہاں قصر کے مفہوم اور تفسیر میں ہم اسی بات کو ترجیح دیتے ہیں جسے جصاص نے لیا ہے کہ اس قصر سے مراد رکعات میں قصر نہیں ہے اس لئے کہ یہ تو مطلق مسافر کے لئے جائز ہے خواہ حالت خوف ہو یا نہ ہو' بلکہ سفر میں تو قصر لازمی ہے - جس طرح حضور اکرم ؐ نے قصر فرمائی اور ہر سفر میں فرمائی' اس لئے کہ سفر میں راجح اقوال کے مطابق پوری رکعات پڑھنا جائز ہی نہیں ہے -

لہذا یہاں حالت خوف میں قصر سے مراد بالکل دوسری ہوگی اور یہ قصر مسافر کی قصر سے مختلف ہوگی - یہ قصر نماز کی کیفیت میں ہوگی مثلاً رکوع' سجود اور قیام میں نہایت ہی سکون سے یہ ارکان سرانجام دینے میں قصر ہوگی - یوں حالت

خوف میں مسافر کے لئے چلتے ہوئے سواری کی حالت میں اور صرف اشارے سے بھی نماز جائز ہوگی اور اس طرح وہ اپنے رب کے ساتھ جڑا ہوا رہے گا۔ حالت خوف اور حالت فتنہ میں بھی وہ اس ضروری ہتھیار سے مسلح ہو گا اور دشمن کے مقابلے میں محتاط بھی ہو گا اس لئے کہ (اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا (٤: ١٠١)) (بے شک کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں)۔

---ooo---

مسافر اور مجاہد کی نماز میں حالت خوف میں قصر کے حکم کے بعد اور اسی مناسبت سے معرکہ کارزار میں اب صلوۃ الخوف کا حکم بھی یہاں دیا جاتا ہے۔ اس خالص فقہی حکم کے اندر بھی نفسیاتی اور تربیتی اشارات کا وافر ذخیرہ دستیاب اور موجود ہے۔

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ
فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا
مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا
حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ
اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ
بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿١٠٢﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ
قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اِنَّ
الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿١٠٣﴾

(اور لے نبی' جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور (حالت جنگ میں) انہیں نماز پڑھانے کھڑے ہو تو چاہئے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور اپنے اسلحہ لئے رہے' پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے آکر تمہارے ساتھ نماز پڑھے اور وہ بھی چوکنا رہے اور اپنے اسلحہ لئے رہے' کیونکہ کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ البتہ اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو تو اسلحہ رکھ دینے میں مضائقہ نہیں' مگر پھر بھی چوکنے رہو۔ یقین رکھو کہ اللہ نے کافرں کے لئے رسواکن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو اور جب اطمینان نصیب ہو جائے تو پوری نماز پڑھو۔ نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندی وقت کے ساتھ اہل ایمان پر لازم کیا گیا ہے)۔

جو شخص قرآن کے اسرار و رموز پر غور کرتا ہے اور جو شخص ربانی منہاج تربیت میں فکر کرتا ہے خصوصاً اس سبق پر' تو اس پر عجیب اسرار و رموز کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس سبق کے اندر ایسے لحات فکر و احساس آتے ہیں جن کا اثر انسان کی روح کی گہرائیوں تک جا اترتا ہے۔ ذرا میدان معرکہ کی ایک جھلکی ملاحظہ فرمائیں :

قرآن کریم کی یہ آیت محض ایک فقہی اور قانونی مسئلہ نہیں بیان کرتی کہ صلوۃ الخوف اس طرح ہو گی' اس کے اندر تعلیم و تربیت کا بے شمار سامان ہے جس کے ذریعے ایک انقلابی جماعت کی اخلاقی تربیت ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ اسے انقلابی عمل سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے۔

اس آیت سے جو پہلی بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں نماز کی اس قدر اہمیت ہے کہ میدان کارزار کے اندر بھی نماز کو نہیں چھوڑا جاتا اور یہ بات ایمانی نقطہ نظر سے بالکل واضح ہے کہ نماز میدان کارزار کے اندر ایک بہترین ہتھیار ہے بلکہ یہ سب ہتھیاروں سے زیادہ اہم ہے اور ہر معرکے کے اندر اس ہتھیار سے فائدہ اٹھانا بہت ہی ضروری ہے۔ اس معرکے کے مزاج اور اس کی فضا کے ساتھ نماز کا گہرا تعلق ہے۔

یہ ابتدائی دور کے اسلامی دستے جن کی تربیت ربانی اور قرآنی منہاج کے ساتھ کی گئی تھی' وہ اپنے دشمن کا مقابلہ اس اسلحہ کے ساتھ کرتے تھے جس میں وہ دشمن پر فوقیت رکھتے تھے۔ وہ اپنے دشمنوں پر یہ فوقیت رکھتے تھے کہ وہ صرف ایک اللہ وحدہ لاشریک کو مانتے تھے۔ انہوں نے اپنے رب کو اچھی طرح پہچان لیا تھا اور ان کو یہ احساس پوری طرح حاصل ہوتا تھا کہ ان کا وہ الہ پوری طرح ان کے ساتھ شریک جنگ ہے۔ وہ مقصدیت کے اعتبار سے بھی دشمن پر فوقیت رکھتے تھے۔ ان کا نصب العین بلند تھا اور وہ بھی اسے سب سے اونچا ہدف سمجھتے تھے۔ ان کا تصور کائنات' تصور حیات اور تصور غایت وجود انسانی ہر دشمن کے مقابلے میں بلند تھا۔ اس برتر نظام زندگی کے تحت ان کی جو تنظیم وجود میں آئی تھی اس میں بھی وہ دشمن کے مقابلے میں برتر تھے۔ میدان جنگ میں نماز ان تمام برتریوں کا اشارہ تھی اور ہر وقت ان کو یہ سبق اور شعور یاد دلاتی تھی کہ وہ برتر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نماز میدان کارزار میں ان کے لئے ایک اعلیٰ ترین اسلحہ تھی بلکہ ان کا انحصار ہی اس اسلحہ پر تھا۔

دوسری بات جو ان آیات کے ضمن میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اہل ایمان روحانی طور پر تیار اور بیدار ہیں اور دشمن کے مقابلے میں کھڑے ہیں۔ دشمن بھی گھات میں بیٹھا ہے اور اہل ایمان کی طرف سے غفلت کی ایک مختصر سی گھڑی کے انتظار میں ہے کہ ذرا وہ غافل ہو اور وہ ان کا اسلحہ اور سازوسامان سب پر قبضہ کر کے اچانک حملہ آور ہو جائے۔ اس تنبیہ'

ڈراوے اور ثابت قدمی اور اطمینان کی تلقین کے ساتھ ہی بتایا جاتا ہے کہ جن لوگوں سے تمہارا مقابلہ ہے ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک توہین آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔ایک طرف سے سخت حکم ہے کہ حالت بیداری اور تیاری میں رہو اور دوسری طرف یہ یقین دہانی ہے کہ مطمئن رہو' ایک طرف سخت حساس اور چوکنا رہنے کی ہدایت اور دوسری جانب سے پورا اطمینان۔یہ ہے وہ منہاج جس کے مطابق اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو تربیت دیتے ہیں اس لئے کہ دشمن سخت مکار ہے اور وہ اوچھے ہتھکنڈے اختیار کر سکتا ہے۔

صلوۃ الخوف کی کیفیت میں فقہاء کا اختلاف ہے۔یہ مسائل انہوں نے اسی آیت سے لئے ہیں۔ہم صرف عام کیفیت بیان کریں گے اور فقہی تفصیلات میں نہیں جائیں گے۔

(وَ إِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَّرَآءِكُمْ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ أَسْلِحَتَهُمْ (٤: ١٠٢))

(اور اے نبی' جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور (حالت جنگ میں) انہیں نماز پڑھانے کھڑے ہو تو چاہئے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور اپنے اسلحہ لئے رہے' پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے آکر تمہارے ساتھ نماز پڑھے اور وہ بھی چوکنا رہے اور اپنے اسلحہ لئے رہے)

مطلب یہ ہے کہ آپ موجود ہوں اور ان کے لئے امامت کر رہے ہوں تو ان میں سے ایک فریق آپ کے پیچھے پہلی رکعت پڑھ لے اور دوسرا فریق اسلحہ لے کر چوکیداری کرے اور جب پہلا فریق رکعت پڑھ لے تو پھر وہ چلا جائے اور چوکیداری پر بمعہ اسلحہ کھڑا ہو جائے اور دوسرا آجائے اور وہ آپ کے پیچھے ایک رکعت پڑھ لے۔اس طرح آپ کی نماز تمام ہو جائے گی اور آپ سلام پھیرلیں گے۔

اس کے بعد پہلا فریق آئے گا اور اس کی جو ایک رکعت رہتی ہے وہ پڑھ لے گا اور چلا جائے گا۔یہ ایک رکعت اکیلی ہو گی' پھر یہ فریق جائے' چوکیداری پر کھڑا ہو اور دوسرا فریق آئے اور اس کی جو ایک رکعت رہ گئی وہ پڑھے جبکہ پہلا فریق چوکیداری کرے۔

اس طرح دونوں فریق امام کے ساتھ نماز پڑھ لیں گے' رسول اللہ ؐ کی امامت میں اور آپ کے بعد جو خلفاء اور امراء آئیں گے ان کے لئے بھی یہی حکم ہے۔

(وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَّاحِدَةً (٤: ١٠٢)) (کیونکہ کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں)

کفار کی جانب سے مومنوں کے خلاف یہ ایسی خواہش ہے جو ہمیشہ ان کے دلوں میں پائی جاتی ہے۔ ماہ و سال گزر رہے ہیں' صدیاں بیت گئی ہیں اور آج بھی کفار کی خواہش یہی ہے' یہ ہے وہ حقیقت جو اللہ تعالیٰ نے پہلی جماعت مومنہ کے دل میں بٹھائی تھی اور آج بھی اسی کی تاکید ہو رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ اللہ اس وقت ان لوگوں کے لئے جنگی اسکیم تیار فرماتا تھا لیکن صلوۃ الخوف میں 'جس طرح کہ ہم نے سمجھا' ہمارے لئے بھی جنگی اسکیم موجود ہے۔

یہ احتیاط اور یہ نفسیاتی تیاری اور یہ مسلسل ہتھیار بند رہنا ہروقت لازمی نہیں ہے' نہ مناسب ہے کہ مسلمانوں کو محض مشقت میں ڈالنے کے لئے دائمی حکم دیا جائے لیکن جس قدر ان سے ہو سکے وہ ایسا کریں۔

(وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ (٤ : ١٠٢)) (البتہ اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو تو اسلحہ رکھ دینے میں مضائقہ نہیں) ایسے حالات میں اسلحہ اٹھانا مشکل ہوتا ہے' اور مفید بھی نہیں ہوتا۔ محض احتیاط ہی کافی ہوتی ہے۔ اور اللہ کی مدد پر بھرپور اعتماد۔

(وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا (٤ : ١٠٢)) (مگر پھر بھی چوکنے رہو یقین رکھو کہ اللہ نے کافروں کے لئے رسواکن عذاب مہیا کر رکھا ہے) ممکن ہے کہ یہی احتیاط' یہی بیداری اور یہی پاسداری اہل کفر کے عذاب کا وسیلہ بن جائے' جو اللہ نے ان کے لئے تیار کیا ہے اور سخت توہین آمیز ہے۔ اس طرح اہل ایمان اللہ کی قدرت کا ذریعہ بن جائیں اور اللہ کی مشیت ان کے ذریعے پوری ہو۔ مذکورہ بالا احتیاط کے ساتھ ساتھ یہ اہل ایمان کے لئے مژدۂ اطمینان ہے۔ اس لئے کہ اہل ایمان کو پورا یقین تھا کہ دشمنان اسلام کے خلاف اللہ ان کا مددگار ہے اور دشمنان اسلام کے لئے توہین آمیز عذاب مقدر ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ وہی دست قدرت ہوں۔

(فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (٤ : ١٠٣)

(پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے' ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو۔ اور جب اطمینان نصیب ہو جائے تو پوری نماز پڑھو' نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندی وقت کے ساتھ اہل ایمان پر لازم کیا گیا ہے)۔ حکم دیا جاتا ہے کہ ہر حال میں دلوں کو اللہ کے ساتھ جوڑے رکھو' نماز میں بھی اور نماز سے باہر رہتے ہوئے بھی اس لئے کہ تعلق باللہ سب سے بڑی جنگی تیاری ہے اور وہ ہتھیار ہے جو کبھی زنگ آلود نہیں ہوتا۔

اطمینان اور امن کے وقت حکم یہ ہے کہ نماز پوری کی پوری بمع جملہ ارکان اطمینان کے ساتھ ادا کرو اور اس میں قصر نہ کرو جیسا کہ کہا گیا اس لئے کہ قصر کی رخصت کچھ حالات کے تحت تھی۔ اس لئے کہ نماز ایک ایسا فریضہ ہے جسے مقررہ وقت پر ادا کرنا لازمی ہے اور جب حالت خوف نہ رہے تو اس کی ادائیگی اسی طرح ہوگی جس طرح عام طور پر ہوتی ہے۔

"نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندی وقت کے ساتھ اہل ایمان پر لازم کیا گیا ہے" کے الفاظ سے ظاہریہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر نماز قضا ہو جائے تو پھر اس کی ادائیگی نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک قضا نماز پڑھنے سے فرض ادا نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں فرض نماز وقت مقررہ کے بعد نہیں ہوتی۔ اگر وقت چلا جائے تو پھر نماز پڑھنے اور ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ ادا ہو جاتی ہے۔ ہاں قضا کی ادائیگی بہت جلدی ہونا چاہئے اور خواہ مخواہ تاخیر کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مزید فروعی اختلافات میں ہم دخل اندازی نہیں کرتے۔

---○○○---

اب اس سبق کا خاتمہ قریب ہے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ جہاد کا عمل جاری رکھو' اگرچہ تمہیں رنج و الم کا سامنا کرنا پڑے اور وہ تمہارے لئے مشقت اور تھکاوٹ کا باعث ہو۔ ایک ایسا تیز احساس دلایا جاتا ہے اور اس قدر تیز جھٹکا دیا جاتا ہے کہ یہ احساس دلوں تک اتر جاتا ہے اور یہ احساس دلوں کی گہرائیوں تک اتر کر انسانی ضمیر کو روشن کرتا ہے اور اسی روشنی میں مقاصد اور رجحانات اور نصب العین متعین ہوتے ہیں۔

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ۖ إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ ۖ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٠٤﴾

(اس گروہ کے تعاقب میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ اگر تم تکلیف اٹھا رہے ہو تو تمہاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں اور تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں ہیں۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور وہ حکیم و دانا ہے) یہ معدودے چند الفاظ ہیں' جن میں دو ٹوک اور واضح خطوط کھینچ دیے گئے ہیں' یہ بتاتے ہیں کہ ایک مومن کی راہ کس قدر طویل اور پر مشقت ہے۔ مومنین ہمیشہ چکی کے دو پاٹوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ بے شک اس دائمی معرکے میں وہ رنج و الم اور گہرے زخم پاتے ہیں لیکن وہ یہ سوچیں کہ کیا یہ تکالیف صرف ان پر ہی آئی ہیں یا دشمنوں کو بھی انہی جیسی تکالیف سے سابقہ درپیش ہے۔ دشمن بھی تو رنج و الم سے دوچار ہوتے ہیں۔ انہیں بھی تو زخم آتے ہیں۔ لیکن تم دونوں میں فرق یہ ہے کہ اہل ایمان تو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور اللہ سے شاندار جزا کے امیدوار ہیں اور ان کے دشمنوں کی حالت یہ ہے کہ وہ بے مقصد اور بے فائدہ جنگ لڑ رہے ہیں' وہ اللہ کے سامنے تو کچھ لے کر جانے والے نہیں' نہ انہیں اس دنیا میں اللہ کی جانب سے کوئی امید ہے اور نہ آخرت میں کوئی توقع ہے..... پس اگر کفار اس معرکے پر مصر ہیں تو مسلمانوں کے لئے تو مناسب ہے کہ وہ اس سے زیادہ اصرار کریں۔ اگر کفار اس معرکے میں گہرے زخم برداشت کرتے ہیں تو اہل اسلام کو چاہئے کہ وہ ان سے زیادہ زخم کھاتے جائیں اور صبر کریں۔ اور ان کو چاہئے کہ وہ ان اہل کفار کا پیچھا کریں' جہاد و قتال جاری رکھیں اور انہیں اس حالت تک پہنچا دیں کہ ان کی قوت ٹوٹ جائے اور وہ کسی مسلمان کے دین اور جان و مال کے لئے فتنہ نہ رہیں۔

ہر جدوجہد میں نظریہ حیات بر تر رہتا ہے۔بعض ایسے لحات بھی آتے ہیں کہ مصائب انسان کی قوت برداشت سے بڑھ جاتے ہیں۔ درد ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ایسے حالات میں مومن کو خاص زادو عتاد کی ضرورت ہوتی ہے۔جس کا فیضان سرچشمہ ایمان اور نظریہ سے ہوتا ہے اور یہ اللہ کی یاد ہوتی ہے جو ہر زخم کے لئے بہتر مرہم ہوتی ہے۔

یہ ہدایات' اس وقت ایک متوازن اور برابری کی جنگ کے اندر دی جارہی تھیں۔اس میں فریقین بر سرپیکار تھے۔ دونوں کا رنج و الم سے سابقہ تھا اور دونوں اسلحہ بند تھے...... لیکن اہل ایمان پر ایسا وقت بھی آسکتا ہے جس میں معرکہ متوازن نہ ہو' کھلی جنگ نہ ہورہی ہو' ایسے حالات میں بھی یہی اصول ہے۔باطل اہل اسلام کو کبھی بھی برداشت نہیں کرتا۔ اگرچہ باطل غالب ہو اور اسلامی عقیدہ مغلوب ہو اس لئے کہ باطل کے اندر ایک تضاد پایا جاتا ہے۔اس داخلی تضاد کی وجہ سے وہ بے چین ہوتا ہے۔وہ خود اپنے اندرون کی کشمکش سے دوچار ہوتا ہے پھر وہ فطرت انسانی اور فطرت اشیاء کے ساتھ بھی بر سرپیکار ہوتا ہے۔

گروہ مومن کی راہ ایسے حالات میں بھی یہی ہے کہ وہ برداشت کرے اور ہمت نہ ہارے۔اسے یہ حقیقت پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اگرچہ وہ مصائب کا شکار ہے' لیکن اس کا دشمن اندرونی تضاد کے روگ کا بیمار ہے۔روگ کی بھی تو قسمیں ہیں۔ دلی چرکے بدن کے زخموں سے زیادہ گہرے ہوتے ہیں اور دشمن کو ایسے زخم آتے ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتے۔ (وَ تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ (٤: ١٠٤) (اور تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں) اور یہ وہ مرہم ہے جو دشمن کو میسر نہیں ہے۔یہی وہ مقام ہے جہاں سے دونوں فریقوں کی راہیں جدا ہوتی ہیں اور اس بات کو اچھی طرح اللہ جانتا ہے۔(وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (٤: ١٠٤) اللہ کو معلوم ہے کہ دلوں اور جذبوں کا مداوا کیا ہے اور ان کے ساتھ ڈیلنگ کس طرح ہوتی ہے اور دلوں کے زخموں کا علاج کیا ہے' روح کی مرہم کیا ہے؟جس سے اہل کفر بے خبر اور محروم ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۳۹ ایک نظر میں

ان آیات میں ایک ایسی کہانی کی طرف اشارہ ہے جس کی کوئی مثال اس کرۂ ارض پر نہیں ملتی بلکہ انسانیت کی تاریخ میں اس کے ساتھ ملتی جلتی کوئی مثال نہیں ہے ۔ یہ مثال بھی شاہد عادل ہے کہ یہ دین من جانب اللہ ہے اور لازماً من جانب اللہ ہے ۔ اس لئے کہ انسانوں کا تصور انصاف اور عدالت جس قدر بھی بلند ہو' ان کی روح جس قدر بھی صاف ہو جائے اور ان کا مزاج جس قدر بھی صراط مستقیم پر قائم ہو وہ اپنے آپ کو اس مقام بلند تک نہیں پہنچا سکتے 'جس کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے ۔ یہ کام صرف وحی الہی کے ذریعے ہی ممکن ہے ۔ انسانی تاریخ کے افق پر کھینچا جانے والا یہ گراف اس قدر اونچا ہے کہ اس مقام تک انسانیت صرف اسلامی نظام زندگی کے زیر سایہ ہی پہنچ سکی اور آئندہ بھی یہ سربلندی صرف اسلامی نظام ہی کے زیر سایہ نصیب ہو سکتی ہے ۔

یہ واقعہ اس وقت ہوا جب مدینہ کے یہودی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وہ تمام زہریلے تیر اور ہتھیار استعمال کر رہے تھے جو ان کے ترکش میں موجود تھے اور جس کی تفصیلات اس سورہ 'سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران میں بیان ہو چکی ہیں ۔ حالات ایسے تھے کہ یہودی اسلام کے خلاف ہر قسم کا جھوٹا پروپیگنڈا کر رہے تھے ۔ وہ مشرکین کا ایک محاذ اسلام کے خلاف بنا رہے تھے اور مشرکین کی حوصلہ افزائی کرتے تھے ۔ ان کے لئے راہ ہموار کرتے تھے' پروپیگنڈے میں جھوٹی خبریں اڑاتے تھے' لوگوں کے ذہنوں کو خراب کرتے تھے ۔ حضور ؐ کی قیادت کی توہین کرتے تھے' وحی اور رسالت میں شکوک پیدا کرتے تھے ۔ وہ اسلامی معاشرے میں اندر سے انتشار پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے اور رات دن اس کام میں لگے ہوئے تھے کہ اسلام کے دشمنوں کو جمع کر کے مسلمانوں پر حملہ کرا دیں ۔ تحریک اسلامی مدینہ میں بالکل نئی تھی' اور انسانوں کے نفوس کے اندر ابھی تک جاہلیت کے آثار موجود تھے ۔ بعض مسلمانوں اور یہودیوں اور مشرکوں کے درمیان ابھی تک رشتہ داری اور دوسرے روابط بھی قائم تھے اور یہ تمام امور اسلامی صفوں کے لئے خطرے کا باعث تھے ۔

ایسے مشکل' خطرناک' اور ہنگامی حالات میں یہ آیات نازل ہوئیں اور رسول اللہ ؐ اور مسلمانوں کو یہ سخت ہدایات دی گئیں ۔ مقصد یہ تھا کہ ایک یہودی ملزم کے ساتھ انصاف کرو' اس پر چوری کا الزام جھوٹا ہے اور جن لوگوں نے جھوٹا الزام لگایا ہے ان کا فرض ہے کہ وہ اس کی تلافی کریں ۔ یہ مدینہ کے انصار کا ایک گھرانا تھا ۔ انصار ان دنوں رسول اللہ ؐ کا سرمایہ تھے' جو ان تمام یہودی سازشوں کے مقابلے میں آپ کے حامی و مددگار تھے اور آپ ؐ کی رسالت اور دین کے معاون تھے ۔

رواداری' سربلندی اور عدل و انصاف کا یہ کس قدر اونچا معیار ہے ۔ اس کی تعریف و توصیف کے لئے تو الفاظ نہیں ملتے ۔ تمام باتیں' تمام تبصرے اور تمام تشریحات اس معیار اور سطح سے نیچے رہ جاتی ہیں ۔ اس سطح اور معیار تک انسانی طاقتیں

اپنی کوشش نہیں پہنچ سکتیں ' صرف انسان یہ معجزہ نہیں دکھا سکتے ' یہ تو اسلامی منہاج کی قیادت اور راہنمائی ہے جو کسی انسان کو اس مقام بلند تک پہنچا سکتی ہے ۔

وہ کہانی جو ان آیات کے پس منظر کے سلسلے میں بیان ہوئی اور جسے متعدد مصادر نے نقل کیا ہے ' مناسب ہے کہ انصار سے سنی جائے ۔ قتادہ ابن النعمان اور ان کے چچا رفاعہ ہونوں نے حضور ؐ کے ساتھ بعض غزوات میں جنگ فرمائی ۔ ان میں سے ایک کی زرہ گم ہوگئی (رفاعہ کی) ۔ عام طور پر انصار کے ایک خاندان بنو ابیرق کے ایک شخص کے بارے میں یہ شبہ ہونے لگا کہ اس نے یہ زرہ چوری کی ہے ۔ مالک نے حضور ؐ کے پاس یہ رپورٹ درج کرائی کہ طعمہ ابن ابیرق نے میری زرہ چرائی ہے ۔ بعض روایات میں بشیر ابن ابیرق کا نام آتا ہے ۔ اس کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ وہ صحابہ کرام کی ہجو میں اشعار لکھتا اور مشہور کرتا کہ یہ فلاں عرب شاعر کے ہیں ۔ جب چور کو معلوم ہوا کہ اس کے خلاف رپورٹ ہو چکی ہے تو اس نے جلدی سے یہ زرہ ایک یہودی زید ابن سمین کے گھر پھینک دی اور اپنے خاندان کے بعض لوگوں سے کہا کہ میں نے زرہ غائب کر دی ہے اور فلاں کے گھر میں پھینک دی ہے اور یہ جلد ہی اس کے گھر سے برآمد ہوگی ۔ تم رسول اللہ ؐ کے پاس جاؤ اور یہ کہو کہ ہمارے بھائی تو بے گناہ ہیں اور فلاں شخص چور ہے اور ہم نے ... اس سلسلے میں معلومات جمع کر لی ہیں ۔ آپ بر سرعام ہمارے آدمی کی برات فرمائیں اور اس کی صفائی فرمادیں اس لئے کہ اگر اسے آپ کے ذریعے اللہ نے باعزت طور پر بری نہ کیا تو اس کی عزت خاک میں مل جائے گی ۔

جب حضور ؐ کو معلوم ہوا کہ فی الواقعہ زرہ یہودی کے گھر سے برآمد ہوگئی ہے تو آپ نے مجمع میں اعلان کر دیا کہ ابن ابیرق بے گناہ ہے ' اس لئے کہ اس کے خاندان نے حضور ؐ سے درخواست کی تھی کہ قتادہ ابن النعمان اور ان کے چچا ہمارے ایک مسلمان خاندان کے گھر آئے اور اسے چوری کا ملزم بنا دیا اور یہ کام انہوں نے بغیر کسی ثبوت اور شہادت کے کیا ۔ قتادہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ؐ کے پاس آیا ۔ میں نے آپ ؐ سے بات کی تو آپ ؐ نے فرمایا : "تم نے جان بوجھ کر ایک ایسے خاندان کے خلاف چوری کا الزام عائد کر دیا جن کا اسلام اور نیکی مشہور و معروف ہیں اور بغیر ثبوت کے" ۔ میں واپس ہوگیا ' لیکن میری حالت یہ تھی کہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر میری تمام دولت چلی جاتی اور میں حضور ؐ سے بات نہ کرتا تو کتنا اچھا ہوتا ۔ اس پر میرے چچا رفاعہ آئے تو مجھے کہا بھتیجے ! یہ تو نے کیا کیا؟ تو میں نے اسے یہ بات بتائی جو حضور ؐ نے کہی تھی ۔ تو رفاعہ نے کہا اللہ ہی مددگار ہے ۔ اس پر زیادہ وقت نہ گزرا کہ یہ آیات نازل ہوئیں ۔

(اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا (٤ : ١٠٥)) یعنی آپ بنی ابیرق کے لئے وکیل صفائی نہ بنیں ۔ "خصیم" کے معنی وکیل ' دفاع کرنے والےاور کسی کی جانب سے مجادلہ اور مباحثہ کرنے والے کے ہوتے ہیں ۔ آپ نے قتادہ کو جو کچھ کہا اس سے اللہ کی مغفرت طلب کریں ' بے شک اللہ غفور الرحیم ہے ۔ مزید یہ آیات ۔ (وَلَا تُجَادِلْ) سے (رَحِيْمًا) تک .... اگر وہ معافی چاہتے تو اللہ ان کو معاف کر دیتا ..... اسی طرح (وَمَنْ يَّكْسِبْ) سے (اِثْمًا مُّبِيْنًا) تک اور (وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ) سے (اَجْرًا عَظِيْمًا) تک ..... جب یہ آیات نازل ہوئیں تو حضور ؐ زرہ لے کر آئے اور رفاعہ کو دے

دی۔ قتادہ کہتے ہیں کہ جب میرے چچا کے پاس زرہ پہنچی ' وہ بوڑھے تھے اور جاہلیت ہی میں ان کی نظر ختم ہوگئی تھی۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ مجبور ہو کر مسلمان ہوگئے ہیں۔ جب میں نے ان کو زرہ دی تو انہوں نے کہا یہ اللہ کی راہ میں ہوگئی۔ یہاں سے مجھے یقین ہوگیا کہ وہ صحیح طرح مسلمان تھے۔ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو بشیر (چور) مشرکین کے ساتھ مل گیا۔ اس پر مزید آیات کا نزول ہوا۔

(وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا (۱۱۵) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا

(۱۱۶) (٤:۱۱۵–۱۱٦)) مسئلہ صرف یہ نہ تھا کہ ایک بے گناہ بری کر دیا گیا جس پر سازش کی وجہ سے الزام لگایا گیا تھا۔ اگرچہ اللہ کے ہاں کسی بے گناہ کا بری کرنا بھی ایک عظیم مسئلہ ہے 'مسئلہ تو اس سے بھی بڑا اور اہم تھا۔ یعنی انصاف کی ترازو کو بالکل برابر کرنا مطلوب تھا کہ وہ کسی ایک طرف جھک نہ جائے۔ نہ نفسانی خواہشات کی طرف اور نہ عصبیت کی وجہ سے۔ نہ دوستی اور دشمنی کی وجہ سے 'میزان عدل میں کسی بھی طرح جھکاؤ نہ آ جائے۔ غرض جو حالات بھی ہوں 'انصاف ہو اور بے لاگ ہو۔

مسئلہ یہ تھا کہ اس جدید معاشرے کو تمام آلائشوں سے پاک کر دیا جائے اور اس کے اندر سے جاہلیت اور عصبیت کے باقی ماندہ آثار کو بھی مٹا دیا جائے چاہے یہ آثار جس شکل و صورت میں بھی ہوں۔ خصوصاً جبکہ ان کا تعلق عوام الناس کے مسئلہ عدل سے ہو۔ اس کے بعد ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھی جانی تھی جو بالکل منفرد ہو اور پوری تاریخ انسانی میں بے مثال ہو۔ یہ بنیاد بالکل پاک و صاف اور مستحکم اصولوں پر رکھنی تھی جن میں تعصب ' ذاتی رجحان' وقتی مصلحتوں اور ذاتی خواہشات کا کوئی دخل نہ ہو۔

اس مقدمے میں بے شمار اسباب موجود تھے جن کی وجہ سے مجرموں کے ساتھ نرمی کی جا سکتی تھی یا کم از کم ان کے بارے میں یہ آیات نازل نہ ہوتیں اور ان پر تنقید نہ کی جاتی۔ ان کو اس طرح سرعام رسوا نہ کیا جاتا یا ان کی سرعام پردہ دری نہ کی جاتی۔

پہلی وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ اس مقدمے میں پہلا ملزم یہودی تھا اور یہودی وہ لوگ تھے کہ ان کے ترکش کا ہر تیر اسلام کے خلاف استعمال ہوتا تھا۔ یہودی وہ لوگ تھے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کو ان کی جانب سے تلخ ترین اذیتیں دی جاتی تھیں اور خدا کا کرنا ایسا ہے کہ ہر دور میں وہ مسلمانوں کے خلاف نیش زنی کرتے رہتے ہیں۔ پھر یہودیوں کا نظریہ یہ تھا کہ وہ نہ کسی کا حق تسلیم کرتے تھے 'نہ کسی کے ساتھ عدل و انصاف کرتے تھے۔ ان کی حالت یہ تھی کہ اس کے ہاں کوئی اخلاقی قدر بھی نہ تھی اور مسلمانوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں تو وہ کسی اخلاقی اصول کے قائل ہی نہ تھے۔

ایک سبب یہ بھی تھا کہ اصل ملزم انصاری تھے اور انصار وہ لوگ تھے جنہوں نے حضور کو پناہ دی اور آپ کی نصرت

کی - پھر انصار کے بعض گھرانوں کے درمیان جاہلیت سے دشمنیاں چلی آ رہی تھیں اور جس طرح الزام اور تفتیش کا رخ یہودیوں کی طرف مڑ گیا تھا اس وقت ان تحقیقات کو یہاں ہی ڈراپ کر کے لئل اسلام کی صفوں کے درمیان انتشار سے بچا جا سکتا تھا۔

ایک تیسرا جواز یہ بھی تھا کہ اس طرح یہودیوں کے ہاتھ میں انصار کو ورغلانے کی خاطر ایک نیا ہتھیار آ رہا تھا۔ یہ کہ انصار اور مسلمان ایک دوسرے کی بھی چوریاں کرتے ہیں اور پھر یہودیوں پر الزام دھرتے ہیں - یہودی اس واقعہ کو بھی اسلام کے خلاف استعمال کر سکتے تھے۔

لیکن یہ معاملہ ان معمولی باتوں کی نسبت بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا' ان تمام خدشات اور اعتبارات سے یہ معاملہ بہت اہم اور بلند تھا۔ یہ باتیں اسلامی نقطہ نظر سے اہمیت نہ رکھتی تھیں - اسلام کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ اس جماعت کو اس قدر تربیت دی جائے کہ وہ نظام خلافت ارضی اور منصب قیادت بشری کے لئے تیار ہو جائے - یہ امت پوری انسانیت کی قیادت اور پورے کرۂ ارض پر خلافت کے لئے اس وقت تک تیار نہیں ہو سکتی تھی جب تک اس کی تربیت نہایت ہی مستحکم اور برتر اصولوں پر نہ کی جائے - جب تک اسلامی نظام زندگی کے اصول اس کی زندگی کا جزء نہ بن جائیں اس کے وجود کو پوری طرح دھو کر اور نچوڑ کر پاک و صاف نہ کر دیا جائے اور اسے ہر قسم کی انسانی کمزوریوں سے پاک نہ کر دیا جائے' جو جاہلیت کے دور سے اس کی شخصیت کا جزء تھیں - نیز جب تک خود اس امت کے درمیان پختہ نظام عدل قائم نہ کر دیا جائے تاکہ وہ اس کے مطابق تمام لوگوں کے درمیان انصاف کریں - اور ان کا یہ انصاف اور ان کی یہ عدالت تمام انسانی کمزوریوں سے پاک ہو اور وہ تمام ظاہری مصلحتوں سے صرف نظر کرنے کے قابل ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات میں اور اس مشکل ترین مرحلے میں ایک یہودی کے واقعہ کے ذریعے امت مسلمہ کو عدل و انصاف کے راستے پر ڈالا - ایسے حالات میں کہ اس دور میں مسلمان یہودیوں کی جانب سے بے شمار ریشہ دوانیوں کا شکار تھے اور وہ پورے عالم عرب میں مسلمانوں کے خلاف محاذ بنانے میں بھی مصروف تھے - مدینہ کے منافقین کے بھی معاون و مددگار تھے' اور وہ دین اسلام کے خلاف اپنے ترکش کا ہر تیر استعمال کر رہے تھے اور اس کے خلاف ہر سازش کر رہے تھے - مسلمانان مدینہ کے لئے مدینہ میں نہایت ہی خطرناک حالات تھے جہاں وہ دشمنیوں اور سازشوں میں گھرے ہوئے تھے اور یہ سب سازشیں یہودیوں کی طرف سے تھیں - اللہ نے ان حالات میں اپنے بندوں کو ہدایت دینے اور نشان راہ متعین کرنے کے لئے ایک یہودی کو چنا۔

ان حالات میں ایک یہودی کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کو یہ سمجھا سکے کہ عدل کا معیار کیا ہے اور اللہ تعالیٰ اس امت کو جو سکھانا چاہتے تھے وہ سکھائے - لہٰذا اس معاملے میں اللہ کی پالیسی میں کوئی سیاست' کوئی نام نہاد دانشوری اور کوئی زبانی ہیر پھیر نہ تھا - اور لیپا پوتی اور واقعات کو چھپانے کی مہارت سے بھی کام نہ لیا گیا اور صاف صاف بات کی گئی -

اس مقدمے کے فیصلے میں تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا اور تمام ظروف و احوال سے صرف نظر کیا گیا۔

معاملہ نہایت ہی حقیقت پسندانہ اور سنجیدہ تھا - اس میں کسی قسم کی ملمع کاری اور لیپا پوتی نہ تھی - حقیقت پسندی اسلامی نظام زندگی کی خصوصیات میں سے اہم خصوصیت ہے اور اس امت کے اوصاف میں سے یہ ایک اہم وصف ہے - یہ اس

امت کے مقاصد میں شامل ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان عدل پھیلائے اور عدل کو اس معیار پر پہنچا دے جہاں تک کبھی انسانیت نہ پہنچی اور صرف اللہ کی جانب سے وحی اور ہدایت ہی کے نتیجے میں یہ امت یہاں تک پہنچی۔

جب انسان اس مقام بلند تک پہنچا تو اس نے دیکھا کہ تاریخ کے تمام ازمنہ اور ادوار میں انسانی پستیوں کے گہرے گڑھے میں پڑے ہیں۔اس نے دیکھا کہ اس مقام بلند تک پہنچنے کی راہ میں نہایت ہی گہری کھائیاں ہیں۔اس راہ میں جگہ جگہ چالاکیاں' ظاہرداریاں' سیاست' عیاری' بلاغت' مہارت' حکومت کی مصلحت' ملک کی مصلحت اور پارٹی کی مصلحت وغیرہ کی بے پناہ رکاوٹیں ہیں جو مختلف ناموں اور مختلف عنوانوں کے ساتھ عدل و انصاف کی راہ روکے کھڑی ہیں۔اور اگر اس بلندی سے انسان تمام نظامہائے زندگی کو دقت نظر سے دیکھے تو اسے دنیا میں گندگی ہی گندگی نظر آئے۔

اس بلندی سے انسان جب نگاہ ڈالتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ امت مسلمہ اس میدان میں یکہ و تنہا نظر آتی ہے۔جو زندگی کی ان غلاظتوں سے بلند ہو کر اس پاکیزہ مقام تک پہنچی ہے اور صرف امت مسلمہ کے لینڈ مارک شاہراہ تاریخ میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں اور عدل و انصاف کی اس بلند چوٹی تک پہنچنے کے لئے صرف امت مسلمہ نے راہیں متعین کی ہیں اور وہ اس میدان میں منفرد ہے۔

رہی وہ گندگی اور وہ تعفن جسے جاہلیت قدیمہ اور جاہلیت جدیدہ میں عدالت کا نام دیا جاتا ہے تو مناسب یہی ہے کہ ہم اس گندگی کو دبی رہنے دیں کیونکہ اس پاکیزہ ماحول کو اس کا تعفن گندہ کر دے گا اور ہر طرف بدبو پھیل جائے گی۔

مناسب ہے کہ اب ہم آیات پر ذرا تفصیل سے بات کریں۔

---ooo---

درس نمبر ۳۹ تشریح آیات

۱۰۵ -- تا -- ۱۱۳

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ
أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ﴿١٠٥﴾ وَٱسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ
غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٠٦﴾ وَلَا تُجَٰدِلْ عَنِ ٱلَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ
لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ﴿١٠٧﴾ يَسْتَخْفُونَ مِنَ ٱلنَّاسِ وَلَا
يَسْتَخْفُونَ مِنَ ٱللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ ٱلْقَوْلِ ۚ
وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ﴿١٠٨﴾ هَٰٓأَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ جَٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ
فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا فَمَن يُجَٰدِلُ ٱللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ أَم
مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿١٠٩﴾

(اے نبی "' ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے ' تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ تم بددیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو' اور اللہ سے درگزر کی درخواست کرو' وہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے۔ جو لوگ اپنے نفس سے خیانت کرتے ہیں تم ان کی حمایت نہ کرو۔ اللہ کو ایسا شخص پسند نہیں ہے جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو۔ یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات چھپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں

چھپا سکتے ـ وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ راتوں کو چھپ کر اس کی مرضی کے خلاف مشورے کرتے ہیں ـ ان کے سارے اعمال پر اللہ محیط ہے ـ ہاں' تم لوگوں نے ان مجرموں کی طرف سے دنیا کی زندگی میں تو جھگڑا کر لیا' مگر قیامت کے روز ان کے لئے اللہ سے کون جھگڑا کرے گا؟ آخر وہاں کون ان کا وکیل ہو گا؟)

بات نہایت ہی سختی سے کہی جا رہی ہے' یوں نظر آتا ہے کہ سچائی کے حق میں غیظ و غضب سے کام لیا جا رہا ہے اور عدل قائم کرنے کے لئے سخت غیرت کا اظہار کیا جا رہا ہے اور جذبات' بات کے ماحول اور فضا سے ظاہر ہو رہے ہیں ـ

اس کا اظہار اس بات سے بھی ہو رہا ہے کہ حضور ؐ کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ ہم نے یہ کتاب سچائی کے ساتھ نازل کی تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اللہ کی اس کتاب کے مطابق فیصلے کریں ـ آپ کو سختی سے منع کیا گیا کہ آپ خائن لوگوں کے طرفدار نہ ہو جائیں اور نہ ان کی جانب سے دفاع کریں اور آپ نے جو مجادلہ ان خائن لوگوں کی طرف سے کیا ہے اس پر اللہ سے مغفرت طلب کریں ـ

(اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا (۱۰۵) وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا

(۱۰۶) (۴: ۱۰۵ ـ ۱۰۶)) (اے نبی ؐ' ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے' تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو ـ تم بددیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو' اور اللہ سے درگزر کی درخواست کرو' وہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے ـ)

اس کے بعد اس ممانعت کو دوبارہ مکرر بیان کیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں کی طرف سے آپ نے خصومت کی وہ اپنے آپ سے خیانت کر رہے ہیں اور وجہ یہ ہے کہ چونکہ یہ خائن ہیں اور اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ـ

(وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِــيْمًا

(۴: ۱۰۷)) (جو لوگ اپنے نفس سے خیانت کرتے ہیں تم ان کی حمایت نہ کرو ـ اللہ کو ایسا شخص پسند نہیں ہے جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو ـ)

بظاہر تو انہوں نے دوسرے لوگوں کے ساتھ خیانت کی تھی لیکن درحقیقت وہ اپنے ساتھ خیانت کر رہے تھے ـ انہوں نے اپنی جماعت اور اپنے نظام کے خلاف خیانت کی ـ اپنے اصولوں اور ان کی ممتاز حیثیت کے خلاف خیانت کی' انہوں نے اس امت کے خلاف خیانت کی جس کے وہ بھی افراد تھے ..... پھر ایک دوسرے پہلو سے بھی وہ اپنے نفس کے خلاف خیانت کر رہے تھے ـ وہ اپنے نفوس کو ایسے جرم میں ملوث کر رہے تھے جس کی سزا بہت ہی سخت تھی ـ جہاں اللہ انہیں مجبور کرے گا اور پکڑ کر سزا دے گا ـ ظاہر ہے کہ یہ اپنے نفس کے خلاف بھی خیانت ہے ـ ایک تیسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے ضمیر کو

جھوٹ کہہ کر اور جرم کر کے خیانت میں ملوث کر رہے تھے۔

(اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا (۴:۱۰۷)) (اللہ کو ایسا شخص پسند نہیں ہے جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو) اور اللہ کی ناپسندیدگی تمام سزاؤں میں سے بڑی سزا ہے۔ اس کے اندر ایک دوسرا اشارہ بھی ہے 'کہ جو لوگ اللہ کے محبوب نہیں' چاہئے کہ کوئی ان کی حمایت نہ کرے۔ کوئی ان کی وکالت نہ کرے 'اس لئے کہ ارتکاب جرم کرنے کی وجہ سے اللہ نے انہیں ناپسند کر لیا ہے۔ ان لوگوں کو خیانت کار اور معصیت پیشہ کہنے کے بعد اب ان کی تصویر کشی اس طرح کی جاتی ہے اور ان کا پردہ یوں چاک ہوتا ہے:

(یَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰہِ وَھُوَ مَعَھُمْ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا یَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ --- (۴:۱۰۸)) (یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات چھپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے۔ وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ راتوں کو چھپ کر اس کی مرضی کے خلاف مشورے کرتے ہیں)۔

ان کی یہ تصویر نہایت ہی کریہہ المنظر ہے۔ اس پر انسان کو بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ اس میں ان کی کمزوری اور سازش صاف صاف نظر آتی ہے۔ یہ راتوں کو جمع ہوتے اور اپنا جرم چھپانے کی سازشیں کرتے ہیں اور خیانت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ لوگوں سے یہ اپنا جرم چھپا سکتے ہیں مگر اللہ سے نہیں چھپا سکتے۔ لوگوں سے چھپنا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ لوگ تو انہیں نفع و نقصان سے نہیں بچا سکتے۔ اور جو ذات نفع و نقصان کی مالک ہے اس سے وہ چھپ نہیں سکتے۔ وہ تو ان کے ساتھ ہوتی ہے جب وہ سازشیں کرتے ہیں۔ وہ ان کے ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ وہ طمع کاری کرتے ہیں اور اللہ کی مرضی کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ ان کا موقف کیا بودا ہے کہ جس سے چھپاتے ہیں اس سے تو چھپ نہیں سکتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ (وَکَانَ اللّٰہُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطًا (۴:۱۰۸)) (ان کے سارے اعمال پر اللہ محیط ہے) اگر اللہ مطلقاً تمام اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہے تو وہ جو رات کو خفیہ سازشیں کرتے ہیں ان کا کیا فائدہ ہو گا۔ اللہ تو اس مجلس میں ان کے ساتھ ہوتا ہے ہر چیز اس کی نظر میں ہے اور اس کے قبضے میں ہے۔ اور یہ غضبناک حملہ ابھی جاری ہے اور اس کا اطلاق ان تمام لوگوں پر ہوتا ہے جو خائن لوگوں اور مجرموں کی طرف سے مجادلہ کرتے ہیں۔

(ھٰاَنْتُمْ ھٰؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا فَمَنْ یُّجَادِلُ اللّٰہَ عَنْھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَمْ مَّنْ یَّکُوْنُ عَلَیْھِمْ وَکِیْلًا (۴:۱۰۹)) (ہاں 'تم لوگوں نے ان مجرموں کی طرف سے دنیا کی زندگی میں تو جھگڑا کر لیا 'مگر قیامت کے روز ان کے لئے اللہ سے کون جھگڑا کرے گا؟ آخر وہاں کون ان کا وکیل ہو گا؟ قیامت کے دن تو ان کا کوئی وکیل اور مجادل نہ ہو گا۔ اگر دنیا میں بذریعہ وکالت وہ بچ بھی گئے تو کیا فائدہ ہوا؟ اس بھاری دن سے تو وہ ہرگز نہ بچ سکیں گے۔

---ooo---

خائنوں اور معصیت پیشہ لوگوں پر اس حملے کے بعد اور ان کے حامیوں، مجادلوں اور وکیلوں کی مذمت کرنے کے بعد اب اس برے فعل کے بارے میں اور اس کے نتائج کے بارے میں اصولی بات کی جاتی ہے۔ اس کا حساب و کتاب آخرت میں کیا ہوگا اور اس کی عمومی سزا کیا ہونا چاہئے اور اللہ تعالیٰ ایسے مجرموں کے ساتھ کیا معاملہ فرماتے ہیں اور پھر یہ کہ جو معاملہ اللہ فرماتے ہیں تم بھی مجرموں اور ایک دوسرے کے ساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھو اور اللہ کے بتائے ہوئے اخلاق اپناؤ خصوصاً عدل و انصاف کے معاملے میں۔

وَمَنْ يَعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾

(اگر کوئی شخص برا فعل کر گزرے یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے اور اس کے بعد اللہ سے درگزر کی درخواست کرے تو اللہ کو درگزر کرنے والا اور رحیم پائے گا۔ مگر جو برائی کمائے تو اس کی یہ کمائی اسی کے لئے وبال ہوگی۔ اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے اور وہ حکیم و دانا ہے۔ پھر جس نے کوئی خطا یا گناہ کر کے اس کا الزام کسی بے گناہ پر تھوپ دیا اس نے تو بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا۔)

یہ تین آیات وہ قواعد کلیہ وضع کرتی ہیں جن کے مطابق اللہ اپنے بندوں کے ساتھ سلوک و انصاف کرے گا۔ اور لوگ بھی اگر چاہیں تو وہ اس کے مطابق سلوک کر کے اچھا معاشرہ تعمیر کر سکتے ہیں اور انہی قواعد کے مطابق وہ اللہ کے ساتھ معاملہ کر کے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں۔

پہلی آیت میں معافی کا دروازہ چوپٹ کھلا رکھا گیا۔ اگر لوگ توبہ کر لیں۔ تو اللہ تعالیٰ کی معافی کا دروازہ کھلا پائیں گے۔ ہر گناہ گار تائب کو معافی کی امید دلائی گئی ہے۔

(وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا

(٤ : ١١٠)) (اگر کوئی شخص برا فعل کر گزرے یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے اور اس کے بعد اللہ سے درگزر کی درخواست کرے تو اللہ کو درگزر کرنے والا اور رحیم پائے گا)۔

اللہ تعالیٰ موجود ہے اور اس کی مغفرت اور رحمت موجود ہے بشرطیکہ کوئی معافی مانگنے والا ہو، کوئی رحمت کا طلب گار ہو

جو باز آ رہا ہو۔ جو شخص برائی کرتا ہے کبھی غیر پر ظلم کرتا ہے اور کبھی اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے (نفس پر ظلم اس وقت ہوتا ہے جب اس کی برائی دوسرے تک متعدی نہ ہو' اس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود ہو۔) بہرحال ظالموں کے لئے معافی کا دروازہ کھلا ہے۔ اگر وہ استغفار کریں۔ اگر وہ توبہ کر کے واپس آئیں تو وہ انہیں معاف کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر رحمت بھی کرتا ہے۔ اس کا دروازہ کھلا ہے' اس پر کوئی دربان نہیں ہے' اور اس کا یہ اعلان' اعلان عام ہے۔ بے قید اور بے شرط ہے۔ جب بھی وہ توبہ کر کے لوٹ آئیں تو اللہ غفور و رحیم ہے۔

دوسری آیت میں یہ اصول طے ہوا ہے کہ مسئولیت انفرادی ہے۔ سزا میں اسلامی نظام زندگی کا یہ اساسی اصول ہے کہ ہر کوئی اپنے کئے کا خود ذمہ دار ہے اور اس اصول سے ہر شخص کے دل میں خوف بھی پیدا ہوتا ہے اور اطمینان بھی پیدا ہوتا ہے۔ خوف اس لئے کہ وہ اپنے اعمال اور اپنے کاموں کو درست کرے گا اور اطمینان اس لئے ہو گا کہ دوسرے کے معاملات اور بدکاریوں کا وہ ذمہ دار نہ ہو گا۔

(وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا

(٤ : ١١٢)) (مگر جو برائی کمائے تو اس کی یہ کمائی اسی کے لئے وبال ہوگی' اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے اور وہ حکیم و دانا ہے) اس اصول کے مطابق جرائم میں اصول وراثت نہیں چلتا۔ جس طرح اہل کنیسہ موروثی جرم کی بات کرتے ہیں۔ اسلام میں یہ تصور نہیں ہے کہ کسی جرم کی سزا کوئی اور بھگتے گا یا کفارہ کوئی اور دے گا۔ اسلام میں ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ اس تصور کے مطابق ہر شخص اپنے اعمال کے بارے میں محتاط ہو گا۔ اور وہ اس بات سے مطمئن ہو گا کہ دوسروں کے جرائم میں اسے نہ پکڑا جائے گا۔ یہ ایک عجیب متوازن قانون اور نہایت ہی متوازن تصور حیات ہے۔ اسلامی تصور حیات کے اساسی عناصر میں سے یہ ایک اہم عنصر ہے (دیکھئے خصائص التصور الاسلامی) اس تصور پر فطرت مطمئن ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بے قید عدل نافذ ہوتا ہے اور انسان کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس اصول جرم و سزا کو دنیا میں اپنائے۔

تیسری آیت اس بارے میں بات کرتی ہے کہ خود جرم کر کے دوسرے انسان پر تھوپنا بہت ہی بڑا جرم ہے اور قصہ زیر بحث میں جرم کا ارتکاب کیا گیا تھا۔

(وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا

(٤ : ١١٢)) (پھر جس نے کوئی خطا یا گناہ کر کے اس کا الزام کسی بے گناہ پر تھوپ دیا اس نے تو بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا)۔

بہتان کے معنی یہ ہیں کہ ایک پاک دامن شخص پر الزام تھوپ دیا جائے اور گناہ وہ ہے جس کا اس نے ارتکاب کرنے کے بعد اسے بری الذمہ شخص کے سر تھوپ دیا۔ گویا اس شخص نے ان دونوں کو اپنے سر پر اٹھا لیا ہے۔ گویا ایک بوجھ ہے جسے یہ شخص اٹھا رہا ہے اور یہ قرآن کریم کا انداز کلام ہے کہ وہ حقائق اور مفاہیم کو مجسم شکل میں پیش کرتا ہے اور یہ قرآن کا معجزانہ انداز بیان ہے۔ (دیکھئے التصویر الفنی فی القرآن)۔

اسلام ان تین اصولوں کے مطابق اپنا نظام عدل استوار کرتا ہے اور انہی کے مطابق مجرمین کو سزا دیتا ہے ۔وہ کسی بھی مجرم کو معاف نہیں کرتا اگر اس جرم کی زد میں کوئی غیر شخص آئے ۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام مغفرت اور توبہ کا دروازہ بھی کھلا چھوڑتا ہے ۔اور یہ طے کرتا ہے کہ طلب مغفرت کرنے والوں اور توبہ کرنے والوں کے لئے ہر وقت یہ دروازہ کھلا رکھا جائے ۔جب بھی وہ چاہیں اسے کھٹکھٹائیں بلکہ اگر وہ اللہ کی درگاہ میں بلا اجازت ہی داخل ہو جائیں اور پناہ لے لیں تو بھی مغفرت اور رحمت ان کو ڈھانپ لے گی ۔

---○○○---

اس کے بعد اللہ تعالیٰ رسول اللہ ؐ پر احسان مندی کا اظہار فرماتے ہیں کہ اگر اللہ نہ بچاتا تو آپ سازشیوں کی سازش کا شکار ہوتے اور کوئی غلط فیصلہ کر دیتے ۔ لیکن اللہ نے وہ سازش طشت ازبام کر دی' جسے وہ لوگوں سے چھپانا چاہتے تھے ۔ اسے وہ اللہ سے تو نہ چھپا سکتے تھے اس لئے کہ رات کے وقت بھی جب وہ ناپسندیدہ باتیں کرتے تھے اللہ ان کے ساتھ تھا ۔ اس کے بعد اللہ بطور احسان یاد دہانی کراتے ہیں کہ اللہ نے آپ پر احسان کیا کہ اس نے آپ پر حکمت اتاری اور وہ تعلیم دی جو آپ کے علم میں نہ تھی اور پھر یہ احسان پوری انسانیت پر تھا اور اس احسان کو آپ کی ذات مکرم میں مجسم کر دیا جبکہ آپ کی ذات باری تعالیٰ سے ہر وقت قربت رکھتی تھی ۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾

(اے نبی ؐ اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا' حالانکہ درحقیقت وہ خود اپنے سوا کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر رہے تھے ۔ اور تمہارا کوئی نقصان نہ کر سکتے تھے ۔ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور تم کو وہ کچھ بتایا ہے جو تمہیں معلوم نہ تھا اور اس کا فضل تم پر بہت ہے)۔

یہ کوشش ان مختلف النوع کوششوں میں سے ایک ہے جو رسول اللہ ؐ کے دشمن اسلام کے خلاف کر رہے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ حضور اکرم ؐ کو سچائی' انصاف اور صراط مستقیم سے بدراہ کر دیں لیکن اللہ کا فضل و کرم ہمیشہ آپ کے شامل حال رہتا اور آپ کو اللہ بچا لیتے اور جو لوگ سازشیں کرتے وہ خود سازش کا شکار ہو جاتے اور خود ہی گمراہ ہوتے ۔اور سیرت الرسول ؐ میں اس قسم کے بے شمار واقعات موجود ہیں کہ سازشیوں نے سازش کی اور اللہ نے ان کی سازش کو ناکام بنا دیا

اور ان کی کوششیں ناکام ہوگئیں..... اللہ تعالیٰ یہاں حضور کو اطمینان دلاتے ہیں کہ اس کا فضل اور رحمت رسول اللہ کے شامل حال رہے گی اور وہ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔

اس مناسبت میں کہ اللہ تعالیٰ نے سازشیں کرنے والوں کی سازش سے آپ کو محفوظ رکھا اور آپ اس سے بچ گئے کہ آپ کے احکام کی وجہ سے ظالم بچ جائے اور بے گناہ کو سزا ہو جائے' اللہ تعالیٰ اپنے ایک عظیم فضل کو یاد دلاتے ہیں۔وہ یہ کہ اللہ نے آپ کو تاج رسالت پہنایا۔

(وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (٤ : ١١٣)) (اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور تم کو وہ کچھ بتایا ہے جو تمہیں معلوم نہ تھا' اور اس کا فضل تم پر بہت ہے) یہ احسان دراصل جنس انسان پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری رسالت انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجی۔ یہ کوئی معمولی احسان نہ تھا بلکہ یہ انسان کے لئے ایک نیا جنم تھا اور اس سے انسانیت کو ایسی زندگی ملی جس طرح کوئی انسان پہلی مرتبہ انسانیت اور روح پاتا ہے۔ یہ احسان جس کی وجہ سے انسان کو جاہلیت کی پستیوں سے اٹھایا گیا اور اسے اسلامی نظام حیات کے ذریعے دنیا میں برتری اور ترقی دے کر نہایت ہی اونچے مقام تک پہنچایا گیا اسے اللہ تعالیٰ نے فضل عظیم سے تعبیر کیا۔

اسلامی نظام زندگی کے احسان اور بھلائی کا صحیح طرح اندازہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس نے اسلام اور جاہلیت کا تقابلی مطالعہ کیا ہو۔ ماضی اور حال کو دیکھا ہو اور جس نے اسلام کی طرح جاہلیت کو بھی چکھا ہو۔

اس احسان کا تذکرہ سب سے پہلے رسول اللہ ؐ سے کیا گیا' اس لئے کہ سب سے پہلے اسلام کو حضور اکرم ؐ نے پایا۔ سب سے پہلے اس کا مزہ چکھا اور سب سے پہلے آپ ؐ نے جانا اور آپ سب سے زیادہ اسلام کے جاننے والے اور اسے چکھنے والے تھے۔ (وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (٤: ١١٣)) تم کو وہ کچھ بتایا جو تم نہ جانتے تھے اور اللہ کا فضل تم پر بہت بڑا ہے) ۔

---ooo---

درس نمبر ۴۰ ایک نظر میں

یہ سبق درس سابق کے ساتھ مربوط ہے اور ان دونوں کے درمیان کئی ربط ہیں۔اس میں بعض آیات تو درس سابق کے واقعہ کی بازگشت ہیں۔ اس واقعہ اور وحی الٰہی کے بعد بشرابن لبیرق جو چوری میں ملوث تھا' مرتد ہو گیا تھا اور رسول اللہ ؐ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا تھا۔ اور اسلام کے بعد دوبارہ جاہلیت میں چلا گیا تھا۔چنانچہ اس حوالے سے اس سبق میں جاہلیت کی بات کی گئی ہے۔جاہلی خیالات 'تصورات اور اس نظام میں شیطان کی کارستانیاں وغیرہ۔بتایا جاتا ہے کہ اسلام اور جاہلیت کے درمیان سرحد شرکیہ عقاید ہیں۔اللہ کے نظام میں شرک کی معافی نہیں ہے۔

اس کے سواسب کچھ قابل معافی ہے..... اس سبق میں راتوں کو خفیہ سازشوں سے بھی منع کیا گیا ہے اور جو کام بھی خفیہ ہوتے ہیں ان میں زیادہ تر اچھے نہیں ہوتے۔مثلاً درس سابق میں چوری کے واقعہ میں جو نجویٰ ہوا۔نجویٰ کی ممانعت کے بعد اس میں بھلائی 'معروف مشورے اور لوگوں کے درمیان اصلاح وغیرہ کی اسکیموں کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا۔اس لئے کہ یہ تو کارثواب ہے۔پھر آخر میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے ہاں جزا اس کے اپنے اصولوں کے مطابق ہوتی ہے اور اس میں کسی کی ذاتی چاہت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔نہ مسلمانوں اور نہ ہی اہل کتاب کی چاہت کا اس میں دخل ہو گا۔سب کام اللہ کے بے قید انصاف کے مطابق ہوں گے۔اور سچائی کے مطابق ہوں گے اور اگر سچائی لوگوں کی چاہتوں کے پیچھے چلے تو زمین و آسمان کا تمام نظام فاسد ہو جائے۔

غرض یہ سبق اپنے موضوع اور اپنے رخ کے اعتبار سے ـــــ سابق کے ساتھ پوری طرح مربوط ہے...... اور اس کے علاوہ امت مسلمہ کی تربیت کی ایک نئی کڑی ہے جسے پوری انسانیت کی قیادت کے لئے تیار کرنا پیش نظر تھا۔اس طرح کہ وہ تنظیم میں فوقیت رکھتی ہو اور اس کی نظر میں ہو کہ اس کی صفوں میں کہاں کہاں کمزوریاں ہیں اور کہاں کہاں ابھی تک آثار جاہلیت باقی ہیں تاکہ وہ ان کی اصلاح کر سکے۔یہ وہ مقصد ہے کہ اس پوری سورہ میں اس کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔اس سے متعلق کئی موضوع زیربحث آئے اور پورے قرآن کریم کے مقاصد میں سے بھی یہ ایک اہم موضوع ہے۔

---ooo---

درس ۴۰ تشریح آیات

۱۱۴ -- تا -- ۱۲۶

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١١٤﴾

(لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر و بیشتر کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ ہاں اگر کوئی پوشیدہ طور پر صدقہ و خیرات کی تلقین کرے یا کسی نیک کام کے لئے یا لوگوں کے معاملات میں اصلاح کرنے کے لئے کسی سے کچھ کہے تو یہ البتہ بھلی بات ہے' اور جو کوئی اللہ کی رضا جوئی کے لئے ایسا کرے اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے۔)

قرآن کریم میں نجویٰ کی بار بار ممانعت کی گئی ہے۔ نجویٰ یہ ہے کہ کوئی گروہ اسلامی جماعت سے علیحدہ اور اسلامی قیادت سے علیحدہ کوئی بات سوچے اور اس کے لئے جمع ہو۔ اسلامی تربیت کا طریق کار یہ تھا کہ لوگ اپنی تمام مشکلات اور مسائل کو لے کر اسلامی قیادت کے پاس آتے اور اگر بات ذاتی ہوتی تو وہ تنہائی میں پیش کرتے تاکہ عوام الناس میں بات پھیل نہ جائے اور اگر بات کی نوعیت عمومی ہوتی تو اسے علانیہ پوچھتے یعنی اگر بات کا خصوصاً پوچھنے والے سے تعلق نہ ہوتا۔

اس پالیسی میں حکمت یہ تھی کہ اس کی وجہ سے جماعت مسلمہ کے اندر کوئی بلاک یا گروہ نہ بن سکتے تھے اور نہ ہی یہ ہو سکتا تھا کہ جماعت کے کچھ حصے اپنے تصورات اور اپنی مشکلات کو لے کر الگ ہو جائیں یا وہ اپنے رجحانات اور اپنے افکار کے مطابق اپنی راہ لیں ۔ یہ صورت حال بھی نہ ہو کہ جماعت کے کچھ لوگ رات کو مشورہ کر کے ایک بات کا فیصلہ کر لیں اور دن کے وقت جماعت کے اندر بطور ایک فیصلہ شدہ امر پیش کر دیں۔ اگرچہ حضور ؐ کے دور میں تو کوئی بات مخفی نہ رہ سکتی تھی' وہ جو کچھ مشورہ کرتے اللہ ان کے ساتھ ہوتا اور بوقت ضرورت حضور ؐ کو اطلاع دے دیتا۔

مسجد نبوی جماعت مسلمہ کی پارلیمنٹ تھی۔ وہاں لوگ باہم ملتے تھے۔ نماز پڑھتے تھے اور زندگی کے تمام معاملات وہاں ہی طے ہوا کرتے تھے۔ پھر اسلامی معاشرہ ایک کھلا معاشرہ (Open Society) تھا۔ اس میں وہ تمام معاملات پیش ہوتے

تھے جو جماعت کے جنگی اسرار و رموز سے متعلق نہ ہوتے یا ایسے مسائل نہ ہوتے جس کا تعلق لوگوں کی ذلت اور خاندانوں سے ہو اور وہ پسند نہ کرتے ہوں کہ لوگوں کے علم میں آئیں۔ اسلامی سوسائٹی چونکہ ایک کھلی سوسائٹی تھی اس لئے وہ آزاد اور پاک و صاف سوسائٹی تھی اور اس سوسائٹی میں علیحدہ جنبہ بناکر راتوں کو مشورہ وہی لوگ کرتے تھے جو اس کے خلاف سازش کرتے تھے یا اس کے اصولوں میں سے کسی اصول کے خلاف جمع ہوتے تھے اور یہ لوگ عموماً منافقین ہوا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی نجویٰ ہوا' اس میں منافقین شریک رہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہمارے لئے بہت ہی مفید ہے۔ —— اسلامی معاشرہ اس سے پاک و صاف ہونا چاہئے۔ اس میں جن لوگوں کو کسی چیز کے بارے میں کوئی بھی خلجان ہو' اسے چاہیے کہ وہ اسے قیادت عامہ کے سامنے پیش کرے۔ یا اگر کوئی مشکل پیش آئے یا کوئی تجویز ان کے سامنے ہو یا کوئی رجحان نظر آئے تو ان معاملات میں اسے قیادت کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

یہاں قرآن مجید نے نجویٰ کی ایک قسم کو جائز رکھا ہے۔ دراصل وہ نجویٰ ہی نہیں ہے اگرچہ شکل نجویٰ کی ہے۔

(اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ (٤ : ١١٤)) (ہاں اگر کوئی پوشیدہ طور پر صدقہ و خیرات کی تلقین کرے یا کسی نیک کام کے لئے یا لوگوں کے معاملات میں اصلاح کرنے کے لئے کسی سے کچھ کہے تو یہ البتہ بھلی بات ہے)۔

مثلاً دو اچھے اور نیک آدمی جمع ہوں اور ایک دوسرے کے ساتھ مشورہ کریں کہ کیا فلاں شخص کی مدد کے لئے یا فلاں کام میں روپیہ خرچ کرنا چاہیے اس لئے کہ اس شخص کو ضرورت ہے اور مجھے اس کی ضرورت کا علم ہے یا یہ کہ فلاں کام میں خرچ کرنے کی ضرورت ہے' آیئے یہ کام کریں۔ یا یہ کہ فلاں اور فلاں کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے ہیں' آیئے ان کے درمیان مصالحت کرادیں۔ ایسے لوگوں کی کوئی انجمن یا سوسائٹی بھی بن سکتی ہے جو مشورہ کرکے کسی نیک کام میں باہم تعاون کرسکتی ہے بشرطیکہ یہ کام نہ نجویٰ ہوں اور نہ اسلامی نظام کے خلاف کوئی سازش۔ اگرچہ ظاہری شکل میں یہ نجویٰ بھی ہوگا لیکن قرآن نے اسے "امر" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اس قسم کی محدود سوسائٹی بعض اوقات اپنے امور رات کو تنہائی میں طے کرتی ہے اور ان کا مقصد معروف اور بھلائی کا کام ہوتا ہے۔

لیکن اس قسم کی سوسائٹی کے لئے بھی ضروری ہے کہ اس کی تشکیل اور سرگرمی اللہ کی رضامندی کے حصول کے لئے ہو۔

(وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (٤ : ١١٤)) (اور جو کوئی اللہ کی رضاجوئی کے لئے ایسا کرے گا تو اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے)۔

یعنی کسی شخص پر صدقہ کرنے اور فلاں اور فلاں کے درمیان اصلاح حال کرنے کا مقصد یہ نہ ہو کہ یہ کام کرنے والے لوگ اس طرح مشہور ہو جائیں کہ لوگ کہیں کہ خدا کی قسم یہ بہت ہی اچھے لوگ ہیں کہ صدقہ و خیرات کے لئے لوگوں کو آمادہ کرتے ہیں اور لوگوں کے درمیان اصلاح کا کام کرتے ہیں۔ غرض اس کام میں ان کے پیش نظر رضائے الٰہی کے حصول کے سوا اور کوئی مقصد نہ ہو۔ یہ ہے وہ فرق و امتیاز جو محض رضائے الٰہی اور اجر اخروی کے لئے کئے جانے والے

کام اور اس کام کے درمیان ہوتا ہے' جو کسی اور غرض کے لئے کیا جاتا ہے ۔ اگرچہ بظاہر دونوں کام ایک جیسے ہوتے ہیں لیکن ایک کا اندراج بھلائی کے رجسٹر میں ہوتا ہے اور دوسرے کا اندراج برائیوں کے رجسٹر میں ہوتا ہے ۔

وَ مَنۡ يُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الۡهُدٰى وَ
يَتَّبِعۡ غَيۡرَ سَبِيۡلِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصۡلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتۡ
مَصِيۡرًا ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَ يَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ
يَّشَآءُ ؕ وَ مَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيۡدًا ﴿۱۱۶﴾

(مگر جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے' درآں حالیکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی ہو' تو اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے ۔ اللہ کے ہاں بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے' اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا)۔

ان آیات کے نزول کے سلسلے میں یہ کہا گیا ہے کہ بشیر ابن ابیرق مرتد ہو گیا اور جا کر مشرکین مکہ کے ساتھ مل گیا حالانکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی تھی ۔ پہلے وہ اسلامی صفوں میں تھا لیکن اس نے اہل ایمان کی راہ کو چھوڑ کر دوسری راہ کو اپنا لیا۔ لیکن یہ آیت مضمون اور اطلاق کے اعتبار سے عام ہے ۔ اس کا اطلاق ہر اس حالت پر ہو گا جس میں رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی جا رہی ہو ۔ جس میں آپ کی مخالفت میں کفر' شرک اور ارتداد اختیار کیا گیا ہو اور اس طرح کے قدیم وجدید تمام واقعات پر اس کا اطلاق ہو گا۔

(المشاقہ) کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص ایک ٹکڑا لے اور دوسرا اس کے مقابلے میں دوسرا ٹکڑا لے لے ۔ اور جو شخص رسول کے ساتھ شقاق کرتا ہے وہ رسول کے بالمقابل جتھہ' بالمقابل صف' اور بالمقابل پارٹی کو اختیار کرتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے جتھے' پارٹی اور محاذ کی مخالفت کرتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے نافذ کردہ نظام زندگی کے بالمقابل نظام اختیار کرتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے طریقوں سے متضاد طریقے اختیار کرتا ہے ۔ رسول اللہ ﷺ اللہ کی جانب سے ایک مکمل نظام حیات لے کر آئے تھے جس کے اندر عقیدے اور نظریات بھی شامل تھے' جس کے اندر مراسم عبودیت بھی تھے ۔ جس کے اندر نظام قانون اور نظام حکومت بھی تھا اور یہ نظام زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھا ۔ اور یہ تمام امور اسلامی نظام کے مجموعی جسم کے اعضاء تھے ۔ اور اصول یہ ہے کہ اگر ان اعضاء کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے تو نظام قائم نہیں رہ سکتا ۔ اس کی روح نکل جائے گی ۔ جو شخص رسول کے ساتھ شقاق کرتا ہے یہ وہی شخص ہے جو یا تو اسلامی نظام حیات کو مکمل طور پر رد کرتا

ہے اور یا بعض حصوں کو مانتا ہے اور بعض کا انکار کرتا ہے۔یعنی ایک حصہ لیتا ہے اور دوسرا چھوڑتا ہے

اللہ کی رحمت کا تقاضا یہ ہوا کہ کہیں ان پر حجت تمام نہ ہو جائے اور وہ برے ٹھکانے جہنم کے مستحق نہ ہو جائیں اس لئے اللہ نے ان کی جانب رسول بھیجے۔رسولوں نے لوگوں کے سامنے سچائی بیان کی۔انہوں نے لوگوں پر راہ ہدایت کو بالکل واضح کر دیا۔پھر اگر وہ انکار کریں گے تو گمراہی کو اختیار کریں گے۔یہ اللہ کی وسیع رحمت تھی کہ اللہ نے اس ضعیف مخلوق کے لئے صراط مستقیم پر چلنے کا یہ اہتمام کیا۔پھر جب کسی پہ راہ حق واضح ہو جائے اور رسول موجود ہو اور پھر بھی وہ رسول کی راہ کے مقابلے میں دوسری راہ اختیار کرے اور آپ پر ایمان نہ لائے اور آپ کی اطاعت نہ کرے اور اسلامی نظام اور نظام مصطفیٰ پر راضی نہ ہو' تو اب حجت تمام ہوتی ہے اور اللہ ان کے حق میں گمراہی لکھ دیتے ہیں اور پھر اسی طرف اسے موڑ دیتے ہیں جس طرف وہ مڑ جاتا ہے۔پھر اسے اللہ کفار کے حوالے کر دیتا ہے۔وہ مشرکین کا ساتھی ہو جاتا ہے اور اب اس پر وہ عذاب حق بن جاتا ہے جس کا اللہ نے اعلان کیا۔

(وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا (۴:۱۱۵))

(مگر جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے' درآں حالیکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی ہو' تو اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بد ترین جائے قرار ہے۔) اس برے انجام کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اللہ کی مغفرت ہر گناہ کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے مگر شرک ایک ایسا گناہ ہے جس کے لئے ہرگز معافی نہیں ہے۔

(اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (۴:۱۱۶)) (اللہ کے ہاں بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے' اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے۔جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا)۔

جیسا کہ ہم اس سے قبل اسی مضمون کی آیت کی تفسیر میں کہہ آئے ہیں کہ شرک کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہوں کو شریک کیا جائے جس طرح عرب دور جاہلیت میں کیا کرتے تھے اور جس طرح عربوں کے علاوہ دوسری قدیم جاہلیتیں کرتی تھیں۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کے خصائص الوہیت خصوصاً صفت حاکمیت میں بھی کسی اور کو شریک کرنے سے شرک کا ارتکاب ہوتا ہے۔مثلاً کسی انسان کو حاکم سمجھا جائے۔جس طرح یہود و نصاریٰ کے شرک کے بارے میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ انہوں نے اپنے احبار اور رہبان کو اللہ کے سوا الٰہ بنا رکھا ہے۔

یہ لوگ احبار و رہبان کی عبادت اس طرح نہ کرتے تھے جس طرح وہ اللہ کی عبادت کرتے تھے بلکہ وہ ان احبار اور

رہبان کو حق قانون سازی دیتے تھے - یہ لوگ ان کے لئے حلال و حرام کے حدود بھی متعین کرتے تھے اور یہود و نصاریٰ اس کام میں ان کی اطاعت کرتے تھے - اس طرح وہ ان لوگوں کو خصائص الوہیت میں سے ایک حصہ عطا کر دیتے تھے اس لئے وہ مشرک قرار پائے - ان کے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ انہوں نے توحید کے سلسلے میں اللہ کی ہدایات کی خلاف ورزی کر ڈالی تھی' حالانکہ اللہ کی طرف سے انہیں حکم صرف یہ تھا کہ وہ صرف الہٰ واحد کی بندگی کریں' صرف اللہ وحدہ کے مراسم عبودیت ادا کریں اور اوامر و نواہی کے ساتھ ساتھ قانون کا ماخذ حکم الٰہی کو قرار دیں -

اللہ کے صریح احکام و اعلانات کے مطابق گناہ شرک کے لئے کوئی معافی نہیں ہے بشرطیکہ کوئی حالت شرک میں مر جائے - شرک کے سوا تمام گناہوں کی معافی ہو سکتی ہے اگر اللہ راضی ہو جائے - سوال یہ ہے کہ شرک کو اس قدر عظیم جرم کیوں قرار دیا گیا ہے کہ وہ ناقابل معافی ہے؟ اصل حقیقت یہ ہے کہ جو شخص شرک کا ارتکاب کرتا ہے وہ خیر اور بھلائی کے دائرے ہی سے خارج ہو جاتا ہے - اور اس کی فطرت ہی بگڑ جاتی ہے اور اس کی اصلاح کی کوئی امید نہیں رہتی -

(وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا (٤: ١١٦)) (جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا) ...... اگر ایسے شخص کی فطرت کے تار و پود میں سے کوئی ایک دھاگہ بھی باقی ہوتا تو وہ اسے اللہ کے نظریہ وحدانیت کے ساتھ جوڑے رکھتا لیکن اس نے تمام رشتے توڑ دیئے - اگر شرک سے کوئی تائب ہو جائے اور موت سے چند منٹ پہلے تائب ہو جائے تو بھی نجات پالے گا' ہاں اگر حالت نزع طاری ہو اور وہ مشرک ہو تو اب اس کا انجام یہ ہو گا کہ (وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا (٤: ١١٥)) (ہم اسے واصل جہنم کریں گے اور یہ بہت ہی برا انجام ہے) -

---ooo---

اس کے بعد اللہ تعالیٰ جاہلیت کے بعض اوہام و خرافات کا تذکرہ کرتا ہے - عربی جاہلیت کے اندر جو شرکیہ خرافات جاری تھیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ وہ ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے - یہ لوگ شیطان کی بھی پوجا کرتے تھے' جس طرح انہوں نے ملائکہ کے بت بنا رکھے تھے' پھر ان کے اندر ایسی رسوم بھی تھیں کہ جو جانور وہ نذر کرتے تھے ان کے کان کاٹ دیتے تھے یا پھاڑ دیتے تھے - یہ ان کے الہٰوں کی نذر ہوتے تھے اور اس طرح وہ اللہ کی پیدائش اور تخلیق کو متغیر کرتے تھے - اور اس طرح شرک کرتے تھے حالانکہ شرک کرنے کا معنی یہ ہے کہ جس طرح انسان فطرت کو بگاڑ دے -

إِنْ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا ۚ وَإِنْ يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا

مَرِيدًا ﴿١١٧﴾ لَعَنَهُ اللَّهُ ۘ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا ﴿١١٨﴾

وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ

فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾ يَعِدُهُمْ وَ يُمَنِّيْهِمْ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾

(وہ اللہ کو چھوڑ کر دیویوں کو معبود بناتے ہیں۔ وہ اس باغی شیطان کو معبود بناتے ہیں جس کو اللہ نے لعنت زدہ کیا ہے۔ (وہ اس شیطان کی اطاعت کر رہے ہیں) جس نے اللہ سے کہا تھا کہ "میں تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ لے کر رہوں گا' میں انہیں بہکاؤں گا' میں انہیں آرزوؤں میں الجھاؤں گا' میں انہیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے جانوروں کے کان پھاڑیں گے اور میں انہیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے خدائی ساخت میں ردوبدل کریں گے۔" اس شیطان کو جس نے اللہ کے بجائے اپنا ولی و سرپرست بنا لیا وہ صریح نقصان میں پڑ گیا۔ وہ ان لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انہیں امیدیں دلاتا ہے 'مگر شیطان کے سارے وعدے بجز فریب کے اور کچھ نہیں ہیں)۔

دور جاہلیت میں عرب یہ سمجھتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ پھر وہ ان فرشتوں کی مورتیاں بنانے اور ان کے نام عورتوں کے ناموں سے رکھتے۔ لات' عزیٰ اور منات وغیرہ۔ پھر وہ ان بتوں کو پوجتے تھے اور پوجتے اس لئے تھے کہ یہ اللہ کی بیٹیوں کے بت ہیں۔ یوں وہ بارگاہ الٰہی میں ان کو تقرب کا ذریعہ بناتے تھے۔ ابتداء میں اس طرح انہوں نے شرک کا آغاز کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اس کہانی کی اصلیت کو بھلا دیا اور ان بتوں کی پوجا بذاتہ کرنے لگے۔ اس کے بعد جب مزید آگے بڑھے تو مطلق پتھروں کی پوجا شروع کر دی۔ پارہ چہارم میں ہم نے اس کی کچھ تفصیلات دی ہیں۔

ان میں سے بعض بذات خود شیطان کے بھی پجاری تھے۔ یہ آیت اس بارے میں نص ہے۔ کلبی کہتے ہیں کہ خزاعہ کی شاخ بنو ملیح جنوں کی پوجا کرتے تھے۔ لیکن اس آیت کا مفہوم بڑا وسیع ہے' اس طرح کہ وہ اپنے شرک میں شیطان کو پکارتے تھے اور اس سے امداد طلب کرتے تھے اور شیطان کا قصہ ان کے دادا آدم کے ساتھ مشہور تھا جسے اللہ نے ملعون قرار دیا تھا۔ اس لئے کہ اس نے انسان کے ساتھ اپنی دشمنی کا اعلان کر دیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسے راندۂ درگاہ کیا تو اسے انسان پر بہت غصہ آ گیا اور وہ اس کا سخت دشمن بن گیا۔ اس نے اللہ سے مہلت مانگی کہ وہ اسے موقعہ دے کہ جو اللہ کے محفوظ قلعے میں پناہ نہیں لیتا وہ اسے گمراہ کر سکے۔

(اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا وَ اِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا (۱۱۷) لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا (۱۱۸) وَّ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (۱۱۹) (۴:۱۱۷ تا ۱۱۹)) (وہ اللہ کو چھوڑ کر دیویوں کو معبود بناتے ہیں ۔ وہ اس باغی شیطان کو معبود بناتے ہیں جس کو اللہ نے لعنت زدہ کیا ہے ۔ (وہ اس شیطان کی اطاعت کر رہے ہیں جس نے اللہ سے کہا تھا کہ "میں تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ لے کر رہوں گا ' میں انہیں بہکاؤں گا ' میں انہیں آرزوؤں میں الجھاؤں گا ' میں انہیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے جانوروں کے کان پھاڑیں گے اور میں انہیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے خدائی ساخت میں ردوبدل کریں گے ۔)

یہ لوگ شیطان کو پکارتے ہیں جو ان کا قدیمی دشمن ہے ۔ وہ اس سے ہدایات لیتے ہیں اور اس گمراہی میں اس سے امداد لیتے ہیں ' حالانکہ یہ شیطان وہ ذات ہے جس پر اللہ نے لعنت بھیجی ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے تصریح کر دی ہے کہ اس کا ارادہ یہ ہے کہ وہ بنی آدم کے ایک بڑے حصے کو گمراہ کر کے رہے گا ۔ انہیں جھوٹی تمناؤں اور جھوٹی خواہشات کا گرویدہ بنا دے گا ۔ وہ جھوٹی لذتوں ' موہوم کامیابیوں اور آخرت کی خوش آیند امیدوں میں گم رہیں گے ۔ نیز وہ شیطان جس نے اعلانیہ اپنے اس ارادے کا اظہار کیا تھا کہ وہ ان انسانوں سے نہایت ہی قبیح اور احمقانہ حرکات کا صدور کرائے گا ۔ وہ نہایت ہی بودے تصورات کے قائل ہوں گے اور محض قصے کہانیوں پر دین کا فیصلہ کریں گے ۔ مثلاً یہ کہ وہ بعض جانوروں کے کان پھاڑ کر کہیں گے کہ اب ان پر سواری حرام ہے یا ان کا گوشت کھانا حرام ہے حالانکہ اللہ نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا ۔ نیز وہ فطرت انسانی اور خلق الٰہی میں بے جا تغیرات کریں گے مثلاً جسم کے بعض اجزاء کاٹیں گے ۔ انسانوں اور حیوانوں کی شکلیں بدلیں گے مثلاً غلاموں کو خصی کریں گے اور ان کے چہرے پر نشانات بنائیں گے ۔ غرض یہ اور تمام دوسرے غیر فطری افعال و حرکات جس کی اجازت فطرت سلیمہ اور اسلام دونوں نہیں دیتے ۔

انسان کا یہ شعور کہ اس کا قدیم دشمن شیطان ہی شرک اور شرکیہ نظریات کا داعی ہے اور وہی ہے جو بت پرستی کی طرف لوگوں کو آمادہ کرتا ہے ' انسان کو کم از کم ان کی کانا پھوسی سے محتاط کر دیتا ہے جو دشمن کی طرف سے ہوتی ہے ۔ اسلام نے زندگی کی اس جنگاہ کو انسان اور شیطان کے درمیان ایک معرکہ قرار دیا ہے ۔ اور انسان کی پوری قوتوں کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ اس جنگاہ میں شیطان اور اس کرۂ ارض پر اس کی پیدا کردہ تمام شرارتوں کے خلاف جدوجہد کریں ۔ وہ اللہ اور حزب اللہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں کیونکہ انسان اور شیطان کے درمیان برپا یہ معرکہ ایک دائمی معرکہ ہے جس کے اندر انسان ہر وقت ہتھیار بند رہتا ہے ۔ شیطان نے مردود ہونے اور دھتکارے جانے کے بعد جب اس جنگ کا اعلان کیا تو وہ اس جنگ میں تھکتا ہی نہیں ہے ۔ مومن بھی اس سے غافل نہیں ہوتا ' نہ مومن اس جنگ سے باہر آ سکتا ہے ' اس لئے کہ اسے معلوم ہے کہ اس جنگ میں یا تو وہ اللہ کا ولی ہو گا یا وہ شیطان کا دوست ہو گا ۔ اس کے درمیان کوئی تیسرا موقف سرے سے ہے ہی نہیں ۔ شیطان کی ٹیکنیک یہ ہے کہ وہ انسان کے دلوں میں شہوت اور لذت اور عیش و طرب پیدا کرتا ہے ۔ پھر یہ اپنا کام مشرکین اور شرپسندوں اور عیاشوں کے روپ میں کرتا ہے ۔ ایک مسلمان اپنی ذلت اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اس کے مقابلے میں آتا ہے اور پوری زندگی کے اندر یہ طویل اور نہ ختم ہونے والی جنگ جاری رہتی ہے ۔

جو شخص اپنا مددگار اللہ کو بنا لے وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور جو شخص شیطان کا ساتھی اور مددگار بن جاتا ہے اور شیطان

اس کی امداد کرتا ہے تو وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔

((وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا (۴: ۱۱۹))

(شیطان کو جس نے اللہ کے بجائے اپنا ولی و سرپرست بنا لیا وہ صریح نقصان میں پڑ گیا)

قرآن کریم شیطان کے اس کردار کی بھی تصویر کشی کرتا ہے جو وہ اپنے ساتھیوں کے حوالے سے ادا کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے کہ گمراہ کرنے میں اس کا طریقہ واردات کیا ہے؟

(يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (۴: ۱۲۰)) (وہ ان لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انہیں امیدیں دلاتا ہے مگر شیطان کے سارے وعدے بجز فریب کے اور کچھ نہیں ہیں)

شیطان کا طریقہ گمراہی یہ ہے کہ وہ انسان کے برے اعمال کو اس کی نظروں میں بہت ہی خوشنما بنا دیتا ہے۔ یہ کام وہ نہایت ہی فریب کاری سے کرتا ہے۔ وہ یہ باور کراتا ہے کہ طریق معصیت میں ہی اس کا فائدہ اور دینوی اور اخروی کامیابی ہے۔ اس طرح انسان شیطان کے ساتھ رفاقت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ اسے باور کراتا ہے کہ ان اعمال کے نتیجے میں اس کو نجات حاصل ہوگی اور یوں انسان خوشی خوشی ہلاکت کی طرف بڑھتا ہے۔ حالانکہ (وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (۴: ۱۲۰)) شیطان کا وعدہ محض فریب ہوتا ہے۔

جب شیطان کے طریقہ واردات کی اس قدر واضح انداز میں تصویر کشی کے باوجود یہ ازلی دشمن اپنے پھندے پھیلاتا ہے اور جال بچھاتا ہے اور شکار کو آہستہ آہستہ اس کی طرف ہانکتا ہے، تو اس کے جال اور پھندے میں وہی لوگ پھنستے ہیں جن کی فطرت بدل چکی ہو اور ان کے نفس سے صلاح کے تمام آثار مٹائے جا چکے ہوں۔ ایسے ہی لوگ مدہوش اور خفتہ ہوتے ہیں اور یہ بات نہیں سوچتے کہ انہیں کس راہ پر چلایا جا رہا ہے اور کس فریب میں ان کو پھنسایا جا رہا ہے۔

اہل ہدایت کو بیدار کرنے کے لئے جو کچھ دیا جا رہا تھا' وہ کام ہی کر رہا تھا اور راہوار خیال اس معرکے کی نوعیت کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ہی ان لوگوں کا انجام سامنے آ جاتا ہے جن کو شیطان نے اپنے پھندے میں پھنسا لیا ہوتا ہے اور جن کو اس نے اپنے منصوبے کے بارے میں پختہ یقین دہانی کرائی ہوتی ہے اور جن پر اس کا اعلان کردہ جادو چل چکا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کا انجام بھی اسکرین پر آتا ہے جو شیطان کے پھندے سے نکل گئے' اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر صحیح طرح ایمان لا چکے تھے۔ اور جن لوگوں کا ایمان پختہ ہوتا ہے وہ شیطان کے پھندے سے محفوظ ہوتے ہیں' اس لئے کہ شیطان کو اللہ نے ملعون قرار دیا ہے اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اسے لوگوں کے اغوا کرنے اور گمراہ کرنے کا موقعہ دیا تھا تو اس وقت ہی اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ دیا تھا کہ میرے مخلص بندوں کا تم کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اللہ کے مخلص بندوں کے معاملے میں کمزور رہا۔ جب تک انہوں نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ ذرا غور فرمایئے!

(وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا (۱۱۹) يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (۱۲۰)(۴: ۱۱۹ — ۱۲۰)) (جس نے

شیطان کو اللہ کے سوا اللہ بنا لیا' وہ صریح گھاٹے میں رہا۔ وہ ان لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انہیں امیدیں دلاتا ہے مگر شیطان کے سارے وعدے بجز فریب کے اور کچھ نہیں)

أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا ﴿١٢١﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ﴿١٢٢﴾

(ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے جس سے خلاصی کی کوئی صورت یہ نہ پائیں گے۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں' تو انہیں ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنی بات میں سچا ہو گا)۔

اور وہ ہے جہنم جس سے اولیاء الشیطان کو کبھی چھٹکارا نہ ہو گا۔ دوسری جانب جنت ہے جس میں خدا دوست ہمیشہ رہیں گے۔ (--- وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيلًا (۴: ۱۲۲) (اور اللہ سے بڑھ کر سچی بات کس کی ہو گی)۔

اللہ کی بات مطلقاً سچی ہوتی ہے' جس کے مقابلے میں شیطان کی بات فریب اور جھوٹ ہوتی ہے اور جو لوگ شیطان کے جھوٹے وعدوں میں آ جاتے ہیں اور جو لوگ اللہ کے سچے وعدے پر یقین کرتے ہیں ان دونوں کے موقف میں بہت ہی بڑا فرق ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم عمل اور جزائے عمل کے بارے میں اللہ کے عظیم اور ناقابل تغیر اصول کو بیان کرتا ہے کہ ثواب و عقاب کا دارومدار محض خواہشات نفس اور تمناؤں پر نہیں ہوتا۔ ثواب و عقاب ایک مستقل سنت اور دائمی اصول پر مبنی ہوتا ہے اور وہ ایک نہایت ہی مثبت قانون ہے۔ اس قانون کا اطلاق تمام امتوں میں رہا ہے' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کا نہ نسب ملتا ہے اور نہ ہی کسی کے ساتھ اللہ کی رشتہ داری ہے اور دنیا میں کوئی نہیں ہے کہ اس کے لئے اس اصول میں کوئی نرمی کی جائے یا اس کی وجہ سے سنت الٰہیہ میں کوئی تبدیلی یا تخلف ہو گا۔ یا اس کے مفاد میں قانون بدل جائے گا۔ جو برا کرے گا وہ جزائے بد سے دوچار ہو گا اور جو اچھائی کرے گا وہ جزائے خیر پائے گا' غرض جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ اس میں نہ دوستی ہے اور نہ لحاظ۔

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ ۗ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا

يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿١٢٣﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ
مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ
الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿١٢٤﴾ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ
لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ
اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿١٢٥﴾

(انجام کار نہ تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر ۔ جو بھی برائی کرے گا اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلے میں اپنے لئے کوئی حامی و مددگار نہ پا سکے گا ۔ اور جو نیک عمل کرے گا' خواہ مرد ہو یا عورت' بشرطیکہ ہو وہ مومن' تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی ۔ اس شخص سے بہتر اور کس کا طریق زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویہ نیک رکھا اور یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقے کی پیروی کی) ۔ یہود اور نصاریٰ کہتے تھے ۔ (نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ) ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں ۔ اور وہ یہ بھی کہتے تھے ۔ (لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً) ہمیں آگ نہ چھوئے گی مگر چند دنوں کے لئے ...... اور یہودی تو آج تک اپنے آپ کو اللہ کی مختار قوم کہتے ہیں ۔

ہو سکتا ہے کہ بعض مسلمانوں کے دل میں بھی یہ بات آتی ہو کہ وہ ایک ایسی امت ہیں جسے تمام لوگوں کے لئے نکالا گیا ہے اور اللہ ان کی تمام غلطیوں کو معاف کر دے گا' اس لئے کہ وہ مسلمان ہیں ۔

چنانچہ یہ آیت ایسے ہی حالات کی تردید کے لئے اتری کہ دونوں فریقوں کے یہ خیالات درست نہیں ہیں ۔ عملوں پر سب کا بیڑا پار ہو گا ۔ تمام لوگوں کے لئے ایک ہی معیار ہے ۔ وہ یہ کہ لوگ سب کے سب اللہ کی طرف متوجہ ہو کر سر تسلیم خم کریں' نہایت ہی عاجزی کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں اور ملت ابراہیمی کے اصولوں کا اتباع کریں جو عین اسلام ہے ۔ اسی لئے ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے اپنا دوست بنایا تھا ۔

بہترین دین' دین ملت ابراہیمی ہے اور بہترین عمل' عمل احسان ہے ۔ اور احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تمہیں دیکھ ہی رہا ہے ۔ اسلام نے ہر معاملے میں احسان کو مد نظر رکھا ہے' یہاں تک کہ ذبیحہ کے لئے بھی احسان تجویز کیا ہے کہ آلہ ذبح تیز ہو تاکہ ذبح کے وقت جانور کو تکلیف زیادہ نہ ہو ۔ اس آیت میں انسان کے دو اصناف کے درمیان بھی اعمال اور جزائے اعمال کے بارے میں مکمل

مساوات کا اظہار کیا گیا ہے۔

(وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (٤: ١٢٤)) (اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی)۔

یہ نص صریح ہے کہ مرد اور عورتوں کے درمیان اعمال اور جزائے اعمال کے اعتبار سے کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے۔ اور یہ نص اس بات میں بھی صریح ہے کہ ایمان کے بغیر کوئی عمل مقبول نہ ہو گا اور یہ کہ اللہ کے نزدیک کسی ایسے عمل کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے جو ایمان پر مبنی نہ ہو یا جس کے ساتھ ایمان نہ ہو اور یہ بات نہایت ہی منطقی اور فطری ہے۔ اس لئے کہ صرف ایمان ہی سے اس بات کا تعین ہوتا ہے کہ عمل کرنے والا کس نظریے اور کس نیت سے یہ عمل کر رہا ہے اور صرف ایمان ہی کسی عمل کو دائمی اور فطری بنا سکتا ہے ورنہ عمل محض ذاتی اور شخصی جوش ہو گا۔

یہ صریح الفاظ اس رائے کے بالکل خلاف ہیں جس کا اظہار محترم مفتی محمد عبدہ نے تفسیر پارہ عم میں کیا ہے۔ آیت (مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ) کے تحت انہوں نے کہا ہے کہ اس آیت میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل ہیں۔ یہ اور تمام دوسری آیات اس کے خلاف ہیں۔ اسی طرح استاد مراغی کی رائے بھی درست نہیں ہے جس پر ہم نے تیسویں پارے میں اظہار خیال کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مسلمانوں پر بہت ہی گراں گزرا تھا۔ (مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (٤: ١٢٣)) وہ انسانی مزاج کو اچھی طرح جانتے تھے اور ان کو یقین تھا کہ انسان سے برائیوں کا ارتکاب ہو گا چاہے کوئی کتنا ہی نیک کیوں نہ بن جائے اور ڈھیری نیکیاں کیوں نہ کرے۔

دور اول کے لوگ نفس انسانی سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ اپنے آپ کو بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو دھوکے میں نہ ڈالتے تھے اور اپنے آپ سے کچھ بھی نہ چھپاتے تھے۔ وہ اس سے بھی چشم پوشی نہ کرتے تھے کہ بعض اوقات ان سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اس لئے وہ اپنی کوتاہیوں کا نہ انکار کرتے تھے اور نہ ہی ان کو چھپاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کو سن کر وہ کانپ اٹھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ہر برے عمل کی انہیں سزا ملے گی تو وہ اس طرح کانپ گئے جس طرح گویا وہ میدان حشر میں ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ یہی صحابہ کرام کی امتیازی خصوصیت تھی کہ وہ آخرت کو اس طرح محسوس کرتے تھے جس طرح ہم عام محسوسات کو کرتے ہیں۔ وہ تصور آخرت اور فکر آخرت میں اس طرح زندہ رہتے تھے جس طرح ہم اس دنیا میں رہتے ہیں محض اس وجہ سے کہ وہ آنے والی ہے بلکہ اس طرح کہ گویا برپا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس آیت کو سنتے ہی کانپنے لگے تھے۔

امام احمد فرماتے ہیں: ''حضرت ابوبکر نے فرمایا رسول اللہ ؐ اس آیت کے بعد فلاح کس طرح ہو گی؟ اللہ فرماتے ہیں (لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (٤: ١٢٣)) (ہم نے جو برائیاں کی ہیں ان پر ہمیں سزا ہو گی۔ اس پر نبی ؐ نے فرمایا: ''اے ابوبکر اللہ تمہیں معاف کر دے کیا تم بیمار نہیں ہوتے، کیا تم تھکتے نہیں ہو، کیا تم

پریشان نہیں ہوتے' کیا تم آہیں نہیں بھرتے ہو؟" تو انہوں نے کہا' ہاں! آپ نے فرمایا تو ان چیزوں پر بھی تمہیں جزا دی جائے گی۔ (روایت حاکم بواسطہ سفیان ثوری)

ابوبکر ابن مردویہ کی روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر فرماتے ہیں جب یہ آیت اتری تو میں حضور ؐ کے پاس تھا۔

(مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَبِهٖ وَلَا یَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا (۴: ۱۲۳)) (جو بھی برائی کرے گا اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلے میں اپنے لئے کوئی حامی و مددگار نہ پا سکے گا)

تو رسول اللہ ؐ نے فرمایا: "ابوبکر تمہیں بتاؤں کہ ابھی کیا آیت اتری ہے؟ تو ابوبکر کہتے ہیں کہ میں نے کہا حضور ؐ بتایئے حضور ؐ نے مجھے یہ آیت پڑھ کر سنائی تو معلوم نہیں میں نے اس طرح محسوس کیا کہ میری پیٹھ میں کچھ ٹوٹ گیا اور میں سیدھا ہو گیا۔ اس پر رسول خدا ؐ نے پوچھا: "ابوبکر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" میں نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں' ہم میں سے کس نے برا کام نہیں کیا ہے اور آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ ہمیں تمام برے کاموں کی سزا دی جائے گی۔ اس پر رسول خدا ؐ نے فرمایا: "ابوبکر تم اور اہل ایمان کو اس دنیا میں جزا دی جائے گی یہاں تک کہ تم اللہ کو اس حال میں ملو گے کہ تمہارا ایک گناہ بھی نہ ہو گا' رہے دوسرے لوگ تو ان کی سیاہ کاریاں جمع ہوں گی اور قیامت کے دن انہیں اس کی جزا دی جائے گی۔" (روایت ترمذی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور ؐ سے عرض کیا: حضور مجھے قرآن کی سخت ترین آیت معلوم ہے۔ آپ ؐ نے فرمایا کون سی؟ تو میں نے کہا۔ (مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَبِهٖ (۴: ۱۲۳)) تو آپ نے فرمایا: کہ بندۂ مومن پر مصائب آتے ہیں۔" (روایت ابن جریر)

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی (مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَبِهٖ (۴: ۱۲۳)) (جس نے بھی برائی کی اسے اس کی جزا دی جائے گی) تو یہ بات مسلمانوں پر بہت ہی گراں گزری اس پر رسول خدا ؐ نے فرمایا: "درمیانی فاصلے بند کرو اور ایک دوسرے کے قریب ہو جاؤ' اس لئے کہ مسلمان کو جو مصیبت بھی آتی ہے اس کی وجہ سے اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں جو مصیبت بھی اس پر آئے یہاں تک کہ ایک کانٹا بھی اسے چبھے۔" (مسلم' ترمذی' نسائی)

بہرحال یہ آیت اسلامی تصورات اور ایمانی طرز فکر کی درستی کے لئے ایک اہم کڑی تھی۔ اس کی وجہ سے ایک تو اہل دین کی سوچ درست ہوئی اور دوسری جانب ان کا عمل درست ہوا۔ اس آیت نے ان کو خوب جھنجوڑا اور ان کے دل کانپ اٹھے' اس لئے کہ وہ تو ہر حکم کو نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ لیتے تھے۔ وہ اللہ کے وعدے کی سچائی اور اس کے اوپر عمل کئے جانے کے بارے میں بہت ہی اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ زندگی ان وعدوں کے اندر رہ کر گزارتے تھے اور وہ آخرت میں بستے تھے حالانکہ وہ لوگ ابھی اس دنیا ہی میں تھے۔

اور آخر میں اختتامیہ آتا ہے' یعنی ایمان و شرک اور اعمال اور جزائے اعمال کے بعد کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس دنیا اور آخرت دونوں میں تمام چیزوں پر محیط ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ۝۱۲۶

(آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے اور اللہ ہرچیز پر محیط ہے) قرآن کریم میں جہاں یہ بات آتی ہے کہ اللہ ایک ہے اور وہی الٰہ ہے تو اس کے ساتھ یہ بات بھی آتی ہے کہ وہی مالک اور نگہبان بھی ہے۔ (ملک ۔ مہیمن) یعنی وہی بادشاہ اور کنٹرول کرنے والا ہے۔پس اسلام کا نظریہ توحید صرف یہ نہیں ہے کہ ذات میں اللہ وحدہ لاشریک ہے بلکہ وہ مثبت توحید ہے اور اس کائنات میں فاعل اور مؤثر بھی وہی ہے اور حکومت اور نگہبانی بھی اسی کی ہے۔

جب نفس انسانی کے اندر یہ شعور پختہ ہو جاتا ہے کہ زمین و آسمانوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے اور وہ ہرچیز کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔کوئی چیز خدا کے علم اور اس کی سلطنت سے باہر نہیں ہے' تو اس طرح ایک انسان اس امر پر بسہولت آمادہ ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کو الٰہ ، اللہ اور حاکم تسلیم کرے اور صرف اسی کی بندگی کرے اور پھر اللہ کو راضی کرنے کی سعی کرے اور اللہ کے احکام کو تسلیم کرے۔اس لئے کہ سب کچھ اس کا ہے' اس کے قبضے میں ہے اور وہ ہرچیز پر محیط ہے۔

بعض فلسفے ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو واحد مانتے ہیں' لیکن اس عقیدۂ توحید کے بعد یہ فلسفے اس گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اللہ صاحب ارادہ نہیں ہے۔بعض یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا علم نہیں ہوتا۔بعض اللہ کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتے' بعض اللہ کی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتے۔(تفصیلات کے لئے دیکھئے فلاسفہ کے خرافات) چنانچہ فلاسفہ کے نزدیک خدا کا تصور ایک منفی تصور ہے۔اس تصور میں لوگوں کی زندگی کے ساتھ اللہ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔نہ ان کے طرز عمل اور ان کے اخلاق پر اس کا کوئی تصرف ہے' فلاسفہ کی توحید محض کلام ہی کلام ہے۔لیکن اسلام میں' اللہ وہ ذات ہے جو زمین و آسمان کا مالک ہے' لہٰذا وہ ہرچیز کا مالک ہے اور وہ ہرچیز پر محیط ہے اور وہ نگہبان ہے۔لہٰذا اس تصور کے زیر سایہ ضمیر کی اصلاح' طرز عمل کی اصلاح اور پوری زندگی کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔

---○○○---

درس نمبر ۱۴ ایک نظر میں

اس سورہ کے آغاز میں اسلام نے جاہلی معاشرے کی اصلاح کے جس کام کا آغاز کیا تھا یہ سبق اسی کا ایک حصہ ہے ۔ اس اصلاح کا تعلق عورتوں کے حقوق اور خاندانی نظام کے ساتھ ہے ۔ ایک خاندان کے نتیجے میں جو بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں سے بعض یتیم رہ جاتے ہیں ۔ ان کے مسائل اس میں لئے گئے ہیں ۔ اسلامی معاشرے کو تنبیہ کی گئی ہے کہ ان مسائل کے اندر جاہلیت کے دور کی جو ناہمواریاں رہ گئی ہیں انہیں دور کیا جائے اور ایک گھرانے کو اس اساس پر اٹھایا جائے کہ اس کے اندر مرد اور عورت دونوں کا احترام ہو' دونوں کی مصلحتوں کا خیال رکھا جائے ۔ خاندان کے اندر جو اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں ان کی اصلاح کی تدابیر اس سبق کا موضوع ہے ۔ یعنی اگر اختلافات ہوں تو معاملات کے بگاڑ سے پہلے ان کی اصلاح کی جائے تاکہ گھرانے ٹوٹنے نہ پائیں ۔ خصوصاً وہ بچے جو ان گھرانوں میں پیدا ہو چکے ہوتے ہیں اور خاندان ان کے لئے نرسری ہوتا ہے ان کی صحیح ترتیب ہو سکے ۔ نیز عام معاشرے کے اندر زیردست لوگوں کی دیکھ بھال کی جائے تاکہ یہ نہ ہو کہ غالب اور زور آور لوگوں کا قانون چلے اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا دور دورہ ہو ۔

یہ سبق بعض معاملات کی اصلاح اس طرح کرتا ہے کہ انہیں نظام کائنات کے ساتھ مربوط کرتا ہے ۔ جس سے مخاطب کو یہ تصور دینا مطلوب ہے کہ عورتوں' گھرانوں' خاندانوں اور معاشرے کے اندر کمزوروں کے مسائل معمولی مسائل نہیں ہیں ۔ ان کی بہت بڑی اہمیت ہے جس کی تفصیلات ہم اس پارے میں دے چکے ہیں ۔ پارۂ چہارم کے مقدمے میں' ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ اسلام میں خاندانی نظام کو کتنی عظیم اہمیت دی گئی ہے ۔ اور یہ کہ اسلامی نظام نے خاندانی ادارے کو جاہلیت کی رسوم بد سے پاک کرنے کے لئے کس قدر عظیم جدوجہد کی ہے اور کس قدر کوشش کی ہے کہ معاشرے کے اندر لوگوں کی اخلاقی' نفسیاتی اور اجتماعی سطح کو بلند کیا جائے تاکہ اسلامی معاشرہ ان تمام معاشروں پر فوقیت حاصل کرلے جو اس وقت اس کے اردگرد پھیلے ہوئے تھے ۔ جو دین اسلام کو قبول نہ کرتے تھے اور جن کی تربیت اسلامی منہاج کے مطابق نہ تھی اور جو اسلامی نظام کے زیر حکومت نہ تھے ۔

اب ذرا تفصیلات کے ساتھ زیر بحث آیات کو لیجئے ۔

---○○○---

درس نمبر ۴۱ تشریح آیات

۱۲۷ --- تا --- ۱۳۴

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ ۖ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ وَمَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ فِي يَتَامَى النِّسَاءِ اللَّاتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِهِ عَلِيمًا ﴿١٢٧﴾

"لوگ تم سے عورتوں کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔کہو اللہ تعالیٰ تمہیں ان کے معاملے میں فتویٰ دیتا ہے' اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سنائے جا رہے ہیں۔یعنی وہ احکام جو ان یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں جن کے حق تم ادا نہیں کرتے اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو (یا لالچ کی بنا پر تم خود ان سے نکاح کر لینا چاہتے ہو) اور وہ احکام جو ان بچوں کے متعلق ہیں جو بیچارے کوئی زور نہیں رکھتے۔اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو' اور جو بھلائی تم کرو گے وہ اللہ کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی)۔

سورہ نساء کے ابتدا میں جو آیات نازل ہوئی تھیں' ان کی وجہ سے کئی سوالات پیدا ہو گئے تھے اور لوگ سوالات کیا کرتے تھے۔مسلمانوں کی جانب سے' اسلامی معاشرے کی تشکیل کے ابتدائی دور میں مختلف مسائل کے بارے میں سوالات کرنا ایک عام پریکٹس تھی اور اس کی تہ میں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ وہ اسلامی نظام زندگی سے متعلق احکام معلوم کرنا چاہتے تھے اس لئے کہ جاہلیت سے اسلام کی طرف منتقل ہونے کا عمل دراصل ان کی زندگیوں میں ایک گہرا انقلاب تھا۔اس کی وجہ سے ان کے شعور میں جاہلیت کے دور میں ہونے والے تمام افعال اور رسوم کے بارے میں شک پیدا ہو گیا تھا۔وہ ہر وقت یہ محسوس

کرتے تھے کہ کسی پیش آمدہ معاملے میں اسلام نے سابق پریکٹس کو منسوخ نہ کر دیا ہو۔ یہ بیداری اور اسلامی احکام کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کا جذبہ ان حضرات کی ایک عام صفت تھی۔ اس کے باوجود بعض آثار جاہلیت ان کی زندگیوں میں باقی تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کے اندر ایک قوی جذبہ موجود تھا' جس کے مطابق وہ اپنی زندگی کے تمام حالات کو اسلام کے مطابق ڈھالتے تھے اور اس روح کے ساتھ وہ بعض احکام کے بارے میں استفسارات کرتے تھے۔ یہ کام وہ محض علم و ثقافت اور محض سوال کی خاطر نہ کرتے تھے جیسا کہ آج کل مفتی حضرات کے پاس اکثر سوالات محض حصول علم و ثقافت کے لئے ہوتے ہیں' کوئی عمل کرنے کے لئے نہیں پوچھتا۔

اس وقت مسلمانوں کو دینی مسائل کے پوچھنے کی حقیقی ضرورت بھی تھی' اس لئے کہ یہ دین ان کے لئے زندگی کا نظام تھا اور وہ اس کے مسائل پوچھنے کے معاملے میں بہت ہی سرگرم تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ان کی عملی زندگی احکام دین کے مطابق بن جائے۔ وہ جاہلیت سے نکلنے کے عمل سے گزر رہے تھے اور جاہلیت کی تمام عادات و تقالید اور اوضاع و اطوار سے خائف تھے کہ کہیں کوئی بات نظام اسلام کے خلاف نہ ہو۔ اسلام نے ان کے اندر جو تغیر اور انقلاب برپا کر دیا تھا اس کے بارے میں وہ بہت ہی حساس تھے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام نے انہیں جو دوسرا جنم دیا تھا' اس کے بارے میں وہ نہایت محتاط تھے۔

یہاں ہمیں ان کا وہ انعام و اکرام نظر آتا ہے جو انہیں ان کے اس سچے عزم اور اسلام کے بارے میں ان کے جوش و خروش کی وجہ سے ملا۔ وہ اس شکل میں کہ اللہ کی خاص عنایت اور توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی ذات باری نے خود براہ راست انہیں ان کے اس استفتاء کا جواب دیا۔

(وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ (٤:١٢٧) (لوگ تم سے عورتوں کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں) وہ تو رسول اللہ ﷺ سے پوچھتے تھے اور اللہ تعالیٰ حضرت نبی ﷺ سے کہتے تھے :"کہو اللہ تمہیں فتویٰ دیتے ہیں' تمہارے سوال اور بقیہ دونوں امور کے بارے میں جن کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ عنایت ہے جس کی قدروقیمت صحابہ کرام ہی جانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نہایت ہی مہربانی' نہایت ہی عزت افزائی کرتے ہوئے بذات خود جماعت مسلمہ کو فتویٰ دیتے ہیں اور یہ اللہ کی جانب سے نیابت یا بندہ پروری اور مہربانی ہے اور بندوں کی جدید زندگی کے لئے ضروری سوالوں کا جواب خود دیا جا رہا ہے۔ یہ سوال ان عملی حالات کے بارے میں تھا جو جاہلیت میں روز مرہ کا معمول تھے۔ وہ جاہلیت جس سے پوچھنے والوں کو اللہ اور اللہ کے نظام نے نکالا تھا۔ دوسرے یہ سوالات ان امور کے بارے میں تھے جن کے ذریعے جدید اسلامی معاشرے کو مزید ترقی دینا مطلوب تھا۔

(قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ (٤:١٢٧))

(کہو اللہ تمہیں ان کے معاملے میں فتویٰ دیتا ہے اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سنائے جارہے ہیں ۔یعنی وہ احکام جو ان یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں جن کے حق تم ادا نہیں کرتے اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو (یا لالچ کی بناء پر تم خود ان سے نکاح کر لینا چاہتے ہو) اور وہ احکام جو ان بچوں کے متعلق ہیں جو بیچارے کوئی زور نہیں رکھتے اللہ تمہیں ہدایت دیتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو۔)

علی ابن ابو طلحہ نے حضرت ابن عباس سے اس آیت کے بارے میں نقل کیا ہے کہ جاہلیت کے دور میں جس کے پاس یتیم لڑکی ہوتی' وہ اس پر اپنا کپڑا ڈال دیتا' جب وہ ایسا کر لیتا تو اس یتیم لڑکی کے ساتھ کوئی شخص بھی کبھی نکاح نہ کر سکتا۔ اگر وہ خوبصورت ہوتی اور وہ اسے پسند کرتا تو وہ اس کے ساتھ خود نکاح کر لیتا اور اس کا مال کھاتا رہتا۔ اور اگر بدصورت ہوتی تو دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی اس کا نکاح کرنے کی اجازت نہ دیتا یہاں تک کہ وہ مرجاتی اور یہ اس کے مال کا وارث ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو حرام قرار دیا اور آئندہ کے لئے اس سے منع فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا! (وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ (۴:۱۲۷)) (اور بچوں میں سے کمزور لوگ) کون تھے؟ جاہلیت میں دراصل کمزور بچوں کو وراثت میں سے حق نہ دیا جاتا تھا اور نہ لڑکیوں کو دیا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں! (لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ (۴:۱۲۷)) تم ان کو وہ حق نہیں دیتے جسے اللہ نے فرض قرار دے دیا ہے۔ اللہ نے اس سے بھی روک دیا اور ہر حقدار کا حصہ قرآن میں مقرر کر دیا اور کہا کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے خواہ عورتیں چھوٹی ہوں یا بڑی ہوں۔

سعید ابن جبیر کہتے ہیں آیت۔ (وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ (۴:۱۲۷)) کی تفسیر یہ ہے کہ اگر یتیم لڑکی مالدار اور خوبصورت ہو تو ولی کہتا کہ میں اسے اپنے لئے چن لیتا ہوں اور اس کے ساتھ نکاح کر لیتا اور اگر صاحب مال و جمال نہ ہوتی تو اسے دوسروں کے نکاح میں دے دیتا۔

(وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ) تا آیت (وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ) کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ یہ اس شخص کے بارے میں ہے جس کے پاس یتیم لڑکی ہوتی۔ وہ اس کا ولی اور وارث ہوتا۔ وہ اسے اپنے مال میں شریک کر لیتی یہاں تک کہ کھجور کے اس گچھے میں بھی جو کھانے کے لئے توڑ لیا جاتا۔ وہ اس کے ساتھ نکاح کرنا بھی پسند نہ کرتا تھا اور کسی دوسرے شخص کے نکاح میں بھی نہ دیتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ مال میں شریک نہ ہو جائے۔ اس طرح وہ عورت معطل رہتی۔ (بخاری مسلم)

ابن ابو حاتم نے عروہ ابن زبیر سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک دوسری روایت نقل کی ہے' فرماتے ہیں: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "اس آیت کے بعد لوگوں نے رسول اللہ ؐ سے اس آیت کے بعد دوبارہ ان عورتوں کے بارے میں پوچھا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ (۴:۱۲۷))

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ اس آیت میں یہ جو کہا گیا ہے کہ جو تم پر کتاب میں پڑھا جاتا ہے (یعنی سابقہ احکام) تو

اس سے مراد وہ سابقہ آیت ہے یعنی (وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتَامٰی فَانْکِحُوْا مَاطَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَاءِ) یعنی اگر وہ صاحب مال و جمال نہ ہوں اور تم ان کے ساتھ نکاح نہ کرنا چاہتے ہو۔ اور اگر وہ صاحب مال و جمال ہوں اور تم ان کے ساتھ نکاح کرنا چاہتے ہو صرف مال کی عرض ہو تو نکاح نہ کرو الا یہ کہ عدل کے ساتھ نکاح کرنا چاہو۔

ان احادیث اور قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت کے دور میں کیا ہو رہا تھا۔ خصوصاً یتیم نوجوان عورتوں کے ساتھ۔ یتیم لڑکی کے ساتھ ولی کی طرف سے مال و دولت میں بھی بے ایمانی ہوتی اور اس کے مہر میں بھی اس کے ساتھ زیادتی ہوتی۔ اس کا مال لٹایا جاتا اور اگر وہ بدصورت ہوتی تو اس کا مال بھی ہڑپ ہوتا اور اس کے ساتھ نکاح بھی نہ ہوتا۔ کسی دوسرے کے نکاح میں بھی نہ دی جاتی کہ کہیں وہ ولی کے ساتھ مال میں شریک نہ ہو جائے کیونکہ مال ولی کے تصرف میں ہوتا۔

یہی حال چھوٹے بچوں اور لڑکیوں کا ہوتا۔ ان کو میراث سے محروم کر دیا جاتا۔ اس لئے کہ وہ ضعیف ہوتے تھے اور وہ اس مال کی مدافعت نہ کر سکتے تھے یا وہ جنگ نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے ان کے لئے کوئی حق یا حصہ نہ ہوتا اور یہ قبائلی تصور حیات کے مطابق ہوتا جن کے مطابق قبیلے کے تمام اموال جنگ کرنے والوں کے لئے ہوتے اور ضعیفوں کے لئے کچھ نہ ہوتا۔

یہ تھے وہ بدوی اور بدشمار رسم و رواج جن کو اسلام نے تبدیل کرنا شروع کیا اور ان کی جگہ ترقی یافتہ قرآنی رسم و رواج کی بنیاد ڈالی اور یہ تبدیلی ایسی نہ تھی کہ گویا بست ہی تیزی سے بطور لانگ جمپ یہ انقلابی تبدیلی کی گئی اور عربی معاشرے کو ایک ترقی یافتہ معاشرہ بنا دیا گیا بلکہ یہ عربوں کے لئے ایک نیا جنم تھا۔ ان کی حقیقت کو بدل کر ایک نئی حقیقت ان کو دی گئی۔

یہاں جو اہم بات ہم ریکارڈ پر لانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ نشاۃ جدیدہ کسی منصوبے کے تحت نشاۃ ثانیہ نہ تھی اور نہ اس کے لئے کوئی خاص منصوبہ بنایا گیا تھا اور نہ منصوبے کے لئے کوئی ابتدائی تیاری کی گئی تھی یا یہ ترقی کسی مادی تبدیلی کی وجہ سے ہوئی تھی اور صرف عربوں کی زندگی میں ہوئی تھی۔

اس لئے کہ حقیقت ملکیت کے جاہلی سبب محاربت کو منسوخ کر کے' اس کی جگہ انسانی اساس پر حق ملکیت کو استوار کرنا' بچے' یتیم اور عورت کو بھی انسانی حقوق عطا کرنا محض اس وجہ سے نہ تھا کہ معاشرے کے اندر تبدیلی آگئی تھی اور اس معاشرے کے اندر جنگی قوت رکھنا یا دفاع کرنا ہی اہم عامل نہ رہا تھا' اس وجہ سے جنگی قوت رکھنے والے افراد خاندان کی امتیازی حیثیت کو ختم کر دیا گیا۔ اب خاندان والوں کے لئے جنگی قوت رکھنے والے افراد کی سرے سے ضرورت ہی نہ تھی اور نہ ان کی امتیازی حیثیت کی ضرورت تھی۔

ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسلامی دور میں بھی جنگی افراد کی اہمیت اپنی جگہ قائم تھی۔ ان کی ضرورت بھی تھی لیکن جو فرق پڑا وہ یہ تھا کہ اسلامی نظام آگیا تھا اور یہ انسان کے لئے ایک جدید جنم تھا۔ یہ جنم ایک کتاب کے ذریعے ملا تھا۔ ایک نظام سے انہیں یہ جنم ملا تھا اور جدید معاشرہ اس جدید نظام نے قائم کیا تھا اور اسی سرزمین پر قائم کیا تھا جس پر جاہلیت قائم تھی اور انہی حالات میں جن میں ذرائع پیداوار کے اندر کوئی تبدیلی نہ کی گئی تھی۔ نہ مادے اور اس کے خواص میں کوئی تبدیلی کی گئی تھی بلکہ تصور حیات اور نظریہ حیات کے اندر انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ اور یہ انقلاب محض اس نظریہ جدیدہ کی وجہ سے ہوا تھا۔

یہ بات بھی حقیقت تھی کہ اسلامی نظام نے لوگوں کے ذہنوں اور طرز عمل سے جاہلیت کے آثار کو مٹانے کے لئے طویل ترین جدوجہد کی اور ان کی جگہ اسلامی تصورات اور اسلامی عادات و اطوار بٹھانے کیلئے سخت محنت کی۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ جاہلیت

کے بعض اطوار ابھی تک اپنے آپ کو بچانے کے لئے کوشاں تھے اور بعض انفرادی حالات میں ان کا پھر سے ظہور ہو جاتا تھا۔ یہ عادات و اطوار مختلف شکلوں میں اپنے آپ کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ نظام جو آسمانوں سے نازل ہوا اور وہ تصورات جو اس نظام نے عطا کئے ہی تو جاہلیت کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کی سعی میں مصروف تھے اور یہ بات نہ تھی کہ مادی صورت حال یا اس کے اندر موجود تضادات اس تبدیلی میں مؤثر تھے یا ذرائع پیداوار میں کوئی تبدیلی ہو گئی تھی یا کوئی اور مارکسی فیکٹر تھا جو مادے یا ذرائع پیداوار میں تبدیلی کی وجہ سے معاشرے میں تغیر لا رہا تھا۔

عرب قوم کی زندگی میں جو نئی چیز تھی وہ دین تھی جو عالم بالا سے ان پر نازل ہوئی تھی۔ اس پر بعض نفوس نے لبیک کہا اس لئے کہ وہ انسانی فطرت سے ہمکلام تھی اور یہ فطرت ہر انسان کے اندر موجود تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ عظیم انقلاب رونما ہوا بلکہ انسان کو یہ نیا جنم ملا' جس نے زندگی کے تمام خدوخال بدل دیئے' ہر پہلو سے بدل دیئے اور جاہلیت کے تو تمام نشانات مٹا دیئے۔

معاشرے کے جدید و قدیم خدوخال کے درمیان جس قدر تنازع بھی نظر آئے اور اس تطہیر اور تجدید کی راہ میں جس قدر رنج و الم اور قربانیاں بھی دی گئی ہوں' یہ سب کچھ آسمانی رسالت کی وجہ سے ہوا۔ ایک نظریاتی اور اعتقادی تصور تھا جو اس انقلاب کے لئے پہلا اور آخری فیکٹر تھا۔ بلکہ اس نئے جنم کے لئے وہی اول و آخر عامل تھا۔ پھر کیا ہوا؟ پھر اس انقلاب کا طوفان صرف اسلامی معاشرے تک ہی محدود نہ رہا بلکہ اس نے پوری انسانی اقدار اور تمام انسانی معاشروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اسلام نے رسول سے تو صرف عورتوں کے بارے میں پوچھا تھا' اور اللہ نے ان عورتوں کے علاوہ یتیم لڑکیوں' چھوٹے بچوں اور ضعیفوں کے حق کے بارے میں بھی جواب دیا تھا' تو اس سوال و جواب کو اللہ تعالیٰ نے اس مصدر کے ساتھ باندھ دیا جس کے ذریعے سے یہ انقلاب آیا تھا۔

(وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا (٤ : ١٢٧)) (اور جو بھلائی تم کرو گے وہ اللہ کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی)

جو کچھ بھی تم کرو گے وہ نامعلوم نہ رہ جائے گا' ضائع نہ ہو گا۔ اللہ کے ہاں ریکارڈ ہو گا اور جو چیز اللہ کے ہاں ریکارڈ ہو جائے وہ ہرگز ضائع نہ ہو گی۔

یہ ہے وہ آخری مرجع جس کی طرف ایک مومن اپنے اعمال بھیجتا ہے اور یہی وہ قبلہ ہے جس کی طرف مومن کے فکر و عمل کا رخ ہوتا ہے۔ اس مرجع کی قوت اور گرفت ہی ان ہدایات اور اس نظام کی قوت اور گرفت ہوتی ہے اور اس کا انسانی نفس' اور اس کی عادات و اطوار بلکہ پوری زندگی پر اثر ہوتا ہے۔

یہ بات اہم نہیں ہوتی کہ کوئی بہت سی ہدایات دے یا لکھ دے' یا کوئی نظام حیات تجویز کرے یا کوئی نیا نظم و نسق قائم کرے۔ اصل اہمیت اس گرفت اور قوت کی ہوتی ہے جو کسی ہدایت' کسی نظام اور کسی تنظیم کی پشت پر ہوتی ہے۔ وہ گرفت جس سے یہ تمام تصورات اور یہ تمام ادارے قوت نافذہ حاصل کرتے ہیں۔ ان نظامہائے زندگی اور ان اقدار میں جو ایک انسان اللہ سے لیتا ہے اور ان میں جو ایک انسان اپنے جیسے انسانوں سے لیتا ہے' زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ یہ اس صورت میں جیسے

دوسری صفات کے حوالے سے انسانی نظام اور الٰہی نظام کے درمیان مساوات فرض کر لی جائے اور یہ بات فرض کر لی جائے کہ یہ دونوں نظام نہایت بلند اور ترقی یافتہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا فرض کرنا بھی محال اور جنون ہے۔ الا یہ کہ انسان سوچ لے کہ یہ بات کس کے منہ سے نکلی اور یہ کہ اس کے بارے میں ہماری سوچ کیا ہے اور اس کے بارے میں ہماری رائے کیا ہے۔ ایک طرف اللہ العلی العظیم کی بات ہے اور دوسری جانب انسان ابن انسان کی بات ہے۔ اجتماعی ضابطہ بندی کا ایک قدم اور۔ یہ بھی خاندان کے دائرے میں اور اس معاشرے میں جسے اسلام نیا جنم دے رہا تھا اور یہ جنم ملاء اعلیٰ سے اسلامی نظام حیات کے ذریعے ہو رہا تھا اور اس کے اندر کسی زمینی فیکٹر یا عامل کا کوئی دخل نہ تھا۔ مادی ہو یا پیداوار سے متعلق ہو۔ ملاحظہ ہو۔

وَاِنِ امۡرَاَةٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِهَا نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ اَنۡ يُّصۡلِحَا بَيۡنَهُمَا صُلۡحًا‌ ؕ وَالصُّلۡحُ خَيۡرٌ‌ ؕ وَاُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ‌ ؕ وَاِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ﴿۱۲۸﴾ وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَيۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ‌ فَلَا تَمِيۡلُوۡا كُلَّ الۡمَيۡلِ فَتَذَرُوۡهَا كَالۡمُعَلَّقَةِ‌ ؕ وَاِنۡ تُصۡلِحُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۲۹﴾ وَاِنۡ يَّتَفَرَّقَا يُغۡنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنۡ سَعَتِهٖ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيۡمًا ﴿۱۳۰﴾

(اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں کہ میاں اور بیوی (کچھ حقوق کی کمی بیشی پر) آپس میں صلح کر لیں۔ صلح بہرحال بہتر ہے۔ نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں، لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو یقین رکھو کہ اللہ تمہارے اس طرز عمل سے بے خبر نہ ہو گا۔ بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ لہذا (قانون الٰہی کا منشا پورا کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ) ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ادھر لٹکتا چھوڑ دو۔ اگر تم اپنا طرز عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ چشم پوشی کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ لیکن اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہی ہو جائیں تو اللہ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ کا دامن بہت کشادہ

ہے اور وہ دانا و بینا ہے)

اسلامی نظام نے اس سے قبل عورت کی طرف سے بدسلوکی اور نافرمانی کے بارے میں قانون سازی کر دی تھی۔ اور وہ تمام انتظامات کر دیئے تھے کہ اس پہلو میں نقصان پیدا ہونے کے خلاف کیا تدابیر اختیار کی جائیں گی۔ (ملاحظہ ہو اس پارہ کی ابتدائی آیات)۔ یہاں اس بے رخی اور نافرمانی کا ذکر کیا جاتا ہے جو خاوند کی طرف سے ہو' اور جس کی وجہ سے عورت کے احترام اور عزت نفس کو خطرہ ہو اور اس کے نتیجے میں خاندان کے تباہ ہونے کا خدشہ ہو اس لئے کہ دل بدل سکتے ہیں اور میلانات اور رجحانات کے اندر تبدیلی آسکتی ہے۔ اسلام ایک ایسا نظام ہے جو معاشرتی معاملات کے اندر زندگی کے تمام اجزاء کا احاطہ کرتا ہے اور جو مشکلات اور خطرات پیش آسکتے ہیں ان کو حل کرتا ہے۔ اسلام ان تمام مسائل کو اپنے رجحانات اور اصول کے مطابق حل کرتا ہے اور اپنی اسکیم کے مطابق تمام اقدامات کرتا ہے۔

اگر عورت اور مرد کے اندر باہم تعلقات میں کشیدگی سی پیدا ہو جائے اور طلاق کا خطرہ ہو' یا یہ خطرہ ہو کہ خاوند بیوی کو معطل اور معلق چھوڑ دے گا۔ نہ وہ بیوی ہو گی اور نہ وہ مطلقہ ہو گی تو اس صورت میں دونوں کے لئے اس امر میں ممانعت نہیں ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف مالی اور دوسرے حقوق کے اندر کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اختیار کر لیں۔ مثلاً یہ کہ عورت اپنے مالی اخراجات میں سے کچھ معاف کر دے یا سب معاف کر دے۔ یا یہ کہ اگر زیادہ عورتیں ہوں تو بیوی اپنی باری وغیرہ سے دست بردار ہو جائے۔ مثلاً اگر کوئی دوسری بیوی مرد کو زیادہ پسند ہو تو اس کے حق میں کوئی بیوی دست بردار ہو جائے یا مثلاً اس صورت میں کہ معاف کرنے والی بیوی کو بعض حقوق کے اندر زیادہ دلچسپی نہ رہتی ہو۔ یہ اس صورت میں کہ عورت تمام احوال اور معاملات کو دیکھ کر' سوچ کر کامل آزادی کے ساتھ یہ فیصلہ کرے کہ اس کے لئے یہ حالت طلاق سے بہتر ہے۔

(وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا (٤:١٢٧)) (اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں کہ میاں اور بیوی (کچھ حقوق کی کمی بیشی پر) آپس میں صلح کر لیں) یہ وہی صلح ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔

اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ مقدمہ بازی سے صلح ہر صورت میں بہتر ہوتی ہے۔ بے رخی' خشک تعلقات اور طلاق' سب حالات کے مقابلے میں صلح خیر ہے۔ (وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (٤:١٢٧))

(صلح بہرحال بہتر ہے) صلح کی وجہ سے خشک اور جفاپیشہ دلوں کے اوپر باد نسیم کے ٹھنڈے جھونکے چلنے لگتے ہیں۔ انس و محبت کی شبنم سے باہم تعلقات کو طراوت نصیب ہوتی ہے اور ازدواجی تعلقات کو باقی رکھنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور اگر ختم ہو چکے ہوں تو ازدواجی تعلقات پھر سے استوار ہو سکتے ہیں۔

اسلام نفس انسانی کے ساتھ حقیقت پسندانہ معاملہ کرتا ہے۔ وہ تمام ذرائع اور وسائل کو کام میں لا کر نفس انسانی کو ایک ایسی سطح تک سربلند کرتا ہے جس کے لئے اس نے اس کے مزاج اور فطرت کو تیار کیا ہے۔ لیکن اسلام ان تمام وسائل کو کام میں لاتے ہوئے یہ بھی پیش نظر رکھتا ہے کہ انسانی فطرت کے بھی کچھ حدود و قیود ہوتے ہیں۔ اسلام فطرت انسانی اور

انسانی مزاج کو ایسے کاموں پر مجبور نہیں کرتا جو اس کی قدرت اور وسعت سے باہر ہوں ۔ اسلام لوگوں کو یہ حکم نہیں دیتا کہ تم اپنے سروں کو دیواروں سے ٹکراؤ اور یہ ہے میرا حکم بس السلام علیکم ! یہ کرو چاہے قدرت ہے یا نہیں ہے ۔

اسلامی نظام نفس انسانی کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ ضعیفی کی حالت پر رہے یا تقصیرات پر راضی ہو ۔ وہ یہ بھی نہیں کرتا کہ انسان گندگی کے دلدل میں کانوں تک ڈوبا ہو' اور وہ اس کی تعریف و تمجید کرے اور اس کے لئے جواز یہ ڈھونڈے کہ انسان بطور حقیقت واقعہ اسی طرح ہے ۔ وہ اس طرح بھی نہیں کرتا کہ اسے عالم بالا کے ساتھ بذریعہ رسی باندھ کر لٹکا دے اور پھر وہ جدھر چاہے جھولتا پھرے کیونکہ اس صورت میں اس کے پاؤں بھی زمین پر نہ ہوں گے اور ہم اس صورت حال کو یہ کہیں کہ یہ رفعت اور سربلندی ہے ۔

اسلام ان انتہاؤں کے درمیان دین وسط ہے ۔ یہ ایسا نظام ہے جس کے اندر حقیقت پسندانہ واقعیت پائی جاتی ہے یا سنجیدہ حقیقت پسندی ہے ۔ یہ نظام انسان کے ساتھ معاملہ کرتا ہے اور انسان کو انسان سمجھ کر معاملہ کرتا ہے ۔ اپنی فطرت کے اعتبار سے انسان ایک عجیب مخلوق ہے ۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کے پاؤں زمین پر ہیں لیکن اس کی روح آسمانوں پر ہے ۔ اس کی روح اس کے جسم میں بھی ہوتی ہے اور آسمانوں پر بھی ہوتی ہے ۔ غرض جسم زمین پر اور روح آسمانوں پر ہوتی ہے ۔

یہ حکم دیتے ہوئے اسلامی نظام ایک انسان کے ساتھ معاملہ کرتا ہے اور اس معاملے میں انسان کی ایک عام خصوصیت کا ذکر کرتا ہے ۔ (وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ (۴:۱۲۷)) (نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں) مطلب یہ ہے کہ تنگ دلی دائماً نفوس کے اندر موجود ہوتی ہے ۔ نفس کے اندر تنگ دلی قائم رہتی ہے ۔ تنگ دلی کی کئی اقسام ہیں ۔ مال میں تنگ دلی ۔ جذبات میں تنگ دلی' زوجین کی زندگی میں بعض اوقات ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے بخل اور تنگدلی ابھر آتی ہے ۔ ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ خاوند عورت کے بارے میں سخت تنگ دل ہو جاتا ہے ۔ اب عورت اگر اپنا بقایا مہر چھوڑ دے یا نفقات معاف کر دے یا مالی تاوان ادا کر دے اور نکاح کو باقی رکھوا لے تو معاملہ خراب ہونے سے ٹل سکتا ہے ۔ اس لئے کہ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ عورت اپنے حقوق زنا و شوئی بھی معاف کر دیتی ہے مگر طلاق لینا پسند نہیں کرتی ۔ اگر صورت یہ ہو کہ خاوند کی کوئی دوسری زیادہ محبوب بیوی ہو اور پہلی بیوی کے اندر کشش اور تازگی باقی نہ رہی ہو اور عورت خاوند کے جذبات کا احترام کر کے اس کو راضی کر لے اور اس طرح نکاح باقی رہ جائے ۔ غرض ان تمام حالات میں معاملہ بیوی کے اختیار میں دے دیا گیا ہے ۔ وہ مختار ہے کہ اس کی مصلحت جس صورت میں ہو وہ اسے اختیار کر لے ۔ اسلامی نظام اس پر کچھ لازم نہیں کرتا بلکہ اختیار ہے کہ وہ اپنے معاملے میں تدبر کر کے کوئی بہتر فیصلہ اپنے حق میں کر لے ۔

لیکن اسلام معاملے کو بخل کے حوالے ہی نہیں کر دیتا بلکہ اسے ایک دوسرے طرز عمل کی طرف بھی بلاتا ہے ' اس لئے کہ بخل ہی انسانی فطرت کا خاصہ قائمہ نہیں ہے بلکہ احسان اور خدا ترسی بھی فطرت انسان کے اندر ہیں ۔

(وَإِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۴:۱۲۷)) (لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو یقین رکھو کہ اللہ تمہارے اس طرز عمل سے بے خبر نہ ہو گا)۔

احسان اور تقویٰ پر ہی آخری دارومدار ہے اور احسان اور تقویٰ کا کوئی عمل ضائع نہ ہو گا۔ اس لئے ضائع نہ ہو گا کہ اللہ کا علم سب چیزوں پر محیط ہے۔ وہ ہر انسان کے عمل سے بھی خبردار ہے اور اس عمل کی تہ میں پائے جانے والی نیت سے بھی خبردار ہے۔ نفس انسانی کو اس طرف پکارنا کہ تم احسان اور تقویٰ کو اپنا شعار بناؤ اور یہ کہ اللہ تمام اعمال سے خبردار ہے' یہ ایک ایسی پکار ہے جس کا نفس انسانی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس پکار پر ہر انسان لبیک کہتا ہے۔ بلکہ یہ وہ واحد دعوت و تلقین ہے جس کے لئے ہر نفس بہت جلدی تیار ہو جاتا ہے۔

ایک بار پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی نظام حیات انسانی زندگی کے حالات اور اس کی واقعی صورت حال کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ یہ معاملہ مثالی طور پر حقیقت پسندانہ ہے یا حقیقت پسندانہ مثالیت ہے۔ اسلام ان باتوں کا اعتراف کرتا ہے جو فطرت انسانی کا لازمی حصہ ہیں اور ہیں بھی پوشیدہ اور یہ اعتراف نہایت ہی تعجب خیز انداز میں ہے۔

(وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا (۱۲۹)

وَإِنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِنْ سَعَتِهِ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا (۱۳۰)

بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا (قانون الٰہی کا منشا پورا کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ) ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ادھر لٹکتا چھوڑ دو۔ اگر تم اپنا طرز عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ چشم پوشی کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ لیکن اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہی ہو جائیں تو اللہ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ کا دامن بہت کشادہ ہے اور وہ دانا و بینا ہے)

اللہ وہ ذات ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور وہ اپنی پیدا کردہ مخلوقات کے بارے میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے بعض میلانات ایسے ہیں جن پر اس کے لئے قابو پانا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسان کے ہاتھ میں تکیل دے دی کہ وہ ان میلانات کو قابو میں رکھے' ان میلانات کی حرکت کو حدود میں رکھے لیکن انہیں بالکل ختم کرنے کی کوشش بھی نہ کرے۔

ان میلانات میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی انسان اپنی متعدد بیویوں میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ مائل ہو۔ یہ میلان ایسا ہوتا ہے جو انسان کی طاقت سے باہر ہوتا ہے۔ انسان اسے ختم نہیں کر سکتا تو اس کا حل کیا ہے؟ اسلام کسی شخص سے اس بات پر مؤاخذہ نہیں کرتا جو اس کی وسعت سے باہر ہو۔ نہ اسے گناہ قرار دیتا ہے اور نہ اس پر سزا دیتا ہے۔ اس بات کو اسلام اس کھاتے میں ڈالتا ہے جو اس کی قدرت سے ہی باہر ہو۔ چنانچہ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ تم اپنی بیویوں کے درمیان ہرگز مکمل عدل نہیں کر سکتے اگرچہ تم ایسا کرنے کی کوشش کرو۔ اس لئے کہ یہ تمہاری قدرت سے باہر ہے۔ تمہارے ارادے میں جو چیز داخل ہے وہ یہ ہے کہ تم معاملہ کرنے میں انصاف کرو' تقسیم میں انصاف کرو' خرچہ دینے میں انصاف کرو' حقوق زناشوئی میں انصاف کرو' یہاں تک کہ مسکرانے میں بھی انصاف کرو' زبانی الفاظ کہنے میں بھی انصاف کرو۔ یہ ہے وہ چیز جس کا

تم سے مطالبہ کیا جارہا ہے۔ یہ ہے وہ تکمیل جو ان میلانات کو کنٹرول میں رکھے گی۔ ضبط مطلوب ہے' میلانات کا قتل مطلوب نہیں ہے۔ (فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (۴ : ۱۲۹)) (ایک بیوی کی طرف اس طرح مائل نہ ہو جاؤ کہ دوسری کو ادھر لٹکتا چھوڑ دو)

یہ ہے وہ بات جس سے منع کیا گیا ہے۔ یعنی ظاہری معاملات میں ایک طرف جھک جانا۔ اس طرح جھکنا کہ دوسری کے حقوق مارے جائیں کہ نہ بیوی ہو اور نہ مطلقہ۔ اس کے ساتھ ہی اہل ایمان کو ایک نہایت ہی مؤثر آواز سے پکارا جاتا ہے۔

(وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا (۴ : ۱۲۹)) (اگر تم اپنا طرز عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ چشم پوشی کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)۔

اسلام انسانی نفس کے ساتھ اس طرح معاملہ کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی ذات ہے جو ایک مٹھی بھر مٹی اور اس میں نفخ روح سے پیدا کی گئی ہے اور اس کے اندر جو قوتیں اور صلاحیتیں ہیں ان کے بالکل مطابق۔ نیز وہ انسان کے ساتھ ایک مثالی حقیقت پسندی یا حقیقی مثالیت کے مطابق اس کے ساتھ ڈیلنگ کرتا ہے کہ وہ ایک انسان ہو' جس کے قدم زمین پر ہوں اور اسے روحانی بلندی حاصل ہو جس میں نہ تو تناقض ہو اور نہ ٹوٹ پھوٹ ہو۔

یہی ہے اسلام' حضور اکرم ؐ انسانی اعتبار سے اوج کمال پر تھے۔ آپ کے اندر تمام قوتیں متوازن تھیں' باہم متناسق تھیں اور انسان کی حدود فطرت کے اندر تھیں۔

حضور اکرم ؐ ازواج مطہرات کے درمیان تقسیم اور منصفانہ تقسیم پر تو قادر تھے ایک بیوی کو دوسری بیوی پر ترجیح نہ دیتے تھے۔ لیکن دلی جذبات پر کنٹرول کسی کی طاقت میں نہیں ہوتا۔ (الهم هذا قسمي فيما املك فلا تلمني فيما لا املك) (اے اللہ یہ ہے میری تقسیم جن معاملات میں میرا اختیار ہے اور آپ مجھے ملامت نہ کریں ان معاملات میں جو میرے اختیار سے باہر ہیں) یعنی دل (ابوداؤد)

ہاں جب دل خشک ہو جائیں' تعلقات بہت ہی خراب ہو جائیں اور زوجین کے درمیان باہم زندگی گزارنا مشکل ہو جائے تو پھر جدائی ہی بہتر ہے۔ اسلام زوجین کو رسیوں اور زنجیروں میں باندھ کر اکٹھا رکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ نہ قید و بند کے ذریعے زوجین کو اکٹھا رکھا جا سکتا ہے۔ صرف محبت اور باہم رحم دلی کے جذبات میں فریقین کو باندھا جا سکتا ہے یا پھر ان کو واجبات اور فرائض کی انجام دہی اور حسن سلوک کے ذریعے یکجا رکھا جا سکتا ہے' خصوصاً ایسے دلوں کو جن کے درمیان نفرت پیدا ہو چکی ہو' اس لئے کہ نفرت کے قلعوں میں دلوں کو بند نہیں کیا جا سکتا۔ نیز یہ تعلق کہ بظاہر تو باہم تعلق ہو اور اندرونی طور پر مکمل کاٹ ہو۔

(وَإِنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِنْ سَعَتِهِ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا (۴ : ۱۳۰))
(اور اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہی ہو جائیں تو اللہ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا) اللہ تعالیٰ دونوں سے وعدہ فرماتے ہیں کہ وہ اپنے فضل اور رحمت سے دونوں کو غنی بنا دے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے

بندوں پر بہت ہی وسعت کرنے والے ہیں' اور وہ اپنے حدود حکمت کے اندر اور بندوں کی مصلحت کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے لئے کشادگی کی حد مقرر فرماتے ہیں' ہر شخص کے حالات کے مطابق۔

اسلام انسانی شعور اور نفس کے پوشیدہ میلانات کے ساتھ جس طرح برتاؤ کرتا ہے اور جس طرح زندگی کے طور طریقوں کو حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھتا ہے وہ اس قدر حیران کن ہے کہ اگر لوگ رات دن اللہ کا شکر ادا کریں تو بھی ان کے لئے اس کا حق ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں انسانی سہولت کا بہت ہی خیال رکھا گیا اور نظر آتا ہے کہ یہ نظام انسانوں کے لئے تجویز ہوا ہے۔ وہ انسانوں کا ہاتھ پکڑ کر ان کو نہایت ہی گری ہوئی حالت سے اٹھاتا ہے اور انہیں نہایت ہی سربلندی تک لے جاتا ہے اور یہ عمل انسان کی فطرت کے عین مطابق ہوتا ہے۔ وہ ان کے لئے بلندی اور رفعت کا کوئی ٹارگٹ اس وقت تک تجویز نہیں کرتا جب تک ان کی فطرت میں اس کے حصول کے لئے داعیہ نہ ہو اور ان کے مزاج میں اس کی کوئی نہ کوئی جڑ موجود نہ ہو۔ اس طرح اسلام ان کو پھر اس بلند مقام تک لے جاتا ہے جہاں تک انہیں کوئی دوسرا نظام نہیں لے جا سکتا۔ یہ کام وہ اس طرح مثالی واقعیت پسندی یا ایسی واقعیت کے ساتھ کرتا ہے جس کی کوئی مثال نہ ہو اور پھر ایسی صورت میں کہ اس عجیب مخلوق انسانی کی اصل طبیعت اور مزاج کے مطابق۔

---OO---

خاندانی نظم کے یہ احکام جن کا تعلق خاص زوجین کی ازدواجی زندگی سے ہے' اسلامی نظام حیات کا ایک حصہ ہیں اور اسلامی نظام حیات اس کائنات کے ناموس اکبر کا ایک حصہ ہے جو اللہ نے اس پوری کائنات کے اندر جاری فرمایا ہے۔ اس لئے اسلامی نظام بھی اس کائنات کی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہے جبکہ دوسری طرف وہ انسانی فطرت کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے۔ اس لئے کہ انسان بھی اس کائنات ہی کا ایک حصہ ہے اور یہ اسلامی نظام زندگی کا نہایت ہی گہرا راز ہے اس لئے عائلی اور خاندانی نظام کے مسائل کے متصلاً بعد اللہ تعالیٰ کائنات کا ذکر فرماتے ہیں جس سے یہ عائلی احکام پوری کائنات کے نظام فطرت کے ساتھ مربوط ہو جاتے ہیں۔ گویا جس طرح انسانی زندگی میں اللہ کی حاکمیت ہے' اسی طرح اس کائنات میں بھی وہی حاکم ہے۔ وہی ہے جو زمین و آسمان کا مالک ہے اور یہ وہی ذات ہے جس نے تمہیں یہ احکام دیئے ہیں۔ وہی ہے جس نے تم سے پہلی امتوں کو یہ احکام دیئے تھے اور یہ تمام احکام اور وصایا ایک ہیں اور ایک ہی منبع سے ہیں۔ اور اسلامی نظام اس پر قائم ہے کہ اس کے نتیجے میں دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی نصیب ہوتی ہے اور یہ وہ اصول ہیں جو سچائی' عدل اور خدا ترسی پر استوار ہیں۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ
تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ

(آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ تم سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی تھی انہیں بھی یہی ہدایت کی تھی اور اب تم کو بھی یہی ہدایت کرتے ہیں کہ خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو لیکن اگر تم نہیں مانتے تو نہ مانو' آسمان و زمین کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہی ہے اور وہ بے نیاز ہے۔ ہر تعریف کا مستحق۔ ہاں' اللہ ہی مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور کارسازی کے لئے بس وہی کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو ہٹا کر تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے' اور وہ اس کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ جو شخص محض ثواب دنیا کا طالب ہو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کے پاس ثواب دنیا بھی ہے اور ثواب آخرت بھی اور اللہ سمیع و بصیر ہے)۔

قرآن کریم میں احکام و نواہی کے بیان کے بعد بار بار یہ تعقیب آتی ہے کہ اللہ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کا مالک ہے۔ یا یہ لفظ آتا ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے لئے ہے۔ یہ دونوں امور ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں اس لئے کہ جو بادشاہ اور مالک ہوتا ہے' اپنی مملکت میں امر اور نہی بھی اسی کا چلتا ہے۔ اس کی مملکت میں جو لوگ بستے ہیں وہ اس کے محکوم ہوں گے اور اس کائنات میں چونکہ اللہ وحدہ مالک ہے تو اس وجہ سے اس دنیا میں صرف اس کا حکم چلے گا اور وہی لوگوں کے لئے قانون بنانے کا حقدار ہو گا۔ دونوں امور ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔

جن لوگوں پر کتاب اتاری گئی ہے یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کو وصیت کی ہے کہ وہ خدا سے ڈریں اور یہ وصیت اس نشاندہی کے بعد کی ہے کہ زمین اور آسمانوں کے اندر جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے اس لئے وصیت کا حق بھی اللہ کو ہے اور قانون سازی کا حق اللہ کو ہے لہٰذا اس سے ڈرو۔

(وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ (٤ : ١٣١)) (آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ تم سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی تھی' انہیں بھی یہی ہدایت کی تھی اور اب تم کو بھی یہی ہدایت کرتے ہیں کہ خدا سے

ڈرتے ہوئے کام کرو۔)

واقعہ یہ ہے کہ جس کو حقیقی اقتدار حاصل ہو لوگ اسی سے ڈرتے ہیں اور خدا ترسی ہی وہ واحد سبیل ہے جس سے "دلوں" کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ پھر خدا ترسی ہی وہ واحد سبیل ہے جس کے ذریعے کسی "نظام" کی اصلاح ہو سکتی ہے اور اس کی جزئیات پر عمل کرایا جا سکتا ہے۔ جو لوگ اللہ کی اس ملکیت میں اپنی حیثیت کو نہیں پہچانتے ان کو اللہ خبردار فرماتے ہیں کہ اللہ انہیں اس دنیا سے دور کر کے ان کی جگہ دوسری آبادی کو لا کر اپنی ملکیت میں بسا سکتے ہیں۔

(وَاِنْ تَكْفُرُوا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا (۱۳۱) وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (۱۳۲) اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا (۱۳۳) (٤: ۱۳۱ تا ۱۳۳)) (لیکن اگر تم نہیں مانتے تو نہ مانو' آسمان و زمین کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہی ہے اور وہ بے نیاز ہے۔ ہر تعریف کا مستحق۔ ہاں' اللہ ہی مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور کارسازی کے لئے بس وہی کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو ہٹا کر تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے' اور وہ اس کی پوری قدرت رکھتا ہے)۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو وصیت کرتے ہیں کہ اللہ سے ڈرو' اگر وہ اللہ سے نہ ڈریں تو اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اور وہ سب کفر کا رویہ اختیار کر لیں تو بھی اللہ کا اس میں کچھ نقصان نہیں ہے اس لئے کہ لوگوں کے کفر کی وجہ سے اللہ کی ملکیت میں سے کوئی چیز کم نہیں ہوتی۔ (فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (٤: ۱۳۱)) (اللہ تو مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں) اور وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تمہیں یہاں سے چلتا کرے اور کسی اور کو لا بسائے۔ وہ جو ان کو وصیت کرتا ہے تو وہ ان کی بھلائی کے لئے کرتا ہے۔ اور ان کے حالات کو درست کرنے کے لئے کرتا ہے۔

اسلام انسان کو جس طرح اس پوری کائنات کا سرتاج قرار دیتا ہے اور انسان کی کرامت کا اعلان کرتا ہے' اور تمام زمین کی مخلوقات سے اسے برتر قرار دیتا ہے' اسی طرح اگر انسان اللہ کا کفر کرلے تو اللہ انسان کو اس کائنات کی بدترین مخلوق قرار دیتا ہے اس لئے کہ وہ اللہ کے حکم سے منہ موڑتا ہے بلکہ وہ سینہ زوری کر کے اللہ کی صفت حاکمیت میں شریک ہو کر اپنے آپ کو یہاں کا حاکم قرار دیتا ہے۔ اور وہ بغیر کسی استحقاق کے ایسا کرتا ہے۔ اسلامی تصور حیات میں یہ دونوں باتیں برابر ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے۔

یہ آیات اس تعقیب پر اختتام کو پہنچتی ہیں کہ جو لوگ صرف دنیاوی مقاصد کے لالچ میں گرفتار ہیں' ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کا فضل بہت ہی وسیع ہے۔ اللہ کے ہاں دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی ہے اور جو لوگ دنیا پر ہی نظریں جمائے بیٹھے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ اپنی نظریں ذرا اونچی کریں اور دیکھیں کہ اللہ کے ہاں دنیا و آخرت کی بھلائی ہے۔

(مَنْ كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيعًا

بَصِيرًا (٤ : ١٣٤)) (جو شخص محض ثواب دنیا کا طالب ہو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کے پاس ثواب دنیا بھی ہے اور ثواب آخرت بھی' اور اللہ سمیع و بصیر ہے)۔ یہ امر ایک واضح حماقت اور ایک واضح کم ہمتی ہوگی کہ انسان دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی حاصل کر سکتا ہو اور اسے دنیا اور آخرت دونوں کا اجر مل سکتا ہو اور اس کامیابی کی ضمانت اسے اسلامی نظام زندگی دے بھی رہا ہو' جو ایک واقعیت پسند عملی اور مثالی نظام ہے' لیکن وہ اس گارنٹی کے باوجود صرف دنیا ہی کی طلب کرے۔ اپنی پوری ہمت دنیا طلبی ہی میں لگا دے۔ اور بالکل اس طرح زندگی بسر کرے جس طرح حیوان' چوپائے اور کیڑے مکوڑے زندگی بسر کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ شخص انسانوں کی طرح بسہولت زندگی بسر کر سکتا ہے اس طرح کہ اس کے قدم زمین پر چلتے ہوں اور اس کی روح آسمانوں میں سیر کرتی اور پھڑپھڑاتی ہو۔ اور اس طرح کہ وہ ایک جاندار موجود کی طرح جو اس کرۂ ارض کے اوپر طبیعی قوانین کے مطابق تگ و دو بھی کر رہا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ عالم بالا کے ساتھ بھی اس کی زندگی کا ربط ہو۔

غرض یہ جزئی اور فروعی احکام پوری طرح اسلامی نظام حیات کے اصولوں کے ساتھ مربوط ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں خاندانی نظام کی بہت ہی اہمیت ہے' اس قدر اہمیت کہ ان احکام کو اس کائنات کے عظیم معاملات کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے اور ان تمام امور پر یہ تعقیب اور تبصرہ کیا گیا ہے کہ اگر تم لوگ اللہ کی ان وصیتوں کو قبول نہیں کرتے تو اللہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ تمہیں ختم کر دے اور تمہاری جگہ کوئی دوسری مخلوق آباد کر دے۔ یہ ایک نہایت ہی خطرناک تبصرہ ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک ایک خاندان کے نظام کے معاملے میں وارد ہونے والے احکام بھی اسی قدر اہم ہیں جس قدر تمام ادیان کو دی جانے والی عظیم ہدایات کی اہمیت ہے۔

---ooo---

پارہ نمبر ۵

درس نمبر ۲۴ ایک نظر میں

یہ سبق بھی امت مسلمہ کے لئے دست قدرت کی تربیت کا ایک نمونہ ہے جس کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ یہ ایک اچھی امت ہے اور جسے لوگوں کے لئے نکالا گیا ہے ۔ یہ سبق بھی اس اسلامی نظام زندگی کی ایک اہم کڑی ہے جو نہایت ہی مستحکم نظام ہے ۔ جس کے مقاصد اور اہداف متعین ہیں اور یہ نظام نفس انسانی کی بہتری کے لئے نازل کیا گیا ہے ۔ اس کے ذریعے نفس انسانی کا اس طرح علاج کیا گیا ہے کہ جس دست قدرت نے ذات انسان کو بنایا ہے ' وہی اس کی کمزوریوں کا علاج بھی کر رہا ہے ۔ یہ علاج اس لئے کامیاب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی اس ممتاز مخلوق اور صنعت کے پرزے پرزے سے واقف ہے ' یہ اس کی حقیقت اور ماہیت کو اچھی طرح جانتا ہے ' اس کے رجحانات و میلانات سے واقف ہے اور اس کی ضروریات اور اس کے اندر پوشیدہ ترین صلاحیتوں اور کمزوریوں سے بھی آگاہی رکھتا ہے ۔

اس سبق میں اسلامی نظام حیات کے اصول ' نہایت ہی اٹل اصول بتائے گئے ہیں جو مستقل ہیں ۔ ہر دور ' ہر جگہ اور ہر زمانے کے لئے ہیں تاکہ انسانیت کو جاہلیت کی پستیوں سے بلند کر کے نہایت اونچی بلندیوں تک پہنچائے اور جہاں تک انسان ترقی کر چکا ہو اس سے اسے مزید آگے بڑھائے ۔ ان اصولوں کے ساتھ ساتھ اس سبق میں پہلی جماعت مسلمہ کے بھی کچھ خدوخال بیان کئے گئے ہیں جو اس قرآن کی پہلی مخاطب جماعت تھی ۔ ان آیات کے آئینے کے اندر پہلی تحریک اسلامی نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ بحیثیت ایک انسانی جماعت نظر آتی ہے ۔ اس میں بشری کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں اور اعلیٰ پاکیزگی کا معیار بھی نظر آتا ہے ۔ اس جماعت کے اندر جاہلی دور کی باقیات اور فطری کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں ۔ قرآن کریم اس جماعت کی تربیت کرتے ہوئے ایک ایک کمزوری کو لیتا ہے اور ان کا علاج کرتا ہے ' پھر اس جماعت کو تقویت دے کر اسے ایک مثالی جماعت بنا رہا ہے ۔ تلقین کی جاتی ہے کہ وہ سچائی پر جم جائیں اور راہ حق میں جدوجہد کریں اور قربانیاں دیں ۔

سبق کا آغاز اس پکار سے کیا جاتا ہے جو جماعت مسلمہ کے نام ہے ۔ اسے کہا جاتا ہے کہ تم خیر امت ہو اور اس دنیا میں تمہارا ایک مقرر کردار ہے ' اسے ادا کرنے کے لئے کمربند ہو اور دنیا میں عدل و انصاف کا وہ معیار قائم کرو جو انسانیت کی تاریخ کا سب سے اونچا معیار اور مثالی عدل ہو ۔ اور عدل قائم کرنے میں تمہارا مطمع نظر اور نصب العین ذات باری کی رضا کا حصول ہو ' اور اس معاملے میں کسی اور جذبے ' کسی اور خواہش اور کسی اور مصلحت کو پیش نظر مت رکھو ۔ اس معاملے میں خود اپنی جماعت ' اپنی حکومت اور اپنی امت (Nation) کے مفادات کو بھی پیش نظر نہ رکھو ۔ اس میں خدا ترسی اور رضائے الٰہی کے سوا تمہارے پیش نظر کوئی اور جذبہ نہ ہو ۔ امت نے فی الواقعہ ایسا کیا اور اس کا ایک نمونہ ایک یہودی کے اوپر جھوٹے الزام کے واقعہ کی شکل میں خود قرآن کریم نے ریکارڈ کیا اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی

"کو بذریعہ وحی انصاف کرنے کی تنبیہ اور تاکید کی جس کا تذکرہ ہم تفصیلاً کر آئے ہیں۔

سبق کا آغاز اس حکم سے ہوتا ہے کہ عدل کرو' مطلق اور خالص عدل کرو۔ مطلق اور خالص عدل کس قدر مشکل کام ہے' اس کو رب کائنات ہی جانتا ہے۔ جس نے انسان کو پیدا کیا۔ رب کو معلوم ہے کہ اس راہ میں کیا کیا مشکلات پیش آتی ہیں۔ اللہ کو معلوم ہے کہ انسان میں کمزوری کے کیا کیا پہلو ہیں۔ انسان کے جذبات اس کی ذات کے لئے اور اقارب کے لئے' کمزوروں اور زبردستوں کے لئے' خصوصاً والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لئے' فقراء اور اغنیاء کے لئے' دوست اور دشمن کے لئے کیسے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے بے شمار جذبات اور یہ سب کے سب یا ان میں کوئی ایک بات عدل کے معاملے میں اثرانداز ہو سکتی ہے اور ان کو نظرانداز کرنا نہایت ہی مشکل کام ہے۔ یہ کام اسی طرح مشکل ہے جس طرح ایک آدمی نہایت ہی عمودی چڑھائی پر چڑھ رہا ہو اور اس میں اس کے پیش نظر صرف رضائے الہی اور حبل اللہ رہے۔ کس قدر مشکل ہے یہ کام۔

دوسری دعوت اس سبق میں یہ ہے کہ مکمل ایمان لے آؤ۔ اللہ' کتابوں' ملائکہ' رسول اور یوم آخرت پر ایمان لاؤ۔ یہ ہے مکمل ایمان۔ اس کے تمام اجزاء کی اپنی اپنی جگہ بہت بڑی اہمیت ہے۔ یہ تمام اجزاء مل کر ایمان کو مکمل کرتے ہیں اور انہی اجزاء سے مجموعی اسلامی تصور حیات وجود میں آتا ہے' جو تمام دوسرے تصورات کے مقابلے میں زیادہ فوقیت رکھتا ہے' جو کسی زمانے میں انسانی معاشروں کے اندر رائج و معروف رہے ہیں۔ اسلام سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ یہ نظریہ حیات بذات خود ہر نظریے سے قوی اور برتر ہے اور اس سے تمام دوسری قدریں وجود میں آتی ہیں چاہے وہ اخلاقی ہوں' اجتماعی ہوں یا تنظیمی ہوں اور جن کا مکمل مظاہرہ پہلی جماعت اسلامی کی زندگی میں ہوا تھا اور آئندہ کے ادوار میں بھی جس جماعت نے اس نظام پر صحیح طرح ایمان کا اظہار کیا اور اس کے تقاضوں کو پورا کیا تو اس کی زندگی کے اندر بھی یہی تفوق اور برتری پیدا ہوئی۔ قیامت تک یہ اصول اپنی جگہ قائم رہے گا اور قیامت میں تو بہرحال اللہ کا کلمہ ہی حق اور برتر ثابت ہو گا۔ یہی ہے مفہوم اس آیت کا (وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (۴: ۱۴۱)) (اللہ نے کافروں کے لئے مسلمانوں کے مقابلے میں برتری کی کوئی سبیل نہیں رکھی)۔

ان دو دعوتوں کے بعد اب اللہ تعالیٰ منافقین پر تنقیدی حملہ شروع کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو وہ ہیں جو ابھی تک اپنے نفاق کو چھپائے ہوئے ہیں اور بعض وہ ہیں جو منافق رہنے کے بعد دوبارہ کفر کا اعلان کر چکے ہیں۔ اس تنقیدی بیان میں منافقین کے مزاج کی قابل نفرت صورت' اسلامی صفوں کے اندر ان کی سرگرمیوں کی جو صورت حال ہے۔ اس کی تفصیلات' ان کا متلون موقف' کہ اگر مسلمانوں کو فتح ہو تو وہ ان کی چاپلوسی کرتے ہیں اور اگر اہل کفر کو فتح نصیب ہو تو یہ ان کے ہاں نیچے ہوتے ہیں اور ہر جگہ خود اپنے آپ کو سبب فتح قرار دیتے ہیں۔ نماز کے لئے نہایت ہی بوجھل قدموں کے ساتھ جاتے ہیں۔ اور دکھاوے کے لئے پڑھتے ہیں' ان کا رویہ نہایت ہی مذبذب ہوتا ہے۔ نہ ادھر کے اور نہ ادھر کے۔

اس تنقیدی حملے کے درمیان جابجا اہل ایمان کو بھی ہدایات دی گئی ہیں جن سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ منافقین اس وقت اسلامی صفوں میں کس طرح گھسے ہوئے تھے اور کیا کیا کارستانیاں کر رہے تھے۔ اسلامی صفوں میں

منافقین کو کس قدر اثر و رسوخ حاصل تھا۔ ان حالات میں اس قسم کے تنقیدی حملے کی ضرورت اس لئے پیش آئی تاکہ اس وقت کے موجود حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے تحریک اسلامی کو قدم بقدم آگے بڑھایا جائے اور اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ منافقین سے آہستہ آہستہ دور ہوتے جائیں اور ان کے ساتھ تعلقات رکھنے سے اجتناب کریں۔ ان کی مجالس میں نہ بیٹھیں' جہاں وہ اکثر کفریہ گفتگوئیں کرتے ہیں اور اللہ کی آیات کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ البتہ اس دور میں قرآن کریم نے منافقین کے ساتھ بائیکاٹ کا حکم تو بہرحال نہیں دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ آیات نازل ہو رہی تھیں اس وقت منافقین کا جتھا بڑا مضبوط تھا اور وہ اس قدر سرگرم تھے کہ اہل اسلام کے لئے ان کا مکمل بائیکاٹ ممکن ہی نہ تھا۔

مسلمانوں کو اس تحذیر اور تنبیہ کرنے کے درمیان ہی یہ بتا دیا گیا کہ نفاق کی علامات کیا ہیں اور نفاق کا آغاز کس طرح شروع ہوتا ہے۔ تاکہ وہ خود بھی نفاق کی علامات سے اپنے آپ کو بچانے کی سعی کریں۔ سب سے پہلی ہدایت یہ دی جاتی ہے کہ تم منافقین کے ساتھ دوستی ہرگز نہ کرو اور منافقین کے ہاں اپنی عزت اور احترام بڑھانے کا لالچ نہ کرو' اس لئے کہ عزت تو صرف اللہ کے ہاں ہے۔ اللہ کو ہرگز یہ بات پسند نہیں کہ وہ کافروں کو اہل اسلام پر برتری دے اور منافقین تو دنیا و آخرت دونوں میں ذلیل ہوں گے۔ یہ ہے ان کی تصویر ذرا ملاحظہ کرو اور پھر آخرت میں وہ دوزخ کے اندر سب سے نیچے پڑے ہوں گے۔

اس انداز میں یہ ہدایات اور تنبیہات بتلاتی ہیں کہ اسلامی نظام زندگی نفس انسانی اور اس کے اندر رچی بسی عادات کو کس طرح درست کرتا ہے اور کسی موجود عملی صورت حال کے اندر اسلام اصلاح کی کاروائی کا آغاز کس طرح کرتا ہے؟ اسلام نہایت ہی تدریج کے ساتھ کوئی تبدیلی لاتا ہے اور آخر کار کسی موجودہ صورت حال کو یکسر تبدیل کر کے اس کی جگہ نہایت ہی جدید صورت حالات لے کر آ جاتا ہے۔ نیز اس سے اس بات کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اس دور میں مسلمانوں کے حالات کیا تھے۔ کفر و نفاق کے محاذ ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح معاون تھے اور وہ کس طرح جماعت مسلمہ اور دین اسلام کے خلاف گٹھ جوڑ کئے ہوئے تھے۔

ان تمام تبصروں کے اندر غور کرنے سے یہ بات نظر آتی ہے کہ وہ کیا عظیم معرکہ تھا' جس کے اندر قرآن کریم نے جماعت مسلمہ کو ڈال دیا تھا۔ اور اس معرکہ میں ڈال کر قرآن کس نظام اور منہاج کے مطابق جماعت مسلمہ اور نفس انسانی کی قیادت اور راہنمائی کر رہا تھا۔ یہ معرکہ وہی معرکہ ہے جو ہر زمان و مکان کے اندر اسلام اور جاہلیت کے درمیان برپا رہا ہے اور کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔ وسائل بدل سکتے ہیں اور چہرے بدل سکتے ہیں لیکن اسلام اور جاہلیت کے درمیان جو جنگ ہے اس کی نوعیت آج بھی وہی ہے جو قرن اول میں تھی۔ نیز ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کی سرگرمیوں میں قرآن کریم کی قیادت اور راہنمائی کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ قرآن کریم یہ قیادت جس طرح حضور کے دور میں کرتا تھا' وہی راہنمائی اور قیادت وہ آج بھی کرتا ہے۔ قرآن کریم کسی ایک دور یا کسی ایک نسل کی راہنمائی کے لئے تو آیا ہی نہیں ہے' یہ تو اس امت کا قائد ہے' اس کا مرشد ہے اور اس کا ہادی ہے اور ہر دور اور ہر نسل کے لئے ہے۔

اور اس سبق کے آخر میں ایک لمحہ فکریہ! یہ کہ اللہ کو کیا پڑی ہے کہ وہ لوگوں کو خواہ مخواہ عذاب دے۔ اس کا

مطالبہ تو صرف یہ ہے کہ ایمان لاؤ اور اللہ کا شکر بجا لاؤ۔ اگر لوگ ایمان نہیں لاتے اور شکر گزار بندے نہیں بنتے تو اسے کوئی پرواہ نہیں۔ وہ تو ان کے ایمان اور شکر گزاری دونوں سے بے نیاز ہے۔ اللہ جو ہدایات دے رہا ہے وہ تو ان کی اصلاح کے لئے ہے۔ ان کو نرمی دینے کے لئے ہیں تاکہ وہ اس بات کے مستحق ہو جائیں کہ ان کو جنت میں انعامات ملیں۔ اگر وہ ان ہدایات کی خلاف ورزی کریں گے اور الٹے پاؤں پھریں گے تو وہ خود عذاب جہنم کے مستحق ہو جائیں گے۔ اس میں صرف ان ہی کا ذاتی نقصان ہے اور منافقین تو اس جہنم کے بھی سب سے خطرناک ''درک اسفل'' میں ہوں گے' سب سے نیچے والے درجے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۲۴ تشریح آیات

۱۳۵ -- تا -- ۱۴۷

يَايُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ
لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ
فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَ اِنْ تَلْوٗٓا
اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' انصاف کے علمبردار اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب' اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو' اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔

یہ اہل ایمان کو خصوصی پکار ہے۔اس پکار میں ان کے لئے ایک جدید لقب اور ایک نئی صفت کو استعمال کیا گیا ہے اور اس لقب اور صفت میں وہ بالکل منفرد ہیں۔اور الذین آمنوا کی روح بدل گئی ہے۔ان کے تصورات بالکل نئے ہوگئے ہیں۔ان کے اصول اور مقاصد بدل کر نئے ہو گئے ہیں۔وہ اس جدید انقلابی مہم کے راہنما بن گئے ہیں اور ان کے کاندھوں پر عظیم ذمہ داریاں عائد کر دی گئی ہیں' اب وہ پوری انسانیت کے لئے پاسبان و نگہبان ہیں۔وہ لوگوں کے درمیان اب فیصلہ کرنے والے ہیں۔اس لئے یہاں (یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا) کے الفاظ نہایت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔یعنی اس صفت ایمان ہی کی وجہ سے ان پر عالمی قیادت کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے اور پورے عالم کی قیادت کرنا گویا تقاضائے ایمان ہے اور صفت ایمان ہی کے تقاضے کے طور پر مسلمان اس قیادت کے مقام کا چارج لینے کے لئے یہ تیاری کر رہے تھے۔

اسلامی منہاج تربیت کی یہ ایک نہایت ہی موثر جھلکی ہے۔اور امت مسلمہ کو ایک نہایت ہی بھاری ذمہ داری کا

چارج دینے سے قبل ہی یہ جھلکی دکھائی گئی اور وہ بھاری ذمہ داری یہ ہے ۔

(یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا (۴:۱۳۵))

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' انصاف کے علمبردار اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنو' اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب' اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔

یہ امانت اور ذمہ داری یہ تھی کہ تم نے عدل قائم کرنا ہے اور یہ عدل مطلق ہو گا جس کا علمبردار تم نے بننا ہے ۔ ہر حال اور ہر میدان میں تم نے انصاف کرنا ہے ۔ ایسا عدل جس کے ذریعے ظلم اور عدوان کی خود بخود نفی ہو جائے اور پورے کرۂ ارض پر کہیں بھی ظلم نہ رہے اور یہ ایسا عدل ہو کہ ہر حقدار کو اس کا حق ملے ۔ اس حق رسیدگی میں مومن اور غیر مومن دونوں برابر ہوں جیسا کہ یہودی کے قصے میں واضح طور پر کہا گیا ہے ۔ اس میں رشتہ دار اور غیر رشتہ دار سب برابر ہوں۔ دوست اور دشمن سب برابر ہوں ۔ غنی اور فقیر کا درجہ ایک ہی ہو۔

(کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ) (انصاف کے علمبردار اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنو) یہ انصاف اور شہادت صرف اللہ کے لئے ہو' اور اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہو اور شہادت نہ ان کے لئے دی جائے جن کے حق میں دی جا رہی ہو اور نہ ان کی وجہ سے دی جائے جن کے خلاف دی جا رہی ہے ۔ یہ شہادت نہ کسی فرد اور نہ کسی جماعت کے مفادات کے لئے ہو اور نہ شہادت ان حالات سے متاثر ہو کر دی جائے جو اس وقت موجود ہوں یا مقدمہ زیر بحث پر اثر انداز ہو رہے ہوں خالصتاً اللہ کے لئے اور خالصتاً اللہ کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے' صرف اس کی رضا کے لئے دی جائے اور ایسے حالات میں کہ کوئی میلان' کوئی رجحان' کوئی مصلحت اور کوئی خواہش اسے متاثر نہ کر رہی ہو۔ نہ کسی کا لحاظ رکھا جا رہا ہو۔

(وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ (۴:۱۳۵)) (اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو) یہاں اسلامی نظام نفس انسانی کو خود اسکے اپنے خلاف مسلح کر رہا ہے ۔ اپنے جذبات کے ساتھ' اپنی ذات کے خلاف' اپنے والدین کے خلاف اور اپنے رشتہ داروں کے خلاف' اور یہ نہایت ہی دشوار مرحلہ ہے کہ کوئی اپنی ذات کے خلاف فیصلہ کرے ۔ محض زبانی جمع خرچ تو آسان ہوتا ہے لیکن عملاً ایسا کرنا نہایت ہی مشکل ہوتا ہے ۔ انسان ذہنی لحاظ سے اس کے بارے میں سوچ تو سکتا ہے کہ ایسا ہونا چاہئے مگر عمل دشوار ہوتا ہے اور اس بات کی اصل مشکلات کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب انسان عملاً یہ کام کرے ۔ اس کے باوجود کہ یہ مشکل کام ہے' اسلامی نظام نفس مومنہ کو تقویٰ کے ذریعے خود اپنی ذات کے خلاف مسلح کر رہا ہے کہ وہ اس

خطرناک تجربے میں کو دپڑے، اس لئے کہ دنیا کے اندر عدل و انصاف کا یہی معیار ہونا چاہئے کہ کوئی اپنی ذات کے خلاف بھی فیصلہ کر گزرے اگر حق و انصاف اس کا تقاضا کرتے ہوں ۔ اور کچھ لوگ یہ فیصلہ عملاً کر کے دکھائیں ۔

اس کے بعد نفس انسانی کو اپنے فطری اور اجتماعی شعور کے خلاف بھی مسلح کیا جاتا ہے کہ جس شخص کے حق میں یا خلاف گواہی دی جا رہی ہو وہ غریب ہو ۔ اگر وہ غریب ہے تو مشکل یہ ہوتی ہے کہ کوئی رحمدل انسان اس کے خلاف شہادت دینا از روئے رحمدلی، پسند نہیں کرتا اور یہ پسند کرتا ہے کہ اس کی کمزوری کی وجہ سے اس کے حق میں شہادت دے ۔ یا کسی اجتماعی مرتبہ و مقام کی وجہ سے یا کسی سوسائٹی کی طبقاتی منافرت کی وجہ سے کوئی کسی زیردست کے ساتھ نفرت کرتا ہو یا اگر مد مقابل غنی ہو تو اس کی وجاہت کا لحاظ رکھے اور اس کے خلاف شہادت نہ دے ۔ جاہلیت کے تمام نظاموں میں ایسا ہوتا رہا ہے ۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک گواہ ایک مالدار شخص کے ساتھ نفرت کرے اور اس کی مالداری اور برتری اسے پسند نہ ہو اور اس وجہ سے وہ شہادت حق نہ دے بلکہ مالدار کے خلاف شہادت دے دے ۔ یہ تمام فطری میلانات ہوئے اور جب عملاً کسی کو واسطہ پڑتا ہے تو انصاف اور شہادت کے وقت یہ اپنا وزن انسان پر ڈالتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے تمام امور کو لے لیا کہ ذات ہو، اقرباء ہوں، غریب ہو یا امیر تم شہادت حق دو ۔

(اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا (۴ : ۱۳۵)) (فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے) یہ نہایت ہی مشکل اور بھاری کام ہے ۔ اسلام نے اہل ایمان کو عملی زندگی میں ڈالا اور اسے اس قدر بلندی تک پہنچایا کہ انہیں پوری انسانیت نے دیکھا لیا کہ اسلام نے اس کرہ ارض پر عالم انسانیت کے اندر یہ ایک عظیم معجزہ دکھایا تھا ۔ یہ ایک ایسا معجزہ تھا کہ صرف اسلامی نظام کے سایہ ہی میں رونما ہو سکتا تھا ۔

(فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا (۴ : ۱۳۵)) (لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو) خواہشات نفسانیہ کی کئی اقسام ہوتی ہیں جن میں سے بعض کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے ۔ ذات کی محبت، اہل و عیال کی محبت، رشتہ داروں کی محبت، کسی فقیر کے ساتھ رحمدلی، (شہادت کے وقت) کسی غنی کی رعایت اور وجاہت کا لحاظ، کسی امیر یا فقیر سے نفرت وغیرہ سب خواہشات نفسانیہ ہیں ۔ خاندان، قبیلے، قوم، وطن اور حکومت کی طرفداری (شہادت کے وقت) دشمن سے نفرت اگرچہ دین کے دشمن ہوں ۔ غرض خواہشات کی بے شمار قسمیں اور رنگ ہیں ۔ ان تمام خواہشات سے اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے متاثر ہونے کو پسند نہیں کرتے ۔ اور اس تاثر کے تحت انصاف اور شہادت حق سے باز رہنے سے منع کرتے ہیں ۔ سب سے آخر میں اس بات پر متنبہ کیا جاتا ہے کہ شہادت کے اندر تحریف ہرگز نہ کرو اور شہادت سے منہ بھی نہ پھیرو ۔

(وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۴ : ۱۳۵)) (اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے) اس معاملے میں صرف یہ یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے تاکہ اہل ایمان کے اندر یہ تاثر پختہ ہو جائے کہ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو اس کا انجام بہت ہی برا ہو گا تاکہ ان کا دل کانپ اٹھے اس لئے کہ قرآن کریم کی ان آیات کے مخاطب اہل ایمان ہی تو تھے ۔

روایات میں آتا ہے کہ جب عبد اللہ ابن رواحہ کو حضور ؐ نے خیبر کی محصولات کی وصولی کے لئے بھیجا (یاد رہے کہ ان کے ساتھ رسول اللہ ؐ نے نصف محصولات پر فیصلہ کیا تھا) اور وہ فتح خیبر کے بعد وہاں گئے تو یہودیوں نے ان کو اس امر کے لئے رشوت دینا چاہی کہ وہ ان کے ساتھ نرمی کریں تو انہوں نے یہودیوں سے کہا: "خدا کی قسم میں تو ایک ایسے شخص کا نمائندہ ہوں جو اس پوری دنیا سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔ خدا کی قسم تم کو میں بندروں اور خنزیروں سے بھی زیادہ برا سمجھتا ہوں لیکن حضور ؐ کی محبت اور تمہاری نفرت مجھے اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ میں تمہارے درمیان عدل کے سوا کچھ اور کروں۔" اس پر یہودیوں نے کہا کہ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے زمین و آسمان کا نظام قائم ہے

عبداللہ ابن رواحہ مدرسہ رسول اللہ ؐ کے تعلیم یافتہ تھے' اور ان کی تعلیم و تربیت ربانی منہاج پر ہوئی تھی ۔ وہ انسان تھے اور پورے انسانی جذبات کے ساتھ کسی عدالت کی کرسی پر بیٹھے اور کامیاب رہے ۔ اور ان کے سوا دوسرے بھی کچھ کم نہ تھے جنھوں نے اسلامی نظام کے زیر سایہ معجزہ دنیا کو کر کے دکھایا۔

سالوں پر سال گزرتے رہے ۔ صدیاں بیت گئیں اور یہ دور بہت دور چلا گیا ہے اور لائبریریاں فقہ اور قانون کی کتابوں سے بھر گئی ہیں ۔ قانونی ضابطوں اور انصاف کے رولز ریگولیشن کی بہتات ہو گئی اور قانون اور انصاف کے محکمے اور وزارتیں تشکیل دے دی گئیں ۔ اور دماغ عدل و انصاف کا نام سن سن کر پھر گئے ۔ دنیا میں عدل کرنے کے بارے میں طویل ترین تقاریر اور مقالات پڑھے جانے لگے ۔ عدل و انصاف کے سلسلے میں کئی نظریات پیدا ہوئے اور کئی تنظیمیں وجود میں آئیں اور کانفرنسیں ہوئیں لیکن وہ حقیقی عدل کہاں ہے؟ اس کا ذائقہ کسی نے نہیں چکھا۔ یہ عدل لوگوں کے ضمیروں اور ان کی زندگی میں عنقا ہی رہا۔ اور یہ عدل ان انتظامات کے باوجود اس اعلیٰ معیار تک نہ پہنچ سکا جو خیر القرون کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس کا حقیقی وجود اگر کہیں تھا تو صرف اسلامی نظام کے دور میں تھا۔ اس مختصر دور میں عدل کا گراف اس قدر بلندی تک پہنچا اور نبوت اور خلافت راشدہ کے بعد اگر وہ کہیں ملا تو صرف اسلامی معاشرے کے اندر ملا اور صرف ان دلوں میں ملا جن میں اسلام جاگزین تھا اور ان افراد اور ان سوسائٹیوں میں ملا جن کی تربیت اسلامی نظام کے زیر سایہ ہو چکی تھی ۔ جو یقیناً ایک واحد اور مثالی عادلانہ نظام ہے ۔

وہ لوگ جو آج کل جدید سے جدید عدالتی نظام تشکیل دیتے ہیں' عدل و انصاف کے لئے جدید سے جدید ذرائع استعمال کرتے ہیں اور عدلیہ کے لئے نہایت ہی پیچیدہ طریقہ کار طے کرتے ہیں' ان لوگوں کو چاہئے کہ وہ ان امور کو بھی مد نظر رکھیں جو ہم نے اوپر دیئے ہیں ۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ کار پیچیدہ ہے اور یہ نہایت ہی منظم عدالتی ڈھانچے اس سادہ اور نہایت ہی ابتدائی انتظامات سے زیادہ مفید ہوں گے جو اسلامی دور میں اختیار کئے گئے تھے ۔ یہ جدید لوگ جن کے ہاتھوں میں عدلیہ کا اہتمام ہے' وہ سمجھتے ہوں گے کہ وہ بہت ہی کامیاب ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے ۔

یہ ایک وہم ہے اور یہ وہم اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ لوگ ظاہری شکلیں اور ظاہری حجم کو دیکھ کر حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ اشیاء کی حقیقت ان کے ظاہری حجم سے معلوم نہیں ہوتی ۔ یہ اسلامی نظام ہی ہے جو ان سادہ حالات کے اندر اس قدر بلند معیار تک پہنچا اور آج بھی اسلام ہی ہے جو اس سطح تک عدل کے معیار کو پہنچا سکتا ہے' بشرطیکہ اسے اختیار کیا جائے ۔

لیکن اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہم جدید ترقی یافتہ دور میں نظام عدالت کے جدید انتظامات اور ضابطہ ہائے دیوانی اور

فوجداری سے فائدہ نہ اٹھائیں یا محکمہ انصاف کی جدید تنظیم اور ترقی یافتہ اشکال کو ختم کر کے ان کی جگہ خلافت راشدہ کی سادہ شکل جاری کر دیں۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ اصل مقصد شکل اور تنظیم نہیں ہے بلکہ اصل مطلوب وہ روح ہے جو ظاہری شکل کے اندر کارفرما ہوتی ہے چاہے اس کی ظاہری شکل اور جسامت جو بھی ہو اور وہ نظام کیسے ہی حالات اور کیسے ہی زمان و مکان میں ہو۔

---○○○---

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ ءَامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَٱلْكِتَٰبِ ٱلَّذِى نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ وَٱلْكِتَٰبِ ٱلَّذِىٓ أَنزَلَ مِن قَبْلُ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِٱللَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ وَكُتُبِهِۦ وَرُسُلِهِۦ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَٰلًۢا بَعِيدًا ﴿١٣٦﴾

(اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ہر اس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے۔ جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روز آخرت سے کفر کیا وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا)

یہ ایک دوسری پکار ہے' جو صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لا چکے ہیں اور یہاں اس صفت اور لقب کے ساتھ ان کو آواز دی گئی ہے جو ان کو ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی جاہلیت سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ صفت ان کے واجبات و فرائض کا تعین کرتی ہے اور ان کو اس منبع اور ذریعے سے مربوط کرتی ہے جو ان کی قوت اور برتری کا اصل ماخذ (Source) ہے جس ماخذ سے وہ تمام قوتیں اور ہمتیں حاصل کرتے ہیں۔

(يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ ءَامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَٱلْكِتَٰبِ ٱلَّذِى نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ وَٱلْكِتَٰبِ ٱلَّذِىٓ أَنزَلَ مِن قَبْلُ (٤ : ١٣٦)) (اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ہر اس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے)۔

یہاں ایمان کے عناصر ترکیبی کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ وہ امور ہیں جن کا ہر شخص کے ایمان اور عقیدے میں موجود ہونا ضروری ہے۔ گویا یہ وہ اساس ہے جس پر ایمان کے اعتقادی تصورات قائم ہوتے ہیں۔ اللہ پر ایمان اور رسولوں پر ایمان انسان کو اس ذات سے مربوط کر دیتا ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اللہ نے پھر رسول کو بھیجا ہے تاکہ وہ انسان کو ہدایت دے۔ ایمان بالرسالت میں یہ امر شامل ہے کہ رسول اللہ نے اللہ کی جانب سے جو پیغام دیا ہے وہ صحیح دیا ہے۔

ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کا لازمی نتیجہ صدق ایمانی ہے۔ اللہ نے جو کتاب رسول کے ذریعہ ارسال کی ہے وہ بالکل سچی ہے۔ اس کتاب کے اندر اللہ نے انسانوں کو زندگی بسر کرنے کے تمام طریقے بتائے ہیں اور یہ کتاب تمام اہل ایمان

کے درمیان ایک مشترکہ رابطہ ہے اور انسانوں نے اس پوری کتاب کو بطور ہدایت لینا ہے۔ یہ جائز نہیں کہ اس میں سے بعض امور کو لے لیا جائے اور نافذ کیا جائے اور اس کے بعض حصوں کو چھوڑ دیا جائے۔

ایمان کے اساسی عناصر میں تمام کتب سابقہ پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ سابقہ انبیاء بھی اللہ کے رسول تھے اور وہ کتب بھی اللہ کی کتابیں تھیں اور ان سب میں جو نظام زندگی تجویز ہوا تھا وہ اسلام ہی تھا۔ سب کی تعلیم یہ تھی کہ اللہ ہی الٰہ ہے' الوہیت کے تمام خصائص کے اندر اس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں ہے اور سب کی تعلیم یہ تھی کہ اس نظام زندگی کی اطاعت اور نفاذ واجب ہے اور اللہ کی وحدانیت کے عقیدے کا یہ تقاضا بھی ہے کہ یہ کتب اپنی تحریف سے قبل سب کی سب اللہ کی طرف سے تھیں۔ ان میں ایک ہی نظام درج تھا' اور بشر کے بارے میں سب کے اندر اللہ ہی کا ارادہ درج تھا۔ ایک ہی راستہ تھا جو صراط مستقیم تھا اور باقی تمام راستے اس کے اردگرد ناقص اور ٹیڑھے تھے۔

تمام کتابوں پر ایمان لانے کا مقصد یہ ہے کہ دراصل تمام کتب ایک ہی کتاب ہے جو الکتاب ہے۔ اور یہ وحدت فکر صرف امت مسلمہ کی خصوصیت ہے۔ اس کا تصور یہ ہے کہ تمام کتب سماوی ایک کتاب ہے' تمام ادیان سماوی ایک دین ہے' ان کے اندر بیان کردہ ضابطہ ایک نظام ہے اور طریق کار بھی ایک ہے۔ یہی تصور حقیقت الوہیت کے ساتھ حقیقی لگا کھاتا ہے اور یہی بشریت کے لئے بھی درست ہے۔ یہ تصور ثابت کرتا ہے کہ سچائی ایک ہوتی ہے اور سچائی میں تعدد ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ گمراہی ہے۔ (فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ) ایمان لانے کا حکم دینے کے بعد ایک سخت تنبیہ آتی ہے یہ کہ ان عناصر ایمان میں سے کسی کا انکار ہرگز قابل برداشت نہیں ہے اور منفی بیان کے اندر بھی عناصر ایمان کی پوری تفصیل دے دی گئی۔

(وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا

(٤ : ١٣٦)) (جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روز آخرت سے کفر کیا وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا)۔ پہلی آیت میں ایمان باللہ اور ایمان بالکتب اور ایمان بالرسل کا ذکر کیا گیا اور ملائکہ کا ذکر نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی کتابوں میں ملائکہ اور ذکر آخرت دونوں آجاتے ہیں۔ اور کتابوں پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ فرشتوں اور یوم آخرت پر ایمان لایا جائے لیکن اس دوسری آیت میں ان کا ذکر کر دیا گیا' اس لئے کہ کفر کے بعد تہدید اور وعید آتی ہے اور عذاب سے ڈرایا جاتا ہے۔ جس کی تصریح اور وضاحت ضروری تھی تاکہ کل یہ کوئی نہ کہے کہ قیامت اور ملائکہ کا ذکر علی التخصیص نہ تھا۔ اس آیت میں "ضلال بعید" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ راہ گمراہی میں یہ لوگ اس قدر دور نکل گئے ہیں کہ اب ان کا راہ ہدایت پر آنا ممکن نہیں ہے اور نہ اس بارے میں ان سے امید کی جاسکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جو شخص اللہ کا منکر ہے' حالانکہ ذات باری پر ہر شخص ذاتی اور طبعی طور پر ایمان لاتا ہے بلکہ ہر شخص بفطرت اس پر ایمان لاتی ہے انکار خدا کے بعد وہ ملائکہ' کتب' یوم آخرت کا انکار کرتا ہے تو وہ درحقیقت ذات باری کے انکار ہی کو آگے بڑھاتا ہے۔ ایسے شخص کی اصل فطرت فساد' تعطل اور خرابی کا شکار ہو چکی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے کفر

کے لئے ضلال بعید کا لفظ استعمال کیا گیا۔

---ooo---

مسلمانوں کو صفت ایمان سے پکار کر دوبار آواز دینے کے بعد اب منافقین پر حملہ شروع ہو جاتا ہے اور یہ حملہ اس وقت ان کے جو حقیقی حالات تھے ان کے ذکر سے شروع ہوتا ہے ۔ان کا یہ موقف ایسا ہے جو آج کل کے منافقین کے ساتھ بالکل ملتا جلتا ہے ۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا ﴿۱۳۷﴾

(رہے وہ لوگ جو ایمان لائے ' پھر کفر کیا ' پھر ایمان لائے ' پھر کفر کیا ' پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے تو اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا اور نہ کبھی ان کو راہ راست دکھائے گا)۔وہ کفر جو ایمان سے پہلے ہو ' اس کے آثار کو ایمان بالکل مٹا دیتا ہے ۔جس شخص نے کبھی روشنی دیکھی ہی نہ ہو وہ اگر اندھیرے میں رہتا ہے تو وہ معذور ہے ۔لیکن ایمان کے بعد کفر کا رویہ اختیار کرنا اور بار بار ایسا کرنا کبیرہ گناہ ہے ' اس قدر بڑا گناہ کہ اللہ تعالیٰ ہرگز اس کی مغفرت نہ کرے گا اور نہ اس حرکت کا کوئی عذر ہو سکتا ہے ۔کفر تو ایک حجاب ہے ' جب پردہ ہٹ جائے تو فطرت اپنے خالق کے ساتھ مربوط ہو جاتی ہے اور گمراہ شخص پھر ہٹ ـــ ساتھ ن جاتا ہے ۔ پودا اپنی نرسری میں آجاتا ہے اور روح ایمان کی مٹھاس کو چکھ لیتی ہے اس لئے جو لوگ ایمان کے بعد بار بار مرتد ہوتے ہیں گویا وہ فطرت سے بھاگتے ہیں ' علم سے بھاگتے ہیں اور عمداً جہالت میں جاگرتے ہیں اور وہ عمداً راہ ضلالت اور گم شدگی پر چل نکلتے ہیں ۔اور پھر وہ اس راہ پر اس قدر دور نکل جاتے ہیں کہ آگے سے راہ ہی ختم ہو جاتی ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے حکم دیا کہ اب وہ انہیں معاف نہ کرے گا اور اب وہ انہیں دوبارہ لوٹا کر راہ ہدایت پر نہ لائے گا اس لئے کہ انہوں نے قصداً راہ حق کو چھوڑا ۔پہلے وہ اس راہ پر چل چکے تھے اور منزل پا چکے تھے ۔انہوں نے قصداً اندھے پن اور برائی کو اختیار کیا جبکہ پہلے وہ صاحب نظر تھے اور صراط مستقیم کے راہ رو تھے ۔

---ooo---

جب تک نفس انسانی اللہ کے لئے خالص نہ ہو جائے ' اس وقت تک وہ اوضاع و اقدار اور مصالح اور مفادات کے دباؤ سے آزاد نہیں ہو سکتا ۔نہ وہ حرص اور لالچ سے پاک ہو سکتا ہے اور نہ وہ مصلحتوں اور امیدوں سے پاک ہو سکتا ہے ۔اور یہ نفس کبھی بھی عزت نفس ' بلندی ' ہمت اور آزادی سے سرشار نہیں ہو سکتا جس طرح وہ نفس ہوتا ہے جو محبت الٰہی سے بھرا ہوا ہو ۔جب کوئی دل محبت الٰہی سے بھر جائے تو وہ دنیاوی اقدار ' دنیاوی طور طریقوں ' دنیا کے واقعات ' دنیا کے لوگوں ' دنیا میں پائے جانے والی تمام قوتوں ' حکومتوں اور ان کے اہالی و موالی کے مقابلے میں برتر ہوتا ہے ۔

یہاں سے پھر نفاق کا پودا پھوٹتا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ نفاق کی حقیقت کیا ہے ؟ نفاق صرف یہ ہے کہ انسان

سچائی پر بظاہر تو ثابت ہو جائے مگر اس کے لئے لڑنے اور باطل کے ساتھ مقابلہ کرنے میں ضعیف ہو۔ یہ ضعف اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں خوف اور لالچ پیدا ہو جاتا ہے اور یہ خوف اور لالچ دونوں اللہ سے نہیں ہوتے بلکہ غیر اللہ سے ہوتے ہیں۔ انسان پھر زمین کے حالات اور زمین کی شخصیات کا قیدی بن جاتا ہے اور اسلامی نظام سے دور ہو جاتا ہے۔

لہٰذا اس سبق میں ایمان کی بات بھی ہوئی ہے 'قیام شہادت اور عدل کی بات بھی ہوئی اور نفاق کی بات بھی ہوئی اور تینوں کے درمیان گہرا ربط ہے۔ عمومی مناسبت تو یہ ہے کہ یہی اس سورہ کے اصل موضوعات ہیں یعنی جماعت مسلمہ کی اسلامی نظام حیات میں تربیت اور اس کی اجتماعی زندگی سے جاہلیت کے آثار کو مٹانا' جماعت کے افراد کے نفوس کو بشری فطری کمزوریوں کے مقابلے میں تیار کرنا اور پھر اسے اردگرد پھیلے ہوئے مشرکین اور منافقین کے ساتھ ہونے والے معرکے کے اندر اتارنا۔ اس پوری سورہ کے اندر یہی مرکزی مضمون ہے جس کے اردگرد یہ سورہ گھومتی ہے 'اول سے آخر تک۔

یہی وجہ ہے کہ اس سبق کے باقی ماندہ حصے میں بات منافقین تک محدود ہے اور اس پر یہ پارہ بھی ختم ہوتا ہے جبکہ اس سے قبل منافقین کی ایک خاص جماعت کا تذکرہ ہوا کہ وہ بار بار اعلان اسلام کرتے ہیں اور پھر کفر کرتے ہیں۔ چنانچہ اب یہاں سے منافقین پر تنقید شروع ہوتی ہے جن کے بارے میں قرآن نے تفصیلات بیان کر دی ہیں اور مختلف انداز میں ان کی بیماری کا مطالعہ کیا ہے تاکہ اسلامی نظام کا مزاج اچھی طرح سامنے آجائے فطرت کے مطابق اس پر عمل ہو اور دلوں میں اور عمل میں اسلامی نظام واضح طور پر نظر آئے۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٣٨﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ
الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ
الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿١٣٩﴾ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ
اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ
حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ
فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ﴿١٤٠﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ
اللّٰهِ قَالُوْا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْا اَلَمْ

نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ اِنَّ
الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ
قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾
مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ
اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾

(جو منافق اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں' انہیں یہ مژدہ سنا دو کہ ان کے لئے دردناک سزا تیار ہے ۔ کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کی لئے ہے ۔ اللہ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں ۔ اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہی کی طرح ہو۔ یقین جانو کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے ۔

یہ منافق تمہارے معاملے میں انتظار کر رہے ہیں (کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے) اگر اللہ کی طرف سے فتح تمہاری ہوئی تو آکر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اگر کافروں کا پلہ بھاری رہا تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا؟ بس اللہ ہی تمہارے اور ان کے معاملے کا فیصلہ قیامت کے روز کرے گا اور (اس فیصلے میں) اللہ نے کافروں کے لئے مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی ۔

یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے ۔ جب یہ نماز کے لئے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں ۔ کفر و ایمان کے درمیان ڈانواڈول ہیں ۔ نہ پورے اس طرف ہیں نہ پورے اس طرف ۔ جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو اس کے لئے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے ۔)

منافقین پر یہ تنقیدی جملہ اس طنز کے ساتھ شروع ہوتا ہے یہاں ارتداد کے بجائے لفظ بشر سے ان پر تنقید شروع کر دی جاتی ہے ۔ انہیں اس عذاب کی خوشخبری دی جا رہی ہے جو ان کے انتظار میں ہے ۔ اس کے بعد سبب عذاب بھی بتا دیا جاتا

ہے' وہ یہ ہے کہ یہ لوگ اہل ایمان کے ساتھ دوستی کرنے کے بجائے کافروں کو دوست بنا رہے ہیں - دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کو اللہ سے بدظنی ہے - تیسرے یہ کہ ان کو معلوم نہیں ہے کہ عزت اور ذلت دینے والا کون ہے -

(بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۱۳۸) الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا(۱۳۹)

(٤: ۱۳۸ - ۱۳۹)) (جو منافق اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں' انہیں یہ مژدہ سنا دو کہ ان کے لئے دردناک سزا تیار ہے - کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کی لئے ہے) - یہاں جن کفار کا ذکر کیا گیا ہے' راجح روایات کے مطابق ان سے مراد یہودی ہیں' منافقین ان کے ہاں پناہ لیتے تھے اور ان کے ہاں راتوں کو چھپتے تھے - ان کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف مشورے کرتے تھے اور مسلمانوں کے خلاف قسم قسم کی سازشیں کرتے تھے -

اللہ تعالیٰ سوالیہ انداز میں پوچھتے ہیں کہ یہ لوگ دعوائے ایمان بھی کرتے ہیں اور اس کے باوجود کفار کے ساتھ دوستی کرتے ہیں' اپنے آپ کو یہ لوگ کس لئے ایسے موقف میں کھڑا کرتے ہیں - کیا یہ لوگ کفار سے عزت کے طلبگار ہیں؟ حالانکہ عزت تو اللہ کے ہاں ہوتی ہے اور عزت صرف اسے ملتی ہے جو اللہ کا دوست ہو اور جو اللہ کی درگاہ سے عزت کا طلبگار ہو اور اللہ کے ہاں وہ پناہ لینے والا ہو -

اس طرح ان آیات میں منافقین کی ایک جھلکی دکھائی جاتی ہے - یہ ان کی پہلی صفت ہے کہ وہ مومنین کے ساتھ دوستی نہیں رکھتے اور کافروں کے دوست ہوتے ہیں - وہ عزت اور قوت کافروں کے ہاں ڈھونڈتے ہیں حالانکہ عزت اور قوت کا سرچشمہ اللہ ہے - اس لئے ضروری ہے عزت کی تلاش اور قوت کی تلاش اللہ کے ہاں سے کی جائے اور اگر وہ یہ تلاش کسی دوسری جگہ کریں گے تو یہ تلاش عبث ہوگی' اس لئے کہ یہ جنس دوسری جگہ ہے ہی نہیں -

یہ بات نوٹ کرلیں کہ اس کائنات میں نفس انسانی کے لئے ایک ہی سہارا ہے' جہاں سے وہ عزت پا سکتا ہے - جب اس سہارے کے آگے یہ نفس جھکے گا تو دوسروں کے مقابلے میں سربلند ہو جائے گا - یہ ایک ہی بندگی اور ایک ہی سجدہ انسان کو تمام سجدوں سے بے نیاز کر دیتا ہے - اگر نفس انسانی نے اللہ کے سامنے جھکنا نہ شروع کیا تو اسے بہت سے خداؤں کی بندگی کرنا ہوگی' اسے کئی اشخاص کی بندگی کرنا ہوگی - وہ مختلف قسم کے لحاظ رکھے گا' مختلف جہتوں کا اسے خیال کرنا ہوگا اور وہ مختلف خطرات سے دوچار ہوگا اور یہ سب لحاظ و ملاحظے اور مختلف لوگوں کی بندگی اور غلامی بھی اسے بچا نہ سکے گی - اس لئے کہ یا یہاں تو اللہ کی بندگی ہوگی اور پھر انسان سربلند اور معزز ہو جائے گا اور یا پھر انسانوں کی بندگی ہوگی جو عبارت ہے' غلامی اور ذلت سے اور جس میں آزادی کے بجائے قید و بند ہے - اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ ان میں سے کس کو اختیار کرتا ہے' غلامی کو یا آزادی کو؟

کوئی شخص مومن ہوتے ہوئے یہ نہیں کر سکتا کہ وہ ماسوئی اللہ کے ہاں عزت کا طلبگار ہو - اگر ایسا کرے گا تو وہ مومن نہیں ہو سکتا - اسی طرح اگر مومن اللہ کے دشمنوں سے عزت' نصرت اور قوت طلب کرتا ہے' تو وہ مومن نہ ہوگا - آج جو

لوگ اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں اور مسلمانوں جیسے نام رکھتے ہیں اور وہ اس کائنات کے اندر دشمنان اسلام سے مدد لیتے ہیں تو سب لوگوں کی نسبت ان کو اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ وہ ذرا قرآن کی ان ہدایات پر تدبر کریں بشرطیکہ ان کے دلوں میں صحیح مسلمان ہونے کی خواہش ہو۔ اگر ان کو اس بارے میں کوئی رغبت ہی نہیں ہے تو اللہ تو عالمین سے غنی ہے۔

علاوہ دوسری باتوں کے یہ بھی کفار سے عزت طلب کرنے کے مترادف ہے کہ انسان اپنے ان آباء و اجداد پر فخر کرے جو کفر پر مر گئے تھے اور یہ لحاظ رکھے کہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان نسبت اور قرابت کا تعلق ہے۔ جس طرح بعض لوگ فرعونوں پر فخر کرتے ہیں 'بعض لوگ اشوریوں پر فخر کرتے ہیں 'بعض فنیقیوں پر فخر کرتے ہیں 'بعض بابلیوں پر فخر کرتے ہیں اور عرب اپنی جاہلیت عربیہ اور جمعیت جاہلیہ کا لحاظ رکھتے ہیں۔

امام احمد نے ابو ریحانہ سے روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں نبی ؐ نے فرمایا :" جو شخص (۹) نو کافر آباؤ اجداد کی طرف اپنی نسبت کرے گا اور اس سے اس کا مقصد یہ ہو کہ وہ ان پر فخر کرتا ہے تو یہ شخص دسواں شخص ہو گا جو ان کا جہنم میں ساتھی ہو گا۔"

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں اکٹھ صرف نظریہ حیات پر ہے۔ اسلام میں امت صرف اسلام و ایمان کی اساس پر ہے اور آغاز اسلام سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ آغاز اسلام سے آج تک ہر سرزمین' ہر جگہ اور ہر نسل میں اسلام کا یہی موقف رہا ہے۔ امت کا معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی دور میں کسی نسل کی ایک جگہ رہائش ہو اور وہ ایک امت بن جائے۔

مراتب نفاق میں سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ ایک مومن کسی ایسی مجلس میں بیٹھا رہے جس کے اندر اللہ کی آیات کا انکار کیا جا رہا ہو' ان کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہو اور یہ شخص خاموش بیٹھا ہو اور چشم پوشی کرے۔ پھر اس کو وہ رواداری کا نام دے یا اسے ہوشیاری' یا وسعت قلبی یا آزادی رائے کا نام دے حالانکہ یہ موقف دراصل داخلی شکست ہے جو اس کی رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔ یہ نام وہ اس لئے رکھ رہا ہے کہ لوگ اسے کمزور اور ضعیف الایمان ہونے کا طعنہ نہ دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ ان الفاظ میں اپنی کمزوری کو چھپاتے ہیں۔

اللہ کے لئے حمیت' اللہ کے دین کے لئے حمیت اور آیات الٰہی کے لئے 'حمیت' درحقیقت ایمان کی بڑی نشانی ہے۔ جب یہ حمیت ختم ہو جاتی ہے تو پھر بند ٹوٹ جاتا ہے اور تمام پردے ہٹ جاتے ہیں۔ تمام رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں اور جب زیادہ دباؤ پڑتا ہے تو وہ کچا دھاگہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ پہلے پہل اسلامی حمیت دب جاتی ہے جس طرح چنگاری کو راکھ میں دبا دیا جاتا ہے۔ پھر وہ ٹھنڈی ہو کر بجھ جاتی ہے۔

جو شخص بھی کسی مجلس میں اپنے دین کے ساتھ مذاق سنے اسے چاہیے کہ یا تو وہ دین کا دفاع کرے یا مجلس سے اٹھ کر چلا جائے لیکن اگر وہ چشم پوشی کرتا ہے اور خاموش رہتا ہے تو یہ اس کی پہلی شکست ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہوتی ہے کہ انسان نفاق کے پل پر بالکل بیچ میں' ایمان اور کفر کے درمیان کھڑا ہوتا ہے۔

مدینہ میں بعض مسلمان ایسے تھے جو بڑے بڑے منافقین کی محفلوں میں بیٹھتے تھے اور یہ منافقین بڑے بااثر تھے۔ حضور ؐ کی ہجرت کے بعد بھی ان کو معاشرے میں اثر و رسوخ حاصل تھا۔ اس لئے قرآن کریم نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ ایسی مجالس میں جانا اور پھر ان مجالس میں جو گفتگوئیں اسلام کے خلاف چلتی ہیں ان کو خاموشی سے سنتے چلے جانا' شکست کا پہلا مرحلہ ہے۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ مسلمان ان مجالس سے باز آ جائیں لیکن حالات ایسے نہ تھے کہ قرآن ایسی مجالس میں بیٹھنے

سے مطلقاً روک دیتا اس لئے یہاں صرف یہ حکم دیا گیا کہ جب اللہ کی آیات کا انکار کیا جا رہا ہو اور ان کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہو تو مسلمانوں کو ان کا بائیکاٹ کر دینا چاہئے۔ اگر اس صورت حال میں بھی ایک مسلم شریک ہوتا ہے تو وہ منافق ہے۔

(وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا (۴ : ۱۴۰))

(اللہ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں۔ اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہی کی طرح ہو۔ یقین جانو کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے)۔ یہاں الکتاب کا جو ریفرنس دیا گیا ہے۔ وہ سورہ انعام کی یہ آیت ہے۔ (وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ) یہاں جو سخت بات کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ (اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ) (اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہی کی طرح ہو) اور اس کے بعد جو سخت وعید آتی ہے وہ ایسی ہے کہ جو بات کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ (اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا (۴: ۱۴۰)) (یقین جانو کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے)۔

لیکن صرف ان مجالس سے منع کیا گیا ہے جن میں آیات الہی کا کفر کیا جا رہا ہو۔ ان کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہو اور اس وقت جماعت مسلمہ جن حالات سے گزر رہی تھی اللہ نے ان حالات میں مکمل بائیکاٹ کا حکم نہیں دیا۔ ایسے حالات دوسرے معاشروں اور آنے والی نسلوں میں بھی پیش آسکتے ہیں اور اسلامی نظام حیات کا طریقہ کار بھی یہی ہے کہ وہ اگر کوئی تحریک برپا کرتا ہے تو اسے نہایت ہی حکمت اور تدریج کے ساتھ لیتا ہے۔ وہ معاشرے کے اندر پائے جانے والے حالات ' واقعی صورت حال اور لوگوں کے افکار و خیالات کو مدنظر رکھتا ہے لیکن ہدف یہی ہوتا ہے کہ اس واقعی صورت حال کو تبدیل کر کے چھوڑا جائے گا اور اس سمت پر مسلسل آگے بڑھا جائے گا۔

اس کے بعد منافقین کے کچھ خدوخال بیان کئے جاتے ہیں۔ یہاں منافقین کی بہت ہی بھونڈی صورت حال کی سینری (Oilpainting) بنائی جاتی ہے کہ وہ جب مسلمانوں کے ہاں کھڑے ہوں تو ان کے چہرے کے خدوخال دوسرے ہوتے ہیں اور اس سینری میں جب وہ منافقین کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں تو ان کے چہرے کے خدوخال بالکل دوسرے ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی عجیب حالت بنا رکھی ہے۔ وہ کیڑے مکوڑوں اور سانپوں کی طرح پہلو بدلتے چلتے ہیں۔ نہ ادھر کے ہیں نہ ادھر کے۔

(اَلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ وَاِنْ

كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا

(٤: ١٤١))

(یہ منافق تمہارے معاملے میں انتظار کر رہے ہیں (کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے) اگر اللہ کی طرف سے فتح تمہاری ہوئی تو آکر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اگر کافروں کا پلہ بھاری رہا تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا؟ بس اللہ ہی تمہارے اور ان کے معاملے کا فیصلہ قیامت کے روز کرے گا اور (اس فیصلے میں) اللہ نے کافروں کے لئے مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی)

یہ عجیب تصویر اور سیزی ہے۔ اس میں دکھایا جاتا ہے کہ منافقین مسلمانوں کے خلاف کس قدر گہری چال چل رہے ہیں اور کس قدر برے ارادے ہیں ان کے۔ وہ ہروقت اس گھڑی کے انتظار میں ہیں کہ اہل اسلام پر کوئی مصیبت آئے۔ لیکن بظاہر وہ مسلمانوں کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو فتح نصیب ہو اور کوئی غنیمت ملے تو وہ اس وقت کہیں گے۔ (اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ (٤: ١٤١)) (کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے) اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ ہم جنگ کے موقعہ میں تمہارے ساتھ تھے۔ اس لئے کہ منافقین کبھی کبھار مسلمانوں کی صفوں میں جاکر اپنی ریشہ دوانیاں جاری رکھتے تھے یا اس سے مراد یہ ہے کہ ہم کہیں گے کہ ہم بھی تمہارے حامی اور ناصر تھے۔ اور اگر جنگ پر نہ گئے تو پشت پر تمہارے ہی مددگار تھے۔

(وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

(٤: ١٤١)) (اگر کافروں کا پلہ بھاری رہا تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا) ان کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ان سے تعاون کیا' امداد کی اور ان کی پشتیبانی کی اور مسلمانوں کے ساتھ سچ نہ کہا اور مسلمانوں کی صفوں کے اندر بے چینی اور افراتفری پیدا کی۔

اس طرح یہ لوگ کیڑوں اور سانپوں کی طرح پہلو بدلتے تھے اور ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف زہر بھرا ہوا تھا۔ ان کے منہ میں چکنی چپڑی باتیں تھیں لیکن یہ کمزور کردار کے لوگ تھے۔ ان کی اس سیزی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت ہی خستہ حال اور بدشکل ہیں اور ان کو اہل ایمان نظرانداز کر رہے ہیں۔ اہل ایمان کی روح کے لئے اسلامی نظام حیات کی یہ پہلی جھلکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور ہدایت کے زیر سایہ منافقین کے ساتھ حضور کا منصوبہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ چشم پوشی اور نرمی کا رویہ اختیار کیا جائے اور اہل اسلام کو ان کے مقابلے میں متنبہ اور خبردار کر دیا جائے۔ ان کو ان کے اصل عزائم سے آگاہ کر دیا جائے اور اس طرح ان کو زہر کا میٹھا پیالہ پلایا جائے اسی لئے ان کی سزا کے لئے یہ کہا جاتا ہے سزا دینے میں شتابی نہ کرو' ان کا فیصلہ اللہ آخرت میں کرے گا۔ (فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (٤: ١٤١)) (اللہ ان کا

فیصلہ قیامت کے روز کرے گا) جہاں کوئی سازش نہ چلے گی' جہاں کوئی عیاری اور مکاری کام نہ دے گی اور جہاں کوئی شخص کوئی بات دل میں نہ چھپا سکے گا۔

اس موقعہ پر اہل ایمان کے ساتھ بھی ایک قطعی وعدہ کر کے ان کو مطمئن کر دیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو مکاری اور عیاری کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اور اس کے ذریعے اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اور کافروں کے ساتھ ان کی سازش ان کو کوئی فائدہ نہ دے گی۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ اس نے کافروں اور منافقوں کے لئے یہ لکھا ہی نہیں ہے کہ وہ اہل ایمان پر غالب ہوں۔

(وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (٤ : ١٤١)) (اور اللہ نے کافروں کو مسلمانوں پر غالب آنے کی کوئی سبیل نہیں رکھی)۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ اس آیت میں کافروں کے غلبے سے مراد قیامت کے روز غلبہ ہے جہاں اللہ اہل ایمان اور منافقین و کافرین کے درمیان فیصلہ کرے گا اور مومنین کے بارے میں اچھا فیصلہ ہو گا۔ لیکن ایک دوسری روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ اس سے مراد کہ مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کافروں کو اس طرح کا غلبہ نہیں دے گا کہ کافر انہیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں اگرچہ بعض معرکوں اور بعض علاقوں میں ان کو غلبہ نصیب ہو سکتا ہے۔ اس آیت کو اگر دنیا اور آخرت دونوں کے لئے لیا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے' اس لئے کہ اس میں کوئی اخروی تحدید و تخصیص نہیں ہے۔

اگر اس سے اخروی کامیابی لی جائے تو پھر اس میں تو کوئی شک و شبہ ہی نہیں ہے۔ البتہ اگر دنیاوی غلبہ لیا جائے تو اس میں بعض اوقات اشکال پیش آسکتے ہیں اور غلط فہمی بھی لاحق ہو سکتی ہے جس کی تشریح کی ضرورت ہے۔

یہ اللہ کا ایک قطعی وعدہ ہے اور اللہ کا ایک جامع حکم ہے۔ جب اہل ایمان کے دلوں میں ایمان کی حقیقت بیٹھ جائے اور ان کی زندگی کی اصل صورت حال میں اس حقیقت کا ظہور ہو جائے' اور پھر یہ حقیقت ان کے لئے نظام زندگی بن جائے اور اس کے اوپر نظام حکومت قائم ہو جائے اور ان کی ہر حرکت اور ہر سوچ اللہ کے لئے ہو جائے اور وہ چھوٹے اور بڑے سب امور میں اللہ کے بندے بن جائیں تو پھر کافروں کو مسلمانوں پر غالب آنے کی کوئی صورت سنت الٰہی میں نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کے خلاف تاریخ اسلامی میں کوئی ایک واقعہ بھی بطور مثال پیش نہیں کیا جا سکتا۔

میں بڑے وثوق سے کہتا ہوں کہ اللہ کے اس وعدے کے بارے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ صحیح اہل ایمان کو کبھی شکست نہیں ہو سکتی۔ اور ان کو تاریخ میں کبھی بھی ایسی کسی شکست سے دوچار ہونا نہیں پڑا۔ اور جب کبھی بھی ایسا ہوا ہے تو صرف اس وقت جب ان کے ایمان میں کمزوری ہوئی ہے۔ یا تو شعوری طور پر ایمان کمزور ہوا ہے یا عقیدے میں کمزوری پائی گئی ہے یا پھر عمل میں کوئی نہ کوئی کمزوری رہی ہے۔ یاد رہے کہ ایمان کا یہ مطالبہ ہے کہ اہل ایمان ہر وقت جہاد کے لئے تیار رہیں اور یہ جہاد بھی خالصتاً فی سبیل اللہ ہو اور اس میں کوئی اور مقصد پیش نظر نہ ہو۔ اور اگر اس میں کوئی لوپ ہول ہو تو پھر اس کمزوری کے مطابق ہی شکست ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جونہی اہل ایمان' ایمان و عمل سے یہ کمزوری دور کر لیں' فتح و کامرانی پھر ان کے قدم چومتی ہے۔

دیکھئے احد میں کمزوری یہ تھی کہ تیراندازوں نے حضور ﷺ کی اطاعت کے بجائے آپ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کا

ارتکاب کیا اور اس کی وجہ صرف مال غنیمت کا لالچ تھا۔ اور جنگ حنین میں یہ کمزوری تھی کہ مسلمانوں کو اپنی کثرت پر ناز ہو گیا اور وہ اپنی قوت کے اصل سرچشمے کو پیش نظر نہ رکھ سکے۔ اگر ہم اپنی پوری تاریخ میں ہر اس واقعے کا تجزیہ کریں جس میں ہمیں شکست ہوئی تو معلوم ہو گا کہ وہاں اس قسم کی کوتاہیوں میں سے کوئی نہ کوئی کوتاہی تھی۔ اگر کہیں کوتاہی نظر نہ آئے تو یہ ہماری فہم کا قصور ہو گا۔ رہا اللہ کا یہ وعدہ تو وہ دنیا و آخرت دونوں میں برحق ہے۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ بعض اوقات ابتلاء محض حکمت خداوندی کی وجہ سے ہوتی ہے اس میں حکمت یہ ہوتی ہے کہ مسلمان اپنے ایمان اور ایمان کے تقاضے میں عائد ہونے والے لازمی اعمال میں اپنی کمزوریوں کا اچھی طرح احساس کر لیں۔ جیسا کہ احد میں پیش آیا اور اس پر اللہ نے طویل تبصرہ فرمایا۔ اور جب اس ابتلا کی وجہ سے حقیقت ایمان لازمی اعمال اور تیاریاں درست ہو گئیں تو اللہ کی مدد آپہنچی اور نصرت سامنے آگئی' بالکل کھلی نصرت۔

رہا یہ کہ ہزیمت سے مراد وہ ہزیمت ہے جو کسی ایک معرکے اور جھڑپ میں ہزیمت نہیں ہے۔ اس کے معنی بھی بہت ہی وسیع ہیں۔ اس سے مراد روحانی شکست ہے' عزم کا ٹوٹ جانا ہے۔ کسی معرکے میں شکست تب تسلیم ہو گی جب اس کے زیر اثر شکست خوردہ جماعت کی ہمت ٹوٹ جائے اور وہ تھک ہار کر بیٹھ جائے۔ لیکن اگر وہ اپنے اندر از سرنو ہمت تازہ پیدا کر لے' از سرنو مشعل روشن کر لے اور اپنی کمزوری کے مقامات تلاش کر لے اور اسے معلوم ہو جائے کہ اس معرکے کا مزاج کیا ہے' اس نظریہ حیات کا مزاج کیا ہے' اور اس راہ میں کیا کیا مشکلات ہیں تو فتح و نصرت کے لئے یہ شکست ایک تمہید ہو گی اگرچہ راہ طویل ہو جائے۔

جب اس آیت میں یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ نے اہل ایمان کے اوپر اہل کفر کے غلبے کی کوئی صورت ہی نہیں رکھی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مومن روحانی طور پر غالب ہوتا ہے اور فتح بھی ہوتی ہے جب روح اور ایمان غالب ہوں۔ فتح دراصل افکار مومنانہ کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دعوت دیتا ہے کہ اپنے شعور اور تصور کے اعتبار سے وہ کامل اور مکمل مومن ہوں۔ اپنی عملی زندگی میں وہ برتر اور کامل ہوں۔ ان کا عمل و کردار برتر ہو اور ان کا اعتبار صرف عنوان پر ہی نہ ہو۔ اس لئے کہ نصرت صرف نام اور عنوان کو نہیں ملتی بلکہ نام اور عنوان کے پیچھے جو حقیقت ہوتی ہے فتح اسے نصیب ہوتی ہے۔

ہماری فتح اور شکست کے لئے صرف ایک ہی شرط ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ ہم حقیقت ایمان کو مکمل کریں اور اس کے بعد اس حقیقت ایمانیہ کے تقاضے میں جو عملی زندگی میں تبدیلیاں لاتی ہیں وہ لائیں۔ حقیقت ایمان یہ ہے کہ ہم پوری طرح تیاری کریں اور سامان جنگ اور تجربہ جنگ سے لیس ہوں۔ ایمان کی حقیقت کی تکمیل میں یہ بات بھی ہے کہ ہم دشمنوں کے آگے ہرگز نہ جھکیں' اور عزت کے طلبگار صرف اللہ سے ہوں۔

اللہ کا یہ مؤکد وعدہ پوری طرح حقیقت ایمانیہ کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے اور اس طرح حقیقت کفر کے ساتھ بھی یہی وعدہ ہے۔ ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کا رابطہ اس عظیم قوت سے ہو جائے جو نہ کمزور پڑتی ہے اور نہ ضعیف ہوتی ہے۔ کفر کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی اس عظیم قوت سے اپنا رابطہ کاٹ دے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ محدود' ٹوٹی پھوٹی' یکہ و تنہا قوت ایک ایسی قوت پر غالب آجائے جو لامحدود ہو' جو اپنے سرچشمہ قوت سے مربوط ہو اور جو قوت اس پوری کائنات کی قوت ہو۔

لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا چاہئے کہ حقیقت ایمان اور محض مظہر ایمان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ حقیقت ایمانیہ تو وہ

قوت ہے جو ٹھوس ہے ' اور اس طرح مستحکم اور اٹل ہے جس طرح اس کائنات کے قوانین طبیعی ٹھوس اور اٹل ہیں۔ اور وہ حقیقت ایمانی حضرت انسان کی شخصیت پر مکمل کنٹرول رکھتی ہے اور اس کی ہر حرکت پر اثرانداز ہوتی ہے۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہوتی ہے اور وہ اس بات کی ضامن ہوتی ہے کہ جب اس کا سامنا کفر کی قوت کے ساتھ ہو جو یکہ و تنہا ہوتی ہے ' جو حقیقی منبع قوت سے کٹی ہوئی ہوتی ہے اور محدود ہوتی ہے تو یہ ایمانی حقیقت "حقیقت کفر پر غالب آ جاتی ہے۔ لیکن ایمان اگر حقیقت نہ ہو محض صورت ہو تو اس صورت پر کفر غالب آسکتا ہے جبکہ کفر اپنی حقیقت کے اندر فعال ہو اور کفر اپنے حقیقت کفر میں مخلص ہو محض صورت نہ ہو اس لئے کہ کسی بھی چیز کی حقیقت محض صورت کے مقابلے میں بھاری ہوتی ہے اگرچہ ایک طرف صورت ایمان اور دوسری طرف صورت کفر ہو۔

اللہ کے ہاں باطل کو مغلوب کرنے کا اصول یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں حق اور سچائی اٹھے اور جب سچائی اپنی حقیقت کے اعتبار سے موجود ہو تو پھر سچائی اور باطل کے درمیان کشمکش کا فیصلہ اسی وقت ہو جاتا ہے۔ اگرچہ باطل بظاہر بہت ہی بڑا اور عظیم نظر آئے اور آنکھوں کو چکا چوند کرنے والا ہو۔

(بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ) (بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینکتے ہیں اور وہ باطل کا سر پھوڑ دیتا ہے اور وہ اچانک زائل ہو جاتا ہے) صدق اللہ العظیم (اور اللہ نے کافروں کے لئے مومنین پر غلبے کی کوئی صورت نہیں رکھی ہے)۔

اس قطعی اور فیصلہ کن وعدے کے بعد کہ کافر مومنین پر غالب و برتر نہیں ہو سکتے اور منافقوں کو جو کافروں کے ساتھ دوستی کرتے ہیں اور جو کافروں کے ہاں عزت ڈھونڈتے ہیں 'اللہ تعالیٰ منافقین کی ایک دوسری تصویر پیش کرتا ہے اور اس تصویر کے ساتھ ان کی ہتک اور ان کی گوشمالی بھی ہے۔

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوْا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَاءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا (۱۴۲) مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ إِلٰى هٰؤُلَآءِ وَلَآ إِلٰى هٰؤُلَآءِ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيْلًا (۱۴۳) (۴: ۱۴۲ - ۱۴۳)) (یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ جب یہ نماز کے لئے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ کفر و ایمان کے درمیان ڈانواڈول ہیں۔ نہ پورے اس طرف ہیں نہ پورے اس طرف۔ جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو اس کے لئے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔) اسلامی نظام کی تجلیوں میں سے یہ ایک اور جھلکی مومن دلوں کو دکھائی جا رہی ہے تاکہ اہل ایمان ایسے لوگوں سے ذرا دور رہیں جو اللہ اور رسول اللہ کو بھی دھوکہ دیتے ہیں اور اہل ایمان جانتے ہیں کہ اللہ تو کسی کو دھوکہ نہیں دیتا 'اس لئے کہ اللہ تو دل کے رازوں کو بھی جانتا ہے اور جو شخص اللہ کو دھوکہ دینے کی جسارت کرتا ہے وہ بہرحال ایک احمق ' جاہل اور نہایت ہی بدفطرت شخص ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ایسے لوگوں کو نہایت ہی حقیر ' قابل نفرت اور گھٹیا قرار دیا جا رہا ہے۔

اس جھلکی اور سچ کے بعد یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ اللہ بھی ان لوگوں کو دھوکے میں ڈال رہا ہے' انہیں مہلت دے رہا ہے اور اس گمراہی کی حالت ہی میں انہیں چھوڑ رہا ہے۔ ان پر کوئی ایسی مصیبت نہیں لا رہا ہے جس سے وہ متنبہ ہو کر راہ راست پر آ جائیں اور نہ ایسی کھٹک سے انہیں دوچار کر رہا ہے جس سے متنبہ ہو کر ان لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں۔ اللہ انہیں کھلی چھٹی دے رہا ہے کہ وہ اس راستے پر چلتے رہیں جس میں گڑھے ہیں تاکہ یہ لوگ ان میں گر جائیں۔ یہ ہے وہ خدع جو اللہ کی طرف سے ان کے ساتھ ہو رہی ہے۔ حادثات اور مشقتیں بعض اوقات اللہ کی رحمت بن کر آتی ہیں۔ جب بعض بندوں پر مصیبتیں آتی ہیں تو وہ راہ خطا سے باز آ جاتے ہیں اور انہیں وہ راز معلوم ہو جاتے ہیں جن کا پہلے انہیں کوئی علم و شعور نہیں ہوتا۔ اور بعض اوقات امن و عافیت انسان کے لئے اللہ کی جانب سے مہلت ہوتی ہے اور گناہگار بری راہ پر مزید آگے بڑھ جاتے ہیں اس لئے کہ یہ لوگ گناہ اور گمراہی کی راہ میں اس قدر آگے جا چکے ہوتے ہیں کہ اللہ انہیں عافیت دے کر مزید آگے جانے دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ برے انجام تک جا پہنچتے ہیں۔

اب بات ذرا اور آگے بڑھتی ہے اور ان کی اس کریہہ المنظر تصویر میں کچھ اور دھبے دکھائی دیتے ہیں۔ (وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا (۴: ۱۴۲)) (جب یہ نماز کے لئے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھاوے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں) وہ نماز کے لئے اس لئے نہیں اٹھتے کہ انہیں اللہ سے ملاقات کرنے کا شوق ہوتا ہے' وہ اللہ کے سامنے دست بستہ کھڑے ہونا چاہتے ہیں' اللہ کے ساتھ جڑنا چاہتے ہیں اور اللہ سے مدد لینا چاہتے ہیں۔ یہ صرف لوگوں کو دکھانے کے لئے نماز پڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ نماز کی طرف نہایت ہی بوجھل قدموں سے اٹھتے ہیں' مثلاً جیسے کوئی شخص کسی بھاری کام کے لئے اٹھ رہا ہو' یا اسے کسی بھاری بیگار کے لئے بلایا جا رہا ہو اور ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اللہ کو بہت ہی کم یاد کرتے ہیں۔ وہ اللہ کو یاد نہیں کرتے بلکہ لوگوں کو یاد کرتے ہیں۔ وہ اللہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے بلکہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

بے شک مومنین کی نظر میں ان کی یہ نہایت ہی کریہہ المنظر صورت ہے۔ اس نے ان کی نظروں میں حقارت اور ناپسندیدگی کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں اور ان جذبات اور اس سوچ کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اہل ایمان اور اہل نفاق کے درمیان بعد پیدا ہو جاتا ہے۔ ذاتی اور مفاداتی تعلقات کمزور پڑتے ہیں اور اہل ایمان اور اہل نفاق کے درمیان مکمل بائیکاٹ کے مراحل میں سے یہ ایک مرحلہ ہے اور اسلامی مناہج تربیت امت مسلمہ کو اس کی طرف بڑھا رہا ہے۔

ذرا مزید خدوخال اور دھبے دیکھئے: (مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا (۴: ۱۴۳)) (کفر و ایمان کے درمیان ڈانواڈول ہیں۔ نہ پورے اس طرف نہ پورے اس طرف اور جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو اس کے لئے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے)۔

ان کا موقف مذبذب اور ڈانواڈول ہے۔ وہ کسی ایک قطار میں ثابت قدمی کے ساتھ کھڑے نہیں ہوتے۔ نہ مومنین کی صف میں ہیں اور نہ کافروں کی صف میں۔ یہ ایک ایسا موقف ہے جو اہل ایمان کے دلوں میں کوئی جذبہ ماسوائے حقارت اور کراہت کے پیدا ہی نہیں کرتا۔ اس سے اہل نفاق کی ذاتی کمزوری بھی سامنے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کوئی

دو ٹوک اور فیصلہ کن موقف اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی وہ علی الاعلان کسی عقیدے اور رائے کا اظہار کر سکتے ہیں - نہ ادھر کے اور نہ ادھر کے -

اب اس بدنما تصویر اور اس عاجزانہ موقف کا اختتامیہ یہ آتا ہے کہ ان لوگوں پر اللہ کا فیصلہ قطعی ہو چکا ہے اور اللہ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ راہ ہدایت کے حصول میں ان کے ساتھ کوئی معاونت نہ کرے - یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی انہیں راہ ہدایت پر نہیں لا سکتا اور نہ ان کے لئے کوئی راہ ہدایت تلاش کر سکتا ہے - (يُضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا (٤:١٤٣))

---o o o---

یہاں تک قرآن کریم نے اہل ایمان کے دلوں میں منافقین کے خلاف کراہت اور حقارت کے جذبات پیدا کر کے ان کو باور کرایا کہ وہ بہت ہی کمزور لوگ ہیں - یہ مقصد اچھی طرح حاصل کرنے کے بعد اب روئے سخن اہل ایمان کی طرف ہوتا ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ کہیں تم بھی اہل نفاق کی راہ پر نہ چل نکلو اور اہل نفاق کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کفار کے ساتھ دوستی کرتے تھے جبکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی دوستی نہ کرتے تھے - اللہ مومنین کو اپنی پکڑ سے ڈراتے ہیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ منافقین کے اخروی انجام کی ایک جھلک دکھا کر ان کو ڈراتے ہیں - یہ جھلک نہایت ہی خوفناک ہے اور نہایت ہی ذلت آمیز ہے -

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ - کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح

حجت دے دو؟یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مدد گار نہ پاؤ گے ۔ البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر دیں' ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے ۔ اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ بڑا قدر دان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے)۔ یہ دوبارہ اہل ایمان کو پکار اور دعوت ہے اور یہاں پھر اس صفت اور لقب سے پکارا گیا جو ان کو انہیں اس وقت کے ماحول سے ممیز کرتی ہے اور جس کی وجہ سے ان کا منہاج صاف ' ان کا طرز زندگی اور ان کا طرز عمل متمیز ہوتا ہے اور یہی وہ صفت ہے جس کی وجہ سے وہ اللہ کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور ہدایات الہیہ پر عمل کرتے ہیں ۔

اس صفت اور لقب سے ان کو اس لئے پکارا جاتا ہے کہ منافقین کی راہ اختیار نہ کریں ۔ اور وہ اس بات سے ڈریں کہ وہ اہل ایمان کو چھوڑ کر اہل کفر کو دوست بنائیں ۔ یہ پکار اس لئے دی گئی کہ اس وقت اسلامی معاشرے کو اس کی اشد ضرورت تھی کیونکہ ابھی تک اہل ایمان اور اہل کفر مثلاً مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان مدینہ میں سماجی تعلقات موجود تھے اور بعض مسلمانوں اور کفار اہل قریش کے درمیان بھی بدستور تعلقات موجود تھے اگرچہ یہ تعلقات محض دینی طور پر ہوں ۔ ہم نے بعض مسلمانوں کا اس لئے کہا ہے کہ بعض نے تو از خود اہل جاہلیت کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات توڑ لئے تھے یہاں تک کہ انہوں نے آباء اور ابناء کو بھی چھوڑ دیا تھا اور صرف اسلامی برادری تک اپنے آپ کو محدود کر لیا تھا جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو تعلیم دی تھی ۔

اور یہی وہ بعض لوگ تھے جن کو متنبہ کرنے کی ضرورت تھی کہ یہ تعلق رکھنا گویا نفاق کی راہ ہے اور یہ تنبیہ اس وقت کی گئی جب یہ کہہ دیا گیا کہ یہ ہے تصویر ان منافقین کی ۔ اور ان کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ اگر تم باز نہ آئے تو اللہ کے غضب اور انجام بد سے نہ بچ سکو گے ۔

(اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا (٤ : ١٤٤)) (کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو) اہل ایمان کا دل تو اللہ کی پکڑ کی دھمکی اور اس کے عذاب کے اشارے ہی سے کانپ اٹھتا ہے ' یہی وجہ ہے کہ یہاں بشکل استفہام ان کو متنبہ کیا گیا کہ اللہ کے عذاب سے ڈرو اور اپنے خلاف حجت قائم نہ کرو۔

ایک بار پھر جھنجوڑا جاتا ہے 'لیکن بالواسطہ یعنی منافقین کے انجام بد کو دوبارہ دہرا کر کہ قیامت کے دن حال یہ ہو گا اور کس قدر خوفناک ہو گا۔

(اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا (٤ : ١٤٥))
(یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے)۔

درک اسفل یعنی سب سے نچلا طبقہ ' یہ اس صورت حال سے زیادہ مناسب ہے کہ دنیا میں وہ زمین کی آلائشوں کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے ' اور سب سے نیچے تھے ' اس طرح وہ قیامت میں بھی سب سے نیچے ہوں گے ۔ دنیا میں بھی انہوں نے رفعت اور بلندی درجات حاصل نہ کی لہٰذا وہاں بھی ان کا یہی حال ہو گا۔ یہ لوگ طمع ' لالچ ' ضعف اور حیرانی کا شکار تھے اور

اسی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ رکھ رکھاؤ اور اہل کفر کے ساتھ دوستی کرتے تھے اور انہوں نے یہ توہین آمیز موقف اختیار کیا ہوا تھا کہ نہ ادھر کے تھے اور نہ ادھر کے۔

دنیا میں اس انجام بد کے لئے انہوں نے کام کیا۔ آج وہ سب سے نچلے درجے میں ہیں۔ اب یہاں ان کا کوئی یار و مددگار نہیں ہے۔ اہل کفر کے ساتھ دوستی وہ مدد اور نصرت کی خاطر ہی تو کرتے تھے لیکن اب یہ لوگ کہاں مدد کر سکتے ہیں۔

ہاں توبہ کا دروازہ اب بھی کھلا ہے اور ان کے لئے موقع ہے کہ وہ باز آ کر اخروی نجات حاصل کر لیں۔

(اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ اعْتَصَمُوْا بِاللّٰہِ وَ اَخْلَصُوْا دِیْنَھُمْ لِلّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَسَوْفَ یُؤْتِ اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا (۴:۱۴۶))

(البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر دیں' ایسے لوگ تو مومنین کے ساتھ ہوں گے اور اللہ عنقریب اہل ایمان کو اجر دے گا)۔

دوسری جگہوں پر صرف اس قدر کہا گیا تھا۔ (اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا (۴:۱۴۶)) اس لئے کہ توبہ اور اصلاح پذیری کے ضمن میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑا جائے اور دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے۔ لیکن یہاں توبہ' اصلاح اور اعتصام باللہ اور اخلاص دین کا بھی ذکر کیا گیا۔ اس لئے کہ یہاں بات ان لوگوں سے ہو رہی تھی جو مذبذب تھے' منافق تھے' اور اللہ کے سوا اور لوگوں کے دوست تھے۔ چنانچہ یہاں توبہ و اصلاح کے ساتھ خلوص دین اور اعتصام باللہ کا ذکر کیا گیا تاکہ یہ لوگ ڈانواڈول ایمان اور بودے کردار سے باز آ جائیں۔ اس طرح اعتصام باللہ سے انہیں قوت ملے گی اور اخلاص سے انہیں نیت کی صفائی ملے گی۔ وہ دنیا میں بداعمالی کی گراوٹوں اور آخرت میں آگ کے درجہ اسفل سے نجات پا لیں گے۔ دنیا میں یہ توبہ کرنے والے لوگ مسلمانوں اور صرف اللہ کی درگاہ سے عزت طلب کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو جائیں گے اور وہ دنیا اور زمین کی آلودگیوں سے ایمان کی قوت کے ذریعے پاک و صاف ہو کر بلند ہوں گے۔

اور ایسے لوگوں کی جزاء کیا ہے۔ (وَسَوْفَ یُؤْتِ اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا (۴:۱۴۶)) (اللہ عنقریب اہل ایمان کو اجر عظیم عطا کرے گا)۔ ان جھلکیوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ اسلامی معاشرے میں منافقین کی حقیقت کو واضح فرماتے ہیں۔ ان کی شان گرتی ہے۔ اہل ایمان کو نفاق کی لغزشوں سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ انجام بد سے ڈرایا جاتا ہے۔ منافقین کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا جاتا ہے تاکہ ان میں سے جس کے اندر شمہ برابر خیر بھی ہو وہ اسلامی صفوں میں شامل ہو جائے' نہایت سچائی اور نہایت اخلاص کے ساتھ۔

اور سب سے آخر میں ایک عجیب جھلکی دکھائی جاتی ہے' جس کا اثر نہایت ہی گہرا ہے۔ خوفناک عذاب کے ذکر کے بعد اور عظیم اجر کے اعلان کے بعد' تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ بندوں کے عذاب سے غنی ہے۔ اللہ کو ان کے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ انہیں عذاب دے۔ اور نہ اس تعذیب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنی قوت کا اظہار چاہتا ہے۔ نہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے اندر ایسی کوئی خواہش ہے کہ وہ لوگوں کو تکلیف دے جیسا کہ بت پرستانہ

تصورات میں ایسی باتیں پائی جاتی ہیں 'بلکہ اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ ایمان اور شکر خداوندی کے ذریعے لوگوں کی اصلاح ہو۔ ایمان اور شکر ان کو محبوب ہو اور اللہ وہ ذات ہے جو نیک اعمال کا بدلہ دیتا ہے اور تمام خفیہ باتوں سے واقف ہے۔

(مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا

(٤ : ١٤٧)) (آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے 'اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ بڑا قدر دان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے)۔ اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو تو اللہ کو کیا پڑی ہے کہ وہ تمہیں عذاب دے۔ اللہ تو کفر اور نافرمانی پر سزا دیتا ہے۔ یہ ایسی تہدید ہے جو لوگوں کو ایمان اور شکر پر آمادہ کر سکتی ہے۔ اللہ کو نہ انتقام کا کوئی داعیہ ہے اور نہ تعذیب میں کوئی مزہ آتا ہے۔ نہ اللہ اس طریق کار کے مطابق اپنی قوت اور سلطنت کا اظہار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان باتوں سے بہت ہی بلند ہے 'اگر تم ایمان لاؤ اور شکر کرو تو یہ اللہ کے ہاں موجب مغفرت اور رضامندی ہے۔ اللہ کی جانب سے بندوں کا شکریہ۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو دل پر گہرا اثر کرتی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ اللہ کی جانب سے شکر کے معنی یہ ہیں کہ اللہ راضی ہے۔ اور رضامندی کا لازمی نتیجہ ثواب دارین ہے۔ لیکن یہ تعبیر کہ اللہ شکر کرتا ہے نہایت ہی گہری اور اشاراتی تعبیر ہے۔

اگر وہ ذات جو خالق ہے 'برتر ہے' دونوں جہانوں سے بے نیاز ہے 'بندوں کا شکر ادا کرتا ہے اس بات پر کہ یہ بندے نیک ہو گئے ہیں 'اچھے مومن ہیں 'شکر بجا لاتے والے ہیں اور اللہ کے احسانات کو ماننے والے ہیں۔ حالانکہ وہ غنی بادشاہ ہے اور اس کو بندوں کے شکر 'احسان مندی اور صلاح کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر اس جہان کا پیدا کرنے والا 'وجود میں لانے والا' برتر اور غنی بادشاہ اگر شکر بجا لاتا ہے تو پھر بندوں کا کیا فرض بنتا ہے جو مخلوق بھی ہیں اور ان پر رات دن انعامات کی بارش ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے بندوں کو اپنے خالق کا وفادار ہونا چاہئے.... بے شک یہ ایک نہایت ہی شرمسار کنندہ جھلکی ہے اور بندہ مومن ایک گہرا تاثر لے کر شکر نعمت کے لئے اٹھتا ہے۔ یہ ایک روشن اشارہ ہے جو نشانات منزل متعین کرتا ہے۔ وہ منزل جو اللہ تک جاتی ہے 'جو بخشندہ' منعم 'شاکر اور علیم ہے۔

یہ ہے قرآن کریم کے تیس پاروں میں سے ایک پارہ۔ اور یہ اپنے دونوں بازوؤں کے نیچے اصلاح 'نظر ثانی' درستی اور پاکیزگی پر مشتمل ہدایات کا ایک عظیم ذخیرہ لئے ہوئے ہے۔ اس میں عالم نفس کی اصلاح' اسلامی معاشرے کی اصلاح' نظام حیات کی اصلاح اور دوسری تعمیری ہدایات ہیں جو اس کے طول و عرض میں پیوستہ ہیں۔ ان ہدایات کے اندر انسان کو بالکل ایک نیا جنم دیا گیا ہے اور ایک ایسا انسان وجود میں لایا گیا ہے کہ جس کی مثال انسانیت نے نہ پہلے کبھی دیکھی تھی اور نہ بعد میں دیکھی۔ حقیقت پسند مثالی انسان 'نظافت اور تطہیر میں مثالی۔ ایک ایسا انسان جو زندگی کے مختلف میدانوں میں کام کرتا ہے اور یہ ایک ایسا انسان ہے جسے اسلامی نظام زندگی نے جاہلیت کے گہرے گڑھوں سے نکال کر نہایت ہی عمودی بلندی پر سربلند کیا اور اعلیٰ ترین بلندیوں پر پہنچا دیا۔ نہایت ہی آسانی کے ساتھ 'نہایت ہی نرمی کے ساتھ اور نہایت ہی ہمدردی کے ساتھ۔

اسلام آباد' ۱۷ دسمبر ۱۹۸۹ء رات ۵۵ : ۱۰

---ooo---

فی ظلال القرآن

پارہ ـــ ۶

سورۃ النساء ـــــ آخری حصہ

آیت نمبر ۱۴۸ ـــ تا ـــ ۱۷۶

سورۃ المائدہ ـــــ ابتدائی حصہ

آیت نمبر ۱ ـــ تا ـــ ۸۲

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پارہ نمبر ۶ ایک نظر میں

پارۂ ششم دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ سورۂ النساء کے بقیہ حصہ پر مشتمل ہے۔ سورۂ النساء کا آغاز پارۂ چہارم کے آخر سے ہوا تھا۔ پورا پارۂ پنجم بھی اس پر مشتمل ہے اور پارۂ ششم میں بھی اس کا کچھ حصہ آگیا ہے۔ اس پارے کا دوسرا حصہ، جو اس کا تقریباً تین چوتھائی حصہ ہے سورۂ مائدہ پر مشتمل ہے۔

یہاں ہم اپنی بات کو صرف اس پارے کے حصہ اول ہی تک محدود رکھیں گے۔ حصہ دوئم یعنی سورۂ مائدہ پر بحث سورۂ مائدہ کے موقع پر ہوگی۔ جہاں ہم سورۂ مائدہ کی اہمیت اور اس کے موضوعات پر اسی طرح بحث کریں گے جس طرح ہم اس سے پہلے کی سورتوں پر کر چکے ہیں۔ اگر اللہ کا تعاون شامل حال رہا۔

سورۂ نساء پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے اس سورہ کے جس منہاج بحث کے سلسلے میں کچھ کہا تھا اس حصے میں بھی وہی منہاج چل رہا ہے۔ یہاں مناسب ہے کہ نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے دوبارہ قارئین کے پیش نظر رکھ دیا جائے۔

یہ سورہ اسلامی تصور حیات سے بحث کرتی ہے اور اسے اس نوخیز اسلامی جماعت کے ذہن نشین کرنے کے درپے ہے جسے اس نے جاہلیت کی گہری اور تنگ وادیوں سے اٹھایا اور اسے بتدریج بام عروج تک پہنچا دیا۔ انتہائی بلندیوں تک اور اس جماعت کے ضمیر کو جاہلیت کے افکار کے ڈھیروں کے نیچے سے نکالا اور اسکے ان افکار کو چھانٹ کر رکھ دیا جن کی وجہ سے اس کے ضمیر کے خدوخال دھندلے پڑ گئے تھے۔ اس صفائی کے ساتھ ساتھ جس طرح ہم نے اوپر کہا اسلامی فکر و شعور سے جاہلیت کے خدوخال مٹا کر ان کی جگہ اسلامی رنگ بھرے گئے۔

اس کے بعد اس جدید تصور حیات کی روشنی میں' یہ سورہ امت مسلمہ کے ضمیر' اس کے اخلاق اور اس کی اجتماعی عادات کو لیتی ہے اور ان کو جاہلی اخلاق و عادات سے ایک ایک کر کے چھانتی چلی جاتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح افکار و تصورات کے اعتبار سے اس کی تطہیر کی گئی۔ نیز فکری اور اخلاقی تطہیر کے علاوہ اس سورہ نے امت کی اجتماعی زندگی اور اس کے عائلی روابط کو اسلام کے مضبوط ربانی نظام زندگی کی اساس پر استوار کیا۔

اس تربیت اور تطہیر کے دوران' اس سورہ میں منحرف اور غلط عقائد کو بھی لیا گیا ہے۔ غلط عقائد و تصورات کے حاملین پر بھی تنقید کی گئی ہے اور اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔ چاہے یہ لوگ مشرکین میں سے ہوں یا یہود و نصاریٰ یعنی اہل کتاب ہوں۔ ان کے عقائد کی تصحیح اور اصلاح کی گئی ہے۔ حق اور سچائی کو نکھارا گیا ہے جسے ان انحرافات نے بگاڑ دیا

تھا۔ جو ان لوگوں نے اپنی کتب میں اور عقائد میں داخل کئے ہوئے تھے۔

اس کے بعد مضامین سورہ اس معرکے میں داخل ہو جاتے ہیں جو اہل کتاب اور جماعت مسلمہ کے درمیان مسلسل برپا تھا' خصوصاً یہودیوں کے ساتھ۔ اس لئے کہ جب سے حضور اکرم ؐ اپنی جماعت کو لیکر مدینہ پہنچے تھے' ان لوگوں نے دعوت اسلامی کا بڑی شدت کے ساتھ مقابلہ شروع کر دیا تھا' اس لئے کہ تحریک اسلامی کا مرکز مدینہ منتقل ہوتے ہی یہودیوں کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ اب مدینہ کے معاشرے میں ان کی سابقہ ممتاز حیثیت قائم نہیں رہ سکتی ان کے ملی وجود کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا حتیٰ کہ ان کا یہ ادعا بھی ختم ہو رہا تھا کہ وہ واحد ممتاز لوگ ہیں جنہیں اللہ کی قربت حاصل ہے اور وہ ایسی قوم ہیں جو اللہ کے ہاں برگزیدہ ہے۔ ان وجوہات کی بناء پر وہ تحریک اسلامی کے مقابلے میں ہر قسم کے ہتھیار لیکر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس سورہ نے ان کی ذہنیت' ان کے وسائل حرب اور خود ان کے اپنے انبیاء کے ساتھ ان کا تاریخی رویہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا تاکہ معلوم ہو کہ انہوں نے ہمیشہ ہر دعوت حق کے ساتھ یہی برتاؤ کیا چاہے اس کا پیش کرنے والا کوئی بھی ہو اگرچہ وہ پیش کرنے والا خود ان کا اپنا نبی' ان کا اپنا قائد اور ان کا اپنا نجات دہندہ ہو۔

اس کے بعد یہ سورہ خود امت مسلمہ کو بتاتی ہے کہ اس کے کاندھوں پر جو بوجھ ڈال دیا گیا ہے' اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اس نے اس کرۂ ارض پر جو کردار ادا کرنا ہے وہ کس قدر عظیم کردار ہے اور وہ حکمت عملی کیا ہے جس کے مطابق اسے جاہلیت کی تمام الائشوں سے پاک کرنا مقصود ہے' اس کے ضمیر کو پاک کرنا مطلوب ہے' اس کی پوری زندگی کو پاک کرنا مطلوب ہے۔ اس غرض کیلئے کس قدر بیدار مغزی کی ضرورت ہے اور کس قدر عظیم قربانیوں کی ضرورت ہے۔ مثلاً اپنے نفس کی دنیا کے ساتھ مسلسل جہاد' اور اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے پورے ماحول کے ساتھ مسلسل جہاد اور مسلسل قربانیاں۔

یہ پوری سورہ مسلسل اپنی اس راہ پر گامزن ہے۔ گزشتہ حصے میں بھی یہی مضامین ہیں اور یہ حصہ بھی اسی راستے کے نشیب و فراز پر مشتمل ہے اور وہی اسلوب ہے جو سابقہ پارے میں تھا۔

---OOO---

اس پارے کا آغاز ہی تطہیر نفس اور تطہیر معاشرہ سے ہوتا ہے' یہ کوشش کی گئی ہے کہ افراد جماعت کے درمیان باہم مکمل اعتماد کی فضا قائم رہے۔ لوگ یہودیوں کے الزامات سے متاثر نہ ہوں اور مسلمان یہ حق رکھتے ہیں کہ وہ بدلہ لیں لیکن عفوو درگزر اور فراخدلی بہرحال انصاف کے ترازو سے بھی زیادہ اونچا مقام ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ غیبت اور بدگوئی کو ناپسند فرماتے ہیں۔ اگر اس نئے معاشرے میں ایک بھائی دوسرے بھائی پر ظلم کرتا ہے اور مظلوم بھائی معاف کر دیتا ہے تو یہ فعل اللہ تعالیٰ کو بہت ہی پسندیدہ ہے۔ اللہ خود بھی معاف کر دیتا ہے حالانکہ وہ انتقام پر قادر ہوتا ہے۔

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اسلامی تصور حیات یہ ہے کہ وہ اللہ کے دین کو ایک نظام زندگی قرار دیتا ہے اور یہ تصور دیتا ہے کہ انسانی تاریخ میں رسولوں کا قافلہ صرف اس ایک دین کا حامل رہا ہے۔ اسلامی عقائد کے مطابق ان رسولوں کے درمیان فرق کرنا اور وہ جو ادیان لیکر آئے ان کے درمیان فرق کرنا صریح کفر ہے۔ یہ بیان اس لئے آتا ہے کہ اہل

کتاب میں سے یہودیوں کے اس نظریے کی تردید کی جائے کہ ان کے نبی کے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے اور یہ نظریہ انہوں نے محض دینی اور قومی تعصب اور کینہ پروری کی وجہ سے اپنایا ہے۔

اس حصے میں یہودیوں کے ساتھ ایک راؤنڈ شروع ہو جاتا ہے' جس میں بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے نبی اور اپنے قائد اور نجات دہندہ حضرت موسیٰ ؑ کے ساتھ کیا کیا نافرمانیاں اور بدسلوکیاں کیں۔ ان واقعات سے یہ عیاں کرنا مطلوب ہے کہ یہودی اپنی فطرت کے اعتبار سے برے لوگ ہیں۔ سچائی اور اسلامی دعوت کے ساتھ ان کا ہمیشہ یہی رویہ رہا ہے۔ چاہے کوئی نبی ہی یہ دعوت دے رہا ہو۔ اگرچہ وہ ان کے عظیم نبی حضرت موسیٰ ؑ ہی کیوں نہ ہوں۔ نیز حضرت عیسیٰ ؑ' ان کی والدہ کے بارے میں ان کے نازیبا الفاظ کی تردید بھی کی گئی ہے جسے اللہ تعالیٰ بہت ہی ناپسند فرماتے ہیں۔ ان واقعات کے بیان سے نبی آخرالزمان ؐ کے ساتھ ان کا رویہ اور عناد قابل فہم ہو جاتے ہیں اور لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس رویئے کے حقیقی اسباب کیا ہیں۔ حضرت مسیح ؑ کے بارے میں یہودیوں کے غلط دعوؤں اور غلط الزامات کی مناسبت سے اور خصوصاً اس دعوے کے حوالے سے کہ انہوں نے حضرت مسیح ؑ کو قتل کر دیا ہے' قرآن کریم اظہار حقیقت کر دیتا ہے۔ ان کے دعوائے قتل مسیح ؑ کی صاف صاف تردید کر دی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو ان کے مظالم کرنے' ارادۂ حق میں رکاوٹ بن جانے اور ان کی سود خوری کی وجہ سے (حالانکہ انہیں ان حرکات سے روکا گیا تھا) کیا کیا سزائیں دیں۔ نیز ان کی حرام خوری اور لوگوں کے معاشی استحصال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر بطور سزا ان بعض چیزوں کو حرام قرار دے دیا جو ساری دنیا کے لئے حلال تھیں اور یہ کہ اس دنیاوی عذاب کے علاوہ انہیں وہ عذاب الیم بھی دیا جائے گا جو آخرت میں ان کا انتظار کر رہا ہے۔ ہاں البتہ اس عذاب سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو علم میں پختہ کار ہیں اور جو حضور اکرم ؐ پر ایمان لائے ہیں۔ جنہوں نے سچائی کو پہچان لیا ہے اور اس کی پیروی کرنے لگے ہیں۔

یہودی' نبی آخرالزمان ؐ کی رسالت کے انکار پر جو اصرار کر رہے تھے' انکے اس موقف کی تردید کرتے ہوئے کہا گیا کہ یہ رسالت تو معمول کی بات ہے۔ یہ کوئی عجیب و غریب امر تو نہیں ہے کہ خود ان میں سے ایک رسول مبعوث ہو گیا ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے کہ لوگوں کی ہدایت کیلئے ایک انسان رسول بن کر آ گیا ہے۔ یہ تو سنت الٰہی ہے۔ حضرت نوح ؑ سے لیکر آج تک رسول آتے رہے۔ حضرت ابراہیم ؑ' حضرت اسماعیل ؑ' حضرت اسحاق ؑ' حضرت یعقوب ؑ' حضرت عیسیٰ ؑ' حضرت ایوب ؑ' حضرت ہارون ؑ' حضرت سلیمان ؑ' اور حضرت داؤد ؑ اسی سنت الٰہی کے مطابق بھیجے گئے۔ نیز وہ تمام دوسرے انبیاء جن کی رسالت کے یہود قائل ہیں اور وہ جن کی رسالت کا وہ محض بغض اور حسد کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت اور اسکیم ہے کہ یہاں لوگوں کی ہدایت کیلئے رسول آئیں جو ڈرانے والے اور خوشخبری دینے والے ہوں۔ (لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (۴: ۱۶۵) "تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے خلاف کوئی حجت نہ ہو۔" نہ صرف یہ کہ یہ منطقی امر ہے بلکہ ضروری بھی ہے۔

یہودیوں کے انکار حق کے مقابلے میں' اللہ تعالیٰ اسلام کی سچائی پر خود شہادت دیتے ہیں' ملائکہ کی شہادت قلم بند

ہوتی ہے اور اللہ کسی بھی امر پر کافی گواہ ہے۔چنانچہ انکار حق کی وجہ سے اور راہ حق کو مسدود کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان ظالموں اور کافروں کو سخت دھمکی دیتے ہیں۔یہ کہ اللہ کبھی ان کی مغفرت نہ کرے گا کبھی ان کی راہنمائی صراط مستقیم کی طرف نہ کرے گا اور اگر ان کی راہنمائی کرے گا تو وہ جہنم کی طرف ہوگی جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔اس کے بعد تمام لوگوں کو پکارا جاتا ہے کہ لوگو! یہ رسول تمہارے پاس رب کی طرف سے سچائی لیکر آیا ہے۔تم اس پر ایمان لاؤ' اگر تم ایسا نہ کرسکو تو جو کچھ زمین اور آسمانوں کے درمیان ہے وہ سب کچھ اللہ کا ہے۔مالک ارض و سما نے اس پیغمبر کی رسالت کی شہادت دے دی ہے۔اور وہ خود تمہیں دعوت ایمان دے رہا ہے اس لئے وہ خود اپنے لئے جو راہ متعین کر رہے ہیں وہ مالک ارض و سما کے مقابلے کی راہ ہے۔

اہل کتاب کے ساتھ یہ راؤنڈ ختم ہو جاتا ہے۔اس میں ان کا مزاج' ان کے وسائل کار' اور قدیم زمانے سے ان کی بری عادتوں کا پردہ چاک کر دیا جاتا ہے۔اس پردہ دری سے ان کے تمام مکاریاں قبل ہو جاتی ہیں اور یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی رسالت برحق ہے اس لئے کہ اس پر اللہ کی جانب سے شہادت دی جاچکی ہے۔تمام سلسلہ رسل اور سلسلہ اصحاب دعوت بھی اس پر گواہ ہیں۔یوں لوگوں پر اللہ کی جانب سے حجت قائم ہوتی ہے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ لوگوں کی نجات کا دارومدار رسولوں کی رسالت پر پختہ ایمان پر ہے۔اگر وہ عذاب جہنم سے نجات چاہتے ہیں یا یہ کہ وہ بتقاضائے منطق اپنے آپ کو اس کا مستحق قرار دیتے ہیں۔یہ ان کی مرضی ہے لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ یہ نہایت ہی خطرناک انجام ہے۔

---○○○---

یہودیوں کے ساتھ اس راؤنڈ کے اختتام' ان کے مقابلے میں حضرت عیسیٰ اور ان کی والدۂ ماجدہ کو انصاف دینے اور حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کے بارے میں ان کے غلط دعوؤں کی تردید کرنے کے بعد' اب خود عیسائیوں کے ساتھ ایک راؤنڈ شروع ہوتا ہے' جو اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیروکار کہتے ہیں۔ان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ تم لوگ حضرت عیسیٰ کے بارے میں غلو نہ کرو۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اصل سچائی یوں ریکارڈ کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور وہ خود بھی اس بات کے اقرار سے نہیں ہچکچاتے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں۔اسی طرح ملائکہ بھی اللہ کے بندے ہیں لہٰذا تم روح القدس کو خدا نہ سمجھو' تثلیث کا عقیدہ غلط ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اللہ کے درمیان باپ بیٹے کا تعلق نہایت ہی غلط تصور ہے۔

تصحیح عقائد نصرانیت کے درمیان اسلام کا صحیح عقیدہ بھی بتا دیا جاتا ہے۔اور اس بات کو چھانٹ کر رکھ دیا جاتا ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کے لئے ہے اور غلامی بندوں کے لئے اور اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے جو کوئی بھی ہے وہ اللہ کا بندہ اور غلام ہے اور یہ اسلامی تصور حیات کا اساسی عقیدہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان کو یہاں فلاح کی خوشخبری دی جاتی ہے اور اہل کفر کو سخت الفاظ میں ڈرایا جاتا ہے اور یہاں بھی' یہودیوں کی بحث کے خاتمے کی طرح' تمام لوگوں کے نام اعلان جاری کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ لوگوں کے پاس اللہ کی جانب سے برہان آچکا ہے' اس لئے اب جو لوگ اس کی قبولیت سے رہ گئے ان کے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی' کوئی شبہات وہ پیش نہ کرسکیں گے اور نہ ان کی کوئی معذرت قبول ہوگی۔

---○○○---

پارہ نمبر ۶

سورہ کا خاتمہ احکام میراث میں سے کلالہ کی ایک صورت کے بیان پر ہے جو پہلے احکام میں بیان نہ ہوئی تھی ۔ اس سورہ میں کلالہ کی بعض صورتوں کا ذکر ہو چکا ہے یہ انہی کا بقیہ ہے ۔ اس لئے اس کو یہاں دے دیا کیونکہ یہ جماعت مسلمہ کی اقتصادی تنظیم نو کا بقیہ حصہ تھا جس پر اسلام اس جدید اسلامی سوسائٹی کو استوار کرنا چاہتا تھا ۔ اسے ایک ایسی سوسائٹی میں تبدیل کرنا چاہتا تھا جس کا اپنا نظام اقتصادیات ہو' اپنے امتیازی خصائص ہوں جو مستقل ہوں تاکہ یہ جدید سوسائٹی اور یہ نئی جماعت پوری انسانیت کے حوالے سے اپنا وہ عظیم کردار ادا کر سکے جس کے لئے اللہ نے اسے برپا کیا ہے ۔ یعنی قیادت' انقلاب اور تنظیم و اصلاح کا کردار ۔

یوں اس پوری سورہ کے مطالعے اور جائزے سے اور خصوصاً زیر بحث حصے کے جائزے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں اجتماعی تنظیم' اقتصادی اصلاحات اور سیاسی ضابطہ بندی کے ساتھ ساتھ اخلاق' تہذیب' تصور حیات کی اصلاح اور عقائد کی تصحیح بھی ہوتی رہتی ہے ۔ اس اخلاقی اور نظریاتی تربیت کے ساتھ ساتھ جماعت مسلمہ کے دشمنوں کے ساتھ میدان جنگ میں بھی معرکہ آرائی جاری رہتی ہے ۔ اس کے باوجود کہ اس جماعت کے کاندھوں پر ذمہ داری کا عظیم بوجھ ڈالا گیا ہے اور اس کرۂ ارض پر اس کیلئے عظیم کردار ادا کرنے کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے ۔ یہ بھی فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ قرآن کریم اس جماعت کا دستور العمل ہے ۔ یہ اس کی دعوت کا ماخذ ہے ۔ اس جماعت کا فرض ہے کہ وہ ان تمام ذمہ داریوں کو ایک ساتھ ادا کرتے ہوئے آگے چلے' نہایت گہری' متوازن اور عمومی صورت میں ۔ یہ ہدایات اور یہ امور ایسی صورت میں بیان کئے جاتے ہیں کہ جو شخص یا جماعت بھی اس امت کی تعمیر جدید کا بیڑا اٹھائے اس کیلئے یہ منہاج لازمی اور حتمی ہو تاکہ وہ اپنے فرائض کو پورا کرے ۔ اس قرآن کو اپنی دعوت کا منہاج بنائے ۔ اس کی تحریک کا منہاج اس قرآن سے اخذ ہو ۔ احیائے اسلام' بعث جدید اور تعمیر جدید کا ہر قدم اس منہاج کے مطابق ہو ۔ اگر ان خطوط پر سوچا جائے تو یہ قرآن بعینہٖ وہ کردار ادا کرنے کیلئے اب بھی تیار کھڑا ہے جو اس نے پہلے ادا کیا تھا ۔ یہ قرآن پوری انسانیت کیلئے اللہ کا خطاب ہے' اور وہ اس کے تمام طور و اطوار کے لئے قیامت تک راہنما ہے ۔ اس کے عجائبات تو کبھی ختم نہ ہوں گے اور اس کے بار بار پڑھے جانے سے وہ پرانا نہیں ہوتا' جیسا کہ اس کے بارے میں حضور ؐ فرماتے ہیں ۔ وہ حضور ؐ جنہوں نے اس قرآن کے ذریعہ کفار اور منافقین کے خلاف جہاد کیا ۔ اس کے ساتھ منحرف اور بھٹکے ہوئے اہل کتاب کے ساتھ جہاد کیا اور اس کے ذریعے انسانیت کی تاریخ میں امت مسلمہ جیسی عظیم امت کی بنیاد رکھی' اسے اٹھایا اور سربلند کیا ۔

---ooo---

درس نمبر ۳۴ تشریح آیات

۱۴۸ ۔۔ تا ۔۔ ۱۷۰

قرآن کریم کے پیش نظر یہ نصب العین تھا کہ وہ اس کرۂ ارض پر ایک بالکل جدید امت پیدا کرے ۔ چنانچہ اس امت کو قرآن نے ان لوگوں سے تشکیل دیا جو جاہلیت کی اندھیری وادیوں میں بھٹک رہے تھے ان میں سے جو قرآن کی دعوت پر لبیک کہہ چکے ' ان مومنین کو قرآن کریم نے ہاتھ سے پکڑ کر آناً فاناً عمودی بلندی پر چڑھا کر تہذیب و تمدن کی چوٹیوں ' بلند ترین چوٹیوں تک پہنچا دیا ۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اس کی تشکیل اور تربیت کے بعد اسے پوری انسانیت کی قیادت کا فریضہ سپرد کیا جا سکے اور اس دنیا کی قیادت میں اس کا عظیم رول متعین کیا جا سکے ۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایسا ہوا ۔

اس جماعت کی تشکیل اور تعمیر کے اہم مقاصد میں سے ایک اہم مقصد اس جماعت کے ضمیر کی تطہیر بھی تھا ' اس ماحول کی تطہیر بھی تھا جو اس جماعت کے اردگرد پایا جاتا تھا اور اس جماعت کی اس اخلاقی اور ذہنی سطح کو بلند کرنا بھی تھا جس پر اس وقت یہ جماعت تھی ۔

اور جب یہ جماعت اس مطلوبہ سطح اور معیار تک پہنچ گئی ' اپنے انفرادی اخلاق میں اونچی ہو گئی ' اپنے اجتماعی اخلاق میں معیاری ہو گئی جس قدر اپنے عقائد و تصورات میں وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں برتر ہو گئی ۔ تو اس وقت پھر اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس کرۂ ارض پر وہ انقلاب برپا کیا جو اللہ کے پیش نظر تھا ۔ اس کے بعد اللہ نے اس امت کو اپنے دین اور اپنے نظام زندگی کا محافظ اور چوکیدار مقرر فرمایا ۔ اس کی یہ ڈیوٹی قرار پائی کہ وہ اس پوری انسانیت کو گمراہی اور اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائے اور مسلسل اس پوری انسانیت کی قیادت کی امانت دار رہے اور اس کی راہنمائی کرتی رہے اور فی الواقع ایسا ہی ہوا ۔

جب کوئی جماعت اس کرۂ ارض کے پورے انسانوں پر ان خصوصیات کے اندر فوقیت حاصل کر لیتی ہے تو انسانیت کے لئے اس کی قیادت بالکل ایک فطری اور طبیعی امر بن جاتا ہے اور یہ امر اپنی صحیح اساسوں پر قائم ہوتا ہے ۔ اس صورت حال کے نتیجے میں ایسی جماعت پھر علم و ثقافت اور تہذیب و تمدن اور اقتصادیات اور سیاسیات میں بھی دوسری اقوام سے برتر ہو جاتی ہے اور یہ دوسری برتری اسے پہلی برتری کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے یعنی اخلاقی اور نظریاتی برتری کے نتیجے میں اور یہی ہے سنت الٰہی اس کرۂ ارض کے تمام افراد کیلئے بھی اور تمام جماعتوں اور سوسائٹیوں کیلئے بھی ۔ اسی نفسیاتی اور اجتماعی تطہیر کے ایک پہلو کو درج ذیل دو آیات کے اندر لیا گیا ہے ۔

---ooo---

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا۝ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا۝

"اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے ' الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے - (مظلوم ہونے کی صورت میں اگرچہ تم کو بدگوئی کا حق ہے -) لیکن اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کئے جاؤ' یاکم ازکم برائی سے درگزر کرو' تو اللہ (کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ بڑا معاف کرنیوالا ہے حالانکہ سزا دینے پر) پوری قدرت رکھتا ہے -"

معاشرہ ہمیشہ نہایت ہی حساس ہوتا ہے اس لئے اسے بعض ایسے اجتماعی آداب کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی اس حساسیت کے مناسب حال ہوں - بعض اوقات ایک شخص ایک سرسری سی بات کہتا ہے لیکن معاشرے پر اس کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ' ان کا وہ اندازہ نہیں کر سکتا - اور بعض اوقات ایک عام بات ہوتی ہے لیکن اس کے قائل کی مراد صرف ایک شخص سے ہوتی ہے لیکن ان باتوں کے اثرات معاشرے کی نفسیات ' اس کے اخلاق اور اس کے رسوم و رواجات پر نہایت ہی مہلک ہوتے ہیں - اس بات سے صرف وہ ایک فرد ہی متاثر نہیں ہوتا بلکہ اس سے پوری جماعت متاثر ہوتی ہے -

کوئی شخص کسی کے بارے میں بدگوئی کرنا چاہے اس کی جو شکل و صورت بھی ہو ' اگر اس کے دل میں خداترسی نہ ہو اور اس کا ضمیر محتاط نہ ہو تو یہ بدگوئی انسان کیلئے بہت ہی آسان ہوتی ہے - لیکن اس بدگوئی اور بدزبانی کے آثار معاشرے میں بہت ہی برے نتائج پیدا کرتے ہیں - بعض اوقات اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ معاشرے سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جاتا ہے - لوگوں کا یہ خیال ہو جاتا ہے کہ اب معاشرے میں شر کو غلبہ حاصل ہو گیا ہے - بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے اندر شر کی استعداد پوشیدہ ہوتی ہے لیکن وہ معاشرتی دباؤ کی وجہ سے شر کا ارتکاب نہیں کرتے وہ اس کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں کیونکہ اب اس کا ارتکاب عام طور پر کیا جاتا ہے اس لئے وہ اس سے باک نہیں کرتے اور نہ ہی انہیں کوئی معاشرتی خوف لاحق ہوتا ہے - وہ سوچتے ہیں کہ صرف وہی اس کا ارتکاب نہیں کر رہے اور لوگ بھی ایسا ہی کر رہے ہیں - بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ کسی برائی کا ارتکاب دیکھتے دیکھتے انسان کے دل سے اس برائی کی کراہت میں کمی آجاتی ہے - انسان پہلے پہل برائی کو بہت ہی شدت سے محسوس کرتا ہے اور جب اس کا بار بار ارتکاب ہوتا رہے یا بار بار ذکر ہوتا رہے تو اس کی نظروں میں اس کی قباحت کم ہو جاتی ہے اور اس کی جانب سے اس کراہت میں کمی آجاتی ہے - لوگوں کیلئے ایسی برائی کا سننا آسان ہو جاتا ہے اور پھر وہ اسے مٹانے کیلئے فوراً اٹھتے بھی نہیں ہیں -

بدگوئی میں انسان سب سے پہلے انفرادی الزامات عائد کرتا ہے - انفرادی گالی گلوچ ہوتی ہے - اس کے بعد

اجتماعی نقصان اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اخلاقی بے راہ روی پھیل جاتی ہے۔ اس میں بعض لوگوں کے بعض دوسرے لوگوں کے بارے میں اندازے بدل جاتے ہیں، بعض لوگوں کا بعض دوسرے لوگوں میں اعتماد نہیں رہتا، اور اسی طرح بعض جماعتوں کا دوسری جماعتوں پر اعتماد نہیں رہتا۔ الزامات پر الزامات آتے ہیں اور زبانیں انہیں بلا کسی جھجک کے چاٹتی رہتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جماعت مسلمہ کیلئے ایک دوسرے کی بدگوئی کو حرام قرار دیا ہے۔ صرف وہی شخص بدگوئی کرسکتا ہے، جس پر ظلم ہوا ہو۔ وہ صرف اس قدر برے لفظ استعمال کرسکتا ہے جن سے ظالم کے حقیقی ظلم کا اظہار ہو رہا ہو ان حدود کے اندر جن کے اندر ظلم ہوا ہے۔ (لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (۴:۱۴۸) "اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی بدگوئی پر زبان کھولے الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو۔"

ظلم کے حالات میں بدگوئی کے ذریعے دشمن سے بدلہ لیا جاتا ہے اور اسی طرح ظلم کے مقابلے میں مدافعت کی جاتی ہے۔ اس بدگوئی میں وہ امور بھی شامل ہیں، جنہیں قانونی اصطلاح میں سب و شتم کہا جاتا ہے۔ اس بدگوئی کے ذریعے ایک فرد، اس انفرادی بدسلوکی کو مسترد کرتا ہے جو فی الواقعہ ہو چکی ہے۔ اس طرح یہ مظلوم اس ظلم اور ظالم کے خلاف پروپیگنڈا کرتا ہے۔ جس کا اسے حق حاصل ہوتا ہے تاکہ سوسائٹی اس مظلوم شخص کے ساتھ انصاف کرسکے۔ وہ ظالم کے ہاتھ کو روک سکے اور معاشرے کے اندر ایک ایسی فضاء قائم ہو سکے جس میں ہر ظالم ظلم سے پہلے اپنے انجام کے بارے میں اچھی طرح سوچے اور اس ظلم کے دوبارہ ارتکاب سے باز آجائے۔ اعلانیہ بدگوئی کا حق بالکل محدود ہے اسے صرف وہی شخص استعمال کرسکتا ہے جس پر ظلم ہوا ہو۔ اس کے جواز کا سبب بھی محدود ہے۔ یعنی صرف وہ ظلم جو کسی متعین شخص کے ساتھ کیا گیا ہو اور یہ بدگوئی صرف اس شخص کے خلاف کی جاسکتی ہے جس نے ظلم کیا ہو۔ ان محدود حالات میں اس بدگوئی کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ اس سے ایک بڑی بھلائی کو رواج دینا مقصود ہے۔ نیز اس بدگوئی سے ظلم اور ظالم کے خلاف صرف تشہیر ہی مقصود نہیں ہے بلکہ اصل ہدف یہ کہ مظلوم کو عدل و انصاف مل سکے۔

اسلامی قانون لوگوں کی شہرت اور عزت کی حفاظت صرف اسی حد تک کرتا ہے، جب تک وہ ظلم و زیادتی نہ کریں۔ جب وہ ظلم کا ارتکاب کریں تو پھر وہ اس بات کے مستحق نہیں ہیں کہ ان کی حیثیت عرفی کو قانونی تحفظ دیا جائے۔ ظلم کے ارتکاب کے بعد مظلوم کو یہ قانونی حق حاصل ہوجاتا ہے کہ وہ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائے اور ایک حد تک بدگوئی بھی کرے۔ یہ واحد استثناء ہے جو مظلوم کے سلسلے میں ہے، ورنہ اسلام کا عام قانونی اور اخلاقی ضابطہ یہی ہے کہ کسی کے خلاف بدگوئی کی اجازت نہ ہوگی۔

اس طرح اسلام کے ان دونوں مقاصد کے درمیان ایک قسم کا توازن قائم ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا نظام انصاف قائم کرنا چاہتا ہے جس میں ظلم کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ ایک ایسا نظام اخلاق بھی رائج کرنا چاہتا ہے جس میں حیائے چشمی اور اجتماعی رواداری پر بھی خراش نہ آئے۔

اس پر قرآن کریم یہ اختتامیہ لاتا ہے۔ (وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا (۴:۱۴۸)) (اور اللہ سب کچھ جاننے والا ہے۔) اور انتہائے کلام پر بھی بات اللہ جل شانہ کی ذات سے مربوط ہو جاتی ہے۔ جبکہ آغاز ذکر محبت الٰہی سے

ہوا تھا۔ (لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْءِ (۱۴۸:۴)) (اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے) یہ اس لئے کہا گیا تاکہ انسان کے دل میں یہ شعور زندہ رہے کہ انسان کی نیت' انسان کی جانب سے بدگوئی کے اسباب اور پھراس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ اور الزامات کی صحت اور ان کی موزونیت کا اللہ تعالیٰ کے ہاں اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے کیونکہ اللہ سنتا ہے اور جو بات کہی جاتی ہے اس کے تمام پس منظر سے وہ اچھی طرح آگاہ ہے۔ جو بات بھی سینوں میں ہے اس پر عیاں ہے۔

قرآن کریم یہاں بات کو بدگوئی کی صرف ممانعت یعنی صرف منفی حکم پر ہی ختم نہیں کر دیتا بلکہ وہ مثبت بات کر کے بھلائی کا حکم دیتا ہے۔ اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ برائی پر عفو و درگزر سے کام لینا بہرحال بہت ہی پسندیدہ ہے۔ عفو و درگزر کو صفات الٰہیہ میں سے ایک اہم صفت ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ہر خطاکار سے مواخذہ کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ یہاں اشارہ دیا جاتا ہے کہ اہل ایمان کو اللہ کے اخلاق و صفات اپنے اندر پیدا کرنا چاہئیں۔ جہاں تک ان میں قدرت ہو اور جہاں تک وہ ایسا کر سکیں۔

(اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْہُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا

(۱۴۹:۴)) (لیکن اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی کیے جاؤ' یا کم از کم برائی سے درگزر کرو' تو اللہ تعالیٰ کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ بڑا معاف کرنیوالا ہے حالانکہ سزا دینے پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے۔)

یوں اسلام کا منہاج تربیت نفس مومن اور جماعت مسلمہ کو ایک قدم اور بلند کر دیتا ہے۔ پہلا مرحلے میں کہا جاتا ہے کہ کسی شریف انسان کیلئے بدگوئی کے ساتھ منہ کھولنا اچھا نہیں ہے۔ اس مرحلے میں ایک استثنائی صورت یہ رکھی جاتی ہے کہ مظلوم بدگوئی کر کے بدلہ بھی لے سکتا ہے اور حصول انصاف کو بھی ممکن بنا سکتا ہے۔ دوسرے مرحلے پر اہل ایمان کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ سب کے سب بھلائی کیلئے ہر وقت کوشاں رہیں اور جس شخص پر ظلم کیا گیا ہے اور وہ بدگوئی کر کے اپنا بدلہ لے سکتا ہے اسے بھی یہ کہا گیا ہے کہ اگر وہ معاف کر دے اور صرف نظر کرے تو یہ نہایت ہی اچھا فعل ہے۔ یہ نہایت ہی بلند اخلاقی ہے' بشرطیکہ وہ انتقام پر قادر ہو اور وہ انتقام کے بجائے عفو و درگزر کو ترجیح دے۔ کیونکہ قدرت انتقام کے بغیر عفو کیا معنی؟ گدا اگر تواضع کند خوائے اوست۔

اگر عفو و درگزر کی نیکی کھل کر کریں تو معاشرہ میں عفو و درگزر کی رسم چلے گی اور نیکی پھیلے گی اور اگر وہ یہ نیکی خفیہ طور پر کریں گے تو بھی تزکیہ نفوس کا کام ہوگا۔ بھلائی اگر اعلانیہ کی جائے تو بھی مفید ہے اور اگر خفیہ کی جائے تو بھی مفید ہے۔ جب لوگوں کے درمیان عفو و درگزر عام ہوگا تو بدگوئی کرنے کے مواقع خود ہی کم ہوتے چلے جائیں گے بشرطیکہ یہ عفو و درگزر وہ شخص کرے جو انتقام پر قدرت رکھتا ہو۔ لیکن اگر کسی شخص کی کمزوری اسے عفو پر مجبور کر رہی ہو تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ یہ عفو و درگزر اللہ تعالیٰ کے اخلاق کو اپناتے ہوئے ہونا چاہئے۔ اللہ قدرت کے باوجود عفو سے کام لیتا ہے۔ (فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا (۱۴۹:۴)) (اللہ بڑا معاف کرنیوالا ہے حالانکہ وہ سزا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔)

---ooo---

اس کے بعد بات کا رخ اہل کتاب کی طرف پھر جاتا ہے ۔پہلے تمام اہل کتاب کے حوالے سے بات ہوتی ہے ۔اس کے بعد خصوصاً یہودیوں کے بعض کارناموں کا تذکرہ ہوتا ہے اور آخر میں نصاریٰ پر تنقید ہوتی ہے ۔یہودی حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم ؑ کے بارے میں سخت بدگوئی کرتے تھے اور ان کی ذات کے بارے میں بہتان باندھتے تھے ۔اس حصہ کلام میں ان کی ان بدگویوں کا ذکر بھی ہوتا ہے ۔اس طرح یہودیوں پر کی جانے والی تنقید کا رابطہ دو سابقہ آیات سے بھی واضح ہو جاتا ہے 'جن میں بدگوئی کی ممانعت کی گئی ہے ۔

اہل کتاب اور یہود و نصاریٰ پر یہ تنقید 'بھی اس معرکے کا حصہ ہے جو مدینہ میں جماعت مسلمہ کو اس کے دشمنوں کے ساتھ درپیش تھا جس کا ایک بہت بڑا حصہ اس سورہ میں اور سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران میں تفصیلاً بیان ہوا ہے ۔ اس معرکے کی تفصیلات قرآنی ترتیب کے مطابق ملاحظہ ہوں ۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ﴿١٥٠﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿١٥١﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٥٢﴾

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں 'اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے 'اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ سب پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کیلئے ہم نے وہ سزا مہیا کر رکھی ہے جو انہیں ذلیل و خوار کر دینے والی ہوگی بخلاف اس کے جو لوگ اللہ اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں اور ان کے درمیان تفریق نہ کریں 'ان کو ہم ضرور ان کے اجر عطا کریں گے اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے ۔"

یہودیوں کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ اپنے نبیوں پر ایمان رکھتے ہیں لیکن وہ حضرت عیسیٰ ؑ اور حضرت محمد ؐ کی رسالتوں کا انکار کرتے تھے ۔جبکہ نصاریٰ کا موقف یہ تھا کہ وہ صرف حضرت عیسیٰ ؑ کی رسالت پر ایمان لاتے تھے اور حضرت محمد ؐ کی رسالت کے وہ بھی منکر تھے ۔اس کے ساتھ ساتھ وہ حضرت عیسیٰ ؑ کو الٰہ بھی سمجھتے تھے ۔

قرآن کریم نے ان دونوں کے موقف پر سخت گرفت کی ۔ اور اللہ اور اس کے انبیاء و رسل پر ایمان لانے کا جامع تصور پیش فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنا بھی غلط ہے اور خود اللہ کے تمام رسولوں کے درمیان فرق کر کے بعض پر ایمان لانا اور بعض کا انکار کرنا بھی غلط ہے بلکہ اللہ اور اللہ کے تمام رسولوں پر بلا امتیاز ایمان لانا ضروری ہے ۔ اور یہی دین اسلام ہے اللہ کو اس کے سوا کوئی اور دین قبول نہیں ہے کیونکہ اللہ کی وحدانیت اور اس کے تقاضوں کو صرف اسی صورت میں پورا کیا جاسکتا ہے ۔

اللہ کی وحدانیت مطلقہ کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کا دین بھی ایک ہو' جس کے حامل وہ تمام رسول قرار دیئے جائیں جو انسان کی ہدایت کیلئے کسی بھی وقت بھیجے گئے ہوں اور جن جن رسولوں کو یہ امانت سپرد کی گئی ان کا درجہ اور مقام بھی ایک ہونا ضروری ہے ۔ رسولوں کے ایک ہی منصب اور ایک ہی مقام کا جو بھی انکار کرے گا وہ اللہ کی توحید کا انکار تصور ہوگا ۔ اس سے اللہ کی وحدانیت کا ایک بڑا تصور سامنے آئے گا اس لئے کہ انسانوں کیلئے اللہ کا پسندیدہ دین بہرحال وہی ایک ہے' اس کی بنیاد ایک ہے' اور اس کا مصدر و منبع ایک ہے' لہٰذا اس کے نمائندوں کے درمیان تفریق کس طرح معقول ہو سکتی ہے ۔

قرآن کریم نے اللہ اور رسولوں کے درمیان تفریق کرنے کو ان الفاظ میں بیان کیا ۔ "کہ وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور رسولوں کا انکار کرتے ہیں ۔" اور رسولوں کے درمیان تفریق کو یوں بیان کیا ۔ "ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے ۔" اور ان دونوں فریقوں کے بارے میں کہا ۔ (اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِه (٤ : ١٥٠))

(جو لوگ اللہ اور رسولوں سے کفر کرتے ہیں ۔) اس طرح قرآن کے نزدیک اللہ اور رسولوں کے درمیان فرق کرنا بھی کفر ہے اور رسولوں میں سے کسی کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا بھی کفر ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان ایک مستقل اکائی ہے اور اسکے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیے جاسکتے ۔ ایمان کا پہلا قدم اللہ کی وحدانیت کا اقرار ہے ۔ اللہ کو وحدہ لاشریک تسلیم کرنے کا لازمی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے انسانوں کیلئے جو نظام زندگی اور جو دین پسند فرمایا ہے وہ بھی ایک ہے جو عقیدۂ توحید کی اساس پر ہے ۔ جو رسول ، اس دین کو لیکر آتے رہے ہیں وہ بھی ایک ہیں اس لئے کہ یہ سب اسی کے بھیجے ہوئے ہیں اور یہ خود سے نہیں آئے نہ وہ اللہ کے ارادے اور اس کی وحی سے علیحدہ رہے ہیں ۔ ان کا موقف ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اس لئے ایک پوری اکائی کی تحلیل اور تجزیہ نہیں ہو سکتا ۔ جو بھی ایمان کی اس وحدت اور اکائی میں فرق کرے گا وہ کفر مطلق کا ارتکاب کرے گا اگرچہ وہ یہ خیال کرتا ہو کہ بعض اجزاء پر ایمان لایا ہے اور بعض سے کفر کیا ہے ۔ ایسے لوگوں کی جزاء اللہ کے نزدیک یہ ہوگی کہ انہیں توہین آمیز عذاب دیا جائے گا ایسے سب لوگوں کو ۔

(اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا (٤ : ١٥١))

"وہ سب پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کیلئے ہم نے وہ سزا مہیا کر رکھی ہے جو انہیں ذلیل و خوار کر دینے والی ہوگی ۔"

رہے مسلمان تو ان کے اعتقادی تصورات میں اللہ کی ذات اور تمام رسولوں پر ایمان لانا شامل ہے ۔ رسولوں کے درمیان کسی قسم کا تفرقہ جائز نہیں ہے ۔ مسلمانوں کے ہاں تمام رسولوں کی عقیدت اور احترام پایا جاتا ہے ۔ مسلمانوں کے نزدیک

تمام سماوی ادیان برحق ہیں' ہاں اگر ان کے اندر تحریف کر دی جائے تو پھر وہ دین نہ رہیں گے اگر چہ ان ادیان کے بعض حصے اپنی اصل شکل میں موجود ہوں' اس لئے کہ دین ایک ہی وحدت ہے اور اہل کتاب اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ دین میں ایک اللہ ہے' اس ایک اللہ نے لوگوں کیلئے ایک ہی دین تجویز کیا ہے۔ یہ دین ان کی زندگی کا ایک مکمل منہاج ہے۔ اللہ نے رسولوں کو بھیجا ہے تاکہ یہ تمام رسول اس منہاج اور اس نظام کی طرف لوگوں کو بلائیں۔ مسلمانوں کے تصور میں قافلہ ایمان ایک دوسرے کے ساتھ قطار کی شکل میں جڑا ہوا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام' حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت موسیٰ علیہ السلام' حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ اس قافلے کی قیادت فرمارہے ہیں جن کے درمیان ان کے بھائی مزید ایسے رسول بھی گزرے ہیں جن کے نام یہاں مذکور نہیں۔ ان تمام رسولوں کا نسب نامہ اسی قافلے کے ساتھ ملتا ہے۔ یہ سب ایک ہی عظیم امانت کے حامل رہے ہیں اور یہ تمام رسل ایک ہی سچائی و بھلائی کے وارث رہے ہیں جس کا سلسلہ طویل اور مبارک ہے۔ اس سلسلے میں کوئی تفرقہ نہیں ہے' اس میں سے کوئی رسول علیحدہ نہیں ہے اور اس سلسلے کے درمیان کوئی انقطاع نہیں ہے اور دین حق کی وراثت کا مصدر یہی لوگ رہے ہیں۔ ان رسولوں کے سلسلے سے ہٹ کر جو دین اور جو نظریہ بھی ہے وہ باطل اور گمراہی ہے۔

یہ ہے اسلامی نظریہ حیات جس کے سوا اللہ تعالیٰ کو کوئی دین اور نظریہ حیات قبول نہیں ہے۔ اور یہ ہیں اہل اسلام جو اپنے اعمال پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجر و ثواب کے مستحق ہیں اور اس کی جانب سے رحمت اور مغفرت کے بھی مستحق ہیں اگر ان سے اپنی زندگی میں کوئی قصور سرزد ہو گیا۔

(وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۴: ۱۵۲)) ”بخلاف اس کے جو لوگ اللہ اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں اور ان کے درمیان تفریق نہ کریں' ان کو ہم ضرور ان کے اجر عطا کریں گے اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔“

اسلام نے اللہ اور رسل کے بارے میں عقائد کو ایک اکائی قرار دینے کے بارے میں اس قدر تشدد کیوں کیا؟ اسی لئے کہ ایک مومن کے تصور اللہ میں عقیدہ توحید ایک اساسی حیثیت کا حامل ہے۔ اور یہ عقیدہ اس کائنات کے اندر ایک مدبر و منتظم کے تصور کے ساتھ بھی لگا کھاتا ہے جو نہ تعدد کو قبول کرتا ہے اور نہ اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا منتظم ہو سکتا ہے۔ یہی عقیدہ کوئی ذی شعور انسان اختیار کر سکتا ہے جو اس کائنات کے اندر جاری و ساری ناموس اکبر کو محسوس کرتا ہے اور جب تک اس کی نظر کو رسائی حاصل ہے۔ یہی تصور حیات اہل ایمان کو ایک متحد قافلے کی شکل دے سکتا ہے جو کفر کی صفوں اور حزب الشیطان کی پارٹی کے مقابلے میں' ایک جماعت کی شکل میں کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اہل ایمان ان نظریات کے حامل لوگوں کی طرح متفرق اور بکھرے ہوئے نہیں ہوتے' جن کا دین اور نظریہ اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے تو سماوی تھا مگر انہوں نے اس میں تحریف کر لی اور اب وہ صحیح اہل ایمان کی طرح ایک ہی صف میں کھڑے نہیں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم صرف اسلام کو دین قرار دیتا ہے ۔ صرف اہل اسلام کو خیرامت قرار دیتا ہے جسے لوگوں کی خاطر برپا کیا گیا ہے ۔ وہ مسلمان جن کا عقیدہ درست ہو ' جن کا عمل اور کردار اس عقیدے اور نظریے کے مطابق ہو ' یہ نہ ہو کہ بس وہ ایک مسلمان کے گھر پیدا ہوئے ہوں اور نہ صرف یہ ہو کہ انھوں نے اسلام کے کلمے کو یاد کر لیا ہو اور زبان سے ادا کر دیا ہو ۔

اس تشریح و بیان کے بعد معلوم ہو گیا کہ وہ کون ہیں جو ایک طرف اللہ اور رسولوں میں جدائی کرتے ہیں اور دوسری جانب رسولوں میں سے بعض کو مانتے ہیں اور بعض دوسروں کا انکار کرتے ہیں ۔ وہ تاریخی قافلہ ایمانی کے سلسلے کے اندر گیپ پیدا کرتے ہیں ' اس وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں جو اللہ نے پیدا کی ہے اور یوں وہ اس وحدانیت کا انکار کر دیتے ہیں جس پر عقیدۂ ایمان باللہ قائم ہے ۔

---ooo---

رسولوں اور انکی رسالت کے بارے میں اسلامی تصور حیات کی خشت اول کو مضبوط کرنے کے بعد اور حقیقت ایمان اور حقیقت کفر کو واضح کر دینے کے بعد ' اس سلسلے میں یہودیوں کے بعض غلط موقف زیر بحث لائے جاتے ہیں ' جن کا تعلق اس بدگوئی سے بھی ہے جس کا ذکر اس پارے کے آغاز میں کیا گیا ہے ۔ اس میں نبی ؐ اور آپ کی رسالت کے بارے میں ان کے موقف کی تردید کی جاتی ہے اور اس بات کی مذمت کی جاتی ہے کہ وہ حضور اکرم ؐ سے معجزات اور نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ وہ اپنے اس موقف اور عقیدے اور حضرت موسیٰ ؑ کے بارے میں اپنے موقف اور عقیدے کے درمیان فرق کرتے ہیں ۔ پھر حضرت مسیح ؑ اور ان کی والدہ محترمہ کے بارے میں ان کا موقف حضرت موسیٰ ؑ سے مختلف ہے ۔ حالانکہ ان تمام پیغمبروں کی حقیقت پوری انسانی تاریخ میں ایک ہی ہے ۔ یہاں سیاق کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید جو یہودی اور اہل کتاب حضرت محمد ؐ کے سامنے کھڑے ہیں وہی لوگ حضرت عیسیٰ ؑ کے سامنے بھی کھڑے تھے اور یہی لوگ حضرت موسیٰ ؑ کے سامنے بھی کھڑے تھے ۔ اس سے اس مفہوم کی تاکید مطلوب ہے کہ جس طرح رسل ایک ہیں اسی طرح ہم بھی ایک ہیں ۔ چنانچہ قرآن کریم ان کی اس جبلت کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے ۔

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ
فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً
فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا
جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا

مُّبِيۡنًا ﴿۱۵۳﴾ وَ رَفَعۡنَا فَوۡقَهُمُ الطُّوۡرَ بِمِيۡثَاقِهِمۡ وَ قُلۡنَا لَهُمُ ادۡخُلُوا
الۡبَابَ سُجَّدًا وَّ قُلۡنَا لَهُمۡ لَا تَعۡدُوۡا فِى السَّبۡتِ وَ اَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ
مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا ﴿۱۵۴﴾ فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ وَكُفۡرِهِمۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ
قَتۡلِهِمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ وَّ قَوۡلِهِمۡ قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ طَبَعَ اللّٰهُ
عَلَيۡهَا بِكُفۡرِهِمۡ فَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۱۵۵﴾ وَّ بِكُفۡرِهِمۡ وَ قَوۡلِهِمۡ عَلٰى
مَرۡيَمَ بُهۡتَانًا عَظِيۡمًا ﴿۱۵۶﴾ وَّ قَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ
رَسُوۡلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ وَ مَا صَلَبُوۡهُ وَلٰـكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ
اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ ؕ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ
وَمَا قَتَلُوۡهُ يَقِيۡنًا ﴿۱۵۷﴾ بَلۡ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ﴿۱۵۸﴾
وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ
يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا ﴿۱۵۹﴾ فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ
طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ وَبِصَدِّهِمۡ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ كَثِيۡرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّ اَخۡذِهِمُ
الرِّبٰوا وَقَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَاَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ ؕ وَاَعۡتَدۡنَا
لِلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۶۱﴾

اے نبی! یہ اہل کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کراؤ تو اس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰ سے کر چکے ہیں۔ اس سے تو انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو اور اسی سرکشی کی وجہ سے یکایک ان پر بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔ پھر انہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا حالانکہ یہ کھلی کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔ اس پر بھی ہم نے ان سے درگزر کیا۔ ہم نے موسیٰ ؑ کو صریح فرمان عطا کیا اور ان لوگوں پر طور کو اٹھا کر ان سے اس فرمان کی اطاعت کا عہد لیا۔ ہم نے ان کو حکم دیا کہ دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو۔ ہم نے ان سے کہا کہ اللہ کا قانون نہ توڑو اور اس پر ان سے پختہ عہد لیا۔ آخر کار ان کی عہد شکنی کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا' اور یہاں تک کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں حالانکہ درحقیقت ان کی باطل پرستی کے سبب سے اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں پھر اپنے کفر میں یہ اتنے بڑھے کہ مریم پر سخت بہتان لگایا' اور خود کہا کہ ہم نے مسیح 'عیسیٰ ؑ ابن مریم' رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے حالانکہ فی الواقع انہوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان کیلئے مشتبہ کر دیا گیا اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں۔ ان کے پاس اس معاملے میں کوئی علم نہیں ہے۔ محض گمان ہی کی پیروی ہے۔ انہوں نے مسیح کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا' اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔ اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہو گا جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے گا اور قیامت کے روز وہ ان پر گواہی دے گا' .... غرض ان یہودیوں کے اسی ظالمانہ رویے کی بناء پر اور اس بناء پر کہ یہ بکثرت اللہ کے راستے سے روکتے ہیں' اور سود لیتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں' ہم نے بہت سی وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کیلئے حلال تھیں' اور وہ لوگ جو ان میں سے کافر ہیں ان کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

جزیرۃ العرب میں یہودیوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے مقابلے میں کھلا معاندانہ دشمنی کا موقف اختیار کیا۔ وہ آپ کے خلاف مسلسل خفیہ اور نہایت ہی معاندانہ سازشیں تیار کرتے رہے جن کی تفصیلات کو قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔ اور جن کے کچھ رنگ ہم سورہ بقرہ' سورہ آل عمران اور خود اسی سورہ کے پارۂ پنجم میں دکھا چکے ہیں۔ ان آیات میں جو باتیں کہی جا رہی ہیں وہ بھی ان کے اس مسلسل موقف کا ایک رنگ ہے۔

ان کی پہلی ہٹ دھرمی یہ ہے کہ وہ حضور ؐ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ آسمانوں سے ایک کتاب نازل فرما دیں' یہ لکھی ہوئی ہو' وہ مجسم طور پر آسمانوں سے ان کے سامنے آ رہی ہو اور وہ اسے اپنے ہاتھوں کے ساتھ چھو لیں۔

(يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ (۴:۱۵۳))

(اے نبی! یہ اہل کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کراؤ۔) اس سوال کا جواب' حضرت نبی اکرم ؐ کی جانب سے خود اللہ تعالیٰ عنایت فرماتے ہیں اور حضور ؐ اور مسلمانوں کے سامنے' یہودیوں کی تردید کرتے ہوئے خود یہودیوں کی اپنی تاریخ سے' ان کا اپنے نجات دہندہ اور قائد اور عظیم نبی حضرت موسیٰ ؑ کے ساتھ ان کے رویے کی ایک جھلک پیش فرماتے ہیں۔ حالانکہ ان یہودیوں کا زعم یہ ہے کہ وہ حضرت موسیٰ

ﷺ پر ایمان لاتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت کی تصدیق نہیں کرتے .... ان کی تاریخ کا یہ صفحہ الٹ کر بتایا جاتا ہے کہ ان کی یہ عادت کوئی نئی عادت نہیں ہے ۔موجودہ مدینہ کے یہودی ہی ایسے سوالات نہیں کر رہے بلکہ ازمنہ قدیمہ سے انکی ایسی ہی عادت رہی ہے۔

ان کی جبلت آج بھی وہی ہے جو عہد موسیٰ میں ہوا کرتی تھی حالانکہ وہ ان کے قائد بھی تھے 'نبی بھی تھے اور ان کے نجات دہندہ بھی تھے ۔وہ موٹے دماغ کے لوگ ہیں۔ ان کو صرف محسوس چیزوں کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے ۔جس طرح یہ لوگ حضرت موسیٰ کے دور میں ہٹ دھرم تھے 'عناد کرنیوالے تھے اور ماسوائے اس کے کہ انہیں کسی کی بات کو زبردستی تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا جائے 'یہ مان کر نہیں دیتے ۔یہ آج بھی ویسے ہی کفر پیشہ اور غدار ہیں اور دوڑکر وعدہ توڑنے والے ہیں ۔نہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ وعدہ خلافی کرتے ہیں بلکہ یہ لوگ اپنے رب کے ساتھ بھی عہد شکنی کرتے ہیں۔ یہ وہی ہیں جھوٹے اور گندے لوگ ۔وہ کسی موقف پر ثابت قدم رہنے والے نہیں ہیں۔ اور نہ ہی یہ لوگ بدگوئی سے چوکتے ہیں۔یہ ہروقت لالچ کے بندے ہیں اور دنیا پرستی ان کا شعار ہے ۔لوگوں کے مال باطل اور ناجائز طریقے سے کھانا ان کا وطیرہ ہے۔ یہ بھی ان کی قدیم عادت ہے کہ یہ لوگ اللہ کے حکم سے روگردانی کرتے ہیں اور اس کے ہاں جو ثواب آخرت میں ملتا ہے اسے خاطر ہی میں نہیں لاتے ۔

ان آیات میں ان کے خلاف یہ مہم اسی لئے چلائی گئی ہے کہ ان کی حقیقت کھول کر سامنے رکھدی جائے ۔انہیں شرمندہ کر دیا جائے ۔اس مہم کے زور اور اس کے تنوع کو دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت یہودی سازش کو بے نقاب کرنے کی کس قدر ضرورت تھی جو سازش وہ اسلام اور وقت کے نبی کے خلاف کر رہے تھے ۔یہودیوں کی یہی حیثیت اور ناپاک سازشیں ہیں جو آج تک اس دین اور اس کے ماننے والوں کے خلاف بدستور جاری ہیں۔

(يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ (٤ : ١٥٣)) (اے نبی اہل کتاب تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کراؤ۔) آپ ان کی اس ہٹ دھرمی سے پریشان نہ ہوں' اس لئے کہ ان کی یہ ہٹ دھرمی تعجب انگیز نہیں ہے' نہ یہ کوئی نئی بات ہے۔

فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (٤ : ١٥٣)) "تو اس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰ علیہ السلام سے کر چکے ہیں۔اس سے توانہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو"..... حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے جو بے شمار معجزات نازل فرمائے تھے وہ ان کے احساس کو نہ جگا سکے ۔ ان عظیم معجزات سے بھی ان کے وجدان کے اندر کوئی ارتعاش پیدا نہ ہوا۔اور یہ حیران کن معجزات بھی ان کے دلوں کو مائل بہ ہدایت و اطاعت نہ کرسکے اور یہ بدبخت آگے بڑھے اور ذات باری کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ کر دیا۔ بالکل کھلے بندوں دیکھنے کا۔ یہ ان کا ایک متکبرانہ مزاج اور مطالبہ تھا' جس میں ایمان کی تروتازگی سرے سے موجود ہی نہ تھی بلکہ ان کی اس جبلت میں سرے سے ایمان کی استعداد ہی موجود نہ تھی۔

(فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ) اور اسی سرکشی کی وجہ سے یکایک ان پر بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔لیکن پھر بھی

اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف ہی کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں حضرت موسیٰ ؑ کی دعا اور اپنے آپ سے ان کے بارے میں عاجزانہ التماس کو قبول ہی کر لیا۔ اس دعا کی تفصیلات سورہ اعراف (۱۵۵) میں ہیں۔

(فَلَمَّآ اَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ قَالَ رَبِّ لَوۡ شِئۡتَ اَهۡلَكۡتَهُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ وَاِيَّایَ ؕ اَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنۡ هِیَ اِلَّا فِتۡنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنۡ تَشَآءُ وَتَهۡدِیۡ مَنۡ تَشَآءُ ؕ اَنۡتَ وَلِيُّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا وَارۡحَمۡنَا وَاَنۡتَ خَيۡرُ الۡغٰفِرِيۡنَ (۱۵۵) وَاكۡتُبۡ لَنَا فِیۡ هٰذِهِ الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِی الۡاٰخِرَةِ اِنَّا هُدۡنَاۤ اِلَيۡكَ ؕ (۱۵۶)(۷:۱۵۵ – ۱۵۶))

(جب ان لوگوں کو ایک سخت زلزلے نے آپکڑا تو موسیٰ ؑ نے عرض کیا۔ "اے میرے سرکار، آپ تو پہلے ہی ان کو اور مجھے ہلاک کر سکتے تھے، کیا اس قصور میں جو ہم میں سے چند نادانوں نے کیا تھا ہم سب کو ہلاک کر دیں گے؟ یہ تو آپکی ڈالی ہوئی آزمائش تھی جس کے ذریعے سے آپ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت بخش دیتے ہیں۔ ہمارے سرپرست تو آپ ہی ہیں۔ پس ہمیں معاف کر دیجئے اور ہم پر رحم فرمایئے۔ آپ سب کو معاف فرمانے والے ہیں۔ اور ہمارے لئے اس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجئے اور آخرت کی بھی۔ ہم نے آپ کی طرف رجوع کر لیا ہے۔")

(ثُمَّ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ (۴:۱۵۳)) (پھر انہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا حالانکہ یہ کھلی کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔) یہ بچھڑا سونے کا بنا ہوا تھا۔ اسے سامری نامی شخص نے بنایا تھا۔ یہ اس نے سونے کے ان زیورات سے بنایا تھا، جو انہوں نے مصری عورتوں سے لئے تھے جب وہ وہاں سے نکل رہے تھے۔ یہ لوگ اس بچھڑے کے اردگرد جمع ہوگئے اور انہوں نے اسے اپنا معبود بنا لیا۔ حضرت موسیٰ ؑ اس وقت کوہ طور پر گئے ہوئے تھے جہاں انہوں نے اپنے رب سے ایک مقررہ وقت میں بات کرنی تھی۔ جہاں ان کو تورات کی الواح اور ہدایت اور نئی روشنی عطا ہونی تھی۔ (فَعَفَوۡنَا عَنۡ ذٰلِكَ) (اس پر بھی ہم نے ان سے درگزر کیا۔) لیکن یہودی، یہودی ہی تو تھے۔ ان کے ساتھ معاملات کرنے میں صرف خوف اور جبر مفید رہتا ہے۔

(وَاٰتَيۡنَا مُوۡسٰى سُلۡطٰنًا مُّبِيۡنًا (۱۵۳) وَرَفَعۡنَا فَوۡقَهُمُ الطُّوۡرَ بِمِيۡثَاقِهِمۡ وَقُلۡنَا لَهُمُ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّقُلۡنَا لَهُمۡ لَا تَعۡدُوۡا فِی السَّبۡتِ وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا

(۱۵۴)(۴:۱۵۳ – ۱۵۴)) (ہم نے موسیٰ کو صریح فرمان عطا کیا اور ان لوگوں پر طور کو اٹھا کر ان سے (اس فرمان کی اطاعت کا) عہد لیا۔ ہم نے ان کو حکم دیا کہ دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو۔ ہم نے

ان سے کہا کہ سبت کا قانون نہ توڑو اور اس پر ان سے پختہ عہد لیا۔)

یہاں سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے جو سلطان عطا فرمایا وہ کیا چیز ہے۔ غالباً وہ وہی شریعت ہے جو الواح میں موجود تھی، تو اللہ کی شریعت گویا اللہ کی جانب سے سلطان اور حاکمیت ہے اور اللہ کے سوا جو شریعت اور قانون بھی ہوگا اس پر اللہ کی جانب سے کوئی سلطان اور سند قبولیت نہ ہوگی۔ عملاً بھی غیر اللہ کی شریعت اور قوانین کو دلوں پر کوئی حکمرانی حاصل نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنے لئے جو قوانین خود بناتے ہیں ان کی کوئی وقعت عوام الناس کے دلوں میں نہیں ہوتی۔ ان قوانین کا نفاذ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ داروغہ سر پر کھڑا ہو یا جلاد کی تلوار سر پر ہو۔ رہی اللہ کی شریعت تو لوگ اس کے سامنے نہایت ہی عاجزی سے سر تسلیم خم کرتے ہیں اور ان کے دل مائل باطاعت ہوتے ہیں۔ دلوں کے اندر شریعت کے خلاف ورزی کا خوف ہوتا ہے اور اللہ کی سزا کا ڈر نظروں میں ہوتا ہے۔ لیکن یہودی جن کے دل شعور ایمان سے محروم تھے انہوں نے حضرت موسیٰ ﷺ کو اللہ کی جانب سے دی گئی الواح شریعت کے ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ اس مقام پر پھر ان پر اللہ کا غضب آتا ہے، اس لئے کہ وہ اپنی فطرت اور اپنے مزاج کے اعتبار سے اس کے لائق تھے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ایک عظیم چٹان ان کے سروں پر لٹک رہی ہے۔ یوں نظر آتا تھا کہ ابھی ان کے سروں پر گری کہ گری۔ وہ چونکے، فوراً انہوں نے اس شریعت کو تسلیم کرنے کا اقرار کیا اور وعدہ کر لیا۔ پختہ میثاق طے ہو گیا۔ اور بڑی بڑی یقین دہانیوں کے ساتھ طے ہو گیا۔ حالانکہ پہلے وہ نہ تسلیم کرنے تھے نہ عہد کرنے کیلئے تیار تھے اور نہ ہی اس عہد قدیم کو لینے کیلئے تیار تھے .... اللہ تعالیٰ یہاں انہیں ان کی اس صفت قدیمہ کو یاد دلاتے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ اس منظر میں ایک سخت پتھر جو ان کے سروں پر لٹک رہا تھا اور دوسری طرف ان کے سینوں میں سخت پتھر کی طرح دل رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس منظر میں ان دو قسم کے پتھروں کے درمیان مناسبت پیدا کر دی گئی ہے۔ اس طرح انداز تعبیر پختہ، متعین اور مجسم ہو جاتا ہے۔ جس طرح قرآن کریم کا عمومی انداز تعبیر ہے کہ وہ مجرد ذہنی مفاہیم کو حسی اور جسمانی شکل دیدیتا ہے۔ (دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن۔) یہ میثاق کیا تھا یہ کہ وہ بیت المقدس میں سجدہ ریز ہو کر داخل ہوں اور یہ کہ وہ سبت کا احترام کریں جسے خود ان کے مطالبے پر ان کیلئے خوشی کا دن بنایا گیا تھا۔

لیکن ہوا کیا؟ پتھر لٹکنے کے خوف و ہراس کے غائب ہوتے ہی اور اس قاہرانہ فضا کے ختم ہوتے ہی ان کے قدم پھسل گئے اور فخر سے یہ کہنے لگے کہ ہمارے دل تو کسی نصیحت سے متاثر نہیں ہوتے۔ وہ مردوں میں ہیں اور ان تک کوئی بات پہنچتی ہی نہیں ہے کیونکہ ان کے دروازے بند ہیں۔ اور یہ کہنے کے بعد انہوں نے ان تمام برے افعال کا ارتکاب کیا جس کی تفصیلات اللہ میاں یہاں نبی ﷺ کو بتاتے ہیں۔ یہ یہاں اس لئے گنوائے گئے ہیں تاکہ حضور ﷺ یہودیوں کو ذرا آئینہ دکھا دیں کہ وہ ہیں کیا؟

(فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ (٤ : ١٥٥)) آخر کار ان کے عہد شکنی کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ کی آیات

کو جھٹلایا اور متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا اور یہاں تک کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں ـ........... ان کی اس بات پر کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں ـ"(قُلُوبُنَا غُلْفٌ (٤: ١٥٥)) ان پر تنقید ختم ہوتی ہے اور اگلی آیت میں ان کی اس بات کا جواب دیا جاتا ہے ـ وہ یہ بات اس وقت کہتے تھے جب حضور ؐ ان پر دعوت اسلامی پیش کرتے ـ یہ لوگ یہ جواب یا تو اس لئے دیتے تھے کہ حضور ؐ ان سے مایوس ہو جائیں اور آئندہ ان پر دعوت پیش نہ کریں اور یا وہ حضور ؐ کی جانب سے تبلیغ پر آپ کے ساتھ بطور مزاح یہ بات کرتے تھے اور آپ کی دعوت کو رد کرکے گویا وہ بڑے لوگ بننے کی کوشش کرتے تھے کہ ہم تو ان باتوں پر کان ہی نہیں دھرتے ـ یہ دونوں باتیں ہی ان کے پیش نظر ہو سکتی ہیں' بہرحال اللہ کا جواب یوں آتا ہے ـ

(بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (٤: ١٥٥)) (حالانکہ درحقیقت ان کی باطل پرستی کے سبب سے اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں.....) مطلب یہ ہے کہ ان کے دل ملفوف نہیں ہیں' بلکہ وہ دعوت اسلامی کا انکار اس لئے کر رہے ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے ـ یہ ٹھپہ بھی ان کے دلوں پر اس لئے لگایا گیا ہے کہ انہوں نے کفر کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے اس لئے ان کے دل سخت ہو گئے ہیں' وہ جمادات کی طرح ہو گئے ہیں' اور کفر کے نیچے دب گئے ہیں ـ انہیں ایمان کی تروتازگی کا کوئی احساس ہی نہیں ہوتا' ان کے اندر ایمان کی مٹھاس کی حس ہی نہیں رہی ہے ـ اس لئے شاذ و نادر ہی یہ ایمان قبول کرتے ہیں ـ یہ شاذ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مذکورہ بالا افعال بد کا ارتکاب نہ کیا تھا' اسی لئے ان کے دلوں پر مہر نہیں لگائی گئی تھی ـ یعنی وہ لوگ جنہوں نے اپنے دلوں کے دروازوں کو قبول حق کیلئے کھلا رکھا اور حق کو قبول کرکے عزت دار بن گئے ـ ان کو اللہ نے ہدایت دی اور ایمان نصیب کیا ـ یہودیوں میں سے ایسے لوگ بہت ہی کم تھے بلکہ کم سے کم' مثلاً عبداللہ بن سلام' ثعلبہ ابن سعیہ' اسد ابن سعیہ اور اسد ابن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ـ

اس تنقید اور استدراک کے بعد' اللہ تعالیٰ ان اسباب کو گنواتے ہیں جن کی وجہ سے یہ یہودی اس سلوک کے مستحق ہوئے جو ان کے ساتھ کیا گیا ـ دنیا میں ان پر بعض نہایت ہی پاک چیزوں کو حرام قرار دے دیا گیا' آخرت میں ان کیلئے آگ کا عذاب تیار کیا گیا تاکہ وہ آخرت اور قیامت آنے سے پہلے ہی اس کا انتظار کریں ـ

(وَّ بِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا (١٥٦) وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ (١٥٧)(٤: ١٥٦ـ١٥٧)) (پھر اپنے کفر میں یہ اتنے بڑھے کہ مریم پر سخت بہتان لگایا' اور خود کہا کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم' رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے ـ)..... جب بھی ان کے برے افعال میں سے کسی بات کا ذکر کیا جاتا ہے قرآن کریم ان کی صفت کفر کو ضرور ساتھ لاتا ہے ـ قتل انبیاء کے ذکر کے وقت بھی یہ صفت دہرائی گئی کہ انہوں نے انبیاء کو ناحق قتل کیا' انبیاء کا قتل جب بھی ہوا ناحق ہی ہوا ـ ناحق کا لفظ بطور حقیقت واقعہ لایا گیا ہے ـ اسی طرح جہاں اس بات کا ذکر ہوا کہ انہوں نے حضرت مریم علیہا السلام پر عظیم بہتان باندھا وہاں بھی اس صفت کا ذکر ہوا ـ مریم پر انہوں نے جو بہتان باندھا اس کے قائل صرف یہودی تھے ـ انہوں نے مریم پر یوسف

نجار کے ساتھ زنا کرنے کا الزام باندھا (ان پر خدا کا غضب ہو!) اس کے بعد انہوں نے یہ ڈینگ ماری کہ انہوں نے حضرت مسیح کو سولی پر چڑھایا اور طنزاً یہ کہا کہ "انہوں نے مسیح ابن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے۔"

یہاں تک آکر سیاق کلام ایک بار پھر رک جاتا ہے اور ان کے اس دعوے کی لگے ہاتھوں تردید کر دی جاتی ہے۔ اور سچائی کو ثابت اور مستحکم کر دیا جاتا ہے۔

(وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا (۱۵۷) بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۱۵۸)(٤:۱۵۷-۱۵۸)) "حالانکہ فی الواقع انہوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان کیلئے مشتبہ کر دیا گیا اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں۔ ان کے پاس اس معاملے میں کوئی علم نہیں ہے محض گمان ہی کی پیروی ہے۔ انہوں نے مسیح کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا' اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔"...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے معاملے میں اہل یہود سخت خبط میں پڑے ہوئے تھے اور خود عیسائیوں کو بھی اس بارے میں سخت غلط فہمی لاحق تھی۔ یہودی یہ کہتے تھے "ہم نے عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ" کو قتل کر دیا ہے۔ لفظ رسول اللہ وہ حضرت عیسیٰ کے لئے بطور مزاح استعمال کرتے تھے۔ اور عیسائیوں کا کہنا یہ تھا "انہیں سولی پر چڑھایا گیا اور دفن کر دیا گیا لیکن تین دنوں کے بعد آپ دوبارہ اٹھ گئے۔" اور ان کی تاریخ حضرت مسیح کی ولادت اور وفات سے اس طرح خاموش ہے کہ شاید اس واقعہ کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ ان دونوں فریقوں نے اس عظیم واقعہ کے بارے میں وثوق کے ساتھ کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس لئے کہ یہ واقعات بہت ہی تیزی سے وقوع پذیر ہوتے رہے اور نظروں سے اوجھل ہوتے رہے۔ مختلف روایات پھیلتی رہیں اور سچ اور جھوٹ ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ ہوگئے۔ کوئی بات یقین کے ساتھ کوئی نہ کہہ سکتا تھا' نہ کسی نے کی' لہذا صرف وہی بات یقینی ہے جو اللہ رب العالمین نے فرمائی۔

جن چار مروجہ اناجیل کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کا قصہ بیان ہوا ہے' آپ کی موت اور سولی پر چڑھانے کا جو قصہ اور پھر دفن کرنے اور پھر اٹھنے کا جو قصہ بیان ہوا ہے' یہ تمام واقعات حضرت عیسیٰ کے اٹھائے جانے کے بہت ہی بعد کے ادوار میں لکھے گئے ہیں۔ اس دور میں حضرت مسیح کے شاگردوں پر مظالم ہوتے رہے اور دین مسیح کو دبایا جاتا رہا۔ اس خوف' رازداری اور تشدد اور جلاوطنی کی فضا میں یہ بات نہایت ہی مشکل تھی کہ کوئی صحیح اور تحقیقی بات لکھی جا سکے۔ اس دور میں بے شمار انجیلیں لکھی گئیں۔ جبکہ ۲۰۰ء کے آخر میں جا کر ان میں سے ان مروجہ چار کو منتخب کیا گیا۔ ان کو سرکاری اناجیل قرار دیا گیا۔ اور ان کو سرکاری اناجیل قرار دینے کے بھی بعض خاص مقاصد تھے اور شک و شبہ سے بالاتر نہ تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جو اناجیل تحریر ہوئیں ان میں سے ایک انجیل برناباس بھی تھی۔ یہ انجیل ان چار منتخب اور تسلیم شدہ اناجیل سے مختلف تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے واقعہ کے بارے میں یہ انجیل کہتی ہے۔

"جب سپاہی یہوداہ کے ساتھ اس جگہ پہنچے 'جہاں یسوع تھا' تو مسیح نے جم غفیر کو پاس آتے سنا اور وہ گھر کے ایک گوشے میں ڈر کر سمٹ گیا' گیارہ شاگرد (بدستور) سو رہے تھے' جب خدائے تعالیٰ نے دیکھا کہ اس کا بندہ (یسوع) خطرے میں ہے تو اس نے اپنے فرشتوں 'جبرئیل' میکائیل' رفائیل اور اوریل کو حکم دیا کہ وہ یسوع کو دنیا سے نکال لائیں' پاکیزہ فرشتے آئے اور وہ یسوع کو اس کھڑکی سے 'جس کا رخ جنوب کی طرف تھا' نکال کر اور اٹھا کر لے گئے اور اسے تیسرے آسمان میں ان فرشتوں کی صحبت میں لے جا کر رکھ دیا' جو تاابد اللہ کی تسبیح کرتے ہیں' یہوداہ وقت کے ساتھ اسی کھڑکی سے گھر میں داخل ہوا' جس سے یسوع کو اٹھا لیا گیا تھا مسیح کے شاگرد سب کے سب (اب بھی) سو رہے تھے' اب عجیب و غریب خدا نے ایک عجیب و غریب کام کیا اور وہ یہ کہ یہوداہ کی بولی اور اس کا چہرہ دونوں بدل گئے اور وہ یسوع کی طرح ہو گیا یہاں تک کہ ہمیں یقین ہو گیا کہ وہی یسوع ہے۔ یہوداہ ہمیں جگانے کے بعد ڈھونڈنے لگا تاکہ معلوم کرے کہ "استاد" (یسوع) کہاں ہے' ہمیں اس پر حیرت ہوئی اور ہم نے اس سے کہا: اے ہمارے آقا! تو ہی تو ہمارا استاد ہے' کیا تو نے ہمیں اس وقت بھلا دیا ہے..."

غرض عیسائیوں کے پاس موجودہ ریکارڈ سے کوئی ایسا شخص جو اس معاملے میں تحقیق کرنا چاہے کوئی قابل یقین اور پختہ بات نہیں پاتا اس لئے کہ یہ واقعہ صبح صادق سے پہلے رات کی تاریکی میں پیش آیا تھا۔ بعد میں آنے والے لوگوں نے جو دلائل پیش کئے وہ روایت در روایت پر مبنی تھے۔ قرآن کریم اس بارے میں کہتا ہے۔

(وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ، مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ، وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا (١٥٧) بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ، وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (١٥٨) (٤: ١٥٧ — ١٥٨)) "اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں۔ ان کے پاس اس معاملے میں کوئی علم نہیں ہے محض گمان ہی کی پیروی ہے۔ انہوں نے مسیح کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا' اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔"

اور اس سے قبل قرآن کریم نے فیصلہ کن انداز میں فرمایا۔ (وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (٤: ١٥٧)) (حالانکہ انہوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان کیلئے مشتبہ کر دیا گیا۔)

قرآن کریم یہاں رفع عیسیٰ علیہ السلام کی تفصیلات نہیں دیتا کہ آیا یہ رفع جسمانی تھا یا روحانی تھا۔ بحالت حیات تھا' یا فقط روحانی بعد الوفات تھا اور یہ کہ یہ توفی کب واقعہ ہوئی اور کہاں ہوئی لیکن قرآن یہ کہتا ہے کہ انہوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ ہی اسے سولی پر چڑھایا۔ یہ قتل اور سولی پر چڑھانے کا فعل اس شخص کے ساتھ ہوا جس کے بارے میں انہیں اشتباہ میں ڈال دیا گیا تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اس کے سوا قرآن کریم یہاں مزید کچھ تفصیل نہیں بتاتا۔ البتہ دوسری

سورہ (سورہ آل عمران) میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ (يٰعِيْسٰى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ) (اے عیسیٰ میں تجھے واپس لے لوں گا اور تجھ کو اپنی طرف اٹھالوں گا۔) اس آیت میں بھی اٹھائے جانے اور واپس لے لینے (وفات) کی تفصیلات نہیں دی گئیں نہ اس توفی کا وقت دیا گیا ہے اور نہ ہی "توفی" کی نوعیت بتائی گئی ہے۔ظلال القرآن میں ہم نے جو طریقہ اختیار کیا ہے ہم بھی اس میں قرآن کریم کے سائے میں رہتے ہوئے تفصیلات میں نہیں جاتے اس لئے کہ کیفیت توفی پر ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔نہ اب تفصیلات کیلئے کوئی سبیل ہے۔محض اقاویل و اساطیر نقل کرنے کا فائدہ ہی کیا ہو گا۔

اب ہم واپس اصل موضوع کی طرف آتے ہیں اور قرآن کریم نے اہل کتاب پر جو استدراک کیا ہے اس کی طرف لوٹتے ہیں۔

(وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (۴: ۱۵۹)) "اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے گا اور قیامت کے روز وہ ان پر گواہی دے گا۔" اس آیت کے مفہوم میں سلف صالحین کے اندر اختلاف رائے رہا ہے۔ اس اختلاف کے پیدا ہونے کی وجہ یہ رہی ہے کہ "موتہ" میں جو ضمیر ہے اس کے مرجع میں اختلاف ہوا ہے۔ اگر اس کا مرجع حضرت عیسیٰ ہوں تو مفہوم یہ ہو گا کہ اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہو گا جو حضرت عیسیٰ کی موت سے قبل حضرت عیسیٰ پر ایمان نہ لائے گا۔اس صورت میں یہ حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ کا نزول ہو گا....... دوسری تعبیر کے مطابق "موتہ" کی ضمیر کا مرجع اہل کتاب ہیں۔یعنی یہ کہ اہل کتاب میں سے ہر شخص اپنی موت سے قبل حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے گا۔وہ یوں کہ موت سے قبل سکرات الموت کے اندر ہی میت پر حق واضح ہو جاتا ہے لیکن اس وقت اگر کوئی ایمان لے آئے تو اس کے لئے وہ ایمان مفید نہیں ہوتا۔

میرے خیال میں یہ دوسرا قول زیادہ قابل ترجیح ہے اور اس کی طرف حضرت ابی کی قرات بھی اشارہ کر رہی ہے۔ (اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهِمْ (۴: ۱۵۹)) (اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہو گا جو ان کی موت سے قبل اس پر ایمان نہ لائے۔) اس قرات کے مطابق اس ضمیر کا مرجع صرف اہل کتاب ہی ہو سکتے ہیں۔اس صورت میں مفہوم یہ ہو گا کہ جو یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرتے ہیں اور اب تک وہ اپنے اس موقف پر قائم ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انہوں نے ان کو قتل کر دیا ہے اور سولی پر چڑھایا ہے ان میں سے جو بھی موت پائے گا اسی وقت اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی (یعنی بوقت نزع) کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو حق پر ہیں ان کی رسالت برحق ہے۔ تو وہ حالت نزع میں حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے گا لیکن اس وقت تو ایمان لانا مفید نہیں ہوتا۔قیامت کے دن حضرت عیسیٰ ان پر خود گواہ ہوں گے۔

یہاں آکر قصہ صلیب ختم ہو جاتا ہے۔اس کے بعد یہودیوں کے دیگر منکرات کا ذکر شروع ہوتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کے ان منکرات پر اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ان کو کیا سزا دی اور آخرت میں ان کیلئے کیا کچھ تیار ہے۔

(فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَٰتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَن سَبِيلِ اللَّهِ
كَثِيرًا (١٦٠) وَّأَخْذِهِمُ الرِّبَوٰا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَٰلَ النَّاسِ بِالْبَٰطِلِ ۚ
وَأَعْتَدْنَا لِلْكَٰفِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (١٦١)(٤: ١٦٠ – ١٦١))

"غرض ان یہودیوں کے اسی ظالمانہ رویے کی بناء پر اور اس بنا پر کہ یہ بکثرت اللہ کے راستے سے روکتے ہیں' اور سود لیتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں' ہم نے بہت سی وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کیلئے حلال تھیں' اور جو لوگ ان میں سے کافر ہیں ان کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔"...... چنانچہ اس آیت کے ذریعے ان کے سابقہ منکرات میں کچھ مزید منکرات کا اضافہ کر دیا گیا۔ اور یہ بتا دیا گیا کہ اللہ کی راہ میں سے لوگوں کو روکنے کے سوا ان کا اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ گویا وہ رات دن ایسی کام میں لگے ہوئے ہیں۔ نیز یہ رات دن سودی کاروبار میں لگے رہتے ہیں اور یہ کام وہ محض کم علمی کی وجہ سے نہیں کر رہے یا یہ کہ انہیں اس سلسلے میں متنبہ نہیں کیا گیا' بلکہ انہیں صاف الفاظ میں اس سے روکا گیا تھا لیکن انہوں نے پھر بھی اس پر اصرار کیا اور لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھاتے رہے۔ یہ ربا کے ذریعے بھی کھاتے رہے اور دوسرے ذرائع سے بھی۔

ان منکرات اور اس سے پہلی سورتوں میں مذکورہ جرائم کی وجہ سے اللہ نے ان پر بعض حلال چیزوں کو حرام کر دیا جو ان کیلئے حلال تھیں اور یہ کہ اللہ نے کافروں کیلئے سخت دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

یہودیوں کے خلاف اس مہم میں یہودیوں کے چہرے سے نقاب اتار کر پھینک دیا گیا' اور ان کی تاریخ سے بعض واقعات بھی پیش کیے گئے تاکہ معلوم ہو کہ ان کی تاریخ کیا ہے۔ ان کی بہانہ سازیوں اور ان کی ہٹ دھرمی کا پردہ چاک کیا گیا اور یہ بتایا گیا کہ وہ کسی طرح مان کر دینے والے نہیں ہیں اور یہ کہ انہوں نے اپنے قائد' اپنے نجات دہندہ اور اپنے عظیم نبی کے ساتھ یہی رویہ اختیار کیے رکھا۔ ان کی عادت یہ رہی ہے کہ وہ ہمیشہ صالحین اور انبیاء کے ساتھ برے سلوک اور ان کے خلاف بدگوئی کرنے میں بہت ہی جری و سریع رہے ہیں۔ وہ انبیاء کو بھی قتل کرتے رہے ہیں اور پھر ندامت کے بجائے اس قتل پر فخر کرتے رہے ہیں۔ ان جملوں کے نتیجے میں' یہودیوں کے مکر و فریب کا جال تار تار ہو گیا جو انہوں نے اسلامی صفوں کے خلاف بچھا رکھا تھا۔ ان کی سازشیں ناکام ہو گئیں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کی خفیہ دوستیاں کٹ گئیں۔ یوں اہل اسلام نے یہودیوں کے اصل مزاج کو اچھی طرح جان لیا۔ اسلام کے خلاف ان کی سازشوں اور ان میں استعمال ہونے والے وسائل و ذرائع کو پہچان لیا۔ اس بات کا انہیں علم ہو گیا کہ وہ کس طرح ہر سچائی کے مقابلے میں جتھہ بندی کر لیتے ہیں چاہے یہ سچائی خود ان کے اندر ان کی اپنی صفوں سے اٹھے یا ان سے باہر دوسری اقوام کے اندر پائی جائے۔ اس لئے کہ وہ ہمیشہ سچ اور اہل حق کے دشمن رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ ہدایت اور ہادیوں کی بیخ کنی کرتے رہے ہیں۔ ہر دور میں اور ہر زمانے میں وہ یہ کام کرتے رہے ہیں۔ اپنے دشمنوں کے ساتھ تو ان کا یہ رویہ بہرحال تھا ہی' وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بھی یہی کچھ کرتے رہے ہیں' اس لئے ہر دور میں ہر اسلامی تحریک اور اسلامی سوسائٹی کا یہ فرض ہے کہ وہ یہودیوں سے چوکنا رہے اس لئے کہ ان کی جبلت ہی ایسی ہے کہ وہ ذاتی طور پر سچائی کے دشمن ہیں۔ ان کے دل کے

اندر حق کی دشمنی بھری ہوئی ہے۔ ان کے کلیجے سخت ہوگئے ہیں۔ وہ اپنے سر صرف اس شخص کیلئے جھکاتے ہیں جو ان پر ڈنڈے برسائے اور وہ سچائی کو تب تسلیم کرتے ہیں جب ان کے سروں پر تلوار لٹک رہی ہو۔

اس قسم کے لوگوں کا یہ تعارف صرف اس جماعت اسلامی کیلئے نہ تھا جو مدینہ طیبہ میں کام کر رہی تھی اس لئے کہ قرآن اس امت کے لئے گائیڈ ہے جب تک کہ یہ امت موجود رہے گی۔ اگر قرآن سے یہ امت اپنے دشمنوں کے بارے میں ہدایات لینا چاہے تو اس میں اسے ہدایات مل جائیں گی۔ اس سے جب بھی یہ امت کوئی نصیحت لینا چاہے یہ کتاب اسے نصیحت دیتی ہے۔ اس کتاب نے امت کو یہودیوں کے بارے میں ہدایت دی۔ نصیحت کی اور فہم دیا تو اس کے نتیجے میں یہودیوں کی گردنیں مسلمانوں کے مقابلے میں جھک گئیں۔ جب اس امت نے قرآن مجید کو چھوڑا تو یہ امت یہودیوں کی غلام بن گئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ امت پوری طرح جمع ہوتی ہے اور یہودیوں کی ایک مختصر جمعیت اس پر غالب آجاتی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ اپنی کتاب اور گائیڈ بک سے غافل ہے۔ وہ قرآن کی ہدایات سے دور بھاگ رہی ہے۔ اس نے اسے پس پشت ڈال دیا ہے۔ اور یہ امت فلاں اور فلاں کے اقوال کی اطاعت کر رہی ہے۔ یہ امت اسی طرح یہودی سازش کا شکار رہے گی اور اسی طرح وہ یہودیوں کے عتاب میں رہے گی جب تک وہ قرآن کی طرف نہیں لوٹتی۔

یہ بیان اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک یہودیوں میں سے نکل کر آنیوالے بعض اچھے لوگوں کی حوصلہ افزائی نہیں کر دی جاتی اور ان کی جسارت رندانہ کی تعریف کی جاتی ہے کہ چھلانگ لگا کر نکل آئے اور سچائی کو قبول کر لیا۔ قرآن کریم ان لوگوں کے علم و ایمان کی تصدیق کرتا ہے جن کی وجہ سے وہ اہل اسلام میں داخل ہوئے اور رسول اللہ ؐ پر نازل شدہ دین کو قبول کیا۔ یہ علم وہ تھا جو رسول اللہ ؐ پر اترا اور جو آپ سے قبل انبیاء پر اترا تھا۔ وہ اس علم میں زیادہ رسوخ رکھتے تھے جس کی وجہ سے ایمان لے آئے۔

لَكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾

مگر ان میں جو لوگ پختہ علم رکھنے والے ہیں اور ایماندار ہیں وہ سب اس تعلیم پر ایمان لاتے ہیں جو اے نبی ' تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھی۔ اس طرح کے ایمان لانے والے اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی کرنیوالے اور اللہ اور روز آخرت پر سچا عقیدہ رکھنے والے لوگوں کو ہم ضرور اجر عظیم عطا کریں گے۔

غرض پختہ علم اور اس پر روشن ایمان انسان کو اسی طرح ہدایت دیتے ہیں کہ انسان پورے دین پر ایمان لانے والا بن جاتا ہے۔ انسان اپنے علم کی پختگی اور صاف ایمان کی وجہ سے اس نتیجے تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ دین اللہ وحدہ کی طرف سے آیا ہے اور یہ کہ اپنے مزاج کے اعتبار سے دین ایک ہی ہے۔

قرآن کریم کی جانب سے یہ اشارہ دینا کہ علم کی گہرائی کے نتیجے میں صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے اور دل کے دروازے نور ایمان کے لئے کھل جاتے ہیں' نزول قرآن کے دور میں نہایت ہی معنی خیز ہے۔ یہ قرآن کریم کے اشارات میں سے ایک اہم اشارہ ہے اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کریم کے نزول کے زمانے میں صورت حال کیا تھی۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں نفس انسانی کی صورت حال کیا ہوتی تھی۔ سطحی علم کی مثال اس طرح ہوتی ہے جس طرح کفر اور انکار۔ یہ کفر اور انکار ان کے دل کے اندر صحیح معرفت کے اترنے میں حائل ہوجاتے ہیں۔ ہر دور میں یوں ہوتا ہے کہ سطحی علم کی وجہ سے حقیقت کی معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ جو لوگ علم میں گہرائی تک چلے جاتے ہیں اور انہیں حقیقی علم حاصل ہو جاتا ہے تو ان کی آنکھوں کے سامنے شواہد آجاتے ہیں جو اس کائنات کے اندر پنہاں ہیں۔ اگر ان کے سامنے شواہد نہیں آتے تو کم از کم ایسے سوالات آجاتے ہیں جن کا جواب ان کے پاس نہیں ہوتا اور محض کسی سماوی نظریہ حیات کو قبول کرکے ہی وہ ان سوالات کے جواب سے جان چھڑا سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کائنات کا ایک الٰہ ہے۔ وہ اس پر حاوی ہے' اس کا مدبر ہے' اور اس پر پوری طرح متصرف ہے۔ اس کا ایک ہی ارادہ ہے۔ اس نے اس کائنات کے اندر یہ ناموس اعظم جاری کیا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جن کے دل ہدایت کیلئے بے تاب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر راز کھول دیتے ہیں اور ان کی روح ہدایت کو پالیتی ہے۔ وہ لوگ جو ادھر ادھر سے کچھ معلومات چن لیتے ہیں اور اپنے آپ کو علماء سمجھنے لگتے ہیں' ان کے اس سطحی علم کا پردہ ان کے اور ان دلائل ایمان کے درمیان حائل ہو جاتا ہے جو اس کائنات میں پوشیدہ ہوتے ہیں' اس لئے وہ ایمان تک نہیں پہنچ پاتے۔ ان پر ایمان ظاہر ہی نہیں ہوتا' اس لئے کہ ان کا علم ناقص اور سطحی ہوتا ہے اور یہ سطحی علم اس کائنات کے سوالات کا ادراک نہیں کرسکتا۔ ان کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ ان کے دل مائل بہ ایمان وہدایت نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ اس کے شائق ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ جس دل میں ہوں وہ ایمان کا ذوق نہیں رکھتا اور نہ اسے نور ایمان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر وہ ایمان رکھتا ہے تو اس دین پر رکھتا ہے جو اسے بطور عصبیت جاہلیہ وراثت میں ملا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اس دین سے دور ہو جاتا ہے جو خدائے متعال کی جانب سے نازل ہوا ہے اور جسے سلسلہ رسل کے ذریعے بھیجا گیا ہے۔ جس کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں صلی اللہ علیہم وسلم اجمعین۔

تفسیر ماثور میں یہ روایات آئی ہیں' کہ یہ اشارہ سب سے پہلے ان لوگوں کی طرف ہے جو لوگ یہودیوں میں سے اپنے رسوخ فی العلم کی وجہ سے ہدایت پاگئے تھے۔ جنہوں نے رسول کی دعوت پر لبیک کہا اور جن کے نام ہم نے گذشتہ سطور میں دے دیئے ہیں لیکن یہ آیت عام ہے اور اس کے مفہوم میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو کبھی بھی اپنے رسوخ فی العلم کی وجہ سے اس دین میں شامل ہوں گے یا وہ اپنی ایمانی بصیرت کی وجہ سے دین اسلام کو قبول کرلیں گے ہیں خواہ تاریخ کے کسی بھی دور میں ہوں۔ ((مثلاً ڈاکٹر محمد اسد' حقیقت حال اللہ ہی جانتا ہے۔))

(لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰۗئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا (٤:١٦٢))

مگر ان میں سے جو لوگ پختہ علم رکھنے والے ہیں اور ایماندار ہیں وہ سب اس تعلیم پر ایمان لاتے ہیں جو اے نبی' تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھی - اس طرح کے ایمان لانے والے اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی کرنیوالے اور اللہ اور روز آخرت پر سچا عقیدہ رکھنے والے لوگوں کو ہم ضرور اجر عظیم عطا کریں گے -

(الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ) جو اگلی پچھلی کتابوں پر ایمان لاتے ہیں اور ایمان لانے والے اور اقامت صلوٰۃ کرنے والے' یہ صفات اہل ایمان مسلمانوں کی ہیں اس لئے کہ مسلمانوں کی صفت عظیمہ ہی اقامت صلوٰۃ' ایتائے زکوٰۃ' ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہے - ان دونوں کیلئے اجر کا اعلان ہوتا ہے کہ ان کو ہم اجر عظیم عطا کریں گے -

یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کے والمقیمین میں عطف المومنوں پر ہے - جبکہ المومنوں کا اعراب رفعی ہے - اس لحاظ سے والمقیمون ہونا چاہئے - لیکن اسے اعراب حالت نصبی کا دیا گیا یعنی اخص المقیمین (میں نماز قائم کرنیوالوں کا ذکر خصوصیت سے کرتا ہوں -) یہ اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ اقامت صلوٰۃ کی اہمیت دین میں کس قدر عظیم ہے - اس طرز ادا کے نظائر کلام عرب اور قرآن مجید میں بالعموم پائے جاتے ہیں اور اس سے سیاق کلام میں کسی بات کی تائید مطلوب ہوتی ہے - عام قراءت تو یہی ہے - البتہ ایک قراءت والمقیمون بھی آتی ہے اور یہ عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں وارد ہے -

---ooo---

سیاق کلام کی مناسبت سے اہل کتاب کے ساتھ مکالمہ جاری ہے اور اس جگہ یہ بات بالخصوص یہودیوں کے ساتھ ہو رہی ہے - یہ بات حضرت محمد ؐ کی رسالت کے بارے میں ہو رہی ہے جس کی وہ تکذیب کرتے تھے - اسی طرح وہ اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق کرتے تھے اور اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے رسول اللہ ؐ سے نشانات و معجزات کا مطالبہ کرتے تھے - مثلاً یہ کہ آپ آسمان سے ایک کتاب اتار کر لائیں .... چنانچہ یہاں کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد ؐ پر وحی کا آنا کوئی نئی بات نہیں ہے نہ یہ کوئی اعجوبہ ہے - رسول بھیجنا تو اللہ کی سنت ہے اور اس سنت پر اللہ تعالیٰ حضرت نوح سے لیکر حضرت محمد ؐ کے دور تک عمل پیرا رہے ہیں - یہ سب رسول' اللہ نے خوشخبری دینے اور ڈرانے کیلئے بھیجے ہیں - یہ اپنے بندوں کے ساتھ اللہ کی شفقت اور رحمت کا تقاضا تھا - نیز اللہ تعالیٰ نے رسول اس لئے بھی بھیجے کہ وہ اپنے بندوں پر حجت تمام کرنا چاہتا تھا اور یوم الحساب آنے سے پہلے انہیں خبردار اور متنبہ کرنا چاہتا تھا - یہ سب حضرات ایک ہی وحی لیکر آئے - ان کا مقصد ایک تھا' اس لئے ان کے درمیان تفریق کرنا محض ضد اور ہٹ دھرمی ہے اور اس کی کوئی دلیل نہیں ہے - اگر وہ ضد اور ہٹ دھرمی کرکے انکار کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ خود اس پیغمبر کی وحی پر شاہد عادل ہے - اس

کی شہادت کے بعد اب کسی اور کی شہادت اور تصدیق کی ضرورت ہی نہیں رہتی ۔ اور اس اللہ کی گواہی پر پھر فرشتے بھی گواہ ہیں ۔ فرماتے ہیں ۔

إِنَّآ أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ كَمَآ أَوۡحَيۡنَآ إِلَىٰ نُوحٖ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ
بَعۡدِهِۦۚ وَأَوۡحَيۡنَآ إِلَىٰٓ إِبۡرَٰهِيمَ وَإِسۡمَٰعِيلَ وَإِسۡحَٰقَ وَيَعۡقُوبَ
وَٱلۡأَسۡبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيۡمَٰنَۚ وَءَاتَيۡنَا
دَاوُۥدَ زَبُورٗا ﴿١٦٣﴾ وَرُسُلٗا قَدۡ قَصَصۡنَٰهُمۡ عَلَيۡكَ مِن قَبۡلُ وَ
رُسُلٗا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَيۡكَۚ وَكَلَّمَ ٱللَّهُ مُوسَىٰ تَكۡلِيمٗا ﴿١٦٤﴾ رُّسُلٗا مُّبَشِّرِينَ
وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى ٱللَّهِ حُجَّةُۢ بَعۡدَ ٱلرُّسُلِۚ وَكَانَ
ٱللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمٗا ﴿١٦٥﴾

"اے نبی! ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوح علیہ السلام اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی ۔ ہم نے ابراہیم علیہ السلام ' اسماعیل علیہ السلام ' اسحاق علیہ السلام ' یعقوب علیہ السلام اور اولاد یعقوب علیہ السلام ' عیسی علیہ السلام ' ایوب علیہ السلام ' یونس علیہ السلام ' ہارون علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی ۔ ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور دی ۔ ہم نے ان رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا ۔ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے اس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے ۔ یہ سارے رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے اور اللہ بہرحال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے ۔"

غرض یہ ایک قافلہ ہے جو شاہراہ تاریخ پر چلتا ہوا نظر آتا ہے اور اس سلسلے کی کڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہیں ۔ یہ ایک ہی رسالت ہے اور اس کا ایک ہی نصب العین ہے کہ انسان کو قبل از وقت خبردار کر دیا جائے اور اچھے لوگوں کو قبل از وقت ہی اچھے انجام کی خوشخبری دیدی جائے ۔ اس قافلے میں آگے پیچھے مختاران درگاہ الٰہی اور انسانوں میں سے چیدہ لوگ آگے پیچھے چلے آرہے ہیں ۔ یہ رہے حضرت نوح علیہ السلام ' یہ رہے حضرت ابراہیم علیہ السلام ' یہ آئی سواری حضرت اسماعیل کی ۔ ان کے بعد یہ چلے آرہے ہیں حضرت اسحاق علیہ السلام ان کے بعد متصلاً حضرت یعقوب آرہے ہیں ۔ اب

کچھ مختلف گروہ نمودار ہوئے۔ حضرت ایوب علیہ السلام ' یونس علیہ السلام ' ہارون علیہ السلام ' سلیمان علیہ السلام ' داؤد علیہ السلام ' موسیٰ علیہ السلام ' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے۔ اپنی اپنی باری پر اور بعض ایسے لوگ بھی چلے آئے ہیں جن کے نام سے ہم واقف نہیں ہیں۔ آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین تشریف لا رہے ہیں اور اب اس قافلے کا آخری سرا اختتام کو پہنچا۔ اس قافلے میں بعض لوگ ایسے ہیں جن کا ذکر قرآن کریم نے پیش کیا۔ اس قافلے میں مختلف رنگوں اور مختلف نسلوں کے نبی ہیں اور کرۂ ارض کے مختلف علاقوں میں یہ قافلہ نظر آتا ہے۔ اور مختلف ادوار اور مختلف زمانوں میں ' مختلف معاشروں اور مختلف خاندانوں میں یہ رسول کام کرتے رہے۔ یہ سب ایک ہی مصدر اور منبع سے پیغام لاتے رہے۔ یہ سب راہ دکھانے والی ایک ہی روشنی کے حامل رہے۔ سب کے سب متنبہ اور خبردار کرتے رہے اور خوشخبری دیتے رہے۔ یہ سب کے سب قافلہ انسانیت کی زمام اپنے ہاتھ میں لیکر اسے نور ہدایت میں داخل کرتے رہے۔ چاہے کوئی کسی ایک خاندان کیلئے آیا ہو' چاہے کوئی کسی ایک قوم کیلئے آیا ہو' چاہے کوئی ایک شہر اور ایک علاقے کیلئے آیا ہو' چاہے کوئی تمام انسانوں کیلئے آیا ہو اور خاتم النبیین کا لقب پایا ہو۔

یہ سب کے سب اللہ وحدہ سے وحی پاتے رہے۔ ان میں سے کسی نے کوئی بات اپنی طرف سے پیش نہیں کی۔ ان میں سے اگر اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے براہ راست بات کی تو وہ بھی وحی کا ایک رنگ تھا۔ اس کیفیت سے ہم آگاہ نہیں ہیں نہ اس کا ادراک کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ قرآن کریم آخری وحی کا ریکارڈ ہے اور یہ اس قدر درست ریکارڈ ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے اور قرآن نے اس ہم کلامی کی کوئی تفصیل یا کیفیت بیان نہیں کی ہے۔ اس کی کیفیت کیا تھی؟ موسیٰ علیہ السلام اپنے کن خواص اور کس قوت ادراک سے اسے پا رہے تھے۔ یہ سب باتیں غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ قرآن کریم نے ان کے بارے میں کوئی بات بیان نہیں کی ہے۔ اور قرآن کریم کے علاوہ اس موضوع پر جو کوئی بھی اپنے ذہن سے بات کرے گا وہ بے سند' فلسفہ یا قصہ کہانی ہوگی۔

یہ رسول' جن میں سے بعض کے نام ذکر ہوئے اور بعض کے نام نہیں لئے گئے کیوں بھیجے گئے؟ اللہ کی شفقت اور رحمت اور عدالت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ رسول بھیجے۔ تاکہ وہ اللہ کے بندوں میں سے مومنین اور اطاعت کنندگان کو خوشخبری دیدیں کہ اللہ نے ان کیلئے کیا کیا نعمتیں تیار کی ہوئی ہیں۔ بے شمار نعمتیں اور اللہ کی رضامندی ان کے انتظار میں ہے۔ اور کافروں اور نافرمانوں کو ڈرائیں کہ اللہ کا غضب اور ایک دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔ اور یہ سب کچھ کیوں کیا گیا۔ (لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (٤: ١٦٥)) "تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے۔" اور یہ رسول لوگوں کو بتا دیں کہ انکے نفس اور انکے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کے اندر کیا کیا دلائل ہیں۔ انہیں بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے جنس بشر کو متاع عقل سے نوازا ہے اور ان کا فرض ہے کہ وہ اس کے ذریعے اپنے نفسوں اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کے اندر دلائل تلاش کریں۔ عقل کے ہوتے ہوئے بھی ان کے پاس رسول بھیجے گئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے بندوں پر خاص شفقت اور رحمت تھی کہ اس نے رسول بھیجے کیونکہ اسے معلوم تھا کہ انسان کی ذاتی خواہشات اور اس کے میلانات اس کی عقل پر غالب آجائیں گے اور ان کے نتیجے یہ عظیم قوت دب کر رہ جائے گی۔ اسی لئے اللہ نے اپنی رحمت خاصہ کے تحت ان کے پاس رسول بھیجے جو مبشرین اور منذرین تھے۔ وہ ان کے سامنے یاد دہانی کراتے رہے۔ انہیں بصارت اور بصیرت دیتے

رہے ۔وہ ان کی فطرت اور ان کی قوت عقلیہ کو شہوات نفسانیہ کے ڈھیروں کے نیچے سے نکال کر آزاد کراتے رہے ۔ جن ڈھیروں کے نیچے رہتے ہوئے اس کی عقل اور فطرت کیلئے دلائل ہدایت اور ایمان کے تقاضوں کو پانا مشکل ہو گیا تھا۔ چاہے یہ دلائل خود نفس انسانی کے اندر ہوں یا اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی اس کائنات کے اندر ہوں ۔

(وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (٤: ١٦٥)) "اور اللہ بہرحال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے ۔" وہ غالب اس طرح ہے کہ اس کے بندے جب جرائم کا ارتکاب کریں ان پر وہ گرفت کر سکتا ہے ۔حکیم و دانا اس طرح ہے کہ وہ اس کائنات کے تمام امور کو اپنی حکمت کے مطابق چلاتا ہے ۔ ہر معاملے کو اپنی جگہ پر طے کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کیلئے جو تقدیرات اور جو اندازے طے کئے ہیں وہ سب حکمت اور اپنی مشیت کے مطابق کئے ہیں ۔

---ooo---

اب ذرا اس منظر کے سامنے رکئے ! (لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (٤: ١٦٥)) "تاکہ ان رسولوں کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے ۔" اس منظر میں تو ہدایات و اشارات کا ایک ذخیرہ پنہاں ہے ۔گہرے اشارے اور واضح ہدایات ۔ہم ان میں سے دو تین کا ذکر کرتے ہیں اور وہ بھی ظلال القرآن کی مناسبت سے نہایت ہی مختصر۔

اس آیت سے پہلی بات جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ نظام دین میں انسانی عقل کا مقام کیا ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ اور انسان کے اہم ترین مسائل مثلاً مسئلہ ایمان کے سلسلے میں عقل کی اہمیت کیا ہے؟ اس لئے کہ ایمان کی بنیادوں پر لوگوں کی زندگی کا نظام استوار ہونا تھا۔اور زندگی کے تمام عناصر' اس کے تمام رجحانات 'اس کی پوری عملی شکل اور اس کی کائنات میں اس کے تمام تصرفات کو ایمانی نظریے پر استوار ہونا تھا' جس طرح عالم آخرت میں اس کا انجام تمام کا تمام اس ایمان پر موقوف تھا۔

اگر اپنی قوتوں کے بل پر (اور اللہ انسان اور اس کی قوتوں کے بارے میں سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہے 'اور ان قوتوں کو انسان کے اندر خود اللہ نے ودیعت کیا ہے) یہ انسان صرف اپنی اس عقل کے ذریعہ ہدایت پا سکتا اور اپنی ذات اور اپنی حیات کیلئے راہ مصلحت تلاش کر سکتا ' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اپنے لئے خیر ڈھونڈ سکتا تو اللہ تعالیٰ پوری انسانی تاریخ میں اس طویل سلسلہ رسل کو ہرگز نہ جاری فرماتا اور لوگوں پر بذریعہ رسل حجت تمام نہ کرتا اور انسان اپنی اس عقل کے بل بوتے پر اپنے لئے دلائل ہدایت اور ایمان و یقین کے اشارات تلاش کر لیتا ۔یہ دلائل وہ اپنے نفس سے بھی معلوم کر لیتا اور اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کے آفاق کے اندر سے بھی وہ ان کو ڈھونڈ لاتا ۔وہ اپنے لئے ایک ایسا نظام زندگی بھی گھڑ لیتا جس سے اس کی زندگی کے تمام مسائل ہو جاتے ۔ وہ راہ حق اور صراط مستقیم پر سیدھا چلتا۔ سلسلہ رسل کی سرے سے ضرورت نہ رہتی ' ان کی تبلیغی سرگرمیوں کی ضرورت نہ رہتی ' اور اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتے کہ اگر رسول نہ ہوتے تو لوگوں کے پاس حجت ہوتی ۔جیسا کہ کہا گیا ۔ (لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (٤: ١٦٥)) "تاکہ ان رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے خلاف کوئی حجت نہ رہے ۔" لیکن اللہ تعالیٰ کو خوب علم تھا کہ اس نے انسان کو عقل کا جو ذریعہ ادراک اور آلہ فہم دیا ہے وہ بذات خود ان امور کے ادراک

سے قاصر ہے اور محض عقل انبیاء کی راہنمائی کے بغیر' رسولوں کی تنظیم اور معاونت کے بغیر ہدایت تک نہیں پہنچ سکتی۔ نیز رسولوں کی راہنمائی کے بغیر اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ پوری انسانی زندگی کیلئے کوئی اور منہاج حیات وضع کرلیں جس میں ان کی پوری پوری مصلحت ہو اور وہ ان کیلئے دنیا اور آخرت دونوں میں اچھے انجام کا ضامن ہو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کو عقل انسانی کی کوتاہ دامنی کا اچھی طرح علم تھا' اسی لئے اللہ کی حکمت اور اس کی شفقت کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ لوگوں کیلئے رسول بھیجے اور یہ کہ رسالت اور تبلیغ ہدایت کے بغیر لوگوں سے کوئی مواخذہ نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ (وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُولًا) "ہم اس وقت تک عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک ہم رسول نہ بھیج دیں۔" اور یہ بات اس قدر بدیہی ہے کو آیت سے قطعاً ثابت ہوتی ہے اور اگر قطعاً ثابت نہیں ہوتی تو اس آیت کا لازمی تقاضا ضرور ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایمان و ہدایت کے میدان میں اور ایمان و ہدایت کی اساس پر تفصیلی نظام زندہ قیام کے معاملے میں پھر عقل کا کردار ہی کیا رہ جاتا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عقل انسانی کا کردار یہ ہے کہ وہ رسولوں سے ہدایت اخذ کرنے کے سلسلے میں اپنے فرائض ادا کرے۔ عقل کا فرض ہے کہ رسولوں کی دعوت پر غور و فکر کرے۔ رسولوں کے فرائض صرف اس حد تک ہیں کہ وہ پہنچا دیں اور سمجھا دیں اور انسانی فطرت کے اوپر جو غلط افکار کے تہہ بہ تہہ ڈھیر ہیں انہیں صاف کر کے فطرت کو ان کے نیچے سے نکال دیں' اور انسان کو اس طرف متوجہ کر دیں کہ اس کے نفس اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کے اندر معرفت کردگار (خالق) کے واضح دلائل موجود ہیں۔ اس کیلئے یہ رسول صحیح نظام تربیت اور صحیح منہاج مطالعہ کائنات وضع کر دیں اور انسانوں کیلئے نظام زندگی تجویز کر دیں جس پر ان کی زندگی کا قافلہ رواں اور دواں ہو جائے اور جس میں ان کی دنیا اور آخرت کی خیر ہو۔

عقل کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ دین اور الٰہیات کے معاملے میں' ان موضوعات کی صحت اور بطلان کے بارے میں مفتی اور جج بن جائے۔ اسے اختیار ہو کہ جو چاہے وہ قبول کرے اور جس چیز کو چاہے اسے رد کر دے جبکہ وہ بات قرآن و سنت سے یقینی طور پر ثابت شدہ ہو یہ بعد کہ اس بات کا مفہوم واضح طور پر سمجھ میں آگیا ہو۔ یعنی نصوص قرآنی کے لغوی اور اصطلاحی مدلولات کی روشنی میں۔ اگر عقل انسانی کو رد و قبول کا یہ اختیار ہوتا یعنی صحیح مفہوم و مدلول کے ادراک کے بعد' بایں طور کہ ہماری عقل اس مدلول کو قبول نہیں کرتی' یا اسے قبول کرنا نہیں چاہتی تو پھر خدا اور رسول کے بیان کے بعد انسان مستحق عذاب قرار نہ پاتا۔ لہٰذا عقل اس بات کی پابند ہے کہ وہ ضروریات دین کو قبول کرے۔ اگر یہ عقائد اس تک صحیح طرح پہنچ جائیں اور جب عقل صحیح طور پر ان نصوص کے مفہوم و مراد کو سمجھ بھی جائے۔

حضور اکرم ؐ کی رسالت عقل کو مخاطب کرتی ہے۔ وہ عقل کو جگاتی ہے' اس کیلئے فکر و نظر کا ایک درست منہاج وضع کرتی ہے اور اسے صحیح راہ پر ڈالتی ہے۔ لیکن یہ خطاب اس مفہوم میں نہیں ہے کہ عقل کو اس رسالت کے صحیح ہونے یا اس کے باطل ہونے کا فیصلہ صادر کرنے کا اختیار ہے یا وہ ایسا کر سکتی ہے۔ یا امور رسالت میں اسے رد و قبول کا اختیار حاصل ہے' بلکہ یہ خطاب اس مفہوم میں ہے کہ جب نص سے کوئی امر ثابت ہو جائے تو وہی اللہ کا حکم ہو گا اور عقل انسانی کا فرض ہے کہ اسے قبول کرے۔

اس کی اطاعت کرے اور اسے اس کرۂ ارض پر نافذ کرے۔ چاہے نص کا یہ مفہوم اس کے ذہن کیلئے مالوف و مقبول ہو یا اس کیلئے عجیب و غریب ہو۔

عقل انسانی کا کردار اس بات میں صرف اس قدر ہے کہ وہ نصوص کو سمجھنے کی صحیح کوشش کرے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ لغت عربی اور اصطلاحات شریعت کے مطابق اس نص کا مفہوم کیا بنتا ہے۔ یہاں آکر عقل کا کام ختم ہو جاتا ہے اور نص شریعت سے جو صحیح مفہوم اخذ ہوتا ہے اسے کسی عقلی دلیل اور قیاس سے رد نہیں کیا جاسکتا' اس لئے کہ جہاں تک نص کا تعلق ہے وہ اللہ کی جانب سے ہے۔ محض عقلی توجیہہ نص سے برتر نہیں ہو سکتی اس لئے کہ عقل الٰہ کا درجہ نہیں رکھتی نہ وہ اللہ کی نصوص کے اوپر ردو قبول کا درجہ رکھتی ہے۔

اس اہم نکتے پر خیالات کے اندر ایک عظیم التباس پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو عقل انسانی کو الٰہ کا درجہ دیدیتے ہیں۔ اپنے معاملات پر بھی اسے حکم قرار دیتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو ایمان و ہدایت کے میدانوں میں عقل کو دخل اندازی کی ذرہ بھر اجازت نہیں دیتے۔ صحیح منہاج وہی ہے جو اوپر ہم نے بیان کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ رسالت نے عقل کو مخاطب کیا ہے تاکہ وہ رسالت کے فیصلوں کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ رسالت اپنے عملی اور نظریاتی فیصلوں کے بارے میں عقل کیلئے بھی ایک منہاج بناتی ہے تاکہ وہ بھی اپنے دائرے کے اندر کام کرے۔ پوری زندگی میں رسالت کے فیصلوں کا ادراک کرے۔ جب عقل نے رسالت کے فیصلوں کو سمجھ لیا کہ نصوص شریعت و رسالت کا مفہوم کیا ہے تو پھر عقل کیلئے تصدیق' اطاعت اور ان کے نفاذ کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں رہتا۔ شریعت یہ لازم نہیں کرتی کہ وہ مفاہیم نصوص سمجھے بغیر ان پر عمل کرے بلکہ شریعت کا مدعا یہ ہے کہ نصوص شریعت پر سمجھ کر عمل کیا جائے۔ لیکن جب عقل ان کا ادراک کر لے تو اس پر فرض ہو جاتا ہے کہ پھر ان پر عمل پیرا ہو اور کوئی چون و چرا نہ کرے۔ نصوص کے مفاہیم کے مطابق بات کو قبول کرے۔ اور نصوص کا مقابلہ اور چون و چرا یہ ہو گا کہ ان میں سے بعض کو قبول کرے اور بعض کو رد کرے۔ بعض کو صحیح قرار دے اور بعض کو غلط قرار دے' باوجود اس علم کے کہ یہ نصوص و ہدایات اللہ کی جانب سے آئی ہوئی ہیں۔ اللہ وہی بات کرتا ہے جو حق ہوتی ہے اور وہ جو حکم بھی دیتا ہے اس میں بھلائی ہوتی ہے۔

اسلامی منہاج حیات میں اللہ سے ہدایت پانے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ نصوص قرآن و سنت کا صحیح مفہوم پا لینے کے بعد اس میں عقلی گھوڑے نہ دوڑائے جائیں یہ فہم اصول فہم کے مطابق ہو۔ انسان قرآن و سنت کا مطالعہ اپنے ذہن میں بعض فیصلے پہلے سے طے کرکے نہ کرے۔ اس طرح کہ اپنے دین میں بعض منطقی نتائج طے کر لے یا اپنے محدود ملاحظے سے کچھ باتیں طے کر لے یا اپنے ناقص تجربات کے مطابق بعض چیزوں کو حقائق سمجھ لے اور اس کے مطابق قرآن و سنت کو ڈھالنے کی سعی کرے۔ صحیح منہاج مطالعہ یہ ہے کہ وہ نصوص کو اس طرح لے جس طرح کہ وہ ہیں اور نصوص نے جو فیصلے کر لئے ہیں وہ بہرحال فیصلے ہیں اور وہ اس کی ذاتی سوچ سے بہتر ہیں اور ان کا نظام اور ان کا منہاج اس کے ذاتی منہاج سے زیادہ مضبوط ہے اس لئے عقل دین کے فیصلوں پر کوئی محاکمہ نہیں کر سکتی۔ جب عقل کے نزدیک یہ بات ثابت ہو جائے کہ یہ فیصلہ دین کا ہے۔ لوگوں کے بتائے ہوئے فیصلے اصول دین پر برتری حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ عقل بہرحال ان دینی ضوابط کی تابع ہوگی۔ بشرطیکہ دین کے ضوابط اور پیمانے اچھی طرح ثابت ہو کر سامنے آجائیں۔

عقل کو الٰہ کا درجہ حاصل نہیں ہے کہ وہ یہ قرار دے کہ اس نے جو نتائج اخذ کر لئے ہیں وہ اللہ کے فیصلے ہیں ہاں

عقل انسانی کو یہ حق ضرور حاصل ہے کہ وہ کسی نص کا کوئی مفہوم انسانی عقل کے مطابق 'کسی دوسرے مفہوم کے مقابلے میں پیش کرے جو بذات خود بھی عقلی مفہوم ہو۔ یہ تو عقل انسانی کا دائرہ کار ہے اور اس میں عقل پر کوئی پابندی نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی حرج ہے بشرطیکہ نصوص کا یہ مفہوم ہ ادراک صحیح اور اصولوں کے دائرے کے اندر ہو مقصود تاویل نصوص اور افہام و تفہیم ہو اور نصوص کے اندر تاویل کی گنجائش موجود ہو۔ یہ تاویل اور تفہیم بھی ان قواعد اور ضوابط کے اندر ہو' جو اس مقصد کیلئے خود دین نے وضع کئے ہیں۔ یہ قواعد ایسے ہیں جو انسانوں کی حریت فکر کی تمام ضروریات کو پورا کرتے ہیں اور انسان کے فہم و ادراک کیلئے ایک وسیع میدان فراہم کرتے ہیں۔ اسلامی نظام میں کوئی ایسا ادارہ 'کوئی ایسی اجتماعی پابندی اور کوئی ایسا عہدیدار نہیں ہے جسے ذہنوں پر تالے لگانے کا اختیار ہو کہ لوگ نصوص شرعیہ کے اندر غور و فکر نہیں کر سکتے۔ ان کے انطباق کیلئے کوئی اچھی رائے نہیں دے سکتے یا کوئی معقول وجوہ پیش نہیں کر سکتے۔ بشرطیکہ کوئی شرعی نص ان آراء' ان تاویلات اور وجوہات کی متحمل ہو اور یہ تاویلات بھی اسلامی نظام کے حدود کے اندر ہوں اور اصول دین پر مبنی ہوں۔ یہ ہے مفہوم اس بات کا کہ رسالت محمدیہ عقل کو خاطب کرتی ہے۔

بے شک اسلام ایک عقلی دین ہے۔ وہ اپنے مسائل 'عقائد اور فیصلے عقل کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور اسلام یہ فیصلے اور عقائد انسانوں سے فوق الفطری انداز میں نہیں منواتا کہ ماننے کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہ رہے بلکہ وہ عقلی دین اس مفہوم میں ہے کہ وہ عقل سے مخاطب ہوتا ہے اور اسے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ وہ اس کے سامنے ہدایت اور صراط مستقیم پر آنے کے دلائل پیش کرتا ہے کہ وہ اپنے نفس اور اپنے آفاق کے اندر پائے جانے والے ان نشانات راہ پر غور کرے اور انسان کی اصلی فطرت کو ان عادات و تقالید کے تہ بہ تہ جمے ہوئے پردوں اور ڈھیروں کے نیچے سے نکالے۔ نیز یہ کہ عقل اپنے آپ کو گمراہ کن خواہشات اور عقل و فطرت پر چھا جانے والے موثرات سے نکال لے۔

قرآن کریم عقل کو اس لئے خطاب کرتا ہے کہ قرآن نے اپنے نصوص کے اندر جو امور طے کر دیئے ہیں وہ ان پر غور و فکر کر کے ان کو تسلیم کرے۔ اور قرآن کریم کا یہ انداز نہیں ہے کہ وہ بغیر سمجھانے کے لوگوں کو بات تسلیم کرنے پر مجبور کرے۔ ہاں جب عقل کو کام میں لا کر انسان کسی نص کا مفہوم و مدلول پالے اور حقائق کا ادراک کرے تو پھر اس کیلئے سر تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے۔ سمجھنے کے بعد اگر وہ تسلیم کرلیں تو مومن ہیں اور اگر تسلیم نہ کریں تو کافر ہیں۔ رہے قرآنی اور اسلامی فیصلے تو وہ عقل کے سامنے پیش کئے جانے سے پہلے ہو چکے ہیں۔ عقل کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ وہ درست ہیں یا غلط ہیں۔ نہ عقل کو اختیار ہے کہ فہم و ادراک کے بعد اسلامی فیصلوں کو رد کر سکے۔ آج کل بعض لوگ عقل کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ اسلامی فیصلوں کو رد کرے۔ ایسے لوگوں کے نزدیک ان کی عقل ان کا الٰہ بن جاتی ہے۔ اب ان کا یہ الٰہ شریعت کے جن فیصلوں کو چاہے قبول کرلے اور جن کو چاہے انہیں رد کر دے۔ جن امور کو چاہے چن لے اور جن کو چاہے چھوڑ دے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ (اَفَتُؤمِنُونَ بِبَعضِ الکِتَابِ وَتَکفُرُونَ بِبَعضٍ) کیا تم کتاب کے بعض حصے پر ایمان لاتے ہو اور بعض سے کفر کرتے ہو۔" یہ طرز عمل کافرانہ ہے اور ایسے لوگوں کو آخرت میں سخت سزا دی جائے گی۔

اب اللہ تعالیٰ نے چاہے اس کائنات کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا' یا انسان کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا' یا کسی بھی

دوسری مخلوق کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا یا اللہ تعالیٰ نے قانون میراث کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا یا فرائض و نواہی کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا تو اللہ کے یہ تمام فیصلے واجب القبول ہیں اور جن تک یہ فیصلے پہنچیں اور وہ ان فیصلوں کے مدلولات کا ادراک کرلیں تو ان کیلئے ان فیصلوں کو قبول کرنا فرض ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کافرمان ہے۔

(اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَھُنَّ) (۶۵ : ۱۲)) "اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہیں کے مانند....." (وَاللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنْ مَّآءٍ) (۲۴ : ۴۵)) "اور اللہ نے ہر جاندار ایک طرح کے پانی سے پیدا کیا۔" (خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ (۱۴) وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (۱۵) (۵۵ : ۱۴-۱۵)) (انسان کو اس نے ٹھیکری جیسے سوکھے سڑے گارے سے بنایا' اور جن کو آگ کی لپٹ سے پیدا کیا۔) یہ اور اس قسم کی بے شمار آیات ہیں جن کا تعلق اس کائنات کی نوعیت اور زندہ اور مردہ اشیاء کی ماہیت سے ہے۔ پس اللہ نے جو کچھ کہہ دیا وہ حق ہے۔ اب عقل کیلئے یہ مجال نہیں ہے کہ وہ یہ کہے کہ یہ باتیں تو میرے فیصلوں کے اندر اس طرح نہیں ہیں یا میرے فہم و ادراک میں یہ بات نہیں سماتی یا یہ بات ابھی میرے تجربے کے اندر نہیں آئی۔ اس لئے کہ ان معاملات میں عقل نے جو فیصلے کیے ہیں وہ درست بھی ہوسکتے ہیں اور غلط بھی ہوسکتے ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کہہ دیا ہے وہ درست ہی ہوسکتا ہے اور اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ البتہ ہماری فہم نصوص کے صحیح مفہوم کا ادراک کرنے میں غلطی کرسکتی ہے اور یہ بات اس صورت میں ہے کہ نصوص کے صحیح مفہوم کا ہم ادراک کرلیں۔ اسی طرح دوسری آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ (وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ) (۵ : ۴۴)) (جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں۔

(یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۲۷۸) فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲۷۹) (۲ : ۲۷۸-۲۷۹))

"اے لوگوں جو ایمان لائے ہو' خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو' اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا' تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اب بھی توبہ کرلو (اور سود چھوڑ دو) تو اپنا اصل سرمایہ تم لینے کے حقدار ہو۔ نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

(وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّۃِ الْاُوْلٰی) (۳۳ : ۳۳)) "اپنے گھروں

میں ٹک کر رہو اور سابق دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔" (وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوبِهِنَّ (۲۴: ۳۱)) "اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں۔" یہ اور انسانی زندگی کے بارے میں دوسری آیات و ہدایات ایسی ہیں کہ ان میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہی سچ ہے اور ان کے بارے میں عقل کو یہ کہنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ عقل کے مطابق فلاں اور فلاں باتوں میں مصلحت زیادہ ہے' جو اللہ کے فیصلوں کے خلاف ہوں یا وہ ایسی باتیں ہوں جن کی اجازت اللہ تعالیٰ نے نہ دی ہو اور اسے لوگوں کیلئے قانون قرار نہ دیا ہو۔ جس امر میں عقل کو مصلحت نظر آتی ہے اس میں خطا اور صواب دونوں کا امکان ہے اور وقتی جذبات اور خواہشات نفسانیہ کا دخل اس میں عین ممکن ہے اس لئے اللہ تعالیٰ جو فیصلہ فرماتے ہیں وہ درست ہی ہوسکتا ہے اور اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے جن عقائد اور تصورات کی تلقین کی ہے' یا زندگی کا جو منہاج اور طریق کار تجویز کیا ہے ان کے بارے میں عقل کا موقف جو ہو سو ہو' جب تک نص صحیح ہے' قطعی الدلالت ہے اور کسی وقت کے ساتھ موقت نہیں ہے۔ اس بارے میں ہم عقل کو یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ یہ کہے کہ جہاں تک عقائد و نظریات کا تعلق ہے وہ تو ہم نصوص کے مطابق لیتے ہیں۔ رہا زندگی کا تفصیلی نظام تو اس بارے میں بات یہ ہے کہ اب زمانہ بہت ہی بدل گیا ہے اور نہایت ہی ترقی یافتہ ہے۔ اس لئے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کہ نصوص شرعیہ کسی خاص وقت تک ہی موثر ہوں تو اللہ تعالیٰ اسی طرح کر سکتا تھا۔ جب تک کوئی نص مطلق ہے تو وہ جس طرح زمانہ نزول کے وقت موثر تھی اسی طرح وہ آخری زمانے میں بھی موثر ہوگی ورنہ یہ بات لازم آئے گی کہ ہم اللہ میاں کو قصوروار ٹھہرانے کی جسارت کریں جو ہر قسم کے نقائص سے پاک و صاف ہے۔

سوال یہ ہوگا کہ کیا اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا ہے؟ نہیں اجتہاد اس میں ہوگا کہ ہم کسی جزئی صورت حال پر کسی نص کی تطبیق کریں۔ یہ اجتہاد نہیں ہے کہ ہم ایک عام اصول میں یا حکم میں کوئی تبدیلی کریں یا اسے رد کردیں' کسی دور میں یا کسی نسل میں اصول عقل میں سے کسی اصول کے تحت کوئی بات کریں۔

درج بالا جو معروضات ہم نے پیش کی ہیں' ان میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو حیات انسانی کے اندر عقل و خرد کی اہمیت کو کم کر رہی ہو اس لئے کہ اسلامی نصوص اور اصولوں کو جدید سے جدید تر حالات پر منطبق کرنے کا ایک وسیع میدان کار عقل کیلئے کھلا ہے۔ جبکہ عقل اسلامی نقطہ نظر اور اسلامی پیمانوں کا اچھی طرح ادراک کرے جو صحیح خطوط پر فہم دین سے مستفاد ہیں۔ اس سے بھی زیادہ وسیع میدان اس کائنات کے اصول طبیعی' اس کی قوتوں اور اس کے اندر پوشیدہ ذخائر کا ہے۔ اس کائنات کا مزاج' اس کے اندر رہنے والی مخلوقات کا علم' ان قوتوں کے استفادے کے ذرائع اور اس میں زندہ مخلوقات کیلئے زندگی آسان بنانے کے ذرائع و اسباب عقل کیلئے وسیع تر میدان ہیں جن میں صرف عقل ہی کام کرسکتی ہے۔ یہاں انسان کو ترقی دی جاسکتی ہے اور حدود اللہ میں رہتے ہوئے اس کی زندگی کے شب و روز بدل سکتے ہیں۔ بہرحال عقل کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ انسانیت کی لگام ہوا و ہوس اور لذت و شہوت کے ہاتھ میں دیدے جہاں عقل ٹھوکر کھاتی ہے اور فطرت خواہشات کے دبیز مادے کے نیچے دب جاتی ہے۔

---○○○---

ذرا پھر رکیے اور اس آیت پر دوبارہ نظر ڈالیے (لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (۴: ۱۶۵)) "تاکہ رسولوں کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے۔" اس آیت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کے کاندھوں پر کس قدر عظیم ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں اور اس کے بعد جو لوگ انبیاء علیہم السلام کی رسالت پر ایمان لانے والے ہیں ان پر تمام انسانوں کے حوالے سے کس قدر عظیم ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں۔ فی الواقعہ یہ عظیم اور بھاری ذمہ داریاں ہیں۔

تمام لوگ جو اس دنیا میں آباد ہیں ان کے انجام' دنیا اور آخرت دونوں میں' رسولوں اور رسولوں کے متبعین کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مثلاً رسول اور ان کے متبعین اللہ کے پیغام کو ان تک پہنچانے کے ذمہ دار ہیں اور اس تبلیغ کے نتیجے ہی میں لوگوں کی خوش بختی اور بدبختی کا فیصلہ ہوگا' اس تبلیغ اور دعوت ہی کے نتیجے میں ثواب اور عتاب کے وہ مستحق ہوں گے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

بے شک یہ ایک ہولناک اور خوفناک اور عظیم ذمہ داری ہے لیکن اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام رسل علیہم السلام اپنی اس عظیم ذمہ داری کا شدید احساس رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ بھی ان کو اس بوجھ سے اچھی طرح آگاہ فرما دیتے تھے جو ان پر ڈالدیا گیا تھا۔ یہی وہ بات ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے کہتے ہیں۔ (اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا (۷۳: ۵)) "ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنیوالے ہیں۔" اور اس کیلئے تیاری یوں ہوگی۔ (یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ (۱) قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا (۲) نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا (۳) اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا (۴) اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا (۵) (۷۳: ۱-۵)) "اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے' رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم' آدھی رات' یا اس سے کچھ کم کرلو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنیوالے ہیں۔"

(اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِیْلًا (۲۳) فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ لَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (۲۴) وَ اذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا (۲۵) وَ مِنَ الَّیْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَ سَبِّحْهُ لَیْلًا طَوِیْلًا (۲۶) (۷۶: ۲۳ تا ۲۶)) "اے نبی! ہم نے تم پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے۔ لہٰذا تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو' اور ان میں سے کسی بدعمل' یا منکر حق کی بات نہ مانو۔ اپنے رب کا نام صبح اور شام یاد کرو۔ رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو' اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو۔" یہ ہے وہ بات جس کا احساس اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو دلاتے ہیں اور اسے حکم دیتے کہ وہ یہ بات کریں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ اس کی حقیقت اور اہمیت کیا ہے۔

(قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّ لَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (۷۲: ۲۲)) "کہو

مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی بچا نہیں سکتا اور نہ میں اس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ پاسکتا ہوں۔ میرا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی بات اور اس کے پیغامات پہنچا دوں۔"

(عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا (۲۶) اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا (۲۷) لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (۲۸) (۷۲:۲۶ تا ۲۸))

"وہ عالم الغیب ہے۔ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا' سوائے اس رسول کے جسے اس نے پسند کر لیا ہو' تو اس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے تاکہ وہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے' اور وہ ان کے پورے ماحول کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے۔"

بے شک یہ ایک خوفناک اور عظیم فریضہ ہے۔ لوگوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ ان کی خوش بختی اور بدبختی کا معاملہ ہے۔ ان کے ثواب اور عذاب کا مسئلہ۔ یہ پوری انسانیت کے انجام کا معاملہ ہے۔ اس فریضے کا خلاصہ یہ ہے کہ اس پیغام کو یا تو لوگوں تک پہنچایا جائے گا تاکہ وہ اسے قبول کریں' اس کی پیروی کریں جس کے نتیجے میں وہ دنیا و آخرت میں فلاح پائیں گے یا ان تک یہ پیغام پہنچے گا تو وہ اسے دور پھینک دیں گے اور دنیا و آخرت دونوں میں بدبختی کا شکار ہوں گے اور یا یہ پیغام ان تک نہ پہنچے گا اور نتیجہ یہ ہو گا کہ لوگوں کے ہاتھ ان کے رب کے خلاف ایک حجت ہاتھ آجائے گی اور ان لوگوں کی اس دنیاوی بدبختی کی ذمہ داری اور ان کی گمراہی کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہوگی جو اس دنیا میں ان تک خدا کا پیغام پہنچانے کے ذمہ دار ہیں اور وہ یہ ذمہ داری پوری نہیں کرتے۔

رہے اللہ کے رسول تو انہوں نے تو اپنی ذمہ داری پوری طرح ادا کر دی۔ انہوں نے اللہ کا پیغام اور امانت لوگوں تک پہنچا دی۔ وہ اپنے رب کے پاس اس حال میں گئے کہ انہوں نے اپنی ذمہ داریاں پوری طرح ادا کر دی تھیں۔ انہوں نے یہ ذمہ داریاں صرف زبانی تبلیغ کی حد تک ہی پوری نہ کی تھیں بلکہ انہوں نے اللہ کے پیغام کو اپنی زندگیوں میں عملی شکل دیکر لوگوں کو دکھایا اور وہ رات اور دن اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے ان مشکلات اور رکاوٹوں کو دور کرتے رہے جو اس پیغام کی راہ میں حائل تھیں۔ یہ مشکلات چاہے شبہات کی شکل میں تھیں جو لوگوں کے ذہنوں میں کھٹک رہے تھے یا گمراہی کی شکل میں تھیں جو لوگوں پر مسلط تھیں یا ایسی قوتوں کی شکل میں تھیں جو طاغوتی قوتیں تھیں اور جو لوگوں کو اس دعوت پر کان دھرنے سے روکتی تھیں اور ان کے دین کیلئے فتنہ بنی ہوئی تھیں۔ خاتم النبیین ؐ نے اپنی عملی زندگی میں اسلام کو پوری طرح نافذ کر کے دکھایا اس لئے کہ آپ آخری مبلغ تھے۔ آپ کی رسالت تمام رسالتوں کا اختتامیہ تھی' تو آپ نے محض زبانی تبلیغ پر اکتفاء نہ کیا۔ آپ نے تلوار اور قوت کے زور سے بھی ان مشکلات اور رکاوٹوں کو دور کیا۔ (حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (۲: ۱۹۳)) "تاکہ کوئی فتنہ نہ رہے اور دین صرف اللہ کیلئے ہو جائے۔" اب یہ بھاری ذمہ داری آپ کے بعد ان لوگوں پر آپڑتی ہے جو آپ کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں۔ زمانے

گزر گئے ' نسلوں کی نسلیں گزر گئیں اور گزرتی رہیں گی ۔ حضور ؐ کے بعد تبلیغ کا سلسلہ آپ کے متبعین کی ذمہ داری میں آگیا ہے اور ان کیلئے اس مشکل اور بھاری ذمہ داری سے بری الذمہ ہونے کی کوئی سبیل نہیں ہے ۔ انہوں نے لوگوں پر حجت قائم کرنی ہے ۔ انہوں نے لوگوں کو دنیا کی بدبختی اور آخرت کی ناکامی سے بچانا ہے ۔ یہ فریضہ اور یہ ذمہ داری صرف تبلیغ کرنے سے ہی ادا کی جاسکتی ہے ۔ اور یہ اسی منہاج پر ادا ہو سکتی ہے جس پر اسے رسول خدا ؐ نے ادا فرمایا ۔ اس لئے کہ رسالت وہی ہے اور اہل ایمان بھی وہی ہیں ۔ گمراہیاں ' خواہشات نفسانیہ اور شبہات اور اعتراضات بھی وہی ہیں ۔ وہ طاغوتی قوتیں بھی اسی طرح موجود ہیں جو لوگوں تک دعوت اسلامی کے پہنچنے کی راہ میں حائل ہیں ۔ یہ قوتیں مسلمانوں کو ان کے دین کے بارے میں فتنے میں ڈال رہی ہیں اور قوت کے بل بوتے پر ان کو گمراہ کر رہی ہیں ۔ وہی موقف ہے جو تھا ' وہی مشکلات ہیں جو تھیں ۔ لوگ بھی وہی ہیں جو تھے ۔

دعوت اسلامی وہ فریضہ ہے جس سے ہم روگردانی اور انکار نہیں کر سکتے ۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم تبلیغ کریں ' یہ بہت ضروری ہے کہ ہم یہ فریضہ ادا کریں ۔ تحریر و تقریر سے تبلیغ کریں ۔ اپنے عمل سے تبلیغ کریں تاکہ مبلغین اپنے عمل اور کردار کی وجہ سے چلتی پھرتی تبلیغ ہوں اور تبلیغ اور دعوت کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہوں ان کو دور کرنے کی کوشش کریں کہ یہ بھی تبلیغ ہی کی ایک صورت ہوگی جو لوگ فتنے میں پھنسے ہوئے ہوں انہیں رہائی دلائیں ۔ اگر یہ کام نہ کیا گیا تو کوئی تبلیغ نہ ہوگی اور نہ ادائیگی فرض ہوگی اور نہ لوگوں پر اللہ کی حجت تمام ہوگی ۔

یہ ذمہ داریاں اٹھانے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے ورنہ اس کے بھاری نتائج برآمد ہوں گے ۔ تمام دنیا گمراہی میں مبتلا ہوگی ۔ وہ اس دنیا میں بدبختی کا شکار ہوگی اور آخرت میں اس کے خلاف اللہ کے ہاں حجت نہ ہوگی اور ان کے ہاتھ حجت آجائے گی ۔ اگر امت یہ ذمہ داری ادا نہ کرے گی تو اس کی وجہ سے لوگ نجات نہ پائیں گے ۔

کون ہے جو اس بوجھ کو ہلکا سمجھے گا؟ یہ کمر توڑ بوجھ ہے 'اس سے جسم کا ہر جوڑ اور ہر عضو کانپ رہا ہے جو شخص بھی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ "مسلم" ہے یا تو وہ اس فریضے کو ادا کرے گا اور دعوت دین کا کام کرے گا ورنہ خود اس دنیا اور آخرت میں اس کیلئے فلاح ممکن نہیں ہے ۔ جب وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مسلم ہے اور پھر دعوت دین کا کام نہیں کرتا اور اپنا فرض ادا نہیں کرتا ' ان تمام طریقوں کے مطابق جو دعوت دین اور ادائیگی فرض کیلئے مسنون ہیں تو وہ گویا اس اسلام کے خلاف شہادت دے رہا ہے جس کا اس نے دعویٰ کیا ہے ۔ اس کی شہادت اسلام کے حق میں نہیں ہے بلکہ اسلام کے خلاف ہے ' حالانکہ اسے اس لئے اٹھایا گیا ہے کہ وہ اسلام کے حق شہادت دے ۔

(وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲ : ۱۴۳) اور اسی طرح ہم نے تم مسلمانوں کو امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو ۔ (تفصیلات کیلئے دیکھئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب شہادت حق (سید قطب))

شہادت حق اور اسلام کے حق میں شہادت کا آغاز یوں ہوگا کہ ایک مسلمان بذاتہ 'پھر اس کا گھر اور خاندان ' پھر اس کی قوم اور اس کے رشتہ دار اس دین کا عملی نمونہ ہوں جس کی وہ دنیا کی دعوت دے رہا ہے ۔ اس کے بعد اس کی

یہ شہادت ایک قدم اور آگے بڑھے اور ایک ایسی امت پیدا ہو جسے امت دعوت کہا جاسکے ۔ وہ اپنے گھر' خاندان' اور رشتہ داری کے حدود میں اسلام اور دعوت اسلامی کو عملی شکل میں پیش کرنے کے بعد شخصی معاملات اور ملک کے سیاسی معاملات کے اندر بھی اس دعوت کے قیام کی ذمہ داری لے ۔ اس کے بعد وہ ایسی شہادت دے کہ ان رکاوٹوں کو دور کر دے جو اسلام کی راہ میں حائل ہیں' جو لوگوں کو گمراہ کر رہی ہیں اور اس دعوت کے حوالے سے ان کو فتنے میں ڈال رہی ہیں ۔ چاہے یہ رکاوٹیں جس قسم کی بھی ہوں ۔ اگر کسی مسلمان نے اس مفہوم میں شہادت دی تو پھر وہ صحیح معنوں میں شاہد بھی ہو گا اور شہید بھی ہو گا ۔ وہ گواہی دیکر اپنے رب کے پاس پہنچ جائے گا ۔ یہ ہے وہ حقیقی شہید ۔

---ooo---

سب سے آخر میں ہم دست بستہ اللہ کے حضور اس کی درگاہ عظمت وجلالت میں کھڑے ہوتے ہیں ۔ یہ درگاہ' درگاہ عدل ہے اور گہرے علم پر مبنی ہے ۔ اس درگاہ میں اللہ کا فضل اور اس کی رحمت سایہ فگن ہوتے ہیں اور اس میں ہر کسی کے ساتھ رعایت اور احسان ہوتا ہے اور یہ سب کچھ اس حضرت انسان کے ساتھ ہوتا ہے جو کبھی منکر حق کے روپ میں آتا ہے اور کبھی سخت نافرمانی بھی کرتا ہے ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت انسان کو اللہ تعالیٰ نے زیور علم سے آراستہ کیا ہے اور اس کی ذات کے اندر بے پناہ قوتیں ودیعت کی ہیں ۔ اس کی ذات میں ہدایت اور ضلالت دونوں کی استعداد پیدا کی ہے ۔ اگر اس علم کو عقل کے تابع نہ کیا جائے تو اس کے نتائج کیا نکلتے ہیں ۔ نیز اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم کا ایک عظیم ہتھیار دیا ہے اور یہ کہ انسان کے انفس اور اس کے آفاق میں ہدایت اور قبول ایمان کے بے شمار دلائل موجود ہیں ۔ اللہ کو علم تھا کہ انسان کے پاس علم کا جو عظیم ہتھیار ہے اس کے مقابلے میں انسان کے اندر قوت شہوانیہ اور حیوانیہ بھی موجود ہے ۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ انفس و آفاق کے اندر جو کثیر التعداد دلائل و شواہد پائے جاتے ہیں انہیں انسان کی خواہشات نفسانیہ دبالیں اور اس کی کوتاہیاں اور اس کی جہالت انہیں اس کی نظروں سے اوجھل کر دیں ۔ انسان کیلئے ان دلائل پر تب ہی غور و فکر کرنا ممکن ہو گا جب اس کے پاس رسول بھیجے جائیں اور اسے بار بار یاددہانی کرائی جائے ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے بیان کے بعد بھی انسان کے ذمے یہ بات نہیں ڈالی کہ وہ اپنے لئے کوئی نظام زندگی بنائے بلکہ اسے نظام زندگی بنا کر دیا اور اس کا فرض یہ قرار دیا کہ وہ اس نظام کو دنیا میں نافذ کرے ۔ اس کے بعد اسے پھر اس دنیا میں آزاد چھوڑ دیا ۔ ان حدود و قیود کے بعد بھی اس کیلئے اس عظیم مملکت میں ایک وسیع دائرہ کار رہ گیا ۔ اسے اجازت دی گئی کہ وہ اس میں جو چاہے نئی نئی ایجادات کرے ۔ جو تغیرات چاہے کرے اور جو ترکیبات چاہے کرے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے جس طرح اس پوری کائنات کو مسخر کیا ہے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے ۔ اس میں یہ انسان کبھی درست فیصلے کرے گا اور کبھی غلط' کبھی وہ پھسلے گا اور کبھی صراط مستقیم پر رواں دواں ہو گا ۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اللہ کے ہاں انصاف کی کیا اہمیت ہے جسے اس آیت میں بیان کیا گیا ہے ۔ اگر رسول نہ بھیجے جاتے تو لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے خلاف ایک حجت ہوتی ۔ لیکن اللہ نے رسول بھیجے جو لوگوں کو خوشخبری دیتے تھے اور انجام بد سے ڈراتے تھے ۔ حالانکہ اس کائنات میں اللہ کی ذات پر ایمان لانے کے تکوینی دلائل موجود تھے اور یہ کائنات سب کے سامنے کتاب مفتوح تھی ۔ نیز نفس انسانی بھی ایک کھلی کتاب کے طور پر انسان کے سامنے موجود

تھا۔جس کے اندر کردگار کے وجود پر بے شمار دلائل تھے۔

جن سے اللہ کی وحدانیت کو اچھی طرح معلوم کیاجاسکتا تھا۔جن سے اللہ کی تقدیر' اللہ کی تدبیر' اللہ کی قدرت اور اس کے علم کے بارے میں اچھی طرح معلوم ہو سکتا تھا۔نیز فطرت انسانی کے اندر بھی ایک قوی اور حقیقی داعیہ موجود ہوتا ہے جس سے انسان کو اس کائنات کے خالق تک رسائی کا ایک نہایت پختہ شوق ملتا ہے اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا کوئی خالق ضرور ہے پھر اس فطرت اور دلائل کونیہ کے درمیان ایک قسم کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ان دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق اور مدبر موجود ہے۔پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا فرمائی تھی جو مشاہدات کے ذریعے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ انسان کی ان تمام قوتوں پر ضعف طاری ہو جاتا ہے۔کبھی کبھی یہ قوتیں معطل ہو جاتی ہیں 'کبھی یوں ہوتا ہے کہ بعض اثرات ان قوتوں کو بگاڑ دیتے ہیں۔کبھی تو ان عقلی قوتوں کو مٹا دیا جاتا ہے۔کبھی عقل کے فیصلوں میں غلطی واقعہ ہوتی ہے اور عقل پریشان ہوجاتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس ڈیوٹی سے معاف کر دیا کہ وہ اس کائنات کے دلائل وشواہد ہی سے راہ ہدایت حاصل کریں یا محض فطری دلائل سے اپنی عقل کے بل بوتے پر راہ حق پائیں 'جب تک ان کے پاس کوئی رسول نہیں آجاتا تاکہ یہ رسالت انسان کی ان تمام خوبیوں اور قوتوں کو ان تمام آلودگیوں سے پاک کر دے اور ان عقلی قوتوں کو ان ضوابط کے اندر لے آئے جو اللہ کی رسالت نے بھیجے۔انسان کی یہ تمام فطری قوتیں جب اسلامی منہاج فکر کے اندر منضبط ہو جاتی ہیں تو ان قوتوں کے ذمے اب صرف یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ اس رسالت کا اقرار کریں اور اللہ کی بندگی کریں اور رسول کا اتباع کریں۔یا اگر وہ انکار کر دیں تو پھر ان پر حجت تمام ہوجائے اور قیامت کے دن سزا کی مستوجب ہو جائیں۔

پھر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کس قدر مہربان ہے۔وہ ان کی کس قدر دیکھ بھال کرتا ہے اور ان کو اپنے فضل وکرم سے نوازتا ہے ان کو کس قدر مکرم اور مختار بناتا ہے۔اس کے باوجود کہ اسے علم ہے کہ انسان خطا اور نقص کا پتلا ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ پھر بھی اس جہان کو اس کے حوالے کر دیتا ہے۔اسے خلیفہ فی الارض بناتا ہے۔ حالانکہ یہ کائنات اس کی نسبت سے بہت ہی بڑی ہے۔اور اللہ تو بے نیاز ہے کہ اگر ایک ذرہ بھی اس کی اس عظیم کائنات میں ہے تو وہ ضائع نہیں ہو سکتا۔

اللہ کی رحمت 'اس کا فضل 'اس کا احسان اور اس کی نظرکرم انسان کو محض اس کی فطرت اور اس کی عقل کے حوالے ہی نہیں کرتی 'اس لئے کہ فطرت کبھی بگڑ جاتی ہے' عقل کبھی دب جاتی ہے اور گمراہ ہو جاتی ہے۔ایسی صورت میں اللہ اپنے فضل وکرم سے رسولوں کا ایک طویل سلسلہ شروع فرماتے ہیں۔لیکن یہ حضرت انسان ان کی بھی تکذیب کرتا ہے اور انکے ساتھ دشمنی پر اتر آتا ہے۔گمراہ ہوتا ہے اور رسولوں سے دوری اختیار کرتا ہے۔لیکن پھر بھی اللہ اس کو اس کی ان عظیم غلطیوں اور کوتاہیوں پر نہیں پکڑتے اور اللہ تعالیٰ اپنی داد و دہش اور بر و احسان جاری رکھتے ہیں۔ رسولوں کے ذریعے حجت تمام کرکے اللہ تعالیٰ اپنا احسان بند نہیں کرتے۔دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ اسے اس وقت سزا دیتے ہیں جب اس کے رسول اچھی طرح ان تک پیغام پہنچا دیتے ہیں۔پھر وہ اعراض کرتا ہے 'کفر کرتا ہے' کافر مرتا ہے اور بروقت توبہ نہیں کرتا رجوع نہیں کرتا۔

عجب زمانہ ہے کہ یہ انسان اب یہ زعم کرنے لگا ہے کہ اسے رب کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔وہ اپنے آپ کو اللہ

کے فضل و کرم' اور اس کی رحمت و احسان سے مستغنی سمجھتا ہے۔ وہ اللہ کی ہدایت' اس کے نظام زندگی اور اس کی راہنمائی سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ وہ اس قوت کے بل بوتے پر بے نیاز ہو گیا ہے جس کے بارے میں اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اس قوت کے بل بوتے پر وہ راہ ہدایت نہیں پاسکتا۔ جب تک یہ قوت (عقل) الٰہی منہاج فکر سے مسلح نہ ہو جائے۔ اللہ نے تو اسے سزا دینے کا فیصلہ تب کیا ہے کہ رسول آئیں اور تبلیغ کریں اور وہ ان کا انکار کرے۔ اللہ کے نزدیک تو عقل کی مثال اس بچے کی سی ہے جو اپنے اندر قدرے قوت محسوس کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کا نگران اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دے اور ہاتھ کھینچ لے تاکہ وہ خود کفیل ہو کر چلے۔ مگر جونہی نگران ہاتھ اٹھاتا ہے بچہ گر جاتا ہے۔ اس خود سر انسان سے تو یہ بچہ زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ وہ فطرت کے دواعی کو لبیک کہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے سہارا دینے والا ہاتھ ہٹ جائے اور وہ خود اپنی قوتوں کے بل بوتے پر چلے۔ یقیناً یہ بچہ اس گمراہ عقلمند سے زیادہ صحیح راہ پر ہے۔ یہ اپنی پوشیدہ قوتوں کو کام میں لاتا ہے۔ وہ اپنی ان قوتوں کو بڑھاتا ہے جو بڑھ سکتی ہیں۔ وہ اپنے اعصاب کو مشق کراتا ہے تاکہ وہ اس مشق سے قوت حاصل کرے۔ لیکن آج کا انسان جو دست قدرت سے اپنے آپ کو چھڑاتا ہے۔ جو اللہ کی راہنمائی سے منہ موڑتا ہے' اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کے وجود کے اندر ودیعت کردہ تمام قوتیں (جو قوتیں اس کے اندر دست قدرت نے رکھی ہیں۔) اسے اللہ کی دستگیری سے مستغنی اور بے نیاز نہیں کر سکتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان قوتوں کے باوجود اسے ربانی ہدایت کی ضرورت ہے۔ مختصراً یہ کہ انسان کی تمام قوتیں رسالت کی مدد سے مضبوط ہوتی ہیں۔ اسی سے وہ راہ مستقیم اور راہ ہدایت پاتی ہیں۔ لیکن اگر انسان رسالت الٰہیہ سے بے نیاز ہو جائے اور اس کی ہدایت سے منہ موڑے تو اس کی یہ قوتیں گمراہ ہو جاتی ہیں' ان کے اندر خلل واقع ہو جاتا ہے اور وہ اضطراب کا شکار ہو جاتی ہیں۔

اگر ہم اسے فریب کاری اور مغالطہ انگیزی نہ کہیں تو یہ امر غلطی اور گمراہی ضرور ہے کہ انسان یہ سوچنے لگے کہ بڑے دماغ بغیر تبلیغ اور رسالت کے بھی ان نتائج تک پہنچ سکتے ہیں جن تک رسالت کی راہنمائی میں پہنچا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسالت کی تعلیمات سے عقل ایک منضبط انداز اختیار کرلیتی ہے۔ اس کا نقطہ نظر صحیح ہوتا ہے۔ اس کے بعد اگر جزئیات مسائل کے اطلاق و انطباق میں وہ غلطی کرتی ہے تو اس کی غلطی اس طرح ہوگی جس طرح وہ گھڑی غلطی کرتی ہے جسے ملایا نہ گیا ہو' اس کے بعد عقل اپنے ماحول اور ماحول کے اندر جمائے جانے والے موثرات سے متاثر ہوتی ہے۔ نیز اس کے کل پرزے بھی ماحول سے متاثر ہوتے ہیں لیکن اس غلطی کی تصحیح ممکن ہے۔ ہاں جس گھڑی کو صحیح ٹائم کے ساتھ ملایا ہی نہ گیا ہو تو وہ وہی ٹائم بتائے گی جس پر اس کی سوئیاں برابر ہوگئیں۔ وہ منضبط نہ ہوں گی۔

سوال یہ ہے کہ آخر اس پر کیا دلیل ہے کہ عقل رسالت کی راہنمائی کے بغیر حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی؟ اس کا جواب انسانی تاریخ دیتی ہے اس لئے کہ پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایک عقلمند آدمی بھی نہیں ملتا جو اس مقام ہدایت تک پہنچ گیا ہو جہاں رسالت کی راہنمائی میں ایک اوسط درجے کا عقلمند آدمی پہنچتا ہے۔ نہ اعتقادی نظریات و تصورات کے میدان میں اور نہ ہی اخلاقی نفسیات کے میدان میں اور نہ ہی موزوں نظام حیات کی تشکیل کے میدان میں اور نہ ہی قانون سازی کے میدان میں۔

افلاطون اور ارسطو کے دماغ درحقیقت مسلّمہ طور پر بڑے دماغ تھے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ ارسطو پوری انسانی تاریخ میں ایک عظیم دماغ کا مالک تھا۔ لیکن وہ اللہ کی رسالت اور ہدایت سے محروم تھا۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے خدائی کی

جو تعریف کرتا ہے 'جس طرح اس نے خود یہ تعریف کی ہے تو اس کے تصور الہٰیہ اور ایک عام آدمی کے تصور اللہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے جو رسالت پر ایمان رکھتا ہے اور کسی نبی کا ماننے والا ہے۔

مصر قدیم میں اخناتون ایک ایسا فلسفی ہے جو عقیدۂ توحید تک پہنچا ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے عقیدہ توحید سے متاثر نہیں ہوا تو بھی اس کے عقیدۂ توحید اور ایک عام مسلمان کے عقیدۂ توحید کے اندر زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اخناتون کے عقیدۂ توحید کے اندر بڑے بڑے خلا ہیں اور ان کو قصوں اور کہانیوں سے بھرا گیا ہے۔ حضور اکرم ؐ کے پروردہ عام لوگوں کے اندر ایسے لوگ پائے جاتے ہیں کہ ان کے تصور الہٰیہ تک انسانی تاریخ کے بڑے بڑے فلسفی نہیں پہنچ سکے۔ خصوصاً وہ فلسفی جن تک کوئی آسمانی رسالت نہیں پہنچی۔

زندگی کے ابتدائی تصورات، زندگی کے اصولوں' اس کی تنظیم' اور اس کیلئے قانون سازی کے میدان میں بھی ہمیں کوئی انسانی نظام نہیں ملتا جس کے اندر اس قدر ہم آہنگی توازن' بلندی اور ترقی پائی جاتی ہو جس قدر اسلامی نظام زندگی میں پائی جاتی ہے۔ اسلامی نظام زندگی نے تاریخ میں جب بھی کوئی معاشرہ پیدا کیا ہے اس کی مثال پوری تاریخ انسانی کے اندر نہیں ملتی اور نہ آئندہ اسلامی نظام کے نفاذ کے سوا کوئی اور نظام ایسا معاشرہ وجود میں لاسکتا ہے۔ غرض اسلامی نظام اس قدر متوازن' اس قدر ہم آہنگ اور زندگی کیلئے اس قدر سہل اور قابل عمل ہے جس کی مثال کسی اور نظام میں نہیں ہے۔

کسی نظام قانون کا تجزیہ صرف اس کی ترقیات اور خصوصاً مادی ترقیات کو دیکھ کر نہیں کیا جاتا اس لئے کہ مادی ترقیات تو سائنس اور علم کی ترقی پر موقوف ہوتی ہیں۔ جس قدر یہ مادی علوم ترقی کریں گے اسی قدر مادی ترقیات سامنے آئیں گی اس لئے کہ مادی ترقیات کا دارومدار مادی وسائل پر ہے۔ لیکن قافلہ حیات کے کسی موڑ پر اسے جو توازن اور زندگی کے تمام اجزاء کے اندر مکمل ہم آہنگی' زندگی کے ساز و سامان اور اس کے اوضاع و اطوار کے اندر ہم آہنگی اور اس ہم آہنگی کے نتیجے میں پیدا ہونے والا سکون و اطمینان جس کے اندر تمام انسانی قوتوں کو مکمل آزادی ہو اور وہ ہر پہلو سے پوری آزادی اور سکون کے ساتھ کام کر سکیں۔ یہ معیار صرف اس مختصر عرصے میں حاصل ہوا جو اسلامی نظام زندگی نے اس دنیا میں ایک رسالت کی تعلیمات کے زیر اثر عملاً دکھایا۔ اسلامی رسالت کی روشنی کے بغیر دنیا کی طویل تاریخ میں کوئی معاشرہ یہ معیار پیش نہیں کر سکا' انسانی تاریخ کے کسی بھی دور میں۔ زندگی کے اندر افراتفری اور اس کے اندر ہمہ گیر عدم توازن ہمیشہ ان تمام نظاموں کی خصوصیت رہی ہے جو اسلام کے سائے سے دور رہے ہیں۔ اگرچہ ان معاشروں کے بعض پہلو نہایت ہی چمکدار نظر آئیں' اگرچہ ان معاشروں کے بعض پہلو ظاہر اور نمایاں نظر آئیں۔ یہ درست ہے کہ جاہلی معاشروں کے بعض پہلو چمکدار ہوتے ہیں اور روشن نظر آتے ہیں لیکن بعض دوسرے پہلو نہایت ہی تاریک اور گم شدہ ہوتے ہیں اور بعض پہلو' بعض دوسرے نہایت ہی اہم پہلوؤں کے تنزل کی قیمت پر ترقی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن انسانیت کی کشتی ان نظاموں میں ڈانواڈول رہتی ہے' حیران رہتی ہے اور آخر کار بد نصیبی کا شکار ہوتی ہے اور غرق ہو جاتی ہے۔

---ooo---

یہاں آکر مناسب ہے کہ ہم رک جائیں۔ ظلال القرآن کی مناسبت سے اس آیت پر اسی قدر کہنا کافی ہے۔ اور اللہ

کا یہ فرمان ۔ (رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (۴: ۱۶۵)
"یہ سارے رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے نہایت واضح ہے اور اس آیت میں نہایت گہری اور قوی ہدایات اور اشارات ہیں۔

لٰکِنِ اللّٰہُ یَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَیْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ یَشْهَدُوْنَ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ﴿۱۶۶﴾

"لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ اے نبی ؐ جو کچھ اس نے تم پر نازل کیا ہے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور اس پر ملائکہ بھی گواہ ہیں' اگرچہ اللہ کا گواہ ہونا بالکل کفایت کرتا ہے۔"

اہل کتاب اس آخری رسالت کا انکار کرتے ہیں' حالانکہ یہ رسالت اللہ کی سنت کے عین مطابق ہے کہ اللہ تعالیٰ خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے رسولوں کو بھیجتے رہتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو ہدایت دیں اور تاکہ لوگوں کے پاس قیامت کے دن کوئی حجت نہ رہے اور یہ کہ اہل کتاب حضرت محمد ؐ سے قبل کے تمام رسل کو ملتے ہیں اور یہودی بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل کے تمام رسولوں کو مانتے ہیں اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ سے پہلے کے تمام رسولوں کو مانتے ہیں۔ اگر باوجود ان حقائق کے یہ لوگ مان کر نہیں دیتے تو نہ سہی ۔ (مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ اے نبی جو کچھ اس نے تم پر نازل کیا ہے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور اس پر ملائکہ بھی گواہ ہیں اگرچہ اللہ کا گواہ ہونا بالکل کفایت کرتا ہے ۔)

اس آیت میں قرآن کی سچائی پر اللہ کی گواہی ہے' اللہ کے بعد فرشتوں کی گواہی ہے اور ان فرشتوں میں وہ بھی شامل ہیں جنہوں نے اس قرآن کو رسول ؐ کریم پر اتارا۔ ان دو گواہیوں سے وہ دعویٰ ساقط ہو جاتا ہے جو اہل کتاب کرتے ہیں۔ اگر اللہ گواہی دیتا ہے تو ان لوگوں کے انکار کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ اگر فرشتے گواہ ہیں تو ان کا انکار چہ معنی دارد۔ جبکہ اللہ کی شہادت ہی کفایت کرتی ہے۔ اس شہادت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضور ؐ کو تسلی دیدی کیونکہ یہودی انکار حق کے ساتھ ساتھ رات دن سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں بھی مصروف تھے ۔

نیز اس شہادت کی وجہ سے اہل اسلام کو اطمینان دلانا بھی مطلوب ہے تاکہ وہ اپنے موقف پر اچھی طرح جم جائیں۔ یہ یقین دہانی انہیں اس دور میں کی گئی جب وہ مدینہ میں نووارد تھے۔ اس دور میں مدینہ کے یہودیوں نے اسلام اور اہل اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کا ایک طوفان برپا کر رکھا تھا اور وہ مختلف طریقوں' مختلف اسالیب سے اسلام کو ختم کرنے کے درپے تھے۔ اور قرآن کریم نے بھی اس دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں اس کا بھرپور جواب دیا۔

---ooo---

یہاں آکر اب منکرین حق کو ایک تہدید آمیز دھمکی دی جاتی ہے۔ اور اللہ اور فرشتوں کی شہادت کے بعد اب دھمکی ہی ان کے خلاف مناسب انداز ہے اس لئے کہ اس شہادت کے باوجود لوگ ہٹ دھرمی اور روگردانی میں مبتلا تھے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا
ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا۝۱۶۷ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ یَكُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ
وَ لَا لِیَهْدِیَهُمْ طَرِیْقًا۝۱۶۸ اِلَّا طَرِیْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ وَ
كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرًا۝۱۶۹

”جو لوگ اس کو ماننے سے خود انکار کرتے ہیں اور دوسروں کو خدا کے راستے سے روکتے ہیں وہ یقیناً گمراہی میں حق سے بہت دور نکل گئے ہیں - اسی طرح جن لوگوں نے کفر و بغاوت کا طریقہ اختیار کیا اور ظلم و ستم پر اتر آئے اللہ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا اور انہیں کوئی راستہ بجز جہنم کے راستہ کے نہ دکھائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے - اللہ کیلئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے -“

یہ اوصاف اور یہ فیصلے ' باوجود اس کے کہ یہ عام ہیں ان کا اطلاق سب سے پہلے یہودیوں پر ہوتا ہے ' اور دین اسلام اور اس کے پیروکاران کے ساتھ یہ موقف ان کا رہا ہے - بلکہ یہودیوں نے ہر سچے دین کے ساتھ یہی رویہ اختیار کیا - یہ یہودی وہ ہوں جو آغاز اسلام کے وقت مدینہ میں موجود تھے یا وہ ہوں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت موجود تھے - یا ان کے بعد آج تک وہ بھی موجود رہے ہوں یا وہ جو آج ہمارے دور میں موجود ہیں ' ان میں سے شاذ و نادر ہی ایسے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اپنے دل اسلام کیلئے کھول دیئے تھے اور ہدایت سے سرفراز ہوئے -

یہ یہودی ہوں یا وہ لوگ ہوں ' جن پر بھی صفت کفر اور دین اسلام کی راہ روکنے کی صفت کا اطلاق ہوتا ہے وہ یقیناً گمراہ ہوگئے ہیں اور راہ حق سے بہت دور نکل گئے ہیں ' انہوں نے اس راہ کو بھلا دیا جس کی طرف اللہ نے ان کی راہنمائی کی تھی اور انہوں نے وہ راستہ ترک کر دیا جو زندگی کا راہ مستقیم تھا - وہ فکری ' تصوراتی اور اعتقادی لحاظ سے گمراہ ہوگئے - وہ اپنے طرز عمل ' اپنے معاشرے اور اپنے اطوار کے لحاظ سے گمراہ ہوگئے - وہ دنیا میں بھی گمراہ ہوگئے اور آخرت میں بھی گمراہ ہوگئے - وہ اس قدر دور چلے گئے کہ ان کی واپسی کی کوئی امید نہیں رہی ہے - (ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِیْدًا (۴: ۱۶۷) (وہ راہ حق سے بہت ہی دور نکل گئے ہیں -)

(اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا (۴: ۱۶۸) ”جن لوگوں نے کفر کیا اور ظلم کرنے لگے -“ کفر بذات خود ظلم ہے - یہ حق کے ساتھ ظلم ہے - یہ نفس انسانی کے ساتھ ظلم ہے اور تمام لوگوں کے ساتھ ظلم ہے - قرآن کریم بعض اوقات کفر پر ظلم کا اطلاق بھی کرتا ہے - مثلاً (اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ) ”بے شک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے -“ اور دوسری جگہ ہے - (وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ) ”جو اللہ کے نازل کردہ

قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ ظالم ہیں۔" اس آیت سے پہلی آیت میں ایسے لوگوں کے بارے میں کہہ دیا گیا تھا کہ جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ (اس کے بارے میں تفصیلی بحث اس پارے کی سورہ مائدہ میں ہوگی۔) ان لوگوں نے صرف شرک کے ظلم ہی کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ انہوں نے اللہ کی راہ روکنے کا ارتکاب بھی کیا۔ اس طرح گویا یہ لوگ کفر میں بہت ہی دور نکل گئے یا ظلم میں حدوں سے نکل گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کیلئے اخروی سزا بھی مقرر فرما دیتے ہیں۔

(اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِیْدًا (۱۶۷) اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ یَكُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِیَهْدِیَهُمْ طَرِیْقًا (۱۶۸) اِلَّا طَرِیْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ، وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرًا (۱۶۹)

"جو لوگ اس کو ماننے سے خود انکار کرتے ہیں اور دوسروں کو خدا کے راستے سے روکتے ہیں وہ یقیناً گمراہی میں حق سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ اسی طرح جن لوگوں نے کفر و بغاوت کا طریقہ اختیار کیا اور ظلم و ستم پر اتر آئے اللہ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا اور انہیں کوئی راستہ بجز جہنم کے راستہ کے نہ دکھائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کیلئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ایسے لوگوں کو بخش دے، جبکہ وہ بہت ہی دور نکل گئے ہیں اور انہوں نے اپنے اوپر خود رحمت و مغفرت کے دروازے بند کر لیے ہیں۔ اب اللہ کی شان کے یہ لائق نہیں ہے کہ جہنم کی راہ کے سوا انہیں کسی اور راستے کی طرف راہنمائی کرے۔ اس لئے کہ انہوں نے خود اپنے لئے ہدایت کے تمام راستے بند کر لیے ہیں اور انہوں نے ان تمام راستوں میں رکاوٹیں خود قائم کر لی ہیں اور صرف اپنے لئے جہنم کی راہ کھلی رکھی ہے۔ اور جہنم کی راہ پر بھی وہ بہت دور نکل گئے ہیں اور اس راہ کے اب وہ دائمی مسافر بن گئے ہیں۔ یہ لوگ اسی پر چلتے رہیں گے اس لئے کہ انہوں نے کفر، ظلم اور اللہ کی راہ کو روکنے کو اپنا مستقل مشغلہ بنا رکھا ہے اور ان سے اب صرف یہی توقع ہے کہ یہ لوگ صرف اسی راستے پر آگے جائیں گے۔

(وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرًا (۴:۱۶۹) "اور اللہ کیلئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔" وہ اپنے بندوں پر پوری طرح حاوی ہے۔ اس کے اور اس کے بندوں میں سے کسی کے درمیان نہ نسب ہے اور نہ رشتہ داری ہے۔ اس کے لئے سب کو سزا دینا بہت ہی آسان ہے۔ کسی بندے کے پاس اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی قوت ہے اور نہ کوئی تدبیر، جس کے ذریعہ وہ اللہ کیلئے کوئی مشکلات پیدا کر سکے۔

یہودی بھی عیسائیوں کی طرح یہ کہتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ اور وہ یہ بھی کہتے تھے۔ (لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ) "ہمیں آگ نہیں چھوئے گی مگر چند گنے چنے دن" اور وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہم

اللہ کی پسندیدہ قوم ہیں۔جب قرآن نازل ہوا تو اس نے ان تمام باتوں کی نفی کر دی اور ہر کسی کو اپنے مقام پر کھڑا کر دیا کہ سب بندے ہیں اگر انہوں نے اچھے کام کئے تو اس پر انہیں ثواب ملے گا اور اگر انہوں نے برے کام کئے اور توبہ و استغفار کا موقعہ نہ ملا تو انہیں عذاب دیا جائے گا اور یہ کام اللہ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

---ooo---

ان تصریحات کے بعد یہاں آکر پوری انسانیت کو دعوت عام دی جاتی ہے کہ یہ رسول تمہارے پاس ایک سچائی لیکر آیا ہے۔اگر اس پر کوئی ایمان لائے گا تو یہ خود اس کیلئے ایک قسم کی بھلائی ہوگی اور جو شخص کفر اختیار کرے گا تو اس سے اللہ کو کوئی نقصان نہ ہوگا۔وہ تو سب سے مستغنی ہے۔اس کی قدرت سب پر حاوی ہے۔اور زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے' اسی کیلئے ہے۔وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور تمام معاملات کو اپنے علم اور حکمت کے مطابق چلاتا ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾

لوگو! یہ رسول تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق لے کر آگیا ہے' ایمان لے آؤ' تمہارے ہی لئے بہتر ہے اور اگر انکار کرتے ہو تو جان لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اور اللہ علیم بھی ہے اور حکیم بھی ہے۔

اس دعوت عامہ سے پہلے' اہل کتاب کی تمام افترابازیوں کا رد کیا گیا تھا اور یہودیوں کی فطرت اور ان کے منکرات اور ان کی تاریخی بداعمالیوں کا تذکرہ کیا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ یہ لوگ ہمیشہ ہٹ دھرم رہے ہیں۔انہوں نے یہی سلوک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی کیا حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے قائد' عظیم نبی اور ان کے نجات دہندہ تھے۔ نیز اس دعوت عامہ سے قبل اللہ تعالیٰ نے رسالت کی حقیقت بھی بیان کر دی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ رسالت کے مقاصد کیا ہوتے ہیں۔ان مقاصد کیلئے رسولوں کا بھیجنا ضروری تھا اور یہ بھی ضروری تھا کہ سب سے آخر میں حضرت محمد ؐ کو بھیجا جائے اس لئے کہ یہ آخری نبی تمام جہانوں کیلئے ہے۔ آپ کی دعوت کافۃ للناس ہے جبکہ آپ سے قبل جتنے رسول آئے تھے وہ اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے تھے۔لیکن جب سلسلہ رسالت کا خاتمہ طے ہوا تو ضروری تھا کہ خاتم النبین تمام دنیا کیلئے پیغام لانے والے ہوں۔(لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (٤: ١٦٥) "تاکہ رسولوں کے مبعوث کرنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے خلاف حجت نہ رہے۔" اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت عام نہ ہوتی اور اس کا اطلاق پوری دنیا کے لوگوں پر نہ ہوتا تو آپ کے بعد جو لوگ اور جو اقوام آتیں' قیامت تک کیلئے ان پر حجت تمام نہ ہوتی بلکہ ان کے ہاتھ اللہ کے خلاف یہ حجت آجاتی کہ ان تک تو کوئی رسول سرے سے بھیجا ہی نہیں گیا۔اس لئے حضور اکرم ؐ کی رسالت کو تمام لوگوں اور تمام زمانوں کیلئے عام کرکے اور آخری رسالت قرار دے

کر اس حجت کو تمام کر دیا گیا۔ چنانچہ یہ بات کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہ ہو گا یا یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہ ہو گا اللہ تعالیٰ کی صفت عدل و انصاف کے خلاف ہو گا۔ کیونکہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول بھیجے کے بغیر ہی لوگوں کو جزاو سزا دیں۔ یہ بات ناقابل انکار ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل کسی نبی اور رسول کی رسالت، رسالت عامہ نہ تھی اس لئے رسالت عامہ کی ضرورت تھی۔ یہ رسالت عامہ اللہ کی صفت عدل اور لوگوں کے ساتھ اس کی رحمت کا تقاضا تھی اور اللہ کی یہ بات سچ تھی کہ ہم نے آپ کو رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ آپ اس دنیا میں بھی رحمت تھے اور آخرت میں بھی رحمت ہوں گے۔ جیسا کہ اس آیت کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۴۴ ایک نظر میں

اس سبق میں اہل کتاب میں سے نصاریٰ کے ساتھ ایک راؤنڈ ہے جیسا کہ اس سے پہلے سبق میں یہودیوں کو لیا گیا تھا۔ بہرحال روئے سخن دونوں فرقوں کی طرف ہے جو مسیح اور مریم کے بارے میں افراط و تفریط میں مبتلا تھے۔

اس سے پہلے سبق میں قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کی جانب سے یہودیوں کی خرافات کا جواب دیا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھانے کے بارے میں صحیح صورت حال بیان کی تھی۔ یہودیوں' انکے اقوال و عقائد اور ان کی ہٹ دھرمی کے مقابلے میں سچائی کی مدافعت کی گئی تھی۔

اس سبق میں بھی موضوع سخن سچائی ہے اور روئے سخن خود نصاریٰ کی طرف ہے کہ وہ خود بھی حضرت مسیح کے بارے میں غلو سے کام لیتے ہیں اور یہ کہ بعض اقوام کے اندر نصرانیت کے سادہ عقائد کے ساتھ ساتھ بت پرستی بھی انکے نظریات کا جزو بن گئی تھی۔ جس وقت ان اقوام نے عیسائیت کو قبول کیا اور مضبوط تعلقات قائم ہوگئے تو خصوصاً یونانی دیومالائی تصورات اور رومی قصے اور کہانیاں اور قدیم مصریوں کی توہم پرستی اور ہندوؤں کی بت پرستی وغیرہ ان کے عقائد میں داخل ہوگئے۔

قرآن کریم جس وقت نازل ہوا' اس وقت اہل کتاب کے عقائد میں بے حد تحریفات ہوگئی تھیں۔ انکے عقائد کے اندر جو دیومالائی قصے داخل ہوگئے تھے قرآن کریم نے ان کا بطلان کیا اور ان کے تمام منحرف عقائد کی نشاندہی کی۔ اسی طرح دین ابراہیم علیہ السلام پر جو لوگ قائم تھے اور جو اپنے آپ کو دین حنیف پر سمجھتے تھے' ان کے عقائد کے اندر بھی گہرا انحراف پیدا ہوگیا اور ان کے تصورات میں بھی قصے کہانیاں اور جاہلیت کے باطل طور طریقے داخل ہوگئے تھے۔ یہ لوگ بھی جزیرۃ العرب میں موجود تھے۔

اسلام اس لئے آیا کہ تمام انسانوں کیلئے' ان کے اللہ کے بارے میں انکے عقائد درست کردے اور انسانوں کو ہر قسم کے انحراف اور خلل سے نجات دلائے۔ عقائد کے اندر ہر قسم کے غلو اور افراط و تفریط کو ختم کردے اور فکر انسانی کو سیدھی راہ پر ڈال دے۔ اس طرح اسلام نے ارسطو کے تصور توحید میں اصلاح کی جو اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے یونان میں پیش کیا تھا۔ اسی طرح اسکندریہ میں افلاطون نے ولادت مسیح کے بعد جو افکار پیش کئے ان میں بھی اصلاح کی۔ نیز ان دونوں کے بعد الٰہیات کے میدان میں جو افکار بھی نام نہاد بڑے دماغوں نے پیش کئے وہ سب کے سب گمراہی اور مخبوط الحواسی کی واضح مثال تھے۔ یہ انسانی عقل کا نتیجہ تھا اور یہ تمام افکار اس بات کے محتاج تھے کہ اللہ کی جانب سے ارسال کردہ پیغام ان کی راہنمائی کرے اور ان گم کردہ راہ لوگوں کو سراب سے نکالے۔

یہاں جو مسئلہ پیش کیا جاتا ہے وہ تثلیث کا مسئلہ ہے' جس میں عیسائیوں نے یہ کہانی گھڑی تھی کہ حضرت مسیح خدا

کے بیٹے ہیں' اس غلط عقیدے کی تردید کر کے درست اور سیدھے طریقے سے عقیدۂ توحید کو سمجھایا گیا۔

جس وقت اسلام آیا اس وقت عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے درمیان جو عقیدہ رائج تھا وہ یہ تھا کہ اللہ اقانیم ثلاثہ کے اندر ایک ہے۔ باپ' بیٹا اور روح القدس۔ ان تینوں میں سے مسیح بیٹا تھا۔ اس کے بعد مسیح کے بارے میں ان کے مذاہب و مکاتب فکر مختلف تھے۔ آیا وہ لاہوتی طبیعت رکھتے تھے یا ناسوتی طبیعت کے مالک تھے یا دونوں کا امتزاج تھے۔ پھر ان کی اپنی حیثیت اختلاف طبعی کے باوجود ایک تھی یا مختلف جثیات تھیں یا یہ کہ باپ کی طرح قدیم تھے یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان اختلافی مذاہب فکر کے درمیان پھر تصادم بھی ہوتے رہے اور ایک دوسرے پر سخت مظالم بھی کئے گئے۔ (اس کی تفصیلات اس سورہ میں تشریح آیات کے وقت دی جائیں گی۔) تاریخی تحقیقات اس بات کی مظہر ہیں کہ عقیدۂ تثلیث' عقیدۂ ابنیت مسیح عقیدہ الوہیت مریم' اور تثلیث کی متعدد شکلوں میں مریم کی شمولیت وغیرہ یہ تمام عقائد ابتدائی مسیحیت کا حصہ نہ تھے۔ یہ عقائد تاریخ کے مختلف ادوار میں مسیحیت میں داخل ہوتے رہے ہیں اور مختلف بت پرست اقوام فوج در فوج مسیحیت میں داخل ہوتی رہیں اور بت پرستی ساتھ لاتی رہیں اس لئے کہ قبول عیسائیت کے ساتھ ان کی نظریاتی تطہیر نہ ہو سکی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تثلیث مصر کے بعض قدیم مذاہب سے لی گئی ہے مثلاً ان میں "اوزوریس' ایزلیس اور حورلیس" اور ان مذاہب میں دوسری متعدد تثلیثات اس عقیدے کا ماخذ ہیں۔

نصاریٰ میں بھی عقیدۂ توحید کے حامل فرقے ہمیشہ رہے ہیں اور پوری تاریخ مسیحیت میں ان موحدین پر سخت مظالم ہوتے رہے ہیں۔ خصوصاً رومی کلیسا کی طرف سے اور ان لوگوں نے جیسا کہ ہمیشہ اہل توحید کا شیوہ رہا ہے' ان مظالم کا بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ یہ مظالم چھٹی صدی عیسوی تک مختلف سوسائٹیوں کی طرف سے ہوتے رہے جو حکومت کی حامی تھیں۔ ان موحدین پر جو مظالم ڈھائے گئے ان میں قتل عام' جلا وطنی اور تمام دوسرے مظالم شامل تھے۔

آج تک نصاریٰ کے عقلمند لوگوں کے ذہنوں میں عقیدۂ تثلیث کے بارے میں ایک شدید خلجان موجود ہے۔ اور اہل کنیسہ اسے مختلف طریقوں سے لوگوں کے ذہنوں میں بٹھاتے ہیں اور ان کا آخری حربہ یہ ہے کہ یہ لوگ اسے یکے از مجہولات قرار دیتے ہیں اور ان کا کہنا یہ ہے کہ ان کا صحیح انکشاف اس وقت ہو گا جب زمین و آسمان کے تمام راز کھول دیئے جائیں گے۔

رسالہ "اصول وقوع" کے مدیر مسٹر پیٹر جو عقیدہ تثلیث کے شارحین میں سے ممتاز شخص ہیں' وہ کہتے ہیں کہ "ہم نے اپنی عقل کی حدود کی حد تک اس کو یوں ہی سمجھا ہے اور امید ہے کہ مستقبل میں ہم اس عقیدے کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے جب اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کے رازوں سے پردہ اٹھائیں گے۔" (دیکھئے۔ نصرانیت پہ معاملات' ابو زہرہ)۔

---○○○---

درس نمبر ۴۴ تشریح آیات

۱۷۱ -- تا -- ۱۷۵

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۡ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ڣ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۭ اِنْتَھُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝

”اے اہل کتاب ‘ اپنے دین میں غلو نہ کرو۔ اور اللہ کی طرف حق کے سواء کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک فرمان تھا جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے (جس نے مریم کے رحم میں بچہ کی شکل اختیار کی) پس تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ تین ہیں۔ باز آجاؤ‘ یہ تمہارے ہی لئے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔ وہ پاک ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔ زمین و آسمان کی ساری چیزیں اس کی ملک ہیں ‘ اور ان کی کفالت و خبرگیری کیلئے بس وہی کافی ہے۔)“

نصرانیوں کا عقیدۂ تثلیث غلو فی الدین ‘ حدود سے تجاوز اور حق سے روگردانی ہے اس لئے اہل کتاب کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اللہ کے بارے میں وہی کچھ کہیں جو حق ہو ‘ مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہے یا یہ کہ وہ تین میں سے ایک ہے۔

ان کے ہاں نظریہ تثلیث مختلف ادوار کے اندر ان کے فکری اتار چڑھاؤ کے مطابق بدلتا رہا ہے۔ لیکن اللہ کی طرف بیٹے کی نسبت کرکے انسان کی فطری ناپسندیدگی کی وجہ سے اور دور جدید کی عقلیت پسندی کی وجہ سے وہ اس ابنیت کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ اس بیٹے کی ولادت اس طرح نہیں ہوئی جس طرح عام بشری ولادت ہوتی ہے بلکہ اس کی

حقیقت اس طرح ہے جس طرح باپ کو بیٹے سے محبت ہوتی ہے اور تین میں سے ایک کی تشریح وہ اس طرح کرتے ہیں جس طرح ایک کی تین صفات ہوتی ہیں۔ اگرچہ آج تک وہ ان ناقابل فہم اور متضاد تصورات کو انسانی فہم و ادراک کے اندر داخل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ آخر کار انہوں نے یہ قرار دیا ہے کہ وہ غیبی معمے ہیں اور ان کی حقیقت کا ادراک اس وقت ہو گا جب اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کے رازوں سے پردہ اٹھائیں گے۔

اللہ کی ذات شرکت اور مشابہت سے پاک ہے اور یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ خالق ہے اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کی ذات اپنی مخلوق سے علیحدہ ذات ہو۔ خالق اور مخلوق کے درمیان جدائی اور مالک اور مملوک کے درمیان علیحدگی ایک قابل فہم تصور ہے جس کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔

(اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۴: ۱۷۱) "اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔ وہ پاک ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔ زمین و آسمانوں کی ساری چیزیں اس کی ملک ہیں۔"

اگر لوگوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بن باپ پیدا ہو جانا عجیب لگتا ہے اور وہ اس دنیا میں رات دن جو کچھ دیکھتے ہیں' اس کے خلاف لگتا ہے تو یہ تعجب اس لئے ہوتا ہے کہ یہ واقعہ معروف اور معتاد طریقہ کار سے ذرا ہٹ کر ہے۔ لیکن لوگ جس چیز کو روز دیکھتے ہیں وہ بھی پوری حقیقت نہیں ہے اور انکے سامنے یہ کائنات جن قوانین کے مطابق چل رہی ہے اللہ کی پوری سنت ان کے اندر محدود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ان سنتوں اور قوانین کا خالق ہے۔ وہ ان کو دہراتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے ان میں تصرف بھی کر سکتا ہے۔ اس کی مشیت پر کوئی حد اور قید عائد نہیں ہے۔

(اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ (۴: ۱۷۱) مسیح عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان تھا جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے (جس نے مریم کے رحم میں بچہ کی شکل اختیار کی)۔

مختصراً یہ کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور انکی پوزیشن اور دوسرے رسولوں کی پوزیشن میں کچھ فرق و امتیاز نہیں ہے۔ وہ وہی حیثیت رکھتے ہیں جو حضرت نوح علیہ السلام' حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت موسیٰ علیہ السلام' اور حضرت محمد ﷺ کی ہے اور وہ اسی برگزیدہ گروہ اور مختاران برائے منصب رسالت میں سے ایک ہیں جو انسانی تاریخ کے طویل ترین دور میں وقتاً فوقتاً مبعوث ہوتے رہے ہیں۔

(وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ (۴: ۱۷۱) "ایک فرمان تھا جو مریم کی طرف بھیجا" اس کی قریب الفہم تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو براہ راست اپنے فرمان سے پیدا کیا۔ اس تکوینی حکم اور فرمان کے لئے قرآن کن فیکون کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اللہ نے مریم کی طرف یہ حکم متوجہ کیا اور اس کے بطن میں حضرت عیسیٰ

علیہ السلام کی تخلیق ہوگئی اور یہ کسی باپ کے نطفے کے بغیر ہوئی۔یعنی اس طرح نہ ہوئی جس طرح انسان کی عمومی زندگی کی روٹین میں ہوتا ہے اور اللہ کا یہ فرمان اور یہ کلمہ وہ ہے جو ہر چیز کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔اس لئے یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بطن مریم میں اپنے حکم اور نفخ روح سے پیدا کر دیں۔ (وَرُوْحٌ مِّنْهُ) "وہ اللہ کی طرف سے ایک روح تھی۔"

تمام کتب سماوی کے ماننے والے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ نے آدم کو مٹی سے بنایا اور بنانے کے بعد اس میں روح پھونکی۔اس طرح وہ انسان کی شکل اختیار کر گئے۔دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

(اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ (۷۱) فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ (۷۲) (۳۸ آیت ۷۲ - ۷۲) "جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا۔"میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ۔" اور یہی بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمائی۔

(وَالَّتِیْ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا (۲۱: ۹۱) "اور وہ خاتون جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی۔ہم نے اس کے اندر اپنی روح سے پھونکا" اس لئے قرآن مجید کے مطابق مریم کے اندر جو روح پھونکی گئی اور اس کی جو تعبیر قرآن نے کی ویسی ہی تعبیر حضرت آدم کے بارے میں بھی کی ہے۔اور دونوں جگہ نفخ روح کا ذکر ہے اور اہل کتاب میں سے کوئی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ حضرت آدم ابن اللہ ہیں حالانکہ وہ سب تخلیق آدم کی کہانی اور آدم میں نفخ روح کے قائل ہیں۔نہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ آدم اقانیم الٰہیہ میں سے کوئی اقنوم ہیں۔جس طرح وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قائل ہیں۔حالانکہ حضرت آدم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان تخلیق اور نفخ روح کے لحاظ سے مکمل مشابہت پائی جاتی ہے۔بلکہ آدم علیہ السلام بغیر باپ اور بغیر ماں کے پیدا ہوئے تھے جبکہ عیسیٰ علیہ السلام کے کیس میں بالاتفاق ماں تو موجود تھی۔یہی حقیقت قرآن کریم دوسری جگہ پیش کرتا ہے۔

(اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (۳: ۵۹) "اللہ کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جاؤ اور وہ ہو گیا۔" انسان اس بات پر متعجب ہوتا ہے کہ ذاتی خواہشات اور بت پرستی کے غلط افکار نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے نہایت ہی سادہ اور قابل فہم مسئلے کو کس قدر چیستان بنا دیا ہے۔جس نے صدیوں تک کئی نسلوں کے ذہن کو پریشان کیے رکھا۔ لیکن جب قرآن آتا ہے تو وہ بڑی سادگی کے ساتھ ایک چٹکی سے اس مسئلے کو حل کر دیتا ہے۔اور اصل حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

جو ذات باری حضرت آدم کو بغیر والدین کے پیدا کر کے اسے روح دے سکتی ہے اور اسے تمام مخلوقات میں سے

ممتاز اور برتر بناسکتی ہے تو وہی ذات ہے جس نے حضرت عیسیٰ ﷺ کو بن باپ پیدا کر دیا اور یہ تمہیں کیوں حیرت انگیز نظر آتا ہے۔یہ بھی زندگی ہے اور وہ بھی زندگی ہے۔اور اللہ کا یہ کلام نہایت ہی واضح اور سادہ اور قابل فہم ہے۔بہ نسبت ان چیستانوں کے جو عیسائیوں کے ہاں رائج ہوئے اور ان کی انتہا الوہیت مسیح کی قرار داد پر ہوئی۔اس نتیجے تک وہ محض اس لئے پہنچے کہ ان کا کوئی باپ نہ تھا۔اور اسی کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کے تین اقنوم کے قائل ہوئے حالانکہ وہ اس تصور سے پاک اور بلند تر ہے۔

(فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِه ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۭ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ (۴ : ۱۷۱) "پس تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ "تین" ہیں۔باز آجاؤ یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔" اللہ اور رسولوں پر ایمان لانے کی اسی دعوت میں حضرت عیسیٰ ﷺ بحیثیت رسول اور حضرت محمد ؐ بحیثیت خاتم النبیین شامل ہیں اور اس میں یہ بھی شامل ہے کہ حضرت عیسیٰ ﷺ کے بارے میں تم جن اساطیر اور جھوٹے دعوؤں پر یقین رکھتے ہو' ان سے باز آجاؤ۔اس کی تفصیلات بعد میں مناسب مقام پر آرہی ہیں۔

(اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۴ : ۱۷۱) (بے شک اللہ تو ایک ہی خدا ہے) اور اس کی وحدانیت پر اس کائنات کے اندر جاری و ساری واحد ناموس گواہی دے رہا ہے۔اس پوری مخلوقات کی وحدت ' اس پوری کائنات کی فطرت کو ایک ہی نہج پر ڈال رہی ہیں۔اور یہ نہج یہ ہے کہ اللہ نے کن کہا اور پھر سب کچھ ہو گیا۔پھر انسانی عقل بھی واحد الٰہ پر گواہ ہے اس لئے کہ ایک واحد مدبر الٰہ کا وجود انسان کیلئے قابل فہم ہے۔عقل انسانی کسی ایسے خالق کا تصور نہیں کر سکتی جو مخلوقات جیسا ہو' نہ وہ تین خالقین کا تصور کر سکتی ہے اور یہ بات تو سمجھ میں آتی ہی نہیں کہ تین بھی ہوں اور ایک بھی ہو۔

(سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ (۴ : ۱۷۱) (وہ اس سے پاک ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔) بیٹا تو اس لئے ہوتا ہے کہ باپ فانی ہوتا ہے اور اس صورت میں نسل کا تسلسل مطلوب ہوتا ہے۔اللہ تو ابد الاباد تک باقی ہے۔اسے کیا ضرورت ہے کہ ایک فانی کو اپنا بیٹا بنائے جب تمام وہ چیزیں جو زمین میں ہیں یا آسمانوں میں ہیں وہ اللہ کی ملکیت میں ہیں۔

(لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۴ : ۱۷۱) "آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں اس کی ملک ہیں۔" اور بندوں کیلئے یہ کافی ہے کہ وہ سب کے سب اللہ کے ساتھ رابطہ بندگی قائم کریں۔وہ تو سب کا نگہبان اور محافظ ہے۔اور سب کا پالنے والا ہے۔اس لئے اللہ کے ساتھ رشتہ نکالنے کی کیا ضرورت ہے۔اللہ اور بندوں کے درمیان یہ تعلق قائم ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کا کفیل اور وکیل ہے۔(وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (۴ : ۱۷۱) "بندوں کی کفالت اور خبرگیری کیلئے وہی کافی ہے۔"

یوں قرآن مجید اس حقیقت کو اس حد تک اجاگر کر دیتا ہے اور حضرت عیسیٰ ﷺ کے عقیدے کے بارے میں فیصلہ کر دیتا ہے۔ساتھ ساتھ لوگوں کو یہ احساس اور یہ شعور بھی دلایا جاتا ہے کہ اللہ ان کا کفیل اور نگہبان بھی ہے۔اللہ ہر وقت ان کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ان کی ضروریات کا بھی وہ کفیل ہے۔ان کے مفادات کا بھی وہ بندوبست کرنیوالا ہے

تاکہ وہ اپنے تمام امور اطمینان کے ساتھ اس کے حوالے کر دیں۔

---ooo---

اب سیاق کلام میں بات ذرا آگے بڑھتی ہے۔اب ہم نہایت ہی عظیم اور اہم نظریاتی مسئلہ کی طرف آتے ہیں۔وہ اعتقاد اور نظریہ جو ایک انسان کے دل و دماغ میں عقیدۂ توحید کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے یعنی یہ کہ اللہ خالق اور مالک ہے اور اس کے جواب میں انسان مملوک اور بندہ ہے۔اس لئے دو حقائق عقیدہ یا دو اجزاء عقیدہ توحید کے لازمی حصے ہیں یہ کہ اللہ حاکم ہے اور لوگ محکوم' اللہ الٰہ ہے اور معبود ہے اور لوگ عابد اور غلام' اور یہ کہ بندگی اور غلامی اس کرۂ ارض کی تمام موجودات کیلئے ہے اور موجودات کی تمام اقسام و انواع اس کی بندگی میں ہیں۔

یہاں قرآن کریم نصاریٰ کے اس عقیدے کی تصحیح کرتا ہے جس کے مطابق وہ فرشتوں کو بھی اللہ کے بیٹے اور اولاد تصور کرتے تھے یا ان کو خدا کے ساتھ خدائی میں شریک کرتے تھے۔جس طرح وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو الوہیت میں شریک کرتے تھے۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ
الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ
جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ
اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا
فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا
وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

"مسیح نے کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ مقرب ترین فرشتے اس کو اپنے لئے عار سمجھتے ہیں۔اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لئے عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا جب اللہ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرے گا۔اس وقت وہ لوگ جنہوں نے ایمان لا کر نیک طرز عمل اختیار کیا ہے اپنے اجر پورے پورے پائیں گے اور اللہ اپنے فضل سے ان کو مزید اجر عطا فرمائے گا۔اور جن لوگوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا ہے ان کو اللہ دردناک سزا دے گا اور اللہ کے سوا جن جن کی سرپرستی و مددگاری پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں' ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے۔"

قرآن کریم نے عقیدۂ توحید لوگوں کے ذہنوں میں بٹھانے کی بڑی کوشش کی ہے۔ایسی وحدانیت جس کے اندر

شرک کا کوئی شائبہ نہ ہو اور نہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ کیلئے کسی قسم کا تشبہ لازم آتا ہو۔ قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ اللہ جیسا کوئی بھی نہیں ہے اور نہ کوئی چیز اس جیسی ہے۔ نہ اللہ کی ماہیت میں اس کا کوئی شریک ہے۔ نہ صفت میں اس کے ساتھ کوئی شریک ہے۔ نہ خاصیت میں اس کے ساتھ کوئی شریک ہے۔ اور قرآن کریم نے خالق اللہ اور مخلوقات کے درمیان ایک ہی رابطہ جائز رکھا ہے۔ اور وہی حقیقت ہے کہ اللہ کے سوا تمام اشیاء (جس میں زندہ مخلوق بھی ہے۔) اس کے بندے اور تابع فرمان ہیں۔ جو شخص بھی قرآن کا مطالعہ کرے گا وہ دیکھے گا کہ قرآن کریم نے اس حقیقت کو ذہن نشین کرانے کیلئے بہت ہی زور دیا ہے۔ اس حقیقت کے ہر پہلو کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس طرح کہ انسان کے دماغ میں کوئی شبہ، کوئی شک اور کوئی پیچیدگی نہ رہے۔

پھر قرآن نے مزید یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ یہ وہ حقیقت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں کو مبعوث فرمایا ہے اس لئے قرآن کریم نے ہر رسول کی سیرت کے واقعات بیان کرتے وقت اور ہر رسول کی دعوت کا خلاصہ پیش کرتے وقت یہ کہا ہے کہ تمام رسولوں کی دعوت عقیدۂ توحید کی طرف رہی ہے۔ نوح علیہ السلام کی رسالت کا یہی عقیدہ رہا ہے اور نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ کی رسالت کا محور بھی عقیدۂ توحید رہا ہے۔ ہر رسول کی دعوت میں یہ فقرہ بنیادی رہا ہے۔ (يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ) "اے قوم! اللہ کی بندگی کرو، تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔" لہٰذا یہ بات نہایت ہی تعجب انگیز تھی کہ ان سماوی ادیان کے پیروکاروں میں سے کوئی شخص یا قوم عقیدۂ توحید کے اندر تحریف کرے، حالانکہ ان ادیان میں عقیدۂ توحید مرکزی نکتہ رہا ہے اور ان ادیان نے اسے نہایت ہی قطعی اور فیصلہ کن انداز میں پیش کیا ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ کسی دین سماوی کے پیروکار اللہ کے لئے کسی کو بیٹے یا بیٹیاں قرار دیں۔ یا یہ کہ ذات باری اقانیم کی صورت میں کسی مخلوق کے اندر امتزاج اختیار کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسے عقائد صرف باہر کے بت پرستوں ہی سے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

اسلام میں تو الوہیت اور عبودیت باہم متقابل ہیں۔ یہی اسلام کی اساس ہے۔ اللہ اور بندے کے درمیان حاکم و محکوم اور معبود اور عابد کے سوا کوئی اور تعلق نہیں ہو سکتا تھا۔ محکوم اور عابد مخلوق ہوگی اور حاکم اور معبود اللہ ہوگا۔ جب تک لوگ اس سیدھے نظریے اور عقیدے کو قبول نہ کریں گے نہ ان کی زندگی درست ہو سکتی ہے اور نہ ہی ان کے تصورات درست ہو سکتے ہیں ورنہ ان کے خیالات میں خواہ مخواہ کوئی شبہ، کوئی ملاوٹ اور کوئی شبہ موجود رہے گا۔

ہاں یہ درست ہے کہ لوگوں کی زندگی اس وقت تک درست نہیں ہو سکتی اور نہ ان کی سوچ میں ٹھہراؤ پیدا ہو سکتا ہے جب تک انہیں اپنے اور اپنے رب کے درمیان اس رابطے کا یقین نہ ہو جائے کہ رب ان کا حاکم ہے اور وہ اس کے محکوم ہیں۔ رب خالق ہے اور وہ مخلوق ہیں۔ رب ان کا مالک ہے اور وہ اس کے مملوک ہیں۔ یہ سب بندے اور مخلوقات اپنی اس حیثیت میں ایک جیسے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اللہ کا بیٹا نہیں ہے۔ کسی کے ساتھ اللہ کا امتزاج نہیں ہے اس لئے اللہ کے ساتھ کسی کی کوئی قرابت نہیں ہے۔ الا یہ کہ کسی کے پاس ایمان اور عمل کی کوئی پونجی ہو اور وہ اس پونجی کو اللہ کے سامنے قلبی رجحان کے ساتھ پیش کرے اور یہ تقرب وہ ہے جو اللہ کے ساتھ اس کی مخلوق میں ہر شخص حاصل کر سکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ کوئی اللہ کا بیٹا ہے یا یہ کہ کسی کے ساتھ اللہ نے امتزاج اختیار کر لیا ہے تو یہ کسی بشر کو بھی حاصل نہیں ہے۔

جب تک لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں یہ حقیقت نہیں بیٹھ جاتی کہ وہ سب کے سب ایک ہی رب کے بندے اور غلام ہیں' اس وقت تک ان کی زندگی درست ہو سکتی ہے' نہ ان کے باہمی رابطے قائم ہو سکتے ہیں اور نہ وہ فرائض حیات کو اچھی طرح سرانجام دے سکتے ہیں۔ اس تصور کا نتیجہ یہ ہے کہ احکم الحاکمین کے ساتھ سب کا موقف برابر فاصلے پر ہو گا اور اس کے ساتھ قرب حاصل کرنا سب کیلئے کھلا ہو گا۔ یوں تمام بنی نوع انسان کے درمیان مرتبہ کے اعتبار سے مکمل مساوات ہو گی۔ اس طرح کہ مالک الملک کے ساتھ ان کا فاصلہ برابر ہو گا اور یہاں پر وہ کھوٹا اور غلط دعویٰ بالکل باطل ہو جائے گا کہ یہاں اللہ اور بندے کے درمیان کوئی واسطہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس تصور کے مطابق کسی فرد یا کسی نسب یا کسی طبقہ حاکمہ کی جانب سے اپنے لئے حاصل کردہ وہ تمام حقوق بے اصل ہو جاتے ہیں کہ وہ دوسرے لوگوں سے رب کے ساتھ تعلق کے حوالے سے کسی طرح ممتاز ہیں۔ اس تصور کے سوا' عوام الناس کے اندر حقیقی مساوات قائم نہیں ہو سکتی نہ انسانوں کا کوئی نظام حیات یا ان کی کوئی سوسائٹی اصول مساولت پر قائم ہو سکتی ہے۔

اس لئے عقیدۂ توحید اس نقطہ نظر سے محض ایک ایسا مسئلہ ہی نہیں رہتا کہ وہ ایک وجدانی تصور ہے جو کسی شخص کے قلب میں مضبوطی سے بیٹھ جائے اور بس' بلکہ عقیدہ توحید ایک نظام زندگی' معاشرتی رابطہ اور بنی نوع انسان کی مختلف نسلوں اور اقوام کے درمیان روابط یعنی سوشیالوجی اور بین الاقوامی مسئلہ بھی بن جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے انسان کو عقیدۂ توحید دیکر اسے ایک جدید زندگی اور نشاۃ ثانیہ عطا کی ہے۔ اس کی رو سے انسان تمام انسانوں کی غلامی سے آزاد ہو کر صرف ایک رب ذوالجلال کا غلام بن جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسلام کی تاریخ میں کوئی ایسا کنیسہ قائم نہیں ہوا جو لوگوں کو اپنا محکوم اس تصور حیات کی اساس پر بنائے کہ وہ ابن اللہ کا نمائندہ ہے۔ یا وہ اس اقنوم کا نمائندہ ہے جو اللہ کے اقانیم کیلئے متمم ہے۔ اس وجہ سے اسلامی تاریخ میں مسلمانوں پر تھیاکریسی کا نظام کبھی قائم نہیں ہوا جس میں کوئی بادشاہ اپنے لئے ظل اللہ فی الارض کا لقب اختیار کرے اس طرح کہ اسے حکومت کا حق من جانب اللہ ہے یا یہ کہ وہ از جانب اللہ قانون سازی کر سکتا ہے اس لئے کہ وہ اللہ کا قرابت دار ہے یا اللہ نے اپنے اختیارات اسے تفویض کر دیئے ہیں۔

کنیسہ اور پوپ نے اپنے لئے یہ حق محفوظ کئے رکھا۔ اسی طرح پیٹر کے پیرو بھی اپنے لئے اس حق کا دعویٰ کرتے تھے۔ یہ حق یورپ میں ابنیت اور امتزاج اقانیم کے نظریات کے تحت لوگ اپنے لئے مخصوص کرتے رہے۔ جب صلیبیوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگیں شروع کیں اور مسلمانوں سے لڑتے رہے۔ تو وہ صلیبی جنگوں میں شکست کے ساتھ ساتھ اسلام کے نظریہ توحید سے بھی شکست کھا گئے۔ ان جنگوں کے نتیجے میں یورپ کے اندر تحریک اصلاح مذہب شروع ہو گئی اور مارٹن لوتھر' کالون اور زنجلی کی تحریکات شروع ہوئیں۔ جنہوں نے کنیسہ کے باطل تصورات کی دھجیاں بکھیر دیں۔ یہ سب مصلحین اسلام کے سیدھے سادھے تصور حیات سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے انسان کے تقدس کے نظریے یا اس تصور کی نفی کی کہ اللہ نے اپنے اختیارات کسی کو تفویض کئے ہیں اس لئے کہ انہوں نے دیکھا کہ اسلام میں ایک الٰہ ہے اور مقابلے میں تمام لوگ بندے ہیں اور ان کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔

---ooo---

یہی وجہ ہے کہ یہاں قرآن کریم میں الوہیت مسیح کے نظریے کی فیصلہ کن انداز میں تردید کر دی گئی۔ اسی طرح روح

القدس کی خدائی کی بھی تردید کر دی کہ وہ اقانیم ثلاثہ میں سے ایک ہیں۔ غرض کسی شکل میں بھی کسی کیلئے نظریہ الوہیت کی تردید کر دی گئی۔ چاہے کوئی یہ نظریہ کسی کیلئے بھی اختیار کرے۔ قرآن کریم فیصلہ کن انداز میں یہ اعلان کرتا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم اللہ کے بندے ہیں اور انہوں نے کبھی بھی اللہ کا بندہ ہونے کو اپنے لئے عار نہیں سمجھا۔ اسی طرح ملائکہ مقربین بھی اللہ کے بندے ہیں اور انہوں نے بھی اپنے لئے اپنی اس حیثیت کو کبھی عار نہیں سمجھا۔ تمام مخلوقات اس کی بندگی میں ہے اور عنقریب ان کو اللہ کے سامنے اجتماعی طور پر اٹھایا جائے گا۔ جو لوگ اللہ کی بندگی کو اپنے لئے عار اور توہین سمجھتے ہیں وہ عذاب الیم کا انتظار کریں اور جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کا بندہ و غلام سمجھتے ہیں وہ انعام و اکرام کے امیدوار ہوں۔

(لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا (۱۷۲) فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۱۷۳) (۴: ۱۷۲ - ۱۷۳) "مسیح نے کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ مقرب ترین فرشتے اس کو اپنے لئے عار سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لئے عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا جب اللہ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرے گا۔ اس وقت وہ لوگ جنہوں نے ایمان لا کر نیک طرز عمل اختیار کیا ہے اپنے اجر پورے پورے پائیں گے۔ اور اللہ اپنے فضل سے ان کو مزید اجر عطا فرمائے گا۔ اور جن لوگوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا ہے ان کو اللہ دردناک سزا دے گا اور اللہ کے سوا جن جن کی سرپرستی و مددگاری پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے۔"

حضرت مسیح ابن مریم اپنے آپ کو اللہ کی بندگی کے مقام سے بلند نہیں سمجھتے۔ اس لئے کہ وہ اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔ وہ تمام لوگوں سے زیادہ مقام الوہیت اور مقام عبودیت سے واقف ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ الوہیت اور عبودیت الگ الگ حقائق ہیں اور ان کے درمیان امتزاج ممکن نہیں ہے۔ وہ سب سے زیادہ جانتے تھے کہ وہ اللہ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہیں' اور اللہ کی مخلوق اللہ جیسی نہیں ہو سکتی۔ نہ وہ اللہ کا جزو ہو سکتی ہے اور وہ سب سے زیادہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ بندگی کے فرائض صرف اللہ کے سامنے بجالائے جانے چاہئیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے اللہ کی بندگی بجالانا ایک حقیقت ہے اور اس کی اس قدر تاکید کی گئی ہے کہ اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ اللہ کی بندگی کا انکار صرف کافر کر سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور انشاء کو نہیں مانتے اور یہ کہ بندگی وہ مرتبہ ہے اور وہ اعزاز ہے جو اللہ اپنے رسولوں کو اس وقت دیتے ہیں جب وہ اعلیٰ اور افضل مراتب پر فائز ہوتے ہیں۔ یہی حال ملائکہ مقربین کا ہے جن میں روح القدس شامل ہیں۔ ان کا حال بھی یہی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور تمام

دوسرے رسل کا ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں۔ لہٰذا اب حضرت مسیح کے ان پیروکاروں کو کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ حضرت مسیح کے حوالے سے اس بات کی نفی کرتے ہیں جس کے وہ خود مقرر ہیں۔

(وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا (٤ : ١٧٢)
"اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لئے عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا جب اللہ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرلے گا۔" اس لئے اگر وہ خدا کی بندگی کو اپنے لئے عار سمجھتے ہیں اور اللہ کے مقابلے میں بڑائی کرتے ہیں تو ان کا فعل انہیں اللہ کے سامنے لاکھڑا ہونے سے ہرگز نہ بچاسکے گا کیونکہ اللہ تمام لوگوں پر حاکم مطلق ہے اور اللہ کی حاکمیت کے مقابلے میں مقرب بندے اور تمام لوگ ایک ہی جیسے ہیں۔

جن لوگوں نے حق کو پہچان لیا اور انہوں نے اللہ کی عبودیت کا اقرار کرلیا اور انہوں نے نیک کام کئے' اس لئے کہ نیک کام کرنا اللہ کی عبودیت کے اقرار کا لازمی ثمرہ ہے تو اللہ تعالیٰ انہیں ان کے صلہ پورا پورا دے گا اور اس صلے سے مزید ان پر اپنا فضل بھی کرے گا۔

(وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (٤ : ١٧٣) اور جن لوگوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا۔ ان کو اللہ

دردناک سزا دے گا اور اللہ کے سوا جن جن کی سرپرستی و مددگاری پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے۔" اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کی جانب سے بندگی کا اقرار اور اس کی بندگی و عبادت کا مطالبہ اس لئے نہیں کرتے کہ اللہ کو ان کے اقرار غلامی یا بندگی کی کوئی خاص ضرورت ہے۔ وہ تو غنی بادشاہ ہے یا یہ کہ اگر یہ لوگ بندگی کریں گے تو اس کی حکومت اور سلطنت میں کوئی اضافہ ہوجائے گا یا یہ کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو اس کی مملکت میں کوئی کمی ہوجائے گی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ لوگ اللہ کی ربوبیت اور حاکمیت کا مفہوم سمجھ لیں۔ وہ اپنے تصورات و عقائد کی تصحیح کرلیں اور وہ اپنے جذبات اور اپنے شعور کے اندر اصلاح کرلیں جس کے نتیجے میں ان کی زندگی اور زندگی کے طور طریقوں کی اصلاح از خود ہوجائے گی۔ اس لئے کہ کوئی نظام زندگی اس وقت تک پرسکون اور پرامن نہیں ہوسکتا اور کوئی تصور اور عقیدہ اس وقت تک مستحکم اور مستقر نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنی بنیاد میں مستحکم نہ ہو۔ زندگی کا کوئی تصور اور کوئی نظام اللہ کی حاکمیت اور اللہ کی بندگی کے بغیر مستحکم نہیں ہوسکتا اور نہ اس کے بغیر زندگی میں اچھے آثار نمودار کرسکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ یہ حقیقت' اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ جس کا بیان اوپر کردیا گیا ہے لوگوں کے ذہن نشین ہوجائے اور اس پر ان کی زندگی کا تفصیلی نقشہ مرتب ہوجائے تاکہ وہ انسانوں کی بندگی سے نکل کر صرف اللہ کی بندگی میں داخل ہوجائیں۔ انہیں معلوم ہوجائے کہ اس پوری کائنات اور اس کرۂ ارض پر اصل حاکم کون ہے۔ وہ اس کے سوا

کسی کے آئے نہ جھکیں۔ وہ اسی کے نظام زندگی اور اسی کے منہاج کے پیرو ہو جائیں۔ وہ اسی کی شریعت کی اطاعت کریں۔ صرف ان حکمرانوں کی اطاعت کریں جو اللہ تعالیٰ کا نظام زندگی نافذ کرنیوالے ہوں۔ اللہ کا ارادہ صرف یہ ہے کہ وہ یہ جان لیں کہ بندے سب کے سب اللہ کے بندے ہیں۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ اللہ کے بندے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں سر اٹھا کے چلیں اور اگر وہ سر جھکاتے ہیں تو صرف اللہ کے سامنے سر جھکائیں۔ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ لوگ جبار، قہار اور اللہ کے باغی حکمرانوں کے مقابلے میں اپنی عزت نفس کا شعور حاصل کریں۔ جب لوگ اللہ کے سامنے رکوع و سجود کریں تو ان کا فرض ہے کہ وہ صرف اللہ کو یاد کریں اور اللہ کے سوا کسی کو یاد نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کی منشاء یہ ہے کہ یہ لوگ اچھی طرح سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کا قرب رشتہ داری اور نسب کی وجہ سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہ قرب صرف تقویٰ اور عمل صالح کی وجہ سے نصیب ہوتا ہے۔ اس زمین کی تعمیر اور نیک کام اللہ کی قرابت اور نزدیکی کا باعث ہیں۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ لوگوں کو حقیقت ربوبیت اور حاکمیت کا ادراک ہو اور وہ اپنے مقام بندگی کو اچھی طرح پہچان لیں۔ وہ اللہ کی حاکمیت کیلئے غیرت اور حمیت رکھتے ہوں اور جو شخص بھی اللہ کے حق حاکمیت میں شریک ہونا چاہتا ہے وہ اس کیلئے سد راہ بن جائیں اور تمام حقوق حاکمیت صرف اللہ کے ساتھ خاص کر دیں۔ اس طرح ان کی زندگی کی اصلاح ہو جائے گی۔ وہ ترقی کریں گے۔ اور اساس بندگی پر مکرم ہوں گے۔

اس عظیم حقیقت کا ادراک، تمام انسانوں کی جانب سے صرف اللہ کی طرف دیکھنا، تمام لوگوں کے قلوب کا اللہ کے ساتھ مربوط ہو جانا۔ تمام لوگوں کے اعمال کا خدا خوفی پر مبنی ہو جانا، تمام لوگوں کے نظام زندگی کا سب کو چھوڑ چھاڑ کر اللہ کے اذن اور حکم پر مبنی ہو جانا وغیرہ یہ سب ایسے امور ہیں جو اس دنیا میں بھلائی، آزادی، عدل اور استقامت کا عظیم سرمایہ ہیں۔ جس سے انسانیت کے سرمایہ میں اس دنیاوی زندگی میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور آخرت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ غرض یہ ایک ایسا سروسامان ہے جس سے اس دنیا میں حریت، شرافت، عدل اور استقامت کا دور دورہ ہو گا اور ایسے نیکوکار لوگوں کا انجام آخرت میں کیا ہو گا، ان پر اللہ کا کرم ہو گا، ان پر اس کا فضل خاص ہو گا۔ اور وہ اللہ کے فیض خاص سے فیض یاب ہوں گے۔

ہمارا فرض ہے کہ درج بالا نکات کی روشنی میں اسلام اور ایمان کے تقاضوں پر غور کریں، اور یہ فیصلہ کریں کہ ایسا ایمان تمام رسولوں کی رسالتوں کی اساس رہا ہے۔ بعد کے ادوار میں ایمان کی اس اصلی صورت میں تحریف اور تبدیلی ہو گئی۔ ایمان کے اس حقیقی نقطہ نظر سے معلوم ہو گا کہ ایمان لانے کی وجہ سے بشریت کو ایک نیا جنم نصیب ہو گا اور اس صورت میں ایمان مقام شرافت اور اعلان حریت ہو گا۔ اس کے نتیجے میں عدل و انصاف کا قیام ہو گا اور انسان انسان کی بندگی اور غلامی سے نکل آئے گا۔

جو لوگ اللہ کی بندگی کو اپنے آپ سے فروتر سمجھتے ہیں اور پھر وہ اس کرۂ ارض پر دوسری لاتعداد اور نہ ختم ہونے والی بندگیوں میں پھنس جاتے ہیں، آخر کار وہ اپنی نفسانی خواہشات کے بندے بن جاتے ہیں۔ پھر وہ اوہام اور خرافات کے غلام بن جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنے جیسے انسانوں کے غلام بن جاتے ہیں اور پھر ان کی پیشانیاں ان انسانوں کے سامنے جھکتی ہیں۔ پھر ان کی زندگی میں، ان کے نظم و نسق میں، ان کے قانون میں، اور ان کے حسن و قبح کے پیمانوں پر بھی انہی جیسے انسان حاکم ہو جاتے ہیں حالانکہ حقیقت نفس الامری میں وہ دونوں برابر اور ایک جیسے انسان ہوتے ہیں لیکن اس

طرح غیر اللہ کی اطاعت کر کے انہوں نے غیر اللہ کو اپنا اللہ تسلیم کر لیا۔ یہ تو ان کی پوزیشن ہوگی ہیں اس دنیا میں کہ وہ اپنے جیسے لوگوں کے غلام ہوگئے اور آخرت میں ان کی پوزیشن یہ ہوگی۔

(فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۙ وَّلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيرًا (٤ : ١٧٣) "ان کو اللہ دردناک سزا دے گا اور اللہ کے سوا جن جن کی سرپرستی اور مددگاری پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہاں نہ پائیں گے۔" اسلامی نظریہ حیات میں یہ ایک اہم مسئلہ ہے جسے قرآن نے اس آیت میں پیش کیا ہے۔ اس کے ذریعے اس وقت اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کی تردید کی گئی ہے اور اب قیامت تک یہ ہمارے لئے سنگ میل ہے۔

---ooo---

سابقہ سبق میں یہودیوں پر تنقید کر کے بتایا گیا تھا کہ لوگو! حضرت محمد ؐ کی رسالت پر اللہ گواہ ہیں جس کی شہادت قطعی برہان ہے۔ اسی طرح یہاں نصاریٰ کی تردید کر کے پھر تمام لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ یہ رسالت اللہ کی جانب سے برہان ہے۔ اور یہ ایک نئی روشنی ہے جس سے جہالت کی تاریکیاں چھٹ جائیں گی اور تمام شبہات دور ہو جائیں گے۔ جس شخص نے اس سے ہدایت حاصل کی اور اسے پختگی سے پکڑا تو اس پر اللہ کی رحمت ہوگی اور اللہ کا فضل اس کے شامل حال ہوگا اور اس روشنی اور ہدایت میں وہ صراط مستقیم پائے گا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ﴿١٧٤﴾

"لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس دلیل روشن آگئی ہے۔ اور ہم نے تمہاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمہیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔ اس قرآن کریم میں اللہ رب العالمین کیلئے برہان ہے۔

(يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ (٤ : ١٧٤)) "اے لوگو! تمہارے پاس رب کی طرف سے دلیل روشن آگئی ہے۔" قرآن کریم ایک ایسا کلام ہے جس کے اندر ایسے شواہد موجود ہیں کہ وہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ اس کے اندر ربانی کاریگری کے شواہد پائے جاتے ہیں اور اس کو یہ شواہد انسانوں کے کلام سے ممتاز کرتے ہیں۔ کلام الٰہی میں الفاظ کی نشست و برخاست اور روانی قابل دید ہوتی ہے۔ اور کلام اللہ کی فصاحت اور بلاغت ایک ایسا معاملہ ہے کہ جس سے نہ صرف یہ کہ انکار نہیں کیا جاسکتا بلکہ بعض واقعات ایسے بھی دیکھنے میں آئے ہیں جو ناقابل یقین نظر آتے ہیں مثلاً وہ لوگ جو عربی زبان سے بالکل ناواقف ہیں وہ بھی جب قرآن مجید کی تلاوت سنتے ہیں تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ہم لوگ بحری جہاز پر سوار تھے۔ بحراوقیانوس میں جانب امریکہ سفر کر رہے تھے۔ ہم نے عرشہ پر جمعہ کی نماز کا اہتمام کیا۔ ہم میں سے چھ آدمی مختلف عرب ممالک کے باشندے تھے اور کچھ دوسری قومیتوں اور نوبہ کے حبشی بھی تھے جو جہاز کے عملے میں شامل تھے۔

میں نے خطبہ جمعہ دیا اور خطبے میں قرآن کریم کی بعض آیات تلاوت کیں۔ اس جہاز کے تمام باشندے ہماری نماز کے اس اجتماع کو گھیرے ہوئے تھے۔ یہ مختلف قومیتوں کے لوگ تھے۔ غور سے دیکھ رہے تھے۔

نماز کے بعد بہت سے لوگ ہمارے پاس آتے اور اپنے تاثرات بیان کرتے رہے۔ لیکن ان میں یوگوسلاویہ کی ایک محترمہ بہت ہی متاثر تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ اپنی کمزور انگریزی میں ہم سے یوں کہنے لگی کہ تمہاری عبادت کے اندر جو خشوع و خضوع ہے میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ مجھے تمہاری زبان کا ایک لفظ بھی نہیں آتا لیکن اس زبان کے اندر ایک ایسا صوتی ترنم ہے جو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ خطیب کے خطبہ میں بعض جملے نہایت ہی ممتاز ہیں اور ان کا مجھ پر بہت ہی اثر ہوا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ خاص فقرے قرآنی آیات کے وہ جملے اور ٹکڑے تھے جو اپنی فصاحت و بلاغت کے اندر نہایت ہی ممتاز ہوتے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ جو لوگ عربی نہیں جانتے ان کے ہاں یہ قاعدہ کلیہ ہے اور ہر قاری کی تلاوت قرآن کا سامعین پر ضرور ایسا ہی اثر ہوتا ہے لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ یہ قرآن کا بالکل ایک واضح وصف ہے کہ اس کی آواز ایسے لوگوں کو بھی مسحور کر دیتی ہے جو بالکل عربی نہیں جانتے۔

رہے وہ لوگ جو عربی کا خاص ذوق رکھتے ہیں اور جو عربی کے مختلف اسالیب سے واقف ہیں' ان پر قرآن کے اثرات کی عجیب و غریب حکایات تاریخ کا حصہ ہیں۔ جب حضور خود اہل کعبہ پر قرآن کریم کی تلاوت فرماتے تھے۔ تو اخنس ابن شریق' ابوسفیان ابن حرب' اور ابوجہل کا قصہ بہت ہی مشہور ہے۔ سیرت ابن ہشام میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک رات ابوسفیان ابن حرب' ابوجہل اور اخنس ابن شریق ثقفی' بنی زہرہ کے حلیف رات کے وقت اپنی اپنی جگہ سے چل پڑے تاکہ حضور کا کلام سنیں جبکہ آپ رات کے وقت اپنے گھر میں نماز کے وقت تلاوت فرماتے تھے۔ ہر شخص ایک جگہ بیٹھ گیا اور قرآن کریم کی تلاوت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ ان میں سے کسی کو بھی دوسرے کے بارے میں خبر نہ تھی۔ وہ رات کے وقت کلام الٰہی سنتے رہے یہاں تک کہ فجر طلوع ہوگئی۔ جب واپس ہونے لگے تو یہ سب ایک دوسرے سے راستے میں مل گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو سخت سست کہا اور یہ بات نوٹ کی گئی کہ اگر کسی عام شخص نے دیکھ لیا تو وہ اس تحریک کا شکار ہو جائے گا' پھر وہ واپس چلے گئے۔ جب دوسری رات ہوئی تو پھر تینوں نہ رہ سکے اور پھر اپنے اپنے خفیہ مقامات پر بیٹھ گئے' رات کو قرآن کریم سنتے رہے' جب صبح ہونے لگی تو اتفاقاً پھر راستے میں تینوں کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے پہلے کی طرح ایک دوسرے کو ملامت کی۔ جب تیسری رات ہوئی تو پھر یہ تینوں قرآن کریم کو سننے کیلئے پہنچ گئے۔ رات گئے تک قرآن کریم سنتے رہے اور جب صبح کو لوٹنے لگے تو پھر راستے میں ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔ اب کے انہوں نے کہا کہ جب تک ہم حلف نہ اٹھالیں گے ہم رک نہ سکیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے حلف پر معاہدہ کیا اور گھروں کو چلے گئے۔

یہ تو ایک قصہ تھا' ان لوگوں کا جن کو زبان عربی اور قرآن کریم کے اندر ایک ذوق ہے۔ وہ جس دور میں بھی ہوں

وہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم بذات خود ایک سلطان اور برہان ہے اور لفظی اور معنوی لحاظ سے معجزہ ہے۔

جہاں تک معنوی اعجاز کا تعلق ہے تو قرآن کریم نے جو فکر پیش کی ہے' جو نظام زندگی اس نے پیش کیا ہے' اور زندگی کا جو نقشہ اس نے تجویز کیا ہے اس جگہ ہم اس کی تفصیلات نہیں دے سکتے۔ لیکن ان تمام پہلوؤں سے بھی قرآن کریم معجزہ ہے اور اس کے اندر برہان اور سلطان موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا مصدر اور منبع کیا ہے اور یہ کہ وہ انسانی کلام نہیں ہے۔ اس کا انداز اور طرز ادا ایسی ہے جو کسی انسانی کلام کے اندر نہیں ہوتی۔ اس لئے (وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا (٤: ١٧٤)) "اور ہم نے تمہاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمہیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔" ...... ایسی روشنی جس کی شعاعوں میں اشیاء کی صحیح حقیقت نظر آتی ہے اور بہت ہی واضح نظر آتی ہے اور جس کی روشنی میں زندگی کے دوراہے پر انسان کو حق و باطل کے راستوں میں سے حق کا راستہ صحیح نظر آتا ہے۔ نفس کی داخلی راہوں کے اندر بھی اور زندگی کی خارجی شاہراہوں پر بھی۔ جو نفس قرآن کی روشنی سے منور ہوا سے اپنا ماحول اچھی طرح نظر آتا ہے۔

اس نور کے مقابلے میں دھند چھٹ جاتی ہے' فضا کھل جاتی ہے اور پھر حقیقت واضح اور کھلی نظر آتی ہے۔ جب یہ روشنی نفس انسانی کو حاصل ہو جاتی ہے تو انسان اپنے اوپر ہنسنے لگتا ہے کہ حقیقت تو بہت ہی کھلی تھی' لیکن تعجب ہے کہ اسے نظر نہ آرہی تھی۔

اور جب کوئی انسان اپنی روح کے ساتھ کچھ عرصہ قرآنی فضا کے اندر رہے اور قرآن سے اپنے تصورات' حسن و قبح کے پیمانے اور اپنی اقدار اخذ کرلے تو وہ تمام معاملات کو نہایت ہی آسانی' نہایت ہی سادگی اور نہایت ہی وضاحت کے ساتھ دیکھتا ہے اور پھر اسے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ کئی ایسے فیصلے جو اس نے کئے اور جو اس کے لئے خلجان کا باعث تھے' اور وہ اسے سمجھ نہ آتے تھے' اب بڑی آسانی سے اس کی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اب حقائق بڑی آسانی سے نکھر جاتے ہیں اور حقائق کے ساتھ جو مزید آلودگیاں تھیں ختم ہوجاتی ہیں اور تمام حقائق اس طرح ذہن میں اتر جاتے ہیں جس طرح ابھی اللہ کی جانب سے صاف و شفاف ہو کر سامنے آئے ہوں۔

کس قدر کم الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ (وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا (٤: ١٧٤)) "اور ہم نے تم پر واضح کرنے والی روشنی اتاری ہے۔" میں نے ان الفاظ کی تشریح اور ان پر تبصرہ صرف اس شخص کی خاطر کیا ہے جس نے اپنے اندر کتاب اللہ کی کچھ روشنی پائی ہو' اس شخص کیلئے نہیں جس کے اندر اس روشنی کی کوئی چمک ہی نہ ہو۔ یہ روحانی روشنی اس وقت حاصل کی جاسکتی ہے جب انسان اس کیلئے دلی کوشش کرے اور ذاتی ذوق پیدا کرے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ قرآنی علوم کے اندر تجربہ رکھتا ہو اور براہ راست قرآن سے روشنی پانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿١٧٥﴾

"جو لوگ بات مان لیں گے اور رب کی پناہ ڈھونڈیں گے ان کو اللہ اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کے دامن میں لے لیگا اور اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ ان کو دکھا دے گا۔"

جب کسی انسان کے اندر ذوق ایمان پیدا ہو جائے تو وہ فوراً اللہ کی پناہ میں آنے کی سعی شروع کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ ایمان صحیح ہو اور نفس انسانی اللہ کی حقیقت کو پا چکے اور اسے معلوم ہو جائے کہ اللہ کی بندگی کا مفہوم کیا ہے۔ جب یہ حقیقت کوئی پالے تو اس کے سامنے اللہ کی پناہ میں پہنچ جانے کے سوا اور کوئی راہ ہی نہیں رہتی اس لئے کہ اللہ ہی بادشاہت اور قدرت کا مالک ہے۔ اور ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور فضل کے سائے میں لے لیتا ہے۔ اس دنیا میں بھی ان پر اللہ کی رحمت سایہ فگن ہوتی ہے اور آخرت میں بھی ان پر رحمت اور فضل و کرم ہوتا ہے' وہ عاجلہ میں بھی کامیاب اور آجلہ میں بھی کامیاب۔ پس صحیح ایمان ایک گھنے سائے والا ایک ایسا پر نم باغ ہے جس کے اندر انسانی روح' بے چین روح' حیران و پریشان روح نہایت ہی خوشگوار باد نسیم پاتی ہے اور اطمینان و سکون حاصل کرتی ہے۔ جبکہ اجتماعی لحاظ سے ایمان ایک ایسا اصول حیات ہے جس کے اوپر اجتماعی زندگی پاکیزگی' احترام' شرافت' آزادی اور استحکام کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔ ہر انسان کو یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ وہ صرف اللہ کا بندہ ہے اور اس کے سوا جس قدر اشیاء اس کائنات میں ہیں ان کا وہ سردار ہے۔ اسلام کے ایمانی نظام زندگی کے سوا کسی اور نظام کے اندر یہ تصور ناپید ہے۔ صرف اسلام اس دنیا میں ایک ایسا نظام ہے جس کا مقصد وحید صرف یہ ہے کہ لوگوں کو اپنے جیسے لوگوں کی غلامی سے نکالا جائے اور صرف اللہ کی بندگی میں داخل کیا جائے۔ یہ نظریہ انسان کو اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ صرف اللہ کو اپنا حاکم سمجھتا ہے اور لوگ' تمام کے تمام لوگ' اللہ کے بندے ہو کر ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ بادشاہت اور حاکمیت صرف اللہ کیلئے خاص ہو جاتی ہے اور انسان انسان کا غلام نہیں رہتا۔ دوسرے نظاموں میں اگرچہ بظاہر وہ آزاد نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً وہ دوسروں کا غلام ہوتا ہے۔

پس جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ بہرحال اللہ کی رحمت اور فضل میں ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اس زندگی میں بھی رحمت میں ہوتے ہیں اور اخروی زندگی میں بھی رحمت میں ہوتے ہیں۔ (وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا (۴: ۱۷۵) "اللہ ان کو اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ دکھا دے گا۔" .... اس فقرے میں لفظ الیہ "اپنی طرف" سے یوں نظر آتا ہے کہ انسان قدم بقدم اس کی طرف بڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہاتھ پکڑ کر مومنین کو اپنی طرف آگے بڑھا رہے ہیں۔ ان کو اللہ کی طرف آنے کے لئے بالکل سیدھے راستے کے ذریعے لے جایا جا رہا ہے۔ وہ قدم بقدم اللہ کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس ایک لفظ سے عبادت کی خوبی اور حسن کو صرف وہ شخص ہی پاسکتا ہے جس نے علی وجہ البصیرت اللہ پر ایمان اپنے اندر پیدا کر لیا ہو اور اس نے راہ ایمان کو پختہ طور پر پکڑ لیا ہو۔ اسے راہ حق پر ہونے کا پختہ یقین ہو۔ اسے ہر لمحہ یہ بات محسوس ہوتی ہو کہ وہ راہ حق کا مسافر ہے۔ اور راستے اس کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور وہ ہر لمحہ آگے ہی بڑھ رہا ہے۔ سیدھے راستے پر واضح پالیسی کے ساتھ۔ یہ ایک مفہوم ہے جس کا تعلق ذوق یقین کے ساتھ ہے اور اس کا احساس اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ذوق اور ذائقہ درست نہ ہو۔

درس نمبر ۵۴ تشریح آیت ۱۷۶

يَسۡتَفۡتُوۡنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفۡتِيۡكُمۡ فِى الۡـكَلٰلَةِ‌ ؕ اِنِ امۡرُؤٌا هَلَكَ لَـيۡسَ
لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخۡتٌ فَلَهَا نِصۡفُ مَا تَرَكَ‌ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ
لَّهَا وَلَدٌ ‌ؕ فَاِنۡ كَانَتَا اثۡنَتَيۡنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ‌ ؕ وَاِنۡ كَانُوۡۤا
اِخۡوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ‌ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَـكُمۡ اَنۡ
تَضِلُّوۡا‌ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ۝۱۷۶

اے نبی، لوگ تم سے کلالہ کے معاملے میں فتویٰ پوچھتے ہیں، کہو اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص بے اولاد مر جائے اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے ترکہ میں سے نصف پائے گی۔ اور اگر بہن بے اولاد مرے تو بھائی اس کا وارث ہو گا۔ اگر میت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکے میں سے دو تہائی کی حقدار ہوں گی۔ اور اگر کئی بھائی بہنیں ہوں تو عورتوں کو اکہرا اور مردوں کا دوہرا حصہ ہو گا۔ اللہ تمہارے لئے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

یہ اس سورہ کا آخری سبق ہے۔ اس سورہ کا آغاز خاندانی تعلقات کی استواری سے ہوا تھا۔ افراد خاندان کے درمیان تعلقات کی درستی سے ہوا تھا اور اس کے درمیان بعض اہم اجتماعی معاملات کا بیان بھی ہوا تھا۔ اب یہ آخری سبق میراث کلالہ کے بارے میں ہے۔ حضرت ابوبکر ﷺ عنہ اور دوسرے اصحاب کے مطابق کلالہ وہ ہے جس کی کوئی اولاد نہ ہو اور نہ اس کے والدین ہوں۔

کلالہ کے بارے میں بعض احکام سورہ کے آغاز میں بیان میراث کے وقت آگئے تھے۔ مثلاً یہ کہ اگر کلالہ کے عصبات نہ ہوں اور اس کی میراث کے حقدار صرف ماں کی طرف سے بہن بھائی ہوں۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا۔

وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَاِنْ كَانُوْا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ (سورہ نمبر ۴ آیت نمبر ۱۲ آخری حصہ)

''اگر وہ مرد یا عورت جس کی میراث تقسیم طلب ہے بے اولاد بھی ہو' اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں' مگر ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور بھائی اور بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکہ کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے۔ جبکہ وصیت جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو میت نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا و بینا اور نرم خو ہے۔''

اب کلالہ کی دوسری شکل کا بیان کیا جاتا ہے جو وہاں نہ کیا گیا تھا۔ اگر متوفی کے والدین اور اولاد نہ ہو اور صرف ایک حقیقی بہن ہو یا باپ کی طرف سے بہن ہو تو وہ نصف ترکہ کی حقدار ہوگی۔ لیکن اگر ایسی بہن مرجائے تو اس کا تمام ترکہ یہ بھائی لے گا۔ اصحاب فروض کے حصص کے سوا۔ اگر اس عورت کے والدین اور اولاد نہ ہو....... ہاں اگر میت کی ایک کے بجائے دو بہنیں ہوں حقیقی ہوں یا صرف باپ کی طرف سے ہوں تو وہ دو تہائی کی حقدار ہوں گی۔ اگر بہت سے بھائی بہن موجود ہوں تو مطابق اصول مرد کا حصہ عورت کے دو حصوں کے برابر ہوگا۔ ہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اگر حقیقی بہن بھائی موجود ہوں تو پھر صرف باپ میں شریک بہن یا بھائی محروم ہو جائیں گے۔

یہ آیت میراث ختم ہو جاتی ہے اور اس پر اس سورہ کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور آخر میں وہی قرآنی تنبیہ اور اختتامیہ آتا ہے کہ تمام باتوں کا مآل اور مرجع اللہ ہی کی طرف ہے۔ اس طرح تمام حقوق و واجبات اور تمام مالی اور غیر مالی امور میں شریعت کی پابندی کو لازمی کر دیا جاتا ہے۔

(يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۴ : ۱۷۶) ''اللہ تمہارے لئے احکام کی توضیح کرتا ہے کہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔'' یہ نہایت ہی جامع آیت ہے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ میراث کا بھی اور دوسرے امور کا بھی۔ خاندانی تعلقات کا بھی اور اجتماعی امور کا بھی۔ احکام کا بھی اور قانون سازی کا بھی۔ یا تو تم ہر معاملے میں اللہ کے احکام کی تابعداری کرو گے یا پھر گمراہی میں پڑو گے۔ تمہاری زندگی بسر کرنے کے صرف دو طریقے ہیں۔ کوئی تیسرا طریقہ نہیں ہے۔ یا تو طریقہ ہدایت ہے۔ جو اللہ نے بیان کیا ہے اور یا کوئی دوسرا طریقہ ہے جو گمراہی ہے۔ اللہ نے سچ کہا ہے۔ (فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ) ''سچائی کے علاوہ گمراہی کے سوا اور کیا ہے۔''

---ooo---

فی ظلال القرآن

پارہ ----- ۶

سورہ المائدہ

آیات ۱ ----- تا ----- ۸۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ مائدہ ایک نظر میں

اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن کریم حضرت محمد ؐ کے قلب مبارک پر اس لئے نازل فرمایا کہ اس کے ذریعے وہ ایک امت کو برپا کریں۔ وہ امت ایک مملکت کی بنیاد رکھے۔ ایک معاشرے کو منظم کرے اور لوگوں کے ضمیر' ان کے اخلاق اور ان کے اذہان کی عقلی تربیت کرے۔ اس قرآن کے ذریعے اس معاشرے کے اجتماعی تعلقات کے حدود و قیود وضع ہوں اور اس مملکت کے اندر لوگوں کے آپس کے تعلقات کے حدود و قیود وضع ہوں اور اس مملکت کے اندر لوگوں کے تعلقات بھی منضبط ہوں اور پھر دوسرے ممالک کے ساتھ بھی اس مملکت کے تعلقات استوار ہوں۔ نیز امت مسلمہ کے تعلقات دوسری امتوں اور ملتوں کے ساتھ قائم ہوں۔ اور اس طرح قرآن اس پوری امت کو ایک مضبوط رسی کے اندر باندھ دے۔ اس کے متفرق اجزاء کو جمع کرے۔ اس کے فرقوں کو جمع کر دے اور اسے ایک مضبوط محور کے اندر پختہ کر دے۔ اس کو اپنی بادشاہت کے اندر لے آئے۔ اور اس کا رخ ایک سمت میں ہو جائے۔ یہ ہے دین اسلام جیسا کہ درحقیقت وہ اللہ کے نزدیک ایسا ہے اور جسے مسلمانوں نے ایسا ہی سمجھا جس وقت مسلمان صحیح مسلمان ہوا کرتے تھے۔

جیسا کہ سابقہ تین طویل سورتوں میں ہم نے یہ حقیقت دیکھی ہے اس سورہ میں بھی مختلف موضوعات کو لیا گیا ہے۔ ان تمام موضوعات کے درمیان قدر مشترک کیا چیز ہے؟ وہی جس کے حصول کیلئے اس دنیا میں پیغام اسلام کی ضرورت محسوس کی گئی یعنی ایک امت کی تشکیل' ایک مملکت کا قیام اور ایک مثالی اسلامی معاشرے کا قیام۔ اس معاشرے کا قیام بھی ایک حساس نظریہ' ایک خاص تصور حیات اور ایک بالکل جدید انداز میں مطلوب تھا اور اس معاشرے کی روح عقیدۂ توحید تھی۔ عقیدۂ توحید اس کا پہلا اصول قرار پایا۔ عقیدہ توحید کی اہم عناصر یہ ہیں کہ الہ اور حاکم فقط اللہ ہے۔ وہی اس کائنات کا تھامنے والا ہے۔ اسی کا حکم چلتا ہے۔ زندگی گزارنے کے طریقے صرف اسی سے اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ وہی شارع ہے' وہی زندگی کی اعلیٰ قدریں متعین کرنے کا حق رکھتا ہے اور حسن و قبح کے پیمانے صرف وہی متعین کر سکتا ہے۔

اس سورہ میں اعتقادی افکار کی توضیح کی گئی ہے اور اسے بت پرستانہ خرافات اور انحرافات سے پاک کیا گیا ہے۔ نیز اہل کتاب نے جو تحریفات کیں انہیں بھی دور کیا گیا ہے۔ جماعت مسلمہ کے سامنے خود اس کا اپنا تعارف پیش کیا گیا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ اس کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے اور اس کے راستے میں جو کانٹے اور جو جال بچھے ہوئے ہیں ان سے بچنے کا کیا طریقہ ہے۔ کہاں کہاں اس کے دین کے دشمن گھات لگائے بیٹھے ہیں اور کہاں کہاں پھسلن ہے۔ اس

کے ساتھ ساتھ' اس سورہ میں عبادات اور شعائر اسلام بھی بتائے گئے ہیں جن کے ذریعے مسلم کی روح پاک ہو جاتی ہے اور اس کا رابطہ اس کے رب کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ نیز اعتقادات و عبادات کے ساتھ ساتھ اس میں اجتماعی روابط' حکومت کیلئے قانون سازی اور پھر اسلامی حکومت کے تعلقات دوسری حکومتوں کے ساتھ بھی بتائے گئے ہیں۔ نیز اسلامی معاشرے میں حلال و حرام کا بھی ذکر ہے کہ مسلمانوں کیلئے کن چیزوں کا کھانا حرام ہے۔ کن مشروبات کا پینا حرام ہے اور کن عورتوں سے نکاح حرام ہے۔ کیا کیا اعمال برے ہیں اور کیا کیا طرزہائے عمل غیر اسلامی ہیں۔ غرض یہ ایک گٹھڑی (Package) ہے' ایک ہی سورہ ہے جس میں یہ تمام امور ایک ہی جگہ آگئے ہیں۔ اور یہ گٹھڑی (Package) مجموعہ دین ہے اور اسی نقطہ نظر سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ دین ان تمام امور پر مشتمل ہے۔

جیسا کہ اس سورہ کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے' اور جس طرح' اس سے پہلے سورہ آل عمران اور سورہ نساء کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام تمام افعال شرعیہ کا نام ہے۔ دین ایک مکمل نظام زندگی ہے جس کے اندر زندگی کے ہر پہلو کے احکام شامل ہیں اور یہ کہ یہ سب امور دین ہیں۔ سیاق قرآنی نے صرف اس استنباطی اور نصوص شریعت کے اس التزامی مفہوم پر ہی اکتفاء نہ کیا کہ کوئی صرف یہ سوچ سکے کہ چونکہ مختلف النوع مضامین اور موضوعات کو ایک ہی سورہ میں لیا گیا ہے یا بعض دوسری صورتوں کے اندر جابجا ان مضامین کو لیا گیا ہے اس لئے یہ سب دین اسلام کا حصہ ہیں۔ یہ سوچ تو محض ایک ضمنی اور استنباطی سوچ ہے اس لئے اس سورہ کے اندر اللہ نے بالکل واضح اور صریح طور پر واضح کیا کہ یہ تمام امور دین ہیں اور تصریح کے بعد قرآن کریم اس مفہوم کی بہت تاکید بھی کرتا ہے۔ وہ دین اور اسلام کے مفہوم کو ان سب امور پر موقوف کرتا ہے اور یہ حکم صادر کرتا ہے کہ اگر یہ امور نہ پائے گئے تو دین نہ ہوگا۔ ان تمام امور کا اقرار ایمان ہے اور ان تمام باتوں کا اپنے عدالتی نظام میں جاری کرنا اور ان کے مطابق فیصلے کرنا عین اسلام ہے۔ جو لوگ اپنی پوری زندگی میں اللہ کے احکام کے سامنے نہیں جھکتے اور اپنے تمام فیصلے اللہ کے حکم کے مطابق نہیں کرتے تو وہ کافر' ظالم اور فاسق ہیں اور اگر وہ غیر اللہ کے احکام کے مطابق فیصلے کرتے ہیں تو وہ جاہلی احکام ہوں گے اور مسلمان کبھی بھی جاہلیت کے احکام کا رواج نہیں چاہتے۔

یہ عظیم اصول اس سورہ میں نہایت ہی واضح اور قطعی شکل میں سامنے آجاتا ہے اور فیصلہ کن انداز میں اس کی تصریح کر دی جاتی ہے۔ اس تصریح کے ساتھ مسلمانوں کے نظریات کو درست کر دیا جاتا ہے اور نظریات کی درستی بھی اسی عظیم اصول پر ہوتی ہے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم قرآن کی ان آیات کی تفصیلات دے کر یہ بات سمجھائیں کہ اسلام کے عقیدہ اور عمل میں یہ دونوں اصولی باتیں شامل ہیں اور کس طرح ان آیات سے یہ منطقی اور طبیعی نتائج اخذ ہوتے ہیں۔ نکتہ کیونکہ اہم ہے اس لئے اس موضوع پر ذرا تفصیلی مطالعے کی ضرورت ہے۔

قرآن کریم اس بات کو فیصلہ کن انداز میں لیتا ہے کہ اسلام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل کے ذریعے اتارا۔ اللہ تعالیٰ نے شریعت کے اندر جو حلال اور حرام مقرر کئے ہیں وہی دین ہے' جبکہ اللہ وحدہ اس جہان کا الٰہ اور حاکم ہے۔ اس کی الوہیت اور حاکمیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ کہ اللہ واحد خالق ہے اور اس تخلیق میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک مالک ہے۔ اس میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ چنانچہ یہ

بات بطور منطقی نتیجہ قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ صرف اسی کے قانون اور اس کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا جائے اس لئے کہ وہ اس جہاں کا خالق اور مالک ہے۔ اس کی مشیت میں اسی کی مرضی اور اسی کی شریعت کو چلنا چاہئے ۔ وہ اپنی سلطنت میں خود قانون بنانے والا ہے ۔ اس کی مملکت میں اسی کی شریعت کو نافذ ہونا چاہئے ۔ اگر ایسا نہ ہو گا تو یہ بغاوت ' نافرمانی اور کفر ہو گا ۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ انسان کیلئے لائحہ عمل تجویز کرے ۔ اس پر ایمان لانے کا مفہوم یہ ہے کہ جو عقیدہ اس نے دیا ہے اسے تسلیم کیا جائے ۔ جو نظام حیات اس نے تجویز کیا ہے اس پر عمل کیا جائے ۔ یہ دونوں باتیں اسلامی نظام کے اہم ترین اساسی اصول ہیں اور برابر ہیں ۔ جس طرح مراسم عبودیت بجا لا کر اس کی عبادت کی جاتی ہے اسی طرح اس کی شریعت پر عمل کر کے بھی اسی کی عبادت کی جاتی ہے ۔ اسلامی شعار اور اسلامی شریعت دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ دونوں اللہ کی جانب سے ہیں' جس کے ساتھ اس کی سلطنت اور اس کی عبادت دونوں میں کوئی شریک نہیں ہے اس لئے کہ اس کے سواء کوئی الہٰ نہیں ہے ۔ وہی وحدہ لا شریک ہے ۔ وہی مالک ہے' وہی آسمانوں اور زمینوں کا علیم و بصیر ہے ۔ اس لئے ہر نبی کا دین یہی ہوتا ہے کہ اس کی شریعت پر عمل کیا جائے' اس لئے کہ نبی کی شریعت ہی اصل دین ہوتا ہے جو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے ۔ اس کے سوا کوئی دین مقبول نہیں ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ اس سورہ میں بہ تکرار ایسی آیات وارد ہیں جن میں یہ تلقین کی گئی کہ اللہ کے سواء کوئی الہٰ اور حاکم نہیں ہے ۔ اللہ کی ذات کے ساتھ ہر قسم کی شرک اور تثلیث کی اس سورہ میں سخت ممانعت کی گئی ہے ۔ اسی طرح اللہ کی ذات کے ساتھ کسی قسم کے امتزاج کو بھی منع کیا گیا ہے ۔ نیز غیر اللہ کیلئے خصائص الوہیت ' حاکمیت اور عبودیت کی سخت ممانعت کی گئی ہے ۔

(يٰأَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ، قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (١٥) يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهِ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (١٦) لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ، قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهُ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ، وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ، يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ، وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (١٧) وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهُ ، قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ، بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ، يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ، وَ

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۱۸) يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ؗ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۹)

"اے اہل کتاب ' ہمارا رسول تمہارے پاس آگیا ہے جو کتاب الٰہی کی بہت سی ان باتوں کو تمہارے سامنے کھول رہا ہے جن پر تم پردہ ڈالا کرتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر بھی کر جاتا ہے۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف ان کی راہنمائی کرتا ہے۔"

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم خدا ہے۔ اے نبی! ان سے کہو کہ اگر خدا مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اس کو اس ارادے سے باز رکھ سکے؟ اللہ تو زمین اور آسمانوں کا اور ان سب چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان پائی جاتی ہے۔ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اس کی قدرت ہر چیز پر جاری ہے۔

یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ ان سے پوچھو ' پھر تمہارے گناہوں پر وہ تمہیں سزا کیوں دیتا ہے؟ درحقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان خدا نے پیدا کئے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے۔ زمین و آسمان اور ان کی ساری موجودات اس کی ملک ہیں اور اس کی طرف سب کو جانا ہے۔

"اے اہل کتاب ' یہ رسول ایسے وقت تمہارے پاس آیا ہے اور دین کی واضح تعلیم دے رہا ہے جبکہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ ایک مدت سے بند تھا ' تاکہ تم یہ بات نہ کر سکو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ سو دیکھو ' اب وہ بشارت دینے اور ڈرانے والا آگیا........ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

(لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۷۲) لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۷۳) (۵: ۷۲ - ۷۳)) "یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن

مریم ہی ہے حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ "اے بنی اسرائیل' اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی -" جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں - یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے حالانکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے - اگر یہ لوگ ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے اس کو دردناک سزا دی جائے گی -"

اس لئے کہ اللہ ہی الٰہ اور حاکم ہے' وہی خالق ہے' وہی مالک ہے - وہی شارع ہے اور وہی حلال اور حرام کے قیود و حدود وضع کرنے والا ہے - وہی اس بات کا مستحق ہے کہ حلال و حرام کے اندر اس کی اطاعت کی جائے جیسا کہ وہ واحد الٰہی ذات ہے جس کی عبادت کی جانی چاہئے' اور وہی ہے جس کی طرف بندے مراسم عبودیت میں رجوع کرتے ہیں - اور اللہ نے اپنے تمام بندوں سے ان باتوں پر عہد لیا ہوا ہے - اللہ تعالیٰ انہیں اس کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو توڑنے سے سخت ڈراتے ہیں جیسا کہ بنی اسرائیل تاریخ میں ہمیشہ ایسا کرتے آئے ہیں لیکن قرآن کہتا ہے -

(يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنْ رَبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۚ وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا ۚ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَنْ صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَنْ تَعْتَدُوا ۘ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۵: ۲)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو - حرام مہینوں میں سے کسی کو حلال نہ کر لو' قربانی کے جانوروں پر دست درازی نہ کرو' ان جانوروں پر ہاتھ نہ ڈالو جن کی گردنوں میں نذر خداوندی کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوئے ہوں اور نہ ان کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور خوشنودی کی تلاش میں مکان محترم کی طرف جا رہے ہوں -"

(وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۷) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (۸) (۵: ۷-۸))

"اللہ نے جو نعمت تم کو عطا کی ہے اس کا خیال رکھو اور اس پختہ عہد و پیمان کو نہ بھولو جو اس نے تم سے لیا ہے' یعنی تمہارا یہ قول کہ "ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی۔" اللہ سے ڈرو' اللہ دلوں کے راز تک جانتا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو' یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔"

(وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ (۱۲) فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰي خَاۗىِٕنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۳) وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰي يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۱٤)

"اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان میں بارہ نقیب مقرر کئے تھے۔ اور ان سے کہا تھا کہ "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقین رکھو کہ میں تمہاری برائیاں تم سے زائل کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی مگر اس کے بعد جس نے تم میں سے کفر کی روش اختیار کی تو درحقیقت اس نے سواء السبیل گم کر دی۔" پھر یہ ان کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اور ان کے دل کو سخت کر دیا۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ الفاظ کا الٹ پھیر کر کے بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔ جو تعلیم انہیں دی گئی تھی اس کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں' اور آئے دن تمہیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ ان میں سے بہت کم لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں۔ لہٰذا انہیں معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو' اللہ ان لوگوں کو

پسند کرتا ہے جو احسان کی روش رکھتے ہیں .... اسی طرح ہم نے ان لوگوں سے بھی پختہ عہد لیا تھا جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں مگر ان کو بھی جو سبق یاد کرایا گیا تھا اس کا ایک بڑا حصہ انہوں نے فراموش کر دیا۔ آخر کار ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کیلئے دشمنی اور آپس میں بغض و عناد کا بیج بو دیا اور ضرور ایک وقت آئے گا جب اللہ انہیں بتائے گا کہ یہ دنیا میں کیا کیا بناتے رہے ہیں۔"

اس سورہ میں متنوع احکام شریعت بیان ہوئے ہیں۔ بعض احکام کا تعلق شکار میں سے حلال و حرام کے ساتھ ہے۔ بعض کا تعلق ان حلال و حرام کے ساتھ ہے جو خصوصاً حج اور ایام حج کے دوران ہوتے ہیں۔ بعض حلال و حرام وہ ہیں جو نکاح کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ بعض احکام ایسے ہیں جو نماز اور طہارت کے ساتھ متعلق ہیں' بعض احکام ایسے ہیں جن کا تعلق عدلیہ کے ساتھ ہے یعنی وہ قیام انصاف سے متعلق ہیں۔ بعض کا تعلق حد سرقہ اور جماعت مسلمہ سے خارج' اور مرتد ہونے سے متعلق ہے۔ بعض کا تعلق شراب نوشی' جوئے بازی اور لاٹری سے ہے۔ بعض احکان ان کفارات کے بارے میں ہیں جو احرام کی حالت میں شکار کرنے کی وجہ سے عائد ہوتے ہیں۔ بعض احکام موت کے وقت وصیت کے ساتھ متعلق ہیں۔ بعض احکام بعض جانوروں کے بارے میں ہیں۔ یعنی بحیرہ' سائبہ' وصیلہ ' حام وغیرہ' بعض کا تعلق قصاص کے بارے میں تورات کے قوانین سے ہے جسے اسلام نے بحال رکھا ہے۔ غرض اس سورہ میں نظام عبادات اور نظام قانون دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان کے درمیان کوئی دوئی یا کوئی حد فاصل نہیں ہے۔

ان احکام کے ساتھ ساتھ یہ اہم حکم بھی دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ شریعت کی اطاعت کریں اور اللہ کے اوامر و نواہی پر عمل کریں اور منہیات سے رکیں اور حلال و حرام اسی کو قرار دیں جسے اللہ نے حلال یا حرام قرار دیا ہے۔ پھر آخر میں تصریح کر دی جاتی ہے کہ یہی ہے اصل دین جسے اللہ تعالیٰ نے اس امت کیلئے وضع فرمایا ہے اور وضع کرنے کے بعد اسے کامل' شامل اور مکمل بنایا ہے۔ یہ مسلمانوں پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَاۗىِٕدَ وَلَآ اٰۗمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا (۵:۲))

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو۔ حرام مہینوں میں سے کسی کو حلال نہ کر لو۔ قربانی کے جانوروں میں سے کسی پر دست درازی نہ کرو' ان جانوروں پر ہاتھ نہ ڈالو جن کی گردنوں میں نذر خداوندی کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوئے ہوں نہ ان لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکان محترم کی طرف جا رہے ہوں۔"

(وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا (۵:۹۲)) "اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول خدا کی اطاعت کرو اور ڈرو۔"

(اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِ ، اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ، فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ، فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵:۳))

"آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔ پس جو شخص شدت بھوک سے بے قرار ہو جائے بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور بڑا مہربان ہے۔"

قرآن کریم نے حلال و حرام میں اللہ و رسول کی اطاعت کرنے کو مجمل نہیں چھوڑا ہے بلکہ قرآن کریم اللہ کے نازل کردہ احکام پر عملاً فیصلے کرنے کی تصریح کرتا ہے اور اس کی تاکید اس طرح کی جاتی ہے کہ اللہ کے قانون کے سوا کسی اور قانون پر تم فیصلے نہ کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو یہ فسق، ظلم اور کفر ہو گا۔ اس نکتے پر قرآن کی آیات قطعی طور پر بار بار آتی ہے اور نہایت ہی فیصلہ کن انداز میں آتی ہیں۔

(يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ، لَمْ يَاْتُوْكَ ، يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ، وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۗ اُولٰۤئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ، لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْيٌ ۚ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۴۱) سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ، فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ، وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۴۲) وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ، وَمَاۤ اُولٰۤئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ (۴۳) ع اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ

اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَیْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۚ وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (٤٤) وَكَتَبْنَا عَلَیْهِمْ فِیْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (٤٥) وَقَفَّیْنَا عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠ وَاٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ فِیْهِ هُدًی وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًی وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ (٤٦) وَلْیَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیْهِ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (٤٧) وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَیْمِنًا عَلَیْهِ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۚ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ ۚ اِلَی اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (٤٨) وَاَنِ احْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّصِیْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ۚ وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ (٥٠) اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِیَّةِ یَبْغُوْنَ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (٥٠) (٥:٤١ تا ٥٠) "اے پیغمبر ؐ تمہارے لئے باعث رنج نہ ہوں وہ لوگ جو کفر کی راہ میں بڑی تیز گامی دکھا رہے ہیں خواہ وہ ان میں سے ہوں جو منہ سے کہتے ہیں ہم ایمان لائے مگر دل ان کے ایمان نہیں لائے' یا ان میں سے جو یہودی ہیں' جن کا حال یہ ہے کہ جھوٹ کیلئے کان لگاتے ہیں' اور دوسرے

لوگوں کی خاطر جو تمہارے پاس کبھی نہیں آئے سن گن لیتے پھرتے ہیں' کتاب اللہ کے الفاظ کو ان کا صحیح محل متعین ہونے کے باوجود اصل معنی سے پھیرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو نہیں تو نہ مانو۔ جسے اللہ ہی نے فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو اس کو اللہ کی گرفت سے بچانے کیلئے تم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہ چاہا' ان کیلئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں سخت سزا۔

یہ جھوٹ سننے والے اور حرام کے مال کھانے والے ہیں' لہٰذا اگر یہ تمہارے پاس (اپنے مقدمات لے کر) آئیں' تو تمہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہو ان کا فیصلہ کرو ورنہ انکار کر دو۔ انکار کر دو تو یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے' اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے...... یہ تمہیں کیسے حکم بناتے ہیں جبکہ ان کے پاس تورات موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے اور پھر یہ اس سے منہ موڑ رہے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے۔"

ہم نے توراۃ نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ ہمارے نبی جو مسلم تھے' اسی کے مطابق ان یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے۔ اور اسی طرح ربانی اور احبار بھی (اسی پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے۔) کیونکہ انہیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے۔ پس (اے گروہ یہود)' تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے سے بیچنا چھوڑ دو۔ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔ تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان' آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے بدلے ناک' کان کے بدلے کان' دانت کے بدلے دانت' اور تمام زخموں کیلئے برابر کا بدلہ' جو قصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریم علیہا السلام کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا۔ تورات میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا وہ اس کی تصدیق کرنیوالا تھا اور ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں راہنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی تورات میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا اس کی تصدیق کرنے والی تھی اور خدا ترس لوگوں کیلئے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔ ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس پر نازل کیا ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔

پھر اے نبی ﷺ ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنیوالی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے۔ لہٰذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم "انسانوں" میں سے ہر ایک کیلئے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی۔ اگر تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا' لیکن اس نے یہ اس لئے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے' پھر وہ تمہیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو' پس اے نبی ؐ تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر

اس ہدایت سے ذرہ بھر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے' پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے ان کے بعض گناہوں کی پاداش میں ان کو مبتلائے مصیبت کرنے کا ارادہ ہی کر لیا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں۔ اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں' حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنیوالا کون ہو سکتا ہے؟"

یوں حتمی انداز میں اس مسئلے کو بیان کیا جاتا ہے کہ الہ ایک ہے' خالق ایک ہے' مالک ایک ہے تو پھر حاکم بھی ایک ہے اور قانون ساز بھی ایک ہے اور تمام امور کے اندر تصرف کرنیوالا بھی ایک ہے۔ ان باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ شریعت بھی ایک ہے اور نظام زندگی بھی ایک ہے اور قانون بھی ایک ہے لہٰذا یہ بات لازمی نتیجے کے طور پر سامنے آتی ہے کہ اللہ کے حکم کی اطاعت اور اس کے احکام کے مطابق زندگی کے تمام فیصلے کرنا ضروری ہے تو یہی ایمان اور یہی اسلام ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہوگی تو وہ خروج از اسلام اور اللہ کے نازل کردہ قانون کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ ہوگا جو ظلم' فسق اور کفر ہے۔ یہ ہے وہ دین جس پر قائم رہنے کا اللہ تعالیٰ نے سب اہل ایمان سے عہد لیا ہے۔ اور تمام رسول یہی دین لیکر آتے رہے ہیں۔ حضرت محمدؐ اور آپ سے قبل تمام امم کا مشن یہی رہا ہے۔

دین اللہ' اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس میں یہ بات لازمی ہو کہ اس کے مطابق تمام فیصلے کئے جائیں۔ یہی صورت ایسی ہے جس میں اللہ کی حاکمیت کا اظہار ہو سکتا ہے۔ اللہ کی سلطنت قائم ہو سکتی ہے اور اسی صورت میں (لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) کا صحیح اظہار ہو سکتا ہے۔

یہ حتمی فیصلہ یعنی اللہ کا دین قائم ہونے کی یہی صورت ہے کہ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کیے جائیں اور یہ کہ اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ جو قانون اللہ نے نازل کیا ہے وہ ان تمام قوانین سے بہتر ہے جو خود انسان اپنے لئے بناتے ہیں اپنے لئے طرز عمل اور اوضاع و اطوار خود تجویز کرتے ہیں۔ صرف یہ بات نہیں ہے کہ اللہ کا قانون ان سے بہتر ہے' یہ تو ان اسباب میں سے ایک سبب ہے اور یہ بات یعنی محض بہتری سبب اول بھی نہیں ہے۔ بلکہ نفاذ شریعت ہی سبب اول ہے اور یہ اسلامی نظام کا سنگ میل اور سنگ اساسی ہے کہ جب کوئی اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے کرتا ہے تو گویا وہ اللہ کی الوہیت اور حاکمیت پر ایمان لاتا ہے' اور وہ شخص اللہ کے سوا تمام دوسرے الہوں اور حاکموں کا انکار کرتا ہے اور یہ ہے حقیقی اسلام جس کا لغوی مفہوم سرتسلیم خم کرنا ہے اور جس اصطلاحی مفہوم کو جیسا کہ تمام ادیان الٰہیہ کا یہ مفہوم رہا ہے کہ دین اللہ کیلئے خالص ہو جائے۔ اور اس کے ساتھ کسی اور کو حاکم تسلیم نہ کیا جائے گا' نہ کسی اور کیلئے اس اہم ترین خصوصیت الٰہیہ میں شرکت روا رکھی جائے۔ اللہ تعالیٰ کے حق اطاعت کا ظہور اس طرح ہو کہ اس کے تمام بندے اس کی شریعت اور اس کے قانون کے مطیع ہوں۔

یہ بات بھی کافی نہیں ہے کہ لوگ اپنے لئے کوئی ایسا قانون بنائیں جو شریعت کے مشابہ ہو۔ بلکہ وہ اگر بعینہٖ کسی منصوص شرعی قانون کو نافذ کریں مگر اسے اپنے قانون کا نام دیں' اور اس پر اپنی علامات وضع کریں اور اسے شریعت کا نام نہ دیں اور نہ اسے الٰہی قانون کے نام سے اور اللہ کے عنوان سے نافذ کریں تو اس صورت میں بھی وہ اسلامی قانون نہ ہوگا۔ اسلامی قانون اس طرح ہوگا کہ اللہ کی حاکمیت اور اللہ کی حکومت کو تسلیم کرتے ہوئے اور الوہیت اور حاکمیت کو حق

خدا قرار دیتے ہوئے' اس طرح کہ اس کا کوئی حصہ کسی انسان کیلئے جائز نہ ہو۔ صرف اس صورت میں وہ اسلامی قانون رہے گا۔ اور صرف اس صورت میں نفاذ شریعت کا تقاضا پورا ہو گا کہ لوگ شریعت کے نفاذ کو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے قیام کے عنوان سے اسے نافذ کریں۔

اس فیصلہ اور انداز کلام سے وہ احکام ثابت ہوتے ہیں جن کا فیصلہ اس سورہ میں سنایا گیا ہے۔ (وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ) "اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قوانین کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو ایسے لوگ ہی کافرہیں۔" اور (وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ) "اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ لوگ ظالم ہیں۔" اور (وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ) "اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو وہی لوگ فاسق ہیں۔" وہ لوگ جو اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ اللہ کی حاکمیت کا انکار کرتے ہیں اور اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ صرف اللہ ہی کو حاکم نہیں سمجھتے بلکہ اس میں دوسروں کو بھی شریک کرتے ہیں اور اس انکار شریعت اور ترک شریعت کا یہ گناہ وہ اپنے عمل سے کرتے ہیں۔ اگرچہ منہ سے وہ اس کا اعلان نہیں کرتے اور ظاہر ہے کہ عمل کی زبان محض الفاظ کی زبان سے زیادہ قوی اور موثر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان آیات میں قرآن کریم ایسے لوگوں پر کفر' فسق اور ظلم کا اطلاق کرتا ہے اس لئے کہ انہوں نے اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کو ترک کر دیا' اس میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کر دیا اور خود اپنی جانب سے قانون سازی اور شریعت سازی کرنے لگے جس کی اجازت ان کو اللہ تعالیٰ نے نہیں دی۔

---ooo---

ان صحیح اعتقادی تصورات کی تفصیلی وضاحت اور ان کے اندر اہل کتاب اور اہل جاہلیت کے اشتباہات کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بیان کہ دین کا مفہوم یہ ہے کہ عقیدہ اور نظریہ حیات صحیح ہو اور اس کے مفہوم میں اللہ کی اطاعت بھی شامل ہے اور حلال و حرام اور قانون کے دائرے میں اللہ کی حاکمیت کا اقرار بھی شامل ہے اور پھر اللہ کی شریعت کا نفاذ بھی اس میں شامل ہے۔ ان کے علاوہ اس سورہ کے اندر ایک دوسری اہم حقیقت کو بھی بیان کیا گیا ہے اور مذکور بالا تمام امور سے وہ اہم ہے۔

وہ اہم حقیقت کیا ہے؟ وہ ہے امت مسلمہ کی شان اور اس کا مقام' اور اس کرۂ ارض پر اس کا حقیقی کردار اور یہ کہ اس دنیا میں امت کے دشمنوں کے بارے میں اس امت کا موقف کیا ہونا چاہئے۔ نیز وہ کون لوگ ہیں جو اس امت کے حقیقی دشمن ہیں اور یہ کہ وہ لوگ اس امت' اور اس دین کے خلاف کیا کیا دشمنیاں کرتے ہیں اور کیا کیا سازشیں کرتے ہیں۔ یہ کہ ان دشمنوں نے کیا کیا گمراہیاں اختیار کر رکھی ہیں اور کہاں کہاں یہ دشمن صحیح عقیدے سے انحراف کر گئے ہیں اور کس کس جہت سے وہ امت کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا معرکتہ الآرا مضمون ہے جو اس سورہ میں بھی ہے اور اس سے پہلے کی تین طویل سورتوں میں بھی اسے بار بار لیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس امت کی کتاب انسانوں کیلئے آخری کتاب ہے۔ یہ کتاب سابقہ کتب سماوی کی اصل اسلامی اعتقاد اور تصور حیات کے مسئلے میں تصدیق کرتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ آخری کتاب ہے' اس لئے یہ ان تمام تعلیمات پر مشتمل

ہے جو اس کتاب سے پہلے اللہ کی جانب سے نازل ہوئیں۔ اس کتاب میں وہ شریعت درج ہے جو قیامت تک کیلئے اب آخری شریعت ہے۔ اس کتاب نے سابقہ شرائع میں سے جس قانون کو بحال رکھا ہے وہ قانون اب اس شریعت کا حصہ بن گیا ہے اور اگر کسی قانون کو اس شریعت نے منسوخ کر دیا ہے تو بھی اس شریعت نے اس کی تصریح کر دی ہے۔ اگرچہ وہ سابقہ شریعتوں میں نافذ رہا ہو۔ اب اس کی قانونی حیثیت ختم ہو گئی ہے۔

(اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

(۳:۵)) ”آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔“

(وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْکِتٰبِ وَمُهَیْمِنًا عَلَیْهِ

(۴۸:۵)) ”پھر اے نبی ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لیکر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ اور نگہبان ہے۔“

اس لئے امت مسلمہ کا اصل کردار اس دنیا میں یہ ہے کہ اس پوری انسانیت پر نگراں ہو، وہ دنیا میں عدل قائم کرے اور اس سلسلے میں کسی کی محبت اور کسی کی دشمنی اسے متاثر نہ کر سکے۔ یہ خیال نہ کرے کہ قیام عدل سے وہ خود متاثر ہوتی ہے یا اس سے لوگ متاثر ہوتے ہیں اس لئے کہ قیام عدل اس کے فرائض میں سے ہے۔ اس کی اب حیثیت یہ ہے کہ وہ تمام اقوام کی نگران، محافظ اور منصف ہے۔ اسی طرح اس امت کو دوسری امم کی گمراہیوں اور خواہش پرستیوں سے بھی متاثر نہ ہونا چاہئے۔ اور اسے شریعت الٰہیہ 'اسلامی نظام حیات اور اسلام کے صراط مستقیم سے ذرہ برابر بھی دور نہیں ہٹنا چاہئے۔ اسے اپنا یہ سفر محض اللہ کی رضا اور اس کی پکڑ سے ڈرتے ہوئے جاری رکھنا چاہئے اور اس میں کسی اور کی رضامندی، تالیف قلب کا کوئی لحاظ نہیں رکھنا چاہئے۔

(وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْکُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (۲:۵)

”اور ایک گروہ نے جو تمہارے لئے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا تو اس پر...... تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔ جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو، گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو اس کی سزا بہت سخت ہے۔“

(یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ؗ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؗ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۵:۸))

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو' کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ - عدل کرو' یہ خدا ترسی سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے - اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو' جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے -“

(وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَیْمِنًا عَلَیْهِ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ

(۵:۴۸) ”پھر اے نبی ہم نے تیری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنیوالی اور اس کی محافظ اور نگہبان ہے - لہذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو -“

(وَ اَنِ احْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَ احْذَرْهُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّصِیْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ (۵:۴۹)

”پس اے نبی تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو - ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے - پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے ان کے بعض گناہوں کی پاداش میں ان کو مبتلائے مصیبت کرنے کا ارادہ ہی کر لیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں -“

یہ حقیقت ہے کہ یہ امت تمام سابقہ رسالتوں کی وارث اور امین ہے اور یہ بات کہ حضرت محمد ﷺ کی رسالت آخری رسالت ہے

اور آپ کا دین آخری دین ہے اور یہ کہ یہ امت تمام امم پر نگران و نگہبان ہے اس بات کی متقاضی ہے کہ یہ امت ان لوگوں کے ساتھ دوستی قائم نہ رکھے جو اس دین کا انکار کرتے ہیں۔ خصوصاً ان لوگوں کے ساتھ جو اسلامی شعائر اور فرائض کو مذاق کا نشانہ بناتے ہیں اور ان کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ اس امت کا فریضہ ہے کہ وہ صرف اللہ اور رسول کے ساتھ دوستی رکھے اور وہ ایسی اقوام اور گروہوں کی حلیف نہ بنے جو اللہ اور رسول پر ایمان نہیں رکھتے اس لئے کہ یہ امت ایک نظریاتی امت ہے۔ یہ کوئی قومی اور نسلی امت نہیں ہے۔ نہ یہ وطنی امت ہے نہ اپنی جاہلی روایات کی حامل امت ہے۔ یہ تو اس نظریہ جدید کی پیداکردہ امت ہے جس کا طریق کار ربانی منہاج ہے۔ اور وہ اس آخری رسالت کی حامل ہے اور یہ رسالت اس کیلئے واحد اساس اجتماع ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

(اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۖ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵:۳))

"آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔"

(يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۵:۵۱))

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں سے ہے۔ یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی راہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔"

(اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (۵۵) وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۵۶)(۵:۵۵-۵۶))

"تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور رسول اللہ اور اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنالے اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔"

(یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِیَآءَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۵۷) وَ اِذَا نَادَیْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ (۵۸)

(۵:۵۷ – ۵۸)) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تمہارے پیش رو اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنالیا ہے۔ انہیں اور دوسرے کافروں کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ۔ اللہ سے ڈرو' اگر تم مومن ہو' جب تم نماز کیلئے منادی کرتے ہو تو وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس سے کھیلتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔"

(یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ اِلَى مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵:۱۰۵)) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنی فکر کرو' کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہ راست پر ہو تم سب نے اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے پھر وہ تمہیں خبر دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

اس امت کے دشمنوں کا حال یہ ہے کہ وہ مطلق ہدایت کے دشمن ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ صحیح نظام زندگی کے ساتھ عداوت کی ہے۔ وہ سچائی کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اور نہ وہ کبھی اس پر تیار ہوں گے کہ سچائی کے ساتھ اپنا دائمی مخاصمانہ رویہ ختم کر دیں۔ اس لئے امت مسلمہ کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو اچھی طرح جان لے۔ ان کی تاریخ سے ان کے خدوخال معلوم کرنے کی کوشش کرے اور اس آخری نبی ؐ اور اس کے دین کے سلسلے میں ان کا جو تازہ ترین موقف ہے' اسے بھی اچھی طرح سمجھ لے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

(وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا ؕ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ؕ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ (۱۲) فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّیْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِیَةً ۚ یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا

حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ
وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۳) وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا
مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ
الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۱۴) (۵: ۱۲ تا ۱۴))

"اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان میں بارہ نقیب مقرر کیے تھے اور ان سے کہا تھا کہ "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقین رکھو کہ میں تمہاری برائیاں تم سے زائل کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی مگر اس کے بعد جس نے تم میں سے کفر کی روش اختیار کی تو درحقیقت اس نے سواء السبیل گم کر دی۔" پھر یہ ان کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اور ان کے دل سخت کر دیئے۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ الفاظ کا الٹ پھیر کرکے بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں' جو تعلیم انہیں دی گئی تھی اس کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں اور آئے دن تمہیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ ان میں سے کم لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں۔ لہٰذا انہیں معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو' اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کی روش رکھتے ہیں .... اسی طرح ہم نے ان لوگوں سے بھی پختہ عہد لیا تھا جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں' مگر ان کو بھی جو سبق یاد کرایا گیا تھا اس کا ایک بڑا حصہ انہوں نے فراموش کر دیا' آخر کار ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کیلئے دشمنی اور آپس کے بغض و عناد کا بیج بو دیا' اور ضرور ایک وقت آئے گا جب اللہ انہیں بتائے گا کہ وہ دنیا میں کیا بناتے رہے ہیں۔"

(وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَ
جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ڰ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (۲۰) يٰقَوْمِ ادْخُلُوا
الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ
(۲۱) قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ڰ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ
فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ (۲۲) قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ

عَلَيْهِمَا ادْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۲۳) قَالُوْا يٰمُوْسٰى إِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (۲۴) قَالَ رَبِّ إِنِّيْ لَآ أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِيْ وَأَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (۲۵) (۵: ۲۰ تا ۲۵))

''یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ ''اے میری قوم کے لوگو' اللہ کی اس نعمت کا خیال کرو جو اس نے تمہیں عطا کی تھی۔ اس نے تم میں سے نبی پیدا کئے' تم کو فرمان روا بنایا اور تم کو وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا۔ اے برادران قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے۔ پیچھے نہ ہٹو ورنہ ناکام و نامراد پلٹو گے۔'' انہوں نے جواب دیا ''اے موسیٰ وہاں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں' ہم وہاں ہرگز نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں اگر وہ نکل آئے تو ہم داخل ہونے کیلئے تیار ہیں۔'' ان ڈرنے والوں میں دو شخص ایسے بھی تھے جن کو اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا' انہوں نے کہا کہ ''ان جباروں کے مقابلے میں دروازے کے اندر گھس جاؤ جب تم اندر پہنچ جاؤ گے تو تم ہی غالب رہو گے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو اگر تم مومن ہو۔'' لیکن انہوں نے پھر یہی کہا۔ '' اے موسیٰ ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے۔ جب تک وہ وہاں موجود ہیں۔ بس تم اور تمہارے رب دونوں جاؤ اور لڑو' ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔'' اس پر موسیٰ نے کہا ''اے میرے رب میرے اختیار میں کوئی نہیں ہے مگر میری اپنی ذات یا میرا بھائی' پس تو ہمیں ان نافرمان لوگوں سے الگ کر دے۔'' اللہ نے جواب دیا ''تو وہ ملک اب چالیس سال تک ان پر حرام ہے۔ یہ زمین میں مارے مارے پھریں گے' ان نافرمانوں کی حالت پر ہرگز ترس نہ کھاؤ۔''

(مِنْ أَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْ إِسْرَآئِيْلَ أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَآ أَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ إِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْأَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ

(۵: ۳۲)) ''اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ ''جس نے کسی انسان کو بغیر اس کے کہ وہ کسی کا قاتل ہو یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔'' مگر ان کا حال یہ ہے کہ ہمارے رسول پے در پے ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات لیکر آئے پھر بھی ان میں بکثرت لوگ زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں۔''

(یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ لَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ ۙ لَمْ یَاْتُوْكَ ۭ یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ یَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِیْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ۭ وَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَمْ یُرِدِ اللّٰهُ اَنْ یُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ۭ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ ښ وَّلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (۴۱) سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ----

(۴۲)(۵:۴۱-۴۲))

"اے پیغمبر' تمہارے لئے باعث رنج نہ ہوں وہ لوگ جو کفر کی راہ میں بڑی تیز گامی دکھا رہے ہیں خواہ وہ ان میں سے ہوں جو منہ سے کہتے ہیں ہم ایمان لائے مگر دل ان کے ایمان نہیں لائے' یا ان میں سے ہوں جو یہودی ہیں' جن کا حال یہ ہے کہ جھوٹ کیلئے کان لگاتے ہیں اور دوسرے لوگوں کی خاطر جو تمہارے پاس کبھی نہ آئے' سن گن لیتے پھرتے ہیں' کتاب اللہ کے الفاظ کو ان کا صحیح محل متعین ہونے کے باوجود اصل معنی سے پھیرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو نہیں تو نہ مانو۔ جسے اللہ نے فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو اس کو اللہ کی گرفت سے بچانے کیلئے تم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا چاہا' مگر ان کیلئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں سخت سزا............ یہ جھوٹ سننے والے اور حرام کے مال کھانے والے ہیں۔"

(قُلْ یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ (۵۹) قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَیْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِیْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ۭ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَاۗءِ السَّبِیْلِ (۶۰)(۵:۵۹-۶۰))

"ان سے کہو: اے اہل کتاب' تم جس بات پر ہم سے بگڑے ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم اللہ پر اور دین کی اس تعلیم پر ایمان لائے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور ہم سے پہلے بھی نازل ہوئی تھی اور تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔ پھر کہو: کیا میں ان لوگوں کی نشاندہی کر دوں جن کا انجام خدا کے ہاں فاسقوں کے انجام سے بدتر ہے' وہ جن

پر خدا نے لعنت کی‘ جن پر اس کا غضب ٹوٹا‘ جن میں سے بندر اور سور بنائے گئے ‘جنہوں نے طاغوت کی بندگی کی ۔ ان کا درجہ اور بھی زیادہ برا ہے ۔ اور وہ سواء السبیل سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں ۔“

(وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ (٦١) وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (٦٢) لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (٦٣) وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ۭ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۭ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰي يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (٦٤)

(٥: ٦٢ تا ٦٤))

”جب یہ لوگ تم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ‘ حالانکہ کفر لیے ہوئے آئے تھے اور کفر ہی لیے ہوئے واپس گئے اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں ۔ تم دیکھتے ہو کہ ان میں سے بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں پر دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں اور حرام کے مال کھاتے ہیں ۔ بہت ہی بری حرکات ہیں جو یہ کر رہے ہیں ۔ ان کے علماء و مشائخ انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے منع نہیں کرتے ۔ یقیناً بہت ہی برا کارنامہ زندگی ہے جو یہ تیار کر رہے ہیں ...... یہودی کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں ...... باندھے گئے ہیں ان کے ہاتھ اور لعنت پڑی ان پر اس بکواس کی بدولت جو یہ کرتے ہیں ...... اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں ‘ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کلام تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے وہ ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی و باطل پرستی میں الٹا اضافہ کا موجب بن گیا ہے اور ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کیلئے عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے ۔ جب کبھی جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اس کو ٹھنڈا کرتا ہے ۔ یہ زمین میں فساد پھیلانے کی سعی کر رہے ہیں مگر اللہ فساد پھیلانے والوں کو پسند نہیں کرتا ۔“

(قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (٦٨) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (٦٩) لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ (٧٠) وَحَسِبُوْۤا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (٧١) (٥:٦٨ تا ٧١))

"صاف کہہ دو کہ اے اہل کتاب ' تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تورات و انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں ۔" ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے ان میں اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دے گا ۔ مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو ۔ مسلمان ہوں یا یہودی ' صابی ہوں یا عیسائی جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا بے شک اس کیلئے نہ کسی خوف کا مقام ہے اور نہ رنج کا .... ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے ۔ مگر جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ' ان کی خواہشات نفس کے خلاف کچھ لیکر آیا تو کسی کو انہوں نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا ۔ اور اپنے نزدیک یہ سمجھے کہ کوئی فتنہ رونما نہ ہوگا ۔ اس لئے اندھے اور بہرے بن گئے ۔ پھر اللہ نے انہیں معاف کیا تو ان میں سے اکثر لوگ اور زیادہ اندھے اور بہرے بنتے چلے گئے ۔ اللہ ان کی سب حرکات دیکھ رہا ہے ۔"

(لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (٧٨) كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (٧٩) تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ (٨٠) وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ

بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۸۱)

(۵:۷۸ تا ۸۱)) "بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہوگئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے' انہوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا' برا طرز عمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا تھا۔ آج تم ان میں بکثرت ایسے لوگ دیکھتے ہو جو کفار کی حمایت ورفاقت کرتے ہیں۔ یقیناً بہت برا انجام ہے جس کی تیاری ان کے نفسوں نے ان کیلئے کی ہے' اللہ ان پر غضبناک ہوگیا ہے اور وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہونیوالے ہیں۔ اگر فی الواقعہ یہ لوگ اللہ اور پیغمبر اور اس چیز کو ماننے والے ہوتے جو پیغمبر پر نازل ہوئی تھی تو کبھی کافروں کو اپنا رفیق نہ بناتے مگر ان میں سے بیشتر تو خدا کی اطاعت سے نکل چکے ہیں۔"

(لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۵:۸۲)) "تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے' اور ایمان لانے والوں کیلئے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں' یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار اور عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرور نفس نہیں ہے۔"

---ooo---

جماعت مسلمہ کے دشمنوں کے خلاف یہ مہم نہایت ہی زوردار ہے۔ اس میں خصوصاً یہود اور مشرکین پر تنقید کی گئی ہے اور اس میں منافقین اور نصاریٰ کا بھی جابجا ذکر ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ اس سورہ میں مدینہ طیبہ میں اس وقت کی جماعت مسلمہ کے موقف کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مدینہ طیبہ میں جماعت مسلمہ کن حالات سے دوچار تھی۔ اور مخالفین کے ساتھ کس کشمکش میں مصروف تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے ہر تحریک اسلامی ایسے ہی حالات سے دوچار ہوتی رہی ہے۔ مدینہ طیبہ میں جو حالات تھے ہمیشہ اہل حق کو ان حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ سوال یہ ہے یہ سورہ مدینہ طیبہ میں کب نازل ہوئی تھی؟ تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس کا اصل تاریخی پس منظر کیا ہے۔

متعدد روایات میں یہ بات آئی ہے کہ یہ سورہ سورہ فتح کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اور سورہ فتح ۶ھ میں واقعہ حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی تھی۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ یہ سورہ آیت ۳ کے سوا سب کی سب ایک ہی دفعہ نازل ہوئی ہے۔ یعنی آیت (اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ) جس کے بارے میں روایت ہے کہ یہ سن دس ہجری میں حجۃ الوداع کے

موقع پر نازل ہوئی۔
لیکن اس سورہ کے مضامین اور موضوعات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان روایات کے اندر جو یہ کہا گیا ہے کہ یہ سورہ سورہ فتح کے بعد پوری کی پوری ایک بار نازل ہوئی شاید درست نہیں ہے۔ سیرت النبی میں غزوہ بدر کے موقع پر ایک واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ ؑ کے ساتھ جنگ کیلئے بیت المقدس میں داخل ہونے سے جو انکار کیا تھا' اس کی بابت مسلمانوں کو بدر کے وقت اچھی طرح علم تھا اور بدر کا واقعہ ۲ ھ میں ہوا تھا۔ بدر کے موقع پر حضرت سعد بن معاذ انصاری ؓ اور بعض روایات میں حضرت مقداد بن عمرو نے یہ کہا تھا۔ "اے رسول اللہ' ہم آپ کو ایسا جواب نہ دیں گے جو قوم موسیٰ کو دیا تھا کہ "تم اور تمہارا رب جاؤ اور لڑو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔" بلکہ ہمارا جواب یہ ہے کہ نکلیں آپ اور آپ کا رب اور ہم آپ کے اتباع میں نکلنے والے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔"
موضوعات اور مضامین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ آیات نازل ہو رہی تھیں' اس وقت یہودی طاقت ور اور مضبوط لوگ تھے اور ان کو مدینہ میں اثر و رسوخ حاصل تھا۔ خود اہل اسلام کی صفوں میں بھی ان سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ قرآن مجید نے ان کے خلاف یہ تنقیدی مہم شروع کر کے ان کی سازشوں سے ان کو خبردار کیا۔ جبکہ تاریخی صورت حال یہ رہی ہے کہ غزوۂ بنو قریظہ اور غزوہ خندق کے بعد ان کو یہ اثر و رسوخ حاصل نہ تھا۔ اور مدینہ کے قرب و جوار سے یہودیوں کے تینوں قبیلے بنی قینقاع و بنو نضیر اور بنو قریظہ کو نکال کر جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ اس لئے صلح حدیبیہ کے بعد یہودیوں کو اس قدر اہمیت حاصل نہ تھی جو اس سورہ میں ان کو دی گئی ہے۔ پھر اس دور میں ان کے ساتھ عدم دشمنی اور دوستی کا جو معاہدہ تھا' وہ بھی ختم ہو گیا تھا اور حدیبیہ کے بعد سابقہ عہد کی جگہ ان کے ساتھ کوئی جدید عہد بھی نہ ہوا تھا۔ اس لئے اللہ کا یہ فرمان (وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۳) "اور آئے دن تمہیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ ان میں سے بہت کم لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں۔ لہذا انہیں معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو۔ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کی روش رکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ ضروری ہے کہ وہ اس دور سے پہلے کا ہو' نیز یہ کہ آپ ان کے درمیان فیصلہ کریں اور ان کے ساتھ چشم پوشی کریں۔"
اس داخلی مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس سورہ کے بعض حصے ایسے ہیں کہ سورہ فتح سے پہلے نازل ہوئے اور بعض ایسے ہیں جو اس کے بعد نازل ہوئے۔ نیز آیت (اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ) لازماً سورہ الفتح کے بعد نازل ہوئی ہے اس لئے کہ راجح اقوال کے مطابق یہ آیت قرآن کریم کی آخری آیات میں سے ہے۔ لہذا یہ بات ثابت ہوئی کہ جس طرح بعض روایات میں آتا ہے ان کے برعکس یہ سورہ سب کی سب ایک ہی بار نازل نہیں ہوئی۔
جس طرح ہم نے سورہ بقرہ' سورہ آل عمران اور سورہ نساء کے آغاز میں کہا کہ قرآن نے مسلمانوں کو لیکر' ان کے دشمنوں کے ساتھ کشمکش شروع کر دی تھی اور ان میں سرفہرست یہودی' اور مشرکین مکہ تھے جو مسلمانوں اور ان کے دین کے سخت دشمن تھے۔ اس کشمکش میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی نظریاتی تطہیر بھی فرما رہے تھے اور ان کیلئے جدید معاشرے کے خدوخال بھی وضع ہو رہے تھے اور بیک وقت ان کیلئے اخلاقی اور قانونی اور تمدنی اصول بھی وضع کئے جا رہے تھے۔ یہ

تمام کام ایک ہی وقت میں ایک ہی طریق کار کے مطابق ہو رہے تھے۔
کسی معاشرے کی تعمیر میں پہلا کام اس کی نظریاتی تطہیر ہوتی ہے اس لئے اس سورہ میں بھی قرآن کریم نے سب سے زیادہ زور نظریۂ توحید پر دیا ہے اور توحید کو ہر قسم کے شرکیہ شائبہ سے پاک کیا گیا ہے۔ پھر اس سورہ میں (الدین) کا مفہوم واضح کر کے بتایا گیا ہے کہ دین سے مراد زندگی کا پورا نظام ہے اور یہ کہ دین پوری زندگی کا منہاج ہے اور یہ کہ کسی بھی اسلامی معاشرے اور تمدن میں لازم ہے کہ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کئے جائیں۔ زندگی کے تمام معاملات میں ہدایات اللہ وحدہ لاشریک سے اخذ کی جائیں۔ یہی ایمان ہے اور یہی اسلام ہے۔ اس کے سوا توحید کا کوئی وجود ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ توحید کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ وحدہ حاکم ہے اور ربوبیت کی تمام صفات اور حقوق صرف اللہ کو حاصل ہیں۔ ان میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ حاکمیت اور قانون سازی اللہ تعالیٰ کی اہم ترین خصوصیات میں سے ہیں۔ حاکمیت اور قانون سازی اللہ ہی کا حق ہے جس طرح پرستش اور عبادت صرف اللہ کا حق ہے۔ اس پوری سورہ میں اس نکتے پر بہت ہی زور دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے تفصیلاً کہا ہے جس طرح اس سے قبل کی طویل سورتوں کے موضوعات ایک جیسے تھے اسی طرح اس سورہ کے بنیادی موضوعات بھی وہی ہیں۔ لیکن ہر سورہ میں ان موضوعات پر بات حالات و مواقع کی مناسبت سے مختلف انداز میں کی گئی ہے۔ ہر سورہ کا وجود' اس کا رنگ اور اس کا اسلوب کلام بالکل مختلف ہے لیکن موضوع سخن ایک ہی ہے۔ جبکہ زاویہ بحث وہ نہیں ہوتا جو دوسری سورتوں میں ہوتا ہے۔ اسی طرح موضوع پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اور بیان کے اندر بعض نئے موثرات لائے جاتے ہیں۔ اس طرح ان عارضی تبدیلیوں سے ہر سورہ کی شخصیت الگ ہو جاتی ہے اور اس کی خصوصیات سامنے آجاتی ہیں۔
اس سورہ کا انداز خطیبانہ ہے اور بات نہایت ہی فیصلہ کن انداز میں کی گئی ہے چاہے بات احکام شرعیہ کی ہو جہاں عموماً بات فیصلہ کن انداز میں ہوتی ہے' یا اصولوں کی بات ہو یا عام ہدایات کا بیان ہو جہاں مختلف انداز اختیار کئے جاتے ہیں۔ بہرحال اس سورہ کے اندر تمام بیانات فیصلہ کن شکل میں ہیں۔ اور بیان کا انداز خطیبانہ ہے۔ غرض اس پوری سورہ کی یہی دو خصوصیات ہیں فیصلہ کن بات اور زوردار خطیبانہ کلام۔
اس سورہ پر بات ختم کرنے سے پہلے یہ بات ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس کی آیت ۳ پر مزید روشنی ڈالی جائے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تمہارے لئے میں نے نظام زندگی کے طور پر اسلام کو پسند کر لیا ہے اور تم پر تمام انعامات مکمل کر دیئے ہیں.............. اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ یہ امت جس منبع اور مرجع سے اپنے لئے نظام حیات اور اپنے معاشرے اور تمدن کا نظام لے گی وہ صرف ایک ہے۔ مسلمان اپنا قانون' اپنی پالیسی' اور اپنے اجتماعی روابط قیامت تک صرف اللہ سے لیں گے۔ اور یہ کہ یہ دین مکمل طور پر قائم و دائم ہو گا۔ یہ بات لازم ہے کہ اسے اپنی تمام جزئیات کے ساتھ قائم کیا جائے۔ اس کے نظریات بھی زندہ رہیں اور اس کے مراسم عبودیت بھی قائم ہوں۔ نہ شریعت و قانون میں تبدیلی ہوگی اور نہ عبادت میں تبدیلی ہوگی۔ یہ دین اب مکمل صورت میں آگیا۔ اس کا معاملہ پورا ہو گیا ہے اور اس میں کسی تبدیلی کا مطلب یہ ہو گا کہ اس کا انکار کر دیا جائے۔ اس لئے کہ جو شخص دین میں کوئی تبدیلی کرتا ہے' وہ گویا بالواسطہ دین کے مکمل ہونے کا انکار کرتا ہے اور دین کے مکمل ہونے کا انکار لازماً کفر ہے۔ رہی یہ بات کہ کوئی شخص دینی نظام اور اسلامی منہاج کو مکمل طور پر چھوڑ کر کسی کافرانہ منہاج کو اختیار کر

لے 'کوئی دوسری شریعت اپنا لے تو اس کے بارے میں کسی فیصلے کی کسی کو ضرورت ہی نہیں ہے۔ اسی سورہ کے اندر خود اللہ نے ایسے شخص کی تعریف کی ہے۔ اس پر زیادتی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ آیت ناقابل انکار انداز میں یہ فیصلہ کرتی ہے کہ دین اسلام دائمی ہے۔ اسلامی قانون دائمی ہے۔ یہ صورت جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کیلئے بطور دین تجویز کی ہے یہ آخری صورت ہے۔ یہ صورت اس وقت بھی شریعت تھی' آج کی بھی شریعت ہے اور ہر دور میں یہی شکل ہماری شریعت کی ہے۔ اب نہ کسی زمانے کیلئے کوئی الگ قانون ہوگا نہ کسی دور میں کوئی نیا دین آئے گا۔ حضرت محمد ؐ کی رسالت آخری رسالت ہے۔ اب دین کامل اور تمام ہوگیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بحیثیت آخری دین اس کی منظوری دیدی ہے۔ اب جو شخص اس میں تبدیلی لاتا ہے' اس کے طور طریقے بدلتا ہے' اس کے اندر تغیر پیدا کرتا ہے یا اس کو نئی شکل و صورت یا نئے رنگ دیتا ہے تو گویا وہ اسلام کے علاوہ کوئی نیا دین تلاش کر رہا ہے اور اللہ کو یہ ہرگز قبول نہ ہوگا۔ (وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ) یہ نظام زندگی وہ ہے جس کے اندر نظریات و اعتقادات موجود ہیں' جس کے اندر مراسم عبودیت موجود ہیں' جس کے اندر زندگی کی تفصیلات اور قوانین موجود ہیں۔ یہ پوری زندگی کی سرگرمیوں پر حکمرانی کرتا ہے' پوری زندگی کے امور میں متصرف ہوتا ہے اور پوری زندگی پر محیط ہوتا ہے۔ وہ اپنے دائرے کے اندر اس زندگی کیلئے نشوونما اور ترقی کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ لیکن وہ اس ترقی اور تبدیلی کی خاطر نہ اسلامی نظام کے اصول قربان کرتا ہے اور نہ جزئیات میں سے کوئی جزئیہ تبدیل کرتا ہے اس لئے کہ یہ دین آیا ہی اس لئے ہے کہ وہ اسلامی اصول قائم کرے اور اسلامی نظام کی جزئیات کو اپنی جگہ استوار کرے۔

اسلامی نظام میں زندگی کے اندر تغیر و تبدل اور حرکت اور ترقی کا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ اسلامی اصول یا فروع میں سے کسی چیز کو ترک کر دیا جائے یا انہیں بے کار چھوڑ دیا جائے بلکہ تمام اصول و فروع پر عمل کرتے ہوئے بھی اسلامی نظام کے اندر تغیر و تبدل اور زندگی کی ترقی کے مواقع موجود ہیں۔ یہ ترقی اسلامی زندگی کے کسی اصول اور کسی جزئیہ پر اثرانداز نہیں ہوتی۔ غرض اسلامی نظام نے پہلے سے ترقی کے دروازے اپنی اسکیم کے مطابق کھلے رکھے ہیں اس لئے کہ اللہ کی نظروں سے کوئی چیز اوجھل نہ تھی۔ اور ہر چیز اور مستقبل کے تمام تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اللہ نے اسلامی نظام حیات کو آخری شکل دی اور اس کو لوگوں کیلئے قیامت تک کیلئے پسند کرلیا۔ اللہ کو علم تھا کہ آئندہ بعض تبدیلیاں ہوں گی بعض ضروریات انسانوں کو نئی لاحق ہوں گی۔ اور ان ضروریات اور ان تبدیلیوں کے نتیجے میں نئے نئے تقاضے سامنے آئیں گے۔ لہٰذا یہ بات ضروری تھی کہ اللہ تعالیٰ اسلامی نظام کے اندر یہ تمام سہولتیں پہلے سے فراہم کر دیں۔

آج جو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اسلامی نظام میں دور جدید کے تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ان لوگوں نے نہ ذات باری کو اچھی طرح سمجھا ہے اور نہ اس پر یقین کیا ہے' اس لئے کہ یہ تصور اللہ کے شایان شان ہی نہیں ہے .... میں سمجھتا ہوں سورہ مائدہ پر اس قدر اجمالی تبصرہ کافی ہے۔ اب ہم اس کے دروس کو تفصیلاً لیں گے۔

---ooo---

درس نمبر ۶۴ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۱۱

(یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ --)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' بندشوں کی پوری پابندی کرو)- زندگی کے بسر کرنے کے لئے کچھ ضوابط کی ضرورت ہوتی ہے- خود انسان اور اس کے نفس کے درمیان جو تعلق ہے اس کے لئے بھی کچھ اصول اور ضوابط ہوتے ہیں- پھر ایک انسان اور انسان کے درمیان تعلق کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور پھر انسان اور تمام دوسری زندہ مخلوق اور غیر زندہ اشیاء کے درمیان بھی تعلق کے ضابطے ہوتے ہیں- لوگوں میں سے رشتہ داروں سے تعلقات' غیر رشتہ داروں اور دور کے لوگوں کے ساتھ تعلقات' خاندان اور قوم کے لوگوں کے ساتھ تعلقات' جماعت کے ساتھ تعلقات اور پھر پوری امت کے ساتھ ایک فرد کا تعلق' دشمنوں کے ساتھ تعلق' دوستوں کے ساتھ تعلق' دنیا کی ان زندہ چیزوں کے ساتھ تعلق جنہیں اللہ نے انسان کے قابو میں رکھا ہے اور ان کے ساتھ تعلق جو بے قابو ہیں اور اس وسیع و عریض کائنات کی تمام اشیاء کے ساتھ انسان کے تعلق کے اصول و ضوابط اسلامی نظام زندگی کے اندر پورے کے پورے موجود ہیں- پھر انسان کی زندگی کا ربط اپنے رب کے ساتھ' اپنے آقا کے ساتھ تو ایک ایسا تعلق ہے جو زندگی کی بنیادی قدر ہے- یہ تمام امور اس نظام کے اندر مقرر اور منضبط ہیں-

اسلامی نظام ان تمام ضوابط اور تعلقات کو انسانی زندگی کے اندر عملاً ثابت کرتا ہے- وہ ان تعلقات کو قائم کرتا ہے' ان کے لئے حدود و قیود متعین کرتا ہے اور ان کی پوری پوری وضاحت کرتا ہے- اور یہ تمام رابطے رب ذوالجلال کے عنوان سے ہوتے ہیں- وہ ان تمام رابطوں کے احترام کی ضمانت دیتا ہے- ان کی بے حرمتی اور ان کے ساتھ مذاق کرنے کی اجازت نہیں دیتا- ان روابط کے بارے میں اسلامی نظام یہ صورت حال برداشت نہیں کرتا کہ انہیں بدلتی ہوئی خواہشات نفسانیہ کے حوالے کر دے یا ان اغراض و مقاصد کے تابع کر دے جن کا تعلق کسی ایک فرد کی خواہش اور سوچ سے ہو- یا کوئی جماعت ان اغراض اور خواہشات میں دلچسپی رکھتی ہو یا اقوام عالم میں سے کسی قوم میں یہ اغراض پائی جاتی ہوں یا تاریخ انسانی کی نسلوں میں سے کوئی نسل ان میں دلچسپی رکھتی ہو اور ان اسباب کی وجہ سے انہیں توڑ دینا چاہتی ہو- ان تمام روابط ہی میں انسان کی مصلحت ہے بشرطیکہ ان روابط کو اللہ اور رسول نے لوگوں کے لئے وضع کیا ہو' اگرچہ کوئی فرد' کوئی جماعت' کوئی قوم یا کوئی نسل یہ سمجھتی ہو کہ ان میں انسانوں کی مصلحت نہیں ہے اس لئے کہ اللہ خوب جانتا ہے

اور لوگوں کا علم محدود ہے۔ جو فیصلہ اللہ کرتا ہے وہ بہتر ہے اس سے جو خود لوگ کرتے ہیں۔ اللہ میاں کے ادب و احترام کا پہلا زینہ یہ ہے کہ انسان اپنے ذاتی اندازے کو اللہ کی تقدیر کے مقابلے میں نہ لائے اور یہ سمجھے کہ بہتر وہی ہے جو اللہ نے قرار دیا۔ اور جو اللہ نے قرار دیا' اس کے آگے سر تسلیم خم کر دے' نہایت ہی رضامندی' نہایت ہی وثوق اور پورے اطمینان کے ساتھ۔

یہ تمام ضوابط جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا' ان کی تعبیر اللہ تعالیٰ لفظ "العقود" سے فرماتے ہیں اور اہل ایمان کو حکم دیتے ہیں کہ وہ ان عقود کی پوری پوری پابندی کریں۔ اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ بندشوں اور عقود کی پابندی کرو اور اس کے بعد پھر حلال و حرام کا بیان شروع کر دیا۔ کھانے پینے میں سے محرمات کو بیان کر دیا۔ نکاح میں جو محرمات ہیں ان کو بیان کر دیا اور ان کے بعد دوسرے شرعی احکام اور عبادات کے طریقوں کی تفصیلات بیان کیں۔ اس کے علاوہ صحیح عقائد و نظریات کی تشریح بھی کی گئی۔ بندگی اور عبادت کے طریقے بھی بیان ہوئے اور اللہ کی حاکمیت کی تفصیلات بھی دی گئیں۔ پھر امت مسلمہ اور دوسری امم کے درمیان تعلقات کی نوعیت کا تذکرہ بھی ہوا اور احکام بھی ذکر ہوئے۔ امت مسلمہ کا فریضہ ہے کہ وہ شہادت حق ادا کرے۔ دنیا میں انصاف قائم کرے۔ پوری انسانیت کی نگرانی کرے' اس لئے کہ اس کی کتاب بھی تمام کتب پر حاوی اور نگہبان ہے۔ اور پھر یہ حکم کہ اسلامی معاشرے میں فیصلے اللہ کے قانون کے مطابق ہوں اور یہ حکم کہ فتنے میں نہ پڑو اور ذاتی اور شخصی وجوہات کی بنا پر عدل و انصاف کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ یہ تمام امور العقود کی تشریح کرتے ہیں۔

غرض اس سورہ کا افتتاح لفظ العقود سے اور اس کے بعد تمام احکام و عقائد و عبادات کی تشریح اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ لفظ عقود اور عقد کا مفہوم اس لغوی مفہوم سے بہت ہی وسیع ہے جو اس لفظ کے سنتے ہی ذہن میں آ جاتا ہے بلکہ اس سے مراد وہ تمام ضابطہ حیات ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ انسان کے لیے اللہ نے جو ضابطہ حیات مقرر فرمایا ہے اس کی اساس ایمان باللہ اور اس معرفت پر ہے کہ اللہ کی الوہیت کا مفہوم کیا ہے اور اللہ کی الوہیت' حاکمیت اور معبودیت کے تقاضے کیا ہیں؟ یہ عقد اس ایمان اور تصور حاکمیت الہیہ سے پھوٹتا ہے اور زندگی کے تمام ضوابط اس ایمان اور عقیدہ اور پابندی عقود پر استوار ہوتے ہیں۔

اللہ پر ایمان لانے کا عقد' اللہ کی حاکمیت' ربوبیت اور اس کے قوام اور نگران ہونے کا اعتراف اور اس عقد و اعتراف کے نتیجے میں اللہ کی مکمل بندگی کرنے کے تقاضے اور ہمہ گیر اور عمیق اطاعت اور سر تسلیم خم کر دینے کے وعدے وہ امور ہیں جن پر اسلام کی عمارت استوار ہے۔ یہ عہد سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم سے اس وقت لیا تھا جب اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب خلافت فی الارض کی چابیاں سپرد فرمائی تھیں۔ اس معاہدے اور میثاق کو قرآن کریم نے ان الفاظ اور شرائط کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

(قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۳۸) وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ

هُمْ فِيهَا خَالِدُوْنَ (۳۹) (۲:۳۸ - ۳۹))

(ہم نے کہا تم سب یہاں سے اتر جاؤ پھر جب میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے 'تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ' ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہو گا۔اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے ' وہ آگ میں جانے والے ہیں 'جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے ۔) حضرت آدم اور آپ کے بعد مطلق انسان کو جو مقام خلافت فی الارض دیا گیا ہے وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اللہ کے رسول جو ہدایت لے کر آئیں گے ان کو قبول کیا جائے گا۔اگر اللہ کے رسولوں اور ان پر نازل شدہ ہدایات کو قبول نہ کیا گیا تو یہ عہد کی صریح خلاف ورزی ہو گی اور پھر انسان کو اس کرۂ ارض پر زندہ رہنے کا کوئی حق نہ ہو گا نہ وہ اس زمین کا مالک ہو گا۔اگر اس عہد کی خلاف ورزی کی گئی تو جو کام بھی اس عہد کے خلاف ہوں گے وہ باطل (Void) اور کالعدم ہوں گے ۔ ان کی کوئی قانونی حیثیت نہ ہو گی اور نہ ان افعال کو از سرنو درست کیا جا سکے گا اس لیے جو شخص بھی اللہ پر صحیح ایمان رکھتا ہو' اللہ کے ساتھ اپنے کئے ہوئے عہد کو پورا کرنا چاہتا ہو' اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اس باطل کی مدافعت کرے' اس کو ہرگز قبول نہ کرے اور اس باطل کی اساس پر کوئی معاملہ نہ کرے ۔اگر کوئی ایسا کرے گا تو وہ ہرگز وفائے عہد نہ کر رہا ہو گا۔

اللہ کے ساتھ اس عقد اور اس عہد کی ذریت آدم کے ساتھ تجدید ہوتی رہی ہے۔آدم علیہ السلام کی جو جو نسل وجود میں آتی رہی ہے اس کے ساتھ یہی عہد از سرنو ہوتا رہا ہے۔ایک دوسری آیت میں ہے۔

(وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِىْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ (۱۷۲) اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ (۱۷۳) (۷:۱۷۲-۱۷۳))

(اور اے نبی لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" انہوں نے کہا: "ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔" یہ ہم نے اس لئے کیا کہ کہیں قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ "ہم اس بات سے بے خبر تھے۔" یا یہ نہ کہنے لگو کہ "شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے ۔پھر کیا آپ ہمیں اس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا؟)

غرض یہ ایک دوسرا صریح معاہدہ تھا جو ہر فرد کے ساتھ طے ہوا۔اور یہ عہد ایسا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ

فرماتے ہیں کہ یہ تمام بنی آدم کے ساتھ طے پایا تھا اور یہ اس وقت ہوا جب وہ اپنے باپوں کی پشتوں میں تھے۔ ہم یہاں یہ سوال نہیں کرسکتے کہ یہ عہد کیسے طے پایا کیونکہ یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ کیسے طے پایا۔ لوگوں کے ساتھ اللہ نے کس طرح خطاب کیا۔ یہ اللہ ہی جانتا ہے جبکہ وہ آباء کی پشتوں میں تھے۔ بہرحال اللہ نے ان سے خطاب کیا اور ان پر اتمام حجت کیا۔ اور ان سے عہد یہ لیا گیا کہ وہ ان کا رب ہے اور انہوں نے اس کا اقرار کیا جس طرح اللہ نے بیان کیا ہے۔ اب اگر لوگ اللہ کی الوہیت کو تسلیم نہ کریں گے تو یہ ان کی جانب سے عہد کی خلاف ورزی ہوگی۔

پھر آگے چل اس سورہ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بھی ایسا ہی عہد لیا تھا' اس وقت جب پہاڑ کو ان کے اوپر ابر کی طرح لٹکا دیا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ یہ پہاڑ ان کے اوپر گرنے ہی والا ہے۔ آگے بتایا جائے گا کہ انہوں نے کس طرح اس عہد و میثاق کی خلاف ورزی کی اور پھر ان پر خدا کا عذاب کس طرح نازل ہوا۔

اسی طرح حضرت محمد ؐ پر ایمان لانے والے لوگوں نے بھی درحقیقت' آپ پر ایمان لاکر اللہ سے معاہدہ کیا۔ انہوں نے سمع اور اطاعت پر عہد کیا۔ خوشی میں بھی اور مشکلات میں بھی اور یہ کہ اس عہد کو ہر چیز پہ مقدم رکھیں گے اور کسی کام کے اہل شخص اور مستحق شخص کے استحقاق کو چیلنج نہ کریں گے۔

اس عام عہد اور عقد کے بعد خصوصی عہد بھی ہوتے رہے۔ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقعہ پر جس کے نتیجے میں ہجرت کا عمل شروع ہوا اور آپ ؐ مکہ سے مدینہ کی طرف منتقل ہوئے' انصار کے نمائندوں کے ساتھ ایسا ہی عقد ہوا تھا اور حدیبیہ میں بھی ایک عقد بیعت الرضوان کے نام سے ہوا تھا۔

غرض اللہ پر ایمان لانے کے عقد' اور اللہ کی بندگی کرنے کے عہد پر تمام دوسرے عقود مرتب ہوتے ہیں' چاہے ان کا تعلق اللہ کے اوامر سے ہو یا نواہی سے ہو یا ان کا تعلق عام لوگوں' زندہ چیزوں یا اس کائنات کی دوسری چیزوں سے ہو یا ان حدود میں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کوئی شرعی حکم دیا ہے۔ یہ سب عقود ہیں اور اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو بحیثیت مومن یہ حکم دے رہے ہیں کہ وہ ان عقود کو پوری طرح سرانجام دیں اس لئے کہ ایمان لاتے ہی ان پر یہ پابندی عائد ہوگئی ہے اور ایمان کا یہ تقاضا ہے کہ وہ ایسا کریں اور یہی وجہ ہے کہ خطاب یوں ہوا (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ) اور اس کے بعد اب مزید تفصیلات ان عقود کی اس طرح آئی ہیں۔

آیاتها ۱۲۰ سُوْرَةُ الْمَآئِدَةِ (۵) مَدَنِيَّةٌ (۱۱۲) رکوعاتها ۱۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۥ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ
اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ

مَا يُرِيْدُ ۝١ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ
وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا
مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ
قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى
الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝٢ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ
وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَ
النَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۠ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ
وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ
اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ
مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٣

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' بندشوں کی پوری پابندی کرو۔ تمہارے لئے مویشی کی قسم کے سب جانور حلال کئے گئے' سوائے ان کے جو آگے چل کر تم کو بتائے جائیں گے لیکن احرام کی حالت میں شکار کو اپنے لئے حلال نہ کر لو' بیشک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو..... حرام مہینوں میں سے کسی کو حلال نہ کر لو' قربانی کے جانوروں پر دست درازی نہ کرو' ان جانوروں پر ہاتھ نہ ڈالو جن کی گردنوں میں نذر خداوندی کی علامت

کے طور پر پٹے پڑے ہوئے ہوں نہ ان لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکان محترم (کعبہ) کی طرف جارہے ہوں۔ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو شکار تم کر سکتے ہو..... اور دیکھو' ایک گروہ نے جو تمہارے لئے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔نہیں' جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔اللہ سے ڈرو' اس کی سزا بہت سخت ہے۔

تم پر حرام کیا گیا مردار' خون' سور کا گوشت' وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو' وہ جو گلا گھٹ کر یا چوٹ کھاکر' یا بلندی سے گر کر' یا ٹکر کھاکر مرا ہو' یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو.... سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پاکر ذبح کر لیا اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا۔ نیز یہ بھی تمہارے لئے ناجائز ہے کہ پانسوں کے ذریعے اپنی قسمت معلوم کرو۔یہ سب افعال فسق ہیں۔ آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے پوری مایوسی ہو چکی ہے لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔(لہٰذا احرام و حلال کی جو قیود تم پر عائد کی گئی ہیں ان کی پابندی کرو) البتہ جو شخص بھوک سے مجبور ہو کر ان میں سے کوئی چیز کھالے' بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو تو بیشک اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)

قابل ذبح جانوروں میں تحریم و تحلیل' مختلف چیزوں میں سے حلال و حرام مختلف جگہوں میں حلال و حرام' مختلف اوقات میں حلال و حرام کی یہ حدود و قیود سب کی سب عقود ہیں۔یہ تمام عقود اور عہد و پیمان ایمان کی بنیاد پر قائم ہیں اس لئے جو لوگ ایمان لائے ہیں' ان کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حلال و حرام کی بابت تمام ہدایات اللہ تعالیٰ سے اخذ کریں اور اس معاملے میں غیر اللہ سے کچھ نہ لیں۔یہی وجہ ہے کہ بیان کے آغاز ہی میں کہا گیا کہ عقود اور بندشوں کی پوری طرح پابندی کرو اب اس کے بعد حلال و حرام کا بیان شروع ہوتا ہے۔(أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ) (تمہارے لئے مویشی کی قسم کے سب جانور حلال کئے گئے' سوائے ان کے جو آگے چل کر تم کو بتائے جائیں گے)

یعنی اس وجہ سے کہ اللہ نے تمہارے لئے حلال کیا اور اس وجہ سے کہ اس حلت کو اللہ نے تمہارے لئے بیان کیا ہے' کسی اور حلال و حرام کرنے والے نے نہیں کیا' تمہارے لئے ان تمام جانوروں کا کھانا جائز ہو گیا جو مویشیوں کی قسم کے ہوں یعنی مذبوحہ جانور اور شکار کے جانور سوائے ان کے جن کی حرمت آگے خود اللہ تعالیٰ بیان فرمارہے ہیں اور آئندہ جن کی حرمت بیان کی جانے والی ہے' وہ یا تو کسی وقت کے ساتھ مخصوص ہے یا کسی جگہ کے ساتھ مخصوص ہے۔یا وہ مطلق حرمت ہے اور ہر زمان و مکان کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔بہیمۃ الانعام کے لفظ میں اونٹ' گائے اور بکری وغیرہ آتے ہیں۔ان جیسے وحشی جانور بھی ان میں داخل ہیں مثلاً وحشی گائے' ہرنی اور جنگلی گدھے وغیرہ۔

اب اس عمومی حلت کے حکم سے بعض استثنائی صورتوں کو پیش کیا جاتا ہے اور پہلی صورت یہ ہے کہ احرام میں شکار کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔(غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنتُمْ حُرُمٌ (۵: ۱) (لیکن احرام کی حالت میں شکار کو اپنے

لئے حلال نہ کر لو) اس تحریم کا اطلاق شکار کرنے کے فعل پر ہو گا ـ حج اور عمرہ کے لئے احرام باندھتے ہی انسان معمول کی زندگی ترک کر کے اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے ـ وہ زندگی کے نئے انداز سے اللہ کے گھر میں داخل ہوتا ہے ـ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس گھر کے لئے کچھ آداب مقرر فرمائے ہیں ـ اسے دار الامن اور دار الامان قرار دیا ہے ـ اس کی حدود کے اندر جو شخص بھی آتا ہے' اس کے لئے کسی بھی زندہ چیز پر ہاتھ اٹھانا حرام قرار دیا ہے ـ یہ ایک نفسیاتی وقفہ ہوتا ہے اور نفس انسانی کے لئے ایسے وقفے ضروری ہوتے ہیں ـ اس طرح تمام زندہ اشیاء کا تعلق زندگی بخشنے والے کے ساتھ استوار ہوتا ہے ـ اس عرصے میں اور اس مقام کے حدود کے اندر کوئی زندہ کسی زندہ پر کسی قسم کی دست درازی نہیں کر سکتا ـ اس حکم کے ذریعے انسانی ضروریات کا دائرہ بھی محدود کر دیا جاتا ہے' جس کی وجہ سے شکار کا کھانا جائز قرار دیا گیا تھا اور دوسرے حیوانات کا کھانا حلال کیا گیا تھا تاکہ انسان اس عرصے میں عام جاری زندگی سے ذرا بلند ہو کر اللہ کے گھر میں زمینی کثافتوں سے اوپر اٹھے اور اس کی نظریں بلند اور روشن افق پر ہوں ـ

اور آگے بڑھنے اور حلال و حرام کی تفصیلات میں جانے سے پہلے اس عقد کو اس عظیم عقد سے مربوط کر دیا جاتا ہے جو ہر مومن اور ہر انسان نے اللہ کے ساتھ کیا تھا ـ اہل ایمان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ وہ بڑا معاہدہ اللہ کے ساتھ ہوا تھا اور اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے ـ (اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ (۵: ۱)) (بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے) اللہ کی مشیت آزاد ہے ـ اس کا ارادہ ہی اصل حاکم ہے' وہ اس حق حکمرانی میں اکیلا ہے لہذا جو چاہے حکم دے ـ کوئی دوسرا نہیں ہے جو اس کے ارادے میں شریک ہو ـ اس کے علاوہ دوسرے کسی کو بھی حق حکمرانی نہیں ہے ـ کوئی اس کے احکام کو مسترد کرنے والا نہیں ہے اور یہاں بھی وہ جسے چاہے حرام کر دے اور جسے چاہے حلال کر دے کیونکہ وہی قانون ساز ہے ـ اس کے بعد مزید بیان ہوتا ہے اور تاکید کی جاتی ہے کہ اللہ کے ہاں محترم چیزوں کی بے حرمتی تمہارے لئے جائز نہیں ہے ـ

(یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰہِ وَلَا الشَّھْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْھَدْیَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ اٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا (۵: ۲) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو' خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو...... حرام مہینوں میں سے کسی کو حلال نہ کر لو' قربانی کے جانوروں پر دست درازی نہ کرو' ان جانوروں پر ہاتھ نہ ڈالو جن کی گردنوں میں نذر خداوندی کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوئے ہوں' نہ ان لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکان محترم (کعبہ) کی طرف جا رہے ہوں ـ ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو شکار تم کر سکتے ہو ـ)

یہ شعائر اللہ کیا ہیں؟ یہاں جس چیز کی طرف ذہن جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد حج' عمرہ ہیں اور وہ محرمات ہیں کہ حج اور عمرہ کے دوران جن کا ارتکاب حرام قرار دیا گیا ہے اور فرائض وہ ہیں جو ان میں ادا ہوتے ہیں یہاں تک کہ حج اور عمرہ ختم ہو جائیں یعنی قربانی کرنے کے بعد ـ احرام کی حالت میں احرام باندھنے والے کے لئے جائز نہیں ہے کہ

وہ ان شعائر اللہ کو حلال قرار دے یا ان کا احترام ملحوظ نہ رکھے کیونکہ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ اس احترام کا لحاظ نہ رکھے گا جو اللہ نے ان چیزوں کے ساتھ وابستہ کیا ہے ۔ ان شعائر کی نسبت اللہ کی طرف اس لئے کی گئی ہے کہ اللہ کے ہاں یہ نہایت ہی محترم چیزیں ہیں اور ان کا استخفاف نہایت ہی خطرناک جرم ہو گا ۔

حرام مہینے کون سے ہیں ۔ رجب ' ذوالقعدہ ' ذوالحجہ اور محرم چار مہینے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے ان مہینوں کے اندر جنگ کو حرام کیا ہے ۔ اسلام سے قبل عرب بھی ان مہینوں میں جنگ کو ناجائز سمجھتے تھے لیکن وہ حسب خواہش ان حرام مہینوں میں رد و بدل کر دیتے تھے ۔ اس میں وہ نسئ کا عمل کرتے تھے یعنی کسی مہینے کی حرمت کو کچھ عرصے کے لئے موخر کر دیتے تھے اور اس تاخیر کا فتویٰ وہ کاہنوں سے لیتے تھے یا بعض مضبوط جنگی قبائل سے اس کا اعلان کروا دیتے تھے ۔ یہ تاخیر ایک سال سے دوسرے سال تک کر دی جاتی ۔ جب اسلام آیا تو اسلام نے اس عمل نسئ کو حرام قرار دیا اور ان مہینوں کو اس طرح حرام قرار دیا جس طرح اللہ نے انہیں حرام قرار دیا تھا اور جس طرح یہ مہینے آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش کے وقت سے اللہ نے رکھے تھے ۔ سورہ توبہ کی آیت میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے ۔

(اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۹:۳۶)

(حقیقت یہ ہے کہ مہینوں کی تعداد جب سے اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے اللہ کے نوشتے میں بارہ رہی ہے اور ان میں سے چار مہینے حرام ہیں یہی ٹھیک ضابطہ ہے تم ان مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو اور تم تمام مشرکوں سے جہاد کرو جیسا کہ وہ تم سب سے لڑتے ہیں ۔)

اس سے اگلی آیت میں فیصلہ کیا گیا کہ نسئ کا عمل کفر کے اندر مزید کافرانہ فعل ہے اور صحیح بات اللہ کا حکم ہے اور وہ یہ کہ اس میں قتال حرام ہے بشرطیکہ ان مہینوں میں کوئی مسلمانوں پر حملہ آور نہ ہو ۔ اگر ان پر حملہ ہو تو وہ دفاع کر سکتے ہیں ۔ یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ حملہ آور ان مہینوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کریں اور خود ان مہینوں کے احترام کا لحاظ نہ رکھیں ۔ ہاں اگر ان کی اسکیم یہ ہو کہ وہ ان مہینوں کو ڈھال بنا کر مسلمانوں کی طرف جوابی کاروائی سے بچ جائیں تو یہ اجازت نہ ہو گی ۔ اشہر حرام کے اندر قتال کا حکم اس سے قبل سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے ۔

"ہدی" وہ جانور ہے ' جسے حاجی یا عمرہ کرنے والا ساتھ لاتا ہے اور حج اور عمرہ سے فارغ ہو کر اسے ذبح کرتا ہے ۔ اسے نحر کہتے ہیں اور اس پر حج اور عمرہ کرنے والے کے مناسک ختم ہو جاتے ہیں یہ یا تو اونٹ ہوتا ہے یا کوئی مویشی ہوتا ہے یا بھیڑ بکری ہوتی ہے ۔ اور یہ کہ "ہدی حلال نہیں ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ جس غرض کے لئے اسے خریدا گیا یا لایا گیا ' اس کے سوا کسی اور غرض کے لئے اس کا استعمال جائز نہیں ہے ۔ اسے اس وقت تک ذبح نہ کیا جائے گا جب تک حج میں یوم النحر کا دن نہیں آ جاتا اور عمرہ کے مناسک ختم نہیں ہو جاتے ۔ ان قربانیوں کے گوشت ' چمڑوں '

بالوں اور اون وغیرہ سے (بشکل قیمت) کوئی شخص خود نفع اندوز نہیں ہو سکتا اور ضروری ہے کہ وہ ان چیزوں کو فقراء پر صرف کرے۔

قلائد سے مراد وہ جانور ہیں جن کے گلے میں اس کا مالک پٹہ ڈال دیتا تھا۔ یہ پٹہ ان جانوروں کے ہدی ہونے کی علامت ہوا کرتا تھا۔ یہ پٹہ ڈال کر حاجی جانور کو آزاد چھوڑ دیتے تھے اور یوم النحر پر اسے ذبح کرتے تھے۔ جانوروں کے گلوں میں جب پٹے ڈال دیئے جاتے اس کے بعد وہ کسی دوسری غرض کے لئے حلال نہ ہوتے اور اس غرض کے سوا انہیں ذبح نہ کیا جا سکتا۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ قلائد وہ ہیں جن کے گلوں میں پٹے ڈال دیئے جاتے تھے اور مقصد یہ ہوتا تھا کہ یہ جانور حج اور عمرہ کے لئے خریدے گئے ہیں۔ اس طرح ان کو ڈاکوؤں، دشمنوں وغیرہ سے بچایا جاتا تھا۔ وہ حرم کے درختوں سے ایسی چیزیں بناتے تھے جن کو ان جانوروں کی گردنوں میں ڈال دیتے تھے۔ ان جانوروں کو عام طور پر علاقے میں چھوڑ دیا جاتا تھا اور کوئی بھی ان پر دست درازی نہ کرتا تھا۔ جن لوگوں نے قلائد کا یہ مفہوم بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے اس لئے کہ اس کے بعد نازل ہونے والی آیت :

(يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ اِنْ شَآءَ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹:۲۸)

(مشرکین ناپاک ہیں، لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکیں اگر تمہیں مفلسی کا خوف ہے تو اللہ تمہیں دولتمند کر دے گا اپنے فضل سے اگر چاہے بے شک اللہ علم و حکمت والا ہے۔)

اور دوسری جگہ (فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ) (پس انہیں پکڑو، قتل کرو، جہاں بھی تم انہیں پاؤ) لیکن پہلا قول زیادہ قوی ہے اور ظاہر ہے کہ قلائد وہ جانور ہیں جو اللہ کے نام پر نحر کرنے کے لئے نذر کر دیئے گئے ہیں اور ان کے گلے میں پٹے ڈال دیئے گئے ہیں اور اس پر یہ بھی دلیل ہے کہ ان کا تذکرہ ہدی کے بعد آیا۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے بھی ہدی مقلد مراد ہے اور یہ حج اور عمرے کے لئے مقلد جانور ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو بھی حرام قرار دیا ہے جو "آمین البیت" ہوں یعنی جنہوں نے بیت اللہ کی طرف جانے کا ارادہ کر لیا ہو اور جن کا مقصد اللہ کے فضل کی تلاش اور اس کی رضامندی ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حج کا ارادہ رکھتے ہوں یا عمرے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اس میں ان کے پیش نظر دو چیزیں ہو سکتی ہیں، تجارت اور رضائے الٰہی کا حصول۔ اس سفر میں اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو امن کی گارنٹی دی ہے۔

آخر میں وضاحت کر دی گئی کہ شکار کرنا تمہارے لئے مستقلاً حرام نہیں کر دیا گیا۔ جب تم احرام سے باہر آ جاؤ تو تمہارے لئے شکار کرنا جائز ہے لیکن حدود حرم سے باہر کیونکہ حدود حرم کے اندر شکار ہر حالت میں حرام ہے۔ (وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا) (اور جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو تم شکار کر سکتے ہو) لیکن حدود حرم سے باہر، اس لئے

کہ حرم کے حدود کو اللہ تعالیٰ نے علاقہ امن قرار دے دیا ہے' جیسا اس نے حرام مہینوں کو امن کا عرصہ (Period) قرار دیا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جس میں لوگ' حیوانات' پرندے اور درخت سب کے سب پرامن رہتے ہیں اور ان کو کسی کی جانب سے دست درازی کا کوئی ڈر نہیں ہوتا۔ غرض ایک ہمہ گیر امن ہے جو اس گھر کے اوپر ایک گھنے سایہ دار درخت کی طرح ہمیشہ لہلہاتا رہتا ہے۔ حدود حرم پر یہ ہمہ گیر "سایہ امن" اس لئے چھایا ہوا ہے کہ اس امت کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کی تھی کہ اللہ اس گھر کو پرامن بنا دے اور اس دعا کو اللہ نے قبول فرمایا تھا اور امن کی یہ فضا چار ماہ تک پوری سرزمین عرب پر بھی چھائی رہتی ہے اور پورے چار ماہ تک یہ امن و سلامتی اسلامی نظام کے سائے میں اپنی شان دکھاتی ہے۔ یہ اس قدر ہمہ گیر سلامتی ہوتی ہے کہ ہر انسانی دل اس کے اطمینان' سکون کو اور ہر صاحب ذوق اس کی مٹھاس کو محسوس کرتا ہے۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم امن و سلامتی کی یہ فضا پیدا کرنے میں نہایت ہی سرگرم ہوں اور ان چار مہینوں کے بعد پوری زندگی کے شب و روز میں' سال کے ۱۲ مہینوں میں اور ہر جگہ ایسی ہی فضا پیدا کرنے کی سعی کریں۔

اس منطقہ امن کے اندر' ان حرمتوں کی فضا میں' اب اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دعوت دیتے ہیں جو اللہ پر ایمان لائے ہوئے ہیں اور جنہوں نے اللہ کے ساتھ عہد کر رکھا ہے کہ وہ اپنے عہد کو پورا کریں گے اور اپنے مقام اور پروگرام اور موقف کو اتنی بلندی تک لے جائیں گے جہاں تک اس عظیم مقصد اور نصب العین کے لئے ضروری ہو جو ان کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ وہ عظیم نصب العین اور مقصد کیا ہے؟ یہ کہ امت مسلمہ اس دنیا پر بسنے والی تمام امم کے لئے نگران ہے اور اسے اپنی زندگی کے اس مشن کو شخصی جذبات' ذاتی رجحانات اور عارضی حالات سے متاثر ہوئے بغیر ادا کرنا چاہئے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ ان لوگوں پر بھی ظلم و زیادتی نہ کرو جنہوں نے حدیبیہ کے موقعہ پر تمہیں مسجد حرام میں جانے سے روک دیا تھا اور اس سے پہلے بھی جب وہ مکہ میں تھے وہ ایسی رکاوٹیں پیدا کیا کرتے تھے۔ ان کے لگائے ہوئے زخم ابھی تک اگرچہ مسلمانوں کے دلوں میں تازہ تھے' اور مسلمانوں کے دلوں میں مسجد حرام سے روکنے کی وجہ سے ان لوگوں کے خلاف نفرت تازہ تھی۔ اگرچہ یہ صورت حال موجود تھی' لیکن امت مسلمہ کے فرائض اور مقاصد ان چیزوں سے بالا تر تھے۔ امت کے مقاصد و فرائض اس امت کے عظیم کردار کے زاویے سے تھے۔ فرماتے ہیں:

(وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۵ : ۲))

(اور دیکھو' ایک گروہ نے جو تمہارے لئے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔ نہیں' جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو' اللہ سے ڈرو' اس کی سزا بہت سخت ہے)

ضبط نفس کے میدان میں یہ بلند ترین مقام ہے۔ دریا دلی میں یہ سب سے اونچا درجہ ہے اور اس مقام تک اس امت کے لئے پہنچنا فرض ہے جسے اب اللہ تعالیٰ نے پوری انسانیت کا نگران اور اتالیق مقرر کیا ہے۔ جسے عوام الناس کی تہذیب اور ترقی کا فریضہ سپرد کیا گیا ہے اور جسے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ پوری انسانیت کو اس بلند اور روشن افق اور نصب العین کی طرف متوجہ کر دے۔

یہ وہ فرائض ہیں جو منصب قیادت 'نگرانی اور احتساب کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ یہ مومنین کا فرض ہے کہ وہ ان تمام مصائب و شدائد کو بھول جائیں جو ان کو ان دشمنوں کے ہاتھوں پہنچے تھے۔ یہ اس لئے کہ وہ اس نمونے کو دنیا کے سامنے عملاً پیش کریں جو اسلام کو مطلوب ہے تاکہ وہ رواداری عملاً انسانوں کے سامنے پیش ہو جسے اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ صرف اسی طرح امت مسلمہ اسلام کے حق میں شہادت حق دے سکتی ہے۔ اور لوگ اسلام کی طرف متوجہ ہو کر اسے پسند کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک عظیم ذمہ داری ہے 'لیکن اس شکل میں وہ نفس انسانی کے لئے گرانبار نہیں ہوتی اور نہ وہ انسان کی قوت اور وسعت سے باہر ہوتی ہے۔ اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ انسان کو غصہ آئے۔ یہ انسان کا حق ہے کہ وہ بری چیز کو ناپسند کرے لیکن انسانوں کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی چیز کو ناپسند کرتے ہی وہ فوراً ردعمل ظاہر کر دیں یا یہ کہ دشمنی اور کینہ کے ہاتھوں بالکل مجبور ہو جائیں۔ اسلام ان کو حکم دیتا ہے کہ وہ نیک اور تقویٰ کے کاموں میں تو فوراً اٹھ کھڑے ہوں اور جلدی ردعمل ظاہر کریں لیکن گناہ اور ظلم کے کام میں جتھہ بندی نہ کریں۔ وہ اللہ سے ڈریں اور اس کی سزا سے اپنے آپ کو بچائیں اور تقویٰ اور خدا خوفی کے ذریعے اپنے نفس پر قابو پائیں۔ اس کی لگام کھینچ کر رکھیں اور اپنے اندر برداشت اور رواداری پیدا کریں۔ اللہ سے ڈریں اور اس کی رضا ہمیشہ ان کے پیش نظر رہے۔

یہ اسلام کا کمال تھا کہ اس کی تربیت نے عرب قوم جیسی اجڈ اور جاہل قوم کو ضبط نفس عطا کر کے ان کے اندر اس سلسلے میں نہایت ہی قوی شعور پیدا کر دیا اور انہوں نے نہایت ہی مشفقانہ اور کریمانہ رویہ اپنایا حالانکہ وہ ایسی قوم تھی کہ ان سے اس سطح تک بلند اخلاقی اور حسن سلوک کی کم ہی توقع کی جا سکتی تھی کیونکہ ان کے تمدن کا رخ ہی اس سمت کے خلاف تھا۔ عربی طرز عمل اور اس بارے میں ان کا رویہ یہ تھا۔ (اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا) (اپنے بھائی کی امداد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو) یہ جاہلانہ حمیت تھی اور دور جاہلیت کی عصبیت تھی۔ ان کے نزدیک گناہ اور ظلم پر باہم تعاون کرنا 'نیکی اور تقویٰ کے معاملات میں تعاون کرنے سے زیادہ پرکشش تھا۔ وہ ہمیشہ باطل و گمراہی پر باہم تعاون کے معاہدے کر لیتے تھے اور حق اور سچائی پر ان کا اجتماع بہت ہی کم ہوا کرتا تھا۔ تاریخ جاہلیت میں سچائی پر کم ہی حلف منعقد ہوئے۔ اور یہ ہر اس معاشرے کا قدرتی خاصہ ہے جس کا رابطہ اور تعلق اللہ کی ذات کے ساتھ نہ ہو اور جس کی عادات اور تقالید اسلامی منہاج اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق نہ ہوں۔ یہ اصول جاہلیت کے اس مشہور مقولے کے اندر پوری طرح منضبط تھا کہ بھائی کی مدد کرو چاہے ظالم ہے یا مظلوم۔ اور اس اصول کو ایک جاہلی شاعر نے اس طرح پیش کیا ہے۔

وهل انا الا من غزية ان غوت غويت
وان ترشد غزية ارشد

(میں تو بس غزیہ قبیلے کا ایک فرد ہوں' اگر وہ گمراہ ہو جائے تو میں گمراہ ہوں گا اور اگر وہ راہ ہدایت پالے تو میں بھی پالوں گا) اسلام آیا' اسلامی نظام تربیت آیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا :

(وَ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْکُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (۵ : ۲))

(اور دیکھو' ایک گروہ نے جو تمہارے لئے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔ نہیں' جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو' اس کی سزا بہت سخت ہے)

اسلام نے آکر دلوں کو اللہ کے ساتھ جوڑ دیا۔ اخلاق اور اقدار حیات کے لئے اللہ کے پیمانے میدان میں آگئے۔ اسلام نے عربوں اور پوری انسانیت کو حمیت جاہلیہ سے نکالا۔ نعرۂ عصبیت سے منع کیا' ذاتی میلانات' شخصی تاثرات' خاندانی اور قبائلی محدود سوچ سے نکالا اور دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت صرف انسانیت کو محور بنایا۔

غلبہ اسلام کے بعد جزیرۃ العرب کے اندر ایک نیا انسان پیدا ہوا' یہ انسان الٰہی اخلاق سے مزین تھا۔ یوں عربوں کو ایک نیا جنم ملا اور جب یہ روشنی دنیا میں پھیلی تو تمام کرۂ ارض پر انسانیت کو ایک جدید جنم ملا۔ اسلام سے قبل جزیرۃ العرب پورے کا پورا جاہلیت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ جس کا نعرہ یہ تھا "بھائی کی مدد کرو' ظالم ہو یا مظلوم ہو" بلکہ پوری دنیا اسی نعرۂ جاہلیہ کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

جاہلیت کے گہرے گڑھے اور اسلام کے روشن افق کے درمیاں بہت ہی دوری اور بعد ہے اور یہ دوری ان دو اقوال سے کس قدر خوبصورتی سے واضح ہوتی ہے۔ ایک بات یہ کہ "بھائی کی مدد کرو ظالم ہے یا مظلوم" اور دوسرا قول باری تعالیٰ کا ہے (اور دیکھو' ایک گروہ نے جو تمہارے لئے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔ نہیں' جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں۔ ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو' اس کی سزا بہت سخت ہے۔)

ان دونوں اقوال میں کس قدر فرق ہے زمین و آسمان کا فرق!

---ooo---

اب یہاں مویشیوں میں سے حلال جانوروں کے کھانے کے اجازت عامہ سے بعض ایسی شکلوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو حلال نہیں ہیں۔

(حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذَلِكُمْ فِسْقٌ الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۳:۵)

تم پر حرام کیا گیا مردار، خون، سور کا گوشت، وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، وہ جو گلا گھٹ کر یا چوٹ کھا کر، یا بلندی سے گر کر، یا ٹکر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو.... سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پاکر ذبح کر لیا۔ اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا۔ نیز یہ بھی تمہارے لئے ناجائز ہے کہ پانسوں کے ذریعے سے اپنی قسمت معلوم کرو۔ یہ سب افعال فسق ہیں۔ آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے پوری مایوسی ہو چکی ہے لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔ (لہٰذا حرام و حلال کی جو قیود تم پر عائد کی گئی ہیں ان کی پابندی کرو) البتہ جو شخص بھوک سے مجبور ہو کر ان میں سے کوئی چیز کھا لے، بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو تو بیشک اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)۔

مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کا حکم اس سے پہلے بھی گزر چکا ہے۔ (دیکھئے بقرہ آیت ۱۷۲) نیز انسانی علم جس قدر حکمت تشریع اسلامی کا ادراک کر سکتا ہے، اس کا بیان بھی وہاں ہوا۔ انسانی علم چاہے قانون الٰہی کی حکمت کا ادراک کر سکے یا نہ کر سکے اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ بہرحال کر دیا ہے کہ یہ چیزیں خوراک کے لئے پاکیزہ نہیں ہیں۔ ہمارے لئے تو صرف حکم الٰہی ہی کافی ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ صرف انہی چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں جو ناپاک ہوتی ہیں، اور ان میں انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کے اعتبار سے ضرر بھی ہوتا ہے چاہے لوگوں کو اس مضرت کا علم نہ ہو۔ سوال تو یہ ہے کہ کیا لوگوں نے ان تمام چیزوں کو معلوم کر لیا ہے جو ان کے لئے مضر ہیں یا مفید ہیں۔ ------ اسی طرح

(وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ (۳:۵)) یعنی جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کئے گئے ہوں اس لئے حرام ہیں کہ وہ بنیادی طور پر ایمانی تصور کے خلاف ہیں۔ ان کی بنیاد ہی اس عقیدے کے خلاف ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے، وہی حاکم اور الٰہ ہے اور وہی نفع و نقصان کا مالک ہے۔ اس عقیدۂ توحید کے پھر کچھ تقاضے ہیں۔ اس کا پہلا

تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے ہر ارادے ' ہر نیت اور ہر عمل کا رخ صرف اللہ کی طرف کر دے ۔ وہ ہر چیز پر صرف اللہ کا نام لے ۔ ہر عمل اور ہر حرکت کو صرف اللہ کے نام سے شروع کرے ۔ اس لئے ہر وہ حرکت و عمل جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو' ہر وہ چیز جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لگ جائے ' اسی طرح ہر وہ ذبیحہ جس پر کسی کا نام ہی نہ لیا جائے ' نہ غیراللہ کا اور نہ اللہ کا تو وہ بھی حرام ہے اس لئے کہ یہ عمل ایمان کی بنیادوں کے ساتھ متضاد ہے ۔ اگر کسی کے دل میں صحیح ایمان ہو تو اس سے یہ فعل صادر ہی نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے کہ یہ ناپاک عمل ہے اور چونکہ یہ فعل عقیدۃ ناپاک ہے اس لئے اس کو بھی ان ناپاک چیزوں کے ساتھ شامل کیا گیا ہے جو جسمانی طور پر ناپاک ہیں مثلاً خون اور خنزیر کا گوشت ۔

(وَالْمُنْخَنِقَةُ) (وہ جسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہو یا خود مر گیا ہو) (وَالْمَوْقُوْذَةُ) (جو کسی اونچی جگہ سے گر جائے 'کسی پہاڑ سے یا کنوئیں میں گر کر مر جائے) (وَالنَّطِيْحَةُ) (وہ جسے دوسرا جانور مار کر ہلاک کر دے) (وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ) (جسے درندے نے پھاڑ کھایا ہو) یہ سب مردار کی اقسام ہیں اور حرام ہیں ۔ ہاں اگر وہ زندہ ہوں اور انہیں ذبح کر لیا جائے تو کھانا جائز ہے ۔ یہاں ذبح کو اس لئے مستثنیٰ کیا گیا ہے کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ کہیں گرنے ' گلا گھٹنے ' جانور کے پھاڑے وغیرہ کی وجہ سے یہ حرمت ہے ۔ اس بارے میں فقہاء کے اقوال میں اختلافات ہیں کہ کب کوئی جانور مذبوحہ تصور ہو گا اور اس کا کھانا حلال ہو جائے گا ۔ بعض اقوال کے مطابق ان تمام ذرائع سے مارا ہوا جانور حرام ہوتا ہے جو بہت جلدی اس کی روح نکال دیں یا مکمل طور پر اسے مردہ کر دیں ۔ ان کے نزدیک اگر ایسے جانور کو ذبح بھی کر دیا جائے تو بھی حرام ہو گا جبکہ بعض اقوال کے مطابق یہ حلال ہوتا ہے بشرطیکہ اس کے اندر زندگی ہو اور اسے ذبح کر دیا جائے چاہے جس طرح بھی ذبح کیا جائے ۔ تفصیلات کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہیں ۔ (وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ) (وہ جانور جو آستانوں پر ذبح کئے جائیں ۔) مشرکین بتوں پر جانور ذبح کرتے تھے اور جاہلیت میں ان کا خون بتوں پر ملتے تھے ۔ عربوں کے علاوہ دوسری اقوام میں بھی ایسی رسومات ہوتی ہیں ۔ یہ حرام ہیں اس لئے کہ ایسے جانوروں کو بتوں پر ذبح کیا گیا اگرچہ ان پر ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو اس لئے کہ بت پر ذبح کرنے سے بہرحال شرک لازم آتا ہے ۔

یہ بھی حرام ہے کہ پانسوں کے ذریعہ تقسیم کرو ۔ ازلام وہ تیر ہیں جن کے ذریعہ عرب فال گیری کرتے تھے کہ یہ کام کریں یا نہ کریں ۔ بعض اقوال کے مطابق یہ تیر تین تھے اور بعض کے مطابق سات تھے ۔ اسی طرح جوئے میں بھی یہ تیر استعمال ہوتے تھے ۔ ان کے ذریعے لوگ ذبح کئے ہوئے جانور کا گوشت بھی تقسیم کرتے تھے ۔ ہر شخص کا ایک تیر ہوتا اور جانور کا جو حصہ جس تیر کے لئے مخصوص ہوتا اگر وہ نکل آتا تو وہ گوشت اس کا ہو جاتا ۔ اللہ تعالیٰ نے اس طریقے سے گوشت کی تقسیم کو حرام قرار دے دیا کیونکہ یہ بھی جوئے کی ایک شکل تھی جسے حرام قرار دیا جا چکا تھا ۔ چنانچہ اس طرح تقسیم کئے ہوئے گوشت کو بھی حرام قرار دے دیا گیا ۔

(فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵:۳)

(البتہ جو شخص بھوک سے مجبور ہو کر ان میں سے کوئی چیز کھا لے ' بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو تو بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)

وہ شخص جو بھوک کی وجہ سے اضطرار کی حالت میں ہو (یعنی مخمصہ میں) اور اس کی زندگی خطرے میں ہو' اس کے لئے ان محرمات میں سے کھانا جائز ہے' بشرطیکہ وہ عمداً گناہ کا ارتکاب نہ کر رہا ہو۔ اس بارے میں فقہاء کی آرا مختلف ہیں کہ وہ کس قدر کھائے۔ آیا اس قدر کھائے کہ زندگی بچ جائے یا بقدر ضرورت سیر ہو کر کھائے یا اگر آئندہ بھی قلت غذا کا خطرہ ہو تو ذخیرہ بھی کرے۔ ہم ان تفصیلات میں نہیں جاتے' یہاں صرف یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ دین اسلام میں یسر اور سہولت رکھی گئی ہے۔ ضرورت کے وقت اسلامی احکام میں سختی نہیں کی جاتی نہ لوگوں کے لئے مشکلات پیدا کی جاتی ہیں۔ معاملات کو لوگوں کی حالات پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور خدا خوفی اور خدا ترسی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی گناہ کا ارتکاب مضطر ہو کر کرتا ہے اور اس کی نیت احکام شکنی کی نہیں ہے اور نہ ہی وہ بالارادہ ایسا کرتا ہے تو اس پر کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵ : ۳) (اللہ غفور و رحیم ہے)۔

اب یہاں آکر ہم ایک اہم موڑ پر کھڑے ہیں۔ محرمات کے ذکر کے بعد قبل اس کے کہ حلال چیزوں کی فہرست شروع ہو اچانک یہ آیت بیچ میں آجاتی ہے۔

(اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵ : ۳)) (اور آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے پوری مایوسی ہو چکی ہے لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے)۔

یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو سب سے آخر میں نازل ہوئی ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ منصوبہ رسالت اپنے آخری مراحل کو پہنچ گیا اور اس طرح لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم مکمل ہو گیا۔ اس آیت کے نزول سے حضرت عمر ﷺ کی تیز بصیرت اور ان کی خدا داد فہم نے معلوم کر لیا اب حضور ؐ کے دن دنیا میں کم رہ گئے ہیں' کیونکہ آپ نے امانت لوگوں کے سپرد کر دی' اللہ کا پیغام پہنچا دیا۔ اب صرف اللہ کے ساتھ ملاقات باقی ہے۔ چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد آپ رونے لگے اور سمجھ گئے کہ حضور ؐ کی جدائی کا وقت اب بہت ہی قریب آگیا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ اس آیت کو حلال و حرام کے احکام کے عین وسط میں لایا گیا ہے اور اسے اس سورہ میں رکھا گیا ہے جس کے مقاصد اور موضوعات پر ہم بحث کر آئے ہیں۔ اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی شریعت ایک مکمل نظام ہے جو ایک کل ہے اس کے اجزاء نہیں کئے جا سکتے۔ اس کے اجزاء باہم اس طرح پیوستہ ہیں کہ ان کو جدا نہیں کیا جا سکتا چاہے وہ اجزاء اعتقادی اور نظریاتی ہوں یا وہ مراسم عبودیت ہوں یا وہ سوسائٹی کے لئے اجتماعی احکام ہوں یا بین الاقوامی امور سے متعلق ہوں۔ یہ تمام امور (الدین) میں شامل ہوں جس کی تکمیل کی بابت اس آیت میں اعلان کیا گیا ہے اور اس پر مزید یہ اعلان بھی کیا گیا ہے کہ اس دین کی تکمیل کر کے اللہ تعالیٰ نے تم پر اتمام نعمت بھی کر دیا ہے۔ اس دین میں اعتقادی امور' مراسم عبودیت کے احکام اور طریقوں' حلال و حرام کے احکام اور اجتماعی اور بین الاقوامی قوانین کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ سب کے سب ایک مجموعے کے اجزاء ہیں جن کے متعلق اللہ نے

اپنی رضامندی صادر فرمائی ہے اور اس نے ہمارے لئے اسے پسند فرمایا ہے اور اہل ایمان اگر اس دین کے کسی جزء سے خارج ہوں اور اس کا انکار کریں گے تو وہ تمام دین کے انکار کے مترادف ہو گا۔ یہ دین سے بغاوت ہو گی اور نتیجتہً ایک شخص مومن نہ رہے گا۔

اگر کوئی کسی ایک جزء کا انکار کرے گا تو اس کا حکم وہی ہو گا جس کا بیان ہم نے اس سے پہلے کیا ہے کہ اس دین کے کسی ایک حصے کو ترک کرنا اور اس کی جگہ کسی انسان کے بنائے ہوئے ضابطے کو رکھنا گویا اللہ کی حاکمیت کا انکار ہے۔ اس طرح ایک انسان کسی ایک ضابطے میں اللہ کی اس خصوصیت کی نسبت کسی انسان کی طرف کرتا ہے جو شرک ہے اور اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے حق حکمرانی پر دست درازی ہے اور خود اپنے لئے حاکمیت اور حکمرانی کا دعویٰ ہے جسے اللہ ہرگز ہرگز جائز نہیں رکھتے۔ اس طرح گویا ایک شخص صراحتاً دین سے بغاوت کرتا ہے اور دین سے بغاوت کے نتیجے میں انسان دین سے خارج ہو جاتا ہے۔

((اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ (۵ : ۳)) (آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے پوری مایوسی ہو چکی ہے) وہ اس بات سے مایوس ہو گئے ہیں کہ اس دین کو باطل کر دیں' اس کو ناقص کر دیں یا اس کے اندر کسی قسم کی تحریف کر دیں۔ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ وہ کامل اور مکمل رہے گا۔ اللہ نے اس بات کو ریکارڈ کر دیا ہے کہ یہ دین ہمیشہ باقی رہے گا۔ اہل کفر کسی موقعہ پر مسلمانوں پر غالب آ سکتے ہیں' وہ کچھ عرصہ تک غالب رہ سکتے ہیں لیکن وہ دین اسلام پر غالب نہیں رہ سکتے۔ یہ سارے ادیان میں سے واحد دین ہے جو محفوظ ہے اور کبھی مٹ نہ سکے گا۔ نہ اس کے اندر تحریف کی جا سکے گی اس کے باوجود کہ اس دین کے دشمن ہمیشہ اس میں تحریف کرنے کے لئے اپنی مساعی جاری رکھیں گے۔ وہ اس دین کے خلاف سخت سے سخت سازشیں کرتے رہیں گے مگر کامیاب نہ ہونگے۔ یہ بھی ہو گا کہ بعض ادوار میں اہل اسلام اپنے دین سے بے حد غافل بھی رہیں گے اور انہیں اپنے دین کے بارے میں بہت ہی کم علم ہو گا۔ ہاں اس کی حفاظت اللہ یوں کرتا ہے کہ وہ اس دین کا حامل گروہ ہمیشہ اس دنیا میں رکھتا ہے' جو اس دین کو اچھی طرح جانتا ہے اور وہ ہر وقت اس کا دفاع کرتا رہتا ہے اور یہ دین اس گروہ میں کمال درجے پر موجود رہتا ہے اور ان کی زندگیوں میں محفوظ رہتا ہے اور وہ اس امانت کو آگے منتقل کرتا رہتا ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ سچا ہوتا رہتا ہے کہ اہل کفر ہر دور میں اس دین کی بابت مایوس رہتے ہیں۔ (فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِ (۵ : ۳)) (لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو) اس لئے کہ اہل کفر کی یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ اس دین کا کچھ بگاڑ سکیں۔ اور وہ اہل اسلام کا بھی صرف اتنا بگاڑ سکتے ہیں وہ انہیں اس دین سے قدرے منحرف کر دیں اس قدر کہ وہ اس دین کی زندہ تصویر نظر نہ آئیں اور اس کے فرائض اور تقاضے پورے نہ کرتے ہوں اور اس دین کے مقاصد اور فرائض کو اپنی زندگیوں میں عملاً نافذ نہ کرتے ہوں۔

اہل اسلام کو مدینہ طیبہ میں یہ جو ہدایت دی گئی تھی کیا یہ صرف اہل مدینہ کے لئے تھی؟ ہرگز نہیں کیا یہ اس نسل کے لئے تھی؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ ایک عام خطاب ہے جو ہر زمان و مکان کے مومنین کے لئے ہے۔ ہم اہل ایمان کی خدمت میں یہ عرض کرتے ہیں کہ اہل ایمان حقیقتاً وہی لوگ ہیں جو اس دین پہ راضی ہو جائیں جسے اللہ نے ان کے لئے پسند

فرمایا ہے اور وہ پورے کا پورا دین اپنی زندگیوں میں نافذ کریں اور اسے اپنے لئے نظام زندگی قرار دیں۔

(اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵:۳)) (آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے)

یہ آیت حجۃ الوداع کے موقعہ پر نازل ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اب اس میں کسی بات کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اہل ایمان پر رب کی نعمت مکمل ہوگئی اور وہ ان کے لئے دین اسلام کو بطور دین قبول کرنے پر راضی ہوگیا ہے اور آج سے جو شخص اس کے سوا کسی اور دین کو پسند کرے گا تو گویا وہ اللہ کی پسند کو ترک کرتا ہے۔

---ooo---

یہ ایک نہایت اہم آیت ہے۔ ایک مومن کو قدرے توقف کر کے اس کے ان ہولناک الفاظ پر غور کرنا چاہئے۔ اگر اس پر اچھی طرح غور کیا جائے تو وہ معارف و حقائق کبھی ختم نہ ہوں گے جو اس کے اندر پنہاں ہیں۔ اس کے اندر گہری ہدایات اور اس دور کے فرائض اور تقاضے ذہن میں آئیں گے۔

سب سے پہلی حقیقت جو اس غور و فکر سے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے دین کو مکمل کر دیا ہے اور پھر ایک مومن تاریخ انسانیت میں حضرت آدم علیہ السلام کی رسالت سے لے کر حضرت محمد ﷺ کی آخری رسالت تک تمام رسالتوں کا جائزہ لیتا ہے اور تمام ادوار میں قوافل ایمان کا جائزہ لیتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ یہ ایک طویل اور غیر منقطع سلسلہ رسل ہے۔ یہ ہدایت اور روشنی کا قافلہ ہے جو اس طویل سفر میں مشعل لئے ہوئے ہے۔ اس طویل سفر میں اس کے نشانات راہ صاف صاف نظر آتے ہیں لیکن اس جائزے میں ہمیں صاف صاف نظر آتا ہے کہ ہر رسول کسی خاص قوم یا کسی خاص زمانے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اس آخری رسالت سے قبل کی تمام رسالتیں کسی خاص دور یا خاص مرحلے کے لئے بھیجی گئی تھیں۔ ایک خاص پیغام' ایک خاص مرحلے اور ایک خاص معاشرے کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان رسالتوں پر مخصوص زمانے اور مخصوص معاشرے کا رنگ غالب تھا۔ وہ ان ظروف و احوال سے متاثر تھیں جن میں ان کو بھیجا گیا۔ یہ سب رسالتیں صرف ایک خدا کی طرف دعوت دے رہی تھیں۔ وہ سب صرف ایک الہ کی بندگی اور حاکمیت کی طرف دعوت دے رہی تھیں کیونکہ یہی دین اسلام ہے کہ ہم صرف ایک اللہ کو اپنا حاکم اور معبود سمجھیں اور اسی کی اطاعت کریں۔ لیکن ان نبیوں کو جو شریعت اور جو قانون اور جو نظام دیا گیا تھا وہ ان کی قوم' ان کے دور اور ان کی سوسائٹی کے لئے مناسب تھا اور ان کے ظروف و احوال کے مطابق تھا۔

جب اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ وہ سلسلہ رسل کو ختم کر دے اور انسانوں تک خاص خاص رسالتیں بھیجنے کا سلسلہ بند کر دے تو اللہ نے ایک آخری رسالت پوری انسانیت کے لئے بھیجی اور ایک رسول خاتم النبیین تمام انسانوں کے لئے ارسال فرمایا جس کی رسالت کسی خاص معاشرے' کسی خاص قوم یا کسی خاص زمانے تک محدود نہ تھی اور نہ کسی دور کے ظروف

و احوال سے خصوصیت رکھتی تھی۔یہ رسالت کسی زمان و مکان کی قید میں مقید نہ تھی اور نہ وہ کسی معاشرے کے ظروف و احوال تک محدود تھی۔اس رسالت کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی حقیقی فطرت کی اساس پر اٹھایا'جس میں کوئی تغیر اور تبدل نہیں ہوتا نہ فطرت انسانی اپنی ڈگر سے ہٹتی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں!

(فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰ : ۳۰)

(پس تو یکسو ہو کر اپنا چہرہ دین کی طرف متوجہ کر لے وہ فطرت جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے' اللہ کی بنائی ہوئی فطرت بدل نہیں سکتی۔یہی بالکل راست اور درست دین ہے لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے)۔

پھر اس آخری رسالت کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر مفصل شریعت عطا کی جس میں زندگی کے ہر پہلو کے مسائل کا حل موجود ہے' زندگی کی ہر سرگرمی کا ضابطہ اس کے اندر درج ہے۔اس شریعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے کلی ضوابط اور اصول درج کئے جن کی روشنی میں وہ ہر دور کے مسائل حل کرتی چلی جاتی ہے۔ ہر زمان و مکان میں وہ ان قواعد کی روشنی میں یوں نظر آتی ہے جیسے ابھی نازل ہوئی ہے۔اس شریعت میں ایسے ضوابط و احکام صراحت سے مذکور ہیں جو کبھی بدلتے نہیں ہیں۔اس طرح یہ شریعت اپنے اصول و مبادی کے ساتھ اور اپنے تفصیلی اور دائمی احکام کے ساتھ ان تمام اصولوں اور تقاضوں پر حاوی ہے جن کی ضرورت کبھی بھی کسی انسان کو لاحق ہو سکتی ہے۔یہ آخری رسالت آغاز آفرینش سے لے کر قیامت تک کے لئے ہے۔اس کے ضوابط' اس کی ہدایات' اس کی قانون سازی اور اس کے نظم و نسق کے ادارے قیامت تک کے لئے ہیں تاکہ وہ ہمیشہ زندہ رہے' ترقی کرے' اس کی تجدید اور نشوونما ان اصولوں کی روشنی میں ہو لیکن اس محور کے اردگرد اور اس دائرے کے اندر جو اس کے لئے اول روز سے وضع کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں!

(اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵ : ۳)) (آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے)

اس آیت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا کہ تمہارا نظریہ حیات مکمل ہو گیا ہے۔تمہاری شریعت مکمل ہو گئی ہے اور یہ ہے دین۔اس لئے اب اہل ایمان کے لئے ایسا کوئی موقعہ ہی نہیں رہا ہے کہ اس دین میں کوئی نقص رہ گیا ہے اور وہ اسے دور کریں گے۔نہ اس میں کوئی کمی ہے جسے وہ پورا کریں گے۔نہ اس میں کسی زمان و مکان کا رنگ ہے کہ وہ اس میں جدید زمان و مکان کا رنگ بھریں گے۔اگر وہ ایسا کریں گے تو نہ تو وہ مومن ہوں گے اور نہ ان کا بنایا ہوا دین' دین اسلام ہو گا اور نہ وہ اللہ کو قبول ہو گا اور نہ ہی صحیح اہل ایمان اسے قبول کریں گے۔

جس دور میں قرآن کریم نازل ہوا' اس دور کی شریعت ہر دور کے لئے ہے۔ اس لئے کہ یہ اس دین کی شریعت ہے جو تمام ادوار کے لئے اس جہان میں آیا ہے اور یہ ابدی دین ہے۔ یہ انسانوں کی کسی خاص جماعت کے لئے نہیں آیا۔ نہ یہ کسی خاص دور کے لوگوں کے لئے آیا ہے اور نہ کسی خاص علاقے کے لئے آیا ہے جس طرح اسلام سے پہلے کی رسالتوں کا حال تھا کہ وہ محدود زمان و مکان کے لئے تھیں۔

اسلام کے تفصیلی احکام ایسے ہیں کہ یہ دائمی احکام ہیں اور اسلام کے جامع اصول ایسے ہیں کہ ان کے دائرے کے اندر ہر دور میں زندگی کے لئے ایک مفصل نظام وجود میں آسکتا ہے اور تاقیامت ان کی روشنی میں انسانی زندگی نشوونما پا سکتی ہے' بغیر کسی مشکل کے۔ الا یہ کہ زندگی ان اصولوں کے دائرے کے تابع ہو جائے اور پھر ایمان کے دائرے سے خارج ہو جائے۔

انسان کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور اللہ جانتا ہے کہ اس نے کیا پیدا کیا ہے۔ اللہ نے انسان کے لئے یہ دین پسند کیا ہے جو اس کی دائمی شریعت پر قائم ہے۔ اس لئے جو شخص یہ کہتا ہے کہ کل کا قانونی نظام آج کے لئے قانون اور شریعت کیسے ہو سکتا ہے' وہ دراصل یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ انسان کی ضروریات کی بابت اللہ تعالیٰ سے زیادہ جانتا ہے اور وہ انسان کے طور طریقوں کا علم اللہ سے زیادہ رکھتا ہے۔

غور و فکر کے اس وقفے میں ہمیں نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے اور یہ نعمت یوں تمام ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دین کو مکمل کر دیا ہے۔ بے شک یہ ایک مکمل' ایک عظیم اور بھاری نعمت ہے۔ اس نعمت کے ذریعے انسان کو ایک جدید جنم ملا ہے۔ اور اس کے ذریعے اس کی نشوونما اور اس کے کمالات کے لئے راہیں کھل گئی ہیں۔ اس لئے کہ انسان جب تک اللہ کی معرفت اس طرح حاصل نہیں کر لیتا جس طرح یہ دین اللہ کی معرفت کے دروازے کھولتا ہے تو انسان اس وقت تک انسان ہوتا ہی نہیں ہے۔ جب تک وہ اس کائنات کی حقیقت اس طرح معلوم نہ کر لے جس طرح اسے یہ دین سکھاتا ہے اور جب تک وہ اپنے نفس کی معرفت اس طرح حاصل نہ کر لے جس طرح اسے یہ دین سکھاتا ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک ایک مکرم مخلوق ہے۔ انسان صحیح معنوں میں موجود ہی نہیں ہوتا جب تک وہ اللہ کی غلامی کے سوا تمام غلامیوں کا انکار نہ کر دے اور ان سے نکل نہ آئے۔ اور جب تک وہ اس حقیقی مساوات کو حاصل نہیں کر لیتا جو اللہ کی بنائی ہوئی شریعت کے تحت انسان کو حاصل ہوتی ہے' جسے نہ کسی انسان نے دیا ہوتا ہے اور نہ اس میں کسی انسان کا دخل ہوتا ہے۔

انسان کی جانب سے ان عظیم حقائق کا ادراک کر لینا ہی دراصل اس کے لئے ایک نیا جنم ہے' بشرطیکہ وہ ان حقائق کا ادراک اسی انداز پر کرے جس پر اسے اس دین نے ادراک کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس معرفت کے سوا انسان کے لئے ممکن ہے کہ وہ ایک حیوان ہو یا وہ زیر تعمیر اور زیر تشکیل انسان کا کوئی منصوبہ ہو لیکن اسے ایک مکمل انسان نہیں کہا جا سکتا۔ وہ مکمل انسان تب ہی ہو گا جب وہ اس معیار کے مطابق جس کی تصویر قرآن نے کھینچی ہے' ان حقائق کا ادراک نہ کر لے۔ انسان کے اس قرآنی تصور اور ان تمام تصورات کے درمیان بہت بڑا فرق ہے جو تصورات خود انسانوں نے از خود گھڑے ہیں۔ (دیکھئے جزء اول اور کتاب خصائص التصور الاسلامی)۔

انسانی زندگی کے اندر اس تصویر کے نقوش بٹھا دینا ہی دراصل اس بات کا ضامن ہے کہ انسان کو مکمل انسانیت

حاصل ہو گئی ہے اور یہ تصویر اس وقت مکمل ہو گی جب ایک انسان اللہ پر پورا عقیدہ رکھے' اللہ کے فرشتوں' کتابوں' رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان لائے تو اس وقت انسان حیوانی دائرہ محسوسات سے نکل کر انسانی عالم الغیب والشہادۃ میں داخل ہو گا۔ وہ محسوسات سے بھی واقف ہو گا اور محسوسات سے بالا دنیا سے بھی واقف ہو گا۔ وہ مادہ کا بھی عالم ہو گا اور فوق المادہ کا بھی عالم ہو گا اور اس طرح وہ حیوان کے محدود حسی دائرے سے باہر نکل آئے گا۔ یہ کمال وہ عقیدۂ توحید کے ذریعے حاصل کرے گا۔ اس طرح وہ خود دوسرے انسانوں کی بندگی کے دائرے سے بھی نکل آئے گا اور صرف اللہ وحدہ کی بندگی کرے گا۔ یوں اسے حقیقی مساوات' حقیقی آزادی اور ماسوا اللہ کے مقابلے میں حقیقی سربلندی نصیب ہو گی۔ اب وہ صرف اللہ کی عبادت کرے گا' صرف اللہ ہی سے شریعت اور نظام زندگی اخذ کرے گا۔ وہ صرف اللہ ہی پر توکل کرے گا اور صرف اللہ سے ڈرے گا۔ یہ مقام اسے اس وقت حاصل ہو گا جب انسان اسلامی نظام زندگی کے مطابق اپنی ترجیحات کی سطح کو بلند کر لے گا۔ اپنے میلانات کو مہذب' اپنی قوتوں کو تعمیر' ترقی کے لئے وقف کر دے اور حیوانی خواہشات کے مقابلے کے لئے اپنی قوتوں کو صرف کرے اور حیوانوں اور بہائم کی طرف محض حصول لذتیت کے پیچھے نہ بھاگے۔ (دیکھئے کتاب ہذا الدین)۔

جس شخص نے جاہلیت کی زندگی میں وقت نہ گزارا ہو اور جس نے جاہلیت کی تباہ کاریاں نہ دیکھی ہوں' وہ شخص نہ دین اسلام کی نعمت کا ادراک کر سکتا ہے اور نہ ہی وہ اس نعمت کی صحیح قدر کر سکتا ہے۔ جاہلیت ہر دور اور ہر مکان میں وہ نظام رہا ہے جو اللہ نے نہ بھیجا ہو' لہٰذا جس شخص نے جاہلیت کو دیکھا ہے اور اس کا مزہ چکھا ہے' تصورات اور نظریات میں اور عملی زندگی کے حالات میں وہ شخص صحیح معنوں میں جاہلیت کا احساس کر سکتا ہے اور اس کے بارے میں شعور رکھ سکتا ہے۔ وہ اسکو اچھی طرح جان سکتا ہے اور صحیح معنوں میں وہی اس دین کی عظیم نعمت کا ادراک کر سکتا ہے۔

جو شخص اندھے پن اور گمراہی کے مصائب میں مبتلا رہا ہو' جو شخص ٹوٹ پھوٹ اور حیرانی و پریشانی کا شکار رہا ہو' جو شخص تباہی اور ذہنی خلا کی مصیبت میں گرفتار ہوا ہو اور جس شخص کو کسی بھی دور میں اور کسی بھی جگہ جاہلی تصورات نے دکھ پہنچائے ہوں صرف وہی شخص ذوق ایمان کی قدر کر سکتا ہے۔ (دیکھئے خصائص التصور الاسلامی کی فصل تیہ و رکام)۔

جو شخص خود سری اور ظلم کی چکی میں پس چکا ہو' جو ضبط اور اضطراب کا شکار رہا ہو' جس کی زندگی افراط و تفریط میں گزری ہو اور جس نے جاہلیت کے طور طریقوں میں زندگی بسر کی ہو صرف وہی شخص اسلامی اور ایمانی نظام حیات کی قدر کر سکتا ہے۔ (الاسلام و مشکلات الحضارہ کی فصل ضبط اور اضطراب)۔

قرآن کریم نے عربوں کو سب سے پہلے خطاب کیا۔ وہ اس کے الفاظ و کلمات کو اچھی طرح جانتے تھے' اس کے الفاظ کے مفاہیم اور مدلولات ان کی زندگیوں میں عملاً قائم رہے تھے۔ یہ تمام چیزیں اس نسل میں تھیں جس کو قرآن نے خطاب کیا تھا۔

وہ خود جاہلیت کے کل پرزے تھے۔ انہوں نے جاہلی تصورات کو اپنے ذہنوں میں عرصے تک بسائے رکھا تھا۔ انہوں نے جاہلیت کے اجتماعی روابط کو برتا تھا' انہوں نے جاہلیت کے اجتماعی اور انفرادی اخلاق کے مظاہرے بار بار کئے تھے اور انہوں نے اس دین کے ذریعے جو کچھ پایا تھا اور اس کے ذریعے ان پر جو فضل و کرم ہوا تھا اسے بھی اپنی زندگی میں آزمایا تھا۔

انہوں نے جاہلیت کی گراوٹوں کو بھی دیکھا تھا اور اسلام کی رفعتوں کو بھی آزمایا تھا۔ اسلام انہیں عرصے تک ساتھ لے کر چلا تھا اور انہیں اس دین نے شارٹ کٹ میں بلندیوں تک پہنچا دیا تھا۔ (دیکھئے مقدمہ سورۂ نساء) اور وہ نہایت ہی بلندیوں سے نہایت ہی مسرت سے اقوام عالم پر نگاہ ڈال چکے تھے اور ایک نظر پیچھے مڑ کر وہ ماضی کو بھی دیکھ رہے تھے۔

اسلام نے انہیں کن کن پہلوؤں سے بلند کیا۔ اعتقادات و تصورات میں جبکہ وہ پتھر کے بتوں کو رب سمجھتے رہے تھے' ملائکہ' جنوں' ستاروں اور اپنے اسلاف کو رب سمجھتے رہے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ احمقانہ اور غلط تصورات کو سینے سے لگائے ہوئے تھے' ان تصورات سے اسلام نے انہیں نکال کر عقیدہ توحید میں داخل کیا' ایک اللہ واحد پر یقین ان کو عطا کیا جو رحیم و ودود' قادر و قاہر' سمیع و بصیر' علیم و خبیر' عادل و کامل' قریب اور مجیب اور بلاواسطہ الٰہ و معبود تھا۔ سب اس کے بندے بن گئے۔ وہ کاہنوں کی حکومت سے باہر آگئے' وہ انسانوں کی ریاست سے نکل آئے اور وہم و خرافات کی حکمرانی سے باہر آگئے جس طرح اندھیرے سے روشنی میں آگئے ہوں۔

پھر اسلام نے اجتماعی طور طریقوں کے اندر بھی انہیں جاہلیت سے نکالا۔ طبقاتی امتیازات ختم کر دیئے' قابل نفرت عادات چھڑا دیں' وہ ظلم و ستم سے باز آگئے کیونکہ جاہلیت میں وہ ہر برا کام کر لیتے جو بس میں ہوتا (یہ بات غلط مشہور ہے کہ عربی زندگی اسلام سے قبل ایک جمہوری زندگی تھی) میں یہاں استاد العقاد کی کتاب سے کچھ اقتباسات دیتا ہوں:

"جزیرۃ العرب کے شمال سے لے کر جنوب تک تمام امراء اور سرداران کے ہاں ظلم پر قدرت رکھنا عزت اور مرتبے کی نشانی تصور کی جاتی تھی۔ مشہور شاعر نجاشی اپنے مخالف کی ہجو کرتے ہوئے' ان کی ہجو میں یوں طنزیہ انداز میں مبالغہ کرتا ہے کہ وہ کمزور ہیں:

قبیله لا یغدرون بذمة
ولا یظلمون الناس حبه حردل

(اس کا قبیلہ کسی ذمہ داری میں کبھی غداری نہیں کرتا اور اس کے قبیلے کے لوگ کسی پر رائی برابر بھی ظلم نہیں کرتے) حجر ابن الحارث عربی بادشاہ نے جب یہ فیصلہ کیا کہ بنی اسد کو غلام بنالے تو بنی اسد کے شاعر ان کی سفارش کے لئے آئے۔ انہوں نے کہا:

انت الملك فیهم
وهم العبید الی القیامة

ذلو لسوطك مثلما
ذل الاشیقر ذو الخزمة

(آپ ان کے بادشاہ ہیں اور وہ قیامت تک تمہارے غلام ہیں' وہ آپ کے کوڑے کے سامنے اس قدر بے بس ہیں جس طرح گہرے زرد اور سرخ رنگ کا اونٹ اس شخص کے سامنے بے بس ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں اس کی نکیل ہوتی ہے)

اور عمرابن ہند بھی بادشاہ تھا جس نے لوگوں کو اس بات کا عادی بنا دیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ پس از پردہ خطاب کرے۔ اور تمام عرب روساء کی مائیں اس کے گھر میں اس کی خدمت کرتیں۔

نعمان ابن منذر بھی عربی بادشاہ تھا۔ وہ اس قدر ظالم اور احمق تھا کہ اس نے اپنے لئے دو دن مقرر کر رکھے تھے۔ ایک خوشی کا دن جس میں جو بھی آتا اسے مویشی عطا کرتا اور ایک غم کا دن مقرر کیا ہوا تھا' جس میں جو کوئی اس کے پاس آتا' اسے وہ قتل کر دیتا اور صبح سے شام تک یہی معمول رہتا۔

کلیب ابن وائل کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اسے کلیب اس لئے کہا جاتا تھا کہ جہاں اسے شکار پسند آتا وہ وہاں کتوں کا جھنڈ چھوڑ دیتا تھا۔ اب کوئی شخص جو ان کتوں کے بھونکنے کی آواز سنتا وہ اس علاقے کے قریب جانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وادی عوف کے اندر کوئی شخص آزاد نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ وادی عوف میں کسی آزاد شخص کو رہنے نہ دیتا تھا تاکہ اس کے پاس اس کی طرح اور کوئی آزاد شخص نہ رہے۔ وہ تھے تو آزاد لیکن تھے غلاموں کی طرح۔ (حقائق الاسلام' العقادص ۱۵۰' ۱۵۱)

ان عربوں کو اسلام نے اپنی عادات' رسوم' اخلاق اور اجتماعی تعلقات کے میدان میں جاہلیت سے اٹھایا۔ انہیں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے' عورتوں پر ظلم کرنے' شراب نوشی اور جوا کھیلنے' جنسی انارکی' فحاشی و عریانی' عورت کو حقیر سمجھنے اور اس کی توہین کرنے' انتقام لینے' ڈاکے ڈالنے' تاخت و تاراج کرنے اور ہر حملہ آور کے مقابلے میں بزدلی دکھانے وغیرہ کی جاہلی کمزوریوں سے پاک کیا۔ جہاں تک بیرونی حملہ آوروں کے مقابلے میں بزدلی اور بے اتفاقی کا معاملہ ہے تو اسلام سے قبل حبشیوں کا حملہ اس پر شاید عادل ہے۔ تمام عرب قبائل جو ایک دوسرے کے مقابلے میں سخت ترین موقف رکھتے تھے وہ اس لشکر کا مقابلہ نہ کر سکے۔ (دیکھئے تفسیر سورۂ فیل)۔

پھر ان گندگیوں سے پاک کر کے اسلام نے عربوں کو ایک امت بنایا' اس قدر سربلند امت کہ وہ نہایت ہی بلند مقام سے پوری انسانیت پر نظر ڈالتی تھی اور یہ انسانیت اس وقت گراوٹوں کے اسفل السافلین میں تھی۔ زندگی کے ہر شعبے میں اس وقت کی بشریت گری ہوئی تھی۔ اس وقت یا اسلام کی سربلندی تھی اور یا جاہلیت کی گراوٹ تھی۔ یہ نسل جانتی تھی کہ جاہلیت کیا ہے اور اسلام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ خدا کے اس فرمان کا مفہوم اچھی طرح جانتے تھے۔

(اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (۵ : ۳)) (آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت تمہارے دین کے قبول کر لیا ہے)

اور ایک بار پھر ہم ایک لمحہ فکریہ کے طور پر ذرا غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے ایک دین پسند فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس امت پر کیا کیا عنایات اور مہربانیاں ہیں۔ خود ان کے لئے دین تجویز کرتا ہے اور پھر اسے قبول بھی کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا انداز تعبیر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اس امت کے ساتھ بے حد محبت کرتا ہے اور اس امت سے بہت راضی ہے کہ وہ اس امت کے لئے ایک نظام زندگی تجویز کرتا ہے۔

یہ عظیم فرقان' اس امت کے کاندھوں پر بہت ہی بھاری بوجھ ڈال دیتا ہے جو اس ذمہ داری کے برابر ہے۔ نعوذ باللہ ...... اللہ تعالیٰ کی اس عظیم رعایت اور مہربانی کے مقابلے میں اس امت کے پاس ہے ہی کیا کہ وہ اللہ کے سامنے

پیش کرے بلکہ اس امت کی تمام اگلی پچھلی نسلوں کے پاس بھی اس نعمت کی برابری کے لئے کچھ نہیں ہے کہ وہ پیش کر سکے۔ ہاں امت پر اس شکر نعمت کے بدلے میں اپنی حد تک جدوجہد فرض ہے۔ اللہ کے انعامات کی پہچان اس پر فرض ہے یعنی اپنے فرض کا ادراک واجب ہے۔ اس کے بعد اس کے لئے بقدر وسعت جدوجہد لازمی ہے اور اس کے اندر اپنی تقصیرات اور کوتاہیوں پر طلب مغفرت کرنا لازم ہے۔

اللہ کی جانب سے اس امت کے لئے اسلام کو بحیثیت دین قبول کرنا' اس امت سے سب سے پہلے مطالبہ یہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کی اس پسند کی قدر و قیمت کو سمجھے۔ اس کے بعد وہ اس دین پر اپنی طاقت اور وسعت کے مطابق جم جائے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ بہت ہی کوتاہ بیں' بہت ہی احمق ہے کہ اس نے اللہ کی پسند اور اس کے انتخاب کو رد کر دیا اور اپنے لئے خود کوئی دین اور نظام اختیار کر لیا۔ یہ نہایت ہی خطرناک جرم ہو گا اس امت کی طرف سے اور اس پر اسے ضرور سزا دی جائے گی۔ کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایسا شخص نجات پا جائے جبکہ اس نے اللہ کے انتخاب کو ٹھکرا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بعض اوقات ان لوگوں کو چھوڑ دیتے ہیں جنہوں نے اسلام کو بطور دین قبول نہیں کیا' کہ وہ جو چاہیں کریں اور ایک وقت تک انہیں مہلت دیتے ہیں لیکن جن لوگوں نے اس دین کو اچھی طرح پہچان اور جان لیا اور پھر اسے ترک کر دیا اور انہوں نے اپنی زندگی کے لئے اس نظام کے سوا کوئی اور نظام از خود منتخب کر لیا تو ایسے لوگوں کو اللہ ہرگز نہ چھوڑے گا اور نہ انہیں مہلت دے گا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بداعمالیوں کے وبال کو چکھ لیں جس کے وہ مستحق ہیں۔

بس اس سے زیادہ تکمیل دین کے بارے اور ان عظیم کلمات کے بارے میں' یہاں کہنا مناسب نہیں ہے' بات بہت لمبی ہو گئی ہے۔ اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔ یہ تو قرآن کے پرتو ہیں' اب ہم اس سورہ کے سیاق کلام سے اگلا ٹکڑا لیتے ہیں۔

---ooo---

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَ اذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ

إِذَآ ءَاتَيۡتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحۡصِنِينَ غَيۡرَ مُسَٰفِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِيٓ أَخۡدَانٖۗ وَمَن يَكۡفُرۡ بِٱلۡإِيمَٰنِ فَقَدۡ حَبِطَ عَمَلُهُۥ وَهُوَ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ مِنَ ٱلۡخَٰسِرِينَ ۝٥

(لوگ پوچھتے ہیں کہ ان کے لئے کیا حلال کیا گیا ہے 'کہو تمہارے لئے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور جن شکاری جانوروں کو تم نے سدھایا ہو.... جن کو خدا کے دیئے ہوئے علم کی بنا پر تم شکار کی تعلیم دیا کرتے ہو..... وہ جس جانور کو تمہارے لئے پکڑ رکھیں اس کو بھی تم کھا سکتے ہو' البتہ اس پر اللہ کا نام لے لو اور اللہ کا قانون توڑنے سے ڈرو' اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی۔

آج تمہارے لئے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے۔ اور محفوظ عورتیں بھی تمہارے لئے حلال ہیں خواہ وہ اہل ایمان کے گروہ سے ہوں یا ان قوموں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی 'بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے نکاح میں ان کے محافظ بنو' نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرو اور جو کسی نے ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کیا تو اس کا سارا کارنامہ زندگی ضائع ہو جائے گا اور وہ آخرت میں دیوالیہ ہو گا)۔

یہ سوال ان لوگوں کی طرف سے ہے جو ایمان لائے اور یہ اس بارے میں ہے کہ ان کے لئے کیا کیا حلال ہے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت امت مختارہ کی نفسیاتی کیفیت کیا تھی۔ یہ امت جو پہلی مرتبہ خطاب الٰہی کا اعزاز پا رہی تھی اس کے اس سوال سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نفوس طیبہ کے اندر ہروقت احتیاط اور خدا ترسی کے جذبات موجزن تھے اور وہ ان تمام کاموں کے بارے میں حرج محسوس کرتے تھے جو دور جاہلیت میں معمول بہ تھے۔ ان کے دل میں یہ خوف رہتا تھا کہ کہیں اسلام نے ان چیزوں کو حرام قرار نہ دے دیا ہو' اس لئے یہ امت ہروقت پوچھنے پر مجبور تھی کہ آیا کوئی درپیش بات جائز ہے یا ناجائز ہے۔

تاریخ اسلام کا آج کا طالب علم اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ اسلام نے امت مسلمہ کے اندر کس قدر عظیم انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اسلام نے اس امت کو اس قدر سختی سے جھنجوڑا کہ اس پر سے دور جاہلیت کا تمام گرد و غبار جھاڑ دیا۔ جن مسلمانوں کو اسلام نے جاہلیت کی پستیوں سے اٹھایا تھا' ان کے ذہن میں یہ احساس تازہ تھا کہ اسلام کے ذریعے انہیں بالکل ایک نیا جنم ملا ہے۔ وہ از سر نو نشو و نما پا رہے ہیں' نیز ان لوگوں کو گہرا احساس اور شعور تھا کہ ان کے اندر ایک عظیم انقلاب پیدا ہو گیا ہے' انہوں نے ایک بہت بڑی چھلانگ لگائی ہے' وہ بہت رفیع الشان بلندیوں تک پہنچ گئے ہیں اور ان کو بلند مرتبہ نعمت سے نوازا گیا ہے۔ اس گہرے اور پختہ شعور اور اس شدید جھٹکے نے ان کے اندر ایک شدید

بیداری اور احتیاط پیدا کر دی تھی اور وہ جاہلیت کی ہر چیز کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ جب انہوں نے ان آیات کو سنا جن میں بعض چیزوں کو حرام قرار دیا گیا تھا تو انہوں نے حضور سے حلال چیزوں کے بارے میں بھی پوچھنا شروع کر دیا۔

(یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ) (ان کے لئے کیا حلال کیا گیا ہے) اور اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے۔ (قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ) (کہو تمہارے لئے تمام پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں)۔ یہ ایک ایسا جواب ہے جو قابل غور ہے۔ ان کے احساس میں یہ بات ڈال دی گئی کہ تمہارے لئے کوئی پاک چیز حرام نہیں کی گئی اور نہ انہیں پاک چیزوں کے استعمال سے منع کیا گیا ہے۔ تمام پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے حلال ہیں۔ صرف نجس اور ناپاک اشیاء حرام کر دی گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے' از روئے طبیعی احساس بھی انسان ان کو پسند نہیں کرتا۔ مثلاً مردار' خون اور خنزیر۔ یا دل مومن ان کو پسند نہیں کرتا مثلاً وہ چیزیں جن کو اللہ کے نام کے سوا کسی اور کے نام اور استھان پر ذبح کیا گیا ہو یا بتوں پر ان کو ذبح کیا گیا ہو یا جن کے گوشت کی تقسیم بذریعہ ازلام ہوئی ہو' اس لئے کہ یہ بھی ایک قسم کا جوا ہے۔

اب طیبات کی عمومی اجازت کے بعد ان میں سے ایک محسوس چیز کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ تخصیص بعد از تعمیم ہے۔ یعنی وہ شکار' جس کو سدھائے ہوئے کتے یا درندے پکڑتے ہیں۔ مثلاً کتے' باز اور شکرے یا مثلاً سدھائے ہوئے چیتے اور شیر پکڑتے ہیں جن کو مالکوں نے سدھایا ہو کہ شکار کو اس طرح پکڑا جاتا ہے اور اس طرح اسے قید میں رکھا جاتا ہے۔

(وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ز فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ص وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ

(۵ : ۴) (اور جن شکاری جانوروں کو تم نے سدھایا ہو..... جن کو خدا کے دیئے ہوئے علم کی بنا پر تم شکار کی تعلیم دیا کرتے ہو..... وہ جس جانور کو تمہارے لئے پکڑ رکھیں اس کو بھی تم کھا سکتے ہو' البتہ اس پر اللہ کا نام لے لو اور اللہ کا قانون توڑنے سے ڈرو' اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی)۔

حلال ہونا اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ یہ شکاری جانور اس قدر سدھائے ہوئے ہوں کہ شکار کو پکڑ کر قید میں رکھیں۔ اور مالک کے آنے تک اسے کھائیں نہیں۔ اسے مالک کے لئے محفوظ رکھیں۔ الا یہ کہ یہ جانور بھوکے ہوں اور مالک اس جگہ سے دور رہ گیا ہو...... اگر یہ شکاری جانور شکار کو پکڑ کر کھانے لگ جائیں تو ایسے جانور کے بارے میں یہ نہ کہا جائے گا کہ وہ سدھائے ہوئے ہیں انہوں نے تو شکار اپنے لئے کیا ہو گا اس لئے وہ حلال نہ ہو گا' اگرچہ شکار کا تھوڑا حصہ کھایا گیا ہو' اور اس کا زیادہ حصہ باقی ہو' اگرچہ یہ جانور اسے زندہ لائے ہوں لیکن اس کا کچھ حصہ انہوں نے کھا لیا ہو تو پھر بھی وہ پاک نہ ہو گا۔

اللہ تعالیٰ یہاں اہل ایمان کو یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ جن جانوروں کو تم سدھاتے ہو اور علم سکھاتے ہو وہ علم بھی

تمہارا اپنا نہیں ہے بلکہ یہ علم تمہیں اللہ نے سکھایا ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے ان کو تمہارے لئے مسخر بنایا اور پھر تمہیں یہ قوت دی کہ تم ان کی تربیت کرو۔ اللہ ہی نے تمہیں حکمت تربیت دی۔ یہ قرآن کریم کا ایک انداز تربیت ہے کہ وہ ہر ہر مرحلے پر اہل ایمان کو اللہ کی طرف متوجہ کرتا ہے اور کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ وہ اس اساسی اور بنیادی حقیقت کی طرف انہیں متوجہ کرتا رہتا ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں یہ سب کچھ دیا ہے۔ وہی خالق ہے' وہی معلم ہے' وہی ہے جس نے انسان کے لئے اس جہان کو مسخر کیا ہے۔ تمام کمالات و فضائل کا مرجع وہی ہے۔ تمام مخلوقات اپنی ہر حرکت' ہر محنت اور ہر امکان میں اسی کی طرف رجوع کرتی ہے۔ چنانچہ کوئی مومن ایک لحظہ کے لئے بھی اس بات کو نہیں بھولتا کہ اس کے جسم میں اور اس کی شخصیت میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کی طرف لوٹتا ہے۔ اس کے اردگرد جو حادثات و واقعات رونما ہوتے وہ سب اللہ کی جانب سے ہیں۔ اور ایک مومن ہروقت اللہ کے کمالات دیکھتا رہتا ہے' اس معاملے میں اللہ کے فضل و کرم کو دیکھتا ہے۔ ہر سانس میں وہ دیکھتا ہے کہ اللہ کا کیا کیا کرم ہے' غرض ہر حرکت اور جسم کے ہر حصے میں اسے حکمت نظر آتی ہے۔ وہ پوری طرح ربانی ہوتا ہے اور کسی لحظہ بھی غافل نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ یہ حکم دیتا ہے کہ سدھائے ہوئے جانور جو شکار کو تمہارے لئے روکتے ہیں' اس پر اللہ کا نام لو اور یہ نام اس وقت لیا جائے جب کسی جانور کو چھوڑا جاتا ہے اس لئے کہ ممکن ہے کہ دانتوں اور پنجوں سے وہ شکار کو ہلاک کر دے۔ یہ بمنزلہ ذبح ہو گا' اس لئے کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔ اس طرح اسے حکم دیا گیا کہ جانور کو چھوڑتے ہی اس پر اللہ کا نام لے لیا جائے۔

آخر کار انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ ہروقت خدا خوفی کو مدنظر رکھو اور اللہ کے حساب و کتاب سے ڈرو۔ اس طرح حلال و حرام کے احکام کو خدا خوفی اور تقویٰ کے شعور سے مربوط کر دیا جاتا ہے جو مومن کی زندگی میں ہر نیت اور ہر عمل کا محور ہوتا ہے اور اسی شعور کی وجہ سے پوری زندگی کا ربط اللہ' اللہ کی بزرگی کے احساس اور کھلے بندوں اور پوشیدہ حالات میں خدا خوفی سے ہو جاتا ہے۔ (وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۵ : ۴)) (اور اللہ سے ڈرو' بے شک اللہ جلدی حساب لینے والا ہے) حلال چیزوں کا بیان جاری ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ تمہارے لئے کن عورتوں سے نکاح جائز ہے:

(اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۭ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۠ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۡ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ

(۵ : ۵)) (آج تمہارے لئے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے۔ اور محفوظ عورتیں بھی تمہارے لئے حلال ہیں خواہ وہ اہل ایمان کے گروہ سے ہوں یا ان قوموں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی' بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے نکاح میں ان کے محافظ بنو' نہ یہ کہ آزاد

شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرو)

اب پھر وہ چیزیں گنوائی جاتی ہیں جو حلال ہیں ۔۔۔۔ (آج تمہارے لئے پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں) اس سے اس مفہوم کی طرف تاکیدی اشارہ ملتا ہے جس کی طرف ہم نے قارئین کو اوپر متوجہ کیا تھا۔ اب طیبات کی فہرست میں کچھ مزید چیزوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی طیب ہیں۔

یہاں اسلام کی رواداری کا ایک نمونہ سامنے آتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ کی ایک خصوصی صورت بتائی جاتی ہے۔ ایسے لوگ جو دارالاسلام میں رہتے ہیں اور اہل الذمہ ہیں اور مملکت اسلامیہ کے شہری ہیں اور ہیں اہل کتاب میں سے۔

اسلام اہل کتاب غیر مسلموں کو صرف مذہبی آزادی دے کر معاشرے کے اندر الگ تھلگ نہیں کر دیتا نہ انہیں اسلامی معاشرے میں قابل نفرت حد تک دور پھینک دیتا ہے۔ وہ انہیں اجتماعی شرکت اور محبت کا احساس بھی دیتا ہے اور انہیں اسلامی معاشرے میں ضم ہونے کے مواقع بھی فراہم کرتا ہے۔ اسلام ان کا کھانا اہل اسلام کے لئے حلال قرار دیتا ہے۔ اہل اسلام کے لئے یہ بھی جائز قرار دیتا ہے کہ وہ اپنا کھانا بھی اہل کتاب کو پیش کر سکتے ہیں تاکہ وہ ایک دوسرے سے ملاقات کر سکیں' ایک دوسرے کے مہمان بن سکیں اور باہم مل کر کھا پی سکیں اور معاشرے کے اندر محبت اور رواداری کی فضا وجود میں آئے۔ اسی طرح اسلام اہل کتاب میں سے پاک دامن عورتوں کے ساتھ اہل اسلام کو نکاح کی بھی اجازت دیتا ہے بشرطیکہ وہ محصنات ہوں یعنی پاکدامن ہوں۔ یہ مسلمانوں کے لئے جائز ہیں۔ یہاں مسلمان پاک دامن عورتوں کے ساتھ اہل کتاب پاکدامن عورتوں کا ذکر یکجا کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی رواداری ہے جو اسلام کے سوا کسی اور مذہب کے ہاں شاذو نادر ہی ملتی ہوگی۔ اس لئے کہ عیسائیوں میں سے بھی کیتھولک فرقہ آرتھوڈکس کے ساتھ نکاح کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اسی طرح پروٹسٹنٹ اور مارونیہ کے ساتھ بھی وہ نکاح جائز نہیں سمجھتے اور اگر عیسائی معاشرے میں کوئی ایسے نکاح کرتا ہے تو عیسائی آرتھوڈکس اسے صحیح عیسائی نہیں بلکہ بدعمل سمجھتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ یہ صرف اسلام ہی ہے جو ایک عالمی معاشرہ قائم کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام نے اہل اسلام اور اہل کتاب کے درمیان مکمل علیحدگی قائم نہیں کی نہ مختلف عقائد رکھنے والوں کے درمیاں مستقل پردے ڈالے ہیں۔ وہ اہل عقائد جو اسلامی مملکت کے شہری ہوتے ہیں حسن معاشرت کے نقطہ نظر سے وہ مسلمانوں کے ساتھ اور مسلمان ان کے ساتھ رابطہ رکھ سکتے ہیں۔ (رہی یہ بات کہ ان لوگوں کے ساتھ خفیہ دوستیاں قائم کرنا جائز ہیں یا نہیں تو اس کا حکم آگے آرہا ہے) رہی یہ شرط کہ کتابیات محصنہ ہوں تو یہ شرط مومنات کے لئے بھی ہے کہ وہ محصنہ ہوں۔

(إِذَآ ءَاتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَٰفِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِىٓ أَخْدَانٍ

(۵:۵)) (بشرطیکہ تم ان کے مہرادا کر کے نکاح میں ان کے محافظ ہو' نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنایاں کرو)۔

وہ اس طرح کہ انہیں مہرادا کرو' ان کے ساتھ شرعی نکاح کرو' جس میں مرد عورت کو حصار نکاح میں لاتا ہے اور

اس کی حفاظت کرتا ہے۔یہ نہ ہو کہ اجر دے کر تم ان کے ساتھ آزاد شہوت رانی کرو یا چوری چھپے دوستیاں کرو۔السفاح کا مفہوم یہ ہے کہ عورت کسی بھی مرد کے ساتھ معاہدہ کرے اور المخادنہ کا مفہوم یہ ہے کہ عورت بغیر شرعی نکاح کے کسی ایک شخص کو دوست بنالے۔یہ دونوں صورتیں عرب میں دور جاہلیت میں مشہور اور متعارف تھیں اور جاہلی معاشرہ ان دونوں قسم کے تعلقات کو تسلیم کرتا تھا۔اسلام آیا اور اس نے معاشرے کو ان گندگیوں سے پاک و صاف کر دیا اور اسے ان گراوٹوں سے اٹھاکر سربلند کر دیا۔

(وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ز وَهُوَفِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ

(۵:۵)) (اور اگر کسی نے ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کیا تو اس کا سارا کارنامہ زندگی ضائع ہو جائے گا اور وہ آخرت میں دیوالیہ ہو گا)۔

یہ تمام قانون سازی ایمان کے ساتھ منسلک ہے۔اس کا نافذ کرنا اسی طرح اہم ہے جس طرح ایمان لانا اہم ہے۔یہ دلیل ایمان ہے' اس لئے کہ جو شخص ان احکام کے نفاذ سے روگردانی کرتا ہے وہ گویا ایمان کا انکار کرتا ہے' ایمان کو چھپاتا ہے' ایمان پر پردہ ڈالتا ہے۔اس طرح جو شخص ایمان کا انکار کرے اس کا عمل باطل ہو جاتا ہے اور وہ مسترد کر دیا جاتا ہے اور نہ وہ شخص اس عمل پر ہمیشہ کے لئے عمل پیرا ہوتا ہے۔الحبوط عربی میں کسی مویشی کے پھول جانے کو کہتے ہیں' جب وہ کوئی زہریلی گھاس چر لیتا ہے اور اس سے مرجاتا ہے۔یہ عمل باطل کی اچھی تصویر کشی ہے کہ بظاہر وہ پھول جاتا ہے لیکن درحقیقت اس کا جسم زہر آلود ہو گیا ہوتا ہے اور وہ مرجاتا ہے۔اسی طرح عمل باطل بھی زیادہ نظر آتا ہے لیکن اس کا اثر نہیں ہوتا اور دنیا میں بے اثر اور بے کار ہونے کے بعد آخرت میں غیر نافع اور سخت خسارے کا سودا ہو گا۔

یہ سخت 'شدید اور خوفناک اختتامی ڈراوا ایک شرعی حکم کے بعد آتا ہے۔یہ شرعی حکم طعام و نکاح کے حوالے سے حلال و حرام کی بابت وارد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام حیات کے ہر جزو پر عمل کرنا ضروری ہے اور یہ کہ اسلامی نظام کا ہر جزئیہ بھی دین ہی ہے اور اسی لئے اس کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں ہے۔شریعت کی مخالفت میں اگر کوئی عمل تھوڑا ہو یا زیادہ اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

پاکیزہ کھانوں اور پاکیزہ بیویوں کے بیان کے ضمن میں نماز کا حکم آجاتا ہے اور نماز کے لئے تیاری اور پاکی کے احکام بتائے جارہے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ

اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ لِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۶

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم نماز کے لئے اٹھو تو چاہئے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لو' سروں پر ہاتھ پھیرلو اور پاؤں ٹخنوں تک دھولیا کرو۔ اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔ اگر بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا ہو' اور پانی نہ ملے' تو پاک مٹی سے کام لو' بس اس پر ہاتھ مار کر اپنے منہ اور ہاتھوں پر پھیرلیا کرو۔ اللہ تم پر زندگی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا' مگر وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے' شاید کہ تم شکر گزار بنو)۔

رزق حلال اور پاکیزہ عورتوں کے احکام کے متصلاً بعد نماز اور نماز کے لئے طہارت کا بیان آتا ہے۔ مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکنے والوں کے ساتھ معاملہ کرنے' شکار کرنے کے احکام کے ساتھ نماز کے لئے طہارت کے احکام کا ذکر محض اتفاقاً نہیں کیا گیا ہے کہ ایک بیان ختم ہوا تو دوسرا شروع کر دیا گیا اور نہ یہ سیاق کلام اور مقاصد کلام کے ساتھ غیر مناسب ہے بلکہ یہ ذکر بھی اپنے صحیح مقام پر ہے اور قرآن کریم کی حکمت بیان کے عین مطابق ہے۔

سب سے پہلے تو یہ پاکیزہ چیزوں میں سے ایک نئے رنگ کی پاکیزگی ہے' روحانی پاکیزگی یعنی پاکیزہ طعام و شراب اور پاکیزہ عورتوں کے ساتھ ایک پاکیزہ چیز' روح کی پاکیزگی کے سامان اور انتظام کا بھی یہاں ذکر کر دیا گیا۔ یہ وہ رنگ ہے جس میں قلب مومن وہ کچھ پاتا ہے جو کسی دوسرے سازو سامان میں نہیں پاتا۔ یہ وہ سازو سامان ہے جو ذریعہ ملاقات محبوب ہے۔ پاکیزگی' طہارت اور عاجزی کی فضا میں جب دنیا کے سامان طعام و شراب کا بیان ختم ہوا اور پاکیزہ ازواج کا ذکر بھی ہو گیا تو پھر روحانی پاکیزگی اور طہارت کا ذکر ہوا جو وضو اور نماز کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ انسان کی زندگی میں پاکیزگی کے تمام رنگ جمع ہو گئے جن کے ساتھ انسان کی تصویر مکمل ہوتی ہے۔

اس سے یہ بتلانا بھی پیش نظر ہے کہ طہارت اور نماز کے احکام بھی اسی طرح دین کا حصہ ہیں جس طرح کھانے کے احکام اور نکاح کے احکام' شکار کے احکام اور حرام اور حلال کے احکام اور جس طرح امن اور جنگ میں لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے کے احکام ہیں یا جس طرح اس پوری سورہ میں مذکور دوسرے احکام ہیں۔ یہ سب احکام اللہ کی عبادت اطاعت اور بندگی ہیں۔ یہ سب دین کا حصہ ہیں۔ اسلام میں ان احکام کے اندر کوئی ایسا فرق نہیں ہے جو فقہاء نے بعد کے

ادوار میں اپنی اصطلاحات کے اندر قائم کر دیا ہو۔یعنی یہ ہیں احکام عبادات اور یہ ہیں احکام معاملات۔

یہ اصطلاحات جو فقہاء نے محض تصنیفی تقاضوں کے تحت قائم کئے تھے اور کتابوں کے ابواب و فصول کے تعین کے لئے کئے تھے' ان کا اصل نظام زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔اور نہ اصل شریعت کے اندر اس تفریق کے لئے کوئی جواز ہے۔اسلامی نظام میں عبادات اور معاملات دونوں موجود ہیں اور ان دونوں کا حکم بھی ایک ہے۔یعنی یہ دونوں امور اسلامی نظام حیات' شریعت اور دین کا حصہ ہیں۔اطاعت اور اتباع میں دونوں کے درمیان شریعت نے کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا ہے۔بلکہ شریعت کا قیام ہی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان دونوں حصوں پر عمل در آمد نہ کیا جائے اور دین اسلام اس وقت تک درست طور پر قائم نہیں ہو سکتا' جب تک جماعت مسلمہ کی زندگی میں یہ دونوں پہلو برابری کے طور پر نافذ نہ ہو جائیں۔

یہ سب معاہدے ہیں جن کے بارے میں اللہ کا حکم یہ ہے کہ انہیں پورا کیا جائے۔یہ تمام عبادات ہیں جن پر ایک مسلمان رضائے الہی کے لئے عمل کرے گا۔یہ تمام امور اسلام کا حصہ ہیں اور ہر ایک پر مسلمان عمل پیرا ہو گا تاکہ وہ اپنی بندگی کا اقرار کرے۔

اسلام میں عبادات اور معاملات کوئی الگ الگ حیثیت نہیں رکھتے۔ان کا بیان صرف فقہی تصنیفات میں الگ الگ کیا گیا ہے۔معاملات اور عبادات دونوں ہی درحقیقت عبادات ہیں۔یہ سب اللہ کی جانب سے فرائض ہیں اور ہم نے اللہ کے ساتھ یہ عہد (عقود) کیا ہے کہ ہم ان پر عمل کریں گے۔ان میں سے کسی ایک کی خلاف ورزی کا مفہوم یہ ہو گا کہ ہم نے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے ایمان کے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔

یہ ہے وہ اہم نقطہ نظر جس کی طرف قرآن یہاں اشارہ کر رہا ہے۔وہ پے درپے مختلف قسم کے احکام کو اس سورہ میں بیان کر رہا ہے جو سب کے سب دین کا حصہ ہیں۔

---ooo---

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَوٰةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ مِنْهُ (۵:۶)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم نماز کے لئے اٹھو تو چاہئے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لو' سروں پر ہاتھ پھیر لو اور پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔اگر بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا ہو' اور پانی نہ ملے' تو پاک مٹی سے کام

لو' بس اس پر ہاتھ مار کر اپنے منہ اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو)

اسلام میں نماز کی حیثیت 'اللہ کے ساتھ ملاقات کی ہے۔انسان اللہ کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوتا ہے' اللہ سے دعا کرتا ہے۔ اللہ کے ساتھ راز و نیاز ہوتا ہے اس لئے اس مقام پر کھڑا ہونے کے لئے مناسب تیاری کی ضرورت ہے۔ روحانی تطہیر سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ جسمانی پاکیزگی بھی ہو۔یہی وجہ ہے کہ وضو کا حکم دیا گیا۔جہاں تک ہم سمجھتے ہیں اصل حکمت تو اللہ کے علم میں ہے۔بہرحال وضو میں درج ذیل چیزیں شامل ہیں: چہرے کا دھونا' ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونا اور سر کا مسح کرنا اور پاؤں کو ٹخنوں تک دھونا۔ان فرائض کے بارے میں معمولی فقہی اختلافات بھی ہیں۔اہم اختلاف یہ ہے کہ آیا یہ فرائض وضو اسی طرح ادا کئے جائیں گے جس ترتیب سے ان کا ذکر قرآن میں ہوا ہے یا اس ترتیب کے سوابھی وضو ہو جاتا ہے۔اس بارے میں دو اقوال ہیں۔

یہ وضو تو اس ناپاکی سے ہے جس میں وضو فرض ہے۔رہی جنابت چاہے وہ عورت کے ساتھ مباشرت کی وجہ سے لازم ہو یا احتلام کی وجہ سے تو اس پر غسل واجب ہے۔ فرائض غسل اور فرائض وضو بیان کرنے کے بعد یہاں تیمم کا ذکر بھی کر دیا گیا۔تیمم کی اجازت درج ذیل حالات کے ساتھ مشروط ہے۔

مثلاً یہ کہ پانی سرے سے موجود ہی نہ ہو یا یہ کہ کوئی شخص مریض ہو اور وہ وضو پر قادر نہ ہو یا اس پر غسل واجب ہو پانی اس کے لئے موجب اذیت ہو۔مسافر جو محتاج وضو ہو یا اس پر غسل واجب ہو اور پانی میسر نہ ہو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے وضو کی موجب ناپاکی کی تعبیر کی ہے۔(اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ (۵: ۶)) (یا تم میں سے کوئی نشیبی جگہ سے آیا ہو) غائط کے معنی نشیبی جگہ کے ہوتے ہیں جہاں اکثر لوگ قضائے حاجت کے لئے جاتے ہیں' چاہے وہ پیشاب ہی کرے اور نشیبی جگہ نہ جائے۔

اور غسل واجب ہونے کی ناپاکی کی تعبیر (اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (۵: ۶)) (یا تم عورتوں کے ساتھ ہاتھ لگاؤ) یہ شریفانہ انداز بیان مباشرت کے لئے ہے۔ایسے حالات میں جن میں حاجت وضو ہو یا حاجت غسل کسی کو نماز کے قریب جانے کی اجازت نہیں' الا یہ کہ وہ تیمم کر لے اور پاک مٹی کا ارادہ کرے۔یعنی ایسی چیز پر تھپکی دے جو زمین سے ہو اور پاک ہو۔چاہے یہ مٹی سواری کی پشت پر ہو' یا دیوار کے ساتھ ہو' چاہے کہ اپنی ہتھیلیوں کے ساتھ مٹی وغیرہ پر تھپکی دے' پھر دونوں ہاتھ کو جھاڑ دے اور منہ پر مسح کر لے اور پھر اپنے ہاتھوں پر کہنیوں تک مسح کر لے۔ایک بار تھپکی دے پورے تیمم کے لئے یا دو بار تھپکی دے۔دو فقہی اقوال کے مطابق لفظ (اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (۵: ۶)) کے مفہوم میں بھی اختلاف ہے۔کیا اس سے مراد صرف لمس ہے یا مباشرت ہے۔یا اس سے مراد مطلق لمس ہے چاہے شہوت اور لذت کے ساتھ ہو یا اس کے بغیر ہو۔اس میں بھی فقہی اختلافات ہیں.... اسی طرح اس میں بھی اختلاف ہے کہ مطلق مرض میں تیمم جائز ہے یا ایسے مرض میں جس میں تکلیف ہو یا تکلیف بڑھ جانے کا خطرہ ہو۔

پھر یہ بھی مختلف فیہ ہے کہ مرض نہ ہو لیکن پانی شدید ٹھنڈا ہو اور اس سے بیماری لاحق ہونے کا خطرہ ہو تو تیمم جائز ہے۔راجح بات یہی ہے کہ جائز ہے۔اس آیت کے اختتام پر یہ تعقیب آتی ہے۔

(مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ

عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۵ : ۶)) (اللہ تم پر زندگی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا، مگر وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے، شاید کہ تم شکر گزار بنو)۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا اللہ کی ملاقات کی حالت میں صفائی شریعت میں واجب کی گئی ہے۔ وضو اور غسل میں جسمانی اور روحانی صفائی حاصل ہوتی ہے۔ رہا تیمم تو اس میں کم از کم روحانی صفائی حاصل ہوتی ہے۔ اور صفائی کے لئے وہ وضو اور غسل کا قائم مقام ہوتا ہے جب پانی نہ ملے یا پانی کے استعمال میں ضرر کا احتمال ہو۔ یہ اس لئے جائز کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر خواہ مخواہ سختی اور شدت نہیں چاہتے اور نہ لوگوں کو مشقت، اور مشکلات میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو پاک کر دے۔ یہ پاکی ان پر بطور انعام آئے اور اس کے بعد وہ اس نعمت کا شکر ادا کریں اور اس شکر کے بدلے اللہ اپنے فضل و کرم اور انعام و اکرام میں مزید اضافہ فرمائیں۔ یہ ہے نرمی، مہربانی اور اسلامی نظام کی واقعیت پسندی اور مستقل سہولت کی فراہمی۔ وضو، غسل اور تیمم کی حکمت۔ اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتے ہیں:

(وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۵ : ۶)) (مگر وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے، شاید کہ تم شکر گزار بنو)۔ اسلامی نظام حیات مسلمانوں کو مراسم عبودیت اور نظام قانون دونوں میں ایک حسین ہم آہنگی عطا کرتا ہے۔ وضو اور غسل سے محض جسمانی تطہیر کا فائدہ ہی حاصل نہیں ہوتا کہ آج کل کے نام نہاد منکرین اسلام یہ اعتراض وارد کر سکیں کہ اس دور جدید میں ہمیں محض صفائی کے لئے اس قسم کے انتظامات کی ضرورت نہیں ہے جس طرح پسماندہ عربوں کو ضرورت تھی اس لئے کہ اب تو حماموں میں صحت و صفائی کے اچھے انتظامات ہیں اور ہم مہذب ہونے کی وجہ سے بھی صفائی کا بہت ہی خیال رکھتے ہیں..... یہ اعتراض اس لئے نہیں وارد کر سکتے کہ وضو اور غسل کے ذریعے اسلام نے جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے ہمارے لئے تطہیر کا نظام وضع کیا ہے۔ پھر اس نظام کو عبادت کے ساتھ منسلک کر کے باقاعدہ بنا دیا ہے کہ تمام لوگ پاک اور صاف و ستھرے ہوں۔ جب وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وضو اور غسل میں جسمانی صفائی سے روحانی صفائی کا پہلو زیادہ مد نظر رکھا گیا ہے تو ان کے عوض تیمم کو رکھا گیا ہے اس لئے کہ جب پانی کا استعمال ممکن نہ ہو تو ان کے عوض تیمم کو رکھا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ تیمم کے اندر ظاہری صفائی حاصل ہی نہیں ہوتی۔ اس پر مزید یہ کہ اسلامی نظام زندگی ایک عام نظام ہے اور وہ ہر قسم کے حالات کے لئے ہے۔ ہر خاندان، ہر طور طریقے کے لئے ایک ہی نظام اور طریقہ ہے، اس لئے اس کا فائدہ ہر قسم کے حالات اور ہر قسم کے ماحول اور ہر قسم کی سوسائٹی میں ہوتا ہے۔ ہر صورت میں اور ہر مفہوم میں اس کی حکمت اور فائدہ موجود ہوتا ہے اور کسی صورت میں بھی اس سے تخلف نہیں ہوتا۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم سب سے پہلے اسلامی نظریہ حیات کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں اور بعد میں اس کے بارے میں اظہار خیال کریں ورنہ ہمارا فتویٰ بغیر علم اور بغیر روشن کتاب کی ہدایات کے ہو گا۔ پھر ہماری سعی یہ ہونا چاہئے کہ ہم اللہ کے ساتھ نہایت ہی ادب و احترام سے پیش آئیں اور جو بات ہم جانتے ہیں اور جو باتیں نہیں جانتے دونوں میں احترام سے پیش آئیں۔ (اس کی ایک مثال زکوٰۃ اور ٹیکس کے درمیان فرق ہے۔ اس لئے ٹیکس کی وجہ سے

ہم زکوٰۃ کو ختم نہیں کر سکتے۔ یہ بحث بھی جلد ہی آئے گی)۔

یہ مسائل کہ جب وضو ممکن نہ ہو یا غسل ممکن نہ ہو عذر اور ضرر کی وجہ سے تو اس وقت تیمم جائز ہے۔ اس میں ہمارے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے اور وہ یہ کہ اسلامی نظام حیات کے اندر نماز کی کس قدر اہمیت ہے اور اس کی راہ میں جو رکاوٹیں اور مشکلات حائل ہوں اسلامی نظام انہیں کیسے حکیمانہ انداز میں حل کرتا ہے۔ تیمم کے اس حکم اور پھر اس کے ساتھ نماز کے بارے میں دوسرے احکام مثلاً صلوٰۃ الخوف' صلوٰۃ المریض کے احکام کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو ثابت ہو گا کہ بیٹھ کر' لیٹ کر' پہلو پر جیسے بھی ممکن ہو نماز کی ادائیگی ضروری ہے۔ اسلام اس پر بہت تاکید کرتا ہے۔ ان تمام احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام حیات مسلمانوں کی اخلاقی اور نفسیاتی تربیت میں نماز کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اس لئے کہ اللہ کے سامنے کھڑے ہونا اور اللہ سے ملاقات کرنا' انسان پر بے حد اثر انداز ہوتا ہے۔ اسلام سخت سے سخت حالات میں بھی اور نہایت ہی مشکل اوقات میں بھی اسے چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کی راہ میں کسی مشکل کو حائل ہونے نہیں دیتا۔ دن میں پانچ بار بندے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے رب سے ملے اور اس ملاقات کو کسی وجہ سے بھی نہ چھوڑے۔ یہ دل کی تازگی ہے اور آنکھوں کا سرور ہے اور اللہ کا سایہ اور خوشگوار سایہ ہے۔

---ooo---

احکام طہارت' اور اس سے پہلے دیئے جانے والے احکام کے بعد اب یہ اختتامیہ آتا ہے جس میں نعمت ایمان کے بارے میں یاد دہانی ہے۔ اور اس عہد کی تذکیر جو انہوں نے اللہ کے ساتھ باندھا تھا اور جس میں انہوں نے سمع اور اطاعت کا اقرار کیا تھا۔ یہ وہی میثاق تھا' جس کے ذریعے وہ اسلام میں داخل ہوئے تھے' جیسا کہ اس سے پہلے ہم بیان کر آئے ہیں' نیز مسلمانوں کو خدا خوفی کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان تمام باتوں کے بارے میں علم ہے' جو ان کے دلوں میں پوشیدہ ہیں۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٧﴾

(اللہ نے تم کو جو نعمت عطا کی ہے اس کا خیال رکھو اور اس پختہ عہد و پیمان کو نہ بھولو جو اس نے تم سے لیا ہے' یعنی تمہارا یہ قول کہ "ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی" اللہ سے ڈرو' اللہ دلوں کے راز تک جانتا ہے)۔

جن لوگوں کو سب سے پہلے قرآن نے خطاب کیا تھا وہ اس دین کی قدر و قیمت کو اچھی طرح جانتے تھے جیسا کہ اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں اس لئے کہ وہ اس دین کی حقیقت اپنی ذات اور شخصیت کے اندر زندہ طور پر دیکھ رہے تھے۔ یہ دین ان کی زندگی' ان کی سوسائٹی اور ان کے ارد گرد پوری بشریت میں اس کے مقام کے حوالے سے ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسمت کی طرف صرف اشارہ ہی ان کے لئے کافی تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بسہولت اس عظیم حقیقت کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے جو ان کی زندگی اور ماحول میں موجود تھی۔

اسی طرح اس میں اس میثاق کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان سے لیا تھا۔ اور یہاں اس کی طرف اس لئے اشارہ کیا گیا کہ یہ بھی ایک واضح حقیقت تھی جسے وہ جانتے تھے اور اس پر وہ بہت فخر کرتے تھے۔ اس معاہدے کا فریق اول اللہ تھا اور فریق دوئم وہ تھے اور یہ بات ان کے لئے نہایت ہی قابل قدر اور قابل عزت تھی' اور یہ بات نہایت عظیم تھی اور وہ اس کی اہمیت اور حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو خدا ترسی کے حوالے کرتے ہیں اور دل کے اندر اللہ کے خوف کا احساس کرنے اور خفیہ خطرات کے مقابلے میں ان کو بیدار کیا جاتا ہے۔

(وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ) (اللہ سے ڈرو' اللہ ان باتوں سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو) انداز تعبیر بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۵: ۷) بالتصویر اور مفہوم کو تیزی سے منتقل کرنے والی ہے۔ مناسب ہو گا کہ اس میں جو خوبصورتی' معنی خیزی اور گہرائی ہے اس کی طرف اشارہ کیا جائے۔ ذات الصدور کا مفہوم عربی میں "دلوں کی مالکہ" جو دلوں میں چھپاں ہو' کنایۃً مراد وہ خفیہ جذبات ہیں جو دلوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ پوشیدہ میلانات' دلوں کے خلجان' خفیہ راز ایسے راز جو دلوں کے ساتھ چسپاں ہیں۔ یہ خفیہ راز بھی اللہ کے سامنے بالکل کھلے ہیں۔ اس لئے کہ وہ دلوں میں چھپی باتوں کا بھی جاننے والا ہے۔

---ooo---

وہ عہد جو اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ سے لیا ہے' اس میں یہ بات بھی ہے کہ یہ امت پوری انسانیت کے لئے عدل و انصاف کی نگران ہو گی۔ ایسا انصاف کہ اس کے ترازو کا کوئی پلڑا دوستی اور دشمنی کی وجہ سے جھک نہ جائے۔ اس پر رشتہ داری اور خواہشات نفسانیہ کے اثرات بھی نہ ہوں اور نہ وہ کسی مصلحت سے متاثر ہو۔ یہ عدل صرف ذات باری کی رضا کے لئے ہو اور اس میں انصاف کرنے والا موثرات دنیا میں سے کسی موثر سے اثر نہ لے اور یہ انصاف اس شعور کے تحت ہو کہ اللہ رقیب اور نگہبان ہے اور خفیہ ترین گوشوں سے باخبر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کی پکار یہ ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو' یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسب رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو' جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے)

اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اس بات سے روکا تھا کہ وہ کسی قوم کے ساتھ دشمنی کی وجہ سے 'کہ انہوں نے مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکا تھا' بے انصافی کرنے سے ہاتھ کھینچ لیں اور کسی کے ساتھ زیادتی نہ کر بیٹھیں ضبط نفس اور رواداری کی یہ انتہا تھی جہاں تک اللہ تعالیٰ ان کو پہنچانا چاہتے تھے اور یہ اللہ کا نہایت ہی مضبوط منہاج تربیت تھا۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اس بات سے روکتے ہیں کہ وہ دشمنی کی وجہ سے عدل سے رک نہ جائیں۔ یہ ایک نہایت ہی اعلیٰ چوٹی ہے اور اس قدر مشکل اور دشوار گزار راہ ہے کہ اس پر چلنا نفس کے لئے نہایت ہی باعث مشقت ہے۔ پہلی آیت میں تھا کہ تم دشمنی کی وجہ سے ظلم نہ کرو اور یہ مرحلہ اس سے آگے کا ہے کہ دشمنی کے باوجود انصاف کرو' یعنی باوجود اس کے کہ ان کے خلاف تمہارے جذبات مشتعل ہیں اور تم کراہت محسوس کرتے ہو پھر بھی عدل کرو۔ پہلا حکم بہت ہی آسان تھا اس لئے کہ وہ منفی کام تھا' انسان اس سے رک سکتا تھا کہ ظلم نہ کرے۔ رہا دوسرا حکم کہ ان ظالموں کے ساتھ اور دشمنوں کے ساتھ عدل و انصاف کرو یہ ایک مثبت اور پر مشقت کام ہے۔ یعنی نفس انسانی کو ایسے مبغوض اور قابل نفرت لوگوں کے ساتھ انصاف کرنے پر مجبور کرنا۔

اسلام کا حکیمانہ نظام تربیت اپنے تربیت یافتہ لوگوں سے ایسا مشکل کام کروا سکتا تھا اس لئے اسلام حکم دیتا ہے۔

(يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ز وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا قف هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (٨:٥))

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو' یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ بات بتائی جاتی ہے جو اس مشکل کام کے لئے معین و مددگار ہے۔

(وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (٨:٥)) اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو' جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے) انسان کا نفس اس قدر بلندی تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا' الا یہ کہ اس کام کا معاملہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ براہ راست ہو' جس وقت انسان صرف اللہ کے لئے کھڑا ہو جائے اور اللہ کے سوا ہر چیز کو چھوڑ دے۔ جس وقت انسان کو خدا خوفی کا شعور ہو اور اسے یہ احساس ہو کہ اللہ کی نظروں سے کوئی خفیہ بات بھی اوجھل نہیں ہے۔

دنیا کے معیاروں میں سے کوئی معیار انسانیت کو یہ رفعت اور بلندی عطا نہیں کر سکتا اور نہ اس بلندی پر کسی قوم کو ثابت قدم رکھ سکتا ہے۔ صرف للہیت کا جذبہ اور اللہ کے ساتھ براہ راست معاملہ کرنے کا جذبہ ہی یہ معیار دے سکتا ہے' جس میں اللہ کے سوا کوئی اور سوچ (Consideration) نہیں ہوتی اور صرف یہی للہیت ہی انسان کو اس مقام تک بلند کر سکتی ہے۔

دنیا میں کوئی ایسا نظام نہیں ہے جو انسانوں کو ایسا انصاف دے سکتا ہو جس میں دوست اور دشمن برابر ہوں۔ یہ

صرف دین اسلام کا کام ہے جو اہل ایمان کو یہ دعوت دیتا ہے کہ انصاف کے معاملے میں محض اللہ کے لئے کھڑے ہو جائیں اور وہ انصاف کے لئے 'ماسوائے انصاف کے ہر سوچ (Consideration) ترک کر دیں۔

یہی وہ بنیادی عناصر ہیں جن کی وجہ سے اس دین کو دین انسانیت اور عالمی دین قرار دیا گیا ہے۔ اس کا نظام تمام لوگوں کے لئے بالکل کافی ہے' چاہے وہ لوگ اس دین کے ماننے والے ہوں یا نہ ماننے والے ہوں۔ تمام لوگ اس کے زیر سایہ عدل و انصاف کی زندگی گزار سکتے ہیں۔ انصاف قائم کرنا ان لوگوں پر فرض ہے جو اس دین کے ماننے والے ہیں اور اس قیام عدل میں ان کا معاملہ اپنے رب کے ساتھ ہے' اگرچہ وہ انصاف چاہنے والوں کے ظلم و عدوان کا شکار رہے ہوں اور ان کے دل میں ان کی دشمنی ہو۔ یہ اس امت کا فریضہ ہے جسے اس پوری انسانیت کا نگران بنایا گیا ہے اگرچہ اس عدل کے قیام میں اسے مشکلات پیش آئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس امت نے یہ فریضہ تاریخ میں بہت ہی اچھی طرح ادا کیا ہے۔ اس نے اس کی راہ میں عظیم مشقتیں برداشت کی ہیں' جبکہ اسلام قائم تھا اور یہ اس امت کی زندگی میں محض وعظ اور نصیحت کا کام نہ تھا۔ نہ اعلیٰ نمونوں کی چند مثالیں تھیں' بلکہ یہ اس کی روز مرہ زندگی کی صورت حالات تھی۔ یہ ایسی صورت حالات تھی جس کو انسانیت نے نہ کبھی پہلے دیکھا تھا اور نہ بعد میں دیکھا۔ اس معیار پر صرف اسلامی نظام زندگی ہی میں انسانیت نے یہ انصاف دیکھا۔ اس کی مثالیں اور بلند ترین مثالیں اسلامی تاریخ میں لاتعداد ہیں اور تاریخ کا حصہ ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی ہدایات اور اس کی مقرر کردہ ڈیوٹیاں امت مسلمہ کی زندگی میں ایک واقعی اور عملی نظام کی شکل میں دیکھی گئیں جو بڑے سادہ طریقے سے ادا ہوتی رہیں۔ اور اس امت کی روز مرہ کی زندگی میں وہ منقش اور مجسم تھیں۔ یہ محض خیالی اعلیٰ معیاروں کی باتیں نہ تھیں' نہ کچھ انفرادی اعلیٰ نمونے تھے بلکہ وہ عملی زندگی کا ایک نقش دل پذیر تھا جس کے سوا آج تک اعلیٰ معیار کے نقوش انسان کو نظر نہ آئے۔

جب اس اعلیٰ مقام سے اور بلند ترین چوٹی سے دنیا کی جاہلیت پر نگاہ ڈالی جائے چاہے وہ جس زمان میں ہو اور جس مکان میں ہو' جن جاہلیتوں میں دور جدید کی پالش شدہ جاہلیت بھی شامل ہے تو نگاہ ڈالنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ اسے اللہ نے انسانوں کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ وہ نظام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لئے بنایا ہے۔ اس مقام بلند سے نظر آتا ہے کہ اسلامی نظام حیات اور ان تمام جاہلی نظامہائے حیات کے درمیان اس قدر طویل فاصلے ہیں جنہیں عبور نہیں کیا جاسکتا۔ عملی زندگی کے اعتبار سے بھی اور انسانی ضمیر اور عقائد کے اعتبار سے بھی۔

بعض اوقات لوگ اصول تو پہچان لیتے ہیں اور اصول پسندی کے نعرے بھی لگاتے ہیں لیکن اصولوں کو عملی شکل میں برتنا اصل چیز ہے۔ یہ فطری بات ہے کہ لوگ اصولوں کی بات کرتے ہیں اور یہ بات وہ اور لوگوں کے لئے کرتے ہیں لیکن یہ اصول عالم عمل میں موجود نہیں ہوتے۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگوں کو اصولوں کی طرف دعوت دی جائے بلکہ دیکھنا چاہیے کہ جہاں سے دعوت آ رہی ہے' جو دعوت کا مقصد ہے اور جو داعی ہے وہ کیسا ہے' چاہیئے تو یہ کہ دعوت داعی کے ضمیر اور اس کے اندرون پر حکمران ہو۔ اصل بات وہ مرجع ہے جہاں سے دعوت جاری ہوتی ہے اور داعی کی جدوجہد اور داعی کی وہ محنت ہے جو وہ دعوت اور اصولوں کو عملی شکل دینے میں خرچ کرتا ہے۔

دعوت اسلامی کی اصل قدر و قیمت یہ ہے کہ چند دینی اصولوں کی طرف یہ دعوت دی جاتی ہے۔ ان کی قدر و قیمت

دین اسلام کی سند سے ہوتی ہے۔ دین اسلام کی قدر و قیمت یہ ہے کہ وہ اللہ کا دین ہے اس لئے جو شخص دین کی دعوت دیتا ہے تو وہ اللہ کے سوا کسی اور کا سہارا اور سند نہیں لیتا اور اگر کسی کی مدد سے کبھی ایسا ہو بھی جائے تو اس سند کا لوگوں کے ایمان و ضمیر پر اثر کیا ہوتا ہے۔ اور لوگوں کو کیا پڑی ہے کہ وہ کسی اور کے اصولوں کو نافذ کرنے کے لئے جدوجہد کریں اور کسی اور کے پاس ہے کیا کہ وہ لوگوں کو بطور اجر دے گا۔

ہزار ہا لوگ عدل کے حق میں نعرے لگاتے ہیں' پاکیزگی کے نعرے لگاتے ہیں' آزادی کے لئے نعرے لگاتے ہیں' رواداری' اولوالعزمی' محبت' قربانی اور ایثار کے نعرے لگاتے ہیں لیکن ان نعروں کے نتیجے میں لوگوں کا ضمیر اپنی جگہ سے نہیں ہلتا' اور دلوں پر ان کا اثر نہیں ہوتا' اس لئے کہ وہ ایک ایسی دعوت دے رہے ہوتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی سند نہیں ہوتی ہے۔ غرض اصل بات صرف زبانی جمع خرچ کی نہیں ہے بلکہ اصل حقیقت وہ چیز ہے جو بات کے پیچھے ہوتی ہے۔

لوگ اپنے جیسے لوگوں کے منہ سے اصول' بلند نمونے اور بلند علامات کی بات سنتے رہتے ہیں لیکن ان کی پشت پر اللہ کی جانب سے کوئی سند نہیں ہوتی۔ پس ان کی اس بات کا اثر کیا ہوتا ہے۔ ان کی فطرت یہ کہتی ہے کہ یہ ایک بات ہے جو ان جیسے لوگوں کی طرف سے ہے۔ اور یہ بات کرنے والے میں وہ تمام نقائص' عیوب اور کوتاہیاں موجود ہیں جو دوسرے لوگوں میں موجود ہوتی ہیں۔ انسان ان باتوں کو صرف اس اساس پر لیتے ہیں اس لئے ان کی فطرت پر ان باتوں کی حکمرانی نہیں ہوتی نہ یہ باتیں ان کی شخصیت کو جھنجوڑ سکتی ہیں۔ ان باتوں کے اثرات' ان لوگوں پر نہیں ہوتے' اگر کوئی اثر ہوتا بھی ہے تو وہ تار عنکبوت کی طرح کمزور ہوتا ہے۔

پھر یہ دینی اصولوں کی ہدایات اس وقت تک مکمل نہیں ہوتیں جب تک ان کو زندگی میں عملی شکل نہ دی جائے۔ اسلام ان ہدایات کو محض ہوا میں بکھیر نہیں دیتا بلکہ ان کو عملی زندگی میں نافذ کرتا ہے اس لئے کہ دین جب صرف مشورہ بن جائے اور صرف چند مراسم عبودیت کا نام رہ جائے تو پھر اس کے یہ مشورے حقیقت کا روپ اختیار نہیں کرتے۔ یہ صورت حال ہمیں آج ہر جگہ نظر آتی ہے کہ اہل دین صرف مشورے دیتے ہیں مگر ان کے پاس قوت نافذہ نہیں ہے۔

لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ دین کے لئے ایک نظام حیات ضروری ہے جو دین کے منہاج کے مطابق ہو اور اس نظام کی روشنی میں اسلامی ہدایات پر عمل کیا جائے۔ یہ نظام ان ہدایات کو زندگی کے تمام طور طریقوں میں علمی اور عملی اقدامات کے درمیان مکمل توازن کے ساتھ نافذ کر دے۔ اسلامی نقطہ نظر سے دین کا بھی مفہوم ہے۔ یعنی دین سے مراد وہ نظام زندگی ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حکمران ہو۔ اس کی پشت پر قوت نافذہ ہو۔

جماعت مسلمہ کی زندگی میں جب دین اپنے اس مفہوم کے ساتھ حقیقت کا روپ اختیار کرلے' تب ہی وہ اس دنیا میں بلندی تک پہنچ سکتی ہے اور پھر وہاں سے پوری انسانیت کا جائزہ لے سکتی ہے۔ اس انسانیت پر جو ابھی تک جدید جاہلیت کے گڑھوں میں افتادہ ہے' جس طرح نزول قرآن کے وقت عربوں کی قدیم جاہلیت کے گڑھوں میں لوگ اوندھے گرے ہوئے تھے لیکن جب دین کو منبر پر وعظ اور مساجد کے اندر چند مراسم عبودیت تک محدود کر دیا جائے اور زندگی کے وسیع عملی میدان سے اسے خارج کر دیا جائے تو اس صورت میں انسان کی عملی زندگی میں دین کی کچھ حقیقت بھی نہ ہوگی۔ نہ اسے نافذ کیا جا سکے گا' نہ اس کی عملی شکل سامنے آئے گی۔

مومنین کے لئے اللہ کی جانب سے اجر ضروری ہے۔ وہ مومنین جو معاملہ صرف اللہ کی ذات کے ساتھ کرتے ہیں تاکہ وہ مزید جوش و خروش اور پوری قوت کے ساتھ اپنی ڈیوٹی برائے نگرانی بشریت ادا کریں۔ اللہ کے ساتھ انہوں نے جو پختہ عہد کیا ہے اسے پورا کریں۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اسلام کی راہ میں کام کرنے والوں اور نیک عمل کرنے والوں اور ان لوگوں کے انجام میں فرق ہو جو اسلام سے انکار کرتے ہیں۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۹ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝۱۰

(جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کی خطاؤں سے درگزر کیا جائے گا اور انہیں بڑا اجر ملے گا اور وہ لوگ جو کفر کریں اور اللہ کی آیات کو جھٹلائیں، تو وہ دوزخ میں جانے والے ہیں)۔

یہ وہ جزاء ہے جو ان برگزیدہ لوگوں کے لئے ہے جن سے دنیاوی لذات اور مفادات فوت ہو جاتے ہیں۔ انہیں دنیا میں عیش کوشی کا موقع نہیں ملتا۔ وہ دنیا میں اسلامی انقلاب کے فرائض سرانجام دیتے رہتے ہیں اور اس انعام کے ہوتے ہوئے دنیا میں بشریت کی نگہبانی کے فرائض بہت ہی کم نظر آتے ہیں اور انسان بشری میلانات، انسانی حسد و عناد اور اس دنیا کے لالچ کو خاطر میں نہیں لاتا۔ پھر اس سے اللہ کی صفت عدل کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیک لوگوں اور اشرار کو ایک ہی سطح پر نہیں رکھتے۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ انقلابی مومنین کی نظریں اللہ کی اس جزاء کے ساتھ اٹکی ہوئی ہوں اور ان کا معاملہ اللہ کے ساتھ اس طرح ہو کہ ان کی راہ میں دنیا کی رکاوٹوں میں سے کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو سکے۔ زندگی کے حالات میں اور مختلف احوال میں بھی۔ بعض دل تو ایسے ہوتے ہیں کہ محض جذبۂ حصول رضائے الٰہی ان کے لئے کافی ہوتا ہے اور وہ اس کو چکھ کر خوب چٹخارے لیتے ہیں جس طرح انہیں اللہ کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کو ایفا کرنے میں خوب مزہ آتا ہے۔ لیکن اسلامی نظام ان اولوالعزم لوگوں کے علاوہ عوام الناس کو بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ عام انسانوں کا مزاج بھی اللہ کے پیش نظر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ عام لوگوں کے لئے امید مغفرت کا ہونا بھی ضروری ہے اور عوام الناس کے ساتھ اجر عظیم کا وعدہ بھی ضروری ہے۔ اسی طرح عوام الناس کو اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ وہ یہ جانیں کہ جھٹلانے والوں کا انجام و سزا کیا ہوگی اس لئے کہ عوام الناس اسی پر راضی ہوتے ہیں اور یہی ان کا مزاج ہوتا ہے۔ اس لئے عوام الناس اپنی جزا اور کفار کی سزا کا حکم سن کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اشرار کے کاموں پر ان کے دل میں جو غیظ و غضب پیدا ہوتا ہے وہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ایسے مواقع پر جب اہل ایمان کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی عدل و انصاف کریں۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ ان کے ہاتھوں اہل ایمان نے مکر و فریب اور ایذاء رسانی اور نیش زنی کو برداشت کیا ہو۔ اسلامی نظام زندگی انسانیت کو اسی طرح لیتا ہے جس طرح انسانوں کی فطرت ہے اور اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتے ہیں۔ اسلام انسانوں کو ایسا نعرہ اور ایسی دعوت دیتا ہے کہ جس سے ان کے شعور کے دریچے کھلتے ہیں اور

جس پر ان کی جان اور روح لبیک کہتی ہے۔پھر یہ انعام یعنی مغفرت اور اجر عظیم اللہ کی رضامندی کی دلیل ہے۔

سیاق کلام میں ذرا آگے جائیں اور عدل' انصاف اور رواداری کی روح اب جماعت مسلمہ کے اندر نہایت ہی قوی پائیں۔اس کے اندر زیادتی' کینہ پروری' اوریک رخی کا شعور ختم کر دیا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو یاد دلاتے ہیں کہ ان پر اللہ کا یہ کس قدر عظیم کرم ہے کہ اللہ نے ان کے خلاف مشرکین کی تمام کاروائیاں بند کرا دیں' جبکہ حدیبیہ کے موقع پر اور دوسرے مواقع پر وہ مسلمانوں کے خلاف کوئی جارحانہ اقدام نہ کر سکے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١١﴾

(اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے (ابھی حال ہی میں) تم پر کیا ہے' جب کہ ایک گروہ نے تم پر دست درازی کا ارادہ کر لیا تھا مگر اللہ نے ان کے ہاتھ تم پر اٹھنے سے روک دیئے۔اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو ایمان رکھنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے)۔

اس آیت کے مفہوم میں اختلاف ہے لیکن راجح بات یہ ہے کہ اس سے مراد وہ واقعہ ہے' جو یوم حدیبیہ پر پیش آیا جب ایک گروہ مسلمانوں اور رسول اللہ ؐ کے خلاف غداری کر کے چاہتا تھا کہ غفلت میں ان پر حملہ کر دے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو مسلمانوں کے ہاتھوں میں قیدی بنا دیا۔(تفصیلات کے لئے دیکھئے سورہ فتح)۔

غرض حادثہ کیسا بھی ہو' بہرحال یہاں اعتبار اور اہمیت اس بات کی ہے جو یہاں اسلام کے نظام تربیت میں پیش نظر ہے اور وہ یہ کہ غصے اور دشمنی کو فرو کرنا چاہئے اور اس طرح دشمنوں کے خلاف اپنے دلوں میں پائے جانے والے کینے اور دشمنی کو نکالنا چاہئے تاکہ مسلمانوں کے دل مطمئن ہو جائیں اور وہ ٹھنڈے دل سے سوچیں اور یہ یقین رکھیں کہ اللہ ان کا نگہبان ہے اور ان کا محافظ ہے۔اس نرمی' سنجیدگی اور اطمینان کی وجہ سے مسلمانوں کو ضبط نفس حاصل ہوتا ہے' ان کے دلوں میں رواداری پیدا ہوتی ہے اور وہ سہولت سے عدل و انصاف قائم کرتے ہیں۔ مسلمان اس بارے میں ندامت محسوس کریں گے اگر وہ پھر بھی اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو پورا نہ کریں' حالانکہ وہ ہر وقت ان کا نگہبان اور محافظ ہے' اور ان کی طرف بڑھنے والے ہاتھ کو پکڑ رہا ہے۔دوسری جگہ آیت یہ ہے:

(إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ (۵:۱۱)) (جب ایک قوم نے تم پر دست درازی کا ارادہ کر لیا تھا مگر اللہ نے ان کے ہاتھ تم پر اٹھنے سے روک دیئے)۔

ہاتھوں کا آگے بڑھنا اور پکڑنا اور پھر ان کا روک دیا جانا' یہ انداز تعبیر ایک زندہ اور مصور انداز تعبیر ہے اور یہ

معنوی انداز سے زیادہ موثر ہے۔اس تعبیر کے اندر تصویر اور حرکت اسکرین پر سامنے آجاتی ہے۔یہ انداز تعبیر بات کو زوردار اور وزنی بنا دیتا ہے۔یوں نظر آتا ہے کہ یہ بالکل ایک نیا اسلوب ہے جو پہلی مرتبہ استعمال ہوا ہے اور اس میں ایک محسوس صورت حال بھی نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔اور وہ متحرک صورت میں تصور کے اسکرین پر دوڑتی ہے۔ یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز بیان ہے اور اسی وجہ سے قرآن معجز ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۴۷ ایک نظر میں

سابقہ سبق کے آخر میں اس معاہدے کا تذکرہ ہوا تھا جو اللہ تعالیٰ اور مسلمانوں کے درمیاں طے پایا تھا اور یہ معاہدہ کر کے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جو عظیم احسان کیا تھا وہ انہیں یاد دلایا تھا۔ یہ اس لئے کہ وہ اس معاہدے کی رو سے ان پر عائد ہونے والی ڈیوٹیوں کو اچھی طرح ادا کریں اور اس بات سے ڈریں کہ وہ اس معاہدے کو توڑ نہ دیں اور اس کی خلاف ورزی نہ کریں۔

اس پورے سبق میں وہ تفصیلات دی گئی ہیں جن میں اہل کتاب نے اپنے ان معاہدوں کی خلاف ورزیاں کیں جو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کئے تھے۔ یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ ان خلاف ورزیوں کے نتیجے میں انہیں اس دنیا میں جو سزائیں دی گئیں وہ کس قدر سخت تھیں۔ یہ اس لئے کہ ایک طرف تو یہ وضاحت جماعت مسلمہ کے لئے ایک تاریخی نصیحت اور عبرت کا کام کرے اور اہل کتاب کی حقیقی صورت حال کی تفصیلات ان کی آنکھوں کے سامنے آ جائیں اور دوسری جانب انہیں بتایا جائے کہ اللہ کی سنت اٹل ہوتی ہے اور وہ اپنے فیصلوں میں کسی کے ساتھ کوئی رو رعایت نہیں کرتا۔ تیسرے یہ کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اہل کتاب کی اصل حقیقت کیا ہے اور تاریخ میں ہمیشہ ان کا موقف کیا رہا ہے' تاکہ مسلمانوں کے خلاف ان کی جانب سے کی جانے والی سازشوں کا اچھی طرح دفعیہ کیا جائے اور ان کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کو ناکام کیا جا سکے۔ یہ سازشیں وہ اپنے دینی لباس اور دینی ثابت قدمی کے رنگ میں کرتے تھے حالانکہ وہ ہمیشہ ان معاہدوں کو توڑتے رہے تھے۔

اس سبق میں اللہ کے اس معاہدے کا جائزہ بھی لیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کے ساتھ اس وقت کیا تھا' جب اس کو مصر کی محکومانہ اور رسواکن زندگی سے نجات دی گئی تھی۔ اس میثاق کو بھی بنی اسرائیل نے توڑ دیا تھا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس عہد شکنی کے نتیجے میں ان پر کیا گزری۔ خدا کی لعنت کے ساتھ انہیں جلاوطن کر دیا گیا اور ہدایت اور انعام سے محروم کر کے انہیں راندۂ درگاہ قرار دیا گیا۔ پھر اس معاہدے کا جائزہ بھی لیا گیا ہے جو ان لوگوں سے کیا گیا تھا' جنہوں نے کہا تھا کہ وہ نصاریٰ ہیں۔ انہوں نے اس معاہدے کو توڑا اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان نفرت اور عداوت پیدا کر دی اور اعلان کر دیا گیا کہ یہ عداوت تاقیامت بحال رہے گی۔ پھر بنی اسرائیل کا موقف' ارض مقدس کے حوالے سے بھی ایکسرے ہوا ہے جس میں انہوں نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اس پر حملہ آور ہوں گے۔ انہوں نے اس عہد کو توڑا اور الٹے پاؤں پھر گئے۔ محض بزدلی کی وجہ سے انہوں نے اللہ کے ساتھ بدعہدی کی اور معاہدے کی ذمہ داریاں ادا نہ کیں۔ انہوں نے حضرت موسیٰ سے صاف صاف کہہ دیا کہ آپ جائیں' آپ اور آپ کا خدا دونوں لڑیں' ہم تو یہیں بیٹھتے ہیں۔

اہل کتاب کے ان معاہدوں اور مواقف کے جائزے کے بیچ میں' یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان عہد شکنیوں کے نتیجے میں اہل کتاب کے اندر کس قدر فکری انحراف پیدا ہو گیا تھا۔ ان معاہدوں میں یہ طے ہوا تھا کہ وہ صرف ایک اللہ کو تسلیم کریں گے اور اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کریں گے۔ اس کے بدلے اللہ نے ان کو انعامات و اکرامات سے نوازنا تھا اور یہ وعدہ کیا تھا کہ تمہیں اس سرزمین کا اقتدار اعلیٰ دیا جائے گا لیکن انہوں نے خدا کی نافرمانی کر کے اپنے آپ کو ان تمام چیزوں سے محروم کر لیا۔ چنانچہ وہ اللہ کی جانب سے ملعون ہو کر اور فرقہ پرستی میں پڑ کر جلاوطنی کی زندگی بسر کرتے رہے۔

ان تبصروں کے بعد از سر نو ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ہدایت کو قبول کر لیں۔ یہ ہدایت جو نہایت ہی اہم ہے' جسے اس آخری رسالت نے پیش کیا ہے اور جسے نبی آخر الزمان خاتم النبیینؐ نے پیش کیا ہے اور جس کی وجہ سے انسانوں پر حجت تمام ہو گئی کہ وہ یہ کہہ سکیں کہ ایک طویل عرصہ گزر گیا ہے اور کوئی نبی نہیں آیا اور آخری نبی گزرنے کے بعد طویل عرصہ گزر گیا ہے۔ اس لئے وہ ہدایت بھول گئے اور اب ان پر مواخذہ کیا ہو گا۔ لو حضرت محمدؐ بشیر و نذیر بن کر آگئے ہیں' اب کیا بہانہ ہے بتاؤ؟

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ بھی از خود بر آمد ہوتا ہے کہ دین اسلام' اپنی اساس کے اعتبار سے ایک ہے۔ اللہ کا اپنے تمام بندوں کے ساتھ عہد و میثاق بھی ایک ہے کہ وہ ایمان لائیں' اللہ کو وحدہ لا شریک سمجھیں' زکوۃ ادا کریں اور اللہ نے ان کو جو رزق دیا ہے' اس میں سے اللہ کے لئے خرچ کریں۔ یہ ایک ایسا میثاق ہے جو صحیح نظریات کو متعین کر دیتا ہے' جو صحیح عبادات کو متعین کر دیتا ہے اور اسلام کے اجتماعی نظام کی بنیادوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس مختصر جائزے کے بعد اب ذرا آیات پر تفصیلی بحث کرتے ہیں۔

---○○○---

درس نمبر ۴۷ تشریح آیات

۱۲ --- تا --- ۲۶

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ
وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ
الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ
اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ
السَّبِيْلِ ﴿۱۲﴾ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ
يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ
تَطَّلِعُ عَلٰي خَاۗىِٕنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ
فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰى
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾

(اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان میں بارہ نقیب مقرر کیے تھے اور ان سے کہا تھا کہ "میں تمہارے ساتھ ہوں' اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوۃ دی اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقین رکھو کہ میں تمہاری برائیاں تم سے زائل کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی' مگر اس کے بعد جس نے تم میں سے کفر کی روش اختیار کی تو درحقیقت اس نے سواء السبیل گم کر دی۔" پھر یہ ان کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اور ان کے دل سخت کر دیئے۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ الفاظ کا الٹ پھیر کر کے بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں جو تعلیم انہیں دی گئی تھی اس کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں اور آئے دن تمہیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ ان میں سے بہت کم لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں (پس جب یہ اس حال کو پہنچ چکے ہیں تو جو شرارتیں بھی یہ کریں وہ ان سے عین متوقع ہیں) لہٰذا انہیں معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو۔ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کی روش رکھتے ہیں۔

اسی طرح ہم نے ان لوگوں سے بھی پختہ عہد لیا تھا' جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں' مگر ان کو بھی جو سبق یاد کرایا گیا تھا اس کا ایک بڑا حصہ انہوں نے فراموش کر دیا' آخر کار ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے دشمنی اور آپس کے بغض و عناد کا بیج بو دیا اور ضرور ایک وقت آئے گا جب اللہ انہیں بتائے گا کہ وہ دنیا میں کیا بناتے رہے ہیں)

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا وہ دو فریقوں کے درمیان معاہدہ تھا۔ اس معاہدے کی عبارت شرط اور جزائے شرط کے انداز میں تھی۔ قرآن کریم نے اس معاہدے کی شرط اور جزاء کو بعینہٖ نقل کیا ہے۔ یہ اصل عبارت عہد کے حالات اور واقعہ عقد کے ذکر کے بعد دی گئی ہے۔ یہ عہد اللہ تعالیٰ اور بنی اسرائیل کے ۱۲ نمائندوں کے درمیان ہوا تھا۔ یہ نمائندے بنی اسرائیل کے ۱۲ قبائل کے نمائندے تھے۔ یہ ۱۲ قبائل حضرت یعقوب علیہ السلام (جن کا نام اسرائیل تھا) کے پوتے اور ان کی اولاد تھے۔ ان نمائندوں کی تعداد ۱۲ تھی اور اس معاہدے کی عبارت یہ تھی:

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ؕ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِىْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ

(۵:۱۲) اور ان سے کہا تھا کہ "میں تمہارے ساتھ ہوں' اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقین رکھو کہ میں تمہاری برائیاں تم سے زائل کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی' مگر اس کے بعد جس نے تم میں سے کفر کی روش اختیار کی تو درحقیقت اس نے سواء السبیل گم کر دی۔"

(اِنِّیْ مَعَکُمْ) میں تمہارے ساتھ ہوں' کس قدر عظیم عہد ہے۔ جس کی حمایت میں اللہ ہو' اس کے خلاف کون ہو سکتا ہے۔ اور جو چیز بھی اس کے خلاف ہو' نہ اس کی کوئی حقیقت ہو گی' نہ اثر ہو گا اور جس کے ساتھ اللہ ہو گا تو وہ ہرگز راستہ نہ بھولے گا' اس لئے کہ اللہ جس کا ساتھی ہو وہ ہدایت پر ہی ہو گا۔ پھر اللہ اس کے لئے کافی بھی ہو گا۔ جس کے ساتھ اللہ ہو تو نہ وہ پریشان ہو گا اور نہ نامراد ہو گا کیونکہ اللہ کے ساتھ اس کی نزدیکی اور قرب اسے مطمئن کر دیتا ہے اور اسے کامیاب کر دیتا ہے۔ غرض جو اللہ کا ساتھی ہوا اور جس کا ساتھی اللہ ہوا تو اس کا ضامن اللہ ہوتا ہے۔ وہ مراد کو پہنچ جاتا ہے۔ اس مقام بلند پر اسے مزید کسی چیز کی ضرورت یا طلب نہیں رہتی۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی رفاقت کا یہ اعلان محض گپ اور مزاح میں نہیں کیا یا ان کے ساتھ کسی خاص دوستی کی وجہ سے نہیں کیا اور نہ یہ ان کی کوئی ذاتی بزرگی کا استحقاق ہے کہ جس کے نہ کوئی اسباب ہیں اور نہ اس کے لئے کچھ شرائط و قیود ہیں۔ بلکہ یہ رفاقت ایک باقاعدہ معاہدے کے تحت طے پائی ہے۔ یہ شرط و جزاء پر مبنی ہے۔

وہ شرط یہ ہے کہ وہ نماز قائم کریں گے۔ صرف نماز کی ادائیگی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا قیام اس طرح ضروری ہے کہ اس کے پورے اصول اس کے اندر قائم ہو جائیں اور وہ اللہ اور اس کے بندے کے درمیان پورا رابطہ ہو۔ نماز ان کے لئے ایک تہذیبی' تربیتی عنصر ہو' اللہ تعالیٰ کے سیدھے نظام تربیت اور نظام حیات کے مطابق۔ اس طرح کہ یہ نماز انہیں تمام فحاشیوں سے روکتی ہو' تمام برائیوں سے منع کرتی ہو اور نماز کو اس بات سے حیا آتی ہو کہ وہ فحاشی اور ناپسندیدہ افعال کے ذخیرے کے ساتھ اللہ کے دربار میں حاضر رہے' منکرات لئے ہوئے۔

اللہ نے انہیں جو رزق اور دولت دی ہے اس کا حق نعمت ادا کرتے ہوئے وہ زکوٰۃ کی ادائیگی باقاعدگی کے ساتھ کرتا ہو اور یہ خیال کرتا ہو کہ اصل مالک اللہ ہے اور وہ اس مال کے تصرف میں اللہ کی پیروی کر رہا ہے۔ اس لئے کہ اللہ اصل مالک ہے اور اللہ کے مال میں لوگ بطور وکلاء اور ایجنٹ تصرفات کرتے ہیں۔ پھر زکوٰۃ کی ادائیگی اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ اسلامی معاشرے کی اجتماعی ضروریات کو اس کے ذریعے پورا کیا جا سکے۔ نیز اسلامی نظام معیشت کے اس زرین اصول کو بروئے کار لایا جا سکے کہ دولت صرف مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتی رہے بلکہ معاشی زندگی کو اجتماعی کفالتی نظام کے اصول پر قائم کیا جائے۔ نیز دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں نہ ہو' جس کی وجہ سے عام معاشرے میں کساد بازاری پیدا ہوتی ہے اور لوگوں کی قوت خرید ختم ہو جاتی ہے۔ اور جس کا آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرے کے اندر پیداواری عمل معطل ہو جاتا ہے یا کم از کم بہت ہی سست پڑ جاتا ہے۔ اس کا واضح نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک قلیل تعداد عیاشی کرتی ہے اور عوام کی کثیر تعداد مفلوک الحال رہتی ہے اور غربت کی زندگی بسر کرتی ہے' جس کے نتیجے میں معاشرتی بگاڑ اور فساد پیدا ہوتا ہے اور یہ بگاڑ مختلف رنگوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ تمام فساد ادائیگی زکوٰۃ سے رکتا ہے ہے اور اس فساد کو دفع کرنے میں اسلامی نظام کا تقسیم دولت کا نظام بہت بڑا کام کرتا ہے اور اسلام اپنا اقتصادی کردار ادا کرتا ہے۔

اللہ کے رسولوں پر ایمان' تمام رسولوں پر بغیر کسی تفرقہ اور جدائی کے کہ یہ سب اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور سب کے سب اللہ کا دین لے کر آئے ہیں اور ان میں سے کسی بھی ایک کا انکار مستلزم کفر ہے۔ کیونکہ یہ اس ذات کا انکار ہے جس نے ان سب کو بھیجا ہے۔

یہ عہد صرف ایمان اور مجرد عقیدہ ہی نہ ہو بلکہ ایک مثبت اقرار ہو اور اس کے ساتھ عملاً رسولوں کی نصرت ہو۔ ان

فرائض میں ان کے ساتھ مدد اور تعاون بھی ہو جو فرائض ان پر اللہ نے عائد کئے ہیں اور جن کو بروئے کار لانے کے لئے ان رسولوں نے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیا ہے۔ اللہ کے دین پر ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ دین کو قائم کرنا چاہتے ہیں ہر مومن لٹھے اور ان کی بھرپور امداد کرے۔ اس دین کو اس کرۂ ارض کی کسی سرزمین پر قائم کر دے اور یہ دین لوگوں کی زندگیوں میں ایک حقیقت بن کر لٹھے۔ اس لئے کہ اللہ کا دین محض اعتقادی تصورات کا نام نہیں ہے' نہ یہ دین صرف مراسم عبادت کا نام ہے بلکہ یہ زندگی کا ایک واقعی اور عملی نظام ہے۔ یہ ایک متعین نظام ہے جو زندگی کے تمام امور میں تصرف اور عمل کرتا ہے۔ اور جو نظام بھی ہو اور جو منہاج بھی ہو وہ نصرت اور امداد اور تعاون کا محتاج ہوتا ہے۔ اسے قوت کی فراہمی ضروری ہوتی ہے۔ اس کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے تاکہ وہ قائم ہو' اس کی حمایت ہو اور اسے بچایا جائے۔ اگر ایسی صورت حال نہ ہو تو مومن نے 'یہ سمجھا جائے گا' کہ اپنے کیے ہوئے عہد کا ایفا نہیں کیا ہے۔

زکوٰۃ کے بعد اب عام انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس نے یہ عام انفاق فرض کیا ہے لیکن یہ قرض ہے۔ حالانکہ اللہ خود تمام دولت کا مالک ہے اور وہی داتا ہے۔ لیکن یہ اس کا فضل و کرم ہے کہ وہ اپنی دی ہوئی چیز کو اپنے لئے بطور قرض مانگتا ہے۔ یہ تمام امور تو شرط تھے۔ اب اس شرط کی جزاء کیا ہے؟

پہلی جزاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے۔ انسان سے خطا کا صدور خواہ ہوتا ہے اور وہ برائی پر مائل ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ بہت ہی نیکوکار ہو۔ اس کی خطاؤں کو معاف کرنا بھی اس کے لئے ایک بہت ہی بڑا انعام ہے۔ اور اللہ کی وسیع رحمت کی وجہ سے اس کے ضعف' اس کی کمزوری اور اس کے عجز و قصور کا تدارک ہوتا ہے۔

پھر اس کی جزاء میں ایسے باغات آتے ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں اور یہ اللہ کا خالص فضل و کرم ہے۔ کوئی انسان اللہ کے اس درجہ فضل و کرم تک محض اپنے عمل کے بل بوتے پر نہیں پہنچ سکتا۔ یہ محض اللہ کا فضل ہے جو کسی انسان کو اس مقام تک پہنچا سکتا ہے اور یہ مقام اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان اس کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ جہاں تک اس کا بس چلے اور جس قدر اس کی وسعت میں ہو۔

اور اس عہد و میثاق میں ایک جزئی شرط یہ بھی تھی۔ (فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (۵: ۱۲) "مگر اس کے بعد تم میں سے جس نے کفر کی روش اختیار کی تو درحقیقت اس نے سواء السبیل گم کر دی۔" اس لئے اب اس کے لئے کوئی ہدایت نہ ہوگی اور نہ وہ گمراہی سے واپس ہو گا۔ جب اس کے لئے ہدایت واضح ہو اور اس کے ساتھ معاہدہ ہو جائے اور راستہ واضح ہو جائے اور اس پر چلنے کی جزاء بھی متعین ہو جائے تو اب اس کی خلاف ورزی لازماً گمراہی ہے۔

یہ تھا اللہ تعالیٰ کا معاہدہ بنی اسرائیل کے نمائندوں کے ساتھ اور یہ لوگ پوری قوم بنی اسرائیل کے نمائندے تھے۔ وہ سب ان کی نمائندگی پر راضی تھے۔ اس طرح یہ میثاق گویا بنی اسرائیل کے ہر فرد کے ساتھ ہو گیا۔ اس جماعت اور امت کے ساتھ بھی ہو گیا جو بنی اسرائیل پر مشتمل تھی لیکن ملاحظہ فرمائیں کہ بنی اسرائیل نے اس عہد کے ساتھ کیا کیا۔

انہوں نے اپنے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے اس عہد کو کھلے بندوں توڑ دیا۔ انہوں نے اپنے نبیوں کو ناجائز طور پر قتل کیا۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل اور سزائے موت دلوانے کی سازش کی حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان

کے انبیاء میں سے آخری نبی تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب توراۃ میں تحریف کی۔ انہوں نے اپنی شریعتوں کو بھلا دیا اور کسی بھی شریعت کو نافذ نہ کیا۔ انہوں نے نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ کی بابت نہایت ہی مکارانہ' معاندانہ اور غیر شریفانہ موقف اختیار کیا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خیانت کی اور حضور ﷺ کے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں کی خلاف ورزی کی اس لئے وہ اللہ کی ہدایت سے نکل گئے۔ ان کے دل سخت ہوگئے اور وہ اس قابل ہی نہ رہے کہ وہ ہدایت قبول کر سکیں۔

(فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ (۵:۱۳))

(پھر یہ ان کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اور ان کے دل سخت کر دیئے۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ الفاظ کا الٹ پھیر کر کے بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں جو تعلیم انہیں دی گئی تھی اس کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں)۔

اللہ کا فرمان کس قدر سچا ہے۔ آج بھی یہودیوں کی خصوصیات یہی ہیں۔ یہ وہ لعنت ہے جو ان کے ماتھے سے ہر وقت عیاں ہے۔ اس سے ان کی اصل فطرت اور جبلت ظاہر ہوتی ہے۔ جس پر خدا کی لعنت ہے وہ درگاہ ہدایت سے راندہ ہے۔ ان کے خدوخال میں بدبختی چمکتی ہے۔ ان کے چہرے پر اللہ کی رحمت کا نشان نہیں ہوتا ہے۔ ان کے معاملات انسانی جذبات سے خالی ہوتے ہیں' اگرچہ وہ مکاری سے یا خوف کی وجہ سے زبردستی اپنے چہروں پر مسکراہٹ لائیں اور بات میں نرمی پیدا کریں اور باہم ملاقات میں نہایت شرافت سے کام لیں۔ اس لئے کہ چہرے مہرے کی سختی اور خدوخال میں خشکی اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ اس شخص کا دل خشک اور اس کا مزاج کرخت ہے۔ اس کے علاوہ ان کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ وہ بات کو اپنی جگہ سے ہٹاتے ہیں۔ انہوں نے پہلے اپنی کتاب تورات میں تحریف کی اور اس کی وہ شکل بگاڑ دی جس پر وہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی تھی۔ یہ تحریف یا تو اس طرح کی گئی کہ انہوں نے اس کتاب میں اپنی مرضی کی چیزوں کا اضافہ کر دیا اور یہ ظاہر کیا کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے اور یا یہ تحریف اس طرح ہوئی کہ آیات تو اصلی ہی باقی رہیں لیکن انہوں نے ان کا مفہوم اپنی مرضی کے ساتھ بدل دیا اور اپنے گھٹیا مقاصد کے حصول کے لئے ان آیات کے مفہوم کے اندر زبردست تبدیلی کر دی اور اس طرح انہوں نے اللہ پر افتراء باندھا۔ یا تحریف اس طرح کی کہ انہوں نے اللہ کے احکام کو بھلا دیا' اسلامی نظام حیات اور شریعت کو موقوف کر دیا اور اپنی زندگیوں میں شریعت پر عمل کرنا بند کر دیا۔ اپنے معاشرے کو آزاد کر دیا اس لئے کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے بعد ان کو اللہ کے اس پاک وصاف اور سیدھے دین کے مطابق سیدھا طرز عمل اختیار کرنا پڑتا تھا' جس کے وہ عادی نہ تھے۔

(وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ (۵:۱۳)) (اور آئے دن تمہیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کا پتہ چلتا رہتا ہے ان میں سے بہت کم لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں)

یہ حضور اکرم ﷺ کو خطاب ہے۔ آپ ﷺ کو بتایا جاتا ہے کہ مدینہ کے اسلامی معاشرے میں یہودیوں کے حالات کیا

ہیں۔ وہ ہمیشہ خائن رہیں گے اور نبی ﷺ کے ساتھ خیانت سے کبھی بھی باز نہ آئیں گے۔ وہ بارہا عملاً خیانت کا ارتکاب کرتے رہے۔ جب تک وہ مدینہ میں رہے وہ آئے دن کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ جزیرۃ العرب میں جب تک رہے ان کی سازشیں جاری رہیں۔ اور اس کے بعد پوری تاریخ میں اسلامی معاشرہ کے ساتھ یہودی اسی خیانت پر گامزن رہے حالانکہ اسلامی معاشرہ وہ واحد معاشرہ تھا جس نے ان کو پناہ دی۔ اور ان کو دوسروں کے مظالم سے نجات دی' ان کے ساتھ حسن سلوک کیا اور اسلامی معاشرے میں وہ ہمیشہ خوشحالی کی زندگی گزارتے رہے۔ لیکن انہوں نے ہمیشہ بعینہٖ انہی خطوط پر جن پر وہ حضرت محمد ﷺ کے ساتھ معاملے کرتے رہے' وہی معاملہ اسلامی معاشرے کے ساتھ کیا۔ بچھوؤں' سانپوں' بھیڑیوں اور گیدڑوں کی طرح وہ مسلمانوں کے خلاف سازش اور ان کے ساتھ خیانت کرتے رہے اور آج بھی وہ اسی مکاری و فریب کاری میں مصروف ہیں۔ جب بھی کبھی انہیں قوت نصیب ہوئی انہوں نے مسلمانوں سے سخت انتقام لیا۔ ان کے لئے پھندے رکھے' اور ان کے خلاف سازشیں کیں' اور مسلمانوں کے ہر دشمن کے وہ دوست بن گئے۔ جہاں بھی انہیں فرصت ملی اور موقعہ ملا انہوں نے مسلمانوں پر وار کیا۔ نہایت سنگدل اور نہایت ہی بے رحم واقع ہوئے ہیں وہ مسلمانوں کے حوالے سے۔ کبھی بھی انہوں نے مسلمانوں پر رحم نہ کیا اور مسلمانوں کے بارے میں انہوں نے ہمیشہ اپنے عہد اور ذمہ داری کو بھلا دیا۔ ان کی اکثریت ایسی ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ان کے بارے میں کہا ہے۔ اور جس طرح ان کی اس جبلت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ عہد شکن رہے ہیں اور قدیم الایام سے ان کا یہ وطیرہ ہے۔

انداز بیان ایسا ہے کہ حضور کو خطاب کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ آپ ان کو ایسا پائیں گے۔ مدینہ کے حوالے سے۔ (وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ (۵: ۱۳)) "آپ ہمیشہ ان میں سے خائن لوگوں پر مطلع ہوتے رہیں گے الا یہ کہ ان میں سے کم لوگ ایسے نہ ہوں گے۔"

ان کے افعال خیانت کارانہ ہوں گے' ان کی نیت میں فتور ہو گا' ان کی بات مکارانہ ہو گی اور ان کی نظر بھی خائن ہو گی۔ یہاں آیت میں موصوف کو حذف کر کے اس کی جگہ صفت کو رکھ دیا یعنی (خائنہ) اور اس سے اس کے مفہوم میں عمومیت پیدا ہو گئی۔ مجرد خیانت' خیانت سے بھرپور فضاء اور خیانت کا سایہ ان پر ہر وقت چھایا ہوا ہو گا۔ ان کی جبلت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ خائن ہیں۔ یہ ان کے موقف کا جوہر ہے اور رسول اللہ اور جماعت مسلمہ کے ساتھ ان کا یہی برتاؤ رہا ہے۔ خائن... خائن... خائن۔

یہ قرآن اس امت کا معلم' مرشد' راہنما اور زندگی کی راہوں کے نشیب و فراز میں اس کا حدی خواں ہے۔ وہ امت کو اس کے دشمنوں کے حالات بتاتا ہے اور دشمنوں کے مزاج اور ان کی تاریخ بھی امت کے سامنے رکھتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اسلامی ہدایات بھی دیتا ہے۔ اگر یہ امت اپنے قرآن سے مشورہ کرتی رہے' قرآن کی ہدایات پر کان دھرے اور اپنی زندگی میں قرآنی اصولوں اور قوانین کو عملاً نافذ کرے تو اس کے دشمن کبھی بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ لیکن جب امت مسلمہ نے خود اپنے اس عہد کو توڑ دیا جو اس نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا اور جب اس نے قرآن کریم کو پس پشت ڈال دیا تو اسے اس صورت حال سے دوچار ہونا پڑا جس میں وہ بالفعل ہے' اگرچہ یہ امت قرآن کریم کو نہایت ہی ترنم اور وجد انگیز انداز میں پڑھتی ہے۔ اس سے تعویذ اور گنڈے بھی بناتی ہے اور اسے دم اور جھاڑ کے لئے

استعمال بھی کرتی ہے۔

بنی اسرائیل پر جو گزری اس کی پوری داستان اللہ تعالیٰ نے امت کو سنائی۔کس طرح وہ ملعون ہوئے' راندہ درگاہ ہوئے' سنگ دل بن گئے اور انہوں نے کتاب اللہ میں کیا کیا تحریفیں کیں' انہوں نے اللہ کے ساتھ اپنے عہد و پیمان توڑے۔یہ سب داستان اس لئے بیان ہوئی کہ یہ امت اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کو نہ توڑے تاکہ اس کا انجام بھی وہ نہ ہو جائے جو اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کے ہر توڑنے والے کا ہوتا ہے۔ ہر اس شخص کا ہوتا ہے جو اپنی بات سے پھر جاتا ہے۔لیکن جب ان قرآنی تنبیہات سے امت مسلمہ نے غفلت برتی اور صحیح راستے کو چھوڑ کر غلط راستے پر پڑ گئی تو اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ سے انسانیت کی قیادت کا مقام منصب ضبط کر لیا اور قافلہ انسانیت میں یہ امت پیچھے چلنے والوں کی صف میں چلی گئی۔

جب تک یہ امت اپنے رب کی طرف رجوع نہ کرے گی' جب تک یہ اپنے عہد و پیمان پر پختگی سے قائم نہ ہوگی' اور جب تک معاہدے کی شرائط کو پورا نہ کرے گی' اس وقت تک اللہ کا وعدہ ان کے حق میں معطل رہے گا۔اگر وہ شرائط پوری کر دے تو اللہ تعالیٰ از سرنو اس امت کو تمکن فی الارض عطا کرے گا۔وہ پوری انسانیت کی قائد ہو جائے گی اور تب وہ لوگوں پر شاہد حق ہوگی۔اگر وہ یہ شرائط پوری نہ کرے گی تو وہ قافلہ انسانیت میں پیچھے چلنے والوں ہی میں رہے گی۔یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کے خلاف کبھی نہیں کرتا۔اس وقت جب یہ آیات نازل ہوئیں اللہ کی جانب سے اس کے نبی کے لئے درج ذیل ہدایات تھیں :

(فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۵:۱۳)) (پس جب یہ اس حال کو پہنچ چکے ہیں تو جو شرارتیں بھی یہ کریں وہ ان سے عین متوقع ہیں) لہٰذا انہیں معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو۔اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کی روش رکھتے ہیں یعنی آپ ان لوگوں کے ان تمام برے افعال کو معاف کر دیں۔یہ طریقہ احسان ہے۔وہ جو خیانتیں کرتے ہیں ان سے بھی صرف نظر کریں اور یہ بھی احسان ہے۔

یہ تو اس وقت کی بات تھی جب یہ سورت نازل ہو رہی تھی' بعد کے ادوار میں حالات ایسے ہو گئے کہ عفو و درگزر کی گنجائش ہی انہوں نے نہ چھوڑی اور نبی ؐ نے ان کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا اور اس کے بعد خلافت راشدہ کے دور میں ان کو پورے جزیرۃ العرب سے جلاوطن کر دیا گیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کو یہ بتاتے ہیں کہ عیسائیوں سے بھی اس نے عہد لیا تھا۔انہوں نے بھی اس عہد کو توڑ دیا۔اور نتیجتاً ان کو بھی اس نقض عہد کی سزا بھگتنی پڑی۔

(وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصٰرٰى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ، وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۵:۱۴)) (اسی طرح ہم نے ان لوگوں سے بھی پختہ عہد لیا تھا' جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں'

مگر ان کو بھی جو سبق یاد کرایا گیا تھا اس کا ایک بڑا حصہ انہوں نے فراموش کر دیا' آخر کار ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے دشمنی اور آپس کے بغض و عناد کا بیج بو دیا اور ضرور ایک وقت آئے گا جب اللہ انہیں بتائے گا کہ وہ دنیا میں کیا بناتے رہے ہیں)

یہاں ایک خاص انداز تعبیر ہے اور اس کے اندر ایک خاص اشارہ ہے۔ (وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصٰرٰى (۵: ۱۴)) "اس طرح ان لوگوں سے بھی عہد لیا تھا جنہوں نے کہا ہم نصاریٰ ہیں۔"

اس انداز کے اندر اشارہ یہ ہے کہ انہوں نے نصاریٰ ہونے کا دعویٰ تو کیا تھا' لیکن عملاً انہوں نے اس عہد کو پورا نہ کیا تھا۔ اس عہد و پیماں کی اساس یہ تھی کہ ہم اللہ کو صرف وحدہ لاشریک سمجھیں گے۔ لیکن انہوں نے اپنی گمراہی کا آغاز ہی اپنے اساسی عقیدہ توحید سے کیا۔ اس لائن پر وہ آگے بڑھ گئے اور یہی وہ سبق (حظ) تھا جو انہوں نے بھلا دیا حالانکہ یہ سبق انہیں اچھی طرح یاد کرایا گیا تھا۔ اور اس سبق کو بھلانے کے نتیجے میں وہ غلط راہ پر دور نکل گئے اور ان کے درمیاں فرقہ وارانہ اور گروہی اختلافات پیدا ہوئے اور پھر ان کے اندر بہت سے مذاہب اور مکاتب فکر پیدا ہو گئے۔ یہ مکاتب فکر اس قدر بڑھے کہ آج ان کا شمار ممکن نہیں ہے۔ قدیم زمانے میں بھی ان کے بے شمار فرقے تھے اور جدید دور میں بھی ان کے بے شمار فرقے ہیں۔ (اجمالی بحث عنقریب آئے گی) ان فرقوں کے درمیان اس قدر بغض و عداوت پیدا ہو گیا جس کی کوئی مثال تاریخ مذاہب میں نہیں ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ اختلافات قیامت تک رہیں گے اور اس لئے رہیں گے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے ہوئے اپنے عہد کا کوئی پاس نہ رکھا۔ انہوں نے اس سبق اور نظریہ حیات ہی کو بھلا دیا جو انہیں اچھی طرح یاد کرایا گیا تھا۔ آخرت میں جب ان کو اللہ وہ تفصیلات بتائے گا کہ اس دنیا میں وہ کیا کیا بناتے رہے ہیں تب ان کی جزاء کا وہاں ہی فیصلہ ہو گا۔ اس وقت اللہ کو ان کی تمام صنعت کاریوں کو ان کے سامنے رکھ کر ان کو خوب شرمندہ کرے گا اور پھر سزا دے گا۔

جو لوگ نصاریٰ (مددگار) ہونے کا دعویٰ کرتے تھے ان کے درمیان اس قدر اختلافات' تفرقہ بازی اور بغض و عداوت پیدا ہوئی جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ان کی تاریخ قدیم میں بھی اور جدید تاریخ میں بھی' جس کی حکایت اللہ تعالیٰ یہاں اپنی کتاب کریم میں فرماتے ہیں۔ ان فرقہ وارانہ جنگوں میں اس قدر خون بہا کہ اس قدر خونریزی ان کی ان تمام تاریخی جنگوں میں نہ ہوئی جو انہوں نے اپنی پوری تاریخ میں لڑیں۔ چاہے دینی عقائد سے پیدا ہونے والے اختلافات کے نتیجے میں یہ خونریزی ہوئی یا دینی سربراہی کے حصول کے لئے ہوئی یا سیاسی' اقتصادی اور اجتماعی اختلافات کے نتیجے میں ہوئی۔ یہ خونریز آویزش اس قدر طویل اور اس قدر گہری تھی کہ اس کے آثار صدیوں تک باقی رہے اور وہ زخم صدیوں بعد بھی مندمل نہ ہوئے اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو اصدق القائلین ہیں۔ یہ اختلافات قیامت تک رہیں گے اور ان کا سبب حقیقی صرف یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے اپنے عہد کو پس پشت ڈال دیا اور انہوں نے اس نظریاتی سبق کو بالکل بھلا دیا جو انہیں اچھی طرح یاد کرایا گیا تھا۔ اس عہد و پیمان کی پہلی دفعہ یہ تھی کہ وہ عقیدۂ توحید پر قائم رہیں گے' جس سے انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے اٹھنے کے بہت تھوڑے عرصے بعد ہی انحراف کر لیا تھا اور اس کے اسباب اور واقعات کی تفصیلات یہاں پیش کرنا مشکل ہے۔

(تفصیلات کے لئے دیکھئے محاضرات فی النصرانیہ 'ابو زہرہ اور فی ظلال القرآن پارۂ سوئم)

---ooo---

یہودیوں اور عیسائیوں کی جانب سے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد وپیمان کی خلاف ورزی اور اس پر کئے جانے والے تبصروں کا بیان یہاں تک پہنچ کر اب خطاب یہود و نصاریٰ دونوں سے ہے۔ دونوں کے سامنے اب حضرت محمدؐ کی رسالت کا اعلان کیا جاتا ہے کہ یہ رسالت تمہارے لئے بھیجی گئی ہے۔ جس طرح یہ رسالت امی عرب اقوام اور تمام جہان کے لئے ہے۔ دنیا کے سب لوگ اس رسالت اور دعوت کے مخاطب ہیں۔ سب کو اللہ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس آخری رسول پر ایمان لائیں۔ یہ بات اللہ کی جانب سے یہود و نصاریٰ دونوں کے ساتھ کئے ہوئے عہد وپیمان کی ایک دفعہ ہے' جیسا کہ ہم اس کی تفصیلات پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس نبی آخر الزماں نے بعض ایسی باتوں کے انکشافات بھی کئے ہیں جنہیں وہ چھپاتے تھے' حالانکہ وہ منکشف کردہ امور ان کے ہاں موجود کتابوں میں موجود تھے۔ انہوں نے ان باتوں کو نہایت ہی حفاظت میں خفیہ رکھا' جو ان کی جانب سے وعدہ خلافی تھی۔ کئی ایسی اور باتیں بھی تھیں کہ رسول خداؐ نے عفو و درگزر کرتے ہوئے ان کا انکشاف نہ کیا' اس لئے کہ اسلام کے جدید قانونی نظام میں ان کے بارے میں انکشافات کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کی بعض گمراہیوں اور انحرافات کا ذکر فرماتے ہیں جو انہوں نے اپنے صحیح اسلامی عقائد کے اندر کئے مثلاً نصاریٰ کا یہ قول کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم خدا ہیں اور یہودیوں کا یہ کہنا کہ وہ اللہ کے محبوب ہیں اور آخر میں بتایا جاتا ہے کہ اس آخری رسالت کے ان انکشافات اور اعلانات اور کھلی روشنی پھیلا دینے کے بعد تمہارے لئے اللہ اور انسانوں کے نزدیک کوئی حجت نہ رہے گی اور ان کے لئے اب یہ ممکن نہ ہو گا کہ وہ یہ کہہ سکیں کہ ہم پر چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک طویل دور گزر گیا تھا' اس لئے خدا تعالیٰ کی تعلیمات ہم بھول گئے اور معاملہ ہم پر مشتبہ ہو گیا۔

يَٰٓأَهْلَ الْكِتَٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ
كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَٰبِ وَيَعْفُوا عَن كَثِيرٍ
قَدْ جَآءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَٰبٌ مُّبِينٌ ﴿١٥﴾ يَهْدِى بِهِ اللَّهُ
مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَٰنَهُۥ سُبُلَ السَّلَٰمِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَٰتِ
إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِۦ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٦﴾ لَقَدْ كَفَرَ

الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ
شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ
جَمِيْعًا ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ
وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝17 وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰۗؤُا
اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ ۭ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۭ
يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَمَا بَيْنَهُمَا ۡ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝18 يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ
لَكُمْ عَلٰي فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَاۗءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۡ
فَقَدْ جَاۗءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝19

(اے اہل کتاب ' ہمارا رسول تمہارے پاس آگیا ہے جو کتاب الٰہی کی بہت سی ان باتوں کو تمہارے سامنے کھول رہا ہے جن پر تم پردہ ڈالا کرتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر بھی کر جاتا ہے ۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں ' سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے ۔

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے ۔ اے نبی " ان سے کہو کہ اگر خدا مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اس کو اس ارادے سے باز رکھ سکے ؟ اللہ تو زمین اور آسمانوں کا اور ان سب چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں ' وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے ۔

یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ان سے پوچھو 'پھر وہ تمہارے گناہوں پر تمہیں سزا کیوں دیتا ہے؟ درحقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان خدا نے پیدا کئے ہیں۔وہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے 'زمین اور آسمان اور ان کی ساری موجودات اس کی ملک ہیں اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔

اے اہل کتاب 'ہمارا یہ رسول ایسے وقت تمہارے پاس آیا ہے اور دین کی واضح تعلیم تمہیں دے رہا ہے جبکہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ ایک مدت سے بند تھا 'تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔سو دیکھو 'اب وہ بشارت دینے اور ڈرانے والا آگیا..... اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے)

اہل کتاب اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ ان کو اسلام کی طرف دعوت ایک ایسا نبی دے جو ان میں سے نہ ہو۔پھر یہ ان کو کب گوارا تھا کہ ان کے پاس نبی ایک ایسی امت سے آجائے جو ایک امی امت ہے اور جس کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو برتر اور ان کے مقابلےمیں اپنے آپ کو زیادہ عالم سمجھتے تھے۔اس لئے کہ وہ اہل کتاب تھے اور یہ عرب امی تھے۔جب اللہ تعالیٰ نے ان امیوں کو سربلند کرنا چاہا تو ان میں ایک نبی مبعوث فرمایا 'اسے خاتم النبیین اور آخری رسول قرار دیا اور اس کی رسالت کو خاتم الرسالات قرار دیا۔اسے تمام انسانیت کے لئے عام رسالت قرار دیا گیا۔اللہ نے ان ان پڑھ لوگوں کو تعلیم دی اور ایک مختصر عرصے میں وہ تمام انسانیت کے مقابلے میں سب سے اونچے علمی مقام پر فائز ہو گئے۔وہ اپنے تصورات اور اعتقادات کے لحاظ سے ترقی یافتہ اور اپنے طریقہ کار اور نظام حیات کے لحاظ سے سب سے زیادہ درست 'اپنے نظم ونسق اور قانون کے اعتبار سے سب سے زیادہ افضل اور اپنے اخلاق اور معاشرت کے لحاظ سے سب سے زیادہ صالح تھے۔اور یہ سب باتیں اس میں شامل ہیں کہ یہ ان پر اللہ کا فضل وکرم تھا۔یہ دین ان کو بطور انعام دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے دین پسند فرمایا تھا۔اگر عرب کے امیوں کو یہ نعمت نہ ملتی تو وہ ہرگز پوری انسانیت کے نگہبان نہ بن سکتے تھے۔اگر اس دین کو الگ کر دیا جائے پھر عربوں کے پاس اور کیا تحفہ ہے جو وہ اس انسانیت کو دیں گے۔

ان حالات میں اللہ تعالیٰ اہل کتاب کو پکارتا ہے۔یہ بات ریکارڈ پر لائی جاتی ہے کہ ان کو خصوصی طور پر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جارہی ہے۔اس رسول پر ایمان لانے اور اس کی مدد کرنے کی دعوت ان کو دی جارہی ہے۔اس عہد وپیمان کے عین مطابق جو ان سے لیا گیا تھا کہ وہ نبی آخر الزمان کی مدد اور نصرت کریں گے۔اللہ تعالیٰ یہ بات بھی ریکارڈ پر لاتا ہے کہ یہ رسول امی اللہ نے ان کے پاس بھیجا ہے۔وہ عربوں کا بھی رسول ہے۔اہل کتاب کے لئے بھی رسول ہے اور پھر پوری انسانیت کے لئے بھی رسول ہے۔اس لئے تم اس کی رسالت کا انکار نہیں کر سکتے اور نہ یہ کہہ سکتے ہو کہ آپ کی رسالت صرف عربوں کے لئے ہے یا یہ کہ اس رسالت میں اہل کتاب کو خصوصیت کے ساتھ کوئی دعوت نہیں دی گئی ہے۔

(يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (۵ : ۱۵) (اے اہل کتاب 'ہمارا رسول تمہارے پاس آگیا ہے جو کتاب الٰہی کی بہت سی

ان باتوں کو تمہارے سامنے کھول رہا ہے جن پر تم پردہ ڈالا کرتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر بھی کر جاتا ہے)

یعنی حضرت محمد ؐ تمہاری جانب ایک رسول ہیں اور تمہارے بارے میں اس کے فرائض میں یہ بات شامل ہے کہ تم نے صدیوں تک جن حقائق کو چھپایا' جو تمہاری کتابوں میں تھے' وہ ان کا کھل کر بیان کرے ۔ رازوں کا انکشاف کرے اور مجمل باتوں کی وضاحت کرے اور اس باب میں یہود و نصاریٰ دونوں برابر ہیں ۔ نصاریٰ نے تو دین کی پہلی اساس ہی کو چھپا دیا تھا یعنی عقیدۂ توحید کو ۔ اسی طرح یہودیوں نے کئی شرعی احکام کو چھپا دیا تھا ۔ مثلاً زانی کے لئے رجم کی سزا اور تمام لوگوں کے لئے سود کی حرمت ۔ نیز انہوں نے نبی آخر الزماں حضرت محمد ؐ کے بارے میں وارد ہونے والی بشارت کو بھی چھپا دیا تھا جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے (الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰاةِ وَالْاِنْجِیْلِ) ''وہ جسے وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں ۔'' اور یہ کہ رسول کریم ؐ نے بہت سی ایسی باتوں کو نہیں چھیڑا جو انہوں نے چھپائی تھیں ۔ لیکن چونکہ وہ اسلامی شریعت میں داخل نہ تھیں یعنی ان کو اللہ نے سابقہ شریعتوں کی دوسری چیزوں کی طرح منسوخ کر دیا' جو انسانی معاشروں سے متروک ہوگئی تھیں اگرچہ وہ کبھی مشروع تھیں لیکن انبیائے سابقہ کے چھوٹے چھوٹے معاشروں میں' جن کے لئے اس سے پہلے رسول بھیجے گئے تھے مگر محدود وقت کے لئے ۔ یہاں تک کہ یہ آخری اور آفاقی رسالت آگئی جو تمام انسانیت کے لئے تھی ۔ یہ آخری رسالت دنیا میں جم گئی اور اللہ نے اسے مکمل کر دیا اور اسے بطور نعمت لوگوں کے لئے مکمل دین کے طور پر پسند کر لیا ۔ اب اس کا فسخ' اس میں کسی قسم کی تبدیلی اور کسی قسم کی ترمیم ممنوع ہو گئی ۔

اب یہاں یہ بھی بیان کر دیا جاتا ہے کہ رسالت آخری کے اہداف کیا ہیں اور اس کی نوعیت کیا ہے اور یہ رسالت لوگوں کی زندگیوں میں کیا کیا تبدیلیاں لائے گی ۔

(---- قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِیْنٌ (۱۵) یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَیَهْدِیْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۱۶) (۵:۱۵-۱۶))

(تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں' سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے)

اس کتاب پر اس سے زیادہ نہ کوئی اور لفظ صادق آتا ہے' نہ اس سے زیادہ پوری طرح منطبق ہوتا ہے اور نہ اس سے زیادہ اس کی حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ یہ کتاب' قرآن' ایک نور ہے اور ایک نئی روشنی ہے ..... یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اسے ایک مسلمان اپنے دل' اپنے وجود' اپنی پوری زندگی' اپنے نقطہ نظر اور اپنی اقدار اور اپنے واقعات اور معاشرے کے تمام افراد کے بارے میں اچھی طرح محسوس کرتا ہے ۔ جونہی ایک مسلمان کے دل میں شمع ایمان روشن

ہوتی ہے وہ اپنے اندر ایک روشنی اور ایک نور محسوس کرتا ہے۔ اس نور سے اس کی شخصیت منور ہوتی ہے' وہ مطمئن ہو جاتی ہے۔ اس کے ماحول میں جو چیز بھی آتی ہے وہ منور ہو جاتی ہے۔ واضح ہو جاتی ہے' صاف صاف دکھائی دیتی ہے اور درست ہو جاتی ہے۔

انسان کی شخصیت کا نیچر' اس کی مٹی کی تاریکی' اس کے گوشت و پوست کی کثافت' اس کی شہوت و لذت کا جوش و خروش سب منور ہو جاتے ہیں۔ سب کے سب چمکتے ہیں' روشن ہو جاتے ہیں اور واضح ہو کر نکھر جاتے ہیں۔ مادیت کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ کثافت اور جوش میں لطافت اور ٹھنڈک آ جاتی ہے۔ انسان کی فکر و نظر سے غبار اور اجمال دور ہو جاتا ہے۔ اس کے اقدام سے تردد اور خلجان ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی جہت نظر سے حیرانی اور پریشانی دور ہو جاتی ہے۔ وہ مویشیوں کے راستے پر نہیں چلتا جس کی کوئی منزل ہوتی ہے نہ نشان منزل۔ اس کا راستہ واضح' سیدھا اور روشن ہو جاتا ہے۔ اس کا نصب العین واضح اور مقاصد حیات متعین ہو جاتے ہیں اور نفس انسانی اس راہ پر مطمئن ہو جاتا ہے۔

"یہ نور اور واضح کتاب ہے" یہ دونوں اوصاف نور اور مبین ایک چیز کے اوصاف ہیں اور یہ وہ کتاب ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آتے ہیں۔

(يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (٥:١٦)) (جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں' سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے)

اللہ نے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا ہے اور جو لوگ اللہ کی اس رضامندی اور پسند کے تابع ہوں گے اور اسے اپنے لئے پسند کریں گے تو اللہ ایسے لوگوں کو سلامتی کے راستوں پر ڈال دیتا ہے۔

یہ انداز اظہار قرآن پر سو فیصدی منطبق ہے اور قرآن اس بات کا نہایت ہی صحیح مصداق ہے کہ وہ سلامتی کا واسطہ ہے۔ اسلام ایک فرد کے لئے جو راہ متعین کرتا ہے وہ سلامتی کا راستہ ہے۔ وہ ضمیر کی سلامتی ہے' وہ عقل کی سلامتی ہے' وہ اعضاء کی سلامتی ہے۔ وہ گھر اور خاندان کی سلامتی ہے۔ وہ معاشرے کی سلامتی ہے' وہ بشریت و انسانیت کی سلامتی ہے۔ وہ اس زندگی کے ساتھ سلامتی ہے' وہ اس کائنات کے ساتھ سلامتی ہے' وہ اللہ رب کائنات کے ساتھ سلامتی' غرض ہمہ گیر اور ہمہ جہت سلامتی ہے جسے اس انسانیت نے نہ کبھی پایا ہے اور نہ کبھی پا سکے گی مگر صرف اسلامی نظام حیات میں' صرف اسلامی منہاج میں' صرف اسلامی شریعت کے قانون میں اور صرف اس معاشرے میں جو اسلامی شریعت اور اسلامی نظریہ حیات کی اساس پر قائم ہو۔

یہ عظیم سچائی ہے کہ اللہ اس دین کی طرف اس شخص کی راہنمائی کرتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوا ہو۔ اور وہ شخص ہوتا ہے جو خود بھی اللہ ہی کی مرضی کا خیال کرتا ہے اور اللہ ہی کی مرضی میں سلامتی کے راستے ہیں یعنی اسلام۔ سلامتی کے تمام راستے اسلام میں ہیں۔ اور اس سچائی کی گہرائی اور عمق کا ادراک وہی کر سکتا ہے جس نے جاہلیت قدیمہ

اور جاہلیت جدیدہ کے وہ تمام راستے دیکھے ہوں جو جنگ جدال کے راستے ہیں۔ اس حقیقت کی گہرائی کا ادراک وہی شخص کر سکتا ہے جس نے جاہلیت کی وجہ سے ضمیر کی گہرائیوں میں پیدا ہونے والی بے چینی کو خود دیکھا ہو اور اس کا مزا چکھا ہو۔ اسی طرح جس نے جاہلی رسم و رواج اور جاہلی نظامہائے حیات اور طور طریقوں سے پیدا ہونے والی بے چینیوں کو دیکھا ہو اور اس افراتفری کو دیکھا ہو جو یہ نظام انسانی زندگی کے معاملات میں پیدا کر دیتا ہے۔

ان آیات کے ساتھ سب سے پہلے جن لوگوں کو خطاب کیا گیا تھا وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ سبل السلام کا مفہوم کیا ہے کیونکہ جاہلیت میں رہ کر ان لوگوں کو اچھی طرح تجربہ تھا کہ سلامتی کیا چیز ہے؟ اس لئے وہ ذاتی طور پر سبل السلام کے مفہوم سے واقف تھے۔ وہ ذاتی طور پر اس کے مزے لے رہے تھے اس لئے کہ وہ جاہلیت کی اس نا آشنا زندگی سے نکلے تھے۔

اس وقت ہمیں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اسلام کے امن و سلامتی کے اس پہلو کا ادراک کریں کیونکہ ہمارے ارد گرد پھیلی ہوئی جاہلیت میں انسانیت ظلم و ستم کا شکار ہو رہی ہے۔ صدیوں سے ہر قسم کی جنگ برپا ہے' میدان میں بھی اور انسانی ضمیر میں بھی اور معاشروں کے اندر بھی۔

ہم لوگ جو اسلام کی سلامتی کے زیر سایہ تاریخ اسلام کے ایک دور میں زندگی بسر کر چکے ہیں اب اس سلامتی کو ترک کر کے' اس نہ ختم ہونے والی کشمکش اور جنگ میں داخل ہو گئے ہیں جس نے ہمارے دلوں اور ارواح کو توڑ پھوڑ دیا ہے' جس نے ہمارے اخلاق اور طرز عمل کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا ہے' جس نے ہمارے معاشرے اور ہماری اقوام کو تہس نہس کر دیا ہے' حالانکہ ہم بڑی سہولت سے دوبارہ اس سلامتی میں داخل ہو سکتے ہیں اس لئے کہ اس سلامتی کا پیغام ہمارے پاس محفوظ ہے۔ یہ اس وقت اپنا معجزہ دکھا سکتا ہے کہ جب ہم اللہ کی مرضی پر راضی ہو جائیں اور اپنے لئے اس کو پسند کر لیں کیونکہ اسے اللہ نے ہمارے لئے پسند کر لیا ہے۔

ہم اس وقت جاہلیت کے مصائب جھیل رہے ہیں حالانکہ اسلام ہمارے قریب ہے' ہمارے پاس ہے۔ ہم جاہلیت کی مسلسل جنگ اور بے امنی میں مبتلا ہیں۔ اگرچہ اسلام کی سلامتی ہماری دست رس میں ہے۔ کیا ہی برا سودا ہے جو ہم کر رہے ہیں کہ ہم ایک اعلیٰ چیز دے کر ایک ادنیٰ چیز خرید رہے ہیں۔ ہم گمراہی لے کر ہدایت چھوڑ رہے ہیں اور ہم امن و سلامتی دے کر جنگ اور بے امنی قبول کر رہے ہیں۔

ہم جو اس وقت تمام انسانیت کو جاہلیت کی ہمہ گیر اور متنوع جنگ و جدال سے نکال کر اسے امن و سلامتی کی راہ دکھا سکتے ہیں خود سخت انتشار کا شکار ہیں۔ ہم انسانیت کو جاہلیت کی بدامنی سے اس وقت نکال سکیں گے جب پہلے ہم خود اپنے نفوس کو جاہلیت سے نکال کر باہر لائیں۔ پہلے ہم خود اسلامی سلامتی کی چھاؤں میں پناہ لے لیں۔ جب ہم اللہ کی رضامندی کی چھاؤں میں داخل ہو جائیں۔ اور اس دین کے تابع ہو جائیں جو اللہ نے ہمارے لئے پسند کیا ہے تو ہم ان لوگوں میں داخل ہو جائیں گے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ سلامتی کی راہوں (سبل السلام) پر سیدھے گئے ہیں اور انہیں اللہ نے ان راہوں پر ڈالا ہے۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے الاسلام والسلام العالمی - الاسلام و مشکلات الحضارہ اور تفسیر فی ظلال القرآن پارہ دوئم تفسیر آیت ادخلوا فی السلم)

(وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ (۴: ۱۶)) "اور اپنے اذن سے ان کو

اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے۔" ...... جاہلیتیں سب کی سب اندھیرے ہیں۔ ان میں شکوک و شبہات کے اندھیرے ہوتے ہیں، ان میں خرافات، داستانوں اور تصورات کے اندھیرے ہوتے ہیں اور شہوت پرستی، میلانات اور رجحانات کے اندھیرے اور صحرا ہوتے ہیں، حیرانی، بے چینی اور وحشت اور سرگردانی کے اندھیرے ہوتے ہیں۔ لوگ اس میں درگاہ امن و سلامتی سے بہت ہی دور ہو جاتے ہیں۔ پھر اقدار میں اضطراب، حسن و قبح کے پیمانوں میں اضطراب اور حکومت کی ہدایات میں اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ اسلامی نظام کی روشنی ان تاریکیوں کے بالمقابل ہے اور روشنی بہرحال روشنی ہے جو اندھیروں میں دور سے نظر آتی ہے۔ اس میں عقل روشن، ضمیر روشن، شخصیت روشن اور زندگی اور اس کے تمام امور روشن ہوتے ہیں۔

(وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۱٦.٥)) "اور راہ راست کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔" یہ راستہ نفس انسانی کی فطرت کے ساتھ ساتھ سیدھا ہے اور ان قوانین کے ساتھ ساتھ جاتا ہے جن کی فطرت پر حکمرانی ہے۔ یہ راستہ اس کائنات کی فطرت کے بھی ساتھ ساتھ جاتا ہے اور جن نوامیس کے مطابق یہ کائنات جاری ہے، اس کے ساتھ بھی سیدھا جا رہا ہے۔ یہ راستہ سیدھا اللہ کی طرف جاتا ہے۔ نہ اس میں بھول بھلیاں ہے اور نہ اس میں موڑ ہیں۔ نہ اس میں مختلف پگ ڈنڈیاں ہیں اور نہ مختلف رجحانات ہیں۔

اللہ ہی ہے جس نے اس انسان اور اس کی فطرت کو پیدا کیا ہے۔ اس نے اس کائنات اور اس کے نوامیس کو پیدا کیا ہے۔ اسی نے پھر انسان کے لئے اسلامی نظام حیات وضع کیا ہے۔ وہی ہے جس نے اہل ایمان کے لئے یہ دین پسند کیا ہے۔ اس لئے یہ بات قدرتی اور واضح ہے کہ یہ نظام لوگوں کو صحیح اور سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرے۔ جبکہ تمام دوسرے نظام اور مناہج جو عاجز، جاہل اور فانی انسان نے بنائے ہیں وہ اس سے بالکل قاصر ہیں۔

اللہ عظیم ہے اور سچا ہے، اور دونوں جہانوں سے بے نیاز ہے۔ ان کی ہدایت سے اسے کوئی فائدہ ہے نہ ان کی ضلالت میں اس کا کوئی نقصان ہے لیکن وہ محض اپنی شفقت سے انہیں اس راستے پر لانا پسند کرتا ہے۔

یہ ہے صراط مستقیم۔ رہا یہ راستہ کہ اللہ مسیح ابن مریم ہے تو یہ کفریہ راہ ہے۔ یہ عقیدہ کہ یہود و نصاریٰ اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے محبوب ہیں تو یہ افتراء ہے اور اس پر کوئی دلیل ان کے پاس نہیں ہے۔ اہل کتاب میں یہ دونوں عقائد پائے جاتے تھے اور یہ دونوں عقیدے توحید کے خلوص میں ملاوٹ پیدا کرتے تھے۔ اور نبی آخر الزماں آئے ہی اس لئے ہیں کہ لوگوں کے غلط عقائد کو درست کریں۔ اور جو لوگ اصل حقیقت سے منحرف ہو کر ادھر ادھر ہو گئے ہیں انہیں صحیح راستے پر لے آئیں۔

(لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قُلْ فَمَن يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَن يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۗ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

(یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے۔ اے نبی " ان سے کہو کہ اگر خدا مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اس کو اس ارادے سے باز رکھ سکے؟ اللہ تو زمین اور آسمانوں کا اور ان سب چیزوں کا ملک ہے جو زمین اور آسمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں' جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی طرف سے جو عقیدہ لے کر آئے تھے وہ وہی عقیدہ توحید تھا جسے ہر رسول لے کر آیا۔ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کرنا وہ اقرار ہے جو ہر رسول نے کیا ہے لیکن اس صاف اور ممتاز عقیدے کے اندر تحریفات کر لی گئیں۔ یہ تحریفات اس وقت ہوئیں جب عیسائیت کے اندر بت پرستی داخل ہوئی اور عیسائیوں نے بت پرستی کے غلط مواد کو لاکر عقیدہ توحید کا جزء بنا دیا اور اس کو اس کے اندر اس قدر گڈمڈ کر دیا کہ عیسائیوں کے عقیدۂ توحید کا اصلی جوہر نکالنا ممکن ہی نہ رہا۔

عیسائیت کے اندر یہ انحرافات اچانک ایک ہی دفعہ نہیں آگئے۔ یہ شرکیہ عقائد آہستہ آہستہ عیسائیت کے اندر داخل ہوتے رہے۔ ایک ایک کر کے عیسائیوں کی مذہبی مجالس نے ان کو دین میں داخل کیا جو یکے بعد دیگرے منعقد ہوتی رہیں۔ عیسائیوں کے عقائد عجیب و غریب شکل اختیار کر گئے جن میں دیومالائی کہانیاں داخل ہو گئیں' جن کو سن کر انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ خود عیسائیوں میں سے اہل ایمان لوگوں کے لئے اس عقیدے کی تشریح مشکل ہو گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے بعد کچھ عرصے تک آپ کے شاگردوں اور متبعین کے اندر عقیدہ توحید رائج رہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات کے بارے میں جو اناجیل لکھی گئیں' ان میں سے ایک اہم انجیل' انجیل برناباس ہے۔ یہ انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ کہتی ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے رسول تھے۔ اس کے بعد ان کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ بعض نے یہ کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام رسولوں کی طرح ایک رسول تھے۔ بعض نے کہا کہ ٹھیک ہے وہ رسول ہیں لیکن ان کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں اس لئے کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن اس قول کے مطابق وہ اللہ کی مخلوق ہیں۔ بعض کا قول یہ تھا کہ وہ اللہ کے بیٹے تھے مگر مخلوق نہ تھے' بلکہ وہ باپ کی طرح قدیم تھے۔

ان اختلافات کو ختم کرنے کے لئے ۳۲۵ء میں بمقام نیقیا ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ۴۸ ہزار مذہبی لیڈر اور ۰۰ ، شامل ہوئے۔ ان کے بارے میں ایک مذہبی لیڈر جو تاریخ عیسائیت کے مشہور ماہریں' کہتے ہیں :

"یہ لوگ آراء و مذاہب میں مختلف تھے۔ بعض یہ کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ اور ان کی ماں اللہ کے علاوہ دو خدا ہیں۔ ان کو بربری کہا جاتا تھا اور عام طور پر ریمنین کے نام سے مشہور تھے۔ بعض یہ کہتے تھے کہ مسیح باپ سے اس طرح پیدا ہوئے جس طرح آگ کے ایک شعلے سے دوسرا شعلہ پیدا ہوتا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اصل شعلہ دوسرے جدا ہونے والے شعلے کی وجہ سے کم ہو گیا ہے۔ یہ قول سابلیوس اور اس کے متبعین نے اختیار کیا ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ مریم حاملہ نہیں ہوئی یعنی دس ماہ تک۔ حضرت عیسیٰ آپ کے پیٹ سے اس طرح ہو کر نکل آئے جس طرح پانی پرنالے سے نکل آتا ہے۔ اس لئے کہ کلمہ آپ کے کان میں داخل ہوا اور وہاں سے نکلا جہاں سے بچہ پیدا ہوتا ہے اور یہ عمل فوراً ہوا۔ یہ قول الیان اور اس کے ساتھیوں کا ہے۔ ان میں سے بعض کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ انسان تھے اور وہ

انسانی جوہر ہی سے پیدا ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ اللہ کی رحمت شامل ہو گئی اور اپنی مرضی سے اس میں حلول کر گئی اور اسی وجہ سے ابن اللہ کا لقب انہوں نے پایا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ جوہر قدیم ہے اور ایک ہے۔ وہ ایک اقنوم ہے جس کے تین نام ہیں۔ یہ لوگ کلمہ ' روح القدس پر ایمان نہیں لاتے۔ یہ پولس شمشاطی کا قول ہے۔ یہ انطاکیہ کا بشپ تھا۔ اور ان لوگوں کو بولیقانیوں کہا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض یہ کہتے تھے کہ یہ تین خدا تھے اور اب بھی ہیں۔ ایک صالح' لیک طالح اور ایک عادل۔ یہ قول لعین مرقیون اور اس کے ساتھیوں کا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ مرقیون حواریوں کا صدر تھا۔ یہ لوگ پطرس کو نہیں مانتے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو حضرت مسیح کو خدا سمجھتے تھے اور یہ پطرس کا عقیدہ تھا جسے پیغام بر کہا جاتا ہے۔ یہی عقیدہ تین سو اسی اسقفوں نے اختیار کیا تھا۔"

(محاضرات فی النصرانیہ شیخ ابو زہرہ)

شہنشاہ قسطنطین نے یہ آخری عقیدہ اپنا لیا جو حال ہی میں عیسائی بنا تھا اور عیسائیت کے بارے میں زیادہ علم نہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنی فوجوں کو مخالفین کے خلاف چھوڑ دیا۔ یہ لوگ جلاوطن کر دیئے گئے۔ خصوصاً ان لوگوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے قائل نہ تھے۔ وہ صرف باپ کو اللہ سمجھتے تھے اور حضرت عیسیٰ کو مخلوق اور ناسوتی سمجھتے تھے۔

تاریخ اقوام قبط کے مصنف اس فیصلے کے متن کے بارے میں لکھتے ہیں :

"یہ مقدس مجلس اور رسول کا کنیسہ ہر اس عقیدے کو حرام قرار دیتا جس میں یہ تسلیم کیا گیا ہو کہ ایک ایسا زمانہ تھا جس میں ابن اللہ موجود نہ تھا۔ اور یہ کہ ولادت سے پہلے وہ موجود نہ تھا۔ یہ کہ وہ عدم سے وجود میں آیا۔ یا یہ بیٹا ایسے مادے اور جوہر سے پیدا کیا گیا جو باپ سے الگ تھا۔ پھر یہ عقیدہ کہ اسے پیدا کیا گیا یا یہ کہ وہ تغیر پذیر ہے اور اس پر سایہ گردش طاری ہوتا ہے۔"

لیکن یہ مجلس عیسائیوں میں اہل توحید کو ختم نہ کر سکی اور ان میں سے آریوس کی شاخ قائم رہی۔ یہ شاخ قسطنطنیہ' انطاکیہ' بابل اور اسکندریہ اور پورے مصر پر قابض ہو گئی۔

اس کے بعد روح القدس کے بارے میں اختلافات شروع ہو گئے۔ بعض نے کہا کہ وہ بھی اللہ ہے۔ بعض نے کہا کہ وہ اللہ نہیں ہے۔ اس پر قسطنطنیہ کی پہلی مجلس ۳۸۱ میں منعقد ہوئی تاکہ ان اختلافات کو ختم کرے۔

اس مجلس میں اسکندریہ کے اسقف نے مقالہ پڑھا اور اس کے مطابق یہ فیصلہ دؤیمو ثاوس بطریق اسکندریہ کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک روح القدس اللہ کی روح کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور اللہ کی روح' اس کی زندگی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اگر ہم کہیں کہ روح القدس مخلوق ہے تو ہمارا قول یہ ہو گا کہ اللہ کی روح مخلوق ہے اور جب ہم اس کے قائل ہو گئے کہ اللہ کی روح مخلوق ہے تو ہم اس کے قائل ہو جائیں گے کہ اللہ کی زندگی مخلوق ہے اور جب ہم نے کہا کہ اللہ کی زندگی مخلوق ہے تو سارا عقیدہ یہ ہو جائے گا کہ اللہ زندہ نہیں ہے۔ جب ہم نے یہ عقیدہ اختیار کر لیا کہ اللہ زندہ نہیں ہے تو ہم نے کفر اختیار کر لیا۔ اور جو کافر ہو جائے اس پر لعنت واجب ہے۔"

یوں اس مجلس میں حضرت مسیح کی الوہیت کے بارے میں قطعی فیصلہ کر دیا گیا' جس طرح نیقیا کی مجلس میں اس بارے میں فیصلہ ہوا تھا۔ اس طرح باپ' بیٹے اور روح القدس پر مشتمل تثلیث ثابت ہو گئی۔ اس کے بعد ایک اور اختلاف

شروع ہوا۔ یہ اختلاف یہ تھا کہ طبیعت الٰہیہ اور طبیعت انسانی کے درمیان امتزاج کیسے ہوگیا یا لاہوت اور ناسوت کے اندر امتزاج کیسے ہوگیا؟ قسطنطنیہ کے پادری نسطور کی رائے یہ تھی کہ ایک اقنوم ہے اور ایک طبیعت ہے۔ اقنوم کی الوہیت باپ سے ہے اور اس کی نسبت باپ کی طرف ہوگی اور انسانی طبیعت مریم سے ولادت میں منتقل ہوئی اور مریم الٰہ نہ تھی اس لئے کہ وہ ایک انسان کی والدہ تھی وہ اللہ کی والدہ نہ تھی ۔۔۔۔ کے بیٹے لکھتے ہیں کہ مسیح جو لوگوں کے اندر آیا اور اس نے لوگوں کے ساتھ بات چیت کی :

"یہ انسان جو کہتا ہے کہ وہ مسیح ہے اور محبت کے ساتھ بیٹے سے متحد ہے اور کہا جاتا ہے وہ اللہ اور ابن اللہ ہے۔ یہ حقیقت میں نہیں ہے بلکہ یہ وہبی ہے۔"

پھر کہتا ہے :

"نسطور کا عقیدہ یہ تھا کہ ہمارا رب یسوع المسیح الٰہ نہ تھا۔ یعنی اپنی ذات کے اعتبار سے بلکہ ' وہ انسان تھا جو برکت اور نعمت سے پر تھا یا وہ ملہم من اللہ تھا تو اس نے کوئی غلطی نہیں کی ہے اور نہ اس نے کفریہ بات کی ہے۔"

اسقف روم نے اس کی رائے کی مخالفت کی' اسی طرح اسکندریہ کے صدر پادری نے اور انطاکیہ کے اسقفوں نے بھی مخالفت کی اس لئے انہوں نے ایک چوتھی مجلس پر اتفاق کیا۔ یہ مجلس افسس میں ۴۳۱ء میں منعقد ہوئی اس مجلس نے فیصلہ کیا جس طرح ابن بطریق کہتے ہیں :

"مریم اللہ کی والدہ ہیں اور حضرت مسیح سچے اللہ اور انسان ہیں اور وہ دو طبیعتوں کے ساتھ مشہور ہیں اور یہ دونوں ایک ہی اقنوم میں ایک ہوگئی ہیں۔" اس مجلس نے نسطور پر لعنت بھیجی۔

اس کے بعد اسکندریہ کے کنیسہ نے ایک نئی رائے اختیار کی۔ اس کے لئے پھر افسس میں ایک دوسری مجلس منعقد ہوئی اور اس نے فیصلہ کیا :

"مسیح ایک ہی طبیعت ہے جس میں لاہوت اور ناسوت جمع ہوگئے ہیں۔" لیکن اس رائے کو تسلیم نہ کیا گیا اور اس بارے میں شدید اختلاف جاری رہے۔ اس پر خلقدونیہ کی مجلس ۴۵۱ء میں منعقد ہوئی اس نے فیصلہ کیا : کہ مسیح کی دو طبیعتیں ہیں' ایک نہیں ہے۔ لاہوت ایک طبیعت ہے جو علیحدہ ہے اور ناسوت ایک جدا طبیعت ہے۔ اور دونوں کا التقاء مسیح کی ذات میں ہوگیا ہے۔" ان لوگوں نے افسس کی مجلس دوئم پر لعن طعن کیا۔

لیکن مصریوں نے اس مجلس کے فیصلوں کو تسلیم نہ کیا۔ اس کے نتیجے میں مصر کے مذہب متوفیسیہ اور ساہی مذہب جو قیصر روم کی حکومت کا پروردہ تھا' کے درمیان خونریز اختلافات ہوئے جس کے بارے میں اس سے پہلے ہم آرنولڈ کے مقالے کا حوالہ دے چکے ہیں۔ دیکھئے اس کی کتاب "دعوت اسلامی"۔ آغاز سورہ آل عمران میں۔

ہمارا خیال ہے کہ الوہیت مسیح کے بارے میں اسقدر افکار باطلہ کے حوالے کافی ہیں کہ اس غلط عقیدے کی وجہ سے کس قدر خونریز فسادات ہوتے رہے اور کس قدر طویل عداوتیں ہوئیں اور کس قدر فرقے وجود میں آئے جو آج تک موجود ہیں۔

اس کے بعد آخری رسالت آتی ہے تاکہ وہ اس مسئلے کا سچائی کے ساتھ فیصلہ کر دے اور فیصلہ کے ساتھ ناقابل تردید بات کرے۔ چنانچہ آخری رسول آتا ہے اور وہ اہل کتاب کو صحیح عقیدے کی تلقین یوں کرتا ہے۔ "وہ لوگ بھی

کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ مسیح ابن مریم ہیں۔" اور "وہ لوگ بھی کافر ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تینوں کا ایک ہے" (تفصیلات آگے آ رہی ہیں)۔

اللہ تعالیٰ ان کو متوجہ کرتے ہیں کہ ذرا عقل سے تو کام لو اور ذرا واقعی صورت حالات پر بھی غور کرو (ان سے کہو کہ اگر خدا مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اس کو اس ارادے سے باز رکھ سکے؟)۔

اس طرح اللہ کی ذات' اس کی طبیعت' اس کی مشیت' اس کی قوت اور حضرت عیسیٰ کی ذات کے اندر مکمل طور پر جدائی کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح اس کی والدہ کی ذات اور تمام دوسری ذاتوں کو اللہ سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ نہایت ہی قطعیت اور نہایت ہی وضاحت کے ساتھ۔ یوں کہ اللہ کی ذات وحدہ لاشریک ہے۔ اس کی مشیت بے قید ہے۔ اس کی حکومت صرف اس کی ہے۔ کوئی بھی اس کی مشیت کو رد نہیں کر سکتا نہ اس کے احکام کو رد کر سکتا ہے۔ وہ مسیح ابن مریم' اس کی والدہ اور تمام باشندگان زمین کو ہلاک کر سکتا ہے۔ وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ وہ ہر چیز کا خالق ہے اور خالق لازماً مخلوق سے جدا ہوتا ہے اور ہر چیز اس کی مخلوق ہے۔

(وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۵:۱۷)) (اللہ تو زمین اور آسمانوں کا اور ان سب چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں' جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے)

یوں اسلامی عقیدہ صاف ہو کر خالص ہو جاتا ہے۔ نہایت ہی واضح اور نہایت ہی سادہ اور وہ بے راہ روی' افکار پریشاں' بے حقیقت داستانوں اور بت پرستوں کے مقابلے میں جو اہل کتاب کے ایک گروہ کے عقائد کے ساتھ شامل تھے' ان کے تہ بہ تہ ڈھیروں کے مقابلے میں بالکل صاف اور معقول بن جاتا ہے اور اسلامی عقیدے اور نظریے کا پہلا خاصہ یعنی یہ کہ الوہیت اور حاکمیت صرف اللہ کے لئے ہے اور بندگی صرف اللہ کی ہوگی' بلاکسی شبہ' بلاکسی پیچیدگی اور بغیر کسی گرد و غبار کے دونوں حقیقتوں کے درمیان فیصلہ کن اور واضح فرق ہو جاتا ہے۔

یہودی اور عیسائی کہتے تھے کہ وہ اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں۔ (وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (۵:۱۸)) (یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں) انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے ابوت (والد ہونا) کا عقیدہ اپنایا' اگرچہ اس ابوت کے لئے وہ کئی تصورات کے قائل تھے۔ اگر وہ جسمانی ابوت نہ بھی مانتے ہوں روحانی ابوت کے وہ بہرحال قائل تھے۔ بہرحال جس قسم کی ابوت کے وہ قائل ہوں' اس کا پرتو عقیدہ توحید پر بہرحال پڑتا ہے اور اللہ کی الوہیت اور مسیح کی عبدیت کے درمیان فیصلہ کن فرق کمزور پڑ جاتا ہے اور جب تک اللہ اور بندوں کے درمیان واضح فرق نہ ہو اس وقت تک نہ عقائد درست ہو سکتے ہیں اور نہ زندگی درست راہ پر استوار ہو سکتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ وہ سمت متعین ہو جائے جس کی طرف تمام بندوں کا رخ ہو اور وہ اس ایک ہی سمت کی بندگی کریں اور اس قبلے اور ماخذ کا بھی تعین ہو جائے جس سے انسان اپنے لئے قانون اور تمدن کے اصول اخذ کریں

اور اس سے وہ اقدار حیات اور حسن وقبح کے پیمانے اخذ کریں۔ بغیر اس کے کہ ان جہات میں کوئی التباس اور باہم تداخل ہو یا بندے اور خدا کے اوصاف باہم گڈمڈ ہوں اور بندے اور خدا کے درمیان امتزاج کا کوئی تصور پیدا ہو۔ لہذا شرک صرف نظریاتی مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ شرکیہ عقائد کے نتیجے میں پوری زندگی کے اندر ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے۔

یہودیوں اور عیسائیوں نے جب یہ دعوے کیے کہ وہ اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں تو پھر ان تصورات کے لازمی نتیجے کے طور پر یہ عقیدہ بھی وہ رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے گناہوں پر کوئی عذاب نہ دے گا' اگرچہ وہ گناہ کریں۔ وہ آگ میں داخل نہ ہوں گے اور اگر داخل بھی ہوں تو وہ صرف چند دن آگ میں رہیں گے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ کا انصاف صحیح طرح کام نہ کرے گا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے بعض کے ساتھ خصوصی دوستانہ تعلق رکھتا ہے' اس لئے وہ ان کو کھلا چھوڑتا ہے کہ وہ اس زمین میں جو فساد چاہیں پھیلاتے پھریں۔ اور ان کو دوسرے مفسدوں کی طرح سزا نہ دی جائے گی۔ ہر انسان سوچ سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے تو اس کی وجہ سے کسی سوسائٹی میں کیا کیا فسادات ہوں گے اور یہ غلط نظریہ حیات کسی سوسائٹی میں کیسے کیسے اضطرابات پیدا کرے گا۔

یہاں اسلام اس غلط تصور پر ایک فیصلہ کن وار کر کے اس کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ اور ان تمام فسادات کا دروازہ بند کر دیتا ہے جس سے یہ فسادات کسی معاشرے میں داخل ہو سکتے تھے اور فیصلہ کرتا ہے کہ اللہ کے عدل میں کوئی رو رعایت نہیں ہے اور بجائے خود یہ عقیدہ بھی غلط ہے۔

(قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ ۖ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِمَّنْ خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ (۵:۱۸) (ان سے پوچھو' پھر وہ تمہارے گناہوں پر تمہیں سزا کیوں دیتا ہے؟ درحقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان خدا نے پیدا کئے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے' سزا دیتا ہے۔

اس کے ذریعے عقیدے اور ایمان کے زاویے سے ایک فیصلہ کن حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ ابن ہونے کا دعویٰ سرے سے باطل ہے بلکہ انبیاء اسی طرح کے مخلوق بندے ہیں جس طرح اور لوگ ہیں اور یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ اللہ کے ہاں عدالت اور انصاف اور سزا و جزاء اور مغفرت صرف ایک اصول کے مطابق ہے۔ اس میدان میں اللہ نے دو معیار نہیں رکھے۔ یہ اللہ کی مشیت کا کام ہے جس میں سزا بھی کچھ اسباب اور اصول کے مطابق ہوتی ہے اور خرابی کے لئے بھی اسباب اور اصول ہیں۔

یہ جزاء اور سزا نہ تو ذاتی تعلقات کے اصول پر ہوگی اور نہ ابن ہونے کی کوئی حقیقت ہے۔ اس کے بعد اس بات کو تکرار لایا جاتا ہے کہ اللہ ہی ہر چیز کا مالک ہے اور تمام چیزوں کو اس کی طرف لوٹنا ہے۔

(وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ (۵:۱۸) (زمین اور آسمان اللہ کی ساری موجودات اسی کی ملک ہیں' اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔

یقیناً مالک اپنے غلام سے علیحدہ ہوتا ہے۔ دونوں کی ذات میں فرق ہوتا ہے۔ اس کی مشیت جدا ہوتی ہے۔ اور تمام لوگ مالک کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اب یہ بیان اپنے اختتام کو پہنچتا ہے اور اہل کتاب کو ایک بار پھر دعوت دی جاتی ہے تاکہ ان پر حجت تمام ہو' ان کے لئے معذرت کا کوئی موقع نہ ہو۔ اہل کتاب کو ان کے انجام کے بالکل سامنے لاکھڑا کر دیا جاتا ہے بغیر کسی میل و غبار کے اور بغیر کسی پیچیدگی کے۔ ان کا انجام روشن ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

يَاهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ؗ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

(۱۹) (اے اہل کتاب' ہمارا یہ رسول ایسے وقت تمہارے پاس آیا ہے اور دین کی واضح تعلیم تمہیں دے رہا ہے جبکہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ ایک مدت سے بند تھا' تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ سو دیکھو' اب وہ بشارت دینے والا اور ڈرانے والا آگیا..... اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے)

اس فیصلہ کن مقابلے کی وجہ سے اب اہل کتاب کے پاس کوئی حجت نہیں رہتی کہ یہ رسول امی ان کی طرف نہیں بھیجا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يَاهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلُنَا (۵:۱۹) اے اہل کتاب ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا ہے۔

اور ان کی یہ حجت ختم ہو جاتی ہے کہ ایک طویل عرصہ گزر گیا کہ انہیں کوئی یاد دہانی نہیں کرائی گئی' نہ کوئی بشارت دی گئی ہے اور نہ کوئی ڈراوا ان تک پہنچا ہے اس لئے ہم بھول گئے اور بے راہ روی اختیار کر لی۔ اب ان کے پاس بشیر و نذیر آچکا ہے۔

یہاں ان کو یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ اللہ کو کوئی چیز بھی شکست نہیں دے سکتی۔ اور اس کے لئے یہ بات بھی کوئی مشکل نہیں ہے کہ وہ امیین میں سے رسول بھیج دے اور یہ بات بھی اسے عاجز نہیں بنا سکتی کہ وہ اہل کتاب کا ان گناہوں پر مواخذہ کرے جن کا وہ ارتکاب کرتے ہیں۔

(وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۵:۱۹)) (بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے) اہل کتاب کے ساتھ یہ نشست اب ختم ہوتی ہے' جس میں ان کے تمام انحرافات اور بے راہ رویاں کھل کر سامنے آجاتی ہیں جن کے مطابق انہوں نے اپنے صحیح دین کو ترک کر دیا جو خود ان کی قوم کے رسول لے کر ان کے پاس آئے تھے ان اعتقادی تصورات کا بھی فیصلہ کر دیا جاتا ہے' جو اللہ نے اہل ایمان کے لئے پسند فرمائے ہیں اور نبی ؐ کے بارے میں انہوں نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ باطل ہو جاتا ہے اور قیامت میں وہ جو عذر لنگ پیش کر سکتے تھے اللہ نے دنیا ہی میں اس کا راستہ بند کر دیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ ایک طرف ان کو راہ ہدایت کی طرف دعوت دیتے ہیں اور دوسری جانب اسلامی صفوں کے اندر ان کی ریشہ دوانیوں کی راہ بند ہو جاتی ہے۔ جماعت مسلمہ کی راہ روشن ہو جاتی ہے اور تمام طالبان ہدایت کو سیدھی راہ صاف صاف نظر آنے لگتی ہے۔

اس سبق کے آخر میں بات اس طرف رخ کرتی ہے کہ بنی اسرائیل کا رویہ اپنے نبی اور نجات دہندہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا رہا اور یہ رویہ انہوں نے عین اس وقت اختیار کیا جب وہ اس سرزمین کی دہلیز پر تھے جس کا وعدہ ان کے ساتھ خود اللہ تعالیٰ نے کیا تھا اور اس طرح انہوں نے خود اپنے رب کے ساتھ جو پیمان کیا تھا' اس کا حشر انہوں نے کیا کیا؟ کس طرح انہوں نے اسے توڑا' اور اس نقض عہد پر پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں کیسی سزا دی؟

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ
جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا
مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۝۲۰ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ
وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ۝۲۱ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّ فِيْهَا
قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖۗ وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا
مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ۝۲۲ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ
عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ۬ وَ عَلَى
اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝۲۳ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا
مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۝۲۴
قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَ اَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ
الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ۝۲۵ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ

یَتِیْھُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۶﴾

(یاد کرو جب موسیٰ ؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "اے میری قوم کے لوگو' اللہ کی اس نعمت کا خیال کرو جو اس نے تمہیں عطا کی تھی۔ اس نے تم میں نبی پیدا کئے' تم کو فرمانروا بنایا' اور تم کو وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا۔ اے برادران قوم' اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ' جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے' پیچھے نہ ہٹو ورنہ ناکام و نامراد پلٹو گے۔" انہوں نے جواب دیا "اے موسیٰ' وہاں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں' ہم وہاں ہرگز نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں اگر وہ نکل گئے تو ہم داخل ہونے کے لئے تیار ہیں۔" ان ڈرنے والوں میں دو شخص ایسے بھی تھے جن کو اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ان جباروں کے مقابلے میں دروازے کے اندر گھس جاؤ' جب تم اندر پہنچ جاؤ گے تو تم ہی غالب رہو گے' اللہ پر بھروسہ رکھو' اگر تم مومن ہو۔" لیکن انہوں نے پھر یہی کہا کہ "اے موسیٰ' ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں موجود ہیں بس تم اور تمہارا رب دونوں جاؤ اور لڑو' ہم یہاں بیٹھے ہیں۔" اس پر موسیٰ نے کہا "اے میرے رب' میرے اختیار میں کوئی نہیں مگر میری اپنی ذات یا میرا بھائی' پس تو ہمیں ان نافرمان لوگوں سے الگ کر دے۔" اللہ نے جواب دیا "اچھا تو وہ ملک چالیس سال تک ان پر حرام ہے' یہ زمین میں مارے مارے پھریں گے' ان نافرمانوں کی حالت پر ہرگز ترس نہ کھاؤ")۔

یہ بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک حصہ ہے اور اسے یہاں تفصیل سے لیا گیا ہے۔ یہ تفصیلات جس حکمت کے تحت دی گئی ہیں اس کے کئی پہلو ہیں۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ بنی اسرائیل ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے دعوت اسلامی کی مخالفت کی' اس کے خلاف سازش کی' مدینہ میں اس کے خلاف بر سرپیکار رہے اور پورے جزیرۃ العرب میں اس کے ساتھ محاربت کرتے رہے۔ وہ پہلے ہی دن سے جماعت مسلمہ کے خلاف بر سرجنگ تھے۔ انہوں نے مدینہ میں نفاق پیدا کیا اور منافقین کی پرورش کرتے رہے۔ یہ لوگ ان منافقین کی امداد کرتے رہے اور یہ امداد اسلامی نظریہ حیات کے خلاف بھی تھی اور مسلمانوں کے خلاف بھی۔ انہوں نے مشرکین کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا' ان کے ساتھ لمبے چوڑے وعدے کئے اور ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیں۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف افواہ سازی کا کام کیا' خفیہ ریشہ دوانیاں کیں' مکاریوں سے کام لیتے رہے اور اسلامی صفوں میں بے چینی پیدا کرتے رہے۔ انہوں نے شکوک و شبہات بھی پھیلانے کی کوشش کی۔ اسلامی عقائد میں بھی اور اسلامی قیادت کے خلاف بھی اور کچھ عرصہ بعد یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف پوری طرح کھل کر سامنے آگئے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ جماعت مسلمہ کے سامنے ان کی پوری حقیقت کو کھول کر رکھ دیا جائے تاکہ اسے معلوم ہو کہ اس کے دشمن کس قماش کے لوگ ہیں' ان کا مزاج کیا ہے' ان کی تاریخ کیا ہے' ان کے وسائل عداوت کیا ہیں اور اس معرکے کی نوعیت کیا ہے جو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف برپا کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم تھا کہ یہ لوگ آنے والی پوری اسلامی تاریخ میں ملت اسلامیہ کے دشمن رہیں گے' جیسے

اسی طرح جس طرح یہ لوگ خود اپنی تاریخ میں ہمیشہ حق کے دشمن رہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی تاریخ ملت اسلامیہ کے سامنے رکھ دی اور اچھی طرح کھول کر رکھ دی اور ملت اسلامیہ کے خلاف یہ لوگ جو ذرائع کام میں لاتے تھے وہ بھی ان کے سامنے رکھ دیئے۔

اس حکمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بنی اسرائیل اس دین کے حامل تھے جو حضرت محمد ؐ کے آخری دین سے پہلے سچا دین تھا اور اسلام سے قبل بنی اسرائیل ایک طویل تاریخ رکھنے والی ملت تھے۔ ان کے عقائد میں انحراف واقعہ ہو گیا تھا اور انہوں نے اس عہد و پیمان کی بار بار خلاف ورزی کی تھی جو انہوں نے اللہ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس نظریاتی انحراف اور اس عہد کی خلاف ورزی کی وجہ سے ان کی زندگی پر برے اثرات مرتب ہو گئے تھے اور ان تمام امور کا تقاضا یہ تھا کہ امت مسلمہ ان کی پوری تاریخ سے آگاہ ہو کیونکہ وہ اس سے قبل کی تمام رسالتوں کی امین اور وارث ہے اور ربانی نظریہ حیات اور صحیح عقائد کی نگہبان ہے۔ ان وجوہات کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ امت مسلمہ کو ان تمام تاریخی انقلابات کا علم ہو اور اس کو معلوم ہو کہ کہاں کہاں ان لوگوں نے ٹھوکر کھائی اور اس کے کیا نتائج نکلے۔ بنی اسرائیل کی زندگی اور ان کے اخلاق پر اس کے کیا نتائج مرتب ہوئے تاکہ اس تجربے کی وجہ سے تحریک اسلامی ان مقامات میں سنبھل کر چلے جہاں ٹھوکریں لگتی ہیں' جہاں سے شیطان حملہ آور ہوتا ہے اور جہاں سے انحراف شروع ہوتا ہے تاکہ ان تاریخی تجربات کے نتیجے میں وہ صحیح راہ پر گامزن رہے۔

اور اس حکمت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل کے تجربات کے کئی پہلو تھے۔ یہ بہت طویل تجربات تھے اور اللہ تعالیٰ کو اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ جب اقوام و ملل پر ایک طویل عرصہ گزر جاتا ہے تو وہ سنگدل ہو جاتی ہیں اور ان کی بعد کی نسلیں اصل راہ سے ہٹ جاتی ہیں اور یہ کہ امت مسلمہ کی تاریخ قیام قیامت تک طویل رہے گی اور اس پر ایسے ادوار آئیں گے جن میں وہ بعینہ بنی اسرائیل جیسے حالات میں مبتلا ہو جائے گی۔ اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ تاریخ اسلام میں پیدا ہونے والے قائدین اور تجدید و احیائے دین کرنے والے مجددین کے سامنے بھی ایسے تجربات کے نمونے ہونے چاہئیں کہ اقوام و ملل کے اندر کس طرح انحراف اور گمراہی سرایت کر جاتی ہے۔ ان مجددین کو معلوم ہونا چاہئے کہ جب بیماری کی تشخیص ہو جائے تو اس کا علاج کیسے ہو گا' اس لئے کہ ہدایت اور صراط مستقیم سے دور چلے جانے میں وہ لوگ بہت ہی سنگدل ہوتے ہیں جو جان بوجھ کر ایسا کریں۔ غافل' خام اور کم علم لوگ بہت جلد ہدایت قبول کرتے ہیں کیونکہ ان کے سامنے ایک جدید دعوت آتی ہے جو انہیں پسند آجاتی ہے اور وہ اسے قبول کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے اوپر سے گردو غبار جھاڑ لیتے ہیں' کیونکہ یہ ان کے لئے ایک نئی چیز ہوتی ہے۔ چونکہ یہ جدید دعوت ان کی فطرت کے لئے ایک نئی چیز ہوتی ہے اس لئے ان کی زندگی میں بہار آجاتی ہے۔ لیکن جن لوگوں کے سامنے پہلے دعوت آجاتی ہے' ان کے لئے دوبارہ وہ دعوت پرکشش نہیں ہوتی۔ نہ وہ ان کے اندر حرکت پیدا کرتی ہے نہ ان کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ یہ کوئی عظیم دعوت ہے' اور اسے سنجیدگی سے لینا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے زیادہ محنت اور طویل اور صبر آزما جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔

قصہ بنی اسرائیل کی تفصیلات کی حکمتوں میں سے یہ بہت اہم پہلو تھے' اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان قصص کو ہمیشہ تفصیلات کے ساتھ دیا ہے اس لئے کہ امت مسلمہ ان تمام عقائد کی وارث تھی۔ اسے اب انسانیت کی قیادت کے فرائض

سرانجام دیتے تھے۔ اس کے کئی اور پہلو بھی ہو سکتے ہیں لیکن یہاں ان اشارات سے زیادہ دینا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اس سبق میں ہم اس مجلس کی طرف واپس آتے ہیں۔

---ooo---

(وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖ یٰقَوْمِ اذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ وَ جَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا ۖ وَّ اٰتٰکُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ (۲۰) یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَۃَ الَّتِیْ کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِکُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ

(۲۱) (۵: ۲۰ - ۲۱)) (یاد کرو جب موسیٰ ﷺ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "اے میری قوم کے لوگو' اللہ کی اس نعمت کا خیال کرو جو اس نے تمہیں عطا کی تھی۔ اس نے تم میں نبی پیدا کیے' تم کو فرمانروا بنایا' اور تم کو وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا۔ اے برادران قوم' اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے' پیچھے نہ ہٹو ورنہ ناکام و نامراد پلٹو گے)۔

یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلمات کے اندر ایسا اشارہ پایا جاتا ہے کہ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کی قوم اس جہاد کے سلسلے میں متردد ہے اور انہیں خطرہ تھا کہ وہ الٹے پاؤں پھر جائے گی۔ انہوں نے بنی اسرائیل کے مصر سے واپسی کے طویل سفر کے اندر اچھی طرح تجربہ کر لیا تھا کہ یہ لوگ بار بار نافرمانی کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو مصر سے نکالا تھا اور ان کو اس ذلت اور بدبختی کی زندگی سے آزاد کیا تھا' جس میں عرصہ غلامی مصر میں وہ مبتلا تھے۔ یہ آزادی انہیں اللہ کے نام پر ملی تھی اور اللہ تعالیٰ کی قوت قاہرہ نے ان کے لئے سمندر کو چیر دیا تھا اور اس میں فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا تھا۔ اس کے بعد جب وہ ایک ایسی قوم سے ہو کر گزرے جو بتوں کی پوجا کرتی تھی۔ تو انہوں نے فوراً مطالبہ کر دیا تھا کہ اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایسا ہی الٰہ بنا دو جیسا کہ ان لوگوں کا الٰہ ہے (یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰـھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ) اور جب حضرت موسیٰ ﷺ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مقررہ میعاد پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ سرگوشی کے لئے کوہ طور پر چلے گئے تو پیچھے سے سامری نے ان زیورات سے جو آتے ہوئے ان کی عورتوں نے مصریوں کی عورتوں سے چرا لئے تھے' ایک بچھڑا بنا دیا۔ یہ بچھڑا ایسا ہی آواز کرتا تھا جس طرح ایک بچھڑا آواز کرتا ہے۔ یہ لوگ اس بچھڑے پر ٹوٹ پڑے اور کہا کہ یہ تو وہی خدا ہے جس کی ملاقات کے لئے حضرت موسیٰ کوہ طور پر چلے گئے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک واضح معجزہ یہ تھا کہ انہوں نے ان کے لئے تپتے ہوئے صحرا کے اندر سے ایک پتھر سے ۱۲ چشمے نکالے۔ ان پر من اور سلویٰ جیسے طعام نازل ہوئے جو نہایت ہی لذیذ تھے لیکن انہوں نے ان لذیذ و مفید کھانوں کو چھوڑ کر ان کھانوں کا مطالبہ کر دیا جو مصر میں وہ کھاتے تھے حالانکہ وہاں وہ بڑی ذلت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہاں انہوں نے ساگ' ترکاری' گیہوں' لہسن اور پیاز کا مطالبہ کیا اور اس کھانے پر صبر نہ کیا جو ان پر نازل ہو رہا تھا حالانکہ وہ عزت' اخلاص اور اعلیٰ مقاصد کے لئے کام کر رہے تھے۔ حضرت موسیٰ ان کو ان اعلیٰ مقاصد کی طرف کھینچ لا رہے تھے

اور وہ پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو گائے کے معاملے میں بھی آزمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا اور وہ اس میں پس و پیش اور بہانہ بازی کرتے اور مدت تک اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے۔ اور بالآخر مجبور ہو کر انہوں نے اس حکم پر عمل کیا لیکن وہ کرنے والے نہ تھے۔

(فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ) پھر انہوں نے ان کا تجربہ اس وقت بھی کیا تھا جب وہ کوہ طور سے واپس ہوئے اور ان کے پاس وہ تختیاں تھیں جن میں وہ میثاق اور عہد تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان سے لیا تھا۔ انہوں نے اس عہد سے انکار کر دیا اور عہد شکنی پر ثابت قدم رہے۔ ان انعامات اور ان کے جواب میں ان نافرمانیوں اور اس کے بعد اس پر پھر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کی معافی کے باوجود پھر بھی انہوں نے اس عہد کو تسلیم نہ کیا اور اللہ تعالیٰ کو ان کے سروں پر پہاڑ اس طرح لٹکانا پڑا جس طرح کہ بادل کا ایک ٹکڑا ہو اور وہ اس حالت میں آ گیا کہ انہوں نے یقین کر لیا کہ اب یہ ان کے اوپر گرنے ہی والا ہے۔ (وَظَنُّوْا اَنَّهٗ وَاقِعٌ بِهِمْ) حضرت موسیٰ ﷺ نے اس طویل سفر آزادی میں ان کو اچھی طرح آزمایا تھا۔ آپ ان کو لے کر ارض مقدس کی دہلیز تک آ پہنچے تھے جس کا وعدہ ان کے ساتھ خود اللہ نے کیا تھا اور اس زمین کے لئے ہی وہ مصر سے نکلے تھے۔ وہ زمین جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے عہد کیا تھا کہ یہ لوگ اس میں بادشاہت قائم کریں گے اور اللہ اس میں پھر ان پر انبیاء بھیجے گا تاکہ وہ اللہ کی نگرانی اور قیادت میں زندگی کے بہترین دن گزاریں۔

حضرت موسیٰ نے ان کو اچھی طرح آزمالیا تھا' اس لئے ان کا یہ حق تھا کہ وہ ایک بار پھر ان کی جانب سے بدعہدی سے ڈریں۔ یہی وجہ ہے کہ اس آخری دعوت میں حضرت موسیٰ نے ان کے سامنے وہ تمام باتیں رکھ دیں جو ان کی سابقہ تاریخ میں سے قابل ذکر تھیں اور ان کے سامنے وہ تمام بشارتیں رکھ دیں جو مستقبل میں ان کو حاصل ہونے والی تھیں۔ ان کے سامنے وہ تمام امور رکھ دیئے جن سے ان کے حوصلے بڑھ سکتے تھے اور وہ سخت سے سخت ڈراوا بھی رکھ دیا :

(وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (۲۰) يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ (۲۱)

(اے میری قوم کے لوگو' اللہ کی اس نعمت کا خیال کرو جو اس نے تمہیں عطا کی تھی' اس نے تم میں نبی پیدا کئے' تم کو فرمانبردار بنایا اور تم کو وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا۔ اے برادران قوم اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے' پیچھے نہ ہٹو ورنہ ناکام و نامراد پلٹو گے) اللہ کا انعام اور وہ وعدے پورے ہو گئے۔ اللہ نے ان میں انبیاء بھیجے اور بادشاہ پیدا کئے۔ اس باب میں اللہ نے انہیں وہ کچھ دیا جو اقوام عالم میں کسی کو نہ دیا گیا تھا' تاریخ کے اس پوائنٹ تک' اور وہ ارض مقدس جسے فتح کرنے جا رہے تھے جو ان کے لئے لکھ دی گئی تھی۔ اور یہ تحریر اللہ کی تھی' لہٰذا اس کا پورا کیا جانا حق الیقین تھا۔ اس سے پہلے اللہ نے ان کے ساتھ جو بھی وعدے کئے تھے وہ ایک ایک کر

کے پورے کر دیئے گئے تھے اور یہ ایک ایسا وعدہ تھا جس کی طرف وہ بڑھ رہے تھے۔اس سے پیچھے ہٹنا ان کے لئے دنیا و آخرت کا خسران تھا..... لیکن بنی اسرائیل بہرحال بنی اسرائیل تھے۔بزدل' سست اور پیچھے کی طرف پلٹنے والے اور بار بار وعدہ خلافی کرنے والے :-

(قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ (۵:۲۲) (انہوں نے جواب دیا "اے موسیٰ' وہاں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں' ہم وہاں ہرگز نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ہاں اگر وہ نکل گئے تو ہم داخل ہونے کے لئے تیار ہیں)

یہاں آکر یہودیوں کی اصل فطرت سامنے آتی ہے' وہ بالکل ننگے ہو جاتے ہیں اور ان پر بالکل مہین سا پردہ بھی نہیں رہتا۔یہ اس لئے کہ اب وہ ایک حقیقی خطرے کے سامنے کھڑے تھے۔اب وہ کسی قسم کی ظاہرداری بھی نہ کر سکتے تھے۔نہ وہ جھوٹی بہادری کا مظاہرہ اور بڑھکیں مار سکتے تھے' نہ منافقت کر سکتے تھے۔خطرہ ان کی آنکھوں کے سامنے مجسم تھا اور قریب تھا۔اس لئے ان کو یہ بات بھی بچا نہ سکی کہ وہ اس سرزمین کے مالک ہیں اور یہ کہ اللہ نے وہ ان کی قسمت میں لکھ دی ہے' اس لئے کہ وہ تو نہایت ہی سستی فتح چاہتے تھے' جس کی انہیں کوئی قیمت ادا کرنی نہ پڑے نہ اس کی راہ میں کوئی جدوجہد کرنی پڑے۔وہ اس قدر آرام دہ فتح چاہتے تھے جو ان پر من اور سلویٰ کی طرح نازل ہو سکتے ہیں :

(---- قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ (۵:۲۲) لیکن فتح اور نصرت کی ذمہ داریاں وہ نہیں ہیں جو بنی اسرائیل کے ذہن میں تھیں۔ان کے دل تو ایمان سے فارغ تھے۔ان کے رجال مومن ان کو کہتے ہیں :-

(قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۵:۲۳) (ان ڈرنے والوں میں دو شخص ایسے بھی تھے جن کو اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا۔انہوں نے کہا کہ ان جباروں کے مقابلے میں دروازے کے اندر گھس جاؤ' جب تم اندر پہنچ جاؤ گے تو تم ہی غالب رہو گے' اللہ پر بھروسہ رکھو اگر تم مومن ہو)۔

یہاں آکر معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ پر بھروسے اور خدا خوفی کی قدر و قیمت کیا ہے؟ یہ دو شخص وہ تھے جو اللہ سے ڈرتے تھے اور ان کی خدا خوفی ان کے اندر اس قدر جرأت پیدا کر رہی تھی کہ وہ جباروں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔اور ان کے اندر ایک موہوم خطرے کے مقابلے میں بے مثال شجاعت تھی۔یہ دونوں یہ شہادت دیتے تھے کہ شدت اور خطرات کے اوقات میں ایمان اور یقین کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ان دونوں کا موقف یہ بتاتا ہے کہ اللہ سے ڈرنے والے لوگوں کا موقف جباروں سے ڈر کے مواقع پر کیا ہوتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کے دل میں دو ڈر نہیں ڈالتا کہ

ایک شخص اللہ جل شانہ سے بھی ڈرے اور وہ لوگوں سے بھی ڈرے۔پس جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔وہ کس جرأت سے کہتے ہیں۔

(ادْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غَالِبُونَ (۵:۲۳) (ان جباروں کے مقابلے میں دروازے میں گھس جاؤ۔جب تم اندر پہنچ جاؤ گے تو تم ہی غالب رہو گے) دلوں کی دنیا اور پھر معرکہ آرائی کی دنیا کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ اقدام کرو اور گھس جاؤ' جب تم کسی قوم پر خود ان کے گھر کے اندر جا پہنچے تو ان کے دل ٹوٹ جائیں گے اور اسی قدر تمہارے حوصلے بڑھ جائیں گے۔اس طرح ان لوگوں کی نفسیات کے اندر شکست داخل ہو جائے گی اور تمہارے لئے فتح مقدر ہو جائے گی۔

رہے اہل ایمان تو ان کا بھروسہ صرف اللہ پر ہوتا ہے۔(وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۵:۲۳) (اور صرف اللہ پر بھروسہ رکھو اگر تم مومن ہو) یہ ایمان کی خاصیت اور ایمان کی علامت ہے اور یہی ایمان کی منطق اور ایمان کا تقاضا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ دو مومن یہ بات کس سے کہہ رہے ہیں۔افسوس کہ ان کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں۔

(قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا أَبَدًا مَا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ (۵:۲۴) (لیکن انہوں نے پھر یہی کہا کہ "اے موسیٰ ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے' جب تک وہ وہاں موجود ہیں۔بس تم اور تمہارا رب' دونوں جاؤ اور لڑو ہم یہاں بیٹھے ہیں) یوں بزدل صفوں سے نکل جاتے ہیں اور شرمندہ ہو جاتے ہیں۔وہ خطرات سے ڈر کر پابزنجیر ہو جاتے ہیں' جس طرح گدھوں کے پاؤں باندھ دیئے جاتے ہیں اور پھر وہ کوئی اقدام نہیں کرتے۔بزدلی اور بے شرمی آپس میں متضاد نہیں ہیں نہ ایک دوسرے سے دور ہیں۔یہ اوصاف بعض اوقات اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ایک بزدل جب اپنے فرائض کی طرف آگے بڑھتا ہے تو وہ بزدلی دکھا کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔وہ اس طرح نکل جاتا ہے جس طرح اس نے فرض کو ترک کر دیا۔پھر وہ اس مقصد ہی کو برا کہتا ہے' اس دعوت کو بھی برا بھلا کہتا ہے' جو اس سے اس بات کا مطالبہ کرتی ہے جو وہ کرنا نہیں چاہتا۔

(فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ (۵:۲۴) (بس تم اور تمہارا رب دونوں جاؤ اور لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں) یہ تھی ایک کمزور اور بزدل کی عاجزی' اس کی زبان بہت ہی تیز ہے لیکن مقصد کی طرف بڑھنے کے لئے اس کے قدم بوجھل ہیں اور وہ تیروں کی چبھن محسوس کرتا ہے۔(فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ (۵:۲۴) (جاؤ تم اور تمہارا رب) اگر وہ اب ہمیں جنگ پر مجبور کرتا ہے تو ہم اس کی الوہیت کو قبول نہیں کرتے۔یہ تمہارا رب ہے۔(إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ (۵:۲۴) (ہم تو یہاں ہی بیٹھے ہیں) ہمیں نہ تو مملکت کی ضرورت ہے' نہ عزت کی ضرورت ہے' نہ ارض موعودہ کی ضرورت ہے۔اس وقت تک جب تک اس میں جبار قوم موجود ہے...... یہ تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عظیم جدوجہد کا انجام ---طویل سفر' اس میں ذلت و خواری' اور بنی اسرائیل کی جانب سے بار

بار انحراف، پہلوتہی اور قدم قدم پر نافرمانی...... یقیناً یہ ان کا انجام ہے کہ وہ ارض مقدس کی فتح سے الٹے پھرتے ہیں، حالانکہ حضرت موسیٰ ان کے ساتھ ہیں اور وہ اس سرزمین کی دہلیز پر ہیں۔ وہ اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان سے پھرتے ہیں۔ حالانکہ اس عہد قدیم کا اس عہد یعنی فتح بیت المقدس سے گہرا ربط تھا۔ اب حضرت موسیٰ اس مایوسی کے عالم میں کریں تو کیا کریں؟

(قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ (۵: ۲۵) (اس پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا "اے میرے رب، میرے اختیار میں کوئی نہیں مگر میری اپنی ذات یا میرا بھائی، پس تو ہمیں ان نافرمان لوگوں سے الگ کر دے۔"

یہ ایک ایسی پکار ہے جو رنج و الم سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں ایک طرف التجاء ہے تو دوسری جانب مکمل تسلیم و رضا ہے اور اس کے بعد فیصلہ کن پختگی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اچھی طرح علم تھا اور یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اب حضرت موسیٰ کا ان کے بھائی کے سوا اور کوئی کا حامی نہیں رہا ہے۔ حضرت موسیٰ ایک شرمندہ انسان کے ضعف اور ایک نبی جو کلیم اللہ ہے، اس کے ایمان کے بیچ میں کھڑے ہیں اور ایک راست باز مومن کی طرح عزم صمیم کئے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہے کہ صرف اللہ کی طرف متوجہ ہوں اور اس کے سامنے اپنے درد دکھ کا اظہار بشکل سرگوشی کریں اور یہ مطالبہ کریں کہ اے اللہ مجھے اجازت دے دے کہ میں اس فاسق قوم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاؤں اس لئے کہ جب انہوں نے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے اپنے پختہ عہد سے روگردانی اختیار کر لی تو اب ان کے ساتھ نبی کلیم کا تعلق ہی کیا رہ گیا ہے؟ وہ ان کے ساتھ بوجہ نسب نامہ مربوط نہ تھے، نہ یہ کہ ان کی تاریخ ایک ہے، نہ ان کا واسطہ ان کے ساتھ اس اساس پر تھا کہ انہوں نے ایک جگہ مل کر جدوجہد کی تھی اور رفیق کار تھے۔ ان کے درمیان رابطہ تو دعوت الی الحق کی اساس پر ہی تھا۔ ان کے درمیان رابطہ یہی عہد قدیم تھا اور یہ عہد انہوں نے توڑ ڈالا تھا۔ اس لئے ان کے درمیان مکمل قطع تعلق ہو گیا اور نہایت ہی گہرائی تک چلا گیا۔ اب حضرت موسیٰ اور ان کے درمیان کوئی رابطہ ہی نہیں رہا ہے۔ حضرت اپنے عہد و میثاق کے پابند ہیں اور قوم نے اس سے نافرمانی اختیار کر لی ہے۔ وہ عہد پر پختہ جمے ہوئے ہیں اور قوم اس سے برگشتہ ہو گئی ہے۔

یہ ہے حضرت موسیٰ کی جانب سے ادب اور احترام۔ اور یہی ہے ان کی سنت اور یہی ہے ایک سچے مومن کا منصوبہ۔ اور یہی ہے وہ اساس اور رابطہ جس پر لوگ جمع ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ اس راہ میں قوم، نسب، نسل اور مشترکہ تاریخ کچھ چیز نہیں ہے۔ اس میں اس زمین کے تعلقات میں سے کوئی تعلق کام نہیں دیتا۔ راہ میں جب نظریات کا تعلق ٹوٹ جائے تو تمام تعلقات ٹوٹ جاتے ہیں اور جب عقیدے جدا ہو جائیں تو راستے اور منہاج بھی جدا ہو جاتے ہیں۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی پکار کا جواب دیتے ہیں اور فاسقوں کو پوری پوری سزا دے دی جاتی ہے۔

(قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۚ یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَی

الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (٢٦) ع (اللہ نے جواب دیا "اچھا تو وہ ملک چالیس سال تک ان پر حرام ہے ' یہ زمین میں مارے مارے پھریں گے ' ان نافرمانوں کی حالت پر ہرگز ترس نہ کھاؤ۔")

اللہ تعالیٰ نے ان بدبختوں کو صحراؤں کے حوالے کر دیا حالانکہ وہ ارض مقدس کی دہلیز پر تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر وہ سرزمین حرام کر دی جو ان کے لئے لکھ دی گئی تھی اور راجح قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس وقت موجود نسل پر اس سرزمین کو حرام کر دیا تھا' اور جب تک ان کے نطفوں سے جدید نسل تیار نہ ہوئی وہ اسی طرح مارے مارے پھرتے رہے ۔ چنانچہ ان پر ارض موعود میں داخلہ اس وقت تک ممنوع رہا جب تک نئی نسل تیار نہ ہو گئی ' ایسی نسل جو نصیحت قبول کرتی ہو ' یہ نسل خالص صحرانوردی کی حالت میں تیار ہوئی اور یہ بالکل آزاد منش اور حریت پسند تھی ۔ یہ وہ نسل نہ تھی جسے ذلت ' غلامی اور مصریوں کے مظالم نے کمزوری کا خوگر بنا دیا تھا ۔ اس لئے وہ نسل اس کام کے لئے موزوں نہ تھی جو اولوالعزم لوگوں کا کام ہے ۔ ذلت ' غلامی اور ظلم انسان کی فطرت کو خراب کر دیتے ہیں ۔ اسی طرح ان چیزوں سے قوموں کی فطرت بھی خراب ہو جاتی ہے اس لئے کہ غلامی میں قوموں کے ضمیر بدل جاتے ہیں ۔

یہاں آکر بات ختم ہو جاتی ہے اور ان لوگوں کو صحرا کے حوالے کر دیا جاتا ہے ۔ اس پر مزید ان کے بارے میں یہاں کچھ نہیں کہا جاتا ۔ یہ ایک ایسا انداز ہے جس میں نفسیاتی عبرت آموزی اور فنی خوبصورتی دونوں ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں ۔ یہ قرآن کریم کا خاص انداز بیان ہے ۔

---ooo---

اس سبق کو مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا ' اللہ نے ان کے سامنے یہ پوری کہانی اسی انداز میں رکھ دی تھی جس طرح وہ پیش آئی تھی ۔ چنانچہ انہوں نے اپنے نبی سے کہا : اے محمد ! آج ہم وہ بات نہ کہیں گے جو بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہی تھی کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا لڑو تم دونوں ' ہم تو یہاں ہی بیٹھے ہیں ۔ ((فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (٥: ٢٤) (قرآن کریم کے انداز تربیت کے یہ بعض نمونے ہیں ۔ قرآن عام قصص کے انداز میں تربیت کرتا ہے ' یہ تھے قصہ بنی اسرائیل کے بیان کی حکمت کے بعض پہلو) ۔

---ooo---

درس نمبر ۴۸ ایک نظر میں

اس سبق میں انسانی زندگی کے لئے بعض نہایت ہی اساسی قوانین وضع کئے گئے ہیں وہ احکام جو جان کی حفاظت کے لئے ہیں۔ یہ احکام اس معاشرے کے لئے ہیں جس میں اسلامی نظام زندگی رائج ہو۔ ان قوانین کا مقصد اسلامی نظام زندگی کی حمایت اور اس نظام کے خلاف بغاوت کے راستوں کو بند کرتا ہے اور اس حکومت کو بچانا ہے جو اللہ کے حکم کے مطابق قائم ہو اور شریعت کے زیر سایہ کام کر رہی ہو۔ نیز اس سے اس سوسائٹی کا تحفظ مطلوب ہے جو شریعت اسلامی کے زیر سایہ اور ایک اسلامی حکومت کے زیر سایہ کام کر رہی ہو۔ ان احکام سے اسلامی حکومت کی رعایا کے مال اور جان دونوں کی حفاظت مطلوب ہے 'بشرطیکہ یہ معاشرہ' یہ حکومت اور یہ نظام اسلامی شریعت کے مطابق چل رہے ہوں۔

اس پورے سبق میں 'سوسائٹی کی اجتماعی زندگی کے بچاؤ کے سلسلے میں نہایت ہی اساسی احکام دیئے گئے ہیں لیکن اس سبق کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کے قصے سے کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ قتل و غارت کے اس جرم کے ارتکاب کے وقت مجرمین کی نفسیات کیا ہوتی ہیں۔ وہ کیا اسباب اور فیکٹر ہوتے ہیں جن کی وجہ سے مجرم جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ نیز اس سبق میں بتایا جاتا ہے کہ یہ جرم نہایت ہی گھناؤنا ہے اور یہ کہ اس کا تدارک اور سدباب کرنا نہایت ہی ضروری ہے۔ اس جرم کے مجرم کو سزا دینا بھی بہت ضروری ہے اور ان اسباب اور موثرات پر قابو پانا بھی ضروری ہے جس کی وجہ سے ایک شخص اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس قصے کے تمام اشارات مکمل طور پر ان احکام کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں جو اس قصے کے بعد آتے ہیں۔ ایک غور و فکر سے پڑھنے والا اس بات کو بسہولت محسوس کر سکتا ہے کہ اس سیاق کلام میں اس قصے کو لانے کا مقصد کیا ہے؟ اور وہ کس قدر عمیق اور تشفی بخش اشارہ ہے' جو یہ قصہ نفس انسانی پر انڈیلتا ہے اور اسے اس میں پیوست کر دیتا ہے۔ یہ قصہ انسان کے دل و دماغ کو ان احکام کو قبول کرنے کے لئے آمادہ کر دیتا ہے کہ وہ ان سخت سزاؤں کو قبول کرے جو اسلام محاربت اور جان کے خلاف جرائم اور نظام ملکیت کے خلاف جرائم کے لئے تجویز کرتا ہے اور انفرادی ملکیت کے خلاف جرائم کے لئے مقرر کرتا ہے۔ یہ سزائیں اسلامی نظام مملکت میں 'اسلامی عدالتوں کی طرف سے نافذ ہوں گی جو اسلامی شریعت کے مطابق کام کرتی ہیں۔

اسلامی معاشرے کا فرض ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی کو اسلامی نظام کے مطابق شریعت محمدیہ کے تحت چلائے۔ وہ اپنے معاملات' اپنے روابط اور تعلقات اسلامی نظام اور اسلامی قانون شریعت کے مطابق منظم کرے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے مطابق یہ معاشرہ ایک فرد کا کفیل بھی ہو گا' ایک جماعت کا بھی وہ کفیل ہو گا اور فرد اور سوسائٹی دونوں کو انصاف' سیکورٹی' اطمینان اور سکون عطا کر سکے گا۔ وہ ان تمام عناصر کے فساد کے دروازے بند کر سکے گا جو افراتفری'

بے چینی' دباؤ اور گھٹن پیدا کرتے ہیں اور وہ تمام اسباب ختم ہو جائیں گے جن کی وجہ سے معاشرے کے اندر ظلم و زیادتی ہوتی ہے۔اسی طرح لوگوں کی حاجات اور ضروریات بھی بڑی آسانی سے پوری ہو سکیں گی۔اسی طرح اس قسم کے باہم متکافل' متوازن' منصفانہ اور فاضلانہ معاشرے کے اندر کسی کی جان اور مال پر' کسی کی انفرادی ملکیت پر یا نظام مملکت کے خلاف اس قسم کے جرائم کا ارتکاب نہایت ہی بری حرکت اور سخت جرم سمجھا جاتا ہے۔اس کے لئے کوئی وجہ جواز یا عذر یا ایسے حالات نہیں ہوتے جو اس جرم کے لئے مخفف (Mit gating) ہوں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جرم اور مجرم کے خلاف اسلام کی جانب سے یہ سختی اس وقت کی جاتی ہے جب ایک فرد کے لئے صحیح راہ پر چلنے کے تمام مواقع فراہم کر دیئے جائیں' یعنی معتدل مزاج لوگوں کے لئے درست طور پر زندگی بسر کرنے کے حالات موجود ہوں اور ایسے حالات موجود ہوں کہ ایک فرد اور ایک جماعت اگر چاہیں تو پاکیزہ زندگی بسر کر سکتے ہوں۔ان تمام باتوں کے باوجود اسلامی نظام حکومت اور اسلامی نظام عدالت مجرم کو مکمل قانونی تحقیقات اور قانونی فیصلے کے حقوق دیتا ہے۔اگر ذرا بھی شبہ پیدا ہو جائے تو شبہات کی وجہ سے حدود ساقط کر دیئے جاتے ہیں۔نیز اس کے لئے توبہ کا دروازہ بھی کھلا چھوڑا جاتا ہے' جس کے مطابق بعض حالات میں اس کا جرم اس دنیا میں بھی معاف ہو سکتا ہے جبکہ آخرت میں اس کے تمام کے تمام جرائم اور گناہوں کو بہرحال اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں گے..... اس درس میں ہم اس کے تمام پہلو اور نمونے پائیں گے اور متعدد احکام اور قوانین کا ذکر ہو گا۔

لیکن آیات کی تفسیر اور براہ راست احکام پر کلام کرنے سے پہلے' اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک عام اور اہم بات یہاں نوٹ کر لی جائے یعنی وہ معاشرہ کیسا ہو گا جس میں یہ سخت قوانین نافذ ہوں گے اور قوت نافذہ کے لئے حدود و قیود کیا ہیں؟

اس سبق میں جو احکام اور قوانین وارد ہیں' چاہے ان کا تعلق ان جرائم سے ہو جو نفس کے خلاف ہوں یا ان احکام سے ہو جو نظام مملکت کے خلاف ہوں یا ان احکام سے ہو جو کسی کے مال کے خلاف ہوں' ان کی حیثیت ان دوسرے شرعی احکام جیسی ہی ہے جو جرائم' حدود' قصاص اور تعزیرات میں وارد ہیں۔یعنی یہ تمام احکام تب نافذ ہوں گے جب ان کی قوت نافذہ اسلامی معاشرے کی شکل میں' دارالاسلام میں موجود ہو۔لہٰذا ضروری ہے کہ شریعت کے مطابق دارالاسلام کی تعریف بھی کر دی جائے۔

اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک پوری دنیا دو بلاکوں میں تقسیم ہے اور ہم کوئی تیسرا بلاک تسلیم نہیں کرتے۔ پہلا بلاک دارالاسلام ہے اور اس سے مراد وہ مملکت ہے جس کے اندر اسلامی احکام نافذ ہوتے ہیں۔جس کا قانونی نظام شریعت پر مبنی ہو' چاہے اس کے باشندے سب کے سب مسلمان ہوں یا مسلمانوں اور ذمیوں دونوں پر مشتمل ہوں یا اس کے لوگ سب کے سب غیر مسلم ہوں اور حکمران مسلمان ہو اور اسلامی شریعت ملک کا قانون ہو اور فیصلے شریعت کے مطابق ہوتے ہوں۔(اگرچہ ذمی پر تمام احکام اسلامی شریعت لازمی نہیں ہیں' اسلام کے صرف سول اور فوجداری احکام لازم ہیں) یا صورت یہ ہو کہ تمام آبادی مسلم ہے یا مسلم اور غیر مسلم مشترکہ آبادی ہو لیکن اس ملک پر حربی غیر مسلموں کا قبضہ ہو جائے لیکن ملک کا قانونی نظام نہ بدلا گیا ہو اور ملک کے باشندے بدستور اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کرتے ہوں۔اس لئے کسی ملک کے دارالاسلام ہونے کا مکمل دارومدار صرف اس بات پر ہے کہ اس کا قانونی نظام شریعت کے

مطابق ہے یا نہیں اور یہ کہ اس کے اندر تنازعات کا فیصلہ شریعت پر ہوتا ہے یا کسی دوسرے قانون پر۔

دوسرا دارالحرب ہے اور دارالحرب ہر وہ ملک ہے جس میں اسلامی شریعت نافذ نہ ہو اور جس میں فیصلے شریعت کے مطابق نہ ہوتے ہوں۔ رہے اس کے باشندے تو وہ جس مذہب وملت کے پیروکار ہوں' چاہے وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوں' چاہے وہ اپنے آپ کو اہل کتاب کہتے ہوں' یا وہ دوسرے کفار ہوں وہ دارالحرب کے باشندے ہوں گے۔ اس لئے کسی ملک کے دارالحرب ہونے کا مدار بھی مکمل طور پر صرف اس بات پر ہے کہ اس کے اندر اسلامی قوانین کا نفاذ نہ ہو اور اس کے اندر عدالتوں میں فیصلے اسلامی شریعت کے مطابق نہ ہوں۔ ایسے ملک کو ایک مسلمان اور ایک اسلامی جماعت کے نقطہ نظر سے دارالحرب کہا جائے گا۔

مسلم معاشرہ وہ ہوتا ہے جو دارالاسلام میں قائم ہو' اپنے درج بالا مفہوم کے مطابق .... اور یہ اسلامی معاشرہ جو اسلامی منہاج کے مطابق ہو' جس پر شریعت اسلامی کی حکمرانی ہو وہ اس بات کا حقدار ہے کہ اس میں لوگوں کی جانوں کو تحفظ دیا جائے' اس میں لوگوں کے اموال کو تحفظ دیا جائے' اس کے نظام مملکت کو بچایا جائے اور اس میں اور صرف اس میں ان مجرموں پر یہ منصوص سزائیں جاری کی جائیں جن کا ذکر ان آیات میں ہو گا اور جو ان لوگوں کے خلاف نافذ ہوں جو لوگوں کی جان' مال اور مملکت میں خلل انداز ہو رہے ہوں۔ اس درس اور اس کے علاوہ دوسری قرآنی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت ہی بلند اور صاحب فضیلت معاشرہ ہو گا۔ اس میں عدل اور آزادیاں ہوں گی۔ اس معاشرے میں روزگار اور ضروریات زندگی کی ضمانت ہوگی چاہے کوئی کام کرنے پر قادر ہو یا معذور ہو۔ یہ ایک ایسا معاشرہ ہو گا جس میں بھلائی پر آمادہ کرنے والے عوامل زیادہ ہوں گے اور برائی پر آمادہ کرنے والے فیکٹر بہت ہی کم ہوں گے۔ اس لئے ایسے معاشرے کا ان تمام لوگوں پر حق ہو گا جو اس کے اندر رہتے ہیں اور اس سے نفع اندوز ہوتے ہیں کہ وہ اس معاشرے کی دل و جان سے حفاظت کریں اور وہ دوسرے باشندگان ملک کے تمام مالی' جانی' عزت کے اور اخلاق کے حقوق کی رعایت و حفاظت کریں۔ یہ تمام باشندے اس دارالاسلام کی حفاظت کریں جس میں وہ صحیح و سالم اور امن و امان سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ جس میں ان کو مکمل سیکورٹی حاصل ہے' جس میں ان کو تمام بنیادی حقوق حاصل ہیں اور جس میں ان کو تمام خصائص انسانی کے مراتب حاصل ہیں' جس میں ان کو تمام سوشل اور اجتماعی حقوق حاصل ہیں بلکہ تمام باشندوں کا فرض ہے کہ وہ ان تمام حقوق کی حفاظت کریں۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی دارالاسلام کے اس نظام کے مقابلے میں بغاوت پر اتر آتا ہے تو وہ ظالم' گناہ گار' شرپسند اور تخریب کار ہے اور اس بات کا مستحق ہے کہ اسے سخت سے سخت سزا دی جائے۔ لیکن اس میں بھی اسے یہ حقوق دیئے گئے ہیں کہ کسی کو محض ظن اور شبہے کی بنا پر نہ پکڑا جائے اور یہ اصول اس قانون پر بھی لاگو ہو گا کیونکہ شبہات کی وجہ سے حدود ساقط ہو جاتے ہیں۔

رہا دارالحرب جس کی تعریف اوپر کر دی گئی ہے تو وہ اور اس کے باشندے اس بات کے مستحق ہی نہیں ہیں کہ ان کو اسلامی شریعت کے اندر نافذ کردہ سزاؤں کا فائدہ دیا جائے' اس لئے کہ وہاں تو سرے سے شریعت کا نفاذ ہی نہیں ہوتا۔ نہ یہ معاشرہ اسلام کی حاکمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ پھر یہ دارالحرب ان مسلمانوں کو بھی تحفظ فراہم نہیں کرتا جو دارالاسلام میں رہتے ہیں اور جو اپنے ہاں اسلامی شریعت کو نافذ کرتے ہیں۔ ان دارالکفر اور دارالحرب والوں کے نزدیک مسلمانوں کی جان و مال مباح ہے۔ اس لئے اسلام کے نزدیک ایسے لوگوں کا کوئی احترام نہیں ہے الا یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ کسی کا

کوئی عہد ہو ' اور ان کے اور دارالاسلام والوں کے نزدیک معاہدے طے ہو جائیں - اسلامی شریعت یہ تمام سہولتیں جو دارالاسلام میں مسلمانوں کو حاصل ہیں ان افراد کو بھی فراہم کرتی ہے جو دارالحرب سے دارالاسلام کو ہجرت یا سفر کر کے آتے ہیں - جب وہ دارالاسلام میں معاہدۂ امن کے ساتھ داخل ہو جائیں اور اس میں عہد کی مدت طے ہو اور وہ دارالاسلام کے حدود کے اندر آجائیں جس کا حاکم مسلمان ہو اور مسلمان حاکم وہی ہوتا ہے جو دارالاسلام میں شریعت حقہ کو نافذ کرے -

---○○○---

درس نمبر ۴۸ تشریح آیات

۲۷ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۴۰

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا
فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ
اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾ لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا
بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّىْٓ اُرِيْدُ
اَنْ تَبُوْۗاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾
فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۭ
قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ
فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ ۔

(اور ذرا انہیں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بھی بے کم و کاست سنا دو۔جب ان دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی نہ کی گئی۔اس نے کہا "میں تجھے مار ڈالوں گا۔" اس نے جواب دیا "اللہ تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے۔اگر تو مجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہ

اٹھاؤں گا۔ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے اور دوزخی بن کر رہے۔ ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے۔" آخر کار اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل اس کے لئے آسان کر دیا اور وہ اسے مار کر ان لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔ پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تاکہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا "افسوس مجھ پر! میں اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر نکال لیتا۔" اس کے بعد وہ اپنے کئے پر بہت پچھتایا)۔

یہ ایک قصہ ہے جو بطور نمونہ شر اور ظلم یہاں لایا گیا ہے۔ یہ ایک ایسے صریح ظلم کا نمونہ ہے جس کے لئے کوئی وجہ جواز نہ ہو اور یہی قصہ ایک ایسا نمونہ بھی پیش کرتا ہے جو نیک نفسی اور رواداری کا اعلیٰ نمونہ ہے اور یہ نمونہ نہایت ہی پاک طینت اور صلح کل نمونہ ہے۔ اس قصے میں یہ دونوں نمونے ایک دوسرے کے بالمقابل پیش کئے جاتے ہیں۔ ہر ایک اپنے مزاج کے مطابق اور اپنی فطرت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ یہ قصہ اس جرم کی نقشہ کشی کرتا ہے' جو بدی اور صریح ظلم کا مظہر ہے اور اسے پڑھ کر انسانی ضمیر میں جوش آتا ہے اور وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ایسے صریح ظلم کے خلاف قانون قصاص ضروری ہے۔ ایک عادلانہ قانونی نظام ہی اس بدی کو صریح ظلم کے ارتکاب سے روکتا ہے جس کے بعد یہ بدی ظلم کے ارتکاب سے رک جائے گی اور اسے ارتکاب جرم سے خوفزدہ کر کے باز رکھا جا سکے گا۔ اگر اس تخویف کے بعد بھی بدی جرم کا ارتکاب کرتی ہے تو اسے منصفانہ سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہی سزا جو اس بدی کے جرم کے بالکل مناسب ہو' تاکہ معاشرے کے نیک نفس لوگوں کو بچایا جائے اور نیک نفس لوگوں کی جان و مال محفوظ ہوں اس کے لئے اس قصے میں جس قسم کے نیک نفس لوگوں کا نمونہ پیش کیا گیا ہے وہ اس کے مستحق ہیں کہ انہیں تحفظ دیا جائے' وہ زندہ رہ سکیں' امن سے رہیں اور ایک عادلانہ قانونی نظام و انتظام کے تحت رہیں۔

قرآن کریم نے ان دو بھائیوں کے نام اور زمان و مکان کے بارے میں تفصیلات نہیں دی ہیں' اگرچہ بعض روایات اس سلسلے میں ہابیل اور قابیل کے بارے میں وارد ہیں۔ یہ دونوں حضرت آدم کے بیٹے تھے اور ان کے درمیان تنازعہ کی تفصیلات بھی ان روایات میں دی گئی ہیں کہ ان دونوں کا تنازعہ دو بہنوں کے سلسلے میں تھا۔ لیکن ہم اس قصے کو اسی طرح مجمل چھوڑنے ہی کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ یہ تمام روایات قطعی الثبوت نہیں ہیں۔ یہ اہل کتاب سے لی گئی ہیں۔ یہ قصہ عہد قدیم میں آیا ہے جہاں دونوں کے نام بھی لئے گئے ہیں اور اس میں اس واقعہ کا زمان و مکان بھی دیا گیا ہے جیسا کہ روایات میں آتا ہے۔ اس قصے کے متعلق جو ایک صحیح حدیث وارد ہے اس میں بھی تفصیلات نہیں دی گئیں۔ یہ روایت حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ حضور ؐ نے فرمایا "کہ کوئی شخص بھی اگر ظلماً قتل ہو گا تو حضرت آدم کے پہلے بیٹے پر اس خون کی ذمہ داری میں سے ایک حصہ ہو گا کیونکہ اس نے سب سے پہلے قتل انسان کا رواج ڈالا" (روایت امام احمد) اس کا سلسلہ سند یہ ہے اعمش' عبداللہ ابن مرہ' مسروق' عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ' ابوداؤد کے سوا دوسرے محدثین نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ اس کے بارے میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت انسان کی زندگی کے ابتدائی دنوں میں پیش آیا۔ اور یہ قتل عمد کا پہلا واقعہ تھا اور قاتل کو اس قدر بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اب میت کو کس طرح دفنائے۔

اس قصے کو اسی طرح مجمل چھوڑنا جس طرح قرآن کریم میں آیا ہے' مقصد قصہ پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ جس غرض

کے لئے اسے لایا گیا ہے وہ اچھی طرح سے پوری ہو جاتی ہے اور اس کے اشارات و ہدایات پوری طرح سمجھ میں آجاتے ہیں - قصے کے جو بنیادی مقاصد ہیں' روایات کی تفصیلات ان پر کوئی چیز زیادہ نہیں کرتیں اس لئے ہم بھی اسے یہاں چھوڑ دیتے ہیں - نہ تفصیلات کی ضرورت ہے اور نہ اختصار کی -

(وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (۵:۲۷)

(اور ذرا انہیں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بھی بے کم و کاست سنا دو' جب ان دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی نہ کی گئی - اس نے کہا "میں تجھے مار ڈالوں گا" اس نے جواب دیا "اللہ تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے)-

یعنی ان لوگوں کو انسانوں کے ان دو نمونوں میں سے دونوں کی مثال پیش کرو' یعنی حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے ان واقعات کے بعد سچائی پر مبنی یہ دو نمونے ان کے سامنے رکھو - یہ قصہ اپنی روایت کے اعتبار سے بالکل سچا ہے اور یہ اس لحاظ سے بھی حق ہے کہ انسانی فطرت کے اندر یہ دو نمونے ہر زمان و مکان میں پائے جاتے ہیں - پھر یہ اس پہلو سے بھی حق ہے کہ یہ ایک منصفانہ نظام عدل کا تقاضا کرتا ہے جس سے شرپسند لوگ ارتکاب جرم سے باز آجائیں -

حضرت آدم کے ان دو بیٹوں کے حالات ایسے تھے کہ ان میں کسی ایک کا قتل کے لئے آمادہ ہو جانا اپنے اندر کوئی جواز نہیں رکھتا - یہ دونوں اللہ کے مطیع فرمان ہیں - دونوں قربانی کرتے ہیں - (اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا (۵: ۲۷) (جب دونوں نے قربانی کی) لیکن ہوا یہ کہ ایک سے قبول کی گئی اور دوسرے سے قبول نہ ہوئی - (فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ (۵: ۲۷)-

یہاں فتقبل میں فعل مجہول استعمال ہوا ہے - مطلب یہ ہے کہ قربانی کا قبول کیا جانا یا نہ کیا جانا' ایک ایسا معاملہ ہے جو غیبی قوت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اس کی کیفیت بھی غیبی ہے - غائب کا صیغہ استعمال کرنے کے دو فائدے ہیں - ایک یہ کہ ہمیں اس قبولیت اور عدم قبولیت کی کیفیت کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہے - تفاسیر میں ان آیات کی تشریح میں بہت سے قصے بیان کئے گئے ہیں اور یہ قصے عہد نامہ قدیم سے لئے گئے ہیں - دوسری بات یہ ہے کہ جس کی قربانی قبول ہوئی' اس نے کوئی جرم نہ کیا تھا کہ اس کے ساتھ عناد کیا جائے اور اس کے قتل کی سازش کی جائے' اس لئے کہ قربانی کی قبولیت میں اس کا کوئی دخل نہ تھا' بلکہ یہ قبولیت انسانی نقطہ نظر سے ایک غیبی قوت کی جانب سے ایک غیبی کیفیت کے مطابق ہوئی - یہ قوت ان دونوں کے ادراک سے وراء ہے اور اس کی مشیت بھی انسان کی مشیت سے وراء ہے - لہٰذا اس فعل پر اپنے بھائی کا گلا گھونٹنے کا اس کے پاس کوئی جواز نہ تھا یا یہ جواز بھی نہ تھا کہ بھائی کے قتل کے لئے کوئی جوش میں آجائے - اس معاملے میں قتل پر آمادہ ہو جانا کسی بھی سلیم الفطرت انسان سے مستبعد ہے کیونکہ معاملہ عبادت کا ہے اور قبولیت اور عدم قبولیت قوت غیبیہ کی طرف سے ہے جس میں کسی انسان کا کوئی داخل نہیں ہے -

(قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ (۵:۲۷) (میں تجھے مار ڈالوں گا) نظر آتا ہے کہ قاتل اس فعل کے ارتکاب پر تلا ہوا تھا اس لئے اس نے نہایت ہی مؤکد صیغہ استعمال کیا ہے۔ قاتل یہاں جوش و خروش کا اظہار بغیر کسی معقول وجہ کے کر رہا ہے یعنی اس کا یہ غصہ بالکل بلاوجہ ہے۔ اس کی اگر کوئی وجہ ہے تو وہ اس کا خبیث ارادہ اور برا احساس ہے' جو حسد اور بغض سے بھرا ہوا شعور ہے جس کی نشوونما کسی پاک نفس میں نہیں ہوتی۔ قصے کے اس منظر میں پہلے ہی مرحلے میں ہم اپنے آپ کو ظلم کے سامنے پاتے ہیں۔ اگرچہ آیت مکمل نہیں ہوئی لیکن اس لفظ ہی سے ارتکاب جرم کے اشارے مل جاتے ہیں۔

اب بات آگے بڑھتی ہے اور اس ظلم کو مزید بھیانک شکل دے دی جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ دوسرا نمونہ قابل قبول ہے' پاک فطرت اور صلح کل ہے۔

(قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (۵:۲۷) (بے شک اللہ متقیوں کی نذر قبول کرتا ہے)

یہاں علی الاعلان بات کو اصلیت اور حقیقت کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے۔ ایمان پر بھروسہ کیا جاتا ہے جسے قبولیت حاصل ہوتی ہے اور نہایت ہی لطیف انداز میں ظالم کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ سے ڈرے اور اسے اس راہ کی طرف بلایا جاتا ہے جو قبولیت کی راہ ہے اس صورت حال کی طرف بھی لطیف اشارہ کر دیا جاتا ہے جو اس کے دل میں کھٹک رہی ہے اور اسے جوش دلاتی ہے اور بدی پر آمادہ کرتی ہے۔

اس کے بعد مومن بھائی' جو خدا ترس' صلح کل اور پرامن شخصیت ہے وہ اپنے شریر بھائی کے دل میں پائے جانے والی وحشیانہ شرپسندی کے جوش کو کس طرح کم کرنا چاہتا ہے۔

(لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (۵:۲۸) (اگر تو مجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں)۔

یوں امن' تقویٰ اور صلح کل کے نمونے کو مصور انداز میں یہاں پیش کر دیا جاتا ہے۔ یہ نمونہ ایک ایسے وقت میں پیش کیا جاتا ہے' جس میں ایک عام انسانی ضمیر بھی نہایت اشتعال میں آ جاتا ہے اگرچہ وہ بہت ٹھنڈا ہو۔ ایسے حالات میں ہر غیر جانبدار انسان' ہر باضمیر انسان ظالم کے مقابلے میں اور مظلوم کے حق میں اٹھ جاتا ہے۔ ان حالات میں بھی یہ مظلوم' نہایت سنجیدہ' نہایت مطمئن ہے حالانکہ وہ کھلی جارحیت کے خطرے سے دوچار ہے لیکن اس کا دل رب العالمین کے خوف سے بھرا ہوا ہے' اس لئے وہ مطمئن ہے۔

یہ نرم اور دلنواز بات اس کے لئے کافی تھی کہ اس دشمنی کو دوستی میں بدل دے۔ حسد کو ٹھنڈا کرے' شر کا جوش کم کر دے' ہیجان زدہ اعصاب کو ٹھنڈا کر کے اس شخص کو بھائی چارے کی محبت کے اندر لے آئے اور اس کے دل میں تقویٰ کا احساس پیدا ہو جائے۔ ہاں یہ طرز عمل اس کے لئے بالکل کافی تھا لیکن یہ شخص باز نہیں آیا چنانچہ نیک بھائی اسے متنبہ کرتا ہے اور آخرت کے برے انجام سے اسے ڈراتا ہے۔

اِنِّىٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِىْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ (۵: ۲۹) (میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے اور دوزخی بن کر رہے 'ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے)

اگر تم میری طرف قتل کے لئے ہاتھ بڑھاؤ تو میرا مزاج تو یہ نہیں ہے کہ میں یہی کام تمہارے ساتھ کروں۔ نہ یہ میری طبیعت ہے اس لئے کہ میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ میں اپنے بھائی کو قتل کر دوں۔ میرا ذہن ہی اس طرف نہیں جاتا۔ میں یہ کام اس لئے نہیں کرتا کہ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ یہ بات نہیں ہے کہ میں اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دے سکتا۔ اس لئے میں تمہیں چھوڑتا ہوں کہ تم اپنے سابقہ گناہوں کے ذخیرے میں جن کی وجہ سے تمہاری نذر ہی مسترد ہوئی' میرے قتل کے گناہ کا اضافہ بھی کر لے۔ اس طرح تمہارا گناہ بھی بڑھے گا اور پھر سزا بھی بڑھتی چلی جائے گی۔ (وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ (۵: ۲۹) (ظالموں کا یہی انجام ہوتا ہے)۔

اس طرح اس صالح بھائی نے ظالم کے سامنے جرم قتل کے ارتکاب سے اپنے خوف کو مصور کر کے پیش کیا تاکہ یہ ظالم بھائی اس ظلم کے ارتکاب سے باز آ جائے جس پر اسی کا نفس اسے بار بار آمادہ کرتا ہے اور پھر اسے اس طرز عمل پر شرمندہ کر دے کہ ایک بھائی 'صلح کل بھائی 'خدا ترس بھائی کے خلاف وہ کس قدر بری طرح سوچ رکھتا ہے۔

اس خدا ترس بھائی نے ظالم کے سامنے جرم قتل کے بھیانک نتائج پیش کئے تاکہ وہ اس گناہ سے متنفر ہو جائے اور اسے دوچند سہ چند گناہ سے نکل آنے میں بہتری نظر آ جائے اور وہ اللہ رب العالمین کا خوف اپنے دل کے اندر رکھے۔ اس سلسلے میں یہ خدا ترس بھائی اس مقام تک چلا جاتا ہے جہاں تک کوئی انسان نہیں جا سکتا اور اس سے آگے شر کے دفعیہ کے لئے اور کوئی صورت ہی نہیں رہتی۔

لیکن جب تک ہمیں معلوم نہ ہو کہ اس کا انجام کیا ہوا اُس شریر بھائی اور مفسد بھائی کی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی' اس انتہائی مثبت طرز عمل کا جواب وہ کیا دیتا ہے؟

(فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۵: ۳۰) (آخر کار اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل اس کے لئے آسان کر دیا اور وہ اسے مار کر ان لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔)

ان تمام کوششوں کے باوجود' اس وعظ' اس نصیحت اور ڈراوے کے باوجود یہ شریر شخصیت جرم پر آمادہ ہو جاتی ہے اور جرم کا ارتکاب ہو جاتا ہے۔ اس کے نفس نے اس کے لئے تمام نتائج آسان کر دیئے۔ تمام رکاوٹیں دور کر دیں۔ قتل پر وہ آسانی سے آمادہ کر دیا گیا۔ اس نے قتل کر ہی دیا لیکن کسے؟ اپنے بھائی کو اور اب وہ خوفناک انجام کا مستحق ہے۔ (فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۵: ۳۰) (وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گیا)۔

اس نے اپنے نفس کا نقصان کیا۔ اسے ہلاکت میں ڈال دیا۔ وہ اپنے بھائی کا نقصان کر گیا' جو اس کا ناصر اور ساتھی تھا۔ اس نے دنیا کا نقصان اس طرح کیا کہ اس کی زندگی اس دنیا میں تلخ ہو گئی اور آخرت کا نقصان یوں ہو گا کہ آخرت

میں اپنے اس قتل کا بھی بدلہ بھگتے گا اور بعد میں آنے والے تمام قاتلوں کے گناہ میں بھی حصہ دار ہو گا۔

اب اس کے لئے اس کے جرم کو ایک نئی شکل میں لایا جاتا ہے۔ بھائی کا لاشہ پڑا ہے' روح نکل چکی ہے۔ گوشت کا ڈھیر ہے اور متعفن ہو رہا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو ناقابل برداشت ہے' ایک لاش۔ اس کا گناہ اب لاش کی صورت میں ہے۔

اب اللہ کی مشیت یہ ہے کہ یہ ذات شریر اپنے کئے کے سامنے عاجز کھڑی ہو' سمجھ نہ آئے کہ اب اس لاش کے ساتھ کیا کرے۔ ابھی تو وہ قاتل' خونریز اور سخت گیر تھا۔ اور اب بے بس۔ سمجھ نہیں آتی کہ اس لاش کو کس طرح ٹھکانے لگائے' اب تو وہ ایک پرندے سے بھی عاجز ہے۔

(فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۭ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ (۵ : ۳۱) (پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تاکہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا "افسوس مجھ پر! میں اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر نکال لیتا۔" اس کے بعد وہ اپنے کئے پر بہت پچھتایا)۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک کوے نے دوسرے کو قتل کر دیا یا اس نے دوسرے کوے کی لاش کو پایا۔ یہ کوا زمین کھودنے لگا۔ اس کے بعد اس نے گڑھے میں ڈال کر اس پر مٹی ڈالنا شروع کیا۔ اس موقع پر اس قاتل نے افسوسناک انداز میں اپنی اس ندامت کا اظہار کیا اور پھر اپنے بھائی کی لاش کو دفن کر دیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قاتل نے اس سے قبل کسی کو دفن ہوتے نہ دیکھا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ضرور لاش کو دفن کر دیتا اور یہ ممکن ہے کہ اس زمین پر یہ پہلی میت ہو یعنی حضرت آدم کی اولاد میں سے۔ یا یہ کہ یہ قاتل نوجوان تھا اور اس نے اس سے قبل کسی کو میتوں کو دفناتے نہ دیکھا تھا۔ دونوں باتیں اپنی جگہ درست ہیں۔ نیز یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس قاتل کی ندامت ایک تائب کی ندامت نہ تھی ورنہ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتے بلکہ وہ نادم اس بات پر ہوا کہ اس کو اس فعل کا کوئی فائدہ نہ ہوا اور اس فعل کے بعد اس کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا' اس کی زندگی تلخ ہو گئی اور وہ نفسیاتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔

جس طرح کوے نے دوسرے کوے کی لاش کو دفن کیا' اس طرح اس نے بھی دفن کیا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ کوے ایسا کرتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قاتل کو سکھانے کے لئے ایک کوے کو بھیج دیا ہو اور یہ خارق عادت کام تھا جو اللہ نے کوے سے کروایا۔ یہ دونوں باتیں اللہ کے لئے برابر ہیں جو ذات باری زندہ انسانوں میں کمالات ودیعت کرتی ہے' وہ ذات اس پر بھی قادر ہے کہ وہ ان کمالات کا صدور کسی بھی زندہ چیز سے کرا دے۔ یہ دونوں امور اس کی قدرت میں ہیں۔

اس مسلسل قصے کو پڑھنے اور دیکھنے کے بعد ذہن انسانی پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں' قرآن یہاں ان کو ریکارڈ پر لاتا

ہے تاکہ ان کو ایک شعوری سوچ بنا دے اور اس سوچ کی اساس پر اگر کوئی شخص قتل کا ارتکاب کر بھی لے تو اس سے منصفانہ قصاص لیا جائے اور مجرم کو معلوم ہو کہ اگر اس نے جرم کیا تو قانون قصاص اس کے انتظار میں ہے۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَ مَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾

(اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ "جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔ "مگر ان کا حال یہ ہے کہ ہمارے رسول پے در پے ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات لے کر آئے پھر بھی ان میں بکثرت لوگ زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں)۔

اس وجہ سے 'یعنی انسانیت کے اندر ایسے لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے 'امن پسند' صلح کل' نیک فطرت اور پاک طینت لوگوں کے خلاف ایسے جرائم کے ارتکاب کی وجہ سے 'جو شر اور ظلم سے بہت دور بھاگتے ہیں' اور اس وجہ سے کہ بعض نہایت ہی فطری شرپسندوں پر وعظ و نصیحت اور ڈراوا کوئی اثر نہیں کرتا اور اس وجہ سے کہ اگر شر انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے تو ایسے لوگوں کے ساتھ امن اور آشتی مفید مطلب نہیں ہوتی' اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قتل نفس کو گناہ کبیرہ اور جرم عظیم قرار دیا۔ اسے اس قدر عظیم جرم قرار دیا کہ گویا اس مجرم نے تمام موجودہ انسانی نسل کو قتل کر دیا۔ پھر جس عمل کے ذریعے ایک شخص کی جان بچ جائے تو گویا اس شخص اور اس عمل نے تمام لوگوں کو زندگی بخش دی۔ یہ بات ہم نے بنی اسرائیل کے لئے شریعت لکھتے وقت مقرر کر دی تھی۔ (تفصیلات احکام قصاص میں آ رہی ہیں)

کسی کے قصاص میں قتل کیے جانے کے علاوہ قتل کر دینا یا فساد فی الارض کو دور کرنے کے لئے کسی کے قتل کے علاوہ' قتل اس قدر عظیم جرم ہے جس طرح کوئی تمام انسانوں کو قتل کر دے۔ ہر نفس دوسرے نفس کے برابر ہے۔ زندگی کا حق ہر ایک نفس کو حاصل ہے۔ لہذا کسی ایک نفس کا قتل کرنا گویا تمام نفوس سے حق زندگی چھین لینے کے برابر ہے اس لئے کہ حق حیات میں تمام نفوس شریک ہیں۔ اسی طرح قتل سے تحفظ کا حق بھی تمام نفوس کو حاصل ہے اور زندگی کا بچانا سب کے لیے لازمی ہے۔ چاہے حالت زندگی میں دفاع کیا جائے یا مرنے کے بعد قصاص جاری کر کے زندگی کا دفاع کیا جائے تاکہ مجرم دوسرے نفوس پر دست درازی نہ کرے۔ اس طرح گویا قانون قصاص تمام زندہ

لوگوں کو زندگی دینے کا مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے۔ کیونکہ قانون قصاص سے زندہ رہنے کا حق فراہم ہوتا ہے جس میں تمام لوگ شریک ہیں۔

ان احکام کے سلسلے میں ہم نے جو تشریح کی ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف دارالاسلام کے باشندوں پر منطبق ہوتا ہے۔ مسلم ہوں' ذمی ہوں یا مستامن ہوں۔ رہے اہل حرب (وہ لوگ جن سے مسلم حکومت بر سر جنگ ہے) تو ان کا خون مباح ہے الا یہ کہ ان کے اور دارالاسلام کے باشندوں کے درمیان کوئی معاہدہ ہو جائے۔ اسی طرح ان کے مال اور جائیداد کو بھی تحفظ حاصل نہ ہو گا' اس لئے ہمیں اس قانونی اصول کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہئے۔ یہ بات بھی ہمیں ذہن نشین کرنا چاہئے کہ دارالاسلام وہ مملکت ہے جس میں اسلامی شریعت نافذ ہو' اور حکومت کے تمام ادارے اس کے مطابق چلتے ہوں اور دارالحرب وہ سرزمین ہے جس میں شریعت نافذ نہ ہو اور کاروبار مملکت میں شریعت کے احکام نہ مانے جاتے ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر یہ اصول فرض کر دیا تھا' اس لئے کہ یہ لوگ اس وقت اہل کتاب تھے۔ جب تک توراۃ کے مطابق وہ کاروبار حکومت چلاتے اس وقت تک وہ دارالاسلام تصور ہوتے بشرطیکہ وہ احکام شریعت تحریف شدہ نہ ہو۔ لیکن بنی اسرائیل نے ہمیشہ حدود شریعت سے تجاوز کیا حالانکہ ان کے رسول ان کے سامنے واضح طور پر شریعت کے احکام لے کر آئے تھے۔ خود رسول اللہ ؐ کے دور میں اور ان کے بعد کے ادوار میں بھی آج تک ان میں ایسے لوگ بکثرت ہیں جو ان کی شریعت توراۃ کی حدود سے تجاوز کرتے تھے۔ قرآن کریم ان کے اس اسراف' تجاوز اور دست درازی کو یہاں ریکارڈ کر رہا ہے جو بلاسبب تھی اور یہ بھی ریکارڈ پر لایا جاتا ہے کہ اللہ کے مقابلے میں اب ان کے پاس کوئی حجت نہیں ہے' اس لئے کہ ان کے پاس اللہ کے رسول آئے' اور ان رسولوں نے شریعت کے احکام ان کے سامنے بیان کر دیئے تھے۔

(وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ز ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ (۳۲) (مگر ان کا حال یہ ہے کہ ہمارے رسول پے در پے ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات لے کر آئے پھر بھی ان میں بکثرت لوگ زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں)

اور اس سے بڑا اسراف اور زیادتی اور کیا ہو گی کہ کوئی حدود اللہ سے تجاوز کرے اور اللہ کی شریعت پر دست درازی کرے۔ اس طرح کہ یا تو اس میں تغیر و تبدل کرے اور یا اس کو معطل چھوڑ دے۔

---ooo---

سابقہ آیت میں یہ کہا گیا تھا کہ کسی کی جان لینا فساد فی الارض کے ضمن میں آتا ہے اور قاتل اور مفسد دونوں کی زندگی کو تحفظ سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ اور یہ کہا گیا تھا کہ کسی کی ناحق جان لینا نہایت ہی گھناؤنا جرم ہے۔ اس لئے کہ دارالاسلام میں ایک مسلم سوسائٹی کا امن و امان' اور اس کی جانب سے بھلائی کے کاموں کو امن و امان اور سکون و اطمینان کے ساتھ سرانجام دینا بعینہٖ اسی طرح ضروری ہے جس طرح اسلامی مملکت میں افراد کا امن و سکون سے زندگی

گزارنا ضروری ہے۔ بلکہ اجتماعی امن کی ضرورت انفرادی امن سے زیادہ ہے اس لئے کہ افراد کو امن و سکون تب ہی نصیب ہوتا ہے جب سوسائٹی کو امن و سکون حاصل ہو۔ نیز یہ بات اس سے بھی اہم ہے کہ اس قسم کی اعلیٰ اور فاضلانہ سوسائٹی کا امن متاثر نہ ہو اور ایسی سوسائٹی کو ہر قسم کے امن اور استحکام کی ضمانت حاصل ہو۔ کیونکہ اس ضمانت سے اس قسم کی سوسائٹی میں افراد کو امن و سکون ملتا ہے اور وہ آزادی سے سرگرم رہ سکتے ہیں اور امن کے زیر سایہ ہی انسانی زندگی سکون کے ساتھ نشو و نما پاتی ہے۔ امن کی پرسکون فضا ہی میں ہر قسم کی بھلائی' اخلاق فاضلہ' پیداوار اور ترقی تسلسل کے ساتھ جاری رہ سکتی ہے۔ ایسی ہی سوسائٹی اپنے افراد کو ضروریات زندگی کی ضمانت بھی دے سکتی ہے اور امن ہی ایسا ماحول اور ایسی فضا فراہم کرتا ہے جس کے اندر بھلائی کے بیج بوئے جاتے ہیں اور نشو و نما پاتے ہیں۔ اور اسی میں برائی کے بیج ختم کئے جا سکتے ہیں۔ ایسی سوسائٹی کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ وہ بیماریوں کا علاج کرنے سے بھی پہلے حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق کام کرتی ہے اور جہاں حفظان صحت کے اصول کام نہ کر سکیں وہاں پھر یہ علاج کرتی ہے۔ یہ سوسائٹی ایک سلیم الفطرت شخص کے لئے کوئی ایسا موقع ہی باقی نہیں چھوڑتی جس میں وہ شر اور دست درازی پر آمادہ ہو' ایسے حالات کے اندر اور ایسی سوسائٹی کے اندر پھر بھی اگر کوئی امن و امان کو تباہ کرنے پر آمادہ ہوتا ہے تو سمجھو کہ وہ مادۂ خبیثہ ہے اور اسے بذریعہ آپریشن سوسائٹی کے وجود سے خارج کرنا ضروری ہے بشرطیکہ علاج کے دوسرے تمام طریقے ناکام ہو جائیں..... یہ ایسے ہی عناصر ہیں جن کے بارے میں اس آیت میں احکام آئے ہیں :

إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسْعَوْنَ فِى ٱلْأَرْضِ فَسَادًا
أَن يُقَتَّلُوٓا۟ أَوْ يُصَلَّبُوٓا۟ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَٰفٍ أَوْ
يُنفَوْا۟ مِنَ ٱلْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى ٱلدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ
عَظِيمٌ ﴿٣٣﴾ إِلَّا ٱلَّذِينَ تَابُوا۟ مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا۟ عَلَيْهِمْ ۖ فَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ
ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣٤﴾

(جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کئے جائیں' یا سولی پر چڑھائے جائیں' یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں' یا وہ جلاوطن کر دیئے جائیں۔ یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لئے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لئے اس سے بڑی سزا ہے۔ مگر جو لوگ توبہ کرلیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ...... تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)

یہ جرم جس کے بارے میں یہ آیت آئی ہے اس کی حدود کیا ہیں؟ یعنی کسی مسلم سربراہ مملکت کے خلاف بغاوت کرنا' جو حکومت شریعت کے مطابق چلا رہا ہو۔ یہ خروج ایک جمعیت کی شکل میں ہو اور کوئی گروہ اس مملکت کے خلاف بغاوت پر اتر آیا ہو اور اس نے ایسی روش اختیار کر لی ہو جس سے دارالاسلام کے لوگوں کے اندر خوف و ہراس پیدا ہو اور اس گروہ کی جانب سے باشندگان دارالاسلام کو مالی' جانی اور عزت کے نقصان کے خطرات لاحق ہوں۔ بعض فقہاء نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ اس قسم کی واردات شہری علاقوں سے دور ہو جہاں مملکت کی انتظامیہ کی دسترس نہ ہو۔ بعض فقہاء نے یہ بھی شرط رکھی ہے کہ اس قسم کے باغیوں کے گروہ کا جمع ہو جانا اور درست درازی کا آغاز کرنا اور عملاً اگر نہ بھی ہو تو بالقوہ یہ پوزیشن اختیار کر لینا ہی اس آیت کے انطباق کے لئے کافی ہے چاہے یہ گروہ شہروں کے اندر ہو یا باہر ہو اور یہ آخری رائے عملاً زیادہ قریب الفہم ہے تاکہ باغیوں کو کیفر کردار تک پہنچایا جا سکے۔

یہ باغی وہ لوگ تصور ہوں گے' جو ایسے حاکم کے خلاف ہوں جو شریعت کے مطابق حکومت کر رہا ہو اور یہ باغی دارالاسلام کے ان باشندوں پر دست درازی کی پوزیشن میں ہوں' جن کے ہاں شریعت جاری ہو' (چاہے یہ لوگ ذمی ہوں' مسلمان ہوں یا مستامن ہوں)۔ یہ لوگ صرف حکم کے خلاف باغی نہ ہوں اور صرف لوگوں کے خلاف بغاوت نہ ہو' بلکہ اللہ اور رسول کے خلاف بھی بغاوت ہو۔ اللہ کی شریعت سے محاربت ہو اور ایک ایسی سوسائٹی کے ساتھ محاربت ہو جو اس شریعت کی اساس پر قائم کی گئی ہو۔ نیز ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے دارالاسلام کو خطرہ لاحق ہو گیا ہو' ان کی یہ جنگ اللہ اور رسول اللہ ؐ کے خلاف تصور ہو گی۔ یہ جنگ شریعت کے خلاف تصور ہو گی اور اس مملکت کے خلاف تصور ہو گی جو شریعت کا نفاذ کر رہی ہوتی ہے۔ ان لوگوں کا یہ فعل فساد فی الارض تصور ہو گا اس لئے کہ اللہ کی شریعت کو معطل کرنے سے بڑا فساد اس دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس سے زیادہ بڑا فساد کوئی ہو سکتا ہے کہ دارالاسلام کے وجود کو خطرہ لاحق ہو جائے۔

یہ لوگ چونکہ اللہ اور رسول اللہ ؐ سے محاربت کرتے ہیں' اگرچہ بظاہر وہ جماعت مسلمہ' اسلامی سوسائٹی اور اس کے سربراہ کے خلاف بر سرپیکار ہوتے ہیں' وہ اللہ تعالیٰ کے خلاف تو تلوار اٹھا ہی نہیں سکتے' اور نہ ہی رسول اللہ ؐ کی ذات کے خلاف تلوار اٹھا سکتے ہیں' جبکہ آپ اس دنیا سے اٹھ چکے ہیں۔ لیکن اگر کوئی جنگ اللہ کی شریعت کے خلاف ہو تو گویا وہ جنگ اللہ اور رسول کے خلاف ہو رہی ہے۔ یہ جنگ اس سوسائٹی کے خلاف تصور ہو گی جس نے اللہ اور رسول کی شریعت کو اپنایا ہے اور اس علاقے کے خلاف ہو گی جس میں یہ شریعت نافذ ہو رہی ہو۔

اس آیت کا ایک اور مفہوم بھی درج بالا مفہوم کے مطابق یہاں متعین ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ جس سربراہ مملکت کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق باغیوں کے خلاف آیت میں درج سزائیں دینے کا اختیار ہے وہ وہی سربراہ مملکت ہے جو اسلامی شریعت کے مطابق سربراہ بنا ہو اور جو شریعت کا نافذ کنندہ ہو۔ ایسے بادشاہ کے علاوہ کسی اور بادشاہ یا سربراہ مملکت کو ایسے اختیارات نہ ہوں گے۔

اس بات کی ہم فیصلہ کن وضاحت اس لئے کر رہے ہیں کہ حکومتوں کے بعض پٹھو جو ہر حکومت کو دستیاب ہو جاتے ہیں' وہ بعض حکومتوں کے لئے ایسی سزاؤں کے اختیارات ثابت کرتے ہیں' جو شریعت کی نافذ کنندہ نہیں ہوتیں حالانکہ وہ حکومتیں اپنے علاقے میں دارالاسلام قائم نہیں کرتیں اگرچہ وہ سمجھتی ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ ایسے پٹھوؤں نے ہمیشہ ان

حکومتوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ان حکومتوں کے خلاف اٹھنے والوں کو یہ قرآنی سزائیں دیں' اور انہیں اللہ کی شریعت کے عنوان سے نافذ کریں' حالانکہ ان لادین حکومتوں کے ارکان اللہ اور رسول کے باغی ہوتے ہیں' بلکہ وہ ایسی حکومتوں کے ارکان ہوتے ہیں جو اللہ اور رسول کی باغی ہوتی ہیں۔

غرض اگر کوئی حکومت دارالاسلام میں اسلامی شریعت کی اساس پر قائم نہ ہو' تو اسے اپنے باغیوں پر وہ سزائیں نافذ کرنے کا شرعی اختیار نہیں ہے۔ ایسی لادین حکومتوں کا شریعت کے ساتھ تعلق ہی کیا ہوتا ہے؟ یہ حکومت ایسی ہوتی ہے جنہوں نے اللہ کے حق الوہیت اور حق حاکمیت پر دست درازی کی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کا قانون شریعت کے ساتھ تعلق ہی کیا رہتا ہے؟

ایسے باغی دستوں کے لئے یہ سزائیں تب ہوں گی جب وہ اسلامی خلیفہ کے خلاف بغاوت کریں اور وہ خلیفہ اسلامی شریعت کا نافذ کنندہ اور حامی ہو۔ یہ لوگ دارالاسلام کے باشندوں کے لئے خطرہ ہوں' ان کی جان' مال اور آبرو ان سے محفوظ نہ ہو' تو تب ان کو قتل کیا جانا جائز اور فرض ہو گا اور ان کو سزائے موت دی جا سکے گی۔ بعض فقہاء نے یہ کہا ہے کہ قتل کرنے کے بعد لاشوں کو لٹکا دیا جائے گا تاکہ وہ دوسروں کے لئے نمونہ عبرت ہوں اور یہ کہ ان کے ہاتھ کاٹے جائیں یعنی دائیں ہاتھ کے ساتھ بایاں پاؤں اور بائیں ہاتھ کے ساتھ دایاں پاؤں۔ (مِّنْ خِلَافٍ) کا مفہوم یہ ہے۔

اس آیت کے بارے میں فقہاء کے درمیان بہت ہی وسیع اختلاف رائے واقع ہوا ہے۔ کیا امام کو اختیار ہے کہ باغیوں کو وہ ان سزاؤں میں سے جو چاہے سزا دے' یا یہ کہ ان جرائم میں سے ہر جرم کی الگ سزا ہے۔

امام ابو حنیفہ' امام شافعی اور امام احمد سے مروی ہے کہ یہ سزائیں ان جرائم کے مطابق دی جائیں گی جو ان باغیوں سے صادر ہوئے۔ اگر کوئی شخص صرف قتل کا ارتکاب کرے اور لوٹ میں حصہ نہ لے تو اسے صرف قتل کیا جائے گا۔ جس شخص نے لوٹ میں حصہ لیا مگر قتل کا ارتکاب نہ کیا تو اسے قطع ید کی سزا دی جائے گی۔ جس نے قتل اور لوٹ دونوں میں حصہ لیا تو اسے قتل اور لٹکانے دونوں کی سزا دی جائے گی۔ اور جس شخص نے محض خوف و ہراس پھیلایا مگر نہ قتل کیا اور نہ مال کی لوٹ میں حصہ لیا تو اسے ملک بدری کی سزا دی جائے گی۔

امام مالک سے روایت ہے کہ باغی نے اگر قتل کا ارتکاب کیا تو اسے لازماً سزائے موت دی جائے گی اور امام وقت کو یہ اختیار نہ ہو گا کہ وہ اسے قطع ید یا ملک بدری کی سزا دے' البتہ اسے یہ اختیار ہے کہ اسے قتل کرا دے یا سولی پر لٹکا دے۔ اسی طرح اگر اس نے قتل کا ارتکاب نہ کیا ہو تو اسے ملک بدری کا اختیار نہ ہو گا۔ امام کو اختیار اس میں ہے کہ وہ قتل کرے یا سولی پر لٹکائے' یا اگر قطع اعضاء کا فیصلہ کرے تو اعضائے مخالفہ میں سے جو بھی اختیار کرے۔ اگر مجرموں سے یہ ڈر ہو' کہ انہوں نے راستوں کو پر خطر بنا دیا ہے تو امام کو اختیار ہے کہ انہیں قتل کرے یا سولی پر چڑھائے یا ہاتھ کاٹ دے یا ملک بدری کی سزا دے اور اختیار تمیزی کا مفہوم امام مالک کے نزدیک یہ ہے کہ معاملہ امام کے اجتہاد پر موقوف ہے۔ اگر باغی صاحب الرائے آدمی ہو اور بغاوت کی تدبیر کر سکتا ہو تو اجتہاد کا تقاضا یہ ہو گا کہ اسے قتل کر دیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے کیونکہ محض قطع ید سے اس کی معترت دفع نہ ہو سکے گی۔ اگر وہ باغی صاحب رائے نہ ہو محض ایک قوی اور بہادر شخص ہو تو اسے صرف قطع ید من خلاف کی سزا دی جائے گی اور اگر اس میں یہ دونوں صفات کسی قدر پائی

جاتی ہوں تو اسے ملک بدری اور تعزیری سزا دی جائے گی۔ (التشریع الجنائی الاسلامی' عبد القادر عودہ)۔

ہمارے خیال میں امام مالک کی رائے زیادہ موزوں ہے کہ سزا بھی تو محض بغاوت اور محاربہ پر یا قطع الطریق کے خطرے اور راستوں کو پر خطر بنانے پر ہوتی ہے اور یہ سزا محض امتناعی (Preventive) ہوتی ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ جرائم کا ارتکاب نہ ہو اور ان لوگوں کو ڈرانا مقصود ہو جو دارالاسلام کے امن و امان کو تباہ کرتے ہیں اور وہ اس سوسائٹی کو خوفزدہ کرتے ہوں جو دارالاسلام میں اسلامی شریعت کی اساس پر قائم ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ سوسائٹی اور دارالاسلام کا علاقہ اس بات کا سب سے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کے اندر امن و اطمینان قائم ہو۔

اسی طرح فقہاء کے اندر ملک بدری کے مفہوم کے اندر بھی اختلاف واقعہ ہوا ہے۔ کیا ملک بدری صرف اس علاقے سے ہوگی جس میں جرم کا ارتکاب ہوا ہے یا اسے اس علاقے سے ملک بدر کر دیا جائے گا جس میں اسے پھرنے کی اجازت ہوتی ہے اور یہ مقصد قید سے پورا ہو سکتا ہے یا یہ کہ اسے پورے کرۂ ارض سے رخصت کر دیا جائے اور یہ تو سزائے موت ہی سے ممکن ہے..... میں سمجھتا ہوں کہ یہی مفہوم اقرب ہے کہ اس مجرم کو اس سرزمین سے باہر نکالا جائے گا جس کے اندر اس نے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اسے اس قدر دور پھینک دیا جائے گا کہ وہ وہاں اپنے آپ کو غریب الوطن سمجھے۔ وہ دھتکارا ہوا اور کمزور ہو اور یہ اس کے اس جرم کی پوری سزا ہے کہ اس نے لوگوں کو پریشان کیا' خوفزدہ کیا اور اپنی قوت کے بل بوتے پر لوگوں پر دست درازی کی۔ یہ ملک بدری اس طرح ہو کہ وہ جہاں جائے وہاں جرم سے باز آجائے اور اس کا جتھا بھی وہاں نہ ہو یا وہ اپنے جتھے سے دور ہو جائے۔

(ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۵:۳۳) "یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لئے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لئے اس سے بڑی سزا ہے۔

اس دنیا میں انہیں جو سزا ملے گی' اس سے ان کی سزائے آخرت ساقط نہ ہو جائے گی اور آخرت میں وہ گناہ کی اس گندگی سے پاک نہ ہوں گے' جس طرح بعض دوسرے حدود کے اندر انسان کو سزا ہو جائے تو وہ آخرت کے لیے پاک ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اس سزا میں سختی کرنے کا ایک پہلو ہے اور اس سے اس جرم کو مزید گھناؤنا ظاہر کرنا مقصود ہے۔ یہ اس لئے کہ دارالاسلام میں اسلامی سوسائٹی اس بات کی مستحق ہے کہ وہ پرامن زندگی بسر کرے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جو حکومت اسلامی شریعت کے مطابق قائم ہوتی ہے اس کا لوگوں پر یہ حق ہے کہ لوگ اس کے احکام کو تسلیم کریں۔ اسلامی نظام حکومت کا ماحول ایک بھلائی کا ماحول ہوتا ہے اور وہ اس بات کا مستحق ہوتا ہے کہ اسے پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کئے جائیں نیز اسلامی نظام زندگی ایک ایسا عادلانہ اور مکمل نظام ہے جس کی حفاظت مسلمانوں پر واجب ہوتی ہے۔

اب یہ باغی اگر اپنی گمراہی کو ترک کر دیں اور فساد کو چھوڑ دیں اور وہ اپنے اس جرم کو برا اور منکر سمجھ کر باز آ جائیں اور صدق دل سے تائب ہو کر راہ راست پر آجائیں اگرچہ وہ اب بھی ایسی پوزیشن میں ہوں کہ وہ اپنی مہم کو جاری رکھ سکتے ہوں اور اسلامی مملکت ان پر ہاتھ ڈال سکتی ہو' تو ان کا جرم اور اس کی سزا دونوں معاف تصور ہوں گے۔ اب حکومت کے لئے جائز نہ ہو گا کہ توبہ کرنے والے لوگوں پر ہاتھ ڈال دے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ غفور و رحیم ہے' اس لئے حساب آخرت میں بھی انہیں معاف کر دے گا۔

(اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْہِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

(۵: ۳٤) "مگر جو لوگ توبہ کرلیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ...... تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

توبہ کرنے والوں کی سزا اور جرم معاف کرنے میں جو حکمت پوشیدہ ہے وہ بالکل واضح ہے اور اس کے دو پہلو ہیں۔ پہلا یہ کہ ان کی توبہ کی حوصلہ افزائی کی جائے' جبکہ وہ پر قوت تھے' بغاوت جاری رکھ سکتے تھے اور یہ ان کی جانب سے اصلاح پذیری اور ہدایت پر آجانے کی قوی دلیل ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہو گا انہیں دیکھ کر اس قسم کے دوسرے لوگ بھی توبہ کرنے اور راہ راست پر آنے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے۔ اس طرح جنگ و جدل اور مقابلے کے ذریعے انہیں مغلوب کرنے کے بجائے آسان طریقوں سے انہیں راہ راست پر لے آنا ممکن ہو جائے گا۔

اسلامی نظام زندگی انسان کی اصلاح کے لئے اس کے تمام جذبات' میلانات' اور تمام ذرائع اور احتمالات کو کام میں لاتا ہے اور یہ ایک ایسا نظام ہے جو خود انسانی مزاج اور فطرت کے بنانے والے نے بنایا ہے۔ وہ ذات انسانی ذات کے نشیب و فراز سے خوب واقف ہے۔ وہ ذات جانتی ہے کہ انسان کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے اور کس ذریعے سے ہو سکتی ہے۔ کیا وہ ذات نہیں جانتی جس نے انسان کو پیدا کیا ہے' وہ تو لطیف و خبیر ہے۔ (اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ)

---ooo---

اسلامی نظام زندگی لوگوں پر صرف اسلامی قانون نافذ نہیں کرتا۔ وہ قانون کی تلوار اٹھا کر لوگوں پر اس طرح مسلط کرتا ہے کہ وہ ڈر کر دوبارہ جرم کا ارتکاب نہ کریں۔ سزا صرف ان لوگوں کو دی جاتی ہے جو ڈنڈے کے بغیر کسی صورت میں بھی اصلاح کی راہ پر نہیں آتے۔ اسلام سب سے پہلے لوگوں کی قلبی تربیت پر زور دیتا ہے۔ لوگوں کے مزاج کو درست کیا جاتا ہے اور ان کی روح کو راہ اصلاح پر لایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسے معاشرے اور ایک ایسی سوسائٹی کا قیام بھی ضروری ہے جس کے اندر اصلاح' نیکی اور بھلائی کے بیج بار آور ہو سکیں۔ یہ بیج اسی زمین میں بار آور ہو سکتے ہیں جس کے اندر سے گندے پودوں اور جڑی بوٹیوں کو ختم کر دیا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی اقدامات کرتے ہی' اصلاح روح اور تقوائے دل کی طرف آجاتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں روحانیت اور خدا ترسی پیدا کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لیے اور اصلاح کی راہ اختیار کرنے کے لیے دوسرے وسائل بھی اختیار کئے جائیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا سب سے بڑا وسیلہ اصلاح ہے۔ اسلامی سوسائٹی کو کفر کے انجام سے ڈرایا جاتا ہے اور آخرت کے عذاب کی ایسی تصویر کشی کی جاتی ہے جو نہایت ہی خوفناک ہوتی ہے اور ہر شخص اس کو دیکھ کر عبرت پکڑ سکتا ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ

وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٣٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٣٦﴾ يُرِيدُونَ أَن يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٣٧﴾

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے ڈرو اور اس کی جناب میں باریابی کا ذریعہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو' شاید کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو جائے ۔ خوب جان لو کہ جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے اگر ان کے قبضے میں ساری زمین کی دولت ہو اور اتنی ہی اور اس کے ساتھ اور وہ چاہیں کہ اسے فدیہ میں دے کر روز قیامت کے عذاب سے بچ جائیں' تب بھی وہ ان سے قبول نہ کی جائے گی اور انہیں دردناک سزا مل کر رہے گی ۔ وہ چاہیں گے کہ دوزخ کی آگ سے نکل بھاگیں مگر نہ نکل سکیں گے اور انہیں قائم رہنے والا عذاب دیا جائے گا)۔

اسلامی نظام زندگی نفس انسانی کی اصلاح کے لیے ہر ذریعہ استعمال کرتا ہے اور اسے ہر پہلو سے گھیرتا ہے ۔ اسلامی نظام انسانی شخصیت کے باطن کی اصلاح بھی ضروری سمجھتا ہے ۔ وہ تمام ذرائع استعمال کر کے اسے اللہ کی اطاعت پر آمادہ کرتا ہے اور معصیت کردگار سے روکتا ہے ۔ اسلامی نظام زندگی کا مقصد اولیں اصلاح فرد ہے اور ایک فرد کو ہر قسم کے انحراف سے بچانا مطلوب ہے ۔ اور سزا دہی کا نظام بھی ایک فرد بشر کی اصلاح ہی کا ایک ذریعہ ہے ۔ سزا دہی اصل مقصد ہے ہی نہیں ۔

ذرا اس سبق پر غور کیجئے کہ یہ حضرت آدم کے دو بیٹوں کے واقعہ سے شروع ہوتا ہے ۔ اس سبق میں جابجا اشارات ہیں ۔ اس کے بعد اس میں سزا کا اعلان کیا جاتا ہے تاکہ دلوں کو اس کی طرف جانے سے روکا جائے ۔ پھر خدا خوفی کی دعوت دی جاتی ہے اور خدا کے عذاب آخرت سے ڈرایا جاتا ہے اور سزا کی اس خوفناک تصویر کشی کے ساتھ ساتھ کہا جاتا ہے ۔

(يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ (۵ : ۳۵) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے ڈرو)

یعنی مناسب یہی ہے کہ اصل خوف اللہ کا خوف ہے' اور انسان جو اکرم المخلوقات ہے' اس کے شایان شان بھی یہ ہے کہ وہ خدا سے ڈرے ۔ کوڑے اور تلوار اور ڈنڈے سے ڈرنا تو ایک گرا ہوا مقام ہے اور ڈنڈے کے ذریعے اصلاح کی تو صرف ان لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے جو لوگ گرے ہوئے ہوتے ہیں ۔ خدا ترسی تو ایک بہتر' پاکیزہ تر اور شریفانہ مقام ہے ۔ پھر خدا ترسی ایک ایسا چوکیدار ہے جو دلوں میں بیٹھا ہوتا ہے جو اعلانیہ اور خفیہ دونوں حالتوں میں سر پر بیٹھا ہوتا ہے ۔

جن حالات میں انسان لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔اس وقت بھی تقویٰ اس کا نگران ہوتا ہے۔ایسے معاملات میں صرف تقویٰ ہی بدی اور شر سے روکتا ہے' جن میں انسان قانون کی گرفت سے دور ہوتا ہے۔یہ بات اچھی طرح یاد رکھنے کے لائق ہے کہ تقویٰ کے بغیر قانون کی گرفت ڈھیلی ہوتی ہے' کیونکہ جو مجرم قانون کی گرفت سے بچ نکلتے ہیں ان کی تعداد ان لوگوں سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے جو قانون کی گرفت میں آجاتے ہیں۔جو معاشرہ صرف قانون پر قائم ہوتا ہے اس میں نہ کسی فرد کی اصلاح ہوتی ہے اور نہ اس معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے۔ قانون کے پیچھے ایک پوشیدہ چوکیدار کا ہونا ضروری ہے اور یہ چوکیدار صرف خدا خوفی کا چوکیدار ہوتا ہے جو ہر دل میں بوجہ خدا ترسی اور تقویٰ بیٹھا ہوتا ہے۔

(وَ ابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ (۵ : ۳۵) (اور اس کی جناب میں باریابی کا ذریعہ تلاش کرو)۔

اللہ سے ڈرو اور اس تک جانے کا وسیلہ تلاش کرو' اور ان اسباب کی تلاش کرو جو تمہیں اللہ کے ساتھ جوڑتے ہیں۔حضرت ابن عباس سے ایک روایت ہے' وَ ابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ(۵ : ۳۵) (یعنی اس سے اپنی حاجات طلب کرو) کا مطلب یہ ہے کہ انسان جب اللہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور پھر اپنی حاجات اللہ سے طلب کرتے ہیں تو وہ اس وقت بندگی کی صحیح پوزیشن میں ہوتے ہیں۔اس وقت اللہ کی ربوبیت پر انہیں پورا پورا یقین ہو جاتا ہے اور ایسے حالات میں وہ اصلاح اور فلاح دونوں کے قریب تر پہنچ جاتے ہیں۔یہ دونوں تفسیریں اس آیت کے الفاظ کے ساتھ لگا کھاتی ہیں۔دونوں کے ذریعے دل کی دنیا کی اصلاح' ضمیر اور روح کی زندگی اور وہ فلاح اخروی حاصل ہوتی ہے جو ہمارا نصب العین ہے۔

(وَ جَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۵ : ۳۵) (اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو' شاید کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو جائے)

اس کے مقابلے میں کفار کا منظر آتا ہے' جو اللہ سے نہیں ڈرتے اور جو اللہ تک پہنچنے کے لیے ذریعے کی تلاش نہیں کرتے۔اور آخرت میں کامیاب نہیں ہوتے۔یہ زندہ اور متحرک منظر ہے' نظروں کے بالکل سامنے۔قرآن اس آیت کے بیان میں بیانیہ اور احکام قانون کا انداز اختیار نہیں کرتا بلکہ ان کے بارے میں حرکات اور تاثرات پیش کئے جاتے ہیں۔شاید قیامت کے بیان میں قرآن کریم کا یہ ایک خاص اسلوب ہے اور اس سے بیان کے تمام اغراض و مقاصد حاصل ہو جاتے ہیں۔

(اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لِیَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۳۶) یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنْهَا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ (۳۷)

"خوب جان لو کہ جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے' اگر ان کے قبضے میں ساری زمین کی دولت ہو اور اتنی ہی اور اس کے ساتھ' اور وہ چاہیں کہ اسے فدیہ میں دے کر روز قیامت کے عذاب سے بچ جائیں' تب بھی وہ ان سے قبول نہ کی جائے گی اور انہیں دردناک سزا مل کر رہے گی۔ وہ چاہیں گے کہ دوزخ کی آگ سے نکل بھاگیں مگر نہ نکل سکیں گے اور انہیں قائم رہنے والا عذاب دیا جائے گا)

بطور فرض انسان جو تصور کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ اہل کفر کے پاس زمین کے تمام خزانے ہوں اور اسی قدر مزید ان کے لیے فرض کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم ان کے لیے یہ بھی فرض کرتا ہے کہ اس جہان جیسا ایک دوسرا جہان بھی ان کے پاس ہو۔ اس کے بعد قرآن کریم یہ فرض کرتا ہے کہ یہ لوگ قیامت کے دن یہ تمام مفروضہ دولت بطور فدیہ اور کفارۂ کفر دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں۔ قرآن کریم ایک ایسا منظر نظروں کے سامنے لاتا ہے کہ وہ آگ سے کس طرح نکلنا چاہتے ہیں مگر وہ نکل نہیں سکتے۔ وہ اپنے اس مقصد اور ہدف میں ناکام رہتے ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ میں زندہ رہتے ہیں۔

یہ ایک ایسا منظر ہے جس کے اندر کئی مناظر ہیں اور جس میں کئی مسلسل حرکات ہیں۔ ایک منظر کفار کا ہے۔ وہ اپنے پاس اس پورے جہان کی دولت لیے ہوئے ہیں' پھر اچانک یہ دولت دوگنی ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اس دولت کو لے کر اسے بطور فدیہ دینے کی پیشکش کرتے ہیں۔ پھر ان کا یہ منظر سامنے آتا ہے کہ وہ یہ مقصد حاصل کرنے میں ناکام لوٹتے ہیں اب انہیں یہ مقصد حاصل کرنے کی کوئی آس بھی نہیں رہتی۔ پھر وہ اچانک آگ میں داخل ہوتے ہیں اور وہ اس سے باہر بھاگنا چاہتے ہیں مگر بھاگ نہیں سکتے۔ پھر ان کو مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ وہاں باقی رہیں ۔ اب پردہ گرتا ہے اور وہ یہاں ہی فروکش ہو جاتے ہیں۔ (دیکھئے کتاب التصویر الفنی میں فصل طریقۃ القرآن)

اور اب اس سبق کے آخر میں چوروں کے احکام:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۹﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۰﴾

(اور چور خواہ عورت ہو یا مرد دونوں کے ہاتھ کاٹ دو' یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرتناک

سزا۔ اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔ پھر جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کر لے تو اللہ کی نظر عنایت پھر اس پر مائل ہو جائے گی' اللہ بہت درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اللہ زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک ہے؟ جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے' وہ ہر چیز کا اختیار رکھتا ہے۔

اسلامی معاشرہ' باشندگان دارالاسلام کے لیے ایک ایسا ماحول فراہم کرتا ہے جس میں کوئی معتدل شخص چوری کے بارے میں سوچ ہی نہ سکے' چاہے ان باشندوں کے عقائد و نظریات جو بھی ہوں۔ اسلامی معاشرہ لپنے باشندوں کو معاشی کفالت' اخلاقی تربیت اور درست طرز عمل اختیار کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔ نیز انصاف اور دولت کی منصفانہ تقسیم کا انتظام کرتا ہے اور وہ یہ انتظام بھی کرتا ہے کہ اس کے اندر انفرادی ملکیت کی شکل ایسی ہو کہ وہ پوری سوسائٹی کے لیے نفع بخش ہو اور وہ معاشرے کے لیے باعث اذیت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے حالات پیدا کر دینے کے بعد بھی اگر کوئی چوری کرتا ہے تو اسلام اسے سخت ترین سزا دیتا ہے۔ اسی طرح انفرادی ملکیت پر دست درازی کرنے والے اور سوسائٹی کا امن و امان تباہ کرنے والے کو عبرت ناک سزا دیتا ہے۔ ان سخت ترین سزاؤں کی تجویز کے ساتھ ساتھ اسلام شبہات کی بنا پر حدود کو ساقط بھی کرتا ہے اور ملزم کو مکمل قانونی دفاع کا اختیار اور حق عطا کرتا ہے تاکہ کسی شخص کو مکمل ثبوت کے بغیر سزا نہ دی جا سکے۔ اب مناسب ہے کہ اس اجمال کے بعد قدرے تفصیلی بحث کر دی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام ایک باہم مربوط کل ہے۔ اس نظام کے کسی ایک جزء کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کسی کے پیش نظر وہ تمام اصولی مباحث نہ ہوں اور وہ ضمانتیں نہ ہوں جو یہ نظام اسلامی معاشرے کو فراہم کرتا ہے اور جن اصولوں اور قواعد پر اس کی جزئیات قائم ہیں۔ پھر اسلامی نظام کا ایک ایک جزء نافذ بھی نہیں ہو سکتا جب تک اسے مکمل طور پر نافذ نہ کیا جائے' اور اسے مجموعی طور پر روبعمل نہ لایا جائے۔ رہی یہ صورت کہ اس نظام کے کسی ایک جزء کو نافذ کرنا یا اس کے اصولوں میں سے کسی ایک اصول کو نافذ کرنا اور یہ نفاذ ایک ایسے معاشرے اور ایک ایسے نظام کے اندر کرنا جو مجموعی طور پر اسلامی نظام نہیں ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔

اسلام سے کٹا ہوا یہ جزء بھی اسلام کا نفاذ تصور نہ ہو گا' اس لیے کہ اسلام' اسلام کے اجزاء اور ٹکڑوں کا نام نہیں ہے۔ اسلام ایک ایسا نظام ہے جو تمام شعبہ ہائے حیات پر حاوی ہے اور اس کے احکام باہم مربوط ہیں..... یہ تو ایک عمومی بات تھی۔

رہی یہ بات کہ چوری کے قانون اسلامی کے بارے میں بات قدرے مختلف ہے تو حقیقت یہ ہے کہ دارالاسلام میں اسلام ہر فرد کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ زندہ رہے' اور اپنی زندگی کے حفظ اور بقاء کے لیے تمام وسائل سے کام لے۔ ہر شخص کھا پی سکتا ہے' ہر شخص کو مکان اور لباس کا حق ہے جہاں وہ آرام اور سکون سے رات گزارے۔ ایک فرد کا اسلامی سوسائٹی پر یہ حق ہے کہ وہ اسے اس کی یہ بنیادی ضروریات فراہم کرے اور ظاہر ہے کہ ایک حکومت پوری سوسائٹی کی طرف سے نمائندہ ہوتی ہے۔ یہ حق اس طرح فراہم ہو گا کہ حکومت ان تمام لوگوں کو روزگار فراہم کرے جو کام کرنے کے قابل ہوں۔ یہ حق ایک فرد کا سوسائٹی پر ہے اور پھر حکومت پر ہے۔ یہ سوسائٹی اور حکومت لوگوں کو کام کرنے کی تربیت بھی دے گی اور لوگوں کو کام کرنے کے مواقع اور کام کے اوزار بھی فراہم کرے گی۔ اگر کوئی بے روزگار ہو جاتا ہے اس طرح کہ اسے کام نہیں ملتا' یا کام کے اوزار نہیں ملتے' یا وہ محنت کے قابل نہیں رہتا اور یہ بیکاری جزئی ہے یا

کل ہے' وقتی ہے یا دائمی ہے' یا صورت یہ ہے کہ وہ کام تو کرتا ہے لیکن یہ کام اس کی ضروریات کے لیے کافی نہیں ہے تو اس فرد کا یہ حق ہے کہ وہ اجتماعی نظام یا سوسائٹی اس فرد کو یہ ضروریات خزانہ سے فراہم کرے یا ان لوگوں کے ذریعے فراہم کرائے جن پر ایسے افراد کا نفقہ فرض ہے۔ اہل محلہ سے ایسے لوگوں کی ضروریات فراہم کرائے ورنہ جیسا کہ کہا گیا بیت المال اور خزانہ سے فراہم کرے۔ بیت المال کی ایک مد زکوۃ تو ہے ہی اس کے لیے۔ اگر زکوۃ فنڈ سے بھی پورا نہ ہو تو پھر پورے دارالاسلام پر اس سلسلے میں ٹیکس عائد ہو سکتا ہے جس کے ذریعے غرباء کو اس قدر دیا جائے کہ ان کی ضروریات پوری ہوں۔ لیکن یہ ٹیکس بھی غرباء کی ضرورت کے مطابق ہی عائد ہو اور ضرورت سے زیادہ نہ ہو اور ایسی انفرادی ملکیت پر ظلم نہ ہو جو بالکل حلال ذرائع سے کمائی گئی ہو۔

پھر اسلام دولت کے ارتکاز پر بھی سخت پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اسلامی نظام میں انفرادی دولت صرف حلال ذرائع سے جمع کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں انفرادی ملکیت کو بغض و حسد کا سامنا کرنا نہیں پڑتا یعنی ان لوگوں کی طرف سے جو نادار ہیں۔ اسی طرح اسلامی معاشرے میں کوئی شخص دوسرے کی جائیداد چھین لینے کے بارے میں بھی نہیں سوچتا خصوصاً اس وقت جب اسلامی نظام ان کے لیے بقدر کفایت انتظام کرتا ہے اور ان کو بالکل محروم نہیں چھوڑتا۔

اسلام لوگوں کے ضمیر اور ان کے اخلاق کی تربیت پر بھی زور دیتا ہے۔ اس لیے اسلام لوگوں کو کسب و عمل پر آمادہ کرتا ہے اور یہ کسب و عمل اسلامی طریقے کے مطابق چاہتا ہے۔ اگر عمل اور روزگار نہ ملے تو اسلامی نظام لوگوں کی ضروریات کی فراہمی کا انتظام کرتا ہے' اور پاک و صاف ذرائع سے ان کی کفالت کرتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایسے معاشرے اور ایسے حالات میں ایک شخص اگر چوری کرتا ہے تو کیوں کرتا ہے؟ یہ شخص ضروریات کے لیے چوری نہیں کرتا بلکہ یہ دولت جمع کرنے کے لیے چوری کرتا ہے۔ یہ دولت وہ کسب اور محنت کے ذریعہ جمع نہیں کرنا چاہتا بلکہ چوری کے ذریعہ دولت جمع کرنے کی خواہش کرتا ہے جس سے پورے دارالاسلام کے امن و امان اور اطمینان کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ اسلامی سوسائٹی کا یہ حق ہے کہ وہ امن و سکون سے جاری و ساری رہے لیکن یہ چوری کا فعل ایک حلال مال کے مالک کو اپنے حق اطمینان سے محروم کر دیتا ہے اور پھر پوری سوسائٹی کو بھی۔

اسلامی معاشرے میں جو شخص حلال دولت کماتا ہے' سود خوری نہیں کرتا' دھوکہ دہی نہیں کرتا' ذخیرہ اندوزی نہیں کرتا' مزدوروں کی مزدوری نہیں مارتا' زکوۃ ادا کرتا ہے' اور اسلامی معاشرے کو وہ ٹیکس بھی ادا کرتا ہے جس کی اس معاشرے کو ضرورت ہو تو ایسے شخص کا بھی اسلامی معاشرے اور دارالاسلام پر یہ حق ہے کہ اس کا مال محفوظ ہو اور اس کی یہ دولت چوری اور ڈاکے سے محفوظ رہے۔

ایسے تمام حالات اور سہولتوں کے بعد بھی اگر کوئی چوری کرتا ہے' وہ اس حال میں چوری کرتا ہے کہ اس کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں' اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ چوری ایک سنگین جرم ہے اور اسے دوسروں کا مال لوٹنے کی ضرورت اور احتیاج بھی نہیں ہے اور ان مالداروں نے نہ لوٹ مار کے ذریعہ یہ مال جمع کیا ہے اور نہ حرام ذرائع سے جمع کیا ہے۔ اگر کوئی ایسے حالات میں سرقے کا ارتکاب کرتا ہے تو یہ سرقہ بلاجواز ہے۔ ایسے حالات میں کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ایسے شخص پر رحم کرے بشرطیکہ اس پر جرم ثابت ہو جائے۔

اگر حالات مقدمہ ایسے ہوں کہ جن میں یہ ثابت ہو جائے کہ چور ضرورت مند تھا' یا کوئی اور عذر تھا تو اسلامی قانون کا عام اصول یہی ہے کہ حدود شبہات کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قحط سالی کے سال میں حضرت عمرؓ نے قطع ید کی سزا کو موقوف فرمایا تھا۔ اس موقعہ پر حالات ایسے تھے کہ لوگ بالعموم بھوکے ہوتے تھے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے ایک خاص حادثے میں بھی سزائے قطع ید نہ دی تھی۔ حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں نے مزینہ کے ایک شخص کی اونٹنی چوری کر لی تھی۔ حضرت عمرؓ نے ان کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تھا' لیکن جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ ان غلاموں کا مالک ان کو بھوکا رکھتا ہے تو آپ نے حد کی سزا ساقط کر دی اور غلاموں کے مالک پر اونٹنی کی قیمت سے دوگنا قیمت بطور تاوان عائد کر دیا۔

مناسب یہ ہے کہ ہم اسلامی حدود کو اس انداز سے سمجھنے کی کوشش کریں اور انہیں اسلام کے مکمل اور مربوط نظام کی شکل و صورت میں سمجھیں جو افراد معاشرہ کو زندگی کی ضمانتیں فراہم کرتا ہے۔ یہ ضمانتیں کسی ایک طبقے کو دوسرے طبقے کے خلاف نہیں فراہم کرتا بلکہ اسلام سزا کے اسباب فراہم کرنے سے پہلے سزا سے بچانے کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ اسلام صرف ان لوگوں کو سزا دیتا ہے جو بلاجواز جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

اس عمومی حقیقت کے اظہار کے بعد اب ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ حد سرقہ کی تفصیلات دی جائیں۔ سرقہ کی تعریف یہ ہے کہ دوسرے کا مال خفیہ طور پر لیا جائے جو مال حرز کے اندر ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مال متقوم ہو یعنی مالیت رکھتا ہو۔ مال کے نصاب کے سلسلے میں فقہاء کے درمیان متفق علیہ بات یہ ہے کہ جو مال لیا گیا ہو اور خفیہ طور پر حرز کے اندر سے لیا گیا ہو' اس کی مقدار 1/4 دینار کے برابر ہونا چاہیے۔ یعنی ہمارے دور کے ۲۵ مصری قرش کے برابر۔ یہ نہایت ہی ضروری ہے کہ یہ مال حرز کے اندر ہو اور چور اسے حرز کے اندر سے لے لے۔ اور وہ لے کر حرز سے نکل جائے۔ اب اگر کوئی کسی کے پاس مالی امانت رکھتا ہے اور وہ اسے چوری کر لیتا ہے تو اس پر حد سرقہ نہ ہو گی۔ اسی طرح جو شخص ملازم ہے اور وہ گھر یا دکان و گودام میں آتا جاتا ہے تو بھی اس پر حد سرقہ جاری نہ ہو گی۔ اس طرح اگر کوئی کسی سے کوئی چیز مانگ کر لے جاتا ہے اور پھر انکار کر دیتا ہے اور اس سے برآمد ہو جاتی ہے تو بھی اس پر حد سرقہ جاری نہ ہو گی۔ نیز ان پھلوں پر بھی حد سرقہ نہ ہو گی جب تک کھلیان میں انہیں جمع نہ کر لیا جائے۔ نہ ایسے مال پر یہ حد ہو گی جو گھر سے باہر ہو یا اس صندوق سے باہر ہو جو اس کی حفاظت کے لیے بنایا گیا ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ مال محفوظ کسی دوسرے شخص کی ملکیت میں ہو' اس لیے اگر کوئی شریک چوری کر لے تو اس پر حد سرقہ نہ ہو گی۔ اس لیے کہ اس میں وہ خود بھی شریک ہے اور وہ خالص طور پر دوسرے کا نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی سرکاری مال چرائے یعنی دارالاسلام کے خزانے سے تو اسے بھی قطع ید کی سزا نہ ہو گی کیونکہ اس مال میں اس کا بھی حصہ ہے اور وہ خالص مال الغیر نہیں ہے۔ ایسے حالات میں سزا قطع ید نہ ہو گی بلکہ تعزیری سزا ہو گی (یاد رہے کہ تعزیری سزا سزائے حد سے کم ہوتی ہے' مثلاً کوڑے' قید' ڈانٹ ڈپٹ اور وعظ و نصیحت بھی اور یہ سزا ظرف احوال کے مطابق قاضی کے اختیار تمیزی پر ہو گی)۔

"قطع ید" دائیں ہاتھ کا ہو گا یعنی کلائی تک اگر دوبارہ چوری کرے تو بایاں پاؤں ٹخنے تک کاٹا جائے گا۔ یہاں تک تو تمام لوگوں کا اتفاق ہے تیسری اور چوتھی بار چوری کرنے کی صورت میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

شبہات کی وجہ سے حدود معاف ہو جاتی ہیں۔ حد سرقہ میں شبہات درج ذیل ہو سکتے ہیں' مثلاً بھوک اور شدید

ضرورت کی وجہ سے حد ساقط ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر مال میں شرکت کا شبہ ہو تو بھی حد ساقط ہوگی' اگر کسی نے اعتراف کیا ہو اور باقی شہادت نہ ہو تو بھی اعتراف جرم سے رجوع کرتے ہی حد ساقط تصور ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی نے شہادت دی ہو لیکن بعد میں وہ شہادت سے پھر جائے تو یہ بھی ایک طرح کا شبہ ہو گا۔

اور فقہاء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کیا چیز ہے جسے شبہ تصور کیا جائے گا۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ جو چیز مباح ہو اصلاً تو اس میں قطع ید کی سزا نہ ہوگی اگرچہ وہ حرز اور حفاظت میں ہو۔ مثلاً ایک شخص کسی کے حرز سے پانی چوری کرتا ہے یا مثلاً ایک شخص شکار کرے اور اسے محفوظ کر لے اور دوسرا اسے چرا لے۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جو اپنی اصلیت کے اعتبار سے سب کے لیے مباح ہیں اور جو چیز اصلیت کے اعتبار سے سب کے لئے مباح ہے اس میں یہ شبہ لاحق ہو سکتا ہے کہ حرز اور حفاظت میں آنے کے بعد بھی اباحت جاری ہو۔ اسی طرح عوام الناس کی مشترکہ دولت اگرچہ کسی خاص شخص کے حرز اور حفاظت میں آجائے' اس میں بھی شبہ لاحق ہو سکتا ہے کہ وہ اب بھی مفاد عامہ کی چیز ہے۔ جبکہ امام شافعی' امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ ایسے حالات میں شبہ کے قائل نہیں ہیں اور حد کو ساقط نہیں کرتے۔ امام ابوحنیفہ ان تمام چیزوں کی چوری میں حد ساقط فرماتے ہیں جن میں گلنے سڑنے کا عمل تیزی سے آتا ہے مثلاً کھانا' پھل' سبزیاں' گوشت' روٹی اور ان جیسی دوسری اشیاء۔ ہاں امام ابو یوسف' امام ابو حنیفہ سے اختلاف کرتے ہیں۔ اور وہ ان میں قطع ید کے قائل ہیں جس طرح ائمہ ثلاثہ قائل ہیں۔

یہاں ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم فقہاء کے اختلافات میں تفصیل سے بحث کریں' یہ تفصیلات کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ چند مثالیں اس بات کے اظہار کے لئے کافی ہیں کہ اسلامی قانون کی پالیسی یہ نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ سزا نافذ کرے بلکہ اسلام شبہات کی وجہ سے حدود کو ساقط کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ حضور ؐ فرماتے ہیں۔ (ادروا الحدود بالشبہات) (حدود کی سزاؤں کو شبہات کی وجہ سے ساقط کر دو) اور حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ شبہات کی وجہ سے حدود کو معطل کر دوں بہ نسبت اس کے کہ میں ایسے حالات میں حدود کو نافذ کروں۔

لیکن قطع ید کے بارے میں مناسب ہے کہ ذرا تفصیلی بات ہو جائے' یہ بات تو ہم کہہ چکے ہیں کہ دارالاسلام میں' ملزم کے بچاؤ اور اسے پورے پورے عدالتی تحفظات دینے کے بعد چور کے ساتھ سختی کیوں کی گئی ہے۔ یہاں مناسب ہے کہ ہم جناب عبدالقادر عودہ کی مشہور کتاب سے کچھ اقتباسات دے دیں۔

"سارق کے لئے قطع ید کی سزا اس لئے تجویز کی گئی ہے کہ چور جب چوری کرتا ہے تو اس کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کی کمائی حاصل کر کے اپنی کمائی میں اضافہ کرے۔ وہ خود حلال طریقے سے جو کماتا ہے اسے ناکافی تصور کرتا ہے۔ اس طرح وہ حرام طریقے سے اپنی کمائی بڑھانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے عمل اور کسب کے نتائج پر اکتفا نہیں کرتا' اور دوسرے کی کمائی ہتھیانے کا لالچ کرتا ہے۔ اور اس کام کے پس پشت وہ یہ خواہش رکھتا ہے کہ اس طرح وہ زیادہ خرچ کرے یا زیادہ دولتمندی کا مظاہرہ کرے یا یہ جذبہ ہوتا ہے کہ وہ کام کرنے اور مشقت کرنے سے بچ جائے یا اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اس کا مستقبل محفوظ ہو جائے۔ غرض چوری پر مائل کرنے کا عامل صرف یہ ہوتا ہے جو اوپر ہم نے بیان کیا یعنی

زیادہ کمائی اور دولتمندی۔ اسلامی شریعت نے ان کی نفسیات کے اندر اس بیماری کا علاج اس طرح شروع کر دیا کہ اس نے اس جرم کے لئے قطع ید کی سزا تجویز کی۔اس قطع ید یا قطع پا سے اس شخص کی کمائی پر اثر پڑے گا اس لئے کہ ہاتھ اور پاؤں دونوں کمائی کے آلات ہیں۔ اب کمائی کم ہو گی تو دولت کم ہو گی اور دولت کم ہو گی تو زیادہ انفاق اور زیادہ دولتمندی کا اظہار بھی کم ہو گا۔ اس کی وجہ سے اب ایسے شخص کو زیادہ محنت کرنے کی ضرورت پڑے گی اور وہ زیادہ وقت کے لئے کام کرے گا اور اسے اپنے پورے مستقبل سے ہاتھ دھونے کا خطرہ درپیش ہو گا۔"

"اس طرح شریعت نے قطع ید کی سزا مقرر کر کے ان نفسیاتی عوامل کو ختم کر دیا جو اس جرم پہ کسی کو آمادہ کرتے ہیں اور مجرم کی نفسیات کے اندر اس جرم پر آمادہ کرنے کے مخالف نفسیاتی عوامل داخل کر دیئے۔ تاہم اگر پھر بھی کسی کی نفسیات میں پائے جانے والے چوری پر آمادہ کنندہ عوامل غالب آجائیں اور انسان یہ جرم کر بیٹھے تو اس صورت میں اسے جو تلخ سزا ملے گی وہ ان مؤثرات پر غالب آجائے گی جو اسے چوری پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ہرگز دوبارہ اس جرم کے ارتکاب کے لئے آمادہ ہو گا۔"

"یہی وہ بنیاد ہے جس پر اسلامی نظام قانون میں قطع ید کی سزا رکھی گئی ہے۔ اور یہ خدا کی قسم، آغاز انسانیت سے لے کر آج تک اس جرم کے لئے بہترین سزا ہے۔"

"دور جدید کے قوانین چور کو سزائے قید دیتے ہیں۔ یہ وہ سزا ہے جو ہر قسم کے جرائم کو ختم کرنے میں بالکل ناکام رہی ہے اور خصوصاً چوری کی سزا کو یہ ختم نہیں کر سکی۔ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ سزائے قید چور کی نفسیات کے اندر وہ عوامل داخل نہیں کر سکتی جو اسے اس جرم سے باز رکھے اس لئے کہ یہ سزا چور کو صرف اسی عرصہ میں جرم سے باز رکھ سکتی ہے جس عرصے کے لئے وہ قید میں ہوتا ہے۔ جب وہ قید ہوتا ہے تو اسے کمانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، اس لئے کہ جیل کے اندر اس کی تمام ضروریات و حاجات کا انتظام ہوتا ہے اور جب وہ جیل سے نکلتا ہے تو وہ کمانے اور محنت کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ اس کو از سر نو موقعہ مل جاتا ہے کہ وہ اپنی کمائی میں اضافہ کرے۔ اپنی دولت کو بڑھائے اور اس میں حلال اور حرام دونوں ذرائع استعمال کرے۔ وہ پھر لوگوں کو دھوکہ دے سکے، اپنے آپ کو شریف ظاہر کر سکے، لوگ اس کی طرف سے مطمئن ہو جائیں اور اس کے ساتھ تعاون کریں۔ اگر وہ اچھا رویہ اختیار کرے جو اسے کرنا چاہئے تو وہ ایسا کرے گا۔ اور اگر وہ اپنے مقاصد حاصل نہ کر سکے تو اس کو کوئی نقصان بھی نہیں ہوا ہے اور وہ بڑی سہولت سے دوبارہ برے راستے پر جا سکتا ہے۔"

"رہی یہ صورت کہ اسے قطع ید کی سزا دے دی جائے تو وہ دوبارہ کسب و عمل پر سرے سے قادر ہی نہ ہو گا یا اس کی کسب و عمل کی صلاحیت بڑی حد تک کم ہو جائے گی اور اس طرح اس کی زیادہ کمائی کے مواقع بہرحال کم ہوں گے۔ بعض اوقات تو یہ مواقع بہت ہی محدود ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات بالکل ختم ہو جاتے ہیں۔ اب وہ لوگوں کو دھوکہ بھی نہ دے سکے گا اور وہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ نہ کر سکے گا کہ وہ اس پر کوئی اعتبار اور اعتماد کریں۔ اس لئے کہ اس کے جسم پر جرم کے آثار موجود ہوں گے۔ اس کا سابقہ کردار اس کے کٹے ہوئے ہاتھ سے عیاں ہو گا۔ اگر قطع ید کی سزا نافذ ہو تو اس صورت میں چور کے لئے خسارہ یقینی اور حتمی ہو گا۔ اگر اسے سزائے قید دی جائے تو اسے فائدہ زیادہ ہو گا اور نقصان کم۔ اور چور ہی کا نہیں بلکہ تمام لوگوں کا یہ اصول ہے کہ وہ اسی طرف جھکتے ہیں جس میں نفع کا احتمال

زیادہ ہو۔ اور ایسا کام وہ ہرگز نہیں کرتے جس میں خسارہ یقینی ہو۔"

"اس بحث کے بعد ان لوگوں کی باتیں نہایت ہی عجیب ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ سزائے قطع ید آج کل کے ترقی یافتہ دور اور مہذب دنیا کے ساتھ لگا نہیں کھاتی۔ گویا تہذیب و تمدن اس چیز کا نام ہے کہ جدید علم اور گہری حکمت کا انکار کر دیا جائے۔ انسان کے مزاج کو بھلا دیا جائے اور تمام اگلی پچھلی امتوں کے تجربات سے انکار کر دیا جائے۔ ہم اپنی عقل کو یک دم معطل کر دیں' اور ہماری فکر واضح طور پر جن نتائج تک پہنچ چکی ہے اسے ترک کر دیں' اور ان باتوں کو لے لیں جن کے قائل کے پاس ان پر بے راہ روی اور گمراہی کے سوا اور کوئی دلیل نہیں ہے۔"

"اگر تہذیب و تمدن کا تقاضا یہ ہے کہ جو بھی سزا ہو وہ تہذیب و تمدن کے مطابق ہو تو پھر سزائے قید اس بات کی مستحق ہے کہ اسے سرے سے ختم کر دیا جائے اور سزائے قطع ید کو نافذ کر دیا جائے۔ اس لئے کہ سزائے قطع ید نفسیاتی محرکات اور علم النفس کے مسلمہ اصولوں کے عین مطابق ہے۔ یہ انسان کے مزاج کے عین مطابق اور تمام اقوام عالم کے تجربات کی روشنی میں بھی نہایت ہی مفید ہے۔ یعنی تمام چیزوں کا ادراک اور ان کی حکمت۔ تہذیب و تمدن بھی اسی اصول ادراک اور اصول حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ رہی سزائے قید تو وہ ہرگز علم النفس ' حکمت و تجربہ پر قائم نہیں ہے اور نہ یہ عقلی منطق اور دنیا کی مخلوقات کے مزاج سے متفق ہے۔

"سزائے قطع ید کی بنیاد انسان کی نفسیات اور اس کی عقلمندی پر ہے۔ یہ سزا افراد کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ یہ معاشرے اور سوسائٹی کے لئے بھی مفید ہے۔ اس کی وجہ سے جرائم میں ایک دم کمی آجاتی ہے۔ معاشرے میں امن قائم ہو جاتا ہے۔ جب ایک سزا ایک فرد کے لئے مناسب اور ایک سوسائٹی کے لئے مفید ہو تو وہ تمام سزاؤں سے زیادہ بہتر ہوتی ہے۔"

"لیکن یہ سب دلائل بھی بعض لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتے کہ سزائے قطع ید مفید ہے۔ ان کی رائے پر ان کے پاس صرف یہ دلیل ہے کہ یہ سنگدلانہ سزا ہے۔ یہ ان کی اول اور آخر دلیل ہے اور ان کی یہ دلیل اس طرح قابل رد ہے کہ لفظ عقوبت (سزا) عقاب کے مشتق ہے۔ اور سزا اس وقت سزا ہی نہیں رہتی اگر وہ نرم اور محض تفریح ہو 'بلکہ وہ محض ایک کھیل تماشا یا اس جیسی کوئی اور چیز ہوگی۔ لہذا سزا ہونی ہی ایسی چاہئے جس میں مجرم پر سختی ہو تاکہ سزا کو سزا کہا جا سکے۔"

اللہ تعالیٰ تو ارحم الراحمین ہے۔ اللہ کا فرمان یہ ہے اور بہت ہی سخت فرمان ہے۔

(فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ (۵:۳۸) (اور چور خواہ عورت ہو یا مرد دونوں کے ہاتھ کاٹ دو' یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا)۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبرتناک اور جرائم سے روکنے والی سزا ہے۔ جس شخص کے دل میں ارتکاب جرم کا داعیہ ہو اور وہ اس سے رک جائے تو یہ اس پر اللہ کی رحمت ہو جاتی ہے۔ یہ رحمت ربانی اسے روکتی ہے' اور پھر یہ پوری سوسائٹی پر ایک قسم کی رحمت ربانی ہوتی ہے کہ اس سے جرم کم ہوتا ہے اور وہ مطمئن زندگی بسر کرتی ہے۔ کسی کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے خالق سے بھی زیادہ ان پر مہربان ہے الا یہ کہ کوئی دلی طور پر اندھا ہو' اور اس کی روح مسخ ہو چکی ہو اور یہ امر واقعہ ہے کہ اسلام کے دور اول میں ایک صدی گزر جانے کے باوجود صرف چند لوگوں کا

ہاتھ کٹا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی نظام حیات کی برکات اور اسلامی سوسائٹی میں لوگوں کی ضروریات کی کفالت کی وجہ سے صرف چند لوگوں پر ہی اس سزا کا اجراء ہوا۔

پھر اللہ تعالیٰ تائب ہونے والوں کے لئے بھی دروازہ کھلا چھوڑتے ہیں کہ اگر وہ تائب ہو جائیں اور شرمندہ ہو جائیں اور ارتکاب جرم سے باز آجائیں تو اللہ بھی معاف کرنے والا ہے بشرطیکہ وہ صرف توبہ ہی نہ کریں بلکہ اپنے اندر مثبت تبدیلی پیدا کریں اور نیک کام شروع کر دیں۔

(فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

(۳۹) (اور وہ دانا و بینا ہے پھر جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کر لے تو اللہ کی نظر عنایت پھر اس پر مائل ہو جائے گی' اللہ بہت درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)

ظلم ایک منفی عمل ہے اور اس سے زمین میں فساد پھیلتا ہے' اس لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ ایک شخص ظلم سے باز آجائے اور بیٹھ جائے بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس ظلم کے بدلے وہ مثبت نیکیاں بھی کرے بلکہ اسلامی نظام میں معاملہ اس سے بھی زیادہ گہرا ہے۔ نفس انسانی تو ہر وقت متحرک رہتا ہے۔ اگر وہ شر و فساد سے باز آجائے اور بھلائی میں شروع نہ ہو' بھلائی کے لئے جدوجہد نہ کرے تو یہ نفس خلا کا شکار ہو گا اور اس بات کا امکان رہتا ہے کہ انسان دوبارہ شر و فساد کی طرف مڑ جائے۔ لیکن جب یہ نفس خیر اور بھلائی کی سمت میں حرکت شروع کر دے گا تو یہ شر و فساد سے مزید دور ہوتا چلا جائے گا اور اس کی واپسی کا کوئی امکان نہ رہے گا۔ یہ عدم امکان محض ایجابیت اور عدم خلا کی وجہ سے ہو گا۔ اس نظام تربیت کے مطابق' جو ذات تربیت دیتی ہے وہ ذات وہی ہے جو خالق ہے اور جانتی ہے کہ اسے اپنی مخلوق کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہئے۔

جرم و سزا کے تذکرے اور توبہ اور مغفرت کے بیان کے بعد اب قرآن کریم وہ اصول اور قاعدے کا بیان کرتا ہے جس کے مطابق اس دنیا اور آخرت میں جزاء و سزا کا نظام جاری کیا گیا ہے۔ اس جہان کا خالق و مالک اللہ ہے اور وہ سزا و جزا کے لئے جو نظام تجویز کرے یہ اس کی مشیت ہے جو بے قید ہے۔ وہ کلی اختیارات کا مالک ہے' وہی ہے جو اس کائنات کے انجام اور اس میں بسنے والوں کے انجام کا فیصلہ کرتا ہے۔ وہی ہے جو اس مخلوقات کے لئے قانون سازی کرتا ہے اور پھر ان کے اعمال پر اس دنیا اور آخرت میں جزا و سزا کا فیصلہ کرتا ہے۔

(اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۴۰) (کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اللہ زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک ہے؟ جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے' وہ ہر چیز کا اختیار رکھتا ہے۔

اللہ کی حکمرانی ایک ہے' وہ مالک الملک ہے' وہی ہے جو اس دنیا کے لئے قانون بناتا ہے اور آخرت میں پھر اس قانون کے مطابق جزا و سزا مقرر کرتا ہے۔ ان معاملات میں نہ تعدد ہے' نہ کوئی تقسیم ہے اور نہ یہ معاملات ایک دوسرے

سے جدا ہیں ۔لوگوں کے معاملات اس وقت تک درست نہیں ہو سکتے جب تک حق قانون سازی اور نظام جزا و سزا دنیا اور آخرت دونوں میں ایک ہی ذات باری میں مرتکز نہ کر دیا جائے ۔اس لئے کہ اگر اس کائنات میں صرف اللہ اللہ نہ ہوتا اور متعدد الہ ہوتے تو یہ کب کی تباہ ہو چکی ہوتی ۔پس وہی ہے جو آسمانوں میں بھی الہ ہے اور زمین میں الہ ۔

---ooo---

درس نمبر ۹۴ ایک نظر میں

اس سبق میں اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام حیات کا نہایت ہی اہم مسئلہ لیا گیا ہے۔ اس پر اسلامی نظام حکومت اور اسلامی زندگی کا دارومدار ہے۔ سورۂ آل عمران اور سورۂ نساء میں بھی اس مسئلے کا بار بار ذکر ہوا ہے لیکن یہاں اس سبق میں اسے نہایت ہی واضح اور قطعی شکل میں لے لیا گیا ہے۔ یہاں اس مسئلے کو اشارۃ النص یا مفہوم آیت کے طور پر نہیں لیا گیا نہ بطور اقتضاء النص لیا گیا۔ یہاں اسے عبارۃ النص اور قطعی الدلالت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

یہ مسئلہ نظام حکومت' قانونی نظام اور عدالتی نظام سے متعلق ہے اور اس کی اساس پر مسئلہ توحید 'مسئلہ حاکمیت الہیہ اور ایک شخص کے ایمان کے ہونے نہ ہونے کا دارومدار ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہمارا نظام حکومت' ہمارا قانونی نظام اور ہمارا نظام عدالت آیا اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہو گا' شریعت کے مطابق ہو گا اور ان شرائع کے مطابق ہو گا جو ادیان سماوی میں محفوظ رہی ہیں۔ سابقہ رسل اور اس رسول آخر الزماں کی شریعت کے مطابق ہو گا یا ہماری خواہشات' بدلتی ہوئی خواہشات یا ہمارے مصالح اور بدلتے ہوئے مصالح کے مطابق ہو گا جو اللہ کی شریعت کے مطابق نہیں ہیں یا صرف کسی دور یا کسی نسل کے رسم ورواج کے مطابق متغیر اور متبدل ہوتا رہے گا۔ آیا لوگوں کی زندگی اور اس کرۂ ارض پر حاکمیت' ربوبیت اور قیومیت اللہ کی ہو گی یا اس میں سے بعض چیزیں اللہ کی اور بعض دوسرے لوگوں کی ہوں گی؟

اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے۔ اس نے لوگوں کے لئے ایک شریعت نازل کی ہے اور یہ شریعت اور قانون اس کی حاکمیت کے مطابق ہے۔ اس نے لوگوں سے یہ عہد لیا ہے کہ وہ اللہ کی شریعت پر قائم رہیں گے اور اس کرۂ ارض پر یہی شریعت حاکم رہے گی۔ اور لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اسی شریعت کے مطابق اپنی عدالتیں چلائیں اور انبیاء کا بھی فرض ہے کہ وہ اس کے مطابق کام کریں۔ انبیاء کے بعد حکام کا فرض بھی یہی ہے کہ وہ اس کے مطابق فیصلے کریں۔

اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اس مسئلے میں کوئی جھوٹ اور کوئی خود مختاری نہیں ہے۔ اس مسئلے میں زندگی کے معاملات میں سے چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں انحراف ناقابل برداشت ہے۔ اگر کوئی پوری نسل کسی بھی دور میں کوئی قانون اس کے مقابلے میں وضع کرے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ نہ کسی قبیلے یا کسی قوم کا کوئی اصول اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت رکھتا ہے الا یہ کہ اللہ نے کسی چیز کا اذن دے دیا ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہاں سوال یا تو ایمان وکفر کا ہے یا اسلام اور جاہلیت کا یا شریعت ہو گی یا نفسانیت۔ اس معاملے

میں نہ کوئی بین بین مقام ہے' نہ نرمی ہے اور نہ مصالحت ہے۔ مومنین وہی لوگ ہیں جو اللہ کے قانون کے مطابق حکم کرتے ہیں۔ اس سے ذرہ برابر انحراف نہیں کرتے اور اس میں ایک حرف کی تبدیلی نہیں کرتے۔ ظالم' فاسق اور کافر وہ لوگ ہیں جو اس معاملے میں انحراف کر کے فیصلے اللہ کے قانون شریعت کے مطابق نہیں کرتے۔ حکمران اگر اللہ کی شریعت کے مطابق حکمران ہوں گے تو وہ دائرہ ایمان میں داخل ہوں گے یا وہ کسی دوسرے آئین و دستور و قانون پر چلتے ہوں گے جس کی اجازت اللہ نے نہ دی ہوگی تو وہ کافر' فاسق اور ظالم ہوں گے۔ لوگوں کے لئے دو ہی راستے ہیں' یا تو وہ حکام اور ججوں کی جانب سے اللہ کے قانون کے مطابق جاری کردہ فیصلے قبول کریں گے اور اپنی زندگی کے تمام امور میں ایسا کریں گے تو وہ مومن ہوں گے اور اگر وہ یہ راہ اختیار نہ کریں گے تو وہ مومن نہ ہوں گے۔ ان دو راستوں کے درمیان کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔ نہ اس معاملے میں کوئی حجت بازی کام دے گی' نہ کوئی معذرت قبول ہوگی' نہ کوئی مصلحت قبول ہوگی۔ اللہ تعالیٰ بہرحال لوگوں کا رب ہے اور وہی جانتا ہے کہ لوگوں کی مصلحت کس میں ہے؟ اللہ تو لوگوں کی حقیقی بہبود کے لئے قانون سازی کرتا ہے لہٰذا اللہ کی شریعت اور اللہ کے احکام سے کوئی قانون اور کوئی آرڈر بہتر نہیں ہوسکتا۔ اللہ کے بندوں میں سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اللہ کی شریعت کو تسلیم نہیں کرتا۔ یا یہ کہ وہ اللہ سے زیادہ لوگوں کی مصلحت کے بارے میں جانتا ہے۔ اگر کوئی اپنی زبان اور اپنے عمل سے ایسا کہے تو وہ دائرہ ایمان سے خارج تصور ہوگا۔

یہ ہے وہ عظیم مسئلہ جو اس سبق میں فیصلہ کن انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس سبق میں یہودیوں کے حالات بھی بیان کئے گئے ہیں جو مدینہ کے اردگرد پھیلے ہوئے تھے جو منافقین کے ساتھ مل کر اسلام کے خلاف سازشیں کر رہے تھے اور داؤ پیچ لڑا رہے تھے۔

مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ (۵ : ۴۱) (ان لوگوں سے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ ان کے دل ایمان نہ لائے تھے) اس میں وہ حالات بھی بیان کئے گئے ہیں جن کے مطابق حضور اکرم ؐ ان سازشوں کا مقابلہ کر رہے تھے اور جن سے یہودی حضور اکرم ؐ کے زمانہ سے آج تک باز نہیں آئے۔

اس سبق میں قرآن کی عبارتوں سے کئی باتیں نکلتی ہیں۔ پہلا فیصلہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام ادیان جو اللہ کی جانب سے نازل ہوئے ان میں تمام فیصلے اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ہوتے رہے۔ ان کے اندر زندگی کا پورا نظام اللہ کی شریعت پر قائم ہوتا رہا۔ یہ بات اسلام اور کفر کے اندر حد فاصل رہی' اسلام اور جاہلیت کے اندر فرق و امتیاز کی بنیاد رہی اور شریعت اور ہوائے نفس کے درمیان جدائی کی اساس رہی کہ کون شریعت کے مطابق فیصلے کراتا ہے اور کون نہیں کراتا ہے۔ توراۃ کو بھی اللہ نے اس لئے نازل فرمایا کہ اس میں ہدایت اور نور تھا۔

(یَحْكُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا وَ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَیْهِ شُهَدَآءَ (۵ : ۴۴))

(سارے نبی جو مسلم تھے ' اسی کے مطابق ان یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے اور اسی طرح ربانی اور احبار بھی - (اسی پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے) کیونکہ انہیں کتاب کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے) اور دوسری جگہ ہے - (وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ (۵:۴۳)) (اور ان کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا حکم ہے) اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے - (وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ) (اور ہم نے اس میں ان پر یہ فرض کر دیا کہ جان کے بدلے جان ہوگی) اور حضرت ابن مریم عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل دی گئی -

(مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰتِ وَهُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (۴۶) وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ (۴۷)(۵:۴۶-۴۷)) (اور وہ تورات میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا اس کی تصدیق کرنے والی تھی اور خدا ترس لوگوں کے لئے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی - ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون کے مطابق فیصلے کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے) - پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی پر قرآن کریم نازل فرمایا -

(بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (۵:۴۸)) (سچائی کے ساتھ ' اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ اور نگہبان ہے) اور نبی آخر الزماں کو حکم دیا گیا :

(فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ (۵:۴۸)) (لہٰذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو) اور پھر کہا :

(وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۵:۴۷)) (جو لوگ اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ فاسق ہیں) اور یہ حکم دیا :

(اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۵:۵۰)) (تو پھر کیا جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے) ان آیات سے صاف نظر آتا ہے کہ تمام ادیان کا اس نکتے پر بڑا پورا اتفاق رہا ہے - یوں اسلامی حدود متعین ہو جاتی ہیں اور اسلام کی شرائط کا تعین ہو جاتا ہے - محکوموں اور عدالتوں کے لئے بھی اور حکام کے لئے بھی - اصل بات یہ ہے کہ تمام فیصلے اللہ کے احکام کے مطابق کئے جائیں اور عوام الناس ان فیصلوں کو قبول

کریں۔ اور اسلامی قانون کو چھوڑ کر دوسرے قوانین اور احکام کے پیچھے نہ بھاگیں۔

اس فریم ورک میں یہ مسئلہ نہایت ہی اہمیت اختیار کر جاتا ہے اور اس زاویے سے اس پر زور دینے کے اسباب بھی لازماً نہایت ہی اہم ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ اسباب کیا ہیں؟ چاہے ان اسباب کی تلاش ہم ان نصوص کے اندر کریں یا پوری قرآنی آیات و عبارات میں کریں یہ اسباب ہمیں بالکل واضح نظر آتے ہیں۔

ان میں پہلا سبب یہ ہے کہ یہ دراصل اللہ کی الوہیت اس کی ربوبیت اور حاکمیت کے اقرار کا مسئلہ ہے اور یہ کہ اس کے ساتھ ان امور میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس کے انکار کا مسئلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ معاملہ ایمان اور کفر کا معاملہ بن جاتا ہے۔ اسلام اور جاہلیت کا مسئلہ ہے۔ یا جاہلیت ہوگی یا اسلام ہو گا۔

آپ پورے قرآن پر نگاہ ڈالیں۔ یہ ایک نمائش گاہ ہے لیکن اس میں جہاں دیکھو اس ایک ہی حقیقت کو برائے مشاہدہ پیش کیا گیا ہے..... یہ کہ اللہ وحدہٗ ہی خالق ہے' اسی نے اس پوری کائنات کو پیدا کیا' اسی نے اس انسان کو پیدا کیا' اسی نے اس زمین و آسمان کو اور ان کے درمیان پائے جانے والی تمام اشیاء کو اس انسان کے لئے مسخر کیا۔ تخلیق صرف اللہ کی ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے' چاہے یہ مخلوق چھوٹی ہو یا بڑی' تھوڑی ہو یا زیادہ ہو..... یہ کہ اللہ ہی مالک ہے اور وہ مالک اس لئے ہے کہ وہی خالق ہے۔ زمینوں اور آسمانوں اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ بھی ہے اس کا مالک اللہ ہے' وہ منفرداً مالک ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے..... پھر یہ کہ اللہ رازق ہے۔ اللہ کے سوا کوئی اور ذات انسان کو یا دوسرے جانداروں کو رزق فراہم نہیں کر سکتی نہ کم اور نہ زیادہ۔

اور پھر یہ کہ اللہ اس کائنات کا شہنشاہ اور اس کے اندر متصرف ہے اور وہ لوگوں کے لئے بھی متصرف الامور ہے۔ اس لئے کہ وہی خالق' وہی مالک اور وہی رازق ہے اور وہ اس قدر قدرتوں کا مالک ہے جس کی قدرت کاملہ کے بغیر نہ تخلیق ہو سکتی ہے اور نہ رزق مل سکتا ہے اور نہ نفع و نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس پوری کائنات پر اس کی حکمرانی ہے۔

اب ایمان کیا ہے' ان مذکورہ بالا امور کا اقرار ایمان ہے یعنی یہ کہ حاکمیت' ملکیت اور ربوبیت میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ خصائص صرف ذات باری کو حاصل ہیں۔ اسلام درحقیقت سر تسلیم خم کر دینے کا نام ہے اور ان خصوصیات کے تقاضوں کے اندر اللہ کی اطاعت کا نام اسلام ہے یعنی الوہیت' ربوبیت' قیومیت اور حاکمیت کا حق صرف ذات باری کو حاصل ہے' اس پوری کائنات پر جس کے اندر انسان اس کا ایک جزء ہے۔ اللہ کے قضا و قدر کے فیصلوں کا اعتراف اور اس کی شریعت کے قوانین کا اعتراف اس میں شامل ہے۔ بس اللہ کی شریعت کا اعتراف ہی دراصل اللہ کی الوہیت' ربوبیت اور اس کی حاکمیت اور نگہبانی کا اعتراف ہے۔ اس شریعت کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کے معنی سب سے پہلے یہ ہیں کہ ہم اللہ کی الوہیت' ربوبیت اور اس کی حاکمیت و قیومیت کا انکار کر رہے ہیں بایں معنی کہ کوئی اپنی زندگی کے تمام جزئی معاملات میں فیصلے کسی اور شریعت و قانون کے مطابق کرے۔ اسلام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا یا اس کا انکار کرنا چاہے زبان سے ہو یا عمل سے ہو دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مسئلہ کفر و ایمان کا مسئلہ ہے' جاہلیت اور اسلام کا مسئلہ ہے اور اسی وجہ سے یہ آیت آئی ہے:

((وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْكَٰفِرُونَ (۵:۴۴))) (جو لوگ بھی اللہ

کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو وہی لوگ کافر ہیں) اور دوسری آیات میں فاسق اور ظالم کے الفاظ آئے ہیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلامی شریعت دوسرے شرائع اور قوانین کے مقابلے میں قطعاً برتر اور افضل ہے۔ اور اس سبق کی آخری آیت اسی کی جانب اشارہ کر رہی ہے۔

(وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۵: ۵۰)) (جو لوگ یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے)۔

اسلامی شریعت کی افضلیت کا یہ اعتراف بھی مسئلہ ایمان کے اندر شامل ہے اور ایک سچے مومن کے نزدیک زندگی کے تمام حالات اور طریقوں میں اللہ کے قانون اور شریعت کو ہی افضل ہونا چاہئے۔ اس لئے کوئی مومن انسان تو یہ دعویٰ کر ہی نہیں سکتا کہ انسانی قوانین اللہ کی شریعت سے افضل یا اس کے مماثل ہو سکتے ہیں۔ کسی پیمانے کسی حال اور کسی رسم و رواج کے اعتبار سے۔ اگر کوئی ایسا دعویٰ کرے گا تو وہ مومن نہ ہو گا نہ وہ مسلم ہو گا' بلکہ اس کے اس دعوے کا مفہوم یہ ہو گا کہ وہ شخص اللہ سے زیادہ لوگوں کے حالات کا جاننے والا ہے اور وہ ان کے حالات کی بابت اللہ سے زیادہ اچھے فیصلے کرنے والا ہے یا اس کے اس دعوے کا مفہوم یہ ہو گا کہ لوگوں کو بعض حالات پیش آئے لیکن ان حالات کا علم اللہ تعالیٰ کو نہ تھا۔ لوگوں کو بعض ضروریات درپیش تھیں' جو اللہ کی نظروں سے اوجھل تھیں (نعوذ باللہ) اور پھر بھی اللہ نے لوگوں کے لئے قانون سازی کی یا یہ کہ اللہ کو ان کا علم تھا لیکن اس کے باوجود اللہ نے ان کے لئے قانون نہ بنایا۔ ظاہر ہے کہ ایسے دعووں کے ساتھ ایمان اور اسلام جمع نہیں ہو سکتے اگرچہ بظاہر اپنی زبان سے کوئی ایمان اور اسلام کا دعویٰ کرے۔

اب اس فضیلت کا عملی اظہار کس طرح ہو گا تو اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کی حقیقت تک پوری طرح پہنچ ہی نہیں سکتے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قوانین کی پوری حکمت کا اظہار کسی دور میں بھی پوری طرح نہیں فرمایا۔ جن حکمتوں کا ذکر ہوا ہے' یہاں ہم فی ظلال القرآن میں ان پر پوری بحث نہیں کر سکتے لہٰذا یہاں ہم چند جھلکیاں ہی دے سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی شریعت ایک کامل اور باہم مربوط نظام حیات ہے۔ اس کے اندر انسان کے لئے راہنمائی' اس کی زندگی کی تنظیم اور ہر جہت سے اس کی تعمیر و ترقی کا سامان موجود ہے۔ یہ نظام اس انسانی زندگی کے ہر قسم کے حالات اور ہر زمان و مکان میں اس کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔

یہ ایک ایسا نظام ہے جو اس انسان کی شخصیت اور اس کے نفس کے بارے میں نہایت ہی گہرے علم پر مبنی ہے اور اس میں اس کی پوری ضروریات کا حل موجود ہے۔ یہ نظام اس پوری کائنات کی ماہیت کو پیش نظر رکھ کر وضع کیا گیا ہے اور اس نظام کی تشکیل میں انسانوں کی فطرت اور اس کائنات کے طبیعی قوانین کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے جو اس پوری کائنات کے اندر کارفرما ہیں اس لئے اس نظام میں انسانی زندگی کے معاملات کے اندر کوئی افراط و تفریط نہیں ہے اور اس میں فطرت انسانی کے ساتھ کوئی تصادم نہیں ہے۔ نہ یہ فطری میلانات کے اندر توڑ پھوڑ کرتا ہے اور نہ انسان کی فطری سرگرمیوں پر بندشیں عائد کرتا ہے۔ اس نظام اور نوامیس فطرت کے اندر کوئی تصادم بھی نہیں ہے بلکہ اس نظام پر عمل

کرنے کے نتیجے میں اس کے اندر اور نوامیس فطرت کے اندر نہایت ہی بہترین توازن ' اعتدال اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے ۔ یہ وہ چیز ہے جو کسی دوسرے انسانی نظام کے اندر کبھی بھی پیدا نہیں ہوئی ۔ انسان تو محض ظاہری باتوں ہی کو جانتا ہے اور ایک انسان ' ایک متعین دور میں زندگی پاتا ہے ۔ وہ اپنے دور کے حالات کے مطابق ہی کچھ ظاہری باتوں کو سمجھ سکتا ہے ۔ انسان خود جو نظام بھی وضع کرتا ہے اس کے اندر انسانی جہالت کے آثار بہرحال پائے جاتے ہیں اور اس کے وضع کردہ نظام کے بعض تباہ کن اثرات بھی انسانی زندگی کے بعض پہلوؤں پر ظاہر ہو جاتے ہیں ۔ انسان کی فطرت اور ان دفعی قوانین کے اندر تباہ کن تصادم کے نتیجے میں انسانیت تباہ کن جھٹکوں سے دوچار ہوتی رہتی ہے ۔

سب سے پہلے یہ کہ اسلامی نظام ' عدل مطلق پر قائم ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہی صحیح طرح اس بات کو جانتا ہے کہ عدل کن ذرائع سے قائم کیا جاسکتا ہے اور کس طرح وہ بار آور ہو سکتا ہے ۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی سب کا رب ہے اس لئے سب کے درمیاں انصاف کرنا بھی اسی کا حق ہے ۔ اللہ کا نظام ذاتی خواہش ' کسی خاص رجحان اور ہر قسم کے نقص سے ایسے ہی پاک ہوتا ہے جس طرح وہ نظام جہالت ' نقص اور افراط و تفریط سے پاک ہوتا ہے ۔ یہ وہ اوصاف ہیں کہ جو کسی ایسے نظام زندگی میں جمع نہیں ہو سکتے جو انسان کا بنایا ہوا ہو ' اس لئے کہ انسان کے اندر شخصی خواہشات بھی ہوتی ہیں ' ذاتی رجحانات بھی اس کے اندر ہوتے ہیں اور انسان کے اندر جہل اور دوسرے نقائص بھی ہوتے ہیں ' چاہے یہ قانون کوئی فرد بنائے یا کوئی طبقہ بنائے یا کوئی پوری قوم بنائے یا کسی خاص زمانے کی پوری نسل انسانی بنا دے یا انسانوں کے تمام ادوار کی نسلیں اسے بنائیں اس لئے کہ ان تمام قانون سازوں کے اپنے میلانات اور رجحانات ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی ذاتی خواہشات اور مفادات ان پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام حالات میں قانون ساز جہالت ' نقص اور عجز سے پاک نہیں ہوتے اور وہ کسی ایک زمان و مکان کے اندر بھی معاملے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کر سکتے ۔

پھر اسلامی نظام ایک ایسا نظام ہے جو اس پوری کائنات کے ناموس کے ساتھ ہم آہنگ ہے اس لئے کہ اسلامی نظام اللہ کا نظام ہے اور ناموس کائنات بھی اللہ کا جاری کردہ ہے ۔ اللہ کی ذات ہی اس کائنات کی صانع ہے اور وہی اس انسان کی بھی صانع ہے ۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جب انسان کے لئے کوئی ضابطہ بنایا ہے تو وہ ایسا ہی ہے جس طرح اس نے کائنات کے ایک حصے کے لئے ضابطہ بنایا ہے ۔ ذات باری اس پوری کائنات کے تمام عناصر پر غالب ہے اور ان پر نگہبان ہے ۔ یہ تمام عناصر اللہ کی ہدایت پر رواں و دواں ہیں اور یہ تمام عناصر ان قوانین کو جانتے ہیں جو ان پر حکمران ہیں ۔ یہ قوانین ان پر ان کے خالق کے حکم سے حکمران ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام میں ایک انسان اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی اس کائنات کے اندر ایک قسم کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے ۔ اس طرح ضابطہ شریعت جو اس انسان کی زندگی کی تنظیم کرتا ہے ایک کائناتی مزاج اپنے اندر رکھتا ہے اور یہ ضابطہ صرف انسانی نفس کے ساتھ معاملہ نہیں کرتا نہ صرف اپنے بنی نوع انسان کے ساتھ ہی نہیں کرتا بلکہ یہ معاملہ زندہ اور غیر زندہ اشیاء کے ساتھ ہوتا ہے اور اس پوری کائنات کے ساتھ ہوتا ہے جس میں وہ زندہ وجود رہ رہا ہے اور اس سے وہ نکل نہیں سکتا اور اسے اس کائنات کے اندر اس کے ساتھ جڑ کر زندہ رہنا ہے ۔ امن اور آشتی کے ساتھ ۔

پھر یہ واحد نظام زندگی ہے جس میں ایک انسان تمام دوسرے انسانوں کی غلامی سے پوری طرح آزاد ہو جاتا ہے ۔

اسلام کے سوا' تمام نظام ہائے زندگی میں انسان انسانوں کے غلام ہوتے ہیں اور صرف اسلامی نظام ہی میں تمام لوگ تمام دوسرے لوگوں کی غلامی سے نکل آتے ہیں اور اس میں وہ صرف اللہ کے بندے ہوتے ہیں سب کے سب۔

جیسا کہ اس سے پہلے ہم بار بار بیان کر آئے ہیں اللہ کی خصوصیات میں سے اہم ترین خصوصیت اللہ کی حاکمیت ہے۔ اور جو شخص خود انسانوں کے لئے قانون بناتا ہے وہ یہ خصوصیت اپنے لئے خاص کر لیتا ہے اور ان انسانوں کے اندر ایک طرح کی الوہیت کا مدعی بن جاتا ہے۔ یہ لوگ جو اس کو انسان کا قانون مانتے ہیں وہ اس انسان کے بندے بن جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی بندگی سے نکل آتے ہیں۔ یہ لوگ اس شخص کے دین پر ہوتے ہیں ' اللہ کے دین پر نہیں ہوتے۔

اسلام جب حق قانون سازی صرف اللہ کے سپرد کرتا ہے تو وہ لوگوں کو تمام انسانوں کی بندگی سے خارج کر کے اسے صرف اللہ کی بندگی میں داخل کر دیتا ہے۔ انسان کی آزادی کا اعلان کرتا ہے بلکہ اسلام انسان کے لئے ایک نئے جنم کا اعلان کرتا ہے۔ اس طرح کہ انسان کی گردن جب تک دوسرے انسان کے حق سے آزاد نہ ہو' اس وقت تک وہ آزاد تصور نہیں ہوتا اور جب تک یہ تمام انسان رب الناس کے سامنے مساوی سطح پر کھڑے نہیں ہو جاتے۔

یہ مسئلہ جو ان آیات میں لیا گیا ہے یہ اسلامی عقیدے اور اسلامی نظریہ حیات کا نہایت ہی اہم اور خطرناک مسئلہ ہے۔ یہ الوہیت اور عبودیت کا مسئلہ ہے۔ یہ عدالت اور اصلاح کا مسئلہ ہے۔ یہ حریت اور مساوات کا مسئلہ ہے۔ یہ پوری انسانیت کی آزادی اور نئے جنم کا مسئلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے کفر اور ایمان کا مسئلہ قرار دیا گیا ہے اور اسے اسلام اور جاہلیت کے امتیاز کا مسئلہ قرار دیا گیا ہے۔

جاہلیت کسی ایک دور کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی حالت کا نام ہے جس کے کچھ بنیادی عناصر ترکیبی ہیں۔ جہاں بھی اس کے یہ عناصر اور مقومات پائے جائیں وہاں جاہلیت موجود ہو جاتی ہے۔ اس کے یہ عناصر جس نظام اور جس صورت حالات میں پائے جائیں وہ نظام جاہلی نظام ہو گا اور اس حالت کو حالت جاہلیت کہیں گے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی یہ ہے کہ کوئی قانون سازی اور حکمرانی میں انسانی خواہشات کا تابع ہو جائے اور اسلامی نظام اور اللہ کی شریعت کے تابع نہ ہو۔ یہ خواہشات چاہے کسی فرد کی خواہشات ہوں' چاہے کسی طبقے کی خواہشات ہوں چاہے کسی ایک قوم کی خواہشات ہوں یا پوری نسل انسانی کی خواہشات' اس لئے کہ یہ سب خواہشات اور یہ سب لوگ جب تک اللہ کی شریعت کے تابع نہ ہوں گے یہ نفسانی خواہشات ہی رہیں گی۔

اگر ایک فرد کسی سوسائٹی کے لئے قانون سازی کرے تو یہ جاہلیت ہے' اس لئے کہ اس صورت میں اس کی خواہش قانون ہو گی۔ اس کی رائے قانون ہو گی' اور اس ضمن میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف الفاظ کا ہے۔ اصل حقیقت وہ ہے جو ہم کہہ رہے ہیں۔

یا کوئی ایک طبقہ تمام طبقات کے لئے قانون سازی کر رہا ہو تو یہ صورت حال بھی جاہلیت ہو گی۔ اس صورت میں اس طبقے کے مفادات قانون کی شکل اختیار کر لیں گے۔ یا اس طبقے کی پارلیمنٹ میں اکثریت کی رائے قانون بن جائے گی۔ اس صورت میں فرق اگر کوئی ہے تو صرف الفاظ کا ہے۔

یا پھر اگر حق قانون سازی تمام طبقات کے نمائندوں کو حاصل ہے اور امت کے تمام گروہوں کو حاصل ہے تو بھی یہ صورت حال جاہلی صورت حال ہے' اس لئے کہ لوگوں کی آراء کسی وقت بھی ذاتی خواہشات سے پاک نہیں ہوتیں۔ پھر

اس قانون سازی میں جہالت بھی شامل ہوگی کیونکہ لوگ جاہلیت سے کبھی پاک نہیں ہوتے یا پھر اگر ریفرنڈم کی صورت ہو تو پوری قوم کی اغلبیت کی رائے قانون ہو جائے گی۔اب بھی فرق اگر کوئی ہو گا تو صرف الفاظ کا ہو گا۔

اس سے بھی وسیع دائرے میں پوری اقوام کا مجموعہ اگر کوئی قانون سازی کرتا ہے تو وہ بھی جاہلیت ہوگی کیونکہ ان اقوام کے قومی مقاصد قانونی صورت اختیار کر لیں گے یا بین الاقوامی مجالس کی جو رائے بنے گی وہ قانون ہو جائے گی اور یہ نظام بھی جاہلی ہو گا۔فرق اگر کوئی ہو گا تو صرف الفاظ کا ہو گا۔

اب تمام افراد، تمام سوسائٹیوں، تمام اقوام اور تمام نسلوں کا خالق اگر کوئی قانون بناتا ہے تو یہ قانون تمام لوگوں کے لئے ہو گا اور یہ اللہ کی شریعت ہوگی۔اس میں کسی ایک کو نقصان دے کر دوسرے کو فائدہ نہیں پہنچایا جاتا۔اس میں کسی فرد، کسی سوسائٹی اور کسی بین الاقوامی انجمن یا کسی پوری نسل انسانی کے ساتھ مخصوص باتوں کو مدنظر نہیں رکھا جاتا اس لئے کہ اللہ سب کے لئے رب العالمین ہے اور اس کے ہاں سب کا رتبہ برابر ہے۔پھر وہ سب کی مصلحت اور مفاد کو بھی اچھی طرح جانتا ہے اور یہ سب امور افراط اور تفریط سے بھی پاک ہوتے ہیں۔

اب اگر کوئی اور قانون سازی کرے تو یقیناً لوگ اس غیر کے غلام ہوں گے چاہے یہ غیر اللہ جو بھی ہو۔فرد ہو، سوسائٹی ہو یا طبقہ ہو یا قوم ہو یا انجمن اقوام ہو...... لیکن اللہ کی قانون سازی میں تمام لوگ آزاد ہو جاتے ہیں، مساوی سطح پر آ جاتے ہیں۔ان کے ماتھے اللہ کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتے۔وہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں کرتے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ مسئلہ انسانوں کی زندگی میں نہایت ہی اہمیت رکھتا ہے اور خود اس نظام کائنات کے اندر بھی اس کی اہمیت ہے۔

(لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ) (اگر سچائی لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو آسمانوں اور زمینوں اور ان کے درمیان میں ان کے معاملات میں بھی فساد ہو جائے) اس لئے اللہ کے سوا کسی اور قانون کے مطابق فیصلے کرنے کے معنی ہیں شرو فساد اور آخر کار اس کی وجہ سے انسان دائرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ذرا قرآنی آیات کو غور سے پڑھیں۔یہ اس نص کا تقاضا ہے۔

---○○○---

درس نمبر ۴۹ تشریح آیات

۴۱ ــــ تا ــــ ۵۰

(اے پیغمبرؐ تمہارے لئے باعث رنج نہ ہوں وہ لوگ جو کفر کی راہ میں بڑی تیز گامی دکھا رہے ہیں خواہ وہ ان میں سے ہوں جو منہ سے کہتے ہیں ہم ایمان لائے مگر دل ان کے ایمان نہیں لائے' یا ان میں سے جو یہودی ہیں' جن کا حال یہ ہے کہ جھوٹ کے لئے کان لگاتے ہیں' اور دوسرے لوگوں کی خاطر جو تمہارے پاس کبھی نہیں آئے' سن گن لیتے پھرتے ہیں' کتاب اللہ کے الفاظ کو ان کا صحیح محل متعین ہونے کے باوجود اصل معنی سے پھیرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو نہیں تو نہ مانو۔ جسے اللہ ہی نے فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو تو اس کو اللہ کی گرفت سے بچانے کے لئے تم کچھ نہیں کر سکتے' یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہ چاہا' ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں سخت سزا۔

یہ جھوٹ سننے والے اور حرام کے مال کھانے والے ہیں' لہٰذا اگر یہ تمہارے پاس (اپنے مقدمات لے کر) آئیں تو تمہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہو ان کا فیصلہ کرو ورنہ انکار کر دو۔ انکار کر دو تو یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اور یہ تمہیں کیسے حکم بناتے ہیں جبکہ ان کے پاس تورات موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے اور پھر یہ اس سے منہ موڑ رہے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے)۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ہجرت کے بعد ابتدائی سالوں میں نازل ہوئیں' اس دور میں جب یہودی بدستور مدینہ میں موجود تھے' کم از کم غزوہ احزاب سے پہلے کے زمانہ میں اور اس سے پہلے جب بنی قریظہ کو سزا دی گئی یا اس سے بھی زیادہ پہلے یعنی یہ اس دور میں نازل ہوئی ہیں جب بنی نضیر اور بنی قینقاع مدینہ کے ارد گرد موجود تھے۔ ان میں سے اول الذکر احد کے بعد اور آخر الذکر احد سے پہلے جلاوطن ہوئے۔ اس دور میں یہودی مسلمانوں کے خلاف اپنی سازشوں میں مصروف تھے اور اس دور میں منافقین ان کے ہاں اس طرح پناہ لینے کے لئے گھستے تھے جس طرح سانپ اپنے سوراخ میں گھستا ہے اور یہ دونوں کفر میں بہت ہی آگے بڑھنے والے تھے۔ اگرچہ منافقین منہ سے یہ کہتے تھے کہ ہم ایمان لائے ہیں مگر ان لوگوں کا طرز عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ہی پریشان کئے ہوئے تھا اور اس سے آپ کو بہت ہی اذیت پہنچتی تھی۔

اللہ تعالیٰ رسول اللہؐ کی تعزیت اور دلجوئی فرماتے ہیں اور ان کے لئے لوگوں کے یہ کرتوت قابل برداشت بناتے

ہیں۔ ساتھ ہی جماعت مسلمہ کے سامنے ان لوگوں کی حقیقت کھول دیتے ہیں کہ یہ کفر میں بہت تیز ہیں اور ان میں یہ دونوں فرقے شامل ہیں۔ آپ کو اس طرز عمل کی ہدایت دی جاتی ہے جو ان کے ساتھ اختیار کیا جانا ضروری ہے جبکہ وہ آپ کے پاس فیصلے کرانے کے لئے آتے ہیں اور اس کے بعد آتے ہیں جب آپ ؐ پر ان کی سازشیں بھی طشت از بام ہو جاتی ہیں جو انہوں نے حضور ؐ کے پاس آنے سے قبل ہی آپس میں کی ہوئی ہوتی ہیں۔

يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا بِأَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِينَ هَادُوا ۛ سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ سَمَّاعُونَ لِقَوْمٍ آخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ ۖ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ ۖ يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَٰذَا فَخُذُوهُ وَإِنْ لَمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوا ۚ

(اے پیغمبر ؐ تمہارے لئے باعث رنج نہ ہوں وہ لوگ جو کفر کی راہ میں بڑی تیز گامی دکھا رہے ہیں خواہ وہ ان میں سے ہوں جو منہ سے کہتے ہیں ہم ایمان لائے مگر دل ان کے ایمان نہیں لائے' یا ان میں سے ہوں جو یہودی ہیں' جن کا حال یہ ہے کہ جھوٹ کے لئے کان لگاتے ہیں' اور دوسرے لوگوں کی خاطر جو تمہارے پاس کبھی نہیں آئے سن گن لیتے پھرتے ہیں' کتاب اللہ کے الفاظ کو ان کا صحیح محل متعین ہونے کے باوجود اصل معنی سے پھیرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو نہیں تو نہ مانو)

روایات میں آتا ہے کہ یہ آیات ان یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں' جنہوں نے بعض جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ ان جرائم کے تعین میں روایات کے اندر اختلاف ہے' بعض میں ہے کہ یہ جرم سرقہ تھا۔ بعض میں ہے کہ یہ جرم زنا تھا اور یہ دونوں جرائم تورات کے مطابق جرائم حدود تھے لیکن یہودیوں نے اپنے ہاں کچھ دوسرے قوانین وضع کئے ہوئے تھے۔ اس کا پہلا سبب تو یہ تھا کہ یہ لوگ تورات کی حدود اپنے ہاں شرفاء پر نافذ نہ کرتے تھے۔ اس کے بعد تمام لوگوں پر انہوں نے نرمی کر کے ان سزاؤں کو موقوف کر دیا تھا۔ ان حدود کی جگہ انہوں نے ازخود کچھ تعزیری سزائیں مقرر کر لی تھیں۔ جس طرح آج کے نام نہاد مسلمانوں نے اپنے ہاں ایسا ہی کر رکھا ہے۔ جب حضور ؐ کے دور میں ان سے ان جرائم کا صدور ہوا تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ان کے بارے میں حضور ؐ سے دریافت کریں گے۔ اگر حضور ؐ نے بھی انہی خفیف تعزیری سزاؤں کے بارے میں حکم دیا تو وہ انہیں نافذ کر دیں گے اور اللہ کے ہاں ان کے لئے عذر ہو

گا کہ ایک رسول نے ان کا فتویٰ دیا تھا اور اگر رسول اللہ ؐ نے بھی وہی فتویٰ دیا جو تورات میں ہے تو وہ اسے رد کر دیں گے ۔ انہوں نے اپنے کچھ لوگوں کو حضور ؐ کے پاس فتویٰ کے لئے بھیجا اور انہی کے بارے میں یہ آتا ہے :

(اِنْ اُوْتِیْتُمْ ھٰذَا فَخُذُوْہُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْہُ فَاحْذَرُوْا (۵ : ۴۱) (اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو ورنہ نہیں)

اس طرح ان لوگوں کی بیہودگی، حماقت اور پہلوتہی کی حد ہوگئی کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملے میں دھوکہ بازی سے کام لیتے ہیں اور رسول اللہ ؐ کے ساتھ ان کے معاملے میں یہ حد ہوگئی ہے کہ اگر خدا کا یہ صحیح حکم دیں تو انکار کر دو ۔ یہ حالت ان تمام لوگوں کی ہو جاتی ہے جب ان پر ایک طویل عرصہ گزر جاتا ہے ۔ ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں ۔ ان میں سے عقیدے کی حرارت ٹھنڈی پڑ جاتی ہے ۔ نور کے شعلے ماند پڑ جاتے ہیں اور پھر یہ لوگ مختلف طریقوں سے اس کتاب کے عقائد و نظریات اور اس کے اصول و شرائع سے جان چھڑانے کے درپے ہو جاتے ہیں اور اس مقصد کے لئے حیلے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں ۔ اس کے بارے میں وہ ہر جگہ سے فتوے مانگتے رہتے ہیں کہ شاید ان کو کسی طرح کوئی راہ فرار مل جائے ۔ کیا آج ان لوگوں کے حالات ایسے ہی نہیں ہیں جو زبانی طور پر تو دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں ۔

(مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اٰمَنَّا بِاَفْوَاھِھِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُھُمْ (۵ : ۴۱) (ان لوگوں میں سے جو اپنے منہ سے کہتے ہیں ہم ایمان لائے حالانکہ ان کے دل مومن نہ تھے) کیا یہ لوگ دین کے خلاف فتوے طلب نہیں کرتے، نفاذ کے لئے نہیں بلکہ دین سے پھیرنے والے ۔ کیا یہ لوگ دین پر ہاتھ محض اس لئے نہیں پھیرتے کہ وہ ان کی خواہشات کو پورا کرے اور ان کی مرضی کے مطابق اس پر سائن کر دے ۔ اگر دین ان کو حق بات کہہ دے اور ان کو سچائی کے مطابق اپنا فیصلہ سنا دے تو ان لوگوں کو پھر دین کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ پھر یہ کہتے ہیں :

(یَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِیْتُمْ ھٰذَا فَخُذُوْہُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْہُ فَاحْذَرُوْا (۵ : ۴۱) (اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو ورنہ نہیں) یہ ہے ان کا حال ۔ اور اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا یہ قصہ اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ محض اس لئے بیان کیا تاکہ آنے والی نسلیں اس سے عبرت پکڑیں اور سمجھدار لوگ اس راہ میں پھسلنے کے مقامات کے بارے میں قبل از وقت متنبہ ہوں ۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے بارے میں جو کفر میں بہت تیزی دکھا رہے ہیں اور ان لوگوں کے بارے میں جو اسلام کے خلاف رالوں کے وقت سورہ کرتے ہیں اور خفیہ کھیل کھیلتے ہیں یہ فیصلہ سناتا ہے کہ یہ لوگ فتنے کی راہ پر چل پڑے ہیں اور اس فتنے کے گڑھے میں انہیں خواہ مخواہ گرنا ہے ۔ اس میں آپ کا کوئی اختیار نہیں ہے ۔ آپ ان لوگوں سے یہ فتنہ دور نہیں کر سکتے اس لئے کہ یہ اس راستے میں بہت آگے نکل گئے ہیں ۔

وَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ فِتْنَتَہٗ فَلَنْ تَمْلِکَ لَہٗ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا ---- (۴۱)

(جسے اللہ نے فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو' اس کو اللہ کی گرفت سے بچانے کے لئے تم کچھ نہیں کر سکتے -) ان لوگوں کے دل ناپاک ہو گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے انکار کی تطہیر نہیں چاہتے' اس لئے یہ لوگ اسی طرح گندگیوں میں پڑے رہیں گے -

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ --- (٤١)

(یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہ چاہا) جلد ہی اللہ ان کو اس دنیا میں شرمندہ کرے گا اور آخرت میں تو ان کے لئے عذاب عظیم تیار ہے -

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ

(ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں سخت سزا) اس لئے آپ ؐ پر ان لوگوں کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور آپ ان کی کفریہ روش سے پریشان نہ ہوں - آپ ان کے معاملے میں کوئی بات نہ کریں اس لئے کہ ان کے معاملے کا فیصلہ ہو چکا ہے -

اس کے بعد ان لوگوں کے مزید حالات بیان کئے ہیں اور یہ بتایا گیا کہ یہ لوگ اپنے طرز عمل اور اخلاقی بگاڑ سے اگرچہ بہت دور نکل گئے ہیں لیکن پھر بھی اگر یہ لوگ آپ کے پاس فیصلہ لے کر آتے ہیں تو ان کے درمیان فیصلہ نہایت عادلانہ کریں -

سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ أَكَّالُونَ لِلسُّحْتِ ۚ فَإِنْ جَاءُوكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ ۖ وَإِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَضُرُّوكَ شَيْئًا ۖ وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ

(یہ جھوٹ سننے والے اور حرام کے مال کھانے والے ہیں' لہذا اگر یہ تمہارے پاس (اپنے مقدمات لے کر) آئیں تو تمہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہو تو ان کا فیصلہ کرو ورنہ انکار کر دو - انکار کر دو تو یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے) -

مکرر طور پر یہاں بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹ سننے کے عادی ہیں' جس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ اس کے عادی ہو گئے ہیں - جھوٹ اور باطل اور ناحق سننے کے لئے ان کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور خوشی سے لپکتے ہیں

اور سچائی اور حق سننے سے انہیں سخت انقباض ہوتا ہے۔اور اس قسم کی گمراہ اور منحرف سوسائٹیوں میں ہمیشہ باطل اور جھوٹ کو خوب کان لگاکر سنا جاتا ہے اور انسان کے دل و دماغ اگر فساد کا شکار ہو جائیں تو ان کی یہی حالت ہوتی ہے۔ روح جب بجھ جاتی ہے تو وہ باطل کی تلاش میں رہتی ہے اور سچائی اسے بہت ہی ناپسند ہوتی ہے۔ایسے ادوار میں باطل کو خوب رواج نصیب ہوتا ہے' اس کا چرچا ہوتا ہے اور سچائی ان ملعون ادوار میں بدحال ہوتی ہے۔

یہ لوگ نہایت ہی دلچسپی سے باطل کی طرف کان دھرتے ہیں 'کیونکہ ان کا عمل حرام خوری ہوتا ہے۔ السحت کا مفہوم ہے ہر وہ چیز جو حرام ہے۔ مثلاً سود' رشوت 'تقریر کی اجرت اور فتویٰ کی اجرت وغیرہ۔یہ وہ چیزیں ہیں جو ان کی حرام خوریوں میں سرفہرست ہیں اور ہر دور میں جب کوئی معاشرہ اسلامی قدروں سے منحرف ہو جائے تو اس میں یہ زمائم بہت ہی زیادہ ہو جاتے ہیں اور حرام چیزوں کو السحت کے لفظ سے اس لئے ادا کیا گیا ہے کہ حرام کی وجہ سے مال سے برکت ختم ہو جاتی ہے اور تمام منحرف اور بے راہ رو معاشروں سے ہر قسم کی برکات ختم ہو جاتی ہیں۔جیسا کہ آج ہم لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ آج ان تمام معاشروں میں جو اللہ کے نظام حیات سے انحراف اختیار کئے ہوئے ہیں 'کوئی برکت نہیں رہی ہے۔ ہر طرف کمی ہی کمی ہے۔

ان لوگوں کے معاملے میں اللہ تعالیٰ حضرت محمد ؐ کو اختیار دیتے ہیں کہ اگر یہ لوگ فیصلے لے کر آپ کے پاس آئیں تو آپ یا تو اعراض کر لیں اور ان کے درمیان کوئی فیصلہ نہ کریں تو بھی یہ لوگ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اگر آپ چاہیں تو ان کے درمیان نہایت ہی منصفانہ فیصلہ کریں۔ان کی خواہشات سے ہرگز متاثر نہ ہوں۔اس بات سے بھی متاثر نہ ہوں کہ یہ لوگ کفر کی راہ میں بہت تیز ہیں اور یہ کہ وہ سازشیں کرتے اور مسلمانوں کے خلاف ہر چال چلتے ہیں۔اس لئے کہ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (۵ : ۴۲) (اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)

رسول اللہ ؐ 'ایک مسلمان حاکم اور ایک مسلمان جج انصاف کے حوالے سے معاملہ اللہ کے ساتھ کرتا ہے۔وہ انصاف اللہ کے خوف سے اور اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے اس لئے کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔اگر لوگ ظلم کریں' خیانت کریں اور راہ حق سے منحرف ہو جائیں تو پھر بھی' عدل اس سے بالا ہے کہ ان کا طرز عمل کیا ہے؟ اس لئے کہ انصاف لوگوں کی خاطر نہیں ہوتا' بلکہ اللہ کی خاطر ہوتا ہے۔اسلامی شریعت میں اس کی پوری پوری ضمانت دی گئی ہے اور اسلامی عدلیہ نے ہر زمان و مکان میں اس پر عمل کیا ہے۔

یہودیوں کو یہ اختیارات دینا کہ وہ اپنے فیصلے خود کریں' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات بہت ہی ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہیں۔بعد کے ادوار میں اسلامی شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا لازمی ہو گیا تھا اس لئے کہ دارالاسلام میں صرف اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے کئے جا سکتے ہیں۔دارالاسلام کے باشندوں پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے فیصلے شرعی قانون کے مطابق کریں۔اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی معاشرے میں اہل کتاب کے متعلق یہ خاص اصول وضع کیا گیا ہے کہ ان کے فیصلے خود ان کی شریعت کے مطابق کئے جائیں گے مثلاً یہ کہ ان کے لئے وہ معاملات جائز ہوں گے جو ان کی شریعت میں جائز ہیں۔مثلاً خنزیر کی ملکیت' اس کا گوشت کھانا' شراب کی ملکیت اور شراب پینا (ہاں مسلمانوں پر فروخت کرنے کی اجازت نہ ہو گی) نیز ان پر سودی کاروبار کرنا حرام ہو گا' اس لئے کہ اہل کتاب کے ہاں بھی سودی کاروبار کرنا حرام ہے۔اسی طرح حد زنا' حد سرقہ بھی ان پر نافذ ہوگی 'کیونکہ ان کی کتابوں میں بھی یہ حدود

نافذ ہیں۔ بغاوت' فساد فی الارض اور دوسری عام تعزیری سزائیں ان پر بھی اسی طرح نافذ ہوں گی جس طرح عام مسلمانوں پر نافذ ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ امور دارالاسلام کے امن و امان کے لئے ضروری ہیں چاہے مسلمان ہوں یا غیر مسلم اور اس معاملے میں کسی کے ساتھ کوئی نرمی نہیں کی جاسکتی۔

اس اختیاری دور میں' جس میں ان کو یہ چھوٹ تھی کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے فیصلے خود اپنے قوانین کے مطابق کر سکتے ہیں' یہ لوگ اپنے بعض تنازعات حضور ؐ کے پاس لے کر آتے تھے۔ مثلاً امام مالک نے حضرت نافع کے رابطے سے عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت کی ہے: "یہودی حضور ؐ کے پاس آئے۔ انہوں نے حضور ؐ سے ذکر کیا کہ ان میں سے ایک مرد اور عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ تو آپ ؐ نے ان سے پوچھا کہ رجم کے بارے میں تورات کے اندر کیا پاتے ہو؟ تو انہوں نے کہا ہم ان کو شرمندہ کریں گے اور اس کے بعد کوڑے ماریں گے۔ عبداللہ ابن سلام نے کہا تم جھوٹ بولتے ہو۔ توراۃ میں تو سزائے رجم مذکور ہے۔ وہ تورات لائے اور اسے کھولا۔ ان میں سے ایک نے رجم کی آیت پر ہاتھ رکھ دیا۔ سابق اور لاحق کو پڑھ لیا۔ عبداللہ ابن سلام نے کہا ذرا ہاتھ اٹھاؤ۔ اس نے ہاتھ اٹھایا تو نیچے آیت رجم لکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے یہ آیت رجم ہے۔ اس پر حضور ؐ نے حکم دیا کہ ان کو رجم کر دیا جائے۔ میں نے خود دیکھا کہ مرد اس عورت پر جھکتا تھا اور اسے پتھروں سے بچاتا تھا۔ (بخاری مسلم' الفاظ بخاری کے ہیں)۔

اسی طرح امام مسلم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے.... یہ آیات یہودیوں کے دو گروہوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ ایک گروہ نے جاہلیت میں دوسرے کو اس فیصلے پر مجبور کر دیا تھا کہ جو مقتول کسی ذلیل طبقے سے ہو اور اسے معزز قاتل نے قتل کیا ہو تو اس کی دیت ۵۰ وسق ہوگی اور اگر کوئی ذلیل شخص کسی معزز شخص کو قتل کر دے تو اس کی دیت ایک سو وسق ہوگی۔ مدینہ میں یہ لوگ اسی طرح فیصلے کرتے تھے یہاں تک کہ حضور ؐ وارد مدینہ ہوئے۔ انہی دنوں ایک ذلیل طبقے کے شخص نے ایک معزز شخص کو قتل کر دیا۔ اس پر معزز قبیلہ نے مطالبہ کیا کہ اسے سو وسق دیت ادا کی جائے۔ اس پر ذلیل قبیلے کے لوگوں نے کہا' کیا یہ فرق ان دو قبائل کے اندر جائز ہے جن کا دین ایک ہے' نسب ایک ہے' شہر ایک ہے اور بعض کی دیت بعض دوسروں سے نصف ہے۔ یہ دیت جو ہم ادا کرتے رہے ہیں یہ تو تمہاری جانب سے مظالم کی وجہ سے ادا کرتے رہے ہیں اور تم نے زبردستی یہ فرق و امتیاز قائم کر دیا تھا۔ اب چونکہ حضرت محمد ؐ تشریف لا چکے ہیں اس لئے ہم دگنی دیت ادا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ان دو قبائل کے اندر جنگ شروع ہونے والی تھی لیکن ان کے درمیان گفتگو کے نتیجے میں یہ فیصلہ ہوا کہ حضور ؐ ہمارے درمیان حکم ہیں۔ اس پر معزز قبیلے کے لوگوں نے کہا' خدا کی قسم محمد ہم کو اس سے دگنی ادا نہ کریں گے جو ہم ادا کرتے ہیں۔ ان کی بات سچ ہے کہ ذلیل قبیلے والے ہمیں تو مجبور ہو کر دگنی دیت ادا کرتے تھے اور وہ ہم سے مجبور تھے۔ اس لئے مناسب ہے کہ حضرت کے پاس خفیہ مشن بھیج کر معلوم کر لو کہ اگر وہ تمہاری مرضی کا فیصلہ کرتے ہیں تو اسے ثالث بنا لیں اور اگر خطرہ یہ ہو کہ وہ تمہاری مرضی کا فیصلہ نہ کریں گے تو حکم ہی نہ بناؤ۔ چنانچہ انہوں نے منافقین پر مشتمل خفیہ مشن حضور کے پاس روانہ کیا۔ جب یہ لوگ رسول اللہ ؐ کے پاس آئے تو اللہ نے حضور ؐ کو خبردار کر دیا کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں' اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

(يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ (۵ : ۴۱)) (اے رسول آپ کو وہ لوگ پریشان نہ کر دیں جو کفر میں بہت تیز ہیں) الفاسقون تک۔ غرض یہ آیات صرف انہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور ان سے یہی لوگ مراد ہیں۔ (ابو داؤد بروایت ابو الزناد عن ابیہ) ابن جریر نے ایک روایت میں معزز قبیلے کا نام بھی لیا ہے وہ بنو النضیر تھے۔ اور ذلیل قبیلہ بنو قریظہ تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ یہ آیات ان قبائل کی جلاوطنی اور سرزنش سے پہلے ہی نازل ہو گئی تھیں۔

اس کے بعد یہودیوں کے موقف کے بارے میں سخت انداز کلام میں' یعنی استفہام انکاری کے طور پر کہا جاتا ہے' کہ یہ یہودیوں کا عام رویہ ہے کہ وہ قانون تورات کے نفاذ سے پہلو تہی کرتے ہیں۔

وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ

(.... اور یہ تمہیں کیسے حکم بناتے ہیں جبکہ ان کے پاس تورات موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے اور پھر یہ اس سے منہ موڑ رہے ہیں)۔

یہ تو عظیم گناہ ہے کہ ان کے پاس خدا کی شریعت موجود ہے اور وہ اس سے منہ موڑتے ہیں اور حضور کے پاس اس توقع سے آتے ہیں کہ آپ شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں اور ان کے ہاں جو تورات میں انہوں نے لکھا اس پر فیصلہ کریں۔ حالانکہ قرآن کے احکام بھی تورات ہی کے اصلی احکام ہیں۔ اور یہ لوگ جس طرح تورات کے احکام سے پہلوتہی کرتے ہیں اسی طرح حضور کے حکم سے بھی اعراض کرتے ہیں۔ یہ اعراض اس طرح کہ حضور کے احکام کی اطاعت نہیں کرتے یا یوں کہ ان پر پھر راضی نہیں ہوتے۔ لیکن یہاں سیاق کلام تو صرف استفہام انکاری پر ہی ختم نہیں کر دیا بلکہ اس موقف پر اسلامی نقطہ نظر سے فیصلہ صادر ہوتا ہے۔

وَمَآ أُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ﴿۴۳﴾ (اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے)۔

یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے اور پھر بھی مومن ہو' یا وہ اللہ کے قانون پر راضی نہ ہو اور پھر بھی یہ زعم رکھتا ہو کہ وہ مومن ہے۔ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی ایمان لاتا ہے تو اسے اپنی پوری زندگی میں شریعت کا نفاذ کرنا ہو گا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کا دعوائے ایمان جھوٹا ہے اور اس کا موقف اس قطعی نص کی بالکل ضد ہے۔ (وَمَآ أُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ (۵ : ۴۳) (یہ لوگ ایمان نہیں رکھتے) یہ معاملہ فقط اس حد تک نہیں ہے کہ حکام کی جانب سے اسلامی شریعت کا نفاذ نہیں ہے بلکہ اگر محکوم لوگ بھی جن پر شریعت کا نفاذ ہوتا ہے' شریعت کے نفاذ پر راضی نہیں تو بھی وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوں گے اگرچہ زبانی طور پر وہ ایمان کا دعویٰ کریں۔

یہ آیت سورہ نساء کی آیت کے عین مطابق ہے جس میں کہا گیا ہے۔

(فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۵:۶۵)

(خدا کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے تنازعات کا فیصلہ آپ سے نہ کرائیں - پھر یہ اپنے دل میں آپ کے فیصلے پر کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور پوری طرح سر تسلیم خم نہ کر دیں) ان دونوں آیات کا تعلق محکوم عوام الناس سے ہے، حکام سے نہیں ہے جبکہ دونوں ایمان سے نکل جاتے ہیں - جو لوگ اللہ اور رسول کے فیصلوں پر راضی نہیں ہوتے ان کے بارے میں یہ آیات کہتی ہیں کہ یہ مومن نہیں رہتے یا اگر رسول فیصلہ کریں اور یہ لوگ روگردانی کر دیں اور تسلیم نہ کریں -

خلاصہ کلام یہ ہے جیسا کہ اس سبق کے آغاز میں ہم نے کہا تھا کہ یہ مسئلہ اللہ کی حاکیت کے اقرار کا مسئلہ ہے - اللہ کی حاکیت، اس کی قیومیت اور انسان پر اس کی نگرانی و نگہبانی کے اقرار کا مسئلہ ہے یا اس کے انکار کا مسئلہ ہے اور اللہ کی شریعت کو قبول کرنا اور اس کے مطابق فیصلے کرانا اللہ کی حاکیت، اس کی نگہبانی کے اقرار کا ایک مظہر اور ثبوت ہے اور شریعت پر فیصلے نہ کرانا اس کے انکار کا مظہر اور ثبوت ہے -

---ooo---

یہ تو فیصلہ ان لوگوں کے بارے میں تھا جو اللہ تعالیٰ کی شریعت کے فیصلے قبول نہیں کرتے - اب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو حکام اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے ان کے بارے میں فتویٰ کیا ہے اور یہ فتویٰ ان تمام ادیان کا ہے جو اللہ کی جانب سے نازل ہوتے ہیں سب سے پہلے تورات کا فتویٰ -

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ
الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا
مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَ اخْشَوْنِ
وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۗ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ
الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ

وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

(ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ سارے نبی' جو مسلم تھے اسی کے مطابق ان یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے اور اسی طرح ربانی اور احبار بھی (اسی پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے) کیونکہ انہیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے۔ پس (اے گروہ یہود) تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے لے کر بیچنا چھوڑ دو جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان' آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے بدلے ناک' کان کے بدلے کان' دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لئے برابر کا بدلہ۔ پھر جو قصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

اللہ کی جانب سے جو دین بھی آیا ہے وہ اس لئے آیا ہے تاکہ وہ نظام زندگی بنے اور لوگوں کی عملی زندگی کا وہ نظام ہو۔ ہر دین اس لئے آیا ہے کہ وہ انسانیت کی قیادت کرے۔ انسان کو منظم کرے' اسے صحیح راستہ دکھائے اور اسے غلطیوں اور سیاہ کاریوں سے بچائے۔ دین محض اس لئے نہیں آتا کہ وہ انسانی شعور میں ایک عقیدہ اور نظریہ ہو' یا وہ محض اس لئے بھی نہیں آتا کہ کلیسا اور مساجد میں چند مراسم عبودیت کے طور پر جاری رہے۔ یہ دونوں باتیں اگرچہ انسان کے عقیدہ و عمل کے لئے ضروری ہیں لیکن صرف عقیدہ اور مراسم عبودیت سے انسانی زندگی کی تنظیم' توجیہ اور سیاہ کاریوں سے بچاؤ ممکن نہیں ہے۔ جب تک دین کی اساس پر پورا نظام زندگی' نظام قانون اور نظام معاشرت نافذ نہ ہو' جب تک ان چیزوں کو عملاً نافذ نہ کیا جائے' جب تک مسند اقتدار پر ایسے لوگ نہ پائے جائیں جو اس حاکمیت اور قانون کے مطابق حکمرانی کریں اور جب تک ایسی حکومت نہ ہو جو اسلامی قوانین اور ہدایات کی خلاف ورزی پر گرفت کرنے والی ہو اور اسلامی سزائیں نافذ کرنے والی ہو اس وقت تک قانون اسلام کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔

انسانی زندگی اس وقت تک استوار نہیں ہو سکتی جب تک نظریہ حیات' مراسم عبودیت اور قانون ایک ہی منبع سے اخذ نہ کئے جائیں۔ اس منبع کی حکمرانی دلوں پر بھی ہو' ذات الصدور پر بھی ہو اور انسان کی عملی حرکات و سکنات پر بھی ہو۔ وہ اس دنیا میں بھی لوگوں کو اجر دیتا ہو اور آخرت میں بھی وہ لوگوں کو اجر دیتا ہو اور حساب و کتاب لیتا ہو۔

جب انسانی زندگی پر حکمرانی مختلف ہو جائے اور رشد و ہدایت کے منابع مختلف ہو جائیں مثلاً ضمیر اور ایمان پر حکمرانی ایک اللہ کی ہو اور ظاہری نظم و نسق اور قانون پر حکمرانی دوسرے حاکم کی ہو اور آخرت کی جزاء کا مالک اور ہو اور دنیا میں سزا دینے والی طاقت کوئی اور ہو تو ایسے حالات میں انسان کی ذات دو مختلف حکمرانوں کے درمیان ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ اس کی شخصیت کے اندر دو مختلف رجحانات ہوتے ہیں اور اس کی زندگی دو طرح کے متضاد طرز ہائے عمل میں بٹ جاتی

ایسے حالات میں زندگی کے اندر وہ بگاڑ پیدا ہوتا ہے جس کی طرف قرآن کریم نے مختلف طریقوں سے اشارہ کیا ہے۔

(لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا) (اگر زمین و آسمان میں زیادہ الٰہ ہوتے تو ان میں فساد برپا ہو جاتا)

(لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ) (اگر حق ان کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو زمین' آسمانوں اور ان کے اندر جو کچھ ہے وہ فساد کا شکار ہو جائے)۔

(ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِيعَةٍ مِنَ الْأَمْرِ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ) (پھر ہم نے آپ کو شریعت پر قائم کیا ہے پس آپ اس کی اطاعت کریں اور ان لوگوں کی خواہشات کی اطاعت نہ کریں جو نہیں جانتے)۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو دین بھی آیا ہے وہ اس لئے آیا ہے کہ وہ زندگی کا نظام بنے۔ یہ دین کسی گاؤں کے لئے ہو' کسی قوم کے لئے ہو یا پوری کی پوری انسانیت کے لئے ہو' بشرطیکہ وہ دین حق ہو اور اس کے ساتھ شریعت ہو۔ ہر دین میں ایک طرف تو ایک نظریہ حیات ہوتا ہے اور دوسری جانب اس میں زندگی کی تفصیلی ہدایات کے لئے ایک شریعت ہوتی ہے۔ اس میں اللہ کی بندگی کے لئے کچھ مراسم عبودیت ہوتے ہیں۔ یہ تین پہلو ہر دین کے بنیادی عناصر ترکیبی ہوتے ہیں جہاں بھی کوئی دین اللہ کی طرف سے آیا ہے' اس میں یہ تین پہلو ضرور ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی تب ہی استوار اور درست ہو سکتی ہے جب دین کو زندگی کا نظام بنا دیا جائے۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے میری کتابیں الاسلام و مشکلات الحضارہ اور المستقبل لھذا الدین اور خصائص التصور الاسلامی ومقوماتہ)

قرآن کریم میں ایسے شواہد موجود ہیں کہ سابقہ ادیان میں سے بعض ایک محدود علاقے کے لئے تھے مثلاً ایک گاؤں کے لئے یا ایک شہر کے لئے یا کسی ایک قبیلے کے لئے لیکن یہ ادیان بھی مکمل نظام زندگی پر مشتمل تھے اور وہ اس گاؤں اور قریہ کے اس وقت کے حالات کے لئے ایک پورا نظام حیات تھے۔ یہاں قرآن کریم بڑے ادیان یہودیت' نصرانیت اور اسلام کے بارے میں کہتا ہے۔

(إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ (۵: ۴۴) (ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔

تورات' جس شکل میں اسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا' ایک کتاب تھی' جسے بنی اسرائیل کی راہنمائی کے لئے بھیجا گیا تھا۔ یہ جادۂ حق پر ان کے لئے روشنی کا مینار تھی اور ان کے لئے زندگی گزارنے کا ایک ماڈل تھی۔ اس میں نظریہ حیات' مراسم عبودیت اور ملک کے لئے سول لا تینوں شعبے تھے۔

يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ (۵: ۴۴) (سارے نبی' جو مسلم تھے اسی کے

مطابق ان یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے اور اسی طرح ربانی اور احبار بھی (اسی پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے) کیونکہ انہیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے)۔

اللہ تعالیٰ نے تورات کو صرف اس لئے نہیں نازل کیا تھا کہ اس میں صرف نظریہ حیات اور عقائد کے بارے میں راہنمائی ہو۔ اس کے اندر عقائد اور مراسم عبودیت کی تفصیل بھی تھی' بلکہ وہ نور وہدایت تھی اس معنی میں کہ اس کے اندر ایک قانونی نظام کی تفصیلات تھیں اور ایک مکمل نظام تھا کیونکہ انسان کی پوری زندگی کو اس نظام کے حدود کے اندر رکھنا ضروری تھا۔ تورات کے مطابق وہ تمام نبی فیصلے کرتے رہے جو اپنے آپ کو مسلم سمجھتے تھے اور انہوں نے سر تسلیم خم کر لیا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کا کوئی حصہ اپنے لئے محفوظ نہ کر رکھا تھا بلکہ پوری زندگی اللہ کے حوالے کر دی تھی۔ وہ کسی معاملے میں اپنی مرضی نہ کرتے تھے' نہ اپنی حکمرانی کرتے تھے' نہ وہ اللہ کے حق حاکمیت میں اپنے آپ کو شریک کرتے تھے۔ یہ ہے اسلام اپنے حقیقی مفہوم میں۔ یہ پیغمبر یہودیوں اور اس تورات کے ذریعہ حکومت کرتے تھے اور تورات اس سلسلے میں ان کا دستور اور قانون شریعت تھی۔ نبیوں کے علاوہ ربانی اور احبار بھی اسی کے مطابق فیصلے کرتے رہے۔ یہ لوگ ان کے علماء اور قاضی تھے اور ان کا یہ فریضہ تھا کہ وہ تورات کی حکمرانی کو قائم رکھیں۔ وہ اس بات کے گواہ رہیں کہ انہوں نے یہ حق ادا کر دیا تھا۔ یہ شہادت وہ اس طرح دیں کہ ان کی اپنی زندگی تورات کے نظام کے مطابق گزرے اور وہ یہ شہادت بھی دیں کہ ان کی قوم نے تورات کو قائم کیا تھا۔ انہوں نے اس کے مطابق فیصلے کئے تھے۔

تورات کے بارے میں بات ختم ہونے سے پہلے ہی روئے سخن جماعت مسلمہ کی طرف پھر جاتا ہے تاکہ انہیں اس بات کی طرف متوجہ کیا جا سکے کہ آیا وہ بھی اپنی کتاب کے مطابق فیصلے کرتے ہیں یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بعض اوقات لوگوں کی ذاتی خواہشات' ان کا عناد اور ان کی جدوجہد اس راہ میں رکاوٹ بنتی ہو۔ ایسے مشکل حالات میں پھر کتاب اللہ کے محافظین کے فرائض کیا ہوتے ہیں اور لوگوں کی مخالفت اور کتاب اللہ سے روگردانی کی سزا کیا ہے۔

(فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵ : ۴۴) (پس (اے گروہ یہود) تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے لے کر بیچنا چھوڑ دو جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں)۔

اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات بہرحال تھی کہ اللہ کے احکام کے مطابق فیصلے کئے جانے کی راہ میں بہرحال ہر دور میں رکاوٹیں پیدا ہوں گی اور بعض لوگ اس کی مخالفت کریں گے۔ بعض انسان ایسے بھی ہوں گے جو خوشی اور تسلیم ورضا کے ساتھ اسے قبول نہ کریں گے نیز بعض باا‌ثر اور بڑے لوگ اور بعض نافرمان اور موروثی طور پر حکومتوں پر قابض ہو جانے والے لوگ اس کی مخالفت کریں گے۔ یہ مخالفت وہ اس لئے کریں گے کہ انہوں نے اللہ کے حق حاکمیت کی چادر خود اپنے اوپر اوڑھ رکھی ہوتی ہے۔ اب اسلامی نظام میں انہیں یہ چادر اترتی نظر آتی ہے اور حاکمیت کا حق صرف اللہ کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ لوگوں کے لئے جو قوانین بناتے ہیں اور جن کا اذن اللہ نے نہیں دیا ہوتا اب وہ ایسا

نہیں کر سکتے ـ اسی طرح مفاد پرست اور مادہ پرست عناصر کے مفادات بھی اس کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں جو لوگوں کا استحصال کرتے ہیں اور عوام پر مظالم ڈھاتے ہیں ـ ایسے لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا عادلانہ نظام ایسے مظالم کو جاری رکھنے کی کبھی اجازت نہ دے گا ـ اسی طرح اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ میں وہ لوگ بھی آڑے آتے ہیں جو عیاش اور نفس پرست اور لذت کام و دہن کے دلدادہ ہوتے ہیں' جو دنیا کے سازوسامان پر فخر کرتے ہیں اور ذاتی مفادات کے بندے ہوتے ہیں ـ ان کو یہ خطرہ ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت انہیں پاکیزہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے گی اور اگر وہ پاکیزہ زندگی بسر نہ کریں گی تو انہیں سزا کا سامنا کرنا ہو گا ـ ان اطراف و جہات کے علاوہ اور بھی کئی قسم کے موانع اور رکاوٹیں سامنے آیا کرتی ہیں علی الخصوص ایسے لوگوں کی طرف سے جو ازروئے فطرت بھلائی نہیں چاہتے اور نیکی اور انصاف کا دور دورہ دیکھ نہیں سکتے ـ

یہ بات اللہ کے علم میں تھی کہ اسلامی شریعت کے نفاذ کی راہ میں مختلف اطراف سے یہ رکاوٹیں سامنے آئیں گی ـ اللہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ اسلام کے محافظین اور مجاہدین و شہداء کو ان رکاوٹوں کا سامنا کرنا ہو گا اور ان کو ان کے بالمقابل بڑی مضبوطی سے کھڑا ہونا ہو گا اور جانی و مالی نقصانات انہیں برداشت کرنے ہوں گے ـ اس لئے اللہ تعالیٰ انہیں پکارتے ہیں :

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ (۵ : ۴۴) (تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو) اس طرح جب وہ اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں گے تو وہ کسی کے ڈر کی وجہ سے شریعت کے نفاذ میں سستی نہ کریں گے ـ یہ ڈر کئی جہات سے ہو سکتا ہے' ایک تو ان لوگوں کی طرف سے جو سرے سے اسلامی نظام قانون کے آگے جھکتے ہی نہیں اور وہ اسلامی شریعت کو تسلیم ہی نہیں کرتے' وہ اللہ کو قانون ساز تسلیم ہی نہیں کرتے یا وہ لوگ شریعت کا نفاذ اس لئے نہیں چاہتے کہ اس کی وجہ سے ان کے استحصالی نظام پر زد پڑتی ہے جس کے ساتھ ان کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں' اور جس کے وہ عادی ہو چکے ہیں ـ یا یہ لوگ عام گمراہ اور منحرف طبقات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جن کے اوپر شریعت کے احکام بہت ہی بھاری ہوتے ہیں اور وہ اس سے پریشان ہوتے ہیں ـ مطلب یہ ہے کہ ان تمام طبقات سے نہ ڈرتے ہوئے یا دوسرے لوگوں سے ڈرتے ہوئے وہ اللہ کے احکام کے نفاذ سے نہیں رکتے اس لئے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی اس بات کا مستحق ہے کہ ہم اس سے ڈریں اور ڈرنا بھی اسی سے چاہیے ـ

اللہ تعالیٰ کو اس بات کا بھی علم تھا کہ کتاب کی حفاظت کرنے والے اور اسلام کی راہ میں شہادت دینے والے ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ دنیا کی اس مختصر زندگی کی خواہشات انہیں ورغلا دیں' یہ محافظین اسلام دیکھتے ہیں کہ اہالیان حکومت' مالدار طبقات اور شہوت پرست اور عیاش لوگ اسلام کے نفاذ کی راہ میں حائل ہیں ـ اس بات کا امکان تھا کہ اہل دین ان طبقات کے ساتھ ریاکاری کرتے ہوئے دنیا کے مفادات کی غرض سے ان کے آلۂ کار بن جائیں' جیسا کہ ہر دور میں' ہر دین کے علمائے سوء ایسا ہی کرتے چلے آئے ہیں اور خصوصاً علمائے بنی اسرائیل یہ بری حرکت ہمیشہ کرتے آئے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو پکارا ـ

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (۵ : ۴۴) (اور میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے پر بیچنا چھوڑ دو) ـ

اس کی متعدد صورتیں ہوتی ہیں مثلاً سچائی کے مقام پر خاموش ہو جانا' یا احکام میں تحریف کرنا یا ایسے فتوے جاری کرنا جس میں حق باطل دونوں ملے جلے ہوں۔

رہی یہ بات کہ ثمن قلیل سے مراد کیا ہے؟ تو ہر قیمت 'قیمت قلیلہ ہے اگر چہ دین میں تحریف کر کے پوری دنیا کسی کی ملکیت میں آ جائے۔ لیکن ان علمائے سوء کی حاصل کردہ قیمت صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ کچھ مفادات 'کچھ وظائف 'کچھ القاب اور دوسرے چھوٹے چھوٹے مفادات حاصل کرتے ہیں اور ان کے عوض دین بیچتے ہیں 'لیکن اس فعل پر انہیں یقیناً جہنم رسید ہونا ہو گا۔

اگر باڑ فصل کو کھانے لگے اور اگر چوکیدار ہی ڈاکو بن جائے اور اگر گواہ جھوٹ بکنے لگے تو اس سے برا اور کیا ہو گا۔ جن لوگوں کے لئے "دینداروں" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں' جن لوگوں کو علماء کہا جاتا ہے' اگر وہ خیانت کرنے لگیں' اگر وہ زیادتی کرنے لگیں' دین کے احکام چھپائیں' اللہ کی شریعت کے نفاذ کے بارے میں سکوت اختیار کر لیں' آیات کا مفہوم بدل دیں اور بااثر لوگوں کے لئے احکام شریعت میں تبدیلی کر دیں تو پھر ایسے لوگوں کے لئے اللہ کا نہایت ہی موزوں فیصلہ ہے۔

(وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵ : ۴۴) (اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تو وہی لوگ کافر ہیں) دو ٹوک بات ہے لفظ من استعمال کر کے اس کے مفہوم کے اندر عمومیت (Generalization) پیدا کر دی گئی ہے۔ من موصولہ اور شرطیہ ہے اور آگے فا کے بعد جملہ جواب شرط ہے۔ یوں یہ حکم مخصوص حالات اور زمان و مکان کی قید سے نکل آتا ہے اور ایک عام حکم بن جاتا ہے' جو بھی اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے' خواہ وہ کسی نسل اور قبیلے سے ہو' کافر سمجھا جائے گا۔

اس حکم کی علت وہی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے' کہ جو شخص اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ اللہ کے حق حاکمیت کا انکار کرتا ہے۔ حاکمیت اللہ کی خصوصیات میں سے اہم خصوصیت ہے اور حاکمیت کا براہ راست تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی شریعت ماخذ قانون ہو۔ اور جو اس کے مطابق فیصلے نہ کرے اور اللہ کے حق حاکمیت کا انکار کرے اور اللہ کی اس خصوصیت کا حق اپنے لئے حاصل کرے تو پھر وہ کافر ہو جائے گا۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اسلام اور ایمان کے معنی کیا رہ جاتے ہیں۔ زبان سے تو ایمان و اسلام کا دعویٰ ہو اور عمل جو اظہار مافی الضمیر کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے' اس سے انسان کفر کا اظہار کرے تو زبانی اظہار اسلام یقیناً بے معنی ہو جاتا ہے۔

اس دو ٹوک' قطعی اور عام حکم کے بارے میں لیت و لعل سے کام لینا محض حقیقت کا سامنا کرنے سے فرار ہے۔ اس قسم کے قطعی اور دو ٹوک حکم میں تاویلات کرنے کا مقصد صرف یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کے واضح احکام کا مفہوم بدل کر رکھ دیا جائے۔ لہذا کوئی شخص جس پر یہ قطعی حکم منطبق ہوتا ہے وہ اس صریح اور مؤکد حکم کے نتائج سے کسی طرح بھی فرار اختیار نہیں کر سکتا۔

دین اسلام کے اس اصولی اور اساسی قاعدے کے بیان کے بعد اب روئے سخن تورات کی طرف پھر جاتا ہے۔ تورات میں بھی اللہ تعالیٰ نے احکام شریعت نافذ کئے تھے اور نبیوں' اہل دین اور علماء کو یہ حکم تھا کہ قانون تورات کے

مطابق فیصلے کریں اس لئے کہ ان کو شریعت تورات پر محافظ بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ بھی تھے۔

(وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ (۵:۴۵)

(تورات میں ہم نے یہودیوں کے لئے یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان 'آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے بدلے ناک 'کان کے بدلے کان' دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے برابر کا بدلہ۔

یہ احکام جو تورات میں نازل ہوئے تھے 'اسلامی شریعت میں بحال رکھے تھے اور اسلامی شریعت کا جزء بن گئے تھے۔ یوں وہ قیامت تک شرعی احکام قرار پائے کیونکہ مسلمانوں کی شریعت قیامت تک کے لئے ہے۔ اگرچہ ان احکام کا نفاذ صرف دارالاسلام میں ہو سکے گا۔ اس لئے کہ عملاً صرف ایسا ہی ممکن ہے اور جو حکومت ان احکام کو نافذ کرتی ہے 'اس کا اقتدار دارالاسلام کے حدود کے اندر ہوتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی استطاعت میں جب بھی یہ بات آئے تو ان پر فرض ہے کہ وہ اسلامی شریعت کو دارالاسلام سے باہر بھی نافذ کریں اس لئے کہ اسلامی شریعت تمام انسانوں کے لئے ہے اور وہ حدود و قیود کی پابند نہیں ہے کیونکہ اللہ کا ارادہ یہی ہے۔

مذکورہ بالا احکام تورات کو اسلامی شریعت کا جزء بناتے وقت ان احکام کے ساتھ 'ایک قانونی دفعہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ (فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ (۵:۴۵) (پس جو قصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے)۔

تورات میں یہ دفعہ نہ تھی۔ احکام تورات کے مطابق یہ جرائم قابل راضی نامہ Compoundable نہ تھے ان میں مستغیث نہ معافی دے سکتا تھا اور نہ صلح ممکن تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کفارہ نہ تھا۔

یہاں مناسب ہے کہ فی ظلال القرآن کی مناسبت سے جرائم قصاص کے بارے میں ایک مختصر بات کر دی جائے۔

اسلامی شریعت قصاص کے بارے میں پہلا اصول مساوات کا متعین کرتی ہے۔ خون سب کا یکساں ہوتا ہے اور سزا بھی سب کے لئے یکساں ہے۔ اسلام کے بغیر کسی دوسری شریعت میں جان کے بدلے جان کی مساوات نہیں ہے۔ چنانچہ اسلام میں جان کے بدلے جان اور عضو کے بدلے وہی عضو ہے۔ اس بارے میں علاقے 'طبقے 'نسب 'خون اور قوم کا کوئی امتیاز یا لحاظ نہیں ہے۔

جان کے بدلے جان 'آنکھ کے بدلے آنکھ 'ناک کے بدلے ناک 'کان کے بدلے کان 'دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں پورا پورا بدلہ ہے۔ اس بارے میں کوئی امتیاز 'کوئی نسلی 'طبقاتی اور قومی فرق نہیں ہے۔ حاکم و محکوم کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ سب کے سب اسلامی شریعت کی نظر میں برابر ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ سب کے سب ایک جوڑے آدم و حوا سے پیدا ہوئے ہیں۔ ابوکم آدم والام حواء۔

اسلامی شریعت نے اس دنیا کو جس زریں اصول سے متعارف کرایا وہ اصول مساوات ہے اور مساوات دے کر اسلام نے انسان کو گویا ایک نیا جنم دیا۔ اس سے پہلے انسان کو حقیقی مساوات نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس مساوات کا پہلا اصول یہ تھا کہ تمام لوگ قانون کی نظروں میں برابر ہوں گے۔ وہ ایک ہی پلیٹ فارم سے انصاف حاصل کریں گے۔

دوسرے یہ کہ سب سے ایک ہی پیمانے کے مطابق قصاص لیا جائے گا۔ اور سب کی قدر ایک ہی ہوگی۔

انسان نے بنائے ہوئے نظام اور قوانین کو اس درجہ مساوات تک پہنچنے کے لئے صدیاں سفر کرنا پڑا اور اسلامی شریعت ہی سے متاثر ہو کر دنیا کے قانونی نظاموں نے صرف بعض پہلوؤں کے اعتبار سے اسلامی مساوات کو حاصل کیا۔ اگرچہ عملاً وہ ایسی مساوات قائم نہیں کر سکے جو اسلام نے قائم کی۔

یہود جن پر نازل شدہ تورات میں انسانی مساوات کے زریں اصول درج تھے' انہوں نے ان قوانین سے روگردانی کی۔ اور یہ روگردانی انہوں نے اپنے اور دوسرے لوگوں ہی کے درمیان نہ کی جس طرح قرآن ان کا یہ قول نقل کرتا ہے۔

(لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ) (ہم پر امی لوگوں کے بارے میں کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا) بلکہ وہ خود اپنے اندر بھی مساوات قائم نہ کر سکے۔ خصوصاً وہ قانونی مساوات پر عمل پیرا نہ تھے جیسا کہ وہ بنو نضیر کو برتر اور بنو قریظہ کو ذلیل قبیلہ سمجھتے تھے اور دونوں کے لئے سزائیں علیحدہ علیحدہ تھیں اور جب حضور اکرم ﷺ مبعوث ہوئے تو آپ نے ان کے درمیان قانونی مساوات قائم فرمائی۔ آپ نے ان میں سے ذلیل لوگوں کی جان کو معزز لوگوں کی جان کے برابر قرار دیا۔

اس عظیم اصول پر قانون قصاص نافذ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ سخت غیرت آموز سزا ہے اور اس کے ہوتے ہوئے ہر شخص اقدام قتل' اقدام ضرر شدید اور اعضاء کے توڑنے کے بارے میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے بار بار سوچتا ہے کہ وہ یہ اقدام کرے یا نہ کرے۔ اس لئے کہ اسے علم ہوتا ہے کہ اگر اس نے قتل کیا تو اسے سولی پر چڑھنا ہوگا' اور اس کا نسب' اس کی سماجی حیثیت اور اس کا رنگ و نسل اسے کوئی فائدہ نہ دے سکے گا۔ اسے ویسی ہی سزا ملے گی جیسا وہ جرم کرے گا۔ اگر وہ کسی کا ہاتھ' پاؤں یا دوسرے اعضاء ضائع کرے گا تو اس کے بھی وہی اعضاء ضائع ہوں گے۔ اگر وہ آنکھ' کان اور ناک ضائع کرے گا تو اس کے یہی اعضاء ضائع ہوں گے۔ اور اگر کوئی یہ سمجھے کہ اسے صرف قید ہونا ہے تو وہ کبھی بھی ایسے جرائم سے باز نہ آئے گا چاہے سزائے قید لمبی ہو۔ اس لئے کہ جسمانی سزا' جسمانی نقص اور شکل کا بگڑنا بمقابلہ مصائب سزائے قید زیادہ اذیت ناک ہے جیسا کہ ہم حد سرقہ کے بیان میں قطع ید کے ضمن میں تفصیلات بیان کر آئے ہیں۔

پھر مزید یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ سزائے قصاص ایک ایسی سزا ہے کہ انسان کی فطرت اس کے اجراء کے بعد مطمئن ہو جاتی ہے اور نفس انسانی سے بغض اور کینہ دور ہو جاتا ہے۔ دل کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں اور انتقام کی آگ بجھ جاتی ہے' جبکہ عرصہ اور جاہلی انتقام بھڑکتا رہتا ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ بعض لوگ قتل میں دیت اور زخموں کا تاوان وصول کر لیتے ہیں لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اجرائے سزائے قصاص پر اصرار کرتے ہیں۔

اسلام نے قانون سازی کرتے وقت فطرت انسانی کے جذبات کو ملحوظ رکھا ہے' جیسا کہ تورات کی شریعت نے اس کی سختی سے پابندی کی اور مکمل قصاص کے نفاذ سے فطرت انسانی کو مطمئن کیا۔ لیکن اسلامی شریعت میں قصاص لینے والے کے لئے یہ اصول بھی رکھا کہ وہ معاف کر سکے بشرطیکہ قصاص لینے پر اسے اختیار حاصل ہو جائے۔ (فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ (۵:۴۵) (اور جو قصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے)۔

یعنی جو خوش دلی کے ساتھ قصاص معاف کر دے' چاہے وہ قتل کی صورت میں ولی الدم ہو' یا جرح اور زخم کی صورت میں خود مجروح ہو' پہلی صورت میں ولی الدم خون کی صورت میں معافی دے کر دیت قبول کر سکتا ہے یا دیت اور

سزائے موت دونوں معاف کر سکتا ہے۔ (فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ (۵ : ۴۵) کے معنی یہ ہیں کہ اس معافی سے معاف کرنے والے کے گناہ معاف ہوں گے۔

اس ترغیب کی وجہ سے اگر کوئی صدقہ کر دے اور معاف کر دے تو اس کے عوض اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے کے گناہ معاف کر دے گا۔ بعض اوقات لوگ عفو و درگزر کی طرف مائل ہو سکتے ہیں' انہیں اللہ کی جانب سے عفو و درگزر کی امید ہو سکتی ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کی طرف سے جن لوگوں کو مالی معاوضے کی ضرورت نہیں ہوتی' اور قصاص کے نفاذ سے بھی ان کی تسلی نہیں ہوتی کیونکہ ان کا جو عزیز ان سے جدا ہو گیا یا انہیں ذاتی طور پر جو نقصان ہوا وہ ناقابل تلافی تھا اس لئے کہ مقتول کے وارث کو کیا ملے گا اگر قاتل کو قتل بھی کر دیا جائے۔ یا اگر اس کا بھائی وغیرہ جدا ہو گیا تو مالی مفادات سے اسے کیا حاصل ہو گا؟ اس سے تو صرف اس دنیا میں انصاف اور امن و امان حاصل ہو سکتے ہیں لیکن ورثاء یا مجرم کے دل میں احساس ہمیشہ کے لئے زندہ رہتا ہے۔ اگر لوگوں کو اللہ کی جانب سے مغفرت کی امید ہو تو ان کے دل صاف ہو سکتے ہیں اور دلوں سے کینہ کی میل دور ہو سکتی ہے۔

امام احمد نے وکیع' یونس' ابوالسفر کے واسطے سے روایت کی ہے۔ ابوالسفر کہتے ہیں کہ ایک قریشی نے ایک انصاری کا دانت توڑ دیا۔ اس نے حضرت معاویہ سے تعاون چاہا۔ معاویہ نے کہا' ہم اسے راضی کر دیں گے' لیکن انصاری نے اصرار کیا کہ قانون قصاص نافذ کیا جائے' تو امیر معاویہ نے کہا کہ تم جانو اور یہ انصاری جانیں' اس مجلس میں ابوالدرداء ﷺ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے فرمایا میں نے حضور ؐ سے سنا کوئی مسلمان اگر دوسرے مسلمان کے ہاتھوں کوئی زخم اٹھائے اور پھر اسے معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ بلند کر دیں گے یا اس کی کوتاہیوں میں سے کوئی کوتاہی معاف کر دیں گے۔ اس پر انصاری نے کہا میں معاف کرتا ہوں۔"

یوں اس شخص کا دل راضی ہو گیا اور مطمئن ہو گیا حالانکہ وہ حضرت معاویہ کی جانب سے کسی بھی مالی تاوان پر راضی نہ ہوا تھا جس کی طرف حضرت معاویہ نے اشارہ فرمایا تھا۔

یہ تو ہے اللہ علیم و خبیر کی شریعت جو اس نے اپنی مخلوق کے لئے وضع فرمائی ہے جس میں لوگوں کے میلانات اور احساسات کا لحاظ رکھا گیا ہے' جس میں لوگوں کی دلی رضامندی کا بہت بڑا دخل ہے اور جس کی وجہ سے لوگوں کے اندر اطمینان' سلامتی اور دلی رضا پیدا ہوتی ہے۔

یہ بتانے کے بعد کہ یہ تورات کی شریعت تھی اور اب یہ اسلامی شریعت کا جزء ہے' ایک عام حکم دے دیا جاتا ہے

(وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۵ : ۴۵) (جن لوگوں نے اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کیا وہ لوگ ظالم ہیں) یہ ایک عام تعبیر ہے۔ یہاں کوئی ایسا قرینہ نہیں ہے جس کی وجہ سے ہم اسے مخصوص کہہ سکیں لیکن ایسے لوگوں کی جدید صفت الظالمون لائی گئی ہے۔

الظالمون سے تعبیر کرنے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ شاید اس تعبیر اور پہلی تعبیر الکافرون کے درمیان کوئی فرق ہے۔ بلکہ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہونے کے ساتھ ظالم بھی ہیں۔ وہ کافر اس لئے ہیں کہ وہ اللہ کی حاکمیت کے منکر ہیں' اس لئے کہ حاکمیت خاصہ خدا ہے اور قانون سازی صرف اللہ کر سکتا ہے اور اگر

کوئی خود اپنا قانون بناتا ہے تو وہ خود حاکمیت کا مدعی ہے اور اپنے لئے حق قانون سازی حاصل کرتا ہے ۔ وہ ظالم اس لئے ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی شریعت کے بجائے اپنی شریعت پر چلاتا ہے ۔ حالانکہ اللہ کی شریعت ان کے لئے مناسب ہے اور ان کے حالات کی اصلاح اس سے ہو سکتی ہے ۔ اور ظلم وہ اس لئے بھی کر رہا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے اور اپنے آپ کو کفر کی سزا کا مستحق بناتا ہے اور اپنی ذات اور تمام لوگوں کی زندگیوں کو فساد میں مبتلا کرتا ہے ۔

یہ مفہوم عربیت کے قواعد کا تقاضا ہے کیونکہ عربیت کی رو سے مسند الیہ اور فعل شرط ایک ہے یعنی وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۴۵) اب اس شرط کا ایک پہلا جواب ہے اور ایک دوسرا جواب ہے ۔ یہاں دوسرا جواب شرط پہلے جواب شرط پر مستزاد ہو گا اور دونوں کا مسند الیہ شرط میں ”من“ ہو گا جو مطلق ہے اور عام ہے ۔

---○○○---

اب یہ بتایا جاتا ہے کہ تورات کے بعد بھی یہ حکم جاری ہی رہا ۔

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۪ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾

(پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا ۔ تورات میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا وہ اس کی تصدیق کرنے والا تھا ۔ اور ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں رہنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی تورات میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا اس کی تصدیق کرنے والی تھی اور خدا ترس لوگوں کے لئے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی ۔ ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں) ۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت عیسیٰ ابن مریم کو انجیل عطا ہوئی تاکہ وہ لوگوں کے لئے نظام زندگی قرار پائے ۔ انجیل میں بذات خود کوئی نیا شرعی نظام نہ تھا ' البتہ انجیل میں تورات کے قانونی نظام میں نہایت ہی خفیف تبدیلیاں کی گئی تھیں ۔ انجیل نے خود تورات کے نظام قانون اور نظریات کی تصدیق کی ' صرف چند تبدیلیاں لائی گئیں ۔ اللہ تعالیٰ نے انجیل کے اندر امت مسلمہ کے لئے ہدایت ' نئی روشنی اور نصیحت اتاری ۔ یہ کس کے لئے ؟ ان لوگوں کے لئے جو خدا ترس تھے ۔ اس لئے متقی

لوگ وہ ہوں گے جو ہدایت 'روشنی اور وعظ و نصیحت اللہ کی کتابوں سے اخذ کرتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں کو یہ کتابیں ہدایات دیتی ہیں - رہے وہ دل جو خشک 'پتھر کی طرح بے جان اور سخت ہوتے ہیں تو کوئی نصیحت ان تک نہیں پہنچتی - ان دلوں کو کلام کے اندر کوئی مفہوم نظر نہیں آتا - ان کو ہدایات کے اندر روح نظر نہیں آتی - ان کو ایمان کے اندر کوئی ذائقہ نظر نہیں آتا - وہ ان ہدایات 'ان انوار سے کوئی راہ نہیں پاتے اور نہ ہی دعوت و پکار پر لبیک کہتے ہیں - نور اور روشنی موجود ہوتی ہے لیکن ان کی بصارت اور بصیرت کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا - راہنمائی موجود ہوتی ہے لیکن اس راہنمائی کا ادراک صرف بلند روحوں کو ہوتا ہے - نصیحت موجود ہوتی ہے لیکن صرف فہم رکھنے والے دل ہی نصیحت لیتے ہیں -

اللہ تعالیٰ نے انجیل میں بھی ہدایت 'نور اور اہل تقویٰ کے لئے نصیحت درج فرمائی اور اہل انجیل کے لئے اسے نظام حیات قرار دیا - اور ان کے لیے قوانین کا ماخذ بنایا یعنی انجیل صرف اہل انجیل کے لئے نظام حیات تھی - وہ تمام لوگوں کے لئے نہ تھی 'کیونکہ انجیل کی دعوت عام نہ تھی لیکن اس کا نفاذ تورات کی طرح' ہر رسالت کی طرح اور ہر رسول کی دعوت کی طرح ضروری تھا' جو رسول کریم ؐ سے پہلے گزرے تھے اور جن کی دعوت نبی ؐ کی دعوت اور شریعت کے مطابق تھی - لہذا شرائع سابقہ کا جو حصہ اسلام کے مطابق ہے وہ اسلام کی شریعت اور قرآن کی شریعت کا حکم رکھتا ہے' جیسا کہ حکم قصاص کے ضمن میں ہم کہہ آئے ہیں -

یعنی اہل انجیل سے بھی مطالبہ یہی تھا کہ وہ انجیل کی شریعت کے مطابق اپنے فیصلے کریں -

(وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ (۵:۴۷) (ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جسے اللہ نے اتارا) یعنی اصل الاصول یہی تھا کہ اللہ کے احکام کے مطابق فیصلے کئے جائیں - اہل انجیل اور یہودیوں دونوں کی کوئی حیثیت نہ تھی جب تک وہ اسلام سے قبل تورات کو نافذ کرتے تھے - اسلام کے آنے کے بعد اب تو سب دنیا کے انسانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اسلامی شریعت نافذ کریں - یہ شریعت اب سب کی شریعت ہے اور یہ اب آخری رسالت اور آخری شریعت ہے -

بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۵:۴۷

(جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں -)

یہاں بھی آیت نہایت ہی عام اور مطلق ہے - اور اس سے قبل اس قسم کے فعل پر صفت کفر اور ظلم کا جو اطلاق ہوا تھا 'صفت کفر ان دونوں پر مستزاد ہے - یہاں فاسقوں سے مراد کوئی اور لوگ نہیں ہیں بلکہ وہی کافرون اور ظالمون ہیں جنہیں یہاں صفت فاسقوں سے بھی متصف کیا گیا ہے اور جو بھی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کرے گا وہ اس صفت سے متصف ہو گا -

کفر اس لئے ہو گا کہ اللہ کی شریعت کا انکار کرنے سے اللہ کی حاکمیت کا انکار ہو گا - ظلم اس لئے لازم ہو گا کہ لوگوں پر اللہ کے سوا کوئی اور قانون نافذ کر کے ظلم ہو گا اور اس قانون کے ذریعے ان کی زندگیوں میں فساد برپا ہو گا اور فسق اس لئے ہو گا کہ اللہ کے نظام حیات سے خارج ہونے والا خود بخود فاسق ہو جاتا ہے - غرض یہ تمام صفات اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے نہ کرنے کے فعل کے ساتھ لازم ہیں اور ایسا فاعل ان تمام صفات کا مرتکب ہوتا ہے

اور ان میں کوئی تفریق نہیں ہے۔

---ooo---

اب بات حضور اکرم ؐ کی آخری رسالت تک آپہنچی ہے۔ اب آخری شریعت یعنی اسلامی شریعت کے بارے میں بات ہوتی ہے۔ اس میں اسلام کو اپنی آخری شکل میں پیش کر دیا گیا تاکہ وہ تمام انسانوں کا دین بن جائے اور اسلام کی شریعت تمام لوگوں کی شریعت ہو۔ نیز اس کے اندر ان تمام ہدایات کو جمع کر کے محفوظ کر دیا جائے جو اس سے پہلے کسی بھی رسول کو دی گئی تھیں اور یہ شریعت اس وقت تک نافذ رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کو لپیٹ نہیں لیتا۔ یہ ایک ایسا نظام زندگی ہے جس پر اسلامی زندگی ہر پہلو کے اعتبار سے قائم ہوتی ہے۔ اس کے دائرے کے اندر زندگی محدود ہو جاتی ہے اور اس کے محور کے اندر گھومتی ہے۔ انسان اپنے اعتقادات و تصورات اسی سے اخذ کرتا ہے۔ اپنا اجتماعی نظام بھی اس کے مطابق استوار کرتا ہے' اور وہ اپنے انفرادی اور سوشل روابط اسی کے مطابق ڈھالتا ہے۔ اور یہ شریعت اس لئے اتاری گئی ہے کہ یہ عدالتوں میں رائج ہو' اس کے مطابق نظام تعلیم استوار ہو' کتابوں اور دفتروں کے اندر اس کا دور دورہ ہو اور اس کی پیروی اور اس کا نفاذ نہایت دقت کے ساتھ ہو۔ اس کا کوئی جزء متروک نہ ہو' اس کا کوئی جزء بدلا نہ گیا ہو' چاہے چھوٹے معاملات سے متعلق ہو یا بڑے معاملات سے اس لئے کہ یا تو شریعت اسلامی ہوگی اور یا جاہلیت ہوگی۔ اس شریعت کے نفاذ کے سلسلے میں اس نیت سے تساہل اور مداہنت کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ اس بہانے بہت سے لوگوں کو اسلام کے نام پر جمع کر دیا جائے' اس لئے کہ اگر اللہ چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ اس کی شریعت کی حکمرانی قائم ہو' پھر جو ہوتا ہے ہو۔

وَأَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ
يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ
وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۚ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً
وَّمِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي
مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۚ إِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا
كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٤٨﴾ وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ
أَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ إِلَيْكَ ۚ

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُصِيبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ ۗ وَإِنَّ
كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ ﴿٤٩﴾ أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ
مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿٥٠﴾

(پھر اے نبی' ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے۔ لہذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو..... ہم نے تو (انسانوں) میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی ہے۔ اگر تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا لیکن اس نے یہ اس لئے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ لہذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے' پھر وہ تمہیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو.... پس اے نبی ؐ تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو' اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنے میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے۔ پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے ان کے بعض گناہوں کی پاداش میں ان کو مبتلائے مصیبت کرنے کا ارادہ ہی کر لیا ہے' اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں (اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں) تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟)۔

انسان جب اس تعبیر کی صفائی پر غور کرتا ہے اور اس دو ٹوک فیصلے پر نگاہ ڈالتا ہے اور اس مکمل اختیار پر غور کرتا ہے کہ اس میں ان تمام امور کی پیش بندی کر دی گئی ہے جو ترک شریعت کے بارے میں کسی انسان کے دل میں آ سکتے ہیں۔ جب انسان غور کرتا ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے کہ کوئی مسلمان ان ہدایات کے باوجود کس طرح شریعت کو ترک کر سکتا ہے۔ یہ ترک وہ حالات اور ضروریات کے بہانے سے کرتا ہے اور پھر بھی دعوائے اسلام کرتا ہے۔ اس سے زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ کوئی شخص اسلامی شریعت کو کلیۃً ترک کر دے اور پھر بھی یہ کہے کہ وہ مسلمان ہے۔ ان لوگوں کی جرأت کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے اپنے گلے سے اسلام کا طوق اتار پھینکا ہے لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو بدستور مسلمان کہتے ہیں۔ پوری کی پوری شریعت کو انہوں نے اپنی زندگی سے یکسر خارج کر دیا ہے۔ وہ اللہ کی حاکمیت کا اقرار ہی نہیں کرتے اور یہ یوں کہ وہ قانون سازی کو اللہ کے ساتھ مخصوص نہیں کرتے اور یہ بات نہیں مانتے کہ اسلامی شریعت ہر قسم کے حالات اور ہر قسم کے اوقات میں قابل عمل ہے اور یہ کہ ہم پر یہ فرض ہے کہ ہم تمام حالات میں شریعت کو نافذ کریں۔

(وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ (۵:۴۸)) (پھر اے نبی ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے)۔

یہ حق اس طرح ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے آئی ہے اور اللہ تعالیٰ اس بات کا مستحق ہے کہ وہ شریعت نازل کرے اور لوگوں پر قانونی ڈیوٹیاں عائد کرے۔ پھر اس کتاب کے مشمولات تمام حق ہیں 'نظریات سچے ہیں' قوانین سچے ہیں' جو قصے اور خبریں اس میں درج ہیں وہ سچے ہیں اور جو ہدایات اس میں دی گئی ہیں وہ برحق دی گئی ہیں۔

(مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (۵:۴۸)) (اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے)۔

اس طرح یہ دین الٰہی کی آخری مکمل شکل ہے اور آخری ماخذ اور مرجع ہے۔ یہ آخری نظام زندگی ہے' آخری قانون ہے اور اس کے بعد قانون و شریعت اور نظام و دستور میں کوئی تبدیلی نہ ہو گی اور نہ کوئی ترمیم و تنسیخ ہو گی۔

اس اصول کا قدرتی تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے تمام اختلافات اس کتاب کی طرف لوٹائیں تاکہ یہ کتاب اس بارے میں فیصلہ کرے' چاہے ان اختلافات کا تعلق اعتقادات اور تصورات کے ساتھ ہو' جو عموماً ادیان سماوی کے حاملین اور علماء کے درمیان ہوتا رہا ہے یا یہ اختلاف خود مسلمانوں کے اندر پایا جاتا ہو تو وہ مرجع اور ماخذ جس کی طرف وہ اپنی پوری زندگی کے امور میں رجوع کریں گے وہ یہی کتاب ہے۔ اور ان معاملات میں انسانوں میں سے بڑے سے بڑے افراد کی ذاتی رائے کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اگر اس رائے کی پشت پر قرآن و سنت سے کوئی دلیل نہیں ہے۔

چنانچہ اس اصول اور حقیقت کا براہ راست تقاضا یہ سامنے آتا ہے . . .

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ

(۵:۴۸)) (لہٰذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو) ابتداً یہ حکم رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا ہے' یعنی ان اہل کتاب کے بارے میں جو آپ کے پاس فیصلے لے کر آتے تھے۔ لیکن یہ حکم اس سبب نزول کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ایک عام حکم ہے اور ہر زمان و مکان کے لئے ہے اس لئے کہ آپ کے بعد کوئی جدید رسول آنے والا نہیں ہے۔ نہ آپ کے بعد کوئی جدید رسالت بھیجی جانے والی ہے کہ اس حکم میں کوئی تبدیلی لائی جا سکے کہ اب قرآن مرجع نہیں رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دین کو مکمل کر دیا ہے اور اس طرح مسلمانوں پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے اور ان تمام اہل ایمان کے لئے یہ اسلامی نظام حیات پسند کر لیا ہے۔ اب اس میں کسی ترمیم اور تبدیلی کا کوئی راستہ نہیں ہے اور نہ ہی کسی اصول کے مطابق اللہ کے کسی حکم کو تبدیل کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم نافذ کر سکتے ہیں۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے اس دین کو لوگوں کے لئے پسند فرمایا تو اللہ کو علم تھا کہ یہ دین تمام لوگوں کے لئے اپنے اندر گنجائش رکھتا ہے اور جب اس دین کو ہدایت کا مرجع بنایا گیا تو اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ اس میں سب کے لئے فلاح اور بھلائی ہے۔ یہ تمام لوگوں کی زندگی کے تمام مسائل قیامت تک حل کر سکتا ہے اور یہ کہ اس کے اندر کوئی تبدیلی (اس سے روگردانی تو بڑی بات ہے)

موجب کفر ہے۔ ایسا فعل کرنے والا دین سے خارج ہے اگرچہ زبانی طور پر وہ لاکھ مرتبہ اپنے آپ کو مسلمان کہے۔ یہ اس دین کی اس نوعیت کا لازمی نتیجہ ہے۔

اللہ کو علم تھا کہ اس راہ میں لوگ لمبی چوڑی معذرتیں پیش کریں گے اور یہ معذرتیں اس لئے پیش کی جائیں گی کہ اللہ کے نازل کردہ قانون سے پھر کر ان لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کیا جائے جو جعلی طور پر حاکم بن گئے 'یا محکوم ہیں۔ بعض حالات میں مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کے متعلق بعض لوگوں کے دلوں میں اندیشے پیدا ہوں گے 'لیکن ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نبی اکرم ؐ کو دو بار اس بارے میں متنبہ کیا کہ آپ ایسے لوگوں کی خواہشات اور خدشات کی پیروی نہ کریں اور ایسے لوگوں کے فتنے سے بچیں۔

ان خدشات میں سے پہلا خدشہ یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک فطری جذبہ ہوتا ہے کہ اس سے سب لوگ خوش رہیں اور تمام طبقات اور تمام رجحانات کے لوگوں کا لحاظ رکھا جائے۔ ان کے وہ رجحانات جن کا اسلامی شریعت کے ساتھ تضاد آتا ہے ان میں ان کا لحاظ رکھا جائے اور معمولی باتوں میں نرمی کی جائے یا ان معاملات میں تساہل کیا جائے جو بظاہر شریعت کے دائرۂ اثر میں نہیں آتے۔

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ ؐ کو یہودیوں نے یہ پیشکش کی کہ وہ ایمان لے آئیں گے اگر آپ بعض احکام کے بارے میں ان کے ساتھ مصالحت کر لیں ان میں سے ایک رجم کا حکم تھا اور یہ تنبیہ خصوصاً ایسے موقع پر نازل ہوئی جیسا کہ اس سے ظاہر ہے۔ لیکن ان آیات میں جو حکم دیا گیا ہے وہ کسی خصوصی سبب کے ساتھ مخصوص نہیں ہے عام ہے۔ یہ حکم مختلف احوال کے لئے ہو سکتا ہے اور حاملین شریعت کو ہر دور میں ایسے حالات پیش آسکتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ وہ اس معاملے میں نہایت ہی دو ٹوک بات کر دیں اور انسانی خواہش کا ہر خفیہ راستہ بند کر دیں جن میں انسان حالات اور واقعات کے مطابق پوری شریعت کے نفاذ میں تساہل کرتا ہے یا بعض لوگوں کی دلجوئی کے لئے تساہل کرتا ہے جبکہ لوگوں کی خواہشات اور میلانات مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ نے اپنے نبی ؐ سے کہا کہ اگر اللہ چاہتا تو لوگوں کو ایک امت بنا دیتا 'لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کے لئے ایک نظام اور منہاج مقرر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جو شریعت عنایت فرمائی تھی انہیں اس کے بارے میں آزمائش میں ڈال دیا اور اس دنیا کی زندگی کے لئے انہیں جو کچھ دیا گیا اس کے بارے میں بھی ان کی آزمائش ہوگی۔ ہر ایک اپنے لئے ایک طریقہ وضع کر لیتا ہے۔ اس کے بعد تمام لوگ لوٹائے جائیں گے۔ اللہ ان کو حقیقت سے آگاہ فرمائے گا اور انہوں نے جو جو طریقے اختیار کئے ان پر ان کا محاسبہ کرے گا۔ اس لئے ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ شریعت میں کوئی سستی اور تساہل برتیں اور اس طرح مختلف مسالک اور مشارب کے لوگوں کو جمع کرنے کی سعی کریں 'اس لئے کہ یہ اجتماع ممکن ہی نہیں ہے۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۚ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (٥:٤٨)

(ہم نے تم (انسانوں) میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی۔ اگر تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا' لیکن اس نے یہ اس لئے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے' پھر وہ تمہیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اس طرح شیطان کی تمام راہیں بند کر دیں۔ یعنی وہ سب راہیں جو بظاہر اچھی تھیں اور ان کے ذریعے تالیف قلب ہو سکتی تھی۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ شریعت کے نفاذ میں بعض امور پر سودا بازی کی جائے اور اس تساہل کے ذریعہ تمام لوگوں کو راضی رکھا جائے۔ یا شریعت میں تساہل کے ذریعہ "قومی اتحاد کا حصول" جیسے نعرے لگائے جائیں۔

اسلامی شریعت ایک نہایت ہی قیمتی سرمایہ ہے۔ وہ اس سے زیادہ قیمتی ہے کہ اس کے بعض اجزاء کی قیمت پر کسی ایسے مقصد کو حاصل کرنے کی سعی کی جائے جسے اللہ کی تقدیر نے نہیں چاہا۔ اللہ ہی نے تو لوگوں کو پیدا کیا ہے اور ان میں سے ہر شخص کو علیحدہ علیحدہ استعداد دی ہے اور لوگوں کے مسالک و مشارب بالکل مختلف اور متنوع ہیں۔ ہر ایک کا اپنا طریقہ اور اپنا منہاج ہے۔ اور یہ اللہ کی حکمت کا تقاضا تھا کہ لوگوں کو اس طرح مختلف طبائع کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ اللہ نے ان پر ہدایت پیش کی اور انہیں اسی طرح چھوڑ دیا کہ وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی سعی کریں۔ یہ مسابقت ان کے درمیان ایک قسم کا ابتلاء ہے اور اسی ابتلاء اور آزمائش کی وجہ سے قیامت کے دن جب سب لوگ اللہ کے ہاں جائیں گے تو انہیں جزا و سزا ہو گی۔

اس لئے کہ یہ کٹ حجتی ہو گی اور ایک ناکام کوشش ہو گی کہ کوئی شخص لوگوں کو اسلامی شریعت کے کسی حصے کو قربان کر کے جمع کرے یا لوگوں کی اصلاح اور ان کے معاشی حالات درست کرنے کے لئے شریعت کی کوئی انوکھی تعبیر کی جائے۔ اسلامی شریعت میں تبدیلی یا اس سے روگردانی کی وجہ سے دنیا میں فساد ہی برپا ہو سکتا ہے' اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس طرح تو صرف یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ لوگ اللہ کے درست اور سیدھے منہاج سے روگردانی کر لیں۔ لوگوں کی زندگیوں میں عدل و انصاف کا نام و نشان نہ رہے اور بعض لوگ بعض دوسروں کے غلام بن جائیں۔ پھر ان میں سے بعض 'بعض دوسروں کے لئے الہ اور رب کا مقام حاصل کر لیں۔ یہ ایک عظیم شر و فساد ہو گا اور اس عظیم شر کو محض ایک موہوم مقصد کے لئے برپا ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی جبکہ یہ مقصد ہو بھی ناممکن الحصول ' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تو یہ اصول رکھا ہی نہیں ہے کہ تمام لوگ ایک ہی راہ پر آجائیں۔ یہ مقصد اس حکمت اور اسکیم کے بھی خلاف ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے مختلف راستے مختلف منہاج اور مختلف ذوق پیدا کئے ہیں۔ وہی تو ہے جو سچائی کا بھی خالق ہے' اور تمام امور اول اور آخر سب اس کے ہاتھ میں ہیں اور اسی کی طرف تمام لوگوں کو لوٹنا ہے۔

ایسے مقاصد کے لئے شریعت کے کسی حصے کو حذف کر دینے کی کوئی کوشش اس آیت کی رو سے ایک ناکام کوشش ہے اور انسانوں کی عملی زندگی اس بات کی شاہد ہے۔ اس کے لئے کسی عملی جواز کی ضرورت نہیں ہے اور اس بات پر ارادۂ الٰہی سے بھی کوئی دلیل نہیں ہے اور اسلامی شعور کے اندر بھی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اسلامی شعور اور احساس تو یہ ہوتا ہے کہ اللہ کا ارادہ بروئے کار آئے۔ بعض لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں' وہ یہاں تک کہتے ہیں ہم اسلامی نظام شریعت اس لئے نافذ نہیں کرتے کہ اس سے ہمارے ملک میں سیاحوں کی آمد کم ہو جائے گی۔ بالکل وہ ایسا ہی کہتے ہیں۔

چنانچہ قرآن کریم اس حقیقت کی دوبارہ وضاحت کرتا ہے۔ پہلی آیت تو یہ تھی

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ

(۵ : ۴۸) (پس آپ ان کے درمیان فیصلہ کریں اس سچائی کے مطابق جو اللہ نے نازل کی ہے اور اتباع نہ کریں ان کی خواہشات بمقابلہ اس کے جو سچائی تمہارے پاس آئی) اس سے یہ مراد ہو سکتی تھی کہ پوری شریعت کو نہ چھوڑ دیا جائے' محض لوگوں کی خواہشات کی وجہ سے۔ لیکن اگر شریعت کا حصہ چھوڑنا پڑے تو اس کے بارے میں یہاں حکم دیا جاتا ہے کہ بعض بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵: ۴۸) کا بھی چھوڑنا منع ہے۔

(وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ

بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (۵ : ۴۹) (پس اے نبی ؐ، تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے)

یہ تنبیہ بہت ہی شدید ہے اور بہت ہی مفصل ہے۔ یہ صورت حال کی حقیقی تصویرکشی ہے اس لئے کہ یہ ایک عظیم فتنہ ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اس سے خبردار رہیں اور تمام فیصلے اللہ کی شریعت کے مطابق کریں۔ اگر مکمل شریعت نہ ہوگی تو پھر مکمل خواہش پرستی ہوگی جس سے اللہ تعالیٰ ڈراتے ہیں۔

اگلی آیت میں بعض خدشات اور پریشانیوں کو دور کیا جاتا ہے اور رسول خدا ؐ کو تسلی دی جاتی ہے کہ اگر یہ لوگ شریعت کے بڑے احکام سے پہلے شریعت کے چھوٹے احکام نافذ کرنا پسند نہیں کرتے اور اگر یہ لوگ اسلام کو مکمل دین کے طور پر اختیار نہیں کرتے۔ یا اسلامی شریعت کے مطابق اپنے فیصلے نہیں لے جاتے (یہ اس دور کی بات ہے جب شریعت کے مطابق فیصلے اختیاری تھے ابھی تک شریعت کا نظام حتمی طور پر نافذ نہ ہوا تھا۔ جب دار الاسلام مکمل طور پر قائم ہوگیا تھا تو پھر شریعت کے مطابق فیصلے کرانا لازم کر دیا گیا) تو پھر یہ لوگ اللہ کے عذاب کے لیے تیار رہیں۔

(فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ

النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ (۵ : ۴۹) (پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے ان کے بعض گناہوں کی پاداش میں ان کو مبتلائے مصیبت کرنے کا ارادہ ہی کر لیا ہے' اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں)

اگر یہ لوگ منہ پھیرلیں تو آپ پر کیا ذمہ داری ہے۔ آپ اپنی جگہ شریعت کو پوری قوت کی ساتھ تھامے رہیں اور اللہ کے احکام نافذ کریں۔ ان لوگوں کا اعراض اور روگردانی آپ کی گرفت کو ڈھیلا نہ کر دے اور آپ کو اپنے موقف سے ہٹانہ دے۔ یہ لوگ تو اعراض اس لئے کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے بعض گناہوں کی پاداش میں سخت مصیبت میں ڈالنے والے ہیں۔ یہ اللہ کی اسکیم ہے کہ یہ لوگ برے نتائج کا شکار ہوں' نہ آپ' نہ اللہ کی شریعت اور نہ

اللہ کا دین متاثر ہو گا اور نہ اسلامی محاذ متاثر ہو گا جس نے شریعت کو پوری طرح پکڑ رکھا ہے۔ ہاں یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ لوگوں کی اکثریت فسق و فجور میں مبتلا رہتی ہے اس لئے وہ اسلام سے نکلتے ہیں اور منحرف ہو جاتے ہیں۔ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ (۵: ۴۹) بے شک لوگوں کی اکثریت فسق و فجور میں مبتلا رہتی ہے۔ یہ لوگ اسی طرح رہیں گے اور آپ اس صورت حال کو بدل نہیں سکتے۔ اس میں شریعت کا بھی کوئی قصور نہیں ہے اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اکثریت کو راہ مستقیم پر استوار کر دیا جائے۔

اس طرح ایک مومن کے نفس کے اندر شیطان کی وسوسہ اندازی کے تمام راستے بند کر دیئے جاتے ہیں اور ایک مومن اپنی راہ پر دلیل کے ساتھ چلتا ہے۔ اسلامی شریعت اور اسلامی احکام میں سے کسی حکم کے چھوڑنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کام کسی دنیاوی غرض کے لئے بھی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ حالات میں سے کسی حال میں ہو سکتا ہے۔

یہاں آکر قرآن کریم انسانوں کو دوراہے پر لاکر کھڑا کر دیتا ہے۔ یا تو انہیں اللہ کے حکم اور قانون کی راہ اختیار کرنی ہو گی یا وہ جاہلیت کی راہ اپنائیں گے۔ ان دوراہوں کے درمیان نہ تیسری راہ ہے اور نہ ان کے متبادل اور کوئی راہ ہے۔ دنیا میں اللہ کے احکام نافذ ہوں گے اور لوگوں کی زندگی میں اسلامی شریعت نافذ ہو گی یعنی یا انسانیت کی قیادت اسلامی نظام کرے گا اور یا احکام جاہلیت نافذ ہوں گے ' قانون سرکشی نافذ ہو گا اور غلامی کا نظام جاری رہے گا۔ اب اس دوراہے پر لوگوں نے فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

(اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۵: ۵۰)

(اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے)۔

یہاں یہ آیت جاہلیت کے مفہوم اور مدلول کو متعین کر دیتی ہے۔ یہ اللہ کا قرآن ہے جو جاہلیت کے مفہوم کو متعین کر دیتا ہے اور اس کے مطابق جاہلیت یہ ہے کہ مملکت میں انسان کی حکومت انسان پر چلے۔ یہ دراصل انسانوں کی جانب سے انسانوں کی غلامی ہے۔ اللہ کی حاکیت کا انکار ہے اور اللہ کی حاکیت کے نظریہ کو ترک کرنا ہے۔ یہ انکار اور ترک اصل انسانوں کی حاکیت کا اقرار ہے اور انسانوں کی بندگی اور پرستش ہے۔

اس آیت کی روشنی میں جاہلیت کا تعلق زمان و مکان سے نہیں ہے بلکہ جاہلیت ایک صورت حال کا نام ہے جو کل بھی تھی ' آج بھی ہے اور کل بھی ہو گی۔ لہذا جس چیز کی ممانعت ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کے مقابلے میں جاہلی صورت حال نہ اختیار کی جائے جو اسلام سے متصادم ہے۔

لوگوں کے مختلف حالات ہو سکتے ہیں ' ہر جگہ اور ہر دور میں ' یا تو وہ اللہ کی شریعت کے مطابق عمل کریں گے ' ماسوائے اس کے کہ وہ اس کے کچھ اجزاء کو ترک کر دیں یا پھر نظام شریعت کو مکمل طور پر تسلیم و رضا کے ساتھ قبول کریں گے۔ ایسی صورت میں لوگ اللہ کے دین میں متصور ہوں گے۔ یا وہ اپنے فیصلے کسی ایسے قانون کے مطابق کر رہے ہوں جو انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے ' چاہے اس کی جو شکل و صورت بھی ہو ' اور وہ اسے قبول کریں گے لہذا یہ لوگ ان لوگوں کے دین کے اندر متصور ہوں گے ' جن کے قانون کو یہ لوگ مانتے ہیں۔ ایسے حالات میں یہ لوگ ہرگز دین اسلام

میں داخل نہ ہوں گے - جو شخص اللہ کے حکم کے مطابق فیصلے نہیں کراتا وہ دراصل جاہلیت کے مطابق فیصلے کراتا ہے - اور جو شخص اللہ کی شریعت کا انکار کرتا ہے' وہ دراصل جاہلیت کی شریعت چاہتا ہے اور جاہلیت میں بستا ہے -

یہ ہے ایک دوراہہ جس پر اللہ تعالیٰ لوگوں کو لاکر کھڑا کر دیتا ہے اور اس کے بعد لوگوں کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ جس راہ پر جانا چاہیں اس راہ کو اختیار کر لیں -

اس کے بعد ذرا درشت نظروں کے ساتھ دیکھ کر پوچھا جاتا ہے ان لوگوں سے جو جاہلیت کے مطابق فیصلے کرانا چاہتے ہیں - یہ استفہام انکاری ہے لیکن سوالیہ انداز میں احکام الٰہی کی برتری کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے -

(وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۵ : ۵۰)) (حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے ؟) ..... ہاں یہ بالکل درست ہے کہ اللہ کے قانون اور احکام کے علاوہ اور کوئی قانون اور حکم نہیں ہے - کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ لوگوں کا قانون ساز ہے - یا وہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں زیادہ اچھا قانون بنا سکتا ہے - وہ اس عظیم دعوے کے حق میں کیا دلیل رکھتا ہے -

کیا کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ لوگوں کے خالق کے مقابلے میں لوگوں کے بارے میں زیادہ جاننے والا ہے - کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ لوگوں کے رب کے مقابلے میں ان کا زیادہ ہمدرد ہے اور کوئی ہے جو یہ کہہ سکتا ہو کہ وہ الٰہ العالمین کے مقابلے میں لوگوں کی مصلحتوں سے زیادہ باخبر ہے ؟ کیا کوئی یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو لوگوں کے لئے آخری شریعت بنا رہا تھا' جو اپنے رسول ﷺ کو خاتم النبیین بنا رہا تھا' جو ان کی رسالت کو خاتم الرسالات بنا رہا تھا' اور ان کی شریعت کو شریعت ابدی بنا رہا تھا - کیا اللہ قیامت تک آنے والے حالات میں سے کسی حال سے بے خبر تھا کہ ایسا حال بھی آئے گا - کیا وہ اس سے بے خبر تھا کہ لوگوں کی نئی نئی ضروریات پیدا ہوں گی' نئے حالات پیدا ہوں گے اور اللہ نے اس قانون سازی میں ان کا کوئی خیال نہ رکھا - مطلب پھر یہ ہو گا کہ اللہ کو ان حالات کا علم نہ تھا اور یہ علم اب آخری زمانے میں لوگوں پر منکشف ہوا -

اس سوال کا وہ شخص جواب دے جو زندگی کے دھارے سے اسلامی شریعت کو نکالنا چاہتا ہے - اس کی جگہ جاہلیت کی شریعت نافذ کرنا چاہتا ہے - وہ اپنی خواہشات کو قانون میں بدلنا چاہتا ہے' یا کسی قوم کی خواہشات کو قانون سمجھتا ہے یا کسی نسل کی خواہشات کو اللہ کے حکم اور اللہ کے قانون سے اونچا سمجھتا ہے - میں پوچھتا ہوں کہ ایسا شخص درج بالا سوالات کا جواب کیا دیتا ہے اور خصوصاً اگر یہ شخص اپنے بارے میں یہ زعم بھی رکھتا ہے کہ وہ مسلمان ہے -

حالات' ماحول' لوگوں کا دلچسپی نہ لینا' دشمنوں کا خوف وغیرہ کیا یہ تمام امور اللہ کے علم میں نہ تھے ؟ خصوصاً اس وقت جب اللہ مسلمانوں کو یہ حکم دے رہا تھا کہ وہ اپنے معاشرے میں شریعت نافذ کریں' اسلامی نظام کے مطابق زندگی بسر کریں اور اللہ تعالیٰ نے جو احکام نازل کئے ہیں ان میں سے کسی ایک کو بھی نہ چھوڑیں -

کیا یہ بات اللہ کے علم میں نہ تھی - نئے نئے حالات پیدا ہوں گے اور ان میں کوئی شرعی حکم نہ ہو گا - نئی نئی عادات پیدا ہوں گی اور انسان کو حالات مجبور کریں گے - یہ سب باتیں اللہ کے علم میں تھیں جب اللہ تعالیٰ بڑی سختی سے یہ حکم دے رہے تھے کہ شریعت کو نافذ کرو اور اگر وہ نافذ نہ کریں تو انہیں اس قدر سخت نتائج سے ڈرا رہا تھا -

ایک غیر مسلم تو جو چاہے کہہ سکتا ہے لیکن مسلمان ' جو اسلام کے داعی ہیں ' وہ ان سوالات کا کیا جواب دیں گے۔

کیا وہ اسلام پر قائم رہ سکتے ہیں یا ان کے پاس اسلام سے کوئی چیز رہ سکتی ہے اگر وہ یہی سوچیں اور یہی کہیں ؟

لاریب یہ ایک فیصلہ کن اور دو ٹوک معاملہ ہے ' انسان دوراہے پر کھڑا ہے۔ کوئی اور راہ نہیں ہے اور اس میں کوئی بحث و تکرار ممکن نہیں۔ اور نہ کوئی حجت بازی کام کر سکتی ہے یا ایک راہ ہے اور یا دوسری راہ ہے ..... یا اسلام ہے اور یا جاہلیت ہے یا ایمان ہے اور یا کفر ہے ' یا اللہ کا حکم ہو گا اور یا جاہلیت کی حکمرانی ہو گی۔ اور جو لوگ اللہ کے احکام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ' ظالم اور فاسق ہوں گے۔ اور محکوموں میں سے جو لوگ اللہ کے احکام کو قبول نہیں کرتے وہ مومن نہیں رہتے۔

ایک مومن کے دل اور فکر میں یہ مسئلہ نہایت ہی واضح اور دو ٹوک ہونا چاہئے۔ اسے چاہئے کہ وہ نفاذ شریعت میں کسی زمان و مکان کے اثر کو قبول نہ کرے۔ نہ تردد کرے اور وہ اس معاملے میں دوست اور دشمن کا کوئی لحاظ نہ کرے۔ جب تک اس مسئلے میں اہل اسلام اپنے ضمیروں میں دو ٹوک فیصلہ نہیں کرتے تو ان کے حالات درست نہیں ہو سکتے نہ ان کا کوئی ایک معیار اور میزان ہو گا نہ ان کا نظام واضح ہو گا نہ ان کے ضمیر کے اندر حق اور باطل کی کوئی تمیز ہو گی اور نہ وہ اسلام کی شاہراہ پر ایک قدم بھی آگے بڑھ سکیں گے۔ اگر یہ اجازت دی جاتی ہے کہ یہ مسئلہ جماہیر کے ذہنوں میں واضح نہ ہو مجمل ہی رہے ' اور لوگوں اور عوام الناس کے ہاں یونہی ڈھیل رہے جس طرح کہ ہے۔ لیکن جو لوگ صحیح طرح مسلمان بننا چاہتے ہیں ان کے ذہن تو صاف ہونے چاہئیں۔ ان کو تو چاہئے کہ وہ اپنے اندر یہ صفت پیدا کریں۔

---ooo---

درس نمبر ۵ ایک نظر میں

اس سورہ کے زمانہ نزول کے بارے میں 'مقدمہ میں ہم نے جو کچھ کہا تھا' اس سبق کی آیات اس کی تصدیق کرتی ہیں' یعنی یہ کہ یہ سورہ تمام کی تمام سورہ فتح کے بعد نازل نہیں ہوئی' جو صلح حدیبیہ کے بعد چھٹی صدی ہجری میں نازل ہوئی تھی۔ اس سورہ کے کئی ٹکڑے ایسے ہیں جو اس سے بہت پہلے نازل ہو چکے ہوں گے۔ یعنی کم از کم بنی قریظہ کی جلاوطنی سے پہلے جو چار ہجری میں ہوئی' یعنی عام الاحزاب میں اگرچہ اس سے مزید پہلے یعنی بنی نضیر کی جلاوطنی (بعد جنگ احد) اور بنی قینقاع کی جلاوطنی (بعد جنگ بدر) کے دور تک ہم اسے قدیم نہ کہہ سکیں۔

بہرحال یہ آیات کچھ واقعات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں اور جماعت مسلمہ کے اندر پیش آنے والے بعض واقعات کی طرف ان میں اشارہ ہے۔ ان میں وہ حالات لئے گئے ہیں جو مدینہ میں منافقین اور یہودیوں کے حوالے سے موجود تھے اور یہ حالات اس وقت ہرگز نہیں رہ سکتے تھے جب کہ یہودیوں کی قوت اور شوکت کو توڑ دیا گیا تھا اور ان پر آخری وار واقعہ بنو قریظہ کی صورت میں ۴ ہجری میں ہو چکا تھا۔

یہ ممانعت کہ یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ اور یہ ڈراوا بلکہ یہ دھمکی کہ جو لوگ ان کو دوست بنائیں گے وہ انہی میں سے ہوں گے' اور یہ اشارہ کہ جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے' وہ ان کے ساتھ دوستی کرتے ہیں اور وہ اس پر اپنی یہ مجبوری بیان کرتے ہیں کہ وہ مصیبتوں سے ڈرتے ہیں اور یہ مسلمانوں کو نفرت دلانا کہ ان لوگوں سے اس لئے دوستی نہ کرو کہ یہ تمہارے دین کو لہو و لعب سمجھتے ہیں اور یہ اشارہ کہ یہ لوگ اقامت صلوٰۃ کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ یہ سب واقعات ممکن ہی تب ہو سکتے ہیں کہ مدینہ میں یہودیوں کو پوری قوت اور شوکت حاصل ہو۔ اگر یہ قوت نہ ہوتی تو اس قسم کے حالات کا مدینہ میں پیش آنا ممکن ہی نہ تھا۔ نہ ایسے واقعات پیش آ سکتے تھے' اور نہ اس قدر شدید دھمکی اور ڈراوے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ اور اس مکرر سہ کرر مخالفت کی ضرورت نہ ہوتی' نیز یہودیوں کی جبلت کو بیان نہ کیا جاتا اور ان کی اس طرح تشہیر نہ ہوتی اور نہ ہی ان پر اس قدر تنقید ہوتی۔ نہ ان کے مکر و فریب کا پردہ چاک کرنے کی ضرورت ہوتی۔ نہ ان کے حالات کو اس قدر دہرایا جاتا یا اس قدر روشنی ڈالی جاتی۔

بعض روایات ایسی بھی ہیں' جن میں ان میں سے بعض حالات و واقعات کا تعلق واقعہ بنی قینقاع سے بتایا گیا ہے' حالانکہ یہ واقعہ غزوۂ بدر کے بعد پیش آیا تھا۔ ان کے بارے میں عبداللہ ابن ابی ابن السلول کا موقف اور اس کا یہ کہنا کہ یہودی اس کے دوست ہیں اور یہ کہ وہ یہودیوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے' مثلاً اس کا یہ کہنا کہ میں ایک آدمی ہوں کہ میں برے حالات سے ڈرتا ہوں اس لئے میں اپنے حلیفوں کی حمایت نہیں چھوڑ سکتا۔

یہ روایات اگر نہ بھی ہوں تب بھی سورہ کے موضوع اور مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے موضوعات' اس کے اندر بیان کردہ واقعات 'سیرت النبی کے واقعات اور مدینہ طیبہ میں اس کے مراحل ' ادوار سب کے سب اسی بات

کو ترجیح دیتے ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا نیز سورہ کے مقدمہ میں بھی یہی موقف اختیار کیا۔

---ooo---

اس سبق کی تمام آیات سے وہ اسلوب معلوم ہوتا ہے جس کے مطابق قرآنی منہاج تربیت نے جماعت مسلمہ کو اس رول کے ادا کرنے کے لئے تیار کیا جو اس نے من جانب اللہ اس دنیا میں ادا کرنا تھا۔ نیز ان آیات سے وہ بنیادی عناصر بھی معلوم ہوتے ہیں جن کا ایک نفس مسلم اور ایک جماعت مسلمہ کی فکر اور سوچ کے اندر ہونا ضروری تھا۔ یہ بنیادی عناصر ہر دور کے لئے وہی ہیں۔ یہ مستقل عناصر ہیں اور مستقل اصول ہیں اور یہ کسی دور یا کسی نسل کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ یہی وہ اصول ہیں جن کے اوپر ایک فرد کی تعمیر ہوتی ہے۔ نیز ایک جماعت کی تنظیم بھی انہی اصولوں پر ہوتی ہے۔

قرآن کریم ہر مسلم فرد کی تعمیر اس اساس پر کرتا ہے کہ اس کی تمام ہمدردیاں پورے خلوص کے ساتھ اللہ' رسول' نظریہ اور اس پر قائم ہونے والی جماعت کے ساتھ ہوں۔ ایک مسلم فرد اور جماعت اور اس فرد اور جماعت کے درمیان مکمل بائیکاٹ ہونا چاہئے جو اسلامی صفوں کے بالمقابل کھڑی ہے اور جس نے اسلام کے مخالف جھنڈے اٹھا رکھے ہیں یعنی جو جماعت حضرت نبی ؐ کی قیادت کو تسلیم نہیں کرتی اور اس جماعت میں ضم نہیں ہوتی جو حزب اللہ کے مقام پر کھڑی ہے۔ قرآن کریم انسان کو یہ شعور دیتا ہے کہ وہ خوش قسمت ہے کہ اسے اللہ نے اپنے کام کے لئے چنا ہے اور وہ پردۂ تقدیر الہی ہے اور اس کے ذریعے اللہ کی تقدیریں پردے سے ظاہر ہوتی ہیں' ان تاریخی واقعات کی صورت میں جو پیش آتے ہیں اور یہ اللہ کا وہ کرم عظیم ہے کہ جس کے حصے میں آگیا سو آگیا۔ الا یہ کہ اسلامی جماعت کے سوا تمام دوسری جماعتوں کے ساتھ دوستی گانٹھنا دین اسلام سے ارتداد کے مترادف ہے اور اس مقام کو ترک کر دینا ہے جو اللہ نے ان کو عطا کیا اور اس خلعت فضیلت کو اتار پھینکنا ہے جو اللہ نے اسے پہنائی تھی۔

یہ ہدایات اس سبق کی آیات میں بہت ہی واضح طور پر دی گئی ہیں مثلاً "اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ' یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے' یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی راہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔"

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہو گا جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے' جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے' جسے چاہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔"

"تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنالے اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب ہونے والی ہے۔"

اس کے بعد قرآن کریم ایک مسلم کے شعور میں اس کے دشمنوں کی حقیقت بھی بٹھاتا ہے' اور اس کشمکش کی حقیقت سے بھی انہیں آگاہ کرتا ہے جو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان برپا ہے۔ یہ کشمکش نظریاتی کشمکش ہے۔ عقیدہ اور نظریہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ایک مسلمان اور اس کے دشمنوں کے درمیان ہر وقت برپا رہتا ہے۔ مسلمانوں کی دشمنی تمام

دوسری چیزوں سے پہلے اپنے عقیدے اور دین کے لئے ہوتی ہے۔ اہل کفر مسلمانوں کے ساتھ یہ دشمنی اس لئے رکھتے ہیں کہ انہوں نے اس دین کی نافرمانی کی ٹھانی ہوئی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص بھی اس دین پر سیدھا چل رہا ہو وہ اسے سخت ناپسند کرتے ہیں۔

"ان سے کہو اے اہل کتاب، تم جس بات پر ہم سے بگڑے ہو، وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم اللہ پر اور دین کی اس تعلیم پر ایمان لے آئے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور ہم سے پہلے بھی نازل ہوئی تھی، اور تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔" یہ ہے نظریہ اور یہ ہے نظریاتی اختلاف اور یہ ہیں اختلافی محرکات۔

اس نظام تربیت اور اس میں دی جانے والی ہدایات کی اہمیت بہت ہی بڑی ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے ساتھ محبت اور رسول اور اس کے دین کے ساتھ والہانہ لگاؤ اور اس کی اساس پر قائم ہونے والی جماعت کے ساتھ لگاؤ اور محبت اور اس دین اور اس کے دشمنوں کے درمیان قائم ہونے والی کشمکش کی اصل نوعیت کو سمجھنا اور اس کے دشمنوں کو اچھی طرح جان لینا ہی اصل دین ہے۔ یہ ایسے امور ہیں کہ جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ ان کے بغیر ایمان کی ضروری شرائط پوری نہیں ہوتیں، ایک مسلمان کی ذاتی تربیت بھی نہیں ہوتی اور اس دین کے لئے کسی متحرک جماعت کی تشکیل بھی ممکن نہیں ہے۔ جو لوگ اس دین کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں وہ اس وقت تک پکے مسلمان نہیں ہو سکتے، اس وقت تک وہ ٹھوس شخصیت کے مالک نہیں ہو سکتے اور اس وقت تک وہ اس کرۂ ارض پر کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے جب تک ان کے دلوں کے اندر ان تمام لوگوں کے مقابلے میں دوری نہیں پیدا ہو جاتی جو اس اسلامی محاذ کے خلاف جھنڈے اٹھائے ہوئے ہیں۔ جب تک اہل ایمان کی محبت اور دوستی اللہ، رسول اور اہل ایمان کے لئے مختص نہیں ہو جاتی اور جب تک وہ اس کشمکش کی اصل حقیقت کو پا نہیں لیتے اس وقت تک دین کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ اور جب تک ان کو یہ یقین نہیں ہوتا ہے کہ وہ محض اس غرض کے لئے جمع ہوئے ہیں، اور یہ کہ ہمارے دشمن سب کے سب اسلامی جماعت اور اسلامی عقائد کے خلاف متحد و متفق ہیں۔

ان آیات میں اس پر اکتفاء نہیں کیا گیا کہ مسلمانوں کو وہ اسباب بتا دیئے جائیں جن کی وجہ سے دشمنان دین اسلام کے خلاف جنگ برپا کئے ہوئے ہیں بلکہ ان آیات میں دشمنوں کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔ ان کے فسق و فجور کی مقدار کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ وہ دین سے کس قدر منحرف ہو گئے ہیں تاکہ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کو کیسے دشمنوں سے واسطہ پڑا ہے اور اس کا ضمیر بھی مطمئن ہو جائے کہ وہ اس معرکے میں حق بجانب ہیں۔ اس جنگ کی سخت ضرورت ہے۔ اور اس سے کوئی مفر نہیں ہے۔ "اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، یہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔"

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تمہارے پیش رو اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنایا ہے انہیں اور دوسرے کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ جب تم نماز کے لئے منادی کرتے ہو تو وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس سے کھیلتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔"

"جب یہ تم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، حالانکہ کفر لئے ہوئے آئے تھے اور کفر ہی لئے واپس گئے اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں تم دیکھتے ہو کہ ان میں سے بکثرت لوگ گناہ اور

ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں اور حرام کے مال کھاتے ہیں بہت ہی بری حرکات ہیں جو یہ کر رہے ہیں۔"

"یہودی کہتے ہیں اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں' باندھے گئے ان کے ہاتھ۔ اور لعنت پڑی ان پر اس بکواس کی بدولت جو یہ کرتے ہیں۔ اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں' جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔"

اس وجہ سے کہ ان کی یہ صفات ہیں اور اس وجہ سے کہ جماعت مسلمہ کے ساتھ ان کا یہ رویہ ہے' اور اس وجہ سے کہ یہ جماعت مسلمہ کے خلاف سب اکٹھے ہو چکے ہیں' اور اس وجہ سے کہ وہ مسلمانوں کے دین اور خصوصاً نماز کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں' ایک صحیح مسلمان کے لئے اور کوئی چارۂ کار بھی نہیں ہے کہ وہ پوری سنجیدگی اور پورے اطمینان کے ساتھ' ان لوگوں کی مدافعت کرے۔

ان نصوص کے اندر اس معرکے کے انجام کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے اور اس کا پورا نتیجہ بھی یہاں دے دیا ہے۔ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ آخرت سے بھی پہلے خود اس دنیا میں اسلام کیا رنگ لاتا ہے: "اور جو اللہ اور رسول اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنا لے اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔" .... "اگر یہ اہل کتاب ایمان لے آتے' اور خدا ترسی کی روش اختیار کرتے' تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے۔ اور ان کو نعمت بھری جنتوں میں پہنچاتے۔ کاش انہوں نے تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں' ایسا کرتے تو ان کے لئے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے ابلتا۔"

نیز ان آیات میں ایسے مسلمانوں کی صفات کا بھی تذکرہ ہے جن کو اللہ اپنے دین کی خدمت کے لئے چن لیتا ہے اور ان کو یہ فضل عظیم عطا کرتا ہے کہ انہیں اس عظیم کردار کے لئے اس نے چن لیا۔

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے' (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے ایسے لوگ پیدا کر دے گا جو اللہ کے محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہو گا' جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے' جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔"

یہ تمام فیصلے اور قرار دادیں اسلامی نظام کے قیام کے لئے اقدامات ہیں اور ان سے مقصود یہ ہے کہ ایک مسلم فرد اور مسلم جماعت کی ٹھوس بنیادوں پر تربیت کی جائے۔

---ooo---

درس نمبر ۵ تشریح آیات

۵۱ --- تا --- ۶۶

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى
اَوْلِيَاۗءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ
مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ
مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَاۗىِٕرَةٌ ۭ فَعَسَى اللّٰهُ
اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰي مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ
نٰدِمِيْنَ ۝ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ
اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ۝

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے۔ یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے وہ انہی میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں۔ کہتے ہیں "ہمیں ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہم کسی مصیبت کے چکر میں نہ پھنس جائیں"۔ مگر بعید نہیں کہ اللہ جب تمہیں فیصلہ کن فتح بخشے گا یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کرے گا تو یہ لوگ اپنے اس نفاق پر جسے یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں، نادم ہوں گے۔ اور اس وقت اہل ایمان کہیں گے "کیا یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں؟" ..... ان کے سب اعمال ضائع ہو گئے اور آخر کار یہ ناکام و نامراد ہو کر رہے)۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ولایت اور رفاقت کا مفہوم متعین کر دیا جائے 'جس سے اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ سختی سے منع کرتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ ایسی رفاقت نہ ہونی چاہئے۔

اس رفاقت کا مفہوم یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ حلیفانہ اور باہم تعاون اور امداد کا معاہدہ نہ ہونا چاہئے۔ اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ تم ان کے دین کا اتباع کرو اس لئے کہ یہ تو سوچنا بھی ممکن نہیں ہے کہ مسلمانوں میں ایسا بھی کوئی ہو سکتا ہے کہ وہ یہودیوں اور نصرانیوں کے دین کی اتباع کرتا ہو۔ یہ درحقیقت باہم تحالف اور معاونت کی دوستی ہوتی تھی 'جس کے بارے میں اس وقت مسلمانوں کا ذہن صاف نہ تھا کہ یہ بھی حرام ہے۔ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ ایسے تحالف اور تعاون ابھی تک جائز ہیں۔ اور یہ التباس اس لئے تھا کہ اسلام سے پہلے ان لوگوں کے درمیان ایسے دوستی کے معاہدے ہوا کرتے تھے اور اسلام کے ابتدائی ایام میں بھی ایسا ہوتا تھا خصوصاً مدینہ کے ابتدائی ایام میں۔ ان نصوص کے ذریعے اللہ نے اس سے منع کر دیا اور ایسے معاہدوں کو باطل قرار دے دیا۔ خصوصاً جبکہ میثاق مدینہ کے مطابق مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ہونے والے معاہدے پر یہودیوں نے عمل نہ کیا تھا اور اس سے ظاہر ہو گیا تھا کہ اہل اسلام اور ان کے درمیان اب کوئی معاہدہ ولا ممکن نہیں ہے۔

یہ مفہوم اور مدلول قرآن کی تعبیرات سے اچھی طرح واضح ہے۔ (دیکھئے مسلمانان مدینہ اور ان مسلمانوں کے بارے میں جو ابھی تک مکے میں تھے اور انہوں نے ہجرت نہ کی تھی' (مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا) یعنی تمہارے اور ان کے درمیان کوئی دوستی اور رفاقت نہیں ہے۔ الا یہ کہ وہ ہجرت کریں۔ ظاہر ہے کہ اس ولایت سے مراد ولایت فی الدین یعنی اسلامی بھائی چارہ نہیں ہے۔ یہاں ولایت سے مراد وہ دوستی ہے جس میں ازروئے معاہدہ ایک دوسرے کے ساتھ نصرت اور تعاون کا اقرار کیا جاتا ہے۔ یہ معاہدہ ان لوگوں کے درمیان بھی نہیں ہو سکتا جو اگرچہ مسلمان ہوں لیکن انہوں نے دارالاسلام کی طرف ابھی تک ہجرت نہ کی ہو۔ یہی قسم ہے 'جس سے ان آیات میں اہل اسلام کو منع کیا گیا ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ اس قسم کی دوستی نہ کریں جبکہ مدینہ کے ابتدائی دنوں میں یہ عہد قائم تھا۔

اہل کتاب کے ساتھ رواداری کا رویہ اور بات ہے اور ان کے ساتھ دوستی کے معاہدے کر کے ان کو اپنا دوست بنانا اور چیز ہے۔ لیکن اہل اسلام کے دماغ کے اندر ابھی تک دین کی حقیقت نہیں اتری اور ابھی تک انہوں نے دین کے فرائض و وظائف کو نہیں سمجھا کہ دین ایک منظم اور حقیقت پسندانہ منہاج ہے۔ یہ مسلسل حرکت میں رہتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر ایک واقعی صورت حال پیدا کر دے جو اسلامی تصور حیات کے مطابق ہو۔ یہ تصور حیات ان تمام تصورات سے مختلف ہے جو انسانیت کے اندر متعارف رہے ہیں۔ اس طرح اس اسلامی صورت حالات کا پھر ان تمام تصورات و حالات کے ساتھ تصادم ہوتا ہے جو اس کے خلاف ہوتے ہیں۔ نیز اس کا لوگوں کی خواہشات کے ساتھ' لوگوں کے فسق و فجور اور ان کے انحرافات کے ساتھ بھی تصادم ہوتا ہے اور یہ نظام پھر ایسی کشمکش میں داخل ہو جاتا ہے کہ اس سے کوئی چھٹکارا نہیں ہوتا۔ یہ تصادم اس لئے ہوتا ہے کہ اسلامی نظام ایک جدید صورت حال پیدا کرتا ہے اور اپنے اس ہدف کی طرف وہ مسلسل مثبت طور پر حرکت کرتا رہتا ہے۔

ایسے لوگ جن کے شعور و احساس کے اندر اسلامی نظریہ حیات کا یہ پہلو واضح نہیں ہوتا اور جن کے شعور کے اندر اسلام اور دوسرے ملل و نحل کے اندر برپا معرکے کا اچھی طرح ادراک نہیں ہوتا اور جو اس قسم کی واضح قرآنی ہدایات

سے غافل ہیں تو وہ ان ہدایات جن کے اندر اسلامی معاشرے میں رہنے والے اہل کتاب کے ساتھ رواداری کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے تمام حقوق محفوظ کئے گئے ہیں اور ان ہدایات کے درمیان جو معاہدات تحالف اور باہم نصرت کے بارے میں ہوتے ہیں اور جن کے مطابق ولایت اور دوستی صرف اللہ اور رسول اللہ اور جماعت مسلمہ کے ساتھ ہی ہو سکتی ہے وہ ان دونوں کے درمیان فرق نہیں کرتے ۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ جب اسلام اور اہل کتاب کے درمیان کوئی معرکہ درپیش ہو تو اس میں اہل کتاب اور تمام دوسرے اہل کفر ایک دوسرے کے حلیف ہوتے ہیں اور یہ ان کی ایک مستقل پالیسی اور صفت ہے ۔ ان کو مسلمانوں کے ساتھ محض ان کے اسلام کی وجہ سے دشمنی ہوتی ہے اور یہ کہ وہ کسی مسلمان سے اس وقت تک راضی نہیں ہوسکتے جب تک وہ اپنے دین کو چھوڑ کر ان کے دین کی اطاعت اختیار نہیں کر لیتا ۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اہل کتاب اسلام اور اسلامی جماعتوں کے خلاف مسلسل برسرپیکار ہیں ۔ تاہم ان کے منہ سے بھی کبھی کبھی یہ بات نکل جاتی ہے اور ان کے دلوں میں جو کچھ چھپا ہوا ہے وہ تو بہت ہی بڑا ہے ۔ یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں ۔

ایک مسلمان کو بہرحال یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اہل کتاب کے ساتھ رواداری کا رویہ اختیار کرے ۔ لیکن اسے اس بات سے روکا گیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کرے ۔ یعنی باہم نصرت اور حلیفانہ دوستی ۔ اس کی راہ جس پر چل کر اس نے دین کو قائم کرنا ہے اور اسے دنیا پہ غالب کرنا ہے اہل کتاب کی راہ سے بہت دور ہے اگرچہ وہ بہت بڑی رواداری اور محبت کا اظہار کیوں نہ کریں ۔ اس لئے کہ یہ لوگ اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوسکتے کہ مسلمان اپنے دین پر قائم رہیں اور اسلامی نظام کو روبعمل لائیں اور یہ رواداری انہیں اس بات سے نہیں روک سکتی کہ وہ اسلام کے خلاف یکجا ہو کر نہ لڑیں ۔ وہ ہمیشہ ایسا کرتے ہیں ۔

یہ ایک عظیم سادہ لوحی ہوگی اور یہ ایک عظیم غفلت ہوگی کہ ہم یہ سمجھ بیٹھیں کہ ہمارے لئے دین کے غلبے کی راہ وہی ہے جس پر اہل کتاب یہود ونصاریٰ چل رہے ہیں اور اس راہ پر چل کر ہم کفار اور ملحدین کا مقابلہ کریں گے جب کہ کفار اور ملحد تو آج کل سب سے زیادہ یہی اہل کتاب ہیں ۔ چنانچہ اب معرکہ بھی مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان ہے ۔

ہم میں سے جو سادہ لوح لوگ ہیں وہ اس ساری حقیقت کو سمجھ نہیں پاتے اور ہر دور میں ایسے مسلمان رہے ہیں کہ جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ مسلمان اور اہل کتاب مل کر الحاد اور مادیت کے خلاف جنگ کر سکتے ہیں اس لئے کہ اہل کتاب بھی اہل دین ہیں اور ہم بھی اہل دین ہیں ۔ لیکن یہ سادہ لوح لوگ قرآن کریم کی ان تمام تعلیمات کو بھول جاتے ہیں بلکہ پوری اسلامی تاریخ کو بھول جاتے ہیں ۔ اہل کتاب تو وہی لوگ ہیں جو ملحد اور مشرک لوگوں سے کہتے تھے (هَؤُلَاءِ أَهْدَى مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا) (یہ مشرک ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ہدایت پر ہیں جو ایمان لائے ہیں) اور یہ اہل کتاب ہی تھے جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف احزاب کو جمع کیا تھا اور مدینہ پر چڑھ دوڑے تھے ۔ یہ تمام احزاب کو پروپیگنڈہ دیتے تھے ۔ یہ اہل کتاب ہی تھے جنہوں نے دو صد سال تک اسلام کے خلاف صلیبی جنگیں لڑیں اور یہی اہل کتاب ہی تو تھے جنہوں نے اندلس میں مسلمانوں کے خلاف ناقابل تصور جرائم کا ارتکاب کیا ۔ یہی اہل کتاب ہیں جنہوں نے حال ہی میں فلسطین سے عرب مسلمانوں کو نکالا اور ان کی جگہ یہودیوں کو بسایا اور اس سلسلے میں وہ تمام ملحدوں اور زندیقوں سے تعاون کرتے رہے ۔ یہ اہل کتاب ہی ہیں جو ہر جگہ سے مسلمانوں کو خانہ بدر کر رہے ہیں ' حبشہ میں ' صومالیہ میں ' اریٹیریا میں اور الجزائر میں غرض ہر جگہ وہ اس ملک بدری اور اس ظلم میں وہ ملحدین ' مشرکین اور بت پرستوں کے

ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ یوگوسلاویہ، چین، ترکستان اور ہندوستان اور ہر جگہ وہ دشمنان اسلام کے ساتھ معاون ہیں۔

قرآن کریم کی ان مکمل اور جامع ہدایات اور فیصلوں کے بعد بھی ہم میں ایسے لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں اور ان اہل کتاب کے درمیان ملحدانہ مادہ پرستی کے خلاف تعاون اور دوستی ہو سکتی ہے۔ ایسے لوگوں نے درحقیقت قرآن کریم کا مطالعہ اچھی طرح نہیں کیا اور اگر کیا ہے تو پھر ان کے ذہنوں میں اسلام کے نظریہ مذہبی رواداری اور نظریہ ولایت اور دوستی کے درمیان خلط واقعہ ہو گیا ہے۔

یہ اس قسم کے لوگ ہیں کہ ان کے شعور میں اسلام کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اسلام ایک نظریہ حیات ہے جو لوگوں سے کوئی دوسرا نظریہ قبول نہیں کرتا۔ نہ ان کے ذہن میں یہ بات ہے کہ اسلام ایک مثبت تحریک ہے جو اس دنیا کی صورت حال کو یکسر بدلنا چاہتا ہے اور یہ کہ اہل کتاب نے ہمیشہ اسلام کی راہ روکی ہے، جس طرح وہ آج بھی اسلام کی راہ روکے کھڑے ہیں اور یہ اہل کتاب کا وہ موقف ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتا کیونکہ یہی ان کے لئے واحد طبعی موقف ہے۔

ہم ان لوگوں کو ان کی اسی پوزیشن میں چھوڑے ہوئے ہیں کہ وہ غافل رہیں اور یا متغافل رہیں اور ہم خود اللہ کی ان ہدایات پر غور کریں جو بالکل واضح اور صریح ہے۔

((يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (۵:۵۱))

"اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے، یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔" اس پکار کا رخ مدینہ طیبہ کے اندر کام کرنے والی جماعت مسلمہ کی طرف ہے لیکن یہی ہدایات ان تمام جماعتوں کے لئے بھی ہیں جو اس کرۂ ارض پر کسی بھی جگہ کام کرتی ہیں۔ اور یہی ہدایات قیامت تک رہیں گی۔ ان تمام لوگوں پر جن پر یہ لقب درست طور پر استعمال ہو۔ يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا نزول قرآن کے وقت ان ہدایات کی ضرورت اس لئے پیش آگئی تھیں اور اہل ایمان کو یہ ہدایات اس لئے دی گئی تھی کہ اس وقت مسلمانوں اور مدینہ کے اردگرد بسنے والے یہودیوں کے درمیان مکمل قطع تعلق نہ تھا۔ ان کے درمیان ولایت کے اور حلیفانہ تعلقات ابھی تک باقی تھے۔ اقتصادی اور دوسرے معاملات ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے تھے اور پڑوس اور ہم نشینی کے تعلقات بھی دونوں کے درمیان موجود تھے۔ مدینہ کے جو تاریخی اور اقتصادی حالات تھے یہ صورت حالات ان کا طبعی نتیجہ تھی کیونکہ وہاں عربوں اور یہودیوں کے درمیان تعلقات قائم تھے۔ ان حالات کی وجہ سے یہودیوں کو یہ موقع مل رہا تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف سازش کر سکیں۔ اور دین اسلام کے خلاف اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔ ان کی یہ سازشیں مختلف نوعیت کی ہیں اور گزشتہ پانچ پاروں کی تفسیر میں ان کی پوری تفصیلات دے دی گئی ہیں اور اس سبق میں بھی اس سازش کے بعض پہلو لئے گئے ہیں۔

قرآن کریم کا نزول صرف اس غرض کے لئے ہوتا رہا کہ مسلمان کو اس دنیا میں اپنے عقیدے اور نظریہ حیات کے

حوالے سے ' جو معرکہ درپیش ہے ' اور اس کے پیش نظر جو مقصد اقامت دین ہے ' اس بارے میں اس کی سوچ اور لازمی حد تک اس کا شعور پختہ ہو جائے ۔ نیز ایک مسلم شعور اور ان تمام لوگوں اور قوتوں کے درمیان مکمل خلیج ہو جائے جو اس دین اور اس کے نظام کی راہ روکے ہوئے ہیں اور جو کسی صورت میں بھی اسلامی جھنڈے کے نیچے نہیں آنا چاہتے ۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اس مکمل بائیکاٹ کے دائرے میں اخلاقی رواداری یا سماجی بائیکاٹ نہیں آتا ۔ اخلاقی برتاؤ اور سماجی روابط بہرحال ایک اچھے مسلمان کی صفات ہیں جو کسی بھی وقت اس سے جدا نہیں ہوتیں ۔ ہاں ان ہدایات میں ان کے ساتھ دوستی اور حلیفانہ تعلقات سے منع کیا گیا جو صرف اللہ ' رسول اللہ اور اہل ایمان کے ساتھ ہی ہو سکتے ہیں اور علیحدگی کا یہ وہ شعور ہے جو ایک مسلمان کے اندر ہر جگہ ' ہر زمانے اور ہر نسل کے اندر ہونا چاہئے ۔ قرآن کے الفاظ پر ذرا غور کیجئے ۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو ' یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ ' یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں ۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی انہی میں ہے ' یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی راہنمائی سے محروم کر دیتا ہے ۔"

یہ لوگ خود ایک دوسرے کے رفیق ہیں ۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو زمان و مکان کی قید سے باہر ہے اس لئے کہ یہ حقیقت ایک طبعی حقیقت ہے اور یہ ان کے مزاج کا تقاضا ہے ۔ یہ لوگ کسی جگہ اور کسی دور میں بھی اہل ایمان کے دوست نہیں بنے ۔ صدیاں بیت گئیں اور ایک مثال بھی ان کی دوستی کی سامنے نہیں آئی اور اللہ کی یہ بات سچی رہی ہے ۔ حضرت محمد ؐ کے خلاف جنگ میں بھی اہل کتاب باہم متحد تھے ۔ آپ کے بعد ہر اسلامی جماعت کی دشمنی میں یہ متحد رہے ہیں اور تاریخ کی طویل کڑیوں میں پورے کرۂ ارض پر یہ اسلام کے خلاف متحد رہے ہیں ۔ ایک بار بھی اس قاعدے کے اندر کبھی استثناء نہیں ہوا اور دنیا میں ہمیشہ وہی ہوتا رہا جو قرآن کریم نے بطور صفت یہاں اہل کتاب کے لئے استعمال کیا ۔ قرآن کریم نے ان کی یہ صفت متفرق حادثات کے حوالے سے بیان نہیں کی ہے ۔ قرآن نے جس انداز میں یہ جملہ اسمیہ یہاں استعمال کیا ہے ۔ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (۵: ۵۱)) یہ محض انداز تعبیر نہیں ہے بلکہ اس سے یہ ظاہر کرنا مطلوب ہے کہ یہ باہم ولایت اور دوستی ان کا دائمی وصف ہے ۔

اس کے بعد قرآن کریم اس حقیقت کے فطری نتائج مرتب کرتا ہے ۔ جب یہود و نصاریٰ صرف ایک دوسرے کے دوست ہیں تو ان کے ساتھ جو مسلمان بھی دوستی کرے گا وہ ان میں سے تصور ہو گا ۔ اسلامی صفوں کا جو شخص ان کا دوست ہو گا وہ اسلامی صف میں نہیں رہے گا ۔ وہ عملاً اپنے آپ سے صفت "اسلامی" کی نفی کرتا ہے ۔ وہ عملاً اپنے اوپر صفت یہودیت اور نصرانیت کا لباس اوڑھتا ہے حالانکہ یہ ایک فطری نتیجہ ہے ۔ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ (۵: ۵۱)) (اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی انہی میں ہے)۔

ایسا شخص اپنے اوپر ظلم کرتا ہے ' اپنے دین پر ظلم کرتا ہے اور جماعت مسلمہ پر بھی ظلم کرتا ہے اور اس ظلم ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو زمرۂ یہود و نصاریٰ میں شمار کرتا ہے ۔ اس لئے کہ اس نے اپنی محبت ان کو دے دی ہے ۔ پھر اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو نہ ہدایت دیتا ہے اور نہ اس کو واپس اسلامی صفوں میں قبول کرتا ہے ۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّلِمِينَ (۵: ۵۱)) (یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی راہنمائی سے محروم کر دیتا ہے)۔

مدینہ کی اسلامی جماعت کے لئے یہ ایک نہایت ہی خوفناک دھمکی تھی۔ یہ دھمکی اگرچہ سخت ہے لیکن بالکل قدرتی ہے اور اس کے اندر کوئی مصنوعی تشدد نہیں ہے۔ اس لئے جو شخص بھی یہ ممنوع حرکت کرتا ہے وہ ان میں سے ہے اگر وہ ان میں سے نہ ہوتا تو ایک مسلمان کسی صورت میں بھی یہود و نصاریٰ کا ولی اور دوست نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی اسلامی صفوں میں ایسے شخص کی ممبرشپ رہ سکتی ہے اس لئے کہ کسی اسلامی جماعت کے افراد کی دوستی اور ان کا حلیفانہ تعلق صرف اللہ اور رسول اللہ اور اہل ایمان کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ ہے ایک دوراہا اور فیصلہ طلب پوائنٹ۔

ایک مسلمان اور اسلامی نظام کے مخالفوں اور دوسرے نظاموں کے داعیوں کے درمیاں مکمل علیحدگی کے معاملے میں کوئی نرمی اختیار نہیں کی جاسکتی۔ ایک نے اسلامی جھنڈا اٹھا رکھا ہے اور دوسرے نے مخالف اسلام جھنڈا اٹھا رکھا ہے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کرۂ ارض پر وہ اسلام کا منفرد نظام قائم نہ کر سکے گا نہ اس سلسلے میں کوئی قابل ذکر سرگرمی دکھا سکے گا'

جب ایک مسلمان کو یہ پختہ یقین ہوتا ہے کہ اس کا دین ہی وہ واحد دین ہے جسے اللہ لوگوں کی جانب سے قبول کرے گا تو اس یقین کے اندر کوئی جھول اور کوئی نرمی نہیں رہتی۔ اسے یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ حضرت محمد ؐ کی رسالت کے بعد اب کوئی رسالت نہیں ہے اور یہ کہ یہ اسلامی نظام زندگی ہی وہ منفرد نظام ہے جسے اس نے لوگوں کی زندگیوں میں قائم کرنا ہے اور اس کے مقابلے میں دنیا کا کوئی نظام قابل عمل نہیں ہے۔ اس کرۂ ارض پر انسان کی زندگی اس وقت تک درست نہیں ہو سکتی جب تک مسلمان اس نظام کو قائم نہ کر دیں اور یہ کہ اللہ اسے معاف نہ کرے گا اگر وہ اپنی پوری قوت اس دین کی اقامت اور غلبے کی راہ میں خرچ نہیں کرتا' جب تک نظریاتی اور عملی طور پر اسے قائم نہیں کرتا اور اس راہ میں اپنی پوری سعی نہیں کرتا' حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نظام کے بدلے میں کوئی دوسرا نظام بطور متبادل قبول نہیں کرتا' بلکہ اسلامی نظام کے کسی جزء کیلئے بھی کوئی متبادل اسے قبول نہیں ہے۔ اور یہ کہ جب تک وہ اسلامی عقائد و تصورات کو خالص کر کے ان کے درمیان میں سے ہر غلط اور ملاوٹ کو پاک نہیں کرتا' جب تک وہ تفصیلی نظام اور قانونی امور سے تمام ملاوٹوں کو ختم نہیں کرتا' الا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ شرائع میں سے کسی چیز کو باقی رکھا ہو اس وقت تک اسلام غلبہ نہیں حاصل کر سکتا۔ غرض ان تمام امور میں جب تک ایک مومن مکمل طور پر یکسو اور یقین محکم کا حامل نہیں ہوتا وہ اس بوجھ کو اٹھا ہی نہیں سکتا اور نہ عملاً اس منہاج حیات کو قائم کر سکتا ہے جس کا بھاری فریضہ اللہ تعالیٰ نے اس کے کاندھوں پر ڈالا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فریضہ اقامت دین ایک مشکل فریضہ ہے۔ اس کی راہ میں سخت مشکلات ہیں' اور اس راہ کی ذمہ داریاں کمر توڑ ہیں۔ اس راستے میں کینہ پرور دشمن بیٹھے ہیں۔ خفیہ پھندے نصب ہیں اور رنج و الم کے وہ مقامات ہیں جو بعض اوقات ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر اس وقت دنیا میں جو جاہلیت قائم ہے اس میں کیا تکلیف ہے۔ چاہے بت پرستانہ جاہلیت ہو' اہل کتاب کی مخلوط جاہلیت ہو یا الحاد و زندقہ کی جدید جاہلیت ہو۔ نیز اگر اسلامی نظام کے اندر کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اختیار کر کے اس کے اور اہل کتاب اور دوسروں کے قائم شدہ نظاموں کے درمیان فرق ہی کو ختم کر دیا جائے یا اسلام اور دور جدید یا قدیم کی جاہلیت کے درمیان امتزاج اور اتحاد کر کے کوئی نظام لایا جائے اور اس پر مصالحت کر لی جائے تو یقیناً پھر اس راہ میں کوئی مشکلات نہیں ہیں۔

یہ ایک فیصلہ کن جدائی اور امتیاز ہے اور جو لوگ ان حدوں کو مٹانا چاہتے ہیں اور اپنی کوششیں رواداری اور ''تقریب بین الادیان السماویہ'' کے دل لگتے عنوان کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہیں وہ نہایت ہی غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ یہ لوگ نہ ''ادیان'' کے مفہوم کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی ''تسامح'' اور رواداری کے مفہوم کو سمجھتے ہیں۔ یاد رہے کہ رواداری محض شخصی اور ذاتی معاملات میں ہوتی ہے۔ اسلامی عقائد و تصورات اور اسلام کے اجتماعی نظام کے ڈھانچے کے اندر کوئی رواداری ممکن نہیں ہے۔ یہ لوگ دراصل مسلمانوں کے اندر پائے جانے والے اس یقین کو متزلزل کرنا چاہتے ہیں جو ان کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اللہ اسلام کے سوا کسی اور دین کو قبول نہیں کرتا اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اقامت دین کے لئے جدوجہد کرے اور اسلام کے مقابلے میں کوئی اور متبادل دین قبول نہ کرے نہ اس کے اندر کوئی تبدیلی اور ترمیم قبول کرے اگرچہ یہ ترمیم نہایت ہی معمولی ہو۔ اس یقین کو قرآن کریم بار بار ایک مومن کے دل و دماغ میں بٹھانا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ (اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ) (اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی دین ہے) (وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ) (اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا تو اس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا)۔ (وَاحْذَرْهُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكَ (۵: ۴۹)) (ان سے ہوشیار رہو کہ وہ تم کو فتنے میں ڈال دیں ان میں سے بعض چیزوں کی نسبت جو اللہ نے تیری طرف نازل کیں) (یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤی اَوْلِیَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ (۵: ۵۱)) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور تم میں جو شخص بھی ان کو دوست بنائے گا' اس کا شمار بھی ان میں ہو گا)۔

قرآن کریم اس صورت حال کی ایک جھلکی دکھاتا ہے جو اس وقت موجود تھی اور جس کی وجہ سے قرآن کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

فَتَرَی الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یُّسَارِعُوْنَ فِیْهِمْ یَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤی اَنْ تُصِیْبَنَا دَآىِٕرَةٌ ؕ

(۵: ۵۲)) (تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے وہ انہی میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں۔ کہتے ہیں ''ہمیں ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہم کسی مصیبت کے چکر میں نہ پھنس جائیں۔''

ابن جریر نے اپنی سند سے ابن سعد کی یہ روایت نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں عبادہ ابن صامت جو حارث ابن الخزرج کی اولاد سے تھے حضور ؐ کے پاس آئے اور کہا: یارسول اللہ! میرے یہودیوں میں بے شمار لوگ دوست ہیں اور میں یہودیوں کی دوستی سے براءت اختیار کر کے اللہ اور رسول اللہ کی دوستی اختیار کرتا ہوں۔ اس پر عبداللہ ابن ابی رئیس المنافقین نے کہا' میں تو ایک ایسا آدمی ہوں کہ میں مختلف چکروں سے ڈرتا ہوں۔ میں تو اپنے حلیفوں اور دوستوں سے براءت کا اعلان نہیں کرتا۔

رسول اللہ نے عبداللہ ابن ابی مذکور سے کہا: ابو الحباب' یہودیوں کی دوستی کے بارے میں آپ کو عبادہ ابن صامت کے ساتھ چشمک تھی تو اب وہ دوستی بھی تم قبول کر لو' اس پر رئیس المنافقین نے کہا مجھے قبول ہے۔ اس

موقعہ پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

(یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِیَآءَ (۵: ۵۱)) ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ زہری کی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ جب بدر والوں کو شکست ہوئی تو مسلمانوں نے یہودیوں میں سے اپنے دوستوں سے کہا' مناسب ہے کہ تم اسلام قبول کر لو' اس سے پہلے کہ تم پر بھی بدر والوں کا دن آئے۔ اس پر مالک بن الصیف نے کہا: تمہیں اس بات نے بہت ہی غرے میں ڈال دیا ہے کہ تم نے قریش کے کچھ لوگوں کو شکست دے دی ہے جن کو جنگ کے بارے میں کچھ علم ہی نہ تھا۔ اگر ہم ہمت باندھتے اور تمہارے خلاف جمع ہو جاتے تو تمہارے اندر اتنی سکت نہ ہوتی کہ تم ہم سب کے خلاف لڑتے۔ اس پر عبادہ ابن صامت نے رسول اللہ ؐ سے کہا کہ یہودیوں میں میرے جو دوست ہیں وہ نہایت ہی مضبوط لوگ ہیں۔ ان کے پاس اسلحہ بھی بہت تھا۔ وہ نہایت بارعب ہیں لیکن میں ان کی دوستی اور معاہدہ وحلیفانہ ربط سے براءت کا اعلان کرتا ہوں۔ اب میرا اللہ اور رسول کے سوا کوئی اور دوست اور حلیف نہیں ہے۔ اس پر عبداللہ ابن ابی نے کہا میں تو یہودیوں کی دوستی سے براءت کا اعلان نہیں کر سکتا۔ میں ایک ایسا آدمی ہوں کہ میرے لئے وہ بہت ہی ضروری ہیں۔ اس پر حضور ؐ نے فرمایا: "اے ابو الحباب تمہیں معلوم ہے کہ تم عبادہ ابن صامت کے ساتھ منافست رکھتے تھے کہ یہودیوں میں ان کے دوست زیادہ تھے۔ اب یہ سب دوستیاں تمہاری۔" تو اس پر اس نے بھی کہا: "اچھا تو میں پھر قبول کرتا ہوں۔"

محمد ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ پہلا یہودی قبیلہ جس نے رسول اللہ ؐ اور اس کے درمیان پائے جانے والے عہد و میثاق کو توڑا وہ بنو قینقاع تھے۔ مجھے عاصم ابن عمر ابن قتادہ نے بتایا کہ رسول اللہ ؐ نے ان کا محاصرہ کر لیا ہے۔ ان لوگوں نے رسول اللہ کے فیصلے پر ہتھیار ڈال دیئے۔ اس پر عبداللہ ابن ابی ابن السلول اٹھا' (جب یہ لوگ حضور ؐ کے قابو آگئے تھے) تو اس نے کہا: اے محمد ؐ میرے دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ یہ لوگ خزرج کے حلیف تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے دوبارہ کہا: اے محمد! میرے دوستوں کے ساتھ نرمی کرو۔ اس پر پھر حضور ؐ نے اس سے روگردانی کر لی۔ اس نے حضور ؐ کی زرہ کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس پر حضور ؐ نے اسے کہا' چھوڑو مجھے' اور حضور ؐ کو بہت ہی غصہ آیا یہاں تک کہ آپ ؐ کے چہرے پر اس کا پرتو آگیا۔ اب کے بعد حضور ؐ نے پھر کہا کہ تمہارا بیڑا غرق ہو مجھے چھوڑو۔ اس کے بعد اس نے کہا خدا کی قسم میں تمہیں ہرگز نہ چھوڑوں گا جب تک تم میرے دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرو۔ چار سو سادہ اور تین سو زرہ پوش دوستوں نے میری حفاظت سرخ اور سیاہ اقوام کے مقابلے میں کی ہے اور میں چھوڑ دوں کہ آپ ایک ہی صبح میں ان کی فصل کو کاٹ دیں۔ میں ایک ایسا شخص ہوں کہ میں مختلف چکروں سے ڈرتا ہوں۔ اس پر حضور ؐ نے فرمایا: "اچھا وہ سب تیرے ہوئے۔"

محمد ابن اسحاق نے عبادہ ابن صامت کی ایک روایت نقل کی ہے کہ جب بنو قینقاع نے حضور ؐ کے ساتھ جنگ کی تو عبداللہ ابن ابی ابن السلول ان کے معاملے میں بڑھ گئے اور ان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور عبادہ ابن صامت حضور ؐ کے پاس گئے اور یہ بھی بنو عوف ابن الخزرج میں سے تھے۔ اور بنو قینقاع میں ان کے بھی اسی قدر حلیف تھے جس قدر عبداللہ ابن ابی کے تھے۔ عبادہ ابن الصامت نے ان کا اختیار حضور ؐ کو دے دیا اور کہا کہ میں ان کی دوستی سے براءت کا

انکار کرتا ہوں اور اب میرا دوست اور حلیف صرف اللہ اور رسول اللہ ہیں۔ اب میں صرف اللہ اور رسول اللہ ہی کو دوست رکھتا ہوں اور کفار کے حلیفانہ تعلقات کے خاتمہ کا اعلان کرتا ہوں۔ تب اللہ نے عبادہ ابن الصامت اور عبداللہ ابن ابی کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی

(یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤی اَوْلِیَآءَ ۘؕ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ---- تا ---- وَ مَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ) امام احمد نے اپنی سند سے 'اسامہ ابن زید کی روایت نقل کی ہے۔ میں رسول ؐ کے ساتھ عبداللہ ابن ابی کے پاس گیا۔ آپ اس کی عیادت کے لئے جا رہے تھے۔ اس کو رسول خدا ؐ نے کہا: "میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ یہودیوں سے محبت نہ رکھو۔ اس پر عبداللہ نے کہا: "اسعد ابن زرارہ ان سے بغض رکھتے تھے اور وہ مر گئے۔"

یہ روایات ان حالات کی اچھی طرح وضاحت کرتی ہیں جو اس وقت اسلامی معاشرے کے اندر عملاً موجود تھے۔ یہ معاشرہ ان روایات کے خلاف تھا جو اسلام سے پہلے مدینہ کے اندر موجود تھیں۔ نیز ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک یہ سوچ فیصلہ کن مرحلے تک نہ پہنچی تھی کہ مدینہ کے اردگرد پھیلے ہوئے یہودیوں کے ساتھ کیسے تعلقات رکھے جائیں اور کیسے نہ رکھے جائیں۔ ہاں ایک بات ظاہر ہے کہ ان تمام روایات کا تعلق یہودیوں سے ہے اور عیسائیوں کے بارے میں کوئی ایسی روایت مذکور نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم مسلمانوں اور تمام دوسری جماعتوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کے لئے ایک دائمی ضابطہ' معیار اور ایک مستقل سوچ دینا چاہتا تھا۔ چاہے اس کا تعلق اہل کتاب سے ہو یا مشرکین سے ہو جیسا کہ اس درس پر تفصیلی بات کرتے وقت بتایا جائے گا۔ ہاں یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مسلمانوں کی نسبت یہودیوں کے موقف اور طرز عمل اور عیسائیوں کے موقف اور طرز عمل کے درمیان کافی فرق تھا اور یہ فرق عہد نبوی میں تھا۔ اور اس سورہ میں ایک دوسری جگہ قرآن کریم نے اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَهُوْدَ وَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰی (۵: ۸۲)) (تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے۔ اور ایمان والوں سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔)

اس اختلاف کے باوجود جو اس وقت موجود تھا' اس آیت میں یہود و نصاریٰ ایک ہی سطح پر رکھا گیا ہے جس طرح اگلی آیت میں اہل کتاب اور کفار کو بھی ایک ہی سطح پر رکھا گیا۔ یہ مساوات دوستی اور ولایت کی حد تک ہے اور یہ بات اسلام کے ایک دوسرے اصول پر مبنی ہے۔ وہ اصول یہ ہے کوئی مسلم دوستی کا عہد اور حلیفانہ تعلقات صرف ایک مسلم ہی سے قائم کر سکتا ہے اس لئے کہ ہر مسلم صرف اللہ' رسول اللہ اور اسلامی جماعت کے ساتھ دوستی کے تعلقات قائم کر سکتا ہے اور اس اصول کے تحت تمام گروہ اور فرقے برابر ہیں' اگرچہ دوسرے ظروف و احوال میں ان کا موقف

مسلمانوں کے مقابلے میں باہم مختلف ہو۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ یہ قاعدہ کلیہ اور دو ٹوک اصول وضع کرتے ہوئے ' اللہ تعالیٰ کو تو تمام ادوار اور ازمنہ کا علم تھا اور یہ قاعدہ صرف حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے لئے نہ تھا اور نہ ان حالات کے لئے تھا جو اس وقت موجود تھے بعد کے حالات نے اس بات کو ثابت کر دیا کہ دین اسلام اور جماعت مسلمہ کے ساتھ عیسائیوں کی عداوت ' دنیا کے مختلف علاقوں میں یہودیوں سے کم نہ تھی۔ اگر ہم عرب اور مصر کے عیسائیوں کے موقف کو مستثنیٰ کر دیں ' جنہوں نے اسلام کا خوب استقبال کیا تو باقی دنیا میں ' خصوصاً یورپ میں عیسائیوں نے اہل اسلام اور دین اسلام کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا وہ یہودیوں کے مقابلے میں بہت خراب تھا یا ان سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اسلام کے ساتھ سخت کینہ پروری کی ' اسلام کے خلاف سازشیں کیں اور اس کے خلاف جنگیں برپا کیں۔ حبشہ جیسے ملک کو لیجئے کہ اس کے اسی زمانے کے بادشاہ نے مسلم مہاجرین کو پناہ دی اور اسلام کو خوش آمدید کہا۔ وہاں بھی اہل اسلام کے خلاف سخت مظالم کئے گئے جو یہودیوں سے بھی زیادہ تھے۔

اللہ تعالیٰ کو تو تمام ادوار کا علم تھا۔ اس لئے اللہ نے اہل اسلام کے لئے یہ قاعدہ کلیہ وضع کر دیا۔ اس میں ان حالات کو نظر انداز کیا جو اس وقت دور اول میں موجود تھے اس لئے کہ وہ حالات مستقل اور دائمی نہ تھے اس قاعدہ کلیہ پر عمل کرتے وقت اہل اسلام بعض ممالک کی پالیسی کو نظر انداز بھی کر سکتے ہیں جن کا رویہ اسلام کے خلاف نہیں ہے یا نہ ہو گا ' آخر الزمان تک۔

آج تک اسلام کے خلاف اور ان لوگوں کے خلاف جو اپنا نام مسلمانوں جیسا رکھتے ہیں اور جن کو صفت اسلام کے ساتھ موصوف کیا جاتا ہے اگرچہ اسلام کے ساتھ ان کا کوئی حقیقی تعلق نہیں ہے ' یہودیوں اور عیسائیوں کی جانب سے ایک عظیم معرکہ آرائی جاری ہے۔ یہ معرکہ آرائی ان کی ذات اور ان کے دین کے خلاف ہے اور دنیا کے ہر حصے میں جاری ہے۔ اور یہ اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ (بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ) ان میں سے بعض ' بعض دوسروں کے دوست ہیں اور یہ بات ہر عقلمند انسان پر لازم کر دیتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس نصیحت کو پلے باندھ لے کہ نصیحت نہیں بلکہ اللہ کی جانب سے اس قطعی ممانعت پر عمل کرنا ہے کہ اللہ کے صحیح بندوں کی دوستی صرف اللہ کے دوستوں اور رسول اللہ سے ہو گی اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جس قدر کیمپ بھی ہوں ' جو اسلام کا علم بلند نہ کر رہے ہوں ان سے کوئی دوستانہ تعلق نہ ہو گا اور نہ حلیفانہ تعلق ہو گا۔ یہ اللہ کا دو ٹوک فیصلہ اور قطعی حکم ہے۔

اسلام مسلمانوں کو یہ ہدایت کرتا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں سے اپنے تعلقات صرف عقیدے اور نظریے کے اساس پر قائم کریں اور ایک مسلمان کے تصور حیات کے اندر دوستی کا عہد اور حلیفانہ عہد یا دشمنی کا تعلق صرف نظریات کے زاویے سے ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان باہم امداد اور نصرت کا معاہدہ (یعنی ولایت) کا قیام جائز نہ ہو گا اس لئے کہ ایک مسلمان اور ایک کافر کے درمیان عقائد و تصورات کے میدان میں کوئی تعاون اور نصرت نہیں ہو سکتی۔ الحاد کے مقابلے میں بھی وہ اکٹھے نہیں ہو سکتے جیسا کہ ہم میں سے بعض سادہ لوح سوچتے ہیں۔ بعض ایسے مسلمان اس لائن پر سوچتے ہیں جو قرآن کریم کو پڑھتے ہی نہیں اس لئے کہ دونوں کے درمیان کوئی مشترکہ بنیاد ہی نہیں ہے۔ لہٰذا وہ کس بنیاد پر حلیف بن سکتے ہیں؟

بعض لوگ جو قرآن مجید کا مطالعہ نہیں کرتے' اور جن کو اسلام کی حقیقت کا ادراک بھی حاصل نہیں ہے اور بعض وہ لوگ جو فریب خوردہ ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام ادیان دین ہیں جس طرح تمام الحاد الحاد ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ تمام اہل دین مل کر الحاد کے مقابلے میں کھڑے ہوں کیونکہ الحاد جنس دین کا منکر ہے اور وہ مطلق دینداری کے خلاف ہے۔

لیکن اسلامی تصور حیات کے مطابق معاملہ اس طرح نہیں ہے اور نہ ایک ایسے مسلمان کا شعور اسے قبول کرتا ہے جس نے اسلام کا مزہ صحیح طرح چکھا ہے۔ اسلام کا مزہ صرف وہی شخص چکھ سکتا ہے جو اسلام کو بطور نظریہ حیات قبول کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ اس نظریہ حیات کے لئے ہروقت متحرک رہتا ہے اور اس کا ہدف یہ ہوتا ہے کہ نظام اسلامی کو قائم کیا جائے۔

ایک صحیح الفکر مسلمان کے ہاں یہ بات بالکل واضح اور متعین ہے کہ اللہ کے ہاں دین صرف اسلامی نظام حیات ہے۔ اسلام کے بغیر کسی سوچ یا نظام کو اللہ دین نہیں مانتا کیونکہ اللہ نے جو فقرہ استعمال کیا ہے وہ یہ ہے۔ (اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ) اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی دین ہے۔ اسلام کے علاوہ اگر کوئی کسی اور عقیدہ وعمل کا اتباع کرتا ہے تو اللہ اسے قبول نہ کرے گا۔ (وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلُ مِنْہُ) حضور اکرم ؐ کے بعد تو کوئی دین دنیا میں ایسا نہیں رہا ہے جو اللہ کو مقبول ہو۔ اب تو تمام دنیا کو اسلام ہی قبول کرنا ہو گا اور اس صورت میں اسے قبول کرنا ہو گا جس صورت میں اسے حضرت محمد ؐ نے ہم تک پہنچایا ہے۔ حضور اکرم ؐ سے قبل نصاریٰ کا جو دین صحیح مانا جاتا تھا وہ اب مقبول نہ ہو گا جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد یہودیوں کا دین غیر مقبول قرار پایا تھا۔

حضور اکرم ؐ کی بعثت کے بعد یہود و نصاریٰ کا وجود یہ معنی نہیں رکھتا کہ جس دین پر وہ عمل کر رہے ہیں وہ اللہ کو مقبول ہے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ بھی الہی دین پر ہیں۔ بے شک ان کا دین الہی تھا مگر حضور اکرم ؐ کی بعثت سے پہلے اور حضور ؐ کی بعثت کے بعد صورت حال یہ ہے اور اس کا تمام مسلمان اعتراف کرتے ہیں کہ اب صرف اسلام ہی دین کی حیثیت رکھتا ہے اور مذکورہ بالا آیت اس سلسلے میں نص قطعی ہے جس میں کسی قسم کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی۔

ہاں یہ بات مسلمہ اصولوں میں سے ہے کہ اسلام یہود و نصاریٰ پر جبر کر کے ان کو دین اسلام کے اعتراف پر مجبور نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اصول یہ ہے کہ (لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ) (دین میں کوئی جبر نہیں ہے) لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ جن امور پر عمل پیرا ہیں وہ دین ہے یا اللہ تعالیٰ ان کو بھی صحیح دین پر سمجھتا ہے۔

اس لئے اسلام کسی ایسے محاذ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا جو دینی محاذ ہو اور اس محاذ کے اندر اسلام بھی شامل ہو' اور وہ الحاد کا مقابلہ کر رہا ہو۔ دین تو فقط ایک ہے جس کا نام اسلام ہے اور اس کے علاوہ تمام محاذ لادین ہیں' جو اسلام سے علیحدہ ہیں۔ اب یہ لادینی نظام چاہے اپنی اصل میں الہی دین ہو اور اس کے اندر انحراف ہو گیا ہو یا وہ بت پرستانہ دین ہو اور اپنی بت پرستی پر قائم ہو یا الحاد ہو اور سرے سے تمام ادیان کا منکر ہو' اور ان کے درمیان حلیفانہ معاہدہ ہو گیا ہو' لیکن یہ تمام لادین دین اسلام سے متضاد ہیں اور ان کے اور اسلام کے درمیان کوئی حلیفانہ تعلق قائم نہیں ہو سکتا اور نہ ان کے درمیان دوستی ہو سکتی ہے۔

ایک مسلمان اہل کتاب کے ساتھ معاملات رکھ سکتا ہے اور اسلام اس سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ ان معاملات کو بر و احسان پر استوار کرے۔ جب تک وہ اسے دین کے معاملے میں ازیت نہ دیں۔ اسلام ایک مسلمان کو یہ اجازت بھی دیتا

ہے کہ وہ ان میں سے پاکدامن عورتوں کے ساتھ نکاح بھی کر سکتا ہے۔ہاں ان میں سے ان لوگوں کے بارے میں فقہی اختلاف ہے۔جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا تسلیم کرتے ہیں اور جو لوگ تثلیث کے قائل ہیں کہ آیا ایسی عورتیں کتابی قرار پاکر حلال ہوں گی یا انہیں بت پرست قرار دے کر حرام قرار دیا جائے گا۔بہرحال اگر ہم یہ اصول ہی لیں کہ نکاح عموماً جائز ہے' تو بھی حسن سلوک یا جواز نکاح سے اس بات پر دلیل نہیں دی جاسکتی کہ ان کے ساتھ دین میں حلیفانہ تعلقات قائم ہوسکتے ہیں اور دوستی بھی کی جاسکتی ہے۔اور اس کا یہ مفہوم بھی نہیں ہے کہ اہل کتاب کا دین حضرت محمد ؐ کی بعثت کے بعد بھی اسلام کے ہاں معتبر ہے اور پھر اس کے ساتھ ایک ہی محاذ پر کھڑے ہوکر اسلام الحاد کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

اسلام تو آیا ہی اس لئے ہے کہ وہ اہل کتاب کے اعتقادات کو درست کرے اور بعینہٖ وہ اس لئے بھی آیا ہے کہ بت پرستوں کے فاسد عقائد کو درست کرے۔دونوں کو اسلام کی دعوت دے۔اس لئے کہ اب تو اسلام ہی وہ دین ہے جس کے سوا اللہ تعالیٰ کسی دین کو قبول نہیں کرتا۔جب یہودیوں نے یہ سمجھا کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بھی دین اسلام کی طرف دعوت دیتے ہیں تو ان کو یہ بات نہایت ہی گراں گزری کہ حضور ؐ ان کو بھی اسلام کی طرف دعوت دیں تو قرآن کریم نے ان کی اس غلط فہمی کو دور کیا اور کہا کہ اللہ تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہے اور اگر تم اعراض کرو تو تم بھی کافر ہو۔

ایک مسلمان تو اس بات کا مکلف ہے کہ وہ اہل کتاب کو اسلام کی طرف دعوت دے جس طرح وہ مکلف ہے کہ بت پرستوں اور ملحدوں کو دین اسلام کی دعوت دے۔ہاں اگر وہ مکلف نہیں ہے تو اس بات کا نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں کو زبردستی اسلام کے اندر داخل کرے اس لئے کہ کسی کے دل و دماغ میں عقائد بذریعہ جبرو اکراہ نہیں جمتے۔"دین میں جبر" صرف یہ نہیں ہے کہ ازروئے قرآن وہ ممنوع ہے۔اگر ممنوع نہ ہوتا تو بھی اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔

یہ بات درست نہ ہوگی کہ ایک مسلمان حضرت نبی ؐ کی بعثت کے بعد اس بات کا اعتراف کرے کہ جس دین پر اہل کتاب ہیں وہ مقبول دین ہے اور پھر بھی وہ انہیں دعوت دے کہ وہ اسلام کی طرف آجائیں۔ایک مسلمان صرف اس اساس پر اس بات کا مکلف ہوسکتا ہے کہ وہ ان کو اسلام کی طرف دعوت دے کہ وہ ان کے دین کو دین تسلیم نہ کرے۔اگر وہ ایسا کرتا ہے تو پھر منطقی بات یہ ہوگی کہ وہ مکلف نہیں ہے۔اس لئے کہ یہ بھی دین ہے اور وہ بھی دین ہے۔اگر یہ بات بطور اصولی موضوع تسلیم کرلی جائے تو اب ایک مسلمان اور ایک اہل کتاب کے درمیان یہ محاذ کہ وہ دین اسلام کو غالب کریں ایک غیر منطقی محاذ ہوگا۔اس لئے کہ وہ تو دین اسلام کو دین تسلیم ہی نہیں کرتے۔غرض اسلام میں یہ مسئلہ دین و ایمان کا مسئلہ ہے اور پھر یہ منطقی اور فطری اتحاد و تنظیم کا بھی مسئلہ ہے۔

جہاں تک ایمان و اعتقاد کا تعلق ہے تو معاملہ بالکل واضح ہے۔ہم نے اس پر بہت طویل بحث کرلی ہے اور اوپر ہم نے قرآنی آیات سے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان کوئی دوستی یا حلیفانہ تعلق قائم نہیں ہوسکتا۔

رہی یہ بات کہ یہ ایک انتظامی اور تحریکی مسئلہ بھی ہے تو یہ بھی مذکورہ بالا بحث سے واضح ہوگیا ہے۔اس لئے کہ ایک مومن کی پوری جدوجہد یہ ہوگی کہ اسلامی نظام حیات کو زندگی کے تمام معاملات کے اندر نافذ کیا جائے اور ان تفصیلات کے ساتھ نافذ کیا جائے جن کا بیان حضرت محمد ؐ نے کیا ہے۔اپنی تمام تفصیلات اور تمام پہلوؤں کے ساتھ اور زندگی کے تمام معاملات میں' تو اس میدان میں ایک مسلم اس شخص کے ساتھ متحد اور ہمرکاب کس طرح ہوسکتا ہے جو سرے سے اسلام کو دین ہی نہیں مانتا۔نہ اسلامی شریعت کو شریعت مانتا ہے اور جس کے اہداف و مقاصد ہی دوسرے

ہیں۔اگرچہ یہ اہداف و مقاصد اسلام کے خلاف نہیں ہیں لیکن وہ اسلام کے اہداف بھی نہیں ہیں۔اس لئے کہ اسلام کسی ہدف اور کسی عمل کو اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک وہ اسلامی عقیدے پر قائم نہ ہو۔

(مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ

(۱۴:۱۸)) جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اڑا دیا ہو۔

اسلام ایک مسلمان پر یہ فریضہ عائد کرتا ہے کہ وہ اپنی جدوجہد صرف اسلام کے لئے کرے اور رات اور دن کی جدوجہد میں اپنی زندگی کے کسی بھی حصے کو اسلام سے باہر نہ رکھے۔اس ڈیوٹی کے ہوتے ہوئے 'مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان اتحاد کو صرف وہی شخص تسلیم کرے گا جس نے نہ اسلام کے مزاج کو سمجھا ہو اور نہ دین اسلام کو سمجھا ہو۔یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ ایک مسلمان کی زندگی کا کوئی حصہ اسلام سے خارج بھی ہو سکتا ہے۔جس کے اندر ایک مسلمان ان لوگوں کے ساتھ تعاون کرے جو دشمنان اسلام ہوں اور دشمن بھی ایسے ہوں جو مسلمانوں سے تب ہی راضی ہو سکتے ہوں جب وہ اسلام کو خیرباد کہہ دیں۔یاد رہے کہ اس بات پر قرآن نے واضح طور پر منصوص ہدایات دی ہیں کہ یہود و نصاریٰ تم سے اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے دین و ملت کو تسلیم نہ کر لو۔غرض یہ اتحاد اعتقادی اور نظریاتی طور پر بھی محال ہے جس طرح یہ عملی طور پر ممکن نہیں ہے۔

عبداللہ ابن ابی ابن السلول نے جو معذرت کی' (یہ شخص ان لوگوں میں سے تھا جن کے دل میں بیماری تھی) اور اس نے آگے بڑھ کر یہودیوں کے ساتھ دوستی اور حلیفانہ تعلقات قائم کئے اور اس نے جو یہ کہا کہ وہ یہودیوں کے ساتھ اپنے حلیفانہ معاہدے توڑ نہیں سکتا کہ وہ ایک ایسا آدمی ہے جو چکروں سے ڈرتا ہے یعنی اسے ڈر یہ تھا کہ حالات ایسے نہ ہو جائیں کہ خود اس پر سختی ہو۔یہ عذر اس بات کا مظہر ہے کہ اس کے دل میں بیماری تھی۔اور وہ ضعیف الایمان تھا۔اس لئے کہ ولی اور مددگار تو صرف اللہ ہوتا ہے۔ناصر تو صرف اللہ ہے۔اور اللہ کے سوا کسی اور سے نصرت طلب کرنا گمراہی ہے۔اگر کوئی طلب کرتا ہے تو اس کا یہ کام ہی عبث ہے اس کا کوئی فائدہ نہ نکلے گا لیکن ابن ابی کی حجت اور اس کا عذر ہر اس شخص کا عذر ہے جو کسی بھی دور میں ابن ابی ابن السلول کا کردار ادا کرتا ہے۔اس کا تصور بھی ہر اس منافق کا تصور ہے جو مریض القلب ہے اور جس نے حقیقت ایمان کو نہیں پایا ہے۔دوسری جانب حضرت عبادہ ابن الصامت کا دل یہودیوں کی دوستی سے بھر گیا جب اس نے دیکھا کہ یہ لوگ غدار ہیں اس لئے کہ وہ خود سچے مومن تھے۔انہوں نے یہودیوں کی دوستی اور حلیفانہ معاہدوں کو توڑ دیا۔جبکہ عبداللہ ابن ابی نے ان معاہدوں کو گرمجوشی سے لیا' ان کو سینے سے لگایا اور ان کو اپنے دانتوں میں مضبوط پکڑ لیا اس لئے کہ وہ منافق تھا۔

یہ دو طریق کار ہیں اور دو طرز ہائے عمل ہیں' یہ دونوں دو مختلف عقائد و تصورات سے پیدا ہوئے۔ان دونوں کی تہ میں دو مختلف شعور کام کر رہے تھے اور یہی اختلاف دو مختلف طرز ہائے عمل کے درمیان قیامت تک رہے گا۔ایک قلب مومن ہو گا اور دوسرا قلب ایسا ہو گا جس نے ایمان کو نہ پہچانا ہو گا۔

جو لوگ دین کے ایسے دشمنوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرتے ہیں اور ان کے ساتھ اکٹھ کرتے ہیں' جو منافق

ہیں اور جن کا نظریہ' جن کی دوستی اور جن کا اعتماد اللہ اور رسول اللہ کے لئے مخلصانہ نہیں ہے' ان کو اللہ تعالیٰ نہایت ہی سختی سے تنبیہ کرتے ہیں کہ اللہ کی جانب سے یا تو اہل اسلام کو فتح نصیب ہو گی یا اور کوئی ایسی بات ظاہر کر دی جائے گی جو فیصلہ کن ہو گی اور اس طرح ان کا نفاق ظاہر ہو جائے گا۔ اور وہ پھر بہت شرمندہ ہوں گے۔

(فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ (۵ : ۵۲)) "مگر بعید نہیں کہ اللہ جب تمہیں فیصلہ کن فتح بخشے گا یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کرے گا تو یہ لوگ اپنے اس نفاق پر جسے یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں' نادم ہوں گے۔

اس وقت یعنی مکمل فتح کے قریب جیسے فتح مکہ ہوئی یا کسی اور ذریعے سے حق و باطل کے درمیان فیصلہ کے وقت اور امر الٰہی کے آجانے کے وقت' وہ لوگ سخت شرمندہ ہوں گے جن کے دل میں نفاق کی بیماری ہے کہ کیوں انہوں نے جلد بازی سے کام لیا اور یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ دوستی اور حلیفانہ معاہدے کر لئے۔ وہ نفاق کرتے رہے اور اب ان کا راز کھل گیا۔ ایسے حالات میں پھر اہل ایمان کو منافقین کے حال پر تعجب ہو گا کہ کس طرح یہ لوگ اپنے سینوں میں نفاق لئے ہوئے تھے اور اب یہ لوگ کس قدر گھاٹے میں ہیں۔

(وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ (۵ : ۵۳)) "اور اس وقت اہل ایمان کہیں گے "کیا یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں؟"....... ان کے سب اعمال ضائع ہو گئے اور آخر کار یہ ناکام و نامراد ہو کر رہے۔

ہاں پھر ایک دن آگیا کہ فتح نصیب ہوئی۔ کئی لوگوں کے خفیہ راز کھل گئے اور ان کے اعمال ضائع ہو گئے اور کئی گروپ سخت گھاٹے میں رہے۔ اور آج بھی ہم اللہ کے اس وعدے کے انتظار میں ہیں کہ فتح آئے گی بشرطیکہ ہم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ رکھیں۔ بشرطیکہ ہماری دوستی صرف اللہ سے ہو' بشرطیکہ ہم اسلامی نظام کو سمجھیں اور اس کے مطابق اپنے افکار اور اپنے اعمال استوار کریں' بشرطیکہ ہم معرکے کے اندر اللہ کی ہدایات اور راہنمائی میں اتریں اور ہم اللہ اور رسول کے سوا کسی کو دوست نہ بنائیں۔

---ooo---

پہلی پکار اہل ایمان کو یہ تھی کہ وہ یہود و نصاریٰ کی دوستی اور ان کے ساتھ حلیفانہ تعلقات قائم کرنے سے باز آجائیں' ورنہ یاد رکھیں کہ ان کا شمار بھی ان میں ہو گا اور اس طرح وہ اسلام سے مرتد ہو جائیں گے۔ ان کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ وہ کیا سے کیا بن گئے بالکل غیر ارادی طور پر۔ اب یہاں ان کو دوسری کال دی جاتی ہے کہ خبردار! ان میں سے کوئی مرتد نہ ہو جائے۔ یہ ارتداد اس دوستی سے بھی ہو سکتا ہے اور دوسرے اسباب کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ اگر وہ مرتد ہو گئے تو اللہ کے ہاں ان کا کوئی مقام نہ رہے گا اور یہ بات بھی نوٹ کر لیں کہ ان کا یہ ارتداد اور الٹا پھرنا' نہ اللہ کو مجبور

کر سکتا ہے اور نہ اللہ کے دین کو نقصان دے سکتا ہے۔ اللہ کے دین کے دوست اور بہت لوگ ہوسکتے ہیں جو اللہ کے علم میں ہیں۔ اگر مسلمان سب کے سب پھر گئے تو وہ لوگ آجائیں گے اور یہاں ان لوگوں کے کچھ خدوخال بھی بتا دیئے جاتے ہیں جو کہ اللہ کے علم میں ہیں اور ریزرو ہیں اور جو اس کے دین کے حامی ومددگار ہوں گے اور یہ خدوخال نہایت ہی پسندیدہ' خوشنما' خوبصورت اور چمکدار ہیں۔ اور وہ قبلہ بھی بتا دیا جاتا ہے جس کی طرف ایک مسلم اپنی دوستی اور محبت کا رخ کرے گا اور اس دوسری پکار میں اس معرکے کا وہ حتمی انجام بھی ذکر کر دیا جاتا ہے' جو حزب اللہ اور تمام دوسری احزاب کے اندر جاری ہے۔ اس انجام تک وہ لوگ اور صرف وہی لوگ پہنچیں گے جن کی محبت صرف اللہ اور رسول اللہ اور اہل ایمان کے ساتھ ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِۦ فَسَوْفَ يَأْتِى
ٱللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُۥٓ أَذِلَّةٍ عَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى
ٱلْكَٰفِرِينَ يُجَٰهِدُونَ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ
لَآئِمٍ ۚ ذَٰلِكَ فَضْلُ ٱللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَآءُ ۚ وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٥٤﴾
إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱلَّذِينَ يُقِيمُونَ ٱلصَّلَوٰةَ
وَيُؤْتُونَ ٱلزَّكَوٰةَ وَهُمْ رَٰكِعُونَ ﴿٥٥﴾ وَمَن يَتَوَلَّ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ
وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ فَإِنَّ حِزْبَ ٱللَّهِ هُمُ ٱلْغَٰلِبُونَ ﴿٥٦﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہو گا' جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے' جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے' جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسولؐ اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنالے اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔"

اس صورت میں اور اس مقام پر مسلمانوں کو یہ تنبیہ کرنا کہ وہ مرتد نہ ہو جائیں' اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ارتداد اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی اور تعلق موالات کے درمیان گہرا ربط ہے۔ خصوصاً اس ریمارک کے بعد کہ جو شخص ان کے ساتھ محبت و موالات کا تعلق قائم کرے گا وہ انہی میں شمار ہو گا۔ وہ جماعت مسلمہ سے خارج تصور ہو گا اور ان کا فرد اور آدمی شمار ہو گا۔ (وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ) (تم میں سے جو ان کے ساتھ موالات کرے گا وہ ان میں سے ہو گا)۔ اس مفہوم کی رو سے یہ دوسری پکار پہلی ہی تاکید و تائید ہو گی اور اس پکار کے بعد جو تیسری پکار آ رہی ہے وہ بھی اس مفہوم پر دلالت کرتی ہے کیونکہ وہاں اہل کتاب اور کفار دونوں کے ساتھ تعلق موالات کی ممانعت کا ذکر ہے اور ان کو ایک صف میں کھڑا کر دیا گیا ہے کہ اہل کتاب اور کفار کے ساتھ موالات کا درجہ ایک ہی ہے اور یہ کہ اسلام میں اہل کتاب اور دوسرے کفار کے ساتھ بعض تعلقات میں جو فرق کیا گیا ہے وہ ہدایات تعلق موالات پر لاگو نہیں ہیں ان میں موالات شامل نہیں ہے۔

يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (۵:۵۴)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہو گا' جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے' جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے' جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔"

کسی ایک گروہ اور جماعت کو اللہ کے کام پر لگانا اللہ کی منشا کو پورا کرنا ہے۔ اگر ایسا گروہ اس کرۂ ارض پر اللہ کے دین کی اقامت کے لئے دست قدرت کا آلہ کار ہو' اور اس کے ذریعے دنیا میں عوام الناس پر اللہ کی حکومت قائم ہو' ان کی زندگی میں اللہ کے احکام و ہدایات نافذ ہوں' انہی کے مطابق ان کی انتظامیہ ہو' ان کی عدالتوں میں اسلامی شریعت نافذ ہو اور بھلائی' خیر' پاکیزگی اور ترقی کا دور دورہ ہو اور یہ اسلامی نظام کی وجہ سے دنیا کو حاصل ہو تو اس گروہ کا اس کام کے لئے منتخب ہونا اور کیا جانا ہی اللہ تعالیٰ کا عظیم فضل و کرم ہے۔ اب اگر کوئی اپنے آپ کو اللہ کے اس فضل و کرم سے محروم کرتا ہے تو یہ اس کی اپنی بدبختی ہو گی۔ اللہ تو غنی بادشاہ ہے اور ان محروم ہونے والوں کے علاوہ بھی اللہ کے علم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس فضل و کرم کے مستحق ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ ان مختاران الٰہی کی جو تصویر کشی فرماتے ہیں اس کے خدوخال نہایت ہی واضح ہیں اور ان کی صفات کا ذکر بھی نہایت ہی واضح طور پر کر دیا گیا ہے۔ یہ تصویر نہایت ہی روشن اور پرکشش ہے۔

(فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّونَهُ (۵:۵۴) "اللہ بہت سے لوگ پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب

ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہو گا۔" یعنی ان کے اور ان کے رب کے درمیان رابطہ اور تعلق محبت کے متبادل تحفے ہوں گے۔ محبت کیا ہے؟ ایک روح ہے جو نہایت ہی لطیف، روشن، پُررونق اور نہایت ہی ہشاش و بشاش روح ہے۔ جو اس قوم اور اللہ تعالیٰ کے درمیان رابطے کا کام دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ محبت کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس کی قدر و قیمت کا ادراک صرف اس شخص کو ہو سکتا ہے جس کو معرفت ربانی حاصل ہو اور انہی صفات سے متصف ہو جو اللہ نے خود بیان کی ہیں۔ نیز صرف وہی شخص اس کا تصور کر سکتا ہے جس کے حس، شعور اور نفس و شخصیت پر ان صفات کا پرتو پڑا ہو۔ یہ فضل و کرم اسی شخص کے ادراک میں آسکتا ہے جو اس داتا کی حقیقت سے واقف ہو، جو جانتا ہو کہ اللہ کون ہے؟ اس عظیم کائنات کا مالک اور صانع کون ہے؟ اور اس کائنات میں اس چھوٹے سے کیڑے انسان کا بھی وہ خالق ہے جو نہایت اونچی عظمتوں والے کے اقتدار میں ہے اور وہ اس کی خدمت میں ہے جو خالص اسی کا ہے اور اس کی بادشاہی میں ہے۔ اور وہ ذات کون ہے اور یہ انسان کیا ہے جس پر وہ ذات فضل و کرم کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ محبت کر رہی ہے حالانکہ انسان خود اس کا بنایا ہوا ہے۔ وہ پاک ہے، جلیل القدر، عظیم المرتبہ، الحی، الدائم، الازلی، الابدی، الاوّل، الآخر اور الظاہر و الباطن ہے۔

کسی بندے کا اپنے اللہ کے ساتھ محبت کرنا اس بندے کے لئے ایک نعمت ہے اور اس کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کو اس کا ذوق ہو اور اللہ کی جانب سے کسی بندے کے ساتھ محبت کرنا تو ایک عظیم بات ہے اور یقیناً عظیم اور بھرپور اور فضل جزیل ہے۔ اسی طرح اللہ کا اپنے بندوں کو ہدایت دینا، ان کی تعریف کرنا بھی ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ ان کے اندر اس ذوق جمیل کا پیدا ہونا اور ایک ایسا ذوق محبت پیدا ہونا جس کی دنیا کی محبتوں میں کوئی نظیر نہ ہو، تو یہ بھی ایک عظیم انعام و اکرام ہے اور ایک عظیم فضل و کرم ہے۔

جس طرح اللہ کی جانب سے بندے کے ساتھ محبت ناقابل بیان ہے اسی طرح بندے کی جانب سے اللہ کے ساتھ محبت بھی ناقابل بیان ہے۔ دنیا کے محبت کرنے والوں کے کلام میں اور عبادات میں اس کا اظہار ممکن نہیں ہے۔ اور یہ وہ شعبہ ہے جس میں صوفیا میں سے واصل باللہ لوگ ہی برتری کے حامل ہیں۔ لیکن صوفیوں کے لباس میں، نام نہاد صوفیوں کی جو فوجیں پھرتی نظر آتی ہیں اور عوام کے درمیان معروف ہیں ان میں ایسے واصل باللہ بہت ہی کم نظر آئیں گے۔ اس سلسلے میں رابعہ عدویہ کے کچھ اشعار میرے ذہن کی اسکرین پر آتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں:

فلیتك تحلوا والحیاة مریرة

ولیتك ترضی والانام غضاب

(اے کاش کہ آپ میٹھے ہوں اور زندگی کڑوی ہو اور اے کاش کہ آپ راضی ہوں اور تمام لوگ مجھ پر غضبناک ہوں)۔

ولیست الذی بینی وبینك عامر

وبینی وبین العلمین خراب

(اے کاش کہ جو میرے اور آپ کے درمیان ہے وہ بستا رہے اور میرے اور لوگوں کے درمیاں جو ہے وہ خراب ہو) یعنی تعلق و رابطہ۔

اذا صح منك الحب فالكل هين
وكل الذى فوق التراب تراب

(اگر آپ کی جانب سے محبت درست ہو جائے تو پھر سب کچھ آسان ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس مٹی کے اوپر جو مخلوق بھی چلتی پھرتی ہے وہ مٹی ہی ہے)۔

اللہ جل شانہ کی طرف سے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کے ساتھ یوں اظہار محبت اور پھر ایک عاجز بندے کی طرف سے اللہ کے ساتھ اظہار محبت جو منعم حقیقی ہے اور جو حقیقی فضل کرنے والا ہے ایک انعام ہے۔ یہ محبت اس پوری کائنات میں پھیل جاتی ہے اور یہ محبت بھی ہر زندہ چیز کا مزاج بن جاتی ہے۔ پھر ایک فضا ہوتی ہے اور ایک سایہ ہوتا ہے جو اس پورے وجود کائنات پر چھا جاتا ہے اور انسان جو محب بھی ہے اور محبوب بھی' اس کی زندگی کا پیمانہ تو اس محبت سے پوری طرح بھر جاتا ہے۔

اسلامی تصور حیات ایک مومن اور اس کے رب کے درمیان اس طرح کا محبوب رابطہ قائم کرتا ہے جو نہایت ہی عجیب اور نہایت ہی پیارا ہوتا ہے۔ یہ دائمی محبت کا رابطہ ایسا نہیں ہوتا کہ اچانک قائم ہو جائے یا ایک چمک پیدا ہو اور چلی جائے۔ یہ اسلامی تصور حیات میں ایک بنیادی اور حقیقی عنصر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

(اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا) ''وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کے لئے رحمٰن محبت پیدا کر دے گا'' اور دوسری جگہ ہے۔ (اِنَّ رَبِّیْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ) ''بے شک میرا رب رحم کرنے والا اور محبت کرنے والا ہے) اور دوسری جگہ ہے (وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ) (اور وہ بخشنے والا اور محبت کرنے والا ہے) اور دوسری جگہ ہے۔ (وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ) ''اور جب تم سے میرے بندے' میرے بارے میں پوچھیں تو بے شک میں قریب ہوں' میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں' جب وہ مجھے پکارتا ہے۔'' (وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ) ''اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کے ساتھ شدید محبت رکھتے ہیں۔''

اور دوسری جگہ ہے۔ (قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ) ''کہہ دیجئے' اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اطاعت کرو' تم سے اللہ محبت کرے گا) وغیرہ وغیرہ بے شمار ایسی آیات ہیں جو اس مضمون کو ظاہر کرتی ہیں۔

ان لوگوں پر تعجب ہے کہ وہ اس مضمون کی آیات پڑھتے ہیں اور پھر بھی کہتے ہیں کہ اسلامی تصور حیات ایک خشک' سخت اور کرخت تصور ہے اور اس میں خدا اور بندے کے درمیان تعلق قہر و غضب' سزا و گوشمالی اور سختی اور دوری کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی ایسا تصور نہیں جس طرح مسیحی تصور میں مسیح کو اقانیم الوہیت میں سے ایک اقنوم تصور کیا جاتا ہے اور لوگوں میں اور اللہ میں ایک گہرا رابطہ بلکہ من تو شدم تو من شدی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تصور حیات کی صفائی اور اس میں حقیقت الوہیت اور مقام بندگی کے اندر مکمل فرق و امتیاز کرنے کی وجہ سے 'الفت و محبت کی پر نم فضا میں کوئی کمی نہیں آتی - اللہ اور بندے کے درمیان اس تصور میں نہایت ہی گہرا ربط موجود ہے لیکن یہ ربط و تعلق رحمت اور عدل کا تعلق ہے - اس تعلق کا ایک رخ باہم محبت ہے تو دوسرا رخ مکمل پاکیزگی کا ہے - ایک طرف محبت ہے اور دوسری جانب اللہ کی ذات کے لئے مکمل پاکیزگی ہے - یہ نہایت ہی جامع اور مانع تصور ہے - اور اس سے وہ تمام بشری تقاضے پورے ہوتے ہیں جو اپنے رب کے حوالے سے انسان کو درکار ہیں -

چنانچہ اس ''مومن رجمنٹ'' کی صفت سے متعلق ' جسے اس دین کے لئے اٹھایا گیا ہے اس آیت میں یہ الفاظ آتے ہیں اور بار بار ذہن میں پھرتے ہیں - (يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ) (وہ اللہ سے محبت کرتا اور اللہ اس سے محبت کرتے ہیں) اس فضائے محبت میں جب یہ رجمنٹ اپنے عظیم فرائض کی ادائیگی کے لئے نکلتی ہے اور یہ بوجھ اٹھاتی ہے تو اس کے دل میں یہ شعور ہوتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے اس خصوصی خدمت کے لئے بھرتی کیا ہے اور وہ اللہ جل شانہ کی خصوصی رجمنٹ ہے -

اس کے بعد اس رجمنٹ کی باقی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں - (اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (۵ : ۵۴) (مومنوں پر نرم ہوں گے) یہ ایک ایسی صفت ہے جو اطاعت ' نرمی اور یسر سے لی گئی ہے اور لفظ یہ استعمال کیا ہے کہ وہ مومنین کے مقابلے میں اپنے آپ کو ذلیل کر کے رکھیں گے - لیکن اگر کوئی مومنین کے مقابلے میں اپنے نفس کو ذلیل کرتا ہے تو وہ ذلت نہیں ہے اور نہ اس میں توہین کا پہلو ہے اس لئے کہ ایک مومن دوسرے مومن کے مقابلے میں نہایت ہی نرم ہوتا ہے ' سخت اور نافرمان نہیں ہوتا - آسان اور نرم ' جلدی لبیک کہنے والا ' رواداد ' محبت کرنے والا ہوتا ہے - اس لئے اس کے لئے اس لفظ کے استعمال میں ذلت بمعنی حقارت کا مفہوم نہیں ہے ' بلکہ اس سے اخوت ' محبت ' عدم تکلف ' نفسیاتی اتحاد اور نظریاتی لگاؤ کے معانی کا اظہار ہوتا ہے - ایک مومن اور دوسرے مومن کے درمیاں کوئی پردہ اور راز نہیں رہتا -

جب انسان بعض چیزیں اپنی ذات کے لئے اٹھا رکھتا ہے تو یہ جذبہ اسے اپنے دوسرے بھائی کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ' بخیل اور کنجوس بنا دیتا ہے - لیکن جب ایک شخص اپنے آپ کو ایک کمپنی یا رجمنٹ کا فرد بنا لیتا ہے تو وہ اپنا سب کچھ اس کے لئے قربان کر دیتا ہے اور اس کی انفرادیت کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے - پھر اس کمپنی کے علاوہ وہ اپنے لئے کچھ اٹھا نہیں رکھتا جبکہ ان کی کمپنی اخوت اسلامی کی کمپنی ہوتی ہے اور وہ اللہ کے نام اور نظام پر جمع ہوئے ہیں - اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں - محبت الٰہی ہی ان میں مشترک ہے اور یہ اسے باہم تقسیم کرتے ہیں -

(اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۵ : ۵۴) (جو کفار پر سخت ہوں گے) یعنی کافروں کے مقابلے میں ان کے اندر برتری ' ناپسندیدگی اور برتری کے جذبات پائے جاتے ہیں اور چونکہ مقابلہ کفار کے ساتھ ہے اس لئے ان کے مقابلے میں ان جذبات کا ہونا مناسب ہے - ان جذبات کا اظہار ان کے مقابلے میں محض ذاتی عزت کے اظہار کے لئے نہیں ہے اور نہ صرف اپنی خودی بلند کرنا مطلوب ہوتا ہے بلکہ ان کی جانب سے عزت کا اظہار اسلامی نظریہ حیات کی طرف سے عزت کا اظہار ہو گا اس جھنڈے کی برتری ہو گی جس کے نیچے اہل ایمان کھڑے ہوں گے اور اہل کفار کے مقابلے میں ہوں گے - اس سے اس بات کا اظہار ہو گا کہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ خیر ہے اور ان کا مقام یہ ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے ساتھ لے کر اس بھلائی کے تابع کر دیں - یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر اس چیز کے تابع ہو جائیں جس کے وہ

دوسرے حائل ہیں اور وہ خیر نہیں ہے۔اس اظہار برتری اور سختی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے اندر دین کے بارے میں خود اعتمادی ہے اور وہ ہوا و ہوس کے دین پر قابو پاچکے ہیں۔ان کے ہاں اللہ کی قوت تمام دوسری قوتوں پر غالب ہے اور اللہ کی جماعت تمام احزاب پر غالب ہے۔اگر وہ بعض معرکوں میں شکست بھی کھا جائیں تو پھر بھی وہ بلند عزم لئے ہوئے ہیں کیونکہ اسلامی جدوجہد کی طویل راہ میں کبھی لغزش بھی تو ہو سکتی ہے۔

(يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ (۵:۵۴) "وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔" یہ جہاد فی سبیل اللہ ہو گا' یہ اس لئے ہو گا کہ زمین پر اسلامی نظام قائم کیا جائے' یہ اس لئے ہو گا کہ لوگوں پر اللہ کی بادشاہت کا اعلان کیا جائے' یہ اس لئے ہو گا کہ ملک کے اندر اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے ہوں اور ملک کے اندر بھلائی' ترقی اور اصلاح بین الناس کا دور دورہ ہو۔ یہ ہے ایک دوسری صفت اسلامی رجمنٹ کی۔اور اسے اللہ تعالیٰ نے محض اس لئے قائم کیا ہے کہ وہ اس کی زمین پر وہ فریضہ سرانجام دے جو اللہ کو مطلوب ہے۔

یہ رجمنٹ فی سبیل اللہ جہاد کرے گی' اپنے کسی ذاتی مقصد کے لئے نہ کرے گی۔نہ اپنی قوم کے کسی مقصد کے لئے لڑے گی' نہ اپنے وطنی مقاصد میں سے کسی مقصد کے لئے لڑے گی' نہ وہ کسی نسل کے لئے کام کرے گی۔اس رجمنٹ کے ارکان صرف اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور یہ جہاد اسلامی نظام حیات کے قیام کے لئے ہے' اللہ کی حکومت کے قیام کے لئے ہے' اور اللہ کی شریعت کے نفاذ کے لئے ہے اور اس راہ میں تمام لوگوں کی بھلائی ہے۔اس میں ان کی ذاتی کوئی غرض نہیں ہے' نہ ان کا اپنا کوئی حصہ ہے۔یہ گروہ صرف اللہ کے لئے ہے اور اس میں کوئی اور شریک نہیں ہے۔

یہ رجمنٹ اللہ کے راستے میں لڑنے مرنے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا کوئی لحاظ نہ رکھے گی۔اس کو لوگوں کا کیا خوف ہو گا اور وہ کیا پرواہ کرے گی وہ تو اللہ کی محبت میں سرشار ہوگی اور یہی محبت اس کے لئے امام ضامن ہے۔لوگوں کے ہاں رائج مقامات قیام پر وہ شاپ نہ کرے گی۔سوسائٹی کی اقدار اس کی نظروں میں ہیچ ہوں گی اور جاہلیت کے ہاں معروف اس کے لئے معروف نہ ہو گا۔وہ تو سنت الٰہی کی رجمنٹ ہوگی اور وہ اسلامی نظام حیات پیش کرنے والی ہو گی۔لوگوں کی ملامت سے تو وہ لوگ ڈرتے ہیں جو اپنی اقدار اور ہدایات لوگوں کی خواہشات کے مطابق تشکیل دیتے ہیں اور جن کی قوت اور طاقت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں۔لیکن جس جماعت کا رخ اللہ کی اقدار اور پیمانوں کی طرف ہو گا وہ تو کلمہ حق کو عوام کی اقدار اور پیمانوں پر غالب کرنے کی سعی کرے گی اور لوگوں کی خواہشات کے برعکس کام کرے گی تو وہ لوگوں سے کیا ڈرے گی۔جس شخص کی قوت اور اقتدار کا سرچشمہ ذات باری ہو' تو اسے کیا پرواہ ہو سکتی ہے کہ لوگ کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔وہ تو یہ سمجھے گا کہ گویا لوگ سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ان لوگوں کی صورت حالات جو ہو سو ہو' ان لوگوں کی تہذیب و تمدن جو ہو سو ہو' وہ اپنی راہ پر رواں دواں رہے گا۔

ہم لوگ تو دیکھتے ہیں کہ لوگ کیا کہتے ہیں 'لوگ کرتے کیا ہیں 'لوگوں کے پاس کیا فکر و عمل ہے 'لوگ کن اصطلاحات میں بات کرتے ہیں 'لوگوں کی عملی زندگی کیا ہے اور ان میں کیا اقدار اور پیمانے ملحوظ ہیں۔ہمارا یہ رویہ اس وجہ سے ہے کہ ہم نے اصل اصول کو بھلا دیا ہے جس کے مطابق ہم نے ان اعتبارات کے مقابلے میں ایک پیمانہ بنانا ہے 'جس کے مطابق

ہم نے اپنے حساب کو درست کرنا ہے اور جس کے مطابق ہم نے آپ کو تولنا ہے۔ اور وہ اصول ہے اسلامی نظام حیات' اسلامی شریعت اور اللہ کے احکام۔ اصل بات یہ ہے کہ یہی ہے اصول حق اور اس کے ماسواسب باطل ہے۔ اگرچہ یہ لاکھوں کروڑوں کے لئے معروف و متداول ہو۔ اگرچہ کئی نسلیں اسے صدیوں تک مانتی چلی آئی ہوں۔

کسی صورت حال' کسی رواج' کسی عادت یا کسی قدر کی یہ کوئی قیمت (Value) نہیں ہے کہ وہ موجود ہے یا وہ امر واقعہ ہے یا لاکھوں لوگ اس کے ماننے والے ہیں یا لاکھوں لوگ اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں یا تمام لوگ اسے اصول حیات تسلیم کرتے ہیں۔ اس قسم کے پیمانے کو اسلامی تصور حیات تسلیم نہیں کرتا بلکہ کسی صورت حال' کسی رواج' کسی عادت' کسی قدر کی قیمت یہ ہوگی کہ اسلامی تصور حیات میں اس کی کوئی قیمت ہے یا نہیں ہے اس لئے کہ تمام اقدار اور پیمانوں کا معیار اسلامی نظام ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ اسلامی رجمنٹ اللہ کی راہ میں جہاد کرے گی اور وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف نہ کھائے گی۔ یہ ہے نشانی ان مومنین کی جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس رجمنٹ میں بھرتی کیا ہو گا۔ اور یہ بھرتی بھی اللہ کرے گا اور پھر اس رجمنٹ کے سپاہیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو بہت گہرا پیار ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ اپنے ان بہادروں کی نشانیاں بتا رہا ہے۔ ان کے پتے بتا رہا ہے..... ان بہادروں کے دلوں میں جو اطمینان ہو گا اور جس ثابت قدمی کے ساتھ راہ جہاد پر وہ رواں دواں ہوں گے یہ بھی اللہ کا فضل و کرم ہو گا۔

(ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۵ : ۵۴) "وہ جسے چاہتا ہے ذرائع دے دیتا ہے اور علم کے مطابق دیتا ہے۔ اور اللہ کا دین بہت ہی وسیع ہے اور اس کے لئے اللہ جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔" اب اللہ تعالیٰ' اس دھمکی کے بعد' اس بات کا تعین فرماتے ہیں کہ اہل ایمان کی دوستی اور موالات کس کے ساتھ ہوگی۔ اس کی تصریح کی جاتی ہے۔

(اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (۵ : ۵۵)) "تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسولﷺ اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔" بطریق حصر یہ فیصلہ دیا جاتا ہے جس میں کسی تاویل اور لیپا پوتی کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اور نہ اسلامی تحریک کو پگھلانے اور اسلامی تصور حیات کو ڈھیلا کرنے کی کوئی گنجائش رہتی ہے۔

اس کے سوا کوئی اور بات ممکن بھی نہ تھی اس لئے کہ یہ مسئلہ اپنی اصلیت کے اعتبار سے نظریاتی مسئلہ ہے۔ پھر اس نظریے کو لے کر ایک تحریک برپا کرنے کا مسئلہ ہے اور اس میں دوستی اور موالات کا خالصتہً اللہ کے لئے ہونا ضروری ہے۔ صرف اللہ ہی پر بھروسہ کرنا ضروری ہے تاکہ دین صرف اسلام ہو جائے اور اسلامی صفوں میں اور ان صفوں کے درمیان مکمل جدائی ہو جائے جو صفیں اسلام کو دین تسلیم نہیں کرتیں جو اسلام کو منہاج حیات نہیں بناتیں۔ یہ تمام دو ٹوک پالیسیاں اس لئے ہیں کہ اسلامی تحریک کے اندر سنجیدگی ہو اور اس کا اپنا نظام ہو۔ اس میں صرف ایک ہی قیادت کے لئے دوستی

اور وفاداری ہو اور اتحاد و یقین ایک ہی رجمنٹ کے افراد کے اندر ہو اس لئے کہ یہ اتحاد اس گروہ کے درمیان ہے جسے نظریات کی اساس پر اٹھایا گیا ہے۔

اب اس رجمنٹ کے بعض دوسرے اوصاف گنوائے جاتے ہیں۔ یہ اس کے ممتاز اوصاف ہیں اور یہ اس لئے گنوائے جاتے ہیں کہ اسلام محض ایک عنوان ہی نہ ہو' محض جھنڈا اور علامت ہی نہ ہو' محض زبانی جمع خرچ نہ ہو یا اس طرح نہ ہو کہ وہ ایک نسب کی طرح پشت در پشت سے منتقل ہوتا ہو یا محض ایک صفت ہو جو اچھے لوگوں میں پائی جاتی ہے بلکہ وہ ایک عملی دین ہو۔

(الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (۵: ۵۵) "وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں" ان کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں۔ صرف نماز ادا نہیں کرتے بلکہ قائم کرتے ہیں۔ اقامت صلوٰۃ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ نماز پورے طور پر ادا کرتے ہیں اور ان کی نماز سے وہ آثار نمودار ہوتے ہیں جن کا ذکر اللہ نے فرمایا ہے۔

(اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ) (نماز فحاشی اور منکر سے روکتی ہے) اور جس شخص کی نماز اسے فحاشی اور برائیوں کے ارتکاب سے نہیں روکتی' اس نے گویا نماز ادا نہیں کی۔ اگر اس نے نماز قائم کی ہوتی تو نماز اسے برائیوں سے روکتی۔

ان کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ دیتے ہیں۔ یعنی اللہ کی عبادت کرتے ہوئے مال میں سے اللہ کا حق ادا کرتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی مالی عبادت ہے اور اسے دل کی رغبت اور رضامندی سے ادا کیا جانا چاہئے اس لئے کہ زکوٰۃ محض ٹیکس نہیں ہے کہ اسے بادل ناخواستہ ادا کیا جائے۔ زکوٰۃ بھی عبادت ہے بلکہ یہ مالی عبادت ہے اور یہ اسلامی نظام کی خصوصیت ہے کہ وہ ایک حکم کے ذریعے مختلف مقاصد کو حاصل کر لیتا ہے۔ رہے انسانوں کے بنائے ہوئے نظام تو ان میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں ہے کہ ایک پہلو میں ہدف کو پورا کر لیں اور دوسرا پہلو سرے سے غائب ہو۔

کسی معاشرے کی اصلاح صرف اس بات سے نہیں ہوتی کہ اس میں لوگوں سے مال محض ٹیکس کے طور پر لیا جائے یا دولت مندوں سے مال لیا جائے اور فقراء کو دیا جائے اور یہ کام حکومت اور قوم کے نام پر کیا جائے یا اسے مالیے کا نام دیا جائے۔ ایسی صورتوں میں صرف ایک مقصد پورا ہوتا ہے وہ یہ کہ محتاجوں تک دولت کا ایک حصہ پہنچ جاتا ہے۔ رہی زکوٰۃ تو اس کے نام اور مفہوم دونوں سے پاکیزگی اور نشوونما کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سے ایک طرف سے انسانی ضمیر کے لئے پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور دوسری طرف مال کی پاکیزگی بھی حاصل ہوتی ہے کیونکہ یہ اللہ کی عبادت ہوتی ہے اور اس میں ادا کرنے والے کے جذبات اپنے فقراء بھائیوں کی طرف نہایت ہی محبت کے ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ دینے والا ایک عبادت کر رہا ہوتا ہے اور اس پر اسے قیامت میں اجر اور جزاء ملتی ہے۔ نیز اس سے اس دنیا میں بھی معاشی ترقی ہوتی ہے اور مال میں برکت اور اضافہ ہوتا ہے۔ پھر اس کے ذریعے جو فقراء مال لیتے ہیں ان کے جذبات بھی مجروح نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ یہ لوگ اس کو اللہ کا فضل سمجھتے ہیں کہ اللہ نے ان کے لئے اغنیاء کی دولت میں حصہ رکھ چھوڑا ہے۔ اس طرح ان کے دلوں میں اغنیاء کے خلاف عداوت و بغض پیدا نہیں ہوتا۔ (اور یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ اسلامی معاشرے

میں اغنیاء بھی حلال ذرائع سے مال کماتے ہیں۔ وہ کسی کا حق نہیں مارتے۔ وہ اپنا نصیب جمع کرتے ہیں) سب سے آخر میں یہ کہ زکوٰۃ کی شکل میں بڑے خوشگوار انداز میں ایک مالی ٹیکس بھی عائد ہو جاتا ہے اور نہایت ہی پاکیزگی ' نہایت ہی طہارت اور بڑھوتری کے ساتھ۔

غرض زکوٰۃ کی ادائیگی ان لوگوں کی نہایت ہی ممتاز علامت ہے جو شریعت کا اتباع کرتے ہیں۔ یہ ان کی جانب سے عملی اقرار ہے کہ وہ اللہ کی حکومت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں۔

(وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (۵:۵۵) (اور وہ رکوع کرتے ہیں) یہ ان کی شان اور صفت ہے ' یعنی یہ گویا ان کا وصف لازم ہے اور ان کی اصلی حالت ہی یہ ہے کہ وہ رکوع میں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یقیمون الصلوٰۃ پر اکتفاء نہ کیا گیا اور راکعون بھی کہا گیا ' اس لئے کہ راکعون گویا ان کی ایک منفرد اور نہایت ہی ممتاز صفت ہے۔ اسم فاعل کے ساتھ یہ صفت لاکر یہ تاثر دیا گیا کہ وہ دائماً ایسا کرتے رہتے ہیں اور اس لئے اسے نمایاں کر کے بیان کیا گیا...... ایسے مقامات پر قرآن کی تعبیرات کے اندر نہایت ہی گہری اشاریت پائی جاتی ہے اگر کسی کو ادبی ذوق ہو۔

اب اس رجمنٹ کے ساتھ اللہ کا وعدہ کیا ہے؟ وہ اللہ پر اعتماد کرتی ہے ' وہ اللہ سے دعا کرتی ہے ' وہ اللہ سے موالات کرتی ہے ' وہ رسول اللہؐ اور مومنین کی دوست ہے۔ پھر دوسری جانب اسلامی صفوں کے سوا تمام صفوں سے کٹ چکی ہے اور خالص اللہ کے لئے ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ اب کیا وعدہ ہے؟

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۵:۵۶)

"اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنالے اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔"

ایمان کے اصول کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے غلبے کا وعدہ کیا ہے۔ اور ایمانی اصل اور ایمانی قاعدہ یہ ہے کہ موالات اور دوستی صرف اللہ ' رسول اللہؐ اور مومنین کے لئے ہو۔ پہلے یہ حکم دیا گیا کہ اگر تم یہودیوں کے ساتھ موالات کرو گے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تم اسلامی صفوں سے خارج تصور ہو گے ' تمہارا شمار یہود و نصاریٰ میں ہو گا اور معنوی اعتبار سے تمہارا یہ عمل دین سے ارتداد ہو گا۔

یہ لحہ فکریہ قرآن میں بار بار آتا ہے ' وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ایک مسلمان سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ اسلام کو مطلقاً خیر سمجھے اور اس پر چلے۔ اس لئے نہیں کہ وہ غالب ہو گا یا اسے زمین کے اندر اقتدار اعلیٰ نصیب ہو گا۔ تمکن فی الارض اور غلبہ تو ایمان کے آثار ہیں اور اپنے وقت پر ضرور نمودار ہوتے ہیں اور یہ اس لئے نمودار ہوتے ہیں کہ اللہ کی تقدیر پردے سے ظاہر ہو کہ اس نے اس دین کو اس کرۂ ارض پر غالب کرنا ہے۔ غلبے کا یہ وعدہ اس لئے نہیں ہے کہ لوگ اس وعدے کے بل بوتے پر دین میں داخل ہو جائیں۔ محض غلبہ مقصود نہیں ہے ' نہ اس میں ان کی ذات اور شخصیت کا کوئی فائدہ ہے ' یہ تو اللہ کی تقدیر ہوتی ہے جو مسلمانوں کے ہاتھوں ازپس پردہ تقدیر نمودار ہوتی ہے۔ یہ غلبہ جو انہیں نصیب ہوتا ہے تو یہ ان کے نظریہ حیات کے لئے ہوتا ہے ' ان کی ذات کے لئے نہیں ہوتا۔ ان کے لئے اگر کچھ ہے تو وہ اس راہ میں جدوجہد کرنے کا ثواب اخروی ہے اور یہ اخروی ثواب انہیں اس جدوجہد کے ان نتائج پر بھی ملے گا۔ مثلاً کرۂ ارض پر

اگر دین غالب ہو جاتا ہے تو اس زمین پر جو اصلاحی کام ہوتا ہے' اس تمام کا ثواب انہیں ملے گا۔

بعض اوقات اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ساتھ غلبے کا وعدہ کرتا ہے تاکہ وہ ثابت قدم ہو جائیں اور ان کے سامنے جو مشکلات بھیانک صورت میں کھڑی ہیں ان کے اثرات سے وہ آزاد ہو جائیں۔ یہ مشکلات بعض اوقات نہایت ہی تباہ کن ہوتی ہیں۔ جب وہ انجام کا یقین حاصل کر لیتے ہیں تو ان کے دل قوی ہو جاتے ہیں اور وہ مشکلات کو انگیز کر لیتے ہیں۔ وہ مشکل گھاٹی کو سر کر لیتے ہیں اور پر امید ہو جاتے ہیں کہ اللہ ان کے ہاتھوں اس امت کے لئے کوئی بھلائی برپا کر دے گا۔ ان کو جہاد کا ثواب ملے گا اور دین کے غلبے کا ثواب ملے گا اور اس پر جو نتائج مرتب ہوں گے ان کا ثواب بھی ملے گا۔

غرض اس مقام پر اس آیت کے لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں جماعت مسلمہ کے شب و روز کیا تھے اور یہ کہ انہیں ایسی خوشخبری کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہ فیصلہ دیا گیا کہ غلبہ حزب اللہ ہی کا ہو گا۔ یہ بات اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یہ آیات کس دور میں نازل ہوئیں۔

ان حالات میں ہمارے لئے تمام نتائج کا خلاصہ اس مختصر فیصلے میں دے دیا جاتا ہے کہ حزب اللہ کو غلبہ ہو گا اور ایک مومن مطمئن ہو جاتا ہے کہ بس یہی ہے سنت الٰہیہ کہ حزب اللہ غالب ہو گی اگرچہ بعض معرکوں میں اسے بظاہر شکست بھی ہو جائے' اس لئے کہ بعض ظاہری حالات کے ہوتے ہوئے بھی اللہ کا وعدہ سچا ہوتا ہے۔ ہاں بعض مراحل تحریک میں شکست بھی نظر آتی ہے۔ اس وعدے کے تحقق کی راہ بہرحال ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ موالات صرف اللہ' رسول اللہ ؐ اور اہل ایمان کے لئے ہو۔

---ooo---

اب ذرا اس امر پر غور کریں کہ قرآن مجید نے اہل ایمان کو ان لوگوں کے ساتھ تعلق موالات قائم کرنے سے بار بار منع کیا ہے جو اہل ایمان کے نظریے کے خلاف ہیں۔ اور اس کے لئے نئے نئے انداز اختیار کئے ہیں تاکہ یہ بات ان کے احساس و شعور کا حصہ بن جائے اور یہ اصول ان کے ایمان کا حصہ بن جائے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تصور حیات میں اس اصول کی کس قدر زیادہ اہمیت ہے۔

اس سلسلے میں جب اہل ایمان کے نام پہلی پکار جاری ہوئی تو وہ براہ راست تھی اور اس میں ان کو منع کیا گیا کہ اہل کتاب کے ساتھ تعلق موالات قائم کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ فتح لے آئیں گے یا کوئی اور حکم جاری کر دیں گے اور اس طرح تمام راز فاش ہو جائیں گے۔ دوسری پکار میں ان کو اس بات سے ڈرایا گیا کہ اگر وہ اللہ اور رسول ؐ اللہ کے دشمنوں سے تعلق موالات کریں گے تو مرتد ہو جائیں گے بلکہ چاہئے کہ تم ایک ایسی رجمنٹ کے سپاہی بن جاؤ جو اللہ کی خاص رجمنٹ ہے۔ جس سے اللہ کو پیار ہے اور اس کو بھی اللہ سے محبت ہے۔ اور یہی اللہ کی پارٹی ہے جسے غلبہ نصیب ہو گا۔

اب یہاں ایک تیسری پکار ہمارے سامنے آتی ہے اس میں اہل ایمان کے جذبہ حمیت دین کو ابھارا جاتا ہے کہ دیکھو یہ لوگ تو تمہارے دین' تمہارے طریقہ عبادت کے نہ صرف یہ کہ مخالف ہیں بلکہ وہ تمہارے طریقوں کے ساتھ سخت مذاق بھی کرتے ہیں۔ اس تیسری پکار میں اللہ تعالیٰ نے ان کو منع کیا کہ وہ اہل کتاب کے ساتھ ساتھ دوسرے کفار کے ساتھ بھی تعلق موالات نہ رکھیں اور خدا خوفی کا رویہ اپنائیں۔ اگر وہ مومن ہیں تو اللہ کی ان ہدایات پر اچھی طرح غور

کریں اور اس پکار میں اہل کتاب اور کفار کی ایک دائمی صفت کا ذکر کیا ہے کہ یہ لوگ بے عقل ہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

”ہاں یہ صورت حال سخت ہیجان انگیز ہوتی بشرطیکہ کسی کے اندر ایمانی حمیت کا جذبہ موجود ہو اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ اگر اس کے سامنے اس کے دین کی توہین کر دی گئی' اس کی عبادت کی توہین کر دی گئی اور اس کے نظریہ حیات اور موقف کی توہین کر دی گئی تو اس کی کوئی عزت اور آبرو نہ رہے گی لہٰذا ایسے لوگوں سے ترک تعلق ہی ایک خدائی امر ہے۔ اہل ایمان اور ایسے لوگوں کے درمیان دوستی یا تعلق موالات کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ یہ حرکات وہ لوگ کرتے بھی اس لئے ہیں کہ ان کی عقل و خرد میں خرابی ہے اس لئے کہ اللہ کے دین اور مسلمانوں کے طریقہ عبادت کے ساتھ مذاق تو وہ لوگ کرتے ہیں جن کی عقل متوازن نہیں ہوتی۔ جب عقل صحت مند اور درست ہو تو وہ اپنے ماحول سے ایمان کے اشارات پاتی رہتی ہے اور جب عقل اور فہم میں خلل واقعہ ہو جاتا ہے تو وہ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے اشارات ایمان کا ادراک نہیں کر سکتی۔ اس خلل کی وجہ سے انسان اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کے درمیان' تعلقات میں بھی خلل پیدا ہو جاتا ہے اس لئے کہ یہ پوری کائنات ہی اس بات پر شاید عادل ہے کہ اللہ ہی انسان کی بندگی کا مستحق ہے اور اگر عقل صحت مند ہو اور اس میں کوئی خلل نہ ہو تو اس کے اندر اس کائنات کی عظمت اور اس کے بنانے والے کی عظمت و جلالت پیدا ہوتی ہے اس لئے کوئی درست اور سلیم عقل اہل اسلام کے طریقہ عبادت کے ساتھ مزاح نہیں کر سکتی۔

اسلامی عبادات کے ساتھ یہ مذاق اہل کتاب یہودیوں کی طرف سے بھی ہوتا تھا اور اہل کفر کی طرف سے بھی۔ یہ مزاح اس وقت ہو رہا تھا جب یہ قرآن حضور اکرم ؐ کے قلب پر اتر رہا تھا اور جماعت مسلمہ اسے اخذ کر رہی تھی' البتہ سیرت رسول ؐ سے کوئی ایسا واقعہ منقول نہیں ہے کہ نصاریٰ کی طرف سے بھی یہ مذاق ہوا ہو۔ لیکن قرآن کریم جماعت مسلمہ کے لئے ایک دائمی اصول وضع کر رہا تھا' مسلمانوں کی زندگی کا ایک دائمی منہاج اور دائمی نظریہ تشکیل پا رہا تھا اور اللہ کو یہ بھی علم تھا کہ زمانے کی گردشیں کیا ہوں گی اور دیکھئے کہ بعد کے ادوار میں دین کے دشمنوں اور تحریک اسلامی کے دشمنوں نے اس امت کے ساتھ کیا سلوک کیا اور یہ سلوک ان لوگوں نے کیا جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے تھے اور یہ لوگ تعداد میں یہودیوں کے مقابلے میں بہت ہی زیادہ تھے۔ بلکہ یہود اور دوسرے کفار سے مل کر بھی زیادہ تھے۔ یہ لوگ اسلام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور صدیوں تک اسلام کی دشمنی دلوں میں اٹھائے پھرے۔ اسلام کے خلاف انہوں

نے جنگیں جاری رکھیں اور یہ محاربت اس وقت سے شروع ہوگئی جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دور میں سلطنت روم کے ساتھ مسلمانوں کی مڈبھیڑ ہوئی اور یہ مڈبھیڑ صلاح الدین ایوبی کے وقت تک صلیبی جنگوں کی شکل میں جاری رہی۔ اس کے بعد عالم اسلام کے خلاف تمام مغربی ممالک نے جمع ہو کر یہاں سے خلافت اسلامیہ کو ختم کیا۔ اس کے بعد مغربی استعمار پیدا ہوا'جس کی آغوش میں صلیبیت چھپی ہوئی تھی اور کبھی کبھار اس استعمار کی زبان سے اس کا اظہار بھی ہو جاتا تھا۔ اس استعمار کے زیر سایہ مسیحی تبلیغ آئی اور مسیحی تبلیغ اور استعمار دونوں اندر سے ملے ہوئے تھے۔ آج بھی ان لوگوں کے خلاف یہود و نصاریٰ کی یہ جنگ جاری ہے جو اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور احیائے اسلام کے لئے کسی بھی جگہ کام کرتے ہیں اور ان حملوں میں یہودی' عیسائی اور تمام مشرکین بحیثیت ملت واحدہ شریک ہیں۔

قرآن اس لئے آیا کہ یہ مسلمانوں کے لئے کتاب ہدایت ہے اور قیامت تک کے لئے ہے اور یہ کتاب ہی اس امت کے تصورات کو تشکیل دیتی ہے۔ امت کے لئے اجتماعی نظام بناتی ہے اور اس کے لئے تحریکی خطوط وضع کرتی ہے۔ چنانچہ یہاں اس نے ایک مستقل اصول رکھ دیا کہ امت مسلمہ کا کوئی فرد اللہ' رسول اللہ اور مومنین کے سوا کسی اور کے ساتھ تعلق موالات قائم نہ کرے گا اور یہ اصول منفی طور پر ان کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ اور کافروں کے ساتھ کوئی تعلق موالات قائم ہی نہ کرے اور اس بات کا فیصلہ نہایت ہی سختی سے کیا جاتا ہے اور اسے اس طرح مختلف انداز سے بار بار لایا جاتا ہے۔

دین اسلام اہل اسلام کو رواداری کا حکم دیتا ہے۔ اہل کتاب کے ساتھ اسلام عموماً حسن معاملہ کا حکم دیتا ہے۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں' ان کے ساتھ اسلامؐ خصوصی طور پر رواداری کا حکم دیتا ہے لیکن اسلام ان لوگوں کے ساتھ بھی تعلق موالات کی ممانعت کا حکم دیتا ہے اس لئے کہ رواداری اور حسن معاملہ اور حسن سلوک اخلاقی معاملات ہیں اور موالات کا تعلق نظریہ حیات اور تنظیم کے ساتھ ہے۔ تعلق موالات دراصل ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا معاہدہ ہوتا ہے اور اس سے دونوں فریق ایک دوسرے کی مدد کرنے اور باہم تعاون کرنے کے پابند ہو جاتے ہیں اور مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان تعاون ممکن نہیں ہے۔ کفار کا حال تو اس سے بھی زیادہ بدتر ہے جیسا کہ اس سے قبل ہم وضاحت کر چکے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ موالات صرف دین' اقامت دین اور جہاد میں ہو سکتی ہے اور ان معاملات میں ایک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان تعاون کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

یہ مسئلہ نظریاتی اور دو ٹوک ہے۔ اس معاملے میں صرف فیصلہ کن اور سخت موقف ہی اختیار کیا جا سکتا ہے اور یہی ایک مسلم کے شایان شان ہے' دو ٹوک سنجیدگی۔

---ooo---

اہل ایمان کے نام ان سخت نداہائے ثلاثہ سے فارغ ہو کر اب حضور نبی کریمؐ کو پکارا جاتا ہے کہ آپ خود اہل کتاب کی طرف متوجہ ہو کر ذرا ان سے پوچھیں کہ آخر تم بتاؤ کہ ہمارے ساتھ تمہاری جانب سے کی جانے والی اس دشمنی کے اسباب کیا ہیں؟ تم ہم سے کیوں ناراض ہو؟ محض اس لئے کہ ہم اللہ وحدہ پر ایمان لائے ہیں اور موجودہ کتاب کے ساتھ ان کتب پر بھی ایمان لائے ہیں جو ہم سے پہلے تم پر نازل ہوئی ہیں اور اب جو باران رحمت آ رہا ہے ہم اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دشمنی بس یہی تو ہے کہ ہم مسلمان پورا پورا ایمان لاتے ہیں اور تم اہل کتاب فسق و فجور

میں مبتلا ہو۔ حضورؐ کا یہ خطاب ان کے لئے نہایت ہی رسواکن ہے لیکن اس خطاب سے اس معاملے کی اچھی طرح وضاحت بھی ہوتی ہے اور یہ فیصلہ کن خطاب ہے اور اس سے تعین ہو جاتا ہے کہ مابہ الافتراق کیا ہے۔

یہ سوال اہل کتاب سے اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق کیا جا رہا ہے۔ ایک جانب سے یہ سوال مظہر حقیقت ہے کہ اہل کتاب اور اہل ایمان کے درمیان اصل صورت حال ہے کیا؟ اور یہ کہ وہ کیا اسباب اور وجوہات ہیں جن کی وجہ سے اہل کتاب نے دین اسلام اور جماعت مسلمہ کے خلاف یہ موقف اختیار کیا ہے۔ دوسری جانب سے یہ استفہام انکاری ہے اور بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے جو موقف اختیار کیا ہے' وہ ان کے شایان شان نہیں ہے۔ جن اسباب کی وجہ سے وہ اس دشمنی پر تلے ہوئے ہیں ان کا تقاضا یہ نہیں ہے جو وہ کرتے ہیں۔ یہ اہل اسلام کے لئے ایک فہمائش بھی ہے اور ان کو یہ نفرت دلائی جاتی ہے کہ وہ اس قوم سے ہرگز تعلق موالات قائم نہ کریں اور یہ بالواسطہ اسی موقف کی تائید ہے جو اس سے قبل ندا ہائے ثلاثہ کے تحت بیان کیا گیا کہ ہرگز ان لوگوں سے یہ تعلق قائم نہ کرو۔

اہل کتاب حضورؐ کے وقت بھی حضورؐ اور تحریک اسلامی کے ساتھ محض اس لئے دشمنی رکھتے تھے کہ یہ لوگ ایمان باللہ پر جمے ہوئے تھے۔ قرآن کریم پر ایمان لاتے تھے' اور سابقہ کتب پر بھی ایمان لاتے تھے اور اس کے سوا اہل ایمان کا اور کوئی جرم نہ تھا' اور آج بھی وہ یہی دشمنی رکھتے ہیں۔

یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ محض اس لئے دشمنی کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور یہود و نصاریٰ نہیں ہیں اور یہود و نصاریٰ کی حالت یہ ہے کہ وہ خود ان کتب سے بھی روگردانی اختیار کر چکے ہیں جو ان کی طرف نازل ہوئیں۔ ان کے فسق و فجور کی اور دلیلوں کے علاوہ یہ بھی ایک بڑی قوی دلیل ہے کہ وہ آخری رسالت پر ایمان نہیں لاتے حالانکہ یہ آخری رسالت تمام سابقہ رسالتوں کی تصدیق کرتی ہے۔ اور ان کی ہدایات کے لئے مہیمن ہے ماسوائے اس کے کہ جو خرافات انہوں نے اپنائے ہیں اور جو تحریفات انہوں نے اس میں خود کی ہیں۔

وہ اسلام کے خلاف یہ شعلہ بار جنگ کیوں جاری رکھے ہوئے ہیں جو کبھی ٹھنڈی نہیں ہوتی اور گزشتہ چودہ صدیوں سے وہ اسے بھڑکا رہے ہیں یہ جنگ اس وقت سے برپا ہے جب سے مدینہ میں ایک اسلامی ریاست قائم ہوئی ہے' اسلامی شخصیت نمودار ہوئی ہے اور مسلمانوں کا نقشہ عالم پر ایک مستقل وجود بنا ہے۔ یہ وجود ان کے دین کی وجہ سے نمودار ہوا ہے۔ ان کے تصور حیات کی وجہ سے بنا ہے اور اسلامی نظام حیات کی وجہ سے بنا ہے اور اسلامی منہاج حیات کے قیام کے لئے بنا ہے۔

غرض مسلمانوں کے خلاف وہ یہ چومکھی لڑائی اس لئے لڑ رہے ہیں کہ وہ سب سے پہلے مسلمان ہیں اور یہ لوگ اپنی اس جنگ کو اس وقت تک ختم نہ کریں گے جب تک مسلمانوں کو اپنے دین سے الٹے پاؤں پھیر کر نہ لے جائیں اور جب تک ان کو غیر مسلم نہ بنا دیں۔ ان کی یہ خواہش اس لئے ہے کہ وہ خود اپنے دین کو چھوڑ کر فاسق ہو گئے ہیں اس لئے وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ کوئی دوسرا بھی صحیح مومن اور دین پر اچھی طرح چلنے والا دنیا میں رہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری جگہ اس حقیقت کو رسول اکرمؐ کو مخاطب کرتے ہوئی بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

(وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ) "اور آپ سے یہود و نصاریٰ

ہرگز راضی نہ ہوں گے 'جب تک آپ ان کی ملت کے تابع نہ ہو جائیں" اور یہی وجہ ہے کہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور اہل کتاب کے سامنے ان کے اصل اغراض و مقاصد رکھ دیئے ہیں کہ وہ دشمنی کیوں کرتے ہیں۔

قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

"ان سے کہو "اے اہل کتاب 'تم جس بات پر ہم سے بگڑے ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم اللہ پر اور دین کی اس تعلیم پر ایمان لے آئے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور ہم سے پہلے بھی نازل ہوئی تھی' اور تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں؟" اللہ تعالیٰ اپنے سچے کلام میں اس حقیقت کو بار بار دہراتے ہیں اور اہل کتاب اس حقیقت کو پگھلا کر ختم کرنا چاہتے ہیں' اسے دبانا چاہتے ہیں۔اس کا انکار کرنا چاہتے ہیں اور اہل کتاب کے علاوہ اکثر نام نہاد مسلمان بھی اس حقیقت کے خلاف ہیں اور وہ مادیت اور الحاد کے عنوان سے اہل اسلام اور اہل کتاب کے درمیان دوستی اور موالات قائم کرنا چاہتے ہیں' جو قرآن کی اس پالیسی کے خلاف ہے۔

آج بھی اہل کتاب اسی برف کو پگھلانا چاہتے ہیں بلکہ اسے دبا کر اس کے آثار تک کو مٹانا چاہتے ہیں۔اور یہ کام وہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اسلامی ممالک کے باشندوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں یا ان باشندوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں جن کے آباؤ اجداد مسلمان تھے۔یہ اہل کتاب اس فہم کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو مسلمانوں کے اندر ربانی منہاج تربیت نے پیدا کر دیا تھا اور جب تک مسلمانوں کے اندر یہ فہم و شعور زندہ ہے صلیبی استعمار ان کے مقابلے میں جم نہیں سکتا چہ جائیکہ وہ خود عالم اسلام میں کالونیاں بنائے۔اہل کتاب کو جب صلیبی جنگ میں شکست فاش ہوئی اور اس کے بعد جب وہ عیسائیت کی تبلیغ میں بھی ناکام رہے' تو ان کے سامنے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا کہ مکر و فریب کی راہ اختیار کریں اور ان آبادیوں کے درمیان یہ تصورات پھیلائیں' جو مسلمانوں کی وارث ہیں' کہ اب دین کے نام پر تمام جنگ جوئیاں ختم ہو چکی ہیں اور یہ تو ایک تاریک دور تھا جس کے اندر تمام اقوام کے اندر مذہبی جنگیں ہوئیں۔اب تو دنیا کو نئی روشنی مل گئی ہے' اب تو ترقی کا دور ہے اور اب تو کسی دینی نظریہ حیات کے مطابق لڑنا نہ جائز ہے' نہ مناسب' اور نہ ہی اس دنیا کے مفاد میں ہے۔آج تو مادی دور ہے اور اب جنگ منڈیوں اور خام مال پر ہو گی۔لہٰذا مسلمانوں یا مسلمانوں کے وارثوں کو چاہئے کہ وہ کسی دینی کشمکش یا کسی تحریک احیائے دین کے متعلق نہ سوچیں۔

اور جب اہل کتاب اس بات سے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اہل اسلام اب اپنی سرحدوں کے بارے میں بے فکر ہو گئے ہیں اور ان کے فکر و شعور سے یہ ترک موالات محو ہو گئی ہے تو اب وہ اپنا استعماری جال پھیلاتے ہیں۔خصوصاً پھر وہ بڑی آزادی سے عالم اسلام کے اندر استعماری جال پھیلاتے ہیں۔اب وہ عالم اسلام میں مسلمانوں کے غیظ و غضب سے محفوظ ہو گئے ہیں اور جب انہوں نے مسلمانوں کو تھپکی دے کر سلا دیا تو اب ان کو محض نظریاتی فتح ہی حاصل نہ ہو گئی' بلکہ اب ان کے لئے عالم اسلام میں ہر قسم کی لوٹ اور مار کے راستے بھی کھل گئے' تب انہوں نے اپنی نو آبادیاں قائم کر لیں'

مسلمانوں کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور نظریاتی فتح کے بعد اب وہ مادی دنیا پر بھی قابض ہوگئے اور صورت حال یہ ہوگئی کہ مسلمانوں اور اہل کتاب کے اندر کوئی فرق ہی نہ رہا۔ دونوں قریب قریب ایک جیسے ہوگئے۔ عالم اسلام کے اندر اب اہل کتاب کے ایجنٹ کام کر رہے ہیں جو استعماری طاقتوں نے جگہ جگہ بٹھا رکھے ہیں۔ بعض اعلانیہ طور پر بٹھا رکھے ہیں اور بعض ان کے خفیہ ایجنٹ ہیں۔ وہ بھی یہی بات دہراتے ہیں کیونکہ اہل کتاب کے ایجنٹ ہیں اور یہ لوگ اسلامی حدود کے اندر یہ کام کرتے ہیں۔ یہ ایجنٹ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ صلیبی جنگیں، دراصل صلیبی جنگیں ہی نہ تھیں وہ مسلمان جنہوں نے اسلامی جھنڈوں کے نیچے یہ جنگیں لڑیں وہ مسلمان ہی نہ تھے۔ وہ تو قوم پرست تھے۔ سبحان اللہ۔

ایک تیسرا فریق جو نہایت کم عقل فریق ہے، اسے مغرب میں صلیبیت کی جانشیں استعماری قوتیں یہ دعوت دیتی ہیں کہ آؤ ہم بھائی بھائی بن جائیں۔ مذہب کا دفاع کریں اور ملحدین کی تردید کریں۔ یہ فریب خوردہ ان کی اس دعوت کو قبول کرتے ہیں لیکن یہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ صلیبیوں کی یہ مغربی اولاد جب بھی اسلام اور الحاد کی جنگ ہوتی ہے، یہ ملحدین کے ساتھ صف آراء ہو جاتی ہے۔ ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں، جب بھی مسلمانوں کا مقابلہ ملحدین کے ساتھ ہو۔ صدیوں سے ان کا یہ طرز عمل بالکل جاری ہے۔ آج بھی ان کے لئے مادیت کی جنگ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ زیادہ تر اہمیت اس جنگ کو دیتے ہیں جو وہ اسلام کے خلاف برپا کئے ہوئے ہیں اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ مادی اور ملحد دشمن ایک وقتی اور عارضی دشمن ہے اور اسلام ایک مستقل اور ٹھوس نظریہ ہے جو ان کے لئے ایک مستقل دشمن ہے۔ یہ جنگ انہوں نے اس لئے شروع کر رکھی ہے کہ اسلامی قوتوں کے اندر بظاہر جو بیداری پیدا ہو رہی ہے، اسے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ نیز یہ لوگ الحاد کے خلاف جنگ میں بے وقوف مسلمانوں کو جھونک کر اپنا مفاد محفوظ کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ ملحدین مغربی اور صلیبی استعمار کے سیاسی مخالف ہیں اور یہ دونوں معرکے گویا اسلام کے خلاف ہوں گے۔ اور یاد رہے کہ صلیبیوں اور ملحدین دونوں کے خلاف مسلمانوں کے پاس صرف نظریاتی ہتھیار ہے اور وہ فہم و فراست ہے جو ان کے اندر قرآن کریم کی یہ آیات پیدا کرنا چاہتی ہیں۔

یہ ایک گہرا کھیل ہے اور یہ اہل اسلام کو دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔ بظاہر اہل کتاب اور صلیبی دوستی کا اظہار کرتے ہیں اور یہ فریب خوردہ مسلمان ان اہل کتاب کو مخلص سمجھتے ہیں۔ وہ اہل اسلام کو اتحاد، بھائی چارے اور موالات کی دعوت دیتے ہیں اور مقصد یہ بتاتے ہیں کہ مذہب کا دفاع کرتے ہیں لیکن فریب خوردہ مسلمان چودہ سو سال کی تاریخ کو بھول جاتے ہیں جس میں ان کا رویہ عداوت کا رہا ہے اور اس میں کوئی استثناء بھی نہیں ہے۔ پھر تاریخ تو بڑی بات ہے اور بہت طویل ہے لیکن یہ لوگ اللہ کی ان واضح تعلیمات کو بھی بھول جاتے ہیں جو انہیں ان کا رب براہ راست دے رہا ہے۔ یہ ایسی تعلیم ہے کہ یہ لاریب ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس سے کوئی پہلوتہی نہیں ہو سکتی بشرطیکہ اللہ پر اعتماد ہو، اور اس بات کا یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان نہایت ہی سنجیدہ ہے۔

یہ فریب دینے والے اور فریب خوردہ لوگ اس سلسلے میں اپنی پالیسی کے حق میں قرآن کریم کی وہ آیات پیش کرتے ہیں اور حضور اکرمؐ کی وہ احادیث پیش کرتے ہیں جن کے اندر اہل کتاب کے ساتھ حسن معاملہ کرنے پر زور دیا گیا ہے اور یہ کہ معیشت اور طرز عمل میں ان کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا جائے۔ لیکن یہ لوگ قرآن کریم کی ان تنبیہات و تحذیرات اور فیصلہ کن ممانعت کو بھلا دیتے ہیں جو قرآن کریم اہل کتاب کے ساتھ تعلق موالات قائم کرنے کے

خلاف کرتا ہے اور تفصیل کے ساتھ بتاتا ہے کہ اس حکم کے اسباب کیا ہیں اور یہ کہ اس سلسلے میں اسلامی تحریک کا منصوبہ کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے۔ اسلامی تنظیم کن خطوط پر ہونا چاہئے اور ان کے ساتھ دوستی اور موالات کے تعلقات کو بالکل ختم کرنا چاہئے کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک باہم موالات اور باہم دگر نصرت صرف اسلامی نظام کے قیام کے لئے ہوتی ہے اور اسلام کو عملی زندگی میں قائم کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ تحریک امامت دین کے نصب العین کے بارے میں ہمارے اور اہل کتاب کے درمیان کوئی نکتہ اشتراک سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اگرچہ مسلمانوں اور اہل کتاب کے دین میں ان کی تحریفات سے پہلے کئی نکات مشترک تھے۔ لیکن اب تو صورت حالات یہ ہے کہ وہ ہمارے دشمن ہی اس لئے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور اقامت دین کے نصب العین کے حامل ہیں اور وہ ہم سے راضی تب ہی ہو سکتے ہیں کہ ہم اس نصب العین کو چھوڑ کر یہودی یا عیسائی بن جائیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نص صریح (البقرہ: ۱۲۰) میں فرمایا۔

یہ لوگ قرآن مجید کے حصے بخرے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس سے وہ اجزاء لیتے ہیں جو انہیں پسند ہیں اور ان کی دعوت کی تائید کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو غافل کرتے ہیں' اگرچہ وہ اپنی جگہ درست کیوں نہ ہوں اور یہ لوگ ان آیات کو چھوڑ دیتے ہیں جو ان کی اس فریب کارانہ پالیسی کے بالکل خلاف ہیں۔

ہم اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ ہم اس مسئلے میں اللہ کی بات سنیں۔ اللہ کا کلام اس سلسلے میں نہایت ہی دو ٹوک اور قطعی ہے۔ رہا ان فریب کاروں کا کلام تو وہ ہم سنیں یا نہ سنیں برابر ہے۔

ذرا چند منٹ کے لئے ٹھہریئے! اور اس موضوع پر غور کیجئے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی ازلی دشمنی کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کے ایمان باللہ' ایمان بالرسول اور ایمان بالکتب کے جامع عقیدے کی وجہ سے یہ لوگ ان کے دشمن بنے ہوئے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ایک اور اہم بات بھی بتاتے ہیں۔

(وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ (۵ : ۵۹) "اور تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔" ان کا یہ فسق و فجور بھی اس عداوت اسلام کے اسباب میں سے ایک سبب ہے اس لئے کہ ایک کج رو شخص کو راست رو شخص بہت ہی برا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے اور اس کی تصدیق قرآن کا یہ فقرہ کرتا ہے۔ یہ ایک گہرا نفسیاتی اشارہ ہے اس لئے کہ جو شخص کسی راہ سے کجروی اختیار کرتا ہے وہ یہ دیکھ ہی نہیں سکتا کہ کچھ اور لوگ اس راہ پر چلیں۔ اگر وہ ایسے لوگوں کو دیکھے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا ہے اور صحیح راہ سے منحرف ہو گیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں کا راہ حق پر قائم رہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ منحرف ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ منحرف شخص جادۂ حق پر مستقیم شخص کا دشمن ہوتا ہے اور پھر اس سے محض اس لئے انتقام لیتا ہے کہ وہ سچا ہے یہ انتقامی کاروائی اس لئے ہوتی ہے کہ یہ منحرف شخص اس صالح کو بھی گھیر گھار کر اپنی راہ پر ڈال دے اور اگر وہ بہت ہی سخت ہو اور بات مان کر نہ دیتا ہو تو اسے سرے سے ختم کر دے۔

یہ ایک دائمی اصول ہے اور یہ حضور اکرم ؐ کے دور میں اہل کتاب اور اہل اسلام کے تعلقات کے بارے ہی میں درست نہیں ہے بلکہ یہ مطلق اہل کتاب اور اہل اسلام کی پالیسیوں پر صادق آتا ہے۔ جو شخص بھی کسی صالح گروہ اور اصول پسند جماعت سے نکلتا ہے اس کی سعی یہی ہوتی ہے کہ وہ تمام لوگوں کو اس جماعت سے منحرف کر دے اور فساق و فجار

اور اشرار کے معاشرے میں جنگ ہمیشہ صالح لوگوں کے خلاف ہوتی ہے۔ تمام فساق صالحین کے خلاف جمع ہو جاتے ہیں اور جو لوگ اصولوں سے منحرف ہو چکے ہوتے ہیں' وہ تمام لوگ ان کے دشمن ہوتے ہیں جو اصولوں پر جمے ہوتے ہیں۔ یہ جنگ ایک قدرتی جنگ ہوتی ہے اور یہ اسی اصول پر برپا ہوتی ہے جس کی طرف اس قرآنی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اللہ کے علم میں یہ بات پہلے سے تھی کہ شر کی طرف سے ہروقت بھلائی کی دشمنی ہوتی رہے گی اور حق کے مقابلے میں باطل ہمیشہ کھڑا ہو گا اور ثابت قدمی کے مظاہر کو دیکھ کر فساق و فجار جلیں گے اور جو لوگ اصولوں پر جمے ہوئے ہوں گے ان پر ان فساق و فجار اور منحرفین کو بہت ہی غصہ آئے گا۔

اللہ کو یہ بھی علم تھا کہ بھلائی' سچائی' استقامت اور اصول پرستی کو اپنی مدافعت کرنا ہوگی اور ان کو شر' باطل' فسق اور انحراف کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ لڑنی ہوگی۔ یہ ایک ایسا حتمی معرکہ ہو گا کہ جس میں اہل حق کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہ ہو گا کہ بس وہ اس معرکے میں کود جائیں اور باطل کا مقابلہ کریں۔ اگر وہ یہ معرکہ آرائی نہ کریں گے تو باطل از خود ان پر حملہ آور ہو جائے گا اور سچائی اس سے کسی طرح جان نہ چھڑا سکے گی کیونکہ باطل کا مقصد اسے سرے سے مٹانا ہوتا ہے۔

یہ ایک نہایت ہی غافلانہ اور احمقانہ سوچ ہوگی کہ کوئی حق پرست' اصلاح پسند' صاحب استقامت اور اصولی شخص یہ سوچے کہ' شر' باطل اور فسق و فجور کے داعی اسے آرام سے چھوڑ دیں گے اور وہ حق و باطل کے اس معرکے سے بچ نکلیں گے یا حق و باطل کے درمیان کوئی مصالحت یا معاہدۂ صلح ہو سکتا ہے۔ اگر نہیں تو ان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ ہر وقت اس اٹل معرکے کے لئے تیار رہیں اور خوب سوچ کے ساتھ اور اچھی تیاری کے ساتھ رہیں اور موہوم امن کے لئے دشمن کی چالوں میں نہ آئیں ورنہ دشمن انہیں کھا کر چاٹ جائے گا۔

اس کے بعد جب ہم مطالعہ جاری رکھتے ہیں تو حضور اکرم ﷺ کو اہل کتاب کے مقابلے کے لئے ہدایات دی جاتی ہیں۔ یاد رہے کہ اس سے پہلے یہ بات واضح طور پر بتا دی گئی تھی کہ اہل کتاب کے دل میں اسلامی نظام اور مسلمانوں کے خلاف اس قدر گہری دشمنی کیوں ہے؟ اب یہاں بنی اسرائیل کی تاریخ قدیم کے کچھ اوراق الٹے جاتے ہیں اور یہ کہ انہوں نے اپنے رب کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا؟

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ أُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۶۰﴾

پھر کہو "کیا میں ان لوگوں کی نشاندہی کروں جن کا انجام خدا کے ہاں فاسقوں کے انجام سے بھی بدتر ہے؟ وہ جن پر خدا نے لعنت کی' جن پر اس کا غضب ٹوٹا' جن میں سے بندر اور سور بنائے گئے' جنہوں نے طاغوت کی بندگی کی۔ ان کا

درجہ اور بھی زیادہ برا ہے اور وہ سواء السبیل سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں ۔"

یہاں ہمیں اب یہودیوں کی تاریخ کا مطالعہ کرایا جاتا ہے ۔ یہ وہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہوئی اور ان پر اللہ کا غضب ہوا اور ان کی شکلیں بگاڑ کر' ان سے بندر اور خنزیر بنائے گئے اور پھر بھی ان لوگوں نے طاغوت ہی کی بندگی اختیار کی ۔ ان کے ملعون ہونے اور ان پر اللہ کا غضب آنے کے قصے' قرآن کریم میں بار بار ذکر ہوئے ہیں ۔ نیز قرآن کریم میں ان کے وہ واقعات بھی مذکور ہیں کہ ان میں سے کچھ لوگوں کو بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ کیا گیا ۔ لیکن یہاں ان پر بندگی طاغوت کی جو فرد جرم عائد کی گئی ہے' اس سورہ کے مضامین کے زاویے سے اس کی بڑی اہمیت ہے ۔ اس کی ہم قدرے تفصیلات دیں گے کیونکہ یہ لفظ نہایت اہم اور خاص معنی کے لئے استعمال ہوا ہے ۔

طاغوت کا لفظ ہر اس اقتدار کے لئے استعمال ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے ماخوذ نہ ہو' ہر حکم' حکم طاغوت ہے اور ہر وہ کام طاغوت ہے جو شریعت اسلامی سے ماخوذ نہ ہو ۔ ہر وہ ظلم طاغوت ہے جو برحق نہ ہو' نیز اللہ کی حاکمیت' اللہ کی الوہیت اور اس کے قانون سازی پر دست درازی کرنا طاغوت کی سب سے بڑی قسم ہے اور جو لفظاً اور معناً طاغوت پر صادق آتی ہے ۔

کی عبادت کرتے تھے' یہ بات نہ تھی کہ وہ ان کی عبادت کرتے تھے ۔ حقیقت یہ تھی انہوں نے ارباب اور رہبان کی بنائی ہوئی شریعت کو اپنا لیا تھا اور اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت کو چھوڑ دیا تھا ۔ اس لئے اللہ نے یہ کہا کہ انہوں نے ارباب و رہبان کی بندگی شروع کر دی ہے اور یہ لوگ مشرک ہو گئے ہیں ۔ لفظ طاغوت میں یہ گہرا مفہوم شامل ہے ۔ یعنی وہ اس حکومت کے مطیع تھے جو شریعت پر مبنی نہ تھی اور سرکش تھی ۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ اس حکومت یا ارباب و رہبان کے سامنے سجدے نہ بجا لاتے تھے بلکہ وہ عبادت اس طرح کرتے تھے کہ وہ ان کی اطاعت کرتے تھے ۔ طاغوت کی جب کوئی اطاعت کرتا ہے تو وہ اللہ کے دین اور اللہ کی اطاعت کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں رسول ﷺ کو اس طرف متوجہ فرمایا ہے کہ آپ اہل کتاب کا مقابلہ ان کی اس تاریخ کو پیش نظر رکھ کر کریں اور یہ کہ وہ اسی جزا کے مستحق ہیں جو انہیں ان کی تاریخ میں ملی ۔ گویا یہ یہودی نسلاً بعد نسل وہی قوم ہیں اس لئے کہ ان کی جبلت ایک ہے اور ان کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا ۔

(قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُم بِشَرٍّ مِّن ذَٰلِكَ مَثُوبَةً عِندَ اللَّهِ (۵ : ۶۰) "پھر کہو کیا میں ان لوگوں کی نشاندہی کروں جو انجام کار خدا کے ہاں فاسقوں کے انجام سے بھی بدتر ہے ۔"

یعنی اہل کتاب کی جانب سے اہل اسلام کی دشمنی سے بھی زیادہ خطرناک' وہ اسلام کے خلاف جو سازشیں کرتے ہیں اور اہل ایمان کو محض ایمان کی وجہ سے سزا اور اذیت دیتے ہیں' اس سے بھی زیادہ بری بات ہے اور وہ ہے خدا کی دشمنی اور خدا کا عذاب ۔ بندے کی دشمنی سے خدا کی دشمنی اور عذاب بہت ہی خطرناک ہے ۔ اور اس کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ شرپسند ہیں' گمراہ ہیں اور صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہیں ۔

(أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ (۵ : ۶۰) "ان کا درجہ اور بھی زیادہ برا ہے اور وہ سواء السبیل سے زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں ۔"

یہاں قرآن کریم ان کی کچھ نشانیوں کی صفات کا ذکر کر کے ان کے ساتھ دوستی کرنے اور تعلق موالات قائم کرنے سے مسلمانوں کو متنفر فرماتے ہیں۔ جبکہ اس سے قبل ان کے تاریخی کردار اور ان کے برے انجام کا ذکر ہوا۔ اب مسلمانوں کو' ان کے بعض راز افشاء کر کے' ان سے ڈرایا جاتا ہے اور اس تصویر کشی میں یہودیوں کو زیادہ نمایاں کیا جاتا ہے اس لئے کہ بات اس وقت کے حالات کے بارے میں چل رہی تھی اور اس وقت سب سے بڑا فتنہ یہودی فتنہ ہی تھا۔

وَإِذَا جَآءُوكُمْ قَالُوٓا ءَامَنَّا وَقَد دَّخَلُوا بِالْكُفْرِ
وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهِۦ ۚ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَكْتُمُونَ ﴿٦١﴾ وَتَرَىٰ
كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَٰنِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ
لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٢﴾ لَوْلَا يَنْهَىٰهُمُ الرَّبَّٰنِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَن
قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ﴿٦٣﴾ وَقَالَتِ
الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ ۚ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا ۘ بَلْ يَدَاهُ
مَبْسُوطَتَانِ يُنفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ۚ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّآ أُنزِلَ إِلَيْكَ
مِن رَّبِّكَ طُغْيَٰنًا وَكُفْرًا ۚ وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَٰوَةَ وَالْبَغْضَآءَ إِلَىٰ
يَوْمِ الْقِيَٰمَةِ ۚ كُلَّمَآ أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ ۚ وَيَسْعَوْنَ فِى
الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٦٤﴾

"جب یہ تم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے' حالانکہ کفر لئے ہوئے آئے تھے اور کفر ہی لئے ہوئے واپس گئے اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ ان میں سے بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں اور حرام کے مال کھاتے ہیں۔ بہت بری حرکات ہیں جو

یہ کر رہے ہیں۔کیوں ان کے علماء اور مشائخ انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے' یقیناً بہت ہی برا کارنامہ زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں۔

یہودی کہتے ہیں اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں..... باندھے گئے ان کے ہاتھ اور لعنت پڑی ان پر اس بکواس کی بدولت جو یہ کرتے ہیں........ اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں 'جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کلام تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے وہ ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی و باطل پرستی میں الٹا اضافہ کا موجب بن گیا ہے اور (اس کی پاداش میں) ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے۔جب کبھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اس کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔یہ زمین میں فساد پھیلانے کی سعی کر رہے ہیں مگر اللہ فساد برپا کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

یہ ایسی عبارتیں ہیں جن کے اندر کچھ چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں اور یہ قرآن مجید کا منفرد اسلوب ہے۔صدیاں گزر گئیں لیکن ان لوگوں کی تصاویر آج بھی ان عبارات میں واضح ہیں 'جن کے بارے میں قرآن کریم ان آیات میں بحث کرتا ہے۔یہاں جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ یہودیوں کا ہے 'اس سے آگے پیچھے بات انہی کی ہو رہی ہے۔اگرچہ اس میں بعض وہ لوگ بھی نظر آتے جو مدینہ کے منافقین ہیں۔نظر آتا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ گفتگو شروع کرتے ہیں "بھائی ہم بھی تو ایمان لا چکے ہیں" لیکن اپنی بغل میں کفر چھپائے ہوئے ہیں۔جب آئے تو یہ کفر ان کے ساتھ تھا۔لیکن ان کے منہ میں رام رام ہے اور بغل میں کفر کی چھری ہے۔

یہ گروہ غالباً گروہ تھا یہودیوں جو اتوں کو اسلام کے خلاف سازشیں تیار کرتے تھے' اور ان میں سے بعض دوسروں سے یہ کہتے تھے کہ صبح اس قرآن پر اپنے ایمان کا اعلان کرو اور شام کو پھر کفر کا اعلان کر دو' اور اس طرح اسلامی صفوں میں بے چینی پیدا کرو۔اس طرح ہو سکتا ہے کہ مسلمان بھی قرآن کو ترک کر دیں اور اپنے دین کو چھوڑ دیں یہ اس افراتفری اور شک وشبہ کی فضا کی وجہ سے ہے۔

(وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ (٥: ٦١)) "اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ چھپاتے ہیں۔" یہ اللہ کا کہنا ہے اور اللہ حقائق کے جاننے والے ہیں۔اور اس اعلان سے اہل ایمان کو اطمینان نصیب ہوتا ہے کہ ان کا رب ان کا محافظ اور نگہبان ہے۔وہی انہیں یہودیوں کی سازشوں سے بچا سکتا ہے کیونکہ اللہ کا علم ان کی خفیہ سازشوں پر محیط ہے اور یہ اللہ کی جانب سے ان کو ایک دھمکی ہے کہ اگر وہ باز نہ آئے تو.....

سیاق کلام کو لے کر ذرا آگے بڑھئے۔اس منظر میں ان کی کچھ اور تصاویر آتی ہیں۔

(وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (٥: ٦٢)) "تم دیکھتے ہو کہ ان میں سے بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں اور حرام کے مال کھاتے ہیں۔بہت بری حرکات ہیں جو یہ کر رہے ہیں۔"

مسارعہ باب مفاعلہ ہے۔بہت سے لوگ ہیں جو باہم مقابلہ کر رہے ہیں' گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے سے آگے

بڑھ رہے ہیں اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر حرام مال کھاتے ہیں - یہ تصویر نہایت ہی مکروہ اور بدنما ہے - لیکن جب کسی قوم کی اخلاقی حالت بگڑ جائے اور اس میں فساد سرایت کر جائے تو اس میں ایسی ہی صورت حالات پیدا ہو جایا کرتی ہے - زندگی کی اعلیٰ اقدار ختم ہوتی ہیں ' معاشرے پر شر غالب ہو جاتا ہے اور جب بھی انسان کو ایسے معاشروں کو دیکھنے کا موقعہ ملتا ہے تو یہ پایا جاتا ہے کہ ان میں لوگ شر' گناہ اور ظلم کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں - اس معاشرے کے طاقتور لوگ اپنے دائرے میں اور زبردست لوگ اپنے دائرے میں ظالم ہوتے ہیں - گناہ میں آلودگی اور ظلم ایسے گرے ہوئے فاسد معاشروں میں صرف طاقتور لوگوں تک محدود نہیں ہوتے بلکہ ضعفاء بھی ان جرائم میں ملوث ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ سب لوگ اثم و عدوان کے سیلاب میں بہتے چلے جاتے ہیں - یہ ضعفاء بے شک زبردستوں پر ظلم کرنے پر قادر نہیں ہوتے لیکن یہ ضعفاء پھر آپس میں ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں اور اگر ایک دوسرے پر ظلم نہ بھی نہ کر سکیں تو یہ لوگ پھر اللہ کی حرمتوں پر ہاتھ ڈالتے ہیں اس لئے کہ فاسد معاشروں کے اندر پھر اللہ کے حدود ہی رہ جاتے ہیں جن کو توڑنے کے لئے ان کے سامنے میدان کھلا ہوتا ہے - ایسے میں نہ طاقتور حکام اور نہ ضعفاء محکوم حدود اللہ کی حفاظت کرتے ہیں - غرض جو معاشرہ بھی اخلاقی بگاڑ کا شکار ہو جائے اس میں گناہ کی زندگی اور ظلم کی حرکات کا دور دورہ ہوتا ہے بلکہ گناہ اور ظلم کی طرف دوڑنے کے مقابلے (مسارعت) ہوتے ہیں - لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۵: ۶۲) "بہت بری حرکات ہیں جو یہ کر رہے ہیں -"

یہاں سیاق کلام فاسد معاشروں کی ایک دوسری خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کے علماء اور مشائخ گنگ ہیں ' بولتے ہی نہیں - علماء جو شریعت اور قانون کے نگران اور نگہبان ہیں ' ان کے سامنے قانون توڑے جاتے ہیں - مشائخ جو علم دین کے استاد ہیں ان کے سامنے غلط افکار پھیل رہے ہیں اور وہ منع نہیں کرتے اور ان کے سامنے لوگ گناہ اور ظلم کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھ رہے ہیں -

(لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۵: ۶۳)) "کیوں ان کے علماء اور مشائخ انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے ' یقیناً بہت ہی برا کارنامہ زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں -" جب کوئی معاشرہ اخلاقی اعتبار سے ٹوٹ پھوٹ اور فساد کا شکار ہوتا ہے تو اس کی ایک بڑی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس میں قانون کے نگران قانون شکنی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں - (علماء) ' اخلاقی رہبر (مشائخ) بداخلاقیوں اور ظلم پر سکوت کرتے ہیں اور بنی اسرائیل کی کیا خصوصیات تھیں؟ (كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ) "وہ اس برائی سے ایک دوسرے کو منع نہ کرتے تھے جو وہ کرتے تھے -" یہ قرآن ہی نے دوسری جگہ ان کے بارے میں کہا ہے -

ایک صحت مند ' زندہ ' قوی اور فاضلانہ معاشرے کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ہر طرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دور دورہ ہوتا ہے - اور اس میں ہر وقت ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کا مشن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوتا ہے اور اس کے عوام کے اندر بھی ایسے عناصر غالب ہوتے ہیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف کان

دھرتے ہیں - اور معاشرے کے اوپر اس قسم کی روایات کی گرفت ہو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ختم نہ کیا جاسکتا ہو اور نہ ایسے لوگوں کا بال بیکا کیا جاسکتا ہو جو یہ کام کرتے ہیں - یہ بات اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کی شکل میں برپا ہونے والے ایک صحت مند معاشرے کے بارے میں فرمائی ہے -

(كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ) "تم خیر امت ہو، حکم دیتے ہو نیکی کا اور منع کرتے ہو منکر سے اور اللہ پر ایمان لانے والے ہو۔" اور بنی اسرائیل جو ایک فاسد معاشرے کے خوگر تھے ان کے بارے میں ہے (كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ) "وہ اس برائی سے ایک دوسرے کو منع نہ کرتے تھے جس کا وہ ارتکاب کرتے تھے -" یہ بات گویا دو قسم کے معاشروں کا مابہ الامتیاز ہے -

یہاں یہودیوں کے علماء اور مشائخ کو ملامت کی جاتی ہے کہ وہ کیوں گنگ ہو گئے ہیں اور وہ ان لوگوں کے خلاف آواز کیوں نہیں اٹھاتے جو گناہ کی زندگی، باہم ظلم کی روش اور حرام خوری میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ رہے ہیں اور کتاب اللہ کی حفاظت کا جو فریضہ ان پر عائد کیا گیا تھا اسے وہ پورا نہیں کرتے -

یہ ان تمام لوگوں کے لئے ڈرانے والے کی پکار ہے جو اہل دین اور علماء کہلاتے ہیں - معاشرے کی اصلاح یا فساد ان لوگوں پر موقوف ہے جو اس معاشرے، دین اور قانون کے نمائندے ہوتے ہیں یعنی علماء و مشائخ - اگر وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض ادا کرتے ہیں تو اصلاح ہو گی اور اگر وہ خاموش رہتے ہیں تو بگاڑ ہو گا اور جس طرح ہم نے اس سے قبل ظلال القرآن میں کہا ہے کہ اس کام کے لئے ایک حکومت درکار ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرے اور یہ نظام دعوت و تبلیغ سے علیحدہ ہو اس لئے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے اقتدار کی ضرورت ہوتی ہے - ایسا اقتدار جس کے ذریعے امر بالمعروف اور عن المنکر ایک بامعنی چیز ہو - محض زبانی جمع خرچ نہ ہو -

اب ان لوگوں کی فکری کجی اور اخلاقی بے راہ روی کی ایک مثال دی جاتی ہے - قرآن کریم ان گمراہ اور ذلیل یہودیوں کی کج فکری اور بدروی کی ایک نہایت ہی گھاؤنی مثال دیتا ہے -

(غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ

(٥ : ٦٤)) "یہودی کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں..... باندھے گئے ان کے ہاتھ، اور لعنت پڑی ان پر اس بکواس کی بدولت جو یہ کرتے ہیں....... اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں، جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے -"

یہ یہودیوں کا اللہ کے بارے میں نہایت ہی برا تصور تھا - ان کی بہت سی بدظنیاں قرآن نے جگہ جگہ نقل کی ہیں - ایک جگہ انہوں نے کہا "اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں -" اور یہ انہوں نے اس وقت کہا کہ جب ان سے اسلامی مقاصد کے لئے چندہ مانگا گیا - اللہ کے ہاتھ بندھے ہونے سے عربی محاورے کے مطابق مراد یہ تھی کہ اللہ بخیل ہے - ان کے خیال کے مطابق اللہ لوگوں کو بہت کم ضروریات دیتا ہے - انہیں بھی کم دیا جاتا ہے اس لئے وہ کس طرح خرچ کریں؟ ان کا

شعور اس قدر بگڑ گیا تھا اور ان کے دل اس قدر سخت ہو گئے تھے کہ انہوں نے اللہ جل شانہ کے لئے لفظ بخیل بھی استعمال نہ کیا' بلکہ اس سے بھی برا لفظ استعمال کیا جو زیادہ توہین آمیز ہے۔یعنی اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔

اللہ یہی جواب ان کو ان کے الفاظ میں دیتے ہیں۔ ان پر لعنت بھیجی جاتی ہے۔ اور ان کو راندۂ درگاہ قرار دیا جاتا ہے۔ (غُلَّتْ اَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا (٥: ٦٤)) ان کے ہاتھ باندھ دیئے گئے اور اس لئے باندھ دیئے گئے کہ انہوں نے یہ بکواس کی اور ان پر لعنت کر دی گئی اور ایسا ہی ہوا کہ تاریخ میں بنی اسرائیل سے زیادہ کوئی بخیل اور زرپرست قوم نہیں ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کی گری ہوئی سوچ درست فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی ذات کبریا کے بارے میں وضاحت فرماتے ہیں کہ وہ بڑا کریم ہے۔ اس کے ہاتھ کھلے ہیں اور وہ اپنے بندوں پر بلاحساب فیضان رحمت کرتا ہے۔

(بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ (٥: ٦٤)) "اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔" اللہ کے عطیے تو جاری ہیں' اور تمام مخلوقات پر ان کی بارش ہو رہی ہے' دیکھنے والوں کے لئے بالکل واضح ہیں۔ دیکھو اللہ کے ہاتھ کھلے ہیں' اس کا فضل وکرم بھرپور ہے' اس کے عطیے عظیم ہیں' اپنی زبان سے خود بولتے ہیں' ہاں یہودیوں کو وہ نظر نہیں آتے' اس لئے کہ وہ رات دن دولت جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ رات دن انکار و نافرمانی میں غرق ہیں اور رات دن اللہ کی ذات کے بارے میں ان کا رویہ توہین آمیز ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کے مستقبل کے بارے میں ایک منظر پیش فرماتے ہیں کہ ان کا حشر کیا ہونے والا ہے اور یہ حشر ان کا اس لئے ہونے والا ہے کہ یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پروانہ رسالت آنے پر جل بھن گئے' خصوصاً اس وجہ سے کہ اس رسالت کے ذریعے ان کے خلاف قدیم و جدید فرد جرم عائد کر دی گئی۔

(وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا (٥: ٦٤))
"حقیقت یہ ہے کہ جو کلام تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے وہ ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی و باطل پرستی میں الٹا اضافہ کا موجب بن گیا ہے۔"

اس کینہ اور حسد کی وجہ سے کہ رسالت حضور ؐ کو کیوں مل گئی اور پھر مزید اس وجہ سے کہ اس رسالت نے ان کی تمام گندی باتوں کو بے کم و کاست ریکارڈ کر دیا یہ لوگ سرکشی اور کفر و انکار کی راہ پر مزید آگے ہی بڑھیں گے۔ اس لئے کہ انہوں نے ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا ایمان کے برعکس راہ کفر ہی پر یہ لوگ آگے بڑھتے چلے جائیں گے۔ اپنے آپ کو بڑا سمجھنے اور مزید کفر کرنے کی وجہ سے اور اپنی فطری سرکشی اور طغیان کی وجہ سے یہ لوگ اس راہ میں مزید آگے بڑھیں گے اور حضور اکرم ؐ ان کے لئے روز وبال جان بنتے چلے جائیں گے۔

مستقبل کے لئے ان کی ایک دوسری خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کے بھی دشمن ہوں گے۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ سخت بغض ہو گا اور جب بھی وہ اسلام کے خلاف کوئی زبردست سازش تیار کریں گے اور جنگ کی آگ بھڑکائیں گے اور تحریک اسلامی کے خلاف کوئی جنگی اسکیم تیار کریں گے اللہ تعالیٰ اس کو ختم کر دے گا

اور جماعت مسلمہ کو بچالے گا۔

وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ، كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (۵ : ۶۴) ”ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے جب کبھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اس کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔“ آج تک یہودی فرقے ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ اگرچہ آج کے دور میں بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ عالمی یہودیت متحد ہوگئی ہے۔ اور اسلامی ممالک میں وہ جابجا جنگ کے شعلے بھڑکا رہی ہے اور کامیاب ہے۔ لیکن بات یہ نہیں ہے کہ ہم تاریخ کے ایک مختصر عرصے کو سامنے رکھ کر بات کریں یا کسی ایک منظر کو اور کسی صورت حال کے ایک پہلو ہی کو دیکھ کر فیصلہ کر دیں۔ گزشتہ چودہ سو سال کے اندر بلکہ اسلام سے پہلے کے ادوار میں بھی، یہودی ذلیل اور باہم دست وگریباں رہے ہیں اور اس کی وجہ سے ہمیشہ جلاوطن اور دربدر پھرتے رہے ہیں۔ ان کا آخری انجام بھی وہی ہوگا جس پر وہ پہلے تھے چاہے ان کے اردگرد جس قدر سہارے ہوں۔ لیکن اصل کنجی تو یہ ہے کہ آیا دنیا میں کوئی اسلامی رجمنٹ بھی ہے یا نہیں؟ یہ اسلامی رجمنٹ ہی ہے جس کے ہاتھوں ان کی ذلت لکھی ہوئی ہے۔ چونکہ اس وقت ایمان میں پختہ کار لوگوں کی رجمنٹ مفقود ہے، جو اللہ کے وعدوں پر بھروسہ کرتی ہے اور جو دست قدرت کا آلہ اور ذریعہ بنتی ہے اور اس رجمنٹ کے ذریعے اللہ وہ کچھ کرتے ہیں جو وہ چاہتے ہیں۔

ہاں جب یہ امت اسلامی نظریہ حیات پر جمع ہوگی، ایمان کی حقیقت اپنے اندر پیدا کرلے گی، اپنی پوری زندگی کو اسلامی نظام حیات کے مطابق بنائے گی اور اسلامی شریعت کو نافذ کرے گی، اس دن پھر اللہ کا وعدہ اس کی مخلوقات میں سے ان شریر ترین لوگوں پر صادق ہوگا اور یہودیوں کو اس بات کا اچھی طرح احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ترکش میں شرارت اور سازش کے جو تیر بھی ہیں وہ اسلامی صفوں کے خلاف چلاتے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں جس قدر گرفت ہے وہ اسے ان اسلامی دستوں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں جو احیائے علوم کی تحریک کے ہراول دستے بن رہے ہیں۔ یہ یہودی تمام دنیا میں چھان بین کر رہے ہیں اور اپنے گماشتوں کے ذریعے یہ جگہ جگہ ان اسلامی رجمنٹوں کا سرکچل رہے ہیں۔ نہایت ہی وحشیانہ جرائم اور نہایت ہی ناپسندیدہ کاروائیاں وہ اسلامی لیڈرشپ کے خلاف کر رہے ہیں۔ وہ اس اسلامی رجمنٹ کے خلاف کسی بھی عہد موالات اور کسی بھی ذمے اور کسی بھی قومی اور بین الاقوامی چارٹر کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ لیکن اللہ نے اپنے معاملات اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے ہیں اور اس کا وعدہ سچا ہے کہ حزب اللہ ہی غالب ہوگی۔

(وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ، كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (۵ : ۶۴)) ”اور ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے۔ جب کبھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں 'اللہ' اس کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔“

یہ شر و فساد جس کے نمائندے اور جس کے ماڈل یہود ہیں، دائمی امر نہیں ہے۔ ایک دن آئے گا کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسا دستہ اٹھائے گا جو اسے پاش پاش کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ فساد فی الارض کو پسند نہیں کرتا اور جس چیز کو اللہ پسند نہیں

کرنا تو ضروری ہے کہ ایک ایسی قوت اٹھائے جو اسے پاش پاش کر دے۔

(وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (۵: ۶۴)) "یہ زمین میں فساد پھیلانے کی سعی کر رہے ہیں مگر اللہ فساد برپا کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

اس سبق کے آخر میں ایک عظیم ایمانی اصول کا ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ خطہ ارض پر دین کے قیام اور اسلامی نظام کے قیام کے معنی یہ ہیں کہ اس میں اصلاحی کام ہوں گے 'لوگوں کو روزگار کے مواقع ملیں گے ' ان کی دنیاوی فلاح و بہبود کے کام زوروں پر ہوں گے اور فلاح دنیا کے ساتھ ساتھ انہیں فلاح آخرت بھی نصیب ہوگی۔ اس خطہ ارض پر پھر دنیا اور آخرت میں فرق نہ ہو گا اور نہ وہاں دین دنیا میں تضاد ہو گا یہ نظام بیک وقت دنیا اور آخرت کا ضامن ہو گا اور اس میں دین اور دنیا علیحدہ نہ ہوں گے۔ اس عظیم تبدیلی کا ذکر اس بات کے بعد کیا جاتا ہے کہ اہل کتاب نے اللہ کے دین سے انحراف کر لیا ہے۔ وہ حرام خور ہو گئے ہیں اور انہوں نے احکام شریعت کے مفہوم کو بدل دیا ہے۔ یہ کام انہوں نے محض دنیاوی مفادات کے حصول کے لئے کیا ہے حالانکہ اگر وہ اپنے اصل دین کا اتباع کرتے تو یہ ان کے لئے دنیا و آخرت اور آسمان و زمین دونوں میں ان کے لئے اچھا ہوتا بشرطیکہ وہ صحیح راہ اختیار کرتے۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأَدْخَلْنَاهُمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ ۚ مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ﴿٦٦﴾

"اگر (اس سرکشی کے بجائے) یہ اہل کتاب ایمان لے آتے اور خدا ترسی کی روش اختیار کرتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور ان کو نعمت بھری جنتوں میں پہنچاتے۔ کاش انہوں نے توراۃ اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ ایسا کرتے تو ان کے لئے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے ابلتا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ راست رو بھی ہیں 'لیکن ان کی اکثریت سخت بدعمل ہے۔"

ان دو آیات کے اندر اسلامی تصور حیات کا ایک عظیم اصول بیان کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دو آیات سے انسانی زندگی کی ایک اساسی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں اس اصول کی مناسب وضاحت کی ضرورت ہے اور دور جدید میں اس وضاحت کی ضرورت پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ عقل انسانی اور انسانی پیمانے اور انسانی حالات بدلتے رہتے ہیں اور ان میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ دور جدید کے ان اضطرابات اور فکری انتشار کی وجہ سے اس عظیم حقیقت کے سمجھنے میں بھی انسان صحیح راہ گم کر سکتا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ اہل کتاب کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ ایمان لائیں اور اگر وہ ایمان لے آئیں تو اللہ ان کی تمام

تقصیرات معاف کر دے گا اور انہیں جنت نعیم میں داخل کر دے گا اور یہ تو ہے جزائے آخرت - لیکن اگر انہوں نے اپنی اس دنیا کی زندگی میں اللہ کا وہ نظام رائج کیا ہوتا جو تورات اور انجیل میں ان کے ہاں موجود تھا اور جو تعلیمات اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل کی تھیں جن میں انہوں نے بعد میں تحریف کر دی تھی' تو اگر وہ ایسا بھی کرتے تو ان کی کم از کم یہ دنیاوی زندگی تو اچھی طرح گزرتی - ان کے ہاں ترقی ہوتی اور ان کے رزق حلال میں اضافہ ہوتا اور ان کے اوپر آسمان سے رزق نازل ہوتا اور ان کے نیچے سے زمین ان کے لئے سونا اگلتی' پیداوار زیادہ ہوتی اور ان کے درمیان وہ خوب تقسیم ہوتی اور ان کے دنیاوی امور و مسائل سب کے سب حل ہو جاتے - لیکن افسوس کہ نہ تو وہ ایمان لاتے ہیں' نہ خدا ترسی کی روش اختیار کرتے ہیں اور نہ ہی وہ اسلامی نظام زندگی نافذ کرتے ہیں........ ہاں ان میں سے قلیل لوگ ان کی تاریخ میں ایسے رہے ہیں جو صراط مستقیم پر چلنے والے تھے اور اپنے نفوس کے خلاف انہوں نے ظلم نہ کیا تھا لیکن ان میں سے زیادہ تر لوگ بدعمل تھے - وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ (۵ : ۶۶) یوں ان دو آیات سے بالکل واضح نظر آتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی کا قیام اور اس دنیا کی زندگی میں اسلام پر عمل پیرا ہونا صرف اس بات کا ضامن نہیں ہے کہ وہ ایسا کرنے والوں کے لئے اخروی زندگی کی بھلائی کے اسباب فراہم کر دے گا - اگرچہ اسلامی نظام کے قیام کا بڑا اور دائمی مقصد فلاح اخروی کا حصول ہے - وہ بھی نہایت ہی اہم اور دائمی مقصد ہے لیکن اقامت دین اس دنیا کے مسائل کا بھی حل ہے اور دین قائم کرنے والوں کی دنیا بھی اچھی ہوگی - اس دنیا کے وسائل زیادہ ہوں گے' ان کی تقسیم بہت ہی اچھی طرح ہوگی - معاشرے کے اندر ایک کفالتی نظام قائم ہوگا اور معاشرہ دنیاوی اعتبار سے خود کفیل ہو جائے گا - اللہ تعالیٰ اسلامی معاشرے کے اندر پائی جانے والی معاشی خوشحالی کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں - اس تصویر کشی میں فیضان اور کثرت کا اظہار ہے - (لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم (۵ : ۶۶)) "تو ان کے اوپر سے رزق برستا اور وہ کھاتے اور نیچے سے ابلتا" یہاں یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق یہ بات نہیں ہے کہ ایک راستہ علیحدہ ہے جو فلاح اخروی پر منتج ہوتا ہے بلکہ صرف ایک ہی راستہ ہے جس کے ذریعے دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی نصیب ہوتی ہے اور جس وقت انسان اس راستے سے ادھر ادھر ہو گیا تو سمجھو کہ اس کی دنیا و آخرت خراب ہوگئی - یہ واحد راستہ ایمان' خدا ترسی اور اقامت دین کا راستہ ہے اور دینی نظام کے تحت زندگی گزارنے کا راستہ ہے -

یہ نظام صرف عقیدے' صرف نظریئے اور صرف قلبی شعور کا نام نہیں ہے - بے شک یہ چیزیں بھی اس کے اندر ہیں لیکن درحقیقت یہ قلبی شعور کے ساتھ انسانی زندگی کے لئے ایک عملی نظام بھی ہے جس کی اقامت فرض ہے اور اس کے مطابق زندگی کو تبدیل کرنا فرض ہے - اور اقامت دین کے ساتھ ساتھ تقویٰ کی بھی ضرورت ہے - تقویٰ ہی وہ معیار ہے جس کے ذریعے اس دنیا میں زندگی کو درست کیا جاسکتا ہے - اسی کے ذریعے اس دنیا کی زندگی کا نظام درست ہو سکتا ہے اور رزق کی فراوانی ہو سکتی ہے - ملک کے اندر پیداوار بڑھ سکتی ہے' اس کی اچھی تقسیم ہو سکتی ہے تاکہ سب لوگ کھائیں اور پئیں اور اس نظام کے اندر ان کے لئے آسمان سے رزق برسے اور زمین ابلے -

ایمانی نظام حیات میں دین داری کے لئے ترک دنیا لازمی نہیں ہے اور نہ ہی سعادت اخروی کے حصول کے لئے دنیا میں ذلت اور خواری ضروری ہے - آخرت کے لئے اس دنیا سے گزرنے کے سوا کوئی اور راہ نہیں ہے - یہ وہ باتیں ہیں جنہوں نے آج دنیا کے لوگوں کے افکار کو دھندلا کر دیا ہے اور ان افکار کی وجہ سے لوگوں کی عملی زندگی بھی متاثر ہوتی ہے -

لوگوں کی سوچ میں دنیا اور آخرت کے راستے جدا جدا ہیں اور اس کی وجہ سے ان کے طرز عمل میں بھی ایک عظیم فرق واقعہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک عام آدمی کی سوچ میں دنیا اور آخرت کے امتزاج کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ اس طرح اس کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی دنیا کی سوچ میں بھی کوئی ایسی صورت نہیں ہے کہ دنیا اور آخرت کی راہ ایک ہو جائے۔ ان لوگوں کی سوچ یہ ہے کہ یہ لوگ یا تو دنیا اختیار کریں گے اس صورت میں انہیں آخرت کو ترک کرنا ہو گا اور یا وہ آخرت کی راہ لیں گے اور اس کے لئے انہیں دنیا ترک کرنا پڑے گی۔ ایسا کوئی تصور نہیں ہے جس میں دنیا اور آخرت ایک ہی نظام میں جمع ہو جائیں اس لئے کہ اس دور میں لوگوں کی حقیقی صورت حال' اس کے طور طریقے انسان کو اس طرح سوچنے پر مجبور کرتے تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ گمراہ جاہلیت' بے خدا جاہلیت اور اسلامی نظام سے بے خبر جاہلیت نے دنیا اور آخرت کے راستوں کو دور دور اور جدا کر دیا ہے۔ وہ ان دونوں راستوں کے درمیان فاصلے بڑھاتی چلی جاتی ہے اور دین کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتی ہے۔ اس جاہلیت نے یہ لازم کر دیا ہے کہ معاشرے کے اندر نمایاں ہونے اور دنیا کے مفادات حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ راہ آخرت کو سرے سے بھلا دیا جائے۔ ان دینی ہدایات کو قربان کر دیا جائے بلکہ اخلاقی قدروں کو ترک کر لیا جائے اور بلند تصورات اور پاکیزہ طرز عمل کو چھوڑ دیا جائے اور یہی وہ امور ہیں جن پر ہمارا دین زور دیتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ آخرت کے طلبگار ہیں انہوں نے اپنے اوپر لازم کر دیا ہے کہ وہ اس زندگی کی تگ و دو سے علیحدہ ہو جائیں کیونکہ اس زندگی کے طور طریقے گندے ہیں اور ان ذرائع سے جو لوگ معاشرے میں نمایاں ہوتے ہیں اور منافع کماتے ہیں وہ غلط طور طریقوں میں ملوث ہیں۔ کاروبار کے تمام ذرائع گندے ہیں اور انہیں صاف نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان کو دین و اخلاق کے مطابق بنایا جاسکتا ہے۔ یہ ذرائع اللہ کی مرضی کے مطابق بن ہی نہیں سکتے اس لئے اگر دین میں کمال حاصل کرنا ہے تو دنیا سے قطع تعلق کرنا ہو گا۔

یہ جدید جاہلیت اس موجودہ صورت حالات کو حتمی سمجھتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ اس بری صورت حال سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ دنیا و آخرت کے درمیان اتحاد ممکن نہیں' نہ ان دو راستوں کا ملانا ممکن ہے' حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ کوئی ناقابل اتحاد صورت حال نہیں ہے۔ دنیا و آخرت کے درمیان تضاد اور دنیا اور آخرت کے راستوں کے درمیان یہ جدائی جو جاہلیت نے پیدا کر دی ہے یہ کوئی آخری اور فیصلہ کن حقیقت نہیں ہے' نہ یہ صورت حال ناقابل تغیر اور ناقابل اصلاح ہے بلکہ موجودہ صورت حال نہایت ہی غیر فطری ہے اور اس کا تبدیل کیا جانا لازمی ہے۔ یہ تو ایک عارضی چیز ہے اور موجودہ حالات انسانیت پر مسلط کئے ہوئے حالات ہیں۔

اصل حقیقت وہ ہے جس میں دنیا و آخرت کی راہ ایک ہو۔ آخرت کی بھلائی کی راہ بھی وہی ہو' جس میں دنیا کی بھلائی ہو' اور جس میں دنیا کا پیداواری عمل' ترقی اور نشوونما' کثرت پیداوار اور زراعت اور زمین کی ترقی کی راہ ہی ثواب آخرت کا باعث اور ذریعہ ثابت ہو۔ جس طرح یہ کام اس دنیا کی بھلائی کے کام ہیں اسی طرح ایمانداری' خدا ترسی اور عمل صالح بھی اس دنیا کی تعمیر و ترقی کا باعث ہوں۔ جس طرح یہ امور اللہ کی رضا کا سبب ہوں اور ان پر آخرت میں ثواب ملے اسی طرح یہ امور ہماری دنیاوی ترقی کا بھی باعث ہوں۔

انسانی فطرت اور مزاج کے مطابق اور اصلی راہ اور سیدھی راہ یہی ہے۔ اس فطری اور اصلی راہ پر انسانیت کا

گامزن ہونا صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانی زندگی اس نظام کے مطابق ڈھل جائے جو اللہ کا پسندیدہ ہے اس لئے کہ یہ نظام ہی تمام اعمال کو عبادت بنا دیتا ہے اور یہی تو وہ نظام ہے جو انسان کے عمل خلافت فی الارض کو عبادت بنا دیتا ہے۔ خلافت فی الارض کیا چیز ہے' یہ عبارت ہے عمل اور پیداوار سے' زیادہ سے زیادہ ترقی اور نشوونما سے۔ انسان کو جو رزق آسمانوں کے ذریعے ملتا ہے اس کی منصفانہ تقسیم خلافت ہے۔ ذرا غور کیجئے اللہ تعالیٰ اس آیت میں کیا فرماتے ہیں۔

اسلامی تصور حیات کے مطابق اس زمین پر انسان اللہ کا خلیفہ ہے۔ یہ خلافت اسے اللہ کے اذن سے حاصل ہوئی ہے اور یہ ایک مشروط خلافت ہے۔ وہ یہ کہ عمل خلافت اسلامی منہاج کے مطابق ہو اور نظام خلافت نظام شریعت کے مطابق چلے۔ انسان اللہ کا مطیع ہو اور آخرت کے ثواب کا طلبگار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کا کوئی عمل جس سے دنیا میں کوئی پیداوار حاصل ہو یا وہ عمل جس سے خام مال کام میں لایا جائے اور لوگوں کے لئے اسے مفید بنایا جائے' خواہ وہ زمین کے اندر ہو یا مافوق کائنات کے اندر ہو' یہ تمام کام اس نظریہ خلافت فی الارض کے تحت آتے ہیں اور عبادت قرار پاتے ہیں۔ اس خلافت کے عمل ہی کا نتیجہ ہے کہ اگر انسان اس پر درست طور پر چلے تو اسے زمین کے اندر سے بھی رزق ملے گا اور آسمانوں سے بھی اس پر فیضان اور نزول برکات ہو گا۔ یہ بات قرآن کریم کے انداز تعبیر سے اچھی طرح معلوم ہو سکتی ہے۔

اسلامی تصور حیات کے مطابق جو انسان زمین کے سینے کو نہیں چیرتا' اس سے چشمے اور نہریں نہیں نکالتا اور اس کائنات کے دوسرے قدرتی وسائل کو کام میں نہیں لاتا' وہ اللہ کا نافرمان اور گنہگار ہے اور وہ فریضہ خلافت فی الارض کی ادائیگی سے پہلوتہی کرتا ہے جس کے لئے اسے اللہ تعالیٰ نے خلیفہ بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا۔ (اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً) "میں زمین کے اوپر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔"

اور دوسری جگہ ہے۔ (وَسَخَّرَلَکُمْ مَّافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ) "اور اس نے مسخر کیا تمہارے لئے وہ سب کچھ جو آسمانوں اور زمینوں میں ہے خود اپنی جانب سے۔" اگر کوئی شخص ترقیات کا کام نہیں کرتا تو وہ گویا اس رزق کو معطل رکھتا ہے جو اللہ نے اس کے لئے پیدا کیا ہے اور جب اس نے اپنی دنیا کو خسارے میں ڈال دیا تو اس کے ساتھ ہی آخرت کا خسارہ بھی ہو گیا۔

اس نظریے کے مطابق اسلامی منہاج حیات دنیاوی عمل اور اخروی کامیابی کے درمیان ایک حسین امتزاج اور ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔ اس لئے اسلام انسان کو یہ مشورہ نہیں دیتا کہ وہ ترک دنیا کرے تاکہ اسے آخرت ملے۔ وہ یہ مشورہ بھی نہیں دیتا کہ وہ آخرت ترک کر دے تاکہ اس کی دنیا بہتر ہو جائے۔ اس لئے کہ دنیا اور آخرت کے درمیان' اسلامی تصور حیات کے مطابق کوئی تضاد نہیں ہے۔ یہ نہ متضاد ہیں اور نہ متبادل ہیں۔

اس دنیا کے تمام انسان اسلامی تصور حیات کے مطابق اللہ کی جانب سے مقام خلافت فی الارض پر فائز ہیں۔ تمام اقوام و ملل کے انسان خلیفۃ اللہ ہیں۔ جنس انسان خلیفہ ہے لیکن کیا ایک فرد انسان کی ذمہ داری اس دنیا کے معاملے میں کوئی مختلف ہے۔ نہیں وہ بھی خلیفہ ہے' اسلامی تصور حیات کے مطابق جو انسانی جماعت کا فریضہ ہے وہ ایک انسان پر بھی فرض ہے۔ فرد اور معاشرے کے فرائض میں کوئی فرق' کوئی تضاد اور تعارض ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اسلام ہر فرد پر یہ فرض کرتا ہے کہ وہ اپنی پوری جسمانی اور عقلی قوت کو زمین و آسمان کے قدرتی وسائل رزق کی ترقی میں صرف کرے

لیکن یہ عمل و انتاج اور یہ کثرت پیداوار اللہ کے لئے ہو۔اس عمل میں وہ کوئی ظلم نہ کرے ' کسی کے ساتھ غداری نہ کرے ۔ اس میں چوری نہ کرے ' خیانت نہ کرے ' حرام نہ کھائے ' اپنے دوسرے بھائی کا حق نہ مارے ' اور اس کے پاس جو وسائل جمع ہوں ان کو تقسیم کرے اگرچہ یہ وسائل اس کی انفرادی ملکیت میں ہوں اور اسے ان کے رکھنے کا پورا پورا حق ہو۔ معاشرے کو اس کے وسائل سے اور اس کی پیداوار سے وہی کچھ لینے کا حق ہو جو اللہ نے مقرر کیا ہے ۔ان حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے کام کرنے والے کے اس کام کو اسلامی نظام ایک عبادت قرار دیتا ہے۔ اس عبادت کا فائدہ اسے دنیا میں بھی ہو گا اور آخرت میں بھی ہو گا۔پھر یہ اسلامی نظام حیات ایک فرد اور اس کے رب کے درمیان ایک مخصوص رابطہ بھی پیدا کرتا ہے اور یہ مخصوص رابطہ ان عبادات کے ذریعے ہوتا ہے جو اسلامی نظام نے تعلق باللہ کے لئے تجویز کی ہیں تاکہ اس فرد انسان کا تعلق اپنے رب کے ساتھ قائم رہے ۔مثلاً بذریعہ فرضیت نماز دن میں پانچ مرتبہ یہ تعلق تازہ سے تازہ ہوتا رہے ۔رمضان شریف میں سال میں ایک ماہ بذریعہ صیام رمضان قوی سے قوی تر ہوتا رہے ۔ پھر ساری عمر میں کم از کم ایک بار حج کر کے یہ رابطہ اب مزید مستحکم سے مستحکم ہوتا چلا جائے اور وہ مذکورہ بالا جو پیداواری عمل کرتا ہے اس سے سال میں ایک بار زکوۃ ادا کر کے یہ رابطہ مضبوط ہوتا رہے ۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عبادات کی اسلامی نظام میں کیا قدر و قیمت ہے ۔یہ گویا اللہ کے ساتھ ایک قسم کا تجدید عہد ہے اور ان کے ذریعے انسان اللہ کے نازل کردہ مکمل نظام حیات سے مربوط ہو جاتا ہے ۔اس مکمل نظام کے نفاذ کے لئے اس کی جو ذمہ داریاں ہیں ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے وہ گویا تجدید عہد کرتا ہے ۔اس نظام حیات کی ذمہ داریوں میں وہ ذمہ داریاں بھی [illegible] ہیں جو اس نے اس کرۂ ارض پر پیداواری عمل ' دولت کی منصفانہ تقسیم اور لوگوں کے درمیان جب اختلافات پیدا ہو جائیں تو ان کے مقدمات کے فیصلوں کے سلسلے میں ادا کرنی ہیں۔ ان عبادات کے ذریعے اس کے اندر از سر نو یہ شعور تازہ ہوتا ہے کہ اللہ اس کا اس سلسلے میں مددگار ہے ۔ وہ تمام فرائض جو اسلام کے اجتماعی نظام کے قیام اور اس کے انتظام و انصرام کے سلسلے میں اس پر عائد ہوتے ہیں اللہ ان میں اس کا مددگار ہے ۔اس راستے میں اس کی اپنی خواہشات ' نفسانی تقاضے ' لوگوں کا بغض و عناد ' لوگوں کا انحراف اور فسق و فجور وغیرہ جو رکاوٹیں پیدا کریں گے اللہ اس میں معاون ہو گا۔

یہ اسلامی عبادات اور اس دنیا کی سرگرمیاں مثلاً پیداواری عمل ' تقسیم دولت اور انتظامیہ اور عدلیہ کے کام اور اللہ کے نظام کے قیام کے سلسلے میں اقدام و دفاع اور اسلامی مملکت کے قیام وغیرہ کے تمام کاموں سے کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے ۔ایمان ' خدا ترسی اور تقویٰ بھی اس اسلامی نظام کا ایک حصہ ہیں جس طرح کا حصہ دوسرے امور حیات ہیں ۔ چنانچہ یہی وہ تصور حیات ہے جس کے مطابق ایمان اور تقویٰ اس دنیا میں فراوانی رزق اور کثرت پیداوار کا باعث بنتے ہیں اور جس کی صراحت یہ دو آیات کرتی ہیں ۔

اسلامی تصور حیات اور اس سے مستنبط ہونے والا اسلامی نظام زندگی کو اخروی زندگی کو اس زندگی پر ترجیح دیتا ہے اور نہ اس زندگی کو اخروی زندگی پر ترجیح دیتا ہے ۔اسلامی تصور کے مطابق دنیا و آخرت سفر انسانی کے دو مراحل ہیں اور یہ ایک ہی راستے کی دو منزلیں ہیں ۔ ایک ہی راہ اور ایک ہی جدوجہد سے دونوں کا حصول ہوتا ہے لیکن دنیا و آخرت کا یہ معجون صرف اسلامی نظام زندگی کے طریق کار کے مطابق تیار ہو سکتا ہے ۔یہ مقصد صرف اسلامی نظام کے اتباع میں

حاصل ہو سکتا ہے اور وہ بھی صرف اس صورت میں کہ دنیا میں خالص اسلامی نظام رائج کیا جائے۔اس کے اندر کوئی دوسرا نظام داخل نہ کیا جائے' نہ اس کے اندر کوئی ایسی چیز ہو جو اسلامی نظام کی نہ ہو۔ نہ اس کے اندر کسی شخص کے ذاتی رجحانات کو شامل کیا جائے۔

اسلامی نظام اور اس پر اسلامی تصور حیات ایمان' تقویٰ اور صالحیت کی ایسی تعبیر نہیں کرتا کہ وہ دنیاوی سرگرمیوں' پیداوار' نشوونما' زندگی کی تحسین و تجمیل کے مخالف یا متبادل ہو' یا ایسا بھی تصور نہیں دیتا کہ وہ آخرت اور حصول جنت کے لئے ان کو اخروی راہ کی نشاندہی تو کرے مگر ان کے لئے دنیاوی بہتری اور دنیا کو جنت بنانے کے لئے آزاد چھوڑ دے کہ وہ اپنے لئے خود ہی کوئی راہ بنائیں جس طرح چاہیں۔ یہ تصور ان لوگوں کا ہے جنہوں نے اس دور جدید میں اسلام کا محض سطحی مطالعہ کیا ہے۔رہا اسلامی تصور حیات تو اس کے اندر تمام سرگرمیاں' تمام پیداواری اعمال' نشوونما کے طریقے' اور اس زندگی کی ہر قسم کی تحسین و تجمیل اسلام کا تقاضا ہیں اور تصور خلافت فی الارض کے فرائض ہیں جبکہ یہ خلافت تمام انسانوں کا حق ہے۔ایمان' عبادت' اصلاح اور تقویٰ وہ رابطے' وہ ضابطے' وہ محرکات اور وہ دواعی ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کی زندگی میں اسلامی نظام عملاً قائم ہوتا ہے۔یہ دونوں چیزیں مل کر انسان کو جنت ارضی اور جنت سماوی کا اہل اور مستحق بناتی ہیں۔یہی ہے صحیح راستہ اور اس کے مطابق الدین اور عملی مادی زندگی کے درمیان کوئی دوئی اور تضاد نہیں ہے۔جس طرح اس وقت تمام کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی مادی جاہلیتوں نے یہ صورت حال بنا دی ہے کہ دین اور مادیت کے درمیان فرق کر دیا گیا ہے۔اس سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ الجھن پیدا ہوتی ہے کہ آخرت کے حصول کے لئے ترک دنیا لازمی ہے اور یہ کہ کسی تصور اور کسی عملی نظام کے مطابق دنیا و آخرت کے درمیان اجتماع ممکن نہیں ہے اور نہ ہی دنیا و آخرت اکٹھے ہو سکتے ہیں۔

یہ مکروہ فرق جو دنیا اور آخرت کے راستوں کے اندر روا رکھا گیا ہے' دنیاوی اعمال اور اخروی اعمال کے درمیان جو لائن کھینچ دی گئی ہے' روحانی ترقی اور مادی ترقی کے درمیان جو بعد المشرقین پیدا کر دیا گیا ہے اور دنیاوی زندگی میں کامیابی اور اخروی زندگی کی فلاح کے درمیان جو بعد پیدا کر دیا گیا ہے۔یہ مکروہ جدائی انسان پر تقدیر الٰہی نے نہیں عائد کی۔نہ قضا و قدر کے احکام الٰہیہ نے ایسی کوئی تفریق کی ہے۔یہ تو ایک نہایت ہی مکروہ بوجھ ہے جو انسانیت نے خود اپنے اوپر عائد کیا ہے اور یہ اس نے اس لئے عائد کر لیا ہے کہ اس نے اسلامی نظام زندگی کو اپنی زندگی سے جلاوطن کر دیا ہے اور اپنے لئے از خود نظامہائے زندگی گھڑ لئے ہیں جو اسلامی زندگی سے متضاد اور مخالف ہیں۔

یہ وہ بوجھ ہے جس نے انسان کے اعصاب کو توڑ دیا ہے اور اس کی دنیاوی زندگی بھی تلخ ہو گئی ہے۔اس کی وجہ سے انسان کو جو اخروی ہلاکت ہوگی وہ اس سے بھی زیادہ سخت اور بہت ہی تلخ ہوگی۔لیکن یہ لوگ اس از خود عائد کردہ فریضے کو تسلسل کے ساتھ پورا کرتے چلے جاتے ہیں۔

اس وجہ سے ان کی زندگی نہایت تلخ ہو گئی ہے۔وہ تحیر' دل تنگی اور فکری پریشانی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ایسا کیوں ہے اس لئے کہ وہ اللہ پر ایمان لانا بھی چاہتے ہیں اور ایسے معاشرے میں بھی زندہ رہ رہے ہیں اور ایسے بین الاقوامی حالات میں بھی رہ رہے ہیں جس کے طور طریقے' جس کے افکار و تصورات اور جس کا تمام کاروبار اور جس کے تمام وسائل کسب و معاش اور جس میں کامیابی کے تمام راستے اللہ کے راستے سے متضاد ہیں۔اس میں دینی تصورات اور دینی

عقائد اور مروجہ اخلاقیات کے درمیان تضاد ہے' اس کا طرز عمل اس کے قوانین اور ضابطے اور اس کی اقدار اور ترجیحات تمام کی تمام دین اور ضمیر کے خلاف ہیں۔

اس وقت پوری انسانیت اس بدبختی کا شکار ہے' چاہے وہ مادی اور الحادی مذاہب کی پیرو ہو یا کسی ایسے مادی مذہب کے تحت زندگی بسر کر رہی ہو جس کے پیروکار اگرچہ مذہب کو مانتے ہوں لیکن مذہب کو عملی زندگی کے دائرے سے دور رکھے ہوئے ہوں، یہ مذاہب ایسا سوچتے ہیں یا ان کے لئے انسانیت کے دشمن ایسی سوچ رائج کرتے ہیں کہ "دین" اللہ کے لئے ہے اور یہ زندگی لوگوں کے لئے ہے اور یہ کہ دین' اخلاق اور شعور اور عبادت پر مشتمل ہوتا ہے اور لوگوں کی عام زندگی کا نظام قانون اور طرز عمل اور پیداواری مشغولیات سب کی سب دین کے دائرے سے باہر ہوتی ہیں۔

اس وقت پوری دنیا ایک جبری ٹیکس کے طور پر یہ بھاری قیمت ادا کر رہی ہے۔ بدبختی' انتہائی قلق' حیرانی' پریشانی اور زندگی کا روحانی خلا ایک ایسا ٹیکس ہے جو انسان نے خود اپنے اوپر عائد کر رکھا ہے۔ یہ ٹیکس اسے اس لئے ادا کرنا پڑتا ہے کہ یہ دنیا اسلامی نظام زندگی کو قبول نہیں کرتی جس میں دنیا اور آخرت کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے بلکہ اس نظام کے اجزائے ترکیبی میں دنیا اور آخرت دونوں شامل ہیں۔ اس نظام میں دنیا میں حاصل ہونے والی سہولت و آرام اور آخرت میں حاصل ہونے والے آرام کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے بلکہ ان کے اندر مکمل ہم آہنگی ہے۔

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے' یہ کہ بعض اقوام جو ایمان سے بھی محروم ہیں' نہ ان کے اندر خدا خوفی ہے اور نہ وہ اسلامی منہاج حیات کو تسلیم کرتی ہیں لیکن ان کے ہاں دنیاوی پیداوار' دنیاوی سہولتیں ریات زندگی کی بڑی کثرت پائی جاتی ہے۔ بے شک بعض ادوار میں دنیا کی تاریخ میں بعض عارضی وقفے ایسے رہے ہیں لیکن یہ وقفے دیرپا نہیں رہے۔ اس لئے ہم ان وقفوں کے اندر پائی جانے والی زندگی کو اللہ کی سنن ثانیہ قرار نہیں دے سکتے۔ بہت جلد ہی ایسی امتوں اور سوسائٹیوں کے اندر دین و دنیا کی اس تفریق کے برے نتائج نمودار ہوئے ہیں اور آج کے دور میں لادینی معاشروں کے اندر درج ذیل برے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔

۱۔ ان معاشروں کے اندر دولت کی تقسیم کے اندر توازن نہیں رہا' بعض لوگ زیادہ امیر اور بعض زیادہ غریب ہو گئے ہیں۔ ان معاشروں کے اندر بے پناہ مشکلات اور کینہ پروریاں پیدا ہو گئیں اور پھر خفیہ ایجنسیوں اور طبقاتی کشمکش کی وجہ سے آنے والے انقلابات کے خوف چھائے رہتے ہیں اور تمام لوگوں کی زندگیاں تلخی کا شکار ہیں۔

۲۔ بعض قوموں کے اندر نہایت گھٹن' جبر اور دباؤ کی فضا قائم ہو گئی ہے۔ ان اقوام نے چاہا کہ زبردستی دولت کو غیر فطری طریقے کے مطابق لوگوں کے اندر تقسیم کیا جائے۔ اس غیر فطری تقسیم دولت کے نتیجے میں سخت توڑ پھوڑ اور خوف و ہراس اور قتل و غارت معاشروں کی عادت بن گئی۔ اس جبری تقسیم دولت کے نتیجے میں ان معاشروں میں نہایت ہی تشدد کا رواج ہوا۔ یہ جبری نظام انسانیت پر وہ مصیبت لایا کہ تمام لوگوں کا اطمینان غارت ہو گیا اور لوگ آرام اور اطمینان کی ایک رات کے لئے ترس گئے۔

۳۔ ان معاشروں کے اندر نفسیاتی اور اخلاقی بیماریوں نے جنم لیا اور اس کی وجہ سے جلد یا بدیر ان مادی معاشروں کو ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونا پڑے گا اس لئے کہ ہر سرگرمی' مادی ترقیاں اور تقسیم دولت کے نظام کو بھی تو اخلاقی ضوابط درکار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مادی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں لوگ قانون کی دھجیاں

بکھیر دیتے ہیں اور اس وقت ان تمام ممالک کے قانونی نظام کو عوام کی جانب سے کوئی اخلاقی تائید حاصل نہیں ہے۔

۴۔ ان نظاموں میں جہاں دین و دنیا کی تفریق ہوئی ہے لوگ اعصابی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آج دنیا کے نہایت ہی ترقی یافتہ ممالک کے اندر اعصابی بیماریاں سب سے زیادہ پائی جاتی ہیں اور ان کی اس بے اخلاق مادی ترقی نے ان کی ذہنی قوتوں اور قوت برداشت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ اس کی وجہ سے ان ممالک کے اندر پیداواری عمل اور پیداوار بھی متاثر ہو رہی ہے' خود اقتصادی ترقی اور مادی سہولیات میں کمی ہو رہی ہے اور یہ وہ بڑے بڑے نتائج ہیں جو کافی واضح ہو کر ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

۵۔ اس کے علاوہ وہ عظیم تباہی 'جس سے تمام انسانیت لرزاں ہے' جس کا خطرہ ہر وقت سروں پر کھڑا ہے اور جس کی وجہ سے دنیا مضطرب ہے وہ خطرہ تباہ کن 'مکمل طور پر تباہ کن جنگ کا ہے۔ یہ خطرہ ہر انسان کے اعصاب کو متاثر کر رہا ہے' چاہے وہ جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں اور اس کی وجہ سے بھی کئی قسم کی بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ سکتہ' عارضہ قلب' دماغی عارضہ اور اقدام خودکشی جیسی امراض جس طرح مغربی معاشرہ کے اندر پھیلی ہوئی ہیں' اس طرح دنیا کے دوسرے ممالک میں نہیں ہیں۔

۶۔ یہ تمام آثار تمام ترقی یافتہ ممالک کے اندر واضح طور پر ظاہر ہو رہے ہیں اور جو قومیں اس کے نتیجے میں تباہی اور ٹوٹ پھوٹ کی طرف بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں ان میں سے ممتاز ترین فرانس ہے جو ہر لحاظ سے زوال کی طرف بڑھ رہا ہے۔ فرانس کی تباہی دوسروں کے لئے عبرت ہے اور اس تباہی کا سبب صرف یہ ہے کہ لوگوں نے اللہ کے ربانی نظام کو دنیاوی ترقی کے میدان سے خارج البلد کر دیا ہے۔ دنیا اور آخرت کی راہیں جدا کر دی گئی ہیں۔ دین کو انسان کی زندگی سے نکال دیا گیا ہے۔ لوگوں نے آخرت کے لئے زندگی کا نظام اللہ سے لینا شروع کر دیا ہے اور دنیا کے لئے زندگی کا نظام وہ لوگوں سے لیتے ہیں اور اسلامی نظام اور لوگوں کے درمیان مکمل دوئی ہو گئی ہے۔

قرآن کریم نے اس عظیم اصول کو جس طرح وضع کیا ہے اس پر اپنے اس تبصرے کو ختم کرنے سے پہلے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اسلامی نظام جس نے ایمان' تقویٰ اور انسان کی واقعی زندگی کے درمیان جو حسین امتزاج پیدا کیا ہے اور جس طرح اخلاقیات کو عمل پیہم اور نظریہ خلافت فی الارض سے منسلک کیا ہے' تو یہی وہ توازن ہے جو اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب اور دنیا میں بسنے والی تمام انسانی سوسائٹیوں کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔ اگر وہ اپنے اندر یہ حسین امتزاج پیدا کریں گے تو وہ رزق وافر پائیں گے۔ آسمان ان کے لئے اپنے خزانے برسائے گا اور زمین اپنے خزانے اگل دے گی۔ اس امتزاج کی صورت میں اگر ان سے دنیا میں کوئی اخلاقی کوتاہیاں بھی ہوں گی تو بھی آخرت میں وہ جنت میں داخل ہوں گے اور دنیا میں ان کو فردوس ارضی ملے گی جس میں وافر ضروریات' امن و سلامتی اور اطمینان قلب ہو گا اور آخرت میں جنت ملے گی جس میں نعیم مقیم ہو گا اور رضائے الٰہی ہو گی۔

لیکن ان تمام حقائق کے ہوتے ہوئے بھی اور اس کی تاکید کرتے ہوئے بھی ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ اسلامی نظام کا مرکزی ستون اور پہلا قاعدہ ایمان' تقویٰ اور اسلامی نظام کا قیام ہی ہے۔ جب اسلامی نظام قائم ہو جائے تو فعالیت' پیداوار' ترقی اور تبدیلی جیسے عوامل خودبخود وجود میں آ جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ

ربط پیدا ہو جانے سے زندگی کے تمام امور کے اندر انسان کا ذوق بدل جاتا ہے۔ تمام اقدار بلند ہو جاتی ہیں۔ زندگی کے پیمانے درست ہو جاتے ہیں۔ اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام حیات کا یہ اصل الاصول ہے۔ تمام دوسری چیزیں اسی اصول بلکہ اصل الاصول کے بعد وجود میں آتی ہیں۔ تمام شاخیں اس سے پھوٹتی ہیں اور اس اصول کی طرف راجع ہوتی ہیں اور دنیا و آخرت کے تمام معاملات نہایت ہی توازن اور تناسق میں طے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اب یہ بات آپ پلے سے باندھ لیں کہ ایمان 'تقویٰ' عبادت 'اللہ سے ربط' عمل الی اللہ اور زندگی میں شریعت کے قیام سے اللہ کو کیا فائدہ ہے۔ یہ سب امور تو انسان ہی کی بھلائی کے لئے ہیں۔ انسانی زندگی کے درست کرنے ہی کے لئے تو ہیں۔ اللہ تو غنی بادشاہ ہے۔ اسلامی نظام زندگی نے تمام امور کو ایمان باللہ اور تقویٰ پر موقوف کر دیا ہے۔ اگر ایمان نہیں ہے تو عمل باطل ہے۔ تمام سرگرمیاں جو اس اصول پر مبنی نہ ہوں کالعدم ہیں' محض ہوا و غبار ہیں' نسیاً' منسیاً ہیں اور ہوا میں تحلیل ہونے والی ہیں' یہ کیوں؟ کیا ان سے اللہ کو کوئی فائدہ ہے اگر تمام لوگ ایمان لائیں تو اللہ کو کوئی چیز ملتی ہے' کیا لوگوں کے تقویٰ اور اسلامی نظام حیات کے مقام سے اللہ کو کوئی فائدہ ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ ان چیزوں کے سوا لوگوں کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس کے سوا ان کی فلاح ممکن بھی نہیں ہے۔

حضرت ابوذر غفاری ﷺ ایک حدیث قدسی میں حضور ؐ سے روایت فرماتے ہیں' اللہ نے فرمایا!

''اے میرے بندو! میں نے تو اپنے اوپر ظلم حرام کر لیا ہے' اور اسے میں نے تمہارے درمیان بھی حرام قرار دے دیا ہے۔ اس لئے باہم ظلم نہ کرو۔ اے بندو! تم میں سے صرف وہی ہدایت پر ہو گا جسے میں نے ہدایت دی باقی سب گمراہ ہوں گے۔ اس لئے ہدایت مجھ ہی سے طلب کرو میں تمہیں ہدایت دوں گا۔ اے میرے بندو! تم میں سے سب بھوکے رہیں گے الا وہ شخص کہ اسے میں نے کھانا دیا۔ لہٰذا مجھ ہی سے رزق طلب کرو۔ میں تمہیں ضرور رزق دوں گا۔ اے میرے بندو! تم میں سے سب ننگے ہیں' ماسوائے اس شخص کے جسے میں پہنا دوں۔ اس لئے مجھ ہی سے پوشاک طلب کرو' میں تمہیں پوشاک دوں گا۔ اے میرے بندو! تم رات اور دن غلطیاں کرتے ہو اور میں تمہارے سب گناہ معاف کرتا ہوں۔ لہٰذا تم مجھ ہی سے مغفرت طلب کرو' میں تمہیں بخش دوں گا۔ اے میرے بندو! تم مجھے نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہیں رکھتے کہ مجھے نقصان پہنچاؤ اور تم مجھے نفع پہنچانے کی طاقت ہی نہیں رکھتے کہ مجھے نفع پہنچاؤ۔ اے میرے بندو! اگر تم سے پہلا شخص اور آخری شخص اور تمہارے سب انسان اور سب جنات اس معیار پر پہنچ جائیں جس پر تم میں کوئی ایک زیادہ سے زیادہ متقی ہو سکتا ہے تو اس سے میری شہنشاہیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اے میرے بندو! اگر تم سے پہلا شخص اور آخری شخص اور تمہارے سب انسان اور سب جن اس قدر برے ہو جائیں جس طرح تم میں کوئی ایک شخص ہو سکتا ہے تو وہ میری ملکیت میں سے کوئی چیز کم نہیں کر سکتا۔ اے میرے بندو! اگر تمہارا پہلا شخص اور آخری شخص اور تمہارے سب انسان اور سب جن ایک ہی میدان میں جمع ہو جائیں اور مجھ سے مانگیں اور میں ہر ایک کے سوال کو قبول کروں تو میرے خزانوں میں کوئی کمی نہ ہو گی' صرف اس قدر کمی ہو گی جس طرح کوئی سوئی دریا میں ڈالے (اور نکالے)۔ اے میرے بندو! یہ تو تمہارے اعمال ہیں کہ میں تمہارے لئے گنتا ہوں اور پھر میں ان پر تمہیں جزا دیتا ہوں۔ اگر کسی کو کوئی بھلائی نصیب ہو تو اسے چاہئے کہ اس پر میرا شکر ادا کرے۔ اور اگر کسی کو بھلائی کے سوا کچھ ملے تو وہ صرف اپنے نفس کو ملامت کرے۔ (روایت مسلم)

صرف یہ اساس ہے جس پر ہمیں ایمان 'تقویٰ' عبادت اور اسلامی نظام حیات کے قیام اور نفاذ شریعت کو سمجھنا چاہئے۔ یہ سب چیزیں تو ہمارے لئے ہیں' انسانوں کے لئے ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ ان تمام امور کی ضرورت اس لئے درپیش ہوتی ہے کہ یہ انسان کی اصلاح وفلاح کے لئے ضروری ہیں' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اب اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ شرط جو اہل کتاب کے لئے عائد کی گئی ہے' صرف ان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اس لئے کہ اہل کتاب کے لئے جس شرط کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان کی فلاح ایمان اور تقویٰ اور ان کے ہاں نازل کردہ کتب میں اسلامی نظام کے قیام پر موقوف ہے یعنی اقامت نظام تورات و انجیل پر' ان ہدایات پر جو ان کے نبیوں کی زبانی دی گئیں. تو یہ شرط ان کے لئے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کے دور کے لئے لگائی گئی ہے۔ یہی شرط اب ہمارے لئے بھی ہے جن کی طرف قرآن کریم نازل کیا گیا ہے۔ یہ شرط خود بخود ان لوگوں پر عائد ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اس لئے کہ مسلمان تو منصوص طور پر قرآن کریم پر بھی ایمان لاتے ہیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے اور دوسری کتابوں پر بھی ایمان لاتے ہیں جو ان سے پہلے نازل کی گئیں۔ ان کے لئے ان احکام پر عمل کرنا بھی ضروری ہے جو ان پر نازل ہوئے اور ان پر بھی جو ان سے پہلے کی شریعتوں میں نازل ہوئے تھے اور اسلامی نظام نے ان کو منسوخ نہیں کیا ہے۔ وہ تو مسلمان ہیں اور اسلام ان کا دین ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں تو دین اسلام کے سوا کوئی اور دین سرے سے مقبول ہی نہیں ہے۔ نہ وہ اب اس دین کے سوا کوئی اور دین کسی کی جانب سے قبول کرتا ہے۔

لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل کتاب کے لئے جو شرط برائے فلاح دنیا و آخرت مقرر کی گئی تھی وہ ہمارے لئے بطریق اولیٰ شرط فلاح ہے۔ اس کے ساتھ جو عہد کیا گیا تھا وہ ہمارے ساتھ بھی عہد ہے۔ اور یہ لوگ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ اللہ کی اس پسند کو قبول کریں جو اللہ نے ان کے لئے پسند کیا تھا۔ اللہ کی اس شرط سے فائدہ اٹھائیں جس سے ان کے گناہ معاف ہوئے اور آخرت میں وہ جنت میں داخل ہوئے۔ اور یہ کہ ان پر آسمان سے رزق کی بارش ہوئی اور زمین نے ان کے لئے سونا اگلا۔

اہل اسلام تو اہل کتاب کے مقابلے میں زیادہ اس بات کے مستحق ہیں کہ اللہ کی اس شرط کو پورا کر کے فائدہ اٹھائیں' اس لئے کہ وہ اس وقت عالم اسلام میں بھوک' افلاس' خوف' بیماری اور غربت میں مبتلا ہیں اور پورے عالم اسلام کی یہی حالت ہے۔ یا اس ملک میں جو کبھی عالم اسلامی تھا اللہ کی شرط قائم ہے اور اس پر عمل کا طریقہ معلوم ہے اگر وہ سمجھیں یا سمجھنے کی کوشش کریں مگر افسوس کہ وہ نہیں سمجھتے۔

---○○○---

درس نمبر۱۵ ایک نظر میں

اس سبق میں بھی اہل کتاب کے حالات کو لیا گیا ہے۔ یہود و نصاریٰ دونوں کے حالات کو۔ ان کے نظریاتی انحراف کا اظہار کیا گیا ہے اور ان کی تاریخی بداعمالیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ خصوصاً یہودیوں کا ذکر تفصیل سے ہوا ہے۔ ان کے اور رسول اللہ کے باہمی تعلق کی تحدید کی گئی ہے۔ نیز مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلق کو طے کیا گیا ہے۔ پھر ان کے حوالے سے حضور اکرم ؐ اور مسلمانوں کے فرائض کا تعین کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ان عظیم نظریاتی امور کو بھی طے کیا گیا ہے جو اسلامی تصور حیات کی اساس کا درجہ رکھتے ہیں۔ نیز جماعت مسلمہ کے لئے تحریکی اصول کار اور حدود بھی وضع کئے گئے ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ان منحرف مقاصد و تصورات کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

حضور اکرم ؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ تک جو تعلیم آرہی ہے آپ اسے لوگوں تک پہنچا دیں۔ پوری کی پوری تعلیمات لوگوں تک منتقل کر دیں۔ ان میں سے کوئی چیز رہنے نہ پائے اور حالات سے متاثر ہو کر کسی چیز کو مؤخر نہ کیا جائے۔ نیز ان لوگوں کی خواہشات کے ساتھ ان تعلیمات کے اندر جو تضاد ہے کہیں اس سے ڈر کر یا جاہلی معاشرے کے طور طریقوں سے متاثر ہو کر کوئی چیز ترک یا مؤخر نہ کی جائے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ نے فریضہ تبلیغ کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہے۔

اور یہ جو حضور ؐ کو حکم دیا ہے کہ آپ بے کم و کاست پہنچا دیں اس میں سرفہرست یہ ہے کہ اہل کتاب کو یہ صاف صاف کہہ دیا جائے کہ جب تک تم توراۃ اور انجیل کو قائم نہ کرو اس وقت تک تمہاری کوئی پوزیشن نہیں ہے۔ اس کے بعد جو اللہ کی طرف سے ہدایات آئی ہیں ان کی تبلیغ بھی ضروری ہے۔ یہ تبلیغ اس طرح قطعی 'کھل کر' صریح اور دو ٹوک انداز میں ہو کہ اس میں کسی قسم کا احتمال نہ ہو۔ آپ یہ بھی اعلان کر دیں کہ یہودیوں نے انبیاء کو قتل کیا اور اللہ کے ساتھ طے پا جانے والے میثاق کو توڑ کر کفر کا ارتکاب کیا۔ نصاریٰ نے بھی عقیدۂ توحید میں تحریف کر کے حضرت مسیح کو خدا سمجھا اور پھر یہ کہ عقیدہ تثلیث اختیار کیا۔ یہ بھی صریح کفر کے مترادف ہے۔ آپ یہ بھی اعلان کر دیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ عقیدہ شرک کے نتیجے میں ان پر جنت حرام ہوگی اور یہ بھی اعلان کر دیں کہ بنی اسرائیل پر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کے ذریعے بھی لعنت و ملامت کی گئی اس لئے کہ وہ نافرمان اور بے عمل ہو گئے تھے۔

اس سبق کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اہل کتاب اہل اسلام کے مقابلے میں اہل شرک کی حمایت کر رہے ہیں۔ یہ بری حرکت وہ اس لئے کر رہے ہیں کہ ان کا اللہ کی ذات پر صحیح طرح ایمان نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تو وہ بہرحال نہیں مانتے۔ لیکن اگر وہ اب نبی آخر الزمان پر ایمان نہ لائیں گے تو وہ مومن نہ ہوں گے۔ اس اجمالی تبصرے کے بعد آپ تفصیلات ملاحظہ فرمائیں۔

درس نمبر ۵۱ تشریح آیات

آیت نمبر ۶۷ --- تا --- ۸۲

يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٦٧﴾ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ ۗ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۖ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٦٨﴾

”اے پیغمبرؐ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔ اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔ یقین رکھو کہ وہ کافروں کو ہدایت کی راہ ہرگز نہ دکھائے گا۔ صاف کہہ دو کہ ”اے اہل کتاب' تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔“ ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دے گا۔ مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔ (یقین جانو کہ یہاں اجارہ کسی کا بھی نہیں ہے)

رسول اللہؐ کے لئے قطعی حکم یہ ہے کہ آپ تمام پیغام کی جو اللہ نے نازل کیا ہے پوری پوری تبلیغ کریں' دنیا کے اندر پائے جانے والے حالات میں سے کسی حال کو بھی کوئی اہمیت نہ دیں اور اپنی دعوت کو بالکل کھل کر صاف بیان کر دیں۔ یہ آپ کا فریضہ رسالت ہے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے فریضہ رسالت کا حق ادا نہ کیا

اور اپنے فرائض پوری طرح سرانجام نہ دیجئے ۔ رہی یہ بات کہ دشمن تمہارا کچھ بگاڑ لیں گے تو یقین رکھو کہ اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا اور جس کو بچانے کا ذمہ اللہ نے لے لے تو لوگ اللہ کے مقابلے میں حیثیت کیا رکھتے ہیں کہ اس کو کوئی نقصان پہنچا سکیں گے ۔

سچائی کے حاملین کو شش و پنج کرنا مناسب نہیں ہے ۔ انہیں چاہئے کہ صاف صاف اور دو ٹوک بات کریں ۔ رہے اہل باطل اور مخالفین حق تو وہ جو چاہیں کہیں جو چاہیں کر لیں ۔ اس لئے کہ سچوں کو لوگوں کی خواہشات کا لحاظ رکھتے ہوئے نرم بات نہیں کرنا چاہئے اور نہ اس سلسلے میں لوگوں کی خواہش کا لحاظ رکھنا چاہئے ۔ سچی بات کو نہایت ہی قوت اور زور دار طریقے سے کہنا چاہئے تاکہ وہ سیدھی لوگوں کے قلوب کے اندر اتر جائے ۔ حاملین حق جب اپنی بات زور دار طریقے سے کرتے ہیں تو جن لوگوں کے دل میں ہدایت قبول کرنے کی ذرا سی استعداد بھی ہوتی ہے تو وہ بات ان تک پہنچ جاتی ہے ۔ اور اگر سچائی کو دو ٹوک الفاظ میں پیش کیا جائے تو اس کے لئے وہ دل نرم نہیں ہوتے جن میں قبول حق کی استعداد نہیں ہوتی اور یہ اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں کہ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ داعی ان کے ساتھ نرمی کرے اور کچھ مطالبات واپس لے لے تب وہ دعوت کو قبول کریں گے ۔ وہ اپنی طرف سے شرائط عائد کرتے ہیں ۔

(انَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ (۵:۶۷)) "اللہ کافروں کو ہدایت کی راہ دکھانے والا نہیں ہے ۔" لہٰذا آپ سچائی کو دو ٹوک الفاظ میں بیان کریں ، جامع اور مانع الفاظ میں بیان کریں ۔ رہی یہ بات کہ کون مانتا ہے اور کون نہیں مانتا ، یہ موقوف اس امر پر ہے کہ سننے والے کے اندر قبول حق کی استعداد ہے یا نہیں یا یہ کہ اس کا دل اس سچائی کے لئے کھلا ہے یا نہیں ۔ مداہنت اور لحاظ و ملاحظہ کرنے اور سچ بات پوری طرح نہ کہنے پر ہدایت کا دارومدار نہیں ہے نہ اس سے کچھ فائدہ ہوتا ہے ۔

نظریاتی اعتبار سے فیصلہ کن بات کرنے کا مقصد یہ بھی نہیں ہے کہ انسان نہایت خشک اور سخت لہجے میں بات کرے ۔ اللہ نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم بھی دیا ہے کہ آپ نہایت ہی حکمت اور اچھے انداز میں نصیحت فرمائیں ۔ اس لئے قرآنی ہدایات میں کوئی تعارض نہیں ہے یعنی کلمہ حکمت اور موعظہ حسنہ اور دو ٹوک اور فیصلہ کن بات کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے ۔ ایک تو نفس بات ہے یا کسی بات کے عناصر ترکیبی ہیں اور دوسرا وہ انداز ہے جس انداز میں اس بات کو لوگوں تک پہنچانا مطلوب ہے ۔ جہاں تک نفس بات اور پیغام حق کا تعلق ہے وہ بے کم و کاست پہنچایا جائے ۔ پوری پوری بات پہنچائی جائے اور اس میں کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اختیار نہ کی جائے ۔ اس لئے کہ عقیدہ اور نظریہ ایک ایسی حقیقت ہوتی ہے جس کے اجزاء نہیں ہو سکتے ۔ ہاں بات کے پہنچانے کے انداز میں نرمی ہو سکتی ہے ۔ ابتدائے بعثت سے حضور ؐ نہایت ہی حکمت سے وعظ فرماتے تھے اور بات نہایت ہی اچھے انداز سے کرتے تھے لیکن بات دو ٹوک ہوتی تھی ۔ آپ اللہ کے حکم سے اس طرح فرمایا کرتے تھے ۔ "اے لوگو ! جنہوں نے کفر کیا ہے ، میں ان بتوں کی بندگی نہیں کرتا جن کی بندگی تم کرتے ہو ۔" آپ صاف کہتے کہ تم کافر ہو ' اور بات بھی صاف کہتے کہ میں تمہارے معبودوں کی بندگی نہیں کرتا اور نہ ہی آپ نے وہ مصالحتی کوششیں منظور کیں جن کا مقصد یہ تھا کہ کچھ لو اور کچھ دو ' نہ آپ نے کبھی مداہنت کی حالانکہ وہ تمنائیں کرتے تھے کہ آپ ایسا کریں ۔ آپ نے کبھی کفار سے یہ نہ کہا کہ تم جس نظام

پر عامل ہو' میں تو اس میں چند معمولی تبدیلیاں لاتا ہوں بلکہ آپ یہ فرماتے کہ تم لوگ سراسر باطل پر ہو اور یہ کہ وہ کامل سچائی لے کر آئے ہیں۔ آپ سچائی کی بات نہایت ہی زور سے کرتے' پوری پوری کرتے لیکن ایسے انداز میں کرتے کہ اس میں کرختگی نہ ہوتی اور نہ سخت مزاجی ہوتی۔ قول لین ہوتا۔ یہاں اس سورہ میں آپ کو حکم یہ دیا جاتا ہے

(یٰاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ (۵:۶۷))

"اے پیغمبر' جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے' وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا' اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔ یقین رکھو کہ وہ کافروں کو (تمہارے مقابلہ میں) کامیابی کی راہ ہرگز نہ دکھائے گا۔"

یہاں اس آیت سے پہلے اور بعد میں آنے والی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مقصد یہ ہے کہ اہل کتاب کو واضح الفاظ میں اور دو ٹوک انداز میں بتایا جائے کہ وہ جس موقف پر جمے ہوئے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔ اور یہ بتا دیا جائے کہ ان کا موقف حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتا۔ نہ ان کا دین' دین ہے نہ ان کا عقیدہ صحیح عقیدہ اور نہ ان کا ایمان مقبول ہے۔ اس لئے کہ ان کی یہ چیزیں خود تورات اور انجیل کے مطابق نہیں ہیں۔ نہ ربانی ہدایات کے مطابق ہیں۔ اس لئے ان کے یہ دعاوی سراسر باطل ہیں کہ وہ اہل کتاب ہیں یا یہ کہ وہ کوئی نظریہ رکھتے ہیں یا یہ کہ وہ دیندار ہیں اور دین سماوی کے پیروکار ہیں۔

(قُلْ یٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۵:۶۸)) صاف کہہ دو کہ "اے اہل کتاب' تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ توراۃ اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔"

جس وقت حضور ؐ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپ ؐ اہل کتاب کے سامنے ان کے دین' ان کے عقیدے اور ان کے ایمان کے بارے میں یہ حقیقت واشگاف الفاظ میں بیان کریں کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور نہ وہ کسی ٹھوس حقیقت پر مبنی ہیں' تو اس وقت وہ اپنی کتابیں باقاعدہ پڑھتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو یہودی اور نصرانی کہتے تھے۔ ان کا دعوے یہ تھا کہ وہ اہل ایمان ہیں لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے موقف پر جو فیصلہ کن تبصرہ کرنے کو کہا گیا اس میں یہ اعلان مضمر تھا کہ اپنے بارے میں ان کے تمام دعاوی غلط ہیں' اس لئے کہ "دین" صرف الفاظ کا نام نہیں ہے جسے کوئی زبان سے ادا کر دے۔ نہ دین کتابوں کا نام ہے جنہیں ترتیل اور خوش الحانی سے پڑھ لیا جائے۔ نہ دین کوئی ایسی صفت ہے جو موروثی طور پر مل جاتی ہو۔ بلکہ دین تو ایک نظام زندگی ہوتا ہے اور دین کے اجزاء میں وہ عقیدہ اور نظریہ بھی شامل ہوتا ہے جو دلوں کے اندر ہوتا ہے' وہ عبادات بھی ہوتی ہیں جو مراسم عبودیت کی شکل میں ادا ہوتی ہیں۔ اس میں وہ نظام بندگی بھی ہوتا ہے جس پر ایک مکمل نظام زندگی استوار ہوتا ہے۔ جب تک وہ اس پورے نظام تورات کو قائم نہیں کرتے تو ان کی

حیثیت یہ ہوگی کہ وہ سرے سے دین پر نہیں ہیں ۔ نہ اہل کتاب میں اور نہ اہل دین و عقیدہ میں اور یہی اعلان رسول اللہ کو کرنے کا حکم دیا گیا کہ ان سے کہہ دیں کہ وہ اپنے لئے ان چیزوں میں سے کسی شے کو Claim نہ کریں ۔

اقامت تورات کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ اہل کتاب حضرت محمد ؐ کے لائے ہوئے دین پر عمل کریں اس لئے کہ ان سے اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لیا تھا کہ وہ تمام رسولوں پر ایمان لائیں اور جو رسول بھی آیا ' اس کی نصرت کریں گے اور مدد دیں گے ۔ ان کے ہاں تورات اور انجیل میں حضرت محمد ؐ کی صفت واضح طور پر موجود ہے ' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کریم کے اندر اس کا تذکرہ فرمایا ۔ نیز ان کو حکم بھی دیا گیا تھا کہ وہ تورات ' انجیل اور اس کلام پہ ایمان لائیں جو اللہ نے نازل کیا ہے (چاہے اس ماانزل اللہ سے مراد قرآن ہو یا دوسری کتب ہوں مثلاً زبور داؤد وغیرہ) ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ تورات اور انجیل کو قائم نہیں کرتے ۔ اب ان کو اس نئے دین میں داخل ہو جانا چاہیے اس لئے کہ یہ دین تورات و انجیل کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے اندر تورات و انجیل کی اصل تعلیمات محفوظ کر دی گئی ہیں ۔ اگر یہ دین اسلام میں داخل نہ ہوں گے تو ان کی کوئی دینی حیثیت نہ ہوگی ' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تو حضور ؐ کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ ایسا اعلان کر دیں ورنہ سمجھا جائے گا کہ آپ نے تبلیغ کا حق ادا نہیں کیا اور یہ ایک شدید ترین تہدید ہے جو حضور اکرم ؐ کو دی گئی ۔

اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم تھا کہ جب اہل کتاب کی دینی حیثیت کو ان فیصلہ کن اور دو ٹوک الفاظ میں چیلنج کیا جائے گا تو وہ کفر و طغیان میں مزید آگے بڑھیں گے ۔ وہ مزید عناد میں مبتلا ہوں گے اور کج بحثیاں کریں گے ۔ لیکن ان خطرات کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ بس وہ یہ اعلان کر ہی دیں اور اس اعلان کے نتیجے میں ہونے والے کفر و سرکشی ' گمراہی اور بغاوت کی کوئی پرواہ نہ کریں اور مایوس نہ ہوں کیونکہ حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ حق کا اعلان بہانگ دہل کیا جائے اور اس پر جو نتائج مرتب ہوتا ہیں وہ ہو جائیں ۔ جو شخص راہ ہدایت کو اختیار کر لیتا ہے وہ کھل کر راہ ہدایت پر آ جائے اور جو راہ ضلالت کا انتخاب کرتا ہے وہ کھل کر راہ ضلالت اختیار کرے ۔

(وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۖ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَٰفِرِينَ (۵ : ۶۸)) " ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دے گا ۔ مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو ۔ "

ان ہدایات کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے داعی کے لئے منہاج دعوت کے نقوش متعین فرما دیئے اور یہ بھی بتا دیا کہ اس کی حکمت کیا ہے ۔ جو لوگ ہدایت قبول نہیں کرتے اور کفر و سرکشی میں مزید آگے بڑھتے ہیں ۔ ان کے بارے میں آپ کی دلجوئی بھی فرما دی کہ یہ لوگ تو اس انجام کے مستحق ہو گئے ہیں ' اس لئے کہ ان کے دل سچی بات کے متحمل ہی نہیں ہوتے ۔ ان کے دلوں کی گہرائیوں سے سچائی کا مادہ ختم ہو چکا ہے ۔ اس لئے ان لوگوں کے سامنے کلمہ حق بہانگ دہل کہہ دیا جائے تاکہ ان کے دلوں کی گندگی ظاہر ہو جائے اور وہ مزید کفر و سرکشی میں آگے بڑھ جائیں اور سرکشوں اور کافروں کے انجام تک پہنچ جائیں ۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب کی کچھ دینی حیثیت نہیں ہے اگر وہ تورات ' انجیل اور ماانزل اللہ کو قائم نہیں کرتے ۔ اور نتیجۃ " دین جدید میں داخل نہیں ہو جاتے ' جیسا کہ اس آیت اور متعدد دوسری آیات میں حکم دیا گیا ہے ۔

اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو نہ مومن ہوں گے اور نہ کسی اور سماوی دین پر ہوں گے اور نہ ایسے دین والے ہوں گے جسے اللہ قبول کرے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور ؐ کی اس انداز کی تبلیغ سے یہ لوگ مزید سرکشی اور کفر میں مبتلا ہو رہے تھے لیکن اس کے باوجود حضور ؐ کو حکم دیا گیا کہ وہ کھل کر اعلان کر دیں اور اس سلسلے میں کوئی توریہ نہ کریں اور نہ نتائج سے گھبرائیں۔

جب یہ ایک فیصلہ کن بات ہے اور اسے فیصلہ کن الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ (لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ (۵:۶۸)) تو اب اہل کتاب کو اہل دین کہنے کی سرے سے گنجائش ہی نہ رہی اور نہ اس بات کی گنجائش رہی کہ اہل اسلام اہل کتاب سے دوستی اور موالات کے تعلقات استوار کریں چہ جائیکہ ان کے ساتھ مل کر ملحدین اور الحاد کے خلاف محاذ بنائیں جیسا کہ آج کل ہمارے بعض فریب خوردہ اور فریب کارر اہل ثقافت ایسا کرتے ہیں۔ اہل کتاب نے نہ تورات کو قائم کیا' نہ انجیل کو قائم کیا اور نہ ان دوسری تعلیمات کو قائم کیا جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں اس لئے کوئی مسلمان ان کی کسی دینی حیثیت کا اعتراف نہیں کر سکتا۔ نہ کوئی مسلمان ان کو وہ حیثیت دے سکتا ہے جو اللہ نے ان کو نہیں دی۔ "اور کسی مومن اور کسی مومنہ کی یہ شان نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ؐ کسی امر کا فیصلہ کر دیں' تو پھر ان کو اس امر میں کوئی اختیار ہو۔" یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اسے کسی قسم کے "ظروف و احوال" نہیں بدل سکتے۔

جب ہم یہ طے کر دیں کہ اللہ کی بات فیصلہ کن ہے جیسا کہ وہ فی الحقیقت حق اور فیصلہ کن ہے تو ہمیں یہ بات خاطر میں نہیں لانا چاہئے کہ ہمارے اس اعلان حق سے اہل کتاب کے اندر کس قدر ہیجان پیدا ہوتا ہے اور وہ ہمارے خلاف کس قدر شدید جنگ شروع کرتے ہیں۔ نہ ہمیں یہ کوشش کرنا چاہئے کہ ہم ان کی دوستی حاصل کرنے کے لئے سعی کریں اور ان کی دینی حیثیت کا اعتراف کریں یا انہیں راضی کر کے اور ان کے ساتھ باہم نصرت اور موالات کا معاہدہ کریں اور پھر ہم دونوں ملتیں مل کر کفر و الحاد کا مقابلہ کریں جبکہ ان کا دین کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اللہ تو ہمیں ایسی کوئی ہدایت نہیں دے رہا ہے اور نہ اللہ کو یہ بات قبول ہے کہ ہم اہل کتاب کی دینی حیثیت کا اعتراف کریں۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس موالات اور باہم نصرت کے فعل کو بھی معاف نہیں کرے گا۔ نہ یہ سوچ قابل معافی ہے جس کے نتیجے میں یہ موالات وجود میں آتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ہم وہ فیصلہ کریں گے جو اللہ نے نہیں کیا اور اپنے لئے وہ کچھ اختیار کریں گے جو اللہ نے نہیں کیا ہے۔ اس طرح ہم یہ تسلیم کریں گے کہ اہل کتاب کے مسخ شدہ اور تحریف شدہ عقائد بھی دین ہیں اور یہ دونوں الٰہی دین ایک جگہ جمع ہو کر کفر کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ اللہ کا کہنا یہ ہے کہ وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے جب تک کہ وہ تورات' انجیل اور ان تمام ہدایات کو قائم نہیں کرتے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئیں' اور ظاہر ہے کہ وہ عملاً ایسا نہیں کر رہے۔

اب ذرا ان لوگوں کو لیجئے جو کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں اور ان کے رب کی طرف سے جو کچھ نازل ہوا ہے وہ اسے قائم نہیں کرتے۔ یہ بھی ہمیشہ اسی طرح ہوں گے جس طرح اہل کتاب ہیں۔ یہ بھی کچھ دینی حیثیت نہیں رکھتے۔ اہل کتاب پر ایک کلام نازل ہوتا ہے اور وہ اسے اپنی زندگیوں میں نافذ نہیں کرتے' نہ اسے اپنے نفوس پر نافذ کرتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص مسلمان بننا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ وہ اسلام اور کتاب اللہ کو پہلے اپنے نفس میں قائم کرے۔ اس کے بعد اپنی پوری زندگی پر قائم کرے اور پھر تمام ان لوگوں کے سامنے یہ اعلان حق کر دے کہ جو لوگ قرآن کو قائم نہیں کرتے ان کی کوئی دینی حیثیت نہیں ہے جب تک کہ وہ قرآن کو اپنی زندگیوں میں نافذ نہیں کرتے۔ اگر وہ اس کے سوا دعوائے دین کرتے

ہیں تو ان کے اس دعوے کی تردید اس دین کے رب فرما رہے ہیں۔ لہٰذا اس معاملے میں ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ فیصلہ کن بات کرے۔ اس قسم کے لوگوں کو از سرنو اسلام کی دعوت دینا ہر مسلمان پر واجب ہے بشرطیکہ اس نے اپنے نفس اور اپنی زندگی میں ما انزل اللہ کو قائم کر دیا ہو۔ محض زبانی طور پر اسلام کا دعویٰ کرنا یا محض موروثی طور پر اسلام کا دعویٰ کرنا کوئی مفید مطلب بات نہیں ہے۔ نہ اس سے اسلام وجود میں آتا ہے اور نہ حقیقت ایمان نفس کے اندر پیدا ہوتی ہے اور نہ ایسا شخص اللہ کے دین کے ساتھ متصف ہو گا۔ ہر زمان و مکان میں اصول و فیصلہ یہی ہو گا...... اگر اہل کتاب ان معنوں میں تورات و انجیل اور ما انزل اللہ کو قائم کر دیں اور مسلمان ان معنوں میں قرآن کو قائم کر دیں تب وہ دین دار ہوں گے اور اہل کتاب بھی اپنے خیال کے مطابق دیندار ہوں گے۔ ایسے حالات میں وہ کوئی معاہدہ کر سکتے ہیں اگر وہ کسی الحاد کے خلاف ہو ورنہ دھوکہ ہو گا' خود فریبی ہو گی اور خود اپنی دینی حیثیت کو پگھلا کر بہا دینا ہو گا۔

اللہ کا دین نہ کوئی جھنڈا ہے اور نہ کوئی یونیفارم ہے' نہ کوئی وراثت ہے' دین اسلام تو دل میں بیٹھتا ہے' زندگی میں نمو دار ہوتا ہے۔ یہ کچھ نظریات ہیں جو دل کو بھر دیتے ہیں' کچھ عبادات ہیں جو سرانجام دی جاتی ہیں اور ایک نظام ہے جو پوری زندگی پر متصرف ہوتا ہے۔ دین اسلام تب قائم ہوتا ہے جب اس کے یہ تمام اجزاء ایک ساتھ کام کر رہے ہوں اور انسانوں کی زندگیوں میں جاری و ساری ہوں۔ اس کے سوا جو صورت بھی ہو گی اس میں اسلام کی ٹھوس شکل کو پگھلا کر بہانا مقصود ہو گا۔ ضمیر کا فریب ہو گا اور کوئی پاک دل مسلمان اس فریب میں نہیں آسکتا۔

ایک مسلمان کو تو چاہئے کہ وہ مذکورہ بالا حقیقت کا بآواز بلند اعلان کر دے اور جو نتائج اس کے نکلتے ہیں' نکلیں۔ اللہ ہے بچانے والا۔ کافروں کو تو اللہ کبھی راہ راست نہیں دکھاتا۔

ایک داعی اس وقت تک حق دعوت ادا نہیں کر سکتا اور اس وقت تک لوگوں پر اللہ کی جانب سے حجت قائم نہیں کر سکتا جب تک وہ ان تک دعوت کی پوری حقیقت اچھی طرح واضح نہیں کر دیتا۔ لوگوں پر اچھی طرح واضح نہیں کر دیتا کہ وہ اس وقت کس پوزیشن میں کھڑے ہیں اور یہ بات وہ بغیر کسی مداہنت اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کہہ نہیں دیتا۔ اگر داعی لوگوں کو صاف صاف یہ نہیں کہتا کہ وہ کس مقام پر کھڑے ہیں' وہ غلط ہے' وہ باطل موقف پر جمے ہوئے ہیں۔ وہ انہیں جس موقف کی طرف دعوت دیتا ہے وہ ان کے موجودہ موقف سے سراسر الگ ایک دوسری چیز ہے اور یہ کہ وہ ایک مکمل تبدیلی کی دعوت دیتا ہے۔ وہ ایک طویل سفر اور طویل جدوجہد کی طرف بلاتا ہے وہ مکمل تبدیلی چاہتا ہے۔ یہ تبدیلی ان کے افکار میں بھی ہے' ان کے طور طریقوں میں بھی ہے۔ ان کے نظام زندگی اور ان کے اخلاقی نظام میں بھی وہ مکمل تغیر چاہتا ہے۔ گویا وہ ان کو اذیت دیتا ہے اس لئے کہ ایک داعی سے لوگوں کی توقع بھی یہ ہوتی ہے کہ وہ واضح طرح بتائے کہ لوگوں کا موجودہ موقف غلط ہے تاکہ جو انکار کرتا ہے وہ واضح طور پر انکار کر دے اور جو اقرار کرتا ہے وہ واضح اقرار کرے۔ جو مرتا ہے مرے اور جو زندہ ہوتا ہے وہ زندہ ہو۔

جب ایک صاحب دعوت اور داعی شش و پنج کرتا ہے اور لوگوں کو صاف صاف نہیں بتاتا ہے کہ ان کی زندگی میں کیا کیا باطل ہے اور یہ کہ وہ حق کیا ہے جس کی طرف وہ دعوت دے رہا ہے اور یہ کہ دعوت حق اور ان کے موقف باطل کے درمیان حد فاصل کیا ہے؟ اور یہ کام وہ محض مشکل ظروف و احوال کی وجہ سے کرتا ہے تو اس وقت گویا وہ لوگوں کو اذیت دیتا ہے اور ان کو فریب دیتا ہے کیونکہ وہ صاف صاف بتا نہیں رہا ہے کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ دوسرا جرم وہ یہ کر رہا

ہوتا ہے کہ اللہ نے اسے جو بات صاف صاف کہہ دینے کا حکم دیا ہے اس پر بھی وہ عمل نہیں کر رہا ہوتا۔

لوگوں کے ساتھ دعوت میں اگر نرمی کی جاسکتی ہے تو وہ صرف اس امر میں کی جاسکتی ہے کہ وہ انداز نرم اختیار کرے۔ بات پوری کرے مگر نہایت ہی سلیقے سے اور نرم انداز میں۔ بات پوری ہو مگر سلیقہ مندی سے اور حکمت سے ' جس کی ہدایت حکمت اور موعظہ حسنہ میں دی گئی ہے۔

آج کل ہمارے بعض دوست یہ دیکھتے ہیں کہ اہل کتاب دنیا میں ایک بڑی تعداد میں بستے ہیں۔ ان کے پاس بہت بڑی مادی قوت ہے۔ پھر یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں بے شمار لوگ بت پرست ہیں اور دنیا کے ممالک کے اندر ان کی بات بھی سنی جاتی ہے۔ پھر جب یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ مادی نظریات کے حامل ممالک کے پاس بڑی قوت ہے۔ نیز ان لوگوں کے پاس تباہ کن اسلحہ جات بھی موجود ہیں اور پھر یہ دوست جب دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ اور ان کے پاس اللہ کی جو کتاب ہے وہ اسے نافذ نہیں کرتے تو ایسے لوگوں پر یہ بات نہایت ہی شاق گزرتی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس قدر زیادہ لوگوں کو یہ حق بات کس طرح کہیں کہ وہ سب گمراہ ہیں۔ اتنی عظیم تعداد کو گمراہ کہنے کا فائدہ کیا ہے اور اس قدر عظیم آبادی کو کس طرح دین حق سمجھایا جاسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ طریق کار یہی ہے۔ جاہلیت اگر پوری کائنات میں پھیل جائے تو بھی جاہلیت ہوگی۔ اس دنیا کے عملی حالات چاہے جیسے بھی ہوں ' وہ اس وقت تک کچھ حیثیت نہیں رکھتے جب تک وہ حق پر استوار نہ ہو جائیں۔ ایک داعی کے سامنے اگر لوگوں کی ایک بہت بڑی آبادی گمراہ کھڑی ہو تو اس کے فرائض میں کچھ کمی نہیں ہوتی ' نہ باطل کا حجم اور اس کا ڈھیر سا ہونا دعوت پر اثرانداز ہو سکتا ہے۔ جس طرح اس دعوت کا آغاز ہوا تھا اور اس نے تمام انسانوں کو خطاب کیا تھا ' کہ وہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے ' اسی طرح ہمیں آج بھی کام شروع کرنا ہوگا۔ گردش ایام کے بعد بات وہیں تک آپہنچی ہے ' جہاں حضور ؐ کے دور میں تھی۔ آپ ؐ کو مبعوث فرمایا گیا تھا اور آپ کو اللہ نے پکارا تھا۔

(يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۵:۶۷)) "اے پیغمبر ؐ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔ اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔ یقین رکھو وہ کافروں کو کامیابی کی راہ ہرگز نہ دکھائے گا۔ صاف کہہ دو کہ "اے اہل کتاب تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تورات اور انجیل اور دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔"

---ooo---

اس حصہ آیات کا خاتمہ اس بات پر ہوتا ہے کہ اللہ کے ہاں جو دین مقبول ہے وہ کیا ہے۔ حضور ؐ کی بعثت سے پہلے لوگوں کی شناخت جو ہو سو ہو اور وہ چاہے جس دین پر بھی ہوں اور جس ملت کے بھی پیرو ہوں ' اب حکم یہ ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٩﴾

"مسلمان ہوں یا یہودی ' صابی ہوں یا عیسائی ' جو بھی اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا بے شک اس کے لئے نہ کسی خوف کا مقام ہے نہ رنج کا۔"

الذین امنوا سے مراد اہل ایمان مسلمان ہیں۔ الذین ھادو سے مراد یہودی ہیں۔ الصابئون سے مراد وہ طبقہ ہے جو بتوں کی عبادت نہ کرتا تھا۔ یہ لوگ حضور ؐ کی بعثت سے پہلے موجود تھے اور صرف ایک اللہ کی عبادت کرتے تھے لیکن ان کا فرقہ کوئی متعین فرقہ نہ تھا۔ اس قسم کے لوگ عرب میں معدودے چند تھے۔ نصاریٰ سے مراد عیسائی ہیں جو حضرت عیسیٰ کی اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اس آیت میں فیصلہ یہ کیا گیا ہے کہ پہلے چاہے کوئی جس عقیدے اور دین پر بھی ہو' اب اگر اللہ پر ایمان لائے گا' آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک کام کرے گا اور یہاں اس میں ضمناً یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ اب نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ شریعت پر بھی ایمان لائے جیسا کہ دوسری جگہوں پر تصریح کر دی گئی ہے' تو ایسے شخص کو نجات ملے گی اور اس کے لئے کوئی خوف و رنج نہ ہو گا۔ اس بات کا کہ اس سے قبل وہ صحیح راہ پر نہ تھے۔ ان سے ان کے سابق مذہب اور عنوان کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا۔ اعتبار آخری بات کا ہو گا۔

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی عقیدے کی ضروریات اور بدیہات میں یہ بات شامل ہے کہ حضرت محمد ؐ خاتم النبیین ہیں اور یہ کہ آپ کو تمام انسانوں کی طرف مبعوث فرمایا گیا ہے اور یہ کہ تمام لوگ چاہے' ان کی ملت' دین' اعتقادات 'نسل اور وطن جو بھی ہو ان کو یہ دعوت دی جارہی ہے کہ وہ حضرت محمد ؐ پر ایمان لائیں اور اپنے تصورات اور اپنی زندگیوں کو حضور اکرم ؐ کی ہدایات کے مطابق ڈھالیں۔ جو شخص آپ کو رسول ؐ نہیں مانتا اور جو شخص اجمالاً اور تفصیلاً آپ پر ایمان نہیں لاتا وہ گمراہ ہے اور اس کا دین اور مسلک مقبول نہ ہو گا اور وہ اس اعلان کا مستحق نہ ہو گا۔ (فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۵: ۶۹)) "کہ ان کے لئے نہ خوف کا مقام ہو گا اور نہ رنج کا" یہ وہ بنیادی حقیقت ہے جو اس دین سے بطور لازمی نتیجہ برآمد ہوتی ہے' اس لئے ایک سچے مسلمان کے لئے اس بارے میں شش و پنج کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خصوصاً اس عظیم جاہلیت سے متاثر ہو کر جو اس کے سامنے پھیلی ہوئی ہے جاہلیت کے ساتھ تعلقات استوار کرتے ہوئے ایک مسلمان کو غافل نہیں ہونا چاہئے جو مختلف ملتوں اور مسلکوں میں بٹی ہوئی ہے۔ مسلمان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ مجبور ہو کر اور متاثر ہو کر ان گمراہ ملتوں میں سے کسی کے پیروکاروں کو "اہل دین" سمجھے اور یہ سمجھے کہ ان کا دین عنداللہ مقبول ہے اور یہ کہ اس کے ساتھ تعلق ولایت قائم ہو سکتا ہے۔

دوست بنائے گا تو اسے یقین رکھنا چاہئے کہ حزب اللہ ہی غالب رہے گی۔" چاہے ظاہری حالات کتنے ہی ناموافق نظر آئیں اور جو شخص بھی ایمان لائے اللہ پر، اور یوم آخرت پر اور نیک عمل کرے اور یہ اس دین آخری کے اصولوں کے مطابق کرے تو اس کے لئے رنج و خوف کا کوئی موقع نہ ہو گا۔ نہ دنیا میں اس کے لئے خوف ہو گا اور نہ آخرت میں اس کے لئے کوئی خوف ہو گا۔ جاہلیت کی تہ بہ تہ قوتوں سے بھی اسے کوئی ڈر نہ ہو گا اور نہ انہیں اہل ایمان سے ڈر ہو گا۔

---ooo---

اب تاریخ بنی اسرائیل کا ایک "باب کھلتا ہے اور اس باب میں بتایا جاتا ہے کہ یہ یہودی کیوں اور کس طرح بے حقیقت ہیں؟ اور کیوں ضروری ہے کہ ان کو دعوت اسلامی سے روشناس کر دیا جائے اور ان کو اس دین جدید کی دعوت دی جائے تاکہ وہ اس دین کی پناہ گاہ میں داخل ہو جائیں۔ یہ باب اس لئے کھولا جاتا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ ان کی حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ وہ وہی ہیں جو تھے۔ مقصد یہ ہے کہ اہل اسلام کی نظروں میں ان کا کوئی اعتبار ہی نہ رہے اور مسلمان اس امر پر توجہ ہی نہ دیں کہ ان کے ساتھ تعلق موالات قائم ہو سکتا ہے یا وہ ان کے ساتھ کوئی نصرت کر سکتے ہیں جب تک کہ وہ اس حال پر قائم ہیں اور سچائی کے مقابلے میں اپنا رویہ انہوں نے تبدیل نہیں کیا۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۝ وَ حَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝

"ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے مگر جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی خواہشات نفس کے خلاف کچھ لے کر آئے تو کسی کو انہوں نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا، اور اپنے نزدیک یہ سمجھے کہ کوئی فتنہ رونما نہ ہو گا، اس لئے اندھے اور بہرے بن گئے۔ پھر اللہ نے انہیں معاف کیا تو ان میں سے اکثر لوگ اور زیادہ اندھے اور بہرے بنتے چلے گئے۔ اللہ ان کی یہ سب حرکات دیکھتا رہا ہے۔"

یہ ان کی قدیم تاریخ ہے۔ حضور اکرم ؐ کے مقابلے میں انہوں نے جو موقف اختیار کیا وہ پہلا اور آخری موقف نہیں ہے۔ یہ لوگ سرکشی اور روگردانی کے عادی مجرم ہیں۔ یہ وعدہ خلافی کے پرانے خوگر ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی خواہشات نفس ہی کو اپنا الٰہ اور حاکم مانا ہے۔ کبھی انہوں نے اللہ کے دین اور رسول ؐ کے آگے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ یہ

لوگ ہمیشہ داعیان حق کے لئے سرکش اور ظالم رہے۔

(لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ (۵: ۷۰)) "ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے مگر جب بھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی خواہشات نفس کے خلاف کچھ لے کر آئے تو کسی کو انہوں نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا۔"

بنی اسرائیل کی قدیم تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے رسولوں کو جھٹلایا اور ان کی تعلیمات سے روگردانی کی۔ انہوں نے کئی ایک پر دست درازی کی اور کئی ایک کو قتل کر دیا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی خواہشات ہی کی پیروی کی...... یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی طویل داستانیں امت مسلمہ کو سنائیں تاکہ وہ بھی کہیں بنی اسرائیل کی راہ پر چل نہ نکلے۔ تاکہ امت مسلمہ کو معلوم ہو جائے کہ اس راہ کی مشکلات کیا ہیں اور ان لوگوں کو جو فہم و فراست کے مالک ہیں اور جن کا تعلق باللہ قائم ہے وہ ان مقامات لغزش کا اچھی طرح ادراک کر لیں اور جب انہیں ویسے ہی حالات درپیش ہوں جو انبیائے بنی اسرائیل کو پیش آئے تو وہ ان سے حوصلہ پکڑیں اور یہ کہ آئندہ اہل اسلام کی آنے والی نسلیں بھی اسی راہ پر چلنے والی تھیں اور انہوں نے بھی عرصہ گزرنے کے بعد ویسی ہی سنگ دلی کا مظاہرہ کرنا تھا جو بنی اسرائیل نے کیا تھا۔ انہوں نے بھی ہدایت کی راہ ترک کر کے اپنی خواہشات نفس کو الٰہ بنانا تھا۔ آنے والے داعیان حق کو جھٹلانا تھا اور بعض کو قتل کرنا تھا' بعینہٖ اسی طرح جس طرح بنی اسرائیل کے باغیوں اور نافرمانوں نے کیا تھا۔

بنی اسرائیل کے یہ سرکش جب یہ سرکشیاں کر رہے تھے تو انہیں یقین تھا کہ ان پر اللہ کا کوئی عذاب نہ آئے گا اور ان سے کوئی مؤاخذہ نہ ہو گا۔ یہ سوچ ان کی اس لئے پختہ ہو گئی تھی کہ وہ سنت الٰہیہ کو بھول گئے تھے اور وہ اس غرور میں گرفتار تھے کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی پیاری قوم ہیں۔

(وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا (۵: ۷۱)) "اور اپنے نزدیک یہ سمجھے کہ کوئی فتنہ رونما نہ ہو گا' اس لئے اندھے اور بہرے بن گئے۔"

ان کی آنکھوں کی بصارت چلی گئی' اس لئے وہ جس کو بھی دیکھتے اسے نہ سمجھتے اور ان کے کانوں پر پردے پڑ گئے' اس لئے جو چیز بھی سنتے اس سے فائدہ نہ اٹھاتے تھے۔

(ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (۵: ۷۱)) "اس کے بعد اللہ نے انہیں پھر معاف کیا۔" یہ اللہ کی خاص رحمت تھی مگر انہوں نے اس کا بھی کچھ پاس نہ کیا۔ (ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ (۵: ۷۱)) "پھر وہ اندھے اور بہرے بن گئے' ان سے اکثر لوگ۔"

(وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (۵: ۷۱)) "اللہ ان کی سب حرکات کو دیکھتا رہا ہے۔" اس لئے وہ انہیں ان کی تمام حرکات پر ان کو جزاء دے گا اور وہ بچ نہ سکیں گے۔

پارہ نمبر ۶

اہل ایمان کے لئے یہاں اس قدر کافی ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے بارے میں جان لیں اور اپنے جدید موقف کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں تاکہ اہل ایمان اس بات میں یکسو ہو جائیں اور ان کے ساتھ تعلق موالات کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیں۔ جس طرح حضرت عبادہ ابن الصامت نے کہا کہ انہوں نے تنفر ہو کر تعلق موالات کے خاتمہ کا اعلان کر دیا اور عبداللہ ابن ابی ابن السلول جیسے منافقین نے اس تعلق کو جاری رکھا۔

---ooo---

یہ تو تھے حالات یہودیوں کے۔ رہے نصاریٰ تو ان کے شب و روز بھی ایسے ہی تھے۔ ان کے بارے میں بھی قرآن کریم ایک فیصلہ کن اور دو ٹوک تبصرہ کرتا ہے۔ اور یہ تبصرہ اس سورہ کے موضوع اور مقصد کے ساتھ بالکل مناسب ہے۔ اس لئے کہ قرآن یہاں اہل دین کو جو موقف دینا چاہتا ہے اس کے ساتھ یہی مناسب ہے۔

اس سے پہلے اس سورہ میں ان لوگوں کے بارے میں کہا گیا تھا' جن کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ ہیں کہ یہ لوگ کافر ہیں۔ اب اس بات کو یہاں دوبارہ دہرایا جاتا ہے کہ جن کا عقیدہ ہے کہ صرف عیسیٰ خدا ہیں یا جن کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ تینوں میں سے ایک ہیں۔ یہ دونوں کافر ہیں اور یہ کہ ان کے کفر پر یہاں حضرت مسیح کے قول سے استدلال کیا گیا ہے۔ ان کو خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ تعلیم دی تھی کہ خبردار اللہ کے سوا کسی اور کو الہ نہ بناؤ۔ آپ نے ان کو یہ تعلیم دی تھی کہ اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے اور اس معاملے میں 'میں اور تم سب برابر ہیں' آخر میں لوگوں کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ حضرت مسیح کے بارے میں ان غلط عقائد کو ترک کر دیں اور ان کے بارے میں وہ عقائد اپنائیں جو اہل ایمان کے ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَ قَالَ الْمَسِيْحُ
يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ
حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾ لَقَدْ
كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ
وَ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۴﴾
مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَ

أُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ۗ انْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ
ثُمَّ انْظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٧٥﴾ قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ
لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۚ وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٧٦﴾

"یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے حالانکہ مسیح علیہ السلام نے کہا تھا کہ "اے بنی اسرائیل ' اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی ۔" جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا۔ اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مدد گار نہیں ۔

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے' حالانکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے ۔ اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس نے کفر کیا ہے اس کو دردناک سزا دی جائے گی ۔ پھر کیا یہ اللہ سے توبہ نہ کریں گے اور اس سے معافی نہ مانگیں گے ؟ اللہ بہت درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے ۔

مسیح ابن مریم اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول تھا' اس سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے ' اس کی ماں راست باز عورت تھی اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے ۔ دیکھو ہم کس طرح ان کے سامنے حقیقت کی نشانیاں واضح کرتے ہیں ' پھر دیکھو یہ کدھر الٹے پھرے جاتے ہیں ۔

ان سے کہو ' تم اللہ کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرتے ہو جو نہ تمہارے لئے نقصان کا اختیار رکھتا ہے نہ نفع کا ؟ حالانکہ سب کی سننے والا اور سب کچھ جاننے والا تو اللہ ہی ہے ۔

اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیان کردہ عقیدۂ توحید کے اندر یہ شرکیہ عقائد کب اور کس کانفرنس کے ذریعہ داخل ہوئے ۔ حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا عقیدہ وہی تھا جو اس کے دوسرے بھائی رسولوں کا تھا' جو خالص توحید کے داعی تھے اور اس میں شمہ بھر شرک نہ تھا۔ اس لئے کہ نوح علیہ السلام کے بعد تمام رسالتوں کی بعثت کا مقصد توحید کی تبلیغ اور شرک کی تردید ہی تھا۔

یہاں مختصراً ہم وہ عقیدہ درج کرتے ہیں جس تک یہ کانفرنسیں بالاتفاق پہنچیں اور اس کے بعد ان کے اوپر جو اختلافات مرتب ہوئے ان کی تفصیلات پہلے گزر گئی ہیں ۔

"نوفل ابن نعمت اللہ ابن جرجس نصرانی کی کتاب "سوسنہ سلیمان" میں ہے کہ عیسائیوں کا وہ عقیدہ جس میں کسی کنیسہ کو اختلاف نہیں ہے اور جسے نیقیا کی مجلس نے بطور اصل عقیدہ طے کیا ہے ' وہ یہ ہے کہ اللہ صرف ایک ہے ' اب باپ اللہ ہے جو سب پر کنٹرول کرنے والا ہے ۔ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے ' جو چیز نظر آئے یا نہ آئے اس کا پیدا کرنے

والا ہے۔ پھر ایک رب واحد یسوع پر ایمان لاتا ہے جو اکلوتا بیٹا ہے اور ایک باپ سے ہے اور یہ زمانوں سے پہلے نور سے پیدا ہوا ہے۔ یہ بھی الٰہ ہے' الٰہ حق سے ہے' مولود ہے اور غیر مخلوق ہے' اپنے جوہر میں باپ کے برابر ہے' جس سے تمام مخلوقات پیدا ہوئی اور جس کی وجہ سے ہم انسان پیدا ہوئے اور یہ باپ ہماری کوتاہیوں کی وجہ سے آسمان سے نازل ہوا۔ روح القدس کو اس کا درجہ ملا۔ اور پیلاطس کے عہد میں کنواری مریم سے اس کا تولد ہوا۔ انسان کی شکل میں آیا۔ عہد پیلاطس میں سولی پر چڑھا۔ دکھ پہنچا' قبر میں دفن ہوا اور مردوں سے تیسرے دن اٹھ کھڑا ہوا جیسا کہ کتابوں میں ہے۔ آسمان کی طرف اٹھا اور رب کے دائیں طرف بیٹھا اور عنقریب اس کا نزول عزت ہو گا اور تمام زندوں کو دین میں داخل کرے گا۔ اس کی بات ختم نہ ہوگی۔ روح القدس اور باپ سے نکلنے والے خدا پر ایمان لانا ضروری ہے جو خدا کے ساتھ موجود ہے اور ان دونوں کے لئے سجدہ ہوتا ہے اور جو انبیاء کے ساتھ باتیں کرتا ہے۔"

ڈاکٹر پوسٹ اپنی کتاب تاریخ کنیسہ میں کہتے ہیں کہ ذات باری تین اقانیم سے عبارت ہے جو مساوی ہیں۔ اللہ باپ' اللہ بیٹا' اللہ روح القدس۔ بیٹے کے ذریعے لوگ باپ سے منسوب ہیں کہ وہ مخلوق ہیں' بیٹے نے قربانی دی اور روح القدس پاک ہے۔"

اب یہ تصور کس قدر دشوار ہے کہ تین ایک بھی ہیں اور توحید اور تثلیث کا ایک ساتھ تصور کس قدر مشکل ہے۔ نصاریٰ کے لاہوتی مصنفین نے یہ تجویز کیا ہے کہ اس عقیدے کے عقلی پہلو پر غور و خوض کو ملتوی رکھا جائے' اس لئے کہ عقل تو اسے سنتے ہی مسترد کر دیتی ہے۔ ان میں سے ایک پادری بوطر اپنے رسالہ "اصول و فروع" میں لکھتے ہیں "ہم نے اپنی عقل کی طاقت کے مطابق اسے یوں سمجھا ہے اور آئندہ اسے ہم واضح طور پر سمجھ سکیں گے جب اللہ آسمانوں اور زمینوں کے رازوں سے پردہ اٹھالے گا۔ فی الحال اس قدر کافی ہے۔"

اللہ کا کہنا ہے کہ یہ تمام معقولات کفر ہیں۔ اس لئے کہ ان تمام میں حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ مانا گیا ہے۔ نیز تینوں میں سے ایک کہنا بھی کفر ہے۔ لہٰذا اللہ کی بات کے بعد کوئی اور بات نہیں ہے۔ اللہ کا فرمان واضح ہے۔

(لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭوَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭاِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭوَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۵ : ۷۲)) "یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے حالانکہ مسیح علیہ السلام نے کہا تھا کہ "اے بنی اسرائیل' اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔" جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔"

حضرت مسیح علیہ السلام نے اسی طرح انہیں صاف صاف ڈرایا تھا مگر وہ باز نہ آئے۔ آپ ؑ کی وفات کے بعد وہ اسی غلطی میں پڑ گئے تھے جس سے آپ نے انہیں متنبہ کر دیا تھا۔ حالانکہ آپ ؑ نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ اگر انہوں نے عقیدۂ توحید کو چھوڑ کر شرک اختیار کیا تو وہ جنت سے محروم ہو کر جہنم کی آگ کے مستحق ہو جائیں گے۔ انہوں نے حضرت

مسیح کے اس قول کو بھلا دیا "اے بنی اسرائیل صرف اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔" اس قول کے مطابق آپ نے انہیں کہا تھا کہ اللہ کے سامنے میں اور تم برابر کے بندے ہیں اور اللہ جو سب کا رب ہے اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ یہاں قرآن کریم ان کے تمام کفریہ معقولات کا ذکر کرتا ہے۔

(لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْآ اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۵:۷۳))

"یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے' حالانکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔" اور ان تمام باطل عقائد کی تردید کر کے یہ بتا دیتا ہے کہ تمام رسول جو عقیدہ لے کر آئے ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور اگر عیسائی اپنے ان معقولات سے باز نہ آئے اور ذات باری اور ذات مسیح کے بارے میں ایسی ہی کفریہ باتیں کہتے رہے تو بعید نہیں کہ ان پر دردناک عذاب آجائے اور قیامت کا دن دور نہیں ہے۔

(وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

(۵:۷۳)) "اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے اس کو دردناک سزا دی جائے گی۔" اور اللہ کی اس تنبیہ کے باوجود کافروں نے ان معقولات سے توبہ نہ کی' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا تھا کہ یہ کافر ہو گئے ہیں تو اس ترہیب کے ساتھ ساتھ اللہ ان کو ترغیب بھی دیتے ہیں کہ اللہ معاف کرنے والا ہے اگر اب بھی یہ لوگ باز آجائیں۔

(اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵:۷۴)) "پھر کیا یہ اللہ سے توبہ نہ کریں گے اور اس سے معافی نہ مانگیں گے؟ اللہ بہت درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" اور یہ اس لئے کہا گیا کہ توبہ کا دروازہ بند نہ ہو اور ہر کسی کو وقت ختم ہونے سے پہلے واپسی کا موقع ہو۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کا حقیقی مقام کیا ہے؟ تو مضبوط منطقی انداز میں بتایا جاتا ہے کہ مسیح کون ہیں اس امید سے کہ شاید ان کی فطرت سلیمہ مقام مسیح کے ادراک میں ان کی مدد کرے۔ اور مسیح کی حقیقت بتانے کے بعد اللہ تعالیٰ تعجب خیز انداز میں کہتے ہیں کہ اس کے باوجود یہ لوگ روگردانی کرتے ہیں۔

(مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا

يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۵:۷۵)) "مسیح ابن مریم اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول تھا' اس سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے' اس کی ماں ایک راست باز عورت تھی' اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو ہم کس طرح ان کے سامنے حقیقت کی نشانیاں واضح کرتے ہیں' پھر دیکھو یہ کدھر الٹے پھرے جاتے ہیں۔"

حضرت مسیح علیہ السلام اور آپ کی والدہ صدیقہ کی زندگی میں کھانا کھانا ایک واقعی امر تھا۔ زندوں کی خصوصیات میں

سے یہ ایک اہم خصوصیت ہے کہ وہ کھانا کھاتے ہیں اور یہی حضرت مسیح اور ان کی والدۂ صدیقہ کی بشریت پر سب سے بڑی دلیل ہے۔ اور ان کی مابعد الطبیعیاتی تعبیرات کے مطابق ان کے ناسوت ہونے پر یہ بڑی دلیل ہے۔ کھانا کھانا بے شک انسان کی جسمانی طلب اور جسمانی احتیاج کی دلیل ہے۔ اور جو ذات زندہ رہنے کے لئے کھانے کی محتاج ہو وہ الٰہ کس طرح بن سکتی ہے۔ اللہ تو بذات خود زندہ ہے۔ بذات خود قائم ہے' بذات خود باقی ہے' وہ کھانا کھانے کا محتاج نہیں ہے اور کھانے کی قسم کی اشیاء نہ اللہ کی ذات میں داخل ہوتی ہیں اور نہ خارج ہوتی ہیں۔

اس سیدھی سادی حقیقت کو دیکھتے ہوئے اور صاف ستھری بات کو دیکھتے ہوئے چونکہ کوئی معقول انسان اس میں مجادلہ نہیں کر سکتا اس لئے اس کے ہوتے ہوئے ان کے موقف پر سخت تعجب کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس منطق سلیم سے پھر بھی منہ موڑتے ہیں۔ "دیکھو ہم کس طرح ان کے سامنے حقیقت کی نشانیاں واضح کرتے ہیں اور پھر ان کو دیکھو کہ یہ لوگ کدھر الٹے پھرے جا رہے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو الوہیت کا جامہ پہنانا چاہا ان کے لئے حضرت مسیح کی انسانی زندگی ہمیشہ تھکا دینے والی حقیقت رہی۔ یہ بات آپ کی تعلیمات کے بھی خلاف تھی' اس لئے یہ لوگ ہمیشہ بحث و مباحثے اور جدل و جدال میں مبتلا رہے۔ اور عیسائیوں کی اثبات میں حضرت مسیح کی لاھوتیت اور ناسوتیت ہمیشہ لاینحل مسئلہ رہی۔

اب قرآن کی منطق سلیم کو ایک دوسرے زاویے سے ملاحظہ کے لئے پیش کیا جاتا ہے اور تعجب خیر استکراہ کے ساتھ۔

(قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ؕ وَ اللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۵ : ۷۶)) "ان سے کہو' کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرتے ہو جو نہ تمہارے لئے نقصان کا اختیار رکھتا ہے' نہ نفع کا؟ حالانکہ سب کی سننے والا اور سب کچھ جاننے والا تو اللہ ہی ہے۔" یہاں قرآن کریم نے لفظ "ما" استعمال کیا ہے۔ حالانکہ یہاں مسیح کے لئے لفظ من استعمال کیا جانا چاہئے تھا' تاکہ اس میں وہ تمام مخلوقات آ جائیں جن جن چیزوں کی پوجا کی گئی۔ ان میں ذوی العقول بھی شامل ہیں۔ اور لفظ "ما" اس عام چیز کی اصل ماہیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ان معبود اشیاء کی اصل ماہیت مخلوق ہے لہٰذا ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام' روح القدس' حضرت مریم صدیقہ' سب کے سب شامل ہوں گے اس لئے کہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے یہ سب مخلوق ہیں۔ چنانچہ اس انداز تعبیر میں بھی ایک خاص اشاریت پائی جاتی ہے اور نتیجہ یہی نکلے گا کہ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی عبادت کا مستحق نہ رہے گا' جبکہ کوئی مخلوق نفع و نقصان کی مالک بھی نہ ہوگی۔

(هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۵ : ۷۶)) (وہ سننے والا اور جاننے والا ہے) یہی وجہ ہے کہ وہ نفع و نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کی پکاروں کو سنتا ہے۔ وہ بندوں کی عبادت کو دیکھتا ہے۔ وہ ان کے دلوں کے بھیدوں کو جانتا ہے۔ ان کی اس پکار و عبادت کے پیچھے جو جذبہ ہے اس کا بھی اسے علم ہے اور اللہ کے سوا جس قدر اور مخلوق ہے وہ نہ سنتی ہے' نہ جانتی ہے اور نہ قبولیت کی طاقت رکھتی ہے۔

اب اس بحث کو اس جامع دعوت کے ساتھ ختم کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضور ؐ کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اہل کتاب کے

سامنے یہ تجویز رکھیں۔

قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لَا تَغْلُوا۟ فِى دِينِكُمْ غَيْرَ ٱلْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوٓا۟ أَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا۟ مِن قَبْلُ وَأَضَلُّوا۟ كَثِيرًا وَضَلُّوا۟ عَن سَوَآءِ ٱلسَّبِيلِ ﴿٧٧﴾

"کہو' اے اہل کتاب' اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کے تخیلات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور "سواء السبیل" سے بھٹک گئے۔" حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں غلو کرنے کی وجہ ہی سے نصاریٰ کے عقائد کے اندر خرافات داخل ہوئے اور اس کے بعد جب سلطنت روما کے حکمران عیسائیت میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنی بت پرستی کو عیسائیت کے اندر داخل کر دیا۔ اس کے بعد مسائل کو حل کرنے کے لئے جو کانفرنسیں منعقد ہوئیں ان کے مندوبین نے بھی اللہ کے دین میں یہ غلط معقولات شامل کر دیئے حالانکہ حضرت مسیح کو اللہ نے جو دین دے کر بھیجا تھا اور جس کی تبلیغ آپ ؑ نے فرمائی تھی وہ بالکل صاف تھا۔ قرآن مجید میں ہے "اے بنی اسرائیل اللہ کی بندگی کرو جو میرا اور تمہارا سب کا رب ہے' بے شک جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا تو اللہ نے اس پر جنت کا داخلہ حرام کر دیا ہے۔ اس کا ٹھکانا جہنم ہے' اور ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہو گا۔"

یہ پکار بنی اسرائیل کو بچانے کی آخری کوشش ہے تاکہ وہ اختلافات' انحرافات' خواہشات نفس کے اتھاہ سمندر سے نکل آئیں' جس کے اندر وہ لوگ گر گئے جو ان سے پہلے گزرے تھے' خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی راہ حق سے بھٹکایا۔

مندرجہ بالا آیات کا یہ حصہ جو یہاں ختم ہوا اس پر ذرا دوبارہ غور کریں۔ اس کے تین حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہاں اجمالاً ان کا تذکرہ ضروری ہے۔

۱۔ یہاں حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی کے اندر اعتقادی تصورات کی درستی کے لئے کس قدر عظیم جدوجہد کی گئی ہے اور تمام اعتقادات کو خالص نظریہ توحید کی اساس پر استوار کیا گیا ہے۔ اس کو بت پرستی کی تمام ملاوٹوں سے پاک کیا گیا ہے۔ شرک کی ہوا بھی اسے لگنے نہیں دی' جس طرح اہل کتاب کے عقائد کے اندر شرک داخل ہو گیا تھا۔ اسلام نے لوگوں کو ذات باری کی حقیقت اچھی طرح سمجھائی۔ اللہ کو اپنی ذات اور اپنی صفات میں منفرد قرار دیا گیا' اور اس بات کی سختی سے نفی کی گئی کہ اللہ کی ذات اور اللہ کی صفات میں کوئی اس کا شریک ہو سکتا ہے۔ اعتقادی تصورات کی تصحیح کے اس شاندار اہتمام سے اور عقیدۂ توحید کے فیصلہ کن بیان اور توضیح سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں صحیح عقائد کی کس قدر اہمیت ہے' اور یہ کہ انسانی زندگی کی اصلاح میں درست عقائد کا کس قدر گہرا اثر ہوتا ہے۔ نیز اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اسلام نے تمام اعمال کو صحیح اعتقادات پر موقوف کیا ہے اور تمام انسانی تعلقات کو عقائد سے مربوط کر دیا گیا ہے۔

۲- دوسری یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ قرآن نے ان لوگوں کے کفر کی تصریح کر دی ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ مسیح ابن مریم اللہ ہے یا جن کا عقیدہ یہ ہے کہ مسیح ابن مریم 'تین خداؤں میں سے ایک ہے - اس تصریح کے بعد کسی مسلمان کے لئے جواز باقی ہی نہیں رہتا کہ وہ اہل کتاب کو دین پر سمجھے اس لئے کہ یہ لوگ ان عقاید کی وجہ سے خود اپنے دین کے بھی منکر ہوگئے ہیں -

اسلام اگر لوگوں کو اس بات پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ جس دین پر ہیں اسے چھوڑ دیں تو اسلام یہ بھی نہیں کرتا کہ کسی ایسے شخص کو جو دین سے خارج ہو چکا ہو 'محض اسے خوش کرنے کے لئے یہ کہہ دے کہ وہ دین پر ہے اور یہ کہ اس کا دین اللہ کو مقبول ہے 'بلکہ اسلام ایسے لوگوں کے دین پر کفر کا اطلاق کرتا ہے اور کفر بھی اللہ کا دین نہیں ہو سکتا -

۳- تیسری حقیقت جو پہلی دونوں حقیقتوں پر بطور لازمی نتیجہ مرتب ہوتی ہے یہ ہے کہ ان عقائد کے حاملین اہل کتاب اور اسلام کے بیان کردہ عقیدۂ توحید کو تسلیم کرنے والے اہل اسلام کے درمیان کوئی تعلق موالات قائم نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ایک مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ اب دین صرف وہی ہے جس کی تعلیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے - یہی وجہ ہے کہ اب یہ بات کہ تمام ادیان کے پیروکاروں کو اتحاد کرکے کفر اور الحاد کا مقابلہ کرنا چاہئے ایک لغو بات ہوگی - اسلامی زاویے سے اس بات کے اندر کوئی وزن نہ ہوگا - جب اعتقادات کے اندر اس قدر فیصلہ کن جدائی اور دوری ہو تو دونوں فریقوں کا کسی بات پر متحد ہونا ممکن نہیں ہے اس لئے کہ دنیا میں ہر چیز کا قیام نظریات پر ہوتا ہے اور اسلام اس کا داعی ہے - اصل چیز نظریہ اور عقیدہ ہی ہوتا ہے -

---ooo---

آخر میں یہ بتایا جاتا ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل کا موقف کفار بنی اسرائیل کے سلسلے میں کیا رہا ہے؟ ان کی تاریخ کی ایک دوسری فصل - بتایا جاتا ہے کہ ذرا حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تبصرہ بنی اسرائیل کے بارے میں کیا تھا - اور اللہ نے بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے ان کے اس موقف کو تسلیم کر لیا - مزید یہ کہ ان کے اجتماعی فساد کی وجہ سے اور ان کی جانب سے اس اجتماعی فساد اور بگاڑ پر مکمل سکوت اختیار کرنے کی وجہ سے اور پھر اس وجہ سے کہ یہ لوگ کفار کے ساتھ دوستی اور موالات کرتے تھے 'اللہ نے انہیں ملعون قرار دے دیا اور یہ فیصلہ کر دیا کہ یہ لوگ جہنم میں رہیں گے -

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ

أَنْ سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ۝ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ أَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۝

"بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہوگئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے، انہوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا، برا طرز عمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔ آج تم ان میں بکثرت ایسے لوگ دیکھتے ہو جو (اہل ایمان کے مقابلے میں) کفار کی حمایت و رفاقت کرتے ہیں۔ یقیناً بہت برا انجام ہے جس کی تیاری ان کے نفسوں نے ان کے لئے کی ہے، اللہ ان پر غضبناک ہوگیا ہے اور وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں۔ اگر فی الواقع یہ لوگ اللہ اور پیغمبرؐ اور اس چیز کے ماننے والے ہوتے جو پیغمبر پر نازل ہوئی تھی تو کبھی (اہل ایمان کے مقابلے میں) کافروں کو اپنا رفیق نہ بناتے مگر ان میں سے تو بیشتر لوگ خدا کی اطاعت سے نکل چکے ہیں۔"

نظر آتا ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ "کفر" معصیت اور لعنتی افعال سے اٹی پڑی ہے اور ان کی ہدایت اور ان کی نجات کے لئے جن انبیاء کو بھیجا گیا تھا انہی نے آخر کار ان پر لعنت کی بارش کر دی اور ان کو اللہ کی راہ ہدایت سے دھتکار دیا۔ اللہ نے بھی ان کی اس دعاء اور پکار کو قبول کر لیا۔ اور ان پر لعنت لکھ دی اور قیامت تک وہ ملعون قرار پائے۔

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر اختیار کیا، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی کتابوں کے اندر تحریف کی۔ یہ وہی لوگ تھے جو اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلے نہ کرتے تھے جیسا کہ اس سورہ میں اور دوسرے مقامات پر قرآن مجید نے تصریح کی ہے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے اس عہد کو توڑا جو ان سے اللہ نے لیا تھا کہ وہ ہر رسول پر ایمان لائیں گے اور اس کے ساتھ تعاون کریں گے اور اس کی نصرت کریں گے۔

(ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (۵:۷۸)) "کیونکہ وہ سرکش ہوگئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے۔" بنی اسرائیل کی پوری تاریخ سرکشی اور زیادتیوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان کے تصورات، عقائد اور طرز عمل میں ہر جگہ سرکشی اور زیادتیوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور قرآن کریم نے اس کی پوری تفصیلات دی ہیں۔

سرکشی کرنا اور زیادتی کرنا بنی اسرائیل میں کوئی انفرادی فعل نہیں رہا تھا بلکہ ان کے معاشرے کی اجتماعی روایات ہی سرکشی اور زیادتی کے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ پورے معاشرے کی یہ فطرت بن گئی تھی اور پورا معاشرہ ان برائیوں کے ارتکاب کو دیکھتا اور خاموش رہتا اور ان کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھاتا۔

(كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۵:۷۹)) "انہوں

نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا' برا طرز عمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔" سرکشی اور ظلم ہر معاشرے میں ہوتے رہتے ہیں اس لئے کہ ہر معاشرے میں شریر' مفسد اور منحرف لوگ موجود ہوتے ہیں۔ یہ زمین کسی بھی وقت شر و فساد سے خالی نہیں رہ سکتی۔ معاشرے کے اندر ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی روش نرالی ہوتی ہے' لیکن معاشرے کا اجتماعی مزاج شر اور منکر کو برداشت نہیں کرتا اور سرکشی اور ظلم کو معاشرے کے مسلمات قرار پانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے سرکشی اور ظلم کا ارتکاب کسی بیدار معاشرے کے اندر بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح زندہ معاشروں کے اندر برائی کا ارتکاب مشکل ہوتا ہے اور معاشرہ اجتماعی طور پر شر کے خلاف ردعمل ظاہر کرتا ہے اور مجرم کو ڈر ہوتا ہے کہ اسے اجتماعی سزا ملے گی۔ ایسی صورت حال میں شر محدود ہوتی ہے اور اس کے اسباب بھی کم ہو جاتے ہیں۔ معاشرے کے اجتماعی بندھن مضبوط ہوتے ہیں اور برائی چند افراد کے اندر محدود ہوتی ہے۔ معاشرہ ان کا پیچھا کر رہا ہوتا ہے اور انہیں پنپنے نہیں دیتا۔ ایسے حالات میں فحاشی اور منکر شائع نہیں ہوتے۔ پھیلتے نہیں بلکہ سکڑتے ہیں اور یہ معاشرے کے اجتماعی ضمیر اور مزاج کی وجہ سے ہوتا ہے۔

بنی اسرائیل کے اس اجتماعی منظر کو یہاں اس مکروہ شکل میں پیش کر کے اور اس پر تنقید کر کے قرآن' اسلامی نظام جماعت کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ اس کا ایک مضبوط اجتماعی وجود ہونا چاہئے اور اس وجود کے اندر اس قدر قوت دفاع ہونی چاہئے کہ وہ سرکشی اور ظلم کو برداشت ہی نہ کرے' چہ جائیکہ وہ معاشرے کی ایک عام روش ہو جائے۔ اسلامی معاشرے کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ اسے بڑی سختی سے سچائی پر قائم ہونا چاہئے اور باطل کے بارے میں سخت حساس ہونا چاہئے۔ دین کے ذمہ داران کو چاہئے کہ وہ اس امانت کی حفاظت کریں جس کے وہ امیں اور محافظ ہیں۔ اور شر' فساد' سرکشی اور ظلم کی راہ روکیں اور اس معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔ چاہے یہ شر ایسے حکام کی جانب سے ہو جن کا حکومت پر تسلط ہو یا ایسے سرمایہ داروں کی طرف سے ہو جنہوں نے دولت جمع کر کے اثر و رسوخ حاصل کر لیا ہو یا ایسے شرپسندوں کی طرف سے ہو جن کو معاشرے میں ایذا رسانی کی قوت حاصل ہو یا ایسے عوام کی جانب سے ہو جو بے راہ رو ہیں۔ اسلامی نظام بہرحال خدائی نظام ہے اور اس کے خلاف اٹھنے والے بااثر ہوں یا بے اثر ہوں وہ سب باغی تصور ہوں گے۔

اسلام اس فرض کی ادائیگی پر بہت ہی زور دیتا ہے۔ اگر معاشرے کا اجتماعی وجود کسی شر کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا تو اسلام پورے معاشرے کو مجرم گردانتا ہے۔ جس طرح ایک ایک فرد ذمہ دار ہے اسی طرح برائی کے خلاف اٹھنے کی ذمہ داری بھی پورے معاشرے پر عائد ہوتی ہے۔

امام احمد نے حضرت عبداللہ ابن مسعود کی یہ روایت نقل فرمائی ہے۔ حضور ؐ نے فرمایا "جب بنی اسرائیل نے برائیوں کا ارتکاب شروع کیا تو ان کے علماء نے انہیں منع کیا۔ وہ منع نہ ہوئے' ان علماء نے بھی ان معصیت پیشہ لوگوں کے ساتھ بیٹھنا اٹھنا اور ان کے ساتھ کھانا پینا شروع کر دیا۔ اللہ نے سب کو باہم ملا دیا۔ حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ ان پر لعنت کی اس لئے کہ یہ لوگ سرکشی کرتے تھے اور ظلم کرتے تھے۔ یہ بات کرتے وقت رسول ؐ جو تکیہ سے ٹیک لگا کر لیٹے ہوئے تھے' اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا: "نہیں' خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم ان کو حق پر سختی سے مجبور کرو گے۔"

ابوداؤد نے حضرت عبداللہ ابن مسعود کی روایت نقل کی ہے۔رسول ؐ اللہ نے فرمایا "بنی اسرائیل میں جو پہلا نقص داخل ہوا وہ یہ تھا کہ ایک آدمی دوسرے سے ملتا تو کہتا: اے فلاں اللہ سے ڈرو اور جو کچھ تم کر رہے ہو' اسے چھوڑ دو اس لئے کہ یہ جائز نہیں ہے۔پھر دوسرے دن اسے ملتا تو اس کی یہ بری بات اسے اس بات سے نہ روکتی کہ وہ اس کا ہم نوالہ اور ہم پیالہ بنے اور اس کا ہمنشیں ہو' جب انہوں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے سب کو باہم ملا دیا۔" اس کے بعد آپ ؐ نے فرمایا "ملعون کر دیا اللہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا۔حضرت داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے۔" لعن سے فاسقون تک۔

اس کے بعد آپ ؐ نے فرمایا "ہرگز نہیں تمہیں امر بالمعروف کرنا ہو گا اور نہی عن المنکر کرنا ہو گا اور تمہیں ظالم کا ہاتھ پکڑنا ہو گا اور تمہیں ان کو حق پر کھڑا کرنا ہو گا یا تمہیں انہیں سچائی پر مجبور کرنا ہو گا۔"

صرف امر اور نہی سے مسئلہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اصرار کرنا ہو گا کہ ظالم باز آجائیں۔ان کے ساتھ مقاطعہ کرنا ہو گا اور شر کو قوت سے مٹانا ہو گا۔فساد' معصیت اور زیادتیوں کی راہ روکنی ہو گی۔

امام مسلم نے اپنی سند کے ساتھ ابو سعید خدری کی حدیث نقل کی ہے۔حضور ؐ نے فرمایا "تم میں سے جس نے بھی منکر کو دیکھا' اسے چاہئے کہ وہ ہاتھ سے اسے روکے' اگر طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر طاقت نہ ہو تو دل میں برا جانے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔"

امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ عدی ابن عمیرہ سے نقل کیا ہے۔فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا "اللہ خاص گناہگاروں کی وجہ سے عام لوگوں کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔ہاں جب وہ اپنے درمیان برائی کو دیکھیں اور وہ اس کے خلاف احتجاج کر سکتے ہوں مگر نہ کریں۔اگر وہ ایسا کریں گے تو اللہ خاص مجرموں کی وجہ سے عام لوگوں کو بھی مبتلائے عذاب کرتے ہیں۔"

امام ترمذی نے ابو سعید سے نقل کیا ہے: "حضور ؐ نے فرمایا! "بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق ہے۔"

قرآن و سنت کی نصوص اس مفہوم میں بکثرت وارد ہیں۔اسلامی معاشرہ ایسا ہونا چاہئے کہ اس میں صورت یہ نہ ہو کہ ایک شخص برائی دیکھے اور کہے مجھے اس سے کیا واسطہ؟ بلکہ اسلامی معاشرے کے اندر برائی کے خلاف حمیت اور جذبہ ہونا چاہئے۔جب بھی کوئی مسلمان کسی برائی کو دیکھے تو یہ نہ کہے کہ میں کیا کر سکتا ہوں بلکہ اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔وہ حدود شریعت کے حق میں اٹھ کھڑا ہو اور یہی وہ جذبہ ہوتا ہے جس پر ایک اسلامی جماعت کی اساس ہے' اس کے سوا ایک مسلم معاشرے کے وجود کا تصور ہی نہ ہو گا۔

یہ حمیت اور جذبہ قلب میں تب پیدا ہو گا جب انسان میں اللہ کے اوپر پختہ یقین پیدا ہو جائے اور اسے یہ شعور ہو کہ اس ایمان کے تقاضے کیا ہیں۔پھر اسے اسلامی نظام زندگی کا صحیح فہم حاصل ہو اور اسے یہ احساس ہو کہ اسلامی نظام زندگی ایک مکمل نظام ہے وہ اس نظریے کو سنجیدگی کے ساتھ لے اور اس کے قیام کے لئے جدوجہد شروع کر دے۔اسلامی معاشرہ ہوتا ہی وہ ہے جس میں قانون کا ماخذ شریعت الٰہی ہو۔اس کی اٹھان اسلامی منہاج پر ہو' اور یہ معاشرہ ایک مسلمان کو اس بات کا موقع دیتا ہو کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر سکے۔یہ اس کا انفرادی عمل نہ ہو کہ وہ اصلاح کی لہریں اٹھائے اور سمندر کے اندر گم ہو جائیں۔حالات ایسے نہ ہوں کہ ایک مسلمان سرے سے اصلاح کر ہی نہ سکے' جیسا کہ آج

کل عالم اسلام کے اکثر اوطان میں صورت حال ایسی ہے کہ انفرادی طور پر بھی کوئی امر بالمعروف کا فریضہ ادا نہیں کر سکتا کیونکہ عالم اسلام کا اجتماعی نظام اس اصول پر قائم ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے معاملات میں دخل ہی نہیں دے سکتا اور اسلامی معاشروں میں فسق وفجور اور اللہ کی معصیت کو لوگوں کے شخصی معاملات سمجھتا ہے۔ کوئی کسی کے کام میں دخل نہیں دے سکتا بلکہ اسلامی معاشروں میں ظلم' مار دھاڑ' سرکشی اور زیادتی اس قدر طاقتور ہیں کہ ڈر کے مارے لوگوں کے منہ بالکل بند ہیں۔ زبانوں پر تالے لگے ہوئے ہیں اور جو شخص بھی برائی کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اس پر مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ حقیقی جدوجہد اور بھاری قربانیاں اس امر کے لئے دینی چاہئیں کہ ایک فلاحی اور خیرپسند معاشرہ قائم ہو اور فلاح اور خیر پر مشتمل معاشرہ صرف اسلامی نظام کے زیر سایہ ہی قائم ہو سکتا ہے اور یہ نیک معاشرہ دوسری جزوی اصلاحات اور شخصی بھلائی کے معاملات سے بھی پہلے بذریعہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قائم ہونا چاہئے۔

اگر پورا معاشرہ گندہ ہو تو کسی فرد کو ستھرا نہیں کہا جا سکتا۔ جبکہ جاہلیت کی سرکشی غالب ہو اور معاشرے کا اجتماعی ڈھانچہ جاہلیت پر قائم ہو۔ اس میں قانون شریعت نافذ نہ ہو' تو ایسے حالات میں ابتدائی کام شروع کرنا چاہئے اور نیکی کو جڑوں سے اٹھنا چاہئے اور وہ اس طرح ممکن ہے کہ کسی خطے میں اسلامی سلطنت قائم ہو اور جب یہ اقتدار قائم ہو جائے تو پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام بنیاد سے شروع ہو گا۔

یہ تمام امور پختہ ایمان کے متقاضی ہیں اور اس بات کے محتاج ہیں کہ نظام زندگی کی تبدیلی میں عزم ویقین کا کام شروع کیا جائے۔ جب ایمان کامل ہو گا تو اللہ پر اعتماد ہو گا۔ اور جب اللہ پر اعتماد ہو گا تو راستہ جس قدر طویل ہو' پرواہ نہ ہو گی اور انسان اپنے اجر کا امیدوار اللہ سے ہو گا۔ پھر یہ مومن اس شخص کا انتظار نہیں کرتا جو اس دنیا میں بھی کچھ چاہتا ہے۔ نہ مومن گمراہ معاشرے کو خاطر میں لاتا ہے اور نہ وہ اہل جاہلیت سے کوئی نصرت طلب کرتا ہے۔

وہ تمام نصوص قرآنی اور احادیث نبوی جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں وارد ہیں وہ ایک اسلامی معاشرے میں ایک مسلم کے فرائض کا تعین کرتی ہیں۔ وہ معاشرہ جس نے اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے اصول کو تسلیم کر لیا ہوتا ہے' جس میں اللہ کی شریعت نافذ ہو چکی ہوتی ہے' اگرچہ اس میں حکومت ظالمانہ ہو' اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ گناہ پھیل جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "افضل جہاد ظالم سلطان کے سامنے کلمہ حق ہے۔ امام جائر بہرحال امام ہوتا ہے اور جب تک یہ ظالم بادشاہ بھی اللہ کی حاکمیت کو تسلیم نہ کرے وہ امام بن ہی نہیں سکتا۔ جب تک وہ شریعت قائم نہ کرے وہ امام نہیں ہے۔ وہ تو کچھ اور ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ (وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ) "جس نے اس قانون کے مطابق فیصلے نہ کیے تو ایسے لوگ ہی کافر ہیں۔" جاہلی معاشرے وہ ہوتے ہیں جو شرعی قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں۔ جاہلی معاشروں کے اندر ہونے والا بڑا منکر' جس سے تمام منکرات پیدا ہوتے ہیں وہ یہی منکر ہے جس کی رو سے اللہ کے حق حاکمیت کو مسترد کیا ہوا ہوتا ہے اور اللہ کی شریعت کے قانون کو نافذ نہیں کیا جاتا۔ اب اگر ایسے معاشرے سے واسطہ ہے تو اہل ایمان کو سب سے پہلے اس عظیم منکر کا قلع قمع کرنا چاہئے کیونکہ یہ ایک بنیادی منکر ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اس کے خلاف نکیر کریں اور دوسرے جزوی منکرات میں وقت ضائع نہ کریں جو اس بڑے منکر کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں۔ وہ تو اس کے فروعات ہیں اور ان کا وجود ہی اس بڑے منکر کا مرہون منت ہے۔

اس میں کوئی فائدہ نہ ہو گا کہ ہم اپنی قوتیں ان جزوی منکرات کے خلاف جدوجہد میں ضائع کریں۔بہت سے نیک فطرت اور صالح لوگ ان جزوی منکرات کے خلاف جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں' حالانکہ یہ منکرات اس منکر اکبر کی پیداوار ہیں۔وہ منکر یہ ہے کہ لوگ اللہ کے حقوق پر دست درازی کر کے اللہ کے حق حاکمیت کو سلب کرتے ہیں' اور اللہ کی شریعت کا انکار کرتے ہیں۔اس لئے ہمیں اپنی قوتیں ان جزوی منکرات کے ازالے میں ضائع نہیں کرنا چاہئیں' جو اس منکر اول یعنی طاغوتی اقتدار اعلیٰ کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔اس میں کوئی شک اور بحث نہیں ہے کہ یہ اسی کا نتیجہ ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک طاغوتی معاشرے میں جب ہم لوگوں کو نہی عن المنکر کرتے ہوئے کہیں کہ یہ برا کام ہے' ایسا مت کرو' تو ہمارے سامنے معیار اور پیمانہ کیا ہو گا۔مثلاً ایک اسلامی آدمی کہے کہ یہ منکر ہے اور ادھر ادھر سے دس افراد اٹھ کھڑے ہو جائیں گے اور کہیں گے ہرگز نہیں' یہ تو برا کام نہیں ہے۔ہاں پرانے زمانے کی باتیں کرتے ہوئے' یہ بات کبھی ایسی تھی۔اب دنیا بدل گئی ہے۔معاشرہ ترقی کر گیا ہے اور اب اقدار بدل گئی ہیں۔

لہذا یہ ضروری ہے کہ ایک پیمانہ ہو اور تمام لوگ اچھائی اور برائی کو اس کے مطابق جانچیں۔اب یہ پیمانہ اور یہ اقدار ہم کہاں سے اخذ کریں۔یہ میزان اور معیار کہاں سے لائیں؟ کیا لوگوں کے اندازے' لوگ کے رواج' ان کی خواہشات پیمانہ حسن و قبح قرار پائیں۔یہ چیزیں تو بدلتی رہتی ہیں۔اس طرح تو ہم ایک ایسے صحرا میں داخل ہو جائیں گے جس میں کوئی راہنما نہ ہو گا اور ایسے سمندر میں داخل ہوں گے جو بے کنار ہو گا۔

لہذا میزان عدل کا قیام پہلے ضروری ہے۔اس میزان اور پیمانے کو مستقل ہونا چاہئے جو لوگوں کی خواہشات کے مطابق بدلتا ہوا نہ ہو۔اور یہ ہے اللہ کا ترازو' مستقل اور دائمی۔

اب اگر کوئی معاشرہ سرے سے اللہ کے میزان ہی کو تسلیم نہیں کرتا تو ...... جب لوگ اپنے فیصلے شریعت کے مطابق ہی نہیں کرتے تو ...... بلکہ صورت یہ ہو کہ جو شخص اسلامی نظام کا داعی ہو' اس پر ظلم ہو رہا ہو' اس سے انتقام لیا جا رہا ہو' اس کے ساتھ تمسخر اور مزاح ہو رہا ہو تو ...... کیا ایسے حالات میں جزوی اصلاح کی جدوجہد ضائع نہ ہو گی محض مذاق ہو کر نہ رہ جائے گی' کیا فائدہ ہو گا کہ تم ایسے معاشرے میں اٹھو اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو اور بعض جزئیات کی اصلاح کے لئے انجمن بنا کر جدوجہد شروع کر دو جن کے تولنے کے بارے میں لوگوں کے پیمانے اور میزان مختلف ہوں جن کے اندر لوگ مختلف الرائے ہوں' ہر شخص اپنی خواہشات کے مطابق راہ لینے میں آزاد ہو۔

لہذا ضروری ہے کہ اصولاً ایک جج پر اتفاق ہو' ایک پیمانے پر اتفاق ہو' ایک مقتدر اعلیٰ اور حاکم پر اتفاق ہو' اس فورم پر اتفاق ہو جو فیصلہ کرے گا اور اختلاف رائے کی صورت میں اس کا جو فیصلہ ہو اور اسے تسلیم کیا جائے۔

یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے معروف اکبر کو قائم کیا جائے اور معروف اکبر یہ ہے کہ اللہ کے حق حاکمیت کو تسلیم کرایا جائے اور اسلامی نظام حیات کے نفاذ کی جدوجہد کی جائے۔سب سے پہلے نہی عن المنکر الاکبر کیا جائے اور منکر اکبر یہ ہے کہ اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا انکار ہو رہا ہو۔اللہ کی شریعت متروک ہو۔اس اساس کو استوار کر کے ہی صالح معاشرے کی تعمیر ممکن ہے۔اس کے بعد پھر ہر طرف سے اصلاح معاشرہ کی کوششیں شروع کی جا سکتی ہیں۔لیکن اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام کوششوں کو مجتمع کر لیا جائے' ان کو ایک سمت میں لگا دیا جائے اور اس اساس کو قائم کیا جائے یعنی اسلامی نظام حکومت۔

بعض اوقات انسان دیکھتا ہے کہ بہت ہی اچھے لوگ ' نہایت ہی عظیم جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں اور وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں ۔ لیکن فروعی منکرات میں ۔ جبکہ وہ اساس جس پر اسلامی معاشرہ کی تعمیر ہوتی ہے اور جس کے اوپر امر بالمعروف و نہی عن المنکر قائم ہوتا ہے وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوتی ہے ۔

کیا فائدہ ہو گا کہ ہم ایک ایسے معاشرے میں لوگوں کو زنا سے روکیں جو زنا کو سرے سے جرم ہی تصور نہیں کرتا ۔ صرف جبری مباشرت کو جرم تصور کرتا ہے ' اور جبری مباشرت میں بھی شریعت کے مطابق سزا نہیں دیتا اس لئے کہ وہ اللہ کی حاکمیت کو تسلیم ہی نہیں کرتا ۔ نہ وہ شریعت کو نظام زندگی تسلیم کرتا ہے ۔

کیا فائدہ ہے کہ لوگوں کو شراب نوشی سے منع کیا جائے اور ایک ایسے معاشرے میں جس میں شراب نوشی جائز ہو ۔ صرف وہ شراب نوشی ممنوع ہو جو شارع عام پر کی جائے ۔ اس پر بھی حد جاری نہ ہوتی ہو ' اس لئے کہ معاشرہ ایسی حدود کو تسلیم ہی نہیں کرتا ۔

کیا فائدہ ہے کہ ہم لوگوں کو اسلام کے خلاف لعن طعن کرنے سے روکیں ایک ایسے معاشرے میں جس میں اللہ کی حکومت کا اعتراف نہ ہو ' جس میں اللہ کی بندگی نہ ہوتی ہو ' بلکہ اس میں انسانوں کو رب بنایا گیا ہو ۔ انسان لوگوں کے لئے پارلیمنٹ سے قانون نازل کرتے ہوں ' لوگوں کے لئے نظام زندگی اور زندگی کے طور طریقے وضع کرتے ہوں ' ان کے لئے اقدار حیات اور حسن و قبح کے پیمانے وضع کرتے ہوں اور گالیاں دینے والا اور جسے گالیاں دی جا رہی ہیں وہ دونوں اللہ کے دین سے خارج ہوں ۔

حالات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فائدہ کیا ہو گا ؟ صغائر تو صغائر میں کہتا ہوں ان کبائر سے روکنے کا فائدہ کیا ہو گا ؟ جبکہ اکبر الکبائر سے کوئی کسی کو نہ روکتا ہو ' کفر عام ہو اور اللہ کی شریعت اور نظام زندگی متروک ہو ۔

یہ معاملہ اس سے بہت بڑا اور بہت ہی اہم ہے ۔ یہ نیک لوگ جو سعی اور جہد کر رہے ہیں اس سے یہ بہت ہی بڑا ہے ۔ یہ ایسا مرحلہ نہیں ہے جس کے اندر ہم فروعی معاملات اور جزوی اصلاحات کے اندر اپنی قوتیں ضائع کریں ۔ میں کہتا ہوں کہ اگر جزوی معاملات نہ ہوں بڑے معاملات ہوں بلکہ حدود اللہ کیوں نہ ہوں لیکن حدود اللہ بھی تب قائم ہوں گی کہ ہم اللہ کی حاکیت اور اقتدار اعلیٰ کا اعتراف کر لیں اور یہ مسئلہ طے ہو جائے کہ اقتدار اعلیٰ اللہ کا ہو گا ۔ اللہ کے سوا کسی کو حق حاکیت حاصل نہ ہو گا ۔ جب تک یہ اعتراف حقیقت واقعیہ نہیں بن جاتا ' جب تک شریعت کو ماخذ قانون قرار نہیں دے دیا جاتا ' جب تک اللہ کی ربوبیت اور اللہ کی حاکیت حکومت اور قوت کے ماخذ نہ بن جائیں تو فروعات کے اندر تمام کوششیں اور تمام انفرادی مساعی ضائع ہوں گی اور ہوتی رہیں گی ۔ مناسب یہی ہے کہ ہم سب سے پہلے منکر اکبر کے خلاف جدوجہد شروع کر دیں اور تمام دوسرے منکرات کو بعد میں لیں ۔

حضور ؐ کا فرمان یہ ہے کہ جو بھی تم میں سے کسی منکر کو پائے تو اسے چاہئے کہ وہ اسے ہاتھ سے روکے اگر طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اس کی بھی طاقت نہ ہو ' دل سے برا جانے اور یہ ضعیف الایمان کا درجہ ہے ۔

اہل دین پر ایسا وقت بھی آتا ہے کہ وہ منکر کو ہاتھ سے نہیں روک سکتے ۔ وہ زبان و قلم سے بھی منکر کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتے ۔ اس کے بعد اضعف الایمان کا درجہ ہی رہ جاتا ہے ۔ دل سے برا جاننا ۔ دل کی دنیا میں تو کوئی مداخلت کر ہی نہیں سکتا ۔ اس لئے دل کی دنیا والے ہمیشہ اضعف الایمان کے درجے میں ہوتے ہیں ' یعنی برائی کو دل سے برا

جاننا۔اگر وہ سچے مسلمان ہوں اور دل سے برائی کو برا سمجھتے ہیں۔

یہ کوئی منفی موقف نہیں ہے جو کوئی برائی کے خلاف اختیار کرے گا۔جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے۔حضورؐ نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے وہ مثبت انداز ہے۔مثلاً دل سے برائی کو برا سمجھنا ہی دل کی جانب سے ایک مثبت کام ہے۔مثلاً دل اسے برا سمجھتا ہے' اس سے نفرت کرتا ہے اور منکر کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا۔اور دل و دماغ ایسی صورت حال کو جائز قانونی صورت نہیں سمجھتے۔اور جب دل و دماغ کسی صورت حال کو تسلیم نہیں کرتے تو یہ بھی درحقیقت اس صورت حالات کو ختم کرنے کی طرف ایک مثبت اقدام ہوتا ہے۔دل میں یہ عزم ہوتا ہے کہ جب بھی فرصت ملے گی اس منکر صورت حال کی جگہ معروف صورت حال کو قائم کر دیا جائے گا اور ایسا شخص انتظار میں بیٹھا ہو گا کہ کس وقت وہ منکر پر حملہ آور ہو اور یہ تمام کام ایجابی اور مثبت کام ہیں اگرچہ یہ ایک ضعیف درجہ ہے۔کسی برے وقت میں ایک مسلمان کے لئے یہ بھی کیا کم ہے کہ وہ اس درجے پر قائم رہے۔کم ازکم وہ منکر کے سامنے ہتھیار تو نہیں ڈالتا کہ منکر ایک واقعہ ہے اسے مان ہی لو۔اور بعض اوقات جب احساس زیاں ختم ہو جاتا ہے تو انسان اضعف الایمان کے مقام سے بھی گر جاتا ہے......... اور پھر کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ بنی اسرائیل کی طرح پورا معاشرہ لعنت کا مستحق ہو جاتا ہے اور اللہ کا یہ قول ان پر صادق آتا ہے

"بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے۔انہوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔

---○○○---

اب اس سے آگے بھی بات بنی اسرائیل ہی کی چلتی ہے اور اس پر ہمارے اس پارے کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔حضورؐ کے دور میں ان کے جو شب و روز تھے وہ بتائے جاتے ہیں۔کم و بیش ہر دور میں ان کے حالات ایسے ہی رہے ہیں۔ان لوگوں نے ہمیشہ اہل اسلام اور جماعت مسلمہ کے خلاف کفار اور بت پرستوں کے ساتھ ایکا کیا اور اس کا سبب یہ ہے' باوجود اس کے کہ وہ اہل کتاب ہیں' وہ اللہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے۔چونکہ وہ اس آخری دین میں داخل نہیں ہوئے وہ مومن نہیں ہیں۔اگر یہ مومن ہوتے تو کافروں کے ساتھ تعلق موالات قائم نہ کرتے۔

(تَرٰی كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ (۸۰) وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۸۱)

"آج تم ان میں بکثرت ایسے لوگ دیکھتے ہو جو (اہل ایمان کے مقابلے میں) کفار کی حمایت و رفاقت کرتے ہیں۔یقیناً بہت برا انجام ہے جس کی تیاری ان کے نفسوں نے ان کے لئے کی ہے' اللہ ان پر غضبناک ہو گیا ہے اور وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں۔اگر فی الواقعہ یہ لوگ اللہ اور پیغمبرؐ اور اس چیز کے ماننے والے ہوتے جو پیغمبر پر

نازل ہوئی تھی تو کبھی (اہل ایمان کے مقابلے میں) کافروں کو اپنا رفیق نہ بناتے مگر ان میں سے تو بیشتر لوگ خدا کی اطاعت سے نکل چکے ہیں۔

"تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کے لئے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرور نفس نہیں ہے۔"

یہ بات جس طرح حضور اکرم ؐ کے دور میں یہودیوں پر منطبق ہوتی تھی اسی طرح آج ے یہودیوں پر بھی منطبق ہے اور کل بھی ہوگی۔ ہر دور میں اہل کتاب یہودی اور عیسائی جو دنیا کے اطراف و اکناف میں پھیلے ہوئے ہیں، ایسے ہی رہیں گے۔ اس سے ہمیں یہ نصیحت ملتی ہے کہ ہم قرآن کریم کے اسرار و رموز پر غور کریں۔ قرآن کریم میں امت مسلمہ کے لئے عجیب ہدایات موجود ہیں اور اسلامی تحریک کو چاہئے کہ وہ ہروقت قرآن سے ہدایات اور پالیسیاں اخذ کرے۔

یہودی مشرکین کے ساتھ، اس دور میں تعلق موالات قائم کئے ہوئے تھے۔ ان کو مسلمانوں کے خلاف جمع کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ کفار اور مشرکین ان مسلمانوں سے زیادہ سیدھی راہ پر ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم نے اس کی صراحت کی ہے، اور اس کا اظہار غزوہ احزاب میں اچھی طرح ہو گیا تھا۔ اس غزوہ سے پہلے اور بعد میں بھی وہ اسی پالیسی پر گامزن رہے اور آج تک وہ اسی موقف پر قائم ہیں۔ فلسطین میں اسرائیل کا قیام ہی ان جدید ملحدین اور کفار کی مساعی سے ہوا ہے۔

رہے عیسائی تو ان کا حال یہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں کا معاملہ پیش آتا ہے تو عیسائی مشرکین کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بت پرستوں کے حامی و مددگار ہوتے ہیں۔ جب بھی مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان کوئی معرکہ پیش آیا۔ ان لوگوں کا دلی بغض اسلام کے خلاف کھل کر سامنے آگیا اور اب تک قائم و دائم ہے۔ اگرچہ معاملہ ان لوگوں کا ہو جو نام نہاد مسلمان ہوں۔ کیا سچ کہا اللہ تعالیٰ نے، (تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۵: ۸۰)

"تم ان میں سے بکثرت ایسے لوگ دیکھتے ہو جو کفار کی حمایت و رفاقت کرتے ہیں۔"

(لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ

(۵: ۸۰) "یقیناً بہت برا انجام ہے جس کی تیاری ان کے نفسوں نے ان کے لئے کی ہے۔ اللہ ان پر غضبناک ہوگیا ہے اور وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں۔"

یہ وہ کمائی ہے جو انہوں نے کی ہے اور وہ اللہ کا غضب ہے جو ان کے لئے جمع ہو رہا ہے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دائماً جہنم میں رہیں گے اور یہ کس قدر برا انجام ہے۔ کس قدر براپس انداز ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ کس قدر تلخ پھل ہے۔ کفار کے ساتھ تعلق موالات کا ہے یہ پھل!

کیا ہم مسلمان اللہ کی اس بات کو نہیں سن رہے؟ کیا ہمیں باز نہیں آنا چاہئے ان اقدامات سے جو ہم مسلسل کر رہے ہیں اور اللہ نے ان کی اجازت نہیں دی ہے۔ پھر بھی ہم مسلمان، اہل کتاب دشمنوں کے ساتھ تعلق موالات کے بارے میں سوچتے ہیں یا متحدہ محاذ بناتے ہیں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ سبب تو یہی ہے کہ اللہ اور رسول پر ایمان نہیں ہے۔

(وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۵ : ۸۱)) "اگر فی الواقعہ یہ لوگ اللہ اور پیغمبرؐ اور اس چیز کے ماننے والے ہوتے جو پیغمبر پر نازل ہوئی تھی تو کبھی (اہل ایمان کے مقابلے میں) کافروں کو اپنا رفیق نہ بناتے مگر ان میں سے تو بیشتر لوگ خدا کی اطاعت سے نکل چکے ہیں۔"

یہ ہے اصل سبب کہ وہ اللہ اور نبی آخر الزمان پر ایمان نہیں لائے۔ ان کی اکثریت فسق و فجور میں مبتلا ہے۔ یہ اپنے شعور اور اپنے رخ کے اعتبار سے کفار کے ہم جنس ہیں۔ اس لئے یہ لوگ کفار کے دوست ہو گئے ہیں اور اہل ایمان سے دوستی نہیں کرتے۔

اس قرآنی تبصرے سے ہمیں تین حقائق واضح طور پر ملتے ہیں۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ اہل کتاب سب کے سب 'ماسوائے ان کے جو حضرت محمدؐ پر ایمان لائے' مومن نہیں ہیں اس لئے کہ وہ رسول آخر الزمان پر ایمان نہیں لائے۔ قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ وہ نبی پر ایمان نہیں لائے بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ خدا پر بھی ایمان لانے والے نہیں ہیں اس لئے کہ "اگر یہ لوگ خدا اور نبی پر ایمان لائے ہوتے تو ان کافروں کے ساتھ دوستی و محبت نہ کرتے۔" یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اس میں تاویل کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ چاہے زبانی طور پر اہل کتاب جس قدر دعوائے ایمان کریں۔ اور اگر ہم خدا تعالیٰ کے بارے میں ان کے منحرف اور فاسد عقائد وتصورات پر بھی غور کریں جن کی تفسیر ہم نے اسی سبق میں ابھی ابھی دی ہے تو ان کے اندر اللہ پر بھی ایمان نہیں ہے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ تمام اہل کتاب کو اسلام دعوت دیتا ہے کہ وہ اسلام میں داخل ہوں۔ اور یہ دعوت انہیں حضرت محمدؐ کی زبان سے دی گئی ہے۔ اگر وہ اس دعوت کو قبول کریں تو مومن ہیں ورنہ نہیں ہیں۔

اور تیسری حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ اہل اسلام اور اہل کتاب کے درمیان موالات اور دوستی کا تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ اور یہ تعلق کسی بھی معاملے میں نہیں ہو سکتا اس لئے کہ مسلمان کے تمام حالات زندگی دین کے تابع ہوتے ہیں اور یہ لوگ دین اسلام کے دشمن ہیں۔

رہی یہ بات کہ اسلام اہل کتاب کے ساتھ حسن معاشرت اور اچھا طرز عمل اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے' ان کے جان و مال اور ان کی عزت و آبرو کی حفاظت کا حکم دیتا ہے جب تک وہ دارالاسلام میں ہوں اور یہ کہ وہ ان کو اجازت دیتا ہے کہ ان کے جو عقائد ہیں وہ ان پر قائم رہیں اور یہ کہ ان کو حکمت اور حسن ادا کے ساتھ اسلام کی طرف دعوت دی جائے اور ان سے بحث و مباحثہ بھی اچھی طرح ہو جب تک وہ اسلامی ریاست کے وفادار رہیں اور یہ کہ ان کو کسی حال میں بھی اپنے عقائد کو ترک کرنے کا حکم نہ دیا جائے تو یہ اسلام کی وہ پالیسی ہے جو اسلام نے دارالاسلام میں رہنے والی تمام اقلیتوں کے لئے وضع کی ہے۔ یہ ہے اسلام' بات واضح اور صاف ہے۔ اسلام نیکی چاہتا ہے۔ رواداری کو رائج کرتا ہے اور بات دوٹوک کرتا ہے کیونکہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اللہ صحیح راہ دکھانے والا ہے۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَ

الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا ۚ وَ لَتَجِدَنَّ اَقۡرَبَہُمۡ مَّوَدَّۃً لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّا نَصٰرٰی ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّ مِنۡہُمۡ قِسِّیۡسِیۡنَ وَ رُہۡبَانًا وَّ اَنَّہُمۡ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ ﴿۸۲﴾

تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کے لئے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاری ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرور نفس نہیں ہے۔

منصورہ ۷ دسمبر ۱۹۸۹ء ۱۲ بجے دن

---○○○---

فی ظلال القرآن

پارہ --------- ۷

سورہ المائدہ ----- آخری حصہ

آیت نمبر ۸۳ --- تا --- ۱۲۰

سورہ الانعام ----- ابتدائی حصہ

آیت نمبر ۱ --- تا --- ۱۱۰

سورہ المائدہ کا آخری حصہ ایک نظر میں

اس پارے میں سورۂ مائدہ کا بقیہ حصہ ہے' اس کے ابتدائی حصوں کے بارے میں تفصیلات پارۂ ششم میں گزر چکی ہیں۔ نیز اس میں سورۂ انعام کے آغاز سے لے کر آیت (وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ) تک کا حصہ بھی مذکور ہے' جس کے بارے میں تفصیلی بحث سورہ انعام کے آغاز میں ہوگی۔ یہاں صرف اس حصے پہ تبصرہ کیا جا رہا ہے جو سورہ مائدہ سے رہ گیا تھا۔

پارہ ششم میں اس سورہ کے تعارف میں ہم نے کہا تھا:

"اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر اس لئے نازل فرمایا کہ اس کے ذریعے وہ ایک امت کو برپا کریں' وہ امت ایک مملکت کی بنیاد رکھے' ایک معاشرے کو منظم کرے اور یہ مملکت لوگوں کے ضمیر' ان کے اخلاق سنوارے اور ان کی عقلی تربیت کرے۔ اس قرآن کے ذریعے اس معاشرے کے اجتماعی تعلقات کے حدود و قیود وضع ہوں اور اس مملکت کے اندر لوگوں کے تعلقات بھی منضبط ہوں اور پھر دوسرے ممالک کے ساتھ بھی اس مملکت کے تعلقات استوار ہوں۔ اس امت کے تعلقات دوسری امتوں اور ملتوں کے ساتھ قائم ہوں۔ قرآن اس تمام پوری امت کو ایک مضبوط رسی کے اندر باندھ دے' اس کے متفرق اجزاء کو جمع کر دے' اس کے فرقوں کو جمع کر دے اور اسے ایک مضبوط محور کے اندر پختہ کر دے' اسے اللہ کی اس بادشاہت کے اندر لے آئے اور اس کا رخ ایک سمت میں ہو جائے۔ یہ ہے دین اسلام جیسا کہ درحقیقت وہ اللہ کے نزدیک ایسا ہی ہے اور جسے مسلمانوں نے ایسا ہی سمجھا جب وہ صحیح مسلمان ہوا کرتے تھے۔

جیسا کہ سابقہ تین طویل سورتوں میں ہم نے دیکھا اس سورہ میں بھی مختلف موضوعات کو لیا گیا ہے۔ ان تمام موضوعات کے درمیان قدر مشترک کیا چیز ہے؟ وہی جس کے حصول کے لئے اس دنیا میں پیغام اسلام کی ضرورت محسوس کی گئی۔ یعنی ایک امت کی تشکیل' ایک مملکت کا قیام اور ایک مثالی اسلامی معاشرے کا قیام۔ اس معاشرے کا قیام بھی ایک خاص نظریہ کے مطابق' ایک خاص تصور حیات کی روشنی میں اور بالکل جدید انداز میں مطلوب تھا۔ اس معاشرے کی روح عقیدۂ توحید تھی۔ عقیدۂ توحید اس کا پہلا اصول قرار پایا اور عقیدۂ توحید کے اہم عناصر یہ ہیں کہ الٰہ اور حاکم فقط اللہ ہے' وہی اس کائنات کا تھامنے والا ہے۔ اسی کا حکم چلتا ہے' زندگی گزارنے کے طریقے صرف اسی سے اخذ کئے جا سکتے ہیں' وہی شارع ہے' وہی زندگی کی اعلیٰ قدریں متعین کرنے کا حق رکھتا ہے اور حسن و قبح کے پیمانے صرف وہی متعین کر سکتا ہے۔"

"اس سورہ میں اعتقادی افکار کی توضیح کی گئی ہے اور اسے بت پرستانہ خرافات اور انحرافات سے پاک کیا گیا ہے۔ نیز اہل کتاب نے جو تحریفات کیں انہیں بھی دور کیا گیا ہے اور جماعت مسلمہ کے سامنے خود اس کا اپنا تعارف پیش کیا گیا ہے

کہ اس کی حقیقت کیا ہے' اس کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے' اور اس کے راستے میں جو کانٹے ہیں اور جو جال بچھے ہوئے ہیں ان سے بچنے کا کیا طریقہ ہے۔ کہاں کہاں اس دین کے دشمن گھات لگائے بیٹھے ہیں اور کہاں کہاں پھسلن ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ' اس سورہ میں عبادات اسلام اور شعائر اسلام بھی بتائے گئے ہیں جن کے ذریعے ایک مسلم کی روح پاک ہو جاتی ہے اور اس کا رابطہ اس کے رب کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ نیز اعتقادات و عبادات کے ساتھ ساتھ اس میں اجتماعی روابط' حکومت کے لئے قانون سازی اور پھر دوسری حکومتوں کے ساتھ اسلامی حکومت کے تعلقات کے اصول بھی بتائے گئے ہیں۔ نیز اسلامی معاشرے میں حلال و حرام کا بھی ذکر ہے کہ مسلمانوں کے لئے کن چیزوں کا کھانا حرام ہے' کن مشروبات کا پینا حرام ہے اور کن عورتوں سے نکاح حرام ہے۔ کیا کیا اعمال برے ہیں اور کیا کیا طرز ہائے عمل غیر اسلامی ہیں۔ غرضیکہ یہ سورہ ایک مکمل گٹھڑی ہے جس کے اندر' یہ تمام امور ایک ہی جگہ آ گئے ہیں اور یہ گٹھڑی مجموعہ دین ہے۔ اسی نقطہ نظر سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ دین ان تمام امور پر مشتمل ہے۔"

اس سورہ کی نوعیت اور اس کے مشمولات و موضوعات کی اس عام تصویر کشی کی روشنی میں ہم اس کے اس بقیہ حصے کا بھی بڑی خوبی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اس حصے میں بھی وہ مباحث اور موضوعات یا ان کے ساتھ ملتی جلتی بحثیں موجود ہیں جن کی تفصیلات پارہ ششم میں گزر چکی ہیں۔

امت مسلمہ کی مخالفت کرنے والے عناصر بعض دوسرے کیمپوں کا تعارف ان مباحث میں کرایا گیا ہے' جن کے بارے میں وہاں اشارات رہ گئے تھے۔ یہ بات نہایت ہی تعجب خیز ہے کہ یہ وہی کیمپ ہیں جو ہمیشہ تحریک اسلامی یا احیائے اسلام کی تحریکات کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس تحریک کے دشمنوں کے رنگ مختلف ہیں لیکن اصل کینہ ایک ہی ہے جو ان کے دلوں میں جاگزیں ہے۔ نیز ان میں ایک نہایت ہی قلیل تعداد ہدایت کے طالب لوگوں بھی ہے' مثلاً بعض عیسائی گروہ' جو ہدایت قبول کر رہے ہیں اور جب اس وقت حضور کی جانب سے انہوں نے یہ دعوت پرسوز سنی تو ان کے دل پگھل گئے اور انہوں نے لبیک کہہ کر اپنے آپ کو ثواب آخرت اور جنت کا مستحق کر لیا۔

ان باقی مباحث میں سے ایک بحث یہ بھی ہے کہ حلال و حرام کے موضوع پر قانون سازی کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے اور اہل ایمان کے لئے سخت ممانعت ہے کہ وہ اس موضوع پر اللہ تعالیٰ کے حق اقتدار اور قانون سازی پر دست درازی کریں۔ اہل ایمان کو خدا کا خوف کرنا چاہئے کیونکہ یہ معاملہ ایمان وکفر کا ہے اور انہوں نے ایمان لانے کا اعلان تو کر ہی دیا ہے۔

اس کے علاوہ قسموں' جوے' شراب' پانسوں' بتوں اور حالت احرام کے اندر شکار جیسے قانونی اور فقہی احکام' خانہ کعبہ' حرام مہینوں' ہدی اور وہ جانور جن کے گلوں میں پٹے ڈالے ہوئے ہوتے ہیں بطور علامت' قربانی کی بابت مسائل نیز اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ شرعی احکام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے دی جانے والی ہدایات کی پیروی کی تاکید اور خدا اور رسول کی مخالفت سے ڈرانے کے مضامین بھی دیئے گئے ہیں اور تنبیہ کی گئی ہے کہ اللہ کے عذاب اور اس کے انتقام سے ڈرو اور ہروقت اس ذات باری کو پیش نظر رکھو جس کے پاس تم نے لوٹ کر جانا ہے۔

اس کے بعد جماعت مسلمہ کی تربیت کے بعض پہلو بھی لئے گئے ہیں' وہ اقدار جن کے مطابق اس نے پوری دنیا کے ساتھ معاملہ کرنا ہے' مثلاً یہ کہ خبیث چیزوں کی کثرت سے انہیں متاثر نہ ہونا چاہئے۔ انہیں یہ دیکھنا چاہئے کہ پاک اور طیب چیزیں ہمیشہ کم ہوتی ہیں۔ نیز ان اقدار اور آداب میں سے اہم ادب یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ اور رسول اللہ سے ہر بات کے بارے میں نہ پوچھا جائے اور اگر خدا تعالیٰ نے کسی بات کو مجمل چھوڑ دیا ہے تو اہل ایمان کو اس کے بارے میں پوچھنے سے گریز کرنا چاہئے۔

اس حصے میں یہ اعلان بھی کیا گیا ہے کہ جاہلیت کی عادات اور رسوم کو باطل قرار دے دیا گیا ہے۔ بت پرستی کی ممانعت کر دی گئی ہے اور بعض قسم کے جانوروں اور ذبیحوں کے حوالے سے جو شرک اور بت پرستی باقی ہے اسے ختم ہونا چاہئے۔ مثلاً بحیرہ' سائبہ' وصیلہ' اور حام وغیرہ اور یہ کہ حلال و حرام کے تعین کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ پوری زندگی کے لئے قانون سازی کا اختیار اللہ کو حاصل ہے اور کوئی قانون سازی لوگوں کے رواج اور لوگوں کی اصلاحات کے مطابق نہیں ہو سکتی۔ یہ کام صرف اللہ کا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کو تنبیہ کی گئی کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے۔ اس کے افراد کے اندر باہم مکمل تکافل ہو اور وہ دوسرے لوگوں سے مکمل طور پر جدا اور کٹے ہوئے ہوں۔ اسے اپنی مخصوص ذمہ داریوں کو ادا کرنا چاہئے اور دوسرے اہل باطل کی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو مکمل طور پر بری الذمہ رکھنا چاہئے۔ اور اپنے انجام اور دوسرے لوگوں کے انجام کو بھی مکمل طور پر اللہ کے حوالے کر دینا چاہئے' جس کا فیصلہ قیامت کے دن اللہ کے ہاں ہو گا۔

اسلامی قانون سازی کرتے ہوئے مضمون کا خاتمہ اس امر پر ہوتا ہے کہ اگر کوئی سفر میں ہو اور اپنے خاندان سے دور ہو اور وہ وصیت کرنا چاہتا ہو تو اس پر شہادت مقرر کرے۔ اس طرح نظر آتا ہے کہ یہ قانون سازی اس لئے ضروری تھی کہ مسلمان جہاد فی سبیل اللہ اور تلاش وسائل اور فضل اللہ کے لئے باہر نکلیں گے۔ لیکن اس قانون سازی میں بھی تمام معاملات کو خوف آخرت کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔

باقی سورہ میں اہل کتاب میں سے نصاریٰ کے عقائد کے بعض دوسرے پہلوؤں کو لیا گیا ہے اور اس مقصد کے لئے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ ؑ کے قصے کے بعض گوشوں کو لایا گیا ہے۔ اور ان معجزات کو بیان کیا گیا ہے جو حضرت عیسیٰ ؑ سے ظاہر ہوئے۔ حواریوں نے جو کھانا طلب کیا تھا' حضرت عیسیٰ ﷺ اور آپ کی والدہ کی الوہیت کے مسائل' اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہرگز ایسے دعاوی نہیں کئے تھے' اور قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کی جھلکی بھی دکھائی گئی ہے جس میں حضرت عیسیٰ ؑ کی قوم کا معاملہ تمام انسانیت کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور وہ اللہ رب العالمین کے لئے پیش ہوتا ہے اور اس خوفناک منظر میں تمام اقوام و رسل موجود ہیں۔

سورہ کا خاتمہ اس موقف پر ہوتا ہے کہ زمین و آسمانوں کا اصل مالک اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت پر کوئی قید و بند نہیں ہے۔

(وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ) "زمین و آسمانوں اور تمام موجودات کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

سورہ کے اس بقیہ حصے کے اس سرسری جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی طریق کار اور اسی منہاج بحث کے مطابق اس کے مباحث آگے بڑھ رہے ہیں' جس کی طرف ہم نے محولہ بالا اقتباسات میں اشارہ کیا ہے۔ اب ہم بقیہ اسباق پر تفصیلی بحث کرتے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۵۲ ایک نظر میں

یہ سبق یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے بارے میں ہونے والی طویل گفتگو ہی کا حصہ ہے ' جو پارۂ ششم میں چل رہی تھی اور جس میں یہ بتانا مقصود تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امت مسلمہ کے بارے میں ان لوگوں کا موقف کیا ہے ۔ یہ بات چیت اس سورہ میں نصف سے بھی زیادہ حصے پر مشتمل ہے ۔ اس بات چیت میں عموماً یہود و نصاریٰ دونوں کے نظریاتی فساد سے پردہ اٹھایا گیا ہے ' اور خصوصاً یہودیوں کی بری نیت اور برے کردار سے بحث کی گئی ہے ۔ یہ کردار ان کا خود ان کے انبیائے سابقہ کے ساتھ رہا ۔ حضرت نبی ؐ کے ساتھ بھی رہا اور وہ اس پورے عرصہ میں اہل اسلام کے بجائے مشرکین کے معاون و مددگار رہے ۔ وہاں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ یہود نصاریٰ جن عقائد تک پہنچے ہوئے ہیں وہ صراحتہً کفریہ عقائد ہیں اس لئے کہ انہوں نے تورات ' انجیل اور قرآن کریم تینوں میں آئے ہوئے عقائد چھوڑ دیئے ہیں ' جب تک وہ تورات ' انجیل اور اب نازل ہونے والے کلام الٰہی کو قائم نہ کریں اس وقت تک ان کی کوئی دینی حیثیت نہ ہوگی ۔ اب بات کا رخ حضور اکرم ؐ کی طرف ہو جاتا ہے کہ آپ کی طرف جو کچھ بھی نازل ہوتا ہے آپ اسے یہود و نصاریٰ اور مشرکین سب تک پہنچا دیں ' اس لئے کہ ان سب لوگوں نے دین الٰہی کو چھوڑ دیا ہے اور اب ان سب کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں اور امت مسلمہ کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اللہ اور رسول اللہ اور اہل ایمان ہی کو دوست اور ولی بنائے اور یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے ساتھ تعلق موالات قائم نہ کرے کیونکہ یہ لوگ خود ایک دوسرے کے دوست ہیں ۔ یہودی تو اہل کفر اور اہل شرک کے ساتھ بھی دوستی کا تعلق قائم کئے ہوئے ہیں حالانکہ حضرت داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کے ذریعہ ان پر لعنت ہو چکی ہے ۔ یہ تو تھا سابقہ مضمون ' اب یہاں حضور ؐ کے حوالے سے ان سب گروہوں نے جو موقف اختیار کر رکھا ہے ' وہ بیان کیا جاتا ہے اور امت مسلمہ کے ساتھ انہوں نے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ اور آخرت میں ان کا جو انجام ہونے والا ہے وہ بیان کیا جاتا ہے ۔

نزول قرآن کے وقت امت مسلمہ قرآن کریم کو یوں لیتی تھی کہ وہ اپنے تمام منصوبے ' اپنی تمام سرگرمیوں اور لوگوں کے متعلق اپنے تمام مواقف اور رویے اس کے مطابق ڈھالتی چلی جاتی تھی اور حالت یہ تھی کہ قرآن کریم ' ان کا ہادی ' محرک ' مرشد اور لیڈر تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ ہر معرکے میں وہ غالب رہتی اور اس کے مخالف مغلوب رہتے ' اس لئے کہ ہر معرکے میں براہ راست وہ ربانی کمانڈ میں لڑتی تھی ' اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم امت کی قیادت عالم بالا کی ربانی ہدایات کے مطابق فرماتے تھے ۔

کیا وہ ربانی ارشادات ہمارے سامنے موجود نہیں ؟ کیا وہ کتاب کریم جس کے اندر وہ ہدایات رقم ہیں موجود نہیں ہے ؟ موجود ہے اور آج جو لوگ دعوت اسلامی دے رہے ہیں یا کل جو لوگ یہ کام کریں گے ان کو چاہئے کہ وہ ان ہدایات اور فیصلوں کو اس طرح لیں جس طرح کہ گویا یہ ہدایات ابھی نازل ہو رہی ہیں اور وہ تمام لوگوں کے مقابلے میں

اپنا موقف ان ہدایات کی روشنی میں متعین کر رہے ہیں۔ تمام مذاہب و مسالک اور تمام آراء اور نظریات اور تمام طور طریقوں اور تمام اقدار اور پیمانوں کے مقابلے میں ان کا موقف اس کی روشنی میں متعین ہو رہا ہے اور یہ کام آج بھی اسی طرح ہونا چاہئے اور کل بھی۔

(لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا)

"تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے۔" عربیت کے اعتبار سے اس آیت کے مخاطب رسول اللہ ؐ بھی ہو سکتے ہیں' اور عام اہل ایمان بھی' اس لئے کہ یہ ایک ایسی حقیقت اور ایسا مفہوم ہے جو سب کو بچشم سر اب بھی نظر آتا ہے اور یہ انداز کلام ایسا ہے کہ اسالیب عربی کے اندر اس کے نظائر موجود ہیں خواہ مخاطب حضور ہوں یا ایک عام مسلمان دونوں صورتوں میں آیت کے ظاہری معنی بالکل واضح ہیں۔

البتہ جو نکتہ قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اس عبارت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین سے بھی پہلے یہودیوں کو لیا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مشرکین کے مقابلے میں یہودیوں کی اسلام دشمنی زیادہ ہے اور تاریخی اور واقعاتی اعتبار سے یہ بات بھی بالکل واضح ہے' اگر غور کیا جائے۔

یہ بات درست ہے کہ گرائمر کے قواعد کے مطابق واو سے جو عطف ہوتا ہے' اس میں تعاقب یا ترتیب کا لحاظ نہیں ہوتا اور معطوف اور معطوف علیہ حکم میں برابر ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں یہودیوں کو مشرکین سے پہلے اس لئے لایا گیا ہے کہ وہ اصلاً اہل کتاب تھے اور ہو سکتا ہے کہ کوئی یہ گمان کرے کہ وہ مسلم دشمنی میں شاید مشرکین سے کم ہوں گے' اس لئے یہاں قواعد نحو سے ہٹ کر اس تقدیم سے یہ تاثر دینا مقصود ہے کہ یہ لوگ مسلم دشمنی میں کم نہیں ہیں۔ اگرچہ قواعد نحو میں اس تقدیم سے یہ تاثر نہیں ملتا لیکن اس بات کا احتمال ضرور ہے کہ یہ اشارہ مقصود ہو کہ یہ لوگ مشرکین سے بھی اسلام دشمنی میں شدید تر ہیں۔

آغاز اسلام سے آج تک جب ہم اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس میں اسلام کے حوالے سے یہودیوں کے طرز عمل پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے مشرکین عالم کے مقابلے میں یہودی اسلام دشمنی میں بہت ہی آگے رہے ہیں۔

جونہی مدینہ میں اسلامی ریاست قائم ہوئی' یہودی اس کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے اور جب امت مسلمہ ایک امت بنی' انہوں نے اس کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ قرآن کریم نے ان کی ان سازشوں اور مکاریوں کے بارے میں نہایت ہی واضح فیصلے کئے اور اشارات دیئے جو اس معرکہ آرائی کا ایک واضح ثبوت ہیں جو یہودیوں نے اسلام اور رسول اسلام کے خلاف اور امت مسلمہ کے خلاف اس کی طویل تاریخ میں برپا کئے رکھی اور جس کے شعلے گذشتہ چودہ سو سال میں کسی بھی وقت فرو نہیں ہوئے اور جس کی گرمی آج بھی چار دانگ عالم میں ہر سو محسوس کی جا رہی ہے۔

جب رسول اللہ ؐ مدینہ تشریف لائے تو آپ نے سب سے پہلے یہودیوں کے ساتھ معاہدۂ امن اور معاہدۂ پرامن بقائے باہمی (Co-existance) کیا۔ آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی جو ان کے پاس موجود کتاب تورات کی تصدیق کرتا تھا لیکن یہودیوں نے اس عہد کو وفا نہ کیا۔ انہوں نے وہی رویہ اختیار کیا جو انہوں نے اس سے پہلے اپنے اللہ' اپنے نبیوں کے ساتھ اختیار کیا تھا اور جس کی وجہ سے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ تبصرہ کیا۔

(وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ) ”ہم نے تمہاری طرف ایسی آیات نازل کی ہیں جو صاف صاف حق کا اظہار کرنے والی ہیں اور ان کی پیروی سے صرف وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو فاسق ہیں۔ کیا ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا رہا ہے کہ جب انہوں نے کوئی عہد کیا' تو ان میں سے ایک نہ ایک گروہ نے اسے ضرور بالائے طاق رکھ دیا؟ بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں' جو سچے دل سے ایمان نہیں لاتے۔ اور جب ان کے پاس 'اللہ کی طرف سے کوئی رسول' اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی' تو ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو اس طرح پس پشت ڈالا' گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔“

جس دن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے' اوس اور خزرج اسلام پر جمع ہوئے' یہودی مسلمانوں کے دلی دشمن بن گئے' اس لئے کہ اسلام کی وجہ سے ان قبائل کے اندر یہودیوں کا عمل دخل یکسر ختم ہو گیا۔ اس مشکل اور عظیم اتحاد کی وجہ سے ہی امت مسلمہ کی قیادت وجود میں آگئی اور اس کی زمام اختیار حضرت محمد ﷺ نے اپنے ہاتھ میں لی اور پورے علاقے سے یہودیوں کے اقتدار کے مواقع ختم ہو گئے۔

یہودیوں کی مکارانہ ذہنیت کے بس میں جو وسائل اور جو ہتھیار تھے' انہوں نے وہ سب مسلمانوں کے خلاف استعمال کئے۔ بابل کی اسیری' مصری غلامی اور رومن عروج کے زمانے میں گزرنے والی غلامانہ زندگی کے شب و روز میں انہوں نے جو مکاری اور عیاری سیکھی تھی وہ سب انہوں نے اسلام کے خلاف استعمال کی۔ حالانکہ تمام اقوام اور ملتوں نے ان کے ساتھ جس تنگ دلی کا رویہ اختیار کیا تھا' اسلام نے اس کے برعکس ان کے ساتھ نہایت ہی فراخدلی کا ثبوت دیا۔ لیکن انہوں نے اسلام کے اس حسن سلوک کا بدلہ اس مکر و فریب سے دیا جو فجر اسلام سے آج تک جاری ہے اور جو نہایت ہی گھٹیا ذہنیت کا غماز ہے۔

انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جزیرۃ العرب کی تمام قوتوں کو اکٹھا کیا اور رات دن عرب کے متفرق قبائل کو اس مہم کے لئے جمع کرتے رہے۔

(وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا) ”وہ ان لوگوں سے کہتے جنہوں نے کفر کی راہ لی کہ یہ ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ہدایت کی راہ پر ہیں۔“

اور جب اسلام یہودیوں کی سازشوں کے برعکس غالب ہو گیا تو انہوں نے اپنی سازشوں کا رنگ بدلا۔ انہوں نے اسلامی لٹریچر کے اندر اپنی جانب سے گھڑی ہوئی باتیں داخل کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ صرف کتاب اللہ ان کی دسترس سے باہر رہی' اس لئے کہ اس کی حفاظت کی ضمانت خود اللہ تعالیٰ نے دی تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کی صفوں کے اندر

اپنے ایجنٹ داخل کئے۔ جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور ابھی ان کے ذہن میں پختگی پیدا نہ ہوئی تھی ان کے اندر انہوں نے فتنہ پردازی شروع کر دی یہ کام وہ مختلف علاقوں میں کرتے رہے اور آج تک وہ مسلمانوں کے خلاف دنیا کے اطراف و اکناف میں لوگوں کو جمع کرتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت دنیا کے چپے چپے پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہودیوں نے جال بچھا رکھے ہیں۔ اس جنگ میں وہ عیسائی اور بت پرست دونوں اقوام کو استعمال کر رہے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے اندر غیر اسلامی طور طریقے رائج کرتے ہیں اور مسلمان ممالک کے اندر ایسی لیڈر شپ سٹیج پر لاتے ہیں جن کے صرف نام مسلمانوں جیسے ہوتے ہیں اور ان کے ذریعے وہ دین اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینکنے کے عمل میں مصروف ہیں۔

ذرا پھر اللہ تعالیٰ کے اس کلام پر غور فرمائیں: ”تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے۔“

☆ جس شخص نے مدینہ کی نوخیز اسلامی مملکت کے خلاف تمام قبائل کو جنگ احزاب میں جمع کیا اور بنی قریظہ اور دوسرے یہودیوں کو جمع کیا اور قریش مکہ اور دوسرے قبائل کو جمع کیا یہ کون تھا؟ یہودی۔

☆ وہ شخص جس نے عوام کو برانگیختہ کیا' اشرار کو مدینہ میں جمع کیا' اور مکروہ پروپیگنڈا کیا جس کے نتیجے میں حضرت عثمان شہید ہوئے اور اس کے بعد نہایت ہی تباہ کن واقعات پیش آئے وہ کون تھا؟ یہودی۔

☆ وہ لوگ جو احادیث رسول میں موضوعات داخل کرتے رہے وہ کون تھے؟ یہودی۔

☆ اسلام کی آخری خلافت' خلافت عثمانیہ کے دور میں قومیت کے نعرے کس نے بلند کئے' عالم اسلام میں انقلابات برپا کر کے اسلامی شریعت اور اسلامی دساتیر کو کس نے منسوخ کیا اور جس شخص نے خلافت عثمانیہ کو ختم کر کے سلطان عبد الحمید کے بعد لادینی نظام رائج کیا' وہ کون تھا؟ اتاترک یہودی۔

☆ وہ تمام اقدامات جو پورے عالم اسلام میں اور پوری دنیا میں اسلامی تحریکات کے خلاف کئے جاتے ہیں ان کی پشت پر کون ہے؟ یہودی۔

☆ اس کرۂ ارض پر مادیت اور ملحدانہ نظریات کا موجد کون ہے؟ یہاں حیوانی اور میلانات' جنسی بے راہ روی کے پھیلانے کی تحاریک کی پشت پر کون ہے؟ ان تمام نظریات کا پرچار کون کرتا ہے جو تمام مذہبی مقدسات اور شعائر کے خلاف ہیں؟ صرف اور' صرف یہودی۔

غرض یہودیوں نے اسلام کے خلاف پوری اسلامی تاریخ میں جو معرکہ آرائی کی ہے اس کی داستان نہایت ہی طویل ہے۔ اور اس کے مقابلے میں مشرکین اور بت پرستوں نے اسلام کے خلاف جو کچھ کیا وہ بہت ہی کم ہے۔ زمانہ قدیم میں بھی اور دور جدید میں بھی۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ مشرکین عرب کے ساتھ اسلام کی معرکہ آرائی مجموعی طور پر صرف بیس سال تک رہی؟ اس طرح اہل فارس کے ساتھ بھی ایک مختصر عرصہ جنگ رہی۔ دور جدید میں اگرچہ ہندستان کے مشرکین بظاہر اسلام کے خلاف لڑتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی دشمنی اور جنگ یہودیوں کے مقابلے کچھ بھی نہیں ہے۔ عالمی صیہونیت (یاد رہے کہ سوشلزم اور کیمونزم عالمی صیہونیت کی شاخیں ہی تصور ہوتی ہیں) ہمیشہ سے اسلام دشمنی میں پیش پیش رہی ہے اور اس سے قبل یہودیوں نے اسلام کے خلاف جو محاذ آرائی کی اور یہ جس قدر طویل اور وسیع رہی ہے'

اس کے مقابلے میں صرف صلیبی جنگیں ہی کسی قدر وقعت رکھتی ہیں جن پر ہم آگے چل کر بات کریں گے۔

اگر ہم اللہ تعالیٰ کے ان الفاظ پر بار بار غور کریں "تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت "یہود اور مشرکین" کو پاؤ گے" تو بات کا حق ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں مشرکین کے مقابلے میں یہودیوں کو پہلا نمبر دیا گیا ہے اور پھر جب ہم یہودیوں کے اس تاریخی رول کو بھی پیش نظر رکھیں جو انہوں نے اسلام کے خلاف ادا کیا، جس کے کچھ واقعات کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس فقرے میں یہودیوں کو کیوں پہلے نمبر پر رکھا ہے۔

بے شک یہودی نہایت ہی بدفطرت لوگ ہیں، ان کے مزاج میں شر ہے، ان کے دلوں کے اندر اسلام اور نبی اسلام کے خلاف کینہ بھرا ہوا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ یہاں مسلمانوں اور نبی اکرم کو خبردار فرماتے ہیں اور ان لوگوں کی اس بری اور شریر فطرت پر اگر دنیا میں کسی نے قابو پایا تو وہ اسلام اور مسلمان تھے، لیکن اس وقت جب مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان تھے۔ صرف اسلام ہی تھا، جس نے اس بدفطرت مخلوق سے لوگوں کو نجات دلائی تھی لیکن اس وقت جب اہل اسلام، اسلام کا حق پورا پورا ادا کرتے تھے۔

(لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۸۲) وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (۸۳) وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ (۸۴) فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ (۸۵) وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۸۶)) "تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کے لئے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرور نفس نہیں ہے۔ جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔ وہ بول اٹھتے ہیں کہ "پروردگار، ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔" اور وہ کہتے ہیں کہ "آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اسے کیوں نہ مان لیں جب کہ ہم اس بات کی خواہش

رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے؟" ان کے اس قول کی وجہ سے اللہ نے ان کو ایسی جنتیں عطا کیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزاء ہے نیک رویہ اختیار کرنے والوں کے لئے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا اور انہیں جھٹلایا، تو وہ جہنم کے مستحق ہیں۔"

ذرا ان آیات پر غور کیجئے۔ یہ ایک مخصوص صورت حال کی نشاندہی کر رہی ہیں اور ان میں جو فیصلہ ہے یہ بھی ایک مخصوص صورت حال میں ہے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں میں سے ایک فریق کے بارے میں ایک تبصرہ ہے جو کہتے تھے کہ ہم "نصاریٰ" ہیں اور تبصرہ ان الفاظ میں ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ محبت میں یہ لوگ قریب تر ہیں۔

لیکن یہ بات یہاں ذہن میں رہنا چاہئے کہ یہ ایک متعین صورت حال پر تبصرہ ہے اس لئے یہ صرف مخصوص صورت حالات پر ہی منطبق ہو گا۔ اکثر لوگوں نے اس تبصرے کو اچھی طرح نہیں سمجھا ہے۔ بعض لوگ اس تبصرے کو اس مقصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں کہ اہل اسلام بعض مخالف کیمپوں کے ساتھ اپنے موقف میں نرمی پیدا کر لیں حالانکہ اپنے موقف میں نرمی کرنا اہل اسلام کے لئے نہایت ہی مضر ہے۔ اس سے دشمن کی پالیسی اور موقف کے سمجھنے میں بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ اس لئے ہم یہاں مناسب سمجھتے ہیں کہ ظلال القرآن میں اس صورت حال کی وضاحت کر دیں جس کی تصویر کشی ان آیات میں کی گئی ہے۔

ان آیات میں جن لوگوں کی تصویر کشی کی گئی ہے وہ ایسے لوگ ہیں جو کہتے تھے کہ ہم "نصاریٰ" ہیں، اور وہ مسلمانوں کی دوستی میں قریب تر ہیں اور یہ لوگ عالم دین اور تارک الدنیا قسم کے فقیر ہیں اور وہ متکبر اور مغرور بھی نہیں ہیں۔

(ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ (۸۲) "یہ اس لئے کہ ان میں عالم دین اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔" لیکن قرآن مجید بات کو یہاں ہی ختم نہیں کر دیتا۔ نہ بات کو مجمل چھوڑا جاتا ہے۔ نہ اسے ہر اس شخص کے لئے عام چھوڑ دیا جاتا ہے جو کہتا ہے کہ میں نصرانی ہوں۔ اس گروہ کی تصویر میں کچھ مزید رنگ بھرے جاتے ہیں اور اس گروہ کے موقف کو یوں واضح کیا جاتا ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۵۲ تشریح آیات

۸۳ ----- تا ----- ۸۶

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾

”جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔ وہ بول اٹھتے ہیں کہ ”پروردگار‘ ہم ایمان لائے‘ ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔“ اور وہ کہتے ہیں کہ ”آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اسے کیوں نہ مان لیں جب کہ ہم اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے۔“

یہ ایک زندہ منظر ہے اور اس میں اس گروہ کی مکمل تصویر نظر آتی ہے۔ یہ گروہ جو اہل ایمان کے ساتھ دوستی میں دوسرے کے مقابلے میں قریب تر ہے۔ یہ ایسا گروہ ہے کہ جب قرآن مجید کا تازہ ترین حصہ نازل ہوتا ہے تو اس گروہ کے جذبات جوش میں آ جاتے ہیں۔ ان کے دل نرم ہو جاتے ہیں اور وہ اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔ یہ بات اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ اس قرآن سے نہایت ہی گہرا اثر لیتے ہیں۔ وہ اس تاثر کا اظہار صرف آنسوؤں کی زبان میں کرتے ہیں اور اس قسم کا اظہار اس وقت کیا جاتا ہے جب انسان کے لئے الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے اس تاثر کا اظہار آنسوؤں کے ذریعے کیا جاتا ہے اور اس طرح دباؤ اور گھٹن ختم ہو جاتی ہے کیونکہ جذبات کا دباؤ نہایت ہی سخت اور گہرا ہوتا ہے۔

یہ لوگ محض آنسو بہا کر رک نہیں جاتے بلکہ قرآن کو سن کر جس سچائی سے وہ متاثر ہو چکے‘ اس کے بارے میں منفی رویہ اختیار نہیں کرتے۔ قرآن کریم جس سچے شعور کا حامل ہے‘ اور جو شدید احساس وہ پیدا کرتا ہے‘ اس کے مقابلے میں خاموش نہیں رہتے۔ وہ صرف اتنا ہی نہیں کرتے کہ بس سن کر متاثر ہوئے اور آنسو بہا کر رک گئے بلکہ وہ اس سے آگے بڑھتے ہیں اور مثبت رویہ اختیار کر کے اس سچائی‘ اس شعور اور احساس کو قبول کر لیتے ہیں۔ وہ ایمان لاتے ہیں‘ یقین کر لیتے

ہیں اور یہ بھی نہیں بلکہ وہ اپنے ایمان اور یقین کا اعلان بھی کرتے ہیں اور یہ اعلان وہ بڑے جوش و خروش سے کرتے ہیں۔

(يَقُولُونَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (٨٣) وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ (٨٤)) "اور وہ بول اٹھتے ہیں کہ پروردگار، ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لیجئے۔" اور وہ کہتے ہیں "آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اسے کیوں نہ مان لیں جب کہ ہم اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے۔"

دیکھئے یہ لوگ اس سچائی کا اعلان کرتے ہیں جو ان تک پہنچی اور وہ اسے پہچان گئے۔ اس کے بعد وہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں گواہوں کی فہرست میں شامل فرما دے اور ہمیں اس لڑی میں شامل کر دے جو اس کرۂ ارض پر اس سچائی کو قائم کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ اس امت میں داخل کر دے جس پر یہ قرآن گواہ ہے کہ وہ امت حقہ ہے اور جو اپنی زبان، اپنے عمل اور اپنی جدوجہد کے ذریعے فریضہ شہادت حق ادا کر رہی ہے اور لوگوں کی زندگیوں میں اس سچائی کو جاری و ساری دیکھنا چاہتی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ فریضہ شہادت حق ادا کرنے والوں میں خود شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ اللہ کو اس بات پر گواہ ٹھہراتے ہیں کہ وہ اس امت میں داخل ہو گئے ہیں اور پھر یہ درخواست بھی کرتے ہیں کہ ہمارا نام رجسٹر کر لیا جائے۔

یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ خود آپ سے بطور استفہام انکاری پوچھتے ہیں کہ اب ہماری راہ قبولیت میں کیا رکاوٹ ہو سکتی ہے؟ کہ سنیں، یقین کریں اور ایمان نہ لائیں تاکہ ان کا رب ان کی دعا قبول کرے، ان کو درجات بلند عطا کرے اور انہیں صالح لوگوں میں درج کرے، کیوں وہ ایسا نہ کریں؟ اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

(وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ (٨٤)) "آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اسے کیوں نہ مان لیں جب کہ ہم اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے۔"

یہ ایک صریح، دوٹوک اور فیصلہ کن موقف ہے، جس میں وہ علی الاعلان قرآن کریم میں جو سچائی اتری ہے اس کو قبول کرتے ہیں۔ غرض یہ لوگ سنتے ہیں، سمجھتے ہیں، گہرا تاثر لیتے ہیں اور ایمان کا اعلان کرتے ہیں۔ اسلام کو قبول کرتے ہیں اور امت مسلمہ کا جزء بن جاتے ہیں اور پھر بھی دعا کرتے ہیں کہ وہ انہیں توفیق دے کہ وہ فریضہ شہادت حق ادا کر سکیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہو جائیں جو اپنے عمل سے، اور جہاد فی سبیل اللہ کر کے اقامت دین کی جدوجہد کرتے ہیں اور دین کو لوگوں کی زندگیوں میں قائم کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی نظر میں راستہ اس قدر صاف ہو جاتا ہے کہ وہ یہ یقین کر لیتے ہیں کہ یہی راہ ہے اور اس کے سوا ان کے لئے کسی دوسری راہ پر چلنا جائز نہیں ہے۔ یہ اللہ پر ایمان لانے کا راستہ ہے اور اس سچائی کا راستہ ہے جو اب اللہ نے اتاری ہے۔ اس امید کا راستہ ہے کہ اللہ انہیں صالحین میں

شامل کرے گا۔

قرآن کریم یہاں آکر بھی نہیں رکتا۔ یہ لوگ کون ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں اور مسلمانوں کی دوستی میں قریب تر ہیں۔ ان کا سلوک اور طرزعمل یہ ہے کہ وہ قرآن کی بیان کردہ سچائی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں' نہایت ہی مثبت طرزعمل اختیار کرتے ہیں' ایمان کا اعلان کرتے ہیں' اسلامی صفوں میں داخل ہوتے ہیں' جان و مال کی جدوجہد کے ذریعے شہادت حق ادا کرتے ہیں' اللہ کی جناب میں دست بدعا ہوتے ہیں کہ وہ ان کا نام فہرست شاہدین حق میں درج کرے اور یہ توقع کرتے ہیں کہ اللہ ان کو صالحین میں شامل کرے' قرآن کریم ان کی صرف ان صفات پر ہی بات ختم نہیں کر دیتا بلکہ ان کی تصویر مکمل کرنے کے لئے کچھ رنگ اور بھرے جاتے ہیں اور یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ قیامت میں ان لوگوں کا انجام کیا ہو گا۔

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

"ان کے اس قول کی وجہ سے اللہ نے ان کو ایسی جنتیں عطا کیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزاء ہے نیک رویہ اختیار کرنے والوں کے لئے۔"

اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ ان کے دل سچے ہیں اور ان کی زبان صداقت شعار ہے۔ وہ صراط مستقیم پر چلنے کا عزم کئے ہوئے ہیں' وہ اس دین کے لئے فریضہ شہادت حق ادا کرنے کے لئے تیار ہیں جس میں وہ داخل ہوئے ہیں۔ وہ صداقت کے ساتھ اسلامی صفوں میں داخل ہوئے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شہادت حق کی ادائیگی اللہ کا ایک احسان ہے جو اپنے بندوں میں سے کسی پر وہ کرتا ہے۔ یہ بات اللہ کے علم میں تھی کہ اب وہ صرف اسلامی راہ پر ہی چلنا چاہتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ اللہ ان کو نیکوں میں شامل کرے گا۔ چونکہ یہ سب باتیں اللہ کے علم میں تھیں اسی لئے اللہ نے ان کی اس بات کو قبول کر لیا اور ان کے لئے جزائے آخرت لکھ دی۔ اس پر اپنی گواہی قائم کر دی کہ یہ لوگ نیک ہیں اور یہ ہے جزائے محسنین :

(فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْمُحْسِنِيْنَ) "ان کے اس قول کی وجہ سے اللہ نے ان کو ایسی جنتیں عطا کیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزاء ہے احسان کا رویہ اختیار کرنے والوں کے لئے۔"

احسان ایمان اور اسلام کے اعلیٰ درجات کو کہتے ہیں اور اللہ بذات خود شہادت دیتے ہیں کہ یہ لوگ گروہ محسنین میں سے ہیں۔ لہٰذا یہ آیات ایک خاص گروہ کے بارے میں ہیں' جس کے خدوخال بالکل واضح ہیں اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ حکم ہے :

(وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى) ”اور ایمان لانے والوں کے لئے دوستی میں قریب تر تم ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔“ یہ ایک ایسا گروہ ہے کہ جب وہ حق بات کو سنتا ہے تو سرکشی نہیں کرتا بلکہ وہ دل کی گہرائیوں سے اسے قبول کرتا ہے اور اس قبولیت کا برملا اعلان کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا فریق ہے کہ وہ اپنے اعلان اسلام میں ایک لمحے کے لئے بھی تردد نہیں کرتا' فوراً اسلامی صفوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہ اس نظریہ حیات کے حوالے سے عائد ہونے والے تمام فرائض کی ادائیگی کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے اور وہ اسلامی نظام حیات کے قیام کی راہ میں جدوجہد کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ نیز یہ ایک ایسا فریق ہے کہ جن کی باتوں کی تصدیق اللہ کرتا ہے اور اعلان کر دیتا ہے کہ یہ محسنین ہیں اور یہ ہے ان کی جزاء۔

لیکن قرآن مجید اس پر اکتفا نہیں کرتا' وہ اس گروہ کے خدوخال میں مزید اضافہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ کون ہیں جو اہل ایمان کے لئے محبت کے جذبات رکھتے ہیں۔ یہ وضاحت اب اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ اس گروہ نصاریٰ کے بالمقابل ایک دوسرے گروہ نصاریٰ کا ذکر کرتا ہے جن کے خدوخال یہ ہیں کہ وہ سچائی کو سن کر' سمجھ کر اس کا انکار کرتے ہیں' وہ اس پر لبیک نہیں کہتے اور وہ گواہی دینے والوں کے ساتھ شامل نہیں ہوتے۔

۱۱
ع۹
۱

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝ ۸۶

”رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا اور انہیں جھٹلایا' تو وہ جہنم کے مستحق ہیں۔“

یہاں (وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا) سے مراد قطعیت کے ساتھ وہی لوگ ہیں' جو نصاریٰ میں سے سچائی کو سنتے ہیں لیکن مان کر نہیں دیتے۔ سچائی کو سن کر نہ ماننے والے نصاریٰ کے بارے میں قرآن یہاں کافرین کا لفظ استعمال کرتا ہے' لہٰذا نصاریٰ جب بھی ایسا موقف اختیار کریں گے ان پر کفر کا اطلاق ہو گا۔ اس میں یہود و نصاریٰ کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے اور جب تک وہ حضرت محمد ﷺ پر نازل شدہ کلام کو تسلیم نہیں کرتے جو کلام برحق ہے ان میں اور مشرکین اور یہودیوں میں کوئی فرق نہیں ہو گا۔ جب تک وہ منکر رہیں گے اور اسلام میں داخل نہ ہوں گے' اس لئے کہ اب اللہ کے ہاں دین اسلام کے سوا کوئی اور دین مقبول نہیں ہے' اور یہ مضمون قرآن مجید کی متعدد آیات میں دہرایا گیا ہے۔

(لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ (۹۸ : ۱)) ”اہل کتاب اور مشرکین سے جو لوگ کافر تھے' وہ باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس دلیل روشن نہ آجائے۔“

(اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ (۹۸ : ۶)) ”اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ یقیناً جہنم

کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔"

(لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (۵:۷۳)) "یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے۔"

(لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (۵:۷۲)) "یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے۔"

(لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ (۵:۷۸)) "بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی۔" غرض قرآن کریم کا یہ ایک عام انداز بیان ہے اور یہ بات معہود فی الذہن ہے لیکن یہاں جو بات ہو رہی ہے وہ نصاریٰ میں سے دو فریقوں کے رویے کے بارے میں ہے۔ اصل میں یہ بتانا مقصود ہے کہ نصاریٰ میں سے دو فریقوں کا موقف اسلام اور اہل اسلام کے بارے میں بالکل مختلف ہے اس لئے ان دونوں کا انجام بھی مختلف ہوگا۔ ایک گروہ کے لئے جو ایمان لائے گا ایسے باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور دوسروں کا انجام یہ ہوگا کہ وہ جہنمی ہوں گے۔ اس بحث سے معلوم ہوگیا کہ وہ تمام لوگ جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں اس آیت میں داخل نہیں جس میں کہا گیا ہے:

(وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا) "تم اہل ایمان کے ساتھ دوستی میں زیادہ قریب ان لوگوں کو پاؤ گے۔" آیات کا یہ مفہوم وہی لوگ لیتے ہیں جو ہر آیت کو علیحدہ لے کر پڑھتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ آیت زیر بحث کا حکم محدود ہے' اور اس سے متعین طور پر وہ لوگ مراد ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان لوگوں کی اچھی طرح وضاحت کر دی ہے اور کوئی غلط فہمی نہیں چھوڑی۔ دونوں فریقوں کو نکھار کر رکھ دیا ہے۔

قرآن کریم کے علاوہ اس مفہوم کی وضاحت اور تائید میں بہت سی روایات بھی آئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے مراد نصاریٰ کے چند متعین لوگ تھے۔

قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: "یہ آیت نجاشی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں ہے' اور یہ اس وقت نازل ہوئی تھی جب ہجرت اول میں مسلمان حبشہ کو گئے تھے' جیسا کہ ابن اسحق اور دوسرے اہل سیر نے لکھا ہے۔ یہ لوگ مشرکین کے خوف اور تشدد کی وجہ سے گئے تھے اور بڑی تعداد میں تھے۔ اس کے بعد حضور نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو یہ لوگ ہجرت کرنے مدینہ نہ آسکے' اس لئے کہ جنگوں کی وجہ سے حالات ایسے ہوگئے کہ وہ حضور سے نہ مل سکے۔ جب بدر کی جنگ ہوئی اور اس میں کفار کے بڑے بڑے لیڈر مارے گئے تو قریش کے لوگوں نے کہا کہ ہم ان لوگوں سے انتقام لے سکتے ہیں جو حبشہ گئے ہوئے ہیں' اس لئے کچھ ہدایات دے کر نجاشی کے پاس دو عقلمند آدمیوں کو بھیجو۔ نجاشی ان لوگوں کو تمہارے حوالے کر دے گا اور تم ان کو قتل کر کے اہل بدر کا بدلہ لے سکو گے۔ اہل قریش نے عمرو ابن

العاص اور عبداللہ ابن ابو ربیعہ کو ہدیے دے کر بھیجا۔حضور کو ان خبروں کی اطلاع ہو گئی۔آپ نے عمرابن امیہ ضمری کو بطور ایلچی بھیجا اور اسے ایک خط دیا۔وہ نجاشی کو ملے 'اس نے حضور کے نامہ مبارک کو پڑھا۔اس کے بعد حضرت جعفر ابن ابو طالب اور مہاجرین کو بلایا اور اپنے علماء اور فقراء کو بھی بلایا اور حضرت جعفر کو حکم دیا کہ ان کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کریں۔انہوں نے سورہ مریم کی تلاوت کی۔یہ علماء اور مشائخ اس حال میں اٹھے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

(وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى) ''تم مسلمانوں کے ساتھ دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں ہم نصاریٰ ہیں۔'' یہ آیت انہوں نے ''الشاہدین'' تک پڑھی۔ (اس حدیث کو ابوداؤد نے محمد ابن مسلمہ 'ابن وہب 'یونس 'ابن شہاب '(انہوں نے ابوبکر ابن عبدالرحمٰن اور سعید ابن مسیب کے واسطے سے) عروہ ابن زبیر سے روایت کیا۔انہوں نے اس حدیث کا آغاز اس سے کیا کہ حبشہ کی پہلی ہجرت کا یہ واقعہ ہے)۔

بیہقی نے ابن اسحٰق سے روایت کی ہے کہ حضور کے پاس بیس افراد آئے۔اس وقت آپ مکہ میں تھے یا مکہ کے قریب تھے۔یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ کے بارے میں اطلاعات حبشہ پہنچی تھیں۔یہ لوگ نصاریٰ تھے۔ ان لوگوں نے مسجد میں حضور کے ساتھ ملاقات کی۔سوالات وجوابات ہوئے اور قریش کے لوگ کعبہ کے اردگرد محفلیں جمائے بیٹھے تھے۔جب ان کے سوالات ختم ہوئے اور جو پوچھنا چاہتے تھے' پوچھ لیا تو حضور نے ان کو دعوت دی اور قرآن مجید پڑھ کر انہیں سنایا۔جب انہوں نے قرآن سنا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔انہوں نے آپ کی دعوت کو قبول کیا' آپ کی تصدیق کی۔انہوں نے حضور ؐ کو ان پیش گوئیوں کی روشنی میں پہچان لیا جو ان کی کتابوں میں تھیں۔

جب یہ لوگ جانے کے لئے اٹھے تو ابوجہل اور قریش کے چند لوگوں نے مداخلت کی۔ابوجہل نے کہا تم جیسا بے وقوف کوئی بھی نہ ہو گا۔تمہیں تمہاری قوم نے تو اس لئے بھیجا تھا کہ تم واپس جاؤ اور اس شخص کے بارے میں ان تک اطلاعات پہنچاؤ لیکن چند منٹ کی بات چیت میں تم نے اپنے دین کو چھوڑ دیا اور اس کی تصدیق کر دی۔میں نے تم سے زیادہ احمق مسافر کوئی اور نہیں دیکھا یا اس نے اس جیسی کوئی اور بات کی۔انہوں نے کہا السلام علیکم ہم تمہارے ساتھ جاہلانہ رویہ اختیار نہیں کرتے۔ہمارے اعمال ہمارے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو بھلائی سے محروم نہیں کرتے۔کہا جاتا ہے۔کہ یہ لوگ اہل نجران میں سے تھے۔اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ہی کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔

(اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ) آیت (لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ) (۲۸: ۵۳ تا ۵۵)) تک۔ان آیات کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جعفر اور ان کے ستر افراد پر مشتمل ساتھی رسول اللہ ؐ کے ساتھ ملاقات کے لئے آئے۔یہ لوگ اونی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ان میں سے باسٹھ افراد حبشہ سے تعلق رکھتے تھے اور آٹھ شامی تھے۔شامیوں میں بحیرا راہب 'ادریس 'اشرف 'ابرہہ 'ثمامہ 'قثم' درید

اور ایمن تھے ۔ ان کے سامنے حضور ؐ نے سورہ لٰسٓین تلاوت فرمائی ۔انہوں نے جب قرآن مجید سنا تو خوب روئے اور حضور ؐ پر ایمان لائے ۔انہوں نے کہا یہ کلام ویسا ہی ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ ان لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ۔

(لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ آمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى (۵ : ۸۲) ''تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کے لئے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں ۔'' اس سے مراد حبشہ کے وفد سے ہے اور یہ لوگ کینسوں کے انچارج تھے ۔سعید ابن جبیر نے کہا ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں یہ آیت اتری :

(اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ) --تا-- (اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ) آخر آیت تک ۔ مقاتل اور کلبی نے کہا ہے کہ ان لوگوں میں سے چالیس افراد نجران کے قبیلہ بنی الحرث ابن کعب سے تھے ۔اور بتیس حبشہ کے تھے اور اڑسٹھ شامی تھے ۔ قتادہ کہتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو حضرت عیسیٰ کی پکی شریعت پر قائم تھے اور جب حضور ؐ مبعوث ہوئے تو وہ حضور ؐ پر ایمان لائے ۔اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کی ۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو قتادہ نے کہا ہے یہی اس آیت کا مفہوم ہے اور سیاق کلام بھی اسی کا اظہار کرتا ہے ۔سابقۃ الذکر تمام روایات اس کی تائید کرتی ہیں اور اس سورہ میں دوسری آیات اور قرآن کریم کی دوسری تصریحات کے ساتھ بھی یہ مفہوم متفق ہے ۔یہ مفہوم اس موقف سے بھی متفق ہے جو یہود و نصاریٰ نے اہل اسلام اور خود اسلام کے مقابلے میں اختیار کیا ۔نیز گزشتہ ۱۴سو سال کی تاریخ میں ان لوگوں نے اسلام کے مقابلے میں جس قسم کا رویہ اختیار کیا۔ اس کے ساتھ بھی یہ مفہوم درست بیٹھتا ہے ۔

یہ سورہ اپنے رجحان ' اپنی فضا اور اپنے مقاصد کے اعتبار سے ایک اکائی ہے ۔اللہ کے کلام میں تناقض ممکن نہیں ہے ۔(وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۴: ۸۲)) ''اگر قرآن مجید اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت اختلاف پاتے ۔'' خود اس سورہ کے اندر بھی بعض فیصلے اور ایسی آیات موجود ہیں جن سے اس آیت کی تشریح اچھی طرح ہو جاتی ہے ۔

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۵ : ۵۱))

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ' یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق

ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے۔ یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی راہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔"

(قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۵ : ۶۸)) "کہہ دو، اے اہل کتاب، تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو، جب تک تورات اور انجیل اور دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو، جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔ ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دے گا، مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔"

اسی طرح سورہ بقرہ میں اس سے پہلے کہا گیا تھا :

(وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۲ : ۱۲۰)) "یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔ صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے ورنہ اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آ چکا ہے، تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لئے نہیں ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو ان آیات میں جو تنبیہ کی تھی، بعد کے ادوار میں پوری تاریخ اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں دونوں نے کبھی اہل اسلام کو معاف نہ کیا۔ تاریخ نے یہودیوں کی اسلام دشمنی کے واقعات کو اس وقت سے ریکارڈ کیا ہے جب سے اسلام مدینہ طیبہ میں داخل ہوا، اور اس وقت سے آج تک ان کا یہی ریکارڈ مسلسل چلا آ رہا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ اپنی ان خبیث سرگرمیوں کو انہوں نے کسی بھی دور میں موقوف نہیں کیا۔ تاریخ نے یہ واقعہ بھی ریکارڈ پر محفوظ کیا ہے کہ جب سے جنگ یرموک میں اہل اسلام اور عیسائیوں کے درمیان جھڑپ ہوئی ہے اس کے بعد عیسائیوں نے بھی اسلام کے خلاف صلیبی جنگیں مسلسل جاری رکھیں، ماسوائے ان چند استثنائی واقعات کے جن کا ذکر ان آیات میں ہوا ہے اور ماسوائے بعض ایسے عیسائی فرقوں کے جو خود دوسرے عیسائی فرقوں کے وبال سے تنگ آ کر اسلامی حدود میں آ بسے۔ رہا عیسائیوں کا عام رویہ تو اس کی اصلی تصویر صلیبی جنگوں ہی میں نظر آتی ہے۔ یاد رہے کہ صلیبی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی، یہ آج تک جاری ہے۔ جب سے اسلام اور مسیحیت کا مقابلہ یرموک کے میدان میں ہوا ہے اس وقت سے یہ جنگ جاری ہے، اگرچہ بظاہر کبھی کبھی امن بھی نظر آ جاتا ہے۔

عیسائیوں کو اسلام کے ساتھ کس قدر بغض و عداوت تھی' اس کا اظہار دو صدیوں تک ہوتا رہا یعنی مشہور صلیبی جنگوں کے دوران۔ نیز اس ذہنیت کا اظہار اس تحریک بیخ کنی سے بھی ہوتا ہے جو عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف اندلس میں جاری رکھی۔ اس کی استعماریت اور تبلیغ مسیحیت کی مہم اسلامی افریقہ میں چلائی گئی اور اس کے بعد اس استعمار اور تبلیغ مسیحیت کو تمام عالم اسلام تک پھیلا دیا گیا۔

اسلام کے خلاف جنگ میں یہودیت اور عیسائیت دونوں باہم حلیف رہے حالانکہ دونوں فرقے ایک دوسرے کے بھی دشمن تھے لیکن اسلام کے خلاف تمام جنگوں میں وہ ایک دوسرے کے دوست بھی رہے۔ جیسا کہ اللہ علیم و خبیر نے آج سے ۱۴سو سال پہلے کہہ دیا تھا کہ (بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ) "وہ خود ایک دوسرے کے دوست ہیں" اور ان کی یہ دوستی اس وقت تک قائم رہی جب انہوں نے خلافت اسلامیہ کو ختم کیا۔ اس کے بعد وہ اس دین کی ایک ایک رسی کو توڑتے رہے اور جب انہوں نے اسلامی نظام حکومت کو ختم کر لیا تو اب وہ اسلام کی اساس نماز کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔

اب دور جدید میں دیکھئے' مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کا جو موقف تھا کہ وہ اہل اسلام کے مقابلے میں مشرکین کو پسند کرتے تھے اب پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے۔ اب عالمی عیسائیت ان تمام بت پرست اقوام کی پشت پر کھڑی ہے بشرطیکہ وہ اسلام کے خلاف لڑ رہے ہوں۔ بعض اوقات تو یہ لوگ تائید کرتے ہیں اور بعض اوقات یہ لوگ براہ راست بین الاقوامی اداروں میں مسلمانوں کے خلاف بت پرستوں کی تائید کرتے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان پائے جانے والے مسئلہ کشمیر میں انہوں نے وہی کردار ادا کیا ہے۔

اس کے علاوہ یہ یہودی و عیسائی احیائے اسلام کی تمام تحریکات کی بیخ کنی میں باہم معاون ہیں۔ انہوں نے عالم اسلام کے اندر ایسے نام نہاد عظیم لیڈر پال رکھے ہیں جو ان کی مرضی اور خواہشات کے مطابق اپنے اپنے ممالک میں اسلام کی بیخ کنی پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ عالمی قوتیں بونے لیڈروں کے ارد گرد اژدہام کئے ہوئے ہیں اور زندہ باد کے نعرے لگا رہی ہیں۔ اس غوغا آرائی نے ان لوگوں کو عظیم لیڈر بنا دیا ہے حالانکہ یہ لوگ نہایت ہی بونے قد کے لوگ ہیں۔

یہ ہے خلاصہ اس ریکارڈ کا جو گذشتہ چودہ سو سال سے اسلامی تاریخ نے قلم بند کیا ہے اور اس میں یہودیوں اور عیسائیوں کا موقف اسلام کے خلاف رہا ہے اور دونوں کی دشمنی کے درمیان کوئی کمی بیشی نہیں ہے۔ نہ ان کے کیمپوں میں فرق کیا جا سکتا ہے اور نہ تحریک اسلامی کے خلاف ان کی اس مسلسل جنگ میں کبھی کمی آتی ہے۔ ایک زمانہ گزر گیا اس صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

یہ ہے وہ صورت حال جسے سمجھنے والوں کو سمجھ لینا چاہئے اور انہیں ان تحریکات کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہئے جو فریب خوردہ لوگ چلا رہے ہیں اور جن کا مقصد اسلامی صلابت اور پختگی کو پگھلانا ہے۔ یہ تحریکات اسلام کو ختم کرنے کے لئے اس آیت سے استدلال کرتی ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ اس کا مفہوم دوسری آیات سے کاٹ کر' اور صرف نظر کر کے وہ مفہوم نکالتی ہیں جو ان کا مفید مطلب ہے۔ اس آیت کے مفہوم کے تعین کے لئے یہ لوگ نہ پوری سورہ کے مضامین کو دیکھتے ہیں نہ قرآن کریم کی دوسری تصریحات سے استفادہ کرتے ہیں' نہ وہ اس سلسلے میں اسلامی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں اور اس طرح وہ اہل ایمان کے شعور کو سلانا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کیمپوں کے مقابلے میں بے حس اور بے فکر ہو جائیں۔ ان کے دل اسلام کے خلاف بغض و عداوت سے بھرے پڑے ہیں اور وہ ہر وقت عالم اسلام کے خلاف سازشوں میں

معروف رہتے ہیں۔وہ اس ثقافتی یلغار کے ذریعے اسلامی نظریہ حیات پر اپنا آخری وار کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام کے یہ دشمن کیمپ جس امر سے بہت خائف ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر دین حق کا فہم و ادراک اور شعور و احساس ترقی نہ کر جائے اگرچہ یہ شعور ایک قلیل تعداد ہی کے اندر پایا جاتا ہو۔جو لوگ مسلمانوں کے اس شعور اور بیداری کے بد ترین دشمن ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں جو فریب خوردہ ہیں اور دشمنان اسلام کے جال میں آگئے ہیں۔ یہ فریب خوردہ لوگ مسلمان ہونے کے باوجود اسلام کے کھلے دشمنوں سے کم خطرناک نہیں ہیں بلکہ یہ لوگ اسلام اور تحریک احیائے اسلام کے لئے زیادہ مضر ہو سکتے ہیں۔بے شک یہ قرآن اس بات کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو نہایت ہی مضبوط اور قائم ہے۔قرآن خود اپنی تردید ہرگز نہیں کرتا۔ہمیں چاہئے کہ ہم قرآن کا مطالعہ دینی بصیرت کے ساتھ کریں۔

---○○○---

درس نمبر ۵۳ ایک نظر میں

یہ پورا سبق ایک ہی مسئلے کو لیتا ہے۔ اگرچہ موضوعات مختلف ہیں لیکن یہ تمام موضوعات ایک ہی محور کے اردگرد گھومتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی نظام حیات میں قانون سازی کا مسئلہ ذات باری سے تعلق رکھتا ہے اور یہ حق صرف اللہ کا ہے کہ وہ حلال و حرام کے حدود و قیود کا تعین کرے۔ یہ اللہ ہی ہے جو جواز اور عدم جواز کے فیصلے کر سکتا ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ اس کا امر ہے اور یہ اس کی جانب سے نہی ہے۔ اس اصولی قاعدے کے ساتھ تمام چھوٹے اور بڑے امور یکساں ہیں' اس لئے زندگی کے تمام معاملات کا حل اس قاعدے کے مطابق ہونا چاہئے۔

انسانوں میں سے جو شخص اپنے لئے قانون سازی کے حق کا دعویٰ کرتا ہے اور اس حق کو استعمال کرتا ہے تو وہ غلطی پر ہے۔ اسلامی نظریے کی رو سے یہ حق صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔ اگر کوئی اللہ کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتا تو گویا وہ اللہ کی الوہیت اور اس کی حاکیت کو چیلنج کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس قسم کی دست درازی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو شخص لوگوں کے رواج' ان کی اصطلاحات اور ان کے اقوال کے مطابق قانون سازی کرتا ہے وہ اللہ کے کلام کے خلاف بغاوت کرتا ہے اور اس طرح وہ دائرہ ایمان اور حدود اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اور وہ دین اسلام میں نہیں رہتا۔

اس سبق کے تمام فقرے (یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا) سے شروع ہوتے ہیں مثلاً:

(یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (۵ : ۸۷)) — (یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ (۵ : ۹۰)) — (یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْــَٔلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ) — (یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ) — (یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِیْنَ الْوَصِیَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِكُمْ (۵ : ۱۰۶))

اس سبق کا موضوع چونکہ مسئلہ قانون سازی ہے' اس لئے اس حوالے سے ان الفاظ کے ساتھ خطاب یہاں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس میں ایک خاص اشارہ پیش نظر ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس مسئلے کا تعلق الوہیت' حاکمیت اور

ایمان اور دین کے ساتھ ہے۔اہل ایمان کو صفت ایمان کے ساتھ پکارا جاتا ہے' اس لئے کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی الوہیت' حاکمیت کا اقرار کیا جائے۔ اس پکار کی وجہ سے اسلام اور دین کا پہلا قاعدہ اور سبق مسلمانوں کے ذہن نشین کرانا مطلوب ہے۔اس مناسبت کے ساتھ حکم دیا جاتا ہے کہ لوگ اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کریں اور اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت سے روگردانی نہ کریں ورنہ ان کو شدید عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔جو شخص یہ اطاعت کرے گا وہ آخرت میں بہت بڑے انعام کا مستحق ہو گا۔

اس کے بعد صفت ایمان کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکم دیا جاتا ہے۔اہل ایمان اور اہل کفر کے درمیان مکمل جدائی ہو گی' اس لئے کہ اہل کفر اہل ایمان کے منہاج کو قبول نہیں کرتے۔ اہل ایمان کا منہاج تو یہ ہے کہ وہ چھوٹے بڑے معاملات میں حق قانون سازی اللہ کو دیتے ہیں اور اللہ کے حق حاکمیت پر دست درازی نہیں کرتے۔

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵ : ۱۰۵)) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنی فکر کرو' کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا' اگر تم خود راہ راست پر ہو۔اللہ کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے' پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔" اہل ایمان ایک امت ہیں' جس کا اپنا دین' اپنی شریعت' شریعت کے اپنے مصادر ہیں اور وہ ان کے سوا کسی اور ذریعے سے قانون نہیں اخذ کرتی۔اگر یہ امت تمام اقوام و ملل پر اپنا یہ موقف واضح کر دے اور پھر بھی وہ گمراہ ہوں تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں' اگر وہ ان سے مکمل جدائی رکھے اور انہیں ان کی جاہلیت اور ضلالت پر چھوڑ دے۔سب نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔

یہ ہے اس پورے سبق کا محور۔رہے وہ موضوعات جو اس سبق کے اندر ہیں اور جو اس دائرے کے اندر گھومتے ہیں تو وہ مختلف ہیں۔اب اس عمومی دائرے کے اندر ان موضوعات کو ہم ذرا تفصیل کے ساتھ لیتے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۵۳ تشریح آیات

۸۷ --- تا --- ۱۰۸

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں انہیں حرام نہ کرلو اور حد سے تجاوز نہ کرو' اللہ کو زیادتی کرنے والے سخت ناپسند ہیں۔ جو کچھ حلال و طیب رزق اللہ نے تم کو دیا ہے اسے کھاؤ پیو اور اس خدا کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔

تم لوگ جو مہمل قسمیں کھالیتے ہو' ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا' مگر جو قسمیں تم جان بوجھ کر کھاتے ہو ان پر وہ ضرور تم سے مواخذہ کرے گا۔ (ایسی قسم توڑنے کا) کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو' یا انہیں کپڑے پہناؤ' یا ایک غلام آزاد کرو' اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو' وہ تین دن کے

روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب کہ تم قسم کھا کر توڑ دو۔ اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو۔ اس طرح اللہ اپنے احکام تمہارے لئے واضح کرتا ہے شاید کہ تم شکر ادا کرو۔"

"اے ایمان لانے والو' تمہارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تم انسان اور اللہ کے غلام ہوتے ہوئے 'اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کے حقوق پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہ کرو' اس لئے تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے حلال کردہ کاموں اور اشیاء کو حرام قرار دو' خصوصاً پاکیزہ چیزوں کو۔ اس لئے تم پاک چیزوں کے کھانے اور پینے سے اس طرح نہ رکو کہ تم ان کو اپنے لئے حرام قرار دے لو۔ اس لئے کہ اللہ نے یہ پاک چیزیں تمہارے لئے ہی تو پیدا کی ہیں اور پھر یہ کہ حلال و حرام کے حدود کا تعین کرنے والا تو اللہ ہی ہے۔

(يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (٨٧) وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (٨٨) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں انہیں حرام نہ کر لو اور حد سے تجاوز نہ کرو' اللہ کو زیادتی کرنے والے سخت ناپسند ہیں۔ جو کچھ حلال و طیب رزق اللہ نے تم کو دیا ہے اسے کھاؤ پیو اور اس خدا کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ قانون سازی کے مسئلے کا تعلق خاص مسئلہ حاکمیت اور الوہیت کے ساتھ ہے۔ قانون سازی کا حق اللہ کی حاکمیت کے ساتھ مخصوص اس لئے ہے کہ اللہ ہی انسانوں کا مالک اور خالق ہے اور وہی ہے جو انسانوں کو رزق فراہم کرتا ہے۔ اس لئے یہ حق صرف اللہ کا ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے لئے' اپنے پیدا کردہ رزق میں سے بعض چیزوں کو حلال کر دے اور بعض کو حرام کر دے۔ یہ ایک ایسی دلیل ہے جس کو انسانوں کی عقل بڑی آسانی سے مان لیتی ہے۔ انسانوں کے نزدیک بھی کسی چیز کا مالک ہی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی مملوکہ چیز میں جس طرح چاہے تصرف کرے اور جو شخص بھی کسی کے حق ملکیت پر دست درازی کرتا ہے تو اسے ظلم و زیادتی کا مرتکب تصور کیا جاتا ہے۔ جو لوگ ایمان لا چکے' ظاہر ہے کہ ان سے یہ توقع نہیں ہے کہ وہ اللہ کے حقوق پر دست درازی کریں گے اس لئے کہ اللہ پر ایمان اور پھر اللہ سے بغاوت دونوں ایک دل میں کس طرح جمع ہو سکتے ہیں۔

یہ ہے وہ مسئلہ جسے یہ دو آیات ایسے واضح اسلوب میں پیش کرتی ہیں کہ کوئی معقول شخص اس بارے میں کوئی مباحثہ اور مجادلہ نہیں کر سکتا اس لئے کہ اللہ دست درازی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ مسئلہ ایک عام قاعدے اور اصول کو طے کرتا ہے کہ تمام لوگ اللہ کے بندے اور غلام ہیں اور اس مسئلے کے مطابق اپنا طرز عمل ڈھالنا تقاضائے ایمان ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ دو آیات اور ان سے اگلی آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئیں۔ یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں پیش آیا لیکن آیت عام ہے اور اسباب نزول کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اسباب نزول کے ذریعے فہم قرآن میں اچھی مدد ملتی ہے۔

ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ ایک دن حضور تشریف فرما تھے۔ آپ نے لوگوں کو یاددہانی کی۔ آپ اٹھ کر چلے گئے

اور آپ نے اس دن انہیں بہت نہ ڈرایا۔ آپ کے جو ساتھی بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے کہا کہ ہم لوگ کچھ باتیں اور اعمال اپنی طرف سے کیوں نہ شروع کر دیں 'نصاریٰ نے تو ایسا کیا کہ بعض چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا' ہمیں بھی چاہئے کہ ہم اپنے اوپر بعض چیزیں حرام کر لیں۔ بعض نے کہا کہ وہ گوشت اور سرین نہ کھائے گا۔ بعض نے کہا کہ وہ دن کو نہ کھائے گا۔ بعض نے اپنے اوپر عورتیں حرام کر لیں' یہ بات رسول اللہ تک پہنچی۔ آپ نے فرمایا کہ لوگ بھی عجیب ہیں کوئی اپنے اوپر عورتوں کو حرام کرتا ہے کوئی کھانا حرام کرتا ہے کوئی نیند حرام کرتا ہے۔ خبردار میں تو سوتا بھی ہوں' کھڑا بھی ہوتا ہوں' روزے بھی رکھتا ہوں' کھاتا بھی ہوں' عورتوں کے ساتھ نکاح بھی کرتا ہوں' پس جو شخص میری اس سنت سے منہ موڑے گا وہ مجھ سے نہ ہو گا۔" اس پر یہ آیات نازل ہوئیں

(يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا) صحیحین میں حضرت انس ؓ سے ایک روایت منقول ہے' وہ بھی ابن جریر کی روایت کی موید ہے۔ انس ، فرماتے ہیں کہ تین افراد ازواج مطہرات کے گھر آئے' انہوں نے حضرت نبی ؐ کی عبادت کے بارے میں پوچھا۔ جب ان کو حضور کی عبادات کے بارے میں معلومات دی گئیں تو گویا انہوں نے ان عبادات کو کم سمجھا۔ انہوں نے کہا ہم حضور کے رتبے تک کب پہنچ سکتے ہیں؟ اللہ نے حضور کے سابقہ اور آیندہ تمام گناہوں کو معاف کر دیا ہے۔ ایک نے کہا میں تو تمام رات نماز پڑھوں گا' دوسرے نے کہا کہ میں تو ہمیشہ کے لئے روزے رکھوں گا اور کبھی افطار نہ کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں تو کبھی بھی عورتوں کے پاس نہ جاؤں گا اور نہ نکاح کروں گا۔ حضور کو جب علم ہوا تو آپ ان کے پاس آئے اور ان سے پوچھا کہ تم لوگ ہو جنہوں نے یہ یہ باتیں کیں۔ خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ متقی ہوں لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں' نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں کے ساتھ نکاح بھی کرتا ہوں۔ لہٰذا جو میری سنت سے ہٹا وہ مجھ سے نہ ہو گا۔"

ترمذی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس ؓ سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص حضور کے پاس آیا اور کہا حضور میں جب گوشت کھاتا ہوں تو مجھ پر شہوت غالب آجاتی ہے اور میں عورتوں کے لئے اٹھتا ہوں اس لئے میں نے اپنے اوپر گوشت حرام کر لیا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی

(يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ) اب رہی وہ آیت جس میں قسموں کا ذکر ہے اور جو ان دو آیات کے بعد آتی ہے تو وہ بھی ایسے ہی حالات میں ہدایت دیتی ہے۔

(لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ

وَاحۡفَظُوۡۤا اَيۡمَانَكُمۡ‌ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَـكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ (۸۹) ”تم لوگ جو مہمل قسمیں کھا لیتے ہو ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا، مگر جو قسمیں تم جان بوجھ کر کھاتے ہو، ان پر وہ ضرور تم سے مواخذہ کرے گا۔ (ایسی قسم توڑنے کا) کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو، یا انہیں کپڑے پہناؤ یا ایک غلام آزاد کر دو، اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب کہ تم قسم کھا کر توڑ دو۔ اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو۔ اس طرح اللہ اپنے احکام تمہارے لئے واضح کرتا ہے شاید کہ تم شکر ادا کرو۔“

یہ آیت ایسے حالات کے لئے ہے کہ کوئی مباح چیزوں کے استعمال کرنے کے خلاف حلف اٹھالے مثلاً جن تین افراد نے قسم اٹھائی تھی کہ وہ یہ یہ کام نہیں کریں گے، اور انہیں رسول اللہ نے قسم کو جاری رکھنے سے منع کر دیا تھا۔ اور قرآن نے ان کو اس بات سے روک دیا تھا کہ وہ اپنے لئے حلال و حرام خود مقرر نہیں کر سکتے۔ یہ ان کا کام نہیں ہے، یہ تو اس اللہ کا کام ہے جس پر وہ ایمان لائے ہیں۔ اس طرح یہ ان تمام صورتوں کے لئے ہدایت ہے جن میں کوئی کسی اچھے کام سے بذریعہ حلف اپنے آپ کو روک لیتا ہے۔ اس لئے کہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی نیک کام کے نہ کرنے کی قسم اٹھاتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ نیک کام جاری رکھے اور قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرے جس کی تفصیلات اس آیت میں دی گئی ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہوا کہ جن لوگوں نے اپنے اوپر بعض کھانے، بعض لباس اور عورتوں کے ساتھ نکاح حرام کر لیا تھا، انہوں نے اس پر حلف بھی اٹھایا تھا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی ”اللہ کی پاک چیزیں اپنے اوپر حرام نہ کرو“ تو انہوں نے پوچھا کہ ہماری قسموں کا کیا بنے گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر لغو قسموں کے بارے میں کوئی مواخذہ نہیں کرتا۔ یعنی محض زبان پر لفظ قسم جاری ہو جائے لیکن دل سے پختہ ارادہ قسم نہ ہو، البتہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم یہ ہے کہ خواہ مخواہ ہر بات پر اللہ کی قسم نہ اٹھائی جائے، اس لئے کہ اللہ کی قسم کا کچھ تو احترام ہونا چاہئے۔ اللہ کی قسم کا وقار ہونا چاہئے اس لئے لغو قسم بھی بار بار اٹھانا ناپسندیدہ ہے۔ رہی وہ پکی قسم جو قصداً ہوتی ہے اور اس کے پیچھے پختہ ارادہ ہوتا ہے، کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کا تو وہ لغو کی طرح معاف نہیں ہے۔ اس پر کفارہ واجب ہے اور یہ آیت اسی کو بیان کرتی ہے۔ ”پکی قسموں کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ یا انہیں کپڑے پہناؤ یا ایک غلام آزاد کرو اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے۔ اگر تم قسم کھا کر توڑ دو۔“

دس مسکینوں کے لئے اوسط درجے کا کھانا ایسا ہو گا کہ قسم اٹھانے والا جس قدر کھانا اپنے اہل و عیال کو دیتا ہے۔ اوسط کا مفہوم احسن بھی ہو سکتا ہے اور متوسط بھی ہو سکتا ہے کیونکہ لفظ اوسط احسن اور متوسط دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اوسط سے دونوں مفہوم مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ اسلام کے پیمانے میں اوسط ہی احسن ہوتا ہے۔

(اَوۡ كِسۡوَتُهُمۡ) سے مراد یہی ہے کہ دس مسکینوں کو اوسط درجے کی پوشاک پہنائی جائے یا ایک غلام آزاد کیا جائے اور یہاں اس بات کی تصریح نہیں کی گئی کہ غلام کو مومن ہونا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بارے میں فقہاء کے

درمیان اختلاف رائے ہوا ہے۔ہم تو فی ظلال القرآن میں فقہی اختلافات کا ذکر نہیں کرتے۔اگر استطاعت نہ ہو تو پھر تین روزے رکھے۔یہ اس صورت میں ہوں گے کہ دوسرے بیان کردہ کفارات میں سے کسی کی ادائیگی ممکن نہ ہو۔اس طرح یہ تین روزے مسلسل ہوں گے یا مسلسل نہ ہوں گے' اس بارے میں بھی فقہی اختلافات ہوئے ہیں اس لئے کہ یہاں متابعات کی تصریح نہیں ہے۔فی ظلال القرآن میں ہمارے طریقہ کار میں فقہی تفصیلات میں جانا ممکن نہیں ہے۔اگر کسی کو شوق ہو تو کتب فقہ میں تلاش کرے۔تمام فقہی اختلافات اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کفارہ اس لئے عائد کیا گیا ہے کہ حالف نے پختہ عقد کو توڑا ہے۔دوسرے یہ کہ قسموں کو ہلکا نہ سمجھا جائے اس لئے کہ قسمیں بھی دراصل ایک عہد ہوتی ہیں اور اللہ کا حکم یہ ہے کہ عقد اور عہد کو پورا کیا جائے۔اور اگر صورت یہ ہو کہ کوئی قسم اٹھالے اور جس بات سے اس نے قسم اٹھائی ہے وہ اچھا کام ہے تو اس پر فرض ہے کہ قسم توڑے اور اچھے کام کو جاری رکھے۔اور اگر اس نے ایسی قسم اٹھائی ہے جس میں اس کا کوئی حق نہیں ہے مثلاً حلال کرنا یا حرام کرنا تو اس پر فرض ہے کہ وہ قسم توڑ دے اور کفارہ ادا کرے۔

اب ہم اس اصل موضوع کی طرف آتے ہیں جس کی وجہ سے یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ان آیات کے اسباب نزول کے زاویے سے دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ یہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے تو وہ طیب ہیں اور جن چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے تو جان لو کہ وہ خبیث اور ناپاک ہیں۔انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے وہ کچھ اختیار کرے جو اللہ نے اس کے لئے اختیار نہیں کیا ہے۔اور اس کی دو وجوہات ہیں۔

ایک یہ ہے کہ حرام و حلال کے قیود مقرر کرنا اللہ کے خصوصی حقوق میں سے ہے' جو رازق ہے۔جب رازق وہ ہے تو اس رزق میں تحریم و تحلیل بھی اسی کا کام ہے۔اگر کوئی اللہ کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتا تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے۔اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا اور نہ اس طرح ایمان درست ہو سکتا ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ نے طیبات کو حلال قرار دیا ہے لہذا کسی کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنے اوپر پاکیزہ چیزوں کو حرام کر لے اس لئے کہ یہ چیزیں اس شخص کے لئے بھی مفید ہیں اور اس کرۂ ارض پر زندگی کے تسلسل کے لئے بھی مفید ہیں۔انسان کی سوچ و بصیرت وہاں تک نہیں پہنچ سکتی جہاں تک علیم و خبیر کی بصیرت کی رسائی ہے جس نے ان طیبات کو حلال قرار دیا ہے۔اگر ان طیبات میں کوئی خرابی ہوتی تو اللہ اس سے اپنے بندوں کو ضرور بچاتا۔اگر ان کے حرام کر دینے میں کوئی بھلائی ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان کو حلال ہی نہ کرتا۔یہ دین تو آیا ہی اس لئے ہے کہ خیر' بھلائی اور بہتری کو روبکار لائے اور انسانیت کی تمام قوتوں کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور توازن قائم کرے۔اسلام انسانی فطرت کی ضروریات میں سے کسی ضرورت سے غافل نہیں ہے اور نہ اس نے انسان کی تعمیری قوتوں میں سے کسی قوت کو مہمل چھوڑا ہے۔اسلام نے وسط کو اختیار کیا ہے اور جادۂ مستقیم پر رواں دواں ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلام نے رہبانیت کے ساتھ جنگ کی' اس لئے کہ رہبانیت کا مقصد فطرت کشی تھا۔اس سے زندگی کی نشوونما رک رہی تھی حالانکہ اللہ کی اسکیم یہ تھی کہ کرۂ ارض پر زندگی کو نشوونما حاصل ہو' اور طیبات کو حرام کرنے سے اسلام نے اس لئے منع کیا کہ طیبات موجب ترقی حیات ہیں جن سے اس دنیا میں زندگی کی تجدید ہوتی چلی جاتی ہے۔اللہ نے اس زندگی کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ تسلسل سے رہے اور اللہ کے نظام حیات کے مطابق اس کی تجدید ہوتی رہے۔رہبانیت جو طیبات کو حرام قرار دیتی ہے وہ اسلامی نظام

حیات کی اسکیم کے ساتھ متصادم ہے۔ رہبانیت انسانیت کو ایک متعین مقام پر روک دیتی ہے اور یہ رکاوٹ وہ بلندی اور علو مرتبت کے نام سے پیدا کرتی ہے حالانکہ بلندی اور علو شان اسلامی نظام حیات کے اندر داخل ہیں جو ایک ایسا نظام ہے جس کے اندر دواعی فطرت پوری طرح موجود ہیں اور یہ علم الٰہی کے مطابق رکھے گئے ہیں۔

کسی آیت کے نزول کے مخصوص واقعات اس آیت کو ان حالات کے اندر محدود نہیں کر دیتے۔ آیت بہرحال عام رہتی ہے اور آیت کی یہ عمومیت بتاتی ہے کہ قانون سازی کے اندر بھی حلال و حرام کے حدود و قیود مقرر کرنا اللہ ہی کا کام ہے اور یہ بات صرف کھانے اور پینے تک محدود نہیں ہے یا نکاح تک محدود نہیں ہے۔ زندگی کے تمام امور میں یہ حق اللہ کو حاصل ہے، شریعت کو حاصل ہے۔

ہم اس مفہوم پر بار بار زور اس لئے دے رہے ہیں کہ ایک طویل عرصہ گزر گیا ہے کہ لوگوں نے اسلام کو زندگی کے عملی دھارے سے نکال دیا ہے، حالانکہ اسلام کی شان یہ ہے کہ وہ پوری زندگی پر حکمران ہو۔ حلال و حرام کے الفاظ اور ان کے پرتو کو محدود کر دیا گیا ہے اور اب اس کے وہ معنی نہیں لئے جاتے جو قرآن کو مطلوب تھے۔ لوگوں کے ذہنوں میں اب حلال و حرام کا مفہوم صرف ذبیحوں، کھانے، پینے کی چیزوں، لباسوں اور نکاح کے اندر محدود ہو گیا ہے۔ لوگ عموماً حلال و حرام کے متعلق صرف انہی باتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ کیا حلال ہے، اور کیا حرام ہے؟ رہے وہ عمومی اور بڑے بڑے معاملات تو ان کے بارے میں فتویٰ وہ جدید دساتیر اور جدید قوانین سے پوچھتے ہیں جو انہوں نے شریعت کی جگہ جاری کر دیئے ہیں۔ غرض تمام اجتماعی معاملات میں، تمام سیاسی نظاموں کے بارے میں، تمام بین الاقوامی معاملات میں اور اللہ کے حق حاکمیت اور الوہیت کے بارے میں اب لوگ اسلام سے فتویٰ طلب نہیں کرتے۔

یاد رہے کہ اسلام ایک مکمل منہاج حیات ہے جو شخص پورے پورے اسلام کا اتباع کرے گا وہی اللہ کے دین میں ہو گا اور جو شخص کسی ایک بھی معاملے میں شریعت کو چھوڑ کر کسی دوسرے قانون کی اطاعت کرے گا تو وہ دین سے خارج ہو جائے گا۔ چاہے وہ ہزار بار اسلامی عقیدے کا اظہار کرے اور یہ اعلان کرے کہ وہ مسلمان ہے، اس لئے کہ اس کے اعلان اسلام کو اس کا یہ عمل جھٹلا دیتا ہے۔ جب وہ اللہ کی شریعت کو چھوڑ کر کسی اور قانون کا اتباع کرتا ہے اور اس طرح وہ دین اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

یہ ہے وہ اصول اعظم جس کا تعین یہ آیات کرتی ہیں، اسے ایمان کا مسئلہ قرار دیتی ہیں، اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے تو اسے اللہ کے حقوق پر دست درازی قرار دیتی ہیں، اور یہی ہے ان آیات کا مفہوم و مدعا۔ یہی مفہوم اس دین کی سنجیدگی اور قرآن کریم کی سنجیدگی کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور اسی کے مطابق الوہیت کا مفہوم اور معنی حقیقی روپ اختیار کرتا ہے۔

---ooo---

اسی سلسلۂ قانون سازی میں جوے اور شراب کے بارے میں آخری اور قطعی حکم آ جاتا ہے تاکہ جماعت مسلمہ کی تربیت ہو اور اسے جاہلیت کی تمام آلودگیوں سے پاک کر دیا جائے، اسے جاہلیت کی گندی اجتماعی عادات سے پاک کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ہی آستانوں اور پانسوں کو بھی حرام قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ بھی شرکیہ افعال ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ
وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾
اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ
وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ
مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ
فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا ۭ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ ۱۲ ع ۷ ۲

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے' یہ سب گندے شیطانی کام ہیں' ان سے پرہیز کرو' امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟ اللہ اور اس کے رسول کی بات مانو اور باز آ جاؤ' لیکن اگر تم نے حکم عدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسول پر بس صاف صاف حکم پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی۔

جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے انہوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا تھا' اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی بشرطیکہ وہ آئندہ ان چیزوں سے بچے رہیں جو حرام کی گئی ہیں اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور اچھے کام کریں' پھر جس چیز سے روکا جائے اس سے رکیں اور جو فرمان الٰہی ہو اسے مانیں' پھر خدا ترسی کے ساتھ نیک رویہ رکھیں۔ اللہ نیک کردار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔"

شراب' جوا' آستانے اور پانسے جاہلی معاشرے کی سب سے بڑی علامات تھیں اور یہ ایسی عادات تھیں جن کا جاہلی معاشرے کے اندر بہت زیادہ رواج تھا۔ یہ تمام عادات دراصل ایک معاشرتی کل تھیں اور باہم مربوط تھیں اور جاہلی

معاشرے کی پہچان تھیں ۔ اہل جاہلیت بڑی مقدار میں شراب استعمال کرتے تھے اور اس میں وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے ۔ ان کی فخریہ حکایات اور فخریہ اشعار کا موضوع کثرت شراب نوشی ہوا کرتی تھی ۔ مجالس شراب کے ساتھ پھر جانوروں کا ذبح کرنا اور شراب کے ساتھ کباب اور تکے کھلانا بھی لازم تھا ۔ اس میں پینے اور پلانے والے سب شریک ہوتے اور اس طرح اس قسم کی مجالس میں سب کے لئے دلچسپی کا سامان ہوتا ۔ یہ ذبیحے وہ بتوں کے نام اور آستانوں پر کرتے تھے اور ان ذبیحوں کا خون بتوں پر ڈالتے تھے ۔ نیز وہ اپنے الہوں اور کاہنوں کے نام پر بھی بعض جانوروں کو ذبح کرتے تھے ۔ شراب نوشی اور دوسرے مواقع پر جو جانور ذبح کرتے تھے ' ان کے گوشت کو پھر وہ پانسوں کے ذریعے تقسیم کرتے تھے ۔ ہر شخص اپنے پانسے کے مقررہ حصے کا گوشت لیتا تھا ' جس کا پانسہ اونچا نکلا اس کا حصہ بھی زیادہ ہوتا تھا ۔ اسی طرح گوشت تقسیم ہوتا ' یہاں تک کہ بعض اوقات جانور ذبح کرنے والے کے حصے میں کچھ نہ آتا اور وہ مکمل خسارے میں پڑ جاتا ۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی رسوم اور عادات باہم مربوط اور متعلق تھیں اور یہ عادات انہی جاہلی طریقوں پر جاری تھیں .... اسلامی نظام زندگی نے تحریک کا آغاز ان رسوم کی اصلاح سے شروع نہیں کیا اس لئے کہ یہ رسوم اور عادات بعض فاسد نظریاتی تصورات پر قائم تھیں ۔ اگر محض اصلاح رسوم کی سطحی تحریک شروع کر دی جاتی اور اصل اعتقادی نظریات کی بیخ کنی نہ کی جاتی تو یہ کام نہایت ہی سطحی ہوتا ۔ اسلام سے ہرگز یہ توقع نہ کی جا سکتی تھی کہ وہ جڑوں کو چھوڑ کر محض سطحی امور تک اپنے آپ کو محدود کر دے ۔ اسلام نے سب سے پہلے نفس انسانی کی پہلی گرہ یعنی عقائد و نظریات پر کلام کیا ۔ اس نے سب سے پہلے جاہلی عقائد و تصورات کو لیا اور انہیں جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا ۔ ان کی جگہ پاک و صاف اسلامی نظریہ حیات دیا اور یہ تصور اور نظریہ فطرت انسانی کی گہرائیوں تک اتار دیا ۔ اسلام نے متعدد الہوں کے بارے میں ان کے تصورات کے فساد کو ظاہر کیا اور ان کو ایک اللہ حق کے عقیدے پر مجتمع کر دیا ۔ جب ان کے دل و دماغ پر یہ عقیدہ توحید چھا گیا تو اب وہ فطری طور پر سوچنے کے لئے تیار ہو گئے کہ ان کا اللہ الحق کس بات کو پسند کرتا ہے اور کس بات کو پسند نہیں کرتا ۔ اس نظریاتی اصلاح سے پہلے وہ کب اپنی عادات و رسومات کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو سکتے تھے وہ نظریاتی تبدیلی کے بغیر اپنے جاہلی پسندیدہ طریقوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے ۔ اگرچہ انہیں بار بار نصیحت کی جاتی ۔ فطرت کی گرہ درحقیقت عقیدے کی گرہ ہوتی ہے ۔ جب تک سب سے پہلے اس گرہ اور عقدے کو حل نہ کیا جائے اس وقت تک کوئی اخلاقی تعلیم ' کوئی تہذیب اخلاق کا پروگرام اور کوئی اجتماعی اصلاحی سکیم کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ نظریہ دراصل انسانی فطرت کی کنجی ہے ۔ جب تک یہ کنجی لگا کر فطرت انسانی کو کھول کر نہیں دیا جاتا اس وقت تک اس کے نہاں خانے اور اس کی راہ و رسم کی تہ تک رسائی ممکن نہ ہو گی ۔ جب ہم اس کی ایک تنگ گلی کو کھولیں گے تو کئی اور تنگ گلیاں سامنے آئیں گی اور اگر ہم اس کا ایک پہلو روشن کر لیں گے تو دس اور تاریک پہلو سامنے آئیں گے ۔ ہم ایک گرہ کھولیں گے اور مزید دس گرہیں لگ جائیں گی ۔ ہم ایک راہ کھولیں گے تو دس راہیں بند ہو جائیں گی اور اس طرح ہم ایسی بھول بھلیاں میں پڑ جائیں گے کہ نکلنے کی راہ نہ ملے گی ۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام حیات نے جاہلیت کی بری رسموں اور گندی عادات سے اپنے اصلاحی کام کا آغاز نہ کیا ۔ اسلام نے سب سے پہلے نظریاتی اصلاح سے کام شروع کیا ۔ سب سے پہلے یہ مطالبہ ہوا کہ تم کلمہ طیبہ کو قبول کرو اور

مکہ کے ابتدائی تیرہ سال اسی نظریاتی اصلاح اور عقائد کی درستی میں صرف ہوئے۔ان طویل سالوں میں تحریک اسلامی کا نصب العین ہی شہادت لا الہ الا اللہ رہا۔اس عرصے میں لوگوں کو رب العالمین سے متعارف کرایا گیا' ان کو صرف اسی کی بندگی کی دعوت دی جاتی رہی' اور لوگوں کو صرف اسی کی بادشاہت کی طرف بلایا جاتا رہا یہاں تک کہ ان کے نفوس صرف رب واحد کے لئے خالص ہو گئے۔ان کی حالت یہ ہو گئی کہ وہ اپنے لئے وہی کچھ پسند کرنے لگے جو ان کے لیے ان کا خدا پسند کرتا تھا۔جب نظریاتی اصلاح اس ڈگری تک پہنچ گئی تو اب فرائض کا آغاز ہوا' مراسم عبودیت فرض ہوئے' اب جاہلیت کی گندی عادات اور رسوم کی اصلاح کا آغاز ہوا' اجتماعی طور طریقوں کے بدلنے کے احکام صادر ہونا شروع ہوئے' اقتصادی اصلاحات نافذ کی گئیں' نفسیاتی اور اخلاقی طرز عمل کی اصلاح شروع ہوئی اور یہ کام ایسے وقت میں شروع ہوا کہ ادھر سے اللہ کا حکم آتا ادھر سے مسلمان اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے' بغیر کسی حیل وحجت کے' اس لئے کہ انہوں نے امر و نہی کے تمام اختیارات اللہ العالمین کے سپرد کر دیئے تھے ان کا اپنا کچھ اختیار نہ تھا۔

دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اوامر اور نواہی کی تلقین اس مرحلے کے بعد شروع ہوئی جب لوگوں نے مکمل انقیاد سے سر تسلیم خم کر دیا۔ ہر ایک مسلم نے اپنا سب کچھ اللہ کے حوالے کر دیا' اور یہ بات تسلیم کر لی کہ اللہ کے اوامر و نواہی کے بالمقابل اس کا کوئی اختیار نہیں ہے جیسا کہ استاد ابوالحسن علی ندوی نے کہا ہے وہ اپنی کتاب عالم اسلام میں مشرقیت اور مغربیت کی کشمکش میں کہتے ہیں۔

"کفر و شرک کا عظیم عقدہ کھل گیا۔بے شک یہ ایک عظیم عقدہ تھا۔اس عقدے کا کھلنا تھا کہ تمام عقدے کھل گئے۔حضور ؐ نے ان کے ساتھ یہ پہلا جہاد کیا اور اس لئے انہیں مزید کسی جہاد کی ضرورت نہ رہی۔ ہر امر اور ہر نہی کے لئے آپ کو کوئی جدوجہد کرنا نہ پڑی۔اس پہلے نظریاتی معرکے میں اسلام کو جاہلیت پر فتح نصیب ہوئی اور اس کے بعد ہر معرکے میں کامیابی نے آپ کا ساتھ دیا۔یہ اس لئے ہوا کہ یہ لوگ اپنے دلوں' اپنی روح' اپنے اعضاء کے ساتھ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔جب ان پر ہدایت نازل ہوتی تو وہ حضور ؐ کے ساتھ مخالفت اور مخاصمت نہ کرتے تھے۔حضور ؐ جو فیصلہ کرتے اس پر وہ اپنے دلوں میں کوئی خلجان نہ پاتے اور سوال کے فیصلے کے بعد ان کے لئے کوئی اختیار یا دائرہ اختیار نہ رہا تھا۔جب معاملات میں ان سے ضمیر اور عقیدے کے خلاف کوئی بات سرزد ہو جاتی تو وہ کھلے طور پر حضور ؐ کو بتلا دیتے' اور اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کر دیتے۔جب ان سے غلطی ہوتی تو ان پر حد نافذ ہو جاتی۔تحریم شراب کا حکم آتا ہے' شراب سے بھرے ہوئے جام ان کے ہاتھوں میں ہیں اور اللہ کا حکم حائل ہو جاتا ہے اور وہ ہونٹوں تک نہیں جاتے۔ہونٹ خشک اور جگر پیاسے رہ جاتے ہیں۔شراب کے مٹکے توڑ دیئے جاتے ہیں اور شراب مدینہ کی گلیوں میں سیلاب کی طرح بہ نکلتی ہے۔"

لیکن اس کے باوجود تحریم شراب اور اس کے ساتھ دوسری اشیاء کی تحریم کوئی اچانک کام نہ تھا۔اس آخری تحریم سے پہلے اس عام اور نہایت ہی گہری بیماری کا علاج بڑی تدریج کے ساتھ کیا گیا' اس لئے کہ لوگ اس کے رسیا تھے۔ اور یہ ان کے لئے ایک نہایت ہی عادی نشہ تھا۔اس کے ساتھ ان کے معاشرتی اور اقتصادی مفادات وابستہ ہے۔

شراب کی یہ آخری حرمت تیسرے یا چوتھے مرحلے میں نازل ہوئی۔پہلے مرحلے میں محض اس سمت میں ایک تیر پھینکا گیا جس کی طرف اسلامی نظام کا رجحان تھا سورۂ نحل کی ایک آیت میں کہا گیا :

(وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا

(۱۶:۶۷)) "کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے جن سے تم شراب اور رزق حسن حاصل کرتے ہو۔"
یہاں سکر یعنی مسکرات کو رزق حسن کے مقابلے میں رکھا گیا جس سے یہ اشارہ مطلوب تھا کہ مسکرات رزق حسن کی تعریف میں نہیں آتے۔ گویا مسکرات کوئی اور چیز ہے اور رزق حسن کوئی اور چیز ہے۔ اس کے بعد سورۂ بقرہ میں مسلمانوں کے دینی وجدان کو شراب کے خلاف ایک قانونی اور منطقی استدلال کے ذریعے جگایا گیا۔

(يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ

اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲:۲۱۹)) "آپ سے شراب اور جوے کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہ دیجئے ان میں گناہ بھی ہے اور لوگوں کے لئے منافع بھی ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے منافع سے بہت ہی بڑا ہے۔" اس آیت میں یہ اشارہ کیا گیا کہ جب ان سے ان کا گناہ بڑا ہے تو قلیل منافع کو نظر انداز کر کے ان کو ترک کرنا ہی اولیٰ ہے۔ اس لئے کہ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی فائدہ تو ضرور ہوتا ہے۔ البتہ حلال اور حرام ہونے کا دارومدار اکثریت پر ہوتا ہے۔ نفع اور نقصان کا غلبہ دیکھا جاتا ہے۔

تیسرا اقدام یہ کیا گیا کہ شراب نوشی کی عادت میں اوقات کی کمی کر دی گئی اور شراب نوشی کو حالت صلوٰۃ کے منافی قرار دیا گیا۔ سورہ نساء کی مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی :

(يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ

(۴:۴۳)) "اے ایمان لانے والو، جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب مت جاؤ، یہاں تک کہ تم جو کچھ کہو اسے سمجھو۔" اب پانچ وقت کی نمازیں چونکہ اکثر باہم بہت ہی قریب ہیں اور ان کے درمیان اس قدر وقفہ نہیں ہوتا کہ کوئی شراب پئے اور نشے میں ہو کر پھر اسے افاقہ ہو جائے، چنانچہ ان اوقات کے اندر عملاً شراب نوشی کا امکان ہی نہ رہا اور اس عمل کے لئے دائرہ تنگ ہو گیا۔ خصوصاً (صبوح) صبح کے وقت کی شراب اور "غبوق" یعنی بعد عصر اور بعد مغرب کی شراب کے لئے اوقات تنگ ہو گئے، اس لئے کہ دور جاہلیت میں انہی اوقات میں شراب پی جاتی تھی اور اس اسکیم کے ذریعے شریعت نے نشے کے اوقات میں خواہش کو توڑ دیا۔ ایک مسلمان کے لئے یہ ایک بہترین تدبیر ثابت ہوئی اس لئے کہ اس وقت کسی مسلم کے بارے میں یہ سوچا بھی نہ جا سکتا تھا کہ وہ نماز چھوڑ کر شراب نوشی کرے گا۔ اس وقت ہر مسلمان اپنے وقت پر نماز ادا کرتا تھا۔ اس طرح شراب کا نشہ ٹوٹ جاتا۔ اس کے بعد چوتھا اور آخری اقدام اس آیت کے ذریعے کیا گیا۔ اب اس آخری وار کے لئے فضا تیار تھی، لوگوں کے نفوس تیار تھے، چنانچہ حکم آتے ہی لوگوں نے یقین کیا اور تعمیل کر ڈالی۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا اے اللہ ہمارے لئے شراب کے سلسلے میں کافی اور شافی بیان دے دے۔ اس پر سورہ بقرہ کی یہ آیت نازل ہوئی :

(یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ

اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲ : ۲۱۹)) "آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں' کہہ دیجئے ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے منافع بھی ہے اور ان کا گناہ ان کے نفع سے بہت زیادہ ہے) حضرت عمرؓ کو بلایا گیا اوران پر یہ آیت پڑھی گئی ۔ اس پر انہوں نے دوبارہ کہا اے اللہ ہمارے لئے شراب کے بارے میں کافی و شافی بیان نازل فرما۔ اس پر سورہ نساء کی یہ آیت نازل ہوئی :

(يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ

(۴ : ۴۳)) "اے ایمان لانے والو! نماز کے قریب مت جاؤ جب تم نشے کی حالت میں ہو' یہاں تک کہ تم جو کچھ کہو اسے سمجھو ۔" جب حضرت عمرؓ کو یہ آیت سنائی گئی تو انہوں نے پھر سوال کیا کہ اے اللہ شراب کے بارے میں کافی و شافی بیان نازل فرما۔ اس پر سورۂ مائدہ کی یہ آیت نازل ہوئی :

(اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ

وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (۵ : ۹۱)) "شیطان یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعے سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے' پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے ۔" اس پر حضرت عمرؓ کو بلایا گیا اوران کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی تو انہوں نے کہا جی ہاں ہم رک گئے' ہم رک گئے ۔" (اصحاب السنن)

جب واقعہ احد کے بعد سن تین ہجری میں یہ آیات نازل ہوئیں تو اس کے سوا کسی اوراقدام کی ضرورت پیش نہیں آئی ۔ بس ایک منادی نے مدینہ میں اعلان کیا :"اے قوم! شراب حرام کر دی گئی ۔" یہ سننا تھا کہ جس کے ہاتھ میں پیالہ تھا اس نے اسے توڑ دیا' جس کے منہ میں گھونٹ تھا' اس نے اسے تھوک دیا' شراب کے مشکیزے پھاڑ ڈالے گئے اور شراب کے مٹکے توڑ دیئے گئے اور صورت حال اس طرح ہوگئی کہ گویا لوگوں نے نشے اور شراب کو کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔

اب ذرا قرآن کی آیات کی بناوٹ (Construction) دیکھئے اور وہ انداز تربیت دیکھئے جو قرآن نے اختیار فرمایا۔

(يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ

عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۹۰) اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ

الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (۹۱) وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۹۲) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہو گی۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟ اللہ اور اس کے رسول کی بات مانو اور باز آ جاؤ۔ لیکن اگر تم نے حکم عدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسول پر بس صاف صاف حکم پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی۔"

آغاز اور لہجہ وہ معروف آواز ہے جس میں لوگوں کو ان کے محبوب لقب اہل ایمان سے پکارا جاتا ہے۔ (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا) — یوں مسلمانوں کے جذبہ ایمان کو جگایا جاتا ہے اور انہیں یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ ان کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ آنے والے احکام کی مکمل اطاعت کریں۔

اس کے بعد آیت کا انداز بیان نہایت ہی دو ٹوک اور حصر کے انداز میں آتا ہے۔

(اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ) "بے شک یہ شراب اور جوا، آستانے اور پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں۔ یہ گندے کام ہیں اور ان کاموں پر طیب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اور اللہ نے صرف طیبات کو حلال کیا ہے اور پھر یہ شیطانی اعمال ہیں اور شیطان انسان کا قدیمی دشمن ہے۔ ایک مومن کے لئے تو بس یہی کافی ہے کہ اسے معلوم ہو جائے کہ کوئی کام شیطانی ہے، یہ سنتے ہی وہ اس سے بدکتا ہے، اس کا پورا وجود کانپ اٹھتا ہے اور وہ ڈر کر اس سے دور ہو جاتا ہے۔

ایسے حالات میں اب قطعی ممانعت صادر ہو جاتی ہے لیکن اس ممانعت کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس پر عمل سے تمہیں فلاح اخروی نصیب ہو گی۔ یہ ایک دوسری جھلکی ہے، جس کے ذریعے یہ دکھایا جاتا ہے کہ قرآن کریم کس طرح انسانی نفسیات کی گہرائیوں تک احساسات اتار دیتا ہے۔

(فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ) اس سے مکمل اجتناب کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔" اب یہ بتایا جاتا ہے کہ اس گندگی کو جاری رکھ کر شیطان اپنے کیا مقاصد پورے کرنا چاہتا ہے: "شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد اور نماز سے روک دے۔"...... یہ ہے شیطان کا اصل منصوبہ اور یہ ہیں شیطان کے مقاصد جو وہ ان ناپاکیوں اور بداخلاقیوں کے ذریعے بروئے کار لانا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی صفوں کے درمیان بغض و عداوت پھیل جائے اور یہ کام وہ شراب و کباب اور جوئے بازی کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دوسرا مقصد اس سے وہ یہ حاصل کرنا چاہتا ہے کہ اہل ایمان کو یاد الہی اور صلوٰۃ سے روکتا ہے، اس سے بڑی سازش اور کیا ہو سکتی ہے؟

یہ شیطانی مقاصد جو قرآن کریم نے بیان کئے ہیں، یہ تو وہ واقعی امور ہیں جنہیں مسلمان اپنی تاریخ میں اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں جبکہ قرآن کریم بذات خود سچا ہے اور اسے کسی تاریخی تصدیق کی ضرورت نہیں ہے۔ اس مسئلے پر کسی بحث اور تفتیش کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شیطان کا یہ منصوبہ کس طرح کام کرتا ہے۔ شراب نوشی سے انسان کا فہم و

اور اک ختم ہو جاتا ہے۔گوشت اور خون کا نقصان اور جذبات اور میلانات کا ہیجان اس کے فوری اثرات ہیں اور جوئے کی وجہ سے لوگوں کو جو مالی نقصان ہوتا ہے' اس کی وجہ سے دلی بغض اور عداوت پیدا ہوتی ہے' اس لئے کہ جوئے میں جو ہارتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ جیتنے والا اس کی دولت کو اس کی آنکھوں کے سامنے بطور مال غنیمت لے کر جا رہا ہے جبکہ وہ شکست خوردہ اور دولت بریدہ ہے۔یہ ایسی باتیں ہیں جن کے نتیجے میں بغض و عداوت کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ اگرچہ شرابی اور جوئے باز بظاہر یار اور دوست نظر آتے ہیں اور ایک ہی مجلس میں خوش و خرم نظر آتے ہیں۔ایک دوسرے کے دوست ہیں اور پختہ ہم نشیں ہیں۔

دوسری برائی کہ یہ دونوں چیزیں ذکر الٰہی سے روکنے والی ہیں اور نماز سے روکتی ہیں۔تو یہ ایسی باتیں ہیں جن کے ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔شراب بے ہوش کرتی ہے اور جوا مدہوش کرتا ہے اور جوئے میں جس طرح مت ماری جاتی ہے وہ شراب نوشی کی بے ہوشی سے کم نہیں ہے۔جوئے باز کی دنیا اور شراب خور کی دنیا ایک ہی دنیا ہے اور یہ شراب و کباب اور جام و سبو سے آگے نہیں ہے۔

جب بات یہاں تک آ پہنچتی ہے اور یہ بتا دیا جاتا ہے کہ اس گندگی کے پھیلانے سے شیطان کے اصل مقاصد کیا ہیں تو ایک مومن کا دل جاگ اٹھتا ہے اور اس کا احساس تیز ہو جاتا ہے۔وہ فیصلہ کن اقدام کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے اور جب یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا تم اس سے باز آنے والے ہو؟ تو ہر مومن کے دل میں وہی جواب تیار ہو چکا ہوتا ہے جو حضرت عمرؓ نے دیا تھا ہاں! بے شک ہم باز آگئے' ہم باز آگئے۔

اب بات مزید آگے بڑھتی ہے اور ایک آخری چوٹ لگائی جاتی ہے۔

(وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (۹۲)) "اللہ اور اس کے رسول کی بات مانو اور باز آجاؤ' لیکن اگر تم نے حکم عدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسول پر بس صاف صاف حکم پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی۔" یہ وہ اصول ہے جس کی طرف تمام معاملات لوٹتے ہیں' اللہ کی اطاعت اور رسول اللہ ؐ کی اطاعت اور یہی ہے اسلام۔اسلام کے اندر اللہ اور رسول اللہ ؐ کی بے قید اطاعت کے علاوہ کسی اور چیز کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔اگر کوئی اللہ اور رسول اللہ ؐ کی اطاعت سے روگردانی کرے گا تو اس کے نتائج کا ذمہ دار وہ خود ہو گا۔

(فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (۹۲)) "اگر تم نے حکم عدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صاف صاف حکم بتا دینے کے سوا کوئی اور ذمہ داری نہیں ہے۔ اور رسول ؐ نے تو اللہ کا پیغام بہت ہی اچھے طریقے سے پہنچا دیا۔اس صاف صاف بتا دینے کے بعد تمام تر ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہو گئی جو مخالفت کر رہے ہیں۔

یہ بالواسطہ طور پر ایک سخت دھمکی ہے۔ایک مومن کا بدن کانپ اٹھتا ہے اس لئے کہ اہل ایمان اگر نافرمانی کرتے ہیں اور اللہ و رسول کی اطاعت نہیں کرتے تو گویا صرف اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔حضور نے تو تبلیغ کر دی اور اپنا فریضہ اچھی طرح

ادا کر دیا اور ان کے معاملے سے فارغ ہو گئے ' ہاتھ جھاڑ دیئے ۔ اب اگر وہ عذاب کے مستحق ہوتے ہیں تو رسول ان سے عذاب کو دفعہ نہیں کر سکتے ۔ خصوصاً جبکہ انہوں نے ان کی نافرمانی کی اور آپ کی اطاعت نہ کی اور اللہ سرکشوں اور نافرمانوں کو سزا دینے پر پوری طرح قادر ہے ۔

یہ اسلامی منہاج اصلاح ہے جو انسان کے دلوں میں اترتا ہے ' دلوں کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے ' دلوں کے بند دروازے کھولتا ہے ۔ اس کے بعد پھر اس پر نہایت ہی خفیہ راستے اور نشیب و فراز کھلتے ہیں ۔

یہاں مناسب ہے کہ ہم ذرا اس شراب کی تفصیلات دے دیں جسے یہاں حرام قرار دیا گیا ہے ۔ امام ابو داؤد نے حضرت ابن عباس ؓ سے اپنی سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے کہ " ہر نشہ دلانے والی چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے ۔"

حضرت عمر ؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر خطبہ دیا اور اس خطبے میں حضور ؐ کے صحابہ کی ایک جماعت موجود تھی ۔ " اے لوگو ' شراب کی حرمت کا حکم جس وقت نازل ہوا تمہیں معلوم ہے ' شراب پانچ چیزوں سے ہے ' انگور سے ' کھجور سے ' شہد سے ' گندم سے اور جو سے اور شراب کی تعریف ہے " وہ جو عقل کو ڈھانپ لے ۔"

ان دونوں روایات سے یہ معلوم ہوا کہ ہر وہ چیز خمر کی تعریف میں آتی ہے جو بے ہوش کرتی ہو ۔ خمر سے مراد شراب مسکر کی کوئی خاص قسم مراد نہیں ہے جو مشروب بے ہوش کرتا ہو وہ خمر ہے ۔

کسی بھی نشہ آور چیز کے ذریعے انسان کی ہوش کا غائب ہونا ' اس دائمی بیداری کے ساتھ متضاد ہے جو اسلام نے ہر شخص کے لئے لازمی کر دی ہے ۔ اسلام کی پالیسی یہ ہے کہ انسان بیدار رہے اور مسلسل اللہ کے ساتھ مربوط رہے ۔ ہر لحظہ وہ اللہ کی طرف دیکھتا رہے ۔ پھر اس مسلسل بیداری کی حالت میں وہ اس دنیا کی ترقی اور نشوونما میں لگا رہے ۔ کمزوری اور فساد سے اس زندگی کو بچاتا رہے اور اپنے نفس اپنے مال اور اپنی عزت کی حفاظت کرتا رہے ۔ جماعت مسلمہ کے امن و امان ' نیز اسلامی شریعت اور اسلامی نظام زندگی کا محافظ ہو تاکہ اس پر کوئی بھی دست درازی نہ کر سکے اس لئے کہ ایک مسلمان فرد صرف اپنی ذات اور اپنی لذتوں کے اندر غرق نہیں رہ سکتا ۔ اس پر اس قسم کے فرائض عائد کئے گئے ہیں جن کی ادائیگی کے لئے اسے ہر وقت بیدار رہنا پڑتا ہے ۔ کچھ فرائض اس پر اس کے رب کی جانب سے ہیں ' کچھ فرائض اپنے نفس کی طرف سے ہیں ' کچھ فرائض اس کے اہل و عیال کی طرف سے ہیں ' کچھ فرائض اس اسلامی سوسائٹی کی طرف سے ہیں جس میں وہ رہ رہا ہے ۔ اس کے بعد پوری انسانیت کی جانب سے بھی اس پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں تاکہ وہ اسے اسلامی دعوت دے اور راہ ہدایت سکھائے ۔ اس وجہ سے اسلام اس سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ اور ہر وقت بیدار رہے ۔ نیز جب وہ پاک چیزوں سے بھی استفادہ کر رہا ہو تو بھی اس سے مطالبہ یہ ہے کہ وہ بیدار رہے ' خوددار رہے اور لذات اور شہوات کا بندہ اور غلام نہ بن جائے ۔ اسے چاہئے کہ وہ اپنی خواہشات اور رغبات کو لگام میں رکھے ۔ وہ اپنی خواہشات کا بندہ و غلام نہ ہو بلکہ مالک اور آقا ہو ۔ جو لوگ مدہوشی میں پناہ لے کر اس دنیا سے اوجھل ہونا چاہتے ہیں ' ظاہر ہے کہ ایسے لوگ مذکورہ بالا فرائض میں سے کوئی فریضہ بھی ادا نہیں کر سکتے ۔

پھر اپنے آپ کو عالم مدہوشی میں داخل کرنے کی حقیقت کیا ہے ۔ کچھ وقت کے لئے نشے باز اپنے آپ کو حقیقی دنیا سے علیحدہ کر دیتا ہے اور وہ ایک طرح حقیقی زندگی سے فرار کا راستہ اختیار کرتا ہے ۔ وہ ان تصورات کی دنیا میں پناہ لیتا ہے جو خمار اور نشے کی حالت میں ذہن میں آتے ہیں ۔ اسلام انسان کے لئے اس قسم کی موہوم دنیا اور خیالی تصورات

میں گھومنے کو حرام قرار دیتا ہے۔ اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ لوگ حقائق کو دیکھیں ' حقائق کا مقابلہ کریں ' حقائق میں زندہ رہیں اور اپنی زندگی کو حقائق پر چلائیں۔ ان کی زندگی محض اوہام اور تخیلات پر قائم نہ ہو۔ جب انسان حقائق کا سامنا کرتا ہے تب اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کے عزم و ارادے کا کیا حال ہے۔ رہا یہ طریق کار کہ کوئی حقائق سے فرار اختیار کر کے محض تخیلات اور اوہام کی زندگی میں چلا جائے تو یہ ناقص اور بیمار انداز حیات ہے۔ اس صورت میں عزم کمزور ہوتا ہے' ارادہ تحلیل ہو جاتا ہے۔ اسلام انسان کے ارادے کو بہت ہی بڑی اہمیت دیتا ہے' اور اس کی پالیسی یہ ہے کہ اس کا ارادہ آزاد ہو اور اس کے اوپر کوئی جابر اور قاہر قوت نہ ہو۔ مذکورہ بالا اسلامی پالیسیاں ہی اس بات کے لئے کافی ہیں کہ تمام نشہ آور چیزوں کو حرام قرار دیا جائے اس لئے کہ یہ ناپاک اور شیطانی اعمال ہیں اور ان سے انسانی زندگی میں فساد اور بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

اس بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا شراب تمام نجاستوں کی طرح نجس بھی ہے یا نہیں ہے؟ یا صرف پینا حرام ہے۔ پہلا قول کہ وہ نجس ہے یہ جمہور کا قول ہے اور دوسرا قول ربیعہ' لیث 'مزنی (امام شافعی کے ساتھی) اور بعض متاخرین بغدادی علماء کا ہے۔ بس ہمارے لئے اسی قدر ذکر کافی ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں شراب کو حرام کر دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ یہ نجس ہے اور شیطانی عمل ہے اس وقت اسلامی سوسائٹی کے اندر دو سوال پیدا ہوئے' ایک یہ کہ بعض نہایت ہی پاک فطرت اور محتاط صحابہ کرام نے یہ سوال اٹھایا کہ ہمارے ان ساتھیوں کا کیا بنے گا جنہوں نے ایسے حالات میں انتقال کیا کہ وہ شراب پیتے تھے۔ بعض نے یہ کہا کہ ان لوگوں کا کیا بنے گا کہ جو احد میں شہید ہوئے اور ان کے پیٹوں میں شراب تھی۔ (اس وقت شراب حرام نہ تھی) اور جو لوگ اسلامی صفوں میں انتشار اور افراتفری پیدا کرنا چاہتے تھے انہوں نے بھی اسی قسم کے خدشات کا اظہار کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا اسلام کے عمل قانون سازی کے اندر شبہات اور شکوک پھیلائیں۔ یہ لوگ یہ اشارہ دیتے کہ جو لوگ پہلے فوت ہوئے ان کا ایمان ضائع ہو گیا اس لئے کہ وہ تو شراب پیتے تھے جو ناپاک ہے اور اعمال شیطانیہ میں سے ہے۔ ان میں سے بعض لوگ اس حال میں فوت ہوئے کہ ان کے پیٹ میں یہ ناپاک شے موجود تھی۔

ان دونوں قسم کے خدشات و اعتراضات کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی:

(لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۵ : ۹۳)) ''جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے انہوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا تھا اس پر کوئی گرفت نہ ہو گی بشرطیکہ وہ آئندہ ان چیزوں سے بچے رہیں جو حرام کی گئی ہیں اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور اچھے کام کریں' پھر جس جس چیز سے روکا جائے اس سے رکیں اور جو فرمان الٰہی ہو اسے مانیں' پھر خدا ترسی کے ساتھ نیک رویہ رکھیں۔ اللہ نیک کردار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔''

اس آیت میں فیصلہ یہ کیا گیا کہ جسے حرام نہ کیا گیا ہو' وہ حرام نہیں ہے۔ اور یہ کہ تحریم کا اطلاق حکم الٰہی کے بعد ہوتا ہے

پہلے نہیں ہوتا' اور یہ کہ تحریم موثر بماضی نہ ہوگی' لہٰذا کوئی سزا اس وقت تک نہ ہوگی جب تک کوئی نص وارد نہ ہو' چاہے یہ سزا دنیا کی سزا ہو یا آخرت کی سزا' اس لئے کہ اللہ کا کلام ہی حکم کو وجود میں لاتا ہے۔ جو لوگ مر گئے' شراب پیتے رہے یا ان کے پیٹ میں شراب تھی اور اس وقت حرام نہ تھی تو ان پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ اس لئے کہ انہوں نے کوئی حرام چیز استعمال نہیں کی۔ نہ انہوں نے کوئی نافرمانی کی۔ وہ تو اللہ سے ڈرنے والے تھے۔ معاصی سے بچنے والے تھے' نیک کام کرتے تھے اور اللہ سے اچھے انجام کی امید رکھتے تھے' ان کو اچھی طرح یقین تھا کہ اللہ ان کی نیتوں سے خوب واقف ہے' ان کے اعمال کو جانتا ہے۔ جن لوگوں کے حالات ایسے ہوں وہ محرمات کا ارتکاب کیسے کر سکتے ہیں اور وہ معصیت کا ارتکاب کیسے کر سکتے ہیں۔

ہم یہاں ان مباحث میں پڑنا ہی نہیں چاہتے' جو معتزلہ نے اس حکم کے بارے میں کیے ہیں۔ معتزلہ نے یہ بحثیں کیں کہ آیا شراب کے اندر نجاست ذاتی ہے یا اس کے اندر نجاست اللہ کی اس آیت کی وجہ سے پیدا ہوگئی۔ نیز تمام محرمات کے اندر حرمت ذاتی ہے یا وارد حکم کی وجہ سے حرمت لاحق ہو جاتی ہے۔ یہ بے نتیجہ بحث ہے اور اسلامی شعور اس بحث کو سرے سے قبول ہی نہیں کرتا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو حرام قرار دیتے ہیں' تو یہ بات اللہ کے علم میں ہوتی ہے کہ اللہ اس چیز کو کیوں حرام قرار دے رہے ہیں چاہے اللہ حرمت کے سبب کی تصریح کرے یا نہ کرے' چاہے حرمت اس لئے ہو کہ سبب حرام چیز کی ذات کے اندر ہو یا اس چیز کو استعمال کرنے والے کے اندر سبب حرمت ہو یا محض سوسائٹی کے مفادات کے لئے اسے حرام قرار دیا گیا ہو' تمام چیزوں کا علم تو صرف اللہ ہی کو ہوتا ہے۔ اللہ کے احکام کی اطاعت واجب ہے اور احکام آنے کے بعد اس قسم کے مباحث کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے۔ اسلامی نظام زندگی کا مزاج ہی واقعیت پسندانہ ہے لہٰذا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اگر حرمت کسی ایسے سبب کی وجہ سے تھی جو محرم کی ذات میں تھی تو پھر حرمت سے پہلے وہ چیز حلال کیوں تھی؟ اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ایسی مصلحت ہو جس کی وجہ سے اللہ نے کچھ عرصہ کے لئے اسے حرام قرار نہ دیا ہو' ہر بات اللہ کے اختیار میں ہے۔ یہی اس کی حاکمیت کا تقاضا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ انسان کسی چیز کو اچھا سمجھے تو اچھی ہے برا سمجھے تو بری ہے۔ بعض اوقات انسان کسی چیز کو حکم کی علت سمجھتا ہے اور وہ علت نہیں ہوتی۔ اللہ کی بارگاہ میں باادب طریقہ یہی ہے کہ حکم کو سنا جائے' قبول کیا جائے اور نافذ کیا جائے' چاہے کوئی اس کی علت اور حکمت کو سمجھے یا نہ سمجھے۔ علت معلوم ہو یا مخفی ہو' اس کو اللہ ہی جانتا ہے اور ہم نہیں جانتے۔

اسلامی شریعت پر عمل کی بنیاد اللہ کی بندگی اور غلامی کے اصول پر ہے۔ اللہ کی اطاعت اس لئے ہے کہ ہم اللہ کے غلام ہیں' اور یہی ہے اسلام بمعنی سر تسلیم خم کرنا۔ یہ تو اطاعت کے بعد کا درجہ ہے کہ کوئی عقلمند شریعت کی حکمتوں کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اپنی سمجھ کے مطابق یہ کام وہ تمام اوامر و نواہی میں کر سکتا ہے' چاہے وہ حکمتیں منصوص ہوں یا منصوص نہ ہوں' اسے عقل انسانی سمجھ سکتی ہو یا نہ سمجھ سکتی ہو۔ اس لئے کہ شریعت اسلامی کے متحقق ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کنندہ انسان نہیں ہے۔ یہ اللہ ہے جو یہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ جب اللہ نے حکم فرما دیا یا منع کر دیا تو اطاعت لازم ہوگی۔ اگر اللہ اسلامی شریعت کے بارے میں آخری فیصلہ کنندہ عقل انسانی کو قرار دے دیتا تو عقل انسانی کا مقام اسلامی شریعت سے اونچا ہو جاتا۔ اس صورت میں مقام الوہیت اور مقام عبودیت کے اندر پھر فرق کیا رہ جاتا۔

اب ذرا عربیت کے اعتبار سے اس آیت کی ترکیب (Construction) پر بات ہو جائے۔ اس آیت میں تقویٰ کو تین

مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ (اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) یعنی تقویٰ ایمان اور عمل صالح۔ پھر (اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا) تقویٰ اور ایمان فقط۔ پھر (اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا) تقویٰ اور احسان کا ذکر کیا ہے۔ اس عبارت میں اس انداز میں تقویٰ کی تکرار کیوں کی گئی۔ اس سلسلے میں کسی مفسر کی توجیہ تشفی بخش نہیں رہی ہے۔ اسی طرح فی ظلال القرآن کے پہلے ایڈیشن میں' میں خود بھی کوئی تشفی بخش توجیہ نہیں کر سکا اور ابھی تک کوئی تسلی بخش بات سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ تفاسیر کی توجیہات میں سے دوسروں کے مقابلے میں جو بہتر توجیہ مجھے ملی ہے وہ ابن جریر کی ہے اگرچہ تشفی بخش نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں :

"پہلے تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ خدا ترسی کے ساتھ اللہ کے حکم کو قبول کیا جائے' اس کی تصدیق کی جائے اور اس پر دینداری کے ساتھ عمل کیا جائے' دوسرے تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ خدا خوفی سے اس پر ثابت قدم رہا جائے' اور تیسرے سے مراد وہ خدا خوفی ہے جس میں احسان اور نوافل کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کیا جائے۔ اس کتاب کے طبع اول میں خود میں نے جو کچھ کہا تھا' وہ یہ تھا :

"یہ مزید تفصیل دے کر تاکید کرنا ہے۔ پہلے فقرے میں ایمان' عمل صالح اور تقویٰ کا ذکر ہوا' دوسرے فقرے میں تقویٰ کا ذکر ایمان کے ساتھ ہوا۔ اور تیسرے میں تقویٰ اور احسان یعنی عمل صالح کے ساتھ ذکر ہوا۔ اس تاکید کا مقصد یہ ہے کہ تمام امور کا مدار تقویٰ پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اعمال کی اصل قدر و قیمت اس باطنی شعور کی وجہ سے ہوتی ہے جو ان کی پشت پر ہوتا ہے اور یہ باطنی شعور تقویٰ ہے' جس کا اظہار خدا ترسی کے ذریعے ہوتا ہے اور اس شعور کی وجہ سے انسان اللہ کی ذات کے ساتھ ہر وقت جڑا رہتا ہے۔ اللہ پر ایمان' اس کے اوامر و نواہی کی تصدیق اور عمل صالح جو اس باطنی عقیدے اور خفیہ شعور کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس عمل صالح اور اس باطنی شعور کے درمیان ایک ربط ہوتا ہے۔ یہ تمام باطنی شعور اور تقویٰ اصل مطلوب ہیں اور انہی پر مدار حکم ہے۔ اعمال کی ظاہری اشکال و صور پر مدار حکم نہیں ہے۔ یہ بات کہ اصل مدار نیت' روح اور باطنی شعور پر ہے اس قدر اہم اور اصولی بات ہے کہ اس کے لئے بار بار تکرار کی ضرورت ہے۔"

ابھی تک میں خود اپنی بات سے بھی مطمئن نہیں ہوں لیکن اس کے سوا کوئی اور بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ واللہ ھو المستعان۔

---ooo---

آگے بات بھی حلال و حرام کے موضوع پر ہی جاری ہے۔ حالت احرام میں شکار کے مسئلے پر بات ہو رہی ہے۔ شکار کے قتل کا کفارہ' یہ حکمت کہ اللہ تعالیٰ کے بیت' اشہر حرام' ہدی اور پٹے ڈالے ہوئے جانوروں کا احترام کیوں فرض کیا ہے؟ اور اس سورہ کے آغاز میں ان چیزوں کو چھیڑنے سے منع کیا گیا ہے۔ آخر میں ایک فرد مسلم اور ایک اسلامی سوسائٹی کے لئے ایک عام اصول اور پیمانے کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ ایسا پیمانہ کہ اس میں پاک چیز کی قدر و قیمت زیادہ ہے اگرچہ قلیل ہو اور ناپاک چیز اگرچہ بہت ہی زیادہ ہو اس کی کوئی قدر نہیں ہے۔

---ooo---

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ
الصَّيْدِ تَنَالُهٗۤ اَيْدِيْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ
بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٩٤﴾ يٰۤاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا
فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا
بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ
وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَ
اللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿٩٥﴾ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَ طَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ
وَ لِلسَّيَّارَةِ ۚ وَ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ
الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٩٦﴾ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ
وَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ الْهَدْيَ وَ الْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا
فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٩٧﴾ اِعْلَمُوْۤا اَنَّ
اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩٨﴾ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ
وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿٩٩﴾ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ
وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ
تُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٠﴾ ع ١٣ ع ٧ ٣

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ تمہیں اس شکار کے ذریعے سے سخت آزمائش میں ڈالے گا جو بالکل تمہارے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں ہو گا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ تم میں سے کون اس سے غائبانہ ڈرتا ہے' پھر جس نے اس تنبیہ کے بعد اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے تجاوز کیا اس کے لئے دردناک سزا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' احرام کی حالت میں شکار نہ مارو' اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور اس نے مارا ہو اسی کے ہم پلہ ایک جانور اسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہو گا جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے اور یہ نذرانہ کعبہ پہنچایا جائے گا' یا نہیں تو اس گناہ کے کفارے میں چند مسکینوں کو کھانا کھلانا ہو گا' یا اس کے بقدر روزے رکھنے ہوں گے' تاکہ وہ اپنے کئے کا مزا چکھے۔ پہلے جو کچھ ہو چکا اسے اللہ نے معاف کر دیا' لیکن اب اگر کسی نے اس حرکت کا اعادہ کیا تو اس سے اللہ بدلہ لے گا' اللہ سب پر غالب ہے اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہے۔

تمہارے لئے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا' جہاں تم ٹھہرو وہاں بھی اسے کھا سکتے ہو اور قافلے کے لئے زادِ راہ بھی بنا سکتے ہو۔ البتہ خشکی کا شکار' جب تک تم احرام کی حالت میں ہو' تم پر حرام کیا گیا ہے۔ پس بچو اس خدا کی نافرمانی سے جس کی پیشی میں تم سب کو گھیر کر حاضر کیا جائے گا۔

اللہ نے مکان محترم کعبہ کو لوگوں کے لئے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ بنایا اور ماہ حرام اور قربانی کے جانوروں اور قلادوں کو بھی (اس کام میں معاون بنا دیا) تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کے سب حالات سے باخبر ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔ خبردار ہو جاؤ! اللہ سزا دینے میں بھی سخت ہے اور اس کے ساتھ بہت درگزر اور رحم بھی کرنے والا ہے۔ رسول پر تو صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے' آگے تمہارے کھلے اور چھپے سب حالات کا جاننے والا اللہ ہے۔

اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ پاک اور ناپاک بہرحال یکساں نہیں ہیں' خواہ ناپاک کی بہتات تمہیں کتنا ہی فریفتہ کرنے والی ہو' پس اے لوگو جو عقل رکھتے ہو' اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو' امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہو گی۔" ذرا پیچھے دیکھ کر اس سورہ کی ابتدائی آیات کو ایک بار پھر پڑھئے۔

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (۱) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَاۗىِٕدَ وَلَآ اٰۗمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا (۲) (۵: ۱ - ۲))

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' بندشوں کی پوری پابندی کرو' تمہارے لئے مویشی قسم کے سب جانور حلال کئے گئے ہیں' سوائے ان کے جو آگے چل کر تم کو بتائے جائیں گے۔ لیکن احرام کی حالت میں شکار کو اپنے لئے حلال نہ کر لو' بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ اے ایمان لانے والو' خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو' حرام مہینوں میں سے

کسی کو حلال نہ کر لو' قربانی کے جانوروں پر دست درازی نہ کرو' ان جانوروں پر ہاتھ نہ ڈالو جن کی گردنوں میں نذر خداوندی کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوئے ہوں۔ نہ ان کو چھیڑو جو اپنے رب اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکان محترم کی طرف جا رہے ہوں' ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو تم شکار کر سکتے ہو)۔

یہ ممانعت اس شکار کے بارے میں تھی جب شکاری حالت احرام میں ہو' اور یہ ممانعت خدا پرستی کی نشانیوں (شعائر) کی بے حرمتی کے بارے میں تھی' قربانی کے جانوروں' پٹے ڈالے ہوئے نذر کے جانوروں' حاجیوں کے ساتھ چھیڑ کی ممانعت کی گئی تھی' لیکن ان ممنوعات پر دنیا میں کوئی سزا نہ سنائی گئی تھی۔ صرف یہ کہا گیا تھا کہ یہ کام گناہ گاری کے کام ہیں۔ اب دنیا میں بطور سزا کفارے کا بیان کیا جاتا ہے تاکہ خلاف ورزی کرنے والا اپنے کیے کا مزہ چکھے۔ البتہ سابقہ غلطیوں کی معافی کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اگر کسی نے پہلے ان ممنوعات کا ارتکاب کیا ہو تو وہ معاف ہیں لیکن آئندہ اس ہدایت کے اعلان وبیان کے بعد جو دوبارہ اس کا ارتکاب کرے گا اسے سخت سزا دی جائے گی اور وہ انتقام الٰہی سے بچ نہ سکے گا۔ آیات کے اس مجموعے کا آغاز بھی اسی شناسا آواز کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

(يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا) اس خطاب کے بعد ان کو کہا جاتا ہے کہ اب تمہاری آزمائش ہونے والی ہے۔ یعنی اس شکار کے بارے میں جس سے تم کو حالت احرام میں منع کیا گیا ہے۔

(يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۹۴))

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ تمہیں اس شکار کے ذریعے سے سخت آزمائش میں ڈالے گا جو بالکل تمہارے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں ہو گا یہ دیکھنے کے لئے کہ تم میں سے کون اس سے غائبانہ ڈرتا ہے۔ پھر جس نے اس تنبیہ کے بعد اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے تجاوز کیا اس کے لئے دردناک سزا ہے۔"

یہ بہت ہی آسان شکار ہوتا ہے' اللہ اسے خود ان کی طرف چلاتا ہے' ایسا شکار ہوتا ہے کہ وہ اسے ہاتھوں کے ساتھ بھی پکڑ سکتے ہیں' ان کے نیزے اور تیر بھی اسے بسہولت مار سکتے ہیں۔ ایسے واقعات سامنے آئے ہیں کہ حرم میں شکار خود خیموں کے اندر آ جاتا ہے' ان کے گھروں کے اندر آ جاتا ہے اور یہ اللہ کی جانب سے آزمائش ہوتی ہے اور یہ وہی آزمائش ہے جس میں بنی اسرائیل فیل ہوئے اور پھر وہ اپنے پاؤں پر کھڑے نہ رہ سکے۔ انہوں نے پہلے اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے باصرار یہ مطالبہ کیا کہ ان کے لئے ایک ایسا دن مقرر کریں جس میں ان کے لئے معاشی سرگرمیوں میں مشغول ہونا ممنوع ہو۔ اس دن وہ مکمل آرام کریں' نماز پڑھیں اور کسی دنیاوی اور معاشی کام میں مشغول نہ ہوں۔ اللہ نے ہفتے کا دن مقرر کر دیا لیکن اللہ نے شکار ان کی آزمائش کے لئے وافر مقدار میں ساحلوں تک چلایا۔ یہ شکار ان کی نظروں کے سامنے پھرتا اور جب ہفتہ نہ ہوتا تو شکار نظر ہی نہ آتا۔ جس طرح مچھلی بالعموم پانی میں چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ اب یہ دیکھ کر بیچارے اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو نہ نبھا سکے۔ یہودیوں کی معروف رگ پھڑکی' ان کی اصل فطرت جاگی۔

انہوں نے اللہ کے ساتھ حیلے بہانے کرنے شروع کر دیئے ۔چنانچہ انہوں نے ہفتے کے دن شکار کو گھیرنا شروع کر دیا جسے وہ بعد کے دنوں میں شکار کرتے ۔ان کی یہی حرکت تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ ان کے سامنے رکھیں ۔ اللہ تعالیٰ حضور کو خطاب کر کے فرماتے ہیں ۔

(وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (٧: ١٦٣)) "اور ذرا ان سے اس بستی کا حال بھی پوچھو جو سمندر کے کنارے واقعہ تھی ' انہیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں لوگ سبت کے دن احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سبت ہی کے دن ابھر ابھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں ۔یہ اس لئے ہوتا تھا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے ۔"

امت اسلامیہ بھی ایسے ہی ابتلاء میں مبتلا کی گئی تھی اور یہ کامیاب رہی جبکہ یہودی ناکام و نامراد رہے ۔اور قرآن کریم کی اس آیت کا یہی مفہوم ہے :

(كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ (٣: ١١٠)) "اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو ' جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے ۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو ' بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو 'اگر یہ اہل کتاب ایمان لاتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا 'اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایماندار بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں ۔"

بے شمار مراحل ایسے آئے جن میں امت اسلامیہ آزمائشوں میں کامیاب رہی اور بنی اسرائیل ناکام رہے اور یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر سے خلافت کا مقام بنی اسرائیل سے سلب کر لیا اور امت مسلمہ کو اس مقام پر فائز کر دیا ۔اور امت مسلمہ کو زمین پر وہ عروج عطا کیا جو اس سے قبل کسی کو بھی نہ دیا تھا ۔اس لئے کہ اسلامی نظام زندگی کسی سابقہ امت کے دور میں اس طرح متمکن نہ ہوا تھا 'جس طرح امت مسلمہ کے دور میں پوری طرح ظاہر ہوا ۔لیکن یہ اس دور میں ہوا جس میں امت مسلمہ فی الواقع امت مسلمہ تھی اور جس دور میں وہ یہ سمجھتی تھی کہ اسلام وہ ہے جو لوگوں کی عملی زندگی کے اندر نمودار ہو اور لوگوں کی زندگی اسلامی شریعت کے مطابق بسر ہو رہی ہو ۔اس دور میں امت مسلمہ کو یہ احساس تھا کہ اسے یہ عظیم امانت سپرد کی گئی ہے اور اسے اس کا امین قرار دیا گیا ہے ۔یہ کہ امت مسلمہ کو پوری انسانیت کا نگہبان مقرر کیا گیا ہے اور اس کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ لوگوں کی زندگیوں کو اسلامی نظام حیات کے مطابق استوار کرے اور ان پر اللہ کی اس امانت کو قائم کرے ۔

یہ آزمائش کہ حالت احرام میں لوگ بسہولت شکار کر سکتے تھے لیکن بطور آزمائش انہیں شکار سے روک دیا گیا ان آزمائشوں میں سے ایک ہے جن میں یہ امت کامیاب رہی ۔ ایسی آزمائشوں کے ذریعے اس امت کو آزمانا اور آزما کر تربیت دینا یہ اللہ تعالیٰ کی بہت ہی بڑی اور کھلی مہربانی تھی ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو منتخب کر لیا ہے ۔

اس امتحان کی حکمت کی تصریح بھی اللہ تعالیٰ نے فرما دی ہے ۔ (لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَخَافُهُ بِالْغَيْبِ) "تاکہ وہ دیکھے کہ تم میں سے کون ہے جو اس سے غائبانہ ڈرتا ہے ۔" ایک مسلمان کے ضمیر کے اندر جو اصول رکھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ سے غائبانہ کون ڈرتا ہے ۔ یہ ایک نہایت ہی مضبوط قاعدہ ہے جس کے اوپر اسلامی نظریہ حیات کی عمارت کھڑی ہے ۔ اسی قاعدے کے مطابق ایک مسلمان کا طرز عمل طے پاتا ہے اور یہ طرز عمل نظریہ خلافت فی الارض اور اسلامی نظام زندگی کے مطابق ہوتا ہے ۔

لوگ اللہ کو نہیں دیکھتے ' لیکن جب وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں تو اللہ ان کے نفس کے اندر موجود ہوتا ہے ۔ ایک انسان کے تصور اور فہم میں اللہ غیب ہوتا ہے لیکن دل مومن اس پر غائبانہ ایمان لاکر ' اللہ سے ڈرتا ہے ۔ جب کسی کے دل و دماغ کے اندر یہ عظیم حقیقت 'حقیقت ایمان بالغیب بیٹھ جاتی ہے اور انسان اللہ سے ڈرنے لگتا ہے اور حسی رویت اور حسی مشاہدے سے مستغنی ہو جاتا ہے لیکن اس کے شعور میں یہ عظیم حقیقت بیٹھ جاتی ہے تو پھر اس کا یہ شعور ' مشاہدے اور حسی ادراک سے زیادہ اہم بن جاتا ہے اور یہ مومن لا الہ الا اللہ کی شہادت دیتا ہے ' جبکہ اس نے اللہ کو بچشم سر دیکھا نہیں ہوتا ۔ وجود انسانی کے اندر اس عظیم حقیقت کا بیٹھ جانا ' اس کے اندر ایک عظیم انقلابی تبدیلی پیدا کر دیتا ہے ۔ اس کی فطری قوتیں آزاد ہو جاتی ہیں اور اس کی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو مشنری سپرٹ ودیعت کی ہے وہ بدرجہ اکمل کام کرتی ہے اور وہ جس قدر بھی عالم غیب کے قریب پہنچتا ہے (جو انسان کے لئے تیار کیا گیا ہے) اسی قدر وہ عالم حیوانات سے دور ہوتا جاتا ہے اور اس سطح تک بلند ہو جاتا ہے جو انسان کے لئے تیار کی گئی ہے ۔ اگر کوئی محسوسات کے ماوراء ادراک کے دروازے اپنے اوپر بند کر لیتا ہے اور اپنے آپ کو دائرہ محسوسات کے اندر سکیڑ لیتا ہے تو وہ اپنے آپ کو مادی دنیا کے اندر محدود کر کے محض حیوانی دائرے کے اندر چلا جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہاں تصریح فرماتے ہیں کہ اس ابتلاء میں حکمت کیا ہے تاکہ اہل ایمان کے نفوس اسے حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اللہ کو علم لدنی کے ذریعے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے غائبانہ طور پر کون ڈرتا ہے ' لیکن اللہ تعالیٰ اپنے علم کے مطابق دنیا میں لوگوں کو نہیں پکڑتا ۔ اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور گرفت صرف ان باتوں پر ہوتی ہے جو واقع ہو جائیں ۔

(فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ) "پھر اس تنبیہ کے بعد بھی جس نے حدود سے تجاوز کیا تو اس کے لئے دردناک سزا ہے ۔" اللہ تعالیٰ نے امتحان کی اطلاع دے دی اس کی حکمت سے بھی آگاہ کر دیا اور اس بات سے متنبہ کر دیا کہ وہ اس آزمائش میں نہ پڑیں اس لئے کہ کامیابی کے تمام اسباب بھی اس کے لئے فراہم کر دیئے گئے ۔ اب بھی اگر کوئی اللہ کی حدود سے تجاوز کرتا ہے تو اس کے لئے دردناک سزا کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ۔ اس کے سوا وہ اور کس انجام کا مستحق ہے اس لئے کہ وہ خود اپنے لئے یہ سزا اختیار کرتا ہے ۔ اس کے بعد اگر کوئی پھر خلاف ورزی کرتا ہے تو اس پر عائد شدہ کفارے کی تفصیلات دے دی جاتی ہیں ۔ دوبارہ بطور تاکید ممانعت بھی کر دی جاتی ہے ۔

(یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ قَتَلَہٗ مِنْکُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ یَحْکُمُ بِہٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْکُمْ ھَدْیًا بٰلِغَ الْکَعْبَۃِ اَوْ کَفَّارَۃٌ طَعَامُ مَسٰکِیْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِکَ صِیَامًا لِّیَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِہٖ عَفَا اللّٰہُ عَمَّا سَلَفَ وَمَنْ عَادَ فَیَنْتَقِمُ اللّٰہُ مِنْہُ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ (۵:۹۵)) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' احرام کی حالت میں شکار نہ مارو' اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور اس نے مارا ہو اسی کے ہم پلہ ایک جانور اسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہوگا جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے' اور یہ نذرانہ کعبہ پہنچایا جائے گا' یا نہیں تو اس گناہ کے کفارے میں چند مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا' یا اس کے بقدر روزے رکھنے ہوں گے' تاکہ وہ اپنے کئے کا مزا چکھے۔ پہلے جو کچھ ہو چکا' اسے اللہ نے معاف کر دیا' لیکن اب اگر کسی نے اس حرکت کا اعادہ کیا تو اس سے اللہ بدلہ لے گا' اللہ سب پر غالب ہے اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہے۔"

ممانعت اس بات کی کی گئی ہے کہ کوئی محرم عمداً کسی شکار کو قتل نہ کرے۔ اگر غلطی سے اس کے ہاتھوں کوئی شکار ہو جائے تو نہ وہ گنہگار ہے اور نہ اس پر کفارہ ہے۔ اگر عمداً اس نے شکار کیا تو اس پر جانور ذبح کرنا فرض ہے۔ اور یہ اس قدر ہو کہ شکار کی قیمت کے برابر ہو' مثلاً ہرن کے شکار کے بدلے اونٹنی کا بچہ یا بکری۔ اگر اونٹ کو شکار کرے تو گائے ذبح کرے۔ لومڑی اور زرافہ کے شکار میں اونٹ کا بچہ' بلی اور خرگوش کے بدلے خرگوش۔ اور جس جانور کے مقابلے میں خانگی جانور نہ ہو تو اس کی قیمت کا جانور ذبح کرے۔

اس کفارے کا فیصلہ دو عادل مسلمان کریں گے۔ اگر دو منصفوں نے کسی جانور کے ذبح کے بارے میں فیصلہ کیا تو جنایت کرنے والا اس جانور کو چھوڑ دے گا کہ وہ کعبے تک پہنچے اور وہاں اسے ذبح کر کے مساکین کو کھلایا جائے۔ اگر کوئی جانور نہ ملے تو دو منصف پھر مساکین کے کھانے کے بارے میں بھی فیصلہ کریں گے اور یہ کھانا اس شکار کی قیمت کے برابر ہونا چاہئے اگرچہ اس کے بارے میں فقہی اختلافات ہیں۔ اگر طعام مساکین کی قدرت بھی نہ ہو تو جنایت کرنے والے محرم کو روزے رکھنے ہوں گے۔ یعنی ایک مسکین کے مقابلے میں ایک روزہ۔ اب مسکین کے کھانے کی قیمت کیا ہوگی اس میں فقہی اختلافات ہیں۔ بہرحال اصل بات یہ ہے کہ اس کا تعین ہر زمانے میں الگ ہوگا۔

اور اس کفارے کی حکمت بھی قرآن کریم نے منصوص طور پر بتلا دی ہے۔ (لِّیَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِہٖ) "تاکہ وہ اپنے کئے کا مزہ چکھے۔" کفارہ عائد کرنے میں سزا دہی کا پہلو بھی موجود ہے اس لئے کہ اس شخص نے جس حرمت کی ہتک کی ہے' اسلام اس کے بارے میں سخت متشدد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں حکم دیا جاتا ہے کہ جو ہو چکا سو ہو چکا اور آئندہ کے لئے جو باز نہ آئے گا اسے سخت انتقام کا سامنا کرنا ہوگا۔

(عَفَا اللّٰہُ عَمَّا سَلَفَ وَمَنْ عَادَ فَیَنْتَقِمُ اللّٰہُ مِنْہُ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ (۵:۹۵))
"لیکن اگر کسی نے اس حرکت کا اعادہ کیا تو اس سے اللہ بدلہ لے گا' اللہ سب پر غالب ہے اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہے۔

یہ تو تھے احکام خشکی کے شکار سے متعلق - رہا سمندری شکار تو وہ حالت احرام اور حالت غیر احرام دونوں میں جائز ہے -

(أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ (۵ : ۹۶)) "تمہارے لئے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا' جہاں تم ٹھہرو وہاں بھی اسے کھا سکتے ہو اور قافلے کے لئے زاد راہ بھی بنا سکتے ہو -"
سمندری حیوانات محرم اور غیر محرم دونوں کے لئے جائز ہیں - شکار بھی کیا جاسکتا ہے اور سٹاک بھی کیا جاسکتا ہے - یہاں چونکہ سمندری حیوانات کے شکار اور استعمال کی اجازت دی گئی تھی اس لئے بری حیوانات کے شکار کی دوبارہ ممانعت کر دی گئی -

(وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا (۵ : ۹۶)) "البتہ خشکی کا شکار' جب تک تم احرام کی حالت میں ہو' تم پر حرام کیا گیا ہے -"
جس بات پر اجماع ہے وہ یہ ہے کہ محرم کے لئے بری شکار کرنا حرام ہے - لیکن اگر کوئی غیر محرم کوئی شکار کرے تو آیا اس کا کھانا بھی جائز ہے یا نہیں - نیز شکار کے معنی میں بھی اختلاف ہے - پھر یہ بھی ایک اختلافی مسئلہ ہے کہ اس سے مراد وہی جانور ہیں جن کا عموماً شکار کیا جاتا ہے یا تمام حیوانوں کا شکار حرام ہے - چاہے ان کا شکار کیا جاتا ہو یا نہ کیا جاتا ہو یا یہ کہ یہ نہی تمام حیوانات کے لئے ہے -
حلال و حرام کی اس بحث کو پھر اس بات پر ختم کیا جاسکتا ہے کہ اصل مدار تقویٰ پر ہے - چنانچہ یہاں بھی خدا ترسی اور خدا خوفی کے جذبات کو ابھارا جاتا ہے -

(وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ (۵ : ۹۶)) "پس بچو اس خدا کی نافرمانی سے جس کی پیشی میں تم سب کو گھیر کر حاضر کیا جائے گا -" سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حرم کے اندر اور محرم کے لئے یہ پابندیاں کیوں ہیں؟ اصل میں یہ دنیا جو لوگوں کے لئے کشمکش کا ایک میدان ہے' اس میں اللہ تعالیٰ حرم کو ایک منطقہ امن قرار دینا چاہتے ہیں اور یہ منطقہ امن اور زمانہ امن خانہ کعبہ اور اشہر حرام ہیں - اس دنیا میں باہم کشمکش جاری رہتی ہے - دشمن ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے رہتے ہیں - ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی سعی ہر وقت جاری رہتی ہے - یہ کشمکش تمام زندہ چیزوں میں جاری ہے اور سب کے لئے یہ خطہ امن اور زمانہ امن اسلام مہیا کرتا ہے جس کی وجہ سے خوف کے بجائے اطمینان ملتا ہے' جنگ کے بجائے امن ملتا ہے اور تمام لوگوں کے سروں پر امن' آشتی' اطمینان اور سلامتی کا سایہ آجاتا ہے - نفس انسانی ایک عملی دنیا میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھتا ہے' محض آئیڈیل نہیں بلکہ عملی - اب وہ محض تخیلات اور خوابوں کی دنیا میں نہیں ہوتا جو واقعی دنیا پر بہت بھاری ہوتی ہے -

(جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ ذَٰلِكَ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَنَّ بِكُلِّ

شَیْءٍ عَلِیْمٌ (۹۷) اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۹۸) مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ (۹۹))

"اللہ نے مکان محترم، کعبہ کو لوگوں کے لئے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ بنایا اور ماہ حرام اور قربانی کے جانوروں اور قلادوں کو بھی (اس کام میں معاون بنا دیا) تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کے سب حالات سے باخبر ہے۔ اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔ خبردار ہو جاؤ! اللہ سزا دینے میں بھی سخت ہے اور اس کے ساتھ بہت درگزر اور رحم بھی کرنے والا ہے۔ رسول پر تو صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے' آگے تمہارے کھلے اور چھپے سب حالات کا جاننے والا اللہ ہے۔"

بیت الحرام کے اندر یہ حرمتیں اس قدر وسیع ہیں کہ ان کے دائرے میں انسان' پرندے' حیوان اور حشرات الارض سب آتے ہیں اور اگر کوئی احرام کی حالت میں حرم کے حدود میں پہنچا ہو' تب بھی اس کے لئے یہ سب چیزیں ممنوع ہیں۔ اس کے علاوہ چار مہینوں کو بھی اشہر حرام قرار دیا گیا ہے۔ ان میں قتل و قتال سخت ممنوع ہے۔ یہ چار مہینے ذوالقعدہ' ذوالحجہ' محرم اور رجب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عربوں کے دل میں ان چار مہینوں کا احترام بٹھا دیا تھا' یہاں تک کہ وہ دور جاہلیت میں بھی ان مہینوں کا احترام کرتے تھے۔ ان مہینوں میں وہ کسی نفس کو ڈراتے دھمکاتے بھی نہ تھے۔ ان مہینوں میں وہ خون کا بدلہ بھی نہ لیتے تھے اور نہ ہی ان میں کوئی شخص انتقام کی توقع کرتا تھا یہاں تک کہ ایک شخص اپنے باپ' بیٹے اور بھائی کے قاتل کو پاتا مگر اسے کوئی اذیت نہ دیتا۔ چنانچہ اس عرصے میں لوگ کھلے بندوں پھرتے اور تجارتی سفر کرتے اور رزق حلال تلاش کرتے۔ یہ امن کے احکامات اللہ نے اس لئے بھی جاری کئے کہ اللہ تعالیٰ خانہ کعبہ کو خطہ امن و سلامتی قرار دینا چاہتے تھے جہاں لوگوں کے اندر ٹھہراؤ پیدا ہو اور کوئی خوف اور بے چینی نہ ہو۔ کعبے کی طرح ان چار مہینوں کو اللہ نے زمانہ امن قرار دیا تھا جس طرح کعبہ مقام امن تھا۔ اس کے بعد اس امن کی حدود کے اندر مزید توسیع کر دی گئی اور اس ہدی کو بھی مامون اور محفوظ کر دیا گیا ہے جسے خانہ کعبہ کی طرف روانہ کر دیا گیا ہو۔ یہ جانور حج اور عمرہ کے موقع پر چلائے جاتے تھے۔

چنانچہ دور جاہلیت میں بھی ان جانوروں کو نہ چھیڑا جاتا تھا۔ اسی طرح اس شخص کو بھی مامون قرار دے دیا گیا جو خانہ کعبہ میں پناہ لے لیتا ہے اور اپنے گلے میں بیت الحرام کے درختوں کا ہار ڈالتا ہے۔

خانہ کعبہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ حرمت حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے ہاتھوں اس کے تعمیر کے وقت ہی سے رکھی تھی اور اللہ نے اس وقت سے خانہ کعبہ کو لوگوں کے آنے جانے کی جگہ قرار دے دیا تھا۔ یہ اللہ کا وہ عظیم فضل و احسان تھا' جس کی یاد دہانی اللہ نے مشرکین کو بھی کرائی اس لئے کہ ان کے لئے بھی بیت اللہ گھومنے پھرنے اور امن کی جگہ تھا۔ اس کے اردگرد بسنے والے لوگوں کی حالت یہ تھی کہ وہ اچک لئے جاتے تھے جبکہ مشرکین یہاں نہایت ہی امن سے رہتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اللہ کا شکریہ ادا نہ کرتے تھے۔ اس خانہ توحید میں اللہ واحد کی بندگی نہ کرتے تھے اور حضور ؐ سے یہ کہتے تھے کہ اگر ہم عقیدۂ توحید کو اپنائیں تو ہمیں اپنی جا اور جاگیر چھوڑنی پڑے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی

یہ بات نقل کر کے اس کی تردید کی اور انہیں بتایا کہ امن اور خوف ہوتا کیا ہے۔

(وَقَالُوا إِنْ نَتَّبِعِ الْهُدَىٰ مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَا ۚ أَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَهُمْ حَرَمًا آمِنًا يُجْبَىٰ إِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ رِزْقًا مِنْ لَدُنَّا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۲۸ : ۵۷))

"وہ کہتے ہیں 'اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کر لیں تو اپنی زمین سے اچک لئے جائیں گے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پر امن حرم کو ان کے لئے جائے قیام بنا دیا جس کی طرف ہر طرف کے ثمرات کھنچے چلے آتے ہیں' ہماری طرف سے رزق کے طور پر مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں۔"

صحیحین میں حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے فتح مکہ کے دن یہ فرمایا: "یہ شہر حرام ہے' اس کے درخت نہ کاٹے جائیں گے' اور یہاں کے سبزے کو بھی خراب نہ کیا جائے گا' یہاں کے شکار کو نہ بھگایا جائے گا اور یہاں کی گمشدہ چیز کو نہ اٹھایا جائے گا مگر وہ شخص جو اعلان کرنا چاہے۔

حضور اکرم ؐ نے حرم میں محرم کے لئے زندہ چیزوں میں سے صرف کوے' چیل' بچھو' چوہے اور کاٹنے والے کتے کو مستثنیٰ فرمایا۔ حضرت عائشہ ؓ کی حدیث میں ہے "حضور اکرم ؐ نے پانچ چیزوں کے قتل کا حکم دیا۔ یہ مضر چیزیں ہیں اور حالت حلت اور احرام دونوں میں یہ حکم دیا۔ کوا' چیل' بچھو' چوہا اور کاٹنے والا کتا۔

صحیحین میں حضرت ابن عمر ؓ سے سانپ کا اضافہ آیا ہے۔

حضرت علی ؓ کی روایت کی رو سے یہی حرمت مدینہ کے لئے بھی عائد ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ؐ نے "عیر" سے لے کر "ثور" مدینہ کو حرم قرار دیا ہے۔ اور صحیحین ہی میں ایک دوسری روایت ہے۔ یہ حضرت عبادہ ابن تمیم سے وارد ہوئی ہے۔ کہ حضور اکرم ؐ نے فرمایا "حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا اور اس کے لئے دعا فرمائی اور میں نے مدینہ کو اسی طرح حرم کر دیا ہے جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا تھا۔"

اس کے علاوہ مزید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ علاقہ اور یہ مہینے ہی صرف امن کے لئے مخصوص نہیں اور صرف یہ بات نہیں ہے کہ اس امن و امان کا دائرہ صرف انسان اور حیوان تک ہی محدود ہے بلکہ اس امن اور سکون کا دائرہ انسانی ضمیر تک وسیع ہو جاتا ہے اس لئے کہ انسانی ضمیر انسانی نفس کی گہرائیوں کے اندر ایک معرکہ کارزار ہے۔ ضمیر کے اندر جنگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو اس کے شعلے اور اس کا دھواں زمان و مکان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ پھر تمام انسان اور حیوان اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ حرمین اس اندرونی معرکہ کارزار میں بھی امن کا سامان پیدا کر دیتے ہیں اور جب ضمیر کے اندر امن و سکون پیدا ہو جاتا ہے تو ایک محرم کسی جاندار کی طرف ہاتھ بڑھانے میں بھی حرج محسوس کرتا ہے اگرچہ یہ شکار حرم سے باہر ہو۔ یہ عرصہ نفس انسانی کی تربیت کا عرصہ ہے تاکہ وہ صاف و شفاف ہو جائے۔ وہ ہلکا ہو جائے اور بلند ہو کر ملاء اعلیٰ سے واصل ہو جائے اور ملاء اعلیٰ کے ساتھ معاملہ کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔

یہ انسانیت' یہ خوفزدہ' مصیبت زدہ' پسی ہوئی انسانیت کس قدر محتاج ہے' اس علاقہ امن کی۔ وہ منطقہ امن جس کو اللہ نے اس دین کے پیروکاروں کے لئے بنایا ہے' اور جس کا اعلان عام قرآن کریم کے اندر کر دیا گیا۔

(ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۵ : ۹۷) "تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ آسمانوں اور زمین سب کے حالات سے باخبر ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔ اس جگہ یہ عجیب اختتامیہ ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ اللہ جو شریعت مقرر کرتا ہے اور لوگوں کے لئے یہ جائے امن جو قرار دیتا ہے' یہ اس لئے بتاتا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اللہ ان تمام حالات سے باخبر ہے جو آسمانوں اور زمینوں کے اندر ہیں اور اسے ہر چیز کا علم ہے' تاکہ انہیں معلوم ہو کہ اللہ انسانوں کے مزاج سے باخبر ہے' وہ ان کی خفیہ نفسیات سے بھی خبردار ہے۔ وہ ان کی روح کی پکار کو سنتا ہے اور وہ ایسا قانون بناتا ہے جس کے ذریعے ان کے مزاج کے تقاضے' ان کی ضروریات اور ان کے میلانات پورے ہوتے ہیں۔ جب لوگ یہ محسوس کریں گے کہ قانون سازی میں اللہ نہایت ہی شفیق و رحیم ہے۔ اور جب لوگوں کے دلوں نے اس شریعت اور ان کی فطرت کے درمیان پوری ہم آہنگی کا مزہ چکھا تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ان تمام امور کو جانتا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کے اندر ہیں اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔

دین اسلام انسانی فطرت اور اس کے میلانات اور خواہشات کے پورے پورے تقاضے ملحوظ رکھنے میں بہت ہی عجیب ہے۔ وہ انسانوں کی تمام ضروریات کا لحاظ رکھتا ہے۔ اسلامی شریعت کی اسکیم انسانی فطرت کی اسکیم کے عین مطابق ہے۔ شریعت کی تشکیل اور انسان کی فطرت کے اندر مکمل ہم آہنگی ہے۔ جب انسان کو اس دین کے بارے میں شرح صدر ہو جاتا ہے تو پھر وہ جس قدر غور کرتا ہے اسے کمال و جمال ہی نظر آتا ہے' پھر اسے انس و محبت ہی نظر آتی ہے اور اسے وہ سکون ملتا ہے جس کا تصور وہ شخص نہیں کر سکتا جس کو شریعت پر شرح صدر حاصل نہ ہو۔

اب حالت احرام اور حالت غیر احرام میں جائز و ناجائز امور کا خاتمہ اس بات پر ہوتا ہے کہ اللہ کا عذاب سخت ہے اور دوسری جانب وہ غفور و رحیم بھی ہے۔

(اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹۸) "خبردار ہو جاؤ کہ اللہ سزا دینے میں سخت ہے اور اس کے ساتھ بہت ہی درگزر اور رحم کرنے والا ہے۔" اور اس ڈراوے کے ساتھ ساتھ بتا دیا جاتا ہے کہ اپنے کئے کی ذمہ داری ہر شخص کے اپنے کاندھوں پر ہے اور جو راہ راست پر نہ ہو وہ خود اپنی گمراہی کا ذمہ دار ہے۔

(مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ (۹۹) "رسول پر تو صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔ آگے تمہارے کھلے اور چھپے حالات کا جاننے والا اللہ ہے۔ اب یہ مضمون ایک عام پیمانے اور اصول پر ختم ہوتا ہے اور یہ پیمانہ تمام اصول و اقدار کے وزن کے لئے ایک ترازو ہے۔ اس کے مطابق ایک مسلم فیصلے کرتا ہے۔ اس میزان میں طیب بھاری رہتا ہے اور خبیث ہلکا ہو جاتا ہے تاکہ خبیث اپنی ظاہری اور جسمانی کثرت کی وجہ سے کسی مسلم کو کسی بھی وقت متاثر نہ کر سکے۔

(قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي

الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۵ : ۱۰۰)) "اے پیغمبر' ان سے کہہ دو کہ پاک اور ناپاک بہرحال یکساں نہیں ہیں خواہ ناپاک کی بہتات تمہیں کتنا ہی فریفتہ کرنے والی ہو' پس اے لوگو جو عقل رکھتے ہو' اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو' امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔"

یہاں پاک و ناپاک کے ذکر کی مناسبت یہ ہے کہ اس سے پہلے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا مضمون چل رہا تھا' شکار میں سے حلال و حرام کا ذکر ظاہر ہے کہ حلال طیب ہوتا ہے اور حرام خبیث ہوتا ہے۔ طیب اور خبیث برابر نہیں ہو سکتے اگرچہ خبیث اپنی کثرت کی وجہ سے انسان کو دھوکے میں ڈالتا ہے اور عجیب معلوم ہوتا ہے' لیکن طیب نہایت ہی خوشگوار ہوتا ہے اور اس کے نتائج بھی اچھے نکلتے ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اس کے نتیجے میں امراض اور آلام سے بھی نجات ملتی ہے۔ خبیث میں اگرچہ لذت ہوتی ہے' اگر طیب کا استعمال اعتدال کے ساتھ کیا جائے تو اس میں اس سے بھی زیادہ لذت ہوتی ہے اور طیب کا انجام دنیا و آخرت میں اچھا ہوتا ہے۔ جب نفس انسانی خواہشات نفسانیہ سے آزاد ہو جاتا ہے اور نفس پر تقویٰ اور دل کی نگرانی قائم ہو جاتی ہے تو وہ خبیث کے مقابلے میں طیب کو اختیار کرتا ہے اور اس طرح وہ دنیا و آخرت میں کامیاب رہتا ہے۔

(فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰأُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۵ : ۱۰۰)) (پس اے صاحبان عقل و خرد اللہ ہی سے ڈرو' امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے) یہ تو تھی ظاہری مناسبت لیکن اس آیت کا افق اور مطالب اس سے بھی زیادہ وسیع ہیں۔ یہ تمام زندگی کو اپنے دائرے میں لیتی ہے اور اس کے مفہوم کی تصدیق مختلف مقامات پر ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس امت کو میدان میں لایا اور اسے خیر امت قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ کی اسکیم یہ تھی کہ اسے ایک عظیم امر کے لئے تیار کیا جائے۔ یہ عظیم امر یہ تھا کہ یہ امت اس کرۂ ارض پر اسلامی نظام کی امانت کی حامل ہوگی۔ وہ اسلامی نظام حیات پر اس طرح قائم ہو کہ اس سے پہلے کوئی امت اس طرح قائم نہ ہوئی ہو۔ وہ اس نظام کو لوگوں کی زندگیوں میں اس طرح قائم کرے کہ کبھی کسی دوسری امت کے اندر یہ نظام اس طرح قائم نہ کیا جا سکا ہو۔ اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ اس امت کو اس قدر طویل تربیت دی جائے کہ اس سے پہلے کسی امت کو نہ دی گئی ہو۔ پہلی تربیت یہ ہو کہ اسے آثار جاہلیت سے مکمل طور پر نکال دیا جائے اور اسے جاہلیت کی گراوٹوں سے اٹھا کر سیدھا اعلیٰ منزل مقصود تک بلند کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ اسلام کی بلند ترین چوٹی پر فائز ہو جائے۔ اس کے بعد یہ امت اپنے تصورات و افکار کو درست کرے' اور اپنی عادات' اپنے شعور' اور اپنے افکار کو جاہلیت کے آثار اور آلودگیوں سے پاک کرے۔ اس کے بعد اس کے اندر اس قدر عزم پیدا کر دیا جائے کہ وہ اس سچائی کو قبول کرلے اور پھر اس قبولیت کے نتیجے میں آنے والی ابتلاؤں کو برداشت کرے۔ اس کے بعد وہ پوری زندگی کو اسلامی اقدار اور پیمانوں کے مطابق استوار کرے یہاں تک کہ یہ ایک ربانی امت بن جائے اور اس کی انسانیت اعلیٰ مدارج انسانیت تک بلند ہو جائے۔ جب یہاں تک اس کی تربیت ہو جائے تو پھر اس کی نظروں میں اچھا اور برا برابر نہ ہوں گے' پاک اور ناپاک برابر نہ ہوں گے۔ اگرچہ خبیث و ناپاک زیادہ اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا ہو اور آنکھوں کو چکاچوند کر دینے والا ہو۔ لیکن جب انسان طیب اور خبیث میں فرق کرلیتا ہے اور اشیاء کو الٰہی میزان میں تولتا ہے تو اس وقت باوجود کثرت اور حجم کے خبیث کا وزن

طیب کے مقابلے میں کم ہوتا ہے اور طیب کا پلڑا باوجود قلت کے بہت بھاری ہوتا ہے۔اس مقام پر آکر یہ امت امین اور امانت دار بن جاتی ہے۔وہ درست اور قابل اعتماد ہوتی ہے۔اب وہ تمام انسانیت کی نگہبان ہوتی ہے۔اب وہ لوگوں کے لئے اللہ کا ترازو استعمال کرتی ہے اور اللہ کی قدر کے ساتھ اقدار کا تعین کرتی ہے' وہ طیب کو اختیار کرتی ہے اور اس کی آنکھیں خبیث کو دیکھ کر خیرہ نہیں ہوتیں۔بعض اوقات ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ ان میں یہ میزان نہایت ہی مفید ہوتا ہے۔ایسے حالات میں کہ جب باطل پھولا ہوا ہو' اور انسان یہ سمجھتا ہو کہ شاید یہ ترقی کر رہا ہے آنکھیں صرف یہ دیکھتی ہیں کہ بظاہر وہ پرقوت اور صاحب کثرت ہے۔ایک مومن اس پھولے ہوئے باطل کو اللہ کے ترازو میں تولتا ہے۔اس طرح اس کے ہاتھ مضطرب نہیں ہوتے' نہ اس کی آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں' نہ اس کا معیار خراب ہوتا ہے چنانچہ وہ اس باطل کے مقابلے میں سچائی کو اختیار کرتا ہے جس میں کوئی جھاگ اور کوئی سوجن نہیں ہے۔نہ اس کے ارد گرد کوئی زادو عتاد ہے۔بس وہ تو فقط حق ہے۔وہ مجرد حق ہے اور اس کے سوا اس کے ساتھ کوئی غرض نہیں ہے۔اللہ کے ترازو میں اس کا وزن زیادہ ہے اور ذاتی طور پر وہ حسین وجمیل ہے۔اس کی ذات کے اندر ایک قوت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کی تربیت عین قرآنی منہاج کے مطابق کی۔اور امت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیم اور نگران مقرر کیا۔پھر وہ اس سطح پر پہنچی کہ وہ اللہ کے دین پر ایمان لانے والی تھی۔محض نفسیاتی ایمان نہیں اور نہ دل کے اندر کا ایمان بلکہ اپنی عملی زندگی میں ایمان اور اس کرۂ ارض پر اپنی تمام سرگرمیوں کے اندر ایمان۔زندگی کے تمام اضطرابات میں' تمام خواہشات اور امیدوں میں' تمام رغبتوں اور مسلکوں میں' تمام مفادات اور مصالح میں اور افراد اور گروہوں کی تمام کشمکشوں میں ایمان' غرض اس کا ایمان اس طرح ہو کہ وہ اس پوری کائنات کے اوپر نگہبانی میں بھی ایماندار ہو' اور اس زندگی کے اتھاہ سمندر میں اپنی عظیم ذمہ داریوں کے اندر بھی وہ ایماندار ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو مختلف ہدایات' مختلف موثرات' مختلف آزمائشوں اور مختلف ضابطہ بندیوں کے ذریعے تربیت دی اور ان تمام امور کو ایک ہی مجموعی شکل میں ایک گھڑی کی طرح ایک نظام بنا دیا جس کے آخری مقاصد ایک ہی تھے۔یعنی اس امت کو اپنے عقائد و تصورات' اپنے شعور اور میلانات اپنے طرز عمل اور اخلاق اور اپنی شریعت اور نظام اس طرح تیار کرنے چاہئیں کہ وہ اللہ کے دین کے اوپر قائم ہو' وہ اس پوری انسانیت پر نگران ہو' اور یہ اللہ کا حق ہے کہ وہ اپنے بندوں سے جو کام لینا چاہے وہ لے۔اللہ اپنے معاملات میں خود مختار ہے۔چنانچہ اس کرۂ ارض پر اسی روشن شکل میں اللہ کا دین چمکتا ہوا قائم ہوا۔وہ ایک تصور تھا جس نے زندگی میں واقعیت اختیار کی اور یہ رسم ڈالی گئی کہ جب بھی ——— اس دین کے قیام کے لئے یہ امت جہاد کرے گی اللہ کی مدد اسے حاصل ہوگی۔

اس کے بعد جماعت مسلمہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بعض آداب سکھائے جاتے ہیں۔بتایا جاتا ہے کہ حضور ؐ نے جو کچھ نہیں بتایا اس کے بارے میں آپ سے سوالات نہ کئے جائیں۔ہو سکتا ہے کہ اگر آپ سوال کریں اور حضور جواب دیں تو آپ لوگوں کو وہ جواب پسند نہ آئے اور یا حرج واقعہ ہو جائے اور جواب کے ذریعے ایسے فرائض عائد ہو جائیں جن پر عمل کرنا ممکن نہ ہو۔یا یہ ہو کہ کسی معاملے میں اللہ تعالیٰ نے وسعت کی تھی اور سوال کی وجہ سے تنگی ہو جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ بندوں پر رحم کرتے ہوئے انہیں زیادہ سے زیادہ آزادی دیتے ہیں۔

---○○○---

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَسْـَٔلُوا۟ عَنْ أَشْيَآءَ إِن تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِن تَسْـَٔلُوا۟ عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ ٱلْقُرْءَانُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا ٱللَّهُ عَنْهَا ۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٠١﴾ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِّن قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا۟ بِهَا كَٰفِرِينَ ﴿١٠٢﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں' لیکن اگر تم انہیں ایسے وقت پوچھو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہو تو وہ تم پر کھول دی جائیں گی۔ اب تک جو کچھ تم نے کیا اسے اللہ نے معاف کر دیا ہے' وہ درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔ تم سے پہلے ایک گروہ نے اسی قسم کے سوالات کئے تھے' پھر وہ لوگ انہی باتوں کی وجہ سے کفر میں مبتلا ہو گئے۔"

بعض صحابہ کرام، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سوالات کرتے تھے' اور یہ سوالات ان باتوں کے متعلق ہوتے تھے جن میں کوئی امر یا نہی نازل نہ ہوئی تھی۔ یہ لوگ بعض ایسے معاملات کی تفصیل میں زیادہ دلچسپی لیتے جن کو قرآن نے مجمل چھوڑا تھا اور اس اجمال کی وجہ سے لوگوں پر ایک قسم کی سہولت تھی۔ بعض اوقات وہ ایسے معاملات کے بارے میں پوچھتے جن کے جوابات کی ضرورت ہی نہ تھی 'کیونکہ یہ ممکن تھا کہ خود سائل کو وہ انکشاف اچھا نہ لگے۔ یا اس سے دوسرے مسلمانوں کو اذیت ملے۔

روایات میں آتا ہے کہ فرضیت حج کی آیت پر کسی نے یہ پوچھا کہ کیا ہر سال حج فرض ہو گیا ہے؟ تو حضور نے اس سوال پر بہت ہی ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ کیونکہ آیت حج میں اجمال تھا۔

(وَلِلَّهِ عَلَى ٱلنَّاسِ حِجُّ ٱلْبَيْتِ مَنِ ٱسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا) "اللہ کی جانب سے لوگوں پر حج بیت اللہ فرض ہے' اس پر جو راستے کی استطاعت رکھتا ہو۔ زندگی میں ایک بار حج کر کے اس آیت پر عمل ہو سکتا تھا۔ اس طرح اگر حضور اس آیت کی یہ تفسیر کر دیتے کہ "ہر سال" تو اس سے بہت سی مشکلات پیدا ہو جاتیں حالانکہ اللہ نے لوگوں کو ان میں ڈالنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

ترمذی اور دارقطنی نے حضرت علیؓ سے ایک حدیث مرسل روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلِلَّهِ عَلَى ٱلنَّاسِ حِجُّ ٱلْبَيْتِ مَنِ ٱسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا) تو لوگوں نے پوچھا حضور ہر سال میں؟ تو آپ خاموش ہو گئے۔ انہوں نے دوبارہ پوچھا کیا ہر سال میں؟ تو آپ نے فرمایا "نہیں اگر میں کہتا کہ "ہاں" تو یہ ہمیشہ کے لئے فرض ہو جاتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

(یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ) دارقطنی نے حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت کی ہے کہ حضور نے فرمایا لوگو تم پر حج فرض کر دیا گیا ہے۔ایک شخص کھڑا ہوا اور سوال کر دیا کہ کیا ہر سال؟ حضور نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔اس کے بعد اس نے پھر سوال کیا "حضور ہر سال؟" تو حضور نے پوچھا یہ سائل کون ہے؟ تو لوگوں نے بتلایا کہ فلاں فلاں ہے۔تو حضور نے فرمایا خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر میں کہہ دیتا ہاں تو یہ ہر سال واجب ہو جاتا اور اگر ہر سال واجب ہوتا تو تم ہرگز اسے ادا نہ کر سکتے۔اور اگر تم نہ کرتے تو کافر ہو جاتے۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

(یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ) ایک دوسری حدیث کا مضمون یہ ہے' اور یہ امام مسلم نے صحیح مسلم میں نقل کی ہے۔وہ حضرت انس ؓ سے روایت کرتے ہیں' آپ نے فرمایا: آپ ؐ نے ایک موقعہ پر فرمایا جب تک میں اس جگہ کھڑا ہوں پوچھو جو پوچھتے ہو۔میں تمہیں اطلاع دوں گا" ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے پوچھا: حضور میں کہاں داخل ہوں گا؟ تو آپ نے فرمایا "آگ میں"۔عبداللہ ابن حذافہ نے پوچھا: میرے باپ کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا تمہارا باپ حذافہ ہے۔ (ابن عبدالبر لکھتے ہیں کہ عبداللہ ابن حذافہ قدیم الاسلام تھے۔انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی' بدر میں شریک ہوئے' یہ نہایت ہی خوش مزاج تھے۔حضور نے انہیں کسریٰ کے پاس پیغام دے کر بھیجا تھا۔جب حضور کے ساتھ اس کا یہ سوال و جواب ہوا کہ میرا باپ کون ہے اور آپ نے فرمایا کہ حذافہ تو اس کی ماں نے کہا میں نے تم جیسا نافرمان بیٹا نہیں دیکھا۔"کیا تم کو یہ اطمینان تھا کہ میں نے جاہلیت کی عورتوں کی طرح گناہ کا ارتکاب نہیں کیا؟ تم مجھے مجمع عام میں شرمندہ کرنا چاہتے تھے؟ اس پر عبداللہ نے کہا "خدا کی قسم اگر حضور مجھے ایک کالے غلام کا بیٹا بتلاتے تو میں اس کے ساتھ اپنا نسب ملا دیتا۔"

ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت کی ہے۔ایک دن حضور نہایت ہی جلال میں تھے۔آپ کا چہرہ سرخ تھا۔آپ منبر پر بیٹھے۔ایک شخص نے پوچھا حضور ؐ میں کہاں ہوں گا تو آپ نے فرمایا "آگ میں"۔ایک دوسرا اٹھا اور پوچھا میرا باپ کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا تمہارا باپ "حذیفہ" ہے۔اس پر حضرت عمر بن خطاب اٹھے اور فرمایا حضور ہم اس بات پر راضی ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے نبی ہیں اور قرآن ہمارا امام ہے۔حضور ہم تو ابھی ابھی جاہلیت سے اور شرک سے نکلے ہیں۔اللہ ہی کو علم ہے کہ ہمارے آباؤاجداد کون ہیں؟ اس پر حضور کا غضب ٹھنڈا ہوا اور یہ آیت نازل ہوئی

(یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ایسی باتیں نہ پوچھا کرو کہ اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں۔مجاہد نے حضرت ابن عباس سے روایت فرمائی ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام کے بارے میں پوچھا تھا۔سعید ابن جبیر نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ اس آیت کے بعد اسی وجہ سے یہ آیت نازل ہوئی

(مَا جَعَلَ اللّٰہُ مِنْۢ بَحِیْرَۃٍ وَّلَا سَآئِبَۃٍ وَّلَا وَصِیْلَۃٍ وَّلَا حَامٍ (۵:۱۰۳) ان روایات

میں وہ تمام سوالات آگئے ہیں جن کے بارے میں پوچھنے سے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو منع فرمایا۔

قرآن کریم کا مقصد یہ نہ تھا کہ محض عقیدہ اور نظریہ ہی بیان کر دے یا ایک شرعی قانون نافذ کر دے۔ بلکہ قرآن کریم کے پیش نظر ایک امت کی تربیت کرنا تھا۔ ایک معاشرہ وجود میں لانا تھا۔ قرآن کریم افراد کو بتا رہا تھا کہ ان کی نشوونما اور تربیت معقول اخلاقی اصولوں پر کی جانی مطلوب تھی۔ یہاں قرآن کریم نے سوالات کے آداب بتلائے ہیں۔ بحث و مباحثہ کی حدود کا تعین کیا ہے۔ علم و معرفت کا طریق کار بتلایا ہے۔ خصوصاً اس عرصے کے لئے جس میں باران رحمت کا نزول ہو رہا تھا۔ غیب سے خبریں آ رہی تھیں۔ حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ لوگ شریعت کی تفصیلات نہ پوچھیں اور نصوص کو مجمل ہی رہنے دیں۔ نیز غیبی امور کو غیب ہی رہنے دیا جائے۔ اور وہ غیبی امور میں اسی حد تک علم کی تمنا کریں جس قدر اللہ علیم و خبیر دے۔ ان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ نئی نئی نصوص طلب کر کے اپنے اوپر مزید مشکلات ڈالتے چلے جائیں۔ محض احتمالات اور فرضی مسائل نہ پوچھیں اور وہ ان غیبی امور کے پیچھے نہ پڑیں جن کا انکشاف اللہ نے نہیں کیا ہے اس لئے کہ اللہ کو انسان کی طاقت اور قدرت کا اچھی طرح علم ہے۔ وہ ان کی حد برداشت کو جانتا ہے۔ وہ ان کی طاقت کے مطابق ان کے لئے قانون بنا رہا ہے۔ اور ان پر ان ہی امور کو منکشف کرتا ہے جس کا ادراک ان کا مزاج کر سکتا ہے۔ بعض امور کو اللہ ارادۃً مجمل چھوڑتا ہے۔ لوگوں کے لئے اس میں کوئی نقصان نہیں ہے کہ وہ امور اسی طرح مجمل رہیں۔ نزول قرآن کے وقت ایسا جواب آسکتا ہے جو انہیں پسند نہ ہو یا بعض لوگ اسے پسند نہ کریں اور وہ سب پر بوجھ بن جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس بات سے منع کر دیا کہ وہ ایسے امور کے بارے میں نہ پوچھیں کہ اگر بتا دیئے جائیں تو انہیں ناگوار ہوں اور انہیں متنبہ کر دیا گیا کہ اگر وہ پوچھیں گے تو جواب آئے گا۔ اس لئے کہ وحی جاری ہے۔ اس طرح فرائض کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔

(يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا (۵ : ۱۰۱)) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں' لیکن اگر تم انہیں ایسے وقت پوچھو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہو تو وہ تم پر کھول دی جائیں گی۔ ان چیزوں کو اللہ نے معاف کر دیا۔"

یعنی ان امور کے بارے میں نہ پوچھو جو اللہ نے معاف کر دیئے اور اس کا فرض کرنا موقوف رکھا۔ اس لئے کہ اجمال ہی میں وسعت ہوتی ہے۔ مثلاً حج کی تعداد کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کوئی بات نہیں کی یا ایسی چیزیں جن کا اللہ نے ذکر ہی نہیں کیا۔

اس کے بعد اللہ نے ان کے سامنے امم سابقہ یعنی اہل کتاب کی مثال پیش کی کہ انہوں نے بار بار سوالات کر کے اپنی آزادی کا دائرہ تنگ کیا اور اس طرح ان پر زیادہ فرائض اور احکام عائد ہوتے چلے گئے اور جب ان پر احکام فرض ہوئے تو انہوں نے ان کی تعمیل سے انکار کر دیا اور کفر کا راستہ اختیار کیا۔ اگر وہ خاموش رہتے اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان پر آسانی کی تھی اسے جاری رہنے دیتے تو ان پر سختی نہ ہوتی اور نہ شدت کے نتیجے میں انہیں انکار کرنا پڑتا۔

سورۂ بقرہ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ جب بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ وہ گائے ذبح کریں اور گائے کے ساتھ تو کوئی قیود و شروط عائد نہ تھے بلکہ صرف یہی کہا گیا تھا کہ بس وہ گائے ذبح کر دیں۔ اگر وہ کوئی گائے ذبح کرتے تو حکم کی تعمیل ہو جاتی۔ انہوں نے گائے کے اوصاف گنانے شروع کر دیئے۔ انہوں نے اس کے رنگ تک تحقیقات شروع کر دیں۔ ہر تحقیق و سوال کے نتیجے میں ان پر سختی ہوتی گئی۔ اگر وہ سوالات کی بوچھاڑ نہ کرتے تو ان کے لئے کوئی مشکل پیدا نہ ہوتی۔

یہی حال تھا ان کا سبت کے بارے میں کہ پہلے انہوں نے خود ایک تعطیل کا مطالبہ کیا اور پھر اس کی پابندی کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کی اس خصلت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر بطور سزا کئی اشیاء کو حرام کر دیا۔

صحیح بخاری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے "میں نے جو احکام نہیں دیئے ان کے بارے میں مجھے چھوڑ دو۔ اس سے پہلے جو قومیں ہلاک ہوئیں وہ زیادہ پوچھنے کی وجہ سے ہلاک ہوئیں اور مزید اس لئے کہ انہوں نے اپنے نبیوں کے ساتھ اختلافات کئے۔

صحیح مسلم میں عامر ابن سعید نے اپنے باپ سے روایت کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمانوں میں سے خود مسلمانوں کے خلاف سب سے بڑا جرم کرنے والا وہ شخص ہے کہ جو کسی ایسی چیز کے بارے میں پوچھے جسے مسلمانوں پر حرام نہیں کیا گیا اور اب اس کے سوالات کی وجہ سے وہ مسلمانوں پر حرام ہو جائے۔

یہ آیات اور ان کے بعد احادیث نبوی کا یہ مجموعہ اسلامی معاشرے میں حصول علم کے لئے ایک منہاج وضع کر دیتا ہے۔ اسلام میں طلب علم کا مقصد واقعی ضروریات کے لئے مسائل کا حل معلوم کرنا ہے اور ضرورت کے دائرے تک کرنا ہے۔ اس لئے عالم غیب میں دلچسپی نہ رکھنے کا فائدہ یہ ہے کہ انسانی طاقتیں ایسے کام کو روشنی میں لانے کے اندر خرچ نہ کی جائیں جن کی حقیقت تک پہنچنے کی انسان کو کوئی عملی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی عملی زندگی اس حقیقت کی محتاج نہیں ہے اور انسانی ذہن کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ عالم غیب پر اسی طرح ایمان لائے جس طرح اللہ علیم و خبیر نے کہہ دیا ہے۔

جب کوئی ایمان کو چھوڑ کر غیبی حقائق پر بحث شروع کر دے تو اس بحث کے نتیجے میں کچھ حاصل نہیں ہوتا اس لئے کہ انسانی ذہن کو یہ قوت اور صلاحیت ہی نہیں دی گئی کہ وہ عالم غیب کے میدان میں کسی چیز کا ادراک کر سکے۔ اس کا ادراک اسی حد تک محدود ہے جس حد تک اسے بتایا گیا ہے لہٰذا اس قسم کی کوئی کوشش بھی بے سود رہے گی۔ یہ اور بات ہے کہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار کر ایسا شخص اپنے آپ کو تھکا ڈالے گا اور آپ ہی ضلال بعید میں جا پڑے گا۔

اسلام کی پالیسی یہ ہے کہ جب کوئی مسئلہ درپیش ہو تو اس وقت اس کے بارے میں سوال کیا جائے' اور یہی ہے اسلامی منہاج۔ آپ دیکھتے نہیں کہ پورے مکی دور میں کوئی ایسا شرعی حکم نازل نہیں ہوا جس کا نفاذ ضروری ہو۔ اگرچہ بعض اشیاء اور بعض انفرادی اعمال کے بارے میں احکام آتے رہے' لیکن ایسے احکام جن کے نفاذ کی ضرورت ہو مثلاً حدود' تعزیرات' کفارات اور قصاص یہ سب کے سب مدینہ میں نازل ہوئے کیونکہ مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی تھی اور نفاذ احکام حکومت ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

ابتدائی اسلامی سوسائٹی نے اس حقیقت کو پا لیا تھا۔ وہ کسی مسئلے کے بارے میں اس وقت تک نہ پوچھتے تھے جب تک وہ واقع نہ ہو جائے اور یہ سوال بھی واقعہ کی حد تک ہوتا' مفصل قانونی دفعات کے وضع کرنے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آتی تاکہ سوال و جواب بھی اسلام کے نظام تربیت کے مطابق ہوں۔

حضرت عمرؓ کا طریقہ یہ تھا کہ اگر کوئی قضیہ درپیش نہ ہوتا تو خواہ مخواہ سوال کرنے والے پر وہ لعنت بھیجتے۔ دارمی نے اپنی مسند میں اور زہری نے اس کا ذکر کیا ہے کہ زید ابن ثابت انصاری سے جب کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو وہ پہلے پوچھتے کہ کیا ایسا کوئی واقعہ ہوا ہے۔ اگر وہ کہتے کہ ہاں ایسا وقوعہ ہو گیا ہے تو وہ پھر اپنے علم کے مطابق بات کرتے۔ اور اگر وہ کہتے کہ واقعہ نہیں ہوا ہے تو وہ جواب دیتے کہ ایسا ہونے دو پھر بات کریں گے۔

اسی طرح عمار ابن یاسر سے بھی روایت ہے کہ ان سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ کیا اس سلسلے کا کوئی واقعہ ہوا ہے تو انہوں نے کہا کہ نہیں تو انہوں نے کہا کہ دیکھو جب ایسا کوئی واقعہ ہو تو پھر بات کریں گے۔

دارمی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے صحابہ رسول سے اچھے لوگ نہیں دیکھے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی وفات تک صرف ۱۳ مسئلے پوچھے۔ اور یہ سب مسئلے قرآن کریم میں ذکر ہوئے ہیں جن میں یہ یسئلون شامل ہیں۔

(يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ .... يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ) اور وہ اسی بات کے بارے میں پوچھتے تھے جو ان کے لئے نفع بخش ہوتی۔

امام مالک فرماتے ہیں کہ جب میں مدینہ میں آیا تو اہل مدینہ کے پاس کتاب و سنت کے سوا کوئی علم نہ تھا۔ جب کوئی معاملہ پیش آتا تو امیر مدینہ موجود علماء کو جمع کرتے اور جس بات پر ان کا اتفاق ہو جاتا وہ اسے نافذ کر دیتے۔ تم لوگ بہت ہی سوالات کرتے ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔

علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں کہا ہے: امام مسلم نے حضرت مغیرہ ابن شعبہ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی حرام کر دی ہے بیٹیوں کا دفن کرنا حرام کر دیا ہے دوسروں کے حقوق منع کرنے اور اپنے حقوق طلب کرنے کو حرام قرار دیا ہے اور تین چیزوں کو ناپسند کیا ہے۔ زیادہ قیل و قال منع ہے' زیادہ سوالات کرنا منع ہے اور دولت کو ضائع کرنا ناپسند ہے۔ اکثر علماء کا کہنا یہ ہے کہ کثرت سوال سے مراد فقہی مسائل میں زیادہ سوالات کرنا ہے۔ یعنی ان معاملات میں جن میں کوئی نص نہیں ہے۔ یعنی فقہی پہیلیاں اور مسائل سے جزئیات اور مشتقات نکالنا۔ سلف صالحین اس کو ناپسند کرتے تھے اور اسے محض تکلف سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب کوئی واقعہ پیش آ جائے تو سوال کا جواب خود توفیق الٰہی سے ذہن میں آ جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام ایک حقیقت پسندانہ نظام ہے۔ یہ عملاً موجود اور واقعی حالات میں اصول شریعت سے احکام وضع کرتا ہے۔ یہ نظام مسئلے کا جائزہ لیتا ہے۔ اس کی شکل' اس کے حجم اور اس کے حالات کا تعین کرتا ہے۔ پھر وہ حالات اور ظروف پر غور کرتا ہے' اس کے بعد یہ نظام حالات کے مطابق ایسا حل تجویز کرتا ہے جو اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے۔

اگر کوئی مسئلہ درپیش ہو تو اس کے بارے میں سوال کرنا تو ایک متعین صورت حالات کے بارے میں سوال ہو گا' لیکن اگر کوئی واقعہ پیش آیا ہی نہ ہو تو اس کا تعین ممکن ہی نہیں ہوتا اور اس کے بارے میں جو بھی فتویٰ دیا جائے گا وہ عملاً اچھی طرح منطبق نہ ہو گا۔ اگر ہم فرضی حالات کے جوابات دینے لگیں تو یہ فعل شریعت کی حقیقت پسندی کے خلاف

ہو گا۔اور اسلام کے منہاج کے متصادم ہو گا۔

آج کے دور میں اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ لوگ ایسے ممالک میں شریعت کے قوانین کے بارے میں سوالات کرتے ہیں جہاں شریعت کے قیام کا مقصد پیش نظر نہیں ہوتا۔نہ فتویٰ اس لئے طلب کیا جاتا ہے کہ شریعت کے کسی حکم کو نافذ کرنا ہے۔

اسلامی شریعت کا طریق کار یہ ہے کہ اس میں فتویٰ نفاذ قانون کے لئے طلب کیا جاتا ہے۔اگر پوچھنے والے اور جواب دینے والے دونوں جانتے ہیں کہ وہ ایک ایسے ملک کے باشندے ہیں جس میں شریعت کا نفاذ نہیں ہو رہا ہے۔اس میں اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو نہ تسلیم کیا جاتا ہے اور نہ اس پر کوئی یقین رکھتا ہے نہ اسے لوگوں کی زندگیوں اور اجتماعی امور میں نافذ کیا جاتا ہے۔بالفاظ دیگر اللہ کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا اور اللہ کے اقتدار اعلیٰ کی اطاعت نہیں کی جاتی تو ایسے حالات میں فتویٰ طلب کرنے کے کیا معنیٰ؟ اور جواب دینے والے کے جواب کا کیا فائدہ؟ یہ دونوں دراصل شریعت کے ساتھ مذاق کرتے ہیں چاہے انہیں اس کا شعور ہو یا لاشعوری طور پر وہ ایسا کر رہے ہوں۔

اسی طرح اسلامی فقہ کی جزئیات کی خیالی تعلیم اور تحقیق ' خصوصاً ان شعبوں میں جن کا اطلاق اور نفاذ نہیں ہوتا' ایک ایسا مطالعہ اور تحقیق ہے جو محض کھیل کے طور پر کیا جاتا ہے اور اس سے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اسلامی فقہ اور اسلامی شریعت کا اس کرۂ ارض پر ایک مقام ہے اور وہ مقام صرف یہ ہے کہ اسے مدارس کے اندر پڑھایا جائے' عدالتوں کے اندر ان فقہی جزئیات کا نفاذ ضروری نہیں ہے۔یہ تاثر جو شخص دیتا ہے وہ اپنے آپ کو ایک بڑے گناہ میں ملوث کرتا ہے' اس لئے کہ یہ شخص لوگوں کو یہ شعور دے کر ان کے جذبہ نفاذ شریعت کو سرد کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دین سنجیدہ دین ہے اور یہ آیا ہی اس لئے ہے کہ لوگوں کی زندگی پر کنٹرول کرے۔یہ اس لئے آیا ہے کہ لوگ صرف اللہ کی بندگی اور غلامی کریں۔اس دین کے آنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کے اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت کے حق کو چھین لیا ہے' ان سے یہ حق واپس لے لیا جائے اور اسے دوبارہ اللہ کے حوالے کیا جائے اور تمام امور میں اللہ کی شریعت اور حکومت جاری ہو۔اللہ کے سوا کسی اور کی شریعت نافذ نہ ہو' اس لئے کہ یہ شریعت آئی ہی اس لئے ہے کہ وہ زندگی پر حکمرانی کرے اور زندگی کے واقعی اور عملی مسئلوں کے حل پیش کرے اور ہر معاملے کی شکل و صورت اور اس کے حجم کے مطابق صحیح صحیح فیصلے دے۔حالات اور واقعات کے مطابق۔

یہ دین اس لئے نہیں آیا کہ اسے بطور علامت اور شعار لیا جائے۔اس لئے نہیں آیا کہ اس کے شرعی نظام پر محض علمی مباحث ہوں' اس لئے نہیں کہ اس کا نفاذ کیسے ہو۔یہ نظام خیالی مفروضات کے حل پیش کرتا ہے اور فرضی واقعات کے فرضی احکام وضع کرتا ہے۔

یہ ہے اسلام کی حقیقت پسندی۔علمائے دین کو چاہئے کہ وہ اس دین کا مطالعہ حقیقت پسندانہ انداز میں کریں اور اس مطالعے کے ساتھ ساتھ نفاذ شریعت کے امکانات کا مطالعہ بھی کریں۔اگر وہ نفاذ شریعت کی جدوجہد نہیں کر سکتے تو ہوا میں محض خیالی فتوے کیوں جاری کرتے ہیں؟

---ooo---

ابن عباس ؓ سے مجاہد نے جو روایت کی ہے اور اس آیت کے شان نزول کے بارے میں سعید ابن جبیر نے کہا ہے کہ آیت (یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ) سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ جاہلیت میں مروج بعض باتوں کے بارے میں پوچھتے تھے۔ البتہ معین طور پر یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ سوال کیا تھا، لیکن اس آیت کے بعد بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں اور آیت سابقہ کے درمیان کوئی تعلق ضرور ہو گا۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝

"اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ نہ وصیلہ اور نہ حام۔ مگر یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر بے عقل ہیں (کہ ایسے وہمیات کو مان رہے ہیں) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس قانون کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور آؤ پیغمبر کی طرف تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لئے تو بس وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید کیے چلے جائیں گے خواہ وہ کچھ نہ جانتے ہوں اور صحیح راستہ کی انہیں خبر ہی نہ ہو؟"

انسانوں کے دل و دماغ یا تو اس صورت پر قائم ہوں گے جس پر انہیں اللہ نے پیدا کیا۔ وہ صرف ایک اللہ کی معرفت پائیں گے، ایک رب العالمین کی غلامی کریں گے، اسی کی شریعت کے تابع ہوں گے اور اللہ کے علاوہ تمام دوسرے شرائع و قوانین کو ترک کر دیں گے۔ تمام دوسرے الٰہوں کی ربوبیت کو ترک کر دیں گے اور کسی اور سرچشمے سے اپنے قوانین اور ضوابط نہ لیں گے۔ یہ ایک نہایت ہی فطری صورت حال ہوگی، بندے کا اپنے رب کے ساتھ جوڑ ہو گا، اس کی عبادت اور رب کریم کے ساتھ اس کے روابط نہایت ہی سادہ ہوں گے ورنہ وہ جاہلیت کی پیچ در پیچ گزر گاہوں میں سرگرداں رہے گا۔ کبھی بت پرست ہو گا اور بے بنیاد کلمات کے اندر گم کردہ راہ رہے گا۔ زندگی کے ہر موڑ پر ایک وہم اور تخیل اسے نچا رہا ہو گا۔ جاہلیت کا ہر بت اس سے اپنے مراسم عبودیت ادا کرنے کا مطالبہ کر رہا ہو گا، ہر بت کا مطالبہ یہ ہو گا کہ وہ اسے راضی کرے۔ پھر عبادات اور قربانیوں کے مراسم بھی متعدد اور متضاد ہوں گے اور ایک بت پرست کے ذہن میں کوئی اصول نہ ہو گا۔ وہ عبادات کے مراسم کو ادا کرتا چلا جائے گا اور اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے گی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ مختلف اور متفرق ارباب کی بندگی اسے تھکا کر چور چور کر دے گی اور اس کی انسانیت کا وہ شرف بھی ختم ہو جائے گا جو اللہ نے انسان کو دیا تھا۔

جب اسلام آیا تو انسانیت مؤخر الذکر حالت میں تھی۔ اس نے لوگوں کے سامنے نظریہ توحید پیش کیا اور بتایا کہ قوت

حاکم ایک ہے جس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ اس نے صرف ایک رب کی بندگی کا نظریہ دیا تاکہ لوگ ایک دوسرے کی بندگی اور غلامی سے نجات پالیں۔ نظریہ توحید کے ذریعے انسان کو متفرق الہوں کی بندگی سے نجات ملی اور انسانی ضمیر اوہام و خرافات کے ناقابل برداشت بوجھ سے نجات پا گیا۔

انسانی فہم و ادراک اور عقلمندی نے اپنا اصل مقام و مرتبہ پایا اور انسان کو مختلف اور متضاد مراسم عبودیت سے نجات ملی۔ پھر انسان نے بت پرستی کے خلاف جہاد شروع کیا اور اس کی تمام شکلوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد زندگی کے تمام نشیب و فراز میں اس کا پیچھا کیا' دل کی گہرائیوں' عبادت کے طریقوں' زندگی کی رسومات اور نظام قانون اور نظام حکومت ہر جگہ سے بت پرستی کا قلع قمع کر دیا گیا۔

افکار جاہلیت میں سے یہ ایک ٹیڑھی فکر تھی' جس کا قرآن کریم یہاں علاج کر رہا ہے تاکہ اسے سیدھا کر دے ' دیا جلا کر اس ٹیڑھی راہ کو روشن کر دے اور فکر و نظر کے اسلامی اصولوں کا دیا جلا دے۔ اصول شریعت اور اصول نظام زندگی۔

(مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۵:۱۰۳) "اللہ نے کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ نہ وصیلہ اور نہ حام۔ مگر یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔" یہ جانوروں کی اقسام تھیں جنہیں وہ اپنے الہوں کے لئے چھوڑ دیتے تھے۔ ان کی کچھ خاص شرائط ہوتی تھیں اور یہ شرائط انہوں نے فکر و نظر کی تاریخ کے تہ بہ تہ پردوں اوہام اور خرافات سے اخذ کی تھیں۔ بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام کیا تھے؟ اور ان کے بارے میں جو اوہام و خرافات عربوں میں رائج تھے ان کا مصدر اور منبع کیا تھا؟

ان کی تعریف میں روایات مختلف ہیں۔ بعض روایات کا یہاں نقل کرنا مناسب ہو گا۔ زہری نے سعید ابن مسیب سے یہ روایت کی ہے۔ بحیرہ اونٹوں میں سے وہ قسم ہوتی ہے جس کا دودھ مالک خود استعمال نہیں کرتا تھا۔ یہ صرف الہوں کے لئے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ الہوں کا مال مذہبی پیشواؤں ہی کے لئے ہوتا ہو گا۔ سائبہ وہ ہے جو وہ اپنے بتوں کی نذر کرتے تھے۔ وصیلہ وہ ہوتی تھی جس کا پہلی بار کا بچہ مادہ ہو پھر دوبارہ بھی بچہ مادہ ہو یعنی دونوں کے درمیان اتصال ہو گیا۔ یعنی درمیان میں نر پیدا نہ ہوا۔ ایسی اونٹنی کو وہ بتوں کے نام پر ذبح کر دیتے تھے اور حام اس اونٹ کو کہتے تھے کہ جس کی نسل سے کئی بچے پیدا ہوئے ہوں۔ اس کی تعداد مقرر تھی جب وہ اس تعداد تک پہنچ جاتا تو اسے حام اس لئے کہتے تھے کہ اس نے اپنی پشت کو مزید استعمال سے بچا لیا۔ اب اس پر سوار نہ ہوتے۔

اہل لغت کہتے ہیں: بحیرہ وہ اونٹنی ہے جس کے کان پھاڑتے تھے۔ وہ کہتے (بحرت اذن الناقه بحرا) (میں نے اپنی اونٹنی کے کان پھاڑ دیئے) ایسی اونٹنی کو بحورہ بھی کہتے تھے اور بحیرہ بھی۔ اور یہ کان آخری حصے تک پھاڑ دیئے جاتے تھے اور بحر کو بھی بحر اس لئے کہتے ہیں کہ یہ وسیع ہوتا ہے۔ اہل جاہلیت کے نزدیک بحیرہ کا گوشت کھانا حرام ہوتا تھا اور اسے بحیرہ اس طرح قرار دیتے کہ جب وہ پانچ بار بچہ دے اور وہ نر ہو۔ اب وہ اس کے کان پھاڑ دیتے' اس کا گوشت حرام قرار دے دیتے اور اس کی قربانی اور اس پر سواری ممنوع ہوتی۔ کوئی شخص اسے اپنے پانی سے نہ روکتا اور کوئی شخص اسے اپنی چراگاہ سے بھی نہ روکتا۔

سائبہ وہ اونٹنی ہوتی جسے پن کر دیا جائے اور اسے مسیبہ بھی کہتے ہیں۔ جاہلیت کے زمانے میں اگر کوئی نذر مانتا کہ وہ سفر سے خیریت سے لوٹا یا بیماری سے تندرست ہوا' تو وہ یہ نذر دے گا۔ تو وہ کہتا میری اونٹنی سائبہ ہوئی' حرمت اور آزادانہ چرنے چگنے میں وہ بھی بحیرہ کی طرح ہوتی۔ اور وصیلہ کے بارے میں بعض اہل لغت نے یہ لکھا ہے کہ اگر بکری کے دو بچے ہوں ایک نر ہو اور دوسرا مادہ ہو تو عرب کہتے کہ اس مادہ نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر ولادت کی تو وہ اس بکری کو ذبح نہ کرتے تھے۔ بعض کہتے تھے کہ اگر بکری مادہ جنے تو یہ ان کی ہے۔ اور اگر نہ جنے تو وہ اسے اپنے الٰہوں کے نام ذبح کر دیتے تھے اور اگر نر اور مادہ دونوں یکجا پیدا ہوں تو کہتے کہ چونکہ یہ بھائی بہن اکٹھے ہوئے ہیں اس لئے وہ بکری کو ذبح نہ کرتے۔ حام وہ اونٹ ہوتا جس کے نطفے سے دس بچے پیدا ہوتے تو اس کے بارے میں وہ کہتے کہ اس نے اپنی پیٹھ کو بچالیا ہے اس لئے وہ اس کو چراگاہ اور پانی سے نہ روکتے۔" (دیکھئے احکام القرآن جصاص)۔

ان جانوروں کی تعریف کے بارے میں اور بھی کئی روایات وارد ہیں اور ان کے پیچھے بس یہی تصور ہے جو اوپر ہم نے ذکر کیا۔ ان جانوروں کے تقدس کے لئے ان اسباب سے کوئی ارفع اور معقول سبب کسی روایت میں نہیں آیا ہے۔ جیسا کہ درج بالا اقتباس سے معلوم ہو گیا ہو گا یہ تمام اسباب بت پرستی اور جاہلیت کے اوہام اور اندھیروں کا نتیجہ تھے۔ جب فیصلے اوہام اور تاریک خیالی کے زاویے سے ہوتے تو پھر وہم پرستی اور تاریک خیالی کی نہ کوئی حد رہتی ہے اور نہ کوئی اصول اور معیار رہتا ہے۔ اس کے نتیجے میں چند مذہبی رسومات پیدا ہو جاتی ہیں کبھی ان رسومات میں کمی آ جاتی ہے اور کبھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ اصول جاہلیت عربیہ کے اندر بھی رائج تھا اور یہی صورت ہر دور اور ہر جگہ واقعہ ہو سکتی ہے۔ جب بھی توحید سے لوگ ہٹیں گے وہ ایسی ہی وہمیات کا شکار ہوں گے اس لئے کہ توحید ہی وہ نظریہ ہے جس میں نہ ٹیڑھ ہے اور نہ تاریکی ہے۔ تمام جاہلی نظاموں میں رسوم و توہمات کی ظاہری شکلیں تو مختلف ہوتی ہیں لیکن خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ بنیاد تاریک خیالی پر ہوتی ہے یعنی زندگی کے معاملات میں اللہ کے سوا کسی اور جگہ سے ہدایات لینا۔

جاہلیت کسی مخصوص زمانے کا نام نہیں ہے بلکہ جاہلیت ایک صورت حال کا نام ہے جو بار بار رنگ بدل کر سامنے آتی رہتی ہے۔ مختلف شکلوں میں آتی ہے۔ مختلف ادوار میں آتی ہے۔ اب صورت حال یا تو ایسی ہو گی کہ ایک اللہ حاکم ہو گا اور اس کے مقابلے میں تمام مخلوق اس کی غلام اور محکوم ہو گی۔ ہر قسم کا اقتدار اللہ کے لئے ہو گا' شعور و فکر اللہ سے لیا گیا ہو گا' نیت اور عمل اللہ کے حوالے سے ہو گا۔ نظم و نسق اور اجتماعی طور طریقے اللہ کی مرضی سے ہوں گے۔ اقدار اور پیمانے اللہ کے تصور سے وضع ہوں گے' قوانین اور ضوابط اللہ کے نافذ ہوں گے اور تمام تصورات فلسفے اور ہدایات اللہ ہی سے اخذ ہوں گے یا پھر جاہلیت ہو گی' کسی بھی رنگ ڈھنگ میں' اس میں بندہ بندے کا غلام ہو گا یا بندہ اللہ کے سوا کسی اور مخلوق کا غلام ہو گا' اس جاہلیت کے نہ حدود ہوں گے اور نہ ضابطے ہوں گے اس لئے کہ کوئی انسان کوئی ایسا ضابطہ بنا ہی نہیں سکتا جسے الٰہی ضابطہ اور اصول کہا جا سکے اس لئے کہ عقل انسانی پر بے شمار چیزیں اثرات ڈال دیتی ہیں۔ ہر دور میں جب انسان نے کوئی تصور اور کوئی نظم دینے کی کوشش کی ہے وہ بے شمار عوامل سے متاثر ہوا ہے اور وہ مختلف اطراف سے پریشر اور دباؤ کا مقابلہ نہیں کر سکا' جب تک کہ وہ موزوں ترین ضابطے کے سامنے جھکا نہیں ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کے اس بیان اور توضیح کو چودہ سو سال گزر گئے ہیں اور جب بھی عقل انسانی نے عقیدۂ توحید سے روگردانی کی وہ پیچیدہ راہوں میں گم ہو گیا اور بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ گیا۔ وہ مختلف' متعدد اور متفرق

ارباب کا معتقد ہوتا رہا۔ اس نے اپنی آزادی' اپنی شرافت اور اپنی قوت مقابلہ سے ہاتھ دھویا۔ صرف اس زیر بحث مسئلہ تقدس حیوانات ہی کو اگر لیا جائے تو آج بھی مصر کے اندر دسیوں خرافات ملیں گے جن میں بعض حیوانات کو تقدس کے خیال سے چھوڑ دیا جاتا ہے اور یہ بعض اولیاء اور مقدس لوگوں کے نام پر' بعینہٖ اسی طرح چھوڑ دیئے جاتے ہیں جس طرح قدیم زمانوں میں الٰہوں کے نام پر حیوانات چھوڑے جاتے تھے۔

ان مراسم عبودیت اور جاہلیت کے مسئلے کا تعلق صرف ایک اصول کے ساتھ ہے اور یہ اصول نقطہ آغاز ہے۔ اس نقطے سے دو راستے نکلتے ہیں یا تو اسلام کا راستہ ہو گا اور یا جاہلیت کا۔ نقطہ یہ ہے کہ لوگوں کی زندگیوں میں حاکمیت کس کی چلے گی؟ اسلامی شریعت کے مطابق حاکیت اللہ کی ہوگی یا غیر اللہ کی حاکیت ہوگی اور لوگ اپنے لئے احکام اور طریقے خود وضع کر رہے ہوں گے۔ یا وہ مراسم عبودیت اور اقدار و پیمانے خود متعین کریں گے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ لوگوں پر الوہیت اللہ کی ہوگی یا اللہ کی مخلوق میں سے کسی اور کی ہوگی۔ غیر اللہ میں سے جو بھی اللہ کی حاکیت کا دعویدار بن جائے گا بس وہ الٰہ تصور ہو گا۔

یہی وجہ ہے کہ آیت کا آغاز ہی اس مضمون سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان مراسم کی اجازت نہیں دی ہے۔ اگر اللہ نے بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام جیسے مراسم کی منظوری نہیں دی ہے تو سوال یہ ہے کہ پھر کس نے یہ نام نہاد جانور حرام کئے ہیں۔

(مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ (۵:۱۰۳) "اللہ نے بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام نامی جانوروں کو وہ حیثیت نہیں دی۔" اور وہ لوگ جو اس شریعت اور قانون کی اطاعت کرتے ہیں وہ کفار ہیں۔ یہ لوگ اس لئے کفار ہیں کہ یہ لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ کبھی وہ خود اپنی طرف سے ایک بات بناتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی شریعت ہے اور کبھی وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے معاملات کے اندر اللہ کی شریعت کا دخل قبول نہیں کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے نافرمان نہیں ہیں۔ یہ سب کفر ہے۔

(وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۵:۱۰۳)) "مگر یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔ مشرکین عرب کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں اور یہ دین حضرت ابراہیم پر اللہ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ یہ لوگ اللہ کی ذات کے منکر نہ تھے' بلکہ وہ ذات باری کے وجود کا اعتراف کرتے تھے۔ وہ اللہ کی قدرت کے بھی معترف تھے اور اس بات کا بھی اعتراف کرتے تھے کہ اللہ ہی متصرف فی الامور ہے۔ لیکن ان اعتراضات کے باوجود وہ اپنے لئے قوانین خود بناتے تھے اور اس کے بعد وہ یہ یقین کرتے تھے کہ یہ قوانین اللہ کی جانب سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کافر بن گئے اور یہی بات ان تمام لوگوں پر صادق آئے گی جو کسی بھی وقت جاہلیت میں زندگی بسر کرتے ہوں اور اپنے لئے قانون خود بناتے ہوں۔ پھر وہ یہ گمان کرتے ہوں کہ یہ اللہ کی شریعت ہے۔

اللہ کی شریعت تو وہی ہے جو کتاب اللہ کے اندر موجود ہے۔ جو اللہ نے اتاری اور نبی نے بیان کی۔ وہ نہ مبہم ہے اور نہ پیچیدہ ہے۔ اللہ کی شریعت اس بات کی متحمل نہیں ہے کہ اپنی جانب سے شریعت کے اوپر افتراء باندھے اور یہ زعم کرے کہ وہ شریعت ہے یا کتاب اللہ ہے جیسا کہ جاہلیت کے پیروکاروں کا وطیرہ ہوتا ہے کہ وہ خود ایک شریعت بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ایسے دعوے کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کفر کے ساتھ متصف کرتا ہے اور کافر کہنے کے بعد ایسے لوگوں کو اللہ بے عقل بھی کہتا ہے اس لئے کہ وہ عقلمند ہوتے تو اللہ پر افتراء نہ باندھتے۔ اگر وہ عقلمند ہوتے تو یہ گمان نہ کرتے کہ ان کا یہ افتراء چل سکے گا۔ اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کے قول و فعل میں بھی تضاد ہے۔

(وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۵: ۱۰۴)) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس قانون کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور آؤ پیغمبر کی طرف۔ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لئے تو بس وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید کئے چلے جائیں گے خواہ وہ کچھ نہ جانتے ہوں اور صحیح راستہ کی انہیں خبر ہی نہ ہو؟"

اللہ تعالیٰ نے جو شریعت نازل کی ہے وہ واضح ہے۔ وہ قرآن کریم اور سنت رسول کی شکل میں ریکارڈ ہے۔ یہی وہ معیار ہے' اور یہی وہ پوائنٹ ہے جس سے اسلام اور جاہلیت کے راستے جدا ہوتے ہیں۔ ایک ہے ایمان کا راستہ اور دوسرا ہے کفر کا راستہ۔ اس جہاں میں یا تو صورت حال یہ ہوگی کہ لوگوں کو ما انزل اللہ کی طرف دعوت دی جائے گی اور وہ اس پر لبیک کہیں گے اور اس صورت میں وہ مسلمان کہلائیں گے یا وہ اس دعوت کا انکار کریں گے' اس صورت میں وہ کافر ہوں گے اور ان دو صورتوں کے درمیان کوئی تیسری صورت نہیں ہے۔

یہ لوگ ایسے تھے کہ جب انہیں اللہ اور رسول اللہ کی طرف دعوت دی جائے تو یہ کہتے ہیں ہمارے لئے وہی راستہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ یہ لوگ اس طرح بندوں کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کرنے لگے اور انہوں نے ان قوانین کو ترک کر دیا جو بندوں کے رب نے وضع کئے تھے۔ انہوں نے آزادی کے اس نعرے کو ترک کر دیا' جس کا خلاصہ یہ تھا کہ انسانوں کی غلامی کو ترک کر دو اور عقل و ضمیر کی پیروی اختیار کرو چاہے یہ عقل و ضمیر ان کی اپنی ہو یا آباؤ اجداد کی ہو۔

اس کے بعد قرآن مجید ان کے موقف پر تعجب اور تاسف کا اظہار کرتا ہے۔

(اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۵: ۱۰۴)) "اگرچہ ان کے آباؤ اجداد کسی چیز کو نہ سمجھتے ہوں اور نہ ہی راہ ہدایت پر ہوں۔"

اس استفہام کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ آباؤ اجداد کے اتباع سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ وہ عقلمند نہیں ہیں اور اگر عقلمند ہوں تو پھر آباؤ اجداد کی اطاعت جائز ہے اور اس صورت میں اللہ اور رسول اللہ کے احکام کو ترک کرنا جائز ہے۔

یہ بات نہیں ہے بلکہ اس اظہار تعجب میں محض ان کی واقعی صورت حال کو بیان کرنا مطلوب ہے کہ اس سے قبل ان کے آباؤ اجداد نامعقول باتوں کو مانتے تھے۔ اس لئے کہ ان کے آباء پھر اپنے آباء کو ماننے والے تھے اور ان آباء نے بھی خود اپنے لئے قواعد و ضوابط وضع کئے تھے اور شریعت الٰہی کے ہوتے ہوئے اگر کوئی شخص اپنے آباء اور اجداد کے رسم و رواج کا اتباع کرتا ہے تو وہ یقیناً بے عقل ہے اور راہ ہدایت پر نہیں ہے۔ چاہے وہ اپنے آپ اور اپنے قوانین کے بارے میں جو چاہے کہے۔ جبکہ اللہ بہت ہی علیم و خبیر ہے اور سچا ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم بہرحال یہی ہے کہ یہ لوگ کچھ بھی نہیں جانتے اور یہ اللہ کی شہادت ہے۔ جو شخص اللہ کی شریعت سے حکم عدولی کرتا ہے وہ جاہل بھی ہے اور گمراہ بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ پر افتراء باندھنے والا اور کافر بھی ہے۔

---ooo---

اہل کفر کے اقوال و افعال کے بیان کے اختتام کے بعد اب روئے سخن ان لوگوں کی طرف مڑ جاتا ہے جو ایمان لائے ہیں۔ یہاں اہل کفر سے ان کی مکمل علیحدگی کر دی جاتی ہے اور ان کو ممیز کر دیا جاتا ہے۔ ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہارے فرائض اور واجبات کیا ہیں اور یہ کہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ان کا موقف کیا ہے اور یہ کہ وہ اللہ کے سپرد ہیں اور ان کی زندگیاں اس فانی دنیا کے سپرد نہیں ہیں۔ نہ ان کا مقصد اس دنیا کے مفادات کا حصول ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٠٥﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی فکر کرو، کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہ راست پر ہو، اللہ کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔“ یہ اہل ایمان اور ان کے مخالف کیمپ کے درمیان ایک مکمل جدائی ہے اور ان کے اپنے درمیان باہم کفالت اور ضمانت ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ مکمل ہمدردی اور یہ کہ وہ ایک امت اور ایک جماعت ہیں۔

(يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

(۵:۱۰۵)) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی فکر کرو، کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا۔ تم ایک اکائی ہو اور تم دوسروں سے علیحدہ اور ممتاز ہو۔ تم باہم متضامن اور متکافل ہو، اس لئے تم اپنے محور کے گرد جمے رہو۔ اپنے آپ کو پاک رکھو۔ اپنا تزکیہ کرو، اپنی جماعت اور اپنی جمعیت کی فکر کرو، اگر تم راہ ہدایت پر جمے رہے تو کسی کی گمراہی تمہیں کوئی نقصان نہ دے سکے گی۔ اس لئے کہ تم ایک علیحدہ جمعیت ہو اور دوسروں سے الگ ہو۔ تم ایک دوسرے کے دوست ہمدرد اور باہم کفیل ہو۔ تمہاری دوسری امتوں کے ساتھ دوستی نہیں ہے اور نہ ان کے ساتھ دلی ربط ہے۔

یہ ایک آیت ہی واضح کر دیتی ہے کہ اس امت اور دوسری امم کے باہم ربط و تعلق کے اصول کیا ہوں گے؟ اور

دوسری اقوام کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی۔

امت مسلمہ اللہ کی پارٹی ہے اور امت کی علاوہ جو بھی امتیں ہیں وہ شیطان کی پارٹیاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ اور دوسری امتوں کے درمیان دوستی اور باہم تضامن قائم نہیں ہو سکتا اس لئے کہ امت مسلمہ اور دوسری امم کے درمیاں کوئی نظریاتی اشتراک نہیں ہے۔ نہ مقاصد کا اشتراک ہے اور نہ وسائل و مقاصد میں ان کے درمیان یگانگت ہے۔ نہ ذمہ داریوں اور نہ ان کی جزاء میں اتحاد ہے۔

امت مسلمہ کا فرض یہ ہے کہ وہ باہم متضامن اور کفیل ہوں اور اس کے افراد ایک دوسرے کے ہمدرد اور مخلص ہوں۔ وہ اللہ کی ہدایت پر چلتے رہیں اس لئے کہ اللہ ہی نے تو انہیں ایک علیحدہ امت قرار دیا ہے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو دنیا کی کوئی قوت انہیں نقصان نہ پہنچا سکے گی اگرچہ ان کے ارد گرد تمام لوگ گمراہی کو اختیار کر لیں۔ لیکن یہ اصول اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک امت ہدایت پر ہو اور قائم ہو۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امت مسلمہ فریضہ دعوت دین سے ہاتھ کھینچ لے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو دین اور ہدایت کی طرف بلائے کیونکہ لوگوں کو راہ ہدایت کی طرف بلانا ہی ہمارا دین ہے۔ یہی ہمارا نظام ہے۔ جب امت اس کرۂ ارض پر کہیں اپنا نظام قائم کر لے تو پھر اس کا فرض ہے کہ وہ تمام انسانوں کو اس دین کی طرف دعوت دے۔ اور پھر انہیں ہدایت دینے کی سعی کرے۔ یہ فرض اس پر بہرحال رہتا ہے کہ وہ انہیں عدل و انصاف کی راہ پر چلائے۔ عدل کی نگرانی کرے اور انسانوں کو مزید گمراہی کے راستے پر چلنے سے بچائے۔ انہیں اس جاہلیت میں داخل ہونے کی اجازت نہ دے جس سے اللہ نے انہیں نکالا۔

یہ بات کہ امت اپنے نفس ہی کی ذمہ دار ہے اور اگر وہ ہدایت پر ہو تو دوسروں کی گمراہی سے اس کو کوئی نقصان نہ ہو گا۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کوتاہی کرے تو اس سے کوئی محاسبہ نہ ہو گا۔ اس پر یہ فرض ہے کہ پہلے امت کی صفوں کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے اور اس کے بعد پورے کرۂ ارض پر یہ فریضہ ادا کرے۔ یہاں سب سے پہلا اور اہم معروف یہ ہے کہ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کیا جائے اور اللہ کی شریعت کو قانون تسلیم کیا جائے۔ سب سے بڑا منکر جاہلیت اور اللہ کے حق حاکمیت پر دست درازی ہے۔ جاہلیت کا حکم بھی طاغوت کا حکم ہے اور طاغوت کی حکومت ہوتی ہی وہ ہے جس میں اللہ کے سوا کسی اور کی حکمرانی ہو جبکہ امت مسلمہ پہلے خود اپنے اوپر قوام ہے اور پھر پوری انسانیت پر قوام ہے۔

اس آیت کا مفہوم و مراد وہ نہیں ہے جس طرح بعض قدیم مفسرین نے سمجھا ہے اور جس طرح بعض جدید لوگ سمجھتے ہیں یعنی یہ کہ ایک فرد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مکلف نہیں ہے بشرطیکہ وہ خود درست طرز عمل اختیار کئے ہوئے ہو۔ نہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ امت مسلمہ بھی اس کرۂ ارض پر اللہ کی شریعت کے قیام کی مکلف نہیں ہے' بشرطیکہ وہ بذات خود راہ راست پر ہو اگرچہ اس کے ارد گرد لوگ گمراہ ہوں۔

یہ آیت نہ ایک مومن کو اور نہ پوری امت کو دنیا میں پائے جانے والی برائی کے مقابلے سے بری الذمہ قرار دیتی ہے۔ ضلالت اور نافرمانی کا مقابلہ فرض ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ کوئی اللہ کے حق حاکمیت پر دست درازی کرے اور اللہ کا حق قانون سازی غصب کرے۔ یہ ایک ایسا منکر ہے جس سے نہ کسی فرد کو فائدہ

ہوتا ہے اور نہ امت کو اور جب تک یہ منکر قائم رہے کوئی امت فلاح نہیں پا سکتی۔

اصحاب سنن نے یہ روایت کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک بار تقریر فرمائی اور کہا: "لوگو! تم یہ آیت پڑھتے ہو (یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵:۱۰۵)) اس آیت کا اطلاق تم ایسی صورت حال پر کرتے ہو جو اس کی مراد نہیں ہے میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ لوگ جب برائی کو دیکھیں اور اسے روکنے کی کوشش نہ کریں تو ممکن ہے کہ اللہ سب کو عذاب میں مبتلا کر دے۔"

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نہایت ہی وقت پر اس غلط فہمی کا ازالہ فرمایا۔ یہ غلط فہمی ان کے دور میں بعض لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی تھی۔ آج ہم تو اس نصیحت کے بہت ہی محتاج ہیں کیونکہ آج منکر کو دور کرنے کے فرائض بہت ہی مشکل ہو گئے ہیں اس لئے ہم جیسے ضعیف لوگ اس آیت کے اس مفہوم کی طرف بہت جلد مائل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح وہ جہاد کی مشقت اور مشکلات سے نجات پالیں گے اور ان کو جہاد فی سبیل اللہ کی مشکلات کو برداشت نہ کرنا پڑے گا۔

ہرگز یہ مفہوم مراد نہیں ہو سکتا' اس لئے کہ یہ فریضہ صرف جدوجہد اور جہاد ہی کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے۔ یہ جہد مسلسل کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے اس لئے اس دین کے لئے کچھ ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو عوام کو اس دین کی طرف دعوت دیں۔ لوگوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کریں اور دنیا میں اللہ کی حاکمیت کو قائم کریں۔ اللہ کا حق حاکمیت جن لوگوں نے چھین لیا ہے' ان سے وہ حق چھین لیں۔ لوگوں کی زندگیوں پر اللہ کی شریعت نافذ کریں اور انہیں شریعت پر استوار کریں۔ اس مقصد کے لئے جدوجہد لازمی ہے تاکہ گمراہ افراد تک نیکی اور روشنی پہنچانے کی جدوجہد کی جائے۔ اگر کوئی قوت لوگوں کو راہ ہدایت پر آنے سے روک رہی ہو تو اس کا مقابلہ قوت سے کیا جائے۔ اس قوت کے اثرات کو ختم کیا جائے جو دین اسلام کو معطل رکھتی ہے اور اسلامی نظام اور اسلامی شریعت کے قیام کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہے۔

اسلام کی راہ میں آڑے آنے والی اس رکاوٹ کو دور کرنے کے بعد اہل ایمان کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے اور تب ہی گمراہ اپنی سزا خود بھگتیں گے جب وہ اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے۔

(اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵:۱۰۵)) "اگر تم خود راہ راست پر ہو' اللہ کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے' پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔"

اب ان احکام شرعیہ میں سے آخری حکم بیان کیا جاتا ہے' جو اس سورہ میں ذکر ہیں اور اس حکم کا تعلق اسلامی معاشرے کے بعض اجتماعی امور سے ہے۔ یہ حکم اس بارے میں ہے کہ اگر کوئی سفر میں وصیت کر رہا ہوں تو اس پر دو منصف اور عادل قسم کے گواہ ٹھہرائے' ایسے حالات میں کہ جب وہ اپنے معاشرے اور خاندان سے دور ہو۔ یہ گواہی اس لئے قائم کی جاتی ہے تاکہ حق حقدار تک پہنچ سکے۔

---ooo---

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ شَهَٰدَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ ٱلْمَوْتُ
حِينَ ٱلْوَصِيَّةِ ٱثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ أَوْ ءَاخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنتُمْ
ضَرَبْتُمْ فِى ٱلْأَرْضِ فَأَصَٰبَتْكُم مُّصِيبَةُ ٱلْمَوْتِ ۚ تَحْبِسُونَهُمَا مِنۢ بَعْدِ
ٱلصَّلَوٰةِ فَيُقْسِمَانِ بِٱللَّهِ إِنِ ٱرْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِى بِهِۦ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ
ذَا قُرْبَىٰ ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَٰدَةَ ٱللَّهِ إِنَّآ إِذًا لَّمِنَ ٱلْءَاثِمِينَ ﴿١٠٦﴾ فَإِنْ عُثِرَ
عَلَىٰٓ أَنَّهُمَا ٱسْتَحَقَّآ إِثْمًا فَـَٔاخَرَانِ يَقُومَانِ مَقَامَهُمَا مِنَ ٱلَّذِينَ ٱسْتَحَقَّ
عَلَيْهِمُ ٱلْأَوْلَيَٰنِ فَيُقْسِمَانِ بِٱللَّهِ لَشَهَٰدَتُنَآ أَحَقُّ مِن شَهَٰدَتِهِمَا وَمَا
ٱعْتَدَيْنَآ إِنَّآ إِذًا لَّمِنَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿١٠٧﴾ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰٓ أَن يَأْتُوا۟ بِٱلشَّهَٰدَةِ عَلَىٰ
وَجْهِهَآ أَوْ يَخَافُوٓا۟ أَن تُرَدَّ أَيْمَٰنٌۢ بَعْدَ أَيْمَٰنِهِمْ ۗ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَٱسْمَعُوا۟ ۗ
۱۴ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلْفَٰسِقِينَ ﴿١٠٨﴾
ع۸
۴

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور وہ وصیت کر رہا ہو تو اس کے لئے شہادت کا نصاب یہ ہے کہ تمہاری جماعت میں سے دو صاحب عدل آدمی گواہ بنائے جائیں 'یا اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور وہاں موت کی مصیبت پیش آجائے تو غیر لوگوں ہی میں سے دو گواہ لے لیے جائیں ۔ پھر اگر کوئی شک پڑ جائے تو نماز کے بعد دونوں گواہوں کو (مسجد میں) روک لیا جائے اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ ”ہم کسی ذاتی فائدے کے عوض شہادت بیچنے والے نہیں ہیں' اور خواہ کوئی ہمارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو (ہم اس کی رعایت کرنے والے نہیں) اور نہ خدا واسطے کی گواہی کو ہم چھپانے والے ہیں' اگر ہم نے ایسا کیا تو گناہ گاروں میں شمار ہوں گے ۔“ لیکن اگر پتہ چل جائے کہ ان دونوں نے اپنے آپ کو گناہ میں مبتلا کیا ہے ۔ تو پھر ان کی جگہ دو اور شخص جو ان کی بہ نسبت شہادت دینے کے لئے اہل تر ہوں ان لوگوں میں سے کھڑے ہوں جن کی حق تلفی ہوئی ہو' اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ ”ہماری شہادت ان

کی شہادت سے زیادہ برحق ہے اور ہم نے اپنی گواہی میں کوئی زیادتی نہیں کی ہے' اگر ہم ایسا کریں تو ظالموں میں سے ہوں گے ۔" اس طریقے سے زیادہ توقع کی جاسکتی ہے کہ لوگ ٹھیک ٹھیک شہادت دیں گے ' یا کم از کم اس بات ہی کا خوف کریں گے کہ ان کی قسموں کے بعد دوسری قسموں سے کہیں ان کی تردید نہ ہو جائے ۔ اللہ سے ڈرو اور سنو' اللہ نافرمانی کرنے والوں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے ۔"

ان تین آیات میں جو حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص یہ محسوس کرے کہ اس کی موت قریب ہے اور وہ اپنے اہل و عیال کے نام وصیت لکھنا چاہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ دو عادل گواہ اہل اسلام میں سے بلائے ۔ اگر وہ مقیم ہو اور ان کو وہ وصیت دے دے جو وہ اس کے ورثاء کے سامنے رکھیں گے اور اگر یہ سفر میں ہو اسے مسلمان گواہ نہ مل رہے ہوں تو پھر یہ بات جائز ہے کہ وہ غیر مسلم دو افراد کو شاہد مقرر کرے ۔

اگر اہل اسلام یا اہل میت ان دو افراد کی شہادت بابت وصیت میں شک کریں کہ انہوں نے وصیت کے بارے میں جو شہادت دی ہے وہ درست نہیں ہے' اور وہ جس چیز پر مامور کئے گئے تھے وہ ٹھیک طور پر ادا نہیں کر رہے تو ان گواہوں کو نماز کی ادائیگی کے بعد یا ان کے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کے بعد یہ حلف دیا جائے گا کہ وہ یہ شہادت اپنی یا کسی اور کے کسی مفاد کے لئے نہیں دے رہے اگرچہ کوئی رشتہ دار ہو اور یہ کہ انہوں نے کوئی امر مخفی نہیں رکھا ہے اور اگر وہ ایسا کریں گے تو یقیناً گناہگار ہوں گے ۔ اس قسم کے حلف کے بعد ان کی شہادت ثابت اور نافذ تصور ہوگی ۔

اب اس حلف کے بعد اگر یہ ثابت ہو جائے کہ انہوں نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور جھوٹی شہادت دی ہے اور امانت میں خیانت کی ہے تو وارثان میں سے دو افراد یہ حلف اٹھائیں گے کہ ان کی شہادت پہلے دو گواہوں کی شہادت سے زیادہ سچی ہے اور یہ کہ وہ یہ حلف اٹھا کر زیادتی نہیں کر رہے ہیں ۔ اس ثبوت اور حلف کے بعد پہلے دو گواہوں کی شہادت ختم تصور ہوگی اور ان دوسرے گواہوں کی شہادت نافذ ہوگی ۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان انتظامات کے ذریعے کسی امر کی اچھی طرح چھان بین ہو سکے گی اور لوگ شہادت دے سکیں گے اور نیز لوگوں کو یہ خوف نہ رہے گا کہ ان کی شہادت کے خلاف اور شہادت قائم ہوگی ۔

(ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ اَوْيَخَافُوْا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ (۵:۱۰۸)) "اس طریقے سے زیادہ توقع کی جاسکتی ہے کہ لوگ ٹھیک ٹھیک شہادت دیں گے ' یا کم از کم اس بات ہی کا خوف کریں گے کہ ان کی قسموں کے بعد دوسری قسموں سے کہیں ان کی تردید نہ ہو جائے ۔"

آخر میں تمام لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ خدا ترسی کا رویہ اختیار کریں اور اس بات کا احساس کریں کہ اللہ دیکھ رہا ہے ۔ اس سے ڈریں اور اس کے احکام کی اطاعت کریں ۔ اس لئے کہ اللہ ان لوگوں کو راہ راست نہیں دکھاتا جو اس کے نافرمان ہیں اور نہ ان کی راہنمائی بھلائی کی طرف کرتا ہے ۔

(وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اسْمَعُوْا وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۵:۱۰۸)) "اللہ سے ڈرو اور سنو' اللہ نافرمانی کرنے والوں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے ۔"

ان تین آیتوں کی شان نزول کے بارے میں امام قرطبی فرماتے ہیں :"اس بارے میں کوئی اختلاف میرے علم کی حد تک نہیں ہے کہ یہ آیات تمیم داری اور عدی ابن بداء کے بارے میں نازل ہوئیں ۔ بخاری اور دارقطنی نے حضرت ابن عباس ؓ سے روایت کی ہے کہ تمیم داری اور عدی ابن بداء مکہ کو آتے جاتے تھے ۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان جو بنی سہم قبیلے کا تھا' سفر پر نکلا ۔ وہ ایسی سرزمین میں فوت ہوا جہاں کوئی مسلمان نہ تھا ۔ اس نے ان دونوں کو وصیت کی اور انہوں نے اس کا ترکہ اس نوجوان کے وارثوں تک پہنچایا ۔ انہوں نے ایک چاندی کا جام روک لیا جسے سونے سے مزین کیا گیا تھا ۔ ان دونوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم دی کہ نہ تو انہوں نے اسے چھپایا ہے اور نہ ان کو اس کے بارے میں کوئی علم ہے ۔ اس کے بعد یہ جام مکہ میں پایا گیا تو جن لوگوں سے ملا انہوں نے کہا کہ ہم نے تمیم اور عدی سے خریدا ہے ۔ اب سہمی متوفی نوجوان کے وارث آئے ۔ انہوں نے یہ حلف اٹھایا کہ یہی جام سہمی کی ملکیت تھا ۔ اور یہ کہ ہماری شہادت ان کی شہادت سے زیادہ معتبر ہے اور یہ کہ ہم کوئی زیادتی نہیں کر رہے ۔ اس کے بعد سہمیوں کو جام دے دیا گیا ۔ یہ آیات اسی بارے میں نازل ہوئیں ۔ (الفاظ دارقطنی کے ہیں) ۔

یہ بات ظاہر ہے کہ یہ آیات جس معاشرے کی اصلاح کے لئے نازل ہوئیں ' اس معاشرے کے حالات کی چھاپ ان تدابیر کے اندر موجود ہے اور ان انتظامات کی نوعیت بھی ایسی ہو سکتی ہے ۔ اس خاص انداز شہادت اور خاص طریقہ ثبوت پر لازماً اس وقت کے معاشرتی حالات اثرانداز ہوئے ہیں ۔ خصوصاً نماز کے بعد حلف دینا ۔ کیونکہ نماز کے بعد انسان کا دینی شعور اور وجدان تازہ ہوتا ہے ۔ انسان اس بات سے بھی ڈرتا ہے کہ وہ بعد نماز مجمع عام میں حلف لے رہا ہے اور اگر یہ بات جھوٹی نکل جائے تو اسے بہت ہی بڑی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ یہ سب باتیں بتاتی ہیں کہ ان انتظامات کے اندر عربوں کے معاشرتی حالات کی جھلک موجود ہے اور اس وقت ایسے ہی اقدامات کی ضرورت تھی ۔

آج کل کے جدید معاشروں میں اثبات کے جدید وسائل بھی موجود ہیں اور انتظامات ثبوت کی نئی شکلیں بھی موجود ہیں مثلاً کتابت ' رجسٹری ' امانت اور لاکرز ۔ سوال یہ ہے کہ آیا آج کے جدید معاشروں میں یہ انتظامات قابل عمل نہیں رہے؟

ہم بعض اوقات کسی متعین معاشرے کو ذہن میں رکھ کر بات کرتے ہیں اور یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ فلاں فلاں انتظامات اب اس دور جدید میں قابل عمل نہیں رہے ہیں ۔ اب ان کی ضرورت نہیں ہے اور یہ ان معاشروں کے بقیہ آثار ہیں جن کا دور گزر گیا ہے ' کیونکہ دور جدید کے وسائل بہت ہی ترقی کر گئے ہیں ۔

اکثر لوگوں کو ایسا دھوکہ ہوتا ہے اور یہ اس لئے ہوتا ہے کہ ہم اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ یہ دین تمام انسانیت کے لئے آیا ہے ۔ ہر دور کے لئے آیا ہے اور آج کے اس جدید دور میں بھی انسانیت کی ایک بڑی تعداد اور آبادی بالکل ابتدائی اور پسماندہ حالت میں ہے ۔ وہ پسماندگی میں کانوں تک ڈوبی ہوئی ہے ۔ انسانیت کے اس بڑے حصے کو ایسے انتظامات کی ضرورت ہے جن پر اس کی اس پسماندہ حالت کے اندر ہی عمل کیا جا سکے ۔ دین اسلام کے اندر ایسے انتظامات بھی موجود ہیں جو ایسی پسماندہ سوسائٹیوں کے اندر بھی چل سکتے ہیں ۔ اور جوں جوں یہ سوسائٹیاں ترقی کرتی جاتی ہیں ' اسلام ان کی ترقی یافتہ ضروریات پوری کرتا جاتا ہے ۔ اسلامی شریعت کے اندر امانت اور ثبوت کے لئے ضوابط

موجود ہیں اور اسلامی شریعت پھر ان کو مزید ترقی کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔ یہ اسلامی نظام حیات اور اسلامی شریعت کا ایک معجزانہ کمال ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ شریعت من جانب اللہ ہے اور اسے اللہ جل شانہ' نے انسانیت کے لئے نازل فرمایا ہے۔

نیز ہم اس بات کے سمجھنے میں بھی دھوکہ کھاتے ہیں کہ ہر ترقی پذیر معاشرے کی ضروریات اسلامی نظام میں پوری ہوتی ہیں۔ اسلامی نظام حیات ہر معاشرے کے لئے اس کے حسب حالات انتظامات کرتا ہے جس میں جامعیت بھی ہوتی ہے اور لوگوں کے لئے یسر اور سہولت بھی ہوتی ہے۔ اس طرح یہ دین ہر معاشرے کے حالات کے مطابق وسائل اور طریقے اختیار کرتا ہے۔ پسماندگی میں بھی اور ترقی یافتہ صحراء اور جنگل میں بھی' اس لئے کہ یہ دین تمام انسانوں کا دین ہے۔ یہ ہر علاقے اور ہر زمانے کا دین ہے اور یہ بات بھی اس دین کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے۔

اور ہماری سب سے بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ ہم انسان یہ سمجھتے ہیں کہ ہم رب الناس کے مقابلے میں بھی لوگوں کے مفادات کو زیادہ سمجھتے ہیں اور جب ہم عملی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں تو ہمیں سخت شرمندگی ہوتی ہے۔ لیکن واقعات و حوادث سے دوچار ہونے سے پہلے ہی ہمارے لئے یہ سمجھنا اچھا نہیں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم انسانوں کے خالق کا احترام کریں اور بارگاہ اللہ میں ایک بندے اور ایک غلام کی طرح بات کریں۔ کاش کہ ہم نصیحت حاصل کریں۔ کاش کہ ہم اپنی کوتاہ دامنی کا اعتراف کریں۔

---ooo---

درس نمبر ۵۴ ایک نظر میں

یہ سبق اگرچہ نسبتاً طویل ہے لیکن اس کا تعلق بھی نظریاتی اصلاح کے مضمون کے ساتھ ہے۔ نصاریٰ کے عقائد میں جو انحرافات پیدا ہو گئے تھے ان کی اصلاح مقصود ہے۔ یہ انحرافات اس قدر دور رس تھے کہ ان کی وجہ سے نصاریٰ اپنے بنیادی نظریات میں سماوی دین کے اصولوں سے منحرف ہو گئے تھے۔ اور وہ اس عقیدۂ توحید ہی سے نکل گئے تھے جس کی تعلیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اور ان سے پہلے آنے والے رسولوں نے دی تھی۔ انہوں نے شرک کے وہ رنگ ڈھنگ اختیار کر لئے تھے جن کا کوئی تعلق دین اسلام سے نہ تھا۔

چنانچہ اس سبق کا مقصد بھی یہی ہے کہ لوگوں کے دین میں اللہ کی الوہیت اور بندوں کی عبودیت کا صحیح مفہوم بٹھایا جائے۔ یہ اصلاح اس طرح کی جاتی ہے کہ ایک عظیم جلسے میں جس میں حضرت عیسیٰ، تمام رسول اور تمام انسان موجود ہیں، اس میں خود حضرت عیسیٰ اعلان کرتے ہیں کہ میں نے ہرگز یہ تعلیم نہ دی تھی کہ لوگ مجھے، میری والدہ اور دوسرے لوگوں کو الٰہ تسلیم کریں اور یہ کہ عیسائیوں کے مزعومات میں سے کسی بات کی تعلیم انہوں نے نہیں دی ہے۔

قرآن کریم اس منظر کی خوب تصویر کشی کرتا ہے، اور یہ منظر، ان مناظر قیامت میں سے ایک ہے جسے قرآن کریم زندہ و تابندہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ نہایت ہی موثر، چلتا پھرتا منظر ہے، دلوں کی گہرائیوں تک اتر جانے والا، جس کے اثرات کا عالم یہ ہے کہ انسان کا وجود کانپ اٹھتا ہے۔ انسان اس طرح محسوس کرتا ہے کہ گویا نظروں کے سامنے ہے، سب کچھ دیکھا جا رہا ہے، سنا جا رہا ہے اور اس کے اندر تاثرات کی کیفیت بالکل متحرک ہے۔ ذرا قرآن کے الفاظ میں غور کیجئے۔

(یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَاعِلْمَ لَنَا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (۵ : ۱۰۹)) ”جس روز اللہ سب رسولوں کو جمع کر کے پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب دیا گیا تو وہ عرض کریں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں، آپ ہی تمام پوشیدہ حقیقتوں کو جانتے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ ان تمام رسولوں کو جمع کرے گا جو مختلف زمانوں میں مبعوث ہوئے تھے۔ یکے بعد دیگرے آئے تھے، یا ایک ہی دور میں تھے مگر ان کا دائرہ کار علیحدہ تھا۔ ہر ایک اپنے زون میں کام کر رہا تھا۔ یا ہر شخص کسی قوم کے لئے مبعوث ہوا تھا اور اپنی قوم ہی میں کام کر رہا تھا۔ ان سب کی دعوت ایک ہی تھی، اگرچہ زمان، مکان اور اقوام علیحدہ تھیں۔ یہاں تک کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم آ گئے۔ انہوں نے تمام جہانوں کے لئے مکمل آخری دعوت دے دی جو ہر مکان، ہر زمان اور ہر قوم اور ملت کے لئے ہے، ہر رنگ و نسل کے لئے ہے۔

یہ سب رسول، جو مختلف اقوام و ملل میں مبعوث ہوئے، مختلف زمانوں میں آئے، اب ان کا بھیجنے والا انہیں ایک ہی جگہ

جمع کر کے ان تمام سے ایک ہی سوال کر رہا ہے۔ یہ سب لوگ دنیا میں انسانیت کے نمائندے ہیں اور ہر ایک کو ایک زون کی رسالت دی گئی ہے۔ مختلف ادوار اور مقامات کے لئے۔ اب یہ نمائندے سب کے سب رب البشریت کے سامنے حاضر ہیں اور ایک عظیم اجتماع کا عظیم منظر ہے۔ اور یہ منظر زندگی کے ساتھ ہر سو حرکت کرتا نظر آتا ہے۔

(يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ (۵: ۱۰۹)) ”جس روز اللہ سب رسولوں کو جمع کر کے پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب دیا گیا۔“ سوال یہ تھا ماذا اجبتم (تمہیں کیا جواب دیا گیا) یہ رسول انسان اور بشر تھے۔ ان کا علم حضوری تھا۔ اور وہ پوشیدہ چیزوں کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے۔ انہوں نے اپنی اقوام کو راہ ہدایت کی طرف بلایا۔ ان میں سے جس نے دعوت کو قبول کیا' کر لیا۔ جس نے منہ پھیرا' پھیر لیا۔ اگرچہ رسول منکرین کے جواب کے بارے میں جانتے تھے کہ انہوں نے انکار کیا ہے لیکن ماننے والوں کی حقیقت سے باخبر نہ تھے کہ انہوں نے دل سے مانا ہے یا نہیں۔ وہ تو صرف ظاہری بات پہ حکم لگا سکتے ہیں۔ رہی پوشیدہ بات تو اس کا علم انہیں نہیں ہے اور اب وہ جناب باری میں حاضر ہیں اور وہ سب جاننے والوں سے زیادہ جاننے والا ہے اور وہ اللہ سے اس قدر ڈرتے ہیں جس قدر کوئی کسی سے ڈر سکتا ہے۔ نیز یہ رسل باری تعالیٰ کی معرفت میں بھی بہت ہی اونچا مقام رکھتے ہیں اور وہ اس بات سے حیا کرتے ہیں کہ باری تعالیٰ کے حضور کھڑے ہو کر اپنے علم کا اظہار کریں جو علیم و خبیر ہے۔

یہ ایک عظیم اجتماع میں ایک عظیم مسئولیت کا دن ہے۔ عالم بالا کے دربار میں' سب لوگوں کے سامنے کھلے دربار میں اور یہ ایک ایسی جواب طلبی ہے جس کا مقصد یہ بھی ہے کہ سب کے سامنے جواب طلب کیا جائے اور ان لوگوں کے سامنے یہ سوال و جواب ہو جو دنیا میں رسولوں کی تکذیب کرتے تھے تاکہ علی الاعلان یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ رسول از خود نہ آئے تھے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اللہ کا دین لے کر آئے تھے۔ یہ دکھانا بھی مطلوب تھا کہ یہ کام وہ ذمہ داری سے کرتے رہے تھے محض شوق کے طور پر نہ کرتے تھے۔ اب دیکھئے وہ اپنی مسئولیت کے مطابق جواب دے رہے ہیں۔ اپنی ڈیوٹی' فریضہ رسالت' اپنی قوم کی بابت جواب دے رہے تھے جنہوں نے ان کی تکذیب کی تھی۔

رہے رسول تو وہ اعلان کر رہے ہیں کہ سچا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ اس لئے ان کے پاس جو تھوڑی سی معلومات ہیں ان کا اظہار وہ علام الغیوب خدا کے سامنے نہیں کرنا چاہتے یہ عدم واقفیت کا اظہار وہ محض ادب اور حیاء کی وجہ سے کر رہے ہیں اور اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

(قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (۵: ۱۰۹)) ”تو وہ عرض کریں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں' آپ ہی تمام پوشیدہ حقیقتوں کو جانتے ہیں۔“

---ooo---

رہے تمام دوسرے رسول' جن کو بعض لوگوں نے مانا اور بعض نے ان کی تکذیب کی' ان کی جانب سے سوال کا اصولی جواب ہی قبول کر لیا گیا۔ انہوں نے کہہ دیا کہ صحیح علم تو اللہ کے پاس ہے جو علام الغیوب ہے۔ انہوں نے اپنا اور اپنی قوم کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا۔ اس منظر میں ان رسولوں سے مزید کوئی سوال نہیں پوچھا جاتا۔ مزید ضمنی سوال صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہوتا ہے۔ ان سے یہ مزید سوال اس لئے کیا جاتا ہے کہ ان کے بارے میں' ان کے

بعد ان کی قوم سخت فتنے میں پڑگئی - ان کے بارے میں فضا کے اندر پیچیدگی پیدا ہوئی اور ان کی ذات کے بارے میں لوگ اوہام اور خرافات کا شکار ہوگئے - ان کی ذات' ان کی صفات' ان کی ولادت اور ان کی پرورش کے بارے میں ان کی قوم نے عجیب و غریب نظریات گھڑ لیے -

اب ان سے ان لوگوں کے سامنے پوچھا جاتا ہے' جو انہیں الٰہ سمجھتے تھے - ان کی عبادت کرتے تھے اور ان کی ذات اور ان کی والدہ کے ارد گرد انہوں نے غلط افکار کے ہالے قائم کیے تھے - ان کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ دیکھو تم پر اور تمہاری والدہ پر میں نے کس قدر انعامات اور اکرامات کیے - یہ کہ تمہیں بہت سے معجزات عطا کیے کہ لوگ تم پر ایمان لے آئیں - بعض لوگوں نے ان کی سخت تکذیب کی - بعض لوگ ان آیات و معجزات کو دیکھ کر سخت فتنے میں پڑ گئے اور انہیں الٰہ بنا دیا - حالانکہ یہ آیات و معجزات تو اللہ کے عطا کردہ تھے اور جن باتوں کا ظہور ان کے ہاتھوں ہوا تھا وہ اللہ کی تائید و نصرت سے ہوا تھا -

---ooo---

درس نمبر ۵۴ تشریح آیات

۱۰۹ ---- تا ---- ۱۲۰

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ
اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾ اِذْ قَالَ
اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَ عَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ
بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۟ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا ۚ وَ اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ
وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۚ وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ
بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ وَ تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ
بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ
اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ
مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾ وَ اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَ بِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْۤا اٰمَنَّا
وَ اشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

جس روز اللہ سب رسولوں کو جمع کر کے پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب دیا گیا' تو وہ عرض کریں گے کہ ہمیں علم نہیں' آپ ہی پوشیدہ حقیقتوں کو جانتے ہیں۔

"پھر تصور کرو اس موقع کا جب اللہ فرمائے گا کہ "اے مریم کے بیٹے عیسیٰ' یاد کر میری اس نعمت کو جو میں نے تجھے اور تیری ماں کو عطا کی تھی۔ میں نے روح پاک سے تیری مدد کی' تو گہوارے میں بھی لوگوں سے بات کرتا تھا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی' میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دی' تو میرے حکم سے مٹی کا پتلا پرندے کی شکل کا بناتا اور اس میں پھونکتا تھا اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا۔ تو مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا

کرتا تھا' تو مردوں کو میرے حکم سے نکالتا تھا۔ پھر جب تو بنی اسرائیل کے پاس صریح نشانیاں لے کر پہنچا اور جو لوگ ان میں سے منکر حق تھے انہوں نے کہا کہ یہ نشانیاں جادوگری کے سوا اور کچھ نہیں ہیں تو میں نے ہی تجھے ان سے بچایا اور جب میں نے حواریوں کو اشارہ کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تب انہوں نے کہا "ہم ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں۔"

یہ حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ پر ہونے والی انعامات کی یاد دہانی ہے۔ یہ کہ روح القدس کے ذریعہ ان کی امداد کی گئی۔ یہ کہ گہوارے کے اندر انہیں لوگوں کے ساتھ بات کرنے کی قدرت دی گئی اور اس طرح انہوں نے اپنی ماں کو تہمتوں سے بری الذمہ قرار دیا۔ کیونکہ ان کی بے مثال ولادت کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں بے شار شبہات پیدا ہو گئے تھے اور پھر بڑے ہو کر بھی ان سے ہمکلام ہوئے اور انہیں دعوت الی اللہ دی۔ دعوت اسلامی میں بھی حضرت جبرائیل ان کی تائید کرتے رہے اور آپ کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے رہے۔ جب وہ اس جہان پر اترے تھے تو ان کے پاس کوئی علم نہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں لکھنا سکھایا' انہیں معاملات کے اندر فیصلے کرنے کی حکمت عطا کی۔ اللہ نے انہیں تورات کا علم بھی عطا کیا' جو بنی اسرائیل کے پاس موجود تھی۔ انجیل کا علم بھی دیا جو ان پر نازل ہوئی اور اس نے بھی تورات کی تصدیق کی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انکو ایسے خارق العادات معجزات دیئے جن کا صدور اذن الہی کے سوا ممکن نہ تھا۔ دیکھئے کہ وہ کیچڑ سے پرندہ بناتے ہیں اور پھر یہ اذن الہی سے ہوتا ہے کہ آپ اس کے منہ میں پھونکتے ہیں اور وہ زندہ ہو جاتا ہے۔ ہمیں ان معجزات کی ماہیت کا پتہ نہیں ہے' اس لئے کہ ہم تو آج تک یہ نہیں جان سکے کہ حیات کی حقیقت کیا ہے؟ اور یہ حیات زندہ چیزوں کے اندر کس طرح پھیل جاتی ہے۔ اب دیکھئے مادر زاد اندھا آتا ہے اور اللہ کے حکم سے اسے بینائی ملتی ہے جبکہ آج تک اطباء اس بات کو پا نہیں سکے کہ مادر زاد اندھے کو بینائی کس طرح مل گئی۔ لیکن اللہ جس نے بینائی کا اصل نظام پیدا کیا وہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ کسی کو از سرنو بینائی دے دے۔ مرض کا علاج آپ بغیر کسی دوائی کے کرتے تھے۔ دوا تو ایک وسیلہ ہے جس کا اثر بھی اللہ کے اذن سے ہوتا ہے لیکن اللہ کے حکم سے وسیلہ بدل بھی سکتا ہے' اور اللہ بلاوسیلہ براہ راست بھی ایک حقیقت کو وجود میں لا سکتا ہے۔ اللہ اپنے حکم سے مردے کو زندہ کر سکتا ہے' وہ زندگی بخشنے والا ہے۔ وہ دوبارہ بھی زندہ کر سکتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو یہ یاد دہانی کراتے ہیں کہ وہ دلائل و بینات اور خوارق و معجزات لے کر بنی اسرائیل کے پاس آئے اور انہوں نے پھر بھی آپ کو جھٹلایا اور انہوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ یہ معجزات واضح سحر ہے۔ اس لئے کہ وہ ان معجزات کے وقوع کا انکار تو کر نہ سکتے تھے۔ ہزاروں انسانوں نے ان معجزات کو دیکھا ہوا تھا۔ یہ لوگ محض عناد اور غرور کی وجہ سے ان معجزات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ پھر انہوں نے آپ کو قتل کرنا چاہا تو اللہ نے آپ کو بچایا۔ پھر اللہ تعالیٰ انہیں یاد دلاتے ہیں کہ ایسے مشکل حالات میں حواریوں نے جرأت کی اور وہ ایمان لائے اور شہادت دی اور صحیح مسلمان بن گئے اور اللہ کو گواہ ٹھہرایا کہ وہ سر تسلیم خم کرنے والے ہیں۔

(وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِىْ وَبِرَسُوْلِىْ قَالُوْا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ (۵: ۱۱۱)) "اور جب میں نے حواریوں کو اشارہ کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تب

انہوں نے کہا "ہم ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں۔" یہ ہیں وہ انعامات جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ ابن مریم پر کیے اور یہ ان کے لئے شواہد و بینات تھے لیکن ان کے متبعین کی اکثریت کے لئے یہ گمراہی اور ضلالت کا باعث بن گئے۔ اور ان کی وجہ سے انہوں نے عظیم گمراہیاں گھڑ لیں اور دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے عالم بالا کے اس منظر میں اس کی جواب طلبی کرتے ہیں' اس منظر میں انبیاء و رسل موجود ہیں اور تمام دنیا کے لوگ بھی حاضر ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی تمام قوم بھی موجود ہے۔ ان کے سامنے یہ حقائق پیش کیے جاتے ہیں تاکہ ان کی قوم بھی سنے اور ان کے لئے شرمساری ذرا اور سخت ہو جائے۔ وہ تمام جہانوں کے سامنے شرمندہ ہوں۔

اب بات اسی لائن پر آگے چلتی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کے اوپر کئے جانے والے احسانات کے ساتھ۔ وہ احسانات بھی گنوائے جاتے ہیں جو آپ کی قوم پر کیے گئے۔ انہیں بھی معجزات دکھائے گئے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا اور حواری ایمان لائے اور انہوں نے شہادت دی۔

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ
يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَن يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ۖ قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ
إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١١٢﴾ قَالُوا نُرِيدُ أَن نَّأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ
الربع أَن قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشَّٰهِدِينَ ﴿١١٣﴾ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ
اللَّهُمَّ رَبَّنَآ أَنزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِّأَوَّلِنَا
وَءَاخِرِنَا وَءَايَةً مِّنكَ ۖ وَارْزُقْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الرَّٰزِقِينَ ﴿١١٤﴾ قَالَ اللَّهُ إِنِّي
مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۖ فَمَن يَكْفُرْ بَعْدُ مِنكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُۥ عَذَابًا لَّآ أُعَذِّبُهُۥٓ أَحَدًا
۱۵ ع ۷ ۵ مِّنَ الْعَٰلَمِينَ ﴿١١٥﴾

(حواریوں کے سلسلے میں) یہ واقعہ بھی یاد رہے کہ جب حواریوں نے کہا "اے عیسیٰ ابن مریم' کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتار سکتا ہے؟" تو حضرت عیسیٰ نے کہا اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ انہوں نے کہا "ہم بس یہ چاہتے ہیں کہ ہم اس خوان سے کھانا کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپ نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ سچ ہے اور ہم اس پر گواہ ہوں۔" اس پر عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی "خدایا! ہمارے رب' ہم پر

آسمان سے ایک خوان نازل کر' جو ہمارے لئے اور ہمارے اگلوں پچھلوں کے لئے خوشی کا موقع قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو' ہم کو رزق دے اور تو بہترین رازق ہے۔" اللہ نے جواب دیا "میں اس کو تم پر نازل کرنے والا ہوں مگر اس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے گا اسے میں ایسی سزا دوں گا جو میں نے کسی کو نہ دی ہو گی۔"

اس گفتگو سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کا مزاج کیسا تھا اور ان میں سے مخلص لوگ کس مزاج کے تھے یعنی آپ کے حواری۔ ان حواریوں اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے درمیان بہت بڑا فرق تھا۔ ان حواریوں کے دلوں میں اللہ نے بطور الہام ایمان کا القاء کر دیا تھا۔ وہ ایمان لائے اور انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے ایمان پر گواہ ٹھہرایا۔ ان حقائق کے ساتھ ساتھ اب دیکھئے کہ اس الہام اور معجزات کے دیکھتے ہوئے وہ پھر ایک نئے معجزے کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ ان کے دل مطمئن ہو جائیں اور وہ جان لیں کہ حضرت عیسیٰ سچے ہیں اور اب وہ عیسیٰ کے بعد اس دعوت کو پھیلائیں گے۔

اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ ہے کہ اسلام لانے کے بعد وہ آپ سے کوئی ایک معجزہ بھی طلب نہیں کرتے۔ جونہی ان کے دلوں میں ایمان داخل ہوا وہ مطمئن ہو گئے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی اور اس تصدیق پر انہوں نے کسی برہان و دلیل کا مطالبہ نہیں کیا۔ انہوں نے حقانیت رسول کی شہادت صرف قرآن کو پڑھ کر دے دی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حواریوں کے درمیان یہ ایک عظیم فرق ہے۔ وہ ایک سطح پر ہیں اور یہ دوسری سطح پر ہیں۔ لیکن یہ بھی مسلمان ہیں اور وہ بھی مسلمان ہیں۔ یہ بھی اللہ کے ہاں برگزیدہ ہیں اور وہ بھی برگزیدہ ہیں لیکن جس طرح اللہ نے چاہا دونوں کی سطح میں بہت ہی فرق رکھا بہت بڑا فرق۔

"کھانے کے اس خوان کا ذکر قرآن میں ہوا ہے لیکن نصاریٰ کے لٹریچر میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ نہ ان اناجیل میں اس کا ذکر ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد لکھی گئیں اگرچہ بہت بعد میں لکھی گئیں۔ اس قدر طویل عرصے میں نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے اندر واقعات کی صحیح رپورٹنگ کی گئی ہو گی۔ نیز ان اناجیل کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض علماء نے ان روایات کو نقل کیا ہے اور ان میں انہوں نے حضرت عیسیٰ کی سیرت کے واقعات نقل کئے ہیں۔ اس لئے یہ روایات اس کلام پر مشتمل نہیں جو اللہ نے اتارا تھا اور اس کا نام انجیل رکھا تھا۔

البتہ ان اناجیل میں اس خوان کے قصے کو دوسرے انداز میں نقل کیا ہے' "متی کی انجیل کے اصحاح ۱۵ کے آخر میں آتا ہے۔ یسوع نے اپنے شاگردوں کو بلایا اور کہا مجھے سب کے بارے میں اندیشہ ہے کیونکہ ان کے لئے صرف تین دن ہیں جو میرے ساتھ چلیں گے اور ان کے پاس خوراک بھی نہیں ہے۔ اور میں یہ بھی نہیں کر سکتا کہ انہیں روزے کی حالت میں واپس کروں کیونکہ راستے میں ان کے لئے پریشانی ہو گی۔ ان سے اس کے تلامذہ نے کہا ہماری تعداد زیادہ ہے اور ہم کہاں سے کھانا پا سکتے ہیں۔ ان سے یسوع نے کہا تمہارے پاس کس قدر روٹیاں ہیں۔ انہوں نے کہا: سات روٹیاں اور کچھ چھوٹی مچھلیاں۔ آپ نے سب سے کہا کہ وہ زمین پر سہارا لے کر بیٹھ جائیں۔ آپ نے روٹی اور مچھلیاں لیں۔ شکر ادا کیا اور انہیں توڑا۔ انہوں نے یہ روٹیاں شاگردوں کو دیں اور انہوں نے سب کو کھلائیں اور سب سیر ہو گئے اور جب روٹیاں اٹھائیں تو سات تھال بھرے ہوئے تھے اور کھانے والے چار ہزار تھے جن میں عورتوں اور بچوں کا شمار نہ

کیا گیا تھا' ایسی ہی روایات دوسری اناجیل میں بھی آئی ہیں۔

بعض تابعین کا خیال ہے کہ یہ مائدہ نہیں اترا۔ مجاہد اور حسن اس طرف گئے ہیں' کیونکہ جب حواریوں نے یہ سنا "میں اتارنے والا ہوں لیکن اس کے بعد جس نے کفران نعمت کیا تو اسے میں ایسی سزا دوں گا جیسی تمام جہان والوں میں کسی کو نہ دی گئی تھی۔" تو وہ ڈر گئے اور انہوں نے اپنا یہ مطالبہ واپس لے لیا تھا۔

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں "لیث نے بذریعہ ابن سلیم مجاہد سے یہ روایت کی ہے کہ یہ ایک مثال تھی جو اللہ نے یہاں بیان کی ورنہ کوئی طعام اترا نہیں تھا۔" ابن جریر نے حارث' قاسم' حجاج ابن جریج کے ذریعہ مجاہد سے یہ روایت کی ہے کہ یہ ایک دستر خوان تھا جس کے اوپر کھانا ہو۔ انہوں نے اس مطالبے کو واپس لے لیا تھا جب انہیں بتایا گیا کہ ان پر عذاب آ جائے گا اگر اس کھانے کے آنے کے بعد انہوں نے ناشکری کی۔ انہوں نے ابو اللیث' محمد ابن جعفر' شعبہ' منصور ابن زاذان کے واسطہ سے حسن سے یہ روایت کی ہے کہ مائدہ نازل نہیں ہوا تھا۔ بشر' یزید اور سعید کے واسطہ سے قتادہ کی یہ روایت ہے کہ حسن کہتے تھے کہ جب انہیں کہا گیا کہ اگر اس کے بعد انہوں نے کفران نعمت کیا تو انہیں ایسی سزا دی جائے جو عالمین میں سے کسی کو نہ دی گئی تھی تو انہوں نے ڈر کر کہا کہ ہمیں ایسے مائدہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر پھر یہ مائدہ نازل نہ ہوا۔

لیکن سلف صالحین میں سے اکثریت کی رائے یہ ہے کہ یہ کھانا نازل ہوا تھا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے الفاظ یہ استعمال کئے ہیں۔ (اِنِّیْ مُنَزِّلُھَا عَلَیْکُمْ (۵:۱۱۵)) (میں اسے تم پر نازل کرنے والا ہوں) یہ اللہ کی طرف سے ایک قسم کا وعدہ ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ خود قرآن کریم کے الفاظ اس رائے کی تائید کرتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ یہی درست ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حشر کے میدان میں اپنی قوم کے سامنے ایک عظیم جلسہ میں یاد دلاتے ہیں کہ میں نے تم پر یہ یہ انعامات کئے۔

(اِذْ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ھَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّکَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ (۵:۱۱۲)) "یہ واقعہ بھی یاد رہے کہ جب حواریوں نے کہا "اے عیسیٰ ابن مریم' کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتار سکتا ہے۔ حواری حضرت عیسیٰ کے تلامذہ تھے' غریب لوگ تھے اور آپ کے بارے میں زیادہ جانتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آپ انسان ہیں۔ جانتے تھے کہ آپ ابن مریم ہیں اور آپ کے بارے میں جو کچھ جانتے تھے وہی کہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ حضرت عیسیٰ رب نہیں ہیں بلکہ وہ رب کے پروردہ بندہ ہیں۔ یہ کہ وہ ابن اللہ نہیں ہیں' بلکہ ابن مریم اور اللہ کے بندے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ رب وہی ہے جو حضرت عیسیٰ کے ہاتھ پر ان معجزات کا صدور کر رہا ہے۔ وہ ان معجزات میں سے کوئی بات از خود صادر نہیں کر سکتے۔ اپنی ذاتی قدرت کے ساتھ۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے ان سے یہ مطالبہ کیا کہ آپ ان پر آسمان سے خوان اتاریں تو انہوں نے یہ مطالبہ حضرت عیسیٰ سے نہ کیا۔ اس لئے کہ وہ بذات خود قدرت نہ رکھتے تھے بلکہ انہوں نے مطالبہ ان الفاظ میں کیا۔

(یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ھَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّکَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ

السَّمَآءِ (۵: ۱۱۲) ”اے عیسیٰ ابن مریم کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے خوان اتار سکتا ہے۔ اب لفظ (هَلْ يَسْتَطِيْعُ) ؟ میں مختلف تاویلات سامنے آتی ہیں۔ سوال یہ تھا کہ ایمان اور کلمہ شہادت کے بعد وہ یہ سوال کیسے کر سکتے ہیں جبکہ وہ اپنے اسلام پر خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شاہد ٹھہراتے ہیں۔ یستطیع کا مفہوم یہ بھی بتایا گیا ہے ھل یقدر ؟ لیکن مقصد وہ نتیجہ ہے جو اس قدرت اور استطاعت کے نتیجے میں آسکتا ہے یعنی آسمان سے خوان۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ سے یہ طلب کر رہے تھے کہ اگر وہ طلب کریں تو کیا اللہ ان کے مطالبے کو پورا کرے گا۔ ایک قرات (هَلْ تَسْتَطِيْعُ رَبَّكَ) یعنی کیا آپ کو یہ سوال کرنے کا اختیار ہے کہ آپ نزول مائدہ کا سوال کریں۔ بہرحال مفہوم جو بھی ہو حضرت عیسیٰ نے جواب میں انہیں تنبیہ کی کہ وہ ایسے سوالات نہ کریں اور خدا سے ڈریں۔

(قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۵: ۱۱۲) (تو عیسیٰ نے کہا اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔) لیکن حواریوں نے دوبارہ مطالبہ کیا۔ اور انہوں نے اپنے مطالبے کی غرض و غایت بھی بتا دی :

(قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ (۵: ۱۱۳) انہوں نے کہا ”ہم بس یہ چاہتے ہیں کہ اس خوان سے کھانا کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپ نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ سچ ہے اور ہم اس پر گواہ ہوں۔“

وہ بہرحال یہ مائدہ کھانا چاہتے تھے جس کی کوئی نذیر زمین پر نہ ہو اس لئے کہ ان کے دل مطمئن ہو جائیں اور وہ اپنی آنکھوں کے سامنے یہ معجزہ ہوتے دیکھیں اور انہیں یقین ہو جائے کہ حضرت عیسیٰ نے ان سے سچ کہا۔ پھر وہ خود اپنی باقی ماندہ قوم کے لئے گواہ ہو جائیں کہ یہ عظیم معجزہ سرزد ہوا۔ یہ تمام امور اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کے حواریوں کا مقام و معیار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حواریوں سے ذرا کم تھا۔ اگر دونوں کرداروں کا باہم موازنہ کیا جائے تو صحابہ محمد کا مقام نہایت ہی ممتاز نظر آتا ہے۔

اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے سامنے دست بدعا ہوتے ہیں :

(قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۵: ۱۱۴)) ”اس پر عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی ”خدایا! ہمارے رب، ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل کر جو، ہمارے لئے اور ہمارے اگلوں پچھلوں کے لئے خوشی کا موقع قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو، ہم کو رزق دے اور تو بہترین رازق ہے۔“

جیسا کہ سیاق کلام میں بار بار اس بات کو دہرایا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا نہایت ہی مؤدبانہ ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ ایک مختار بندہ اپنے رب اور اپنے آقا کے ساتھ نہایت ہی رازدارانہ انداز میں بات کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ”اے اللہ“ ”اے ہمارے رب“ کے الفاظ کے ساتھ دعا شروع کرتے ہیں۔ اے اللہ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ہمارے اوپر آسمان سے خوان نازل فرما۔ اور یہ خوان ایسا ہو کہ ہمارے لئے خوشی اور انبساط کا سبب بنے اور وہ

ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لئے سامان فرحت ہو۔ نیز یہ آپ کے خصوصی رزق سے ہو۔ اور آپ رزق دینے والوں میں سے حقیقی رازق ہیں۔ حضرت عیسیٰ جانتے ہیں کہ وہ بندے ہیں اور اللہ ہی رب العالمین ہے اور یہ اعتراف وہ ایک کھلی مجلس اور دربار میں کرتے ہیں۔ یہ کھلی مجلس دربار قیامت میں ہے اور حضرت کی قوم کے سامنے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ ابن مریم کی دعا کو قبول کر لیا۔ لیکن اس قبولیت دعا کو سنجیدگی کا عنصر بھی دے دیا جو حضرت عیسیٰ کے شایان شان تھا۔ انہوں نے ایک معجزے کا مطالبہ کیا۔ اللہ نے اسے قبولیت بخشی لیکن یہ شرط عائد کر دی کہ اگر اس کے بعد کسی نے کفران نعمت کیا تو اسے شدید عذاب کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس قدر شدید جس کی کوئی مثال نہ ہو' اور ایسا عذاب کبھی کسی قوم پر نہ آیا ہو۔

(قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ فَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ (۵:۱۱۵)) اللہ نے جواب دیا "میں اس کو تم پر نازل کرنے والا ہوں' مگر اس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے گا اسے میں ایسی سزا دوں گا جو میں نے کسی کو نہ دی ہو گی۔" یہ سنجیدگی اللہ کی شان کے لائق ہے تاکہ معجزات کا مطالبہ ایک مذاق نہ بن جائے۔ اور یہ بھی نہ ہو کہ جن لوگوں کے سامنے بین اور معجز دلائل پیش ہوں اور پھر بھی وہ کفر کریں تو انہیں عذاب الہی کا سامنا کرنے کا خوف تو ہو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ جن اقوام نے معجزات طلب کئے ہیں اور پھر انہوں نے سچائی کو تسلیم نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ضرور ہلاک کیا ہے۔ رہی آیت زیر بحث تو ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد دنیا کا عذاب ہو اور اگر یہاں نہ ہو تو آخرت کا عذاب ہو۔

اب اس تنبیہ اور تخویف کے بعد یہاں سیاق کلام خاموش ہے کہ آیا یہ خوان اترا یا نہیں اور روئے سخن اپنے اصل موضوع کی طرف پھر جاتا ہے۔ یعنی الوہیت اور ربوبیت کے اصل موضوع کی طرف کیونکہ اس سبق کا اصل موضوع یہی ہے۔ یہ عظیم دربار ابھی تک جاری ہے اور لوگ اس کا تماشا کر رہے ہیں۔ چاہیے کہ ہم ذرا اس کی طرف لوٹیں اور براہ راست سوال و جواب سے لطف اندوز ہوں۔ اب اللہ تعالیٰ اس دربار میں حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ مریم کی الوہیت کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے وہ پیروکار بھی موجود ہیں جنہوں نے ان کو اور ان کی والدہ کو الہ سمجھا تھا تاکہ وہ سنیں اور ان کے سامنے حضرت ان کے لغو عقائد سے براءت کا اظہار کریں۔ یہ جواب نہایت ہی خوفناک فضا پیدا کرتا ہے۔ ذرا ملاحظہ ہو:

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ

وَلَآ اَعۡلَمُ مَا فِیۡ نَفۡسِکَ ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ ﴿۱۱۶﴾ مَا قُلۡتُ لَهُمۡ اِلَّا مَاۤ
اَمَرۡتَنِیۡ بِهٖۤ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیۡ وَ رَبَّکُمۡ ۚ وَکُنۡتُ عَلَیۡهِمۡ شَهِیۡدًا مَّا دُمۡتُ
فِیۡهِمۡ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیۡتَنِیۡ کُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِیۡبَ عَلَیۡهِمۡ ؕ وَ اَنۡتَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ
شَهِیۡدٌ ﴿۱۱۷﴾ اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُکَ ۚ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ
الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۱۸﴾

”غرض جب (یہ احسانات یاد دلا کر) اللہ فرمائے گا کہ ”اے عیسیٰ ابن مریم کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنالو؟“ تو وہ جواب میں عرض کرے گا کہ ”سبحان اللہ ' میرا یہ کام نہ تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا' اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوتا' آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ آپ کے دل میں ہے' آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے عالم ہیں۔ میں نے ان سے اس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا' یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ میں اسی وقت تک ان کا نگران تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا۔ جب آپ نے مجھے واپس بلا لیا تو آپ ان پر نگران تھے اور آپ تو ساری ہی چیزوں پر نگران ہیں۔ اب اگر آپ انہیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ غالب اور دانا ہیں۔“

اللہ تعالیٰ تو خوب جانتے تھے کہ حضرت عیسیٰ لوگوں کے سامنے کن عقائد کی تبلیغ کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس خوفناک دن میں یہ عظیم جواب طلبی اور پھر ایسے شخص سے جو ذمہ دار بھی نہیں ہے' اس لئے کی گئی کہ اس صالح بندے اور ان کی والدہ کو جو لوگ الہ تصور کرتے تھے' ان کا یہ پورا موقف اچھی طرح واضح ہو جائے اور وہ خوب شرمندہ ہوں۔

یہ اس قدر عظیم جسارت ہے کہ کوئی عام اور معقول انسان اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ خود الہ ہے۔ جبکہ وہ جانتا ہو کہ وہ بندہ ہے۔ ایک رسول اس قسم کا دعویٰ کب کر سکتا ہے اور پھر اولوالعزم رسولوں میں سے ایک رسول۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسا رسول۔ حالانکہ اللہ نے رسالت سے پہلے اور رسالت کے بعد اسے معجزات اور مقامات عطا کئے تھے اور ان پر عظیم انعامات کئے تھے اور اعزاز بخشے تھے۔ ایسے رسول کب ایسا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ ایک صالح اور راہ راست پر گامزن رسول۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت کی طرف سے نہایت ہی خشوع و خضوع کے ساتھ عاجزانہ جواب آتا ہے۔ نہایت ہی حمد و ثنا کے ساتھ (سُبۡحٰنَکَ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اَقُوۡلَ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِحَقٍّ (۵: ۱۱۶)) ”سبحان اللہ' میرا یہ کام نہ تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا۔“ اس طرح حضرت جلدی سے جواب دے دیتے ہیں کہ میں نے مطلقاً یہ بات نہیں کہی۔

حضرت عیسیٰ اپنی براءت پر اللہ کو گواہ ٹھہراتے ہیں اور اپنی عاجزی دکھاتے ہوئے اللہ کے خصائص الوہیت اور

بندے کے شایان عبودیت کے افعال بتاتے ہیں۔

(اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (۵:۱۱۶)) "اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوتا، آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ آپ کے دل میں ہے، آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے عالم ہیں۔"

اس قدر تسبیح اور پاکی بیان کرنے کے بعد اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ جرأت کرتے ہیں کہ وہ کوئی مثبت بات کریں اور یہ کہیں کہ انہوں نے ہرگز انہیں ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے۔ بلکہ انہوں نے تو یہ کہا ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور تم بھی سب صرف اللہ ہی کی بندگی کرو۔

(مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِهٖ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ (۵:۱۱۷)) "میں نے ان سے اس کی سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا، یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔" اور آپ علیہ السلام یہ فرماتے ہیں کہ میں تو ان پر نگران صرف اس وقت تک کے لئے تھا جب میں ان کے سامنے تھا۔ لیکن اپنی وفات کے بعد میں نگران نہ تھا۔ قرآن کی ظاہری آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے حضرت عیسیٰ کو وفات دی اور پھر اپنی طرف اٹھا لیا جبکہ بعض آثار میں یہ آتا ہے کہ آپ اللہ کے ہاں زندہ ہیں۔ میرے خیال میں دونوں قسم کے نصوص میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ زمین کی زندگی سے ان کا قطع تعلق ہو گیا ہو اور انہیں اٹھا لیا گیا ہو اور یہ بھی درست ہے کہ انہیں زندہ حالت میں اٹھا لیا گیا ہو کیونکہ شہداء بھی تو اللہ کے ہاں زندہ ہوتے ہیں اگرچہ دنیا سے ان کی زندگی کٹ جاتی ہے اگرچہ شہداء کی زندگی کی نوعیت کا ہمیں تفصیلی علم نہیں ہے۔ یہی صورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ میری وفات کے بعد مجھے علم نہ تھا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں؟

(وَكُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ (۵:۱۱۷)) "میں اسی وقت تک ان کا نگراں تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا۔ جب آپ نے مجھے واپس بلا لیا تو آپ ان پر نگران تھے اور آپ تو ساری ہی چیزوں پر نگران ہیں۔" حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں، کہ آپ چاہیں تو سزا دیں اور اگر آپ ان کو بخش دیں تو بھی آپ قادر مطلق ہیں۔ بہرحال وہ ہیں تیرے ہی بندے اور آپ ہی جانتے ہیں کہ ان کے لئے سزا مقرر ہے یا مغفرت۔

(اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۵:۱۱۸)) (اب اگر آپ انہیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ غالب اور

دانا ہیں۔) ذرا ملاحظہ تو کیجئے کہ اللہ کے یہ صالح اور مقرب بندے بارگاہ الوہیت میں کس قدر خوفزدہ ہیں اور ان لوگوں کی جرأت کو دیکھئے جنہوں نے یہ افتراء باندھا، جس سے حضرت عیسیٰ ابن مریم صاف صاف براءت کا اظہار کرتے ہیں اور ان لوگوں کی اس افتراء کی وجہ سے یہ بندہ اللہ کے سامنے اس طرح گڑگڑاتے ہوئے کلام کرتا ہے۔

ان لوگوں کے موقف کو دیکھئے اور اس عظیم دربار کو دیکھئے۔ اس دربار میں اپنے اس غلط موقف کی وجہ سے اس قدر ذلیل و حقیر نظر آتے ہیں کہ اس پورے مکالمے میں ان کے ساتھ کوئی بات نہیں کی جاتی اور نہ ان کی طرف کوئی التفات کیا جاتا ہے۔ شاید اس منظر میں شرمندگی اور ندامت کی وجہ سے یہ لوگ پسینہ پسینہ ہو گئے ہوں گے۔ جس طرح اللہ نے انہیں نظرانداز کیا ہم بھی انہیں اسی طرح چھوڑتے ہیں اور آیئے ذرا اس دربار کے آخری منظر کو دیکھیں۔

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۭ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾

"تب اللہ فرمائے گا "یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی نفع دیتی ہے، ان کے لئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، یہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہو اور وہ اللہ سے، یہی بڑی کامیابی ہے۔"

"یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی نفع دیتی ہے" یہ اللہ کی بات ہے اور جھوٹوں کی اس شرمندگی پر یہ خوب تبصرہ ہے۔ انہوں نے یہ افتراء باندھا اور یہ افتراء بھی اولوالعزم رسولوں میں ایک معزز رسول پر باندھا۔ اور مسئلہ الوہیت اور بندگی میں یہ افتراء باندھا جس کی اساس پر یہ پوری کائنات قائم ہے اور جس کی اساس پر دنیا میں سچائی قائم ہے اور تمام مخلوقات قائم ہے۔

"یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کے لئے ان کی سچائی مفید ہوگی۔" اس عظیم منظر اور شاہی دربار کے سوال و جواب کے آخر میں یہ رب العالمین کا فیصلہ ہے۔ تمام جہان کے لوگوں کی موجودگی میں اس منظر کے مکالمے کے یہ آخری الفاظ ہیں اور کس قدر فیصلہ کن الفاظ ہیں اور اس کے بعد پھر سچوں کے انجام کی ایک جھلکی بھی دکھائی دیتی ہے۔

(لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۵:۱۱۹)) "ان کے لئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، یہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے، یہی بڑی کامیابی ہے۔"

درجوں کے بعد بلند درجے، جنتیں، پھر ان میں دائمی زندگی اور پھر اللہ کی رضامندی یقیناً یہ بڑی کامیابی ہے۔"

ہم نے یہ منظر دیکھا اور یہ منظر قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز اور اسلوب میں پیش کیا۔ اس منظر کا آخری مکالمہ بھی ہم نے سنا۔ ہم نے گویا اس منظر کو دیکھا اپنی آنکھوں کے ساتھ اور سنا اپنے کانوں کے ساتھ۔ قرآن کریم

کے انداز تصویر کشی کے مطابق بات کا طریقہ یہ نہیں اختیار کیا جاتا ہے کہ ایسا ہو گا بلکہ عملاً منظر پیش کر دیا جاتا ہے۔ انسان کو اس منظر موعودہ کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ قرآن کریم محض خشک عبارت ہی پیش نہیں کرتا جسے صرف پڑھا جائے بلکہ وہ متحرک اور مجسم اور مشخص مناظر پیش کرتا ہے جس میں انسان چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور مکالمے ہوتے ہوئے اس طرح نظر آتے ہیں جس طرح اسکرین پر۔

ہماری سوچ اور ہمارے تصور کے مطابق تو یہ ایک منظر ہو گا جو واقع ہو گا' البتہ اللہ کے علم کے مطابق تو وہ ہو چکا۔ اس لئے کہ اللہ کا علم زمان و مکان کے حدود و قیود سے آزاد ہے۔ زمان و مکان کا تصور تو انسان کے محدود علم کے لئے ہے۔ ہمارا علم محدود اور فانی ہے۔

اس سبق کے آخر میں اور اس عظیم افتراء کے بیان کے خاتمے پر جس سے بڑا افتراء کسی رسول کے کسی پیروکار نے نہیں باندھا۔ حضرت مسیح کے پیروکاروں کی اس عظیم غلط فہمی کے بیان کے آخر میں' جس میں انہوں نے اس افتراء سے لاتعلقی کا اظہار کیا اور ان افتراء پردازی کرنے والوں کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا۔ اس کے بارے میں اس سوال و جواب اور اس سوال و جواب کے لئے قائم کئے گئے اس عظیم دربار کے خاتمے پر اب یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قسم کے افتراؤں سے پاک ہے اور زمین و آسمانوں پر صرف اسی کی حکومت ہے اور اس کی حکومت بے حد و بے قید ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا فِيْهِنَّ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
۱۲۰ قَدِيْرٌ ۝ ع ۵

”زمین اور آسمانوں اور تمام موجودات کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“

یہ ایک ایسا اختتامی تبصرہ ہے جو اس عظیم مسئلے کی بحث کے خاتمے کے لئے موزوں اور مناسب ہے۔ نیز اس عظیم منظر سے جو تاثر ملتا ہے اس کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے۔ یہاں اللہ وحدہ الٰہ ہے اور وہی قادر مطلق ہے۔ اس کے سامنے تمام رسول سر تسلیم خم کرتے ہیں اور سب رسول آخری فیصلہ اللہ کے سپرد کرتے ہیں اس میں حضرت عیسیٰ ابن مریم بھی اپنا فیصلہ اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں زمین و آسمان کی حکومت ہے۔

اور یہ آخری تبصرہ اس پوری سورت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اس سورہ کا مرکزی موضوع ”الدین“ ہے اور دین اور دینداری کا اظہار اللہ کی شریعت کی اطاعت میں ہوتا ہے۔ صرف اللہ کے قوانین و ضوابط اخذ کرنا اور صرف اسی کے مطابق فیصلے کرنا اس لئے کہ وہی بادشاہ ہے جس کے سوا کوئی بادشاہ نہیں ہے۔ زمین و آسمان کے درمیان جس قدر چیزیں بھی ہیں وہ اس کی مملوک ہیں اور یہ مالک اور بادشاہ یہ آرڈیننس جاری فرماتا ہے (وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ) ”اور جو شخص اس قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہ کافر ہے۔“ یہی ایک مسئلہ ہے اور یہ اللہ کی حاکمیت کا مسئلہ ہے۔ یہ عقیدۂ توحید کا مسئلہ ہے۔ اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کا مسئلہ ہے' جس کے بعد ہی مکمل توحید وجود میں آتی ہے اور صرف اللہ اللہ و حاکم قرار پاتا ہے۔

---ooo---

پارہ نمبر ۷

فی ظلال القرآن

پارہ ----- ۷

سورہ الانعام - ٦

آیت نمبر ۱ --- تا --- ۱۱۰

سورہ انعام ایک نظر میں

یہ سورہ کی سورتوں میں سے ہے اور یہ قرآن کا وہ حصہ ہے جو مکہ میں نازل ہوا۔ قرآن مجید کا جو حصہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوا' اس کا زمانہ نزول تیرہ سال ہے۔ اس پورے عرصے میں وحی کا محور اور مرکزی مضمون ایک ہی رہا اور کسی وقت اس میں تبدیلی نہ ہوئی' البتہ اسلوب بیان میں تبدیلی برابر ہوتی رہی۔ مضامین کو بار بار دہرایا گیا لیکن ہر مرتبہ نئے نئے اسلوب سے بات کی گئی اور سامعین کو یوں محسوس ہوا کہ گویا یہ بات آج ہی پہلی مرتبہ بیان ہو رہی ہے۔

یہ وہ دور تھا جب قرآن کریم ایک نہایت ہی اہم اور اساسی مسئلے کو حل کر رہا تھا۔ اس مسئلے پر اس نئے دین کی نیو اٹھنے والی تھی اور اس کا اظہار اس کے اساسی نظریات میں ہونے والا تھا۔ یعنی "حقیقت الوہیت' حقیقت عبودیت اور ان کا باہمی تعلق"۔ اس قضیہ کا حل بھی خالص انسانی نقطہ نظر سے مطلوب تھا۔ یہ کوئی وقتی حل نہ تھا بلکہ اس وقت کے عرب اور آج کے عرب یا اس وقت کے انسان اور آج کے انسان سب کے سب' اس کی رو سے ایک ہی حقیقت اور حیثیت کے حامل ہیں۔ چونکہ اس بحث کا محور اساسی سوالات یہ تھے کہ اس کائنات میں وجود انسانی کی کیا حقیقت ہے۔ اس کائنات کی کیا اصلیت ہے اور انسان اور کائنات اور انسان اور موجودات کے درمیان روابط کی کیا نوعیت ہے؟ اور پھر ان دونوں یعنی انسان اور موجودات اور ان کے خالق کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اس لئے نہ تو یہ مسائل وقتی نوعیت کے حامل تھے اور نہ ہی ان کا یہ حل وقتی نوعیت کا حامل ہو سکتا تھا بلکہ یہ خالص انسانی مسائل تھے اور یہ ان کا دائمی حل تھا۔

نزول قرآن کے مکی دور میں' جن سوالات کو چھیڑا گیا ان کا تعلق انسان اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی پوری کائنات سے تھا۔ یہ تفصیلات کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیوں آیا ہے؟ آخر کار اسے کہاں جانا ہے؟ کون ہے جو اسے ایک نامعلوم عدم سے لایا؟ کون ہے جو اسے یہاں سے لے چلے گا؟ پھر اس کا انجام کیا ہو گا؟ اس دور میں قرآن نے انسان کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ اس کائنات کی حقیقت پر غور کرے جسے وہ دیکھ رہا ہے اور محسوس کر رہا ہے۔ اس کے سامنے ایک مستور غیب ہے۔ وہ کائنات کو دیکھ بھی رہا ہے لیکن وہ اس کی کوئی معقول تعبیر نہیں کر سکتا کہ اس پر اسرار کائنات کا خالق کون ہے؟ کون اس حیرت انگیز نظم کو چلا رہا ہے؟ اس کا مدبر کون ہے؟ اور اس میں جو تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں ان کے پیچھے کس طاقت کا ہاتھ کام کر رہا ہے؟ مکہ مکرمہ میں قرآنی تعلیمات نے انسان کو بالتفصیل بتایا کہ اس کا تعلق اپنے رب سے کیا ہے؟ اس کا تعلق اس مخلوقات سے کیا ہے؟ اور یہ کہ انسانوں کے باہمی تعلقات کا مدار کس پہ رکھنا ہے؟ یہ مسئلہ چونکہ نہایت اہم' اساسی اور انسان کی پوری تاریخ اور حیات سے لے کر موت تک کی پوری زندگی سے تعلق رکھتا تھا' اس لئے' اس کی وضاحت اور بیان و تشریح میں قرآن کریم نے پورے تیرہ سال صرف کئے' کیونکہ یہ ایک ایسا اہم قضیہ تھا جس کے حل ہونے کے بعد' انسانی زندگی میں کوئی ایسا مسئلہ ہی نہیں رہتا جو حل طلب ہو۔

اس تیرہ سالہ دور میں قرآن نے کبھی بھی ان بنیادی مسائل کو چھوڑ کر اسلامی نظام حیات کی تفصیلات بیان نہیں

کیں۔جب یہ بالکل واضح ہو گیا کہ تحریک اسلامی کے کارکنوں کے دل و دماغ میں اسلامی نظام کے اساسی تصورات اچھی طرح جاگزیں ہو گئے ہیں' تو اس کے بعد تفصیلی تعلیمات شروع ہوئیں اور اس سے قبل' اس پورے عرصے میں صرف اس ممتاز گروہ یعنی صحابہ کرام کی تربیت ہوتی رہی جس نے آگے جاکر اقامت دین کا کام سنبھالنا تھا۔

اقامت دین کا طریق کار

ہمارے اس دور میں' جو لوگ اسلامی نظام حیات کے قیام اور احیاء کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں' میں ان کی توجہ قرآن کریم کے اس خاص اسلوب کی طرف مبذول کراؤں گا۔ انہیں غور کرنا چاہئے کہ قرآن کریم نے پورے تیرہ سال تک کیوں صرف عقائد و نظریات اور دین کے صرف اساسی مسائل سے بحث کی اور اس پورے عرصے میں کبھی بھی اسلامی نظام حیات کی تفصیلات کو نہ چھیڑا گیا' نہ ہی وہ احکام اور قوانین بیان کئے گئے جنہیں آگے جاکر اسلامی معاشرے میں نافذ ہونا تھا۔اس طریق کار کی تہ میں یہ حکمت کارفرما تھی کہ اللہ تعالیٰ' حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخالفین کے درمیان سب سے پہلے نظریاتی جنگ کا فیصلہ کرانا چاہتے تھے۔چنانچہ آپ نے اپنی دعوت کا آغاز (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) سے کیا جس کے مفہوم کو عرب اچھی طرح جانتے تھے۔اس کا اعلان ہوتے ہی ایک نظریاتی جنگ چھڑ گئی اور حضور نے لوگوں کے سامنے یہ دعوت پیش کرنا شروع کر دی کہ وہ تمام الٰہوں' ارباب اور دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف ایک ہی رب کی عبادت کریں۔

عرب اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی زبان میں (اِلٰہَ) کے کیا معنی ہیں؟ اور (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) کے کیا معنی ہوتے ہیں۔وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ الٰہ تو وہ ہوتا ہے جو انسان کی تکوینی زندگی پر بھی حاکم ہو اور تشریعی زندگی بھی اسی کے زیر نگیں ہو۔اگر ہم اس کا اقرار کر لیتے ہیں تو اس کا اولین اثر یہ ہو گا کہ ہمارے ہاتھ سے امارتیں اور سیادتیں سب چلی جائیں گی اور اس کے بعد قلب و ضمیر' دل و دماغ' احساس و شعور' عدالت و امارت' تجارت و معیشت غرض روح و بدن سب پر صرف ایک خدا اور حاکم مطلق کی فرمان روائی ہو گی۔چنانچہ کلمہ طیبہ کو سنتے ہی وہ تاڑ گئے کہ یہ کلمہ نہ صرف یہ کہ ان کے اختیارات حاکمیت کے خلاف اعلان جنگ ہے بلکہ وہ مستقبل قریب میں ان کی عادات و اطوار اور رسم و رواج کو بھی یکسر بدل کر رکھ دے گا۔بہرحال وہ عرب تھے اور اہل لسان ہونے کی حیثیت سے یہ اچھی طرح محسوس کر رہے تھے کہ (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) ان کے لئے کیا کیا مشکلات پیدا کرنے والا ہے۔انہوں نے اس کلمہ کو سنتے ہی اس کا سخت ترین نوٹس لیا' جس سے تاریخ کا ہر طالب علم خوب واقف ہے۔ یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ کفر و اسلام کی اس جنگ کا آغاز اس قدر پیچیدہ نظریاتی جنگ سے کیوں کیا گیا جب کہ بظاہر یہ بات ذہن میں نہیں آتی تھی کہ یہ نظریات عربوں کو اپیل کریں گے۔

قومی تحریک کا راستہ

یہ سوال اور بھی قابل توجہ ہو جاتا ہے' جب ہم غور کریں کہ دعوت اسلامی کے آغاز کے وقت جزیرۃ عرب کے

مخصوص سیاسی حالات کیا تھے؟ جس وقت حضور نے دعوت اسلامی کا آغاز کیا تو سرزمین عرب کے سب سے آباد اور شاداب علاقے' عربوں کے بجائے دوسری اقوام کے قبضے میں تھے۔ شمال میں شام سے متصل علاقوں پر رومیوں کا قبضہ تھا اور ان کی جانب سے ان پر عرب حکمران حکومت کر رہے تھے۔ جنوب میں یمن پر ایرانیوں کی حکومت تھی اور عربوں کے پاس صرف حجاز' تہامہ اور نجد کے علاقے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے پاس فقط صحرائے عرب کی چند متفرق سرسبز پٹیاں تھیں۔

ان حالات کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے مقبول اور قابل اعتماد شخص کے لئے مناسب یہ تھا کہ وہ ان حالات میں عربی قومیت کا نعرہ بلند کرتے' عرب کے منتشر قبائل کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرتے' ان کی خانہ جنگیاں ختم کرتے' جنہوں نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا تھا۔ اس طرح آپ کے لئے بسہولت یہ ممکن تھا کہ آپ شمال کی جانب رومی اور جنوب کی طرف سے ایرانی استعمار کے خلاف صف آراء ہو جاتے' عرب کے خونی رشتوں سے اپیل کرتے اور پورے جزیرۃ العرب کو ایک قومی وحدت میں جمع کر دیتے۔ یہ کام حضور کے لئے اس وجہ سے بھی آسان تھا کہ آپ قریش جیسے معزز قبیلے کے چشم و چراغ تھا۔ آپ کے پورے قبیلے نے حجر اسود کے جھگڑے میں آپ کو فیصل بھی مقرر کر دیا تھا اور پندرہ سال تک آپ کو ثالث بھی مان چکے تھے۔

اگر آپ اپنی تحریک کا آغاز اس طرح کرتے تو تمام عرب فی الفور آپ کی دعوت پر لبیک کہہ دیتے' اور اس طرح آپ کو پورے تیرہ سال تک خود غرض حکمرانوں اور شیوخ و امراء کا جانکا مقابلہ نہ کرنا پڑتا اور جس وقت پورا جزیرۃ العرب آپ کے زیرنگیں ہو جاتا اور اقتدار اعلیٰ آپ کے ہاتھوں میں آ جاتا تو آپ اپنی پوری طاقت سے لوگوں کو وہ تعلیم دینا شروع کر دیتے' جس کے ساتھ باری تعالیٰ نے آپ کو ہدایت بشریت کے لیے بھیجا تھا' اور آپ بسہولت لوگوں کو بتا سکتے کہ لوگو! انسانوں کی اطاعت اور بندگی کے بجائے صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو اور شرک سے باز آ جاؤ۔

لیکن اللہ تعالیٰ علیم و خبیر تھا' اس کا منصوبہ کچھ اور ہی تھا' اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کا اعلان کر دیں' اسلامی تاریخ ہمارے سامنے ہے کہ حضور اور آپ کے ساتھیوں نے کس طرح باطل کے خلاف واضح نظریاتی جنگ کا اعلان کیا اور اس کے نتیجے میں' بے حد و حساب مصائب برداشت کئے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب نہ تھا کہ خواہ مخواہ' حضور اور آپ کے مٹھی بھر ساتھیوں کو مصیبت میں مبتلا کریں بلکہ یہی ایک صحیح مستقیم اور متین طریق کار تھا جسے اپنانا ضروری تھا۔ نیز اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب نہ تھا کہ انسانیت کو رومی طاغوت یا فارسی طاغوت کے چنگل سے چھڑا کر عربی طاغوت کے زیرنگیں کر دیا جائے۔ طاغوت خواہ جس قوم و نسل سے بھی تعلق رکھتا ہو وہ بہرحال طاغوت ہے۔ مقصود یہ سمجھانا تھا کہ کائنات کا مالک صرف اللہ ہے اور اس پر اسی کی حکمرانی ہونا چاہیے۔ اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہونا چاہئے اور یہ کام صرف اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب اس سرزمین پر صرف (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کا علم بلند کیا جائے اور خداوند کریم کی بادشاہت کے مقابلے میں قائم ہونے والی تمام ایرانی' رومی اور عربی بادشاہتوں کو ختم کر دیا جائے۔ اس کلمے کی بنیاد پر جو اجتماعیت اور جو قومیت وجود میں آتی ہے وہ ایک نظریاتی قومیت ہوتی ہے اور اسے عربی' رومی اور ایرانی قومیت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ تھا وہ راز جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی قومیت کا نعرہ بلند کرنے کے بجائے نظریاتی کشمکش کے طریق کار کو اختیار کرنے کا حکم ہوا۔ یاد رکھئے! آج بھی ہمارے لئے بہترین طریق کار یہی ہے۔

---ooo---

معاشی مساوات کا راستہ

جس دور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اس وقت معاشی لحاظ سے دنیا کی حالت ناگفتہ بہ تھی - دولت کی مساوی تقسیم اور عدل و انصاف کا نام و نشان تک نہ تھا۔ دولت اور تجارت پر ایک چھوٹی سی اقلیت نے قبضہ کر رکھا تھا اور یہ اقلیت اپنا پورا کاروبار سودی نظام کے مطابق چلا رہی تھی ' اس لئے اس کی دولت میں بڑی تیز رفتاری سے اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس ایک عظیم اکثریت تھی جو فقر و فاقہ اور غربت و افلاس کا شکار تھی - جو لوگ دولت و ثروت پر قبضہ جمائے ہوئے تھے ' وہی سوسائٹی میں اونچے مناصب پر بھی براجمان تھے اور عام لوگوں کی حالت یہ تھی کہ نہ مایہ اور نہ سرمایہ -

ان حالات کے پیش نظر یہ ممکن تھا کہ حضور معاشی مساوات کا نعرہ بلند فرماتے - مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان طبقاتی کشمکش قائم ہو جاتی اور ایک عوامی تحریک برپا ہو جاتی۔ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جاتا اور لوگ موجودہ معاشی ناہمواریوں کو حل کرنے کے لئے ' آپ کے ساتھ ہو جاتے تاکہ امراء کی دولت فقراء میں بانٹ دی جائے - یہ راستہ دوسرے راستوں سے نسبتاً سہل بھی ہوتا کیونکہ اس نعرے سے پورا معاشرہ فی الفور دو گروہوں میں بٹ جاتا۔ ایک طرف دولت ' شرف اور اقتدار کی دست درازیوں سے نالاں ایک عظیم اکثریت ہوتی اور دوسری جانب ان برائیوں کی حامل ایک حقیر سی اقلیت - پھر وہ صورت حال پیش نہ آتی جو نظریاتی اعلان جنگ کی صورت میں پیش آئی کہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کرنے والی ایک کمتر سی اقلیت کے مقابلے میں پورا معاشرہ صف آرا ہو گیا۔ نیز یہ معاشی انقلاب برپا کرنے کے بعد جب اقتدار اعلیٰ آپ کے ہاتھ میں آ جاتا اور آپ اکثریت کے بل بوتے پر حکمران ہو جاتے تو آپ اقتدار اور اکثریت کے زور سے پوری آبادی سے اپنے وہ عقائد منوالیتے ' جو بحیثیت رسول خدا آپ لے کر آئے تھے اور اس طرح لوگ انسانوں کی غلامی سے نکل کر ایک خدا کی بندگی میں داخل ہو جاتے -

لیکن آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انقلاب کے لئے یہ راہ اختیار کرنے کی ہدایت نہیں کی ' کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تحریک اسلامی کے انقلابی کام کا طریق کار یہ نہ تھا اور اللہ تعالیٰ کو اس بات کا خوب علم تھا کہ صحیح معاشی نظام وہی ہوتا ہے جس کی کونپلیں صحیح نظریات سے پھوٹتی ہیں۔ صحیح نظریہ حیات صرف یہی ہے کہ ہر قسم کی حاکمیت کو صرف اللہ کے لئے مخصوص کر دیا جائے - اس نظریے کے مطابق ایک معاشرہ وجود میں آئے اور اس کا ہر رکن رضاکارانہ اور اطاعت گذارانہ طور پر اللہ جل شانہ کے ان احکام کی پابندی کرے جو اس نے اجتماعی انصاف ' معاشی کفالت اور دولت کی منصفانہ تقسیم کے بارے میں دیئے ہیں اور اس معاشرے میں کاروبار کرنے والے دونوں فریق یہ خیال کرتے ہوں کہ اس لین دین میں وہ اللہ کے احکامات نافذ کر رہے ہیں اور پھر یہ کہ ان احکامات کی اطاعت کر کے وہ دنیا و آخرت کی سرخروئی حاصل کر رہے ہیں۔ یہی ایک ایسی صورت ہے جس میں سے کوئی بھی حرص و آز کا شکار نہ ہو گا ' نہ کسی کے دل میں کسی کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوں گے - ایسے معاشرے میں ہر کام کے لئے قوت اور طاقت استعمال کرنے کی ضرورت نہ ہو گی اور لوگ اس معاشرے میں وہ گھٹن محسوس نہ کریں گے جو ہر اس معاشرے میں پائی جاتی ہے جس کی اساس (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) پر نہ رکھی گئی ہو۔

---○○○---

پارہ نمبر ۷

اخلاقی اصلاح کا راستہ

جب حضور اکرمؐ تشریف لائے 'تو عرب سوسائٹی' اخلاقی لحاظ سے قعر مذلت میں گری ہوئی تھی۔ چند بدویانہ فضائل اخلاق کو چھوڑ کر وہ کسی ضابطے کے پابند نہ تھے' زہیر بن ابی سلمی اخلاقی صورت حال کی عکاسی یوں کرتے ہیں۔

ومن لم يذ وعن حوضه بسلاحه

يهدم ومن لا يظلم الناس يظلم

(اور جو اپنے حوض کی حفاظت 'اپنے اسلحہ کے ذریعے نہیں کریں گے 'ان کے حوض کو منہدم کر دیا جائے گا اور جو لوگوں پر ظلم نہیں کرے گا' مظلوم بنے گا)"جاہلیت کا یہ متعارف قول تھا کہ "اپنے بھائی کی مدد کرو' خواہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔"

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے 'عربوں کی زندگی میں جو انقلاب برپا کیا' وہ اخلاق و عادات اور قواعد و قوانین تک ہی محدود نہ تھا بلکہ آپ نے عربوں کے ادب کی اصلاح بھی فرمائی۔ اس جملے کا مفہوم آپ نے یوں بدل دیا کہ مظلوم کی حمایت کرنا تو واضح ہے 'لیکن ظالم بھائی کی مدد یوں ہو سکتی کہ اسے ظلم سے باز رکھا جائے۔ چنانچہ اس قول کو اس معنوی ترمیم کے ساتھ حضور نے ادا فرمایا اور دور جاہلیت کا یہ قول ذخیرہ احادیث کا جزو بن گیا)۔

یہ شعر اس معاشرے کی اخلاقی صورت حال کی صحیح تعبیر تھا۔ شراب نوشی اور قمار بازی دونوں ان کی زندگی کا لازمہ تھیں اور یہ لوگ ان پر فخر کیا کرتے تھے۔ جاہلیت کی پوری شاعری عربوں کے ان اخلاق کی عکاسی کرتی ہے۔ بطور مثال طرفہ بن العبد کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

فلولا ثلاث هن من عيشه الفتي

وجدك لم احفل متي قام عودى

(اگر تین چیزیں نہ ہوتیں جو ایک نوجوان کے لئے سامان عیش ہیں تو تیرے سر کی قسم میں اپنی پوری زندگی میں کسی محفل میں شریک نہ ہوتا۔)

فمنهن سبقي العاذلات بشربه

كميت متي ما تعل بالماء تزبد

ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں شرمسار کنندہ عورتوں سے بھی آگے بڑھ کر کلیجی رنگ کی شراب کا جام اٹھا لیتا ہوں' جس میں اگر پانی ڈالا جائے تو کف آجائے۔

فما لذال تشرابي الخمور ولذتي

وبذلي و انفاقي طريفي وتالدى

میں ہمیشہ شراب نوشی اور لذت کوشی کا عادی ہوں اور مسلسل اپنی جدی دولت اور تازہ جمع کردہ دولت کو خرچ کرتا رہتا ہوں۔

الا ان تحامتني العشيرة كلها

وافردت افراد البعيد النمعبد

یہاں تک کہ میرا قبیلہ میری دشمنی پر اتر آیا اور میں اس طرح اکیلا ہو گیا جس طرح خارش زدہ اونٹ علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔

فسق و فجور' اپنی مختلف شکلوں کے ساتھ اس معاشرے میں وبا کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ عرب کیا بلکہ ہر قدیم و جدید جاہلی معاشرے کی یہ امتیازی خصوصیت رہی ہے کہ اخلاقی لحاظ سے وہ ایک فاجر اور فاسد معاشرہ ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث سے اچھی طرح ہوتا ہے جس میں آپ جاہلیت کی عائلی زندگی کی تفصیلات بتاتی ہیں۔ جاہلیت میں نکاح چار قسم کا ہوا کرتا تھا۔

(۱) ایک تو وہ نکاح جو آج ہمارے اندر رائج ہے۔ ایک آدمی کسی کی بیٹی یا اس کی زیر دست کا پیغام دیتا تھا اس کا مہر دے کر وہ اس سے نکاح کر لیتا تھا۔

(۲) دوسرا یہ کہ مرد اپنی بیوی سے کہتا تھا' جب وہ ایام ماہواری سے پاک ہو جاتی' کہ تو فلاں کے پاس چلی جا اور اس سے ہم بستری کر۔ مرد عورت سے علیحدہ رہتا تھا اور اسے چھوتا بھی نہ تھا یہاں تک کہ اس مرد سے اس کا حمل ٹھہر جاتا۔ جب حمل واضح ہو جاتا تو پھر یہ اس کے پاس جاتا جب چاہتا۔ یہ حرکت اس لئے کی جاتی تھی کہ نجیب النسب اولاد حاصل کی جائے۔ اس نکاح کو "نکاح استبضاع" کہتے تھے۔

(۳) اس کے علاوہ ایک تیسرا نکاح بھی ہوتا تھا۔ دس آدمیوں سے کم آدمی جمع ہو جاتے تھے اور وہ سب ایک ہی عورت کے پاس جاتے اور سب کے سب اس سے جماع کرتے۔ جب اس کا حمل ٹھہرتا اور وہ بچہ جن دیتی تو چند دن گزرنے کے بعد وہ سب کو بلا لیتی۔ قانون کے مطابق ہر ایک کو حاضر ہونا پڑتا۔ جب سب آ جاتے تو وہ انہیں کہتی "تم جانتے ہی ہو میرے ساتھ جو تمہارا معاملہ تھا۔ اب چونکہ میں نے بچہ جن دیا ہے تو اے فلاں! یہ تیرا بیٹا ہے۔" تو یہ جسے چاہتی اس کا نام لے لیتی اور بچہ اس کی نسل سے ملحق ہو جاتا۔ کسی شخص کو اختیار نہ ہوتا تھا کہ وہ انکار کر سکے۔

(۴) چوتھا نکاح اس طرح ہوتا کہ بے شمار لوگ جمع ہو جاتے وہ سب ایک ہی عورت کے پاس جاتے۔ یہ فاحشہ عورتیں ہوا کرتی تھیں اور کسی کو ہم بستری سے نہ روکتی تھیں۔ اپنے دروازوں پر خاص قسم کے جھنڈے نصب کر دیتی تھیں جو ان کی خاص علامت ہوتے تھے۔ جو چاہتا وہاں جاتا۔ جب ان میں سے کوئی حاملہ ہو جاتی تو سب لوگ وہاں جمع ہوتے اور قیافہ دان کو بلایا جاتا۔ قیافہ دان بچے کو جس سے ملا دیتے وہ اسے اٹھا لیتا اور اسے اپنا بیٹا پکارتا۔"

۱۔ بخاری کتاب النکاح

عربوں کی اس اخلاقی صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر

اپنی دعوت کا آغاز اصلاح معاشرہ اور تزکیہ نفس کے پروگرام سے کرتے تو زیادہ مناسب تھا۔ اس صورت میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد بسہولت آپ کی تحریک میں شامل ہو جاتی۔ ہر معاشرے میں ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہوتی ہے جو اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی برائیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور جو بھی ان کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اسے اپنی تائید میں' ایسے لوگوں کی ایک کثیر تعداد مل جاتی ہے۔ اس طریق کار کا اثر یہ ہوتا کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد حضور کے ساتھ ہو جاتی' ان کے اخلاق درست ہو جاتے' ان کی روحیں پاکیزہ ہو جاتیں اور وہ اس قابل ہو جاتے کہ بسہولت صحیح عقیدہ اپنا لیں اور یہ صورت حال پیش نہ آتی جو ابتداء ہی سے (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) کی نظریاتی جنگ چھیڑ دینے کی صورت میں پیش آئی کہ تمام عالم عرب کلمہ حق کے سامنے سینہ سپر ہو گیا۔

لیکن میں یہی کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جاننے والا تھا کہ انقلابی عمل کا صحیح راستہ کون سا ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی کہ صحیح اخلاق اور ٹھوس کردار کی تعمیر صرف عقیدہ اور نظریے ہی کی اساس پر ہو سکتی ہے۔ یہ نظریہ ہی ہوتا ہے جو انسانوں کے لئے اخلاقی پیمانے وضع کرتا ہے۔ عقیدہ ہی انسان کو اس ذات سے متعارف کراتا ہے جو اخلاقی قدروں اور اخلاقی اصول کا ماخذ و مصدر ہوتی ہے اور اس کی طرف سے جزاو سزا کا تعین بھی ہوتا ہے جو ان اصولوں کی نافرمانی کی صورت میں دی جائے گی۔ اگر اس عقیدے کا تعین نہ ہو اور نظریات واضح نہ ہوں تو اس صورت میں جو اصلاحی کام بھی ہو گا' جو اخلاق بھی تعمیر ہوں گے وہ خام ہوں گے۔ ان کا کوئی ضابطہ نہ ہو گا' کوئی قوت نافذہ نہ ہو گی اور نہ ہی خلاف ورزی کی صورت میں جزاو سزا کا کوئی معقول انتظام ہو گا۔

اس کے برعکس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریق کار اختیار کیا وہ کس قدر کامیاب ثابت ہوا؟ اس کا اندازہ تحریک اسلامی کی تاریخ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ آپ نے نظریات کا اعلان فرمایا' ان کے لئے ان تھک جدوجہد کی' لوگوں کے دل و دماغ میں اسلامی نظریات بیٹھ گئے۔ ان نظریات کے خطوط پر ایک ریاست تشکیل پائی اور اس کا اقتدار مضبوط ہو گیا۔ لوگوں نے اپنے رب کو پہچان لیا اور صرف اسی کی بندگی کرنے لگے۔ انسان' انسان کی بندگی سے آزاد ہو گیا اور ہر طرف (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) کی حکمرانی شروع ہو گئی۔ اس نظریے کے قائلین کی وہ پوری تربیت ہو گئی جو اللہ کو مطلوب تھی تو اس طریق کار کے عظیم الشان نتائج سامنے آ گئے۔ اس زمین کو رومیوں اور فارسیوں کے ناپاک نظاموں سے پاک کر دیا گیا اور یہ کام اس لئے نہ کیا گیا تھا کہ وہاں رومیوں اور فارسیوں کی جگہ عربوں کی سلطنت قائم ہو جائے بلکہ صرف اس لئے کہ پورے کرۂ ارض پر صرف اللہ تعالیٰ کی حکمرانی ہو اور اسے ان تمام طاقتوں سے' علی السواء پاک کر دیا جائے خواہ یہ رومی ہوں' فارسی ہوں یا عربی ہوں۔

اس طریق کار کے مطابق جو انقلاب رونما ہوا اس کے اثرات یہ ہوئے کہ معاشرے کو ہر قسم کے ظلم و ستم سے پاک کر دیا گیا۔ ایک خالص اسلامی نظام زندگی قائم ہوا جس کی اساس عدل و انصاف اور کلی مساوات پر تھی۔ اس میں تمام انسانوں کے ساتھ یکساں سلوک ہونے لگا۔ اجتماعی انصاف کا جھنڈا صرف خدائے واحد و برتر کے نام کا بلند ہوا اور اس میں اس کے ساتھ کوئی دوسرا نعرہ شریک نہ تھا۔ اسلامی نظام کے علم پر صرف (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) لکھا ہوا تھا۔

لوگوں کے اخلاق درست ہو گئے' نفوس پاک ہو گئے' ان کے دل اور روح آئینہ بن گئے۔ وہ یوں پاک ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود و تعزیرات کے نفاذ کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ کیونکہ خود ہر فرد کے دل و دماغ میں کچھ

چوکیدار بیٹھ گئے تھے۔ یعنی اللہ کی رحمت کی امیدداری' اس کی رضاجوئی اور عذاب آخرت کا ڈر۔ یہ تھے وہ محافظ جو ہروقت اس گروہ کے ہر فرد کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ اسلامی نظام کا اثر صرف عرب اور مسلم معاشرے تک ہی محدود نہ رہا بلکہ اس سے پوری انسانیت کو فائدہ پہنچا۔ اس کی تنظیم اور اس کے اجتماعی نظم ونسق کو ترقی نصیب ہوئی اور اس نے وہ کمال حاصل کیا جو اس سے پہلے کبھی حاصل نہ کیا تھا۔

یہ انقلاب' اس خوش اسلوبی سے محض اس لئے وقوع پذیر ہوا کہ جن لوگوں نے اسلامی نظام حیات کو ایک ریاست' ایک نظام' ایک قانون اور ایک حکومت کی شکل میں قائم کرنے سے قبل اسے خود اپنی زندگیوں میں نافذ کر دیا تھا' یہ دین ان کی زندگیوں میں رچ بس گیا تھا۔ یہی ان کا عقیدہ تھا' یہی ان کا اخلاق تھا' یہی ان کی عبادت اور عام طرز عمل تھا۔

پھر ان لوگوں نے یہ کام کسی دنیاوی غرض کے لئے نہ کیا تھا بلکہ ان کے پیش نظر صرف فلاح اخروی اور جنت الماویٰ تھی۔ یہ تک مطلوب نہ تھا کہ انہیں یہاں غلبہ نصیب ہو یا انہی کے ہاتھوں سے نظام اسلامی کا قیام عمل میں آجائے بلکہ ان تمام کوششوں' ان تمام ناقابل برداشت ابتلاؤں اور حق و باطل اور اسلام و جاہلیت کی اس طویل کشمکش کے صلے میں ان کی صرف ایک تمنا تھی ...... یعنی رضائے الٰہی اور فلاح اخروی اور ان سب حقائق کے بالمقابل انہوں نے یہ کام اس عنوان سے کیا جو تاریخ انسانی کا معروف عنوان تھا یعنی (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) — ہمیشہ اس نعرے کو خطرناک قرار دیا گیا خصوصاً ان لوگوں کی طرف جو مناصب حکومت پر براجمان ہوتے تھے۔

اقتدار کب ملتا ہے ؟

قرن اول کے ان لوگوں کو جب اللہ نے آزمایا۔ تو وہ اس میں پورے اترے۔ ان کے نفوس ہر قسم کی نفسیاتی آلائشوں سے پاک ہوگئے اور جب اللہ نے دیکھ لیا کہ وہ اس دنیائے دنی کے کسی ذلیل و حقیر مقصد کے لئے نہیں لڑ رہے' یہاں تک کہ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ صرف انہی کے ہاتھوں اس دعوت کو کامیابی حاصل ہو اور اسلامی نظام حیات کا قیام عمل میں آجائے۔ نیز ان کے دل قومیت اور وطنیت اور نسل پرستی' کنبہ پروری اور قبائلی عصبیت جیسے فروتر جذبات سے پاک ہوگئے اور انہیں ان روابط سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رہا۔ ان میں وہ تمام مطلوب خوبیاں اور کمالات پیدا ہوگئے جو اللہ کو مطلوب تھے تو پھر خود اللہ نے فیصلہ کر لیا کہ یہ لوگ اب اس امانت کو سنبھالنے کے قابل ہوگئے ہیں۔ یہ اس عقیدے اور نظریہ حیات کے امین ہو سکتے ہیں جس میں حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ صرف اللہ وحدہ لاشریک کا ہو کیونکہ یہ عقیدہ ان کے دل و جاں میں جاگزیں ہو چکا ہے۔ ان کے شعور و عمل کا جزو بن چکا ہے اور ان کے جان و مال پر حاکم ہے۔ وہ اس قابل ہوگئے ہیں کہ اقتدار اعلیٰ ان کے سپرد کر دیا جائے' جس کے ذریعے وہ اللہ کی شریعت کو اس دنیا میں چلائیں اور خالص خدائی عدل و انصاف جاری کریں۔ جو کچھ کریں وہ رضائے الٰہی کے حصول کے لئے کریں کیونکہ اسی نے یہ امانت ان کے سپرد کی ہے اور ان کے پیش نظر اپنی ذات' اپنا خاندان اور اپنی قوم یا اپنا قبیلہ ہرگز نہ ہو۔

غرض اسلامی نظام حیات کا قیام اور اس کی سربلندی صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ہم اس کے قیام کے لئے وہی طریق کار اختیار کریں جو حضور نبی اکرم ؐ نے اللہ تعالیٰ کی راہنمائی میں اختیار فرمایا یعنی (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کا علم بلند کرنا اور اس کلمے کے ساتھ کسی اور کلمے' نعرے اور نظریئے کو شریک نہ کرنا۔ اگرچہ بظاہر یہ طریق کار نہایت مشکل اور

پر خطر تھا، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہی حقیقت پسندانہ اور مناسب تھا اس لئے اسی کو اختیار کیا گیا۔

اگر دعوت اسلامی کو ایک قومی تحریک، وطنی تحریک یا کسی اجتماعی تحریک یا اخلاقی اور اصلاح معاشرہ کی تحریک کی شکل میں اٹھایا جاتا تو اس کے نتیجے میں بپا ہونے والا نظام حیات خالص خدائی نظام حیات نہ ہوتا اور اس تحریک کا علم وہ نہ ہوتا جو تحریک اسلامی کا تھا یعنی (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ)۔

یہ طریق کار کیوں ؟

پورے مکی دور میں قرآن کریم نے اسلام کی نظریاتی اساس، (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کو دل و دماغ میں بٹھانے کی کوشش کی اور اس کے لئے وہ پر آشوب طریق کار اختیار کیا گیا جس کا ذکر اوپر ہوا اور کسی وقت بھی اسے چھوڑ کر کوئی دوسرا طریق کار اختیار نہ کیا گیا بلکہ ہمیشہ اسی پر اصرار کیا گیا۔ نیز قرآن مجید نے دعوت کے آغاز میں اور مکی دور میں صرف عقائد و نظریات ہی پر زور دیا اور نظام اسلامی کی فقہی اور شرعی تفصیلات کو نہ چھیڑا۔ یہ طریق کار محض اتفاقی طور پر نہیں اختیار کیا گیا بلکہ اس میں گہری حکمت کار فرما تھی۔ دعوت اسلامی کے ہر کارکن کا یہ فرض ہے کہ وہ گہری سوچ بچار کر کے معلوم کرے کہ وہ حکمت کیا تھی؟

وہ یہ ہے کہ اس نظام حیات کے مزاج کا تقاضا ہی یہی تھا۔ کیونکہ پورے نظام کی تشکیل اور تمام تر فقہی اور تشریعی ضوابط کی تعمیر و تدوین صرف اسی ایک اساس پر ہونی تھی یعنی عقیدہ توحید اسلامی نظام حیات کا اساسی نظریہ۔ یوں سمجھئے کہ یہ دین گویا ایک تناور درخت ہے جو دور دور تک پھیلا ہوا ہے جس کی شاخیں لمبی اور گھنی ہیں۔ اس کے بے شمار سایہ دار پتے ہیں اور وہ دور تک فضاء میں بلند ہو گیا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس تناوری اور طول و عرض اور بلندی و ضخامت کے لحاظ سے زمین کے اندر دور تک اس کی جڑیں گہری ہوں اور دور تک پھیلی ہوئی ہوں۔ یہی مثال اسلامی نظام حیات کی بھی ہے۔ وہ زندگی کا جو نظم پیش کرتا ہے وہ جامع و شامل ہے۔ زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ ہر چھوٹے اور بڑے امر کے بارے میں فیصلے کرتا ہے۔ یہ زندگی کے صرف دنیاوی دائرے تک محدود نہیں ہے بلکہ فلاح اخروی کا بھی ضامن ہے۔ صرف دنیائے بنی و گوش ہی سے سروکار نہیں رکھتا بلکہ پردہ ہائے غیب کے اندر مستور ایک "بڑے جہاں" سے بھی گہری دلچسپی رکھتا ہے پھر اسے انسان کے صرف ظاہری اور مادی معاملات ہی سے دلچسپی نہیں بلکہ اس کا تعلق انسانی ضمیر کی گہرائیوں سے بھی ہے اور وہ انسان کے "راز ہائے سینہ" اور "دنیائے نیات" سے بھی گہرا ربط رکھتا ہے۔ ہاں تو جب وہ ایک عظیم درخت ہے جس کی شاخیں حیات انسانی کے ایک وسیع تر خطے میں پھیلی ہوئی ہیں تو یہ امر نہایت ضروری ہو جاتا ہے کہ اس وسعت، اس ضخامت اور اس عمق اور پھیلاؤ کے مطابق، اس کی جڑیں بھی کشت زار دل و دماغ میں نہایت ہی گہری ہوں۔

(اَصْلُهَا ثَابِتٌ فِی الْاَرْضِ وَفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ) اسلامی نظام حیات کے مزاج اور اس کی تعمیری باریکیوں کا یہ ایک خاص پہلو ہے کہ وہ اپنی تعمیر اور پھیلاؤ میں ایک خاص طریق کار اختیار کرتا ہے۔ وہ اس بات کو حد درجہ اہمیت دیتا ہے کہ اس کی نشو و نما اور تعمیر جن عقائد و نظریات پر ہو رہی ہے وہ دل و دماغ میں غایت درجہ متمکن ہو جائیں۔ نفس

انسانی اور انسانی فکر و عمل کو پورے طور پر اپنے رنگ میں رنگ دیں' اس کی جڑوں اور تناور شاخوں کے درمیان ایک خاص تناسب ہو اور جڑیں اس قدر مضبوط اور طاقتور ہوں کہ فضا میں پھیلی ہوئی بلند شاخوں اور بھاری تنوں کا بوجھ بسہولت سہار سکیں۔

اس طریق کار کے مطابق جب کسی فرد اور گروہ کے دل و دماغ کی گہرائیوں تک (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) اتر جاتا ہے تو اس کی زندگی میں اس نظام حیات کی بنیاد پڑ جاتی ہے جسے اس کلمہ پر تعمیر ہونا ہوتا ہے اور اس کی جھلک اس میں نظر آتی ہے۔جوں جوں اس نظام کی تفصیلات سامنے آتی جاتی ہیں لوگ برضا و رغبت انہیں اپناتے جاتے ہیں کیونکہ ان کی جڑیں پہلے سے ان کے دل میں ہوتی ہیں۔یہی معاملہ صحابہ کرامؓ کا تھا کہ مکی دور کی اس فکری تطہیر اور صالح عقائد کی وجہ سے ان کے ذہن نہ صرف یہ کہ اسلامی احکام کے لئے آمادہ تھے بلکہ طالب تھے حالانکہ احکام کی تفصیلات ابھی تک پردۂ اخفا میں تھیں۔

دور اول میں ہمیں جو معجزانہ تسلیم و انقیاد نظر آتا ہے وہ فقط ایمان راسخ اور صالح نظریات کی تشکیل کا رہین منت ہے۔اس ایمان کے بعد حالت یہ تھی کہ شرعی احکامات آرہے ہیں' نظم و نسق کے بارے میں ہدایات آرہی ہیں اور ان پر بے چون و چرا اور کامل تسلیم و رضا کے ساتھ عمل ہو رہا ہے۔وہ موجودہ احکامات کے متنفر ہو جاتے ہیں اور جو حکم آجاتا ہے اس کی تعمیل میں پل بھر کی دیر نہیں کرتے۔یہی وجوہات تھیں جس کی وجہ سے شراب نوشی ختم ہوئی' سودی کاروبار کا نام و نشان تک نہ رہا۔قماربازی کا وجود ناپید ہو گیا اور تمام جاہلی عادات اور اوضاع و اطواریوں مٹے کہ گویا کبھی تھے ہی نہیں' اور سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ یہ تمام کام چند احکام خداوندی نازل ہوتے ہی سرانجام پاگئے' بس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے احکامات سننے کی دیر تھی۔

اس کے برعکس ان نظاموں کا حال دیکھ لیجئے جن کی تعمیر اس طریق کار کے برعکس متعارف دنیاوی طریقوں کے مطابق ہوتی ہے۔آج کل اگر کوئی حکومت ان منکرات کو بند کرنا چاہتی ہے تو وہ قانون سازی کے ساتھ مقننہ' انتظامیہ کے تمام محکمہ جات' پولیس اور فوج اور نشرواشاعت کے تمام ذرائع کو پوری جدوجہد کے ساتھ کام میں لاتی ہے' لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ پھر بھی اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ چند ظاہری اور خلاف قانون چیزوں پر ہی کنٹرول کر سکتی ہیں جب کہ معاشرے کی اندرونی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ منہیات اور منکرات سے اٹاپڑا ہوتا ہے۔

(تحریم شراب کے سلسلے میں ملاحظہ ہو میری تفسیر فی ظلال القرآن جلد ۵ از ص ۷۸ تا ص ۸۰ منقح ایڈیشن - نیز ملاحظہ ہو الاستاذ المودودی کی کتاب "تنقیحات" بحوالہ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین - از ابوالحسن علی الندوی)

نظریہ اور تحریک ساتھ ساتھ

اس مضبوط طریق کار کو سمجھ لینے سے' اس دین کے مزاج اور خصوصیات کا ایک اور پہلو بھی روشن ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ دین درحقیقت ایک بہترین عملی اور متحرک پروگرام ہے اور یہ آیا ہی اس لئے ہے کہ زندگی کے تمام واقعات و حقائق پر حکمران ہو۔یہ زندگی کے حقائق کا سامنا اس حیثیت سے کرتا ہے کہ ان پر اپنے اوامر نافذ کرے۔انہیں برقرار رکھے' یا بدل دے یا سرے سے منسوخ کر دے۔یہی وجہ ہے کہ اس دین میں قانون سازی صرف انہی امور کے

متعلق ہوتی ہے جو واقع ہو چکے ہوتے ہیں اور یہ بھی ایک ایسے معاشرے میں جس نے ابتدائی طور پر صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا اقرار کر لیا ہو۔

یہ دین کوئی ایسا "نظریہ" نہیں ہے جو محض مفروضات سے دلچسپی رکھتا ہو' بلکہ یہ ایک ایسا نصب العین اور پروگرام ہے جس کا معاملہ تمام تر واقعات حیات سے ہے۔ لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ پہلے ایک ایسا معاشرہ موجود ہو جو (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کا اقرار کرے۔ یعنی کہ حاکمیت اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے اور اس کے ساتھ اللہ کے سوا تمام دوسرے لوگوں کی حاکمیت کا انکار کرے۔ ایسے تمام طور طریقوں کو ترک کر دے جو اس قاعدے کے خلاف ہوں اور نہ ہی انہیں جائز سمجھے۔

جب ایسے معاشرے کا قیام فعلاً ہو جائے تو اس وقت محض ایک خیالی معاشرے کے بجائے وہ ایک حقیقی اور زندہ معاشرہ ہو گا جسے تنظیم اور قانون سازی کی ضرورت پڑے گی۔ ایسے حالات میں پھر یہ دین اس معاشرے کی اجتماعی زندگی کی تنظیم شروع کر دیتا ہے اور قانون سازی کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ یہ قانون سازی اس قوم کے لئے ہوتی ہے جو دل و جان سے نظم و قانون کی مطیع ہو چکی ہے اور جس نے تمام غیر دینی نظاموں اور قوانین کو سرے سے ترک کر دیا ہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر ضروری ہو جاتا ہے کہ جو لوگ ایسے نظریات و عقائد کے حامل ہوں' انہیں خود اپنے آپ اور اپنے معاشرے پر خود مختاری حاصل ہو' جو اس معاشرے میں اس نظام حیات کے نافذ کرنے کی ضامن ہو' تاکہ لوگوں کے دل میں اس نظام کا احترام ہو۔ لوگوں کو معلوم ہو کہ یہ شریعت ایک حقیقت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشرے میں ایسے حالات بھی موجود ہوں جو فوری نظم و نسق اور قانون سازی کے متقاضی ہوں۔

---ooo---

اقامت دین کے لئے حکومت کی ضرورت

جب مسلمان مکے میں تھے تو انہیں اپنے امور میں خود مختاری حاصل نہ تھی۔ نہ معاشرے پر انہیں کوئی اختیار حاصل تھا اور نہ ہی ان کی زندگی اس طرح مستقل اور آزاد تھی کہ وہ خود ہی اسے اللہ کی شریعت کے مطابق چلا سکتے ہوں..... اس لئے زندگی کے اس دور میں صرف عقائد نازل ہوئے۔ عقائد کی مضبوطی اور پختگی کے بعد ایسے اخلاقی احکامات آئے جو ان عقائد پر مبنی تھے' لیکن جس وقت مدینہ طیبہ میں انہوں نے اپنی ایک مستقل حکومت قائم کر لی جس میں وہ بالکل خود مختار تھے' تو اس وقت اسلامی معاشرتی قوانین کا نزول شروع ہوا' مسلم معاشرے کے لئے ایک ایسا نظام متعین ہوا جو اس کی تمام حقیقی ضروریات کا متکفل تھا۔ یہ ایسا نظام تھا جس کی پشت پر ایک حکومت اور ایک قوت نافذہ بھی تھی۔

اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ نہ تھی کہ وہ مکہ مکرمہ ہی میں قوانین اتار دیں تاکہ وہ خزانہ قوانین میں تیار رکھے ہوں اور مدینہ طیبہ میں حکومت بنتے ہی نافذ کر دیئے جائیں۔

یہ طریق کار اس دین کے مزاج کے خلاف ہے۔ یہ دین ایک نہایت ہی حقیقت پسندانہ اور واقعیت جویانہ دین ہے..... وہ ازخود مشکلات فرض کر کے ان کے لئے حل تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ وہ صرف ان امور کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو حقائق ہوں۔ ایسے حقیقی مسلم معاشرے کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس نے اللہ کی شریعت کے سامنے

سر تسلیم خم کر دیا ہو اور اس کے سوا تمام دینوں سے منہ پھیر لیا ہو۔ اس کا سلوک بعینہٖ اس معاشرے کی وسعت' اس کی نوعیت اور اس کے ظروف و احوال کے مطابق ہوتا ہے تاکہ قوانین' معاشرے کی نوعیت' وسعت اور حالات و ضروریات کے مطابق ہوں۔

لوگ اس وقت اسلام سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ نظریات وضع کرے' مجوزہ نظام حیات کے طور طریقے اور شکلیں متعین کرے اور زندگی کے لئے مفصل قوانین وضع کرے' جب کہ صورت حال یہ ہے کہ اس وقت کرۂ ارض پر کوئی ایسا معاشرہ موجود نہیں ہے جس نے عملاً اس بات کا اقرار کر لیا ہو کہ اس میں صرف خدا کی شریعت کی حکمرانی ہوگی اور اس نے تمام غیر اسلامی شرائع و قوانین کو ترک کر دیا ہو یا اس کے پاس اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے قوت نافذہ بھی ہو۔ جو لوگ اسلام سے ایسی توقعات رکھتے ہیں انہوں نے درحقیقت اس دین کے مزاج ہی کو نہیں پایا۔ بدقسمتی سے وہ نہیں جانتے کہ یہ دین اللہ کے پسندیدہ طریق کار کے مطابق کس طرح عملی شکل اختیار کیا کرتا ہے۔

اس طرز پر سوچنے والے لوگوں کا اصل منشاء درحقیقت یہ ہوتا ہے کہ وہ اس دین کے مزاج' اس کے طریق کار اور اس کی تاریخ کو بدل دیں تاکہ وہ انسانی نظریات اور انسانی طریق ہائے حیات کے مطابق ہو جائے۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ یہ دین' اپنے طریق کار اور اقدامات کو چھوڑ کر ان کی وقتی خواہشات اور نفسانی تقاضوں کو پورا کرے۔ یہ ایسی خواہشات ہیں جو انسان کے وضع کردہ چھوٹے بڑے نظامہائے حیات کے مقابلے میں ان کی روحانی اور اندرونی شکست خوردگی کی آئینہ دار ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ یہ دین اپنے آپ کو جدید نظریات اور مفروضات کی شکل میں ڈھال لے اور ایسے مستقبل کی طرف متوجہ ہو جو سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ لیکن اللہ نے اس دین کے لئے وہی طریق کار مقرر فرمایا ہے جو اسے پسند ہے یعنی یہ کہ وہ ایک عقیدہ ہو جو دل دماغ پر چھا جائے۔ انسانی ضمیر پر اس کی حکومت ہو۔ اس عقیدے کا لازمی تقاضا یہ ہو کہ اس کا ماننے والا اللہ کے سوا کسی کے آگے نہ جھکے اور یہی عقیدہ قانون و شریعت کا ماخذ بھی ہو اور اس کے سوا کوئی دوسرا ماخذ نہ ہو۔ جب اس عقیدے کے حاملین موجود ہوں اور انہیں اپنے معاشرے پر اقتدار بھی حاصل ہو تو پھر ان کی واقعی ضروریات کے لئے قانون سازی کا کام شروع ہو اور اس کے مطابق ان کی واقعی زندگی کی تنظیم و تشکیل کی جائے۔

یہ ہے وہ طریق کار جسے اللہ نے اس دین کی اقامت کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ آپ یقین کریں کہ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے' رہیں لوگوں کی نفسانی خواہشات سو جو ہوتی ہیں ہوا کریں۔

دعوت اسلامی کے حاملین کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس طریق کار کے مطابق جب بھی وہ لوگوں کو دین کی طرف بلائیں' انہیں سب سے پہلے اسلامی نظریہ حیات سے روشناس کرائیں۔

یہ بات صرف غیر مسلموں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلم کہلاتے ہیں اور مردم شماری کا ریکارڈ بھی گواہ ہے کہ وہ مسلمان ہیں' ان کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کا نئے سرے سے اقرار کریں' اس کے مفہوم اور مراد کو سمجھیں۔ حاکمیت کو خاصہ خدا سمجھیں اور اس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور یہ بھی زندگی کے ایک محدود دائرے میں نہیں بلکہ پوری زندگی میں اس کے ساتھ ساتھ وہ ان لوگوں کی حاکمیت کا بھی صاف صاف انکار کر دیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حق حاکمیت کو اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ یہ اقرار دل کی

گہرائیوں سے ، پورے شعور کے ساتھ ہو اور اس کا اظہار انسانی زندگی کے عملی طور طریقوں اور حقائق میں بھی ہو رہا ہو۔

پہلے فکری اصلاح اور پھر قانونی اصلاح

لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینے کی اساس یہی نظریاتی اقرار ہونا چاہئے۔یہی اقرار اول روز سے دعوت اسلامی کی بنیاد رہا ہے۔مکہ مکرمہ میں پورے تیرہ سال تک قرآن مجید اسی کی طرف بلاتا رہا۔جب (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کا یہ مفہوم سامنے رکھتے ہوئے ایک اچھی خاصی جمعیت دین اسلام میں داخل ہو گئی، تو اس گروہ پر اسلامی معاشرے کا اطلاق ہونے لگا، یعنی وہ معاشرہ جس میں اسلامی نظام حیات، انسانوں کی اجتماعی زندگی میں قائم ہو سکتا ہو کیونکہ اپنے عقیدے اور اقرار کی رو سے اس معاشرے نے فیصلہ کر لیا ہوتا ہے کہ آئندہ اس کی پوری زندگی کا ارتقاء اس عقیدے کی بنیاد پر ہو گا اور یہ کہ وہ اپنی پوری زندگی میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حکمران تسلیم کرے گا۔

جب اسلامی نظام حیات کی اساس مستحکم ہو جاتی ہے تو اس کے بعد اسلامی نظام کے تفصیلی منصوبے کا نفاذ شروع ہو جاتا ہے۔معاشرے کی فعال طاقتیں خود بخود ایسے اسلامی قوانین کا اجراء شروع کر دیتی ہیں، جن کا تعلق معاشرتی زندگی کی حقیقی ضروریات سے ہوتا ہے۔نظریاتی اساس کی پختگی کے بعد جو تفصیلی قوانین وضع ہوتے ہیں وہ اسلامی نظام کے نظریاتی اصولوں کی روشنی میں ہوتے ہیں۔ غرض اسلامی نظام کے نفاذ اور قیام کا یہی صحیح اور متوازن طریق کار ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے طریق کار کے ذریعے ان زریں عملی اور واقعیت پسند اصولوں کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔

تحریک اسلامی کے بعض مخلص لیکن جلد باز کارکنوں کا خیال یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے نظام اسلامی کے بنیادی تصورات ہی نہیں بلکہ تفصیلی تشریعات تک کو پیش کر دینا نہایت ضروری ہے۔اس سے ایک طرف تو لوگ دین اسلام میں دلچسپی لیں گے اور دوسری جانب یہ فائدہ بھی ہو گا کہ دعوت دین کا کام بہت آسان ہو جائے گا۔اس طرز پر سوچنے والے لوگوں نے دراصل اس دین کی حقیقت اور مزاج پر غور ہی نہیں کیا اور نہ ہی رب العالمین کے مضبوط "منہاج کار" کو سامنے رکھا ہے، جو اس ذات علیم و حکیم کی حکمت خاص پر مبنی ہے۔ظاہر ہے کہ وہی انسانی طبائع اور زندگی کی حقیقی ضروریات کو صحیح معنوں میں جانتا ہے۔

یہ خیال دراصل جلد بازی کے باعث پیدا ہوتا ہے اور اس کی مثال اس طرح ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ سہولت کار کی خاطر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت کو ایک قومی نصب العین کے عنوان سے یا کسی اجتماعی نصب العین کے رنگ میں یا کسی اخلاقی اصلاح کے نام سے شروع کرتے۔اس صورت میں آپ کو وہ مشکلات پیش نہ آتیں جو آئیں۔ لیکن یہ انداز فکر درست نہیں ہے۔سب سے پہلے ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ کی طرف یکسو ہو جائیں، اس کی مکمل اطاعت کا اعلان کر دیں، اس کی شریعت کو غیر مشروط طور پر تسلیم کر لیں اور اس کے علاوہ تمام دوسرے شرائع کا انکار کر دیں۔یہ وہ کام ہے جو سب سے پہلے ہونا ضروری ہے اور اسے نظام اسلامی کی تفصیلات پیش کرنے سے پہلے سرانجام پا جانا چاہئے۔اس کے بعد اسلامی نظام کی تفصیلات پیش کی جائیں جو انسانوں کے لئے افادیت رکھتی ہیں اور مرغوب ہیں، تاکہ شریعت کی جانب میلان اور رغبت کی اساس خالص اطاعت الٰہی ہو اور شریعت پر عمل کرنے والوں کے پیش نظر یہ ہو کہ وہ غیر اللہ کی غلامی سے آزاد ہو کر صرف اللہ کی غلامی چاہتے ہیں۔ان کی پیش نظر صرف یہ جذبہ نہ ہونا چاہئے کہ اسلامی نظام حیات کو وہ

اس لئے قبول کر رہے ہیں کہ وہ اپنی تفصیلات کے لحاظ سے دوسرے تمام نظام ہائے زندگی سے بہتر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نظام اسلامی اپنی جگہ ایک بہترین اور افضل ترین نظام ہے کیونکہ وہ اللہ کے تجویز کردہ قانون کی شکل میں آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی انسانی قانون کبھی الٰہی قانون کا ہمسر نہیں ہو سکتا لیکن یہ چیز اصول دعوت میں سے نہیں ہے۔ دعوت دین کا اصل الاصول یہ ہے کہ اللہ کی شریعت جیسی بھی ہو اسے قبول کیا جائے اور غیر اللہ کی شریعت کو رد کیا جائے ' خواہ وہ خوشنما کیوں نہ ہو...... یہی ہے حقیقت اسلام۔ اس کے سوا اسلام کا کوئی اور مفہوم نہیں ہے۔ جو شخص ابتدائی طور پر اسلام کی طرف مائل ہو گیا اس نے گویا معاملے کا فیصلہ کر دیا۔ اب اسے اس نظام کی خوبصورتی اور افضلیت سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ایمان کی بدیہات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

(مصنف یہاں تسلیم و رضا کے اعلیٰ مدارج بیان کر رہا ہے جس کے بعد کسی کو شریعت محمدیہ کی فضیلت بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی لیکن ظروف و احوال کی تبدیلی سے دعوت دین کے طریق کار میں تبدیلی ضروری ہوتی ہے۔
ایک وقت تھا کہ پوری انسانیت نظام اسلامی اور اسلامی تہذیب کو افضل ترین تہذیب کی حیثیت سے مانتی تھی۔ مسلمان دنیا میں مہذب ترین مخلوق تھے۔ لیکن اس وقت صورت حال یہ ہے کہ نہ صرف غیر مسلم بلکہ اکثر مسلمان بھی اسلام کی فضیلت کے قائل نہیں رہے حتیٰ کہ وہ اسے قابل عمل بھی نہیں سمجھتے۔ اس لئے ان حالات میں ہمیں نہ صرف یہ کہ اسلام کی افضیلت کو اجاگر کرنا ہے بلکہ دنیا پر یہ ثابت کرنا ہے ' کہ اسلام قابل عمل بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ نے اس میدان میں گراں قدر تصنیف پیش کی۔ آپ سے پہلے امام غزالی نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ خود قرآن اور حدیث سے یہ ثابت ہے کہ خدا اور رسول نے اسلام کی افضلیت اور افادیت کو بطور ترغیب پیش فرمایا۔ ایک موقع پر حضور نے قریش کے رؤسا کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں تمہیں ایسے کلمے کی طرف دعوت دیتا ہوں کہ اگر تم اسے تسلیم کر لو تو عرب و عجم تمہارے زیر نگیں ہو جائیں۔ (مترجم))

نظریاتی اصلاح کا انداز

اس موقع پر ہمارے سامنے قدرتی طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ قرآن مجید نے پورے تیرہ سالہ مکی دور میں عقائد کے مسئلہ کو کس طرح حل کیا؟ دراصل قرآن مجید نے عقائد کو نہ تو محض نظریہ کے طور پر پیش کیا ہے اور نہ ہی مسائل ''لاہوت'' کی شکل میں بیان کیا ہے۔ نیز اس نے علم کلام کی متداول اصطلاحات کا وہ انداز بھی اختیار نہ کیا' جو ''علم التوحید'' کے عنوان سے کلامی کتابوں میں موجود ہیں۔

قرآن مجید نے براہ راست فطرت انسانی سے خطاب کیا' جو اس کے وجود کے اندر ودیعت تھی۔ نیز اس نے استدلال کا سادہ طریقہ اختیار کرتے ہوئے انہی فطری دلائل و شواہد سے استدلال کیا جنہیں ہر انسان اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات میں دیکھ رہا تھا۔ اسلام کا انسانیت پر یہ عظیم احسان ہے کہ اس نے فطرت انسانی کو جاہلیت کی دبیز تہوں کے نیچے سے نکالا اور اس کے دل و دماغ کو اوہام و اساطیر کے زنگ سے صاف کیا' جس نے اسے سوچنے سمجھنے اور قبولیت حق کی استعداد سے محروم کر دیا تھا۔ قرآن نے ان کے دل و دماغ کے دروازے قبولیت حق کے لئے کھول دیئے اور انسان اس قابل ہو گئے کہ صالح افکار و خیالات کو اخذ کر سکیں۔

یہ کام قرآن کریم نے عمومی انداز میں کیا' لیکن اس کے لئے قرآن کریم کے حاملین کو ایک زبردست نظریاتی جنگ بھی لڑنا پڑی' کیونکہ لوگوں کی فطرت سلیمہ تعطل کا شکار تھی اور غیر صالح افکار کے تہ بہ تہ پردوں میں مستور تھی۔ اسے

اس حالت سے نکالنے کے لئے' اسلام کو زبردست جدوجہد کرنی پڑی۔جب ہم قرن اول کے اسلامی نظریاتی انقلاب اور زمانہ حال کے نظریات کا مقابلہ کرتے ہیں تو ان میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔اسلام محض نظریہ ہی نہ تھابلکہ ایک تحریک بھی تھا اور اس تحریک کو' اپنے راستے سے رکاوٹوں' بندشوں اور مشکلات کو دور کرنے کے لئے' خونریز معرکوں سے دوچار ہونا پڑا۔یہ نظریاتی انقلاب محض ذہنی اور جدلی معرکہ نہ تھاجس کی بنیاد منطق پر ہو اور جس کے نتیجے میں کوئی علم الکلام مدون ہو جائے۔(اگرچہ یہ چیزیں بھی اپنی جگہ ایک اہمیت رکھتی ہیں)بلکہ اس نظریاتی اقدام کا مقابلہ ایک زندہ معاشرے سے تھا' جو اپنے طور پر ہر قسم کے ہتھیاروں سے مسلح تھا' چنانچہ قرآن نے اس صورت حال سے نمٹنے اور اس معاشرے کو توڑنے کے لئے پوری انسانیت سے اپیل کی۔ اسلام کے نظریات کے لئے لاہوتی (Divinity) شکل بھی مناسب نہ تھی کیونکہ اسلامی نظریہ حیات اگرچہ درحقیقت ایک عقیدہ ہی ہے لیکن عقیدے کے ساتھ ساتھ وہ ایک مکمل نظام حیات بھی پیش کرتا ہے اور اسے عملاً نافذ کرنے کا بھی مطالبہ کرتا ہے' اس لئے وہ اپنے آپ کو لاہوتی ابحاث کی طرح ایک محدود دائرے کے اندر محدود نہیں کرتا۔

اندرونی اور بیرونی کشمکش

قرآن نے جماعت مسلمہ کے دل و دماغ میں پاک اور صالح عقائد و نظریات بٹھانے کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی کیا کہ اس جماعت کو لے کر' اپنے اردگرد پھیلی ہوئی جاہلیت کے ساتھ چومکھی لڑائی کا اعلان کر دیا یہ جنگ اس قدر ہمہ گیر و ہمہ پہلو ہوگئی کہ اس بیرونی جنگ کے ساتھ ساتھ جماعت مسلمہ کو اپنے ضمیر' اپنے اخلاق اور اپنے معاشرے کے اندر جمے ہوئے جاہلی اثرات کے خلاف بھی لڑنا پڑا۔یہ تھے وہ خاص حالات جن کی وجہ سے اسلامی نظریہ حیات کی نشوونما' ایک خالص نظریے (Theory) کی شکل میں یا لاہوت (Divinity) کی شکل میں یا علم کلام کے لاحاصل جدلیات کی شکل میں نہیں ہوئی بلکہ یہ نشوونما ایک مجسم اور زندہ اجتماعیت کی شکل میں ہوئی' ایک ایسی تنظیم کی شکل میں' جس کا عملی زندگی سے گہرا تعلق تھا۔یہ اجتماعیت اور یہ تنظیم' جماعت مسلمہ کی اجتماعی زندگی میں عملاً موجود تھی اور کام کر رہی تھی۔اس تصور حیات کے مطابق امت مسلمہ کے اعتقادی تصورات اور ان عقائد و تصورات کے مطابق ان کی زندگی کی تعمیر ہوتی رہی اور جاہلیت کے ساتھ عملی ٹکراؤ کی وجہ سے' ایک منظم محارب قوت کی حیثیت سے' اس کی عملی تربیت بھی ہوتی رہی۔جماعت کی یہ خارجی نشوونما ہی درحقیقت اس کی نظریاتی تعمیر و ترقی کی آئینہ دار تھی اور یہ عملی جدوجہد جماعت کے عقائد کی زندہ ترجمانی تھی۔

تحریک اسلامی کے ہر داعی کا یہ فرض ہے کہ وہ اس دین کے مزاج اور تحریک اسلامی میں اس کے پروگرام کو انہی خطوط پر سمجھنے کی کوشش کرے جن پر ہم نے سمجھنے کی کوشش کی ہے تاکہ انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اس پروگرام کے مطابق تعمیر افکار کا یہ طویل مکی دور' عملی تعمیر سے خالی نہ تھابلکہ اس میں مسلسل تحریک اسلامی کی عملی تشکیل و تعمیر بھی ہوتی رہی اور کارکنوں کی ایک ٹھوس جماعت وجود میں آگئی۔یہ مرحلہ محض علمی اور نظریاتی درس و تدریس کا نہ تھابلکہ اس مرحلے میں تحریک اسلامی کی بنیادیں اٹھائی جا رہی تھیں۔یہ بنیادیں افکار و عقائد اور تحریک جماعت کے عملی وجود پر مشتمل تھیں اور سب کی تعمیر ساتھ ساتھ ہو رہی تھی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جہاں اور جب بھی کام شروع کیا جائے اسے انہی

خطوط پر کیا جانا چاہئے۔

(مصنف نے بڑی خوبی سے اسلام کی تحریک کو واضح کیا ہے۔ اگر اسے غور سے پڑھا جائے اور حضور اکرم ؐ کی سیرت طیبہ سامنے ہو تو وہ تمام اختلافات از خود ختم ہو جاتے ہیں جو احیائے اسلام کی مختلف تحاریک کے پروگراموں میں موجود ہیں۔ بعض لوگ اس وقت اس کوشش میں ہیں کہ مسلمانوں کے دل میں ایمان بٹھا دیا جائے۔ عملی خرابیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ جاہلیت کے ساتھ الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جاہلیت چونکہ حکومت و اقتدار کی شکل میں ہوتی ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ اسلام کو حکومت و اقتدار سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور یہ کہ حضور نے مکی دور میں محض ایمان و عقائد کی تبلیغ کی ہے۔ سید صاحب کا مقصد یہ ہے کہ مکی دور میں عقائد کی تعمیر اس طرز پر ہوئی تھی کہ اصلاح حکومت اور جاہلیت سے عملی ٹکراؤ اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ ان عقائد کی ذہن نشینی کا لازمی تقاضا اور پہلا نتیجہ عملی تحریک کی شکل میں ظاہر ہُوا تھا اور جس حد تک ممکن تھا اندرونی اور بیرونی جاہلیت سے تصادم کا سلسلہ اول روز سے ہی جاری تھا۔ اگر ایسا نہ تھا تو بیت ارقم میں خفیہ کام کی ضرورت کیا تھی۔ مخالفین کے ساتھ ٹکراؤ اور نام لے کر ان کے بتوں کی مذمت کی ضرورت کیا تھی۔

غیر متحرک اور جامد ایمان کی تبلیغ درحقیقت جاہلیت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے سے گریز ہے۔ حضور ؐ صرف یہ تبلیغ نہ کرتے کہ لوگو بتوں کی پوجا چھوڑ دو بلکہ وہ بتوں کی تذلیل بھی کرتے تھے اور جاہلیت کو مٹانے کا اعلان بھی کرتے تھے۔ لہٰذا صرف یہ دعوت اور مطالبہ کافی نہیں ہے کہ اسلامی قانون جاری کیجئے بلکہ اس کے ساتھ یہ اعلان بھی ضروری ہے کہ ہم غیر اسلامی قوانین کو ختم کر کے دم لیں گے۔ (مترجم)

تعمیر افکار کا طویل دور اسی طریق کار کے مطابق ہونا چاہئے اور یہ تعمیر بتدریج 'عمیق اور مضبوط بنیادوں پر ہونی چاہئے۔ نیز یہ تعمیر محض عقائد کی فلسفیانہ تدریس تک ہی محدود نہ ہو بلکہ اس فکری تعمیر کے مرحلے کو ان عقائد کا زندہ ترجمان بھی ہونا چاہئے۔ حالت یہ ہو کہ عقیدہ زندہ شکل میں چلتا پھرتا نظر آئے 'اس کا کیف و سرور انسانوں کے دلوں میں جاگزیں ہو اور وہ ایک اجتماعی اور متحرک معاشرے میں متشکل نظر آئے 'جس کی تعمیر و ترقی اندرونی طور پر بھی اور بیرونی لحاظ سے بھی اسی عقیدے کی تعمیر و ترقی کی زندہ تعبیر ہو۔ نیز اس کے ساتھ وہ معاشرہ نظریات کے میدان میں بھی اور خارجی زندگی کے عملی میدان میں بھی جاہلیت سے برسرپیکار ہو۔ وہ ایک زندہ عقیدے کا مظہر ہو اور معرکہ حق و باطل کے طوفانوں میں اس کی نشوونما ہو رہی ہو۔

اسلامی نقطہ نظر سے 'یہ خیال حد درجہ غلط ہے کہ عقیدے کو محض نظریے (Theory) یا محض علمی درس و تدریس یا محض ادب و ثقافت کے طور پر پڑھایا پڑھایا جائے ...... یہ طریق فکر نہایت خطرناک ہے۔

قرآن مجید نے عقائد و نظریات کی تعمیر و تطہیر میں تیرہ سال اس طرح نہیں گزار دیئے کہ اس نے کچھ عقائد بیان کر دیئے اور لوگوں کو بیان عقائد کے بعد اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہو۔ تاریخ اس کے خلاف شاہد ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ پورے قرآن مجید ہی کو ایک دفعہ نازل فرما کر چھوڑ دیتے اور مسلمان تیرہ سال تک اسے پڑھتے پڑھاتے رہتے یہاں تک کہ وہ پورے نظریہ اسلامی سے واقف ہو جاتے۔

لیکن ' اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تحریک اسلامی کے لئے ایک خاص اور منفرد طریق کار مطلوب تھا۔ عقیدہ 'تحریک اور جماعت کی تعمیر و تشکیل بیک وقت مطلوب تھی۔ یوں کہ عقیدہ ایک فعال و متحرک جماعت کا اوڑھنا بچھونا بن جائے اور اس کی تعمیر جماعت اور تحریک کی شکل میں ہو۔ ایک فعال جماعت اور ایک منظم تحریک اس عقیدے کا ظاہری قالب ہو۔ اس ذات علیم و خبیر کو خوب معلوم تھا کہ کسی نفس کی اصلاح اور کسی جماعت کی تشکیل دنوں اور ہفتوں کا کام نہیں ہے۔ تربیت اخلاق اور تنظیم جماعت کے لئے جس قدر وقت درکار ہوتا ہے' اتنا ہی وقت تطہیر افکار اور عقائد کی پختگی کے لئے بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس طریق کے مطابق جب عقائد راسخ اور کردار پختہ ہو گیا تو پوری امت مسلمہ اسلام کا مظہر بن گئی۔

یہ اس دین کی اہم خصوصیت ہے اور یہی اس کا مزاج ہے۔کئی دور کی روشنی میں 'اس خصوصیت کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ہمارے لئے سخت مضر ہے کہ ہم زمانہ حاضرہ کے نظریات سے متاثر ہو کر یا اپنی مخصوص خواہشات کی خاطر اس دین کو بدلنے کی کوشش کریں۔اس دین نے اپنی انہی خصوصیات اور اسی مزاج کی وجہ سے تاریخ انسانی میں 'امت مسلمہ جیسی عظیم امت کو جنم دیا تھا۔آئندہ بھی احیاء امت کی کوئی کوشش اگر کامیاب ہو سکتی ہے تو وہ اسی طریق کار کو اختیار کرنے سے ہو سکتی ہے 'جس کے مطابق پہلی بار اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو برپا کیا تھا۔

اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف حلقوں کی طرف سے اسلام کے ان زندہ 'متحرک اور واقعیت پسندانہ افکار و نظریات کو 'محض ایک ثقافتی اور تدریسی نظریہ (Theory) بنانے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں انہیں سمجھیں اور کامیاب نہ ہونے دیں کیونکہ اسلام دراصل ایک فعال اور زندہ معاشرے میں منعکس ہونا چاہتا ہے۔اس تصور کے مطابق اگر کام کیا گیا تو وہ اپنی اس خصوصیت اور اس مزاج کو کھو دے گا اور ہم اسلامی نظریہ حیات کو لے کر دوسرے نظریات کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔

تحریک احیائے اسلام میں اس بات کو بے حد اہمیت حاصل ہے کہ اسلامی نظریہ حیات کا ظہور انسان کی عملی زندگی میں ہو۔ایک حقیقی تنظیم کی شکل میں 'ایک زندہ و فعال معاشرے کی صورت میں اور ایک ایسی تحریک کے کردار میں جو ہر جانب سے جاہلیت کے ساتھ نبرد آزما ہو۔یہ تحریک مسلسل 'یہ کوشش کر رہی ہو کہ خود اس کے اندر سے بھی جاہلی افکار و خیالات اور اطوار و عادات ختم ہو جائیں کیونکہ تحریک میں جو لوگ آتے ہیں بہرحال وہ جاہلیت کی صفوں میں سے چھٹ کر آتے ہیں اور اسلامی نظریہ حیات کو اختیار کرنے سے پہلے وہ جاہلی افکار کے حامل ہوا کرتے ہیں۔جب اسلامی نظریہ حیات 'انہیں جاہلی طبقات میں سے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے تو وہ جاہلی افکار سے چشم زدن میں پاک و صاف نہیں ہو جاتے کیونکہ جاہلیت انسان کے دل و دماغ 'اس کی ذہنیت 'بلکہ اس کی عملی زندگی کے اتنے وسیع حصے پر چھائی ہوئی ہوتی ہے جو محض ''نظریہ'' کے محدود دائرہ اثر تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس سے باہر بھی ہوتا ہے۔اس میں شک نہیں کہ جاہلیت نظریات اور نظریات کے عناصر ترکیبی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے تاہم اس کا دائرہ اثر 'نظریہ محض (Theory) سے کہیں وسیع تر ہوتا ہے۔

کائنات کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر

الوہیت 'کائنات کے وجود 'زندگی اور انسان کے بارے میں اسلامی نظریہ ایک کامل اور وسیع نظریہ ہے 'لیکن ایک نظریہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ واقعیت پسند اور مثبت فکر بھی ہے۔

اسلامی نظریہ حیات 'اپنے مزاج کے اعتبار سے اس بات سے ابا کرتا ہے کہ وہ محض ایک تصور یا ذہنی فلسفہ یا تدریسی نظریہ ہو کیونکہ یہ اس کے طبعی مزاج اور اس کی اصل غرض و غایت ہی کے خلاف ہے۔اس کا مزاج یہ ہے کہ وہ کچھ لوگوں کی زندگیوں میں 'ایک زندہ تنظیم کی شکل میں اور ایک ٹھوس تحریک کی شکل میں ظاہر ہو اور اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ کچھ لوگوں کی زندگیوں میں سے پھوٹ کر نکلے 'اسے ایک تنظیم ملے 'اس کے پیچھے ایک ٹھوس تحریک ہو اور اس کی تعبیر نظریاتی طور پر اور عملی پہلو سے بیک وقت مکمل ہو۔یہاں نظریت اور عملیت میں دوئی اور فرق نہیں ہے بلکہ اسلامی نظریہ حیات ایک چلتا پھرتا نظریہ ہوتا ہے اور ایک فعال تحریک ہوتا ہے۔رہی اسلام کی ایسی نظریاتی تعبیر جس کے پیچھے کوئی تحریک نہ

ہو اور اس کے ساتھ ساتھ کسی قسم کی عملی حرکت نہ ہو' تو یہ ایک نہایت ہی خطرناک تعبیر ہے۔ایک غلط رجحان ہے اور اسلامی نظریہ حیات کی فطرت' اس کی غرض و غایت اور ایک فرد کے تزکیہ نفس کے بلند تر مقصد کے سراسر خلاف ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو متفرق طور پر نازل فرمایا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

(وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ)------(عَلَى مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا)

اور قرآن جسے ہم نے متفرق اور ٹکڑے ٹکڑے بنایا تاکہ آپ اسے لوگوں تک وقفہ وقفہ کے بعد پہنچائیں اور ہم نے اسے بتدریج نازل کیا ہے۔" (اسراء :۱۰٦)

یعنی قرآن کریم کو مجملا" مجملا" اور وقفوں کے بعد نازل کیا گیا اور مطلوب یہ تھا کہ اسلامی نظریہ حیات کی بنا اور تعمیر ایک زندہ تنظیم کی شکل میں ہو محض "نظریہ" (Theory) کی صورت میں نہیں۔

نیز ہمیں اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ جس طرح یہ دین اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ رسول نازل کیا گیا اسی طرح اس کا طریق کار بھی اللہ تعالیٰ نے سنت رسول کے ذریعے مقرر فرما دیا۔یہ مسنون طریق کار ہی اس دین کے مزاج کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور اس دین اور اس کے فطری طریق کار کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہمارے پیش نظر رہے کہ جس طرح اسلام نظریاتی اصلاح کے ذریعہ انسان کے کردار میں اصلاح اور تبدیلی چاہتا ہے' بعینہٖ اسی طرح وہ اس طریق کار کو بھی بدل دینا چاہتا ہے جس کے مطابق فکری اور نظریاتی اصلاح درکار ہے۔مثلاً یہ کہ وہ محض فکری تعمیر' فلسفیانہ طور پر نہیں چاہتا بلکہ وہ فکری اصلاح اور راہنمائی کے ساتھ ساتھ ایک تحریک بھی برپا کرنا چاہتا ہے' تاکہ ایک ایسی امت (Great Nation) کی تعمیر ہو جس کے طرز فکر میں اعتقادی تصورات اور ایک زندہ و فعال معاشرے کا وجود ساتھ ساتھ موجود ہوں۔غرض اسلامی نظریہ حیات کی رو سے اس کے طرز فکر' اور اس فکر کے مطابق اساسی تصورات اور ان تصورات کے مطابق وجود میں آنے والے معاشرے کے درمیان ایسی کوئی حد فاصل نہیں ہے کہ جب ایک پر کام ہو رہا ہو تو دوسرے کو ہاتھ نہ لگایا جائے' احیائے دین کے اسلامی طریق کار کے مطابق سب پر بیک وقت کام ہو گا۔

اس طریق کار کی اہمیت

احیائے دین کے اس طریق کار کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں اس بات کو اپنے ذہن میں رکھنا چاہئے کہ یہ طریق نہایت اہم اور نہایت بنیادی ہے۔یہ کسی خاص مرحلے'کسی خاص خاندان اور کسی خاص معاشرے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اور نہ ہی یہ طریق پہلی تحریک اسلامی کے ظروف و احوال کے ساتھ مخصوص تھا۔یہ ایسا طریق کار ہے جس کو اختیار کیے بغیر احیائے دین کا کام کسی جگہ اور کسی زمانے میں بھی نہیں ہو سکتا۔

اسلام کے پیش نظر صرف یہ نہ تھا کہ لوگوں کے کچھ عقائد میں تبدیلی کر کے اور معاشرتی حالات میں کچھ اصلاحات کر کے بیٹھ جائے۔وہ لوگوں کے فکر و نظر میں ہمہ گیر تبدیلی چاہتا تھا اور یہی وہ مہم تھی جس کا بیڑا اس نے اٹھایا۔اس نے انہیں نظریہ بھی دیا اور واقعیت بھی دی اور اس کے لئے ایک خاص طریق کار بھی دیا اور چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ طریق کار

ہے اس لئے وہ اپنے مزاج کے اعتبار ہی سے انسانوں کے وضع کردہ ناقص طریق ہائے کار سے ' سراسر مختلف ہے۔

اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام زندگی کا حصول اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہم اپنے اندر اسلامی طرز فکر (Islamic Way of Thinking) پیدا نہ کرلیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی طرز فکر پر لوگوں کے افکار و تصورات کی تعمیر کی اور ان کے تمام عقائد درست ہو گئے اور ان کی عملی زندگی کی تشکیل اور تعمیر بھی صحیح خطوط پر ہوئی۔ جدید افکار سے متاثر ہو کر جب ہم اسلامی نظریہ حیات کو محض تعلیمی اور تدریسی نظریہ بنا دیں گے تو وہ اپنا مخصوص مزاج کھو دے گا اور ہم اس ذہنی شکست کا شکار ہوں گے کہ گویا اسلامی طریق کار اور الٰہی نقطہ نظر انسانی نظریوں اور نظاموں سے فروتر ہے یا یہ کہ وہ ان سے ناقص ہے اور ہم یہ تبدیلی کر کے اس کے نقص کو دور کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ انسانی طریق کار اور معیار کے مطابق ہو جائے .... یہ ایک عظیم شکست ہوگی اور تباہ کن بھی۔

اسلامی نظام حیات کی خصوصیت یہ ہو کہ وہ تحریک اسلامی کے کارکنوں کو ایک خاص طرز فکر عطا کرے اور انہیں جاہلی طرز فکر کے بندھنوں سے آزاد کر دے ' جو اس وقت ہر طرف چھائے ہوئے ہیں اور جن سے ہماری تنظیمیں اور ہماری پوری ثقافت متاثر ہے۔ اگر ہم اسلامی نظام حیات کو اسی نقطہ نظر سے دیکھیں ' جو کسی دنیاوی جاہلی نظام کے بارے میں رکھا جاتا ہے تو یہ اسلامی نظام حیات کے مزاج کے سراسر خلاف ہو گا اس طرح اس دین کا وہ اصلی مقصد ہی فوت ہو جائے گا جو مقصد وہ فلاح انسانیت کے سلسلے میں پیش نظر رکھتا ہے۔ اس نقطہ نظر کو اختیار کرنے کے بعد ہمارے لئے یہ بے حد مشکل ہو گا کہ ہم جاہلی نظام حیات سے نجات پا سکیں۔ جب کہ یہ نظام اس وقت ہر طرف سے غلبہ پا رہا ہے۔ اس طرح ہم ایک زریں موقع کھو دیں گے اور ہماری اجتماعی زندگی جاہلی نظریات اور غیر اسلامی افکار کے نیچے دب جائے گی اور اس کے نتائج دور رس اور تباہ کن ہوں گے۔

نقطہ نظر کا توازن

تحریک احیائے اسلام میں طرز فکر اور طریق کار ' تصور حیات اور نظام حیات کے درمیان اہمیت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ طرز فکر اور طریق کار کسی وقت بھی مفصل نظام حیات اور تصور حیات سے منفصل نہیں ہو سکتے اور اس تصور حیات اور نظام حیات کو اگر محض تعبیری شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتیجے میں قطعاً کوئی تحریک وجود میں نہ آئے گی اور اسلامی نظریہ حیات محض ذہنی نظریہ بن کر رہ جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اگر ہم اسلام کے تصور حیات کو پیش کرنے کے لئے محض تعبیری طریق کار کو اختیار بھی کر لیں تو پھر بھی اس سے وہی لوگ مستفید ہو سکیں گے جو عملاً اس تحریک کو اپنائے ہوئے ہوں اور یہ بھی اس صورت میں کہ جس منزل پر یہ کارکن ہوں اس میں وہ اسلامی نظام حیات کے احکامات پر پوری طرح عمل پیرا ہوں۔ یعنی اس نظریہ حیات سے استفادہ مقدار عمل کے مطابق اٹھایا جا سکتا ہے ' مقدار علم کے مطابق نہیں۔ غرض میری ان معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تصور حیات فی الفور ایک تحریک کی شکل میں ظاہر ہونا چاہیے اور یہ تحریک اس تصور حیات کی صحیح تمثیل اور ترجمہ ہو۔ یہی اسلامی نظام حیات کے قیام کا فطری طریق کار ہے اور تمام دوسرے طریقوں سے اعلیٰ ' ارفع اور ٹھوس بھی ہے۔ انسانی فطرت کے ساتھ زیادہ مطابق بھی ہے اور اس میں زیادہ تحریکیت اور فعالیت پائی جاتی ہے۔ محض جامد شکل میں ایک مستقل اور مکمل نظریہ

حیات پیش کر دینے سے یہ طریق کار زیادہ مفید ہے کیونکہ اس میں فعال اور متحرک لوگوں کے سامنے لائحہ عمل پیش ہوتا ہے اور غیر متحرک لوگوں سے واسطہ نہیں پڑتا بلکہ لوگ ذہنی تصورات اور نظریہ حیات کی جیتی جاگتی تصویر ہوتے ہیں۔

تحریک اسلامی اور علمی تحقیقات

اگر میری یہ رائے اصل اسلامی نظریہ حیات کے بارے میں درست ہے تو اسے اسلامی نظریہ حیات کے اساسی تصورات کے بارے میں بھی درست ہونا چاہئے۔ نیز اسلامی نظام حیات کے مفصل قوانین پیش کرنے کے مسئلے میں بھی یہی طریق کار' یعنی تدوین و نفاذ کا اتحاد ہی درست ہونا چاہئے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہمارے اردگرد جاہلیت کا گھٹاٹوپ اندھیرا ہے۔ وہ تحریک اسلامی کے کارکنوں پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ جوں جوں وہ احیائے دین کے لئے' اسلامی نظام حیات کے مقررہ طریق کار کے مطابق قدم آگے بڑھاتے ہیں وہ ان سے بڑے معصوم لہجے میں سوال کرتی ہے کہ جس نظام حیات کی طرف تم لوگوں کو بلا رہے ہو اس کی تفصیلات کیا ہیں۔ اس کے نفاذ کے لئے تم نے کیا کیا علمی تحقیقات کی ہیں' اس کی علمی اور نظری بنیادیں کہاں تک تیار ہو چکی ہیں اور جدید خطوط پر اسلامی فقہ کی تدوین کہاں تک ہوگئی ہے؟ ان معصومانہ سوالات کو سن کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا اسلامی نظام حیات کے نفاذ کی راہ میں' اب صرف یہی رکاوٹیں حائل ہیں کہ صرف فقہی احکامات کی تدوین اور بعض فقہی موضوعات پر تحقیق کی ضرورت پوری ہو جائے۔ رہی جاہلیت تو وہ تو اللہ کی حاکمیت کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے اور تمام لوگ اس کے لئے آمادہ ہو چکے ہیں کہ اسلامی قوانین کو نافذ کیا جائے۔ مشکل صرف یہ درپیش ہے کہ کوئی ایسا فقیہ' مجتہد اور مقنن نہیں مل رہا جو جدید قانونی خطوط پر اسلامی شریعت کو مدون کر سکے۔ یہ دراصل ایک گہری سازش اور ایک کھلا مزاح ہے جو شریعت اسلامیہ کے ساتھ کیا جا رہا ہے اور ہر حساس دل کو اس کی طرف خاطر خواہ توجہ دینا چاہئے۔

جاہلیت کے پیرو کار ایسے سوالات اٹھا کر' دراصل شریعت اسلامی کے نفاذ سے پہلوتہی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو بدستور غیر اسلامی اور انسانی قوانین کے تابع رکھا جائے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ تحریک اسلامی کو اقامت دین کے اسلامی طریق کار سے ہٹا دیا جائے' تعمیر افکار اور احیائے تحریک کے ضروری مرحلے کو نظرانداز کر دیا جائے اور اس سے پہلے ہی قانون کی تدوین شروع کر دی جائے' حالانکہ اقامت دین کا صحیح طریق کار یہ ہے کہ سب سے پہلے اسلامی نظریہ حیات تحریک اسلامی کی فعال شکل میں ظہور پذیر ہو اور اقامت دین کا جو مرحلہ درپیش ہو اس کی حقیقی ضرورت کے مطابق ہی تفصیلی قوانین کو سامنے لایا جائے اور تدوین قانون اس وقت ہو جب اس کی ضرورت درپیش ہو۔

تحریک اسلامی کے کارکنوں کا یہ فرض اولین ہے کہ وہ اسی طریق کار کو پیش نظر رکھیں۔ سازشوں اور فوجی انقلابات کے طریق کار سے باز رہیں اور اس اسلامی طریق کار کے مقابلے میں' اپنی طرف سے کوئی طریق کار املاء نہ کرائیں۔ جو لوگ سرے سے خدا اور رسول پر یقین ہی نہیں رکھتے ان کی باتوں پر توجہ نہ دیں۔ یہ لوگ دراصل ہمارے تحریک اسلامی کے کارکنوں کو گمراہ کر کے جلد باز بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہمیں بے حد سنجیدہ ہونا چاہئے۔

اسلام پسند عناصر میں مختلف طریقوں سے جو تنگ دلی پھیلائی جا رہی ہے اس کا مقابلہ بے حد ضروری ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس سازش کو بھی ناکام بنائیں اور اس پست ذہنیت کو نظرانداز کر دیں جو "فقہ اسلامی کے ارتقاء" کے نام

سے ایک ایسے ملک میں پھیلائی جا رہی ہے جو سرے سے شریعت کی اطاعت اور نفاذ کا قائل ہی نہیں ہے۔ہمیں چاہیے کہ ہم اس بے فائدہ مزاح کو نظرانداز کرتے ہوئے صحیح اسلامی طریق کار کے مطابق اپنے حقیقی نصب العین کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہوا میں تخم ریزی کا فائدہ کچھ نہ ہو گا۔اسلامی تحقیقات اور فقہی ارتقاء کا یہ خوش آئند کھیل دراصل ایک گہری سازش ہے اور ہمارا فرض یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں احیائے دین کے صحیح اور فطری طریق کار ہی پر ڈٹ جائیں۔اسی میں اس دین کی قوت کا راز مضمر ہے اور وہی ہمارے کارکنوں کی معنوی قوت کا مصدر ہے۔

(اس وقت مصر میں پاکستان کے ادارۂ ثقافت اسلامیہ اور مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی کی طرز پر کئی ادارے اسلام پر تحقیقات کر رہے ہیں۔یہ تحقیقات ایسی ہی ہیں جیسے کوئی مستشرق فن ریگستانوں میں اثری انکشافات میں مصروف ہوتا ہے۔سید قطب کا مقصد یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو اسلام کے احیاء سے کوئی سروکار ہے نہ وہ لوگ جو ان اداروں میں کام کرتے ہیں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور نہ ان کی حکومتوں کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ ان تحقیقات کو نافذ کیا جائے بلکہ محض علمی اور فنی عیاشی کے طور پر یہ کام کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی کوئی تدبیر اسلام کو مطلوب نہیں ہے۔

البتہ یہ بات اپنی جگہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام کے ہر موضوع پر اٹھائے ہوئے جدید سوالات اور جدید حالات کی روشنی میں تحقیقات کی اشد ضرورت ہے' خصوصاً دفاعی تحقیقات۔نیز یہ بھی پیش نظر رہے کہ عربوں کے سامنے اسلامی نظام پہلی مرتبہ پیش ہوا اور ساتھ ساتھ بتدریج اس پر عمل بھی ہوتا رہا ہے۔لہذا قدرتی طور پر تعمیر افکار' اس کا طریق کار اور تحریک اسلامی اور تشکیل نظام حیات کے کام ساتھ ساتھ ہی ہوتے رہے۔لیکن اب ہم جس صورت حال سے دوچار ہیں اس کے دو پہلو ہیں۔ایک طرف عوام الناس ہیں جو اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے آمادہ ہیں یا کم از کم اس کے مخالف نہیں ہیں کہ ان پر یہ نظام نافذ کیا جائے اور دوسری طرف ایک محدود اقلیت ہے جو اسلامی نظام کے نفاذ کی امکانیت کی قائل نہیں اور یہ اقلیت محض طاقت اور اقتدار کے بل بوتے پر اسلامی نظام حیات کے راستے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے' لہذا اس صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے بعینہٖ وہ طریق کار جس میں تمام لوگوں کو غیر مسلم فرض کر کے اختیار کیا جاتا ہے' نہیں اپنایا جاسکتا۔ ایک دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ دور اول میں اسلامی قوانین کی تفصیلات پردہ غیب میں مستور تھیں اور جاہلیت کے حامل صرف انہی قوانین اور احکامات پر اعتراض کر سکتے تھے جو نازل ہو جاتے تھے۔لیکن اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اسلامی نظام حیات مفصل طور پر قرآن وسنت میں موجود ہے۔اسلامی تاریخ مدون ہے اور جاہلیت کو یہ موقع مل رہا ہے کہ وہ اسلامی ثقافت کے بارے میں قسم قسم کے اعتراضات اٹھائے۔ لہذا اسلامی نظام حیات کے احیاء کے ابتدائی طریق کار کے ہر مرحلے میں یہ ضروری ہو گا کہ جاہلیت کے اعتراضات کا دفعیہ کیا جائے اور اسلامی قوانین کے مختلف گوشوں کی وضاحت کی جائے۔نیز اس وقت ساری دنیا کو زندگی کے اساسی مسائل کا سامنا ہے اور مختلف نظام ہائے حیات کی باہمی آویزش میں صرف وہی نظام حیات کامیاب ہو سکتا ہے جو عالمی مسائل کا بہترین حل پیش کرتا ہو۔لہذا یہ ضروری ہے کہ تحریک اسلامی اس میدان میں بھی اسلامی نظام حیات کی برتری کو ذہن نشین کرائے۔اس طرح صحیح خطوط پر اسلامی تحقیقات کا کام بھی اشد ضروری ہو جاتا ہے۔ان حقائق کے پیش نظر سید قطب کا یہ فرمان کہ اسلامی قانون کی تفصیلات کو بالکل نہ چھیڑا جائے خالی از مبالغہ نہیں ہے)۔

احیائے دین کا اسلامی طریق کار اور خود اسلامی نظام حیات آپس میں عین ہیں۔ان کے درمیان کوئی فرق اور جدائی نہیں ہے۔اس طریق کار کے سوا کوئی دوسرا طریق کار اسلامی نظام حیات کو جنم نہیں دے سکتا۔کسی دوسرے طریق کار کے نتیجے میں کوئی انسانی اور جاہلی نظام حیات ہی جنم لے سکتا ہے۔اسلامی نظام حیات کا احیاء اس کے مطابق ہرگز نہیں ہو سکتا۔غرض اس پوری بحث کا نچوڑ یہ ہے کہ احیائے دین کی ہر تحریک اور ہر کوشش میں' احیائے دین کے اسلامی طریق کار کا التزام اس قدر ضروری ہے جس طرح اسلامی نظریہ حیات اور خود اسلامی نظام حیات کا التزام ضروری ہے۔

---ooo---

یہ میری آخری بات ہے اور مجھے یہ یقین ہے کہ اس طویل نوٹ کے ذریعے میں نے مکی سورتوں اور ان کے اندر

طے کردہ منہاج کی پوری پوری وضاحت کر دی ہے۔ اب ان تمام قائدین کو چاہیے کہ وہ اپنی تحریکوں کے لئے اسلامی منہاج کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیں جو اسلام کا کام کرنا چاہتے ہیں۔ پھر اطمینان کر لیں اور امید رکھیں کہ وہ جس منہاج کو پا چکے ہیں وہ خیر اور بھلائی ہے اور یہ کہ وہی بلند ترین لوگ ہیں اور یہ کہ قرآن کریم جو راہ دکھاتا ہے وہ اقوم اور مضبوط ہے۔ (اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ)

---ooo---

اب ہم کچھ بات اس سورہ کے بارے میں کرتے ہیں۔ ظلال القرآن میں یہ پہلی مکی سورہ ہے جس پر ہمیں کلام کرنے کا موقعہ مل رہا ہے اور یہ سورہ مکی قرآن اور مکی انداز کلام اور مضامین کی ایک مکمل تصویر ہے، جس کے خصائص ' جس کے مزاج اور مضامین کے بارے میں ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں۔ اس سورہ میں قرآن کریم کے خصائص ' اس کے منہاج کلام ' اس کے موضوع اساسی ' اور طرز ادا کے زاویے سے ایک مثالی بحث موجود ہے۔ اس عمومی اسلوب کو اپناتے ہوئے سورہ کے اپنے مزاج کو بھی قائم رکھا گیا ہے۔ جس طرح قرآن کریم کی تمام سورتوں کی یہ خصوصیت ہے کہ ان میں قرآن کریم کے عمومی اسلوب اور اخذ کے ساتھ ساتھ سورہ کا ایک خاص مزاج اور اسلوب بھی قائم رکھا گیا ہے۔ اور ہر سورہ کا مخصوص ماحول دوسری سورتوں میں نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ قرآن کریم کی ہر سورہ کی اپنی ذاتی شخصیت بھی ہوتی ہے ' اس کا ایک علیحدہ محور ہوتا ہے ' ہر سورہ کے مخصوص خدوخال ہوتے ہیں اور اس کا ایک بڑا موضوع ہوتا ہے جس کے گرد تمام مباحث گھومتے ہیں۔ پھر اس موضوع کی مناسبت اور دوسرے اسباب جو ادائے مطلب کو نہایت ہی موثر بناتے ہیں۔ مخصوص منظر کشی ' مخصوص سائے اور مخصوص فضا ہر سورہ میں ممیز و ممتاز نظر آتی ہے۔

ہر سورہ میں مخصوص اسلوب کے جملے بار بار تکرار کے ساتھ آتے ہیں۔ موضوعات بعض اوقات ملتے جلتے بھی ہوتے ہیں ' سورہ کی شخصیت کا تعین موضوع سے نہیں ہوتا بلکہ کچھ دوسرے خدوخال ہوتے ہیں جو اس سورہ کی شخصیت کے لئے سیٹ کا کام دیتے ہیں جو اس سورہ کے ساتھ خاص ہوتے ہیں اور دوسری سورتوں میں نہیں ہوتے۔

رہی سورہ زیر بحث تو اس کا ایک ہی مرکزی موضوع ہے اور یہ موضوع ہر لمحہ ' ہر وقت ' ہر منظر میں نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ایسی خوبصورتی کے ساتھ جس کو دیکھ کر آنکھیں چندھیا جائیں۔ انسان انگشت بدنداں رہ جائے اور اس کی سانس رک جائے۔ اس وقت جبکہ کوئی اس کے مناظر پر غور کرے ' اس کے زیر و بم کو دیکھے اور اس کے اثرات کو محسوس کرے۔

ہاں یہ ایک حقیقت بہت اہم ہے ' میں اپنے نفس کے اندر اس حقیقت کو پاتا ہوں ' جب بھی میں اس سورہ کے سیاق کلام کے ساتھ چلتا ہوں ' اس کے مناظر کی سیر کرتا ہوں اور اس کے اثرات کو محسوس کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص بھی ایک حساس دل رکھتا ہے ' وہ ضرور ان احساسات میں سے کچھ نہ کچھ پائے گا جو میں محسوس کرتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس سورہ کی خوبصورتی انسان کو مبہوت کر دیتی ہے اور دل و دماغ مسحور ہو کر اس کے ساتھ چلتے ہیں۔

یہ سورہ مجموعی لحاظ سے اللہ کی حاکمیت سے بحث کرتی ہے۔ اس پوری کائنات کے دائرے میں بھی اور انسانی زندگی کے دائرے میں بھی۔ انسانی نفس اور ضمیر کے دائرے میں بھی اور اس دکھائی دینے والی کائنات کے نامعلوم رازوں کے دائرے میں بھی۔ نیز عالم الغیب کے نامعلوم رازوں کے دائرے میں بھی۔ یہ سورہ اس کائنات کی تخلیق ' اس کرۂ ارض

کے اوپر زندگی کی تخلیق 'پھر حیوانات کے اوپر انسان کی تخلیق کے باب میں تصور حاکیت اللہ کو پیش کرتی ہے - پھر تاریخی زاویے سے یہ سورہ گزرنے والوں کی باہمی کشمکش اور پھر ان کی جگہ لینے والوں کی جانشینی میں بھی حاکیت الٰہیہ کے کچھ رنگ دکھاتی ہے - غرض اس کائنات کے اوپر نظر ڈالتے ہوئے مظاہر فطرت پر اللہ کی حاکیت ' دنیا میں رونما ہونے والے بڑے بڑے واقعات میں اللہ کی حاکیت ' اور دنیا میں خوشحالی اور بدحالی میں اللہ کی حاکیت اس سورہ کا موضوع ہے - قدرت الٰہیہ کے مختلف مظاہر و مشاہد میں اللہ حاکیت ' انسانی زندگی کے اوپر اللہ کی ظاہری اور باطنی گرفت میں اللہ کی حاکیت ' اس کرۂ ارض پر رونما ہونے والے واقعات و حوادث میں اللہ کی حاکیت اور سب سے آخر میں مشاہد قیامت اور لوگوں کے بارگاہ الٰہی میں کھڑے ہونے میں اللہ کی حاکیت -

وہ موضوع جو اس سورہ میں آغاز سے انتہا تک چلتا ہے وہ نظریے کا موضوع ہے - اس موضوع کے تمام عناصر ترکیبی نظریاتی ہیں اور اس کے تمام پوشیدہ معانی بھی نظریاتی ہیں - یہ سورہ انسانی معاشروں کا ہاتھ پکڑتی ہے اور انہیں لے کر اس پوری کائنات کی سیر کراتی ہے - یہ انہیں اس کائنات کے نظریاتی سرچشموں اور ان کے ظاہری اور خفیہ اشارات کی سیر کراتی ہے - نفس انسانی کو لے کر یہ زمین و آسمانوں کی بادشاہت میں چلتی ہے - جہاں یہ نفس عالم ظلمات اور عالم نور کی سیر کرتا ہے ' سورج چاند اور ستاروں کے جھرمٹ دیکھتا ہے - یہ اس زمین کے باغات میں سیر کرتا ہے جس میں قسم قسم کے پھل ہیں - ان پر بارشیں ہو رہی ہیں اور ان کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں - پھر یہ سورہ نفس انسانی کو ایسے معرکہ کارزار میں لاکر کھڑا کر دیتی ہے جس میں گزشتہ اقوام مرتی مٹتی نظر آتی ہیں اور ان کے آثار قدیمہ نظر آتے ہیں - پھر بحر و بر کے اندھیروں کی سیر کرائی جاتی ہے - کچھ غیبی راز بتائے جاتے ہیں - انسانی نفسیات کے راز آشکارا ہوتے ہیں - پھر ہم دیکھتے ہیں کہ زندہ مردے سے نکلتا ہے اور مردہ زندے سے نکلتا ہے - ایک بیج ہے جو زمین کے پیٹ کی تاریکیوں میں پوشیدہ ' ایک نطفہ ہے جو رحم کے اندھیروں میں پرورش پا رہا ہے - پھر اس سورہ کی اسکرین پر جن و انس کے غول آتے ہیں ' پھر پرندوں اور دوسرے وحوش کے گلے آتے ہیں - پھر اولین اور آخرین آتے ہیں - زندہ لوگ اور مرے ہوئے لوگ بھی نظر آتے ہیں اور رات و دن کے وقت محافظین الٰہی بھی نظر آتے ہیں -

یہ بے شمار کائناتی مشاہد و مناظر انسانی حس اور انسانی نفس پر ہر جانب سے حملہ آور ہوتے ہیں - انسان بالکل ایک نیا نیچ محسوس کرتا ہے - نہایت ہی زندہ احساس نفس کے اندر پیدا ہوتا ہے اور یہ مناظر اور یہ معانی پردہ خیال پر زندہ دوڑتے نظر آتے ہیں - حالت یہ ہو جاتی ہے کہ مکرر اور دیکھے ہوئے مناظر اور احساسات بھی بالکل نئے اور انوکھے نظر آتے ہیں ' بالکل جدید اور بالکل متحرک اور زندہ - انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ احساس اور یہ شعور بالکل پہلی مرتبہ حاصل ہوا ہے - گویا اس سے قبل کوئی انسانی ضمیر اور شعور ان احساسات سے کبھی دوچار نہ ہوا تھا -

یہ سورہ اپنے ان شاہدات و مواقف ' اپنے اشارات و اثرات اور اپنی تصاویر و شیڈز کے ساتھ اس طرح جاری و ساری ہے جس طرح کوئی دریا اپنی امواج کے ساتھ جاری و ساری رہتا ہے - ایک موج ساحل سے نہیں ٹکراتی کہ دوسری اٹھتی ہے - امواج کے اس نشیب و فراز میں اس سورہ کا دریا مسلسل آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے -

یہ سورہ اپنی امواج کے اس مسلسل تلاطم کے ساتھ اور اپنی امواج کے باہم ٹکراؤ کے ساتھ اس قدر خوبصورت نظر آتی ہے کہ انسان مسحور ہو جاتا ہے - اس خوبصورتی کے ساتھ ساتھ مضامین اور مفاہیم کو بھی نہایت ہی ہم آہنگی اور خوش

اسلوبی کے ساتھ ادا کیا گیا ہے اور اس قدر اثرانگیز طریقے سے مضامین پیش کئے گئے ہیں کہ انسان کے احساسات دنگ رہ جاتے ہیں۔ نہایت ہی زندہ 'متحرک' ہم آہنگ اور مؤثر صوتی اثرات والے الفاظ ہیں جو نفس انسانی پر ہر جہت اور ہر سمت سے اثرانداز ہو کر اسے مسحور کر دیتے ہیں۔ زندگی سے بھرپور فقرے 'مؤثر صوتی اثرات اور تصویری انداز تعبیر نفس انسانی کے ہر پہلو پر اپنے اثرات چھوڑتا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ ہم اس سورہ میں وہ اثرات جو دل و دماغ پر مرتب ہوتے ہیں' ان کا اظہار ہم اپنے الفاظ میں نہیں کر سکتے۔ بہتر تو یہ ہے کہ پڑھنے والا اسے خود پڑھے اور خود براہ راست اس کے اثرات اور کرشمے محسوس کرے۔ اس سورہ کے ادبی اور اشاراتی اوصاف ہم اپنے انسانی الفاظ اور فقروں میں بیان ہی نہیں کر سکتے۔ البتہ ہم ان لوگوں کو اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے ذریعے ایک راہ دکھلاتے ہیں جنہوں نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔ ان کی زندگی اور قرآن کے درمیان خلیج واقعہ ہو گئی ہے اور وہ قرآن کی فضا سے متضاد فضاؤں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

قرآنی فضا میں زندگی گزارنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم قرآن مجید کی تعلیم حاصل کریں۔ اس کو قرأت کے ساتھ پڑھیں اور اس کے علوم و فنون سے آگاہ ہوں اور اس کی ادبی خوبیاں ہمیں معلوم ہوں۔ یہ قرآنی فضا نہیں ہے۔ قرآن کی فضا میں زندگی گزارنے کے معنی ہمارے نزدیک یہ ہیں کہ انسان ایسے حالات میں 'ایسی فضا میں' ایسی کشمکش میں 'ایسی مشکلات میں اور ایسی اقدار میں زندگی بسر کرے جس طرح دور اول میں نزول قرآن کے وقت تھی۔ اس طرح کہ گویا یہ قرآن ابھی نازل ہو رہا ہے۔ انسان اس جاہلیت کے بالمقابل زندگی بسر کرے جو اس وقت پورے کرۂ ارض پر چھائی ہوئی ہے۔ انسان اپنے دل میں 'اپنے ارادوں میں' اپنی حرکات میں' جاہلیت کا مقابلہ کر رہا ہو' اپنے نفس اور لوگوں کے نفس کے اندر اسلام کو پیدا کر رہا ہو' اپنی زندگی میں اور لوگوں کی زندگیوں میں' جاہلیت کا مقابلہ کرتے ہوئے از سرنو اسلام کو پیدا کر رہا ہو۔ وہ جاہلیت کے تمام تصورات' جاہلیت کی تمام ترجیحات' جاہلیت کی تمام رسومات اور جاہلیت کی تمام عملی صورت حال کا از سرنو مقابلہ کرے۔ جاہلیت کے تمام پریشرز' جاہلیت کی ہر قسم کی معرکہ آرائی' ہر قسم کے مقابلے اور اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام حیات پر ہر قسم کے حملے کے سامنے صف آراء ہو جائے۔ اسلامی نظام اور اسلامی نظریہ حیات کے تمام تقاضے پورے کرے' اسلام کی راہ میں جہاد کرے اور اس پر مصر رہے۔ یہ ہے قرآنی فضا کا مفہوم۔

یہ ہے وہ قرآنی فضا جس میں رہنے کا تقاضا یہ قرآن کرتا ہے' صرف اسی صورت میں کوئی صاحب ذوق فہم قرآن کو پا سکتا ہے۔ اس لئے کہ ایسے ہی حالات میں یہ قرآن نازل ہوا' ایسے ہی بحر مشکلات میں قرآن نے اپنا کام کیا جو مسلمان ایسی فضاؤں سے نا آشنا ہیں وہ قرآن سے محروم ہیں۔ اگرچہ وہ اسلامی مدارس میں پڑھتے ہوں' قاری ہوں اور قرآنی علوم و فنون کے ماہر ہوں۔

قرآن کی دنیا میں داخل ہونے کے لئے' مخلصین کے استعمال کے لئے ہم جو فہم قرآن کا پل تعمیر کر رہے ہیں' اس کا فائدہ ان مخلصین کو تب ہی ہو گا کہ وہ اس پل کو عبور کر کے قرآن کی دنیا میں داخل ہو جائیں' وہ اس جہان اور منطقہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے علاقے میں داخل ہو جائیں' اور اپنے عمل اور اپنی جدوجہد کے ذریعے وہ قرآن کی فضا میں داخل ہو جائیں' اور یہ فضا وہ خود پیدا کریں' صرف اس وقت ان کو قرآن کا ذائقہ محسوس ہو گا اور صرف اس وقت ہی وہ محسوس کریں گے کہ اللہ نے انہیں ایک عظیم نعمت سے نوازا ہے۔

یہ سورہ اسلامی نظریہ حیات سے بحث کرتی ہے۔ اس کا موضوع اللہ کی الوہیت اور بندے کی بندگی ہے۔ یہ سورہ اللہ کے بندوں کے سامنے اللہ کا تعارف پیش کرتی ہے کہ اللہ کیا ہے؟ اس کائنات کی اصلیت کیا ہے؟ اس کی پشت پر کیا راز ہائے دروں ہیں؟ یہ انسان کون ہیں؟ انہیں کون وجود میں لایا ہے؟ انہیں کس نے پیدا کیا؟ انہیں رزق کون فراہم کرتا ہے؟ ان کی کفالت کون کرتا ہے؟ ان کے معاملات کی تدبیر کون کرتا ہے؟ ان کے دلوں اور ان کے نقطہ نظر میں تبدیلی کون لاتا ہے؟ ان کے شب و روز کو کون بدلتا ہے؟ کون ان کو پیدا کرتا ہے اور کون ہے جو انہیں قیامت میں دوبارہ پیدا کرے گا؟ ان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ ان کی زندگی کو یہاں محدود کیوں رکھا گیا ہے؟ ان کا انجام کیا ہو گا؟ یہ زندگی کیا ہے اور اس کی بوقلمونیاں کیا ہیں؟ اس کرۂ ارض پر اسے کس نے پھیلایا؟ یہ پانی کیا ہے؟ یہ چشمے 'یہ پھل اوپر نیچے' یہ شہاب ثاقب' یہ صبح کی نمو داری' یہ رات کی تاریکی' یہ آسمانوں کی گردش' ان کے پیچھے کون ہے؟ اور ان کے پیچھے کیا راز ہیں؟ کیا اطلاعات ہیں؟ یہ اقوام' یہ صدیاں' لوگ آتے ہیں اور جاتے ہیں' اقوام ہلاک ہوتی ہیں اور دوسری نمودار ہوتی ہیں۔ یہ کون ہے جو زوال دیتا ہے اور عروج بخشتا ہے؟ یہ اقوام ہلاکت سے کیوں دوچار ہوتی ہیں؟ اور پھر نئے لوگوں کو اوپر لاکر جس آزمائش میں ڈالا جاتا ہے ان کا انجام' آزمائش اور جزاء و سزا کس طرح وقوع پذیر ہوتی ہے عمل اور مکافات عمل کا یہ کیا چکر ہے؟

اس طرح یہ سورہ قلب انسانی کو لے کر ان تمام ابعاد و آفاق تک لے جاتی ہے اور ان تمام نشیب و فراز کی سیر کراتی ہے' لیکن پوری سورہ میں قرآن کریم کا مکی انداز برقرار ہے جس کے اسلوب کے بارے میں ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں۔ مکی اسلوب کے ساتھ ساتھ پورے قرآن کا انداز کلام بھی اس سورہ میں اپنے اعلیٰ معیار پر ہے۔ انداز بحث صرف نظریاتی نہیں ہے اور نہ ہی لاہوتی جدلیات پر مشتمل ہے کہ قارئین کے افکار اور ان کے ذہنوں کو مشغول کیے رکھے' بلکہ سیدھے سادے انداز میں' یہ سورہ رب العالمین کا تعارف لوگوں سے کراتی ہے تاکہ لوگ اپنے سچے رب کی بندگی اور غلامی اختیار کریں۔ ان کا ضمیر اور ان کی روح اللہ کی غلام ہو جائے۔ ان کی جدوجہد اور ان کی تمام مساعی اللہ کی تابعداری میں ہوں' ان کے رسوم اور رواج اللہ کی اطاعت میں ہوں اور ان کی زندگی کی پوری عملی صورت حال اللہ وحدہ کی حاکمیت کے تحت ہو جس کے سوا زمین و آسمان کے اندر کسی کی حاکمیت نہیں ہے۔

یوں نظر آتا ہے کہ یہ سورہ اول سے آخر تک ایک متعین نصب العین کی طرف بڑھ رہی ہے' یہ کہ اللہ ہی خالق ہے' وہی مالک ہے' وہی قدرتوں والا ہے اور وہی بادشاہ اور قہار ہے۔ وہی پوشیدہ چیزوں اور غیب کا جاننے والا ہے۔ وہ جس طرح رات اور دن کو گردش دے رہا ہے اسی طرح وہ دلوں اور دماغوں کا بھی پھیرنے والا ہے اس لئے اسی کو تمام لوگوں کی زندگیوں پر حاکم ہونا چاہئے اور لوگوں کی زندگیوں میں امر اور نہی کا اختیار صرف اسے ہونا چاہئے۔ کوئی حکم کوئی قانون اس سے سوا نہ ہو گا۔ حلال و حرام کے تعین کا اختیار بھی صرف اسی کو ہے۔ اس لئے کہ یہ تمام امور اللہ کی الوہیت کے عناصر ترکیبی ہیں۔ لہٰذا لوگوں کی زندگیوں میں ان کے بارے میں تصرف صرف اللہ کر سکتا ہے۔ اس کے سوا نہ کوئی خالق ہے' نہ کوئی رازق ہے' نہ زندہ کرنے والا ہے' نہ مارنے والا ہے' نہ نفع دینے والا ہے' نہ نقصان دینے والا ہے' نہ کوئی داتا ہے اور نہ کوئی مانع ہے۔ غرض نہ اللہ کے سوا کوئی بھی کسی کے لئے یا اپنے لئے نفع و نقصان کا مالک ہو سکتا ہے' نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ اس سورہ میں اول سے آخر تک اس مقصد کے لئے دلائل و شواہد پیش کیے گئے

ہیں۔اور یہ دلائل ان مشاہدات ' مؤثرات اور قدرتی مواقف کے ذریعے پیش کیے گئے ہیں جو اس کائنات میں موجود ہیں اور فکر و نظر کو مسحور کرنے والے ہیں۔ان مناظر فطرت کے اس مطالعے سے دل پر ہر طرف سے اشارات و مؤثرات ہر دروازے اور ہر پہلو سے ہوتے ہیں۔

وہ سب سے بڑا مسئلہ جس پر یہ سورہ زور دے رہی ہے ' وہ زمین و آسمانوں کے اندر اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کا مسئلہ ہے۔زمین و آسمان کے وسیع دائرے میں اور اس کائنات کے وسیع و عریض میدان میں تصور حاکمیت الٰہیہ کا مسئلہ۔ یہ سورہ اسی مسئلے کو پیش کرتی ہے لیکن اخلاقی انداز اور بات کی مناسبت یہ ہے کہ جاہلیت کے پیروکار بعض ذبیحوں اور بعض کھانوں کے معاملے میں حلال و حرام کے اختیارات اللہ کے سوا دوسروں کو دیتے تھے۔اسی طرح نذر بعض قربانیوں ' بعض پھلوں اور بعض بچوں کے سلسلے میں جاہلیت کے پرستار اللہ کے سوا دوسرے الٰہوں کو اختیارات دیتے تھے۔اس مناسبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس پوری کائنات کے اندر نظریہ حاکمیت الٰہیہ یہاں تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور اس مناسبت کی طرف سورہ کی آخری آیات کے اندر اشارے کیے گئے ہیں۔

(پھر اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو ' تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو ' اس کا گوشت کھاؤ۔آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو ' حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالت اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے ان کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے۔بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بنا پر گمراہ کن باتیں کرتے ہیں ' ان حد سے گزرنے والوں کو تمہارا رب خوب جانتا ہے۔ تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی۔جو لوگ گناہ کا اکتساب کرتے ہیں وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے۔اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو ' اس کا گوشت نہ کھاؤ ' ایسا کرنا فسق ہے۔شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔لیکن اگر تم نے ان کی اطاعت قبول کر لی تو یقیناً تم مشرک ہو گے۔ (۶: ۱۱۸ تا ۱۲۱)

(اور ان لوگوں نے اللہ کے لئے خود اس کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے ' اور کہتے ہیں یہ اللہ کے لئے ہے بزعم خود ' اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لئے ہے۔پھر جو حصہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لئے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لئے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے۔کیسے برے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ۔اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لئے ان کے شریکوں نے اولاد کے قتل کو خوشنما بنایا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے ' لہٰذا انہیں چھوڑ دو کہ یہ اپنی افترا پردازیوں میں لگے رہیں۔کہتے ہیں یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں۔انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھلانا چاہیں حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے۔پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے اور یہ سب کچھ انہوں نے اللہ پر افتراء کیا ہے۔عنقریب اللہ انہیں ان کی افتراء پردازیوں کا بدلہ دے گا۔اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے یہ ہمارے مردوں کے لئے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ' لیکن اگر وہ مردہ ہوں تو دونوں اس کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں۔یہ باتیں جو انہوں نے گھڑ لی ہیں ان کا بدلہ اللہ انہیں دے کر رہے گا۔یقیناً وہ حکیم ہے اور سب باتوں کی اسے خبر ہے۔یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ

لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت اور نادانی کی وجہ سے قتل کیا اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو اللہ پر افتراء پردازی کر کے حرام ٹھہرالیا۔ یقیناً وہ بھٹک گئے اور ہرگز وہ راہ راست پانے والوں میں سے نہ تھے۔ (۶:۱۳۶ تا ۱۴۰)

امت مسلمہ کی زندگی میں یہ ایک عملی پہلو تھا' جس کی مناسبت سے اس سورہ میں اس عظیم مسئلہ کو لیا گیا۔ اس دور میں امت مسلمہ کے ماحول پر بھی جاہلیت چھائی ہوئی تھی جس میں قانون سازی اور حلال و حرام کے تعین کے معاملے میں یہ شرکیہ عقائد موجود تھے۔ ان کی اصلاح کے حوالے سے یہاں اللہ کی الوہیت' اللہ کی حاکمیت اور تمام انسانوں کی بندگی اور عبودیت کے مسائل کو لیا گیا۔ چنانچہ جس طرح تمام کی قرآن میں اس مسئلے کو لیا گیا ہے' اسی طرح اس سورہ میں بھی اس مسئلے کو بڑی تفصیل سے لیا گیا ہے۔ مدنی آیات میں جہاں بھی حلال و حرام اور حق قانون سازی کا بیان آتا ہے وہاں بھی مسئلہ حاکمیت الٰہیہ کو لیا جاتا ہے۔

اس سیاق کلام میں جن مؤثر ہدایات اور فیصلوں اور قراردادوں کا سیلاب امنڈتا چلا آ رہا ہے اور ان جانوروں' نذروں اور ذبیحوں کے بارے میں اہل شرک کی جو تردید کی جا رہی ہے' اسی حوالے سے یہاں اللہ کے مسئلہ الوہیت اور اللہ کے حق قانون سازی کو بھی بیان کیا جا رہا ہے۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ حلال و حرام کی اس قانون سازی کا تعلق اسلامی عقائد اور اسلامی نظریات کے ساتھ ہے۔ وہ نظریہ اسلام کا نظریہ حاکمیت الٰہیہ اور انسانوں کی بندگی اور غلامی کا ہے اور یہ مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے' اسلام اور کفر اور اسلام اور جاہلیت کا مسئلہ ہے۔ ہدایات کے اس سیلاب میں سے ہم یہاں اس سورہ کے تعارف میں صرف چند نمونے پیش کریں گے لیکن ان کی مکمل تفصیلات اس وقت آئیں گی جب ہم اس سورہ کی آیات پر تفصیلی بحث کریں گے۔ لیکن اپنے اثرات کے اعتبار سے یہ سیلاب نفس انسانی کے اندر اس دین کے مزاج کی حقیقی ماہیت بٹھا دیتا ہے۔ وہ یہ کہ انسانی زندگی کا چھوٹا مسئلہ ہو یا بڑا' ______ اللہ کے حق حاکمیت کے تحت حل ہونا چاہئے اور اللہ کی حاکمیت اسلامی شریعت کی صورت میں ریکارڈ شدہ ہے۔ اگر اس طرح نہ ہو گا تو پھر یہ تصور ہو گا کہ ایسے لوگ یا معاشرہ دین سے خارج ہے۔ ایک جزوی مسئلے یا معمولی مسئلے کی حد تک انسان دین سے نکل گیا ہے۔

ہدایات کا یہ کثیر مجموعہ اس بات کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ یہ دین انسانی زندگی کے تمام مظاہر سے اور زندگی کے تمام معاملات میں سے انسانوں کی حاکمیت کو ختم کرتا ہے۔ یہ معاملات اہم ہوں یا غیر اہم' بڑے ہوں یا چھوٹے' ان معاملات کو اس عظیم اصول کے دائرے کے اندر لاتا ہے یعنی یہ کہ اللہ کی الوہیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پورے کرۂ ارض پر حاکم مطلق ہے اور وہ بلاشرکت غیرے اس کائنات کے اوپر متصرف ہے۔ یہ اصول دین اسلام کے اندر پوری طرح ظاہر اور مجسم ہے۔

اس سورہ میں مویشیوں' پھلوں' نذر و نیاز اور اولاد کے بارے میں دور جاہلیت کی رسومات اور شعائر کے ذکر کے بعد مختلف قسم کے تبصرے بھی کیے گئے ہیں' جن سے اس بات کا اظہار مطلوب ہے کہ یہ رسومات اور شعائر نہایت ہی احمقانہ' نہایت ہی متضاد ہیں۔ بعض میں یہ کہا گیا ہے کہ انسان کا یہ حق نہیں ہے کہ حلال و حرام کا تعین خود کرے بلکہ یہ کام تو ایک عظیم نظریاتی کام ہے اور حلال و حرام کے تعین میں اللہ کے احکام کی اطاعت ہی درست راستہ اور صحیح طرز عمل ہے۔ اگر کوئی شخص حلال و حرام کے تعین میں اللہ کے احکام کی اطاعت نہیں کرتا تو وہ دین سے خارج ہے' سابقہ آیات کے بعد ملاحظہ ہو ذرا طرز ادا اور پھر تبصرے :

"وہ اللہ ہی ہے جس نے طرح طرح کے باغ اور تاکستان اور نخلستان پیدا کئے۔ کھیتیاں اگائیں جن سے قسم قسم کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں' زیتون اور انار کے درخت پیدا کئے جن کے پھل صورت میں مشابہ اور مزے میں مختلف ہوتے ہیں۔ کھاؤ اس کی پیداوار جب کہ یہ پھلیں اور اللہ کا حق ادا کرو' جب ان کی فصل کاٹو' اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر وہی ہے جس نے مویشیوں میں سے وہ جانور بھی پیدا کئے جن سے سواری و بار برداری کا کام لیا جاتا ہے اور وہ بھی جو کھانے اور بچھانے کے کام آتے ہیں۔ کھاؤ ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں بخشی ہیں اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ یہ آٹھ نر و مادہ ہیں' دو بھیڑ کی قسم سے' دو بکری کی قسم سے' اے محمدؐ ان سے پوچھو کہ اللہ نے ان کے نر حرام کئے ہیں یا مادہ' یا وہ بچے جو بھیڑوں اور بکریوں کے پیٹ میں ہوں؟ ٹھیک ٹھیک علم کے ساتھ مجھے بتاؤ اگر تم سچے ہو اور اسی طرح دو اونٹ کی قسم سے ہیں اور دو گائے کی قسم سے۔ پوچھو' ان کے نر حرام کئے ہیں یا مادہ' یا وہ بچے جو اونٹنی اور گائے کے پیٹ میں ہوں۔ کیا تم اس وقت حاضر تھے جب اللہ نے ان کے حرام ہونے کا حکم دیا تھا؟" پھر اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ کی طرف منسوب کر کے جھوٹی بات کہے تاکہ علم کے بغیر لوگوں کی راہنمائی کرے یقیناً اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھاتا۔ اے محمدؐ ان سے کہو کہ جو وحی میرے پاس آئی ہے اس میں تو میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر حرام ہو' الا یہ کہ وہ مردار ہو' یا بہایا ہوا خون ہو یا سور کا گوشت ہو' کہ وہ ناپاک ہے' یا فسق ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ پھر جو شخص مجبوری کی حالت میں بغیر اس کے کہ وہ نافرمانی کا ارادہ رکھتا ہو اور بغیر اس کے کہ وہ حد ضرورت سے تجاوز کرے' یقیناً تمہارا رب درگزر سے کام لینے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے اور گائے اور بکری کی چربی بھی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا آنتوں سے لگی ہوئی ہو' یا ہڈی سے لگی رہ جائے۔ یہ ہم نے ان کی سرکشی کی سزا انہیں دی تھی' اور یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ اب اگر وہ تمہیں جھٹلائیں تو ان سے کہہ دو کہ تمہارے رب کا دامن رحمت وسیع ہے اور مجرموں سے اس کے عذاب کو پھیرا نہیں جا سکتا۔ یہ مشرک لوگ ضرور کہیں گے کہ "اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔" ایسی ہی باتیں بنا کر ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا یہاں تک کہ آخر کار ہمارے عذاب کا مزہ انہوں نے چکھ لیا۔ ان سے کہو "کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو۔" پھر کہو "حقیقت رس حجت تو اللہ کے پاس ہے' بے شک اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔" ان سے کہو "کہ لاؤ اپنے وہ گواہ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ ہی نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے۔" پھر اگر وہ شہادت دے دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دینا اور ہرگز ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے اور جو آخرت کے منکر ہیں اور جو دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں۔ اے محمدؐ ان سے کہو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تم پر کیا کیا پابندیاں عائد کی ہیں؟

(۱) یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

(۲) اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

(۳) اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو' ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے اور بے شرمی

کی باتوں کے قریب نہ جاؤ۔ خواہ وہ کھلی 'یا چھپی ہوں۔

(۴) اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ...... یہ باتیں ہیں جس کی ہدایت تمہیں اس نے کی ہے شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔

(۵) اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو' یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے۔

(٦) اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو' ہم ہر شخص پر ذمہ داریوں کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے۔

(۷) اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنی رشتہ داری کا کیوں نہ ہو۔

(۸) اور اللہ کے عہد کو پورا کرو...... ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم نصیحت قبول کرو۔

(۹) نیز اللہ کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے' لہٰذا اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے۔ یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم کج روی سے بچو۔"

یہاں یہ بات نظر آتی ہے کہ مویشیوں' جانوروں اور پھلوں اور بچوں کی نذر و نیاز کی جو رسوم جاہلیت میں مروج تھیں' ان کے جواز اور عدم جواز کے ایک بالکل جزوی مسئلے کو بھی عظیم نظریاتی اور فکری مسائل کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ اس جواز و عدم جواز کو ہدایت اور گمراہی' اسلامی نظام کے اتباع اور شیطانی نظام کے اتباع اور اللہ کی رحمت اور اللہ کی پکڑ کے مسائل کے ساتھ جوڑ دیا گیا جو زندگی کے اہم ترین مسائل ہیں۔ یہ قرار دیا گیا کہ ان مسائل سے عقیدۂ توحید اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو برابر کرنے کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ قرار دیا گیا کہ جو لوگ غیر اللہ کی نذر و نیاز دیتے ہیں وہ اللہ کے صراط مستقیم سے ہٹ گئے ہیں۔ اس لئے ان مسائل کی اہمیت کے پیش نظر وہی تعبیرات اختیار کی گئی ہیں جو ان بلند نظریاتی مسائل کے اظہار کے لئے اختیار کی گئی تھیں۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں اشارات و دلائل کا وہی رنگ اختیار کیا گیا ہے جو قرآن کریم ان مسائل عالیہ کے لئے اختیار کرتا ہے۔ مسئلہ تخلیق اور مختلف زندہ چیزوں کی اقسام' باغات اور تاکستان' نخلستان اور کھیت' مختلف رنگ اور ذائقہ' زیتون' انار' ایک سے ذائقے اور مختلف ذائقے وغیرہ۔ وہ حقائق بھی لائے گئے جو عقیدہ توحید کے لیے لائے جاتے ہیں اور یہاں مشرکین کے لئے اللہ کے عذاب اور پکڑ کو بھی لایا گیا ہے۔

یہ تمام مشاہد و مناظر اس سے پہلے بھی اس سورہ میں پیش کئے گئے' جب موضوع عقیدۂ توحید تھا۔ اس وقت نذر و نیاز کا مسئلہ زیر بحث نہ تھا۔ اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ جہاں بات عقیدۂ توحید کی ہو اور اللہ کی حاکمیت کا مسئلہ زیر بحث ہو تو قرآن کا انداز ایسا ہی ہوتا ہے چاہے کوئی جزوی مسئلہ ہی کیوں نہ ہو۔

---ooo---

اس سے پہلے جب ہم نے اس سورہ کے موضوع اور مضمون کے بارے میں مجموعی بات کی' اس سے ہمارا مقصد یہ نہ تھا کہ یہ زوردار انداز کلام اور یہ اہم فیصلے محض مسئلہ الوہیت اور حاکمیت الٰہیہ کے موضوع کے ساتھ مخصوص ہیں بلکہ یہ مسئلہ پوری سورہ کا مرکزی مضمون اور محور تھا اور یہ کہ اس دین کا مزاج یہ ہے کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی

سے بڑی بات مسئلہ حاکمیت الٰہیہ اور اللہ کے حق قانون سازی کے ساتھ مربوط ہے۔

اب ہم یہاں اس سورہ کے تعارف اور اس کی خصوصیات کی طرف کچھ اشارہ کریں گے جس طرح ظلال القرآن میں ہم نے تمام سورتوں کا تعارف کرایا ہے۔ حضرت ابن عباس ' حضرت اسماء بنت یزید ' حضرت جابر ' حضرت انس ابن مالک اور حضرت عبداللہ ابن مسعود کی روایات میں یہ بات آتی ہے کہ یہ مکی سورہ ہے اور یہ سورہ مکہ میں ایک ہی دفعہ مکمل نازل ہوئی ہے۔ ان روایات میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جن سے اس سورہ کے زمانہ نزول پر روشنی پڑتی ہو کہ مکی عہد میں یہ کس زمانے میں نازل ہوئی۔ رائج ترتیب کے مطابق یہ سورہ الحجر کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اس طرح ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس کا نمبر ۵۵ بنتا ہے۔ لیکن جس طرح ہم نے سورہ البقرہ کے آغاز میں کہا کہ اس قسم کی معلومات کے ذریعے ہم کوئی بات یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ کون سی سورہ کس دور میں نازل ہوئی۔ اصل بات یہ ہے کہ مفسرین و مؤرخین نے صرف یہ دیکھا ہے کہ سورہ کا ابتدائی حصہ کس دور میں نازل ہوا ہے۔ ترتیب نزولی میں ان کی مراد پوری سورہ نہیں ہوتی۔ بعض اوقات کسی سورہ کے بعض حصے اس کے ابتدائی حصے کے بعد میں نازل ہوتے رہے ہیں۔ لہٰذا کسی سورہ کے زمانہ نزول کے تعین میں اصل دارومدار اس کے آغاز میں مذکور حصے کے تعین سے ہوتا ہے۔ رہی سورہ انعام تو یہ سب کی سب یکبارگی نازل ہوئی ہے ' البتہ اس کی تاریخ نزول کے بارے میں ہمیں کوئی متعین بات معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ رسالت کے ابتدائی دنوں کے بعد نازل ہوئی ہے۔ پانچویں یا چھٹے سال میں اور یہ بات بھی ہم صرف اس درجے کی بنا پر کہہ رہے ہیں جو اس کو ترتیب نزول کے مطابق شمار کرنے والوں نے دیا ہے۔ مزید یہ کہ اس سورہ میں بہت سے موضوعات کو لیا گیا ہے اور بات بڑی تفصیل سے کی گئی ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کے ساتھ بات چیت اور بحث و مباحثہ پر عرصہ گزر گیا تھا اور اب بڑی تفصیل کے ساتھ مدلل گفتگو کی ضرورت تھی۔ جس طرح اس سورہ میں اصول و نظریات پر بات کی گئی ہے اس کے بعد ایسی ہی فیصلہ کن ' اور مدلل گفتگو کی ضرورت تھی۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ایک طویل عرصے سے کام کر رہے تھے اور کام کرتے کرتے تھک گئے تھے انہیں بھی تسلی دینے کی ضرورت تھی۔

حضرت ابن عباس ؓ سے ایک روایت ہے کہ یہ سورہ مکی ہے صرف دو آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں یعنی آیت نمبر ۹۱ (وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ ....) اور ۱۴۱ (وَهُوَ الَّذِیْ ....) آیت ۹۱ مالک ابن سیف اور کعب ابن الاشرف یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی اور آیت ۱۴۱ ثابت ابن قیس ابن شماس الانصاری کے حق میں نازل ہوئی۔ ابن جریج اور الماوردی کہتے ہیں یہ معاذ ابن جبل کے بارے میں نازل ہوئی۔

پہلی آیت میں تو دونوں احتمالات ہیں کیونکہ اس میں اس کتاب کا ذکر ہے جو موسیٰ پر نازل ہوئی تھی ' جو نور اور ہدایت تھی اور یہودیوں کو جس لفظ سے خطاب نظر آتا ہے وہ ہے۔ (تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا) "تم پارہ پارہ کر کے رکھتے ہو ' کچھ دکھاتے ہو ------)" اس لئے کہ اس کے بارے میں حضرت ابن عباس اور مجاہد سے روایات ہیں کہ (مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ) کا عقیدہ اہل مکہ کا تھا۔ پھر آیت زیر بحث میں ایک قراۃ تَجْعَلُوْنَ کی جگہ یَجْعَلُوْنَ بھی ہے۔ پھر معنی یہ ہو جاتا ہے "پوچھو ' پھر وہ کتاب جسے موسیٰ لایا تھا ' جو تمام انسانوں کے لئے روشنی اور ہدایت تھی ' جسے وہ پارہ پارہ کر کے رکھتے ہیں ' کچھ دکھاتے ہیں اور بہت کچھ چھپاتے ہیں۔" یعنی تُبْدُوْنَ کی جگہ

يُبْدُوْنَ اور تُخْفُوْنَ کی جگہ يُخْفُوْنَ کی بھی ایک قراءت ہے۔ اس قرأت کے مطابق آیت مکی بن جاتی ہے۔ اور اس سورہ میں اہل کتاب کو خطاب نہیں رہتا اور سیاق کلام ہم آہنگ ہو کر مشرکین مکہ کے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے۔ ابن جریر نے اس روایت اور اس قراءت کو ترجیح دی ہے اور اس طرح یہ آیت بھی مکی بن جاتی ہے۔ رہی دوسری آیت تو اس کا سیاق و سباق بھی اس کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ آیت مدنی ہو' اس لئے کہ اگر اس آیت کو مدنی کہا جائے تو اس سے پہلے اور بعد کی عبارت لفظاً اور معناً منتشر ہو جاتی ہے حالانکہ قرآن میں سیاق و سباق بالکل جڑا ہوا ہے۔ اللہ نے باغات اور جانوروں کی بات کی ہے جو سواری اور فرش کے لئے کام آتے ہیں۔ آیت ہے۔

(وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (٦ : ١٤٢)) (پھر وہی ہے جس نے مویشیوں میں سے وہ جانور بھی پیدا کئے جن سے سواری و بار برداری کا کام لیا جاتا ہے اور وہ بھی جو کھانے اور بچھانے کے کام آتے ہیں۔ کھاؤ ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں بخشی ہیں اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔) اس کے بعد مویشیوں کے بارے میں بات مکمل کی جاتی ہے اور اس سے قبل پھلوں کے تذکرے کے بعد اس کا آغاز ہوا تھا۔ بات سب کی سب ایک ہی موضوع سے متعلق ہے۔ سابقہ پیراگراف میں ہم نے اس کے بارے میں مفصل بات کی ہے جس کا تعلق حلت اور حرمت کے اختیارات کے بارے میں تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ جس وجہ سے اس آیت کو مدنی کہا گیا ہے وہ یہ الفاظ ہیں:

(كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (٦ : ١٤١)) (کھاؤ ان کی پیداوار جب کہ یہ پھلیں اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو۔) ان لوگوں نے حقہ سے زکات مراد لی ہے اور زکات کا نصاب اور مقدار مدینہ میں متعین ہوئے تھے فصلوں میں بھی اور پھلوں میں بھی۔ لیکن آیت میں یہ مفہوم صریح نہیں ہے اس لئے کہ اس آیت کے بارے میں علماء کے یہ اقوال نقل ہیں کہ اس سے مراد صدقات ہیں یا حق خدا۔ مراد یہ ہے کہ فصل کاٹتے وقت اور باغ کو اتارتے وقت جو بھی آئے انہیں کچھ نہ کچھ دینا چاہئے۔

نیز یہ مفہوم بھی مراد ہو سکتا ہے کہ رشتہ داروں کو بھی دو۔ زکات جب مقرر ہوئی تو عشر اور نصف عشر زکات لازم کر دی گئی۔ اس تفصیل کے بعد کوئی شک نہیں رہتا کہ یہ آیت مکی ہے۔

ثعلبی نے کہا ہے کہ سورہ انعام سب کی سب مکی ہے۔ صرف چھ آیات مدینہ میں نازل ہوئیں یعنی (وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (٦ : ٩١)) کے بعد تین آیات اور (قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ (٦ : ١٥١)) کے بعد تین آیات۔ پہلی تین آیات کے مکی ہونے کا بیان تو ہم نے کر دیا ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے پہلی آیت کا جو مضمون ہے وہی دوسری اور تیسری کا بھی ہے۔

رہی دوسری تین آیات تو ان کے بارے میں' میری اطلاع کے مطابق کسی صحابی اور تابعی سے کوئی روایت نہیں ہے کہ وہ مدنی ہیں۔ نہ ان کے موضوع میں ایسی کوئی بات ہے کہ یہ مدنی ہیں۔ ان میں بعض جاہلی تصورات سے بحث کی گئی

ہے اور ذبیحوں اور نذروں کے بارے میں جو بات چلی آتی ہے ان کے اندر بھی وہی بات مذکور ہے 'لہٰذا درست یہی ہے کہ یہ آیات بھی مکی ہیں۔

مصحف امیری میں ہے کہ آیات ۲۰' ۲۳' ۹۱' ۹۲' ۱۱۴' ۱۴۱' ۱۵۱' ۱۵۲ اور ۱۵۳ مدنی ہیں۔ آیات ۹۱' ۹۲' ۱۴۱' ۱۵۱' ۱۵۲ کے بارے میں تو ہم بات کر آئے ہیں۔ آیات ۲۰' ۲۳' ۱۱۴ میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ ان پر مدنی ہونے کا شبہ کیا جائے ماسوائے اس بات کے کہ ان میں اہل کتاب کا ذکر ہے لیکن یہ مدنی ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اہل کتاب کا ذکر مکی آیات میں بھی آیا ہے۔

لہٰذا میری رائے اس طرف مائل ہے کہ جو مطلق روایات ہیں کہ یہ پوری سورہ یکبارگی مکہ میں نازل ہوئی وہی درست ہیں۔ حضرت ابن عباس ' اسماء بنت یزید کی روایات میں اس کی صراحت ہے اور اسماء بنت یزید کی روایت میں ایک خاص واقعے کا بھی ذکر ہے۔ سفیان ثوری 'لیث 'شہر ابن حوشب کے ذریعے اسماء بنت یزید سے روایت ہے 'فرماتی ہیں : "سورہ انعام حضور پر یکبارگی نازل ہوئی۔ اس وقت میں نے آپ کی ناقہ کی زمام تھامی ہوئی تھی اور اس وقت ناقہ پر اس قدر بوجھ تھا کہ قریب تھا کہ اس کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں۔

طبرانی نے حضرت ابن عباس سے جو روایت نقل کی ہے وہ یہ ہے۔ عبدالعزیز ' حجاج ابن منہال ' حماد ابن سلمہ 'علی ابن زید 'یوسف ابن مہران اور ابن عباس سے۔ انہوں نے کہا "انعام مکہ میں نازل ہوئی 'یکبارگی اس کے ارد گرد ستر ہزار فرشتے تھے اور وہ تسبیح پڑھ رہے تھے۔"

یہ دونوں روایات ان تمام اقوال سے زیادہ مضبوط ہیں جن میں یہ آیا ہے کہ بعض آیات مدنی ہیں۔ مزید یہ کہ موضوع و مضمون کے زاویے سے ہم نے جو تجزیہ کیا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سورہ انعام میں بات کی روانی ' اس کا باہم اتصال اور ربط ایسی خصوصیات ہیں جن سے یہ سورہ ایک ایسی نہر کی طرح نظر آتی ہے جس کا پانی نہایت ہی ترتیب اور روانی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے 'جس طرح ایک سیلاب آگے بڑھتا ہے۔ اس میں کوئی کٹاؤ اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اس سورہ کی بناوٹ (Construction) سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ ایک ہی بار نازل ہوئی ہے۔

---ooo---

اس سورہ کے بنیادی موضوع اور اس کی شخصیت کے بارے میں اجمالی بات اس سے قبل ہم کر چکے ہیں یعنی اس مقدمے کے آغاز میں لیکن اس بارے میں کچھ تفصیلات بھی ضروری ہیں۔

ابوبکر ابن مردویہ نے حضرت انس ابن مالک کی یہ روایت نقل کی ہے۔ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "جب سورہ انعام نازل ہوئی تو اس کے ساتھ فرشتوں کا جلوس تھا۔ اس جلوس نے شرق و غرب کے درمیان پوری جگہ کو روک دیا۔ وہ تسبیح کے ساتھ گنگنا رہے تھے اور ان کی وجہ سے زمین کانپ رہی تھی۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے جاتے تھے۔ سبحان اللہ العظیم ' سبحان اللہ العظیم۔"

یہ جلوس اور یہ فرشتوں کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی فوج اس پوری سورہ پہ سایہ فگن ہے۔ یہ پوری سورہ ایک جلوس ہے جس سے مرعوب ہو کر نفس انسانی پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ پر سکون حالت ایک زلزلے میں بدل جاتی ہے۔ اس

میں مختلف مواقف، مختلف مناظر، مختلف اشارات اور مختلف مؤثرات کا اژدہام ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ معانی و تصورات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا ہے جو بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، لہر پر لہر اٹھتی ہے۔ ایک لہر ساحل تک پہنچتی نہیں کہ دوسری نمودار ہو جاتی ہے اور یہ تمام لہریں گتھم گتھا ہوتی ہیں اور مسلسل آگے ہی بڑھتی ہیں۔

اس تلاطم معانی میں سورہ کا اصل موضوع ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اس لئے یہ ممکن ہی نظر نہیں آتا کہ اس سورہ کو مختلف حصوں اور ٹکڑوں میں تقسیم کیا جا سکے اور ہر ٹکڑے کا الگ موضوع ہو، یا وہ موضوع کے کسی خاص حصے سے بات کر رہا ہو۔ یہ پے در پے موجوں کی شکل میں ہے اور ہر موج کا تعلق اس سے پہلی موج کے ساتھ قائم ہے۔ ہر موج دوسری کے لئے تکملہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس سورہ کے اس دیباچے میں موضوعات کا ذکر نہیں کیا۔ ہماری کوشش یہ ہوگی کہ مختلف اسباق کے تعین کے بجائے مختلف موجوں اور لہروں کے بارے میں بات کریں اور یہ بتائیں کہ اس نئی لہر کی غرض و غایت کیا ہے۔

سورہ کا آغاز اس مضمون سے ہوتا ہے کہ مشرکین جو اللہ کے ساتھ الٰہ ٹھہراتے ہیں ان کا موقف نہایت ہی بودا ہے، حالانکہ توحید کے دلائل ان کے سامنے ہیں، ہر طرف سے انہیں گھیرے ہوئے ہیں اور وہ اپنے نفوس میں اور آفاق میں انہیں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ سورہ ہمارا استقبال ایک واضح حقیقت الوہیت کے ساتھ کرتی ہے اور چند جھلکیوں کے ذریعے اس پوری کائنات کے اوراق الٹ دیتی ہے۔ صرف تین جھلکیوں میں ہم اس پوری کائنات کی تہ تک اتر جاتے ہیں اور اس کی وسعت کو اپنے دائرے میں لے لیتے ہیں۔

(اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ (۱) هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ (۲) وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَفِی الْاَرْضِ یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَیَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ (۳))

”تعریف ہے اللہ کے لئے جس نے زمین و آسمان بنائے، روشنیاں اور تاریکیاں پیدا کیں۔ پھر بھی وہ لوگ جنہوں نے دعوت حق کو ماننے سے انکار کر دیا ہے دوسروں کو اپنے رب کے ہمسر ٹھہراتے ہیں۔ وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر تمہارے لئے زندگی کی ایک مدت مقرر کر دی، اور ایک دوسری مدت اور بھی ہے جو اس کے ہاں طے شدہ ہے۔ مگر تم لوگ ہو جو شک میں پڑے ہوئے ہو۔ وہی ایک خدا آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی، تمہارے کھلے اور چھپے سب حال جانتا ہے۔ اور جو برائی یا بھلائی تم کماتے ہو اس سے خوب واقف ہے۔“

یہ تین جھلکیاں ہیں۔ ایک جھلکی میں اس پوری کائنات کی تخلیق دکھائی جاتی ہے، دوسری میں پوری انسانیت کی تخلیق دکھائی جاتی ہے اور تیسری میں ان دونوں وجودوں کو ذات باری گھیرے ہوئے ہے۔ کیا اعجاز ہے یہ! کلام کی شوکت اور

زور کو تو دیکھئے 'کس قدر جامع اور مانع بات ہے!

اس کائنات کے ہوتے ہوئے جو وحدت خالق پر دال ہے' وجود انسانی کے ہوتے ہوئے جو ایک ذات مدبر پر شاہد عادل ہے اور اس کرۂ ارض اور کرات سماوی اور ان کے اندر اللہ کی جاری و ساری حاکیت کے ہوتے ہوئے بھی کیا کوئی ذات باری میں شک کر سکتا ہے؟ کیا کوئی ذات باری کا انکار کر سکتا ہے؟ ان شواہد کے ہوتے ہوئے مشرکین کے شرک اور شک کرنے والوں کے شک کی کوئی گنجائش ازروئے عقل نہیں ہونا چاہئے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کا یہ رویہ نظام کائنات 'انسان کے نفس اور اس کی فطرت اور ایک صحت مند انسان کے دل اور اس کی عقل کی روشنی میں تعجب انگیز ہے۔

اس لمحے میں اس سورہ کے دریا میں ایک دوسری لہر نمودار ہوتی ہے۔ اس میں جھٹلانے والوں کا موقف پیش کیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ ایسی نشانیوں اور ایسے دلائل کو جھٹلاتے ہیں جو اس پوری کائنات اور خود انسان کے نفس کے اندر بکھرے پڑے ہیں اور موجود ہیں۔ ان منکرین کے عجیب و غریب موقف کو پیش کر کے انہیں سخت تنبیہ بھی کی جاتی ہے۔ ان کے سامنے ان منکرین کے نقشے پیش کئے جاتے ہیں جن کے لاشے انسانی تاریخ کی اسکرین پر بکھرے نظر آتے ہیں۔ اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی قوت قاہرہ کے مقابلے میں ان کی کوئی پوزیشن نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ وہ اللہ کی ایسی ہی کسی پکڑ سے بالکل نہیں ڈرتے۔ وہ حق مبین کو دیکھتے ہوئے بھی 'اپنی سرکشی پر قائم ہیں۔ اس لہر سے ظاہر ہوتا ہے کہ منکرین دلائل کی کمی کی وجہ سے انکار نہیں کرتے بلکہ ان کی نیت درست نہیں ہے اور ان کے دل قبولیت حق کے لئے ابھی نہیں کھلے 'ان کے دلوں کے دروازے بند ہیں۔ ذرا قرآن کے الفاظ دیکھیں۔

"لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ایسی نہیں ہے جو ان کے سامنے آئی ہو' اور انہوں نے اس سے منہ نہ موڑ لیا ہو۔ چنانچہ اب جو حق ان کے پاس آیا تو اسے بھی انہوں نے جھٹلا دیا۔ اچھا' جس چیز کا وہ اب تک مذاق اڑاتے رہے ہیں عنقریب اس کے متعلق کچھ چیزیں انہیں پہنچیں گی۔ کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے زمانے میں دور دورہ رہا ہے؟ ان کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا جو تمہیں نہیں بخشا' ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہا دیں (مگر انہوں نے کفران نعمت کیا) تو آخر کار ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دوسرے دور کی قوموں کو اٹھایا۔ اے پیغمبر' اگر ہم تمہارے اوپر کوئی کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب بھی اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنہوں نے حق کا انکار کیا وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ اگر کہیں ہم نے فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا' پھر انہیں کوئی مہلت نہ دی جاتی۔ اور اگر ہم فرشتہ اتارتے تب بھی اسے انسانی شکل میں اتارتے اور اس طرح انہیں اسی شبہ میں مبتلا کر دیتے جس میں اب یہ مبتلا ہیں۔ اے محمد ؐ، تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے 'مگر ان مذاق اڑانے والوں پر آخر کار وہی حقیقت مسلط ہو کر رہی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ ان سے کہو' ذرا زمین پر چل پھر کر دیکھو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے"

اس مقام پر اب ایک تیسری موج اٹھتی ہے۔ اس لہر میں شان الوہیت کا حقیقی تعارف ہے اور اس کا اظہار یوں کیا گیا ہے کہ زمین و آسمانوں اور مافیہا کا مالک ذات باری ہے۔ رات کے اندھیروں میں اور دن کے اجالوں میں جو کچھ ٹھہرا ہوا ہے وہ اسی کا ہے۔ وہ ایسا رازق ہے جو سب کو کھلا رہا ہے اور اسے کسی جانب سے جوابی کھلانے کی کوئی ضرورت

ہی نہیں ہے ۔یہی وجہ ہے کہ صرف وہی ولی ہے اور اس کے سوا کوئی اور ولی نہیں ہے ۔بندوں کو چاہئے کہ اپنے آپ کو صرف اس کے حوالے کر دیں ۔یہ وہی تو ہے جو آخرت میں نافرمانوں کو سزا دے گا ۔وہی ہے جو بندوں کی بھلائی اور مصیبت کا مالک ہے 'اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ۔اپنے بندوں پر اسے مکمل کنٹرول حاصل ہے ۔وہ حکیم و خبیر ہے ۔

اس پوری تمہید کے بعد اب یہ لہر اپنی بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے ۔رسول اور اس کی قوم کے درمیان ثبوت واثبات کے بعد مکمل فیصلہ کر دیا جاتا ہے ۔قوم کو ڈرایا جاتا ہے کہ وہ شرک سے دور رہیں اور یہ کہ رسول ان کے شرک کے ذمہ دار نہیں ہیں ۔یہ اعلان نہایت ہی بلند آہنگی اور نہایت ہی فیصلہ کن انداز میں ہوتا ہے ۔ذرا قرآن کے الفاظ دیکھیں ،

"ان سے پوچھو 'آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے ؟ کہو سب کچھ اللہ کا ہے 'اس نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے ۔قیامت کے روز وہ تم سب کو ضرور جمع کرے گا 'یہ بالکل ایک غیر مشتبہ حقیقت ہے ۔مگر جن لوگوں نے اپنے آپ کو خود تباہی کے خطرے میں مبتلا کر لیا ہے وہ اسے نہیں مانتے ۔رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں جو کچھ ٹھہرا ہوا ہے 'سب اللہ کا ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے ۔کہو 'اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنالوں ؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمانوں کا خالق ہے اور جو روزی دیتا ہے اور روزی لیتا نہیں ؟ کہو 'مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سر تسلیم خم کروں اور "تو بہرحال مشرکوں میں شامل نہ ہو" کہو 'اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی ۔اس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے ۔اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے 'اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے ۔وہ اپنے بندوں پر کامل اختیار رکھتا ہے اور وہ دانا اور باخبر ہے ۔ان سے پوچھو کس کی گواہی بڑھ کر ہے ؟ کہو میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے ۔یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے 'سب کو متنبہ کر دوں ۔کیا تم لوگ واقعی یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی شریک ہیں ؟ کہو 'میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں دے سکتا ۔کہو خدا تو وہی ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو ۔"

اب ایک چوتھی لہر اٹھتی ہے ۔اس میں اس نئی کتاب کے بارے میں اہل کتاب کے رویے کا ذکر ہے 'جسے مشرکین نے جھٹلایا ہے ۔اس لہر میں یہ بتایا گیا ہے کہ شرک ایک عظیم ظلم ہے اور یہ تمام مظالم سے بدتر ہے ۔اس لہر میں مشرکین کے سامنے قیامت میں ان کو پیش آنے والے واقعات کے منظر کو پیش کیا جاتا ہے ۔اس منظر میں اہل شرک ان لوگوں سے دریافت کرتے ہیں جنہیں وہ شریک ٹھہراتے تھے 'یہ لوگ ان کے اس شرک کا صاف صاف انکار کرتے ہیں ۔اس لئے ان کی اس افتراء پردازی کے تار و پود بکھر جاتے ہیں ۔اس لہر میں اہل شرک کے حالات کی تصویر کشی کی جاتی ہے ۔نظر آتا ہے کہ ان کی قبولیت حق کی فطری قوتیں معطل ہیں ۔وہ ایمان کے اشارات سے استفادہ کرنے سے قاصر ہیں اس لئے وہ ایمان نہیں لاتے ۔وہ دلائل نہیں پاتے 'اس لئے کہ ان کے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں 'کیونکہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن محض پرانے قصوں پر مشتمل ہے ۔اس لہر میں ان کو کہا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی ہدایت قبول کرنے سے روکتے ہیں اور خود بھی قرآن سے دور بھاگتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں ۔ان کے حالات کی تصویر کشی یوں کی جاتی ہے '

اس وقت کے حالات کی جب وہ آگ پر کھڑے ہوں گے' اس وقت ان کی سوچ کی کیفیت یہ ہو گی کہ کاش ہمیں دوبارہ دنیا میں لوٹا دیا جاتا اور ہم اپنے رب کی آیات کو نہ جھٹلائیں اور اہل ایمان میں شامل ہو جائیں لیکن اگر وہ لوٹا بھی دیئے جائیں تو پھر معاد اور آخرت کا انکار کر دیں۔ تصویر کا ایک دوسرا رخ جب وہ اپنے رب کے سامنے پیش ہوتے ہیں' ان سے ان کے اس جحود انکار کے بارے میں بازپرس ہوتی ہے۔ حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے گناہوں کو مشخص طور پر اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اس لہر کے آخر میں ان کی حسرت اور پشیمانی کا ذکر ہے۔ اس ملاقات میں ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حیات دنیا محض لہو و لعب تھی اور آخرت ہی زندگی جاوداں ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ دیکھیں۔

"جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس بات کو اس طرح غیر مشتبہ طور پر پہچانتے ہیں جیسے ان کو اپنے بیٹوں کے پہچاننے میں کوئی اشتباہ پیش نہیں آتا۔ مگر جنہوں نے اپنے آپ کو خود خسارے میں ڈال دیا ہے وہ اسے نہیں مانتے۔ اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگائے' یا اللہ کی نشانیوں کو جھٹلائے؟ یقیناً ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ جس روز ہم ان کو اکٹھا کریں گے اور مشرکین سے پوچھیں گے کہ اب وہ تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریک کہاں ہیں جن کو تم خدا سمجھتے تھے تو وہ اس کے سوا کوئی فتنہ نہ اٹھا سکیں گے کہ لے، ہمارے آقا! تیری قسم ہم ہرگز مشرک نہ تھے۔ دیکھو' اس وقت یہ کس طرح اپنے اوپر آپ جھوٹ گھڑیں گے اور وہاں ان کے سارے بناوٹی معبود گم ہو جائیں گے۔ ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمہاری بات سنتے ہیں مگر حال یہ ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس کو کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے۔ وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں' اس پر ایمان لا کر نہ دیں گے۔ حد یہ ہے کہ جب وہ تمہارے پاس آکر تم سے جھگڑتے ہیں تو ان میں سے جن لوگوں نے انکار کا فیصلہ کر لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک داستان پارینہ کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اس امر حق کو قبول کرنے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور بھاگتے ہیں حالانکہ دراصل وہ خود اپنی ہی تباہی کا سامان کر رہے ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ کاش تم اس وقت ان کی حالت دیکھ سکتے کہ جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کئے جائیں گے۔ اس وقت وہ کہیں گے کہ کاش کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں پھر واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔ درحقیقت یہ بات وہ محض اس وجہ سے کہیں گے کہ جس حقیقت پر انہوں نے پردہ ڈال رکھا تھا وہ اس وقت بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آچکی ہو گی' ورنہ اگر انہیں سابق زندگی کی طرف واپس بھیجا جائے تو پھر وہی سب کچھ کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے۔

وہ تو ہیں ہی جھوٹے۔ آج یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے۔ کاش وہ منظر تم دیکھ سکو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے۔ اس وقت ان کا رب ان سے پوچھے گا "کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟" یہ کہیں گے "ہاں ہمارے رب! یہ حقیقت ہی ہے۔" وہ فرمائے گا "اچھا تو اپنے انکار کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو۔" .... نقصان میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے اپنی ملاقات کی اطلاع کو جھوٹ قرار دیا۔ جب اچانک وہ گھڑی آ جائے گی تو یہی لوگ کہیں گے "افسوس! ہم سے اس معاملے میں کیسی تقصیر ہوئی۔" اور ان کا حال یہ ہو گا کہ اپنی پیٹھوں پر اپنے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے ہوں گے۔ دیکھو

کیسا برا بوجھ ہے جو یہ اٹھا رہے ہیں۔ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور تماشا ہے' حقیقت میں آخرت کا مقام ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو زیاں کاری سے بچنا چاہتے ہیں۔ پھر کیا تم لوگ عقل سے کام نہ لو گے؟"

اب اس سورہ کے دریا میں پانچویں موج اٹھتی ہے۔ اس میں روئے سخن رسول اللہ کی طرف مڑ جاتا ہے۔ آپ کو تسلی دی جاتی ہے اور آپ کے حزن و ملال کو دور کیا جاتا ہے۔ آپ کی پریشانی یہ تھی کہ لوگ آپ کو اور آپ پر نازل ہونے والے کلام کی تکذیب کرتے تھے۔ آپ کو تلقین کی جاتی ہے کہ آپ انبیائے سابقین کے اسوہ حسنہ کو اپنائیں جن کی تکذیب کی گئی جن کو جھٹلایا گیا اور جن کو اذیت دی گئی۔ یہاں تک کہ اللہ کی نصرت آپہنچی۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ اللہ کی سنت ہے اور اس میں تبدیلی نہیں ہوتی لیکن اللہ کی سنت اپنے وقت سے پہلے بھی نہیں آتی۔ اگر آپ ان کے جود و انکار پر صبر نہیں کرتے تو آپ خود اپنی طرف سے کوئی معجزہ لے آئیں اور یہ سوچیں کہ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو اللہ ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ اللہ وحدہ صاحب حکم و تصرف ہے اور اس کی مشیت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ لوگ دعوت حق کو قبول کریں جن کی فطری قوتیں قبولیت حق کے لئے نااہل نہیں ہو چکیں۔ رہے وہ لوگ جو روحانی طور پر مر چکے ہیں اور ان کے اندر زندگی کی رمق باقی نہیں ہے تو وہ اشارات ہدایت کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور سچائی کو قبول نہیں کرتے۔ ایک دن آنے والا بہرحال ہے اور وہ سب اٹھ کر اس کے سامنے پیش ہوں گے۔

"اے محمد ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے' لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔ تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر جو انہیں پہنچائی گئیں انہوں نے صبر کیا' یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں تمہیں پہنچ چکی ہیں۔ تاہم اگر ان لوگوں کی بے رخی تم سے برداشت نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو۔ اگر اللہ چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا لہٰذا نادان مت بنو۔ دعوت حق پر لبیک وہی کہتے ہیں جو سننے والے ہیں' رہے مردے تو انہیں تو بس اللہ قبروں سے اٹھائے گا اور پھر وہ واپس لائے جائیں گے۔"

یوں اس سورہ میں کلام کی روانی موج در موج کی صورت میں چلتی ہے اور اس انداز میں جس کے نمونے ہم نے قارئین کے سامنے رکھے۔ ان نمونوں سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اس سورہ کا مزاج کیسا ہے نیز اس سے سورہ کے موضوع کے بارے میں بھی اچھی طرح روشنی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کی بعض لہریں ان سے بھی اونچی ہیں جن کو ہم نے بطور نمونہ درج کیا۔ بعض مقامات میں ان کا بہاؤ اور ٹکراؤ زیادہ پرجوش اور شدید ہے۔ ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ اس پوری سورت کا تنقیدی جائزہ اور تعارف ان مختصر الفاظ میں کر سکیں۔ بہرحال اس کا ایک دوسرا پہلو اگلے پیراگراف میں دیکھیں۔

---:0:0---

اس سے پہلے ہم یہ بات کہہ آئے ہیں کہ یہ سورہ اپنے مرکزی موضوع کو نہایت ہی منفرد انداز میں پیش کرتی ہے' اس لیے کہ یہ سورہ ہر لمحہ میں' ہر موقف میں اور ہر منظر میں آنکھوں میں چکا چوند کرنے والا حسن لیے ہوئے ہے۔ جب انسان اس کے مناظر' اس کے اثرات' اور اس کے اشارات کو پے در پے دیکھتا ہے تو نفس انسانی انہیں اپنا حصہ بنا لیتا

ہے' اس کے تمام اثرات کو پلے باندھ لیتا ہے اور ہدایت کی روشنی حاصل کر لیتا ہے۔

اب ہم قارئین کے سامنے بعض ایسی آیات رکھتے ہیں جن سے یہ حقائق براہ راست قرآنی اسلوب میں نظر آئیں اس لیے کہ تبصرے کے ذریعے ہم جس قدر تعریف بھی کریں وہ براہ راست قرآنی آیات کے مطالعے کے مقابلے میں کم ہی مفید ہوتی ہے۔ آیات کا براہ راست اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

مقام الوہیت کا بیان' لوگوں کو اپنے سچے رب سے متعارف کرانا اور لوگوں کو صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کے دائرے میں لانا اس سورہ کا مرکزی موضوع اور محور ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجئے مختلف مواقع اور مواقف پر قرآن کریم اس موضوع کو کس طرح لیتا ہے۔

شہادت اور فیصلہ کن موقف کے وقت' جہاں صب مومن میں مقام الوہیت اچھی طرح بیٹھ جاتا ہے' جہاں مخالفین کے سامنے صاف صاف یہ موقف واضح کر دیا جاتا ہے نہایت ہی قوت اور نہایت ہی یقین کے ساتھ تو قرآن کا اسلوب یہ ہوتا ہے :

(قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ قُلْ اِنِّيْ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (١٤) قُلْ اِنِّيْ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (١٥) مَنْ يُصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ (١٦) وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (١٧) وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ (١٨) قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ شَهِيْدٌ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى قُلْ لَّآ اَشْهَدُ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (١٩)

"کہو' اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنا لوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین اور آسمان کا خالق ہے' اور جو روزی دیتا ہے اور روزی لیتا نہیں ہے؟ کہو' مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سر تسلیم خم کر دوں۔" "اور تم مشرکین میں شامل نہ ہو۔" "کہو' اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی۔ اس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے۔ اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے

تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنے بندوں پر کامل اختیارات رکھتا ہے اور دانا و باخبر ہے۔ ان سے پوچھو' کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے؟ کہو میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے سب کو متنبہ کر دوں۔ کیا واقعی تم لوگ یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں؟ کہو' میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں دے سکتا۔ کہو' خدا تو وہی ایک ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔"

جب اللہ کی حاکمیت اور سلطنت تمام بندوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور انسانی فطرت واشگاف ہو جاتی ہے' اس پر سے جاہلیت کے زنگ اتر جاتے ہیں' انسان اپنے رب واحد کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے' وہ جھوٹے خداؤں کا انکار کر دیتا ہے اور انسان جھٹلانے والوں کے خوفناک انجام کو دیکھتا ہے تو اس خوفناک صورت حالات میں اسے ان الفاظ میں متنبہ کیا جاتا ہے۔

(قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۴۰) بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ (۴۱) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ (۴۲) فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۴۳) فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ (۴۴) فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۵) قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ (۴۶) قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ (۴۷))

"ان سے کہو' ذرا غور کر کے بتاؤ' اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے کوئی بڑی مصیبت آجاتی یا آخری گھڑی آپہنچتی ہے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم سچے ہو۔ اس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے ہو۔ پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو بھول جاتے ہو۔ تم سے

پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور ان قوموں کو مصائب و آلام میں مبتلا کیا تاکہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جھک جائیں۔پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انہوں نے عاجزی اختیار کی؟ مگر ان کے دل تو اور سخت ہوگئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو' جو انہیں کی گئی تھی' بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے' یہاں تک کہ جب ان بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں وہ خوب مگن ہوگئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر چیز سے مایوس تھے۔اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا۔اور تعریف اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔اے محمد ان سے کہو' کبھی تم نے یہ سوچا کہ اگر اللہ تمہاری بینائی اور سماعت تم سے چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا اور کون سا خدا ہے جو یہ قوتیں تمہیں واپس دلا سکتا ہے۔دیکھو کس طرح ہم بار بار اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر یہ کس طرح ان سے نظر چراتے ہیں۔کہو کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ کی طرف سے اچانک یا اعلانیہ تم پر عذاب آجائے تو کیا ظالم لوگوں کے سوا کوئی اور ہلاک ہوگا؟''

جب مضمون یہ ہوتا ہے کہ اللہ تمام غیب اور تمام رازوں کا جاننے والا ہے' وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کون کتنی بار سانس لے گا اور کس کی کیا عمر ہوگی۔وہ بحر و بر کو گھیرے ہوئے ہے' رات دن کا نگہبان ہے' دنیا و آخرت کا حکمران ہے اور زندگی اور موت اسی کے اختیار اور قدرت میں ہے تو ان مضامین کو یوں ادا کیا جاتا ہے۔

(وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ
وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ
مُبِينٍ (٥٩) وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ
لِيُقْضَى أَجَلٌ مُسَمًّى ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (٦٠) وَهُوَ
الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتَّى إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ
رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُونَ (٦١) ثُمَّ رُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ أَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ
أَسْرَعُ الْحَاسِبِينَ (٦٢) ''اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔بحر و بر میں
جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے' درخت سے گرنے والا کوئی پتا ایسا نہیں ہے جس کا اسے علم نہ ہو' زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں ہے جس سے وہ باخبر نہ ہو' خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔وہی ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہے۔پھر دوسرے روز وہ تمہیں اسی کاروبار کے عالم میں واپس بھیج دیتا ہے تاکہ زندگی کی مقرر مدت پوری ہو' آخر کار اسی کی طرف تمہاری واپسی ہے' پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔اپنے بندوں پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے اور تم پر نگرانی کرنے والے مقرر کر کے

بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو اس کے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی جان نکال لیتے ہیں اور اپنا فرض انجام دیتے ہیں اور ذرا کوتاہی نہیں کرتے 'پھر سب کے سب اللہ' اپنے حقیقی آقا کی طرف واپس جاتے ہیں۔ خبردار ہو جاؤ کہ سارے اختیارات اس کو حاصل ہیں اور وہ حساب لینے میں بہت تیز ہے"۔

جب یہ مضمون آتا ہے کہ فطرت انسانی خود رب جلیل کی طرف سے ہادی اور رہبر ہے 'بشرطیکہ انسان اپنی فطرت کے دروازے ہدایت اور اشارات کائنات کے لئے کھول دے اور انسان قبولیت ہدایت کے لئے تیار ہو اس لیے کہ یہ کائنات اپنی زبان میں نہایت ہی موثر انداز میں بات کرتی ہے' تو یہ سورہ یوں گویا ہوتی ہے۔

(وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (٧٤) وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (٧٥) فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (٧٦) فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ (٧٧) فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (٧٨) اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (٧٩) وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْئًا وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ (٨٠) وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (٨١) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (٨٢) "اور ابراہیم کا واقعہ یاد کرو جب اس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا: "کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے؟ میں تو تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں۔" ابراہیم کو ہم اسی طرح زمین و آسمان کا نظام سلطنت دکھاتے تھے اور اس لئے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔ چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا۔ کہا یہ میرا رب ہے؟ مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا ڈوب جانے

والوں کا میں گرویدہ نہیں ہوں۔ پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ میرا رب ہے' مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری راہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیم پکار اٹھا "اے برادران قوم! میں ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔" اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے کہا "کیا تم لوگ اللہ کے معاملے میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے راہ راست دکھا دی ہے اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا۔ ہاں اگر میرا رب کچھ چاہے تو ضرور ہو سکتا ہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے' پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟ اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جبکہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لئے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی؟ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی اور اطمینان کا مستحق ہے؟ بتاؤ اگر تم علم رکھتے ہو۔ حقیقت میں تو امن انہی کے لئے ہے اور راہ راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔"

اب گردش لیل و نہار کا منظر آتا ہے۔ اس میں زندہ اور متحرک مخلوق رواں دواں ہے' رات کی تاریکی میں چمکتے ہوئے ستارے' بحری ظلمات میں سمندری طوفانی لہریں' اور خشکی پر بڑھتے ہوئے فصل' میوہ جات اور زرعی کھیت' لہلہاتے ہوئے زیر بحث آتے ہیں۔ ان سب میں معرفت کردگار کا سامان ہے۔ کون ہے وہ ذات جس نے ان مناظر کو بغیر سابقہ مثال کے پیدا کیا؟ کیا کوئی عقل' اگر وہ درست و سلیم ہو' ایسے مبدع کے ساتھ شریک ٹھہرا سکتی ہے؟ سورہ کے الفاظ ہیں :

(اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الْحَبِّ وَ النَّوٰی یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ (۹۵) فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَ جَعَلَ الَّیْلَ سَکَنًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (۹۶) وَ ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ النُّجُوْمَ لِتَھْتَدُوْا بِھَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (۹۷) وَ ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَھُوْنَ (۹۸) وَ ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِہٖ نَبَاتَ کُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْہُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْہُ حَبًّا مُّتَرَاکِبًا وَ مِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِھَا قِنْوَانٌ دَانِیَۃٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِھًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِہٍ اُنْظُرُوْٓا اِلٰی ثَمَرِہٖٓ اِذَآ

اَلثَّمَرِ وَ يَنْعِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۹۹) وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ

وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ بَنٰتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ (۱۰۰)

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ

وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۱۰۱) ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ

فَاعْبُدُوْهُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (۱۰۲) لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ

الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (۱۰۳) ”دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے۔ وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی مردہ کو زندہ سے خارج کرتا ہے۔ یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ ہے' پھر تم کدھر بہکے چلے جا رہے ہو؟ شب کو چاک کر کے وہی صبح نکالتا ہے۔ اسی نے رات کو سکون کا وقت بنایا ہے۔ اسی نے چاند اور سورج کے طلوع و غروب کا حساب مقرر کیا ہے۔ یہ سب اسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھہرائے ہوئے اندازے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا۔ دیکھو ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں' ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں اور وہی ہے جس نے ایک متنفس سے تم کو پیدا کیا۔ پھر ہر ایک کے لئے ایک جائے قرار ہے اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ۔ یہ نشانیاں ہم نے واضح کر دی ہیں ان لوگوں کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر اس کے ذریعے سے ہر قسم کی نباتات اگائیں۔ پھر اس سے ہرے بھرے کھیت اور درخت پیدا کئے' پھر ان سے تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھولوں کے گچھے پیدا کئے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں اور انگور' زیتون اور انار کے باغ لگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور پھر ہر ایک کی خصوصیت جدا جدا بھی ہے۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو' ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔ اس پر بھی لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا دیا حالانکہ وہ خالق ہے اور بے جانے بوجھے اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں تصنیف کر دیں' حالانکہ وہ پاک اور بالاتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ وہ تو آسمان اور زمین کا موجد ہے' اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اس کی کوئی شریک زندگی ہی نہیں ہے۔ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ یہ ہے اللہ تمہارا رب' کوئی خدا' اس کے سوا نہیں ہے' ہر چیز کا خالق' لہٰذا تم اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے۔ نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے وہ نہایت باریک بیں اور باخبر ہے۔“

اب اللہ کی طرف نہایت ہی خشوع کے ساتھ رجوع کا منظر آتا ہے۔ اللہ واحد کی طرف سے نماز اور روزہ' زندگی اور موت صرف اسی کے لئے اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک کرنے کا انکار اور نفی۔ تمام امور' دنیاوی اور اخروی' دنیا میں خلافت اور نظام خلافت اور آزمائش اور آخرت میں حساب و کتاب اور جزا و سزا سب اسی کے لئے ثابت کئے جاتے ہیں اور یہ اس سورہ کا آخری منظر ہے۔

(قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَ مَا كَانَ
مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (١٦١) قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ
الْعٰلَمِیْنَ (١٦٢) لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (١٦٣)
قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا وَ لَا تَزِرُ
وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ
(١٦٤) وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ
لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (١٦٥)

"اے محمدؐ! کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھایا ہے' بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں' ابراہیم کا طریقہ جسے یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو' میری نماز' میرے تمام مراسم عبودیت' میرا جینا اور مرنا' سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا ہوں۔ کہو' کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے؟ ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے' کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا' پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے' اس وقت وہ تمہارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا' اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں بلند درجے دیئے' تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔"

یہ تھے نمونے جو ہم نے اوپر پیش کئے' اس سورہ کے حسن بے بہا کو صرف یہی ظاہر نہیں کرتے' بلکہ اس سورہ کا ہر منظر اور ہر موقف حسن اثر اور حسن اظہار کا بہترین نمونہ ہے۔

---ooo---

اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں کہ اس سورہ کا سیاق کلام ہر مرحلے اور ہر منظر پر نہایت ہی دلکش پیرائے میں ہے' جبکہ ہر مرحلے اور ہر منظر میں بات متوازن بھی ہے۔ کلام کے توازن اور دلکشی پر بات کرنے کا ہم نے وعدہ کیا تھا۔ یہاں مناسب یہی ہے کہ ہم چند ہی نمونے پیش کریں اور تفصیلی بات چیت کو ایک بار پھر تشریح اور تفسیر کے موقع کے لئے چھوڑ دیں۔ اس سورہ میں کلام کی شوکت اور دلکشی کے صرف تین رنگ ملاحظہ کریں۔ یہ رنگ بہت ہی نمایاں ہیں۔

واقعات اور مناظر کے بیان میں ایک اہم خصوصیت یہ ہے اور یہ خصوصیت پوری سورہ میں پائی جاتی ہے کہ سامعین کو ایک زندہ اور متحرک منظر اور موقف کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ انسان کی نظروں کے سامنے ایک بھرپور منظر

ہوتا ہے اور وہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ مناظر اور مقاصد ایسے الفاظ میں پیش کئے جاتے ہیں کہ وہ تمام افراد اور واقعات کو مجسم طور پر پیش کر دیتے ہیں۔ گویا ان مناظر میں لوگ زندہ کھڑے ہیں' سامع انہیں دیکھ رہا ہے اور واقعات اس کی نظروں کے سامنے رونما ہو رہے ہیں۔ قیامت کے مناظر میں یوں نظر آتا ہے کہ گویا قیامت برپا ہے۔

(وَلَوْ تَرٰى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (٦: ٢٧) کاش تم اس وقت کی حالت دیکھ سکتے جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کئے جائیں گے۔ اس وقت وہ کہیں گے کہ کاش کوئی ایسی صورت ہو کہ دنیا میں پھر واپس جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔

(وَلَوْ تَرٰى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (٦: ٣٠) کاش وہ منظر تم دیکھ سکو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے۔ اس وت ان کا رب ان سے پوچھے گا "کیا یہ حقیقت نہیں ہے" یہ کہیں گے "ہاں اے ہمارے رب! یہ حقیقت ہی ہے" وہ فرمائے گا "اچھا تو اب اپنے انکار کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو۔"

(وَلَوْ تَرٰى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ (٩٣) وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ

(٩٤) کاش تم ظالموں کو اس حالت میں دیکھ سکو جب کہ وہ سکرات موت میں ڈبکیاں کھا رہے ہوتے ہیں اور فرشتے ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ "لاؤ' نکالو اپنی جان' آج تمہیں ان باتوں کی پاداش میں ذلت کا عذاب دیا جائے گا جو تم اللہ پر تہمت رکھ کر ناحق بکا کرتے تھے اور اس کی آیات کے مقابلے میں سرکشی دکھاتے تھے" (اور اللہ فرمائے گا) "لو اب تم ایسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا۔ جو کچھ ہم نے تمہیں دنیا میں دیا تھا' وہ سب تم پیچھے چھوڑ آئے ہو' اور اب ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمہارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے۔ تمہارے آپس کے سب رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے گم ہو گئے جن کا تم زعم رکھتے تھے۔"

(وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ (۲۲) ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ (۲۳) انْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ (۲۴)

"جس روز ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے اور مشرکین سے پوچھیں گے کہ اب وہ تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریک کہاں ہیں جن کو تم اپنا خدا سمجھتے تھے تو وہ اس کے سوا کوئی فتنہ نہ اٹھا سکیں گے کہ اے ہمارے آقا" تیری قسم ہم ہرگز مشرک نہ تھے۔" دیکھو اس وقت یہ کس طرح اپنے اوپر آپ جھوٹ گھڑیں گے اور وہاں ان کے سارے بناوٹی معبود گم ہو جائیں گے۔

اور جب یہ موقعہ آتا ہے کہ مکذبین کو اللہ کی پکڑ سے ڈرایا جائے اور یہ سمجھایا جائے کہ اللہ کی حاکمیت کی گرفت سے کوئی بچ نہیں سکتا تو لوگوں کو اللہ کی پکڑ کے مناظر کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

(قُلْ أَرَأَيْتَكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ اللَّهِ تَدْعُونَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۴۰) بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ (۴۱)) "ان سے کہو' ذرا غور کر کے بتاؤ' اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے مصیبت آ جاتی ہے یا آخری گھڑی آ پہنچتی ہے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم سچے ہو۔ اس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے ہو' پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو بھول جاتے ہو۔

(قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَأَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلَى قُلُوبِكُمْ مَنْ إِلَهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِهِ انْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُونَ (۴۶) قُلْ أَرَأَيْتَكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ بَغْتَةً أَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الظَّالِمُونَ (۴۷))

"اے محمدؐ ان سے کہو کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ تمہاری بینائیاں اور سماعت تم سے چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا اور کون خدا ہے جو یہ قوتیں تمہیں واپس دلا سکتا ہے؟ دیکھو کس طرح ہم بار بار اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر یہ کس طرح ان سے نظر چراتے جاتے ہیں۔ کہو کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ کی طرف سے اچانک یا اعلانیہ تم پر عذاب آ جائے تو ظالم لوگوں کے سوا کوئی اور ہلاک ہو گا؟"

ہدایت کے بعد ضلالت کی تمثیل پیش کرتے ہوئے اور ہدایت کے بعد حق سے رجوع اور روگردانی کرنے کی حالت

کے منظر کو یوں پیش کیا کہ ایک مجسم صورت حال نظروں کے سامنے ہوتی ہے' اگرچہ الفاظ میں اس طرف نہ اشارہ ہوتا ہے اور نہ کوئی حکم ہوتا ہے کہ اس کی طرف توجہ کرو' لیکن انسان منظر کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔

(قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰۤى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ لَهٗۤ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (٦: ٧١)

اے محمدؐ ان سے پوچھو کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں' نہ نقصان؟ اور جب اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا چکا ہے تو کیا اب ہم الٹے پاؤں پھر جائیں؟ کیا ہم اپنا حال اس شخص کا سا کر لیں جسے شیطانوں نے صحرا میں بھٹکا دیا ہو اور وہ حیراں و سرگرداں پھر رہا ہو' درآں حالیکہ اس کے ساتھی اسے پکار رہے ہوں کہ ادھر آؤ' سیدھی راہ موجود ہے۔"

اب ہمارے سامنے پختہ پھلوں کا منظر آتا ہے' اور جنت کی زندگی کا نقشہ کھینچا جاتا ہے اور دست قدرت کے نتیجے میں قسم قسم کے پھل سامنے آتے ہیں اور قارئین کو اس منظر کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِىْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَىْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ اِنَّ فِىْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (٩٩)

"اور وہی ہے جس نے آسمانوں سے پانی برسایا' پھر اس کے ذریعے ہر قسم کی نباتات اگائی' پھر اس سے ہرے بھرے کھیت اور درخت پیدا کئے' پھر ان سے تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے۔ اور پھر کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے مہیا کئے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں اور انگور' زیتون اور انار کے باغ لگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور پھر ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا بھی ہیں۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو' ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔"

یہ ہیں' اس سورہ کے مقامات اور مناظر جن میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور یہ رنگ اس پوری سورہ میں برابر نظر آتا ہے۔ ان تمام رنگوں کے اندر ایک بات مشترک نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ان مناظر کی تصویر کشی اس انداز میں کی گئی ہے کہ مجرمین اور جھٹلانے والوں کے خلاف ہر قسم کی شہادت اور ثبوت جرم خود بخود ذہن نشین ہو جاتا ہے اور ان مناظر

میں ان مجرمین کی تصویر خود بخود نظروں میں آجاتی ہے۔ ان مناظر کے نمونے ہم نے اس سے قبل بھی پیش ہیں کئے جو لفظ (وَلَوْ تَرَىٰ) سے شروع ہوتے ہیں۔ ان مناظر میں اسلامی نظریہ حیات پر بھی دلائل دیئے جاتے ہیں اور اسلامی شریعت پر بھی۔ اس سورہ کے آغاز میں جب اسلامی عقائد اور نظریات سے بحث کی جاتی ہے تو ان جامع و مانع الفاظ میں کی جاتی ہے:

(قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ شَهِیْدٌ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی قُلْ لَّآ اَشْهَدُ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (۱۹)

"ان سے پوچھو کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے؟ کہو، میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے، اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے سب کو متنبہ کر دوں، کیا واقعی تم لوگ یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں؟ کہو، میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں دے سکتا۔ کہو خدا تو وہی ایک ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔"

اور بات جب اس مضمون تک پہنچتی ہے جو حلال و حرام کے تعین سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا نظریاتی پہلو زیر بحث آتا ہے تو ایک نیا منظر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس جزوی مسئلے پر بھی ایسا ہی ثبوت طلب کیا جاتا ہے جس طرح اسلامی نظریات کے خلاف دوسرے موضوعات پر۔ مثلاً شرک وغیرہ پر ثبوت طلب کیا جاتا ہے اور قرآن کریم کا یہ عمومی انداز ہے۔

(قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِیْنَ یَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ (۱۵۰) "ان سے کہو کہ لاؤ اپنے وہ گواہ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ ہی نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے۔" پھر اگر وہ شہادت دے دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دینا، اور ہرگز ان کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور جو آخرت کے منکر ہیں اور جو دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں۔

قرآن کریم میں کلام کی ہم آہنگی کا ایک تیسرا رنگ یوں نظر آتا ہے کہ کسی موضوع پر مختلف مقامات پر جو بھی بات ہوتی ہے اس کا رنگ ڈھنگ ایک جیسا ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی عبارت مختلف ہو تو گویا ایک ہی حقیقت کو مختلف رنگوں میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ رنگ ڈھنگ چاہے جس قدر بھی مختلف ہوں حقیقت وہی رہتی ہے۔ مثلاً سورہ کے آغاز میں کہا گیا کہ جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ رب کے ساتھ دوسروں کو ہمسر بناتے ہیں۔ اسی طرح اس سورہ میں یہ کہا گیا کہ حلال و حرام جو لوگ از خود مقرر کریں وہ بھی دوسروں کو اللہ کا ہمسر بناتے ہیں دونوں جگہ (یَعْدِلُوْنَ) کا لفظ لایا جاتا ہے۔

(اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِیْنَ

كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ (۱) "تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے زمین و آسمان بنائے ' روشنیاں اور تاریکیاں پیدا کیں - پھر بھی وہ لوگ جنہوں نے دعوت حق کو ماننے سے انکار کیا ہے دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھہراتے ہیں -

(قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ (۱۵۰) "ان سے کہو لاؤ اپنے گواہ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ ہی نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ' پھر اگر وہ شہادت دے دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دینا اور ہرگز ان کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور جو آخرت کے منکر ہیں اور جو دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں -"

پہلی آیت میں اپنے رب کے ساتھ لوگوں کو ہمسر بنانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں اور دوسری آیت میں بھی وہ اللہ کے ساتھ ہمسر بناتے ہیں اس لئے کہ وہ حق قانون سازی میں دوسروں کو اللہ کا شریک اور ہمسر ٹھہراتے ہیں....... ان دونوں جگہ لفظ يَعْدِلُوْنَ اپنے مضمون کو بھی اچھی طرح ادا کرتا ہے اور اس کے اندر حسن تعبیر بھی ہے -

اسی طرح قرآن کریم میں لفظ صراط سے پورا اسلام بھی مراد ہوتا ہے اور اس سے اسلام میں حق قانون سازی کا اظہار بھی کیا جاتا ہے -

(فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۲۵) وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (۱۲۶) "پس جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے - اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے - اور ایسا بھینچتا ہے کہ اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے ' اس طرح اللہ ناپاکی ان لوگوں پر مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے ' حالانکہ یہ راستہ تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے اور اس کے نشانات ان لوگوں کے لئے واضح کر دیئے گئے ہیں جو نصیحت قبول کرتے ہیں -"

اور جب سورہ کے آخر میں مویشیوں اور کھیتوں اور حلال و حرام کی بحث آتی ہے تو وہاں بھی لفظ صراط استعمال کیا جاتا ہے -

(وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ

ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۵۳) "یہ کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے۔ یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں دی ہے شاید کہ تم کج روی سے بچو۔"

صرف ایک لفظ کے انتخاب سے ایک جزوی مسئلے کو ایمان اور نظریہ کے زمرے میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ دونوں معاملات میں اللہ کی ہدایت پر عمل صراط مستقیم پر چلنا ہے اور دونوں میں انحراف سیدھی راہ سے انحراف ہے۔ دونوں معاملات میں مسئلہ کفر و ایمان کا مسئلہ قرار پاتا ہے۔ یا کوئی شخص اسلام پر عمل پیرا ہوتا ہے یا رسم جاہلیت کا پیروکار ہوتا ہے جس طرح آغاز کلام میں ہم اس نکتے پر مفصل بحث کر آئے ہیں۔

مناسب ہے کہ اس سورہ کی اجمالی تعریف اور تبصرہ یہاں ختم ہو جائے اور اب اس کی آیات کو تفصیلاً لیا جائے۔ جس طرح اس سورہ میں ایک لہر کے بعد دوسری لہر اٹھتی ہے اس طرح ہم بھی تفصیلات میں جائیں گے اور اس میں ہمارا انداز کلام درس (سبق) کا نہ ہو گا جس طرح دوسری مدنی سورتوں میں ہم نے اختیار کیا' اس لئے کہ یہ انداز اس سورہ کے مزاج کے زیادہ مناسب ہے۔ واللہ ہو الموفق۔

---ooo---

درس نمبر ۵۵ ایک نظر میں

سورہ کے آغاز میں یہ وسیع لہر انسان کے دل و دماغ کو تخلیق کائنات اور اس کے اندر تخلیق پر غور و خوض کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہ دونوں حقائق بیک وقت آفاق اور انفس میں نقطہ استدلال ہیں لیکن قرآن کریم ادراک انسانی کو اس طرف محض جدلیاتی انداز میں متوجہ نہیں کرتا اور نہ ہی لاہوتی اور کلامی انداز بحث اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا خطاب ہے جو زندگی سے بھرپور ہے اور خفتہ فطرت انسانی کو جگاتا ہے۔ انسانی فطرت کے سامنے تخلیق کائنات اور تخلیق حیات کو پیش کیا جاتا ہے۔ فیصلہ کن انداز میں تدبیر کائنات اور اس پر مکمل کنٹرول اور ضابطے کے پابند نظام کو پیش کیا جاتا ہے۔ محض جدلیاتی انداز میں نہیں۔ اس فیصلہ کن انداز کی تہ میں یقین کی قوت ہے جو کلام الٰہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس پر فطرت انسانی گواہ ہے اور فطرت انسانی شاہد عادل ہوتی ہے۔

زمین و آسمان کا وجود' ان کا ایک مخصوص نظام کے مطابق چلنا' ان کے اندر زندگی کا پیدا ہونا اور اس زندگی میں سے انسان کا اشرف المخلوق ہونا اور ان تمام امور کا ایک ضابطے کے مطابق جاری و ساری رہنا' ایسے حقائق ہیں جو انسانی فطرت کے سامنے اصل سچائی کو روشن کرتے ہیں۔ فطرت انسانی کے اندر اللہ کی وحدانیت پر اس کا یقین پیدا کرتے ہیں اور وحدانیت اس سورہ کا اصل موضوع بھی ہے۔ نہ صرف اس پوری سورہ بلکہ پورے قرآن کا اصل موضوع ہی اللہ کی مکمل وحدانیت ہے۔ پورا قرآن ثبوت توحید کے لئے کوشاں ہے۔ قرآن مجید کے پیش نظر اصل مسئلہ یہ تھا ہی نہیں کہ اللہ موجود ہے یا نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اللہ جو موجود ہے اس کی صحیح معرفت کیا ہے۔ اس کی سچی صفات کیا ہیں؟ مسئلہ یہ کبھی نہیں رہا ہے کہ آیا اس کائنات کا کوئی الٰہ ہے یا نہیں ہے۔

مشرکین عرب جن کو یہ سورہ مخاطب کرتی تھی' وہ وجود باری کے منکر تو تھے ہی نہیں۔ وہ اللہ کے وجود کا اقرار کرتے تھے اور مانتے تھے کہ اللہ خالق ہے' رازق ہے' مالک ہے' زندہ کرنے والا اور مارنے والا ہے وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم میں ان کے جو افکار نقل کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان صفات باری کے قائل تھے۔ ان لوگوں کو اس اعتراف کے باوجود مشرک قرار دیا گیا تھا اس لئے کہ وہ اللہ وحدہ کے اس اعتراف کے مطابق اللہ وحدہ کو حاکم مطلق نہ قرار دیتے تھے اور اپنے تمام امور میں ذات باری کو حکم تسلیم نہ کرتے تھے۔ اپنی زندگی کے تمام معاملات سے دوسرے شرکاء کے عمل دخل کو خارج نہ کرتے تھے اور صرف اللہ کی شریعت کو قانون حیات تسلیم نہ کرتے تھے۔ اور وہ اس اصول کو تسلیم نہ کرتے تھے کہ زندگی کے معاملات میں سے کسی بھی معاملے میں غیر اللہ کو قانون سازی کا کوئی حق نہ ہو گا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ان لوگوں کو مشرک اور کافر کہا' حالانکہ وہ وجود باری کا اقرار کرتے تھے اور مذکورہ بالا صفات باری کے بھی قائل تھے' جن کا تقاضا یہ تھا کہ ان کے تمام امور میں حاکمیت کا حق صرف اللہ کو ہے اس لئے کہ جب خالق' رازق اور مالک وہی ہے تو حاکم بھی اللہ ہی کو ہونا چاہئے۔ اس سورہ کے آغاز میں اسی لئے ان کے سامنے یہ

حقیقت رکھی گئی کہ اللہ انسانوں کا بھی خالق و مدبر ہے اور اس کائنات کا بھی خالق و مدبر ہے۔ اس کائنات اور انسانوں کی تدبیر میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ کائنات اور انسانوں کے تمام امور سے واقف ہے۔ ظاہری اور باطنی چیزوں سے خبردار ہے، انسانوں کے اعمال اور کردار سے بھی واقف ہے۔ یہ تمام امور ایسے ہیں کہ ان کے لازمی تقاضے کے طور پر تسلیم کیا جانا چاہئے کہ حاکم اور شارع بھی صرف اللہ ہی ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جس کی وضاحت ہم نے اس سورہ کے اجمالی تبصرے میں کر دی ہے۔

تخلیق اور روئیدگی حیات جس طرح مشرکین کے مقابلے میں عقیدۂ توحید کے حق میں مضبوط دلائل و شواہد تھے اور ان کا تقاضا تھا کہ اللہ ہی حاکم ہو، یہ دونوں باتیں جدید جاہلی تہذیب کے خلاف بھی نہایت ہی مضبوط دلائل ہیں جس کی بنیاد انکار خدا پر رکھی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جاہلیت جدیدہ کے ملحد پیروکار تو شاید اس بارے میں بھی شک میں مبتلا ہیں کہ آیا وہ خود اپنی ذات کے وجود کے بھی قائل ہیں یا نہیں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جاہلیت جدید کینسہ کے ردعمل کے طور پر ابھری۔ اس تحریک کو یہودیوں نے ہائی جیک کر لیا اور اسے اپنے اس منصوبے کے لئے استعمال کیا کہ دنیا میں اصول دین کی بنیاد پر ان کی تہذیب کے سوا کوئی دوسری تہذیب استوار نہ ہو اور تمام انسانیت کو الحاد و زندقہ میں پھنسا کر تاخت و تاراج کر دیا جائے۔ حکمائے یہود کے مشہور مکالمات میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت پوری انسانیت ان یہودیوں کے چنگل میں گرفتار ہے اور یہ محض اس لئے کہ اس وقت صرف یہودی ہی وہ لوگ ہیں جو قوت کے حقیقی سرچشمے یعنی عقیدۂ توحید اور دین کو پختگی کے ساتھ پکڑے ہوئے ہیں اور دوسری اقوام کو انہوں نے بے دین بنا دیا ہے۔

یہودیوں کے مکر و فریب کا یہ جال چاہے جس قدر بھی وسیع ہو وہ انسانی فطرت کو اس میں نہیں پھنسا سکتے۔ اس لئے کہ ذات باری پر ایمان انسان کی فطرت کی آواز ہے۔ اس سلسلے میں اگر انسان کبھی کوئی بڑی ٹھوکر کھاتا ہے تو وہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ذات باری کی صفات میں افراط و تفریط کرتا ہے۔ مزید یہ کہ انسان اللہ کو تو مانتا ہے لیکن اللہ کے حق حاکمیت کو تسلیم کرنے میں وہ متامل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ایسے لوگوں کو مشرک اور کافر کہتا ہے۔ بعض لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کی فطرت فساد و بگاڑ کا شکار ہوتی ہے اور وہ فطرت کی آواز کو نہیں سن سکتے اور ایسی بگاڑ کا شکار لوگ بسہولت یہودیوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور وجود باری کا انکار کر دیتے ہیں، البتہ یہ حقیقت ہے کہ اس کرۂ ارض کی عظیم آبادی میں ایسے بگڑے ہوئے نفوس شاذ کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کی تعداد ہر دور میں کم ہی رہی ہے۔ اس وقت پورے کرۂ ارض پر روس میں چند ملین ملحد ہوں گے اور چند ملین چین میں ہوں گے جن پر نہایت ہی قلیل تعداد میں پائے جانے والے حکمران آگ اور خون کے بل بوتے پر حکومت کرتے ہیں، اس کے باوجود کہ ان ملحد ممالک نے اربوں روپے خرچ کر کے اور تمام تعلیمی وسائل کو کام میں لاکر ان کے ذہن میں الحاد کا عقیدہ بٹھانے کی سعی کی ہے جس کے لئے انہوں نے نشرواشاعت کے تمام جدید ذرائع بھی استعمال کئے۔

ایک دوسرے میدان میں یہودی بہت کامیاب ہیں، وہ یہ کہ انہوں نے دین کو محض وجدان اور چند رسوم تک محدود کر دیا ہے اور اسے عملی زندگی سے نکال دیا ہے۔ انہوں نے لوگوں کو اس وہم میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ اس کے باوجود مومنین میں شمار ہو سکتے ہیں کہ اللہ ان کا قانون ساز نہ ہو اور انہوں نے قانون سازی کا حق کچھ اور ارباب کو دے

رکھا ہو۔ اپنی اس کامیاب پالیسی کی وجہ سے انہوں نے تمام انسانیت کو تباہ کر دیا ہے۔ لوگ کافر ہو گئے ہیں لیکن وہ سمجھتے یہی ہیں کہ وہ پکے مومن ہیں۔

یہودیوں کی دین دشمنی کا رخ سب سے زیادہ اسلام کی طرف ہے اس لئے کہ انہیں اپنی تاریخ کا پوری طرح علم ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ جب دین اسلام انسان کی پوری زندگی پر حکمران تھا تو اس نے ان یہودیوں پر بھی غلبہ پالیا تھا اور یہ کہ جب مسلمانوں نے اپنی عملی زندگی سے دین اسلام کو باہر نکالا تو یہودیوں کو مسلمانوں پر غلبہ نصیب ہو گیا۔ مسلمان اس زعم میں مبتلا رہے کہ وہ پکے مسلمان اور پکے مومن ہیں۔ دین کی موجودگی کے معاملے میں یہ بے فکری اور خوش فہمی جبکہ دین سرے سے موجود ہی نہ ہو' یہودی سازش کی کامیابی کے لئے نہایت ہی ضروری ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اللہ لوگوں کو اس بے فکری اور بے حسی سے اپنے حکم سے نکال دے۔

میں سمجھتا ہوں کہ صیہونی یہودی اور عیسائی صلیبی' دین اسلام کے حوالے سے مایوس نظر آتے ہیں۔ وہ اس وسیع اسلامی خطے کے بارے میں سخت مایوسی کا شکار ہیں جو یورپ' افریقہ اور ایشیا کے وسیع حصے پر مشتمل ہے۔ وہ اس بارے میں مایوس ہو گئے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو ملحد بنا سکیں گے یا یہ کہ جدید مادی نظریات سے مسلمانوں کو متاثر کیا جا سکے گا۔ اسی طرح وہ اس امر سے بھی مایوس ہو چکے ہیں کہ وہ مسیحی واعظین کے ذریعے مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کر سکیں گے اس لئے وہ اہل اسلام کے خلاف نہایت ہی مکروہ وسائل استعمال کر رہے ہیں اور گہری سازش تیار کر رہے ہیں۔ انہوں نے ان ممالک میں ایسی تنظیمیں تیار کر لی ہیں جو اپنے آپ کو اسلامی رنگ میں ظاہر کرتی ہیں۔ یہ تنظیمیں نظریات کے اندر بڑی رواداری کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ اگرچہ یہ تنظیمیں پورے دین کا انکار نہیں کرتیں لیکن اپنے اسلامی لباس میں یہ تنظیمیں وہ تمام منصوبے عالم اسلام میں روبکار لاتی ہیں جن کا حکم انہیں عیسائی اور یہودی استاد دیتے ہیں۔ یہ لوگ وہ کام بھی کر گزرتے ہیں جن کو سرانجام دینے میں صدیوں تک یہودی اور عیسائی ایجنٹ ناکام رہے۔

یہ تنظیمیں اسلام کے جھنڈے بلند کرتی ہیں اور زبان سے یہ اعلان کرتی ہیں کہ ہم دین کا احترام کریں گے لیکن اپنی حکومتوں میں یہ پوری طرح غیر اسلامی قوانین جاری کئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے خدا کی شریعت کو اپنی زندگیوں سے پوری طرح نکالا ہوا ہے۔ حرام کو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ حلال کیا جا رہا ہے۔ وہ اپنے ہاں تصورات اور اقدار کے میدان میں ایسے تصورات اور اخلاق کو رواج دے رہی ہیں جن سے اسلامی اخلاق اور اسلامی تصورات ختم ہو رہے ہیں۔ ان کی نشرواشاعت اور تعلیم و تربیت کے تمام وسائل اس طرح کام کر رہے ہیں کہ جن کے نتیجے میں تمام اسلامی تصورات اور اسلامی اخلاق کی نفی ہوتی ہے۔ اور جن کی وجہ سے تمام دینی اقدار مٹ رہی ہیں۔ یہ لوگ وہ تمام قوانین اور قراردادیں نافذ کرتے ہیں جن کو عیسائی مجالس اور یہودی پروٹوکول پاس کر دیں۔ مثلاً مسلمان عورت کو بازاروں اور سڑکوں میں نکالنا' عورت کو معاشرے کے لئے فتنہ بنانا' اور یہ بتانا کہ کثرت پیداوار اور ترقی کے لئے عورت کا گھر سے باہر آ جانا ضروری ہے جبکہ ہزاروں مرد گھروں میں بیکار اور بے روزگار بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اخلاقی بے راہ روی کو مختلف طریقوں سے عام کرتے ہیں اور لوگوں کو عملاً بے راہ روی میں مبتلا ہونے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ سب کام کرتے ہوئے یہ تنظیمیں یہ دعویٰ بھی کرتی چلی جاتی ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور اسلام کا احترام کرتی ہیں۔ عام لوگ بھی اس وہم میں مبتلا ہیں کہ وہ ایک مسلم معاشرے میں زندہ رہ رہے ہیں۔ وہ مسلمان ہیں اور ان میں سے کچھ اچھے لوگ نماز بھی پڑھتے ہیں اور

روزے بھی رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حق حاکمیت یا تو صرف اللہ کے لئے ہو گا یا ارباب متفرقون کے لئے ہو گا۔ بس یہی نقطہ حکمرانی ہے جس کے بارے میں صلیبی عیسائیوں اور صیہونی یہودیوں نے اہل اسلام کو مکمل طور پر دھوکے میں ڈال دیا ہے اور ان کے تمام نشرواشاعت کے ذرائع اور تعلیم و تربیت کے وسائل پورے طور پر اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ مغربی استعمار کے ایجنٹ ' مستشرقین اور مغربی علماء اور مفکرین رات اور دن اس کام میں لگے ہوئے ہیں کہ حکومت اور حکمرانی کے ساتھ دین کا کوئی واسطہ اور تعلق نہیں ہے۔ اسلامی حکومت کے بغیر بھی وہ مسلمان رہ سکتے ہیں۔ وہ دین اسلام میں داخل شمار ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ ان کی پوری زندگی ایسی اقدار پر استوار اور ایسے تصورات پر اٹھی ہو جن کا تعلق نہ اسلام سے ہو اور نہ شریعت میں ان کی کوئی گنجائش ہو۔

اس سازش کو مزید گہری اور گمراہ کن بنانے کے لئے یہ عالمی صیہونیت اور عالمی صلیبیت' عالم اسلام میں مقرر کردہ اپنے ایجنٹوں کے ساتھ مصنوعی معرکہ آرائی بھی شروع کر دیتی ہیں۔ بعض جگہ یہ معرکہ آرائی سرد جنگ کی صورت میں ہوتی ہے جبکہ بعض اوقات عملی جنگ ہوتی ہے اور مختلف شکلوں میں لوگوں کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ ان مغربی ایجنٹوں کے سخت مخالف ہیں حالانکہ یہ ایجنٹ درحقیقت خود انہوں نے مقرر کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ان کو ہر قسم کی مالی' ادبی' ثقافتی امداد دیتے ہیں اور اپنی ظاہری اور خفیہ قوتوں کی وجہ سے ان کی حفاظت کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کی خفیہ ایجنسیاں رات دن ان گماشتوں کی خدمت اور حفاظت میں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔

یہ ظاہری اور مصنوعی عداوت اس لئے پیدا کی جاتی ہے کہ یہ صیہونی اور صلیبی سازش نہایت ہی گہری ہو اور کسی کے ذہن میں یہ خیال تک نہ گزرے کہ عالم اسلام کے حکمران مغرب کے گماشتے ہیں اور یہ اہالیان مغرب کے لئے وہ کام کر رہے ہیں جو اہل مغرب اپنے استعمار کی تین صدیوں تک نہ کر سکے تھے۔ یہ لوگ عالم اسلام کے اخلاق کو تباہ کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی اقدار کو ختم کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے تصورات اور نظریات کو برباد کر رہے ہیں اور وہ مسلمانوں کو ان کی قوت کے اصل سرچشمے سے محروم کر رہے ہیں۔ کہ کہیں وہ اپنی زندگیوں کو اسلامی شریعت کے اوپر استوار نہ کر لیں تاکہ یہ ایجنٹ صیہونیوں کے پاس کردہ پروٹوکولز عالم اسلام میں نافذ کریں اور عالمی صلیبیوں کے پاس کردہ فیصلوں کے مطابق حکومت کریں اور کوئی آنکھ انہیں دیکھ نہ رہی ہو اور عالم اسلام کا کوئی بیدار شخص انہیں نوٹ نہ کر سکے۔

لیکن ان تدابیر کے باوجود بھی اگر عالم اسلام میں کوئی شخص ایسا پایا جائے جو اس گہری سازش کے پھندے میں نہ آئے اور جعلی اسلام پر مطمئن ہو کر بے حس ہونے کے لئے تیار نہ ہو' ان دینی تنظیموں کے پھندے میں نہ آئے جو دین اسلام کی تحریف کے لئے وجود میں لائی گئی ہیں جو کفر کو اسلام ثابت کرتی ہیں۔ فسق' فجور اور اخلاقی بے راہ روی کو ترقی پسندی سے تعبیر کرتی ہیں۔ اگر اس قسم کا کوئی صاحب بصیرت ان گماشتوں کو نظر آئے تو یہ فوراً اس کے خلاف تباہ کن جنگ شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر جھوٹی تہمتیں لگاتے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ تمام ایسے بیدار لوگوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے اور ان پر ناقابل برداشت مظالم ڈھائے جائیں' لیکن مغربی عالمی خبر رساں ادارے اور خبر رساں ایجنسیاں اس طرح مہر بلب ہوتی ہیں کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ ان کا کردار گونگے 'شیطان کا کردار ہوتا ہے اور اس وقت انہیں بنیادی حقوق بالکل یاد نہیں ہوتے۔

عالم اسلام کے سادہ لوح اور نیک مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ ان غیر ملکی ایجنٹوں اور عالم اسلام کی بیدار لیڈر شپ کے

درمیان شاید کوئی شخصی تنازعہ ہے اور اس جنگ کا دین اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بدستور اپنی سادہ لوحی میں روز و شب بسر کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے دینی معاملات میں تو بڑی دینی حمیت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے مسائل پر سینہ تان کر سامنے آ جاتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے منکرات کے خلاف ضرور اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے ان مکروہات اور منکرات کے خلاف زبانی آواز اٹھا کر بس دینی فریضہ ادا کر دیا ہے لیکن وہ دیکھ رہے ہیں کہ دین کی بنیادوں کو اکھاڑا جا رہا ہے' اس کی اساسوں پر کلہاڑا چلایا جا رہا ہے' اللہ کے حق حاکمیت اور حق قانون سازی کو غصب کیا جا رہا ہے اور اللہ کے مقابلے میں طاغوت کی شریعت نافذ ہے' حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ شریعت طاغوت کا انکار کر دیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ طاغوت حکمران ہے اور لوگوں کی پوری زندگی پر حکمران ہے لیکن وہ اسے انگیز کیے جا رہے ہیں۔

عالمی یہودیت اور عالمی صلیبیت جب یہ دیکھتی ہے کہ اس کی یہ سازش نہایت کامیابی سے آگے بڑھ رہی ہے تو وہ خوشی سے پھولی نہیں سماتی حالانکہ وہ اعلانیہ الحاد کے ذریعہ دین اسلام کا مقابلہ کر کے عاجز آگئی تھی' نیز صدیوں تک کوشش کرنے کے باوجود وہ مسلمانوں کو دین اسلام سے پھیر کر عیسائی نہ بنا سکی تھی۔

لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ غبار جلد ہی چھٹ جائے گا اور یہ دین ایک دن ضرور غالب ہو کے رہے گا۔ بے شک یہ لوگ گہری چال چلتے ہیں لیکن اللہ خیر الماکرین ہے۔ اس کا فرمان ہے:

(وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ (٤٦) فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ

(١٤: ٤٦ – ٤٧)) ”انہوں نے اپنی ساری چالیں چل دیکھیں مگر ان کی ہر چال کا توڑ اللہ کے پاس تھا' اگرچہ ان کی چال ایسی غضب کی تھی کہ پہاڑ اس سے ٹل جائیں۔ اے نبی تم ہرگز گمان نہ کرو کہ اللہ کبھی اپنے رسولوں سے کئے ہوئے وعدوں کے خلاف کرے گا۔ اللہ زبردست ہے' اور انتقام لینے والا ہے۔“

الحاد کے جنون کے علاج کے لئے تخلیق اور حیات کے دلائل نہایت مفید نسخہ ہے۔ یہ اس قدر قوی دلیل ہے کہ ملحدین اس کے مقابلے میں محض شف شف اور بودی تاویلیں ہی کر سکتے ہیں۔

اس کائنات کا اس کے مخصوص نظام کے ساتھ وجود میں لانا' فطرت کے بدیہی استدلال کے مطابق اور نفس انسانی کے عقلی تقاضے کے مطابق' اس بات کو مستلزم ہے کہ اس کا کوئی موجد' خالق اور مدبر ہو اس لئے کہ وجود اور عدم کے درمیان جو فاصلے اور گیپ ہیں ان کو محض انسانی ادراک عبور نہیں کر سکتا۔ یہ گیپ صرف اس عقیدے اور نظریے کے ذریعہ ہی بھرا جا سکتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق' موجد اور الٰہ ہو۔

جو لوگ عقیدۂ الحاد کے قائل ہیں وہ اس گیپ کو محض مکابرہ کے ذریعہ بھرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بات ضروری نہیں ہے کہ ہم وجود سے قبل عدم کے قائل ہوں۔ ان میں سے ایک برگسان یہودی فلسفی ہیں' جو روحانیت کے فلسفی مشہور ہیں' وہ مادیت کے مقابلے میں روحانیت کا دفاع کرتے ہیں اور اس پہلو سے بعض مسلمان بھی ان سے متاثر

نظر آتے ہیں۔انہوں نے ان کے بعض اقوال سے اپنے دین کے حق میں استدلال بھی کیا ہے۔گویا یہ لوگ اللہ کے دین کو بندوں کے اقوال کے ذریعے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔برگسان کے فلسفے کا نچوڑ یہ ہے کہ اس کائنات سے پہلے عدم تھا ہی نہیں۔اور یہ مفروضہ کہ یہ کائنات عدم سے وجود میں آئی محض انسانی عقل کا مفروضہ ہے اور انسانی عقل کی کمزوری یہ ہے کہ وہ صرف اسی نہج پر سوچ سکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ برگسان کس منطق سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وجود سے پہلے عدم نہ تھا۔

کیا عقل اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ وجود سے پہلے عدم نہ تھا؟ نہیں' وہ خود اس نتیجے تک پہنچا ہے کہ عقل تو صرف عدم کے بعد وجود کا تصور کر سکتی ہے۔پھر کیا اس نے اللہ کی جانب سے کسی وحی کے بل بوتے پر یہ نتیجہ اخذ کیا؟ نہیں وہ اس کا بھی مدعی نہیں رہا ہے۔اگرچہ وہ اس کا قائل ہے کہ روحانی صوفیوں کا وجدان ہمیشہ اللہ العالمین کا قائل رہا ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس مسلسل وجدان کی تصدیق نہ کریں۔(ہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ جس اللہ کو برگسان کے مطابق صوفی وجدان نے ہمیشہ پایا ہے وہ زندگی ہے)۔اب سوال یہ ہے کہ وہ تیسرا ذریعہ کیا ہے جس سے وہ اپنے اس فلسفے کو ثابت کرتا ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کائناتی وجود سے قبل کوئی عدم ہو......کوئی عقلی نقلی دلیل اس کے ہاں نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر ذی شعور اس بات پر مجبور نظر آتا ہے کہ وہ اس کائنات کے لئے ایک خالق کا قائل ہو اور وہ مجبور اس لئے ہے کہ وہ اس کائنات کے وجود کی کوئی علت سمجھ سکے۔ ہمارے سامنے مجرد اور فقط وجود ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے سامنے ایک کائناتی نظام ہے۔ یہ نظام ایسے ضابطوں کا پابند ہے جس کی ذرہ برابر خلاف ورزی نہیں ہو رہی ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز حساب و ہندسہ کے مطابق معیاری ہے اور ہماری چھوٹی عقلیں صدیوں کے غور و خوض کے بعد بھی اس کائنات کے نہایت ہی قلیل ضابطوں کو سمجھ سکی ہیں۔

(انکار خدا کا اصل سبب یہ ہے کہ اہل کنیسہ اللہ کے نام سے عوام الناس کی گردنوں پر صدیوں سے سوار تھے۔ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں کلیسا سے فرار کی راہ یوں اختیار کی گئی کہ لوگوں نے سرے سے خدا کا انکار کر دیا۔کینسہ سے فرار حاصل کرنے والوں میں جو لوگ زیادہ سمجھدار تھے انہوں نے انکار خدا کے بجائے عقل کو وہ صفات دے دیں جو اللہ کی تھیں اور ان میں سے جو لوگ مادہ پرست تھے۔انہوں نے صرف مادہ کو صفات باری عطا کر دیں' اس لئے کہ ان سب کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا کہ یہ لوگ اپنے وجود اور تمام موجودات کے اوپر کسی قوت کے قائل ہوں' جس کی روشنی میں اس کائنات کو بامعنی بنایا جا سکے اور اس کے اندر جو واقعات اور تغیرات ہوتے ہیں ان کو سمجھا جا سکے۔یہ لوگ محض انکار خدا چاہتے تھے اور اس سے بھی ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ اہل کینسہ کے کنٹرول سے نکل آئیں۔)

اسی طرح اس کرۂ ارض کے اوپر زندگی کا نمودار ہونا بھی ایک بہت ہی بڑا راز ہے۔زندگی اور مادے کے درمیان بہت ہی بڑا فرق ہے اگرچہ مادے کی اصلیت ہم روشنی کو قرار دیں۔بہرحال کسی ایسی ذات کا تصور ضروری ہے جو اللہ ہو' مدبر ہو' خالق ہو' جس نے اس کائنات کی تخلیق اس انداز میں فرمائی جس کے اندر زندگی کے نشوونما پانے کے لئے سازگار حالات پیدا ہوئے۔ایسے اسباب فراہم کئے جس کے نتیجے میں زندگی کو جاری رکھا جا سکتا ہے۔پھر اس کائنات کے اوپر پائی جانے والی تمام زندہ مخلوقات کے سرخیل ''انسان'' کی زندگی تو اپنے مخصوص خدوخال رکھتی ہے۔انسان کی

اصل ساخت مٹی سے ہے اور مٹی اس زمین کا اصل مادہ ہے لہٰذا اس مٹی سے اوپر کوئی ارادہ ضرور ہونا چاہئے جس نے انسان کو حیات عطا فرمائی اور اسے خصائص انسانیت عطا کرتے ہوئے صاحب ارادہ اور صاحب اختیار مخلوق قرار دیا۔

اب ذرا ملحدین کی سوچ پر نگاہ ڈالیں۔ آج تک انہوں نے "زندگی" کی جو تفسیر اور تشریح بھی کرنے کی سعی کی ہے، اس میں وہ ناکام رہے ہیں۔ یعنی زندگی کی وہ تشریح جو انسانی عقل کے ذریعے کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں جو آخری بات میں نے پڑھی ہے وہ مسٹر ڈیورانٹ کی تحریر ہے، جو نام نہاد امریکی فلسفی ہیں۔ انہوں نے ایٹم کے اندر پائے جانے والی حرکت اور اس کرۂ ارض پر پائے جانے والی زندگی کے درمیاں مماثلت ثابت کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ ایٹم کے اندر پائے جانے والی حرکت کو زندگی قرار دیتا ہے۔ یہ ایک بھونڈی کوشش ہے جو یہ ملحد فلسفی اس گیپ کو بھرنے کے لئے کر رہے ہیں جو مردہ مادے اور متحرک اور دوڑتی ہوئی زندگی کے درمیان موجود ہے۔ اور یہ تفسیریں اور تعبیریں یہ ملحد فلسفی اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں کائنات کی حقیقی تشریح کے لئے کسی اللہ کا قائل ہونا نہ پڑے۔ جو زندگی بھی دینے والا ہے اور موت بھی دینے والا ہے۔

لیکن مسٹر ڈیورانٹ کی یہ بھونڈی کوشش نہ اس کے لئے مفید ہے اور نہ ان ملحدین کے لیے مفید مطلب ہے، جو خدا کے منکر ہیں۔ اس لئے کہ اگر زندگی کو ایک ایسی خصوصیت قرار دیا جائے جو مادے کے اندر موجود ہے اور اس مادے کے اوپر کسی صاحب عزم و ارادہ قوت کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہو گا کہ اس مادے کے اندر موجود زندگی کی خصوصیات مختلف زندہ چیزوں میں مختلف کیوں ہیں؟ بعض اشیاء کی زندگی نہایت ہی پیچیدہ ہے اور مادہ ترقی یافتہ ہے۔ مثلاً ایٹم کے اندر جو حرکت ہے اس کے اندر فہم و ادراک نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ زندگی اور حرکت نباتات کے اندر ایک عضو کی حرکت کی صورت میں آتی ہے۔ اس کے بعد زندہ چیزوں کے اندر ان کی عضویاتی تشکیل زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ مادہ جس کے اندر حرکت یا زندگی ایک ہی معیار کی ہے، اس کا ظہور بعض چیزوں کے اندر بمقابلہ بعض دوسری چیزوں کے کیوں زیادہ معیاری اور مکمل ہوتا ہے اور بعض میں غیر مکمل ہوتا ہے۔ کیا اس تغیر کے پیچھے کوئی قوت مدبرہ آپ مانتے ہیں یا نہیں؟ آخر مختلف چیزوں کے اندر یہ مادی حرکت ہے یا بقول شما زندگی مختلف کیوں ہے؟

ہم تو اس کی تعبیر یہ کرتے ہیں کہ ایک قوت مدبرہ ہے جو اپنے ارادے سے ایسا کرتی ہے اور وہ اللہ العٰلمین ہے، اور یہ تعبیر دل لگتی ہے، لیکن اگر آپ مادے سے وراء کوئی قوت نہیں مانتے تو عقل انسانی کے لئے زندگی کے ان تغیرات اور بوقلمونیوں کو سمجھنا کس قدر مشکل ہے۔

ہم تو بسہولت اس کائنات کو سمجھ لیتے ہیں جب ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ اس کائنات کے اوپر ایک قوت مدبرہ حاکم ہے۔ لیکن اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ایٹم زندہ ہے (چلو ہم فرض کر لیتے ہیں) اور اس زندہ ایٹم کے اوپر کوئی اور قوت مدبر نہیں ہے تو اس صورت میں عقل انسانی کے لئے زندگی کی ان بوقلمونیوں کو سمجھنا مشکل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے ان متنوع مظاہر کو صرف اس انداز میں حل کیا جاسکتا ہے جس میں انہیں اسلامی تصور حیات حل کرتا ہے اور اس حل اور تصور کے علاوہ جس قدر مادی تصورات بھی پیش کئے گئے ہیں وہ بری طرح ناکام رہے۔

تفسیر ظلال القرآن میں ہم نے چونکہ صرف قرآنی انداز تفسیر اپنایا ہے اس لئے اس موضوع پر ہم اس سے زیادہ کوئی بات کرنا مناسب نہیں سمجھتے، اس لئے الحاد کے خلاف ہم یہی دو دلائل دے کر اپنی بات کو ختم کرتے ہیں جو قرآن نے دیئے

یعنی تخلیق اور حیات ۔ قرآن نے وجود باری کے ثبوت کو اپنے ذمے نہیں لیا ہے ۔ وجود باری کا اقرار تقاضائے فطرت ہے اور الحاد کی گندگی کو فطرت کبھی قبول ہی نہیں کرتی ۔ قرآن جس مسئلے پر بہت زور دیتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کو وحدہ لاشریک تسلیم کیا جائے اور انسانوں کی زندگی میں اللہ کی سلطنت کو قائم کیا جائے ۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اس پہلی موج میں ، اشارہ فرمایا ہے ۔

---ooo---

درس نمبر ۵۵ تشریح آیات

۱ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۳

اس سورہ کے آغاز میں اس حقیقت کی کچھ جھلکیاں دکھائی گئی ہیں جو اس میں زیر بحث ہے۔ سورہ کا آغاز ہی طویل زیر و بم سے کیا گیا ہے۔ ابتدائی آیات ہی میں اسلامی نظریہ حیات کی حقیقت اور سورہ کے موضوع کا کلیہ بیان کر دیا گیا ہے۔ آغاز یوں ہوتا ہے۔

آیاتہا ۱۶۵ سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ (۶) مَكِّيَّةٌ (۵۵) رکوعاتہا ۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱﴾

تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے زمین اور آسمان بنائے' روشنی اور تاریکیاں پیدا کیں۔ پھر بھی وہ لوگ جنہوں نے دعوت حق کو ماننے سے انکار کر دیا ہے دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھہرا رہے ہیں۔"

یہ ابتدائی جھلکیاں' الحمدللہ سے شروع ہوتی ہیں' اللہ کی تعریف کی جاتی ہے اور اس کی پاکی کا بیان ہوتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ حمد و ثنا کا مستحق اور سزاوار وہی ہے اور یہ اس لئے کہ اس کی الوہیت اور بادشاہی اس کی تخلیق اور مخلوقات سے واضح طور پر عیاں ہے۔ اس طرح تعریف کے سزاوار اللہ اور اس کی اہم خصوصیت یعنی تخلیق کائنات کو یہاں مربوط کیا جاتا ہے اور اس کائنات کے وسیع حصے کی تخلیق کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ یعنی آسمان و زمین کو۔ نیز تخلیق کے اس وسیع حصے کے اہم مظہر یعنی ظلمت و نور کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو گردش ارض و سما کے نتیجے میں سامنے آتا ہے۔ ایک جھلکی میں اس نظر آنے والی کائنات کے وسیع حصے کو ہمارے فکر و نظر کے لئے پیش کر دیا جاتا ہے' حالانکہ اس کائنات کے اجرام فلکی جو ظلمت و نور کا سبب ہیں ان کے درمیان وسیع مسافتیں ہیں' لیکن کائنات کی ان وسعتوں میں ان کی گردش کے نتائج کو یہاں لایا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ ان لوگوں کی حالت پر حیرت کا اظہار کیا جائے جو اس عظیم کائنات کے ان

کھلے صفحات کو دیکھ رہے ہیں جن کے اندر ایک عظیم حکمت وتدبیر صاف نظر آتی ہے۔لیکن عقل و خرد کے مالک ہونے کے باوجود وہ ایمان نہیں لاتے ' اللہ کو وحدہ لاشریک نہیں سمجھتے اور اس کی حمد وثنا نہیں کرتے بلکہ وہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں اور اللہ کے مساوی درجہ دیتے ہیں۔

(ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ (٦ : ١)) پھر بھی وہ لوگ جنہوں نے دعوت حق کو ماننے سے انکار کر دیا ہے' دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھہرا رہے ہیں۔" تعجب ہے اس بات پر کہ اس کائنات میں عقیدۂ توحید پر عظیم دلائل موجود ہیں جو پکار پکار کا دعوت غور و فکر دے رہے ہیں لیکن ان تمام دلائل کے آثار نفس انسانی پر اثر نہیں کرتے۔ایک کفر کرنے والے نفس پر۔انسان کا نقطۂ نظر کس قدر حقیقت سے دور ہے کہ وہ ان اجرام فلکی اور ان کے درمیان پائے جانے والے فاصلوں اور ان کے دوران گردش کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مظاہر پر نہ صرف یہ کہ غور نہیں کرتا بلکہ وہ حقیقت سے بہت ہی دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

ایک دوسری جھلکی :

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝۲

"وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا' تمہارے لئے زندگی کی ایک مدت مقرر کر دی' اور ایک دوسری مدت اور بھی ہے جو اس کے ہاں طے شدہ ہے' مگر تم لوگ ہو کہ شک میں پڑے ہوئے ہو۔"

کائنات کے بعد اب اس کائنات کے اندر وجود انسانی کی جھلکی دکھائی جاتی ہے۔پہلے اس کائنات اور اس میں پیدا ہونے والے بڑے مظاہر روز و شب کو غور و فکر کے لئے پیش کیا گیا تھا۔اس بے جان کائنات کے اندر ایک جاندار اور شاندار مخلوق انسانی کو غور فکر کے لئے پیش کیا جاتا ہے کہ ایک بے جان اور تاریک مٹی کے اندر انقلاب برپا کر کے اللہ نے اس سے ایک زندہ اور تروتازہ مخلوق کو پیدا کیا۔ دونوں جھلکیوں کے اندر تناسب اور ہم آہنگی دیکھئے کہ ظلمت و نور اور مردہ و زندہ کے اندر کس قدر خوبصورت فنی تقابل ہے۔ان دونوں جھلکیوں کے اندر دو اور جھلکیاں بھی ہیں' ایک یہ کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ اس زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا اور دوسرے یہ کہ بیک وقت یہ تمام مردہ لوگ میدان حشر میں جمع ہوں گے۔تمام مردہ اور ساکن لوگ بیک وقت جنبش میں آجائیں گے اور میدان حشر برپا ہو گا جس میں ہر طرف حرکت ہی حرکت ہوگی جس طرح مٹی ساکن اور ہر جاندار متحرک ہوتا ہے۔ان مردوں اور زندوں کے درمیان اپنی حقیقت کے اعتبار سے بہت بڑا فرق اور فاصلہ ہے۔ان تمام مناظر و مظاہر کا تقاضا تو یہ تھا کہ ایک سلیم الفطرت انسان کا کاسہ دل ایمان سے لبریز ہو جاتا اور وہ اللہ کے سامنے ایک دن پیش ہونے کا یقین کر لیتا لیکن اس سورہ کے مخاطب اہل کفر اس کے باوجود اس میں شک کرتے ہیں۔ (ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ (۲: ۲)) "مگر تم لوگ ہو کہ شک میں پڑے ہوئے ہو۔" تیسری جھلکی کی نوعیت یہ ہے کہ وہ ان تمام سابقہ مظاہر کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ یہ

پوری کائنات ' یہ پوری زندگی اور پھر خصوصا پورا عالم انسانیت اللہ کے دائرہ حکومت میں داخل ہے۔

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۭ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ③

"وہی ایک حاکم آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی' تمہارے کھلے اور چھپے سب حال جانتا ہے اور جو برائی یا بھلائی تم کماتے ہو اس سے خوب واقف ہے۔"

وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا' وہی آسمانوں اور زمین کی حاکم مطلق ہے۔ اس حق حاکیت میں وہ منفرد ہے۔ زمین و آسمان دونوں پر اس کی حکومت کو تسلیم کیا جانا چاہئے۔ اللہ کی شان حاکیت' زمین و آسمان میں پوری طرح جاری و ساری ہے۔ یوں کہ زمین و آسمان میں اللہ کا جاری کردہ ناموس کائنات ان پر پوری طرح حاوی ہے اور وہ اس سے سرتابی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اللہ کی منشا یہ ہے کہ انسانوں کی زندگی کے اندر بھی اللہ کا حکم' قانون اور شریعت جاری ہو' اس لئے کہ جس طرح اللہ نے زمین و آسمان کی تخلیق فرمائی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو بھی پیدا کیا ہے۔ انسان اپنی ابتدائی تخلیق کے وقت اس زمین کی مٹی سے پیدا کیا گیا۔ اس کے اندر وہ خصائص رکھے گئے جن کی وجہ سے وہ انسان بنا اور اس زمین ہی سے اس کے رزق کا بھی بندوبست کیا گیا۔ یہ انسان اپنی جسمانی تخلیق کے زاویہ سے بھی اسی قانون قدرت کا تابع ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے جاری کیا ہے' چاہے وہ راضی ہو یا نہ ہو۔ اس کی ابتدائی تخلیق صرف اللہ کی مرضی سے ہوتی ہے۔ انسان کی ذات کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا' نہ اس کی ماں اور باپ کی مشیت اور ارادے کا اس میں کوئی دخل ہوتا ہے۔ وہ دونوں باہم ملتے ضرور ہیں لیکن وہ بچے میں روح نہیں ڈال سکتے نہ جنین کو وجود بخش سکتے ہیں۔ یہ بچہ ان تمام قوانین قدرت کے مطابق مدت حمل پوری کر کے اس ناموس فطرت کے مطابق بطن مادر سے باہر آتا ہے جو اس کے لئے رب ذوالجلال نے تجویز کیا ہے۔ وہ اس ہوا میں سانس لیتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیمانوں کے مطابق بنایا ہے اور وہ اسی قدر اور اسی کیفیت کے مطابق سانس لیتا ہے جو اللہ کے قانون قدرت نے وضع فرمائے۔ اس کا احساس رنج والم' اس کا بھوک اور پیاس کا احساس' اس کا کھانا اور پینا اور عام طور پر زندہ رہنا عین ناموس فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں اس کے ارادے کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اپنے فطری وجود کے اعتبار سے انسان اور زمین و آسمان کی فطرت اور ناموس کے اندر کوئی فرق نہیں ہے۔

اللہ وہ ذات ہے کہ انسان کے بھیدوں سے بھی واقف ہے۔ اور اس کی ظاہری باتوں سے بھی واقف ہے۔ وہ جو اعمال بھی کرتا ہے چاہے وہ ظاہری ہوں یا خفیہ ہوں ان سب سے اللہ اچھی طرح باخبر ہے اس لئے حق تو یہ ہے کہ وہ اللہ کے اس ناموس اور قانون کا بھی اتباع کرے جو اللہ نے اس کی اختیاری زندگی کے لئے تجویز کیا ہے۔ وہ اپنے نظریات و عقائد بھی اللہ سے لے۔ وہ اقدار حیات بھی اللہ سے لے اور زندگی کے طور طریقے بھی اللہ سے اخذ کرے تاکہ اس کی وہ زندگی جو ناموس تکوینی کے اندر جکڑی ہوئی ہے اور وہ زندگی جو اختیاری ہے دونوں میں وہ اللہ کی شریعت کے تابع ہو'

دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں۔ ان دونوں زندگیوں کے اندر کوئی تضاد اور کشمکش نہ ہو' کوئی عملی تصادم نہ ہو اور یہ دونوں ناموس باہم ٹکرا کر پاش پاش نہ ہو جائیں کہ اس کائنات اور زندگی میں الٰہی ناموس ہو اور اختیاری اور قانونی اور شرعی زندگی طاغوتی اور غیر اسلامی بنیادوں پر استوار نہ ہو۔

---ooo---

درس نمبر ۵۶ ایک نظر میں

افتتاح سورہ کے بعد یہ ایک دوسری لہر ہے۔ پہلی لہر کے اثرات نہایت ہی دور رس تھے۔ اس نے اس پوری کائنات کو حقیقت وجود باری سے بھر دیا تھا۔ صرف زمین و آسمان کی تخلیق اور نور و ظلمت کے ظہور سے اس میں اس حقیقت پر استدلال کیا گیا۔ پھر یہ بتایا گیا کہ اس تاریک مادے سے اللہ نے انسان جیسی مخلوق کو پیدا کیا۔ اس کی زندگی کے خاتمے کے لئے ایک مقررہ وقت دیا اور بتایا گیا کہ بعث بعد الموت کے لئے بھی ایک وقت مقرر ہے جس کا سوائے اللہ کے کسی کو علم نہیں ہے۔ یہ بھی واضح کیا گیا کہ ذات باری لوگوں کے تمام افعال و اقوال کو جانتی ہے۔ وہ چھپے اور ظاہر سے بھی واقف ہے اور ان کے پورے اعمال سے باخبر ہے۔

وجود باری جو انفس اور آفاق میں تاباں ہے' وہ منفرد اور واحد وجود ہے۔ اس جیسا کوئی دوسرا وجود نہیں ہے۔ اللہ کے سوا کوئی اور خالق نہیں ہے۔ وہ بھرپور' روشن اور نہایت ہی چھایا ہوا وجود حق ہے۔ ان آیات و دلائل کی روشنی میں اس کی تکذیب نہایت ہی مکروہ فعل ہے جس کی کوئی سند نہیں ہے اور نہ یہ منکر معذور تصور ہو گا۔

اس لئے اس لہر میں مشرکین کے موقف کو اس وجود برحق کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے کہ یہ لوگ دعوت اسلامی کا انکار ایسے حالات میں کر رہے ہیں کہ ذات باری پر روشن دلائل ان کے انفس و آفاق میں واضح طور پر موجود ہیں' اس لئے ان کا یہ موقف نہایت ہی مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔ ان منکرین کا یہ طرز عمل خود ان کے اپنے احساس و شعور کی رو سے بھی مکروہ ہے اس لئے کہ قرآن ان کے سامنے یہ دلائل پیش کر رہا تھا۔ چنانچہ پہلے ہی معرکے میں قرآن کریم انہیں شکست دے دیتا ہے اور لوگوں کی فطرت کی گہرائیوں کے اندر اس سچائی کو اتار دیتا ہے اگرچہ بظاہر وہ مکابرہ میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن دراصل عناد کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم اس عہد میں ان کے عناد اور غرور اور مکابرہ کی ایک تصویر کبھی تو نہایت ہی تہدید آمیز لہجے میں اور تلخ نوائی کے ساتھ پیش کرتا ہے اور کبھی ان کو یوں دعوت دیتا ہے کہ ذرا اس سے پہلے کے جھٹلانے والوں کے انجام کی تاریخ پر غور کرو۔ جس میں بے شمار سامان عبرت و بصیرت ہے۔ بعض اوقات ان جھٹلانے والوں کا انجام بھی سامنے رکھ دیتا ہے اور بے شمار ہدایات و اشارات فراہم کر دیتا ہے۔

---○○○---

درس نمبر ۵٦ تشریح آیات

۴ ---- تا ---- ۱۱

وَ مَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا
مُعْرِضِیْنَ ﴿۴﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ؕ فَسَوْفَ یَاْتِیْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا
مَا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۵﴾ اَلَمْ یَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ
مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَیْهِمْ
مِّدْرَارًا ۪ وَّ جَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ
وَ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ ﴿۶﴾

"لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ایسی نہیں جو ان کے سامنے آئی ہو اور انہوں نے اس سے منہ نہ موڑ لیا ہو۔ چنانچہ اب جو حق ان کے پاس آیا تو اسے بھی انہوں نے جھٹلا دیا۔ اچھا' جس چیز کا وہ اب تک مذاق اڑاتے رہے ہیں عنقریب اس کے متعلق کچھ خبریں انہیں پہنچیں گی۔ کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے اپنے زمانے میں دور دورہ رہا ہے؟ ان کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا تھا جو تمہیں نہیں بخشا ہے' ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہا دیں' (مگر جب انہوں نے کفران نعمت کیا تو) آخر کار ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دوسرے دور کی قوموں کو اٹھایا۔

ان لوگوں نے عناد اور باطل پہ اصرار کرنے کے موقف کو اپنایا' حالانکہ ایسے دلائل اور نشانیوں کی کمی نہ تھی جن کو دیکھ کر وہ ایمان لاتے اور نہ ایسے دلائل اور نشانات کی کمی تھی جن سے معلوم ہوتا کہ پیغمبروں کی دعوت نہایت ہی سچی دعوت ہے' نہ یہ بات تھی کہ اس دعوت اور داعی کی سچائی پہ دلائل کی کوئی کمی تھی۔ وجود باری پر دلائل و براہین بھی

موجود تھے - غرض ان چیزوں کی ان کے ہاں کوئی کمی نہ تھی بلکہ جس چیز کی کمی تھی وہ یہ تھی کہ وہ مان کر نہ دیتے تھے - وہ باطل پہ مصر تھے' تحریک سے عناد رکھتے تھے اور اس روگردانی کی وجہ ان کے لئے اس دین اور تحریک میں غور و فکر کرنے کے مواقع جاتے رہے -

(وَمَا تَأْتِيهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ (٦ : ٤) " لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ایسی نہیں جو ان کے سامنے آئی ہو اور انہوں نے اس سے منہ نہ موڑ لیا ہو -" جب صورت حالات یہ ہو جائے کہ لوگ جان بوجھ کر حق سے روگردانی اختیار کریں' جبکہ ان کے پاس آیات و دلائل موجود ہوں' حقائق ان پر روز روشن کی طرح واضح ہو چکے ہوں تو پھر بعض اوقات ڈراوا اور تہدید ان کی آنکھیں کھول دیتی ہے - ایک جھٹکے سے آنکھ کھل جاتی ہے اور فطرت کے دریچے کھل جاتے ہیں' بشرطیکہ غرور اور عناد کے پردے حائل نہ ہوں -

(فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَسَوْفَ يَاْتِيهِمْ اَنْبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (٦ : ٥)) " چنانچہ اب جو حق ان کے پاس آیا تو اسے بھی انہوں نے جھٹلا دیا - اچھا' جس چیز کا وہ اب تک مذاق اڑاتے رہے ہیں عنقریب اس کے متعلق کچھ خبریں انہیں پہنچیں گی -"

زمین و آسمانوں کے خالق کی طرف سے جو ہدایت آئی وہ سچائی تھی - روشنی اور تاریکی پیدا کرنے والے کی طرف سے سچائی تھی' جس نے انسان کو کیچڑ سے پیدا کیا - جو آسمانوں کا بھی حاکم ہے اور زمین کا بھی حاکم ہے' جو ان کے کھلے اور پوشیدہ سب امور سے واقف ہے - وہ جو کچھ بھی کماتے ہیں ان سے واقف ہے - وہ سچائی ہے اور انہوں نے سچائی کو جھٹلایا ہے - اب وہ اس تکذیب پر اصرار کر رہے ہیں' آیات الہی سے روگردانی کرتے ہیں' دعوت اسلامی کے ساتھ مذاق کرتے ہیں - لہٰذا انہیں چاہئے کہ وہ اب اس بات کے انجام اور آخری خبر کا انتظار کریں -

اب یہ ایک نہایت ہی اجمالی تہدید اور ڈراوا ہے جس کی نہ تفصیلات دی گئی ہیں اور نہ اس انجام بد کا کوئی وقت مقرر کیا گیا ہے - انہیں صرف یہ تاثر دیا گیا ہے کہ وہ ہر وقت اس انجام کا انتظار کریں - ان پر عذاب الہی کسی بھی وقت آ سکتا ہے - ان پر سچائی کھل جائے گی اور وہ اپنی آنکھوں سے عذاب کو دیکھ لیں گے -

اس تہدید اور ڈراوے کے مقام پر انہیں یاد دلایا جاتا ہے' انہیں متوجہ کیا جاتا ہے کہ ذرا پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھیں اور ذرا نگاہ ڈالیں کہ انسانی تاریخ میں جھٹلانے والوں کا انجام کیا رہا ہے؟ ان میں سے بعض لوگوں کے انجام سے وہ واقف بھی تھے - احقاف میں قوم عاد کا جو انجام ہوا اور حجر میں قوم ثمود کا جو انجام ہوا' اس کی داستانیں ان کے ہاں مشہور تھیں - جب عرب گرمیوں میں شمال کی طرف جاتے اور سردیوں میں جنوب کی طرف سفر کرتے تو ان اقوام کے کھنڈرات کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے - قوم لوط پر جہاں تباہی آئی وہ مقامات بھی انہیں معلوم تھے اور ان کے ارد گرد رہنے والے لوگ ان مقامات سے واقف تھے لہٰذا یہاں ان کی توجہ ان حقائق کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے -

(اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ

وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ (٦ : ٦) ''کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے اپنے زمانے میں دور دورہ رہا ہے؟ ان کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا تھا جو تمہیں نہیں بخشا ہے' ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہا دیں' (مگر جب انہوں نے کفران نعمت کیا تو) آخر کار ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دوسرے دور کی قوموں کو اٹھایا۔''

کیا یہ لوگ گزری ہوئی اقوام کے انجام بد سے عبرت نہیں لیتے؟ اللہ تعالیٰ نے ان اقوام کو اس کرۂ ارض پر بہت ہی بڑا اقتدار عطا کیا تھا۔ انہیں قوت اور سلطنت کے اسباب فراہم کئے تھے۔ اور وہ اس قدر ترقی یافتہ اور قوی تھی کہ قرآن کے مخاطبین اہل قریش اور ان کے درمیان کوئی مماثلت ہی نہ تھی۔ ان پر پے در پے بارشیں ہوتی تھیں' ان کی سرزمین تروتازہ تھی اور ہر قسم کی پیداوار کی فراوانی تھی۔ پھر کیا ہوا؟ انہوں نے اپنے رب کی نافرمانی شروع کر دی۔ اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑا۔ ان کو تباہ کر کے ان کی جگہ دوسری اقوام کو منصہ شہود پر لایا گیا اور زمین کا اقتدار ان کے حوالے کر دیا گیا۔ اس زمین نے جانے والوں پر کوئی ماتم نہ کیا اس لئے کہ زمین کے وارث اب دوسرے لوگ تھے۔ ذرا دیکھئے کہ ان مکذبین اور روگردانی کرنے والوں کی حیثیت ہی کیا رہی ہے۔ اللہ کے ہاں وہ کس قدر ہلکے ہیں اور اس زمین پر وہ کس قدر ہلکے ہیں۔ وہ ہلاک کر دیئے گئے' نیست و نابود ہو گئے اور اس زمین کو کوئی احساس ہی نہ ہوا۔ اور نہ یہ زمین خالی رہ گئی' اس خلا کو دوسری اقوام نے پر کر دیا اور یہ زمین اس طرح گردش کرتی رہی کہ گویا یہ مٹنے والی اقوام کبھی اس پر بسی ہی نہ تھیں۔ اور زندگی اس طرح چلتی رہی کہ گویا سابقہ لوگ کبھی زندہ ہی نہ تھے۔

جب اللہ کسی کو اس کرۂ ارض پر تمکن عطا کرتا ہے تو صاحبان اقتدار سب سے پہلے اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ یہ اقتدار انہیں اللہ کی مرضی سے نصیب ہوا ہے اور یہ ان کے لئے ایک بڑی آزمائش ہے۔ آزمائش یہ کہ آیا وہ اس اقتدار کو اللہ کے عہد اور شرط کے مطابق استعمال کرتے ہیں اور اس میں وہ صرف اللہ کی بندگی کرتے ہیں اور صرف اسی سے ہدایات لیتے ہیں اس لئے کہ وہی تو اس اقتدار کا اصل مالک ہے اور انسان تو اس کا خلیفہ ہے' یا وہ اپنے آپ کو طاغوت کا منصب دیتے ہیں اور اپنے لئے اللہ کے اختیارات حاصل کرتے ہیں اور وہ ان اختیارات کو بطور خلیفہ استعمال نہیں کرتے بلکہ بطور مالک خود مختار استعمال کرتے ہیں۔

یہ وہ حقیقت ہے جسے انسان بھول جاتے ہیں' الا یہ کہ کوئی اللہ کی جانب سے محفوظ کر دیا گیا ہو۔ جب انسان اس حقیقت کو بھول جائیں تو وہ اللہ کے عہد اور ان کے خلیفہ فی الارض ہونے کی شرائط سے صرف نظر کرنے لگتے ہیں اور سنت الہیہ کے خلاف جاتے ہیں۔ پہلے پہل انہیں احساس نہیں ہوتا کہ اس انحراف کے نتائج کیا ہوں گے' چنانچہ ان کے اندر آہستہ آہستہ فساد رونما ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ انہیں اس کا شعور بالکل نہیں ہوتا' یہاں تک کہ وقت مقررہ تک وہ پہنچ جاتے ہیں اور اللہ کا وعدہ آ جاتا ہے۔ ان کے انجام پھر مختلف ہوتے ہیں' بعض اوقات ان پر ایسا عذاب آتا ہے کہ انہیں بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ عذاب کبھی آسمان سے آتا ہے اور کبھی نیچے زمین سے آتا ہے۔ دنیا کی کئی

اقوام کو اس عذاب کے ذریعے تباہ کیا گیا اور بعض اوقات یہ عذاب قحط سالی اور خشک سالی کی صورت میں آتا ہے' پھل اور پیداوار ختم ہو جاتے ہیں اور لوگ بھوکے مرنے لگتے ہیں۔ کئی اقوام عالم اس عذاب سے دوچار ہوئیں۔ بعض اوقات وہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے ہیں اور ہر ایک دوسرے کے لئے عذاب بن جاتا ہے۔ بعض دوسروں کو مبتلائے عذاب کرتے ہیں' بعض اقوام دوسروں کو نیست و نابود کر دیتی ہیں۔ بعض دوسروں کو اذیت دیتی ہیں اور کئی دوسروں کو امن نہیں دیتے۔ اس طرح ان کی قوت اور شوکت ختم ہو جاتی ہے' اور اللہ ان پر پھر اپنے دوسرے بندوں کو مسلط کر دیتا ہے جو یا تو اللہ کے فرمانبردار ہوتے ہیں اور یا نافرمان ہوتے ہیں۔ وہ ان کی قوت کو توڑ کر انہیں اس اقتدار اعلیٰ سے محروم کر دیتے ہیں جس پر ان کو متمکن کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اللہ کچھ نئے لوگوں کو تمکین فی الارض عطا کرتا ہے تاکہ اب ان کی آزمائش کا دور شروع ہو۔ یوں سنت الٰہیہ کا دور چلتا ہے اور دنیا میں نیک بخت اقوام وہ ہوتی ہیں جو سنت الٰہیہ کا ادراک رکھتی ہیں۔ جو یہ سمجھتی ہیں کہ یہ ایک آزمائش ہے۔ وہ اللہ کے عہد کا پاس رکھتی ہیں۔ بدبخت اقوام وہ ہوتی ہیں جو اس حقیقت سے غافل ہوتی ہیں اور یہ گمان کرنے لگتی ہیں کہ یہ اقتدار انہیں خود ان کے علم و کمال کی وجہ سے ملا ہے یا کسی حیلے اور تدبیر سے ملا ہے یا اتفاقاً بغیر کسی منصوبے کے انہیں مل گیا ہے۔

لوگوں کو یہ امر دھوکے میں ڈالتا ہے کہ وہ ایک باغی و سرکش' ایک بدکار اور مفسد اور ایک ملحد اور کافر کو دیکھتے ہیں کہ وہ اس کرۂ ارض پر مقتدر اعلیٰ ہے اور اس پر اللہ کی جانب سے کوئی مواخذہ نہیں ہو رہا ہے۔ وہ مایوس ہو جاتے ہیں' لیکن ایسے لوگ جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ وہ راستہ کا ابتدائی حصہ دیکھتے ہیں' درمیانی حصہ بھی دیکھتے ہیں لیکن ان کی نظر منزل مقصود پر نہیں ہوتی۔ راستے کی انتہا منزل مقصود اس وقت نظر آتی ہے' جب کوئی شخص اس تک پہنچ جاتا ہے۔ جب ایسے سرکشوں پر اللہ کا عذاب آتا ہے تو وہ نیست و نابود ہو جاتے ہیں اور ان کے بارے میں محض قصے' اور کہانیاں ہی رہ جاتی ہیں' تب حقیقت نظر آتی ہے۔ قرآن کریم ایسے لوگوں کے ہونے والے انجام کے کچھ مظاہر پیش کرتا ہے تاکہ ایسے غافل سرکشوں کو ہوش آ جائے' کیونکہ ایسے لوگ اپنے انفرادی حالات میں اس قدر مست ہوتے ہیں کہ انہیں منزل مقصود اور اپنا آخری انجام نظر نہیں آتا۔ یہ لوگ بس اس مختصر زندگی کو دیکھ سکتے ہیں اور اسے ہی آخری منزل سمجھتے ہیں۔

قرآن کریم کی یہ آیت (فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ (٦: ٦)) اور اس جیسی دوسری آیات بار بار دہرائی گئی ہیں۔ ایسی آیات میں اللہ کی ایک ناقابل تبدیل سنت کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور ان میں اسلام کے نظریہ تاریخ کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ سنت الٰہیہ یہ ہے کہ بدکار لوگوں کو آخرکار ان کی اس بدکاری کی وجہ سے ہلاک اور برباد کر دیا جاتا ہے۔ ان پر یہ ہلاکت اور بربادی اللہ کی جانب سے آتی ہے اور یہ سنت اس کائنات میں ہمیشہ کے لئے جاری و ساری ہے۔ اگرچہ ایک فرد اپنی مختصر زندگی میں اسے نہ سمجھ سکے۔ یا ایک محدود اور متعین نسل کی زندگی میں یہ ہلاکت نہ آئے۔ لیکن یہ ایک ایسی سنت الٰہیہ ہے کہ جب کسی قوم میں جرائم اور بدکاریاں بہت زیادہ ہو جاتی ہیں اور پوری زندگی کا نظام بدکاری اور جرائم پر قائم ہو' تو پھر اللہ کی جانب سے عذاب ضرور آتا ہے۔ اسلام کا نظریہ تاریخ یہ ہے کہ اقوام کے عروج و زوال میں اصل اور موثر عامل (Factor) یہ ہوتا ہے کہ ان کے جسم میں جب بدکاری اور جرائم سرایت کر جاتی ہیں تو یہ تباہی اور بربادی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ یہ تباہی یا تو آفات سماویہ کے ذریعے سے ہوتی ہے جیسا کہ قدیم

تاریخ میں یہ واقعات رونما ہوئے یا نہایت ہی تدریجی تباہی کے ذریعے طبعی طور پر' جس طرح کسی جسم پر عارضی طور پر زوال آتا ہے جب وہ بدکاری اور جرائم میں کانوں تک ڈوب جاتے -

انسان کی جدید تاریخ میں ہمارے سامنے اس زوال کی کئی مثالیں موجود ہیں جن میں اقوام پر اخلاقی بے راہ روی' بدکرداری اور فحاشی' عیاشی اور اسراف اور لہو ولعب کی وجہ سے تباہی آئی۔ مثلاً یونان کی تباہی کے یہی عوامل تھے۔ اس کے بعد رومیوں کی تباہی اور زوال کے یہی اسباب تھے۔ یہ اقوام اپنے عروج کے باوجود اس طرح مٹ گئیں کہ اب ان کے صرف قصے کہانیاں ہی رہ گئیں۔ جدید ترقی یافتہ اقوام کے اندر بھی اس عظیم تباہی اور زوال کے اسباب نمودار ہونا شروع ہوگئے ہیں مثلاً فرانس اور برطانیہ کا زوال شروع ہو چکا ہے حالانکہ مادی' جنگی اور تکنیکی قوت کے اعتبار سے وہ عروج پر ہیں اور نہایت ہی ترقی یافتہ اور دولتمند ہیں۔

تاریخ کی مادی تفسیر لکھنے والوں اور اقوام کے عروج و زوال کی داستانیں لکھنے والوں کی نظر سے تاریخ کا یہ اخلاقی پہلو غائب ہے' اس لئے کہ مادی نقطہ نظر رکھنے والے کی نگاہوں سے شروع ہی سے اخلاقی عناصر اوجھل رہتے ہیں۔ اصل الاصول یعنی سنت الہیہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوتی ہے۔ جو لوگ تاریخ کی تفسیر اور اس پر تبصرہ صرف مادی نقطہ نظر سے کرتے ہیں وہ اقوام کے عروج و زوال کے سلسلے میں نہایت ہی مضحکہ خیز باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ اقوام کے عروج و زوال کے بعض واقعات کی معقول تفسیر صرف اعتقادی اور اخلاقی زاویے ہی سے کی جاسکتی ہے۔

اسلام کا تاریخی نقطہ نظر نہایت جامع' حقیقت پسندانہ اور سچا ہے اور وہ اپنی اس جامعیت کی وجہ سے مادی عنصر کو بالکل نظرانداز نہیں کرتا۔ لیکن مادی نقطہ نظر رکھنے والے مورخین اسے صرف مادی زاویے ہی سے دیکھتے ہیں۔ جہاں تک اسلامی نقطہ نظر کا تعلق ہے' وہ زوال اقوام میں مادی زوال کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ تاہم اسلام دوسرے عوامل کو بھی لیتا ہے جن کا انکار صرف معاندین ہی کرتے ہیں۔ اسلام نے سب سے پہلے اللہ کی سنت اور اللہ کی تقدیر کو اصل عامل قرار دیتا ہے۔ پھر انسان کے داخلی شعور' جذبات اور تصورات اور نظریات کو اس کا سبب قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد اسلام لوگوں کی عام اخلاقی اور عملی زندگی کو بھی اس میں اہمیت دیتا ہے اور وہ ان اسباب و علل میں سے کسی ایک کو بھی نظرانداز نہیں کرتا جو کسی قوم کے عروج و زوال کا سبب بنتی ہیں۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے الاسلام ومشکلات الحضارۃ - التطور والثبات فی حیات البریہ - خصائص التصور الاسلامی وھو ماتہ التصویر الفنی فی القرآن)

اب اگلی آیات میں ان لوگوں کے اس عناد کی تصویر کشی کی جاتی ہے' جس کی وجہ سے یہ بیماری لاحق ہوتی ہے۔ اس تصویر کشی میں انسانوں کی ایک عجیب قسم پیش کی جاتی ہے۔ انسانوں کی یہ قسم صرف ماضی یا کسی ایک زمانے تک محدود نہیں ہے' اس قسم کے لوگ تاریخ میں بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ ہر زمانے میں ہر جگہ ایسے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ہر نسل اور ہر خاندان میں یہ نمونے موجود ہوتے ہیں۔ یہ ہٹ دھرم قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ سچائی ان کی آنکھوں کو پھاڑتی ہے لیکن یہ اسے دیکھ نہیں پاتے۔ یہ لوگ ایسے امور کا بھی بڑی ڈھٹائی کے ساتھ انکار کرتے ہیں جن کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے امور جو اس قدر واضح ہوتے ہیں کہ ان کے انکار کی وجہ سے منکر کو کم از کم شرم آتی ہے۔ قرآن کریم اس قسم کے نمونے کا بڑی وضاحت سے ذکر کرتا ہے۔ مختصر کلمات میں عجیب انداز میں جو انوکھا بھی ہے اور معجزانہ بھی ہے۔ جس طرح قرآن کریم کا انداز تعبیر بالعموم اعجاز کا حامل ہوتا ہے۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

"اے پیغمبر" اگر ہم تمہارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنہوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔"

یہ لوگ آیات الہٰی کا انکار اس لئے نہیں کرتے کہ ان آیات کی صداقت کی دلیل میں کوئی کمزوری ہے یا اس کے ادراک میں کوئی پیچیدگی ہے یا یہ کہ مختلف دماغ اس کے بارے میں ایک طرح نہیں سوچتے بلکہ وہ ہٹ دھرمی اور مکابرہ کی وجہ سے اور کھلے عناد کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔ انہوں نے دلیل و برہاں پر غور کرنے سے پہلے ہی اس حقیقت کے انکار کی ٹھان لی ہے۔ اگر نزول قرآن کی صورت یہ ہوتی کہ وہ آسمان سے پرچوں کی شکل میں اترتا اور وہ اپنے ہاتھوں سے اسے چھوتے اور آنکھوں سے دیکھتے اور یہ نہ ہوتا کہ بذریعہ وحی حضور پر آتا اور آپ اسے سناتے تو اس صورت میں بھی وہ اس محسوس اور مشاہد حقیقت کے بارے میں یوں کہتے : (اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (٦: ٧)) "یہ تو صریح جادو ہے۔" یہ ان لوگوں کی ایسی مکروہ تصویر ہے کہ انسانی فطرت کو اس سے گھن آتی ہے۔ یہ ایک ایسی تصویر ہے جسے دیکھتے ہی ہر انسان ان کے منانے کے لئے آگے بڑھتا ہے' اس لئے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ بحث و تکرار اور دلیل و استدلال کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس انداز میں اس تصویر کشی کے دو فائدے ہیں بلکہ کئی فائدے ہیں (تصویر کشی کا یہ انداز اس طرح ہے کہ قرآن کریم عام طور پر دیکھے جانے والے نمونے کو سامنے لاتا ہے۔)

ایک تو یہ فائدہ ہے کہ قرآن کریم خود ان لوگوں کے سامنے ان کا یہ کریہہ اور ناپسندیدہ موقف پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ دیکھیں تو سہی ان کی تصویر کس قدر بھدی ہے۔ مثلاً کوئی کسی کریہہ المنظر شخص کے ہاتھ میں آئینہ پکڑا دے اور کہہ دے کہ دیکھو یہ ہو تم۔ اور وہ شخص اپنی شکل دیکھ کر شرمندہ ہو جائے۔

اس کے ساتھ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس تصویر کشی کے ذریعہ اہل ایمان کے دلوں میں جوش پیدا ہو جاتا ہے' اور وہ مشرکین کے مقاصد کو ناکام بنا دیتے ہیں وہ منکرین کے انکار کا مقابلہ کرتے ہیں اور خود ان کے دل حق پر جم جاتے ہیں۔ وہ اس فضا سے متاثر نہیں ہوتے جس میں ہر طرف سے انکار' استہزاء' فتنہ اور ایذا ہوتی ہے۔ اس سے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نہایت حلیم ہے اور وہ ان جھٹلانے والوں اور تکذیب کرنے والوں کو جلدی نہیں پکڑتا' حالانکہ وہ بہت قابل نفرت انداز میں انکار کرتے ہیں اور کھلے عناد میں مبتلا ہیں۔ یہ تمام امور جماعت مسلمہ اور مشرکین کے درمیان برپا کشمکش میں مسلمانوں کے لئے اسلحہ اور زاد راہ ہیں۔

---○○○---

اس کے بعد قرآن مجید اہل شرک کی جانب سے آنے والی بعض تجاویز کو ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بغض و عناد میں کس قدر عیار ہیں اور ان کی سوچ کس قدر پوچ ہے۔ تجویز یہ لاتے ہیں کہ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق ہیں تو آپ کے ساتھ تبلیغ کے وقت ایک فرشتہ ہو جو ساتھ ساتھ آپ کی تصدیق

کرتا جائے۔ اس تجویز کے ذکر کے بعد اس پر تنقید بھی کی جاتی ہے کہ اس میں کیا نقص ہے؟ ایک تو یہ کہ یہ لوگ ملائکہ کی ماہیت سے بھی واقف نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ فرشتوں کو بھیجنے کے سلسلے میں اللہ کی جو سنت ہے اس سے بھی یہ لوگ واقف نہیں ہیں۔ پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ اللہ کی بہت بڑی مہربانی ہے کہ وہ فرشتے نہیں بھیج رہا ہے اور ان کی تجویز کو تسلیم نہیں کرتا۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَ لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝۸ وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝۹

”کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ اگر کہیں ہم نے فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا، پھر انہیں کوئی مہلت نہ دی جاتی۔ اور اگر ہم فرشتے کو اتارتے تب بھی اسے انسانی شکل ہی میں اتارتے اور اس طرح انہیں اسی شبہ میں مبتلا کر دیتے جس میں اب یہ مبتلا ہیں۔“

یہ تجویز مشرکین کی طرف سے تھی اور ان مشرکین سے پہلے بھی کئی اقوام نے یہ تجویز پیش کی۔ ہر قوم نے اپنے رسول سے نزول فرشتگان کا مطالبہ کیا۔ دوسری جگہ قرآن کریم نے ایسے مطالبے پیش کئے ہیں اور یہاں اس تجویز کو دلائل کے ساتھ رد کر دیا جاتا ہے۔ اس تجویز کے بارے میں، مناسب ہے کہ ہم تمام حقائق یہاں پیش کر دیں حتی الامکان۔

اس کے متعلق پہلی حقیقت یہ ہے کہ مشرکین عرب اللہ کا انکار نہ کرتے تھے بلکہ وہ اس بارے میں ایک بین دلیل طلب کرتے تھے جس سے معلوم ہو جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی مرسل ہیں اور آپ جو کتاب ان کے سامنے پڑھتے ہیں وہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ اس سلسلے میں وہ جو متعین دلیل طلب کرتے تھے وہ یہ تھی کہ ایک فرشتہ حضور کے اوپر نازل ہو جو آپ کے ساتھ ساتھ پھرے اور آپ کی دعوت کی تصدیق کرے۔ ان کی یہ تجویز ایسی ہی تھی جس طرح وہ اس سلسلے میں دوسری تجاویز دیتے تھے۔ یہ تجاویز قرآن کریم نے متعدد مقامات پر ذکر فرمائی ہیں۔ مثلاً سورہ اسرائیل میں یہ تجاویز مذکور ہیں۔ اس میں اس تجویز کے ساتھ ساتھ دوسری تجاویز بھی دی گئی ہیں جن سے ان لوگوں کی ہٹ دھرمی اور عناد کا اظہار ہوتا ہے۔ عناد کے علاوہ ان کی کج فہمی پر بھی خود ان کی تجویز دلیل بین ہے۔ اس لئے کہ یہ لوگ نہ اس نظام کائنات کو اچھی طرح سمجھے ہیں اور نہ حقیقی اقدار کو سمجھتے ہیں۔ سورہ اسرائیل میں آتا ہے۔

(وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا (۹۰) اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا (۹۱) اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (۹۲) اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ

مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ

سُبْحَانَ رَبِّىْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (۹۳) وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا اِذْ جَآءَهُمُ

الْهُدٰى اِلَّا اَنْ قَالُوْا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (۹۴) قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ

مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (۹۵)

(اور انہوں نے کہا "ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لئے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے ۔ یا تیرے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے ۔ یا تو آسمانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے یا خدا اور فرشتوں کو رو در رو ہمارے سامنے لے آئے ۔ یا تیرے لئے سونے کا ایک گھر بن جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں .... اے نبی ان سے کہو "پاک ہے میرا پروردگار' کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟" ..... لوگوں کے سامنے جب کبھی ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے ان کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر ان کے اسی قول نے کہ "کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا ۔ ان سے کہو اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہیں تو ہم ضرور آسمان سے کسی فرشتے ہی کو ان کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجتے ۔)

یہ تجاویز اور مطالبے ایسے ہیں کہ ان سے ایک طرف ان کی ہٹ دھرمی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری جانب ان کی جہالت کا ۔ اس لئے کہ ان کے سامنے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب اخلاق کھلی تھی' وہ طویل ترین تجربے سے آپ کو اچھی طرح جانتے تھے اور آپ کے اخلاق سے ان کو معلوم تھا کہ آپ سچے اور امین ہیں اور ان ہی لوگوں نے ان کو امین کا لقب دیا ہوا تھا ۔ آپ کے ساتھ ان کے شدید نظریاتی اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی یہ لوگ اپنی امانتیں حضور ؐ کے پاس رکھتے تھے ۔ جب آپ نے ہجرت فرمائی تو آپ نے اپنے چچازاد بھائی حضرت علی ؓ کو امانتوں کی ادائیگی کے لئے اپنے پیچھے چھوڑا تھا کہ وہ اہل قریش کی وہ امانتیں ادا کر دیں جو ابھی تک آپ کی تحویل میں تھیں ۔ لیکن ان کو ان کے ساتھ اس قدر اختلاف تھا کہ وہ لوگ آپ ؐ کے قتل کی تدابیر کر رہے تھے ۔ آپ کی امانت و دیانت جس طرح مسلم تھی اسی طرح آپ کی سچائی بھی مسلم تھی' اس لئے کہ جب آپ نے سب سے پہلے کوہ صفا پر انہیں علی الاعلان دعوت دی ۔ یہ اس وقت ہوا جب اللہ کا حکم آگیا کہ آپ علی الاعلان دعوت کا آغاز کر دیں ۔ اس موقعہ پر آپ نے ان سے سوال کیا کہ اگر میں آپ لوگوں کو کوئی اہم خبر دوں تو آپ لوگ تصدیق کر دیں گے ؟ تو سب نے مل کر جواب دیا کہ آپ تو نہایت ہی سچے آدمی ہیں ۔ اگر یہ لوگ صرف یہ جاننا چاہتے کہ آپ سچے ہیں یا نہیں تو آپ کے ماضی میں ان کے لئے دلیل و برہان تھی ۔ وہ جانتے تھے کہ آپ تو نہایت ہی سچے آدمی ہیں ۔ اسی سورہ میں یہ مضمون آنے والا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ یہ لوگ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ اللہ کو جھٹلاتے ہیں ۔

(قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ

اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۳۳)) ”ہم جانتے ہیں کہ آپ کو ان لوگوں کی باتیں بہت پریشان کرتی ہیں' دراصل یہ لوگ آپ کی تکذیب نہیں کرتے لیکن یہ ظالم اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔“ ان لوگوں کا مقصد یہ تھا کہ وہ انکار کر دیں۔ یہ انکار محض عناد اور کبر کی وجہ سے تھا۔ جہاں تک حضورؐ کی سچائی کا تعلق ہے تو اس میں کسی کو شک نہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ عربوں کے لئے خود قرآن کریم کے اندر ایک عظیم شہادت موجود تھی۔ یہ شہادت ان شہادتوں سے زیادہ وقیع تھی جو وہ طلب کرتے تھے۔ قرآن بذات خود شاہد تھا۔ قرآن کا طرز تعبیر اور اس کے مضامین بھی اس بات پر شاہد تھے کہ وہ من جانب اللہ ہے۔ یہ لوگ ذات باری کے تو منکر نہ تھے اور قرآن کی اندرونی شہادت کا انہیں بھی احساس تھا۔ وہ جس قدر ادبی اور لسانی ذوق رکھتے تھے اس کے ذریعے وہ جانتے تھے کہ انسانوں کی ادبی اور لسانی صلاحیت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ قرآن کریم انسانی حدود سے ماوراء ہے۔ جو لوگ فنی اور ادبی ذوق رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ جانتے ہیں جو ادبی ذوق نہیں رکھتے۔ دنیا میں جو لوگ اسالیب کلام کے اندر کچھ بھی ذوق رکھتے ہیں (چاہے مسلم ہوں یا غیر مسلم) وہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم کا اسلوب انسان کی قدرت سے بہت ہی اونچا ہے۔ انسان اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس حقیقت کا انکار صرف ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جو معاند ہو' جو ایک حقیقت کو پا رہا ہو لیکن اسے اپنے عناد کی وجہ سے دل میں چھپا رہا ہو۔ نیز اس بہترین اسلوب کے اندر قرآن کریم نے جو تصورات پیش کئے ہیں' ان تصورات اور اعتقادات کو جس اسلوب میں نفس انسانی کے اندر بٹھانے کی کوشش کی' جس انداز میں قرآن' نفس انسانی اور ادراک انسانی پر اثر انداز ہوتا ہے اور اسے جو اشارات اور احساسات دیتا ہے' یہ تمام امور ایسے ہیں کہ انسانی اسلوب ادا اور انسانی افکار و عقائد کے اندر وہ چیز ناپید ہے۔ انسانی طرز ادا اور انسانی نفسیاتی اسلوب اظہار سے قرآن کا اسلوب نہایت ہی مختلف اور معجز ہے۔ عربوں کے گہرے شعور اور ان کی نفسیات کی اندرونی حالت یہ تھی کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے۔ ان کے حالات اور ان کے اقوال سے بھی یہ بات اچھی طرح عیاں ہے کہ وہ اس بات میں کسی شک میں مبتلا نہ تھے کہ یہ قرآن اللہ کی جانب سے ہے۔

یہ بھی اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حضورؐ سے جو مطالبے کئے تھے' وہ اس لئے نہ تھے کہ وہ تسلیم کے لئے کسی دلیل و برہان کے طالب تھے بلکہ یہ ان کی ہٹ دھرمی تھی۔ یہ ایک ایسا انداز تھا جس کے ذریعے وہ یہ جتلانا چاہتے تھے کہ وہ ہٹ کے پکے ہیں اور یہ مطالبے تو وہ محض عناد اور نہ ماننے کی وجہ سے کر رہے تھے۔ اللہ نے فرمایا:

(وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (٦ : ٧)) ”اے پیغمبرؐ اگر ہم تمہارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی اتار دیتے اور وہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنہوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔“

دوسری حقیقت یہ ہے کہ عرب ملائکہ کو تو مانتے تھے اور مطالبہ یہ کرتے تھے کہ حضورؐ پر ایک فرشتہ نازل ہو اور جب آپ تبلیغ کریں تو وہ ساتھ ساتھ آپ کی تصدیق و تائید کرے۔ لیکن ان کے ذہن میں یہ بات نہ تھی کہ ملائکہ کی حقیقت اور ماہیت کیا ہے؟ وہ اس مخلوق کے بارے میں اپنے عقیدے اور تصور میں نہایت ہی مخبوط الحواس تھے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ ملائکہ کا اپنے رب کے ساتھ تعلق کیا ہوتا ہے۔ اس زمین اور اس کے باسیوں کے ساتھ ان کا تعلق کیا

ہوتا ہے؟ قرآن کریم نے عربوں کی فکری ژولیدگی کی کئی مثالیں بیان کی ہیں اور ملائکہ کے بارے میں ان کے جو بت پرستانہ خیالات تھے وہ بھی قرآن نے بیان کئے ہیں۔ قرآن کریم نے ان تمام فکری غلطیوں کی اصلاح کی ہے تاکہ یہ لوگ پاک و صاف عقیدے کے حامل بن جائیں اور صحیح راہ پر گامزن ہوں۔ کائنات اور اس میں بسنے والی مخلوق کے بارے میں بھی قرآن نے صحیح فکر دی ہے۔ اس زاویے سے اسلام نے جس طرح عقل و شعور کو غذا فراہم کی اسی طرح دل اور ضمیر کو بھی صحیح سوچ دی اور اس درست فکر کی اساس پر لوگوں کے اعمال و اطوار کو بھی درست کیا۔

قرآن کریم نے عربوں کی توہم پرستیوں اور باطل نظریات کے کئی پہلوؤں پر بحث کی ہے کہ وہ کس قدر باطل نظریات کے حامل تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ سمجھتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں حالانکہ اللہ اس تصور سے پاک اور برتر ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ان فرشتوں کو ناقابل استرداد سفارش کے اختیارات بھی حاصل ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ عربوں کے اندر مروج بتوں میں اکثر ان فرشتوں کے تصور پر بنائے گئے تھے اور ان کے اس تصور اور مطالبے سے کہ حضورؐ پر ایک مؤید اور مصدق فرشتہ اترے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

قرآن کریم نے سورہ نجم میں ان کی اس کج فکری کی اصلاح اس طرح کی ہے۔

(اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى (١٩) وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى (٢٠) اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى (٢١) تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى (٢٢) اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (٢٣) اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى (٢٤) فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى (٢٥)) وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى (٢٦) اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى (٢٧) وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (٢٨)) (٥٣: ١٩ تا ٢٨) "اب ذرا بتاؤ تم نے کبھی اس لات' اور عزیٰ اور تیسری ایک دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور کیا ہے؟ کیا بیٹے تمہارے لئے ہیں اور بیٹیاں خدا کے لئے؟ یہ تو پھر بڑی دھاندلی کی تقسیم ہوئی' دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ محض وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشات نفس کے مرید بنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔ کیا انسان جو کچھ چاہے اس کے لئے وہی حق ہے۔ دنیا و آخرت کا مالک تو اللہ ہی ہے۔ آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے موجود ہیں۔ ان کی شفاعت کچھ

بھی کام نہیں آسکتی جب تک کہ اللہ کسی شخص کے حق میں اس کی اجازت نہ دے دے جس کے لئے وہ کوئی عرضداشت سننا چاہے اور اس کو پسند کرے ۔ مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ فرشتوں کو دیویوں کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں ' حالانکہ اس معاملے کا علم بھی انہیں حاصل نہیں ہے ۔ وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا ۔"

مزید یہ کہ ان دو آیات میں قرآن کریم نے فرشتوں کی ماہیت کے بارے میں ان کی دوسری کج فکری کی اصلاح بھی کر دی ہے ۔ اس سورہ کے علاوہ دوسری سورتوں کے اندر بھی ان کی فکری اصلاح کی گئی :

(وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ مَلَكٌ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِیَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا یُنْظَرُوْنَ (٦ : ٨)) "کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا ہے؟ اگر کہیں فرشتہ اتار دیا گیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ' پھر انہیں کوئی مہلت نہ دی جاتی ۔" اللہ کی مخلوقات میں سے جن لوگوں کی یہ سوچ ہے ' یہاں ان کے بارے میں وضاحت کر دی گئی ۔ یہ لوگ یہ تجویز کرتے ہیں کہ اللہ قرآن کے ساتھ فرشتہ بھی اتارے ۔ لیکن فرشتوں کے اترنے کے بارے میں اللہ کی سنت یہ ہے کہ جب وہ اترتے ہیں تو وہ اس قوم کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں جس نے کسی نبی کی تکذیب کی ہوتی ہے اور وہ پھر تباہی و بربادی کے بارے میں اللہ کے احکامات پر عمل کرتے ہیں ۔ اگر اللہ تعالیٰ مشرکین عرب کی اس تجویز اور مطالبے کو تسلیم کر لیتے تو بات کا فیصلہ ہو جاتا اور وہ تباہ کر دیئے گئے ہوتے ۔ اس کے بعد انہیں کوئی مہلت نہ دی جاتی ۔ کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے اور کیا انہیں اس قدر شعور بھی نہیں ہے کہ ان کی بات نہ مان کر اللہ تعالیٰ انہیں ایک عظیم تباہی اور عذاب سے بچا رہا ہے ۔ یوں سیاق کلام میں ان کو یہ بات براہ راست جتا دی جاتی ہے کہ اللہ انہیں مہلت دے کر ان کے ساتھ نہایت ہی رحمت اور درگزر سے کام لے رہا ہے ۔ یہ اس لئے کہ وہ خود اپنی مصلحت کو بھی نہیں سمجھتے اور سنت الہیہ سے بالکل بے خبر ہیں ۔ وہ اس جہالت میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ اس طرح ان کی زندگی ہی تباہ ہو جائے ۔ اس جہالت کی وجہ سے وہ بدستور اللہ کی رحمت سے انکار کر رہے ہیں ' ہدایت سے دور بھاگے جا رہے ہیں ' دلائل و معجزات اور فرشتے اترنے کے مطالبے کر رہے ہیں ۔ ان کی کج فہمی کو درست کرنے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے :

(وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَیْهِمْ مَّا یَلْبِسُوْنَ (٦ : ٩)) "اگر ہم فرشتے کو اتارتے تب بھی اسے انسانی شکل ہی میں اتارتے اور اس طرح انہیں اسی شبہ میں مبتلا کر دیتے جس میں اب وہ مبتلا ہیں ۔" ان کا مطالبہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول پر ایک فرشتہ نازل کریں اور یہ فرشتہ حضور ؐ کے دعوائے نبوت کی تصدیق کرے ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ فرشتے تو انسانوں سے بالکل جدا مخلوق ہیں ۔ ان کا اپنا ایک خاص مزاج اور ماہیت ہے جس کے بارے میں صرف اللہ تعالیٰ کو علم ہے ۔ یہ فرشتے (جس طرح ان کے بارے میں ان کا خالق ہمیں معلومات فراہم کرتا ہے) اپنی موجودہ ہیئت کے ساتھ اس زمین پر نہیں چل سکتے کیونکہ وہ اس کرۂ ارض کے باشندے نہیں ہیں ۔ تاہم اگر وہ اس کرۂ ارض پر انسانوں کے حوالے سے کوئی ڈیوٹی سرانجام دیں تو وہ انسانوں کی شکل اختیار کر کے یہاں آتے ہیں

مثلاً تبلیغ رسالت اور مکذبین کو ہلاک کرنے کی ڈیوٹی وغیرہ۔یا مسلمانوں کی تسلی اور حوصلہ افزائی کی ڈیوٹی یا مسلمانوں کے دشمنوں کو قتل کرنے کی ڈیوٹی یا اس قسم کی دوسری ڈیوٹیاں جن کی بابت انہیں اللہ ہدایت کر دے۔وہ ان کے سرانجام دینے میں اللہ کی ہدایت کی ذرہ برابر نافرمانی نہیں کرتے۔

اگر اللہ تعالیٰ رسول کی تصدیق کے لئے کوئی فرشتہ بھیج بھی دے تو وہ لوگوں کے سامنے ایک انسان کی شکل اختیار کر کے ہی ظاہر ہو گا۔وہ فرشتوں کی اصل صورت میں ہرگز نہ آئے گا۔اور جب فرشتہ انسان کی شکل میں آئے گا تو وہ پھر بھی اسی شبہے کا شکار ہوں گے اور انہیں وہی تردد لاحق ہو گا۔وہ پہلے بھی اس تردد کا شکار ہیں حالانکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ جو بات کرتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "میں محمد ہوں' تم مجھے خوب جانتے ہو۔مجھے اللہ نے رسول بناکر بھیجا ہے تاکہ میں تمہیں برے انجام سے خبردار کروں اور اچھے انجام کی خوشخبری دوں۔" لیکن اگر کوئی فرشتہ آئے اور وہ ایک ایسے انسان کی شکل میں آئے جسے وہ نہیں جانتے اور وہ یوں گویا ہو: "میں فرشتہ ہوں اور مجھے اللہ نے بھیجا ہے کہ میں رسول خدا حضرت محمد ؐ کی تصدیق کروں۔" تو وہ دیکھیں گے کہ یہ شخص تو ان ہی جیسا ایک آدمی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھی انہیں ویسا ہی شبہ لاحق ہو گا۔غرض اگر کوئی فرشتہ آدمی کی شکل میں آتا تو بھی وہ اسی شبہے کا شکار ہوتے جس کا وہ پہلے سے شکار تھے اور کوئی یقینی بات نہ کر سکتے۔

اس طرح ان آیات میں اللہ تعالیٰ یہ بتاتے ہیں کہ یہ لوگ حقائق کائنات کے بارے میں کس قدر جاہل ہیں اور سنت الٰہیہ سے کس قدر ناواقف ہیں جبکہ اپنی جگہ نہایت ہی معاند اور بغیر علم و جواز کے ہٹ دھرمی میں مبتلا ہیں۔بالکل بلا دلیل۔تیسری حقیقت جو یہ آیات انسانی سوچ کے اندر پیدا کرتی ہیں' وہ یہ ہے کہ اسلامی تصور حیات اور اس کے اساسی عناصر ترکیبی کیا ہیں؟ ان عناصر میں وہ تمام مظاہر فطرت شامل ہیں جن کے بارے میں اسلام ایک مسلمان کو ہدایت دیتا ہے کہ وہ ان کا ادراک کرے اور اپنی زندگی کو ان مظاہر فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کر لے۔ نیز عالم غیب بھی ان اساسی عناصر میں شامل ہے جس میں ملائکہ بھی شامل ہیں۔اسلام نے ایمان کے بنیادی عناصر میں اس بات کو شامل کیا ہے کہ تم فرشتوں پر بھی ایمان لاؤ گے۔ فرشتوں پر ایمان کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔اللہ پر ایمان' ملائکہ پر ایمان' کتابوں پر ایمان' رسولوں پر ایمان' یوم آخرت پر ایمان اور اچھی اور بری تقدیر پر ایمان۔

ظلال القرآن کی جلد اول میں جب ہم نے سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات کی تشریح کی تھی تو اس میں ہم نے اس موضوع پر بات کی تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان بالغیب کی وجہ سے انسانی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہو جاتا ہے۔انسان محض عالم محسوسات کے محدود دائرے سے نکل جاتا ہے اور وہ اس بات پر ایمان لاتا ہے کہ ایک عالم اور بھی ہے جو ہمیں معلوم نہیں ہے۔ہم اگرچہ اس کا تصور نہیں کر سکتے لیکن وہ بلاشک اور لاریب آنے والا ہے۔یہ تصور انسان کو حیوانات کے محسوس دائرے سے نکال کر انسانی ادراک کے دائرے میں داخل کر دیتا ہے اور جو لوگ انسان کے لئے محسوسات سے اوپر جانے کا دروازہ بند کرتے ہیں وہ انسان کو مقام انسانیت سے گرا کر اسے پیچھے حیوانی دائرے میں لے جاتے ہیں اور اس کا نام ترقی پسندی رکھتے ہیں۔اس سورہ میں جب ہم عالم غیب کے بارے میں بات کریں گے تو اس نکتے کی مزید وضاحت کریں گے۔آیت عندہ مفاتح الغیب کے ذیل میں۔ان شاء اللہ۔

عالم غیب کے بارے میں جو اسلامی تصور ہے اس میں یہ بات موجود ہے کہ عالم غیب میں ایک مخلوق ایسی ہے جو نظر

نہیں آتی اور وہ فرشتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس مخلوق کی بعض صفات کا تذکرہ کیا ہے' جو ان کے بارے میں ایک مجمل تصور کے لئے کافی ہے اور انسان اپنے حدود کے اندر فرشتوں کے ساتھ جو برتاؤ کرے گا اس کی بنیاد اسی بات پر ہونی چاہئے۔

فرشتے اللہ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہیں۔ وہ ہروقت اللہ کی اطاعت اور بندگی پر کمربستہ ہیں۔ مطلق مطیع ہیں۔ وہ اللہ کے قریب رہتے ہیں۔ وہ اللہ کے کس طرح مقرب ہیں اس کی کیفیت کا ہمیں پوری طرح علم نہیں ہے۔

(وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ (۲٦) لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ (۲۷) يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ (۲۸)(۲۱ : ۲٦ تا ۲۸) (یہ کہتے ہیں رحمٰن اولاد رکھتا ہے' سبحان اللہ' وہ تو بندے ہیں جنہیں عزت دی گئی ہے۔ اس کے حضور بڑھ کر نہیں بولتے اور بس اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ جو کچھ ان کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے وہ باخبر ہے' وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اس کے کہ جس کے حق میں سفارش سننے پر اللہ راضی ہو' اور وہ اس کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں)۔

(وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ) (اور جو فرشتے اس کے پاس ہیں وہ نہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اس کی بندگی سے سرتابی کرتے ہیں اور نہ ملول ہوتے ہیں۔ شب و روز اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں دم نہیں لیتے) یہ فرشتے اللہ کے تخت کو بھی اٹھائے ہوئے ہیں اور قیامت کے دن بھی اسے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اس کی کیفیت کا ادراک انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس غیبی حقیقت کے بارے میں ہمارا ادراک اسی حد تک محدود ہے جس حد تک اللہ تعالیٰ نے انکشاف فرمایا ہے۔

(اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (۴۰ : ۷)) "عرش الٰہی کے حامل فرشتے اور وہ جو عرش الٰہی کے گرد و پیش حاضر رہتے ہیں' پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں اور وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔"

(وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۳۹ : ۷۵)) "اور تم دیکھو گے کہ فرشتے عرش کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنے رب کی حمد و تسبیح کر رہے ہوں گے اور لوگوں کے درمیان ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ چکا دیا جائے گا اور پکار دیا جائے گا کہ حمد ہے اللہ رب العالمین کے لئے۔"

وہ اللہ کے خزانوں کے بھی نگراں ہیں اور آگ اور جہنم کے داروغے بھی وہی ہوں گے۔ اہل جنت کو سلام اور دعاء کے ساتھ استقبال کریں گے اور اہل جہنم کو وہ سخت عذاب کی دھمکی دیتے ہوئے لیں گے۔"

(وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى جَهَنَّمَ زُمَرًا حَتَّى إِذَا جَاءُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِنْكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا قَالُوا بَلَى وَلَكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكَافِرِينَ (۷۱) قِيلَ ادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ (۷۲) وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتَّى إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ (۷۳) (۳۹: ۷۱ تا ۷۳) "اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا، جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے کارندے ان سے کہیں گے "کیا تمہارے پاس تمہارے اپنے لوگوں میں سے ایسے رسول نہیں آئے تھے جنہوں نے تم کو تمہارے رب کی آیات سنائی ہوں اور تمہیں اس بات سے ڈرایا ہو کہ ایک وقت تمہیں یہ دن بھی دیکھنا ہو گا۔" وہ جواب دیں گے "ہاں آئے تھے مگر عذاب کا فیصلہ کافروں پر چپک گیا۔" کہا جائے گا داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں، یہاں اب تمہیں ہمیشہ رہنا ہے، بڑا ہی برا ٹھکانا ہے یہ متکبروں کے لئے ...... اور جو لوگ اپنے رب کی نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے انہیں گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہوں گے تو اس کے منتظمین ان سے کہیں گے "سلام ہو تم پر، بہت اچھے رہے، داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ کے لئے۔" اور دوسری جگہ آتا ہے:

(وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً) "اور ہم نے آگ کا نگران بھی صرف ملائکہ کو بنایا ہے۔" ایک اہم سوال یہ ہے کہ یہ فرشتے اہل زمین کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اہل زمین کے ساتھ ان کا معاملہ مختلف شکلوں میں ہوتا ہے۔ وہ خدا کے حکم سے اہل زمین کی حفاظت بھی کرتے ہیں اور ان کے اعمال کا مکمل ریکارڈ بھی تیار کرتے ہیں اور جب ان کا مقررہ وقت پورا ہوتا ہے تو وہ ان کی روح قبض کر لیتے ہیں۔

(وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتَّى إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُونَ (۶: ۶۱)) "اور اپنے بندوں پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے اور تم پر نگرانی کرنے والے مقرر کر کے بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آتا ہے تو اس کے

بھیجے ہوئے فرشتے اس کی جان نکال لیتے ہیں اور اپنا فرض انجام دینے میں ذرا کوتاہی نہیں کرتے ۔"

(لَهُ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُوْنَهُ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (۱۳ : ۱۱)) "ہر شخص کے آگے پیچھے اس کے مقرر کئے ہوئے نگران لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں ۔"

(مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (۵۰ : ۱۸)) "کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا ہے جسے محفوظ کرنے کے لئے ایک حاضر باش نگران نہ ہو ۔"

ان فرشتوں کے فرائض میں یہ بات بھی شامل ہے کہ یہ رسولوں کے اوپر وحی لے کر آتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتا دیا ہے کہ ان میں سے حضرت جبرائیل یہ کام سرانجام دیتے ہیں ۔

(يُنَزِّلُ الْمَلٰئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ اَنْ اَنْذِرُوْا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ (۱٦ : ۲)) "وہ اس روح کو اپنے جس بندے پر چاہتا ہے اپنے حکم سے ملائکہ کے ذریعے نازل فرما دیتا ہے (اس ہدایت کے ساتھ کہ) لوگوں کو آگاہ کر دو ' میرے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ہے لہذا تم مجھ ہی سے ڈرو ۔"

(قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۲ : ۹۷)) "ان سے کہو کہ جو کوئی جبرائیل سے عداوت رکھتا ہو ' اسے معلوم ہونا چاہئے کہ جبرائیل نے اللہ ہی کے اذن سے یہ قرآن تمہارے قلب پر نازل کیا ہے ۔"

(وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى (۱) مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى (۲) وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (۳) اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (٤) عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى (۵) ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى (٦) وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى (۷) ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى (۸) فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (۹) فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (۱۰) مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (۱۱) اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى (۱۲) وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى (۱۳) عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (۱٤) عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (۱۵) اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى (۱٦) مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (۱۷) لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (۱۸)) (۵۳ : ۱ تا ۱۸) "قسم ہے تارے کی جب وہ غروب ہوا ' تمہارا رفیق نہ بھٹکا ہے ' نہ بہکا ہے ۔ وہ اپنی

خواہش نفس سے نہیں بولتا' یہ تو ایک وحی ہے' جو اس پر نازل کی جاتی ہے' اسے زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے' جو بڑا صاحب حکمت ہے۔ اور وہ سامنے آکھڑا ہوا جبکہ وہ بالائی افق پر تھا' پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہو گیا۔ یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔ تب اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو اس نے پہنچانی تھی۔ نظر نے جو کچھ دیکھا دل نے اس میں جھوٹ نہ ملایا۔ اب کیا تم اس چیز پر اس سے جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے۔" اور ایک دفعہ پھر اس نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اترتے دیکھا' جہاں پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ چندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی اور اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

اور جب مسلمانوں کی طاغوت کے ساتھ نہایت ہی اہم اور بڑی جنگ ہوتی ہے تو اس معرکے میں وہ بطور تائید اور امداد ثابت قدمی پیدا کرنے کے لئے اترتے ہیں :

(اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۳۰) (۴۱ : ۳۰)) "جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے' اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں "نہ ڈرو' نہ غم کرو' اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔"

(اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ اَلَنْ یَّکْفِیَکُمْ اَنْ یُّمِدَّکُمْ رَبُّکُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُنْزَلِیْنَ (۱۲۴) بَلٰۤی اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَیَاْتُوْکُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا یُمْدِدْکُمْ رَبُّکُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُسَوِّمِیْنَ (۱۲۵) وَمَا جَعَلَهُ اللّٰہُ اِلَّا بُشْرٰی لَکُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُکُمْ بِهٖ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ (۱۲۶) (۳ : ۱۲۴ تا ۱۲۶)) "اے نبی یاد کرو جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے "کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ اللہ تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کرے؟" بے شک اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ آئیں گے' اسی آن تمہارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ یہ بات اللہ نے تمہیں اس لئے بتا دی ہے تاکہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہارے دل مطمئن ہو جائیں۔ فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے جو بڑی قوت والا اور دانا اور بینا ہے۔"

(اِذْ یُوْحِیْ رَبُّکَ اِلَی الْمَلٰٓئِکَةِ اَنِّیْ مَعَکُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ

الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (۸ : ۱۲)
(اور وہ وقت جبکہ تمہارا رب فرشتوں کو اشارہ کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں' تم اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو' میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیتا ہوں' پس تم ان کی گردنوں پر ضرب لگاؤ اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ۔) یہ فرشتے اہل ایمان کے کاموں میں بھی مصروف رہتے ہیں' وہ اللہ کی تسبیح کرتے ہیں اور ان لوگوں کے لئے ہر وقت مغفرت کی دعا کرتے ہیں جو اہل ایمان ہیں اور وہ ان مومنین کے لئے اس قدر شغف کے ساتھ دعا کرتے ہیں کہ جس طرح ایک نہایت ہی محبت کرنے والا شخص اپنے محبوب کے لئے دعا کرتا ہے۔

(اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ (۷) رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۸) وَقِهِمُ السَّیِّاٰتِ وَمَنْ تَقِ السَّیِّاٰتِ یَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۹) (۴۰ : ۷ تا ۹)

"عرش الٰہی کے حامل فرشتے' اور وہ جو عرش کے گرد و پیش رہتے ہیں' سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "اے ہمارے رب' تو اپنی رحمت اور علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے' پس معاف کر دے اور عذاب دوزخ سے بچالے ان لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ اے ہمارے رب' اور داخل کر ان کو ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کے والدین' اور بیویوں اور اولاد میں سے جو صالح ہوں (ان کو بھی وہاں ان کے ساتھ ہی پہنچا دے)۔ تو بلاشبہ قادر مطلق ہے اور حکیم ہے' اور بچا دے ان کو برائیوں سے' جس کو تو نے قیامت کے دن برائیوں سے بچا دیا اس پر تو نے رحم کیا' یہی بڑی کامیابی ہے۔"

جب فرشتے روح قبض کرتے ہیں تو اس وقت اہل ایمان کو جنت کی خوشخبری دیتے ہیں اور ان کا استقبال خوشخبری سے کرتے ہیں اور آخرت میں وہ ان کی سلام و آداب سے عزت افزائی کریں گے۔

(اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱٦ : ۳۲)) "ان متقیوں کو جن کی روحیں پاکیزگی کی حالت میں جب ملائکہ قبض کرتے ہیں تو کہتے ہیں "سلام ہو تم پر' جاؤ جنت میں اپنے اعمال کے بدلے۔"

(جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ (۲۳) سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (۲۴) (۱۳ : ۲۳ - ۲۴) ایسے باغ جو ان کی ابدی قیام گاہ ہوں گے ۔ وہ خود بھی ان میں داخل ہوں گے اور ان کے آباؤ اجداد اور ان کی بیویاں اور ان کی اولاد میں سے جو صالح ہیں وہ بھی ان کے ساتھ وہاں جائیں گے ۔ ملائکہ ہر طرف سے ان کے استقبال کے لئے آئیں گے اور کہیں گے تم پر سلامتی ہے' تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اس کی بدولت آج تم اس کے مستحق ہو ۔ پس کیا ہی خوب ہے یہ آخرت کا گھر ۔

ان کے فرائض میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ اہل کفر کا استقبال آخرت میں توہین آمیز رویے کے ساتھ کریں گے اور دنیا میں کفر و اسلام کے معرکے میں وہ کفار کے مقابلے میں لڑتے ہیں اور جب کفار کی روح قبض کرتے ہیں تو وہ سختی' اذیت اور توہین آمیز انداز میں قبض کرتے ہیں ۔

(وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ (۶ : ۹۳) ''کاش تم ظالموں کو اس حالت میں دیکھ سکو جبکہ وہ سکرات موت میں ڈبکیاں کھا رہے ہوتے ہیں اور فرشتے ہاتھ بڑھا کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ''لاؤ' نکالو اپنی جان' آج تمہیں ان باتوں کی پاداش میں ذلت کا عذاب دیا جائے گا جو تم اللہ پر تہمت رکھ کر ناحق بکا کرتے تھے اور اس کی آیات کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرتے تھے ۔''

(فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ (۴۷ : ۲۷) ''پھر اس وقت کیا حال ہو گا جب فرشتے ان کی روحیں قبض کریں گے اور ان کے منہ اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے انہیں لے جائیں گے ۔''

جب سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے باوا آدم کو پیدا کیا اس وقت سے فرشتوں کا انسانوں کے ساتھ ایک خاص تعلق رہا ہے اور یہ سلسلہ طول حیات تک دنیا میں جاری رہا ہے اور قیامت تک جاری رہے گا جیسا کہ مذکورہ بالا قرآنی آیات کے اقتباسات سے اچھی طرح معلوم ہوا ہے ۔ فرشتوں اور عالم بشریت کے باہم تعلق پر بھی قرآن کریم کے متعدد مقامات پر بحث کی گئی ہے اور سورہ بقرہ میں اس کی پوری تفصیل دی گئی ہے ۔

(وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا

تَعْلَمُوْنَ (۳۰) وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۱) قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (۳۲) قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (۳۳) وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (۳۴) (۲: ۳۰ تا ۳۴))

”پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ ”میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔“ انہوں نے عرض کیا ”کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے نظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔“ فرمایا: ”میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔“ اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔ پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: ”اگر تمہارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے نظام بگڑ جائے گا) تو بتاؤ ان چیزوں کے نام کیا ہیں؟“ انہوں نے عرض کیا ”نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے۔ ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں' جتنا آپ نے ہم کو دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے والا اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔“ پھر اللہ نے آدم سے کہا: ”تم انہیں ان چیزوں کے نام بتاؤ۔“ جب اس نے ان کو ان سب کے نام بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا: ”میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں' جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو' وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اسے بھی میں جانتا ہوں۔“ پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ' تو سب جھک گئے مگر ابلیس نے انکار کیا۔ وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔)

یہ ایک وسیع میدان ہے جس میں انسانی زندگی اور عالم بالا کی زندگی کا باہم اتصال ہوتا ہے اور اس اتصال کی وجہ سے انسانی سوچ میں ایک وسعت سی پیدا ہو جاتی ہے اور انسان اس کائنات کے حقائق کا ادراک ایک وسیع زاویے سے کر سکتا ہے۔ اس کا نفسیاتی شعور وسیع اور اس کے ذہن کی جولانی کا دائرہ کھل جاتا ہے اور فکر و نظر کی یہ وسعت ایک مسلمان کو ایک ہمہ گیر اسلامی تصور عطا کرتی ہے۔ قرآن کریم انسان کے سامنے اس وسیع اور مشہود کائنات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کا آخری اتصال عالم غیب کے اس وسیع میدان سے ہوتا ہے۔

عالم غیب کا ایک وسیع عالم اور ایک کھلا میدان ہے۔ جو لوگ انسان پر عالم غیب کے دروازے بند کرنا چاہتے ہیں وہ انسان کے ساتھ نہایت ہی قبیح عداوت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ وہ انسان کی دنیا کو اس کے نہایت ہی محدود تصور بلکہ عالم محسوسات کے اندر محدود کر دینا چاہتے ہیں اور اسے عالم حیوانات میں داخل کرنا چاہتے ہیں حالانکہ اللہ نے انسان کو عزت

اور شرافت اس طرح بخشی کہ اسے غور و فکر کی قوت عطا کی۔ اس غور و فکر کی قوت سے انسان ان چیزوں کا ادراک کر سکتا ہے جس سے جانور اور بہائم محروم ہیں۔ انسان اپنی اس صلاحیت کی وجہ سے علم و معرفت کی فراوانی پاتا ہے اور اس کا شعور نہایت ہی وسیع ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی عقل اور اپنے دل کی وجہ سے عالم بالا کی وسعتوں تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ اخلاق پاکیزہ حاصل کرتا ہے اور اپنے وجود کے ساتھ نورانی عالم بالا کی سیر کرتا ہے۔

عرب اپنی اس جاہلیت کے باوجود جس میں وہ غرق تھے اور جس میں ان کا تصور حیات نہایت ہی غلط اصولوں پر قائم تھا' دور جدید کی سائنسی جاہلیت کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ یہ جدید جاہلیت کے پیروکار عالم غیب کے ساتھ مذاق کرتے ہیں اور ایسے غیبی امور پر ایمان لانے کو غیر علمی اور غیر سائنسی تصور سمجھتے ہیں۔ وہ عالم غیب کو ترازو کے ایک پلڑے میں ڈالتے ہیں اور عالم سائنس کو دوسرے میں جو ایک نہایت ہی غلط تقابل ہے۔ اس تصور کی تردید میں آیت (عندہ مفاتح الغیب) کے ضمن میں کروں گا اس لئے کہ جاہلیت جدیدہ کا یہ وہ دعویٰ ہے جس کے اوپر سائنس کے اصولوں کے مطابق کوئی دلیل نہیں لائی جا سکتی نہ دین میں اس کے اوپر کوئی دلیل پیش کی جا سکتی ہے۔ یہاں ہم صرف فرشتوں کے وجود کے بارے میں ایک مختصر بات کریں گے۔

سائنس دانوں سے ہم صرف یہ بات پوچھتے ہیں کہ وہ جو فرشتوں کا انکار کرتے ہیں اس پر ان کے پاس سائنسی اصولوں کے مطابق کیا دلیل ہے؟ وہ فرشتوں کے وجود کو تصور اور تصدیق کے دائرے سے کیوں نکالتے ہیں؟ ذرا وہ کوئی سائنسی فارمولا بتائیں جس کی رو سے وہ ایسا عقیدہ رکھنے پر مجبور ہوں کہ فرشتوں کا وجود نہیں ہے۔

ان کی سائنس کی حالت تو یہ ہے کہ وہ دوسرے کرات سماوی کے اندر ایسی موجودات کے اقرار اور انکار سے بھی عاجز ہے جو اس کرۂ ارض پر موجود ہیں۔ کجا کہ وہ کرات جن کی فضا اور جن کی کیمیاوی اور طبیعیاتی ترکیب اور مسافت زمین سے مختلف ہے اور جن کی فضائیں مختلف ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ ان دوسرے جہانوں کا انکار کس اصول پر کرتے ہیں جبکہ ان کے پاس فرشتوں کے وجود کی نفی پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

ہم ان سے اپنے عقائد کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں چاہتے اور نہ ہم اللہ کے کلام کے بارے میں ان سے کوئی استدلال چاہتے ہیں۔ ہم ان سے خود ان کے اس علم اور سائنس کے بارے میں محاکمہ چاہتے ہیں جس کو انہوں نے الٰہ بنا لیا ہے۔ اس سوال کے جواب میں ان کے پاس مکابرہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اب ان کی یہ سائنس جو انہیں عالم غیب اور ملائکہ کے انکار پر آمادہ کرتی ہے' اس سوال سے لاجواب ہو جاتی ہے۔ انکار محض اس لئے کہ یہ جہان پردۂ غیب میں مستور ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جس سائنس کی وجہ سے وہ عالم غیب اور فرشتوں کا انکار کرتے ہیں وہی بالجزم عالم غیب کو ثابت کرتی ہے۔ بلکہ اس سائنس نے عالم غیب کو ایک طرح سے عالم شہادت میں بدل دیا ہے اور کئی ایسے انکشاف کر دیئے ہیں جو پہلے عالم مغیبات میں تھے۔ ان مغیبات کو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

اس موج کا اختتام اس انجام کے تذکرے سے ہوتا' جس سے انسانی تاریخ میں وہ تمام لوگ دوچار ہوئے جنہوں نے رسولوں کا مذاق اڑایا۔ پھر جھٹلانے والوں کو دعوت دی گئی کہ ذرا وہ انسانی تاریخ میں ان مقتل گاہوں کا مطالعہ کریں جن میں ان کے اسلاف پر عذاب آئے۔ ذرا اس کرۂ ارض پر چل پھر کر جھٹلانے والوں کے انجام کو دیکھیں۔ یہ واقعات

زبان حال سے گویا ہیں کہ جھٹلانے والوں اور مذاق کرنے والوں کا انجام کیا ہوا ہے؟

---ooo---

وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۰﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾

"اے نبی ؐ" تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے 'مگر ان مذاق اڑانے والوں پر آخر کار وہی حقیقت مسلط ہو کر رہی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ۔ ان سے کہو' ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے۔" یہ ایک جھلکی ہے' جو ان لوگوں کی روگردانی اور ہٹ دھرمی کے بعد اور ان کی جاہلانہ اور احمقانہ مطالبات کے بعد آتی ہے ۔ اور اس کے بعد کہ ان کے اس چیلنج اور ان کے ان مطالبات کو اللہ تعالیٰ نے نہایت مہربانی اور نہایت ہی بردباری کر کے قبول نہ کیا ورنہ وہ ہلاک ہو جاتے 'تو اس موقعہ پر اس جھلکی سے دو مقاصد مطلوب ہیں ۔

پہلا مقصد تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جائے اور ان کے دل سے غبار غم چھٹ جائے کیونکہ روگردانی کرنے والوں اور مذاق اڑانے والوں کے رویے کی وجہ سے اور مسلسل ہٹ دھرمی کی وجہ سے آپ بہت ہی پریشان ہو جاتے تھے ۔ اس طرح حضور ؐ کا دل مطمئن ہو جاتا کہ جھٹلانے والوں اور مذاق اڑانے والوں کا انجام آخر کار خراب ہی ہوتا ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سمجھایا جاتا ہے کہ تاریخ دعوت و تاریخ رسل میں یہ رویہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے ۔ آپ سے پہلے بھی رسولوں کے ساتھ یہی رویہ اختیار کیا گیا ۔ مذاق اڑانے والوں کا یہی انجام رہا ہے اور وہ جس چیز سے مذاق کرتے تھے آخر کار اسی چیز نے انہیں گھیر لیا اور جس کو دھمکی سمجھتے تھے وہ عذاب ان پر آکر رہا اور حق کو باطل پر آخر کار غلبہ نصیب ہوا ۔

دوسرا مقصد یہ تھا کہ ان جھٹلانے والوں اور مذاق کرنے والوں کے دلوں کو بھی ذرا جھنجوڑا جائے اور انہیں اس طرف متوجہ کیا جائے کہ وہ ذرا اپنے اسلاف کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں جنہوں نے نبیوں کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑایا اور اس کی وجہ سے اللہ کے عذاب نے انہیں گھیرا ۔ یہ لوگ قوت اور شوکت کے اعتبار سے تم سے زیادہ قوی اور پر شوکت تھے ۔ وہ زیادہ آسودہ حال اور ترقی یافتہ تھے ۔ اس طرح انہیں اس طرف متوجہ کیا ۔ شاید کہ وہ ہدایت قبول کر لیں جس طرح سورہ کے آغاز میں بھی انہیں واقعات تاریخ سے عبرت حاصل کرنے کا حکم دیا گیا تھا ۔ قرآن کریم کے درج ذیل الفاظ قابل غور ہیں :

(قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۶ : ۱۱)

"ان سے کہو' ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو' جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے؟" زمین میں سیر و سیاحت کے مقاصد یہ

ہیں کہ پھرنے والے کو علم حاصل ہو' وہ حالات پر غور کرے اور ان سے عبرت حاصل کرے۔ اور پھر تدبر کے بعد پھرنے والا یہ معلوم کرے کہ سنن الہیہ حوادث و واقعات میں کس طرح کارفرما ہوتی ہیں۔ سنن الہیہ آثار قدیمہ سے بھی معلوم ہو سکتی ہیں جو نظر آتے ہیں اور ابھی تک کھڑے ہیں۔ ان تاریخی واقعات کے اندر بھی معلوم کی جاسکتی ہیں جو ہر خطے اور ہر قوم کی روایتی تاریخ کے اندر منضبط ہوتے ہیں۔ زمین کے اندر اس غرض کے لئے اور اس نہج پر سیاحت کرنا عربوں کے لئے ایک انوکھی بات تھی۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں جیسی بدوی اور سادہ قوم میں قرآن مجید فکر و نظر کا کس قدر عظیم انقلاب لارہا ہے۔ وہ ایک جاہل اور ان پڑھ قوم کو فلسفہ تاریخ پڑھا رہا ہے۔

وہ زمین میں پھرتے تھے' سیاحت کے عادی تھے۔ وہ زندگی گزارنے اور تجارت کے لئے قافلوں کی صورت میں پھرنے کے عادی تھے لیکن ان کے پیش نظر صرف وہ امور تھے جن کا تعلق صرف تجارت اور شکار وغیرہ سے تھا۔ تربیتی مقاصد کے لئے سیر و سیاحت کبھی ان کا مقصود نہیں رہی تھی۔ یہ سفر ان کے لئے بالکل جدید تھا۔ یہ جدید نظام حیات انہیں سچ کی یہ نئی لائن دے رہا تھا اور بچوں کی طرح انہیں ہاتھ سے پکڑ کر جاہلیت کی گہرائیوں اور تاریکیوں سے نکال رہا تھا۔ انہیں ایک بلند اور کھلی شاہراہ پر ڈال کر مقام سربلندی تک لے جارہا تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ قرآن پر عمل کر کے ہی وہ اس بلند مقام تک پہنچے۔

مطالعہ تاریخ کا یہ منہاج جو قرآن کریم عربوں کو سکھا رہا تھا' اپنے اول اور آخر سے یہ انسانی تاریخ کے مطالعے کا بالکل ایک نیا منہاج تھا جس کے مطابق اس دور میں اسلامی نظام زندگی نے انسانی عقل کے سامنے انسانی تاریخ کو پیش کیا۔ اس طرز مطالعہ سے صاف صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ جب کچھ اسباب اللہ کی مشیت کے مطابق جمع ہو جاتے ہیں تو ان کے نتائج لازماً ظہور پذیر ہوتے ہیں اور انسان کھلی آنکھوں سے تاریخ میں واقعات و احداث کو سنن الہیہ کے مطابق ظاہر ہوتا دیکھتا ہے۔ اسلامی نظام سے پہلے انسان اور ان کی روایات میں سے محض چند واقعات گنوائے گئے تھے اور کچھ مشاہدات اور لوگوں کے کچھ رسوم اور رواجات کو قلم بند کیا گیا تھا۔ کہیں بھی واقعات کے اسباب اور وجوہات کے بارے میں کوئی بحث اور تبصرہ نہیں ہوا تھا اور نہ ان کا تجزیہ کیا گیا تھا کہ یہ اسباب اور یہ ان کے نتائج نکلے۔ یہ تھے تاریخ کے مراحل اور انقلابات۔ یہ اسلامی نظام اور قرآن تھا جس نے انسان کو فلسفہ تاریخ دیا اور اسے یہ سکھایا کہ تاریخی واقعات کے اندر اسباب و نتائج کا مطالعہ کرو۔ قرآن نے فلسفہ تاریخ کا کوئی مرحلہ پیش نہیں کیا اور نہ کسی پرانی فکر کو آگے بڑھایا ہے بلکہ قرآن نے انسان کو تاریخی تجزیہ کا ایک منہاج دیا ہے اور صرف اس منہاج کے مطابق ہی انسانی تاریخ کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔

بعض لوگ اس امر پر تعجب کرتے ہیں کہ اسلامی نظام نے اور رسالت محمدیہ نے صرف ربع صدی کے ایک مختصر عرصے میں عربوں کی زندگی میں ایک عظیم اور بے مثال ثقافتی اور اقتصادی انقلاب برپا کر دیا۔ یہ عرصہ بظاہر اس قدر عظیم اور ہمہ گیر انقلاب کے لئے نہایت ہی قلیل ہے۔ اگر وہ اقتصادی انقلاب کے اصل عوامل کا مطالعہ کریں تو وہ ہرگز یہ تعجب نہ کریں گے۔ انہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ عوامل کیا تھے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدائے علیم و خبیر کی طرف سے لے کر آئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اقتصادی انقلاب بھی اسلامی نظام زندگی کا دکھایا ہوا معجزہ تھا اور اس کا راز اسی نظام میں پنہاں ہے۔ جو لوگ دور جدید کے جدید اقتصادی نظریات اور کھوئے ہوئے اقتصادی اصولوں کے اندر جو چیز تلاش کر رہے ہیں اور اس کے لئے تاریخ کی مادی تعبیر کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ یہ راز اسلامی نظام کے اندر تلاش کریں۔

اگر وہ اس کے اسباب اسلامی نظام زندگی کے اندر تلاش نہیں کرتے تو رسالت محمدیہ کے نتیجے میں پسماندہ اور بدوی عربوں میں جو اقتصادی انقلاب برپا ہوا' اس کے نتیجے میں لوگوں کو ایک نظریہ اور تصور حیات ملا' ایک نظام حکومت ملا' فکر و نظر کا نیا انداز ملا' اخلاق ملا' اقدار ملیں' اجتماعی اوضاع و اطوار ملے اور نہایت ہی مختصر عرصے یعنی ربع صدی میں ملے۔ ان کے وہ کیا اسباب اور عوامل بتا سکیں گے؟ (هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ)

اس جھلکی پر ذرا دوبارہ غور کیجئے۔

(قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (٦: ١١))

"ان سے کہو کہ ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا؟" .... اور اس لہر کے ابتدائی حصہ میں آنے والے ریمارک کو ذرا دوبارہ ذہن میں تازہ کریں۔

(اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَالَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ (٦: ٦)) "کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے اپنے زمانے میں دور دورہ رہا ہے؟ ان کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا تھا جو تمہیں نہیں بخشا ہے' ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہا دیں۔ آخر کار ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دوسرے دور کی قوموں کو اٹھایا۔"

یہ آیات اور ایسی ہی آیات اس سورہ میں اور پورے قرآن میں پائی جاتی ہیں اور انسانیت کو فکر و نظر کا ایک جدید منہاج عطا کرتی ہیں۔ یہ زندہ رہنے والا منہاج ہے اور یہ بے مثال اور لاثانی نظام زندگی ہے۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے میری کتاب خصائص التصور الاسلامی وتموماتہ کی "فصل" اسلام کا فلسفہ تاریخ)۔

---ooo---

درس نمبر ۵۷ ایک نظر میں

یہ لہر نہایت ہی اونچی ہے اور اس کا ٹکراؤ بھی بہت خوفناک ہے۔ جھٹلانے ' روگردانی کرنے ' مذاق اڑانے اور دعوت اسلامی کے ساتھ استہزاء کرنے کی بحث کے بعد متصلاً یہ لہر اٹھتی ہے۔ روگردانی اور استہزاء کی گزشتہ بحث کے درمیان لوگوں کے لئے ڈراوا اور انجام بد سے ان کے دلوں میں خوف پیدا کیا گیا تھا اور لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا گیا تھا کہ وہ جھٹلانے والوں اور مذاق اڑانے والوں کے اس تاریخی انجام پر بھی غور کریں ' جس سے وہ دوچار ہوئے۔ مکذبین کے متعلق لہر نمبر ۲ سے پہلے اس سورت کی افتتاحی لہر میں اس پوری کائنات میں حقیقت الہی اور اس کی شان حاکمیت سے بحث کی گئی تھی۔ یہ شان پوری کائنات کے ساتھ ساتھ خود نفس انسانی کی اندر بھی دکھائی گئی تھی۔ اب اس لہر میں بھی ذات باری کے اقتدار اعلیٰ اور اس کے تصرفات کے کچھ اور پہلو دکھائے گئے ہیں۔ ایک نئے زیر و بم اور کچھ نئے فیکٹرز کے ساتھ۔ گویا افتتاحی لہر اور اس لہر کا مضمون ایک ہی ہے ' فرق صرف یہ ہے ان دونوں کے درمیان مکذبین اور مذاق اڑانے والوں کے لئے ایک سخت تنبیہ آگئی ہے اور جس نے یہ بتانا مقصود ہے کہ معترضین کا یہ فعل نہایت ہی شنیع فعل ہے۔ جو لوگ دعوت سے منہ موڑتے ہیں وہ بہت ہی بری حرکت کر رہے ہیں۔

پہلی لہر میں شان الہی کو زمین و آسمان کی تخلیق میں دکھایا گیا ' کہ کس طرح یہاں ظلمت و نور کا نظام پیدا کیا گیا اور پھر اس کائنات کے اندر کیچڑ سے انسان کو کس طرح پیدا کیا گیا۔ پہلا مرحلہ اس کی عمر کا طے کیا گیا اور دوسرا مرحلہ اس کی قیامت اور بعث کے لئے مقرر کیا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ خدا کی خدائی زمیں و آسمانوں سب پر حاوی ہے۔ زمین پر اس مخلوق یعنی حضرت انسان کی تمام سرگرمیوں پر بھی حاوی ہے چاہے وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ ' بلند آواز سے ہوں یا خفیہ ' ان کے افعال کھلے بندوں ہوں یا پوشیدگی کے ساتھ۔ یہ سب امور اس لئے نہ لائے گئے کہ قرآن کے پیش نظر کوئی لاہوتی یا نظریاتی بحث نہ تھی بلکہ اس لئے کہ ان حقائق کے تقاضے انسانی زندگی میں عملاً نمودار ہوں۔ انسان کی پوری کی پوری زندگی اللہ واحد کے سامنے سرنگوں ہو اور انسان اللہ العالمین کے سوا کسی اور کے آگے نہ جھکے اور توحید میں کوئی شک و شبہ نہ رہے۔ وہ یہ سمجھے اور اقرار کرے کہ اللہ کی حاکمیت اس پوری کائنات اور انسان کی ظاہری و باطنی زندگی پر حاوی ہے اور یوں انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی پوری زندگی کو حاکمیت الہیہ کے تابع کر دے۔ جس طرح کہ اس کی تکوینی زندگی حاکمیت الہیہ کے تابع ہے۔

اس جدید بلند لہر کا مقصد بھی حقیقت الوہیت اور حاکمیت الہیہ کا اظہار ہے وہ اس طرح کہ اس پوری کائنات کا مالک اللہ ہی ہے۔ فعال بھی وہی ہے۔ رزق بھی وہی دیتا ہے اور کفالت بھی وہی کرتا ہے۔ وہ قادر اور قہار ہے ' وہ نافع اور ضار ہے ' لیکن یہ عقائد محض سلبی اور نظریاتی نہیں ہیں بلکہ ضروری ہے کہ ان عقائد کی روشنی میں اللہ وحدہ کو ولی تسلیم کیا جائے اور اس کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس کی مکمل بندگی کی جائے اور اس کا مطیع فرمان رہا جائے۔ ان تمام امور کا

اظہار اس طرح ہو گا کہ اللہ ہی کو اپنا دوست اور حاکم تسلیم کیا جائے' اس لئے کہ وہی تو ہے جو ہمارا رب اور مطعم ہے جبکہ ہماری جانب سے اسے کچھ نہیں دیا جاتا۔ دوسرے یہ کہ خود اس نے اس بات سے منع کیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو ولی حاکم اور دوست بنایا جائے یا ان امور میں اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کیا جائے۔

اس مقصد کے لئے اور اس شکل میں 'حقیقت الوہیت کے بیان کے ساتھ ساتھ ان مؤثرات اور فیکٹرز کو بھی بیان کر دیا گیا ہے جو دل کو پریشان کرتے ہیں۔ آغاز اس سے کیا جاتا ہے۔ اللہ تمام چیزوں کا مالک ہے' پھر وہی رب ہے لیکن اس طرح کہ وہ تمام لوگوں کو کھلاتا ہے اور اسے کوئی بھی نہیں کھلاتا اور نہ وہ محتاج ہے۔ پھر اللہ کے اس عذاب کا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ اگر کسی سے وہ عذاب ٹل جائے تو گویا اس نے عظیم کامیابی حاصل کر لی۔ پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ خیر و شر پر قادر ہیں اور یہ کہ وہ ہر فعل پر قادر ہیں اور قہار ہیں' وہ حکیم اور تجربہ کار ہیں۔ ان تمام امور کو ایک مؤثر انداز بیان کے ساتھ لایا جاتا ہے اور نہایت ہی بلند شان سے کہا جاتا ہے۔ کہہ دو' کہہ دو' کہہ دو۔

حقیقت حاکمیت الٰہیہ کے اس گہرے اور مؤثر بیان کا خاتمہ نہایت ہی بلند آہنگی کے ساتھ ہوتا ہے اور عقیدۂ توحید اور رد شرک اور ان کے درمیان فرق و امتیاز کو نہایت ہی پر زور انداز میں بیان کر کے اس کی شہادت دی جاتی ہے اور یہ شہادت بھی نہایت ہی شاہانہ انداز میں دی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے۔

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً سب سے بڑی شہادت کیا ہے؟ قُلِ اللّٰهُ کہو اللہ' کہو میں تو شرک پر شہادت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ اللہ تو صرف ایک ہی ذات ہے جو الٰہ واحد ہے۔ ان فقروں اور تنبیہ آمیز سوال و جواب کی وجہ سے ایک پر خطر اور خوفناک فضا پیدا ہو جاتی ہے اور ماحول یکلخت سنجیدہ ہو جاتا ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۵۷ تشریح آیات

۱۲--- تا--- ۱۹

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ لَهٗ مَا سَكَنَ فِی الَّيْلِ وَ النَّهَارِ ؕ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾

"ان سے پوچھو' آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے' وہ کس کا ہے؟ .... کہو سب کچھ اللہ ہی کا ہے' اس نے رحم وکرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے' (اسی لئے وہ نافرمانیوں اور اور سرکشیوں پر تمہیں جلدی سے نہیں پکڑ لیتا)' قیامت کے روز وہ تم سب کو ضرور جمع کرے گا' یہ بالکل ایک غیر مشتبہ حقیقت ہے' مگر جن لوگوں نے اپنے آپ کو خود تباہی کے خطرے میں مبتلا کر لیا ہے' وہ اسے نہیں مانتے ۔ رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں جو کچھ ٹھہرا ہوا ہے' سب اللہ کا ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے ۔"

یہاں خطاب بیان اور فیصلے کے لئے ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ ان مشرکین سے مخاطب ہوں جو اچھی طرح جانتے ہیں اللہ ہی خالق ہے لیکن یہ جانتے ہوئے بھی خالق کا ہمسر ان لوگوں کو بناتے ہیں جو بذات خود مخلوق ہیں ۔ اور پھر بزعم خود اپنی زندگی کے تصرفات میں ان شرکاء کو بھی دخیل کرتے ہیں ۔ سوال یہ کیا جاتا ہے کہ تم مانتے ہو کہ اللہ خالق ہے تو یہ بتاؤ کہ تخلیق کے بعد پھر مالک کون ہے؟ یعنی اس پوری کائنات اور زمین و آسمان کا خالق کون ہے؟ (مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) کا مالک کون ہے؟ اور پھر اس سوال کا جواب خود ہی دے دیا جاتا ہے اس لئے کہ وہ اس کا انکار نہ کرتے تھے ۔ (قُلْ لِّلّٰهِ) عربوں سے اگر پوچھا جاتا کہ (لِمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) ؟ تو وہ جواب دیتے (للہ) تو معلوم ہوا کہ جاہلیت کے اندھیروں میں ہوتے ہوئے اور فکری اور نظری گمراہی کا شکار ہوتے ہوئے بھی وہ دور جدید کی جاہلیت سے بہرحال زیادہ بہتر تھے ۔ دور جدید کی جاہلیت کو علمی جاہلیت کہا جا سکتا ہے اس لئے کہ وہ اس سادہ حقیقت کی بھی منکر ہے' کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے ۔

اس نے اپنی فطرت کو اندھا کر دیا ہے اور وہ اس بدیہی حقیقت کو بھی دیکھ نہیں رہی ہے۔ عرب جاہلیت کے پیروکار اگرچہ اس بدیہی حقیقت کا ادراک کرتے تھے اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے لیکن وہ اس حقیقت اور اقرار پر پھر اس کے منطقی نتیجے مرتب نہ کرتے تھے۔ یوں وہ اللہ کو اس کی مملوکات کے اندر بھی حاکم مطلق اور مقتدر اعلیٰ نہ سمجھتے تھے۔ وہ دنیا میں اپنے تمام تصرفات اور تمام حرکات و سکنات کو اذن اللہ کے دائرے کے اندر محدود نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مشرک قرار پاتے تھے اور انہیں اہل جاہلیت کہا گیا۔ رہے وہ لوگ جو اپنے تمام امور کو اللہ تعالیٰ کے دائرہ حاکمیت سے نکال دیں اور اپنی زندگی کے خود حاکم بن جائیں تو اب یہ سوال ان سے کیا جا سکتا ہے کہ ہم انہیں کیا کہیں اور ان کی زندگی پر کیا فیصلہ دیں۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو مشرکین کے سوا کوئی اور لقب نہیں دیا جا سکتا اور نہ ان کی زندگی کو شرکیہ زندگی کے سوا کچھ اور کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ خود اللہ کے فیصلے کے مطابق ان کی یہ زندگی فاسقانہ' ظالمانہ اور کافرانہ ہے۔ چاہے وہ جس قدر بھی اسلام کا دعویٰ کریں (ان کے برتھ سرٹیفکیٹ چاہے ان کا مذہب جو بھی بتائیں کیونکہ وہ تو پیدائش کے وقت خانہ پری ہوتی ہے)۔

اب ذرا آیت پر بھرپور نظر ڈالیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ یہ قرار دینے کے بعد کہ زمین اور آسمان کا مالک وہ ہے' ساتھ ساتھ یہ بھی اضافہ فرماتے ہیں (كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ) ''اس نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔'' اللہ وحدہ خالق و مالک ہے اور اس میں اس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں ہے جو نزاع کر سکے۔ لیکن اس نے اپنے فضل و کرم سے اپنے اوپر یہ بات لازم کر لی ہے کہ وہ رؤف و رحیم ہے۔ اپنے ارادے اور اپنی مشیت اور مرضی سے اس نے یہ رویہ لازم کر لیا ہے کوئی اور نہیں ہے جس نے اللہ پر اس رویے کو لازم کر دیا ہو' نہ کسی اور نے اللہ سے اس کا مطالبہ کیا ہے۔ اپنے ارادۂ مطلق اور اپنی کریمانہ شان ربوبیت کی وجہ سے اس نے یہ رحیمانہ رویہ اپنایا ہوا ہے۔ اور یہ اصول اللہ تعالیٰ نے اپنے فیصلوں' اپنے اخلاق اور اپنے معاملات میں' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اپنے لئے ایک مسلمہ قاعدہ قرار دیا ہے۔ اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظریات کی بنیادوں کے اندر بھی یہ اصول کارفرما ہے۔ اصل اصول یہ ہے کہ اللہ بندوں پر رحم کرتا ہے یہاں تک کہ اگر اللہ کسی بندے کو مشکلات اور مصائب سے دوچار کرتا ہے تو بھی دراصل اس پر شفقت مطلوب ہوتی ہے۔ وہ بندوں کو مشکلات میں اس لئے ڈالتا ہے تاکہ ان میں سے ایک ایسا عنصر ہر وقت تیار رہے جو اللہ کی امانت کا بار اٹھانے کا اہل ہو اور یہ امانت کبریٰ ان کو تب سپرد کی جاتی ہے جب یہ گروہ اپنے خلوص' اپنی بے لوثی اور اپنی فہم و ادراک' اور اپنی تیاری اور تجربات کے اعتبار سے اس بوجھ کے اٹھانے کے لئے تیار ہو جائے۔ خبیث قوتیں پاک اور صاف لوگوں کی صفوں سے نکال کر باہر پھینک دی جائیں اور یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ کون صحیح طرح مطیع رسول ہے اور کون بھاگنے والا ہے۔ جو ہلاک ہوتا ہے وہ سمجھ کر ہلاک ہو اور جو زندہ رہتا ہے تو اصولوں پر زندہ رہے۔ یہ تمام امور اللہ کے دائرہ رحمت کے اندر ہیں۔

اللہ کی رحمت کے مواقع سے تو ہماری زندگی بھری پڑی ہے۔ ہر لمحہ اور ہر لحظہ اس کی شفقت اور رحمت کی نئی شان ہے۔ ہم نے ابتلاء اور مشکلات کے زمانے کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ بعض اوقات لوگوں کی فکر و نظر اس میں دھوکہ کھا جاتی ہے۔

ہماری یہاں یہ کوشش نہیں ہے کہ ہم اللہ کی رحمت کے معاملات اور مظاہر گنوائیں' بعض مظاہر آنے والے صفحات میں آپ دیکھیں گے۔ یہاں ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اس آیت پر قدرے غور کریں۔ اور دیکھیں (كَتَبَ

عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ) سے دراصل کیا مراد ہے۔اسی سورہ میں دوسری جگہ اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے (كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ) اس آیت میں جو بات جاذب نظر ہے وہ یہی فضل و کرم ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔یعنی ایک ذات عالی جو خالق ہے' مالک ہے اور قوت قاہرہ کی مالک ہے وہ اپنی قوت قاہرہ کے استعمال کے بجائے فضل و کرم کا مظاہرہ فرمارہی ہے اور پھر اس صورت میں کہ اس نے اس فعل کو اپنے اوپر لکھ لیا ہے' فرض قرار دے لیا ہے۔ازخود اس نے اس عہد پر دستخط کر لئے ہیں۔محض اپنے ارادہ مطلقہ اور اپنی مشیت کی رو سے وہ ہم پر فضل کر رہا ہے۔یہ وہ عظیم حقیقت ہے کہ جب انسان اسے پیش نظر رکھے اس پر غور کرے اور اس کے عجیب انداز کا ملاحظہ کرے تو اس کا انسان کی شخصیت' اس کی فکر اور اس کے ذوق نظر پر اچھا اثر مرتب ہونا ضروری ہے۔

پھر یہ امر بھی جاذب نظر ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں کو اپنی اس شان رحیمی کی اطلاع بھی دیتا ہے کہ میں نے یہ اصول اپنے اوپر لکھ لیا ہے' اپنے لئے اسے فرض قرار دے لیا ہے کہ میں فضل و کرم ضرور کروں گا۔اب وہ بندے ہیں کون جن کے بارے میں عالم بالا میں یہ فیصلہ ہوا ہے اور اس کا حکم ان تک تحریری شکل میں آپہنچا ہے کہ ان کے بارے میں یہ فیصلہ ہو گیا ہے اور رسول اللہ کی زبانی ان تک اس کی اطلاع ہو رہی ہے۔یہ لوگ کون ہیں؟ یہ کوئی خاص لوگ نہیں ہیں' بلکہ یہ لوگ عام لوگ ہیں اور اللہ کا یہ فضل و کرم تمام لوگوں کے لئے ہے۔

اس انداز میں' اس حقیقت پر غور کرنے سے دل میں عجیب و غریب خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔انسان حیران ہو جاتا ہے۔اس کے دل میں انس اور اس کے اندر اس قدر روحانی سرور پیدا ہوتا ہے جس کا اظہار الفاظ کے اندر ممکن نہیں ہے۔یہ حقائق قلب و نظر پر جو اثرات چھوڑتے ہیں انسان اسے چکھ تو سکتا ہے' اسے محسوس تو کر سکتا ہے لیکن انسانی اسلوب کلام میں ان کا اظہار ممکن نہیں ہے اور نہ پوری طرح اسے بیان کیا جاسکتا ہے۔

اس حقیقت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی تصور حیات میں شان رحیمی حقیقت الٰہیہ کا اساسی پہلو ہے۔اسی کی اساس پر بندے اور اللہ کا تعلق بندگی استوار ہوتا ہے اور یہ تصور نہایت ہی خوبصورت' پرکیف ہے اور محبت اور مودت سے سرشار ہے۔اس اساسی تصور کے ہوتے ہوئے ہر منصف مزاج شخص کو ان بدمزاج لوگوں کی ذہنیت اور ان کی بہتان تراشیوں پر سخت تعجب ہو گا کہ وہ جو اسلام کے تصور اللہ کے خلاف ایسی باتیں کرتے ہیں جو خلاف حقیقت ہیں ' یہ الزامات وہ اس لئے عائد کرتے ہیں کہ اسلام عقیدۂ ابنیت کا قائل نہیں ہے۔اسلام اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ اللہ کے بندوں میں سے بھی کوئی اس کا بیٹا ہو سکتا ہے جب کہ کینسہ نے انجیل میں انحراف کر کے یہ عقیدہ گھڑا۔اسلامی تصور حیات اللہ کی شان کریمی کے بارے میں بہت ہی اعلیٰ و ارفع ہے اور وہ کنیسہ کہ کینسہ بیگانہ تصورات سے بہت ہی بلند ہے۔اللہ اور بندے کے درمیان جو شفقت اور محبت کا تعلق ہے وہ انسانی الفاظ سے ماوراء ہے۔اللہ کی شان جلالت کے ساتھ ساتھ اسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن بیان نہیں کیا جاسکتا۔

اللہ کی رحمت کا فیضان اس کے تمام بندوں پر ہوتا ہے۔یہ رحمت سب کو اپنے جوار میں لیتی ہے۔یہ اس کی رحمت ہی ہے جس کے ذریعے ذات انسان زندہ ہے۔اس کے جسم اور جان کا رشتہ استوار ہے۔انسانی وجود میں اور اس پوری کائنات کے وجود میں اللہ کی رحمت اور اس کی شان کریمی ہروقت جاری و ساری ہے۔جہاں تک انسانی زندگی اور انسانی جسم کا تعلق ہے' اس کے اندر اللہ کی رحمت کے مواقع کو تو ہم گن ہی نہیں سکتے۔البتہ ان میں سے چند ممتاز پہلوؤں اور

مظاہر کا ذکر ضروری ہے۔

سب سے پہلے انسان کی ذات میں اللہ کی شان رحیمی نظر آتی ہے۔انسان کو اللہ تعالیٰ اس طرح پیدا کرتا ہے کہ خود انسان کو اس کا کوئی علم نہیں ہوتا۔خود انہیں اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ کس طرح انہیں یہ وجود عطا ہوا۔پھر اس کے اندر ایسے خصائص رکھ دیئے گئے جن کی وجہ سے انسان کو تمام موجودات پر فضیلت حاصل ہوگئی۔

پھر اس کی شان کریمی ان قوتوں کے اندر نظر آتی ہے جن کو آج تک انسان مسخر کر سکا ہے۔یہ کائنات اور اس کی قوتیں' اور یہ ہے اللہ کا رزق اپنے وسیع تر مفہوم میں' یوں سمجھیں کہ کائنات جس کے وسیع میدانوں میں ہر وقت انسان جولانیاں دکھاتا ہے۔

پھر اس شان کریمی کا اظہار اس حقیقت سے بھی ہوتا ہے کہ اللہ نے انسان کو علم عطا فرمایا۔پہلے اسے حصول علم کی استعداد عطا کی اور اس کی صلاحیتوں اور اس کائنات کی قوتوں کے اندر ہم آہنگی پیدا کی۔یہ علم جس کی وجہ سے بعض بدفطرت اور بدمزاج انسان خود ذات باری پر دست درازی شروع کر دیتے ہیں حالانکہ یہ وہی تو ہے جس نے ان بدمزاجوں کو یہ علم عطا فرمایا اور یہ علم اللہ کے ارزاق میں سے ایک رزق ہے۔

پھر اس شان رحیمی کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے کہ اللہ نے انسان کو اس جہان میں اپنا خلیفہ بنا کر اس کی نگہداشت اور تربیت کا انتظام یوں کیا کہ اس کی ہدایت کیلئے مسلسل رسول بھیجے۔جب بھی انسان بھٹکا' اللہ نے اسے ہدایت سے نوازا اور بڑی محبت اور صبر کے ساتھ اسے دوبارہ راہ مستقیم پر ڈال دیا۔حالانکہ بعض اوقات انسان نے ان ڈرانے والوں اور نصیحت کرنے والے رسولوں کی آواز پر کان بھی نہ دھرا۔اللہ کے لئے اس کا ہلاک کر دینا مشکل نہ تھا لیکن اللہ کی صفت رحمت نے ہمیشہ اس کو مہلت دی اور ہمیشہ اللہ کے حلم نے انسان کو ڈھانپ لیا۔

پھر اللہ کی اس شان کریمی کا اظہار اس حقیقت سے بھی ہوتا ہے کہ جب ایک بندہ اپنی جہالت کی وجہ سے گناہ کرتا ہے اور پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دیتے ہیں اور یہ اس وجہ سے کہ اللہ نے اپنے اوپر رحمت کرنا لازم کر لیا ہے۔

اور یہ بھی اس کی شان کریمی کا ایک پہلو ہے کہ وہ برائی کی جگہ ایک ہی برائی شمار کرتا ہے۔ایک ہی برائی کی سزا دیتا ہے لیکن ایک نیکی کے بدلے وہ دس نیکیوں کا ثواب اور اجر عطا کرتا ہے اور اس کے بعد بھی وہ جس کے اعمال نامے میں جو چاہے اضافہ کر دے۔پھر مزید یہ کہ اللہ نیکی کے بدلے کو محو بھی کرتا جاتا ہے اور یہ سب اس کا کرم ہے۔پھر یہ کہ کوئی شخص محض اپنے اعمال کے بل بوتے پر جنت حاصل نہیں کر سکتا جب تک اس کا کرم شامل حال نہ ہو۔یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں بھی یہی کہا ہے کہ وہ بھی اللہ کے فضل سے جنت میں جائیں گے۔اگر اللہ کا فضل و کرم شامل حال نہ ہو تو انسان بہت ہی عاجز ہے۔

غرض اللہ کے رحم و کرم اور جود و سخا کے مواقع اور مظاہر کی تفصیلات دینے کے بجائے ہمارے لئے بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے قصور فہم کا اعلان کر دیں اور یہ کہہ دیں کہ ہمارے لئے اس کی شان کریمی کو پوری طرح سمجھنا ہی مشکل ہے اور ہمارے لئے یہی مناسب رویہ ہے۔اس لئے کہ اگر ہم ایسا نہ کریں اور یہ اعلان نہ کر دیں کہ ہم فیل ہو گئے تو ہم اس میدان میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔وہ لمحہ جس میں کسی بندے پر اللہ کی رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں' اسے اللہ تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔وہ معرفت کردگار سے سرشار ہوتا ہے' اسے سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔اس کے سایہ

عاطفت میں پناہ لیتا ہے۔ اس کی بارگاہ میں پناہ لیتا ہے' ایسا ایک مختصر لحظہ بھی اس قدر وسعت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی انسان کے لئے اس کا بیان کرنا اور اس کی وضاحت کرنا ممکن نہیں ہے' یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان اللہ کی شان کریمی کو پوری طرح بیان کر سکے۔

ذرا غور کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جوامع الکلم کے ذریعے' خوبصورت تمثیلات کے ذریعے کس طرح اللہ کی شان کریمی کو ہماری فہم اور ہماری عقل کے قریب کرنے کی سعی کی ہے : شیخین نے اپنی سندوں کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت فرمائی ہے :

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ نے مخلوقات کا فیصلہ کر دیا (امام مسلم نے کہا جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کر دیا) تو اللہ نے ایک ایسی کتاب میں جو ذات باری کے پاس عرش پر ہے لکھا کہ "میری رحمت میرے غضب سے پہلے ہو گئی۔" امام بخاری نے ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ دیئے ہیں "میری رحمت' میرے غضب پر غالب آگئی ہے۔"

شیخین نے اسی سند سے حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ رسول ؐ خدا نے فرمایا "اللہ نے رحمت کے سو حصے کئے ہیں جن میں سے ۹۹ اللہ نے اپنے ہاں روک لئے ہیں اور زمین پر اللہ نے صرف ایک حصہ اتارا ہے۔ اس ایک حصے کو استعمال کر کے مخلوقات ایک دوسرے کے ساتھ رحیمانہ سلوک کرتی ہیں۔" یہاں تک کہ ایک جانور اپنے کھروں کو اٹھاتا ہے مبادا کہ اس کا پاؤں اس کے بچے پر پڑ جائے۔"

امام مسلم نے اپنی سند کے ذریعے حضرت سلمان فارسی سے روایت فرمائی ہے۔ انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کے پاس سو رحمتیں ہیں' ان میں سے ایک رحمت کو استعمال کر کے مخلوق خدا باہم شفیقانہ سلوک کرتی ہے اور ۹۹ رحمتیں اللہ نے قیامت کے لئے محفوظ کی ہوئی ہیں۔"

انہی سے ایک دوسری روایت میں ہے "جس دن اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا تو اس نے سو رحمتیں پیدا کیں۔ اللہ کی ہر رحمت زمین و آسمان سے بڑی ہے۔ ان میں صرف ایک رحمت کو اللہ تعالیٰ نے زمین کے اوپر استعمال کے لئے دیا۔ اسی رحمت سے والدہ اپنے بچے پر شفقت کرتی ہے اور وحشی جانور اور پرندے ایک دوسرے پر رحمت کرتے ہیں۔ جب قیامت کا دن ہو گا تو اس کے باقی ۹۹ % کے ذریعے اللہ تعالیٰ اس رحمت کو مکمل کر دے گا۔"

حضور اکرم ؐ نے جس تمثیلی انداز میں رحمت کی مقدار کو بیان کیا ہے یہ محض تقریب الی الافہام کے لئے ہے۔ انسان جب زندہ جانوروں میں یہ دیکھتا ہے کہ مائیں اپنے بچوں کے ساتھ کس قدر رحمت و شفقت سے پیش آتی ہیں' لوگ بچوں پر کس قدر شفقت کرتے ہیں' اسی طرح بوڑھوں' ضعفاء' مریضوں' اقرباء' دوستوں اور اولاد پر' نیز پرندے اور وحشی جانور ایک دوسرے کے ساتھ' تو انسان ورطہ حیرت میں غرق ہو جاتا ہے۔ بعض مناظر تو ایسے ہوتے ہیں کہ انسان پر دہشت طاری ہو جاتی ہے اور اس کے بعد جب انسان یہ تصور کرتا ہے کہ اللہ کی شان کریمی کے سو حصوں میں سے یہ صرف ایک حصہ ہے تو انسان مزید حیران ہوتا ہے۔ یہ انداز تفہیم ایسا ہے کہ بات لوگوں کے ذہن کے قریب آ جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اپنے ساتھیوں کو اس عظیم رحمت کے بارے میں آگاہ کرتے رہتے تھے۔

حضرت عمر ابن خطاب ؓ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ جنگی قیدی عورتیں لائی گئیں۔ ان میں سے ایک عورت دوڑی پھرتی تھی' اس کے پستانوں سے دودھ بہہ رہا تھا۔ اسے گرفتار عورتوں کے کیمپ میں جو بچہ

بھی ملتا وہ اسے پکڑتی' اسے پیٹ سے لگاتی اور دودھ پلاتی۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا تم اس بات پر یقین کرو گے کہ یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں پھینک دے گی۔" ہم نے کہا خدا کی قسم اگر وہ ایسا نہ کرنے کی قدرت رکھتی ہو (یعنی مجبور نہ ہو) تو وہ ہرگز ایسا نہ کرے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جان لو کہ اس عورت کو اپنے بچے سے جس قدر محبت ہے' اللہ کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے زیادہ محبت ہے۔" (بخاری۔ مسلم)

کس طرح نہ ہوگی؟ یہ عورت اپنے بچے کے ساتھ جو رحم اور شفقت رکھتی ہے تو یہ اس رحمت کی برکت ہے جو اللہ نے اپنی وسیع رحمت سے اہل زمین کو عطا کی ہے۔

حضور اکرم ؐ نے اپنے ساتھیوں کو اس قسم کی جو تعلیم دی تھی' یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے ایک قدم مزید آگے بڑھ کر اپنے ساتھیوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اس سلسلے میں اللہ کے اخلاق کو اپنائیں۔ آپس میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ رحمت اور مودت سے پیش آئیں۔ اس جہان کے تمام زندہ جانوروں کے ساتھ رحم کریں۔ ان کے دلوں کے اندر محبت اور شفقت کا ذوق پیدا ہو اور وہ اپنے تمام معاملات میں اس ذوق کو برتیں جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے معاملات میں اپنی مخلوقات کے ساتھ رحمت برتتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا یہ پہلو نہایت ہی زندہ اور تابندہ ہے۔ کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت عمرو ابن العاص ؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "رحم کرنے والوں پر اللہ کا رحم ہوگا۔ تم لوگ اہل زمین پر رحم کرو تم پر وہ رحم کرے گا جو آسمانوں میں ہے۔" (ابوداؤد' ترمذی)۔

ابن جریر ؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ اس شخص پر رحم نہیں فرماتے جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔" (بخاری' مسلم اور ترمذی)

ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابوہریرۃ ؓ سے ایک روایت میں یہ کہا ہے حضور ؐ نے فرمایا "رحمت صرف اس شخص سے چھین لی جاتی ہے جو شقی القلب ہو۔"

اور اسی طرح حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن ابن علی کو بوسہ دیا اور اس وقت آپ کے پاس اقرع ابن حابس بیٹھے ہوئے تھے۔ اقرع نے کہا میرے تو دس بیٹے ہیں میں نے کبھی ان میں سے ایک کو بھی بوسہ نہیں دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا: "جس نے شفقت نہ کی اس پر شفقت نہ ہوگی۔" (مسلم و بخاری)

حضور اکرم ؐ نے اپنے ساتھیوں کو صرف یہ تعلیم نہ دی تھی کہ وہ فقط انسانوں کے ساتھ مشفقانہ سلوک رکھیں' اس لئے کہ آپ کو علم تھا کہ اللہ کی رحمت بہت ہی وسیع ہے اور مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اندر خدائی اخلاق پیدا کریں۔ انسان اس وقت تک مکمل انسان نہیں بن سکتا جب تک وہ تمام مخلوقات کے ساتھ رحمت کا برتاؤ نہ کرے۔ اس سلسلے میں آپ کی تعلیمات نہایت ہی مؤثر تھیں جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یوں ہوا کہ ایک شخص کسی سفر کے دوران کسی راستے پر جا رہا تھا کہ اسے شدید پیاس لگ گئی۔ اسے ایک کنواں ملا۔ وہ اس میں اترا اور پانی پیا اور باہر نکل آیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک کتا پیاس کی وجہ سے ہانپ رہا ہے اور پیاس کی شدت کی وجہ سے مٹی کھا رہا

ہے۔ اس شخص نے کہا' اس کا حال بھی پیاس نے ایسا کر دیا جس طرح میرا کر دیا تھا۔ وہ کنویں میں اترا' اپنے جوتے کو پانی سے بھرا اور اسے اپنے منہ میں پکڑا یہاں تک کہ نکل آیا۔ اس نے کتے کو پانی پلایا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اس کا اجر دیا اور اس کی مغفرت فرما دی۔" اس پر صحابہ کرام نے کہا: رسول اللہ کیا ہمارے لئے بہائم میں بھی اجر ہے؟ تو آپ ؐ نے فرمایا ہر ترکلیجے والی چیز کی ساتھ رحم پر اجر ہے۔" (بخاری' مسلم' موطاء)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک بدکار عورت نے ایک بار دیکھا کہ شدید گرمی میں ایک کتا ایک کنویں کے ارد گرد چکر لگا رہا ہے۔ اس نے پیاس کی وجہ سے زبان نکالی ہوئی ہے۔ اس نے اس کے لئے اپنے جوتے کو ڈول بنا کر اور دوپٹے کو رسی بنا کر پانی نکال کر پلایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی۔"

حضرت عبدالرحمٰن ابن عبداللہ ؓ نے اپنے باپ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ ہم نے ایک (حُمَّرَہ) (پرندہ) کو دیکھا جس کے ساتھ اس کے دو بچے تھے۔ ہم نے اس کے بچے پکڑ لئے۔ (حُمَّرَہ) آئی اور وہ زمین پر بچھی جا رہی تھی (یعنی پر ڈھیلے کر کے پھیلا کر زمین کے قریب ہو رہی تھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ نے فرمایا: "کس نے اسے اس کے بچوں کی وجہ سے تکلیف دی۔ اس کے بچوں کو لوٹا کر اسے دے دو۔" حضور ؐ نے دیکھا کہ ہم نے چیونٹیوں کے گھر کو جلا دیا تھا تو آپ ؐ نے پوچھا یہ کس نے جلایا ہے؟ ہم نے کہا یہ تو ہم نے جلایا ہے تو آپ ؐ نے فرمایا کہ آگ کے ساتھ صرف آگ کا مالک سزا دے سکتا ہے۔ (ابو داؤد)

حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے۔ حضور ؐ نے فرمایا کسی نبی کو چیونٹی نے کاٹا۔ آپ نے حکم دیا کہ ان کے گھر کو جلایا جائے اللہ تعالیٰ نے اس پر وحی بھیجی "اگر آپ کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا تو کیا آپ اس کی پوری نوع کو جلا ڈالیں گے جو تسبیح کرتی ہے۔ (مسلم بخاری)

یوں حضور ؐ نے اپنے ساتھیوں کو قرآن کریم کی اس تعلیم کے مطابق تربیت دی کہ وہ اللہ کی رحمت کا مزہ اس طرح چکھیں کہ اسے لوگوں کے ساتھ برتیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مخلوقات ایک دوسرے کے ساتھ جو رحم اور شفقت کرتی ہے وہ اللہ کی بے بہا اور بے شمار رحمتوں میں سے ایک رحمت ہے۔

اب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایک مسلمان کے تصور حیات کے اندر رحمت کی حقیقت بیٹھ جانے سے اس کے احساسات' اس کی زندگی اور اس کے اخلاق پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور انہیں کسی صورت میں بھی مٹایا نہیں جا سکتا۔ مذکور بالا تعلیم کے جو اثرات ایک مسلم کی زندگی پر پڑتے ہیں' یہاں ہم ظلال القرآن کے مختصر اسلوب کے مطابق اس کی طرف بھی کچھ اشارہ کئے دیتے ہیں۔

اس حقیقت کے شعور کے نتیجے میں' دل مومن اطمینان کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے اور وہ اپنے رب کی جانب سے پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب کہ وہ مشکلات اور شدید لمحات سے گزر رہا ہو کیونکہ مصائب و شدائد میں انسان کے قلب و نظر دھوکہ کھا سکتے ہیں۔ اس طرح مشکلات میں گھرا ہوا مومن ہر وقت رحمت خداوندی کا امیدوار ہوتے ہوئے یہ یقین رکھتا ہے کہ کسی بھی لحہ حالات میں تبدیلی آسکتی ہے اور ہر صورت حال کے بعد نئی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔ اللہ اپنے بندوں کو مشکلات میں مبتلا کر کے چھوڑ نہیں دیتا' یا اسے اپنی رحمت سے محروم

نہیں کر دیتا۔ اس لئے کہ جو شخص بھی رحمت خداوندی کا طلبگار ہو گا اسے اللہ محروم نہ کرے گا۔ لوگ تو خود اپنے آپ کو رحمت خداوندی سے محروم کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی ناشکری کرتے ہیں' رحمت کے سایہ میں آنے سے انکار کرتے ہیں اور اس سے دور بھاگتے ہیں۔ پھر اللہ کی رحمت کی امیدواری پر پختہ اطمینان کے نتیجے میں انسان کے اندر صبر و ثبات پیدا ہوتا ہے' امید کی کرن روشن ہوتی ہے' وہ اطمینان اور آرام محسوس کرتا ہے' کیونکہ وہ بارگاہ رحمت و محبت میں ہوتا ہے' جس کا سایہ گھنا ہوتا ہے جب تک وہ خود اپنے آپ کو اس سے دور نہ کر لے۔

جب ایک مسلم یہ شعور پاتا ہے تو اس کے احساسات میں باری تعالیٰ کی نسبت سے ایک حیا پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ مغفرت کی امیدواری اور رحمت باری کی خواہش کے باوجود کوئی شخص یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ اللہ کی نافرمانی کرے۔ بعض لوگوں کا یہ وہم درست نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کا کوئی امیدوار ہوتا ہے تو وہ پھر نافرمانی کرتا ہے حالانکہ اس امید کے نتیجے میں اللہ غفور و رحیم کی نافرمانی کرنے سے شرم آتی ہے۔ جن لوگوں کے اندر رحمت خداوندی اور مغفرت خداوندی کے نتیجے میں مزید معصیت کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے انہوں نے درحقیقت ایمان کی حقیقی مٹھاس کو پایا ہی نہیں ہے۔ اس لئے نہ یہ بات میری سمجھ میں آتی ہے اور نہ میں اسے تسلیم کرتا ہوں جو بعض صوفی کہتے ہیں کہ وہ گناہوں کا ارتکاب اس لئے کرتے ہیں تاکہ وہ اللہ کے صبر اور حلم کا مزہ چکھیں یا اس کی مغفرت اور رحمت سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ سلیم الفطرت لوگوں کی سوچ نہیں ہے' رحمت الٰہیہ کے لئے یہ ایک منفی ردعمل ہے۔

اس حقیقت کو اس انداز میں پالینے کے بعد ایک مسلم کے ذہن میں بہت ہی اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ اسے اپنے اندر خدائی اخلاق پیدا کرنے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس پر ہر طرف سے اللہ کی رحمتوں کی بارش ہو رہی ہے اس کے باوجود کہ وہ پراز تقصیرات ہے اور اس سے گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح وہ خود بھی رحم اور شفقت کے انداز سیکھ لیتا ہے' وہ معاف کرنا جانتا ہے۔ وہ گناہوں اور غلطیوں سے درگزر کرتا ہے اور یہ بات ہمیں ان تعلیمات میں صاف صاف نظر آتی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو دیں اور یہ تعلیم آپ نے بذریعہ "تخلق باخلاق اللہ" دی۔ اللہ کی رحمت کے مقامات میں سے ایک مقام یہ ہے کہ اللہ نے اپنے اوپر یہ لکھ دیا ہے کہ وہ تمام انسانوں کو ایک دن میدان حشر میں اٹھائے گا۔ یہ آیت اس کا بھی فیصلہ کرتی ہے:

(قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلْ لِّلّٰهِ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ (٦: ١٢)) ان سے پوچھو' آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے' وہ کس کا ہے؟ .... کہو سب کچھ اللہ ہی کا ہے' اس نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے (اسی لئے وہ نافرمانیوں اور سرکشیوں پر تمہیں جلدی سے نہیں پکڑ لیتا) قیامت کے روز وہ تم سب کو ضرور جمع کرے گا' یہ بالکل ایک غیر مشتبہ حقیقت ہے۔

اللہ کی اس تحریری رحمت کے دعوے میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ ایک دن انہیں دوبارہ جمع کرے گا اور یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ اور اس جمع کے بعد اللہ کی عنایات کا دور ہو گا اور یہ عنایات اللہ کی ان لوگوں پر ہونگی جو اس کی بندگی کریں گے۔ اس لئے کہ اللہ نے انہیں پیدا ہی اس لئے کیا تھا کہ وہ اپنی پوری زندگی میں اللہ کی بندگی کی راہ اپنائیں۔ انہیں اس زمین پر منصب خلافت صرف اسی مقصد کے لئے دیا گیا تھا۔ انہیں بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا اور نہ وہ یونہی چھوڑ دیئے

گئے - ایک دن ایسا آنے والا ہے جس میں یہ سب لوگ جمع ہوں گے - یہ وہ آخری ٹھکانا ہے جس کی طرح یہ لوگ اس طرح لوٹیں گے جس طرح ایک سواری اور قافلہ اپنی منزل مقصود کی طرف مسلسل بڑھتا ہے - وہاں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جزاء دے گا جنہوں نے اللہ کی طرف جانے کی صحیح راہ اختیار کی اور زندگی کے اس طویل سفر میں تکلیفات اٹھائیں - دنیا میں انہوں نے جو اچھے اعمال کئے اور اب وہاں انہیں اس کا اجر ملے گا تاکہ ان کی مشقتیں اور تکالیف ضائع نہ جائیں بلکہ یوم آخرت میں انہیں ان کا اجر پورا پورا دیا جائے گا - یوں اللہ کی رحمتوں کے مظاہر میں سے ایک مظہر کا اظہار ہو گا - قیامت میں اللہ کا جو فضل ہو گا کہ برائی کا بدلہ صرف برائی جیسا ہو گا جبکہ نیکی کے بدلے دس گناہ اجر ہو گا بلکہ اللہ چاہے تو اضعاف مضاعفہ ہو گا تو یہ بھی اللہ کی رحمت اور شفقت کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہو گا -

اللہ نے عربوں پر دین اسلام کے ذریعے جو فضل و کرم کیا اور انہیں اس دین کے ذریعے جو باعزت مقام دیا وہ ان پر اللہ کا احسان عظیم ہے - اس سے قبل عرب قیام قیامت کا انکار کرتے تھے - وہ بعینہٖ اسی طرح کے تصورات رکھتے تھے جس طرح دور جدید کی مہذب جاہلیت کے افکار ہیں' یعنی سائنسی جاہلیت - یہی وجہ ہے کہ قیام قیامت کا ذکر اس قدر تاکیدی الفاظ میں کیا گیا اور اس تکذیب کے مقابلے میں اس قدر حروف تاکید لائے گئے -

(لَیَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ (٦: ١٢)) تمہیں قیامت کے دن اٹھایا اور جمع کیا جائے گا جس میں کوئی شک نہیں ہے -"

قیامت کے دن خسارہ صرف ان لوگوں کو ہو گا' جو اس دنیا میں ایمان سے محروم رہیں گے - اہل ایمان کو کوئی خسارہ نہ ہو گا - جبکہ اہل کفر کو پورا پورا خسارہ ہو گا - اس لئے کہ انہوں نے اپنی ذات ہی کو ہار دیا تو وہ کمائیں گے کیا - انسان تو اپنی جان اور اپنے نفس کے لئے کماتا ہے - اگر اس کا نفس اور اس کی زبان ہی چلی جائے تو وہ کمائی کس کے لئے کرے گا - کس کے لئے کمائے گا - (اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (٦: ١٢)) مگر جن لوگوں نے اپنے آپ کو خود تباہی کے خطرے میں مبتلا کر دیا ہے وہ اسے نہیں مانتے -"

انہوں نے اپنی ذات ہی کو خسارے میں ہار دیا - ان کی ذات اور شخصیت ہی چلی گئی' چونکہ ان کے پاس کوئی شخصیت ہی نہ رہی لہٰذا ایمان کون لائے - اہل کفر کی حالت کی یہ نہایت ہی لطیف اور حقیقت پسندانہ تعبیر ہے - اس تعبیر کے اندر ایک نہایت ہی گہری فطری پکار ہے کہ ایمان لاؤ - ایمان کی برکات میں سے ایک بڑی برکت یہ ہے کہ وہ تمہیں ایک ذات اور شخصیت عطا کرتا ہے - یہ لوگ جو ایمان سے قبل اپنی شخصیت گم کر بیٹھے تھے' ان کی فطرت مسخ ہو چکی تھی - ان کی وہ صلاحیتیں جو حق کو قبول کرتی ہیں' ختم ہو گئی تھیں یا معطل ہو گئی تھیں' یا ان پر پردے پڑ گئے تھے اس لئے وہ قبولیت حق کی صلاحیت کھو کر اپنی شخصیت اور شناخت گم کر گئے تھے - یہی وجہ ہے کہ وہ ایمان نہ لائے تھے اس لئے کہ ان کے پاس ان کی ذات اور شخصیت ہی نہ رہی تھی - یہ ان کے عدم اطمینان اور کفر کی ایک نہایت ہی لطیف اور گہری تعبیر ہے - حالانکہ دلائل ایمان موجود تھے اور ایسے اشارات موجود تھے کہ جن کی وجہ سے انسان حق کو قبول کرتا ہے اس امر نے ان کے معاملے میں فیصلہ کن حیثیت اختیار کی - یوں گویا وہ اپنی شخصیت سے ہاتھ دھو کر ایک عظیم خسارے سے دوچار ہوئے -

اب اگلی آیت میں بتایا جاتا ہے کہ لیل و نہار میں جو لوگ اور جو مخلوق ہے یعنی زمان میں' وہ بھی اسی کی ملکیت ہے -

جس طرح پہلی آیات میں بتایا گیا تھا کہ جہاں اور جس جگہ بھی جو متنفس ہے' وہ اللہ کا مملوک ہے - یوں یہ ملکیت زمان و مکان دونوں پر مشتمل ہو گئی - اللہ کا علم تمام مخلوقات کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے-

(وَلَهُ مَا سَكَنَ فِى الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (٦: ١٣)) رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں جو کچھ ٹھہرا ہوا ہے' سب اللہ کا ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے-"

(مَا سَكَنَ) کی زیادہ قریب الفہم تفسیر یہ ہے کہ یہ لفظ سکنیہ سے ہے' جیسا کہ زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے یعنی وہ تمام اشیاء جو لیل و نہار میں پناہ لیتی ہیں یعنی تمام مخلوقات - یہ سب مخلوق اللہ کی ملکیت میں ہے - اس سے پہلی آیت میں بھی یہ قرار دیا گیا - (قُلْ لِّمَنْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلْ لِّلّٰهِ (٦: ١٢)) اس آیت میں تمام مخلوقات کی حصر بلحاظ مکان تھی اب اس آیت میں (وَلَهُ مَا سَكَنَ فِى الَّيْلِ وَالنَّهَارِ (٦: ١٣) آیا ہے جس میں حصر بلحاظ زمان ہے - قرآن کریم کا یہ معروف انداز بیان ہے - ان آیات کی تفسیر میں بہت کچھ لکھا گیا ہے - میرے خیال میں یہ تاویل سب سے بہتر ہے کہ ایک آیت میں حصر زمانی اور دوسری میں حصر مکانی ہے -

اس کے بعد ایک تبصرہ یہ آتا ہے کہ اللہ سمیع و علیم ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کے اعتبار سے بھی اللہ تمام مخلوقات کا احاطہ کئے ہوئے ہے - اس آیت کے جواب میں مشرکین جو بھی کہتے ہیں وہ اللہ کے علم میں ہے یعنی وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ اللہ وحدہ ہی مالک ہے' اس کے باوجود وہ بعض مویشیوں' ان کے بچوں اور بعض پھلوں کو شرکاء کے لئے مخصوص کرتے تھے - اس سورہ کے آخر میں یہ بحث آرہی ہے - یہاں اللہ تعالیٰ انسانوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ تمام مخلوقات پر اللہ کا حق ملکیت تسلیم کریں تاکہ بعد میں انہیں یہ سمجھایا جائے کہ اللہ کی مخلوقات میں سے بعض چیزیں تم شرکاء کے کھاتے میں کس کی اجازت سے ڈالتے ہو - جبکہ اسی فقرے میں آنے والی یہ بات بھی اس سے ثابت کرنا مطلوب ہے کہ جب مالک وہ ہے تو ولی اور حاکم بھی وہی ہے - اور وہ اس لئے حاکم ہے کہ وہی مالک ہے ہر اس چیز کا جو زمان و مکان کے اندر ہے اور جو اللہ کے علم کے اندر ہے -

---ooo---

اب جبکہ یہ بات تسلیم ہو گئی کہ وہی خالق ہے اور وہی مالک ہے تو ان لوگوں پر سخت نکیر و تنقید کی جاتی ہے جو اللہ کے سوا کسی اور سے امداد طلب کرتے ہیں - جو اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرتے ہیں اور کسی اور کو ولی اور حاکم بناتے ہیں - چنانچہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ صورت حال اسلام سے متضاد ہے - یہ صریح شرک ہے اور اسلام کے ساتھ اس کا یکجا جمع ہونا ممکن نہیں ہے - یہاں اللہ کی صفات میں سے اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے فاطرالسموت والارض' رازق و مطعم' نافع و ضار اور قاہر و قادر کے الفاظ لائے جاتے ہیں' جبکہ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ خوفناک سزا بھی دیتا ہے - اس سے فضا پر ایک دم جلال باری تعالیٰ کے سائے پڑ جاتے ہیں اور یہ انسان ڈر جاتا ہے اور یہ نہایت ہی زوردار انداز میں کہا جاتا ہے :

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ
يُطْعِمُ وَ لَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَ لَا
تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ
يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ
الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ؕ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ
بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾ وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ
الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۸﴾

"کہو اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنالوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا خالق ہے اور جو روزی دیتا ہے۔ روزی لیتا نہیں ہے؟ کہو مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سرتسلیم خم کروں اور (تاکید کی گئی ہے کہ کوئی شرک کرتا ہے تو کرے) تو بہرحال مشرکوں میں شامل نہ ہو۔ کہو' اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے (خوفناک) دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی۔ اس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے۔ اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے' اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنے بندوں پر کامل اختیارات رکھتا ہے اور دانا اور باخبر ہے۔"

یہ مسئلہ کہ اللہ وحدہ ولی ہے لفظ ولی کے تمام معنوں میں ہے۔ یعنی وہ وحدہ رب ہے۔ وہ وحدہ معبود ہے۔ تمام لوگ اسی کی بندگی کرتے ہیں اور تمام اس کے اقتدار اعلیٰ کے تابع ہیں۔ وہ عبادت بھی اس کی کرتے ہیں اور عبادت کے مراسم بھی اس کے سامنے ادا کرتے ہیں۔ صرف اسی کو ناصر اور مددگار سمجھتے ہیں' اسی پر اعتماد کرتے ہیں' مصائب میں اسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ اسلام کا اساسی عقیدہ ہے۔ انسان اگر صرف اللہ کو اپنا ولی سمجھے گا' ان تمام مفہومات کے ساتھ تو پھر وہ مسلمان ہو گا اور اگر اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی ولی بنائے گا تو پھر وہ مشرک ہو گا۔ شرک اور اللہ وحدہ کی ولایت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

اس آیت میں اس حقیقت کو نہایت ہی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ ذرا دوبارہ غور کریں۔

(قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ قُلْ اِنِّي اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۶ : ۱۴)) "کہو اللہ کو چھوڑ کر

کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنالوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا خالق ہے اور جو روزی دیتا ہے۔ روزی لیتا نہیں ہے؟ کہو ' مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سرتسلیم خم کروں (اور تاکید کی گئی ہے کہ کوئی شرک کرتا ہے تو کرے) تو بہرحال مشرکوں میں شامل نہ ہو۔"

یہ ایک نہایت ہی گہری 'فطری اور منطقی سوچ ہے۔ کون ولی ہو گا اور ولایت کس کے لئے خالص ہو گی؟ اگر ہم زمین و آسمانوں کے بنانے والے اور ان کو وجود میں لانے والے کو اپنا ولی نہ بنائیں گے تو پھر کس کو بنائیں گے۔ زمین و آسمان میں رہنے والی تمام مخلوقات کو رزق دینے والا ولی نہ ہو گا تو اور کون ہو گا۔ جو تمام مخلوقات کو رزق دیتا ہے اور خود کسی کا محتاج نہیں ہے۔

کہو کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو ولی بنالوں ' جبکہ اللہ کی ذات ان صفات کی مالک ہے جن کا ذکر ہوا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیا دلیل اور منطق ہے 'جس کی وجہ سے کوئی انسان مجبور ہو کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کو ولی بنائے۔ انسان کسی کو ولی اور سرپرست اس لئے بناتا ہے کہ وہ اس کی مدد کرتا ہے۔ اللہ جب زمین و آسمانوں کا بنانے والا ہے وہ زمین و آسمان دونوں پر صاحب اقتدار ہے 'اگر ولایت اور سرپرستی کا مقصد یہ ہے کہ سرپرست رزق اور طعام دے تو ذات باری تو تمام جہان والوں کی رازق اور مطعم ہے ' خواہ زمین میں ہوں یا آسمانوں میں۔ اب اللہ کے سوا کسی اور کو ولی اور سرپرست بنانے کا فائدہ کیا ہو گا؟

پھر یہ کہ "کہو ' مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سرتسلیم خم کروں اور مجھے تاکید کی گئی ہے کہ تو بہرحال مشرکین میں شامل نہ ہو۔" معلوم ہوا کہ سرتسلیم خم کرنے اور شرک سے باز رہنے کے لازمی معنی یہ ہیں کہ اللہ کے سوا کسی اور کو سرپرست نہ بنایا جائے۔ دوسرے زاویے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو سرپرست بنانے کا مقصد یہ ہے کہ گویا ہم شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں اور شرک ہرگز اسلام نہیں ہو سکتا۔

یہ ایک واضح اور متعین مسئلہ ہے۔ اس کے بارے میں کوئی دو رنگی اور نرمی نہیں ہو سکتی۔ اس معاملے میں ہم صرف دو موقف اختیار کر سکتے ہیں یا تو اللہ کو وحدہ لا شریک سمجھیں گے ' صرف اسی کی طرف متوجہ ہوں گے ' اسی کی اطاعت کریں گے ' اسی سے ڈریں گے ' خشوع و خضوع کے ساتھ اسی کی عبادت کریں گے ' صرف اسی سے امداد طلب کریں گے ' صرف اسی کو اپنا حاکم اور مقتدر اعلیٰ اور قانون ساز سمجھیں گے۔ اپنی زندگی کے پورے امور میں اس کی اطاعت کریں گے ' اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کریں گے ' اپنے دل اور اپنے عمل میں ' اپنے قانون اور طرز عمل میں اسی کو اپنا ولی اور سرپرست سمجھیں گے اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کریں گے تو ہمارا یہ رویہ عین اسلام ہو گا یا پھر ہم اس کے بندوں میں سے کسی کو ان معاملات میں اس کے ساتھ شریک کریں گے تو یہ رویہ مشرکانہ ہو گا اور شرک وہ بیماری اور وہ حقیقت ہے جو اسلام کے ساتھ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی۔

اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ مشرکین کے سامنے اپنی اس ناپسندیدگی کا اظہار برملا کر دیں کیونکہ وہ آپ کو اس بات پر آمادہ کر رہے تھے کہ آپ ان کے ساتھ اس نظریاتی مسئلے میں نرمی اور مداہنت کریں اور ان کے الہوں کو بھی اپنے اس جدید دین میں کوئی نہ کوئی حیثیت دے دیں۔ اس کے بدلے میں وہ اس دین میں داخل ہو جائیں گے۔ یوں کہ آپ ان کے الہوں کو الوہیت کے بعض خصائص عطا کر دیں تاکہ مشرکین کی حیثیت اور مرتبہ اور ان

کے مفادات اپنی جگہ پر قائم رہیں - وہ سب سے پہلے اور سرفہرست یہ چاہتے تھے کہ ان کے الٰہوں کو حرام کرنے اور حلال کرنے کا حق دیا جائے اور اس کے عوض وہ حضور ؐ کی مخالفت ترک کر دیں گے' آپ کو رئیس مکہ بھی تسلیم کریں گے' آپ کو مالی واجبات بھی ادا کریں گے اور اپنی خوبصورت ترین لڑکیاں بھی آپ کے نکاح میں دے دیں گے -

مشرکین مکہ ایک طرف تو آپ ؐ کو اذیت دیتے تھے' مسلمانوں پر مظالم ڈھاتے تھے اور دوسری جانب نرمی اور مصالحت کا ہاتھ بڑھا کر آپ کو پھسلانا بھی چاہتے تھے - ان کی اس پالیسی کی وجہ ہی سے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ ؐ ان کے سامنے ان باتوں سے اپنی شدید ترین نفرت کا اظہار کریں اور فیصلہ کن انداز میں اور دو ٹوک الفاظ میں اعلان کر دیں کہ آپ اس نظریاتی معاملے میں کوئی نرمی نہیں کر سکتے -

(قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۱۵) مَنْ یُّصْرَفْ عَنْهُ یَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِیْنُ (۱۶) (۶: ۱۵، ۱۶)) "کہو' اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے خوفناک دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی - اس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے -"

آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس معاملے کی اہمیت اور سنجیدگی کا اعلان کر دیں اور یہ کہہ دیں کہ اگر وہ سرمو انحراف بھی کریں تو خود ان پر عذاب الٰہی نازل ہو سکتا ہے - خصوصاً اسلام اور توحید کے معاملے میں اس طرح خود اہل شرک کے دلوں میں خوف اور رعب پیدا ہو گا -

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے احکام کے بارے میں جس قدر حساس تھے یہ اس کی بہترین تصویر کشی ہے - نظر آتا ہے کہ حضور ؐ عذاب الٰہی سے بہت ہی ڈرتے تھے - اللہ کا عذاب اس قدر خوفناک ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی سے ٹل جائے تو اس کا محض ٹلنا ہی فوز عظیم تصور ہوتا ہے - اس تصویری احساس کے علاوہ اس میں اہل شرک کے لئے دلوں کو ہلا دینے والی ایک تنبیہ بھی ہے - اس دور کے مشرکین کے لئے بھی اور بعد کے ادوار کے مشرکین کے لئے بھی - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا عذاب کس قدر ہولناک ہو گا - یہ عذاب اپنے شکار کو بسہولت تلاش کرے گا - اسے گھیر لے گا اور اس کو جھپٹ کر اپنے قبضے میں لے لے گا - صرف قادر مطلق ہی اسے بچا سکتا ہے - چونکہ عذاب الٰہی کی باگیں اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہیں' اسے صرف وہی پھیر سکتا ہے - انسان جب اس تصویر کشی پر غور کرتا ہے تو اس کی سانس رکنے لگتی ہے - یہ آخری گھڑی کس قدر ہوش ربا ہے - (تفصیلات کے لئے دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی میں طریقہ قرآن) -

سوال یہ ہے کہ کوئی شخص غیر اللہ کو ولی اور سرپرست کیوں بنائے ؟ اپنے آپ کو اس شرک میں مبتلا کیوں کرے اور اس کے نتیجے میں اپنے آپ کو کیوں اس قدر ہولناک عذاب میں مبتلا کرے ؟ کیا وہ اپنے آپ کو کوئی نفع پہنچانے کے لئے ایسا کرے' یا کسی دنیاوی مضرت سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ایسا کرے - یا اس لئے کرے کہ مشکلات میں لوگ امداد کریں یا بدحالی میں کوئی نفع دیں - حالانکہ نفع و نقصان تو صرف اللہ کے ہاتھ میں ہیں - عالم اسباب میں وہ اللہ کی ذات ہی ہے جو قدرتوں والی ہے - تمام انسان اس کے قبضہ قدرت اور کنٹرول میں ہیں - عطا کرنے اور روکنے میں صرف اس کی حکیمانہ پالیسی ہی کارفرما ہوتی ہے -

(وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۱۷) وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ (۱۸)) (۶:۱۷، ۱۸) ”اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنے بندوں پر کامل اختیارات رکھتا ہے اور دانا اور باخبر ہے۔“

وہ نفس انسانی کے ہر خیال اور اس کے سینے کے ہر وسوسے کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ دلی خواہشات اور اندرونی اندیشوں سے بھی باخبر ہے۔ وہ شکوک و شبہات کی تمام شکلوں کو جانتا ہے اور ان تمام باتوں کو نظریاتی روشنی سے حل کرتا ہے۔ برہان و دلیل سے انسانی تصور کو واضح کرتا ہے اور اپنی خدائی کی صحیح معرفت عطا کرتا ہے۔ چونکہ یہ ایک اہم مسئلہ ہے اس لئے قرآن کریم دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔

اب یہ لہر اپنے عروج پر ہے اور اس سے نہایت ہی گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ بات شہادت' ثبوت اور سرزنش تک آ پہنچتی ہے۔ اب جدائی اور براءت کا اعلان کر دیا جاتا ہے کہ بس ہم تمہارے ساتھ شرکیہ امور میں شریک نہیں ہو سکتے۔ نہایت ہی بلند آواز میں اور نہایت ہی رعب دار اور فیصلہ کن اعلان میں :

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ۫ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ۫ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۘ﴿۱۹﴾

”ان سے پوچھو' کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے؟..... کہو میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے' اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے' سب کو متنبہ کر دوں۔ کیا واقعی تم لوگ یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں؟ کہو' میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں دے سکتا۔ کہو' خدا تو وہی ایک ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔“

بات کا جگہ جگہ رکنا' اور پھر مؤثر آغاز اور ایک ہی آیت میں یہ زیروبم ایک عجیب انداز کلام ہے۔ ایک لفظ میں ایک موقف بیان ہو جاتا ہے' ایک ایک لفظ ایک منظر کو پیش کرتا ہے جس سے شبہات و خلجانات اور ان کی نوعیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

بذات خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا جاتا ہے اور احکام دیئے جاتے ہیں۔ پھر حضورؐ ان احکامات کے تحت ان مشرکین سے مخاطب ہوتے ہیں جنہوں نے اللہ کے سوا اور لوگوں کو اپنا سرپرست بنا رکھا ہے۔ وہ اللہ کے مخصوص حقوق میں بعض حقوق غیر اللہ کو دیتے ہیں اور ان سرپرستوں کو اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ پھر یہ لوگ حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ آپ ؐ ان کو ان کی اس حالت پر برقرار رکھیں تاکہ وہ اس کے بدلے حضور ؐ کے دین میں شریک ہو جائیں۔ ان کے خیال میں ایسا ممکن تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اسلام اور شرک ایک ہی دل میں جمع ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں ایک سوچ دل میں بٹھالی تھی۔ آج کے دور جدید میں بھی لوگوں کے دلوں میں اس قسم کی سوچ بیٹھی ہوئی ہے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ کے حوالے سے مسلمان بھی ہو سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے معاملات میں غیر اللہ سے ہدایات بھی لے سکتے ہیں۔ وہ غیر اللہ کے مطیع فرمان بھی ہو سکتے ہیں اور غیر اللہ سے غیبی امداد بھی لے سکتے ہیں اور غیر اللہ کو ولی اور سرپرست بھی بنا سکتے ہیں۔

حضور اب یہاں مشرکین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ یہاں آکر آپ ؐ کے دین اور ان کے ادیان کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔ آپ کی توحید اور ان کا شرک اب اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ آپ ؐ کا اسلام اور ان کی جاہلیت ایک جگہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ اب آپ ان کے ساتھ فیصلہ کر دیتے ہیں: "اب میرے اور تمہارے درمیان اتحاد و اتصال ممکن نہیں ہے۔ اتحاد صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ تم لوگ اپنا دین چھوڑ کر میرے دین میں شامل ہو جاؤ ورنہ۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ اتحاد ہو سکے کیونکہ آغاز ہی سے دونوں کی راہیں جدا ہو چکی ہیں۔"

حضور ؐ ان کے ساتھ یوں ہمکلام ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ کون سی سند اور شہادت ہے؟ ذرا لائیں میدان میں کوئی شہادت اور کوئی ثبوت اپنے موقف پر۔

(قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَھَادَۃً (۶:۱۹)) ان سے پوچھو 'کس چیز کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے۔"

اس پوری کائنات میں سب سے بڑی شہادت کیا ہے؟ وہ کون سی شہادت ہے جسے درجہ تصدیق حاصل ہے؟ مقدمے میں کون سا ثبوت فائنل ہے جس کے بعد کسی ثبوت کی ضرورت نہ ہو؟

یہ نہایت ہی عمومی سوال ہے۔ شَیْءٍ کے لفظ سے سوال کیا گیا ہے یعنی پوری کائنات کی کوئی شے ثبوت میں لاؤ۔ جو سب سے بڑی شہادت ہو۔

حضور ؐ کو جس طرح حکم دیا جاتا ہے کہ ان سے پوچھو 'اسی طرح آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان کو جواب بھی دے دو۔ اس لئے کہ خود مخالفین اس بات کے معترف تھے کہ دراصل جواب وہی ہے جو حضور ؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ یہ جواب دے دیں۔ (قُلِ اللّٰہُ (۶:۱۹)) "کہو اللہ" ہاں! اللہ بے شک سب سے بڑا گواہ ہے۔ وہی تو ہے جو اس سچائی کو بیان کر رہا ہے۔ وہی تو ہے جو سب سے بھلے فیصلے کرتا ہے اور اس کی گواہی کے بعد کوئی گواہی نہیں ہے۔ اس کی بات کے بعد کسی بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جب اللہ بات کر دے تو تمام باتیں ختم ہو جاتی ہیں اور معاملے کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

جب اس حقیقت کا اعلان کر دیا گیا کہ اللہ کی شہادت سب سے برتر شہادت ہے تو اب اس بات کا اعلان کیا جاتا ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان بس اللہ گواہ ہے اور اللہ ہی اس مسئلے کا فیصلہ کرے گا۔

(شَھِیْدٌ بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ (۶:۱۹)) "میرے اور تمہارے درمیان وہ گواہ ہے۔" مطلب یہ ہوا (ھُوَ شَھِیْدٌ)۔ میرے اور تمہارے درمیان وہ گواہ ہے۔ اس مقام پر لفظ اللہ کے بعد وقف مناسب ہے۔ کیونکہ یہاں مختصر مختصر فقروں میں بات ہو رہی ہے۔ یعنی لفظ اللہ کے بعد وقف وصل کے مقابلے میں زیادہ مناسب ہے۔ اگر وصل ہو تو اللہ

(شَهِيدٌ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ (٦: ١٩)) ہو گا۔

جب یہ اصول متعین ہو گیا کہ اس معاملے میں فیصلہ صرف اللہ کا فیصلہ ہے تو یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کی شہادت قرآن کی شکل میں آگئی ہے۔ اللہ نے یہ قرآن کریم محض اس لئے نازل کیا ہے کہ میں تمہیں اور ان تمام دوسرے لوگوں کو ڈراؤں جن تک وہ پہنچے۔ آپ کی زندگی میں یا آپ کی وفات کے بعد۔ لہذا قرآن کریم ان لوگوں پر بھی حجت ہو گا جن تک حضور ؐ کی موجودگی میں پہنچا یا آپ ؐ کے بعد جن تک پہنچا۔ اس لئے کہ انسانی سوچ کے اس اساسی مسئلے میں قرآن ہی فیصلہ کن شہادت ہے اور اسی سوچ پر دنیا اور آخرت کی نجات کا مدار ہے اس پر انسانی وجود قائم ہے۔

وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ (٦: ١٩) "اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے، سب کو متنبہ کر دوں۔" ہر وہ شخص جس تک قرآن کی تعلیمات پہنچ جائیں، کسی ایسی زبان میں جسے وہ سمجھتا ہو اور اس سے وہ دعوت قرآن اخذ کر سکتا ہو تو اس پر حجت قائم ہو گئی۔ حضور ؐ کا فریضہ انذار ادا ہو گیا، اور اگر وہ نافرمانی کرے اور تکذیب کرے تو اس کے لئے عذاب لازم ہو گیا۔ (ہاں جو شخص عربی زبان نہیں جانتا اور اس کی زبان میں قرآن کی دعوت بھی موجود نہیں ہے تو اس پر حجت قائم نہ ہو گی اور اس بات کا مؤاخذہ اہل اسلام سے ہو گا کیونکہ انہوں نے اس زبان میں قرآن کے مفہوم کو منتقل نہ کیا جسے وہ سمجھتا ہے۔ اگر اس کی زبان میں قرآن کا ترجمہ کر دیا گیا ہو تو اس پر حجت تمام ہو گی)۔

جب یہ اعلان کر دیا گیا کہ اللہ کی شہادت قرآن کریم کے اندر درج ہے تو اس شہادت کا مضمون بھی بتا دیا گیا۔ اور یہ چیلنج کی صورت میں اور سخت تنبیہ کے انداز میں بتا دیا گیا وہ لوگ جو شہادت دیتے تھے اس پر ان کی سرزنش کی گئی کہ کیا تم اللہ کے مقابلے میں خود اپنی شہادت پیش کرتے ہو؟ بتا دیا گیا کہ ہم تمہاری اس شہادت کو مسترد کرتے ہیں۔ آپ اس کے مخالف موقف کا اعلان فرما دیتے ہیں اور اعلان کر دیتے ہیں کہ اللہ کی ذات وحدہ لاشریک ہے۔ صرف اللہ ہی الہ ہے اور اس معاملے میں ہمارے اور تمہارے درمیان مکمل جدائی ہے، ہماری راہیں مختلف ہیں۔ نہایت ہی تاکید کی اور فیصلہ کن الفاظ میں اپنی براءت کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔

(أَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ آلِهَةً أُخْرَىٰ قُل لَّا أَشْهَدُ قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَإِنَّنِي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ (٦: ١٩)) "کیا واقعی تم لوگ یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں؟ کہو، میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں دے سکتا۔ کہو، خدا تو وہی ایک ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔" قرآن کی یہ آیات، ان آیات کے یہ مقطعے اور ان کی یہ ضربات انسانی دل کو اس قدر جھنجوڑتی ہیں کہ الفاظ میں ان کے اثرات کو بیان کرنا ہی محال ہے اس لئے میں مناسب نہیں سمجھتا کہ اپنے الفاظ کے ذریعے ان کے اثرات اور ان کی خوبصورتی کو محدود کر دوں کیونکہ کوئی تبصرہ ان کے حسن کو بیان نہیں کر سکتا۔

---ooo---

آیات کے اس مجموعے یا اس لہر میں جس مسئلے کو لیا گیا ہے اس پر قدرے بحث ضروری ہے۔ یہ مسئلہ سرپرستی،

توحید اور مشرکین کے ساتھ مکمل جدائی کا مسئلہ ہے - یہ اسلامی نظریہ حیات کا اساسی مسئلہ ہے اور اس دین میں یہ ایک عظیم اور اہم حقیقت ہے - آج کے اسلامی گروہ اور اسلامی جماعت کو چاہئے کہ وہ اس مسئلے پر غور کرے' اس سبق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ذرا طویل وقفہ کرے اور تامل وتدبر کرے -

اس وقت تحریک اسلامی کا مقابلہ پورے کرۂ ارض پر چھائے ہوئے نظام جاہلیت کے ساتھ ہے - جس طرح نزول قرآن کے وقت برپا ہونے والی تحریک اسلامی کا مقابلہ اس وقت کی جاہلیت سے تھا - اس لئے آج کی تحریک اسلامی کو چاہئے کہ وہ اپنا موقف نزول قرآن کے وقت کی تحریک اسلامی کے موقف کی روشنی میں متعین کرے تاکہ وہ اس روشنی کی مدد سے اپنی راہ کو اچھی طرح دیکھ سکے - چنانچہ تحریک اسلامی کی یہ ضرورت ہے کہ وہ ان آیات پر خوب اچھی طرح طویل غور و فکر کرے اور پہلی تحریک اسلامی کے نقوش پا سے راہنمائی حاصل کرے -

زمانہ لوٹ کر اسی مقام پر آگیا ہے جہاں پہلی تحریک اسلامی کے وقت تھا - انسانیت اسی مقام پر آگئی ہے جس پر وہ نزول قرآن کے وقت تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ و موجود تھے - ان پر اسلام نازل ہوا تھا اور اس کی اساس اس بات کی شہادت پر تھی کہ اللہ ایک ہے' اور اس کے سوا کوئی اور الہٰ نہیں ہے - یہ شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں ہے' اسی طرح ہم نے ادا کرنی ہے جس طرح اسے حضرت ربعی ابن عامر نے ادا کیا تھا' جب وہ مسلمانوں کے کمانڈر انچیف کے ایلچی کے طور پر ایرانیوں کے کمانڈر انچیف رستم کے ہاں گئے تھے اور جنہوں نے حضرت ربعی سے پوچھا تھا "تم نے کیوں ہم لوگوں پر لشکرکشی کی ہے؟" ان کا جواب یہ تھا: "اللہ نے ہمیں اس لئے اٹھایا ہے کہ وہ اپنے جن بندوں کو انسانوں کی غلامی سے نکالنا چاہتا ہے انہیں اس غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی بندگی میں داخل کر دے - پھر انہیں دنیا اور آخرت کی وسعتوں کے اندر لے جائے اور دوسرے ادیان کے مظالم سے نکال کر اسلام کے نظام عدل میں داخل کر دے -" حضرت ربعی ؓ نے یہ شہادت یہ جانتے ہوئے دی کہ رستم اور اس کے ساتھی کسی کی پوجا یہ جانتے ہوئے نہ کرتے تھے کہ وہ اللہ ہے اور ان کا خالق ہے یا اس کائنات کا خالق ہے اور نہ یہ لوگ کسریٰ کے سامنے معروف مراسم عبودیت بجالاتے تھے - بلکہ وہ قانون اور شریعت کسریٰ سے اخذ کرتے تھے - اس طرح وہ کسریٰ کی بندگی کرتے تھے جو اسلام کے منافی تھی - ربعی ؓ نے ان کو بتایا کہ وہ لوگوں کو انسانی نظاموں سے نکال کر اللہ کے نظام حاکمیت میں داخل کرنا چاہتے ہیں جس میں اطاعت اور بندگی صرف اللہ وحدہ کے لئے مخصوص ہے اور اس کے مقابلے میں اسلامی نظام زندگی ہے جس کے اندر حاکمیت' اطاعت اور بندگی صرف اللہ وحدہ کے لئے ہے -

آج کل زمانہ اس مقام پر لوٹ آیا ہے جس پر کبھی اسلام نے لوگوں کے سامنے (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کی شہادت پیش کی تھی - آج انسانیت لوٹ کر بندوں کی غلامی میں داخل ہوگئی ہے' وہ دوسرے ادیان کے مظالم سہ رہی ہے اور اس عظیم شہادت سے اس نے روگردانی اختیار کر لی ہے - اگرچہ انسانیت کی آبادی کا ایک حصہ مسجدوں سے اذانوں کے ذریعے سے روز و شب (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کی شہادت نشر کر رہا ہے لیکن اسے معلوم نہیں ہے کہ اس شہادت اور کلمہ شہادت کا مدلول اور مفہوم کیا ہے؟ نہ یہ شہادت دیتے وقت یہ لوگ اس مفہوم کو ذہن میں لاتے ہیں - نہ یہ لوگ اس حاکمیت کا انکار کرتے ہیں جو کچھ لوگوں نے اپنے لئے مخصوص کر لی ہے حالانکہ ان کا یہ موقف اعلان خدائی کے برابر ہے چاہے وہ اپنے اس موقف کا اعلان کریں یا نہ کریں - مثلاً دنیا میں مروج مجالس قانون ساز کا جو حال ہے یا کچھ اقوام کا حال

ہے۔ اس معاملے میں افراد و مجالس کا حکم ایک ہی ہے۔ افراد اور اقوام کی حیثیت ایک ہی ہے۔ یہ افراد اور یہ مجالس اور یہ اقوام چونکہ الٰہ نہیں ہیں اس لئے انہیں انسانوں کے لئے قانون سازی کا کوئی حق نہیں ہے الا یہ کہ انسانیت مرتد ہو کر (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) سے انکار کر دے اور وہ یہ اختیارات اللہ کے سوا کسی اور کو دے دے تو اس صورت میں وہ عقیدۂ توحید کی منکر ہوگی اور صرف اللہ اس کا والی اور سرپرست نہ ہوگا۔

اس وقت صورت حالات یہ ہے کہ پوری انسانیت' جس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو رات اور دن مساجد سے اذانوں کے ذریعے سے (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) کا مفہوم نہ سمجھتے ہوئے اس کا اعلان کرتے ہیں۔ یہ لوگ قیامت کے دن سب سے بڑے گناہگار اور زیادہ عذاب کے مستحق ہوں گے' اس لئے کہ انہوں نے مسلمان ہونے کے بعد لوٹ کر انسانوں کی بندگی اختیار کر لی ہے۔ اس کے بعد کہ ان پر یہ سچائی اتری اور ان تک پہنچ گئی اور اس کے بعد کہ وہ دین اسلام میں داخل تھے' لہٰذا اس دور میں تحریک اسلامی اس بات کی زیادہ محتاج ہے کہ وہ ان آیات پر اچھی طرح غور کرے :

(قُلْ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَتَّخِذُ وَلِیًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَھُوَ یُطْعِمُ وَلَا یُطْعَمُ قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (٦: ١٤))

"کہو اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنالوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین اور آسمان کا خالق ہے اور جو روزی دیتا ہے' روزی لیتا نہیں ہے؟ کہو مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سرتسلیم خم کر دوں (مجھے کہا گیا) تو بہرحال مشرکین میں شامل نہ ہو۔" ضرورت اس امر کی ہے کہ تحریک اسلامی کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو ولی اور سرپرست بنانا' چاہے اس کا جو مفہوم بھی لیا جائے' اس کا مطلب ہو گا اس کے سامنے عاجزی کرنا' اس کی اطاعت کرنا' اس سے نصرت طلب کرنا اور اس سے استعانت طلب کرنا۔ یہ سب امور اسلام کے ساتھ متضاد ہیں اس لئے کہ یہ امور شرکیہ ہیں اور اسلام آیا ہی اس لئے ہے کہ لوگوں کو ان شرکیہ امور سے نکالا جائے۔ تحریک اسلامی کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ولایت کا اظہار سب سے پہلے جس بات میں ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی اپنے نظریہ یا اپنی زندگی کے نظام میں غیر اللہ کی حاکمیت کو قبول کر لے۔ یہ وہ بات ہے جس میں اس وقت کرۂ ارض پر بسنے والی پوری انسانیت مبتلا ہے۔ بلا استثناء۔ اور تاکہ تحریک اسلامی کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اس کے سامنے جو ہدف ہے وہ یہ ہے کہ اس نے عوام الناس کو لوگوں کی بندگی سے نکال کر صرف اللہ وحدہ کی بندگی میں داخل کرنا ہے اور یہ کہ اسے اسی قسم کی جاہلیت سے واسطہ درپیش ہے جس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلی تحریک اسلامی کو سابقہ درپیش تھا جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں۔

نیز تحریک اسلامی کو اس شراب ایمانی کی بھی اشد ضرورت ہے جو یہ آیات قلب مومن میں انڈیل رہی ہیں جبکہ دل مومن کسی جاہلیت کے سامنے صف آرا ہو:

(قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (١٥) مَنْ یُّصْرَفْ عَنْہُ

يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ (١٦) وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (١٧) وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ (١٨) (٦:١٥ تا ١٨))

دوکہو' اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی - اس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے - اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے' اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے - وہ اپنے بندوں پر کامل اختیار رکھتا ہے اور دانا و باخبر ہے -" جو تحریک بھی جاہلیت اور اس کی طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کر رہی ہو' جو جاہلیت کے جبر و قہر اور عناد و سرکشی کا مقابلہ کر رہی ہو اور جو جاہلیت کی سازشوں اور کینہ پروریوں کے سامنے صف آرا ہو اور اس کے پھیلائے ہوئے فساد اور فسق و فجور کا دفعیہ چاہتی ہو اس کے لئے اس تمام شر کے مقابلے کے لئے ان حقائق کا ادراک ضروری ہے اور اس تحریک کے اندر یہ جذبات اور یہ شعور موجود ہونا چاہئے - ورنہ اس بات کا خطرہ ہے کہ وہ غیراللہ کو اپنا سرپرست بنالے اور یہ نہ ہو کہ اس نافرمانی کے نتیجے میں وہ عذاب اخروی کی سزاوار ہو جائے - تحریک اسلامی کو یہ یقین کر لینا چاہئے کہ نفع و نقصان صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور یہ کہ اللہ کو اپنے بندوں پر پورا پورا کنٹرول حاصل ہے - اس کے فیصلے کے بعد کوئی فیصلہ نہیں ہے اور نہ اس کے حکم اور فیصلے کو کوئی رد کر سکتا ہے - جس دل میں یہ یقین اور یہ شعور نہ ہو وہ احیائے اسلام کی مشکلات کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا جبکہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ جاہلیت کے قائم نظام کے مقابلے میں ہو رہی ہو اس لئے کہ احیائے اسلام کی تحریک کو جاہلیت کبھی بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتی - اس کی راہ میں ہمیشہ پہاڑ جیسی مشکلات حائل کی جاتی رہی ہیں -

یہ یقین کر لینے کے بعد کہ آج کرۂ ارض پر تحریک اسلامی کا نصب العین کس قدر اہم اور مشکل ہے' اپنے نظریے اور عقیدے کے صحیح ادراک کے بعد اور اس کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کہ اللہ سبحانہ وحدہ لاشریک ہے اور اس توحید کے کئی پہلو ہیں اور ان تمام امور کے ساتھ ساتھ یہ شعور کہ اس راہ میں کیا کیا مشکلات ہیں - آج کی تحریک اسلامی کو اللہ کی جانب سے شہادت اور جاہلیت کے ساتھ مکمل بائیکاٹ اور فیصلہ کن علیحدگی کی ضرورت ہے کیونکہ جاہلیت بعینہ اسی شرک میں مبتلا ہے جس میں قرون اولیٰ کی جاہلیت مبتلا تھی - اس لئے تحریک اسلامی کو چاہئے کہ وہ ویسا ہی اعلان کر دے جس اعلان کے کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا - جس طرح رسول ؐ نے اس وقت کی جاہلیت کے منہ پر اس کے نظریات مار دیئے تھے آج بھی تحریک کو چاہئے کہ وہ دور جدید کی جاہلیت کے غلط افکار اس کے منہ پر دے مارے اور اللہ رب العالمین کے ان احکام کو نافذ کر دے -

(قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ شَهِيْدٌ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى قُلْ لَّا اَشْهَدُ قُلْ اِنَّمَا

هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (٦ : ١٩) "ان سے پوچھو کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے؟ کہو اللہ..... میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے۔ اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے، سب کو متنبہ کر دوں، کیا واقعی تم لوگ یہ شہادت دے سکتے ہو؟ کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں؟ کہو میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں دے سکتا۔ کہو خدا تو وہی ایک خدا ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔" تحریک اسلامی کا یہ فرض ہے کہ وہ اس وقت کرۂ ارض پر چھائی ہوئی جاہلیت کے مقابلے میں یہ موقف اختیار کرے۔ اسے چاہئے کہ وہ اس کے مقابلے میں اپنے سچے نظریات کا اعلان ببانگ دہل کرتے اور فیصلہ دل دہلانے دینے والی رعب دار آواز میں کرے۔ اس کے بعد نتائج اللہ پر چھوڑ دے جو ہر چیز پر قادر ہے۔ اسے اپنے بندوں کے معاملات پر پورا پورا کنٹرول ہے۔ اللہ کے بندے، جس میں یہ جابر طاغوتی طاقتیں بھی شامل ہیں، اللہ کے مقابلے میں ایک مکھی جتنی طاقت بھی نہیں رکھتے۔ اگر ان سے مکھی بھی کوئی چیز لے بھاگے تو یہ اس سے نہیں چھڑا سکتے۔ یہ جابر قوتیں اللہ کے اذن کے بغیر کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں نہ یہ قوتیں کسی کو کوئی نفع پہنچا سکتی ہیں۔ اللہ تمام امور کائنات پر پوری طرح غالب ہے لیکن لوگوں کو اللہ کا غلبہ نظر نہیں آتا۔

تحریک اسلامی کو اچھی طرح یقین کر لینا چاہئے کہ اسے حسب وعدہ الٰہی تمکن فی الارض اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک وہ جاہلیت سے مقابلے میں اپنی زندگی کی راہیں بالکل الگ نہیں کر لیتی، اس کے ساتھ مکمل طور پر قطع تعلق نہیں کر لیتی، جب تک طاغوتی قوتوں کے مقابلے میں تحریک اسلامی اعلان حق نہیں کر دیتی اور جب تک وہ جاہلیت کے مقابلے میں اس اسلوب پر شہادت حق نہیں دے دیتی جس طرح ان آیات میں اسے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جب تک وہ جاہلیت کو اسی انداز میں چیلنج نہیں کرتی اور اس کے ساتھ مکمل بائیکاٹ نہیں کر دیتی اور اس سے اعلان برأت نہیں کر دیتی۔

قرآن کریم تاریخ کے ایک مخصوص دور کی اصلاح کے لئے مخصوص نہ تھا۔ قرآنی ہدایات مکان و زمان کے قیود سے آزاد ہیں۔ قرآن تو ایک منہاج انقلاب ہے، اور جب بھی کوئی تحریک اس منہاج کو اپنائے گی اسے اسی طرح کام کرنا پڑے گا جس طرح پہلی تحریک اسلامی کو کرنا پڑا۔ آج ہمیں ویسے ہی حالات درپیش ہیں جیسے نزول قرآن کے وقت درپیش تھے۔ زمانہ اسی مقام پر لوٹ کر آگیا ہے جس پر وہ حضور ؐ کے وقت تھا۔ جبکہ دنیا میں اسلام متعارف ہو رہا تھا۔ ہمیں اس دین کی حقیقت پر پورا بھروسہ ہونا چاہئے۔ ہمیں اللہ کی قدرت اور اس کے غلبے پر پورا پورا بھروسہ ہونا چاہئے۔ جماعت اسلامی کو اسی انداز میں تیاری کرنا چاہئے۔ اللہ سب سے اچھا محافظ ہے اور وہ ارحم الراحمین ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۵۸ ایک نظر میں

''یہ ایک نئی لہر ہے۔ روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جو قرآن کریم کی تکذیب کرتے ہیں اور خصوصاً قرآن کے نظریہ بعث بعد الموت کو جھٹلاتے ہیں۔ البتہ اس لہر میں نہ تو ان کی ہٹ دھرمی اور عناد کی تصویر کشی کی گئی ہے اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے وہ اسلاف جو قرآن اور بعث بعد الموت کے منکر تھے' ان کا انجام کیا ہوا؟ بلکہ ان کے سامنے یوم البعث کے کچھ مناظر اور جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں اور ان کے اخروی انجام بد کی تصویر کشی کی جاتی ہے اور یہ انجام بد نہایت متحرک اور زندہ مناظر و مشاہد کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ میدان حشر میں ہیں اور نہایت ہی شرمسار کنندہ سوالات سے دوچار ہیں جس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے' سرعام رسوا ہو رہے ہیں۔ کوئی جواب بن نہیں پڑتا۔

(اَیْنَ شُرَکَآؤُکُمُ الَّذِیْنَ کُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (۶ : ۲۲)) ''کہاں ہیں تمہارے وہ شریک جنہیں تم خدا کے ساتھ برابر سمجھتے تھے؟'' یہ سوال اس قدر شان جلالت کے ساتھ ہوتا ہے کہ ان پر جزع و فزع کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ اب وہ نہایت ہی خاکساری اور نہایت ہی بھولے پن سے قسمیں اٹھاتے ہیں اور اللہ کی ربوبیت کا اعتراف کرتے ہیں۔

(وَاللّٰہِ رَبِّنَا مَا کُنَّا مُشْرِکِیْنَ (۶ : ۲۳)) اللہ ہمارے رب کی قسم ہم تو مشرک تھے ہی نہیں۔'' لیکن جب وہ آگ کے کنارے پہنچتے ہیں' ہتھکڑیاں لگی ہوئی' حسرت و ندامت میں ڈوبے ہوئے ڈرے اور سہمے ہوئے تو یوں گویا ہوتے ہیں۔

(یٰلَیْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُکَذِّبُ بِاٰیٰتِ رَبِّنَا وَنَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۶ : ۲۷)) ''اے کاش! کہ ہم لوٹائے جائیں' اور اللہ کی آیات کی تکذیب نہ کریں اور مومنین میں شامل ہو جائیں۔'' اب خود اللہ جل جلالہ ان سے ایک سوال کرتے ہیں اور ان کی حالت یہ ہے کہ وہ شرم و ندامت کی وجہ سے پگھلے جا رہے ہیں اور خوف و ہراس کی وجہ سے ان کی جان نکلی جا رہی ہے۔

(اَلَیْسَ ھٰذَا بِالْحَقِّ (۶ : ۳۰)) ''کیا یہ سچائی نہیں ہے؟'' اب وہ نہایت ہی خاکساری اور شرمندگی کے ساتھ جواب دیتے ہیں (بَلٰی وَرَبِّنَا (۶ : ۳۰)) ''ہمارے رب کی قسم' ہاں''........ اب یہ اعتراف ان کے لئے مفید نہیں ہے۔ حکم ہوتا ہے۔

(فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ (۶ : ۳۰)) پس چکھو تم اس عذاب کو اس لئے کہ تم انکار پر مصر تھے۔'' وہ ایسے حالات میں اس صورت حالات سے دوچار ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ہار چکے ہیں۔ سب کچھ ہار چکے ہیں۔ اب انہوں نے اپنے کاندھوں پر اپنے تمام برے اعمال اٹھائے ہوئے ہیں اور آخرت کے بارے میں

اپنے برے موقف کی وجہ سے اور اس گھاٹے کے سودے پر سخت نالاں ہیں اور غم سے نڈھال ہو چکے ہیں۔

• ایک منظر کے بعد دوسرا منظر اسکرین پر آتا ہے۔ ہر منظر ایسا ہے کہ دل دہل جاتا ہے' پورا بدن ٹوٹ رہا ہے' پورا وجود ریزہ ریزہ ہوا چاہتا ہے۔ دل و دماغ کے دریچے اب تو بالکل کھلے ہیں۔ اب وہ سچائی انہیں صاف صاف نظر آتی ہے جو حضور ؐ پیش فرما رہے تھے۔ لیکن ان مناظر کو بھی دیکھ کر قبولیت حق کی توفیق صرف ان لوگوں کو ہوئی جن کے بارے میں مشیت الٰہی نے فیصلہ کیا کہ وہ حق کو قبول کریں گے' لیکن وہ لوگ جن کو قرآن کریم سے پہلے کتابیں دی گئی تھیں وہ تو اس سچائی کو اس طرح پہچان رہے تھے جس طرح وہ اپنے بچوں کو پہچانتے تھے' لیکن اس کے باوجود اس سچائی کو قبول نہ کرتے تھے۔

---o o o---

درس نمبر ۵۸ تشریح آیات

۲۰ ـــ تا ـــ ۳۲

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ ۲
اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ ع ۱۰ ۸

(”جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس بات کو اس طرح غیر مشتبہ طور پر پہچانتے ہیں جیسے ان ا اپنے بیٹوں کے پہچاننے میں کوئی اشتباہ پیش نہیں آتا۔ مگر انہوں نے اپنے آپ کو خود خسارے میں ڈال دیا ہے وہ اسے نہیں مانتے۔) قرآن کریم میں اس بات کا ذکر بار بار آتا ہے کہ اہل کتاب 'یہود و نصاریٰ' قرآن کریم کو بعینہٖ اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق ہیں اور یہ قرآن کریم ان پر اللہ کی جانب سے نازل ہو رہا ہے۔ یہ حقیقت اہل کتاب کے ساتھ کلام کرتے ہوئے بھی بیان کی گئی ہے اور مشرکین عرب کے مقابلے میں بھی یہ دلیل دی گئی۔ اہل کتاب بالعموم مدینہ میں تحریک اسلامی کے خلاف دشمنی' عناد اور مقابلے کا موقف اختیار کئے ہوئے تھے اور اہل شرک ہر جگہ پر تھے۔ یہ حقیقت اس لئے لائی گئی کہ مشرکین عرب مانتے تھے کہ اہل کتاب ان کے مقابلے میں زیادہ اہل علم ہیں اور وہ کتب سماویہ اور وحی کے مزاج سے زیادہ باخبر ہیں۔ لہذا یہ بات لائی گئی کہ اہل کتاب قرآن کریم کو اچھی طرح بغیر کسی اشتباہ کے پہچانتے ہیں اور یہ کہ حضورؐ پر بھی اسی رب کی وحی آرہی ہے جس نے پہلے رسولوں پر وحی بھیجی تھی۔

جس طرح ہم نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ آیت مکی ہے' اور اس میں اس انداز سے اہل کتاب کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں خطاب مشرکین مکہ سے تھا کہ جس کتاب کا تم انکار کر رہے ہو اہل کتاب اسے اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں اور اگر اہل کتاب کی ایک بڑی اکثریت ایمان نہیں لائی تو اس نے درحقیقت اپنے آپ کو ایک بہت ہی بڑے خسارے میں ڈال لیا ہے۔ اس معاملے میں علم کے باوجود وہ مشرکین کے ہم پلہ ہوگئے ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالتے ہوئے ایمان کی دولت سے محروم کر لیا ہے۔ اس آیت سے قبل اور بعد کی بات بہرحال مشرکین مکہ کی بابت ہے۔ اس لئے 'جس طرح ہم نے اس سورہ کے تعارف کے وقت بتایا' ہم ترجیح اس بات کو دیتے ہیں کہ یہ آیات بھی مکی ہیں۔ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں' (اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (٦: ٢٠)) ”جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس بات کو اس طرح غیر مشتبہ طور پر پہچانتے

ہیں جیسے ان کو اپنے بیٹوں کے پہچاننے میں کوئی اشتباہ نہیں آتا۔" کا حوالہ دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ وہ مانتے ہیں کہ یہ کلام منزل من اللہ اور سچا ہے یا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے نبی ہیں اور ان پر بذریعہ وحی یہ قرآن نازل ہو رہا ہے۔ یہ تفسیر بھی بہرحال اس آیت کے مدلول اور مفہوم میں داخل ہے لیکن تاریخی واقعات کی روشنی میں اور اہل کتاب کے رویے کو پیش نظر رکھتے ہوئے' جو انہوں نے دین اسلام کے مقابلے میں اختیار کیا' ہم یہ کہتے ہیں کہ اس آیت کے مفہوم کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ اللہ کا منشا یہ تھا کہ جماعت مسلمہ کے ذہن میں یہ پہلو بھی آجائے تاکہ وہ آئندہ کے ادوار میں اہل کتاب کے حوالے سے اپنا اپنا رویہ متعین کرلے اور یہ جان لے کہ ان کا رویہ اسلام کی بابت کیا ہوگا۔

اہل کتاب اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ کتاب از جانب اللہ برحق ہے' اس لئے کہ وہ اس کتاب کی قوت تاثیر سے واقف تھے۔ اس میں جو بھلائی اور اصلاح تھی اس سے بھی وہ واقف تھے۔ وہ اس بات سے بھی اچھی طرح باخبر تھے کہ اس کتاب کے اندر پائے جانے والے نظریات کو جو قوم سینے سے لگاتی ہے اس کے اندر پھیلاؤ کی کس قدر عظیم قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کے نتیجے میں کسی قوم کے اندر جو اخلاقی قوت پیدا ہوتی ہے اس کے اثرات کس قدر دور رس ہوتے ہیں۔ یہ کتاب جو نظام حیات پیش کرتی ہے وہ کس قدر مستحکم نظام ہے۔ اہل کتاب اس کتاب اور اس کے ماننے والوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اس کتاب میں ان کے لئے نہ کوئی گنجائش ہے اور نہ کسی دوسرے دین کے لئے کوئی گنجائش ہے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اس کتاب میں کس قدر عظیم سچائی ہے اور وہ خود کس عظیم باطل کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اس نظام جاہلیت سے بھی واقف تھے جس تک وہ آپہنچے اور جس تک ان کی قوم' ان کے اوضاع و اطوار اور ان کے اخلاق اور ان کا اجتماعی نظم پہنچ گئے ہیں۔ اب صورت یہ ہوگئی کہ یہ دین برحق ان کے ساتھ کوئی مصالحت نہیں کر سکتا۔ نہ ان کے درمیان بقائے باہمی ممکن ہے۔ اس لئے جو معرکہ درپیش ہے وہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اس کرۂ ارض کے اوپر سے جاہلیت ختم نہیں ہو جاتی' جب تک ہر جگہ یہ دین غالب نہیں ہو جاتا اور پوری دنیا کا دین خدا پرستی پر قائم نہیں ہو جاتا اور اس کرۂ ارض پر اللہ کی بادشاہت قائم نہیں ہو جاتی۔ جب تک اللہ کے حقوق سلطنت اور حقوق اقتدار اعلیٰ پر دست درازی کرنے والوں کو اس کرۂ ارض کے اوپر سے بھگا نہیں دیا جاتا اس وقت تک دونوں گروہوں کے درمیان مصالحت نہیں ہو سکتی اس لئے کہ صرف اسی طریقے سے خدا کی بادشاہت قائم ہو سکتی ہے۔

اہل کتاب اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ اس دین میں یہ حقیقت موجود ہے اور اس حقیقت کو وہ بعینہٖ اس طرح بغیر کسی اشتباہ کے جانتے تھے جس طرح وہ اپنے بچوں کو جانتے تھے۔ اہل کتاب نسلاً بعد نسل اس دین کا مطالعہ کرتے چلے آئے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ اس دین کے اندر قوت اور شوکت کے سرچشمے پنہاں ہیں اور یہ کہ یہ دین نفس انسانی کے اندر کن کن راہوں پر اپنے اثرات چھوڑتا ہے۔ اسی لئے وہ ہر وقت ان تحقیقات میں لگے رہتے ہیں کہ وہ اس دین کی ان قوتوں کے اثرات کو کس طرح زائل کر دیں۔ کس طرح وہ اہل اسلام کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر سکتے ہیں؟ کس طرح وہ دین اسلام کے نصوص میں لفظی اور معنوی تحریف کر سکتے ہیں؟ کس طرح وہ اس دین کو باطل اور جاہلیت کے مقابلے میں تحریک نفاذ اسلام اور تحریک قیام حکومت الٰہیہ کے مقام سے گرا کر ایک مجرد ثقافتی اور علمی تحریک میں بدل سکتے ہیں اور اس کی زندہ نصوص کو محض الٰہیاتی نظریاتی مباحث میں بدل کر انہیں بے جان کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کی

یہی سعی رہی کہ اس دین کو محض لاہوتی، فقہی اور فرقہ وارانہ اختلافات کا اکھاڑہ بنا کر رکھ دیا جائے۔ وہ دین اسلام کے مطالب اور مفہومات کو ایسے تصورات اور ایسی اشکال میں ڈھالتے ہیں جن کا اس دین سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ اس دین کے لئے مہلک ہیں۔ لیکن ان سازشوں کے باوجود وہ اہل اسلام کو یہ باور کراتے ہیں کہ تمہارا عقیدہ محفوظ ہے اور قابل احترام ہے۔ اس طرح جو خلا وہ پیدا کرتے ہیں اس کی جگہ وہ نئے تصورات' نئے طور طریقے اور نئی ترجیحات سامنے لاتے ہیں اور اس طرح وہ اسلامی سوچ کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں۔

اہل کتاب دین اسلام کا بہت ہی گہرا مطالعہ کرتے ہیں اور نہایت ہی سنجیدگی اور گہرائی سے اسلام کو سمجھنے کی سعی کرتے ہیں۔ لیکن اس سے وہ کسی حقیقت کی تلاش میں نہیں ہیں۔ ہمارے بعض سادہ لوح لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید انہیں حقیقت کی تلاش ہے یا وہ اس دین کے ساتھ کوئی انصاف کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ ہمارے بعض سادہ لوح لوگ ایسا سمجھتے ہیں جب مستشرقین میں سے کوئی اسلام کے بعض پہلوؤں کے بارے میں اچھے تاثرات کا اظہار کرے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے کہ یہ لوگ سچائی کی تلاش میں ہیں یا یہ کہ وہ دین اسلام پر کوئی منصفانہ تبصرہ کرنا چاہتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی ان تحقیقات سے اس امر کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کس مقام سے وہ دین اسلام پر حملہ آور ہوں۔ یہ لوگ دین اسلام کے ان تمام سرچشموں کو بند کرنا چاہتے ہیں جن کی وجہ سے انسانی فطرت کو سیرابی حاصل ہو سکتی ہے یا فطرت انسانی ان پہلوؤں سے متاثر ہو سکتی ہے۔ وہ ایسے تمام سرچشموں کو بند کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس دین کی قوتوں کے راز معلوم کرتے ہیں تاکہ وہ ان قوتوں کا اچھی طرح دفاع کر سکیں۔ یہ لوگ یہ جاننا چاہتے کہ یہ دین اپنے آپ کو انسانی نفسیات کے اندر کس طرح نشو و نما دیتا ہے تاکہ یہ لوگ اہل اسلام کو غافل پاکر کچھ اپنے تصورات اس کے اندر داخل کر دیں اور لوگوں کے نفوس کے اندر جو بھی خلا باقی ہو اسے وہ دین کے ساتھ متضاد تصورات کے ذریعے بھر دیں۔

چنانچہ ان مقاصد کے حصول کے لئے یہ لوگ دین اسلام کو اسی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بچوں کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ ہمیں ان حقائق کے بارے میں علم ہونا چاہئے۔ ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ ہمیں اپنے دین کے بارے میں بھی پورا پورا علم ہونا چاہئے اور ہمیں بھی چاہئے کہ ہمیں اپنے دین کے بارے میں اسی طرح پہچان ہو جس طرح ہمیں اپنی اولاد کے بارے میں پہچان ہوتی ہے۔

گزشتہ چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ کی عملی صورت حال اس بات کی تصدیق کرتی ہے جس کے بارے میں قرآن کریم نے پہلے سے بتا دیا تھا

(اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ (٦ : ٢٠)) "وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے' وہ اسے اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔" ماضی قریب کے تاریخی دور میں یہ صورت حال بہت ہی اچھی طرح واضح ہوگئی ہے۔ آج اسلام کے بارے میں جو بحثیں ہو رہی ہیں وہ اس قدر وسیع ہیں کہ ہر ہفتے کی تحریروں کو جمع کر کے ایک کتاب شائع کی جا سکتی ہے۔ یہ صورت تمام غیر ملکی زبانوں کی ہے۔ ان مباحث سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب اس دین کی ہر چھوٹی بڑی بات سے واقف ہیں۔ وہ اس کے مزاج اور اس کی تاریخ سے پوری طرح باخبر ہیں۔ انہیں اس دین کی قوت کے سرچشمے بھی معلوم ہیں اور اس کی قوت مدافعت سے بھی وہ پوری

طرح باخبر ہیں۔انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس دین کے بگاڑنے کے طریقے کیا ہیں' لیکن اہل کتاب کی اکثریت اپنی اس نیت کو چھپائے رکھتی ہے۔ وہ اپنے مقاصد کو اس لئے خفیہ رکھتے ہیں کہ اگر دین اسلام پر براہ راست حملہ کیا جائے تو لوگ اس کی مدافعت کے لئے اٹھتے ہیں اور طرفداری کرتے ہیں۔وہ تحریکات جو اس دین پر مسلح حملوں کے دفاع کے لئے برپا کی گئیں' مثلاً استعماری قوتوں کے خلاف تو یہ تحریکات ایک دینی فہم اور دینی جذبے کے اوپر قائم تھیں۔انہوں نے اپنے وقت میں دین کے دفاع کا فریضہ سرانجام دیا' لیکن آج دین کے خلاف فکری جنگ شروع ہے۔اس فکری و نظریاتی جنگ کی مدافعت کے لئے بھی اسلامی تحریکات اٹھتی رہی ہیں اور اہل کتاب کو اس کا اندیشہ ہمیشہ رہتا ہے۔اس لئے وہ نہایت ہی مذموم طریقے اختیار کرتے ہیں اور وہ یوں کہ وہ پہلے دین اسلام کی کسی قدر تعریف کرتے ہیں اور اسلام کی مدافعت اور حمایت کے جذبات کو سلا دیتے ہیں تاکہ اسلام کی حمایت کا جذبہ بے حس کر دیا جائے' اور پڑھنے والے کے دل میں اطمینان پیدا ہو جائے اور اس طرح ایسے مصنفین پیالے میں زہر ڈالتے جائیں اور پڑھنے والا ایک ایک گھونٹ پیتا رہے۔اب ایسے لوگوں کی بات کچھ اس طرح کی ہوتی ہے۔"بے شک اسلام ایک عظیم دین ہے لیکن اس کے معانی اور تصورات کو ترقی یافتہ شکل میں جدید تہذیب کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا ضروری ہے تاکہ وہ جدید دور کی ضروریات کو پورا کرے۔دور جدید میں معاشروں کے اندر جو جدت اور ترقی کا عمل جاری ہے' مناسب نہیں ہے کہ یہ دین اس کی راہ میں رکاوٹ بنے بلکہ مناسب یہ ہے کہ یہ دین جدید اخلاقی قدریں اپنالے اور جدید نظامہائے حکومت اور اجتماعی امور کو نہ چھیڑے۔اس طرح کہ جو چاہے اسلامی عقائد کو اپنے دلوں میں بٹھائے رکھے لیکن انسان کی عملی زندگی میں جدید نظریات اور تہذیب مغرب کے رنگ ڈھنگ اس کے دائرے سے باہر نکل آئیں۔ وہ اپنے اجتماعی معاملات بھی ان لوگوں کے حوالے کر دے جو اس کرۂ ارض پر اللہ اور رب بنے ہوئے ہیں اور خود اپنا دین چلا رہے ہیں' اس طرح اسلام ایک ہمہ گیر دین قرار پائے گا"۔

اس انداز گفتگو کے دوران یہ مصنفین اپنی اقوام کو یہ راز سمجھاتے ہیں کہ دین اسلام کی قوت اور صلابت کا راز کیا ہے؟ بظاہر یہ تعریف کر رہے ہوتے ہیں لیکن بباطن اپنی اقوام کو تاثر دیتے ہیں کہ یہ دین نہایت ہی خطرناک ہے۔یوں تعریف کے لباس میں یہ اپنی اقوام کو اس دین کی قوت کے راز سے آگاہ کرتے ہیں تاکہ ان انکشافات کے ذریعے تخریبی قوتیں دین کے نازک مقامات پر حملہ آور ہوں اور ان کے وار اور بمباری ٹھیک ٹھیک نشانے پر لگے اور ان کو اس بارے میں اس قدر علم و معرفت حاصل ہوتی رہے جس طرح وہ اپنے بچوں کے بارے میں جانتے ہیں۔

قرآن کریم کے اسرار و رموز اس کے جاننے والوں پر کھلتے ہی رہیں گے۔یہ کتاب ہمیشہ جدید اور نئی رہے گی۔گزشتہ چودہ سو سال میں یہ ہمیشہ جدید رہی ہے۔مسلمان اس کی روشنی میں معرکے لڑتے رہے ہیں اور اپنی تاریخ پر اس کی روشنی میں غور کرتے رہے ہیں۔وہ اپنے ماضی اور حال کا جائزہ اس کی روشنی میں لیتے رہے ہیں اور اپنے معاملات کو اللہ کے نور میں دیکھتے رہے ہیں جس کے ذریعے سچائی کے راستے واضح ہو جاتے ہیں۔

---ooo---

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۗ
إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿٢١﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ
أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُن فِتْنَتُهُمْ
إِلَّا أَن قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ﴿٢٣﴾ انظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ
أَنفُسِهِمْ ۚ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾

"اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگائے' یا اللہ کی نشانیوں کو جھٹلائے؟ یقیناً ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ جس روز ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے اور مشرکوں سے پوچھیں گے کہ اب وہ تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریک کہاں ہیں جن کو تم اپنا خدا سمجھتے تھے تو وہ اس فتنے سے نکل آئیں گے اور کہیں گے اے ہمارے آقا' تیری قسم ہم ہرگز مشرک نہ تھے۔ دیکھو' انہوں نے کس طرح اپنے اوپر جھوٹ گھڑا اور وہاں ان کے سارے بناوٹی معبود گم ہو گئے۔"

بات کی مناسبت سے اب مشرکین کے سامنے وہ حقیقت رکھی جاتی ہے جس پر وہ دنیا میں قائم تھے۔ اس کی روشنی میں ان کے موقف اور عمل کو خدا تعالیٰ کے پیمانوں سے ناپا جاتا ہے۔ سب سے پہلے ان سے پوچھا جاتا ہے کہ ذرا وہ اپنے رویے پر غور کریں کہ وہ اللہ پر افتراء پردازی کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ وہ اس دین پر ہیں جس کے ساتھ حضرت ابراہیم مبعوث ہوئے تھے۔ اور ان کے مزعومات میں سے یہ بھی تھا کہ وہ خود جن چیزوں کو حلال اور حرام قرار دیتے تھے ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے جیسا کہ اس سورہ کے آخر میں لفظ بزعمہم سے اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ حالانکہ اللہ نے اس چیز کی حلت یا حرمت کا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ جس طرح آج ہمارے زمانے میں بے شمار لوگ دعوائے اسلام کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں' حالانکہ ان کا یہ دعویٰ سراسر جھوٹا ہے اور اللہ پر افتراء ہے۔ وہ خود اپنی جانب سے قوانین اور فرامین جاری کرتے ہیں' خود اپنی جانب سے زندگی کے اوضاع و اطوار اور رسومات پیدا کرتے ہیں اور اپنی جانب سے نئی نئی چیزیں جاری کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ان معاملات میں اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو غصب کر لیتے ہیں اور خود مقتدر اعلیٰ بن بیٹھتے ہیں۔ پھر بھی ان کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ دین اسلام پر ہیں جو سراسر جھوٹ ہے۔ ان میں سے تعلیم یافتہ لوگ جنہوں نے اپنا دین فروخت کر دیا ہے اور اپنے لئے جہنم کے بدترین درجے کو الاٹ کرا لیا ہے وہ ایسے لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ وہ پھر بھی مسلمان ہیں۔ ان آیات میں ان کی جانب سے پیش کی جانے والی آیات کو جھٹلانے پر بھی ان کے خلاف نکیر کی جاتی ہے۔ انہوں نے آیات الٰہیہ کو مسترد کیا' ان کا مقابلہ اور انکار کیا' انہوں نے یہ الزام بھی لگایا کہ یہ آیات از جانب اللہ نہیں ہیں اور جس جاہلیت پر وہ عمل پیرا ہیں وہ از جانب اللہ ہیں۔ یہ موقف بعینہ ویسا ہی ہے جس طرح آج کے دور میں اہل جاہلیت جدید اس کے مدعی ہیں۔ ان دونوں کا موقف بالکل یکساں ہے۔

(وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ (٦ : ٢١)) "اور اس شخص

سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگائے 'یا اللہ کی نشانیوں کو جھٹلائے ۔'' یہاں ظلم سے مراد شرک ہے شرک کو ظلم اس لئے کہا گیا ہے کہ لفظ ''ظلم'' سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے اس کے گھناؤنے پن اور قباحت کا اظہار اچھی طرح ہو جائے ۔ قرآن کریم میں بیشتر شرک کی تعبیر ظلم سے کی جاتی ہے اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ اسے ایک نہایت ہی برا فعل سمجھ کر اس سے متنفر ہو جائیں اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ شرک سچائی کے ساتھ ظلم ہے ۔ نفس انسانی کے ساتھ ظلم ہے اور عوام الناس پر ظلم ہے ۔ اس لئے کہ کبریائی صرف اللہ کا حق ہے اور وہ اس بات کا مستحق ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے کیونکہ اس سے اللہ کی حق تلفی ہوگی ۔ نفس انسانی پر یہ اس لئے ظلم ہے کہ اس کی وجہ سے یہ دائمی ہلاکت میں پڑ جائے گا ۔ اور لوگوں پر ظلم یہ ہے کہ وہ معرفت حق سے محروم ہوں گے اور ان کی زندگی ایسے اصولوں کے تحت چلتی رہے گی جو ظالمانہ ہوں گے ' غرض شرک ہر پہلو سے ظلم عظیم ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے آخر میں رب العالمین خود فرماتے ہیں ۔ (اِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (٦: ٢١)) یقیناً ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے ۔''

یہاں اللہ تعالیٰ ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیتے ہیں اور حکم آ جاتا ہے کہ مشرک یا ظلم اور ظالموں کا انجام کیا ہو گا ۔ انسانوں کی کوتاہ نظر آنکھیں جو کچھ دیکھ سکتی ہیں وہ قابل اعتبار حقیقت نہیں ہوتی ۔ انسان کی نظر نہایت ہی قریبی فاصلے تک ہوتی ہے ۔ انسان صرف دنیوی فلاح اور نجات کو دیکھ سکتا ہے ۔ یہ ہے وہ تدبیر جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو انجام بد تک پہنچاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ صادق القول اور کوئی نہیں ہو سکتا ۔

اس موقعہ پر قرآن ان کی ناکامی اور عدم فلاح اور ان کے غلط موقف کی ایک تصویر کشی نہایت ہی زندہ ' متحرک اور دلکش الفاظ میں فرماتے ہیں :

(وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَاۗؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (٢٢) ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (٢٣) اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (٢٤)) (٦: ٢٢ تا ٢٤)) ''جس روز ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے اور مشرکوں سے پوچھیں گے کہ اب وہ تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریک کہاں ہیں جن کو تم اپنا خدا سمجھتے تھے تو وہ اس فتنے سے نکل آئیں گے اور کہیں گے اے ہمارے آقا ' تیری قسم ہم ہرگز مشرک نہ تھے ۔ دیکھو ' انہوں نے کس طرح اپنے اوپر جھوٹ گھڑا اور وہاں ان کے سارے بناوٹی معبود گم ہو گئے ۔'' حقیقت یہ ہے کہ مشرک کی کئی قسمیں ہیں ۔ اللہ کے ساتھ ٹھہرائے ہوئے شرکاء کی بھی کئی اقسام ہیں اور صورت حال وہ نہیں ہے جو عام طور پر کلمہ شرک اور شرکاء اور مشرکین کے اطلاق سے آج کل عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ کچھ لوگ بتوں اور پتھروں کی پوجا کرتے ہیں یا پتھروں ' درختوں اور آگ وغیرہ کے مظاہر کی پرستش کرتے ہیں ۔ بس یہی ہے شرک کا مفہوم ۔

درحقیقت شرک تو یہ ہے کہ کوئی اللہ کے سوا کسی اور کے بارے میں یہ اعتراف کرے کہ ذات باری کے خصائص میں سے کچھ خصائص اس میں بھی پائے جاتے ہیں۔ چاہے وہ نظریاتی امور ہوں جن میں کا اس کائنات کے تصرفات میں سے کوئی امر اللہ کے سوا کسی اور سے منسوب کیا جائے' یا مراسم عبودیت ہوں کہ اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے بجا لائے جائیں مثلاً عبادت اور نذر و نیاز وغیرہ یا زندگی کے نظام کو درست کرنے کے لئے اصول اور ضابطے اللہ کے سوا کسی اور سے لیے جائیں۔ یہ سب کے سب شرک کے الوان و اقسام ہیں۔ اس شرک کا ارتکاب یوں ہوتا ہے کہ بعض لوگ ایک قسم کا شرک کرتے ہیں اور بعض دوسری قسم کے شرک میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھر مختلف قسم کے مشرکین کے شرکاء اور معبود بھی مختلف ہوتے ہیں۔

قرآن کریم نے ان تمام اقسام پر کلمہ شرک کا اطلاق کیا ہے اور شاید قیامت کے مناظر کے اندر ان مشرکین اور شرکاء کے زندہ مناظر پیش کر کے اہل ایمان کو حقیقت سمجھانے کی سعی کی ہے۔ قرآن کریم نے لفظ شرک کو کسی ایک مفہوم تک محدود نہیں رکھا ہے اور نہ ان میں سے کسی ایک مفہوم سے متصف کسی شخص کو مشرک کہا ہے اور نہ دنیا اور آخرت میں ان تمام اقسام کے مشرکین کے انجام اور سزا اور ان کے ساتھ تعلق میں کوئی فرق کیا ہے۔

عربوں کے اندر شرک کی یہ تمام اقسام پائی جاتی تھیں۔ عربوں میں یہ اعتقاد موجود تھا کہ اللہ کی مخلوقات میں سے بعض اللہ کے ساتھ شریک ہیں۔ یہ شرکت اس طرح ہے کہ اللہ کے ہاں جو بات وہ کہتے ہیں وہ لازماً منظور ہوتی ہے۔ لوگوں کی قسمتوں کے فیصلوں اور واقعات کی رونمائی میں ان کا بھی دخل ہوتا ہے۔ مثلاً فرشتے شریک ہوتے ہیں یا یوں کہ یہ مخلوقات انسان کو اذیت دینے پر قادر ہے۔ مثلاً جنات کے بارے میں یہ عمومی عقیدہ ہوتا ہے کہ وہ نقصان دیتے ہیں یا کاہنوں اور جادوگروں کے واسطے سے جنات نقصان دیتے ہیں۔ یا دونوں طریقوں سے یہ انسان کو اذیت دے سکتے ہیں۔ مثلاً آباؤاجداد کی روحیں بھی نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ ان جنات' کاہنوں اور اجداد کی ارواح کی طرف اشارات کے طور پر یہ لوگ ان کی طرف منسوب بت بناتے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ ہوتا تھا کہ ان بتوں کے اندر ان خدارسیدہ مخلوقات کی روح آ جاتی ہے۔ کاہن پھر ان روحوں اور بتوں کے ساتھ ہم کلام بھی ہوتے تھے۔ یوں ان کے لئے یہ کاہن اس اسلوب اور انکل سے بعض چیزوں کو حرام کرتے تھے اور بعض کو حلال کرتے تھے۔ اس طرح درحقیقت یہ کاہن ہی تھے جو یہ کام کرتے تھے اور وہی شریک کا درجہ رکھتے تھے۔

مزید برآں شرک کا ارتکاب وہ اس طرح بھی کرتے تھے کہ ان بتوں کے سامنے مراسم بندگی ادا کرتے تھے۔ ان کے استھانوں پر قربانیاں کرتے اور ان کی نذریں مانتے تھے۔ یہ قربانیاں اور نذریں اور عبادات بھی دراصل وہ ان کاہنوں کی کرتے تھے۔ بعض عرب ایرانیوں کے زیر اثر یہ بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ کواکب کو بھی واقعات عالم میں اثر و دخل حاصل ہے' اور اس طرح گویا یہ ستارے بھی خدا کے شریک ہیں۔ چنانچہ عربوں کے اندر ستارہ پرستی داخل ہو گئی۔ اس سورہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو قصہ لایا گیا ہے وہ بھی اسی نقطہ نظر سے لایا گیا ہے اور اس سورہ کے موضوع سے یہی بات اس قصے کو مربوط کر دیتی ہے۔ (جیسا کہ آگے ہم بتائیں گے انشاء اللہ)۔

شرک کی تیسری صورت بھی ان عربوں کے اندر رائج تھی۔ یہ لوگ کاہنوں کی مدد سے اپنے لئے دستور اور قانون خود بناتے تھے اور زندگی کے طور طریقے اور رسم و رواج اپنے لئے خود وضع کرتے تھے۔ اگرچہ اس کے اندر قانون

سازی کی اجازت اللہ نے نہ دی تھی لیکن خود قانون بنا کر وہ دعویٰ یہ کرتے تھے کہ یہ اللہ کا قانون اور شریعت ہے جس طرح آج کے بعض سیاسی مفکر ایسا دعویٰ کرتے ہیں۔

پس اس منظر میں، یعنی قیامت کے دن، اللہ تعالیٰ تمام قسم کے شرکاء کے بارے میں لوگوں کو بلا کر یہ سوال کریں گے کہ لاؤ ان کو اب جن کو تم میرا شریک ٹھہراتے تھے؟ آج تو ان کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ آج تو وہ اپنے متبعین کی کوئی امداد نہیں کر سکتے۔ نہ ان کو اس ہولناک صورت حال سے بچا سکتے ہیں۔

(وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ (٦: ٢٢)) "جس روز ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے اور مشرکوں سے پوچھیں گے کہ اب وہ تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریک کہاں ہیں جن کو تم اپنا خدا سمجھتے تھے۔" یہ منظر بالکل آنکھوں کے سامنے ہے۔ گو میدان حشر برپا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ مشرکوں سے یہ باز پرس ہو رہی ہے اور ان کے لئے یہ باز پرس نہایت ہی المناک ہے۔ "وہ تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریک کہاں ہیں؟"

یہ ہولناک باز پرس انہیں حواس باختہ کر دیتی ہے۔ اب ان کی فطرت پر جو پردے پڑ گئے تھے وہ پردے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کی فطرت اور ان کی یادداشت سے وہ عارضی حالات محو ہو جاتے ہیں اس لئے کہ ان حالات کی بنیاد فطرت پر تھی ہی نہیں۔ یہ غیر فطری اور محض سراب کی طرح عارضی حالات تھے۔ ان کا شعور اب یہ بتاتا ہے کہ وہ کس طرح شریک ٹھہر سکتے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ نہ تو شرکاء موجود تھے اور نہ ہی ہم نے کسی کو شریک بنایا۔ اب یہ منظر ان کے لئے ایک نئے فتنے کا سبب بنے گا۔ اس حقیقی دربار میں اب خبیث اور بے اصل افکار ان کے ذہن سے محو ہو جاتے ہیں جس طرح بھٹی میں تپ کر چیزوں سے غلط عناصر جھاگ کی شکل میں خارج ہو جاتے ہیں۔

(ثُمَّ لَمْ تَكُن فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ (٦: ٢٣)) "تو ان کا فتنہ نہ رہے گا اور وہ یہ کہیں گے کہ لے ہمارے آقا تیری قسم ہم ہرگز مشرک نہ تھے۔" وہ حقیقت سامنے آگئی جس کی وجہ سے فتنہ چھٹ گیا یا اس کی روشنی میں فتنہ واضح ہو گیا۔ ان لوگوں نے اپنے ماضی سے مکمل طور پر کٹ کر اللہ وحدہ کی ربوبیت کا اقرار کر لیا لیکن انہوں نے یہ کام اس وقت کیا جب ان کے لئے اقرار مفید نہ تھا۔ اس اقرار باطل سے علیحدگی ان کے لئے مفید نہ رہے گی۔ بلکہ یہ ان کے لئے ایک مصیبت ہو گی اور ان کا یہ اقرار ان کے لئے اب موجب نجات نہ ہو گا۔ وقت جا چکا ہو گا۔ آج تو جزائے اعمال کا دن ہے۔ آج تو آخری فیصلوں کا دن ہے۔ یہ ریمانڈ کا دن نہ ہو گا۔

ان کی اس حالت پر اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ تبصرہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے جب شرک کا ارتکاب کیا اور ان لوگوں کو اللہ کا شریک ٹھہرایا تو انہوں نے اپنے نفوس کے ساتھ جھوٹ اور فریب کا ارتکاب کیا اس لئے کہ اللہ کے ساتھ کسی شریک کا تو دراصل کوئی وجود ہی نہ تھا۔ نہ ان شرکاء کی کوئی حقیقت تھی۔ آج ان سے وہ افتراء غائب ہے۔ انہوں نے حق کا اعتراف اس وقت کیا جب ان کا جھوٹا طلسم غائب ہو گیا۔

(اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (٦: ٢٤))

"دیکھو ' انہوں نے کس طرح اپنے اوپر جھوٹ گھڑا 'لیکن یہاں ان کے تمام بناوٹی معبود ناپید ہو گئے۔" انہوں نے اپنے اوپر جھوٹ بولا ہے۔ جب انہوں نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو انہوں نے اسی وقت اپنے اوپر جھوٹ بولا اور اپنے آپ کو فریب میں ڈال دیا۔ اللہ پر افتراً باندھا اور اب ان کے تمام معبود ناپید اور گمشدہ ہیں اور اب تو حشر اور حساب کا دن ہے۔

میرے خیال میں اس آیت کی یہی اطمینان بخش تفسیر ہے 'کیونکہ منظر قیامت کا ہے اور وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہیں اور ذات باری کی قسم اٹھا کر کہتے ہیں کہ وہ مشرک نہ تھے اس لئے کہ قیامت کے دن ان کا جھوٹ ان کے خلاف ہو گا اس مفہوم میں۔ کیونکہ قیامت کے دن وہ اللہ پر جھوٹ نہ باندھ سکیں گے اور نہ ارادۃً جھوٹی قسم اٹھا سکیں گے۔ جن لوگوں نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے کہ وہ عمداً جھوٹ بولیں گے تو وہ اس لئے درست نہیں ہے کہ لایکتمون اللہ حدیثا کے بموجب وہ قیامت میں اللہ سے تو کوئی بات چھپا نہ سکیں گے۔ بلکہ قیامت کے اس ہولناک منظر میں ان کی فطرت پاک و صاف ہو جائے گی اور اس سے شرک کی آلائشیں دور ہو جائیں گی۔ ان کی فطرت سے شرک اور باطل افکار اسی طرح محو ہو جائیں گے کہ وہ اس دن ماضی کا احساس بھی نہ کر سکیں گے۔ لیکن اللہ ان پر تعجب فرماتا ہے کہ دیکھو انہوں نے دنیا میں اپنی زندگی کس جھوٹ میں بسر کی اور آج آخرت میں ان کے پردۂ خیال میں اس جھوٹ کا کوئی اثر نہیں ہے۔ (واللہ اعلم بالمراد۔۔) بہرحال یہ بھی احتمالات میں سے ایک احتمال ہے۔

اگلی آیات میں مشرکین کا ایک دوسرا گروہ اسکرین پر آتا ہے اور اب ان کے کیس کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ مناظر قیامت میں سے ایک دوسرا منظر ہے۔ یہ لوگ قرآن کریم کو سنتے ہیں لیکن انہوں نے اپنی قوت مدرکہ کو معطل کر دیا ہے ' ان کی فطرت مسخ ہو چکی ہے۔ یہ لوگ تحریک اسلامی کے معاند ہیں اور اپنے آپ کو بہت ہی بڑی شے سمجھتے ہیں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مجادلہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس صورت میں وہ آنکھیں بند کرنے اور نفرت کرنے کی وجہ سے اس قرآن کریم پر یہ تبصرہ کرتے ہیں "یہ تو ایک داستان پارینہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔" اور پھر وہ دوسروں کو بھی اس حقیقت کو سننے اور قبول کرنے سے منع کرتے ہیں اور خود بھی اس سے دور بھاگتے ہیں۔ ان کے حالات کی یہ تصویر صفحہ کی ایک طرف ہے اور اس صفحے کے دوسری جانب ان کی نہایت ہی مکروہ اور دردناک حالت کو منقش کیا گیا ہے۔ وہ آگ کے کنارے کھڑے ہیں گرفتار ہیں اور انہیں اس خوفناک انجام کے دھانے پر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ وہ نہایت ہی ذلت میں چیخ و پکار کرتے ہیں اور نہایت ہی حسرت آمیز انداز میں یہ تمنا کرتے ہیں کہ اگر انہیں دنیا کی طرف لوٹایا جائے تو وہ اپنے موقف میں تبدیلی کر لیں گے جس کی وجہ سے ان کو یہ روز بد دیکھنا پڑا۔ چنانچہ نہایت ہی حقارت آمیز انداز میں ان کی اس تمنا اور خواہش کو رد کیا جاتا ہے۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ حَتّٰۤى

إِذَا جَآءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوٓا إِنْ هٰذَآ إِلَّآ أَسَاطِيرُ
الْأَوَّلِينَ ﴿٢٥﴾ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْئَوْنَ عَنْهُ ۚ وَإِنْ يُهْلِكُونَ إِلَّآ
أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ تَرٰىٓ إِذْ وُقِفُوا عَلَى النَّارِ فَقَالُوا يٰلَيْتَنَا
نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٧﴾ بَلْ بَدَا لَهُمْ
مَّا كَانُوا يُخْفُونَ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَإِنَّهُمْ
لَكٰذِبُونَ ﴿٢٨﴾

"ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمہاری بات سنتے ہیں مگر حال یہ ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس کو کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے (کہ سب کچھ سننے پر بھی کچھ نہیں سنتے)۔ وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں' اس پر ایمان لا کر نہ دیں گے۔ حد یہ ہے کہ جب وہ تمہارے پاس آکر تم سے جھگڑتے ہیں تو ان میں سے جن لوگوں نے انکار کا فیصلہ کر لیا ہے وہ (ساری باتیں سننے کے بعد) یہی کہتے ہیں کہ یہ ایک داستان پارینہ کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اس امر حق کو قبول کرنے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور بھاگتے ہیں۔ (وہ سمجھتے ہیں کہ اس حرکت سے وہ تمہارا کچھ بگاڑ رہے ہیں) حالانکہ دراصل وہ خود اپنی ہی تباہی کا سامان کر رہے ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ کاش تم اس وقت کی حالت دیکھ سکتے جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے۔ اس وقت وہ کہیں گے کاش کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں پھر واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔ درحقیقت یہ بات وہ محض اس وجہ سے کہیں گے کہ جس حقیقت پر انہوں نے پردہ ڈال رکھا تھا وہ اس وقت بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آچکی ہو گی' ورنہ اگر انہیں سابق زندگی کی طرف واپس بھیجا جائے تو پھر بھی وہ وہی سب کچھ کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے' وہ تو ہیں ہی جھوٹے۔"

ان کی تصویر کے یہ دو رخ ہیں۔ ایک رخ دنیا سے متعلق ہے جس میں عناد' بغض اور سرکشی کے رنگ بھرے ہوئے ہیں' اور دوسرا رخ آخرت سے متعلق ہے اور اس میں حسرت اور ندامت کے رنگ ہیں۔ قرآن کریم ان دونوں حالتوں کی تصویر کشی نہایت ہی مؤثر اور اشاراتی انداز میں کرتا ہے۔ جامد فطرت پگھل جاتی ہے اور اس میں حرکت اور جوش پیدا ہو جاتا ہے' شاید کہ اس کے اوپر جہالت کی جو تہیں چڑھی ہوئی ہیں وہ دور ہو جائیں اور فطرت کے بند دریچے وا ہو جائیں اور قبل اس کے کہ وقت ختم ہو' وہ راہ راست پر آجائے۔

(وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ إِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَّفْقَهُوهُ وَفِيْ أٰذَانِهِمْ وَقْرًا وَإِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا (٦ : ٢٥)) "ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر

تمہاری بات سنتے ہیں مگر حال یہ ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس کو کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے (کہ سب کچھ سننے پر بھی کچھ نہیں سنتے) ۔ وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں' اس پر ایمان لا کر نہ دیں گے ۔"

انسانیت کے یہ ایسے نمونے ہیں کہ بظاہر سنتے ہیں لیکن ان کے دلوں پر پردے ہیں ۔ اکنہ کے معنی ہیں غلاف ۔ اور یہ غلاف قوت مدرکہ کو بند کر دیتے ہیں ۔ الوقر کا مفہوم ہے بوجھ یعنی ان کے کان بھاری ہیں' اس لئے اس بھارے پن کی وجہ سے وہ سننے کا فریضہ ادا نہیں کر سکتے ۔ اس قسم کے لوگ انسانیت کا حصہ ہیں اور ہر دور میں اور ہر جگہ موجود رہتے ہیں ۔ ہر قوم اور ہر قبیلے میں ایسے لوگ ہوتے ہی ہیں ۔ یہ ٹھیک ٹھیک انسان ہوتے ہیں ۔ بظاہر وہ بات سنتے ہیں لیکن سنی ان سنی کر دیتے ہیں ۔ ان کے کان گویا بہرے ہیں ۔ اپنا فریضہ منصب فطری ادا نہیں کرتے ۔ ان کی قوت مدرکہ گویا غلافوں میں لپٹی ہوئی ہے اور اس تک قرآنی مدلولات نہیں پہنچے ۔

(حَتّٰی اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ هٰذَا اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (٦ : ٢٥)) "حد یہ ہے کہ جب وہ تمہارے پاس آ کر تم سے جھگڑتے ہیں تو ان میں سے جن لوگوں نے انکار کا فیصلہ کر لیا ہے وہ (ساری باتیں سننے کے بعد) یہی کہتے ہیں کہ یہ ایک داستان پارینہ کے سوا کچھ نہیں ۔" ان کی آنکھیں بھی دیکھ رہی ہوتی ہیں لیکن درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی ہوتیں ۔ جو منظر وہ دیکھتی ہیں اس کا ان کے دل و دماغ پر کوئی اثر نہیں ہوتا ۔

سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ اور کیا بات ہے جو انہیں سمجھنے اور قبول کرنے سے روک رہی ہے؟ حالانکہ وہ سننے والے کان' بینا آنکھیں اور تیز عقل کے مالک ہیں' تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "مگر ان کا حال یہ ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں جن کی وجہ سے وہ کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی ہے ۔ وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں اس پر ایمان لا کر نہ دیں گے ۔"

یوں ان کے بارے میں اللہ کے فیصلے کو بیان کیا جاتا ہے کہ ان کا ادراک اس حقیقت تک نہ پہنچ سکے گا اور نہ ہی اسے سمجھ سکے گا ان کی قوت شنوائی کام چھوڑ دے گی ۔ وہ ان کی قوت مدرکہ تک ان کی رہنمائی ہی نہ کرے گی کہ وہ اسے سمجھ سکیں اور قبول کریں چاہے وہ اپنی آنکھوں سے حقائق کو دیکھ رہے ہوں اور دلائل ایمان ان کے سامنے ہوں ۔ ہاں' ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس فیصلے میں سنت الٰہیہ کو پڑھنے کی سعی کریں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

(وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا) "جو لوگ ہمارے بارے میں سعی کریں گے ہم انہیں ضرور اپنی راہوں کی طرف لے جائیں گے ۔" اور دوسری جگہ ہے۔

(وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا (٧) فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (٨) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (٩) وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (١٠) (٩١ : ٧ تا ١٠)) "اور نفس انسانی کی اور اس

ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا' پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیز گاری اس پر الہام کر دی' یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔" (الشمس)

اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ ہر اس شخص کو ہدایت دیتا ہے جو ہدایت پانے کی جدوجہد کر رہا ہو اور ہر اس شخص کو کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے جو اپنے نفس کو پاک اور مطہر کر لے۔ مذکورہ بالا لوگوں کا رویہ یہ رہا کہ انہوں نے قبول ہدایت کے لئے کوئی سعی نہ کی اور انہوں نے قبولیت حق کی فطری قوتوں کو اس طرف متوجہ ہی نہ کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کو قبولیت حق کی توفیق دے دیتا۔ انہوں نے دراصل اپنی فطری قوتوں کو معطل کر دیا اور یوں اللہ تعالیٰ نے ان کے اور سچائی کے درمیان حجاب ڈال دیا۔ ان کے بارے میں سنت الٰہیہ کے مطابق فیصلہ یہ ہوا کہ انہیں ان کے پہلے فعل اور ان کی نیت اور ارادے پر چھوڑ دیا جائے۔ ہر کام اللہ کے حکم اور امر الٰہی سے ہوتا ہے اور اللہ کا امر اور حکم یہ ہے کہ جو بھی جدوجہد کرے اسے راہنمائی فراہم کی جائے اور جو بھی تزکیہ نفس کرے کامیاب ہو۔ اللہ کا حکم یہ ہے کہ اعراض کرنے والوں کے دلوں پر پردے ڈال دے اور وہ سمجھ ہی نہ سکیں۔ ان کے کان بہرے ہو جائیں اور وہ سن ہی نہ سکیں۔ اپنی آنکھوں سے آیات و دلائل دیکھیں اور ہدایت نہ پا سکیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی گواہی' ان کی جانب سے شرک کا ارتکاب اور ان کی تمام خطا کاریاں اللہ کے ارادے کے نتیجے میں ہیں اور یہ کہ ان کے بارے میں تو اللہ نے پہلے ہی فیصلے کر دیئے ہیں۔ وہ اپنی اس سوچ میں مغالطے کا شکار ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے سامنے حقیقت پیش فرماتے ہیں۔ ان کے یہ اقوال نقل کر کے ان کا سقم ظاہر فرماتے ہیں۔ ذرا اس آیت پر غور کریں:

(وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۳۵) وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۳۶) (۱۶: ۳۵-۳۶)) (یہ مشرکین کہتے ہیں "اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اس کے سوا کسی اور کی عبادت کرتے۔ اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔" ایسے ہی بہانے ان سے پہلے کے لوگ بھی بناتے رہے ہیں۔ تو کیا رسولوں پر صاف صاف بات پہنچا دینے کے سوا اور بھی کوئی ذمہ داری ہے؟ ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا' اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ "اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔" اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کسی پر ضلالت مسلط ہو گئی۔ پھر ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہو چکا ہے؟) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول پر ناراضگی کا اظہار کیا اور یہ کہ ان کی گمراہی کا فیصلہ اس لئے کر دیا گیا کہ ان پر فریضہ تبلیغ ادا ہو گیا۔ اس کے بعد ان کے طرز عمل کی وجہ سے ان کے ساتھ یہ سلوک ہوا۔

جو لوگ قضا و قدر اور صبر اور اختیار کے مسائل میں اور بندے کے ارادے اور اس کے عمل کے بارے میں فضول مباحث کرتے ہیں اور ان سادہ سے مسائل کو پیچیدہ لاہوتی مباحث بنا دیتے ہیں وہ ان باتوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں جو ان کی عقل میں آتی ہیں۔ یہ لوگ فرضی و تقدیری کے انداز میں بحثیں کرتے چلے جاتے ہیں' مگر قرآن کریم کے مثبت' سادہ اور حقیقت پسندانہ طرز فکر کو چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ سادہ حقیقت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ تقدیر الٰہی کے مطابق ہوتا ہے اور یہ کہ انسان کا ایک طرف مائل ہونا یا دوسری طرف مائل ہونا اس کی اس فطرت میں داخل ہے' جس پر اللہ نے اسے پیدا کیا ہے۔ یہ فطرت بھی تقدیر الٰہی کے مطابق ہے' اور وہ اسی طرح ہے جس طرح تقدیر الٰہی ہے۔ انسان کا کسی طرف مائل ہونا اور اس پر دنیا اور آخرت کے نتائج کا مرتب ہونا بھی تقدیر الٰہی کے حدود کے اندر ہے۔ تمام امور اللہ کی تقدیر کی طرف لوٹتے ہیں لیکن یہ تمام نتائج انسان کے ارادے پر مرتب ہوتے ہیں اور انسان کا یہ ارادہ بھی تقدیر الٰہی کا پیدا کردہ ہے۔ یہ ہے اصل حقیقت اور اس سے آگے اگر کوئی بحث کرتا ہے تو ماسوائے اس کے کہ وہ مزید پیچیدگیوں میں مبتلا ہو اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔

مشرکین کی صورت حال یہ تھی کہ ان کے سامنے ہدایت کی علامات پیش کر دی گئی تھیں۔ سچائی کے دلائل واضح کر دیئے گئے تھے اور ایمان کے اشارات ان پر واضح کر دیئے گئے تھے۔ قرآن کریم میں ان پر انفس و آفاق میں بکھرے ہوئے دلائل جمع کر دیئے گئے تھے۔ اگر ان کے دل اس طرف متوجہ ہوتے تو صرف قرآنی دلائل ہی اس بات کے لئے کافی و شافی تھے کہ وہ مشرکین کے قلوب کی تاروں کو زمزمہ خیز بنا دیتے اور ان کے خفیہ گوشہائے ادراک کو جگاتے' ان کو زندگی بخشتے اور اس طرح ان کے دل ہدایت کو قبول کر کے لبیک کہتے۔ لیکن انہوں نے اس مقصد کے حصول کے لئے کوئی زحمت گوارا نہ کی جس سے وہ راہ ہدایت پا لیتے بلکہ انہوں نے اپنی فطرت اور اس کے صحیح رجحانات کو معطل کر دیا۔ اس طرح ان کے اور اشارات ہدایت کے درمیان پردے حائل ہو گئے۔ جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تو وہ کھلی آنکھوں کے ساتھ نہ آتے۔ ان کے کان بھی سننے کے لئے تیار نہ ہوتے۔ ان کے دل سمجھنے کے لئے تیار نہ ہوتے اور وہ قرآن پر اس طرح تدبر نہ کرتے جس طرح حق اور سچائی کے متلاشی اس پر غور کرتے ہیں بلکہ وہ قرآن کا مطالعہ ہی اس لئے کرتے کہ مجادلہ کریں اور اس کی تکذیب اور اس کے رد کے مواقع تلاش کریں۔

(حَتّٰی اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (٦: ٢٥)) "حدیہ کہ جب وہ تمہارے پاس آکر تم سے جھگڑتے ہیں تو ان میں سے جن لوگوں نے انکار کا فیصلہ کر لیا ہے وہ یہی کہتے ہیں کہ یہ ایک داستان پارینہ کے سوا کچھ نہیں۔" اساطیر' اسطورہ کی جمع ہے۔ اور اسطورہ کا اطلاق ان کہانیوں پر ہوتا تھا' جن میں خداؤں کے بارے میں خارق عادت کہانیوں کا ذکر ہوتا تھا یا بڑے بڑے لیڈروں' بہادروں اور بت پرستی کے واقعات کا تذکرہ ہوتا تھا عربوں میں زیادہ تر ایرانی بت پرستی کے قصے مشہور تھے کیونکہ وہ عربوں کے قریب تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مشرکین اچھی طرح جانتے تھے کہ قرآن کریم کا ان پرانی داستانوں کے ساتھ تعلق ہی نہیں ہے۔ یہ محض ان کی جانب سے مجادلہ تھا اور وہ قرآن کریم کو رد کرنے اور اس کو جھٹلانے کے لئے حیلے بہانے تلاش کر رہے تھے

اور قرآن سے دور دراز کی باتیں تلاش کر کے ان کے ذریعے قرآن کو رد کرتے تھے۔ قرآن کریم میں چونکہ رسولوں اور ان کی اقوام کے واقعات وقصص مذکور تھے' نیز اس میں ان اقوام کا بھی ذکر تھا جن کو اللہ نے ہلاک فرمایا تھا تو محض فریب کاری اور نہایت ہی بودے اعتراض اور دور کی کوڑی ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ لاتے تھے۔ چنانچہ ان نصوص بلکہ پورے قرآن کے بارے میں وہ یہ تبصرہ کرتے "کہ یہ ایک داستان پارینہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

لوگوں کو اس قرآن کریم سے دور رکھنے کی سازش کو مزید گہرا کرنے کے لئے اور اسے نہایت ہی پختہ بنیادوں پر استوار کرنے کی غرض سے اور عوام کے ذہنوں میں یہ بٹھانے کی خاطر کہ قرآن کریم ایک داستان پارینہ ہے' مکہ کا ایک دانشور نضر بن حارث اہل فارس کے رستم واسفندیار کی داستانیں حفظ کرتا اور اس طرح اہل فارس کے دوسرے لیڈروں اور بہادروں کے قصے اور کہانیاں جمع کرتا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہی اپنی مجلس قائم کرتا جبکہ حضور ؐ لوگوں کے سامنے قرآن مجید پڑھتے۔ وہ لوگوں سے کہتا اگر محمد تم پر پرانے لوگوں کے افسانے پڑھتا ہے تو میرے پاس اس کے مقابلے میں زیادہ ادبی مواد ہے۔ اس کے بعد وہ رستم واسفندیار کے قصے شروع کر دیتا اور یہ تدبیر وہ اس لئے کرتا تھا کہ لوگ قرآن کو نہ سنیں۔

یہ لوگ عوام الناس کو قرآن سننے سے بھی منع کرتے تھے' اس لئے کہ اس وقت کی سوسائٹی کے وہ لوگ لیڈر تھے۔ وہ لوگوں کو ایسے مواقع سے دور رکھتے تھے اس ڈر سے کہ کہیں وہ قرآن کریم کی تلاوت سن کر اس سے متاثر نہ ہو جائیں۔

(وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْئَوْنَ عَنْهُ وَإِنْ يُهْلِكُوْنَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (٦: ٢٦)) "وہ اس امر حق کو قبول کرنے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور بھاگتے ہیں۔ (وہ سمجھتے ہیں کہ اس حرکت سے وہ تمہارا کچھ بگاڑ رہے ہیں) حالانکہ دراصل وہ خود اپنی ہی تباہی کا سامان کر رہے ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔" وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ قرآن کریم محض پرانے لوگوں کے قصوں پر مشتمل نہیں ہے اور اس کا پرانے قصوں کے ساتھ مقابلہ کوئی فائدہ نہ دے گا۔ اگر لوگ قرآن کو سنتے رہے تو اس سے متاثر ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ قریش کے بڑے بڑے دانشور تو خود اپنے بارے میں یہ خوف رکھتے تھے کہ تلاوت قرآن خود ان کو بھی متاثر کر سکتی ہے۔ اپنے متبعین کے بارے میں تو انہیں شدید خوف لاحق تھا۔ اس لئے اس زوردار' پھیلنے والی اور زبردست تحریک اور اہل مکہ کی کمزور اور باطل سوسائٹی کے درمیاں برپا کشمکش میں صرف یہ امر کافی نہ تھا کہ نضر ابن حارث حضور ؐ کے بالمقابل مجلس لگائے اور اس میں اہل فارس کے ادبی شہ پارے پیش کرے۔ لہٰذا احتیاطی تدابیر کے طور پر وہ اپنے متبعین کو قرآن سننے سے منع کرتے تھے اور خود بھی اپنے آپ کو ایسے مواقع سے دور رکھتے تھے جہاں وہ قرآن کریم سنیں۔ محض اس خوف سے کہ کہیں وہ خود ہی متاثر نہ ہو جائیں اور اسے قبول ہی نہ کر لیں۔ اخنس ابن شریق' ابوسفیان ابن حرب اور عمرو ابن ہشام کا قصہ تو بہت ہی مشہور ہے۔ یہ لوگ قرآن کریم کی اس جاذبیت کا مقابلہ کرتے تھے لیکن قرآن پھر بھی انہیں اپنی طرف کھینچ لاتا تھا۔ (دیکھئے ابن ہشام جزء اول اور ظلال القرآن پارہ ششم)۔

یہ تمام پاپڑ وہ اس لئے بیلتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے متبعین کو قرآن سننے سے بچا سکیں تاکہ وہ اس سے متاثر نہ ہو جائیں اور اسے قبول نہ کر لیں اور یہ کام درحقیقت خود ان کے لئے باعث ہلاکت تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وہ

درحقیقت خود اپنی تباہی کا سامان کرتے ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔"

جو شخص اپنے آپ کو اور دوسروں کو راہ ہدایت' راہ حق اور راہ نجات سے روکے رکھتا ہے وہ دنیا و آخرت دونوں میں خود اپنے آپ کو خسارے اور ہلاکت میں ڈالتا ہے۔وہ لوگ جو خود اپنے آپ کو اور اپنے متبعین کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں' دراصل وہ مساکین ہیں۔اگرچہ بظاہر وہ بڑے قہار و جبار اور بڑے بڑے طاغوت نظر آتے ہیں۔وہ تو دنیا و آخرت میں صرف اپنے اوپر اختیار رکھتے ہیں۔اگرچہ انہیں اور ان کے متبعین کو دنیا میں بعض اوقات ایک مختصر عرصے کے لئے یہ نظر آتا ہے کہ وہ بہت ہی فائدے میں ہیں اور کامیاب ہیں'لیکن دراصل وہ مفلس ہوتے ہیں۔اور ان کا آخری انجام کیا ہونے والا ہے تو پھر ذرا تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیں :

(وَلَوْ تَرٰى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (٦:٢٧)) "کاش تم اس وقت کی حالت دیکھ سکتے جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کئے جائیں گے۔اس وقت وہ کہیں گے کاش کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں پھر واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔" اس دنیا کے مختصر منظر کے بالمقابل دنیائے اخروی کا یہ منظر ہے۔نہایت ہی رسواکن' شرمساری اور یاس و حسرت کا منظر۔دنیا میں تو وہ سرکشی کرتے' جھگڑتے اور اسلام کے قریب آنے سے لوگوں کو روکتے اور لمبے چوڑے وعدے کرتے لیکن یہاں ان کے ارمان یہ ہیں جبکہ وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کئے جائیں گے۔یہ منظر دیکھنے کے لائق ہو گا۔یہ آگ پر گرفتار کر کے پیش کئے جائیں گے۔اب انہیں یہ طاقت ہی نہ ہوگی کہ وہ اعراض اور سرکشی کر سکیں۔اب نہ وہ جھگڑ سکیں گے اور نہ مغالطہ آرائی کر سکیں گے۔اس قابل دید منظر میں ان کی جانب سے اس تمنا کا اظہار ہو گا اور اگر آپ اس وقت ہوتے تو وہ یوں گویا ہوں گے "اس وقت وہ کہیں گے کاش کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں پھر واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔"

اب تو وہ جانتے ہیں کہ یہ آیات الہیہ تھیں۔اب وہ تمنا کرتے ہیں کہ وہ دنیا کی طرف لوٹا دیئے جائیں۔اب تو وہ ان آیات کی تکذیب نہیں کر سکتے لہٰذا اب تو وہ پکے مومن بن جائیں گے لیکن اب کیا ہو سکتا ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

اب یہ لوگ اپنی جبلت کو بھول گئے۔وہ ایسی جبلت کے مالک ہیں جو مان کر نہیں دیتی اور ان کی یہ بات کہ کاش وہ اگر لوٹا دیئے جائیں تو وہ تکذیب نہ کریں گے اور لازماً ایمان لائیں گے۔یہ تمنا بھی جھوٹی تمنا ہے یہ وہ تمنا ہے جو ان کی جبلت و حقیقت کے ساتھ لگا نہیں کھاتی۔اگر ان کی یہ تمنا پوری بھی کر دی جاتی تو بھی وہ ایسا نہ کرتے۔اور پھر ان کی بات یہ نہ ہوتی اور یہ لوگ یہ بات اس لئے کہیں گے کہ ان کے سامنے ان کے اعمال اور ان کا برا انجام واضح ہو جائے گا جبکہ اس سے قبل وہ اپنے متبعین سے اپنے یہ اعمال اور یہ برا انجام چھپاتے تھے تاکہ ان کو اس فریب میں ڈالے رکھیں کہ یہ حق پرست ہیں اور آخرت میں وہ کامیاب ہونے والے ہیں اور فلاح پانے والے ہیں۔

(بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (٦:٢٨)) "درحقیقت یہ بات وہ محض اس وجہ سے کہیں گے کہ جس حقیقت پر انہوں نے پردہ ڈال

رکھا تھا وہ اس وقت بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آچکی ہو گی' ورنہ اگر انہیں سابق زندگی کی طرف واپس بھیجا جائے تو پھر وہی سب کچھ کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے' وہ تو ہیں ہی جھوٹے۔" یہاں اب ان کے بارے میں بات ختم ہو جاتی ہے اور وہ اس بری حالت میں ایک جھوٹے انسان کے طور پر حقارت کے ساتھ پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔

اب ایسے لوگوں کے بارے میں ان کے کچھ مزید رخ سامنے آتے ہیں اور ان کے اس اخروی منظر کے مقابلے میں دو مزید منظر پیش کئے جاتے ہیں۔ایک تو دنیا کا منظر ہے جس میں وہ عزم بالجزم کے ساتھ اس بات کا اظہار کرتے تھے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے اور اللہ کسی کو دوبارہ نہ اٹھائے گا اور کوئی حساب و کتاب نہیں ہے۔ اور دوسرا منظر آخرت سے متعلق ہے۔ایک جھلکی جس میں وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے دکھائے جاتے ہیں اور اللہ رب العالمین ان سے باز پرس فرماتے ہیں (اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ (٦: ٣٠)) کیا یہ قیامت حق نہ تھی اور حقیقت نہیں ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس سے وہ ٹوٹ جاتے ہیں بلکہ پگھل جاتے ہیں اور ایک نہایت ہی بدحال اور ذلیل آدمی کی طرح جواب دیتے ہیں (بَلٰى وَرَبِّنَا (٦: ٣٠)) "ہمارے رب تیری قسم یہ حقیقت ہے۔" اور اب وہ اپنے اعمال کی وجہ سے عذاب الیم سے دوچار ہوتے ہیں۔ایک دوسری جھلکی بھی سامنے آتی ہے۔اچانک وہ گھڑی آپہنچتی ہے جس کے بارے میں وہ اللہ کے اس "آمنے سامنے" سے بالکل منکر تھے۔اب یہ یاس و حسرت میں ڈوب جاتے ہیں۔اپنے کاندھوں پر اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں اور آخر میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے ترازو میں دنیا کی حقیقت کیا ہے اور آخرت کا مقام کیا ہے؟

وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۲۹﴾ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۭ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ۭ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۰﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰي مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰي ظُهُوْرِهِمْ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾

"آج یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے۔کاش وہ منظر تم دیکھ سکو جب وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے۔اس وقت ان کا رب ان سے پوچھے گا "کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟" یہ کہیں گے "ہاں اے ہمارے رب' یہ حقیقت ہی ہے۔" وہ فرمائے گا "اچھا' تو

اب اپنے انکار حقیقت کی پاداش میں عذاب کا مزا چکھو۔" نقصان میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے اپنی ملاقات کی اطلاع کو جھوٹ قرار دیا۔ جب اچانک وہ گھڑی آجائے گی تو یہی لوگ کہیں گے "افسوس! ہم سے اس معاملے میں کیسی تقصیر ہوئی۔" اور ان کا حال یہ ہو گا کہ اپنی پیٹھوں پر اپنے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے ہوں گے۔ دیکھو! کیسا برا بوجھ ہے جو یہ اٹھا رہے ہیں۔ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور ایک تماشا ہے۔ حقیقت میں آخرت ہی کا مقام ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو زیاں کاری سے بچنا چاہتے ہیں' پھر کیا تم لوگ عقل سے کام نہ لوگے؟ قیامت کی جزاو سزا اور دار آخرت کا عقیدہ اسلامی عقائد و نظریات کی اساس ہے اور ہمیشہ یہ عقیدہ صرف اسلام نے پیش کیا ہے اور عقیدہ توحید کے بعد اسلامی نظام کا ڈھانچہ اسی پر استوار ہے۔ دین اسلام کے عقائد و نظریات' اخلاق و طرز عمل' قانون و دستور صرف اسی صورت میں قائم اور استوار ہو سکتے ہیں جب لوگوں کے اندر آخرت کی جوابدہی کا احساس پیدا ہو جائے۔

یہ دین جسے اللہ نے مکمل فرمایا ہے' اور اس دین کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر اپنی نعمتوں کو مکمل کر دیا ہے اسے اللہ نے مسلمانوں کے نظام حیات کے طور پر پسند کر لیا ہے۔ جیسا کہ قرآن خود یہ کہتا ہے کہ یہ دین درحقیقت زندگی کا ایک مکمل نظام ہے اور اپنی ساخت میں وہ باہم مربوط اور باہم متعلق ہے۔ اس کے اخلاقی اصولوں اور عقائد و نظریات کے درمیان ایک گہرا ربط و تعلق ہے۔ اور پھر عقائد و اخلاقیات دونوں کا قانون' دستور اور انتظام ملک سے تعلق ہے۔ یہ تمام امور اللہ کے عقیدۂ حاکمیت اور آخرت کی جوابدہی کی اساس پر قائم ہیں۔

اسلامی نظریہ حیات کے مطابق زندگی وہ مختصر عرصہ نہیں ہے جو ایک فرد اس جہان میں بسر کرتا ہے اور نہ زندگی وہ مختصر عرصہ ہے جس میں کوئی قوم زندہ رہتی ہے۔ اور نہ زندگی وہ عرصہ معلوم ہے جو اس دنیا میں انسانیت کو دیا گیا ہے اور جسے ہم دیکھ رہے ہیں۔ اسلامی تصور حیات کے مطابق زندگی ایک طویل اور نہ ختم ہونے والا عرصہ ہے۔ یہ آفاق کائنات میں وسعت پذیر ہے اور تمام جہانوں میں گہرائی تک چلا گیا ہے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے متنوع اور رنگا رنگ ہے اور یہ اس زندگی سے بالکل مختلف ہے جسے آخرت کے منکر یا اس سے غافل لوگ زندگی سمجھتے ہیں' اسے بسر کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بس یہی زندگی ہے اور اس جہان کے بعد کوئی اور جہان نہیں ہے۔ اس طرح وہ آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔

اسلامی تصور حیات کے مطابق زندگی بہت ہی وسیع ہے۔ اس میں یہ زمانہ بھی شامل ہے جسے ہم دیکھ رہے ہیں' یعنی دنیا۔ وہ اخروی زمانہ بھی اس میں شامل ہے جسے اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ اس طویل اخروی زندگی کے مقابلے میں یہ زندگی اس قدر قصیر ہے کہ یہ ساعتہ من نہار ہی کہی جا سکتی ہے۔ یعنی دن کا ایک حصہ۔

مکانیت کے اعتبار سے یہ تصور اس قدر وسیع ہے کہ وہ اس جہان اور اس کرۂ ارض کے مقابلے میں مزید کروں اور جہانوں کا قائل ہے۔ وہ ایک ایسی جنت کا قائل ہے جو آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ وسیع ہے۔ جہنم بھی اس قدر وسیع ہے کہ اس کے پیٹ کو ان تمام انس و جن سے نہیں بھرا جا سکتا جو آغاز انسانیت سے اس دنیا میں آباد ہیں اور یہ آبادی لاکھوں سالوں پر مشتمل ہے۔

پھر یہ تصور نامعلوم جہانوں تک وسیع ہو جاتا ہے۔ اس جہان سے آگے کئی جہان ہیں جن کے بارے میں صرف ذات باری کو علم ہے اور ہم اس کے بارے میں وہی کچھ اور صرف اسی قدر جانتے ہیں جس قدر اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے۔ اور یہ اخروی زندگی موت سے شروع ہو کر دار آخرت تک جا پہنچتی ہے۔ عالم موت اور عالم آخرت دونوں غیبی جہان ہیں اور

ان میں انسانی وجود اس صورت میں آگے بڑھتا ہے جس کی صحیح کیفیت صرف اللہ کے علم میں ہے۔

یہ زندگی بھی وسعت اختیار کرتی ہے' یہ جہان جسے ہم دیکھ رہے ہیں اس سے آگے بڑھتی ہے اور آخرت میں جنت و دوزخ میں بھی رواں دواں نظر آتی ہے۔ یہ اس زندگی کے مختلف رنگ ہیں اور اس دنیا کی زندگی میں اس کی صورتیں اور ذائقے مختلف ہیں۔ آخرت میں بھی اس کے رنگ ڈھنگ ہیں لیکن دنیا کی یہ پوری زندگی اخروی زندگی کے مقابلے میں اس قدر بے قیمت ہے جس طرح دنیا کے مقابلے میں مچھر کا ایک پر بے قیمت ہے۔

یہ ہے اسلامی تصور حیات کے مطابق انسانی شخصیت' جس کا وجود زمانے کی حدود سے باہر پھیلا ہوا ہے۔ جس کا عمل دخل مکان سے آگے آفاق کائنات میں وسعت رکھتا ہے اور جس کا مرتبہ اس کائنات میں پائے جانے والے عالمین سے زیادہ گہرا ہے۔ اس کا تصور اس پوری کائنات تک وسیع ہے اور پورے انسانی وجود کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اس کا ذوق حیات بہت ہی وسیع ہے۔ اس میں انسانیت کی اہمیت ہے۔ انسانی روابط کی اہمیت ہے اور انسانی اقدار کی اہمیت ہے۔ جس طرح یہ تصور وسیع ہے جو زمان و مکان کے حدود و قیود سے ماوراء ہے' لیکن جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کی سوچ خود اس کائنات کے بارے میں نہایت ہی محدود اور کمزور ہے۔ انسانی تصور حیات کے بارے میں ان کی سوچ بہت ہی محدود ہے۔ وہ اپنے آپ کو' اپنی اقدار حیات کو اور اپنے تصورات کو اس محدود دنیا کی تنگنائی تک محدود کرتے ہیں۔

اس نظریاتی اختلاف کی وجہ سے پھر اقدار حیات' زندگی کے تفصیلی نظام اور عملی شکل میں اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی کس قدر جامع اور مکمل نظام زندگی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نظام کی تشکیل میں عقیدہ آخرت کا کس قدر دخل ہے۔ نظریات و تصورات کے اعتبار سے' اخلاق اور طرز عمل کے اعتبار سے اور نظام قانون اور نظام دستور کے اعتبار سے۔

وہ انسان جو اس طویل زمانے' اس وسیع و عریض کائنات اور اس کے اندر پائے جانے والی تمام مخلوقات کے ساتھ بس رہا ہے' یقیناً اس انسان سے مختلف ہے جو اس تنگ دنیا کے غار میں بند ہے اور وہ اس تنگ غار میں بھی دوسرے انسانوں کے ساتھ بر سرپیکار ہے۔ اس کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ اگر اس دنیا میں وہ کسی چیز سے محروم رہ گیا تو عالم آخرت میں وہ اس سے بہتر پائے گا اور اگر اس دنیا میں اسے کسی عمل کا اجر نہ ملا تو اسے آخرت میں یقیناً بہتر اجر ملے گا اگر اس کے اندر یہ یقین پیدا ہو جائے تو یہ شخص اس دنیا کے لوگوں اور مفادات کے بارے میں بہت ہی سخت رویہ اختیار کرے گا۔

جس قدر انسان کی سوچ وسیع ہوتی ہے اور حقائق کا گہرا ادراک اسے حاصل ہوتا ہے' اسی قدر اس کی شخصیت بڑی ہوتی ہے۔ اس کی ترجیحات بلند ہوتی ہیں' اس کا شعور بلند ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کے اخلاق اور اس کا طرز عمل بھی بہت ہی پاکیزہ بن جاتا ہے اور ایسے شخص کا طرز عمل ان لوگوں کے مقابلے میں بہت ہی بلند ہوتا ہے جو سوراخوں میں بند ہوتے ہیں۔ جب ایسے وسیع سوچ رکھنے والے کسی فرد کی سوچ میں عقیدۂ آخرت اور اخروی جزاء و سزا کی سوچ داخل ہو جاتی ہے تو اس کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ اس کی سوچ میں نفاست اور پاکیزگی آ جاتی ہے۔ اس کا دل بھلائی اور جزائے اخروی کے راستے میں خرچ کے لئے تیار ہو جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور اس پر اخروی جزاء مرتب ہو گی۔ یوں اس کا اخلاق اور اس کا طرز عمل صالح ہو جاتا ہے اور وہ پختہ کردار کا مالک بن جاتا ہے۔ یہ پختگی اس وقت تک رہتی ہے جب تک اس کے دل و دماغ پر یہ عقیدہ چھایا رہتا ہے۔ ایسے لوگ ہروقت اصلاح اور بھلائی کے لئے کوشاں رہتے ہیں

کیونکہ وہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر وہ خاموش رہے تو نہ صرف یہ کہ ان کی دنیا فساد کا شکار ہوگی بلکہ آخرت میں بھی وہ خسران کا شکار ہو جائیں گے۔

جو لوگ حیات اخروی کے بارے میں افتراء باندھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کو اخروی زندگی کی طرف بلانا اس جہاں کے سلسلے میں ایک منفی رویہ ہے۔ اس کے نتیجے میں لوگ اس دنیا سے لاتعلق ہو جاتے ہیں اور پھر وہ اس دنیا کو خوبصورت بنانے اور اس کی اصلاح کے لئے جدوجہد نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے اقتدار پر مفسدوں کا قبضہ ہو جاتا ہے کیونکہ ان نیک لوگوں کی نظریں صرف آخرت ہی پر لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ جو لوگ اسلام پر یہ الزام دھرتے ہیں وہ جہالت میں مبتلا ہیں۔ یہ لوگ اسلام کے نظریہ آخرت اور اہل کنیسہ کے نظام رہبانیت اور ترک دنیا کے اندر فرق نہیں کرتے۔ اسلامی تصور حیات کے مطابق آخرت کا تصور یہ ہے کہ دنیا آخرت کے لئے ایک مزرع ہے اور دنیا میں ہم اس کھیت میں جو بوئیں گے وہی آخرت میں کاٹیں گے۔ اسلام کا نظریہ جہاد بھی تو اس دنیا کی اصلاح کے لئے ہے۔ یہ اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ اس دنیا سے شر و فساد کو بالکلیہ مٹا دیا جائے اور اس جہان میں جو لوگ اللہ کے حق حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ پر دست درازی کرتے ہیں ان کا ہاتھ پکڑا جائے۔ یہاں تمام ظالم طاغوتوں کی حکومت کو ختم کر کے کرۂ ارض پر عادلانہ نظام قائم کیا جائے جس میں تمام انسانوں کی بھلائی اور خیر ہو' اور یہ تمام کام فلاح اخروی کے لئے کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے مجاہدین فی سبیل اللہ کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے ہیں اور باطل کے ساتھ اس کشمکش میں وہ جو کھوتے ہیں وہاں اللہ انہیں اس کا عوض ادا کرتا ہے۔ انہوں نے اس کی راہ میں جو اذیت اٹھائی اس کے بدلے انہیں راحت دیتا ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ایسا نظریہ حیات جس کی سوچ یہ ہو' وہ انسانی زندگی معطل کر کے اسے متعفن بنا دے؟ یا یہ زندگی فساد زدہ اور خلفشار میں مبتلا ہو' یا اس میں ظلم اور سرکشی کا دور دورہ ہو اور کوئی نہ ہو کہ ظالم کا ہاتھ روکے۔ یا وہ زندگی کو پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ حالت میں چھوڑ دے جبکہ ایسے نظریے کے حامل لوگوں کی نظریں آخرت پر لگی ہوں اور وہ آخرت میں جزاء کے طالب ہوں۔

یہ درست ہے کہ تاریخ کے بعض ادوار میں لوگ منفی سوچ کے حامل رہے ہیں۔ وہ شر و فساد' ظلم و سرکشی کے داعی رہے ہیں۔ پسماندگی اور جہالت ان کی زندگی پر چھائی رہی ہے اور یہ لوگ اپنے ان حالات کے ساتھ [illegible] اسلام کے مدعی بھی رہے ہیں۔ لیکن ان کے یہ حالات اسلام کی وجہ سے نہ تھے بلکہ اسلام کے بارے میں ان کی سوچ صحت مند نہ تھی۔ ان کا تصور اسلام بگڑا ہوا تھا۔ وہ جادہ مستقیم سے منحرف ہو گئے تھے اور آخرت پر انہیں کوئی یقین نہ رہا تھا۔ ان کا ایمان متزلزل تھا۔ ان کے یہ حالات اس لئے نہ تھے کہ وہ حقیقتاً دین پر چل رہے تھے اور انہیں پورا یقین تھا کہ انہوں نے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ہرگز ایسے حالات میں زندگی بسر نہ کرتے جن میں انہوں نے پوری زندگی گزار دی کیونکہ جو شخص حقیقت دین کو پا لیتا ہے وہ ان لوگوں کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ یعنی منفی سوچ کا حامل پسماندہ اور شر و فساد پر راضی۔

ایک مسلمان اس دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو اس دنیا سے بہت ہی اونچا تصور کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس حقیر دنیا سے بہت ہی عظیم سمجھتا ہے۔ وہ اس دنیا کی پاکیزہ چیزوں کو کام میں لاتا ہے یا وہ جائز اور حلال چیزوں سے بھی دامن پاک رکھتا ہے محض اپنی اخروی فلاح کے لئے۔ وہ دنیا کی قوتوں کی تسخیر اور دنیاوی زندگی کی ترقی اور نشو و نما کے لئے پوری کوشش کرتا ہے لیکن اس نقطہ نظر سے کہ یہ جدوجہد اس پر اس کے منصب خلافت کی رو سے بطور

فریضہ عائد ہوتی ہے اور یہ کہ اس کا فرض ہے کہ وہ اس جہان میں شر و فساد اور ظلم و سرکشی کے خلاف جہاد کرے اور اس جہاد کی راہ میں جان و مال کی قربانی دے تاکہ اسے فلاح اخروی حاصل ہو۔ اس کا دین اسے یہ تعلیم دیتا ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور آخرت تک پہنچنے کا واحد راستہ یہ دنیا ہے۔ اس دنیا سے ہو کر ہر شخص کو آخرت تک پہنچنا ہے۔ لیکن آخرت کے مقابلے میں دنیا نہایت ہی حقیر اور کم ہے۔ بہرحال دنیا بھی ایک محدود نعمت ہے۔ اور اس محدود نعمت کو انسان عبور کر کے لامحدود نعمتوں میں داخل ہوتا ہے۔

اسلامی نظام کا ہر جزء اخروی زندگی کے لئے ایک سیڑھی کا کام دیتا ہے۔ اسلامی نظام کی اس سوچ کی وجہ سے انسان کے تصور میں وسعت' حسن اور بلندی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سوچ کے نتیجے میں رفعت' پاکیزگی اور رواداری پیدا ہوتی ہے اور انسان اس راہ کے لئے پرجوش ہو جاتا ہے۔ وہ محتاط اور متقی بن جاتا ہے اور انسانی جدوجہد اور زندگی میں خوشی' پختگی اور اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی زندگی صرف تصور آخرت پر استوار ہو سکتی ہے اور اسی لئے قرآن کریم نے اول سے آخر تک جگہ جگہ خوف آخرت اور یقین قیامت پر زور دیا ہے اور حقیقت آخرت کے مضامین و مناظر کو پیش کیا ہے۔

عرب ایک گھمبیر جاہلیت میں ڈوبے ہوئے تھے اور اسی جاہلیت کی وجہ سے ان کی سوچ اور ان کے شعور کی تنگ حدود میں عالم آخرت کا تصور نہیں سماتا تھا اور وہ اس دنیا کے علاوہ کوئی اور بات نہ سوچ سکتے تھے۔ وہ صرف اسی دنیا کو دیکھ سکتے تھے جو ان کی نظروں کے سامنے تھی۔ وہ اپنی شخصیت اور اپنی فکر کو اس محدود دنیا کی حدود کے آگے نہ بڑھا سکتے تھے اور نہ ہی کائنات کی مزید وسعتوں کے بارے میں کوئی تصور کر سکتے تھے۔ ان کی سوچ اور ان کا شعور بالکل حیوانی سطح تک تھا اور وہ بعینہ اس طرح سوچتے تھے جس طرح جدید جاہلیت سوچتی ہے حالانکہ دور جدید کے لوگ اپنے آپ کو علمی اور سائنسی اعتبار سے ترقی یافتہ کہتے ہیں۔ چنانچہ عربوں کی سوچ یہ تھی۔

(وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ (٦ : ٢٩)) "آج یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے۔"

یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی کہ مذکورہ بالا نظریہ حیات اور اعتقادات کے نتیجے میں ایک پاکیزہ' شریفانہ اور بلند مرتبہ زندگی وجود میں نہیں لائی جا سکتی۔ شعور اور تصور کے یہ محدود دائرے انسان کو گرا کر اسے مٹی میں ملا دیتے ہیں اور اس کی سوچ کو جانوروں کی طرح محسوسات تک محدود کر دیتے ہیں۔ جب انسان اس محدود دنیا کے اندر بند ہو جاتا ہے تو اس کے نفس کے اندر دنیا کی بھوک پیدا ہو جاتی ہے اور دنیاوی وسائل کے بارے میں حرص اور آز پیدا ہو جاتی ہے اور انسان دنیا کی اس مال و متاع کا بندہ بن جاتا ہے۔ جس طرح شہوت پرستیاں جب بے لگام ہو جائیں تو خرمستیاں کرتی ہیں اور بے روک ٹوک اور بغیر ٹھہراؤ کے اور بغیر کسی حدود کے زیادہ ہی ہوتی رہتی ہیں۔ پھر اگر یہ خواہشات اور شہوات پوری نہیں ہوتیں تو انسان اپنے آپ کو محروم تصور کرتا ہے کیونکہ اسے کسی اخروی اجر کی بھی امید نہیں ہوتی' اگرچہ وہ نہایت ہی گری ہوئی کیوں نہ ہوں اور وہ نہایت ہی چھوٹی خواہشات کیوں نہ ہوں اور ان کی نوعیت محض حیوانی خواہشات کی ہی کیوں نہ ہو۔

آج دنیا کی جو صورت حال ہے اور اس کے ردعمل میں آج لوگوں کا جو طرز عمل ہے صرف دنیا کے اس محدود دائرے کو پیش نظر رکھ کر تشکیل پاتا ہے' جس میں لوگوں کے پیش نظر صرف زمان و مکان کا محدود دائرہ ہوتا ہے جس میں عدل و انصاف اور ہمدردی اور رحم دلی کا کوئی نام و نشان نہیں ہے' جس میں ہر انسان دوسرے انسان کے ساتھ بر سر جنگ ہے' جس میں ہر طبقہ دوسرے طبقے سے بر سرپیکار ہے' جس میں ایک نسل دوسری نسل کی بیخ کنی میں مصروف ہے اور سب انسان جنگل کے جانوروں کی طرح اس دنیا کے جنگل میں آزاد پھر رہے ہیں۔ وحشیوں کی طرح جس کے جی میں جو آتا ہے کرنے پر آمادہ ہے۔ یہ مناظر آج کی مہذب دنیا میں رات اور دن ہم دیکھتے ہیں اور ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ یہ سب کے سب دنیا کے اس محدود تصور کی وجہ سے ہیں۔

ذات باری کو ان سب حالات کا علم تھا کہ وہ امت جسے پوری انسانیت کی نگرانی کا فریضہ سپرد کیا جانا تھا' اور جس کے فرائض میں یہ بات بھی شامل تھی کہ پوری انسانیت کو وہ مقام بلند تک پہنچا دے اور اسے اس طرح ترقی دے کہ اس میں انسان کا انسانی پہلو اپنی حقیقی شکل میں نمودار ہو جائے۔ اپنے یہ فرائض اس وقت تک سرانجام نہیں دے سکتی جب تک وہ دنیا کے اس محدود دائرے سے باہر نہیں آجاتی۔ جب تک اس کے تصورات اور اس کی اقدار اس محدود غار سے نکل کر آفاقی نہیں بن جاتے اور جب تک خود یہ امت دنیا کی تنگ نائیوں سے نکل کر آخرت کی وسعتوں کی سیر نہیں کرتی۔ یہ وہ سبب ہے جس کی وجہ سے قرآن نے عقیدۂ آخرت پر بہت ہی زور دیا ہے۔ ایک تو اس لئے کہ یہ ایک حقیقت ہے جو آنے والی ہے' اور قرآن کریم کا نزول اس لئے ہوا ہے کہ وہ حقائق بیان کرے۔ دوسرے اس لئے کہ اس عقیدے کے سوا کوئی انسان مکمل انسان ہی نہیں بن سکتا۔ نہ تصورات و عقائد کے اعتبار سے' نہ اخلاق اور طرز عمل کے اعتبار سے اور نہ اپنے نظام قانون اور نظام دستور کے اعتبار سے۔

یہی وجہ ہے کہ اس لہر میں اس قدر شدید اتار چڑھاؤ ہے۔ اور اس میں ایک ایسی خوفناک فضا پائی جاتی ہے جس سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان خوفناک مناظر کی بابت اللہ کو علم تھا کہ وہ انسان پر بہت ہی اثرانداز ہوتے ہیں اور اس سے انسان کے دل و دماغ کے دریچے وا ہو جاتے ہیں۔ انسان کے اندر قبولیت حق کی جو فطری استعداد ودیعت کی گئی ہے وہ جاگ اٹھتی ہے۔ اس کے اندر حرکت پیدا ہو جاتی ہے' وہ زندہ انسان نظر آتا ہے اور ہر وقت سچائی کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک عظیم سچائی کا اظہار ہے۔

(وَ لَوْ تَرٰی اِذْ وُقِفُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ قَالَ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوْا بَلٰی وَ رَبِّنَا قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (۶ : ۳۰) "کاش وہ منظر تم دیکھ سکو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے۔ اس وقت ان کا رب ان سے پوچھے گا "کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟" یہ کہیں گے "ہاں اے ہمارے رب' یہ حقیقت ہی ہے۔" وہ فرمائے گا "اچھا" تو اب اپنے انکار حقیقت کی پاداش میں عذاب کا مزا چکھو۔" یہ ہے ان لوگوں کا انجام جو کہتے تھے :۔

"جو کچھ ہے بس ہماری دنیا کی زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے۔" یہ ایک نہایت ہی برا' توہین آمیز اور شرمسار کنندہ منظر ہے۔ یہ لوگ بارگاہ الٰہی میں کھڑے ہیں' وہ یہاں پیش ہونے کی تکذیب کرتے

تھے - اب وہ اس موقف سے ہل بھی نہیں سکتے - یوں کھڑے ہیں جس طرح باندھے ہوئے ہیں اور سامنے خوفناک انجام ہے - ان سے پوچھا جاتا ہے - "کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟"

یہ سوال ہی نہایت شرمسار کرنے والا ہے - سوال سنتے ہی مارے شرم کے انسان پسینے سے شرابور ہو جاتا ہے - اب وہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں؟ "ہاں ہمارے رب یہ حقیقت ہے -" اس حقیقت کو وہ ایسے وقت تسلیم کرتے ہیں جبکہ وہ باری تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہیں اور ایک ایسی جگہ کھڑے ہیں جس کا وہ بڑی سختی سے انکار کرتے تھے - اب نہایت ہی شاہانہ انداز میں اور نہایت ہی مختصر فیصلے میں اور نہایت ہی خوفناک انداز میں ان کا انجام بتا دیا جاتا ہے - عالم بالا سے نہایت ہی سری فیصلہ آجاتا ہے لیکن فائنل! "اچھا تو اب اپنے انکار حقیقت کی پاداش میں عذاب کا مزا چکھو -" یہ انجام ان لوگوں کا بالکل مناسب انجام ہے جنہوں نے اپنے اوپر اسلام کے وسیع تصور حیات کے دروازے بند کر لیے ہیں اور اس تصور کی وسعتوں کو چھوڑ کر وہ محسوسات کے تنگ دائرے میں بند ہو چکے ہیں' جو گوشت و پوست کی دنیا سے بلند ہو کر انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنا نہیں چاہتے اور زمین اور مادے کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں - انہوں نے اپنی پوری زندگی کے نظام کو ایک گرے پڑے اور کمزور تصور پر استوار کر لیا ہے - یہ لوگ اس قدر گر گئے ہیں کہ انہوں نے خود اپنے آپ کو اس عذاب کا مستحق بنا لیا ہے' جو ان لوگوں کی طبیعت اور مزاج سے زیادہ مناسب ہے جو قیام قیامت کے منکر ہیں' جنہوں نے اس قدر گھٹیا زندگی کو اختیار کر لیا ہے اور جو اس قدر گرے ہوئے خیالات کے حامل ہیں - اس فیصلے پر جس منظر کا خاتمہ ہوتا ہے اس کی تکمیل ان خوفناک ریمارکس کے ساتھ ہوتی ہے' جو رعب و داب میں شان باری کے شایان شان ہیں - فرماتے ہیں :

(قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا

عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا (۶ : ۳۱)) "نقصان میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے اپنی ملاقات کی اطلاع کو جھوٹ قرار دیا - جب اچانک وہ گھڑی آجائے گی تو یہی لوگ کہیں گے "افسوس! ہم سے اس معاملے میں کیسی تقصیر ہوئی -" یقیناً یہ عظیم خسارہ ہو گا' دنیا میں بھی انہوں نے گھٹیا اور نچلے درجے کی زندگی گزاری اور آخرت میں تو حال وہ ہو گا جس کا تذکرہ ہوا - اب اچانک وہ گھڑی آپہنچی جس کی توقع ان غفلت شعاروں کو نہ تھی اور جو اسے شمار ہی میں نہ لاتے تھے - لیکن "جب وہ گھڑی آجائے گی تو یہی لوگ کہیں گے "افسوس کہ اس معاملے میں ہم سے کیسی تقصیر ہوئی -"

اب ان لوگوں کا اگلا منظر ملاحظہ فرمائیں - یہ لوگ یوں نظر آتے ہیں جس طرح بار برداری کے ایسے جانور جن پر بھاری بوجھ لدا ہو - (وَهُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ (۶ : ۳۱) "اور ان کا حال یہ ہو گا کہ اپنی پیٹھوں پر اپنے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے ہوں گے -" بلکہ جانور تو ان کے مقابلے میں بہتر ہیں کیونکہ یہ بار برداری سے متعلق ہیں اور بوجھ اٹھاتے ہیں لیکن یہ لوگ جرائم کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں گے - جانور اپنے بوجھ کو منزل تک پہنچا کر آرام کرتے ہیں اور یہ لوگ گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے وارد جہنم ہوں گے اور ان کو تو مجرم قرار دے کر وہاں بھیجا جائے گا -

(اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ (۶ : ۳۱)) دیکھو! کیسا برا بوجھ ہے جو یہ اٹھا رہے ہیں -" اب اس پیراگراف کا

آخری بند آتا ہے' خسارے اور ہلاکت کے اس منظر میں اور خوف و ہراس کے ان حالات میں بات ختم ہوتی ہے۔ اللہ کے ترازو میں ایک طرف دنیا کا وزن ہے اور دوسری جانب آخرت کی قدروقیمت رکھی جاتی ہے اور اقدار کو یوں تولا جاتا ہے :

(وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۶ : ۳۲)) " دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور ایک تماشا ہے۔ حقیقت میں آخرت ہی کا مقام ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو زیاں کاری سے بچنا چاہتے ہیں۔ پھر کیا تم لوگ عقل سے کام نہ لوگے ؟) اللہ کے پیانے کے مطابق حیات دنیا اور حیات اخروی کا یہ وزن ہے اور یہ حقیقی وزن ہے۔ اس چھوٹے سے کرے پر جس کا نام زمین ہے۔ ایک گھنٹے کی زندگی کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے۔ یہ لہو و لعب ہی ہو سکتا ہے۔ خصوصاً جب اس کا موازنہ عالم آخرت کی طویل اور ابدی زندگی سے کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ عالم آخرت کے مقابلے میں اسے لہو و لعب ہی کہا جا سکتا ہے اس لئے کہ وہ ابدی اور دوامی زندگی ہے اور جنت بہت ہی کشادہ ہے۔

یہ تو ہے اس دنیا کی حقیقی قدر و قیمت بمقابلہ آخرت لیکن اسلامی تصور حیات نے اس مختصر دنیا کو بھی مہمل نہیں چھوڑا اور نہ ہی اس کے ساتھ منفی رویہ اختیار کیا ہے اور نہ ہی ترک دنیا کی تعلیم دی ہے۔ تصوف اور زاہدانہ زندگی کے بعض مناظر میں جو ترک دنیا اور رہبانیت نظر آتی ہے اس کا سرچشمہ اسلامی تصور حیات نہیں ہے۔ یہ چیزیں اسلامی تصور حیات میں کنیسہ اور رہبانیت کے راستے داخل ہوئی ہیں یا اہل فارس کے بعض اداروں سے در آئی ہیں یا بعض ہندوانہ اور یونانی تصورات کی وجہ سے آئی ہیں۔ اس وقت جب دوسرے معاشروں کی ثقافتوں کو اسلامی معاشرے میں منتقل کیا گیا۔

اسلامی تصور حیات کے مطابق عملی زندگی کا مکمل نمونہ صحابہ کرام تھے۔ انہوں نے دنیا کے حوالے سے کوئی منفی رویہ اختیار نہیں کیا اور نہ ہی ترک دنیا کا راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے اپنے نفوس کے اندر پائے جانے والے شیطانی نفس پر قابو پایا۔ انہوں نے کرۂ ارض پر غالب نظام جاہلیت کو مغلوب کیا۔ ان نظاموں میں حق حاکمیت خدا کے بجائے دوسرے سرداروں اور بادشاہوں کو حاصل تھا۔ صحابہ کرام میزان الٰہی کے مطابق اس دنیاوی زندگی کی اصل قدر و قیمت بھی سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی میں آخرت کے لئے کام کیا اور اس دنیا کے حوالے سے بھی مثبت رویہ کا اختیار کیا۔ انہوں نے معاملات حیات میں سرگرمی سے حصہ لیا اور جوش و خروش کے ساتھ معاملات دنیا طے کئے اور دنیاوی زندگی کے ہر پہلو پر انہوں نے کام کیا۔ لیکن صحابہ کرام کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے دنیا کی حقیقت کی تعلیم نے بہت ہی فائدہ دیا۔ اس لئے وہ دنیا ہی کے بندے نہ بنے بلکہ انہوں نے آخرت کے لئے بھی کام کیا۔ وہ دنیا پر سوار تھے ' دنیا ان کے اوپر سوار نہ تھی۔ انہوں نے دنیا کو اپنا غلام بنا کر اسے ذلیل کیا اور خود دنیا کے غلام بن کر انہوں نے دنیا کی سلطنت کی ماتحتی اختیار نہ کی۔ وہ اس دنیا پر اللہ کی جانب سے نائب اور خلیفہ رہے۔ انہوں نے حق خلافت خوب ادا کیا اور اس دنیا کی خوب تعمیر کی۔ اس کی خوب اصلاح کی لیکن انہوں نے یہ سب رضائے الٰہی کے لئے کیا اور اجر اخروی کی امید پر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دنیا کے میدان میں بھی اہل دنیا اور دنیا پرستوں سے آگے بڑھ گئے اور آخرت کے میدان میں تو وہ تھے ہی ان سے آگے۔

آخرت بے شک پردۂ غیب میں مستور ہے اس لئے جو شخص آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کی سوچ وسیع اور اس

کا ادراک بلند ہوتا ہے اور جو لوگ عقل رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ اچھا راستہ ہے۔ ’’حقیقت میں آخرت ہی کا مقام ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو زیاں کاری سے بچنا چاہتے ہیں۔ پھر کیا تم عقل سے کام نہ لوگے؟‘‘

جو لوگ آج کے دور میں آخرت کے منکر ہیں اور اس لئے منکر ہیں کہ وہ پردۂ غیب میں مستور ہے‘ وہ دراصل پرلے درجے کے جاہل ہیں حالانکہ وہ دعویٰ علم کا کرتے ہیں اور یہ لوگ جس علم کا دعویٰ کرتے ہیں وہ انسانی علم ہے اور انسانی علم میں آج تک کوئی ایسی حقیقت سامنے نہیں آئی ہے کہ اسے آخری حقیقت کہا جا سکے۔ اگر کوئی حقیقت سامنے آئی ہے تو وہ یہ ہے کہ ہمیں غیب کا کوئی علم نہیں ہے اور غیب ہم سے مخفی ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۵۹ ایک نظر میں

اس سورہ کی پر تلاطم موجوں میں سے اس موج میں روئے سخن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دلجوئی فرماتے ہیں کہ آپ ؐ اس رویے سے پریشان نہ ہوں جو آپ ؐ کی جانب آپ ؐ کی قوم نے اختیار کر رکھا ہے۔ آپ ؐ کی قوم آپ ؐ کو صادق و امین مانتی ہے' اس لئے یہ لوگ آپ ؐ کو جھوٹا نہیں سمجھتے بلکہ وہ اصرار اس بات پر کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی آیات کو نہ مانیں گے اور ایمان نہ لائیں گے۔ اس لئے نہیں کہ وہ حضور ؐ کو جھوٹا سمجھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ کچھ دوسری وجوہات سے وہ اسلامی نظریہ حیات کا انکار کرتے ہیں۔ آپ کی تسلی کے لئے آپ کے سابق بھائیوں اور رسولوں کے قصے اور واقعات کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا ہے کہ ان کو آپ سے زیادہ اذیت دی گئی لیکن انہوں نے صبر سے کام لیا اور مشکلات کو انگیز کیا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح و کامرانی عطا فرمائی اور یہ سب کچھ سنت الٰہیہ کے اصولوں کے مطابق ہوا جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور اطمینان دلایا جاچکا تو پھر آپ کے سامنے اللہ تعالیٰ دعوت اسلامی کے بارے میں ایک اہم حقیقت برائے غور رکھتے ہیں۔ وہ یہ کہ دعوت اسلامی کا کام سنت الٰہیہ کے مطابق اس جہاں میں چلتا رہتا ہے اور داعی کا کردار اس میں صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ دعوت کو مخاطبین تک پہنچائے اور بات کرتا چلا جائے۔ تمام امور کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے' وہ اس جہان کو جس طرف چاہے موڑ دے۔ داعی کا کام بس صرف یہ ہے کہ وہ احکام الٰہی کے مطابق اپنی جدوجہد جاری رکھے اور ایک قدم بھی اپنی راہ سے ادھر ادھر نہ ہو اور خود اللہ کو تجاویز دینا نہ شروع کر دے۔ اگر داعی بذات خود حضور اکرم ؐ ہوں تو انہیں بھی اس کی اجازت نہیں ہے۔ نہ داعی کا یہ کام ہے کہ وہ مخالفین اور مکذبین کی تجاویز پر غور کرے نہ عوام الناس کے کام پر غور کرے کہ دعوت کا منہاج یہ ہونا چاہئے اور نہ ہی وہ ان کی جانب سے دلائل و معجزات کا مطالبہ مانے۔ اس لئے کہ زندہ دل لوگ تو اس کی بات سنیں گے اور قبول کریں گے' لیکن جن لوگوں کے دل مر چکے ہیں وہ ہرگز اس کی بات قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ لوگوں کو اسی طرح مردہ رہنے دیتا ہے یا انہیں زندگی بخشتا ہے۔ قیامت اور حشر تک اللہ کی یہ سنت جاری رہے گی۔

یہ لوگ اقوام سابقہ کی طرح آیات و معجزات طلب کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اگرچہ ہر قسم کے معجزات کے صدور پر قادر ہے' لیکن وہ حکیم ہے' اور وہ ان معجزات کا صدور اپنی حکمت کی بناء پر نہیں کرتا۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جاتا ہے کہ اگر آپ پر یہ صورت حال شاق گزر رہی ہے تو پھر اگر آپ کے اندر کوئی طاقت ہے تو آپ خود کسی معجزے کا بندوبست کریں۔ اللہ تو تمام مخلوقات کا خالق ہے۔ وہ تمام مخلوق کے بھیدوں کا جاننے والا ہے' ان کے مزاج اور صلاحیتوں کو خوب جانتا ہے۔ وہ اپنی حکمت کے تحت جھٹلانے والوں کو اندھیروں میں چھوڑتا ہے جس طرح گونگے اور بہرے ہوتے ہیں۔ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ضلالت میں چھوڑ دیتا ہے۔ یہ سب امور اس کی حکمت کے تحت چلتے ہیں۔

درس نمبر۵۹ تشریح آیات

۳۳ ----- تا ----- ۳۹

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٣٣﴾

"اے نبی ؐ ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے، لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔

مشرکین عرب عموماً اور قریش کا وہ طبقہ خصوصاً جو دعوت اسلامی کے مقابلے میں ڈٹا ہوا تھا اور جاہلیت میں گرفتار تھا، وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت میں شک نہ کرتا تھا۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ آپ صادق اور امین ہیں۔ ان کے علم میں کوئی ایک چھوٹا سا واقعہ بھی نہ تھا جس میں آپ نے جھوٹ بولا ہو کیونکہ آپ رسالت سے قبل ان میں ایک طویل زمانہ رہ چکے تھے۔ اسی طرح جو طبقات آپ کی دعوت کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے تھے انہیں اس بات میں بھی شک نہ تھا کہ آپ بالکل سچے رسول ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ قرآن انسانی کلام نہیں ہے اور یہ کہ انسان اس قسم کا کلام پیش نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے باوجود اپنے اس علم اور یقین کے اظہار سے انکار کر رہے تھے اور اس دین جدید میں داخل ہونے سے مسلسل انکار کرتے چلے جاتے تھے۔ وہ یہ انکار اس لئے نہ کرتے تھے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرتے تھے بلکہ وہ اس لئے یہ انکار کرتے تھے کہ اس طرح ان کے اپنے اثر و رسوخ اور ان کی معاشرتی پوزیشن پر زد پڑتی تھی۔ یہ تھی وہ اصل بات جس کی وجہ سے انہوں نے انکار اور کفر کی راہ کو اپنا لیا تھا اور اپنے باطل شرکیہ انکار پر جمے ہوئے تھے۔

اسلامی تاریخ اور ذخیرہ احادیث میں متعدد ایسی روایات موجود ہیں جن سے قریش اور دوسرے عربوں کی اس پالیسی کا اچھی طرح اظہار ہوتا ہے۔ وہ لوگ قرآن کے بارے میں اپنی حقیقی رائے کو چھپاتے تھے۔

ابن اسحٰق نے ابن شہاب زہری سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ابوسفیان ابن حرب، ابوجہل ابن ہشام اور بنی زہرہ کے حلیف اخنس ابن شریق ابن عمر ابن وہب ثقفی ایک رات خفیہ طور پر نکلے تاکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنیں۔ آپ رات کو اپنے گھر میں نماز میں قرآن کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ ہر ایک کسی خفیہ جگہ بیٹھ گیا اور تلاوت سنتا رہا۔ ان تین افراد میں سے کوئی شخص دوسرے کے بارے میں نہ جانتا تھا۔ یہ لوگ ساری رات قرآن کریم سنتے رہے جب صبح ہوئی تو بکھر گئے۔ راستے میں اتفاقاً ایک دوسرے کو انہوں نے دیکھ لیا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو ملامت کی اور ایک دوسرے سے کہا

کہ دوبارہ کوئی یہ حرکت نہ کرے کیونکہ اگر ہمیں عام نادان لوگوں نے دیکھ لیا تو ان کے دل میں تم اچھا تاثر نہ چھوڑو گے۔ اس قرارداد کے بعد یہ لوگ چلے گئے۔ جب دوسری رات آئی تو ان میں سے ہر ایک پھر آکر اپنی جگہ چھپ گیا۔ ساری رات سنتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو یہ لوگ پھر بکھر گئے۔ اتفاقاً راستے میں پھر ان کی ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے پھر پہلی رات کی طرح ایک دوسرے کو سخت وسست کہا اور چلے گئے۔ جب تیسری رات ہوئی تو یہ پھر اپنی اپنی جگہ آکر بیٹھ گئے اور ساری رات کلام الٰہی سنتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو پھر جانے لگے اور راستے میں انہوں نے پھر ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔ انہوں نے کہا ' ہم ایک دوسرے کو نہ چھوڑیں گے جب تک کہ ہم پختہ عہد نہ کرلیں کہ پھر اس طرف نہ آئیں گے۔ چنانچہ انہوں نے پھر نہ آنے کا باقاعدہ معاہدہ کرلیا اور چلے گئے دوسرے دن صبح ہوتے ہی اخنس ابن شریق نے اپنا عصا لیا اور ابوسفیان ابن حرب سے ان کے گھر آکر ملا۔ اس نے ابوسفیان سے کہا : بتاؤ ابو حنظلہ رات کو تم نے محمد سے جو کلام سنا اس کے بارے میں تمہاری حقیقی رائے کیا ہے؟ اس نے کہا : "ابوثعلبہ! خدا کی قسم میں نے اس سے بعض ایسی باتیں سنیں جنہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں اور ان کا مطلب بھی اچھی طرح سمجھتا ہوں اور بعض باتیں میں نے ایسی بھی سنی ہیں کہ جن کے معنی و مراد کو میں نہیں سمجھا ہوں۔" اخنس نے کہا : "اس خدا کی قسم جس کے نام پر میں نے حلف لیا۔ میرا بھی یہی حال ہے۔ اب اخنس ان کے ہاں سے نکلا اور ابوجہل کے پاس آیا' اس کے گھر گیا۔ اور اسے کہا ابوالحکم! تم بتاؤ محمد سے تم نے جو کلام سنا اس کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے؟ ابوجہل نے کہا : "میں نے کیا سنا؟" اور پھر کہا : "ہمارا اور عبد مناف کا ہمیشہ مقابلہ رہا۔ انہوں نے لوگوں کو کھانا کھلانا شروع کیا۔ ہم نے بھی لوگوں کو مقابلے میں خوب کھلایا' انہوں نے لوگوں کو سواریاں دیں تو ہم نے بھی سواریاں دینا شروع کردیں۔ انہوں نے عطیے دیئے تو ہم نے بھی عطایا کی بارش کر دی یہاں تک کہ ہم گھوڑوں کے اوپر بیٹھ کر بھی گھٹنے سے گھٹنا ملا کر چلے اور ہم ایک دوسرے سے اس طرح آگے بڑھے جس طرح مقابلے کے دو گھوڑے ایک دوسرے سے آگے بڑھتے ہیں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ ہم میں ایک نبی پیدا ہوگیا ہے اور اس پر آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے۔ ہم ان کے مقابلے میں نبی کہاں سے لائیں گے؟ خدا کی قسم ہم کبھی بھی اس پر ایمان نہ لائیں گے۔ اور کبھی بھی اس کی تصدیق نہ کریں گے۔ راوی کہتے ہیں کہ اخنس اسے چھوڑ کر اٹھ گیا۔

ابن جریر نے آیت (قَدْ نَعْلَمُ ...... (۶ : ۳۳) الخ کے بارے میں سدی سے بواسطہ اسباط یہ روایت نقل کی ہے کہ بدر کے موقعہ پر اخنس ابن شریق نے بنی زہرہ سے کہا : اے بنی زہرہ' محمد تمہارا بھانجا ہے' تمہارا حق تو یہ ہے کہ تم اپنے بھانجے کی مدافعت کرو۔ اگر وہ فی الحقیقت نبی ہے تو تم ایک نبی کے ساتھ مقاتلہ کرنے کے گناہ سے بچ جاؤ گے۔ اگر وہ جھوٹا ہوا تو تمہارا حق تو یہ ہے کہ تم اپنے بھانجے پر دست درازی نہ کرو۔ تم رک جاؤ حتیٰ کہ اس کی مڈبھیڑ ابوجہل سے ہو جائے۔ اگر محمد غالب ہوا تو تم صحیح و سلامت واپس ہو جاؤ گے اور اگر محمد مغلوب ہوگیا تو بھی تمہاری قوم تم سے کوئی مؤاخذہ نہ کرے گی۔ چنانچہ بدر کے واقعہ کے بعد اس کا نام اخنس (علیحدہ ہونے والا' چھپنے والا) پڑ گیا حالانکہ پہلے اس کا نام ابی تھا۔ اس کے بعد اخنس نے ابوجہل سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات تنہائی میں ہوئی۔ اخنس نے کہا : "ابوالحکم' مجھے محمد کے بارے میں بتاؤ کہ وہ سچے ہیں یا جھوٹے؟ یہاں قریش کا میرے اور تمہارے سوا کوئی نہیں ہے جو ہماری بات سنتا ہو' ابوجہل نے کہا : "تم برباد ہو جاؤ' وہ تو سچے ہیں خدا کی قسم۔" محمد نے تو کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ لیکن بات یہ ہے کہ اگر قصی کی اولاد لواء' سقایہ اور حجابہ کے مناصب کے ساتھ ساتھ نبوت کا مرتبہ بھی لے جائے تو قریش کے باقی قبائل کے پاس کیا رہ جائے

گا۔" یہی مفہوم ہے اس آیت کا "یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔"

یہاں یہ بات نوٹ کر لی جائے کہ یہ سورہ مکی ہے اور یہ آیت بھی بے شک مکی ہے لیکن بدر کا واقعہ مدینہ میں پیش آیا' لیکن جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ صحابہ کرام کسی آیت میں یہ کہتے (ذلك قوله) اور اس کے بعد کسی واقعہ کا ذکر کرتے تو مطلب یہ نہ ہوتا تھا کہ اس واقعہ کی بابت یہ آیت نازل ہوئی تھی بلکہ مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس واقعہ پر یہ آیت صادق آتی ہے اور اس واقعہ پر اس سے راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ چاہے یہ آیت اس واقعہ سے پہلے نازل ہوئی ہو یا بعد میں نازل ہوئی ہو لہٰذا یہ روایت اس لحاظ سے غریب نہ ہوگی۔

ابن اسحاق نے یزید ابن زیادہ سے روایت کی ہے' انہوں نے محمد ابن کعب قرظی سے روایت کی ہے۔ محمد نے کہا کہ مجھے یہ بتایا گیا ہے عتبہ ابن ربیعہ سرداران قریش سے تھا' ایک دن قریش کی ایک محفل میں بیٹھا ہوا تھا۔ حضور اکرم ؐ بھی مسجد حرام میں اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔ عتبہ نے قریش سے کہا' کیا یہ مناسب ہے کہ میں محمد ؐ کے پاس جاکر ان کے سامنے کچھ تجاویز پیش کروں؟ اور وہ جو مطالبے کرے ہم انہیں پورا کر دیں اور وہ ہم پر تنقید بند کر دے' شاید کہ وہ مان جائے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب حضرت حمزہ مسلمان ہو گئے تھے اور آپ کے ساتھی روز بروز بڑھ رہے تھے۔ مجلس نے بالاتفاق کہا کہ تجویز بالکل درست ہے۔ ابو الولید اٹھو اور ان سے بات کرو۔ عتبہ اٹھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ ؐ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور بولا: "بھتیجے! تم جانتے ہو کہ ہم میں تمہارا بلند مقام ہے' افراد قبیلہ بھی کافی ہیں اور آپ کا نسب بھی بلند مرتبت ہے لیکن تم نے اپنی قوم کو ایک عظیم مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ قوم کا اتحاد و اتفاق ختم ہو گیا ہے' تم نے قوم کے افکار و عقائد کی تضحیک کی۔ ان کے دین اور الہوں کو برا بھلا کہا اور قوم کے آباؤ اجداد جو فوت ہو گئے ہیں ان کو تم کافر اور جہنمی قرار دیتے ہو۔ میں تمہارے سامنے کچھ تجاویز پیش کرتا ہوں تم انہیں ذرا غور سے سنو۔ ممکن ہے کہ یہ تمہارے لئے قابل قبول ہوں۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا: "ابوالولید کہو' میں سنتا ہوں۔" اس پر عتبہ نے کہا: "بھتیجے! تم نے جو تحریک برپا کر رکھی ہے اگر اس سے تمہاری غرض یہ ہو کہ تم مال و دولت جمع کر لو تو ہم تمہارے لئے اس قدر مال جمع کر دیتے ہیں کہ ہم میں تم سب سے زیادہ مالدار بن جاؤ گے۔ اگر تم لیڈر شپ چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا اتنا بڑا لیڈر بنا دیتے ہیں کہ تمہارے بغیر ہم کوئی فیصلہ نہ کریں گے۔ اگر تم بادشاہت چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں اور اگر صورت حال یہ ہے کہ جو خیالات تم پر نازل ہوتے ہیں یہ کوئی ایسی نفسیاتی بیماری ہے جس میں تم مجبور ہو اور تم ان خیالات کو ترک نہیں کر سکتے تو ہم تمہارے لئے بڑے بڑے اطباء کا انتظام کرتے ہیں اور اس قدر خرچ کرتے ہیں کہ تم صحیح اور تندرست ہو جاؤ اس لئے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کا تابع اس پر غالب آ جاتا ہے اور اس کا علاج کرنا پڑتا ہے۔ (یہ تھے تقریباً اس کے الفاظ) عتبہ نے یہ بات کی اور فارغ ہو گیا۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی باتوں کو اچھی طرح سنتے رہے۔ اس کے بعد آپ ؐ نے اس سے پوچھا ابوالولید تمہاری بات ختم ہو گئی۔" تو اس نے کہا' ہاں۔ حضور ؐ نے ان سے کہا" اب تم میری بات توجہ سے سنو' تو عتبہ نے کہا فرمایئے! آپ نے پڑھنا شروع کیا۔

حٰمٓ (۱) تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۲) كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۳) بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (۴) (۴۱ : ۱ تا

٤)) آپ نے سورہ حم السجدہ کی یہ آیات 'آیت سجدہ تک تلاوت کیں اور پھر سجدہ فرمایا۔ عتبہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اپنے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے زمین پر رکھے اور ان پر ٹیک لگائی۔ حضور ؐ نے فرمایا: ''ابوالولید تم نے سن لیا' یہ ہے میرا جواب۔'' عتبہ اٹھا اور اپنی محفل میں گیا۔ انہوں نے جب عتبہ کو آتے دیکھا تو ایک دوسرے سے کہا: ''خدا کی قسم ابوالولید جو چہرہ لے کر گیا تھا اب اس کا وہ چہرہ نہیں ہے۔'' لیکن جب وہ ان کے پاس بیٹھا تو انہوں نے پوچھا ابوالولید تم کیا لے کر آئے ہو؟ اس نے کہا کہ میرے پاس یہ بات ہے کہ میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے کہ خدا کی قسم میں نے پہلے کبھی ایسا کلام نہیں سنا۔ خدا کی قسم نہ وہ جادو ہے' نہ شعر ہے' نہ کہانت ہے۔ اے اہل قریش! تمہیں میرا مشورہ یہ ہے کہ تم میری بات مانو اور اس معاملے کو مجھ پر چھوڑ دو۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اس شخص سے تعرض نہ کرو اور اس کی راہ نہ روکو' اسے اس کے حال پر چھوڑ دو' خدا کی قسم میں نے اس کی جو بات سنی ہے اس کے بارے میں ایک دن تم کوئی عظیم خبر سنو گے۔ اگر اس کو عربوں نے ختم کر دیا تو وہ تمہارا یہ مسئلہ حل کر دیں گے۔ اور اگر یہ شخص عربوں پر غالب آگیا تو اس کی حکومت تمہاری حکومت ہوگی۔ اس کی عزت تمہاری عزت ہوگی اور تم اس کی وجہ سے نہایت ہی خوشحال قوم بن جاؤ گے۔'' اس پر اہل محفل نے یک زبان ہو کر کہا: ''ابو الولید خدا کی قسم اس نے اپنی باتوں سے تم پر جادو کر دیا ہے۔'' اس پر ابو الولید نے کہا'' یہ تمہاری رائے ہے لہٰذا جو تمہاری سمجھ میں آئے کرو۔''

علامہ بغوی نے اپنی تفسیر میں حضرت جابر ؓ کی روایت نقل فرمائی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ حم السجدہ پڑھتے پڑھتے اس آیت تک پہنچے (فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ (۱ ٤: ۱ ۳)) تو عتبہ نے حضور ؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور آپ ؐ کو صلہ رحمی کا واسطہ دیا کہ ایسا نہ کہیں' اس کے بعد عتبہ اپنے خاندان کے پاس چلا گیا اور قریش کی طرف نہ آیا اور اس نے اپنے آپ کو بند کر لیا۔

اس کے بعد جب عتبہ سے اس بارے میں گفتگو کی جاتی تو وہ کہتا: ''میں نے حضور ؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور آپ ؐ کو صلہ رحمی کا واسطہ دیا کہ وہ آگے نہ بڑھیں اور کیا تمہیں علم نہیں ہے جب محمد کوئی بات کہتا ہے تو وہ ہو کر رہتی ہے' اس لئے میں ڈر گیا تھا کہ کہیں تم پر بھی عذاب نازل نہ ہو جائے۔

ابن اسحاق نے یہ روایت کی ہے کہ ولید ابن مغیرہ کے پاس قریش کے کچھ زعماء جمع ہوئے۔ ولید ابن مغیرہ ان میں ایک معمر دانشور تھا۔ زمانہ حج کا تھا۔ اس نے ان زعماء سے کہا' اہل قریش موسم حج آرہا ہے اور تمام عرب وفود کی شکل میں آئیں گے اور انہوں نے تمہارے ساتھی کے بارے میں سن رکھا ہے' لہٰذا اس کے بارے میں تم ایک رائے پر متفق ہو جاؤ اور اگر تم مختلف باتیں کرو گے تو اس طرح تم خود ایک دوسرے کی تکذیب کرو گے۔ خود تمہاری اپنی باتیں تمہاری تردید کر دیں گی۔ انہوں نے کہا' ابو شمس! تم ہی کچھ کہو اور ہمارے لئے ایک پختہ بات متعین کر دو تاکہ ہم سب وہی ایک بات کہیں۔ اس نے کہا مناسب تو یہ ہے کہ پہلے تم خود تجاویز دو' میں سنتا ہوں۔ انہوں نے کہا: ''ہم اسے کاہن کہیں گے۔'' اس نے کہا: ''یہ بات بالکل غلط ہے' اس لئے کہ وہ ہرگز کاہن نہیں ہے۔ ہم نے کاہن بہت دیکھے ہیں' نہ وہ کاہنوں کی طرح گاتا گنگناتا ہے اور نہ سجع ملاتا ہے۔'' پھر انہوں نے یہ تجویز دی کہ ہم اسے مجنون کہیں گے' اس پر اس نے کہا: کہ وہ مجنوں بھی نہیں ہے۔ ہم نے بہت سے پاگل دیکھے ہیں اور پاگلوں کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں نہ اس کا گلا گھونٹا ہوا ہے' نہ اس کے دل میں وسوسے آتے ہیں' نہ اس کے دل میں شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ پھر انہوں نے تجویز کیا کہ

اسے شاعر کہنا چاہئے تو اس نے کہا : کہ آپ ؐ شاعر بھی نہیں ہیں۔ ہم اشعار کو اچھی جانتے ہیں ' رجز ' ہزج ' قریضہ ' مقبوضہ اور مبسوطہ اس کی اقسام ہیں لہٰذا قرآن شعر کے زمرے میں نہیں آتا۔ تو پھر انہوں نے کہا کہ ہمیں انہیں ساحر کہنا چاہیے۔ اس پر اس نے کہا : کہ حضور ؐ ساحر بھی نہیں ہیں۔ ہم نے جادوگروں اور ان کے جادوگرانہ کرتبوں کو دیکھا ہے۔ وہ نہ پھونک جھاڑ کا کام کرتا ہے اور نہ تعویذ گنڈوں کا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ابوشمس پھر تم ہی بتاؤ کہ ہم کیا کہیں۔ انہوں نے کہا : خدا کی قسم ' ان کی باتوں میں بڑی مٹھاس ہے اس کا اصل پھل دار ہے اور اس کی شاخیں بار آور ہیں اور ان باتوں میں سے جس کا بھی تم اظہار کرو گے لوگ انہیں غلط سمجھیں گے۔ میرے خیال میں اگر اس کلام کے بارے میں کوئی معقول بات کہی جا سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ تم محمد پر ساحر ہونے کا الزام عائد کرو کہ وہ ایسی جادو بھری باتیں کرتا ہے جن کی وجہ سے باپ اور بیٹے کے درمیان تفرقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بھائی اور بھائی کے درمیان دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ میاں اور بیوی کے درمیان اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور ایک شخص اپنے خاندان سے کٹ جاتا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ یہ بات لے کر پھیل گئے اور موسم حج میں تمام راستوں پر بیٹھ گئے ' جو شخص بھی آتا یہ لوگ اسے ڈراتے اور خبردار کرتے اور حضور ؐ کے کام سے لوگوں کو باخبر کرتے۔

ابن جریر نے عبدالاعلیٰ ' محمد ابن ثورہ ' معمر ' عبادہ ابن منصور کے واسطوں سے عکرمہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ولید ابن مغیرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ نے اسے قرآن کریم سنایا۔ اس پر قرآن کریم کا بہت ہی اثر ہوا۔ اس واقعہ سے جب ابوجہل ابن ہشام خبردار ہوا تو وہ ولید کے پاس آیا اور اسے کہا کہ تمہاری قوم یہ چاہتی ہے کہ وہ تمہارے لئے دولت جمع کرے تو ولید نے کہا یہ کیوں؟ تو اس نے کہا کہ آپ کے لئے بطور چندہ وہ جمع کر رہے ہیں اس لئے کہ تم محمد کے پاس گئے تھے اور اس کی جانب سے عطیے کے خواہاں تھے۔ (یہ خبیث اس کی عزت نفس پر چوٹ لگانا چاہتا تھا کیونکہ یہ شخص اپنے آپ کو مالدار سمجھتا تھا اور اپنے مال پر فخر کرتا تھا) اس نے کہا کہ آیا قریش کو معلوم نہیں ہے کہ میں ان میں سب سے زیادہ مالدار ہوں؟ تو اس پر ابوجہل نے کہا ' پھر آپ کے لئے مناسب ہے کہ محمد کے بارے میں کوئی ایسی بات کہیں جس سے معلوم ہو کہ تم اسے سخت ناپسند کرتے ہو اور اس کے خلاف ہو۔ تو ولید نے کہا : کہ "تم بتاؤ میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ خدا کی قسم تم میں کوئی ایک بھی میرے مقابلے میں اصناف شعر سے زیادہ واقف نہیں ہے ' نہ مجھ سے زیادہ رجزیہ اشعار کو جانتا ہے ' نہ قصائد کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ نہ کوئی جنات کے اشعار کا مجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ خدا کی قسم محمد کی کوئی بات شعر کے زمرے میں نہیں آتی۔ خدا کی قسم وہ جو بات کرتا ہے وہ بہت ہی میٹھی بات ہے ' اس کی ظاہری شکل نہایت ہی پالش شدہ ہے۔ اس کے سامنے جو چیز آتی ہے وہ اسے توڑ دیتی ہے۔ الغرض اس کی بات برتر اور بلند رہتی ہے اور اس پر کوئی بات بلندی حاصل نہیں کر سکتی۔ ابوجہل نے کہا ' خدا کی قسم لوگ تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے۔ تمہیں بہرحال کچھ کہنا ہی پڑے گا۔

اس نے کہا "پھر مجھے سوچنے دیجئے۔" جب اس نے اچھی طرح سوچا تو پھر کہا : "یہ ایک جادو ہے جو پراثر ہے اور کسی اور ذریعے سے آتا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ..... تا ..... عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ) ایک دوسری روایت میں ہے کہ قریش نے کہا کہ اگر ولید صابی بن گیا تو تمام قریش صابی بن جائیں گے۔ ابوجہل نے کہا : "اس کا بندوبست میں کر لوں گا۔ فکر مت کرو۔" اس کے بعد وہ اس سے ملا اور اس نے بڑے غور و فکر

کے بعد یہ بات کہی کہ "یہ جادو بھرا کلام ہے۔کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اس کے نتیجے میں ایک شخص اور اس کی اولاد اور اس کے ملازمین کے درمیان تفرقہ پیدا ہو جاتا ہے۔"

ان تمام باتوں سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضور ؐ کے مخالفین کا یہ عقیدہ نہ تھا کہ آپ ان تک جو پیغام پہنچا رہے ہیں اس میں آپ ؐ ان سے کوئی جھوٹ بول رہے ہیں بلکہ وہ ان روایات کے مطابق بعض دوسری وجوہات و اسباب کی وجہ سے آپ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے تھے۔ان اسباب میں سے سب سے بڑا سبب یہ کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس دعوت و تحریک کے نتیجے میں ان سے ان کی موجود سیادت و قیادت چھن جائے گی' جس پر وہ غاصبانہ طور پر فائز تھے۔ حالانکہ سیادت و قیادت اور حاکمیت کا مقام خاصہ خدا تھا اور یہی مفہوم ہے (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کا جو دعوت اسلامی کی اساس ہے۔یہ لوگ بہرحال عربی زبان اور اس کے مفہومات سے اچھی طرح واقف تھے اور وہ کلمہ شہادت کے اس مفہوم کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔اس لئے کہ کلمہ شہادت تمام حاکمیتوں اور قیادتوں کے خلاف ایک انقلابی دعوت تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ انسانوں کی زندگی سے غیراللہ کی بندگی کا قلع قمع کر دیا جائے۔

(قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِیْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (٣٣) وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا (٣٤) (٦: ٣٣ - ٣٤) "اے نبی ؐ! ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے' لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں' مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر انہوں نے صبر کیا۔

یہاں الظالمون سے مراد المشرکون ہے اور قرآن کریم کے بیشتر مقامات میں الظالمون سے مراد المشرکون ہی ہوتا ہے حضور اکرم ؐ کے طیب خاطر کے لئے بات آگے بڑھتی ہے اور وہ حقیقی اسباب بیان کر دیئے جاتے ہیں جن کی بناء پر جھٹلانے والے حضور ؐ کی دعوت کو جھٹلاتے ہیں اور اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں۔حالانکہ آیات الٰہیہ کی صداقت اور سچائی بالکل بدیہی ہے۔پھر اس سے آگے یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ کے ہم منصب رسولوں کے ساتھ پوری انسانی تاریخ میں مکذبین نے یہی رویہ اختیار کیا ہے' جن کے کچھ حالات قرآن نے بھی بیان کیے ہیں کہ رسولوں نے کن کن مشکل حالات میں اپنا کام جاری رکھا۔انہوں نے مشکلات پر صبر کیا یہاں تک کہ اللہ کی مدد آپہنچی۔یہ اشارہ اس لئے کیا گیا کہ سنت الٰہیہ کی یہی شان ہے۔سنت الٰہیہ کبھی نہیں بدلتی اور کسی کی تجاویز اور کسی کی خواہشات کے بدلے اللہ کی سنت نہیں بدلتی۔نیز کسی کے جھٹلانے کی وجہ سے' کسی کی تکالیف کی وجہ سے اور کسی کی ذاتی مشکلات کی وجہ سے سنت الٰہیہ میں کبھی فیصلے قبل از وقت نہیں کیے جاتے۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ

مِن نَّبَإِي الْمُرْسَلِينَ ﴿٣٤﴾

"تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں' مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر جو انہیں پہنچائی گئیں' انہوں نے صبر کیا' یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے۔ اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں تمہیں پہنچ ہی چکی ہیں۔"

خدا پرستی کی دعوت ایک قدیم دعوت ہے۔ تاریخ قدیم کی دور دراز وادیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ راہ بالکل سیدھی ہے اور بالکل واضح ہے۔ اس کے خطوط بالکل سیدھے ہیں۔ اس پر چلنے والے پاؤں ہمیشہ ثابت قدم رہے ہیں۔ مختلف قسم کے جرائم پیشہ لوگوں نے اس راہ کو روکنے کی کوشش کی ہے۔ نیز گمراہوں اور ان کے شدید ترین پیروکاروں نے اس دعوت کی راہ ہمیشہ روکی ہے۔ اس راہ میں کئی داعیوں کو سخت مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ خون دینا پڑا اور جان دینی پڑی لیکن قافلہ داعیان حق نے ہمیشہ اپنا سفر بالکل سیدھی سمت میں جاری رکھا۔ یہ قافلہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس سیدھی راہ سے ادھر ادھر نہ ہوا۔ نہ اس نے اس راہ کو چھوڑ کر روگردانی اختیار کی۔ لیکن انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے اور آخر کار اللہ کی نصرت صرف اللہ کے اصولوں اور فیصلوں کے مطابق آتی ہے۔

"تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں' مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر جو انہیں پہنچائی گئیں' انہوں نے صبر کیا' یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں تمہیں پہنچ ہی چکی ہیں۔"

یہ وہ الفاظ ہیں جو اللہ کی جانب سے اپنے رسول کو کہے جا رہے ہیں۔ یہ ایک یاد دہانی ہے اور ایک گونہ تسلی ہے۔ ہمدردی اور تسلی کا ہاتھ آپ کے سر پر پھیرا جا رہا ہے اور ان الفاظ کے اندر حضور اکرم ﷺ کے بعد آنے والے داعیوں کے بھی نقوش راہ واضح ہیں۔ ایک واضح راستہ انہیں دکھایا جاتا ہے' ان کا کردار بھی ان کے لئے متعین کر دیا جاتا ہے اور آگاہ کر دیا جاتا ہے کہ لا اللہ الا اللہ کہنے سے مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ سکتے ہیں اور جو مشکلات پہلے لوگوں کو پیش آئیں وہ ہر داعی حق کی راہ میں آتی ہیں۔

یہ الفاظ داعیان حق کو بتاتے ہیں کہ دعوت حق کے لئے سنت الہیہ ایک ہی ہے اور دعوت حق بھی ایک ہی ہے۔ اس میں تعدد ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی دعوت ہے کہ اکثر لوگ اس کی تکذیب کرتے ہیں اور مکذبین کی روش ہمیشہ ایسی ہی رہی ہے' اس دعوت کے حاملین کو ہمیشہ اذیت دی جاتی رہی ہے اور اس تکذیب اور ایذا رسانی پر داعیوں کو صبر کرنا پڑتا ہے اور پھر صبر کے مرحلے کے بعد آخر کار داعیوں کو فتح و کامرانی نصیب ہوتی ہے۔ لیکن نصرت اللہ کے طے کردہ اصولوں کے مطابق اور اپنے وقت پر آتی ہے۔ یہ نصرت محض اس لئے قبل از وقت نہیں آجاتی کہ کچھ پاک طینت اور بے گناہ داعیوں کو جھٹلایا جاتا ہے اور انہیں اذیت دی جاتی ہے۔ یا یہ کہ گمراہ لوگ اور گمراہی کے لیڈر ان پاک طینت لوگوں کو اذیت دینے پر قادر ہیں۔ نیز یہ امر بھی سنت الہیہ کی رفتار کو تیز نہیں کر سکتا کہ ایک مخلص' ذاتی خواہشات سے پاک و صاف' نہایت ہی پاک طینت کارکن اور داعی اپنے دل کے اندر شدید خواہش رکھتا ہے کہ اس کی قوم راہ راست پر آجائے اور وہ اس حقیقت پر بہت ہی فکر مند اور دل گرفتہ ہے کہ اس کی قوم ضلالت میں گری ہوئی ہے اور یہ کہ اس کی قوم دنیا کی تباہی اور آخرت کے عذاب کی راہ پر چل پڑی ہے۔ یہ تمام امور سنت الہیہ کو قبل از وقت ظاہر نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کی جلد بازی کی

وجہ سے اپنے کسی کام میں جلد بازی نہیں کرتا۔ اور اللہ کے کلمات میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ چاہے ان کلمات کا تعلق عباد صالحین کی آخری فتح سے ہو یا ان کے متعلق کسی طے شدہ تقدیر سے ہو۔

یہ ایک فیصلہ کن دو ٹوک اور سنجیدہ فیصلہ ہے۔ اس کا مقصد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور اطمینان دلانا ہے اور مشکلات راہ پر آپ کے ساتھ ہمدردی اور یک جہتی کا اظہار ہے۔

اب یہ سنجیدہ فیصلہ اپنے اثرات کو اپنی آخری ممکن حدوں تک پہنچاتا ہے۔ ان خدشات کی راہ بھی روک دی جاتی ہے جو ممکن تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں پیدا ہو جائیں۔ اس لئے کہ فطری طور پر ایک انسان' یہ چاہتا ہے کہ اس کی قوم سدھر جائے اور ایک رسول تو پوری بشریت کی ہدایت کا مشتاق ہوتا ہے۔ وہ خواہش مند ہوتا ہے اور انتظار میں ہوتا ہے کہ کب اس کی قوم اس کی دعوت پر لبیک کہتی ہے اور کب ہدایت پذیر ہو جاتی ہے؟ اس قسم کی خواہشات نزول قرآن کے وقت بعض مسلمانوں کے دل میں بھی جوش مارتی تھیں جن کی طرف اسی سورہ کی دوسری آیات میں اشارات موجود ہیں۔ اس قسم کی خواہشات انسانوں کے اندر نہایت ہی قدرتی اور فطری ہوتی ہیں لیکن اس دعوت اسلامی کے فیصلہ کن انداز' اس کے حقیقی مزاج' اس کے بارے میں رسولوں کے کردار اور پھر عوام الناس کے کردار کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن کریم ذرا سخت لہجے میں یوں مخاطب ہوتا ہے :-

وَ اِنۡ كَانَ كَبُرَ عَلَيۡكَ اِعۡرَاضُهُمۡ فَاِنِ اسۡتَطَعۡتَ اَنۡ تَبۡتَغِىَ نَفَقًا فِى الۡاَرۡضِ اَوۡ سُلَّمًا فِى السَّمَآءِ فَتَاۡتِيَهُمۡ بِاٰيَةٍ‌ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمۡ عَلَى الۡهُدٰى فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا يَسۡتَجِيۡبُ الَّذِيۡنَ يَسۡمَعُوۡنَ‌ ؕ وَالۡمَوۡتٰى يَبۡعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيۡهِ يُرۡجَعُوۡنَ ﴿۳۶﴾ النصف

"تاہم اگر ان لوگوں کی بے رخی تم سے برداشت نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو۔ اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا' لہذا نادان مت بنو۔ دعوت حق پر لبیک وہی لوگ کہتے ہیں جو سننے والے ہیں۔ رہے مردے' تو انہیں تو اللہ بس قبروں ہی سے اٹھائے گا اور پھر وہ (اس کی عدالت میں پیش ہونے کے لئے) واپس لائے جائیں گے۔" نہایت ہی شاہانہ انداز کے درمیان سے خوف کے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ کوئی ان الفاظ کی ہولناکی اور اس معاملے کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ اس حقیقت کو اپنے ذہن میں تازہ نہ رکھے کہ یہ الفاظ رب العالمین کی طرف سے ہیں اور ان کے ساتھ اللہ رب العالمین نے اپنے نبی کو مخاطب کیا ہے جن کی صفات میں صابر ہونا اور اولوالعزم رسولوں میں سے ہونا اہم صفات ہیں۔ جنہوں نے نہایت ہی صبر اور خلوص کے ساتھ اپنی قوم کی جانب سے پہنچنے والی ایذاؤں کو برداشت کیا۔ آپ نے حضرت نوح علیہ السلام کی طرح ان کو بددعا نہ دی حالانکہ ایک زمانہ آپ ان کی تمسخر زنیاں سہتے رہے۔ اور نہایت ہی صبر اور حلم کا مظاہرہ فرماتے رہے۔

اے محمد! یہ تو ہماری سنت ہے۔ اگر ان لوگوں کی بے رخی اور ان کی جانب سے مسلسل تکذیب آپ برداشت نہیں کر سکتے اور آپ بہرحال انہیں کوئی معجزہ ہی دکھانا چاہتے ہیں تو پھر اگر آپ کے اندر استطاعت ہے تو آپ زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈلیں یا آسمان تک پہنچنے کے لئے کوئی سیڑھی لگالیں اور اس طرح ان لوگوں کے سامنے کوئی حیران کن معجزہ پیش کر دیں۔

ان کی ہدایت، حقیقت یہ ہے کہ اس لئے موقوف نہیں ہے کہ تم ان کے سامنے کوئی معجزہ پیش کر دو۔ صرف یہ کمی نہیں رہ گئی کہ بس کوئی معجزہ صادر ہو اور وہ ہدایت کو قبول کر لیں۔ جیسے وہ بالکل تیار بیٹھے ہوں۔ اس طرح تو اللہ تعالیٰ اگر چاہتا تو انہیں ہدایت پر جمع کر دیتا۔ یا تو اللہ اس طرح کرتا کہ ابتداء ہی سے انہیں اس طرح پیدا کرتا کہ وہ ہدایت کے سوا کوئی اور راستہ قبول ہی نہ کرتے مثلاً ملائکہ اور یا یوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو اپنی قدرت کے ذریعے راہ ہدایت کی طرف موڑ دیتا اور وہ ہدایت کی قبولیت کے لئے آمادہ ہو جاتے اور یا اللہ تعالیٰ کوئی ایسا معجزہ صادر کر دے جس کی وجہ سے ان کی گردنیں جھک جائیں اور کسی وجہ سے یا بغیر کسی وسیلہ کے اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دے دے کیونکہ وہ قادر مطلق ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے 'اپنی اس حکمت کی وجہ سے جو اس پوری کائنات میں جاری و ساری ہے' اس مخلوق مکرم حضرت انسان کو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا۔ اس آسمانی منصوبے کے مطابق اس مقصد کی خاطر اس بات کی ضرورت تھی کہ اس مخلوق کو کچھ متعین صلاحیتیں دی جائیں اور یہ صلاحیتیں ان صلاحیتوں سے جدا ہوں جو فرشتوں کو دی گئی تھیں۔ ان خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ انسانوں کی صلاحیتوں کے درمیان تفاوت رکھی جائے۔ یہ کہ لوگوں کے اندر ہدایت اور ایمان کی قبولیت کی استعداد بھی مختلف ہو اور لوگوں کے اندر قبولیت حق کے مادے کی مقدار بھی مختلف ہو۔ یہ کام اللہ کے دائرہ قدرت کے مطابق 'اللہ کے قانون عدل کے مطابق اور اس کے قانون جزاء و سزا کے عین مطابق ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی تکوینی جبر کے ذریعے لوگوں کو راہ ہدایت پر جمع نہیں فرمایا۔ اللہ نے انہیں حکم دیا کہ وہ ہدایت کی راہ لیں اور ماننے نہ ماننے کا اختیار انہیں دے دیا اور آخرت میں اس پر عادلانہ جزاء و سزا کا اجراء فرمایا۔ اس حقیقت کو جاننا چاہئے اور اس سے غافل نہ ہونا چاہئے۔

(وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (٦ : ٣٥)) "اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا' لہٰذا نادان مت بنو۔" شوکت کلام دیکھنے کے قابل ہے اور فیصلہ ہدایت بھی قابل دید ہے' لیکن بات کا موقع و محل ہی ایسا تھا جس کے اندر اس زور داریات اور دوٹوک ہدایت کی ضرورت تھی۔

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ نے انسانوں کو کس مزاج اور کس فطرت پر پیدا کیا ہے اور یہ کہ وہ ہدایت کے مقابلے میں کیا موقف اختیار کرتے ہیں حالانکہ دعوت حق کے پاس ثبوت دلیل کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔

(اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ

(٦ : ٣٦)) "دعوت حق پر لبیک وہی لوگ کہتے ہیں جو سننے والے ہیں۔ رہے مردے تو انہیں تو اللہ بس قبروں ہی سے اٹھائے گا اور پھر وہ (اس کی عدالت میں پیش ہونے کے لئے) واپس لائے جائیں گے۔" جب کوئی رسول دعوت حق لے کر لوگوں کے پاس آتا ہے تو اس دعوت کے مقابلے میں لوگ دوگروہ بن جاتے ہیں۔ ایک فریق تو زندہ اور بیدار

لوگوں کا ہوتا ہے' جن کے اندر قبولیت حق کی استعداد ہوتی ہے' یہ استعداد کام کر رہی ہوتی ہے اور ان لوگوں کے دل کے دریچے کھلے ہوتے ہیں ۔ ایسے لوگ ہدایت قبول کر لیتے ہیں اس لئے کہ ہدایت اور سچائی کے اندر ذاتی قوت 'نکھار اور فطرت کے ساتھ ہم آہنگی ہوتی ہے اور ایسے لوگ اسے پاتے ہی قبول کر لیتے ہیں ۔ (اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ (٦: ٣٦)) یعنی جن لوگوں کی قوت شنوائی کام کر رہی ہوتی ہے وہ حق کو قبول کر لیتے ہیں ۔ ایک دوسرا فریق وہ ہوتا ہے جو دراصل مردہ ہوتا ہے ۔ اس کی فطرت معطل ہو جاتی ہے ۔ وہ نہ سنتا ہے اور نہ قبول کرتا ہے ۔ وہ نہ متاثر ہوتا ہے اور نہ ہی لبیک کہتا ہے ۔ یہ بات نہیں ہوتی کہ اس سچائی کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہوتی کیونکہ سچائی تو خود دلیل ہوتی ہے' آفتاب آمد دلیل آفتاب' اور جب بصیرت رکھنے والی فطرت اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو وہ اس کے اندر سچائی دیکھ لیتی ہے ۔ فوراً وہ آخری فیصلہ کر کے تسلیم کر لیتی ہے ۔ دوسری قسم کے لوگوں کے اندر جو کمی ہوتی ہے ۔ وہ یہ ہے کہ ان کی فطرت مر چکی ہوتی ہے اور ان کی استعداد قبولیت حق جاتی رہتی ہے لہٰذا ان کے اندر محض دعوت سننے ہی قبولیت حق کی استعداد پیدا نہیں ہوتی ۔ ایسے لوگوں کا کوئی علاج خود رسول وقت کے پاس بھی نہیں ہوتا ۔ ان پر کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی ۔ ان کا معاملہ اللہ کی مشیت کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے ۔ اگر اللہ چاہے تو ایسے لوگوں کو زندہ کر دیتا ہے اور اگر نہ چاہے تو یہ لوگ زندہ ہوں یا مردہ قیامت تک مردہ رہیں گے ۔ اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انہیں اٹھائے گا ۔

(وَالْمَوْتٰی یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ (٦: ٣٦)) مردوں کو تو اللہ قبروں ہی سے اٹھائے گا اور وہ اس کی عدالت میں پیش ہوں گے ۔ یہ ہے کہانی قبولیت حق اور محرومیت کی ۔ اس سے ہدایت و ضلالت کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے ۔ رسول کے فرائض متعین ہو جاتے ہیں اور تمام امور کا آخری فیصلہ اللہ کے سپرد ہوتا ہے ۔ وہ جو چاہتا ہے' کرتا ہے ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس حقیقت کو آشکارا کرنے کے بعد' اب روئے سخن اہل کفار اور مشرکین کے اس غلط مطالبے کی طرف پھر جاتا ہے جس میں وہ خوارق و معجزات کے مطالبے کرتے تھے ۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کا یہ مطالبہ جہالت پر مبنی ہے اور یہ لوگ اس معاملے میں سنت الٰہیہ سے بالکل بے خبر ہیں ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی معجزہ صادر ہوتا ہے تو اس کے بعد نہ ماننے والوں بلکہ ماننے والوں کو بھی ایک عظیم بربادی سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ جو ان لوگوں کے مطالبے کو تسلیم نہیں کرتا تو اس لئے نہیں کرتا کہ وہ ان پر رحم کر کے انہیں اس عظیم تباہی سے بچانا چاہتا ہے ۔
اس موقعہ پر تمام زندہ مخلوقات کے بارے میں اللہ کی حکیمانہ تدابیر کو بھی بیان کر دیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ سنت تمام زندہ مخلوقات تک وسعت پذیر ہے ۔ یہاں وہ حکمت بتائی جاتی ہے جو ہدایت و ضلالت کے فیصلوں کے پیچھے کام کرتی ہے اور جس میں اللہ تعالیٰ کی بے قید مشیت کام کرتی ہے ۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنْ یُّنَزِّلَ اٰیَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَ

لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ
ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي
الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۹﴾

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی؟ کہو' اللہ تعالیٰ نشانی اتارنے کی پوری قدرت رکھتا ہے' مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی میں مبتلا ہیں ۔ زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو' یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں' ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے' پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں مگر جو لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے اور گونگے ہیں' تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں ۔ اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے رستے پر لگا دیتا ہے ۔" حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ لوگ ایسے خوارق عادت معجزات کے طلبگار تھے' جو آپ سے قبل آنے والے رسولوں کو دیئے گئے تھے ۔ یہ لوگ قرآن کریم جیسے زندہ معجزے پر اکتفا کرنے والے نہ تھے' جو قیامت تک کے لئے باقی ہے' جو انسانی فہم و ادراک کو اپیل کرتا ہے اور یہ اعلان کرتا ہے کہ اب انسان فکری اعتبار سے بلوغ تک پہنچ گیا ہے ۔ اس لئے انسان کو ایسے فلسفیانہ اور بلند کلام کے ذریعے مخاطب کیا جاتا ہے اور یہ کلام ایسا لازوال اور ابدی کلام ہے کہ کسی نسل کے ساتھ اس کا خاتمہ نہیں ہو جاتا' بلکہ دائم و باقی ہے اور قیامت تک انسانی شعور اور ادراک سے مخاطب ہے ۔

یہ لوگ خارق عادت معجزے کے تو طلبگار تھے لیکن ایسے معجزات کے صدور کے بعد سنت الٰہی کے مطابق جو عذاب آتا ہے اسے سمجھ نہیں پا رہے تھے ۔ اس عذاب کی لپیٹ میں سب لوگ آجایا کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو دنیا میں ہلاک کر دیا جاتا ہے ۔ نیز یہ لوگ اس حکمت کو بھی نہ پا رہے تھے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ایسے معجزے کا صدور نہ فرمایا ۔ اس لئے کہ اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ اگر معجزہ صادر بھی ہو جائے تو بھی یہ لوگ ماننے والے نہ تھے ۔ حضور ؐ سے قبل کئی اقوام نے یہ حرکت کی تھی' اور وہ ہلاکت کی مستحق ہو گئی تھیں جبکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ ان لوگوں کو مہلت دی جائے اور ان لوگوں میں سے کئی ایسے تھے جن کی قسمت میں ایمان لانا لکھا تھا ۔ اگر کوئی شخص ان میں سے ایمان نہ بھی لایا تو اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ اس کی پشت سے امت مومنہ پیدا ہونے والی ہے ۔ لیکن یہ لوگ اس مہلت پر خدا کا شکر ادا نہیں کرتے کہ اللہ نے خود ان کے مطالبے کے باوجود انہیں اس ابتلاء سے بچایا جبکہ وہ اس مطالبے کے عواقب سے بے خبر تھے ۔

قرآن کریم ان کے اس مطالبے کے تذکرے کے بعد یہ فیصلہ کرتا ہے کہ یہ لوگ بے علم ہیں اور یہ لوگ ان نتائج سے بے خبر ہیں جو ان کے مطالبے کے پورے ہو جانے کے بعد ظہور پذیر ہونے والے تھے ۔ حکم ہوتا ہے کہ اللہ کی قدرت میں ہے ہر قسم کے معجزات کا صدور' لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ان لوگوں کو مطالبے کے باوجود ان مشکلات اور ہلاکتوں سے دوچار نہ کیا جائے ۔ یہ اس کی رحمت کا بھی تقاضا ہے کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کرنا فرض کر لیا ہے ۔

(وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (٦: ٣٧)) "یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی؟ کہو' اللہ نشانی اتارنے کی پوری قدرت رکھتا ہے' مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی میں مبتلا ہیں۔" اس انتباہ کے بعد اب سیاق کلام قرآن کریم کو ایک نہایت ہی لطیف راستے سے مخاطب کے دل میں اتارنے کی راہ تلاش کرتا ہے۔ انسان کی قوت مشاہدہ اور قوت تدبر کو جگایا جاتا ہے کہ ذرا وہ اس کائنات پر غور و فکر کر کے اس کے اندر پائے جانے والے دلائل ایمان پر غور کرے۔ اگر وہ غور و فکر کرے تو اسے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔

(وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ (٦: ٣٨)) "زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو' یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں' ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے' پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔" اس کائنات میں صرف انسان ہی نہیں بستے تاکہ ہم یہ کہیں کہ بس اتفاقاً وہ وجود میں آگئے اور اب ان کی زندگی بھی جس طرح وہ چاہیں بسر ہو اور لغو جائے۔ بلکہ انسان کے ارد گرد دوسری جاندار مخلوقات بھی ہوتی ہیں اور ان تمام جانداروں کی زندگی ایک خاص منظم طریقے سے بسر ہو رہی ہے۔ ان کی زندگی کے مطالعے سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زندگی بامقصد' ایک اسکیم کے مطابق اور حکیمانہ انداز میں بسر ہو رہی ہے اور تمام مخلوقات کی زندگی کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ یہ سب مخلوق ایک ہی خالق کی پیدا کردہ ہے ایک ہی قوت مدبرہ ہے جو ان تمام مخلوقات کے پیچھے عمل پیرا ہے اور کائنات پر پوری طرح حاوی ہے۔

جو جانور زمین پر چلتے ہیں (وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ (٦: ٣٨)) اس لفظ میں تمام جاندار حشرات الارض تک شامل ہیں۔ کیڑے مکوڑے یہاں تک کہ تمام جراثیم' تمام پرندے جو ہواؤں میں اڑتے ہیں اور تمام مخلوق جو اس کائنات پر زندہ ہے' وہ ایک امت ہے۔ اس میں ایک جیسے خصائص ہیں۔ وہ ایک طرح زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کی زندگی کے امور بعینہٖ اسی طرح ہیں جس طرح یہاں امم انسانی کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سے کوئی چیز بغیر اسکیم اور تدبیر کے نہیں چھوڑی اور نہ کوئی چیز اپنے مخصوص علم کے دائرے سے باہر رکھی ہے۔ آخرت میں یہ تمام مخلوقات اپنے رب کے سامنے حاضر ہوں گی اور ان کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ آخری فیصلے کرے گا' جو وہ چاہے گا۔

یہ آیت نہایت ہی مختصر ہونے کے باوجود زندہ مخلوقات کے بارے میں ایک فیصلہ کن بات ہمارے سامنے رکھتی ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ اللہ کی جانب سے پوری مخلوقات کی مکمل نگرانی ہو رہی ہے۔ پوری مخلوق اس کی فعال تدبیر کے تحت زندہ ہے' وہ اس پوری مخلوق کے بارے میں خوب جانتا ہے اور ہر چیز اس کے دائرہ قدرت میں ہے جو رب ذوالجلال ہے۔

یہاں ظلال القرآن میں ہمارا جو انداز ہے' اس کے پیش نظر ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم یہاں کائنات کے اندر پائے جانے والی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کر سکیں۔ (البتہ میری کتاب خصائص التصور الاسلامی میں'

حقیقت الوہیت 'حقیقت انسانی اور حقیقت مادہ کے عنوانات قابل ملاحظہ ہیں)یہاں اس بحث کے دوران اس حقیقت کو اس لئے لایا گیا ہے کہ انسان کے دل و دماغ کو اس طرف متوجہ کیا جائے کہ یہ تمام مخلوقات اور اس مخلوق کا یہ نظام حیات جس کے مطابق زندگی رواں دواں ہے اور پھر اس کے بارے میں اللہ کی جانب سے مکمل تدبیر اور علم اور آخرت میں ان تمام مخلوقات کا اللہ کے سامنے اٹھنا یہ سب ایسے امور ہیں کہ ان میں کسی معجزے سے زیادہ حیرت انگیز دلائل اور اشارات ہیں۔ اگر کوئی معجزہ صادر ہو جائے تو اسے انسانوں کی ایک وقت میں موجود نسل ہی ملاحظہ کرے گی لیکن ان مخلوقات کے اندر موجود آیات الٰہی پر اگر غور کیا جائے تو ہر وقت زندہ معجزات نظر آئیں گے اور ہر دور کے لوگ انہیں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

اب اس لہر کا خاتمہ اس حقیقت پر ہوتا ہے کہ ہدایت و ضلالت کی پشت پر سنت الٰہی کے مطابق مشیت الٰہی کام کر رہی ہے اور یہ کہ اللہ کی مشیت اور سنت انسانی فطرت پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں اور راہنمائی کرتی ہیں۔

(وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (٦ : ٣٩)) "مگر جو لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے اور گونگے ہیں' تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے' بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے رستے پر لگا دیتا ہے۔" یہ اسی حقیقت کا اعادہ ہے کہ کون لوگ ہیں جو سنتے ہیں اور کون ہیں جو مردہ ہیں اور سن ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا وہ قبول حق سے محروم ہیں لیکن یہاں بات کو ایک دوسرے تناظر میں پیش کیا جاتا ہے۔ جو لوگ آیات الٰہی کی تکذیب کرتے اور ان دلائل و بینات پر غور نہیں کرتے جو اس کائنات میں ہر طرف بکھری پڑی ہیں۔ پھر قرآن کریم میں پائی جانے والی آیات و نشانیوں پر بھی وہ غور نہیں کرتے یہ کیوں؟ اس لئے کہ انہوں نے اپنی شخصیات میں پائے جانے والے قبولیت حق کے مادے اور صلاحیت ہی کو معطل کر دیا ہے۔ یہ بہرے ہیں سنتے ہی نہیں 'گونگے ہیں اور کوئی بات ہی نہیں کرتے۔ گمراہی کے اندھیروں میں غرق ہیں۔ کچھ دیکھتے ہی نہیں۔ صرف مادی اعتبار سے ہی نہیں حقیقی اعتبار سے بھی یہ بہرے 'گونگے اور اندھے ہیں اس طرح کہ ان کے قوت مدرکہ معطل ہے۔ ان کے حواس کام ہی نہیں کرتے اور نہ ان کے حواس کوئی اچھی بات ان کے دماغوں تک منتقل کرتے ہیں۔ اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ قرآن کی آیات بذات خود اثر انگیز' محرک اور جھنجوڑنے والی ہیں لیکن ان پر ان آیات کا کچھ اثر ہی نہیں ہو رہا ہے۔ وہ بات کو پاتے ہی نہیں۔ لہٰذا ان آیات بینات سے جو شخص روگردانی کرتا ہے اس کی فطرت میں فساد پیدا ہو گیا ہے' لہٰذا وہ اس قابل نہیں رہی ہے کہ ہدایت قبول کرے اور ایک ترقی یافتہ زندگی بسر کرنے کا اہل بن جائے۔

اور یہ سب صورت حالات اللہ کی مشیت کے دائرے کے اندر رونما ہو رہی ہے۔ اس مشیت کا تقاضا ہی یہ تھا کہ حضرت انسان کے اندر ہدایت قبول کرنے اور گمراہی اختیار کرنے کی دونوں صلاحیتیں موجود ہوں اور وہ دونوں راستوں میں سے کوئی ایک راہ اختیار کرنے میں آزاد ہو اور اس پر کوئی جبر نہ ہو اور نہ کوئی قضائے مبرم ہو۔ اس طرح اللہ جسے چاہتا ہے راہ ہدایت پر ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اور یہ ہے اللہ کی مشیت کا مفہوم۔ اللہ کی مشیت اس شخص کی مددگار ہوتی ہے جو اس کی راہ میں جدوجہد کرتا ہے اور جو شخص عناد کی راہ اختیار کرتا ہے خود گمراہ ہوتا ہے۔

اللہ کسی بندے پر ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

راہ ہدایت کی طرف انسان کا رجحان اور میلان یا راہ ضلالت کی طرف انسان کا رجحان اور میلان ' دونوں اس مخلوق کے اندر اللہ کی پیدا کردہ صلاحیت سے پیدا ہوتے اور اس کی مشیت کے مطابق ہی کام کرتے ہیں۔ ابتداء " تو یہ رجحان اللہ کا پیدا کردہ ہے اور اس ابتدائی تخلیق کردہ مادے کے نتائج کے طور پر جو ہدایت و گمراہی آتی ہے یہ بھی دائرہ مشیت الہیہ کے اندر ہوتی ہے۔ اور یہ مشیت بے قید ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر باز پرس اور سزا و جزاء کیوں ہے؟ تو وہ اس وجہ سے ہے کہ انسان کا رجحان بہرحال آزادی کی طرف ہوتا ہے۔ میلان میں وہ آزاد ہے۔ اگرچہ اس کی یہ صلاحیت اس کے اندر اللہ کی تخلیق کردہ ہے اور اللہ کی مشیت کے ماتحت ہے۔ (دیکھئے "خصائص تصور اسلامی" کا عنوان "التوازن")

اس لہر کی آیات کی تشریح کے بعد اب ذرا رکیے تاکہ ہم اس مطالعے سے ان لوگوں کے لئے سرمہ بصیرت حاصل کر لیں جو کسی بھی دور میں اور کسی بھی امت میں دعوت اسلامی کا کام کرتے ہیں۔ ان آیات میں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ زمان و مکان کی حدود سے باہر ہیں۔ ان کا اطلاق تمام حالات اور تمام تحریکوں پر ہوتا ہے اور ان میں دعوت دین کے ایسے نقوش وضع کئے گئے ہیں جو ہر دور کے لئے کار آمد ہیں۔ یہاں ہم اس نکتے کے پورے پہلوؤں کو زیر بحث نہیں لا سکتے البتہ ہم یہاں نشانات راہ معلوم کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دعوت اسلامی کی راہ نہایت ہی پر خطر ہے۔ اس میں جگہ جگہ کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ ہر قدم پر ایک ناپسندیدہ صورت حال کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود سچائی کو فتح اور کامرانی کی گارنٹی دی گئی ہے۔ ہاں یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ فتح کا وقت پس پردہ تقدیر ہوتا ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے۔ اس کی حکمت کے مطابق ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے اور اس کے سوا کوئی اور اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ یہاں تک کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس غیب کا علم نہیں دیا گیا۔ اس راہ میں جو مشکلات سامنے آتی ہیں وہ دو اہم اساسی فیکٹرز کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ پہلا فیکٹر یہ ہے کہ جب دعوت اسلامی کا آغاز ہوتا ہے تو پہلے لوگ اس سے روگردانی اختیار کرتے ہیں۔ اس کے بعد دوسری مشقت یہ ہوتی ہے کہ داعی کے دل میں اس بات کی شدید خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ لوگ دعوت اسلامی کو قبول کر کے راہ حق پر آ جائیں اور اس ذوق و شوق میں وہ بھی ڈوب جائیں جس سے داعی سرشار ہوتا ہے۔ اس کے لئے وہ پرجوش ہوتا ہے اور اپنی دعوت کے کلمے کی سربلندی چاہتا ہے۔ یہ خواہش بھی اسی قدر تکلیف دہ ہوتی ہے جس قدر مخالفین کی طرف سے اعراض اور تکذیب تکلیف دہ ہوتی ہے۔ یہ دونوں فیکٹرز داعی کے لئے سوہان روح بن جاتے ہیں۔

یہاں ' اس لہر میں قرآن کریم جو ہدایات دیتا ہے وہ اس مشقت کے دونوں پہلوؤں کے سلسلے میں ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جو لوگ قرآن کی دعوت سے اعراض کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلاتے ہیں وہ حق الیقین رکھتے ہیں کہ صرف حضور ؐ اور آپ کی دعوت عین سچائی ہیں۔ اور حضور ؐ سچے ہیں اور وہ یہ پیغام اللہ کی جانب سے لے کر آئے ہیں۔ لیکن اپنے اس علم کے باوجود وہ اس دعوت کو قبول نہیں کرتے۔ وہ محض ذاتی خواہشات اور ہوائے نفس کی وجہ سے تکذیب کرتے ہیں حالانکہ یہ دعوت ایسی ہے کہ وہ بذات خود دلیل حق ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب کا مصداق ہے اور انسان کے فطری تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ بشرطیکہ فطرت زندہ ہو

اور سچائی کو قبول کرنے کا مادہ اپنے اندر رکھتی ہو۔ کیونکہ (اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ (۶ : ۳۶)) بے شک دعوت حق تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو تکذیب پر اصرار کرتے ہیں تو ان کے دل و دماغ مردہ ہیں۔ وہ خود بھی مردہ ہیں۔ گونگے 'بہرے اور اندھے ہیں اور تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ رسول کے اندر یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ مردوں کو سنوائے اور نہ مردے سنتے ہیں۔ اگرچہ کوئی پکارتا ہے۔ ایک داعی کی ڈیوٹی یہ نہیں ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کرے۔ کیونکہ یہ تو اللہ کی شان ہے اور یہ اللہ کا کام ہے۔ یہ تو ہے معاملے کا ایک پہلو اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ کی نصرت بہرحال حق کے ساتھ ہوتی ہے۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ دستور الٰہی ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے مقرر شدہ وقت پر آتی ہے۔ جس طرح سنت الٰہیہ قبل از وقت ظاہر نہیں ہوتی اور جس طرح اللہ کے کلمات بدلتے نہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی اٹل ہے کہ آخر کار نصرت آتی ضرور ہے اور یہ بات بھی اپنی جگہ پر ہے کہ وہ قبل از وقت نہیں آتی۔ اپنے وقت پر ہی ظاہر ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس معاملے میں کوئی جلد بازی نہیں فرماتے۔ اس لئے کہ اذیت اور تکالیف تو داعیوں پر آتی ہی رہتی ہیں اگرچہ داعی رسول ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ داعیوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ بغیر عجلت اور شتابی اور بے صبری کے مشکلات کو انگیز کریں اور قبل از وقت نصرت کا مطالبہ نہ کریں۔

دین اسلام میں ایک داعی اور رسول کا کردار کیا ہوتا ہے ' ان قرآنی ہدایات میں اس کا تعین بھی کر دیا گیا ہے۔ تمام ادوار کے لئے اور تمام معاملات کے لئے۔ وہ کردار یہ ہے کہ انہوں نے پیغام پہنچانا ہے اور اپنی راہ پر آگے بڑھنا ہے اور اس راہ کی مشکلات کو برداشت کرنا ہے۔ رہی یہ بات کہ لوگ راہ ہدایت پر آتے ہیں یا نہیں تو یہ جس طرح داعی اور رسول کی طاقت کے حدود سے باہر ہے اسی طرح ان کے فرائض میں بھی شامل نہیں ہے۔ ہدایت و ضلالت سنت الٰہیہ کے مطابق کام کرتی ہیں اور سنت الٰہیہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اگر رسول اپنے کسی محبوب کے بارے میں لاکھ چاہے کہ وہ ہدایت پر آجائے تو اگر سنت الٰہیہ اس کے حق میں نہیں ہے تو وہ راہ ہدایت نہیں پا سکتا۔ جبکہ رسول کے دشمنوں اور مبغوض لوگوں کو بھی ہدایت نصیب ہو سکتی ہے۔ اس معاملے میں داعی اور رسول کی شخصیت اور ذات کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ رسول کے ساتھ یہ حساب نہ ہو گا کہ اس کی دعوت کے نتیجے میں کتنے لوگ راہ راست پر آئے ہیں۔ اس سے صرف یہ پوچھا جائے گا کہ اس نے دعوت کا حق کس قدر ادا کیا' کس قدر مشکلات کو برداشت کیا اور کس قدر اپنی راہ و روش پر جمے رہے۔ اور کس قدر ثابت قدمی اختیار کی۔ رہی یہ بات کہ لوگ ہدایت قبول کرتے ہیں یا نہیں' تو یہ معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

(مَنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یُضْلِلْهُ وَمَنْ یَّشَاْ یَجْعَلْهُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۶ : ۳۹)) جسے اللہ چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے صراط مستقیم پر ڈال دیتا ہے۔" (وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَی الْهُدٰی (۶ : ۳۵)) اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔" (اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ (۶ : ۳۶)) دعوت حق پر لبیک وہی لوگ کہتے ہیں جو سنتے ہیں۔ اس سے قبل ہم یہ بیان کر آئے ہیں کہ اللہ کی مشیت ہدایت و ضلالت کے بارے میں بے قید ہے اور اس کا رابطہ لوگوں کے رجحان اور جدوجہد کے ساتھ ہے۔ وہ بیان کافی و شافی ہے۔

چنانچہ داعی حق کا رویہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ جن لوگوں کو دعوت دیتا ہے' ان کی جانب سے پیش کردہ تجاویز پر کان نہ دھرے ۔ خصوصاً جبکہ ان تجاویز کا تعلق اساس دین اور منہاج دعوت سے ہو ۔ نہ کسی داعی کے لئے مناسب ہے کہ وہ دین کے اصولوں کو لوگوں کی وقتی خواہشات و رغبات کے مطابق بنا سجا کے پیش کرے ۔ مشرکین کا مطالبہ یہ تھا کہ حضور ؐ کچھ خارق عادت معجزات پیش کریں جو ان کے زمانے کے تصورات اور مالوفات کے مطابق ہوں اور جنہیں وہ سمجھ سکیں جس کے بارے میں قرآن کریم نے کئی مقامات پر ذکر کیا ہے ۔ اس سورہ میں بھی ان کا یہ قول مذکور ہے ۔

(لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ (٢٥ : ٧) وہ کہتے ہیں کہ اس پر فرشتہ کیوں نہیں نازل ہوتا؟ (وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ) اور وہ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں نازل ہوتی اس پر کوئی نشانی اس کے رب کی جانب سے؟" (وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا(٦ : ١٠٩) اور وہ پختہ قسمیں اٹھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئی تو وہ اس پر ضرور ایمان لائیں گے ۔" ایک دوسری سورہ میں ان کا یہ مطالبہ نہایت ہی تعجب خیز انداز میں سامنے آتا ہے ۔ سورہ اسراء میں اللہ نے ان کے اس مطالبے اور تجویز کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ۔

(وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا (٩٠) اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا (٩١) اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (٩٢) اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ

(٩٣) (١٧ : ٩٠ تا ٩٣)) "اور انہوں نے کہا ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لئے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے ۔ یا تیرے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے ۔ یا تو آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے یا خدا اور فرشتوں کو رو در رو ہمارے سامنے لے آئے ۔ یا تیرے لئے سونے کا ایک گھر بن جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں ۔" اور سورہ الفرقان میں اسے یوں بیان کیا گیا ہے ۔

(وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا (٧) اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا (٨)

(٢٥ : ٧ - ٨) کہتے ہیں یہ کیسا رسول ہے' جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ کیوں نہ اس کے پاس

کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو) دھمکاتا یا اور نہیں تو اس کے لئے کوئی خزانہ ہی اتار دیا جاتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ روزی حاصل کرتا۔" اس لہر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو براہ راست اس بات کی ممانعت کی گئی ہے کہ وہ اہل کفر کے مطالبے سے متاثر ہو کر کہیں اس خواہش کا اظہار نہ کریں کہ کوئی معجزہ صادر ہو ہی جائے۔ چنانچہ حضور ؐ سے ان الفاظ میں خطاب ہوا۔

(وَاِنْ کَانَ کَبُرَ عَلَیْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِیَهُمْ بِاٰیَةٍ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَی الْهُدٰی فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ (۳۵) اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ وَالْمَوْتٰی یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ (۳۶) (۶ : ۳۵ - ۳۶) "اگر ان لوگوں کی بے رخی تم سے برداشت نہیں ہوتی' تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کچھ سرنگ ڈھونڈو' یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو' اگر اللہ چاہتا تو ان لوگوں کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا' لہذا نادان مت بنو۔ دعوت حق پر لبیک وہی لوگ کہتے ہیں جو سننے والے ہیں۔ رہے مردے تو انہیں اللہ بس قبروں سے اٹھائے گا اور پھر وہ واپس لائے جائیں گے (اس کی عدالت میں پیش ہونے کے لئے)۔

بعض مسلمانوں کے دلوں میں یہ رغبت پائی جاتی تھی کہ مشرکین صدور معجزات کے بارے میں جو مطالبے کرتے ہیں ان کا مطالبہ پورا کر دیا جائے۔ اس لئے کہ وہ پختہ قسمیں کھاتے تھے کہ اگر کوئی معجزہ صادر ہو گیا تو وہ ضرور ایمان لائیں گے۔ ایسے لوگوں کو کہا گیا :۔

(قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا یُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۱۰۹) وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ یُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ (۱۱۰)) (۶ : ۱۰۹ - ۱۱۰)) (اے نبی ؐ' ان سے کہو نشانیاں تو اللہ کے اختیار میں ہیں اور تمہیں کیسے سمجھایا جائے کہ اگر نشانیاں آ بھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں۔ ہم اسی طرح ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر رہے ہیں جس طرح یہ پہلی مرتبہ اس پر ایمان نہیں لائے تھے۔ ہم انہیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑے دیتے ہیں۔) تاکہ اہل ایمان یہ جان لیں کہ اہل کفر کے ہاں اس بات کی کمی نہیں ہے کہ ان کے سامنے کوئی معجزہ نہیں ہے یا ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے جو انہیں سچائی تک لے جائے' بلکہ ان کے ہاں جو کمی ہے وہ یہ ہے کہ وہ سنتے ہی نہیں۔ وہ اس طرح ہیں جس طرح مردے۔ ان کی قسمت میں ہدایت نہیں ہے۔ وہ سنت الٰہی کے مطابق اپنے آپ کو ہدایت سے محروم کر چکے ہیں۔ لہذا تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ دین اللہ کی سنت کے مطابق چلتا ہے۔ اور اس کا مقام

اس سے بلند ہے کہ وہ لوگوں کی خواہشات اور عوام کی تجاویز کے مطابق کوئی روش اختیار کرے - اب ہم قرآنی آیات کے ایک وسیع دائرے میں آجاتے ہیں - اب ایسی ہدایات سامنے آتی ہیں جو زمان و مکان کی قید سے وراء ہیں' جن کا تعلق کسی ایک واقعہ سے نہیں ہے - نہ کسی مخصوص تجویز سے ان کا تعلق ہے - زمانہ تو بدلتا رہتا ہے - لوگوں کی خواہشات اور ان کے مطالبات بھی بدلتے رہتے ہیں اس لئے داعیان حق کو چاہئے کہ انہیں لوگوں کی خواہشات صراط مستقیم سے ادھر ادھر نہ کر دیں - یہ لوگوں کی خواہشات اور ان کے مطالبات ہی ہیں جن کا لحاظ کرتے ہوئے بعض داعیان حق اسلامی نظریہ حیات کو ایک مذہب کے طور پر تسلیم کر کے اسے دوسرے مذہب کی طرح ایک کاغذی مذہب قرار دیتے ہیں اور اسے انفرادی زندگی کے معاملات تک محدود کر دیتے ہیں - جس طرح اس کرۂ ارض پر متعدد دوسرے مذاہب موجود ہیں جو کسی وقت ایک محدود مقصد کے لئے وجود میں آجاتے ہیں - جب ان مذاہب پر کچھ وقت گزر جاتا ہے تو وہ بکواس ثابت ہوتے ہیں اور ان کے تضادات کھل کر سامنے آجاتے ہیں - پھر اسی جذبے کے تحت بعض داعی اسلامی نظام کو ایک کاغذی منصوبے یا ایک مفصل کاغذی قانونی نظام کی صورت میں پیش کرتے ہیں اور اس منصوبے کے ذریعے وہ دور جدید کی جاہلیت کے واقعی حالات کا مقابلہ کرتے ہیں حالانکہ اہل جاہلیت کی جو عملی صورت حال ہے اس کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے - اس لئے کہ دور جدید کے اہل جاہلیت تو ببانگ دہل یہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک پرائیویٹ عقیدہ ہے اور اس کا زندگی کے واقعی اور عملی نظام کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے - یہ داعی لوگوں کے لئے اس عملی جاہلی صورت حال کو اسلامی رنگ میں مرتب کرتے ہیں - اس کے مطابق لوگ بدستور جاہلیت پر قائم رہتے ہیں' اپنے فیصلے طاغوت کی عدالت سے کراتے ہیں - نہ وہ شریعت کے مطابق فیصلے کرتے ہیں اور نہ کراتے ہیں - اس قسم کی تمام کوششیں نہایت ہی گھٹیا اور ذلیل حرکات ہیں - ایک سچے مسلمان کو چاہئے کہ وہ ان جدید فکری رنگوں میں رنگے ہوئے ان خیالات کو پرے پھینک دیں' اس لئے کہ یہ خیالات ناپختہ ہیں اور کسی حال میں بھی اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتے - اگرچہ ان کو دعوت اسلامی کے جدید رنگ اور جدید تکنیک کا نام دیا جائے -

اور اس سے بھی زیادہ ذلیل اور گھٹیا حرکت ان لوگوں کی ہے جو اسلام کو جدید لباس پہناتے ہیں اور اسلام پر ایسی صفات اور اصطلاحات کا اطلاق کرتے ہیں جو تاریخی ادوار میں کسی دور میں خود انسانوں نے ایجاد کیں - مثلاً اشتراکیت اور جمہوریت وغیرہ - ایسے لوگوں کی اس سعی نامشکور کا مقصد یہ رہا ہے کہ وہ اسلام کی ترقی یافتہ تعبیر کر کے اس طرح اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں - ذرا غور کیجئے اشتراکیت ایک اجتماعی اور اشتراکی نظام ہے اور یہ خالص انسانوں کا بنایا ہوا ہے - اس کے اندر کچھ چیزیں درست بھی ہو سکتی ہیں اور کچھ غلط بھی ہو سکتی ہیں - اسی طرح جمہوریت بھی ایک نظام حکومت اور نظام زندگی ہے - یہ جمہوری نظام خود انسانوں کی سوچ اور فکر کے نتیجے میں بنایا گیا ہے - اس میں بعض چیزیں درست بھی ہو سکتی ہیں اور غلط بھی ہو سکتی ہیں - ان کے مقابلے میں اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور یہ نظریاتی افکار ایک اجتماعی سوشل نظام' ایک علیحدہ اقتصادی نظام اور ایک ممتاز عملی اور انتظامی ڈھانچے پر مشتمل ہے اور یہ نظام اللہ کا بنایا ہوا نظام ہے - اس کے اندر نہ کوئی نقص پایا جاتا ہے اور نہ کوئی عیب ہے - لہذا جو شخص اسلامی نظام حیات کے لئے وہ خصوصیات اور صفات تلاش کرتا ہے جو انسانوں کی بنائی ہوئی ہیں اور ان کی سفارش کرتا ہے تو وہ شخص اسلام کے حوالے سے درست موقف کا حامل نہیں ہے - یا اس پر ایسے اقوال منطبق کرتا ہے جو انسانوں کے اعمال ہیں -

اہل جاہلیت مشرک صرف اس لئے قرار پاتے تھے کہ وہ اللہ کی مخلوقات میں سے بعض لوگوں کو اللہ کے ہاں سفارشی بناتے تھے اور ان کو دوست بناتے تھے۔

(وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی

(۳۹ : ۳)) "وہ لوگ جنہوں نے اس کے سوا دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں۔ (اور اپنے اس فعل کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ) ہم تو ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کر دیں" یہی تو شرک ہے' سوال یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے دربار میں کچھ لوگوں کی سفارش کے مرحلے سے بھی آگے بڑھ کر کچھ دوسرے لوگوں کے بنائے ہوئے نظام حیات کے ذریعے تقرب حاصل کرتے ہیں ان کا یہ فعل' مشرکین عرب کے فعل سے کس قدر زیادہ مکروہ ہے۔ مشرکین عرب دین بہرحال خدا ہی کا مانتے تھے البتہ کچھ اشخاص کو شریک بناتے تھے۔ یہ لوگ تو نظام حیات غیراللہ کا اپناتے ہیں اور قرب اللہ کا چاہتے ہیں۔

خوب غور کیجئے اور سمجھیے کہ اسلام اسلام ہے' سوشلزم سوشلزم ہے اور جمہوریت جمہوریت ہے۔ اسلام کا صرف وہی نام اور وہی عنوان ہو گا جو اس کے لئے اللہ نے رکھا ہے اور تجویز کیا ہے۔ یہ دوسرے نام اور عنوان لوگوں کے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ تمام دوسرے نظام لوگوں نے اپنے تجربوں سے بنائے ہوئے ہیں' اگر کوئی شخص ان نظاموں کو اپناتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ انہیں اپنے نام اور عنوان سے اپنائے۔ کسی داعی دین کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ لوگوں کے اپنائے ہوئے کسی رنگ کو اپنائے اور دعویٰ یہ کرے کہ وہ اللہ کے دین پر کوئی احسان کر رہا ہے۔

بہرحال ہم ایسے لوگوں سے ایک بات پوچھتے ہیں' آخر تمہاری نظروں میں اللہ کا دین اس قدر بے وقعت کیوں ہو گیا ہے' اور تم کیوں اللہ کی عظمت کو اپنے دل میں اس طرح نہیں بٹھاتے جس طرح اس کا حق ہے۔ تم لوگ آج کے دور میں اسلام کو کیوں اشتراکیت اور جمہوریت کے رنگ میں پیش کرتے ہو' کیونکہ یہ تو دور حاضر کے فتنے اور دور حاضر کے بدلتے ہوئے رنگ ہیں۔ تم دیکھتے نہیں ہو کہ ماضی قریب ہی میں سرمایہ داری کس قدر محبوب نظام تھا۔ یہ اس لئے محبوب تھا کہ لوگ جاگیرداری سے گلوخلاصی چاہتے تھے جبکہ جاگیرداری سے بھی پہلے ڈکٹیٹرشپ ایک محبوب نظام تھا اور اس کے ذریعے لوگ چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور بکھری ہوئی ظالم ریاستوں سے نجات چاہتے تھے مثلاً جرمنی اور اٹلی کے ممالک اس دور سے بھی گزرے ہیں۔ کل مذکورہ بالا نظاموں کے مقابلے میں دنیا میں کوئی نیا نظام بھی رائج ہو سکتا ہے جو اہل دنیا کا کوئی تجربہ یا نیا رنگ ہو گا اور جس میں ایک نئی شکل میں انسان' انسان کا غلام ہو گا تو تم پھر کل اسلام پر اس نئے نظام اور رنگ کا لیبل چسپاں کرو گے تاکہ تم اسلام کو ایک ایسے رنگ میں پیش کر سکو جسے لوگ چاہتے ہیں؟

آیات کے زیر بحث حصے بالخصوص اور قرآن کریم کے دوسرے مقامات پر یہ ہدایات دی گئی ہیں کہ داعی دین کا رویہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنی دعوت و نظریہ کو لے کر اور مستغنی ہو کر آگے بڑھے اور جو لوگ دعوت اسلامی کے سلسلے میں ترمیمی تجاویز دیتے ہیں ان کی باتوں اور تجویزوں پر سرے سے کان ہی نہ دھرے۔ نیز دین اسلام کو اس کے اصل نام اور عنوان کے ساتھ ہی پیش کرے اور اسے دوسرے مروجہ ناموں اور عنوانوں کے ساتھ معنون کرنے کی سعی نہ کرے۔ وہ لوگوں کو اسلامی منہاج اور اسلامی ذرائع ہی کے ذریعے بیدار کرنے کی سعی کرے۔ اللہ تمام جہانوں

سے بے نیاز ہے۔ اگر کوئی اس دعوت کو اس طرح قبول نہیں کرتا جس میں وہ صرف اللہ کی بندگی کرے اور اس کے سوا تمام غلامیوں سے نکل آئے تو دین اسلام کو کسی ایسے شخص کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کو کسی سرکش اور کسی مطیع فرمان کی طرف کوئی احتیاج ہے۔

دین اسلام اپنے بنیادی عناصر اور اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اپنی ایک خاص اصلیت (Orignality) رکھتا ہے۔ اللہ کا منشا یہ ہے کہ یہ خصائص اور یہ اساسی اقدار غالب ہو جائیں۔ دنیا کے عملی نظام کے معاملے میں یہ دین اصلیت (Orignality) کا مالک ہے اور وہ جس انداز میں انسان کو دعوت فکر دیتا ہے وہ بھی اور جنسل ہے۔ جس خدا نے اس دین کو اپنی خصوصیات اور اپنے عناصر ترکیبی کے ساتھ اتارا ہے' وہی خدا تو ہے جو اس حضرت انسان کا خالق ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ انسان کیا کیا سوچتا رہتا ہے اور اس کے دل میں خواہشات کی کیا کیا لہریں اٹھتی ہیں؟

اس لہر میں قرآن کریم کے اس انداز خطاب کا بھی ایک نمونہ موجود ہے جس کے ساتھ وہ فطرت انسانی کو مخاطب کرتا ہے۔ اس کے اسلوب خطاب میں سے یہ بھی ایک اساسی نمونہ ہے۔ قرآن انسانی فطرت اور اس کائنات کے طبعی عمل کے درمیان ایک رابطہ اور تعلق پیدا کرتا ہے۔ وہ کائناتی اثرات و اشارات کا رخ فطرت انسانی کی طرف موڑتا ہے۔ اس اثناء میں قرآن انسان کی فطری ساخت کو اس پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ ان فطری اشارات کو قبول کرے۔ قرآن جانتا ہے کہ جب اس کائنات کے تکوینی اشارات انسانی فطرت کی گہرائیوں تک پہنچ جائیں تو انسان فوراً لبیک کہتا ہے۔

(اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ (٦ : ٣٦) "بے شک وہ لوگ قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں۔" وہ نمونہ طرز ادا کیا ہے جو اس لہر میں ہم سے مخاطب ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں۔

(وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓی اَنْ یُّنَزِّلَ اٰیَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (٦ : ٣٧)) "یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی؟ کہو' اللہ نشانی اتارنے کی پوری قدرت رکھتا ہے' مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی میں مبتلا ہیں۔"

اس آیت میں ان لوگوں کی بات نقل کی گئی ہے جو دین اسلام کو جھٹلاتے تھے' حضور ؐ کا مقابلہ کرتے تھے' اور ایسے خارق عادت معجزات کے طلبگار تھے جنہیں ان کی آبادی بچشم سر دیکھے یہاں ان کا مطالبہ نقل کرنے کے بعد ان کے دلوں میں یہ بات بٹھائی جاتی ہے کہ اگر ان کا یہ مطالبہ مان لیا جائے تو اس کے نتائج کیا نکلیں گے۔ یہ کہ وہ خدا کی شدید پکڑ میں آ جائیں گے اور ہلاک و برباد کر دیئے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اللہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ کوئی معجزہ نازل فرمائے۔ لیکن اللہ کی رحمت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ نازل نہ کرے اور اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کے اس مطالبے کو مسترد کر دے۔

سیاق کلام اب اس محدود موضوع سے نکل کر کائنات کی وسعتوں میں داخل ہو جاتا ہے اور لوگوں کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ تم اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی اس کائنات پر ذرا نگاہ ڈالو' وہ آیات و معجزات خود کتاب کائنات کے اندر موجود ہیں جن کے مقابلے میں وہ خوارق کچھ خوارق نہیں جن کا وہ مطالبہ کرتے ہیں۔ اور یہ معجزات اور نشانات اس کائنات کے

دل میں ابد الاباد تک قائم ہیں تاکہ صرف ایک موجودہ نسل ہی نہیں سب نسلیں انہیں دیکھتی رہیں۔

(وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ (۶ : ۳۸)) "زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمہاری ہی طرح کے انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جا رہے ہیں۔" یہ بے شک ایک ہولناک حقیقت ہے۔ یہ وہ عظیم حقیقت ہے جسے اس وقت ان کی قوت مشاہدہ دیکھ سکتی تھی، اس لئے کہ اس وقت تک وہ سائنس میں کوئی منظم علم نہ رکھتے تھے۔ وہ یہ کہ تمہارے اردگرد موجود تمام مخلوقات کے اصناف و اجناس اپنی جگہ اقوام و امم ہیں۔ ہر ایک کی اپنی خصوصیت ہے اور اپنا نظام ہے، لیکن یہ مشاہدہ اس قدر عظیم حقیقت ہے کہ جس قدر اس کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کی عظمت کا یقین ہوتا جاتا ہے، اس سے انسانی علم میں اضافہ ہوتا ہے ہاں انسانی علوم اس کائنات کے علوم میں اضافہ تو کر سکتے ہیں لیکن ان کی وجہ سے اس کائنات کی کسی بھی حقیقت میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی علوم کے متوازی اللہ کے علوم غیبی ہیں جو اپنا کام کرتے ہیں اور ہر معاملے پر الہی علم و ارادہ اپنا تدبیری عمل جاری رکھے ہوئے ہے اور اس کائنات میں ہمارا مشاہدہ جس قدر آگے جاتا ہے، یہ حقیقت اور واضح ہوتی جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس کائنات کے اندر جو الہی قوتیں کارفرما ہیں اور جو نہایت ہی معجزانہ انداز میں کام کر رہی ہیں ان کے مقابلے میں ان لوگوں کے مطلوبہ معجزات کی حیثیت ہی کیا ہے؟ یہ کائناتی آیات و معجزات تو وہ حقائق ہیں کہ انسان کی بصارت اور بصیرت جس قدر آگے بڑھتی ہے وہ ان کے نئے نئے پہلو دیکھتے ہیں اور قیامت تک دیکھتے رہیں گے۔

اس انتخاب اور نمونے میں قرآنی منہاج کلام یہ ہے کہ قرآن کریم فطرت انسانی اور اس کائنات کے درمیان ایک ربط اور جوڑ پیدا کر دیتا ہے۔ وہ فطرت کے دریچے کائنات کے رازوں کے لئے وا کر دیتا ہے اور اس طرح قرآن کریم اس عظیم کائنات کے رازوں کے ذریعے انسان کی شخصیت اور اس کی سوچ پر گہرے اثرات چھوڑتا ہے۔

قرآن کریم انسان کی فطرت کے سامنے محض جدلیاتی لاہوتی مباحث پیش نہیں کرتا۔ نہ ان کے سامنے محض جدلیاتی علم الکلام اور توحیدی مباحث پیش کرتا ہے۔ نہ عقلی اور حسی فلسفے پیش کرتا ہے۔ یہ امور اسلامی اور قرآنی منہاج کے خلاف ہیں۔ قرآن لوگوں کے سامنے عالم موجودات اور عالم غیب کے واقعی مشاہد و حقائق پیش کرتا ہے۔ عقل انسانی کو آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ وہ غور و فکر کرے، ان سے نتائج اخذ کرے اور قدرت کی کارفرمائیوں کے ساتھ ہمقدم ہو کر چلے اور حقائق کو قبول کرے لیکن قرآن کریم انسان پر یہ ایک خاص ضابطے اور اسلوب کے ساتھ پیش کرتا ہے اور اسے اسی طرح نہیں چھوڑ دیتا کہ وہ عالم شہادت کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر صراط مستقیم کھو دے۔ اب سب سے آخر میں ان لوگوں کا انجام بتلایا جاتا ہے جو اس عظیم معجزے کے منکر ہیں :-

(وَالَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِی الظُّلُمٰتِ مَنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یُضْلِلْهُ وَمَنْ یَّشَاْ

يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (٦: ٣٩)) "مگر جو لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں' وہ بہرے اور گونگے ہیں' تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے رستے پر لگا دیتا ہے۔" قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ جو لوگ آیات الٰہی کو جھٹلاتے ہیں وہ گونگے اور بہرے ہیں اور اندھیروں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور پھر بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے نزدیک ہدایت و ضلالت کے بارے میں کیا اصول رائج ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہدایت وضلالت اللہ کی مشیت کے دائرے میں آتی ہے اور یہ اس قانون فطرت کے مطابق ہے جس پر اللہ نے بندوں کو پیدا کیا ہے۔

یوں اس معاملے میں اسلامی تصور حیات کے تمام پہلو جڑ جاتے ہیں اور اسلامی منہاج دعوت کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے۔ ایک داعی کے موقف کو متعین کر دیا جاتا ہے' جو اپنے نظریات و عقائد کے مطابق جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ ہر دور اور ہر حال میں وہ لوگوں کے سامنے دعوت پیش کرتا رہتا ہے۔ امید ہے کہ اس قدر کلمات کے ساتھ ہم اپنا مدعا واضح کر چکے ہیں اور اس کے ساتھ وہ مزید بحث بھی قابل ملاحظہ ہے جو ہم نے دعوت اسلامی کے منہاج کے سلسلے میں اس سورہ کے مقدمے میں کی ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۶۰ ایک نظر میں

یہاں سے سیاق کلام کا رخ اب اس موضوع کی طرف پھر جاتا ہے کہ جب اللہ کا عذاب آتا ہے تو اس کا مشرکین کی فطرت پر کیا ردعمل ہوتا ہے بلکہ مشرکین کے سامنے ان کے فطری ردعمل کا نمونہ پیش کر دیا جاتا ہے کہ جس سے وہ عذاب الہی کے وقت دوچار ہوتے ہیں۔ جب انسان اور ان مشرکین کی فطرت کے اوپر سے تہ بہ تہ جمے ہوئے مادی پردے ہٹ جاتے ہیں اور جب وہ خوفناک حالات سے جھنجوڑے جاتے ہیں تو فطرت کے اوپر جمی ہوئی گرد و غبار چھٹ جاتی ہے۔ ایسے حالات میں یہ مشرکین اپنے جھوٹے خداؤں کی تمام کہانیاں بھول جاتے ہیں۔ وہ رب واحد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جس کی معرفت ان کی فطرت کی گہرائیوں میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ اب وہ صرف اللہ کے سامنے نجات اور فلاح کے لئے دست بدعا ہوتے ہیں۔

اس کے بعد سیاق کلام ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک دوسرے منظر کے سامنے لے جاتا ہے اور اس منظر میں انہیں بتایا جاتا ہے کہ ان کے اسلاف پر کیا کیا عذاب نازل ہوئے اور کس کس میدان میں وہ مارے گئے۔ سنت الہیہ نے تاریخ میں کیا کیا کردار ادا کیا اور قضائے الہی کس طرح ان کے ساتھ عمل کرتی رہی۔ ان کی بصارت اور بصیرت کو روشن کرنے کے لئے انہیں وہ واقعات بتائے گئے کہ اللہ نے انہیں کہاں کہاں مہلت دی جس کے اندر وہ رسولوں کو جھٹلاتے رہے۔ اور نتیجۃً کس طرح ایک ابتلاء کے بعد ان پر دوسری ابتلاء آتی رہی۔ انہیں مصائب و مشکلات سے دوچار کیا گیا۔ پھر نعمت و دولت کے ذریعے انہیں آزمائش میں ڈالا گیا اور انہیں مہلت کے بعد مہلت دی جاتی رہی تاکہ وہ غفلت کی نیند سے بیدار ہو جائیں یہاں تک کہ انہوں نے فرصت کے تمام مواقع ضائع کر دیئے۔ مشکلات اور مصائب نے ان کے اندر جو احساس پیدا کر دیا تھا' دولت و نعمت نے انہیں اس احساس سے محروم کر دیا۔ اللہ کی سنت کے مطابق ان پر پھر عذاب الہی آیا اور اس نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ یہ تھا :-

(فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶ : ۴۵) "اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی ہے جنہوں نے ظلم کیا تھا اور تعریف ہے اللہ رب العالمین کے لئے۔"

یہ منظر جو دلوں کو دہلانے والا ہے' ابھی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا کہ سامنے سے دوسرا منظر نمودار ہو جاتا ہے۔ اس نئے منظر میں یہ لوگ اللہ کے عذاب میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اللہ کے عذاب نے ان کی قوت سماعت اور ان کی قوت بصارت کو ختم کر دیا ہے۔ ان کے دلوں پر مہریں لگ چکی ہیں اور اب اللہ کے سوا' اس منظر میں' کوئی دوسری قوت انہیں نظر نہیں آتی جو ان کی کھوئی ہوئی بصارت' سماعت اور قوت مدرکہ انہیں دوبارہ دے سکے۔ ان نمایاں اور خوفناک مناظر کی موجودگی میں بتایا جاتا ہے کہ کسی رسول کے فرائض کیا ہیں؟ یہ کہ وہ بشیر و نذیر ہوتا ہے اور اس کے سوا نہ کوئی

اس کی ڈیوٹی ہے اور نہ اختیار۔ رسول کے پاس یہ طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی جانب سے کوئی معجزہ پیش کرے۔ نہ رسولوں کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ لوگوں سے تجاویز لیں اور ان کے مطابق کام کریں۔ وہ تو مبلغ ہوتے ہیں اور بشیر و نذیر ہوتے ہیں۔ اب صورت حالات یہ ہو جاتی ہے کہ بعض لوگ ان پر ایمان لا کر عمل صالح شروع کر دیتے ہیں۔ وہ خوف سے اور پریشانی سے نجات پا جاتے ہیں اور بعض لوگ ان کی تکذیب کرتے ہیں' اس لئے انہیں عذاب سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور یہ عذاب ان پر اس روگردانی اور تکذیب کی وجہ سے آتا ہے۔ اس لئے جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کا رویہ اختیار کرے' اس کا انجام یہ ہو گا' جس کا اس لہر میں ذکر ہوا ہے۔

-----○ ○ ○-----

درس نمبر ۶ تشریح آیات

۴۰ ---- تا ---- ۴۹

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَ تَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۝

"ان سے کہو' ذرا غور کر کے بتاؤ' اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے کوئی بڑی مصیبت آجاتی ہے یا آخری گھڑی آپہنچتی ہے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم سچے ہو۔ اس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے ہو' پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو بھول جاتے ہو۔" اللہ تعالیٰ فطرت انسانی کے خطاب کے لئے جو وسائل استعمال فرماتے ہیں یہ اس کا ایک نمونہ ہے۔ یہ نمونے اس سے پہلے کی لہروں میں بھی بیان کئے جا چکے ہیں اور اس کے بعد جو فقرات آرہے ہیں ان میں بھی اس کے نمونے آئیں گے۔ اس پوری سورہ میں انسانی فطرت کو مخاطب کیا گیا ہے۔

اس سے قبل یہ بات کہی گئی تھی کہ زندہ مخلوقات کے جہان تمہاری نظروں کے سامنے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مدبرانہ قدرت نے ان کے اندر کس قدر تنظیم پیدا کر رکھی ہے۔ پھر ذرا دیکھو کہ اللہ کا علم کس قدر وسیع اور شامل ہے۔ اس زیر بحث مجموعہ آیات میں اللہ کے عذاب اور آفات ناگہانی کا ذکر ہے۔ جب یہ ناگہانی آفات و بلیات انسانی فطرت پر آتی ہیں تو ان کے مقابلے میں انسان کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب یہ آفات ایک ہولناک صورت میں ہوتی ہیں جس سے انسان کا دل دہل جاتا ہے۔ ایسے حالات میں انسان کے دل و دماغ سے شرک کے گرد و غبار کی تہیں چھٹ جاتی ہیں اور انسانی فطرت صاف ہو کر سامنے آجاتی ہے اور عقیدۂ توحید جو انسانی فطرت کی گہرائیوں میں موجود رہتا ہے وہ سامنے آتا ہے اور انسانی فطرت صرف رب واحد کو پکارتی ہے۔

(قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ اِنْ كُنْتُمْ

صٰدِقِيْنَ (٦: ٤٠) ''ان سے کہو' ذرا غور کر کے بتاؤ اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے کوئی بڑی مصیبت آ جاتی ہے یا آخری گھڑی آ پہنچتی ہے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم سچے ہو۔'' یہاں ایک خوفناک صورت حال کا تصور پیش کیا جاتا ہے اور دنیا میں تباہی و بربادی کے بعض مناظر نظروں کے سامنے لائے جاتے ہیں یا یہ تصور کہ اچانک قیامت برپا ہو جائے۔ جب انسانی فطرت کے سامنے یہ مناظر آتے ہیں تو فطری احساس چٹکیاں لینے لگتا ہے۔ ان مناظر کی ہولناکی کا تصور ذہن میں خوبی کے ساتھ آ جاتا ہے اور اللہ خوب جانتا ہے جو خالق فطرت ہے کہ اس اسلوب کے ساتھ فطرت ان مناظر کا اچھی طرح ادراک کر لیتی ہے اور بسہولت حقیقت تک رسائی حاصل کر لیتی ہے۔ اس کی تمام قوتیں ان مناظر کی وجہ سے حرکت میں آ جاتی ہیں اس لئے کہ ان ہولناک مناظر میں جو حقیقت ہوتی ہے وہ فطرت انسانی کے اندر موجود ہوتی ہے۔ خالق فطرت کو تو اچھی طرح علم ہے کہ یہ حقیقت فطرت کے اندر موجود ہوتی ہے اس لئے باری تعالیٰ اس اسلوب میں فطرت سے مخاطب ہوتے ہیں اور فطرت اس تصور کو قبول کر لیتی ہے' کانپ اٹھتی ہے اور غفلت اور سرکشی پردوں اور غبار کی تہوں کے نیچے سے صاف صاف نمودار ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتے ہیں یا جواب طلب فرماتے ہیں اور خود ان کی زبان سے جواب چاہتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ یہ جواب ان کی فطرت کا حقیقی اظہار ہے۔ (اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ) کیا تم اللہ کے سوا دوسروں کو پکارتے ہو' اگر تم سچے ہو تو جواب دو۔''

ان کی جانب سے جواب کا انتظار کئے بغیر سچا اور حقیقی جواب آ جاتا ہے جو عملاً ان کی فطرت کے مطابق ہے' اگرچہ وہ جواب نہ دیں لیکن ایسے مواقع پر ان کا عمل کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ (بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ (٦: ٤١) اس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے ہو' پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو بھول جاتے ہو۔'' بلکہ تم صرف اللہ وحدہ ہی کو پکارو گے اور ایسے حالات میں تم اپنے شرکیہ تصورات کو یکسر بھول جاؤ گے۔ یہ خوفناک صورت حال تمہاری اصل فطرت کو سطح تک لے آئے گی اور اب یہ فطرت صرف اللہ وحدہ کو پکارے گی۔ اسے یہ بات یاد بھی نہ رہے گی کہ کوئی شخص شرک کرتے ہوئے غیر اللہ کو بھی پکارتا رہا ہے۔ سرے سے حقیقت شرک بھی ان کے ذہن سے محو ہو جائے گی۔ اس لئے کہ معرفت کردگار ہی وہ اصل حقیقت ہے جو انسانی فطرت کے اندر موجود ہوتی ہے۔ رہے شرکیہ تصورات تو یہ جھلکی کی طرح عارضی چیز ہوتی ہے۔ بعض عارضی عوامل اور حالات کی وجہ سے یہ شرکیہ تصورات جنم لیتے ہیں۔ انسانی فطرت پر یہ عارضی پردے پڑ کر اصل حقیقت کو نیچے چھپا دیتے ہیں۔ جب کوئی خوفناک صورت حالات انسان کو جھنجوڑتی ہے تو اوپر کے پردے اور غبار چھٹ جاتے ہیں اور نیچے سے اصل حقیقت نمودار ہو جاتی ہے۔ اب یہ فطرت رب ذوالجلال کے سامنے اپنا ردعمل ظاہر کرتی ہے اور امید کرتی ہے کہ ان خوفناک حالات میں صرف اللہ تعالیٰ ہی انسان کی مدد کر سکتے ہیں اور ایسے حالات میں انسان کے لئے کوئی اور چارہ کار نہیں رہتا۔

یہ ہے انسان کی حقیقی فطری روش۔ اللہ تعالیٰ مشرکین کے سامنے انسان کے اس فطری ردعمل کو برائے غور پیش فرماتے ہیں لیکن ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ کی شان بے نیازی کیا روش اختیار فرماتی ہے؟ یہ کہ اگر اللہ چاہے کہ ان پر سے ان مشکلات کو دور فرما دے تو اس کی مشیت بے قید ہے۔ اس کے ارادے کو رد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر چاہے تو ان کی دعاؤں کو قبول کر لے' تکالیف پوری طرح دور ہو جائیں یا جزوی طور پر دور ہو جائیں۔ اور اگر اس کی مشیت کا تقاضا یہ

ہو کہ ان کی پکار کو رد کر دے تو کر دیتا ہے۔ یہ فیصلہ 'اس کی تقدیر' اس کے علم اور اس کی حکمت پر موقوف ہے۔

اگرچہ شرک انسانی فطرت کے خلاف ہے لیکن بعض اوقات انسان شرکیہ تصورات اختیار کر لیتا ہے۔ یہ وہ اس وقت اختیار کرتا ہے جب وہ راہ فطرت سے انحراف اختیار کر لیتا ہے اور یہ انحراف مختلف عوامل کی وجہ سے واقع ہوتا ہے اور یہ عوامل انسان کے اندر جو صاف ستھری فطرت موجود ہے اسے دبا دیتے ہیں اور ان عوامل کے نیچے رب واحد کی حقیقی معرفت انسان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ انسان کبھی بھی وجود باری کا منکر نہیں رہا ہے اور نہ یہ اس کا فطری موقف رہا ہے کہ وہ وجود باری سے انکار کر دے۔

جیسا کہ ہم بارہا دیکھ چکے ہیں کہ جو لوگ بظاہر اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ ملحد ہیں اور وہ وجود خالق کے منکر ہیں' درحقیقت وہ خدا کے منکر نہیں ہوتے۔ ہم یہ یقین نہیں کر سکتے کہ جن لوگوں کو دست قدرت نے بنایا ہے اور جن کے وجود کے ہر ذرے اور ہر خلیے میں دست قدرت کی چھاپ موجود ہے' پھر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے خالق کو بالکل بھول جائیں اور حقیقی ملحد ہو جائیں۔ ان کے وجود کا تو ہر ذرہ ذات باری پر گواہ ہے۔

انسانیت پر اس خوفناک عذاب کے نزول کی ایک طویل داستان ہے۔ کنیسہ اور فطرت کے درمیان ایک طویل عرصے تک کشمکش جاری رہی۔ کنیسہ اس جدوجہد میں رہا کہ فطری عوامل اور دواعی کا قلع قمع کر دے۔ اہل کنیسہ انسان کی فطری خواہشات اور میلانات کی قانونی حیثیت کا انکار کرتے تھے۔ جبکہ درحقیقت وہ نہایت ہی مکروہ زندگی بسر کرتے تھے جو عیاشیوں سے پر تھی۔ اس طرح فطرت کے ساتھ مخاصمت اور کشمکش یورپ میں صدیوں تک برپا رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل یورپ نے یہ سمجھا کہ خدا پرستی کا مطلب فطرت کا انکار ہے۔ یوں وہ کفر اور الحاد کے صحرا میں گم گشتہ راہ ہو گئے اور کنیسہ کی رہبانی زندگی سے بھی مکروہ تر زندگی اور سراب کے پیچھے بھاگتے رہے۔ (دیکھئے میری کتاب المستقبل لھذا الدین کی فصل غیر فطری افتراق)

اس صورت حال سے یہودیوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور نصاریٰ کو اپنے صحیح دین سے برگشتہ کر دیا تاکہ ان کی نکیل ان کے ہاتھ آ جائے اور وہ خوب اچھی طرح سے ان کے اندر فسق و فجور اور اخلاقی بے راہ روی پھیلا سکیں اور ان کو اپنے مقاصد کے لئے اس طرح استعمال کریں جس طرح گدھے کو استعمال کیا جاتا ہے' جس کا اظہار انہوں نے تلمود اور یہودی زعما کے پروٹوکولز میں بڑی صراحت سے کیا ہے۔ یہودی یہ کام اس وقت تک نہ کر سکتے جب تک انہوں نے یورپ کی اس غیر فطری تاریخ کنیسہ پر تنقید کر کے لوگوں کو گمراہ نہ کر دیا اور لوگوں کو کنیسہ سے متنفر کر کے ملحد نہ بنا دیا۔

اس صریح اور ان تھک مکارانہ جدوجہد کا آخری اظہار عالمی کمیونزم کی صورت میں ہوا۔ یہ بات یاد رہے کہ عالمی کمیونزم لوگوں کو ملحد اور گمراہ کرنے کی ایک عظیم یہودی سازش تھی۔ یہ لوگ گزشتہ نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے سے تمام حکومتی ذرائع ابلاغ کے ذریعے لوگوں کو ملحد بنانے میں مصروف رہے لیکن دوسری اقوام کے دلوں کی گہرائی کے اندر اب بھی عقیدہ خدا پرستی موجود ہے۔ سٹالن جیسے وحشی انسان کو بھی بالآخر کنیسہ کے ساتھ مصالحت کرنی پڑی اور دوسری عالم گیر جنگ کے دوران اس نے کنیسہ کے مشائخ کو رہا کر دیا۔ دوسری عالم گیر جنگ نے اس پر اس قدر بوجھ ڈالا کہ اس کی گردن بھی تصور خدا کے سامنے آخر جھک ہی گئی اس لئے کہ لوگوں کی فطرت کے اندر تصور خدا موجود تھا۔ اگرچہ سٹالن اور اس کے مٹھی بھر ساتھی ملحد تھے جن کے ہاتھوں میں زمام حکومت تھی۔

یہودیوں نے اپنے صلیبی خرکاروں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان اقوام کے اندر بھی کفر و الحاد کا مصنوعی سیلاب لانے کی بے حد سعی کی۔ اگرچہ مسلم اقوام کے دل و دماغ میں عقیدہ خدا پرستی نہایت ہی کمزور ہو گیا تھا لیکن انہوں نے ترکی کے نام نہاد لیڈر اتاترک کے ذریعے عالم اسلام کے اندر کفر و الحاد کی جو تحریک شروع کی تھی وہ تحریک خود ترکی کے اندر بری طرح ناکام ہو گئی' حالانکہ یہودیوں اور ان کے خرکاروں نے اس نام نہاد لیڈر کی عظمت اور برتری کے ڈھنڈورے پیٹے اور ہر طرف سے مالی امداد کے دروازے کھول دیئے۔ ترکی کی تحریک الحاد پر انہوں نے بے شمار کتابیں بھی لکھیں اور ان میں اس کے الحادی تجربے کو بے حد سراہا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ عالم اسلام میں ترکی کے تجربے کے بعد جو دوسرے تجربے کر رہے ہیں ان کو وہ الحاد و زندقہ کا عنوان نہیں دیتے بلکہ یہاں وہ اسلام کے نام سے الحاد پھیلاتے ہیں تاکہ ان کی تحریک کا ٹکراؤ انسان کے فطری میلانات سے نہ ہو' جس طرح اتاترک کے تجرباتی کے انسان کے فطری رجحان کے ساتھ ٹکراؤ ہوا اور وہ اپنی جگہ پاش پاش ہو گیا۔ اب یہ لوگ اسلامی جھنڈوں کے سائے تلے گندگی' غلاظت اور اخلاقی بے راہ روی پھیلاتے ہیں۔ اس طرح خام انسانی عقول کو تباہ و برباد کرتے ہیں اور یہودی اور ان کے خرکار صلیبی یہ کام عالم اسلام میں بڑے اہتمام سے کرتے ہیں۔

لیکن ان تمام تجربات کے بعد جو حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ انسانی فطرت اپنے رب کو اچھی طرح جانتی ہے۔ وہ رب کو وحدہ لاشریک بھی تسلیم کرتی ہے۔ اگر کسی وقت انسانی فطرت پر فسق و فجور کی گرد پڑ جائے اور وہ اس آلودگی کے نیچے دب جائے تو جونہی کوئی اچانک خطرہ درپیش ہو اور انسان جھنجوڑا جائے تو یہ گرد و غبار چھٹ جاتا ہے اور اصل انسانی فطرت واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے اور انسان اپنے رب کو یوں پکارتا ہے جس طرح اس وقت انسان نے پکارا تھا جب اسے اللہ نے پیدا کیا تھا۔ اچانک وہ مطیع فرمان مومن اور خشوع و خضوع کرنے والا انسان بن جاتا ہے۔ یہودیوں اور ان کے خرکاروں کی اس عالمی سازش کا تار و پود فطرت کی ایک کڑکے دار چیخ ہی سے پاش پاش ہو جاتا ہے اور فطرت دوبارہ باری تعالیٰ کے آستانے پر آگرتی ہے۔ جس خطے میں یہ فطری آواز بلند ہو وہاں سے یہ سازش نابود ہو جاتی ہے اور یہودی اور ان کے خرکار جس قدر جدوجہد بھی کریں' زمین پر یہ آواز حق بلند ہوتی رہے گی۔

---○○○---

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ

ظَلَمُوۡا ؕ وَ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۵﴾

"تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور ان قوموں کو مصائب و آلام میں مبتلا کیا تاکہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جھک جائیں۔ پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انہوں نے عاجزی اختیار کی؟ مگر ان کے دل تو اور سخت ہوگئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔ پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو جو انہیں کی گئی تھی 'بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے' یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہوگئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔ اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا اور تعریف ہے اللہ رب العالمین کے لئے (کہ اس نے ان کی جڑ کاٹ دی)۔

یہ لہر عذاب الٰہی کی ایک جھلکی ہے اور انسان کی تاریخ کی واقعی صورت حال کی طرف اشارہ ہے لیکن اس میں کسی واقعہ کے بجائے یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ عذاب الٰہی کی زد میں کس طرح آتے ہیں۔ اور ان کا انجام کیا ہوتا ہے۔ عذاب سے پہلے اللہ تعالیٰ کس طرح انہیں مہلت کے بعد مہلت دیتا چلا جاتا ہے اور کس طرح ان کو تنبیہ کے بعد تنبیہ کی جاتی رہتی ہے۔ لیکن وہ بھلاتے ہی چلے جاتے ہیں اور بعض اوقات شدید سے شدید عذاب بھی انہیں خواب غفلت سے نہیں جگا سکتا۔ اور جب ان پر انعامات و اکرامات کی بارش کر دی جاتی ہے تو وہ شکر ادا نہیں کرتے یا زوال نعمت اور فتنوں سے نہیں ڈرتے۔ ان کی فطرت اس قدر بگڑ جاتی ہے کہ اب وہ لاعلاج ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں اس قدر عمل بگاڑ رونما ہو جاتا ہے کہ اب اصلاح احوال ممکن ہی نہیں رہتی۔ ایسے لوگوں پر حجت تمام ہو جاتی ہے اور ان پر اللہ کا ایسا عذاب آتا ہے کہ پھر ان میں کا کوئی متنفس زندہ نہیں رہتا۔

(وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰۤی اُمَمٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ فَاَخَذۡنٰہُمۡ بِالۡبَاۡسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّہُمۡ یَتَضَرَّعُوۡنَ

(۴۲) فَلَوۡلَاۤ اِذۡ جَآءَہُمۡ بَاۡسُنَا تَضَرَّعُوۡا وَ لٰکِنۡ قَسَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ وَ زَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ مَا

کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (۴۳) (۶: ۴۲ - ۴۳)) "تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور ان قوموں کو مصائب و آلام میں مبتلا کیا تاکہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جھک جائیں۔ پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انہوں نے عاجزی اختیار کی؟ مگر ان کے دل تو اور سخت ہوگئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔" انسانی تاریخ میں ایسی اقوام بکثرت موجود ہیں اور ان میں سے بے شمار قرآن کریم نے انسانوں کو گنوا کر ان کے حالات بتائے ہیں۔ قرآن نے یہ حالات اس وقت بتائے جب انسانی تاریخ ابھی مدون ہی نہ ہوئی تھی۔ تاریخ کی جن کتابوں کو انسانوں نے مرتب کیا ہے وہ تو بہت ہی قریبی ادوار سے متعلق ہیں وہ حدیث السن اور نومولود ہے۔ ہماری تاریخ انسان کی طویل ترین تاریخ کو سمجھنے سمجھانے کی اہل نہیں ہے کیونکہ کرۂ ارض پر انسان کے بسنے کی تاریخ بہت ہی طویل ہے اور انسان نے جو تاریخ مرتب کی ہے یہ تو جھوٹ کا پلندہ ہے۔ وہ ہے بھی بہت ہی مختصر اور اس کے

اندر تاریخ کے اصل عوامل اور اسباب کا احاطہ ہی نہیں کیا جاسکا۔ ان تاریخی عوامل میں سے بعض تو نفس انسانی کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہیں اور بعض ایسے اسباب ہیں جو پردۂ غیب میں مستور ہیں اور ان میں سے نہایت ہی قلیل حصہ انسان پر ظاہر ہوا ہے۔ پھر جو بعض انسانوں پر ظاہر بھی ہوئے ہیں انسانوں نے ان کے جمع و تدوین میں غلطی کی۔ ٹھیک طور پر واقعات جمع کر بھی لئے گئے تو ان کے سمجھنے میں غلطیاں کی گئیں اور ان میں سے سچے اور جھوٹے واقعات و اسباب کو ایک دوسرے سے جدا نہ کیا جاسکا۔ صرف چند واقعات کا درست تجزیہ ہو سکا۔ لہٰذا کسی انسان کی جانب سے یہ دعویٰ کرنا کہ اس نے پوری انسانی تاریخ کے واقعات و اسباب کا احاطہ کر لیا ہے اور یہ کہ وہ ان واقعات کی سائنٹیفک تفسیر کر سکتا ہے اور یہ کہ وہ تاریخ کے مستقبل کے رخ کو بھی صحیح طرح متعین کر سکتا ہے اور نتائج اخذ کر سکتا ہے تو یہ بہت ہی بڑا جھوٹ ہے جو کوئی بول سکتا ہے۔ ایک نہایت ہی تعجب انگیز بات یہ ہے کہ بعض لوگ ایسے جھوٹ کا دعویٰ کرتے نہیں شرماتے۔ اگر ایسے لوگ یہ کہتے کہ مستقبل میں یہ واقعات ظاہر ہونے کی توقع ہے تو ان کی بات معقول ہوتی لیکن اگر کسی جھوٹے شخص کو ایسے افراد مل رہے ہوں جو اس کے جھوٹ کی تصدیق کے لئے ہروقت تیار ہوں تو اسے جھوٹ سے باز رہنے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ بہرحال سچائی بیان کرتا ہے اور صادق القول ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ دنیا میں کیا واقعات ہو گزرے ہیں۔ اور اپنی مہربانی اور فضل کی وجہ سے وہ بندوں کے سامنے ان حقائق کو بیان کرتا ہے۔ کلام الٰہی اللہ کی تقدیر' اس کے فیصلوں اور اس کائنات میں اس کی سنت پر مشتمل ہوتا ہے تاکہ لوگ احتیاط کریں اور واقعات سے عبرت حاصل کریں۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ سکیں کہ ان واقعات کے پیچھے کیا اسباب و عوامل کارفرما تھے اور ظاہری اسباب کیا نظر آتے تھے تاکہ وہ ان تاریخی واقعات کو صحیح طرح سمجھ سکیں اور ان کی تشریح تجزیہ اور تحلیل کر سکیں۔ پھر آئندہ تاریخ پر پڑنے والے اثرات اور نکلنے والے نتائج کو سمجھ سکیں اور ان کا استدلال سنت الٰہیہ کی روشنی میں ہو جس کے اصول یہاں اللہ نے اپنی کتاب میں بیان کئے ہیں۔

آیات زیر بحث میں ایسے واقعات کی صورت گری کی گئی ہے جو مختلف اقوام میں بار بار پیش آتے رہے ہیں۔ ان اقوام کے پاس اللہ کی طرف سے بھیجے گئے رسول آئے' لیکن انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں مشکلات اور تکالیف کے ذریعے ابتلاء میں ڈالا گیا۔ یہ مشکلات مالی بھی تھیں اور جانی بھی۔ ان کو مشکل حالات اور مشکل مسائل میں مبتلا کر دیا گیا لیکن یہ مشکلات ابھی عذاب الٰہی کی حد تک نہ پہنچی تھیں' جن کا ذکر اس سے قبل کی آیات میں آ گیا ہے۔ یعنی یہ مشکلات تباہی اور بربادی کی حد تک نہ تھیں۔

قرآن کریم نے ان اقوام کے بعض نمونے پیش کئے ہیں اور ان مشکلات اور مصائب کا ذکر بھی کیا ہے جو ان پر ڈالے گئے۔ ان میں سے فرعون اور اس کے ساتھیوں کا قصہ بہت ہی مشہور ہے۔

(وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ
(۱۳۰) فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰى
وَمَنْ مَّعَهٗ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۱۳۱) وَقَالُوْا مَهْمَا

تَأْتِنَا بِهِ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۱۳۲) فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (۱۳۳) (۷: ۱۳۰ تا ۱۳۳)) (ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ شاید ان کو ہوش آجائے۔ مگر ان کا حال یہ تھا کہ جب اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اسی کے مستحق ہیں' اور جب برا زمانہ آتا تو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کو اپنے لئے فال بد ٹھہراتے' حالانکہ درحقیقت ان کی فال بد تو اللہ کے پاس تھی' مگر ان میں سے اکثر بے علم تھے۔ انہوں نے موسیٰ سے کہا: "تو ہمیں مسحور کرنے کے لئے خواہ کوئی نشانی لے آئے ہم تو تیری بات ماننے والے نہیں ہیں۔" آخر کار ہم نے ان پر طوفان بھیجا' ٹڈی دل چھوڑے' سر سریاں پھیلائیں' مینڈک نکالے اور خون برسایا۔ یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں مگر وہ سرکشی کئے چلے گئے) یہ ہے ایک نمونہ ان واقعات کا' جس کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو مشکلات و مصائب سے محض اس لئے دوچار کیا کہ وہ ذرا ہوش میں آجائیں' وہ ذرا اپنے ضمیر میں جھانکیں اور اپنے حالات پر غور و فکر کریں' محض اس لئے کہ ان شدائد کی وجہ سے شاید وہ اللہ کے سامنے عاجزی کرنے لگیں اور اپنے آپ کو اللہ کے سامنے ذلیل و جھکنے والے بنا دیں۔ وہ اپنے کبر و غرور کو چھوڑ کر سنجیدہ رویہ اختیار کریں اور اخلاص سے دعا کریں کہ اللہ ان پر سے یہ مشکلات دور کر دے۔ ان کے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے' لیکن ان کے لئے جو مناسب تھا وہ انہوں نے نہ کیا۔ انہوں نے اللہ کی پناہ میں داخل ہونے سے انکار کر دیا اور اپنے عناد اور سرکشی کو جاری رکھا اور ان مشکلات کی وجہ سے بھی ان کی سوچ اس طرف نہ لوٹی۔ ان کی چشم بصیرت وا نہ ہوئی اور ان کے دل نرم نہ ہوئے۔ شیطان ان کے پیچھے خوب لگا ہوا تھا۔ وہ ان کے لئے ان کی ضلالت اور سرکشی کو مزین کر رہا تھا۔ "مگر ان کے دل تو اور سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلا دیا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔"

وہ دل جو شدائد اور مصائب کے باوجود رجوع الی اللہ اختیار نہیں کرتا وہ دل اس طرح خشک ہو گیا ہے جس طرح پتھر خشک ہوتا ہے اور اس کے اندر رس کا ایک قطرہ بھی نہیں ہوتا جسے شدائد اور مصائب نچوڑ سکیں۔ یہ دل مر گیا ہے اور اس پر جس قدر دباؤ آئے اسے احساس نہ ہو گا۔ اس دل کے اندر سے قبولیت حق کا تمام مواد خارج ہو چکا ہے۔ وہ پوری طرح مر چکا ہے اس لئے اس کو احساس دلانے کے لئے چاہے جس قدر چٹکیاں بھریں اسے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ حالانکہ زندہ دل ایسے جھٹکوں کے نتیجے میں بیدار ہو جاتے ہیں اور اللہ کی جانب سے اس قسم کے مصائب آتے ہی حق کو قبول کر لیتے ہیں۔ وہ جاگ اٹھتے ہیں اور ان کے دریچے کھل جاتے ہیں اور یوں ان کو رجوع الی اللہ نصیب ہو جاتا ہے۔ وہ اس رحمت اور رافت اور جود و کرم کے مستحق ہو جاتے ہیں جسے اللہ نے اپنے اوپر فرض کر لیا ہے۔ جو شخص مر چکا ہو یہ مشکلات اس کے لئے محاسبہ اور سزا ہوتے ہیں اور ان سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ الٹا اس شخص کے تمام عذرات ختم ہو جاتے ہیں اور تمام دلائل بیکار جاتے ہیں۔ وہ انجام بد اور شقاوت کا مستحق قرار پاتا ہے لہٰذا اللہ کا عذاب اس کے لئے طے ہو جاتا ہے۔

یہ امم سابقہ جن کی خبریں اللہ تعالیٰ رسول اللہ پر نازل کرتے ہیں اور آپ کے واسطے سے ہمیں پہنچاتے ہیں' انہوں نے ان مصائب و شدائد سے کوئی عبرت نہ پکڑی۔ انہوں نے رجوع الی اللہ اختیار نہ کیا اور نہ اللہ کے سامنے بدست بدعا

ہوئے۔ شیطان نے ان کے لئے روگردانی اور عناد کو مزین کر دیا ہے وہ اسے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ایسی اقوام کو اللہ تعالیٰ مہلت دیتے ہیں اور انہیں آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور وہ حدوں سے گزر جاتے ہیں۔

(فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ (٤٤) فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (٤٥) (٦: ٤٤ — ٤٥)) ”پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو جو انہیں کی گئی تھی، بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے، یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔ اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا اور تعریف ہے اللہ رب العالمین کے لئے (کہ اس نے ان کی جڑ کاٹ دی)“۔ خوشحالی بھی دراصل ابتلاء ہے جس طرح مصائب اور شدائد ابتلاء ہیں لیکن خوشحالی غربت اور بدحالی کے مقابلے میں شدید ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کو جس طرح بدحالی سے آزماتا ہے اسی طرح خوشحالی سے بھی آزماتا ہے۔ جب کسی مومن پر بدحالی آجائے اور وہ آزمائش میں مبتلا ہو جائے تو وہ صبر کرتا ہے اور اگر مومن پر خوشحالی آجائے تو وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اس لئے وہ ہر حالت میں اچھا رہتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے: ”مومن بھی عجیب ہے کہ اس کے تمام حالات خیر ہی خیر ہوتے ہیں اور یہ خصوصیت صرف مومن کو حاصل ہے۔ اگر اسے خوشحالی نصیب ہو اور وہ اس کا شکر ادا کرے تو یہ اس کے لئے خیر ہے اور اگر وہ بدحال ہو اور صبر کرے تو بھی اس کے لئے خیر ہے۔“ (روایت مسلم)

رہیں وہ اقوام جنہوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی اور جن کی کہانیاں اللہ نے یہاں بیان کیں تو انہوں نے اس ہدایت کو بھلا دیا جو انہیں دی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم تھا کہ اب وہ ہلاکت سے دوچار ہونے ہی والے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو شدائد و مصائب میں ڈالا تو بھی انہیں ہوش نہ آیا۔ اور ان میں سے بعض پر انعامات کے دروازے کھول دیئے اور ہر چیز کی فراوانی کر دی اور ان کے لئے میدان کھلا چھوڑ دیا تاکہ وہ سرکشی میں خوب آگے بڑھ جائیں۔ یہاں قرآن کا انداز تعبیر بھی نہایت ہی خوبصورت ہے۔

(فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ (٦: ٤٤)) (ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے) اس کے اندر ہر قسم کی بھلائیاں، ہر قسم کی ضروریات، ساز و سامان اور عزت و شان کی بڑی فراوانی کے ساتھ شامل ہیں۔ یعنی ہر چیز سیلاب کی طرح بہتات میں، بغیر رکاوٹ اور پابندی کے ان کے لئے عام کر دی یہ نعمت انہیں بسہولت ارزاں ملتی رہی بغیر کسی محنت و مشقت کے۔ فی الحقیقت یہ ایک نہایت ہی مؤثر منظر ہے۔ قرآن کریم کے فنی انداز تعبیر کا یہ ایک نادر نمونہ ہے۔ (دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی میں باب طریقۃ القرآن)

(حَتّٰى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْا (٦: ٤٤ — ٤٥)) (یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو

انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے) ہر قسم کی بھلائیوں اور ساز و سامان کی بہتات میں وہ غرق ہو گئے اور عیش و عشرت میں مگن ہو گئے ۔ انہوں نے ایسے حالات میں نہ خدا کو یاد کیا اور نہ اس کا شکر ادا کیا اور ان کے دلوں سے منعم حقیقی کا تصور محو ہو گیا اور خشیت الٰہی سے انکے دل خالی ہو گئے ۔ وہ عیش کوشی اور کام و دہن کی لذت کوشی میں مکمل طور پر گھر گئے اور اپنے آپ کو مکمل طور پر ان چیزوں کے حوالے کر دیا ۔ ان کی زندگی میں اعلیٰ اقدام کی کوئی اہمیت نہ رہی اور یہ لہو و لعب اور عیش طرب میں غرق لوگوں کی عام عادت ہوتی ہے کہ ان میں سے اعلیٰ قدریں غائب ہو جاتی ہیں ۔ اس کے بعد ان کی سوسائٹی سے نظم اور اچھی عادات غائب ہو جاتی ہیں اور وہ اخلاقی اعتبار سے مکمل طور پر تباہ ہو جاتے ہیں ۔ یوں ان کے یہ حالات اس پر منتج ہوتے ہیں کہ ان کی پوری زندگی تباہ ہو جاتی ہے اور اب یہ تباہی بالکل قدرتی ہوتی ہے ۔ یہ عین سنت الٰہیہ ہے ۔

(اَخَذْنٰھُمْ بَغْتَةً فَاِذَا ھُمْ مُّبْلِسُوْنَ (٦ : ٤٤)) (تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے) اب یہ پکڑ بالکل ناگہانی تھی ۔ یہ لوگ مدہوشی کی حالت میں تھے اور عیش و عشرت میں مست تھے اور جب اچانک اللہ کی پکڑ میں آتے ہیں تو حیرت زدہ ہو جاتے ہیں ۔ اب کچھ سوجھتا ہی نہیں کہ کدھر جائیں ۔ ایسے ہی حالات میں سب کے سب تباہ کر دیئے جاتے ہیں ۔

(فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا (٦ : ٤٥)) (اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا) کسی قوم کا دابر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو سب سے پیچھے آتا ہے یعنی ان کا آخری آدمی ۔ جب آخری آدمی ہی کٹ گیا تو اس سے پہلے کے بدرجہ اولیٰ کٹ گئے ۔

(الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا (٦ : ٤٥)) سے یہاں وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے شرک کیا اس لئے کہ قرآن کریم بیشتر مقامات پر مشرکین کو ظالمین سے تعبیر کرتا ہے اور شرک پر ظلم کے لفظ کا اطلاق کرتا ہے ۔

(وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ) (اور تعریف ہے اللہ رب العالمین کے لئے) یہ تبصرہ ہے اس بات پر کہ اللہ نے مشرکین کی جڑ کاٹ دی اور یوں انہیں مہلت دیتے دیتے اچانک پکڑ لیا ۔ سوال یہ ہے کہ اللہ کی حمد تو اللہ کے انعام و اکرام پر ہوتی ہے؟ ہاں، لیکن اللہ کی زمین کا تو ظالموں سے پاک ہونا بھی ایک گونہ نعمت ہے ۔ نیز اللہ کی حمد اس کی رحمت پر ہوتی ہے تو زمین کو پاک کر دینا بھی سب سے بڑی رحمت ہے ۔

اللہ نے نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام، صالح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی اقوام کو پکڑا ۔ فرعون اور اہل یونان اور اہل روما کو پکڑا اور اسی سنت کے مطابق اس نے دوسری اقوام کو بھی عروج کے بعد پکڑا ۔ پہلے ان کی تہذیب و تمدن کو خوب ترقی دی اور پھر انہیں تباہ و برباد کر دیا ۔ یہ بہرحال اللہ کی تقدیروں کے راز ہیں لیکن سنت الٰہیہ عروج و زوال کی اس داستان میں ظاہر ہے اور اللہ اسی کی داستاں یہاں اس اصولی انداز میں ثبت فرماتے ہیں ۔

ان اقوام کی اپنی اپنی تہذیبیں تھیں اور اپنے وقت میں ان کو بڑا عروج حاصل تھا ۔ ان کو بڑی فراوانی اور دولتمندی حاصل تھی ۔ بعض پہلوؤں سے وہ آج کے ترقی یافتہ دور سے بھی زیادہ خوشحال تھے ۔ انہیں شان و شوکت اور ساز و

سامان اور فراوانی حاصل تھی اور وہ اس دھوکے میں تھے کہ وہ یوں ہی رہیں گے ۔ یہ اقوام ان دوسری اقوام کو بھی دھوکہ دے رہی تھیں جو خوشحالی اور ترقی کے بارے میں سنت الٰہیہ سے واقف نہ تھیں ۔

یہ اقوام اس بات کو نہ سمجھ سکیں کہ اس کائنات میں سنت الٰہیہ کام کرتی ہے ۔ وہ یہ بات بھی نہ سمجھ سکیں کہ انہیں ڈھیل دی جارہی ہے' اس سنت کی پالیسی کے عین مطابق ۔ جو لوگ سنت الٰہیہ کے آسمان میں گردش کر رہے تھے اللہ کی نعمتوں کی بارش نے ان کی آنکھیں چندھیا دی تھیں ۔ شوکت و قوت نے ان کے اندر بہت ہی زیادہ اعتماد پیدا کر دیا تھا اور ان خوشحال اقوام کو جو مہلت اور ڈھیل دی گئی تھی اس کی وجہ سے وہ دھوکے میں پڑ گئے تھے ۔ یہ لوگ نہ اللہ کی عبادت کرتے تھے اور نہ انہیں اللہ کی معرفت حاصل تھی ۔ یہ لوگ اللہ کی حاکمیت کے خلاف باغی ہو گئے تھے بلکہ انہوں نے حق حاکمیت کا دعویٰ خود کیا تھا حالانکہ حاکمیت الوہیت کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت ہے ۔ یہ لوگ زمین میں فساد پھیلاتے تھے' لوگوں پر مظالم ڈھاتے تھے اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے مقابلے میں حاکمیت کا دعویٰ خود کر لیا تھا ۔ جب میں امریکہ میں تھا تو میں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا وہ اس آیت کا مصداق تھا ۔

(فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ (٦ : ٤٤)) (پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو بھلا دیا جو انہیں کی گئی تھی' تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے) یہ منظر جس کی تصویر کشی اس آیت میں کی گئی ہے' یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان لوگوں پر رزق کی فراوانی تھی اور ہر جانب سے بلاحساب سہولیات کا سیلاب تھا جو لڈتا چلا آ رہا تھا ۔ یہ منظر امریکہ میں پوری طرح عروج پر تھا ۔

میں نے دیکھا کہ یہ قوم اس خوشحالی پر بے حد مغرور بھی ہے اور ان کے شعور میں یہ بات پوری طرح بیٹھی ہوئی نظر آتی تھی کہ سہولتوں کی یہ بہتات صرف سفید رنگ کے لوگوں کے لئے مخصوص ہے ۔ رنگ دار لوگوں کے ساتھ ان کا طرز عمل نہایت متکبرانہ اور وحشیانہ ہوتا ہے ۔ امریکی پورے کرۂ ارض کے لوگوں کو اس قدر کم وقعت سمجھتے ہیں جس کے مقابلے میں یہودیوں کا نازی ازم بھی کچھ وقعت نہیں رکھتا حالانکہ یہودی اس کے بارے میں بہت مشہور ہیں اور قومی اور نسلی افتخار ان کا طرۂ امتیاز ہے ۔ سفید رنگ امریکیوں کا رویہ رنگ دار امریکیوں کی نسبت یہودیوں سے بھی زیادہ برا اور زیادہ سخت ہے ۔ یہ سختی خصوصاً اور زیادہ ہو جاتی ہے جب رنگ دار لوگ مسلمان ہوں ۔

امریکہ میں' میں یہ سب کچھ دیکھتا رہا اور یہ توقع کرتا رہا کہ سنت الٰہیہ ایک دن ضرور اپنا کام کرے گی ۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ سنت الٰہیہ امریکی سوسائٹی کی طرف دھیمی رفتار سے بڑھ رہی ہے ۔

(حَتَّى إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ (٤٤) فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (٤٥) (٦ : ٤٤ - ٤٥)) "یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر چیز سے مایوس تھے ۔ اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا اور تعریف ہے' اللہ رب العالمین کے لئے ۔" حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ نے اقوام عالم پر یہ رحم فرمایا کہ اب ان کو مسخ

نہ کیا جائے گا اور نہ انہیں بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا۔ لیکن اللہ کے عذابوں کی کئی اقسام اب بھی آتی رہتی ہیں خصوصاً ان اقوام پر جنہیں خوشحالی اور فراوانی دی گئی ہے۔ ان پر انواع و اقسام کے عذاب آئے دن آتے رہتے ہیں' اس کے باوجود کہ ان کے ہاں ضروریات زندگی کی پیداوار حد سے زیادہ ہو چکی ہے اور انہیں رزق اور سہولیات کی بہتات سے نوازا گیا ہے۔

نفسیاتی عذاب' روحانی بے چینی' جنسی بے راہ روی اور اخلاقی بگاڑ جیسے عذابوں نے انہیں تباہ کر دیا ہے اور ان کی اس خوشحالی اور مادی پیداوار اور سازو سامان میں بھی ان کے لئے کوئی ذریعہ اطمینان نہیں ہے اور قریب ہے کہ ان کی پوری زندگی بدبختی' قلق و پریشانی میں ڈوب جائے۔ (دیکھئے میری کتاب اسلام اور مشکلات تہذیب کا باب خبط و اضطراب) اس خوشحالی کے باوجود ان لوگوں کی اخلاقی حالت یہ ہے کہ بڑے بڑے سیاسی راز چند ٹکوں میں بیچ دیئے جاتے ہیں اور پوری قوم کے خلاف جرم خیانت کا ارتکاب کیا جاتا ہے اور حاصل کیا ہوتا ہے چند لمحوں کی عیاشی' جنسی لذت اور چند ٹکے اور یہ ایسی علامات ہیں کہ مستقبل قریب میں ایسی اقوام کے لئے شدید خطرے کی نشان دہی کرتی ہیں۔

اقوام مغرب کی تباہی کے یہ بالکل ابتدائی آثار ہیں۔ حضور اکرم ؐ نے بالکل سچ فرمایا :"جب تم دیکھو کہ جب اللہ کسی کو اس کی بدکرداری کے باوجود سب کچھ دے جو وہ چاہتا ہو' تو سمجھ لو کہ یہ اسے ڈھیل دی جارہی ہے۔" اس کے بعد حضور ؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی :"یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں' جو انہیں عطا کی گئیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر چیز سے مایوس ہو گئے' اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا اور تعریف ہے' اللہ رب العالمین کے لئے۔" (ابن جریر' ابن ابی حاتم)

لیکن یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اہل باطل کو ہلاک کرنے کا اصول اور سنت الٰہیہ کی اسکیم میں صرف یہ نہیں ہوتا کہ اہل باطل کو نیست و نابود کر دیا جائے بلکہ یہ امر بھی اس کا حصہ ہوتا ہے کہ اہل حق کو قائم اور غالب کر دیا جائے اور یہ اہل حق ایک امت کی شکل میں نمودار ہوں۔ اصل اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سچائی کے ذریعے اور اہل حق کے ذریعے باطل پر وار کرتا ہے اور باطل کا سرپھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ باطل نابود ہو جاتا ہے لہٰذا اہل حق کو ڈھیلے ہو کر بیٹھ نہ جانا چاہیے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر صرف سنت الٰہیہ کا انتظار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ سنت الٰہیہ بھی اسلامی جدوجہد کے نتیجے میں روبعمل ہوتی ہے۔ اگر اہل حق بے عمل ہو کر بیٹھ جائیں تو وہ اہل حق نہ رہیں گے اور وہ غلبہ اور باطل کا سرپھوڑنے کے قابل ہی نہ رہیں گے۔ خصوصاً جبکہ وہ سست اور بے عمل ہو کر بیٹھ جائیں۔ حق تو ایسی امت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جو کرۂ ارض پر اللہ کی حاکمیت کے مقام کے لئے جدوجہد کر رہی ہوتی ہے اور ان لوگوں کے مقابلے میں دفاع کر رہی ہوتی ہے جنہوں نے اللہ کے مقابلے میں اپنی حاکمیت قائم کی ہوئی ہوتی ہے جبکہ حاکمیت الٰہیہ خصائص الوہیت میں سے ایک خاصہ ہے۔ یہ ہے اصلی اور بنیادی سچائی۔

(وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ) (اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض دوسروں کے ذریعے نہ روکتا تو زمین میں فساد برپا ہو جاتا)۔

---ooo---

اب سیاق کلام مشرکین کو عذاب الہٰی کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتا ہے اور عذاب کی یہ مجوزہ شکل ان کی ذات اوران کے نفوس کے ساتھ متعلق ہے۔اس کا تعلق ان کی قوت باصرہ' قوت سامعہ اور قوت ادراک کے ساتھ ہے۔ تجویز یہ ہے کہ اگر اللہ ان قوتوں کو سلب کرے تو کون ہے جو تمہیں یہ قوتیں لوٹا کر دے دے 'کوئی نہیں ہے۔ اب سوچنے کے بعد وہ بھی یقین کرلیتے ہیں کہ کوئی نہ ہو گا جو انہیں 'قوت سماعت 'قوت باصرہ اور قوت ادراک دے سکے اگر اللہ ان قوتوں کو چھین لے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝

''اے نبی ؐ'' ان سے کہو 'کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ تمہاری بینائی اور سماعت تم سے چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا اور کون سا خدا ہے جو یہ قوتیں تمہیں واپس دلا سکتا ہے ؟ دیکھو 'کس طرح ہم بار بار اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر یہ کس طرح ان سے نظر چرا جاتے ہیں۔''

یہ ایک ایسے منظر کی تصویر کشی ہے جس میں وہ خود اپنے عقائد کے مطابق اللہ کے اس مجوزہ عذاب سے بچنے کی کوئی سبیل نہیں پاتے جبکہ ضمناً یہ بات بھی آجاتی ہے کہ یہ لوگ اللہ کے سوا جن دوسرے لوگوں کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں وہ بھی نہایت ہی عاجز ہیں۔ البتہ اس منظر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اس مجوزہ عذاب کی تجویز نے ان لوگوں کو خوب جھنجوڑا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فطرت انسانی کا خالق ہے۔ اسے خوب علم ہے کہ اس فطرت کے اندر ادراک حقیقت کی حقیقی قوت بھی موجود ہے اور فطرت انسانی سچائی سے دور نہیں ہے۔ فطرت انسانی کو اس بات کا ادراک ہے اور علی وجہ البصیرت ہے کہ یہ کام صرف اللہ کر سکتا ہے اور کوئی نہیں۔ وہ قوت باصرہ' قوت سامعہ اور قوت مدرکہ کو سلب بھی کر سکتا ہے اور لوٹا بھی سکتا ہے اور اس کے سوا کوئی اور یہ کام نہیں کر سکتا۔

دل کو دہلا دینے والے اور اعضائے جسم پر کپکپی طاری کر دینے والے اس منظر کے ذریعے اور عقیدہ شرک اور اللہ کے شرکاء کی زبوں حالی کا منظر پیش کرنے کے بعد اب سیاق کلام میں اس تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے کہ جن لوگوں کے سامنے یہ مناظر اور یہ دلائل رکھے جا رہے ہیں وہ پھر بھی بیمار اونٹ کی طرح ایک طرف جھکتے ہیں اور سیدھی راہ پر بھی ٹیڑھے چلتے ہیں۔

(اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ (٦ : ٤٦)) دیکھو 'کس طرح ہم بار بار اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر یہ کس طرح ان سے نظر چرا جاتے ہیں۔'' یہ تعجب ان کی جانب سے جادۂ حق سے ایک طرف چلنے کے منظر پر کیا جا رہا ہے۔ (يَصْدِفُوْنَ (٦: ٤٦)) کا مفہوم عربوں میں مشہور ہے۔ فعل

صدف کا صدور بیمار اونٹ سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان لوگوں کے بارے میں ایک قسم کا بیمانہ اور قابل نفرت تصور دیا جاتا ہے جو ان کے لئے ایک لطیف توہین ہے۔

---ooo---

ابھی اس متوقع مجوزہ تصوراتی منظر کے اثرات زائل نہ ہوئے تھے کہ ان کے سامنے اب ایک دوسرا متوقع منظر پیش کر دیا جاتا ہے۔ وہ خود بھی یقین رکھتے ہیں کہ اس مجوزہ منظر کو عملی شکل دینا اللہ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس منظر میں انہیں یہ دکھایا جاتا ہے کہ اگر اللہ کا عذاب اچانک آگیا تو تم سوچو کہ اس کی زد میں ظالموں کے سوا اور کون آئے گا؟ مشرکین ہی تو سب سے پہلے تباہ ہوں گے۔ ایک جھلکی دکھائی جاتی ہے کہ جب اچانک عذاب آتا ہے تو ظالم اور مشرک نابود کر دیئے جاتے ہیں' چاہے یہ عذاب اچانک آئے یا اطلاع کے بعد کھلے بندوں آئے۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾

"کہو' کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ کی طرف سے اچانک یا علانیہ تم پر عذاب آ جائے تو کیا ظالم لوگوں کے سوا کوئی اور ہلاک ہو گا؟" ظالموں کو عذاب الٰہی ہر صورت میں پکڑتا ہے۔ یہ اچانک بھی آتا ہے جبکہ وہ غفلت میں ہوتے ہیں اور انہیں کوئی توقع نہیں ہوتی اور کبھی ان پر یہ عذاب اعلانیہ آتا ہے اور وہ اس کے لئے پوری طرح تیار بھی ہوتے ہیں' لیکن ظالم اقوام پر تباہی آکر رہتی ہے۔ (یہ بات یاد رہے کہ قرآن کریم کی تعبیرات کے مطابق ظالمین سے مراد مشرکین ہیں) جب یہ عذاب آتا ہے چاہے اچانک آئے یا اعلانیہ تو پھر اس کے مقابلے میں وہ کوئی بچاؤ نہیں کر سکتے اس لئے کہ عذاب الٰہی کے مقابلے میں وہ اس قدر ضعیف ہیں کہ وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ نہ ان کے بنائے ہوئے شریک اس عذاب کو روک سکتے ہیں اس لئے کہ جن لوگوں کو یہ لوگ شریک بناتے ہیں وہ تو اللہ کے ضعیف بندے ہیں۔

یہ ایک متوقع صورت حالات ہے' جو قرآن کریم ان کے سامنے اس مؤثر انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ یہ لوگ اس صورت حال سے ڈر جائیں اور اپنا بچاؤ کر لیں اور اس صورت حالات کے وقوع کے اسباب فراہم کرنے سے باز رہیں۔ یہ متوقع صورت حال اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے سامنے اس لئے پیش فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ خود انسانی فطرت کے اندر تقویٰ موجود ہے اور ایسی صورت حالات کے تصور ہی سے انسان کانپ اٹھتا ہے۔

---ooo---

اب جب یہ لہر ساحل کے قریب پہنچ جاتی ہے اور اس کے اندر ایک دوسرے کے بعد اٹھنے والے مناظر دکھائے جا چکے ہیں اور موثر ہدایات دی جا چکی ہیں اور ان ہدایات کے تاثرات سامعین اور ناظرین کے قلوب کی تہہ تک اتر جاتے ہیں تو اب حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے رسولوں کے فرائض نبوت کا تعین کر دیا جاتا ہے۔ یہ تعین اس لئے کیا جاتا ہے کہ رسولوں سے ان کی اقوام کے لوگ خارق عادت معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ رسول تو صرف مبلغ

ہوتے ہیں' خوشخبری دیتے ہیں اور انجام بد سے ڈراتے ہیں۔اس فریضہ کی ادائیگی کے بعد اب لوگ خود مختار ہوتے ہیں کہ وہ جو راہ چاہیں اختیار کریں۔ان کے اس اختیار تمیزی کے اوپر پھر سزا و جزاء مرتب ہوگی۔

وَ مَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۝۴۸ وَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا یَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ۝۴۹

"ہم جو رسول بھیجتے ہیں اسی لئے تو بھیجتے ہیں کہ وہ نیک کردار لوگوں کے لئے خوشخبری دینے والے اور بدکرداروں کے لئے ڈرانے والے ہوں۔پھر جو لوگ ان کی بات مان لیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔اور جو ہماری آیات کو جھٹلائیں وہ اپنی نافرمانیوں کی پاداش میں سزا بھگت کر رہیں گے۔"

دین اسلام کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو ذہنی اور عقلی بلوغ تک پہنچائے اور انہیں اس قابل بنائے کہ وہ اس عظیم قوت کو کام میں لاکر فائدہ اٹھائیں جو اللہ نے صرف انسان کو دی ہے اور اسے پوری طرح اس سچائی کے سمجھنے میں استعمال کریں جو اس کائنات کے صفحات میں موجود ہے۔خود زندگی کے طور طریقوں کے اندر موجود ہے اور انسان کی تخلیق کے رازوں میں پوشیدہ ہے۔یہ راز قرآن مجید نے سب سے پہلے انسانوں پر کھولے اور انسان کی قوت مدرکہ کو ان کی طرف متوجہ کیا۔

یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو حسی خارق عادت معجزات سے نکال کر عقلی میدان میں داخل کیا گیا۔ حسی معجزات کے نتیجے میں انسان یقین کرنے پر مجبور تو ہو جاتا ہے لیکن اصل حقیقت اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔انسان کی گردن ظاہری خارق عادت واقعہ کے سامنے جھک جاتی ہے۔اس کے مقابلے میں دین اسلام نے عقل انسانی کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی کاریگریوں کا مطالعہ کرے اور انہیں سمجھنے کی سعی کرے۔اس لئے کہ اس کائنات کی راز بذات خود معجزات ہیں۔یہ اور بات ہے کہ یہ معجزات ہروقت ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں اور ان کے صدور پر یہ کائنات قائم ہے اور اس کے عناصر ترکیبی' انہی قدرتی بوقلمونیوں پر مشتمل ہیں۔اسلام نے انسان کو یہ قوت مدرکہ اور یہ ملکہ بذریعہ کتاب الہی عطا کیا۔اپنے انداز بیاں اور طرز تعبیر کے اعتبار سے یہ کتاب معجز ہے' اس کا اسلوب بھی معجزے اور اس کی اجتماعی ساخت اور متحرک انداز بیاں اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ اس کی ساخت بے مثال ہے اور قرآن کے نزول کے بعد آج تک اس کی کوئی مثال نہیں لائی جا سکی۔

انسان کو عقلی بلوغ کے مقام تک پہنچانے کے لئے طویل تربیت اور مسلسل ہدایت کی ضرورت تھی تاکہ انسان کی قوت مدرکہ کے اندر یہ مطلوب عظیم انقلاب روبہ عمل لایا جا سکے' اور انسانیت ترقی کے مقام بلند تک پہنچ سکے اور انسان خود اپنی قوت مدرکہ کے ساتھ اس کائنات اور موجودات کے اس مسلسل سفر کو سمجھ سکے۔لیکن قرآنی ہدایات کی روشنی میں' قرآنی ضابطوں کے اندر رہتے ہوئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی روشنی میں انسان سفر کائنات کو مثبت' واقعیت اور اچانک ایک مختصر عرصے میں سمجھ سکے اور اس کی یہ سمجھ اور اس کا یہ ادراک ان فلسفوں کے تصور اور ادراک سے بالکل مختلف

ہو جو اس وقت رائج تھے - مثلاً یونانی اور مسیحی لاہوتی فلسفے یا محض حسی اور مادی تصور کائنات جو اس دور میں ہندی 'مصری' مجوسی اور بودھ فلسفوں کی شکل میں رائج تھے اور انسانوں کو رنگ و بو کے اس محدود دائرے سے بھی نکال دے جو نزول قرآن کے وقت عربوں میں عام تھے -

یہ ہدایت و تربیت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں سے تھی اور جس طرح ان دو آیات کے اندر اس کی وضاحت کی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل کردار یہ تھا - اس کی مزید تشریح اگلی لہر میں بھی آپ دیکھیں گے - خلاصہ یہ کہ رسول انسان ہوتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ دنیا والوں کی طرف اس لئے بھیجتے ہیں کہ وہ انہیں اچھے انجام کی خوشخبری دے اور برے انجام سے ڈرائے - ان امور پر اس کا فریضہ رسالت ختم ہو جاتا ہے - اب آگے لوگوں کا فریضہ شروع ہو جاتا ہے کہ وہ رسول کی دعوت کو قبول کریں - لوگوں کی جانب سے قبولیت اللہ کی مشیت کے دائرے کے اندر ہوتی ہے اور اس دعوت کے مقابلے میں جو شخص جو رویہ بھی اختیار کرے گا اس پر جزا ملے گی یا سزا ہوگی - لہٰذا جو ایمان لے آئے اور ایسے نیک کام کرے جن سے اس کے ایمان کا اظہار ہو تو اس کا انجام اطمینان بخش ہو گا اور وہ کسی خوف سے دوچار نہ ہو گا نہ اسے بے اطمینانی ہوگی - اس کی تمام سابقہ کوتاہیاں معاف کر دی جائیں گی اور جو نیکی کے کام اس نے کئے ہوں گے ان پر اسے ثواب ملے گا - جن لوگوں نے ان آیات کو جھٹلایا جو رسول لے کر آتا ہے اور جن کے اشارات کتاب کائنات کے اندر موجود ہوتے ہیں تو وہ لوگ عذاب سے دوچار ہوں گے - اور یہ عذاب اور سزا ان کو ان کی اس تکذیب کی وجہ سے دی جائے گی اور اس کی تعبیر یوں کی گئی بما کانوا یفسقون (اس وجہ سے کہ انہوں نے فسق اختیار کیا تھا جس سے مراد کفر ہے) - قرآن کریم میں اکثر مقامات پر شرک پر ظلم کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے اور کفر پر فسق کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے -

یہ ایک نہایت ہی واضح اور سیدھا سادا تصور ہے جس کے اندر کوئی پیچیدگی نہیں ہے - رسول کے مقام اور اس کے فرائض کے بارے میں یہ ایک واضح نشاندہی ہے کہ دین میں رسول کا کیا مقام و حیثیت ہے اور اس کے فرائض کیا ہیں؟ یہ ایک ایسا تصور ہے کہ جس کے مطابق مقام الوہیت صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے 'اپنے تمام خصائص کے ساتھ اور تمام کاموں کو اللہ کی تقدیر اور فیصلوں پر موقوف کر دیا جاتا ہے - اللہ کی تقدیر اور مشیت کے دائرے کے اندر انسان کو سوچ اور فیصلے کی آزادی بھی دی گئی ہے - اس وجہ سے انسان مسئول ہو جاتا ہے اور جزاء و سزا کے نتائج اس کے اعمال پر مرتب ہوتے ہیں - اس واضح تصور سے ان پیچیدہ تصورات کی مکمل نفی ہو جاتی ہے جو بعض لوگوں میں رسولوں کی شخصیت اور طبیعت کے بارے میں غلط فلسفوں کے نتیجے میں رائج ہیں یا دور جاہلیت میں رائج تھے جو یہ توقع کرتے تھے کہ اگر رسول برحق ہے تو معجزے کیوں نہیں لاتا؟ اور لوگ اس کے مطیع فرمان کیوں نہیں ہوتے؟ یوں اسلام نے انسان کو عقلی بلوغ کے دور میں داخل کیا اور نہایت ہی سادہ انداز میں ' بغیر اس کے کہ وہ پیچیدہ ذہنی اور فلسفیانہ تصورات میں گم ہو ' یا لاہوتی جدلیات و مباحث میں پڑ کر اپنی قوت مدرکہ کو ضائع کرے جس طرح قرون مظلمہ میں ہوتا رہا ہے -

---ooo---

درس نمبر ۶۱ ایک نظر میں

اس لہر میں حقیقت رسالت کے بیان کا باقی حصہ دیا گیا ہے۔ مشرکین عرب کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ رسالت کی حقیقت کیا ہوتی ہے اور رسول کا مزاج کیا ہوتا ہے اور یہ حقیقت ان کو سمجھانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ یہ لوگ رسول اکرم ؐ سے خارق عادت معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ سابقہ لہر میں ان کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ یہاں رسالت کے بارے میں ان کے جو جاہلانہ تصورات تھے ان کی مزید درستی کی جا رہی ہے۔ خصوصاً یہ وضاحت کر دی جاتی ہے کہ رسول بشر ہوتے ہیں اور تمام رسول بشر ہی گزرے ہیں اس لئے کہ عربوں اور ان کے اردگرد پھیلی ہوئی جاہلیتوں کے اندر حقیقت رسالت کے بارے میں بہت کچھ غلط فہمیاں پائی جاتی تھیں۔ ان تصورات کی وجہ سے یہ لوگ حقیقت رسالت 'حقیقت وحی اور حقیقت نبوت اور ذات رسل کے بارے میں جادۂ حق سے بہت دور نکل چکے تھے اور تمام لوگ خرافات اور قصے کہانیوں کی دنیا میں داخل ہو کر گمراہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے نبوت اور رسالت کو سحر اور جادوگری سے ملا دیا تھا۔ وحی کو وہ جنون سے بھی تعبیر کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ ہوتا تھا کہ رسول غیب کی خبریں دیا کرتا ہے۔ رسول وہ ہوتا ہے جس کے ہاتھ سے خوارق اور معجزات صادر ہوتے ہیں اور اسے وہ کام کرنے چاہئیں جو جنات کے عامل اور جادوگر کیا کرتے ہیں۔
جب اسلامی نظریہ حیات آیا تو اس نے باطل عقائد پر بمباری کر کے باطل کا سر پھوڑ کر رکھ دیا اور ایمان کو اس کی سادگی' واقعیت' سچائی اور اس کی وضاحت لوٹا کر دے دی۔ یوں ایک نبی کی سچی تصویر سامنے آئی اور نبوت کا واضح تصور دنیا نے پایا اور تمام خرافات اور قصے کہانیوں اور وہمی دیومالائی تصورات سے انسان نے نجات پائی جو اس وقت دنیا پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔ مشرکین کے ہاں رائج تصورات وہ تھے جو ان کے قرب و جوار میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اندر بالعموم پائے جاتے تھے۔ ان دونوں ملتوں کے اندر بھی بہت سی شاخیں اور فرقے تھے۔ لیکن تمام فرقوں کے اندر حقیقت نبوت کو بگاڑنا قدر مشترک تھی۔

اس لہر میں حقیقت رسالت اور حقیقت رسول ؐ کو باطل اوہام و خرافات سے پاک و صاف کر کے پیش کرنے کے بعد اب اسلامی نظریہ حیات کو بھی نہایت ہی سادہ انداز میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ اسے بغیر کسی مبالغہ اور بغیر کسی بناوٹ کے اپنے سادہ اور حقیقی خدوخال کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اس نظریہ کے پیش کرنے والے ہیں وہ بھی تو انسان ہیں۔ ان کے پاس دنیا کے خزانے نہیں ہیں۔ وہ غیب کا علم نہیں رکھتے 'نہ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ فرشتے ہیں۔ وہ تو صرف اپنے رب کی طرف سے ہدایات اخذ کرتے ہیں اور صرف اسی کے حکم کا متبع ہیں۔ ان کے پاس سارا علم بذریعہ وحی رب کی طرف سے ان کے پاس آ جاتا ہے۔ جو لوگ آپ کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں وہ لوگوں کے نزدیک نہایت ہی مکرم ہیں۔ اس لئے رسول کا بھی فرض ہے کہ وہ انہیں اپنے ساتھ جوڑے رکھے اور ان کا خیر مقدم کرے۔ انہیں یہ خوشخبری دے کہ اللہ نے اپنے اوپر یہ فرض کر لیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ نہایت ہی

رحیمانہ سلوک کرے گا۔ نیز رسول کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ان لوگوں کو ڈرائے جن کے دلوں کے اندر خوف خدا موجود ہے اور جو آخرت کی جوابدہی کے قائل ہیں تاکہ وہ خدا خوفی کے اعلیٰ مقام تک پہنچ جائیں ۔بس یہی ہے رسول کا فریضہ اور اس کی ڈیوٹی اور اس کی حقیقت دو لفظوں کے اندر منحصر ہے ۔"بشریت" اور "اخذ وحی" ۔ان دو لفظوں کے اندر رسول کی حقیقت بھی بیان کر دی گئی اور رسول کے فرائض منصبی کے حدود کا بھی تعین کر دیا گیا ۔فکر کی اس درستی اور انجام بد کی نشاندہی کے ساتھ ہی مجرمین کی راہ بھی متعین ہو جاتی ہے اور مومنین اور مجرمین کی راہیں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہیں ۔ حق و باطل ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور حقیقت رسول اور منصب رسالت کے بارے میں تمام اوہام و خرافات کا رد ہو جاتا ہے ۔نہایت ہی واضح طور پر مومنین اور غیر مومنین کے درمیاں لکیر کھنچ جاتی ہے 'کھلے طور پر ۔

ان حقائق کی وضاحت کے ساتھ ساتھ مقام الوہیت کے بعض پہلو بھی لوگوں کے سامنے رکھ دیئے جاتے ہیں ۔ رسول خدا اور خدا کے درمیان تعلق کی نوعیت بھی بتا دی جاتی ہے ۔ نیز رسول اور اس کے متبعین اور اس کے مخالفین کے ساتھ اس کے تعلق کی حدود اور نوعیت کا بھی تعین کر دیا جاتا ہے ۔یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ متبعین کا رنگ ڈھنگ کیا ہوتا ہے اور گمراہوں کے طور طریقے کیا ہوتے ہیں ۔جو لوگ ہدایت پانے والے ہیں وہ آنکھوں والے ہوتے ہیں اور جو گمراہ ہیں وہ اندھے ہوتے ہیں ۔اللہ نے اپنے اوپر اپنے مومن بندوں کے لئے رحمت فرض کر دی ہے اور اگر ان میں سے کوئی تائب ہو جائے تو اللہ اسے ضرور معاف فرماتے ہیں 'اگرچہ انہوں نے معاصی کا ارتکاب کیا ہو 'بشرطیکہ یہ ارتکاب انہوں نے جہالت کی وجہ سے کیا ہو اور توبہ کے بعد وہ اصلاح کی راہ اپنائیں ۔ نیز اللہ مجرموں کی روش کو اچھی طرح واضح کرنا چاہتے ہیں ۔ لہٰذا جو بھی ایمان لاتا ہے وہ علی وجہ البصیرت ایمان لائے اور جو گمراہ ہوتا ہے وہ بھی علی وجہ البصیرت گمراہ ہو ۔ ہر شخص جو موقف بھی اختیار کرے سوچ کر کرے ۔کسی غلط فہمی اور کسی گمان و تخمین کی بنیاد نہ ہو ۔

---ooo---

درس نمبر ۶۱ تشریح آیات

۵۰ --- تا --- ۵۵

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۗ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾

"اے نبی ؐ، ان سے کہو، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔" پھر ان سے پوچھو "کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟"

اہل مکہ میں سے معاندین اور مخالفین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ آپ ؐ ان کے سامنے کوئی خارق عادت معجزہ پیش کر دیں تو وہ آپ کی دعوت کو قبول کر لیں گے۔ لیکن جیسا کہ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ اہل مکہ کو آپ کی صداقت میں ذرہ برابر شک نہ تھا۔ یہ محض بہانہ سازی تھی۔ کبھی وہ اس مطالبے کا مخصوص طور پر ذکر کرتے تھے اور وہ یہ کہ آپ صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کو سونے میں تبدیل کر دیں۔ کبھی وہ یہ مطالبہ کرتے تھے کہ ان پہاڑیوں کو مکہ سے غائب کر دیا جائے، ان کی جگہ سرسبز و شاداب زمین بن جائے اور اس میں فصل اور پھل اگ آئے۔ کبھی وہ یہ مطالبہ کرتے تھے کہ آپ انہیں کچھ غیبی امور کی اطلاع کر دیں۔ کبھی وہ یہ مطالبہ کرتے کہ ان کے سامنے فرشتہ آجائے۔ کبھی وہ یہ مطالبہ کرتے کہ قرآن کریم کتابی صورت میں لکھا ہوا ان کے سامنے آپ پر نازل ہو جائے، وہ اسے پڑھ لیں اور نازل ہوتے ہوئے دیکھ بھی لیں۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے مطالبات دراصل وہ اس لئے کرتے تھے کہ ان کے نیچے وہ اپنے بغض و عناد کو چھپالیں جس کی وجہ سے وہ مان کر نہ دیتے تھے۔

یہ مطالبات ان کے ذہن میں ان تصورات کی وجہ سے پیدا ہوتے تھے، جو عربوں کے اردگرد پھیلی ہوئی جاہلیتوں نے حقیقت رسالت اور شخصیت رسول کے ساتھ غلط طور پر وابستہ کر رکھے تھے۔ ان تمام وہمی تصورات کو اہل کتاب نے اپنے ہاں تصور نبوت میں جگہ دے رکھی تھی، اور انہوں نے ان ہدایات کو ترک کر دیا تھا جو اہل کتاب کے پاس ان کے رسول

لے کر آتے رہے تھے۔

دنیا میں رائج مختلف جاہلیتوں میں بہت سے لوگوں نے اپنے آپ کو خود نبی بنا کر پیش کیا تھا اور بعض سادہ لوح اقوام نے ان کو نبی تسلیم بھی کر لیا تھا۔ ان لوگوں پر جادوگروں' کاہنوں' اہل نجوم اور جنات والوں کے دعوے شامل تھے جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اس قسم کے تمام نبیوں نے ہمیشہ عالم الغیب ہونے کا دعویٰ کیا' مزید یہ کہ انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ روحیں ان کے قبضے میں ہیں اور جنات کے ساتھ ان کے رابطے ہیں اور یہ کہ وہ تعویذوں اور گنڈوں کے ذریعے نظام قدرت کو تبدیل کر سکتے ہیں یا یہ کہ وہ عبادات اور دعاؤں کے ذریعہ کارسازی کر سکتے ہیں یا دوسرے خفیہ ذرائع سے مقصد برآری کر سکتے ہیں۔ یہ تمام مذاہب جس امر پر متفق ہیں وہ یہ ہے کہ یہ لوگ متبعین کو وہم میں مبتلا کرتے ہیں اور راہ حق سے انہیں گمراہ کرتے ہیں۔ ہاں اس وہم پرستی اور ضلالت کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں۔

جادوگروں کی نبوت کا تعلق ہمیشہ ارواح خبیثہ کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ یہ جادوگر ان خبیث روحوں کے ساتھ تعلقات استوار کرتے تاکہ نامعلوم امور کو معلوم کر سکیں یا یہ کہ وہ واقعات و حالات پر اثر انداز ہو سکیں۔ کاہنوں کی نبوت کی شکل یہ ہوتی کہ اس کا تعلق بعض خداؤں سے ہوتا۔ یہ خدا کاہن کے ماتحت نہیں ہوتے نہ اس کے قبضے میں ہوتے ہیں لیکن وہ اس کی درخواست اور عبادت کو قبول کرتے ہیں اور کاہن کو جو مسائل درپیش ہوتے ہیں انہیں وہ سوتے میں یا حالت بیداری میں حل کر دیتے ہیں اور اسے بعض اشارات یا خوابوں کے ذریعہ ہدایات دیتے ہیں۔ لیکن کاہن کی تمام درخواستیں اور دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ یہ دونوں قسم کی نبوتیں جذب و جنون کی نبوت سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ ساحر اور کاہن دونوں جو طلب کرتے ہیں وہ اسے خود سمجھتے ہیں۔ وہ بالارادہ دعا کرتے ہیں جو بھی کرتے ہیں یا وہ جو عزم و ارادہ کرتے ہیں وہ سوچ سمجھ کر کرتے ہیں لیکن جذب و جنون کا نبی جذب و جنون کے ہاتھوں بے بس ہوتا ہے۔ اس کی زبان سے مبہم قسم کی باتیں نکلتی ہیں۔ وہ بالارادہ یہ باتیں نہیں کرتا۔ بعض اوقات شاید وہ سمجھتا بھی نہیں کہ وہ کیا کہتا ہے۔ اکثر اقوام میں یوں ہوتا ہے کہ جذب و جنون میں سرشار نبی کے ساتھ ایک مفسر ہوتا ہے جو اس مجذوب کے کلام کو سمجھنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ یونانی زبان میں ایسے نبی کو مانتی (Manti) اور اس کے شارح کو پرافٹ (Prophet) کہا جاتا ہے۔ لغوی مفہوم یہ ہے "وہ جو دوسرے کی جانب سے بطور نائب بات کرتا ہے۔" اسی لفظ کو اہل یورپ نے نبوت کے مختلف معنوں میں اپنے ہاں رائج کیا۔ کاہن اور مجذوب کبھی بھی ایک دوسرے کے ساتھ متفق نہیں ہوئے۔ ہاں ایک صورت ایسی ہے کہ کاہن اور مجذوب باہم متفق ہو جاتے ہیں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب مجذوب کا شارح کلام' کاہن ہو اور اس کی ڈیوٹی یہ ہو کہ وہ مجذوب کے اشارات و مضامین کی تشریح کرے گا۔ اکثر اوقات ان کے درمیان اختلاف ہو جاتا ہے اور ان کے درمیان تنازعات برپا ہو جاتے ہیں کیونکہ ان دونوں کی معاشرتی ذمہ داریاں جدا ہوتی ہیں اور ان کی تربیت مختلف حالات میں ہوئی ہوتی ہے۔ مجذوب ایک انقلابی مزاج رکھتا ہے اور وہ عادات اور سوشل مراسم کا پابند نہیں ہوتا جبکہ کاہن سوشل مراسم کا پابند اور محافظ ہوتا ہے کیونکہ اکثر اوقات یہ کہانت اسے ورثے میں ملتی ہے۔ اس کے آباؤ اجداد بھی کاہن ہوتے ہیں۔ کہانت ایسے معاشرے میں چلتی ہے جو کسی علاقے میں قریب و بعید سے یا ہیکل سے متاثر ہو جبکہ جذب کسی معاشرے اور رسم کا پابند نہیں ہوتا کیونکہ صاحب جذب بعض اوقات پوری دنیا سے کٹ جاتا ہے اور اس کی موجودہ صورت حالات اسے اپنے ارد گرد سوسائٹی سے کاٹ دیتی ہے۔"

"بنی اسرائیل کے قبائل میں انبیاء کی بڑی کثرت رہی ہے اور بنی اسرائیل کی طویل تاریخ میں ان کی مثال اسی طرح ہے

جس طرح جدید دور میں اہل ذکر کے سلسلے ہیں یا صوفیاء کے طریقے ہیں۔ کیونکہ بعض زمانوں میں ان کی تعداد سینکڑوں میں رہی ہے اور انہوں نے اپنے متبعین میں ریاضت اور تربیت کے وہی طریقے جاری کئے جو آج بھی صوفیاء کے ہاں جاری ہیں' مثلاً جسمانی ریاضت کے ذریعے سے جذب حاصل کرنا یا سماع اور طرب و نشاط کے آلات کے ذریعے جذب حاصل کرنا۔"

(اسلام کے حقائق اور اس کے دشمنوں کی گمراہیاں۔ مصنفہ استاد عقاد صفحہ '۲۲٦)

یہ بات یاد رہے کہ ہم نے عقاد کی کتاب سے محض غلط تصورات کا حوالہ دیا ہے۔ البتہ انہوں نے تصور خدا اور تصور رسالت میں جو ارتقائی بحث کی ہے بلکہ ادیان سماوی کے اندر بھی ارتقاء ثابت کیا ہے اور اسے اسلام میں تصور خدا اور رسالت تک پہنچایا ہے' اس منہاج سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ دراصل تمام ادیان سماوی میں خدا کا وہی تصور تھا جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ ہاں مثل انبیاء سابقین اگر گمراہ ہو کر جاہلیت میں داخل ہوگئیں تو اس کی ذمہ داری ادیان پر نہیں ہے کیونکہ بعد کے ادوار میں ملتوں نے انبیاء کی صحیح تعلیمات کے اندر تحریفات کر دیں اور اسلام کے صحیح تصور کو اپنے جاہلی تصورات کے تابع کر دیا۔ قرآن کریم ہماری اس بات کی تائید کرتا ہے۔ اہل مغرب کے اہل علم جو ادیان کے بارے میں بحث کرتے ہیں خصوصاً ارتقائی نظریے سے تو یہ محض مفروضے اور شبہات ہیں۔ (سید قطب)

"سموئیل اول کی کتاب میں ہے کہ :

"ساؤل نے داؤد کو گرفتار کرنے کے لئے کچھ ایلچی بھیجے .... سو انہوں نے نبیوں کی جماعت کو نبوت کرتے دیکھا اور ساؤل ان کے درمیان بطور رئیس کھڑا تھا۔ پھر اللہ کی روح ساؤل کے ایلچیوں پر اتری اور انہوں نے بھی نبوت کی۔ پھر اس نے اوروں کو بھیجا تو انہوں نے نبوت کی .... پس اس نے اپنے کپڑے اتار دیئے۔ اور اس نے بھی سموئیل کے آگے نبوت کی اور وہ دن بھر اور رات بھر ننگا رہا۔

اسی طرح کتاب سموئیل میں یہ بھی آیا ہے کہ :تو نبیوں کے ایک گروہ سے ملے گا جو ٹیلے سے اترتے ہوں گے۔ ان کے آگے رباب' دف' بانسری اور عود بجتے ہوں گے۔ اور وہ نبوت کرتے ہوں گے۔ پس ان پر رب کی روح اترے گی اور ان کے ساتھ نبوت کرے گی اور ایک اور آدمی کی طرف منتقل ہوگی۔

گزشتہ بیان سے ثابت ہوا کہ نبوت ایک فن تھا۔ جس کا تعلق ماوراء کے ساتھ تھا۔ بیٹے اسے آباؤاجداد سے سیکھتے تھے۔ جس طرح کہ کتاب سلاطین دوم میں آیا ہے: جب کہ نبیوں کے بیٹوں نے کہا اے الیسع یہ وہ جگہ ہے جہاں پر ہم تیرے آگے مقیم ہیں۔ یہ جگہ ہم پر تنگ ہے سو اب ہم کو اردن جانا چاہیے۔

بعض مواضع میں ان کی خدمات لشکر کے سپرد ہوتی تھیں۔ جیسے کہ ایام کے سفر اول میں ہے :داؤد اور لشکروں کے سرداروں نے بنی اساف وغیرہ کے نبی کہلانے والوں کو عود' رباب اور سارنگیوں سے سرفراز کیا"۔ یہ تھا قدیم جاہلیتوں کا حال اور ان میں وہ جاہلیتیں بھی شامل ہیں جو آسمانی رسالتوں پر ایمان لانے والی امتوں میں فکری انحراف کی وجہ سے رائج ہوگئی تھیں اور اس فکری انحراف کی وجہ سے ان کے ہاں حقیقت نبوت اور مزاج نبی کے بارے میں غلط افکار نے راہ پالی تھی۔ ان غلط افکار کی وجہ سے عوام الناس ہر مدعی نبوت سے یہ توقع رکھتے تھے کہ اس سے مطلوبہ واقعات صادر ہوں۔ کبھی تو وہ یہ توقع کرتے تھے کہ وہ انہیں غیب کی خبریں دے۔ کبھی وہ یہ مطالبہ کرتے تھے کہ وہ سحر اور کہانت کے ذریعے کائنات کے طبیعی قوانین کو بدل دے۔ یہی تصور تھا جس کی وجہ سے مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کے مطالبات کرتے تھے۔ اور ان غلط افکار کی درستی کے لئے قرآن کریم نے حقیقت رسالت اور طبیعت رسول کے بارے میں بار بار وضاحت کی ہے۔ اور ان وضاحتوں میں سے ایک یہ ہے :

(قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَکُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ اَفَلَا تَتَفَکَّرُوْنَ

(٦ : ٥٠)) اے نبی ؐ ' ان سے کہو ''میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں - نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں ' اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں - میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے -'' پھر ان سے پوچھو ''کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟'' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے رب کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو صرف بطور انسان پیش کریں اور اپنے ساتھ جاہلیت کے اوہام اور دیومالائی قصے وابستہ نہ کریں جو اہالیان جاہلیت نے نبوت کی حقیقت اور نبی کی ذات میں داخل کر دیئے تھے - نیز حضور ؐ ان کے سامنے اسلامی نظریہ حیات کو بغیر کسی لاگ و لپیٹ کے پیش کریں 'جس میں کوئی زیادتی نہ ہو اور نہ ادعا ہو - بس یہ ایک عقیدہ ہے جسے رسول لے کر آیا ہے اور اس سے فائدہ وہی شخص اٹھا سکتا ہے جسے اللہ ہدایت دے ' بذات خود رسول کسی کو ہدایت بھی نہیں دے سکتا - راہ دکھانے والا صرف اللہ ہے -

رسول کی حقیقت اس نظریہ حیات کے مطابق صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے آمدہ وحی کی پیروی کرتا ہے - اللہ اسے ان باتوں کی تعلیم دیتا ہے جنہیں وہ پہلے نہ جانتا تھا - رسول اللہ کے خزانوں کا مختار نہیں بن جاتا کہ وہ ان خزانوں کے دروازے ان لوگوں پر کھول دے جو اس کے متبعین ہیں - نہ اس کے پاس غیب کی کنجیاں آجاتی ہیں کہ وہ اپنے پیرو کاروں کو آنے والے واقعات بتاتا جائے - نہ وہ فرشتہ ہوتا ہے کہ اس کی پاس فرشتے آیا کریں اور ساتھ رہیں - وہ بشر اور رسول ہوتا ہے - یہ ہے اسلامی نظریہ حیات پاک و صاف اور بالکل واضح اور سیدھا سادا -

یہ عقیدہ فطرت کی آواز ہے - یہ زندگی کا بنیادی عنصر ہے اور اللہ اور آخرت کے راستے کے لئے چراغ راہ ہے - اسے اس کی اصل شکل کے سوا کسی اور سجاوٹ کی ضرورت نہیں ہے - اگر کوئی شخص صرف اس عقیدے کو چاہتا ہے تو وہی اس کا مستحق ہے اور یہ عقیدہ اس کے لئے سب سے اونچی قدر ہو گی - اگر کوئی شخص اس عقیدے کو بطور سامان ' دنیا اپنائے تو وہ اس کی حقیقت کا ادراک نہ کر سکے گا - نہ اس کی قدر و قیمت کو سمجھ سکے گا ' لہٰذا یہ عقیدہ بھی ایسے شخص کو کچھ نہ دے سکے گا - ایسا شخص محتاج ہی رہے گا -

ان وجوہات کی بنا پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اسے اس انداز میں پیش کریں کہ اس میں کوئی بناوٹ اور تصنع نہ ہو 'کیونکہ اسے کسی بناؤ سنگھار کی ضرورت نہیں ہے تاکہ معلوم ہو کہ جو لوگ اس نظریے کے سایہ عاطفت میں آتے ہیں وہ کسی غرض اور دولت کے لئے نہیں آتے 'کسی جاہ و جلال کے لئے نہیں آتے اور ماسوائے تقویٰ کے کسی فضیلت کے طلبگار نہیں ہیں - وہ محض اللہ کی راہنمائی حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں جو اللہ کا بڑا کرم اور سب سے بڑی دولت ہے - ذرا دوبارہ غور کیجئے :

(قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَکُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ

انْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَیَّ (٦: ٥٠)) اے نبی "ان سے کہو "میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں' اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔" نیز انہیں معلوم ہو کہ وہ ہدایت الہی ہیں اگر درحقیقت نور و بصیرت کے دائرے میں آ جاتے ہیں اور جہالت اور ظلمت سے نکل آتے ہیں۔ (قُلْ هَلْ يَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ (٦: ٥٠)) "پھر ان سے پوچھو' کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟" ایک اہم سوال یہ ہے کہ صرف وحی کی پیروی کرنا ہی ہدایت اور بصیرت ہے اور جو شخص وحی سے محروم ہو گیا وہ نابینا اور اندھا تصور ہو گا۔ اس آیت نے نہایت ہی دو ٹوک الفاظ میں اس سوال کو حل کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں عقل انسانی کا کیا کردار ہے؟

اسلامی نظام حیات نے اس سوال کا نہایت ہی واضح اور دو ٹوک جواب دیا ہے۔ عقل جو خود اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے' بذات خود دین الہی ہے۔ اس کے اندر یہ قوت تو ہے کہ وہ وحی الہی کو اخذ کر سکے' اور اس کے مفہومات کو سمجھ سکے۔ یہ اس کا فریضہ بھی ہے اور یہ اس کا دائرہ اختیار بھی ہے کہ وہ نور ہدایت کو اپنائے اور اپنے آپ کو اس مضبوط ضابطے کا پابند کر لے جس کے اندر کسی جانب سے کوئی جھول یا غلطی نہیں ہے۔

لیکن اگر عقل انسانی اپنے آپ کو ضابطہ وحی الہی سے آزاد کر لے تو وہ ہمیشہ گمراہی اور انحراف کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کا مطالعہ غلط ہوتا ہے' اس کے اندازے بہت ہی غلط ہو جاتے ہیں اور اس کی تمام تدابیر ناکارہ رہ جاتی ہیں۔

عقل انسانی اس حادثے سے دوچار اس لئے ہوتی ہے کہ اپنی ساخت کی وجہ سے عقل انسانی اس کائنات کے اجزاء کا ادراک تو کر سکتی ہے لیکن اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کائنات کو بحیثیت کل واحد یا مجموعی طور پر مطالعہ کر سکے۔ انفرادی اور جزئی ادراک کی وجہ سے عقل بار بار تجربہ کرتی ہے' حادثے کے بعد حادثہ رونما ہوتا ہے' ایک تصویر بنتی ہے اور دوسری بگڑتی ہے۔ لیکن عقل چوبیں پاکے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ پوری کائنات کو مجموعی حیثیت سے دیکھ سکے اور اس مجموعی اور کلی مطالعے کے نتیجے میں احکام صادر کر سکے۔ اس کلی ادراک کے نتیجے میں کوئی نظام تشکیل دے سکے' جس کے اندر مکمل جامعیت اور توازن موجود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب عقل ہدایت الٰہیہ اور وحی الہی سے آزاد ہو کر فیصلے کرتی ہے تو اسے بار بار تجربے کرنے پڑتے ہیں اور بار بار احکام تبدیل کرنے پڑتے ہیں۔ بار بار نظام بدلنا پڑتا ہے' ایک اقدام کرنا پڑتا ہے جس کا کوئی الٹا ردعمل سامنے آتا ہے۔ کبھی تو عقل نہایت بائیں طرف جھک کر دور چلی جاتی ہے اور کبھی دائیں طرف جھک کر بہت دور نکل جاتی ہے۔ یوں وہ اس عزیز ترین مخلوق خدا یعنی انسان کو ضائع کرتی رہتی ہے اور معزز انسانی ڈھانچے کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ اگر عقل اپنے دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے وحی کی مطیع فرمان ہو جاتی تو پوری انسانیت اس تباہی سے بچ جاتی۔ تجربات اور رسم و رواج کے لئے ہم مادی میدان کا انتخاب کر لیتے' نیز صنعتی اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ہم عقل کو چھوڑ دیتے' کیونکہ یہ وہ میدان ہے جس میں عقل "مستقلاً" کام کر سکتی ہے۔ اگر اس میں اس کا کوئی تجربہ غلط نکلے تو انسان کو مادی نقصان تو ہو سکتا ہے لیکن انسانی اور روحانی نقصان سے وہ دوچار نہ ہو گا۔

لیکن اس کی کیا وجوہات ہیں کہ انسان عقل کی وجہ سے ان مشکلات سے دوچار ہو جاتا ہے؟ اس کی عقل کی فطری ساخت کے علاوہ اس کی کچھ اور وجوہات بھی ہیں۔ اس کے اندر کچھ فطری میلانات' خواہشات اور جذبات بھی ہیں اور

انسان کے ان فطری میلانات ' جذبات اور خواہشات کے لئے کسی ضابطے کی بھی ضرورت ہے تاکہ وہ ان ضابطوں کے اندر رہتے ہوئے سلسلہ زندگی کو جاری رکھ سکے ۔ اسے ترقی دے سکے اور اپنے فطری فرائض کو ادا کر سکے اور فطری ضابطوں کے محفوظ حدود سے آگے نہ بڑھ جائے ' جس کی وجہ سے اس کی پوری زندگی تباہی اور بربادی کا شکار ہو جائے ۔ یہ ضابطہ بندی کون کرے گا؟ کیا صرف عقل انسانی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ بذات خود کوئی اصول طے کر دے ؟ عقل چونکہ یا تو بذات خود جذبات اور میلانات اور جسمانی خواہشات کے زیر اثر کام کرتی ہے جن کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے ' لہٰذا اس کے لئے کسی اور مصدر کی طرف سے ضابطہ بندی ضروری ہے ۔ یہ مصدر اس ضابطہ بندی کے بعد اس کا محافظ بھی ہو سکتا ہے اور عقل انسانی ہروقت اس کی طرف رجوع کر سکے گی ۔ انسانی زندگی کے ہر حکم پر ' ہر تجربے کی ضابطہ بندی اس مصدر و منبع کی سمت میں ہوگی اور انسان کی حرکت اور جدوجہد کا قبلہ درست رہے گا ۔

جو لوگ عقل انسانی کو وحی الٰہی کی طرح فیصلہ کن اور حقیقی سمجھتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ جس طرح وحی الٰہی خدا کی جانب سے ہوتی ہے ' اسی طرح عقل انسانی بھی خدا ہی کی دین ہے اور انسان کو خدا ہی نے عقل عطا کی ہے لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وحی الٰہی اور عقل انسانی کے اندر کوئی تضاد ہو ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عقل انسانی کو وہ درجہ دیتے ہیں جو اسے انسانی فلاسفروں نے دیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے عقل انسانی کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کی ہے ۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ صرف کسی ایک انسان کی عقل انسان کو وحی الٰہی سے بے نیاز کر دیتی ہے ' اگر وہ بہت ہی بڑا انسان ہو ۔ وہ اس معاملے میں ایسی بات کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمائی ۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے خلاف وحی اور رسالت کو حجت قرار دیا ہے ۔ محض انسانی عقل پر نظام مسئولیت نہیں موقوف کیا ۔ نہ صرف اس بات کا انسان کو مکلف بنایا ہے کہ وہ اپنی فطری قوتوں کے بل بوتے ہی پر راہ ہدایت حاصل کرے اور معرفت کردگار حاصل کرے ۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ صرف عقل کے لئے منزل مقصود تک پہنچنا مشکل ہے ۔ صرف فطرت پر ہی اعتماد نہیں کیا جا سکتا ۔ کیونکہ فطرت کے اندر انحراف ممکن ہے جب وحی راہنما نہ بنے کیونکہ یہی قابل اعتماد راہنما ہے اور صاحب بصیرت لیڈر ۔ (دیکھئے فی ظلال القرآن پارۂ ششم آیت ---- کی تفسیر)

جو لوگ یہ یقین رکھتے ہیں کہ عقل انسان کو دین سے مستغنی کر دیتی ہے یا یہ کہ سائنس جو عقل کی پیداوار ہے ' انسان کو اللہ کی جانب سے راہنمائی کی ضرورت سے بے نیاز کر دیتی ہے ' یہ لوگ ایسی بات کرتے ہیں جو نہ حقیقی ہے اور نہ امر واقعہ اس طرح ہے ۔ اس لئے کہ عملی صورت حال بتاتی ہے کہ جن لوگوں کی زندگی کسی فلسفیانہ تصور پر استوار ہے یا سائنسی نظریات پر استوار ہے وہ نہایت ہی تکلیف دہ زندگی گزار رہے ہیں اور اس میں انسان سخت ترین مصائب کا شکار ہے ۔ اگرچہ ان کی زندگی پر ہر طرف سے سہولیات کی بارش ہو ' ان کی پیداوار اور آمدن بہت زیادہ ہو اور اس میں وسائل زندگی اور اسباب عیش و طرب حد سے زیادہ ہوں ۔ (دیکھئے ' اسلام اور مشکلات تہذیب کا باب خبط اور اضطراب) اس کے برعکس یہ بات بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی کہ حیات دنیا محض جہالت اور اتفاق پر مبنی ہے ۔ جو لوگ اس کائنات کی تعبیر اس انداز سے کرتے ہیں کہ یہ خود بخود وجود میں آگئی ہے وہ مطلب پرست اور خود غرض ہیں ۔

اسلام ایک ایسا نظام زندگی ہے جس میں عقل انسانی کو ایسی ضمانتیں دی گئی ہیں جن کی وجہ سے انسان اپنی ذاتی ساخت میں پائی جانے والی کمزوریوں سے بھی پاک ہو جاتا ہے ' نیز ان کمزوریوں سے بھی بچ جاتا ہے جن میں وہ ذاتی خواہشات اور

میلانات کی وجہ سے مبتلا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اسلام عقل کے لئے اصول و ضوابط وضع کرتا ہے جن کی وجہ سے وہ سائنس اور تجربات اور علم و معرفت کے میدان میں محفوظ طریقے سے کام کرتی ہے۔ ان قواعد کے نتیجے میں عقل کی سرگرمیاں عملی زندگی میں بھی خوب پھیلتی ہیں۔ یہ سب امور اسلامی شریعت کے مطابق طے پاتے ہیں اور عملی زندگی میں عقل پر کوئی پابندی بھی نہیں ہوتی تاکہ وہ برے راستوں پر پڑکر سیدھے راستے سے منحرف نہ ہو جائے۔

جب عقل کو وحی الہی کی راہنمائی حاصل ہوتی ہے تو وہ صاحب بصارت ہو جاتی ہے۔ اگر وہ وحی الہی کی راہنمائی سے آزاد ہوکر چلے تو وہ اندھی ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ ذکر کہ حضور صرف وحی سے ہدایت اخذ کرتے ہیں اور اس کے بعد یہ کہنا کہ اندھے اور آنکھوں والے برابر نہیں ہوتے اور سوالیہ انداز میں یہ کہنا اور اس کے بعد بات پر زور دینا کہ غور و فکر سے کام لو' معنی خیز ہے۔

(اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰی اِلَیَّ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ اَفَلَا تَتَفَکَّرُوْنَ

(۶ : ۵۰)) (میں تو صرف وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل ہوتی ہے' پھر ان سے پوچھو کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟) یہاں آگے پیچھے ایسے اشارات کا ذکر اور یہ انداز' قرآن کریم کا مخصوص انداز تعبیر ہے۔ اسلام میں غور و فکر مطلوب ہے اور قرآن کریم اس پر بار بار زور دیتا ہے لیکن اسلامی غور و فکر کو وحی کے ضوابط کے اندر منضبط کر دیا گیا ہے۔ وحی عقل کے لئے بطور بصارت کام کرتی ہے۔ اگر وحی نہ ہو تو عقل چوبیں یا اندھی بھی ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ اندھیروں میں لڑکھڑاتی پھرتی ہے۔ بغیر دلیل و بغیر ہدایت کے اور بغیر کسی کتاب منیر کے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر عقل کو ضابطہ ہی کے اندر منضبط کر دیا جائے تو کیا اس کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے؟ نہیں وحی اسے ایک وسیع جولانگاہ فراہم کرتی ہے۔ عقل کے میدان کار میں یہ پوری کائنات بھی آتی ہے اور اس سے آگے عالم غیب بھی اس کی فکری جولانگاہ میں آ جاتا ہے جبکہ عالم غیب کا میدان عالم شہادت سے بہت وسیع ہے۔ نفس انسانی کی گہرائی 'انسانی زندگی اور زندگی کے واقعات یہ سب انسانی غور و فکر کا موضوع ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ وحی الہی کسی موڑ پر بھی عقل انسانی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ اگر کسی جگہ وہ رکاوٹ بنتی ہے تو اس مقام پر جب عقل بے راہ روی اختیار کرتی ہے۔ غلط منہاج سے سوچتی ہے اور خواہشات اور اغراض کے پیچھے بھاگتی ہے۔ ورنہ وحی الہی تو عقل سے کام لینے کی ہدایت کرتی ہے اور اس کی سرگرمیوں کے لئے میدان کا تعین کرتی ہے' اس لئے کہ عقل وہ عظیم قوت ہے جو خود اللہ نے انسان کو عطا کی ہے۔ لیکن یہ قوت انسان کو اس لئے دی گئی ہے کہ انسان اس کے ذریعے ربانی ہدایت اور ربانی نظام کی حفاظت کرے نہ اس لئے کہ اس کے ذریعے وہ تخریب کاری کر کے گمراہ اور سرکش بن جائے۔

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْٓا اِلٰی رَبِّهِمْ لَیْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۭ مَا عَلَيْكَ مِنْ
حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ
فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا
اَهٰٓؤُلَاۗءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝ وَاِذَا
جَاۗءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي
نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْۗءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ
مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

"اور اے نبی ﷺ، تم اس (علم وحی) کے ذریعے سے ان لوگوں کو نصیحت کرو جو اس کا خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے سامنے کبھی اس حال میں پیش کیے جائیں گے کہ اس کے سوا وہاں کوئی (ایسا ذی اقتدار) نہ ہو گا جو ان کا حامی و مددگار ہو یا ان کی سفارش کرے، شاید کہ (اس نصیحت سے متنبہ ہو کر) وہ خدا ترسی کی روش اختیار کر لیں اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں انہیں اپنے سے دور نہ پھینکو۔ ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں ہے اور تمہارے حساب میں سے کسی چیز کا بار ان پر نہیں۔ اس پر بھی اگر تم انہیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گے۔ دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے آزمائش میں ڈالا ہے۔ تاکہ وہ انہیں دیکھ کر کہیں "کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے؟" ....
ہاں! کیا خدا اپنے شکرگزار بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا ہے؟ جب تمہارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان کو کہو "تم پر سلامتی ہے۔ تمہارے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ (یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ) اگر تم میں سے کوئی نادانی کے ساتھ کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھا ہو پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کر لے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے۔"

یہ اسلامی نظریہ حیات کی برتری اور عزت کی علامت ہے کہ اس میں اس دنیا کے عارضی کروفر کو کوئی وقعت نہیں دی گئی۔ اس میں پیش نظر اعلیٰ اقدار ہوتی ہیں اور دنیا کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ اس دعوت کو صاف اور ستھرے انداز میں بغیر کسی بناوٹ کے اصل شکل میں پیش فرما دیں اور اس دعوت کے عوض میں لوگوں کو کسی دنیاوی غرض کا لالچ نہ دیں۔ یہ حکم بھی دیا گیا کہ آپ صرف ان لوگوں ہی کو پیش نظر رکھیں جو اس دعوت سے کوئی دنیاوی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے ہیں نہ آپ اس سے نفع لینا چاہتے ہیں۔ اور اپنے اردگرد ان لوگوں کو جمع کریں جو اس دعوت کو قبول کرتے ہیں اور مخلص ہیں۔ جو لوگ دل

و جان سے اللہ کی طرف متوجہ ہیں اور صرف رضائے الٰہی کے لئے کام کرنے والے ہیں۔ آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ جاہلی معاشرے کے رسوم و رواجات اور جاہلی اقدار کو دعوت اسلامی کے نظام میں کوئی وزن نہ دیں اور دنیاوی اعتبارات اور علامات میں سے کسی علامت کو اہمیت دیں۔

(وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (٦ : ٥١)) "اور اے نبی ؐ، تم اس (علم وحی) کے ذریعے سے ان لوگوں کو نصیحت کرو جو اس کا خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے سامنے کبھی اس حال میں پیش کیے جائیں گے کہ اس کے سوا وہاں کوئی (ایسا ذی اقتدار) نہ ہو گا جو ان کا حامی و مددگار ہو' یا ان کی سفارش کرے' شاید کہ (اس نصیحت سے متنبہ ہوکر) وہ خدا ترسی کی روش اختیار کرلیں۔" یعنی دعوت اسلامی ان لوگوں کے سامنے سب سے پہلے پیش کی جائے جو لوگ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن انہیں اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ وہاں ان کی حالت یہ ہو گی کہ نہ کوئی ولی ہو گا جو مدد کر سکے اور نہ کوئی سفارشی ہو گا جو چھڑا سکے۔ اس لئے کہ قیامت کے دن اللہ کے ہاں' اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی بھی سفارش نہیں کر سکتا۔ اگر کسی کو سفارش کی اجازت بھی مل جائے تو بھی وہ ان لوگوں کے حق میں اللہ کی جناب میں سفارش نہ کرے گا۔ کیونکہ سفارش کے منصب پر فائز ہونے والے لوگ تو خود اس دن خوف کا شدید شعور رکھتے ہوں گے کیونکہ اس دن کوئی اللہ کے سوا شفیع و مددگار نہ ہو گا۔ اس لئے کہ ان خدا رسیدہ اور خدا سے ڈرنے والے لوگوں سے اس بات کی توقع زیادہ ہوگی' وہ زیادہ خوف محسوس کریں گے اور زیادہ مطیع فرمان ہوں گے اور ہدایت الٰہی سے اور لوگوں کے مقابلے میں زیادہ نفع اندوز ہوں گے۔ ایسے لوگوں سے زیادہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی اس دنیاوی زندگی میں ایسے امور سے بچیں جن کی وجہ آخرت میں عذاب الٰہی میں مبتلا ہوں۔ لہٰذا ڈراوا ایک ایسا بیان ہوتا ہے جو واضح ہوتا ہے اور اس کا بہت اثر ہوتا ہے۔ یوں انذار کی وجہ سے ان پر وہ امور واضح ہو جائیں گے جن سے وہ پہلے ہی خائف ہیں' لہٰذا ان امور کے بیان اور انذار کی وجہ سے وہ مزید متقی بنیں گے اور حدود اللہ پامال کرنے سے ڈریں گے اور ان امور میں مبتلا نہ ہوں گے جن سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اس کے بعد ہو گا جبکہ ان کے سامنے ممنوع باتوں کا بیان ہو جائے۔

(وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (٦ : ٥٢))
"اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں' انہیں اپنے سے دور نہ پھینکو۔" جن لوگوں نے اپنے آپ کو اللہ کے لئے خالص کر دیا ہے انہیں اپنے آپ سے دور نہ پھینکو۔ ایسے لوگ جو صبح و شام اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اسے پکارتے ہیں اور یہ کام وہ محض رضائے الٰہی کے لئے کرتے ہیں۔ یہ خلوص اور محبت کا مقام ہے اور ادب اور احترام کی فضا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نہایت خضوع اور خشوع کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور عبادت میں مشغول ہیں۔ رضائے الٰہی کا حصول صرف اس وقت ہوتا ہے جب انسان نہایت ہی خلوص کے ساتھ رب کی طرف متوجہ ہو' پوری طرح اللہ کے ساتھ محبت کرتا ہو اور دربار الٰہی میں نہایت ادب اور خشوع کے ساتھ کھڑا ہوتا ہو یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے ربانی کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے یعنی للہ فی اللہ والے۔

سوال یہ ہے کہ حضور ؐ کو یہ حکم کیوں دیا گیا؟ اصل بات کیا ہے۔ واقعہ یوں ہوا کہ اشراف عرب میں سے بعض لوگ دعوت اسلامی کو اس لئے قبول نہ کرتے تھے کہ حضور اکرم ؐ کے ارد گرد فقراء اور کمزور لوگ جمع تھے مثلاً صہیب 'بلال 'عمار 'خباب 'سلمان اور ابن مسعود وغیرہ اور ان لوگوں نے ایسے جبے پہنے ہوئے ہوتے تھے جن سے بدبو آتی تھی 'کیونکہ غربت کی وجہ سے وہ بار بار دھو نہیں سکتے تھے۔ ان لوگوں کی معاشرتی حیثیت یہ تھی کہ وہ قریش کے بڑے لوگوں کی مجلس میں بیٹھنے کے اہل نہ سمجھے جاتے تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر قریش کے ان اکابرین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ ان لوگوں کو اپنی مجلس سے دور کر دیں۔ حضور اکرم ؐ نے اس بات کا انکار کر دیا۔ اس پر ان لوگوں نے یہ مطالبہ کیا کہ حضور ؐ ان کے لئے علیحدہ مجلس بنا دیں اور صاحب حیثیت لوگوں کے لئے ایک مجلس بنا دیں جس میں ان فقراء میں سے کوئی بھی نہ ہو۔ یہ مطالبہ وہ اس لئے کرتے تھے کہ جاہلیت میں دور جاہلیت کی مجالس میں اکابرین قریش کو یہ امتیازات حاصل تھے جن کی وجہ سے وہ عوام پر اپنا رعب بٹھاتے تھے۔ اس دوسری تجویز کے بارے میں حضور ؐ نے غور کرنا شروع کر دیا محض اس لئے کہ شاید اس طرح ان کے دل میں دعوت اسلامی اتر جائے۔ اس پر حکم صادر ہوا۔

(وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (۶:۵۲)

"اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں 'انہیں اپنے سے دور نہ پھینکو۔" امام مسلم نے سعد ابن ابی وقاص سے روایت نقل کی ہے 'وہ فرماتے ہیں ہم چھ افراد حضور ؐ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ مشرکین نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائش کی 'ذرا آپ ان لوگوں کو اپنے ہاں سے ہٹا دیں تاکہ یہ لوگ بے تکلف ہو کر ہمارے خلاف حوصلے نہ پالیں۔ وہ کہتے ہیں ان چھ میں 'ایک میں تھا' ابن مسعود تھے 'ایک شخص ہذیل کا تھا' بلال تھے اور دو افراد اور تھے جن کے نام یاد نہیں۔ قریش کی بات کا اثر رسول ؐ اللہ کے دل پر ہوا جو اللہ نے چاہا۔ آپ نے ان کی فرمائش پر سوچنا شروع کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

(وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (۶:۵۲)

"اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں 'انہیں اپنے سے دور نہ پھینکو۔" یہ کبراء ان بیچاروں کے بارے میں بہت کچھ کہتے تھے۔ ادھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ان پر بے حد عنایات تھیں اور آپ کی مجلس میں ان کا خصوصی مقام تھا۔ کبراء ان پر الزام لگاتے اور انہیں برا بھلا کہتے اور ان کی غربت اور ضعف پر تنقید کرتے۔ ان لوگوں کو ان کا حضور ؐ کی مجلس میں بیٹھنا گوارا نہ تھا اس لئے یہ کبراء اسلام سے نفرت کرتے تھے اور اسلام قبول کرنا نہ چاہتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس امر کے بارے میں ایک فیصلہ کن حکم دے دیا۔ ان کی اس تجویز کو بنیادی طور پر رد کر دیا گیا اور اسے کالعدم قرار دے دیا گیا۔

(مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۶:۵۲)) "ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں ہے اور تمہارے حساب

میں سے کسی چیز کا بار ان پر نہیں ۔ اس پر بھی اگر تم انہیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گے -" وہ خود اپنا بوجھ اٹھائیں گے اور حساب دیں گے اور تم اپنا بوجھ اٹھاؤ گے اور حساب دو گے ۔ یہ کہ وہ غریب ہیں تو ان کی قسمت میں یہ اللہ نے لکھا ہے ۔ اس میں تمہارا کوئی دخل نہیں ہے ۔ اسی طرح اے پیغمبر خود تمہاری امارت یا فقر کے بارے میں ان سے بھی نہ پوچھا جائے گا ۔ ایمان اور کفر کے معاملے میں امارت اور غربت کا کوئی اعتبار نہیں ہے ۔ اگر آپ کسی کو اپنی مجلس میں جگہ دیں یا نکال دیں ان کی امارت اور غربت کا لحاظ رکھتے ہوئے تو یہ فعل اللہ کے ترازو میں کوئی وزن اور قیمت نہ رکھے گا ۔ اس طرح آپ ظالموں میں سے ہوں گے اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی رسول ظالموں میں سے ہو جائے ۔

وہ لوگ جو دل کے تونگر تھے اور جیب کے لحاظ سے غریب تھے ۔ وہ مجلس رسول کے مستقل ممبر رہے ۔ جو لوگ دنیاوی لحاظ سے کمزور تھے مگر ایمانی اور نظریاتی اعتبار سے طاقتور تھے وہ اسی مقام پر برقرار رہے جو ان کے ایمان نے ان کے لئے مقرر کر دیا تھا ۔ اس مقام کے وہ اس لئے مستحق ہو گئے تھے کہ وہ صرف اللہ کو پکارتے تھے اور صرف اللہ کی رضامندی کے طالب تھے ۔ یوں اسلامی اقدار نے اس طرح روایات کی شکل اختیار کی جس طرح اللہ تعالیٰ پسند فرماتے تھے ۔

اہل کبر و غرور تحریک اسلامی سے متنفر ہو گئے ۔ ان کا تاثر یہ تھا کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے ایسے لوگ اللہ کے فضل و کرم کے مالک بن جائیں ۔ یہ ٹٹ پونجیے! اگر محمد کی برپا کی ہوئی تحریک اور آپ جو پیغام لے کر آئے ہیں اس میں کوئی بھلائی ہوتی تو اس کے قبول کرنے میں یہ لوگ ہم سے آگے نہ ہوتے ۔ اللہ ہمیں ان سے پہلے اس کی جانب راہنمائی فرماتا ۔ یہ کوئی معقول بات نظر نہیں آتی کہ اہل عرب میں سے اللہ تعالیٰ ان ضعفاء اور ناداروں کو اپنے فضل و کرم کے لئے منتخب فرمائیں جبکہ ہم صاحب جاہ و مرتبہ ہیں ۔

نسب اور مال پر غرور کرنے والے ان لوگوں کو اللہ نے دراصل فتنے میں ڈال دیا تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے دین اسلام کو سمجھا ہی نہ تھا ۔ نیز یہ دین انسانیت کو جس نئی دنیا میں لے جانا چاہتا تھا اسے بھی یہ لوگ نہ سمجھ سکے تھے جس کے آفاق نہایت ہی وسیع تھے ۔ یہ دین انسانوں کو اس جدید دنیا میں نہایت ہی بلندیوں تک لے جانا چاہتا تھا ۔ اس جدید اسلامی دنیا کا علم اس وقت نہ عربوں کو تھا اور نہ دوسرے لوگوں کو تھا ۔ آج جو لوگ جمہوریت اور دوسرے ناموں سے ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں وہ بھی اسلامی نظام کی دنیا سے بے خبر ہیں ۔

(وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا (۶ : ۵۳))

"دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالا ہے تاکہ وہ انہیں دیکھ کر کہیں "کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن کریم یوں دیتا ہے یعنی طبقہ کبراء کے استفہام انکاری کو یوں رد کیا جاتا ہے ۔

(اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ (۶ : ۵۳)) ہاں! کیا خدا اپنے شکر گزار بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا ہے ۔ اس تردید میں بہت کچھ ہدایات اور اشارات دیئے گئے ۔ پہلی ہدایت یہ دی گئی کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم ان لوگوں پر کرتا ہے جن کے بارے میں اللہ کے علم میں یہ بات ہوتی ہے کہ وہ شکر نعمت بجا لائیں گے ۔ اگرچہ کوئی بندہ اللہ کے انعام کا حق ادا نہیں کر سکتا لیکن بندہ شکر نعمت کے میدان میں جو حقیری کوشش بھی کرے اللہ اسے قبول کرتا ہے اور

اس حقیر سے شکر پر اسے وہ انعام دیتا ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا کہ نعمت ایمان کا تعلق ان حقیر اقدار سے نہیں ہے جو اس دنیا پر چھائے ہوئے جاہلی نظاموں میں اہمیت رکھتی ہیں۔ ایمان کی دولت اللہ ان لوگوں کو نصیب کرتا ہے جن کے بارے میں اللہ کو علم ہے کہ وہ شکر بجا لائیں گے' اگرچہ وہ غلام' ضعیف اور نادار ہوں کیونکہ اللہ کے ترازو میں دنیا کی دولت اور مال کا کوئی وزن نہیں ہے۔ انہیں صرف جاہلیت ہی اہمیت دیتی ہے حالانکہ اللہ کے نزدیک ان میں کوئی وزن نہیں ہوتا ہے۔

اس جواب میں یہ فیصلہ بھی کر دیا جاتا ہے کہ دراصل یہ اعتراض وہ لوگ کرتے ہیں جو چیزوں کی حقیقت سے واقف نہیں ہوتے۔ اللہ دولت ایمان کو جب تقسیم فرماتے ہیں تو وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کا مستحق کون ہے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی اعتراض کرے گا تو ایک تو وہ جاہل ہو گا اور اس کے ساتھ ساتھ نہایت گستاخ بھی ہو گا۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی جاتی ہے کہ آپ آغاز دعوت ان لوگوں سے کریں جن پر اللہ نے فضل فرمایا' سب سے پہلے انہیں نعمت ایمان سے نوازا' ان کو سابقون الاولون کی فضیلت دی گئی اور جن سے یہ کبراء اور اشراف نفرت کرتے ہیں۔ حکم دیا جاتا ہے کہ آپ سب سے پہلے انہیں سلام کریں اور اس کے بعد انہیں خوشخبری دیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر ان کے لئے رحمت فرض کر لی ہے اور اگر ان میں سے کسی سے دور جاہلیت میں کوئی غلطی صادر ہوئی ہے تو وہ معاف ہے بشرطیکہ وہ توبہ کرے اور اصلاح کر لے۔

(وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٦ : ٥٤)) "جب تمہارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے کہو "تم پر سلامتی ہے۔ تمہارے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ (یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ) اگر تم میں سے کوئی نادانی کے ساتھ کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھا ہو پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کر لے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے۔" نعمت ایمان کے بعد یہ ان کے لئے ایک بڑا اعزاز ہے۔ اس سے حساب و کتاب میں بہت ہی نرمی ہو گی اور جزاء میں نہایت ہی فیاضی اور فراوانی ہو گی۔ اس قدر عظیم رحمت اور یقینی رحمت کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر اس فعل کو فرض کر لیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ بعد سلام ایسے مومنین آیات الہٰی کو خوشخبری بھی دے دیں کہ ان کے ساتھ عفو و درگزر کا سلوک ہو گا بشرطیکہ وہ توبہ اختیار کریں اور صالحانہ روش اپنائیں۔ اسی لئے بعض مفسرین نے جہالت کی تعریف یہ کی ہے کہ کوئی ارتکاب ذنوب پر جما ہوا ہو ورنہ جو شخص بھی ارتکاب جرم کرتا ہے وہ جہالت ہی کی وجہ سے کرتا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق اس نص میں ہر وہ گناہ شامل ہو گا جو کسی سے صادر ہو اور جب وہ توبہ کرے اور نیک ہو جائے تو گناہ معاف ہو جائے گا۔ اس رائے کی تائید ان آیات و نصوص سے بھی ہوتی ہے جن میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ توبہ اور اس کے بعد اصلاح حال سے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ وہ رحمت الہٰی ہے جسے اللہ نے اپنے اوپر فرض کر لیا ہے۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ بعض اہم احادیث کا یہاں تذکرہ کر دیا جائے' جو ان واقعات و حالات کے بارے میں ہیں جن میں یہ آیات نازل ہوئیں ۔ ان آثار و احادیث اور اس آیت کو اگر ملا کر پڑھا جائے تو معلوم ہو گا کہ دین اسلام اس وقت انسانیت کے اندر کس قدر عظیم انقلاب لا رہا تھا۔ اس وقت معاشرتی اعتبار سے اسلام نے انسانیت کو جس مقام بلند تک پہنچا دیا تھا' انسانیت آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکی ہے۔

طبری نے صناد' ابوزید' اشعث 'کردوس اور حضرت ابن مسعود کے سلسلہ روایت سے نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ قریش کے کچھ کبراء حضور کے پاس سے گزرے' اس وقت آپ ؐ کے پاس صہیب' عمار 'بلال' خباب اور ان جیسے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ ہم تمام مسلمانوں میں زیردست لوگ تھے۔ ان کبراء نے کہا: "اے محمد ؐ 'کیا تم نے اپنی قوم سے ان لوگوں کو منتخب کیا ہے؟ کیا ہم میں سے اللہ نے صرف ان لوگوں پر احسان کیا ہے؟ کیا ہم ان لوگوں کے زیر اطاعت آجائیں؟ آپ ان لوگوں کو اپنے پاس سے بھگا دیں' اگر آپ نے ایسا کیا تو ممکن ہے کہ ہم تمہارے مطیع ہو جائیں' اس واقعہ پر یہ آیات نازل ہوئیں

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۵۲) وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ --- (۵۳) (۶: ۵۲-۵۳) تک۔

طبری نے حسین ابن عمرو ابن محمد عنقزی' انہوں نے اپنے والد' انہوں نے بعض دوسرے لوگوں اور انہوں نے سدی اور ابوسعید ازدی سے نقل کیا ہے۔ یہ ازد قبیلہ کے قاری تھے۔ انہوں نے خباب سے اس آیت

(وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ

(۶: ۵۲)) کے بارے میں کہا کہ اقرع ابن حابس تمیمی اور عیینہ ابن حصن فزاری آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بلال 'صہیب' عمار' خباب اور دوسرے ضعیف اور کمزور اہل ایمان کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے جب ان ضعفاء کو دیکھا تو انہیں حقیر سمجھا۔ یہ دونوں حضور ؐ کے پاس آئے اور انہوں نے کہا' ہم چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے ہمراہ ایک جگہ بیٹھیں جس کی وجہ سے عربوں کے اندر ہماری عزت ہو' کیونکہ آپ کے پاس عربوں کے وفود آتے جاتے ہیں لیکن ہم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ہمیں عرب آپ کے پاس ان دوسرے درجے کے لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے پائیں۔ جب ہم آپ لوگوں کے پاس آئیں تو آپ ذرا ان لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دیا کریں۔ جب ہم چلے جائیں تو پھر آپ آزاد ہیں ان کے پاس بیٹھیں یا نہ بیٹھیں۔ آپ نے فرمایا" درست" اس پر ان لوگوں نے یہ مطالبہ کیا کہ اس سلسلے میں آپ ایک پروٹوکول پر دستخط فرما دیں۔ راوی کہتا ہے آپ نے کاغذ منگوایا اور حضرت علی ؓ کو بلایا کہ انہیں یہ

بات لکھ دیں۔ راوی کہتا ہے ہم ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے کہ جبرئیل علیہ السلام آئے اور یہ آیت نازل ہوئی۔

(وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ (٦ : ٥٢)) "اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں انہیں اپنے سے دور نہ پھینکو"۔ ان کے حساب میں کسی چیز کا بار تم پر نہیں ہے۔ اور تمہارے حساب میں سے کسی چیز کا بار ان پر نہیں۔ اس پر بھی اگر انہیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہوگے) اس کے بعد آپ ؐ نے پڑھا۔

(وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ (٦ : ٥٣)) (دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈال دیا ہے تاکہ وہ انہیں دیکھ کر کہیں : کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے؟ ہاں کیا اللہ اپنے شکرگزار بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا) اور اس کے بعد پڑھا

(وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (٦ : ٥٤)) تک

(جب تمہارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے کہو : تم پر سلامتی ہے۔ تمہارے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر دیا ہے) اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے کاغذ پھینک دیا۔ اور ہمیں بلایا اور آپ یہ آیت پڑھ رہے تھے۔ (سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (٦ : ٥٤))

اس کے بعد ہم آپ کے پاس بیٹھا کرتے اور جب آپ جانا چاہتے تو خود اٹھ کر چلے جاتے اور ہم اپنی جگہ پر ہوتے۔ اس کے بعد سورۂ کہف کی یہ آیت نازل ہوئی۔

(وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (١٨ : ٢٨)) "اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو۔" راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ بیٹھے رہتے اور جب وقت ہو جاتا تو ہم خود اٹھ جاتے اور آپ ؐ کو اکیلا چھوڑتے کہ آپ ؐ اٹھ کر چلے جائیں۔

(ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس حدیث پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ "یہ حدیث غریب ہے۔ یہ آیت مکی ہے' اور اقرع ابن حابس اور عیینہ ہجرت کے بہت بعد میں مسلمان ہوئے ہیں۔" لیکن اس تنقید کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ان کی اس روایت کا تعلق ان کے

اسلام کے پہلے کے واقعہ سے ہے۔ انہوں نے یہ تو نہیں کہا کہ اس واقعے کے وقت وہ مسلمان ہو چکے تھے۔ لہٰذا ان کے اسلام اور اس روایت کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے۔کیونکہ جب حضور ؐ نے ان کی بات تسلیم نہ کی تو انہوں نے اس وقت اسلام سے اعراض کر دیا۔ (سید قطب))

اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو دیکھتے ان کو سلام کرنے میں پہل فرماتے اور فرماتے "خدا کا شکر ہے کہ میری امت میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جن کے بارے میں اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں انہیں پہلے سلام کروں۔"

صحیح مسلم میں عائذ ابن عمر کی روایت ہے کہ ابو سفیان آیا اور مجلس میں سلمان 'صہیب' بلال اور دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ ان لوگوں نے کہا: "خدا کی قسم اللہ کی تلواروں نے خدا کے دشمنوں میں سے جس مقام تک پہنچنا چاہئے تھا نہ پہنچ سکیں۔" اس پر حضرت ابوبکر نے فرمایا: تم لوگ یہ ریمارکس شیخ قریش اور ان کے سردار کے بارے میں پاس کر رہے ہو؟ ابوبکر ؓ حضور ؐ کے پاس آئے اور انہوں نے اس واقعہ کی اطلاع آپ ؐ کو دی تو حضور ؐ نے فرمایا: "تم نے ان کو ناراض تو نہیں کر دیا؟ اگر تم نے ان لوگوں کو ناراض کر دیا ہے تو' تو نے رب کو ناراض کر دیا ہے۔" ابوبکر ؓ فوراً ان کے پاس آئے اور ان سے پوچھا "بھائیو! کیا تم میری بات سے ناراض تو نہیں ہو گئے ہو؟ تو انہوں نے کہا: "نہیں تو' بھائی تمہیں اللہ معاف کر دے۔

---ooo---

ذرا ٹھہرو' یہ غور کا مقام ہے اور اس پر ذرا طویل وقفہ کرو۔ ان آیات پر غور کرو' بلکہ تمام انسانیت کا یہ حق ہے کہ وہ اس مقام پر رکے اور دیر تک غور کرے۔ ان آیات میں انسان کے خالی خولی حقوق اور چمکدار اصولوں اور اقدار ہی کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ ان آیات میں جو بات کہی گئی ہے وہ انسانی حقوق سے بھی بہت بلند اور اہم ہے۔ یہاں ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو عملاً لوگوں کی زندگیوں میں موجود ہے اور یہ وہ عظیم انقلاب ہے جو اسلامی نظام حیات نے پوری انسانیت کی زندگی میں عملاً برپا کیا۔ ذرا آسمان انسانیت کے افق پر نگاہ ڈالو' وہ ہے بلند اور باریک لکیر جس تک کبھی یہ انسانیت پہنچی تھی اور کاغذوں پر نہیں عملاً وہاں تک پہنچی تھی آج ذرا غور کرو کہ وہی انسانیت اس ریکارڈ مقام سے کس قدر نیچے گر گئی ہے اس لئے کہ انسانیت دین اسلام کی قیادت سے محروم ہو گئی ہے۔ انسانیت جس قدر بھی گر جائے اس ریکارڈ کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ اس انقلاب کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے کیونکہ تاریخ کے ایک دور میں انسانیت اس مقام تک پہنچی ہے۔ یہ ریکارڈ عملاً قائم ہوا ہے اور انسان نے یہ خط ایک دن اپنے عمل سے افق انسانیت پر رقم کیا ہے۔ انسانیت کو چاہئے کہ اس مقام بلند تک دوبارہ پہنچنے کی سعی کرے اس لئے کہ اسلامی انقلاب نے اس چوٹی کو ایک بار سر کیا ہے۔ دوبارہ اس مقام تک پہنچا جا سکتا ہے۔ وہ دیکھو افق انسانیت پر مسلمانوں کے نقوش پا موجود ہیں۔ اب بھی انسان وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ اب بھی دین اسلام موجود ہے۔ صرف عزم' یقین اور اعتماد کی ضرورت ہے۔

ان آیات کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں انسانیت کے اس عظیم سفر کے نقوش پا کو دائماً مرتسم کر دیا گیا ہے۔ ان آیات میں اس تاریخی عمل کو ریکارڈ کر دیا گیا جس کے ذریعے اسلام نے عربوں کو جاہلیت کی گراوٹوں اور گندگیوں سے اٹھا کر اس مقام بلند تک پہنچا دیا تھا اور پھر ان کے ہاتھ میں پوری انسانیت کی قیادت دے دی تھی۔ انہوں نے اطراف عالم میں پوری

انسانیت کو ہاتھ سے پکڑا اور افق انسانیت میں اس ریکارڈ لکیر تک اٹھا دیا جسے کوئی اور نظام آج تک عبور نہیں کر سکا۔

انسانیت عموماً اور عرب خصوصاً جس قعر مذلت میں گرے ہوئے تھے' ان آیات میں اس کا تصور سردار قریش کے ان الفاظ کے اندر بالکل واضح ہے۔ کہتے ہیں: "محمد' تم نے اپنی قوم میں سے صرف ان لوگوں کو چن لیا ہے؟ کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر اللہ تعالٰی نے 'ہم سب کو چھوڑ کر' احسان کیا ہے؟ اور کیا اب ہم ان لوگوں کے مطیع فرمان ہو جائیں؟ ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو اپنی مجلس سے بھگا دیں۔ اگر آپ نے انہیں اپنی مجلس سے رخصت کر دیا تو امید ہے کہ ہم آپ کی اطاعت کر لیں گے۔"...... اقرع ابن حابس اور عیینہ ابن حصن فزاری نے جو الفاظ کہے ان میں بھی صاف نظر آتا ہے کہ اس وقت دنیا کس قعر مذلت میں گری ہوئی تھی۔ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سابقین اولین کے بارے میں اس حقارت آمیز انداز میں کلام کرتے ہیں کہ بلال' صہیب' عمار اور خباب جیسے لوگ دوسرے درجے کے لوگ ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ملاقات کرنا چاہتے ہیں لیکن ہمیں یہ پسند نہیں ہے کہ اہل عرب ہمیں ان جیسے ضعفاء اور غلاموں کے ساتھ ایک ہی مجلس میں بیٹھے ہوئے دیکھیں کیونکہ حضور ؐ کے پاس تو ہر وقت عالم عرب سے وفود آتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کا موقف یہ تھا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ ان کا بیٹھنا ان کے لئے باعث ننگ ہے۔

اس جگہ جاہلیت کا سیاہ چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے اور اس کی حقیر رسمیں اور کمزور اقدار کھل کر سامنے آ جاتی ہیں۔ قوم' نسب اور مال و دولت کی بنیاد پر قائم ہونے والی عصبیت واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ ان فقراء میں سے بعض لوگ سرے سے عرب ہی نہ تھے۔ بعض دوسرے ایسے تھے کہ ان کا تعلق وقت کے نام نہاد شرفاء میں سے نہ تھا اور بعض ایسے تھے جو مالدار نہ تھے۔ یہی وہ اقدار ہیں جن کو دنیا کی ہر جاہلیت نشوونما دیتی ہے۔ دور جدید کی جاہلیتیں بھی آج تک اس قسم کے تصور قومیت' تصور نسل اور مالی لحاظ سے اٹھنے والے طبقاتی تصور سے بلند نہیں ہو سکیں۔

یہ ہیں جاہلیت کی گراوٹیں اور پستیاں اور یہ ہے اسلام کی سربلندی اور علو شان۔ اسلام کی نظر میں ان قومی' نسلی اور طبقاتی نعروں کا کوئی وزن نہیں ہے اور نہ ان پست اور سطحی تصورات کا کوئی اعتبار ہے۔ اسلام وہ نظام ہے جو آسمان سے نازل ہوا' یہ کوئی ایسا نظام نہیں ہے جو زمین سے اگا ہو۔ اس لئے کہ زمین کے اندر تو پستیاں موجود ہیں اور یہ پستیاں ایسی شور زدہ ہیں کہ ان کے اندر ایسے خیالات کے پودے اگ ہی نہیں سکتے کیونکہ اسلامی پودا نہایت ہی پاکیزہ درخت ہوتا ہے۔ اسلام کی اطاعت سب سے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے ہیں جو اللہ کے نبی اور رسول ہیں اور جن پر آسمانوں سے وحی آتی ہے۔ وہ قریش کی ایک سرکردہ شاخ بنی ہاشم کے فرد ہیں۔ پھر اسلام کی اطاعت حضرت ابوبکر کرتے ہیں' جو حضور اکرم ؐ کے ساتھی ہیں۔ یہ حضرات سب سے پہلے ان غلاموں کے بارے میں' ان زیردستوں کے بارے میں اسلامی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ یہ غلام اور زیردست وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کے سوا تمام غلامیوں کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا ہے۔ صرف اللہ کے غلام بن گئے ہیں اور صرف اللہ کے غلام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں مذکورہ بالا انقلابی ہدایات آئیں۔

جس طرح قریش کے ان سرداروں کی باتوں میں جاہلیت کی پستیاں عیاں ہیں اور اقرع اور عیینہ کی ذہنیت میں یہ گراوٹیں نمایاں ہیں اس طرح کلام الہی کے اس حصے میں بھی علو شان عیاں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ میں ہدایات دی جاتی ہیں۔ ذرا دوبارہ غور کیجئے۔

(وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِم مِّن شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظّٰلِمِينَ (٥٢) وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوا أَهٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَعْلَمَ بِالشّٰكِرِينَ (٥٣) وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنكُمْ سُوْءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِن بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (٥٤)) (٦: ٥٢ تا ٥٤) "اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں انہیں اپنے سے دور نہ پھینکو۔ ان کے حساب میں سے کسی کا بار تم پر نہیں ہے اور تمہارے حساب میں سے کسی چیز کا بار ان پر نہیں ہے۔ اس پر بھی اگر تم انہیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گے۔ دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالا ہے تاکہ وہ انہیں دیکھ کر کہیں "کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے۔" ہاں! کیا خدا اپنے شکرگزار بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا ہے؟ جب تمہارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے کہو "تم پر سلامتی ہے۔ تمہارے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے (یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ) اگر تم میں سے کوئی نادانی کے ساتھ کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھا ہو پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے تو وہ معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے"۔ اسلام کی یہ سربلندی اس رویے سے عیاں ہوتی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان غلاموں کے ساتھ اختیار کیا جن کے بارے میں اللہ نے نبی کو حکم دیا کہ آپ ان کو سلام کرنے میں پہل کریں اور جب وہ مجلس میں بیٹھے ہوئے ہوں تو اس وقت تک انتظار کریں جب تک وہ خود اٹھ نہیں جاتے حالانکہ حضور محمد ابن عبداللہ ابن ہاشم تھے' اس کے سوا آپ پیغمبر خدا تھے اور خیر الخلائق تھے اور ان لوگوں کے سرخیل تھے جن کی وجہ سے انسانیت اور زندگی کو شرف نصیب ہوا۔

ان غلاموں کی ذہنیت سے بھی اسلامی نظریہ حیات کی سربلندی عیاں ہے۔ وہ اللہ کے ہاں اپنے مرتبے کا احساس رکھتے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں چلنے والی تلواروں کے کام اور فرائض کے بارے میں بھی احساس رکھتے ہیں کہ یہ اللہ کی تلواریں ہیں۔ ابوسفیان قریش کا شیخ اور سردار ہے اور وہ اسلامی صفوں میں اس لئے پیچھے رہ گیا کہ وہ فتح مکہ کے بعد عام معافی کے نتیجے میں ایمان لایا۔ یہ غلام اس لئے پہلی صفوں میں چلے گئے کہ انہوں نے مشکل دور میں دعوت اسلامی پر لبیک کہا اور شدید ابتلا میں ڈالے گئے۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے انہیں ابوسفیان کے معاملے میں ڈانٹا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سخت متنبہ کیا اور کہا کہ تم نے ان لوگوں کو غصہ تو نہیں دلایا۔ اگر تم نے انہیں ناراض کیا ہے تو گویا تم نے اللہ کو ناراض کر دیا ہے۔ آج کے دور میں ہمارا کوئی تبصرہ یہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ ہم تو صرف سادہ الفاظ میں اس واقعہ کو نقل کر سکتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ فوراً اٹھ کر ان کے پاس واپس جاتے اور پوچھتے ہیں "بھائیو! تم ناراض تو نہیں ہو گئے

ہو۔" وہ جواب دیتے ہیں "نہیں بھائی' اللہ تمہاری مغفرت کرے۔"

یہ کس قدر حیران کن واقعہ ہے جو انسانی تاریخ میں رونما ہوا؟ یہ کس قدر عظیم انقلاب تھا جو انسانی زندگی میں رونما ہوا؟ جس کے اندر اقدار بدل گئیں' طور طریقے بدل گئے۔ لوگوں کا شعور بدل گیا اور ان کے خیالات بدل گئے اور یہ تمام تغیرات آناً فاناً واقع ہوئے جبکہ علاقے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لوگ بدل نہیں گئے تھے اور اقتصادی نظام جوں کا توں تھا۔ نظریات کے سوا تمام حالات زندگی جوں کے توں تھے۔ بس آسمان سے ایک پیغام آیا' وہ ایک بشر پر آیا' یہ صرف اللہ کی حاکمیت کا پیغام تھا۔ انسانی فطرت تہ بہ تہ آلودگیوں میں ڈوبی ہوئی تھی' لوگ جاہلیت کی پستیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس پیغام لانے والے نے انہیں پکارا' اس پکار کی وجہ سے ان کی قوتوں نے جوش مارا اور اس جوش میں وہ پستیوں سے اٹھ کر بلند ترین چوٹیوں پر چڑھ گئے۔ یہ برتری انہیں صرف اسلام کی برکت سے نصیب ہوئی۔

پھر تاریخ نے دیکھا کہ یہ لوگ ان بلندیوں سے پستیوں میں جا جا کر گرنے لگے۔ اور آخر کار دوبارہ پستیوں تک پہنچ گئے۔ آج نام نہاد تہذیب کے مراکز واشنگٹن' نیویارک' شکاگو اور جوہانسبرگ وغیرہ میں یہ گندی عصبیتیں دوبارہ عروج پر ہیں۔ رنگ اور نسل کی اساس پر آج پھر لوگوں نے عصبیتوں کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ کہیں وطنیت کا فتنہ ہے' کہیں قومیت کا چرچا ہے' کہیں طبقاتی جنگ برپا ہے اور ان جاہلیتوں کی گندگی جاہلیت عربیہ سے کچھ کم بدبودار نہیں ہے۔

لیکن اسلامی نظام حیات آج بھی سرفراز ہے۔ اس کے عروج کا خط آج بھی افق انسانیت پر ریکارڈ ہے۔ آج بھی انسانیت کے لئے یہ نظام رحمت ہے اور امید کی کرن ہے کہ شاید دوبارہ انسانیت اس مقام تک اس کی قیادت میں پہنچ جائے اور اس گندے اور بدبودار تعفن سے نکل آئے۔ اس کی آنکھیں اور نظریں اوپر کو اٹھیں۔ وہ دوبارہ اس ریکارڈ خط تک پہنچنے کی سعی کرے۔ شاید وہ دوبارہ یہ میٹھی آواز سن سکے اور داعی اسلام کی حدی خوانی سے وجد میں آ جائے اور اسلامی نقوش راہ پر چل کر دوبارہ اس بلند ترین ٹارگٹ تک جا پہنچے۔

اس تفسیر میں ہم نے جو انداز اختیار کیا ہے اس کی وجہ سے ان اجمالی اشارات سے آگے ہم نہیں جا سکتے۔ جس قدر وقفہ ہم نے کر لیا اب اس سے زیادہ نہیں رک سکتے تاکہ ہم تمام انسانیت کو دعوت دے سکیں کہ وہ ان آیات پر غور کرے اور دیکھے کہ پوری انسانی تاریخ کے اندر یہ واقعہ کس قدر روشن اور چمکدار ہے۔ اس کے اندر انسانیت نے نہایت ہی پستیوں سے اسلامی نقوش راہ پر چلتے ہوئے بلندی حاصل کی اور وہ بلندیوں میں بہت دور تک جا نکلی۔ کس طرح آج کی مادی اور بے دین تہذیب کی قیادت میں وہ دوبارہ گری اور اب اس کی حالت یہ ہے کہ انسانیت ایک ایسا جسم ہے جس میں کوئی روحانیت نہیں ہے۔ انسان ہیں مگر وہ نظریہ حیات سے محروم ہیں۔ یہ بھی معلوم کر لیں اسلام میں کس قدر صلاحیت ہے کہ وہ دوبارہ قائدانہ مقام حاصل کر سکتا ہے۔ خصوصاً تاریخ کے ایسے موڑ پر جبکہ تمام تجربے' تمام مکاتب فکر' تمام طرز ہائے حیات' تمام نظامہائے زندگی' تمام تصورات حیات اور تمام افکار' جو انسانوں کے خود ساختہ تھے اور جن میں دین اسلام سے ہدایت نہ اخذ کی گئی تھی وہ زندگی کے مسائل حل کرنے میں بری طرح ناکام ہو گئے ہیں۔ یہ تمام افکار انسانی زندگی کو اس سربلندی تک نہ پہنچا سکے جس تک اسلامی نظام نے اسے پہنچایا تھا۔ یہ تمام تصورات انسانیت کو عزت و احترام کا وہ مقام نہ دلا سکے جو اسے اسلام کے زیر سایہ نصیب ہوا۔ انسانوں کو وہ اطمینان نہ دلا سکے جو اسلام نے انہیں عطا کیا۔ خصوصاً وہ انقلاب جو اسلامی نظام نے عربوں میں رونما کیا' بغیر اس کے کہ لاکھوں انسانوں کو ذبح کیا جائے' بغیر اس

کے کہ کروڑوں پر تشدد کیا جائے' بغیر اس کے کہ لوگوں کو بغیر مقدمہ چلائے کیمپوں میں بند رکھا جائے' بغیر تشدد' بغیر بے چینی' بغیر ایذا رسانی' بغیر بھوک اور بغیر فقر اور بغیر ان انقلابات کے جن کی زد میں انسانیت آتی رہتی ہے اور جس میں کچھ لوگ دوسروں کو جسمانی یا روحانی طور پر غلام بنالیتے ہیں۔ اللہ کی غلامی کے سوا اور غلامیاں راسخ ہو جاتی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں یہاں اسی قدر کلام کافی ہے اور یہ آیات بذات خود جو گہرے اثرات نفس انسانی پر چھوڑتی ہیں وہ کسی تشریح کے محتاج نہیں ہیں۔ (مزید تشریح کے لئے پارہ ۳۰ میں سورہ عبس کی تشریح ملاحظہ فرمائیں)

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝٥٥ ع ۶ ۱۲

"اور اس طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں تاکہ مجرموں کی راہ بالکل نمایاں ہو جائے۔"

یہ اس لہر کا خاتمہ ہے۔ اس میں حقیقت رسالت اور مزاج رسول کی بڑی خوبی سے وضاحت کی گئی ہے اور اسلامی نظریہ حیات کو بھی کسی بغیر لاگ و لپیٹ کے بتایا گیا ہے۔ ان اقدار حیات کو بھی واضح کیا گیا ہے جن کے غلبے کے لئے اسلام اس جہان میں آیا اور ان کو بھی جدا کر دیا گیا جن کی بیخ کنی کے لئے اسلام اٹھا۔

(وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ (٦ : ٥٥)) (اس طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں) کیوں اس لئے کہ (لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ (٦ : ٥٥)) (تاکہ مجرموں کی راہ بالکل نمایاں ہو جائے) یعنی اس انداز' اس منہاج اور اس طرز کلام کے ساتھ ہم بیان مدعا کرتے ہیں۔ بڑی تفصیلات کے ساتھ جن کے بعد سچائی کی پہچان میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی۔ بات میں کوئی اجمال یا پیچیدگی نہیں رہتی اور اس فصاحت کے بعد سچائی کو تسلیم کرنے کے لئے کسی معجزے کی ضرورت نہیں رہتی۔ سچائی واضح ہو جاتی ہے' بات کھل جاتی ہے اور قرآنی انداز کلام کے مطابق۔ اس پوری سورہ کے اندر بیان ہونے والے شواہد و دلائل کے مطابق حقائق و واقعات کی روشنی میں یہ امور تفصیل آیات کے مفہوم میں شامل ہیں۔

مقصد مجرموں کی راہوں کو جدا کرنا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اسلامی نظریہ حیات اور اس کی اساس پر تحریک برپا کرنے کے لئے قرآن کا منہاج کیا ہے؟ (لِتَسْتَبِيْنَ) قرآن کا منہاج و انداز یہ نہیں ہے کہ وہ فقط مومنین و صالحین کی راہوں کی نشاندہی کر دے' بلکہ قرآن کا منہاج تحریک یہ ہے کہ قرآن کریم گمراہوں اور مجرموں کے طور طریقوں کی وضاحت بھی کرتا ہے۔ مجرموں کی راہوں کی وضاحت بذریعہ تنقید باطل بے حد ضروری ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل حق کے راستے کی وضاحت ہو۔ یہ دعوت اسلامی کے واضح خطوط ہیں جن پر ہمیں چلنا ہے۔ حق و باطل کا طریقہ کار یہاں سے جدا ہو جاتا ہے۔

اسلام کا منہاج عمل اللہ نے متعین کیا ہے اور یہ اس لئے متعین کیا گیا ہے کہ اس منہاج کے مطابق نفوس انسانی کا علاج کیا جائے۔ اللہ کو اس بات کا خوب علم تھا کہ سچائی و بھلائی پر پختہ یقین اس وقت حاصل ہوتا ہے کہ جب بھلائی کے مقابلے میں شر اور سچائی کے مقابلے میں جھوٹ پر بھی نظر رکھی جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ یہ باطل خالص جھوٹ اور شر محض ہے جس کے مقابلے میں حق خالص سچائی اور خیر محض ہے۔ نیز حق و صداقت کی حمایت پر انسان اس وقت آمادہ ہوتا ہے جب وہ یہ یقین کر لے کہ اس سچائی کا مقابلہ جو قوت کر رہی ہے وہ باطل ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ قوت

باطلہ مجرموں کی راہوں کی مسافر ہے اور مجرمین وہ قوت ہیں جن کے بارے میں ایک دوسری جگہ قرآن کریم یہ تصریح کرتا ہے کہ ہر نبی کا کوئی دشمن ہوتا ہے۔ (وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ) (اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے مجرموں میں سے ایک دشمن پیدا کیا) یہ اس لئے تاکہ نبی اور مومنین کے دلوں میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ جائے کہ ان کا دشمن مجرم ہے اور ان کا یہ عقیدہ پختہ یقین، اعتماد اور شرح صدر پر مبنی ہو۔

کفر، شر اور مجرمانہ حرکات کی وضاحت، ایمان، بھلائی اور اصلاح کے لئے نہایت ضروری ہوتی ہے۔ اس لئے کہ مجرمین کے راستوں کی وضاحت آیات الٰہیہ کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے، مجرمین کے موقف اور ان کے طرز عمل کے بارے میں کوئی بھی شعبہ یا معمولی التباس خود مومنین کے موقف، ان کے طرز عمل اور ان کی راہ میں شبہات پیدا کر دیتا ہے، اس لئے کہ دونوں تصویر کے دو رخ ہیں، کتاب کے صفحات متقابل ہیں اور دو جدا جدا راستے ہیں۔ دونوں کے الگ الگ رنگ ہیں جن کے درمیان امتیاز ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تحریک اسلامی کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کے کارکنوں کے فکر و نظر مومنین اور مجرمین کا راستہ ممتاز ہو۔ ہر تحریک کو چاہئے کہ وہ سب سے پہلے اپنے راستے کو متعارف کرائے اور اس کے بالمقابل مجرمین کے جو راستے ہیں ان پر تنقید کر کے ان کی کمزوریاں واضح کرے اور دونوں کے درمیان جو فرق و امتیاز ہے اسے کھول کر بیان کرے۔ یہ فرق و امتیاز عالم واقعہ میں بھی ہو، حقیقی ہو، محض نظریاتی نہ ہو، اس لئے کہ داعیوں اور ان کے کارکنوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ جس ماحول میں وہ کام کر رہے ہیں ان میں مومنین کون ہیں اور مجرمین کون ہیں؟ نیز ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان مجرمین کا طریق کار کیا ہے، ان کا منہاج کار کیا ہے اور ان کی علامات کیا کیا ہیں۔ تاکہ ان کے ذہن میں دونوں راستوں اور منہاج کے اندر کوئی شبہ و التباس نہ ہو۔ نہ عنوان ایک ہو اور نہ صفات اور خدوخال ایک ہوں۔ مومنین اور مجرمین ان کے تصور میں ایک دوسرے سے اچھی طرح ممتاز ہوں۔

جس وقت جزیرۃ العرب میں سب سے پہلے اسلام اور شرک کی مڈبھیڑ ہوئی، اہل ایمان اور مجرمین کے درمیان یہ فرق و امتیاز بالکل واضح تھا۔ دونوں کے راستے اچھی طرح ممتاز اور جدا تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ مومنین کا راستہ تھا اور یہی آپ کے ساتھیوں کا راستہ تھا اور مجرمین کا راستہ ان لوگوں کا راستہ تھا جو تحریک اسلامی میں آپ کے ساتھ شامل نہ ہوئے تھے اور ایمان نہ لائے تھے۔ اس حدبندی اور اس وضاحت کے ساتھ قرآن کریم نازل ہو رہا تھا اور آیات الٰہیہ تفصیلات دے رہی تھیں۔ جس کے نمونے. اس سورہ میں آپ نے دیکھے۔ یہ آخری نمونہ تو سبیل المجرمین کی اچھی طرح نشاندہی کر رہا ہے۔

جب اسلام نے شرک، بت پرستی، الحاد اور ان ادیان کا سامنا کیا جو اپنی اصل کے اعتبار سے ادیان سماوی تھے لیکن ان کے اندر بعد میں آنے والے انسانوں نے اپنی خواہشات کے مطابق تحریفات کر دی تھیں، تو اسلام نے ان ادیان و نظریات کے مقابلے میں مومنین کو ایک واضح موقف اور ایک صاف و سیدھا راستہ دیا۔ جس طرح ان کافروں اور مشرکوں کی راہ واضح اور متعین تھی، اور ان کے اندر کوئی تلبیس اور شک نہ تھا۔

لیکن آج عالم اسلام میں چلنے والی تحریکات اور ان کے مخالفین کے درمیان راستے کی صفائی اور اس کا تعین نہیں ہے۔ اور یہی بہت بڑی مشکل ہے۔ یہ اسلامی تحریکات ایسے لوگوں کے درمیان چل رہی ہیں جو نسلی اعتبار سے مسلمان ہیں

اور ایسے علاقوں میں چل رہی ہیں جو کسی وقت دارالاسلام میں شامل تھے۔ کسی وقت ان علاقوں پر دین اسلام کی حکمرانی تھی اور شریعت ان علاقوں کا بنیادی قانون تھی۔ پھر ان علاقوں نے اور ان اقوام نے حقیقی اعتبار سے اسلام کو چھوڑ دیا' صرف نام کے مسلمان رہ گئے اور انہوں نے اسلام کے بنیادی عناصر کو عملاً اور اعتقاداً ترک کر دیا۔ اگرچہ وہ اس زعم میں مبتلا رہے کہ انہوں نے عقیدے کے اعتبار سے اسلام کو اپنایا ہوا ہے۔ حالانکہ اسلام کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی اس بات کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ اور حاکم نہیں ہے۔ اس شہادت کے اندر یہ مفہوم شامل ہیں کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے' وہ اس کائنات کا خالق اور اس میں متصرف ہے۔ انسان صرف اسی کی عبادت کریں گے اور اسی کے احکام کے مطابق پوری زندگی بسر کریں گے۔ انسانوں کا یہ فرض ہو گا کہ صرف اللہ سے اپنے قوانین اخذ کریں اور اپنی پوری زندگی میں اللہ کے احکام کے سامنے سرتسلیم خم کریں۔ جو شخص اس مفہوم کے ساتھ اللہ کی وحدانیت کا اقرار نہیں کرتا تو اس نے نہ کلمہ شہادت پڑھا اور نہ وہ اسلام میں داخل ہوا۔ چاہے اس کا نام اور اس کا لقب اور اس کی نسل اور نسب جو بھی ہو۔ جس سرزمین پر بھی کلمہ شہادت اپنے اس مدلول کے ساتھ جاری نہ ہو تو اس سرزمین کو ہم دارالاسلام نہیں کہہ سکتے اور نہ وہ سرزمین' سرزمین اسلام ہے۔

اس کرۂ ارض پر لوگوں کی بڑی بڑی قومیں آباد ہیں جن کے نام مسلمانوں کے ناموں جیسے ہیں اور یہ لوگ ہیں بھی مسلمانوں کی نسلوں سے۔ ان لوگوں کے علاقے بھی کسی وقت دارالاسلام تھے لیکن ان میں سے آج کوئی قوم بھی لا الٰہ الا اللہ کی شہادت اس مفہوم کے مطابق نہیں دیتی اور نہ کسی ملک میں لوگ اس مفہوم کے مطابق نظام حکومت چلاتے ہیں۔

یہ ایک نہایت ہی تکلیف دہ صورت حال ہے' جس کا مقابلہ آج ان ملکوں میں اسلامی تحریکات کر رہی ہیں۔ ایسے لوگوں سے ان کا رابطہ ہے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ ان تحریکات کو یہ مشکل درپیش ہے کہ نام نہاد مسلمانوں کے اندر لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم نہیں سمجھا جاتا۔ اور نہ لوگ لفظ اسلام کو اس کے صحیح معنوں میں سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ نہ تو جاہلیت کے مفہوم سے آگاہ ہیں اور نہ ہی شرک کی حقیقت سے۔

اس کے علاوہ اسلامی تحریکات کو یہ مشکل بھی درپیش ہے کہ خود صالح مسلمانوں کے سامنے صحیح راستہ متعین نہیں ہے۔ ان کا راستہ مجرموں اور مشرکوں کے راستے سے جدا نہیں ہے۔ دونوں کے نشانات و عنوانات ایک ہیں۔ دونوں کے نام اور اوصاف ایک جیسے ہیں اور دونوں ایک ناپید اکنار صحرا میں گم گشتہ راہ ہیں۔

اسلامی تحریکات' اس کمزوری کو اچھی طرح جانتی ہیں' لیکن وہ اس عظیم کوتاہی کے بارے میں خاموش ہیں۔ یہ خاموشی محض وسعت قلبی' بے راہ روی' منافقت اور حق و باطل کے درمیان ملاوٹ کی وجہ سے اختیار کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس پوائنٹ پر جو شخص سچی اور فیصلہ کن بات کرتا ہے وہی الٹا مجرم بن جاتا ہے۔ اس کی پکڑ دھکڑ شروع ہو جاتی ہے اور اس پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ یہ شخص مسلمانوں کی تکفیر کرتا ہے۔ اس طرح ان لوگوں کے نزدیک مسلمان وہ نہیں جو اقوال خدا اور اقوال رسول کے مطابق مسلمان ہو بلکہ مسلمان وہ ہوتا ہے جو ان کی اپنی اصطلاحات اور ان کے رسم و رواج کے مطابق مسلمان ہو۔ یہ ہے وہ عظیم مشکل جو اسلامی تحریکات کی راہ میں مائل ہے۔ لیکن تمام اہل دعوت کے لئے لازم ہے کہ وہ اس مشکل مسئلے کو حل کر کے آگے بڑھیں' وہ جہاں بھی ہوں اور جس دور میں بھی ہوں۔

مناسب یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کی تحریک کا آغاز یوں کیا جائے کہ ابتداء ہی سے مومنین اور مجرمین کی راہیں بالکل

علیحدہ اور متعین ہو جائیں۔ اہل دعوت جب کام کا آغاز کریں تو حق اور صداقت کا اظہار بغیر کسی مداہنت کے دو ٹوک الفاظ میں کریں۔ وہ بغیر کسی خوف اور لاگ لپیٹ کے بات کریں۔ ان کی بات میں کوئی پیچیدگی نہ ہو اور وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔ ان کے دل میں کوئی خوف اور ڈر نہ ہو۔ نہ وہ اپنے دل میں اس بات کا خوف پیدا ہونے دیں کہ ان کے خلاف کوئی مخالفانہ آواز اٹھے گی اور یہ کہا جائے گا "دیکھو یہ لوگ تو مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں۔

اسلام کا موقف یہ نہیں ہے جو ان بے راہ رو لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ اسلام کا راستہ واضح ہے 'جس طرح کفر کی راہ بالکل واضح ہے۔ اسلام یہ ہے کہ کلمہ طیبہ کا اقرار درج بالا مفہوم کے ساتھ کیا جائے۔ جو شخص اس مفہوم کے ساتھ کلمہ طیبہ کا اقرار نہیں کرتا اور جو شخص اپنی زندگی میں کلمہ طیبہ کو اس مفہوم کے اندر قائم نہیں کرتا تو اس کے بارے میں اللہ اور رسول اللہ کا حکم یہ ہے کہ وہ ظالم 'فاسق اور کافر ہے اور مجرم ہے۔

ذرا پھر پڑھیے (وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ (٦: ٥٥)) (اور اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں تاکہ مجرموں کی راہ بالکل نمایاں ہو جائے) یاد رکھیے دعوت الی اللہ کا کام کرنے والوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے اس گھاٹی کو سر کریں۔ اپنی راہ سے اس رکاوٹ کو ہٹائیں۔ وہ اپنے نظریات کے اندر خلوص اور للہیت پیدا کریں تاکہ وہ اپنی پوری قوتوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں اٹھ کھڑے ہوں۔ کوئی شبہ ان کی راہ نہ روک سکے 'کوئی التباس 'کوئی مداہنت اور کوئی بے راہ روی ان کی راہ میں حائل نہ ہو 'اس لئے کہ ان کی قوتیں اس وقت تک کھل کر کام نہ کر سکیں گی جب تک انہیں یہ یقین نہ ہو کہ وہ سچے مسلمان ہیں اور یہ کہ جو لوگ ان کی راہ روکے کھڑے ہیں اور ان کو اور تمام دوسرے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکے ہوئے ہیں وہ مجرمین ہیں۔ یہ بات بھی تحریک اسلامی کے حاملین کے پیش نظر رہے کہ اقامت دین کے مسئلے کو جب تک کفر و ایمان کا مسئلہ نہ تصور کیا جائے گا اس وقت تک کوئی بھی اس راہ کی مشکلات کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو گا۔ جب تک ایک مسلمان یہ یقین نہ کر لے کہ اس کی راہ اور اس کی قوم کی راہ بالکل جدا ہے 'یہ کہ اس کی ملت اور اس کی قوم کی ملت جدا ہے اور یہ کہ ان کا دین اور ان کی قوم کا دین جدا ہے۔ ذرا پھر دہرائیے۔

(وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ (٦: ٥٥)) (اور اس طرح ہم نشانیاں کھول کر پیش کرتے ہیں تاکہ مجرموں کی راہ بالکل نمایاں ہو جائے) صدق اللہ العظیم۔

---OOO---

درس نمبر ٦٢ ایک نظر میں

حقیقت رسول ؐ اور حقیقت رسالت کے بیان کے بعد اب روئے سخن دوبارہ حقیقت الوہیت کی طرف پھر گیا ہے۔ ان حقائق پر سابقہ لہر میں بحث کی گئی تھی۔ ان تمام لہروں کا باہم گہرا ربط ہے۔ حقیقت رسول اور حقیقت رسالت کے بعد یہ بھی واضح کیا گیا کہ رسول کا راستہ مومنین کا راستہ ہے اور اس کے مقابلے میں تمام راستے مجرمین کے راستے ہیں۔

اس لہر میں شان کبریائی کا اظہار کئی رنگوں اور کئی میدانوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تفصیلات تو ہم تشریح آیات کے ضمن میں دیں گے البتہ یہاں ہم ان کی طرف اجمالی اشارات کریں گے۔

حقیقت الوہیت کا چراغ قلب رسول میں روشن ہے۔ رسول کا دل اعتماد اور یقین کی شراب طہور سے بھرپور ہوتا ہے۔ اگر پوری دنیا بھی اس حقیقت کو جھٹلا دے تو رسول ثابت قدم رہتا ہے اس کے پائے یقین میں کوئی لغزش نہیں آتی۔ اس لئے رسول اللہ اعلان کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے ہوگئے ہیں اور وہ اس معاملے میں ان لوگوں سے مکمل علیحدہ راہ اپنا لیتے ہیں جو اس بارے میں متزلزل ہوتے ہیں اور یہ جدائی رسول کے پختہ یقین اور عزم کی وجہ سے ہے۔

(قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ (٥٦) قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ (٥٧) ((٦: ٥٦-٥٧))

(اے نبی ؐ، ان سے کہو "تم لوگ اللہ کے سوا جن دوسروں کو پکارتے ہو ان کی بندگی کرنے سے مجھے منع کیا گیا ہے۔" کہو: "میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا، اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو گیا، راہ راست پانے والوں میں سے نہ رہا۔" کہو: "میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر قائم ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے۔ اب میرے اختیار میں وہ چیز ہے نہیں جس کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو، فیصلے کا سارا اختیار اللہ کو ہے، وہی امر حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے)۔ شان کبریائی کا اظہار اس حلم اور برداشت سے بھی ہوتا جس کا برتاؤ اللہ تعالیٰ ان مکذبین کے ساتھ فرماتے ہیں۔ وہ تو مطالبہ کرتے ہیں کہ ان پر خارق عادت معجزے کا وقوع ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ ان کے اس مطالبے کے جواب میں نہایت ہی بردباری کا عمل اختیار فرماتے ہیں اور یہ اس لئے کہ اگر کسی خارق عادت معجزے کا ظہور ہو جائے اور پھر وہ تکذیب کریں تو سنت الٰہیہ کے مطابق پھر ان پر نزول عذاب لازم ہو جائے گا اور ہر قسم کا عذاب نازل کرنا اللہ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں

ہے۔ اگر نزول عذاب کو خود حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں دے دیا جاتا تو ان لوگوں نے جو رویہ اختیار کیا اس کے پیش نظر یہ خطرہ تھا کہ حضور ان پر یہ عذاب نازل ہی کر دیتے کیونکہ انہوں نے بار بار ناحق جھٹلا کر آپ کو دل تنگ کر دیا تھا اور آپ کی قوت برداشت سے یہ صورت حال باہر ہو گئی تھی۔ لہٰذا ایسے حالات میں بھی ان کو مہلت دے دینا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نہایت ہی حلیم و حکیم ہے اور اس سے شان کبریائی کا ظہور بھی ہوتا ہے۔

(قُلْ لَوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ

(٦ : ٥٨)) (کہو: "اگر کہیں وہ چیز میرے اختیار میں ہوتی جس کی تم جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ مگر اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ ظالموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جانا چاہئے؟") شان کبریائی کا ظہور اس حقیقت سے بھی ہوتا ہے کہ وہ عالم الغیب ہے اور اس کائنات کے اندر جو واقعہ بھی ہوتا ہے، اس کا علم اسے احاطے میں لئے ہوئے ہے اور یہ علم اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں ہے۔ اس غیب کا یہ نقش اور یہ صورت صرف اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔

(وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ

(٦ : ٥٩)) (اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے۔ درخت سے گرنے والا کوئی پتہ ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو۔ زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔ خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے)۔ اس کا اظہار اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ اللہ کو اپنے بندوں پر مکمل گرفت حاصل ہے۔ وہ ہر حال میں اللہ کے کنٹرول میں ہیں، سوتے ہوں یا جاگتے، زندہ ہوں یا مردہ اور دنیا میں ہوں یا آخرت میں ہوں۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (٦٠) وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَیُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةً حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ (٦١) ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ

(٦٢) (٦ : ٦٠ تا ٦٢)) (وہی ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہے، پھر دوسرے روز تمہیں اسی کاروبار کے عالم میں واپس بھیج دیتا ہے تاکہ زندگی کی مقررہ مدت پوری

ہو۔ آخرکار اسی کی طرف تمہاری واپسی ہے' پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو؟ اپنے بندوں پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے اور تم پر نگرانی کرنے والے مقرر کر کے بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو اس کے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی جان نکال لیتے ہیں اور اپنا فرض انجام دینے میں ذرا کوتاہی نہیں کرتے' پھر سب کے سب اللہ' اپنے حقیقی آقا کی طرف واپس لائے جاتے ہیں' خبردار ہو جاؤ فیصلہ کے سارے اختیارات اسی کو حاصل ہیں اور وہ حساب لینے میں بہت تیز ہے۔)

یہ شان کبریائی خود ان لوگوں کے اس فطری ردعمل کے وقت بھی ظاہر ہوتی ہے جب یہ جھٹلانے والے کسی خطرے سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ لوگ دوسرے شرکاء کو چھوڑ کر صرف اللہ کو پکارتے ہیں کہ وہ اس خطرے کو ٹال دے لیکن اس کے باوجود پھر شرک کرنے لگتے ہیں اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس خطرے کو ٹالنے کے لئے وہ جس خدا کو پکارتے تھے وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ انہیں کسی دوسرے ایسے عذاب سے دوچار کر دے جس کے بعد ان میں سے کوئی زندہ نہ بچے۔

(قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ (٦٣) قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ (٦٤) قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ (٦٥) (٦: ٦٣ تا ٦٥)) (اے نبی ''ان سے پوچھو' صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں کون تمہیں خطرات سے بچاتا ہے' کون ہے جس سے تم (مصیبت کے وقت) گڑگڑا گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعائیں مانگتے ہو؟ کس سے کہتے ہو کہ اگر اس بلا سے اس نے ہم کو بچا لیا تو ہم ضرور شکر گزار ہوں گے؟ کہو' اللہ تمہیں اس سے اور ہر تکلیف سے نجات دیتا ہے۔ پھر تم دوسروں کو اس کا شریک ٹھہراتے ہو۔ کہو ''وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب اوپر سے نازل کر دے' یا تمہارے قدموں کے نیچے سے برپا کر دے' یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزہ چکھوا دے۔'' دیکھو ہم کس طرح بار بار مختلف طریقوں سے اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں شاید کہ یہ حقیقت کو سمجھ لیں)۔

---ooo---

درس نمبر ٦٢ تشریح آیات

٥٦ ---- تا ---- ٦٥

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ۝۵۶ قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَ هُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ۝۵۷ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ۝۵۸

(اے نبی ؐ' ان سے کہو کہ "تم لوگ اللہ کے سوا جن دوسروں کو پکارتے ہو ان کی بندگی کرنے سے مجھے منع کیا گیا ہے۔" کہو "میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا' اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو گیا' راہ راست پانے والوں میں سے نہ رہا۔ "کہو' میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر قائم ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے۔ اب میرے اختیار میں وہ چیز ہے نہیں جس کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو' فیصلہ کا سارا اختیار اللہ کو ہے' وہی امر حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔" کہو' "اگر کہیں وہ چیز میرے اختیار میں ہوتی جس کی تم جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ اور اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ ظالموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جانا چاہئے)۔

یہ لہر ہدایات اور اشارات سے بھری پڑی ہے۔ اس میں قلب انسانی پر اثرانداز ہونے والے مختلف عوامل کے ذریعے حقیقت الوہیت کو نظروں کے سامنے لایا گیا ہے۔ ان مؤثرات اور ضربات میں سے اہم اور گہرا مؤثر اس میں لفظ قل کا تکرار ہے' کہہ دو' کہہ دو' کہہ دو' اس میں خطاب رسول اللہ ؐ کو کیا گیا ہے کہ آپ اپنے رب کی طرف سے آنے والے ہر پیغام کو پہنچا دیں۔ یہ وہ پیغام ہے جو کسی اور گروہ کے پاس نہیں ہے' کوئی اور اس پیغام کا حامل نہیں ہے

اور نہ یہ پیغام کسی اور پر القا ہوتا ہے۔

قُلْ اِنِّی نُهِيتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَ كُمْ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ (٥٦)(٦: ٥٥-٥٦)) "اے نبی " ان سے کہو کہ "تم لوگ اللہ کے سوا جن دوسروں کو پکارتے ہو ان کی بندگی کرنے سے مجھے منع کیا گیا ہے۔" کہو "میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا' اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو گیا' راہ راست پانے والوں میں سے نہ رہا۔" حضور " کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اعلان فرما دیں کہ آپ کو ان لوگوں کی بندگی کرنے اور ان کی پیروی کرنے سے خدا نے منع کر دیا ہے جن کی بندگی اور پیروی تم مشرکین کرتے ہو۔ میں تمہارے معبودوں کو کسی صورت میں اپنے رب کا ہمسر نہیں بنا سکتا۔ اس لئے کہ مجھے اس بات سے روک دیا گیا کہ میں لوگوں کی خواہشات کی پیروی کروں اور جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی کرتے ہیں وہ محض اپنی خواہشات نفس کی وجہ سے ان لوگوں کی پیروی کرتے ہیں اور انہیں اللہ کا ہمسر بناتے ہیں۔ وہ کسی علم یا دلیل کی وجہ سے ایسا نہیں کر رہے۔ اور نہ اس وجہ سے کر رہے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ کوئی حق بات ہے۔ نیز یہ کہ اگر میں ان لوگوں کی پیروی کروں تو میں گمراہ ہو جاؤں گا اور ہدایت یافتہ نہ رہوں گا کیونکہ جن لوگوں پر ان کی خواہشات مسلط ہوتی ہیں وہ لازماً گمراہی کا شکار ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیتے ہیں کہ آپ مشرکین کے ساتھ اس انداز میں ہمکلام ہوں۔ ان کے ساتھ اس انداز میں دو ٹوک بات کریں۔ اس سورہ میں اس سے پہلے بھی حضور کو حکم دیا جا چکا ہے۔

(اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى قُلْ لَّآ اَشْهَدُ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِي بَرِيٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ (٦: ١٩)) "کیا واقعی تم لوگ یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرا خدا بھی ہے؟ کہو' میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں دے سکتا۔ خدا تو وہی ایک ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔" مشرکین مکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پیشکش کرتے رہے تھے کہ آپ ان کے دین کو مان لیں اور وہ آپ کے دین کو تسلیم کریں گے۔ آپ ان کے خداؤں کے سامنے سجدہ ریز ہوں اور وہ آپ کے اللہ واحد کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ شاید اس قسم کی مصالحت و مسالمت کا امکان ہے اور یہ کہ ایک ہی دل میں شرک اور توحید جمع ہو سکتے ہیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ غیراللہ کی بندگی اور پیروی کے ساتھ ساتھ اللہ کی بندگی اور پیروی بھی ممکن ہے حالانکہ یہ اجتماع ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ اللہ کو کیا پڑی ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسرے شریکوں کو تسلیم کرے۔ وہ تو یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اس کے بندے صرف اور صرف اس کی بندگی کریں۔ اللہ کو وہ بندگی سرے سے قبول ہی نہیں ہے جس میں شرک کا کوئی شائبہ تک موجود ہو' چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔

آیت کا مقصد تو یہ ہے کہ حضور " ان سے یوں مخاطب ہوں کہ آپ " کو ان کی بندگی سے منع کر دیا گیا ہے جن کی یہ لوگ بندگی کرتے ہیں یا جنہیں وہ الٰہ کہتے ہیں۔ لیکن یہاں انداز تعبیر یوں ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے "الذین" کا لفظ

استعمال کیا گیا ہے جو قابل غور ہے اس لئے کہ الذین کا لفظ ذو العقول کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اگر مراد صرف بتوں سے ہوتی یا دوسرے بے جان معبود مراد ہوتے تو یہاں لفظ (ما) استعمال ہوتا (الذین) استعمال نہ ہوتا۔ لہذا یہاں بتوں اور دوسرے حجر و شجر سے کوئی اور مخلوق مراد ہے جن کے لئے لفظ الذین استعمال ہوا ہے۔ ان معبودوں کے لئے الذین کی ضمیر استعمال بتاتا ہے کہ معبود ذو العقول تھے۔ اس تعبیر کی تائید دو باتوں سے ہوتی ہے ایک تو واقعی تاریخی حقائق سے اور دوسری اسلامی اصطلاحات سے۔

تاریخی واقعہ یہ ہے کہ مشرک صرف پتھر کے بتوں اور درختوں کی پوجا نہ کرتے تھے بلکہ ان کے ساتھ وہ جنوں' فرشتوں اور انسانوں کو بھی پوجتے تھے۔ انسانوں کی پوجا اس طرح کرتے تھے کہ وہ انسانوں کو قانون سازی اور افراد کے لئے راہنمائی کا حق دیتے تھے یہ انسان ان کے لئے رسم و رواج قوانین اور ضابطے بناتے تھے جن کے مطابق ان کے ہاں اجتماعی عمل ہوتا اور تنازعات کے فیصلے ہوتے۔ ان انسانوں کی رائے اور دوسرے انسانوں کے رواج کے مطابق۔

اب ہم اسلامی اصطلاحات کی طرف آتے ہیں۔ اسلام اسے شرک تصور کرتا ہے۔ اسلام کا تصور یہ ہے کہ انسانوں کے امور زندگی میں کچھ دوسرے انسانوں کو حاکم بنانا اس طرح ہے جس طرح انہیں کوئی اپنا الہ بنا لے اور انہیں اللہ کا شریک اور ہمسر بنا دے۔ اسلام اس حرکت سے اسی طرح منع کرتا ہے جس طرح اسلام بتوں اور پتھروں کی پوجا سے منع کرتا ہے۔ یہ دونوں کام اسلام کے عرف میں برابر اور مساوی درجے کے منکرات ہیں۔ یہ صریح شرک ہے اور اللہ کے ساتھ دوسروں کو ہمسر بنانا ہے۔ اب پہلی چوٹ کے ساتھ متصلاً دوسری چوٹ لگتی ہے۔ یہ دوسری ضرب پہلی ضرب کی تکمیل ہے اور اس سے متصل ہے۔

(قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ (۶:۵۷)) "کہو' "میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر قائم ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے' اب میرے اختیار میں وہ چیز ہے نہیں جس کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو' فیصلہ کا سارا اختیار اللہ کو ہے' وہی امر حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔"

یہ ضرب اللہ کی جانب سے ہے۔ اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتے ہیں کہ آپ کفار اور جھٹلانے والوں کے سامنے واضح الفاظ میں اس بات کا اعلان کر دیں کہ آپ کے دل میں اپنے پیغام کے بارے میں پختہ یقین ہے اور آپ کو اس سلسلے میں مکمل یکسوئی حاصل ہے۔ آپ کے شعور میں اس پیغام کی سچائی پر بین دلائل موجود ہیں اور آپ کی ذات میں اس امر کا گہرا وجدانی احساس موجود ہے کہ آپ ؐ جو پیغام دے رہے ہیں وہ حق ہے۔ یہ ایک ایسا شعور ہے' جو تمام نبیوں کے اندر پوری طرح پایا جاتا ہے اور تمام نبیوں نے اس احساس و شعور اور وجدانی راہنمائی کا اظہار ایسے ہی الفاظ میں کیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا:

(قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰىنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّیَتْ عَلَیْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ (۱۱:۲۸)) "نوح نے کہا اے برادران قوم' ذرا سوچو تو

سی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا' اور پھر اس نے مجھ کو اپنی خاص رحمت سے بھی نواز دیا مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو تمہارے سر پر چپکا دیں۔" اور حضرت صالح علیہ السلام نے کہا :

(قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ (۱۱ : ۶۳) "صالح نے کہا اے برادران قوم' تم نے کچھ اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا اور پھر اس نے مجھے اپنی رحمت سے بھی نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھے کون بچائے گا اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ تم میرے کس کام آسکتے ہو؟ سوائے اس کے کہ مجھے اور خسارہ میں ڈال دو۔" اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا :

(وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ (۶ : ۸۰) "اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے قوم سے کہا :" کیا تم لوگ اللہ کے معاملے میں مجھ سے جھگڑتے ہو حالانکہ اس نے مجھے راہ راست دکھا دی ہے۔" اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا :

(فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۲ : ۹۶)) "پھر جب خوشخبری لانے والا آیا تو اس نے یوسف کا قمیص یعقوب کے منہ پر ڈال دیا اور یکایک اس کی بینائی عود کر آئی۔ تب اس نے کہا :" میں تم سے کہتا نہ تھا؟ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

یہ ہے حقیقت خدائی' جو اللہ والوں کے دل میں روشن چراغ کی طرح نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن صرف ان لوگوں کے دلوں میں یہ چراغ روشن ہوتا ہے جن کے دلوں میں اللہ روشن کرنا چاہے۔ ایسے لوگ اللہ کو اپنے دل میں موجود پاتے ہیں اور ان کی شخصیت کی گہرائیوں میں یہ حقیقت بیٹھ جاتی ہے اور ان کے دلوں کو یقین سے بھر دیتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے بارے میں اللہ اپنے نبی کو حکم دیتا ہے کہ وہ مشرکین کے سامنے اس کا اعلان ببانگ دہل کر دیں۔ مشرکین دراصل دعوت الی اللہ کی تکذیب کرنا چاہتے ہیں اور وہ حیلے بہانے بنا کر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ اس حقیقت کو تسلیم کرانے کے لئے معجزات پیش کریں حالانکہ یہ حقیقت تو قلب رسول میں روشن چراغ کی طرح موجود ہے۔

(قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ((۶ : ۵۷)) (کہو' میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر قائم ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے) وہ ہمیشہ یہ مطالبہ کرتے رہتے تھے کہ یا تو ان پر کوئی خارق عادت معجزہ نازل ہو جائے یا ان پر عذاب الہی نازل ہو جائے تاکہ وہ اس بات کو تسلیم کر لیں۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم دیا جاتا تھا کہ اس سوال کے جواب میں آپ ان کے سامنے رسول اور رسالت کی حقیقت کا اعلان کریں اور رسول اور رسالت اور اللہ اور اس کی الوہیت و حاکمیت کے درمیان مکمل فرق بیان کریں۔ نیز یہ بھی اعلان کر دیں کہ جس عذاب اور

معجزے کی آمد میں کے لئے وہ عجلت کا اظہار کر رہے ہیں اس کے صدور میں ان کو بالکل اختیارات نہیں ہیں - یہ کام تو صرف اللہ کے دست قدرت میں ہے - وہ تو الٰہ نہیں وہ تو فقط پیغام بر ہیں -

(مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ

(٦:٥٧)) "میرے اختیار میں وہ چیز نہیں ہے جس کی تم جلدی مچا رہے ہو، فیصلے کا سارا اختیار اللہ کو ہے - وہی حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے -" کسی معجزے کا آنا اور اس کے بعد نہ ماننے کی صورت میں ان پر عذاب الٰہی کا نزول ایک ایسا معاملہ ہے جس کا تعلق اللہ کے فیصلے اور حکم سے ہے اور اس معاملے میں جج اور فیصلہ کرنے والا صرف اللہ ہی ہے - اللہ ہی حق بیان کرنے والا ہے اور اطلاع دینے والا ہے - اللہ ہی ہے جو کسی پیغمبر اور اس کی امت دعوت کے درمیان فیصلے کا اختیار رکھتا ہے - کسی انسان کو اس باب میں کوئی اختیار اور حق مداخلت نہیں دیا گیا ہے -

اس طرح رسول اللہ اعلان کر دیتے ہیں کہ ایسا کوئی فیصلہ کرنے کا انہیں کوئی اختیار نہیں ہے اور نہ وہ قضا و قدر کے ان امور میں مداخلت کر سکتے ہیں - یہ اللہ کے نظام الوہیت کے ساتھ مخصوص ہے اور خصائص الوہیت میں سے ہے جبکہ وہ خود ایک بشر ہیں - ہاں امتیاز یہ ہے کہ ان کی طرف وحی آتی ہے - ان کا فرض یہ ہے کہ وہ اسے لوگوں تک پہنچا دیں اور انہیں انجام بد سے ڈرائیں - ان کا یہ منصب نہیں ہے کہ فیصلے کریں اور ان کے مطابق لوگوں کو سزا دیں - جس طرح اللہ تعالیٰ حق بیان کرتا ہے اور ہمیں اس کی اطلاع دیتا ہے اسی طرح فیصلوں کا اختیار بھی اللہ کو ہے - یہ وہ انداز ہے جس کے سوا ایک بشر اور ذات باری کے درمیان فرق و امتیاز کی کوئی اور سبیل نہیں ہے -

اس کے بعد حضرت کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ان کے قلب و نظر سے اپیل کریں اور ان کی توجہ ان قوی دلائل و اشارات کی طرف مبذول کرائیں جو اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ پیغام اللہ کی جانب سے ہے اور اس کا فیصلہ بھی مشیت الٰہی پر موقوف ہے - اگر معجزات کا صدور اور عذاب الٰہی کا نزول آپ کے قبضہ قدرت میں ہوتا تو تقاضائے انسانیت کے نتیجے میں آپ فوراً ہی یہ چیلنج قبول کر لیتے اور اس معاملے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے کیونکہ وہ تو اس امر کا بار بار باصرار مطالبہ کرتے تھے - لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ معاملہ اللہ کے اختیار میں تھا اور اللہ وہ ذات ہے جو اپنے بندوں کے مقابلے میں نہایت ہی حلیم ہے - اسی لئے اللہ تعالیٰ کوئی خارق عادت معجزہ نہیں صادر فرماتے کیونکہ اس کے بعد ان پر عذاب آتا ہے - وہ تو تکذیب پر تلے ہوئے تھے اور یہ وہ بات ہے جو تاریخ میں اس سے قبل اقوام و ملل کو پیش آتی رہی ہے -

(قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَيْنِیْ وَبَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

بِالظّٰلِمِيْنَ (٦:٥٨)) "کہو، اگر وہ چیز میرے اختیار میں ہوتی جس کی تم جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا - اور اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ ظالموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جانا چاہئے -" جہاں تک انسان کا تعلق ہے 'صبر' 'حلم' بردباری اور مہلت دینے میں اس کی صلاحیت محدود ہے - جب انسان 'انسان' کے خلاف بغاوت اور سرکشی اختیار کرتا ہے تو انسان کی قوت برداشت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ انسان دوسرے زیر دست انسان کی

جانب سے سرکشی کو برداشت ہی نہیں کرتا لیکن اللہ حلیم ' بردبار اور قوی ہے ' وہ عظمت والا ہے۔

ذرا کلام الٰہی پر غور کرو۔ بارہا ایسا ہوتا ہے انسان بعض دوسرے انسانوں سے ایسے امور دیکھتا ہے کہ اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا ہے اور اس کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں دیکھو کہ انسان اللہ کی نافرمانی کرتا چلا جاتا ہے لیکن وہ پھر بھی اللہ کی زمین پر رہتے ہیں ' وہ اللہ کھانا و پینا فراہم کرتا ہے ' ان پر بارش برساتا ہے ' ان کے لئے ہر طرف سے فراوانی کے دروازے کھول دیتا ہے اور اس کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہیں رہتا کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی بات کو دہرائے۔ ایک بار وہ معرکہ جنگ میں تھے۔ معرکہ اس قدر گرم تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا اور کفار نے فیصلہ کن حملہ کیا ہوا تھا۔ ہر طرف سے بزن کا عالم تھا۔ آپ نے فرمایا: "اے اللہ آپ کس قدر حلیم اور بردبار ہیں! اے اللہ آپ کس قدر حلیم و بردبار ہیں۔ غرض یہ اللہ کا علم اور بردباری ہی ہے کہ نافرمانوں کو مہلت دیئے جا رہی ہے۔

(وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ (٦: ٥٨)) "اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ ظالموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جانا چاہئے۔" وہ جانتے ہوئے مہلت دیتا ہے۔ وہ حکمت کے ساتھ انہیں ڈھیل دیتا ہے۔ وہ علیم بھی ہے اور قدرت بھی رکھتا ہے کہ ان کے مطالبے کو بھی پورا کر دے اور انہیں سخت عذاب سے بھی دوچار کر دے۔"

---ooo---

* بات یہ ہو رہی تھی کہ اللہ ظالموں کے بارے میں خوب جانتے ہیں ' اور یہ کہ حقیقت الوہیت اور شان کبریائی کیا ہے ' اس مناسبت سے یہاں شان کبریائی کے ایک وسیع ترمیدان کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور یہ وسیع ترمیدان عالم غیب ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کا علم تمام خفیہ باتوں پر محیط ہے۔ یہاں اللہ کے علم کی وسعت کی عجیب اور منفرد تصویر کشی کی جاتی ہے اور اس میدان میں اللہ کے علم کی وسعتوں کی طرف دور تک راہوار خیال کو گامزن کیا جاتا ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٥٩﴾

"اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے۔ درخت سے گرنے والا کوئی پتہ ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو۔ زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔ خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

اللہ کے کامل اور محیط علم کی یہ نہایت خوبصورت تصویر ہے۔ یہ علم اس قدر محیط ہے کہ زمان و مکان کا ایک ذرہ بھی

اس سے باہر نہیں ہے۔ زمین و آسمان کی ہر چیز اس کے علم میں ہے۔ بر و بحر کے تمام موجودات اس کے علم کے دائرے کے اندر ہیں۔ فضاؤں اور زمین کی گہرائیوں میں پائے جانے والے تمام ذرات بھی اس کے دائرۂ علم کے اندر ہیں۔ خشک و تر اور زندہ و مردہ ہر چیز اس کے علم میں ہے۔

ہمارے اس بیان اور آیت زیر بحث کے اسلوب بیان میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قرآن کا انداز نہایت ہی منفرد، شامل و کامل، گہرا عمیق اور نہایت ہی مؤثر اور معنی آفریں ہے۔

ہمارا راہوار خیال اس مختصر آیت کے پیچھے سرپٹ بھاگتا ہے۔ ہمارا خیال عالم معلومات اور عالم مجہولات میں گھوڑے دوڑاتا ہے۔ انسان عالم غیب و عالم شہادت پر غور و فکر کرتا ہے تو اس کا وجدان اور مشاہدہ کانپ اٹھتا ہے کہ ہر وادی میں اور ہر طرف اسے مشاہدات و مظاہر کی نئی نئی شکلیں نظر آتی ہیں۔ انسان کی جدوجہد بڑی تیزی سے اپنی تلاش نامعلوم کے لئے جاری ہے۔ وہ غیب کے پردوں کو پھاڑ کر سب کچھ عیاں کرنا چاہتا ہے۔ وہ ماضی اور مستقبل کے تمام پردے ہٹانا چاہتا ہے۔ زمان و مکان کے آفاق اور گہرائیوں میں وہ دور تک جھانکنا چاہتا ہے لیکن وہ جس سمت سے آگے بڑھتا ہے اسے نظر آتا ہے کہ غیب کی چابیاں تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ ایک حد پر جاکر اس کو علم و انکشافات کے دروازے مقفل نظر آتے ہیں اور آگے کی چابیاں اللہ کے پاس ہیں۔ غرض انسان کا وجدان کائنات کی تاریک وادیوں اور سمندر کی گہرائیوں میں دوڑتا ہے۔ یہ سب جگہیں اللہ کے علم کے زاویے سے عیاں ہیں۔ پھر ہمارا شعور دنیا کے ہر خزاں میں گرنے والے پتوں کی طرف جاتا ہے، جن کی تعداد سے انسان بے خبر ہیں لیکن اللہ کی آنکھ ایک ایک کو دیکھ رہی ہے کہ کس طرح وہ امر ربی سے گرتا ہے اور اس پوری کائنات میں یہ علم ان پتوں تک وسیع ہے۔ اس کائنات میں اگنے والے بے شمار پودوں سے نکلنے والے چھوٹے چھوٹے بیج اور ان کا ایک ایک دانہ جو ظلمات ارض میں کہیں پڑا ہے وہ بھی اللہ کی نظر میں ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات کا ہر خشک و تر اللہ کی نظروں میں ہے اور کوئی بھی چیز علم الٰہی سے باہر نہیں ہے۔

غرض یہ تصور سر کو چکرا دیتا ہے اور اس سے عقل مبہوت ہو جاتی ہے۔ یہ تصور اور شعور ہمیں تاریخ اور زمانوں کی طوالتوں میں لے جاتا ہے۔ یہ آفاق کائنات کی دوریوں کا تصور دلاتا ہے۔ عالم معلوم اور مشاہد اور عالم غیب اور مجہول کا تصور انسان کرتا ہے تو اس میں ہر طرف وسعت ہی وسعت نظر آتی ہے۔ راہوار خیال تھک کر چورچور ہو جاتا ہے لیکن قرآن کریم کے چند کلمات ان وسعتوں اور دوریوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ یہ ہے قرآن کا اعجاز، اعجاز عبارت اور اعجاز خیال۔ جس پہلو سے بھی ہم اس مختصر آیت پر نگاہ ڈالیں یہ معجز ہے اور یہ اعجاز ہمیں واضح طور پر اس طرف لے جاتا ہے کہ اس عظیم کلام کا مصدر اور منبع کیا ہے؟

قرآن کریم جو اسلامی تصور حیات کا مصدر اور سرچشمہ ہے اور جس سے اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی ہے، وہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ اس کائنات کے دو جہان ہیں، ایک عالم غیب ہے اور دوسرا عالم مشاہدہ یا عالم شہادت۔ لہٰذا انسان جس جہان میں رہتا ہے اس کے تمام حقائق غیبی نہیں ہیں اور نہ اس کا واسطہ عالم مجہولات سے ہے بلکہ یہاں عالم شہادت بھی ہے۔

اس کائنات کے اندر بعض ناقابل تغیر قوانین اور سنن ہیں اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ سنن کائنات میں سے ضروری کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ اپنی اس صلاحیت اور ضرورت کے مطابق اسے یہ صلاحیت اس لئے دی گئی ہے کہ وہ یہاں خلافت ارضی کے منصب سے وابستہ فرائض ادا کر سکے اور اپنی زندگی کو سنن کائنات کے ساتھ ہم

آہنگ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس قدر صلاحیت دی ہے جس قدر اسے منصب خلافت کے تقاضے پورے کرنے کے لئے درکار ہے۔ تاکہ انسان کائناتی قوتوں کو مسخر کر کے اس زمین کو آباد کر سکے' یہاں زندگی کو ترقی دے سکے اور انسانی زندگی کی بہتری کے لئے اللہ نے اس کائنات کے اندر جو ذخائر ودیعت کئے ہیں انہیں کام میں لا سکے۔

لیکن ان قوانین قدرت کے ساتھ ساتھ مشیت الٰہی بھی بطور ایک حقیقت کے موجود ہے۔ اگرچہ یہ تمام قوانین قدرت مشیت ازدی کا نتیجہ ہیں لیکن یہ قوانین قدرت مشیت الٰہیہ کے بجائے تقدیر الٰہی کے مطابق کام کرتے ہیں۔ یہ تمام قوانین قدرت الٰہیہ کے تحت چلتے ہیں۔ یہ کوئی خود مختار یا کنٹرول سے باہر مشینری نہیں ہے۔ اللہ کی قدرت اور اس کی تقدیر ان قوانین پر پوری طرح محیط ہے۔ اس کائنات کی ہر حرکت اس کے دائرہ قدرت میں ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ کائنات ایک ناموس کے مطابق رواں دواں ہے لیکن یہ ناموس اللہ کا پیدا کردہ ہے۔ اللہ کا نظام قضا و قدر ان قوانین قدرت کو نافذ کرتا ہے۔ نظام قضا و قدر عالم غیب کا حصہ ہے اور اس کے بارے میں علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ لوگوں نے جو سائنسی اصول وضع کر رکھے ہیں وہ بھی ظنی اور احتمالی ہوتے ہیں اور آج تک انسان نے اس کائنات کے جو راز معلوم کئے ہیں ان کے اندر بھی یہ اعتراف موجود ہے۔

ذرا انسان کے اس مختصر وجود پر غور کیجئے۔ اس کے اندر ہر لحظہ لاکھوں ذرات سرگرداں ہیں۔ یہ سب تصرفات انسانی نقطہ نظر سے غیب ہیں۔ اگرچہ یہ تمام حرکات اور مؤثرات خود اس کے وجود کے اندر روبعمل رہتے ہیں۔ پھر اس عظیم کائنات کے اندر جو مؤثرات کام کر رہے ہیں وہ تو لاتعد و لاتحصی ہیں۔ انسان ان میں سے کچھ بھی نہیں جانتا۔

عالم غیب انسان کے ماضی پر بھی محیط ہے اور اس کائنات کے ماضی پر بھی محیط ہے۔ انسان اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی اس کائنات اور اس کی موجودہ حالت پر بھی عالم غیب محیط ہے۔ نیز ان کے مستقبل پر بھی عالم غیب محیط ہے۔ یہ سب امور سنن الٰہیہ کے مطابق روبعمل ہیں جن میں سے نہایت ہی قلیل مقدار کا علم ابھی تک انسان کو ہو سکا ہے۔ انسان ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور انہیں منظم اور مربوط طریقے سے فریضہ خلافت کی ادائیگی میں استعمال کر رہا ہے۔

انسان اس کائنات میں اپنی خواہش کے مطابق نہیں آتا۔ نہ اسے یہ علم ہوتا ہے کہ اب وہ اس جہان میں وارد ہو گا۔ جب وہ اس جہان سے رخصت ہوتا ہے تب بھی اس رخصتی میں اس کی خواہش شامل نہیں ہوتی اور نہ اسے علم ہوتا ہے کہ کب اسے جانا ہے۔ یہی صورت حال ہر زندہ مخلوق کی ہے۔ انسان جس قدر علم بھی حاصل کر لے اور اس کی معرفت اور آگاہی کا دائرہ کتنا ہی وسیع تر کیوں نہ ہو جائے وہ اس صورت حالات میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا۔

اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر اپنی ماہیت کے اعتبار سے "غیبی علمی" نوعیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ غیب اور عدم علم سائنسی اعتبار سے بھی حقیقی علم ہے۔ جو لوگ غیب کا انکار کرتے ہیں وہ جاہل ہیں حالانکہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ بہت کچھ جاننے والے ہیں۔

اسلامی فکر کی اساس یہ ہے کہ ایک مسلمان ایسے غیبی حقائق کے وجود کا اقرار کرتا ہے جس کا حقیقی علم صرف اللہ کو ہے۔ اس علم کی کنجیاں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ پھر اسلامی فکر یہ بھی یقین رکھتی ہے کہ یہ کائنات سنن الٰہیہ کے مطابق چل رہی ہے۔ اور ان سنن الٰہیہ میں سے بعض ایسے ہیں جن کا علم فریضہ خلافت فی الارض کے لئے ضروری ہے۔ ان اصولوں کے ساتھ مضبوط اساسوں پر ہم آہنگی اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر کی وجہ سے انسان نہ علم و معرفت سے محروم ہوتا ہے اور نہ حقیقت واقعیہ کے ادراک سے محروم ہوتا ہے۔ اس عالم شہادت سے آگے ایک عالم غیب ہے اور

اس عالم مغیبات کا علم صرف اللہ کو ہے اور اپنے بندوں میں سے اگر اللہ چاہے تو کسی قدر علم کسی کو عطا کر دے۔

ایمان بالغیب وہ دشوار گزار گھاٹی ہے جس کو انسان نے ضرور عبور کرنا ہے۔ جب تک وہ اس مقام پر فائز نہیں ہوتا وہ حیوانی مقام سے بلند ہو کر انسانی مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ حیوان صرف ان امور کا ادراک کر سکتا ہے جو اس کے حواس کے دائرے میں آتے ہیں۔ اس حقیقت کا ادراک صرف انسان ہی کر سکتا ہے کہ یہ کائنات صرف اسی قدر محدود نہیں ہے جو اس کے حواس میں آتی ہے یہ بہت ہی وسیع ہے بلکہ اس سے بھی وسیع تر ہے جو بذریعہ آلات اس کے ترقی دادہ حواس خمسہ کے دائرہ ادراک میں آ رہی ہے۔ یہ اسلامی تصور اس کائنات کے تصور سے کہیں وسیع تر تصور ہے بلکہ اس کائنات کے بارے میں انسانی سوچ کے اندر یہ ایک دور رس تبدیلی ہے۔ یہ انسانی شخصیت کے بارے میں بھی انسانی سوچ میں ایک دور رس تبدیلی ہے۔ انسانی شخصیت کے اندر جو قوتیں کار فرما ہیں ان کے بارے میں بھی یہ ایک انقلابی سوچ ہے۔ اس سوچ کے تحت ایک انسان کے اندر اس کائنات کے بارے میں اور اس کے پیچھے کام کرنے والی قوتوں کے بارے میں ایک نیا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس تصور کے اثرات اس کرۂ ارض پر انسان کی عملی زندگی پر بھی پڑتے ہیں اس لئے کہ وہ انسان جو صرف اپنے ماحول کا اپنے حواس کے ساتھ ایک محدود مشاہدہ کرتا ہے اس انسان کے مساوی نہیں ہو سکتا جو اپنی بصیرت اور اپنے نظریات کی وجہ سے اس کائنات کے بارے میں وسیع تر سوچ رکھتا ہے۔ یہ عقلمند انسان فطرت کائنات کی آواز کو اپنی شخصیت کے نہاں خانے سے سنتا ہے اور اپنے دل کی گہرائیوں سے اشارات پاتا ہے۔ وہ یہ شعور رکھتا ہے کہ اس کا دائرہ کار زمان و مکان کی قید سے زیادہ وسیع ہے۔ اور اس کی شخصیت اس سے کہیں وسیع ہے جو وہ سمجھتا ہے یا اپنی عمر کے ایک مختصر عرصے میں وہ سمجھ سکتا ہے۔ وہ اس بات کا شعور رکھتا ہے کہ اس ظاہری اور پوشیدہ کائنات کے پس پشت ایک عظیم حقیقت ہے اور یہ حقیقت اس کائنات سے بڑی اور اس کی خالق ہے۔ اس عظیم حقیقت کے وجود ہی سے تمام کائنات کا وجود مستفاد ہے۔ یہ ہے حقیقت باری تعالیٰ جسے آنکھیں نہیں پا سکتیں اور جو انسان کی عقل کے احاطے میں نہیں آ سکتی۔

ایمان بالغیب وہ پوٹنٹ ہے جہاں سے انسان اور حیوان کے راستے جدا ہوتے ہیں اور انسان عالم حیوانیت سے بلند ہوتا ہے۔ لیکن ہر زمانے کی طرح ہمارے دور کے مادہ پرست بھی یہ چاہتے ہیں کہ انسان کو انسانیت کے مقام بلند سے گرا کر عالم حیوانیت کی طرف لوٹا کر لے آئیں جہاں وہی چیز حقیقت سمجھی جاتی ہے جو حواس کے دائرے میں آتی ہے۔ یہ مادیت پسند اس بات کو ترقی پسندی کہتے ہیں حالانکہ یہ دراصل رجعت پسندی اور ناکامی ہے جس سے اللہ نے مسلمانوں کو ابھی تک بچایا ہے۔ لہٰذا ان کی امتیازی صفت ہی یہ قرار دی گئی کہ یومنون بالغیب (جو غیب پر ایمان لاتے ہیں) اور یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے جس پر ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ یہ نکتہ گرنے والوں اور منہ موڑنے والوں کے لئے ہلاکت اور تباہی کا مقام ہے۔

جو لوگ غیب اور سائنس کا باہم تقابل کر کے بحث کرتے ہیں وہ تاریخی واقعات کی فیصلہ کن تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک گویا مستقبل ان کے سامنے یقینی صورت میں موجود ہے حالانکہ جدید ترین سائنسی انکشافات یہ ہیں کہ مستقبل کا دارومدار محض احتمالات پر ہے۔ مستقبل کے بارے میں انسان کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا۔

مارکس کی یہ عادت تھی کہ وہ تاریخی اسباب کی روشنی میں مستقبل کے لئے قطعی فیصلے کرتا تھا۔ لیکن آج کا انسان بچشم سر دیکھ سکتا ہے کہ مارکس کی ان تمام پیشین گوئیوں کا حشر کیا ہوا؟

مارکس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ سب سے پہلے انگلستان میں کیمونزم نافذ ہو گا کیونکہ انگلستان صنعتی اعتبار سے چوٹی پر پہنچ

چکا ہے۔ وہاں ایک طرف سرمایہ دار عروج پر ہے اور دوسری جانب مزدور فقر و فاقے کے اعتبار سے اپنی آخری منزل تک پہنچ چکا ہے۔ لیکن بعد کے ادوار میں ہم نے دیکھا کہ نہایت ہی پسماندہ اقوام کے اندر کیمونزم کامیاب ہوا' مثلاً روس اور چین میں۔ اور صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ممالک میں سے کسی ایک میں بھی کیمونسٹ انقلاب برپا نہ ہوا۔

لینن اور اسٹالن نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ سوشلسٹ دنیا اور سرمایہ دار دنیا کے درمیان کسی وقت بھی عالمگیر جنگ ہوگی' لیکن ان دونوں کے خلیفہ خروشیف باہم سلامتی اور دیانت کے جھنڈے اٹھائے ہوئے ہیں.......... میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کی پیشین گوئیوں پر مزید بحث کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ان لوگوں کی یہ یقینی پیشن گوئیاں اس لائق نہیں کہ ان پر کوئی سنجیدہ بحث کی جائے۔

یقینی حقیقت اگر کوئی ہے تو یہی غیبی حقیقت ہے اور اس کے سوا تمام باتیں محض احتمالات ہیں۔ اگر کوئی حتمی بات ہے تو وہی ہے جس کا فیصلہ اللہ کی قضا و قدر نے کر دیا ہے اور مستقبل کے بارے میں اللہ نے کیا فیصلہ کیا ہے' اس کا کسی کو علم نہیں ہے سوائے اللہ کے۔ ہاں تقدیر الہی کے اٹل حقیقت ہونے کے باوجود اس کائنات کے بارے میں کچھ سنن الہیہ ایسی بھی ہیں جو اٹل ہیں اور جو تقدیر الہیہ کا حصہ ہیں۔ ان میں سے بعض سنن الہیہ تک انسان کی رسائی بھی ممکن ہے اور ان تک رسائی حاصل کر کے انسان اپنے منصب خلافت الہیہ کے فرائض کو بہت ہی اچھی طرح ادا کر سکتا ہے۔ لیکن ان وسائل کے باوجود اللہ کا فیصلہ اور اس کی تقدیر سپریم ہے اور تقدیر الہی نامعلوم ہے۔ یہ اس کائنات کی اصل حقیقت ہے اور (اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (۱۷ : ۹)) یہ قرآن کریم اس بات کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو نہایت ہی سیدھی ہے۔

---ooo---

اب روئے سخن غیب کے علوم کی کنجیوں سے اس کائنات کے ایک خاص پہلو کی طرف مڑ جاتا ہے۔ یعنی ذات انسانی کی طرف جو اس کائنات ہی کا ایک حصہ ہے اور اللہ کی قدرت کے کرشموں میں سے اہم کرشمہ ہے جس سے اللہ کے علم محیط کا بہت ہی اچھی طرح اظہار ہوتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ
یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ
ع ۵ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۰﴾
۱۴

"وہی ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہے' پھر دوسرے روز وہ تمہیں اسی کاروبار کے عالم میں واپس بھیج دیتا ہے تاکہ زندگی کی مقررہ مدت پوری ہو۔ آخر کار اسی کی طرف تمہاری واپسی ہے' پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔"

یہ چند مزید الفاظ ہیں' اس سے پہلے چند کلمات میں عالم غیب کے طویل و عریض آفاق کے خطوط کھینچ دیئے گئے تھے

اور سابق آیت کے محدود کلمات نے یہ واضح کر دیا تھا کہ باری تعالیٰ کا علم کس قدر کامل اور شامل ہے۔ اب ان زیر بحث چند کلمات اور محدود فقروں سے یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ انسان کی پوری زندگی مکمل طور پر اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ تمام امور اللہ کے علم' اللہ کی تقدیر اور اللہ کی تدبیر کے مطابق طے پا رہے ہیں۔ انسان کا جاگنا اور سونا' اس کا مرنا اور پیدا ہونا' اس کا دوبارہ اٹھنا اور حساب و کتاب سب کے سب امرالٰہی کے مطابق طے ہو رہے ہیں اور آئندہ بھی اس کے مطابق ہی طے ہوں گے۔ یہ حقیقت قرآن کے مخصوص طرز ادا اور نہایت ہی ایجاز اور نہایت ہی مؤثر پیرائے میں بیان کی جاتی ہے۔ طرز ادا نہایت ہی محسوس' متحرک اور ایسے انداز میں ہے کہ پورا منظر اسکرین پر چلتا پھرتا نظر آتا ہے اور انسانی شعور اور جذبات کو ساتھ لئے ہوئے ہے' نہایت ہی تعجب خیز طرز تعبیر میں۔

(وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّكُمْ بِالَّيْلِ (٦ : ٦٠)) وہی ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے۔ جب انسان نیند کی آغوش میں ڈوب جاتا ہے تو گویا وہ مر جاتا ہے۔ حالت نوم بھی دراصل موت کی ایک قسم ہے۔ جس طرح حالت موت میں انسان کے حواس معطل ہو جاتے ہیں اسی طرح حالت خواب میں بھی حواس معطل ہو جاتے ہیں اور انسان غافل ہوتا ہے۔ حواس مردہ ہو جاتے ہیں' عقل رک جاتی ہے اور انسان کا فہم و ادراک بھی ختم جاتا ہے۔ یہ ایک راز ہے جو ابھی تک انسانی فہم سے باہر ہے کہ انسانی قوتیں حالت خواب میں کس طرح رک جاتی ہیں۔ اگرچہ ہم حالت خواب کے آثار کو جانتے ہیں لیکن اس کی حقیقت تک انسان نہیں پہنچ سکا کہ یہ حالت کس طرح طاری ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ایک حالت غیبی ہے جس طرح دوسرے غیبی حالات انسان کے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن جب انسان اس حالت میں پہنچتا ہے تو اس کی تمام قوتیں اس سے سلب ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ فہم و ادراک کی قوت سے بھی انسان محروم ہو جاتا ہے۔ ایک مخصوص وقت تک کے لئے انسان آثار حیات سے محروم ہو جاتا ہے اور اللہ کے قبضہ قدرت میں جا پہنچتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جب انسان خواب میں چلا جائے تو صرف اور صرف ارادۂ الٰہی اسے حالت بیداری میں لاتا ہے۔ ذرا غور کیجئے! کہ انسان جب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہو تو وہ کس قدر کمزور و ناتواں ہے۔

(وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ (٦ : ٦٠) "اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو' اسے جانتا ہے۔" انسانوں کے اعضاء حالت بیداری میں پورا دن جو حرکات کرتے ہیں جو پکڑتے ہیں اور جو چھوڑتے ہیں' جو اچھے کام کرتے ہیں اور جو برے کام کرتے ہیں' سب کے سب اللہ کے علم میں ہیں۔ تمام کے تمام انسانوں کی حرکات و سکنات اللہ کی نگرانی میں ہوتی ہیں اور ان کی حرکات و سکنات میں سے کوئی چیز اللہ کے علم سے باہر نہیں جاتی۔

(ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَى أَجَلٌ مُّسَمًّى (٦ : ٦٠)) "پھر دوسرے روز وہ تمہیں اسی کاروبار کے عالم میں واپس بھیج دیتا ہے تاکہ زندگی کی مقرر مدت پوری ہو۔" یعنی جب تم رات سوتے میں گزارتے ہو تو وہ اس ٹھہراؤ اور انقطاع کی حالت سے تمہیں جگاتا ہے تاکہ تم حقیقی موت تک اپنی مقررہ مدت حیات پوری کر سکو۔ تو گویا یہ سب انسان ان تمام حالات میں اللہ کی قدرت اور تقدیر میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ تقدیر الٰہی سے باہر نکل نہیں سکتے۔ نہ یہ تقدیر کہیں جا کر رکتی ہے۔

(ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ (٦ : ٦٠)) آخر کار اسی کی طرف تمہاری واپسی ہے۔" جس طرح ایک ریوڑ چرنے چگنے کے بعد واپس اپنی جائے قیام اور اپنے مالک کی طرف لوٹتا ہے اسی طرح انسان واپس اپنے مالک حقیقی کی طرف لوٹتا ہے۔

(ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (٦ : ٦٠)) پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو؟" اس وقت ان کا وہ اعمال نامہ پیش ہو گا جس کے اندر ان کا ہر فعل درج ہو گا۔ اور اس پر اس قدر حقیقی انصاف ہو گا جس میں ظلم کا شائبہ تک نہ ہو گا۔

غرض یہ آیت چند کلمات پر مشتمل ہے لیکن ان کلمات کے اندر ایک طویل ریل لپٹی ہوئی ہے۔ اس کے اندر مختلف تصاویر اور مناظر پنہاں ہیں۔ مختلف فیصلے 'مختلف اشارات اور ہدایات ثبت ہیں۔ مختلف شیڈ اور رنگ ہیں 'کون ہے جو اس قدر مختلف کلمات میں یہ رنگ بھر سکتا ہے۔ اگر یہ آیات معجز نہیں ہیں تو پھر کون سا کلام معجز ہو سکتا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ تکذیب کرنے والے اور کفر کا رویہ اپنانے والے ان سے غافل ہیں اور مادی معجزات اور خوارق کے طلبگار ہیں اور اللہ کے عذاب الیم کو دعوت دے رہے ہیں۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ۝٦١ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۣ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ۝٦٢

"اپنے بندوں پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے اور تم پر نگرانی کرنے والے مقرر کر کے بھیجتا ہے' یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو اس کے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی جان نکال لیتے ہیں اور اپنا فرض انجام دینے میں ذرا کوتاہی نہیں کرتے۔ پھر سب کے سب اللہ' اپنے حقیقی آقا کی طرف واپس لائے جاتے ہیں۔ خبردار ہو جاؤ' فیصلہ کے سارے اختیارات اسی کو حاصل ہیں اور وہ حساب لینے میں بہت تیز ہے۔"

(وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (٦ : ٦١)) اپنے بندوں پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے۔" یعنی وہ صاحب قوت بادشاہ ہے اور تمام انسان اس کی ایسی رعایا ہیں جو اس کے مکمل کنٹرول میں ہیں۔ اس بادشاہ کی حقیقی قوت اور لوگوں کی قوت کے درمیان کوئی نسبت نہیں ہے۔ اس کے بالمقابل نہ صرف یہ کہ ان کی کوئی قوت نہیں ہے بلکہ ان کے لئے کوئی معاون و مددگار بھی نہیں ہے سب پوری طرح اس کے غلام ہیں اور پوری طرح اس کے تابع اور زیر قبضہ ہیں۔

یہ ہے انسان کی جانب سے ایک قاہر اور مکمل طور پر حاوی خدا کی مکمل غلامی اور یہی وہ حقیقی تصور ہے جو لوگوں کی

عملی زندگی میں حقیقی تبدیلی پیدا کرتا ہے چاہے اللہ لوگوں کو مکمل آزادی اور اختیارات عطا کر دے ' ان کو وافر مقدار میں علم و معرفت دے دے اور ان کو وافر مقدار میں قوت دے دے تاکہ وہ اس کرۂ ارض پر فریضہ خلافت ارضی کے تقاضے پورے کر سکیں ۔ لیکن ان باتوں کے باوجود انسانی زندگی کے تمام سانس اللہ کے ہاں مقرر ہیں اور انسان کی تمام حرکات و سکنات اللہ کے اس قانون قدرت کے مطابق ہیں جو اس نے خود انسانوں کے وجود میں جاری اور ساری کر دیئے ہیں اور انسان خود اپنے وجود کے ان قوانین کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا ۔ اور یہ قوانین بھی نفس انسانی اور حرکات انسانی کے اندر متعین اور مقرر ہیں ۔

(وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً (۶ : ۶۱)) اور تم پر نگرانی کرنے والے مقرر کر کے بھیجتا ہے ۔" یہاں آیت میں ان نگرانوں کی نوعیت کو متعین نہیں کیا گیا ۔ دوسرے مقامات پر بتایا گیا ہے کہ یہ نگرانی کرنے والے فرشتے ہیں جو انسانوں کے ساتھ لگے ہوئے ہیں اور وہ تمام اعمال ریکارڈ کر رہے ہیں جو انسانوں سے صادر ہوتے ہیں ۔ یہاں صرف اس امر پر روشنی ڈالنا مقصود ہے کہ ہر انسان براہ راست اللہ کی نگرانی میں ہے اور انسانی سوچ میں یہ شعور ڈالنا ہے کہ نفس انسانی کو ایک لحظہ کے لئے بھی آزاد نہیں چھوڑا جاتا اور نہ ہی وہ کسی وقت تنہا ہوتا ہے ۔ ہر وقت اس کے ساتھ ایسے افراد موجود ہوتے ہیں جو اس کی تمام حرکات و سکنات کو ریکارڈ کرتے رہتے ہیں اور اس قدر مکمل اور جامع ریکارڈ تیار کرتے ہیں کہ ان کی نظروں سے کوئی بات بچ کر نہیں رہتی ۔ یہ ایک ایسا تصور اور ایسی سوچ ہے جس کے نتیجے میں مکمل انسانی شخصیت بیدار ہو جاتی ہے اور وہ ہر بات کو محسوس کرتی ہے ۔

(حَتّٰی اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ (۶ : ۶۱))

"یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو اس کے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی جان نکال لیتے ہیں اور اپنا فرض انجام دینے میں ذرا کوتاہی نہیں کرتے ۔" یہ اسی ربانی نگرانی کا رنگ ہے ' لیکن مختلف شیڈز میں ' یعنی ہر انسان کے لئے اس دنیا میں سانس لینے کی تعداد مقرر ہے ۔ اس کے ان سانسوں کے رک جانے کا بھی ایک وقت مقرر ہے لیکن اس کو وہ جانتا نہیں ہے ۔ انسانی زاویے سے اجل مقرر ہے جو اس کے لئے غیب ہے اور اس کا علم اسے کسی ذریعے سے بھی نہیں ہو سکتا ۔ لیکن اللہ کے علم میں وہ پہلے سے تحریری طور پر ثبت ہے اور ایک سیکنڈ آگے پیچھے نہیں ہو سکتی ۔ ہر شخص زندگی کے سانس پورے کر رہا ہے ۔ اس دنیا سے اس کے جانے کا وقت دور نہیں ہے بلکہ بالکل قریب ہے ' اس کے اندر کوئی تغیر ممکن نہیں ہے ۔ نہ اس میں بھول چوک ممکن ہے ۔ اللہ کے نمائندے تیار کھڑے ہوتے ہیں ' یہ فرشتے ہوتے ہیں اور ان کا نظام نہایت ہی محفوظ ہوتا ہے ۔ ہر شخص کی موت کا وقت تحریری طور پر ثبت ہے لیکن انسان سخت غفلت میں ہوتا ہے ۔ یہ نمائندے اپنا فرض نہایت ہی باریک بینی سے ادا کرتے ہیں ۔ وہ اپنا پیغام وقت پر پہنچاتے ہیں ۔ یہ سوچ اور یہ عقیدہ ہی ایک غافل انسان کو جھنجوڑنے کے لئے کافی اور شافی ہے ۔ اس عقیدے کا حامل انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اللہ کے فیصلے اسے پوری طرح گھیرے ہوئے ہیں ۔ ہر وقت وہ یہ یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ اگلے ہی لمحے میں اس کی روح قبض ہو سکتی ہے اور اگلے ہی سانس میں اس کی حرکت قلب رک سکتی ہے ۔

(ثُمَّ رُدُّوْا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ (٦٢:٦) پھر سب کے سب اللہ' اپنے حقیقی آقا کی طرف واپس لائے جاتے ہیں ۔" حقیقی آقا وہی ہے اور اس کے سوا جن آقاؤں کو لوگ پکارتے ہیں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے ۔ وہی آقا ہے جس نے انہیں پیدا کیا ہے ۔ وہی ہے جس نے انہیں یہاں اس کرۂ ارض پر زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کئے اور ان پر یہاں ان کی پوری زندگی کا ریکارڈ تیار کرنے کے لئے اپنے نگران مقرر کئے جو بالکل کوئی کمی بیشی نہیں کرتے ۔ اس کے بعد وہی آقا ہے کہ جب چاہتا ہے ان انسانوں کو اپنے پاس بلا لیتا ہے تاکہ وہ ان کے بارے میں اپنی مرضی سے فیصلہ کرے اور اس کے فیصلے پر کوئی اپیل نہیں ہو سکتی ۔

(اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ (٦٢:٦)) خبردار ہو جاؤ' فیصلہ کے سارے اختیارات اسی کو حاصل ہیں اور وہ حساب لینے میں بہت تیز ہے ۔" صرف وہی فیصلہ کرتا ہے' وہ خود ہی حساب لیتا ہے ۔ وہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں کرتا ۔ اور نہ جزا و سزا میں تاخیر کرتا ہے ۔ جلدی فیصلہ کرنے کے اثرات بھی انسانی زندگی پر نہایت ہی گہرے ہوتے ہیں ۔ انسان سوچتا ہے کہ اللہ کے ہاں نہ حساب میں دیر لگتی ہے اور نہ فیصلہ کرنے میں ۔

ایک مسلمان کی یہ سوچ کہ اللہ اس کا خالق ہے اور ایک دن اسے مرنا ہے اور اللہ کے سامنے اپنی پوری زندگی کا حساب و کتاب پیش کرنا ہے اسے ایک لمحہ کے لئے غافل نہیں ہونے دیتی ۔ اس سوچ کے مطابق اس کے عقائد کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ وہ صرف اللہ وحدہ کو حقیقی حاکم سمجھنے لگتا ہے اور اس کا یہ منطقی عقیدہ ہو جاتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر بندوں کے تمام امور اللہ کے حکم کے مطابق طے ہونے چاہئیں ۔

آخرت کا حساب و کتاب اور آخرت میں سزا و جزاء کے فیصلے بہرحال اس دنیا میں کیے گئے اعمال پر مرتب ہوتے ہیں اور لوگ اس دنیا میں اس وقت تک صحیح طرز عمل اختیار نہیں کر سکتے جب تک ان کے لئے کسی شریعت کی شکل میں مربوط ضابطہ عمل موجود نہ ہو جس میں ان کے لئے حلال و حرام کی حد بندی کر دی گئی ہو اور جس کے اوپر ان کا اخروی حساب و کتاب ہو ۔ اس طرح اس تصور حیات کے مطابق یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ اس دنیا میں بھی حاکم اللہ ہے اور آخرت میں بھی حاکم اللہ ہے ۔

اگر طے یہ کر دیا جائے کہ دنیا میں اللہ کی شریعت کے سوا کوئی اور قانون رائج ہو گا تو پھر آخرت میں ان سے مؤاخذہ اور حساب و کتاب کس ضابطہ عمل پر ہو گا؟ کیا ان کے اعمال کا موازنہ قیامت کے روز ان قوانین کے مطابق ہو گا جو دنیا میں کچھ انسانوں نے یا سب انسانوں نے مل کر بنائے اور نافذ کیے تھے اور جن کے مطابق وہ اپنے تنازعات حل کرتے تھے یا قیامت میں لوگوں کا حساب و کتاب اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق ہو گا جو دنیا میں عملاً نافذ نہ تھی اور نہ یہ لوگ اپنے فیصلے اس شریعت کے مطابق کراتے تھے؟ یہ صورت حال ہرگز ممکن نہیں ہے ۔

لوگوں کو چاہئے کہ وہ اچھی طرح سمجھ لیں اور اس بات کا یقین کر لیں کہ اللہ ان سے حساب و کتاب خود اپنی شریعت کے مطابق لے گا ۔ اگر انہوں نے اپنی پوری زندگی کو اور اپنے تمام معاملات کو اللہ کی شریعت کے مطابق نہ ڈھالا' جس طرح وہ اپنے مراسم عبودیت شریعت کے مطابق بجالاتے ہیں تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان سے حساب لیتے وقت سب

سے پہلے اس بات کا حساب لیا جائے گا کہ انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا اور یہ کہ کیوں انہوں نے اللہ کے سوا کئی دوسرے الہوں کو حاکم اور شارع مقرر کیا اور تسلیم کیا۔ صرف اللہ وحدہ لاشریک ہی کو حاکم اور رب قرار کیوں نہ دیا؟ حقیقت یہ ہے کہ ان سے پہلا حساب یہ لیا جائے گا کہ انہوں نے اللہ کے حق حاکیت کا انکار کیوں کیا یا انہوں نے اللہ کی شریعت کے ساتھ ساتھ دوسرے شرائع کا اتباع کر کے اور اللہ کی بندگی کے ساتھ دوسروں کی بندگی کر کے شرک کا ارتکاب کیوں کیا؟ انہوں نے اپنی اجتماعی زندگی میں اپنے اقتصادی اور سیاسی نظام میں' اپنے معاملات اور سوشل روابط میں اللہ کے سوا دوسروں کی پیروی کر کے شرک کا ارتکاب کیوں کیا جو ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ شرک کو معاف نہیں کرتا اور شرک کے سوا سب کوتاہیوں سے درگزر کرتا ہے' اگر چاہے۔

---ooo---

اب اللہ تعالیٰ انہیں عدالت فطرت میں پیش فرماتے ہیں' کیونکہ خود فطرت انسانی کو حقیقت الٰہیہ کا شعور ہوتا ہے۔ فطرت انسانی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ مشکل لمحات میں بارگاہ الٰہیہ میں پناہ لیتی ہے۔ قرآن ایسے بعض شدید لمحات کی تصویرکشی بھی کرتا ہے جہاں انسان ہولناک اور کربناک صورت حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ پھر قرآن کریم یہ بھی بتا دیتا ہے کہ جونہی وہ حالت دور ہوتی ہے انسان اپنی فطری راہ سے ہٹ جاتا ہے۔ یہ سب تصویرکشی بڑی سرعت سے ہوتی ہے اور یہ منظر اسکرین پر آکر چلا جاتا ہے۔ لیکن یہ منظر نہایت ہی دوٹوک 'فیصلہ کن' مؤثر اور حیران کن ہوتا ہے۔

یہ ہولناک اور کربناک صورت حال ہمیشہ قیامت کے لئے مؤخر نہیں کر دی جاتی' کبھی کبھار اس دنیا میں بھی انسان ایسے حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ مثلاً بحری سفر میں انسان کو جو مشکلات پیش آتی ہیں تو ان میں مشرکین بھی ہمیشہ اللہ جل شانہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ ہی پھر لوگوں کو نجات دیتے ہیں۔ لیکن جب وہ اس مشکل اور خوفناک صورت حالات سے بخیریت نکل آتے ہیں اور نارمل زندگی میں داخل ہوتے ہیں تو پھر شرک کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾

"اے نبی ؐ' ان سے پوچھو 'صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں کون تمہیں خطرات سے بچاتا ہے؟ کون ہے جس سے تم (مصیبت کے وقت) گڑگڑا گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعائیں مانگتے ہو؟ کس سے کہتے ہو کہ اگر اس بلا سے اس نے ہم کو بچا لیا تو ہم ضرور شکرگزار ہوں گے؟ .... کہو' اللہ تمہیں اس سے اور ہر تکلیف سے نجات دیتا ہے پھر تم دوسروں کو اس کا شریک ٹھہراتے ہو۔"

خطرات کا تصور اور ہولناک لمحات کی یاد بعض اوقات خود سر انسانوں کو بھی راہ راست پر لے آتی ہے۔اس سے پتھر دل بھی موم ہو جاتے ہیں۔اس سے انسان کو یہ شعور دیا جاتا ہے کہ انسان بہت ہی ضعیف ہے اور اسے ہر وقت اللہ کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے'جس کے نتیجے میں اس کی مشکلات دور ہو جاتی ہیں اور اسے نعمت الٰہیہ بشکل نجات دستیاب ہوتی ہے۔

(قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً لَئِنْ أَنْجَانَا مِنْ هٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشّٰكِرِينَ (٦:٦٣)) "اے نبی " ان سے پوچھو'صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں کون تمہیں خطرات سے بچاتا ہے؟کون ہے جس سے تم (مصیبت کے وقت)گڑگڑا گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعائیں مانگتے ہو؟کس سے کہتے ہو کہ اگر اس بلا سے اس نے ہم کو بچالیا تو ہم ضرور شکرگزار ہوں گے؟ یہ وہ نفسیاتی تجربہ ہے جو ہر اس شخص کو درپیش ہوا ہے جو کبھی مشکلات میں گھرا ہے یا جس نے مشکلات کے اندر گھرے ہوئے لوگوں کو دیکھا ہے'کیونکہ خشکی اور سمندر دونوں میں انسان اس قسم کی مشکلات سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ضروری نہیں کہ اندھیروں کا تحقق رات ہی میں ہو' اس لئے کہ لاچاری بھی ایک اندھیرا ہے۔خطرہ بھی اندھیرا ہے۔خشکی اور سمندر کے غیبی واقعات جن کے انتظار میں پوری دنیا کی نظریں لگی ہوتی ہیں یہ بھی ظلمات ہوتے ہیں۔جب بھی انسان خشکی اور سمندر کی ان ظلمتوں میں گھرتا ہے تو اس کائنات میں انہیں صرف اللہ ہی حقیقی متصرف نظر آتا ہے۔ایسے حالات میں انسان بڑی عاجزی'یکسوئی اور نہایت ہی رازدارانہ طور پر صرف اللہ ہی کے سامنے دست بدعاء ہوتا ہے۔ایسے حالات میں فطرت انسانی اپنی اصل شکل میں تمام پردوں سے باہر آکر عیاں ہوتی ہے۔اس وقت فطرت کی گہرائیوں میں جو حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے وہ سامنے آتی ہے اور وہ حقیقت ہوتی ہے اللہ وحدہ لاشریک کی حاکمیت۔انسان حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اب اس کے ساتھ کسی کو شریک بھی نہیں ٹھہراتا۔ اس وقت انسان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ شرکیہ تصورات کس قدر بودے ہوتے ہیں۔اب شرک کا نام و نشان نہیں ہوتا اور جو لوگ اس کرب والم میں مبتلا ہوتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے :"اگر اس بلا سے اس نے ہم کو بچالیا تو ہم ضرور شکرگزار ہوں گے؟" اللہ تعالیٰ اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کو اصل حقیقت کی طرف متوجہ کریں :

(قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيكُمْ مِنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ أَنْتُمْ تُشْرِكُونَ (٦:٦٤)) کہو'اللہ تمہیں اس سے اور ہر تکلیف سے نجات دیتا ہے پھر تم دوسروں کو اس کا شریک ٹھہراتے ہو۔" اس کے اندر ہی انہیں یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ وہ پھر بھی شرک جیسے منکر کا ارتکاب کرتے ہیں اور تعجب خیز انداز میں الٹے پھرتے ہیں۔

---ooo---

یہاں انسانوں کو یہ صورت حال یاد دلائی جاتی ہے کہ اس نجات کے بعد بھی دوبارہ وہ ایسے ہی مشکل حالات میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔یہ بات نہیں ہے کہ یہ مشکلات صرف ایک بار ہی آنے والی تھیں۔یہ بار ی ان پر سے گزر گئی اور اب گویا وہ اللہ کے قبضہ قدرت سے نکل گئے ہیں۔اگر وہ ایسا سمجھتے ہیں تو یہ ان کی بھول ہے۔اس سلسلے میں ذیل کی آیت ملاحظہ ہو:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى أَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ

اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ۝

"دیکھو' وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب اوپر سے نازل کر دے ' یا تمہارے قدموں کے نیچے سے برپا کر دے ' یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزہ چکھوا دے ۔" دیکھو ' ہم کس طرح بار بار مختلف طریقوں سے اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں شاید کہ یہ حقیقت کو سمجھ لیں"۔

اگر کوئی مصیبت سر کے اوپر آکر پڑتی ہے یا پاؤں کے نیچے سے کوئی مصیبت پھوٹتی ہے تو اس کا تصور دائیں بائیں سے آنے والی مصیبتوں سے زیادہ خوفناک ہوتا ہے اس لئے کہ انسان کی قوت واہمہ یہ سمجھتی ہے کہ وہ دائیں بائیں سے آنے والی مصیبت کا مقابلہ کر سکتا ہے لیکن جو عذاب سر کے اوپر سے نازل ہو یا جو عذاب پاؤں کے نیچے سے ابل پڑے وہ انسان کو ڈھانپ لیتا ہے ' اسے متزلزل کر دیتا ہے ' اور انسان کی محدود قوت پر غالب آجاتا ہے ۔ اس کے مقابلے میں ٹھہرنا اور اس کا مقابلہ کرنا مشکل ہوتا ہے ۔ انداز بیان ایسا ہے جو انسان کے شعور و احساس میں اس قوی فیکٹر کو اجاگر کرتا ہے اور انسان یہ یقین کر لیتا ہے کہ اللہ کا عذاب جب چاہے اور جس طرح چاہے انسان کو اپنے گھیرے میں لے سکتا ہے ۔ اللہ کسی بھی وقت بندوں کو پکڑنے کی قدرت رکھتا ہے ۔

اس آیت میں عذاب کی ان قسموں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ' عذاب کی ان اقسام کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے جو نہایت ہی دھیمی رفتار سے اور طویل زمانے کے بعد انسان پر آتی ہیں ۔ ان اقسام کا عمل لمحہ بھر یا مختصر عرصے میں پورا نہیں ہو جاتا ۔ یہ اقسام انسان کی ساتھی بن جاتی ہیں ' انسان کی آبادی اور اس کی پوری زندگی میں رچ بس جاتی ہیں اور رات دن انسان کی رفیق سفر رہتی ہیں ۔

(اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ (٦ : ٦٥)) "یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزہ چکھوا دے ۔" اللہ کے دائمی اور طویل المدت عذاب کی یہ ایک اور شکل ہے ۔ یہ عذاب انسانوں پر خود اپنے ہاتھوں آتا ہے اور وہ خود اسے گھونٹ گھونٹ پیتے ہیں ' وہ یوں کہ اللہ انہیں گروہوں اور پارٹیوں میں تقسیم کر دیتا ہے ' یہ گروہ اور احزاب ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں ہو جاتے ہیں ' وہ ایک قسم کی پارٹیاں ہوتی ہیں ' عوام ان فرقوں کے اندر فرق و امتیاز بھی نہیں کر سکتے ۔ ان فرقوں کے درمیان جدل و جدال قائم رہتا ہے ۔ ایک طویل دشمنی قائم ہو جاتی ہے اور ان میں سے ایک فرقہ دوسرے کے لئے بلائے جان ہوتا ہے ۔

انسانیت نے اپنی تاریخ کے مختلف وقفوں میں اس قسم کے عذاب کو محسوس کیا ہے ۔ جب بھی انسان نے اپنی اجتماعی زندگی سے اسلامی نظام حیات کو بدر کیا ہے ' انسان اس عذاب میں مبتلا کر دیا گیا ہے ۔ جب بھی اسلام کو ترک کر کے انسانوں نے اپنی خواہشات اور میلانات کی پیروی شروع کی ہے اور اپنی کوتاہیوں ' کمزوریوں اور جہالتوں کو اپنا اصول بنایا ہے وہ اس قسم کے عذاب سے دوچار ہوئے ہیں ۔ جب بھی لوگ راہ گم کر دیتے ہیں اور اپنے لئے خود نظام زندگی بنانے

لگتے ہیں' اپنے لئے رسم و رواج اور اجتماعی قوانین خود بنانے لگتے ہیں اور حسن و قبح کے پیمانے خود تجویز کرنے لگتے ہیں تو اس کے نتیجے میں انسانوں میں سے بعض لوگ بعض دوسرے انسانوں کے غلام بن جاتے ہیں۔ بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کے تجویز کردہ نظام زندگی کی اطاعت کریں۔ اور یوں وہ دوسروں کے غلام بن جائیں اور اس کے مقابلے میں بعض دوسرے لوگ اس نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یوں فریق اول ان مخالفین پر حتی المقدور مظالم ڈھانے لگتا ہے۔ اب دو فریق میدان میں ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی خواہشات ' میلانات اور مقاصد و مفادات کے درمیان ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں وہ ایک دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھتے ہیں۔ بعض لوگ بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں' ایک دوسرے پر غصہ ہوتے ہیں اور ان سب تضادات کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ یہ دونوں فریق کسی ایک پیمانے پر متفق نہیں ہوتے۔ وہ پیمانہ معبود نے سب کے لئے تجویز کیا ہے جس کے مطابق تمام لوگ رب ذوالجلال کے بندے ہوتے ہیں۔ اس رب کے سامنے کوئی بھی جھکنے سے نہیں کتراتا نہ وہ اس عبادت اور جھکنے میں اپنے لئے کوئی سبکی محسوس کرتا ہے۔

اس کرۂ ارض پر سب سے بڑا فتنہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ یہ مطالبہ لے کر اٹھیں کہ دوسرے لوگ انہیں الٰہ سمجھتے ہوئے ان کی بندگی کریں اور ان کے حق حاکمیت کو تسلیم کریں۔ یہ وہ فتنہ ہے جس کی وجہ سے انسان گروہوں میں بٹ کر باہم دست و گریباں ہو جاتے ہیں اس لئے کہ بظاہر تو وہ ایک ہی قوم اور ایک امت نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ایک دوسرے کے غلام اور بندے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگوں کی ہاتھ میں اقتدار ہوتا ہے اور وہ اس اقتدار کے ساتھ چمٹے ہوئے ہوتے ہیں' اس لئے کہ اس اقتدار میں وہ اللہ کی شریعت کے پابند نہیں ہوتے۔ بعض دوسرے جن کے ہاتھ میں اقتدار نہیں ہوتا ان کے دل میں اہل اقتدار کے لئے نفرت اور بغض ہوتا ہے۔ یہ صاحبان اقتدار اور ان سے اقتدار چھیننے کی فکر کرنے والے متربصین (گھات میں بیٹھنے والے) ایک دوسرے کی طاقت اور دشمنی کا مزہ چکھتے ہیں۔ یہ سب لوگ پارٹیوں میں بٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے نہ علیحدہ ہوتے اور نہ ہی ان کے درمیان کوئی فاصلہ ہوتا ہے۔ وہ ایک ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں------ آج اس کرۂ ارض پر تمام انسانیت اللہ کے اس عذاب میں مبتلا ہے اور یہ اللہ کا وہ عذاب ہے جو نہایت ہی دھیمی رفتار سے اپنا کام کرتا ہے۔

اس وقت اس کرۂ ارض پر اسلامی تحریک کا جو موقف ہے وہ قابل التفات ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس اسلامی تحریک کے موقف کو دنیا پر چھائی ہوئی جاہلیت سے بالکل علیحدہ اور ممتاز کر دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ جاہلیت ہے کیا؟ ہر صورت حال' ہر حکومت اور ہر معاشرہ جس پر اسلامی شریعت کی حکمرانی نہ ہو' وہ جاہلیت ہے۔ ہر وہ صورت حال جس میں اللہ وحدہ کی حاکمیت کو تسلیم نہ کیا جاتا ہو جاہلیت ہے۔ اس جاہلیت اور اسلامی تحریک کے موقف کے درمیان مکمل جدائی ضروری ہے۔ تحریک اسلامی کو ہر قوم اور ہر معاشرے کے اندر جو جاہلیت میں رہتی ہو اور جاہلی قوانین اور اقدار نافذ کرنا چاہتی ہو خود اپنا ایک مستقل اور جداوجود اور تشخص قائم کرنا چاہئے اور اسے جدا نظر آنا چاہئے۔

اسلامی تحریک عذاب الٰہی کی اس دھمکی کی زد سے صرف اس صورت میں نجات پا سکتی ہے کہ وہ شعوری 'نظریاتی' اور اپنے نظام زندگی کے اعتبار سے اہل جاہلیت سے مکمل طور پر علیحدہ ہو جائے۔ آیت کے یہ الفاظ "یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزہ چکھوا دے اس بات کا تقاضا کرتے ہیں۔" اور یہ مکمل جدائی

اور علیحدہ تشخص اس وقت تک قائم رہے جب تک اللہ ہمیں دارالاسلام قائم کرنے کی توفیق نہیں دے دیتا۔ اسلامی تحریک کے اندر یہ شعور زندہ رہنا چاہئے کہ وہی حقیقی امت مسلمہ ہے اور اس کے اردگرد جو معاشرہ عملاً موجود ہے وہ ابھی تک اسلامی امت کا حصہ نہیں بنا ہے۔ یہ لوگ حاملین جاہلیت ہیں۔ اس نظریے اور اس منہاج پر تحریک اسلامی کو دوسرے لوگوں سے جدا ہونا چاہئے۔ اس کے بعد اسے بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہونا چاہئے کہ لے اللہ ہمارے اور ہماری اس قوم اور اس معاشرے کے اندر حق کے اوپر فیصلہ کر دے تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

اگر تحریک اسلامی یہ امتیاز اور جدائی اختیار نہیں کرتی تو مذکورہ بالا وعید اور دھمکی کی مستوجب ہوگی۔ وہ کسی مخصوص معاشرے میں ایک گروہ اور فرقہ بن جائے گی، اور یہ فرقہ بھی دوسرے فرقوں کے ساتھ خلط ملط ہو گا۔ اس کا کوئی علیحدہ تشخص نہ ہو گا اور نہ اپنے ماحول کے اندر ان کی کوئی امتیازی شان ہوگی۔ اس پر بھی وہ عذاب نازل ہو گا جو دوسرے لوگوں پر ہو گا اور یہ ایک دائم اور طویل عذاب ہو گا۔ اور یہ امید تک نہ رہے گی کہ اسے کوئی فتح اور نصرت نصیب ہوگی جس کا اللہ نے وعدہ کیا ہوا ہے۔

اپنے معاشرے سے مکمل جدائی اور امتیاز کی وجہ سے بعض اوقات بہت بڑی قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں اور مصائب کے پہاڑ بھی ٹوٹتے ہیں۔ لیکن یہ مصائب اور نقصانات ان مصائب اور نقصانات سے کہیں کم ہوتے ہیں جو اس صورت میں کسی اسلامی تحریک پر آتے جب وہ جاہلی معاشرے میں خلط ملط ہو اور اس کا موقف واضح اور ممتاز نہ ہو اور وہ جاہلی معاشرے میں مدغم اور پیوستہ رہے اور آخر کار ہرکہ درکان نمک رفت نمک شد ہو جائے۔

اس نکتے کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم انبیاء و رسل کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔ رسولوں کی تاریخ سے یہ بات نظر آتی ہے کہ جب تک رسولوں کے متبعین نے اس وقت کے موجود جاہلی معاشرے سے اپنے آپ کو مکمل طور پر علیحدہ نہیں کر لیا، اس وقت تک انہیں وہ فتح اور نصرت حاصل نہیں ہوئی جس کا اللہ نے تمام رسولوں کے ساتھ وعدہ کیا ہوا ہوتا ہے کہ اہل ایمان اور رسول آخر کار غالب ہوں گے۔ کسی امت کو بھی غلبہ اور کامیابی اس وقت تک نصیب نہیں ہوئی جب تک وہ اس وقت کے جاہلی معاشرے سے کٹ کر علیحدہ نہیں ہوگئی۔ اور انہوں نے دوسرے لوگوں سے اپنا نظریہ اور نظم زندگی علیحدہ اور ممتاز نہیں کر لیا۔ اس علیحدگی اور امتیاز سے مراد یہ نہیں ہے کہ اسلامی تحریک لوگوں سے معاشرتی بائیکاٹ کر دے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اپنے نظریہ حیات اور اپنے دین اور نظام کے اعتبار سے ممتاز ہو۔ یہ وہ پوئنٹ ہے جس سے اسلامی تحریکوں اور دوسرے لوگوں کی راہ جدا ہو جاتی ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ دعوت اسلامی کا منہاج وہی ہو گا جس کے مطابق رسولوں نے دعوت دی۔ اس راہ میں وہی مقامات ہیں جو رسولوں کو پیش آئے۔

" (انْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ (٦:٦٥)) دیکھو، ہم کس طرح بار بار مختلف طریقوں سے اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں شاید کہ یہ حقیقت کو سمجھ لیں۔"

---ooo---

درس نمبر ۶۲ ایک نظر میں

سابق لہر میں اہل حق و باطل کے درمیاں مکمل جدائی کے مضمون پر خاتمہ ہوا تھا۔ اس لہر میں اس کی مزید تفصیل دی گئی ہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم ہی تھی جس نے اس کتاب کو جھٹلایا جو آپ پر نازل ہوئی تھی اور وہ کتاب برحق تھی۔ اسی نکتے پر حضور ؐ اور آپ کی قوم کی راہیں جدا ہو گئیں اور آپ ؐ نے ان سے علیحدہ ہو کر اپنی راہ لی۔ آپ ؐ کو اللہ نے حکم دیا کہ آپ ان سے علیحدہ ہو جائیں اور اعلانیہ کہہ دیں کہ میں تمہارا حوالہ دار نہیں ہوں اور یہ کہ اب میں تمہیں تمہاری تقدیر کے حوالے کرتا ہوں اور تم برے انجام تک پہنچنے والے ہو' وہ عنقریب آنے والا ہے۔

رسول ؐ کو یہ بھی حکم دیا جاتا ہے کہ جب وہ اسلام پر نکتہ چینیاں کر رہے ہوں تو آپ ان کی مجلس میں نہ بیٹھیں' اس وقت جبکہ وہ دین اسلام کے ساتھ مذاق کر رہے ہوں اور دین اسلام کا شایان شان احترام نہ کر رہے ہوں۔ لیکن اس جدائی اور امتیاز کے ساتھ ساتھ حکم یہ ہے کہ انہیں انجام بد سے ڈرایا جاتا رہے اور وعظ و تبلیغ کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ یہ صورتحال بہرحال موجود رہنی چاہئے کہ اہل دعوت اور اہل جاہلیت ایک قوم ہونے کے ساتھ ساتھ دو الگ فرقے ہوں' دو علیحدہ امتیں ہوں۔ اس لئے کہ اسلام میں رنگ و نسل اور خاندان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہاں تو اتحاد و افتراق کا مدار نظریے' دین اور عقیدے کی اساس پر ہے۔ یہ نظریہ اور عقیدہ ہی ہوتا ہے جو نکتہ اتفاق یا مقام افتراق ہوتا ہے۔ جب دینی اساس پائی جائے تو لوگ متحد ہو جاتے ہیں اور جب دینی عنصر مفقود ہو تو تمام دوسرے روابط کٹ جاتے ہیں............ پس یہی اس لہر کا مختصر مضمون ہے۔

---ООО---

درس نمبر ۶۲ تشریح آیات

۶۶ --- تا --- ۷۰

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ؕ﴿۶۶﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ؗ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾

"اور تمہاری قوم نے اس کا انکار کر دیا ہے حالانکہ وہ حقیقت ہے۔ ان سے کہہ دو کہ میں تم پر حوالہ دار نہیں بنایا گیا ہوں ہر خبر کے ظہور میں آنے کا ایک وقت مقرر ہے، عنقریب تم کو خود انجام معلوم ہو جائے گا"۔

یہاں روئے سخن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ اس خطاب کے ذریعے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آنے والے اہل ایمان کے کاسہ دل کو ایمان و یقین سے بھر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ ایک داعی کی پوری قوم اور پورا معاشرہ حق کو جھٹلا دے تب بھی اسے یقین ہوتا ہے کہ حق غالب رہے گا اس لئے کہ سچائی کے بارے میں فیصلہ کرنا اہل جاہلیت کا کام نہیں ہے، یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ حق اور باطل کا فیصلہ کرے۔ اللہ ہی ہے جو یہ اعلان کر سکتا ہے کہ فلاں چیز حق ہے اور فلاں چیز باطل۔ لہٰذا جھٹلانے والوں کے کسی فیصلے کی کوئی حقیقت اور حیثیت نہیں ہے۔

اس کے بعد حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی قوم سے دامن جھاڑ دیں اور اعلان کر دیں کہ وہ ان سے بری الذمہ ہیں اور یہ کہ اب ان کی اور ان کی قوم کی راہیں جدا ہو گئی ہیں اور یہ بھی اعلان کر دیں کہ وہ ان کے معاملے میں کسی چیز کے مختار و حوالہ دار نہیں ہیں اور نہ ان کی نگہبانی کے ذمہ دار ہیں۔ ان کا فریضہ اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب وہ پیغام پہنچا دیں اور سمجھا دیں کیونکہ ذمہ داری اور نگہبانی رسولوں کی ڈیوٹی میں شامل نہیں ہے۔ جب کوئی رسول پیغام پہنچا دے اور سمجھا دے تو اس کا فریضہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد رسول اقوام کو چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اپنے فطری انجام تک پہنچ جائیں، کیونکہ ہر بات اپنے مقررہ وقت پر ظاہر ہو جاتی ہے اور جب بات سامنے آ جاتی ہے تو سب اسے جان لیتے ہیں۔

(لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (٦:٦٧)) ہر خبر کے ظہور میں آنے کا ایک وقت مقرر ہے، عنقریب تم کو خود انجام معلوم ہو جائے گا"۔ یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ کیا بات ہے جو ظاہر

ہونے والی ہے۔ ایسے مقامات پر بات کو مجمل رکھنا زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔ مارے ڈر کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔

آیات میں حق پر ثابت قدمی کی تلقین ہے۔یقین دلایا گیا ہے کہ باطل کا ظاہری غلغلہ جس قدر بھی ہو اس کا انجام بہرحال برا ہو گا اور ایک مقررہ وقت پر اللہ کی جانب سے اہل باطل کو پکڑا جاتا ہے اور یہ کہ ہربات کے ظہور کا وقت مقرر ہے اور ہرحاضر صورت حال کا ایک انجام سامنے آنے والا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ داعیان حق کو اپنی قوم کی جانب سے جس تکذیب اور سردمہری کا سامنا کرنا پڑتا ہے' ان پر اپنے خاندان کی جانب سے جو مظالم ہوتے ہیں' جس طرح وہ اپنے اہل و عیال میں بیگانے بن جاتے ہیں' انہیں جن اعصاب شکن حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے' ایسے حالات میں فی الواقعہ وہ ایسی ہی تسلی کے محتاج ہوتے ہیں' اس طرح ان کا کاسہ دل اطمینان اور یقین سے بھرجاتا ہے اور یہ اطمینان اور سکینت قرآن ہی ان کے دلوں میں پیدا کر سکتا ہے۔

جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تک یہ پیغام پہنچا دیا اور ان کی جانب سے ناروا تکذیب و انکار کا جواب ان کے ساتھ قطع تعلق کے ذریعے دے دیا گیا تو اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ان کی ہمنشینی اختیار نہ کریں' یہاں تک کہ تبلیغی مقاصد کے لئے بھی ان کے پاس نہ جائیں اگر حالات ایسے ہوں کہ وہ اسلام پر تنقید اور نکتہ چینیاں کر رہے ہوں اور عزت و احترام اور سنجیدگی سے اسلامی موضوعات پر بحث نہ کر رہے ہوں۔ اسلام جس سنجیدہ عزت و وقار اور رعب و داب کا تقاضا کرتا ہے وہ اس کا لحاظ نہ کر رہے ہوں بلکہ الٹا دین کے ساتھ مذاق کر رہے ہوں اور ہنسی مزاح کے ساتھ ریمارکس پاس کر رہے ہوں چاہے اپنی زبان سے وہ ایسا کر رہے ہوں یا عمل کے ساتھ۔ ایسے حالات میں حکم دیا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ ہم نشینی اختیار نہ کی جائے کیونکہ اس طرح معنوی اعتبار سے ہم نشینی کرنے والا ان باتوں کا تائید کنندہ تصور ہو گا یا کم از کم یہ تصور ہو گا کہ ایسے شخص کے اندر کوئی دینی غیرت نہیں ہے۔ اگر شیطان کسی مسلمان کو بھلاوے میں ڈال دے اور وہ ایسی محفل میں بیٹھ جائے تو یاد آتے ہی اس کا فرض ہے کہ وہ وہاں سے اٹھ کھڑا ہو۔

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ وَإِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٦٨﴾

"اور اے نبی ؐ' جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ' یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں لگ جائیں۔ اور اگر کبھی شیطان تمہیں بھلاوے میں ڈال دے تو جس وقت تمہیں اس غلطی کا احساس ہو جائے اس کے بعد پھر ایسے ظالم لوگوں کے پاس نہ بیٹھو"۔

یہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے بعد آنے والے مسلمان بھی اس میں شامل ہوں۔ یہ حکم مکی دور کے لئے تھا۔ اس وقت آپ کا کام صرف دعوت و تبلیغ تک محدود تھا اور اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ آپ جہاد و قتال سے باز رہیں۔ آپ کو یہ ہدایت تھی کہ آپ مشرکین کے ساتھ تصادم سے باز رہیں۔ چنانچہ اس

دور میں آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ آپ جب دیکھیں کہ مشرکین کی کسی مجلس میں دین اسلام کے خلاف بدتمیزی ہو رہی ہے تو آپ ایسی مجالس میں بیٹھنے سے اجتناب فرمائیں اور اگر کبھی ایسا ہو کہ شیطان آپ کو بہلاوے میں ڈال دے اور آپ کسی ایسی مجلس میں پہنچ جائیں اور وہاں اسلام کے بارے میں گستاخانہ باتیں ہو رہی ہوں تو آپ یاد آتے ہی وہاں سے اٹھ کھڑے ہوں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ اہل اسلام سب کو یہی حکم تھا۔ یہاں ظالمون سے مراد مشرکون ہے جیسا کہ اس سے پہلے ہم کہہ چکے ہیں۔ قرآن کریم کا یہ عام انداز گفتگو ہے۔

لیکن جب مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو اس وقت مشرکین کے مقابلے میں حضورؐ کی پوزیشن مختلف تھی۔ اب پوزیشن یہ تھی کہ حضورؐ ان کے مقابلے میں اس وقت تک جہاد و قتال جاری رکھے ہوئے تھے جب تک تمام فتنوں کا استیصال نہیں کر دیا جاتا اور کسی کو یہ جرأت ہی نہیں رہتی کہ وہ آیات الٰہیہ کے خلاف کوئی ہرزہ سرائی کرے۔

اس کے بعد سیاق کلام مومنین اور مشرکین کے درمیان مکمل فرق و امتیاز کی بات کو پھر دہراتا ہے جس طرح اس سے قبل رسولؐ اللہ اور مشرکین کے درمیان جدائی کا فیصلہ ہوا تھا۔ یہاں فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ دونوں کے انجام اور ذمہ داریوں میں بھی فرق ہے۔

وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٦٩﴾

"ان کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمہ داری پرہیز گار لوگوں پر نہیں ہے، البتہ نصیحت کرنا ان کا فرض ہے شاید کہ وہ غلط روی سے بچ جائیں"۔ اسلامی نظام میں متقین اور مشرکین کے درمیان کوئی مشترکہ ذمہ داری نہیں ہے کیونکہ متقین اور مشرکین دو علیحدہ علیحدہ امتیں ہیں۔ اگرچہ رنگ و نسل اور قوم و حکومت میں وہ ایک ہوں۔ کیونکہ اسلامی پیمانے کے مطابق رنگ، نسل اور قوم کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اہل تقویٰ ایک امت ہیں اور ظالم اور مشرک بالکل ایک دوسری امت ہیں۔ ظالموں کے حساب و کتاب میں سے کسی چیز کی ذمہ داری اہل تقویٰ پر نہیں ہے۔ ہاں ان کی ذمہ داری اس حد تک ضرور ہے کہ وہ ظالموں کی اصلاح کے لئے سعی کرتے رہیں تاکہ وہ بھی ان کی طرح اہل تقویٰ بن جائیں اور ان کی امت کا حصہ بن جائیں۔ اگر اہل تقویٰ اور اہل ظلم کے درمیان نظریاتی اتحاد نہیں ہو جاتا تو پھر ان کے درمیان کسی اور بات پر اشتراک نہیں ہو سکتا۔

یہ ہے دین اسلام اور یہ ہے اللہ کا کلام۔ اگر کوئی اس کے سوا کوئی اور بات کرتا ہے یا کوئی اور طرز عمل اختیار کرتا ہے تو یہ فعل اس کا اپنا ہو گا لیکن اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اپنے اس طرز عمل کے سبب دین اسلام سے خارج بھی ہو سکتا ہے۔ ذرا مزید مطالعہ کیجئے، قرآن کریم کچھ مزید ہدایات دیتا ہے، اہل حق و اہل باطل کے درمیان مکمل جدائی کی کچھ مزید حدود و قیود بیان کی جاتی ہیں۔

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ

الدُّنْيَا وَ ذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ ۚ وَ اِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا
يَكْفُرُوْنَ ۝ ۷۰ ع ۸ ۱۴

""چھوڑو ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے اور جنہیں دنیا کی زندگی فریب میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ ہاں مگر یہ قرآن سنا کر نصیحت اور تنبیہ کرتے رہو کہ کہیں کوئی شخص اپنے کیے ہوئے کرتوتوں کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے' اور اگر گرفتار بھی اس حال میں ہو کہ اللہ سے بچانے والا کوئی حامی و مددگار اور کوئی سفارشی اس کے لئے نہ ہو' اور اگر وہ ہر ممکن چیز فدیہ میں دے کر چھوٹنا چاہے تو وہ بھی اس سے قبول نہ کی جائے۔ کیونکہ ایسے لوگ تو خود اپنی کمائی کے نتیجے میں پکڑے جائیں گے' ان کو تو اپنے انکار حق کے معاوضہ میں کھولتا ہوا پانی پینے کو اور دردناک عذاب بھگتنے کو ملے گا""۔ اس میں ہم درج ذیل حقائق کے سامنے کھڑے ہیں :

ایک یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ان لوگوں سے قطع تعلق کر لیں جو آپ کے دین اور اسلامی نظام کے ساتھ ٹھٹھا مذاق کرتے ہیں اور آپ کے بعد اہل ایمان کے لئے بھی یہی ہدایت آتی ہے اور یہ قطع تعلق اور جدائی بات چیت میں بھی ہوتی ہے اور عمل میں بھی۔ جو لوگ دین اسلام کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنا کر' اپنے لئے ماخذ نظریات قرار دے کر' اپنے لئے نظام عمل بنا کر' اپنے لئے نظام اخلاق اور اپنے لئے نظام قانون قرار دے کر اس کا صحیح مقام نہیں دیتے اور اسے پروقار نہیں بناتے وہ بھی دراصل اس دین کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ جو لوگ اس دین کے موضوعات پر بحث کرتے ہیں' اسلامی شریعت پر کلام کرتے ہیں اور اس دین کی طرف قابل تضحیک اوصاف کی نسبت کرتے ہیں وہ بھی دین کے ساتھ مذاق کرنے والوں میں شامل ہیں۔ مثلاً وہ لوگ جو غیب کے بارے میں باتیں کرتے ہیں اور عالم غیب کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں حالانکہ ایمان بالغیب اصول عقائد میں سے ہے اور جو لوگ زکوٰۃ کے ساتھ مزاح کرتے ہیں حالانکہ وہ دین کی بنیادوں میں سے ہے۔ اور جو لوگ شرم و حیاء اور عفت و پاکیزگی کے ساتھ مزاح کرتے ہیں حالانکہ یہ اصول دین میں سے ہیں۔ یہ لوگ اپنی تقریروں اور تحریروں میں انہیں قرون اولیٰ کے زرعی اور جاگیردارانہ اخلاق میں سے قرار دیتے ہیں یا انہیں بورژوا اخلاق قرار دیتے ہیں اور جو لوگ حقوق الزوجین کے بارے میں تحقیر آمیز ریمارکس پاس کرتے ہیں اور جو لوگ عورت کے لئے مقرر اصول عفت و پاکیزگی کو عورت کی پسماندگی اور اس کا استحصال قرار دیتے ہیں اور سب سے آخر میں اور تمام باتوں سے پہلے وہ انسانوں کی پوری زندگی میں اللہ کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتے اور انسان کی سیاسی' اجتماعی' اقتصادی اور قانونی زندگی میں اللہ کی حاکمیت کے قائل نہیں ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ ان شعبوں میں لوگ اللہ کی شریعت سے بغاوت کرتے ہوئے اپنے اختیارات استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ سب

لوگ اس آیت کے مفہوم میں داخل ہیں اور اللہ کے دین کے ساتھ ٹھٹھا مذاق کرنے والے سمجھے جائیں گے۔اس لئے ہر مسلمان کو حکم ہے کہ وہ ماسوائے تبلیغی مقاصد کے ان لوگوں سے دور رہے اس لئے کہ یہ لوگ ظالم اور مشرک ہیں اور ان کافروں میں سے ہیں جو اپنے کفریہ اعمال میں گرفتار ہونے والے ہیں اور قیامت میں ان کی تواضع کھولتے ہوئے پانی سے کی جائے گی اور وہ دردناک عذاب میں رہیں گے' اس لئے کہ یہ لوگ مذکورہ کفریہ روش میں مبتلا تھے۔

دوسری حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ ایسے لوگوں کو ایک طرف چھوڑ دیں اور یہی حکم آپ کے بعد آنے والے اہل ایمان کے لئے بھی باقی ہے۔لیکن حضور کو اس مقاطعہ کے ساتھ ساتھ یہ ہدایت بھی دی گئی کہ وہ لوگ جنہوں نے اس دین کے ساتھ ہنسی مذاق کو اپنا شیوہ بنا رکھا ہے اور انہیں دنیا کی اس عارضی زندگی نے فریب میں ڈال دیا ہے انہیں نظرانداز کرتے ہوئے بھی' انہیں یاد دہانی کراتے جائیں۔انہیں ڈراتے رہیں کہ وہ جو کچھ برائیاں سمیٹ رہے ہیں ان کا وبال ان کی جان پر ہو گا اور ایک وقت آنے والا ہے جس میں وہ اللہ سے ملیں گے اور اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار نہ ہو گا جو کچھ بھی تعاون کر سکے۔نہ کوئی ان کا سفارشی ہو گا' نہ ان سے کوئی مالی تاوان قابل قبول ہو گا جس کے ذریعے وہ اپنی جان کو ان باتوں سے چھڑا سکیں جن کا انہوں نے دنیا میں ارتکاب کیا۔یہ مفہوم قرآن کریم نے جن الفاظ میں ادا کیا ہے' ان کی خوبصورتی اور معنوی گہرائی قابل غور ہے۔ذرا دوبارہ تلاوت کیجئے۔

(وَذَكِّرْ بِهِ أَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ وَإِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَا يُؤْخَذْ مِنْهَا (۶ : ۷۰)) ہاں مگر یہ قرآن سنا کر نصیحت اور تنبیہ کرتے رہو کہ کہیں کوئی شخص اپنے کیے کرتوتوں کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے۔اور گرفتار بھی اس حال میں ہو کہ اللہ سے بچانے والا کوئی حامی و مددگار اور کوئی سفارشی اس کے لئے نہ ہو اور اگر وہ ہر ممکن چیز فدیہ میں دے کر چھوٹنا چاہے تو وہ بھی اس سے قبول نہ کی جائے''۔ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت میں ماخوذ ہو گا' ذمہ داری انفرادی ہو گی اور اپنے اعمال کی بنیاد پر ہو گی اور ایسے حالات میں ہو گی کہ جہاں اللہ کے سوا کوئی ولی اور سفارش کرنے والا نہ ہو گا اور اگر کوئی ممکن حد تک زیادہ معاوضہ و تاوان دینا چاہے تو بھی قبول نہ ہو گا اور یوں وہ کسی صورت میں بھی گردن نہ چھڑا سکے گا۔

رہے وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین کو مذاق کا نشانہ بنایا اور دنیا کی چند روزہ حیات سے دھوکہ کھا گئے تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی کو گروی رکھ دیا اپنی بداعمالیوں کے ہاتھ' اور اس وجہ سے ان پر وہ عذاب ثابت ہو گیا جس کا تذکرہ اس آیت میں ہوا اور ان کا انجام یہ قرار پایا:

أُولَئِكَ الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ (۶ : ۷۰)) کیونکہ ایسے لوگ تو خود اپنی کمائی کے نتیجے میں پکڑے جائیں گے' ان کو تو اپنے انکار حق کے معاوضے میں کھولتا ہوا پانی پینے کو اور دردناک عذاب بھگتنے کو ملے گا''۔گویا وہ اپنے افعال بد کی وجہ سے پکڑے گئے اور یہ

ان کے لئے مناسب سزا تھی، کیسی جزاء؟ ایسا گرم پانی جو ان کے حلق اور پیٹ کو بھون ڈالے گا۔ ان کے کفریہ اعمال کی وجہ سے یہ ان کے لئے ایک دردناک عذاب ہو گا اور یہ عذاب اس بات کی دلیل ہو گا کہ وہ دین کے ساتھ مذاق کرتے رہے۔

تیسری بات اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اللہ کا سچا دین فی الحقیقت ان کا دین ہے۔ (دینھم) سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین میں داخل ہو گئے ہیں اور داخل ہونے کے بعد انہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے۔ مدینہ طیبہ میں اس قسم کے لوگ موجود تھے اور عرف عام میں انہیں منافقین کہا جاتا تھا۔ مدینہ طیبہ میں تو بات ایسی ہی تھی۔

سوال یہ ہے کہ آیا اس آیت کا اطلاق ان لوگوں پر بھی ہو گا مثلاً مشرکین جو دین اسلام میں داخل نہیں ہوئے۔ ہاں ان پر بھی ہو گا اس لئے کہ حقیقی دین' دین اسلام ہی ہے۔ یہ پوری بشریت کا دین ہے چاہے کوئی اس پر ایمان لائے یا نہ لائے۔ اس لئے کہ جو شخص اس دین کا انکار کرتا ہے اسے چھوڑ دیتا ہے تو وہ درحقیقت خود اپنے دین کو چھوڑتا ہے۔ اس لئے کہ یہی تو دین ہے جو اللہ کے نزدیک دین ہے اور خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اللہ کی جانب سے صرف یہی دین مقبول ہے۔

یہی مفہوم ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دین کی نسبت ان کی طرف کی ہے کہ یہ ان کا دین ہے۔

(وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا(۷:۷۰))

"چھوڑو ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے اور جنہیں دنیا کی زندگی فریب میں مبتلا کئے ہوئے ہے"۔ جیسا کہ ہم نے وضاحت کی اس آیت میں اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے کہ دین اسلام تمام انسانوں کا دین ہے۔ لہذا جو شخص دین اسلام کو کھیل اور تماشا بناتا ہے گویا وہ خود اپنے دین کے ساتھ مذاق کرتا ہے۔ اگرچہ ایسا کرنے والا شخص مشرک ہو۔

چہارم یہ کہ ظالموں اور مشرکوں کی ہم نشینی کس قدر جائز ہے؟ اور جو لوگ دین اسلام کو کھیل تماشا بناتے ہیں ان کے ساتھ مجالست کی حدود کیا ہیں؟ یہ مجالست صرف وعظ و نصیحت کی خاطر جائز ہے اور اس کے سوا ایسے لوگوں کے ساتھ کسی قسم کا تعلق جائز نہیں ہے۔ یعنی ایسے حالات میں جب وہ آیات الٰہی کے ساتھ مذاق کر رہے ہیں اور نکتہ چینی کر رہے ہوں اور یہ نکتہ چینی اور مذاق مختلف انداز میں ہو سکتا ہے۔

امام قرطبی نے اپنی تفسیر جامع الاحکام میں اس سلسلے میں لکھا ہے کہ "اس آیت میں بصراحت اس نظریے کی تردید آجاتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ راہنمایان دین اور ان کے متبعین بطور تقیہ فاسقین کے ساتھ ہم نشینی اختیار کر سکتے ہیں اور ان کی غلط آرا کی تصدیق بطور تقیہ کر سکتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ فاسقین اور مفسدین کی مجالس میں وعظ و تذکیر کی خاطر بھی ان حدود و قیود کے ساتھ ہم بیٹھ سکتے ہیں جن کا تذکرہ اس آیت میں ہو چکا ہے۔ رہی یہ بات کہ فساق و فجار کی مجالس میں بیٹھنا اور ان کی بری اور مفسدانہ باتوں پر سکوت اختیار کرنا اور بطور تقیہ ایسا کرنا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے کیونکہ یہ تو کھلے طور پر باطل کا اقرار ہے اور حق کے خلاف شہادت ہے اور لوگوں کو دھوکے میں ڈالنا ہے۔ نیز اس طرز عمل میں دین کی بھی توہین ہے اور جو لوگ دین

کا کام کرتے ہیں ان کی بھی توہین ہے۔ لہٰذا ایسے حالات میں بیٹھنا منع ہو گا اور ایسی مجالس کو چھوڑنا فرض ہو گا۔

امام قرطبی نے بعض دوسرے اقوال بھی نقل کئے ہیں: "ابن خویز مقداد کہتے ہیں کہ جو شخص آیات الٰہی کے بارے میں گستاخانہ کلام کرے اس کی مجلس سے فوراً واک آوٹ کرنا چاہئے خواہ یہ شخص مومن ہو یا کافر۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ائمہ نے دشمن کی سرزمین میں جانے سے منع کیا ہے۔ اسی طرح گرجوں اور مندروں میں جانے سے بھی منع کیا گیا ہے اور کفار اور بدعتیوں کے ساتھ ہم نشینی کی بھی ممانعت کی گئی ہے۔ نیز یہ بات بھی منع ہے کہ کوئی ان سے محبت و دوستی کرے، ان کی باتیں سنے اور ان کے ساتھ مناظرے کرے۔ روایات میں آیا ہے کہ بعض بدعتی لوگوں نے ابو عمران نخعی سے کہا کہ میری بات سنو تو انہوں نے ان سے منہ پھیر لیا اور کہا میں تمہاری آدھی بات سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں"۔ اسی قسم کی بات ایوب سختیانی سے بھی منقول ہے اور فضیل ابن عباس نے کہا ہے: جو شخص کسی صاحب بدعت کے ساتھ دوستی رکھے گا، اس کے اعمال تباہ ہو جائیں گے اور یوں اس کے دل سے اسلام خارج ہو جائے گا۔ جس شخص نے کسی مبتدع شخص کو رشتہ دیا تو اس نے قطع رحم کیا اور جو شخص بدعتی لوگوں کے ساتھ بیٹھے گا وہ دانشمندی سے محروم کر دیا جائے گا۔ اگر اللہ کو معلوم ہوا کہ فلاں بندہ بدعتی کو بری نظروں سے دیکھتا ہے تو مجھے امید ہے کہ ایسے شخص کو اللہ بخش دے گا۔ ابو عبداللہ حاکم نے حضرت عائشہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس شخص نے بدعتی کی عزت افزائی کی اس نے اسلام کو منہدم کرنے کے کام میں معاونت کی"۔

یہ باتیں تو اس شخص کے بارے میں ہیں جو بدعتی ہو، البتہ دین اسلام کا پیروکار ہو، رہا وہ شخص جو اپنے لئے اللہ کی خصوصیات میں سے ایک صفت کا دعویٰ کرتا ہو، مثلاً صفت حاکیت تو وہ بدعتی سے بھی بڑا مجرم ہے اور جو شخص ایسے شخص کو اس صفت کے ساتھ متصف کرتے ہیں وہ اس سے بھی بڑے مجرم ہیں۔ یہ جرم محض ارتکاب بدعت جیسا جرم نہیں ہے بلکہ کفر اور شرک جیسا بڑا جرم ہے۔ کسی شخص کو صفت حاکیت سے متصف کرنا سلف صالحین کے دور میں نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے اس نکتے پر بحث نہیں کی۔ تاریخ اسلام میں کسی وقت بھی کسی نے اپنے آپ کو اللہ کے بالمقابل حاکم نہیں سمجھا اور نہ حاکیت خود یا حاکیت عوام کا دعویٰ کیا ہے اور ساتھ ہی وہ مسلمان ہونے کا بھی مدعی ہو۔ شرق اوسط پر فرانسیسی حملے سے پہلے عالم اسلام میں اللہ کی حاکیت کا نظام قائم تھا۔ فرانسیسی حملے کے بعد ہی لوگ اللہ کی حاکیت کے دائرے سے خارج ہوئے ہیں۔ ہاں بعض لوگ ایسے تھے جو اس سے بچے رہے۔ لہٰذا اقوال سلف میں سے ایسے اقوال کم ملتے ہیں جن کا انطباق ہم اس جدید صورت حالات پر کر سکیں اس لئے کہ یہ جدید صورت حال ایسی ہے کہ اس میں مسلمان شرعی حدود کو دور پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۶۴ ایک نظر میں

یہ لہر حقیقت الوہیت اور خصوصیات ذات کبریائی کے بیان میں ایک نہایت ہی موزوں زمزمہ ہے۔اس میں ایسے شخص کے بارے میں بڑی شدت کے ساتھ سمجھایا گیا ہے جو راہ ہدایت پانے کے بعد دوبارہ شرک کے اندھیروں میں داخل ہو جائے اور آگے بڑھنے کے بعد رجعت قہقہری اختیار کر لے یا دین اسلام کو ترک کر کے مرتد ہو جائے ۔ایسے شخص کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے جیسے وہ ایک صحرا میں کھڑا ہے اور اسے اپنی منزل مقصود کی طرف جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔اس فیصلے اور قرارداد پر کہ ہدایت وہی ہے جو اللہ کی راہنمائی پر مبنی ہو' اس لہر کا میٹھا نغمہ اپنے طویل ترنم کے ساتھ اس بات پر ختم ہو جاتا ہے کہ تخلیق اور نظام حکومت (امر) کے بارے صرف اللہ وحدہ کو تمام اختیارات حاصل ہیں ۔اس اختیار کلی کا اظہار اس وقت ہو گا جب نفخ صور کے دن مومن و کافر سب کو اپنی اپنی قبر سے اٹھایا جائے گا سب کے سب اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے تو اس وقت جس کا عقیدہ نہیں تھا وہ بھی یقین سے جان لے گا کہ اب تو تمام اختیارات اللہ وحدہ کے ہاتھ میں ہیں اور اب تمام معاملات اسی کی طرف لوٹ آئے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۶۴ تشریح آیات

۷۱ --- تا --- ۷۳

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُنَا وَ لَا یَضُرُّنَا وَ نُرَدُّ عَلٰۤى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِی اسْتَهْوَتْهُ الشَّیٰطِیْنُ فِی الْاَرْضِ حَیْرَانَ۪ لَهٗۤ اَصْحٰبٌ یَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۱﴾ وَ اَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ

"اے نبی " ان سے پوچھو کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان؟ اور جب کہ اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا چکا ہے تو کیا اب ہم الٹے پاؤں پھر جائیں؟ کیا ہم اپنا حال اس شخص کا سا کر لیں جسے شیطانوں نے صحرا میں بھٹکا دیا ہو اور وہ حیران و سرگرداں پھر رہا ہو در آں حالیکہ اس کے ساتھی اسے پکار رہے ہوں کہ ادھر آ یہ سیدھی راہ موجود ہے؟ کہو "حقیقت میں صحیح راہنمائی تو صرف اللہ ہی کی رہنمائی ہے اور اس کی طرف سے ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ مالک کائنات کے آگے سر اطاعت خم کر دو' نماز قائم کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو۔"

اس سورہ میں بار بار مضراب قل سے ضربات لگائی جا رہی ہیں۔ یہ نہایت ہی پر تاثیر طرز خطاب ہے جس سے یہ تاثر دیا جانا مطلوب ہے کہ حلال و حرام کے حدود و قیود کے تعین کا اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو محض مبلغ اور انجام بد سے ڈرانے والے ہیں۔ اس انداز کلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ نہایت ہی اہم' بڑا اور خوفناک ہے۔ یہ تصورات جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پیش فرما رہے ہیں یہ ان کی ڈیوٹی ہے اور انہیں خدا کی جانب سے امر ہے کہ وہ ایسا کریں۔

(قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُنَا وَ لَا یَضُرُّنَا (٦ : ٧١)) اے نبی " ان سے پوچھو کیا

ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان؟" لوگ اللہ کے سوا اوروں کو پکارتے تھے اور ان سے امداد طلب کرتے تھے۔ ان کی اس حرکت کو برا سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے نبی "ان سے صاف صاف کہہ دو کہ تم نے جو ان لوگوں کی اطاعت اختیار کر رکھی ہے وہ تمہارے نفع و نقصان کے مالک ہی نہیں۔ تم ان لوگوں کو کیوں پکارتے ہو؟ غیراللہ سے مراد یہاں 'بت' آستانے بھی ہیں' درخت و پتھر بھی ہیں' روحانی مخلوق اور فرشتے بھی ہیں اور انسان و شیاطین بھی ہیں۔ یہ سب کے سب اس لحاظ سے برابر ہیں کہ ان کے قبضے میں کسی کا نفع و نقصان نہیں ہے۔ وہ اس پوزیشن سے بہت دور ہیں کہ کسی کو نفع و نقصان پہنچا سکیں۔ اس دنیا میں تمام حرکات و سکنات اور سب کا نفع و نقصان اللہ کی تقدیر کے مطابق ظاہر ہوتا ہے۔ اللہ کا اذن نہ ہو تو کوئی واقعہ نہیں ہو سکتا اور جو کچھ واقعہ ہو جاتا ہے وہ اللہ کی تقدیر اور رضا کے مطابق ہوتا ہے' اللہ کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

غیراللہ کو پکارنا' غیر اللہ کی بندگی کرنا اور غیر اللہ سے استعانت طلب کرنا قابل نفرت کام ہے۔ غیراللہ کے سامنے عاجزی کرنا اور اللہ کے سوا دوسروں کے لئے تمام ایسے نظریات اور اعمال کھوٹے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تردید و نکیر ان باتوں کو دیکھ کر ہو جس پر مشرکین عمل پیرا تھے یا یہ تردید ان کی اس تجویز کی تردید کرتے ہوئے آئی ہو جس میں وہ لوگ تجویز کرتے تھے کہ ہم حضور ؐ کے خدا کی عبادت شروع کر دیں گے بشرطیکہ حضور ؐ ہمارے الٰہوں کی عبادت میں شریک ہوں۔ بہرحال یہ ازخود تردید ہو یا ان کی کسی تجویز کا رد ہو دونوں صورتوں میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مشرکین کے ساتھ مکمل نظریاتی قطع تعلق کر لیں۔ مشرکین کے نظریات اور عمل دونوں عقل انسانی کی رو سے نہایت کمزور اور بودے ہیں بشرطیکہ روشن فکری کے ماحول میں عقل کو دعوت فکر دی جائے اور رسم و رواج اور موروثی روایات کی تہوں کے نیچے عقل دبی ہوئی نہ ہو جیسا کہ حضور ؐ کے دور میں لوگوں کا شعور ماحول میں دبا ہوا تھا۔

ان مشرکانہ معتقدات اور اعمال کو یہاں ان ہدایات کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دیں تاکہ اسلامی ہدایات کے بالمقابل ان کا کھوٹ اور ان کا قابل نفرت ہونا اچھی طرح واضح ہو جائے' کیونکہ اللہ نے یہ ہدایت دی ہے کہ صرف اللہ وحدہ کی عبادت کی جائے صرف اسے ہی الٰہ اور حاکم تسلیم کیا جائے اور بلا شرکت غیرے اس کے تجویز کردہ نظام زندگی کو قبول کیا جائے۔ ذرا انداز کلام ملاحظہ ہو۔ "اے نبی" ان سے پوچھو کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان۔" اگر ہم ایسا کریں تو یہ صحیح معنوں میں ارتداد ہو گا' الٹے پاؤں پھرنا ہو گا' رجعت پسندی ہو گی۔ ترقی پسندی اور آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے لوٹنا ہو گا' کیونکہ اسلام نام ہی ترقی پسندی کا ہے۔

(وَنُرَدُّ عَلٰٓی اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ (٦: ٧١)) "اور جب کہ اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا چکا ہے تو کیا اب ہم الٹے پاؤں پھر جائیں؟" اس کے بعد ایک اور متحرک اور مشخص منظر اسکرین پر آتا ہے۔

(كَالَّذِی اسْتَهْوَتْهُ الشَّیٰطِیْنُ فِی الْاَرْضِ حَیْرَانَ لَهٗۤ اَصْحٰبٌ یَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَی الْهُدَی ائْتِنَا (٦: ٧١)) کیا ہم اپنا حال اس شخص کا سا کر لیں جسے شیطانوں نے صحرا میں بھٹکا دیا ہو اور وہ حیران و سرگرداں پھر رہا ہو درآں حالیکہ اس کے ساتھی اسے پکار رہے ہوں کہ ادھر آ' یہ سیدھی راہ موجود ہے؟" ضلالت و

گمراہی اور حیرانی و پریشانی کا یہ ایک متحرک اور جیتا جاگتا منظر ہے جو شخص عقیدۂ توحید کے بعد شرک اختیار کرتا ہے۔جس کا ضمیر رب واحد اور ارباب متفرقہ کے درمیان گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے' وہ عموماً ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے اور فیصلہ نہیں کر پاتا کہ کون سی راہ اختیار کرے۔ غرض یہ ایک ایسی بدبخت مخلوق خدا کا منظر ہے "جسے شیطان نے صحرا میں بھٹکا دیا ہو۔لفظ استہوتہ اپنے مفہوم کی تصویر کشی خود ہی کر دیتا ہے۔اگر وہ ایک راہ لیتا تو کوئی بات نہ تھی۔کسی ایک راہ پر پڑ جاتا چاہے وہ گمراہی کی راہ ہوتی' لیکن یہاں وہ جس صورت حال سے دوچار ہے وہ یہ ہے کہ دوسری جانب سے اس کے کچھ ساتھی ہدایت یافتہ ہیں اور وہ اسے راہ راست کی طرف بلاتے ہیں اور بار بار پکارتے ہیں کہ آؤ بھائی ادھر آؤ۔وہ اس شیطانی بے راہ روی اور دوستوں کی پکار کے درمیاں حیران و پریشان کھڑا ہے۔ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کدھر جائے اور دونوں پکارنے والوں میں سے کس کی راہ کا انتخاب کرے۔وہ اس نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہے اور قرآن کے الفاظ کے درمیان سے اس شخص کی ذہنی اذیت واضح طور پر نظر آتی ہے۔

میں جب بھی اس آیت کی تلاوت کرتا تو سوچتا رہتا کہ اس ذہنی کھینچا تانی 'کشمکش اور تذبذب کی وجہ سے انسان کس عذاب میں مبتلا ہوتا ہوگا۔ایسے افراد کا ایک ذہنی نقشہ سامنے آجاتا ہے لیکن یہ صرف ذہنی تصور ہی ہوتا ہے جبکہ عملی زندگی میں' ہمارے سامنے بعض لوگوں کے حقیقی حالات بھی آئے ہیں جن پہ یہ منظر پوری طرح چسپاں ہوتا ہے اور وہ لوگ اس عذاب میں مبتلا نظر آتے ہیں۔یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلامی نظریہ حیات کو تو پالیا تھا اور اس میں اپنی ذہنی و عملی بساط کے مطابق معرفت بھی حاصل کی مگر اس کے بعد وہ الٹے پاؤں پھرے اور کھوٹے اور جھوٹے الہوں کی پرستش اور اطاعت کرنے لگے۔یہ اطاعت انہوں نے خوف اور لالچ کی وجہ سے کی۔میں نے دیکھا کہ وہ ایسی ہی کربناک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ایسے لوگوں کے عملی حالات کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ اس آیت کا حقیقی مفہوم کیا ہے اور قرآن کریم کا یہ انداز بیاں کس قدر جامع اور مؤثر ہے۔

ابھی یہ خوفناک منظر آنکھوں کے سامنے تھا اور اس برے انجام کو دیکھ کر دل مومن کانپ ہی رہا تھا کہ صراط مستقیم دکھا دیا جاتا ہے اور فیصلہ کن حکم دیا جاتا ہے۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۷۱) وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ (۶ : ۷۲ - ۷۱) "کہو' حقیقت میں صحیح رہنمائی تو صرف اللہ ہی کی رہنمائی ہے اور اس کی طرف سے ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ مالک کائنات کے آگے سر اطاعت خم کر دو' نماز قائم کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو۔"

نہایت ہی مناسب نفسیاتی حالات میں یہ فیصلہ کن بات ہے۔اس لئے کہ جب انسان یہ مشاہدہ کرتا ہے کہ اس کے سامنے حیرانی اور کشمکش کی ایک تصویر چل رہی ہے' اسے کوئی سکون و قرار حاصل نہیں ہے اور وہ سخت ترین اذیت کا شکار ہے تو ایسے حالات کو دیکھ کر کوئی بھی قاری اس بات کے لئے آمادہ ہوتا ہے کہ وہ فیصلہ کن اور مطمئن کر دینے والی بات کو قبول کرے اور راحت و سکون کی تلاش کرے۔یہ فیصلہ کن بات کیا ہے؟ یہ ہے سچائی۔"راہنمائی تو صرف اللہ کی راہنمائی ہے۔" هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى کی ترکیب سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ بات فیصلہ کن ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ اللہ کی راہنمائی ہی حقیقی راہنمائی ہے۔

انسان نے جب بھی اللہ کی ہدایت سے منہ موڑا وہ آوارۂ صحرا ہوا۔ نیز اگر انسان اللہ کی راہنمائی کا کچھ حصہ تبدیل کر کے اس کی جگہ اپنے تصورات نافذ کرے ' اپنے فارمولے آزمائے ' اپنی جانب سے قوانین وضع کرے ' اپنے طور طریقے اپنائے ' خود ساختہ پیمانے رائج کرے اور یہ سب کام علم الہیٰ ' ہدایت الہیہ اور اللہ کی روشن کتاب کی راہنمائی کے دائرے سے باہر نکل کر کرے تو وہ کبھی بھی راہ راست نہ پائے گا اور بے کنار صحرا ہی میں پھرتا رہے گا۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت انسان کو اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی قوتیں عطا کی ہیں جن کے ذریعے وہ اس کائنات کے بعض نوامیس فطرت تک رسائی حاصل کر چکا ہے ' کائنات کی بعض قوتوں کو اس نے مسخر کر لیا ہے ' اس کرۂ ارض کا نظام چلانے کے لئے وہ ان قوتوں سے استفادہ کر رہا ہے اور اس دنیا کی زندگی کو ترقی دے رہا ہے لیکن اس کو اللہ نے اس قدر وسیع علم اور قوت نہیں دی ہے کہ وہ اس کائنات کی تمام قوتوں اور تمام حقیقتوں کی تہہ تک پہنچ سکے ' نہ یہ حضرت انسان اس عالم غیب کی وسعتوں کے اندر داخل ہو سکتا ہے جو اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ خود انسان کی عقل ' انسان کی سوچ ' اس کے جسم کے مختلف اعضاء کا کام کرنا اور ان کے اسباب اور ان اعضاء کا اس طرح مربوط طریقے پر کام کرنا ' یہ سب امور ایسے ہیں جو انسان کے لئے ابھی تک عالم غیب کے حصے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ خود اپنی ذات کے بارے میں بھی انسان خدائی ہدایت اور راہنمائی کا محتاج ہے۔ انسان کی زندگی ' اس کے نظریات ' اس کی تخلیق و نشوونما ' زندگی کی اقدار اور پیمانے ' زندگی کا نظام اور طور طریقے ' زندگی کے ضوابط اور قوانین ایسے امور ہیں جن میں انسان کو اللہ کی راہنمائی درکار ہے تاکہ ان چیزوں کو اس کی زندگی میں نافذ کیا جا سکے اور اس کی عملی زندگی پر ان خدائی ہدایات کا نفاذ ہو۔

یہ انسان جب اللہ کی ہدایت کی طرف لوٹ آتا ہے اور ہدایت کو قبول کر لیتا ہے تو وہ صحیح معنوں میں ہدایت یافتہ انسان قرار پاتا ہے کیونکہ اللہ کی ہدایت ہی صحیح ہدایت ہے جب بھی وہ اللہ کی ہدایت سے دور ہوتا ہے یا اللہ کی راہنمائی میں سے بعض اجزاء سے انحراف کرتا ہے یا اس میں سے بعض اجزاء کو تبدیل کر کے اس کے اندر خود ساختہ اجزاء پیوست کر دیتا ہے تو وہ گمراہ ہو جاتا ہے اس لئے کہ جو بات اللہ کی راہنمائی پر مبنی نہ ہو تو وہ ضلالت ہے کیونکہ کوئی تیسرا اور درمیانی راستہ موجود نہیں ہے۔ (فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ) "سچائی کے بعد گمراہی کے سوا اور ہے کیا؟" انسان نے اپنی طویل تاریخ میں اس گمراہی کا مزہ خوب چکھا ہے اس کی وجہ سے اس نے بے حد مصائب جھیلے ہیں اور آج تک انسانیت ان مصائب میں مبتلا ہے۔ انسانی تاریخ نے اپنا یہ حتمی فیصلہ دے دیا ہے کہ اس کا یہی انجام ہو گا ' جب بھی وہ اللہ کی راہنمائی سے انحراف کرے گی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نیز اللہ کا حکم بھی یہی ہے اور اللہ کی جانب سے اطلاع بھی یہی ہے۔ اس حقیقت کی سوا اور کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگرچہ دعویٰ بہت سے حقائق کا کیا جاتا ہے لیکن تاریخ نے کسی کی تصدیق نہیں کی۔ جو لوگ خدائی راہنمائی سے انحراف کی وجہ سے انسانی مصائب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں انہیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے معاشروں کا مطالعہ کریں۔ ایک عقلمند سب کچھ چشم بینا سے دیکھ سکتا ہے۔ وہ ان مصائب کو ہاتھ سے چھو سکتا ہے۔ یہ محسوس ہیں اور اس پوری دنیا کے عقلمند لوگ ان کی بابت چیخ و پکار کر رہے ہیں۔

چنانچہ سیاق کلام میں مکرر حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دو صرف اللہ کے سامنے۔ اسی سے ذرہ

اور اسی کی بندگی اور عبادت کرو۔ وامرنا...... اور اس کی طرف سے ہمیں حکم ملا ہے کہ مالک کائنات کے آگے سر اطاعت خم کر دو اور نماز قائم کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو۔"

یعنی اے محمد اعلان کر دو کہ راہنمائی اور ہدایت تو صرف اللہ کی راہنمائی اور ہدایت ہے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ اللہ رب العالمین ہی کے آگے سر تسلیم خم کر دو' اس لئے کہ عالمین اسی کے آگے جھکتے ہیں۔ یہ پوری کائنات اس کے آگے پابند حکم ہے' پس کوئی جواز نہیں ہے کہ اس پوری کائنات کے اندر انسان جیسی عقلمند مخلوق اللہ رب العالمین کے آگے نہ جھکے اور اللہ کی ملکیت اور ربوبیت کا انکار کر دے اور آسمان و زمین اور پوری کائنات سے مختلف روش اختیار کرے۔

یہاں پورے جہان اور اس کی ربوبیت کا ذکر بے محل نہیں ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے تسلیم کئے بغیر بات بنتی ہی نہیں۔ اس کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا یہ کہ پوری دنیا میں مشہود اور غائب دونوں شامل ہیں اور وہ قوانین قدرت جن کے مطابق یہ رواں دواں ہے ان سے یہ کائنات شمہ بھر انحراف بھی نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ اللہ رب العالمین ہے۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے اپنی طبیعی زندگی کے اندر وہ بھی ان نوامیس فطرت کا پابند ہے۔ انسان کی جسمانی زندگی ان ضوابط کے اندر جکڑی ہوئی ہے اور وہ ان ضوابط کا مطیع ہے۔ ان کے دائرے سے خارج نہیں ہو سکتا۔ لہذا انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی اس محدود اختیاری زندگی کے اندر بھی اللہ کے ضوابط کی پابندی کرے اور یہ اس کے لئے سخت آزمائش ہے۔ اس آزمائش میں دیکھا جائے گا کہ وہ راہ ہدایت پالیتا ہے یا صحرائے ضلالت کی طرف جانکلتا ہے۔ اگر وہ خدائی ضوابط کی اس طرح پابندی کرے جس طرح وہ اپنی طبیعی زندگی کے اندر مطیع نوامیس الہی ہے تو اس کی زندگی خوش اسلوبی سے گزرے گی اور اس کا طرز عمل اور اس کی طبیعی زندگی باہم متناسق ہوں گے۔ اس کا جسم اس کی روح کا ساتھی ہو گا اور اس کی دنیا آخرت کے ساتھ جڑی ہوئی ہوگی۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے (امیر جماعت اسلامی پاکستان کی کتاب رسالہ دینیات)۔

یہ کہنا کہ مجھے اور تمام مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مالک حقیقی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں' اس لئے انہوں نے سر تسلیم خم کر دینے کی روش اختیار کی ہے' ایک نہایت ہی مؤثر اور مفرح انداز گفتگو ہے اور تاقیامت جو لوگ بھی راہ تسلیم و رضا کو اختیار کریں گے وہ اپنے آپ کو براہ راست امر الہی کا تعمیل کنندہ سمجھیں گے۔

اب وہ ماموراتِ آتے ہیں جو اعلان تسلیم و رضا کے بعد کا لائحہ عمل ہیں۔

(وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ (٦: ٧٢)) یہ کہ نماز قائم کرو اور اس کی نافرمانی سے ڈرو۔"

اصل فریضہ یہ ہے کہ اللہ کی ربوبیت کو تسلیم کیا جائے۔ اس کی حاکمیت کو تسلیم کیا جائے اور اس کی رضا کے مطابق اپنے آپ کو درست کیا جائے۔ اس کے بعد پھر عبادات کا درجہ آتا ہے اور نفسیاتی اصلاح کا کام شروع ہوتا ہے تاکہ تسلیم و رضا کی اساس پر عملی زندگی کا نقشہ قائم ہو سکے اور عملی زندگی اور تفصیلی نظام زندگی اس وقت تک استحکام حاصل نہیں کر سکتا جب تک اس کی تعمیر مستحکم بنیادوں پر نہ ہو۔

اس لہر کی آخری ضرب اسلامی نظریہ حیات کے اساسی حقائق کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ یہ حقائق اسلامی نظریہ حیات کے اصلی اور بنیادی عوامل ہیں۔ مثلاً حشر و نشر' تخلیق کائنات' حاکمیت الہیہ' علم غیب اور علم شہادت اور یہ کہ

اللہ حکیم و خبیر ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْكُ
يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝

"اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔ اور جس دن وہ کہے گا کہ حشر ہو جائے اسی دن وہ ہو جائے گا۔ اس کا ارشاد عین حق ہے۔ اور جس روز صور پھونکا جائے گا اس روز بادشاہی اسی کی ہوگی' وہ غیب اور شہادت ہر چیز کا عالم ہے اور دانا اور باخبر ہے۔"

(وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (٦ : ٧٢)) اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔" اسی لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ تم صرف اس کے سامنے سرتسلیم خم کرو کیونکہ تم کو آخر کار اسی کی طرف جانا ہے۔ لہذا انسانوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ یوم الحشر کے لئے کچھ چیزیں ساتھ لے کر جائیں جس کی وجہ سے ان کی نجات ہو' کیا وہ اس کے سامنے نہیں جھکتے جس کے سامنے حشر کے دن عالمین سرنگوں ہوں گے۔ مناسب ہے کہ اس دن کے آنے سے پہلے ہی وہ جھکیں۔ حشر کا تصور دے کر یہاں انسان کو اس بات پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ آج ہی سے اس کے سامنے سرنگوں ہونا شروع کر دو جبکہ حشر کے روز کوئی بچ کر نہیں نکل سکے گا۔

(وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (٦ : ٧٣)) "وہی ہے جس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔" یہ ایک دوسری حقیقت ہے جو اصلاح احوال کا ایک دوسرا بہترین مؤثر ہے۔ وہ اللہ جس کے سامنے سرنگوں ہونے کا یہاں حکم دیا جا رہا ہے' وہ وہی ہے جس نے زمین و آسمان کو برحق پیدا کیا ہے۔ وہ ذات وہی ہے جو پیدا کرتا ہے' جو مالک ہے' جو حاکم ہے اور جو تمام امور میں متصرف ہے اور اس نے زمین و آسمان کو پیدا بھی حق پر کیا ہے۔ تخلیقات کائنات میں سچائی ایک بنیادی عنصر ہے اور یہ ایک حقیقت ہے۔ اس فقرے میں ایک جانب تو اس کائنات کے بارے میں افلاطون کے مثالی نظریے کی تردید کر دی جس میں کہا گیا تھا کہ یہ کائنات ایک وہم ہے اور اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دوسری جانب اس میں یہ قرار دیا گیا کہ سچائی اپنے اندر اصلیت رکھتی ہے اور وہ اس کائنات کا بنیادی عنصر ہے۔ جو لوگ سچائی کا سہارا لیتے ہیں فطرت کائنات کے اندر موجود سچائی بھی اسی طرف لوٹتی ہے۔ اس طرح اس

کائنات کی طبیعی سچائی اور اسلامی نظریہ حیات کی سچائی باہم مل کر ایک خوفناک اور عظیم قوت بن جاتی ہیں۔ پھر اس عظیم قوت کے سامنے باطل اپنے پائے چوبیں پر کھڑا ہی نہیں ہو سکتا' اس لئے کہ باطل کی جڑیں اس کائنات کے اندر نہیں ہوتیں۔ اس کی مثال تو ایک خبیث درخت جیسی ہوتی ہے جسے زمین کے اوپر سے باسانی اکھاڑ لیا جاتا ہے اور وہ زمین پر ٹھہر نہیں سکتا یا اس کی مثال اس جھاگ کی طرح ہوتی جس کے اندر جسمانی حقیقت نہیں ہوتی اور وہ جلد ہی خود بخود بیٹھ جاتی ہے۔ اس لئے باطل پر اس کائنات کی بنیاد نہیں رکھی گئی۔ یہ ایک عظیم اور مؤثر نظریاتی حقیقت ہے۔

وہ مومن جس کے شعور میں یہ بات ہو کہ وہ حق کا حامل ہے وہ شخصی اور ذاتی طور پر اس سچائی کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے جو اس کائنات کے اندر موجود ہے۔ (ایک دوسری آیت میں ہے کہ ان اللہ ھو الحق یعنی اللہ سچائی ہے) یہ دونوں سچائیاں پھر ذات باری تعالیٰ سے اتصال حاصل کر لیتی ہیں جو بذات خود عظیم سچائی ہے۔ جب ایک مرد مومن اپنے اندر یہ شعور پیدا کر لیتا ہے کہ وہ واصل بالحق ہے تو اس کے سامنے پھر باطل کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہتی۔ اگرچہ یہ باطل طاقت بظاہر بہت عظیم و ضخیم نظر آتی ہو' جابر و قاہر ہو اور اسے اذیت رسانی کی بڑی قوت ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ ایسا مرد مومن یہ سمجھتا ہے کہ یہ صورت حال نہایت ہی عارضی اور حقیر ہے۔ اس کی جڑیں اس کائنات کے اندر نہیں ہیں اور نہ اسے ثبات و قرار حاصل ہو گا۔ جلد ہی یہ عارضی حالت ختم ہو گی اور صورت حال اس طرح بدل جائے گی کہ گویا وہ یہاں تھی ہی نہیں .... اور جب ایک منکر اور غیر مومن اس حقیقت پر غور کرتا ہے تو بعض اوقات وہ راہ راست پر آجاتا ہے اور اللہ کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے۔

(وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ (۶ : ۷۳)) اور جس دن وہ کہے گا کہ حشر ہو جائے اسی دن وہ ہو جائے گا۔" وہ قادر مطلق بادشاہ ہے' اور اس کی مشیت بے قید ہے۔ از سر نو تخلیق' اپنی تخلیق میں تغیر و تبدل کرنے میں اسے کچھ دیر نہیں لگتی۔ اللہ کی اس قدرت کا یہاں ذکر کرنے کے دو مقاصد ہیں۔ ایک طرف تو اس سے اسلامی نظریہ حیات کو قلب مومن میں جاگزیں کیا جا رہا ہے۔ دوسری جانب ان لوگوں کے لئے جنہیں دعوت دی جا رہی ہے یہ امر ایک مؤثر ذریعہ ہے کہ وہ دعوت کو قبول کریں اور اللہ رب العالمین کے سامنے سرنگوں ہو جائیں کیونکہ کن فیکون کہنے والا وہی قادر مطلق ہے۔

(قَوْلُهُ الْحَقُّ (۶ : ۷۳)) اس کا ارشاد عین حق ہے۔" اس کا وہ قول بھی حق ہے جس کے ذریعے اس نے پوری کائنات کی تخلیق کی اور کن فیکون کہا۔ اس کا وہ فرمان بھی برحق ہے جس کے ذریعے اس نے بندوں کو حکم دیا کہ وہ صرف اس کی اطاعت کریں اور صرف اس کے سامنے سرنگوں ہوں۔ اس کے وہ احکام بھی برحق ہیں جن کے ذریعے اس نے لوگوں کے لئے قانون سازی کی۔ اور وہ اقوال بھی برحق ہیں جن میں ماضی' حال اور مستقبل کے بارے میں اطلاعات دی گئی ہیں یعنی خلق' نشاۃ اور حشر و نشر کی بابت اور سزا و جزاء سے متعلق۔

(وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ (۶ : ۷۳)) اور جس روز صور پھونکا جائے گا اس روز بادشاہی اسی کی ہو گی۔" اور جب صور میں پھونکا جائے گا (صور ڈھول کی طرح اندر سے خالی سینگ کو کہتے ہیں) یہ وہ دن ہو گا جس میں لوگ اپنی قبروں سے اٹھ کر پھیلیں گے' یہ کیونکر ہو گا؟ انسان کے علم میں یہ کیفیت نہیں آسکتی۔ یہ ان غیبی

امور میں سے ہے جس کا علم اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔ صور کی ماہیت اور حقیقت کیا ہوگی' یہ بھی غیبی امور میں سے ہے۔ کس طرح تمام مردے اٹھ کھڑے ہونگے اس کا تصور بھی ہم نہیں کر سکتے۔ روایات میں آتا ہے کہ صور ایک نورانی بگل ہے جس میں فرشتہ پھونکے گا۔ تمام اہل قبور اسے سنیں گے اور وہ جہاں بھی ہوں گے اٹھنے کی تیاری کریں گے اور یہ دوسری آواز ہوگی۔ رہا پہلا صور تو اس کے نتیجے میں تمام لوگ مرکر گر جائیں گے یعنی زمین و آسمان کی تمام مخلوق جان دے دیگی۔ الا ماشاء اللہ۔ سورہ زمر میں ہے "اور اس روز صور پھونکا جائے گا اور وہ سب مرکر گر جائیں گے جو آسمان و زمین میں ہیں سوائے ان کے جنہیں اللہ زندہ رکھنا چاہے۔ پھر ایک دوسرا صور پھونکا جائے گا اور یکایک سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے۔" (٦٨:٣٩) صور اور اس کے پھونکنے کے جو آثار یہاں دیئے گئے وہ ایسے ہیں کہ انسان جس صورت حال کے عام طور پر عادی ہیں ان میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے' ایک عام انسان ایسے حالات کا تصور نہیں کر سکتا اس لئے کہ یہ اللہ کے ان غیبی حقائق میں سے ایک ہے جس کا علم ہمیں نہیں دیا گیا۔ ہمارا علم وہاں تک محدود ہے جو اللہ نے ہمیں دیا۔ اس لئے ہم اس کے بارے میں اس سے آگے نہیں بڑھتے جس قدر اس آیت میں دے دیا گیا ہے۔ نہ آگے جانے میں کوئی فائدہ ہے۔ اگر اس کی کیفیات پر کوئی کلام کرے گا تو وہ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے مترادف ہوگا محض ظن و تخمین ہوگا۔

ہاں جس دن صور میں پھونکا جائے گا اس دن اصل حقیقت منکرین پر بھی ظاہر ہوگی اور اندھے بھی اسے دیکھ لیں گے کہ اس دن صرف اللہ کی بادشاہی ہوگی اور صرف اللہ ہی بادشاہ ہوگا۔ صرف اللہ ہی فیصلے کرے گا۔ لہذا اس دنیا میں جو لوگ سرکش ہیں انہیں چاہئے کہ وہ ابھی سے اپنا طرز عمل درست کر لیں۔ قبل اس کے کہ وہ جبار و قہار کے سامنے کھڑے ہو کر اطاعت کریں یعنی نفخ صور کے دن۔

(عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (٦:٧٣)) "وہ غیب اور شہادت ہر چیز کا عالم ہے۔" یعنی ان باتوں کی کیفیات کا علم اسے ہے جنہیں ہم نہیں سمجھتے۔ وہ ان باتوں کو اس طرح جانتا ہے جس طرح ہم عالم شہادت کو جانتے ہیں اور بندوں کی پوشیدہ چیزوں سے کوئی چیز بھی اس پر مخفی نہیں ہے۔ نہ کوئی چیز اس سے چھوٹ سکتی ہے۔ لہذا لوگوں کو چاہئے کہ وہ اللہ کی اطاعت کریں اور اس سے ڈریں۔ اپنی جگہ حقیقت اور جزو عقیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ دھمکی مخالفین اور جھٹلانے والوں کے لئے مفید ہے۔

(وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ (٦:٧٣)) اور وہ دانا اور باخبر ہے۔" وہ اپنی حکمت کے مطابق اس پوری کائنات کو چلاتا ہے۔ وہ دنیا و آخرت دونوں میں اپنے بندوں کے معاملات کو نہایت خبرداری اور حکمت سے چلاتا ہے۔ لہذا لوگوں کو چاہئے کہ وہ اللہ کی ہدایت اور اس کی شریعت کی پیروی کریں اور اللہ کے علم و حکمت سے استفادہ کریں۔ اس کی ہدایت و رحمت کے سائے میں لوٹ آئیں۔ حیرانی و پریشانی سے نکل کر اس کے سایہ عاطفت اور حکمت و دانائی میں داخل ہو جائیں جہاں انہیں صراط مستقیم ملے گا اور علم و بصیرت ملے گی۔

یوں اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو لوگوں کی عقل و بصیرت کے لئے مؤثر بناتے ہیں۔

---OOO---

پارہ نمبر ٧

درس نمبر ۶۵ ایک نظر میں

یہ درس 'طوالت کے باوجود' ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا موضوع بھی ایک ہے جس کے تمام پیراگراف باہم پیوستہ ہیں۔ یہ اس سورہ کے مرکزی مضمون سے متعلق ہے۔ سورہ کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ اسلامی نظریہ حیات کی تعبیر مقام الوہیت کی صحیح تعریف اور توضیح کے رنگ میں کی جائے۔ اس کے مقابلے میں بندے کی حقیقت اور اس کے آداب زندگی کی وضاحت اور عبد و معبود کے درمیان تعلق کی صحیح نوعیت کا بیان۔ لیکن اس سبق میں ان حقائق اور موضوعات پر بات کرنے کا ایک نیا انداز اختیار کیا گیا ہے جو اس سے قبل اس سورہ میں اختیار کیے جانے والے انداز سے بالکل جدا ہے۔

یہاں اس موضوع اور مضمون کو قصے کے انداز میں لیا گیا ہے۔ لیکن اس قصے میں وہ تمام اثر آفریں باتیں آگئی ہیں جو اس سے قبل اس سورہ میں آنے والی تمام لہروں میں مذکور ہیں جیسا کہ ہم نے اس سورہ پر تبصرہ کرتے وقت بیان کیا تھا۔ مثلاً ایک یہ ہے کہ مختلف لہروں کے درمیانی وقفے میں قیامت کے دن اللہ کے سامنے پیشی کے مناظر بار بار دہرائے گئے ہیں اور نہایت مرتب انداز میں۔

اس سبق میں اس مسلسل قافلہ دعوت اسلامی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جو حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک طویل انسانی تاریخ کی شاہ راہ پر پھیلا ہوا ہے۔ اس قافلے کی طرف اشارہ کرنے سے پہلے مقام کبریائی کی توضیح کر دی گئی ہے اور یہ توضیح ایک مومن کامل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فطری تاثرات کی شکل میں کی گئی ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ فطرت سلیمہ اس طرح کی ہوتی ہے اور یہ فطرت سلیمہ جب سچائی کی متلاشی ہوتی ہے تو اس کا انداز اس طرح کا ہوتا ہے۔ اللہ کی کبریائی کا صحیح تصور تو خود فطرت سلیمہ کے اندر موجود ہوتا ہے' رہے خارجی مظاہر تو ان میں تو قدم قدم پر جاہلیت کو تصادم کے بعد ہی صحیح تصورات عطا کیے جا سکتے ہیں۔ یہ تصورات حق تعالیٰ کے بارے میں فطرت انسانی کے اپنے تصور کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ ان تصورات کی بنیادان داخلی شواہد پر ہوتی ہے جو فطرت انسانی کے اندر ہوتے ہیں اور جو محسوس شواہد سے زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنے داخلی فطری شواہد کی وجہ سے حق تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لیتے ہیں اور انہیں ان داخلی فطری شواہد کی وجہ سے اطمینان حاصل ہو جاتا ہے تو قرآن کریم اس داخلی واردات کی حکایت ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ قَالَ اَتُحَاجُّوْنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْــٴًـا وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ (۸۰) وَكَیْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا

فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۸۱) (۶: ۸۰ تا ۸۱))

''اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے قوم سے کہا: کیا تم لوگ اللہ کے معاملے میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے راہ راست دکھا دی ہے۔ اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا، ہاں اگر میرا رب کچھ چاہے تو وہ ضرور ہو سکتا ہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے۔ اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لئے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی؟ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی اور اطمینان کا مستحق ہے؟ بتاؤ اگر تم علم رکھتے ہو۔'' اب سیاق کلام قافلہ ایمان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اس قافلے کی قیادت اللہ کے رسولوں کے ہاتھ میں ہے۔ شاہراہ تاریخ پر یہ رواں دواں ہے۔ اس طویل شاہراہ پر مشرکین کا شرک اور مکذبین کی تکذیب بے وزن نظر آتے ہیں۔ اور اس قافلے نے ان چیزوں کو ٹھوکریں مار کر اس شاہراہ سے ایک طرف پھینک دیا ہے۔ یہ قافلہ رواں دواں ہے۔ اس قافلے کی آخری کڑی اس کی ابتدائی کڑی سے جڑی ہوئی ہے۔ یوں ایک متحدہ امت تشکیل پاتی ہے۔ اس امت مسلمہ کا آخری حصہ اسی ہدایت کی پیروی کر رہا ہے جس کی پیروی اس کے ابتدائی حصے نے کی۔ اس امت کی تشکیل میں زمان و مکان کا کوئی لحاظ نہیں ہے۔ قوم اور نسل کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ رنگ و نسب کا کوئی لحاظ نہیں ہے۔ اس امت کے درمیاں واحد رابطہ اور واحد رسی دین اسلام ہے اور اس رسی اور حبل اللہ کو سب نے پکڑ رکھا ہے۔

یہ ایک حیران کن منظر ہے۔ اللہ تعالیٰ قافلہ رسل، کا نام لے کر گنواتے ہیں اور اس کے بعد فرماتے ہیں:

(ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۸۸) اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَاۗءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ (۸۹) اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۭ قُلْ لَّآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (۹۰) (۶: ۸۸ تا ۹۰))

''یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے راہنمائی کرتا ہے، لیکن اگر کہیں ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا سب کا کیا کرایا غارت ہو جاتا۔ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی تھی۔ اب اگر یہ لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو (پرواہ نہیں) ہم نے کچھ اور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے جو اس سے منکر نہیں ہیں۔ اے نبی وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے۔ انہی کے راستہ پر تم چلو اور کہہ دو میں اس (تبلیغ و ہدایت کے) کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لئے۔'' اس موقف کو پیش کرنے کے بعد ان لوگوں پر سخت تنقید کی جاتی ہے جو یہ زعم لئے ہوئے تھے کہ اللہ

تعالیٰ نے کوئی رسول نہیں بھیجا اور نہ اللہ نے کسی انسان پر کوئی کتاب اتاری ہے ۔کہا جاتا ہے کہ اس قسم کے لوگ درحقیقت کوتاہ بین ہیں اور انہوں نے ذات باری کی صحیح معرفت حاصل نہیں کی ۔ان کے اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے لوگوں کو پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ دیا' ان کی لگام ان کے نفس اور ان کی عقل کے ہاتھ میں دے دی' ان کی خواہشات اور ان کی ناقص فہم اور ان کا سرکش نفس انہیں جو چاہے حکم دے ۔ اللہ کی شان کبریائی اور اس کی الوہیت و ربوبیت سے یہ نظریہ فروتر ہے ۔اس کا علم' اس کی حکمت اور اس کی عدالت اور پھر سب سے بڑھ کر اس کی شان رحیمی ایسا ہرگز نہیں کر سکتی ۔اس کے علم' اس کی رحمت اور اس کے عدل کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اپنے بندوں میں سے بعض برگزیدہ ہستیوں کو رسول بنا کر بھیجے اور ان میں سے بعض رسولوں پر کتاب نازل کرے تاکہ یہ سب لوگ عوام الناس کا ہاتھ تھام کر انہیں اللہ کی طرف لے جائیں اور ان کی فطرت سلیمہ پر جو تہ بہ تہ پردے پڑ جائیں انہیں اتاریں ۔ان کے قلب ونظر کے جو دریچے بند ہو چکے ہیں انہیں از سرنو کھولیں اور وہ ان کی دعوت پر لبیک کہیں ۔اس سلسلے میں یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی کتاب کی مثال دی گئی اور پھر قرآن ایک شاہد عادل ہے' جو ماقبل کی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے ۔

اس طویل سبق کا خاتمہ ان لوگوں کو دھمکی دینے پر ہوتا ہے جو اللہ پر افتراء باندھتے ہیں اور جو یہ غلط دعویٰ کرتے ہیں کہ ان پر وحی نازل ہوئی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جس قسم کا کلام اللہ نازل کرتا ہے ویسا ہی کلام یہ لوگ بھی نازل کر سکتے ہیں اور یہ دعوے ایسے ہیں جو ہر پیغمبر کے مقابلے میں غلط مدعیان نبوت نے ہمیشہ کیے ہیں ۔بعض نے وحی کا دعویٰ کیا اور بعض نے نبوت کا دعویٰ کیا ۔آخر میں مشرکین کا ایک کربناک منظر پیش کیا جاتا ہے ۔ یہ اس منظر کی ایک جھلک ہے جو آخر میں انہیں درپیش ہو گا ۔

(وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓىٕكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ وَ كُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ(۹۳) وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ وَ مَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِیْكُمْ شُرَكٰٓؤُا لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَیْنَكُمْ وَ ضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ(۹۴)(۶:۹۳-۹۴))

''کاش تم ظالموں کو اس حالت میں دیکھ سکو جبکہ وہ سکرات الموت میں ڈبکیاں کھا رہے ہوتے ہیں اور فرشتے ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ''لاؤ' نکالو اپنی جان' آج تمہیں ان باتوں کی پاداش میں ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔ جو تم اللہ پر تہمت رکھ کر ناحق بکا کرتے تھے اور اس کی آیات کے مقابلے میں سرکشی دکھاتے تھے ۔'''لو اب تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا' جو کچھ ہم نے تمہیں دنیا میں دیا تھا وہ سب کچھ تم

پیچھے چھوڑ آئے ہو' اور اب ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمہارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے۔ تمہارے آپس کے تمام رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے گم ہو گئے جن کا تم زعم رکھتے تھے۔" یہ نہایت ہی اعصاب شکن منظر ہے۔ انسان دیکھتے ہی خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ اس منظر میں ان لوگوں کی حالت زار صاف صاف نظر آتی ہے جس میں وہ حیران و پریشان نظر آتے ہیں اور ان کی پشیمانی اور ان کی گوشمالی ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ ہے جزاء ان کی سرکشی' روگردانی اور تکذیب و افتراء کی۔

---ooo---

درس نمبر ۶۵ تشریح آیات

۷۴ ---تا--- ۷۹

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ لِأَبِيهِ ءَازَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا ءَالِهَةً ۚ إِنِّىٓ أَرٰىكَ وَ
قَوْمَكَ فِى ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ﴿٧٤﴾ وَكَذٰلِكَ نُرِىٓ إِبْرٰهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَءَا كَوْكَبًا ۖ
قَالَ هٰذَا رَبِّى ۖ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَآ أُحِبُّ الْءَافِلِينَ ﴿٧٦﴾ فَلَمَّا رَءَا الْقَمَرَ
بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّى ۖ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِى رَبِّى لَأَكُونَنَّ
مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّينَ ﴿٧٧﴾ فَلَمَّا رَءَا الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّى هٰذَآ
أَكْبَرُ ۖ فَلَمَّآ أَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ إِنِّى بَرِىٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ﴿٧٨﴾ إِنِّى وَجَّهْتُ
وَجْهِىَ لِلَّذِى فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا ۖ وَمَآ أَنَا۠ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٧٩﴾

”ابراہیم ؑ کا واقعہ یاد کرو جب کہ اس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا ”کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے؟ میں تو تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں۔“ ابراہیم ؑ کو ہم اسی طرح زمین اور آسمانوں کا نظام سلطنت دکھاتے تھے اور اس لئے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔ چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا' کہا' یہ میرا رب ہے مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں۔ پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا' یہ ہے میرا رب۔ مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب' یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیم ؑ پکار اٹھے ”اے برادران قوم' میں ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

ان آیات میں قرآن کریم نے جس منظر کی تصویر کشی کی ہے وہ ایک عجیب منظر ہے۔ یہ فطرت انسانی کا مظاہرہ ہے۔ فطرت انسانی دیکھتے ہی تمام جاہلی تصورات اور شرکیہ بت پرستانہ عقائد کو رد کر دیتی ہے۔ ان غلط تصورات کو دیکھتے ہی فطرت دامن جھاڑتی ہے اور تلاش الہ حق کی راہ میں نکل کھڑی ہوتی ہے۔ یہ حقیقی سچائی خود اس کے ضمیر میں موجود ہے لیکن انسان کو اس کا ادراک نہیں ہے اور فطرت اس پر متنبہ نہیں ہے۔ لیکن یہ فطرت تلاش حق میں ہر اس چیز سے ربط قائم کرتی ہے جو بظاہر الہ ہو سکتی ہو' لیکن جب ملاحظہ عمیق کرتی ہے تو وہ کھوٹے خداؤں کو رد کر دیتی ہے کیونکہ فطرت کے اندر حقیقی الہ کی جو ذات و صفات ودیعت ہیں وہ چیز اس کے ساتھ ٹیلی نہیں کرتی۔ جب تلاش کرتے کرتے یہ فطرت اللہ کی ذات تک جا پہنچتی ہے تو وہ حقیقت اسے واضح نظر آ رہی ہوتی ہے جس سے اسے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ اس کے اندر جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے' اس لئے کہ وہ اس منزل تک بدلائل پہنچ جاتی ہے وہ خود اس کے اندر پنہاں ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ فطری منظر جو قلب ابراہیم علیہ السلام کو دکھایا جاتا ہے۔ وہ جس تجربے سے گزرے اسے ان مختصر آیات میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ حق و باطل کے بارے میں فطری سوچ کی یہ عجیب کہانی ہے جسے یہاں اس اسلوب میں لایا گیا ہے۔ یہ ایک نظریہ حیات کا معاملہ ہے جس کا اظہار ایک مومن بیانگ دہل کرتا ہے اور اس معاملے میں وہ کوئی رکھ رکھاؤ نہیں کرتا۔ اس راہ میں وہ باپ' خاندان اور قوم کسی کے ساتھ کوئی نرمی نہیں کرتا جیسا کہ ایسا ہی رویہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے معاملے میں اختیار کیا۔ انہوں نے ناقابل تغیر اور بالکل غیر لچک دار موقف اختیار کیا اور اپنے موقف کو بالکل واضح کر کے بیان کیا۔

(وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً اِنِّیْۤ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (٦ : ٧٤)) یہ وہ فطری پکار ہے جو حضرت ابراہیم کی زبانی ظاہر ہوتی ہے۔ اگرچہ اپنی فہم و فراست کے ذریعے حضرت ابراہیم ﷺ کو الہ حقیقی تک رسائی حاصل نہ ہوئی تھی لیکن آپ کی فطرت سلیمہ ابتداً ہی سے اس بات کا انکار کر رہی تھی کہ اس کی قوم جن بتوں کی پوجا کرتی ہے وہ حقیقی الہ ہو سکتے ہیں۔ حضرت ابراہیم کی قوم عراق کے کلدانی تھے۔ وہ بتوں' ستاروں اور سیاروں کے پجاری تھے لیکن حضرت ابراہیم کی فطرت یہ جانتی تھی کہ وہ رب' معبود اور وہ ذات باری جس کی طرف لوگ خوشحالی اور بدحالی میں متوجہ ہوتے ہیں اور جس نے تمام لوگوں اور تمام زندہ مخلوق کو پیدا کیا ہے۔ وہ ذات یہ بت نہیں ہیں۔ بتوں کی ظاہری حالت ہی بتا رہی تھی کہ نہ وہ خالق ہیں' نہ رازق ہیں' نہ سنتے ہیں اور نہ جواب دیتے ہیں لہذا یہ حقیقی الہ نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان کی فطرت تلاش حق کی راہ پر نکل پڑی اور فیصلہ دے دیا کہ یہ الہ جن کی تم پوجا کرتے ہو نہ یہ الہ حقیقی ہیں اور نہ ہی وہ اس قابل ہیں کہ انہیں الہ حقیقی تک رسائی کا واسطہ اور ذریعہ بنایا جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فطرت اس صورت حال کو واضح طور پر گمراہی کی صورت حال پاتی ہے اور انہیں صحیح فیصلے تک پہنچنے میں کوئی دیر نہیں لگتی۔ یہ ہے اس فطرت کا نمونہ کامل جس پر اللہ نے اپنی تمام مخلوق کو پیدا کیا ہے۔ پھر یہ وہ ردعمل ہے فطرت سلیمہ کا جب اس کا مقابلہ کسی واضح گمراہی کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ فوراً اس کا انکار کر دیتی ہے اور اسے اس سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اس باطل بین کے معاملے میں پھر فطرت سلیمہ اعلان حق کرنے میں ذرہ بھر دیر نہیں کرتی' خصوصاً جب معاملہ عقیدے اور نظریات کا ہو۔

"کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے؟ میں تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں۔" یہ بات حضرت ابراہیم ﷺ اپنے

باپ کے سامنے کرتے ہیں' حالانکہ حضرت ابراہیم اپنے مزاج کے اعتبار سے نہایت ہی نرم مزاج' بردبار اور حلیم الطبع تھے اور پھر وہ تھے بھی ایک بیٹے کی پوزیشن میں لیکن نظریہ حیات کی قدر و قیمت باپ بیٹے کے تعلق اور صبر اور برداشت کی صفات کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ نشان راہ تھے جس کے بارے میں ان کی اولاد کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اس کی پیروی کریں اور یہ قصہ بھی بطور مثال اور نمونہ پیش کیا جارہا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی فطرت کی صفائی اور اپنے خلوص نیت کی بنا پر اس بات کے مستحق ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی بادشاہت کے کچھ مخصوص راز منکشف فرمائیں اور ان کو وہ دلائل عطا کریں جو زمین و آسمان کے اندر اللہ کی بادشاہت کے دلائل ہیں۔

(وَكَذٰلِكَ نُرِىٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ

(٦ : ٧٥)) ابراہیم ؑ کو ہم اسی طرح زمین اور آسمانوں کا نظام سلطنت دکھاتے تھے اور اس لئے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔'' اس فطرت سلیمہ کے ساتھ' اس کھلی بصیرت کے ساتھ اور طلب حق کی راہ میں اس خلوص کی وجہ سے اور اس قوت اور صراحت کے ساتھ باطل کے انکار کی وجہ سے اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زمین و آسمان کی بادشاہت کے کچھ راز بتائے' جن میں زمین اور آسمانوں میں مملکت الٰہیہ کے کچھ اصول تھے۔ اس کائنات کے کچھ خفیہ راز جن پر یہ نظام استوار ہے' پھر اللہ نے انہیں وہ دلائل و شواہد دیئے جو اس کائنات میں موجود تھے۔ خود ان کی فطرت اور ان کے دل کے اندر بھی ان ہی جیسے دلائل و شواہد موجود تھے جو راہ ہدایت دکھا رہے تھے تاکہ حضرت ابراہیم باطل کے انکار کے مقام سے آگے بڑھ کر حصول حق اور معرفت حق کے درجے تک پہنچ جائیں اور انہیں پوری طرح یقین آجائے۔

یہ ہے فطرت کا گہرا طریق کار۔ اس کے مطابق جو فراست دی جاتی ہے وہ کبھی بھی زنگ آلود نہیں ہو سکتی اور انسان کے اندر ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جو اپنی آنکھوں سے اس کائنات میں قدرت کے عجائبات کو دیکھتی ہے۔ انسان کے اندر ایسا تدبر پیدا ہوتا ہے جو ان مشاہدات عجیبہ کا تتبع کرتا ہے اور آخر کار راز کائنات تک جا پہنچتا ہے۔ جب اس کے ساتھ انسان اللہ کی راہ میں جدوجہد کرتا ہے تو اس کے عوض اللہ تعالیٰ اس انسان کی راہنمائی کرتا ہے۔

یوں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کائنات کی سیر شروع کی اور اس راہ سے انہیں اللہ کے ساتھ وصل نصیب ہوا۔ پہلے تو وہ اپنی فطرت سلیمہ کے ذریعے حق تعالیٰ کو پکار رہے تھے لیکن اب تو آپ کی قوت مدرکہ اور آپ کے علم میں ذات باری موجود تھی۔ پہلے تو حقیقت الوہیت کا شعور ان کے ضمیر اور ان کی فطرت سلیمہ میں تھا مگر اب یہ حقیقت ان کے فہم و ادراک میں آچکی تھی۔

حضرت ابراہیم کی فطرت صادقہ اور فطرت سلیمہ کا یہ سفر نہایت ہی دلچسپ ہے۔ اس کا مطالعہ جاری رہنا چاہئے۔ یہ ایک عظیم سفر تھا اگرچہ چشم ظاہر بین کو یہ سفر ایک معمولی سفر نظر آتا ہے۔ یہ سفر درحقیقت فطری ایمان سے آگے بڑھ کر ایمان مدرک اور ایمان مفہومہ کی طرف انتقال تھا۔ ایمان مدرک اور ایمان مفہوم کے اوپر ہی شرعی فرائض اور واجبات کا دارومدار ہوتا ہے اور پھر انسان پر شریعت کا اتباع فرض ہو جاتا ہے۔ یہ ایمان اور اتباع شریعت' وہ مقام ہے جسے صرف

لوگوں کے عقلی سفر پر ہی نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ اللہ نے اس کے بیان اور تشریح کے لئے نبوت کو جاری کیا اور سلسلہ رسل کو جاری فرمایا تاکہ لوگ ایمان و شریعت کو صرف اپنی عقل ہی سے معلوم نہ کریں بلکہ رسول اس کی تبلیغ اور تبیین کریں۔ لوگوں پر عقلی ایمان کے بجائے شرعی ایمان اور شرعی دلائل حجت قرار پائیں۔ آخرت میں بھی جزاو سزا کا مدار ان احکام شرعی پر ہو گا جو رسولوں کی زبانی نازل نہیں ہوئے اور یہ سلسلہ اس لئے جاری کیا کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ انسان صرف اپنی عقل سے ایمان و شریعت کی تفصیلات طے نہیں کر سکتا۔

رہے ابراہیم علیہ السلام تو وہ ابراہیم علیہ السلام تھے۔ وہ ایک عام انسان نہ تھے۔ وہ اللہ کے دوست تھے اور مسلمانوں کے ابو الاباء تھے۔

(فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ

(٦ : ٧٦)) "چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا کہا یہ میرا رب ہے مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں۔" یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نفس کی تصویر کشی ہے۔ ان پر معبودان خاندانی کے سلسلے میں شک بلکہ فیصلہ کن انکار پوری طرح حاوی ہو چکا ہے۔ ان کے والد اور ان کی قوم جن معبودان باطل اور بتوں کی پوجا کر رہے تھے ان کے ذہن نے اس سے ابا کر دیا ہے۔ اور وہ صحیح نظریہ حیات اور صحیح عقیدے کے متلاشی ہیں اور یہ ان کے لئے عظیم مسئلہ بن گیا ہے۔ اس مسئلے کی تصویر کشی ان الفاظ سے اچھی طرح ہوتی (فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ) "جب رات ان پر طاری ہوئی۔" گویا رات نے صرف حضرت ابراہیم ہی کو گھیر لیا ہے اور یہ رات ان کو دوسرے لوگوں سے علیحدہ کر رہی ہے' تاکہ وہ رات کی تاریکی میں سکون کے ساتھ اپنے دل میں اس مسئلے پر سوچ بچار کر سکیں اور اسے حل کر سکیں جو انہیں پریشان کر رہا ہے اور بار بار حملہ آور ہوتا ہے۔ "چنانچہ جب رات طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا' کہا یہ میرا رب ہے۔" ان کی قوم ستاروں کی بھی پوجا کرتی تھے جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں۔

جب حضرت ابراہیم اس بات سے مایوس ہو گئے کہ ان کی فطرت کے اندر اللہ برحق کی جو تصویر ہے اس کے ساتھ تو یہ بت مطابقت نہیں رکھتے تو انہوں نے شاید یہ امید رکھی کہ وہ اللہ برحق بتوں کے علاوہ دوسرے سیاروں اور ستاروں کی صورت میں مل جائے۔

صورت حال یہ نہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ اور اپنی قوم کو کہیں پہلی مرتبہ ستاروں اور سیاروں کی پوجا کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ نہ صورت حال یہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان ستاروں سیاروں کو پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے لیکن آج کی رات یہ ستارے حضرت ابراہیم کو جو بات بتا رہے تھے وہ بات انہوں نے اس سے پہلے نہ کی تھی۔ آج وہ حضرت ابراہیم کو وہ حقیقت بتا رہے تھے' جو آپ کی فطرت کے عین مطابق تھی' جس کے لئے آپ پریشان و متوحش تھے اور اس کے بارے میں ان پر خیالات و تصورات کا ہجوم رہتا تھا۔

(قَالَ هٰذَا رَبِّيْ (٦ : ٧٦)) یہ میرا رب ہے۔" اپنے نور اور اپنی چمک اور اپنے مقام بلند کی وجہ سے شاید بتوں کے مقابلے میں اس کا رب ہونا زیادہ ممکن ہے۔ لیکن نہیں نہیں یہ امکان بھی بعید ہے' ایسا نہیں ہو سکتا۔

(فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (٦ : ٧٦)) جب ڈوب گیا تو بولا میں ڈوب جانے والوں کا گرویدہ نہیں ہوں۔" یہ ستارہ یا سیارہ تو لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے؟ مخلوقات سے دور ہو جاتا ہے' غائب ہو جاتا ہے۔اگر خدا ڈوب گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا تو پھر کون ہے جو اس عالم کی تدبیر کرتا ہے۔رب ہو اور غائب ہو' نہیں' یہ ستارہ رب نہیں ہو سکتا۔رب تو اوجھل نہیں ہو سکتا۔

یہ ہے فطری اور بدیہی استدلال۔یہ منطقی اور جدلیاتی فلسفیانہ استدلال نہیں ہے۔یہ وجدانی استدلال ہے جو براہ راست سامنے آتا ہے اور بڑی سہولت سے یقین پیدا کر دیتا ہے۔پوری انسانیت اور پوری انسانی فکر اسے قبول کر لیتی ہے۔اور اسے گہرا یقین حاصل ہو جاتا ہے

(لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (٦ : ٧٦)) (میں ڈوب جانے والوں کو پسند نہیں کرتا) انسانی فطرت اور الہ العالمین کے درمیاں حقیقی تعلق محبت کا تعلق ہے اور محبت کا یہ ربط قلبی ربط ہے۔اسی لئے فطرت ابراہیم ڈوب جانے والوں کے ساتھ محبت نہیں رکھتی۔لہٰذا انہیں الٰہ تسلیم نہیں کرتی۔اور فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ جو الٰہ ہے وہ ہر وقت حاضر و محبوب ہو گا۔

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّاۗلِّيْنَ (٦ : ٧٧) پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ ہے میرا رب۔مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا" سابقہ تجربہ بھی سامنے آتا ہے۔نظر یوں آتا ہے کہ گویا حضرت ابراہیم نے اس سے قبل چاند کو دیکھا تک نہ تھا۔گویا آپ کو پتہ تک نہ تھا کہ آپ کا خاندان اور آپ کی قوم چاند کی پرستش کرتی ہے۔اور یہ کہ آج کی رات بالکل ایک نئی رات تھی (غور و فکر کی رات)۔

(قَالَ هٰذَا رَبِّيْ (٦ : ٧٧)) انہوں نے کہا یہ میرا رب ہے۔" یہ پوری کائنات پر اپنا نور نچھاور کر رہا ہے' آسمانوں میں اکیلا نظر آتا ہے اور اس کی روشنی بھی پسندیدہ ہے لیکن دیکھو یہ بھی غائب ہو رہا ہے لیکن رب کائنات جس سے فطرت ابراہیمی خوب واقف تھی' وہ تو غائب نہیں ہوتا' وہ تو حضرت ابراہیم کے دل میں جاگزیں تھا۔

اس مقام پر آکر حضرت ابراہیم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس حل طلب مسئلے کو وہ ذاتی غور و فکر ہی سے حل نہیں کر سکتے اور انہیں اس رب ذوالجلال کی جانب سے معاونت کی ضرورت ہے جسے ان کی فطرت پا رہی ہے اور جو ان کے ضمیر میں بیٹھا ہے۔وہ رب جسے وہ محبوب رکھتے ہیں لیکن وہ آپ کے ادراک اور آپ کی فہم میں نہیں اتر رہا۔آپ یہ اعلان کرتے ہیں کہ اس مقام پر اگر ان کا رب انہیں ہدایت نہ کرے گا تو وہ صحیح راہ نہ پا سکیں گے۔اب اس رب کی جانب سے دست گیری کی ضرورت ہے۔اس کی جانب سے براہ راست راہنمائی کی ضرورت ہے۔

(قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّاۗلِّيْنَ (٦ : ٧٧)) کہا' اگر میرے رب نے میری راہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاتا۔"

(فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ
مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (۷۸) اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ
مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۷۹) (۶:۷۸-۷۹)) پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب' یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیم علیہ السلام پکار اٹھے "اے برادران قوم' میں ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

یہ تیسرا تجربہ ہے اور یہ تجربہ اس کائنات کے سب سے بڑے کرے کے ساتھ ہوا' جسے دیکھا جاسکتا ہے۔ جس کی ضو پاشیاں عیاں ہیں اور جس کی گرمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ سورج تو روز طلوع و غروب ہوتا رہتا ہے لیکن وہ آج حضرت ابراہیم کی نظروں میں بالکل ایک نئی چیز ہے۔ (وہ نئے زاویئے سے اسے دیکھ رہے ہیں) آج تو ابراہیم ان تمام چیزوں کو اس زاویئے سے جانچ رہے ہیں کہ آیا ان میں سے کوئی چیز اس قابل ہے کہ اسے الٰہ تسلیم کیا جائے اس پر دل مطمئن بھی ہو جائے اور اس پریشانی اور حیرت انگیز مسئلے کے حل کی طویل جدوجہد میں یہ امر فیصلہ کن ہو۔

(قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ (۶:۷۸)) کہا یہ میرا رب ہے! یہ سب سے بڑا ہے۔" لیکن تعجب ہے کہ یہ بھی غائب ہو رہا ہے۔ اس مقام پر دونوں حقائق آپس میں جڑتے ہیں۔ اس اتصال و التباس سے ایک چنگاری نکلتی ہے۔ یہاں فطرت صادقہ اور ذات کبریا کے درمیان اتصال ہو جاتا ہے۔ قلب سلیم روشنی سے معمور ہو جاتا ہے اور پھر یہ روشنی پوری کائنات کو منور کر دیتی ہے۔ اس کے ذریعے انسان کی عقل و فکر بھی روشن ہو جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم کو مطلوب الٰہی مل جاتا ہے جس طرح ان کی فطرت اور ان کے شعور میں وہ موجود تھا۔ اس کا تصور ان کے فہم و ادراک میں بھی آجاتا ہے اور فطرت کے شعور احساس اور عقلی ادراک کے درمیان اتحاد و توافق ہو جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم کو اپنا رب و الٰہ مل جاتا ہے' لیکن یہ الٰہ کسی چمکدار ستارے کی شکل میں بھی نہیں۔ کسی طلوع ہونے والے چاند کی شکل میں نہیں' بلند ہونے والے سورج کی شکل میں نہیں' کسی ایسی شکل میں نہیں جسے آنکھ دیکھ سکے' کسی ایسی صورت میں بھی نہیں جسے انسان چھو سکے' بلکہ یہ الٰہ ان کے شعور اور فطرت میں ہے' ان کی عقل اور فہم میں ہے' اس پوری کائنات میں ہر جگہ موجود ہے۔ وہ ان تمام مخلوقات کا خالق ہے جسے آنکھ دیکھ سکتی ہے' جسے محسوس کیا جاسکتا ہے یا جس کا انسانی عقل ادراک کر سکتی ہے۔

اب وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی اور ان کی قوم کے درمیان اب مکمل جدائی کا وقت آگیا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ آپ ان تمام معبودات باطلہ سے اپنی اعلانیہ براءت کا اظہار کر دیں اور دو ٹوک انداز میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے ان کے نقطہ نظر اور ان کے منہاج حیات اور مشرکانہ عقائد و خیالات کو یکسر رد کر دیں۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ یہ لوگ ذات کبریائی کے بالکل منکر نہ تھے لیکن صورت حال ایسی تھی کہ وہ لوگ حقیقی الٰہ کے ساتھ ان جھوٹے خداؤں کو شریک کرتے تھے اور حضرت ابراہیم الٰہ العالمین کی طرف اس طرح متوجہ ہوئے تھے کہ وہ اللہ

کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے تھے۔

"تو ابراہیم پکار اٹھا" اے برادران قوم' میں ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔میں نے تو یکسو ہوکر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا ہے' جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

اب گویا ان کا رخ آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے والے کی طرف مڑ گیا اور اس قدر یکسوئی کے ساتھ مڑا کہ اس میں شرک کا شائبہ تک نہ رہا۔انہوں نے فیصلہ کن بات کر دی' یقین محکم کا اظہار کر دیا اور آخری طور پر اپنا رخ متعین کر لیا۔ اب نہ تو کوئی تردد ہے' نہ الجھن ۔عقل وادراک اس طرح روشن ہوگئے جس طرح ان کا شعور اور ضمیر روشن تھے۔

ایک بار پھر ہم آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا خوش کن منظر دیکھ رہے ہیں۔یہ ایک نظریہ حیات کا منظر ہے جو نفس انسانی کے اندر نمودار ہوگیا ہو' جو کسی دل پر غالب اور حاوی ہوگیا ہو' جو پوری طرح واضح اور نمایاں ہوگیا ہو اور اس سے ہر قسم کا غبار چھٹ گیا ہو۔یہ منظر ہمارے سامنے آتا ہے اور اس کی حالت یہ ہے کہ ایک انسان کی شخصیت پر وہ چھایا ہوا ہے اور اس نے اس شخصیت کے ہر پہلو کو ڈھانپ لیا ہے۔اس شخصیت کے کاسہ دل کو شراب اطمینان سے بھر دیا ہے۔اب اسے اپنے اس رب پر پورا اعتماد ہے جسے اس نے عقلی طور پر پالیا ہے اور وہ اس کے اردگرد کے وجود پر چھایا ہوا ہے۔یہ ایک ایسا منظر ہے جو سیاق کلام کے آنے والے جملوں کے اندر اچھی طرح نمایاں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اب اپنے ضمیر' اپنی عقل اور اپنے اردگرد پھیلے ہوئے وجود کے اندر اپنے رب کو دیکھ رہے ہیں۔ان کی مشکل حل ہوگئی ہے اور ان کا دل مطمئن ہے۔اب وہ محسوس کر رہے ہیں کہ دست قدرت اس راہ میں ان کی راہنمائی کر رہا ہے اب تو ان کی قوم سامنے آتی ہے اور یہ قوم ان نتائج کو چیلنج کر رہی ہے جن تک وہ جا پہنچے ہیں اور انہیں ان کا یقین حاصل ہوگیا ہے۔ان کے دل میں عقیدہ توحید بیٹھ گیا ہے۔یہ قوم اب حضرت ابراہیم کو اپنے خداؤں سے ڈراتی ہے کہ یہ الٰہ انہیں نقصان پہنچائیں گے اور آپ ان کو نہایت ہی اعتماد ایک راسخ العقیدہ مسلم کی طرح جواب دیتے ہیں اور یہ جواب وہ ظاہری اور باطنی دونوں طرح اپنے رب پر اپنے عقیدے کو پیش نظر رکھتے ہوئے دیتے ہیں۔

وَحَاۤجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَاۤجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَاۤ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَكَیْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾

"اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے قوم سے کہا: "کیا تم لوگ اللہ کے معاملے میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے راہ راست دکھا دی ہے اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا' ہاں اگر میرا رب کچھ چاہے تو وہ ضرور ہو سکتا ہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے' پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟ اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں' جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لئے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی و اطمینان کا مستحق ہے؟ بتاؤ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔"

جب انسان کی فطرت راہ سلامتی سے ہٹ جاتی ہے تو وہ گمراہ ہو کر غلط راستوں پر پڑ جاتی ہے۔ وہ ان راستوں پر بہت دور نکل جاتی ہے۔ اب زاویہ کشادہ ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کے بازو ایک دوسرے سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ جس نقطے سے یہ فطرت راہ مستقیم سے ہٹ جاتی ہے وہ دور رہ جاتا ہے۔ خود انسان اس راہ مستقیم سے اتنا دور نکل جاتا ہے کہ اس کے لئے لوٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم کی اس قوم کو دیکھو' یہ بتوں' ستاروں اور سیاروں کی پرستش کر رہے ہیں لیکن وہ اس تبدیلی اور تغیر کو محسوس کرنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جو حضرت ابراہیم کی زندگی میں نمودار ہوئی۔ اگر وہ معمولی غور و فکر بھی کرتے تو وہ اسے محسوس کرنے لگتے۔ اس کے بجائے انہوں نے الٹا حضرت ابراہیم سے مجادلہ شروع کر دیا اور احتجاج شروع کر دیا' حالانکہ وہ خود نہایت ہی بودے تصورات کے حامل تھے اور واضح طور پر گمراہ تھے۔

لیکن حضرت ابراہیم پکے مومن تھے' اپنے دل و دماغ میں اور پوری کائنات میں اللہ کو پا رہے ہیں اور وہ پورے قلبی اطمینان کے ساتھ ان کو جواب دیتے ہیں۔

(وَحَآجَّهُ قَوْمُهُ قَالَ اَتُحَآجُّوْنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ (٦: ٨٠)) تم مجھ سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو' میں نے تو محسوس کیا ہے کہ وہ ہاتھ پکڑ کے مجھے راہ راست پر لا رہا ہے' میری چشم بصیرت کھول رہا ہے' وہ اپنی طرف مجھے بلا رہا ہے۔ مجھے اپنی معرفت نصیب کر کے اپنا مقرب بنا رہا ہے۔ جب اس نے میرے ہاتھ پکڑ کر مجھے ہدایت دی تو وہ موجود ہے' یہ میرے لئے نفسیاتی اور وجدانی دلیل ہے۔ میں اپنے ضمیر میں اسے پاتا ہوں' میں اپنے فہم کے مطابق اس کے بارے میں سوچتا ہوں اور میں اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات میں اسے دیکھتا ہوں۔ ایک بات جو میری نفسیات اور میرے ضمیر و شعور میں موجود ہے کیا اس کے بارے میں تم مجھ سے الجھتے ہو؟ میں نے کب تم سے دلیل طلب کی ہے؟ اس نے خود مجھے اپنی طرف راہنمائی دی ہے اور یہی میری دلیل ہے۔

(وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖ (٦: ٨٠)) اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا۔" وہ شخص جس نے اللہ کو پا لیا ہو' وہ شریکوں سے کیسے ڈر سکتا ہے۔ وہ کس سے ڈرے اور کیوں ڈرے؟ اللہ کے سوا تمام قوتیں ہیچ ہیں اور اللہ کی بادشاہت کے سوا تمام بادشاہتیں اس قابل ہی نہیں کہ ان سے خوف کھایا جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے پختہ ایمان اور اللہ کے مطیع فرمان ہونے کے باوجود کسی بات کو ماسوائے مشیت الٰہی دو ٹوک انداز میں نہ کہتے تھے۔ وہ ہر معاملے میں الا ماشاء اللہ کہتے تھے اور ہر بات کو اللہ کے علم کی طرف لوٹاتے تھے۔

(اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْئًا وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا (٦ : ٨٠)) حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کی جانب سے حمایت و رعایت کو اللہ کی مشیت پر چھوڑتے ہیں اور اعلان فرماتے ہیں کہ وہ مشرکین کے الٰہوں سے ذرہ بھر خوف نہیں کھاتے کیونکہ ان کا تکیہ اللہ کی حفاظت و حمایت پر ہے۔ انہیں پورا یقین ہے کہ انہیں اس وقت تک کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی جب تک اللہ نہ چاہے اور اللہ علیم ہے اور اس کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔

(وَكَیْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (٦ : ٨١)) "اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لئے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی و اطمینان کا مستحق ہے؟ بتاؤ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔" یہ اس شخص کا استدلال ہے جس نے اس دنیا کے حقائق کا ادراک کر لیا ہے۔ اگر کوئی ڈرتا ہے تو ڈرے، ابراہیم نہیں ڈرتا کیونکہ ابراہیم تو وہ مومن ہے جس نے اپنا ہاتھ اللہ کے ہاتھ میں دے دیا ہے اور اپنے راستے پر چل رہا ہے۔ پھر وہ موجودہ عاجز ولاچار الٰہوں سے کیوں ڈرے، چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں؟ اس لئے کہ الٰہ قہار و جبار حکمرانوں کی شکل میں سامنے آتے ہیں جن کی گرفت بظاہر بہت ہی سخت ہوتی ہے۔ لیکن اللہ کی قدرت کے سامنے ان کی کچھ حیثیت نہیں ہوتی۔ وہاں یہ بھی عاجز ہوتے ہیں اس لئے حضرت ابراہیم جیسے موحد ایسے ضعیف اور جھوٹے خداؤں سے کس طرح ڈر سکتے ہیں حالانکہ ڈرنا مشرکین کو چاہئے کہ انہوں نے بغیر ثبوت و برہان کے اللہ کے ساتھ ان ضعیف خداؤں کو شریک بنالیا ہے اور یہ اس قدر ضعیف ہیں کہ ان کے اندر کوئی قوت نہیں ہے۔ یہ نہایت ہی اہم سوال ہے کہ ہم دونوں فریقوں میں سے کون سا فریق زیادہ مامون اور بے خوف ہے؟ اللہ پر ایمان رکھنے والا یا ان ضعیف بتوں کو الٰہ ماننے والا، جن کو وہ اللہ جل شانہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہے اور آنکھوں سے دیکھ بھی رہے ہیں کہ ان کو کوئی اقتدار اور قوت حاصل نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے پاس فہم و ادراک کی کوئی بصیرت نہیں ہے۔

اس سوال کے جواب میں وحی آتی ہے اور اس قضیے کا فیصلہ یوں ہوتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ
٩ ع١٢ ١٥ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿٨٢﴾

"حقیقت میں تو امن انہی کے لئے ہے اور راہ راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔"

وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے لئے خالص کر لیا اور اس ایمان میں انہوں نے کسی قسم کے شرک کو نہ ملایا۔ نہ غیر اللہ کی اطاعت کی اور نہ اسلام کے سوا کوئی اور رخ اختیار کیا تو ایسے ہی لوگ مطمئن اور مامون رہیں گے اور صرف ایسے ہی لوگ راہ ہدایت پا سکتے ہیں۔

یہی وہ محبت تھی جس کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ توفیق دی گئی کہ انہوں نے اپنے ساتھ مجادلہ کرنے والوں کے تمام دلائل کو رد کر دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے سامنے یہ انکشاف کیا کہ ان کے تمام دلائل بودے ہیں' الہوں کے بارے میں ان کے تمام تصورات غلط ہیں اور ان کا یہ وہم بھی فرضی ہے کہ ان کے الٰہ حضرت ابراہیم کو کوئی گزند پہنچا سکتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم تھی کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے وجود کے منکر نہ تھے اور نہ اس بات کے منکر تھے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات میں قوت اور حکومت اور اقتدار کا مالک ہے۔ غلطی صرف یہ تھی کہ وہ لوگ اپنے ان الہوں کو اللہ کے ساتھ شریک کرتے تھے۔ جب حضرت ابراہیم ﷤ نے ان کے سامنے یہ بات رکھی کہ جو شخص صرف اللہ وحدہ پر یقین رکھتا ہے وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ اللہ کے سوا اوروں سے تو اس شخص کو ڈرنا چاہئے جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتا ہے۔ جب حضرت ابراہیم نے ان کے سامنے یہ حقیقت رکھی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ڈال دی تھی تو ان کے تمام دلائل خاک میں مل گئے' حضرت ابراہیم کی بات بلند ہوئی اور اپنے عقائد و نظریات کے اعتبار سے حضرت ابراہیم اپنی قوم کے مقابلے میں برتر و سربلند ہو گئے۔ یوں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا مقام اور درجہ بلند کر دیتا ہے اور یہ اللہ کے تصرفات ہیں اس کی حکمتوں کے تقاضوں کے مطابق۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ؀

"یہ تھی ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی۔ ہم جسے چاہتے ہیں بلند مرتبے عطا کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ تمہارا رب نہایت دانا اور علیم ہے۔"

قبل اس کے کہ ہم آیات زیر بحث کو چھوڑ کر آگے بڑھیں' میں مناسب سمجھتا ہوں کہ صحابہ کرام کی زندگی کے کچھ خوشگوار واقعات ناظرین کے سامنے رکھوں۔ ان پر قرآن کریم باران رحمت کی طرح اثر کر رہا تھا اور ان کے نفوس اس سے خوب سیراب ہو رہے تھے۔ وہ اس قرآن کے ساتھ زندہ تھے اور قرآن کے لئے زندہ تھے۔ وہ اپنی زندگی کو قرآن کریم کے اشاروں' اس کے مفہومات و مدلولات کے ساتھ بدلتے اور ہم آہنگ کرتے چلے جاتے تھے۔ اس کے تقاضوں کو پورے کرتے چلے جاتے تھے اور وہ نہایت ہی سنجیدگی' نہایت ہی فہم و فراست اور نہایت ہی سختی کے ساتھ اسے لیتے تھے۔ قرآن کریم کی خوبصورتی' اثر آفرینی' عملیت اور سنجیدگی کو دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ یہ امر حیران کن ہے کہ قرآن نے گروہ صحابہ کے اندر کس قدر خارق العادت تبدیلی پیدا کی کہ صرف ۲۵ سال کے اندر اندر یہ معجزہ رونما ہوا جس کی کوئی مثال تاریخ میں نہیں۔ یہ اس لئے ہوا کہ گروہ صحابہ نہایت ہی محیرالعقول لوگ تھے۔ ابن جریر نے' اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ ابن ادریس سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری

(اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ نہ ملایا۔" تو یہ بات صحابہ کرام پر بہت ہی گراں گزری۔ انہوں نے کہا کہ ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے نفس

پر ظلم نہ کیا ہو۔کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس طرح نہیں جس طرح تم لوگ گمان کرتے ہو' یہ تو اس طرح ہے جس طرح حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا تھا

(لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ) بیٹے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ بے شک شرک ظلم عظیم ہے۔" انہوں نے اپنی سند کے ساتھ ابوالاشعری 'عبدی اور اس کے باپ سے نقل کیا ہے کہ زید ابن ہومان نے سلمان سے پوچھا: اے ابو عبداللہ 'اللہ کی کتاب میں سے ایک آیت نے میرا برا حال بنا دیا ہے۔

(اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کو نہ ملایا۔" تو سلمان نے کہا کہ یہ تو اللہ کے ساتھ شرک ہے اور اس کا ذکر اللہ نے کیا ہے۔ زید نے کہا کہ آپ سے یہ سن کر مجھے اس قدر خوشی ہوئی کہ کل رات میری جس قدر دولت تھی اگر اسی قدر مجھے اور بھی مل جائے تو اتنی خوشی نہ ہوتی۔

ان تین روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحابہ کا معزز گروہ قرآن کریم کے بارے میں کس قدر حساس تھا اور ان کی زندگی پر قرآن کس قدر عملاً اثرانداز ہوتا تھا اور کس طرح وہ قرآن کریم کو لیتے تھے؟" اس طرح کہ یہ ایسے احکام ہیں جن کا فی الفور نافذ کرنا ضروری ہے۔ اور یہ ایسی ہدایات اور ایسے فیصلے ہیں جن کی اطاعت ضروری ہے۔کیونکہ یہ آخری احکام اور فیصلے ہیں اور جب وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی وسعت و طاقت اور مطلوبہ احکام کے درمیان فرق ہے اور ان کے لئے ان احکام کا نفاذ ممکن نہ رہے گا تو وہ بے چین ہو جاتے تھے اور اللہ اور رسول ان احکام میں رعایت اور نرمی فرما دیتے تھے۔ یہ وہ مناظر ہیں جو آنکھوں کو خیرہ کر دیتے ہیں۔ یہ ہیں ان لوگوں کے حالات جو اس دین کے حاملین تھے۔ وہ ایسا پر وہ تقدیر الٰہی تھے اور وہ دستہ تھے جو مشیت الٰہی کے نفاذ کے لئے منتخب کیا گیا تھا اور یہ مشیت سب سے پہلے انہوں نے اپنی زندگی میں نافذ کی تھی۔

---ooo---

اب سیاق کلام میں اس عظیم قافلہ ایمان کا ذکر آتا ہے جس کے قائدین انبیاء و رسل تھے۔ حضرت نوحؑ سے خاتم النبیین تک ان سب پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔ یہ طویل قافلہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہے۔ خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ان حضرات کے تذکرے میں تاریخی تسلسل کا خیال نہیں رکھا گیا۔ جیسا کہ دوسرے مقامات پر نظر آتا ہے کیونکہ یہاں مقصد یہ نہیں ہے کہ ان کی تاریخی ترتیب کو بیان کیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ تمام انبیاء کا مشن ایک ہی تھا یعنی عقیدۂ توحید :

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَ نُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ

عِيسٰى وَ اِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ يُوْنُسَ
وَ لُوْطًا ؕ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ
اِخْوَانِهِمْ ۚ وَ اجْتَبَيْنٰهُمْ وَ هَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾ ذٰلِكَ هُدَى
اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ
مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ
يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ١٠
ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾ ع ٨ ١٦

پھر ہم نے ابراہیم ؑ کو اسحاق ؑ اور یعقوب ؑ جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو راہ راست دکھائی (وہی راہ راست جو) اس سے پہلے نوح ؑ کو دکھائی تھی۔ اور اس کی نسل سے ہم نے داؤد ؑ ' سلیمان ؑ ' ایوب ؑ ' یوسف ؑ ' موسیٰ ؑ ' اور ہارون ؑ کو (ہدایت بخشی)۔ اسی طرح ہم نیکو کاروں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں۔ (اسی کی اولاد سے) زکریا ؑ ' یحییٰ ؑ ' عیسیٰ ؑ ' اور الیاس ؑ کو (راہ یاب کیا) ہر ایک ان میں سے صالح تھا۔ (اسی کے خاندان سے) اسماعیل ؑ ' الیسع ؑ ' اور یونس ؑ اور لوط ؑ کو (راستہ دکھایا)۔ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کی۔ نیز ان کے آباؤ اجداد اور ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بہتوں کو ہم نے نوازا۔ انہیں اپنی خدمت کے لئے چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی راہنمائی کی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اگر کہیں ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی تھی۔ اب اگر یہ لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو (پرواہ نہیں) ہم نے کچھ اور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے جو اس سے منکر نہیں ہیں۔ اے نبی ' وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے ' انہی کے راستہ پر تم چلو اور کہہ دو کہ میں (اس تبلیغ و ہدایت کے) کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں ' یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لئے۔

ان آیات میں ۱۷ رسولوں اور نبیوں کا ذکر ہے یعنی حضرت نوح ؑ اور حضرت ابراہیم ؑ کے علاوہ اور دوسروں کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

(وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ (٦ : ٨٧)) اور ان کے آباء ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے۔" اور اس قافلہ ایمان پر جو تبصرے کئے گئے ہیں۔

(وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ (۶: ۸۴)) "اور ہم نیک کام کرنے والوں کو اسی طرح جزاء دیتے ہیں۔

(وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۶: ۸۶)) اور ان سب کو ہم نے تمام جہان والوں پر فضیلت دی۔" اور

(وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۶: ۸۷)) اور ہم نے انہیں منتخب کیا اور انہیں سیدھی راہ کی طرف ہدایت کی۔" ان تمام تبصروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قافلہ رسل کس قدر قابل قدر اور کس قدر منتخب لوگوں پر مشتمل تھا اور یہ کہ یہ صحیح راہ کی طرف ہدایت یافتہ تھا۔ اس گروہ کو اس انداز میں پیش کرنا اور اس کو اس شکل و صورت میں اجاگر کرنا دراصل ایک اہم بات کہنے کے لئے تمہید کے طور پر تھا۔ بات یہ تھی :

(ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۶: ۸۸)) یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اگر کہیں ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا۔" یہ فیصلہ ہے اس امر کا کہ اس کرۂ ارض پر ہدایت کے سرچشمے کون سے ہیں؟ تو انسانوں کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ کی وہ تعلیمات ہیں جو رسولوں کے ذریعے بھیجی گئیں اور ان ہدایات الٰہیہ میں سے جو ہدایات یقینی طور پر ثابت اور محفوظ ہیں وہ اسی منبع اور سرچشمہ قرآن میں ہیں جس کے بارے میں اللہ کا فیصلہ ہے کہ یہی اس کی ہدایت ہے۔ اور یہ کہ یہ ہدایت اپنے مختار بندوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ہی بھیجتا ہے۔ اگر یہ مختار بندے بھی اس راہ کو چھوڑ دیں اور ہدایت کے اس سرچشمے کو ترک کر دیں جس سے وہ ہدایات لیتے ہیں اور نظریات و اعمال اور عقیدہ و عبادت میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کر دیں تو ان کا انجام بھی یہ ہو گا کہ ان کے تمام اعمال اکارت جائیں گے 'ضائع ہو جائیں گے اور وہ اس طرح ہلاک ہو جائیں گے جس طرح کوئی جانور زہریلی گھاس کھا کر پھول جاتا ہے اور اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ "حبط" کے لغوی معنی یہی ہیں۔

(اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ (۶: ۸۹)) "یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی تھی۔ اب اگر یہ لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو (پرواہ نہیں) ہم نے کچھ اور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے جو اس سے منکر نہیں ہیں۔ یہ دوسرا نتیجہ ہے۔ پہلی تنقیح میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مصدر ہدایت اللہ ہے۔ اللہ کی ہدایت وہ ہے جو رسولوں کے ذریعے سے انسانوں تک پہنچی ہو۔ دوسری میں یہ کہا گیا کہ جن رسولوں کا ذکر کیا گیا اور جن کی طرف مجمل اشارہ کیا گیا یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے کتاب' حکمت 'حکومت اور نبوت عطا کی۔ اس آیت "حکم" اپنے دونوں مفاہیم میں استعمال ہوا ہے۔ بمعنی حکومت بھی استعمال ہوتا ہے اور حکم بمعنی مکرت سلطنت اور اقتدار بھی استعمال ہوتا ہے اور اس آیت میں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ ان رسولوں میں سے بعض پر تو کتاب نازل کی گئی مثلاً تورات حضرت موسیٰ پر' زبور حضرت داؤد پر' انجیل حضرت عیسیٰ پر اور بعض کو اقتدار دیا گیا۔ مثلاً داؤد اور سلیمان علیہ السلام کو اور

ہرایک کو اس معنی میں اقتدار اعلیٰ دیا گیا کہ اس کے پاس جو ہدایت ہے وہ اللہ کی جانب سے ہے اور جو دین وہ لے کر آئے ہیں لوگوں پر اسی کی حکمرانی ہو گی ۔ اللہ نے جو رسول بھی بھیجے ہیں وہ اس لئے بھیجے ہیں کہ ان کی اطاعت کی جائے اور اللہ نے جو کتاب بھی بھیجی ہے وہ اس لئے بھیجی ہے کہ لوگوں کے درمیان اس کتاب کے مطابق فیصلے کئے جائیں جیسا کہ دوسری آیات میں آتا ہے کہ تمام نبیوں کو حکم اور نبوت دیا گیا ۔ اللہ نے اپنا دین ان ہی کے حوالے کیا تاکہ وہ لوگوں تک اسے پہنچائیں ۔ خود اس دین پر قائم رہیں' ایمان لائیں اور اس کی حفاظت کریں ۔ اگر مشرکین عرب اللہ کی کتاب' اس کی حکومت اور نبوت کا انکار کر دیں تو اللہ کا دین ان کا محتاج نہیں ۔ اللہ کے نبی اور ان کے ساتھی اس دین کے لئے کافی ہیں ۔ یہ دین ایک پرانی حقیقت ہے اور اس درخت کی جڑیں دور تک تاریخ کے اندر پھیلی ہوئی ہیں ۔ رسولوں کی کڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں' ایک کے بعد دوسرا آیا ہے اور وہی دعوت لے کر آیا ہے ۔ جس کی قسمت میں اللہ نے ہدایت یافتہ ہونا لکھ دیا تھا اس نے ان سے ہدایت لی کیونکہ یہ اللہ ہی جانتا تھا کہ کون ہدایت کا مستحق ہے ۔ یہ وہ تبصرہ ہے جس کے ذریعے مومنوں کے دلوں کو یقین و اطمینان کے ساتھ بھر دیا جاتا ہے' ہر دور کا گروہ مومن ان ہدایات سے اطمینان حاصل کر سکتا ہے ۔ چاہے تعداد میں وہ کم ہو یا زیادہ ہو' کیونکہ تحریک اسلامی کے ساتھی چاہے کم ہوں اکیلے نہیں ہوتے ۔ پوری تاریخ اسلامی ان کی پشت پر ہے ۔ یہ ایک ایسا پودا ہے جس کی جڑیں زمین کے اندر دور تک گئی ہوئی ہیں اور اس کی شاخیں فضا میں دور تک بلند ہیں ۔ یہ تحریک ایک عظیم تاریخی تحریک اسلامی کی ایک کڑی ہے جس کا آخری سرا اللہ تک پہنچا ہوا ہے ۔ ایک منفرد مومن' اس کرۂ ارض پر جہاں بھی ہو' جس قوم میں بھی ہو' وہ نہایت ہی طاقتور ہے اور ایک عظیم الشان حقیقت ہے ۔ وہ اس عظیم درخت کی ایک شاخ ہے جس کی جڑیں دور تک ہیں اور انسانی فطرت کی زمین کے اندر گہرائی تک چلی گئی ہیں ۔ انسانیت کے اندر دور تک پھیلی ہوئی ہیں' انسانی تاریخ کے اندر گہرائی تک گئی ہوئی ہیں اور وہ واحد مومن فرد بھی قافلہ اہل ایمان کا ایک حصہ ہے اور اس کی تاریخ زمانوں تک پھیلی ہوئی ہے ۔

(أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (٦ : ٩٠)) اے نبی ؐ' وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے' انہی کے راستہ پر تم چلو' اور کہہ دو کہ میں (اس تبلیغ و ہدایت کے) کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں' یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لئے ۔"

یہ ایک تیسری قرارداد ہے ۔ یہ قافلہ رسل جو اہل ایمان کی جماعت کے قائد ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے راہ ہدایت دکھائی ۔ ان کے پاس اللہ کی جانب سے جو ہدایات آتی رہیں وہ نبی آخرالزمان کے لئے بھی مشعل راہ ہیں ۔ ان افراد کے لئے بھی مشعل راہ ہیں جو آپ ؐ پر ایمان لائے ہیں ۔ لہٰذا حضور ؐ انہی ہدایات پر چلیں گے اور اپنی زندگی کے تمام امور میں فیصلے انہی ہدایات سے لیں گے ۔ انہی ہدایات کی طرف پوری انسانیت کو دعوت دیں گے اور آپ امت دعوت کے سامنے یوں گویا ہوں گے ۔

(قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (٦ : ٩٠)) "میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا مطالبہ نہیں کرتا" ۔

هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (٦ : ٩٠) "یہ تو تمام جہان والوں کے لئے صرف ایک نصیحت ہے۔" یہ نصیحت تمام لوگوں کے لئے ہے یہ کسی ایک نسل یا کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اور نہ قریب وبعید کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ تو پوری انسانیت کے لئے ایک یاد دہانی ہے اس لئے وہ اس پر کسی اجر کا تقاضا نہیں کر رہے۔ رسول کا اجر تو اللہ پر ہے۔

اب آگے یہ مضمون آتا ہے کہ جو لوگ سرے سے نبوت اور رسالت کے منکر ہیں ان کا موقف درست نہیں ہے۔ ان کی غلطی یہ ہے کہ وہ مقام الوہیت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے۔ نہ اللہ کی حکمت 'اس کی رحمت اور اس کے انصاف کے بارے میں ان کا تصور درست ہے۔ لہٰذا یہ بات جان لو کہ یہ آخری نبوت بھی سابقہ نبوتوں اور رسالتوں کے طریق پر ہے اور یہ کتاب بھی تمام کتب سابقہ کی تصدیق و تائید کر رہی ہے۔ تمام انبیائے سابق کی تعلیمات بھی اسی کتاب کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿٩١﴾ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿٩٢﴾

"ان لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے۔ ان سے پوچھو 'پھر وہ کتاب جسے موسیٰ لایا تھا' جو تمام انسانوں کے لئے روشنی اور ہدایت تھی' جسے تم پارہ پارہ کر کے رکھتے ہو 'کچھ دکھاتے ہو اور بہت کچھ چھپا جاتے ہو' اور جس کے ذریعے سے تم کو وہ علم دیا گیا جو نہ تمہیں حاصل تھا اور نہ تمہارے باپ دادا کو' آخر اس کا نازل کرنے والا کون تھا؟......... بس اتنا کہہ دو کہ اللہ 'پھر انہیں اپنی دلیل بازیوں سے کھیلنے کے لئے چھوڑ دو۔ (اسی کتاب کی طرح) یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔ بڑی خیر و برکت والی ہے۔ اس چیز کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آئی تھی۔ اور اس لئے نازل کی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ سے تم بستیوں کے اس مرکز (یعنی مکہ) اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو متنبہ کرو۔ جو لوگ آخرت کو مانتے ہیں وہ اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔"

مشرکین اپنی کج بحثی اور عناد کی وجہ سے یہ کہتے تھے کہ اللہ نے تو انسانوں میں سے کسی فرد کو رسول بنا کر بھیجا ہی نہیں ہے۔ نہ اللہ تعالیٰ نے کوئی کتاب بھیجی ہے جو اللہ کی وحی پر مبنی ہو حالانکہ مشرکین کے پڑوس ہی میں یہودی اہل کتاب رہتے تھے اور ان مشرکین نے کبھی اس امر کا انکار نہ کیا تھا کہ وہ اہل کتاب ہیں۔ نہ انہوں نے اس بات کا انکار کیا تھا کہ تورات اللہ کی جانب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اتری۔ یہ بات وہ عناد اور محض کٹ حجتی کی خاطر کرتے تھے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اس بہانے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر سکیں۔ اسی لئے قرآن مجید یہاں ان پر تنقید کرتا ہے کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ اللہ نے کوئی کتاب کسی انسان پر نہیں اتاری تو پھر حضرت موسیٰ کے بارے میں یہ بات تم کیوں نہ کہتے تھے۔

(وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ (۶: ۹۱))

ان لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا' جب کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے۔" یہ نظریہ مشرکین مکہ دور جاہلیت میں رکھتے تھے۔ ہر دور میں اس قسم کے لوگ ہمیشہ رہے ہیں۔ آج دور جدید میں بھی بعض لوگوں کا یہی نظریہ ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ تمام ادیان سماوی انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں اور ان ادیان نے بھی درجہ بدرجہ ترقی کی جس طرح انسان نے بتدریج ترقی کی۔ یہ لوگ اس معاملے میں ان ادیان کے درمیان جو خود لوگوں نے بنائے مثلاً قدیم و جدیدیت پرستیاں اور ان ادیان کے درمیان فرق نہیں کرتے جو اللہ کے فرستادہ رسول لے کر آئے اور جو اب تک اپنے حقیقی اصولوں پر قائم ہیں۔ تمام رسول پے درپے انہی ادیان پر قائم رہے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے ان ادیان کو قبول کیا اور بعض نے انکار کیا۔ بعد کے زمانوں میں ان کے اصول و فروع کے درمیان تحریف واقع ہوگئی اور لوگ اس تحریف کی وجہ سے دوبارہ جاہلیت کی طرف لوٹ گئے۔ اس کے بعد اللہ نے ان قوموں کے اندر رسول بھیجنے کی ضرورت محسوس کی۔ آخر کار دین اسلام آیا۔ ان لوگوں کا نظریہ فقط یہ ہے کہ جس طرح انسان نے ترقی کی اسی طرح ادیان نے بھی ساتھ ساتھ ترقی کی۔

یہ بات قدیم لوگوں نے کی یا جدید لوگوں نے 'ان لوگوں نے فی الحقیقت اللہ کی ذات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کے فضل' اس کی رحمت اور اس کے عدل کو صحیح طرح نہیں پہچانا۔ ان لوگوں کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو رسول بنا کر نہیں بھیجتا۔ اگر اللہ کوئی رسول بھیجنا چاہتا تو کسی فرشتے کو بھیج دیتا جس طرح بعض عرب یہ کہتے تھے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس عظیم کائنات کے عظیم خالق کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اپنی مخلوقات میں سے ایک چھوٹے سے ذرے جس کا نام کرۂ ارض ہے' کے اوپر بسنے والی اس حقیر مخلوق کی اس قدر فکر کرے جس طرح اہل ادیان کہتے ہیں کہ اس نے رسول بھیجے' رسولوں پر کتابیں بھیجیں تاکہ ان کے ذریعے ان حقیر اہل ارض کو صحیح راستے پر لایا جائے یا جس طرح بعض قدیم اور جدید فلاسفر یہ کہتے آئے ہیں کہ نہ کوئی الٰہ ہے' نہ کوئی وحی ہے اور نہ رسول ہیں۔ یہ لوگوں کے اوہام ہیں اور دین کے نام پر بعض لوگ بعض دوسرے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں جس طرح آج کے جدید ملحد اور مادہ پرست لوگ کہتے ہیں۔

یہ تمام لوگ دراصل اللہ کی ذات کے بارے میں اندازہ لگانے میں غلطی کرتے ہیں۔ ایک عظیم و کریم ذات' ایک

رحیم اور عادل پروردگار اور ایک علیم و حکیم خالق کس طرح انسان کو بلاہدایت اور بلاحکمت و بصیرت چھوڑ سکتا ہے حالانکہ اللہ نے اس انسان کو پیدا کیا۔ وہ اس کی خفیہ اور ظاہر ہر جبلت سے واقف ہے۔ اس کی قوتوں اور صلاحیتوں سے باخبر ہے۔ وہ اس کی کمزوریوں اور کوتاہیوں سے بھی واقف ہے' وہ اس کی ضروریات اور اقدار کے بارے میں بھی خوب جانتا ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ اللہ اس کے لئے کچھ اصول اور پیمانے وضع نہ کرے جس کے مطابق اس کے اعمال و افعال کو جانچا جائے اور اس کی اچھائیوں اور برائیوں کی نشاندہی کی جائے۔ اللہ کو یہ بھی علم تھا کہ اس انسان کو جو عقل دی گئی ہے وہ محدود القوت ہے اور اس پر کئی فیکٹر اثر انداز ہو جاتے ہیں۔ خواہشات نفس اور ذاتی میلانات کے وہ تابع ہوتی ہے' وہ لالچ اور مفادات سے بھی متاثر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ عقل کے ذمہ از جانب اللہ یہ فریضہ بھی عائد ہے کہ وہ اس کائنات کی قوتوں کو مسخر کر کے کام میں لائے لیکن اس کے ذمہ یہ فریضہ عائد نہیں کیا گیا کہ وہ اس کائنات کے بارے میں کوئی مطلق تصور پیش کرے۔ نہ اس پر یہ فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ اس زندگی کے لئے کوئی مستحکم نظام اور اصول تجویز کرے اس لئے کہ زندگی کا نظام تجویز کرنا اس کا کام نہیں ہے' یہ نظام اس کے لئے منجانب اللہ آئے گا۔ اللہ نے زندگی کا نظام تجویز کرنے کا کام صرف عقل انسانی پر نہیں چھوڑا ہے اور نہ یہ امر اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس فطری قوت کے حوالے کیا ہے جس کی رو سے اس پر یہ بات لازم ہے کہ وہ اللہ کی ذات کے سلسلے میں اجمالی معرفت حاصل کرے۔ مصیبت کے وقت وہ اس رب ہی کو پکارتا ہے اس لئے کہ انسان کی اس فطرت سلیمہ پر بھی بعض فیکٹر دباؤ ڈال کر اسے فساد میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہ فیکٹر داخلی بھی اور خارجی بھی ہو سکتے ہیں۔ نیز انسان کو بدی کی طرف انسانوں اور جنوں کے تمام شیاطین ہر وقت مائل کرتے رہتے ہیں اور وہ اس سلسلے میں انسان کو متاثر کرنے کے لئے تمام توجیہات اور تمام ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نظام زندگی کے بارے میں انسان کو صرف وحی اور رسالت کے حوالے کرتے ہیں۔ اس کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اس کی ان ہدایات کی پیروی کرے جو اس نے کتابوں میں اتاری ہیں تاکہ اس کی فطرت درست اور صاف رہ سکے۔ ان کی عقل اور سوچ صحیح سمت میں کام کر سکے۔ اور ان پر وہ عوامل نہ اندر سے اثر انداز ہو سکیں اور نہ باہر سے جو انسان کو گمراہ کرتے ہیں۔ یہی پالیسی اللہ کی شان اور اس کے فضل و کرم اور اس کی رحمت اور عدالت اور اس کی حکمت اور علم کے شایان شان ہے۔ اللہ کے لئے یہ بات کیسے مناسب ہو سکتی ہے کہ وہ انسان کو پیدا کر کے یونہی چھوڑ دے۔ قیامت کے دن ان سے حساب و کتاب تولے لیکن ان کی ہدایات کے لئے کوئی رسول نہ بھیجے حالانکہ اللہ کا اعلان ہے:

(وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا) اور ہم کسی قوم کو اس وقت تک عذاب دینے والے نہیں جب تک ان کے لئے رسول نہ بھیجیں۔" اس لئے اللہ کی الوہیت کا صحیح اندازہ لگانے اور اس کی قدر و قیمت کا اقرار کرنے کے لئے لازم ہے کہ یہ اعتراف کیا جائے کہ اس نے اپنے بندوں کے لئے رسول بھیجے ہیں۔ ان رسولوں کا مقصد یہ رہا ہے کہ وہ لوگوں کی فطرت کو تمام آلودگیوں سے پاک کر کے' اور ان کی عقل و ادراک کو تمام مؤثرات سے نکال کر خالص اور آزادانہ غور و فکر کرنے کے لئے آزاد کر دیں۔ اللہ نے ان رسولوں کو دعوت کا منہاج اور طریقہ کار بھی سکھایا اور ان میں سے بعض کو کتابیں بھی دیں جو آج تک موجود ہیں جیسا کہ داؤد اور موسیٰ علیہ السلام۔ نبی آخر الزمان کو

قرآن کریم دیا گیا جو آج تک تمام تحریفات سے پاک ہے۔

چونکہ ساکنان جزیرۂ عرب کے ہاں حضرت موسیٰ کی رسالت معروف و مشہور تھی اور عرب اہل کتاب کو بھی جانتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے رسول کو حکم دیا کہ وہ ان کے سامنے اہل کتاب اور کتاب موسیٰ کو بطور مثال پیش کریں کہ اس کا تو کبھی تم نے انکار نہیں کیا۔

(قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰی نُوْرًا وَّهُدًی لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِیْرًا وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ (۶ : ۹۱)) "ان سے پوچھو' پھر وہ کتاب جسے موسیٰ علیہ السلام لائے تھے' جو تمام انسانوں کے لئے روشنی اور ہدایت تھی' جسے تم پارہ پارہ کر کے رکھتے ہو کچھ دکھاتے ہو اور بہت کچھ چھپا جاتے ہو' اور جس کے ذریعے سے تم کو وہ علم دیا گیا جو نہ تمہیں حاصل تھا اور نہ تمہارے باپ دادا کو' آخر اس کا نازل کرنے والا کون تھا؟" اس سورہ پر تبصرے کے وقت ہم نے بتایا تھا کہ ان لوگوں کا قول درست نہیں ہے کہ یہ آیت مدنی ہے۔ انہوں نے یہ قول اس لئے اختیار کیا کہ اس میں یہ الفاظ ہیں : "جسے تم پارہ پارہ کر کے رکھتے ہو' کچھ دکھاتے ہو اور کچھ چھپاتے ہو۔" ہم نے اس موقعہ پر بتایا تھا کہ ابن جریر کی رائے یہ ہے کہ یہ آیت مکی ہے اور اس میں ایک قرات یجعلونہ یبدونہا اور یخفون بھی ہے اس صورت میں ضمیر غائب اہل کتاب کی طرف راجع ہے۔ اگرچہ مخاطب مشرکین مکہ ہیں لیکن بات اہل کتاب کے متعلق ہے۔ جس طرح انہوں نے عملاً کر رکھا تھا کہ تورات کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بعض حصوں کو چھپاتے تھے اور بعض کو اپنے منصوبے اور مقاصد کے مطابق ظاہر کرتے تھے۔ یوں وہ عوام کو دھوکہ دیتے تھے اور احکام و فرائض کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔ یہودیوں کے ان کارناموں سے بعض عرب بھی واقف تھے' جس طرح قرآن کریم بھی ان کا انکشاف کر رہا ہے۔ تو گویا یہ آیت اخبار عن الیہود ہے جو مشرکین مکہ سے ہونے والی بات چیت کے اندر بطور جملہ معترضہ آگئی ہے۔ اس طرح یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ آیت بھی مکی ہے' مدنی نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں ابن جریر کی رائے درست ہے۔

اب مضمون و مفہوم یہ ہو گا: "اے محمد ﷺ ان سے کہو وہ کتاب جو موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے جس میں نئی روشنی انسان کو دی گئی تاکہ لوگ راہ ہدایت پائیں جبکہ یہود نے اسے پارہ پارہ کیا' جس میں سے بعض حصوں کو وہ چھپاتے تھے اور بعض کو ظاہر کرتے تھے اور کتاب الٰہی کے ساتھ یہ مذاق وہ اپنے ذاتی مقاصد کے لئے کرتے تھے۔" ذرا غور تو کرو کہ اللہ تمہیں وہ حقائق بتا رہا ہے جن کے بارے میں تم نہ جانتے تھے' اس لئے تم پر یہ فرض ہے کہ اللہ کے اس فضل و کرم کا شکر ادا کرو اور سرے سے تم اس بات کے منکر نہ بن جاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے نہ وحی بھیجی ہے اور نہ کوئی کتاب نازل کی ہے۔

یہ سوال کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں موقعہ ہی نہ دیا کہ وہ جواب دیں۔ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ خود ہی جواب دے دیں اور فیصلہ کن اور دو ٹوک بات کر دیں تاکہ کوئی تنازعہ ہی نہ رہے اور نہ ہی مزید قیل و قال کرنے کی ضرورت رہے۔

(قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرْھُمْ فِیْ خَوْضِھِمْ یَلْعَبُوْنَ (٦ : ٩١)) بس اتنا کہہ دو کہ اللہ' پھر انہیں اپنی دلیل بازیوں سے کھیلنے کے لئے چھوڑ دو۔" اللہ نے اسے نازل کیا ہے۔بس یہ کہہ دیں اور اس کے بعد ان کے ساتھ مزید بات چیت کی ضرورت نہیں ہے۔ان کی کٹ حجتی اور لجاجت اور ظاہرداری کو خاطر میں نہ لائیں اور پھر ان کو چھوڑ دیں کہ وہ اپنی کٹ حجتی میں مگن رہیں۔یہ انداز کلام نہایت ہی تہدید آمیز ہے اور اس میں ان کے لئے ایک قسم کی توہین بھی ہے۔اس سے حق پرستی اور سنجیدگی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔جب لوگوں کی غیر سنجیدگی کا عالم یہ ہو جائے اور وہ ایسی باتیں کرنے لگیں تو مناسب یہی ہے کہ دوٹوک انداز میں کہہ دیا جائے کہ ہماری تو یہ راہ ہے تمہاری جو مرضی ہے 'کرو۔

آگے اس کتاب جدید کے بارے میں ایک مختصر تبصرہ آتا ہے 'جس کے بارے میں منکرین یہ کہتے تھے کہ اللہ سرے سے کتاب نازل ہی نہیں کرتا۔بتایا یہ جاتا ہے کہ یہ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے 'یہ تو کتاب سماوی کا آخری حلقہ ہے۔اللہ اس سے قبل بھی رسول بھیجتا رہا ہے۔اور ان میں سے جسے چاہتا ہے کتاب عطا کرتا رہا ہے۔

(وَھٰذَا کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ مُبٰرَکٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْہِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَھَا وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ وَھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ

(٦ : ٩٢)) " (اس کتاب کی طرح) یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔بڑی خیر و برکت والی ہے۔اس چیز کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آئی تھی۔اور اس لئے نازل کی گئی ہے کہ اس کے ذریعے سے تم بستیوں کے اس مرکز (یعنی مکہ) اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو متنبہ کرو جو لوگ آخرت کو مانتے ہیں وہ اس کتاب پر بھی ایمان لاتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔

سنن الٰہیہ میں سے یہ بھی ایک سنت ہے کہ اللہ رسول بھیجا کرتا ہے۔یہ جدید کتاب جس کے نزول کے بارے میں یہ لوگ شک کرتے ہیں یہ ایک کتاب مبارک ہے اور خدا کی قسم فی الواقعہ یہ ایک مبارک کتاب ہے.............. یہ ہر معنی کے اعتبار سے مبارک ہے اور حقیقت کے اعتبار سے مبارک ہے۔اس میں اللہ نے اس وقت برکت ڈالی جب اسے نازل کیا۔اس اعتبار سے بھی مبارک ہے کہ جس محل اور رسول پر اسے اتارا گیا وہ بھی مبارک ہے۔یعنی قلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کریم اور عظیم ہیں۔یہ اپنے حجم اور مضامین کے اعتبار سے بھی مبارک ہے۔یہ انسانوں کی لکھی ہوئی طویل کتابوں کے مقابلے میں چند صفحات ہیں۔لیکن مفہوم' ہدایات' تعلیمات اور اثرات کے اعتبار سے وہ اس قدر عظیم ہے کہ انسانوں کی لکھی ہوئی دسیوں کتابیں ان کی تشریح نہیں کر سکتیں اگرچہ وہ حجم اور صفحات کے اعتبار سے قرآن کریم سے کئی گناہ زیادہ کیوں نہ ہوں۔وہ لوگ جو اسالیب کلام' خود اپنے کلام یا دوسروں کے کلام پر تبصرے اور غور و فکر کرتے ہیں اور الفاظ کے ذریعے معانی کی طرز ہائے تعبیر پر تنقیدی نگاہ رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ متن قرآن اظہار معانی کے اعتبار سے نہایت ہی مبارک کلام ہے اور یہ بات ناممکن ہے کہ کوئی انسان اس طرز پر بات کر سکے۔کوئی شخص طویل ترین عبارات کے اندر بھی وہ معانی ادا نہیں کر سکتا جو قرآن نے مختصر ترین جملوں میں ادا کئے ہیں۔ان میں معانی کا دریا ہے' اشارات اور معانی کا سیلاب ہے' اور پھر نہایت ہی اثر آفریں بھی۔ایک پوری آیت تو اس قدر معانی ادا کرتی ہے

اور اس قدر حقائق اس کے اندر سمو دیئے گئے ہوتے ہیں کہ اسے تقریر و تحریر کے بہترین نمونے اور ایک منفرد ٹکڑے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے' جس کی نظیر بلیغ سے بلیغ انسانی کلام میں نہیں ملتی ۔ پھر یہ کتاب اپنے اثرات کے اعتبار سے بھی بہت ہی مبارک ہے ۔ یہ انسانی فطرت اور انسانی شخصیت کو جامعیت کے ساتھ خطاب کرتی ہے اور یہ خطاب نہایت ہی لطیف پیرائے میں اور براہ راست ہوتا ہے ۔ یہ خطاب نہایت ہی لطیف انداز میں فطرت کے اندر اتر جاتا ہے ۔ یوں یہ کلام فطرت انسانی کو اس کے ہر پہلو اور ہر راستے سے متاثر کرتا ہے اور اس پر یوں اثرانداز ہوتا ہے کہ کوئی اور کلام اس پر اس طرح اثرانداز نہیں ہو سکتا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کلام میں اللہ کی جانب سے ایک قوت ودیعت کر دی گئی ہے اور اس کے سوا دوسرے لوگوں کے کلام کے اندر اس قسم کی کوئی قوت نہیں ہوتی ۔

کتاب اللہ کی برکات کے بارے میں یہاں مزید کہنا ہمارے لئے ممکن نہیں اور اگر ہم اس موضوع پر کلام جاری بھی رکھیں تو اس کا حق ادا کرنا کسی انسان کے لئے ممکن ہی نہیں ہے ۔ بس اللہ کی یہ بات کافی و شافی ہے کہ یہ کلام مبارک ہے اور فصل الخطاب پر مشتمل ہے ۔

(مُصَدِّقُ الَّذِی بَیْنَ یَدَیْہِ (۶ : ۹۲)) یہ سابقہ کتب کی تصدیق کرنے والی ہے ۔" یعنی یہ ان تمام کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو کبھی بھی اللہ کی جانب سے اتری ہیں لیکن یہ کتاب ان کتابوں کی تصدیق ان کی اصلی شکل میں کرتی ہے' اس شکل میں نہیں جن میں ان کتابوں کو ان کے ماننے والوں کی مختلف کانفرنسوں نے پیش کیا اور کہا کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہے ۔ یہ کتاب کتب سابقہ کی تصدیق اس لئے کرتی ہے کہ اصول و عقائد کے اندر یہ کتاب جو سچائی پیش کرتی ہے' وہ ان کتب سابقہ کے اندر بھی موجود ہے ۔ رہی شریعت اور قوانین تو اللہ کی سنت یہ ہے کہ اللہ ہر امت کے لئے علیحدہ شریعت اور علیحدہ منہاج وضع کیا کرتا ہے لیکن یہ منہاج اور یہ شریعت دین کے عظیم اصولوں کی روشنی میں طے ہوتے ہیں ۔

جو لوگ اسلام کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ یہ پہلا دین ہے جس نے مکمل توحید کا نظریہ پیش کیا اور یہ کہ رسالت اور رسولوں کے بارے میں اس دین نے سب سے پہلے مکمل تصور پیش کیا ۔ آخرت اور حساب و کتاب کے بارے میں سب سے پہلے مکمل نظریہ پیش کیا ۔ ایسے لوگوں کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی تعریف کریں ۔ ایسے لوگوں نے دراصل قرآن کریم کا مطالعہ نہیں کیا ہوتا ۔ اگر انہوں نے قرآن کریم کا مطالعہ کیا ہوتا تو وہ لوگ بسہولت معلوم کر لیتے کہ قرآن کے مطابق تمام رسولوں نے مکمل اور خالص توحید کا نظریہ اور عقیدہ پیش کیا جس کے اندر شرک کا شائبہ تک نہ تھا' اور یہ کہ تمام رسولوں نے رسالت کی حقیقت بیان کی اور سب نے یہی کہا کہ وہ کسی کے نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں ۔ وہ غیب نہیں جانتے اور یہ کہ وہ کسی کے رزق میں نہ کمی کر سکتے ہیں اور نہ زیادتی ۔ تمام رسولوں نے اپنی اپنی قوم اور امت کو آخرت کی جواب دہی کا احساس دلایا اور کہا کہ تم کو وہاں حساب و کتاب سے سابقہ پیش ہو گا ۔ تمام رسولوں نے ایک ہی قسم کے اساسی عقائد و نظریات پیش کئے ۔ قرآن کریم جو آخری کتاب ہے اس نے ان تمام سابقہ کتب کی تصدیق کی ۔ اسلام کے بارے میں یہ تعریفی جملے جن کا ذکر ہوا یورپین تصورات کا چربہ ہیں اور یورپین تصور یہ ہے کہ تمام آسمانی مذاہب ترقی پذیر ہیں اور وہ ترقی کے مختلف مراحل سے گزرے ہیں ۔ جوں جوں قوموں نے ترقی

کی' ان مذاہب کے تصورات میں بھی ترقی ہوتی رہی ۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے کسی اصول کو منہدم کر کے اسلام کی تعریف و توصیف نہیں کی جا سکتی لہذا تمام لکھنے والوں اور تمام پڑھنے والوں کو چاہئے کہ وہ ایسی باتیں نہ لکھیں اور نہ ایسی باتیں پڑھیں ۔ اور یہ آخری کتاب کیوں نازل کی گئی؟ تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل مکہ اور اس کے اردگرد جو لوگ بستے ہیں ان کو ڈرائیں ۔

(لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (٦: ٩٢)) تاکہ تم ام القری اور اس کے اردگرد بسنے والوں کو ڈراؤ ۔" مکہ مکرمہ کو ام القری اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں وہ گھر ہے جسے سب سے پہلے اللہ وحدہ کی عبادت کے لئے تعمیر کیا گیا اور اسے امن اور لوگوں کے آنے جانے کی جگہ قرار دیا گیا ۔ فقط انسانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ہر زندہ چیز کے لئے اسے جائے امن قرار دیا گیا اور مکہ مکرمہ ہی سے تمام روئے زمین کے باشندوں کے لئے دعوت اٹھی ۔ اس سے قبل تمام انبیاء کی دعوت کبھی دعوت عامہ نہیں رہی اور یہ ام القری اس لئے بھی ہے کہ یہاں تمام اہل ایمان حج کے لئے آتے ہیں تاکہ یہاں سے دعوت اسلامی کو لے کر دنیا میں پھیل جائیں ۔

اس آیت سے وہ مراد نہیں جو مغربی مستشرقین نے نکالی ہے کہ دعوت اسلامی صرف اہل مکہ اور اس کے اردگرد بسنے والے لوگوں کے لئے ہے ۔ مستشرقین اس آیت کا یہ مفہوم اس طرح نکالتے ہیں کہ اسے دوسرے قرآن مجید سے کاٹ کر پڑھتے ہیں اور یہ اخذ کرتے ہیں کہ پہلے پہل حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد صرف یہ تھا کہ اہل مکہ اور چند دوسرے شہروں کے لوگوں تک اپنی دعوت کو محدود رکھیں مگر بعد میں آپ نے اپنی دعوت کو پورے جزیرۃ العرب تک وسعت دے دی حالانکہ پہلے آپ کے خیال میں یہ بات نہ تھی کہ آپ وسیع علاقے تک دعوت کو پھیلائیں ۔ اس کے بعد آپ نے یہ ارادہ کیا کہ اسے اور آگے بڑھایا جائے ۔ آپ کے ذہن میں یہ خیال بعض اتفاقات کی وجہ سے پیدا ہوا یعنی مدینہ کی طرف ہجرت کرنے اور وہاں حکومت قائم ہو جانے کی وجہ سے 'لیکن ان لوگوں نے اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ عظیم افتراء باندھا ہے اس لئے کہ دعوت کے ابتدائی دنوں ہی میں اللہ نے حضور ؐ کو کہہ دیا تھا

(وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (٢١: ١٠٧)) اور ہم نے تو تجھے پورے جہان والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے ۔"

(وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (٣٤: ٢٨)) اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے ۔" یہ اس دور کی بات ہے جب دعوت اسلامی مکہ میں شعب ابو طالب میں محصور تھی اور اسے سخت مشکلات کا سامنا تھا ۔

(وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (٦: ٩٢))
اور وہ لوگ جو آخرت پر ایمان لاتے ہیں وہ اس کتاب پر بھی ایمان لاتے ہیں اور وہ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں ۔" وہ لوگ جو اس حقیقت پر ایمان لاتے ہیں کہ ایک دن ہم نے اپنی زندگی کا حساب و کتاب دینا ہے' وہ اس بات

پر بھی ایمان لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لازماً رسول بھیجتا ہے اور وہ رسولوں کی طرف وحی کرتا ہے۔ ایسے لوگ قرآن مجید کی تصدیق کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے بلکہ یہ ایمان انہیں اس تصدیق پر آمادہ کرتا ہے اور پھر وہ اپنے اس ایمان بالآخرت اور ایمان بالکتاب کی وجہ سے اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں تاکہ ان کا تعلق ذات باری سے قائم و دائم ہے اور وہ نماز کی شکل میں اطاعت باری تعالیٰ کا اظہار کر سکیں۔ یہ انسانی نفسیات کی کیفیت ہے کہ جب کسی کے دل میں خوف آخرت پیدا ہو جائے اور اس کو قیام قیامت کا یقین ہو جائے تو ایسے نفوس اللہ کی جانب سے کتاب ہدایت کے نزول کو خود بخود مان لیتے ہیں اور اس کے بعد وہ نماز کی صورت میں اللہ کے ساتھ اپنا تعلق قائم کر لیتے ہیں۔ قرآن کریم کے اندر جابجا جن انسانی نفسیات و کیفیات کو قلم بند کیا گیا ہے' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رب العالمین کا سچا کلام ہے۔

---ooo---

اب آگے اس لہر اور سبق کا آخری حصہ ہے۔ یہ حصہ ایک خوفناک اور متحرک منظر پیش کرتا ہے۔ یہ منظر الفاظ کی تصویر کے ذریعے نظروں کے سامنے اسکرین پر ہے۔ اس منظر کے کردار وہ لوگ ہیں جو مشرک ہیں اور ظالم ہیں اور جن کا وطیرہ یہ ہے کہ یہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ یہ جعلی مدعیان نبوت ہیں جن کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کی طرف وحی آتی ہے۔ حالانکہ ان کی طرف کوئی وحی نہیں آتی۔ یا وہ لوگ جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ بھی قرآن مجید جیسا کلام پیش کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ حالت نزع میں ہیں اور ان کا ظلم اس قدر عظیم ہے کہ اس کے بارے میں انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ موت کے وقت فرشتے ہاتھوں میں ذرائع عذاب لے کر ان کی جان نکالنے کے لئے حاضر ہوں گے۔ اس وقت ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہوں گی اور یہ لوگ اس دنیا کی ہر چیز کو پیچھے چھوڑتے ہوئے جان دیں گے اور رخصت ہوں گے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ قَالَ
أُوحِيَ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ وَمَن قَالَ سَأُنزِلُ مِثْلَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ ۗ
وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُو أَيْدِيهِمْ
أَخْرِجُوا أَنفُسَكُمُ ۖ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى
اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ ﴿٩٣﴾ وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا
خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُم مَّا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ ۖ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ
شُفَعَاءَكُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ ۚ لَقَد تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ
عَنكُم مَّا كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٩٤﴾ ع ۱۱ ۴ ۱۷

اور اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑے ' کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے در آں حالیکہ اس پر کوئی وحی نازل نہ کی گئی ہو' یا جو اللہ کی نازل کردہ چیز کے مقابلے میں کہے کہ میں بھی ایسی چیز نازل کر کے دکھا دوں گا؟ کاش تم ظالموں کو اس حالت میں دیکھ سکو جب کہ وہ سکرات موت میں ڈبکیاں کھا رہے ہوتے ہیں اور فرشتے ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ "لاؤ' نکالو اپنی جان' آج تمہیں ان باتوں کی پاداش میں ذلت کا عذاب دیا جائے گا جو تم اللہ پر تہمت رکھ کر ناحق بکا کرتے تھے اور اس کی آیات کے مقابلے میں سرکشی دکھاتے تھے۔" (اور اللہ فرمائے گا) "لو اب تم ایسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہوگئے جیسا ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا' جو کچھ ہم نے تمہیں دنیا میں دیا تھا وہ سب تم پیچھے چھوڑ آئے ہو' اور اب ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمہارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے' تمہارے آپس کے سب رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے گم ہوگئے جن کا تم زعم رکھتے تھے۔"

حضرت قتادہ اور حضرت ابن عباس سے یہ روایت ہے کہ یہ آیت مسیلمہ کذاب اور اس کی بیوی سجاح بنت حارث کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اسود عنسی کے بارے میں بھی۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل کی ہے۔ رہی یہ بات کہ (سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (٦: ٩٣)) یا جس نے کہا کہ "میری طرف بھی وحی آئی ہے۔" تو حضرت ابن عباس کی ایک روایت میں ہے کہ اس سے مراد عبداللہ ابن سعد ابن ابی سرح ہیں۔ یہ ایمان لائے تھے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی تھے۔ جب سورہ المومنون کی یہ آیت نازل ہوئی

(لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (٢٣: ١٢)) تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور اسے لکھوانا شروع کیا اور جب یہ آیات یہاں تک پہنچیں۔

(ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (٢٣: ١٤)) تو عبداللہ کو تخلیق کی ان تفصیلات پر تعجب ہوا۔ تو اس نے کہا

(فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (٢٣: ١٤)) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اسی طرح آیت نازل ہوئی ہے۔ اس مقام پر عبداللہ نے شک کر لیا کہ اگر محمد سچا ہو تو پھر مجھ پر بھی ویسے ہی وحی نازل ہوگی جس طرح ان پر نازل ہوئی اور اگر جھوٹے ہوں تو جس طرح انہوں نے کہا ویسا ہی میں نے بھی کہا۔ اسی طرح وہ اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو گیا اور مشرکین سے دوبارہ مل گیا۔ یہ ہے مصداق اس آیت کا۔

(سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (٦: ٩٣)) (روایت کلبی عن ابن عباس)۔

یہاں سیاق کلام میں' ان مشرک ظالموں کے جس انجام کا ذکر ہوا ہے وہ نہایت خوفناک 'کربناک اور ہراساں کنندہ ہے۔ نظر آتا ہے کہ یہ ظالم سکرات الموت کی حالت میں ہیں اور اس حالت کے لئے لفظ غمرات کا استعمال بتاتا ہے کہ ان کی حالت نہایت دردناک ہوگی۔ فرشتے ان کی جان لینے کے لئے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے اور فرشتوں کی یہ گرفت بھی سزا

وہی کے طور پر ہوگی - یہ فرشتے ان کی روح نکال لیں گے اور پھر عذاب الہی ان کے لئے حاضر ہو گا۔

(وَلَوْ تَرٰى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَیْدِیْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ (۹۳) کاش تم ظالموں کو اس حالت میں دیکھ سکو جب کہ وہ سکرات الموت میں ڈبکیاں کھا رہے ہوتے ہیں اور فرشتے ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ "لاؤ" نکالو اپنی جان' آج تمہیں ان باتوں کی پاداش میں ذلت کا عذاب دیا جائے گا جو تم اللہ پر تہمت رکھ کر ناحق بکا کرتے تھے اور اس کی آیات کے مقابلے میں سرکشی دکھاتے تھے۔"

ان کے استکبار اور سرکشی کی وجہ سے انہیں عذاب عظیم میں مبتلا ہونا ہو گا۔ یہ توہین آمیز سزا انہیں اس لئے دی جا رہی ہے کہ انہوں نے اللہ پر افتراء باندھا۔ ان تمام امور کے تذکرے سے اس منظر پر ایک خوفناک فضا طاری ہو جاتی ہے اور اس کو دیکھ کر انسان مارے خوف کے دہشت زدہ ہو جاتا ہے اور اس کا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

آخر میں یہ توبیخ اور جھڑک اس وقت ہوتی ہے جب وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور اللہ تعالیٰ کا خطاب ان سے ایسے حالات میں یوں ہوتا ہے۔

(وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۶ : ۹۴)) (اور اللہ فرمائے گا) "لو اب تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے ہو جیسا ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا۔" اب تمہارے پاس فقط تمہاری ذات ہے۔ تم بالکل اکیلے ہو' تم اپنے رب کے سامنے گروہ کی شکل میں نہ ہو گے بلکہ فرداً فرداً جس طرح تم ماں کے پیٹ سے اکیلے اس جہان میں آئے تھے' ننگا جسم اور بے یار و مددگار۔

اب تم سے تمہارے تمام یار و مددگار دور ہو چکے ہیں۔ ہر سہارا اور وسیلہ تم سے دور ہو چکا ہے۔ اب تمہیں ان چیزوں پر بھی اختیارات حاصل نہیں ہیں جنہیں اللہ نے تمہاری ملکیت میں دیا تھا۔

(وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ (۶ : ۹۴)) جو کچھ ہم نے تمہیں دنیا میں دیا تھا وہ سب تم پیچھے چھوڑ آئے ہو۔" وہ مال و زینت جس کے تم دنیا میں مالک تھے' وہ تم سے پیچھے رہ گیا ہے۔ اولاد اور مرتبہ تم سے پیچھے رہ گیا ہے۔ قوت اور اختیارات سب کے سب ختم ہو گئے۔ یہ سب چیزیں دنیا میں رہ گئیں اور اب تمہارے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے اور نہ کسی دنیاوی امر پر اب تمہیں کوئی اختیار حاصل ہے۔

(وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِیْكُمْ شُرَكٰٓؤُا (۶ : ۹۴)) اور اب ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمہارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے۔"

یہ لوگ جن کے بارے میں تم سمجھتے تھے کہ یہ لوگ مشکلات میں تمہاری سفارش کریں گے اور تم انہیں اپنی زندگی اور اپنے مال میں شریک ٹھہراتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کے ہاں یہ تمہارے سفارشی ہوں گے - دوسری جگہ میں آتا ہے -

(مَا نَعبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُونَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى) ہم تو ان کی بندگی صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں -" چاہے یہ شریک لوگ ہوں' کاہن ہوں یا وقت کے حکمران ہوں' یا پتھر ہوں یا حجر و شجر کے بت ہوں' جنات ہوں یا ملائکہ ہوں' ستارے ہوں یا سیارے ہوں یا اولیاء فقراء ہوں بتاؤ وہ کہاں ہیں؟ بتوں کی نسبت یا ستاروں کی نسبت وہ اپنے جھوٹے خداؤں کی طرف کرتے تھے اور اپنے مال اور اپنی زندگی میں یہ لوگ انہیں شریک بناتے تھے - اللہ میاں سوال کریں گے' بتاؤ وہ کہاں گئے؟

(لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ (٦ : ٩٤)) تمہارے آپس کے سب رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے گم ہو گئے جن کا تم زعم رکھتے تھے -" تمام رابطے ٹوٹ گئے' تمام تعلقات ختم ہو گئے اور تمام اسباب اور وسیلے ختم ہو گئے - اب وہ تمہارے تمام مزعومہ خدا اور الٰہ غائب ہو گئے ہیں' جس طرح شرکاء غائب ہیں اسی طرح تمہارے مزعومہ عقائد بھی کافور ہو گئے ہیں - تم دیکھ رہے ہو کہ میرے ہاں اب ان کا نہ کوئی اثر ہے' نہ کوئی سفارش ہے اور نہ اثر و رسوخ ہے -

غرض یہ ایک ایسا منظر ہے جو انسان کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے - یہ منظر نہایت ہی مجسم شکل میں اور متحرک طور پر سامنے نظر آتا ہے - نفس انسانی پر اس کی چھاؤں پڑتی ہے - دل مومن معرفت سے بھر جاتا ہے - یہ سائے نہایت ہی خوفناک اور دہشتناک ہیں - بے شک یہ قرآن ہی کا انداز بیان ہے اور قرآن ہی کا حصہ ہے -

---ooo---

درس نمبر ۶۶ ایک نظر میں

مناسب ہے کہ یہاں وہ تبصرہ ہمارے پیش نظر رہے جو ہم نے اس سورہ پر کیا تھا' اور یہ بات بھی ہمارے سامنے رہے کہ اس سورہ کے مضامین دریا کی لہروں کی طرح ٹھاٹھیں مارتے ہوئے آرہے ہیں اور لہر کے پیچھے لہر چلی آرہی ہے۔ اس کا انداز بیان اس حد تک خوبصورت اور اس قدر فصیح و بلیغ ہے کہ حسن تعبیر کے بارے میں انسان جس حد تک سوچ سکتا ہے۔اثر آفریں کلام کی جو آخری حد ہو سکتی ہے یہ سورہ اس سے بھی آگے بڑھ رہی ہے۔ہم نے کہا تھا:

"یہ سورہ اپنے اساسی موضوع کو ایک منفرد طریقے پر لے رہی ہے۔ ہر لمحے' ہر موقف اور ہر منظر میں اس کا انداز بیان خیرہ کن ہے۔جب انسان اس پر غور کرتا ہے اور اس کے مناظر کی سیر کرتا ہے تو احساس اس کے مناظر کا گرفتار ہو جاتا ہے اور ایک لمحہ کے لئے سانس رک سا جاتا ہے خصوصاً جب انسان اس کے مناظر پر غور کرے۔اس کے زیر و بم کو سمجھنے کی کوشش کرے اور اس کے اثرات کو محسوس کرے۔"

"یہ سورہ اپنے مشاہد و مواقف' اپنے اشارات و اثرات اور اپنی تقاریر و شیڈز کے ساتھ اس طرح جاری و ساری ہے جس طرح کوئی لہر اور دریا اپنی امواج اور لہروں کے ساتھ جاری و ساری رہتا ہے۔ایک لہر ساحل سے نہیں ٹکراتی کہ دوسری اٹھ رہی ہوتی ہے۔امواج کے اس تلاطم میں اس سورہ کا دریا اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔"

"یہ سورہ اپنی امواج کے اس تلاطم کے ساتھ اور اپنی لہروں کے باہم ٹکراؤ کی روشنی میں اس قدر خوبصورت نظر آتی ہے کہ انسان مسحور ہو جاتا ہے۔اس خوبصورتی کے ساتھ ساتھ مضامین اور مفہومات کو نہایت ہی ہم آہنگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کیا گیا ہے اور اس قدر اثر انگیز طریقے سے مضامین پیش کئے گئے ہیں کہ انسان کے احساسات دنگ رہ جاتے ہیں۔نہایت ہی زندہ' متحرک' ہم آہنگ اور مؤثر صوتی اثرات کے ذریعے الفاظ نفس انسانی پر ہر جہت اور ہر سمت سے اثر انداز ہو کر اسے مسحور کر دیتے ہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔

یہ تمام خصوصیات جن کا اوپر اس سورہ کے بارے میں ذکر ہوا' اس سبق میں پوری طرح عیاں اور نمایاں ہیں۔ قاری یوں محسوس کرتا ہے کہ یہ مناظر اسکرین پر یکے بعد دیگرے چل رہے ہیں۔چمک دمک کے ساتھ سامنے آرہے ہیں۔جس طرح الفاظ کا سیل رواں سامنے آتا ہے' اسی طرح معانی کا بھی ایک سیلاب ہے جو امڈتا چلا آرہا ہے اور دونوں کے درمیان ہم آہنگی ہے۔جس طرح یہ مناظر سب کچھ دکھا رہے ہیں' اسی طرح لفظی تعبیر بھی پورے مفہوم و مراد کو واضح کرتی چلی جاتی ہے اور دونوں اپنے ہدف کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

ان مناظر و مشاہد میں سے ہر منظر کسی نامعلوم خزانہ سے نہایت ہی چمک دمک اور نہایت ہی دل کشی ساتھ لے کر سامنے آتا ہے اور دل و دماغ اور قلب و نظر کو روشن کر کے غائب ہو جاتا ہے۔

پھر الفاظ و عبارات اس طرح ہیں جس طرح ایک قدرتی چشمہ سے پانی پھوٹتا ہے۔ عبارت یوں چلتی ہے جس طرح کہ

گویا کسی منظر پر رننگ کنٹری ہو رہی ہو اور الفاظ اور ان سے مراد مناظر دونوں نہایت تابانی کے ساتھ ہم قدم ہو کر چلتے ہیں۔

یہ مناظر اور یہ تصورات اور یہ الفاظ و نعرے یوں چلتے ہیں جس طرح لہریں اور موجیں یکے بعد دیگرے ایک توازن کے ساتھ چلتی ہیں۔ انسان کی نظریں ان کا تعاقب کرتی ہیں اور یوں کہ جس طرح چندھیا جائیں' خیالات و تصورات کی ایک لہر ابھی ساحل کے ساتھ ٹکرا کر ختم نہیں ہوتی کہ تصورات کی اور بہت سی لہریں اٹھتی ہیں۔ اس سبق یا اس لہر میں وہ تمام خواص نمایاں ہیں جن کا ہم نے سورہ کے آغاز میں ذکر کیا ہے۔

خوبصورتی اس لہر کی نمایاں خصوصیت ہے' اس قدر خوبصورتی کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اس سبق میں جو مناظر ہیں وہ بالکل صاف ہیں اور خوبصورتی کے اعتبار سے منتخب ہیں۔ الفاظ' عبارتیں اپنے مفہوم و مدلول کے اعتبار سے اور اپنے لفظی حسن کے اعتبار سے اور اپنے تصورات اور حقائق کے اعتبار سے نہایت ہی اعلیٰ معیار کی اور حسین و جمیل ہیں۔ غرض مفہوم اور حقائق موتیوں کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں۔

اس سبق کی خوبصورتی اور تروتازہ حسن کا اظہار اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ خود اللہ جل شانہ نے ایک منظر کے حسن و خوبی کی طرف متوجہ کیا ہے۔ باغات کے اندر پھلوں کی تازگی اور حسن کے سلسلے میں دعوت نظارہ دی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے۔

(انْظُرُوْا اِلٰى ثَمَرِهٖ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ (۶:۹۹)) یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو۔" یہ براہ راست دعوت نظارہ ہے کہ اس قدرتی جمال کو دیکھو' اس پر غور کرو اور لطف اندوز ہوتے رہو۔

اب ایک ایسا مقام آتا ہے کہ یہ خوبصورتی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ انسان نہایت ہی تعجب میں پڑ جاتا ہے اور اس کے دل و دماغ روشن ہو جاتے ہیں۔ اب یہ بہار اس کائنات کے دائرے سے نکل کر ماوراء کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور اب یہ بہار' تروتازگی اور خوبصورت بیان بدیع السماوات والارض ذات کبریا کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ ذات کبریا کے بارے میں یہاں جو بات کی جاتی ہے بتائی جاتی ہے اس میں معیار فصاحت و بلاغت بدستور ہے۔ ذرا قرآن ہی کے الفاظ میں پڑھئے

(لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (۶:۱۰۳))
نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ وہ نہایت ہی باریک بین اور باخبر ہے۔"

اب میں ایک دوسرے پہلو کو لیتا ہوں۔ اس سبق میں ہم اس کائنات کی کھلی کتاب کو پڑھتے ہیں۔ اس کتاب کو غافل لوگ ہر لحظہ دیکھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں مگر وہ کتاب کائنات کے عجائبات اور معجزات کو گہری نظر سے نہیں دیکھتے۔ جو صاف اندھے ہیں انہیں تو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ وہ کیا دیکھیں کہ اس میں کیا کیا اعجوبے ہیں لیکن قرآن کریم کی یہ آیات ہمیں ایک ایک اعجوبے کے سامنے لا کھڑا کرتی ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ شاید ان سے پہلے ہم اس دنیا میں نہ تھے اور اب اس میں اتر رہے ہیں۔ یہ آیات ہمیں اس کتاب کے عجیب و غریب نشانات کے سامنے کھڑا کر دیتی ہیں۔ اور ہمارے تجسس کو ان عجائبات کی طرف ابھارتی ہیں جن پر سے دنیا کے غافل انسان یونہی گزر جاتے ہیں۔

اب ہم ایک ایسے خارق العادت اعجوبے کے سامنے ہیں جو رات کے ہر لحظہ میں رونما ہوتا رہتا ہے' یہ کہ اس دنیا

میں مردہ چیزوں سے زندہ اشیاء رات اور دن نمودار ہو رہی ہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ مردہ زمین سے یہ روئیدگی کس طرح نمودار ہو رہی ہے؟ ہم اس کرۂ ارض پر زندگی کے مختلف نمونے پاتے ہیں اور ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اور تعبیر نہیں ہے کہ اللہ کے حکم اور فیصلے کے مطابق سب کچھ ہو رہا ہے۔ انسان نہ تو یہ عمل کر سکتا ہے کہ کسی مردہ چیز سے زندہ چیز کو نکالے اور نہ ہی وہ اس کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔

اب ہم زمین و آسمان کے نظام کی گردش بلکہ گردشوں کے سامنے ہیں۔ یہ گردشیں بھی عجیب ہیں۔ زمین کی گردش جو رات دن ہو رہی ہے' نہایت ہی تعجب خیز ہے اور ہر لمحہ اور ہر سیکنڈ میں اس کی تکمیل ہو رہی ہے۔ اب ہم خود تخلیق انسان کے سامنے ہیں۔ ایک ہی نفس سے انسان پیدا ہوتا ہے اور اپنی نسل کشی کے نظام سے بڑھتا جاتا ہے۔

اب ہم نباتات کی اگائی کے نظام کے سامنے ہیں۔ نباتات کو زندگی مل رہی ہے۔ بارشیں ہو رہی ہیں' پھل پھول اُگ رہے ہیں' کیا ہی خوبصورت ہیں اور کیا ہی خوش ذائقہ ہیں۔ ان میں قسم قسم کے حیوانات ہیں اور عجیب و غریب مناظر ہیں' اگر ہم زندہ احساس اور روشن آنکھوں سے انہیں دیکھیں تو ہر ایک میں سامان عبرت ہے۔

اب ہم اس پوری کائنات کے سامنے ہیں۔ اب یہ ہمیں اس طرح نظر آ رہی ہے گویا ہم اسے پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ یہ ایک زندہ کائنات ہے۔ وہ ہم سے پیار کرتی ہے اور ہم اس سے پیار کرتے ہیں۔ یہ رواں دواں ہے' اس کی رگ رگ میں حرکت اور دوڑ ہے۔ یہ ہمارے احساس و شعور کا دامن پکڑتی ہے اور اپنے خالق کی بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنی انفرادی اور انوکھی حیثیت میں اللہ کی قدرت اور اس کی ذات کے لئے دلیل و برہان ہے۔

یہاں آکر اچانک بات کا رخ شرک باللہ کی طرف پھر جاتا ہے اور شرک اور مشرکین کی مذمت کی جاتی ہے۔ یہ اس کائنات کی فطرت اور اس کے وجود کے مزاج ہی کے خلاف تصور ہے' یہ فطرت کائنات کے خلاف ہے۔ جو شخص دلائل و شواہد کی اس بھری کائنات کا مطالعہ کرتا ہے اس کے آئینہ فطرت پر یہ ایک بدنما داغ نظر آتا ہے۔ شرک اور اللہ کے ساتھ! اس کائنات کا گہرا مطالعہ اسے یکسر رد کر دیتا ہے اور یوں غور کرنے والے کا دل گہرے ایمان سے بھر جاتا ہے۔

قرآن کریم جب شخصیت انسانی کو ذات باری کے بارے میں خطاب کرتا ہے تو اس کا انداز بحث یہ ہوتا ہے۔ دیکھو وہ تمہارا اور پوری کائنات کا خالق ہے' اس نے اس کرۂ ارض پر سب سے پہلے زندگی اور روئیدگی پیدا کی۔ پھر اس نے تمام جانداروں اور نباتات کی زندگی کی نشوونما کا انتظام کیا اور ان کے لئے اپنی پوری کائنات کی قوتوں کو ممد و معاون بنایا۔ اللہ وہ ذات ہے کہ عالم اسباب اور اس کائنات کے اندر ہونے والے تمام تغیرات اور تصرفات صرف اس کی مرضی اور ارادے سے ہوتے ہیں۔ اس دنیا کے تمام ظاہری اسباب کو اللہ ہی نے تاثیر بخشی ہوئی ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ تم صرف اللہ کی بندگی کرو۔ کیا تم اشارات فطرت کو نہیں پاتے؟ کیا اس دنیا کی رنگا رنگ بوقلمونیاں انسان کے لئے برہان ناطق نہیں ہیں کہ وہ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کرے' صرف اللہ ہی کے سامنے مراسم عبودیت بجا لائے اور اسی کے سامنے عاجزی اور خشوع کرے اور اس کی اطاعت کرے؟ اس کائنات کی کھلی کتاب کو برائے مطالعہ پیش کر کے قرآن کریم یہ دعوت دیتا ہے کہ چونکہ تخلیق اس کی ہے' رزق اس کا ہے' کفالت اس کی ہے تو سلطنت اور بندگی بھی اس کی ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم خدائی اور خدائی کے حقوق میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اسی کے لیے مراسم عبودیت بجا لائیں' وہی حاکم ہو اور زندگی کے تمام امور میں وہی متصرف ہو' اور اس کے سوا جو بھی ان حقوق و خصائص کا

مدعی ہو اس کا انکار کیا جائے۔ اس سبق میں آتا ہے۔

(ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَىْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ وَّكِيْلٌ (٦: ١٠٢)) یہ سب کام تمہارے رب کے ہیں۔ اس کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کا خالق ہے، پس اس کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔" یہ ہے قرآن کریم کا منہاج استدلال کہ چونکہ اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر چیز کا نگہبان ہے اس لئے بندگی اسی کی چاہئے وہی اس کا مستحق ہے۔

اس سبق کے آخر میں 'کتاب کائنات کو کھولنے اور اس کے اندر سے خوارق و معجزات دکھانے کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کائنات کے ہوتے ہوئے بھی جو لوگ مزید معجزات اور خوارق عادت امور کے طالب ہیں وہ نہایت ہی کم عقل ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ جو لوگ اب بھی منکر ہیں وہ دلائل و معجزات کی کمی کی وجہ سے منکر نہیں ہیں بلکہ ان کی چشم بصیرت میں بینائی نہیں ہے ورنہ اس کائنات میں تو ہر طرف وجود باری اور خصائص الوہیت پر دلائل و معجزات کے انبار لگے ہوئے ہیں اور دعوت نظارہ دیتے ہیں۔

---ooo---

درس ٦٦ تشریح آیات

٩٥ --- تا --- ١١٠

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ﴿٩٥﴾

”دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے۔ وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی مردہ کو زندہ سے خارج کرنے والا ہے۔ یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ ہے' پھر تم کدھر بہکے چلے جا رہے ہو؟“

یہ وہ معجزہ ہے جس کے راز تک کوئی نہیں پہنچ سکا یہ تو بڑی بات ہو گی کہ کوئی یہ معجزہ کر دکھائے۔ کیا معجزہ؟ یعنی زندگی کی تخلیق اور اس کی نشوونما اور اس کی حرکت' ہر وقت ایک زندہ اور بڑھنے والے درخت سے مردہ بیج نکالتا ہے اور ایک بے جان گٹھلی ایک بڑھنے والے درخت سے نکلتی ہے۔ پھر اس بیج اور اس گٹھلی کے اندر پوشیدہ زندگی ایک پودے اور ایک درخت کی شکل اختیار کرتی ہے۔ یہ ایک خفیہ راز ہے جس کی حقیقت کا علم صرف اللہ کی ذات کریم کو ہے۔ اس زندگی کا اصل مصدر اور منبع کیا ہے' اس بات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ انسان نے جو بھی عملی ترقی کی ہے' جس قدر زندگی کے ظاہری امور کا مطالعہ کیا ہے اور جس قدر خصائص بھی متعین کئے ہیں اس کی انتہا پر ایک راز ہے جو غائب ہے۔ اس سلسلے میں جس طرح پہلے انسان کا علم محدود تھا اسی طرح اس آخری دور کے ترقی یافتہ انسان کا علم بھی محدود ہے۔ انسان صرف مظاہر اور خواص حیات سے واقف ہے لیکن اسے زندگی کے اصل منبع اور اس کی اصل ماہیت کا علم نہیں ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ زندگی ہماری آنکھوں کے سامنے رواں دواں ہے اور یہ معجزہ ہر لحظہ واقعہ ہوتا رہتا ہے۔

اللہ وہ ذات ہے جس نے روز اول سے ایک مردہ حالت سے انسان کو زندگی بخشی۔ یہ کائنات تو تھی مگر انسان نہ تھا۔ یہ زمین تھی مگر اس پر زندگی نہ تھی۔ پھر یہ زندگی اذن الٰہی سے نمودار ہوئی۔ یہ کیسے نمودار ہوئی؟ اس کا ہمیں علم نہیں ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک یہ زندگی مردے سے نمودار ہو رہی ہے اور مردہ ذرات زندگی کے ذریعے زندگی پاتے ہیں۔ یہ بے جان مواد زندہ عضوی شکل اختیار کرتا ہے' اور پھر یہ زندہ خلیہ انسان کے جسم میں اور تمام جانداروں کے جسم میں داخل ہوتا ہے۔ یہ زندہ ذرات اب مزید تغیرپذیری کے ذریعے زندہ خلیے بن جاتے ہیں اور اس کے بعد یہ زندہ خلیے پھر مرجاتے ہیں۔ کیونکہ زندہ خلیے ہر وقت مردہ خلیوں کی شکل اختیار کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ یہ زندہ شخص یا جانور ایک دن مردہ ذرات کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ ہے مفہوم اس جملے کا۔

(يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ (٦: ٩٥)) وہ زندہ کو مردے سے خارج کرنے والا ہے اور مردے کو زندہ سے خارج کرنے والا ہے۔" اللہ کے سوا کوئی بھی یہ کام نہیں کر سکتا اور یہ بھی ناممکن ہے کہ آغاز حیات کے وقت اللہ کے سوا کوئی اور حیات پیدا کر سکے اور نہ کوئی یہ قدرت رکھتا ہے کہ وہ مردہ ذروں کو زندہ ذروں کی شکل دے دے۔ یہ اللہ ہی ہے جو ان زندہ ذروں کو پھر مردہ ذروں کی شکل دیتا ہے اور یہ سرکل ایک ایسا سرکل ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ اس کا آغاز کب ہوا اور کب یہ سرکل ختم ہو گا۔ سائنس دان جو قیافے لگاتے رہتے ہیں وہ محض احتمالات ہیں۔

اس کرۂ ارض پر ظہور حیات کے خصائص کے بارے میں آج تک سائنس دانوں نے جو نظریات بیان کئے ہیں ان میں سے کوئی نظریہ بھی تشفی بخش نہیں ہے۔ صرف یہ نظریہ تشفی بخش ہے کہ اس دنیا پر تخلیق کائنات ذات باری کا کارنامہ ہے اور یورپ میں جب قرون وسطیٰ میں عوام کنیسہ سے بھاگ کھڑے ہوئے جس طرح بدکے ہوئے گدھے ہوں یا جس طرح شیر کے ڈر سے جانور بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ مذہب سے فرار اختیار کرنے والوں نے جب اس کرۂ ارض پر تخلیق حیات کے راز کے عقدے کو حل کرنا چاہا، پھر جب انہوں نے خود اس کائنات کی تخلیق کے رازوں سے پردہ اٹھانا چاہا، اور یہ کام انہوں نے خدا کے نظریے کو اپناتے ہوئے کیا تو ان کی تمام مساعی ناکام رہیں اور بیسویں صدی میں اس موضوع پر جو کچھ بھی لکھا گیا وہ ایک مذاق کے سوا کچھ نہ تھا اور یہ تمام تحریریں عناد اور انکار مذہب پر مبنی تھیں اور کوئی مخلصانہ مساعی نہ تھیں۔

ان سائنس دانوں میں سے بعض صحیح الفکر لوگوں نے اپنے عجز اور ناتوانی کا اعتراف کیا ہے۔ ایسے لوگوں کی باتوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس موضوع پر انسان کا علم کس قدر محدود ہے۔ ہمارے ہاں بعض ایسے لوگ اب بھی موجود ہیں جو سترہویں یا انیسویں صدی کے مغربی افکار کو نقل کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ سائنس دان ہیں اور صرف مشاہدے کے قائل، جبکہ اہل مذہب عالم غیب کو ماننے والے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سمجھانے کے لیے میں یہاں بعض بڑے سائنس دانوں کے اقوال نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں مثلاً بعض امریکی علماء یہاں تک پہنچے ہیں۔

ڈاکٹر فرانک ایلن، کورنل یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں اور کینیڈا کی مانٹویا یونیورسٹی میں طبیعیات کے استاد ہیں۔ اپنے ایک مقالے میں جس کا عنوان ہے "یہ دنیا یا اتفاقاً وجود میں آئی یا منصوبے کے تحت"۔ یہ مقالہ اللہ یتجلی فی عصر العلم کتاب ترجمہ ڈاکٹر مرداش عبدالحمید سرفان سے نقل کیا گیا ہے۔

"اگر یہ زندگی کسی سابقہ متعین منصوبے اور اسکیم کے تحت وجود میں نہیں لائی گئی تو پھر یہ اتفاقاً وجود میں آگئی ہو گی۔ وہ "اتفاق" کیا ہے؟ معلوم ہونا چاہئے تاکہ ہم اس پر غور کریں اور دیکھیں کہ اس "اتفاق" کے ذریعے زندگی کا ظہور کس طرح ہوتا ہے۔"

"اتفاق اور احتمال (بخت و اتفاق) کے جو نظریات اس وقت پائے جاتے ہیں پہلے کی طرح نہیں ہیں۔ دور جدید میں اب ان کے لئے ریاضی کے کچھ ٹھوس اصول اور قواعد مرتب ہو چکے ہیں اور اگر کسی موضوع پر یقینی فیصلہ نہ کیا جا سکتا ہو تو ان اصولوں کے مطابق بخت و اتفاق کے اصولوں کو کام میں لایا جاتا ہے اور ان اصولوں کے مطابق جو نتائج سامنے آتے ہیں وہ اقرب الی الصواب ہوتے ہیں اگرچہ ان نتائج کے غلط ہونے کے امکان کو بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حقیقت

ہے کہ ریاضی کے زاویہ سے نظریہ بخت و اتفاق نے کافی ترقی کر لی ہے۔ ان قواعد اور اصولوں کے مطابق انسان کے لئے ممکن ہو گیا ہے کہ وہ بعض واقعات کے بارے میں بات کر سکے' جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ واقعات اتفاقاً ہو گئے ہیں اور جن کے ظہور کے اسباب و عوامل دوسرے ذرائع سے معلوم نہیں ہو سکتے۔ (مثلاً تاش کے کھیل میں پھول کا پھینکنا) ان تحقیقات کی وجہ سے انسان اس بات پر قادر ہو گیا ہے کہ وہ یہ بتا سکے کہ کیا چیز اتفاقاً وجود میں آ جاتی ہے اور کیا امر ہے جو اتفاقاً وجود میں نہیں آ سکتا۔

(اسلامی تصور حیات کے مطابق اس دنیا میں بخت واتفاق نہیں ہے۔ ہر چیز کی تخلیق تقدیر الٰہی کے مطابق ہوتی ہے۔ انا خلقنا کل شئی بقدر

(ہم نے ہر چیز کو اندازے کے مطابق تخلیق کیا) اللہ نے تخلیق کائنات کے لئے اٹل قوانین وضع کئے ہیں۔ جو واقعات ہوتے ہیں ان میں ہر بار سنت الٰہیہ کے مطابق تقدیر الٰہی تصرف کرتی ہے۔ اسی طرح یہ قوانین قدرت بھی کبھی کبھی ٹال دیئے جاتے ہیں اور ایک خارق عادت معجزہ صادر ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک خاص حکمت الٰہیہ کے مطابق ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ نوامیس فطرت اور خارق عادت بظاہر دونوں اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوتے ہیں۔ ہم نے جو سائنس دانوں کے حوالے دیئے ہیں تو ضروری نہیں ہے کہ ہم محولہ عبارت سے پوری طرح متفق بھی ہوں۔) اور یہ بھی بتایا جا سکتا ہے کہ کون سا واقعہ کس قدر عرصے کے بعد اتفاقاً نمودار ہو سکتا ہے۔ اس تمہید کے بعد اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس کرۂ ارض پر زندگی کا ظہور بطور اتفاق ہو سکتا ہے۔"

تمام زندہ خلیوں میں پروٹین بنیادی عناصر ترکیبی ہیں۔ یہ پروٹین پانچ عناصر سے مرکب ہوتے ہیں۔ کاربن' ہائیڈروجن' نائٹروجن' آکسیجن اور گندھک۔ ایک پروٹین میں چالیس ہزار ایٹم ہوتے ہیں۔ کیمیاوی عناصر کی تعداد ۹۲ ہے اور یہ سب غیر منظم اور نامعلوم مقداروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

(عقل انتہائی بھی فلسفیانہ اصطلاحات میں سے ایک ہے۔ ایک مسلمان اللہ پر صرف اس کے اسمائے حسنیٰ ہی کا اطلاق کر سکتا ہے اس لئے اللہ پر اس لفظ کا اطلاق مناسب نہیں ہے۔)

ان پانچ عناصر کے آپس میں ملنے کے احتمال کے تعین کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس مادے کی مقدار اور زمانے کا تعین ہو اور وہ مادہ مسلسل ان عناصر پر مشتمل مخلوطہ میں رہے اور پھر اس قدر طویل عرصے تک وہ مادہ یونہی رہے تاکہ اس عرصے میں "اتفاقاً" واقعہ ہو جائے اور یوں ایک عدد پروٹین حاصل ہو جائے۔" غرض یہ تعین ضروری ہے کہ کتنا مادہ کتنے عرصے کے لئے ضروری ہے۔"

"سوئٹزر لینڈ کے ایک ریاضی دان نے کچھ حساب لگایا ہے (چارلز یوجین سچ) اس نے اس کا حساب لگا کر کہا ہے کہ احتمال کے طور پر ایک پروٹین کی تشکیل پر ایک نسبت : دس کی قیمت ۱۶۰ مرتبہ لگائی جائے ($1:10^{160}$) یہ اس قدر بڑی رقم بنتی ہے کہ زبان سے اس کا ادا کرنا بھی مشکل ہے نہ الفاظ کے ذریعے اسے بیان کیا جا سکتا ہے اور بطور اتفاق اس عمل کی تکمیل کے لئے یعنی ایک پروٹین کی تشکیل کے لئے اس قدر مادے کی ضرورت ہے جس کے ساتھ اس پوری کائنات کو کئی ملین بار بھرا جا سکتا ہو اور اگر صرف روئے زمین پر اتفاقاً ایک پروٹین کو پیدا کرنا ہو تو اس کے لئے کئی بلین سالوں کی ضرورت ہو گی اور یعنی ۱۰ کی "۲۴۳ بار سال (10^{243})۔ یہ زمانہ مذکور ماہر طبیعیات نے تجویز کیا ہے۔

"پروٹین اینو ایسڈ کے طویل سلسلوں سے تشکیل پاتے ہیں' تو سوال یہ ہے کہ ان جزئیات کے ذرات کی باہم تالیف

کس طرح ہوتی ہے؟ جس طرح ان کی تشکیل طبعی ہوتی ہے اگر اس کے سوا کسی اور طریق سے ان کی تالیف ہو تو وہ زندگی کے اہل ہی نہیں رہتے اور بعض اوقات ایسے پروٹین زہر بن جاتے ہیں۔ ایک برطانوی سکالر ج ب سیتھر (J.B.Seather) نے حساب لگایا ہے کہ ان سلسلوں میں پروٹینی ایٹم کس تعداد میں ہوتے ہیں ان کے نزدیک ان کی تعداد (10^{48}) ہوتی ہے۔ اس لئے عقلاً یہ بات محال ہے کہ احماض امینہ کا یہ پورا سلسلہ محض اتفاقی طور پر تالیف پا جائے اور دنیا میں ایک پروٹین بن جائے۔"

"لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بات پیش نظر رہے کہ پروٹین ایک کیمیاوی مادہ ہے جس کے اندر کوئی زندگی نہیں ہوتی اور اس کے اندر زندگی اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک اس کے اندر وہ خفیہ عمل نہیں ہو جاتا جو آج تک ایک عجیب راز ہے اور جس کی حقیقت کا ہمیں کوئی علم نہیں ہے اور اس بات کو صرف "عقل لا انتہائی" ۲۔ جانتا ہے اور یہ صرف اللہ ہے جس کی حکمت بالغہ کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے کہ یہ پروٹینی جزء مقر حیات بنتا ہے۔ یہ حیات کی منزل ہے جسے اللہ نے بنایا۔ اس کو ایک بہترین شکل دی ہے اور اس کو راز حیات بخشتا ہے۔"

نباتات کی موروثی صفات کے ایک ماہر مسٹر ارفنگ ولیم 'استاد طبیعیات جامعہ ایوی میچگن مقالے بعنوان "صرف مادیت کافی نہیں ہے" میں لکھتے ہیں:

سائنس اس بات پر قادر نہیں ہے کہ نہایت ہی چھوٹے ایٹم لاتعداد صورت میں کس طرح وجود میں آجاتے ہیں' جن سے دنیا کے تمام مادے مرکب ہوتے ہیں اور اس طرح سائنس کوئی قابل اعتماد توجیہ نہیں کر سکتی کہ ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے ذی حیات جاندار کس طرح اتفاقاً بن جاتے ہیں اور یہ نظریہ کہ تمام جاندار اپنی موجودہ ترقی یافتہ صورت میں بسبب حدوث طفرات عشوریہ اور ھجائن کے تجربات کی وجہ سے پہلے پہنچے ایک ایسا نظریہ ہے جو کسی ایسی دلیل و منطق کی اساس پر قائم نہیں ہے جس پر اطمینان ہوتا ہو' یہ بات محض تسلیم کر لینے کی وجہ سے ہی ممکن ہے۔"

(یہ بھی سائنس دانوں کا خبط ہے کہ عناصر کی مقدار معلوم نہیں ہے۔ ان عناصر کی مقدار بھی مقرر ہے۔)

باہلر یونیورسٹی کے پروفیسر طبیعیات ڈاکٹر البرٹ میکومب ونسٹر اپنے ایک مقالے کا عنوان یہ دیتے ہیں "سائنس نے میرے ایمان باللہ کو مضبوط کر دیا"۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں نے حیاتیات کے مطالعہ میں اپنے آپ کو مصروف رکھا۔ حیاتیات وہ علم ہے جس کا موضوع زندگی ہے جس کا میدان مطالعہ بہت ہی وسیع ہے اور اللہ کی تمام مخلوقات میں سے زیادہ دلکش چیز اس دنیا کی زندہ مخلوق ہے۔"

"ذرا پودے کو دیکھئے' یہ نہایت ہی چھوٹا پودا ہے۔ یہ راستے کے ایک کنارے پر اگا ہوا ہے۔ کیا آپ بے شمار انسانی مصنوعات و آلات میں سے کسی چیز کو اس کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ یہ ایک زندہ آلہ ہے اور مسلسل رات دن چلتا رہتا ہے۔ اس کے اندر ہزاروں کیمیاوی عمل اور ردعمل واقعہ ہوتے رہتے ہیں' طبعی تغیرات ہوتے ہیں اور پروٹو پلازم کے تحت ہوتے ہیں۔ یہ وہ مادہ ہے جو تمام زندہ کائنات کی ترکیب میں داخل ہوتا ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ یہ زندہ اور پیچیدہ آلہ کہاں سے آگیا؟ اسے اللہ نے صرف اس کو اس شکل میں نہیں بنایا بلکہ اللہ نے پوری زندگی کو بھی تخلیق کیا ہے اور اسے اپنے تحفظ کی قوت بھی دی ہے۔ وہ اس زندگی کو تسلسل بھی بخشتا ہے اور اس نے اس کے اندر وہ تمام خواص رکھے ہیں اور تمام خصوصی صفات اس کے اندر ودیعت کیں ہیں جن کی وجہ سے ہم ایک

پودے اور دوسرے پودے کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ زندہ اشیاء میں اس عظیم کثرت کا مطالعہ بھی ایک عظیم اور دلچسپ موضوع ہے اور اس سے قدرت کی طاقت کی بوقلمونیوں کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ خلیہ جس کے ذریعے نسل کشی ہوتی ہے اور ایک نیا پودا وجود میں آتا ہے اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ صرف مائیکروسکوپ سے نظر آتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس پودے کے خواص 'ہررگ' ہرریشہ' ہرشاخ اور ہرتنا' ہرجڑ اور ہرچھوٹا ریشہ' ایسے انجینئروں کی زیرنگرانی سرانجام پاتا ہے کہ یہ تمام نقوش اس چھوٹے سے خلیہ کے اندر موجود ہوتے ہیں اور اس کے اندر موجود رہتے ہیں۔ یہ انجینئر کون ہوتے ہیں؟ یہ کرو موسوم ہوتے ہیں۔"

میں سمجھتا ہوں کہ اس قدر حوالے کافی ہیں اب پھر ہم دوبارہ اس حسن ادا کی طرف لوٹتے ہیں جو قرآن کریم کی عبارت میں موجود ہے۔

(ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ (٦ : ١٠٢)) یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ تمہارا رب ہے۔" جو اس معجزۂ حیات کا موجد ہے اور اس معجزے کا ظہور تسلسل سے ہو رہا ہے لیکن راز حیات کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔ یہ ہے اللہ تمہارا رب اور وہی ان بات کا مستحق ہے کہ تم لوگ اس کے حلقہ بگوش بنو۔ اس کے ساتھ خشوع و خضوع کرو اور اس کے احکام کا اتباع کرو۔

(فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (٦ : ٩٥)) پھر تم کدھر بہکے چلے جا رہے ہو؟" تم اس سچائی سے صرف نظر کر کے دوسری راہوں پر چل رہے ہو حالانکہ یہ راہ حق ہے' عقلی طور پر واضح ہے' دل لگتی بات ہے اور چشم بصیرت کے لئے تشفی ہے۔

یہ معجزہ یعنی مردے سے زندہ کو نکالنا' قرآن نے اس کا ذکر بار بار کیا ہے اور اس حقیقت کو بھی قرآن نے بار بار دہرایا ہے کہ اللہ نے اس کائنات کو سب سے پہلے پیدا کیا ہے۔ ان حقائق کا ذکر اس ضمن میں کیا گیا جہاں مقام الوہیت کی حقیقت کا ذکر آیا ہے اور جہاں ان آثار کا ذکر کیا گیا ہے جو بتلاتے ہیں کہ خالق کائنات وحدہ لاشریک ہے۔ یہ اس لئے کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ خالق کائنات ایک ہے اور اسی وحدہ لاشریک کی بندگی کی ضرورت ہے۔ عقیدہ و نظریہ میں بھی وحدہ لاشریک کو مانا جائے اور ربوبیت بھی اسی وحدہ لاشریک کی تسلیم کی جائے۔ مراسم عبودیت بھی اسی کے سامنے بجا لائے جائیں اور زندگی کے قوانین اور ضوابط بھی اسی کے احکام سے اخذ کئے جائیں۔ صرف اسی کے نافذ کردہ قانونی نظام یعنی شریعت کی پابندی کی جائے۔

(اس مصنف نے اس مقالے میں برٹرینڈرسل کے اس نظریے کی تردید کی ہے کہ زندگی اتفاق کے طور پر وجود میں آتی ہے اور اتفاقاً چلی جاتی ہے۔)

قرآن کریم میں ان باتوں کا ذکر محض لاہوتی فلسفیانہ انداز میں نہیں کیا جاتا۔ یہ دین تو بہت ہی معقول اور سنجیدہ دین ہے اور لوگوں کا وقت لاہوتی مباحث اور فلسفیانہ موشگافیوں میں ضائع نہیں کرتا۔ دین اسلام کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں کے تصور حیات کو درست کیا جائے اور انہیں صحیح افکار اور صحیح عقائد دیئے جائیں تاکہ ان کی ظاہری اور باطنی زندگی درست ہو سکے۔ لوگوں کی زندگی کی اصلاح صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ وہ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کی طرف لوٹ

جائیں اور اپنے جیسے انسانوں کی غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکیں۔ جب تک کہ وہ اپنی پوری زندگی میں اللہ کی اطاعت اختیار نہ کرلیں اور روز مرہ کی زندگی میں اللہ وحدہ کی شریعت کو نہ اپنالیں ۔حیات کے بارے میں ان کا عقیدہ اور نظریہ درست نہیں ہوسکتا۔ ان کی زندگی میں ایسے لوگوں کا اقتدار نہ ہو جو زبردستی ان پر مسلط ہوگئے ہوں' جو بالفاظ دیگر حق الوہیت کے دعویدار ہیں اور لوگوں کی زندگیوں پر اللہ کے حق حاکمیت کے بجائے وہ خود اپنا حق استعمال کرتے ہیں۔ یوں وہ اس دنیا کے جھوٹے خداؤں میں شامل ہوگئے ہیں انہوں نے لوگوں کی حیات دنیوی میں بگاڑ پیدا کر دیا ہے اور یہ فساد محض اس لئے ہے کہ لوگ اللہ کے سوا کسی اور کی اطاعت کرنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان باتوں پر تعقیب یہ آتی ہے۔

(ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۶:۹۵)) یہ سارے کام تو اللہ تمہارے رب کے ہیں پھر تم کدھر بہکے جا رہے ہو؟" تمہاری زندگی میں ربوبیت یعنی مکمل اطاعت کا مستحق تو وہی ہے۔ رب کا مفہوم ہے مربی' جس کی طرف انسان متوجہ ہو' جو سردار اور حاکم ہو' اپنے ان مفہومات کے ساتھ اللہ کے سوا کوئی اور رب نہیں ہے۔

(لفظ رب کی توضیح کے لئے دیکھئے امیر جماعت اسلامی پاکستان کی کتاب المصطلحات الاربعہ فی القرآن)

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَ جَعَلَ الَّیْلَ سَكَنًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۹۶﴾

"پردۂ شب کو چاک کر کے وہی صبح نکالتا ہے۔ اسی نے رات کو سکون کا وقت بنایا ہے۔ اسی نے چاند اور سورج کے طلوع و غروب کا حساب مقرر کیا ہے۔ یہ سب اسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھہرائے ہوئے اندازے ہیں۔"

دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے۔ پردۂ شب کو چاک کر کے وہی صبح کو نکالتا ہے' وہی ہے جس نے سکون کے لئے رات بنائی ہے' اور وہی ہے جس نے چاند ستاروں کی گردش کے لئے صحیح اوقات مقرر کئے ہیں۔ ان کی گردش کے لئے ایک مقرر نظام تجویز کیا ہے اور اس نظام کو اس قدر مؤثر اور کنٹرول میں رکھا ہے جس سے اس کے مکمل قبضے کا ثبوت ملتا ہے اور جس سے اس کے وسیع اور محیط علم کا ثبوت ملتا ہے۔

رات کی تاریکیوں سے سپیدۂ صبح نکالنا ایک ایسا ہی عمل ہے جس طرح گٹھلی اور دانے کو پھاڑ کر اس سے پودا اور درخت نکالا جاتا ہے۔ ایک حرکت میں صبح کی روشنی نمودار ہوتی ہے۔ اور دوسری حرکت میں پودے کی سوئی برآمد ہوتی ہے۔ ان دونوں مثالوں میں وجہ تشبیہ یہ ہے کہ دونوں میں حرکت' زندگی خوبصورتی اور جمال ہے جبکہ دونوں حقیقتیں اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک جیسی بھی ہیں۔

گٹھلی اور دانے کو پھاڑ کر اس سے پودوں کا اخراج جبکہ پہلے یہ جامد تھے اور رات کی تاریکیوں سے اور سکون سے صبح کی روشنی نکالنا یہ بھی وجہ مماثلت ہے۔ گٹھلی اور رات دونوں کے اندر سکون موجود ہے۔ اس کائنات میں صبح و شام اور وقت و سکون کا موجودہ نظام زندگی اور ہر چیز کے اگنے اور بڑھنے سے خاص تعلق رکھتا ہے۔

زمین کا اپنے محور کے گرد گھومنا' اور سورج کے سامنے ایک فاصلے اور متعین فاصلے پر رہنا' چاند کا موجودہ حجم اور

موجودہ فاصلے پر رہنا اور سورج کا موجودہ حجم' موجودہ فاصلہ اور موجودہ درجہ حرارت' یہ وہ اندازے اور تقدیرات ہیں جن کی وجہ سے اس کرۂ ارض پر زندگی ممکن ہو سکی ہے اور انہی اندازوں اور تدابیر تکوینی کی وجہ سے انسانی اور نباتاتی زندگی ممکن ہو سکتی ہے۔ انہی کی وجہ سے گٹھلی اور دانے کو پھاڑ کر نباتات اگ سکے ہیں۔

یہ ایک کائنات ہے جسے دقیق حسابی اور ریاضی اصولوں پر استوار کیا گیا ہے۔ اس کے اندر ہر قسم کے ذی حیات کی زندگی کا بھی پہلے سے حساب موجود ہے۔ اس زندگی کا مقام اور اس کی نوعیت ایک ایسی کائنات ہے جس کے اندر بخت و اتفاق کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ نیز یہاں اس نظریے کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ یہاں وجود بخت و اتفاق سے ہے لیکن اس بخت و اتفاق کے لئے حساب و کتاب اور ضابطہ مقرر ہے۔

جو لوگ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ زندگی اس کائنات میں جاری ہے لیکن اس کائنات کو زندگی کے ساتھ کوئی ہم آہنگی نہیں ہے بلکہ کائنات زندگی کی مخالف اور دشمن ہے۔ یہ چھوٹا سا سیارہ یعنی کرۂ ارض جس کے اوپر یہ زندگی موجود ہے' بتا رہا ہے کہ وہ اس زندگی کا مخالف ہے۔ ایسے لوگوں میں بعض تو یہ کہتے ہیں کہ اگر اس کائنات کا کوئی الٰہ ہوتا تو وہ اس چھوٹے سے کرۂ ارض اور اس پر موجود زندگی کے جھمیلوں میں نہ پڑتا اور اس قسم کے دوسرے خرافات یہ لوگ بکتے ہیں۔ کبھی اسے علم اور سائنس کا نام دیتے ہیں' کبھی اسے فلسفہ کہتے ہیں اور یہ خرافات ایسے ہیں کہ ان کی طرف کسی سنجیدہ نگاہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

یہ لوگ اپنی ان خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں جو ان کے نفوس پر حاوی ہیں اور ان سائنسی نتائج کو بھی تسلیم نہیں کرتے جن کا استخراج خود انہوں نے کیا ہے۔ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے دین میں جو فیصلے کر لئے وہ ان کے خلاف کسی واضح ترین حقیقت کا سامنا کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ وہ اپنے فیصلوں کو سینے سے لگا کر بھاگ رہے ہیں۔ وہ لوگ ذات باری سے بھاگ رہے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی وحدانیت کے دلائل ان کے سامنے منکشف کرتے چلے جاتے ہیں اور اس کی قدرت کے نظارے ہر طرف عام ہیں اور دعوت نظارہ دے رہے ہیں' وہ ذات باری سے فرار کرتے ہوئے جو راہ بھی لیتے ہیں اس کے آخری سرے پر ذات باری پھر کھڑی ہوتی ہے۔ یوں وہ پریشان ہو کر دوسری گلی سے بھاگتے ہیں لیکن وہاں بھی انہیں ذات باری کی حقیقت کبریٰ نظر آتی ہے۔

یہ علمی اور عقلی دونوں لحاظ سے یتیم ہیں' علمی لحاظ سے تہی دامن ہیں اور نہایت ہی بدبخت ہیں۔ یہ لوگ کینسہ اور اس کے الٰہ سے بہت پہلے بھاگے تھے' اس لئے کہ کینسہ نے انہیں اپنا غلام بنا لیا تھا۔ وہ اس طرح بھاگے تھے جس طرح کسی شیر کی آمد پر گدھے بدکتے ہیں اور وہ آج تک بھاگ ہی رہے ہیں۔ اس صدی کے اوائل تک وہ بھاگتے رہے اور آج تک سرپٹ بھاگ رہے ہیں لیکن پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھتے کہ آیا کلیسا اب بھی ان کا پیچھا کر رہا ہے یا نہیں۔ یا خود کلیسا نے اپنا غلط موقف ترک کر دیا ہے یا ابھی تک اسی موقف پر قائم ہے۔ ان لوگوں کا سانس ابھی تک پھولا ہوا ہے لیکن بھاگ رہے ہیں۔

یہ بدبخت خستہ حال لوگ ہیں اور ان کی بدقسمتی یہ ہے کہ انہوں نے سائنس کے میدان میں جو دریافتیں کی ہیں ان کے نتائج ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کہاں تک بھاگتے رہیں گے۔ فرانک ایلن جس کی تحریروں سے اس سے قبل ہم اقتباسات دیکھ آئے ہیں دنیا میں زندگی کی نمود کے بارے میں کہتے ہیں :

"زندگی کے لئے زمین کی سازگاری نے' یہاں زندگی کو مختلف شکلوں میں ترقی دی ہے۔ زندگی کی ان بوقلمونیوں کی

توجیہ سے ہم محض ''اتفاق'' نہیں کر سکتے اور نہ لاادریت سے اس کی کوئی تعبیر کر سکتے ہیں اس لئے کہ یہ زمین ایک کرہ ہے جو ہوا میں معلق ہے۔یہ اپنے ارد گرد چکر لگا رہی ہے۔اس کے نتیجے میں رات اور دن پیدا ہوتے ہیں اور فضاؤں میں یہ زمین سال میں ایک بار سورج کے ارد گرد بھی گھومتی ہے۔اس کے نتیجے میں مختلف موسم آگے پیچھے آتے ہیں اور اس کی وجہ سے ہمارے اس کرے کا زیادہ سے زیادہ حصہ قابل رہائش بن جاتا ہے۔مختلف قسم کے نباتات اُگ آتے ہیں۔اگر یہ زمین ایک ہی جگہ رہتی تو اس قدر اقسام کے نباتات نہ ہوتے۔اس کرۂ ارض کے ارد گرد ایک گیس اوزون کا پردہ ہے جس میں ایسی قسم کی گیسیں پائی جاتی ہیں جو زندگی کے لئے اہم ہیں۔ان گیسوں کا یہ خول بہت بلندی تک گیا ہوا ہے۔''

''یہ گیس اس قدر کثیف ہے کہ آسمانوں سے ہزاروں شہاب جو زمین کی طرف آتے ہیں وہ اس سے ٹکرا کر ٹوٹ جاتے ہیں اور یہ تیس میل ایک سیکنڈ کے حساب سے ٹوٹتے ہیں۔ان گیسوں کا خول اس کرۂ ارض کے درجہ حرارت کو بھی کنٹرول کرتا ہے اور اسے زندگی کے لئے مناسب حدود میں رکھتا ہے۔ان گیسوں کی وجہ سے آبی بخارات فضاؤں میں دور تک چلے جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بارش میں بدل کر زمین کو موت کے بعد دوبارہ زندہ کر دیتے ہیں۔بارش کی وجہ سے ہمیں میٹھا پانی ملتا ہے' اور اگر بارشیں نہ ہوتیں تو یہ زمین ایک چٹیل میدان ہوتی اور اس میں کوئی اگنے والی چیز یا دوسری حیوانی زندگی کا کوئی نام و نشان نہ ہوتا۔اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فضا اور سطح زمین کے گرد دوسرے خول نظام طبیعی کے اندر ایک توازن پیدا کرتے ہیں۔''

غرض اب ایسے علمی اور سائنسی دلائل کا انبار لگ گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر آثار حیات اور اقسام حیات کی کوئی تعبیر دل لگتی تعبیر نہیں کی جا سکتی۔اس زندگی کے آغاز' نشوونما اور اس کے قیام دوام کے لئے جو عوامل کارفرما ہیں وہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ کائنات ایک منصوبے کے تحت وجود میں آئی ہے۔ان دلائل میں سے بعض وہ ہیں جن کا ذکر علم طبیعیات کے مذکورہ بالا ماہرین نے کیا ہے۔ان کے علاوہ بھی بے شمار آثار و دلائل ہیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔اور یہ اللہ ہی کی ذات ہے۔

(اَلَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی) جس نے زندگی دی اور پھر ہدایت دی اور جس نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا لیکن اندازے اور منصوبے کے ساتھ۔''

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۹۷﴾

اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا۔دیکھو ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔''

یہ نظام فلکی کے منظر کا تتمہ ہے' جس کے اندر سورج' چاند اور ستارے سرگرداں ہیں اور یہ پوری کائنات کے منظر کا حصہ ہے جو نہایت ہی وسیع' نہایت ہی حیران کن ہے اور جس کی تمام حرکات و سکنات انسانی زندگی اور اس کے مفادات اور

ضروریات کے ساتھ وابستہ ہیں۔

(لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (۶:۹۷)) تاکہ تم ان کے ذریعے صحرا اور سمندروں کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرو۔" صحراؤں اور سمندروں کی دوریوں میں انسان ہمیشہ ستاروں کے ذریعے راستہ معلوم کرتا آیا ہے اور آج بھی وہی نظام ہے۔ اصول وہی ہیں اگرچہ دور جدید کے انکشافات کی وجہ سے وسائل بدل گئے ہیں۔ سمندری سفر کے لئے جدید آلات تیار ہو گئے ہیں لیکن اصل الاصول یہی ہے ان سفروں میں قطب شمالی اور ستاروں سے ہدایت لی جاتی ہے۔ ظلمات البر والبحر میں حسی اور حقیقی اندھیرا بھی شامل ہے اور فکری اور تصوراتی اندھیرا بھی۔ لہٰذا نص قرآن جس طرح آج سے صدیوں پہلے بامقصد تھی اسی طرح آج بھی بامقصد اور بامصداق ہے۔ آج کی بحری زندگی بھی اسی اصول کے مطابق ہے۔ آج بھی قرآن انسانوں سے اسی طرح مخاطب ہے جس طرح آج سے پہلے تھا حالانکہ آج کے دور میں انسانی انفس اور آفاق میں اللہ نے انسان کو وسیع علم سے نوازا ہے لیکن آج بھی ہماری بحری سفری زندگی اسی آیت کی مصداق ہے۔

قرآن آج بھی فطری انداز میں انسانوں کو خطاب کرتا ہے اور تکوینی حقائق ان کے سامنے رکھتا ہے۔ محض نظریاتی بنیادوں پر خطاب نہیں کرتا بلکہ "واقعی" صورت انسان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو آج تک قائم ہے۔ اس صورت میں خطاب کے نتیجے میں صانع کائنات کی کارفرمائی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اللہ کی تقدیر اس کی تدبیر اور اس کی شان رحیمی عقل و نظر سے بالکل روشن نظر آتی ہے۔ انسان بصیرت حاصل کرتا ہے' اس کے ادراک کو جلا ملتی ہے اور وہ کائنات پر تدبر بھی کرتا ہے۔ اس سے نصیحت بھی حاصل کرتا ہے اور اپنے علم' اپنی معرفت اور ترقی کو اس کائنات میں کارفرما حقیقت کبریٰ کے ادراک کے لئے استعمال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حقیقت انسان کے سامنے رکھنے کے بعد کہ اللہ بحر و بر کے اندھیروں میں ان کی راہنمائی کا انتظام کرتا ہے یہ تعقیب آتی ہے۔

(قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (۶:۹۷)) دیکھو ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں' ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔" اس لئے کہ صحرا کی پہنائیوں اور سمندر کی تاریکیوں میں ستاروں سے ہدایت تب ہی لی جا سکتی ہے جب انسان کو ستاروں کے مداروں' ان کے دوروں اور مختلف اوقات میں ان کے مواقع کے بارے میں علم حاصل ہو اور معنوی اندھیروں میں ہدایت وہ لوگ لے سکتے ہیں جنہیں علم ہو کہ یہ کائنات صانع حکیم کی بنائی ہوئی ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا یہاں ہدایت سے مراد دونوں قسم کی ہدایات ہیں' حسی اور بحری سفر کی ہدایات بھی اور معنوی اور گمراہی قلب و نظر کی ہدایات بھی۔ وہ لوگ جو ستاروں کو حسی رہبری کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس رہبری سے اپنے خالق تک پہنچنے کی ہدایت و بصیرت اخذ نہیں کرتے وہ گویا علم سے محروم ہیں کیونکہ انہوں نے ان چیزوں سے جھوٹی اور حقیر ہدایت تو لی لیکن ہدایت کبریٰ اخذ نہ کی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس کائنات کا تعلق رب کائنات سے کاٹنا چاہتے ہیں اور اس کائنات کے ان دلائل سے وہ ہدایت اخذ نہیں کرتے جو مبدع عظیم پر دال ہیں۔ صدق اللہ العظیم۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ ۝۹۸

”اور وہی ہے جس نے ایک جان سے تم کو پیدا کیا۔ پھر ہر ایک کے لئے ایک جائے قرار ہے اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ۔ یہ نشانیاں ہم نے واضح کر دی ہیں ان لوگوں کے لئے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔“

اب یہ چٹکی براہ راست ہے' اور یہ نجِ نفس انسانی اور ذلت انسانی کو دیا جاتا ہے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے انسان ایک ہی نفس سے پیدا کئے گئے ہیں کیونکہ مرد اور عورت اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ لہٰذا پوری بشریت ایک حقیقت واحدہ ہے۔ مرد و عورت کے درمیان زندگی کا آغاز تناسل کے خلیہ سے شروع ہوتا ہے۔ مثلاً خلیہ جب صلب پدر میں ہوتا ہے تو وہ جائے قرار میں ہوتا ہے۔ جب وہی خلیہ رحم مادر میں جاتا ہے تو وہ اس کے لئے سپردگی کی جگہ ہے اس کے بعد زندگی بڑھتی ہے اور پھیل جاتی ہے اور مختلف نسلوں اور رنگوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ مختلف گروہوں اور زبانوں میں بٹ جاتی ہے۔ مختلف اقوام و قبائل میں تقسیم ہو جاتی ہے اور اس زندگی کے اس قدر نمونے بن جاتے ہیں جن کا گننا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر زندگی کے اس قدر کلچر وجود میں آجاتے ہیں کہ جب تک زندگی موجود رہے گی آتے رہیں گے۔

(نفس واحدہ سے مراد میں نے نفس انسانیت لیا ہے اس لئے کہ مجھے اس بارے میں قابل اعتماد حدیث نہیں ملی کہ حوا کو آدم سے پیدا کیا گیا۔)

(قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (٦:٩٨)) یہ نشانیاں ہم نے واضح کر دی ہیں ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔“ یہاں فقیہ وہ شخص ہو گا' جو اس نفس انسانی کی تخلیق کے بارے میں اللہ کی کاریگری کا ادراک رکھتا ہو اور پھر اس بات میں مہارت رکھتا ہو کہ ایک انسان آگے جا کر کن کن کلچروں اور نمونوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور یوں انسان ایک نفس کو بذریعہ نسل آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ اس عمل سے بے شمار مرد اور عورتیں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور انسانی آبادی بڑھتی رہتی ہے۔ یہ تمام کام اللہ کی اس حکمت کے نتیجے میں پورا ہوتا ہے جسے اس نے نظام زوجیت کے ذریعے فرض قرار دیا۔ جس کے ذریعے آبادی بڑھتی ہے' بچوں کی نشوونما دائرہ انسانیت کے اندر ہوتی ہے اور وہ آئندہ زندگی میں وظیفہ انسانیت ادا کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

ہم یہاں ظلال القرآن میں اس موضوع کی پوری تفصیلات نہیں دے سکتے جس سے انسانیت کے دونوں اصناف کے درمیان تمام تعلقات کو زیر بحث لا سکیں۔ اس کے لئے تو علیحدہ ایک کتاب کی ضرورت ہے۔

(دیکھئے کتاب خصائص التصور الاسلامی میں بحث حقیقۃ الحیاۃ)

لیکن یہاں اس قدر تذکرے کی بہرحال ضرورت ہے کہ نطفے سے مرد اور عورت کس طرح پیدا ہو جاتے ہیں اور کس طرح ایک غیبانی قوت اور قدرت الٰہی مرد اور عورتوں کی تعداد کو برابر رکھتی ہے تاکہ آئندہ نسل کشی کے لئے اور سلسلہ توالد و تکاثر کو جاری رکھنے کے لئے مناسب انتظام ہو۔ اس سے قبل ہم نے آیت۔

(وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ (٦:٥٩)) کی تفسیر میں کہا تھا کہ مرد کے مادہ منویہ کے اندر جو کروموسوم ہوتے ہیں اور جب ان کا التقاء عورت کے انڈے کے ساتھ ہوتا ہے تو اس وقت صرف تقدیر الٰہی ہوتی ہے جو مذکر کروموسوم کو مؤنث کروموسوم پر ترجیح دیتی ہے یا اس کے برعکس فیصلہ کرتی ہے اور یہ ترجیح از جانب تقدیر الٰہی غیبِ الٰہی ہے۔ اس معاملے میں کسی انسان کو کوئی اختیار نہیں ہے۔

یہ تقدیر فیصلہ کرتی ہے اور کسی کو لڑکا عطا ہوتا ہے اور کسی کو لڑکی - یہ تقدیر تمام روئے زمین پر مردوں اور عورتوں کی تعداد کے اندر مطلوب توازن کو برقرار رکھتی ہے کہ کس قدر مرد درکار ہیں اور کس قدر عورتیں - چنانچہ آج تک پوری انسانیت کی سطح پر اس توازن کے اندر کوئی فرق نہیں پڑا اور اس توازن کے ذریعے سلسلہ توالد و تکاثر آج تک جاری و ساری ہے - یہ درست ہے کہ اگر مرد کم ہوں تو بھی توالد و تکاثر کا سلسلہ جاری رہ سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اسکیم کا مطلب فقط یہ تھا کہ انسانوں کے درمیان نہ صرف نسل کشی کا انتظام کر دیا جائے بلکہ ساتھ یہ بھی مطلوب تھا کہ حیوانی سطح سے اوپر جاکر انسان کی ازدواجی زندگی میں توازن اور استحکام پیدا ہو 'کیونکہ اس استحکام کے بغیر مقاصد انسانیت کی تکمیل ممکن نہ ہوتی - ان میں سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ ماں باپ کی پرورش کے بغیر بچوں کی تربیت اسلامی خطوط پر ممکن نہ تھی یعنی ایک خاندان کی خوشگوار فضا کے اندر تاکہ یہ بچے آئندہ زندگی میں اپنا انسانی کردار ادا کر سکیں - صرف یہ نہ ہو کہ بچے ایک حیوان کی طرح مادی زندگی کے لحاظ سے بلوغ تک پہنچ جائیں - انسانی کردار یہ بچے تب ہی ادا کر سکتے ہیں جب یہ ایک پر سکون خاندانی زندگی میں ماں اور باپ دونوں کی پرورش میں ایک طویل عرصے تک رہیں کیونکہ انسانی بچہ حیوانات کے مقابلے میں ایک طویل عرصے تک بچپن میں ہوتا ہے اور محتاج ہوتا ہے -

مرد اور عورتوں کی تعداد کے درمیان یہ توازن اس بات پر کافی وشافی دلیل ہے کہ اس کائنات میں خالق کائنات کی تدبیر 'حکمت اور اس کی تقدیر کس طرح ہروقت کارفرما ہے لیکن یہ دلیل اور نشانی صرف ان لوگوں کیلئے ہے جو فقیہ ہیں (لقوم یفقھو ن) - رہے وہ لوگ جو اندھے ہیں اور حقیقت ان کی نظروں سے اوجھل ہے تو ان کی نابینائی کا کوئی علاج نہیں ہے - ان کے سرخیل وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو سائنس دان کہتے ہیں اور کسی غیبی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں بلکہ وہ عالم الغیب تسلیم کرنے والوں کے ساتھ مذاق کرتے ہیں تو ایسے لوگ ان آیات الٰہیہ کو اس طرح پڑھ کر گزر جاتے ہیں جس طرح اندھے گزر جاتے ہیں - ان لوگوں کی نظروں سے حقیقت اوجھل رہتی ہے اور ان کی حالت یہ ہوتی ہے -

(وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِھَا) وہ جو نشانی بھی دیکھیں 'اس پر ایمان نہیں لاتے -

---ooo---

اب اگلی آیت میں اس زندگی کا منظر سامنے لایا جاتا ہے جو اس کرۂ ارض پر ہر طرف نظر آتی ہے اور آنکھیں ہرروز اسے دیکھتی ہیں - حواس کے دائرے کے اندر سے اور اس کو دیکھ کر دل و دماغ اس کے بارے میں سوچتے بھی ہیں - ہمارے ادراک کو اس میں اللہ کی تخلیق اور کاریگری صاف صاف نظر بھی آتی ہے - کلام الٰہی اسے اسی طرح پیش کرتا ہے جس طرح یہ چیزیں نظر آتی ہیں اور ان کے مختلف رنگ اور مختلف مناظر پیش کر کے ذرا نظروں کو ان کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے 'مختلف شکلیں اور مختلف قسمیں سامنے لائی جاتی ہیں ' انسانی وجدان کو بتایا جاتا ہے کہ زندگی کی نشوونما کو دیکھے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ قدرت نے کیسی کیسی چیزیں پیدا کی ہیں - قلب انسانی کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ اس نظام کی خوبصورتی کو بھی ذرا دیکھے اور لطف اندوز ہو -

وَھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا

مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

''اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا' پھر اس کے ذریعے سے ہر قسم کی نباتات اگائی' پھر اس سے ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کئے' پھر ان سے تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کئے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں' اور انگور' زیتون اور انار کے باغ اگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور پھر ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا بھی ہیں۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو' ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔''

قرآن کریم میں جب بھی حیاتیات اور نباتات کا ذکر ہوتا ہے اس دوران پانی کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے۔

(وَهُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ (٦ : ٩٩)) اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا' پھر اس کے ذریعے سے ہر قسم کی نباتات اگائی۔'' ہر چیز کی پیدائش میں پانی کا جو کردار ہے وہ بالکل ظاہر ہے اور اس کے بارے میں ایک پسماندہ اور ترقی یافتہ انسان دونوں یکساں طور پر جانتے ہیں۔ عالم اور جاہل دونوں جانتے ہیں لیکن قرآن کریم نے ظاہری طور پر عوام کے لئے جو کچھ کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کی تخلیق میں پانی کا کردار کہیں زیادہ ہے۔ مثلاً سطح زمین پر مٹی کی فراہمی پانیوں کی مرہون منت ہے۔ یہ بات میں ان نظریات کی اساس پر کہہ رہا ہوں جو اس وقت سطح زمین کے بارے میں معروف ہیں۔ (اگر وہ درست ہوں) مثلاً یہ کہ ابتداء میں سطح زمین آگ کا گولہ تھی' اس کے بعد وہ سخت ہوگئی' اس قدر سخت کہ سطح زمین پر نباتات اگنے کے لئے کوئی مٹی نہ تھی' اس کے بعد فضائی عوامل اور پانی کی وجہ سے سطح زمین پر مٹی جمع ہونا شروع ہوئی اور اس کے بعد اس زمین کو تروتازہ اور سرسبز رکھنے کے لئے پانی اہم کردار ادا کرتا رہا۔ اس کے بعد آسمانوں میں بجلیوں کی چمک کی وجہ سے برف اور بارشوں کے ساتھ ایسی نائٹروجن گرتی رہی جو پانیوں میں تحلیل ہو سکتی تھی اور اس طرح زمین کے اندر روئیدگی شروع ہوگئی۔ یہ وہ کھاد ہے' جسے آج انسان انہیں قوانین قدرت کے اصول کو اپنا کر بنا رہے ہیں اور یہ وہ مادہ ہے کہ اگر روئے زمین اس سے خالی ہو جائے تو زمین کے اوپر کوئی تروتازگی نہ رہے گی۔

(فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ (٦ : ٩٩)) پھر اس سے ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کئے' پھر ان سے تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے

پھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کئے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں' اور انگور' زیتون اور انار کے باغ اگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور پھر ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا بھی ہیں۔" ہر پودا جب اگتا ہے تو وہ سبز ہوتا ہے اور خضر کا لفظ اخضر سے زیادہ لطیف ہے اور زیادہ پسندیدہ ہے۔ یہ ہرا پودا تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے دیتا ہے۔ مثلاً خوشے وغیرہ۔ اور کھجور کے درخت کے اوپر چھوٹی چھوٹی شاخیں نکلتی ہیں۔ (قنو۔ جمع قنوان) یعنی وہ شاخ جس پر کھجوریں لگتی ہیں۔ پھر (قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ (٦: ٩٩)) شاخیں جھکی ہوئی بھی ایک نہایت ہی دل پسند اور لطیف ترکیب ہے۔ یہ پورا منظر یوں نظر آتا ہے کہ گویا ہرے بھرے کھیتوں اور باغ کی گھنی چھاؤں کے درمیان انسان سیر کر رہا ہو جس میں انگوروں کے باغ اور زیتون کے باغات ہیں۔ یہ نباتات اپنی مختلف اقسام اور خاندانوں کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ ملتے جلتے بھی ہیں اور علیحدہ خصوصیات کے بھی مالک ہے۔

(اُنْظُرُوْا اِلٰى ثَمَرِهٖ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ (٦: ٩٩)) یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو"۔

تیز احساس اور بیدار دل کے ساتھ ان کی طرف دیکھو' یہ کس قدر تر و تازہ ہیں اور جس وقت یہ پکتے ہیں تو کس قدر خوبصورت نظر آتے ہیں۔ دیکھو اور ان خوبصورت مناظر کو دیکھ کر لطف حاصل کرو۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ تم ان کے پھلوں کو کھاؤ جب وہ پھل دے دیں بلکہ یہ کہا کہ تم غور کی نظر سے دیکھو کہ کس طرح پھل لگتا ہے اور کس خوبصورتی کے ساتھ پکتا ہے اس لئے کہ یہاں خوبصورتی کے اظہار کا اور دعوت نظارہ کا مقام ہے۔ پھر ان مناظر کا گہری نظر سے مطالعہ کرکے اللہ کی نشانیوں پر غور کرنے کا مقام ہے۔ نیز اللہ کی کاریگری اور اس کی صنعت کاریوں پر فکر و تدبر کا مقام ہے۔

(اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (٦: ٩٩)) ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔" ایمان ہی وہ نعمت ہے جس سے دل کھل جاتا ہے اور جس کے ذریعے بصیرت روشن ہوتی ہے اور فطرت میں کسی حقیقت کو قبولیت اور تسلیم کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ اجاگر ہو جاتی ہے۔ ذات انسانی کا ربط اس کائنات کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے اور انسان کا وجدان اس پوری کائنات کے خالق اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے ورنہ بعض دل ایسے ہوتے ہیں جو بند ہوتے ہیں اور بعض لوگوں کی بصیرت تاریک ہو جاتی ہے۔ ان کی فطرت کا رخ الٹے پاؤں کی طرف ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی ان کاریگریوں اور صنعت کاریوں کو دیکھتے ہیں۔ ان تمام آیات و دلائل کو دیکھتے ہیں لیکن انہیں کوئی احساس نہیں ہوتا اور نہ وہ سچائی کو قبول کرتے ہیں۔

(اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ) قبول تو وہ لوگ کرتے ہیں جو سنتے ہیں۔" اور ان آیات و نشانات کو صرف وہ لوگ پاتے ہیں جو صاحب ایمان ہوں۔

---○○○---

جب بات یہاں تک پہنچتی ہے تو انسان کے قلب و نظر کے سامنے اس پوری کائنات کی کتاب کو پیش کر دیا جاتا ہے جو اللہ کے وجود کے دلائل' اس کی وحدانیت' اس کی قدرت اور اس کی تدبیر کے مختلف مظاہر سے بھری پڑی ہے اور

انسانی وجدان کو اس کائنات کے پرتو نے اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ انسانی ضمیر نے انسانی زندگی کو بدل کر رکھ دیا اور انسانی ضمیر اللہ کی حکیمانہ صنعت و خلاقی کا اعتراف کرنے لگا۔ جب بات اس مقام پر پہنچ گئی تو اب مشرکین کے افعال شرکیہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں کہ شرک انسان کو غیر مانوس اور انوکھا لگتا ہے اور معرفت کردگار کی اس فضا میں اور اعتراف مبدع خلائق کے ان تصورات میں جب مشرکین کے افکار و ہمیہ کو پیش کیا جاتا ہے تو وہ بالکل پوچ اور بے بنیاد نظر آتے ہیں اور ایک سلیم الفطرت انسان کا مزاج ان سے ابا کرتا ہے۔ انسانی فہم و ادراک اور انسانی عقل اسے مسترد کر دیتی ہے اور فوراً ان شرکیہ تصورات پر تنقید کی جاتی ہے اور اس انکار اور تنبیہ کے لئے فضا بالکل تیار ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ ۱۲
عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ ع ۶
لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ ۱۸
عَلِيْمٌ ۝

"اس پر بھی لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرالیا' حالانکہ وہ ان کا خالق ہے' اور بے جانے بوجھے اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں تصنیف کر دیں' حالانکہ وہ پاک اور بالا تر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے۔ جب کہ کوئی اس کی شریک زندگی ہی نہیں ہے۔ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔"

عرب کے بعض مشرکین جنوں کی عبادت کرتے تھے' لیکن ان کو علم نہیں تھا کہ جن ہیں کیا۔ البتہ یہ انہیں ایک وہمی سی مخلوق سمجھتے تھے اور یہ بتوں کے پیچھے کوئی مخلوق تھی۔ انسان جب ایک بالشت کے برابر بھی عقیدۂ توحید سے ہٹ جائے تو وہ اس قدر ہٹتا چلا جاتا ہے کہ راہ حق سے کوسوں دور ہو جاتا ہے لیکن آخر کار انسان دیکھتا ہے کہ نقطہ آغاز کا انحراف اگرچہ تھوڑا سا اور ناقابل لحاظ تھا لیکن آگے جا کر دونوں راہوں کے درمیان بہت بڑی خلیج واقع ہو جاتی ہے۔ یہ مشرکین مکہ آغاز میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دین پر تھے اور حضرت اسماعیل کا دین وہی دین توحید تھا جسے اس علاقے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیا تھا۔ لیکن یہ لوگ اس عقیدۂ توحید سے انکار کر بیٹھے۔ اگرچہ یہ انحراف آغاز کار میں بہت ہی معمولی ہو گا لیکن وہ بت پرستی کے فعل شنیع پر منتج ہوا اور وہ یہاں تک آپہنچے کہ جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرانے لگے حالانکہ جن اللہ کی مخلوق ہیں۔

(وَ جَعَلُوْا اللّٰہِ شُرَکَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَھُمْ (۶ : ۱۰۰)) اس پر بھی لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا دیا' حالانکہ وہ ان کا خالق ہے۔" دنیا میں جس قدر بت پرست مذاہب گزرے ہیں اور جن کی نوعیت مختلف

جاہلیتوں میں مختلف رہی ہے ان سب میں ایک شریر مخلوق کا تصور رہا ہے اور اس شریر مخلوق کا تصور ایسا ہی رہا ہے جس طرح شیطان کا تصور ہے۔ تمام بت پرست ہمیشہ اس شریر مخلوق سے ڈرتے رہے ہیں۔ چاہے یہ شریر مخلوق ارواح شریرہ ہوں یا اشخاص شریرہ۔ ان بت پرست مذاہب میں یہ رواج رہا ہے کہ وہ اس شریر مخلوق کے شر سے بچنے کے لئے کچھ قربانیاں دیں۔ ہوتے ہوتے یہ شرکیہ مذاہب ان کی پوجا کرنے لگے۔

عرب بت پرستی میں بھی ایسے ہی تصورات پائے جاتے تھے مثلاً وہ جنوں کی پوجا کرتے تھے۔ ان کو اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے حالانکہ اللہ کی ذات ان چیزوں سے پاک ہے۔ قرآن کریم یہاں ان کے ان عقائد کی کمزوری ان کو بتاتا ہے اور بالکل ایک لفظ میں بات کو ختم کر دیتا ہے۔ (خلقھم)۔ اللہ نے تو ان کو خود پیدا کیا۔ یہ ہے تو صرف ایک لفظ لیکن ان کے عقائد کو مذاق بنا دینے کے لئے یہ ایک لفظ ہی کافی ہے۔ جب پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے اور اس نے ان کی تخلیق کی ہے تو اللہ کی مخلوق اس کے ساتھ شریک کیسے ہو جائے گی اور اس مخلوق کو الوہیت اور ربوبیت کے حقوق کیسے حاصل ہو جائیں گے۔

ان لوگوں نے صرف اس دعوے پر ہی اکتفا نہ کیا' کیونکہ بت پرستانہ اوہام جب شروع ہوتے ہیں تو پھر کسی حد پر جا کر نہیں رکتے اور یہ انحراف آگے ہی بڑھتا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اس سے بھی آگے بڑھے اور یہ عقیدہ اختیار کر لیا کہ اللہ کے بیٹے اور بیٹیاں بھی ہیں۔

(وَ خَرَقُوْا لَهُ بَنِيْنَ وَ بَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (٦ : ١٠٠)) اور بے جانے بوجھے اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں تصنیف کر دیں۔" خرقوا کا مفہوم ہے کہ انہوں نے جعلی طور پر یہ عقیدہ تصنیف کر لیا۔ خرقوا کے معنے ہوتے ہیں اپنی جانب سے جھوٹ گھڑنا۔ خرق کے اصل معنی پھاڑنے کے ہیں مثلاً کوئی جھوٹی خبر لے کر آتا ہے۔ یہودیوں کے نزدیک حضرت عزیر ابن اللہ تھے۔ نصاریٰ حضرت مسیح کو ابن اللہ کہتے تھے۔ مشرکین مکہ کے نزدیک ملائکہ اللہ کی بیٹیاں تھیں۔ وہ فرشتوں کو مادہ تصور کرتے تھے لیکن وہ کوئی معقول بات نہ کرتے تھے کہ وہ کیوں مؤنث ہیں۔ کیونکہ جھوٹے دعوے ہمیشہ بغیر علم کے ہوا کرتے ہیں لہٰذا ان لوگوں کے دعوے بھی بغیر علم کے ہیں۔

(سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ (٦ : ١٠٠)) حالانکہ وہ پاک اور بالا تر ہے' ان باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔" اس کے بعد اب اللہ تعالیٰ ان کے ان افتراؤں کے جواب میں اصل حقیقت سامنے لاتے ہیں۔ ان کے غلط تصورات کی تردید فرماتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ ان میں کیا کیا جھول ہے۔

(بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (٦ : ١٠١)) وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کوئی اس کی شریک زندگی ہی نہیں ہے۔ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔ اللہ تو وہ ہے جو اس پوری کائنات کو عدم مطلق سے وجود میں لایا لہٰذا اسے کیا ضرورت ہے کہ وہ کسی کو اپنا خلف تجویز

کرے۔ خلف اور پسماندگان تو اس ذات کے لئے ہوتے ہیں جو فانی ہو۔ اور یا جو کمزور ہو اور اسے امداد کی ضرورت ہو' یا جنہیں دیکھ کر وہ خوش ہو سکے۔

پھر ان لوگوں کو معلوم ہے کہ توالد و تکاثر کا ضابطہ کیا ہوتا ہے۔ کسی شخص کے لئے اس ہی کی جنس سے ایک مادہ جوڑ ہوتا ہے۔ جب اللہ کی بیوی ہی نہیں ہے تو بیٹا کیسے ہو گا اور وہ ان چیزوں سے پاک بھی ہے۔ اس جیسی تو کوئی چیز ہی نہیں ہے لہذا کس طرح ممکن ہے کہ بغیر شادی کے نسل چلے............ یہ تو حقیقت ہے لیکن قرآن کریم اس حقیقت کو ان کے لئے قریب الفہم بنا دیتا ہے اور ان کے ساتھ خطاب میں ان کی فہم کو ملحوظ رکھتا ہے تاکہ وہ اپنے مشاہدات کے رنگ میں بات کو سمجھ سکیں۔

یہاں قرآن کریم ان کی تردید میں صرف حقیقت تخلیق کو پیش کرتا ہے تاکہ شرک کا کوئی سایہ تک باقی نہ رہے۔ یوں کہ کسی صورت میں بھی مخلوق خالق کے ساتھ شریک نہیں بن سکتی۔ کیونکہ خالق اور مخلوق کی حقیقت ہی جدا ہوتی ہے اور دوسری دلیل اللہ یہ دیتے ہیں کہ اللہ ہی حقائق کا علم رکھتا ہے اور ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے۔

(خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (٦:١٠١)) یعنی خلق بھی اس کا ہے اور علم بھی وہی رکھتا ہے۔

---ooo---

جس طرح اس سے قبل قرآن کریم نے مشرکین مکہ کی تردید کرتے ہوئے یہ کہا کہ "اللہ نے ہر چیز کی تخلیق کی ہے۔" اور اس سے ان کے ان تصورات کی تردید کر دی گئی اور بتا دیا گیا کہ اللہ کے بیٹے بیٹیاں کیسے ہو سکتی ہیں جبکہ اللہ کی کوئی شریک زندگی ہی نہیں ہے یا اللہ کا کوئی شریک خود اس کی مخلوق سے کیسے بن سکتا ہے' تو یہاں دوبارہ اللہ کی صفت تخلیق کو لایا جاتا ہے تاکہ یہ بات ثابت کی جاسکے کہ چونکہ وہ خالق ہے' اس لئے وہی معبود ہو گا اور ہمیں چاہئے کہ ہم صرف اسی کی بندگی کریں اور اپنی زندگی میں پورا دین صرف اس کا نافذ کریں اسی لئے کہ خالق وہی ہے۔ اس کے سوا کوئی الہ اور حاکم نہیں ہو سکتا اور نہ ان کا اس کے سوا کوئی رب ہو سکتا ہے.....

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿١٠٢﴾

"یہ ہے اللہ تمہارا رب کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے' ہر چیز کا خالق' لہذا تم اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے۔"

جب یہ بات تسلیم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ وحدہ ہی خالق ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ وہی بادشاہ اور مالک ہے۔ اور جب اللہ ہی خالق اور مالک ہے تو لازماً وہی رازق ہے اس لئے کہ جب وہ خالق ہے اور مالک ہے تو رزق اسی کی ذمہ داری ہے اور یہ رزق وہ اپنی مملکت سے دیتا ہے جس میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ اللہ کی مملکت میں جو کچھ بھی ہے یا جس چیز سے بھی انسان فائدہ اٹھاتے ہیں وہ تمام چیزیں اللہ کی مملوکہ ہیں اور جب تخلیق' ملکیت اور رزق

اللہ کا ہے تو یہ بات حتماً ثابت ہو جاتی ہے کہ رب بھی وہی ہے ۔ لہذا یہ ہر انسان کا فرض ہو گا کہ وہ خصائص ربوبیت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے ۔ ربوبیت کی اہم خصوصیات یہ ہیں' مختار و منتظم ہونا' ہدایت دینا' بادشاہ ہونا اور ایسی پوزیشن میں ہونا کہ اس کی اطاعت کی جائے اور وہ ایک ایسا نظام اور دین دے جس پر لوگ اجتماعی طور پر عمل کریں ۔ (دیکھئے المصطلحات الاربعہ فی القرآن مولانا مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان' مباحث الوہیت' ربوبیت اور عبادت) لہذا ہر قسم کی عبادت و بندگی اور اطاعت اس کی ہوگی جن میں سے اہم خضوع اور سر تسلیم خم کرنا ہے ۔

عرب لوگ اپنے دور جاہلیت میں اس بات کے منکر نہ تھے کہ اللہ اس کائنات کا خالق ہے ۔ وہ لوگوں کا خالق اور رازق ہے اور تمام لوگوں کو اللہ کی ملکیت سے تمام ضروریات زندگی فراہم ہو رہی ہیں ۔ اس کی ملکیت میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں ہے ۔ عربوں کے علاوہ تمام دوسری جاہلیتیں بھی ان حقائق کا انکار نہ کرتی تھیں (ماسوائے یونانی فلاسفہ کی ایک قلیل تعداد کے) اور اس زمانے میں ہمارے دور جدید کے مادی مذاہب نہ تھے جن کی تشہیر و تشریح یونانی دور کے مقابلے میں زیادہ وسیع طور پر ہو رہی ہے ۔ لہذا اسلام کے آغاز کے دور میں اللہ کے ساتھ جن الٰہوں کو شریک کیا جاتا تھا ان کی عبادت اس لئے کی جاتی تھی کہ یہ الٰہ' اللہ حقیقی کے قرب کا سبب اور ذریعہ ہیں ۔ یہ ایک انحراف تھا اور دوسرا انحراف یہ تھا کہ لوگوں کی زندگیوں پر اسلامی نظام حیات کی حکمرانی نہ تھی ۔ اور نہ اس دور میں تحریک اسلامی کو ایسے لوگوں سے سابقہ تھا جو ہمارے دور میں پائے جاتے ہیں جو سرے سے وجود باری کے منکر ہیں اور یہ انکار وہ بغیر علم' بغیر ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے کر رہے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ آج بھی جو لوگ وجود باری کے منکر ہیں یا انکار خدا پر اصرار کرتے ہیں وہ بہت ہی تھوڑے ہیں اور ایسے لوگ ہمیشہ ایک حقیر اقلیت ہی میں رہیں گے ۔ حقیقی گمراہی یہ تھی جس طرح آج ہے کہ لوگ اللہ کے سوا کسی اور سے نظام زندگی اخذ کرتے تھے اور یہی وہ روایاتی شرک تھا جس پر جاہلیت عربیہ قائم تھی اور تمام دوسری جاہلیتیں قائم رہی ہیں ۔

اب جو حقیر اقلیت انکار خدا پر مصر ہے کیا اس کے پاس کوئی علمی دلیل ہے؟ کیا اس کا انکار سائنس پر مبنی ہے؟ اگرچہ اس کا دعویٰ تو ہے لیکن سائنس ان کے اس عقیدے کی تصدیق نہیں کرتی ہے؟ نہ کوئی سائنسی دلیل ہے اور نہ اس کائنات کی طبیعیات میں اس بات پر کوئی دلیل ہے ۔ یہ دراصل وہ انحراف اور بغاوت ہے جو لوگوں نے اہل کلیسا اور ان کے خداؤں کے خلاف اختیار کی ۔ کلیسا کے خدا اس بات پر مصر تھے کہ لوگ کلیسا کے پاس غلام ہوں حالانکہ اصول دین میں سے کوئی اصل ایسا نہ تھا کہ لوگوں کو غلام رکھا جائے ۔ پھر ان مذہبی پیشواؤں کی شخصیت کی فطری نشوونما بھی غلط تھی ۔ وہ انسان کے انسانی وظائف کو معطل کر رہے تھے مثلاً وہ لوگ جنہیں بپتسمہ دے دیا جاتا تھا ۔ (دیکھئے کتاب الخصائص التصور الاسلامی' باب الوہیت اور بندگی) ۔

یہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید میں تخلیق کائنات اور تقدیر نظام کائنات کا ذکر اس لئے نہیں کیا جاتا کہ ان امور سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے وجود پر دلائل قائم کیے جائیں' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے منکرین کا موقف اس قدر بودا تھا کہ قرآن کریم جیسی سنجیدہ کتاب میں اس پر بحث مناسب ہی نہ تھی ۔ خلق اور تقدیر کے حقائق تو قرآن مجید میں اس لئے لائے گئے ہیں کہ لوگ راہ راست پر آ جائیں' وہ اپنے عقائد و اعمال میں اللہ کی الوہیت' اس کی حاکمیت اور اس کی مکمل بندگی کو نافذ کریں اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں ۔ یہی صورت حال حقیقت حیات کی ہے ۔

تعین سائنسی اعتبار سے تخلیق اور دنیا کو ایک نہایت ہی حکیمانہ اندازے کے مطابق پیدا کرنا' اور اس کائنات کے اندر زندگی کی مختلف شکلوں کو پیدا کرنا' ایسے حقائق ہیں جو ان لوگوں کے دلائل کے قلع قمع کرنے کے لئے نہایت ہی کافی و شافی ہیں۔ جو لوگ ذات باری کے وجود کے بارے میں کج بحثی کرتے ہیں وہ ان حقائق کے ہوتے ہوئے وجود باری کے خلاف کوئی قوی دلیل نہیں لا سکتے' ماسوائے اس کے کہ وہ ہٹ دھرمی کریں اور اپنے آپ کو شرمندہ کریں۔

جولیان ہاکسلے نے دو کتابیں لکھی ہیں "انسان اکیلا کھڑا ہے" اور "انسان جدید دنیا میں"۔ یہ شخص ایسے ہی لوگوں میں سے ہے جو اس سلسلے میں نہایت ہی دریدہ دہنی سے کام لیتے ہیں اور ہٹ دھرمی کرتے ہیں۔ یہ شخص ایسی باتیں کرتا ہے جو صرف اس نے دل کی خواہشات ہیں اور ان باتوں پر کوئی علمی اور سائنسی دلیل اس کے پاس نہیں ہے۔ یہ اپنی کتاب "انسان جدید دنیا میں" میں دین کے موضوع پر یہ کلام کرتا ہے :

"ہمیں سائنس کی ترقی' منطق کی ترقی اور علم النفس کی ترقی نے اس مقام تک پہنچا دیا ہے کہ ایسے حالات میں اب اس کائنات کے کسی خدا کو فرض کرنے کا فائدہ نہیں ہے۔ طبیعی علوم نے ہماری عقل سے خدا کو نکال دیا ہے۔ چنانچہ اب وہ اس کائنات کا حاکم اور مدبر نہیں رہا ہے۔ اب یہ خدا اگر ہے تو وہ پہلا سبب (cause) ہے اور ایک مجمل یا ناقابل فہم بنیاد ہے"۔ ول ڈیورانٹ اپنی کتاب "مناہج فلاسفہ" میں لکھتے ہیں :

"فلسفہ بھی خدا کی ذات سے بحث کرتا ہے لیکن فلسفے کا خدا لاہوتی خدا نہیں ہے جسے وہ لوگ عالم طبیعی سے خارج وجود سمجھتے ہیں بلکہ فلاسفہ کا الہ "قانون عالم' اس کا ہیکل' اس کی زندگی اور اس کی مشیت ہے"۔ ہمارے قارئین ایسی باتیں برداشت نہیں کر سکتے لیکن بہرحال یہ باتیں کہی گئی ہیں۔

ہم اپنے مسائل کا فیصلہ نہ قرآن سے کرتے ہیں اور نہ ہی اپنی عقل سے ان کے ان غلط اقوال پر کوئی فیصلہ کرتے ہیں کیونکہ ہماری عقل بھی قرآنی ہدایت سے فیض یاب ہے۔ ہم ان لوگوں کا فیصلہ انہی جیسے سائنس دانوں کی عدالت میں پیش کر دیتے ہیں جنہوں نے اس مسئلے پر ذرا سنجیدگی سے غور کیا ہے۔

جان کلیولانڈ کوتران' مشہور ریاضی دان اور ماہر طبیعیات ہیں۔ انہوں نے جامعہ کورنل سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی اور ایک دوسری یونیورسٹی میں طبیعیات کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ہیں۔ یہ شخص اپنے ایک مقالے میں جو "حتمی نتیجہ" کے عنوان سے کتاب "اللہ سائنس کے دور میں روز روشن کی طرح ہیں" میں شائع ہوا لکھتے ہیں :

"کیا کوئی سمجھ دار آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ مادہ جو عقل اور حکمت سے عاری ہے' وہ خود اپنے آپ کو پیدا کر سکتا ہے اور یہ بھی محض اتفاق ہے۔ کون عقلمند ہے جو ایسا عقیدہ رکھ سکتا ہے یا کوئی یہ سوچ سکتا ہے کہ اس بے جان ، بے عقل مادے نے یہ پورا نظام اور یہ قوانین طبیعی ایجاد کئے اور پھر یہ قوانین اس نے اپنے اوپر لاگو کر لیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر معقول انسان اس سوال کا جواب نفی میں دے گا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب مادہ قوت میں بدلتا ہے یا قوت مادے میں بدلتی ہے تو یہ عمل بھی متعین قوانین کے تحت ہوتا ہے۔ وہ مادہ جو یہ نتائج پیدا کرتا ہے وہ بھی ان قوانین طبیعی کا پابند ہے جن کا وہ مادہ پابند ہے جو اس سے پہلے تھا"۔

"کیمیائی تجربے بتاتے ہیں کہ مادے میں سے بعض چیزیں زوال اور فنا کی طرف جا رہی ہیں۔ ان میں سے بعض فنا کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ بعض دوسری ایسی ہیں جو سست رفتاری سے فنا کی طرف جا رہی ہیں۔ اس کے باوجود یہ

بات مسلمہ ہے کہ مادہ ابدی نہیں ہے اور جب وہ ابدی نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ وہ ازلی بھی نہیں ہے۔کیونکہ ایک دن ایسا تھا جس میں مادے کی ابتدا ہوئی۔کیمیائی شواہد اور دوسرے سائنسی حقائق یہ بتاتے ہیں کہ مادے کا آغاز اس طرح نہیں ہوا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ پیدا ہوا ہو یا وہ تدریج کے ساتھ آگے بڑھا ہو بلکہ دلائل یہ بتاتے ہیں کہ مادہ اچانک نمودار ہوا ہے۔ آج سائنس نے وہ وقت بھی متعین کر دیا ہے جس میں مادہ وجود میں آیا۔ان حقائق سے معلوم ہو گیا کہ یہ جہان مخلوق ہے اور جب سے یہ پیدا ہوا ہے وہ متعین قوانین قدرت کا پابند ہے۔ لہٰذا اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے اور نہ گنجائش ہے کہ یہاں معاملات اتفاقات سے طے ہوتے ہیں۔"

"جب یہ مادی دنیا' اس بات کی اہل نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو خود پیدا کر سکے' یا وہ قوانین اور ضابطے متعین کر سکے جس کے تحت دنیا کو چلنا ہے تو یہ بات متعین ہو گئی اور ثابت ہو گئی کہ یہ مادی مخلوقات کسی غیر مادی ذات کی پیدا کردہ ہے۔ تمام قرائن اور شواہد اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اس ذات خالق کو عقل و حکمت کا حامل ہونا چاہئے۔عقل عالم مادی میں کوئی کام بغیر اس کے اس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک اس کے ساتھ ارادہ نہ ہو۔مثلاً طب اور نفسیاتی علاج کا نظام اس بات کو ثابت کرتا ہے اور جو ذات صاحب ارادہ ہو گی وہ لازماً اپنا ذاتی وجود رکھتی ہو گی لہٰذا خود ہماری عقل جو حتمی اور لازمی نتیجہ نکالتی ہے وہ یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس عالم کا ایک خالق ہے بلکہ وہ خالق علیم و حکیم بھی ہے اور ہر چیز پر قادر بھی۔ وہ اس عالم کی تخلیق کی بھی قدرت رکھتا ہے اور اس کا انتظام اور تدبیر بھی کرتا ہے' اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خالق دائم الوجود ہو۔اس کی آیات و علامات ہر جگہ پائی جاتی ہوں لہٰذا کوئی معقول شخص اس عالم کے مسئلہ کو اس وقت تک حل نہیں کر سکتا جب تک وہ وجود باری تعالیٰ پر ایمان نہ رکھتا ہو' جو اس عالم کا خالق ہو اور اس کی طرف متوجہ ہو جس طرح ہم نے اس مقالے کے آغاز میں کہا"۔

لارڈ کلیفن کے زمانے کے بعد سائنسی علوم نے جس قدر ترقی کی ہے' اس کے بعد ہمارے لئے یہ دلیل بے مثال انداز میں مؤکد ہو گئی ہے۔اس سے پہلے اس قسم کا کوئی تاکیدی استدلال نہ تھا کہ جس قدر بھی ہم گہرے غور و فکر سے کام لیں تو بہت جلد سائنس ہمیں مجبور کر دے گی کہ ہم خدا پر ایمان لائیں۔

ایک دوسرے ماہر علوم جدید اور بیالوجی کے ماہر فرانک ایلن ایک مقالے میں جس کا عنوان یہ ہے "تخلیق کائنات اتفاق ہے یا بالارادہ ہے" اور یہ مقالہ بھی مذکورہ بالا کتاب میں ہے۔لکھتے ہیں:

"اکثر اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مادی کائنات کسی بھی خالق کی محتاج نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم تسلیم کریں کہ یہ جہان موجود ہے تو سوال یہ ہو گا کہ یہ کس طرح موجود ہوا۔اس سوال کے صرف چار جواب ہو سکتے ہیں۔ایک یہ کہ محض وہم اور خیال ہے' تو یہ احتمال اس لئے غلط ہو گا کہ ہم نے اس کا وجود تسلیم کر کے گفتگو شروع کی ہے۔دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ کائنات ازخود وجود میں آئی ہے اور عدم سے وجود میں آئی ہے اور پھر تیسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ازلی ہو اور اس کا کوئی آغاز نہ ہو اور چوتھا یہ ہے کہ اس کا کوئی خالق ہو۔

جہاں تک پہلے احتمال کا تعلق ہے تو اسے تسلیم کرنے میں اور کوئی مشکل نہیں ہے ماسوائے اس کے کہ ہمارا شعور و احساس اس احتمال کو کبھی تسلیم نہیں کرے گا کہ یہ عالم محض وہم ہے اور اس میں حقیقت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ ماضی قریب میں یہ رائے سرجیمس جینز نے اختیار کی۔انہوں نے طبیعیات میں اس رائے کا اظہار کیا۔وہ کہتے ہیں کہ اس جہان

کا کوئی عملی وجود نہیں ہے بلکہ ہمارے ذہن کے اندر یہ محض ایک تصویر ہے۔اس رائے کے نتیجے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم محض اوہام کی دنیا میں رہتے ہیں۔مثلاً یہ ریل گاڑی جس میں ہم سوار ہو کر جاتے ہیں اور جسے ہم چھوتے ہیں یہ محض وہم ہے۔ان گاڑیوں میں جو لوگ بیٹھے ہوتے ہیں وہ بھی محض اوہام ہیں اور یہ ریلیں جن صحراؤں اور دریاؤں کو عبور کرتی چلی جا رہی ہیں ان کا بھی کوئی وجود نہیں ہے۔وہ جن پلوں کے اوپر سے گزرتی ہیں وہ بھی محض وہم ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس رائے اور نظریے سے بڑھ کر اور کوئی وہمی بات نہ ہوگی۔

رہی دوسری رائے کہ یہ جہان اور یہ پوری مادی دنیا خود بخود وجود میں آگئی تو یہ بات اور احتمال سابقہ احتمال سے بھی زیادہ بودا ہے' زیادہ احمقانہ ہے اور اس کے بارے میں بھی بحث و جدال کرنا یا اس پر سوچنا تک حماقت ہے۔

تیسری رائے یہ کہ یہ جہان ازلی ابدی ہے اور اس کا کوئی آغاز نہیں ہے۔تو یہ رائے چوتھی رائے کے ساتھ ازلیت میں مشترک ہے کیونکہ وہاں اللہ ازلی ہے یہاں مادہ ازلی ہے۔اب سوال یہ ہے کہ ہم صفت ازلیت کو کسی مردہ جہان کی طرف راجع کرتے ہیں یا ہم صفت ازلیت کو کسی زندہ حی و قیوم اور خالق کی طرف منسوب کرتے ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں احتمالات کو مان لینے میں اس قدر شبہات و مشکلات نہیں ہیں جس قدر پہلے دو احتمالات کو قبول کرنے میں ہیں۔ لیکن ڈائنامک حرارت کے قوانین یہ بتاتے ہیں کہ اس جہان کی ضرورت تدریجاً ختم ہو رہی ہے اور آخر جا کر اس نے ختم ہونا ہے اور ایک دن ایسا آئے گا کہ دنیا کا درجہ حرارت نہایت کم ہو جائے گا مثلاً مطلق صفر تک۔اس دن قوت ختم ہو جائے گی' زندگی محال ہو جائے گی۔ ایسا ایک دن ضرور آئے گا جب تمام اجسام کا درجہ حرارت صفر مطلق تک پہنچ جائے گا - یہ حالت طویل زمانے کے بعد ہوگی۔جلنے والا سورج' بھڑکتے ہوئے ستارے اور یہ زمین اپنی زندگی کے مختلف انواع کے ساتھ یہ بتا رہی ہے کہ اس کا آغاز ایک وقت سے ہوا' اور اس متعین وقت میں یہ وجود میں آئی۔لہٰذا اس بات کو تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اس جہان کا ایک خالق ہے جو ازلی اور ابدی ہے' اس کا کوئی آغاز نہیں ہے اور نہ خاتمہ ہے' وہ ہر چیز کو جانتا ہے' وہ نہایت ہی قوی اور اس کی قوت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔لہٰذا حقیقی بات یہی ہے کہ اس کے دست قدرت نے اس جہان کو بنایا ہے''۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور اس کے سوا کوئی اور اللہ نہیں ہے۔یہاں قرآن کریم تخلیق کی اساس پر یہ اصول قائم کرتا ہے کہ چونکہ وہ خالق ہے لہٰذا یہ امر واجب ہے کہ صرف اسی کی بندگی کی جائے اور صرف وہی رب ہے' اپنے تمام مفاہیم اور معانی کے ساتھ یعنی حاکم بھی وہی ہے۔ مربی اور تربیت کنندہ بھی وہی ہے' ہادی و رہبر بھی وہی ہے اور قیوم بھی وہی ہے۔

(ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (۶ : ۱۰۲)) یہ ہے اللہ تمہارا رب' کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے' ہر چیز کا خالق' لہٰذا تم اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے''۔اللہ قیوم اور نگران ہے' صرف انسانوں پر ہی نہیں بلکہ تمام کائنات کا قیوم اور منتظم اعلیٰ ہے اس لئے کہ وہ سب کا خالق ہے۔اس اصول تخلیق کے یہاں ذکر کا مقصد ہی یہ ہے اور اس بات کا انکار مشرکین مکہ دور جاہلیت میں بھی نہ کرتے تھے کہ اللہ خالق ہے' لیکن وہ لوگ خالق کائنات کی تخلیق کا حق نہ ادا کرتے تھے۔یعنی اللہ

کی حاکمیت کو تسلیم کرنا اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور اس کے تجویز کردہ نظام حیات کو اپنی پوری زندگی میں اپنانا۔ یہ صاحب نہایت یقین سے یہ باتیں کرتے ہیں لیکن خود انسانی علم بھی اسے تسلیم نہیں کرتا۔ پھر حرارت کے ڈائنامک قوانین بھی حتمی نہیں۔ البتہ تشریح کائنات کے دوسرے نظریات میں سے یہ بھی ایک نظریہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں ترمیم ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نظریہ سرے سے اڑ جائے۔ ہماری عادت یہ نہیں ہے کہ ہم سائنس کے اصولوں سے اسلام کی صحت پر استدلال کریں۔ نہ ہم سائنس کو اسلام کا تصدیق کنندہ سمجھتے ہیں۔ ہم ان لوگوں کے لئے یہ سائنسی شواہد پیش کرتے ہیں جو صرف سائنس کو الٰہ سمجھتے ہیں۔ گویا یہ اقوال ان خداؤں کے ہیں جن پر جولیان ہاکسلے یقین رکھتے ہیں۔

---ooo---

اس کے بعد اللہ کی صفات کی یہاں ایک تعبیر پیش کی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی تعبیر ہے جو موضوع کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی انسانی زبان اللہ کی ایسی توصیف کر سکتی ہے' لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ہم قرآن کو اسی طرح بلا تشریح دیکھیں کہ وہ نہایت صاف و شفاف انداز میں ذات باری کے بارے میں روشنی ڈالے اور اس مشہد کی تصویر کشی کرے جس کے اندر ایک نہایت ہی عظیم اور ہولناک حقیقت پوشیدہ ہے تاکہ صفات باری کے معاملے میں انسان کو پوری تشفی ہو اور اس کا ضمیر روشن ہو۔

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴿١٠٣﴾

"نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے' وہ نہایت باریک بیں اور باخبر ہے"۔ وہ لوگ جو اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ وہ اللہ کو دیکھ لیں' وہ ایسے ہی ہیں جس طرح بعض دوسرے لوگ اپنی قبیح فطرت کی وجہ سے وجود باری پر مادی دلیل پیش کرتے ہیں۔ یہ دونوں قسم کے لوگ درحقیقت سمجھتے ہی نہیں کہ وہ کہتے کیا ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی نظر' انسان کے حواس' اور انسان کا ذہنی ادراک یہ سب قوتیں اسے صرف اس لئے دی گئی ہیں کہ وہ اس کائنات سے ساتھ تعلق کی نسبت سے اپنے معاملات طے کر سکے اور اس کرۂ ارض پر منصب خلافت کی ذمہ داریاں ادا کر سکے اور اس مخلوق کائنات کے صفحات میں وجود باری پر دلالت کرنے والے آثار کی تلاش کر سکے۔ رہی ذات باری کی حقیقت تو وہ اس طاقت ہی سے محروم ہیں جس کے ذریعے وہ اس کا ادراک کر سکیں۔ اس لئے کہ ایک حادث اور فانی وجود کے اندر وہ قدرت ہی نہیں ہے کہ وہ ازلی اور ابدی ذات کا ادراک کر سکے۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اس کرۂ ارض پر انسان کی جو ذمہ داریاں ہیں ان کی ادائیگی کے لئے اس کے لئے رویت باری کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جہاں تک یہاں انسانی فرائض کا تعلق ہے ان کی ادائیگی کے لئے انسان کو مناسب طاقت دی گئی ہے۔

انسان کے لئے یہ تو ممکن ہے کہ وہ سابقہ لوگوں کی سادگی کو سمجھ لے مگر وہ آخری دور میں آنے والوں کی قبیح فطرت کو سمجھنے میں غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہے' یہ لوگ ایٹم اور برق کی بات کرتے ہیں۔ پروٹون اور نیوٹرون کی بات کرتے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے اپنی زندگی کے اندر کوئی ایٹم' کوئی برق' کوئی نیوٹرون اور کوئی پروٹون نہ دیکھا' اس لئے کہ زندگی کی ماہیت کو دیکھنے کی دوربین ابھی تک وجود میں نہیں آ سکی۔ ان سائنس دانوں کے نزدیک یہ امور بہرحال

مسلم ہیں اور وہ ان کے وجود کو فرض کرتے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے ان چیزوں کے کچھ آثار متعین کر لئے ہیں۔ جب وہ آثار پائے جاتے ہیں تو ان لوگوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ موجود ہیں اور کائنات بھی موجود ہے حالانکہ یہ صرف احتمال ہے کہ جس طرح انہوں نے فرض کیا ہے کائنات اسی طرح ہو۔ تاہم جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ موجود ہے اس لئے کہ اس کے آثار موجود ہیں اور یہ آثار اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اللہ موجود ہے تو پھر یہ لوگ وجود باری کے بارے میں جدل و جدال اور مناقشہ شروع کر دیتے ہیں بغیر علم' بغیر ہدایت' بغیر ادراک اور بغیر کسی کتاب منیر کے۔ اس کے برعکس اللہ کے وجود کے لئے وہ ایسی دلیل طلب کرتے ہیں کہ آنکھیں اللہ کو دیکھ سکیں۔ اس کرۂ ارض پر زندگی کے عجائب گویا ان کے لئے کافی نہیں ہیں حالانکہ وہ وجود باری پر کافی ثبوت ہیں۔

---○○○---

دلائل تکوینی جو اس کائنات کی کھلی کتاب کے صفحات میں بکھرے ہوئے ہیں اور انسانی نفوس کے اندر بھی موجود ہیں ان کے بیان کے بعد اور یہ کہنے کے بعد کہ۔

(لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (٦:١٠٣))

نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے' وہ نہایت باریک بیں اور باخبر ہے۔" اب اس خوبصورت انداز میں صفات الٰہی کے بیان کے بعد بات یوں آگے بڑھتی ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۱۰۴﴾

"دیکھو' تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں' اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا اور میں تم پر کوئی پاسبان نہیں ہوں"۔ یہ جو کچھ اللہ کی طرف سے آ رہا ہے بصیرت کی روشنی ہے۔ بصیرت انسان کو ہدایت دیتی ہے اور راہنمائی کرتی ہے۔ یہ بذات خود عین روشنی ہے۔ اس لئے جو شخص اسے دیکھے گا وہ روشن دیکھے گا اور اگر کوئی آنکھیں بند کرے گا تو وہ اندھا ہو گا۔ ان بصیرتوں اور روشنیوں کے آ جانے کے بعد صرف اندھا ہی محروم رہ سکتا ہے۔ وہ جس کے حواس کام نہ کر رہے ہوں اور جس کے شعور کا دروازہ بند ہو جس کا ضمیر اندھا ہو۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اپنی برأت کا اعلان یوں کر دیں کہ میں تم پر نگہبان اور پاسبان مقرر نہیں کیا گیا ہوں۔ (مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (٦:١٠٤)) "میں تمہارے لئے پاسبان مقرر نہیں ہوا ہوں"۔ یہاں عبارت میں ایک عجیب تناسق ہے۔ اللہ کی صفت بیان کرتے ہوئے کہا گیا تھا۔

(لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (٦:١٠٣))

نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے' وہ نہایت باریک بین اور باخبر ہے۔" اور دوسری آیت میں کہا گیا ہے :

(قَدْ جَآءَ كُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِه وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا (٦: ١٠٤)) "دیکھو تمہارے پاس' تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں' اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا"۔ ایک جگہ ابصار اور مقابل میں بصائر ہے۔ ایک جگہ بصیر ہے اور مقابلے میں عمی ہے' یہ عربی اسلوب میں الفاظ کا بہترین انتخاب ہے۔

---ooo---

اس کے بعد روئے سخن حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مڑ جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ قرآن کریم کے اندر جو اسلوب کلام اختیار کیا گیا ہے وہ ایسا نہیں ہے جو کسی امی شخص کی طرف سے بنایا جاسکتا ہو اور جس سے مالکان بصیرت خود بخود یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہ یقیناً کلام الٰہی ہے۔ لیکن مشرکین انکار اس لئے نہ کرتے تھے کہ ان کے سامنے تشفی بخش دلائل نہ تھے' بلکہ وہ بہانہ سازی کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ عظیم علمی کام اور فصیح و بلیغ کلام بعض اہل کتاب سے سیکھ کر بنا رہے ہیں حالانکہ وہ جانتے تھے کہ اس وقت جو اہل کتاب تھے ان کے پاس نہ یہ پیغام تھا اور نہ یہ اعلیٰ کلام۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کر دی جاتی ہے کہ آپ مشرکین سے اعراض کریں اور اللہ کی ہدایات پر عمل کرتے چلے جائیں۔

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿١٠٥﴾ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٦﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۭ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿١٠٧﴾

"اس طرح ہم اپنی آیات کو بار بار مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور اس لئے کرتے ہیں کہ یہ لوگ کہیں "تم کسی سے پڑھ آئے ہو" ' اور جو لوگ علم رکھتے ہیں ان پر ہم حقیقت کو روشن کر دیں۔ اے نبی "اس وحی کی پیروی کیے جاؤ' جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے کیونکہ اس ایک رب کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ اور ان مشرکین کے پیچھے نہ پڑو۔ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو (وہ خود ایسا بندوبست کر سکتا تھا کہ) یہ لوگ شرک نہ کرتے۔ تم کو ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم ان پر حوالہ دار ہو"۔

اللہ اپنی آیات اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ عربوں کے اندر نہ یہ اسلوب تھا اور نہ وہ اس پر قادر تھے کیونکہ یہ ان کے

معاشرے سے ماخوذ نہ تھا۔ یہ پیغام اور یہ کلام پوری انسانیت کے پاس بھی اس وقت نہ تھا' اس لئے اس کلام کے دو نتائج برآمد ہوئے۔

جو لوگ ہدایت چاہتے ہی نہ تھے' جن کو اس پیغام اور علم سے دلچسپی ہی نہ تھی وہ حقیقت تک پہنچنے کی سعی ہی نہ کرتے تھے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس بلند مقام سے ان سے ہمکلام ہوتے تھے اسے وہ اس انکار اور عدم دلچسپی کا جواز بنا کر پیش کرتے تھے اس لئے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ خوب جانتے تھے' یہ بات ان کے بھی سامنے تھی کہ محمد جو اونچا کلام پیش کرتے تھے وہ ان کا ذاتی نہ تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہے تھے اس کے بارے میں سمجھتے تھے کہ یہ بہانہ بناوٹی ہے کیونکہ وہ حضور ؐ سے خوب واقف تھے۔ رسالت سے قبل بھی اور بعد میں بھی۔ اسی لئے انہوں نے یہ کہا کہ اے محمد تو نے یہ کلام اہل کتاب سے سیکھا ہے۔ حالانکہ خود اہل کتاب کے ہاں نہ یہ پیغام تھا اور نہ ایسا اسلوب کلام تھا۔ اہل کتب کی کتابیں تو وہ پڑھتے تھے اور ان کے پاس موجود تھیں اور اب بھی وہ کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں۔ ان کتابوں کے پیغام اور کلام میں اور قرآن کے پیغام و کلام میں کوسوں اور میلوں فاصلے ہیں۔ ان کے ہاں جو کلام ہے وہ تو تاریخ انبیاء کی بے ترتیب تاریخی روایات ہیں۔ سابقہ بادشاہوں کی تاریخ اور قصے کہانیاں ہیں اور ان کو نامعلوم افراد نے تصنیف کیا ہے۔ یہ تو عہد قدیم کی بات ہے۔ رہیں عہد جدید کی کتب یعنی اناجیل تو ان میں حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں کی روایات کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پھر یہ بھی آپ کے جانے کے کئی سال بعد جمع کی گئی کتابیں ہیں۔ بعد میں عیسائیوں کی مختلف کانفرنسوں نے ان میں کئی تبدیلیاں کیں اور سالہا سال تک یہ تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ اخلاقی تعلیمات اور روحانی ہدایات بھی اس تحریف اور تعدیل سے نہ بچ سکیں۔ یہ چیزیں تھیں اس وقت اہل کتاب کے پاس۔ ان کا قرآن کریم کے ساتھ تقابلی مطالعہ بھی کیا گیا ہے لیکن جاہلیت کے دور میں مشرکین کے پاس اس کے سوا اور کوئی بہانہ تھا کہاں؟ تعجب کی بات یہ ہے کہ ہمارے دور کے مستشرقین اور نام نہاد مسلمان بھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ وہ اسے علمی تحقیقات کا نام دیتے ہیں اور ان بے بنیاد تحقیقات تک صرف نام نہاد ماہرین علوم شرقیہ ہی پہنچتے ہیں۔

رہے وہ لوگ جو حقیقی علم رکھتے ہیں تو اس انداز میں کلام عالی سنتے ہی وہ تسلیم کرلیتے ہیں کہ یہ حق ہے اور ان کے بارے میں اللہ فرماتے ہیں۔

(وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (٦:١٠٥)) اور جو لوگ علم رکھتے ہیں ان پر ہم حقیقت کھول دیں"۔

اس کے بعد یہ حکم آتا ہے کہ وہ جو چشم بینا رکھتے ہیں اور جانتے ہیں اور وہ جو اندھے ہیں اور کورے ہیں ان کے درمیان مکمل جدائی ہونا چاہئے۔

اللہ کی جانب سے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ اب جبکہ اللہ نے اپنی آیات کو ایک اعلیٰ اسلوب میں کھول کر بیان کر دیا ہے اور لوگ اس کے نتیجے میں دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں تو آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ آنے والی وحی کی پیروی کریں اور مشرکین کو ایک طرف چھوڑ دیں۔ آپ اب ان سے ہمکلام ہی نہ ہوں اور وہ جو گھٹیا گفتگو کرتے ہیں اس کی طرف توجہ ہی نہ کریں۔ وہ جو کج بحثی کرتے ہیں' آپ کی تکذیب کرتے ہیں اور آپ کے ساتھ بغض رکھتے ہیں' اس کی کوئی پرواہ نہ کریں۔ آپ کے لئے اب راہ صرف ایک ہے کہ آپ اللہ کے راستے پر چل پڑیں۔ اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالیں' اپنے ساتھیوں کی زندگیوں کو اس کے مطابق درست کریں۔ آپ مشرکین

کے ذمہ دار نہیں ہیں اور جب آپ اپنے رب کی وحی کی اطاعت کریں گے تو بندوں کی ذمہ داری آپ پر نہ ہوگی۔

(اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ (۶:۱۰۶)) اے نبی "اس وحی کی پیروی کیے جاؤ' جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے کیونکہ اس ایک رب کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ اور ان مشرکین کے پیچھے نہ پڑو"۔ اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی کہ ان پر ہدایت لازم کر دے تو اللہ نے لازم کر دی ہوتی۔ اگر اللہ یہ چاہتا کہ ان کو آغاز ہی سے فرشتوں کی طرح ہدایت پر پیدا کرتا تو وہ ایسا کر دیتا' لیکن اللہ نے انسان کو اس طرح پیدا کیا اور اس کے اندر ہدایت و ضلالت دونوں کی طاقت و دیعت کر دی اور اسے آزاد چھوڑ دیا کہ وہ ہدایت اختیار کرتا ہے یا ضلالت۔ پھر جو راستہ بھی وہ اختیار کرے اس کی سزا و جزا اسے دی جائے اور یہ تمام کام اللہ کی مشیت کے دائرے کے اندر ہو جس سے کوئی بات بھی باہر نہیں ہو سکتی۔ البتہ اللہ کسی انسان کو ہدایت یا گمراہی پر مجبور نہیں کرتا اور یہ کام اللہ نے اپنی اس حکمت کی وجہ سے کیا ہے جس کا علم صرف اسے ہے تاکہ انسان اس کائنات میں اپنا مقررہ کردار ادا کر سکے' اپنی صلاحیتوں اور اپنے تصرفات کے مطابق۔

(وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا (۶:۱۰۷)) اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو (وہ خود ایسا بندوبست کر سکتا تھا کہ) یہ لوگ شرک نہ کرتے"۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اعمال کے بارے میں مسئول نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو لوگوں کے اعمال کا مختار اور پاسبان مقرر نہیں کیا۔ یہ کام تو اللہ کا ہے۔

یہ ہدایت حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے کرام اور ان کے بعد ان تمام لوگوں کے لئے حدود کار متعین کر دیتی ہے جو آپ کے بعد آئیں گے۔ ہر دور میں اور ہر قوم میں اور ہر معاشرے میں۔

کسی داعی کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنی دعوت' اپنے دل' اور اپنی سرگرمیوں کو صرف منحرفین اور معاندین کے لئے وقف کر دے حالانکہ ان کے دل اور دماغ قبول دعوت اور دلائل قبول دعوت اور شواہد حقیقت کے لئے کھلے ہی نہیں۔ داعی کو چاہئے کہ وہ دل کھلا رکھے اور اپنی امیدیں اور اپنی سرگرمیاں ان لوگوں تک محدود رکھے جو قبول دعوت کے لئے آمادہ ہوں۔ یہ لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی سیرت کی تعمیر اصول دین کی روشنی میں کی جائے۔ یعنی اسلامی نظریہ حیات کی روشنی میں۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کے دلوں میں اس کائنات اور اس دنیاوی زندگی کے بارے میں اسلامی نظریہ حیات کی روشنی میں ایک گہرا تصور بٹھایا جائے۔ نیز ایسے ہی لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے اخلاق اور ان کے طرز عمل کو صحیح طرح استوار کیا جائے اور پھر ایسے افراد کی ایک ایسی سوسائٹی تشکیل دی جائے جس کی بنیاد اس عقیدے اور نظریہ حیات پر ہو۔ یہ کام اس قدر بھاری ہے کہ اس کے لئے زبردست جدوجہد کی ضرورت ہے اور یہ کام مسلسل جدوجہد کا مستحق بھی ہے۔ رہے وہ لوگ جو دعوت کی مخالفت میں صف آرا ہیں تو وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ دعوت دے کر انہیں ایک طرف چھوڑ دیا جائے۔ جب سچائی قوت پکڑتی ہے اور غالب ہو جاتی ہے تو پھر اللہ کی سنت یہ ہے کہ سچائی برائی پر حملہ آور ہوتی ہے اور باطل مٹ جاتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سچائی موجود رہے۔ جب سچائی مکمل شکل میں موجود ہوتی ہے تو اس کے مقابلے میں باطل نرم پڑ جاتا ہے اور اس کے دن گنے جاتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دینے کے بعد کہ آپ مشرکین سے اعراض کریں' حضور کو اور اہل اسلام کو

حکم دیا گیا کہ یہ اعراض اور صرف نظر نہایت ہی شائستہ انداز میں اور پروقار طریقے سے ہو مثلاً یہ کہ وہ مشرکین کے الٰہوں کو برا بھلا نہ کہیں کیونکہ اس کے جواب میں وہ لوگ اللہ کی شان میں گستاخی کر سکتے ہیں اس لئے کہ انہیں اللہ جل شانہ کی جلالت قدر کا کوئی علم نہیں ہے۔ چنانچہ مسلمان تو ان کے الٰہوں کو برا کہیں گے جو حقیر ہیں اور اس کے مقابلے میں وہ لوگ ان کے جلیل القدر اللہ کو برا بھلا کہیں گے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٠٨﴾

"اور (اے مسلمانو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔ ہم نے تو اسی طرح ہر گروہ کے لئے اس کے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے' پھر انہیں اپنے رب ہی کی طرف پلٹ کر آنا ہے' اس وقت وہ انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ ان میں سے جو شخص بھی کوئی عمل کرتا ہے وہ اسے اچھا سمجھ کر کرتا ہے اور وہ اپنے طرز عمل کی مدافعت کرتا ہے۔ اگر وہ اچھے اعمال پر عمل پیرا ہے تو بھی وہ انہیں اچھا سمجھتا ہے۔ اگر وہ برے اعمال پر عمل پیرا ہے تو بھی وہ انہیں اچھا سمجھتا ہے اور ان کی مدافعت کرتا ہے۔ اگر وہ صحیح راہ پر ہو تو بھی اسے اچھا سمجھتا ہے اور اگر وہ ضلالت کی راہ پر گامزن ہو تو بھی وہ اسے اچھا سمجھتا ہے۔ یہ ہے انسان کی فطرت اور اس کا مزاج۔ مشرکین مکہ اللہ کے ساتھ کچھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے تھے حالانکہ وہ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ صرف اللہ ہی خالق اور رازق ہے۔ اگر ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو مسلمانوں نے برا بھلا کہا تو وہ اپنے بتوں کے دفاع میں نکل آئیں گے اور اللہ رب العزت کو برا بھلا کہیں گے۔ لہٰذا مسلمانوں کو ہدایت ہوئی کہ وہ انہیں ان کے حال ہی پر چھوڑ دیں۔

(ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۶:۱۰۸)) "پھر انہیں اپنے رب ہی کی طرف پلٹ کر آنا ہے' اس وقت وہ انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں۔" ایک مومن جس کو اسلامی دین پر اطمینان قلب حاصل ہو اور اسے یہ یقین ہو کہ وہ جس دین پر ہے وہ برحق ہے۔ اس کا قلب مطمئن ہے اور وہ ایسے امور کے پیچھے نہیں پڑتا جس میں کوئی فائدہ نہ ہو' کیونکہ بتوں کو گالیاں دینے سے ان کے ایمان و یقین میں کوئی اضافہ ہو نہیں سکتا۔ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ مخالفین کے دلوں میں عناد بڑھ جائے۔ اس لیے اہل ایمان کو اس بے فائدہ مشغلے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ خطرہ ہو سکتا ہے کہ جواب میں اہل ایمان مخالفین کی جانب سے ایسی باتیں سنیں جن کو وہ پسند نہیں کرتے یعنی رب ذوالجلال کی شان میں گستاخی۔

اب اس سبق کا خاتمہ ہو رہا ہے' اس پورے سبق میں اللہ تعالیٰ نے ایسے دلائل و شواہد پیش کئے ہیں جو رات و دن کے ہر لمحے میں چشم بینا کے لئے وافر مقدار میں موجود ہیں سبق کا خاتمہ اس بات پر ہوتا ہے کہ یہ مخالفین اللہ کی قسمیں کھا

کر کتے ہیں کہ اگر ہمارے سامنے بھی رسولان سابقہ کی طرح کوئی خارق العادۃ مادی معجزہ آ جائے تو وہ ضرور ایمان لائیں گے اور ان کے اس حلفیہ بیان کو سن کر بعض مخلصین اہل ایمان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تجویز پیش کی کہ آپ اللہ سے کسی ایسے معجزے کے صدور کے لئے دست بدعا ہوں۔اس تجویز کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ دو ٹوک جواب یوں دیتے ہیں کہ دیکھو تمہیں ان مکذبین اور ان کی تکذیب کی حقیقت ہی کا علم نہیں ہے۔

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ

بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ مَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا

۱۳ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَ نُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ

۱۰ ع وَّ نَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝

۱۹

"یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی (یعنی معجزہ) ہمارے سامنے آ جائے تو ہم اس پر ایمان لے آئیں گے۔اے نبی" ان سے کہو کہ "نشانیاں تو اللہ کے اختیار میں ہیں۔" اور تمہیں کیسے سمجھایا جائے کہ اگر نشانیاں آ بھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں۔ہم اسی طرح ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر رہے ہیں جس طرح یہ پہلی مرتبہ اس (کتاب) پر ایمان نہیں لائے تھے۔ہم انہیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑے دیتے ہیں۔"

وہ دل جو اس کائنات میں بکھرے ہوئے شواہد و دلائل کو تسلیم نہیں کرتا، خصوصاً اس تبلیغ و بیان کے بعد جو اس کتاب نے بے مثال پیرائے میں پیش کیا اور اس کائنات اور خود انسان کے نفس کے اندر موجود آیات الٰہیہ اسے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتیں اور وہ اپنے رب کی طرف دوڑ کر نہیں آتا تو ایسا دل یقیناً لاعلاج دل ہے۔ان لوگوں نے ابتداء ہی سے ایمان کا انکار کر دیا ہے تو جو مسلمان حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواستیں کرتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ سے ایسے معجزات کے صدور کی دعا کریں تو ان کے پاس کیا گارنٹی ہے کہ وہ صدور معجزہ کے بعد دوبارہ انکار نہ کریں گے۔اللہ ہی ان کے دلوں کا حال جانتا ہے اور خوب جانتا ہے۔اللہ کی مشیت یہ ہے کہ یہ لوگ یونہی اپنی سرکشی میں غرق رہیں کیونکہ اللہ جانتا ہے کہ ان کی تکذیب کا صلہ یہی ہے اور اللہ کو یہ بھی علم ہے کہ صدور معجزہ کے بعد بھی یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔اگر فرشتے بھی اتر آئیں تب بھی وہ مان کر دینے والے نہیں ہیں۔اگر مردے اٹھ کر قبروں سے بات چیت شروع کر دیں تب بھی نہیں مانیں گے۔اگر تمام مخلوق کو اٹھا کر ان کے سامنے حشر برپا کر دیا جائے اور یہ تمام مخلوق ان کو دعوت ایمان دے تب بھی یہ مان کر دینے والے نہیں ہیں۔یہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک اللہ کی مشیت انہیں مجبور ایمان نہ کر دے۔ اور اللہ کی مشیت کسی کو مجبور نہیں کرتی کیونکہ لوگ اس طرف آنا ہی نہیں چاہتے۔یہ وہ نفسیاتی حقیقت ہے جسے اکثر داعی بھول جاتے ہیں۔یہ بات نہیں ہے کہ اہل ضلال کے سامنے دلائل و براہین کی کوئی کمی ہے بلکہ وہ دل کے بیمار ہیں۔ان کی فطرت معطل ہو چکی ہے اور ان کا ضمیر فاسد ہو چکا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ہدایت ان لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو اس کی طرف متوجہ ہوں اور اس کے حصول کے لئے سعی کریں۔ہنگرام ۱۲ دسمبر ۱۹۹۰-۹-۴: ۱۲ بجے دن

فی ظلال القرآن

پارہ ---------- ۸

سورۃ الانعام ------- ۱۱۱ تا ۱۶۵

سورۃ الاعراف ------- ۱ تا ۸۷

پارہ نمبر ۸ ایک نظر میں

اس پارے کے دو حصے ہیں۔پہلے حصے میں سورہ الانعام کا باقی حصہ ہے' جس کا پہلا حصہ ساتویں پارے میں تھا۔ دوسرا حصہ سورہ اعراف پر مشتمل ہے۔ سورہ انعام کا تعارف ہم نے ساتویں پارے میں کرا دیا تھا۔ہم چاہتے ہیں کہ اس تعارف کا ایک حصہ قارئین کی یاد تازہ کرنے کے لئے یہاں بھی ذکر کریں۔ رہی سورہ اعراف تو اس کے آغاز میں اس کا مکمل تعارف دے دیا جائے گا' انشاء اللہ تعالیٰ!

سورہ انعام کا یہ حصہ بھی اسی پیٹرن (Pattern) پر آگے بڑھتا ہے جس کی وضاحت ہم نے سورہ انعام کے آغاز میں کر دی تھی' یعنی ساتویں پارے میں۔ یہاں چند فقروں میں مختصر اشارات کافی ہوں گے۔ اس سورہ کے تعارف میں ساتویں پارے میں یہ فقرے اس قابل ہیں کہ انہیں ذہن میں تازہ کیا جائے۔

"یہ سورہ مجموعی لحاظ سے حقیقت الوہیت سے بحث کرتی ہے۔ اس پوری کائنات کے دائرے میں بھی اور انسانی زندگی کے دائرے میں بھی۔ انسانی نفس اور ضمیر کے دائرے میں بھی اور اس دکھائی دینے والی کائنات کے نامعلوم رازوں کے دائرے میں بھی اور عالم غیب کے نامعلوم رازوں کے دائرے میں بھی۔ یہ سورہ اس کائنات کی تخلیق' اس کے اوپر زندگی کی تخلیق اور پھر حیوانات کے اوپر انسانی تخلیق کے دائرے کے اندر بھی تصور حاکمیت الٰہیہ کو پیش کرتی ہے اور گزرنے والوں کی باہمی کشمکش اور ان کی جگہ لینے والوں کی جانشینی میں بھی حاکمیت الٰہیہ کے کچھ رنگ دکھاتی ہے۔ غرض اس کائنات پر نظر ڈالتے ہوئے مشاہد فطرت میں اللہ کی حاکمیت' دنیا میں ہونے والے بڑے بڑے واقعات میں اللہ کی حاکمیت' دنیا کی خوشحالی اور بدحالی میں اللہ کی حاکمیت اس سورہ کا موضوع ہے۔ قدرت الٰہیہ کے مختلف مظاہر و مشاہد میں اللہ کی حاکمیت' انسان کی زندگی کے اوپر اللہ کی ظاہری اور باطنی گرفت میں اللہ کی حاکمیت دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اور متوقع حوادث میں اور سب سے آخر میں قیامت کے مناظر اور خصوصاً اس منظر میں اللہ کی حاکمیت جس میں سب لوگ بارگاہ الٰہی میں کھڑے ہونگے۔"

"اس طرح یہ سورہ قلب انسانی کو لے کر مختلف ابعاد و آفاق تک لے جاتی ہے اور ان کے نشیب و فراز کی سیر کراتی ہے' لیکن پوری سورہ میں قرآن کریم کا مکی انداز برقرار ہے جس کے اسلوب کے بارے میں ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں۔ مکی اسلوب کے ساتھ ساتھ پورے قرآن کا انداز کلام بھی اس سورہ میں اپنے اعلیٰ معیار پر ہے۔ انداز صرف نظریاتی نہیں ہے' نہ ہی لاہوتی جدلیات پر مشتمل ہے کہ قارئین کے افکار اور ان کے ذہنوں کو مشغول رکھنے کے لئے کوئی بحث مطلوب ہو۔ بلکہ سیدھے سادے انداز میں یہ سورہ رب العالمین کا تعارف لوگوں سے کراتی ہے' تاکہ لوگ اپنے سچے رب کی بندگی اور غلامی کریں۔ ان کا ضمیر اور ان کی روح اللہ کی غلام ہو جائے' ان کی جدوجہد اور ان کی تمام مساعی اللہ کی تابعداری میں ہوں' ان کے رسوم و رواج اللہ کے رنگ میں ہوں' اور ان کی زندگی کی پوری صورت حال اللہ وحدہ کی

حاکمیت کے تحت ہو، جس کے سوا زمین و آسمان میں کسی اور کی حاکمیت نہیں ہے۔"

"یوں نظر آتا ہے کہ یہ سورہ اول سے آخر تک ایک متعین نصب العین کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہ کہ اللہ ہی خالق ہے، وہی مالک ہے، وہی قدرتوں والا ہے، اور وہی بادشاہ اور قہار ہے۔ وہی پوشیدہ چیزوں اور غیب کا جاننے والا ہے۔ وہ جس طرح رات و دن کو گردش دے رہا ہے، اسی طرح وہ دلوں اور دماغوں کا بھی پھیرنے والا ہے اس لئے اس کو تمام لوگوں کی زندگیوں پر حاکم ہونا چاہئے۔ لوگوں کی زندگیوں میں امر و نہی کا اختیار صرف اسی کو ہونا چاہئے۔ کوئی حکم اور کوئی قانون اس کے حکم اور قانون کے سوا نہ ہو گا۔ حلال و حرام کے تعین کا اختیار بھی صرف اسی کو ہے، اس لئے کہ یہ تمام امور اللہ کی الوہیت کے عناصر ترکیبی ہیں، لہٰذا لوگوں کی زندگیوں میں ان کے بارے میں تصرف صرف اللہ کر سکتا ہے۔ اس کے سوا نہ کوئی خالق ہے، نہ کوئی رازق ہے، نہ زندہ کرنے والا ہے اور نہ مارنے والا ہے، نہ نفع دینے والا ہے اور نہ نقصان دینے والا ہے، نہ کوئی داتا ہے اور نہ کوئی مانع ہے۔ غرض نہ اللہ کے سوا کوئی بھی کسی کے لئے یا اپنے لئے نفع و نقصان کا مالک ہو سکتا ہے، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ اس سورہ میں اول سے آخر تک اس مقصد کے لئے دلائل و شواہد پیش کئے گئے ہیں اور یہ دلائل ان مشاہدات، مؤثرات اور قدرتی مواقف کے ذریعے فراہم ہوئے ہیں جو اس کائنات میں موجود ہیں اور فکر و نظر کو مسحور کرنے والے ہیں۔ اور ان مناظر فطرت کے اس مطالعے سے دل پر ہر طرف سے اشارات و مؤثرات ہر دروازے اور ہر پہلو سے متوجہ ہوتے ہیں اور اثر انداز ہوتے ہیں۔

وہ سب سے بڑا مسئلہ جس پر یہ سورہ زور دے رہی ہے، وہ زمین و آسمانوں کے اندر اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کا مسئلہ ہے، زمین و آسمان کے وسیع دائرے میں اور کائنات کے وسیع و عریض میدان میں تصور حاکمیت الٰہیہ کا مسئلہ۔ یہ سورہ اسی مسئلے کو پیش کرتی ہے لیکن اطلاقی انداز اور بات کی مناسبت یہ ہے کہ جاہلیت کے پیرو کار بعض ذبیحوں اور بعض کھانوں کے معاملے میں حلال و حرام کے اختیارات اللہ کے سوا دوسروں کو دیتے تھے۔ اسی طرح نذر کے معاملے میں بعض قربانیوں، بعض پھلوں اور بعض بچوں کے ملنے میں جاہلیت کے پرستار اللہ کے سوا دوسرے الٰہوں کو اختیارات دیتے تھے۔ اس مناسبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس پوری کائنات کے اندر نظریہ حاکمیت الٰہیہ یہاں تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور اسی مناسبت کی طرف سورہ کی آخری آیات کے اندر اشارے کئے گئے ہیں۔

(پھر اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو، تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اس کا گوشت کھاؤ، آخر کیا وجہ ہے کہ وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالت اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے، ان کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے۔ بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بناء پر گمراہ کن باتیں کرتے ہیں، ان حد سے گزرنے والوں کو تمہارا رب خوب جانتا ہے۔ تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی۔ جو لوگ گناہ کا اکتساب کرتے ہیں وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو، اس کا گوشت نہ کھاؤ، ایسا کرنا فسق ہے۔ شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات القاء کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں لیکن اگر تم نے ان کی اطاعت قبول کر لی تو یقیناً تم مشرک ہو گے۔ (۶: ۱۱۸ تا ۱۲۱)

(اور ان لوگوں نے اللہ کے لئے خود اس کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے، اور

کہتے ہیں یہ اللہ کے لئے بزعم خود' اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لئے ہے۔ پھر جو حصہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لئے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لئے ہے وہ ان شریکوں کو پہنچ جاتا ہے۔ کیسے برے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ۔ اور اس طرح بہت سے مشرکوں کے لئے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنایا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے ' لہٰذا انہیں چھوڑ دو کہ اپنی افتراء پردازیوں میں لگے رہیں۔ کہتے ہیں یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں' انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھلانا چاہیں حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے' پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور باربرداری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے اور یہ سب کچھ انہوں نے اللہ پر افتراء کیا ہے۔ عنقریب اللہ انہیں ان کی افتراء پردازیوں کا بدلہ دے گا۔ اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے یہ ہمارے مردوں کے لئے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں پر حرام' لیکن اگر وہ مردہ ہوں تو وہ دونوں اس کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ باتیں جو انہوں نے گھڑی ہیں ان کا بدلہ اللہ انہیں دے کر رہے گا۔ یقیناً وہ حکیم ہے اور سب باتوں کی اسے خبر ہے۔ یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت اور نادانی کی وجہ سے قتل کیا اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو اللہ پر افتراء پردازی کر کے حرام ٹھہرا لیا۔ یقیناً وہ بھٹک گئے اور ہرگز وہ راہ راست پانے والوں میں سے نہ تھے۔ (۶: ۱۳۶ تا ۱۴۰)

"امت مسلمہ کی زندگی میں یہ ایک عملی پہلو تھا' جس کی مناسبت سے اس سورہ میں اس عظیم مسئلہ کو لیا گیا۔ اس دور میں امت مسلمہ کے ماحول پر بھی جاہلیت چھائی ہوئی تھی۔ قانون سازی اور حلال و حرام کے تعین کے معاملے میں جو شرکیہ عقائد موجود تھے ان کی اصلاح کے حوالے سے یہاں اللہ کی الوہیت ' اللہ کی حاکمیت اور تمام انسانوں کی بندگی اور عبودیت کے مسائل کو لیا گیا۔ چنانچہ جس طرح تمام کی قرآن میں اس مسئلے کو لیا گیا ہے' اسی طرح اس سورہ میں بھی اس مسئلے کو بڑی تفصیل سے لیا گیا ہے اور مدنی آیات میں جہاں بھی حلال و حرام اور حق قانون سازی کا بیان آتا ہے وہاں بھی مسئلہ حاکمیت الہیہ کو لیا جاتا ہے۔"

"اس سیاق کلام میں جن مؤثر ہدایات اور فیصلوں اور قرار دادوں کا سیلاب امنڈتا چلا آ رہا ہے اور جن جانوروں' نذروں اور ذبیحوں کے بارے میں مشرکین کی جو تردید کی جا رہی ہے' اسی حوالے سے یہاں اللہ کے مسئلہ الوہیت اور اللہ کے حق قانون سازی کو بھی بیان کیا جا رہا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ حلال و حرام کی اس قانون سازی کا تعلق اسلامی عقائد اور اسلامی نظریات کے ساتھ ہے' اور وہ نظریہ' حاکمیت الہیہ اور انسانوں کی بندگی اور غلامی کا ہے۔ یہ مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے' یہ اسلام اور کفر اور اسلام اور جاہلیت کا مسئلہ ہے۔ ہدایات کے اس سیلاب میں سے ہم یہاں اس سورہ کے تعارف میں صرف چند نمونے پیش کریں گے لیکن ان کی مکمل تفصیلات اس وقت آئیں گی جب ہم سورہ کی آیات پر تفصیلی بحث کریں گے۔ اپنے اثرات کے اعتبار سے یہ سیلاب نفس انسانی کے اندر اس دین کے مزاج کی حقیقی ماہیت بٹھا دیتا ہے۔ وہ یہ کہ انسانی زندگی کا چھوٹا مسئلہ ہو یا بڑا' اللہ کے حق حاکمیت کے تحت حل ہونا چاہئے اور اللہ کی حاکمیت اسلامی شریعت کی صورت میں ریکارڈ شدہ ہے۔ اگر اس طرح نہ ہو گا تو پھر یہ تصور ہو گا کہ ایسے لوگ یا معاشرہ دین سے خارج ہے' یا ایک جزوی مسئلے یا اس معمولی مسئلے کی حد تک انسان دین سے نکل گیا ہے۔"

"اور یہ کثرت ہدایات اس بات کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ دین انسانی زندگی کے تمام مظاہر سے اور زندگی کے تمام

معاملات سے انسانوں کی حاکمیت کو ختم کرتا ہے ۔ یہ معاملات اہم ہوں یا غیر اہم ' بڑے ہوں یا چھوٹے ان کو اس عظیم اصول کے دائرے کے اندر لاتا ہے ۔ یعنی یہ کہ اللہ کی الوہیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پورے کرۂ ارض پر حاکم مطلق ہے ' بلا شرکت غیرے اس کائنات کے اوپر متصرف ہے اور یہ اصول دین اسلام کے اندر پوری طرح ظاہر اور مجسم ہے ۔"

---ooo---

درج بالا اقتباسات میں جس صورت حالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ امت مسلمہ کی زندگی میں موجود تھی اور امت کے ارد گرد جاہلیت بھی موجود تھی جس کی اصلاح یہ سورہ مذکورہ بالا انداز میں کر رہی تھی ۔ اس پارے میں سورہ انعام کے جس حصے کی بابت ہم بات کریں گے یہ حصہ اسی صورت حالات سے متعلق ہے جبکہ سورہ انعام کا جو حصہ گزشتہ پارے میں گزر گیا ہے اس کا موضوع بھی مسئلہ الوہیت ' حاکمیت اور انسانوں کی بندگی تھا ' لیکن یہ مسئلہ وہاں عمومی طور پر لیا گیا تھا ۔ اب سیاق کلام یہاں مخصوص جاہلی رسوم کی شکل میں اسی مسئلہ الوہیت اور عبودیت کو لے رہا ہے اور دونوں کے درمیان ربط واضح ہے ' ایک جگہ اصول عام ہے اور دوسری جگہ اس کی مثال ہے ۔

اس پارے میں اب متعدد اور بے شمار مثالوں کو لے کر بعض جاہلی رسوم کو لیا گیا ہے ' کہ اہل جاہلیت نے بعض کھانوں کو حرام قرار دیا تھا اور بعض کو جائز قرار دے دیا تھا ۔ جن کا تعلق نذر و نیاز ' بعض پھلوں اور بعض بچوں سے تھا ۔ اس حوالے سے نہایت ہی مؤثر اور متعدد فیصلے کئے گئے ۔ ان فیصلوں کا ربط بعض حقائق اور اصولوں کے ساتھ ہے جو اس دین کی اساس ہیں ۔ ان قواعد اور اصولوں کے بڑے بڑے اختلافات اور نتائج کو بھی پیش کیا گیا ہے ' ان تمام باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ دین اسلام اس بات کو نہایت ہی زیادہ اہمیت دیتا ہے کہ انسان کی زندگی جاہلیت سے مکمل طور پر خالی ہو ' اور پوری کی پوری اسلام میں داخل ہو یعنی اللہ کی حاکمیت کے نیچے آ جائے ۔

اس پارے کا آغاز بطور تمہید اس بات سے کیا جاتا ہے کہ اللہ کی مشیت تمام بندوں کو گھیرے ہوئے ہے ' جنوں کو بھی اور انسانوں کو بھی اور تمام جہانوں کے واقعات اللہ کی تقدیر اور مشیت کے مطابق رونما ہوتے ہیں ۔ انسانوں اور جنوں میں سے جو لوگ شیطان ہیں ' رسولوں کے دشمن ہیں ۔ انہیں اللہ تعالیٰ مہلت دیتا ہے ' ڈھیل دیتا ہے ' تاکہ وہ جن برائیوں کا ارتکاب کرنا چاہتے ہیں ' کر لیں ۔ اگر اللہ چاہتا تو انہیں مجبور کر کے ہدایت دے دیتا اور انہیں گمراہی سے روک دیتا ' یا انہیں ہدایت دے دیتا اور راہ حق پر انہیں شرح صدر حاصل ہو جاتی یا انہیں اس بات سے روک دیتا کہ وہ رسولوں کو اذیت دیں ' مومنین کو تنگ کریں اور ان کے ہاتھ ہی رسولوں اور مومنین تک نہ پہنچ سکتے ۔ اس لئے کہ وہ جن برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور رسولوں کو اذیت دیتے ہیں تو یہ اللہ کی مشیت کے دائرے سے باہر نکل کر نہیں کرتے ' اللہ کی مشیت اور سلطنت کے اندر رہ کر وہ یہ کام کرتے ہیں ۔ یہ اللہ کی مشیت ہی ہے جس نے ان کو یہ سب کچھ کرنے کا اختیار دیا ہے کہ وہ چاہیں تو ہدایت کی راہ لیں اور چاہیں تو ضلالت کی راہ لیں ۔ وہ تو بہرحال اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں :"اور ہم نے تو اسی طرح شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القاکرتے رہتے ہیں ' اگر تمہارے رب کی مشیت یہ ہوتی کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کرتے ' پس تم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ اپنی افتراء پردازیاں کرتے رہیں اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ' ان کے دل اس دھوکے کی طرف مائل ہوں اور اس سے راضی ہو جائیں اور ان برائیوں کا اکتساب کریں جن کا اکتساب وہ کرنا چاہتے ہیں ۔"

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ انسانوں میں سے شیطان اور جنوں میں سے شیطان' سنت الٰہی کے مطابق انبیاء رسل کے دشمن ہوں گے اور یہ کہ یہ شیاطین اپنی تمام کارستانیوں کے باوجود اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کو بہت ہی برا سمجھا کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کو حکم کیسے بنا سکتا ہوں۔ یعنی تمام معاملات میں مطلقاً یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کو حکم بناؤں چاہے معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو' اس لئے کھانے پینے کی ان چیزوں میں اللہ کے سوا کسی اور کے فیصلے کو ماننے کے معنی یہ ہیں کہ ہم تمام معاملات میں غیراللہ کو حکم بنا رہے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ سے کے سوا میں کسی اور کی ربوبیت کا اقرار کیسے کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب اور اس شریعت کی صورت میں فیصلہ کن بات آگئی ہے اس لئے اللہ کی بات کے بعد کسی کی بات کا کیا موقعہ ہے اور اللہ کے حکم کے بعد کسی حکم کی ضرورت ہی کیا ہے؟ حضور اکرم ؐ کو متنبہ کر دیا گیا کہ آپ اللہ کے دین کے معاملے میں کسی انسان کی اطاعت نہ کریں۔ اس لئے کہ لوگ تو محض ظن و تخمین سے کام چلاتے ہیں اور ان کے پاس کوئی یقینی علم نہیں ہے۔ اگر کسی نے ان کی اطاعت کی تو وہ اسے گمراہ کر دیں گے۔ اس بات کا علم صرف اللہ کو ہے کہ اس کے بندوں میں سے ہدایت یافتہ کون ہے اور گمراہ کون ہے؟ یہ بات بطور تمہید یہ حکم دینے کے لئے کہی گئی کہ اگر تم مومن ہو تو ان جانوروں کو خوب کھاؤ جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہو' اور ان جانوروں کو نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو' اور اس بات سے ڈرایا گیا کہ تم حلال و حرام کے تعین میں شیطان کے دوستوں کی بات ہرگز نہ مانو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تم بھی انہی کی طرح مشرکین میں سے ہو جاؤ گے۔ آخر میں پھر ان احکامات کا خاتمہ اس وضاحت پر ہوتا ہے کہ کفر کی حقیقت کیا ہے اور ایمان کی ماہیت کیا ہے۔ اور وہ اسباب کیا ہیں جو ان کفار کو برائیوں کے ارتکاب پر مجبور کرتے ہیں۔ ذرا قرآن کے ان الفاظ پر غور کریں :

"پھر جب حال یہ ہے تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں' حالانکہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کر دی ہے' اور جن لوگوں کو ہم نے تم سے پہلے کتاب دی تھی وہ جانتے تھے کہ یہ کتاب تمہارے رب ہی کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے لہٰذا تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔ تمہارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے' کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے اور اے محمد اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو بس گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ درحقیقت تمہارا رب بہتر جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے ہٹا ہوا ہے اور کون سیدھی راہ پر ہے۔ پھر اگر تم لوگ اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اس کا گوشت کھاؤ۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو' حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالت اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے ان کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے۔ بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بناء پر گمراہ کن باتیں کرتے ہیں' ان حد سے گزرنے والوں کو تمہارا رب خوب جانتا ہے۔ تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی' جو لوگ گناہ کا اکتساب کرتے ہیں وہ اپنی کمائی کا بدلہ پاکر رہیں گے اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو اس کا گوشت نہ کھاؤ' ایسا کرنا فسق ہے۔ شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات القاء کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔ لیکن اگر تم نے ان کی اطاعت

قبول کر لی تو یقیناً تم مشرک ہو۔ کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح اس سے نہ نکلتا ہو۔ کافروں کے لئے تو اسی طرح ان کے اعمال خوشنما بنا دیئے گئے ہیں اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکر و فریب کا جال پھیلائیں۔ دراصل وہ اپنے فریب کے جال میں خود پھنستے ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ جب ان کے سامنے کوئی آیت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم نہ مانیں گے جب تک کہ وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے۔ اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغامبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔ قریب ہے وہ وقت کہ یہ مجرم اپنی مکاریوں کی پاداش میں اللہ کے ہاں ذلت اور سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔"

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ ہدایت پانے والوں کی ہدایت اور ضلالت کی راہ لینے والوں کی گمراہی دونوں کی تکمیل تب ہی ہو سکتی ہے کہ جب قدرت الٰہیہ کا منشا ہو۔ دونوں قسم کے لوگ اللہ کے قبضہ قدرت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کے تحت ہیں اور یہ دونوں اللہ کی قدرت اور مشیت کے دائرے کے اندر رہتے ہیں۔ فرمایا جا رہا ہے :

"پس حقیقت یہ ہے کہ اللہ جسے ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا کہ اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے۔ اس طرح اللہ ناپاکی ان لوگوں پر مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔"

آیات کا یہ حصہ اس بات پر اختتام پذیر ہوتا ہے کہ اس سے قبل جو امر و نہی وارد ہوئے' جو اعتقادات اور تصورات بیان کئے گئے یہ سب کے سب صراط مستقیم ہیں۔ اللہ کی مشیت اور قدرت کے تعین کے اصول اور ان اوامر و نوہی کے درمیان ربط پیدا کر کے انہیں ایک پیکج قرار دیا جاتا ہے جسے صراط مستقیم قرار دے کر حکم دیا جاتا ہے کہ اس راہ کو اپنائیں تاکہ اپنے رب کے ہاں امن و سلامتی کی منزل کو پالیں اور اللہ بہرحال ان کا ولی اور ناصر ہے۔ "حالانکہ یہ راستہ تمہارے رب کا سیدھا راستہ ہے اور اس کے نشانات ان لوگوں کے لئے واضح کر دیئے گئے ہیں جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔ ان کے لئے ان کے رب کے پاس سلامتی کا گھر ہے اور وہ ان کا سرپرست ہے' اس صحیح طرز عمل کی وجہ سے جو انہوں نے اختیار کیا۔"

ذبیحوں کی بحث اور ان کے کھانے کے مسائل ختم ہونے سے پہلے یہاں قرآن کریم ان لوگوں کے انجام کا ذکر بھی کر دیتا ہے جو شیاطین ہیں اور جن و انس دونوں میں سے ہیں اور جو اس وقت اہل ایمان کے ساتھ ان ذبیحوں کے مسائل پر سخت الجھ رہے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ آخری انجام اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ قادر مطلق اور حاکم ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو جسے چاہے اس زمین کی خلافت عطا کرتا ہے۔ جس کے بارے میں چاہے اسے اس جہان سے حرف غلط کی طرح مٹا دے۔ اس بات پر سخت تنبیہ کی جاتی ہے کہ کوئی شخص خودسری اختیار نہ کرے اس لئے کہ اسے جو آزادی اور اختیار دیا گیا ہے وہ خودسری کے لئے نہیں دیا گیا بلکہ اسے آزمانے کے لئے دیا گیا ہے اور مہلت دی گئی ہے کہ وہ کس راہ پر چلتا ہے اور آخر کار جب مہلت ختم ہوگی تو اس سے مواخذہ ہو گا اور جو کچھ اس نے کمایا اس کی سزا بھگتے گا۔ "اور جس روز اللہ ان سب لوگوں کو گھیر کر جمع کرے گا' اس روز جنوں سے خطاب کر کے فرمائے گا "اے گروہ جن! تم نے نوع

انسانی پر خوب ہاتھ صاف کیا۔" انسانوں میں سے جو ان کے رفیق تھے وہ عرض کریں گے پروردگار! ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے کو خوب استعمال کیا ہے' اور اب ہم اس وقت پر آپہنچے ہیں جو تو نے ہمارے لئے مقرر کر دیا ہے۔ اللہ فرمائے گا "اچھا اب آگ تمہارا ٹھکانا ہے' اس میں تم ہمیشہ رہو گے۔" اس سے بچیں گے صرف وہی جنہیں اللہ بچانا چاہے گا' بے شک تمہارا رب دانا اور علیم ہے۔ دیکھو اس طرح ہم ظالموں کو ایک دوسرے کا ساتھی بنائیں گے۔ اس کمائی کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے .... "اے گروہ جن و انس! کیا تمہارے پاس خود تم ہی میں سے وہ پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم کو میری آیات سناتے اور اس دن کے انجام سے ڈراتے تھے۔" وہ کہیں گے "ہاں! ہم اپنے خلاف خود گواہی دیتے ہیں۔" آج دنیا کی زندگی نے ان لوگوں کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ مگر اس وقت وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔ تمہارا رب بستیوں کو ظلم کے ساتھ تباہ کرنے والا نہ تھا بلکہ ان کے باشندے حقیقت سے ناواقف تھے۔ ہر شخص کا درجہ اس کے عمل کے لحاظ سے ہے اور تمہارا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ تمہارا رب بے نیاز ہے اور مہربانی اس کا شیوہ ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے اور تمہاری جگہ دوسرے جن لوگوں کو چاہے لے آئے' جس طرح اس نے تمہیں کچھ اور لوگوں کی نسل سے اٹھایا ہے۔ تم سے جس چیز کا وعدہ کیا جا رہا ہے وہ یقیناً آنے والی ہے اور تم خدا کو عاجز کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اے محمد ؐ! کہہ دو کہ لوگو تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو اور میں بھی اپنی جگہ عمل کر رہا ہوں' عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ انجام کار کس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔"

اب ذرا غور کیجئے کہ کھانے یا نہ کھانے کا ایک جزئی مسئلہ ہے کہ کون سے ذبیحے کا کھانا جائز ہے اور کس کا ناجائز ہے؟ لیکن اس جاہلی رسم و رواج کے مقابلے میں قرآن اسلامی نظریہ حیات کا اساسی تصور پیش کرتا ہے۔ نہایت ہی مؤثر اشارات اور مختلف قسم کے مشاہدات سے اللہ کی مشیت کے بعض حقائق پر روشنی ڈالی جاتی ہے' اللہ کے بعض تکوینی تصرفات کو پیش کیا جاتا ہے' انسانی نفسیات کے بعض اصولوں سے پردہ اٹھایا جاتا ہے' انسانی زندگی کے بعض ظاہری اور بعض خفیہ میلانات کو ظاہر کیا جاتا ہے' زمین و آسمان پر اللہ کی حاکمیت کے بارے میں بعض حقائق پیش کئے جاتے ہیں' دنیا و آخرت میں اور ان سب امور کو محض ایک جزوی مسئلہ حلت و حرمت کے ضمن میں۔ سوال یہ ہے کہ اس مسئلے کو اس قدر اہمیت کیوں دی گئی؟ اس لئے کہ یہ اس دین کا اساسی مسئلہ ہے۔ یہ اس کرۂ ارض پر اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت کا مسئلہ ہے کہ یہ حق کس کو حاصل ہے؟ بالفاظ دیگر یہ الوہیت اور ربوبیت کا مسئلہ ہے اور فیصلہ یہ کرنا ہے کہ الٰہ اور رب کون ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اس جزوی مسئلے کے بیان کے ضمن میں اس قدر اساسی نظریاتی مباحث کو یہاں لایا گیا ہے۔

یہی تمام امور مسئلہ نذر و نیاز کے بیان کے ضمن میں بیان ہوئے ہیں یعنی پھلوں' مویشیوں اور اولاد کے بارے میں جاہلیت میں مروج نذر و نیاز کے بارے میں ...... وجہ یہ ہے کہ عرب جاہلیت ذات باری کی منکر نہ تھی۔ اسی طرح دور جاہلیت کے عرب اللہ کے ساتھ مساوی طور پر کسی اور کو الٰہ بناتے تھے۔ ان کی کج فکری یہ تھی کہ وہ اللہ کے ساتھ کچھ اور الٰہ قرار دیتے تھے اور مقام و مرتبہ کے اعتبار سے ان کے الٰہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کم مرتبہ ہوتے تھے اور وہ کہتے یہ تھے کہ ان دوسری شخصیات کو ہم الٰہ اس لئے قرار دیتے ہیں کہ ان کے ذریعے ہم اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں اور یہی وہ شرک تھا جس کا وہ ارتکاب کرتے تھے اور اسی وجہ سے قرآن انہیں مشرکین کا لقب دیتا ہے۔

نیز ان کے شرک میں سے ایک شرک یہ تھا کہ اپنے کاہنوں اور اپنے مشائخ کے ذریعے انہوں نے اپنے لئے کچھ توانین اور کچھ رسم و رواج گھڑ لئے تھے جو ان کے لئے شریعت کا درجہ رکھتے تھے۔ اور ان کا زعم یہ تھا کہ یہ توانین اور رسوم ان کے لئے اللہ نے تجویز کئے ہیں اور اللہ نے انہیں حکم دیا ہے کہ وہ ان کی پابندی کریں۔ وہ اس قدر شدید مشرک نہ تھے کہ وہ ان توانین اور رسوم کو اپنی طرف منسوب کرتے اور یہ دعویٰ کرتے کہ اقتدار اعلیٰ کا حق خود انہیں حاصل ہے اور انہیں حق ہے کہ اپنے لئے جو چاہیں قانون سازی کریں۔ یہ خودسری تو دور حاضر کے مشرکین نے سیکھی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے سوا از خود اپنے لئے قانون سازی کر سکتے ہیں۔ یہی ان کا شرک تھا اور اسی وجہ سے وہ مشرکین کہلائے۔

یہ توانین اور رسومات جو انہوں نے خود اپنے لئے گھڑ لئے تھے اور زعم یہ تھا کہ وہ خدا کی طرف سے ہیں ان میں ان کے توانین نذر و نیاز بھی تھے جو انہوں نے اپنے پھلوں اور مویشیوں کے بارے میں وضع کئے تھے۔ یہ توانین انہوں نے خود بنائے تھے یا ان کے کاہنوں اور شیوخ نے بنائے تھے۔ بہرحال وہ ایسے تھے کہ "جو ان کے شرکاء کے لئے ہوتا وہ اللہ کے حصے کے ساتھ نہ مل سکتا اور جو اللہ کے لئے ہوتا وہ ان کے شرکاء کے حصص کے ساتھ مل سکتا۔" مثلاً وہ اپنی اولاد میں سے بعض کی منت مانتے اور اس طرح وہ اپنے بنائے ہوئے توانین کے مطابق اپنی بیٹیوں کو قتل کرتے۔

ان توانین میں سے ایک قانون یہ تھا کہ وہ بعض فصلوں 'پھلوں اور مویشیوں کو بند کر دیتے اور یہ کہتے کہ ان کا استعمال صرف ان کے لئے جائز ہو گا جنہیں اللہ اجازت دے حالانکہ ان چیزوں کو حرام بھی وہ خود قرار دیتے اور جن لوگوں کے لئے ان کا استعمال جائز تھا ان کا تعین بھی وہ خود کرتے۔ بعض توانین ایسے تھے کہ وہ بعض مویشیوں پر سواری حرام قرار دیتے مثلاً بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام۔ (دیکھئے سورہ مائدہ)

ایک قانون یہ بھی تھا کہ وہ مویشیوں کے بعض حمل کو مردوں کے لئے خاص کر دیتے اور عورتوں پر حرام کر دیتے الا یہ کہ مویشیوں کا بچہ مردہ پیدا ہو تو اس صورت میں دونوں شریک ہوتے۔ یہ لوگ ایک چیز کو حرام قرار دیتے اور دوسری کو حلال قرار دیتے۔ ایک قانون یہ بھی تھا کہ وہ مردار کو حلال قرار دیتے اور یہ کہتے کہ اسے خود اللہ نے ذبح کیا ہے۔

اسلام ان تمام باتوں پر ایک کھلا حملہ کرتا ہے۔ اس تنقیدی حملے میں بنیادی نظریاتی فیصلے کئے جاتے ہیں۔ ان جزوی توانین اور مسائل کے بارے میں قرآن کریم نہایت ہی مؤثر حقائق اور شواہد پیش کرتا ہے۔ وہ شواہد و حقائق جو قرآن اس پوری مدت میں ایمان و شرک کے موضوع پر لاتا ہے۔ اس لئے کہ ان جزوی مسائل کا تعلق بھی شرک اور ایمان کے اصولی مسائل کے ساتھ ہے۔ یہ جزوی مسائل وہ ہیں جن پر ایمان اور شرک کے اصولوں کی تطبیق اور اطلاق ہوتا ہے۔

اس تنقیدی حملے کا مطالعہ کر کے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسائل جزئی مسائل نہیں بلکہ اس دین کے اساسی مسائل ہیں۔ ان کا تعلق نظریات کے ساتھ ہے۔ یہ توانین اور یہ رسوم ان مشرکین کے لئے ان لوگوں نے مزین کر کے تجویز کئے ہیں جن کو یہ لوگ اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ یہ شرکاء ان مشرکین کی زندگی کو تباہ کرتے ہیں اور ان پر دین کو مشتبہ بناتے ہیں۔ یہ دینی تلبیس اور زندگی کی تباہ کاریاں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں یا تو لوگ شریعت کے پیروکار ہوں گے اور اس صورت میں ان کی زندگی صحیح و سلامت ہوگی اور یا وہ اسلامی شریعت سے متضاد شریعت پر چلتے ہوں گے تو اس صورت میں وہ کوئی سیدھی راہ نہ پا سکیں گے اور ان کی زندگی خطرے میں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

(وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ (٦ : ١٣٧)) "اور اسی طرح بہت سے مشرکین کے لئے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔"

اس تنقیدی مہم کے دوران یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ شریعت خداوندی سے سرتابی کی پشت پر ہمیشہ شیطانی سازش ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی قوم شریعت کو چھوڑتی ہے تو وہ جن لوگوں کی بھی اطاعت کرے گی وہ اللہ کے شرکاء ہوں گے۔ اس مہم کا اہم عنصر یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اور جب اس کی یہ سازش کامیاب ہوتی ہے تو وہ ایسے مشرکین کی قیادت ہلاکت اور تباہ کن گھاٹے کی طرف کرتا ہے۔

(كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (٦ : ١٤٢)) "کھاؤ ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں بخشی ہیں اور شیطان کی پیروی نہ کرو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔" اس مہم سے معلوم ہوتا ہے کہ حلال و حرام کا شریعت اسلامیہ کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے تعین کرنا کھلا شرک ہے اور یہ شرک جلی کے برابر ہے۔ لیکن تمام زمانوں میں مشرکین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ شرک کرنے پر مجبور ہیں ورنہ وہ اللہ کی قوت قاہرہ کے خلاف کیونکر جا سکتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کی مشیت تو یہ تھی کہ اس نے ہر انسان کو ایک حد تک مختار بنایا ہے اور اسی اختیار کے نتیجے میں اس کے لئے آزمائش لازمی کی ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے کسی کو بھی اس بات پر مجبور نہیں کیا کہ وہ شرک کرے بہرحال وہ آزمائش میں ہیں اور اللہ کے دائرہ قدرت کے اندر ان کی آزمائش ہو رہی ہے۔

(سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ (١٤٨) قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ (١٤٩)) "یہ مشرک لوگ ضرور کہیں گے کہ "اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔" ایسی ہی باتیں بنا کر ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا تھا یہاں تک کہ آخرکار ہمارے عذاب کا مزہ انہوں نے چکھ لیا۔ ان سے کہو "کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو۔" پھر کہو، تمہاری (اس حجت کے مقابلے میں) حقیقت تک پہنچنے والی حجت تو اللہ کے پاس ہے، بے شک اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔"

اب اس کے بعد ہمارے سامنے طلب ثبوت اور شہادت کا ایک منظر آتا ہے۔ ان سے یہ ثبوت مانگا جاتا ہے کہ اپنے مزعومات کے بارے میں وہ دعویٰ کرتے کہ ان کو اللہ نے حرام کیا ہے تو اس پر وہ گواہ لائیں۔ اس سے ذہن اس طرف

منتقل ہو جاتا ہے کہ اس سورہ کے آغاز میں بھی اللہ کی حاکمیت کے مسئلے پر ان سے ثبوت اور شہادت طلب کی گئی تھی - اس لئے کہ اللہ کی حاکمیت اور حلال و حرام کے تعین کے اختیارات کا آپس میں چولی دامن کا تعلق ہے - اور یہ کہ حلال و حرام کے تعین کا اختیار اللہ کی حاکمیت کے مخصوص ترین خصائص میں سے ایک ہے - اور یہی حقیقی سوال ہے -

(قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَ كُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ (٦ : ١٥٠)) "ان سے کہو "لاؤ اپنے وہ گواہ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ ہی نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے -" پھر اگر وہ شہادت دے دیں تو ان کے ساتھ شہادت نہ دینا اور ہرگز ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے اور جو آخرت کے منکر ہیں اور جو دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں -" یہاں لفظ (يَعْدِلُوْنَ) ذہن کو اس سورہ کے آغاز میں 'عقیدۂ توحید کے ذکر کے وقت اسی لفظ کے استعمال کی طرف متوجہ کرتا ہے' وہاں بھی مشرکین کو یہ کہا گیا کہ وہ دوسروں کو اللہ کا ہمسر بناتے ہیں - (يَعْدِلُوْنَ) دیکھئے سورہ انعام آیت (۱)

اس کے بعد یہ مہم اس آخری فیصلے پر ختم ہوتی ہے کہ قانون سازی اور مویشیوں اور ان کے بچوں اور پھلوں کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کیا ہے وہی صراط مستقیم ہے - یہی انداز گفتگو اس سے پہلے ذبیحوں کی حلت اور حرمت کے مضامین کے وقت اختیار کیا گیا تھا اور یہی انداز اس سورہ کے آغاز میں مسئلہ الوہیت کے بیان کے وقت اختیار کیا گیا تھا -

(وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (٦:١٥٣)) "نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے - یہ ہے وہ ہدایت جو رب نے تمہیں کی ہے 'شاید کہ تم کج روی سے بچو -"

بات ان اقتباسات پر ختم نہیں ہو جاتی جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا 'بلکہ اس سے آگے یہ بتایا جاتا ہے کہ اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اپنی قوم کے لئے ایک کتاب لے کر آئے تھے جس کے اندر تمام امور کی تفصیلات تھیں - وہ ہدایت اور رحمت تھی اور اس کتاب کا مقصد بھی یہ تھا کہ لوگ قیامت کی جوابدہی پر ایمان لے آئیں - اس کتاب کا مقصد بھی یہ ہے کہ مسلمان اس کی اطاعت کریں اور خدا ترسی کا رویہ اختیار کریں تاکہ ان پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں اور وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ اللہ نے یہود و نصاریٰ کے لئے تو مفصل کتابیں بھیجیں مگر ہمارے لئے کوئی کتاب نہ بھیجی جس میں ہمارے لئے تفصیلی ہدایات ہوں اور انہیں معلوم ہو کہ شریعت کے احکام کیا ہیں اور یہ کہ انہیں جو باتیں شریعت کی بتائی جاتی ہیں وہ شریعت نہیں ہے اور محض افتراء ہے -

اس کے بعد ان لوگوں کو تہدید آمیز تنبیہ کی جاتی ہے جو حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے اور اس

جاہلی نظام پر قائم رہتے ہیں جسے وہ من جانب اللہ کہتے ہیں اور ان کا یہ دعویٰ صریح افتراء ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ایسے خارق العادت معجزات کا بھی مطالبہ کرتے ہیں جن کے نتیجے میں وہ تصدیق اور اتباع پر مجبور ہو جائیں۔ ان لوگوں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ جس دن ایسے معجزات آگئے تو وہ دن ان کا آخری دن ہو گا اور اس کے بعد وہ ہلاک اور نیست و نابود کر دیے جائیں گے۔

(هَلْ يَنْظُرُونَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ (٦:١٥٨)) ”کیا اب یہ لوگ اس کے منتظر ہیں کہ ان کے سامنے فرشتے کھڑے ہوں یا تمہارا رب خود آ جائے' یا تمہارے رب کی صریح نشانیاں نمودار ہو جائیں؟ جس روز تمہارے رب کی بعض مخصوص نشانیاں نمودار ہو جائیں گی پھر کسی ایسے شخص کو اس کا ایمان کچھ فائدہ نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو' جس نے اپنے ایمان میں کوئی بھلائی نہ کمائی ہو۔ اے محمدؐ! ان سے کہہ دو کہ اچھا' تم انتظار کرو' ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔“ اس کے بعد یہ فیصلہ آتا ہے کہ حضرت محمدؐ' امت مسلمہ اور دین اسلام اور ان لوگوں کے درمیان اتحاد ممکن ہی نہیں ہے جو اللہ کی شریعت کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے لئے حلال و حرام اور جائز و ناجائز مقرر کرتے ہیں اور اپنے لئے شریعت خود بناتے ہیں اور اس پر یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ یہ شریعت الٰہیہ ہے۔

(اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (٦:١٥٩)) ”جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں۔ ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے' وہی ان کو بتائے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے۔“ اللہ کا فیصلہ بہت ہی واضح ہے۔ لست منهم في شيء ”ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں ہے۔“ اب یہ سورہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور قانون سازی اور اللہ کی حاکمیت کو نہایت ہی مفصل اور واضح انداز میں بیان کر دیا جاتا ہے' بظاہر تو یہ موضوع ایک جزئی موضوع نظر آتا ہے' لیکن یہاں اس نظریاتی مسئلے کو نہایت ہی اصولی انداز میں پیش کیا جاتا ہے اور پورے دین کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ مسائل دین اسلام کے مقاصد و نظریات ہیں۔ ان کے بارے میں اہل اسلام کا قلب و نظر صاف اور یکسو ہونا چاہئے اور پھر اس نظریے' اس عقیدے اور یکسوئی کو ایک مفصل نظام حیات کی شکل میں ظاہر ہونا چاہئے۔

(قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (١٦١) قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ

الْعٰلَمِيْنَ (۱۶۲) لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (۱۶۳) قُلْ
اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ
وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ
(۱۶۴) وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ
لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۶۵))

"اے محمد ؐ! کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھایا ہے' بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں' ابراہیم کا طریقہ جسے یکسو ہوکر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو' میری نماز میرے تمام مراسم عبودیت' میرا جینا' میرا مرنا' سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔ کہو' کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے؟ ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے' کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا' پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے' اس وقت وہ تمہارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیئے' تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے۔ اور بہت درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔"

یہ وہ مسائل ہیں جو اسلامی نظریہ حیات اور دین اسلام کے اساسی مسائل ہیں۔ دنیا و آخرت کے بارے میں ہدایات' زندگی اور موت کے مسائل' عمل اور مکافات عمل کے مسائل' عبادت اور احسان کے مسائل اور ان تمام مسائل کو زبانی اسلوب بیان اس سورہ کے اس رعب دار اختتامیہ میں نہایت ہی پرشوکت اور خوفناک انداز میں جمع کر دیتا ہے۔ اللہ کی حاکمیت اور سلطنت اور اس کی قانون سازی کے حق کے اعلیٰ ترین مسئلے کو نہایت ہی سادہ اور روزمرہ کے مسائل یعنی کھانے پینے کے عام مسائل کے ضمن میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ کی حاکمیت اور ربوبیت بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے معاملات میں اپنا فیصلہ کرتی ہے......... یہ ہے اسلام جس کی تشریح خود قرآن مجید کر رہا ہے جو کلام اللہ العالمین ہے۔

---000---

درس ۶۷ تشریح آیات

۱۱۱ --- تا --- ۱۱۳

یہ پارہ ہشتم کی ابتدائی آیات ہیں۔ ان میں سے پہلا پیرا گراف پارہ ہفتم کی آخری آیات سے متعلق ہے۔ پارہ ہفتم کی آخری آیات میں مشرکین عرب کی اس تجویز کا ذکر تھا کہ حضور ؐ ان کے سامنے، خود ان کے تجویز کردہ معجزات پیش کریں۔ اور وہ اپنی اس بات پر قسمیں کھاتے تھے کہ اگر ان کے طلب کردہ معجزات پیش کر دیے جائیں تو وہ آپ کی تصدیق کریں گے اور آپ پر ایمان لائیں گے۔ ان لوگوں کی ان قسموں کی وجہ سے بعض اہل اسلام بھی دل ہی دل میں یہ خواہش رکھتے تھے کہ اگر اللہ ان لوگوں کی اس خواہش کو پورا کر دے تو بہتر ہو، اور یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ مطالبہ کرتے تھے کہ آپ بھی اللہ تعالیٰ سے یہ مطالبہ فرمائیں کہ اللہ ان لوگوں کی خواہشات کو پورا کر دے۔ پارہ ہفتم اور پارہ ہشتم کے ان حصوں کا پورا مضمون یوں ہے۔

(وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰۹) وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۱۱۰) وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ (۱۱۱) (۶: ۱۰۹ تا ۱۱۱)) "یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی (یعنی معجزہ) ہمارے سامنے آجائے تو ہم اس پر ایمان لائیں گے۔ اے نبی ؐ! ان سے کہو کہ نشانیاں تو اللہ کے اختیار میں ہیں" اور تمہیں کیسے سمجھایا جائے کہ اگر نشانیاں آ بھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں۔ ہم اسی طرح ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر رہے ہیں جس طرح یہ پہلی مرتبہ اس کتاب پر ایمان نہیں لائے تھے۔ ہم انہیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر ہم فرشتے بھی ان پر نازل کر دیتے اور مردے ان سے باتیں کرتے اور دنیا بھر کی چیزوں کو ہم ان کی آنکھوں کے سامنے جمع کر دیتے تب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے الا یہ کہ مشیت الٰہی یہی ہو (کہ یہ ایمان لائیں) مگر اکثر لوگ نادانی کی باتیں کرتے ہیں۔"

ان آیات کی تفسیر ہم پارۂ ہفتم میں کر آئے ہیں۔ یہاں ہم وہ عمومی حقائق بیان کریں گے جو ان آیات میں دیئے گئے ہیں اور جن کے بارے میں وہاں بات نہ ہوئی تھی۔

۱۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ ایمان و کفر' اور ہدایت و ضلالت کا دار و مدار صرف دلائل پر نہیں ہوتا کہ اگر کسی سچائی پر دلائل نہ دیئے گئے تھے تو لوگ اسے تسلیم نہ کریں گے۔ بلکہ سچائی تو بذات خود ایک دلیل ہوتی ہے۔ سچائی کے اندر بذات خود اس قدر قوت ہوتی ہے کہ وہ قلب انسانی پر چھا جاتی ہے' ہر انسان کا دل اس پر مطمئن ہو جاتا ہے اور اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے لیکن کچھ دوسرے داخلی اور خارجی اسباب ایسے ہوتے ہیں جو کسی انسان اور قبولیت حق کے درمیان رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ ایسی ہی رکاوٹوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَمَا يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَآ إِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُونَ (۱۰۹) وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِۦٓ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِى طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ (۱۱۰) "اور تمہیں کیسے سمجھایا جائے کہ اگر نشانیاں آبھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں۔ ہم اسی طرح ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر رہے ہیں جس طرح یہ پہلی مرتبہ اس کتاب پر ایمان نہیں لائے تھے۔ ہم انہیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑے دیتے ہیں۔"

سوال یہ ہے کہ پہلی بار جب ان کے سامنے دعوت اسلامی پیش ہوئی تو انہوں نے کیوں نہ اسے قبول کیا؟ اور اگر معجزات آبھی جائیں تب بھی کیا گارنٹی ہے کہ وہ دوبارہ انکار نہ کریں گے اور ان نامعلوم اسباب کی وجہ سے کیوں وہ دوبارہ انکار نہ کر دیں گے؟

یہ حقیقت ہے کہ ایمان کے دواعی دلوں کے اندر ہوتے ہیں' نیز سچائی کے اندر بھی وہ دواعی موجود ہوتے ہیں۔ قبولیت حق کا تعلق خارجی عوامل سے ہرگز نہیں ہوتا لہذا ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے اس دل کا علاج کریں اور دل کو ان بیماریوں سے بچائیں جو قبولیت حق کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔

۲۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کا دار و مدار مشیت الٰہیہ پر ہے۔ اللہ کی مشیت کا تقاضا یہ ہوا کہ انسان کو اس قدر آزادی اور اختیار دیا جائے کہ وہ آزادی کے ساتھ کسی بھی راستے کی طرف متوجہ ہو جائے اور انسان کو جو آزادی دی گئی ہے یہی اس کی مسئولیت اور اس کی آزمائش کا سبب ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اپنی اس آزادی کو کس طرح استعمال کرتا ہے؟ اگر اسے کوئی قبولیت حق کی طرف رغبت اور توجہ کے لئے استعمال کرتا ہے اور راہ ہدایت پانے کی سعی کرتا ہے' اگرچہ اسے معلوم نہ ہو کہ ہدایت کہاں ہے تو اس صورت میں مشیت الٰہی کی دست گیری کرتی ہے' اس کے ساتھ اللہ کی توفیق شامل ہو جاتی ہے اور وہ صحیح راستے پر آجاتا ہے اور جو شخص اس آزادی کو ہدایت کے ساتھ نفرت کرنے اور راہ ہدایت پانے کے ذرائع سے منہ موڑنے کے لئے استعمال کرتا ہے تو اللہ کی مشیت اسے راہ حق سے دور پھینک دیتی ہے اور وہ اندھیروں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں انسان اور اس کے حالات اللہ کے ارادے اور اللہ کی قدرت کے دائرے کے اندر ہوتے ہیں اور مآل امر تمام کا تمام اللہ کی ذات کی طرف ہوتا ہے۔ اس حقیقت کی طرف درج ذیل آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ (۱۱۰) ''اور ہم اسی طرح ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر رہے ہیں جس طرح یہ پہلی مرتبہ اس کتاب پر ایمان نہیں لائے تھے۔ہم انہیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔'' اور دوسری آیت میں ہے :

وَلَوْ أَنَّنَا نَزَّلْنَآ إِلَيْهِمُ الْمَلَٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَىٰ وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوا لِيُؤْمِنُوٓا إِلَّآ أَن يَشَآءَ اللَّهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ ﴿۱۱۱﴾

''اگر ہم فرشتے بھی ان پر نازل کر دیتے اور مردے ان سے باتیں کرتے اور دنیا بھر کی چیزوں کو ہم ان کی آنکھوں کے سامنے جمع کر دیتے تب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے' الا یہ کہ مشیت الٰہی یہی ہو کہ (یہ ایمان لائیں) مگر اکثر لوگ نادانی کی باتیں کرتے ہیں۔'' اور اسی پیراگراف میں ایک سابقہ آیت بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے :

(اتَّبِعْ مَآ أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ (۶:۱۰۶)) وَلَوْ شَآءَ اللَّهُ مَآ أَشْرَكُوا وَمَا جَعَلْنَٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا وَمَآ أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ (۱۰۷)) ''اے نبی '' اس وحی کی پیروی کیے جاؤ جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے کیونکہ اس ایک رب کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ اور مشرکین کے پیچھے نہ پڑو۔ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو (وہ ایسا بندوبست کر سکتا تھا کہ) یہ لوگ شرک نہ کرتے۔تم کو ہم نے ان پر پاسباں مقرر نہیں کیا اور نہ تم ان پر حوالہ دار ہو۔''

(وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَٰطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ (۶:۱۱۲) ''اور ہم نے تو اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القاکرتے رہے ہیں۔اگر تمہارے رب کی مشیت یہ ہوتی کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کرتے۔پس تم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ اپنی افترا پردازیاں کرتے رہیں۔''

لہٰذا بات پوری کی پوری مشیت الٰہیہ پر موقوف ہے۔یہ اللہ ہی تو ہے جس نے یہ چاہا کہ یہ لوگ ہدایت نہ پائیں اس لئے کہ ان کو جو قوت تمیزی دی گئی تھی اور جو دائرۂ اختیار دیا گیا تھا اس میں انہوں نے ان اسباب کو نہ اپنایا جو

اسباب ہدایت تھے - یہ اختیار اللہ نے ان لوگوں کو اس لئے دیا تھا کہ وہ ان کو آزمائے - ہاں جب وہ اسباب ہدایت اپنائیں اور سعی کریں تو ہدایت دینے والا وہی ہے اور جب وہ ضلالت کے اسباب اپنائیں تب بھی گمراہ کرنے والا بھی اللہ ہے - اور اس اسلامی تصور حیات میں کوئی تعارض اور تضاد نہیں ہے - اللہ کی مشیت مطلقہ اور انسان کی محدود مقدار آزادی کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے - (تفصیلات کے لئے دیکھئے 'خصائص التصور الاسلامی حصہ اول)

۳- تیسری حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کرنے والے اور گمراہی کا راستہ اختیار کرنے والے دونوں اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں - دونوں اللہ کے سامنے مغلوب اور محکوم ہیں - یہ دونوں مل کر بھی اتنی قوت نہیں رکھتے کہ کوئی چیز اللہ کی تقدیر اور توفیق کے بغیر سامنے لا سکیں - تمام معاملات یہاں سنن الہیہ کے مطابق طے پاتے ہیں اور انہی کے مطابق اللہ یہاں معاملات کو چلاتے ہیں - مومنین کو جو محدود اختیار دیا گیا ہے وہ اسے بھی اللہ کی مشیت اور تقدیر کے مطابق استعمال کرتے ہیں - وہ اپنے اجسام کے اندر جاری و ساری قانون قدرت ' اپنے مزاج ' اپنے خلیوں اور اپنی عضویاتی اور نفسیاتی ساخت اور اپنے دائرہ اختیار کے اندر ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں اور اس اختیاری حصے میں وہ پابندی اللہ کی ہدایت کی وجہ سے کرتے ہیں - یوں وہ خود اپنی ذات کے ساتھ بھی ہم نشینی اور مطابقت پیدا کر لیتے ہیں 'کیونکہ اس صورت میں انسان کی ذات کے اندر جاری و ساری ناموس اور ان کی اختیاری زندگی کے اندر جاری ناموس ایک ہی ناموس ہوتا ہے اور تکوینی زندگی اور اختیاری زندگی کے اندر ایک ہی حکومت چلتی رہتی ہے - رہے اہل کفر تو وہ تکوینی زندگی میں تو ناموس الہیہ کی اطاعت پر مجبور ہوتے ہیں اور کسی صورت میں بھی اس سے نکل نہیں سکتے - وہ اسی ناموس کے مطابق اپنی جسمانی ضروریات پوری کرتے ہیں - رہی ان کی اختیاری زندگی تو اس میں وہ اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں اور اس زندگی میں وہ اللہ کے ضابطہ حکمرانی یعنی نظام شریعت کے خلاف جاتے ہیں - اس تضاد کی وجہ سے ان کی پوری زندگی بے چینی سے گزرتی ہے' اس لئے کہ وہ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہوتے ہیں اور اس سے کسی بھی وقت میں خارج نہیں ہو سکتے اور وہ اس تقدیر الہیہ کے مطابق ہی چل سکتے ہیں -

اس سورہ کا بقیہ حصہ اسی تیسری حقیقت سے بحث کرتا ہے - متعدد مقامات میں اور بار بار تکرار کے ساتھ اس حقیقت کو اس میں بیان کیا گیا ہے - جیسا کہ اس سے قبل ہم اس نکتے کو بیان کر کے آئے ہیں اس سورہ میں اللہ کی حاکیت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کی بحث ہو گی کہ اللہ کی حاکیت کس طرح لوگوں کی زندگی اور ان کے شرعی عمل میں کارفرما ہو گی - یہی وجہ ہے کہ اس حصے میں انداز کلام یوں ہو گا کہ اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کے لئے ہو گا - یہاں تک کہ جو لوگ اللہ کے نافرمان اور باغی ہیں وہ بھی اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں - یہ باغی بھی اللہ کے دوستوں کو کوئی تکلیف نہیں دے سکتے ' الا ماشاء اللہ ' اس لئے کہ وہ اس قدر عاجز ہیں کہ وہ خود اپنی ذاتوں پر قادر نہیں ہیں - وہ اہل ایمان پر قدرت کس طرح رکھیں گے - یہ صرف ذات باری کی مشیت ہے جو بیک وقت اہل ایمان اور اہل کفر پر حکمران ہے -

ابو جعفر محمد ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں :

"اللہ تعالیٰ اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہیں : اے محمد ان لوگوں کی نجات اور فلاح سے آپ اپنے آپ کو مایوس کر دیں کیونکہ یہ لوگ بتوں اور مورتیوں کو اللہ کے برابر ٹھہراتے ہیں - یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی معجزہ یا نشانی آ جائے تو وہ ایمان لائیں گے - اگر ہم ملائکہ بھی بھیج دیں اور یہ لوگ انہیں اپنی آنکھوں سے

دیکھ لیں اور مردے اٹھ کر ان کے ساتھ بات کرنا شروع کر دیں' مثلاً اگر ہم ان کو معجزانہ طور پر زندہ کر دیں اور بطور ثبوت آپ کی نبوت پر پیش کر دیں اور وہ مردے کہہ دیں کہ آپ برحق ہیں اور یہ کلام' کلام الٰہی ہے اور ہم ان پر تمام مخلوق کو اٹھا کر ان کے سامنے پیش کر دیں تو بھی یہ نہ تو ایمان لائیں گے اور نہ آپ کی تصدیق کریں گے۔ الا ماشاء اللہ جن کے بارے میں اللہ چاہے' لیکن ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں۔ یعنی وہ نہیں جانتے کہ معاملات کس نہج پر جا رہے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایمان و کفر ان کے دائرۂ اختیار میں ہے جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر اختیار کرے حالانکہ بات اس طرح نہیں ہے۔ یہ تمام امور تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ ان میں سے کوئی اس وقت تک ایمان نہیں لا سکتا جب تک اللہ کی ہدایت و توفیق شامل حال نہ ہو۔ اور کفر بھی فقط وہی اختیار کرے گا جسے اللہ شرمندہ کر کے گمراہ کر دے۔"

یہاں ابن جریر جس اصول کا ذکر کر رہے ہیں وہ صحیح ہے لیکن اس امر اور نکتے کی مزید وضاحت کی ضرورت ہے۔ اور یہی تو وہ منہج ہے جس کی تشریح ہم نے گزشتہ صفحات میں کی اور یہ نکتہ ہم نے ہدایت و ضلالت کے بارے میں آنے والی تمام نصوص پر غور کرنے کے بعد سمجھا ہے۔ اس لئے کہ ایمان و کفر دونوں حادث ہیں اور کوئی حادث اللہ کی مشیت کے بغیر حادث ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

(اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ) ہم نے ہر چیز کو ایک مقدار کے ساتھ پیدا کیا ہے۔" رہی وہ سنت الٰہیہ جس کی اساس پر کوئی گمراہ بن جاتا ہے اور کوئی راہ ہدایت پاتا ہے تو اس کا بیان ان ہی نصوص میں ہوا ہے۔ انسان اپنے مقدار اختیار کے مطابق آزمائش میں ہے۔ جب وہ راہ ہدایت کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اللہ اسے ہدایت دیتا ہے اور یہ سہولت بھی اسے تقدیر الٰہی کے مطابق ملتی ہے اور جب کوئی شخص راہ راست کو ناپسند کرنے لگے اور غلط راہ کو اختیار کرے تو اللہ اسے گمراہ کر دیتا ہے اور یہ ضلالت بھی تقدیر الٰہی کے مطابق ہوا کرتی ہے۔ دونوں قسم کے حالات میں انسان اللہ کے قبضہ قدرت میں اور اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے تحت ہوتا ہے۔ اس کی زندگی اللہ کی تقدیر کے مطابق ہی چل رہی ہوتی ہے یعنی سنت الٰہیہ کے مطابق۔ اور اللہ کی تقدیر اور اس کی مشیت بے قید ہے۔

---ooo---

اس کے بعد سیاق کلام میں دو آیات آتی ہیں اور ان آیات میں وہی مفہوم بیان ہوئے ہیں جن کے بارے میں اوپر ہم تفصیلاً بات کر آئے ہیں۔ دوسری جانب یہ دو آیات اللہ کی حاکمیت' اس کے اقتدار اعلیٰ اور نظام شریعت کے بارے میں آنے والی تصریحات کے لئے تمہیدی آیات ہیں کیونکہ اس سورہ کے بقیہ حصے میں یہی مضامین ہیں۔ وہ دو آیتیں یہ ہیں:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا

يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوا مَا هُم مُّقْتَرِفُونَ﴿۱۱۳﴾

"اور ہم نے تو اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے رہے ہیں۔ اگر تمہارے رب کی مشیت یہ ہوتی کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کرتے۔ پس تم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ اپنی افترا پردازیاں کرتے رہیں۔ (یہ سب کچھ ہم انہیں اسی لئے کرنے دے رہے ہیں کہ) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل اس خوشنما دھوکے کی طرف مائل ہوں اور وہ اس سے راضی ہو جائیں اور ان برائیوں کا اکتساب کریں جن کا اکتساب وہ کرنا چاہتے ہیں۔

یوں ہم نے انسان کے لئے مقدر کر دیا ہے کہ جو مشرکین اپنے ایمان کو ایسی باتوں پر موقوف کرتے ہیں جو خوارق عادت ہیں اور اپنے انفس اور اپنے آفاق و ماحول میں اس پھیلی ہوئی کائنات کے اندر دلائل ہدایت اور نشانات راہ پر غور نہیں کرتے تو اگر ان کے پاس ہزار معجزات اور خوارق عادت واقعات آ جائیں وہ ایمان نہ لائیں گے۔

ان لوگوں کی تقدیر کو ہم نے اسی طرح بنا دیا ہے۔ ہم نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ہر نبی کے بالمقابل انسانوں اور جنوں میں سے کچھ شیاطین اٹھ کھڑے ہوں گے اور ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان میں سے بعض، بعض دوسروں پر خوش آئند باتیں القا کرتے ہیں۔ اور یہ عوام الناس کو دھوکہ اور فریب دیتے ہیں اور یوں وہ رسولوں کے ساتھ دشمنی کر کے لوگوں کو فریب دیتے ہیں حالانکہ درحقیقت وہ ہدایت کے ساتھ برسرپیکار ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہماری سنت اور ہماری اسکیم ہے کہ ان شیطانوں کی باتوں کی طرف وہ لوگ بڑے شوق سے کان رکھتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اپنی اس روش پر راضی ہیں اور گناہ کماتے ہیں جس میں وہ مصروف ہیں یعنی رسولوں کی عداوت اور اس کرۂ ارض پر فساد اور گمراہی کو پھیلانا۔

یہ سب واقعات تقدیر الٰہی کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اس کی مشیت کے مطابق واقع ہوتے ہیں اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو یہ لوگ ایسا رویہ اختیار نہ کرتے اور واقعات کا رخ بالکل الٹی سمت ہوتا اور اللہ کی تقدیر بالکل دوسری سمت پر چلتی۔ اس لئے کہ یہ واقعات محض اتفاق کے طور پر واقع نہیں ہوتے اور نہ دنیا میں رونما ہونے والے واقعات خود حضرت انسان کی اپنی طاقت اور قوت سے رونما ہوتے ہیں۔

جب یہ بات طے ہو گئی کہ اس جہان میں حق و باطل کا جو معرکہ برپا ہے اور جس کے فریق ایک جانب سے رسول اور ان کے ساتھ کی سچائی ہے اور دوسرا فریق انسانوں اور جنوں کے شیاطین ہیں جن کے ساتھ باطل، فریب اور دھوکہ ہے اور جب یہ بات بھی طے ہو گئی کہ یہ پوری کشاکش، حق و باطل کی کشمکش، اللہ کی مشیت اور اس کی تقدیر کی اسکیم کے تحت جاری ہے تو ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس حکمت اور تدبیر پر غور کرے جو اس کشمکش کی تہ میں کارفرما ہے اور اس سے قبل بندۂ مومن کو چاہیے کہ وہ ان واقعات کی تہ تک پہنچنے کی سعی کرے۔

(وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَٰطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا (٦: ١١٢) "اور ہم نے تو اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان

جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القاکرتے رہے ہیں۔"
یعنی اپنے ارادے اور تقدیر کے مطابق ہم نے ایسا کیا ہے۔ ہر نبی کا ہم نے ایک دشمن پیدا کیا ہے۔ یہ دشمن انسانوں اور جنوں میں سے وہ لوگ ہوتے رہے ہیں جو شیطان تھے۔ شیطنت کے معنی نافرمانی اور حکم عدولی کے ہیں۔ شیطنت کا مفہوم ہے مجسمہ شر ہونا۔ یہ ایسی صفت ہے جس سے انسان بھی متصف ہوتے ہیں اور جن بھی۔ اگر کوئی مجسمہ شر ہو تو اگر جن ہو تو وہ جن شیطان ہے اور اگر انسان ہو تو وہ انسان شیطان ہے۔ بعض اوقات اس صفت کے ساتھ ایک حیوان بھی متصف ہوتا ہے جبکہ وہ نافرمان' سرکش اور حملہ آور ہو' اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے کہ سیاہ کتا شیطان ہوتا ہے۔"

یہ جنی اور انسی شیاطین جن کے بارے میں فیصلہ الٰہیہ ہے کہ وہ ہر نبی کے دشمن ہوں گے' یہ ایک دوسرے کو چکنی چپڑی باتوں سے دھوکہ دیتے ہیں اور یہ باتیں وہ ایک دوسرے پر القاکرتے ہیں۔ وحی کے مفہومات میں سے ایک مفہوم یہ ہے کہ کسی ایک جان سے دوسری جان کی طرف ایک خفیہ اور داخلی اثر منتقل ہو۔ یا کوئی ایک شخص دوسرے کو دھوکہ دے اور لوگ ایک دوسرے کو سرکشی' نافرمانی اور شرو معصیت کے لئے ابھاریں۔

ان شیاطین میں سے جو انسان ہیں ان کی سرگرمیاں معروف و مشہور ہیں اور اس کرۂ ارض پر ہم ان کو رات و دن دیکھتے ہیں۔ ان کے نمونے اور ماڈل اور انبیاء کے مقابلے میں ان کی سرگرمیاں معلوم و معروف ہیں۔ ہر دور کے انسانوں نے اسے دیکھا ہے اور اب بھی دیکھ رہے ہیں۔

رہے وہ شیطان جن کا تعلق جنات سے ہے تو وہ اللہ کے غیبی امور میں سے ایک امر ہے۔ ان کے بارے میں ہم صرف اسی قدر جانتے ہیں جس قدر اللہ اور رسول نے ہمیں بتایا ہے۔ اس لئے کہ مفاتیح غیب صرف اللہ کے پاس ہیں اور ان کے بارے میں اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ بات کہ اس کرۂ ارض پر معروف و مشہور ذی روح اشیاء کے علاوہ بھی کوئی مخلوق ہے' تو اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں اطلاع دی ہے۔ اور اس مخلوق کے بارے میں اللہ نے جو اطلاع دی ہے اس کے حدود کے اندر ہم ایمان لاتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو سائنس کو ڈھال بنا کر اللہ کی ایسی کسی مخلوق کا انکار کرتے ہیں تو ہمیں معلوم نہیں ہے کہ وہ کن دلائل پر انحصار کرتے ہوئے ایسا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ انسانی علم نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ انسان نے تمام قسم کی ذی روح اشیاء کو معلوم کر لیا ہے۔ خصوصاً اس چھوٹے سے ستارے کرۂ ارض کے اندر بھی جبکہ دوسرے بے شمار اجرام فلکی کے بارے میں سائنس کے پاس ابھی تک ابتدائی معلومات ہی ہیں' صرف یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر جس قسم کی مخلوق ہے وہ بعض دوسرے ستاروں میں ممکن ہے یا نہیں ہے۔ اس سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ زندگی کی ایک مختلف قسم اور زندہ اور ذی روح مخلوقات کی کوئی دوسری جنس و صنف ممکن نہیں ہے جس کا علم سائنس کو نہ ہو۔ اس لئے کہ سائنس کے عنوان سے کوئی جاہل ہی ہوگا جو اس جہان سے آگے دوسرے جہانوں کا انکار کرتا ہو۔ ہوسکتا ہے بے شمار ایسی مخلوقات ہوں۔

اس اصولی عقیدے کے بعد اب یہ بات کہ اس مخلوقات کا مزاج کیا ہوتا ہے اور اس کی طبعی زندگی کیسی ہوتی ہے تو اس کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔ اس بارے میں ہم اسی قدر جانتے ہیں جس قدر مخبر صادق حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا ہے۔

ہم اس قدر جانتے ہیں کہ یہ مخلوق ناری مخلوق ہے۔ یہ مخلوق زمین کے اوپر' زمین کے اندر اور اس سے خارج میں

بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ یہ مخلوق نہایت ہی سریع الحرکت ہے۔اس مخلوق میں سے بعض لوگ صالح اور مومن ہیں' بعض شیاطین اور سرکش ہیں۔وہ انسانوں کو دیکھ سکتے ہیں اور انسان ان کو نہیں دیکھ سکتے۔یعنی ان کی اصلی شکل میں۔ اور کتنی ہی مخلوق ہے جسے انسان نظر آتا ہے لیکن انسانوں کو وہ نظر نہیں آتی۔بعض شیاطین ایسے ہیں جو انسانوں پر مسلط کر دیئے گئے ہیں اور وہ انسانوں کو دھوکہ و فریب دے کر گمراہ کرتے ہیں لیکن ان کو اللہ کے خاص بندوں پر کوئی قدرت حاصل نہیں ہوتی جو اللہ کو یاد کرنے والے اور پختہ ایمان کے مالک ہوتے ہیں۔شیطان ہر وقت مومن کے ساتھ لگا ہوا ہوتا ہے۔ جب مومن اللہ کو یاد کرتا ہے تو وہ چھپ جاتا ہے اور بھاگ جاتا ہے اور جب وہ غافل ہوتا ہے تو پھر وسوسے ڈالتا ہے۔ مومن جب یاد الہی سے سرشار ہوتا ہے تو اس کے مقابلے میں شیطان کا مکر کمزور ہو جاتا ہے۔جنوں کا حشر و نشر بھی اس طرح ہو گا جس طرح انسانوں کا حشر و نشر ہو گا۔اسی طرح ان کا بھی حساب و کتاب ہو گا۔ اسی طرح جنت کی جزاء اور دوزخ کی سزا کے وہ بھی مستوجب ہوں گے۔جنات کا جب فرشتوں سے سامنا ہوتا ہے تو وہ بہت ہی ضعیف نظر آتے ہیں اور ان کے پاس کوئی قوت نہیں ہوتی۔اس آیت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کے مقابلے میں جنوں اور انسانوں میں سے اپوزیشن کو کھڑا کیا ہے۔

اللہ کی ذات تو اس بات پر قادر تھی کہ اگر اس کی مشیت کا تقاضا ہوتا تو جن یہ طرز عمل اختیار نہ کرتے۔وہ سرکشی نہ کرتے اور مجسمہ شر ہرگز نہ بنتے۔وہ انبیاء کے دشمن نہ ہوتے' اہل ایمان کو اذیت نہ دیتے اور عوام الناس کو اللہ کی راہ سے برگشتہ نہ کرتے۔اللہ تو اس بات پر قادر تھا کہ انہیں مجبور کر کے ہدایت کی راہ پر ڈال دیتا اور ان کو ہدایت دے دیتا بشرطیکہ وہ ہدایت کی طرف متوجہ ہوتے اور یوں وہ انبیاء کی دشمنی' حق کی مخالفت اور مومنین سے عداوت نہ کرتے۔لیکن اللہ نے ان کو ایک حد تک اختیار اور آزادی دے دی اور ان کو یہ اذن دے دیا کہ وہ اللہ کے دوستوں پر دست درازیاں کرتے پھریں۔اللہ کی مشیت اور اس کی اسکیم تقدیر کے مطابق تاکہ اس کے دوستوں کی آزمائش ہو سکے اور یہ آزمائش اس کے دشمنوں کے ذریعے ایذار سانی سے ہو۔جس طرح اللہ اپنے دشمنوں کو قوت' اختیار اور آزادی کی ایک محدود مقدار عطا کر کے آزماتا ہے۔دشمن بھی اللہ کے دوستوں کو اسی حد تک اذیت دے سکتے ہیں جس حد کو اللہ نے مقرر کیا ہے۔

(وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ (٦: ١١٢) اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا کر ہی نہ سکتے۔") سوال یہ ہے کہ اس ہدایت سے ہمارے لئے کیا نتائج نکلتے ہیں؟

۱- یہ کہ جو لوگ انبیاء کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور انبیاء کے متبعین کو اذیت دیتے ہیں وہ شیطان ہوتے ہیں۔یہ شیطان انسانوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور جنات سے بھی۔جنوں کے شیطان اور انسانوں کے شیطان دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں اور دونوں کے کام کی نوعیت بھی ایک جیسی ہوتی ہے۔وہ ایک دوسرے کو دھوکہ اور فریب دیتے ہیں اور گمراہ کرتے ہیں جبکہ سب کی مشترکہ خاصیت یہ ہے کہ وہ سرکش' گمراہ اور اللہ کے دشمن ہوتے ہیں۔

۲- دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ شیاطین جو انبیاء کے دشمن ہوتے ہیں اور انبیاء کے متبعین کو اذیت دیتے ہیں' یہ اپنی کسی ذاتی قوت یا صلاحیت کی بنیاد پر ایسا نہیں کرتے۔یہ تو سب کے سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کے ذریعے اللہ اپنے بندوں اور دوستوں کو آزماتا ہے اور یہ آزمائش بھی گہری حکمت پر مبنی ہوتی

ہے - تاکہ لوگوں کو چھان پھٹک کر دیکھ لیا جائے' ان کے دلوں کو صاف کیا جائے - ان کے صبر کا امتحان لیا جائے' ان کی قوت برداشت اور امانت و دیانت کو آزمایا جائے - جب بھی وہ اس آزمائش میں کامیاب ہو گئے یہ آزمائش اور امتحان ختم ہو جاتا ہے اور مخالفین کی مخالفت ختم ہو جاتی ہے - اب دشمن دست درازی کرنے پر قدرت نہیں رکھتے - اس لئے کہ اللہ کی اسکیم تقدیر ختم ہو جاتی ہے اور اب ان کے دشمن کمزور اور ناکام ہو جاتے ہیں - ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے کرتوتوں کا بوجھ اٹھائے اللہ کی طرف لوٹ رہے ہوتے ہیں -

(وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ) اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے -"

۳- یہ کہ یہ اللہ کی حکمت کا تقاضا تھا کہ وہ شیاطین جن اور شیاطین انس کو یہ مہلت عطا کرے کہ وہ شیطنت کرتے پھریں اس لئے کہ اللہ نے ان شیطانوں کو جو مہلت اور طاقت دی ہوئی ہے اس میں ان کو آزمائے' تاکہ وہ ایک وقت تک اللہ کے دوستوں کو اذیت دیتے رہیں - اس طرح اللہ اپنے دوستوں کو بھی آزماتا ہے تاکہ دیکھا جائے کہ وہ صبر کرتے ہیں؟ کیا ان کے پاس جو سچائی ہے اس پر وہ ثابت قدم رہتے ہیں جبکہ باطل ان پر زور آور ہو رہا ہے اور دست درازی کر رہا ہو - کیا وہ اپنے نفوس کو اللہ کے ہاں پوری طرح فروخت کرتے ہیں اور خوشی اور دکھ دونوں حالتوں میں' تنگی و ترشی میں اور فراوانی اور خوشحالی دونوں میں اللہ کے عہد پر پختہ رہتے ہیں؟ ورنہ یہ تو اللہ کے دائرۂ قدرت میں تھا کہ وہ اس تمام کھیل کو شروع ہی نہ کرتا -

۴- یہ کہ جن و انس کے تمام شیاطین کی مکاری کی کوئی بھی حقیقت نہیں ہے' یہ تو بہت ہی کمزور مخلوقات ہیں - ان کے پاس ان کی کوئی ذاتی قوت اور طاقت نہیں ہے - وہ تو ان حدود و قیود کے اندر کام کر سکتے ہیں جو انکے لئے اللہ نے مقرر فرمائی ہیں - وہ مومن جو اس بات کو جانتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ قادر مطلق تو . ہے' وہی ہے جس نے ان لوگوں کو اجازت دے رکھی ہے' تو اس کی نظروں میں یہ شیاطین ضعیف ہوتے ہیں - اگرچہ بظاہر وہ قہار و جبار نظر آئیں - یہی وجہ ہے کہ حضور کو متوجہ کر دیا جاتا ہے - (فذرھم وما یفترون) چھوڑ دیجئے ان کو اور ان کی افتراء پردازی کو - میں قادر مطلق ہوں اور ان کے جرائم کی سزا ان کے لئے تیار ہے -

۵- ان اہل ایمان اور شیاطین کے ابتلاء کے علاوہ ایک اور حکمت بھی ہے - یہ عداوت اور یہ گمراہی پھیلانا اور قول و فعل سے یہ وسیع فریب کاری' اللہ نے اس کا اذن اس لئے بھی دے رکھا ہے :

(وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ (۶:۱۱۳)) "(یہ سب کچھ ہم انہیں اس لئے کرنے دے رہے ہیں) کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل اس طرف مائل ہوں اور وہ اس سے راضی ہو جائیں اور ان برائیوں کا اکتساب کریں جن کا اکتساب وہ کرنا چاہتے ہیں -"

یعنی جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ ان ہدایات پر کان نہیں دھریں گے اور ان شیطانوں کی وسوسہ اندازی پر توجہ دیں گے - اس لئے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کی تمام صلاحیتیں دنیاوی کاموں میں صرف ہوتی

ہیں۔ایسے لوگ جب دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر موڑ پر یہ شیاطین بیٹھے ہوئے ہیں اور نبی کے مخالف ہیں 'نبیوں کے متبعین کو رات اور دن اذیت دیتے ہیں اور یہ شیاطین ایک دوسرے کے مددگار ہیں' ایک دوسرے کی باتوں کو مزین بناتے ہیں اور ایک دوسرے کی قولی اور فعلی تائید کرتے ہیں ۔اس لئے یہ دنیا پرست لوگ شیاطین کے تابع ہو جاتے ہیں اور ان کے اس باطل رعب و داب اور شان و شوکت سے مرعوب ہو جاتے ہیں حالانکہ ان کا یہ اقتدار اور قوت نہایت ہی کمزور ہوتی ہے۔ چنانچہ یوں وہ بھی برائی اور گناہ کماتے ہیں اور شر' معصیت اور فساد کے پھیلانے میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اس توجہ اور اصغاء کی وجہ سے یہ دنیا پرست شیطانی ہدایات لیتے رہتے ہیں۔

یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ اس کا یونہی چلنا منصوبہ تقدیر الٰہیہ کے مطابق تھا۔کیونکہ اس عمل کے ذریعے اپنے بندوں کی آزمائش کرکے اللہ ان میں سے کھرے اور کھوٹے کو سامنے لانا چاہتے تھے ۔نیز اس اسکیم کے مطابق اللہ ہر شخص کو آزادی کے ساتھ ایک راہ پر چلانا چاہتے تھے تاکہ وہ قیامت کے دن اپنے عمل کے ساتھ بالکل مناسب جزا کا مستحق بن جائے۔

نیز یہ مقصد بھی تھا کہ اس کشمکش حق و باطل کے ذریعے دنیا میں اصلاحی کام جاری رہ سکے ۔حق باطل سے علیحدہ ہوکر ممتاز ہو جائے اور صبر کے صیقل کے ذریعے خیر صاف ستھری ہوکر سامنے آ جائے۔شیاطین قیامت کے دن اپنے کئے کا پورا پورا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں اور یہ تمام اسکیم اللہ کی مشیت کے مطابق جاری و ساری رہے۔اسی اسکیم کے مطابق معاملہ اللہ کے دوستوں کا بھی طے ہو اور اسی کے مطابق معاملہ اللہ کے دشمنوں کا بھی طے ہو۔یہ ہے اللہ کی اسکیم مشیت اور اللہ جو چاہتا ہے' وہ کرتا ہے۔

اب ذرا اس منظر پر غور کریں' اس میدان معرکہ میں ایک جانب جن و انس کے تمام شیطان اور ان کے دوست و مددگار کھڑے ہیں اور دوسری جانب انبیائے کرام اور ان کے تمام متبعین کھڑے ہیں اور اس کشمکش میں ایک تیسری اور فیصلہ کن قوت اللہ کی مشیت' اس کا غلبہ اور اس کا اقتدار اعلیٰ ہے۔اس منظر کے یہ تین پہلو ہیں اور ہمیں چاہیے کہ ہم ذرا توقف کر کے اس پر گہری نگاہ ڈالیں۔

یہ ایک ایسا معرکہ ہے کہ اس میں اس کائنات میں شر کی تمام قوتیں جمع ہو رہی ہیں۔جن شیطان اور انسان شیطان شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔یہ اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر رہے ہیں اور نہایت ہی تعاون اور ہم آہنگی سے کام کر رہے ہیں۔ان لوگوں کا مشترکہ منصوبہ یہ ہے کہ یہ تمام انبیاء' ان کی دعوت اور ان کے حامیوں کے دشمن ہیں۔اور ان کا ہدف اور منصوبہ متعین ہے۔"یہ ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القاکر رہے ہیں۔یہ ایک دوسرے کی مدد تمام وسائل کے ساتھ کرتے ہیں جن میں فریب کاری اور دھوکہ بازی کے تمام ذرائع شامل ہیں اور یہ خود آپس میں بھی ایک دوسرے کو گمراہ کرتے ہیں اور جب بھی حق اور سچائی کے مطابق کوئی مجمع جمع ہوتا ہے تو اس مجمع کی اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ ایک دوسرے کو بھی فریب دیتے ہیں۔وہ باہم تعاون کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو گمراہ کرتے ہیں اور اس گمراہی میں ایک دوسرے کے معاون بنتے ہیں۔یہ لوگ ایک دوسرے کو حق کی کوئی بات نہیں بتاتے ۔بلکہ وہ ایک دوسرے کے سامنے سچائی کی دشمنی کو ایک بڑا جہاد کہہ کر پیش کرتے ہیں اور یہ عزم کرتے ہیں کہ وہ اس سچائی کے ساتھ طویل عرصے تک لڑیں گے۔

ان قوتوں کی یہ مکاری مکمل طور پر آزاد اور بے قید بھی نہیں ہے۔اس کے اردگرد مشیت الٰہیہ کا ایک وسیع دائرہ

ہے۔ یہ شیاطین جو سرگرمیاں بھی دکھاتے ہیں وہ اللہ کی مشیت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ یہ مشیت کا دائرہ اللہ کی تقسیم کا دائرہ ہے۔ یہیں سے اللہ کے بندوں کی نظروں میں شرکی قوتوں کا یہ اکٹھ اور ان کی پشت پر عالمی تائید پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ یہ مقید اور پابزنجیر ہے۔ یہ اکٹھ اور گٹھ جوڑ بے قید اور آزاد نہیں ہے۔ اللہ جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے اور یوں نہیں کرتا کہ ہر کوئی ان کے اس جال میں بغیر کسی مدافعت اور مقاومت کے پھنس جائے جس طرح ہمیشہ تمام سرکش شیاطین چاہتے ہیں کہ انہیں بے قید حاکمیت حاصل ہو اور لوگ ان کی غیر مشروط اطاعت کریں اور ان کی مرضی اور خواہش کے اوپر عمل پیرا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ان سرکشوں کی تمام سرگرمیاں اللہ کی مشیت اور اس کی تقدیر اور ضوابط کے اندر محدود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شیطانی قوتیں اللہ کے دوستوں کو کوئی اذیت اور نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ ہاں اس قدر اذیت یہ ضرور پہنچا دیتے ہیں جس قدر اللہ میاں اپنے دوستوں کی آزمائش کے طور پر اجازت دیں۔ آخر کار تمام معاملات اللہ کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

لیکن شرکی قوتوں کا یہ اکٹھ اور ان کا باہم تعاون اہل حق کے لئے بھی ایک نکتہ تفکیر ہے۔ ان کو غور و فکر کر کے شر کی قوتوں کے اس منصوبے کو سمجھنا چاہیے اور شر کے وسائل کو بھی زیر نظر رکھنا چاہیے۔ اسی طرح یہ منظر کہ اللہ کی مشیت اور تقدیر ان لوگوں کی تمام سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے ہے یہ بھی اہل حق کے لئے ایک بشارت ہے۔ اس سے بھی اہل حق کو یقین اور اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ آخر کار وہ کامیاب رہیں گے۔ اس لئے ان کی نظریں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی قوت قاہرہ پر مرکوز رہنی چاہئیں جو ہمیشہ نافذ اور کارگر رہتی ہے۔ اور آخر کار اللہ کا اقتدار اعلیٰ قائم ہوتا ہے اور حق کو غلبہ نصیب ہوتا ہے' اس لئے اہل حق کو چاہیے کہ وہ اپنے یقین اور عقیدے کو اللہ کی ذات کبریا کے ساتھ وابستہ رکھیں خواہ شیطان چاہے یا نہ چاہے۔ اور وہ اپنی راہ پر اس طرح گامزن ہوں کہ ان کے اخلاق و اعمال میں سچائی رچی بسی ہو' ان کے دل و دماغ حق سے سرشار ہوں۔ رہی شیطانوں کی دشمنی اور ان کی مکاری تو اہل حق کو چاہیے کہ ان کو اللہ کی مشیت اور قدرت کے حوالے کر دیں جو ہر صورت میں کامیاب اور غالب رہتی ہے۔ اس لئے کہ یہ سب امور اللہ کی مشیت کے مطابق چلتے ہیں اور "اگر تمہارے رب کی مشیت ہوتی تو وہ ایسا نہ کرتے پس انہیں چھوڑ دیں جو چاہیں افتراپردازیاں کرتے پھریں۔"

---ooo---

درس ۶۸ ایک نظر میں

اب یہاں سے وہ موضوع شروع ہوتا ہے جو اس پوری سورہ کا موضوع ہے اور اس موضوع کے بارے میں تمہیدی باتیں اس سورہ میں جگہ جگہ آتی رہی ہیں۔ ان میں سے آخری تمہیدی بات وہ عظیم نظریاتی مسئلہ ہے جو سابقہ دو آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ نیز وہ نظریاتی کشمکش ہے جو حق و باطل کے درمیان برپا رہی ہے اور اس کشمکش کے درمیان شیاطین جن اور شیاطین انس اور دوسری جانب سے انبیاء اور ان کے متبعین کے درمیان دشمنی رہی ہے اور اس پر آخرکار اللہ کی مشیت غالب رہی ہے اور پھر یہ بیان کہ ہدایت و ضلالت سنت الہیہ کے مطابق اور مشیت الہیہ کے تحت ہوتی ہے۔ یعنی درس سابق کے آخر میں آنے والے تمام مباحث جن پر تفصیلی بحث کی گئی ہے بطور تمہید آئے ہیں۔

اب روئے سخن اس اصل موضوع کی طرف آتا ہے جس کے لئے یہ تمام باتیں بطور تمہید تھیں۔ یہ موضوع تھا مسئلہ ما اهل به لغير الله یعنی ان چیزوں کی حلت اور حرمت کا مسئلہ جن پر ذبح کے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ اس مسئلہ کی اہمیت اسلام کے اس اولین اصول کی وجہ سے ہے کہ اسلام میں حق حاکمیت صرف اللہ کو حاصل ہے' اور اقتدار اعلیٰ کا مستحق صرف اللہ ہے۔ کسی انسان کو اللہ کے حق حاکمیت کو کسی صورت میں بھی استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اور اگر مسئلہ اصولی اور نظریاتی ہو تو اس میں چھوٹی سی بات بھی ایک نہایت ہی عظیم معاملے کی طرح اہم ہو جاتی ہے۔ یہ بات اہم نہیں ہے کہ یہ ایک ذبیحہ کا مسئلہ ہے یا یہ کہ یہ اس قدر معمولی مسئلہ ہے کہ ایک متعین جانور کا گوشت کھانا جائز ہے یا ناجائز ہے یا یہ معاملہ ہے کہ ایک مملکت کا اقتدار اعلیٰ کس کو حاصل ہو یا کسی معاشرے میں اقتدار اعلیٰ کس کا ہو گا۔ اصولوں کے اس معاملے میں دونوں باتوں کی اہمیت برابر ہے کیونکہ دونوں میں ایک شخص اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ حاکمیت کس کو حاصل ہے اللہ کو یا کسی اور کو۔ یا یہ کہ اقرار حاکمیت الہیہ ہے یا اس کا انکار ہے۔

اسلامی نظام حیات اور قرآن اس اصول پر ہر جگہ زور دیتا ہے اور چاہے معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا' ہر جگہ اس اصول کو بتکرار اور بتاکید مزید پیش کیا جاتا ہے' اس لئے کہ یہ اصول نہایت ہی اہم نظریاتی اصول ہے۔ یہ اصول اسلام ہے اور یہی دین ہے۔ اس اصول کے علاوہ جو مسائل بھی ہیں وہ اس اصول کی عملی تطبیق اور تشریح ہیں اور تفصیلی نتائج ہیں۔

سورہ کے زیر بحث حصے میں یا سورہ کی تمام دوسری آیات میں ہم اس حقیقت کو پالیں گے کہ قرآن میں اس اصول کو بتکرار دہرایا گیا ہے اور مختلف شکلوں میں اسے لایا گیا ہے۔ جب دور جاہلیت کے قانون' نظام اور رسم و رواج پر بحث ہوتی ہے تو بھی اس اصول کو دہرایا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قوانین اور رسوم و رواج شرک ہیں اور اسلام سے سرکشی کے مترادف ہیں۔ اور یہ قوانین و ضوابط اس نظریہ سے پیدا ہوئے کہ اللہ کے سوا کوئی اور الہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام ایسے قوانین اور ایسے رسوم و رواج پر سخت ترین تنقید کرتا ہے۔ اور یہ تنقید مختلف اسالیب اور مختلف طرز ادا میں کی گئی ہے۔ لیکن اس تنقید کا اصل محور یہی اسلام کا اصول اعظم ہے کہ اس کائنات پر مقتدر اعلیٰ صرف اللہ ہے۔ یہی اصل اسلام اور اصل ایمان ہے۔

درس ٦٨ تشریح آیات

۱۱۴ --- تا --- ۱۲۷

آغاز کلام اس سوال سے ہوتا ہے کہ لوگوں کے معاملات میں حاکم اعلیٰ کون ہے؟ اور یہ بات اس لئے لائی گئی ہے کہ آگے جاکر یہ بتایا جائے کہ ذبیحوں میں بھی حلال قرار دینے اور حرام قرار دینے کے اختیارات صرف اللہ جل شانہ کے ہاتھ میں ہیں۔ ذبائح کے معاملے میں مشرکین حق حاکیت الٰہیہ پر دست درازی کرتے تھے اور یہ کام وہ خود ذات باری پر افتراء پردازی کرتے ہوئے کرتے تھے۔ چنانچہ اس بارے میں ایک طویل تمہیدی بات اس طرح شروع کی جاتی ہے۔

أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ
مُفَصَّلًا ۚ وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ
فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿١١٤﴾ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ
لِكَلِمَاتِهِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١١٥﴾ وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ
يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ
﴿١١٦﴾ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ مَنْ يَضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿١١٧﴾

"پھر جب حال یہ ہے تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں' حالانکہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کر دی ہے؟ اور جن لوگوں کو ہم نے (تم سے پہلے) کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمہارے رب ہی کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے لہٰذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو۔ تمہارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے' کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور

وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

اور اے نبیؐ! اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو گے جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ درحقیقت تمہارا رب زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے ہٹا ہوا ہے اور کون سیدھی راہ پر ہے۔

یہ اہم تمہیدی امور یہاں اس لئے لائے گئے ہیں کہ اصل موضوع پر کلام کیا جا سکے۔ اس کے بعد اس تمہید اور موضوع دونوں کو مسئلہ کفر و ایمان کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہے۔

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِن كُنتُم بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ ﴿١١٨﴾ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ۗ

”پھر اگر تم لوگ اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اس کا گوشت کھاؤ۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو؟ حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالت اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے ان کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے۔“

اس سے قبل کہ اس تمہید کے بعد حلال و حرام کا آخری فیصلہ دے دیا جائے بعض دوسری ہدایات اور نتائج دیئے جاتے ہیں جو امر و نہی کے بیان اور وعید اخروی اور ضروری تنبیہ پر مشتمل ہیں:

وَإِنَّ كَثِيرًا لَّيُضِلُّونَ بِأَهْوَائِهِم بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ ﴿١١٩﴾ وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ ﴿١٢٠﴾

”بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بنا پر گمراہ کن باتیں کرتے ہیں، ان حد سے گزرنے والوں کو تمہارا رب خوب جانتا ہے۔ تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی، جو لوگ گناہ کا اکتساب کرتے ہیں وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے۔“ اور اس کے بعد تحلیل و تحریم کے مسئلے کو لیا جاتا ہے اور اسے اسلام اور شرک کا مسئلہ قرار دیا جاتا ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ۗ

١٢ وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِیٰٓـِٕهِمْ لِیُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ
١١ ع لَمُشْرِكُوْنَ ﴿١٢١﴾
١

"اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو اس کا گوشت نہ کھاؤ' ایسا کرنا فسق ہے۔ شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔ لیکن اگر تم نے ان کی اطاعت قبول کر لی تو یقیناً تم مشرک ہو۔" اس کے بعد ایک بار پھر کفر و ایمان کی اصل حقیقت پر بات کی جاتی ہے اور دوبارہ تکرار کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں حلال و حرام قرار دینے کا تعلق کفر و اسلام سے ہے۔

یہ بار بار کی تاکید' یہ بار بار کے ربط اور بات کو دہرانے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں قانون سازی اور اقتدار اعلیٰ انسان کی روز مرہ زندگی کے اندر کس قدر اہمیت رکھتے ہیں۔

(اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۭ وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ (٦:١١٤))
"پھر جب حال یہ ہے تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں' حالانکہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کر دی ہے؟ اور جن لوگوں کو ہم نے (تم سے پہلے) کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمہارے رب ہی کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے' لہٰذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو۔"

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ایک سوال ہے اور یہ استفہام انکاری ہے۔ یہ تنبیہ اس بات پر کی گئی ہے کہ کسی کے لئے یہ کوئی درست رویہ نہیں ہے کہ وہ اپنی زندگی کے معاملات میں سے کسی معاملے میں بھی اللہ کے سوا کسی اور کو حاکم اور فیصلہ کنندہ تسلیم کرے۔ چنانچہ اس طرح اس بات کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ اسلامی نظام میں زندگی کے تمام معاملات میں فیصلہ صرف اللہ کے اختیار میں ہو گا اور یہ ایک غیر متنازعہ بات ہے اور اس بات کی ممانعت کر دی جاتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو انسانوں کی زندگیوں میں فیصلے کرنے کا مجاز ہو اور اپنی مرضی کے مطابق وہ ایسا کرتا رہے۔

(اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا) کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں؟" اس کے بعد اس ناگوار احساس کی تفصیل آتی ہے' ان حالات کی تفصیل بھی بیان کر دی جاتی ہے جن کی وجہ سے اللہ کے سوا دوسروں کا اقتدار اعلیٰ ایک قابل سرزنش فعل قرار پاتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کی تفصیلات دے دی ہیں اور بندوں کو اس بات کا محتاج نہیں چھوڑا کہ وہ اپنے لئے خود راہ ہدایت تلاش کرتے پھریں' یا اللہ کے سوا کسی دوسری جگہ سے اپنی زندگی کے مسائل کے فیصلے لیں۔ اور مشکلات حیات کو حل کریں۔

(وَهُوَ الَّذِیٓ اَنۡزَلَ اِلَیۡکُمُ الۡکِتٰبَ مُفَصَّلًا) ”حالانکہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کر دی ہے۔“ یہ کتاب اس لئے نازل کی گئی ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان ان معاملات کے فیصلے کرے جن کے بارے میں ان کے درمیان اختلاف ہو اور یوں اللہ کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کا ظہور ہو۔ پھر اللہ نے یہ کتاب نہایت ہی مفصل طور پر نازل کی ہے۔ اس میں وہ تمام اصول منضبط کر دیئے گئے ہیں جن کے اوپر پورا نظام زندگی استوار ہو گا۔ اس میں بعض فروعی اور جزئی مسائل بھی بیان کر دیئے گئے ہیں جن کے بارے میں اللہ کی مرضی یہ تھی کہ وہ انسانی معاشرے کے لئے دائمی احکام ہوں چاہے وہ معاشرہ جس قدر بھی ترقی یافتہ ہو اور علمی لحاظ سے وہ بہت ہی آگے کیوں نہ بڑھ گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے ہوتے ہوئے پھر کسی دوسرے پلیٹ فارم سے فیصلہ لینے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یہ ہے وہ فیصلہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب کے مقام کے بارے میں کیا ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہتا ہے ”کہ دنیا ترقی کر چکی ہے اور اب اسے اس کتاب کی طرف رجوع کی ضرورت نہیں ہے تو ہزار بار کہتا پھرے لیکن اسے اس قول کے ساتھ ایک اور بات بھی صاف صاف کہہ دینا چاہیے وہ یہ کہ میں (نعوذ باللہ) کافر ہوں' اس دین اسلام کا منکر ہوں اور اللہ رب العالمین کے اقوال کی تکذیب کرتا ہوں۔

یہاں ان لوگوں کے ارد گرد ایک مخصوص صورت حالات بھی موجود ہے' جس کے اندر زندگی کے حالات میں سے کسی حال میں بھی اللہ کے سوا کسی اور مصدر سے فیصلہ طلب کرنا نہایت ہی مکروہ عمل قرار پاتا ہے' اور نہایت ہی عجیب سا لگتا ہے۔ وہ یہ کہ جن لوگوں کو اس سے قبل آسمانی کتابیں دی گئیں ۔وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن بھی منزل من اللہ ہے' اس لئے کہ وہ کتب سماوی کے بارے میں زیادہ معرفت رکھنے والے ہیں۔

(وَالَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنۡ رَّبِّکَ بِالۡحَقِّ (٦:١١٤) ”اور جن لوگوں کو ہم نے (تم سے پہلے) کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمہارے رب ہی کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔“ یہ صورت حالات مکہ مکرمہ اور جزیرۃ العرب میں موجود تھی اس لئے اللہ تعالیٰ مشرکین کو اس طرف متوجہ فرماتے ہیں۔ چاہے اہل کتاب اس حقیقت کو مان کر اعلان کر دیں جس طرح بعض لوگوں نے کیا بھی جن کے دل اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیئے تھے' یا وہ اسے چھپا دیں اور اس کا اظہار نہ کریں۔ اکثر اہل کتاب نے یہی رویہ اختیار کیا' لیکن دونوں صورتوں میں یہ حقیقت اپنی جگہ موجود تھی کہ اہل کتاب حقیقت سے باخبر تھے۔ خود اللہ تعالیٰ ان کے علم کے بارے میں شہادت دیتے ہیں اور اللہ کی شہادت سچی ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ واضح الفاظ میں فرماتے ہیں کہ یہ لوگ (یَعۡلَمُوۡنَ) جانتے ہیں کہ قرآن اللہ کی جانب سے سچائی لے کر نازل ہوا ہے اور اس میں صرف سچائی ہی سچائی ہے اور یہ سچائی منزل من اللہ ہے۔

آج بھی اہل کتاب اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اس دین کی قوت کا راز صرف یہ ہے کہ اس کی پشت پر عظیم سچائی ہے اور قرآن کریم اسی عظیم سچائی پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اس علم کی وجہ سے اس دین کے خلاف اس بے جگری سے مسلسل لڑ رہے ہیں۔ وہ اس کتاب سے بھی لڑتے ہیں اور ان کی یہ لڑائی اس دین کے آغاز سے آج تک جاری ہے۔ یہ

نہایت ہی شدید اور تکلیف دہ جنگ ہے - یہ جنگ اہل کتاب محض اس مقصد کے لئے لڑ رہے ہیں کہ مسلمانوں کی زندگی کے اوپر سے اس کتاب کی حاکمیت ختم کر دیں اور مسلمانوں کی زندگی کچھ دوسری کتابوں اور کچھ دوسرے وضعی قوانین کی حکمرانی میں آجائے - وہ اللہ کے سوا کسی اور کو جج اور حاکم بنالیں تاکہ یہ کتاب زندہ نہ رہے اور اللہ کے دین کا کوئی حقیقی وجود نہ رہے - ان کی کوشش ہے وہ ان اسلامی ممالک میں جہاں کبھی اللہ کی حاکمیت قائم تھی کچھ دوسری حاکمیتیں اور اقتدار قائم کر دیں حالانکہ کبھی ان ممالک میں وہ نظام اور قانون نافذ تھا جو اس کتاب میں تھا - صرف یہی قانون نافذ تھا اور اس میں اس کے ساتھ کوئی دوسرے قوانین شریک عمل نہ تھے - نہ اللہ کی کتاب کے ساتھ کچھ دوسری کتابیں بھی رائج تھیں جن سے لوگ اصول قانون اور زندگی کی دوسری اقدار اخذ کرتے ہوں اور ان کی دفعات اور آیات کو کتاب اللہ کی طرح بطور اتھارٹی پیش کرتے ہوں - ایسے تمام منصوبوں کے پیچھے اہل کتاب یعنی صلیبی اور صہیونی عزائم کام کر رہے ہوتے ہیں - اس قسم کی تمام سرگرمیاں آج بھی ان اہل کتاب ہی کی ریشہ دوانیوں سے ہوتی ہیں -

یہاں کہا گیا کہ اللہ نے اس کتاب کو نہایت مفصل انداز میں نازل کیا ہے اور یہ کہ اہل کتاب اس بات کو اچھی طرح جانتے بھی ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے سچائی کے ساتھ نازل ہوئی ہے - اب روئے سخن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے اور آپ کے واسطہ سے تمام اہل ایمان کو یہ حقیقت بتلائی جاتی ہے اور یہ تسلی دی جاتی ہے کہ آپ اہل کتاب کے جدل و جدال اور تکذیب اور روگردانی سے دل تنگ نہ ہوں - وہ جو حق کو چھپا رہے ہیں جانتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے - یہ بات آپ کے لئے گراں بار نہ ہو -

(فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ (۶: ۱۱۴)) لہٰذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کبھی شک اور شبہ نہیں کیا - حدیث میں آتا ہے کہ جب آپ پر سورۂ یونس کی یہ آیت نازل ہوئی :

(فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ (۱۰: ۹۴)) "اب اگر تجھے اس ہدایت کی طرف سے کچھ شک ہو جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو پہلے سے کتاب پڑھ رہے ہیں - فی الواقع یہ تیرے پاس حق ہی آیا ہے 'تیرے رب کی طرف سے لہٰذا تو شک کرنے والوں میں نہ ہو" اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں نہ شک کرتا ہوں اور نہ مجھے ان سے پوچھنے کی ضرورت ہے -"

لیکن ان ہدایات اور اس قسم کی دوسری مثالوں سے جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس دور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور امت مسلمہ کو نہایت ہی گہری ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا - مخالفین سخت عناد اور انکار کا مظاہرہ کر رہے تھے اور اللہ کی رحمت کا یہ تقاضا تھا کہ آپ کو ایسی سخت ہدایات دے کر آپ اور امت مسلمہ کو سخت موقف اختیار کرنے کی تلقین کی جائے -

آگے مزید کہا جاتا ہے کہ اللہ کی دوٹوک بات اب ختم ہو گئی ہے 'مکمل ہو گئی ہے - اللہ کی اتھارٹی کے اوپر کوئی اور اتھارٹی نہیں ہے جو اس فیصلہ کن بات کو بدل دے کیونکہ یہ برحق ہے اور یہ حق ان کی تمام سازشوں تک رسائی رکھتا ہے -

(وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَامُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

(٦: ١١٥) ”تمہارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے‘ کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔“ اللہ تعالیٰ نے جو کہنا تھا اور جو فیصلے کرنے تھے وہ سچائی کے ساتھ کر دیئے‘ اور جو قانون سازی کرنی تھی وہ عادلانہ طور پر کر دی۔ اللہ کی بات کے بعد اب نہ کسی کی بات ہے‘ نہ کوئی نظریہ و عقیدہ ہے‘ نہ کوئی اصول و قانون ہے اور نہ کوئی قدر اور میزان ہے۔ اب نہ کوئی قانون اور شریعت کے بارے میں اس کے خلاف کوئی بات کہہ سکتا ہے‘ نہ کوئی رسم و رواج اس کے مقابلے میں رہ سکتے ہیں۔ نہ اللہ کی اتھارٹی کے اوپر کوئی اتھارٹی ہے کہ وہ اللہ کی بات کو بدلنے کی مجاز ہو۔

(وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (٦: ١١٥)) وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔“ اس کے بندے جو کچھ کہتے ہیں وہ سنتا ہے اور ان کے اقوال کے پس منظر کو بھی جانتا ہے اور ان کے مصالح و مفادات کو بھی اچھی طرح جانتا ہے۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ سچائی وہی ہے جو کتاب اللہ میں ہے اور جو اللہ نے نازل کی ہے‘ یہ بھی فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ کتاب اللہ کی سوچ کے مقابلے میں انسان جو سوچ پیش کرتا ہے وہ محض ظن و تخمین کے پائے چوبیں پر قائم ہوتی ہے۔ جو لوگ انسانی سوچ کی پیروی کرتے ہیں وہ محض ظن و تخمین کی پیروی کرتے ہیں اور ان کا انجام صرف یہی ہو گا کہ وہ سیدھے راستے سے بھٹک جائیں گے۔ انسانوں کی سوچ صرف اسی وقت درست اور ہدایت یافتہ ہو سکتی ہے جب وہ کتاب اللہ سے ماخوذ ہو جو ایک یقینی مصدر ہدایت ہے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی متنبہ فرماتے ہیں کہ وہ لوگوں کی ان باتوں پر دھیان نہ دیں جو وہ محض انسانی سوچ کی بنیاد پر کرتے ہیں اگرچہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس سوچ کی ماننے والی ہو‘ اس لئے کہ جاہلیت بہرحال جاہلیت ہوتی ہے‘ چاہے اس کے ماننے والے زیادہ ہوں یا کم‘ بہرحال وہ گمراہ ہوتے ہیں۔

(وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ

وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (٦: ١١٦)) ”اور اے نبی “ اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو گے جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ کے راستہ سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔“ زمین پر بسنے والے لوگوں کی اکثریت‘ نزول قرآن کے وقت اہل جاہلیت پر مشتمل تھی‘ جس طرح آج ہمارے دور میں لوگوں کی اکثریت نے جاہلیت کو اپنا لیا ہے۔ اس وقت لوگوں کی اکثریت الہی قانون کے مطابق اپنے فیصلے نہ کرتی تھی‘ نہ انہوں نے اللہ کی کتابوں میں موجود شریعت کو لاء آف دی لینڈ قرار دیا تھا۔ وہ اپنے تصورات و افکار‘ اپنی طرز فکر اور طرز زندگی اللہ کی ہدایات اور راہنمائی سے اخذ نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثریت نزول قرآن کے وقت جاہلیت میں مبتلا تھی جس طرح آج لوگوں کی اکثریت جاہلیت میں مبتلا ہے۔ وہ لوگ کوئی فکر‘ کوئی رائے اور کوئی فیصلہ اس ”حق“ سے اخذ نہ کرتے تھے اور نہ وہ اس سچائی پر مبنی ہوتا تھا۔ نیز اس دور کے قائدین اپنے متبع لوگوں کو ہدایت کی طرف نہیں بلکہ

ضلالت کی طرف لے جاتے تھے۔ جس طرح آج کی صورت حال ہے کہ لوگ یقینی علم کتاب و سنت کو چھوڑ کر ظن اور تخمین کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ظن و تخمین صرف گمراہی پر منتج ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو متنبہ کر دیا گیا کہ آپ ؐ نے اگر لوگوں کی اطاعت شروع کر دی تو وہ آپ کو گمراہ کر دیں گے۔ اللہ نے حضور ؐ کو عمومی ہدایات اگرچہ شان نزول کے اعتبار سے دی ہیں تاہم یہ ہدایت ایک مخصوص مسئلے یعنی ذبیحوں کے ضمن میں آئی جیسا کہ آگے تفصیلات آ رہی ہیں۔

اس کے بعد یہ قرار داد آتی ہے کہ بندوں کے بارے میں ہدایت یافتہ ہونے یا گمراہ ہونے کا فیصلہ کرنے کا مجاز بھی اللہ ہی ہے کیونکہ یہ اللہ ہی ہے جو بندوں کی حقیقت سے باخبر ہے۔ کسی کے راہ راست پر ہونے اور گمراہ ہونے کا فیصلہ بھی وہی کر سکتا ہے۔

(اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ مَنْ یَّضِلُّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ (۶:۱۱۷)) "اور حقیقت تمہارا رب زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے ہٹا ہوا ہے اور کون سیدھی راہ پر ہے۔" لوگوں کے تصورات و افکار، ان کی اقدار اور پیمانوں، ان کے طرز عمل اور سرگرمیوں کے بارے میں حسن و قبح کا فیصلہ کرنے کے لئے لازماً کوئی معیار ہونا چاہیے جس کے مطابق یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ یہ معیار لوگوں کی خواہشات نفسانیہ اور ان کی بدلتی ہوئی اصطلاحات اور رسم و رواج کو نہیں ہونا چاہیے اس لئے کہ یہ دونوں امور متغیر ہیں۔ اس لئے ایک ایسے منبع اور ماخذ کا تعین ہونا چاہیے جہاں سے لوگ اپنے پیمانوں اور خود لوگوں کے بارے میں فیصلے کر سکیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ یہ قرار دیتے ہیں کہ یہ فیصلہ اللہ نے کرنا ہے کہ یہاں اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے؟ اور یہ حق صرف اللہ ہی کو ہے۔ وہی فیصلہ کر سکتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیا ہے، ہادی کون ہے اور ضال کون ہے؟

ہم کسی سوسائٹی کو یہ اختیار نہیں دے سکتے کہ وہ اپنے بدلتے ہوئے حالات اور اصطلاحات کے مطابق حسن و قبح کا فیصلہ کرے اس لئے کہ ہر سوسائٹی کے عناصر ترکیبی، اس کی شکل و صورت اور اس کی مادی ضروریات بدلتی رہتی ہیں۔ اگر یہ حق سوسائٹی کو دے دیا جائے تو حسن و قبح کے پیمانے بھی مستقل نہ رہیں گے۔ پھر ایک زرعی معاشرے کی اخلاقی اقدار اور ہوں گی اور ایک صنعتی معاشرے کی اقدار اور ہوں گی۔ سرمایہ دارانہ بورژوا معاشرے کی اقدار اور ہوں گی اور اشتراکی اور کمیونسٹ معاشرے کی اقدار اور ہوں گی اور پھر ان معاشروں کی اقدار کے مطابق لوگوں کے حسن و قبح کے اصول مختلف ہوں گے۔

اسلام اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے، اس لئے ایسی مستقل ذاتی اقدار وضع کرتا ہے جو اللہ کی طرف سے مستقلاً دی گئی ہیں۔ معاشرے اور سوسائٹیاں جس قدر بدل جائیں، ترقی یافتہ ہوں یا پسماندہ۔ جو سوسائٹیاں ان اصولوں کو ترک کر دیں اسلامی نظام ان کے لئے ایک مخصوص اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ اسلام انہیں جاہلی معاشرے کے نام سے پکارتا ہے۔ یہ مشرک معاشرہ ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ معاشرہ اللہ کے سوا دوسرے خداؤں کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ ان کے لئے حسن و قبح کے پیمانے مقرر کریں۔ ان کو تصور حیات، اصول اخلاق اور نظام حیات دیں۔ اسلامی نظام صرف ایک ہی تقسیم روا رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک ایک معاشرہ یا تو اسلامی معاشرہ ہے یا جاہلی معاشرہ۔ کوئی تیسری قسم اس کے

نزدیک نہیں ہے۔ آگے جاہلی معاشرے کی اشکال اور صورتیں پھر مختلف ہو سکتی ہیں۔

اس طویل تمہید کے بعد اب اسلامی نظام میں ذبحوں کے اصولی مسئلے کو لیا جاتا ہے۔ اس مسئلے کو اسی اساسی اصول کے مطابق لیا جاتا ہے کہ اسلام میں حسن و قبح اور حلال و حرام کے تعین کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سابقہ آیات میں اس اصول پر تفصیلی گفتگو ہوئی :

(فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ (۱۱۸) وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ وَإِنَّ كَثِيرًا لَيُضِلُّونَ بِأَهْوَائِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ (۱۱۹) وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ (۱۲۰) وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ (۱۲۱) "پھر اگر تم لوگ اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اس کا گوشت کھاؤ۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو؟ حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالت اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے۔ ان کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے۔ بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بنا پر گمراہ کن باتیں کرتے ہیں، ان حد سے گزرنے والوں کو تمہارا رب خوب جانتا ہے۔ تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی، جو لوگ گناہ کا اکتساب کرتے ہیں وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو اس کا گوشت نہ کھاؤ، ایسا کرنا فسق ہے۔ شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات القاء کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔ لیکن اگر تم نے ان کی اطاعت قبول کر لی تو یقیناً تم مشرک ہو۔"

حکم یہ ہے کہ جس ذبیحہ پر اللہ کا نام لے لیا جائے اسے کھاؤ۔ اللہ کا نام لینا اس لئے ضروری قرار دیا گیا کہ لوگوں کے نظریے اور ان کے عقیدے کی سمت کا تعین کر دیا جائے، تاکہ ان کا ایمان اور ان کی اطاعت ان احکام کے لئے مخصوص ہو جو اللہ کی طرف سے صادر ہوتے ہیں۔

(فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ (۶:۱۱۸)) "پھر اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اس کا گوشت کھاؤ۔" اور اس کے بعد ان سے پوچھا جاتا ہے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو تمہارے لئے ایسے جانوروں کے گوشت کو کھانے سے روک رہی ہے جبکہ ان پر اللہ کا نام لیا گیا ہے، اور ان کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے۔ حالانکہ اللہ نے اضطراری حالت میں استثناء کی گنجائش رکھتے ہوئے ان چیزوں کی تفصیلات دے دی ہیں جو حرام ہیں۔ یوں اللہ تعالیٰ نے حلت اور حرمت کے معاملے میں کسی کو بات کرنے کا کوئی اختیار

نہیں دیا ہے۔ اس لئے کوئی شخص یہ نہیں کرسکتا کہ وہ اپنی مرضی سے بعض چیزوں کو حلال سمجھتے ہوئے کھائے اور بعض کو حرام سمجھتے ہوئے ترک کر دے۔

(وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ (۶: ۱۱۹)) ''آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو؟ حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالت اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے۔ ان کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے۔''

اس مسئلے کا وقتی تعلق اس وقت کے معاشرے میں پائے جانے والے ایک معاملے سے ہے۔ مشرکین مکہ بعض ایسے جانوروں کا گوشت کھاتے تھے جنہیں اللہ نے حرام قرار دے دیا تھا اور بعض ایسے جانور کے گوشت کو حرام قرار دیتے ہوئے نہ کھاتے ہیں جو عنداللہ حلال تھے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ اللہ کی شریعت ہے۔ چنانچہ یہاں قرآن مجید اس قصے کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ قرار دیتا ہے کہ یہ لوگ اپنی خواہشات سے متاثر ہو کر اور بغیر علم کے قانون سازی کرتے ہیں اور یوں وہ اللہ تعالیٰ کے حق حاکیت پر دست درازی کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ان حدود کار میں داخل ہوتے ہیں جو اللہ کے لئے مخصوص ہیں حالانکہ وہ اللہ کے بندے اور غلام ہیں۔

(وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ (۶: ۱۱۹)) ''بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بنا پر گمراہ کن باتیں کرتے ہیں۔ ان حد سے گزرنے والوں کو تمہارا رب خوب جانتا ہے۔'' اس لئے اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ تم ہر قسم کے گناہوں کو ترک کر دو' چاہے ظاہری ہوں یا باطنی۔ یہ بات بھی ان گناہوں ہی میں سے ہے کہ کوئی بغیر علم کے لوگوں کو گمراہ کرنے کا سبب بنے۔ اور یہ کام وہ محض اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے کرے اور پھر اپنی اس سرگرمی کو دینی اور شرعی رنگ بھی دے اگرچہ شریعت کے ساتھ اسے کوئی نسبت بھی نہ ہو بلکہ یہ اسلامی شریعت پر محض افترا ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ انہیں اس قسم کی افتراء پردازی کے انجام بد سے ڈراتا ہے۔

(وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ (۶: ۱۲۰)) ''تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی بچو' جو لوگ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پاکر رہیں گے۔'' اس کے بعد حکم دیا جاتا ہے کہ جن جانوروں پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو' ان کا گوشت کھانے سے باز رہو۔ یہ لوگ بعض جانوروں کو ذبح کرتے وقت ان پر اللہ کے سوا اور الہوں کے نام لیتے تھے۔ یا وہ انہیں قمار بازی کے لئے ذبح کرتے تھے اور پھر پانسوں کے ذریعے انہیں تقسیم کرتے تھے۔ بعض مردار جانوروں کے گوشت کے استعمال کے معاملے میں وہ مسلمانوں سے جھگڑتے تھے۔ وہ کہتے تھے' اگرچہ ایسے مردہ جانوروں پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا لیکن اللہ نے خود انہیں ذبح کر دیا ہے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ مسلمان اپنے ہاتھ سے ذبح کئے

ہوئے جانوروں کا گوشت تو کھاتے ہیں لیکن اللہ کے ذبح کیے ہوئے جانوروں کا گوشت وہ نہیں کھاتے۔ یہ وہ تصور اور استدلال ہے جس کی کمزوری بالکل واضح ہے اور یہ تصور تمام جاہلیتوں کے اندر پایا جاتا رہا ہے۔ یہ تصور مشرکین کو ان کے وہ شیاطین دیتے تھے جو جنوں اور انسانوں میں سے ان کے ساتھ لگے ہوئے تھے تاکہ وہ ان کے بودے تصورات اور دلائل کے ذریعے مسلمانوں کے ساتھ مجادلہ کریں۔ ان باتوں کی تفصیلات ان آیات میں دی گئی ہیں۔

(وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ (٦:١٢١)) ''اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو' اس کا گوشت کھاؤ' ایسا کرنا فسق ہے' شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔ لیکن اگر تم نے ان کی اطاعت قبول کر لی تو یقیناً تم مشرک ہو۔'' اس آخری فیصلے کے سامنے کھڑے ہو کر ذرا غور کیجئے۔ یہ فیصلہ کس قدر دوٹوک اور صریح ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حاکم صرف اللہ ہے' اس لئے مطاع بھی وہی ہو گا اور یہ اس دین کا بنیادی اصول ہے۔ یہ آیت فیصلہ کر دیتی ہے کہ زندگی کے مسائل کے کسی ایک جزئیہ میں بھی اللہ کے سوا کسی اور کی اطاعت کرنا جبکہ یہ اطاعت اللہ کی شریعت اور اس کے اصولوں کی طرف منسوب نہ ہو' کھلا شرک ہے اور اس کی وجہ سے ایک مسلمان دائرہ اسلام سے خارج ہو کر دائرہ کفر میں داخل ہو جاتا ہے۔ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کا یہ کہنا کہ

وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ (٦:١٢١)) اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو تم مشرکین میں سے ہو گے۔'' یعنی جہاں تم نے امر الٰہی اور شریعت الہیہ کو ترک کر دیا اور دوسروں کے اوامر اور احکام کو ان پر ترجیح دے دی تو یہ صریح شرک ہو گا۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(اتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ) انہوں نے اپنے احبار اور رہبان کو اللہ کے سوا رب بنایا ہے۔'' اس آیت کی تفسیر میں ترمذی نے ایک روایت نقل کی ہے۔ وہ حضرت عدیؓ ابن حاتم سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے پوچھا رسولؐ اللہ! انہوں نے تو احبار و رہبان کی بندگی نہیں کی ہے۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا: ''ہاں'' بالکل انہوں نے کی ہے۔ انہوں نے ان کے لئے حرام کو حلال کر دیا اور حلال کو حرام اور یہ لوگ ان کی اطاعت کرتے ہیں تو یہ ان لوگوں کی جانب سے احبار و رہبان کی عبادت ہے۔ اسی طرح علامہ ابن کثیر نے حضرت عدیؓ سے روایت کی ہے کہ اس آیت

(اتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ) کا مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے لوگوں سے نصیحت و ہدایت طلب کی اور اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا۔

(وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا) ''ان کو حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ صرف الٰہ واحد کی بندگی کریں۔'' یعنی اس کی بندگی کریں جس نے اگر کسی چیز کو حرام قرار دے دیا تو وہ حرام ہو جاتی ہے اور کسی چیز کو حلال قرار

دے دیا تو وہ حرام ہو جاتی ہے ۔ جو قانون بنایا وہ قابل اتباع ہوتا ہے جو فیصلہ وہ کرتا ہے وہ نافذ ہوتا ہے ۔

یہ ہیں اقوال حضرت ابن کثیر اور سدی کے ۔ یہ دونوں حضرات نہایت ہی دو ٹوک الفاظ میں فیصلہ کرتے ہیں اور بات کو بالکل کھول کر بیان کرتے ہیں اور یہ اس لئے کہ اس معاملے میں قرآن کی بات بھی نہایت ہی واضح اور دو ٹوک ہے ۔ پھر اس بات کو حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تشریح کر کے واضح کر دیا ہے کہ جو شخص بھی معاملات زندگی کے کسی بھی جزئیہ میں اللہ کی بنائی ہوئی شریعت کے مقابلے میں لوگوں کی بنائی ہوئی شریعت پر چلتا ہے وہ مشرک ہے اگرچہ ایسا شخص اپنی اصلیت کے اعتبار سے مسلم ہو کیونکہ اس فعل کی وجہ سے وہ اسلام سے خارج ہو کر مشرکوں کی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے ۔ اگرچہ زبان کے ساتھ وہ بار بار "اشھد" پڑھتا رہے جبکہ عملاً وہ غیر اللہ کا مطیع فرمان اور شاگرد ہو ۔

آج جب ہم اس کرۂ ارض پر اس زاویے سے نظر ڈالتے ہیں اور پھر اسے ہم ان آیات کی ان تصریحات کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پر شرک اور جاہلیت کا مکمل کنٹرول ہے ۔ الا ماشاء اللہ تو ہم اس کرۂ ارض کے مالکان اقتدار کے اس عمل پر اعتراض کرتے ہیں جنہوں نے خدائی خصوصیات کا دعویٰ کر دیا ہے کہ ان کا کوئی قانون اور کوئی حکم قابل قبول نہیں ہے ۔ الا یہ کہ کوئی نہایت ہی مجبور ہو ۔

آیت زیر بحث (وَلَا تَأْكُلُوا) میں ذبیحوں کے بارے میں جو ہدایات دی گئی ہیں ان میں سے فقہی اعتبار سے حلال و حرام کی تفصیلات علامہ ابن کثیر نے اس طرح دی ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں ائمہ فقہ کے تین اقوال ہیں ۔

بعض فقہاء کہتے ہیں کہ ایسے ذبیحے کا گوشت کھانا حرام ہے چاہے ذبیحے پر اللہ کا نام عمداً نہ لیا گیا ہو یا سہواً ۔ حضرت ابن عمر' نافع' عامر شعبی اور محمد ابن سیرین سے بھی ایسے ہی مروی ہے' امام مالک سے بھی ایک روایت ایسی ہی ہے' امام احمد ابن حنبل سے بھی ایک روایت ایسی ہی ہے اور متقدمین و متاخرین میں سے ایک گروہ نے اس کی تائید کی ہے ۔

ابوثور' داؤد ظاہری اور ابو الفتوح محمد ابن محمد ابن علی طائی جو متاخرین شافعیہ میں ہیں' انہوں نے اپنی کتاب اربعین میں بھی یہی رائے اختیار کی ہے اور انہوں نے اپنے مذہب پر اسی آیت سے استدلال کیا ہے ۔ نیز اس گروہ نے شکار کے بارے میں وارد دوسری آیت سے بھی استدلال کیا ہے ۔

(وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ) پس اس شکار سے کھاؤ جسے وہ (کتے) پکڑ کر تمہارے لئے روک لیں' اور اس پر اللہ کا نام لو ۔" ان کا استدلال یہ بھی ہے کہ اس آیت میں اس کے لئے انہ لفسق کا تاکیدی لفظ آیا ہے ۔ انہ کی ضمیر کا مرجع اکل ہے ۔ بعض مفسرین نے غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنے کی طرف عائد کیا ہے ۔ نیز یہ رائے رکھنے والے حضرات ان احادیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جو شکار اور ذبیحوں پر اللہ کا نام لینے کے بارے میں وارد ہیں مثلاً عدی ابن حاتم اور ابو ثعلبہ کی احادیث ۔ "جب تم نے اپنے سدھائے ہوئے کتے کو چھوڑا اور اس پر تم نے اللہ کا نام لیا تو جب تک وہ کتا تمہارے لئے روکے رکھے تم کھاؤ ۔" یہ دونوں احادیث صحیحین نے روایت کی ہیں ۔ نیز رافع ابن خدیج کی حدیث سے بھی یہ گروہ استدلال کرتا ہے ۔ "جس سے خون نکلا اور اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو تو اسے کھاؤ ۔" یہ حدیث بھی صحیحین نے روایت کی ہے ۔ اس مسئلے میں دوسرا مذہب یہ ہے کہ ذبیحوں پر اللہ کا نام لینا شرط اور واجب نہیں ہے ۔ بلکہ یہ مستحب ہے ۔ اگر کوئی عمداً یا نسیان کی وجہ سے ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ یہ امام شافعی کا مذہب ہے ۔ اور آپ کے تمام رفقاء بھی اسی طرف گئے ہیں ۔ امام احمد ابن حنبل سے بھی

ایک روایت اسی مضمون کی ہے۔ امام مالک سے بھی ایک روایت اس کے مطابق ہے۔ آپ کے رفقاء میں سے اشہب ابن عبد العزیز نے اس کی تصریح کی ہے اور انہوں نے حضرت ابن عباس ' ابو ہریرہ ' عطاء ابن ابو رباح سے بھی ایسی ہی روایات نقل کی ہیں ' واللہ اعلم۔ اب رہیں وہ آیات و احادیث تو ان کی تاویل امام شافعی نے یوں کی ہے کہ آیت

(وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ) ان ذبیحوں کے بارے میں ہے جن پر بتوں کا نام لیا گیا ہو۔ مثلاً

(اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِه) میں اس کی تصریح ہے۔ اسی طرح ابن جریج کہتے ہیں کہ آیت (وَلَا تَاْكُلُوْا --------) میں ممانعت ان ذبیحوں سے ہے جو قریش بتوں کے اوپر ذبح کرتے تھے۔ نیز ان ذبیحوں کے بارے میں جو مجوسی ذبح کرتے تھے۔ امام شافعی نے جو مسلک اختیار کیا ہے یہ قوی تر ہے۔

ابن ابو حاتم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس ؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ

(وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ) مردار کے بارے میں ہے۔ اس کی تائید میں امام ابو داؤد نے اپنی مرسل احادیث میں ثور ابن یزید کی حدیث نقل کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مسلم کا ذبیحہ حلال ہے ' اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو۔ اس لئے کہ اگر وہ نام لیتا تو صرف اللہ ہی کا لیتا۔" اور اس مرسل روایت کی تائید دارقطنی کی روایت سے ہوتی ہے کہ جب ایک مسلمان ذبح کرے اور اس ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لے تو چاہیے کہ اس کا گوشت کھایا جائے ' اس لئے کہ مسلمان کے اندر اللہ کے ناموں میں سے کوئی نام ہوتا ہی ہے۔"

تیسرا مذہب یہ ہے کہ اگر کوئی بھول کر اللہ کا نام نہ لے تو کوئی حرج نہیں ہے اور اگر عمداً ایسا کرے تو کھانا جائز نہ ہو گا۔ امام مالک اور امام احمد ابن حنبل کا یہ مشہور مذہب ہے۔ اور امام ابو حنیفہ اور ان کے ساتھی بھی اسی طرف گئے ہیں۔ اسحاق ابن راہویہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ حضرت علی ' ابن عباس ' سعید ابن مسیب ' عطاء ' طاؤس ' حسن بصری ' ابو مالک ' عبد الرحمٰن ابن ابولیلیٰ ' جعفر ابن محمد اور ربیعہ ابن عبد الرحمٰن سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔

ابن جریر کہتے ہیں اہل علم نے اس آیت کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ اس آیت کا کوئی حکم منسوخ ہوا ہے یا نہیں۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ اپنے مفہوم میں محکم آیت ہے اور اس کا کوئی حصہ منسوخ نہیں ہے۔ مجاہد اسی کے قائل ہیں۔ حسن بصری ' عکرمہ کا یہ قول ہے کہ

(فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ (۱۱۸))

دوسری جگہ اللہ فرماتے ہیں۔

(وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ) اس طرح اس آیت نے پہلی کو منسوخ کر دیا۔ پھر اس سے اہل کتاب کا کھانا مستثنیٰ کیا گیا۔

(وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوتُوْا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ) ابن ابو حاتم کہتے ہیں کہ عباس ابن الولید کے سامنے مکحول کی یہ روایت پڑھی گئی کہ اللہ نے پہلے یہ آیت نازل فرمائی۔

(وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ) اور اس کے بعد اللہ نے اسے منسوخ کر دیا۔ یوں اس نے اہل اسلام پر رحم فرمایا اور یہ آیت نازل ہوئی۔

(اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوتُوْا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ) یوں اس دوسری آیت نے پہلی کو منسوخ کر دیا اور اہل کتاب کا ذبیحہ حلال قرار دیا گیا۔ اس کے بعد ابن جریر نے کہا: درحقیقت یہ ہے کہ جن چیزوں پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ ان کی حرمت اور اہل کتاب کے ذبیحوں کی حلت کے احکام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابن جریر کی بات درست ہے۔ سلف میں سے جن لوگوں نے نسخ کا لفظ استعمال کیا ان کی مراد تخصیص ہے' واللہ اعلم۔

---ooo---

اس کے بعد اسلام اور کفر کے درمیان ایک مکمل معرکہ سامنے آتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر گاؤں میں بڑے بڑے مجرمین پیدا کئے ہیں اور ان کے دلوں میں کبر و غرور کی ایک بڑی مقدار پائی جاتی ہے۔ یہ اس گاؤں کے بڑے مجرم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ پورے علاقے میں لوگوں کو راہ راست پر آنے سے روکتے ہیں۔ اس بیانیہ میں واضح طور پر یہ دکھایا جاتا ہے کہ جن لوگوں کے دل ایمان کے لئے کھل جاتے ہیں ان کے حالات کیسے ہوتے ہیں۔ وہ حالات کس طرح کے ہوتے ہیں جن میں لوگوں کا دل اسلام اور قبولیت حق کے لئے تنگ ہو جاتا ہے اور اسلام کا تصور کرتے ہی وہ لوگ تنگی محسوس کرتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ گویا ان کی سانس رک گئی ہے۔ یوں یہ بیانیہ موضوع سخن یعنی اسلام میں حلال و حرام کے موضوع کے ساتھ اصولی طور پر منسلک ہو جاتا ہے' یعنی اصول اور فروع کی نسبت قائم ہو جاتی ہے اور یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ ذبیحوں کی حلت اور حرمت کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ نہایت ہی اصولی مسئلہ ہے۔

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔۘ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ

عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ ﴿١٢٤﴾ فَمَن يُرِدِ اللَّهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ
صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ ۖ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا
يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٢٥﴾

"کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح ان سے نہ نکلتا ہو؟ کافروں کے لئے تو اسی طرح ان کے اعمال خوشنما بنا دیئے گئے ہیں' اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکروفریب کا جال پھیلائیں۔ دراصل وہ اپنے فریب کے جال میں آپ پھنستے ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔

جب ان کے سامنے کوئی آیت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں "ہم نہ مانیں گے جب تک کہ وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے۔" اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغامبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔ قریب ہے وہ وقت جب یہ مجرم اپنی مکاریوں کی پاداش میں اللہ کے ہاں ذلت اور سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔

پس (یہ حقیقت ہے کہ) جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ (اسلام کا تصور کرتے ہی) اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے۔ اس طرح اللہ (حق سے فرار اور نفرت کی) ناپاکی ان لوگوں پر مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔"

ان آیات میں ہدایت و ضلالت کی ماہیت کی تصویرکشی کی گئی ہے اور حقیقت ہدایت و ضلالت پر حقیقت ضلالت کی نہایت ہی حقیقت پسندانہ تعبیر کی گئی ہے۔ اس کے اندر جو تشبیہات اور جو مجاز استعمال کیا گیا ہے وہ اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ تصویر پر تاثیر بن جائے۔ تشبیہات اور مجاز بھی نہایت ہی واقعیت پسندانہ ہیں۔

ہدایت و ضلالت کے حقائق اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسے ہیں جن کو سمجھانے کے لئے اس قسم کی تصویرکشی اور مؤثر انداز بیاں نہایت ہی ضروری ہے۔ اگرچہ بلاشبہ ہدایت و ضلالت حقائق ہیں لیکن یہ روحانی اور نظریاتی حقائق ہیں اور ایسے حقائق میں جنہیں تجربات اور عمل کے ذریعے چکھا جا سکتا ہے۔ رہی کسی روحانی حقیقت کی تعبیر یا حسن تعبیر تو اس سے لطف اندوز صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے ان حقائق کو عملاً برتا ہو۔

یہ ایسے حقائق ہیں جو مردہ دلوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو تاریک قلب و نظر کو روشن کرتے ہیں۔ یہ حقائق انسان کو ایسی زندگی دیتے ہیں جس کے ذریعے انسان ہر چیز کا مزہ لیتا ہے۔ ہر چیز کے بارے میں درست نقطہ نظر اپناتا ہے' ہر چیز کی

صحیح قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ انسان کا احساس تمام محسوسات کے بارے میں یکسر بدل جاتا ہے اور اس کے دل و دماغ میں اس قدر روشنی پیدا ہو جاتی ہے جس میں انسان ایک نئے جہاں کو دریافت کر لیتا ہے 'جس کے بارے میں پہلے اسے کچھ احساس بھی نہیں ہوتا۔

یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو عام انسان کے حس و ادراک میں نہیں آسکتا۔ نہ انسان اسے الفاظ کا جامہ پہنا سکتا ہے۔ اس کا ادراک صرف وہ شخص کر سکتا ہے جس نے اس حقیقت کو چکھا ہو۔ قرآن کریم کا اسلوب بیان اس قدر زوردار ہے کہ صرف وہی اسے ہمارے ادراک کے قریب تر کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ قرآن کا کمال ہے کہ وہ ہر حقیقت کے لئے حسب حال الفاظ لے کر آتا ہے جو مفہوم کی حقیقت کے ساتھ ہم رنگ ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کفر انسان کو ازلی اور ابدی حقیقت سے دور کر دیتا ہے۔ یہ ازلی اور ابدی حقیقت ایسی ہوتی ہے جس کے لئے فنا نہیں ہے۔ جو اوجھل نہیں ہوتی اور نہ گہرائی تک اترتی ہے۔ ابدی اور ازلی حقیقت سے قطع تعلق ہی درحقیقت موت ہے 'کسی انسان کے لئے۔ ایسا انسان کبھی بھی فعال نہیں ہو سکتا' مؤثر نہیں ہو سکتا اور اس کائنات پر اسے کنٹرول نہیں حاصل ہو سکتا۔ چنانچہ ایسا شخص مردہ شخص ہے۔ اس کی قوتیں اور صلاحیتیں مرجاتی ہیں اور وہ فطرتاً مردہ انسان ہوتا ہے۔ یہی ہے موت کی حقیقت۔

اس کے مقابلے میں ایمان نام ہے اس ابدی قوت کے ساتھ اتحاد و اتصال کا۔ ایمان اس قوت سے مدد لیتا ہے اور یہ قوت اس کی دعا کو قبول کرتی ہے لہٰذا ایمان حیات ہے اور کفر موت ہے۔

پھر کفر کی حالت میں روح انسانی شرف اور علم سے محروم ہوتی ہے۔ وہ تاریکی میں گھر جاتی ہے۔ انسان کے اعضاء اور اس کے شعور پر تالے پڑ جاتے ہیں۔ انسان تاریکی میں کھو جاتا ہے اور گمراہ ہو جاتا ہے۔ ایمان ہی درحقیقت آنکھیں کھول دیتا ہے۔ وہ ادراک کا بہترین وسیلہ ہے۔ اس سے استقامت نصیب ہوتی ہے۔ وہ ایک نور ہے' نور کے ہر مفہوم کے اعتبار سے۔

کفر سے انسان سکڑ جاتا ہے' اور بالآخر پتھر بن جاتا ہے' اس کی سوچ تنگ ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے انسان فطری راستے سے بے راہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کفر ایک قسم کی تنگی ہے جس میں ہر شخص اطمینان سے محروم ہو جاتا ہے اور ہر وقت دل تنگ رہتا ہے جبکہ ایمان سے شرح صدر' خوشی' سہولت حاصل ہوتی ہے اور اس کے خوشگوار سایۂ میں اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

کافر کی حیثیت اس طرح ہوتی ہے جس طرح کوئی خودرو گھاس اور پودا ہوتا ہے۔ جس کا اس کرۂ ارض پر کوئی مضبوط وجود نہیں ہوتا اور نہ اس کی پختہ جڑیں ہوتی ہیں' وہ ایک ایسا فرد ہوتا ہے جو اپنے خالق سے منقطع ہوتا ہے اور تنہا تنہا نظر آتا ہے۔ اس کائنات سے بھی وہ مربوط نہیں ہوتا' اس کائنات کے ساتھ اس کا روحانی ربط نہیں ہوتا۔ فقط مادی ربط ہوتا ہے جو نہایت ہی محدود تعلق ہے اور یہ اسی طرح ہے جس طرح کسی بھی حیوان کا اس کائنات کے ساتھ فطری ربط ہوتا ہے۔ محض محسوس ربط اور دائرہ۔

' اس کے مقابلے میں للہ فی اللہ جو تعلق ہوتا ہے وہ انسان فانی کو حقیقت ابدیہ اور حقیقت ازلیہ کے ساتھ مربوط کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے اس کائنات ظاہری کے ساتھ بھی موصول اور مربوط کر دیتا ہے۔

اس کے بعد ایک مومن کا گہرا تعلق اس قافلہ ایمان کے ساتھ اور ایک ایسی امت کے ساتھ ہوتا ہے جس کی جڑیں انسانی تاریخ میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ لہٰذا مومن روابط کے ایک بڑے خزانے کا مالک ہوتا ہے۔ وہ تعلقات کا ایک عظیم اور وسیع سرمایہ رکھتا ہے۔ وہ ایک نہایت ہی بھرپور اور وسیع شخصیت رکھتا ہے۔ اس کا وجود اور اس کی شخصیت اس کی عمر کے اختتام کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔

جب انسان ایمان لاتا ہے تو وہ اپنے دل میں ایک روشنی پاتا ہے اور اس روشنی کے ذریعے پھر اسے دین کے حقائق معلوم ہوتے ہیں اور اسے اس دین کے منہاج عمل اور طرز تحریک کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ اس کے قلب پر عجیب انکشافات ہوتے ہیں۔ جب ایک مومن اپنے دل میں یہ نور پاتا ہے تو اسے عجیب و غریب مناظر و مقامات نظر آتے ہیں۔ اسے نظر آتا ہے کہ اس دین کے تمام اجزاء کے اندر ایک گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ اسے حقائق واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ اسے نظر آتا ہے کہ اس دین کا منہاج عمل نہایت ہی گہرا اور نہایت ہی خوبصورت ہے۔ یہ دین متفرق عقائد اور متفرق عبادات کا کوئی بے ربط مجموعہ نہیں ہے جس میں کچھ قوانین بھی ہوں اور کچھ ہدایات بھی' بلکہ یہ دین ایک مکمل منصوبہ ہے' اس کے تمام اجزاء ایک دوسرے میں داخل اور ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ ہیں' ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ نہایت ہی گہرا عشق رکھتے ہیں۔ یہ تمام اجزاء ایک جسم کی طرح زندہ اور اس کائنات کی فطرت کے ساتھ ہم سفر ہیں اور یہ سفر نہایت ہی دوستانہ' باہم محبت اور گہری الفت کے ساتھ جاری و ساری ہے' نہایت ہی جوش و محبت کے ساتھ۔

انسان اپنے دل میں یہ نور پاتا ہے' اس کے ذریعے اس پر اپنی ذات کے حقائق' اپنی حیات کے حقائق' کرۂ ارض پر رونما ہونے والے حقائق' لوگوں کے حقائق اور لوگوں کے احوال کے حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ ان کی نظروں کے سامنے نہایت ہی روشن اور خیرہ کن مناظر آتے ہیں۔ وہ اس کائنات کے اندر جاری و ساری سنت الٰہیہ اور اس کے ضوابط کو بھی پالیتا ہے' جو نہایت ہی محکم اور فطری اور خوشگوار انداز میں جاری ہیں۔ پھر وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ ان سنن وضوابط کے پیچھے اللہ کی مشیت بھی کام کر رہی ہے اور یہ اللہ کی مشیت ہی ہے جس نے اس کائنات میں سنن الٰہیہ کو آزادی کے ساتھ جاری وساری کیا ہے اور کام کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ ایسا شخص پھر اس کائنات کے انسانوں کو دیکھتا ہے کہ یہ لوگ کس طرح سنن الٰہیہ کے مطابق چلتے پھرتے ہیں لیکن سنن الٰہیہ کے حدود کے اندر۔

جب کسی انسان کے دل میں یہ نور ایمانی پیدا ہو جاتا ہے تو وہ ہر معاملے' ہر واقعہ اور ہر مسئلے میں سچائی کی راہ واضح طور پر پا لیتا ہے۔ اب وہ اپنے اردگرد جاری سنن الٰہیہ اور واقعات کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہے۔ خواہ وہ اس کے نفس سے متعلق ہوں' اس کے خیالات سے متعلق ہوں یا اس کے اردگرد مختلف لوگوں کی طرف سے جاری منصوبوں سے متعلق ہوں۔ وہ اپنے ماحول کے ارادوں کو بھی معلوم کر لیتا ہے چاہے یہ ارادے ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔ واقعات کی تعبیر و توضیح وہ اپنی عقل اور اپنے نفس کے اندر واضح طور پر پاتا ہے۔ وہ رونما ہونے والے تمام واقعات کی تعبیر اچھی طرح کر سکتا ہے گویا وہ ہر معاملے کا جواب کتاب اللہ سے اخذ کر رہا ہے۔

جسے یہ نور حاصل ہوتا ہے اس کے خیالات' اس کا شعور اور اس کے خدوخال بھی روشن نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے دل میں مسرور' اپنے حالات پر خوش اور اپنے انجام سے مطمئن ہوتا ہے۔ وہ حکم دیتے وقت نرم اور خوشگوار رویہ اپناتا

ہے۔ وہ واقعات و حالات کا سامنا بھی نہایت ہی سنجیدگی سے کرتا ہے اور ہر حال میں مطمئن ' پر امید اور پر یقین ہوتا ہے۔
یہ ہے وہ حقیقت جس کی تصویر کشی قرآن کریم ان الفاظ میں کرتا ہے اور کتنی خوبصورتی سے اور کس پیارے انداز میں۔

(اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (۱۲۲:۶)) "کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا' پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح ان سے نہ نکلتا ہو؟

اس دین سے قبل مسلمان ایسے ہی تھے' وہ مردہ تھے' یہ اسلام ہی ہے جس نے ان کی روح کو وسعت دی اور انہیں زندگی بخشی۔ ان کو ترقی جستجو' حرکت اور حیات جاوداں عطا کی جبکہ اس سے پہلے ان کے دل بجھے بجھے تھے۔ ان کی روح تاریک تھی' لیکن جب ان کے دلوں کے اوپر ایمان کی بارش ہوئی تو وہ سرسبز اور لہلاتے ہوئے کھیت کی طرح ہو گئے۔ ان کی روح سے نور کے چشمے پھوٹنے لگے' روشنی اور نور کی لہریں اٹھنے لگیں۔ وہ گمراہوں کو راہ بتلانے لگے۔ وہ حیران و پریشان لوگوں کو راہ دکھاتے' خوفزدہ انسانیت کو اطمینان دلاتے' غلاموں کو رہائی دلاتے' وہ لوگوں کے لئے زندگی کے سفر کی سمت متعین کرنے لگے اور یہ اعلان کرنے لگے کہ انسان کو از سرنو زندگی عطا ہو گئی ہے۔ اب وہ صرف اللہ کا غلام ہے اور دنیا کی تمام غلامیوں سے اس نے رہائی پالی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جس کی روح میں اللہ نے زندگی بھر دی ہو' کیا وہ شخص اس آدمی کی طرح ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں گھرا ہوا ہے اور ان سے اس کے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ یقیناً ان دونوں افراد کے حالات ایک دوسرے سے بہت ہی مختلف ہیں اور ان کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ لہٰذا کون ہے جو اس ظلمت کدے میں دھرنا مار کر بیٹھ جائے جبکہ اس کے اردگرد نور کا فیضان ہو رہا ہو؟

(كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۲۲:۶)) "کافروں کے لئے تو اسی طرح ان کے اعمال خوشنما بنا دیئے گئے ہیں۔" یہ ہے حقیقی راز۔ یہاں کفر کی تعبیر تاریکی اور موت سے کی گئی ہے اور کفر کے اندر یہ صفات مشیت الٰہی نے ودیعت کی ہیں۔ پھر اللہ نے انسانوں کے اندر ایسی اقسام پیدا کی ہیں کہ ان میں سے بعض لوگ نور کو پسند کرتے ہیں اور بعض لوگ ظلمت کو پسند کرتے ہیں۔ جب کوئی ظلمت کو پسند کرنے لگتا ہے تو اس کے لئے ظلمت محبوب کر دی جاتی ہے اور وہ گمراہی میں دور تک نکل جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے لئے واپس آنے کا کوئی راستہ ہی نہیں رہتا۔ اس کے بعد جنوں اور انسانوں میں سے شیاطین کا ایک لشکر سامنے آتا ہے جو ایک دوسرے کے سامنے بدنما اور گمراہ کن باتوں کو اچھا بنا کر پیش کرتا ہے۔ اور پھر وہ کافروں کے لئے ان کے اعمال کو مزید خوشنما بنا دیتے ہیں۔ جس دل میں نور ایمان نہیں ہوتا وہ ان شیاطین کی باتوں پر توجہ سے کان دھرتا ہے۔ وہ ان کے وسوسوں کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ اب وہ ہدایت و ضلالت کی بھی کوئی تمیز نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اندھیروں میں گھرا ہوتا ہے۔ یوں اللہ کافروں کے لئے ان کے اعمال کو خوشنما بنا دیتا ہے۔

اس اصول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہر گاؤں میں کچھ وڈیرے مجرم بنا دیے ہیں اور وہ ان بستیوں میں اپنی مکاریوں کے جال پھیلاتے ہیں۔ یوں اللہ کی جانب سے انسانوں کے ابتلاء کی یہ اسکیم مکمل ہوتی ہے اور اللہ کی تقدیر اپنا کام کرتی ہے۔ اس کی حکمت کے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور ہر شخص اس دنیا میں وہی راستہ اختیار کرتا ہے جو اس کے لئے سازگار بنا دیا گیا ہوتا ہے اور آخر کار ہر شخص اپنے مقرر انجام تک جا پہنچتا ہے۔

(وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (٦: ١٢٣)) "اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکر و فریب کا جال پھیلائیں۔ دراصل وہ اپنے فریب کے جال میں آپ پھنستے ہیں، مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔" یہ اللہ کی سنت ہے کہ وہ ہر بستی 'شہر یا دارالخلافہ میں بڑے بڑے مجرمین میں کچھ لوگوں کو مقتدر بنا دیتا ہے۔ یہ جرائم پیشہ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دین کے دشمن ہوتے ہیں اور یہ دین کے دشمن اس لئے ہوتے ہیں کہ بستیوں کے اوپر اقتدار حاصل کر کے اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ دین ان سے اس اقتدار کو چھین کر اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ یوں دین ان سے ربوبیت اور حاکمیت کی حیثیت چھین لیتا ہے اور لوگوں کو آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ یوں دین تمام لوگوں کو اللہ کی غلامی میں دے دیتا ہے اور اللہ ہی رب الناس اور ملک الناس قرار پاتا ہے۔

یہ سنت الٰہیہ ہے کہ اللہ سچائی کے ساتھ رسولوں کو بھیجے اور یہ سچائی تمام مدعیان ربوبیت سے ان کی ربوبیت چھین لے اور تمام مدعیان حاکمیت سے ان کا حق اقتدار چھین لے۔ چنانچہ سچائی کے باوجود یہ اکابر مجرمین رسولوں اور سچائی کے دشمن ہو جاتے ہیں اور بستیوں اور دارالحکومتوں میں اپنی مکاری کے جال پھیلاتے ہیں۔ تمام لوگ اپنے اپنے دارالخلافوں سے ایک دوسرے کو ہدایات اور رپورٹیں دیتے ہیں جو فریب پر مبنی ہوتی ہیں اور یہ لوگ معرکہ حق و باطل میں شیاطین کے معاون بنتے ہیں۔ باطل اور گمراہی کو پھیلانے کی سعی کرتے رہتے ہیں اور اپنی اس ظاہری اور خفیہ سازش کی وجہ سے لوگوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔

یہ سنت جاریہ اور ہمہ گیر معرکہ ہے۔ اس لئے کہ دونوں قوتوں کے درمیان اصل اول ہی کی بنا پر تضاد وجود میں آ گیا ہے۔ اصل اول یہ ہے کہ حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ صرف اللہ جل شانہ کے ساتھ مخصوص ہے جبکہ کسی بھی بستی کے مجرمین کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس بستی میں ان کی بات کی چلت ہو اس کے علاوہ اہل حق اور ان اکابر مجرمین کے درمیان ذاتی تضاد بھی ہوتا ہے۔

ہر نبی کو اس معرکے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کوئی نبی اس سے بچ نہیں سکتا۔ نبی اور اہل ایمان کے لئے لازمی ہے کہ وہ اس معرکے میں کودیں اور آخر کار اس میں سے سرخروئی کے ساتھ نکلیں۔ اللہ اپنے دوستوں کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ان مجرمین کا مکر و فریب کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو اور ان کا جال طویل سے طویل تر کیوں نہ ہو؟ آخر کار یہ مکر خود ان پر آ کر پڑے گا۔ اس لئے کہ اہل ایمان صرف تنہا اس معرکے میں نہیں کودتے اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ ان کے لئے کافی مددگار ہے۔ وہ کافرین کی سازش کو خود ان پر لوٹاتا ہے۔ "دراصل وہ خود اپنے فریب کے جال میں پھنستے

ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں۔

(وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۶: ۱۲۳)) "لہٰذا اہل ایمان کو پوری طرح مطمئن رہنا چاہیے۔" اب قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ اللہ کے رسولوں اور اللہ کے دین کے دشمنوں کے مزاج میں کبرو غرور کا مادہ بھرا ہوتا ہے۔ اور یہی کبر اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ اسلام سے دور رہیں اور یہ اس لئے اس نظریہ سے دور بھاگتے ہیں کہ اس میں جس طرح یہ اکابر اللہ کے بندے ہوتے ہیں اس طرح تمام عوام بھی اللہ کے بندے ہوتے ہیں' کوئی طبقاتی فرق باقی نہیں رہتا۔ چونکہ یہ لوگ اپنے اس طبقاتی فرق و امتیاز کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اس لئے ایسے لوگوں کے لئے یہ ایک بڑا کڑوا گھونٹ ہے کہ یہ ایمان لے آئیں اور نبی کے سامنے اطاعت کریں حالانکہ وہ اس بات کے عادی ہیں کہ وہ خود مطاع بنیں اور الوہیت اور ربوبیت کے مقام پر فائز ہوں' قانون سازی کریں اور ان کے قوانین کو تسلیم کیا جائے۔ وہ احکام دیں اور لوگ ان کے احکام کی اطاعت کریں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جو کرنے کی نہیں ہیں۔ نہایت ہی بے بنیاد بات کرتے ہیں کہ ہم اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمیں وہ تعلیم نہ دی جائے جو نبیوں کو دی گئی :

(وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ (۶: ۱۲۴))

"جب ان کے سامنے کوئی آیت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں "ہم نہ مانیں گے جب تک کہ وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے۔" ولید ابن مغیرہ نے ایک بار کہا : "کہ اگر نبوت حق بات ہوتی تو میں زیادہ مستحق تھا کہ میں نبی ہوتا' کیونکہ میں عمر میں 'اے محمد' تم سے بڑا ہو۔ مال میں تم سے زیادہ ہوں۔" اور ابوجہل نے کہا "خدا کی قسم ہم اس تحریک پر راضی نہ ہوں گے اور نہ ہی اس کی اطاعت کریں گے الا یہ کہ ہم پر بھی اسی طرح جبرئیل وحی لے کر آئیں جس طرح اس پر لاتے ہیں۔

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ کبر نفس اور اس قسم کے لوگ جس طرح کے عادی ہوتے ہیں کہ یہ احکام صادر کرتے ہیں اور دوسرے لوگ اطاعت کرتے ہیں ایسے امور ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کے لئے ضلالت کو مزین کر دیا جاتا ہے اور یوں یہ لوگ دین اور داعیان دین (رسل) کے مقابلے میں دشمنی پر اتر آتے ہیں۔

چنانچہ اللہ ایسے لوگوں کے ان اقوال کی تردید فرماتے ہیں۔ اول یہ کہ کسی کو رسول مقرر کرنا یہ اللہ کے علم محیط پر موقوف ہے کہ کون اس لائق ہے کیونکہ نبوت ایک نہایت ہی اہم کائناتی منصب ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ یہاں اللہ تعالیٰ ان کی تردید سخت تحقیر اور دھمکی سے کرتے ہیں کہ تمہارا انجام بہت ہی برا ہونے والا ہے۔

(اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ (۶: ۱۲۴)) "اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغامبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔ قریب ہے وہ وقت جب یہ مجرم اپنی مکاریوں کی پاداش میں اللہ کے ہاں ذلت اور سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔" رسالت ایک نہایت ہی عظیم اور مہتم بالشان منصب ہے۔ یہ ایک کائناتی معاملہ ہے

جس میں ازلی اور ابدی ارادۂ الٰہیہ ایک بندے کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ عالم بالا اور انسان کی محدود دنیا کے درمیان اتصال ہو جاتا ہے۔ آسمان اور زمین آپس میں مل جاتے ہیں' دنیا اور آخرت ایک ہو جاتے ہیں۔ اس میں سچائی کے کلیات انسانی دلوں' انسانی واقعات' انسانی تاریخ اور عملی دنیا پر منطبق ہوتے ہیں۔ اس میں ایک انسان اپنی ذات سے الگ ہو جاتا ہے اور خالص اور کامل اللہ کا ہو جاتا ہے۔ محض نیت اور عمل کا خلوص ہی نہیں بلکہ اس مخصوص انسان کا ظرف بھی اس عظیم کام کے لئے خالی ہو جاتا ہے۔ ذات رسول ذات باری کے ساتھ مربوط ہو جاتی ہے۔ رسول اور خدا کے درمیان براہ راست رابطہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ اتصال صرف اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے کہ رسول کی ذات اپنی ماہیت کے اعتبار سے اس رابطے کے لئے صالح اور قابل ہو جائے۔ اس کے اندر ایسی صلاحیت پیدا کر دی جائے کہ وہ اس پیغام کو وصول کر سکے۔

اس لئے یہ بات اللہ ہی جانتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے کہ امانت رسالت وہ کہاں لا کر رکھ دے۔ اس مقصد کے لئے کس ذات کا انتخاب کرے کیونکہ اللہ کے اربوں بندے اس زمین پر آتے جاتے اور موجود رہتے ہیں۔ یہ اللہ ہی ہے کہ ان اربوں میں سے کسی ایک کا انتخاب فرما لیتا ہے۔

جو لوگ مقام رسالت تک پہنچنا چاہتے ہیں یا وہ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کو دینی تعلیمات عطا کی جائیں جو رسولوں کو دی گئی ہیں' لیکن یہ لوگ ایسا مزاج رکھتے ہیں جو مسلمان کے لئے موزوں ہی نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ خود اپنی ذات کو محور کائنات سمجھتے ہیں جبکہ رسولوں کا مزاج بالکل دوسرا ہوتا ہے۔ رسول کا مزاج تو یہ ہوتا ہے کہ وہ نہایت ہی عاجزی سے رسالت کو قبول کرتا ہے اور پھر اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ وہ اپنی ذات کو اس پیغام میں نشوونما دیتا ہے اور پھر رسول کو یہ منصب ایسے حالات میں دیا جاتا ہے کہ وہ نہ اس کے بارے میں کوئی خبر رکھتا ہے اور نہ ہی وہ اس کا امیدوار ہوتا ہے۔

(وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ) تم اس بات کی امید نہ رکھتے تھے کہ تمہارے طرف کتاب کا القاء ہو گا' یہ تو تمہارے رب کی ایک رحمت تھی۔" دوسری بات یہ ہے کہ یہ اکابر جاہل ہیں اور اس منصب کی اہمیت سے واقف ہی نہیں ہیں۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ ہی نہیں پا رہے کہ یہ منصب کسی کو عطا کرنا صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔

یہی وجوہات ہیں جن کی بنا پر قرآن ان کی بات کا دو ٹوک الفاظ میں جواب دیتا ہے۔

(اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (٦ : ١٢٤)) "اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغامبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔" چونکہ اللہ جانتا تھا' اس لئے اس نے یہ منصب موزوں شخص کو دے دیا۔ نہایت ہی مکرم اور مخلص شخص کے سپرد ہوا۔ پوری تاریخ میں اس نے رسولوں کے معزز سلسلے کو جاری کیا اور اسے خاتم النبیین پر ختم کیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان مجرمین کو یہ دھمکی دیتے ہیں کہ ان کا انجام توہین آمیز ہو گا اور انہیں شدید عذاب سے دوچار ہونا ہو گا۔

(سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِندَ اللَّهِ وَعَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ (٦:١٢٤)) قریب ہے وہ وقت جب مجرم اپنی مکاریوں کی پاداش میں اللہ کے ہاں ذلت اور سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔" اللہ کے ہاں ان کو ذلت اس لئے نصیب ہوگی کہ انہوں نے اپنے متبعین کے ہاں اپنے آپ کو سربلند کیا ہوا تھا اور وہ بوجہ کبرو غرور قبول حق سے انکار کرتے تھے اور ان برائیوں کے ساتھ ساتھ مقام رسالت کی تمنا بھی کرتے تھے۔ اور چونکہ انہوں نے اسلامی تحریک کے مقابلے میں سازش کا جال پھیلایا' رسولوں کی دشمنی اختیار کی اور مومنین کو اذیت دی' اس لئے انہیں سخت عذاب دیا جائے گا۔

اب یہ بیان اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ انسانوں کے دل و دماغ میں ایمان ہو تو کیا صورت حال ہوتی ہے اور ہدایت سے انسان کے شب و روز کس طرح بدل جاتے ہیں۔

(فَمَن يُرِدِ اللَّهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ (٦:١٢٥)) "پس (یہ حقیقت ہے کہ) جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ (اسلام کا تصور کرتے ہی) اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے۔ اس طرح اللہ (حق سے فرار اور نفرت کی) ناپاکی ان لوگوں پر مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔"

اللہ تعالیٰ نے اس جہاں میں ہر شخص کو اختیار تمیزی اور آزادی دی ہے کہ وہ ضلالت اختیار کرے یا ہدایت۔ اب جو شخص اللہ تعالیٰ کی اس سنت جاریہ کے مطابق جو اس نے اس کائنات میں ہدایت کے سلسلے میں وضع فرمائی ہے راہ ہدایت کے حصول میں دلچسپی رکھتا ہے اور اسے آزمانے کے لئے اسے جو اختیار دیا گیا ہے اور وہ اس کو استعمال کر کے ہدایت کے لئے سعی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سینہ کو اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔ اس کے دل کے دریچے کھل جاتے ہیں اور وہ بسہولت اسلام کو قبول کرتا ہے اور اس میں دلچسپی لیتا ہے' اس پر مطمئن ہو جاتا ہے اور وہ اسلام کے ساتھ گھل مل جاتا ہے۔

اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے جس کے لئے گمراہی مقدر کر دی ہے' اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی اسی سنت جاریہ کے مطابق اسی شخص کو مقدر کر دی جاتی ہے جسے اسلام اور ہدایت سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ اس کے دل کے دریچے بند ہو جاتے ہیں اور اس کا سینہ اسلام کے لئے تنگ ہو جاتا ہے۔ اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ گویا اس کی روح آسمان پر پرواز کرنے والی ہے۔ چنانچہ اس کا دل و دماغ اس کے لئے بند ہو جاتا ہے اور وہ راہ ہدایت کو اختیار کرنے میں نہایت ہی مشکل محسوس کرتا ہے۔

(كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ) کے الفاظ میں ایک نفسیاتی صورت حال کا نقشہ حسی انداز بیان میں کھینچا گیا

ہے۔ ایسے حالات جس میں انسان کی سانس پھول جاتی ہے اور سینہ تنگی محسوس کرتا ہے 'جس طرح بلندی پر چڑھتے وقت انسان محسوس کرتا ہے۔ مفہوم کے ساتھ ساتھ قرأۃ حفص کے مطابق لفظ (يَصَّعَّدُ) کے اندر بذات خود ایک قسم کی سختی اور مشکل پائی جاتی ہے اور بڑی محنت سے یہ لفظ ادا ہوا ہے۔ اس لفظ کی آواز ہی سے اس کے مفہوم کی مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے۔ یوں انسان کی نفسیاتی حالت' اس کی حسی حالت اور انداز تعبیر سب کے سب یہاں یکجا اور یک رنگ ہو جاتے ہیں۔ (تفصیلات دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی میں بحث حسی تخیل)۔

یہ منظر اس اختتامیہ پر ختم ہوتا ہے :

(كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (٦: ١٢٥)) "اور اسی طرح اللہ تعالیٰ ناپاکی ان لوگوں پر مسلط کر دیتا ہے' جو ایمان نہیں لاتے۔" اسی طرح کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنا نظام قضا و قدر جاری کیا ہے۔ اس کے مطابق اور اللہ کی جاری و ساری سنت کے مطابق جو شخص راہ ہدایت تلاش کرتا ہے اللہ اس کا سینہ کھول دیتا ہے اور جو شخص ہدایت کو پسند نہیں کرتا' اللہ اسے گمراہی کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔ اللہ اس طرح ایمان نہ لانے والوں کو گندگی میں ڈال دیتا ہے۔ (الرِّجْسَ) کے مفہومات میں سے ایک مفہوم عذاب بھی ہے اور اس کے مفہوم میں گندگی اور ناپاکی بھی ہے اور گراوٹ بھی ہے۔ یعنی جو شخص اس ناپاکی اور گندگی کے دلدل میں پھنس جاتا ہے وہ اسی میں پڑا رہتا ہے اور رجس کے لفظ کے استعمال سے یہی اشارہ دینا مطلوب ہے۔

اب ہم اس آیت پر دوبارہ غور کرتے ہیں :

(فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (٦: ١٢٥)) "پس (یہ حقیقت ہے کہ) جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ (اسلام کا تصور کرتے ہی) اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے۔ اس طرح اللہ (حق سے فرار اور نفرت کی) ناپاکی ان لوگوں پر مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔"

اس آیت میں جس عظیم حقیقت کو بیان کیا گیا ہے یعنی مشیت الٰہیہ اور اس کے ساتھ وہ تمام دوسری آیات و نصوص جن کا تعلق اللہ کی مشیت اور انسانی اعمال اور رجحانات سے ہے' اور جن میں انسانی اعمال پر جزاو سزا کو مرتب کیا گیا ہے یا جن میں انسان کی ہدایت اور ضلالت کے احکام مرتب ہوئے ہیں' ان تمام آیات کو صحیح طرح سمجھنے کے لئے عقلی اور فلسفیانہ منطق کے سوا ایک دوسری منطق اور قوت ادراک کی ضرورت ہے۔ یہ منطق اور قوت ادراک' ہماری ظاہری عقل اور منطق سے وراء ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی افکار کی تاریخ میں جو بحثیں معتزلہ اور اہل سنت کے درمیان ہوئی ہیں اور اہل سنت اور مرجئہ کے درمیان اور اس سے قبل عیسائیوں کے فلسفہ لاہوت کے اندر جو بحث وجدال رہی ہے اور اس سلسلے میں جو منطق صغریٰ و کبریٰ متعین ہوئے ان سب سے وہ قوت مدرکہ وراء ہے۔

اس نازک بحث کو سمجھنے کے لئے ہمیں انسان کی عقلی اور منطقی دنیا سے ذرا آگے جانا ہو گا اور اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہمیں عقلی اور فلسفیانہ دنیا سے ذرا باہر آکر انسان کی عملی زندگی میں آنا ہو گا۔ قرآن کریم جس صورت حال کی تصویر کشی کر رہا ہے اس کا تعلق انسان کی عملی صورت حالات سے ہے۔ اس کا تعلق محض عقلی اور فلسفیانہ مباحث سے نہیں ہے۔ انسان کے واقعی حالات اور اس کے عملی شب و روز جس طرح ہوتے ہیں اور اس کائنات میں جس طرح عملی طور پر چلتے ہیں ان آیات میں ان کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جب ہم انسان کی عملی دنیا کو دیکھتے ہیں تو اس میں اللہ کی قدرت اور مشیت اور انسان کا ارادہ اور سعی و عمل ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں اور ان کا عملی میدان اس طرح باہم ملا ہوا ہے کہ محض فلسفیانہ منطق اس گتھی کو سلجھا نہیں سکتی۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ کا ارادہ اور تقدیر انسان کو ہدایت یا ضلالت کی طرف دھکیل دیتی ہے تو یہ صورت بھی عملی نہیں ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ بس انسان کا ارادہ اور عمل ہی اس کے انجام کو متعین کرتا ہے تو عملاً ایسا بھی نہیں ہے۔ حقیقت کا تعلق ان دونوں امور کے ساتھ ہے اور وہ اس قدر لطیف اور نظروں سے اوجھل ہے اور اسی طرح بین بین ہے کہ ایک طرف اللہ کی مشیت مطلقہ ہے اور دوسری جانب انسان کا ارادہ اور رجحان ہے' دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان کے درمیان عملاً تصادم بھی نہیں ہوتا۔

لیکن جبر و اکراہ اور قدرت واختیار کے اس حسین امتزاج کی اصل نوعیت کو ہم محض استدلال یا عقلی سوچ کے ذریعے متعین نہیں کر پاتے۔ نہ ہم اس کی واضح تعبیر انسانی الفاظ و عبارات میں کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ انسانی عبارات کسی حقیقت کی حقیقی نوعیت سے عبارت ہوتی ہیں اور جب اصل حقیقت ہی منطقی استدلال اور عقلی فکر کی رینج سے باہر ہو تو عبارات اور اسلوب اظہار کیا کر سکتا ہے۔

اس عظیم عملی حقیقت کے صحیح تصور کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان کو بیک وقت عقلی اور روحانی دنیا کا تجربہ ہو۔ عملاً یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کا فطری میلان اسلام کی طرف ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔ یہ بات قطعی طور پر اللہ کا فعل ہوتی ہے اس لئے کہ یہ شرح صدر ایک وقوعہ ہے اور کوئی وقوعہ اللہ کی تخلیق کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔ اور جس کی فطرت ضلالت کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو وہ اپنے دل میں تنگی اور گھٹن محسوس کرتا ہے اور اسلام و ہدایت کا تصور کرتے ہی وہ مشکل محسوس کرتا ہے۔ یہ بھی اللہ کا کام ہے کیونکہ یہ بھی ایک وقوعہ ہے اور اس کا ظہور بھی اللہ کی تخلیق اور عملاً اس کی مشیت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں امور اس ارادے کے تابع ہیں جو اللہ کی ذات انسانوں کے بارے میں فرماتی ہے۔ لیکن اللہ کے اس ارادے کو جبری ارادہ نہیں کہہ سکتے۔ یہ ارادہ اللہ کی سنت جاریہ کے مطابق ہے۔ وہ سنت یہ ہے کہ اللہ نے حضرت انسان کو ایک مخصوص مقدار میں آزادی عطا کر کے اسے آزمائش میں ڈال دیا ہے اور اللہ کی یہ سنت اور یہ تقدیر انسان کی جانب سے اس آزادی کے استعمال کے نتیجے میں اپنا کام کرتی ہے۔ رہی ہدایت و ضلالت تو یہ انسان کے خود اپنے رجحان اور صلاحیت پر مبنی ہے۔

اگر ہم ایک عقلی صغریٰ کے مقابلے میں ایک عقلی کبریٰ لائیں اور ان صغریٰ اور کبریٰ کے قضیوں کے ساتھ روحانی اور باطنی علم کو نہ ملائیں اور نہ ہی اس کے ساتھ انسان کے عملی اور نفسیاتی تجربات کو شامل کریں تو ہم اس عظیم حقیقت کو اپنے ادراک کے دائرے میں نہیں لا سکتے۔ پوری اسلامی تاریخ میں اس مسئلے پر جو بحث و جدال رہا اس کا یہی نتیجہ نکلا ہے۔

اسی طرح اسلام کے علاوہ دوسرے فلسفوں کا نتیجہ بھی ایسا ہی رہا ہے۔ لہذا اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے ہمیں عملی اور روحانی ذوق کو بھی استعمال کرنا ہوگا۔ ایسا ذوق جو اس حقیقت کو منطقی صغریٰ وکبریٰ سے نکل کر براہ راست پا سکے۔

اب ہم دوبارہ سیاق قرآن کی طرف لوٹتے ہیں۔ اس سبق کی یہ لہر سابق بیان پر بطور تبصرہ وارد ہوئی۔ سابق بیان ذبیحوں کی حلت اور حرمت کے بارے میں تھا لیکن یہ تمام امور دراصل ایک ہی پیکج کے مختلف حصے ہیں۔ انسان کے اندر دینی شعور کی تعمیر' انسان کے لئے قانون اور اقتدار کی تجویز' انسان پر اللہ کی حاکمیت کا تصور اور ان سب کو دائرہ ایمان کے اندر لاکر ایک ہی پیکج بنا دینا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ایمان اور کفر اور ہدایت و ضلالت کے مضمون کو بھی بیچ میں بیان کر دیا گیا۔ اب آخر میں ایک دوسرا تبصرہ آتا ہے جس کے نتیجے میں یہ تمام امور باہم مربوط ہو جاتے ہیں۔ ان امور کا مجموعہ صراط مستقیم کہلاتا ہے۔ اگر ان امور میں سے کوئی ایک بھی ترک کر دیا گیا تو گویا انسان نے صراط مستقیم کو ترک کر دیا۔ یعنی عقیدۂ توحید و شعور بھی اس کا حصہ ہے اور اس راستے پر جاکر انسان دارالسلام تک پہنچتا ہے۔ اور دارالسلام میں اللہ اہل ایمان کا دوست و ولی ہوتا ہے۔

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾
لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

''حالانکہ یہ راستہ تمہارے رب کا سیدھا راستہ ہے اور اس کے نشانات ان لوگوں کے لئے واضح کر دیئے گئے ہیں جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔ ان کے رب کے پاس ان کے لئے سلامتی کا گھر ہے اور وہ ان کا سرپرست ہے اس صحیح طرز عمل کی وجہ سے جو انہوں نے اختیار کیا۔'' یہ ہے صحیح راستہ' اور تیرے رب کا راستہ۔ ''تیرے رب'' کا لفظ نہایت ہی اطمینان بخش اور تشفی بخش ہے۔ دل مومن کو اعتماد اور یقین سے بھر دینے والا ہے اور ایک اچھے انجام کے لئے خوشخبری ہے۔ یعنی یہ ہے ہدایت و ضلالت کے بارے میں سنت الٰہیہ اور یہ ہے اسلام کا قانون حلال و حرام اور یہ دونوں دین اسلام کا حصہ ہیں اور سیاق قرآن میں اسی لئے انہیں یکجا اور ایک ٹکڑا بنایا گیا ہے۔

ہم نے تو ان آیات الٰہیہ کو نہایت ہی واضح کر کے بیان کر دیا ہے۔ لیکن ان سے استفادہ وہی لوگ کر سکیں گے جو ان کو بھلائیں گے نہیں بلکہ یاد رکھیں گے۔ اس لئے کہ دل مومن تو یاد کرنے والا ہے' بھولنے والا نہیں ہے۔ نیز دل مومن ہمیشہ ہدایت کے لئے کھلا رہتا ہے۔ وہ زندہ ہوتا ہے اور بات سنتا ہے' مردوں کی طرح نہیں ہوتا۔

پھر جو لوگ یاد کرتے ہیں اور نصیحت پکڑتے ہیں ان کے لئے ان کے رب کے نزدیک دارالسلام ہے جہاں وہ تسلی اور تشفی سے رہیں گے۔ اس امن و طمانیت کی ضمانت اللہ دیتا ہے جو کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ وہ ان کا ولی اور مددگار ہے اس لئے کہ وہ صحیح راستے پر عمل کرتے ہیں اور آزمائش دنیا میں ان کی کامیابی پر یہ ان کے لئے انعام ہے۔

یہاں آکر ہم ایک بار پھر اپنے آپ کو ایک عظیم حقیقت کے سامنے کھڑا پاتے ہیں۔ اس حقیقت کا تعلق اس دین کے نظریاتی پہلو سے ہے اور یہ حقیقت اسلام کے ان نظریات اور اللہ کے حق حاکمیت پر مشتمل ہے جن کے اوپر اللہ کا سیدھا راستہ استوار ہوتا ہے۔ یہ اس دین کا حقیقی مزاج ہے اور اسی پر اسے اللہ رب العالمین نے استوار کیا ہے۔

درس ٦٩ ایک نظر میں

یہ پورا مضمون درس سابق ہی کے ساتھ ملحق ہے 'بلکہ یہ اسی کا تسلسل ہے۔ اور یہ اسی طرح ہے جس طرح سمندر میں لہر کے بعد لہر اٹھتی ہے۔ اس میں شیاطین جن اور شیاطین انس کے انجام کا بیان کیا گیا ہے اور یہ انجام اس اچھے انجام کے بالمقابل بیان ہوا ہے جو ان لوگوں کا ہو گا جو صراط مستقیم پر قائم ہوں گے۔ اس جگہ اس کا ذکر اس مناسبت سے ہوا ہے کہ یہاں اللہ کی حاکمیت اور اس کے حق قانون سازی کا مضمون چل رہا تھا اور یہ مسائل وہ ہیں جن کا تعلق دین اسلام کے بنیادی اور ایمانی تصورات کے ساتھ ہے۔ مقصد یہ بتلانا ہے کہ یہ مسائل محض سیاسی اور دنیاوی مسائل نہیں ہیں بلکہ یہ ایمانیات کے ساتھ متعلق ہیں اور ان پر اخروی جزاو سزابھی مرتب ہوتی ہے یعنی دنیا میں تبلیغ اور دعوت اور ڈراوے کے بعد انسان جو بھی کمائے گا اس پر تمام لوگوں کا انجام ہو گا۔ اگر لوگوں کے کسب و عمل کو دخل نہ ہوتا تو اللہ تو اس بات پر پوری پوری قدرت رکھتا ہے کہ شیاطین اور ان کی دوست اقوام کو صفحہ ہستی سے مٹا دے اور ان کی جگہ دوسری فرمانبردار اقوام کو لے آئے کیونکہ پوری دنیا کی آبادی اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ یہ تمام امور نظریاتی عقائد کے ساتھ متعلق ہیں۔ اور ان کو ذبیحوں کے حلال و حرام کی بحث کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس بحث سے قبل بھی اور بعد میں بھی۔ ذبیحوں کے بیان کے بعد پھلوں اور مویشیوں اور اولاد کی نذر کے مسئلے کو بھی یہاں لیا گیا ہے' اس کا بھی یہاں نظریاتی پہلو ہے اور جاہلیت کے مختلف ادوار میں یہ رسوم کچھ نظریات پر مبنی تھیں۔ اس طرح یہ تمام مباحث ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ اور پیوستہ نظر آتے ہیں۔ اور یہ مسئلہ اسلامی نظام میں اس کی حقیقی حیثیت اور مقام میں نظر آتا ہے۔ ان سب کے اندر مشترکہ صفت یہ ہے کہ ان تمام مسائل کا ایک نظریاتی پہلو ہے اور وہ یہ کہ اسلامی نظریہ حیات کے مطابق حلال و حرام کے تعین کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔

---○○○---

درس نمبر ۶۹ تشریح آیات

۱۲۸--- تا--- ۱۳۵

اس سے پہلے سبق میں یہ بات گزری ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے دلوں کو اسلام کے لے کھول دیتا ہے۔ایسے لوگوں کے دل بیدار ہوتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔یہ لوگ دار السلام میں داخل ہوتے ہیں اور اپنے رب کی ولایت اور کفالت میں رہتے بستے ہیں۔اب یہاں ایسے لوگوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو ان کے نقیض ہیں۔قیامت کے مناظر بیان کرتے ہوئے قرآن کریم کا یہی انداز ہوتا ہے کہ وہ تصویر کے دونوں رخ انسان کے سامنے پیش کرتا ہے۔اب یہاں انسانوں اور جنوں میں سے جو لوگ شیطانی کام کرتے ہیں ان کے شب و روز کا ذکر کیا جاتا ہے' یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں ایسی زندگی گزاری ہے کہ یہ ایک دوسرے کو کھوٹی باتیں بتاتے رہے ہیں۔ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے رہے ہیں اور یہ کام وہ اس لئے کرتے رہے ہیں کہ لوگ گمراہ ہوں۔ان لوگوں کا رویہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ یہ لوگ نبیوں کے مقابلے میں ایک دوسرے کے پشتیبان بنیں اور یہ لوگ ایک دوسرے کو مشورے دیتے رہے ہیں تاکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ان معاملات میں بحث و مباحثہ کریں جن میں اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے حلال و حرام کا تعین کیا ہے۔ ان لوگوں کو قرآن کریم نے اس طرح پیش کیا ہے جس طرح ایک زندہ اور متحرک منظر میں کوئی چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔یہ لوگ اس منظر میں ایک دوسرے پر الزام لگاتے ہوئے 'نہایت ہی منافق نظر آئے۔غرض اس آیت میں وہ مناظر بھرپور انداز میں آگئے جس طرح کہ قرآن کریم ہر جگہ مناظر قیامت کے بیان کے وقت یہ انداز عموماً اختیار کرتا ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ۚ يَٰمَعْشَرَ ٱلْجِنِّ قَدِ ٱسْتَكْثَرْتُم مِّنَ ٱلْإِنسِ ۖ وَقَالَ أَوْلِيَآؤُهُم مِّنَ ٱلْإِنسِ رَبَّنَا ٱسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَغْنَآ أَجَلَنَا ٱلَّذِىٓ أَجَّلْتَ لَنَا ۚ قَالَ ٱلنَّارُ مَثْوَىٰكُمْ خَٰلِدِينَ فِيهَآ إِلَّا مَا شَآءَ ٱللَّهُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿١٢٨﴾ وَكَذَٰلِكَ نُوَلِّى بَعْضَ ٱلظَّٰلِمِينَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ ﴿١٢٩﴾

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَ يُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤى اَنْفُسِنَا وَ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ شَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

"جس روز اللہ سب لوگوں کو گھیر کر جمع کرے گا' اس روز وہ جنوں (یعنی شیاطین جن) سے خطاب کر کے فرمائے گا کہ "اے گروہ جن' تم نے تو نوع انسانی پر خوب ہاتھ صاف کیا۔" انسانوں میں سے جو ان کے رفیق تھے' وہ عرض کریں گے "پروردگار! ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے کو استعمال کیا ہے' اور اب ہم اس وقت پر آپہنچے ہیں جو تو نے ہمارے لئے مقرر کر دیا تھا۔" اللہ فرمائے گا "اچھا اب آگ تمہارا ٹھکانا ہے' اس میں تم ہمیشہ رہو گے۔" اس سے بچیں گے صرف وہی جنہیں اللہ بچانا چاہے گا' بے شک تمہارا رب دانا اور علیم ہے۔ دیکھو' اس طرح ہم (آخرت میں) ظالموں کو ایک دوسرے کا ساتھی بنائیں گے۔ اس کمائی کی وجہ سے جو وہ (دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر) کرتے تھے۔ (اس موقع پر اللہ ان سے یہ بھی پوچھے گا کہ) "اے گروہ جن و انس' کیا تمہارے پاس خود تم میں سے ایسے رسول نہیں آئے تھے جو تم کو میری آیات سناتے اور اس دن کے انجام سے ڈراتے "؟ وہ کہیں گے "ہاں' ہم اپنے خلاف خود گواہی دیتے ہیں۔" آج دنیا کی زندگی نے ان لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا ہے' مگر اس وقت وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔

یہ منظر براہ راست مستقبل کے واقعات سے شروع ہوتا ہے' جب اللہ تعالیٰ سب کو گھیر کر میدان حشر میں جمع کرے گا' لیکن سننے والے کے لئے یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے اور وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو اور یہ تخیل اور تصور صرف ایک لفظ (اور کہے گا) کے حذف سے سامنے آتا ہے یعنی "اور جس روز اللہ ان سب کو گھیر کر جمع کرلے گا (اور یہ کہے گا) اے گروہ جن"۔ صرف لفظ کہے گا کے حذف سے مفہوم ایک منظر کی شکل میں نظروں کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ منظر جو مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والا تھا فی الواقع سامنے آجاتا ہے اور یہ انداز بیان قرآن کریم کے ساتھ مخصوص ہے۔ اب ذرا اس منظر کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیں۔

(يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ (۶:۱۲۸)) "اے گروہ جن' تم نے تو نوع انسانی پر خوب ہاتھ صاف کیا۔" یعنی تم نے انسانوں کی اکثریت کو اپنا تابع بنا لیا۔ وہ تمہاری ہدایات و اشارات پر چلتے رہے اور تمہاری وسوسہ اندازیوں پر خوب یقین کرتے رہے۔ تمہارے منصوبوں پر چلتے رہے۔ یہ صورت واقعہ کا ایسا بیان ہے کہ جس سے مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ صرف واقعہ بیان کرنا مطلوب ہے اس لئے کہ جن اس بات کو خوب جانتے تھے کہ انہوں نے انسانوں کی ایک بڑی اکثریت کو گمراہ کر دیا ہے بلکہ اس واقعی صورت حال کے بیان سے مقصد یہ ہے کہ یہ تمہارا بہت ہی بڑا جرم ہے کہ تم نے انسانوں کی اتنی بڑی اکثریت کو گمراہ کر دیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے اس جرم کو دیکھ کر

پشیمان ہو جائیں - یہی وجہ ہے کہ یہاں جنات کی جانب سے کوئی جواب نہیں دیا گیا - البتہ وہ لوگ جواب دیتے ہیں جنہیں دھوکہ دیا گیا اور جو بسہولت ان شیاطین کے وسوسوں کا شکار ہو جاتے تھے - یہ لوگ یوں جواب دیتے ہیں -

(وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا (٦:١٢٨)) انسانوں میں سے جو ان کے رفیق تھے وہ عرض کریں گے "پروردگار' ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے کو خوب استعمال کیا ہے' اور اب ہم اس وقت پر آپہنچے ہیں جو تو نے ہمارے لئے مقرر کر دیا تھا۔"

اس جواب سے ان غافلوں کی غفلت اور ان کے ہلکے پن کا اندازہ ہوتا ہے اور اس دنیا میں شیطان انسانوں کو جس راہ پر گمراہ کرتا ہے اس کا اندازہ بھی خوب ہو جاتا ہے - یعنی جب جنات ان لوگوں کو دھوکہ دے رہے تھے تو یہ دھوکہ کھانے والے بھی انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے - یوں یہ جنات ان افکار و تصورات کو ان لوگوں کے لئے خوشنما بناتے تھے - اس طرح یہ لوگ ظاہری اور باطنی بدکاریوں میں مبتلا ہو جاتے تھے - گویا شیطان عیاشیوں کے راستے سے انسان کو گمراہ کرتا ہے - اس طرح اس دھوکے اور گمراہ سازی کے ذریعے یہ شیاطین بھی خوب لطف اندوز ہوتے تھے - یوں شیطان ان کو اپنی ہوس کا شکار بناتا اور ان سے کھیلتا اور ان کو اس جہان میں ابلیسی مقاصد کے لئے استعمال کرتا - جبکہ یہ دھوکہ کھانے والے یہ سمجھتے کہ ہم نے شیطان کو گمراہ کر دیا ہے - اس طرح یہ خود بھی اس کھیل میں مشغول ہوتے ' دلچسپی لیتے اور لطف اندوز ہوتے - یہی وجہ ہے کہ وہ کہتے تھے -

(اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ) (ہم ایک دوسرے سے خوب لطف اندوز ہوتے -) چنانچہ مرنے تک ہماری یہی عیاشی جاری رہی اور پھر اچانک موت آگئی - اور اب وہ جان رہے ہیں کہ یہ مہلت تو اللہ تعالیٰ نے دی تھی اور یہ جو عیاشیاں کرتے تھے ' اس وقت بھی دراصل وہ پوری طرح اللہ کے قبضہ قدرت میں تھے - (اور اب ہم اس وقت پر آپہنچے ہیں جو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا ہے) - اب اس مقام پر اللہ کی جانب سے فیصلہ کن جواب آتا ہے :

(قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (٦:١٢٨)) "اللہ فرمائے گا "اچھا اب آگ تمہارا ٹھکانا ہے ' اس میں تم ہمیشہ رہو گے -" اس سے بچیں گے صرف وہی جنہیں اللہ بچانا چاہے گا ' بیشک تمہارا رب دانا اور علیم ہے -"

یعنی تمہارا ٹھکانا جہنم ہے - یہاں تمہارا قیام ہو گا اور یہ قیام دائمی ہو گا ' (اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ (٦:١٢٨)) اور یہ لفظ (اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ (٦:١٢٨)) یہاں اس لئے استعمال ہوا ہے کہ اللہ کی مشیت مطلق ہے ' بے قید ہے - اسلامی تصورات و عقائد میں اللہ کی مشیت کا بے قید ہونا ایک اساسی اصول ہے - نہ اس پر کوئی چیک ہے اور نہ اس میں کوئی نقص ہے کیونکہ اللہ دانا اور علیم ہے اور وہ اپنی مشیت اور تقدیر کو پورے علم کے ساتھ چلاتا ہے - اس کے علم کے ساتھ حکمت بھی موجود ہے - اس منظر کے خاتمے سے پہلے اس منظر پر ایک تبصرہ سامنے آتا ہے اور یوں ایک حکمت ہمارے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے -

(وَكَذٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظّٰلِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ "دیکھو' اس طرح ہم (آخرت میں) ظالموں کو ایک دوسرے کا ساتھی بنائیں گے اس کمائی کی وجہ سے جو وہ (دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کرتے تھے)۔" یعنی یہ بات قابل عبرت ہے کہ جنوں اور انسانوں کے درمیان اس طرح دوستی قائم ہو جاتی ہے اور اس دوستی کا یہ انجام ہوتا ہے۔ اس طرح اللہ انہیں ایک دوسرے کے لئے سازگار بنا دیتا ہے۔ خود ان کی اپنی کمائی کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں' اس لئے کہ ان کے مزاج اور ان کی خواہشات ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتی ہیں۔ ان کے رجحانات اور اہداف ایک ہوتے ہیں اور پھر ان کا انجام بھی ایک جیسا ہوتا ہے۔

یہ تعقیب اور اس میں بیان کردہ حقیقت اس وقت کے موجودہ حالات کے مقابلے میں زیادہ دور رس نتائج کی حامل ہے۔ اس میں جنی اور انسی شیطانوں کے درمیان پائے جانے والے رابطے اور دوستی کی اصل حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے اس لئے کہ وہ لوگ جو ظالم ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں شرک کرتے ہیں' وہ سچائی اور ہدایت کے مقابلے میں اکٹھ کر لیتے ہیں اور ان لوگوں کا وطیرہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ نبی اور اس کے ساتھیوں کے مقابلے میں آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جس طرح ان لوگوں کی فطرت اور مزاج ایک ہے' اگرچہ شکلیں مختلف ہوں' اسی طرح ان کے اغراض و مقاصد بھی ایک ہوتے ہیں اور ان کے اغراض و اہداف یہ ہوتے ہیں یعنی اللہ کے مقابلے میں اپنا حق حاکمیت چلاتے ہیں اور خواہشات نفسانیہ اور عیاشی کے معاملے میں کوئی حد اور قید قبول نہیں کرتے 'یعنی اللہ کے جانب سے حدود و قیود۔

یہ لوگ ہر دور میں ایک گروہ اور ایک بلاک ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں حالانکہ خود ان کے درمیان باہم مقاصد و مفادات کے اختلافات بھی ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کا مزاج اور رجحان ایک ہوتا ہے' ان کے مقاصد ایک ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کے درمیان باہم محبت ہوتی ہے اس لئے جس طرح گزشتہ منظر میں بتایا گیا ان کا انجام بھی ایک ہی ہوتا ہے۔

آج کے دور میں' ایک طویل عرصے سے ہم اس بات کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ انسانی شیطان مثلاً صلیبی' صہیونی' بت پرست اور اشتراکی' مختلف مفادات اور مختلف بلاکوں کے ممبر ہوتے ہوئے بھی باہم دوست ہیں اور باہم معاون و مددگار ہیں۔ ان کا یہ اتحاد و اتفاق اسلام اور اسلامی تحریکات کے دستوں کے خلاف ہے اور یہ پوری دنیا پر موجود ہے۔

عملاً یہ ایک خوفناک گٹھ جوڑ ہے۔ یہ گٹھ جوڑ کرنے والے وہ لوگ ہیں جن کو صدیوں تک اسلام کے مقابلے میں محاربت کا تجربہ ہے۔ یہ لوگ مادی اور علمی معاشرتی قوتوں اور تمام دوسرے سازوسامان کے ساتھ اسلام کے مقابلے میں معرکہ آراء ہیں اور اپنی مکارانہ شیطانی چالوں کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔ اس گٹھ جوڑ پر اللہ کا یہ فرمان آج اچھی طرح چسپاں ہوتا ہے۔ "اور ہم ظالموں کو اسی طرح ایک دوسرے کا دلی بناتے ہیں اس کمائی کی وجہ سے جو وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کرتے ہیں۔" اس گٹھ جوڑ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے آنے والی یہ آیت صادق آتی ہے۔

(وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ) "اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے' پس آپ ان کو چھوڑ دیجئے جو چاہیں افتراء باندھیں) لیکن اس تسلی کے تقاضے تب ہی پورے ہوں گے کہ دنیا میں حضور ؐ کے نقش قدم پر چلنے والا ایک گروہ موجود ہو اور یہ معلوم ہو کہ یہ گروہ حضور کے ساتھیوں کا قائم مقام ہے۔ دین پر دشمنوں کے

حموں کی راہ میں کھڑا ہے۔اب ذرا دوبارہ آیات قرآنیہ کی طرف آیئے۔

(یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ وَیُنْذِرُوْنَکُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ ھٰذَا قَالُوْا شَھِدْنَا عَلٰٓی اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْھُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وَشَھِدُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ اَنَّھُمْ کَانُوْا کٰفِرِیْنَ (۶:۱۳۰)) "(اس موقع پر اللہ ان سے یہ بھی پوچھے گا کہ) "اے گروہ جن و انس 'کیا تمہارے پاس خود تم میں سے ایسے رسول نہیں آئے تھے جو تم کو میری آیات سناتے اور اس دن کے انجام سے ڈراتے"؟ وہ کہیں گے "ہاں' ہم اپنے خلاف خود گواہی دیتے ہیں-" آج دنیا کی زندگی نے ان لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا ہے 'مگر اس وقت وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے-"

یہ استفہام تقریری ہے-یہ اس لئے نہیں ہے کہ اللہ ان لوگوں سے معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے کہ آیا رسول آئے تھے یا نہیں- اللہ تو خوب جانتے تھے کہ کیا ہو چکا ہے-ان کی جانب سے اقرار اور استشہاد درحقیقت ان کی سزا کے لئے وجہ جواز ہے-یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ سزا ان کے لئے عادلانہ سزا ہے-وہ اس کے مستحق ہیں-

خطاب جس طرح جنوں سے ہے اسی طرح انسانوں سے ہے-سوال یہ ہے کہ کیا جنوں کے پاس بھی خود ان کے ہم جنس رسول بھیجے گئے تھے؟ جس طرح انسانوں کے پاس انسان آئے تھے-جن انسانوں سے پوشیدہ مخلوق ہے اور ان کے اصل حالات سے تو صرف اللہ خبر رکھتا ہے- رہی یہ آیت 'تو اس کی تفسیر میں کہا جاسکتا ہے کہ جنات بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والے کلام کو سنتے تھے-پھر جاکر اپنی قوم کو ڈراتے تھے اور خوشخبری بھی سناتے تھے-اس کی تفصیلات سورہ احقاف میں قرآن نے دی ہیں:-

"اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ وہ قرآن سنیں- جب وہ اس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو انہوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ'پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے-انہوں نے جاکر کہا:"اے ہماری قوم کے لوگو' ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے' تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی' راہنمائی کرتی ہے حق اور راہ راست کی طرف' اے ہماری قوم کے لوگو' اللہ کی طرف بلانے والی دعوت قبول کر لو' اور اس پر ایمان لے آؤ اور اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں عذاب الیم سے بچالے گا-" اور جو کوئی اللہ کے داعی کی بات نہ مانے وہ نہ زمین میں خود کوئی بل بوتا رکھتا ہے کہ اللہ کو زچ کر دے اور نہ اس کے کوئی ایسے حامی و سرپرست ہیں کہ اللہ سے اس کو بچائیں-ایسے لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہیں-" (۴۶:۲۹تا۳۲)

ہو سکتا ہے کہ یہ سوال و جواب ان انسانوں اور جنوں سے ہو رہا ہو جو اس طرح کھڑے تھے-بہرحال اصل علم اللہ ہی کو ہے-یہاں ہم اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتے-اس سے زیادہ اس مسئلے پر بحث کرنے کا کچھ فائدہ بھی نہیں ہے-

بہرحال جن و انس میں سے جن لوگوں سے یہ سوال کیا گیا تھا' وہ جانتے تھے کہ یہ محض استفسار کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ فرد قرارداد جرم ہے-ان کے جرم کا ریکارڈ تیار ہو رہا ہے اور یہ سوال و جواب محض زجر و توبیخ کے لئے ہیں-

چنانچہ انہوں نے پورا پورا اعتراف کر لیا اور اس بات کا اقرار کر لیا جس کے وہ مستحق تھے۔

(قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰى اَنْفُسِنَا (٦ : ١٣٠)) انہوں نے کہا ہم خود اپنے اوپر گواہی دیتے ہیں۔" اب یہاں اس منظر پر ایک مبصر سامنے آتا ہے اور کہتا ہے۔

(وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ (٦ : ١٣٠)) "آج دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ مگر اس وقت وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔" یہ تبصرہ دنیا میں ان کے حالات پر خوب منطبق ہوتا ہے۔ دراصل اس دنیاوی زندگی کی بوقلمونیوں نے انہیں دھوکہ دے رکھا ہے اور اس دھوکے کی وجہ سے وہ کفر میں مبتلا ہیں۔ اب وہ قیامت کے دن سب کچھ دیکھ لینے کی بعد مجبور ہیں کہ اپنے اوپر شہادت دیں کیونکہ یہاں انکار اور مکابرہ کرنے سے کچھ حاصل ہونے کی امید نہیں ہے۔ اس سے بڑی مایوس کن صورت حالات اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان اپنے آپ کو ایسے حالات میں گھرا ہوا پائے کہ خود اپنا دفاع بھی نہ کر سکتا ہو۔ نہ انکار کی تاب ہو۔ اور نہ کوئی عذر و معذرت اس کے پاس ہو۔

اب ذرا ملاحظہ ہو قرآن کریم کا انداز بیان۔ مشاہدہ قیامت کا جو تصویری نقشہ قرآن پیش کرتا ہے اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا نقشہ یوں کھینچ دیا جاتا ہے کہ انسان منظر کو اسکرین پر دوڑتا محسوس کرتا ہے۔ مستقبل کے بجائے قرآن کریم ان مناظر کے لئے ماضی کا صیغہ استعمال کرتا ہے' گویا یہ مناظر دکھلائے جا چکے ہیں۔

یہ قرآن ہم اس دنیا میں پڑھ رہے ہیں' بلکہ آج پڑھ رہے ہیں' ابھی قیامت تو واقعہ ہی نہیں ہوئی۔ ابھی تو ہم اس کرۂ ارض پر ہیں لیکن یوں نظر آتا ہے کہ یہ منظر نظروں کے سامنے ہے بلکہ یہ منظر ہم دیکھ چکے ہیں۔ ایک دیکھے ہوئے منظر کی حکایت ہو رہی ہے اور ہم اپنے حافظہ سے یاد تازہ کر رہے ہیں۔ انسان یہ بات بھول جاتا ہے کہ اس منظر کو تو ابھی آنا ہے۔ لیکن بات یوں ہو رہی ہے کہ شاید کوئی تاریخی واقعہ دہرایا جا رہا ہے۔

(وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ (٦ : ١٣٠)) آج دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ مگر اس وقت وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔" یہ انداز تخیل کے عجائبات میں سے ہے۔

---ooo---

اب اس منظر کا خاتمہ ہوتا ہے اور روئے سخن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے۔ آپ کو خطاب کر کے اہل ایمان کو سمجھایا جاتا ہے اور اہل ایمان کے بعد قیامت تک آنے والے مومنین کو بتایا جاتا ہے کہ جن و انس کے اس انجام میں تمہارے لئے یہ سبق ہے۔ یہ عظیم مخلوق جو جہنم کی طرف جا رہی ہے اور تم اس منظر میں دیکھ رہے ہو کہ وہ خود اپنے خلاف اقرار جرم کر رہے ہیں کہ بے شک رسول آئے تھے' انہوں نے اللہ کی پوری پوری ہدایات ہمیں سنائی

تھیں ۔ اس برے انجام سے ہمیں پہلے ہی خبردار کر دیا گیا تھا۔ مومنین کو خبردار کیا جاتا ہے کہ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ تو ان پر حجت تمام کرتا ہے' ان کو بذریعہ رسل خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کرتا ہے۔ خوشخبری بھی دیتا ہے اور انجام بد سے ڈراتا بھی ہے۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾

یہ شہادت ان سے اس لئے لی جائے گی کہ یہ ثابت ہو جائے کہ تمہارا رب بستیوں کو ظلم کے ساتھ تباہ کرنے والا نہ تھا جب کہ ان کے باشندے حقیقت سے ناواقف ہوں۔"

اللہ کی رحمت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ لوگوں کو شرک 'کفر اور نافرمانی پر اس وقت تک سزا نہ دے جب تک ان تک رسولوں کے ذریعے اپنا پیغام پہنچا نہ دے حالانکہ اللہ نے لوگوں کی فطرت کے اندر یہ صلاحیت ودیعت کر دی تھی کہ وہ از خود اپنے رب کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی تلاش کریں۔ یہ انتظام اس لئے کیا گیا کہ انسانی فطرت بعض اوقات صحیح راہ کو گم کر دیتی ہے۔ انسان کے فطری رجحانات کے علاوہ اللہ نے انسان کو عقلی قوت دے کر بھی ایک امتیاز بخشا لیکن اللہ نے اس عقلی قوت کے باوجود رسول بھیجے اس لئے کہ عقلی قوت بھی نفسانی خواہشات کے نتیجے میں بسااوقات دب جاتی ہے۔ نیز اس کائنات کے مشاہد و مناظر کے اندر بے شمار دلائل ایسے موجود تھے جو انسان کو دعوت فکر دیتے تھے لیکن انسان کی عقلی اور ادراکی قوتیں بسااوقات معطل ہو جاتی ہیں۔

ان وجوہات کی بنا پر اللہ نے انسانی فطرت' انسانی عقل اور انسانی مشاہدے کو رسولوں کی دعوت کے ساتھ منسلک کر دیا تاکہ انسان کی ان قوتوں کو فساد سے بچایا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تب ہی لوگوں کو عذاب دیتا ہے جب رسولوں کی دعوت کسی تک پہنچ جائے اور ان پر حجت تمام ہو جائے۔

اس حقیقت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے ساتھ کس قدر رحیمانہ اور کریمانہ سلوک کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان صرف اپنی قوت ادراک اور عقلی قوتوں کے بل بوتے پر راہ ہدایت نہیں پا سکتا۔ نہ وہ یقین حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی عقل اور ادراک کے ذریعے اپنی شہوانی قوتوں کو ضابطے کا پابند کر سکتا ہے۔ یہ قوتیں تب ہی کام کر سکتی ہیں جب ان کی پشت پر دین اور عقیدے کی قوت موجود ہو۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ جزاو سزا کے بارے میں ایک دوسرے اہم اصول کا ذکر فرماتا ہے اور یہ اصول اہل ایمان اور جن و شیاطین سب کے لئے ہے۔

وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

"ہر شخص کا درجہ اس کے عمل کے لحاظ سے ہے اور تمہارا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔" اہل ایمان کے بھی درجے ہیں۔ ایک سے ایک بڑا ہے۔ شیاطین کے بھی درجے ہیں۔ ایک سے ایک بڑا ہے۔ اور سب لوگوں کے اعمال ریکارڈ شدہ ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے بے خبر نہیں ہے۔ (وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ (۶: ۱۳۲))

اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے رسول بھیجے' یہ محض اس کا کرم ہے کہ اس نے ایسا کیا' اس لئے کہ وہ غنی بادشاہ ہے' اسے ان کے ایمان کی کوئی ضرورت لاحق نہیں ہے۔ نہ اسے ان کی جانب سے عبادت اور بندگی کی کوئی احتیاج ہے۔ اگر وہ نیک بنتے ہیں تو وہ دنیا اور آخرت میں اپنی بھلائی کے لئے نیک بنیں گے۔ اسی طرح اللہ رحمت کا اظہار اس وقت بھی علی وجہ الاتم ہوتا ہے کہ اللہ اس دنیا میں نافرمانوں کو بھی مہلت دیتا ہے ورنہ وہ اس بات کی پوری پوری قدرت رکھتا ہے کہ وہ سب کو ہلاک کر دے اور ان کی جگہ کوئی دوسری قوم اور نسل لے آئے۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِن بَعْدِكُم مَّا يَشَاءُ كَمَا أَنشَأَكُم مِّن ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ﴿١٣٣﴾

"تمہارا رب بے نیاز ہے اور مہربانی اس کا شیوہ ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے اور تمہاری جگہ دوسرے جن لوگوں کو چاہے لے آئے جس طرح اس نے تمہیں کچھ اور لوگوں کی نسل سے اٹھایا ہے۔"

لوگوں کو یہ بات نہ بھولنا چاہیے کہ وہ اس دنیا میں محض اللہ کی مہربانی کی وجہ سے زندہ ہیں۔ ان کا یہاں رہنا اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ ان کے پاس جو قوت اور حکمت ہے یہ انہیں اللہ کی عطا کی ہوئی ہے۔ یہ اصل قوت نہیں ہے بلکہ عطائی ہے۔ وہ خود مختار نہیں ہیں اس لئے کہ کوئی شخص اپنی پیدائش اپنے وجود اور اس جہان میں اپنی بقا میں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ انسان کو جو بھی قوت دی گئی ہے اس میں اس کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ان کو یہاں سے ہٹانا اور ان کی جگہ دوسری اقوام کو لانا اللہ کے لئے بہت ہی آسان ہے۔ کیا وہ دیکھتے نہیں کہ خود اللہ نے دوسری اقوام کی جگہ انہیں یہاں وجود بخشا اور اپنی قدرت کے ذریعے ان دوسری اقوام کی جگہ یہاں انہیں اقتدار اور قوت دی۔

یہ نہایت ہی شدید تنبیہات ہیں اور نہایت ہی سختی کے ساتھ انسانوں کے دل و دماغ کو جھنجوڑا جا رہا ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کو جو ظالم اور مشرک ہیں اور وہ جنات جو مکر و فریب کا جال بچھاتے ہیں' لوگوں پر دست درازیاں کرتے ہیں' اقتدار کا تخت بچھاتے ہیں۔ خود حلال و حرام قرار دیتے ہیں اور اللہ کی شریعت پر دست درازی کرتے اور خود قانون بناتے ہیں۔ یہ سب لوگ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں جب تک وہ چاہے وہ رہیں گے اور جب چاہے ان کو اس دنیا سے رخصت کر کے ان کی جگہ دوسری اقوام کو لے آئے۔ ان تنبیہات کے ذریعے اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو تسلی بھی دیتا ہے کہ اگرچہ ان پر مظالم ہوتے ہیں' ان کے خلاف سازشیں ہوتی ہیں اور انہیں اذیت دی جاتی ہے لیکن ان کے دشمن اللہ پر غالب نہیں ہیں۔ یہ امتحان ہے اور اللہ کسی بھی وقت ان کو اور ان کی مکاریوں کو صفحہ ہستی سے مٹا سکتا ہے۔ اور یہ آخری ضرب ہے۔

إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ ۖ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ﴿١٣٤﴾

تم سے جس چیز کا وعدہ کیا جا رہا ہے' وہ یقیناً آنے والی ہے اور تم خدا کو عاجز کر دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔"

تم اللہ کے قبضہ قدرت میں ہو' اور تم اس کی مشیت کے مرہون منت ہو۔ تم اللہ کی مشیت کے دائرے سے نہ باہر

نکل سکتے ہو اور نہ اللہ کے مقابلے میں سرکشی کر سکتے ہو۔ اس سے قبل مناظر قیامت جن کی ایک جھلک تم دیکھ چکے ہو' تمہارے انتظار میں ہیں۔ یہ مناظر عملاً تمہارے سامنے آنے والے ہیں۔ تم ان سے بچ کر نہیں نکل سکو گے کیونکہ اللہ کا نظام نہایت ہی قوی اور متین ہے۔

اب یہ تبصرے اور نتائج ایک نہایت ہی سخت تہدید پر ختم ہوتے ہیں جس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

"اے نبی ؐ' کہہ دو کہ لوگو' تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو اور میں بھی اپنی جگہ عمل کر رہا ہوں' عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ انجام کار کس کے حق میں بہتر ہوتا ہے' بہرحال یہ حقیقت ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔"

یہ نہایت ہی پختہ تہدید ہے' حق پر مشتمل ہے اور اس کی پشت پر سچائی کی قوت ہے۔ یہ تہدید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ہے کہ وہ ان کے معاملات سے ہاتھ نکال رہے ہیں' انہیں یقین ہے کہ وہ سچائی پر ہیں' انہیں یقین ہے کہ ان کا طریق کار اور نظام سچائی پر مشتمل ہے اور انہیں پختہ یقین ہے کہ ان کے مخالفین گمراہی پر ہیں اور ان کا انجام برا ہونے والا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ

(اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (٦ : ١٣٥)) کہ ظالم فلاح نہیں پا سکتے۔" اس لئے کہ یہ غیر متبدل اصول ہے' کہ مشرکین جو اللہ کے سوا کسی اور کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں اور انہیں اپنا دوست بناتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے اس لئے کہ اللہ کے سوا کوئی اور کسی کا مددگار نہیں ہو سکتا' نہ اس کے سوا کوئی اور نصرت کر سکتا ہے۔ جو لوگ اللہ کی ہدایات سے منہ موڑتے ہیں' وہ نہایت اعلیٰ درجے کی گمراہی میں بہت دور تک چلے گئے ہیں اور وہ گھاٹے ہی گھاٹے میں ہیں۔

---ooo---

اب اس سورہ کے دوسرے حلقے میں کلام کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ اس سبق پر قدرے غور کیا جائے۔ اس سبق سے پہلے ان ذبیحوں پر کلام تھا جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا تھا اور اس سبق کے بعد پھلوں' مویشیوں اور اولاد کے بارے میں نذر و نیاز کی بحث ہے۔ ان دو جزوی مسائل کے درمیان یہ سبق خالص نظریاتی اور عقائد کے مباحث پر مشتمل ہے اور اس میں ایمان و کفر کے مسائل اور مناظر بیان کئے گئے۔ اس درمیانی سبق میں انسانوں اور جنوں' انبیاء اور ان کے دشمنوں کے درمیان چلنے والی کشمکش کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ تمام بڑے بڑے نظریاتی مسائل چھیڑے گئے ہیں جو اس سورہ میں بالعموم بیان ہوئے ہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم زندگی کے ان جزوی مسائل کو کس طرح شریعت کے مطابق اسلام کی نظریاتی اساس پر منطبق کرتا ہے اور اس بات کو اہمیت دیتا ہے کہ ہر مسئلے کا نظریاتی پس منظر نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ وہ نظریاتی اساس یہ ہے کہ اس کائنات کا رب اور حاکم صرف اللہ ہے اور وہی ہے جو حلال و حرام کی حدود کا تعین کرتا ہے۔ سوال

یہ ہے کہ قرآن کریم جگہ جگہ اپنے نظریہ اساسی کو کیوں بار بار دہراتا ہے۔اس لئے کہ قرآن کریم اصولاً اس بات کو اسلام کا اساسی نظریہ قرار دیتا ہے۔اسلام کا نظریہ اساسی کلمہ شہادت (لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ) پر قائم ہے۔اسی کلمے کے ذریعے اسلام مسلمانوں کے دلوں سے تمام دوسری خدائیاں نکال کر ان کے دلوں میں صرف اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کا عقیدہ جاگزیں کرتا ہے۔چنانچہ اسلام تمام لوگوں سے حق حاکمیت چھین کر صرف اللہ کی حاکمیت قائم کرتا ہے۔قانون سازی ایک ایسا معاملہ ہے کہ کوئی چھوٹا قانون ہو یا بڑا' دونوں میں اللہ کا حق حاکمیت استعمال ہوتا ہے۔یہی وہ حق ہے جسے ایک مسلمان صرف اللہ کے لئے مخصوص کر دیتا ہے اور تمام دوسرے لوگوں کے لیے اس حق کی نفی کر دیتا ہے۔اسلام میں دین کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں' چاہے وہ عقائد و نظریات سے متعلق ہوں مثلاً الوہیت و حاکمیت یا عملی معاملات ہوں سب میں صرف اللہ کی اطاعت اور بندگی کی جائے اور قانون سازی کا حق صرف اللہ کو ہو۔اس طرح قانون کا حق بھی صرف اللہ کے قانون کو حاصل ہو۔چنانچہ ایک مسلمان کا دین یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام اطاعتوں اور قیادتوں کا انکار کر کے صرف اللہ کی اطاعت اور قیادت کو قبول کر لے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ان اعتقادی امور کو بار بار دہراتا اور ان کو بہت ہی اہمیت دیتا ہے اور تمام امور کو ان نظریات پر مرتب کرتا ہے جس طرح اس مکمل سورہ میں صاف نظر آتا ہے جیسا کہ آغاز سورہ میں ہم نے کہا کہ یہ سورہ پوری کی پوری مکی ہے اور مکی سورتوں میں امت مسلمہ کے سامنے قانون سازی کا کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا۔اس کے باوجود اس سورہ میں نظریاتی اور اعتقادی طور پر اس بات کی صاف صاف نشاندہی کر دی گئی ہے کہ قانون سازی کا حق صرف اللہ کو ہے اور یہ اسلام اور دین اسلام کا ایک عظیم اور اساسی نظریاتی اصول ہے جس پر یہ دین قائم ہے۔ [1]

---○○○---

(۱)(دیکھئے خصائص التصور الاسلامی کا فصل الوہیت اور عبودیت)۔

درس نمبر ۷ ایک نظر میں

یہ سبق جو قدرے طویل ہے اور اس سے پہلے کا سبق اور اس پر آنے والے تبصرے اسلام کے نظریہ حاکمیت سے متعلق ہیں۔ یہ ایک ایسی سورہ میں ہیں جو مکہ میں نازل ہوئی' جبکہ یہ بات معلوم ہے کہ مکی سورتوں کا موضوع بالعموم نظریات اور عقائد سے متعلق ہوتا ہے۔ مکی سورتوں میں قانون سازی کو نہیں چھیڑا گیا تھا' قانون سازی کے بارے میں صرف وہ باتیں ان سورتوں میں ہوتی تھیں جن کا تعلق اصول قانون سے تھا۔ مکہ مکرمہ میں کوئی اسلامی حکومت موجود نہ تھی جسے قانون سازی کی ضرورت پڑتی اور اللہ تعالیٰ شریعت کو محض داستان یا تاریخ کے طور پر ذکر کرنا نہ چاہتا تھا۔ نہ اس وقت اسلامی شریعت بحث و تحقیق کا محض کوئی تدریسی موضوع تھا۔ اسلام تو ایک ایسا معاشرہ چاہتا تھا جو عملاً پورے کا پورا اسلام میں داخل ہو سکے' جس کے اندر لوگ اپنے آپ کو' اپنی پوری زندگی کو اللہ کی بندگی اور شریعت کی قیادت میں دینے کے لئے تیار ہوں۔ لہٰذا اسلام میں قانون سازی اس وقت تک نہ ہو سکتی تھی جب تک اسلامی حکومت قائم نہ ہو جائے اور وہ لوگوں کے درمیان اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے کرنا نہ شروع کر دے۔ صورت یہ نہ ہو کہ ادھر سے حکم آ رہا ہو اور ادھر انسانوں پر نافذ ہو رہا ہو' اس لئے کہ اسلام کا مزاج ہی ایسا ہے کہ وہ ایک عملی نظام ہے اور اپنے قانونی نظام کا نفاذ بھی سنجیدگی' وقار اور متانت کے ساتھ کرتا ہے۔

لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ یہ سبق ایک مکی سورہ میں ہونے کے باوجود قانون سازی کے مسئلے کے ساتھ متعلق ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلام قانون سازی کو بہت ہی اہمیت دیتا ہے اور قانون سازی کو اس دین کے اساسی مسائل میں سے تصور کرتا ہے۔

اس سے قبل کہ ہم اس سبق کی تفصیلات میں جائیں مناسب ہو گا کہ ظلال القرآن کی طرز پر ہم اس پورے سبق پر ایک اجمالی نگاہ دوڑائیں اور دیکھیں کہ اس سبق کی مراد کیا ہے اور اس میں کیا ہدایات دی گئی ہیں؟

اس کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ مشرکین مکہ پھلوں' مویشیوں اور اولاد کے بارے میں کچھ تصورات اور اوہام رکھتے تھے۔ ان کے کچھ مالی اور کچھ اجتماعی تصورات تھے جو دور جاہلیت میں عقیدے اور قانون کا درجہ رکھتے تھے۔ یہ تصورات اور اوہام درج ذیل امور پر مشتمل تھے۔

۱۔ اللہ نے انہیں فصلوں اور مویشیوں کی صورت میں جو رزق عطا کیا تھا وہ انہوں نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک حصہ اللہ کے لئے تھا' اور وہ یہ زعم رکھتے تھے کہ اللہ نے یہ حصہ اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ ایک دوسرا حصہ انہوں نے اپنے شرکاء کے ساتھ مخصوص کر دیا تھا۔ یہ شرکاء وہ الٰہ تھے جن کو وہ پکارتے تھے اور ان کو وہ اللہ کے ساتھ اپنے نفس کے معاملات' اموال اور اولاد کے معاملات میں شریک کرتے تھے۔

(وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا (۶ : ۱۳۶) "انھوں نے اللہ کے لئے خود اس کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ کے لئے ہے 'بزعم خود' اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لئے ہے۔"

۲۔ اس کے بعد وہ خود بزعم خود مقرر کردہ حصہ خدا پر دست درازی کرتے تھے' اس حصے سے کچھ وہ لے لیتے تھے اور اسے اپنے شریکوں کے حصے کے ساتھ ملا دیتے تھے لیکن وہ اپنے شرکاء کے حصے کے ساتھ یہ سلوک نہ کرتے تھے۔

(فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ (۶ : ۱۳۶) "پھر جو حصہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کا ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لئے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے۔"

۳۔ ان کے ان شرکاء نے ان کے لئے قتل اولاد کو خوشنما بنا دیا تھا۔ یہ کام ان کے معاشرے میں پائے جانے والے کاہنوں کا تھا جو ان کے قوانین بناتے تھے جو ان کے لئے ازخود ایسی رسومات گھڑتے تھے کہ ان پر لوگ عمل کرنے پر مجبور ہوتے۔ ان پر ایک طرف سے اجتماعی دباؤ ہوتا تھا اور دوسری جانب سے وہ دینی رسومات کے زاویہ سے ازخود ایسا کرنا چاہتے تھے مثلاً وہ فقر اور عار کی وجہ سے لڑکیوں کو قتل کرتے تھے اور بعض اوقات وہ بطور نذر بھی اولاد کو قتل کرتے تھے جس طرح عبدالمطلب نے نذر مانی تھی کہ اگر اس کے دس بچے ہوئے اور جوان ہوئے تو وہ ایک کو الہوں کے نام پر قربان کرے گا۔

(وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ (۶ : ۱۳۷)) "اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لئے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔"

۴۔ یہ لوگ بعض جانوروں اور بعض فصلوں پر پابندی عائد کر دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ان کا کھانا محض اللہ کے اذن پر موقوف ہے اور یہ ان کا زعم تھا۔ بعض سواری کے جانوروں کی پشت کا گوشت نہ کھاتے تھے۔ بعض پر وہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا جائز نہ سمجھتے تھے یا حج کے موسم میں اگر ان پر سوار ہوتے تو اللہ کا نام نہ لیتے اس لئے کہ وہ کہتے تھے کہ یہ حج کی سواریاں ہیں اور ان کے اندر اللہ کا ذکر موجود ہے۔ وہ کہتے یہ تھے کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔

(وَقَالُوا هٰذِهٖ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ (۶ : ۱۳۸)) "وہ کہتے ہیں کہ یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں' انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھلانا چاہیں حالانکہ یہ پابندی ان کی

خود ساختہ ہے۔ پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے' اور یہ سب کچھ انہوں نے اللہ پر افتراء کیا ہے۔"

۵- وہ یہ کہتے تھے کہ بعض جانوروں کا جو حمل ہے وہ صرف مردوں کے لئے ہے اور عورتوں پر وہ حرام ہے۔ہاں اگر وہ بچہ مردہ پیدا ہو تو مرد اور عورت دونوں مساویانہ طور پر حقدار ہوں گے اور اس مضحکہ خیز قانون کو بھی وہ منجانب اللہ سمجھتے تھے۔

(وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۶:۱۳۹)) "اور کہتے ہیں جو کچھ جانوروں کے پیٹ میں ہے یہ ہمارے مردوں کے لئے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے۔ لیکن اگر وہ مردہ ہو تو دونوں اس کے کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ باتیں جو انہوں نے گھڑ لی ہیں ان کا بدلہ اللہ انہیں دے کر رہے گا۔ یقیناً وہ حکیم ہے اور سب باتوں کی اسے خبر ہے۔"

عربی سوسائٹی کے اسلام سے پہلے جو رنگ ڈھنگ تھے مذکور بالا تصورات' مزعومات اور رسم و رواج سے ان کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے اور مکہ مکرمہ کے اندر اس سورہ کی اصلاحات کے ذریعے قرآن کریم ان کا قلع قمع کرنے کے درپے ہے۔ عربوں کے دل و دماغ کو ان غلط مزعومات سے پاک کر رہا ہے اور عرب کی جاہلی سوسائٹی سے ان کو محو کر رہا ہے۔ قرآن کریم نہایت ہی دھیمی رفتار سے اپنے مخصوص منہاج اصلاح کے ذریعے غلط تصورات کے اس جنگل کو صاف کر رہا ہے۔

- سب سے پہلے اس نے لوگوں کو یہ بتایا کہ جو لوگ اپنی اولاد کو مختلف وجوہات کی بنا پر قتل کر رہے ہیں وہ بے وقوف ہیں۔ وہ علم و معرفت سے محروم ہیں اور اپنے آپ کو نعمت اولاد سے محروم کر رہے ہیں۔ پھر یہ کام وہ یوں کرتے ہیں کہ اسے اللہ کی طرف منسوب کر کے اس کی ذات بے عیب پر افتراء باندھنے کے جرم کا ارتکاب بھی کرتے ہیں۔ قرآن نے اعلان کیا کہ یہ مطلق گمراہی ہے اور یہ مزعومات سب کے سب غلط ہیں۔
- اس کے بعد قرآن نے انہیں یہ سمجھایا کہ ان کے یہ تمام اموال جن میں وہ تصرف کرتے ہیں یہ دراصل اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔ اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے طرح طرح کے باغ' تاکستان اور نخلستان پیدا کئے۔ وہی ہے جس نے تمہارے تمام جانور پیدا کئے اور وہی ہے جو سب کو رزق دیتا ہے۔ غرض وہی مالک ہے اور صرف وہی لوگوں کے لئے قانون بنانے کا حق رکھتا ہے' ان تمام چیزوں میں جو اس نے اس دنیا میں بطور رزق پیدا کیں۔ اس بیان کے دوران قرآن کریم ان مناظر کو کام میں لاتا ہے جو انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھلوں کے باغ اور لہلہاتے کھیت اور نخلستان اور تاکستان وغیرہ اور حیوانات جو بہترین اور خوبصورت سواری کا کام کرتے ہیں اور ان کی فرسے فرش کا کام لیا جاتا ہے' ان کا گوشت کھایا جاتا ہے' ان کی کھالوں سے متعدد مفادات لئے جاتے ہیں بلکہ اون اور بال بھی کام میں لائے جاتے ہیں۔ اس مقام پر یہ تاثر بھی واضح طور پر دیا جاتا ہے کہ انسان اور شیطان کے درمیان روز اول سے دشمنی ہے لہٰذا انہیں ہرگز اپنے دشمنوں کے قدموں پر نہیں چلنا چاہیے اس لئے کہ وہ کھلا دشمن ہے۔
- اس کے بعد بعض حیوانات کے بارے میں ان کے بودے تصورات کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ تصورات اور

عقائد ادنیٰ منطق سے بھی خالی ہیں۔ ان تصورات کو ایسے انداز میں سامنے لایا گیا ہے کہ وہ بادی النظر میں حقیر، بودے اور بے وقعت نظر آتے ہیں۔ اس وضاحت کے بعد ان سے پوچھا جاتا ہے کہ ان بے دلیل قوانین و رواجات پر وہ کیوں عمل پیرا ہیں؟ وہ کس دلیل سے کہتے ہیں کہ یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں، انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھلانا چاہیں، حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے۔ پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے۔ کچھ جانور ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے اور یہ سب کچھ انہوں نے اللہ پر افتراء کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سوال کرتے ہیں کیا تم اس وقت موجود تھے جب اللہ تعالیٰ نے یہ قوانین بنائے؟ یا یہ کوئی راز کی بات تھی جو اللہ نے صرف تمہیں بتائی تھی یا یہ حکم صرف تمہارے لئے تھا۔ فرماتے ہیں یہ سب کچھ افتراء ہے اور لوگوں کو ناحق گمراہ کرنا ہے اور اس افتراء اور گمراہی کے نتیجے میں اللہ ان سے مؤاخذہ کرے گا۔

○ اس مقام پر اللہ تعالیٰ واضح فرماتے ہیں کہ حرام کیا ہے اور حلال کیا ہے اور یہ کہ یہودیوں کے لئے کیا حرام کیا گیا تھا اور کیوں، اور مسلمانوں کے لئے کیا حرام ہے اور وہ کیا چیزیں ہیں جو اگرچہ یہودیوں کے لئے قبلاً حرام تھیں مگر اب حلال کر دی گئی ہیں۔

○ اس کے بعد ان کے اس استدلال کی تردید کی جاتی ہے کہ وہ جو کہتے ہیں کہ اگر اللہ نہ چاہتا تو وہ اس جاہلیت میں مبتلا نہ ہوتے اور یوں اپنے لئے خود حلال و حرام کے اصول طے کر کے شرک کا ارتکاب نہ کرتے۔

(وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ (۶ : ۱۴۸)) "اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے، نہ ہمارے آباء شرک کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام قرار دیتے۔" چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ بات اور یہ استدلال تمام کافر ہمیشہ سے پیش کرتے چلے آئے ہیں لیکن تاریخ میں جن اقوام نے یہ استدلال کیا ہے وہ ہمارے عذاب سے بچ کر نہیں نکل سکیں۔

(كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا (۶ : ۱۴۸)) "اسی طرح ان سے پہلے جو لوگ تھے انہوں نے تکذیب کی یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کو چکھا۔"

ان آیات سے ثابت ہوا کہ شریعت کے بغیر از خود کسی چیز کو حرام سمجھنا شرک باللہ کے مترادف ہے۔ جن لوگوں نے ہمیشہ آیات الٰہی کی تکذیب کی ہے وہ ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتے ہیں کہ وہ اس قسم کے فیصلے اور استدلال کس منطق کی رو سے کرتے ہیں۔

(قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ۔ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ (۶ : ۱۴۸)) "ان سے کہو کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کر رہے ہو۔"

☆ اس کے بعد ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے موقف پر کوئی علمی ثبوت پیش کریں لیکن اگر وہ کوئی جھوٹے

دلائل دیں تو ان کو یکسر رد کر دیں۔ اس سورہ کے آغاز میں بھی اصل عقائد کے مضمون میں یہی حکم دیا گیا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ رابطہ ہی ختم کر دیا جائے۔ دونوں مواقع پر مضمون کے الفاظ میں بہت کم تغیر پایا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک باللہ (ذات میں) اور شرک باللہ (حاکمیت میں) ایک ہی درجہ رکھتا ہے۔ جو شخص اللہ کے سوا قانون سازی کرتا ہے یا کسی کو قانون ساز تسلیم کرتا ہے وہ بھی شرک کرتا ہے۔

(قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَ كُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ (٦ : ١٥٠)) "ان سے کہو لاؤ اپنے گواہ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ ہی نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے۔ پھر اگر وہ شہادت دیں تو ان کے ساتھ شہادت نہ دینا اور ہرگز ان لوگوں کی شہادت کے پیچھے نہ چلنا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور جو آخرت کے منکر ہیں اور جو دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں۔"

ان آیات اور سابقہ آیات کے مناظر' عبارات اور الفاظ تک ایک ہیں۔ جو لوگ قانون سازی از خود کرتے ہیں وہ ہوائے نفس کے متبع ہیں اور یہ وہی لوگ ہیں جو آیات الہی کو جھٹلاتے ہیں اور یہ وہی لوگ ہیں جو آخرت پر ایمان ویقین نہیں رکھتے۔ اگر وہ اللہ کی آیات کو سچا مانتے اور آخرت پر ایمان لاتے اور اللہ کی ہدایت کو تسلیم کرتے تو وہ اپنے لئے اور لوگوں کے لئے خود قانون نہ بناتے اور اللہ کے احکام کے سوا کسی چیز کو حرام قرار نہ دیتے۔

☆ اور آخر میں اللہ تعالیٰ ان چیزوں کے بارے میں بتاتے ہیں جو اس نے فی الحقیقت حرام کر دی ہیں۔ اس میں اجتماعی زندگی کے تمام اصول بتلا دیئے گئے ہیں یعنی اللہ کی توحید' اللہ کے احکام اور حدود و فرائض لیکن زیادہ تر وہ چیزیں گنوائی گئی ہیں جو حرام ہیں .... چنانچہ اللہ نے شرک کی ممانعت کی' والدین کے ساتھ احسان کا حکم دیا اور فقر و فاقہ کے ڈر سے اولاد کے قتل کی ممانعت اور یہ کہ اللہ رازق ہے اور یہ کہ ممانعت کی ظاہری اور خفیہ خواہش کے قریب مت جاؤ اور کسی جان کو ناحق قتل کر دینے کی ممانعت اور یتیم کے مال کو کھانے کی ممانعت الا یہ کہ جائز طور پر اسے استعمال کیا جائے اور ناپ اور تول کے پیمانوں کو درست رکھنے کا حکم۔ بات اور معاملات میں عدل سے کام لیا جائے اگرچہ معاملہ رشتہ داروں کا ہو اور اللہ کے عہد سے وفا کی جائے اور ان سب امور کو منجانب اللہ وصیت قرار دیا گیا اور ان امور کے بارے وصیت کو بار بار دہرایا گیا ہے۔

یہ تمام امور اسلامی نظریہ حیات کے اساسی اصول اور شریعت کے مبادی ہیں۔ ان کو ایک ہی سلسلہ کلام میں جمع کیا گیا ہے اور بالکل ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر اور منظم کر کے بیان کیا گیا ہے۔ یہ سب احکام ایک ہی جملے' ایک ہی گروپ' اور ایک ہی اجتماعی شکل میں لائے گئے ہیں۔ اس سے قرآن کریم کی اجتماعی سوچ اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے اور اسلام کا منہاج بھی واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سبق کے آخر میں کہا جاتا ہے۔

(وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ

سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (٦:١٥٣) ”اور یہ کہ یہ میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے - یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم کج روی سے بچو -“

یہ آخری جملہ اس لئے کہا گیا تاکہ اس پورے سبق سے جو مقصود اصلی ہے وہ بالکل سامنے آجائے اور بات کھل کر ایک ہی فقرے میں سمیٹ لی جائے اور اس طرح دوٹوک بن جائے - دین اسلام میں عقائد اور قانون دونوں کا تعلق توحید اور شرک سے ہے - بلکہ اسلامی قانون سازی میں بھی شرک کا ارتکاب ہو سکتا ہے جس طرح عقیدے میں شرک ہو سکتا ہے کیونکہ اسلام میں قانون سازی عین عقیدہ ہے اس لئے کہ قانون اسلامی دراصل عقیدہ توحید کی تفصیل و تشریح ہوتا ہے - یہ حقیقت قرآن کریم کے متعدد نصوص سے بالکل واضح ہے - اور اسلام کے اسلوب بیان کے مطابق اسے جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے -

یہ وہ حقیقی مقام ہے جس سے دین کا مفہوم طویل تاریخی عوامل کی وجہ سے دور ہو گیا اور یہ عمل طویل زمانے میں مکمل ہوا - اس مقصد کے حصول کے لئے خبیث اور اوچھے ہتھکنڈے استعمال کئے گئے - آج حال یہ ہے کہ دین کے دشمن تو ہیں ہی دشمن 'خود دین کے لئے کام کرنے والوں اور اس کے پرجوش کارکنوں کے ذہنوں سے یہ حقیقت اوجھل ہو گئی - خود حامیان دین بھی عقیدۂ حاکمیت الٰہیہ کو اسلامی عقائد سے علیحدہ سمجھتے ہیں اور حامیان دین بھی مسئلہ حاکمیت الٰہیہ میں اس طرح پرجوش نہیں رہے جس طرح وہ معروف دینی عقائد کے لئے پرجوش ہیں - وہ لوگ عقیدہ حاکمیت الٰہیہ کے انکار کو دین کا انکار نہیں سمجھتے جس طرح وہ عقیدۂ توحید کے انکار اور اللہ کی عبادات کے انکار کو دین کا انکار سمجھتے ہیں حالانکہ دین اسلام نے کسی جگہ بھی عقیدے ' بندگی اور شریعت کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا ہے - اسلامی نظریہ حیات کے تصور سے حاکمیت الٰہیہ کے تصور کو طویل تاریخی اور تدریجی سازشوں کے تحت نکالا گیا ہے اور نہایت ہی ہوشیاری اور تجربہ کاری کے ساتھ یہ کام کیا گیا ہے - یہاں تک کہ حاکمیت الٰہیہ کے عقیدے نے موجودہ شکل اختیار کر لی - اسلام کے پرجوش حامی بھی اس کے حامی نہ رہے ' حالانکہ یہ حقیقت اس سورہ میں واضح طور پر بیان ہوئی ہے ' باوجود اس کے کہ یہ سورہ مکی سورہ ہے اور اس کا موضوع دستور و قانون نہیں ہے بلکہ اس کا موضوع عقیدۂ توحید اور اسلامی نظریہ حیات ہے لیکن اس کے باوجود اس نکتے کے تمام پہلو لئے گئے ہیں اور تمام تفصیلات دی گئی ہیں اور یہ بھی اس حوالے سے کہ بات اجتماعی زندگی کے اس جزوی مسئلے پر ہو رہی تھی لیکن اس جزوی مسئلے کا تعلق چونکہ ایک اصول سے تھا ' نظریاتی اور دستوری مسئلے سے تھا - یہ اصول بھی ایسا تھا جو اساس دین ہے اس لئے یہاں اس پر زور دیا گیا -

لوگ بتوں کی پوجا کرنے والے پر تو شرک کا فتویٰ لگاتے ہیں لیکن ان لوگوں پر شرک کا فتویٰ نہیں لگاتے جو اپنے فیصلے طاغوتی عدالتوں سے کراتے ہیں - وہ بت پرستی سے تو اجتناب کرتے ہیں لیکن طاغوتی حکام کی اطاعت سے اجتناب نہیں کرتے - یہ لوگ قرآن کریم کی تلاوت تو کرتے ہیں لیکن اس دین کے مزاج کو نہیں سمجھتے - انہیں چاہیے کہ قرآن کو اس طرح پڑھیں جس طرح وہ نازل ہوا ہے - انہیں اس آیت پر غور کرنا چاہیے -

(وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ) ”اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو تم مشرک بن جاؤ گے -“
اسلام کے یہ پرجوش حامی اپنے آپ کو اور دوسرے لوگوں کو صرف بعض جزوی امور کو زیر بحث لاکر مطمئن کرنے کی

سعی کرتے ہیں کہ فلاں فلاں قانون' اسلام کے خلاف ہے یا فلاں فلاں قانون کا فلاں جزء اسلام کے خلاف ہے۔ ان کا جوش بعض جزوی اصلاحات تک موقوف ہے یا وہ بعض بدعملیوں کی اصلاح تک اپنے آپ محدود رکھتے ہیں اور ان کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ گو اسلام تو پورے کا پورا قائم ہے لیکن بعض جزوی امور میں نقص رہ گیا ہے بس صرف ان امور کی اصلاح ہی سے اس کی تکمیل ہو جائے گی۔

دین اسلام کے بارے میں غیرت رکھنے والے اور اس کے پرجوش حامی درحقیقت اس دین کے لئے باعث اذیت ہیں لیکن سمجھتے نہیں بلکہ اس قسم کی جزوی اور غیر اہم باتوں کو اہمیت دے کر یہ لوگ دین کی پیٹھ میں چھرا گھونپتے ہیں۔ امت مسلمہ کے اندر اس وقت جو نظریاتی قوت اور جوش پایا جاتا ہے یہ لوگ اسے اس قسم کی غیر اہم باتوں پر صرف کرتے ہیں اور ضمناً وہ موجودہ دور کے جاہلی اجتماعی نظام اور جاہلی سوسائٹی کی تائید کرتے ہیں۔ وہ عملاً یہ شہادت دیتے ہیں کہ دین قائم ہے اور اگر کوئی کمی ہے تو وہ صرف یہ جزوی نقائص ہیں جنہیں وہ ختم کرنا چاہتے ہیں حالانکہ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ دین مکمل طور پر معطل ہے اور اس وقت موجودہ سوسائٹی پوری طرح جاہلی سوسائٹی ہے۔ اس میں اللہ کی حاکمیت جاری نہیں ہے' ایسی حاکمیت جس میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو۔

دین اسلام تب قائم ہو گا جب زمین پر اللہ کی حاکمیت جاری ہوگی۔ جب تک اللہ کی حاکمیت قائم نہ ہوگی دین پوری طرح قائم نہیں ہو سکتا۔ آج اس کرۂ ارض پر مسئلہ ہی یہ ہے کہ یہاں ایسے طاغوتی نظام قائم ہیں جنہوں نے دست درازی کر کے اللہ کی حاکمیت کو چھین لیا ہے۔ یہ اختیار خود انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے کر لوگوں کے لئے حلال و حرام متعین کرنا شروع کر دیا ہے اور وہ لوگوں کے مال اور اولاد کے بارے میں قوانین بناتے ہیں۔

زیر بحث آیات اور بیانات میں اسی مشکل مسئلے کو نہایت ہی مؤثر انداز میں نہایت ہی تفصیل کے ساتھ لیا گیا ہے۔ تمام باتوں کو اللہ کی حاکمیت اور بندگی کے نظریات کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے اور انہیں مسئلہ کفر و اسلام اور مسئلہ اسلام و جاہلیت قرار دیا گیا ہے۔

اسلام نے جس عظیم معرکے کے بعد اس دنیا میں اپنا وجود قائم کیا تھا وہ محض الحاد کے خلاف معرکہ نہ تھا' کہ ایک شخص خدا کو مان لے اور چند دینی رسومات کا پابند ہو کر حامی دین بن جائے۔ یہ معرکہ اجتماعی فساد اور اخلاقی فساد کے خلاف محض کوئی اصلاحی تحریک بھی نہ تھا' یہ باتیں بھی اگرچہ اس معرکہ میں شامل تھیں لیکن یہ تحریکات دین کے قیام کے بعد بھی جاری رہیں۔ اسلام نے اپنے وجود کے لئے جو معرکہ سر کیا وہ اس کرۂ ارض پر حاکمیت الٰہیہ کے قیام کا معرکہ تھا۔ مکہ میں لوگ سمجھتے تھے کہ لا الہ الا اللہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے۔ اس وقت مکہ میں قرآن نے اس نظریہ کو مسلمانوں کے ذہن میں اچھی طرح بٹھا دیا تھا۔ قرآن نے مسلمانوں کے ضمیر کے اندر اور ان کے دل و دماغ کے اندر یہ نظریہ اچھی طرح مرتسم کر دیا تھا کہ حاکم صرف اللہ ہے اگرچہ مکہ میں نظام حاکمیت الٰہیہ اور نظام قانون اسلامی کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ کسی مسلمان کے ذہن میں یہ بات تھی ہی نہیں کہ اللہ کے سوا کوئی اور حاکم ہو سکتا ہے اور اگر کوئی یہ تصور کرتا تھا تو وہ مومن نہ ہو سکتا تھا۔ جب یہ نظریہ مکہ میں مسلمانوں کے دل و دماغ میں اچھی طرح بیٹھ گیا تو مدینہ میں اس نظریہ کی بنیاد پر حاکمیت الٰہیہ قائم ہوئی۔ اگر ہمارے دور کے دین کے پرجوش حامیوں کے ذہن میں یہ بات سما جائے تو انہیں اپنے طرز عمل پر غور کرنا چاہیے کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور انہیں کرنا کیا چاہیے؟ .... میں سمجھتا ہوں اس سبق پر یہ تبصرہ کافی ہے۔ اب آیات کی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔

درس نمبر ۷۰ تشریح آیات

۱۳۶ --- تا --- ۱۵۳

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

"انہوں نے اللہ کے لئے خود اس کی پیدا کی ہوئی کھیتوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ کے لئے ہے' بزعم خود' اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لئے ہے۔ پھر جو حصہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لئے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لئے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے۔ کیسے برے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ!"

فصلوں اور مویشیوں کے بارے میں جاہلی سوسائٹی کے رسم و رواج کے بیان کے بعد یہاں بتایا جاتا ہے کہ ان فصلوں اور مویشیوں کی خالق اللہ کی ذات ہے اور وہی ہے جو زمین و آسمان سے لوگوں کے لیے وسائل رزق فراہم کرتا ہے۔ لیکن ان حقائق کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کے بعد ذرا سوچیں کہ تم لوگ اللہ کے عطا کر دہ رزق کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو' یہ کہ وہ اس کا ایک حصہ تو اللہ کے لئے قرار دیتے ہیں اور دوسرا حصہ اپنے بتوں کے نام منسوب کرتے ہیں۔ (ظاہر ہے کہ بتون کے مجاور ہی وہ لوگ ہیں جو بتوں کے حصے کو حاصل کرنے کے حقدار ہوتے ہیں)۔ اب اللہ کے حصے کے ساتھ وہ یہ توہین آمیز سلوک کرتے ہیں جس کی تفصیلات آیت کے اندر دی گئی ہیں۔

حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ جب وہ غلہ لے آتے تو اسے ڈھیر بنالیتے۔ اس میں سے ایک حصہ اللہ کے لئے نکالتے اور ایک بتوں کے لئے۔ اب جب تیز ہوا چلتی اور غلے کے دانے بتوں کے حصے سے اڑ کر اللہ کے حصے میں شامل ہو جاتے تو یہ اس حصے سے ان کو جدا کر کے پھر بتوں کے حصے میں ملا دیتے' اور اگر اللہ کے حصے کی جانب سے ہوا آئے اور اللہ کے حصے سے دانے بتوں کے حصے میں مل جاتے تو وہ انہیں اسی طرح چھوڑ دیتے۔ اسی کے بارے میں یہ آیت آئی ہے۔

(سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۶: ۱۳۶)) یہ لوگ بہت برے فیصلے کرتے ہیں۔" مجاہد سے روایت ہے کہ وہ کھیت کے ایک حصے کو اللہ کے نام کر دیتے اور ایک حصے کو اپنے بتوں کے لئے مخصوص کر دیتے۔ اب اللہ کے حصے سے ہوا اگر کسی چیز کو اڑا کر بتوں والے حصے میں ملا دے تو یہ اسے اسی طرح چھوڑ دیتے تھے اور اگر بتوں کے حصے سے کوئی چیز اللہ کے حصے میں مل جائے تو یہ اسے واپس کر دیتے تھے۔ اور کہتے۔

(اَللّٰهُ عَنْ هٰذَا غَنِيٌّ) اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اور مویشیوں میں سے انہوں نے سائبہ اور بحیرہ نام رکھے ہوئے تھے۔ حضرت قتادہ سے روایت ہے۔ اہل ضلالت نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے مویشیوں اور فصلوں کے ایک حصے کو اللہ کا حق قرار دے دیا اور ایک حصے کو بتوں کا حق قرار دیا۔ اب اگر اللہ کے حصے کی کوئی چیز بتوں کے حصے میں خلط ملط ہو جاتی تو یہ اسے چھوڑ دیتے اور اگر بتوں کے حصے سے کوئی چیز اللہ کے حصے میں جا پڑتی تو یہ اسے لوٹا دیتے۔ اور اگر کبھی خشک سالی ہوتی تو وہ اللہ کے حصے کو موقوف کر کے خود استعمال کرتے لیکن بتوں کے حصے کو ہر حال میں قائم رکھتے۔ اس کے بارے میں اللہ نے کہا (سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۶: ۱۳۶)) (یہ برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔")

حضرت سدی کہتے ہیں کہ یہ اپنے مالوں کے حصے بناتے تھے اور فصلوں میں سے بھی اللہ کا حصہ مقرر کرتے تھے۔ اسی طرح بتوں کے لئے بھی حصہ مقرر تھا۔ بتوں کے حصے کو بتوں پر صرف کرتے اور اللہ کے حصے کو صدقہ کر دیتے۔ اب وہ مویشی جو بتوں کا حصہ ہوتے اگر اتفاقاً مرجاتے اور اللہ کا حصہ زیادہ ہو جاتا تو وہ کہتے کہ ہمارے خداؤں کے لئے بھی تو اخراجات درکار ہیں تو وہ اللہ کے حصے میں سے لے کر اللہ کے ساتھ ٹھہرائے ہوئے شریکوں پر خرچ کرتے۔ اور اگر اللہ کے حصے کی فصل خراب ہو جاتی اور بتوں والے حصے میں فصل زیادہ ہو جاتی تو کہتے کہ اگر اللہ چاہتا تو وہ اپنے حصے کو اچھا بناتا۔ یوں وہ بتوں کے حصے سے لے کر اللہ کے حصے کو پورا نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "اگر یہ سچے ہوتے تو ہرگز ایسا نہ کرتے کیونکہ یہ لوگ میرے حصے سے تو لیتے ہیں لیکن میرے حصے میں شامل نہیں کرتے۔ اور یہی مطلب ہے۔ (سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۶: ۱۳۶)) کا۔

ابن جریر (سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۶: ۱۳۶)) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان لوگوں کے بارے میں اطلاع ہے کہ وہ برے فیصلے کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انہوں نے جو فیصلہ کیا وہ نہایت ہی غلط فیصلہ تھا کہ انہوں نے میرا حصہ ان لوگوں کو دے دیا جو انہوں نے بزعم خود میرے شریک ٹھہرائے ہوئے ہیں اور مزید یہ کہ ان مزعومہ شریکوں کے حصے میں سے وہ مجھے کچھ نہیں دیتے۔ یہی بات اس امر کے لئے کافی ثبوت ہے کہ یہ لوگ گمراہ بھی ہیں اور جاہل بھی۔ انہوں نے سچائی کی راہ کو ایک طرف چھوڑ دیا کیونکہ وہ جب اپنے خالق اور رازق کے ساتھ انصاف نہیں کرتے تو اور کس کے ساتھ کریں گے جبکہ اس نے ان پر لاتعداد احسانات بھی کر رکھے ہیں۔ وہ اللہ کو ان بتوں کے برابر کرتے ہیں جو نفع و نقصان نہیں دے سکتے۔ بلکہ انہوں نے ان بتوں کو اللہ پر فضیلت دے دی کہ ان کے حصے کو اللہ کے حصے سے بڑا قرار دیا۔

یہ تھی وہ بات جو انسانوں اور جنوں میں سے شیطان لوگ اپنے دوستوں کو بجھاتے تھے تاکہ وہ مویشیوں اور فصلوں کے بارے میں اہل ایمان کے ساتھ الجھتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شیاطین انسانوں کو جو زاویہ نظر دیتے ہیں' اس میں ان

شیاطین کا کوئی نہ کوئی مفاد ضرور ہوتا ہے۔ انسانی شیطانوں کا مفاد یہ ہے (یہ کاہنوں' مجاوروں اور رئیسوں میں سے ہوتے ہیں) کہ پہلے تو وہ ان انسانوں کے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں اور اس اثر کو قائم کر لینے کے بعد وہ ان کو اپنی مطلوبہ سمت کی طرف حرکت دیتے ہیں۔ اپنے دیئے ہوئے زاویہ نظر کے عین مطابق جو باطل تصورات اور فاسد عقائد پر مشتمل ہوتا ہے۔ یوں وہ ان عوام الناس کو گمراہ کر کے خود اپنے مادی مفاد بھی حاصل کرتے ہیں مثلاً یہ بر خود غلط عوام بتوں کے لئے جو حصے تجویز کرتے ہیں وہ عملاً انہی لوگوں کو ملتے ہیں جو ان کو یہ تصور دیتے ہیں۔ جنوں کے شیاطین کا مفاد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال کر ان کو گمراہ کرتے ہیں اور ان کی قیادت کر کے ان کی دنیا بھی خراب کرتے ہیں اور آخرت بھی۔

یہ تصورات جو عرب جاہلیت میں پائے جاتے تھے' ان کی مثالیں دنیا میں پائی جانے والی دوسری جاہلیتوں کے اندر بھی موجود ہیں۔ مثلاً یونانی' فارسی' رومی اور افریقہ و ایشیا کی دوسری جاہلیتوں میں۔ یہ تصورات تمام جاہلیتوں میں مالی تصرفات کرتے ہیں اور یہ ہر جاہلیت میں موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً دور جدید کی جاہلیت بھی ایسے مالی تصرفات کو روا رکھتی ہے جس کی اجازت اللہ نے نہیں دی۔ چنانچہ اس شرک میں دور جدید کی جاہلیت بھی ازمنہ سابقہ کی جاہلیتوں کے بالکل برابر ہے۔ دونوں ایک ہی اصول پر قائم ہیں۔ مثلاً جاہلیت کی تعریف ہے ہروہ تصرف جو عوام الناس کی زندگیوں میں کیا جائے جبکہ اس کی اجازت اللہ نے نہ دی ہو۔ اب یہ اور بات ہے کہ قدیم زمانوں میں اس قسم کے تصرفات کی شکل و نوعیت اور ہوتی تھی اور آج ذرا مختلف ہے۔ اصول ایک ہے اور شکلیں مختلف۔

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

"اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لئے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کر دیں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے' لہٰذا انہیں چھوڑ دو کہ اپنی افتراء پردازیوں میں لگے رہیں۔"

جس طرح ان لوگوں کے لئے ان کے شرکاء اور ان کے شیاطین نے اپنے مالوں اور فصلوں میں یہ تصرفات خوبصورت بنا دیئے ہیں' اسی طرح انہوں نے ان کے لئے قتل اولاد کو بھی مزین بنا دیا ہے۔ یوں کہ وہ لوگ اپنی بیٹیوں کو تنگدستی کے خوف سے زندہ درگور کر دیتے تھے' یا اس لئے کہ وہ جنگی قیدی بن جائیں گی اور ان کے لئے موجب عار ہوں گی۔ بعض اوقات وہ اولاد کو بطور نذر بھی قتل کرتے تھے۔ جس طرح حضرت عبدالمطلب سے روایت ہے کہ انہوں نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر اللہ نے ان کو دس ایسے بیٹے بخشے جو ان کے لئے دست و بازو ہوں تو وہ ان میں سے ایک کو قربان کریں گے۔

یہ تمام باتیں ان کے دل و دماغ میں ان کی جاہلی رسومات نے پختہ طور پر بٹھا دی تھیں - یہ رسومات جاہلیت وہ تھیں جو لوگوں نے خود ہی اپنے لئے وضع کی تھیں - اس آیت میں جن شرکاء کا ذکر ہے اس سے مراد شیاطین جن و انس ہیں - انسانوں میں سے جو شیاطین تھے وہ کاہن ' مجاور اور سردار تھے - جنوں میں سے وہ لوگ تھے جو بعض انسانوں کے دوست بن جاتے تھے اور وہ ان انسانوں کی مدد کرتے تھے - اس آیت میں ان شیاطین کا جو واضح ہدف بتایا گیا ہے وہ یہ ہے -

(لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ (٦ : ١٣٧)) تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں -" یعنی وہ ان کو ہلاک کر دیں ' ان پر ان کے دین کو گنجلک اور مشتبہ بنا دیں - اس طرح کہ وہ اسے واضح طور پر سمجھ نہ سکیں - ہلاک کرنے کا مصداق ایک تو یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کرتے ہیں - دوسرا مصداق یہ ہے کہ ان کی اجتماعی زندگی اسلام کے خلاف ہو جاتی ہے اور وہ اپنے معاشرے میں ان مویشیوں کی طرح بن جاتے ہیں جن کو وہ شیاطین جس طرف چاہیں ہانک کر لے جائیں ' یعنی اپنے مقاصد اور مفادات کے مطابق یہاں تک کہ وہ لوگ ان حیوانوں کے اموال ' اولاد اور خود ان کی جان کے بارے میں قتل کرنے اور ہلاک کرنے کے اختیارات کے بھی مالک ہو جاتے ہیں - ان حیوانوں کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ پوری اطاعت کریں - اس لئے کہ دین اور عقیدے کے ساتھ جو زائد تصورات وابستہ کر دیئے گئے اور جو درحقیقت دین سے نہیں ہیں ' وہ نہایت ہی گہرے ہو گئے اور اب دیندار لوگوں پر ان کا بھاری دباؤ ہے - یہ تصورات چونکہ سوسائٹی کے اندر موجود رسم و رواج کی وجہ سے دین سے وابستہ ہوئے ہیں اس لئے یہ عرف بھی ان کی پشت پر ہوتا ہے اور ان رسومات کا دباؤ معاشرے پر اس قدر زیادہ ہو جاتا ہے کہ عوام کالانعام اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے - الا یہ کہ ان میں سے کوئی حقیقی دین کی بنیادوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہو اور قرآن و سنت پر اس کی گرفت مضبوط ہو -

یہ دینی رنگ کے مبہم اور پیچیدہ تصورات جن کو لوگ دین سمجھتے ہیں ' یہ اجتماعی رسومات جن سے یہ تصورات پروان چڑھتے ہیں اور جو عوام الناس پر کمرتوڑ بوجھ بنے ہوئے ہیں ' یہ ان صورتوں تک محدود نہیں ہیں جو قدیم زمانوں کی جاہلیتوں کے اندر پائی جاتی تھیں ' دور جدید کی تازہ ترین جاہلیت میں بھی یہ تصورات واضح طور پر موجود ہیں - یہ رسم و رواج جو دور جدید میں بھی عوام الناس پر بارگراں بنے ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے عوام کی زندگی اجیرن بنی ہوئی ہے ' لوگوں کے لئے لابدی بن گئے ہیں اور اب لوگوں کے لئے کوئی راہ نہیں رہی ہے کہ وہ ان کے چنگل سے نکل بھاگیں - لوگوں نے اپنے اوپر مخصوص لباس فرض کر لئے ہیں اور بعض اوقات ان پر اس قدر روپیہ خرچ کرتے ہیں جو ان کے پاس نہیں ہوتا - یہ رسم و رواج لوگوں کی زندگی کو چاٹ جاتے ہیں - ان کی تمام آرزوئیں خاک میں مل جاتی ہیں ' ان کے اخلاق ختم ہو جاتے ہیں لیکن وہ ہر حال میں ان کی پابندی کرتے ہیں - صبح کا لباس ' دوپہر کا لباس ' شام کا لباس ' منی اسکرٹ ' ٹیڈی لباس اور مضحکہ خیز لباس ' قسم قسم کا میک اپ اور بناؤ سنگھار - بعض لوگ یہ کام کرتے ہیں بعض ان سے کراتے ہیں - کرانے والوں میں لباس کے بڑے بڑے تاجر ' بڑی بڑی کمپنیاں اور بینکوں اور مالی اداروں کے سود خوار کارندے اور وہ تاجر شامل ہیں جو لوگوں سے یہ حرکات اس لئے کراتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں جو نفع ملے اسے وہ مزے لے لے کر کھائیں - اس تمام صورت حال کی پشت پر یہودی سازش ہے اور یہودیوں نے یہ صورت حال اس لئے

چلا رکھی ہے کہ اس طرح وہ لوگوں پر معاشی اور سیاسی حکمرانی کریں۔ لیکن یہودی یہ کام اسلحہ اور فوج کے ذریعے نہیں کرتے بلکہ یہ کام وہ افکار و خیالات، تصورات و نظریات کے ہتھیاروں کے ذریعے کرتے ہیں اور یہ حکومت وہ عرف عام کے دباؤ سے کرتے ہیں اور یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ نظریات کا اثر اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک یہ نظریات نظام حکومت کا روپ نہ دھاریں اور اجتماعی شکل اختیار نہ کرلیں اور سوسائٹی کے ڈھانچے کے اندر نہ گھس جائیں۔ چنانچہ سوسائٹی کے اندر ان جاہلی نظریات اور تصورات کو یہ یہودی بڑی اسکیم کے ساتھ پھیلاتے اور جاری کرتے ہیں۔

یہ کام معاشرے کے تمام شیاطین کرتے ہیں، یہ شیاطین جنوں میں بھی ہیں اور انسانوں میں بھی۔ یہ تمام کام جاہلیت ہیں جس کی اشکال اور صورتیں مختلف ہیں۔ لیکن اس کے اصول اور جڑیں اور بنیادیں ایک ہی ہوتی ہیں۔ اگر ہم یہ سمجھیں کہ قرآن نے بعض ازمنہ قدیمہ کی جاہلیتوں ہی پر بحث و تنقید کی ہے اور جدید دور کی جاہلیتوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں تو ہم قرآن کریم کی شان کو گھٹا رہے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم تمام قدیم و جدید جاہلیتوں پر بحث کرتا ہے۔ وہ ہر دور میں انحراف کرنے والے معاشرے کا مقابلہ کرتا ہے اور اسے واپس لاکر جادۂ مستقیم پر ڈالتا ہے۔

باوجود اس کے کہ یہ ایک عظیم عمرانی بوجھ اور سازش ہے قرآن کریم مسئلہ جاہلیت کے حل کو آسان کرنے کے لئے اس حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ یہ تمام شیاطین اور ان کے دوست اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور وہ جو کچھ کر رہے ہیں اپنی قوت اور قدرت سے نہیں کر رہے۔ وہ یہ کام اس لئے کر رہے ہیں کہ اللہ نے ان کو مہلت دے رکھی ہے، اس دنیا کی مختصر زندگی کے لئے۔ یہاں یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ کے دائرہ قدرت کے اندر اور اللہ کی مشیت کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اگر اللہ کی مشیت نہ ہوتی تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتے۔ لہٰذا کوئی پرواہ نہیں ہے، انہیں اپنی روش پر چلنے دیجئے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ (۶:۱۳۷) اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے، لہٰذا انہیں چھوڑ دو کہ اپنی افتراء پردازیوں میں لگے رہیں"۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ لوگ اس قدر بے باک ہوگئے تھے کہ وہ یہ بات تسلیم نہ کرتے تھے کہ وہ یہ بات اپنی جانب سے کر رہے ہیں بلکہ وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ یہ تمام تصورات اور تصرفات من جانب اللہ ہیں اور ان کے لئے یہ شریعت ہیں۔ اپنے زعم کے مطابق وہ کہتے تھے کہ یہ تصورات و تصرفات حضرت اسماعیل ؑ اور حضرت ابراہیم ؑ کی شریعت ہیں۔

آج جاہلیت جدیدہ کے دور میں بھی شیاطین کا یہی رویہ ہے۔ ان کی اکثریت میں اس قدر جرأت تو نہیں ہے کہ وہ کیمونسٹوں کی طرح سرے سے وجود باری کا انکار ہی کر دیں لیکن وہ دین کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو دور جاہلیت قدیمہ کے لوگ کرتے تھے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو دین اور مذہب کا سخت احترام کرتے ہیں اور وہ جو قانون بناتے ہیں اس کی اساس بھی دین اسلام پر ہی ہے۔ لیکن ان لوگوں کا طریقہ واردات خالص منکرین خدا اور کیمونسٹوں کے مقابلے میں زیادہ مکارانہ اور اذیت دہ ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے اس سوئے ہوئے جذبہ دین سے بہت ڈرتے ہیں جو ان کی رگ و روح میں جاری و ساری ہے۔ اگرچہ وہ جذبہ اسلام کا حقیقی جذبہ نہ ہو کیونکہ مکمل اسلام تو پورا نظام حیات ہے۔ وہ محض خفیہ جذبہ نہیں ہے اور نہ بجھی ہوئی چنگاری ہے۔ اس طرح یہ لوگ مسلمانوں کے غیض و غضب سے بچنا چاہتے

ہیں - یہ نہایت ہی مکارانہ چال ہے اور اسلام کے خلاف ایک نہایت ہی تکلیف دہ صورت حالات ہے -

اب ذرا دین کے ان نادان حامیوں کے حالات کو دیکھئے - یہ اسلامی نظام حیات کے اساسی مقاصد کو چھوڑ کر ادھر ادھر کی باتوں پر اپنی قوتیں کھپاتے ہیں - انہیں اس جاہلی صورت حالات کے اندر یہ بات نظر ہی نہیں آتی کہ اللہ کی حاکمیت پر دست درازی کر کے شرک کا ارتکاب کیا جارہا ہے اور اپنے اس بے دانش جوش کی وجہ سے وہ موجودہ مشرکانہ نظام کو ایک اسلامی صورت حالات بناتے ہیں - اپنی اس روش کی وجہ سے یہ تاثر دیتے ہیں کہ موجودہ حالات گویا اسلامی حالات ہیں اور ان حالات اور عالم اسلام کی صورت حال میں صرف چند جزئیات کا اختلاف ہے -

اپنے اس رویے کی وجہ سے اسلام کے یہ نادان دوست' مذہبی طبقے اور بظاہر اسلام کے پرجوش حامی اس غیر اسلامی صورت حالات کو طول دے رہے جو سراسر غیر اسلامی ہے اور اسلامی دنیا پر چھائی ہوئی ہے حالانکہ اس طرز عمل کی وجہ سے ان لوگوں کے مقاصد پورے ہو رہے ہیں جو اسلام کے دشمن ہیں - یہ خدمات وہ لوگ انجام دیتے ہیں جنہوں نے اسلام کا مخصوص مذہبی لباس پہن رکھا ہے حالانکہ اسلامی نظام نے کوئی ایسا مخصوص مذہبی طبقہ نہیں رکھا کہ اسلام کے بارے میں وہی بات کر سکے - اسلام کا نہ کوئی کاہن ہے اور نہ اس میں کسی پادری کی گنجائش ہے کہ ان کے سوا کوئی اور اسلام کی بات ہی نہ کر سکے -

وَ قَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّ حَرْثٌ حِجْرٌ ۖۗ لَّا یَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَ اَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَ اَنْعَامٌ لَّا یَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا افْتِرَآءً عَلَیْهِ ؕ سَیَجْزِیْهِمْ بِمَا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ۝۱۳۸

"کہتے ہیں یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں' انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھلانا چاہیں' حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے - پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن پر یہ اللہ کا نام نہیں لیتے اور یہ سب کچھ انہوں نے اللہ پر افتراء کیا ہے' عنقریب اللہ انہیں ان افتراء پردازیوں کا بدلہ دے گا" -

ابن جریر طبری کہتے ہیں ان جاہلوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ اطلاع دیتے ہیں کہ یہ لوگ از خود بعض چیزوں کو حلال قرار دیتے تھے اور بعض کو حرام قرار دیتے تھے' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو قانون سازی کے اختیارات نہیں دیئے تھے -

آیت میں لفظ حجر کے معنی حرام کے ہیں - یہ لوگ جو اللہ کے حق قانون سازی اور حق حاکمیت پر دست درازی کرتے تھے' یہ دعویٰ بھی کرتے تھے کہ یہ اللہ کی شریعت ہے جو ایک جرم ہے - انہوں نے اپنی فصلوں کے ایک حصے کو اور بعض قسم کے مویشیوں کو اپنے الٰہوں کے لئے مختص کر رکھا تھا جیسا کہ اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں - وہ کہتے تھے کہ یہ پھل اور مویشی ان کے لئے حرام ہیں اور ان کو وہی شخص کھا سکتا ہے جس کو اللہ کی طرف سے اجازت ہو - یہ سب اقوال ان کا زعم تھا اور ظاہر ہے کہ ان کے مذہب میں پھر اجازت صرف کاہنوں' گدی نشینوں اور بعض رئیسوں کو تھی - پھر انہوں نے مویشیوں میں سے بعض کو اسی طرح اپنے اوپر بھی حرام کر دیا تھا جن کا ذکر سورت مائدہ میں ہو چکا ہے - "اللہ

نے کسی جانور کو بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام قرار نہیں دیا"۔ یہ انہوں نے از خود قرار دیا کہ ان جانوروں پر سواری حرام ہے۔ اسی طرح انہوں نے یہ قرار دیا کہ بعض جانوروں کے اوپر اللہ کا نام نہ لیا جائے گا یعنی سواری کے وقت' دودھ نکالنے کے وقت اور نہ ان کے ذبح کے وقت بلکہ ان پر الٰہوں کا نام لیا جائے گا جن کے نام وہ مختص ہو چکے تھے۔

ابن جریر افتراء علی اللہ کی تفسیر میں یہ کہتے ہیں کہ "ان لوگوں نے بعض چیزوں کو حرام قرار دے کر اور پھر یہ کہہ کر کہ یہ اللہ کی نازل کردہ شریعت ہے' اللہ پر افتراء باندھا ہے' اللہ پر جھوٹ بولا ہے کیونکہ انہوں نے ازخود بعض چیزوں کو حرام قرار دے کر اس کی نسبت اللہ کی طرف کر دی تھی۔ اس آیت میں اللہ نے اس بات کی تردید کر دی کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے انہیں جھوٹا قرار دیا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو یہ اطلاع کر دی کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں"۔

یہاں ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ جاہلیت کے وہ خدوخال کون سے ہیں' جو اکثر جاہلیتوں میں مشترک ہوتے ہیں۔ ان تمام جاہلیتوں میں یہ بات مشترک ہوتی ہے کہ بعض لوگ دیدہ دلیری سے کام لے کر اس دنیا کو محض مادہ قرار دیتے ہیں اور بعض اگرچہ بے حیائی میں اس حد تک آگے نہیں جاتے اور خدا کا سرے سے انکار نہیں کرتے مگر وہ کہتے ہیں کہ دین تو صرف عقیدے کا نام ہے۔ یہ کوئی نظام زندگی یا اجتماعی ڈھانچہ' یا سیاسی اور اقتصادی نظام نہیں ہے جو پوری زندگی کو اپنے دائرہ اختیار میں لے سکتا ہو۔

جاہلیت کی دوسری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ہر جاہلیت ایک مخصوص دنیاوی نظام قائم کرتی ہے جس میں حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ اللہ کے سوا کسی اور کے لئے ہوتا ہے' البتہ ہر جاہلیت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ مذہب کا احترام کرتی ہے اور وہ اپنے خدوخال دین ہی سے لیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی جاہلیت کا یہ انداز نہایت ہی خطرناک اور گہری عیاری اور چالاکی پر مبنی ہوتا ہے۔ عالمی عیسائیت اور عالمی صیہونیت نے اس علاقے میں جو کبھی دارالسلام تھا' اور جہاں شریعت الٰہی قانون کی حیثیت رکھتی تھی' یہی پالیسی اپنا رکھی ہے۔ یہ پالیسی انہوں نے ترکی میں عظیم لیڈر کے تجربے کی ناکامی کے بعد اپنائی ہے۔ یاد رہے کہ ترکی کا یہ عظیم لیڈر خود انہوں نے مصنوعی طور پر پیدا کیا تھا' اس نے انہی کی ہدایت پر ترکی سے خلافت اسلامیہ کو ختم کیا۔ اس لئے کہ ترکی کی خلافت اسلامیہ اس کرہ ارض پر عظمت اسلام کی آخری نشانی تھی' لیکن ترکی میں ان کی اعلانیہ ملحدانہ پالیسی بری طرح ناکام رہی اور اس نے اس علاقے میں کوئی اہم کردار ادا نہ کیا۔ اس ملحدانہ پالیسی نے اعلانیہ دین سے علیحدگی اختیار کر لی۔ چنانچہ یہ پالیسی وہاں کے اجتماعی نظام سے بالکل نامانوس رہی کیونکہ باشندگان ترکیہ کے دلوں میں ابھی تک محبت اسلام کی آگ سلگ رہی تھی۔ چنانچہ اس تجربے کے بعد عالمی صلیبیت اور صیہونیت نے نئے تجربے شروع کیے' جن کے مقاصد تو وہی ہیں البتہ ان نئے تجربات میں کمالی غلطیوں کو نہیں دہرایا جاتا۔ چنانچہ وہ اب جو سازشیں کرتے ہیں وہ دین کے پردے میں رہ کر کرتے ہیں۔ وہ دینی تنظیمیں قائم کرتے ہیں جو یا تو اعلانیہ ان مقاصد کے لئے کام کرتی ہیں اور یا ان کا مقصد یہ ہوتا ہے۔ وہ ان تنظیموں کے بعض جزوی مسائل کو لے کر بیٹھ جاتی ہیں اور یہ تاثر دیتی ہیں کہ ان جزوی خرابیوں کے علاوہ جو کچھ ہے وہ درست ہے۔ میں سمجھتا ہوں اسلام کے خلاف یہ نہایت ہی گہری سازش ہے جو دین اسلام کے خلاف شیاطین جن و انس نے تیار کی ہے۔

صلیبی اور صیہونی اس عرصے میں پوری طرح اپنے مقاصد کے لئے کام کرتے رہے۔ باوجود مذہبی اختلافات کے وہ

باہم دگر متحد و متفق رہے اور باہم تجربات اور مہارتوں کا تبادلہ کرتے رہے۔ بظاہر وہ اس ترکی تجربے کے بھی خلاف رہے اور یہ تاثر دیتے رہے کہ ترکوں کی تحریک بھی دراصل احیائے اسلام کی تحریک ہے اور یہ کہ ترکی حکومت محض زبانی طور پر اپنے آپ کو لادینی حکومت ظاہر کر رہی ہے۔

مستشرقین صلیبی اور صیہونی استعمار کو فکری غذا مہیا کرتے ہیں۔ انہوں نے اس بات پر بڑی محنت کی ہے کہ ترکی تجربہ فی الواقعہ ملحدانہ تجربہ نہ تھا اور یہ محنت وہ اس لئے کرتے ہیں کہ ترکی تجربے کے ملحدانہ خدوخال کی وجہ سے اس کے اثرورسوخ اور فعالیت میں کمی واقع ہوگئی تھی۔ مستشرقین کی جانب سے اسلامی تحریک کے خلاف یہ تباہ کن حملہ تھا لیکن ترکی کی تحریک الحاد اب اس قابل نہ رہی تھی کہ وہ دوبارہ فعال ہو سکے۔ دور جدید میں مستشرقین کی جانب سے اسلام کے خلاف کارروائی خود اسلام کے عنوان سے کی جارہی ہے۔ یہ لوگ اسلامی نظریات کے مفہوم بدل رہے ہیں۔ اسلام کے لئے لوگوں کے جوش و خروش کو کم کر رہے ہیں اور اس کو جاہلی رنگ دے رہے ہیں۔ دین کے نام سے دینی نظریات کو بدلنے کی سعی کرتے ہیں۔ اسلامی اخلاق اور انسان کی نہایت ہی فطری عادات کو دین کے نام سے بے راہ روی پر ڈال رہے ہیں۔ پھر وہ جاہلیت کے ہر نشان کو ایسا ثابت کر رہے ہیں کہ یہ عین اسلام ہے اور اس کو ان ممالک میں رواج دے رہے ہیں جہاں اسلام کے بارے میں لوگوں کے جذبات حساس نہیں۔ یوں وہ عالم اسلام کو صلیبیت اور صیہونیت کے دام تذویر میں پھنساتے ہیں اور ان کی یہ تحریک ان صلیبی اور صیہونی جنگوں سے زیادہ کامیاب ہے جو وہ اسلام کے خلاف گزشتہ تیرہ سو سال سے لڑ رہے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے۔

(سَيَجْزِيهِمْ بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ (٦:١٣٨)) "عنقریب اللہ انہیں ان افتراء پردازیوں کا بدلہ دے گا"۔

وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَٰذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا ۖ وَإِن يَكُن مَّيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ ۚ سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿١٣٩﴾

"اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے یہ ہمارے مردوں کے لئے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں پر حرام، لیکن اگر وہ مردہ ہو تو دونوں اس کے کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ باتیں جو انہوں نے گھڑ لی ہیں ان کا بدلہ اللہ انہیں دے کر رہے گا۔ یقیناً وہ حکیم ہے اور سب باتوں کی اسے خبر ہے"۔

اس شرک اور بت پرستی سے جو اوہام پیدا ہوئے تھے، ان کے اندر یہ لوگ اس قدر آگے بڑھ گئے تھے کہ انہوں نے حلال و حرام کے تعین کا کام بھی اللہ کے بجائے انسانوں کے سپرد کر دیا تھا اور دعویٰ یہ کرتے تھے کہ یہ انسان جو قانون سازی کر رہے ہیں وہی اللہ کی شریعت ہے۔ چنانچہ خرافات کی دنیا میں وہ اس مقام تک آپہنچے کہ کہنے لگے کہ ان جانوروں

کے پیٹ میں جو کچھ ہے وہ مردوں کے لئے ہے یا شاید یہ بات وہ مذکورہ بالا بحیرہ' سائبہ اور وصیلہ وغیرہ کے حق میں کہتے تھے کہ عورتوں کے لئے اس کا کھانا حرام ہے۔ہاں ایک صورت ہے کہ اگر یہ جانور مردہ حالت میں پیدا ہو تو عورتیں بھی ان سے کھا سکتی ہیں اور یہ کیوں؟ اس کا کوئی منطقی جواز ان کے پاس نہ تھا۔ہاں جواز صرف یہ تھا کہ انہوں نے قانون سازی کا کام جن لوگوں کے سپرد کر دیا تھا ان کی منشا یہ ہوگی یا ان کا مفاد اس میں ہو گا۔یہ خالص بے معنی قانون سازی تھی۔یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے آخر میں قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ یہ نہایت ہی مکروہ قانون ہے۔جن لوگوں نے یہ بنایا ہے انہوں نے اللہ پر افتراء پردازی کی ہے' خصوصاً یہ بات جو وہ کہتے ہیں کہ یہ بھی من عنداللہ شریعت ہے۔

(سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ (٦:١٣٩)) "ان کا بدلہ اللہ انہیں دے کر رہے گا۔ یقیناً وہ حکیم ہے اور سب باتوں کی اسے خبر ہے"۔ اللہ تمام حالات سے باخبر ہے' وہ تمام امور میں بڑی حکمت کے ساتھ تصرفات کرتا ہے اور اس کے فیصلے اور قانون ایسے نہیں ہوتے جیسے ان جاہلوں کے ہوتے ہیں۔

جب انسان کلام الٰہی کو پڑھتے ہوئے ان گمراہیوں پر نظر ڈالتا ہے اور ان گمراہیوں کے حاملین جن خساروں' نقصانات اور مشکلات میں مبتلا ہوتے ہیں ان پر غور کرتا ہے تو وہ یہ دیکھ کر نہایت ہی تعجب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ لوگ اسلامی شریعت اور اسلامی نظام سے انحراف کر کے کس قدر نقصانات اٹھا رہے ہیں اور کن ناقابل برداشت ذمہ داریوں میں گھر گئے ہیں۔ان ذمہ داریوں کو لے کر وہ کس قدر فضول اور مجمل ناقابل فہم امور میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ان کے عقائد غلط ہیں اور ان پر فرائض ایسے عائد کر دیئے گئے ہیں کہ ناقابل برداشت ہیں۔ان کی زندگی پیچیدہ اور اضطراب انگیز ہے۔زندگی کا کوئی اصول نہیں ہے۔ ہر طرف وہم و خرافات اور تقلید اور نقل ہے۔ان سب حالات کے مقابلے میں اسلام کا عقیدہ توحید ہے جو بالکل صاف ستھرا اور واضح ہے۔یہ عقیدہ انسانی ذہن سے اوہام اور خرافات کو کھرچ کر رکھ دیتا ہے اور انسانی عقل کو اندھی تقلید کی پیروی اور جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیتا ہے۔یہ عقیدہ انسانیت کو جاہلیت اور اس کی رسومات سے رہائی دلاتا ہے۔ پھر یہ عقیدہ بندوں کو بندوں کی غلامی سے آزاد کرتا ہے' چاہے یہ غلامی قانون سازی کے معاملے میں ہو' یا رسومات اور طرز عمل میں ہو یا حسن و قبح کے پیمانوں کے میدان میں ہو۔اس جنگل سے نکال کر عقیدۂ توحید انسان کو ایک واضح نظریہ دیتا ہے۔ایک واضح معنی دیتا ہے۔اس کے تصورات واضح اور آسان ہیں۔ان تصورات کی روشنی میں انسان کو ہمہ گیر آزادی نصیب ہو جاتی ہے اور انسان صرف اللہ کی بندگی اور غلامی کے اعلیٰ و ارفع مقام تک پہنچ جاتا ہے۔لوگ نبی کی اتباع سے وہاں پہنچ سکتے ہیں۔

آہ! یہ ایک عظیم خسارہ ہے اور یہ خسارہ دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی' بلکہ آخرت کا خسارہ تو بہت ہی زیادہ ہے اور یہ اس لئے ہے کہ انسانیت نے اللہ کی سیدھی راہ سے انحراف کر لیا ہے اور جاہلیت کی گندگی میں ڈوب گئی ہے۔ اس نے انسانوں کی غلامی میں اپنے آپ کو دے دیا ہے۔

---○○○---

قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمُوا مَا

رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ۚ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

"یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت و نادانی کی بنا پر قتل کیا اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو اللہ پر افتراء پردازی کر کے حرام ٹھہرا لیا۔ یقیناً وہ بھٹک گئے اور ہرگز وہ راہ راست پانے والوں میں سے نہ تھے"۔

یہ ایک عام اور مطلق خسارہ ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ ہے۔ ان کا اپنا بھی خسارہ ہے اور آنے والی نسلوں کا بھی خسارہ ہے۔ ان کا فکری خسارہ ہے اور روحانی خسارہ ہے اور ان کی آزادی کا خسارہ ہے کہ اللہ نے تو انہیں انسانوں کی غلامی سے چھڑایا اور انہیں رب کی غلامی میں داخل کیا لیکن انہوں نے اپنے آپ کو اپنے جیسے بندوں کی غلامی میں دوبارہ داخل کر دیا۔ اور ان انسانوں کو اپنا حاکم بنالیا۔ ان تمام امور سے صرف نظر بھی کیا جائے تو انہوں نے ضلالت اختیار کر لی ہے اور ہدایت کی راہ کو ترک کر دیا ہے۔

(قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (۶: ۱۴۰)) "یقیناً وہ بھٹک گئے اور ہرگز راہ راست پانے والوں میں سے نہ تھے"۔

---ooo---

اس کے بعد قرآن کریم انہیں اس کائنات کی پہلی حقیقت کی طرف لاتا ہے جسے انہوں نے بھلا دیا تھا اور آغاز کلام میں آیت

(وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ (۶: ۱۳۶)) میں اشارہ بھی کر دیا تھا۔ انہیں اس حقیقت کی طرف لایا جاتا ہے کہ جن فصلوں اور مویشیوں کے متعلق وہ ایسے نامعقول قواعد وضع کرتے ہیں، ان کی ماہیت کیا ہے اور ان کا اصل اور مصدر کیا ہے۔ وہ ان کے بارے میں جنوں اور انسانوں کے شیاطین کی ہدایات لیتے ہیں جبکہ ان کو ان جنوں اور شیطانوں نے پیدا نہیں کیا۔ اللہ وہ ذات ہے جس نے ان فصلوں اور مویشیوں کو پیدا کیا۔ ان چیزوں کو تمہارے سازوسامان کے طور پر پیدا کیا گیا اور تم انہیں استعمال کر رہے ہو۔ تمہارا فرض تو یہ ہے کہ تم شکر خداوندی بجالاؤ اور صرف اللہ کی عبادت کرو، حالانکہ اللہ کو تمہارے شکر اور تمہاری بندگی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو غنی اور رحمتوں والا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ حقائق و عقائد تو خود انسانوں کی دنیا و آخرت کو سدھارنے کے لئے بتلائے جاتے ہیں جو ان میں سے کسی ایک چیز کے مالک و خالق نہیں ہیں۔ یہ تو اللہ کے پیدا کردہ فصل اور مویشی ہیں لیکن انسان اللہ کی مخلوق کو تقسیم کر کے کچھ بتوں کو دے دیتے ہیں اور کچھ اللہ کے لئے مخصوص کرتے ہیں۔ پھر اللہ کے حصے کے ساتھ توہین آمیز سلوک کرتے ہیں اور یوں شیطانوں کو خوش کرتے ہیں۔

حالانکہ اللہ ہی خالق، مالک اور رازق و رب ہے، اور ان مالوں میں کوئی تصرف اس کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس کا اذن اسلامی شریعت کی صورت میں موجود ہے۔ اور یہ شریعت اللہ کی جانب سے رسول اللہ لائے ہیں۔ اللہ کا اذن ان غاصبوں کے جاری کردہ قوانین کو حاصل نہیں ہے۔ جنہوں نے اللہ کے حق حاکمیت کو غصب کر لیا ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَیْرَ
مَعْرُوْشٰتٍ وَّ النَّخْلَ وَ الزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ
مُتَشَابِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ
یَوْمَ حَصَادِهٖ ۖۗ وَ لَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ﴿۱۴۱﴾ۙ وَ مِنَ الْاَنْعَامِ
حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ
اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۴۲﴾ۙ

”وہ اللہ ہی ہے جس نے طرح طرح کے باغ اور تاکستان اور نخلستان پیدا کیے ' کھیتیاں اگائیں جن سے قسم قسم کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں ' زیتون اور انار کے درخت پیدا کیے جن کے پھل صورت میں مشابہ اور مزے میں مختلف ہوتے ہیں۔ کھاؤ ان کی پیداوار جب کہ یہ پھلیں ' اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر وہی ہے جس نے مویشیوں میں سے وہ جانور بھی پیدا کیے جن سے سواری و باربرداری کا کام لیا جاتا ہے اور وہ بھی جو کھانے اور بچھانے کے کام آتے ہیں۔ کھاؤ ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں بخشی ہیں اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے“۔

اللہ وہ ذات ہے جس نے ابتداء ان باغات کو پیدا کیا۔ لہٰذا وہی ہے جو ایک مردہ سے زندہ چیز کو نکالتا ہے۔ ان باغوں میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو تاکستان کی شکل کے ہیں اور انسان انہیں اگاتا ہے۔ اور ان کے اردگرد باڑ لگاتا ہے اور کچھ نخلستان کی شکل کے ہیں۔ جو خود ہی پیدا ہوتے ہیں اور ان کو انسان کی جانب سے کسی قسم کی اعانت کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ اور فصلیں اس نے اگائیں۔ زیتون اور انار اس نے پیدا کیے اور قسم قسم کے پھل ہیں جو ملتے جلتے بھی ہیں اور جدا جدا بھی ہیں۔ پھر حیوانات بھی اس نے پیدا کیے جن میں سے بعض اونچے قد کے ہیں اور کچھ چھوٹے جسم کے ہیں اور وہ تمہارے کھانے کے لئے اور لباس کے لئے ہیں اور جن کے بالوں سے تم فرش و قالین بناتے ہو۔

اور یہ اللہ ہی ہے جس نے اس کرۂ ارض پر رنگا رنگ زندہ مخلوقات کو پھیلایا اور اس مخلوقات کی رنگا رنگی حیرت انگیز ہے۔ اور پھر اس مخلوق کو ان فرائض کے لئے نہایت ہی سازگار ماحول دیا جو انسان کو اس کرۂ ارض پر ادا کرتے ہیں۔ ان کو ان ضروریات کے لئے بھی موافق بنایا جو انسان کی زندگی کے لئے لابدی ہیں۔ ان آیات و دلائل اور ان رنگا رنگ مخلوقات کو دیکھ کر ایک انسان کس طرح کچھ اثر لئے بغیر گزر سکتا ہے۔ پھر بھی وہ اس مخلوق اور ان زرعی اجناس میں اللہ کے سوا کسی اور کی حاکیت و اختیارات کو تسلیم کرتا ہے۔

قرآن کریم بار بار اس رزق کا ذکر کرتا ہے جو انسان کے لئے اللہ نے اس کرۂ ارض پر بکھیر دیا ہے۔ اس متنوع رزق کو اس بات پر دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے کہ اگر رازق وہ ہے تو حاکم بھی وہی ہے۔ انسانوں پر اس کی حکومت چلنی چاہئے۔ اس لئے کہ جو خالق ہے' رازق ہے' رب ہے اور پوری زندگی میں کفیل ہے' صرف وہی اس بات کا مستحق ہے کہ لوگ زرعی اجناس اور مویشیوں اور پوری زندگی کے معاملات میں اسے اپنا حاکم' مختار اور قانون ساز سمجھیں۔ اور اس میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے باغات اور پھلوں کے کئی مناظر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مختلف قسم کے جانوروں کا ذکر کیا ہے اور بتلایا ہے کہ یہ تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں۔ اس سے پہلے ان مناظر سے اللہ کی الوہیت اور خدائی پر استدلال کیا گیا ہے۔ اور یہاں اللہ تعالیٰ ان چیزوں کے ذکر سے اپنے حق حکمرانی پر استدلال کرتا ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ الوہیت اور حاکمیت دراصل ایک ہی حقیقت ہے۔ وہی حاکم ہے اور یہ اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔

(لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لَا حَاکِمَ اِلَّا اللّٰهُ) اب فصلوں اور پھلوں کے ذکر کے بعد یہ حکم ہے۔ ایک قانون کی طرف اشارہ۔

(كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (٦ : ١٤١)) "کھاؤ ان کی پیداوار جب کہ یہ پھلیں' اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ جب تم اس کی فصل کاٹو تو اللہ کا حق دو' اس فقرے کی وجہ سے بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ آیت مدنی ہے۔ لیکن ہم نے اس سورہ کے مقدمہ میں اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ یہ آیت مکی ہے۔ اور اگر اس سورہ سے اس آیت کو علیحدہ کر دیا جائے تو بات مکمل نہیں ہوتی۔ اس آیت سے قبل کا کلام اور بعد کا کلام ایک دوسرے سے اس وقت تک کٹ جاتا ہے جب تک یہ آیت مدینہ میں نازل نہیں ہو جاتی' لہٰذا یہ بات درست نہیں ہے۔ پھر ضروری نہیں ہے کہ اللہ کا حق جس کا اس سورہ میں ذکر ہے وہ زکوٰۃ ہی ہو۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ اس سے مراد مقدمہ ہے۔ رہی زکوٰۃ' تو اپنی متعین شرح کے ساتھ تو وہ ہجرت کے بعد دوسرے سال میں فرض ہوئی۔

(وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (٦ : ١٤١)) "اور حد سے نہ گزرو بے شک اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" یہ آیت کھانے پر بھی مناسب حد بندی ہے اور عطا پر بھی مناسب حد بندی عائد کرتی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ مسلمان جب دینے لگے تو حد سے گزر گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی "کہ حد سے نہ گزرو بے شک اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" اسلام ہر بات میں اعتدال کو پسند کرتا ہے۔

(وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (٦ : ١٤٢)) "پھر وہی ہے جس نے مویشیوں میں سے وہ جانور بھی پیدا کئے جن سے

سواری و باربرداری کا کام لیا جاتا ہے۔ اور وہ بھی جو کھانے اور بچھانے کے کام آتے ہیں۔ کھاؤ ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں بخشی ہیں اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

مویشیوں کے ذکر میں یہ کہا گیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ انسان کو یہ یاد دلانا مطلوب ہے کہ یہ تمام مخلوق اللہ کی پیدا کردہ ہے۔ شیطان کسی چیز کا خالق نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب شیطان کا کچھ ہے ہی نہیں تو پھر یہ کیا ہے کہ نعمتیں اللہ کی اور پیروی شیطان کی؟ جبکہ معلوم ہے کہ شیطان ہے بھی کھلا دشمن۔ کیا سوچتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چیزیں استعمال کر کے شیطان کی پیروی کرتے ہو اور وہ تو کھلا دشمن ہے۔

اب قرآن کریم نہایت ہی گہرائی میں جاکر اوہام جاہلیت کو تلاش کرتا ہے۔ نہایت ہی خفیہ گوشوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور ایک ایک خفیہ گوشے کو روشنی میں لایا جاتا ہے۔ ایسے ایسے گوشے واضح کرتا ہے جو بادی النظر میں بھی نامعقول ہیں اور ان کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی' اور بعض اوقات تو ان اوہام میں مبتلا لوگوں کو بہت زیادہ شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب ان کی یہ حرکات کھلے میدان میں آشکارا ہو جاتی ہیں اور جب وہ دیکھ لیتے ہیں کہ ان کے ان اوہام کی پشت پر نہ کوئی سند ہے' نہ کوئی کتاب منیر ہے اور نہ کوئی عقلی دلیل ہے۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

"یہ آٹھ نر و مادہ ہیں' دو بھیڑ کی قسم سے اور دو بکری کی قسم سے۔ اے نبی "ان سے پوچھو کہ اللہ نے ان کے نر حرام کئے ہیں یا مادہ' یا وہ بچے جو بھیڑوں اور بکریوں کے پیٹ میں ہوں؟ ٹھیک ٹھیک علم کے ساتھ مجھے بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ اور اسی طرح دو اونٹ کی قسم سے ہیں اور دو گائے کی قسم سے۔ پوچھو' ان کے نر اللہ نے حرام کئے ہیں یا مادہ' یا وہ بچے جو اونٹنی اور گائے کے پیٹ میں ہوں؟ کیا تم اس وقت حاضر تھے جب اللہ نے ان کے حرام ہونے کا حکم تمہیں دیا تھا؟ پھر

اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ کی طرف منسوب کر کے جھوٹی بات کہے تاکہ علم کے بغیر لوگوں کی غلط راہنمائی کرے۔ یقیناً اللہ ایسے ظالموں کو راہ راست نہیں دکھاتا۔

یہ مویشی جن کے بارے میں تنازعہ چل رہا ہے اور جن کے بارے میں آیت سابقہ میں یہ کہا گیا کہ یہ صرف اللہ کی مخلوق ہے ان کے آٹھ سیٹ ہیں لفظ "ازواج" اس وقت بولا جاتا ہے جب نر اور مادہ دونوں ہوں' زوج کے معنے جوڑا' ایک جوڑا بھیڑوں کا اور ایک بکریوں کا۔ سوال یہ ہے کہ ان کو اللہ نے کن لوگوں پر حرام قرار دیا ہے؟ یا ان کے پیٹ میں جو جنین ہیں ان کے بارے میں حرمت کا حکم کہاں ہے؟ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ۔

(نَبِّئُوْنِیْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (٦: ١٤٣)) اس لئے کہ حلال و حرام کے فیصلے محض ظن و تخمین سے تو نہیں ہو سکتے' نہ ہی انکل پچو سے اس معاملے میں کوئی فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔ نہ اس بارے میں معلوم اور مسلم سند کے بغیر کوئی قانون بنایا جا سکتا ہے۔

باقی جوڑے نر اونٹ اور مادہ اونٹ' بیل اور گائے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان کے بارے میں حلال و حرام کا حکم کہاں ہے؟ یا ان کے جنین کے بارے میں حکم کہاں ہے اور کس نے دیا ہے؟

(اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا (٦: ١٤٤)) کیا تم اس وقت حاضر تھے جب اللہ نے ان کے حرام ہونے کا حکم تمہیں دیا تھا۔" یعنی تم حاضر تھے اور تم اس بات کے گواہ ہو کہ اللہ نے اس کا حکم تمہیں دیا ہے۔ اس لئے کہ کوئی چیز حلال و حرام تو صرف اللہ کے حکم سے ہو سکتی ہے اور حکم بھی یقینی ہو۔ محض ظن و تخمین سے اس معاملے میں بات نہیں ہو سکتی۔

اس آیت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قانون ساز صرف اللہ ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ جو قانون بناتے ہیں وہ قانون الٰہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ فوراً ان کو متنبہ کرتے ہیں۔

(فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّیُضِلَّ النَّاسَ بِغَیْرِ عِلْمٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (٦: ١٤٤)) "پھر اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ کی طرف منسوب کر کے جھوٹی بات کہے تاکہ علم کے بغیر لوگوں کی غلط راہنمائی کرے۔ یقیناً اللہ ایسے ظالموں کو راہ راست نہیں دکھاتا۔" اس شخص سے بڑا ظالم اور کوئی نہیں ہے جو از خود قانون بنا کر اسے اللہ کا قانون بتلاتا ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ شریعت ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ عوام کالانعام کو گمراہ کرے۔ ایسا شخص لوگوں کو محض ظن کی طرف بلاتا ہے جبکہ ایسے لوگوں کے لئے ہدایت کی راہ مسدود ہو چکی ہے۔ انہوں نے غلط راہ کو اپنا لیا ہے اور اللہ کے ساتھ شرک کا ارتکاب کر کے ظلم کا ارتکاب کیا ہے اور کسی ظالم کو اللہ راہ ہدایت نہیں دیتا۔

اب جبکہ ان کے معتقدات' تصورات اور ان کی عملی رسومات کے بودے پن کو ظاہر کر دیا گیا اور یہ ثابت کر دیا گیا کہ یہ سب کچھ محض وہمی ہے اور بے اصل ہے' اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ ان کے تصورات اور عقائد کسی علم و دلیل پر مبنی

نہیں ہیں اور یہ کہ مویشیوں اور فصلوں کے بارے میں جو تصورات اور رسومات وہ رکھتے ہیں وہ یا تو انہوں نے ازخود گھڑ لئے ہیں اور یا ان کے شیاطین نے ان پر القاء کئے ہیں حالانکہ یہ مویشی اور یہ فصل اور پھول پھل ان کے پیدا کردہ نہیں ہیں۔ یہ تو اللہ کی تخلیق کے کمالات ہیں' لہٰذا حاکمیت اور عبادت سب کی سب اللہ کے لئے مخصوص ہونی چاہیے۔ اس لئے کہ مخلوق اس کی ہے' رزق اس کا ہے اور لوگوں کو ہر قسم کے مال اس نے دیئے ہیں۔

اب اس تمہید کے بعد اللہ تعالیٰ بتلاتے ہیں کہ وہ کیا چیزیں ہیں جو اللہ نے حرام کی ہیں۔ اور وہ چیزیں اللہ نے سچائی اور دلیل کی اساس پر حرام کی ہیں' محض وہم وگمان کی بنا پر نہیں۔ کیونکہ اللہ وہی ذات ہے جس کو حاکمیت کا حق حاصل ہے' جسے قانون سازی کا حق ہے۔ یہ اللہ ہی کا منصب اور مقام ہے کہ وہ جس چیز کو حلال کرے وہ حلال ہے اور جس کو حرام کرے تو وہ حرام ہے۔ اس کام میں کوئی انسان نہ شریک ہے اور نہ کوئی اس میں کسی قسم کی مداخلت کر سکتا ہے۔ اللہ کی حاکمیت اور اس کی قانون سازی پر کوئی نظرثانی کرنے والا نہیں ہے۔ موقعہ کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے یہاں وہ چیزیں بھی گنوا دیں جو یہودیوں پر حرام تھیں اور مسلمانوں کے لئے حلال کر دی گئیں' اس لئے کہ وہ یہودیوں پر بطور سزا حرام کی گئی تھیں کیونکہ وہ ظلم و شرک میں مبتلا ہو گئے تھے اور اللہ کی شریعت سے دور ہو گئے تھے۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَ عَلَى الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ ۚ وَ مِنَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ شُحُوْمَهُمَاۤ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَاۤ اَوِ الْحَوَایَاۤ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَیْنٰهُمْ بِبَغْیِهِمْ ۖؗ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

"اے نبی" ان سے کہو کہ جو وحی میرے پاس آئی ہے اس میں تو میں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر حرام ہو' الا یہ کہ وہ مردار ہو' یا بہایا ہوا خون ہو' یا سور کا گوشت ہو کہ وہ ناپاک ہے' یا فسق ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ پھر جو شخص مجبوری کی حالت میں (کوئی چیز ان میں سے کھا لے) بغیر اس کے کہ وہ نافرمانی کا ارادہ رکھتا ہو اور بغیر اس کے کہ وہ حد ضرورت سے تجاوز کرے' تو یقیناً تمہارا رب درگزر سے کام لینے والا اور رحم

فرمانے والا ہے۔ اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے' اور گائے اور بکری کی چربی بھی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا ان کی آنتوں سے لگی ہوئی ہو یا ہڈی سے لگی رہ جائے' یہ ہم نے ان کی سرکشی کی سزا انہیں دی تھی۔ اور یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔"

"ابن جریر طبری لکھتے ہیں" اللہ اپنے نبی سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں اے محمد! ان لوگوں سے یہ کہہ دیں جنہوں نے اللہ کی پیدا کردہ فصلوں اور مویشیوں میں ایک حصہ اللہ کے لئے مخصوص کر دیا ہے اور ایک حصہ اپنے ان معبودوں کے لئے مخصوص کر دیا ہے جو خود انہوں نے اللہ کے شریک قرار دیئے ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ مویشی اور یہ فصل اور لوگوں کے لئے ممنوع ہے اور اسے صرف وہی لوگ استعمال کر سکتے ہیں جن کے بارے میں ہم چاہیں یہ قانون وہ بزعم خود بناتے ہیں جو بعض جانوروں پر بار برداری کو حرام کرتے ہیں اور بعض جانور ایسے ہیں جن پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا جائز نہیں سمجھتے۔ وہ بعض جانوروں کے پیٹ میں جنین کو اپنی عورتوں اور بیویوں کے لئے حرام قرار دیتے ہیں اور مردوں کے لئے حلال قرار دیتے ہیں۔ وہ اللہ کے پیدا کردہ بعض دوسرے ارزاق کو حرام قرار دیتے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ یہ قوانین و ضوابط اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان کے یہ کام شرک کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان سے پوچھو! کہ آیا اللہ کی جانب سے کوئی رسول آیا تھا جس نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا تو بتاؤ وہ کون سا رسول تھا یا اللہ نے جب ان چیزوں کو حرام قرار دیا تو تم خود اس مجلس میں موجود تھے۔ تم نے خود اللہ سے سنا ہے کہ یہ چیزیں حرام ہیں۔ اگر تم ایسا دعویٰ کرو تو بادی النظر میں یہ جھوٹا ہو گا اور تم عقلاً ایسا دعویٰ کر ہی نہیں سکتے۔ اگر تم ایسا دعویٰ کرو تو تمام جہان تمہاری تکذیب کر دے گا۔ رہا یہ میرا معاملہ' تو میرے اوپر جو کتاب قرآن نازل ہو رہی ہے اس میں کسی شخص پر کوئی ایسی چیز حرام نہیں ہے جس کو تم حرام قرار دیتے ہو اور بزعم خود "تم" حرام قرار دیتے ہو۔ میرے اوپر اللہ نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ یہ ہیں کہ کوئی جانور مردار ہو گیا ہو' بغیر ذبح کے مر گیا ہو' یا بہایا ہوا خون ہو' یا خنزیر کا گوشت حرام ہے اس لئے کہ یہ ناپاک ہے' یا وہ گوشت جو فسق کا ہو' مثلاً وہ ذبیحہ جو مشرکین بتوں پر ذبح کرتے ہیں' اپنے بتوں اور آستانوں پر اور ان پر بتوں کا نام لیا گیا ہو' یہ ذبح اسلام میں فسق تصور ہوتا ہے' اسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے اور ایسا کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے۔ یہ مردار تصور ہوتا ہے اور اس کا کھانا حرام ہے۔"

یہ اللہ کی جانب سے اعلان ہے ان مشرکین کے لئے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ مردار کی حلت و حرمت کے مسئلے میں مجادلہ کرتے تھے کہ وہ جن چیزوں میں مجادلہ کرتے ہیں ان میں سے بعض اشیاء تو حرام ہیں جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہے اور بعض اشیاء حلال ہیں جنہیں اللہ نے حلال قرار دیا ہے۔ ان حلال چیزوں کی حرمت کی نسبت جو وہ اللہ کی طرف کرتے ہیں اس میں وہ جھوٹے ہیں۔ ابن جریر آیت (فَمَنِ اضْطُرَّ ......) کی تفسیر میں کہتے ہیں: "اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے مردار' خون' لحم خنزیر یا بتوں کے نام پر ذبح ہونے والے جانوروں کو حرام قرار دیا لیکن اگر کوئی اس کے کھانے پر مجبور ہو جائے' بطور حکم عدولی نہ کھا رہا ہو اور یہ نہ ہو کہ حالت اضطرار میں نہ ہو اور اسی طرح وہ جان بوجھ کر حدود سے تجاوز نہ کر رہا ہو اور حد ضرورت کے اندر کھا رہا ہو مثلاً صرف اس قدر کھا رہا ہو کہ اس کی زندگی بچ جائے' اس سے زیادہ نہ کھا رہا ہو تو اس قدر کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے' بے شک اللہ غفور و رحیم ہے اور وہ اس کی پردہ پوشی کرنے والا ہے۔ اس پر اس کو کوئی سزا نہ ہو گی اور

گناہ بخش دیا جائے گا' یہ ہے مفہوم غفور کا۔ اور رحیم اس لئے ہے کہ اس نے لوگوں پر رحم کر کے بوقت مجبوری جواز کا حکم دیا۔ ورنہ اگر وہ چاہتا تو وہ ان چیزوں کے استعمال کو ہر حال میں حرام کر دیتا۔"

رہی وہ مقدار جو ان چیزوں سے کھائی جا سکتی ہے تو اس بارے میں فقہاء کے درمیان اختلافات ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ وہ صرف اسی قدر کھائے گا جس سے جان بچ جائے' دوسری رائے یہ ہے کہ بقدر کفایت اور سیر ہو جانے تک کھا سکتا ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ ایک بار کھانے کے علاوہ دوسرے اوقات مجبوری کے لئے ذخیرہ بھی کر سکتا ہے۔ اگر اسے یہ ڈر ہو کہ آئندہ بھی رزق حلال نہ ملے گا' میں ان اختلافات کی تفصیلات میں نہیں جاتا۔ اس موضوع پر اسی قدر کافی ہے۔

رہے یہودی تو ان پر وہ تمام جانور حرام کر دیئے گئے تھے جن کے ناخن تھے۔ یعنی وہ تمام حیوانات جن کے پاؤں پھاڑے ہوئے نہیں ہیں مثلاً اونٹ' شتر مرغ' مرغابی اور بطخ۔ ان پر گائے اور بکریوں کی چربی بھی حرام کر دی گئی تھی' صرف پیٹھ کی چربی جائز تھی یا وہ چربی جو آنتوں کے ساتھ لگی ہوئی تھی یا جو ہڈیوں سے ملی ہوئی تھی۔ یہ چیزیں ان پر بطور سزا حرام کی گئیں اور یہ سزا ان کو اس بغاوت کے نتیجے میں دی گئی جو وہ اللہ کے احکام اور قوانین سے کرتے تھے۔

(وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ (٦:١٤٦)) "اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے' اور گائے اور بکری کی چربی بھی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا ان کی آنتوں سے لگی ہوئی ہو یا ہڈی سے لگی رہ جائے۔ یہ ہم نے ان کی سرکشی کی سزا انہیں دی تھی اور یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔" قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ وہ سبب بتا دیا جس کی وجہ سے ان پر یہ چیزیں حرام کر دی گئی تھیں اور یہ حرمت یہودیوں کے ساتھ مخصوص تھی اور یہی حقیقی سبب تھا۔ وہ سبب نہ تھا جو وہ کہتے ہیں کہ اسرائیل یعنی حضرت یعقوب نے خود اپنے اوپر یہ چیزیں حرام کر لی تھیں اور اسرائیل کی اطاعت میں یہ لوگ بھی بدستور ان چیزوں کو اپنے اوپر حرام کئے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اشیاء حضرت یعقوب کے لئے مباح اور حلال تھیں یعنی ان کے بعد جب انہوں نے سرکشی اختیار کی تو ان پر اللہ نے ان چیزوں کو حرام کر دیا اور یوں انہیں سزا دی۔

فَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٤٧﴾

"اب اگر وہ تمہیں جھٹلائیں تو ان سے کہہ دو کہ تمہارے رب کا دامن رحمت وسیع ہے اور مجرموں سے اس کے عذاب کو پھیرا نہیں جا سکتا۔"

اس کا دامن رحمت بہت وسیع ہے اور یہ رحمت ہمارے لئے بھی وسیع ہے اور اس سے پہلے کے مومنین کے

لئے بھی وسیع تھی اور مومنین کے علاوہ تمام مخلوقات کے لئے بھی اس میں وسعت ہے کیونکہ وہ تو محسن ہے۔ دوست کے لئے بھی رحیم ہے اور دشمن کے لئے بھی رحیم ہے۔ اگر مجرم عذاب کے مستحق ہوں تو بھی وہ نفاذ عذاب میں جلدی نہیں کرتا اور یہ اس کی شان کریمی ہے اور اس ڈھیل کے عرصہ میں کئی لوگ توبہ کر لیتے ہیں اور اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن اس کا عذاب نہایت ہی سخت ہے۔ صرف اس کا حلم ہی اسے اہل ایمان سے رد کر سکتا ہے۔ اللہ کے نظام قضا و قدر میں جو وقت متعین ہے اس وقت تک ہی وہ مؤخر ہو سکتا ہے۔

اس آیت میں اگرچہ شمع امید کو بھی روشن رکھا گیا ہے اور انسان کو مایوس نہیں کیا گیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں تنبیہ بھی موجود ہے کہ وہ حد سے نہ گزرے اور اللہ وہ ذات ہے جس نے لوگوں کے دل و دماغ کو پیدا کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ ان کے لئے یہ دونوں باتیں ضروری ہیں تاکہ وہ ڈر جائیں' اپنے رویے پر غور کریں اور دعوت اسلامی کو قبول کر لیں۔

---ooo---

جب بات یہاں تک پہنچتی ہے اور اہل ضلالت کے لئے کوئی مفر نہیں رہتا۔ جب ان کے پاس کوئی استدلال نہیں رہتا اور تمام بھاگنے کے راستے بند ہو جاتے ہیں تو قرآن کریم ان کے فرار کے آخری راستے کو بھی بند کر دیتا ہے۔ ان کے گمراہانہ تصورات' شرکیہ عقائد اور بے معنی اعمال کے لئے ایک راہ موجود تھی۔ وہ کہتے تھے کہ وہ اپنا کوئی اختیار نہیں رکھتے' وہ تو مجبور ہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو وہ نہ ایسے تصورات رکھتے' نہ غلط عقائد ان کے ہوتے اور نہ وہ بداعمالیوں میں مبتلا ہوتے۔ اگر اللہ چاہتا تو وہ ہمیں ان باتوں سے روک دیتا۔ وہ تو قادر مطلق ہے اور اس کی قدرت پر کوئی قید نہیں ہے۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَ لَآ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿۱۴۸﴾ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

"یہ مشرک لوگ (تمہاری ان باتوں کے جواب میں) ضرور کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا' اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔" ایسی ہی باتیں بنا بنا کر ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا تھا یہاں تک کہ آخر کار ہمارے عذاب کا مزا انہوں نے چکھ لیا۔ ان سے کہو "کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو۔" پھر کہو (تمہاری اس حجت کے

مقابلے میں) حقیقت رس حجت تو اللہ کے پاس ہے' بے شک اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔

افکار اسلامی کی تاریخ میں مسئلہ جبر و قدر پر طویل مباحث رہے ہیں۔ اہل سنت اور معتزلہ اور مرجیئہ اس میں باہم دست وگریباں رہے ہیں۔ یونانی فلسفہ اور یونانی منطق جب عالم اسلام میں آئی تو اس نے بھی ان مباحث کو متاثر کیا۔ پھر عیسائیوں کے فلسفہ لاہوت نے بھی اثرات ڈالے۔ اور اس کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا کہ یہ اسلام کے واضح اور حقیقت پسندانہ تصور کے لئے ناقابل فہم بن گیا۔ اگر اس مسئلے پر قرآن کے سنجیدہ 'حقیقت پسندانہ اور ڈائرکٹ انداز میں غور کیا جاتا تو یہ جدل و جدال نہ ہوتا اور یہ بحث وہ رخ اختیار نہ کرتی جو اس نے اختیار کیا۔

جب ہم مشرکین کے قول کو پڑھتے ہیں اور اس کو قرآن کریم نے جس سادہ اور واضح انداز میں رد کیا اسے دیکھتے ہیں تو یہ بہت ہی سادہ اور قابل فہم نظر آتا ہے۔

(سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ (٦:١٤٨)) یہ مشرک لوگ (تمہاری ان باتوں کے جواب میں) ضرور کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا' اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔

ان کا مقصد یہ تھا کہ انہوں نے جو شرک کیا' ان کے آبا نے جو شرک کیا یا انہوں نے از خود جن چیزوں کو حرام قرار دیا اللہ نے انہیں حرام قرار دیا تھا' اور ان کا یہ دعویٰ کرنا کہ یہ اللہ کی جانب سے مقرر کردہ شریعت ہے اور بلادلیل یہ دعویٰ کرنا کہ یہ سب امور اللہ کی مشیت کے مطابق چل رہے ہیں۔ اگر اللہ نہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔ اور نہ ان چیزوں کو حرام قرار دیتے۔ یہ سب بیکار باتیں ہیں۔

اب دیکھئے کہ قرآن کریم ان کے اس فلسفے کی تردید کس طرح کرتا ہے۔ قرآن کریم صرف یہ کہتا ہے کہ یہ لوگ بعینہ اسی طرح جھوٹ بول رہے ہیں جس طرح ان سے پہلے لوگوں نے جھوٹ بولا۔ اور اس سے پہلے جن لوگوں نے جھوٹ بولا انہوں نے تو اپنے جھوٹ کا مزہ چکھ لیا ہے اور اب یہ نئے مکذبین آگئے ہیں اور اللہ کا عذاب ان کے انتظار اور استقبال میں ہے۔

(كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا (٦:١٤٨)) ایسی ہی باتیں بنا بنا کر ان سے پہلے لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا تھا یہاں تک کہ آخر کار ہمارے عذاب کا مزا انہوں نے چکھ لیا۔" یہ وہ تنبیہ ہے جو سوچنے والے کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ غافل سے غافل انسان بھی ہوش میں آجاتا ہے اور انجام کو سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اب ایک دوسری تنبیہ ہے جس کے ذریعے ان کی فکری اصلاح مطلوب ہے۔ یہ کہ اللہ نے کچھ احکامات و اوامر دیئے ہیں اور بعض چیزوں سے منع کیا ہے اور انہیں حرام قرار دیا ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں وہ یقینی اور ناقابل شک علم حاصل کر سکتے ہیں۔ رہی اللہ کی مشیت اور اس کا نظام تو وہ ایک پوشیدہ نظام ہے اور اس کی اصل حقیقت تک پہنچنا انسان کی قوت مدرکہ کے لئے کوئی آسان کام نہیں ہے۔ وہ کس طرح جان سکتے ہیں کہ اللہ کی مشیت

کیا ہے۔ اور جب انسان اللہ کے نظام قضا و قدر کا ادراک ہی نہیں کر سکتا تو وہ کسی کے فعل کو کس طرح نظام قضا و قدر کی طرف منسوب کر سکتا ہے۔

(قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ (۶:۱۴۸)) ان سے کہو "کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو۔" اللہ نے جو احکام دیئے یا اس کی جانب سے جو منہیات ہیں، وہ معلوم ہیں اور ان کے بارے میں قطعی علم ہمارے پاس قرآن میں موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ ان قطعی معلومات کو چھوڑ کر محض ظن و تخمین کے سراب کے پیچھے کیوں دوڑتے ہیں اور اس وادی میں کیوں قدم رکھتے ہیں جس کے نشیب و فراز سے وہ واقف نہیں ہیں۔

میں سمجھتا ہوں مسئلہ جبر و قدر میں یہ ایک فیصلہ کن بات ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس بات کا مکلف نہیں بناتا کہ وہ اللہ کے نظام قضا و قدر کا علم حاصل کریں اور اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالیں۔ اللہ کی جانب سے لوگوں پر صرف یہ فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے اوامر اور منہیات کا علم حاصل کریں اور اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالیں۔ جب وہ اس سلسلے میں سعی شروع کریں گے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اللہ انہیں راہ ہدایت پر ڈال دیں گے اور ان کے دل اسلام کے لئے کھل جائیں گے۔ مسئلہ قضا و قدر میں یہ ایک حقیقت پسندانہ اور عملی سوچ ہے اور انسان کے مسائل کے حل کے لئے کافی ہے' یہ آسان بھی ہے' واضح بھی ہے اور اس میں کوئی بحث و مباحثہ اور جدل و جدال نہیں ہے۔ نہ تحکم اور سینہ زوری ہے۔

اگر اللہ چاہتا تو آغاز ہی سے انسان کو اس طرح پیدا کرتا کہ وہ ہدایت کی راہ کے سوا کسی دوسری راہ پر چل ہی نہ سکتا یا اللہ انہیں مجبور کر دیتا کہ وہ ہدایت اختیار کریں یا اللہ ان کے دلوں میں از خود ہدایت ڈال دیتا اور ان پر ہدایت کے لئے جبری ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی لیکن اللہ جل شانہ یہ نہیں چاہتے تھے۔ اللہ کی مشیت یہ تھی کہ آدم کو قدرت و اختیار دے کر اسے آزمائے اور یہ اختیار اس قدر ہو کہ وہ ہدایت و ضلالت میں سے جس راہ کو چاہے اختیار کرے۔ انسان جب کسی راہ کا آزادانہ ارادہ کرے تو اللہ پھر اس کی مدد کرے' ہدایت کی طرف یا ضلالت کی طرف' یعنی جو ضلالت کی طرف اشارہ کرے اس کے لئے وہ راہ بھی آسان ہو۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے مطابق اس کی سنت جاری رہتی ہے۔

(قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۶:۱۴۹)) پھر کہو (تمہاری اس حجت کے مقابلے میں) حقیقت رس حجت تو اللہ کے پاس ہے' بے شک اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔" اب یہ مشکل مسئلہ واضح ہو جاتا ہے اور قرآن اسے اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ ہر انسان اسے بسہولت سمجھ سکتا ہے۔ رہی وہ علمی کشتیاں جو اس مسئلے پر ہوتی رہیں اور وہ طویل جدل و جدال جو ہماری تاریخ کا حصہ ہے تو وہ اسلامی احساس اور اسلامی منہاج کے ساتھ لگا نہیں کھاتا۔ نہ صرف یہ کہ اسلامی سوچ اسے قبول نہیں کرتی بلکہ یونانی فلسفے اور عیسائیوں کے ہاں لاہوتی مباحث بھی آج تک کسی نتیجے تک نہیں پہنچ پائے۔ اس لئے کہ یہ مباحث جس انداز سے چلے

وہ اس مسئلے کے مزاج کے خلاف تھا۔

ہر حقیقت کی جو نوعیت ہوتی ہے اس کے مطابق ہی اسے لیا جاتا ہے اور اس پر بحث کے لئے اس کے حسب حال اسلوب اپنایا جاتا ہے۔ جہاں تک مادی حقائق کا تعلق ہے ان کو بذریعہ تجربہ معلوم کیا جاسکتا ہے اور ریاضی حقائق کو ذہنی مفروضات کے ذریعے معلوم کیا جاتا ہے لیکن جو حقائق مادی دنیا سے ورا ہیں ان کا اپنا منہاج بحث ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر کہا کہ یہ حقائق عملی نوعیت رکھتے ہیں اور انہیں عملی انداز میں اور حقیقت پسندانہ منہاج بحث کے ساتھ لینا چاہئے۔ ان کو محض ذہنی مفروضوں کے انداز میں نہیں لینا چاہیے جس طرح ان کو پہلے بھی لیا گیا اور آج بھی لیا جا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام اس دنیا میں اس لئے آیا تھا کہ یہاں ایک عملی صورت حالات پیدا کر دے۔ وہ احکام اور منہیات پر مشتمل ہے اور یہ احکام اور منہیات واضح ہیں۔ ان کے بارے میں نامعلوم مشیت الٰہیہ کو زیر بحث لانے کا مقصد یہ ہو گا کہ ہم کسی بے کنار صحرا میں بلا دلیل پڑ جائیں اور اپنی قوتوں کو لاحاصل جدل و جدال اور بادیہ پیمائی میں صرف کر دیں۔

---ООО---

اب اللہ تعالیٰ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کرتے ہیں کہ آپ اس قانون سازی میں اللہ کو بطور گواہ پیش فرمائیں۔ اس طرح جس طرح اس سے پہلے حضور کو ہدایت ہوئی تھی کہ آپ اللہ کے اقتدار اعلیٰ اور حاکیت کے مسئلے میں بھی اللہ کی ذات کو بطور شہادت پیش فرمائیں۔ اس سورہ کے آغاز میں یہ فرمایا گیا تھا۔

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ شَهِیْدٌ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی قُلْ لَّآ اَشْهَدُ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (۶:۱۹) "ان سے پوچھو کس کی شہادت بڑھ کر ہے؟ کہو میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے، اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے سب کو متنبہ کر دوں۔ کیا واقعی تم یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں؟ کہو میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں دے سکتا۔ کہو خدا تو وہی ایک ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔ اور یہاں اللہ نے یوں فرمایا!

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِیْنَ یَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

""ان سے کہو ""لاؤ اپنے وہ گواہ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ ہی نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے۔" پھر اگر وہ شہادت دے دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دینا اور ہرگز ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے' اور جو آخرت کے منکر ہیں اور جو دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں۔""

یہ ایک عظیم مقابلہ ہے' اور یہ بھی فیصلہ کن اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام کا مزاج کیا ہے؟ دین اسلام میں اللہ کی ذات میں کسی اور کو شریک ٹھہرانا شرک ہے۔ اسی طرح اللہ کے حق حاکمیت اور قانون سازی میں کسی اور کو عملاً شریک کرنا بھی شرک ہے جو عملی شرک ہے۔ الا یہ کہ کوئی ایسا قانون بنائے جس کی قرآن وسنت نے اجازت دی ہو۔ قانون سازی میں اگر کوئی زبانی طور پر یہ اعلان کر دے کہ یہ قانون از جانب اللہ ہے تو اس کا دعویٰ مسترد ہو گا الا یہ کہ درحقیقت وہ منجانب اللہ ہو۔ یہاں اللہ تعالیٰ اس قسم کے لوگوں کو جو خود قانون بناتے ہیں یا کوئی قانون بنا کر اسے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں' اللہ جھوٹا قرار دیتا ہے اور یہ اعلان بھی کر دیا جاتا ہے کہ ایسے لوگوں کے دل میں نہ خوف آخرت ہے اور نہ ایمان آخرت اس لئے کہ یہ لوگ اگر منکر آخرت نہ ہوتے تو اللہ کے ساتھ دوسروں کو ہمسر بنانے کی جرأت ہی نہ کرتے۔ نہ کسی کو اللہ کا شریک ٹھہراتے۔ ایسی ہی تعبیر اس سورہ کے آغاز میں بھی آئی تھی۔

(اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ (٦: ١)) ""تعریف ہے اللہ کے لئے جس نے زمین و آسمان بنائے' روشنیاں اور تاریکیاں پیدا کیں۔ پھر بھی وہ لوگ جنہوں نے دعوت حق کو ماننے سے انکار کر دیا دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھہرا رہے ہیں۔"" یہ ہے حکم ان لوگوں کے بارے میں جو اللہ سے اس کا حق حاکمیت چھینتے ہیں اور اسے ان لوگوں کے سپرد کرتے ہیں جو خود ان ہی کی طرح انسان ہیں۔ یہاں ان لوگوں کے اس دعویٰ کو بھی مسترد کر دیا جاتا ہے کہ ایسی کوئی قانون سازی اسلامی قانون سازی ہو سکتی ہے۔ اب اللہ کے اس حکم کے بعد کسی اور انسانی رائے کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔

اگر ہم یہ بات سمجھنا چاہیں کہ اللہ نے اس مسئلے کا فیصلہ اس انداز میں کیوں کیا؟ اور ایسے لوگوں کو آیات الٰہیہ کو جھٹلانے والا کیوں کہا۔ ان کے بارے میں یہ فیصلہ کیوں دے دیا کہ وہ آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور یہ کہ وہ مشرک ہیں اور اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو ہمسر بنانے والے ہیں' تو ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم سمجھنے کی سعی ضرور کریں کیونکہ اللہ کی شریعت' اس کے احکام اور فیصلوں پر تدبر کرنا اور ان کی حکمت معلوم کرنا ایک مطلوبہ امر ہے۔

اللہ نے ان لوگوں کے بارے میں جو اپنی جانب سے عوام کے لئے قانون بنائیں یہاں یہ حکم لگایا ہے کہ وہ آیات الٰہیہ کی تکذیب کرتے ہیں اگرچہ وہ اسے اللہ کی شریعت کا عنوان دیں' کیونکہ آیات الٰہیہ سے یہاں دو مفہوم لئے جا سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان سے مراد آیات کونیہ ہیں' تو یہ آیات بھی اس بات پر گواہ ہیں کہ خالق اور رازق اللہ وحدہ ہے' اور جو خالق اور رازق ہو گا وہی مالک ہو گا لہٰذا وہی متصرف اور حاکم ہو گا۔ اس لئے جو شخص صرف اللہ کو حاکم نہ سمجھے تو وہ گویا آیات الٰہیہ کونیہ کی تکذیب کرتا ہے اور اگر ان آیات سے مراد قرآنی آیات ہوں تو قرآن کی بے شمار آیات واضح اور دو ٹوک انداز میں یہ قرار دیتی ہیں کہ حاکمیت اور قانون سازی کے معاملے میں اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ صرف اللہ کی شریعت ہی کو قانونی درجہ حاصل ہے۔ اور لوگوں کو صرف اللہ کی شریعت کی پابندی کرنی اور کرانی چاہیے۔

ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ نے بھی یہ قرار دیا ہے کہ یہ لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے اس لئے کہ جو شخص آخرت پر یقین و ایمان رکھتا ہے کہ وہ ایک دن قیامت کے روز اپنے رب کو ملنے والا ہے تو ایسا شخص ہرگز اللہ کے حق حاکمیت پر دست درازی نہیں کرے گا اور نہ وہ اپنے لئے کسی ایسے حق کا مطالبہ کرے گا۔ اللہ انسانوں کا حاکم مطلق ہے اس کا نظام قضا و قدر بھی انسان پر جاری ہے اور اس طرح اس کی شریعت بھی ان پر جاری ہونا چاہیے۔

ان لوگوں کے بارے میں اللہ کی تیسری قرار داد یہ ہے کہ یہ لوگ دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں۔ یعنی وہ اسی طرح شرک ہیں جس طرح بت پرست مشرک ہیں۔ اگر یہ اہل توحید میں سے ہوتے تو وہ دوسروں کو اللہ کا ہمسر نہ بناتے نہ اس کے حق حاکمیت میں اور نہ اس کے حق الوہیت میں کیونکہ وہ ان میں منفرد ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا ان حقوق کو استعمال کر رہا ہو تو اس کی مخالفت کرتے اور ہرگز اس پر راضی نہ ہوتے۔

جیسا کہ معلوم ہوتا ہے' یہ بات ان تمام احکام کی علت ہے کہ جو لوگ قرآن و سنت کے بالمقابل قانون سازی کرتے ہیں ان کے اس فعل کی وجہ سے اللہ نے ان پر یہ احکام صادر کئے کہ وہ مشرک ہیں' اللہ کی آیات کو جھٹلانے والے ہیں اور یہ کہ دراصل وہ آخرت کی جوابدہی پر یقین نہیں رکھتے کہ ایک دن انہوں نے اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ یہ ہے علت اور اس کے نتیجے میں یہ ہے حکم۔ رہا یہ کہ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ کا یہ حکم کیوں ہے تو یہ تو نص قطعی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور اس کے مطابق تو ایسے لوگ مشرک ہی سمجھے جائیں گے۔ تو اب یہ ہر مسلمان کے سوچنے کی بات ہے کہ وہ اس سلسلے میں کیا طرز عمل اختیار کرتا ہے۔

اس شہادت اور گواہی کے بعد اور ان کی جانب سے قرار دادہ محرمات کو رد کر دینے کے بعد اب وہ فہرست دی جاتی ہے کہ فی الواقعہ اللہ نے کن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ یہاں محرمات کے ذکر کے ساتھ ساتھ بعض مثبت احکام کی یاد دہانی بھی کی گئی ہے جس کے مخالف طرز عمل کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ ان محرمات کا آغاز ارتکاب شرک سے ہوتا ہے کیونکہ یہ اسلام کا اصول اولیں ہے اور سب سے پہلے اس کو ذہن نشین کرانا ضروری ہے۔ شرک سے مراد عام ہے۔ شرک فی الاعتقاد اور شرک فی الحکم۔ یہاں شرک سے دونوں قسم کے شرک مراد ہیں۔ اس بنیادی اصول کے بعد تمام اوامر اور نواہی اسی پر مرتب ہوتے ہیں یعنی اسلام قبول کر لے اور پھر سر تسلیم خم کر دے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿١٥١﴾ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ

حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّہٗ ۚ وَ اَوْفُوا الْکَیْلَ وَ الْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُکَلِّفُ نَفْسًا
اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی ۚ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ
اَوْفُوْا ؕ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِهٖ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ
مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِکُمْ
وَصّٰکُمْ بِهٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

"اے نبی" ' ان سے کہو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں : یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو ' اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو ' ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے ' اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ ' خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی ' اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ - یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو - اور مال یتیم کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو ' یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے - اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو ' ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے - اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو - ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم نصیحت قبول کرو - نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے - یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم کج روی سے بچو -

اللہ تعالیٰ نے آیات کے اس حصے میں جو وصیتیں فرمائی ہیں اور جو قوانین بتلائے ہیں مثلاً مویشیوں اور پیداوار کے متعلق اور اوہام جاہلیت اور رسوم جاہلیت کی تردید وغیرہ تو ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوانین و ہدایات اس دین کی اساسی باتوں پر مشتمل ہیں - ان کی وجہ سے انسان کے ضمیر کو توحید کی روشنی اور زندگی ملتی ہے اور صدیوں پر مشتمل تاریخ میں انسانی خاندان کو تقویت ملتی ہے - باہم تکافل اور باہم نصرت کی وجہ سے اجتماعی روابط مضبوط ہوتے ہیں اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جس میں حقوق کی ضمانت ہوتی ہے اور فرائض ادا کئے جاتے ہیں - یہ سب کام اللہ کی ہدایات کے مطابق چلتے ہیں مگر ان کا آغاز عقیدۂ توحید سے ہوتا ہے -

اور جب یہ ہدایات ختم ہوتی ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہی اللہ کا جاری کردہ صراط مستقیم ہے اور اس کے علاوہ جس قدر بھی راستے ہیں وہ ٹیڑھے راستے ہیں یعنی راہ توحید سے ہٹے ہوئے -

غرض ان تین آیات میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ نہایت ہی اہم امور سے متعلق ہیں - یہ امور اس مسئلے کے بعد

ذکر ہوئے جو بظاہر جاہلیت کا جزوی مسئلہ معلوم ہوتا ہے لیکن یہ مسئلہ اس دین کا نہایت ہی اساسی مسئلہ ہے کیونکہ یہ ان اہم وصیتوں کے ساتھ مربوط ہے۔

(قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ (٦: ١٥١)) اے نبی "ان سے کہو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں۔"

آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ اللہ نے کیا حرام کیا ہے؟ تم خود جن بعض چیزوں کو حرام قرار دیتے وہ دراصل حرام نہیں ہیں۔ اس نے تم پر بعض چیزیں حرام قرار دی ہیں اس لئے کہ اسے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے کہ وہی تمہارا رب ہے۔ رب کا مفہوم ہے' قیم' مربی' ہادی اور حاکم۔ لہذا حلال و حرام مقرر کرنا اس کا کام ہے۔ یہ اس کا مقام اور منصب ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اگر اللہ کے سوا کوئی اور حلال و حرام مقرر کرے گا تو وہی رب کہلائے گا۔ فی الحقیقت رب ہوتا ہی وہ ہے جو حلال و حرام مقرر کرے۔

(اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا (٦: ١٥١)) یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو" یہ وہ بنیادی اصول ہے جس پر اسلامی تصور حیات کی پوری عمارت اٹھائی گئی ہے۔ تمام واجبات و فرائض اسی کی جانب لوٹتے ہیں اور اسی سے حقوق و واجبات متعین ہوتے ہیں۔ یہ وہ اصول ہے کہ اس کے تسلیم کرنے کے بعد ہی کسی پر دوسرے احکام اور منہیات فرض ہوتے ہیں۔ فرائض و تکالیف اور اسلامی نظام کی تفصیلات اور اسلامی دستور و قوانین کی پیروی تب عائد ہوتی ہے جب کوئی انسان یا معاشرہ عقیدۂ توحید کو قبول کر کے اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اللہ وحدہ اس کا رب ہے اور وہی الٰہ اور حاکم ہے۔ اس کی الوہیت' اس کے اقتدار اعلیٰ اور اس کی ربوبیت میں وہ کسی کو شریک نہیں سمجھتا۔ وہ اعتراف کر لیتا ہے کہ اللہ ہی اس پوری کائنات کے تمام طبیعی امور میں متصرف ہے۔ عالم اسباب اور نظام قضا و قدر اسی کی مرضی سے چلتا ہے۔ وہ یہ عقیدہ بھی اپنا لیتے ہیں کہ آخرت میں انہوں نے اپنی پوری زندگی کی کارکردگی کا جواب دینا ہے۔ وہ یہ بھی اعتراف کر لیتے ہیں کہ نظام حکومت میں بھی وہ اللہ کے احکام کے پابند ہیں۔ غرض انسانی دل و دماغ کے لئے یہ عقیدہ ایک مکمل تطہیر ہے اور انسانی فکر اور عقلیت کو وہم و گمان کی بیماریوں سے مکمل طور پر صاف کر دیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے ہی کسی معاشرے کو جاہلیت کی آلودگیوں سے پاک کیا جا سکتا ہے اور انسان انسانوں کی غلامی اور بندگی سے رہا ہو سکتا ہے۔

شرک اپنی ہر شکل و صورت کے اعتبار سے حرام ہے اس لئے کہ اس کی وجہ سے انسان ہر حرام چیز میں پڑ سکتا ہے۔ یہ پہلا منکر ہے جس کے خلاف جہاد کا آغاز ہوتا ہے اور اس کے ہر پہلو کا انکار ضروری ہے۔ یہاں تک کہ لوگ اعتراف کر لیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اللہ کے سوا کوئی رب نہیں' اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے' اللہ کے سوا کوئی قانون ساز نہیں ہے اور پھر لوگ اس بات کا اعتراف بھی کر لیں کہ وہ ان معاملات میں صرف اللہ کے سوا کسی طرف رجوع نہ کریں گے۔

توحید اپنے تمام معانی کے ساتھ' اسلام کا وہ اساسی اصول ہے کہ جسے کسی صورت میں بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ نہ اسلام میں توحید کی کمی کو پورا کیا جا سکتا ہے' نہ یہ کمی عبادت سے پر کی جا سکتی ہے' نہ حسن اخلاق سے اور نہ فضائل اعمال سے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں جو وصیتیں کی جا رہی ہیں ان کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے

(اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا (٦ : ١٥١)) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔" ہمیں چاہیے کہ یہاں ایک نظر ان آیات پر ڈالیں جو ان وصیتوں سے پہلے وارد ہوئی ہیں تاکہ ہمیں اس شرک کے تعین میں دشواری نہ ہو' جس سے یہاں منع کیا گیا ہے۔ ان وصیتوں سے پہلے ایک متعین موضوع پر بحث تھی۔ وہ موضوع تھا حق قانون سازی' اقتدار اعلیٰ کا استعمال اور احکام و نواہی کا صدور۔ ایک آیت قبل ہی یہ کہا گیا:

(قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ (٦ : ١٥٠)) "ان سے کہو "لاؤ اپنے وہ گواہ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ ہی نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے۔" پھر اگر وہ شہادت دے دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دینا اور ہرگز ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے' اور جو آخرت کے منکر ہیں اور جو دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں۔"

ہم اس لگاتار یاد دہانی کے اس لئے محتاج ہیں کہ اسلامی تاریخ میں شیاطین نے دین اسلام کی اساسی اصطلاحات کے معانی اور مفاہیم کو بدلنے کی جو جدوجہد کی ہے' اس کے آثار اب ظاہر ہو رہے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں حاکمیت کے مسئلے کو اسلام کے بنیادی عقیدے کے مفہوم سے نکال دیا گیا ہے اور اس کو اسلامی فکر کا شعور اور احساس ہی نہیں رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جو لوگ اسلام کے نہایت ہی مخلص اور پرجوش حامی ہیں وہ ایک پرستش کے شعار' عبادات کے طریقے اور ایک اخلاقی قدر کے قیام اور قوانین کی معمولی خلاف ورزی کے جزوی مسائل پر تو بات کرتے ہیں مگر اصل مسئلہ یعنی اقتدار اعلیٰ اور اس کے نظریاتی مقام پر بات نہیں کرتے۔ وہ منکرات کے خلاف تو مہم چلاتے ہیں لیکن وہ اس عظیم منکر کے خلاف نہیں اٹھتے یعنی یہ کہ زندگی کو عقیدۂ توحید کی اساس پر قائم کرنے کے لئے نہیں اٹھتے' ایسا نظام قائم کرنے کے لئے سعی نہیں کرتے جس میں حاکمیت صرف اللہ کی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ تمام دوسری وصیتوں سے پہلے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو یہ وصیت کی کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور یہ وصیت ایسے سیاق میں کی جا رہی ہے کہ شرک کا مفہوم ان تمام وصیتوں کے اصول کی روشنی میں متعین ہوتا ہے۔

توحید اور نفی شرک وہ اصول ہے جس کی اساس پر ایک انسان علی وجہ البصیرت اپنے رب کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے اور جماعت مسلمہ کے افراد بھی باہم ان اصولوں کی اساس پر جڑ جاتے ہیں جو عقیدۂ توحید اور نفی شرک کے نتیجے میں متعین ہوتے ہیں اور وہ اقدار ان لوگوں کے درمیان قدر مشترک بن جاتی ہیں جو عقیدۂ توحید کے بعد وجود میں آتی ہیں۔

اور یہ اصول و اقدار اس قدر مستحکم ہوتے ہیں کہ جن کو خواہشات نفسانیہ اور جذبات سفلیہ کے طوفان اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے اور نہ ان پر ان اصطلاحات کا اثر ہوتا ہے جو انسان نے اپنی خواہشات اور میلانات کے تحت وضع کر رکھی ہیں۔

(وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (٦ : ١٥١)) اور والدین

کے ساتھ نیک سلوک کرو' اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو' ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے ۔" صدیوں سے یہ خاندانی نظام قائم ہے اور اللہ نے یہ نظام عقیدۂ توحید کی اساس پر قائم کیا ہے۔ اللہ لوگوں پر والدین اور اولاد سے بھی زیادہ رحیم و کریم ہے اس لئے اللہ نے اولاد کو والدین کے بارے میں حسن سلوک کی وصیت فرمائی اور والدین کو ان کی اولاد کے بارے میں وصیت فرمائی۔ اس وصیت کی پشت پر وہ نظریاتی رابطہ ہے جو اللہ کی حاکمیت اور ربوبیت کی صورت میں قائم ہے۔ اللہ نے ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ وہی خالق ہے اور وہی رازق ہے۔ لہٰذا تم والدین کے بارے میں ان کی کبرسنی کے دور میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرو' اور اولاد جب ضعیف و ناتواں ہو تو تم ان کے بارے میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرو اور فقر اور مجبوری سے نہ ڈرو کیونکہ اللہ تعالیٰ سب کا رازق ہے۔

(وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (۶:۱۵۱)) اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ' خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی ۔" اللہ تعالیٰ نے سابقہ فقرے میں وصیت فرمائی کہ خاندانی نظام کو مضبوط بناؤ تو اس کے بعد حکم دیا گیا کہ خاندان اور معاشرے کو پاک و صاف رکھو کیونکہ معاشرہ بھی خاندانوں سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ معاشرے کی اخلاقی تطہیر کا خیال رکھو۔ اسلام معاشرے میں فحاشی کو برداشت نہیں کرتا' چاہے یہ فحاشی ظاہری ہو یا پوشیدہ' لہٰذا اس وصیت اور سابقہ وصیت کے درمیان گہرا ربط ہے۔

یہ حکم اس لئے دیا گیا کہ فحاشی کے کیچڑ میں کوئی پاکیزہ خاندان اور پاکیزہ معاشرہ پروان نہیں چڑھ سکتا۔ فحاشی ظاہری ہو یا خفیہ اور باطنی ہو اس لئے کہ اسلام عفت اور پاکیزگی کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ جو طبقات بھی فحاشی پھیلاتے ہیں ان کا مقصد دراصل یہ ہوتا ہے کہ خاندانی نظام اور معاشرہ کمزور ہو جائیں' ان کی بنیادیں ہل جائیں اور آخر کار وہ معاشرہ دم توڑ دے۔

فواحش کیا ہوتے ہیں؟ ہر وہ بات فواحش میں آتی ہے جو حد سے متجاوز ہو۔ لفظ فحش بعض اوقات خصوصاً صرف زنا پر بھی بولا جاتا ہے۔ اس آیت میں بھی غالب گمان یہ ہے کہ اس لفظ سے زنا مراد ہے۔ کیونکہ یہاں اللہ تعالیٰ ان حرام امور کا ذکر فرما رہے ہیں جن کا ارتکاب ممنوع ہے خواہ کم ہو یا زیادہ' لہٰذا یہاں مراد زنا ہوگا۔ ورنہ قتل نفس بھی فاحشہ ہے اور مال یتیم کھانا بھی فاحشہ ہے۔ اور اللہ کے ساتھ شرک بھی فاحشہ ہے۔ لہٰذا یہاں لفظ فاحشہ سے مراد مخصوص طور پر زنا ہوگا اور زنا کے لئے "فواحش" یعنی جمع کا لفظ اس لئے استعمال ہوا ہے کہ زنا کے ساتھ اور مقدمات اور لوازم بھی لازماً ہوتے ہیں جو سب کے سب فواحش ہیں مثلاً نمائش حسن' بے پردگی' اختلاط' الفاظ و مکالمات' حرکات و اشارات' ہنسی اور مذاق' میک اپ اور لوگوں کو آمادہ کرنا' یہ سب افعال فواحش میں آتے ہیں۔ ان میں سے بعض خفیہ ہیں اور بعض ظاہری ہیں۔ بعض دل میں ہوتے ہیں اور بعض اعضاء سے ہوتے ہیں۔ یہ تمام فواحش کسی بھی معاشرے کے لئے سم قاتل ہوتے ہیں اور کسی سوسائٹی کا اجتماعی وجود ان کے ذریعے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ افراد معاشرہ کے دل گندے ہوتے ہیں اور ان کی ترجیحات حقیر ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کے بعد یہ وصیت ذکر ہوئی۔

زنا کے ساتھ متعلق فواحش چونکہ اپنے اندر جاذبیت رکھتے ہیں' اس لئے حکم دیا گیا کہ ان کے قریب مت جاؤ' تاکہ اس برائی میں مبتلا ہونے کے ذرائع ہی بند ہو جائیں اور دور رہنے کی وجہ سے ان فواحش کی کشش کے اثرات کم ہو

جائیں - اور وہ انسان کی قوت ارادی پر غالب نہ آ جائیں - یہی وجہ ہے کہ اسلام نے یہ بات حرام قرار دی ہے کہ اگر کسی عورت پر ایک دفعہ نظر پڑ جائے تو دوسری بار اسے دیکھنے کی کوشش نہ کی جائے اور مرد و زن کے درمیان اختلاط کو بھی ممنوع کیا گیا اور جاہلانہ آرائش و زیبائش کو ممنوع کیا گیا ہے - یہاں تک کہ عطر لگا کر باہر نکلنے سے بھی منع کیا گیا ہے - اسی طرح تمام ایسی حرکات ہنسی مذاق اور اشارات کو اسلام کے پاک معاشرے میں منع کیا گیا ہے - اسلام لوگوں کو ایسی مشکل صورت حال سے دوچار نہیں کرتا کہ اس میں انہیں اپنے اعصاب کے اوپر کنٹرول نہ رہے اور وہ ترغیبات کا مقابلہ نہ کر سکیں - اسلام ایک ایسا دین ہے جو حدود نافذ کرنے اور سزائیں دینے سے پہلے ہی لوگوں کو بچاتا بھی ہے - اسلام لوگوں کے ضمیر، شعور، حواس اور اعضاء تک کو بچانے کی سعی کرتا ہے اس لئے کہ رب تعالیٰ اپنی مخلوق کی کمزوریوں سے خوب واقف ہے - وہ لطیف و خبیر ہے -

ہم اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو لوگ دوسروں کے لئے عیاشیاں پیدا کرتے ہیں، ان کے سفلی جذبات کو آزاد کرتے ہیں، اور اس مقصد کے لیے تصاویر، فلمیں، افسانے، میلے اور دوسرے تمام ذرائع فراہم کرتے ہیں وہ دین اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کیا ارادے رکھتے ہیں -

(وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ (٦ : ١٥١)) "اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ -" قرآن کریم میں ان تین منکرات کا ذکر بارہا ایک جگہ آیا ہے - یعنی شرک زنا اور قتل نفس کا ذکر بارہا ایک ساتھ کیا گیا ہے اس لئے کہ یہ تمام جرائم دراصل قتل کے جرائم ہیں - پہلا جرم شرک دراصل فطرت کا قتل ہے - دوسرا جرم معاشرے کا قتل ہے، اور تیسرا جرم نفس انسانی کا قتل ہے - اس لئے کہ جو فطرت توحید پر قائم نہیں ہے وہ دراصل مردہ فطرت ہے اور جس سوسائٹی میں فحاشی پھیل گئی ہے وہ سوسائٹی بھی مردہ سوسائٹی ہے اور اس نے آخر کار ہلاک و برباد ہونا ہے - یونانی تہذیب، رومی تہذیب اور فارسی تہذیب کی تباہی اسی بیماری یعنی فحاشی کی بیماری کی وجہ سے وقوع پذیر ہوئی - یہ تاریخی تباہیاں بتاتی ہیں کہ کسی تہذیب کی بربادی اور ہلاکت کی پہلی علامت فحاشی ہوتی ہے - آج مغربی تہذیب کے اندر جس تیزی سے فحاشی پھیلی ہے، ماہرین اب انتظار کر رہے ہیں کہ کب اس پر ہمہ گیر تباہی آتی ہے - اسی طرح وہ معاشرہ جس میں امن و امان نہ ہو وہ بھی لازماً اپنے انجام تک پہنچتا ہے - یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ان جرائم کے لئے سخت سزائیں مقرر کی ہیں کیونکہ اسلام اپنے معاشرے کو ہمہ گیر تباہی سے بچانا چاہتا ہے -

اس سے پہلے یہ بات آ گئی ہے کہ اپنی اولاد کو بھوک و افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو، یہاں مطلق نفس کے قتل کی ممانعت کی گئی ہے - یہاں اشارہ یہ مطلوب ہے کہ ایک فرد کے خلاف بھی اگر جرم قتل کا ارتکاب کیا جائے تو یہ جرم پورے معاشرے کے خلاف جرم تصور ہو گا - دوسری جگہ اس کی تصریح یوں کی گئی ہے -

(أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا (٥ : ٣٢)) جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی

بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخشی۔"

اس لئے کہ ارتکاب قتل کا وقوع زندگی پر ہوتا ہے اور زندگی نفس بشر میں ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس اصول کے تحت نفس انسانی کی بقا کی ضمانت دی ہے تاکہ دارالاسلام میں جماعت مسلمہ کے تمام افراد کو امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع ملے اور اسلامی معاشرے کا ہر فرد بڑی آزادی کے ساتھ ترقی کی جدوجہد میں حصہ لے سکے۔ اور اسے ماسوائے حق کے کسی اور وجہ سے نہ ستایا جائے۔ وہ سچائی جس کی اساس پر کسی کو ستایا جا سکتا ہے وہ اسلامی شریعت میں بیان کر دی گئی ہے اور اس بارے میں کسی تاویل یا اندازے کی اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں اس کی تفصیلات نہیں دی گئیں اس لئے کہ یہ کام مدینہ میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد کیا جانا تھا تاکہ وہاں اسلامی شریعت کے نفاذ کے لئے ایک حکومت بھی موجود ہو۔ اس نکتے کی بڑی اہمیت ہے' اور اس سے اسلامی نظام اور دین اسلام کے عملی مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ اسلامی نظام کی نشوونما اور اس کی حرکیت میں عملیت ایک اہم پہلو ہے کہ ان اساسی اصولوں کی تفصیلات بھی نہیں دی گئیں کیونکہ ابھی ان کے نفاذ کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ یہ اصول و قواعد اور اوامر و نواہی اللہ کی جانب سے ایک وصیت ہے اور اس پر تمہیں عمل کرنا ہے۔

(ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (٦ : ١٥١)) یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔" اس قسم کی تعقیبات قرآن کریم کے ہر حکم' ہر امر و نہی کے بعد آتی ہیں اور یہ قرآن کا خاص اسلوب ہے جس کے ذریعے وہ قانونی امور کو بھی اللہ کی ذات سے وابستہ کر دیتا ہے اور یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ امر و نہی کے صدور اور قانون سازی کا کام صرف اللہ وحدہ کے اختیار میں ہے۔ یوں اسلامی نظام مملکت میں قانون کے لئے بے حد احترام پایا جاتا ہے۔

اس بات میں ایک یہ اشارہ بھی ہے کہ یہی بات قابل فہم ہے۔ اس لئے کہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی حکومت کی اطاعت کی جائے' جیسا کہ اوپر کہا گیا۔ اسلامی تصور یہ ہے کہ اللہ خالق' رازق اور متصرف فی الکون ہے لہٰذا لوگوں کی زندگی میں تصرفات بھی اللہ کے چلنے چاہئیں۔

اس تعقیب اور وصیت سے پہلے جو آیت ہے اس میں پائے جانے والے احکام باہم متناسب ہیں اور بعد کی آنے والی آیت میں پائے جانے والے امور بھی باہم ہم رنگ ہیں اور درمیان میں یہ تبصرہ ہے۔

(وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ (٦ : ١٥٢)) اور یہ کہ مال یتیم کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو' یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے۔" کسی سوسائٹی میں یتیم ایک کمزور شخصیت ہوتی ہے' اس کا حامی اور مربی کوئی نہیں ہوتا اور اس کے سر پر والدین کا سایہ نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی ذمہ داری اسلامی سوسائٹی پر ڈال دی گئی ہے کیونکہ سوشل سیکورٹی اسلامی نظام کی اساس ہے۔ دور جاہلیت میں یتیم ہمیشہ کسمپرسی کی حالت میں ہوتے تھے۔ یتیم کے بارے میں قرآن کریم بار بار ہدایات دیتا ہے اور مختلف پہلوؤں سے اس مسئلے کو لیا گیا ہے۔ اس سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دور جاہلیت میں یتامیٰ کی بے حد حق تلفی ہوا کرتی

تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبری کے لئے بھی ایک یتیم شخص کا انتخاب کیا اور اسے یہ عظیم اعزاز بخشا کہ اسے تمام جہان والوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا پھر فرمایا کہ ان کا خیال اس طرح رکھا جائے کہ ان کے مال کے قریب نہ جاؤ' مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو' یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے۔"

حکم یہ ہے کہ یتیم کے متولی اور گارڈین کو یتیم کے مال میں صرف اتنا تصرف کرنا ہے جو اس کے لئے احسن ہو۔ اس کا فرض ہو گا کہ وہ اسے بچائے اور اسے ترقی دے۔ جب وہ سن رشد تک پہنچ جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے پورا پورا دے اور ترقی یافتہ شکل میں دے۔ سن رشد اس وقت حاصل ہوتا ہے کہ جب یتیم کی جسمانی اور عقلی قوت کمال کو پہنچ جائے' اس طرح کہ وہ مال کو بچا بھی سکے اور اس کی حفاظت بھی کر سکے اور اسے ترقی بھی دے سکے۔ اور وہ جب سوسائٹی میں ایک مختار شخص کی صورت میں آئے تو وہ اس کا ایک صحت مند فرد ہو اور سوسائٹی کے لئے مفید ہو۔

سن رشد اور بلوغ کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلافات ہیں۔ عبدالرحمن ابن زید اور امام مالک کے نزدیک عقلی بلوغ ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک پندرہ سال کی عمر ہے۔ سدی تیس سال کی عمر مقرر کرتے ہیں اور اہل مدینہ بلوغ اور عقلمندی دونوں کے حصول کے بعد سن رشد مانتے ہیں اور کسی عمر کی تحدید نہیں کرتے۔

(وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ لَانُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (٦:١٥٢)) اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو' ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے۔"

یہ حکم تجارتی معاملات کے بارے میں ہے کہ تجارتی معاملات میں حتی المقدور کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔ ان احکام کو اسلامی عقائد و نظریات سے وابستہ کیا گیا ہے حالانکہ یہ محض تجارتی معاملات ہیں۔ یہ اس لئے کہ اسلامی نظام میں تمام معاملات دین و ایمان سے وابستہ ہیں اور ان کے بارے میں جو احکام ہیں وہ منجانب اللہ ہیں۔ اس طرح یہ احکام اللہ اور اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے مسئلہ سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان احکام کو ایک ایسے منظر میں لایا جاتا ہے جس میں اسلامی نظریہ حیات کا ربط زندگی کے تمام معاملات میں عیاں کیا گیا ہے۔

تمام جاہلی نظاموں میں جس میں دور جدید کی جاہلیت بھی شامل ہے' طریقہ یہ رہا ہے کہ عقائد و عبادات سے قانون اور معاملات کو بالکل علیحدہ رکھا جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے حضرت شعیب علیہ السلام کے قصے میں اچھی طرح واضح کیا ہے۔

(قَالُوا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (١١:٨٦)) انہوں نے جواب دیا: اے شعیب کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشا کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟" یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں باہم مالی اور تجارتی معاملات' بیع و شرا کے مسائل اور اسلامی نظریہ حیات کے نظریاتی پہلوؤں کو ایک ساتھ لایا جاتا ہے تاکہ یہ بتایا جا سکے کہ اس دین کا مزاج کیا ہے؟ اور اس میں عقائد و قانون کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ عبادت اور معاملات دونوں میں اللہ کی بندگی ضروری ہے کیونکہ یہ

سب امور دین ہی کا حصہ ہیں اور اس کے اصل الاصول سے مربوط ہیں۔

(وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (٦: ١٥٢)) اور جب بات کہو انصاف کی کہو' خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو۔" سب سے پہلے اسلام قلب مومن کا رابطہ اللہ کے ساتھ قائم کرتا ہے اور اس طرح انسان کو نہایت ہی بلند مقام تک پہنچاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لائے اور ہروقت اس سے ڈرتا رہے۔ اس راستے میں کئی ایسے مقامات آتے ہیں جہاں قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ انسانی کمزوری اثر کر جاتی ہے اور انسان قرابت' رشتہ داری اور قرابت کے حقوق کا لحاظ کر جاتا ہے۔ کیونکہ انسان نہایت ہی کمزور' ضعیف ہے اور دور اندیش نہیں ہے اور رشتہ داری کی قوت اس سے کمزوری کا ارتکاب کراتی ہے۔ رشتہ داری کے ماحول میں وہ پروان چڑھتا ہے۔ اس ماحول میں وہ زندہ رہتا ہے اور جب وہ رشتہ دار کے مقابلے میں شہادت کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اس سے کمزوری کا ارتکاب ہوتا ہے۔ اگر بھائی کے لئے شہادت دے تو مبالغہ ہو گا اور اگر خلاف دے تو کمی کرے گا یا بھائی اور دوسرے شخص کے درمیان فیصلہ کرے تو جانب داری کرے گا۔ اس خطرناک مقام پر اسلام ہی مدد کو آتا ہے۔ وہ انسانی ضمیر کو ہدایت دیتا ہے کہ وہ کلمہ حق کہے اور انصاف کرے۔ اور صرف اللہ وحدہ پر بھروسہ کرے۔ صرف اس سے ڈرے اور بھائی کی دوستی و دشمنی کے معاملے صرف اللہ کی نصرت طلب کرے۔ اللہ سے ڈرے اور یہ نہ کرے کہ رشتہ داری کا حق ادا کرتے ہوئے اللہ کے حقوق کو تلف کر دے۔ اللہ انسان کا خالق ہے اور اس کی شہ رگ سے زیادہ اس کے قریب ہے۔ چنانچہ اللہ یہاں اپنی وصیتوں کے بعد اپنے ساتھ کئے ہوئے عہد کو یاد دلاتے ہیں۔

(وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا (٦: ١٥٢)) "اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔" اللہ کے عہد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سچ کہو اگرچہ اس کی زد تمہارے کسی قرابت دار پر پڑتی ہو۔ اس کے عہد میں سے یہ بھی ہے کہ ناپ اور تول کے پیمانے پورے رکھو۔ اس کے عہد میں سے یہ بھی ہے کہ یتیم کے مال میں اس طرح تصرف کرو کہ وہ اس کے لئے احسن ہو۔ اس کے عہد میں یہ امر بھی داخل ہے کہ بے گناہ جان کا احترام کرو' اور ان سب عہدوں سے بڑا عہد یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ الوہیت اور حاکمیت میں کسی کو شریک نہ کرو' اور یہ عہد عہد اکبر ہے۔ یہی انسانی فطرت کا تقاضا ہے' اس لئے کہ مخلوق کو خالق کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے اور اسے ان نوامیس قدرت کا شعور ہونا چاہیے جو انسان کے اندر اور اس کے اردگرد کائنات میں جاری و ساری ہیں۔ اور آخر میں وہی تبصرہ۔

(ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (٦: ١٥٢)) ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم نصیحت قبول کرو۔" ذکر کا مفہوم غفلت کے بالمقابل ہے۔ لہٰذا یاد رکھنے والا دل غافل دل کے متضاد ہو گا اور ذاکر وہ ہو گا جو اللہ کے عہد کو یاد رکھے اور ان عہود کے بارے میں اللہ کی وصیتوں کا خیال رکھے اور ان کو کسی حالت میں نہ بھولے۔

یہ اصول جن کا آغاز عقیدۂ توحید کے ساتھ ہوا' جس میں اسلامی عقائد اور اسلامی قانون اور اسلام کے اجتماعی نظام کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں اور جن سے پہلے کے سبق میں اللہ کے اقتدار اعلیٰ اور اس کے حق حاکمیت کے مضامین

تھے، جس میں حق قانون سازی نمایاں ہے، یہ سب اصول اللہ کا صراط مستقیم ہیں۔ یہ وہ راستہ ہے جس کے مقابلے میں دوسرے تمام راستے غلط، دشوار گزار ہیں، یہی مستقیم راستہ ہے۔

(وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (٦:١٥٣)) "نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے۔ یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم کج روی سے بچو۔" یہ سبق یہاں ختم ہوتا ہے جس کا آغاز اس آیت سے ہوا تھا:

(اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ اِلَیْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا) کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو حکم تلاش کروں، حالانکہ وہی ہے جس نے تمہاری طرف کتاب مفصل طور پر نازل کر دی ہے۔" اور اس طویل سبق کا خاتمہ اس فقرے سے ہوا۔ اس آغاز اور انجام اور درمیان میں مسئلہ حاکیت الٰہیہ، مسئلہ قانون سازی، پھلوں اور مویشیوں کی حلت و حرمت، ذبیحوں اور نذروں کے مسائل اور دوسرے اساسی اور اصولی مسائل تھے۔ یہ مسائل اس آغاز و انجام کے درمیان بیان ہوئے۔ مقصد یہ بتانا تھا کہ یہ ہے وہ وسیع دائرہ جس کے اندر یہ سب چیزیں آتی ہیں اور ان سب کا تعلق ان عقائد اور نظریات کے ساتھ ہے جو اس سورہ کا اساسی مضمون ہے جس کا اہم نکتہ یہ ہے کہ اللہ حاکم و معبود ہے اور اس معاملے میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔

یہ واحد راستہ ہی اللہ کا راستہ ہے اور اس راہ سے ہم اللہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ لوگ اللہ وحدہ کو رب تسلیم کریں، اسی کی عبادت کریں، اسی کی اطاعت کریں، صرف اسی کو اپنا حاکم و قانون ساز تسلیم کریں اور پوری زندگی اسی کے رنگ میں رنگ دیں۔

یہی راہ ہے جو اللہ کی راہ ہے۔ اس کے سوا جس قدر بھی راستے ہیں وہ اللہ کی راہ سے جدا ہو جاتے ہیں اور وہ راستے کسی انجام تک نہیں پہنچتے۔ اللہ نے تمہیں اسی راستے پر چلنے کی ہدایت فرمائی ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ تقویٰ کا مدار صحیح عقیدے اور صحیح عمل پر ہے۔ یہ تقویٰ ہی ہے جو انسان کو اللہ کے راستے کی طرف لے جاتا ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۷ ایک نظر میں

اس سورہ کے اس آخری حصے میں جو موضوع درس سابق میں تھا وہی ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی طرح آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ کہ اللہ ہی حاکم اور قانون ساز ہے اور یہ بات اسلام کے اساسی عقائد و نظریات کا حصہ ہے۔ یہ سبق بھی اسی موضوع کا حصہ ہے اور اس میں کچھ مزید پہلو سامنے آتے ہیں تاکہ یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

اس سورہ کے آغاز میں دین اسلام کے اساسی نظریات اور عقائد موضوع بحث ہیں اور آخری حصے میں یہ موضوع آیا تھا کہ اسلام کے اساسی نظریات میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اللہ وحدہ حاکم اور قانون ساز ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اللہ کا اقتدار جس کا ظہور قانون سازی کی صورت میں ہوتا ہے اس دین کے اساسی قضایا میں سے ہے اور اسی طریقے اور اسی سطح پر قرآن اسے رکھتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن کریم اس دوسرے مسئلے پر وہی دلائل و براہین پیش کرتا ہے جو اس نے اس سورہ کے حصہ اول میں عقائد و نظریات کے بارے میں پیش کئے۔

- یہاں بھی رسولوں، کتابوں، وحی اور معجزات کی بات ہے۔
- یہاں بھی اس بات کا ذکر ہے کہ اگر معجزات پیش ہوئے اور مان کر نہ دیئے گئے تو پھر اللہ کا عذاب لازماً آئے گا۔
- مناظر قیامت اور حساب و کتاب۔
- یہ کہ رسول اور اس کی قوم کے درمیان کوئی تعلق و رابطہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ قوم رسول کے نظریات کو رد کر کے متفرق ارباب کے تابع ہوگئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اپنے نظریات کو واضح، دوٹوک اور فیصلہ کن انداز میں پیش کریں۔
- یہ کہ دو جہانوں کا رب اور حاکم صرف اللہ ہے اور اس کے سوا کوئی اور رب تلاش نہ کرو۔
- اللہ تمام مخلوقات کا رب اور خالق ہے اور انسانوں کو اس جہان میں اسی رب نے بسایا اور بٹھایا ہے اور وہ اس بات پر قادر ہے کہ موجودہ لوگوں کو بے دخل کر کے کسی اور مخلوق کو یہاں لا بٹھائے۔

یہ ہیں وہ مسائل جو اس سبق میں لیے گئے ہیں جبکہ یہی مسائل سورہ کے آغاز اور اس کے پہلے حصے میں موضوع بحث تھے۔ لیکن وہاں نظریاتی پہلو نمایاں تھا اور یہاں مسئلہ حاکمیت اور قانون سازی عیاں ہے۔ یہ قرآن کریم کا ایک خاص اسلوب اور انداز ہے اور اسے صرف وہی شخص جان سکتا ہے جو قرآن کے اسلوب کلام سے واقف ہو اور اس کی ممارست رکھتا ہو۔

اس سبق کے آغاز میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کی بات ہے اور سابقہ بات کا تکملہ ہے جس میں کہا گیا تھا کہ یہی صراط مستقیم ہے۔ کہ یہی ہمارا سیدھا راستہ ہے 'اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے۔" یہاں کتاب موسیٰ کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ یہ راستہ ایک طویل شاہراہ ہے جس پر انسانی تاریخ کے

تمام انبیاء چلتے رہے ہیں۔ تمام رسولوں کی شریعتیں اسی راہ کی کڑیاں ہیں اور ان میں سے قریب ترین شریعت ' شریعت موسوی ہے۔ اللہ نے حضرت موسیٰ کو بھی ایک کتاب دی تھی جس میں ہر چیز کی تفصیلات تھیں اور یہ شریعت ان کی امت کے لئے ہدایت و رحمت تھی۔ صرف ان لوگوں کے لئے جو خوف آخرت اور قیام قیامت پر یقین رکھتے تھے۔

(ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ (۱۵٤:٦)) پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی تھی ' جو بھلائی کی روش اختیار کرنے والے انسان پر نعمت کی تکمیل اور ہر ضروری چیز کی تفصیل اور سراسر ہدایت اور رحمت تھی۔ شاید کہ لوگ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لے آئیں۔"

پھر دوبارہ کتاب جدید ' قرآن کا ذکر آتا ہے ' جو کتاب موسیٰ کی صف میں ہے اور اس میں بھی نظریہ حیات اور نظام زندگی موجود ہے۔ اس کا اتباع ضروری ہے تاکہ لوگوں کی دنیا اور آخرت دونوں سدھر جائیں۔

(وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۱۵۵:٦)) اور اسی طرح یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے۔ ایک برکت والی کتاب ' پس تم اس کی پیروی کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو ' بعید نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے۔" قرآن کریم عربوں پر بطور حجت نازل ہوا ہے ' تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم پر ایسی کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی ہے جس طرح یہود و نصاریٰ پر کتابیں نازل ہوئی۔ اگر ہم پر کوئی ایسی کتاب نازل ہوتی جس طرح ان پر نازل ہوئی ہے تو ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے .... چنانچہ عربوں پر حجت تمام کرنے کے لئے کہا گیا ' لیجئے یہ ہے کتاب جو تم پر نازل کی گئی۔ اور اس کے بعد بھی اگر وہ اس کتاب کو جھٹلاتے ہیں تو وہ دردناک عذاب کے مستحق ہوں گے۔

(اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا سَنَجْزِى الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ (۱۵۷:٦)) "اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتاب تو ہم سے پہلے دو گروہوں کو دی گئی تھی اور ہم کو کوئی خبر نہیں کہ وہ کیا پڑھتے پڑھاتے تھے۔ اب تم یہ بہانہ بھی نہیں کر سکتے کہ اگر ہم پر کتاب نازل کی گئی ہوتی تو ہم ان سے زیادہ راست رو ثابت ہوتے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن اور ہدایت و رحمت (قرآن کی صورت میں) آگئی ہے۔ اب اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا ' جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے اور ان سے منہ موڑے۔ جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑتے ہیں انہیں اس روگردانی کی پاداش میں ہم بدترین سزا دے کر رہیں گے۔"

یقیناً قرآن کے نزول سے عربوں پر حجت تمام ہو گئی لیکن وہ اب بھی شرک کر رہے ہیں۔ وہ اب بھی خود قانون

بناتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ خدائی شریعت ہے حالانکہ خدا کی کتاب آگئی ہے۔ اس میں وہ باتیں نہیں ہیں جو وہ ازخود گھڑتے ہیں اور ماننے کے بجائے وہ مزید خوارق عادت معجزات طلب کرتے ہیں تاکہ وہ کتاب کی تصدیق کریں اور پھر اس پر عمل کریں۔ لیکن یہ سمجھتے نہیں کہ اگر کوئی خارق عادت معجزہ آجائے یا بعض حصہ اس کا آجائے تو پھر یہ آخری فیصلے کا وقت ہو گا۔

(هَلْ يَنظُرُونَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ (٦:١٥٨)) اب لوگ اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے سامنے فرشتے آکھڑے ہوں یا تمہارا رب خود آجائے' یا تمہارے رب کی بعض صریح نشانیاں نمودار ہو جائیں؟ جس روز تمہارے رب کی بعض مخصوص نشانیاں نمودار ہو جائیں گی پھر کسی ایسے شخص کو اس کا ایمان کچھ فائدہ نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو' یا جس نے اپنے ایمان میں کوئی بھلائی نہ کمائی ہو' اے نبی ؐ ان سے کہہ دو کہ اچھا تم انتظار کرو ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔"

یہاں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین اور ان تمام ادیان کے اندر فرق کر دیتے ہیں جو عقیدۂ توحید اور اس پر مبنی قانونی نظام پر قائم نہیں ہیں اور یہ کہ ان کا معاملہ اللہ کے ہاں ہے اور وہ اپنے نظام عدل اور رحمت کے مطابق ان کا فیصلہ کرے گا۔

(اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (١٥٩) مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (١٦٠)(٦:١٥٩–١٦٠)) "جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے یقیناً ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں ہے' ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے' وہی ان کو بتائے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے جو اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اس کے لئے دس گنا اجر ہے اور جو بدی لے کر آئے گا اس کو اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا جتنا اس نے قصور کیا اور کسی پر ظلم نہ کیا جائے گا۔"

اب اس سبق کی آخری ضرب آتی ہے اور اس پر اس سورہ کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ تسبیح کا آخری دانہ گرا' نہایت ہی تروتازگی' نہایت ہی نرمی کے ساتھ' نہایت حکیمانہ اور نہایت دوٹوک انداز میں۔ اس دین کے انتہائی گہرے حقائق کا خلاصہ پیش کر دیا جاتا ہے یعنی بے قید اور ہمہ جہت توحید' خالص بندگی اور اطاعت' سنجیدگی کے ساتھ آخرت کا اقرار و جوابدہی کا تصور۔ دنیا میں ہر شخص کے لئے اپنے اور صرف اپنے اعمال کی جوابدہی۔ ہر چیز میں نظام ربوبیت کا مشاہدہ' اور یہ کہ یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ اپنی اس سرزمین پر اقتدار کی کنجیاں کس کے حوالے کرتا ہے۔ اللہ کے اس اختیار

میں اس کے ساتھ نہ کوئی شریک ہے اور نہ ہی اس سے کوئی باز پرس کرنے کا مجاز ہے۔ اس آخری حصے میں مقام الوہیت کو تفصیل سے واضح کیا جاتا ہے۔ نہایت ہی مخلص 'پاک و صاف دل یعنی قلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ربانی تجلیات پھوٹتی ہیں اور انداز تعبیر قرآنی ہے جو کسی بھی مفہوم کی تصویر کشی میں لاثانی ہے۔

(قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (١٦١) قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (١٦٢) لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (١٦٣) قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (١٦٤) وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (١٦٥) (٦: ١٦١ تا ١٦٥)) "اے نبی ؐ! کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے' بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں' ابراہیم ؑ کا طریقہ جسے یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو میری نماز' میرے تمام مراسم عبودیت' میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔ کہو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے؟ ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے' کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا' پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ اس وقت وہ تمہارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلہ میں زیادہ بلند درجے دیئے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے' اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔"

---ooo---

درس نمبر ا ۷ تشریح آیات

۱۵۴--- تا --- ۱۶۵

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ﴿۱۵۴﴾

"پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی تھی جو بھلائی کی روش اختیار کرنے والے انسان پر نعمت کی تکمیل اور ہر ضروری چیز کی تفصیل اور سراسر ہدایت و رحمت تھی ۔ (اور اس لئے بنی اسرائیل کو دی گئی تھی کہ) شاید لوگ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لائیں ۔"

یہ کلام لفظ ثم کے ذریعہ کلام ماقبل پر عطف ہے ۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ پہلے یہ آیت آئی تھی ۔

(قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا (۶:۱۵۱)) جہاں یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ تمہارا حرام کردہ حرام نہیں بلکہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام کیا ۔ پھر کہا (وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا (۶:۱۵۳)) کہ یہی میرا سیدھا راستہ اور دین ہے ۔ اس جملے کا عطف پہلے پر ہوا تھا ۔ یعنی (اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ) پر ۔ اس کے بعد یہ آیت آئی (ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ (۶:۱۵۴)) جس کا عطف مذکورہ بالا دونوں جملوں پر ہوا ۔ اس طرح یہ پورا کلام مسلسل ایک دوسرے سے مربوط ہے ۔ (تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ (۶:۱۵۴)) کا مفہوم یہ ہے 'جیسا کہ ابن جریر نے لکھا ہے "پھر ہم نے موسیٰ کو تورات دی اور یہ ان پر ہماری جانب سے تکمیل نعمت تھی ۔ ہماری جانب سے ان کے لئے اعزاز و شرف تھا اس وجہ سے کہ انہوں نے احسان کا رویہ اختیار کیا اور اپنے رب کی اطاعت کی ۔ رب کی جانب سے جو فرائض بھی عائد کئے گئے ہیں اس پر وہ عمل پیرا ہوئے اور اس کتاب میں وہ تمام امور درج ہیں جن کی حضرت موسیٰ کی قوم کو ضرورت تھی ۔

(وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۶:۱۵۴)) "قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد حلال و حرام ہیں ۔ (وَهُدًى وَّرَحْمَةً ۶:۱۵۴)) کے معنی یہ ہیں کہ ان کی قوم ہدایت پائے اور آخرت کی جوابدہی پر ایمان لے آئے اور اس طرح اللہ کی رحمت کی مستحق ہو کر اللہ کے عذاب سے بچ جائے ۔

یہ تھے مقاصد جن کے لئے ہم نے حضرت موسیٰ کو کتاب دی تھی 'انہی مقاصد کی خاطر اللہ نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم بھی ہدایت پاؤ اور پھر رحمت کے مستحق قرار پاؤ۔

وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾

"اور اسی طرح یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے۔ایک برکت والی کتاب۔پس تم اس کی پیروی کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو 'بعید نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے۔"

بے شک یہ ایک مبارک کتاب ہے اور اس کی تشریح ہم نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس آیت کی تفسیر میں کر دی ہے جہاں یہ لفظ پہلے آیا تھا:

(وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ

(٦: ٩٢)) "یہ کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے' بڑی خیر و برکت والی ہے'اس چیز کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آئی تھی اور اس لئے نازل کی گئی ہے کہ اس کے ذریعے سے تم بستیوں کے اس مرکز اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو متنبہ کرو' جو لوگ آخرت کو مانتے ہیں' وہ اس کتاب کو مانتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔" یہاں لفظ مبارک اسلامی نظریہ حیات اور اس کی شمولیت اور ہمہ گیری کی بحث کے ضمن میں آیا ہے' یعنی یہ کتاب ایک شرعی نظام پر مشتمل ہے۔ حکم یہ دیا جا رہا ہے کہ تم اس شرعی نظام کی اطاعت کرو اور تم پر اللہ کی رحمت صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ تم اس کتاب کا اتباع کرو 'کیونکہ یہاں کلام شرعی نظام کے بارے میں ہے جبکہ سورہ کے آغاز میں بات اسلامی عقائد و نظریات کی تھی۔

یعنی اب تمہارے لئے کوئی وجہ معذرت باقی نہیں ہے اور نہ کوئی حجت باقی ہے۔یہ کتاب نازل ہو گئی اور اس نے تمام دلائل اور حجتوں کو منسوخ و باطل کر دیا ہے۔ اس کتاب میں زندگی کے تمام امور کی تفصیلات موجود ہیں۔ ر گی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں اس میں ہدایات موجود نہ ہوں کہ تم خود اپنے لئے قانون بنانے کے لئے محتاج رہ جاؤ۔

اَنْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ

هُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ؕ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ۝١٥٧

"اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتاب تو ہم سے پہلے کے دو گروہوں کو دی گئی تھی' اور ہم کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کیا پڑھتے پڑھاتے تھے۔ اور اب تم یہ بہانہ بھی نہیں کر سکتے کہ اگر ہم پر کتاب نازل کی گئی ہوتی تو ہم ان سے زیادہ راست رو ثابت ہوتے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن اور ہدایت اور رحمت آگئی ہے' اب اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے اور ان سے منہ موڑے۔ جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑتے ہیں انہیں اس روگردانی کی پاداش میں ہم بدترین سزا دے کر رہیں گے۔"

اللہ تعالیٰ کی اسکیم یہ تھی کہ ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان میں پیغام دے کر بھیجا گیا اور جب آخری رسالت دنیا میں آئی تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اقوام عالم کی طرف بھیجا گیا۔ لہٰذا حضور ؐ تمام انسانوں کے لئے آخری رسول ہیں' کیونکہ ان کو تمام انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا ہے۔

عربوں پر اللہ نے حجت اس طرح تمام کر دی کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اپنی قوموں کی طرف بھیجے گئے اور عرب کہتے تھے کہ ہم ان کی کتابوں کو نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ہم عالم نہ تھے' نہ ہم تک اس دعوت کو پہنچانے کا کوئی اہتمام کیا گیا۔ اگر ہمارے پاس ہماری زبان میں کوئی کتاب آئی ہوتی تو ہم ضرور ایمان لاتے اور ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ چنانچہ ان کے پاس یہ کتاب آگئی اور رسول بھی آگئے' بلکہ یہ رسول تمام جہان والوں کے لئے آگئے۔ اس رسول کو ایسی کتاب دی گئی جو خود اپنی سچائی کی دلیل ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ پھر اس کتاب میں جو حقائق بیان ہوئے ان میں کوئی التباس یا پیچیدگی نہیں ہے۔ لوگ جس گمراہی میں ڈوبے ہوئے ہیں ان کے لئے چراغ روشن ہے اور جن مصیبتوں میں وہ مبتلا ہیں ان کے مقابلے میں رحمت ہے' دنیا کے لئے بھی اور آخرت کے لئے بھی۔

اگر صورت حال یہ ہے تو پھر اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو ایسی کتاب کی آیات کی تکذیب کرتا ہو یا ان سے منہ موڑتا ہو حالانکہ یہ کتاب صحیح راہ' اصلاح حال اور دنیا و آخرت کی فلاح کی طرف بلاتی ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو اور عوام الناس کو اس کتاب کی برکتوں سے محروم کرتا ہے' اس سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے۔ وہی شخص ظالم ہے جو جاہلی تصورات اور خلاف اسلام قانون بنا کر اس زمین پر فساد پھیلاتا ہے۔ جو لوگ اس کتاب سے روگردانی کرتے ہیں درحقیقت ان کے مزاج میں فساد پوشیدہ ہے جو انہیں اس چشمہ خیر سے دور رکھتا ہے۔ مثلاً اونٹ کے پاؤں میں جب نقص ہو یا بیماری ہو تو وہ ایک طرف جھکتا ہے اور سیدھا نہیں چلتا۔ (صَدَفَ کا یہی مفہوم ہے) یعنی یہ لوگ سچائی سے ایک طرف چلے جاتے ہیں جس طرح ایک بیمار اونٹ ایک طرف جھکا ہوا ہوتا ہے اور سیدھا نہیں چل سکتا۔ اپنے اس میلان کی وجہ سے وہ برے عذاب کے مستحق ہوں گے۔

(سَنَجْزِی الَّذِیْنَ یَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰیٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا یَصْدِفُوْنَ (٦ : ١٥٧))
"جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑتے ہیں' انہیں اس روگردانی کی پاداش میں ہم بدترین سزا دے کر رہیں گے۔"
قرآنی انداز بیان کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ عربی زبان کے ایک ایک لفظ کو حسی مفہوم سے بلند کر کے معنوی مدلول کے لئے استعمال کرتا ہے' لیکن یہ استعمال معنوی مفہوم پر اس طرح منطبق ہوتا ہے کہ اصل حسی مفہوم بھی اپنی جگہ درست نظر آتا ہے۔ اسی طرح (یَصْدِفُوْنَ) کا استعمال ہوا ہے۔ (صَدَفَ) کے معنی یہ ہیں کہ اونٹ اپنے پاؤں کی بیماری کی وجہ سے ایک طرف جھک کر چلے۔ اس کی دوسری مثال ہے (اَلصَّعَرْ) صعر عربی زبان میں ایک ایسی بیماری کو کہا جاتا ہے جس میں اونٹ کا منہ ایک طرف ٹیڑھا ہو جاتا ہے اور گردن سیدھی نہیں ہو سکتی۔ یہ بیماری انسانوں کو بھی لاحق ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اسے بطور تکبر منہ ٹیڑھا کرنے کے لئے استعمال کیا (وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ (۳۱: ۱۸)) منہ کو ٹیڑھا نہ کرو' تکبر نہ کرو' اس کی تیسری مثال خبط کی ہے۔ خبط کے معنی ہیں کسی جانور کا زہریلی گھاس کھا کر پھول جانا۔ خطبت النافۃ اس وقت بولتے ہیں جب اونٹنی زہریلی گھاس چر کر پھول جائے۔ قرآن نے یہ لفظ بے مقصد اور بغیر ایمان کے اعمال کے لئے استعمال کیا ہے۔ جس میں بظاہر اعمال بڑے نظر آئیں۔ اس قسم کے استعمال کی بے شمار مثالیں قرآن میں ہیں۔

اب بات ذرا آگے بڑھتی ہے اور اس کتاب کے آجانے کے بعد اب یہ لوگ مزید خوارق عادت واقعات اور معجزات طلب کرتے ہیں تاکہ وہ اسے تسلیم کر لیں۔ اس قسم کی تہدید سورہ کے آغاز میں بھی تھی جہاں اسلامی نظریہ توحید اور عقائد کو تسلیم نہ کرنے پر تہدید دی گئی تھی اور یہاں یہ تہدید اسلامی نظام حیات اور اسلامی شریعت کو تسلیم نہ کرنے کی مناسبت سے دوبارہ دہرائی گئی ہے۔ ابتداء میں یہ کہا گیا تھا:

(وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ مَلَكٌ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِیَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا یُنْظَرُوْنَ (٦ : ٨)) "کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ اگر کہیں ہم نے فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ پھر انہیں کوئی مہلت نہ دی جاتی۔ یہاں اسی مضمون کو دہرایا گیا:

هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِیَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ یَاْتِیَ رَبُّكَ اَوْ یَاْتِیَ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ ؕ یَوْمَ یَاْتِیْ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِیْٓ اِیْمَانِهَا خَیْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

"کیا اب لوگ اس کے منتظر ہیں کہ ان کے سامنے فرشتے آکھڑے ہوں' یا تمہارا رب خود آجائے' یا تمہارے رب کی بعض صریح نشانیاں نمودار ہو جائیں؟ جس روز تمہارے رب کی بعض مخصوص نشانیاں نمودار ہو جائیں گی پھر کسی ایسے

شخص کو اس کا ایمان کچھ فائدہ نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو یا جس نے اپنے ایمان میں کوئی بھلائی نہ کمائی ہو۔ اے نبی ؐ ان سے کہہ دو کہ اچھا' تم انتظار کرو' ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔"

یہ ایک دو ٹوک اور واضح تہدید ہے' کیونکہ یہ اللہ کی ناقابل تبدیل سنت ہے کہ جب کوئی معجزہ آتا ہے اور لوگ پھر بھی تکذیب کرتے ہیں تو انہیں ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جن خوارق عادت واقعات کا مطالبہ کرتے ہیں اگر ان میں سے کوئی واقعہ لایا جاتا تو ان کا فیصلہ کب کا ہو چکا ہوتا کیونکہ جب اس قسم کا کوئی معجزہ آتا ہے تو مدت عمل اور مہلت ختم ہو جاتی ہے اور پھر ایمان و عمل مفید نہیں ہوتے۔ جو لوگ پہلے سے مومن اور اسلامی نظام پر عمل پیرا نہ تھے ان کے لئے پھر کوئی وقت نہیں ہوتا۔ قرآن کریم میں ایمان کے ساتھ عمل کا ذکر ہمیشہ کیا جاتا ہے' کیونکہ اسلامی پیمانے کے مطابق وہی ایمان مقبول ہے جو عمل کے ساتھ ہو۔ متعدد روایات میں آتا ہے کہ اس آیت (يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ (٦: ١٥٨)) سے علامات قیامت مراد ہیں کیونکہ علامات قیامت آنے کے بعد پھر ایمان و عمل مفید نہیں رہتے اور بعض روایات میں اشراط الساعۃ کو گنوایا بھی گیا ہے۔ لیکن اس آیت کی تفسیر اس مفہوم میں زیادہ بہتر ہے کہ اس سے مراد اس دنیا میں اللہ کی سنت جاریہ ہے۔ اس کی مثال اسی سورہ کے آغاز میں موجود ہے۔

(وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ (٦: ٨)) "کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ اگر کہیں ہم نے فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ پھر انہیں کوئی مہلت نہ دی جاتی۔" یہ بات ذہن میں رہے کہ آغاز سورہ میں یہی باتیں ایمان لانے اور اسلامی نظریات قبول کرنے کے موضوع پر کہی گئی تھیں اور یہاں یہی باتیں اسلامی نظام کے نفاذ اور شریعت کے اجراء کے موضوع پر کہی جا رہی ہیں۔ یہ نہایت ہی اہم اور یاد رکھنے کے قابل بات ہے تاکہ اسلامی شریعت اور اللہ کی حاکمیت کے قیام کی حقیقت ذہن میں رہے۔ جس طرح آغاز سورہ کی یہ بات سنت جاریہ پر محمول ہے' اسی طرح یہاں بھی اس کی تاویل اشراط قیامت کے مقابلے میں سنت جاریہ کے ساتھ مناسب ہے۔ یہ مناسب تاویل و تفسیر ہوگی اور یہاں اسے قیامت پر محمول کرنے کی ضرورت نہ ہوگی جس کے وقوع کا علم عالم الغیب کو ہے۔

---ooo---

اب بات کا رخ رسول اللہ کی طرف مڑ جاتا ہے کہ آپ کی شریعت اور آپ کی ملت دنیا میں تمام قائم ملتوں سے علیحدہ ہے۔ تمام فرقے اور مذاہب جن میں مشرکین مکہ کا مذہب بھی شامل ہے' سب باطل ہیں اور آپ کے دین و شریعت سے متضاد ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿١٥٩﴾

"جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے یقیناً ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں ' ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے ' وہی ان کو بتائے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے ۔"

یہاں آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین ' آپ کی شریعت اور نظام حیات کے بارے میں یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ دنیا میں قائم تمام ادیان ' تمام نظام ہائے قانونی کا آپ کے دین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے ۔ نہ آپ کا تعلق مشرکین عرب سے ہے جنہیں اوہام جاہلیت ' جاہلی اعتقادات اور عادات و رسومات نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور وہ باہم جنگ و جدال میں مصروف ہیں 'گروہ ' فرقے اور شاخ در شاخ بٹے ہوئے ہیں ۔ نہ آپ کے دین و نظام کا تعلق اہل کتاب اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ ہے جن کو مذہبی اختلافات نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور ان کے اندر کئی کئی فرقے اور گروہ بن گئے ہیں اور نہ آپ کا تعلق آئندہ آنے والے فرقوں اور مسلکوں سے ہو گا جو قیامت تک وجود میں آتے رہیں گے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان فرق و مذاہب سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ آپ کا دین ' دین اسلام ہے اور آپ کی شریعت وہ ہے جو اس کتاب میں ہے ۔ اور آپ کا لایا ہوا نظام ایک منفرد نظام ہے جو سب سے جدا ہے ۔ اس دین کے تصورات اور اعتقادات دوسرے ادیان کے ساتھ خلط ملط نہیں ہو سکتے ۔ نہ آپ کی شریعت دوسرے قانونی نظاموں اور رسومات کے ساتھ خلط ملط ہو سکتی ہے ۔ کسی صورت حالات اور کسی نظام قانون پر بیک وقت اسلامی اور غیر اسلامی کا اطلاق نہیں ہو سکتا ۔ اسلام فقط اسلام ہے اور اسلامی شریعت ہی اصل شریعت ہے ۔ اسلام کا اپنا سیاسی ' اجتماعی ' اقتصادی نظام ہی اسلامی نظام ہے ۔ اور قیامت تک رسول خدا اور ان کے لائے ہوئے نظام زندگی کا کوئی تعلق دوسرے لوگوں اور نظاموں سے نہیں ہو سکتا ۔

ان تمام ادیان اور تصورات کو جب کسی مسلم سے واسطہ پڑتا ہے تو اس کا پہلا ردعمل مکمل انکار اور جدائی اور قطع تعلق کا ہونا چاہئے ۔ اسی طرح وہ تمام اجتماعی و سیاسی نظام جن میں اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت بالفاظ دیگر الوہیت و ربوبیت اللہ کی نہیں ہے ' ایک مسلمان کا پہلا فرض یہ ہے کہ سابقہ پیش آتے ہی انہیں رد کر دے اور ان سے اپنی برأت کا اعلان کر دے ۔ نہ اسے ان نظاموں اور اسلام کے درمیان قدر مشترک ڈھونڈنا چاہئے اور نہ ان کے بارے میں موافقت اور مخالفت کی بحث میں شریک ہونا چاہئے ۔

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے اور جن لوگوں نے دین اسلام کو قبول نہیں کیا اور اسے اپنی زندگیوں پر جاری نہیں کیا ' ان لوگوں کے ساتھ رسول اللہ کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔

اللہ کے نزدیک دین اسلام ایک سیاسی قانونی نظام ہے اور جو لوگ اسے نہیں اپناتے ان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ یہی حقیقت ہے اور اس پر کسی بحث و مباحثے کی گنجائش نہیں ہے اور نہ کسی قیل و قال کی ضرورت ہے ۔

جن لوگوں نے دوسرے نظامہائے زندگی کو عمداً اپنا رکھا ہے ان کا بھی رسول خدا سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ان کے بارے میں یہ فیصلہ اللہ نے کیا ہے اور قیامت میں بھی ان کے بارے میں فیصلہ اللہ کرے گا اور اللہ ہی ان سے حساب لینے والا ہے ' ان تمام امور کا جو وہ کرتے ہیں ۔

(اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۶ : ۱۵۹)) "ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے وہی انہیں بتائے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے۔" ایسے لوگوں کے حساب و کتاب کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے حساب و کتاب میں اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ بندوں سے حساب لیتے وقت وہ رحیم و کریم ہو گا۔ اس لئے جو شخص مومن ہے اور وہ کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اسے دس گناہ اجر ملے گا۔ یاد رہے کہ اچھے کام کے لئے ایمان شرط ہے کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی کام اچھا نہیں ہو سکتا' ہاں اگر ایمان ہو تو اچھے کام کا بدلہ دس گنا ملے گا اور اگر برائی کی ہے تو صرف اس کے برابر کا بدلہ ہو گا۔ اللہ کسی پر کوئی ظلم نہیں کرتا۔

(مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۶ : ۱۶۰)) "جو اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اس کے لئے دس گنا اجر ہے' اور جو بدی لے کر آئے گا اس کو اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا جتنا اس نے قصور کیا ہے اور کسی پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ اس سورہ کے خاتمے اور اسلام کے نظریہ حاکمیت اور قانون سازی پر اس طویل بحث کے خاتمے پر نہایت ہی تر و تازہ عبارت' نہایت ہی نرم اور حسین الفاظ میں' نہایت ہی خوشگوار آواز میں' لیکن نہایت ہی دو ٹوک اور فیصلہ کن انداز میں آتی ہے۔ بات کو اس طرح ختم کیا جاتا ہے کہ یہ مضمون دل کی گہرائیوں تک اتر جاتا ہے۔ ہر بات کو لفظ (قُلْ، قُلْ) اور (قُلْ) سے دہرایا جاتا ہے اور ہمہ جہت نظریہ توحید ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ رستے اور ملت کی وحدت' سمت اور حرکت کی وحدت' الہ اور رب کی وحدت' بندگی اور اطاعت کی وحدت' پوری کائنات اور اس کے اندر جاری و ساری نوامیس قدرت کی وحدت اور ان کے اندر پائے جانے والے عناصر ترکیبی کی وحدت۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۭ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ

فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (١٦٤) وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ
الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۗ
٢٠ ع ١١ ٧ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ (١٦٥)

"جو اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اس کے لئے دس گنا اجر ہے' اور جو بدی لے کر آئے گا اس کو اتنا ہی بدلا دیا جائے گا جتنا اس نے قصور کیا ہے اور کسی پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ اے نبی ؐ 'کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے' بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں' ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ جسے یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو میری نماز' میرے تمام مراسم عبودیت' میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔ کہو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے؟ ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے' کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا' پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ اس وقت وہ تمہارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیئے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے' اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔"

یہ تعقیب اور خاتمہ کلام اس سورہ کے شروع کے مضامین کو مدنظر رکھتے ہوئے' ایک نہایت ہی خوبصورت زمزمہ ہے' نہایت موزوں اور خیرہ کن۔ اس زمزمے کے ساتھ ذبیحوں اور نذر و نیاز' پھلوں اور فصلوں سے نیاز' اور اس سلسلے میں جاہلیت کے اوہام و رسومات اور پھر یہ دعوے کہ یہ شریعت من جانب اللہ ہے' کا موضوع یہاں اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ یہ تعقیب اور آخری زمزمہ اس مضمون میں کیا اضافہ کرتا ہے؟ میں سمجھتا ہوں ان موضوعات پر ہم نے جو بات کی ہے اس کے بعد اس پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (٦ : ١٦١)) "اے نبی ؐ 'کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے' بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں' ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ جسے یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔" یہ سپاس گزاری پر مشتمل اعلان ہے' جس سے یقین محکم اور بھرپور بھروسے کا اظہار ہوتا ہے۔ اس میں عبارت کی لفظی تعبیر اور اس کے حقیقی مفہوم کو سمو دیا گیا ہے۔ اس سے رب کے ساتھ ہدایت کا ربط' ربوبیت کا تعلق اور اس کی جانب سے مسلسل نگہبانی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس میں اس بات کا شکر ادا کیا گیا ہے کہ اس نے ہمیں صراط مستقیم کی طرف

ہدایت بخشی' جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے۔ وہ دین قیم ہے اور یہ دین ہماری قدیم میراث بھی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے یہی دین اسلام ہے' حضرت ابراہیم اس امت کے ابو الاباء ہیں اور اس وقت سے امت مسلمہ مبارک امت ہے۔ اس میں دو ٹوک اعلان ہے کہ حضرت ابراہیم مشرکین میں سے نہ تھے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱۶۲) لَا شَرِیْكَ لَہٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (۱۶۳) (۶: ۱۶۲-۱۶۳)) "کہو میری نماز' میرے تمام مراسم عبودیت' میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔" یہ توحید کا نغمہ ہے۔ مطلق توحید اور ہمہ گیر بندگی کا اظہار جس میں نماز' اعتکاف' زندگی اور موت سب امور اللہ کے لئے مختص کر دیئے گئے ہیں جو رب العالمین ہے۔ جو سنبھالنے والا وحدہ متصرف اور نگہبان ہے۔ مربی اور عالمین کا حاکم اور رب ہے۔ اس میں مکمل اسلام کا اعلان ہے نفس زندگی کے تمام امور بلکہ موت تک میں' ضمیر میں اور عمل میں سب میں مکمل اسلام۔ (وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ) میں یہ کہا گیا کہ یہ مکمل اسلام امر الٰہی ہے' محض رضاکارانہ فعل نہیں ہے۔ اس لئے سب سے پہلے مسلم حضور اکرم ؐ ہیں۔

(قُلْ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّھُوَ رَبُّ کُلِّ شَیْءٍ وَلَا تَکْسِبُ کُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْھَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمْ مَّرْجِعُکُمْ فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ فِیْہِ تَخْتَلِفُوْنَ

(۶: ۱۶۴)) "کہو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے؟ ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے' کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا' پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ اس وقت وہ تمہارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔" یہ ایک لفظ ہے جو پوری کائنات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ زمین و آسمان اور مافیہا۔ وہ تمام مخلوق اس میں آتی ہے جو معلوم ہے یا نامعلوم ہے۔ ہر واقعہ اور ہر حادثہ اس میں آتا ہے جو ظاہری ہو یا باطنی۔ یہ سب اللہ کی ربوبیت کے سائے میں ہیں۔ اور یہ عظیم کائنات اللہ کی ربوبیت کے دائرے میں ہے۔ اس پر اللہ کی حاکمیت حاوی ہے اور یہ اس کی مطیع فرمان ہے۔ عقائد میں' عبادت میں اور قانونی نظام میں۔ (وَّھُوَ رَبُّ کُلِّ شَیْءٍ ذرا انداز کلام ملاحظہ' استفہام انکاری۔ کیا میں اللہ کے سوا کسی اور رب کو تلاش کروں؟ (وَّھُوَ رَبُّ کُلِّ شَیْءٍ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ میں غیر اللہ کو رب تسلیم کروں' وہ میرا حاکم ہو' وہ میرے امور میں متصرف ہو' وہ مجھ پر نگہبان ہو' وہ میرا مصلح اور راہنما ہو' حالانکہ میری نیت اور عمل کے بارے میں مجھ سے باز پرس صرف اللہ کرے گا' صرف وہی ہے جو حساب لے گا' اطاعت کا اور معصیت کا۔ پس یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ میں غیر اللہ کو رب تسلیم کروں جبکہ یہ پوری کائنات اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے اور میں اور تم سب اس کے نظام ربوبیت کا حصہ ہیں۔

میں غیر اللہ کو کس طرح رب بنا سکتا ہوں' کیونکہ آخرت میں جب ہر شخص کو اس کے کئے ہوئے جرائم کی سزا ملے گی

تو یہ غیر کیا' بچے گا' وہاں تو ہر شخص اپنے کیے کا خود ذمہ دار ہو گا اور کوئی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھا سکے گا۔

میں غیراللہ کو رب کس طرح بنا سکتا ہوں' انہی میں انسانوں کو تو اللہ نے لا کر بسایا ہے اور اس میں ان کی تنظیم کر کر کے کسی کو بلند رتبے دیئے ہیں اور کسی کو ماتحت بنایا ہے۔ کسی کو عقل مند اور کسی کو نادان' کسی کو توانا اور کسی کو ناتواں' کسی کو مالدار اور کسی کو غریب تاکہ سب کی آزمائش ہو' کسی غیر کو کس طرح رب بناؤں جب غفور و رحیم تو صرف اللہ رب العالمین ہے۔

(وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٦: ١٦٥))

"وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیئے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے' اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔" کیا میں غیراللہ کو رب بناؤں اور اس کی شریعت کو اپنے لئے شریعت بناؤں اور اس کے امر کو امر سمجھوں' اس کے حکم کو حکم مانوں یہ سب دلائل میرے سامنے موجود ہیں' سب شواہد موجود ہیں اور یہ سب دلائل بتلاتے ہیں کہ ہمیں صرف اللہ وحدہ کو رب بنانا چاہئے۔

یہ توحید کا نغمہ ہے' نہایت نرم اور خوشگوار۔ اس نغمے کے اندر ایمان کی حقیقت اور اس کے مظاہر و مشاہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کی اسکرین پر صاف صاف نظر آتے ہیں۔ اسے ایسے انداز اور ایسے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جو قرآن کا واضح اعجاز ہے اور منفرد انداز بیان۔

شعور کی تاروں پر یہ آخری ضرب ہے جس کا مقصد اللہ کی حاکمیت اور اس کے قانونی نظام کی اطاعت کا اعلان ہے بعینہ اس طرح ہے جس طرح سورہ کے آغاز میں' اللہ کی حاکمیت کے بارے میں نظریاتی اظہار کے وقت کیا گیا تھا۔ سورہ کے آغاز میں سے اس آیت اور اس جیسی دوسری آیات کو ذرا دوبارہ ملاحظہ فرمائیں۔

(قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (١٤) قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (١٥) مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ (١٦) (٦: ١٤ تا ١٦))

"کہو' اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنا لوں' اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا مالک ہے اور جو روزی دیتا ہے' روزی لیتا نہیں ہے۔ کہو مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سر تسلیم خم کروں (اور یہ کہ) تو بہرحال مشرکوں میں شامل نہ ہو۔ کہو' اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے دن سزا بھگتنی پڑے گی۔ اس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے

بڑا کرم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے۔"

---ooo---

اب اس بارے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس سورہ کے آغاز میں جن امور کا تذکرہ ہوا تھا اسے اختتام پر دوبارہ دہرایا گیا تھا۔ابتداء کے معانی اور اختتام کے معانی ایک جیسے ہیں' ابتداء میں ان معانی اور حقائق کے نظریاتی پہلو کو لیا گیا تھا اور اختتام پر ان کو عملی اور نظام حیات کی شکل میں لیا گیا ہے۔ دونوں جگہ اس دین کی ایک ہی حقیقت کے دو پہلوؤں کو لیا گیا ہے۔

اب یہ سورہ ختم ہو گئی ہے' ذرا پیچھے مڑ کر نظر ڈالئے' ہم نے ایک طویل ذہنی سفر کیا' معانی کے وسیع صحراؤں اور دریاؤں کو عبور کیا' طویل اور گہری وادیوں کا سفر کیا۔اس سورہ کا کچھ حصہ سابقہ پارے میں تھا اور کچھ حصہ زیر نظر پارے میں آیا۔معانی و حقائق کا یہ کس قدر عظیم سفر تھا۔اگر اس سورہ کے حجم کو دیکھا جائے تو یہ گنے چنے صفحات ہی ہیں۔محدود آیات و عبارات ہیں۔اگر یہ انسانی کلام ہوتا تو وہ ان لامحدود حقائق کو اس قدر مختصر سورہ میں ادا نہ کر سکتا۔حقائق' مشاہدات' ہدایات واشارات کا ایک عظیم ذخیرہ ہے جو ان آیات میں سمو دیا گیا ہے۔اور کلام کا انداز نہایت ہی معجز اور مترنم ہے اور تعبیر نہایت ہی مختصر اور بے مثال۔

اس سورہ کے مضامین کی دنیا میں ہم نے جو سفر کیا یہ نہایت ہی طویل' وسیع اور نشیب و فراز پر مشتمل تھا۔اس میں اس کائنات کے حقائق سے بھی ہم دوچار ہوئے اور اسلامی تصور حیات کے حدود کی پیمائش بھی ہم نے کی۔اس سفر میں ہم حقیقت الوہیت' اس کی خوبصورتی اور اس کے جلال و جمال سے بھی آگاہ ہوئے۔اس سفر میں ہم نے اس کائنات اور اس کے اندر پائے جانے والے حقائق' اس کے اندر زندگی اور اس کی بوقلمونیوں کا بھی مشاہدہ کیا اور اس کے پس منظر میں جو غیبی حقائق موجود ہیں یا آنے والے ہیں ان کے مناظر بھی ہم نے دیکھے۔اللہ کے نظام مشیت کے بارے میں بھی ہمیں علم ہوا کہ کس طرح وہ ثبات دیتی ہے اور کس طرح مٹا دیتی ہے' کس طرح پیدا کرتی ہے اور کس طرح معدوم کر دیتی ہے' کس طرح زندگی بخشتی ہے اور کس طرح موت طاری کرتی ہے۔اس پوری کائنات کو اس نے کس طرح متحرک کر دیا ہے' تمام زندہ اور مردہ مخلوق کس طرح رواں اور دواں ہے۔

اس سفر میں ہم نفس انسانی کی گہرائیوں تک بھی گئے' اس کے نشیب و فراز میں بھی ہم نے سفر کیا' اس کی ظاہری تصویر اور باطنی حقیقت سے بھی آگاہ ہوئے' اس کی خواہشات اور میلانات سے بھی دوچار ہوئے' اس کی ہدایت یابی اور گمراہی کو بھی دیکھا' اس نفس انسانی کے اندر شیاطین جن و انس کی کارستانیاں بھی ملاحظہ کیں اور ان کے اقدامات و منصوبے دیکھے' ہدایت دینے والوں اور گمراہ کرنے والوں کو باہم دست و گریباں ہوتے بھی دیکھا۔

اس طویل سیر میں مشاہد قیامت' حشر و نشر کے مناظر' کرب و ابتلا کے اوقات' خوشی اور فلاح کے لمحات' اس کرۂ ارض پر انسانیت کی آبادی اور اس کی تاریخ کے بعض باب اور اس کائنات کی تاریخ کی بعض جھلکیاں بھی نظر آئیں۔ غرض اس سورہ میں ہم نے وہ کچھ دیکھا جس کی پوری تلخیص یہاں ممکن نہیں ہے۔ پوری حقیقت تو اس سورہ کے مطالعہ اور اس کے پیارے اسلوب ہی سے اخذ ہو سکتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ قرآن فی الواقعہ ایک کتاب مبارک ہے اور یہ سورہ اس کی برکات میں سے ایک حصہ ہے۔

(وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ)

فی ظلال القرآن

پارہ نمبر - ۸

سورۃ الاعراف

آیات ۱ — تا — ۹۳

سورہ اعراف ایک نظر میں

سورہ انعام کی طرح یہ بھی مکی سورہ ہے اور اس کے اندر بنیادی موضوعات وہی ہیں جو عموماً مکی آیات میں بیان ہوتے ہیں، یعنی نظریاتی مباحث۔ لیکن یہ دونوں سورتیں اس عظیم مسئلے کے بیان میں جو طرز عمل اور اسلوب بیان اختیار کرتی ہیں اور جس طرح میدان کار میں حرکت پذیر ہوتی ہیں، ان کے درمیان بہت بڑا فرق و امتیاز ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی ہر سورہ ایک علیحدہ شخصیت کی مالک ہے۔ ہر سورہ کے اپنے خدوخال ہیں، ہر ایک کا ایک متعین اسلوب ہے، ہر ایک کا ایک میدان کار ہے، جس میں یہ سورہ اپنے اسی عظیم نظریاتی ہدف کی طرف بڑھتی ہے جو ایک ہے۔

ہر سورہ کا ایک موضوع اور ہدف ہوتا ہے۔ یہ موضوع اور ہدف لے کر یہ سورہ اپنے مخصوص میدان میں آگے بڑھتی ہے اور اپنی مخصوص راہوں پر چلتی ہے۔ اپنے اس مضمون کو آگے بڑھاتی ہے اور اپنے ہدف اور مقصد تک پہنچتی ہے اور قارئین کو بھی پہنچاتی ہے۔

قرآن کریم کی تمام سورتوں کا حال بعینہ انسانوں کی طرح ہے۔ تمام انسان انسان ہیں لیکن ہر انسان کے خدوخال دوسرے سے جدا ہیں، ہر ایک کے انسانی خصائص مختلف ہیں۔ ہر ایک کی عضویاتی ساخت اور بناوٹ مختلف ہے۔ پھر شخصیت کے اعتبار سے انسانوں کے مختلف نمونے ہیں اور یہ اختلاف بھی بین اختلاف ہے۔ بعض کے درمیان معمولی اختلاف ہوتا ہے اور بعض ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ بنیادی اور عام انسانی خصوصیات کے سوا ان کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں ہوتی۔

میں قرآن کو اسی انداز میں سمجھنے کا عادی ہوں، قرآن کے بارے میں یہی میرا احساس ہے۔ اس کے ساتھ اسی احساس کے مطابق میں معاملہ کرتا ہوں۔ قرآن کے ساتھ طویل صحبت، طویل الفت اور طویل ترین ممارست اور اس کی تمام سورتوں میں غور و فکر کرنے کے بعد میں نے ہر سورہ کا مزاج، اس کا رجحان اور اس کے خدوخال کو بالکل علیحدہ متعین کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مجھے قرآن کی سورتوں کی شکل میں مختلف نمونے نظر آتے ہیں اور میں نے ہر سورہ کے ساتھ ذاتی تعلق کی وجہ سے ایک خاص لگاؤ پیدا کر لیا ہے اور ہر سورہ کے ساتھ اس ذاتی لگاؤ اور ممارست کی وجہ سے مجھے نظر آتا ہے کہ اس کے خدوخال دوسری سورتوں سے مختلف ہیں اور اس کے رجحانات بھی دوسری سورتوں کے مقابلے میں مختلف ہیں۔

قرآن کی سورتوں کے ساتھ میرا تعلق بعینہ اسی طرح ہے جس طرح کسی انسان کا مختلف دوستوں کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک دوست ہوتا ہے۔ سب کے ساتھ الفت اور محبت ہوتی ہے سب محبوب ہوتے ہیں، سب قیمتی

متاع کا درجہ رکھتے ہیں لیکن ہر ایک کے ساتھ انسان کا دل عجیب رنگ ڈھنگ اختیار کرتا ہے' ہر ایک کے اندر وہ ایک جدا خوشی پاتا ہے' ہر ایک کے ساتھ علیحدہ اثرات اور مؤثرات ہوتے ہیں اور ہر ایک کے ساتھ برتاؤ اور مذاق علیحدہ ہوتا ہے۔

جب انسان ایک سورہ کے اندر داخل ہوتا ہے تو اس کے اول سے آخر تک ایک سفر ہوتا ہے۔اس سورہ کی دنیا اور اس کے مناظر دوسری سورتوں سے الگ ہوتے ہیں۔تصورات اور حقائق مختلف ہوتے ہیں۔ اشارات اور قرار دادیں مختلف ہوتی ہیں' ہر سورہ نفس انسانی میں غوطے لگا کر موتی نکال لاتی ہے' ہر سورہ میں نئے نئے مناظر پیش کئے جاتے ہیں حتیٰ کہ ہر سورہ کا سفر ایک نئی دنیا کا سفر ہوتا ہے اور اس سفر کی منزل اور نشانات منزل متعین ہوتے ہیں۔

سورہ انعام کا موضوع بھی نظریہ حیات تھا اور اعراف کا موضوع بھی اسلامی عقائد و نظریات ہیں ۔لیکن سورہ انعام میں اسلامی عقائد سے براہ راست ذاتی طور پر بات کی گئی تھی ۔عقائد اور ان کی حقیقت سے بحث کی گئی تھی اور ان عقائد کے حوالے سے عرب جاہلیت پر بھرپور تنقید کی گئی تھی ۔جاہلیت عربیہ کو خطاب کر کے دوسری جاہلیتوں کو بھی بالواسطہ رد کیا گیا تھا اور اس میں سچائی کے حامل پیغمبر کو اس روپ میں دکھایا گیا تھا کہ وہ ببانگ دہل سچائی کا اعلان کر رہے ہیں۔ اس اعلان حق کے ساتھ ساتھ فطرت کے گہرے اور بے شمار اور عظیم اشارات بھی پیش کئے گئے تھے جو اس سچائی کے لئے بطور دلیل اور مشیر موجود تھے اور جن اشارات فطرت کے بارے میں ہم نے سورہ انعام کے آغاز میں' ساتویں پارے میں اور اس پارے میں مختصر اور مفصل کلام کیا ہے اور اس سورہ پر غور و فکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ سورہ انعام کا رنگ ڈھنگ اور اسلوب اور طریق کیا ہے۔اب ہم دیکھتے ہیں کہ سورہ اعراف کا موضوع بھی وہی اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقائد ہیں لیکن اس کا طریقہ کار بالکل مختلف ہے۔یہ ایک بالکل نئے میدان میں اس موضوع کو لے جاتی ہے۔اس سورہ میں اسی موضوع کو انسانی تاریخی زاویہ سے لیا گیا ہے۔انسان جب اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے تو وہ جنت میں ملاء اعلیٰ کا باشندہ ہوتا ہے۔یہ سورہ اس نقطہ آغاز سے انسان کو لے کر آگے بڑھتی ہے۔انسانی سفر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد تک ہمارے سامنے آتا ہے اور انسانیت کی اس طویل شاہراہ پر قافلہ ایمان مختلف مقامات و منازل سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا ہے یہ قافلہ اس نظریہ اور عقائد کے جھنڈے اٹھائے ہوئے ہے۔ نسلاً بعد نسلٍ اقوام کے بعد اقوام آتی ہیں اور اس سورہ میں ان قافلوں کے سفر کو ریکارڈ کیا جاتا ہے۔پھر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ہر دور میں انسانوں نے اس قافلہ ایمان کا استقبال کس انداز میں کیا۔اس نے ان ہدایات کو پاکر کیا رد عمل ظاہر کیا۔اس قافلہ ایمان نے دعوت کس انداز میں پیش کی۔اور لوگوں نے کیا جواب دیا۔کس طرح بعض لوگوں نے اس قافلے کی راہ کو روکنے کی کوشش کی اور اس قافلے نے کس طرح مشکلات کے باوجود اپنی راہ نکالی اور اپنی منزل کی طرف یہ قافلہ آگے ہی بڑھتا رہا۔راہ روکنے والوں اور جھٹلانے والوں کا انجام کیا رہا اور قافلہ ایمان کس انجام سے دوچار ہوا۔دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

یہ نہایت ہی طویل ترین سفر ہے' لیکن یہ سورہ اسے مرحلہ بمرحلہ طے کرتی چلی جاتی ہے۔یہ قافلہ بعض نہایت ہی اہم مقامات اور منازل میں ٹھہرتا بھی ہے' لیکن اپنے مقررہ راستے پر چل بھی پڑتا ہے۔اس قافلے کے نشانات اور خدوخال بالکل واضح ہیں۔اس کے سنگ ہائے میل قائم ہیں۔اس کے سفر کا نقطہ آغاز بھی معلوم ہے اور منزل بھی متعین ہے۔انسانیت اپنی بڑی بڑی جمعیتوں کو لے کر اس منزل کی طرف رواں دواں ہے۔اور آخر کار یہ سورہ انسانیت کو اس کے نقطہ آغاز یعنی عالم بالا تک پہنچا دیتی ہے۔

انسانیت کا آغاز حضرت آدم و حوا کی شکل میں دو افراد سے ہوا۔ آدم ابو البشر اور حوا ام البشر ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ ساتھ شیطان بھی اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے اور اسے اللہ کی جانب سے یہ اجازت مل جاتی ہے کہ وہ جس حیلے سے چاہے انسان کو گمراہ کر سکتا ہے۔ حضرت آدم و حوا کو بھی گمراہ کر سکتا ہے اور ان کی اولاد کو بھی۔ اللہ ان دونوں سے اور دونوں کی اولاد سے عہد لیتے ہیں کہ وہ اس سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ اولاد آدم کو بھی اس کرۂ ارض پر یہ اختیار دیا گیا کہ وہ جو راہ چاہے اختیار کرے لیکن اس اختیار تمیزی کے استعمال پر اس سے بازپرس ضرور ہوگی۔ ذریت آدم کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے اس عہد کو مضبوطی سے تھامیں اور شیطان کے آگے نہ جھکیں جو خود ان کا اور ان کے ابو الآباء آدم علیہ السلام کا دشمن ہے اور یہ شیطان ہی ہے جس نے آدم و حوا کو جنت سے نکالنے کا سامان کیا اور یہ کہ گردش ایام میں جس جس مرحلے پر بھی رسول آئیں انسانوں کا فرض یہ ہے کہ وہ ان رسولوں کی ہدایات کو قبول کریں۔ اگر وہ انبیاء کی بات نہ سنیں گے تو وہ شیطان کے بہکاوے میں آجائیں گے جس کی فوجیں ہروقت ان کی آگے اور پیچھے لگی ہوتی ہیں اور دائیں اور بائیں ہر طرف سے ایک انسان پر حملہ آور ہوتی ہیں۔

انسانیت کا آغاز جنت سے 'اپنے رب کے ہاں سے ہوتا ہے۔ وہاں سے انسانیت کا نزول زمین کی طرف ہوتا ہے۔ یہاں عمل اور مکافات عمل 'سعی و مشقت 'اصلاح و فساد 'تعمیر و تخریب' منافست اور مقابلے کا بازار گرم ہوتا ہے اور اس مقابلے میں ہر نیک و بد شریک ہے۔ کسی کے لئے اس سے باہر نکل بھاگنا ممکن نہیں ہے۔ اب یہ انسانیت لوٹ رہی ہے' اپنے رب کی طرف 'جس نے اسے کھلا چھوڑ کر اس جہان میں اختیار تمیزی دیا اور اس لمبے سفر میں انسانیت نے جو کچھ کمایا اسے وہ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ اس نے جو کچھ جمع کیا ہے اس میں کانٹے بھی ہیں اور پھول بھی ہیں۔ اس میں قیمتی متاع بھی ہے اور کھوٹے سکے بھی ہیں۔ خیر بھی ہے اور شر بھی ہے' اچھائیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی ہیں۔ سونا بھی ہے اور پیتل۔ اس نے صبح انسانیت میں آغاز کیا اب شام ہونے کو ہے اور اس کا انجام ہے اور ہم اس سورہ کی عبارات اور آیات کے آئینے میں اس سفر کو اور اس کے آغاز و انجام کو دیکھ رہے ہیں۔ لوگ اپنے اپنے بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں اور اپنے رب کی طرف لوٹ رہے ہیں' کسی کا بوجھ کم ہے اور کسی کا زیادہ ہے' کسی کا اچھا ہے اور کسی کا برا۔ ہر ایک افتاں و خیزاں اسے اٹھائے ہوئے ہے۔ یہ سب لوگ مشقت میں ہیں اور تھکے ماندے جا رہے ہیں۔ ہر ایک دوبارہ نقطہ آغاز تک پہنچ جاتا ہے اور اللہ کی میزان کے سامنے اپنا بوجھ رکھ دیتا ہے اور نہایت ہی خوف و ہراس میں اپنے نتیجے کا منتظر ہے۔ ہر شخص اپنی کمائی کو فرداً فرداً لے کر آ رہا ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا اسے دعوت دے کہ وہ اس سے کوئی بوجھ ہٹا لے تو کوئی اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ اگرچہ بلائے جانے والا رشتہ دار و تعلق دار ہو۔ ہر شخص اپنا حساب علیحدہ چکا رہا ہے۔ اور جزا و سزا سے دوچار ہو رہا ہے۔ اس سورہ میں لوگ فوج در فوج چلتے نظر آتے ہیں' کوئی جنت کی طرف رواں ہے اور کوئی جہنم کی طرف ہانکا جا رہا ہے اور جب سب لوگ واپس ہو کر اپنی اپنی جگہ داخل ہو جاتے ہیں تو پھر دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ گویا لوگ اس جہان میں غریب اور مسافر تھے۔

(كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ (۲۹) فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۳۰)(۷:۲۹-۳۰)) "جس

طرح اس نے تمہیں اب پیدا کیا اسی طرح تم پھر پیدا کئے جاؤ گے ۔ ایک گروہ کو تو اس نے سیدھا راستہ دکھایا ہے ' مگر دوسرے گروہ پر گمراہی چسپاں ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ انہوں نے خدا کے بجائے شیاطین کو اپنا سرپرست بنالیا ہے اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم سیدھی راہ پر ہیں ۔" گردش لیل و نہار اور مناظر صبح و شام میں حق و باطل کے معرکوں کی جھلکیاں بھی پیش کی جاتی ہیں ' ہدایت اور ضلالت کی معرکہ آرائی کے مناظر دکھائے جاتے ہیں ' رسولوں اور مخلص مومنین کے قافلوں کو متکبرین اور ذلیل لوگوں کے پیروکاروں کے ساتھ لڑتے دکھایا گیا ہے ۔ یہ ٹکراؤ تاریخ میں بار بار دکھایا جاتا ہے اور اس تاریخی تبصرے میں ایک جیسے نتائج سامنے آتے ہیں ۔ ایمانی صحیفے روشن اور پرایمان اور واضح اور جلی نظر آتے ہیں اور کفر کے صحیفے بجھے بجھے نظر آتے ہیں ' کبھی کبھی جھٹلانے والوں کے مقتل کے مناظر بھی دکھائے جاتے ہیں اور کلام کا بہاؤ رک جاتا ہے اور درمیان میں ایک نہایت ہی پر مغز تبصرہ کیا جاتا ہے ۔ یاد دہانی اور ڈراوا آجاتا ہے اور یہ وقفے سورہ کے اندر ایک خاص انتظام کے تحت ہوتے ہیں ۔ تاریخی واقعات کے ہر مرحلے کے بعد بات رک جاتی ہے اور بیچ میں تبصرہ ہوتا ہے اور ایک مختصر کلمہ نصیحت کہہ دیا جاتا ہے ۔ یاد دہانی اور ڈراوے کے لئے اور پھر سلسلہ کلام آگے چلتا ہے ۔

غرض یہ سورہ انسانیت کی ایک کہانی ہے کہ یہ جنت اور ملاء اعلیٰ سے نکلی اور پھر لوٹی اور دنیا کے اس سفر میں اس کی نظریاتی صورت حال کا نقشہ اس میں کھینچا گیا ہے ۔ تاریخ کے طویل سفر میں اس کی حرکات و سکنات کو ریکارڈ کیا گیا ہے اور انسانیت کا آغاز جہاں سے ہوا یہ سورہ انجام کار انسانیت کو نقطہ آغاز تک پہنچاتی ہے ۔ بشریت کی نظریاتی کشمکش کا یہ ایک دوسرا انداز بیان ہے اور یہ انداز سورہ انعام سے بالکل مختلف ہے ۔ اگرچہ دونوں سورتوں میں بعض اوقات جھٹلانے والوں کے جو انجام دکھائے گئے ہیں وہ یکساں نظر آتے ہیں ' دونوں میں شاید مناظر قیامت بھی یکساں ہیں اور اس کائنات پر جو تبصرے کئے گئے ہیں اور اس کے جو مناظر دکھائے گئے ہیں وہ بھی یکساں ہیں ' لیکن اس سورہ کا انداز اور میدان کار سورہ انعام سے بالکل جدا ہے اور حدود بھی علیحدہ ہیں ۔

یہ اختلاف اس وجہ سے ہے کہ دونوں سورتوں کا انداز تعبیر مختلف ہے ۔ ہر سورہ میں تعبیر کا وہ انداز اختیار کیا گیا جو اس کے موضوع کو پیش کرنے کے لئے مناسب سمجھا گیا ۔ انعام کی حالت یہ تھی کہ وہ انداز بیان لہروں کی شکل میں تھا اور ایک لہر کے بعد دوسری لہر اٹھتی ۔ اس میں مناظر نہایت ہی بھڑکیلے اور چمکدار تھے اور اس میں الفاظ کی سرموسیقی کی حد تک پہنچ رہی تھی ' سورہ کے اندر سیاق کلام نہایت ہی تیز ' بڑھنے والا اور بمباری جیسا تھا جبکہ سورہ اعراف میں بات نہایت ہی نرمی سے اور دھیرے دھیرے آگے بڑھتی ہے ' الفاظ کی سر نہایت ہی نرم اور اسلوب بیان دھیما ہے ۔ گویا ایک قافلہ نہایت ہی سنجیدہ رفتار سے جا رہا ہے اور اس پر رننگ کمنٹری ہو رہی ہے اور قافلہ قدم بقدم آگے بڑھ رہا ہے اور آخرکار اپنے نقطہ آغاز کی طرف لوٹ جاتا ہے ۔ ہاں اس سورہ میں جب تذکیر و تہدید کا مرحلہ آتا ہے تو انداز کلام سخت ہو جاتا ہے لیکن جونہی تہدید اور ڈراوے کا موضوع ختم ہوتا ہے بات دوبارہ سنجیدگی اختیار کر لیتی ہے اور نہایت ہی مرتب انداز میں آگے بڑھتی ہے ۔

---○○○---

یہاں مناسب ہے کہ انسانی تاریخ کے بہاؤ میں یہ سورہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقیدے کو جس طرح ایک متحرک شکل میں پیش کرتی ہے ' اس کے کچھ نمونے پیش کریں ۔

یہ سورہ اسلامی نظریہ حیات کی تاریخ اس طرح بیان نہیں کرتی جس طرح نظریات کی تاریخ عموماً بیان کی جاتی ہے۔ یعنی اسلامی نظریہ حیات کو آدم سے لے کر انتہا تک ایک حصے کی شکل میں بیان کر دے ۔بلکہ وہ اسلامی نظریہ حیات کی وہ جھلکیاں دکھاتی ہے جس میں کسی دور میں اس نظریہ اور اس کے مقابل جاہلیت کے درمیان کشمکش برپا رہی ہے۔چنانچہ اس سورہ میں بعض تاریخی مناظر اور معرکے لئے گئے ہیں اور یہ مناظر اور معرکے وہ ان لوگوں کے سامنے پیش کرتی ہے جو اس قرآن کے مخاطب تھے ۔ قرآن ان لوگوں کے سامنے اس طویل قصے کو پیش کرتے ہوئے اس کے نتائج اور نصائح کو بھی ان کے سامنے پیش کرتا ہے اور ساتھ ساتھ ان کو یاد دہانی بھی کراتا جاتا ہے۔اس طرح قرآن کریم ان زندہ مخاطبین کو لے کر ایک معرکے میں داخل ہوتا ہے اور یہ معرکہ حقیقتاً برپا ہوتا ہے اور جب قصص کے اہم مراحل آتے ہیں تو پھر قرآن کریم ان پر مختصراً تبصرہ بھی کرتا ہے اور اس تبصرے کے مخاطب وہ زندہ لوگ ہوتے ہیں جو قرآن کو سنتے ہیں اور جو تحریک اسلامی کے معرکے کے اندر حصہ دار ہوتے ہیں جس طرح اس وقت صحابہ کرام عملاً تحریک اسلامی کے معرکے میں شامل تھے ۔قرآن کریم جو قصہ بھی بیان کرتا ہے اس کو کسی متعین صورت حال پر چسپاں کرتا ہے۔وہ جس حقیقت کا اظہار کرتا ہے اس کے بالمقابل کسی قائم باطل کو ختم کرنا مطلوب ہوتا ہے۔ اس کے قصص محض فنی اور تاریخی پہلو سے بیان نہیں ہوئے ۔

---ooo---

جب کسی قصے کے آخر میں یا درمیان میں قرآن کریم ان واقعات پر تبصرہ کرتا ہے تو اس میں وہ مسلمانوں کو نصائح اور ڈراوے کے اسباق پڑھاتا ہے' جبکہ کلام کا نقطہ آغاز اور انجام اس کے پیش نظر ہوتا ہے۔اس سورہ میں اگر قوم نوح' قوم ہود' قوم صالح' قوم لوط ور قوم شعیب کے قصص کو سرسری طور پر لیا گیا ہے تو حضرت موسیٰ کے قصے کو بڑی تفصیل سے لیا گیا ہے۔یہاں اس سورہ کے اجمالی تعارف میں تو ہم صرف چند نمونے ہی پیش کر سکتے ہیں کہ یہ سورہ کن اہم نکات پر اپنی توجہ مرکوز کئے ہوئے ہے۔سورہ کا آغاز یوں ہوتا ہے :

الٓمّٓصٓ (۱) كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۲) اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۳) (۷ : ۱ تا ۳) "ا' ل' م' ص ۔ یہ ایک کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے' پس اے محمدؐ تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو۔اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے سے ڈراؤ اور ایمان والوں کو یاد دہانی کراؤ۔لوگو' جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو مگر تم نصیحت کم ہی مانتے ہو۔" یہ سورہ اپنے آغاز ہی سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کو خطاب کر رہی ہے' جو اس قرآن کو لے کر جہاد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔اس کے بعد جو قصص بھی اس میں لائے گئے ہیں اور انسانیت کے طویل ترین سفر پر جو کمنٹری کی گئی ہے' اس کے بعد قافلہ انسانیت کو جو رب ذوالجلال کے سامنے پہنچایا گیا ہے اور اس کے اندر جو مناظر اور جو مشاہدات پیش کئے گئے ہیں دنیا میں

اور قیامت میں وہ بھی بالواسطہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کو خطاب کا درجہ رکھتے ہیں اور ایسا محض ڈراوے اور یاد دہانی کی خاطر کیا گیا ہے۔ اس امر کی طرف وہ مختصر فقرات اشارہ کر رہے ہیں' جن میں اللہ تعالیٰ رسول اکرم ؐ سے فرماتے ہیں "یہ ایک کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے' پس اے محمد تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو۔"

یہ ایسی صورت حال ہے جسے صرف وہ شخص سمجھ سکتا ہے جو جاہلیت کے نظام میں زندگی بسر کر رہا ہو اور اس جاہلی ماحول میں وہ لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دے رہا ہو وہ جانتا ہو کہ اس کا ہدف ایک عظیم انقلاب ہے اور اس کے حصول کی راہ میں بہت ہی بڑی دشواریاں حائل ہیں۔ اس کا ہدف یہ ہو کہ وہ دنیا کو ایک نیا نظریہ حیات دے' ایک نیا تصور حیات دے' نئی اقدار اور نئے پیمانے دے' نئے حالات اور نئے طور طریقے پیدا کرے اور یہ سب کے سب اس وقت کی قائم صورت حالات اور اقدار سے بالکل مختلف اور متضاد ہوں۔ وہ شخص سمجھتا ہو کہ جاہلیت کی آلودگیاں نفوس انسانی کے اندر رچی بسی ہیں۔ لوگوں کے دماغوں پر جاہلیت کے تصورات چھائے ہوئے ہیں۔ زندگی میں جاہلی اقدار کی حکمرانی ہے اور انسان کی عادات اور اس کے اعصاب پر ان کا مکمل دباؤ ہے اور اسے یہ احساس ہو رہا ہو کہ ایسے حالات میں وہ جو بات کرتا ہے وہ عجیب و غریب لگ رہی ہے۔ لوگوں کے لئے وہ بات نہایت ہی ثقیل ہے اور ان کے دل اس بات کو ناپسند کرتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے جس کی کچھ ذمہ داریاں ہیں' اس لئے کہ یہ بات لوگوں کے افکار' ان کے تصورات' ان کی اقدار' ان کے پیمانوں' ان کے قوانین' ان کی عادات اور ان کے اوضاع و اطوار کے اندر مکمل تبدیلی کی بات ہے۔ اس کے نتیجے میں ان کے تمام جاہلی روابط کٹ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس عظیم بات کے نتائج کے بارے میں ممکن ہے کہ آپ کے دل میں خلجان پیدا ہو جائے کہ لوگ اس عظیم بات سے ردعمل کا اظہار کس طرح کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیتے ہیں کہ آپ کوئی جھجک محسوس نہ کریں اور یاد دہانی اور ڈراوے کا کام جاری رکھیں۔ اس سچی بات کے مقابلے میں کوئی جس قدر شدید ردعمل بھی ظاہر کرے' برا سمجھے یا تشدد کرے آپ اس کی پرواہ نہ کریں۔ کوئی مقابلے میں اتر آئے' جنگ کے لئے تیار ہو جائے اور دشمنی پر اتر آئے تو آئے۔

اس سے پہلے کہ بات تفصیلی قصص میں داخل ہو' قرآن اپنے مخاطبوں کو فیصلہ کن انداز میں متنبہ کرتا ہے اور یہ بات ان کے علم میں لاتا ہے کہ ان سے پہلے جھٹلانے والوں کا جو انجام ہوا ہے وہ ذرا اس پر غور کر لیں یہ تنبیہ انہیں اس لئے کی جاتی ہے کہ اسلامی انقلاب کی بات نہایت ہی دور رس ہے' انوکھی ہے' لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں اور اس کے مقابلے میں اتر آتے ہیں۔ اس لئے بھی کہ یہ بات مکمل انقلاب کی بات ہے اس سے ان کے عقائد' تصورات اور طرز عمل سب کے سب بدلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ (٤) فَمَا كَانَ دَعْوٰهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (٥) فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ (٦) فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ (٧)

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۸) وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ

(۹) (۷ : ٤ تا ۹)) "کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ ان پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت ٹوٹ پڑا' یا دن دہاڑے ایسے وقت آیا جبکہ وہ آرام کر رہے تھے اور جب ہمارا عذاب ان پر آگیا تو ان کی زبان پر اس کے سوا کوئی صدا نہ تھی کہ واقعی ہم ظالم تھے۔ پس یہ ضرور ہو کر رہتا ہے کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں۔ پھر ہم خود پورے علم کے ساتھ ساری سرگزشت ان کے آگے پیش کر دیں' آخر ہم کہیں غائب تو نہیں تھے اور وزن اس روز عین حق ہو گا جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے رہیں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں گے کیونکہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے رہے تھے۔" اس تمہید کے بعد اب قصہ انسانیت کا آغاز ہوتا ہے۔ اور یہ کہانی بتائی جاتی ہے کہ انسان کو اس کرۂ ارض پر کس طرح بسایا گیا۔ اس کرۂ ارض کے اندر ایسی خصوصیات اور ایسی صلاحیتیں ودیعت کی گئی تھیں کہ اس پر انسان کا بسایا جانا آسان تھا۔ پھر انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے ایسی صلاحیتیں دی تھیں کہ اس کرۂ ارض کو اس کے حوالے کرنا موزوں تھا۔ ان کی صلاحیتیں اس کائنات کے خزانوں کے ساتھ ہم آہنگ تھیں۔ وہ اس کائنات کے اصولوں اور نوامیس کا ادراک کر سکتا تھا۔ اس کائنات کے اندر پوشیدہ قوتوں کو کام میں لا سکتا تھا اور اس سے بھرپور استفادے کی قوت اپنے اندر رکھتا تھا۔

(وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ

(۷ : ۱۰)) "ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لئے یہاں سامان زیست فراہم کیا' مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔" یہ بات بطور تمہید لائی گئی۔ اس کے بعد وہ قصہ تفصیلاً آتا ہے کہ اس جہان میں انسانیت کی تخلیق کس طرح ہوئی اور اس دنیا میں انسانیت نے اپنے اس مقررہ سفر کا آغاز کس طرح کیا۔ اس سورہ کے سیاق کلام میں انسانیت کے نقطہ آغاز پر بات کو مرکوز کیا گیا ہے۔ انسانیت کی تخلیق کی کہانی پر بھی ذرا دوا اور یاد دہانی کرائی جاتی ہے۔ اور انسانوں کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ ذرا عمل تخلیق کے واقعات پر غور تو کریں' اس میں کیا کیا سامان عبرت ہے۔

(وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ (۱۱) قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (۱۲) قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ

لك ان تتكبر فيها فاخرج انك من الصغرين (۱۳) قال انظرني الى يوم يبعثون (۱٤) قال انك من المنظرين (۱۵) قال فبما اغويتني لاقعدن لهم صراطك المستقيم (۱٦) ثم لاتينهم من بين ايديهم ومن خلفهم وعن ايمانهم وعن شمائلهم ولا تجد اكثرهم شكرين (۱۷) قال اخرج منها مذءوما مدحورا لمن تبعك منهم لاملئن جهنم منكم اجمعين (۱۸) ويادم اسكن انت وزوجك الجنة فكلا من حيث شئتما ولا تقربا هذه الشجرة فتكونا من الظلمين (۱۹) فوسوس لهما الشيطن ليبدي لهما ما وري عنهما من سواتهما وقال ما نهكما ربكما عن هذه الشجرة الا ان تكونا ملكين او تكونا من الخلدين (۲۰) وقاسمهما اني لكما لمن النصحين (۲۱) فدلهما بغرور فلما ذاقا الشجرة بدت لهما سواتهما وطفقا يخصفن عليهما من ورق الجنة ونادهما ربهما الم انهكما عن تلكما الشجرة واقل لكما ان الشيطن لكما عدو مبين (۲۲) قالا ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنكونن من الخسرين (۲۳) قال اهبطوا بعضكم لبعض عدو ولكم في الارض مستقر ومتاع الى حين (۲٤) قال فيها تحيون وفيها تموتون ومنها تخرجون (۲۵)(۷:۱۱ تا ۲۵)) ”بے شک ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتداء کی ' پھر تمہاری صورت بنائی ' پھر فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو ' اس حکم پر سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ پوچھا ”تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب میں نے تجھ کو حکم دیا تھا۔“ بولا :”میں اس سے بہتر ہوں ' تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔“ فرمایا :”تو یہاں سے نیچے اتر تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے۔ نکل جا کہ درحقیقت تو ان لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں۔“ بولا :”مجھے اس دن تک مہلت دے جبکہ یہ سب دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔“ فرمایا :”تجھے مہلت ہے۔“ بولا : ”اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا ' آگے اور پیچھے ' دائیں اور بائیں ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔“ فرمایا :”نکل

جا یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا، یقین رکھ کہ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے تجھ سمیت ان سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔ اور اے آدم، تو اور تیری بیوی دونوں اس جنت میں رہو جہاں جس چیز کو تمہارا جی چاہے کھاؤ مگر اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے ۔" پھر شیطان نے ان کو بہکایا تاکہ ان کی شرمگاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں ان کے سامنے کھول دے ۔ اس نے ان سے کہا "تمہارے رب نے تمہیں جو اس درخت سے روکا ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے ۔ اور اس نے قسم کھا کر ان سے کہا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں ۔ اس طرح دھوکہ دے کر وہ ان دونوں کو رفتہ رفتہ اپنے ڈھب پر لے آیا ۔ آخر کار جب انہوں نے اس درخت کا مزہ چکھا تو ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے ۔ تب ان کے رب نے انہیں پکارا "کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہ روکا تھا، اور نہ کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے ۔" دونوں بول اٹھے "اے ہمارے رب ہم نے اپنے اوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے ۔" فرمایا: "اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اور تمہارے لئے ایک خاص مدت تک زمین ہی میں جائے قرار اور سامان زیست ہے ۔" اور فرمایا "وہیں تم کو جینا اور وہیں مرنا ہے اور اسی میں سے تم کو آخر کار نکالا جائے گا ۔"

اس منظر میں، جس میں انسانیت کا آغاز دکھایا گیا ہے، یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے اور سفر انسانیت کے مسافران کی آخری منزل کون سی ہے ۔ جب انسانیت اس طویل سفر کا آغاز کرتی ہے تو اس سفر میں معرکہ خیر و شر شروع ہو جاتا ہے اور دوران سفر یہ ہر وقت برپا ہے ۔ یہ معرکہ شیطان، حزب الشیطان اور انسانوں کے درمیان برپا ہے ۔ اس پورے سفر میں ہمیں وہ مقامات بھی نظر آتے ہیں جہاں بنی آدم کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر یہ شیطان حملہ آور ہوتا ہے ۔ ان مقامات پر سورہ میں انسانوں کو یاد دہانی اور ڈراوے کے لئے وقفہ کیا جاتا ہے ۔ لوگوں کو ڈرایا جاتا ہے کہ ذرا غور تو کرو کہ اس شیطان مردود نے تمہارے باپ آدم کے ساتھ کیا سلوک کیا ۔ اس منظر میں آدم و شیطان آمنے سامنے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اس معرکہ آدم و ابلیس میں جب ابلیس اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتا ہے اور آدم و حوا جنت سے نکل جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انسانوں کو یاد دلاتے ہیں اور ڈراتے ہیں ۔

(يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (۲۶) يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۲۷) (۷: ۲۶ - ۲۷))

اے اولاد آدم، ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے لئے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو، اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے ۔ یہ اللہ

کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے' شاید کہ لوگ اس سے سبق لیں - اے بنی آدم ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے جس نے اس سے پہلے تمہارے والدین کو اس نے جنت سے نکلوایا اور ان کے لباس ان پر سے اتروا دیئے تھے تاکہ ان کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے - وہ اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے - ان شیاطین کو ہم نے ان لوگوں کا سرپرست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے -"

(یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ (۳۵) وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (۳۶)(۷:۳۵ - ۳۶)) "اے بنی آدم' یاد رکھو! اگر تمہارے پاس خود تم میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سنا رہے ہوں' تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویے کی اصلاح کرے گا اس کے لئے کسی خوف و رنج کا موقع نہیں ہے' اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلے میں سرکشی برتیں گے وہی اہل دوزخ ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے -" یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ ممنوع کے ارتکاب کے بعد آدم و حوا کے ننگے ہو جانے کا جو منظر سامنے آتا ہے اور اس میں وہ جنت کے پتوں کے ذریعے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اس واقعہ پر قرآن مجید کا محولہ بالا تبصرہ کہ لباس انسان کے لئے اللہ نے اتارا ہے اور ستر کی پوشیدگی اور وہ لباس جس کے ذریعہ وہ زینت اختیار کرتے ہیں غوروفکر کی دعوت دیتا ہے - یہ لباس اللہ کے نازل کردہ ہیں - پھر انہیں شیطان کے فتنے سے آگاہ کیا جاتا ہے کہ شیطان کی سعی یہ ہے کہ وہ انہیں بھی اس طرح ننگا کر دے جس طرح ان کے باپ کو اس نے ننگا کر کے جنت سے نکال دیا - یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ قصہ تخلیق آدم کی اس کڑی کا یہاں خاص طور پر ذکر کرنا اور پھر اس پر یہ تبصرہ کرنا اس بات کا مظہر ہے کہ اس وقت عربوں کے مشرک جاہلی معاشرے میں ایسی ہی عملی صورت حال موجود تھی کیونکہ اس معاشرے میں لوگ اپنے جاہلی رسم و رواج اور اپنے جاہلی تصورات کے نتیجے میں اور اپنی سابقہ دیو مالائی روایات کے مطابق بیت اللہ کے گرد ننگے ہو کر طواف کرتے تھے - نیز انہی تصورات کے تحت وہ خاص قسم کے لباسوں کو حرام قرار دیتے تھے' بعض کھانوں کو بھی حرام قرار دیتے تھے خصوصاً حج کے دنوں میں' اور یہ خیال کرتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی شریعت ہے - نیز انہوں نے اپنے اوپر جو کچھ حرام قرار دیا ہے وہ دراصل اللہ نے حرام قرار دیا ہے - یہی وجہ ہے کہ انسانیت کی تخلیق کی کہانی کی اس کڑی کے بعد ایسا تبصرہ آتا ہے جو اس وقت کے موجود حالات کے ساتھ نہایت ہی مناسبت رکھتا ہے - یہ واقعی صورت حال صرف عرب جاہلیت کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ تمام جاہلیتوں میں حالات ایسے ہی ہوتے ہیں - آپ دیکھتے نہیں کہ تمام جاہلیتوں میں عریانی اور بے حیائی اور خدا خوفی کو نظرانداز کرنا ایک قدر مشترک ہے -

اس سے ہمیں قرآن کریم کی ایک نہایت ہی اہم خصوصیت کا پتہ چلتا ہے اور اس کا ذکر یہاں نہایت ضروری ہے - وہ یہ کہ قرآن کریم جو بات بھی کرتا ہے یا جو قصہ بھی بیان کرتا ہے' وہ ایک واقعی اور موجود صورت حالات کے لئے ہوتا ہے اور قرآن اپنے آپ کو عملی حالات تک محدود رکھتا ہے - جس قدر واقعات ہوتے ہیں اور ان میں جس قدر ہدایات کی

ضرورت ہوتی ہے ' قرآن اسی قدر بات کرتا ہے۔ صرف حسب ضرورت۔ سورہ انعام کے تعارف میں ہم نے اس اہم قاعدے کی طرف اشارہ کیا تھا کہ قرآن کریم کوئی ایسی بات نہیں کرتا جس کی فی الواقعہ ضرورت نہ ہو۔ قرآن کریم کا طریق کار یہ نہیں ہے کہ وہ معلومات یا احکام کے فرضی مجموعے تیار کرے یہاں تک کہ قرآن کریم قصص کے معاملے میں بھی وہ تمام حلقے چھوڑ دیتا ہے جن کی موضوع زیر بحث میں ضرورت نہ ہو۔ قرآن معلومات و احکام کا خزانہ تیار نہیں کرتا تاکہ جب ضرورت ہو تو اس سے احکام لئے جائیں۔ یہ قرآن کا طریق کار نہیں ہے۔

اب اس سے پہلے کہ قافلہ انسانیت اپنی راہ پر روانہ ہو اور اس سے پہلے کہ رسول آکر انسانیت کے سامنے ہدایت پیش کریں اور اس سے پہلے کہ قرآن کریم کا سیاق کلام اس بات کو پیش کرے کہ نظریاتی تحریک کس طرح قافلہ انسانیت کے ساتھ ساتھ چلتی رہی اور آدم علیہ السلام اور بی بی حوا کے پہلے تجربے کے ساتھ ساتھ سلسلہ انبیاء و رسل کس طرح چلا؟ ان تمام امور کے بیان سے پہلے قرآن کریم قافلہ انسانیت کے آخری منظر کو پیش کرتا ہے۔ اس عظیم مرحلے کے آخری حصے کو یہاں پہلے لایا جاتا ہے اور قرآن کریم کا یہ عمومی طریقہ ہے کہ وہ ابتلاء اور جزا و سزا کے مناظر کو پہلے لے لیتا ہے۔ اس طرح گویا یہ سب مناظر ایک ہی سفر کی جھلکیاں ہیں۔

یہاں مشاہد قیامت میں سے ایک طویل ترین منظر پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں بہت سی تفصیلات دی گئی ہیں ' پے درپے کئی مناظر پیش کئے گئے ہیں اور کئی قسم کے ڈائیلاگ دیئے گئے ہیں۔ سورہ میں یہ منظر اس موقعہ و مناسبت میں دیا گیا کہ قصہ آدم و ابلیس میں ابلیس آدم اور ان کی بیوی کو ورغلاتا ہے اور ان کو جنت سے نکال دیا جاتا ہے اور یہاں لوگوں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ خبردار شیطان تمہیں اس طرح نہ ورغلائے جس طرح تمہارے ماں باپ کو ورغلایا اور جنت سے نکلوا دیا۔ اب اللہ کی جانب سے تمہارے پاس رسول آتے رہیں گے جو تم پر اللہ کی آیات پڑھیں گے اور یہ منظر اس لئے بھی یہاں پیش کیا جاتا ہے کہ جب رسول آئیں گے تو لوگ ان کی تصدیق سے جنت میں دوبارہ داخل ہوں گے اور جن لوگوں نے شیطان کی اطاعت کی وہ جنت میں داخل نہ ہو سکیں گے۔ گویا وہ آدم کی طرح شیطان کے بہکاوے میں آجائیں گے اور جن لوگوں نے شیطان کی مخالفت کی ' وہ لوٹیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے۔ ان پر یہ آواز ہوگی "یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث ہوگئے ہو' جس کے بارے میں تم بھی جانتے تھے۔" اب یہ مسافر اس پرمشقت سفر کو ختم کریں گے اور نعمتوں کی جگہ جنت میں داخل ہوں گے۔

یہ منظر نہایت ہی طویل ہے اور اس مختصر تبصرے میں ہم اسے پیش نہیں کر سکتے۔ جب تفسیر کا موقعہ آئے گا تو تفصیلی بحث ہوگی۔ البتہ اس منظر کو پیش کر کے قرآن کریم یاد دہانی اور ڈراوے کے لئے موقعہ نکالتا ہے۔ ان لوگوں کو خبردار کیا جاتا ہے جو قرآن کریم کا مقابلہ تکذیب سے کرتے ہیں اور معجزات اور خوارق طلب کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ تمہارا انجام اچھا نہ ہوگا۔

(وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۵۲) هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ

رَبِّنَا بِالْحَقِّ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعْمَلُ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۵۳) (۷: ۵۲-۵۳) "اور ہم ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس کو ہم نے علم کی بنا پر مفصل بنایا ہے اور جو ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت و رحمت ہے۔ اب کیا یہ لوگ اس کے سوا کسی اور بات کے منتظر ہیں کہ وہ انجام سامنے آجائے جس کی یہ کتاب خبر دے رہی ہے؟ جس روز انجام سامنے آگیا تو وہی لوگ جنہوں نے اسے نظرانداز کر دیا تھا کہیں گے کہ "واقعی ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے 'پھر کیا اب ہمیں کچھ سفارشی ملیں گے جو ہمارے حق میں سفارش کریں؟ یا ہمیں دوبارہ واپس ہی بھیج دیا جائے تاکہ جو کچھ ہم پہلے کرتے تھے اس کے بجائے اب دوسرے طریقے پر کام کر کے دکھائیں۔" انہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا اور سارے جھوٹ جو انہوں نے تصنیف کر رکھے تھے آج ان سے گم ہوئے۔"

اس دور دراز اور طویل سفر میں آغاز تخلیق اور انتہائے خلقت کے بیان کے بعد بات میں ایک وقفہ آتا ہے۔ اب سابقہ کلام پر ایک تبصرہ سامنے آتا ہے۔ اس تبصرے میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ خدا کی خدائی کی حقیقت کیا ہے۔ اللہ کی ربوبیت اس کائنات کے مناظر میں اپنا کام کس طرح کرتی ہے۔ اللہ کی ربوبیت اس حقیقت پر کس طرح شاہد عادل ہے۔ جس طرح قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ وہ کائنات کے اندر نظر آنے والے عجیب و غریب مشاہدات اور کائنات کے آثار کے ذریعہ اس حقیقت کبریٰ پر استدلال کرتا ہے جس کے انسانی احساسات پر نہایت ہی گہرے اثرات پڑتے ہیں بشرطیکہ انسانی دل اور اس کی بصیرت ان اشارات فطرت کے اخذ کے لئے تیار ہو۔ قرآن کریم کے اس تاریخی سفر کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ بتائے کہ انسانیت کے پاس نظریاتی پیغام ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور وہ یہ کہ اس پوری کائنات میں اللہ کی بندگی اور اس کی ربوبیت کا نظام جاری و ساری ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو اس پوری کائنات کا حاکم اور رب ہے لہٰذا انسان کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ نافرمان نہ ہو اور اس رب کائنات کی بندگی سے سرتابی نہ کرے جو اس کائنات کا خالق بھی ہے اور اس کا حکمران مطلق بھی' اور وہی ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ پروردگار ہے۔

(اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ يُغْشِی الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۵۴) اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (۵۵) وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۵۶) وَهُوَ الَّذِیْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ

بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ
فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (٥٧) وَالْبَلَدُ
الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَالَّذِىْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ
الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ (٥٨)(٧: ٥٤ تا ٥٨)) "درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمان و زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا' پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے جس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کئے۔ سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار رہو اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ' سارے جہانوں کا مالک و پروردگار۔ اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے' یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو' جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔ اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت سے آگے آگے خوشخبری لئے ہوئے بھیجتا ہے۔ پھر جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھا لیتی ہیں تو انہیں کسی مردہ سرزمین کی طرف حرکت دیتا ہے اور وہاں مینہ برسا کر طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے۔ دیکھو اس طرح ہم مردوں کو حالت موت سے نکالتے ہیں' شاید کہ تم اس مشاہدے سے سبق لو۔ جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ اس طرح ہم اپنی نشانیوں کو بار بار پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو شکرگزار ہونے والے ہیں۔"

اب یہ سفر شروع ہوتا ہے اور انسانیت کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ پردہ عدم کے پیچھے قافلہ ایمان نمودار ہوتا ہے۔ یہ قافلہ گم گشتہ راہ انسانیت کو پکارتا ہے' اسے یاد دہانی کراتا ہے اور برے انجام سے ڈراتا ہے لیکن یہ گمراہ انسانیت روگردانی کرتی ہے اور قافلہ ایمان کی دشمنی پر اتر آتی ہے۔ وہ اس اصلاحی تحریک کا مقابلہ عناد اور سرکشی کے ساتھ کرتی ہے۔ پھر ظلم و زیادتی شروع کر دیتی ہے اور اس قافلے کی راہ روکتی ہے۔ جب رسول یاد دہانی اور ڈراوے کا فریضہ ادا کر چکتے ہیں تو اللہ تعالیٰ خیر و شر کے اس معرکے کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب رسولوں کی قوم انہیں جھٹلاتی ہے اور وہ نافرمانی کر کے منہ موڑ لیتے ہیں۔ ظلم اور پکڑ دھکڑ کا آغاز کر دیتے ہیں۔ اس وقت صالح لوگ اسی نظریاتی بنیاد پر قوم سے جدا ہو جاتے ہیں اور صرف اللہ کو پکارتے ہوئے تمام اختیارات اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔

قرآن کریم اس سورہ میں حضرت نوح' حضرت ہود' حضرت صالح' حضرت لوط' حضرت شعیب اور ان کی اقوام کے قصے نقل کرتا ہے۔ یہ تمام رسول ایک ہی حقیقت اپنی قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں' صرف اللہ کی بندگی کرو۔ "اے قوم صرف اللہ کی بندگی کرو اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی اور حاکم و الٰہ نہیں ہے۔" ان تمام رسولوں کی اقوام نے ان کے ساتھ اللہ کے حق حاکمیت کے سلسلے میں جھگڑا کیا۔ ان سب قوموں کو اعتراض بھی رہا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم ربوبیت کے اختیارات سب کے سب اللہ کو دے دیں۔ نیز ان لوگوں نے اس بات پر بھی اعتراض کیا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ ہم جیسے انسان کو ہمارے پاس رسول بنا کر بھیج دے۔ بعض اقوام نے یہ اعتراض کیا کہ ہم مذہب کا یہ حق تسلیم

نہیں کرتے کہ وہ لوگوں کی زندگی کے معاملات میں دخل دے اور مالی اور تجارتی معاملات میں فیصلے کرے۔ آج صدیوں کے بعد' جاہلیت جدیدہ کے متبعین میں سے بعض لوگ بعینہٖ یہی اعتراض کرتے ہیں اور اپنے اس قدیم جاہلی فعل کو وہ ترقی اور آزادی کا نام دیتے ہیں۔ ہر قصے کے آخر میں ان تمام اقوام کا انجام بھی نقل کر دیا جاتا ہے۔

جو شخص ان قصص کا بغور مطالعہ کرے گا وہ دیکھے گا کہ ان میں ہر رسول اپنی قوم کے سامنے ایک ہی بات رکھتا ہے۔ "اے قوم اللہ ہی کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا اور کوئی حاکم و الٰہ نہیں ہے۔" ہر ایک رسول لوگوں کے سامنے وہ حقیقت پیش کرتا رہا ہے جس کا محافظ اور مبلغ اسے اللہ نے مقرر کیا تھا۔ وہ نہایت ہی اخلاص اور شفقت کے ساتھ اپنی قوم کو خطاب کرتا رہا۔ وہ نہایت ہی درد کے ساتھ انہیں اس انجام سے آگاہ کرتا جس سے وہ دو چار ہونے والے تھے لیکن وہ اس سے غافل تھے۔ ان کی نظروں میں ان رسولوں کی نصیحت کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ وہ اپنی بات کے انجام پر کوئی غور نہ کرتے تھے۔ وہ اس گہرے اخلاص کو نہ سمجھ سکے جو ان کے رسول کے دل میں پنہاں تھا۔ وہ اس بات کو بھی نہ سمجھتے تھے کہ یہ رسول نہایت ہی مخلص اور بے لوث تھے اور ان کو اچھی طرح احساس تھا کہ ان کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

یہاں بطور مثال حضرت نوح علیہ السلام کے قصے کا ایک حصہ نقل کرنا نامناسب نہ ہو گا۔ یہ پہلا قصہ ہے۔ نیز حضرت شعیب علیہ السلام کے قصے کا بھی ایک حصہ یہاں بیان کرنا مناسب ہے۔ یہ ان قصوں کے آخری فقرے ہیں۔ اس کے بعد ان قصوں پر تبصرے آتے ہیں۔

(لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۵۹) قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۶۰) قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶۱) اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۶۲) اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۶۳) فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ (۶۴)) (۷: ۵۹ تا ۶۴) "اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا: "اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ میں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔" اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا: "ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔" نوح نے کہا: "اے برادران قوم! میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں تمہیں اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں' تمہارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں ہے۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ

تمہیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے؟" مگر انہوں نے اس کو جھٹلایا۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں نجات دی اور ان لوگوں کو ڈبو دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا' یقیناً وہ اندھے لوگ تھے۔"

(وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۸۵) وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَاذْكُرُوْا اِذْ كُنْتُمْ قَلِیْلًا فَكَثَّرَكُمْ وَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ (۸۶) وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِیْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ یُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰی یَحْكُمَ اللّٰهُ بَیْنَنَا وَهُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ (۸۷) قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ (۸۸) قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا وَمَا یَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَآ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا عَلَی اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ (۸۹) وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَیْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (۹۰) فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ (۹۱) الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِیْنَ (۹۲) فَتَوَلّٰی عَنْهُمْ وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَیْفَ اٰسٰی عَلٰی قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ (۹۳)(۷: ۸۵ تا ۹۳)) "اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا' اس نے کہا: "اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی صاف راہنمائی آگئی ہے۔ لہٰذا وزن اور پیمانے پورے کرو' لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو' اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے۔ اس میں تمہاری بھلائی ہے۔ اگر تم واقعی مومن ہو' اور ہر راستے پر رہزن بن کر نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوفزدہ

کرنے اور ایمان لانے والوں کو خدا کے راستے سے روکنے لگو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔یاد کرو وہ زمانہ جبکہ تم تھوڑے تھے پھر اللہ نے تمہیں بہت کر دیا اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ دنیا میں مفسدوں کاکیاانجام ہوا ہے اگر تم میں ایک گروہ اس تعلیم پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں' ایمان لاتا ہے اور دوسرا ایمان نہیں لاتا تو صبر کے ساتھ دیکھتے رہو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔"

اس کی قوم کے سرداروں نے 'جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے' اس سے کہا"اے شعیب 'ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہو گا۔"شعیب نے جواب دیا"کیا زبر دستی ہمیں پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں۔ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے اگر تمہاری ملت میں پلٹ آئیں جبکہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے۔ہمارے لئے تو اس طرف پلٹنا اب کسی طرح ممکن نہیں الا یہ کہ ہمارا رب ہی ایسا چاہے ہمارے رب کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔اس پر ہم نے اعتماد کر لیا۔اے رب' ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیجئے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔" اس کی قوم کے سرداروں نے' جو اس کی بات ماننے سے انکار کر چکے تھے' آپس میں کہا"اگر تم نے شعیب کی پیروی قبول کر لی تو برباد ہو جاؤ گے۔"مگر ہوا یہ ایک دہلا دینے والی آفت نے ان کو آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ ایسے مٹے کہ گویا کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے۔شعیب کے جھٹلانے والے ہی آخر کار برباد ہو کر رہے اور شعیب یہ کہہ کر ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ"اے برادران قوم میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔اب میں اس قوم پر کیسے افسوس کروں جو قبول حق سے انکار کرتی ہے۔"

ان دو نمونوں کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ ان دو قصوں کے علاوہ جو اور قصے لائے گئے تھے ان کا حال کیا ہے۔ ان تمام قصوں میں ایک ہی نظریہ حیات کو پیش کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام اولاد آدم کے لئے بھیجا۔ ہر قوم کے پاس ایک رسول بھیجا اور تمام اقوام کے منکر مستکبرین نے رسولوں کے ماننے والے متبعین اور مستضعفین کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا۔یہ بات بھی تمام قصوں میں یکساں ہے کہ رسولوں اور ان کے ——— قلوب اور اذہان میں یہ نظریہ کس قدر واضح تھا اور یہ کہ ان رسولوں اور اہل ایمان کے دلوں کے اندر یہ خواہش کس طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ ان کی پوری قوم راہ ہدایت کو اختیار کرے اور جب رسولوں کی اقوام نے مکمل سرکشی اور عناد اور انکار کا مظاہرہ کر دیا تو رسولوں نے اور ان کے متبعین نے ان اقوام کے ساتھ پورا پورا بائیکاٹ کر دیا اور رسولوں نے یاد دہانی اور ڈراوے کا فریضہ ترک کر دیا۔اس لئے کہ جھٹلانے والوں نے انکار پر مکمل اصرار کیا اور کسی طرح بھی مان کر نہ دیا۔

اس مقام پر آکر اس سورہ میں تمام رسولوں کے قصص کا بیان رک جاتا ہے۔ایک مختصر تبصرہ آتا ہے اور اس تبصرے میں اللہ کی اس سنت کا تذکرہ ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے رسول آتے ہیں اور کوئی قوم ان کے پیغام اور دعوت کو مکمل طور پر رد کر دیتی ہے تو اللہ کی سنت اپنا کام کس طرح کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی اقوام کو مصائب و مشکلات سے دوچار کرتا ہے۔اس لئے کہ شاید ان کے دلوں کے اندر نرمی پیدا ہو جائے۔وہ خواب غفلت سے جاگ اٹھیں اور دعوت کو قبول کر لیں۔اور جب ان مصائب اور مشکلات کی وجہ سے وہ مائل بحق نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ انہیں چھٹی دے کر ان پر اچھے دن لے آتے ہیں۔ مشکلات کے مقابلے میں خوشحالی بہت ہی خطرناک فتنہ ہوتی ہے۔اچھے

دنوں میں وہ سنت الٰہیہ کو پوری طرح بھول جاتے ہیں۔ اور پھر اللہ کا ایک سخت عذاب انہیں اچانک آلیتا ہے درآں حالیکہ انہیں کوئی شعور و احساس نہیں ہوتا۔

جب اللہ اپنی اس سنت کی وضاحت فرماتے ہیں تو پھر انہیں اللہ کے اس عذاب سے خبردار کیا جاتا ہے جو انہیں اچانک آلے گا۔ اور وہ غفلت میں سو رہے ہوں گے ۔کیونکہ سنت الٰہیہ ان کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ یہ سورہ لوگوں کو اس طرح متوجہ کرتی ہے کہ کیا ان لوگوں کی تباہی کا نقشہ ان لوگوں کے لئے کافی نہیں کہ لوگ اپنے گھروں کے اندر پڑے کے پڑے رہ گئے۔

(وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ (٩٤) ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (٩٥) وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (٩٦) اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ (٩٧) اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ (٩٨) اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ (٩٩) اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَاۤ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (١٠٠) تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ (١٠١) وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ وَاِنْ وَّجَدْنَاۤ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ (١٠٢)) (٧: ٩٤ تا ١٠٢) "اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں نبی بھیجا ہو اور اس بستی کے لوگوں کو تنگی اور سختی میں مبتلا نہ کیا ہو' اس خیال سے کہ شاید وہ عاجزی پر اتر آئیں۔ پھر ہم نے ان کی بدحالی کو خوشحالی سے بدل دیا یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پھولے اور کہنے لگے: "ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور برے دن آتے رہے ہیں۔" آخر کار ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا اور انہیں خبر تک نہ ہوئی۔ اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش

اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے مگر انہوں نے تو جھٹلایا' لہذا ہم نے اس بری کمائی کے حساب میں انہیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔پھر کیا بستیوں کے لوگ اب اس سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ ہماری گرفت کبھی اچانک ان پر رات کے وقت نہ آجائے گی جبکہ وہ سوئے پڑے ہوں ؟ یا انہیں اطمینان ہوگیا ہے کہ ہمارا مضبوط ہاتھ کبھی یکایک ان پر دن کے وقت نہ پڑے گا کہ وہ کھیل رہے ہوں؟ کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں؟ حالانکہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو۔اور کیا ان لوگوں کو جو سابق اہل زمین کے بعد زمین کے وارث ہوئے ہیں اس امر واقعی نے کچھ سبق نہیں دیا کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے قصوروں پر انہیں پکڑ سکتے ہیں اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں پھر وہ کچھ نہیں سنتے۔یہ قومیں جن کے قصے ہم تمہیں سنا رہے ہیں ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے 'مگر جس چیز کو وہ ایک دفعہ جھٹلا چکے تھے اسے وہ ماننے والے نہ تھے۔دیکھو اس طرح ہم منکرین حق کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔ہم نے ان میں سے اکثر میں کوئی پاس عہد نہ پایا بلکہ اکثر کو فاسق ہی پایا۔

اس کے بعد قرآن کریم فرعون اور اس کے مددگاروں کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معرکے کی داستان کو لیتا ہے اور بنی اسرائیل کی کہانی شروع ہوتی ہے۔اس قصے کی اس سورہ میں تمام قرآن کریم کے مقابلے میں زیادہ تفصیلات دی گئی ہیں اور اس کے کئی حلقے یہاں تفصیل کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔بعض حلقے دینے کے بعد سیاق کلام میں ایک وقفہ دیا جاتا ہے اور اس میں اس پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔جب یہ قصہ ختم ہو جاتا ہے تو سورہ کے آخر تک اس پر طویل تبصرہ ہوتا ہے۔

اس سے قبل جو سورتیں نازل ہوگئی تھیں' ترتیب نزولی کے مطابق' سورہ مزمل' الفجر' ق اور القمر میں قصہ موسیٰ و فرعون کے مختصر اشارات دیئے گئے تھے۔یہ پہلی سورہ ہے جس میں اس قصے کی طویل کڑیاں لائی گئی ہیں اور وسیع حصوں کو لیا گیا ہے۔اس میں پہلے تو یہ کڑی لائی گئی ہے کہ فرعون نے دعوت اسلامی کا مقابلہ کس طرح کیا۔پھر جادوگروں کے چیلنج کو لایا گیا ہے۔یہ دونوں حصے دوسری سورتوں میں بھی مذکور تھے۔ایک نئی بات جو یہاں لائی گئی وہ یہ تھی کہ قوم فرعون پر برے دن آئے' آفات و بلیات 'طوفان' ٹڈی دل کے حملے' خون 'مینڈکوں اور سرسریوں کی کثرت وغیرہ عذاب ان پر آئے۔یہ تفصیلات صرف اسی سورہ میں دی گئیں' یہاں فرعون اور اس کی فوج کی غرقابی کا ذکر ہے۔اس کے بعد یہ عجیب بات کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ ان کے لئے ایک ایسا الٰہ بنائیں جو دوسری قوموں کے الٰہوں کی طرح ہو یعنی بت جس طرح سینائی میں انہوں نے بعض بت پرست اقوام کے ہاں دیکھا۔پھر حضرت موسیٰ کی مناجات کو بھی یہاں لایا گیا ہے جس میں آپ نے رویت باری کا مطالبہ کیا اور جب انوار الٰہی پہاڑ پر اترے تو وہ ریزہ ریزہ ہوگیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوگئے۔پھر تختیوں کا نزول اور بنی اسرائیل کی جانب سے بچھڑے کی پوجا۔پھر ستر افراد کے ساتھ موسیٰ کا طور پر جانا اور ان کا بے ہوش ہو جانا۔انہوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ وہ اللہ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔اس کے بعد ان کا ایک گاؤں میں آباد ہونا اور سبت کے دن شکار کرنا۔پھر ان کے اوپر پہاڑ کا سایہ فگن ہونا اور تمام تفصیلات جن کی وجہ سے یہ قصہ قرآن کریم کے ایک بہت بڑے حصے پر منتقل ہوگیا ہے۔

ایک موقعہ پر اس قصے میں سیاق کلام نبی آخرالزماں کی طرف پھر جاتا ہے اور آخری نبوت کی حقیقت اور اس کی

دعوت کے بنیادی عناصر سے بحث کی جاتی ہے۔ یہ اس وقت جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں کے بارے میں دعا کی جو بے ہوش ہوگئے تھے۔ اس کے بعد اللہ کی رحمت آئی۔ اس موقعے پر قرآن نے نبوت آخرہ کے بارے میں ایک جھلک دکھا دی کیونکہ ان قصص سے مراد اور غرض و غایت یہی تھی کہ لوگوں کو آخری نبوت کے بارے میں آگاہ کیا جائے۔ ملاحظہ کیجئے :

(وَاخْتَارَ مُوْسٰی قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ (۱۵۵) وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۵۶) اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۵۷)(۷ : ۱۵۵ تا ۱۵۷)) "اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو منتخب کیا تاکہ وہ ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر حاضر ہوں۔ جب ان لوگوں کو ایک سخت زلزلے نے آ پکڑا تو موسیٰ نے عرض کیا "اے میرے سرکار! آپ چاہتے تو پہلے ہی ان کو اور مجھے ہلاک کر سکتے تھے۔ کیا آپ اس قصور میں جو ہم میں سے چند نادانوں نے کیا تھا' ہم سب کو ہلاک کر دیں گے؟ یہ تو آپ کی ڈالی ہوئی ایک آزمائش تھی جس کے ذریعے آپ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت بخش دیتے ہیں۔ ہمارے سرپرست تو آپ ہی ہیں۔ پس ہمیں معاف کر دیجئے اور ہم پر رحم فرمایئے' آپ سب سے بڑھ کر معاف فرمانے والے ہیں۔ اور ہمارے لئے اس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجئے اور آخرت کی بھی' ہم نے آپ کی طرف رجوع کر لیا۔" جواب میں ارشاد ہوا: "سزا تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے' اور اسے میں ان لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے' زکوۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے جو اس پیغمبر' نبی امی کی پیروی اختیار کریں گے جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے' بدی سے

روکتا ہے' ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے' جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے' وہی فلاح پانے والے ہیں۔"

اس سچی خبر کی روشنی میں اور اس سابقہ عہد کے نتیجے میں' اللہ تعالیٰ نبی آخر الزماں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنی نبوت کے اساسی عناصر ترکیبی کا اعلان کر دیں اور یہ بتا دیں کہ آپ کی نبوت کے اہداف کیا ہیں اور اس رب ذوالجلال کی حقیقت کا اعلان کر دیں جس نے آپ کو بھیجا ہے اور اس نظریاتی اصل الاصول کا اعلان کر دیں جو تمام رسولوں کی دعوت کی اساس تھا۔

(قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِىِّ الْاُمِّىِّ الَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۷ : ۱۵۸)) "اے محمدؐ کہو "اے انسانو' میں تم سب کی طرف خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے' پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امی پر جو اللہ اور اس کے ارشاد کو مانتا ہے اور پیروی اختیار کرو اس کی' امید ہے کہ تم راہ راست پا لوگے۔"

اس واقعے کے بعد قصہ موسیٰ و فرعون آگے بڑھتا ہے۔ بنی اسرائیل کے ساتھ عہد' پہاڑ کا سایہ اور اس کے نتیجے میں ان کے ساتھ پختہ معاہدہ اور بنی اسرائیل کے اس عہد و پیمان ہی کی مناسبت سے اس عہد کا تذکرہ بھی کر دیا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی فطرت سے لیا تھا۔

(وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِىْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ (۱۷۲) اَوْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ (۱۷۳) (۷ : ۱۷۲–۱۷۳)) "اور اے نبی' لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا: "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" انہوں نے کہا: "ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں' ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔" یہ ہم نے اس لئے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ یہ تو اس بات سے بے خبر تھے۔" یا یہ نہ کہنے لگو کہ "شرک کی ابتداء تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے' پھر کیا آپ ہمیں اس تصور میں

پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا۔

اس کے بعد اس قصے پر کئی تبصرے سامنے آتے ہیں۔ایک تبصرہ فطری عہد کے بعد آتا ہے۔اس میں اس شخص کی صورت حال کا نقشہ کھینچا گیا ہے جسے اللہ نے اپنی نشانیاں عطاکیں اور وہ اس سے نکل گیا۔مثلاً بنی اسرائیل اور وہ تمام دوسری اقوام جنہیں اللہ نے اپنی نشانیاں عطاکیں لیکن انہوں نے ان کی پابندی نہ کی۔یہ ایک ایسا تبصرہ ہے جس میں تمام اشکال اور تمام حرکات اور اشارات ہماری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں اور سورہ انعام جیسے مناظر اور مشاہد سامنے آتے ہیں۔

(وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ (۱۷۵) وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۱۷۶) سَآءَ مَثَلَا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ (۱۷۷) مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۷۸) وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۱۷۹))(۷:۱۷۵ تا ۱۷۹)) "اور اے محمدؐ ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا۔مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا۔آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا۔یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعے سے بلندی عطا کرتے 'مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا' لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں۔تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو' شاید کہ یہ غور و فکر کریں۔بڑی ہی بری مثال ہے ایسے لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا' اور وہ آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرتے رہے ہیں جسے اللہ ہدایت بخشے بس وہی راہ راست پاتا ہے۔اور جسے اللہ اپنی راہنمائی سے محروم کر دے وہی ناکام و نامراد ہو کر رہتا ہے۔اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ان کے پاس دل ہیں مگر ان سے سوچتے نہیں' ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے ہیں۔وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے اور یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔

اب براہ راست نظریاتی مباحث آتے ہیں۔نظریاتی مباحث کے ساتھ بعض کائناتی شواہد و مؤثرات بھی پیش کیے

جاتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کے عذاب اور اس کی سخت پکڑ سے ڈرایا جاتا ہے۔ ان کے دلوں کو ٹٹولا جاتا ہے کہ وہ غور و فکر کریں' اللہ کی آیات میں تدبر کریں اور اس رسول اور اس کی رسالت کے بارے میں سوچ سے کام لیں۔

(وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِىْٓ اَسْمَآئِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۸۰) وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (۱۸۱) وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۸۲) وَاُمْلِىْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِىْ مَتِيْنٌ (۱۸۳) اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۱۸۴) اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِىْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَىْءٍ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ فَبِاَىِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ (۱۸۵) مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ وَيَذَرُهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۱۸۶) (۷ : ۱۸۰ تا ۱۸۶))

"اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے' اس کو اچھے ناموں ہی سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے نام رکھنے میں' وہ راستی سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں اس کا بدلہ وہ پاکر رہیں گے۔ ہماری مخلوق میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ہدایت اور حق ہی کے مطابق انصاف کرتا ہے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے' تو انہیں ہم بتدریج ایسے طریقے سے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انہیں خبر تک نہ ہو گی۔ میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں' میری چال کا کوئی توڑ نہیں۔ اور کیا ان لوگوں نے کبھی سوچا نہیں؟ ان کے رفیق پر جنون کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ تو ایک خبردار کرنے والا ہے جو صاف صاف متنبہ کر رہا ہے۔ کیا ان لوگوں نے آسمان و زمین کے انتظام پر کبھی غور نہیں کیا اور کسی چیز کو بھی جو خدا نے پیدا کی ہے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا؟ اور کیا یہ بھی انہوں نے نہیں سوچا کہ شاید ان کی مہلت زندگی پوری ہونے کا وقت قریب آ لگا ہو؟ پھر آخر پیغمبر کی اس تنبیہ کے بعد اور کون سی بات ایسی ہو سکتی ہے جس پر یہ ایمان لائیں؟ جس کو اللہ راہنمائی سے محروم کر دے اس کے لئے پھر کوئی راہنمائی نہیں ہے اور اللہ انہیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔

اس کے بعد اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو اپنی دعوت کی نوعیت سے آگاہ کریں اور اس نظریہ حیات میں رسول کے حدود کار سے آگاہ کریں۔ یہ بات ان کے اس سوال کے جواب میں آتی ہے جس میں انہوں نے رسول سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ اس قیامت کے وقت کا تعین کر دیں جس سے وہ انہیں ہر وقت ڈراتے رہتے ہیں۔

(یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰھَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُھَا عِنْدَ رَبِّیْ لَا یُجَلِّیْھَا لِوَقْتِھَآ اِلَّا ھُوَ ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِیْکُمْ اِلَّا بَغْتَةً یَسْئَلُوْنَکَ کَاَنَّکَ حَفِیٌّ عَنْھَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُھَا عِنْدَ اللّٰہِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۱۸۷) قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہُ وَلَوْ کُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۱۸۸) (۷: ۱۸۷ - ۱۸۸)) ”یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر وہ قیامت کی گھڑی کب نازل ہوگی؟ کہو اس کا علم میرے رب ہی کے پاس ہے۔ اسے اپنے وقت پر وہی ظاہر کرے گا۔ آسمانوں اور زمین میں وہ بڑا سخت وقت ہوگا۔ وہ تم پر اچانک آ جائے گا۔“ یہ لوگ اس کے متعلق تم سے اس طرح پوچھتے ہیں گویا کہ تم اس کی کھوج میں لگے ہوئے ہو۔ کہو ”اس کا علم تو صرف اللہ کو ہے مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔“ اے محمدؐ، ان سے کہو کہ ”میں اپنی ذات کے لئے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے، وہ ہوتا ہے۔ اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لئے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں ایک محض خبردار کرنے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں ان لوگوں کے لئے جو میری بات مانیں۔

---ooo---

اس کے بعد قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ نفس انسانی جس سے اللہ نے عہد لیا تھا کہ وہ راہ ہدایت پر قائم رہے گا کس طرح اس عقیدۂ توحید کو ترک کر دیتا ہے جس کا اقرار اس کی فطرت نے کیا تھا۔ یہاں شرک کی کراہت اور شریک معبودوں کی کمزوری کو بیان کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ان معبودوں کی تحدی کریں کہ وہ کس قدر عاجز ہیں۔

(قُلِ ادْعُوْا شُرَکَآءَکُمْ ثُمَّ کِیْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ (۱۹۵) اِنَّ وَلِیِّیَ اللّٰہُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ (۱۹۶) وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَکُمْ وَلَآ اَنْفُسَھُمْ یَنْصُرُوْنَ (۱۹۷) وَاِنْ تَدْعُوْھُمْ اِلَی الْھُدٰی لَا یَسْمَعُوْا وَتَرٰھُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (۱۹۸))(۷: ۱۹۵ تا ۱۹۸)) ”اے محمدؐ ان سے کہو کہ ”بلا لو اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو، پھر تم سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو، میرا حامی و ناصر وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت کرتا ہے، بخلاف اس کے تم جنہیں، خدا کو چھوڑ کر، پکارتے ہو وہ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد ہی کرنے کے قابل ہیں بلکہ اگر تم انہیں

سیدھی راہ پر آنے کے لئے کہو تو وہ تمہاری بات سن بھی نہیں سکتے۔ بظاہر تم کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر فی الواقعہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔"

اب آگے خطاب صرف حضور ؐ سے کیا جاتا ہے اور یہ آخر تک چلتا ہے۔ یاد رہے کہ سورہ کا آغاز بھی براہ راست حضور ؐ کے خطاب کے ساتھ ہوا تھا۔ یہاں حضور ؐ کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کریں گے۔ دعوت کو لے کر کس طرح بڑھیں گے۔ راستے کی مشکلات پر کس طرح قابو پائیں گے' لوگوں کی سازشوں اور ایذا رسانیوں پر کس طرح قابو پائیں گے۔ وہ اور اہل ایمان قرآن پر کس طرح کان دھریں گے۔ وہ اللہ کو ہر وقت کس طرح یاد کریں گے اور اس کے ساتھ ایک تعلق کس طرح قائم رکھیں گے۔ نیز یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے ہاں ملائکہ کس طرح اللہ کو یاد کرتے ہیں۔

(خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (۱۹۹) وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۰۰) اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (۲۰۱) وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ (۲۰۲) وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۲۰۳) وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۲۰۴) وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ (۲۰۵) اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ (۲۰۶) (۷ : ۱۹۹ تا ۲۰۶)) "اے نبی' نرمی اور درگزر کا طریقہ اختیار کرو' معروف کی تلقین کئے جاؤ' اور جاہلوں سے نہ الجھو۔ اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو۔ وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگ جاتا ہے کہ ان کے لئے صحیح طریق کار کیا ہے۔ رہے ان کے (شیطانوں کے) بھائی بند' تو وہ انہیں کج روی میں کھینچے لئے چلے جاتے ہیں اور انہیں بھٹکانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ اے نبی' جب تم ان لوگوں کے سامنے کوئی نشانی پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے ان کے لئے کوئی نشانی کیوں نہ انتخاب کر لی؟ ان سے کہو "میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں۔ جو

میرے رب نے میری طرف بھیجی ہے - یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اسے قبول کریں - جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو' شاید کہ تم پر بھی رحمت کی جائے -" اے نبی اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو - دل ہی دل میں زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ - تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں - جو فرشتے تمہارے رب کے حضور تقرب کا مقام رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آکر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کے آگے جھکتے ہیں -"

امید ہے کہ اس خلاصے اور ان اقتباسات سے سورہ اعراف کے خدوخال واضح ہو گئے ہوں گے - اور اس میں اور سورہ انعام میں فرق و امتیاز بھی واضح ہو گیا ہو گا کہ دونوں سورتیں ایک ہی موضوع کو کس طرح مختلف انداز میں بیان کرتی ہیں - دونوں کا موضوع اسلامی عقیدہ اور نظریہ حیات ہے - جہاں تک ہر موضوع پر تفصیلی بات کا تعلق ہے وہ نصوص پر تفصیلی بحث کے وقت آئے گی - ان شاء اللہ' اللہ کے فضل و کرم سے!

---ooo---

سورۃ الاعراف مکیۃ (۳۹) آیاتھا ۲۰۶ رکوعاتھا ۲۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

درس نمبر ۲۷ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۹

(المٓصٓ) الف لام میم صاد' سورہ کا آغاز ان حروف مقطعات سے کیا گیا ہے ۔ سورہ بقرہ کے آغاز میں ہم ان پر بحث کر آئے ہیں ۔ اسی طرح سورہ آل عمران کے آغاز میں بھی ۔ ان کی تفسیر کے سلسلے میں ہم نے اس رائے کو ترجیح دی ہے کہ ان سے مراد یہ ہے کہ یہ سورہ ایسے ہی حروف سے بنی ہوئی ہے اور عربی زبان کے ان حروف تہجی کو تمام لوگ استعمال کرتے ہیں لیکن کوئی شخص اس میٹریل سے قرآن جیسا کلام نہیں بنا سکتا اور یہ بذات خود اس بات کے لئے شاہد عادل ہے کہ قرآن انسان کا بنایا ہوا کلام نہیں ہے کیونکہ یہ حروف اور عربی زبان کے الفاظ ان کے سامنے موجود ہیں ۔ لیکن وہ ان سے قرآن نہیں بنا سکتے ۔ ہم نے یہ رائے بطور ترجیح اختیار کی ہے ۔ ہم جزم سے کوئی بات نہیں کہہ سکتے واللہ اعلم ۔

اس لحاظ سے پھر ترکیب یوں ہوگی کہ المص مبتدأ ہے اور کتاب انزل الیک اس کی خبر ہے ۔ یعنی ان حروف اور کلمات سے مرکب یہ کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے ۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ (المٓصٓ) صرف اشارہ ہے جس سے یہ مفہوم اخذ ہوتا ہے اور کتاب خبر ہے اور مبتدأ محذوف ہے یعنی (هٰذَا كِتٰبٌ)

الٓمّٓصٓ ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾

”ا' ل' م' ص ۔ یہ ایک کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے' پس اے نبی ؐ تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو ۔ اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے (منکرین کو) ڈراؤ اور ایمان لانے والوں کو نصیحت ہو ۔“

یہ کتاب تمہاری جانب اتاری گئی ہے تاکہ تم لوگوں کو بھلایا ہوا سبق یاد دلاؤ اور انجام بد سے ڈراؤ ۔ اس میں جو سچائی ہے اسے صاف صاف لوگوں کے سامنے بیان کر دیں اور اس بات کا خیال نہ کریں کہ لوگ اسے پسند کرتے ہیں یا نہیں ۔ یہ کتاب آئی ہی اس لئے ہے کہ لوگوں کے سامنے وہ حقائق پیش کرے جسے وہ پسند نہیں کرتے' یہ آئی ہی اس لئے ہے کہ غلط عقائد' رسومات اور غلط تعلقات کو ختم کرے اور باطل نظامہائے حکومت' باطل قوانین اور باطل معاشروں کا مقابلہ کرے ۔ لہذا اس کتاب کی راہ میں مشکلات بہت ہیں' اس کتاب کا پیغام لے کر جو بھی آئے گا' اسے مشکلات کو انگیز کرنا ہوگا ۔ اس کتاب کے اس پہلو کا ادراک وہی شخص کر سکتا ہے' جیسا کہ ہم نے سورہ پر

تبصرے کے وقت کہا' جو اس کے پیغام کو لے کر اٹھے ۔ اس کتاب کے نظریات کا اعلان بانگ دہل کر دے اور اس راہ میں جو مشکلات پیش ہوں انہیں برداشت کرے ۔ اس حقیقت کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو اس کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے لئے اہداف طے کرے اور وہ جاہلی معاشرے کو جڑوں سے' اس کے تنے اور شاخوں سمیت اکھاڑ پھینکنے اور اس کی جگہ مکمل تغیر اور انقلاب لانے کا داعیہ اپنے اندر رکھتا ہو' جس طرح اس کتاب کے حامل اول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لے کر دنیا میں انقلاب برپا کیا تھا اور طاغوت اور جاہلیت کا مقابلہ کیا اور پہلے جزیرۃ العرب میں اور پھر پوری دنیا کی کایا پلٹ دی تھی ۔

اس کتاب کے ساتھ یہ طرز عمل اس وقت جزیرۃ العرب اور اس کے ارد گرد کے ماحول میں لائے جانے والے انقلاب تک ہی موقوف و مخصوص نہ تھا' کیونکہ اسلام کوئی حادثہ یا تاریخ نہیں ہے کہ ایک وقفہ تاریخ میں واقعہ ہو گیا اور اس کے بعد لوگوں نے اسے تاریخ میں لکھنا شروع کر دیا ۔ اسلام تو انسانیت کے بالمقابل ایک دائمی تحریک ہے اور یہ تحریک قیامت تک رہے گی ۔ اسلام لوگوں کے لئے وہی پیغام ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے تھا ۔ جب بھی انسانیت صراط مستقیم سے انحراف کرے' اسلام اسے روکتا ہے اور واپس اسے جادہ مستقیم پر ڈال دیتا ہے اس لئے کہ تاریخی عوامل کے تحت انسانیت بار بار جاہلیت کی طرف لوٹ جاتی ہے ۔ یہ اس کی پسماندگی اور رجعت ہوتی ہےلیکن اسلامی تحریک اس مرحلے پر آگے بڑھتی ہے۔ دوبارہ اسلام کی تجدید ہو جاتی ہے اور اس کمزوری کے بعد اسلام دوبارہ ایک قوت بن کر اٹھتا ہے اور دوبارہ انسانیت کو ترقی اور تہذیب و تمدن کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔ ہر دور میں اس تحریک کے قائدین کو وہ مشکلات پیش آتی ہیں جو داعی اول کو پیش آئیں' اس لئے کہ جب انسانیت جاہلیت کے گندے کیچڑ میں لت پت ہوتی ہے تو انہیں اس پوری انسانیت کو کھینچ کر واپس لانا ہوتا ہے' کیونکہ جاہلیت میں انسانیت فکری گمراہی میں مبتلا ہوتی ہے ۔ اس کے تصورات تاریک ہو جاتے ہیں' وہ نفسیاتی خواہشات کی تاریکیوں میں گرفتار ہوتی ہے' وہ ظلم اور ذلت' غلامی اور ذاتی خواہشات' مفادات و اغراض کا شکار ہوتی ہے اور جو شخص انسانیت کو اس جاہلیت اور گندگی سے نکالنا چاہتا ہے' اسے اس قسم کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ اس لئے کہ وہ اس جہان کو ان گندگیوں سے پاک کرنے کے لئے تحریک چلاتا ہے اور اس تحریک میں وہ اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کو خوب سمجھ سکتا ہے ۔

(الٓمّٓصٓ (۱) كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۲) (۷ : ۱ - ۲)) "ا' ل' م' ص ۔ یہ ایک کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے' پس اے نبی تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو ۔ اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے (منکرین کو) ڈراؤ اور ایمان لانے والوں کو نصیحت ہو ۔"

ایک مومن اپنے معاشرے کے حالات سے یہ اندازہ کر لیتا ہے کہ مومن کون ہیں جنہیں نصیحت کی جاتی ہے اور غیر مومن کون ہیں جن کے لئے انذار کا حکم ہے ۔ اس تحریکی کارکن کے لئے یہ قرآن ایک زندہ کتاب ہوتی ہے' جسے پڑھتے ہوئے وہ محسوس کرتا ہے کہ گویا یہ کتاب ابھی نازل ہو رہی ہے ۔ یہ کتاب اس شخص کے لئے تازہ پیغام ہوتی ہے جب وہ اسے بطور پیغام لے کر پوری دنیا کے خلاف جدوجہد شروع کر دے ۔

اس وقت پوری انسانیت کی حالت ویسی ہی ہے جس طرح اس وقت تھی جب یہ کتاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ اس وقت حضور ؐ کو حکم تھا کہ آپ تذکیر اور انذار کا فریضہ سرانجام دیں اور جب آپ جاہلیت کے مقابلے میں اٹھیں تو آپ کے دل میں کوئی جھجک نہیں ہونا چاہئے۔ آپ کے اندر یہ داعیہ ہونا چاہئے کہ آپ نے جاہلیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔

آج گردش دوراں نے حالات کو اسی مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جس طرح آج سے چودہ سو سال پہلے نزول قرآن کے وقت تھے۔ اس وقت دنیا مکمل طور پر جاہلیت کی طرف لوٹ گئی ہے۔ اس نے اصول و فروع دونوں میں جاہلیت کو اپنا لیا ہے' اس کا ظاہر و باطن اور اس کی سطح اور گہرائی سب کی سب جاہلیت میں ہے۔

اس وقت انسانیت کے تمام تصورات و نظریات جاہلی ہیں۔ یہاں تک کہ جن کے آباؤ اجداد مومن تھے اور مومنین مخلصین تھے انہوں نے بھی پوری طرح جاہلی افکار کو اپنا لیا ہے۔ ان کے تصورات و خیالات میں دین اسلام کا وہ مفہوم باقی نہیں رہا جو حقیقت میں ہے۔ انہوں نے اسلامی نظام کا مفہوم ہی بدل دیا ہے۔

یہ دین تو اس دنیا میں اس لئے آیا تھا کہ وہ اس کرۂ ارض کے خدوخال ہی بدل دے اور اس کی جگہ اسے ایک نیا روپ دے۔ یہاں صرف اللہ کا اقتدار اعلیٰ قائم کرے اور طاغوت کے اقتدار کا خاتمہ کر دے۔ یہ دنیا ایسی دنیا ہو جس میں صرف اللہ کی مکمل بندگی ہو' اور اللہ کے علاوہ انسانوں میں سے کوئی اپنی بندگی نہ کرائے۔ ایک ایسی دنیا ہو جس میں لوگ آزادی کے ساتھ انسانوں کی بندگی سے باہر نکل آئیں۔ اس دنیا میں آزاد' شریف اور پاکدامن انسان پیدا ہوں' وہ خود اپنی شہوات سفلیہ سے بھی آزاد ہوں اور دوسرے لوگوں کی غلامی سے بھی آزاد ہوں۔

یہ دین اس لئے آیا تھا کہ دنیا میں یہ اصول قائم کرے (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) یعنی اللہ کے سوا کوئی حاکم اور مقتدر اعلیٰ نہیں ہے۔ انسانی تاریخ میں تمام انبیاء یہی دعوت لے کر آتے ہیں۔ یہ سورہ اور قرآن کریم کی دوسری نصوص و آیات اس بات کی صراحت کرتی ہیں کہ (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کا مفہوم صرف یہی ہے کہ اقتدار اعلیٰ اللہ کے سوا کسی اور کا نہیں ہے اور جس طرح اللہ اس کائنات کے اوپر حاکم ہے' اسی طرح وہ انسان کی زندگی کے اوپر بھی حاکم ہے۔ وہ اپنے نظام قضا و قدر کے ذریعے اس کائنات اور خود انسان کی طبیعی زندگی پر حکمران ہے لہٰذا وہ انسانوں کے قانونی اور ذاتی نظام کے متعلق امور پر بھی حاکم ہے۔ اس اصول کے تحت جس طرح ایک مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ اس جہاں کی تکوینی زندگی میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ صرف وہی متصرف ہے اور ایک مسلمان بندگی کے مراسم جس طرح صرف اللہ کے سامنے بجا لاتا ہے اسی طرح دستور و قانون میں بھی وہ صرف اسی اللہ کا مطیع ہے۔ وہ اپنی اقدار اور حسن و قبح کے پیمانے بھی اسی سے اخذ کرتا ہے۔ عقائد و نظریات بھی اللہ سے اخذ کرتا ہے اور وہ ہرگز کسی طاغوت کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اللہ کے اس اقتدار اعلیٰ کا کوئی حصہ اپنے لئے مختص کر لے یا اللہ کے ساتھ شریک ہو جائے۔

غرض اعتقاد و نظریے کے اعتبار سے یہ اس دین کا بنیادی اصول ہے۔ اس اصول کی روشنی میں اگر ہم آج دنیا پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا نے اس اساسی اصول کو ترک کر دیا ہے۔ اس دنیا میں فرقے فرقے ہیں اور یہ سب فرقے جاہلیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

ایک گروہ ملحدین کا گروہ ہے اور یہ لوگ سرے سے وجود باری تعالیٰ کے منکر ہیں' ان پر کسی تبصرے کی کوئی

ضرورت نہیں ہے۔ ایک گروہ بت پرستوں کا ہے' جو ایک اللہ کے وجود کے تو قائل ہیں لیکن وہ اس خدا کے ساتھ دوسرے خداؤں کو شریک کرتے ہیں اور انہوں نے کئی رب بنا رکھے ہیں مثلاً ہند اور وسطی افریقہ اور بعض دوسرے علاقوں میں بھی ایسے لوگ ہیں۔

ایک گروہ اہل کتاب کا ہے یعنی یہود و نصاریٰ کا۔ یہ لوگ اللہ کے بیٹے کے قائل ہیں اور بیٹے کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں اور اپنے احبار اور رہبان کو ایسا سمجھتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے احبار و رہبان کی حاکمیت اعلیٰ اور حق قانون سازی کو تسلیم کر لیا ہے اگرچہ یہ ان کی نماز نہیں پڑھتے اور ان کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوتے اور نہ ان کے سامنے جھکتے ہیں۔ آج کے دور میں عیسائیوں نے اپنی زندگی سے اللہ کے اقتدار کو خارج کر دیا ہے اور انہوں نے اپنے لئے نظامہائے زندگی تجویز کر لئے ہیں جنہیں وہ سرمایہ داری' اشتراکیت اور دوسرے ناموں سے پکارتے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے نظامہائے حکومت بھی تجویز کر لئے ہیں جسے وہ جمہوریت اور ڈکٹیٹرشپ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے اللہ کے اصول و دستور کو کلیتاً ترک کر دیا ہے۔ جیسا کہ یونانی اور رومی جاہلیت نے اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو ترک کر کے اپنا نظام زندگی اور نظام حکومت خود گھڑ لیا تھا۔

ایک گروہ وہ ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے لیکن اپنی زندگی میں وہ اہل کتاب کے نظام کا مطیع ہے۔ وہ پوری طرح اہل مغرب کے عیسائیوں کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ فرقہ اللہ کے نظام کو ترک کر کے اہل مغرب کے نظام کو اپنا چکا ہے۔ اللہ کا دین قرآن و سنت اور اسلامی شریعت ہے اور یہی اسلامی نظام قانون و دستور ہے اور انسانوں کا دین انسانوں کا بنایا ہوا دستور اور قانون ہے۔

لہٰذا بات یہی ہے کہ زمانہ گردش کر کے اسی مقام پر آگیا ہے جس پر اس وقت تھا جب پہلے پہل دین اسلام انسانوں کی ہدایت کے لئے آیا۔ لوگ دین اسلام کو ترک کر کے جاہلیت کی طرف لوٹ گئے ہیں اور فرقے فرقے بن گئے ہیں لیکن کوئی فرقہ دین اسلام کا مطیع نہیں ہے۔ آج قرآن پوری انسانیت کے لئے اسی طرح دعوت فکر و عمل ہے جس طرح اپنے نزول کے وقت تھا۔ اس دین کا آج بھی ہدف یہ ہے کہ انسان کو سب سے پہلے عقیدے اور نظریات کے زاویے سے اسلام میں داخل کرے' پھر نظام زندگی اور میدان عمل کو اسلام کے مطابق ڈھالا جائے۔ چنانچہ آج جو شخص بھی قرآنی دعوت کو لے کر اٹھتا ہے وہ ویسی ہی مشکلات سے دوچار ہو گا جس طرح کی مشکلات سے رسول اللہ دوچار ہے تھے۔ کیونکہ آپ نے جب انسانیت کو خطاب فرمایا تو وہ جاہلیت کی گندگی میں آلودہ تھی۔ جاہلیت کے صحرا میں گم کردہ راہ تھی۔ اس نے شیطان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا اور بھٹک رہی تھی۔ لہٰذا آج پہلا ہدف یہ ہونا چاہئے کہ لوگوں کے دل میں کلمہ شہادت کے مطابق اسلامی تصور حیات اور اسلامی سوچ پیدا کی جائے اور دنیا میں ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں صرف اللہ کی عبادت ہو' اور اللہ کے سوا کوئی اور حاکم اور مقتدر اعلیٰ نہ ہو۔ یوں انسان کو ایک نئی اسلامی زندگی عطا کی جائے جس میں انسان انسانوں کی زندگی سے آزاد ہو کر اور اپنی خواہشات سے آزاد ہو کر صرف اللہ کی بندگی میں داخل ہو جائے۔

اسلام کوئی تاریخی حادثہ نہیں ہے کہ وہ ایک دفعہ پیش آگیا اور پھر جس طرح اس سے پہلے کا دور ایک تاریخ ہے اور بعد کا دور بھی ایک تاریخ ہے۔ اسے آج بھی وہی کردار ادا کرنا ہے جو اس نے ایک بار پہلے ادا کیا تھا۔ وہ اس طرح کام کرے گا جیسے حالات اور واقعات میں' جیسے نظام اور معاشرے میں' جیسے عقائد و تصورات میں' جیسی اقدار اور پیمانوں میں اس نے

پہلے کام کیا تھا اور نظام باطل کا مقابلہ کیا تھا۔

یاد رہے کہ جاہلیت ایک صورت حال ہوتی ہے۔ جاہلیت تاریخ کے کسی مخصوص دور کا نام نہیں ہے۔ اس وقت اطراف عالم میں یہ جاہلیت چھائی ہوئی ہے۔ تمام فرقوں' تمام تصورات' تمام مذاہب اور تمام نظامہائے زندگی میں جاہلیت قائم و دائم ہے۔ اس کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان انسانوں کے غلام ہوں اور اس میں اللہ کی ہمہ گیر حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کا انکار ہو۔ اس کا دوسرا اصول یہ ہے کہ وہ انسانی خواہشات پر قائم ہوتی ہے' چاہے ان کی شکل و صورت جو بھی ہو۔ اس کی اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں اللہ کی شریعت کو بطور نظام حکومت تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس کے بعد اس کی شکل وصورت' اس کے خدو خال' اس کے جھنڈے اور شعائر' اس کے نام و القاب' اس کے گروہ اور مذاہب اور اس کے ملل و نحل اگرچہ مختلف ہوتے ہیں لیکن ان تمام میں مذکورہ بالا اساسی ضابطے اور اصول موجود ہوتے ہیں۔

ان اصولوں کی روشنی میں' آج اگر دنیا پر نظر ڈالی جائے تو اس میں ہر طرف جاہلیت چھائی ہوئی ہے۔ بلکہ اس وقت پوری دنیا پر جاہلیت حکمران ہے۔ اس وقت دنیا میں اسلامی نظام زندگی معطل ہے اور جو لوگ اس وقت دنیا میں اسلامی نظام زندگی کی طرف دعوت دے رہے ہیں' انہیں ویسی ہی مشکلات درپیش ہیں جیسی حضور اکرمؐ کو درپیش تھیں۔ ان کا ہدف وہی ہے جو رسول اللہ کا تھا اور آج یہ آیت ان سے اسی طرح مخاطب ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب تھی۔

(كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ

(۷:۲)) "یہ ایک کتاب ہے جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے' پس اے نبی تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو۔" اس وقت دنیا میں جس قدر معاشرے موجود ہیں' وہ جاہلی معاشرے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ پسماندہ' رجعت پسند معاشرے ہیں کیونکہ وہ دوبارہ جاہلیت کی طرف لوٹ گئے ہیں حالانکہ اسلام نے انہیں اس جاہلیت سے نجات دی تھی۔ آج بھی اسلام کا یہ فرض ہے کہ وہ ان جاہلی معاشروں کو رجعت پسندی اور پسماندگی سے نجات دے۔ اور ترقی اور ربانی ہدایات کے مطابق تہذیب و تمدن کے حصول کے لئے ان کی قیادت کے فرائض سرانجام دے۔

جب اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کے لئے مخصوص ہو جائے اور یہ اقتدار ایک معاشرے کی صورت میں روبعمل آجائے جس میں اسلامی شریعت نافذ ہو' تو یہی ایک صورت حالات ہوگی جس میں انسانیت انسانوں کی غلامی سے پوری طرح آزاد ہوگی۔ وہ ہوائے نفس اور مطلب پرستی کی غلامی سے آزاد ہوگی اور صرف یہی صورت حالات اسلامی اور متمدن صورت حالات ہوگی' اسلامی اقدار کے مطابق' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جس تہذیب و تمدن کو انسان کے لئے پسند فرماتے ہیں وہ ہر فرد کی مکمل آزادی اور شرف کے اصول پر مبنی ہے۔ اس طرح کا کوئی تمدن اللہ کو پسند نہیں ہے جس میں انسان کو ایسی آزادی حاصل ہو جس میں وہ دوسرے انسانوں کا غلام ہو اور جس میں انسان انسانوں کے رب اور خدا ہوں اور ان کے حاکم اور قانون ساز ہوں۔ بعض تابع ہوں اور بعض متبوع اور حاکم ہوں۔ قانون سازی سے مراد محض رسمی قوانین ہی نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد حسن و قبح کے پیمانے' اخلاق اور رسم و رواج بھی ہیں۔ یہ سب قوانین و ضوابط ہیں اور لوگ ان کے تابع ہوتے ہیں چاہے لوگ شعوری طور پر ان کے پابند ہوں یا غیر شعوری طور پر۔ اس قسم کے معاشروں کو

رجعت پسند اور پسماندہ معاشرے تصور کیا جاتا ہے اور اسلامی اصطلاح کے مطابق انہیں جاہلی معاشرے کہا جاتا ہے۔

جب کسی معاشرے میں اجتماعیت کی اساس نظریہ حیات پر ہو' اس کی اساس پر ایک نظام حیات بھی ہو اور یہ تصور اور نظام دونوں کا مصدر ذات باری تعالیٰ ہو'کسی ایک فرد کی خواہش نہ ہو'کسی ایک بندے کا ارادہ نہ ہو' تو یہ معاشرہ ترقی یافتہ مہذب معاشرہ ہو گا۔ اسلامی اصطلاح کے مطابق اسے ربانی اور مسلم معاشرہ کہا جائے گا۔ کیونکہ اس معاشرے میں اجتماعیت انسانی خواص پر نہ ہو گی بلکہ روحانی اور فکری تصورات پر ہو گی۔ لیکن اگر کسی اجتماعی نظام اور معاشرے کی اساس قوم'نسل وغیرہ اور زمین کی اساس پر ہو تو ایسا معاشرہ رجعت پسند اور پسماندہ معاشرہ کہلائے گا یا اسلامی اصطلاحات کے مطابق اسے جاہلی اور مشرک معاشرہ کہا جائے گا۔ اس لئے کہ قوم و نسل اور زمین و رنگ کوئی اعلیٰ انسانی اقدار نہیں ہیں کیونکہ انسان کسی نسل'کسی قوم'کسی زمین'کسی رنگ میں بھی ہو وہ بہرحال انسان رہتا ہے۔ اور اس کے اندر اگر کوئی فرق ہوتا ہے تو روح اور فکر کے ذریعے ہوتا ہے۔

انسان اپنے آزادانہ اختیار اور ارادے سے اور یہ اختیار ارادہ وہ عظیم شرف ہے جو انسان کو عطا ہوا ہے' اپنے عقائد و اپنے تصورات کو بدل سکتا ہے'بشرطیکہ اپنے فہم کے ادراک کے ذریعے وہ کسی سمت میں مائل ہو جائے اور اسے اطمینان ہو جائے' اس صورت میں گمراہی کو ترک کر کے ہدایت اپنا سکتا ہے' اور کوئی اچھا نظام حیات اپنا سکتا ہے' لیکن کوئی انسان اپنی نسل'اپنا رنگ'اپنی قوم اور اپنے اس ملک کو نہیں بدل سکتا اور زمین کا تعین نہیں کر سکتا۔ اس لئے وہ معاشرہ اور وہ اجتماعی نظام جسے لوگوں نے خود اپنے آزادانہ ارادہ سے اپنایا ہو وہ بہتر ہے یا وہ نظام جس کے اندر کوئی شخص مقہور و مجبور ہو۔ اور اس میں اس کی آزادی اور ارادے کا کوئی دخل نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت حالات شرف انسانیت کے لئے اعلیٰ و ارفع ہے اور اسے زیادہ ترقی پسندانہ کہا جاسکتا ہے۔

اگر کسی معاشرے میں انسان کی انسانیت ہی اعلیٰ قدر قرار پائے انسان کے انسانی خصائص اہمیت اور رعایت کے مستحق قرار پائیں تو وہ معاشرہ ترقی پسند اور مہذب معاشرہ قرار پائے گا اور اسلامی اصطلاح میں وہ ربانی اور مسلم معاشرہ ہو گا۔ لیکن اگر کسی معاشرے کی اساس مادے پر ہو' چاہے جس شکل و صورت میں بھی وہ ہو' اور مادہ ہی اعلیٰ قدر ہو' وہ مارکسی نظریات کے مطابق ہو' یا مادی پیداوار کے نظریہ کے مطابق ہو۔ مثلاً یورپ و امریکہ کے تمام معاشرے جہاں اعلیٰ قدر و قیمت مادی پیداوار ہے جس کے لئے انہوں نے تمام اعلیٰ انسانی اقدار اور انسانی خصوصیات کو قربان کر دیا ہے۔ اس کے لئے ان معاشروں نے تمام اخلاقی اقدار کو ثانوی حیثیت دے دی ہے تو یہ معاشرہ پسماندہ اور رجعت پسند معاشرہ تصور ہو گا اور اسلامی اصطلاح میں اسے جاہلی اور مشرکانہ معاشرہ کہا جائے گا۔

اسلام کا ربانی معاشرہ بھی مادے کو حقارت کی نظروں سے نہیں دیکھتا' نہ اس نقطہ نظر سے کہ اس پوری کائنات کی تشکیل اسی مادے سے ہوئی ہے اور نہ اس اعتبار سے کہ اس سے پیداوار حاصل کر کے انسان کو اس سے استفادہ کرنا چاہئے'کیونکہ مادہ اور مادی پیداوار اس کرۂ ارض پر انسان کے لئے اپنے فرائض خلافت ادا کرنے کے لئے ازحد ضروری ہیں۔ دنیا کی حلال چیزوں سے فائدہ اٹھانا اسلام جائز سمجھتا ہے بلکہ اس کی دعوت دیتا ہے جیسا کہ آگے ہم اس سورہ میں بتائیں گے لیکن اسلام مادے اور مادی پیداوار کو اس کائنات کی اعلیٰ قدر قرار نہیں دیتا جس کے حصول کے لے اعلیٰ انسانی اقدار کو قربان کر دیا جائے جیسا کہ تمام جاہلی اور مادی معاشرے کرتے ہیں۔

انسانی اقدار اور انسانی اخلاق ہی اگر کسی معاشرے میں سربلند ہوں' اس طرح جس طرح انہیں اللہ تعالیٰ نے وضع کیا ہے تو یہ معاشرہ مہذب اور ربانی معاشرہ ہو گا۔ اب سوال یہ ہے کہ انسانی اخلاق کیا ہیں اور انسانی اقدار کیا ہیں؟ تو یہ کوئی پوشیدہ اور ناقابل فہم مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی اخلاق و اقدار تغیر پذیر ہوتے ہیں یا ایک حالت پر نہیں رہتے جیسا کہ وہ لوگ رائے رکھتے ہیں جو اسلام کے اخلاقی نظام میں طوائف الملوکی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اعلیٰ اقدار اور اعلیٰ اخلاقی معیار انسان کی ان خصوصیات کو اجاگر کرتے ہیں جن میں وہ دوسرے حیوانات کے مقابلے میں منفرد ہے۔ انسان کے انسانی پہلو کو اس کے حیوانی پہلو پر غالب کرتے ہیں۔ اخلاقی قدریں انسان اور حیوان کے درمیان مشترکہ خصوصیات کو پروان نہیں چڑھاتیں۔ اگر اس مسئلے کو اس انداز سے لیا جائے تو اعلیٰ اقدار اور اخلاق اور محض حیوانیت کے درمیان ایک حد فاصل قائم ہو جائے گی اور اعلیٰ قدروں کو اچھی طرح سمجھا جا سکے گا۔ چنانچہ اس طرح ترقی پسندوں کے تمام فلسفے ڈھیر ہو جاتے ہیں اور سرمایہ دارانہ اخلاق' اشتراکی اخلاق' غرباء کے اخلاق اور مالداروں کے اخلاق جیسی کوئی تقسیم نہیں باقی رہتی' صرف انسانی اخلاق اور حیوانی اخلاق رہ جاتے ہیں۔ اس طرح معاشرتی اخلاق اور معاشی اخلاق کی تقسیم کوئی مستقل تقسیم نہ رہے گی۔ یہ چیزیں تعمیر اخلاق میں مستقل عوامل شمار نہیں ہوں گی اور تعمیر اخلاق میں ان کا اثر حتمی تصور ہو گا۔ اس زاویہ سے ایک طرف انسانی اخلاق اور انسانی اقدار ہوں گی اور یہ اسلامی معاشرے کے اخلاق ہوں گے اور دوسری جانب حیوانی اخلاق اور اقدار ہوں گی اور اسے پسماندہ کہا جائے گا۔ اسلامی اصطلاحات میں اس تقسیم کو اسلامی اور ربانی اخلاق و اقدار اور رجعت پسندانہ جاہلی اخلاق و اقدار کہا جاتا ہے۔

وہ معاشرے جن پر حیوانی خواہشات اور میلانات چھائے ہوئے ہوتے ہیں' وہ کبھی مہذب معاشرے نہیں بن سکتے۔ اگرچہ وہ صنعتی اور اقتصادی اعتبار سے بہت ہی ترقی یافتہ ہوں۔ انسان کی ترقی میں یہ معیار کبھی غلط ثابت نہیں ہوا ہے۔

دور جدید کے جاہلی معاشروں نے اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ اقدار کو ان تمام شعبوں سے نکال دیا ہے جن کا تعلق انسان کے حیوانی پہلو سے ہے۔ ان معاشروں میں فری سیکس کا اصول کار فرما ہے۔ ان لوگوں کے ہاں نہایت ہی سوقیانہ جنسی حرکات کو بھی جائز سمجھا جاتا ہے۔ ان کے ہاں اگر ان کا کوئی قومی مفاد تقاضا کرتا ہو تو وہ شخصی معاملات' اقتصادی روابط اور سیاست میں اخلاق کے قائل ہیں' اپنی قومی مصلحتوں کے دائرے کے اندر اندر۔ ان ممالک کے صحافی' ادیب اور میڈیا کے تمام شعبے نوجوانوں کو جنسی بے راہ روی کی تعلیم دیتے ہیں اور ان میں جنسی اتصال کو اخلاق رزیلہ میں شمار نہیں کیا جاتا۔

اس قسم کے معاشرے اسلامی نقطہ نظر سے پسماندہ معاشرے ہیں اور انسانی زاویہ سے بہت ہی گرے ہوئے ہیں۔ اسلامی لحاظ سے تو یہ اس لئے قابل رد ہیں کہ اسلام انسان کی حیوانی خواہشات کو ضبط میں لاتا ہے اور اس کے انسانی پہلوؤں کو نرمی دیتا ہے اور انسانی پہلو کو حیوانی پہلو پر غالب کرتا ہے۔

آج کے انسانی معاشروں پر یہاں ہم اس سے زیادہ بحث نہیں کر سکتے۔ یہ معاشرے درحقیقت جاہلیت میں غرق ہیں۔ نظریات سے لے کر اخلاق تک میں اور تصورات سے لے کر طرز عمل تک میں۔ ان معاشروں کے خدوخال کی وضاحت کے لئے یہ اشارات' میں سمجھتا ہوں یہاں کفایت کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں ان کا تعارف ان اشارات سے ہو جاتا ہے۔ ہمارے دور میں تحریک اسلامی کا اپنے اہداف' دعوت اسلامی اور احیائے دین کے لئے اس قدر تعارف کافی

ہے - آج کی دعوت دین اور تحریک اسلامی کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسانیت کو از سرنو اسلام کی طرف دعوت دی جائے' نظریات کے اعتبار سے بھی' اخلاق کے اعتبار سے بھی اور نظام زندگی کے اعتبار سے بھی - یہ وہی جدوجہد ہے جس کا آغاز حضور اکرم ؐ نے فرمایا تھا - ہماری دعوت کا آغاز بھی اسی مقام سے ہونا چاہئے جہاں سے داعی اول نے کیا تھا - جس طرح داعی اول نے اس کتاب کے ساتھ رویہ اختیار کیا تھا وہی ہمارا بھی ہونا چاہئے اور دوبارہ اس آیت پر غور کرنا چاہئے -

(یہ کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے - پس تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو) -

---ooo---

اللہ نے اس کتاب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نازل فرمایا اور حضور ؐ نے سب سے پہلے کتاب کو لوگوں کے سامنے پیش فرمایا - قیامت تک جب بھی کوئی شخص اس کتاب کو کسی قوم کے سامنے پیش کرے گا تو وہ ان لوگوں کو سب سے پہلے یہی حکم دے گا کہ تم ان احکام کی پیروی کرو جو اس کتاب میں ہیں - اللہ کے سوا کسی اور کو ولی اور کارساز نہ بناؤ - کیونکہ دعوت اسلامی کا اصل محور ہی یہ ہے کہ اسلامی احکامات کا اتباع کیا جائے بجائے اس کے کہ دوسرے لوگوں کا اتباع کیا جائے - جو لوگ اس کتاب کا اتباع کرتے ہیں وہ مسلمان ہیں اور اگر وہ دوسروں کا اتباع کرتے ہیں تو مشرک ہیں - اہل کتاب کے مقابلے میں صرف یہی دو موقف ہیں یا مسلم یا مشرک -

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝

"لوگو' جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو --- مگر تم نصیحت کم ہی ملنتے ہو -"

یہ اس دین کا اساسی مسئلہ ہے' یہ کہ یا تو اس وحی کی پیروی ہو گی تو یہ اسلام ہو گا اور اس میں اللہ کی ربوبیت کا اعتراف ہو گا - اس میں اللہ وحدہ کی حاکمیت کا اعتراف ہو گا' اللہ حکم دے گا اور لوگ اطاعت کریں گے - اللہ نہی کرے گا اور لوگ رک جائیں گے - یا اگر لوگ اپنے لئے کچھ اور لوگوں کو سرپرست بنالیں گے تو یہ شرک ہو گا اور شرک کے معنی یہ ہوں گے کہ لوگ صرف اللہ کو رب تسلیم نہیں کرتے اس لئے کہ ربوبیت اور اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کا ہے -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے وقت یہ فرمایا گیا کہ (كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ) (۷: ۲)) یعنی نزول آپ کی ذات پر ہوا ہے اور جب لوگوں کو خطاب ہوا تو فرمایا گیا (اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ) (۷: ۳)) رسول کی طرف تو کتاب نازل ہوئی کہ آپ اس پر ایمان لائیں اور اسے لوگوں تک پہنچائیں اور انہیں انجام بد سے ڈرائیں اور لوگوں کی طرف کتاب کے نزول کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں اور عمل کریں اور اس کے علاوہ کسی اور کی اطاعت نہ کریں - دونوں صورتوں میں الیک اور الیکم کے ذریعے حضور ؐ اور آپ کی امت کی عزت افزائی کی گئی ہے اور ان کے حوصلے بڑھائے گئے ہیں اس لئے کہ جس کی طرف اللہ کتاب بھیج دے اور اسے اس عظیم کام کے لئے چن لے اور اس پر یہ کرم کر دے کہ وہ اس بات کا مستحق ہے کہ وہ اس کا شکر بھی بجالائے - اس فریضے کو اچھی طرح سرانجام دے اور اس

میں سستی نہ کرے۔

چونکہ یہ ایک عظیم جدوجہد ہے' اس میں پیش نظر یہ ہے کہ جاہلیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔ اس کے تصورات' اس کے افکار' اس کی اقدار' اس کی عادات' اس کی رسومات' اس کے انتظامات' اور اس کی اجتماعی عادات و اطوار' اقتصادی نظام کو اور اس کائنات اور انسانوں کے ساتھ اس کے روابط کو یکسر ختم کرنا ہے...... یہ ایک عظیم جدوجہد ہے اس لئے یہاں انسانوں کے ضمیر کو خوب جھنجوڑا جاتا ہے اور انسانی اعصاب کو حساس بنایا جاتا ہے۔ انہیں ہلا مارنا اور ان کی سوئی ہوئی فطرت کو جگانا' جو زمانہ جاہلیت میں جاہلی تصورات اور اطوار میں ڈوبی ہوئی تھی' مقصود ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے لوگوں کے سامنے ازمنہ ماضی کے مکذبین کے انجام کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے اور یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ آج دنیا کی خواری کے بعد آخرت میں وہ زیادہ برباد ہوں گے۔

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ۝۴ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ۝۵ فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ۝۶ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ۝۷ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِۨالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝۸ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ۝۹

"کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ ان پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت ٹوٹ پڑا' یا دن دیہاڑے ایسے وقت آیا جب کہ وہ آرام کر رہے تھے۔ اور جب ہمارا عذاب ان پر آگیا تو ان کی زبان پر اس کے سوا کوئی صدا نہ تھی کہ واقعی ہم ظالم تھے۔

پس یہ ضرور ہو کر رہنا ہے کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں (کہ انہوں نے پیغام رسانی کا فرض کہاں تک انجام دیا اور انہیں اس کا کیا جواب ملا) پھر ہم خود پورے علم کے ساتھ ساری سرگزشت ان کے آگے پیش کر دیں گے' آخر ہم کہیں غائب تو نہیں تھے۔ اور وزن اس روز عین حق ہو گا جن کے پلڑے بھاری ہوں گے' وہی فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں گے کیونکہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے رہے تھے۔"

اقوام سابقہ کا انجام سبق آموز ہوتا ہے۔ وہ نہایت ہی اونچا ڈراوا ہوتا ہے۔ قرآن کریم اقوام سابقہ کے عبرت آموز حصوں کو نہایت ہی مؤثر انداز میں لاتا ہے جس سے انسان خواب غفلت سے جاگ اٹھتا ہے۔ اور دل پر سے غفلت کے پردے ہٹ جاتے ہیں۔

بے شمار ایسی بستیاں ہیں جو غفلت کی وجہ سے اللہ کے عذاب کی مستحق ٹھہریں۔ ان پر جب ہلاکت آئی تو وہ خواب غفلت میں مدہوش تھیں۔ یہ عذاب ان پر رات کے وقت آیا یا دن کے وقت وہ سوتے میں مارے گئے۔ بالعموم لوگ دوپہر کے وقت آرام کرتے ہیں اور اس وقت ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ امن و امان سے رہیں۔

(وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْهُمْ قَآئِلُوْنَ (۷ : ۴)) ”کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ ان پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت ٹوٹ پڑا' یا دن دیہاڑے ایسے وقت آیا جب کہ وہ آرام کر رہے تھے۔“

یہ دونوں حالتیں' یعنی قیلولہ کی حالت اور رات کے وقت سونے کی حالت ایسی حالت ہوتی ہے جس میں انسان بے پرواہ' پرامن اور غفلت کی حالت میں ہوتا ہے اور ایسی حالت میں کسی کا پکڑا جانا اور عذاب میں مبتلا ہونا نہایت ہی خوفناک اور زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں' ڈر' نصیحت آموزی' احتیاط وتقویٰ' زیادہ سہولت کے ساتھ حاصل ہو سکتا ہے۔

ایسے حالات میں جب یہ مجرمین پکڑے گئے اور ان پر عذاب آیا تو ان کا ردعمل کیا تھا' اعتراف اور مطلق اعتراف جرم۔ ماسوائے اقرار کے ان کے پاس اور کوئی بہانہ نہ رہا۔

(فَمَا كَانَ دَعْوٰهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۵) (۷ : ۵))

”اور جب ہمارا عذاب ان پر آگیا تو ان کی زبان پر اس کے سوا کوئی صدا نہ تھی کہ واقعی ہم ظالم تھے۔“

انسان ہر قسم کے بہانے تلاش کرتا ہے لیکن اعتراف اس کے لئے مشکل کام ہوتا ہے۔ وہ آخری وقت تک اقرار نہیں کرتا۔ لیکن ان لوگوں کو عذاب الہی نے اس قدر اچانک آلیا تھا کہ ماسوائے اقرار کے ان میں اور کوئی حجت نہ رہی تھی۔ اس لئے کہ وہ نہایت ہی خوفناک اور مرعوب کن پوزیشن میں ڈال دیئے گئے تھے ایسی پوزیشن میں جہاں اقرار و اعتراف آخری کوشش ہوتی ہے۔ یہاں انہوں نے ظلم یعنی شرک کا اقرار کیا۔

یہاں ظلم سے مراد وہ شرک لیتے ہیں۔ قرآن کریم کی تعبیرات میں سے بیشتر میں ظلم سے مراد شرک ہی ہے۔ ظاہر ہے شرک ظلم ہے اور ظلم شرک ہے اس لئے کہ جو شخص اپنے خالق کے ساتھ کسی کو شریک کرے۔ اس سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے؟

اب ذرا دیکھئے کہ دنیا کے عذاب کا منظر نظروں کے سامنے ہے' جھٹلانے والے عذاب الہی کی گرفت میں ہیں اور وہ اعتراف کر رہے ہیں کہ بے شک وہ ظالم تھے' حق ان کے سامنے واضح ہو جاتا ہے اور وہ حق کا اعتراف بھی کر لیتے ہیں لیکن اب یہ اعتراف ان کے لیے مفید مطلب نہیں ہے۔ یہ عذاب اب ندامت اور اعتراف کی وجہ سے نہیں ٹل سکتا' نہ

اب توبہ مفید ہے اس لئے کہ توبہ و ندامت کا وقت چلا گیا ہے اور توبہ کا دروازہ بند ہے۔

یہ منظر ابھی چل رہا ہے اور دنیا کی سطح پر وہ عذاب الٰہی سے کچلے جا رہے ہیں، کہ اچانک دیکھنے والے اپنے آپ کو میدان حشر میں پاتے ہیں، کوئی وقفہ درمیان میں نہیں ہے۔ سیاق کلام ایک ریل پر چل رہا ہے جو جڑی ہوئی ہے اور منظر کے بعد منظر سامنے آتا ہے۔ زمان و مکان کی طنابیں کھنچ جاتی ہیں اور دنیا و آخرت باہم مل جاتے ہیں۔ عذاب دنیا ابھی ختم نہیں ہوا کہ آخرت کا عذاب شروع ہو جاتا ہے۔ اچانک دوسرا منظر سامنے ہے۔

(فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ (٦) فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ (٧) وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (٨) وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ

(۹) (۷ : ٦ تا ۹)) "پس یہ ضرور ہو کر رہنا ہے کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں (کہ انہوں نے پیغام رسانی کا فرض کہاں تک انجام دیا اور انہیں اس کا کیا جواب ملا) پھر ہم خود پورے علم کے ساتھ ساری سرگزشت ان کے آگے پیش کر دیں گے، آخر ہم کہیں غائب تو نہیں تھے۔ اور وزن اس روز عین حق ہو گا، جن کے پلڑے بھاری ہوں گے، وہی فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں گے کیونکہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے رہے تھے۔"

یہ تصویر کشی کا انداز بیان قرآنی تعبیرات کا خاصہ ہے۔ طرز تعبیر ہمیں لحظہ بھر میں پوری دنیا کی سیر کرا دیتا ہے۔ پھر قرآن کی ایک سطر میں دنیا اور آخرت مل جاتے ہیں اور آغاز و انجام ایک ہو جاتے ہیں۔

اس جہان میں تو یہ لوگ عذاب الٰہی سے دوچار ہیں اور اس جہان میں ان سے باز پرس ہو رہی ہے اور جب عذاب آ گیا تھا اور وہ غفلت میں تھے تو پھر اچانک انہوں نے اعتراف کرنا شروع کر دیا اور کہا (اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ) (بے شک ہم ظالم تھے) لیکن اس جہان میں

(فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ (٦) "پس یہ ضرور ہو کر رہنا ہے کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں گے جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے۔

یہ سوال نہایت ہی جامع و مانع ہے۔ یہ رسولوں سے بھی ہو گا اور ان کی امتوں سے بھی ہو گا۔ یہ سوال و جواب کھلی مجلس میں ہو گا، ایک بڑے اجتماع میں اور اس میں تمام راز کھل جائیں گے۔ امت دعوت سے سوال ہو گا اور ان کی جانب سے اعتراف ہو گا، رسولوں سے بھی باز پرس ہو گی اور وہ جواب دیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ لوگوں کے اعمال کا ریکارڈ پوری تفصیلات کے ساتھ پیش کریں گے اس لئے کہ اللہ تو ہر چیز کے پاس تھا، اس سے کوئی چیز غائب نہ تھی۔ یہ نہایت ہی مؤثر ٹچ ہے۔

(وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ (۷: ۸)) "وزن اس روز حق ہو گا۔" اس دن وزن کے اندر کوئی غلطی کا امکان نہ ہو گا اور نہ فیصلے میں کوئی غلطی ہو گی۔ دنیا میں فیصلوں پر جو جدل و جدال اور واقعات ہوتے ہیں وہ نہ ہوں گے۔

(فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُه فَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۷: ۸)) جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پانے والے ہوں گے۔" اللہ کا ترازو سچا ہے۔ اب وہ بھاری ہو گیا ہے لہذا آگ سے بچاؤ ہو گیا۔ جنت کی طرف سفر شروع ہو گیا اور یہ اس طویل سفر کا آخری ٹھکانا ہے۔

(وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُه فَأُولٰئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ (۷: ۹)) "اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں گے کیونکہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے رہے ہیں۔

اللہ کے ترازو میں غلطی کا امکان ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ گھاٹا کھا گئے ہیں۔ اب تو کمائی کا وقت ختم ہے۔ انسان اپنے لئے کماتا ہے' جب خسارہ ہی ہو گیا کاروبار میں تو کیا کمائے گا اور کیا رہے گا۔ انہوں نے کفر کیا' اپنی جان ہی کو گنوا دیا۔ کیونکہ آیات الٰہیہ کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے تھے' جیسا کہ کہا گیا ظلم سے مراد شرک ہے کیونکہ شرک ظلم عظیم ہے۔ (اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ) یہاں ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ وزن اور میزان کی شکل کیا ہو گی۔ اسلامی عقائد کی تاریخ میں اس پر بحثیں ہو چکی ہیں' کیونکہ اللہ کے افعال کی شکل و صورت اور کیف و کم کی کوئی مثال نہیں ہے۔ خود اللہ تعالیٰ کی کوئی مثال نہیں۔ (لَيْسَ كَمِثْلِه شَيْءٌ) اس لئے ہم قرآن کے فرمان ہی پر اکتفا کرتے ہیں کہ اس دن حساب برحق ہو گا کہ انسان کے کسی بھی نیک عمل میں نہ کمی ہو گی' نہ وہ شمار سے رہ جائے گا اور نہ ہی ضائع ہو گا۔

---ooo---

درس نمبر ۳۷ تشریح آیات

۱۰ --- تا --- ۲۵

یہاں سے انسانیت کے عظیم سفر کا آغاز ہوتا ہے اور نسل انسانی کو کرۂ ارض کا چارج دیا جاتا ہے ۔ یہ فقرہ قصہ انسانیت کے لئے ایک تمہید ہے ۔ تفصیلات آگے آرہی ہیں ۔

۱ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا
۱۰ع تَشْكُرُوْنَ ۝۱۰ۧ
۸

ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لئے یہاں سامان زیست فراہم کیا ، مگر تم لوگ کم ہی شکرگزار ہوتے ہو ۔"

اس زمین اور انسانوں کے خالق ہی نے یہاں انسانوں کو بسایا اور اسی نے زمین کے اندر وہ وسائل و خصائص پیدا کئے جو انسانی زندگی کے لئے سازگار ہیں جو انسانوں کے لئے قوت و ضروریات مہیا کرتے ہیں اور اس کی نگہداشت کرتے ہیں جن میں وسائل رزق و معاش شامل ہیں ۔

یہ اللہ ہی ہے کہ جس نے کرۂ ارض کو ایک ایسے مقام پر رکھا جو انسانوں کی نشو و نما کے لئے سازگار ہے ۔ زمین اپنی ترکیب ، حجم اور سورج و چاند سے اپنے متعین فاصلے اور سورج کے گرد اپنی گردش ، اور اپنے طور پر ایک طرف جھکاؤ اور اپنی گردش کی رفتار وغیرہ کے اعتبار سے انسانی زندگی کے لئے مفید ہے ۔ پھر یہ اللہ ہی ہے جس نے زمین کے اندر بے حد و حساب خزانے ودیعت کئے ہیں اور اس میں اکثر چیزیں انسان کی خوراک اور استعمال کے لئے فراوانی سے پیدا کی ، جو اس انسان کے لئے یہاں نشو و نما پانے اور ترقی کرنے کا سبب ہیں ۔ پھر وہ اللہ ہی ہے جس نے جنس انسانی کو اس زمین کا سردار بنایا ہے ۔ وہ اس قابل ہوا ہے کہ ان قوتوں کو تسخیر کرے اور انہیں اپنی آسائش کے لئے استعمال کرے ۔ پھر اللہ نے انسانوں کو ایسی عقلی قوت دی ہے جس کے ذریعے انہوں نے اس کائنات کے بعض پوشیدہ رازوں تک رسائی حاصل کر لی ہے ۔ اور اس علم کو پھر وہ اپنی ضروریات کے لئے استعمال کر رہا ہے ۔

اگر اللہ تعالیٰ انسانوں کو یہ قوت نہ دیتا تو یہ ضعیف انسان ان کائناتی قوتوں کو "تسخیر" نہ کر سکتا (جس طرح قدیم و جدید جاہلیت کے علمبردار اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں) اور اس عظیم کائنات اور طویل و عریض دنیا کی قوتوں کا

مقابلہ نہ کر سکتا۔

دور جدید کی تہذیب پر رومی اور یونانی جاہلی افکار کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ یہ جاہلی تصورات کائناتی قوتوں کو انسان کی دشمن قوتیں سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک یہ قوتیں انسان کے وجود اور اس کی سرگرمیوں کی دشمن ہیں۔ان تصورات کے مطابق انسان اور کائناتی قوتوں کے درمیان مسلسل جنگ ہے۔اس لئے انسان جب اس کائنات کے بھیدوں میں سے کسی بھید کو جان لیتا ہے تو یہ لوگ اسے "تسخیر فطرت" کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں لیکن یہ تصورات غلط ہیں اور پھر ان کے پس منظر میں خباثت بھی چھپی ہوئی ہے۔

اگر یہ کائناتی قوتیں انسان کی دشمن ہوتیں' اس کی زندگی کا نقیض ہوتیں' اس کے خلاف مورچہ زن ہوتیں' اس کی مخالفت کرتیں' اور ان کے پس منظر میں کسی مدبر ذات کا ارادہ کام نہ کر رہا ہوتا' جس طرح ان لوگوں کا خیال ہے تو انسان سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا۔ اگر پیدا ہوتا تو وہ اس کائنات کے اندر کسی طرح نشوونما نہ پا سکتا تھا۔کیونکہ ان تصورات کے مطابق یہ پورا جہان انسان کا دشمن ہے محض اس لئے کہ وہ وجود میں آگیا ہے۔لہذا وہ یہاں زندگی بسر کر رہا ہے' یہ کوئی معقول توجیہ نہیں ہے۔کیونکہ اگر یہ پوری کائنات ہی انسان کی دشمن ہے تو وہ کس طرح یہاں چل سکتا ہے۔ان لوگوں کا تصور یہ تھا کہ یہ کائنات خود مختار ہے اور اس کے اوپر کوئی مقتدر اعلیٰ نہیں ہے۔

ان تصورات کے مقابلے میں اسلامی تصور کائنات ہی وہ حقیقی تصور ہے جو یہاں اس کائنات کے تمام اجزاء کی پوری پوری تشریح کر دیتا ہے۔وہ یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا۔ وہی ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور یہ وہی اللہ ہے جس نے اس کائنات کے مزاج کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ اپنی ساخت کے اعتبار ہی سے انسان کے لئے مدد و معاون ہے۔ انسان کے اندر اسی اللہ نے ایسی قوتیں ودیعت کی ہیں جن کی وجہ سے وہ اس کائنات کی قوتوں کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کر پاتا ہے۔ یہ موافقت اور یہ ہم آہنگی ہی وہ قابل لحاظ راز ہے جس کی وجہ سے اللہ نے ہر چیز کی تخلیق کو بہترین بنایا ہے۔یہ نہیں ہے کہ کائنات کی یہ قوتیں باہمدگر بر سر جنگ ہیں۔

اس اسلامی تصور کے مطابق انسان اس کائنات کے ساتھ باہم دوست کی طرح زندگی گزار رہا ہے۔ایک قوت مدبرہ یعنی باری تعالیٰ کی نگرانی میں۔اس کا قلب مطمئن ہے۔اس کا نفس خوش ہے۔اس کے قدم مضبوط ہیں اور وہ پورے اعتماد کے ساتھ اس کرۂ ارض پر اپنے فرائض خلافت انسانی کو سرانجام دے رہا ہے۔وہ کائنات کا انیس و ہم نشیں ہے اور اللہ کا شکرگزار ہے کہ اس نے اسے اس کائنات کا راز بخشا ہے۔ جونہی وہ اس کائنات کے رازہائے نہفتہ میں سے کوئی راز دریافت کرتا ہے' جو اس کے فرائض کے لئے معاون ہوتا ہے تو اس کی ترقی' آرام اور خوشحالی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اس کائنات کے بارے میں یہ تصور جو اسلام دیتا ہے' انسان کو اس بات سے نہیں روکتا کہ وہ اس کائنات کے مزید راز معلوم کرے۔ یہ تصور اس کی اس بات کے لئے حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اسے نہایت ہی اطمینان اور خود اعتمادی کی کیفیت دیتا ہے کیونکہ اس کی حرکت' ایک ایسے دوست کی ہمرکابی میں ہوتی ہے جو بخیل نہیں ہے جو اسے اپنے راز نہ بتاتا ہو۔ وہ اپنے تعاون اور امداد سے بھی ہاتھ نہیں کھینچتا۔ اس کی وجہ سے انسان کا کسی ایسے دشمن سے رابطہ نہیں ہوتا جو ہروقت مخالفت کرتا ہے اور راستے میں روڑے اٹکاتا ہے اور اس کی آرزوؤں اور امیدوں پر پانی پھیرتا ہے۔

فلسفہ وجودیت کا یہ عظیم المیہ ہے کہ اس کائنات کے بارے میں ایک برا اور خبیث تصور رکھتا ہے۔ اس فلسفے کا تصور کائنات یہ ہے کہ یہ پوری کائنات اور اس کے اندر انسان کا اجتماعی نظام انسان کے انفرادی وجود کا دشمن ہے اور اس کائنات کا بوجھ اور پھر انسان کی اجتماعیت کا بوجھ انسان کے لئے تباہ کن ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے کہ اس پر یقین رکھنے والا انسان رجعت پسندی' عزلت نشینی بلکہ عدم کے دامن میں لوٹ جاتا ہے یا پھر اس کے نتیجے میں انفرادیت اور خود سری اور سرکشی جنم لیتی ہے۔ دونوں حالتوں میں ایک انسان بے چینی اور قلق میں مبتلا ہوتا ہے جس کا بوجھ وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ عقل و خرد انسان کے لئے وبال جان بن جاتے ہیں۔ وہ عملی اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے اور یا وہ سرکشی کی راہ اختیار کر لیتا ہے یا عدم کے صحرا میں گم گشتہ راہ ہو جاتا ہے اور یہ دونوں حالتیں ایک ہی طرح کی مصیبت ہیں۔

یورپی افکار کے شعبہ وجودیت ہی کا یہ المیہ نہیں ہے بلکہ پوری دنیا کے پورے فلسفے کا بھی یہی المیہ ہے۔ یورپ کے تمام مکاتب فکر اور رجحانات اسی المیہ میں گرفتار ہیں بلکہ ہر قسم کا جاہلی نظام ہر دور میں اور ہر معاشرے میں اس المیے سے دوچار ہوتا ہے۔ اس المیے کا مقابلہ صرف اسلامی نظام فکر و عمل ہی کرتا ہے کیونکہ اسلام ہی انسان کو اس کائنات کے بارے میں ایک درست زاویہ فکر دیتا ہے۔ بلکہ وہ ورائے کائنات بھی ایک معقول تصور دیتا ہے۔

انسان اس زمین کا بیٹا ہے' وہ اس کائنات کی پیداوار ہے۔ وہ اس زمین سے پیدا کیا گیا' اسی میں پروان چڑھا۔ اس کی بودوباش اور نشوونما کا انتظام اسی زمین میں ہے اور اسے یہاں ایسی عقلی قوت دی گئی ہے جس کے ذریعے وہ اس جہان کے پوشیدہ رازوں تک رسائی حاصل کرتا ہے اور یہ راز اور قوتیں انسانی وجود کے لئے سازگار ہیں۔ جب ان رازوں تک انسان رسائل حاصل کر لیتا ہے تو یہ انسان کے معاون ہوتے ہیں اور اس کی زندگی کی تفسیر و تعبیر کرتے ہیں۔

لیکن انسان! انسان کی اکثریت ناشکری ہے اس لئے کہ وہ اپنی جہالت اور جاہلیت میں گم گشتہ راہ ہے۔ جو لوگ اس کائنات کے رازہائے نہفتہ سے واقف ہوگئے ہیں وہ بھی حق شکر ادا نہیں کرتے۔ وہ شکر و ثنا کر بھی کیسے سکتے ہیں جب اللہ کو ان کی جانب سے یہ اعزاز قبول ہی نہیں۔ (وہ انسانیت کے بجائے اپنی حیوانیت ثابت کرتے ہیں) ۔

(وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ

(۷ : ۱۰)) "ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لئے یہاں سامان زیست فراہم کیا' مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔"

---ooo--

اب قصہ انسانیت کے دلچسپ واقعات بیان ہوتے ہیں۔ ایک عظیم محفل میں انسانیت کی ولادت کی تقریب منعقد ہوتی ہے۔ یہ ملاء اعلیٰ میں ایک عظیم الشان تقریب ہے۔ اللہ تعالیٰ جو ایک عظیم اور جلیل القدر بادشاہ ہے' اس کی جانب سے تخلیق آدم کا اعلان ہوتا ہے' خود بادشاہ کائنات اعلان کرتے ہیں۔ یہ اس بندہ انسان کے لئے ایک بڑا اعزاز ہے۔ اس محفل میں تمام ملائکہ حاضر ہیں۔ ان میں حضرت ابلیس بھی موجود ہیں۔ اگرچہ یہ دراصل فرشتہ نہیں تھا لیکن اس تقریب میں پوری کائنات اور اس کی مخلوقات موجود ہیں' اس لئے کہ یہ نہایت ہی اہم واقعہ ہے اور عظیم الشان معاملہ

ہے جس کی اہمیت پوری کائنات کی اسکیم میں مرکزیت کی حامل ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا
لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ مَا مَنَعَكَ
اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ
طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ
مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ
الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۱۵﴾ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ
لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ
شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا
مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾

"ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتداء کی' پھر تمہاری صورت بنائی' پھر فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو۔ اس حکم پر سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ پوچھا "تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا؟" بولا "میں اس سے بہتر ہوں' تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے۔" فرمایا "اچھا' تو یہاں سے نیچے اتر۔ تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے۔ نکل جا کہ در حقیقت تو ان لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں۔" بولا "مجھے اس دن تک مہلت دے جب کہ یہ سب دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔" فرمایا "تجھے مہلت ہے۔" بولا "اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا' آگے اور پیچھے' دائیں اور بائیں' ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔" فرمایا "نکل جا یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ یقین رکھ کہ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے' تجھ سمیت ان سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔"

یہ پہلا منظر ہے اس قصے کا۔ نہایت ہی دلچسپ' نہایت ہی اہم۔ ہم اس قصے کے مناظر اس کی تفسیر سے پہلے پیش

کریں گے ۔ ان مناظر سے فارغ ہونے کے بعد ہم اس قصے کے اشارات و اثرات پیش کریں گے ۔

(وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ (۷ : ۱۱)) "ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتداء کی' پھر تمہاری صورت بنائی' پھر فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو ۔ اس حکم پر سب نے سجدہ کیا' مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا ۔

لفظ خلق کبھی تو محض وجود میں لانے کے لئے آتا ہے ۔ اسی طرح تصویر کا مفہوم کبھی یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کو شکل و صورت اور خصائص دینا ۔ اس اعتبار سے خلق و تصویر کی تخلیق کے دو مرحلے نہیں ہوتے بلکہ بیک وقت کسی تخلیق میں پیدا ہوتے ہیں ۔ اس لئے کہ یہ لازمی نہیں ہے کہ ثم کا لفظ ہمیشہ ترتیب زمانی کے لئے استعمال ہو ۔ یہ معنوی ترقی کے مفہوم میں بھی آتا ہے ۔ معنوی اعتبار سے محض وجود کے مقابلے میں مصور ہونا زیادہ ترقی یافتہ شکل ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ محض مادے پر بھی وجود کا اطلاق ہوتا ہے ۔ البتہ تصویر کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں مجرد وجود ہی نہیں بخشا گیا بلکہ ایک ترقی یافتہ مصور اور صاحب خصائص و کمالات وجود دیا گیا ہے ۔ دوسری جگہ (اَلَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی) جس نے ہر چیز کو اس کا وجود بخشا اور پھر ہدایت دی ۔" .... اس لئے کہ اللہ نے ہر چیز کو اس کے خصائص اور اس کے مقاصد و فرائض اسی وقت دے دیئے تھے جس وقت انہیں پیدا کیا تھا اور تخلیق کے وقت ہی ہدایت کر دی تھی کہ اپنے ان وظائف و فرائض کے لئے کام کرو' اور تخلیق اور ہدایت کے درمیان کوئی زمانی فاصلہ نہ تھا ۔ اگر ہدایت سے مراد رب کی طرف ہدایت لی جائے تب بھی مفہوم میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ تخلیق کرتے ہی اللہ نے انسان کو ہدایت کر دی تھی ۔ اسی طرح آدم کو بھی خصائص انسانیت تخلیق کے وقت ہی دے دیئے گئے تھے ۔ اور ثم کا لفظ یہاں ترقی اور مرتبہ کی بڑائی کے معنوں میں ہے ۔ زمانہ ماقبل یا مابعد کے معنی میں نہیں ہے ۔ ہمارے خیال میں یہی مفہوم درست ہے ۔

بہرحال خلق آدم کے بارے میں جس قدر نصوص وارد ہیں اور اس کرۂ ارض کے اوپر نسل انسانی کے بارے میں جس قدر آیات آئی ہیں ان سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ انسان کو اس کی تخلیق کے ساتھ ہی اس کے انسانی خصائص اور فرائض منصبی دے دیئے گئے تھے اور انسانی تاریخ میں جو ترقی نظر آتی ہے وہ صرف ان صلاحیتوں کے ظہور میں ہوئی ہے ۔ انسان کے تجربے اور اس کی مہارت میں اضافہ بہرحال ہوتا رہا ہے ۔ یہ ترقی انسان کے وجود اور اس کی ذہنی صلاحیت میں نہیں ہوئی لہٰذا یہ فلسفہ بالکل غلط ہے جو ڈارون نے گھڑا ہے کہ انسان کی ساخت میں ترقی ہوتی رہی ہے ۔

ڈارون کا یہ نظریہ کہ حیوانات کے انواع میں ترقی ہوتی رہی ۔ آثار قدیمہ اور پتھروں کی کھدائی پر مبنی ہے اور محض ظن و تخمین ہے ۔ طبقات الارض کے لحاظ سے بھی پتھروں اور پہاڑوں کی عمر کا تعین کوئی یقینی امر نہیں ہے ۔ یہ محض ظنی اور تخمینی فیصلے ہیں ۔ مثلاً شعاعوں کے ذریعے ستاروں کی عمر معلوم کرنا ۔ یہ علوم جو محض ظن و تخمین اور مفروضوں پر مبنی ہیں ۔ ان کے مقابلے میں دوسرے مفروضے بھی ہو سکتے ہیں جو ان سے زیادہ معقول ہو سکتے ہیں ۔

اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ پتھروں اور چٹانوں کی عمر یقینی طور پر متعین ہو گئی ہے تب بھی یہ ممکن ہے کہ قدیم زمانوں سے حیوانات کی مختلف اقسام اپنی موجودہ شکل میں تھیں ۔ ان ادوار میں ان کے لئے حالات سازگار تھے لیکن بعد میں ان کے لئے حالات سازگار نہ رہے اور ان کی نوع دنیا سے ختم ہو گئی ۔ لیکن اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ان

میں سے ایک نوع دوسری نوع کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ہم دونوں کو مستقل انواع مان سکتے ہیں۔ ڈارون کی کھدائیاں اور اس کے بعد دریافت ہونے والے انواع اس سے زیادہ کچھ ثابت نہیں کر سکتے۔ ان چٹانی تصاویر سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کسی ایک نوع سے زیادہ ترقی یافتہ نوع فلاں وقت میں موجود تھی اور اس بات کی تاویل کی جا سکتی ہے کہ اس وقت اس نوع کے وجود کے لئے حالات سازگار تھے اور بعد میں حالات ناسازگار ہونے کے باعث وہ نوع ختم ہو گئی اور اس کی جگہ دوسری قسم کے حیوانات وجود میں آگئے اور ترقی کر گئے۔

اس لئے ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ نوع انسانی روز اول سے ایسی ہی ہے جس طرح کہ آج ہے اور اسے اللہ تعالیٰ زمین پر اس وقت وجود میں لائے جب یہاں کے حالات انسان کے لئے سازگار بنا دیئے گئے۔ تمام قرآنی نصوص اسی بات کی تائید کرتے ہیں۔

مزید یہ کہ انسان طبیعیاتی' عضویاتی اور عقلی و روحانی اعتبار سے اس قدر منفرد ہے کہ دور جدید کے ڈارونی بھی اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہوگئے ہیں کہ انسان کسی دوسری نوع کی ترقی پذیر نوع نہیں ہے اور وہ کسی دوسری نوع کے ساتھ عضویاتی مماثلت نہیں رکھتا۔ حالانکہ ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو سرے سے ذات باری کے قائل ہی نہیں ہیں اور ان کی جانب سے یہ ایک قسم کا اعتراف ہے کہ انسان کا وجود اور اس کی نشو ونما بالکل منفرد ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا اعلان فرشتوں کے اجتماع میں کیا اور یہ اجتماع عالم بالا میں منعقد ہوا۔

(ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ

(۷: ۱۱) "پھر ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو۔ اس حکم پر سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔"

ملائکہ اللہ کی مخلوقات میں سے ایک مستقل مخلوق ہے اور ان کے اپنے خصائص و فرائض ہیں۔ ہم ان کے بارے میں اسی قدر جانتے ہیں جس قدر اللہ نے ہمیں بتایا ہے۔ ظلال القرآن میں ہم اس سے قبل فرشتوں کے بارے میں ایک نوٹ دے آئے ہیں۔ اسی طرح ابلیس بھی ایک مستقل نوع کی مخلوق سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے کان من الجن ففسق عن امر ربہ "یہ جنوں میں سے تھا' اس نے اپنے رب کی حکم عدولی کی۔" جنات فرشتوں سے الگ ایک مخلوق ہیں۔ ان کے بارے میں بھی ہم اسی قدر جانتے ہیں جس قدر ہمیں اللہ نے بتایا ہے۔ ان کے بارے میں بھی ہم نے ایک مجمل حاشیہ اسی پارے میں دے دیا ہے۔ اس سورہ میں آگے جاکر یہ بات آئے گی کہ ابلیس آگ سے پیدا ہوا اس لئے وہ ملائکہ سے الگ ایک مخلوق سے وابستہ ہے۔ ابلیس کو بھی حضرت آدم کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا گیا تھا اس لئے کہ یہ زمرۂ ملائکہ میں شامل تھا اور اس وقت وہ عالم بالا کی اس محفل میں موجود تھا' جہاں تخلیق آدم کی تقریب ہوئی۔

رہے فرشتے تو وہ تو ایسی مخلوق ہیں جو اللہ کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرتے اور انہیں جو حکم بھی دیا جائے اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں اس لئے انہوں نے مطیع فرمان ہو کر سجدہ کر دیا اور اللہ کے حکم کی تعمیل کر دی۔ کیونکہ وہ کسی معاملے میں نہ تردد کرتے ہیں نہ تکبر کرتے ہیں اور نہ وہ اللہ کی نافرمانی کے بارے میں سوچ سکتے ہیں' چاہے کوئی سبب اور کوئی جواز ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ان کا مزاج ہے۔ یہ اطاعت شعاری ان کی خصوصیت ہے اور یہ ان کے فرائض منصبی میں شامل

ہے۔ اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت انسان کی ذات کس قدر مکرم ہے اور یہ بھی عیاں ہو جاتا ہے کہ فرشتے اللہ کے مطیع مطلق ہیں۔

رہا ابلیس تو اس نے امتثال امر نہ کیا اور نافرمانی کر دی۔ یہ بات آگے آ رہی ہے کہ کس وجہ سے اس کے دل میں خلجان پیدا ہوا۔ اس پر کیا خیالات چھا گئے جس کی وجہ سے اس نے نافرمانی کی جرأت کی؟ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اللہ رب العالمین ہے اور خود اس کا بھی خالق ہے۔ وہ اس کے امور اور خود اس کے وجود کا بھی مالک ہے' اسے ان معاملات میں کوئی شک نہیں تھا۔

اس منظر میں اللہ کی مخلوقات کے تین نمونے پائے جاتے ہیں۔ ایک نمونہ وہ ہے جو ہر لحاظ سے مطیع فرمان ہے اور اس کی فطرت میں تعمیل امر ہے۔ دوسرا نمونہ ہے جو مکمل طور پر نافرمان ہے اور اس کی فطرت میں استکبار اور نافرمانی ہے۔ تیسری مخلوق انسانی مخلوق ہے۔ اس کی صفات' اس کی کمزوریوں اور کمالات پر بھی عنقریب بات ہوگی۔ پہلی قسم کی مخلوق خالص الٰہی مخلوق ہے اور انہوں نے اپنا فرض اس محفل ہی میں پوری طرح ادا کر دیا۔ دوسری دو قسم کی مخلوقات کے بارے میں عنقریب تفصیلات آئیں گی کہ ان کے رجحانات کیا ہیں؟

(قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (۱۲:۷)) "پوچھا' تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا؟" بولا "میں اس سے بہتر ہوں' تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے۔"

ابلیس کا قصور یہ تھا کہ نص صریح کے ہوتے ہوئے بھی اس نے یہ سوچا کہ وہ اپنی رائے پر عمل کر سکتا ہے اور اگر حکم کے باوجود کوئی سبب اور علت ہو تو اس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ جب نص صریح آ جائے تو پھر فکر و نظر کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اب صرف یہ صورت رہتی ہے کہ اطاعت کی جائے اور حکم کو نافذ کیا جائے۔ اب حضرت ابلیس ملعون کو دیکھئے کہ باوجود اس بات کے علم کے کہ اللہ خالق و مالک ہے' وہی رازق اور مدبر ہے اور اس دنیا میں کوئی بات اس کے علم اور اذن کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس کے حکم کی اطاعت نہیں کرتا جو اس کے پاس پہنچ گیا ہے۔ وہ اپنی منطق سامنے لاتا ہے۔ "میں اس سے زیادہ بہتر ہوں کہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔" اس کی اس حجت سازی پر اس کو فوراً سزا ملتی ہے۔

(قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ (۱۳:۷)) فرمایا "اچھا' تو یہاں سے نیچے اتر' تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے۔ نکل جا کہ درحقیقت تو ان لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں۔"

یہاں اب اس کا علم اس کے لئے نفع بخش نہیں رہا' وہ اللہ کی ذات و صفات سے خوب واقف ہے لیکن یہ علم اس کے لئے نفع بخش نہیں ہے۔ یہی حال ہر اس شخص کا ہو گا جس تک اللہ کا حکم پہنچ جاتا ہے اور اس کے بعد وہ پھر اپنی فکر و

نظر کے گھوڑے دوڑاتا ہے اور خود فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اسے قبول کرے یا نہ کرے۔ایک مسئلہ اس کے سامنے ہے جس کا فیصلہ اللہ کی عدالت سے ہو گیا ہے لیکن وہ اسے نہیں مانتا' وہ اپنا فیصلہ خود کرتا ہے اور اس کے ذریعہ اللہ کے فیصلے کو رد کرتا ہے۔پس یہ جان بوجھ کر اور اچھی طرح سمجھ کر کفر کا ارتکاب ہے۔ابلیس کے پاس علم و معرفت کی کمی نہ تھی' اس کا اعتقاد متزلزل نہ تھا۔

چنانچہ وہ جنت سے بھگایا گیا' اللہ کی رحمت سے محروم ہو گیا اور اس پر لعنت لکھ دی گئی۔اس کے اوپر ذلت مسلط کر دی گئی۔لیکن یہ شدید فطرت اس بات کو سمجھنے کی سعی ہی نہیں کرتی کہ اس آدم کی وجہ سے وہ راندۂ درگاہ ہوا۔چنانچہ اب وہ توبہ کرنے کے بجائے انتقام پر اتر آتا ہے۔اب وہ اپنے سر پر وہ ذمہ داریاں لیتا ہے جو اس شر کے ساتھ مناسب ہیں جس میں وہ مبتلا ہو گیا ہے۔

(قَالَ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (۱۴) قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ (۱۵) قَالَ فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ (۱۶) ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ (۱۷)(۷:۱۴ تا ۱۷)) "بولا" مجھے اس دن تک مہلت دے جب کہ یہ سب دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔" فرمایا" تجھے مہلت ہے۔" بولا" اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا' آگے اور پیچھے' دائیں اور بائیں' ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔"

معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنی اس شرپسندی پر اصرار کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس نے پوری طرح عزم کر لیا ہے کہ وہ گمراہ ہو گا اور مزید لوگوں کو گمراہ کرے گا۔اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیطانی مخلوق کی فطرت میں گمراہی رچی بسی ہے اور یہ اس کی خصوصیت اولی ہے۔یہ شر عارضی اور وقتی نہیں ہے' یہ اصلی' بامقصد اور عمداً ہے اور نہایت ہی گہری دشمنی پر مبنی ہے۔

یہ آیت عقلی' معنوی اور نفسیاتی حرکات کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے اور اس میں زندہ مناظر نظر آتے ہیں۔

ابلیس یہ درخواست کرتا ہے کہ اسے قیامت تک مہلت دی جائے' اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے اللہ کی مشیت و ارادے کے بغیر اس تک نہیں پہنچ سکتا۔اللہ تعالیٰ انتظار اور مہلت کے بارے میں اس کی درخواست منظور فرماتے ہیں لیکن ایک معلوم میعاد تک جیسا کہ دوسری سورتوں میں وضاحت کر دی گئی ہے۔روایات میں آتا ہے کہ یہ مہلت نفخۂ اولی کے دن تک ہے جس دن تمام مخلوق جان دے دے گی۔یوم البعث تک نہیں ہے۔

اب مہلت کے بارے میں فیصلہ لے لینے کے بعد ابلیس نہایت ہی ڈھٹائی اور خبث باطن کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ وہ اپنی گمراہی اور راندگی کا بدلہ اللہ کی مخلوق سے یوں لے گا کہ وہ اللہ کی اس مکرم مخلوق کو گمراہ کر کے چھوڑے گا اور وہ اپنے اس پروگرام کا اعلان ایسے فیصلہ کن انداز میں کرتا ہے۔

(لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ (١٦) ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ (١٧)(٧:١٦ - ١٧)) ''میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا' آگے اور پیچھے اور دائیں اور بائیں ہر طرف سے ان کو گھیروں گا۔''

یعنی تو نے ان کے لئے جو سیدھا راستہ تجویز کیا ہے میں اس میں اپنے مورچے لگاؤں گا۔ ان کو اس راہ سے روکنے کی سعی کروں گا۔ اللہ کی طرف جانے والا راستہ ظاہر ہے کہ کوئی محسوس راستہ نہیں ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ ایک ہی جگہ میں ہے اور اس کی طرف یہ راستہ جا رہا ہے۔ اللہ کا راستہ تو ایمان اور اطاعت کا راستہ ہے جس کے نتیجے میں اللہ کی رضا کا حصول ہوتا ہے۔ لہٰذا شیطان انسانوں پر ہر جانب سے حملہ آور ہوتا ہے' آگے سے' پیچھے سے' دائیں سے اور بائیں سے۔ اس طرح وہ انسانوں کو ان کے ایمان و عمل کی راہ میں روکے گا۔ یہ گویا ایک ایسا منظر ہے جو زندہ اور رواں دواں ہے۔ ابلیس ہر طرف سے انسانوں پر حملہ آور ہوتا ہے' مسلسل انہیں بدراہ کر رہا ہے اور لوگ اس کے دام فریب میں گرفتار ہو کر اللہ کی معرفت اور اس کے شکر سے محروم ہوتے ہیں۔ ہاں ایک قلیل تعداد ایسی ہے جو اس کے دام سے بچ نکلتی ہے اور وہ اللہ کے احکام پر چلتی ہے۔

(وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (٧: ١٧)) ''تو ان میں سے اکثر کو شکرگزار نہ پائے گا'' یہاں شکر کا تذکرہ آغاز سورہ میں تذکرہ شکر سے بطور ہم آہنگی کیا گیا ہے۔ آغاز میں کہا گیا (قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (٧ : ١٠)) ''تم کم ہی شکرگزار رہتے ہو۔'' مقصد یہاں یہ بتانا ہے کہ وہ کیا سبب ہے کہ انسان شکرگزار نہیں رہتا۔ اس لئے کہ ابلیس خفیہ طور پر شکرگزاری کے خلاف کام کرتا ہے۔ وہ ہر راستہ پر مورچہ زن ہے اس لئے انسانوں کو چاہئے کہ وہ پوری طرح چوکنے ہو جائیں' دشمن گھات لگائے بیٹھا ہے۔ وہ ہر طریقے سے انہیں ہدایت سے روکتا ہے اور انہیں اس امر کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جبکہ انہیں معلوم ہے کہ ان پر یہ مصیبت کس راستے سے آ رہی ہے۔

ابلیس کی درخواست اس لئے منظور کی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تقاضا بھی یہ تھا کہ انسان خود مختاری سے اپنا راستہ خود بنائے' کیونکہ اس کی فطرت میں خیر و شر دونوں کی استعداد موجود ہے۔ اسے عقلی قوت بھی دی گئی ہے جو شر کے مقابلے میں خیر کو ترجیح دیتی ہے۔ پھر رسولوں کے ہاتھ پیغام بھیج کر اسے شر کے انجام بد سے خبردار بھی کر دیا اور پھر اسے دین اسلام کا ضابطہ دے کر اسے درست راہ پر گامزن بھی کر دیا گیا۔ اسے بتایا گیا کہ مشیت الٰہی کا یہ تقاضا تھا کہ وہ ہدایت اختیار کرے یا گمراہی اور اس کی شخصیت میں خیر و شر کی کشمکش رہے اور وہ دو انجاموں میں سے کسی ایک تک پہنچ جائے اور اللہ کی مشیت کے مطابق اس پر سنت الٰہیہ جاری ہو۔ چاہے وہ ہدایت کی راہ لے یا ضلالت کا فیصلہ ہو۔

لیکن یہاں سیاق کلام میں ابلیس ملعون کو بصراحت یہ اجازت نہیں دی گئی کہ جاؤ تمہیں اجازت ہے کہ تم لوگوں کو گمراہ کرو' جس طرح اس کے پہلے سوال کو منظور کرتے ہوئے قیامت تک اسے مہلت دے دی گئی تھی' یہاں اس کی کارستانیوں پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جاتا اور اعلان کر دیا جاتا ہے کہ تم ذلیل و خوار کر کے یہاں سے نکالے جاتے ہو اور اسے یہ دھمکی دی جاتی ہے کہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔

(قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَّدْحُورًا لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ أَجْمَعِينَ (۷:۱۸)) فرمایا! "نکل جا یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ یقین رکھ کہ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے، تجھ سمیت ان سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔"

انسانوں میں سے بعض لوگ تو اللہ کو جانتے ہوئے شیطان کی پیروی کرتے ہیں اور ان کا یہ عقیدہ بھی ہوتا ہے کہ اللہ ہمارا اللہ ہے لیکن اس معرفت اور عقیدے کے ساتھ ساتھ وہ اللہ کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ اور اللہ کے قوانین کے مطابق فیصلے کرنے سے انکار کرتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے احکام پر نظر ثانی کر سکتے ہیں اور اللہ کے احکام کو نافذ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ یا پھر شیطان ان کو اس قدر گمراہ کر دیتا ہے کہ وہ سرے سے خدا کو مانتے ہی نہیں۔ یہ دونوں قسم کے لوگ شیطان کے پیروکار ہیں اور جہنم کے مستحق ہوں گے۔

اللہ نے ابلیس اور اس کی جماعت کو یہ موقع دے دیا ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرنے کی آزادانہ سعی کرے اور آدم اور اس کی اولاد کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ اپنے اختیار سے جو راہ چاہے اختیار کرے۔ دونوں کے لئے آزمائش کے مواقع ہیں اور یہ اللہ کی مشیت کا تقاضا تھا کہ وہ اس طرح انسان کو آزمائے۔ اس طرح اسے اس کائنات کی ایک منفرد اور مکرم مخلوق کا مقام دے تاکہ یہ انسان نہ فرشتہ ہو اور نہ شیطان، بلکہ وہ اپنا ہی کردار ادا کرے نہ شیطانی کردار اور نہ ہی فرشتوں کا کردار۔

---ООО---

اب یہ منظر ختم ہوتا ہے اور اس کے بعد دوسرا منظر سامنے آتا ہے۔ ابلیس کو جنت سے دھتکارنے کے بعد اللہ تعالیٰ حضرت آدم اور ان کی بیوی سے مخاطب ہوتے ہیں۔ یہاں ہمیں صرف اس قدر بتایا جاتا ہے کہ آدم کی بیوی بھی تھی اور وہ اس کی ہم جنس تھی، لیکن یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کی تخلیق کس طرح ہوئی۔ آیت زیر بحث اور اس جیسی دوسری آیات جو قرآن کریم میں وارد ہیں، اس معاملے میں کوئی بات نہیں بتاتیں اور تخلیق حوا کے بارے میں جو روایات ہیں ان کے اندر اسرائیلیات کے اثرات ضرور ہیں اس لئے ہم اس بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہہ سکتے کہ حوا کی تخلیق کیسے ہوئی؟ یہ بات یقینی ہے کہ اللہ نے آدم کی ہم جنس اس کی بیوی پیدا کی اور اس طرح وہ جوڑا ہو گئے۔ اللہ نے اپنی تمام مخلوق میں جوڑے پیدا کئے ہیں۔

(وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ) "اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے ہیں تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔" چنانچہ یہ اللہ کی سنت جاریہ اور اس کائنات کا بنیادی اصول ہے۔ جب ہم اس اصول کے مطابق رائے اختیار کریں تو پھر ہمیں یہ رائے اختیار کرنی ہوگی کہ خلق آدم کے بعد حوا کی تخلیق بھی جلد ہی کی گئی اور حضرت حوا کی تخلیق بھی حضرت آدم کی طرح ہوئی۔

بہرحال اب خطاب حضرت آدم اور آپ کی بیوی حضرت حوا سے ہے تاکہ سب سے پہلے ان کی زندگی کے بارے میں اللہ ان کو احکام دے۔ ان کی تربیت کی جائے اور زمین پر انہوں نے جو بنیادی کردار ادا کرنا ہے اس کے لئے انہیں تیار کیا جائے کیونکہ آدم کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ اس کرۂ ارض پر فریضہ خلافت الٰہیہ انجام دے جب کہ سورہ بقرہ کی

آیت میں واضح طور پر کہا گیا ہے۔

(اذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً) "جب اللہ نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔"

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾

"اور اے آدم' تو اور تیری بیوی' دونوں اس جنت میں رہو' جہاں جس چیز کو تمہارا جی چاہے کھاؤ' مگر اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔"

قرآن کریم نے اس درخت کا نام نہیں لیا کیونکہ درخت کا نام لینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل بات یہ تھی کہ انہیں صرف منع کرنا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمام حلال چیزوں کے استعمال کی اجازت دے دی تھی اور ممنوعات کے استعمال سے روک دیا تھا۔ ممنوعات کی حد اس لئے ضروری تھی تاکہ انسان کو معلوم ہو جائے کہ وہ اس سے آگے نہیں جا سکتا اور اس کو ارادہ و اختیار کی جو آزادی دی گئی ہے اس کو استعمال کر کے وہ اپنی خواہشات اور میلانات پر کنٹرول کرنا سیکھے اور خواہشات اور میلانات پر برتری حاصل کرے۔ وہ حیوانات کی طرح خواہشات کا غلام نہ ہو بلکہ خواہشات کا حاکم ہو۔ کیونکہ ایک انسان اور حیوان میں فرق ہی یہ ہے کہ انسان خواہشات پر قابو رکھتا ہے اور حیوان خواہشات پر کوئی کنٹرول نہیں رکھتا۔

اب ابلیس اپنا وہ کام شروع کرتا ہے جس کے لئے اس نے اپنے آپ کو وقف کر لیا ہے۔ یہ انسان جسے اللہ نے یہ اعزاز دیا اور جس کی تخلیق کا اعلان عالم بالا کی اس عظیم تقریب میں کیا گیا' جسے تمام فرشتوں نے سجدہ ریز ہو کر سلامی دی' اور جس کے سامنے سجدہ ریز نہ ہونے کی بنا پر ابلیس کو عالم بالا سے خارج البلد کیا گیا۔ یہ مخلوق اپنے اندر دو صلاحیتیں رکھتی ہے۔ یہ دونوں جانب جا سکتی ہے اور اس مخلوق میں بعض کمزور پوائنٹ بھی ہیں جن سے اسے پکڑا جا سکتا ہے۔ الا یہ کہ وہ امر الٰہی پر کاربند ہو جائے۔ ان کمزور مقامات سے اس پر حملہ کیا جا سکتا ہے اور اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ ان کمزور نکات میں سے ایک ہے شہوات نفسانیہ .... ذرا دیکھئے شیطان ان نکات سے کس طرح انسان پر قابو پاتا ہے۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ

تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾

''پھر شیطان نے ان کو بہکایا تاکہ ان کی شرمگاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں ان کے سامنے کھول دے۔ اس نے ان سے کہا ''تمہارے رب نے تمہیں جو اس درخت سے روکا ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ، یا تمہیں ہیشگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے۔'' اور اس نے قسم کھا کر ان سے کہا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔''

معلوم نہیں کہ شیطانی وسوسہ کس طرح عمل پیرا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہم شیطان کی حقیقت سے واقف نہیں جس سے ہم اس کے اعمال کی نوعیت سے خبردار ہو جائیں یا یہ معلوم کر سکیں کہ وہ انسان تک رسائل کیونکر حاصل کرتا ہے اور اس کو کس طرح گمراہ کرتا ہے۔ لیکن ہمیں مخبر صادق کے ذریعے یہ علم حاصل ہے کہ شیطان کسی نہ کسی طرح انسان کو گمراہ کرتا ہے اور ان غیبی حقائق کے بارے میں مخبر صادق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی سچا اور یقینی ذریعہ علم ہیں۔ شیطان انسان کو مختلف طریقوں سے گمراہ کرتا ہے اور یہ تمام طریقے انسانی شخصیت میں کمزور مقامات کے ذریعے سے سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ انسانی شخصیت میں جو فطری کمزوریاں ہیں ان سے انسان صرف پختہ ایمان اور یاد الٰہی کے ذریعے سے بچ سکتا ہے اور ایمان اور ذکر کے بعد صورت یہ ہو جاتی ہے کہ شیطان کا انسان پر کوئی کنٹرول نہیں رہتا۔ اس کی سازشیں کمزور پڑ جاتی ہیں اور انسان پر ان کا اثر نہیں ہوتا۔ اس طرح شیطان نے ان کو بہکایا اور ان کی شرمگاہیں جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھیں ان کو ان پر ظاہر کر دیا گیا اور یہ تھا اس کا اصل مقصد۔ ان کی شرمگاہیں تھیں لیکن وہ ان کی نظروں سے اوجھل تھیں۔ وہ دیکھ نہ سکتے تھے۔ آگے تفصیلات آئیں گی کہ یہ جسمانی شرمگاہیں تھیں اور ان کو کسی دوسری مادی چیز سے چھپانے کی ضرورت تھی۔ شیطان نے ان پر اپنی اسکیم ظاہر نہ کی تھی البتہ وہ ان کی خواہشات کی راہ سے داخل ہو گیا۔ اس نے کہا ''تمہارے رب نے تمہیں جو اس درخت سے روکا ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمہیں ہیشگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے۔''

یوں شیطان انسانی خواہشات کے ساتھ کھیلا۔ ہر انسان یہ خواہش رکھتا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے یا طویل عرصے تک عمر پائے اور اسے خلود نصیب ہو۔ اور اس کو ایسی سلطنت ملے جو محدود زندگی سے آگے ہو۔

بعض قراءتوں میں (مَلِكَيْنِ) لفظ ل کی زیر کے ساتھ آیا ہے۔ (مَلِكَيْنِ) جس کے معنی دو بادشاہ کے ہوتے ہیں۔ سورہ طٰہٰ کی آیت (هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (۲۰ : ۱۲۰)) ''کیا میں خلود کا درخت نہ بتاؤں اور ایسی بادشاہت جو ختم ہونے والی نہ ہو۔'' اس صورت میں شیطان نے انہیں دائمی عمر اور دائمی حکومت کا لالچ دیا۔ یہ دونوں چیزیں انسان کی خواہشات میں سرفہرست ہیں۔ جنسی خواہش کی اصل حقیقت بھی یہ ہے کہ جنسی تعلق و اتصال کے ذریعے ایک انسان خلود ہی چاہتا ہے یعنی اس کی اولاد ہو اور نسلاً بعد نسلٍ وہ زندہ رہے اور اگر ملکین پڑھیں تو مراد یہ ہوگی کہ دونوں فرشتے بن جاؤ گے اور انسان کی جسمانی ضروریات سے فارغ ہو جاؤ گے اور ملائکہ کی طرح زندگی بھی دائمی ہوگی لیکن پہلی قرأت اگرچہ مشہور قرأت نہیں ہے، سورہ طٰہٰ کی آیت سے زیادہ موافق ہے اور اس سورہ میں شیطان کا دھوکہ بھی انسانی خواہشات کی حدود کے اندر رہتا ہے۔

شیطان لعین چونکہ جانتا تھا کہ اللہ نے ان کو بصراحت اس درخت سے منع کر دیا ہے اور یہ کہ اللہ کی جانب سے ممانعت کی وجہ سے ان کے دل میں کھٹکا موجود ہے اور قوت مدافعت ان کے اندر پائی جاتی ہے اس لئے اس وسوسہ اندازی میں وہ انسانی خواہشات اور کمزوریوں سے استفادے کے ساتھ ساتھ ناصح مشفق بن کر اور قسمیں اٹھا کر کہتا ہے (وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّی لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ (۷: ۲۱)) "اور اس نے قسم کھا کر ان سے کہا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔"

آدم اور ان کی بیوی اللہ کی اس تنبیہ کو بھول جاتے ہیں کہ شیطان ان کا دشمن ہے۔ یہ بھول ان کی شخصی خواہش اور شیطان کی قسموں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا تھا کہ تم احکام الٰہیہ کی اطاعت کرو چاہے کسی حکم کی علت سمجھو یا نہ سمجھو۔ یہ دونوں یہ بھی بھول گئے کہ اللہ کی تقدیر اور حکم کے سوا کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر اللہ نے ان کے لئے خلود نہیں لکھا اور دائمی حکومت نہیں لکھی تو یہ مقصد کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۗ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾

"پس دھوکا دے کر وہ ان دونوں کو رفتہ رفتہ اپنے ڈھب پر لے آیا۔ آخر کار جب انہوں نے اس درخت کا مزا چکھا تو ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔ تب ان کے رب نے انہیں پکارا "کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہ روکا تھا اور تم دونوں سے نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

اب یہ دھوکہ تمام ہوا اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے آگیا۔ شیطان نے ان کو اللہ کی اطاعت سے پھیر کر اللہ کی معصیت میں مبتلا کر دیا اور یہ سب کچھ اس نے گہری سازش اور دھوکے سے کیا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس جوڑے کو دنیا میں اتار دیا۔ (فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ (۷: ۲۲)) "اس نے دھوکہ دے کر یہ مقصد حاصل کیا۔"

اب انہیں اس بات کا شعور ہوا کہ ان کے جسم میں شرمگاہیں بھی ہیں۔ یہ شرمگاہیں پہلے ان کی نظروں سے اوجھل تھیں۔ چنانچہ انہوں نے جنت کے درختوں کے پتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر ان کو اپنی شرمگاہوں پر رکھنا شروع کر دیا۔ ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان شرمگاہوں سے مراد وہ جسمانی حصے ہیں جن کے ظاہر ہونے سے انسان فطرتاً شرمندہ ہوتا ہے اور ان مقامات کو صرف وہی شخص ننگا اور ظاہر کر سکتا ہے جس کی فطرت کسی جاہلی سوسائٹی کی وجہ سے فساد پذیر ہو چکی ہو۔

(وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ

لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ (۷: ۲۲) "تب ان کے رب نے انہیں پکارا "کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہ روکا تھا اور نہ کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے ۔"

ان دونوں نے اللہ کی جانب سے آنے والی یہ جواب طلبی سنی کیونکہ انہوں نے نصیحت کو بھلا دیا اور نافرمانی کی ۔ سوال یہ ہے کہ اللہ کی جانب سے آنے والی اس ندا کی کیفیت کیا تھی؟ ویسی ہی جس طرح پہلی مرتبہ اللہ نے انہیں خطاب کیا تھا' جس طرح فرشتوں کو خطاب کیا تھا ۔ جس طرح ابلیس کو خطاب کیا تھا ۔ یہ سب امور غیبی امور ہیں اور ان کے بارے میں ہم صرف گمان رکھتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا ہو گا اور اللہ جو چاہتا ہے' کرتا ہے ۔

اس پکار کے مقابلے میں' معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کی اس منفرد مخلوق انسان کی شخصیت کا ایک دوسرا اہم پہلو بھی ہے ۔ وہ یہ کہ وہ بھول بھی جاتا ہے اور اس سے غلطی بھی سرزد ہو جاتی ہے اور یہ کہ اس میں ایسی کمزوریاں بھی ہیں جن کے راستے سے شیطان اس پر اثرانداز ہوتا ہے ۔ نیز یہ کہ یہ انسان نہ ہمیشہ غلطی پر ہوتا ہے اور نہ ہمیشہ صحیح راستے پر ہوتا ہے ۔ البتہ یہ ہے کہ وہ اپنی غلطی اور لغزش کا ادراک کر لیتا ہے اور اس ادراک کے بعد وہ طلب مغفرت کرتا ہے اور نادم ہو جاتا ہے ۔ وہ واپس ہو کر توبہ کرتا ہے اور شیطان کی طرح معصیت پر اصرار نہیں کرتا ۔ وہ اپنے رب سے معصیت پر معاونت طلب نہیں کرتا ۔

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٢٣﴾

دونوں بول اٹھے "اے رب' ہم نے اپنے اوپر ستم کیا' اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے ۔"

یہ انسان کی وہ خصوصیت ہے جو اسے اپنے رب سے ملائے رکھتی ہے' اور رب تک رسائی کے دروازے کھلے رکھتی ہے ۔ اعتراف جرم اور ندامت و استغفار ۔ اپنی کمزوری کا شعور اور اللہ سے طلب استعانت اور طلب رحمت' اور یہ یقین کہ اللہ کے سوا کوئی اور قوت کا سرچشمہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی معاونت کر سکتا ہے ۔ اگر اللہ کی رحمت و معاونت نہ ہو تو انسان عظیم خسارے سے دوچار ہوتا ہے ۔

یہاں انسان کا پہلا تجربہ پورا ہو جاتا ہے اور اس کی شخصیت کے بڑے بڑے خدوخال واضح ہو جاتے ہیں ۔ خود انسان اپنی کمزوریوں اور اپنے کمالات و صلاحیتوں سے واقف ہو جاتا ہے' وہ صلاحیتیں جو اسے کرۂ ارض پر فریضہ خلافت کی ادائیگی کے لئے دی گئی ہیں ۔ اس فریضے کا اہم حصہ یہ ہے کہ اس زمین پر انسان نے اپنے دشمن شیطان کے ساتھ ایک دائمی معرکہ سر کرنا ہے ۔

قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ

مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا
تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾ ع ۲ ۱۵ ۹

فرمایا "اتر جاؤ' تم ایک دوسرے کے دشمن ہو' اور تمہارے لئے ایک خاص مدت تک زمین ہی میں جائے قرار اور سامان زیست ہے' اور فرمایا "وہیں تم کو جینا اور وہیں مرنا ہے اور اسی میں سے تم کو آخر کار نکالا جائے گا۔"

سب کے سب اتر جاؤ' اس کرۂ ارض پر جابسو' سوال یہ ہے کہ اس وقت یہ لوگ کہاں تھے؟ جنت کہاں ہے؟ یہ غیبی امور سے متعلق باتیں ہیں اور اس بارے میں ہم اسی قدر جانتے ہیں جس قدر ہمیں وہ ذات باری بتا دے جس کے ہاتھ میں غیب کی کنجیاں ہیں۔ اب جب کہ وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے تو کسی انسان کی جانب سے ان غیبی امور و مقامات کی تلاش ایک فضول کوشش ہو گی۔ اسی طرح جو لوگ ان امور کا انکار کرتے ہیں اور اپنی سائنسی اور غیر یقینی معلومات کی اساس پر کرتے ہیں وہ بھی اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں اور ان کا یہ موقف محض خود سری اور مکابرہ ہے۔ اس لئے کہ وہ اس عالم غیب کی بات کرتے ہیں جہاں تک انہیں رسائی حاصل نہیں ہے لیکن ان لوگوں کی خود سری کا عالم یہ ہے کہ یہ سرے سے عالم غیب کا انکار کرتے ہیں حالانکہ اس غیب نے ابھی تک انسان کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ ان لوگوں کے علم کا موضوع مادہ ہے اور مادے کی دنیا میں بھی اب تک کے معلوم سے مجہول زیادہ ہے۔

بہرحال یہ سب لوگ اترے۔ زمین پر آگئے۔ آدم' حوا' ابلیس اور اس کے حواری و موالی اور یہاں وہ اس لئے اترے کہ اس میدان میں معرکہ آدم و ابلیس شروع ہو' وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں اور دو مزاجوں کے درمیان معرکہ شروع ہو جائے۔ ایک مزاج سو فیصد شرپسند ہے اور دوسرا خیر و شر دونوں کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اللہ کی مشیت نے ابتلاء کی جو اسکیم تیار کی ہے اسے پورا کیا جا سکے اور اللہ کا منصوبہ قضا و قدر آخر تک پہنچے۔

اللہ نے آدم اور ان کی اولاد کے لئے زمین پر رہنا مقرر کر دیا کہ وہ یہاں بسیں۔ دنیا کی پیداوار سے فائدہ اٹھائیں۔ ایک وقت مقررہ تک۔ یہاں زندہ رہیں اور مریں اور وقت آنے پر انہیں اٹھایا جائے گا تاکہ وہ اپنے رب کے سامنے جوابدہی کریں۔ اہل جنت' جنت میں اور اہل النار دوزخ میں جائیں۔ یہ ہو گا انجام اس عظیم سفر انسانیت کا۔

اب یہ پہلا راؤنڈ ختم ہوا۔ اس کے بعد معرکہ آدم و ابلیس کے نئے راؤنڈ ہوں گے۔ ان میں انسان صرف اس صورت میں کامیاب ہو گا کہ اس نے اپنے رب کی پناہ لی ہو گی اور اگر اس نے اپنے دشمن کو دوست بنا لیا تو ظاہر ہے کہ وہ شکست کھائے گا۔

---ooo---

یہاں یہ بات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ کوئی قصہ یا کہانی نہیں ہے بلکہ ان آیات میں انسان کی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے تاکہ اس کے مزاج' اس کی نشوونما' اس کے ماحول' نظام قضا و قدر جو اس کی زندگی کو متاثر کرتا ہے اور وہ نظام جو اللہ نے اس کے لئے پسند کیا' وہ ابتلاء جس سے اس نے دوچار ہونا ہے اور وہ انجام جس تک اس نے پہنچنا ہے' کے بارے میں حقائق سامنے آسکیں اور یہ وہ باتیں ہیں جو اسلامی تصور حیات کی بنیادوں میں شامل ہیں۔

جہاں تک ہمیں فی ظلال القرآن کا منہاج اجازت دے گا' ہم اس کے بنیادی نکات یہاں نوٹ کریں گے۔ تفصیلات ہم اپنی کتاب "خصائص التصور الاسلامی" کے لئے چھوڑتے ہیں جو اس موضوع پر تفصیلی بحث کرتی ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں' قصہ تخلیق انسانیت سے ہمیں جو پہلی حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق اور انسان کی تخلیق کے درمیان ایک فطری ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یہ دونوں اللہ کے نظام قضا و قدر کے اندر کام کرتے ہیں۔ اس حقیقت کے ادراک سے ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ انسان کی تخلیق جوایک تقدیر اور منصوبے کے مطابق ہوئی محض اتفاقی بات نہ تھی اور اس کائنات' انسان اور نظام قضا و قدر کے درمیان مکمل توافق ہے۔

جو لوگ اللہ کی معرفت سے محروم ہیں وہ ذات باری کی قدر نہیں کر سکتے جس طرح کہ اس کا حق ہے۔ یہ لوگ اللہ کے کاموں اور اس کے نظام قضا و قدر کو ان پیمانوں سے ناپتے ہیں جو انسان کے چھوٹے چھوٹے کاموں اور منصوبوں کے لئے وضع ہوئے ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں تو ان کی سمجھ میں صرف یہ بات آتی ہے کہ انسان بھی اس دنیا کی دوسری مخلوقات کی طرح کی ایک مخلوق ہے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ اس عظیم کائنات میں یہ زمین ایک ذرہ کے برابر ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ کوئی معقول بات نہیں ہے کہ انسان کی پیدائش کے پیچھے کوئی مقصد تلاش کیا جائے' لہٰذا اس انسان کی اس کائنات میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ انسان کا وجود یہاں محض اتفاق سے ہو گیا اور اس انسان کے اردگرد جو کائنات ہے وہ اس کے وجود اور نشوونما کے سخت خلاف ہے۔ یہ محض تیر تکے ہیں جو یہ لوگ اللہ کے افعال اور اس کے نظام قضا و قدر کے بارے میں چلاتے ہیں۔ اور وہ بھی محض اپنی محدود انسانی معیار عقل و دانش کے مطابق۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ پوری کائنات انسان کی ملکیت ہوتی تو وہ اس چھوٹے سے کرۂ ارض کو خاطر ہی میں نہ لاتا اور نہ اس چھوٹی سی مخلوق کی پرواہ کرتا جو اس پر چلتی ہے۔ کیونکہ انسان اس پوری کائنات کی عظیم مملکت کا اہتمام نہیں کر سکتا۔ نہ وہ اس کی ہر چیز کی تدبیر کر سکتا ہے' نہ ہر چیز کا اندازہ کر سکتا ہے اور نہ وہ اس جہان کی تمام اشیاء کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جہان کا بادشاہ اللہ ہے اور آسمانوں اور زمینوں میں سے کوئی ایک ذرہ بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہے۔ اللہ اس عظیم کائنات کا تھامنے والا ہے اور اس کائنات کی کوئی چیز اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتی اگر اللہ کا حکم نہ ہو۔ یہاں کوئی چیز بھی اللہ کی مشیت کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی۔ انسان جب اللہ کی ہدایت کو ترک کر دے اور اپنی خواہشات نفسانیہ کی پیروی شروع کر دے تو وہ معصیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر اس معصیت کو وہ علم کا نام دیتا ہے تو یہ اس کی مرضی ہے۔ وہ اللہ کو اپنے اوپر قیاس کرتا ہے اور اللہ کے افعال و اعمال کو اپنے افعال پر قیاس کرتا ہے حالانکہ اللہ کے افعال و اقدار انسان کے قیاس سے باہر ہیں۔ یہ انسان کی غلط فہمی ہے کہ وہ اپنی خواہش کو اپنی کم ظرفی کی وجہ سے حقیقت سمجھتا ہے۔

سر جیمس جینز اپنی کتاب "کائنات جو ایک راز ہے" انسان کے گمراہانہ تصورات کے بارے میں کہتا ہے۔

"ہم جب اس زمین پر کھڑے ہوتے ہیں' جو ریت کا ایک چھوٹا سا دانہ ہے تو ہم یہ کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس پوری کائنات کی طبیعت اور ماہیت کو معلوم کریں جو ہمارے اردگرد اور زمان و مکان کی ناقابل تصور وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہم یہ بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس کو وجود میں لانے کی غرض و غایت کیا ہے؟ جب ہم اس کائنات کو دیکھتے ہیں تو سب سے پہلے تو ہم حیرانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ہماری نظریں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ

کائنات کس طرح ہمیں خوف میں مبتلا نہ کرے جبکہ اس کی وسعتیں اس قدر بڑی ہیں کہ ہماری عقل ان کا ادراک نہیں کر سکتی۔ پھر اسی کائنات پر ایک طویل عرصہ گزر گیا ہے اور ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور اس کے مقابلے میں انسان کے ذخیرہ علم میں جو تاریخ ہے وہ ان زمانوں کے مقابلے میں ایک لمحہ ہے۔ پھر یہ اس اعتبار سے بھی خوفناک ہے کہ اس کے اندر ایک خوفناک وحدت پائی جاتی ہے۔ پھر یہ اس لئے بھی خوفناک ہے کہ اس کائنات کے اندر ہمارا وطن' یہ زمین اس قدر چھوٹی ہے کہ دنیا کے سمندروں کے ایک چھوٹے سے ریت کے کنکر کو اگر ایک ملین ٹکڑے کیا جائے تو اس سے بھی کم ہے۔ لیکن اس کائنات کی سب سے زیادہ خوفناکی اس پہلو سے ہے کہ یہ ایک بے مطلب چیز ہے۔ جس طرح ہماری زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بے مطلب ہے۔ ہمارے جذبات' ہمارے مقاصد' ہمارے اعمال' ہمارے فنون اور ہمارے ادیان سب کے سب اس کائنات کے نظام کے ساتھ غیرمانوس ہیں اور اس کے نظام کے ساتھ بے میل ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اس کائنات اور ہماری زندگی کے درمیان مستقل دشمنی اور تضاد ہے تو یہ بات غلط نہ ہوگی اس لئے کہ اس کائنات کی فضا کی اکثریت اس قدر ٹھنڈی ہے کہ جہاں زندگی ممکن نہیں ہے۔ تمام انواع حیات وہاں منجمد ہو جاتے ہیں اور اکثر مادی اجزاء اس قدر گرم ہیں کہ ان میں زندہ رہنا محال ہے۔ اس فضائے کائنات میں ایسی شعاعیں ہر وقت باہم متصادم ہوتی رہتی ہیں کہ اجرام فلکی باہم متصادم رہتے ہیں اور یہ شعاعیں بسا اوقات زندگی کی دشمن ہو سکتی ہیں بلکہ کسی بھی وقت زندگی ختم کر سکتی ہیں۔"

"یہ کائنات جس میں حالات نے ہمیں لا کر پھینک دیا ہے' اگر یہ بات سچ نہیں ہے کہ ہم یہاں اس کائنات کی کسی غلطی کی وجہ سے زندہ ہیں تو یہ بات بہرحال قرین قیاس ہے کہ انسان کا وجود یہاں محض اتفاق اور مصادفت سے ہو گیا ہے۔"

یہ ہیں ان لوگوں کے خیالات۔ یاد رہے کہ اس سے قبل ہم اس نکتے پر بحث کر آئے ہیں کہ اس کائنات کا دشمن حیات ہونا اور یہ فرض کر لینا کہ یہ کائنات کسی مدبر اور کنٹرول کرنے والے کے بغیر ہے' اور یہ کہ اس کے اوپر انسان جیسی مخلوق اور مطلق زندگی کا وجود میں آ جانا محض اتفاق کے طور پر ہے کسی عام آدمی کی عقل میں آنے والی بات نہیں ہے چہ جائیکہ کوئی بڑا عالم یا سائنس دان ایسی باتیں کرے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ کائنات اس کے اندر پائے جانے والی ہر قسم کی زندگی کی قاتل ہے اور کوئی اس کے اوپر قوت مدبرہ بھی نہیں ہے تو یہ زندگی کس طرح وجود میں آ گئی؟ سوال یہ ہے کہ یہ زندگی کائنات سے زیادہ طاقتور ہے کہ یہ کائنات کے علی الرغم وجود میں آ گئی اور باوجود اس کے وجود میں آ گئی کہ کائنات اس کے وجود میں آنے کے خلاف تھی۔ کیا انسان وجود میں آنے سے قبل اس عظیم کائنات سے زیادہ قوی تھا' اور اس طرح وہ زبردستی یہاں آ کر کھڑا ہو گیا۔

میں کہتا ہوں یہ ایک ایسی سوچ ہے جس پر توجہ ہی نہ دینا چاہئے۔ اگر یہ نام نہاد علماء فقط یہ کہنے پر اکتفا کرتے کہ ہمارے ذرائع علم اس کائنات کی تفسیر و توضیح نہیں کر سکتے اور یہ خرافات نہ بکتے جو وہ میٹافزکس کے بارے میں بکتے ہیں' جن پر کوئی سند ان کے پاس نہیں ہے تو وہ اپنا فرض ادا کر جاتے اگرچہ یہ فرض بھی ناقص ہوتا۔ البتہ وہ کہہ دیتے کہ ہمارے اردگرد جو کائنات ہے یہ ایک معمہ ہے لیکن وہ اپنے دائرہ علم سے بہت آگے بڑھ جاتے ہیں اور مفروضوں' بلادلیل تصورات اور انسانی خواہشات کے پیدا کردہ فنی مزعومات کی دلدل میں جا پھنستے ہیں جو غیر محفوظ علاقے ہیں۔

ہم مسلمان الحمدللہ جب اس کائنات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں نہ خوف دامن گیر ہوتا ہے اور نہ ہم اس حیرت میں

پڑتے ہیں، جس کا اظہار سر جیمس جینز نے کیا ہے بلکہ ہم تو اس کائنات کے خالق کے بارے میں ڈر جاتے ہیں اور ہمیں وہ جمال و جلال نظر آتا ہے جو اس کائنات کے اندر ودیعت کر دیا گیا ہے۔ ہمیں بے حد اطمینان اور انس کا احساس ہوتا ہے اور یہ کائنات ہماری دوست بن جاتی ہے اس لئے کہ اس کو بھی خالق نے پیدا کیا ہے اور ہمیں بھی۔ دونوں کے اندر پورا توافق اور ہم آہنگی ہے۔ ہم اس کی ضخامت اور اس کی باریکی سے حیرت زدہ ضرور ہوتے ہیں لیکن خوفزدہ نہیں ہوتے اور ہمیں یہ شعور اور احساس آکر نہیں پکڑتا کہ اب ہم آج یا کل برباد ہو رہے ہیں اس لئے کہ ہمارا اور اس کائنات کا رب ایک ہے۔ ہم اس کے ساتھ نہایت ہی انس و محبت اور اعتماد اور یقین کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ ہمارا رزق اور ضروریات اور ہماری معاش اور معیشت کے زخائر اسی میں ہیں اور ہمیں اس کائنات کے خالق کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

(وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْأَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۷: ۱۰)) "ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لئے یہاں سامان زیست فراہم کیا۔ مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔"

قصہ تخلیق آدم سے ہمیں جو دوسری حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی جملہ زندہ مخلوق کے مقابلے میں انسان ایک معزز، برتر اور مکرم مخلوق ہے۔ اس نے اس جہان میں نہایت ہی اہم رول ادا کرنا ہے۔ اس نے نہایت ہی وسیع میدان میں تگ و دو کرنی ہے اور اس کے ساتھ یہاں کئی جہانوں کا معاملہ ہے۔ لیکن یہ تمام امور اللہ وحدہ کی بندگی اور غلامی کی حدود میں ہیں۔ اس انسان کی یہاں وہ پوزیشن نہیں جو اسے وہ مکاتب فکر دیتے ہیں جو حواس خمسہ اور مادیت کے اندر محدود ہیں۔ یہ مکاتب فکر انسان کو اس کائنات کا ایک مؤثر عامل نہیں سمجھتے۔ ان مذاہب و تصورات میں تمام اہمیت مادے اور اس کے اثرات کو دی جاتی ہے۔ اسی طرح نظریات ارتقاء کے قائلین اسے اس سے بھی گھٹیا مقام دیتے ہیں یعنی حیوانات میں سے ایک حیوان۔ ان لوگوں کو انسان کی انسانی خصوصیات سے کوئی غرض اور واسطہ نہیں ہے۔ یا وہ اسے فرائیڈ کے نظریہ جنسیت کے زاویہ سے دیکھتے ہیں جو انسان کو محض جنس کے گندے تالاب کا ایک کیڑا سمجھتا ہے اور وہ اسی گندے تالاب کے ذریعے ہی ترقی کرتا ہے۔ لیکن اسلام اس منفرد مخلوق یعنی انسان کو جو عزت و کرامت عطا کرتا ہے وہ اس مقام تک نہیں پہنچتی کہ وہ الہ بن جائے جیسا کہ جدید روشن خیالی کے دور میں پیدا ہونے والے تصورات حیات نے اسے الہ بنا دیا ہے۔ اسلامی تصور حیات اسے سچائی اور اعتدال کا درجہ دیتا ہے جو درست اور صحت مند ہے۔

پھر اس منفرد مخلوق حضرت انسان کی تخلیق کا اعلان عالم بالا کی ایک نہایت ہی پر وقار تقریب میں کیا گیا، اور جیسا کہ ہم نے قرآنی نصوص کی روشنی میں کہا اس تقریب میں ایک مکمل انسان پیش کیا گیا۔ اس میں یہ اعلان بھی کیا گیا کہ وہ اس زمین کا خلیفہ ہے۔ جنت میں اس پر جو ابتلا آئی وہ بھی اسی غرض کے لئے تھی کہ وہ فرائض خلافت کی ادائیگی کے لئے تیار ہو جائے، جیسا کہ دوسری آیات میں آتا ہے کہ یہ پوری کائنات، صرف زمین نہیں، انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ وہ اس کے لئے مفید و معاون ہے اور زمین و آسمان میں جس قدر چیزیں ہیں، انسان کے لئے مسخر کر دی گئیں۔

پھر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے اس دنیا میں انسان کو جو کردار سپرد کیا ہے وہ بھی بہت ہی عظیم ہے۔ اس

پورے کرۂ ارض کو ترقی دینا اور اس کے اوپر اللہ کا نظام خلافت قائم کرنا چاہے اس زمین کا حجم بڑا ہو یا چھوٹا' بہرحال یہ ایک عظیم ڈیوٹی ہے جو انسان کے سپرد کی گئی۔

اس قصے اور قرآن کریم کی دوسری آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک منفرد مخلوق ہے اور یہ صرف اس کرۂ ارض پر ہی منفرد نہیں ہے بلکہ یہ پوری کائنات میں منفرد مخلوق ہے۔ دوسرے ستاروں میں ملائکہ' جنات اور وہ تمام مخلوقات ہیں جن کے بارے میں صرف اللہ جانتا ہے۔ ان مخلوقات کے دوسرے فرائض ہیں' یہ تمام مخلوقات اپنا علیحدہ مزاج اور طبیعت رکھتی ہیں۔ ان کی طبیعت ان کے فرائض کے ساتھ مناسب ہے۔ البتہ انسان ایک منفرد مخلوق ہے جس کے فرائض اور وظائف بھی منفرد ہیں اور اس پر قرآن کی یہ آیت دلالت کرتی ہے۔

(انَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۳۳ : ۷۲)) "ہم نے اس امانت کو آسمانوں' زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے' لیکن انسان نے اسے اٹھالیا' بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔"

گویا انسان اس پوری کائنات میں اپنی خصوصیات کے اعتبار سے منفرد ہے۔ ان خصوصیات میں ظلم اور جہل دونوں شامل ہیں۔ اس ظلم اور جہل کے ساتھ اسے ذاتی خودمختاری دی گئی ہے اور علم و معرفت کی استعداد دی گئی ہے۔ ذاتی ارادہ دیا گیا ہے اور جس قدر وہ جہل و ظلم پر قادر ہے اسی قدر وہ عدل اور علم پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ غرض انسانی صلاحیتوں کی یہ رنگارنگی ہی اس کی اہم خصوصیت ہے۔

ان تمام خصوصیات کے ساتھ' اب یہ بات اہم نہیں رہتی کہ انسان جس کرے پر زندہ ہے وہ اپنے حجم اور اس پوری کائنات کی وسعت کے اعتبار سے بہت ہی چھوٹا ہے۔ اس لئے کہ ہر معاملے میں حجم کی اہمیت نہیں ہوتی۔ مثلاً قوت عقلی جو اشیاء کا ادراک کرتی ہے اور انسان کا متحرک بالارادہ ہونا اور اپنی ذاتی ترجیح کے مطابق کام کرنا' اگرچہ اللہ کی بندگی کے وسیع تر دائرے کے اندر ہو' یہ سب چیزیں بہرحال انسان کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتی ہیں اور اسے ایک منفرد مخلوق بنا دیتی ہیں۔ محض اس زمین کے حجم کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے سر جیمس جینز جیسے لوگ انسان کی قدر و قیمت کو گھٹاتے ہیں۔ یہ بات درست نہیں ہے۔

یہ آیات اور یہ قصص انسان کو جو اعزاز عطا کرتے ہیں وہ اس کے فریضہ خلافت الٰہیہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس منفرد مخلوق کا اعزاز اور اس کی اہمیت مزید واضح ہوتی ہے جب ہم ان آفاق اور کائنات کی ان پہنائیوں پر نظر ڈالتے ہیں جن میں یہ کام کرتا ہے۔

اب ذرا دیکھئے کہ اس منفرد مخلوق کا معاملہ اپنے رب کے ساتھ براہ راست ہے۔ اس نے اسے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا ہے۔ پھر عالم بالا کی پروقار تقریب میں اس کا اعلان کیا ہے اور اسے گویائی عطا کی۔ پھر اسے جنت میں داخل کیا اور کہا کہ کھاؤ جہاں سے چاہو ماسوائے ممنوعہ درخت کے۔ اس کے بعد اسے خلافت کا مقام عطا کیا' خود اپنے کلام کے ساتھ۔ پھر اللہ نے اسے تعلیم دی جیسا کہ آیت سورۂ بقرہ میں ہم نے اس کی تشریح کر دی ہے کہ اسماء سے مراد الفاظ کے معانی ہیں یعنی لفظ اور

مدلول وہ چیز ہے جس پر علم و معرفت کا تبادلہ ممکن ہوا ہے۔ ان ہی کے ذریعے سے تمام انسانوں کے علم میں اضافہ ہوا ہے۔ اور آدم کو جنت میں بھی اور اس کے بعد بھی اللہ نے وصیت کی اور اسے ایسی خصوصی صلاحیتیں دیں جو صرف انسان میں ہیں اور کسی اور مخلوق کو نہیں دی گئیں اور پھر اپنی مزید ہدایت دے کر رسولوں کو بھیجا۔ پھر اللہ نے اپنے اوپر اپنی مخلوق کے ساتھ رحمت کرنا فرض کر لیا کہ اگر وہ توبہ کر لیں اور معافی کے خواستگار ہوں تو انہیں معاف کر دیا جائے اور یہ اس منفرد مخلوق پر اللہ کا آخری کرم ہے۔

یہ انسان عالم بالا کے ساتھ بھی باہم ہم سفر ہے۔ فرشتے اس کی تکریم میں سجدہ کرتے ہیں۔ پھر اس کی حفاظت کے لئے بھی فرشتے مقرر ہیں۔ ان میں سے بعض وحی لانے کے فرائض سرانجام دیتے ہیں اور اللہ کے جو بندے یہ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر ثابت قدمی اختیار کرتے ہیں تو ان پر اللہ فرشتے نازل کرتا ہے' جو اسے خوشخبری دیتے ہیں۔ اس طرح جو لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں ان کی بھی یہ فرشتے نصرت کرتے ہیں اور انہیں فتح کی خوشخبری دیتے ہیں۔ پھر یہ فرشتے کفار پر مسلط کئے جاتے ہیں جو انہیں قتل بھی کرتے ہیں اور ان کی ارواح کو بھی عذاب دیتے ہیں۔ غرض یہ اور دوسرے معاملات ایسے ہیں جن میں انسان کا فرشتوں کی دنیا سے بھی ربط و معاملہ ہے۔

پھر انسان کا جنات کے ساتھ بھی معاملہ ہے۔ ان کے صالحین کے ساتھ بھی اور ان کے شرپسندوں کے ساتھ بھی۔ انسان اور شیطان اعظم کے درمیان جو معرکہ ہوا اس کے بارے میں تو قارئین جان چکے ہیں۔ یہ عظیم معرکہ اب بھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ لیکن نیک جنوں کے ساتھ انسان کا باہم ربط بھی بعض آیات میں مذکور ہے اور جنات کی تسخیر بھی قرآن سے ثابت ہے جس طرح حضرت سلیمان کے قصے میں مذکور ہے کہ انہوں نے جنات کو مسخر کر لیا تھا۔

اسی طرح یہ انسان اس پوری مادی کائنات کے ساتھ بھی مربوط ہے۔ خصوصاً زمین اور اس کے اردگرد ستاروں اور سیاروں کے ساتھ۔ اس زمین پر تو انسان اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے۔ انسان کے لئے اس کی تمام قوتیں مسخر کر دی گئی ہیں' اس کے خزانے اور پیداوار انسان کے لئے وقف ہے۔ اور انسان کے اندر وہ قوت اور استعداد ودیعت کر دی گئی ہے جو اس کی کنہ تک مسلسل پہنچ رہا ہے اور اس کے طبیعی قوانین کا انکشاف کرتا چلا جاتا ہے اور اس طرح وہ اس زمین پر عظیم کردار ادا کر رہا ہے۔ یوں اس کا اس کائنات کی تمام زندہ مخلوق کے ساتھ ربط ہے۔ پھر اپنی طبیعت کی بوقلمونیوں کی وجہ سے وہ خود اپنے نفس کے اندر بہت دور تک معرفت کے گھوڑے دوڑاتا ہے۔ یہ آسمانوں تک معراج حاصل کرتا ہے اور فرشتوں کے مقامات سے بھی آگے چلا جاتا ہے۔ لیکن اس وقت جب وہ اللہ کا بندۂ خاص ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ گر جائے تو محض ایک حیوان کی سطح تک بھی اتر آتا ہے۔ جب وہ اپنی خواہشات کو اپنا الٰہ بنالے۔ اس وقت اس کی انسانیت گندے حیوانی تالاب میں لت پت ہو جاتی ہے۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان ایک وسیع و عریض میدان درجات ہے جو عالم حس کے اندر اور اس کے آگے ورائے حس کی حدود تک پھیلا ہوا ہے اور اس کا اس میں معاملہ ہے........ یاد رہے کہ انسان کے سوا کسی اور مخلوق کے لئے یہ مقامات نہیں ہیں' جیسا کہ اس قصے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ یہ منفرد مخلوق' اپنی اس انفرادیت کے باوجود بعض پہلوؤں سے کمزور بھی ہے اور اپنی ان کمزوریوں کی وجہ سے اس بات کا امکان ہے کہ اسے شر کی طرف کھینچا جا سکتا ہے وہ ذاتی اور سفلی خواہشات کے پیچھے درجہ اسفل تک بھی گر سکتا ہے۔ اس کی ایک کمزوری تو یہ ہے کہ وہ یہاں باقی رہنا چاہتا ہے۔ پھر وہ اقتدار کا بھی بھوکا ہے اور اس

کے اندر اقتدار کی سخت خواہش ہے ۔ جب وہ اللہ کی ہدایات کو پس پشت ڈال دیتا ہے تو اس کی کمزریوں میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے ۔ اور وہ خالص خواہشات نفسانیہ کا بندہ بن جاتا ہے یا وہ ایسے دشمن شیطان کا پیرو کار بن جاتا ہے ' جس نے یہ ڈیوٹی اپنے ذمے لے رکھی ہے کہ وہ اسے گمراہ کرے گا ' اس مقصد کے لئے انتھک کوشش جاری رکھے گا اور اس مقصد کے حصول کے لئے وہ تمام ذرائع و وسائل کام میں لائے گا ۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کی وجہ سے اسے پوری طرح اس کی فطرت کے سپرد نہیں کر دیا ۔ نہ اسے اپنی عقل اور سوچ کے حوالے کر دیا ہے ۔ بلکہ اس کی ہدایت کے لئے اور اسے انجام بد سے ڈرانے کے لئے رسولوں کا سلسلہ بھیجا ہے ۔ چنانچہ اس قصے پر بطور تبصرہ اگلی آیات کی تفسیر میں آ رہا ہے ۔ اور یہ انسان کی کامیابی کا پہلا زینہ ہے ۔ اس طرح وہ اپنی خواہشات کے جنگل سے آزاد ہو کر اللہ کی جانب چلا آتا ہے اور اس طرح اپنے خفیہ دشمن سے نجات پا جاتا ہے ۔ یہ نجات اسے اللہ کے ذکر ' اس کی یاد ' اس کی رحمت اور اس کے اجر کے حصول کے داعیہ اور اس کی سرزنش سے ڈر کی وجہ سے ملتی ہے ۔

یہ تمام باتیں اسے قوت بخشتی ہیں اور ان کے ذریعے وہ اپنی کمزوریوں اور شہوات پر قابو پا لیتا ہے ۔ اس سلسلے میں اس کی پہلی ٹریننگ یہ تھی کہ جنت میں اس کے لئے ایک درخت کو حرام کر دیا گیا تاکہ وہ اس سے بچ کر اپنے ارادے کو قوت بخشے اور کمزوریوں اور نافرمانیوں کی کشش کا مقابلہ کرے ۔ اگرچہ وہ اس پہلے تجربے اور پہلی آزمائش میں کامیاب نہیں رہا لیکن بعد میں یہ ناکامی اس کے لئے سبق آموز ثابت ہوئی ۔

اس کی ان کمزوریوں کی وجہ سے اللہ نے رحم فرمایا اور اس کے لئے توبہ کے دروازے کو کھلا رکھا ۔ جب وہ بھول جائے اور پھر اسے یاد آ جائے اور وہ پشیمان ہو ۔ جب وہ گر جائے اور پھر اٹھے ' جب وہ راہ راست سے ہٹ جائے اور توبہ کر لے اور مڑ کر سیدھی راہ اختیار کر لے تو اس کے لئے توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے ۔ اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے ' اس کی غلطی کو معاف کرتا ہے اور یہ نہیں کہ اگر کسی سے غلطی ہو جائے تو ضرور اسے پکڑے ۔ یا اس کے لئے لعنت ہو اور اس کی اولاد بھی اس تہمت سے متہم ہو ' کیونکہ کوئی گناہ ابدی نہیں ہوتا ۔ کوئی بوجھ اٹھانے والے دوسرے کا بوجھ کس طرح اٹھائے گا ؟

اسلامی نظام حیات کا یہ تصور اس کہانی کو رد کر دیتا ہے جو انسانیت پر کینسہ کے غلط تصورات نے مسلط کی تھی اور جس کے نتیجے میں عیسائی مذہب پر کئی غیر فطری عقائد اور رسومات مسلط ہو گئے اور یہ مذہب درست عقائد کے بجائے خرافات میں گم ہو گیا ۔ یہ عجیب تصور ہے کہ آدم کی لغزش اب پوری انسانیت کی گردن میں لٹکی ہوئی ہے ' اور ایک دائمی لعنت ہے ' یہاں تک کہ وہ ان کے خود ساختہ خدا مسیح کے ساتھ بھی لگی ہوئی ہے ۔ ان کی جان بھی اس سے تب چھوٹتی ہے اور انسانیت کا دامن بھی تب صاف ہوتا ہے جب یہ انسانی خدا سولی پر چڑھ جاتا ہے اور پھر کیا ہوتا ہے ؟ جو لوگ قیامت تک عیسائیت کو قبول کرتے ہیں ان کے گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں ۔ بہت خوب !

اس کے مقابلے میں اسلامی تصور حیات میں یہ معاملہ کس قدر آسان اور قابل فہم ہے کہ حضرت آدم بھول گئے اور ان سے لغزش کا صدور ہو گیا ۔ انہوں نے توبہ کی اور اللہ نے بخش دیا اور یوں اس پہلی لغزش کا معاملہ ختم ہو گیا اور یہ لغزش انسان کے لیے ایک سبق آموز تجربہ کے طور پر تاریخ میں محفوظ ہو گئی اور بس تاکہ انسان اس سے سبق حاصل کرے ۔

ذرا دیکھئے یہ تصور کس قدر سادہ ہے ۔ کس قدر واضح ہے اور اس تصور کا اپنانا کس قدر سادہ ہے اور آسان ہے ۔

چوتھی حقیقت یہ ہے کہ یہاں انسان اور شیطان کی کشمکش ایک حقیقی کشمکش ہے ۔ یہ مسلسل اور سخت ترین کشمکش ہے ۔ اس قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دشمن انسان نے ہر حالت میں انسان کے خلاف اپنی کاروائی جاری رکھنے کا اعلان کر دیا ہے اور اس نے برملا کہہ دیا ہے کہ وہ ہر طرف اور ہر جہت سے انسان پر حملہ آور ہو گا اور اپنے حملوں کو مسلسل جاری رکھے گا ۔ وہ ان الفاظ میں اعلان جنگ کرتا ہے ۔

"اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کے گھات میں لگا رہوں گا' آگے اور پیچھے ' دائیں اور بائیں ' ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا ۔"

شیطان ملعون نے یہ راہ اپنائی کہ وہ انسانوں کے خلاف اپنی اس فریب کاری کو جاری رکھے گا ۔ اسے اس کاروائی کے لئے مہلت ملنی چاہئے ۔ اس کے مقابلے میں اس کے سامنے جو سیدھی راہ تھی اسے اس نے ترک کر دیا ۔ سیدھی راہ یہ تھی کہ اس نے ذات باری کے سامنے ' اللہ کے احکام کو درست طرح سن کر جو معصیت کی اس پر وہ نادم ہوتا اور اللہ سے بخشش طلب کرتا ۔ اس کے برعکس اس نے یہ اعلان کیا کہ وہ ہر راہ گزر پر بیٹھ کر ان کو گمراہ کرے گا اور ہر جہت اور ہر طرف سے ان پر حملہ آور ہو گا اور ان کو گمراہ کر کے چھوڑے گا ۔

شیطان انسانوں پر ان مقامات سے حملہ کرتا ہے جو دفاعی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں ۔ یہ کمزور مقامات جنسی خواہشات اور مرتبے کے حصول کی خواہشات ہیں ۔ ان کمزور مقامات کو انسان صرف خدا خوفی اور ذکر الہٰی کے ذریعے درست کر سکتا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی ذاتی خواہشات کو دبائے اور اپنی خواہشات کو اللہ کی ہدایت کے تابع کر دے ۔

انسان اور شیطان کی جنگ ایک اہم جنگ ہے ۔ یہ ہماری مادی خواہشات کے خلاف جنگ ہے اور اللہ کی جانب سے آئی ہوئی ہدایت کا اتباع ہے ۔ اور مادی خواہشات پر قابو پا کر صرف وہ لوگ بلندی حاصل کر سکتے جو بلند نظریات اور بلند ارادے رکھتے ہوں اس لئے کہ یہاں شیطان اپنے لاؤ لشکر سمیت ایک طرف میدان میں ہے اور اس کا مقابلہ تب ہی کیا جا سکتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر شریعت کو نافذ کر دیا جائے ۔ پس یہ معرکہ نظریات اور ضمیر کے میدان میں بھی جاری ہے اور زندگی کے عملی میدان میں بھی جاری ہے ۔ دونوں میدانوں میں یکبارگی یہ کشمکش ضروری ہے ۔

وہ شیاطین جو دنیا میں براجمان ہیں وہ لوگوں کو اپنی شریعت ' اپنی وضع کردہ اقدار کے مطابق چلاتے ہیں ۔ انہوں نے یہاں حسن و قبح کے اپنے پیمانے بنا رکھے ہیں جو اللہ کی حاکمیت ' اس کے اقتدار اعلیٰ اور اس کی شریعت کی نفی کرتے ہیں اور ان اقدار کے خلاف چلتے ہیں جو دین اسلام سے نکلتی ہیں ۔ یہ انسانی شیاطین ہیں اور ان کو جنی شیاطین ہدایات دیتے ہیں ۔ ان انسانی شیاطین کے ساتھ یہ سیاسی معرکہ بھی خود شیطان اصلی کے خلاف معرکہ ہے ۔ یہ اس سے کوئی علیحدہ بات نہیں ہے ۔

اس طرح اس دنیا میں برپا یہ عظیم کشمکش دراصل شیطان کے ساتھ ایک عظیم معرکہ ہے ۔ شیطان کے دوستوں کے ساتھ معرکہ ہے ۔ جب ایک صحیح الفکر مسلمان اس معرکے میں کودتا ہے تو وہ فی الحقیقت اپنی مادی خواہشات کے ساتھ برسر جنگ ہوتا ہے ۔ پھر وہ شیطان کے ان دوستوں کے خلاف برسرجنگ ہوتا ہے جنہوں نے اس کرۂ ارض پر خود اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کر رکھا ہے ۔ وہ ان تمام شرارتوں کے ساتھ برسرجنگ ہوتا ہے جو ان شیاطین اور ان کے دوستوں نے دنیا میں برپا کر رکھی ہیں اور جب ایک مومن اس ہمہ جہت جنگ میں مصروف ہوتا ہے تو وہ پوری طرح یہ شعور رکھتا ہے کہ وہ یہ ہمہ جہت جنگ شیطان کے ساتھ لڑ رہا ہے جو اس کا حقیقی دشمن ہے اور جس نے اس کے خلاف مسلسل جنگ کرنے کا اعلان کر رکھا

ہے۔ یہ جنگ قیامت تک ہوگی اور یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ ﴿اَلْجِهَادُ مَاضٍ اِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (حدیث)﴾ کہ "جہاد قیامت تک جاری رہے گا اور ہر صورت اور ہر میدان میں جاری رہے گا"

آخری بات اس قصے سے یہ معلوم ہوتی ہے' جیسا کہ تفصیلات آگے آرہی ہیں' کہ خود انسان کی فطرت' طبیعت اور مزاج میں ایک چیز موجود ہے اور وہ ہے شرم و حیاء۔ انسان عریانی کو فطرتاً ناپسند کرتا ہے خصوصاً شرمگاہ کی عریانی کو۔

(فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا (۷: ۲۰))

"شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ وہ ننگا کر دے ان کی ان شرمگاہوں کو جو پوشیدہ تھیں۔"

(فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ (۷: ۲۲)) "اس طرح دھوکا دے کر وہ ان دونوں کو رفتہ رفتہ اپنے ڈھب پر لے آیا۔ آخر کار جب انہوں نے اس درخت کا مزا چکھا تو ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو جنت کے پتوں سے ڈھانپنے لگے۔"

(يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ (۷: ۲۶)) "اے اولاد آدم' ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے لئے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔"

(يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا (۷: ۲۷)) "اے بنی آدم' ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اسی فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس ان سے اتروا لئے تھے تاکہ ان کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے۔"

یہ تمام ہدایات و تبصرے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ مسئلہ بہت ہی اہم اور نہایت ہی فطری مسئلہ ہے اور یہ داعیہ انسانی فطرت کی انتہائی گہرائیوں میں ہے کہ وہ لباس پہنے اور اپنی شرمگاہ کو چھپائے' لباس انسان کے لئے زینت اور پردہ ہے جبکہ لباس تقویٰ انسان کی روحانی شرمگاہوں کے لئے ستر ہے۔

فطرت سلیمہ نے ہمیشہ اپنی جسمانی اور روحانی شرمگاہوں کو چھپانے کی سعی کی ہے اور وہ ہمیشہ ان کمزوریوں کو چھپانے پر حریص رہی ہے۔ جو لوگ انسانی جسم کو لباس سے عاری کرنا چاہتے ہیں' نفس انسانی کو لباس تقویٰ سے محروم کر کے ننگا کرنا چاہتے ہیں' اللہ اور انسانوں سے شرم و حیاء کو ختم کرنا چاہتے ہیں' جن لوگوں کی زبانیں' جن کے قلم' اور جن کے ذرائع ابلاغ

اور میڈیا اس بات میں رات اور دن مصروف ہو کہ مختلف طریقوں سے اور مختلف خبیث اور شیطانی ذرائع سے ان کو اپنے ان فطری دواعی سے عاری کر دیں' وہ درحقیقت انسان سے وہ فطری خواص چھین لینا چاہتے ہیں جن کی وجہ سے انسان' انسان ہے۔ یہ لوگ انسان کو اس شیطان کے سامنے جھکانا چاہتے ہیں جو ان کا دشمن ہے جس نے سب سے پہلے انسان کی شرمگاہ کو ننگا کرنے سے اپنی شیطنت کا آغاز کیا تھا۔ پھر یہ لوگ ان صیہونی منصوبوں کو مکمل کرنا چاہتے ہیں جو یہودیوں نے انسانیت کی بربادی کے لئے تیار کر رکھے ہیں اور ان کے مطابق وہ پوری انسانیت کو اس قدر مضمحل کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے مقابلے میں اٹھ نہ سکے اور اس کی حالت یہ ہو جائے کہ اس کے اندر کوئی انسانی خصوصیت نہ رہے۔

عریانی فطرتاً ایک حیوانی خاصہ ہے۔ اس کی طرف انسان صرف اس وقت آمادہ ہو سکتا ہے جب وہ مقام انسانیت سے گر کر حیوانی مرتبے میں آ جائے۔ نیز عریانیت کو خوبصورتی صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں' جن کا ذوق انسانی ختم ہو چکا ہو۔ چنانچہ وسطی افریقہ کے نہایت ہی پسماندہ لوگ مادر زاد ننگے ہوتے ہیں اور جب اسلام ان میں داخل ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ انہیں کپڑے پہناتا ہے۔ آج مغرب کے نام نہاد ترقی پسند دانشور انسان کو عریانی کے اس گڑھے میں گرا رہے ہیں جہاں سے اسلام نے انہیں نکالا تھا اور نکالنے کے بعد ان کو نہایت ہی متمدن بنا دیا تھا اور ان کو اسلامی مفہوم اور اہداف کے مطابق متمدن بنایا تھا۔ اسلام میں تمدن اور ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے اندر انسانی خصائص کو ترقی دی جائے اور ان کو زیادہ سے زیادہ ظاہر کیا جائے۔

نفس کی عریانی یہ ہے کہ انسان شرم و حیاء کو خیرباد کہہ دے اور یہ وہ مقصد ہے جس کے لئے یورپ کا میڈیا' قلم' آواز اور اسکرین کام کر رہی ہے۔ یہ اس قدر پسماندگی اور جاہلیت کی طرف رجعت قہقہری ہے جو کبھی تھی' اسے کسی مفہوم میں بھی ترقی' حضارت اور تمدن نہیں کہا جا سکتا جیسا کہ آج مغرب کا شیطانی میڈیا مسلمانوں کو باور کرا رہا ہے۔

تخلیق انسانیت کا قصہ ان تمام اقدار اور پیمانوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مسلمانوں کو اس طرف ہدایت کی اور تمام شیطانی وساوس سے نجات دی اور جاہلیت کے گندے تالاب سے مسلمانوں کو نکالا۔ قرآن نے یہ قصہ انہی مقاصد کے لئے پیش کیا ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۷۴ ایک نظر میں

زیر نظر سبق اس سورہ کے وقفوں میں سے ایک وقفہ ہے۔ پہلے منظر کے بعد یہ ایک طویل وقفہ ہے جس میں تخلیق انسانیت کی ایک عظیم روئیداد بیان کی گئی ہے۔ اس سورہ میں جگہ جگہ ایسے وقفے آتے ہیں۔ گویا سامعین سے کہا جاتا ہے' ذرا رکیں' کہ یہاں تک جو کچھ آپ نے دیکھا اس پر غور کریں اور آگے بڑھنے سے پہلے یہ جان لیں کہ اس منظر میں انسانیت کے لئے کیا کیا نصائح ہیں اور کیا کیا عبرت آموزیاں ہے۔

یہ وقفہ ان دستوں کی موجودگی میں ہے جو ایک طرف انسانیت کی جانب سے اور دوسری جانب شیطان کی جانب سے باہم معرکہ آرائی کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ اس وقفے میں بتایا جاتا ہے کہ شیطان کس اسلوب سے اور کس گزرگاہ سے داخل ہوتا ہے اور یہ کہ اس کا منصوبہ کیا ہے اور کس شکل و صورت میں ہے۔

قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ صرف اس صورت میں ہدایت دیتا ہے جب کوئی صورت عملاً قائم ہو' موجود ہو اور مسئلہ پیدا ہو گیا ہو۔ وہ جو قصص بھی بیان کرتا ہے' اس لئے بیان کرتا ہے کہ تحریک اسلامی کے اندر کچھ واقعی حالات موجود ہوتے ہیں جن پر وہ قصہ منطبق ہوتا ہے۔ قرآن کے قصص جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں محض فنی اور ادبی مقاصد کے لئے نہیں ہوتے اور نہ قرآن کسی مسئلے پر محض نظریاتی زاویے سے بحث کرتا ہے۔ اسلام کی حقیقت پسندی اور اس کی سنجیدگی اس بات کی متقاضی تھی کہ اس کی ہدایات ایسے مسائل کے بارے میں ہوں جو عملاً تحریک اسلامی کو اس وقت درپیش تھے۔

قصہ آدمیت کے اس پہلے مرحلے کے بعد آنے والے اس وقفے کا تعلق عرب جاہلیت کی واقعی صورت حال کے ساتھ ہے۔ قریش نے دوسرے عربوں کے مقابلے میں اپنے لئے کچھ حقوق مختص کئے ہوئے تھے۔ لوگ باہر سے حج بیت اللہ کے لئے آتے تھے جسے قریش نے بت خانہ بنا دیا تھا اور یہ حقوق وہ اپنے لئے بعض جعلی تصورات کی اساس پر مختص کرتے تھے اور اسے اللہ کی شریعت قرار دیتے تھے۔ ان تصورات کو انہوں نے قانونی شکل دے رکھی تھی اور اسے شریعت کہتے تھے تاکہ دوسرے مشرکین ان قوانین کی پیروی کریں۔ ہر جاہلیت میں کاہن' سردار' گدی نشین لوگ عوام الناس کے لئے ایسے ہی اصول گھڑ لیتے ہیں۔ قریش نے اپنے لئے ایک خاص لقب اختیار کیا ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو "حمس" کہتے تھے۔ اور اپنے لئے انہوں نے بعض حقوق مختص کر رکھے تھے جو دوسرے عربوں کو حاصل نہ تھے۔ ان حقوق میں سے بعض طواف بیت اللہ کے بارے میں تھے۔ صرف ان کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے زیر استعمال کپڑوں میں طواف کر سکتے تھے' رہے دوسرے عرب تو وہ ان کپڑوں میں حج نہ کر سکتے تھے جو کبھی کسی نے پہنے ہوں۔ اب ان لوگوں کے لئے دو صورتیں تھیں یا تو وہ قریش سے کپڑے مستعار لیتے تھے تاکہ وہ طواف کر لیں اور یا اپنے لئے نئے کپڑے بنواتے تھے اور اگر وہ ان دونوں صورتوں پر عمل نہ کر سکتے تو پھر وہ ننگے طواف کرتے اور ان میں عورتیں بھی شامل ہوتیں۔

علامہ ابن کثیر کہتے ہیں "ماسوائے قریش کے دوسرے عرب ان کپڑوں میں طواف نہ کر سکتے تھے جو انہوں نے اس سے پہلے پہن لئے ہوتے تھے۔ اس بات کے پیچھے ان کا یہ نظریہ تھا کہ چونکہ ان کپڑوں میں وہ اللہ کی نافرمانی کرتے رہے ہیں اس لئے ان میں ہمارے لئے طواف کرنا درست نہیں ہے۔ قریش جو حمس کہلاتے تھے' ان کا یہ حق تھا کہ وہ اپنے زیر استعمال کپڑوں ہی میں طواف کریں۔ اگر قریش میں سے کوئی دوسرے عربوں کو عاریتاً کپڑے دے دیتا تو وہ بھی طواف کر لیتا' کسی کے پاس جدید کپڑے ہوتے تو بھی وہ طواف کر لیتا' لیکن طواف کے بعد اسے پھینک دیتا اور وہ کسی کی ملکیت نہ ہوتا۔ اگر کسی کو نہ نیا کپڑا ملتا اور نہ عاریتاً اہل قریش میں سے دستیاب ہوتا تو وہ ننگا طواف کرتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک عورت ننگی حالت میں طواف کر رہی ہے' اس صورت میں وہ اندام نہانی کو ڈھانپ لیتی۔ لیکن جن عورتوں کو ایسی حالت میں طواف کرنا پڑتا وہ اکثر اوقات رات کے وقت طواف کرتیں۔ یہ رسوم انہوں نے اپنی جانب سے گھڑ لی تھیں اور آباؤ اجداد کے وقت سے وہ ان پر عمل پیرا تھے۔ وہ عقیدہ یہ رکھتے تھے کہ ان کا یہ جدی فعل شریعت الٰہیہ پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بات پر حرف گیری فرمائی۔

(وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا (۷:۲۸)) "اور جب وہ کوئی فحش کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے آباء کو ایسا ہی کرتے پایا ہے اور یہ کہ اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔" (قُلْ اَیْ) "اے پیغمبر کہہ دے (اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ (۷:۲۸)) "بے شک اللہ فاشی کا حکم نہیں دیتا۔" یعنی تم جو کچھ کر رہے ہو یہ ایک فحش کام ہے اور قابل نفرت ہے اور اللہ ایسے قابل نفرت کاموں کا بھی حکم نہیں دیتا۔ (اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۷:۲۸)) "کیا تم اللہ پر وہ افتراء باندھتے ہو جو تمہارے علم میں نہیں ہے۔" یعنی تم اللہ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہو جن کی صحت کا خود تمہیں بھی یقین نہیں ہے۔ (قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ (۷:۲۹)) "کہہ دے کہ مجھے میرے رب نے عدل و انصاف کا حکم دیا ہے۔"

(وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (۷:۲۹))
"اس کا حکم یہ ہے کہ ہر عبادت میں اپنا رخ ٹھیک رکھو اور اسی کو پکارو اپنے دین کو اس کے لئے خالص رکھ کر۔" یعنی اس نے جو حکم دیا ہے وہ یہ ہے کہ عبادت اور عبادت کے مقامات کو درست رکھو اور ان رسولوں کی اطاعت کرو جو معجزات لے کر آئے ہیں اور عبادت صرف اللہ کی کرو' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ان دو بنیادی ارکان کے سوا کسی کی عبادت کو قبول نہیں کرتا یعنی یہ کہ وہ عمل شریعت کے مطابق ہو اور دوسرے یہ کہ وہ شرک سے خالص ہو۔

عبادت' طواف اور لباس کے بارے میں شرعی قوانین اور خوراک کے معاملات میں عربوں کی جاہلی سوسائٹی میں جو عملی صورت حال اس وقت موجود تھی اور جسے وہ شریعت منجانب اللہ سمجھتے تھے' اس عملی صورت حال کے بارے میں یہ تبصرہ آیا ہے یہ تبصرہ انسانیت کی تخلیق کی عظیم کہانی کے ضمن میں آیا ہے۔ کھانے کا ذکر شجر ممنوعہ کے ضمن میں اور لباس کا ذکر واقعہ نزع لباس میں تھا جو شیطان کی سازش سے حضرت آدم اور حوا سے اتار دیا گیا۔ اس سازش کا شکار ہو کر وہ اس ممنوعہ درخت کے پھل کو کھا گئے تھے اور انسان کی فطری حیا کا ذکر بھی اس میں آگیا تھا کہ جب ان سے لباس جنت

اتار دیا گیا تو پھر وہ جنت کے درختوں کے پتے اپنے اوپر لپیٹنے لگے اور یوں وہ ستر پوشی کرنے لگے۔

غرض اس قصے میں جو واقعات آئے اور اس کے بعد ان پر جو تبصرہ ہوا' وہ عربوں کے اندر موجود جاہلی صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ قصہ قرآن کی دوسری سورتوں میں بھی آئے گا۔ لیکن اس وقت اس کے لانے کے مقاصد اور ہوں گے اور اس پر پھر تبصرے اور نتائج بھی اور ہوں گے۔ قرآن کریم ہر جگہ جو قصہ بھی لاتا ہے وہ انسانوں کی کسی عملی صورت حال پر ہی پیش کرتا ہے اور اس پر پھر تبصرے بھی ان مقاصد اور صورت حالات کے مطابق کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم ہر مقام کے حالات کے مطابق قصے کی متعلقہ کڑی پیش کرتا ہے اور ہر مقام کے مزاج کے مطابق اس کی تفصیلات دیتا ہے۔

(تفصیلات کے لئے دیکھئے فصل قصص ' میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن میں)۔

---ooo---

درس نمبر ۴۷ تشریح آیات

۲۶ --- تا --- ۳۴

يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ قَدۡ أَنزَلۡنَا عَلَيۡكُمۡ لِبَاسٗا يُوَٰرِي سَوۡءَٰتِكُمۡ وَرِيشٗاۖ وَلِبَاسُ ٱلتَّقۡوَىٰ ذَٰلِكَ خَيۡرٞۚ ذَٰلِكَ مِنۡ ءَايَٰتِ ٱللَّهِ لَعَلَّهُمۡ يَذَّكَّرُونَ ۝٢٦

"اے اولاد آدم' ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے لئے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو' اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے - یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے' شاید کہ لوگ اس سے سبق لیں -"

یہ اللہ کی جانب سے انسانوں کے نام ایک درد انگیز پکار ہے اور یہ پکار تخلیق انسانیت کی کہانی کے منظر کے بعد آئی ہے - خصوصاً اس کے اس حصے کے بعد جس میں شیطان کی سازش سے حضرت آدم اور حوا کے جسموں سے جنت کا لباس اتار دیا گیا اور جس میں دونوں اس طرح دکھائی دیتے تھے کہ وہ اپنے جسموں کے اوپر جنت کے پتوں کو چسپاں کر رہے تھے - یہ دن انہیں اللہ کی حکم عدولی کرنے کی وجہ سے دیکھنے پڑے تھے کیونکہ انہیں ایک خاص درخت کا پھل کھانے کی صریح ممانعت کی گئی تھی - یہ ایک لغزش تھی اور اس کی نوعیت ایسی نہ تھی جس کی تفصیلات اہل کتاب کی محرف کتابوں تورات و انجیل کے اندر موجود ہیں اور جن کا پرتو آج مغرب کے تمام علوم و فنون پر صاف صاف نظر آتا ہے - دور جدید میں فرائڈ کے افکار اس پر مستزاد ہیں - ان اساطیر اور فضول قصوں میں یہ کہا گیا ہے کہ شجر ممنوعہ شجر علم تھا اور شجر حیات تھا اور اگر آدم و حوا اس کا پھل کھا لیتے تو اللہ کو یہ ڈر تھا کہ وہ بھی خدا کی طرح الٰہ بن جاتے - نہ یہ ممانعت جنسی ملاپ کی ممانعت تھی جس طرح فرائڈ اور مغربی علوم و فنون اور مغربی ارٹ اس بات کا انعکاس کرتے ہیں اور انہوں نے ان کہانیوں کی اساس پر جنسی بے راہ روی کا فلسفہ فرائڈ کے خیالات کی شکل میں اپنا رکھا ہے -

غرض حضرت آدم کی لغزش کے نتیجے میں ان کے لباس کے اتر جانے کے منظر اور پھر دور جاہلیت میں عریانی کی حالت میں طواف کرنے کی صورت حال کے پیش نظر یہ پکار آتی ہے کہ اے انسان اللہ نے تم پر کس قدر رحمت اور شفقت کی ہے کہ تمہاری زینت اور شرمگاہوں کو چھپانے کے لئے لباس کا انتظام کیا اور اسے تمہارے ستر کے لئے ایک لازمی قانون کی شکل دی - اگر لباس نہ ہوتا تو تم برہنگی کی حالت میں نہایت ہی مکروہ نظر آتے - (اَنْزَلْنَا) کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ لباس بطور قانون لازمی ہے - لباس کا اطلاق کبھی تو ستر پر ہوتا ہے یعنی داخلی ستر اور ریاش کا اطلاق

اس لباس پر ہوتا ہے جو زیب و زینت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔یعنی ظاہری لباس۔لفظ ریاش کے معنی ہیں عیش و عشرت اور مال و دولت ہے۔ان سب معانی کا ایک دوسرے سے تعلق ہے اور یہ لازم و ملزوم ہیں۔

(یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِیْشًا (۷:۲۶)) "اے اولاد آدم' ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے لئے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو۔"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ تقویٰ کے لباس کا ذکر فرماتے ہیں اور ساتھ یہ اضافہ بھی کر دیتے ہیں کہ لباس تقویٰ زیادہ بہتر ہے۔

(وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَیْرٌ ذٰلِكَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ (۷:۲۶)) "اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔"

عبدالرحمٰن ابن اسلم نے یہ کہا ہے کہ "جو اللہ سے ڈرے اور اپنی شرمگاہ کو چھپائے تو یہ لباس تقویٰ ہے۔" لباس ستر اور لباس تقویٰ شریعت میں لازم و ملزوم ہیں۔لباس ستر جسم کو چھپانے اور زینت کے لئے ہے اور لباس تقویٰ دل کے قابل شرم حالات کو چھپاتا ہے اور قلب کی زیب و زینت بنتا ہے۔دونوں لازم و ملزوم ہیں اس لئے کہ خدا کے خوف اور خدا سے حیاء کرنے کے شعور کے نتیجے ہی میں انسان جسم کے قابل شرم حصوں کو کھلا رکھنا قبیح سمجھتا ہے اور جو شخص اللہ سے حیا نہیں کرتا اور اس نہیں ڈرتا' اس کے لئے جسمانی عریانی کوئی قابل ملامت بات نہیں ہوتی۔چنانچہ اسلام کی نظر میں تقویٰ اور حیا سے عاری ہونا اور لباس کو اتار دینا ایک ہی جیسا قبیح فعل ہے۔

جسم کا چھپانا فطری حیاء ہے اور اس کا تعلق محض کسی خاندان اور سوسائٹی کے رواج کے ساتھ نہیں ہے۔جیسا کہ بعض وہ لوگ اس کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں جو اسلامی معاشرے سے حیاء کو ختم کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ مسلمانوں کی انسانیت کو ختم کر دیں اور یہ عین اس منصوبے کے مطابق ہے جو صیہونی لیڈروں نے انسانیت کی تباہی کے لئے بنایا تھا۔بلکہ یہ ایک فطری داعیہ ہے جسے اللہ نے انسان کے اندر ودیعت کر رکھا ہے۔پھر یہ ایک شرعی اور قانونی تقاضا ہے جو اللہ نے نازل کیا ہے۔اللہ نے انسانوں کو یہ توفیق دی ہے کہ وہ دنیا میں اس قانون کو نافذ کریں کیونکہ یہ زمین اللہ نے انسانوں کے اختیار میں دی ہے اور اسے ان کے لئے جائے رزق بنا دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ انسان کو یاد دلاتے ہیں کہ اس لباس اور ستر پوشی کا قانون دے کر تم پر عظیم رحمت کی گئی ہے۔اس طرح اللہ نے ان کی قیمتی متاع انسانیت کو اس انجام سے بچایا ہے کہ وہ حیوانات کی سطح تک نیچے چلی جائے۔پھر اللہ تعالیٰ انہیں وہ تمام مسائل یاد دلا کر ان سے توقع کرتے ہیں کہ (لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ (۷:۲۶)) "شاید کہ لوگ اس سے سبق لیں۔" اس مقام پر آکر ایک مسلمان اچھی طرح معلوم کر سکتا ہے کہ زیب و زینت 'فیشن' ترقی پسندی اور محبت کے نام پر انسانوں کے اخلاق کو بگاڑنے اور انہیں جسمانی طور پر ننگا کرنے کے لئے جو عظیم کوشش ہو رہی ہے وہ اس یہودی سازش کے عین مطابق ہے جو انہوں نے انسانیت کی تباہی کے لئے تیار کر رکھی ہے۔یہ سازش یہودیوں نے اس لئے تیار کی ہے کہ مسلمانوں کی قوت جلدی سے تباہ ہو جائے اور انہیں جلدی سے غلام بنایا جا سکے۔نیز دین اسلام کے ساتھ لوگوں کے

دلوں کی گہرائیوں میں جو محبت ابھی تک باقی ہے یہ منصوبہ اس کی مکمل بیخ کنی کے لئے بھی بنایا گیا ہے اور اس مقصد کے لئے یہ یہودیوں اور ان کے ایجنٹوں کی قلمیں ' فلمیں ' تمام تعلیمی ادارے اور میڈیا مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں حالانکہ انسان کے لئے زینت عریانی میں نہیں ستر میں پوشیدہ ہے ۔ یہ حیوانات کی زینت ہے کہ وہ ننگے رہیں' لیکن آج کا انسان جاہلیت اور پسماندگی کی طرف لوٹ رہا ہے اور انسان کے بجائے حیوان بن رہا ہے ۔ کیا انسان اس نعمت کو یاد نہیں کر رہا ہے جو اللہ نے اسے انسان بنانے کے حوالے سے کی ہے ۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۣ وَ اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ۬ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَرِيْقًا هَدٰى وَ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾

اے بنی آدم ' ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا ۔ اور ان کے لباس ان پر سے اتروا دیئے تھے تاکہ ان کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے ۔ وہ اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے ۔ ان شیاطین کو ہم نے ان لوگوں کا سرپرست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے ۔

یہ لوگ جب کوئی شرمناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقے پر پایا ہے اور اللہ ہی نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے ۔ ان سے کہو اللہ بے حیائی کا حکم کبھی نہیں دیا کرتا ۔ کیا تم اللہ کا نام لے کر وہ باتیں کہتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہیں ؟ اے نبی " ان سے کہو ! میرے رب نے تو راستی و انصاف کا حکم دیا ہے ' اور اس کا حکم تو یہ ہے کہ ہر عبادت میں اپنا رخ ٹھیک رکھو اور اسی کو پکارو ۔ اس کے دین کو اس کے لئے

خالص رکھ کر۔ جس طرح اس نے تمہیں اب پیدا کیا ہے' اسی طرح تم پھر پیدا کئے جاؤ گے - ایک گروہ کو تو اس نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے' مگر دوسرے گروہ پر گمراہی چسپاں ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ انہوں نے خدا کے بجائے شیاطین کو اپنا سرپرست بنالیا ہے اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم سیدھی راہ پر ہیں -"

یہ اللہ کی جانب سے انسان کے نام دوسری پکار ہے - یہ غور و فکر کے اس وقفے میں ہے جو ان کے والدین حضرت آدم و حوا کے قصے کے دوران کیا گیا ہے - اور خصوصاً اس منظر پر بطور تبصرہ کیا گیا ہے جس میں شیطان نے اپنی گہری سازش کے ذریعے انہیں بے لباس کر دیا کہ انہوں نے اس سازش کا شکار ہو کر اللہ کے صریح حکم کو بھلا دیا اور شیطان کی وسوسہ اندازی کے نتیجے میں ان سے لغزش سرزد ہو گئی - نیز ہم نے جاہلیت عربیہ کے دور میں برہنہ طواف کے بارے میں جو کچھ کہا اس کی روشنی میں بھی یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ اللہ نے کیوں اس انداز میں بنی نوع انسان کو پکارا کیونکہ وہ اس عریانی کو منجانب اللہ شریعت سمجھتے تھے -

پہلی ندا میں تو بنی آدم کو یہ یاد دلایا گیا کہ ان کے ابوالآباء کے ساتھ کیا پیش آیا اور کس طرح اللہ نے ان کی شرمگاہوں کے چھپانے اور پھر ان کی زیب و زینت کا انتظام فرمایا - رہی یہ دوسری پکار تو یہ بنی آدم کو عموماً اور مشرکین مکہ کو خصوصاً یہ یاد دہانی ہے جن سے اسلام سب سے پہلے خطاب کر رہا تھا کہ وہ شیطان کی پیروی نہ کریں اور اپنے لئے خود نظام زندگی اور رسم و رواج اور شریعت تصنیف نہ کریں اور اس طرح شیطان کے فتنے کا شکار نہ ہوں کیونکہ اس نے تمہارے باپ کے خلاف یہی سازش کی تھی' اس کو سازش کے ذریعے جنت سے نکلوایا تھا' اور انہیں جنت کے لباس سے محروم کر کے ان کی شرمگاہوں کو ان کے سامنے ننگا کر دیا تھا - لہٰذا ہر وہ تحریک جو عریانی کی دعوت دیتی ہے وہ شیطانی تحریک ہے اور جاہلی تحریک ہے خواہ یہ زمانہ قدیم کی ہو یا دور جدید کی - یہ تحریک تمہارے دشمن کی تحریک ہے - شیطان تو تمہارا کھلا دشمن تھا اور وہ آدم اور اس کی اولاد کا دائمی دشمن ہے - عریانی کی تحریک بھی انسان اور شیطان کی دشمنی کی ہمہ گیر تحریک کا ایک پہلو ہے - لہٰذا بنی آدم کو اپنے دشمن کو یہ موقع نہ دینا چاہئے کہ وہ اس معرکہ میں کامیاب ہو اور اس طرح انسانوں اور جنوں سے جہنم کو بھر دیئے جانے کا باعث بن سکے -

(يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا (۷: ۲۷)) "اے بنی آدم' ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس ان پر سے اتروا دیئے تھے تاکہ ان کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے -"

انسانوں کو زیادہ ڈرانے کے لئے اللہ تعالیٰ انہیں یہ اطلاع بھی دیتے ہیں کہ شیطان اور اس کا قبیلہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے اور تم اسے نہیں دیکھ سکتے' لہٰذا وہ اپنے پوشیدہ وسائل کے ذریعے تمہارے بدراہ کرنے پر زیادہ قدرت رکھتا ہے' لہٰذا انہیں ڈرنا چاہئے اور شدید احتیاط کرنا چاہئے - ہر وقت چوکنا رہنا چاہئے اور حد درجہ محتاط رہنا چاہئے - ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں آلے اور تمہیں پتہ ہی نہ ہو -

(اِنَّهُ یَرٰکُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهُ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (۷:۲۷)) "وہ اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔"

اور اب اس فقرے کا آخری بند آتا ہے جو نہایت ہی مؤثر ہے اور اس طرف ہدایت کرتا ہے کہ تم احتیاط کرو کیونکہ تقدیر الہی کے نظام نے ان لوگوں کے ساتھ شیطان کو بطور دوست لگا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے' اور اس شخص کی بربادی کی کیا انتہا ہوگی جس کا دوست شیطان ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ ان پر قبضہ کر لے گا گمراہ کرے گا اور ان کی تکمیل تھام کر جدھر چاہے گا' لے جائے گا اور ان کا کوئی مددگار اور معاون نہ ہو گا۔ اور نہ اللہ ان کا دوست ہو گا۔

(اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۷:۲۷)) "ان شیاطین کو ہم نے ان لوگوں کا سرپرست بنایا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔"

یہ ایک عظیم حقیقت ہے جو لوگ ایمان نہیں لاتے' شیطان ان کا یار اور مددگار ہوتا ہے۔ اور اس کے بالمقابل حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں اللہ ان کا ولی اور ناصر ہوتا ہے۔ یہ ایک خوفناک حقیقت ہے اور اس کے نتائج بھی خوفناک ہیں اور اس حقیقت کو یہاں ایک کلیہ کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد اس کلیہ کی ایک مثال بھی پیش کر دی جاتی ہے جو عملاً مشرکین کی زندگیوں میں موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شیطان کس طرح ولی اور مددگار ہوتا ہے۔ اور اس کی ولایت لوگوں کے تصورات اور عملی زندگی میں کس طرح کام کرتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

(وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَیْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا (۷:۲۸)) "یہ لوگ جب کوئی شرمناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقہ پر پایا ہے اور اللہ ہی نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔"

مشرکین عرب اس کے قائل تھے اور اس پر عمل پیرا بھی تھے وہ برہنگی کی حالت میں طواف کر کے بیت الحرام میں اس فحاشی کا ارتکاب کرتے تھے اور اس میں ان کی عورتیں بھی شامل ہوتی تھیں لیکن وہ زعم یہ رکھتے تھے کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ اس طرح کہ اللہ نے ہمارے آباء کو اس کا حکم دیا تھا اس لئے وہ ایسا ہی کرتے چلے آئے تھے اور ہم کو یہ رسم وراثت میں ملی ہے اس لئے ہم بھی ایسا کرتے ہیں۔

باوجود اس کے کہ وہ مشرک تھے' لیکن وہ دور جدید کی جاہلیت کی طرح مغرور اور سرکش نہ تھے۔ آج کے لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ مذہب کا معاملات زندگی کے ساتھ تعلق ہی کیا ہے' یہ تو عوام کا حق ہے کہ وہ اپنے لئے جو قوانین' جو اقدار اور جو رسومات چاہیں وضع کر لیں۔ اس میں اللہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ پرانی جاہلیت کے پیروکار تو فقط یہ جرم کرتے تھے کہ اپنے لئے خود قوانین اور دستور حیات وضع کرتے اور پھر کہتے کہ یہ امر الہی ہے۔ یہ غلطی زیادہ بھیانک تو ہو سکتی ہے اور زیادہ قابل ملامت بھی ہو سکتی ہے کیونکہ یہ دین کے نام پر دھوکہ اور فریب ہے اور لوگوں کے جذبہ دین سے بھی غلط فائدہ اٹھاتا ہے لیکن خود سری اور غرور کے اعتبار سے یہ ان لوگوں سے کم تھے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ لوگوں کے لئے قانون سازی کا حق صرف ان کو حاصل ہے اور وہی یہ فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں کہ لوگوں کے لئے کیا مفید ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرماتے ہیں کہ وہ ان سے یوں مخاطب ہوں کہ یہ تم اللہ پر خالص

افترا باندھتے ہو اور یہ کہ اللہ کی شریعت اور اس کا قانونی نظام اپنے مزاج کے اعتبار سے فحاشی کو پسند نہیں کرتا' لہذا اللہ تعالیٰ کس طرح تمہیں یہ حکم دے سکتا ہے کہ تم فحاشی و عریانی کا ارتکاب کرو۔

(قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ (۷:۲۸)) "ان سے کہو اللہ بے حیائی کا حکم کبھی نہیں دیا کرتا۔ کیا تم اللہ کا نام لے کر وہ باتیں کہتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ مطلقاً فحاشی کے خلاف ہیں اور فحاشی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کسی بھی معاملے میں مقررہ حد سے گزر جائے۔ عریانی بھی اسی کی تعریف میں آتی ہے اس لئے اللہ اس کا حکم کیسے دے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حدود مقرر کیے ہیں اور وہ یہ حکم نہیں دیتا کہ اس کے مقرر کردہ حدود توڑے جائیں۔ اس نے شرم' حیاء اور تقویٰ کا حکم دیا ہے تو پھر عریانی کا حکم کیسے صادر ہو سکتا ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ ان کو اللہ کے اس حکم کی اطلاع کس نے دی ہے۔ کیونکہ اللہ کے احکام اور قوانین محض دعویٰ سے تو ثابت نہیں ہوتے۔ اللہ کے احکام اور قوانین تو اس کی کتابوں اور رسولوں کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے اللہ کے احکام معلوم ہوں۔ کوئی انسان کسی بات کے اللہ اور رسول کی جانب سے آنے کا دعویٰ اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ثابت نہ ہو۔ اس لئے اللہ کے دین میں سند کے بغیر کوئی قول نہیں کیا جا سکتا' ورنہ اس فکری انتشار کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکے گا کہ لوگ بات تو خود کریں مگر اسے اللہ کی طرف منسوب کر دیں۔

جاہلیت بہرحال جاہلیت ہوتی ہے اور اس کے جو بنیادی عناصر ہوتے ہیں وہ ہر جاہلیت میں موجود ہوتے ہیں۔ جب بھی لوگ جاہلیت کی طرف لوٹتے ہیں وہ ایک ہی طرح کی بات کرتے ہیں اور ان کی سوچ ایک ہی طرح کی ہوتی ہے۔ باوجود اس کے کہ قدیم اور جدید دونوں جاہلیتوں کے درمیان ایک طویل زمانہ حائل ہے اور وہ مکان کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے بہت ہی دور ہیں۔ آج ہم جس جاہلیت میں زندگی بسر کر رہے ہیں' اس میں کوئی ایک جھوٹا اٹھتا ہے اور وہ باتیں کہنا شروع کر دیتا جو اس کی خواہشات نفسانیہ ڈکٹیٹ کرتی ہیں اور پھر کہتا ہے کہ یہ ہے اللہ کی شریعت۔ پھر ایک اور خود سر اور سرکش اٹھتا ہے اور اللہ کے دین کے صریح اور بدیہی امور کا انکار کرتا ہے۔ وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ کا دین اس قسم کے احکام پر مشتمل نہیں ہو سکتا۔ دین کس طرح یہ احکام دے سکتا ہے' دین ان امور سے کس طرح منع کر سکتا ہے اور ایسے لوگوں سے اگر دلیل پوچھی جائے تو ان کی خواہش نفس کے سوا اور کوئی دلیل ان کے پاس نہیں ہوتی۔ ہم کہتے ہیں (اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ (۷:۲۸))

ان کے اس دعویٰ کی تردید کے بعد کہ اللہ نے اس قسم کی فحاشی کا حکم نہیں دیا' اب اللہ کے احکام تو اس کے بالکل متضاد اور برعکس ہیں۔ اللہ تو عدل' اعتدال کا حکم دیتا ہے اور حد سے تجاوز کرنے سے روکتا ہے۔ وہ حدود سے تجاوز اور فحاشی کا حکم ہرگز نہیں دیتا۔ اللہ کا حکم یہ ہے کہ عبادت یا شعائر زندگی اور پکارنے کے معاملے میں صرف اللہ کی بندگی کرو جیسا کہ اللہ نے اپنی نازل کردہ کتاب میں صریح ہدایات دی ہیں۔ اللہ نے اس مسئلے کو یوں نہیں چھوڑ دیا کہ اس کے بارے میں ہر انسان جو چاہے رائے رکھے اور پھر یہ دعویٰ کرے کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔ بلکہ اللہ نے یہ حکم دے دیا

ہے کہ دین خالص اللہ کے لئے ہو گا اور صرف اللہ کی مکمل بندگی ہوگی۔ نہ کوئی کسی کا غلام اور مطیع ہو گا اور نہ کوئی کسی کے ذاتی احکام کا پابند ہو گا۔

(قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (۷: ۲۹)) "اے نبی ؐ، ان سے کہو، میرے رب نے تو راستی و انصاف کا حکم دیا ہے، اور اس کا حکم تو یہ ہے کہ ہر عبادت میں اپنا رخ ٹھیک رکھوں اور اسی کو پکاروں۔ اپنے دین کو اس کے لئے خالص رکھ کر۔"

یہ تو ہیں اللہ کی جانب سے مامورات اور یہ اس صورت حال کے برعکس ہے جس پر وہ قائم ہیں۔ یہ اس کے بھی خلاف ہیں کہ وہ اپنے آباء کی اطاعت کریں اور آباء کے قوانین کی اطاعت کریں کیونکہ یہ بھی تو ہماری طرح کے بندے تھے اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ اسے سمجھتے بھی منجانب اللہ ہیں۔ نیز یہ احکام اس عریانی اور ننگے پن کے بھی خلاف ہیں، جبکہ اللہ نے آدم و حوا پر یہ احسان کیا تھا کہ انہیں لباس دے کر اور زیب و زینت کا سامان دے کر ان کو حکم دیا تھا کہ اپنے آپ کو ڈھانپ لو اور اپنی شکل و صورت اچھی بناؤ۔ پھر یہ احکام اس صورت حال کے بھی خلاف تھے جس میں انہوں نے اپنے عقائد اور نظام زندگی میں شرک کو داخل کر دیا ہے۔

یہاں آکر اب لہجہ ذرا سخت ہو جاتا ہے اور سخت الفاظ میں سبق یاد دلایا جاتا ہے۔ انجام بد سے بھی ڈرایا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس چند روزہ زندگی کے خاتمے پر تمہیں اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ ان کی پیشی کا منظر یہ ہو گا کہ وہ دو فریق بن جائیں گے۔ ایک وہ فریق جو اللہ کی راہ پر ہو گا اور امر الٰہی کا پابند ہو گا اور دوسرا فریق وہ ہو گا جو شیطان کے احکام کا پیرو کار ہو گا۔

(كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ (۲۹) فَرِیْقًا هَدٰى وَفَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۳۰) (۷: ۲۹ - ۳۰)) جس طرح اس نے تمہیں اب پیدا کیا ہے اسی طرح تم پھر پیدا کئے جاؤ گے۔ ایک گروہ کو تو اس نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، مگر دوسرے گروہ پر گمراہی چسپاں ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ انہوں نے خدا کے بجائے شیاطین کو اپنا سرپرست بنا لیا ہے اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم سیدھی راہ پر ہیں۔"

یہ آیت ایک خوشنما خوشے کی طرح ہے جس کے اندر اس عظیم سفر انسانیت کا نقطہ آغاز اور نقطہ اختتام دونوں آگئے ہیں۔ (كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ (۷: ۲۹)) "جس طرح اس نے تمہیں پیدا کیا، اسی طرح تم دوبارہ پیدا کئے جاؤ گے۔" تمہاری زندگی کا آغاز جوڑے کی شکل میں ہوا، آدم اور حوا، شیطان اور اس کے حواری، اسی طرح دوبارہ تمہیں پیدا کیا جائے گا۔ ایک فریق مسلم اور مطیع ہو گا اور یہ آدم اور حوا کے زمرے میں ہو گا اور مومن ہو گا۔ دوسرا گروہ ابلیس کے حواریوں اور متبعین کا ہو گا اور اللہ ان کے ساتھ جہنم کو بھر دے گا۔ یہ ابلیس کے دوست ہوں گے اور ابلیس ان کا دوست ہو گا اور اسی وجہ سے وہ جہنم میں جائیں گے اگرچہ ان کا خیال یہ ہو گا کہ وہ ہدایت پر ہیں۔

جس شخص کا دوست اللہ ہو وہ ہدایت پر ہو گا اور جس شخص کا دوست شیطان ہو وہ گمراہ ہو گا اور اس طرح یہ دونوں فریق لوٹ کر آئیں گے۔ (فریقًا ھدٰی ---------) "ایک گروہ کو تو اس نے سیدھا راستہ دکھایا ہے مگر دوسرے گروہ پر گمراہی چسپاں ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ انہوں نے خدا کے بجائے شیاطین کو اپنا سرپرست بنالیا ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ سیدھی راہ پر رہیں۔" اسی طرح وہ واپس آرہے ہوں گے۔ غرض ایک ہی لمحے میں سفر کا آغاز ہوا اور دوسرے میں انجام کی منظرکشی کر دی گئی۔ یہ ہے قرآن کریم کا معجزانہ انداز بیان اور قرآن کے علاوہ آج تک کسی عبارت میں یہ اسلوب نہیں پایا گیا۔

---ooo---

اب بنی آدم کو دوبارہ پکارا جاتا ہے اور یہ تیسری پکار بھی اسی وقفے میں ہے۔ آگے انسانیت کا عظیم سفر دوبارہ شروع ہونے والا ہے جو اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق جاری رہے گا۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ
لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣١﴾ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ ٣ ع ٦ ١٠
اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٣٢﴾
قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ
الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ
تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٣٣﴾

"اے بنی آدم، ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

"اے نبی"، ان سے کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لئے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟ کہو، یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لئے ہیں، اور قیامت کے روز تو خالصتاً انہی کے لئے ہوں گی۔ اس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو علم رکھنے والے ہیں۔

اے نبی " ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں : بے شرمی کے کام ---- خواہ کھلے ہوں یا چھپے ---- اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی اور یہ کہ اللہ کے ساتھ تم کسی ایسے کو شریک کرو جس کے لئے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی ' اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلق تمہیں علم نہ ہو (کہ وہ حقیقت میں اسی نے فرمائی ہے)۔

یہ اسلامی نظریہ حیات کے اساسی عقائد پر تاکید مزید ہے - زور اس بات پر دیا جا رہا ہے کہ عرب جاہلیت کے مقابلے میں اسلام کی اساس ان امور پر ہے - یہ نظریہ پوری انسانیت کے لئے تجویز کیا گیا ہے اور اسے اس بحث کے ضمن میں لایا گیا ہے جو اس کرۂ ارض پر پوری انسانیت کی تخلیق کے قصے سے متعلق ہے -

ان حقائق میں سے اہم ترین حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس مخلوق ' انسان کے لئے جن چیزوں کو پیدا کیا ہے ' اس میں سے بعض چیزوں کو خود بعض انسان حرام قرار دیتے ہیں اور یہ کام بھی وہ اذن الٰہی کے بغیر کرتے ہیں اور اللہ کے قانون میں سے کسی سند کے بغیر' جبکہ ان کا یہ فعل یعنی یہ تحریم و تحلیل ایک شرکیہ فعل ہے - پھر یہ اللہ تعالیٰ پر ایک افتراء بھی ہے اور ان کا ذاتی زعم بھی -

چنانچہ اللہ ان کو پکارتے ہیں کہ اللہ نے تمہاری زیب و زینت کے لئے جو سامان پیدا کیا ہے اس سے آراستہ رہو - عربی میں اسے "ریش" کہتے ہیں خصوصاً عبادت کے وقت اور عبادات میں طواف بھی شامل ہے ' جسے وہ برہنہ حالت میں ادا کرتے تھے - وہ ایسے لباسوں کو حرام قرار دیتے تھے جنہیں اللہ نے حرام قرار نہیں دیا بلکہ وہ بندوں کے لئے انعام و اکرام تھا - لہٰذا ان کے لئے بہتر ہے کہ وہ اللہ کے فراہم کردہ زیب و زینت میں اس کی عبادت کریں ' نہ کہ ننگے ہو کر اور نہ ہی فحاشی کرتے ہوئے -

(يٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (۷ : ۳۱)) "اے بنی آدم ' ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو -"

اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ پوری انسانیت کو یہ بھی حکم دیتے ہیں کہ یہاں پاکیزہ چیزوں کو استعمال کرو اور کھانے پینے کی قسم کی تمام چیزوں کو کام میں لاؤ - لیکن اسراف نہ کرو ' اور دوسرے یہ کہ پاکیزہ چیزیں استعمال میں لاؤ -

(وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (۷ : ۳۱)) "اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو ' اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا -"

احادیث میں وارد ہے کہ جس طرح وہ لوگ بعض اوقات لباس کو حرام قرار دیتے تھے ' اسی طرح وہ بعض کپڑوں کو پہننا بھی حرام سمجھتے تھے - اور یہ باتیں قریش نے اپنی طرف سے گھڑ لی تھیں -

صحیح مسلم میں ہشام ابن عروہ کی روایت ہے کہ عرب بیت اللہ کا طواف عریانی کی حالت میں کرتے تھے ماسوائے قریش اور ان کی اولاد کے - یہ لوگ ننگے ہو کر طواف کرتے تھے ' الا یہ کہ قریش انہیں کپڑے دیں - چنانچہ قریش کے مرد مردوں کو کپڑے دیتے تھے اور عورتیں عورتوں کو ' نیز قریش مزدلفہ سے آگے نہیں جاتے تھے جبکہ دوسرے لوگ عرفات تک جاتے تھے - قریش یہ کہتے تھے کہ ہم حرم والے ہیں اس لئے کسی عرب کو یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ہمارے کپڑوں کے

سوا کسی اور کپڑے میں طواف کرے ۔ اسی طرح جب کوئی عرب حرم میں داخل ہو تو وہ صرف اہل قریش کا کھانا کھا سکتا ہے اس لئے کہ اگر کسی عرب کا مکہ میں دوست نہ ہوتا جو اسے کپڑے عاریتاً دے سکتا' اور یا اگر اسے یہ سہولت حاصل نہ ہوتی کہ وہ کرایہ کے کپڑے خرید سکتا تو اس کے لئے دو راستے کھلے ہوئے تھے' ایک یہ کہ وہ عریانی کی حالت میں طواف کرے اور یا کپڑوں میں طواف کر کے کپڑے پھینک دے ۔ ایسے کپڑوں کو لقی کہا جاتا تھا اور پھر انہیں کوئی بھی ہاتھ نہ لگاتا۔"

قرطبی ' احکام القرآن میں لکھتے ہیں : کہا جاتا ہے کہ عرب ایام حج میں مرغن غذا نہ کھاتے تھے اور تھوڑا بہت کھاتے تھے اور برہنہ حالت میں طواف کرتے تھے ۔ انہیں کہا گیا" ہر عبادت کے وقت اپنے آپ کو زینت سے آراستہ کرو اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو ۔" یعنی جو چیزیں تم پر حرام نہیں قرار دی گئی ہیں ان کو حرام کرنے میں اسراف نہ کرو۔ اس لئے کہ اسراف کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا اور حد سے تجاوز یہ بھی ہے کہ حلال چیزوں کو حرام قرار دیا جائے ۔ جائز کرنے میں حدود توڑنا اور حرام کرنے میں حدود سے آگے بڑھنا دونوں تجاوزات میں آتے ہیں۔

یہاں قرآن کریم صرف اس بات پر اکتفاء نہیں کرتا کہ ہر عبادت گاہ میں صرف لباس زیب تن کر کے جاؤ' اور اللہ کے پیدا کردہ پاکیزہ رزق سے فائدہ اٹھاؤ اور کھاؤ پیو' بلکہ بطور استنکار ان لوگوں سے پوچھتا ہے کہ اللہ نے لوگوں کے لئے زیب و زینت کی جو چیزیں پیدا کی ہیں انہیں کس نے حرام قرار دیا ہے اور جو پاکیزہ خوراک پیدا کی ہے اسے کس نے حرام قرار دیا ہے ۔ اس لئے کہ لوگوں کی جانب سے از خود رزق کو حلال قرار دینا اور اپنے اوپر زیب و زینت کو حرام قرار دینا کس کے اذن سے ہے' کیونکہ حلال و حرام کا تعین من جانب شارع ہوتا ہے ۔

(قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷: ۳۲))
"اے نبی ' ان سے کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لئے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں ۔"

اس تنبیہ آمیز سوال کے بعد یہ قرار دیا جاتا ہے کہ یہ لباس اور یہ پاکیزہ رزق اہل ایمان کا حق ہے' اس لئے کہ وہ مومن ہیں اور وہ اس رب پر ایمان لانے والے ہیں جس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے' اگرچہ ان چیزوں میں غیر مومن اس دنیا کی حد تک ان کے ساتھ شریک ہیں لیکن قیامت میں اور اگلے جہان میں تو یہ چیزیں خالصتاً مومنین کے لئے ہیں اور وہاں کفار کا کوئی حصہ نہیں ہو گا۔ (قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ (۷: ۳۲)) "کہو' یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لئے ہیں' اور قیامت کے روز تو خالصتاً انہی کے لئے ہوں گی ۔" اس لئے اگر صورت حال یہ ہے تو یہ حرام کیسے ہو سکتی ہیں؟ ایک چیز قیامت میں تو مسلمانوں کے لئے خاص ہو اور یہاں ان پر حرام ہو۔

(كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۷: ۳۲)) "اس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو علم رکھنے والے ہیں ۔" اور جو لوگ اس دین کی حقیقت کو سمجھتے ہیں وہی اس بیان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

رہی وہ چیز جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے تو اگر اس کا تعلق لباس سے ہے تو بھی وہ صحت مند لباس نہیں ہے۔ اگر اس کا تعلق خوراک و اسکاک سے ہے تو وہ طیب نہیں ہے ماسوائے اسراف اور کبر و غرور کے۔ حرام تو وہ چیزیں ہیں جن کا ارتکاب وہ رات دن کر رہے ہیں۔

(قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَالَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ (۷: ۳۳)) "اے نبی" ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے شرمی کے کام ----- خواہ کھلے ہوں یا چھپے ----- اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی اور یہ کہ اللہ کے ساتھ تم کسی ایسے کو شریک کرو جس کے لئے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی' اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلق تمہیں علم نہ ہو (کہ وہ حقیقت میں اسی نے فرمائی ہے)۔"

یہ ہیں وہ چیزیں جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ وہ فحش افعال جو حدود الٰہیہ سے متجاوز ہوں۔ چاہے وہ ظاہر ہوں یا خفیہ ہوں' (اِثْم) ہر معصیت کو کہتے ہیں۔ (بَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ) وہ ظلم جو حق و انصاف کے خلاف ہو' اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا جبکہ شرک کی پشت پر کوئی قوت دلیل نہیں ہوتی۔ اس شرک میں وہ بھی شامل ہے جو عرب جاہلیت میں بھی تھی اور اس کے علاوہ بھی تمام جاہلیتوں میں تھی کہ قانون سازی میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کیا جائے حالانکہ قانون سازی اور شریعت سازی اللہ کی اہم خصوصیات میں سے ایک ہے۔ اللہ کی طرف ایسی باتوں کی نسبت کرنا جو خود نسبت کرنے والے کے علم میں بھی نہ ہوں' مثلاً وہ جن چیزوں کو حلال و حرام قرار دیتے تھے وہ ان کے علم میں نہ تھیں اور وہ بغیر علم و یقین کے ان کی نسبت اللہ کی طرف کرتے تھے۔ یہ بجائے خود شرک ہے۔

اس سلسلے میں کلبی نے ایک عجیب روایت نقل کی ہے کہ جب مشرکین کو یہ خطاب کیا گیا اور ان پر یہ گرفت کی گئی تو اس وقت ان کی حالت یہ تھی کہ "جب مسلمانوں نے لباس پہن کر بیت اللہ کا طواف کیا تو مشرکین نے ان کو غیرت دلائی اور انہیں شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جاہلیت اپنے پیروکاروں کو کس حد تک پہنچا دیتی ہے۔ بعض لوگ ننگے بیت اللہ کا طواف کرتے تھے۔ ان کی فطرت نے اپنی حالت بدل دی تھی اور ان کی فطرت اس حقیقی شرم و حیا سے محروم ہو چکی تھی جس کے بارے میں قصہ آدم و ابلیس میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ یہ شرم و حیا آدم و حوا میں موجود تھا کیونکہ "جب انہوں نے درخت کو چکھا تو ان کی شرمگاہیں ظاہر ہو گئیں اور وہ اپنے اوپر جنت کے درختوں کے پتے لپیٹنے لگے۔ جب کفار نے دیکھا کہ مسلمان تو لباس پہن کر بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں اور زیب و زینت کے ساتھ طواف کر رہے ہیں اور ستر و شرافت کے ساتھ کر رہے ہیں تاکہ ان میں فطرت کے عین مطابق انسانی خصوصیات پروان چڑھیں اور وہ حیوانوں کی طرح عریانی سے محفوظ رہیں۔ جب مسلمانوں نے یہ فطری حالت اختیار کی تو انہوں نے اس پر نکتہ چینی شروع کر دی۔

یہ ہے جاہلیت کا کارنامہ۔ وہ لوگوں کی فطرت' ان کی روح' ان کے تصورات اور ان کی اقدار اور پیمانوں کو مسخ کر

دیتی ہے - آج دور جدید کی جاہلیت لوگوں کے ساتھ وہی کچھ کر رہی ہے جو ان کے ساتھ جاہلیت عربیہ کر رہی تھی یا اس سے پہلے یونانی جاہلیت کر رہی تھی یا رومی جاہلیت کر رہی تھی یا فارس کی مشرک جاہلیت کر رہی تھی غرض ہر خطے اور ہر دور میں جاہلیت کے یہی خدو خال رہے ہیں -

دور جدید کی جاہلیت کیا کر رہی ہے ' صرف یہ کہ وہ لوگوں کو ننگا کر رہی ہے - ان کے جسم سے شرم و حیا اور تقویٰ کے لباس کو اتار رہی ہے - اس کام کو وہ ترقی اور تہذیب و تمدن کا نام دیتی ہے - اس کے بعد وہ شریف زادوں اور شریف زادیوں کو طعنہ دیتی ہے کہ وہ رجعت پسند ' مقلد ' روایت پسند اور دیہاتی ہیں -

مسخ فطرت کو مسخ کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے - فطرت سے روگردانی کرنے کو فطرت کا فساد ہی کہا جاسکتا ہے - حسن و قبح کے پیمانے بدل جانے کو ضمیر کا بدلنا ہی کہا جاسکتا ہے اور اس پر اگر کوئی فخر بھی کرتا ہے تو وہ اس کا احمقانہ غرور ہی ہو گا بلکہ صریح سرکشی ہو گی - کیونکہ اس بیماری ' اس حیوانیت اور اس سرکشی کا تعلق شرک کے ساتھ ہے ' یہ دراصل اربابا من دون اللہ کی طرف سے ان کے لئے قانون سازی اور ضابطہ بندی ہے اور انہوں نے مل کر ایک دوسرے کو اس کی وصیت کی ہے -

عرب مشرکین اس قسم کی ہدایات اپنے علاقے کے حاکموں سے اخذ کرتے تھے اور یہ حکام ان کا استحصال کرتے تھے ' محض ان کی جہالت کی وجہ سے اور ان سے اس قسم کے غیر معقول کام کروا کر ان پر اپنی قیادت و سیادت مسلط کرتے تھے - اسی طرح قدیم جاہلیتوں کا حال تھا ' بعض چالاک اور عیار لوگ لوگوں کو اس قسم کے اوہام میں مبتلا کر کے ان پر اپنی سیادت مسلط کرتے جن میں کاہن سردار اور امراء سب شامل تھے - آج بھی لوگ اپنی دنیاوی قیادتوں سے ایسی ہی ہدایات اخذ کرتے ہیں اور ان کی ہدایات کی تعمیل خدائی احکام کی طرح فرض ہوتی ہے - کوئی انہیں رد نہیں کر سکتا -

آج آرائش کی دکانیں اور ان کی منصوبہ بندی کرنے والے ' اسی طرح فیشن کی منصوبہ بندی کرنے والے وہ ارباب ہیں جن کے جال میں دور جدید کی جاہلیت میں بسنے والی تمام عورتیں اور مرد پھنسے ہوئے ہیں - یہ ارباب اپنے احکام صادر کرتے ہیں اور ان کی تعمیل وہ تمام لوگ کرتے ہیں جو پوری دنیا میں ننگی ٹکڑیوں کی شکل میں موجود ہیں اور یہ لوگ ان منصوبہ سازوں کے احکام کی تعمیل نہایت ہی بے بسی کی حالت میں کرتے ہیں - یہ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کے لئے نئے سال کے لئے جو فیشن تیار کر لیا گیا ہے وہ ان کے حالات اور ضروریات کے لیے مناسب بھی ہے یا نہیں - یہ لوگ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ یہ لباس ان کے لئے مفید ہے یا نہیں بلکہ نہایت ہی عاجزی سے یہ لوگ ان کے اشاروں پر چلتے ہیں - اگر یہ نہ چلیں تو ان پر دوسرے مویشی اور حیوانات حرف گیری کرتے ہیں اور طعنے دیتے ہیں -

سوال یہ ہے کہ آرائش و زیبائش اور فیشن ہاؤس کے پیچھے کون سی قوتیں کام کر رہی ہیں ؟ اور یہ کون سی قوتیں ہیں جو لوگوں کو ننگا کر رہی ہیں - ناولوں اور فلموں کے پیچھے کیا مقاصد کام کر رہے ہیں ؟ رسالوں اور اخباروں کی پشت پر کون سی قوتیں کارفرما ہیں - بعض اخبارات تو مسلسل اخلاقی پستی اور اخلاقی فساد پھیلا رہے ہیں - سوال یہ ہے کہ ان چیزوں کی پشت پر وہ کون سی خفیہ قوت ہے ؟ حقیقت یہ ہے کہ اس تمام عالمی فساد کی پشت پر یہودیوں کی قوت ہے - یہ یہودی ہی ہیں جو دراصل ان لوگوں کے خدا بنے ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی نکیل ان کے ہاتھ میں دے دی ہے - وہ اپنے مقاصد دنیا میں اس قسم کی لہریں پیدا کر کے حاصل کرتے ہیں اور پوری دنیا ان مقاصد کے لئے بھاری قیمت ادا کر کے کام کر رہی

ہے۔ان مقاصد کے لئے وہ لوگوں کے اندر نفسیاتی بے چینی پھیلاتے ہیں' انسانی فطرت کو بدلتے ہیں اور انسان کو فیشن اور جنسی بے راہ روی کے ہاتھ میں ایک کھلونا بنا دیا گیا ہے۔ اس اسراف و تبذیر اور اخلاقی فساد کے ذریعے یہ یہودی قوت اپنے معاشی مقاصد پورے کرتی ہے۔کیونکہ فیشن اور میک اپ اور سامان تعیش کے کار خانے عالمی یہودیت نے لگا رکھے ہیں اور یہ لوگوں کے اندر مانگ پیدا کر کے پھر ان اشیاء کو ان پر ہی فروخت کرتے ہیں۔

لباس اور فیشن کا معاملہ اسلامی شریعت سے جدا نہیں ہے۔اسلامی نظام حیات میں اس کے لئے بھی ضابطہ مقرر ہے۔ اور اسی لئے اسے ایمان اور توحید و شرک کے اساسی مسئلے کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے۔ مختلف اسباب کی بنا پر یہ مسئلہ نظریات اور شریعت کے ساتھ مربوط ہے۔

- لباس کا تعلق اللہ کے اقتدار اعلیٰ سے ہے کیونکہ اللہ ہی وہ ذات ہے جس کی طرف ہمیں اس معاملے میں رجوع کرنا ہے کیونکہ لباس ایک ایسی چیز ہے جس کے اثرات اخلاق' معیشت اور زندگی کے دوسرے اہم معاملات پر پڑتے ہیں۔
- لباس ہی کے ذریعے انسان کی انسانی خصوصیات کا ظہور ہوتا ہے اور انسانی شخصیت کے حیوانی پہلو کو دبا کر انسانی پہلو کو نمایاں کیا جاتا ہے۔

ہر جاہلیت کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ وہ عوام الناس کے ذوق' ان کے اخلاق اور ان کے حسن و قبح کے پیمانے بدل دیتی ہے اور عریانی اور حیوانیت کو ترقی کا نام دیتی ہے۔ اور ستر اور حیا چشمی کو رجعت پسندی اور پسماندگی کہتی ہے۔ایسی صورت میں انسانی فطرت کو مسخ کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

ہمارے ہاں آج اس قسم کے جاہل موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ لباس کا دین اور مذہب کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ دین کا عورتوں کے لباس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ دین و مذہب اور آرائش و زیبائش کا آپس میں تعلق ہی کیا ہے؟ یہ ہے وہ فکری بگاڑ جو جاہلیت ہر دور میں اور ہر جگہ پیدا کرتی ہے۔

بظاہر تو لباس کا مسئلہ ایک جزئی مسئلہ نظر آتا ہے لیکن اسلام اور رب تعالیٰ کے ہاں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ ایک تو اس کا تعلق توحید و شرک کے مسئلے سے ہے' دوسرے اس کا تعلق انسان کے اخلاق و معاشرے کی اصلاح و فساد کے ساتھ ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہاں اس پر ایک نہایت ہی مؤثر اور پر زور تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ تبصرہ عموماً قرآن کریم میں بڑے بڑے اور اہم مسائل پر بحث کے بعد کیا گیا ہے۔اس تبصرے میں بنی آدم کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ انہیں اپنی اصل حقیقت پر بھی غور کرنا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ یہاں ان کا رہنا اور سہنا بہرحال ایک محدود مدت تک کے لئے ہے اور ایک دن انہیں یہاں سے جانا ہے جس کا وقت مقرر ہے جب وہ وقت آجاتا ہے تو ایک منٹ کی تاخیر و تقدیم نہیں ہو سکتی۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٣٤﴾

"ہر قوم کے لئے مہلت کی ایک مدت مقرر ہے' پھر جب کسی قوم کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی

تاخیر و تقدیم بھی نہیں ہوتی۔"

اسلامی تصور حیات کا یہ ایک اساسی عقیدہ ہے۔ اور قرآن کریم بار بار غافل اور ناشکرے دلوں کے اندر اس کو جگاتا رہتا ہے تاکہ وہ اپنی اس زندگی اور اس کی محدود مہلت کو دائمی نہ سمجھ لیں اور سرکشی اختیار نہ کریں۔

یہاں اس مہلت سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آج کی نسل انسانی کے لئے طبیعی زندگی کی ایک حد ہے اور اس سے مراد ملت اور تہذیب کی عمر طبیعی بھی ہو سکتی ہے جس میں اس کے اقتدار اعلیٰ اور دنیا میں اس کی برتری کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔ مراد کسی نسل کی عمر طبیعی ہو یا کسی ملت کی عمر طبیعی ہو، بہرحال جب مہلت ختم ہو تو اس کے بعد ان کا زندہ رہنا یا مقتدر اعلیٰ رہنا ممکن نہیں ہوتا۔

---ooo---

یہاں بحث کے خاتمہ سے پہلے ایک عجیب نکتے پر اظہار خیال ضروری ہے۔ سورہ انعام اور سورہ اعراف میں، جاہلیت کے زاویے سے نذر و نیاز، حلال و حرام کے تعین کے مسائل پر قرآن نے جو منہاج بحث اختیار کیا اور مسائل لباس اور خوراک اور کھانوں کے مسائل پر جو بحث کی گئی اس میں ایک عجیب مماثلت پائی جاتی ہے۔

وہاں ذبحوں، نذر و نیاز، مویشیوں اور کھانوں پر بحث کا آغاز اس طرح کیا گیا کہ سب سے پہلے اس صورت حالات کو سامنے لایا گیا جو عملاً موجود تھی اور کہا گیا کہ یہ اللہ پر افتراء ہے کہ اس صورت حالات کو منجانب اللہ شریعت سے تعبیر کیا جائے۔ اس کے بعد کہا گیا کہ تم اس پر کوئی دلیل پیش کرو اگر تمہارے پاس کوئی سند ہے تو۔ کہا گیا (اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا) کہ جب اللہ نے یہ شریعت بنائی اور تمہیں تلقین کی کہ اس پر عمل کرو کیا تم خود اس وقت موجود تھے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے کہ وہ جھوٹ بولے اور جھوٹ اس لئے بولے کہ لوگوں کو بغیر علم کے وہ گمراہ کرے، ایسا شخص ظالم ہے اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ اس کے بعد بیان یوں آگے بڑھا کہ کفار نے کہا کہ وہ جو شرک کر رہے ہیں وہ امرالٰہی کے نتیجے میں ہے، اگر اللہ نہ چاہتا تو ایسا نہ ہوتا (سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔) وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا ہے وہ یہ کہیں گے کہ اگر اللہ نہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے آباء کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کرتے۔ اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی جھٹلایا یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا۔ اے پیغمبر ان سے کہو کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے کہ تم اسے ہمارے لئے نکال لاؤ، تم تو ماسوائے ظن و تخمین کے کسی اور چیز کی پیروی نہیں کر رہے ہو، بلکہ تم اپنی جانب سے باتیں گھڑتے ہو، کہہ دو اللہ ہی کے پاس حجت بالغہ ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔ کہہ دو، لاؤ اپنے گواہوں کو جو یہ شہادت دیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ اے پیغمبر اگر کوئی گواہ یہ شہادت دے بھی تو تم اس کے ساتھ شہادت نہ دو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے اور جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو برابر قرار دیتے ہیں۔

اس کے بعد وہاں ان کے ان مزعومات اور مفتریات کو مضحکہ خیز بتایا گیا اور کہا گیا کہ آؤ، ہم تمہیں بتائیں کہ اللہ کی جانب سے کیا حرام ہے، کیونکہ حلال و حرام کا اختیار اللہ کے پاس ہے۔ اور وہی کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دے سکتا

ہے۔ فرمایا (قُلْ تَعَالَوْا ....) کہہ دو آؤ' میں تمہیں سناؤں کہ تمہارے رب نے تم پر کیا حرام کیا ہے؟ یہ کہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔"

یہاں بھی اسی منہاج بحث کو اختیار کیا گیا ہے۔ وہی مدارج بیان یہاں بھی ہیں۔ پہلے ان کی صورت حالات کو پیش کیا گیا کہ وہ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور از خود حلال و حرام کے حدود مقرر کرتے ہیں' خصوصاً لباس اور کھانوں کے معاملات میں۔ پھر انہیں تنبیہ کی گئی کہ وہ فحاشی اور شرک جیسے خطرناک گناہوں میں مبتلا ہیں اور ان کے سامنے یہ حقیقت رکھی گئی کہ شیطان نے جنت میں کس طرح تمہارے باپ کو بے لباس کیا اور پھر یہ کہا گیا کہ لباس ستر اور لباس زینت تمہارے لئے اتارا گیا ہے اور یہ رب کی نعمت ہے۔ اس کے بعد ان کو یہ تنبیہ کی گئی کہ تمہارا یہ دعویٰ غلط ہے کہ یہ حلال و حرام جس پر تم عمل پیرا ہو یہ اللہ نے مقرر کئے ہوئے ہیں اور اللہ کی شریعت ہیں۔ (قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ) "کہہ دیجئے کہ اللہ نے اپنے بندوں کے لئے جو زینت پیدا کی ہے اسے کس نے حرام قرار دیا ہے؟ اور پھر پاکیزہ رزق ...... کہہ دیجئے یہ دنیا کی زندگی میں ان لوگوں کے لئے ہیں جو ایمان لائے ہیں اور قیامت میں تو خالصتاً ان کے لئے ہیں۔ ہم آیات کو مفصل ان لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں جو ایمان لائیں۔" تفصیل آیات میں یقینی علم کی طرف اشارہ ہے اور ان کی پیروی ضروری ہے۔ لوگ عبادات و شریعت کے بارے میں جس ظن و تخمین کی پیروی کرتے ہیں وہ درست نہیں ہے اور اس سلسلے میں ان کے تمام دعوے غلط ہیں۔ اس کے بعد آخر میں بتایا جاتا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں اللہ نے کن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ (قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ) "کہہ دیجئے' میرے رب نے تو صرف ظاہری اور باطنی فواحش کو حرام قرار دیا ہے 'مطلق گناہ' بغیر حق کے دست درازی' اور یہ کہ تم بے دلیل شرک کرو' اور اللہ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرو جن کے بارے میں تمہارے پاس علم نہیں ہے۔"

اور جس طرح اللہ نے لباس و طعام کے بارے میں احکام دیئے اسی طرح اس نے عبادت اور اکل و شرب کے بارے میں بھی دیئے ہیں۔ (قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ (۷: ۲۹)) "کہہ دیجئے میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے' اور عبادت کے وقت اپنے چہروں کو درست رکھو' کھاؤ' پیو اور اسراف نہ کرو' اللہ اسراف کرنے والوں کو محبوب نہیں رکھتا۔"

ان دونوں مباحث میں مسائل حلال و حرام کا تعلق ایمان اور شرک کے ساتھ جوڑا گیا ہے کیونکہ تحلیل و تحریم کا تعلق مسئلہ اقتدار اعلیٰ سے ہے اور انسانوں میں سے کوئی مقتدر اعلیٰ نہیں ہو سکتا۔ نیز ان مسائل کا تعلق اس معاملے سے ہے کہ یہاں لوگ کس کی بندگی کریں گے؟ غرض دونوں مقامات پر مسئلہ بھی ایک ہے اور منہاج بحث بھی ایک ہے اور اس بحث کے لئے جو درجے (steps) رکھے گئے ہیں وہ بھی وہی ہیں۔ (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ) اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ قرآن اگر اللہ کی جانب سے نہ ہوتا تو دیکھنے والا دیکھتا کہ اس میں اختلافات ہیں۔ وحدت منہاج کی اہمیت اس وقت دوچند ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ سورہ انعام اور سورہ اعراف کے موضوعات بحث مختلف ہیں لیکن جاہلیت کے ساتھ جب اسلامی نظام کا مقابلہ ہوتا ہے تو منہاج بحث ایک جیسا ہو جاتا ہے' خصوصاً جبکہ بات اساسی موضوعات و تصورات پر ہو۔

درس نمبر ۵۷ تشریح آیات

۳۵ --- تا --- ۵۳

قصہ تخلیق انسانیت پر تبصرہ کرنے کے لئے یہ ایک طویل وقفہ تھا۔ اس تبصرے میں کہا گیا تھا کہ اس وقت انسانیت کس قسم کی جاہلیت میں ڈوبی ہوئی ہے اور اس کے مقابلے میں عرب جاہلیت کس مقام پر ہے۔ جاہلیت کا موازنہ چند اساسی مسائل کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ یعنی جسم کی ستر پوشی اور روح کی ستر پوشی لباس تقویٰ کے ساتھ۔ جسم و روح کی ستر پوشی کا تعلق اسلامی نظریہ حیات کے اساسی عقیدے 'عقیدۂ توحید و شرک کے ساتھ ہے جو اسلامی نظریہ حیات کا بنیادی عقیدہ ہے۔

اب یہاں سے انسانیت کے نام ایک دوسری پکار شروع ہوتی ہے۔ اس ندا اور پکار کا تعلق مسئلہ لباس کے ساتھ بھی ہے اور انسانوں کے لئے زندگی کے تمام معاملات میں ہدایات لینے اور ان کا اتباع کرنے کے معاملے سے بھی ہے۔ قانون سازی کے مسئلے سے بھی ہے اور دنیا میں اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے قیام کے مسئلے سے بھی ہے تاکہ لوگوں کو اچھی طرح از سر نو یہ بات معلوم ہو جائے کہ انہوں نے ان موضوعات پر ہدایات کہاں سے لینی ہیں۔ تو بتایا جاتا ہے کہ ہدایات لینے کا قوام رسالت کا قوام ہے۔ اور زندگی کے موجودہ مرحلے کے اختتام پر قیامت کے دن حساب و کتاب اسی نقطہ نظر سے ہو گا کہ کس نے رسولوں سے ہدایات لے کر ان کی پیروی کی اور کس نے ان کی نافرمانی کی؟

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٦﴾

(اور یہ بات اللہ نے آغاز تخلیق ہی میں صاف فرما دی تھی کہ) "اے بنی آدم 'یاد رکھو' اگر تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سنا رہے ہوں' تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویے کی اصلاح کرلے گا اس کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے' اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلے

میں سرکشی برتیں گے وہی اہل دوزخ ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے ۔"

اللہ کی جانب سے بنی آدم کو آغاز تخلیق ہی میں یہ صاف ہدایت تھی اور یہ اس کرۂ ارض پر بنی آدم کے اقتدار اور خلافت کے لئے لازمی شرط بھی تھی' کیونکہ یہ زمین اللہ نے پیدا کی ہے ۔ اس میں انسانوں کی زندگی کی ضروریات اس نے پیدا کی ہیں اور اس کے اوپر اقتدار و اختیار اللہ ہی نے انسان کو عطا کیا ہے تاکہ انسان یہاں مناسب رول ادا کر سکے' ورنہ انسان کا ہر قسم کا عمل مردود ہو گا اور اسے کوئی مسلمان قبول نہ کرے گا ۔ آخرت میں بھی وہ گناہ ہو گا اور موجب جہنم ہو گا اور کوئی بدلہ اس عذاب سے چھڑا نہ سکے گا ۔

(فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۷ : ۳۵)) "تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویے کی اصلاح کرلے گا اس کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے ۔"

اس لئے کہ تقویٰ ہی انہیں گناہوں اور فواحش سے دور رکھ سکتا ہے ۔ سب سے بڑی فحاشی اللہ کے ساتھ شرک کا ارتکاب ہے' پھر اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے حق پر ہاتھ ڈالنا ہے اور خدائی خصوصیات کا دعویٰ کرنا ہے ۔ تقویٰ ہی انسان کو خدا کی اطاعت اور نیک کاموں پر آمادہ کرتا ہے اور خوف سے نجات دے کر دارالامان میں داخل کرتا ہے اور اسی کے ذریعے حصول رضائے الٰہی ممکن ہے ۔

(وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

(۷ : ۳۶)) "اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلے میں سرکشی برتیں گے وہی اہل دوزخ ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے ۔"

کیونکہ اللہ کے عہد و نصیحت کو فراموش کرنے اور استکبار اور تکذیب کی وجہ سے یہ لوگ اپنے دوست شیطان سے مل چکے ہیں اور ان پر اللہ کا یہ فیصلہ نافذ ہو گیا ہے کہ "جو لوگ تم میں سے اس کی اطاعت کریں گے تو ان سب سے میں جہنم کو بھر دوں گا ۔"

---○○○---

اب یہاں سے اللہ کے سامنے پیشی کا منظر شروع ہوتا ہے' جس کی طرف سابقہ سبق کے آخر میں اشارہ کیا گیا تھا ۔

(وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا

يَسْتَقْدِمُوْنَ (۷ : ۳۴)) "ہر قوم کے لئے مہلت کی ایک مدت مقرر ہے' پھر جب کسی قوم کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی تاخیر و تقدیم بھی نہیں ہوتی ۔" اس کے بعد یوم حساب کا منظر شروع ہوتا ہے' فیصلے اور سزا و جزاء کے مناظر آتے ہیں ۔ گویا یہ متقین اور مستکبرین کے انجام کی تفصیل ہے ۔ یہ منظر اسی طرح ہے جس طرح قرآن کریم مناظر قیامت کو پیش کرتا ہے ۔ قارئین کو یوں نظر آتا ہے کہ واقعات عملاً رونما ہو رہے ہیں ۔

قرآن کریم نے مناظر قیامت کے بیان میں ایک خاص اسلوب اپنایا ہے ۔ حشر و نشر' حساب و کتاب' انعام و اکرام

اور عذاب اور سزا کے بیان میں نہایت ہی موثر اسلوب اپنایا ہے۔ یہاں صرف یہ نہیں ہے کہ قرآن نے موجودہ دنیا کے بعد آنے والے جہان کے کچھ اوصاف گنوا دیئے ہیں بلکہ اس کے مناظر کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ وہ مناظر محسوس اور مجسم نظر آتے ہیں۔ ان کے اندر افراد چلتے پھرتے اور زندہ نظر آتے ہیں اور نہایت ہی واضح شکل و صورت میں۔ قرآن کریم کی دنیا میں جب ایک مسلم زندگی بسر کرتا ہے تو وہ ان مشاہدات و مناظر کو اپنی آنکھوں سے جگہ جگہ دیکھتا ہے۔ وہ ان سے متاثر ہوتا ہے۔ کبھی اس کا دل دھڑکتا ہے' کبھی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں' کبھی وہ بری طرح خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ پوری طرح مطمئن اور ہشاش و بشاش ہو جاتا ہے۔ کبھی اسے آگ کے شعلہ ہائے جوالہ نظر آتے ہیں اور کبھی اسے جنت کی باد نسیم محسوس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں زندہ رہنے والا مومن اس دن سے پوری طرح واقف ہوتا ہے اور جو لوگ ان مناظر کے بارے میں آیات کو غور سے پڑھتے ہیں' وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اس دنیا کے مقابلے میں درحقیقت میدان حشر میں زندہ رہ رہے ہیں۔ وہ قرآن کی دنیا میں اس طرح گم ہو جاتے ہیں جس طرح کوئی انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں چلا جاتا ہے اور یہ انتقال محسوس طور پر ہوتا ہے۔ غرض اس کے احساس و شعور میں عالم آخرت آنے والا مستقبل نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسا حال ہوتا ہے جس کا وہ مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے۔

یہاں جن مناظر کو پیش کیا گیا ہے وہ طویل ترین مناظر میں سے ہیں اور ان میں زندگی بھرپور نظر آتی ہے۔ یہ مسلسل مناظر ہیں اور ان میں لوگوں کے ڈائیلاگ بھی موجود ہیں اور زندہ اور بھرپور مکالمات کو حیرت انگیز الفاظ میں منتقل کیا گیا ہے۔ اس طرح مکمل طور پر جس طرح آنکھوں سے دیکھ کر کوئی کسی منظر کو محفوظ کر لیتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے اس سے قبل کہا یہ مناظر قصہ آدم پر تبصرے کے بعد آئے ہیں جبکہ آدم جنت سے نکال دیئے گئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی کا اخراج بھی ہو گیا تھا اور یہ اخراج شیطان کی وسوسہ اندازی کے نتیجے میں عمل میں آیا تھا۔ اس کے بعد بنی آدم کو یہ تنبیہ بھی کر دی گئی تھی کہ شیطان کے فتنوں سے بچو وہ تمہیں اس طرح نقصان نہ پہنچا دے جس طرح تمہارے باپ کو اپنی دسیسہ کاریوں سے جنت سے نکلوایا۔ اس تنبیہ کے ساتھ کہ اگر انہوں نے آنے والے رسولوں کو چھوڑ کر شیطان کا اتباع اختیار کیا تو وہ جہنم کی سزا کے مستحق ہوں گے۔ ان باتوں کے بعد قیامت کے دن اللہ کے سامنے حضوری کے شاہد پیش کئے گئے۔ یہ شاہد اس طرح پیش کئے گئے کہ گویا یہ قصہ آدم کے متصلاً پیش آ رہے ہیں۔ اچانک رسولوں کی بعثت اور ان کے مقاصد سامنے آ جاتے ہیں' اچانک ان لوگوں کا منظر سامنے آ جاتا ہے جو شیطان کے پیروکار ہیں' اچانک وہ لوگ سامنے آ جاتے ہیں جو شیطان کے مخالف ہیں اور جنت کے وارث ہیں۔ وہ عالم بالا سے یہ پکار سنتے ہیں "کہ یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث ہو' اس لئے کہ تمہارے عمل اچھے تھے۔" (اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ الَّتِیْ) یوں نظر آتا ہے کہ مسافر گھروں کو واپس آ رہے ہیں' مہاجر اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں اور اب انہوں نے اس دارالنعیم میں ہمیشہ رہنا ہے۔

اس قصے اور اس پر تبصرے کے اندر جو ہم آہنگی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے قصہ آتا ہے اور اس کے مناظر عالم بالا میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس پر تبصرہ اور شاید قیامت آئے۔ اس ہم آہنگی میں جو خوبصورتی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ یہ کہانی عالم بالا میں فرشتوں کے سامنے شروع ہوتی ہے۔ اس وقت آدم و حوا کی تخلیق کی تقریب سعید تھی۔ آدم

اور حوا کو جنت میں رکھا گیا تھا' اور شیطان کی وسوسہ اندازی سے جنت سے ان کے اخراج کے واقعات پیش آئے۔ اخراج اس لئے ہوا کہ انہوں نے مکمل اطاعت اور بندگی نہ کی اور عالم بالا ہی میں یہ مناظر آغاز و انجام یکجا ہو جاتے ہیں اور ان کے درمیان انسانی زندگی کے طویل مناظر پیوست ہیں۔ گویا ایک ہی اسٹیج پر یہ تمام مناظر آغاز' درمیان اور انجام پیش ہو گئے۔ نہایت ہی ہم آہنگی اور مناسب انداز و پیرائے میں۔

---○○○---

اب ہم میدان حشر میں آگئے ہیں اور اس میں اللہ کے سامنے ان لوگوں کو پیش کیا گیا ہے جو اللہ پر بہتان باندھتے ہیں۔ ان لوگوں کا افتراء اور بہتان یہ ہے کہ انہوں نے آباؤ اجداد سے کچھ رسومات اور ضابطے ورثے میں پائے ہیں اور کچھ ضابطے اور قوانین خود انہوں نے اپنی جانب سے وضع کئے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ من جانب اللہ ہیں۔ ان لوگوں کی بھی پیشی ہے جن لوگوں نے اللہ کے بھیجے ہوئے رسولوں کو جھٹلایا حالانکہ وہ یقینی شریعت لے کر آئے تھے۔ اس کے مقابلے میں انہوں نے ظن و تخمین سے کام لے کر علم و یقین کو رد کر دیا' یہ لوگ دنیا میں عیش و عشرت کرتے رہے اور زمانہ ابتلاء خوب مستی سے گزارا اور رسولوں نے ان کے سامنے جو پیغام پیش کیا وہ بھی ان تک پہنچا جسے قبول کرنا ان کی قسمت میں نہ تھا۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

"آخر اس سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جو بالکل جھوٹی باتیں گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی سچی آیات کو جھٹلائے؟ ایسے لوگ اپنے نوشتہ تقدیر کے مطابق اپنا حصہ پاتے رہیں گے' یہاں تک کہ وہ گھڑی آجائے گی جب ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے کے لئے پہنچیں گے۔ اس وقت وہ ان سے پوچھیں گے کہ "بتاؤ' اب کہاں ہیں تمہارے معبود جن کو تم خدا کے بجائے پکارتے تھے؟" وہ کہیں گے کہ "سب ہم سے گم ہو گئے۔" اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ ہم واقعی منکر حق تھے۔

دیکھئے اب ہم ان لوگوں کو دیکھ رہے ہیں جنہوں نے اللہ پر بہتان باندھا اور اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔ حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کے رسول آچکے تھے۔ اس منظر میں پہلے تو ان کی روح قبض کی جاتی ہے گویا ملزم گرفتار ہوتے ہیں۔ پھر ان کے درمیان یہ مکالمہ ہو گا: فرشتے کہیں گے "بتاؤ اب کہاں ہیں تمہارے وہ معبود جن کو تم خدا کے بجائے پکارتے تھے؟" وہ کہیں گے کہ "وہ سب ہم سے گم ہو گئے۔"

اب تمہارے وہ دعوے کہاں ہیں جن کے ذریعے تم اللہ پر افتراء باندھتے تھے' اور وہ الٰہ کہاں ہیں جن کو تم نے دنیا میں دوست بنا رکھا تھا' جن کی وجہ سے تم فتنے میں پڑ گئے اور رسولوں کی لائی ہوئی دعوت کو چھوڑ دیا۔ یہ قوتیں اس آڑے وقت میں تمہاری مدد کو کیوں نہیں آ رہی ہیں کہ اب تمہاری جان لی جا رہی ہے اور تمہیں کوئی ایسا مددگار نہیں مل رہا جو اس مقررہ وقت سے لمحہ بھر کے لئے موت کو مؤخر کر دے۔ ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ ان کا یہی جواب ہو سکتا ہے۔ (قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا (۷: ۳۷)) "وہ سب ہم سے گم ہو گئے۔"

وہ ہم سے اس طرح گم ہو گئے اور اس طرح غائب ہو گئے کہ ہمیں ان کا کوئی اتا پتا نہیں مل رہا۔ اب وہ ہماری طرف نہیں آ رہے۔ غرض وہ لوگ اس قدر بدحال ہوں گے کہ ان کے خدا بھی ان کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں گے اور نہ وہ ایسے برے حالات میں ان کی کوئی مدد کر سکیں گے اور ایسے خداؤں سے زیادہ گھاٹے میں اور کون ہو گا جو اپنے بندوں تک نہ پہنچ سکتے ہوں اور ایسے مشکل حالات میں۔

(وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ (۷: ۳۷)) "وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ ہم واقعی منکر حق تھے۔" اس سے قبل جب ان پر دنیا میں عذاب آیا تھا تو بھی انہوں نے یہی اعتراف کیا تھا۔ (فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ) "جب ہمارا عذاب آیا تو ان کی پکار صرف یہی تھی کہ حقیقت میں ہم ظالم تھے۔"

---ooo---

اب حاضری دربار الٰہی کا منظر ختم ہے اور اس کے بعد دوسرا منظر سامنے آتا ہے۔ یہ مجرم اب جہنم کی آگ میں ہیں۔ ان دونوں مناظر کی درمیانی کڑیاں غائب ہیں۔ موت کے واقعات' نشر و حشر کے واقعات درمیان میں سے غائب ہیں گویا ان کو پکڑ کر سیدھا جہنم میں ڈال دیا گیا۔

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ
الْاِنْسِ فِي النَّارِ ۭ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا
جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا
ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ڛ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۸ وَقَالَتْ
اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا ۴
كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝۳۹ ۧ ع ۸
۱۱

"اللہ فرمائے گا جاؤ' تم بھی اسی جہنم میں چلے جاؤ جس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے گروہ جن و انس جا چکے ہیں۔ ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہو گا تو اپنے پیش رو گروہ پر لعنت کرتا ہوا داخل ہو گا' حتیٰ کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں

گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے رب' یہ لوگ تھے جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا' لہٰذا انہیں آگ کا دوہرا عذاب دے ۔ جواب میں ارشاد ہو گا۔ ہر ایک کے لئے دوہرا عذاب ہی ہے مگر تم جانتے نہیں ہو ۔ اور پہلا گروہ دوسرے گروہ سے کہے گا کہ (اگر ہم قابل الزام تھے تو) تمہی کو ہم پر کون سی فضیلت حاصل تھی' اب اپنی کمائی کے نتیجے میں عذاب کا مزا چکھو۔"--- ذرا ان الفاظ پر غور کیجئے ۔

(قَالَ ادْخُلُوْا فِیْ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِی النَّارِ (۷:۳۸)) "اللہ فرمائے گا جاؤ' تم بھی اسی جہنم میں چلے جاؤ جس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے گروہ جن و انس جا چکے ہیں۔"

یعنی اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا ملو' انسانوں اور جنوں میں سے تمہارے جو دوست ہیں ان میں شامل ہو جاؤ' لیکن جہنم میں ۔ کیا تمہیں معلوم نہ تھا کہ ابلیس نے اپنے رب کی نافرمانی کی تھی؟ کیا اس نے آدم اور ان کی بیوی کو جنت سے نہ نکلوایا تھا؟ کیا شیطان نے اولاد آدم کو گمراہ نہ کیا تھا؟ کیا اللہ نے اسی شیطان کو دھمکی نہ دی تھی کہ وہ اور اس کے تمام متبعین جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے؟ لہٰذا اب تم سب جہنم میں خوشی سے داخل ہو جاؤ' کچھ پہلے جاؤ اور کچھ ان کے پیچھے ان کا اتباع کرو' تم سب ایک دوسرے کے دوست ہو اور سب کے سب برابری کی بنیاد پر اس کے مستحق ہو ۔

یہ تمام امتیں اور یہ تمام اقوام اور جماعتیں باہم دگر اس طرح دوست' حلیف اور پیوست تھیں کہ ان میں سے آخری قوم سب سے پہلی قوم کی تبع تھی اور ان میں سے تابع جماعت اپنی متبوع جماعت سے ہدایات لیتی تھی لیکن آج صورت حالات یہ ہے کہ ان کے درمیان دشمنی ہو گئی ہے اور وہ ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ رہی ہیں ۔

(كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا (۷:۳۸)) "ہر گروہ جہنم میں داخل ہو گا تو اپنے پیش رو گروہ پر لعنت کرتا ہوا داخل ہو گا۔" ملاحظہ کیجئے کہ بیٹا باپ پر لعنت بھیج رہا ہو گا' کس قدر برا ہے یہ انجام ۔ دوست دوست کو کوس رہا ہو گا۔ پچھلے لوگ اگلوں سے مل جائیں گے اور دور اور قریب والے سب ایک جگہ ہوں گے تو ان کے درمیان اب جدل و جدال یوں شروع ہو گا۔

(حَتّٰۤی اِذَا ادَّارَكُوْا فِیْهَا جَمِیْعًا قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ (۷:۳۸)) "حتیٰ کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے رب' یہ لوگ تھے جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا' لہٰذا انہیں آگ کا دوہرا عذاب دے ۔"

یوں ان لوگوں کے مصائب کا آغاز ہوتا ہے ۔ اس منظر میں دوست اور یار بھی سامنے آتے ہیں' یہ لوگ ایک دوسرے کو کوستے ہیں' اب یہ ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ہیں ۔ ایک دوسرے پہ لعن طعن کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ایک دوسرے کے خلاف یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ انہیں سخت عذاب دیا جائے ۔ حالانکہ وہ "رب" پر دنیا میں افتراء باندھتے تھے اور اس کی آیات کو جھٹلاتے تھے ۔ اب اسی کو "ربنا" کہتے ہیں ۔ اب تو وہ صرف اسی کی طرف لوٹ رہے ہیں

اور صرف اسی کی طرف رخ کئے ہوئے ہیں لیکن اللہ کی جانب سے ان کو جو جواب دیا جاتا ہے اور ان کی دعا جس طرح قبول ہوتی ہے وہ یہ ہے ۔

(قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ (۷:۳۸)) "جواب میں ارشاد ہو گا' ہر ایک کے لئے دوہرا عذاب ہی ہے مگر تم جانتے نہیں ہو۔" تمہارے اور ان سب کے لئے دوگنا عذاب ہے ۔

جب ان لوگوں نے یہ فیصلہ سنا تو جن کے خلاف یہ شکایت کی گئی تھی انہوں نے دعا کرنے والوں کا خوب مذاق اڑایا اور ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ ہم سب برابر کے مجرم ہیں ۔

(وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ (۷:۳۹)) "اور پہلا گروہ دوسرے گروہ سے کہے گا (اگر ہم قابل الزام تھے تو) تمہی کو ہم پر کون سی فضیلت حاصل تھی' اب اپنی کمائی کے نتیجے میں عذاب کا مزا چکھو۔"

اب یہاں یہ المناک منظر ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد ان لوگوں کے اس انجام کو ایک منطقی انجام ثابت کرنے کے لئے تبصرہ آتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی ممکن ہی نہیں ہے ۔ یہ تبصرہ اس منظر سے پہلے آتا ہے جو مومنین صادقین کا منظر ہے اور اس المناک منظر کے بالکل برعکس ہے ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

"یقین جانو' جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے اور ان کے مقابلے میں سرکشی رہے ان کے لئے آسمان کے دروازے ہرگز نہ کھولے جائیں گے ۔ ان کا جنت میں جانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا ۔ مجرموں کو ہمارے ہاں ایسا ہی بدلا ملا کرتا ہے ۔ ان کے لئے تو جہنم کا بچھونا ہو گا اور جہنم ہی کا اوڑھنا ہے ۔ یہ ہے وہ جزا جو ہم ظالموں کو دیا کرتے ہیں۔

اب ذرا اپنے تصورات کو لے کر رکیے ۔ یہ ایک عجیب منظر ہے ۔ ایک اونٹ ہے اور اسے سوئی کے ناکے میں داخل کرانے کے لئے تیار کیا جا رہا ہے ۔ کہا جا رہا ہے کہ انتظار کرو کہ یہ ناکہ اس قدر کھل جائے کہ اس سے اونٹ پار ہو جائے تب ہی ان کفار کے لئے جنت کے دروازے کھل سکتے ہیں ۔ تب ہی ان کی توبہ قبول ہو سکتی ہے' لیکن وقت تو گزر

چکا ہے - اب یہ جنت میں اسی طرح داخل نہیں ہو سکتے جس طرح سوئی کے ناکے سے ایک اونٹ پار نہیں ہو سکتا' لہذا یہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور اس میں یہ لوگ پے درپے جمع ہوں گے - اسی میں یہ لوگ ایک دوسرے کو ملامت کرتے رہیں گے - ایک دوسرے پر لعنت بھیجتے رہیں گے - ایک دوسرے کے لئے سزا کا مطالبہ کرتے رہیں گے لیکن سب کے سب اسی عذاب میں مبتلا رہیں گے - (وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُجْرِمِيْنَ (۷: ۴۰)) "اسی طرح ہم مجرموں کو سزا دیتے ہیں-" اور وہاں ان کی حالت یہ ہوگی -

(لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ (۷: ۴۱)) "ان کے لئے تو جہنم کا بچھونا ہو گا اور جہنم ہی کا اوڑھنا-" یعنی ان کے لئے فرش بھی جہنم کی آگ کا ہو گا اور مہاد کا اطلاق اس پر بطور مذاق کیا گیا ہے - بچھونا ایسا ہو گا جس میں نہ نرمی ہوگی اور نہ ہی وہ فرحت بخش ہو گا اور آگ ہی کا اوڑھنا ہو گا- یعنی ہر طرف سے آگ میں گھرے ہوں گے -

(وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الظّٰلِمِيْنَ (۷: ۴۱)) "یہ ہے وہ جزا جو ہم ظالموں کو دیا کرتے ہیں-" ظالم ہی مجرم ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو مشرک ہیں اور آیات الہی کی تکذیب کرتے ہیں- قرآن کی تعبیر کی رو سے یہ اوصاف مترادف ہیں - اب اس منظر کے بالمقابل دوسرا منظر دیکھئے -

---

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۡ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۗ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

"بخلاف اس کے جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا ہے اور اچھے کام کئے ہیں ----- اور اس باب میں ہم ہر ایک کو اس کی استطاعت ہی کے مطابق ذمہ دار ٹھہراتے ہیں ----- وہ اہل جنت ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے - ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ کدورت ہوگی اسے ہم نکال دیں گے - ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ کہیں گے کہ "تعریف خدا ہی کے لئے ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا' ہم خود راہ نہ پا سکتے تھے اگر خدا ہماری رہنمائی نہ کرتا' ہمارے رب کے بھیجے ہوئے رسول واقعی حق ہی لے کر آئے تھے -" اس وقت ندا آئے گی کہ "یہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو تمہیں ان اعمال کے بدلے میں ملی ہے جو تم کرتے رہے تھے -"

یہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنی استطاعت کے مطابق عمل کیا (کیونکہ اللہ کی جانب سے صرف وہی فرائض عائد کئے جاتے ہیں جن پر عمل ممکن ہوتا ہے) تو یہ لوگ ان باغوں کی طرف لوٹیں گے جو ان کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے فضل و کرم کی وجہ سے ان جنتوں کے مالک ہوں گے اور اس نے ان لوگوں کو ان جنتوں کا وارث و مالک بنا دیا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ انہوں نے ایمان کے بعد عمل صالح کو اپنایا اور یہ باغات اس بات کا صلہ ہیں کہ انہوں نے رسولوں کا اتباع کیا اور شیطان کے مخالف چلے۔ انہوں نے اللہ رحیم و کریم کے احکام ماننے اور شیطان رجیم کی معصیت کی لیکن یہ سب کچھ اللہ کی رحمت سے ممکن ہوا۔ اگر اللہ کی رحمت نہ ہوتی تو ان کے لئے یہ سب کچھ ممکن نہ تھا۔ اور اس مضمون کو حضور نے ایک حدیث میں یوں بیان کیا ہے کہ "تم میں سے کوئی ایک بھی صرف اپنے عمل کی وجہ سے جنت کو نہ جائے گا۔" کہا کہ حضور ؐ آپ بھی نہ جائیں گے؟ "نہیں 'میں بھی نہیں الا یہ کہ مجھے اللہ کی رحمت اور فضل ڈھانپ لے۔"...... یاد رہے کہ اس آیت اور حضور ؐ کے قول مبارک کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اس لئے کہ حضور ؐ کے اقوال بھی وحی پر مبنی ہوتے ہیں اور اسلامی فرقوں نے اس موضوع پر جو اختلافی مباحث کیے ہیں وہ غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ یہ اختلافات محض ذاتی خواہشات پر مبنی تھے۔ اللہ کے علم میں تھا کہ انسان ضعیف' کمزور اور عاجز مخلوق ہے۔ وہ صرف اپنے اعمال کے بل بوتے پر جنت کے استحقاق کے مقام تک نہیں پہنچ سکتی اور نہ وہ دنیا میں کسی ایک نعمت کے استحقاق پر جنت میں داخل ہو سکتی ہے' اس لئے اللہ نے اپنے اوپر یہ فرض کر لیا کہ وہ رحیم و کریم ہو گا اور انسانوں کی جانب سے تھوڑے بہت اچھے اعمال بھی قبول کر لے گا۔ اور ان تھوڑے بہت اعمال ہی کی بناء پر ان کے نام جنت لکھ دے گا مگر یہ محض اس کا فضل و کرم ہو گا۔ پس وہ اپنے عمل ہی کی وجہ سے جنت کے مستحق قرار پائیں گے لیکن ان تھوڑے اعمال پر استحقاق کی عطاء محض رحمت الٰہی کی وجہ سے ہو گی۔

ایک طرف یہ مفتری' جھوٹے' مجرم' ظالم' کافر اور مشرک اہل جہنم ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے' باہم جھگڑیں گے' ان کے دل کینہ پروری اور دشمنی سے جوش ماریں گے' حالانکہ دنیا میں وہ ہم نشین اور دوست تھے۔ دوسری جانب وہ لوگ جو ایمان لائے تھے' نیک عمل والے تھے وہ جنت میں بھائی بھائی' محبت کرنے والے دوست' اولیائے باصفا اور ہم نشینان دلسوز ہوں گے اور ان پر محبت و سلامتی کا سایہ ہو گا۔

(وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ (۷: ۴۳)) "ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ کدورت ہوگی اسے ہم نکال دیں گے۔" بہرحال ایمان والے انسان ہی تو تھے' انسانوں کی حیثیت سے انہوں نے زندگی بسر کی۔ بارہا ایسا ہوا کہ وہ ایک دوسرے پر دنیا میں خفا ہوئے مگر انہوں نے اس خفگی کو چھپایا اور ان کے دل میں ایک دوسرے کے خلاف کدورت پیدا ہوئی مگر انہوں نے اس کدورت پر غلبہ پایا۔ البتہ کچھ اثرات آخر تک ان کے دلوں میں موجود رہے۔

قرطبی اپنی تفسیر احکام القرآن میں کہتے ہیں: "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غل (کدورت) جنت کے دروازوں کے باہر پڑی ہوگی جس طرح اونٹوں کی مینگنیاں۔ اللہ نے مومنین کے دلوں سے اس کو نکال پھینکا ہو گا۔" اور حضرت علی ؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا: "میں امید کرتا ہوں کہ میں' عثمان' طلحہ اور زبیر ان لوگوں میں سے ہوں

گے جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا (وَنَزَعْنَا) "ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو کدورت ہوگی اسے ہم نکال دیں گے ۔"

اہل جہنم جب ہر طرف سے آگ میں گھرے ہوئے ہوں گے تو دوسری جانب اہل جنت جن باغات میں ہوں گے ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور ان کی وجہ سے پوری فضا پر ٹھنڈی ہوا جاری ہوگی ۔

(تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ (۷:۴۳)) ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ۔" ایک طرف اہل جہنم ایک دوسرے کو کوس رہے ہوں گے اور دست و گریباں ہوں گے اور دوسری جانب اہل جنت اللہ کی تعریف اور اس کے احسانات کا اعتراف کر رہے ہوں گے ۔

(وَقَالُوْا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ (۷:۴۳)) "اور وہ کہیں گے کہ "تعریف خدا ہی کے لئے ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا' ہم خود راہ نہ پا سکتے تھے' اگر خدا ہماری راہنمائی نہ کرتا' ہمارے رب کے بھیجے ہوئے رسول واقعی حق ہی لے کر آئے تھے ۔"

ایک طرف اہل جہنم کو بطور تحقیر و طنز اور برائے شرمساری یہ کہا جائے گا ۔

(قَالَ ادْخُلُوْا فِیْ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِی النَّارِ (۷:۳۸)) "تم بھی اسی جہنم میں چلے جاؤ جس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے گروہ جن و انس جا چکے ہیں ۔" دوسری جانب اہل جنت کو اہلاً وسہلاً کہا جا رہا ہوگا ۔

(وَنُوْدُوْا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۷:۴۳)) "اس وقت ندا آئے گی کہ "یہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو تمہیں ان اعمال کے بدلے میں ملی ہے جو تم کرتے رہے تھے ۔"

اسی طرح اہل جنت اور اہل جہنم کے درمیان مکمل تقابل ان آیات میں دے دیا گیا ہے ۔ غرض یہ مناظر مزید آگے بڑھتے ہیں ۔ اب ہمارے سامنے ایک نیا منظر ہے ۔ اہل جنت جنت میں اتر چکے ہیں اور مطمئن ہیں اور اہل جہنم کو بھی یقین ہو چکا ہے کہ اب یہی ان کا دائمی انجام ہے ۔ چنانچہ اہل جنت اب ان پر یہ آوازہ کستے ہیں اور وہ بھی بے بسی میں یہ جواب دیتے ہیں :

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ

اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾

''پھر یہ جنت کے لوگ دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے ''ہم نے ان سارے وعدوں کو ٹھیک پایا جو ہمارے رب نے ہم سے کئے تھے' کیا تم نے بھی ان وعدوں کو ٹھیک پایا جو تمہارے رب نے کئے تھے؟'' وہ جواب دیں گے ''ہاں ۔'' تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکارے گا کہ ''خدا کی لعنت ان ظالموں پر جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکتے رہے اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے تھے اور آخرت کے منکر تھے ۔''

یہ آواز کس قدر توہین آمیز اور کس قدر تلخ ہے؟ اہل زبان ہی سمجھ سکتے ہیں ۔ اہل ایمان کو تو اچھی طرح یقین ہے کہ اللہ کا وعدہ بھی سچا ہے اور اس کی وعید بھی اٹل ہے لیکن وہ پھر بھی اہل جہنم سے سوال کرتے ہیں اور جواب میں وہ صرف لفظ ''ہاں'' منہ سے نکال سکتے ہیں ۔ صرف ایک ہاں پر جواب ختم اور بات کٹ جاتی ہے اور آواز آتی ہے :

(فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (٤٤) اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ (٤٥) (٧: ٤٤ — ٤٥)) ''تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکارے گا کہ ''خدا کی لعنت ان ظالموں پر جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکتے رہے اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے تھے اور آخرت کے منکر تھے ۔'' اس آیت سے معلوم ہو جاتا ہے ظالمون کا مفہوم کافرون کے مترادف ہے ۔ کیونکہ یہی لوگ ہیں جو لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں ۔ یہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کو سیدھی راہ سے ہٹاکر ٹیڑھی راہ پر ڈال دیں اور یہی لوگ منکر قیامت ہیں ۔

یہ صفت کہ وہ اللہ کے راستے کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں بتاتی ہے کہ جو لوگ عوام کو اللہ کے راستے سے روکنا چاہتے ہیں ان کا منصوبہ کیا ہے' ان کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ وہ ٹیڑھا راستہ تجویز کرتے ہیں' لوگوں کو سیدھے راستے پر نہیں ڈالتے ۔ وہ ٹیڑھ چاہتے ہیں اور ''سیدھ'' سے بھاگتے ہیں ۔ استقامت کی صورت ایک ہی ہے ۔ وہ یہ کہ انسان اللہ کے منہاج اور شریعت کو اپنالے ۔ اس کے سوا تمام راستے ٹیڑھے ہیں اور جو کوئی دوسری راہ کا ارادہ کرے گا وہ آخر کار دار کفر میں پہنچ جائے گا ۔ کفر یہ ہے کہ انسان آخرت کی جواب دہی کا منکر ہو جائے اس لئے کہ اگر کسی کو آخرت میں ملاقات رب کا یقین ہو تو وہ ہرگز کسی کو اللہ کی راہ سے نہیں روکتا اور نہ وہ خود اللہ کے منہاج اور شریعت سے ایک طرف جاتا ہے ۔ غرض اللہ کی راہ سے روکنے والوں کی تصویر کشی اس آیت میں نہایت ہی صحیح اور جامع و مانع کی گئی ہے اور ہر دور میں دشمنان دین کی نفسیات یہی ہوتی ہیں ۔

---ooo---

اب منظر پر ایک نیا خطہ آتا ہے' یہ جنت و جہنم کے درمیان حد فاصل ہے ۔ اس حد فاصل کے اوپر بھی کچھ مخلوق خدا بیٹھی ہے' یہ لوگ اہل جنت کو بھی ان کی علامات سے پہچانتے ہیں اور اہل جہنم کو بھی ان کی علامات سے پہچان لیتے ہیں ۔

دیکھئے! یہ اہل جنت اور اہل جہنم کے بارے میں کیا تاثرات پیش کرتے ہیں۔

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ
كُلًّا بِسِيمَاهُمْ ۚ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۚ لَمْ
يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ﴿۴۶﴾ وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ لا
قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿۴۷﴾ وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ ۵ ع ۸ ۱۲
رِجَالًا يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ قَالُوا مَا أَغْنَىٰ عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ
تَسْتَكْبِرُونَ ﴿۴۸﴾ أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللَّهُ بِرَحْمَةٍ ۚ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ
لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ﴿۴۹﴾

"ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک اوٹ حائل ہوگی جس کی بلندیوں (اعراف) پر کچھ اور لوگ ہوں گے۔ یہ ہر ایک کو اس کے قیافہ سے پہچانیں گے اور جنت والوں سے پکار کر کہیں گے کہ "سلامتی ہو تم پر"۔ یہ لوگ جنت میں داخل تو نہیں ہوئے مگر اس کے امیدوار ہوں گے اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف پھریں گی تو کہیں گے "اے رب، ہمیں ان ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجیو۔" پھر یہ اعراف کے لوگ دوزخ کی چند بڑی بڑی شخصیتوں کو ان کی علامتوں سے پہچان کر پکاریں گے کہ "دیکھ لیا تم نے 'آج نہ تمہارے جتھے تمہارے کسی کام آئے اور نہ وہ سازوسامان جن کو تم بڑی چیز سمجھتے تھے۔ اور کیا یہ اہل جنت وہی لوگ نہیں ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ان کو تو خدا اپنی رحمت میں سے کچھ نہ دے گا؟ آج انہی سے کہا گیا کہ داخل ہو جاؤ جنت میں 'تمہارے لئے نہ خوف ہے نہ رنج۔"

روایات میں آتا ہے کہ اعراف پر جو لوگ کھڑے ہوں گے۔ یہ انسانوں ہی کا ایک گروہ ہوگا' یاد رہے کہ اعراف جنت اور دوزخ کے درمیان حائل جگہ ہوگی' یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور برائیاں وزن میں برابر ہوں گی۔ نہ نیکی انہیں جنت میں اہل جنت کے ساتھ لے جاسکے گی اور نہ برائی انہیں اہل جہنم کے ساتھ جہنم میں لے جاسکے گی۔ یہ لوگ بین بین ہوں گے اور اللہ کے فضل اور رحمت کے انتظار میں ہوں گے۔ یہ لوگ اہل جنت کو ان کی علامات کی وجہ سے پہچان سکیں گے' کیونکہ اہل جنت کے چہرے ہشاش بشاش اور سفید ہوں گے' ان کے آگے ایک نور جاری و ساری ہوگا اور ان کا ایمان محسوس ہوگا۔ یہ لوگ اہل جہنم کو بھی ان کی علامات سے پہچان سکیں گے کیونکہ ان کے چہرے سیاہ ہوں

گے اور ہوائیاں اڑ رہی ہوں گی یا وہ ان لوگوں کو اس داغ کی وجہ سے پہچان لیں گے جو ان کی ناک پر لگایا جائے گا۔جس طرح سورہ قلم میں ہے (سَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرْطُوْمِ (٦٨: ١٦)) "ہم عنقریب ان کی ناک پر داغ لگائیں گے۔" تو یہ اہل اعراف اہل جنت کو سلام کریں گے؛ اور سلام اس انداز کا ہو گا کہ وہ امید کریں گے کہ جلد ہی وہ بھی داخلہ جنت کے مستحق قرار پائیں گے اور جب وہ اہل جہنم کو دیکھیں گے تو ان کی یہ نظر اچٹتی ہو گی' بالارادہ وہ ان پر نگاہ ڈالنا پسند نہ کریں گے۔وہ انہیں دیکھتے ہی اللہ کی پناہ مانگنے لگیں کہ بارالہا! ہمیں ان کا ساتھی نہ بنا۔

(وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰهُمْ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ (٤٦) وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (٤٧)(٧: ٤٦ – ٤٧)) "ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک اوٹ حائل ہو گی جس کی بلندیوں (اعراف) پر کچھ اور لوگ ہوں گے۔یہ ہر ایک کو اس کے قیافہ سے پہچانیں گے اور جنت والوں سے پکار کر کہیں گے کہ "سلامتی ہو تم پر" یہ لوگ جنت میں داخل تو نہیں ہوئے مگر اس کے امیدوار ہوں گے اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف پھریں گی تو کہیں گے "اے رب' ہمیں ان ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجیو۔"

اس کے بعد اصحاب اعراف بڑے بڑے مجرموں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔یہ لوگ معروف قسم کے لوگ تھے اور ان پر بھی علامات جہنم عیاں تھیں۔ان پر وہ یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ دنیا میں تمہاری جو جمعیت اور شوکت تھی اب وہ کہاں گئی؟ ان کو یوں شرمندہ کرتے ہیں۔

(وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ (٧: ٤٨)) "پھر یہ اعراف کے لوگ دوزخ کی چند بڑی بڑی شخصیتوں کو ان کی علامتوں سے پہچان کر پکاریں گے کہ "دیکھ لیا تم نے' آج نہ تمہارے جتھے تمہارے کسی کام آئے اور نہ وہ سازوسامان جن کو تم بڑی چیز سمجھتے تھے۔"

اب ذرا اپنی حالت کو دیکھو کہ کہاں پڑے ہو' تمہاری جمعیت نے تمہیں کیا فائدہ دیا اور تمہارے استکبار نے تمہیں کیا تحفظ دیا؟ اب یہ لوگ ان اکابر مجرمین کو یاد دلاتے ہیں کہ تم تو اہل ایمان کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ یہ گمراہ ہو گئے ہیں اور یہ کہ یہ لوگ اللہ کی رحمت سے محروم ہیں۔

(اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ (٧: ٤٩)) "اور کیا یہ اہل جنت وہی لوگ نہیں ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ان کو تو خدا اپنی رحمت میں سے کچھ نہ دے گا۔اب دیکھو کہ تم کہاں کھڑے ہو اور یہ بھی دیکھو کہ ان کے بارے میں اللہ کے احکام کیا ہیں؟ یہ ہیں :

(اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَاخَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُونَ (۷:۴۹)) "آج انہی سے کہا گیا کہ داخل ہو جاؤ جنت میں، تمہارے لئے نہ خوف ہے نہ رنج ۔"

---○○○---

ہاں، ایک آواز اہل جہنم کی طرف سے بھی سنائی دیتی ہے ۔ یہ پرامید بھی ہے اور رحم طلب بھی ۔ دوسری جانب سے اس کا جو جواب دیا جاتا ہے وہ نہایت ہی تلخ، دردناک اور عبرت آموز ہے ۔ ذرا غور کیجئے ۔

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ

"اور دوزخ کے لوگ جنت والوں کو پکاریں گے کہ کچھ تھوڑا سا پانی ہم پر ڈال دو یا جو رزق اللہ نے تمہیں دیا ہے اسی میں سے کچھ پھینک دو ۔ وہ جواب دیں گے کہ "اللہ نے یہ دونوں چیزیں ان منکرین حق پر حرام کر دی ہیں جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تفریح بنا لیا تھا اور جنہیں دنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا ۔

اب انسانوں کا باہم مکالمہ ختم ہو جاتا ہے اور اللہ رب العزت اور صاحب اقتدار اور صاحب ملک کی بات سنی جاتی ہے ۔

فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝
وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝
هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ
قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ
نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا ۶
كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ ع ۱۱
۱۳

اللہ فرماتا ہے کہ "آج ہم بھی انہیں اسی طرح بھلا دیں گے جس طرح وہ اس دن کی ملاقات کو بھولے رہے اور

ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔"

ہم ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس کو ہم نے علم کی بناء پر مفصل بنایا ہے اور جو ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔ اب کیا یہ لوگ اس کے سوا کسی اور بات کے منتظر ہیں کہ وہ انجام سامنے آجائے جس کی یہ کتاب خبر دے رہی ہے؟ جس روز وہ انجام سامنے آگیا تو وہی لوگ جنہوں نے پہلے اسے نظرانداز کر دیا تھا کہیں گے کہ "واقعی ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے' پھر کیا اب ہمیں کچھ سفارشی ملیں گے جو ہمارے حق میں سفارش کریں؟ یا ہمیں دوبارہ واپس ہی بھیج دیا جائے تاکہ جو کچھ ہم پہلے کرتے تھے اس کے بجائے اب دوسرے طریقے پر کام کر کے دکھائیں۔" .... انہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا اور وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے تصنیف کر رکھے تھے آج ان سے گم ہو گئے۔

اس طرح اس طویل منظر کی جھلکیاں سامنے آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ ابھی آخرت کی جھلکی ہے اور ساتھ ہی دنیا کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے۔ ایک لمحہ ہم ان لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں جو آگ میں جل رہے ہیں' جن کا خیال تھا کہ وہ اللہ کے حضور پیش نہ ہوں گے اور جنہوں نے آیات الہی کا انکار کر دیا تھا حالانکہ ان کے پاس کتاب مفصل آچکی تھی جو بالکل واضح تھی اور اس کی تفصیلات اللہ کے علم پر مبنی تھیں۔ انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا اور اپنی پسند کے اوہام اور شکوک کو اختیار کر لیا۔ دوسرے ہی لمحہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہی لوگ دنیا میں اس کتاب کے انجام کا انتظار کر رہے ہیں اور اس میں جو ڈراوے درج ہیں ان کے ظہور کے منتظر ہیں۔ انہیں اس انجام بد سے ڈرایا جاتا ہے مگر اس منظر میں وہ واقع ہو چکا ہے۔

یہ عجیب مناظر ہیں جو اس کتاب کے صفحات میں پیش کئے گئے اور انہیں اس انداز میں یہی کتاب معجز بیان پیش کر سکتی تھی۔ اس طرح یہ طویل منظر کشی یہاں ختم ہو جاتی ہے اور اس پر اللہ کی جانب سے یہ آخری تبصرہ آتا ہے' جس میں لوگوں کو ان مناظر قیامت کی روشن یاد دہانی کرائی جاتی ہے اور لوگوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ اللہ کے رسول اور اللہ کی آیات کی تکذیب کا انجام کیا ہو گا؟

کہا جاتا ہے کہ لوگ اس کتاب میں دیئے گئے انجام کے بارے میں انتظار کرتے ہیں تو یہ ہے اس کا انجام۔ اور اس انجام کے دن توبہ کی کوئی گنجائش نہ ہو گی۔ مشکلات میں کوئی سفارش نہ چلے گی اور یہ بھی ممکن نہ ہو گا کہ آزمائش کے لئے دوبارہ چانس دیا جائے۔

یوں یہ منظر ختم ہوتا ہے اور انسان اس منظر میں گم رہتا ہے۔ جب یہ منظر ختم ہوتا ہے تو دیکھنے والا یہ محسوس کرتا ہے گویا وہ قیامت کے میدان سے پھر لوٹ کر دنیا میں آگیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پلک جھپکتے ہی ہم آخرت میں چلے گئے اور واپس آگئے۔

یہ پورے مناظر زندگی کے سفر پر مشتمل ہیں۔ زندگی کا طویل سفر' حشر و نشر اور حساب و کتاب اور جزاء و سزاء جبکہ اس سے قبل کے سبق میں انسانیت نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا جبکہ انسان کے جد امجد جنت میں تھے۔ ان کی لغزش کی وجہ سے انسان جنت سے اترا تھا۔

یوں قرآن کریم انسان کو اور اس کے تصورات کو کہاں سے کہاں لے جاتا ہے' زمان و مکان کے دفتر لپیٹ دیئے

جاتے ہیں' فاصلے مٹ جاتے ہیں اور انسان کو ملکوت السماوات کی سیر کرائی جاتی ہے اور یہ سیر چند لمحات میں کرا دی جاتی ہے تاکہ وہ نصیحت پکڑے اور ڈرانے والوں کی باتوں کی طرف توجہ کرے اور سورہ اعراف کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے کیا خوب کہا۔

(كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۲) اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۳)) (۷:۲ – ۳)

"یہ کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے' پس اے نبی تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو' اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے سے ڈراؤ اور ایمان لانے والے لوگوں کو نصیحت ہو۔"

---o o o---

درس نمبر ۶۷ ایک نظر میں

پہلے دو اسباق میں ہم نے قصہ آغاز انسانیت ' جنت سے اس کے نزول اور پھر حشر و نشر کے میدان اور جنت و دوزخ کے مناظر کی سیر کی ۔ اب اگلے سبق میں ملکوت السموات والارض کی سیر ہے ۔ اس پھیلی ہوئی کائنات کے ضمیر کی سیر مطلوب ہے ۔ انسان کی تخلیق سے ذرا پیچھے جاکر اس پوری کائنات کی تخلیق کی روئیداد بھی سن لیجئے ۔ متوجہ کیا جاتا ہے کہ ذرا اس کائنات کے اسرار و رموز پر بھی غور کرو اور یہ سمجھو کہ اس کا قصہ تخلیق کیا ہے ؟ ذرا اس کے مناظر و مظاہر پر بھی غور کرو ۔ گردش افلاک میں مناظر لیل و نہار کی دوڑ پر غور کرو ۔ سورج اور چاند کو دیکھو اور فضا کی وسعتوں میں سیاروں اور ستاروں کی بندش کو ملاحظہ کرو ۔ فضا میں ہواؤں کی گردش اور ان کے اثرات ' بادل اور بارش اور پھر مردہ زمین اور باران رحمت کے بعد اس کی تازگی اور روئیدگی ' ایک لمحہ مردہ اور ایک لمحہ فصلوں اور پھلوں سے بھرپور ۔

اللہ کی بادشاہت کی وادیوں سے قبل قصہ تخلیق انسانیت بیان ہو چکا ہے ۔ اس کے بعد انسانیت کے اس طویل سفر کا آغاز و انجام بیان ہو چکا ہے اور اس سے قبل یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ اتباع شیطان اور اللہ کی آیات اور احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے استکبار کا انجام کیا ہو گا ۔ نیز یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ جاہلی تصورات و رسومات کیا ہیں اور انسان کی جانب سے اپنے لئے شریعت سازی اللہ کی نظر میں کیا حیثیت رکھتی ہے ۔ ان موضوعات کے بعد انسان کو کائنات کی وسعتوں میں لے جایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے اس رب کی طرف لوٹ سکے جو ان وسعتوں کا خالق ہے اور پھر ان کو مسخر کرنے والا ہے ' جو اس وسیع و عریض کائنات کو اپنے نظام قضا و قدر سے چلاتا ہے ' اس کے لئے اس نے ایک ناموس تجویز کر رکھا ہے لہٰذا وہی ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا اور وہی ہے جو سیاسی اقتدار اعلیٰ کا مالک ہے ۔

ملکوت السموات کی اس سیر کے ذریعے یہ گہرا تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ پوری کائنات رب کائنات کی مطیع ہے ' لہٰذا اس ناقابل تصور طویل و عریض کائنات کے اندر اس چھوٹے سے انسان کی سرکشی اور استکبار فطرت کائنات سے نافرمانی ہے ۔ اس طرز عمل سے انسان ناموس فطرت اور ناموس شریعت سے بیک وقت سرکشی اختیار کرتا ہے لہٰذا انسان کو اس کائنات کے اندر رہتے ہوئے یہ رویہ اختیار نہ کرنا چاہئے ۔

(اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (۵۵) وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ

الْمُحْسِنِينَ (٥٦) (٧: ٥٥-٥٦)) "اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے' یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں کے قریب ہے۔"

دین کو اللہ کے لئے خالص کر دینا' اور تمام انسانوں کی جانب سے اللہ کی بندگی اختیار کرنا اس عظیم بندگی اور سرنگونی کا ایک معمولی سا جزء اور ایک چھوٹی سی شاخ ہے جو اس عظیم اور بیکراں کائنات کی طرف سے رب ذوالجلال کے حضور کی جا رہی ہے۔ یہ ہے وہ سوچ اور وہ تصور جسے پورا قرآن کریم انسان کے دل و دماغ اور اس کے نظریات و تصورات میں نہایت ہی عمدگی سے بٹھانا چاہتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو دل و دماغ بھی سوچ اور ادراک کے دروازے کھول کر اس پوری کائنات اور اس کے ان نوامیس کی طرف متوجہ ہو گا جو اس کائنات میں پوشیدہ ہیں یا بالکل ظاہر ہیں تو لابدی ہے کہ وہ نہایت ہی پختہ انداز میں اور نہایت ہی گہرائی کے ساتھ اس سے متاثر ہو گا اور دل کی گہرائیوں سے یہ شعور پائے گا کہ وہ ذات نہایت ہی عظیم ہے جس نے اس کائنات اور اس کے نوامیس کو بنایا ہے اور وہی بنانے والی ذات سیاسی اقتدار اعلیٰ کی بھی سزاوار ہے۔ یہ غور و فکر وہ پہلا قدم ہے جو انبیاء کی دعوت کی قبولیت کی طرف انسان کو لے جاتا ہے اور پھر انسان پوری طرح اللہ رب العالمین کے احکام کے سامنے سرتسلیم خم کر دیتا ہے جس طرح سے پوری کائنات سرتسلیم خم کئے ہوئے ہے اور پھر انسان کائنات کا ہم قدم ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم حقیقت الوہیت کو سمجھانے کے لئے حقیقت کائنات کے ادراک کو پہلا زینہ قرار دیتا ہے اور اس طرح پوری انسانیت کو اللہ وحدہ کی غلامی کے لئے تیار کرتا ہے۔ اس طرح انسانی شعور اور انسانی شخصیت کو حقیقت عبودیت سے روشناس کراتا ہے۔ انسان بڑے اطمینان سے ذوق بندگی پاتا ہے اور وہ یقین کر لیتا ہے کہ وہ اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی یہ کائنات دونوں ہم قدم ہو کر بندگی رب کی راہ پر چل رہے ہیں۔

پوری کائنات کی جانب سے اللہ کی بندگی کے ثبوت کا مقصد قرآن کے پیش نظر محض عقلی استدلال ہی نہیں ہے کہ چونکہ کائنات اللہ کے ہاتھ میں مسخر ہے' وہ پوری طرح مطیع فرمان ہے' اور نہایت ہی فرمانبرداری سے' نہایت ہی گہرائی اور مکمل طور پر اللہ کے حکم اور امر کی پابند ہے لہٰذا انسان کو بھی ایسا ہونا چاہئے۔ صرف عقلی استدلال ہی پیش نظر نہیں بلکہ اس سے ایک دوسرا ذوق بھی انسان کے اندر پیدا کرنا مطلوب ہے۔ وہ یہ ذوق و احساس ہے کہ انسان اور یہ پوری کائنات اس بندگی اور غلامی میں باہم شریک و رفیق ہیں اور نہایت ہی اطمینان کے ساتھ انسان یہ بندگی کر سکتا ہے گویا اس طرح انسان اس قافلہ کائنات کا ایک فرد ہو گا جو مطیع رب ہو گا۔

گویا ہر انسان راضی برضا بندگی کر رہا ہے۔ کوئی امر اسے مجبور نہیں کر رہا ہے' وہ جبر کے تحت نہیں بلکہ محبت اور اطمینان کی وجہ سے بندگی کر رہا ہے۔ اس بندگی کی وجہ سے وہ اس پوری کائنات سے ہم آہنگ ہو رہا ہے۔ لہٰذا ایسا انسان بندگی سے فرار کی راہیں تلاش نہیں کرتا' نہ اس جبر سے اپنے آپ کو آزاد کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس تصور سے بندگی' اس کی فطرت قرار پاتی ہے اور اس کے لئے خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ یہ ایسی بندگی ہوتی ہے جس کی وجہ سے انسان تمام غیر اللہ کی بندگیوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور رب رفیع و ذوالجلال ہی کا بندہ بن جاتا ہے جو رب العالمین ہے۔

یہی بندگی ایمان کی تمثیل ہوتی ہے اور اسے پر ذائقہ بناتی ہے۔ اسی بندگی سے اسلام کا مفہوم ظہور پذیر ہوتا ہے اور اسلام کے اندر روح اور زندگی اور تروتازگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہ اساس ہے جس پر اسلام کو قائم ہونا چاہئے اس اساس کو اچھی طرح پختہ کرنا چاہئے اور اس کے بعد کسی بندے کو احکام و شریعت دینا چاہئے۔ اس کے بعد ہی قوانین و ضوابط کا اقرار ہونا چاہئے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کا منہاج اور اسلوب سب سے پہلے انسان کے اندر یہ شعور اور ذوق پیدا کرتا ہے۔ اسے پختہ کرتا ہے اور یہ نہایت ہی متین اور پختہ منہاج ہے۔

---000---

درس نمبر ۶۷ تشریح آیات

۵۴ --- تا --- ۵۸

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرٰتٍ بِأَمْرِهِ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبٰرَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعٰلَمِينَ ﴿۵۴﴾

"درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا' پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے۔ جس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کئے سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار رہو! اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ' سارے جہانوں کا مالک و پروردگار۔

اسلام کا نظریہ توحید ایسا عقیدہ ہے جو اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں ہر قسم کے انسانی تصورات کا قلع قمع کر دیتا ہے۔ اللہ کے افعال کی کیفیات کی بھی وہ نفی کرتا ہے' کیونکہ اللہ ایسا ہے جیسا کوئی بھی نہیں ہے۔ چنانچہ انسانی تصور اللہ کی کوئی تصویر نہیں کھینچ سکتا' کیونکہ انسانی تصور اور انسانی عقل وہی تصاویر اللہ پر چسپاں کرے گا جو وہ اپنے ماحول سے اخذ کرے گا اور اس میں ان اشکال کا دخل ہو گا جو انسان دیکھتا ہے اور اللہ کی ذات ایسی ہے جیسا کوئی اور ذات نہیں ہے لہذا انسانی تصور اللہ کی کوئی تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ اور جب ذات باری انسانی تصور کے دائرہ تصویر کشی سے باہر ہے تو اللہ کے افعال کی کیفیات بھی دائرہ عقل سے وراء ہیں۔ انسان صرف یہی کر سکتا ہے کہ ذات باری اور افعال باری کے آثار ہی ہمارے فہم و ادراک کا موضوع ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ ایسے سوالات کہ اللہ نے آسمان و زمین کو کس طرح پیدا کیا؟ اللہ پھر عرش پر کیسے متمکن ہوا؟ اور وہ عرش کیسا ہے جس پر باری تعالیٰ متمکن ہوا؟ یہ تمام سوالات لغو سوالات ہیں اور اسلامی تصورات و عقائد کے اصول کے خلاف ہیں۔ ایسے سوالات کے جواب دینا ان سوالات سے بھی لغو بات ہے اور کوئی شخص جو اسلامی تصورات و عقائد کے ان

اصولوں سے واقف ہے ' وہ کبھی ان سوالات کا جواب دینے کی سعی نہیں کرے گا۔ اسلامی فرقوں میں سے بعض لوگوں نے ان سوالات کے جوابات دینے کی سعی کی ہے ' جو نہایت ہی افسوسناک مشغلہ تھا۔ اسلامی افکار کی تاریخ ایسے مباحث سے بھری پڑی ہے اور یہ مباحث اس وقت پیدا ہوئے جب اسلامی فکر کو یونان کی افکار کی بیماری لاحق ہوئی۔

رہے وہ چھ دن جن میں اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا تو یہ بھی ایک غیبی حقیقت ہے جس کا صحیح علم صرف اللہ کو ہے۔ اس وقت انسان موجود نہ تھا کہ وہ اس تخلیق اور زمانہ تخلیق کے بارے میں کچھ کہہ سکتا ہو۔ نہ اللہ کی دوسری مخلوق کے بارے میں انسان کچھ کہہ سکتا ہے۔ (مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ) تم نے تخلیق سماوات اور زمین اور خود اپنے نفوس کی تخلیق کا مشاہدہ نہیں کیا۔" اس کے بعد ان موضوعات پر کوئی شخص جو بھی کہے گا وہ کسی یقینی اصول پر مبنی نہ ہو گا۔

یہ چھ مراحل بھی ہو سکتے ہیں ' چھ طریقے بھی ہو سکتے ہیں۔ اور اللہ کے ایام میں سے چھ یوم بھی ہو سکتے ہیں۔ ایام الٰہی ان ایام جیسے نہیں ہوتے جو اجرام سماوی کی حرکات کے نتیجے میں ہم لوگ دیکھتے ہیں کیونکہ تخلیق کائنات سے قبل یہ اجرام فلکی تو موجود ہی نہ تھے جن سے ہم وقت کا تعین کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ یہ ایام اور کوئی چیز بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا کوئی انسان متعین طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ چھ ایام کے عدد سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں انسانوں نے جو کچھ کہا ہے وہ بہرحال انسانی مفروضے ہیں جو ظن و تخمین پر مبنی ہیں اور تعجب ہے کہ بعض لوگ ان اندازوں کو علم اور سائنس قرار دیتے ہیں جو کھلا تحکم ہے اور ذہنی و روحانی شکست پر مبنی ہے۔ یہ سائنس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے برابر ہے جو بذات خود غیر یقینی چیز ہے اور اکثر اوقات مفروضات پر مبنی ہوتی ہے۔

ہم اس آیت کو ان مفروضوں سے آلودہ نہیں کرتے ' کیونکہ ان مفروضوں کی وجہ سے اس کے مفہوم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ آیئے ہم اس وسیع و عریض کائنات کی سیر شروع کرتے ہیں۔ آیت پر دوبارہ نگاہ ڈالیں۔

(اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۷: ۵٤)) "درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا ' پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے۔ جس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کئے ' سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار رہو! اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ ' سارے جہانوں کا مالک و پروردگار۔

یہ عظیم کائنات جو ہمیں نظر آتی ہے اور جو نہایت ہی وسیع ہے ' یہ اللہ کی پیدا کردہ ہے اور اللہ اس پر حاوی اور سربلند ہے۔ وہ اپنی قدرت اور تدبیر کے ساتھ اسے چلاتا ہے ' جو رات کو دن پر ڈھانپ دیتا ہے اور پھر رات کو دن کے پیچھے دوڑاتا ہے۔ یہ سلسلہ مسلسل دوران کی شکل میں چلتا ہی رہتا ہے لیل و نہار آگے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ جس نے سورج ' چاند اور ستاروں کو اپنے قبضے میں رکھا ہوا ہے۔ وہ نگہبان ' متصرف اور مدبر ہے ' وہی تمہارا رب ہے۔ وہی اس بات کا

مستحق ہے کہ وہ رب ہو' وہ اپنے طبیعی نظام کے ذریعے تمہاری تربیت کرتا ہے 'تم اس کے نظام کے مطابق اٹھتے ہو' وہ اپنے حکم سے تمہارے لئے قانون بناتا ہے' وہ اپنے قانون کے مطابق تمہارے درمیان فیصلے کرتا ہے' وہی خالق ہے اور وہی حاکم ہے۔جس طرح اس کے ساتھ خلق میں کوئی شریک نہیں اسی طرح اس کے ساتھ سیاسی حاکمیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔یہی وہ اصل مسئلہ ہے جو اس سبق کی روح ہے۔الوہیت' ربوبیت' سیاسی حاکمیت' اور اقتدار اعلیٰ میں اللہ کو وحدہ لاشریک سمجھنا وغیرہ۔اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی میں اللہ کی شریعت کا پابند ہو اور اس پوری سورہ کا اصلی موضوع یہی ہے'کبھی تو اسے لباس اور خوراک کے مسائل کے ضمن میں لیا جاتا ہے اور کبھی دوسری شکل میں'جس طرح سورہ انعام میں مویشیوں اور فصلوں اور نذر ونیاز کے موضوع کے ضمن میں اسے بیان کیا گیا۔

قرآن کریم کے پیش نظر جو ہدف ہے اسے سمجھتے ہوئے ہمیں اس بات کو بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا چاہئے کہ ان مناظر کی خوبصورتی کا معیار کس قدر اونچا ہے۔یہ مناظر زندگی اور حرکت سے کس قدر بھرپور ہیں اور ان کے اندر کس قدر اشاریت اور راہنمائی پائی جاتی ہے۔اس عظیم ہدف کے حصول کے لئے قرآن کریم نے کس قدر اچھا اسلوب اختیار کیا ہے۔

گردش لیل و نہار کے ساتھ ساتھ گردش افکار وتصورات اور اس کائنات میں فکر کی جولانی' دن کے پیچھے رات کا تعاقب اور اس کے پکڑنے میں اس کی ناکامی ایک ایسی تگ و دو ہے کہ انسانی وجدان اس پر سے غفلت اور لاپرواہی کے ساتھ نہیں گزر سکتا'اس گردش پیہم سے انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔بلکہ انسان ہروقت انتظار اور امید میں رہتا ہے۔

اس کائنات میں گردش اور زندگی قدرتی طور پر حسین لگتی ہے' پھر گردش لیل و نہار کو ایک زندہ اور صاحب ارادہ ذات انسان کے ملاحظہ کے لئے پیش کرنا'ایک نہایت ہی خوبصورت طرز تعبیر ہے۔کوئی انسانی طرز تعبیرات اس حسن کے ساتھ پیش نہیں کرسکتا یہ قرآن کا مطلق اعجاز ہے۔

جب انسان کسی منظر کا عادی ہو جاتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے حسن اور خوبصورتی کے اثرات ختم ہو جاتے ہیں۔انسان ان مناظر سے یونہی ایک بلید الطبع شخص کی طرح متاثر ہوئے بغیر ہی گزر جاتا ہے۔قرآن کریم عادی مناظر و مشاہد کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ وہ عادی اور روٹین کے مناظر نہیں رہتے' وہ انہیں ایسے نئے انداز میں پیش کرتا ہے اور اس انداز تعبیر کے اثرات اس طرح مرتب ہوتے ہیں کہ گویا یہ منظر انسان نے بالکل پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔زیر نظر گردش لیل و نہار کے مناظر کو دیکھئے' یہ عام' عادی اور پیش پاافتادہ مناظر نہیں ہیں بلکہ لیل و نہار زندہ انسانوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے نظر آتے ہیں اور ارادہ اور روح کے حامل حقائق و اشخاص نظر آتے ہیں۔اپنی اس حرکت اور دوڑ میں لیل و نہار انسان کے ساتھ شریک اور مانوس ہیں اور ان کی حرکت کو ایسی حرکت سے تعبیر کیا گیا ہے جس میں لوگ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہیں۔

اسی طرح سورج' چاند اور ستارے بھی اس منظر میں اس طرح پیش ہوئے ہیں گویا زندہ ارواح ہیں اور اللہ کے احکام ان پر آتے ہیں وہ ان احکام کے مطابق حرکت کرتے ہیں اور پوری اطاعت اور وفاکیشی کے ساتھ حرکت پذیر ہیں۔وہ اس طرح ڈسپلن میں ہیں کہ احکام لیتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں' جہاں ان کو حکم دیا جاتا ہے وہاں جاتے ہیں'جس طرح زندہ باوردی فوجیوں کو احکام ملتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس انداز تعبیر سے انسان جھوم اٹھتا ہے' فوراً احکام الٰہی کی تعمیل کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے اور انسان اپنے

آپ کو قافلہ وفا کیشاں کائنات کا فرد سمجھتا ہے اور انسان پر قرآن کی گرفت اس طرح نظر آتی ہے جس طرح کوئی کسی بادشاہ کی قید میں ہوتا ہے۔ یاد رکھیے کہ قرآن انسانی فطرت سے مخاطب ہوتا ہے۔ یہ فطرت اس خالق نے پیدا کی ہے' جو قرآن کی شکل میں انسان سے ہمکلام ہے اور اللہ انسان کی فطرت کے اسرار و رموز سے خوب واقف ہے۔

---ООО---

جب بات اس مقام تک پہنچی ہے' جب انسانوں کے اندر شعور و وجدان پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ اس کائنات کے زندۂ جاوید مناظر کے ہمرکاب ہو جاتے ہیں۔ اس سے قبل وہ ایک غافل اور بلید الطبع انسان کی طرح ان حسین مناظر سے متاثر ہوئے بغیر گزر جاتے تھے۔ اور جب انسان کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ مناظر اللہ کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ اس کے مطیع فرمان ہیں اور اپنے خالق کے احکام و نوامیس سے ذرہ برابر سرتابی نہیں کرتے تو اس مقام پر قرآن انسان کو اپنے رب کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ اپنے رب کو نہایت ہی خضوع و خشوع کے ساتھ پکارو' چونکہ وہ تمہارا رب ہے' لہٰذا اس کے ساتھ جڑ جاؤ اور اللہ کی حدود و قیود کی پابندی کرو۔ اللہ کے سیاسی اقتدار اعلیٰ پر دست درازی نہ کرو۔ اور اس زمین اپنی پر اللہ کی شریعت کو چھوڑ کر اپنی ہوائے نفس کی پیروی نہ کرو خصوصاً جبکہ اللہ نے اپنے نظام کے ذریعے انسانی مصالح کا انتظام فرما دیا ہے۔

ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

"اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے' یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ' یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔"

یہ ہدایات ایسے وقت میں دی جا رہی ہیں جبکہ مطالعہ کرنے والا نفسیاتی طور پر ان کو قبول کرنے کے لئے پوری طرح آمادہ ہو جاتا ہے۔ وہ دعاء اور رجوع الی اللہ کی حالت میں ہوتا ہے اور اس عظیم کارخانہ قدرت کے مطالعہ کے بعد اللہ کے سامنے عاجزی اور فروتنی کی حالت میں ہوتا ہے۔ خفیہ سے مراد یہ ہے کہ چیخ و پکار نہ کرو' دھیمی آواز سے پکارو کیونکہ اللہ کی جلالت شان کے لائق یہ ہے کہ انسان اسے نہایت ہی نرم اور دھیمی آواز میں پکارے اور اس انداز میں جس سے معلوم ہو کہ اللہ قریب ہے اور سن رہا ہے۔

مسلم کی روایت ہے۔ حضرت ابو موسیٰ ؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ ایک روایت میں آتا ہے ایک غزوہ میں تھے' لوگوں نے زور زور سے اللہ اکبر کہنا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' لوگو ذرا نرمی کے ساتھ اور اپنے دل میں پکارو' تم کسی بہرے کو نہیں پکار رہے اور نہ کسی ایسے

شخص کو پکار رہے ہو جو غائب ہے 'تم تو سننے والی قریب ذات کو پکار رہے ہو جو تمہارے ساتھ ہے۔

یہاں قرآن کریم کا یہ اسلوب لوگوں کے اندر یہ احساس پیدا کر رہا ہے کہ اللہ کی ذات جلیل القدر ہے اور قریب ہے اور دعا اور پکارنے کے وقت قرآن کریم عمداً ایسی ہیئت اور شکل پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ پکارنے والا ذات باری کی برتری کی وجہ سے چیخنے اور چلانے سے حیا کرتا ہے۔ جن لوگوں کے دل میں اللہ کی جلالت قدر بیٹھی ہوئی ہے وہ اللہ کی جناب میں شور و شغب سے دور رہتے ہیں۔

غرض اس عاجزانہ دعا اور انکساری اور خشوع و خضوع کی فضا میں' اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس بات کی ممانعت کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے لئے اس حاکیت کا دعویٰ کریں جو وہ ایام جاہلیت میں کیا کرتے تھے کیونکہ حاکیت اور اقتدار اعلیٰ کا حق صرف اللہ کو ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ممانعت بھی آجاتی ہے کہ فساد فی الارض سے باز رہو' جبکہ اسلامی شریعت کے نظام کے ذریعے اللہ نے اس کی اصلاح کر دی ہے۔ جو شخص عاجزی' تضرع اور نہایت ہی خفیہ طریقے سے اللہ کو پکارتا ہے جو قریب بھی ہے اور سننے والا بھی ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا شخص زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہیں پھیلاتا کیونکہ ان دونوں تاثرات کے درمیان ایک گہرا داخلی اور نفسیاتی ربط ہے۔ قرآن کا منہاج اصلاح یہ ہے کہ وہ دلوں کی گہری سوچوں اور نفسیاتی میلانات کو لے کر چلتا ہے اور یہ منہاج وہی ذات اختیار کر سکتی ہے جو لطیف و خبیر ہے۔

(اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (٥٥) وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ

(٥٦) (٧: ٥٥ - ٥٦)) "اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے' یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں کے قریب ہے۔"

خوف اس لئے کہ تم اس کے غضب سے بچ جاؤ اور طمع اس لئے کرو کہ وہ تم سے راضی ہو گا اور اجر دے گا۔ جو لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اس طرح کرتے ہیں کہ گویا اللہ کو دیکھ رہے ہیں اور اگر وہ اسے دیکھ نہیں رہے تو ان کی حالت ایسی ہو کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ انہیں دیکھ رہا ہے۔ جیسا کہ حدیث کے مضمون میں آتا ہے تو یہ ہے احسان۔ حضورؐ کی تعریف کے مطابق۔

---ooo---

ایک بار پھر قرآن کریم اس کھلی کائنات کا ایک دوسرا ورق انسان کے مطالعے کیلئے الٹتا ہے۔ یہ ورق تو ہمارے سامنے ہر وقت کھلا رہتا ہے لیکن ہم غفلت میں اس کے پاس سے گزر جاتے ہیں۔ ہم اس سے کوئی تاثر نہیں لیتے' ہم اس کی پکار کو نہیں سنتے۔ یہ وہ صفحہ ہے کہ آیت سابقہ میں رحمت الٰہیہ کے ضمن میں اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ یہاں رحمت الٰہیہ کے ایک نمونے کے طور پر اسی صفحے کو کھولا جا رہا ہے۔ آسمانوں سے پانی گر رہا ہے' زمین سے مختلف قسم کی فصلیں اگ رہی ہیں اور زمین مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھتی ہے یعنی سرسبز ہو جاتی ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ حَتّٰٓى إِذَآ أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَأَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۚ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾

"اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوشخبری لئے ہوئے بھیجتا ہے' پھر جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھالیتی ہیں تو انہیں کسی مردہ سرزمین کی طرف حرکت دیتا ہے اور وہاں مینہ برسا کر (اسی مری ہوئی زمین سے) طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے۔ دیکھو' اسی طرح ہم مردوں کو حالت موت سے نکالتے ہیں' شاید کہ تم اس مشاہدے سے سبق لو۔"

یہاں اس کائنات میں شان ربوبیت کے آثار کو قلم بند کیا گیا ہے' مثلاً کائنات میں فعالیت' اس پر کنٹرول' اس کا مدبرانہ نظام اور اس کی قوتوں کی تحدید و تقدیر۔ یہ سب امور اللہ کی عظیم کارفرمائیوں کے مظہر ہیں اور ایسے امور ہیں جو بتاتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی رب نہیں ہو سکتا۔ وہی خالق اور رازق ہے' مسبب الاسباب ہے اور یہ اسباب اس نے اپنی مخلوق کے لئے تیار کئے ہیں۔

ہوا ہر وقت چلتی رہتی ہے' ہر وقت وہ اس کائنات میں بادلوں کو اٹھاتی اور دوڑاتی ہے۔ ہر وقت بادلوں سے بارش برستی رہتی ہے۔ لیکن یہ سب امور اللہ کے فضل و کرم کے مظہر ہیں جیسا کہ یہ حقیقت ہے۔ یہ بات ہمارے مشاہدے سے وراء ہے اور نئی ہے جسے سیاق کلام میں سمو دیا گیا ہے اور نہایت ہی مؤثر' متحرک اور مشخص انداز میں اسے یہاں پیش کیا جا رہا ہے' یوں کہ گویا منظر آنکھوں کے سامنے ہے۔

یہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو چلاتا ہے اور وہ اللہ کی رحمت لئے ہوئے ہوتی ہیں۔ لوگوں کے لئے سامان مسرت فراہم کرتی ہیں۔ یہ ہوائیں ان نوامیس فطرت کے مطابق چلتی ہیں جو اللہ نے اس کائنات پر حاوی کر دیئے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے عقل کی کسی بڑی مقدار کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ کائنات اپنے آپ کو وجود میں خود نہیں لائی اور نہ اس نے اپنے لئے یہ نوامیس فطرت خود وضع کئے ہیں' جبکہ اسلام کے معقول تصور حیات میں ہے کہ اس کائنات میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں وہ ان قوانین تکوینی کے مطابق ہوتے ہیں جو اللہ نے اس کائنات کے لئے وضع کئے ہیں اور مقدر کر دیئے ہیں۔ تمام حادثات کا ظہور ان قوانین کے مطابق ہوتا ہے' تمام انفرادی حوادث کا ظہور بھی اسی ناموس کے مطابق ہوتا ہے' لہٰذا ہواؤں کا کسی معین وقت اور معین خطے میں چلنا بھی اسی قاعدہ کلیہ اور اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوتا ہے۔

چنانچہ یہ ہوائیں بھی سنت الہیہ اور ناموس الٰہی کے مطابق چلتی ہیں لیکن ایک خاص مقدار کے مطابق' ان ہواؤں کو مردہ علاقے اور صحراؤں کی طرف چلایا جاتا ہے اور یہ سب کچھ امر الٰہی کے مطابق ہوتا ہے۔ کسی جگہ جو بارش برستی ہے وہ مقررہ مقدار کے مطابق برستی ہے۔ اس سے جو روئیدگی اور پیداوار حاصل ہوتی ہے' وہ بھی تقدیر الٰہی کے مطابق بطور خاص ہوتی ہے اور یہ تمام عمل اس کائنات کے نظام کے مطابق ہوتا ہے۔

غرض اسلامی تصور حیات کے مطابق یہاں کوئی واقعہ آزادانہ یا بطور اتفاق وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ تخلیق سے لے کر ظہور واقعات تک ہر حرکت ' ہر تغیر اور ہر تبدیلی بر وقت 'مقررہ تقدیر اور سنت کے مطابق ہوتی ہے۔ اسی طرح یہاں اسلامی نقطہ نظر سے یہ تصور بھی غلط ہے کہ یہ کائنات مجبور محض ہے اور اللہ نے اسے پیدا کر کے اپنے طور پر اسے چھوڑ دیا ہے۔ اس نے اس کی حرکت کے قوانین وضع کر دیئے ہیں' اب وہ اس کی حرکت کے قوانین میں جکڑی ہوئی ہے اور اس حرکت کے پیچھے کوئی ارادہ اب نہیں ہے۔

اسلامی تصور یہ ہے کہ تخلیق اللہ کی مشیت اور ارادے سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد مخلوقات میں اللہ کی سنت جاریہ کا نفاذ ہوتا ہے لیکن اس کائنات کی ہر حرکت تقدیر الٰہی کے مطابق ہوتی ہے۔ اور ہر دفعہ کی حرکت میں سنت الٰہیہ جاری و ساری نظر آتی ہے اور ہر حرکت کی مقدار مقرر ہے۔ یہ سب کچھ اس مشیت الٰہیہ کے مطابق ہوتا ہے جس کو نوامیس الٰہیہ پر بھی بالادستی حاصل ہوتی ہے۔

یہ ایک زندہ اور روشن دل و دماغ کا حامل تصور ہے اور اس کے مطابق ـــــ یہ کائنات مجبور محض اور مردہ نہیں ہیں۔ یہ کائنات سوتی نہیں' جاگتی ہے اور خود سر نہیں بلکہ اس کا قیم اور نگران ہر وقت اس کی طرف متوجہ ہے۔ یہاں جو کچھ واقعہ ہوتا ہے وہ ارادۂ مدبرہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہر حرکت ناموس کے مطابق ہوتی ہے' اور ہر حرکت سے قلب مومن جاگ اٹھتا ہے۔ وہ اللہ کی تقدیر اور سنت کو دیکھتا ہے کہ وہ اپنا کام کر رہی ہے۔ چنانچہ قلب مومن اللہ کی حمد میں رطب اللسان ہوتا ہے' اللہ کو یاد کرتا ہے۔ وہ مردہ آلات کی طرح غافل ہو کر حرکت نہیں کرتا' اندھا اور بہرا ہو کر۔

یہ تصور حیات مومن کے دل میں حیاء اور دماغ میں جوش ادراک پیدا کرتا ہے۔ وہ تمام حرکات و واقعات میں دست قدرت کی کارفرمائیاں دیکھتا ہے اور ہر حرکت' ہر حادثے میں رات اور دن اللہ کی تسبیح و تہلیل کرتا ہے۔

اب اس مقام پر قرآن کریم' اس رواں دواں زندگی کا ربط حیات اخروی کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ یہاں کی تخلیق اور آخرت میں دوبارہ اٹھانا' ایک ہی عمل نظر آتا ہے۔ اللہ کی مشیت کے مطابق یہ اسی طرح ممکن ہے جس طرح اس جہان میں یہ زندگی رواں دواں ہوئی۔

(كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۷:۵۷)) "دیکھو' اسی طرح ہم مردوں کو حالت موت سے نکالتے ہیں' شاید کہ تم اس مشاہدے سے سبق لو۔"

اس کرۂ ارض پر زندگی کے رنگ ڈھنگ مختلف ہیں لیکن زندگی کی اس بوقلمونی کے باوجود اس کائنات پر وجود حیات کا معجزہ ایک ہی جیسا ہے۔ اس تبصرے میں اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جس طرح یہاں مردے سے زندہ اجسام نکلتے ہیں اسی طرح آخرت میں مردوں کو زندہ کر دیا جائے گا' جس اللہ نے اس کرۂ ارض پر زندگی کے یہ مختلف رنگ ڈھنگ پیدا کئے وہ اس بات پر قادر ہے کہ آخرت میں انسان کو دوبارہ زندہ کر دے۔ جو قوت اور جو قدرت یہاں مردے سے زندہ کو وجود میں لا سکتی ہے' وہ ذات آخرت میں مردے کو دوبارہ زندگی کیوں نہیں بخش سکتی۔ (لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۷:۵۷)) "شاید کہ اس مشاہدے سے تم سبق لو۔"

یہ ایک پیش پا افتادہ اور عظیم حقیقت ہے' لیکن لوگ دیکھتے ہوئے بھی اسے دیکھنا نہیں چاہتے اور لایعنی اوہام و

خرافات کو حقیقت بتانے کے درپے ہیں۔

اس کائنات کی وسعتوں کے اس سفر اور اسرار کائنات کے اس غور و فکر کو قرآن کریم ایک مثال پر ختم کرتا ہے۔ یہ تمثیل ایک صالح اور پاک اور غیر صالح اور ناپاک دل کے بارے میں ہے۔ اور یہ تمثیل بھی اس کائنات کے مشاہدے اور اس مطالعاتی سفر سے اخذ کی گئی ہے تاکہ یہ تمثیل اس مطالعاتی سفر سے ہم آہنگ نظر آئے اور انسانی طبیعت اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا
نَكِدًا ۚ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿٥٨﴾ ۵ ع ۷ ۱۴

''جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ اسی طرح ہم اپنی نشانیوں کو بار بار پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو شکر گزار ہونے والے ہیں۔''

اچھے دل کو قرآن و سنت میں زرخیز مٹی اور صالح زمین سے مشابہت دی جاتی ہے' اور برے دلوں کو بیکار مٹی اور بنجر زمین سے۔ اس لئے کہ اچھی زمین میں اچھی فصل پیدا ہوتی ہے اور وہ پھل پھول لاتی ہے اور اسی طرح اچھے دل میں صالح خیالات اور اچھے تصورات پیدا ہوتے ہیں اور وہ ایک پاکیزہ شعور و تصورات کا مسکن ہوتا ہے۔ اس کے اندر انسانی رجحانات میلانات اور ارادے اور عزائم جاگزیں ہوتے ہیں جو بعد میں عملی شکل اختیار کرتے ہیں بعینہ اس طرح جس طرح زمین سے ہر قسم کی پیداوار حاصل ہوتی ہے اور مختلف رنگوں اور مختلف ذائقوں کے پھل نمودار ہوتے ہیں۔

(وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِىْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا (۷: ۵۸)) ''جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔''

اچھی زمین وہ ہوتی ہے جو نرم اور آسان ہوتی ہے اور جو بری ہوتی ہے وہ اذیت دہ' سخت مشقت خیز اور تنگ ہوتی ہے۔ ایک اچھے دل پر ہدایت' نصیحت اور یاد دہانی کی بارش نازل ہوتی ہے' جس طرح اچھی زمین پر بادلوں سے بارش برستی ہے۔ اگر دل پاکیزہ ہو' ایک اچھی اور زرخیز زمین کی طرح تو وہ کھل جاتا ہے۔ وہ ہدایت اور نصیحت کو قبول کرتا ہے اور مزید پاکیزہ ہو کر کامیاب ہو جاتا ہے۔ اگر دل فاسد ہو' جس طرح خبیث اور بنجر زمین ہوتی ہے تو اس دل کے دریچے بند ہو جاتے ہیں' وہ سخت ہو جاتا ہے اور شر و فساد کی راہ لیتا ہے۔ یقین کے بجائے اس دل میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں جس طرح بنجر زمین میں جھاڑیاں پیدا ہوتی ہیں۔

(كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ (۷: ۵۸)) ''اسی طرح ہم اپنی نشانیوں کو بار بار

پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو شکر گزار ہونے والے ہیں۔"

شکر کا پودا پاکیزہ دل ہی میں اگ سکتا ہے' اور اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ دل پر نصیحت کا اثر ہو گیا ہے اور وہ قبولیت کی راہ لے رہا ہے۔ ایسے ہی دل رکھنے والے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ اپنی آیات اور دلائل بار بار اور مختلف انداز میں بیان کرتا ہے' کیونکہ صرف ایسے ہی لوگ ان بیانات سے نفع اٹھاتے ہیں اور اپنے شب و روز کو درست کرتے ہیں۔

شکر الٰہی' اس سورہ کا خاص مضمون ہے۔ اس سورہ میں انذار و تذکیر کے ساتھ ساتھ اس کا خصوصاً ذکر ہوا ہے۔ اس سے پہلے بھی ہم اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں اور آئندہ بھی اس سورہ کی دوسری خصوصیات یعنی انذار و تذکیر کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کریں گے۔

---000---

درس نمبر ۷ ایک نظر میں

اس سبق میں ہم قافلہ ایمان کے ہمرکاب ہیں - یہ ہیں اس کے لیڈر اور یہ ہیں اس کے جھنڈے اور یہ ہیں ان کے نشانات راہ - یہ قافلہ اس کرۂ ارض کی تاریخ کے طویل میدانوں میں رواں دواں ہے - اور پوری انسانیت کے ساتھ ہمکلام ہے - اس طویل سفر میں انسانیت جب بھی بے راہ روی اختیار کرتی ہے' یہ قافلہ لئل حق اس کی راہ روکتا ہے اور اسے صراط مستقیم پر ڈال دیتا ہے - انسانیت راہ مستقیم سے اس وقت ہٹ جاتی ہے کہ جب اس پر شیطانی خواہشات کا غلبہ ہو جائے - شیطان ہروقت اس تاک میں لگا رہتا ہے کہ انسانیت کو بدراہ کر کے اپنے جذبہ انتقام کو ٹھنڈا کرتا رہے اور انسانیت کے منہ میں شہوت نفسانیہ کی لگام ڈال کر اسے جہنم رسید کر دے - جب بھی شیطان یہ اسکیم شروع کرتا ہے پیغمبروں کا قافلہ ایمان نمودار ہو جاتا ہے پیغمبر اور ان کے پیروکار انسانیت کے سامنے روشنی کے مینار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور انسانیت کے لئے جنت کی باد نسیم کے جھونکے کھل جاتے ہیں - یہ پروقار قافلہ جہنم کی گرم لو سے انہیں ڈرانے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے - اور شیطان رجیم کے وسوسوں سے اسے نجات دیتا ہے کیونکہ وہ انسانوں کا ازلی دشمن ہے -

یہ نہایت ہی خوبصورت منظر ہے - ایک طویل شاہراہ حیات پر حق و باطل کی گھمسان کی جنگ جاری ہے - حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ نہایت ہی پیچیدہ انداز میں گزر رہی ہے' اس لئے کہ انسان تو تاریخ بناتا ہے جو بذات خود ایک پیچیدہ مخلوق ہے - یہ دو عناصر سے بنا ہے ایک تو وہ خاکی مادہ ہے جس سے اس کا خمیر تیار ہوا اور دوسرا عنصر وہ روح ہے جو اس جسد خاکی کے اندر پھونکی گئی اور اس نفخ روح کی وجہ سے انسان' انسان کہلایا - اس طرح دو متضاد عناصر کا یہ اتحاد و ازدواج اللہ کے دست قدرت کے ذریعے تکمیل کو پہنچا - اس لئے حضرت انسان تاریخ میں بڑی پیچیدگی سے آگے بڑھتا ہے - اس کی ذات اور اس کے اعمال و نظریات بھی پیچیدہ ہیں - انسان اپنی اس مخصوص طبیعت اور مزاج کے ساتھ اس وسیع کائنات اور اس کے آفاق کے ساتھ تعلق کا ایک خاص زاویہ رکھتا ہے جس کی تفصیلات ہم نے قصہ آدم و ابلیس میں دے دی ہیں - یہ ایک طرح حقیقت الٰہیہ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اللہ کی تقدیر' اس کی مشیت' اللہ کی قدرت اس کی طاقت اور اس کے رحم و کرم کا موضوع بنتا ہے - وہ عالم بالا اور ملائکہ کے ساتھ بھی مربوط ہے - پھر وہ ابلیس اور شیطان اعظم کے ساتھ بھی معاملہ کرتا ہے - وہ اس قابل مشاہدہ کائنات اور اس کے قوانین فطرت کے ساتھ بھی ملحق ہے - وہ اس کرۂ ارض کی تمام چیزوں کے ساتھ بھی طرز عمل اختیار کرتا ہے اور دوسرے ہم جنس انسانوں کے ساتھ بھی اس کے روابط قائم ہوتے ہیں اور یوں وہ اپنی اس طبیعت کے ساتھ پورے عالم مشہود کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے - اس کائنات کی ہم آہنگ قوتوں کے ساتھ بھی اس کا واسطہ ہے اور اس کی مخالف اور متضاد قوتوں کے ساتھ بھی اس کا معاملہ ہے -

غرض تاریخ کے اس باہم متلاطم اور پیچیدہ سمندر میں انسانی تاریخ دنیا کا سفر طے کرتی ہے - کبھی اس کی ذات قوی نظر آتی ہے اور کبھی گم کردہ راہ - کبھی وہ متقی اور ہدایت یافتہ ہوتا ہے اور کبھی ضعیف ہوتا ہے کبھی وہ عالم غیب سے جڑ جاتا ہے

اور کبھی عالم مشاہدہ میں ہی گم رہتا ہے' کبھی وہ عالم مادیات میں سرگرم رہتا ہے' اور کبھی عالم روح اور دل کی دنیا میں پھرتا ہے لیکن آخر کار وہ اللہ کی تقدیر کے سامنے بے بس نظر آتا ہے۔ یہ سب رنگ اس کی تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ لہٰذا انسانی تاریخ کی تشریح صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ اس کے یہ متضاد عناصر ترکیبی پیش نظر رہیں۔

آج کل بعض لوگ انسانی تاریخ کی تشریح محض اقتصادی زاویہ سے کرتے ہیں۔ بعض اس کی تاریخ محض سیاسی زاویہ سے لکھتے ہیں' بعض لوگ اس کی تاریخ بیالوجی اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے لکھتے ہیں۔ بعض لوگ محض روح اور بعض دوسرے محض نفس اور بعض دوسرے محض عقل کے اعتبار سے تاریخ لکھتے ہیں۔ جو لوگ انسان کا مطالعہ محض ایک ہی زاویہ سے کرتے ہیں وہ انسان کے دوسرے متعدد پہلوؤں کو نظرانداز کر جاتے ہیں' یوں یہ مطالعہ نہایت ہی سطحی ہوتا ہے حالانکہ انسان کا ہمہ گیر مطالعہ ضروری ہے۔ اسی طرح اس کی تاریخ کی تشریح بھی ہمہ پہلو اور ہمہ جہت ہونا چاہئے۔ انسانیت کی تاریخ کی اسلامی تشریح ہی وہ ہمہ جہت تشریح ہے جس کا مؤرخ انسانیت کے وسیع سمندر میں گہرائی تک غوطے لگاتا ہے اور ہر حقیقت نکال لاتا ہے۔ اسلامی مؤرخ اس ہمہ گیر اور گہرے مطالعے کے بعد اس کے واقعات پر نظر ڈالتا ہے۔ (دیکھئے اسلامی تصور حیات کے بنیادی عناصر کی فصل حقیقت انسان)۔

یہاں ہم اب ایک عظیم تاریخی سمندر کے سامنے کھڑے ہیں۔ اس سے قبل ہم تخلیق انسانیت کے مناظر دیکھ چکے ہیں۔ اس منظر میں تمام جہانوں کا اکٹھ تھا۔ وہ تمام مخلوقات جمع تھی جس کے ساتھ انسان کا واسطہ پڑنا مقرر تھا۔ تمام آفاق اور تمام مخلوق و عناصر ظاہر تھے یا خفیہ' سب کے ساتھ حاضر مجلس تھے۔ اس محفل میں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ اس نئی مخلوق کی صلاحیت کیا ہے اور اس کی اساسی خصوصیات کیا ہیں۔ عالم بالا کی یہ مجلس اس کے اعزاز میں منعقد ہوئی ہے اور اس میں اسے آخری اعزاز ملا یعنی ملائکہ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اسے سجدہ کریں۔ اس وقت اللہ نے اعلان کیا کہ یہ ہے جدید مخلوق۔ پھر ہم نے اس منظر کی ایک دوسری جھلک بھی دیکھی جس میں اس کی کمزوری سامنے آئی اور وہ دشمن کے ہتھے چڑھ گیا۔ پھر کیا ہوا؟ وہ جو ہونا تھا کہ اسے زمین پر اتار دیا گیا اور اسے آزاد چھوڑ دیا گیا کہ وہ اس کرۂ ارض کے تمام عناصر کے ساتھ اپنے تعلقات کی نوعیت متعین کرے۔

ہم نے دیکھا کہ حضرت انسان اس کرۂ ارض پر بطور مومن اتر رہا ہے۔ وہ اپنی کوتاہی اور لغزش پر اللہ سے مغفرت طلب کر رہا ہے۔ اس سے عہد لیا جاتا ہے کہ وہ فرائض خلافت فی الارض پورے کرے گا اور اللہ کی جانب سے جو احکام آئیں گے ان کی پیروی کرے گا۔ شیطان یا نفسانی خواہشات کے تابع نہ ہو گا اور اس سلسلے میں اسے جنت سے نکلنے کا جو تجربہ ہوا اسے زاد راہ بنائے گا۔

اب صدیاں گزر گئی ہیں اور تاریخ کے ناپید اکنار سمندر کی متلاطم امواج کے تھپیڑوں نے اسے اچھا خاصا تجربہ کار بنا دیا ہے۔ اس پوری کائنات' اس کے ماحول اور اس میں باہم بر سرپیکار متضاد عوامل میں رہتے ہوئے اسے ایک عرصہ گزر گیا ہے۔ وہ اپنے ضمیر اور اپنے میلانات کے ساتھ بھی کشمکش میں رہا ہے۔ چنانچہ اس سبق میں حضرت انسان کی طویل تاریخ کی بعض جھلکیاں دکھائی جاتی ہیں کہ وہ کس طرح اس کرۂ ارض کے متضاد میلانات کی کشاکش میں زندگی بسر کرتا رہا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان بھول جاتا ہے۔ بارہا وہ اپنا سبق بھول گیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے بارہا کمزوریاں سرزد ہوتی رہیں اور ہوئیں۔ شیطان اس پر غالب آجاتا ہے اور بارہا ایسا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ بار بار اس کی راہنمائی کی جائے

اور اسے مصیبتوں سے نجات دلائی جائے۔

جب وہ اس کرۂ ارض پر اترا تو وہ توبہ کر چکا تھا' ہدایت یافتہ تھا اور عقیدۂ توحید پر قائم تھا۔ لیکن اگلے ہی منظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پھر گمراہ ہو گیا ہے 'مشرک بن گیا ہے اور اللہ پر افتراء باندھ رہا ہے۔ لیکن تاریخی امواج کے اس تلاطم میں اس کے لئے ایک نشان راہ اور ادارۂ رسالت کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ اسے بار بار اپنے رب کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے اور یہ اللہ کا عظیم رحم و کرم ہے کہ اس نے اسے بے سہارا نہیں چھوڑا۔

اس سورہ میں ہم قافلہ ایمان کے طویل سفر کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اس قافلے کی ہدایت کے لئے انبیاء و رسل نے ہدایت کے جھنڈے بلند کر رکھے ہیں۔ حضرت نوح' حضرت ہود' حضرت صالح' حضرت لوط' حضرت شعیب' حضرت موسیٰ ﷺ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسان کی ہدایت کے لئے تشریف لائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ حضرات اللہ کی ہدایات کے مطابق ہاتھ پکڑ پکڑ کر انسان کو اس راہ سے روکتے ہیں جس راہ پر چلا کر شیطان انہیں وارد جہنم کرنا چاہتا ہے۔ شیطان کے ساتھ اس کے مددگار بھی اس کام میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ وہ مستکبرین ہیں جو ہر زمانے میں اپنے آپ کو حق سے بالا سمجھتے رہے ہیں۔ پھر ہم ہدایت و ضلالت کے درمیان جو مسلسل کشمکش برپا ہے 'اس کی جھلکیاں بھی ان مناظر میں دیکھتے ہیں۔ ایک طرف حق ہے اور دوسری جانب باطل' حق کے لیڈر انبیاء رسل ہیں اور باطل کے لیڈر شیاطین جن و انس ہیں۔ اس سفر کے آخری مرحلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ جھٹلانے والے کس طرح مار کھاتے ہیں' ان کے لاشے ہر طرف بکھرے نظر آتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اہل ایمان کامیاب اور پر مسرت ہیں۔ یاد دہانی اور تذکیر کا یہ ایک طویل سلسلہ ہے جو اس سبق میں نظر آتا ہے۔

قرآن میں قصص کا بیان لازماً تاریخی ترتیب کے مطابق نہیں ہوتا' لیکن اس سورہ میں قصص کی تاریخی ترتیب کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے 'اس لئے کہ اس سورہ میں انسانیت کے طویل سفر کو بھی پیش نظر رکھنا مطلوب ہے۔ یہ بھی مطلوب ہے کہ نظر آئے کہ کس طرح اس طویل انسانی سفر میں انبیاء و رسل بار بار انسان کو ہدایت فراہم کرتے ہیں۔ جب بھی وہ راہ راست سے بھٹک جاتا ہے یہ لوگ اس کا ہاتھ پکڑتے ہیں۔ جب بھی شیطان نے انسانیت کی قیادت سنبھالی ہے اور اسے جہنم کی طرف لے چلنے کا حکم دیا ہے انبیاء و رسل نے اسے روکنے کی سعی کی ہے۔

اس سبق میں جو نشانات راہ دکھائے گئے ہیں ان کا خلاصہ ہم یوں پیش کرتے ہیں :

یہ کہ انسانیت کا آغاز ایک مومن ہدایت یافتہ اور عقیدۂ توحید پر ایمان رکھنے والے انسان کے ساتھ ہوا۔ بعد کے ادوار میں انسان بھٹک کر مشرکانہ عقائد کا حامل بن گیا۔ انسان کے بھٹکنے کا سبب وہ عوامل اور رجحانات و میلانات بنے جو اس کی ذات کے اندر اللہ نے ودیعت کئے تھے یا وہ عناصر اور اسباب اس کی گمراہی کا سبب بنے جو اس جہان میں پنہاں تھے۔ جب بھی انسان گمراہی میں مبتلا ہوا ایک رسول دنیا کی اسٹیج پر نمودار ہوا اور وہ وہی دعوت اس کے سامنے پیش کرنے لگا جس کا یہ گمراہ انسان اپنی گمراہی سے قبل ماننے والا اور اس کا حامل تھا۔ رسول کی دعوت آنے کے بعد لوگ ہمیشہ دو گرہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ نے ہلاکت کی راہ لی اور دوسرا گروہ از سر نو زندہ ہو گیا۔ زندہ وہ لوگ ہوئے جو راہ ہدایت کی طرف لوٹ آئے اور انہوں نے جان لیا کہ ان کا الٰہ' الٰہ واحد ہے اور وہ پوری طرح اس الٰہ واحد کے سامنے سر تسلیم خم کرنے لگے۔ انہوں نے اس رسول کی پکار کو سنا جو انہیں کہہ رہا تھا "اے میری قوم صرف اللہ کی بندگی کرو' حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا

تمہارا کوئی اور حاکم نہیں ہے۔“ پس یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس پر اللہ کا پورا دین قائم ہے اور انسان کی طویل تاریخ میں تمام رسولوں نے صرف اسی عقیدے کی طرف دعوت دی ہے۔ جو رسول بھی آیا' اس نے قوم کے سامنے یہی کلمہ پیش کیا۔ ایسے حالات میں جب اس کی قوم کو شیطان نے گمراہی کے جال میں پھنسا لیا تھا۔ وہ اصل عقیدے کو بھول گئے تھے اور گمراہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے اللہ کے ساتھ بے شمار شریک ٹھہرائے ہوئے تھے۔ مختلف جاہلیتوں کے اندر یہ شریک مختلف نوعیت کے تھے۔ ان بت پرستیوں کی اساس پر انسانی تاریخ میں حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی قائم رہی ہے اور اسی معرکہ آرائی کی اساس پر اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ جھٹلانے والوں کو پکڑا ہے اور ایمان لانے والوں کو نجات دی ہے۔ قرآن نے ان دعوتوں کو ایک ہی جیسے الفاظ میں منضبط کیا ہے حالانکہ انبیاء مختلف زبانوں میں دعوت دیتے چلے آئے تھے۔ انہوں نے مختلف ادوار اور مختلف زبانوں میں جو دعوت دی' قرآن نے اس کی تعبیر ان الفاظ میں کی ہے۔ ”اے قوم' صرف اللہ کی بندگی کرو' تمہارا اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے۔“ اس سے اس حقیقت کا اظہار مقصود تھا کہ پوری انسانی تاریخ میں دعوت اسلامی ایک ہی رہی ہے بلکہ اسے ایک جیسے الفاظ ہی میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ عبارت اور یہ الفاظ اس عقیدے کو پوری طرح اور جامع و مانع انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جس طرح سیاق کلام سے بھی اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ایک کے بعد ایک رسول اسٹیج پر آتا ہے اور وہی الفاظ دہراتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے اسلامی نظریہ حیات کے بیان کے لئے کیا منہاج اختیار کیا ہے؟

اس بات سے یہ حقیقت خود بخود سامنے آ جاتی ہے کہ جدید دور میں ادیان کا تقابلی مطالعہ کرنے والے مفکرین اور قرآن کے منہاج کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ قرآنی منہاج یہ ہے کہ رسول جو عقائد لے کر آئے ان کے اندر کوئی ترقی یا تغیر و تبدیلی نہیں ہوئی ہے' نہ ان عقائد کے اندر غور و فکر کے کوئی ابتدائی یا انسانی مدارج رہے ہیں۔ جو لوگ ادیان کے بنیادی عقائد کی ارتقائی اور تدریجی ارتقائی سوچ بیان کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اسلامی نظریات کو بھی ارتقائی شکل میں پڑھتے ہیں وہ ایسی بات کرتے ہیں جو اللہ نے قرآن کے اندر نہیں کی ہے۔ جس طرح قرآن کریم واضح طور پر اظہار کرتا ہے کہ انبیاء نے ہمیشہ ایک ہی دعوت دی ہے۔ قرآن اس دعوت کو ایک ہی عبارت میں بیان کرتا ہے یعنی ”اے قوم صرف اللہ کی بندگی کرو' حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا تمہارا کوئی اور حاکم نہیں ہے۔“

(اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷: ۶۰)) اور یہ الٰہ جس کی طرف تمام رسول دعوت دیتے رہے' وہ رب العالمین ہے اور لوگوں سے ایک عظیم دن حساب و کتاب لے گا۔ رسولوں میں سے کوئی ایک رسول بھی ایسا نہیں گزرا جس نے لوگوں کو اپنے قبیلے کی طرف دعوت دی ہو' یا کسی قوم یا کسی نسل کے رب کی طرف لوگوں کو بلایا ہو۔ نہ رسولوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا گزرا ہے جس نے دو الہوں کی طرف دعوت دی ہو یا متعدد الہوں کا پرچار کیا۔ رسولوں میں سے کسی رسول نے بھی سورج' چاند' ستاروں' ارواح یا بتوں کی پوجا اور غلامی کی طرف نہیں بلایا۔ اسی طرح اللہ کی جانب سے کوئی ایسا نظام وضع نہیں ہوا جس میں آخرت کا تصور نہ ہو' جس طرح بعض وہ لوگ کہتے ہیں جو اپنے آپ کو ماہرین ادیان کہتے ہیں اور جو دنیا کی مختلف جاہلیتوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ جن نتائج تک پہنچے ہیں وہی اس دنیا کے معروف ادیان تھے اور اس کے علاوہ کوئی اور دین ان ادوار میں نہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر پے درپے رسول آتے رہے اور انہوں نے صرف اور صرف عقیدۂ توحید اور

خالص توحید کا عقیدہ پیش کیا۔ انہوں نے یہ نظریہ دیا کہ صرف اللہ رب العالمین ہے' اور وہ لازماً قیامت کے دن سب سے حساب لے گا۔ لیکن ہر رسالت کے خاتمے کے بعد جاہلیت دوبارہ دنیا پر چھا گئی اور اس کے چھانے کے اسباب کچھ تو انسانوں کے اندر تھے اور کچھ وہ عوامل و دواعی تھے جو انسان کو فراہم کردہ ماحول میں نہایت ہی پیچیدہ شکل میں موجود تھے۔ یہ انحرافات مختلف تصورات، عقائد کی صورت میں سامنے آئے اور آج کل کے ماہرین ادیان درحقیقت اصل دین کو چھوڑ کر ان ہی منحرف ادیان کا مطالعہ کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے اخذ کردہ خطوط پر دنیا میں دین اور مذہب نے بتدریج ارتقائی سفر کے ذریعے موجودہ شکل اختیار کی ہے۔

بہرحال اللہ کا فرمان زیادہ قابل تقلید ہے' خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو دین کے موضوع پر لکھتے ہیں جو اسلام کے حق میں لکھتے ہیں اور اس کی جانب سے دفاع کرتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو سرے سے قرآن پر ایمان ہی نہیں لاتے تو ہم ان سے مخاطب ہی نہیں ہیں' اللہ بہرحال سچائی بیان کرتا ہے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

تمام رسول جب بھی وہ آئے تو انہوں نے سب سے پہلے اپنی قوم کو دعوت دی ہے۔ انہوں نے قوم میں دعوت اسلامی کا کام اس وقت شروع کیا ہے جب قوم صراط مستقیم اور اس عقیدے سے منحرف ہو گئی' جس پر سابقہ رسول نے انہیں چھوڑا تھا۔ چنانچہ پہلے انسان اہل توحید تھے اور وہ رب العالمین کو تسلیم کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ وہی تھا جو آدم ؑ اور ان کی بیوی کا تھا۔ اس کے بعد مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اور ان اسباب کی وجہ سے جن کا تذکرہ ہم نے کیا وہ اس عقیدے سے منحرف ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام تشریف لائے۔ انہوں نے لوگوں کو دوبارہ رب العالمین کے عقیدۂ توحید پر قائم ہونے کی دعوت دی۔ ان کی دعوت کے اختتام پر ایک عظیم طوفان آیا' اہل ایمان نے نجات پائی' اہل تکذیب کو طوفان میں غرق کر دیا گیا۔ اس کرۂ ارض پر اہل توحید نے قبضہ کیا اور اسے آباد کر دیا۔ دنیا کی اس تعمیر نو کی تعلیم ان کو حضرت نوح ؑ نے اپنی اولاد کے واسطے سے دی تھی۔ جب مزید وقت گزرا تو یہ لوگ پھر گمراہ ہو گئے اور اس کے بعد حضرت ہود تشریف لائے اور ان کی دعوت کے اختتام پر انہیں ایک سخت ہوائی طوفان نے آ لیا۔ یوں یہ قصہ اسی طرح آگے بڑھتا رہا اور تاریخ کا سفر جاری رہا۔

ان رسولوں میں سے ہر رسول اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا۔ اس نے یوں خطاب کیا "اے برادران قوم' صرف اللہ کی بندگی کرو' تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی اور الہٰ نہیں ہے۔" اور ہر رسول نے اپنی قوم سے کہا (اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ (۷: ۶۸) "میں تمہارے لئے ناصح امین ہوں۔"

ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کو اپنی عظیم ذمہ داریوں کا کس قدر شدید احساس تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کی قوم کے لوگ جس صورت حالات میں پھنسے ہوئے ہیں دنیا اور آخرت میں اس کا انجام کس قدر برا ہونے والا ہے۔ رسولوں کے دلوں میں شدید خواہش تھی کہ ان کی قوم ہدایت پائے اس لئے کہ وہ قوم میں سے تھے اور قوم ان سے تھی مگر اس وقت قوم کے سرداروں نے ان کی راہ روکی اور حکم حق کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اللہ رب العالمین کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان سرداروں نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ نظام زندگی صرف اللہ کا جاری ہو اور اس نظام میں صرف اللہ کی بندگی ہو۔ یہی وہ اساس ہے جس کے اوپر تمام رسالتوں کا مدار رہا اور اسی کے اوپر اللہ کے ہاں سے تمام ادیان استوار ہوئے۔ لیکن رسولوں نے تمام طاغوتی طاقتوں اور تمام سرداروں کے منہ پر کلمہ حق نہایت

ہی وضاحت اور صاف گوئی کے ساتھ بلند کیا اور ہر بار ان کی قوم دو نظریاتی دھڑوں میں تقسیم ہوئی۔ لوگوں کے درمیان قومیت اور رشتہ داری کے روابط کٹ گئے اور ان کی جگہ ایک نظریہ کی اساس پر اخوت استوار ہوگئی۔ جو لوگ ایک قوم کے افراد تھے وہ دو امتوں کی شکل اختیار کر گئے اور یوں نظر آنے لگے کہ ان کے درمیان نہ تو کوئی قرابت ہے اور نہ ہی متحدہ قومیت کا کوئی تعلق ہے۔ اس کشاکش کے بعد فتح آتی ہے اور اس کے ذریعے دونوں امتوں کے درمیان فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ امت ہدایت اور امت ضلالت کے درمیان جدائی کر دیتا ہے۔ اب جھٹلانے والے مستکبرین اور سردار پکڑے جاتے ہیں اور مطیع فرمان اور سرتسلیم خم کرنے والے نجات پاتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی قوم نظریاتی اعتبار سے بٹی نہ ہو اور اللہ کی جانب سے فتح آگئی ہو۔ ہمیشہ یہی ہوا کہ کوئی قوم نظریاتی اعتبار سے بٹ جاتی ہے اور پھر دونوں میں سے اہل حق فتح پاتے ہیں اہل اللہ' اللہ کی بندگی اور غلامی میں خالص ہو جاتے ہیں۔ وہ طاغوتی طاقتوں کے مقابلے میں صف آرا ہو جاتے ہیں اور خود اپنی قوم سے علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ وہ مشاہدہ ہے جو دعوت انبیاء کی تاریخ کے مطالعے کے دوران واضح طور پر نظر آتا ہے۔

ان تمام رسالتوں میں ایک بات پر فوکس کیا گیا ہے۔ یہ کہ تمام لوگ رب واحد کی بندگی اور غلامی اختیار کریں اس لئے کہ صرف اللہ رب العالمین ہی بندگی کا مستحق ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم بندگی اور اقتدار اعلیٰ کا حق دوسری تمام مخلوق سے لے کر رب العالمین کو دے دیں۔ انسانی زندگی کا کوئی پہلو بھی اس کے عقیدے کے بغیر اصلاح پذیر نہیں ہو سکتا۔ تمام رسالتوں کے اس مشترکہ اصول کے بیان کے بعد قرآن کریم نے ان رسالتوں کی دعوت کی تفصیلات نہیں دی ہیں اس لئے کہ تمام رسولوں کے ادیان کی تفصیلات اسی مرکزی اصول پر مبنی تھیں۔ کوئی بات اس عقیدے سے خارج نہ تھی۔ یہ اصول چونکہ نہایت ہی اہم اور اساسی تھا اس لئے قرآن کریم نے اس پر اس قدر زور دیا ہے کہ اسے علیحدہ بیان کیا ہے۔ جس طرح ہم نے سورہ انعام پر تبصرے میں کہا کہ تمام مکی قرآن کا اصل مبحث ہی یہی ہے' لیکن مدنی حصے میں بھی جہاں جہاں موقع آیا ہے اس کی مناسبت سے اس موضوع پر بات ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام ایک ٹھوس حقیقت ہے' ایک نظام ہے اور اس حقیقت کو پیش کرنے کے لئے ایک منہاج اور طریقہ کار ہے۔ اور منہاج اسلام دین اسلام سے کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہئے کہ وہ عظیم حقیقت کیا ہے جسے یہ دین لے کر دنیا میں آیا ہے؟ اسی طرح ہمیں دین اسلام کو سمجھنے کے لئے اور اس کے قیام کے لئے وہی منہاج اپنانا چاہئے جس میں اس حقیقت کو پیش کیا گیا ہے۔ اور اس منہاج کا خلاصہ یہ ہے کہ عقیدۂ توحید کو مکرر' مؤکد اور منفرد انداز میں پیش کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورہ میں اس منہاج کو بار بار' مؤکد سے مؤکد الفاظ میں اور نہایت ہی واضح اور سادہ اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ منہاج اس سورہ کے تمام قصص میں واضح ہے۔

اس سورہ میں جو قصص بیان ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کا مزاج کیا ہوتا ہے اور کفر کا مزاج کیا ہوتا ہے اور نفس انسانی پر دونوں کے اثرات کیا مرتب ہوتے ہیں۔ یہاں بتکرار بتایا جاتا ہے کہ جو قلوب ایمان کے لئے مستعد ہوتے ہیں وہ کس قسم کے ہوتے ہیں اور جو دل کفر اور انکار پر آمادہ ہوتے ہیں وہ کس قسم کے ہوتے ہیں؟ جن لوگوں نے رسولوں کی دعوت کو قبول کیا ان کے دلوں میں کبر و غرور نہ تھا اور وہ رسولوں کی دعوت کو قبول کرنے اور اس کے سامنے سرتسلیم خم کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ کرتے تھے۔ ان کو یہ بات انوکھی نہ لگتی تھی کہ اللہ ان میں سے ایک شخص کو

رسول بنا کر بھیج دے جو ان تک اس کا پیغام پہنچائے اور انہیں انجام بد سے خبردار کرے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے کسی بھی رسول کو ماننے سے انکار کیا، وہ ہمیشہ اس قسم کے لوگ رہے ہیں جنہوں نے گناہ کی راہ اس لئے اختیار کی کہ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے تھے اور صاحب مرتبہ لوگ تھے۔ انہوں نے اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے قیام کے بجائے خود اپنا اقتدار لوگوں پر مسلط کر دیا تھا اور کسی صورت میں بھی اس غاصبانہ اقتدار سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ نہ اس کے لئے تیار تھے کہ وہ خود اپنے ایک عام آدمی کی سمع و اطاعت کریں۔ یہی لوگ تھے جن کے لئے قرآن کریم "مَلَأُ" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یہ حکام، بڑے لوگ، صاحب قوت و اقتدار لوگ تھے اور یہیں سے اس دین کا اصل راز معلوم ہوتا ہے۔ یہ راز اللہ کا اقتدار اعلیٰ اور اللہ کی حاکمیت کے قیام کا مسئلہ ہے۔ یہ بڑے لوگ رسول کے ان الفاظ کے نتائج کو اچھی طرح سمجھتے تھے "اے برادران قوم! صرف اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا اور کوئی حاکم نہیں ہے۔" اور "میں تو رب العالمین کا فرستادہ ہوں۔" وہ سمجھتے تھے کہ اقتدار اور حاکمیت اللہ کی ہو جائے اور اللہ کا رسول یہ شخص ہو تو ظاہر ہے کہ ان کی تمام بڑائی ختم اور ان کے تمام اختیارات ازخود اس شخص کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں جو رب العالمین کا نمائندہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس دعوت کے لئے سد راہ بن گئے تھے اور نتیجۃً" ان لوگوں میں شامل ہو گئے تھے جو ہلاک ہونے والے تھے۔ یہ لوگ اس اقتدار اعلیٰ کے شیدائی ہو گئے تھے کہ ان کی آنے والی نسلیں بھی انہی کی راہ پر چلتی تھیں اور انہی کی طرح جہنم کی راہ پر پڑ گئی تھیں جس کا انجام ہلاکت کے سوا کچھ نہ تھا۔ غرض جھٹلانے والوں کی مقتل گاہوں کے جو نقشے ان قصص میں کھینچے گئے ہیں وہ اللہ رب العالمین کی اس سنت کے مطابق ہیں جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ لوگ اللہ کی آیات کو یکسر بھلا دیتے تھے اور اللہ کی راہ سے انحراف کر لیتے تھے۔ اللہ کی جانب سے رسولوں کے ذریعے ڈراوا آتا تھا اور وہ اللہ کی بندگی کے اقرار کو اپنے لئے ہتک سمجھتے تھے۔ وہ اپنی خوشحالی پر فخر کرتے اور مطالبہ کرتے کہ جلدی عذاب لاؤ۔ اس کے برعکس وہ رسول اور اہل ایمان کو دھمکیاں دیتے اور ایذا پہنچاتے، جس کے مقابلے میں اہل ایمان ثابت قدم رہتے اور اپنے نظریات پر جم جاتے۔ اس کے بعد پھر عذاب الٰہی آ جاتا۔ یہ ہے تاریخ انسانیت۔

سب سے آخری بات یہ ہے کہ باطل کی سرکش قوت کا مزاج ہی یہی ہے کہ وہ سچائی کے وجود ہی کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ سچائی اگر باطل کے مقابلے میں گوشہ نشین ہو کر حق و باطل کا فیصلہ اللہ پر چھوڑ دے تو بھی باطل اسے برداشت نہ کرے گا۔ بلکہ باطل اس کا پیچھا کرے گا اور اسے آخری حدوں تک بھگانے کی سعی کرے گا۔ اسے شکست دینے کی کوشش کرے گا۔ حضرت شعیب نے اپنی قوم سے کہا: "تم میں سے اگر ایک گروہ اس دعوت پر ایمان لایا ہے جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا ہے تو تم صبر کرو کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے، وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔" لیکن انہوں نے حضرت شعیب کی اس پیشکش کو قبول نہیں کیا اور وہ اس بات کو برداشت نہ کر سکے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے سچائی موجود ہو اور وہ پھلے پھولے۔ نہ کوئی باطل یہ برداشت کر سکتا ہے کہ کوئی ایسی جماعت میدان میں موجود رہے جو صرف اللہ کی بندگی کرتی ہو اور تمام طاغوتی طاقتوں کے اقتدار اعلیٰ کی منکر ہو۔" شعیب کی قوم سے ان لوگوں نے جو مستکبرین تھے، انہیں یہ کہا "اے شعیب ہمیں تو تم کو اور ان لوگوں کو جو تم پر ایمان لے آئے ہیں اپنے اس گاؤں سے نکالنا پڑے گا۔ یا تمہیں ہمارے نظام و ملت میں واپس آنا ہو گا۔" لیکن حضرت شعیب بھی ان کی اس تجویز کو صاف صاف رد کر دیتے ہیں۔ "انہوں نے کہا، تب بھی کہ ہم ایسا نہ چاہ رہے ہوں۔ اگر ہم تمہارے نظام اور ملت میں

واپس لوٹ آئیں گے تو ہم تو اللہ پر افتراء پردازی کر رہے ہوں گے جبکہ اس سے اللہ نے ہمیں نجات دے دی ہے۔"

یہ مکالمہ بتاتا ہے کہ اہل دعوت پر طاغوتی طاقتوں کے ساتھ یہ معرکہ آرائی فرض ہے اور انہیں اس کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔کوئی اٹکل اور کوئی حکمت حاملین دعوت اسلامی کو اس معرکے سے بچا نہیں سکتی اس لئے کہ طاغوتی طاقتیں تب آرام کریں گی جب وہ دعوت اسلامی کو اپنے نظریات سے منحرف کر لیں گی یہ قوتیں تب دم لیں گی جب تک داعیان حق واپس ان کی گمراہ ملت کی طرف لوٹ نہ آئیں گے حالانکہ اللہ نے ان کے دل سے یہ منحرف ملی نظریات نکال کر ان کے دل میں صرف اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے نظریات بٹھا دیئے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں قوتوں کے درمیان معرکہ آرائی لابدی ہے اور اس سے نہیں بچا جاسکتا۔جب معرکہ لابدی ہے تو پھر اس کی مشکلات کو برداشت کرنا بھی لابدی ہے۔اور یہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک فتح نصیب نہیں ہو جاتی اور جب تک وہ کشتیاں جلا کر شعیب علیہ السلام کا یہ نغمہ نہیں الاپتے۔"ہم نے اللہ پر بھروسہ کر لیا ہے۔اے اللہ اب تو ہی ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ فرما کیونکہ تو بہترین فیصلے کرنے والا ہے۔" (عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا (۷: ۸۹)) اب اللہ کی سنت چلتی ہے اور پوری انسانی تاریخ میں یہ چلتی رہی ہے۔ان قصص پر یہ تبصرہ کافی ہے۔اب آیات قرآن تفصیلات کے ساتھ۔

---O O O---

درس نمبر ۷۷ تشریح آیات

۵۹ --- تا --- ۹۳

انسانی تاریخ میں قافلہ انسانیت کے اس سفر کے بیان سے پہلے ' ایسے ہی ایک کائناتی مومن قافلے کا ذکر تھا' جو اس کائنات میں رواں دواں نظر آتا ہے۔ اس سے پہلے سبق کے آخر میں ایسے مومنین کا ذکر جو امر الہی سے ذرا بھی سرتابی نہیں کرتے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے۔

(اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۷:۵۴)) "درحقیقت تمہارا رب ہی ہے جس نے آسمان و زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا۔ جو رات کو دن پر ڈھانپ دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑتا چلا جاتا ہے۔ جس نے سورج چاند اور تارے پیدا کئے۔ سب اس کے فرمان کے تابع ہیں' خبردار رہو اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ رب العالمین۔" قرآن کریم میں بسااوقات اس حقیقت کو کہ یہ پوری کائنات اللہ کی مطیع فرمان ہے اور یہ حقیقت کہ تمام انسانوں پر اللہ کا امر جاری ہونا چاہئے ایک ساتھ لایا جاتا ہے۔ یعنی جس طرح وہ کائنات مطیع فرمان ہے جس میں انسان بستے ہیں اسی طرح انہیں بھی اللہ کا مطیع فرمان ہونا چاہیے۔ تمہارا اسلام اس طرح ہونا چاہئے جس طرح کا اس پوری کائنات کا ہے۔ اور جس کے قوانین میں وہ جکڑی ہوئی ہے۔ اس طرح اس پوری کائنات کے مسلم ہونے کے اثرات قلب مومن پر پڑتے ہیں' اسے خوب جھنجوڑتے ہیں اور اسے آمادہ کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی اطاعت کے لئے آمادہ ہو جائے اور یہ کہ اس کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کے اردگرد یہ پھیلی ہوئی کائنات تو اللہ کی مطیع فرمان ہو اور اس کائنات میں وہ اللہ وحدہ کے مقابلے میں سرکشی کرے۔

غرض رسولوں کی دعوت کوئی ایسی دعوت نہیں ہے جو انوکھی ہو' بلکہ وہ تو اس حقیقت کی طرف بلاتے ہیں جو اس پوری کائنات میں جاری و ساری ہے' اس پوری کائنات کے ضمیر میں رچی بسی ہے اور یہی حقیقت خود انسان کی فطرت کے اندر بھی موجود ہے۔ جب بھی انسان کی فطرت پر شہوات اور خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے یہ فطرت ضمیر کے اندر اسے پکارتی ہے اور اس طرح شیطان انسان کو گمراہ کر کے اس کی نکیل اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو اس سبق کے تمام قصوں میں مختلف پیرائیوں میں بیان کی گئی ہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ
إِلَٰهٍ غَيْرُهُۥٓ إِنِّيٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٥٩﴾ قَالَ الْمَلَأُ مِن
قَوْمِهِۦٓ إِنَّا لَنَرَىٰكَ فِي ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ ﴿٦٠﴾ قَالَ يَٰقَوْمِ لَيْسَ بِي ضَلَٰلَةٌ
وَلَٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَٰلَمِينَ ﴿٦١﴾ أُبَلِّغُكُمْ رِسَٰلَٰتِ رَبِّي وَأَنصَحُ لَكُمْ
وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦٢﴾ أَوَعَجِبْتُمْ أَن جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن
رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٦٣﴾ فَكَذَّبُوهُ
فَأَنجَيْنَٰهُ وَالَّذِينَ مَعَهُۥ فِي الْفُلْكِ وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِـَٔايَٰتِنَآ
إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا عَمِينَ ﴿٦٤﴾ ع ۸ ۶
۱۵

''ہم نے نوح علیہ السلام کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا ''اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ میں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔'' اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا: ''ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔'' نوح علیہ السلام نے کہا ''اے برادران قوم' میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں' تمہارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں ہے۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمہیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے؟'' مگر انہوں نے اس کو جھٹلایا۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں نجات دی اور ان لوگوں کو ڈبو دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا' یقیناً وہ اندھے لوگ تھے۔''

یہاں اس قصے کو نہایت ہی اختصار کے ساتھ لیا گیا ہے' جبکہ دوسرے مقامات پر جہاں تفصیلات کی ضرورت تھی اس کی تفصیلات بھی دی گئی ہیں۔ مثلاً سورہ ہود اور سورہ نوح میں' اس لئے کہ یہاں صرف ان نشانات راہ کی طرف اشارہ کرنا مطلوب تھا جن کے بارے میں ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ یعنی اسلامی نظریہ حیات کا مزاج کیا ہے اور اس کے پھیلانے اور دعوت اسلامی کا طریقہ تفہیم کیا ہے اور اس دعوت کے آغاز کے بعد لوگوں کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟ اس کے داعی کے جذبات کیا ہوتے ہیں۔ یہاں ہم صرف انہی نشانات راہ کی طرف اشارہ کریں گے جن کے لئے اس قصے کو یہاں لایا گیا ہے۔

(لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ (۷:۵۹)) "ہم نے نوح ﷺ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔" یہ اللہ کی سنت ہے کہ اللہ ہر قوم کی طرف رسول اس کی قوم سے بھیجتے ہیں۔ وہ ان سے ان کی زبان میں بات کرتا ہے۔ یہ رعایت اللہ نے ہر قوم کی تالیف قلب کے لئے دی ہے اور اس لئے دی ہے کہ ان کے لئے پیغام کو سمجھنا آسان ہو اور ان کا باہم تعارف ہو لیکن یہ سہولتیں بھی ان لوگوں کے لئے مفید ہوتی ہیں جن کی فطرت بگڑ نہ چکی ہو۔ رہے وہ لوگ جن کی فطرت بگڑی ہوئی ہوتی ہے انہیں یہ انتظام بھی عجیب لگتا ہے۔ وہ دعوت کو قبول نہیں کرتے اور اپنے آپ کو اس مقام سے اونچا سمجھتے ہیں کہ وہ ایمان لائیں اور اطاعت کریں' اس لئے وہ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ملائکہ اور فرشتے آکر انہیں تبلیغ کریں۔ یہ بات محض بہانہ سازی ہے۔ اگر فرشتے بھی آتے تب بھی یہ لوگ مان کر نہ دیتے۔ چاہے جو بھی طریقہ اختیار کیا جاتا وہ ماننے والے نہ تھے۔

حضرت نوح ﷺ کو جب رسول بنا کر بھیجا گیا تو انہوں نے دعوت کا آغاز انہی کلمات سے کیا جن کے ساتھ بعد میں آنے والے تمام رسولوں نے کیا۔ (فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ (۷:۵۹)) "اس نے کہا" اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔" یہ کلمات آخر تک نہیں بدلتے۔ یہ وہ اصولی قاعدہ ہے جس کے سوا اسلام متحقق نہیں ہو سکتا۔ یہ انسانی زندگی کا بنیادی پتھر ہے اور اس کے بغیر انسانیت کی عمارت کھڑی ہی نہیں ہو سکتی۔ یہی قاعدہ کلیہ اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ لوگوں کا نقطہ نظر ایک ہو' ان کے مقاصد ایک ہوں اور ان کے درمیان رابطہ ایک طرح کا ہو' یہی اصول ہے جس کے ذریعے کوئی انسان ہوا و ہوس کی غلامی سے آزاد ہو سکتا ہے اور خود اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے بھی آزاد ہو سکتا ہے۔ اسی کے ذریعے انسان بے پناہ انسانی خواہشات کو کنٹرول کر سکتا ہے اور انعام و سزا کو منضبط کر سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ اس کا اساسی قاعدہ یہ ہے کہ انسانوں کی پوری زندگی کے اندر اللہ کی حاکمیت اور بادشاہت کو قائم کیا جائے۔ یہی ہے مفہوم اس بات کا کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور یہی مفہوم ہے اس فقرے کا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ (حاکم) نہیں ہے۔ اللہ کی بادشاہت جس طرح کائنات کی تخلیق میں ہے' اس کی ربوبیت' تدبیر اور تقدیر میں ہے اور جس طرح یہ بادشاہت انسان کی تخلیق' ربوبیت اور اس کی تقدیر اس کے عناصر ترکیبی میں ہے اسی طرح یہ بادشاہت انسان کی عملی زندگی میں بھی قائم ہونا چاہیے اور اس کی عملی زندگی کو اللہ کی شریعت کے مطابق استوار ہونا چاہئے۔ مثلاً مراسم عبودیت میں' اور زندگی کے تمام دوسرے معاملات میں ابلوریکیج اللہ کی بندگی ہونا چاہئے۔ اگر ایسا نہ ہو گا تو پھر انسان شرک کا مرتکب ہو گا اور عملاً وہ اس بات کا قائل ہو گا کہ اللہ کے سوا کوئی اور حاکم بھی ہیں۔

حضرت نوح ﷺ نے اپنی قوم کے لوگوں سے یہ مختصر بات کی اور انہیں ان کے انجام بد سے ڈرایا۔ انہوں نے اس طرح نصیحت کی جس طرح ایک مشفق بھائی' بھائی کو کرتا ہے' اور جس طرح ایک مشفق سربراہ اپنی قوم اور خاندان کو کرتا ہے کہ اگر تم نے تکذیب کی تو انجام بہت ہی بھیانک ہو گا۔

(اِنِّیْ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۷:۵۹)) "میں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔" اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ترین دین' دین نوح میں بھی تصور آخرت اپنی مکمل شکل

میں موجود ہے - وہ فرماتے ہیں کہ میں یوم الحساب میں تمہارے برے انجام سے کانپ رہا ہوں - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی اور دینی عقائد کے بارے میں قرآن کا تصور کیا ہے اور ان نام نہاد ماہرین ادیان کا کیا تصور ہے جو تاریخ ادیان کو بھی ارتقائی انداز میں مرتب کرتے ہیں - یہ لوگ قرآنی منہاج سے بے خبر ہیں -

(قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۷: ۶۰)) "قوم کے سرداروں نے جواب دیا "ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔" یہی بات مشرکین عرب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہی تھی - انہ صباء "یہ کہ آپ بے دین ہو گئے ہیں۔" اور آپ نے دین ابراہیم سے روگردانی اختیار کر لی ہے - جب کوئی شخص گمراہی کی حد پار کر لیتا ہے تو وہ ان لوگوں کو گمراہ سمجھتا ہے جو اسے راہ ہدایت کی طرف بلاتے ہیں اور جب کسی کی فطرت مسخ ہو جاتی ہے تو وہ بھی خود سری کے اس مقام تک جا پہنچتا ہے - یوں اقدار بدل جاتی ہیں اور حق و باطل کے پرکھنے کا معیار بدل جاتا ہے - انسان نفسانی خواہشات کے تابع ہو جاتا ہے - الا یہ کہ انسان اللہ کی اقدار اور پیمانوں کو نہیں اپنا لیتا اس لئے کہ یہ اقدار اور پیمانے غیر متبدل ہوتے ہیں اور ان کے اندر کبھی انحراف نہیں ہوتا -

جو لوگ آج کے دور میں ہدایات اللہ سے لیتے ہیں' ان کو دور جدید کی جاہلیت گمراہ کہتی ہے اور جو شخص جاہلیت جدید سے ہدایت اخذ کرے ' مغربی تہذیب کے گندے نالے میں گر جائے اور اس کریہہ ماحول میں اتر آئے اسے وہ ہدایت یافتہ اور ترقی یافتہ کہتے ہیں -

آج جو عورت اپنے گوشت کو ننگا نہیں کرتی' اپنے جسم کو عریاں نہیں کرتی' اور جو اس پست حالت کو قبول نہیں کرتی اس کے بارے میں جدید جاہلیت کیا کہتی ہے؟ یہ دنیا جدید دور کی اس پاک و صاف اور صالح عورت کو رجعت پسند کہتی ہے اسے پسماندگی اور دیہاتی پن کا طعنہ دیا جاتا ہے اور جاہلیت جدید نے اپنے پورے ذرائع ابلاغ اور میڈیا کو اس مقصد کے لئے مصروف کر رکھا ہے کہ وہ ہماری عورت کی اس پاکیزگی' نظافت اور سربلندی کو ختم کر کے اسے جنسیت کے اس گندے تالاب میں گرا دے جو نہایت ہی کریہہ المنظر ہے -

جن لوگوں کی ترجیحات کھیل کود سے بلند ہیں' جو فلموں' سینماؤں اور ٹیلی ویژن کے جنون سے سربلند ہیں اور جو لوگ رقص و سرود اور جام و سبو کی فحاشیوں اور عیاشیوں سے اپنے آپ کو دور رکھنا چاہتے ہیں' یہ جاہلیت ان کے بارے میں کیا کہتی ہے؟ یہ کہتی ہے کہ یہ لوگ جامد اور کوڑ مغز ہیں' اپنے آپ میں گم' غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ ہیں - یہ جاہلیت ہر وقت اسی کام میں لگی ہوئی ہے کہ وہ تمام لوگوں کو اس گندگی میں ڈال دے اور لوگ سب کے سب عیاشی اور فحاشی میں زندگی بسر کریں - غرض جاہلیت ہر دور میں جاہلیت ہوتی ہے - وہ اشکال و ظروف تو بدلتی ہے مگر اس کی ماہیت وہی رہتی ہے -

حضرت نوح علیہ السلام ان کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ گمراہ نہیں ہیں - وہ ان کے سامنے اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی دعوت کیا ہے اور اس دعوت کا سرچشمہ کیا ہے؟ یہ کہ انہوں نے اپنی سوچ اور فکر سے اس دعوت کو نہیں شروع کیا نہ ان کی یہ ذاتی خواہش ہے - وہ تو رب العالمین کے رسول ہیں اور حامل رسالت ہیں - وہ نہایت ہی امانت و دیانت سے اللہ کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق نصیحت کرتے ہیں اور وہ جو تعلیمات دیتے ہیں وہ بھی رب العالمین کی طرف سے ہیں - یہ تعلیمات ان کے قلب پر اترتی ہیں اور یہ کہ ان کا رب العالمین کے ساتھ مسلسل رابطہ ہے جبکہ تم

لوگ اللہ کے ساتھ رابطہ نہیں رکھتے۔

(قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (٦١) اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (٦٢) (٧: ٦١-٦٢))

"نوح ؑ نے کہا "اے برادران قوم' میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں' تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں' تمہارا خیرخواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں ہے۔"
یہاں سیاق قصہ میں ایک کڑی غائب ہے' رسول کی اس دعوت پر انہوں نے گویا اس تعجب کا اظہار کر دیا کہ اللہ نے انسانوں میں سے ایک شخص کو رسول بناکر کس طرح بھیج دیا؟ اور یہ کہ کس طرح اللہ کا پیغام ایک شخص تک پہنچ جاتا ہے اور دوسرے لوگ اس پیغام کے آنے سے خبردار ہی نہیں ہوتے۔ واقعات کی اس کڑی کا اظہار آنے والی آیات سے ہوتا ہے۔

(اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (٧: ٦٣)) "کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمہیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ' اور تم پر رحم کیا جائے؟" اللہ کی جانب سے کسی ایک شخص کو پیغامبری کے لئے چن لینا اگرچہ تعجب خیز ہے لیکن حضرت انسان کی پوری شان ہی نرالی ہے۔ یہ تو جہانوں کے ساتھ معاملات کرتا ہے' ان سے مربوط ہے۔ دوسری جانب یہ اللہ کے ساتھ بھی جڑا ہوا ہے' کیونکہ اللہ نے خود اس کے جسم میں روح اور زندگی پھونکی ہے' لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی انسان کو رسول بناتا ہے اور اس کام کو اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کس کو اس منصب کے لئے منتخب کرے تو یہ انسان پھر اللہ سے براہ راست ہدایت اخذ کرتا ہے' اس لئے کہ اللہ نے اس کے جسم کے اندر یہ استعداد اور قابلیت رکھ دی ہوتی ہے۔ یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے انسان' انسان ہے اور اسی وجہ سے وہ خالق کائنات کے ہاں معزز اور مکرم ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح فرماتے ہیں "تاکہ وہ تمہیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور پھر تم پر رحم کیا جائے۔" رسول کا مشن یہ ہے کہ لوگوں کو ڈرایا جائے اور ان کے دل دہل جائیں اور وہ تقویٰ کے لئے آمادہ ہوں اور آخر کار رحمت خداوندی سے بہرہ ور ہوں۔ اس سے زیادہ حضرت نوح ؑ کا کوئی اور مقصد نہ تھا۔ یہی وہ بلند اور اعلیٰ نصب العین ہے جس کے لئے حضرت نوح ؑ کام کر رہے تھے۔

لیکن انسان کی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ جب وہ ایک معین حد سے گزر جائے تو وہ پھر غور و فکر اور سوچ سے کام نہیں لیتی اور اس کے لئے انذار اور نصیحت آموزی نفع بخش نہیں رہتی۔

(فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ (٧: ٦٤)) "مگر انہوں نے اس کو جھٹلا دیا۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو

ایک کشتی میں نجات دی اور ان لوگوں کو ڈبو دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا' یقیناً وہ اندھے لوگ تھے ۔"

ہم نے دیکھا کہ انہوں نے مخلصانہ نصیحت اور حقیقی خطرے سے ڈراوے کو قبول نہ کیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں ۔ اسی وجہ سے انہوں نے تکذیب کی اور اسی وجہ سے وہ اس انجام تک پہنچے جس کا ذکر قرآن کر رہا ہے ۔

---o o o---

اب تاریخ کی گاڑی ذرا اور آگے بڑھتی ہے اور قرآن اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے ۔ ہم اب حضرت ہود کی قوم عاد کے سامنے ہیں ۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ
الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۶﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۷﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿۶۸﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ
جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ؕ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ
خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ
اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَ نَذَرَ مَا كَانَ
يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ
عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ
وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۷۱﴾
فَاَنْجَيْنٰهُ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا
۹
۸ ع وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾
16

"اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا ۔ اس نے کہا "اے برادران قوم ' اللہ کی بندگی کرو ' اس کے سوا

تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز کرو گے؟" اس کی قوم کے سرداروں نے' جو اس کی بات ماننے سے انکار کر رہے تھے' جواب میں کہا "ہم تو تمہیں بے عقلی میں مبتلا سمجھتے تھے اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو۔" اس نے کہا "اے برادران قوم' میں بے عقلی میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں' تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں' اور تمہارا ایسا خیرخواہ ہوں جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ وہ تمہیں خبردار کرے؟ بھول نہ جاؤ کہ تمہارے رب نے نوح علیہ السلام کی قوم کے بعد تم کو اس کا جانشین بنایا اور تمہیں خوب تنومند کیا' پس اللہ کی قدرت کے کرشموں کو یاد رکھو' امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔" انہوں نے جواب دیا "کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ ہی کی عبادت کریں اور انہیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں؟ اچھا تو لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو سچا ہے۔" اس نے کہا "تمہارے رب کی پھٹکار تم پر پڑ گئی اور اس کا غضب ٹوٹ پڑا۔ کیا تم مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں' جن کے لئے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ اچھا تو تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔" آخر کار ہم نے اپنی مہربانی سے ہود اور اس کے ساتھیوں کو بچا لیا اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جو ہماری آیات کو جھٹلا چکے تھے اور ایمان لانے والے نہ تھے۔"

یہ وہی رسالت اور وہی پیغام بری ہے۔ وہی معاملہ اور وہی انجام ہے۔ وہی سنت الٰہیہ ہے جو جاری و ساری ہے اور وہی قانون الٰہی ہے جس کے مطابق یہ کائنات قائم ہے۔ ایک ہی قانون ہے اور ایک ہی ضابطہ ہے۔

قوم عاد حضرت نوح کی اولاد میں سے ہے' یا ان لوگوں کی اولاد میں سے ہے جو آپ کے ساتھ کشتی میں سوار تھے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ ان کی تعداد تیرہ تھی' ظاہر ہے کہ یہ سب لوگ دین نوح علیہ السلام کے پیرو تھے اور نوح علیہ السلام کا دین' دین اسلام تھا۔ یہ صرف اللہ وحدہ کو پکارتے تھے اور وہ اللہ کے سوا اپنے لئے کسی اور کو الٰہ نہ بناتے تھے' ان کا عقیدہ یہی تھا کہ اللہ ہی رب العالمین ہے' اور حضرت نوح نے انہیں یہی تعلیم دی تھی۔ وَلٰكِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۷: ۶۷) "میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں۔" لیکن جب طویل زمانہ گزر گیا اور یہ لوگ زمین کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے تو شیطان نے انہیں اچھی طرح گمراہ کر دیا اور انہیں اپنی خواہشات اور شہوات کے مطیع بنا دیا اور انسان کی سب سے بڑی خواہش ملکیت اور ساز و سامان کی خواہش ہوتی ہے۔ اور یہ مال و دولت اور ساز و سامان وہ شریعت کے قانون کے علی الرغم جمع کرتے ہیں' تو اس وجہ سے حضرت ہود کی قوم عاد نے اس دعوت کو بہت ہی ناپسندیدہ سمجھا کہ وہ اب صرف اللہ کی بندگی اور اطاعت کریں۔

(وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ

(۷: ۶۵)) "اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کرو گے۔"

اور یہ وہی بات ہے جو اس سے قبل حضرت نوح نے کہی تھی' اور جس پر قوم نوح نے ان کی تکذیب کی تھی اور اس کے نتیجے میں ان پر جو عذاب آیا وہ معلوم ہے۔ حضرت نوح کے بعد اللہ تعالیٰ نے قوم عاد کو [illegible] اپنا خلیفہ بنایا تھا۔ یہاں

قرآن کریم نے قوم عاد کے مسکن کی نشاندہی نہیں فرمائی لیکن دوسری سورتوں میں یہ تصریح آئی ہے کہ یہ احقاف میں تھے۔ یہ یمامہ اور حضرموت کے درمیان بڑے بڑے ٹیلے ہیں۔ غرض یہ لوگ اسی راہ پر چل نکلے جس پر اس سے قبل قوم نوح چل رہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے نہ تو نصیحت پر کان دھرا اور نہ ہی واقعات نوح سے عبرت پکڑی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ہود اپنے خطاب میں مزید یہ بھی کہتے ہیں کیا تمہیں اللہ کا خوف نہیں ہے؟ یہ ان کے رویے پر نکیر ہے' اور انہیں اس خوفناک انجام بد سے ڈرایا جارہا ہے۔

غرض اس قوم کے سرداروں کو یہ بات بہت ہی ناگوار گزری کہ ان میں سے ایک عام آدمی اٹھ کر انہیں ڈرائے اور یہ بتائے کہ وہ خدا سے نہیں ڈرتے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ یہ شخص نہایت ہی احمق اور سفیہ ہے' اپنی حدود سے آگے بڑھ رہا ہے اور ہمارے مقام و منصب کا صحیح خیال نہیں رکھ رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے نبی کی طرف یہ باتیں منسوب کیں کہ وہ احمق اور جھوٹے ہیں اور اس قسم کے الزام لگانے میں انہوں نے ذرہ بھر شرم محسوس نہ کی۔

(قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ

(۷: ۶۶)) "اس کی قوم کے سرداروں نے' جو اس کی بات ماننے سے انکار کر رہے تھے' جواب میں کہا "ہم تو تمہیں بے عقلی میں مبتلا سمجھتے ہیں اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو۔" یہ تھا ان اکابرین کا جواب جو محض ایک مذاق تھا اور تدبر اور دلیل سے خالی تھا۔ حضرت کا جواب یہ تھا:

(قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۶۷) اُبَلِّغُكُمْ

رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ (۶۸) (۷: ۶۷ - ۶۸)) "اس نے کہا "اے برادران قوم' میں بے عقلی میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں' تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں' اور تمہارا ایسا خیرخواہ ہوں جس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔" آپ نے بڑی سچائی اور سنجیدگی سے اس بات کی نفی کی کہ وہ بے وقوف یا سفیہ ہیں۔ اسی طرح آپ نے اس بات کی نفی بھی کی کہ آپ گمراہ ہیں' اس لئے کہ حضرت نوح کی طرح آپ نے بھی انہیں بتا دیا تھا کہ ان کے پیغام کا سرچشمہ کیا ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟ یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ ناصح امین ہیں اور یہ بات انہوں نے نہایت ہی درد بھرے لہجے میں ان سے کہی' نہایت ہی سچائی اور صفائی کے ساتھ۔

یہاں یہ بات لازمی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ حضرت ہود ؑ کی قوم نے آپ کے نظریات پر تعجب کیا' جس طرح اس سے قبل حضرت نوح ؑ کی قوم نے تعجب کیا تھا کہ کس طرح اللہ عام انسانوں میں سے کسی کو نبی چن سکتا ہے اور رسول بنا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت ہود ؑ بھی وہی بات دہراتے ہیں جو حضرت نوح ؑ نے کی تھی۔ یوں نظر آتا ہے کہ ان دونوں شخصیتوں کی روح ایک ہے' صرف اجسام میں اختلاف ہے۔

(اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِیُنْذِرَكُمْ (۷: ۶۹))

"کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ وہ تمہیں خبردار کرے؟" اس کے بعد وہ ان کو اس صورت حال کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو ان کی واقعی صورت حال سے واضح تھی کہ اللہ نے قوم نوح کے بعد ان کو خلافت فی الارض کا منصب عطا فرمایا تھا' ان کو جسمانی قوت دی تھی اور پہاڑوں میں بسنے والوں کی طرح وہ جسمانی توانائی رکھتے تھے نیز سیاسی اور سماجی اعتبار سے بھی ان کو زمین میں اقتدار دیا گیا تھا۔

(وَاذْكُرُوْا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْۜطَةً

فَاذْكُرُوْا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۷:۶۹)) "بھول نہ جاؤ کہ تمہارے رب نے نوح کی قوم کے بعد تم کو اس کا جانشین بنایا اور تمہیں خوب تنومند کیا' پس اللہ کی قدرت کے کرشموں کو یاد رکھو' امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔" انہیں زمین میں جو اقتدار اعلیٰ عطا کیا گیا تھا اور جو جسمانی توانائی عطا ہوئی تھی اس کی وجہ سے ان کا فرض یہ تھا کہ وہ ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے اور اللہ کی پکڑ سے ڈرتے اور اس برے انجام سے خوف کھاتے جو ان سے پہلے آنے والی اقوام کا ہوا۔ اس لئے کہ انہوں نے اللہ سے ایسا کوئی عہد تو نہیں کیا تھا کہ اللہ کی سنت کا اجراء ان پر نہ ہو گا۔ کیونکہ اللہ کی ناقابل تغیر سنت میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی ہے اور وہ اس کائنات میں اللہ کے جاری کردہ ضابطے کے مطابق چلتی رہتی ہے۔ نعمتوں کے ذکر سے یہ اشارہ کرنا مطلوب ہے کہ ان پر اللہ کا شکر ادا کیا جائے اور شکر ادا کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان نعمتوں کے اسباب کو قائم و دائم رکھا جائے کیونکہ دنیا و آخرت کی کامیابی اسی میں ہوتی ہے۔

لیکن جب انسان کی فطرت میں فساد اور انحراف پیدا ہو جاتا ہے تو پھر وہ غور و فکر اور تدبر سے کام نہیں لیتا' چنانچہ یہ دعوت سن کر وہ آمادۂ انکار و سرکشی ہو گئے اور برے طرز عمل کو اپنانے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے اب بات کو کاٹ کر مکالمہ ہی بند کر دیا اور جلد ہی نزول عذاب چاہنے لگے' ان کے لئے نصیحت بوجھل بن گئی اور ڈراوے کے ساتھ وہ مذاق کرنے لگے۔

(قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ

مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۷:۷۰)) "انہوں نے جواب دیا "کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ ہی کی عبادت کریں اور انہیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں؟ اچھا تو لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے۔ اگر تو سچا ہے۔" یہ روایات اور ان کے موجودہ حالات کی ذلت آمیز غلامی کی ایک تصویر ہے۔ انسان کے دل و دماغ حالات کے اسیر ہیں۔ یہ ایسی غلامی اور قید ہے جس میں انسان سے اس کے اعلیٰ ترین خصائص گم ہو جاتے ہیں۔ وہ آزادانہ غور و فکر سے محروم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ لوگ بھی آزادی رائے اور آزادی اعتقاد کے حق سے محروم ہو گئے۔ نظر آتا ہے کہ یہ لوگ اپنی عادات و رسومات کے غلام ہیں۔ تقلید آباء ان پر حکمران ہے اور ذاتی خواہشات اور شہوات نفسانیہ کے وہ اسیر ہیں اور ان لوگوں نے اپنے اوپر علم و معرفت اور روشنی کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں۔

ان کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ وہ سچائی سے فرار اختیار کرنے کے لئے خودکشی پر آمادہ ہیں اور عذاب کو جلدی سے دیکھنا

چاہتے ہیں۔ وہ یہ سوچتا ہی نہیں چاہتے کہ وہ کس قدر حماقت میں مبتلا ہیں اور جہالت کے اسیر ہیں۔ چنانچہ اپنے ناصح اور امین نبی کو کہتے ہیں "اگر تم سچے ہو تو وہ عذاب لے آؤ جس سے ہمیں ڈراتے ہو؟" اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت ہی جلد انہیں اپنے رسول کی طرف سے دوٹوک جواب دلواتے ہیں۔ :

(قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ اَتُجَادِلُوْنَنِیْ فِیْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (۷ : ۷۱)) "اس نے کہا "تمہارے رب کی پھٹکار تم پر پڑ گئی اور اس کا غضب ٹوٹ پڑا۔ کیا تم مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں' جن کے لئے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ اچھا تو تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔" حضرت ہود ؑ نے انہیں اس انجام بد سے خبردار کر دیا جس کی اطلاع انہیں ان کے رب نے دی تھی اور جس کا فیصلہ ان کے بارے میں ہو چکا تھا اور اب وہ عذاب ٹلنے والا نہ تھا۔ یہ اللہ کا غضب تھا اور اللہ کا غضب جس پر آ جائے وہ کبھی ٹلتا نہیں۔ پھر کہا کہ تم تو جلدی عذاب چاہتے ہو لیکن اپنے معتقدات پر غور نہیں کرتے کہ وہ کس قدر بودے تصورات ہیں لیکن عذاب جلدی چاہتے ہو۔ "کیا تم مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں جن کے لئے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔"

تم نے اللہ کے ساتھ جو شریک ٹھہرائے ہوئے ہیں وہ تو محض نام ہی نام ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور یہ نام تم نے اور تمہارے باپ دادا نے از خود گھڑ لئے ہیں۔ محض اپنی طرف سے' اللہ کی طرف سے اس پر تو کوئی سند نازل نہیں ہوئی۔ نہ اللہ نے اس کی اجازت دی اور نہ تمہارے پاس کوئی دلیل و برہان ہے۔

قرآن کریم اس ضمن میں بار بار یہ کہتا ہے کہ "جس کے لئے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے"۔ یہ تعبیر ایک عظیم حقیقت کا اظہار کر رہی ہے۔ یعنی ہر وہ بات' ہر وہ قانون' ہر وہ رواج غرض ہر وہ فکر و تصور جس کی پشت پر اللہ کی جانب سے کوئی برہان نہ ہو' وہ بے حقیقت' ہلکا' بے اثر' زائل ہونے والا اور کالعدم ہے اور انسانی فطرت ایسی چیز کو ہلکا تصور کرتی ہے۔ لیکن جب کوئی بات منجانب اللہ ہوتی ہے تو وہ بھاری' نافذ العمل اور گہری ہوتی ہے اس لئے کہ اس کی پشت پر اللہ کی دلیل ہوتی ہے۔

دنیا میں ہم نہایت ہی زرق و برق الفاظ سنتے ہیں' بے شمار مذاہب و نظریات پڑھتے ہیں' بے شمار کھوٹے اور بے حقیقت تصورات دیکھتے ہیں اور بے شمار رسومات اور عادات کو دیکھتے ہیں۔ جنہیں دنیا والوں کے لئے مزید مستحکم کیا جاتا ہے لیکن جب اللہ کا کلمہ آتا ہے تو یہ تمام چیزیں برف کی طرح پگھل جاتی ہیں اس لئے کہ اللہ کے کلمے کے اندر ایسی قوت و حرارت ہوتی ہے کہ اس کی تپش تو یہ چیزیں برداشت ہی نہیں کر سکتیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ہود نہایت ہی اہتمام' وثوق' اطمینان اور چیلنج کے انداز میں جواب دیتے ہیں۔ "اچھا تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔"

جو لوگ بھی اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں' ان کے اندر یہ اطمینان اور قوت ہوتی ہے' انہیں یقین ہوتا ہے کہ باطل

کمزور' ہلکا اور بے وزن ہوتا ہے۔ اگرچہ بظاہر وہ پھولا ہوا نظر آئے' اگرچہ بہت عظیم نظر آئے۔ داعی کو یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کی پشت پر سچائی کی قوت ہے اور اس کو تائید ایزدی حاصل ہے۔ چنانچہ مزید انتظار کئے بغیر کہا جاتا ہے۔

(فَأَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۷: ۷۲)) "آخر کار ہم نے اپنی مہربانی سے ہود اور اس کے ساتھیوں کو بچالیا اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جو ہماری آیات کو جھٹلا چکے تھے اور ایمان لانے والے نہ تھے۔" یہ ہے وہ حقیقت جس سے کوئی بھی بھاگ نہیں سکتا۔ کہا گیا کہ ہم نے ان کی جڑ کاٹ دی۔ (دابر) عربی میں اس آخری شخص کو کہا جاتا ہے جو قافلے کے آخری سرے میں ہوتا ہے۔ غرض جھٹلانے والوں کی تاریخ کا یہ دوسرا صفحہ بھی اب الٹ دیا جاتا ہے اور ایک بار پھر تاریخ دیکھتی ہے کہ جن لوگوں نے نصیحت سے استفادہ نہ کیا ان کا انجام کیا ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی ہلاکت کی وہ تفصیلات یہاں نہیں دی گئیں جو قرآن کریم نے دوسرے مقامات پر دی ہیں' لہذا ہم بھی اس سرسری نظر میں قرآن کے انداز کا اتباع کرتے ہوئے یہاں ہی رک جاتے ہیں اور مزید تفصیلات وہیں دیں گے جہاں اس قصے کی دوسری تفصیلات دی گئی ہیں۔

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَٰلِحًا ۗ قَالَ يَٰقَوْمِ اعْبُدُوا
اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ هَٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ
لَكُمْ آيَةً ۖ فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ ۖ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ
عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٧٣﴾ وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِي
الْأَرْضِ تَتَّخِذُونَ مِن سُهُولِهَا قُصُورًا وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا ۖ فَاذْكُرُوا
آلَاءَ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٧٤﴾ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا
مِن قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَٰلِحًا
مُّرْسَلٌ مِّن رَّبِّهِ ۚ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿٧٥﴾ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا
إِنَّا بِالَّذِي آمَنتُم بِهِ كَافِرُونَ ﴿٧٦﴾ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَ

قَالُوْا یٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۷۷﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ ﴿۷۹﴾

"اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے برادران قوم، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی کھلی دلیل آگئی ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے ایک نشانی کے طور پر ہے، لہٰذا اسے چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں چرتی پھرے۔ اس کو کسی برے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ ایک دردناک عذاب تمہیں آلے گا۔ یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اس کے ہموار میدانوں میں عالیشان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو۔ پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔"

اس کی قوم کے سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے کمزور طبقہ کے ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے کہا "کیا واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح علیہ السلام اپنے رب کا پیغمبر ہے؟" انہوں نے جواب دیا "بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے اسے ہم مانتے ہیں۔" ان بڑائی کے مدعیوں نے کہا "جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اس کے منکر ہیں۔"

پھر انہوں نے اونٹنی کو مار ڈالا اور پورے تمرد کے ساتھ اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کر گزرے اور صالح سے کہہ دیا کہ "لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو واقعی پیغمبروں میں سے ہے۔" آخر کار ایک دہلا دینے والی آفت نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔ اور صالح یہ کہتا ہوا ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ "اے میری قوم، میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں نے تیری بہت خیر خواہی کی مگر میں کیا کروں کہ تجھے اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں ہیں۔"

قصہ انسانیت کی کتاب کا اب ایک اور صفحہ الٹا جاتا ہے۔ اس صفحہ میں تاریخ کے ناپیدار کنار سمندر کی گہرائیوں کی ایک عظیم لہر اٹھی ہے۔ انسانیت کی کشتی ایک بار پھر منحرف ہو کر پیچھے چلی گئی ہے اور اب وہ مکمل جاہلیت کے چنگل میں ہے۔ حق و باطل کے درمیان کشمکش کا ایک نیا منظر سامنے ہے اور مکذبین اور جھٹلانے والوں کی ایک نئی قتل گاہ منظر پر آنے والی ہے۔

(وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ

(۷۳:۷)) "اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے برادران قوم، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔" یہ وہی کلمہ ہے جس سے اس جہان کا آغاز ہوا اور اسی پر اس کا اختتام ہو گا۔ اعتقاد، طرز عمل اور نقطہ نظر کی وہی سمت ہے جو دعوت و تبلیغ میں اختیار کی جا رہی ہے۔ وہی انداز کلام و گفتگو ہے جو روز اول سے جاری ہے۔ تمام انبیاء کے ہاں یہی طرز تبلیغ ہے۔

ہاں یہاں ایک عنصر کا اضافہ ہے۔ حضرت صالح کی دعوت کی پشت پر اب استدلال کے ساتھ ساتھ ایک معجزہ بھی نظر آتا ہے اور یہ معجزہ خود قوم ثمود کے مطالبے کے نتیجے میں اللہ کی قدرت کاملہ کا مظہر ہے اور حضرت صالح کی دعوت کی تصدیق و تائید کے لئے ہے۔

(قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً (۷:۷۳)) "تمہارے پاس تمہارے رب کی کھلی دلیل آگئی ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے ایک نشانی کے طور پر ہے۔" یہاں سیاق کلام سے اصل مطلوب یہ ہے کہ دعوت اسلامی اپنے اصولوں کے اعتبار سے ایک ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس پر جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا انجام کیا ہوتا ہے اور جو لوگ انکار کرتے ہیں اور اس دعوت کو جھٹلاتے ہیں ان کا حشر کیا ہوتا ہے۔ اس لئے قصوں کی اہم اہم جھلکیاں دی گئی ہیں۔ یہاں یہ تفصیل اس لئے نہیں دی گئی کہ انہوں نے اس طرح معجزے کا مطالبہ کیا اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے انہیں معجزہ دکھایا بلکہ صرف یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ان کو دعوت دی گئی اور اس کے بعد معجزہ دکھایا گیا۔ ناقہ کے بارے میں بھی صرف اسی قدر کہا گیا کہ وہ اللہ کی جانب سے ایک نشانی تھی۔ یہ اللہ کی ناقہ تھی اور ایک معجزہ تھی۔ اس انداز کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک غیر معمولی ناقہ تھی یا اس ناقے کی پیدائش معجزانہ انداز میں ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ اللہ کی نشانی کہلائی۔ یہی وجہ ہے کہ اسے "اللہ کی اونٹنی" کے الفاظ سے پکارا گیا اور وہ نشانی تھی اس بات کی کہ حضرت صالح کی نبوت برحق ہے۔ اس ناقہ کے بارے میں بس ہم اتنی ہی معلومات پر اکتفا کرتے ہیں جو یقینی ہیں اور اس قدر اشارات ہی ان روایات سے بہتر ہیں جو یقینی نہیں ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔

(فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

(۷:۷۳)) "لہٰذا اسے چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں چرتی پھرے۔ اس کو کسی برے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ ایک دردناک عذاب تمہیں آلے گا۔" یہ اللہ کی ناقہ ہے اور اسے اللہ کی زمین میں آزادانہ چرنے دو اور اگر تم نے اسے برے ارادے سے چھوا بھی تو تم پر عذاب الٰہی نازل ہو گا۔

یہ معجزہ پیش کرنے اور اس نشانی کے بارے میں خبردار کرنے کے بعد حضرت صالح قوم کو نصیحت اور یاد دہانی شروع کر دیتے ہیں اور انہیں مشورہ دیتے ہیں کہ ان کی دعوت پر غور کرو اور ذرا انسانی تاریخ پر بھی نگاہ ڈالو۔ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے دوسری اقوام کو ہلاک کر کے تمہیں مواقع دیئے ہیں۔

(وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِی الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ

مُفْسِدِيْنَ (۷:۷۴)) "یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اس کے ہموار میدانوں میں عالیشان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں

تراشتے ہو۔ پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔" یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ قوم ثمود کا مسکن کہاں تھا؟ لیکن دوسری سورہ میں ہے کہ یہ الحجر میں رہتے تھے' جو حجاز اور شام کے درمیان کا علاقہ ہے' حضرت صالح ان کو یاد دلاتے ہیں کہ ذرا دیکھو کہ اللہ نے تم پر کس قدر انعام کیا ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین پر نہایت ہی ترقی یافتہ اور سیاسی اعتبار سے ایک قوت تھے۔ ان کے جغرافیہ کی طرف جو اشارہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں پہاڑ بھی تھے اور ہموار علاقے بھی تھے۔ وہ ہموار علاقوں میں عالیشان محل بناتے تھے اور پہاڑوں کو بھی تراش کر مکانات بناتے تھے۔ گویا اس مختصر آیت میں ان کی تہذیب اور ان کے تمدن کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ حضرت صالح یہ بھی بتاتے ہیں کہ عاد کے بعد قوم ثمود کو عروج حاصل ہوا۔ اگرچہ یہ لوگ قوم عاد کی سرزمین میں نہ رہتے تھے۔ ہاں یہ حقیقت واضح ہے کہ وہ عاد کی تہذیب کے بعد نمودار ہونے والی تہذیب کے حامل تھے اور حجر سے باہر بھی دور دراز علاقوں تک ان کی مملکت پھیلی ہوئی تھی۔ اس طرح وہ خلیفۃ اللہ فی الارض کے منصب پر فائز تھے اس لئے حضرت صالح ان کو نصیحت کرتے ہیں کہ تمہارا کام فساد فی الارض نہیں ہے اور تمہیں اپنی شان و شوکت پر غرور نہیں کرنا چاہئے۔ تمہیں چاہیے کہ ذرا پچھلی اقوام کے انجام کو نگاہ میں رکھو۔

یہاں سیاق قصہ میں ایک دوسرا خلا بھی ہے جس کا ذکر نہیں ہوا' یہ کہ حضرت صالح کی دعوت کو بعض لوگوں نے قبول کر لیا اور یہ مطیع فرمان لوگ تھے اور بعض لوگوں نے تکبر کر کے اسے رد کر دیا۔ کسی علاقے کے بااثر لوگ ہمیشہ دعوت اسلامی کو سب سے آخر میں قبول کرتے ہیں کیونکہ اس دعوت کا منشا یہ ہوتا ہے کہ تمام لوگ اپنی بڑائیاں اور خدائیاں چھوڑ کر صرف اللہ واحد کو بڑا اور بادشاہ تسلیم کر لیں جو رب العالمین ہے۔ اس سے قبل یہ بڑے لوگ ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ جن ضعفاء نے اپنی گردنوں سے طاغوت کی غلامی کا جوا اتار پھینکا ہے اور اللہ کے سوا تمام غلامیوں سے آزاد ہو گئے ہیں ان پر تشدد کریں ...... چنانچہ حضرت صالح کی قوم کے بڑے اور بااثر لوگ ان ضعفاء پر تشدد کرتے ہیں جو ایمان لائے ہیں اور ان کے لئے قسم قسم کا فتنہ و فساد پیدا کرتے ہیں۔

(قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (۷:۷۵)) "اس کی قوم کے سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے' کمزور طبقہ کے ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے' کہا "کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کا پیغمبر ہے۔" بااثر لوگوں کی طرف سے یہ سوال تہدید اور ڈرانے کے لئے کیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے اس بات کو بہت ہی برا سمجھا کہ یہ غریب لوگ بھی صالح کے جنبہ دار بن گئے ہیں اور یہ حضرت صالح کی تصدیق کر رہے ہیں؟

لیکن حقیقت یہ ہوتی ہے کہ ضعیف لوگ جب ایمان لے آتے ہیں تو وہ ضعیف نہیں رہتے۔ ایمان ان کے دلوں کو قوت اور جرأت سے بھر دیتا ہے۔ ان کے دلوں کے اندر اطمینان اور یقین پیدا ہو جاتا ہے' انہیں اپنے نظریات پر اعتماد ہوتا ہے' لہٰذا اب دنیا والوں کی تہدید و تخویف اور ڈراوے دھمکاوے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ نہ مذاق اور استہزاء کا ان پر اثر ہوتا ہے۔ اب وہ متکبرین کو خاطر میں نہیں لاتے اور ایمان کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اور جواب میں یہ متکبرین بھی تہدید آمیز لہجے میں یہ بتا دیتے ہیں کہ اچھا' ہم تو اس دعوت کا صاف صاف انکار کر رہے ہیں۔

(قَالُوْا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (۷۵) قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۷۶) (۷:۷۵-۷۶)) "انہوں نے جواب دیا" بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے اسے ہم مانتے ہیں۔" ان بڑائی کے مدعیوں نے کہا "جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اس کے منکر ہیں۔" حالانکہ صالح علیہ السلام واضح دلائل لے کر آئے تھے، ان دلائل و معجزات کے بعد پھر شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ اکابرین قوم اس لئے انکار نہ کر رہے تھے کہ ان کے سامنے دلائل و معجزات کی کوئی کمی تھی بلکہ وہ اس لئے منکر تھے کہ وہ ایک ایسے نظام مملکت کو تسلیم نہ کرنا چاہتے تھے جس میں صرف رب العالمین کی اطاعت ہوتی ہو۔ مسئلہ حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے دل میں حاکمیت و اقتدار کی ایک اعلیٰ اور گہری خواہش پائی جاتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے شیطان انسان پر حملہ آور ہوتا ہے۔

چنانچہ انہوں نے قولی انکار کے بعد کافرانہ کاروائی کی اور اللہ کی اس ناقہ پر دست درازی کی جو درحقیقت نبی وقت کی تائید کے لئے بطور معجزہ لائی گئی تھی اور جس کے بارے میں نبی وقت نے، قبل از وقت ان کو متنبہ کر دیا تھا کہ وہ اس پر دست درازی سے باز رہیں ورنہ وہ ایک دردناک عذاب سے دوچار ہوں گے۔

(فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۷:۷۷)) "پھر انہوں نے اس اونٹنی کو مار ڈالا اور پورے تمرد کے ساتھ اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کر گزرے اور صالح سے کہہ دیا کہ "لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے، اگر تو واقعی پیغمبروں میں سے ہے۔" معصیت اور نافرمانی کے بعد یہاں ان کی خودسری بھی عیاں ہے۔ یہاں ان کی معصیت اور خودسری کے لئے لفظ "عتو" استعمال ہوا ہے تاکہ ان کی نفسیاتی حالت کی تصویر بھی اچھی طرح سامنے آجائے جس کی وجہ سے وہ عذاب کے نزول کا مطالبہ کرتے ہیں اور پیغمبر کو حقیر جانتے ہیں۔ بغیر کسی تاخیر کے اب ان کے خاتمے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔

(فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ (۷:۷۸)) "آخرکار ایک دہلا دینے والی آفت نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔" چنانچہ دہلا دینے والی مصیبت آگئی اور اس کے نتیجے میں ان کو اوندھا اس لئے گرایا گیا تاکہ ان کی اکڑ اور سرکشی کے لئے مناسب سزا ان کو دے دی جائے، کیونکہ کڑک اور جھنجوڑنے کے نتیجے میں وہ خوفزدہ ہوئے اور بے حس و حرکت اوندھے منہ گرے۔ ان کی یہ حالت ان کی سرکشی اور اکڑ کے لئے مناسب سزا تھی۔ الفاظ کی نفسیاتی تصویرکشی قابل دید ہے۔

اب ان کو اسی طرح اوندھے پڑے چھوڑ کر بات کا رخ حضرت صالح کی طرف مڑ گیا، جس کی انہوں نے تکذیب کی تھی اور چیلنج دیا تھا۔ آپ کا تبصرہ یہ رہا۔

(فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا

تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ (۷ : ۷۹)) اور صالح یہ کہتا ہوا ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ "اے میری قوم' میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں نے تیری بہت خیر خواہی کی 'مگر میں کیا کروں کہ تجھے اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں ہیں۔" یہ شہادت دے دی گئی کہ حضرت صالح نے پیغام پوری طرح پہنچا دیا تھا اور سرکشی اور نافرمانی کر کے انہوں نے خود اپنے آپ کو اس انجام کا مستحق بنایا تھا۔ یہاں مکذبین کی تاریخ کا ایک دوسرا صفحہ لپیٹ دیا جاتا ہے اور کسی ڈرانے والے کی توہین و تکذیب کرنے والے برے انجام کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

---ooo---

اب تاریخ کی گاڑی آگے بڑھتی ہے اور ہم عہد ابراہیم علیہ السلام میں پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن یہاں حضرت ابراہیم کا قصہ بیان نہیں کیا جاتا کیونکہ یہاں ان سرکش نافرمانوں کا ذکر مطلوب ہے جنہیں ہلاک کر دیا گیا۔ یہ اس آیت اور موضوع کی تفصیل ہے جسے آغاز سورت میں لایا گیا تھا۔

(وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا) "کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کیا)۔ یہ قصص گویا اس موضوع کی تفصیلات کے طور پر آرہے ہیں جبکہ قوم ابراہیم کو ہلاک نہ کیا گیا چونکہ حضرت ابراہیم نے اللہ سے ان کی ہلاکت کے لئے کوئی مطالبہ نہ کیا تھا بلکہ حضرت ابراہیم نے ان کو اور ان کی بت پرستی کو چھوڑ کر ان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ اس لئے یہاں قصہ لوط کو لایا جاتا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم کے بھتیجے تھے اور آپ کے معاصر تھے۔ اس قصے میں بھی ڈراوا ہے' اور لوگوں کی طرف سے تکذیب ہے اور انجام میں قوم کی ہلاکت ہے اور یہ اس سلسلہ قصص اور موضوع سے مناسبت رکھتا ہے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَاۗءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ڮ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝

"اور لوط کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا' پھر یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا "کیا تم ایسے بے حیا ہو گئے کہ وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔" مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ "نکالو ان لوگوں کو

اپنی بستیوں سے 'بڑے پاکباز بنتے ہیں۔" آخر کار ہم نے لوط اور اس کے گھر والوں کو نجات دی بجز اس کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی....... بچاکر نکال دیا اور اس قوم پر برسائی ایک بارش 'پھر دیکھو کہ ان مجرموں کا کیا انجام ہوا؟

قصہ لوط میں انسانی فطرت کے ایک ایسے بگاڑ کا ذکر ہے، جس کی مخصوص نوعیت ہے۔ سابقہ قصص میں تو اقوام کی ہلاکت نہایت ہی اساسی نظریہ حیات یعنی عقیدہ توحید اور وحدت حاکمیت اللہ کے مسئلے پر ہوتی تھی۔ لیکن فطرت کا یہ بگاڑ بھی نہایت ہی اساسی مسئلہ تھا اور یہ عقیدہ توحید اور مسئلہ حاکمیت سے متعلق تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ربوبیت اور عبودیت کے اقرار کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ قرآن وسنت کی مکمل اطاعت کی جائے۔ سنت الٰہیہ یہ ہے کہ اللہ نے مرد اور عورت کو علیحدہ اصناف میں پیدا کیا اور مرد اور عورت کے اتصال کو ایسا ذریعہ بنایا جس کے نتیجے میں وہ ایک دوسرے کے لئے ذریعہ تکمیل ثابت ہوئے اور اس طرح نسل انسانی کے اجراؤ امتداد کا سامان فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے دونوں اصناف کے وظائف مقرر کر کے انہیں ایک دوسرے کے لئے مناسب جسمانی اور نفسیاتی اہلیت دی اور باہم ملاپ سے نسل انسانی کی بقا کا انتظام فرمایا۔ پھر اس ملاپ کے اندر دونوں کے لئے گہری لذت ودیعت کی اور اسے ایک فطری لذت قرار دیا تاکہ وہ دلکشی اور کشش کے ساتھ باہم ملیں اور بقائے نسل انسانی کی ذمہ داریاں قبول کریں اور اس راہ میں آنے والی تمام مشکلات کو بھی برداشت کریں۔ حمل 'وضع حمل اور بچوں کی پرورش اور رضاعت 'نفقہ اولاد و اہلیہ اور تربیت اولاد کی ذمہ داریاں اور کفالت اور اس کے بعد پورے خاندان کے افراد کی باہم ذمہ داریاں۔ باوجود اس کے کہ دوسرے حیوانات کے مقابلے میں انسانی بچوں کی نشوونما اور تربیت کا عمل نہایت ہی طویل اور صبر آزما ہوتا ہے۔

یہ فریضہ چونکہ نہایت ہی اساسی اور بنیادی فریضہ ہے اور اس کے سوا نسل انسانی کی بقا ممکن نہیں۔ اس لئے اس فریضے کے اندر انحراف کو بھی ایک اساسی جرم قرار دیا گیا جس طرح عقیدہ توحید کے اندر ذرا بھر انحراف ناقابل برداشت ہے۔ اس لئے نظریہ حیات اور عقیدہ توحید کے اندر انحراف اور ہم جنس پرستی کے انحراف کو ایک درجے کا جرم قرار دیا گیا۔

قوم لوط کے قصے میں انحراف واضح طور پر نظر آتا ہے۔ یہ فطرت سے انحراف ہے اور حضرت لوط ان سے کہتے ہیں کہ یہ ایک نئی اخلاقی بے راہ روی انہوں نے شروع کی ہے اور ان سے پہلے کسی قوم میں یہ اخلاقی فساد نہ تھا۔

(وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ

(۸۰) اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ

(۸۱) (۷: ۸۰ – ۸۱)) اور لوط علیہ السلام کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا 'پھر یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا "کیا تم ایسے بے حیا ہو گئے کہ وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔"

حضرت لوط علیہ السلام ان پر حد سے گزرنے کا جو الزام لگاتے ہیں اور اس پر ان کی سرزنش کرتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطرت سلیمہ کا جو نظام انسانوں کے لئے وضع کیا ہے اس سے آگے گزر جانا اسراف ہے۔ پھر اللہ نے انہیں توالد و تناسل کے لئے جو قوتیں دی ہوئی ہیں ان کا صحیح مصرف یہ ہے کہ ان کو یہاں زندگی کی نشوونما کے لئے صرف کیا جائے

جبکہ وہ ان قوتوں کو بنجر زمین میں ضائع کر رہے ہیں اور محض عارضی لذت اور شہوت رانی کے لئے کام میں لاتے ہیں ' حالانکہ شہوت اور لذت کا حصول بھی طبعی راہ سے ہونا چاہئے۔ اگر کوئی سنت الہیہ کے خلاف لذت کوشی کی سعی کرتا ہے تو اسے بے راہ روی ' اور خلاف فطرت عمل تصور کیا جائے گا۔ مزید یہ کہ یہ عمل خلاف اخلاق بھی ہو گا ' اس لئے کہ اسلامی اخلاق بھی فطری اخلاق ہوتے ہیں اور ان کے اندر کوئی فساد اور انحراف نہیں ہوتا۔

عورت کی نفسیاتی اور عضویاتی ساخت ایسی ہوتی ہے جس سے مرد کو حقیقی لذت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے بھی مقصد صرف حصول لذت نہیں ہوتا بلکہ اس ملاپ کے نتیجے میں رحمت اور نعمت بھی حاصل ہوتی ہے ' اس طرح کہ اس ملاپ کے نتیجے میں سنت الہیہ کے مطابق سلسلہ حیات کی بقا کا انتظام ہو رہا ہے۔ رہا یہ کہ مرد اور مرد کے درمیان جو عضویاتی یکسانیت ہوتی ہے تو اس سے کوئی صحت مند لذت حاصل نہیں ہوتی بلکہ انسان کو اس میں گندگی کا احساس ہوتا ہے اس لئے فطرت سلیمہ اس ملاپ کو قبول نہیں کرتی۔

اس سلسلے میں انسان کے اعتقادات اور تصورات کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ آج کے دور میں یورپ میں جو جاہلیت مروج ہے ' وہ اس جنسی بے راہ روی کو بڑی بے حیائی کے ساتھ پھیلاتی ہے اور یہ بے راہ روی محض نظریاتی بے راہ روی کے نتیجے میں ہے۔

ہمارے دور میں یہودی تمام غیر یہودی اقوام کو اخلاقی اعتبار سے برباد کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کے نشر و اشاعت کے ادارے رات اور دن کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ نظریاتی اور اخلاقی طور پر غیر یہودی اقوام کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ دعویٰ کرتے رہے کہ یہ جنسی انتشار اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ عورت پردہ کرتی ہے ' لیکن واقعات اس کے برعکس بتاتے ہیں ' اس لئے کہ یورپ و امریکہ کے اندر کسی مرد اور عورت کے ملاپ کے لئے کوئی ضابطہ یا کوئی قید نہیں ہے ' بعینہٖ اسی طرح جس طرح بہائم بوقت ضرورت ملتے ہیں۔ لیکن ان کھلے معاشروں میں خلاف وضع فطرت فعل بھی دوسرے معاشروں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے بلکہ ہم جنس پرستی صرف مردوں کے اندر ہی نہیں عورتوں کے درمیان بھی یہ فعل رائج ہے۔ اگر کسی کو شبہ ہے تو وہ مسٹر کنزی کی کتابیں پڑھیں۔ "مردوں کے درمیان جنسی تعلقات" اور "عورتوں کے درمیان جنسی تعلقات"۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود یہ جھوٹے ذرائع ابلاغ اپنی اس جھوٹی بات کو دہراتے چلے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ فعل بد عورتوں کے پردے کی وجہ سے کسی سوسائٹی میں پھیلتا ہے۔ یہ پروپیگنڈہ وہ ان مقاصد کے لئے کرتے ہیں جن کا اظہار انہوں نے اکابرین یہود کے پروٹوکول میں کیا ہے۔ اب ذرا دوبارہ قرآنی قصے کی طرف آیئے اور سنئے کہ وہ اپنے نبی کو کیا جواب دیتے ہیں۔

(وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ (۷: ۸۲)) "مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ "نکالو ان لوگوں کو اپنی بستیوں سے ' بڑے پاکباز بنتے ہیں یہ۔" عجیب بات ہے! جو پاکباز ہے اسے گاؤں سے نکالا جا رہا ہے اور گندے ' غلیظ اور ناپاک لوگ بستیوں کے اندر رہنے کے مستحق بنتے ہیں لیکن یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ دور جدید کی جاہلیت یہی تو کر رہی ہے کیا یہ ان لوگوں کو مسترد نہیں کر رہی ہے جو پاکبازی اختیار کرتے ہیں اور ان گندگیوں میں اپنے آپ کو آلودہ نہیں کرتے۔ اس بات کو

وہ ترقی پسندی کہتے ہیں اور اسے عورت اور مرد کی آزادی کا نام دیتے ہیں - یہ جاہلیت آج کے دور میں ایسے پاکباز لوگوں پر رزق کے دروازے بند کر رہی ہے' ان کا زندہ رہنا اس نے مشکل کر دیا ہے - ان کی دولت کے ذرائع سکیڑ دیئے گئے ہیں' ان کے افکار و تصورات کو دبایا جاتا ہے - جاہلیت اس بات کو دیکھ ہی نہیں سکتی کہ کوئی پاکبازی اختیار کرے - کیونکہ اس جاہلیت کو صرف وہی لوگ قبول ہیں جو گندے' ناپاک اور برائیوں میں ملوث ہوں' پاک لوگوں کے لئے اس کا دل تنگ ہے - ہر دور میں جاہلیت کی ذہنیت یہی رہی ہے -

چنانچہ ان کو جلدی اپنے انجام سے دوچار کر دیا جاتا ہے اور تمام دوسری تفصیلات کو یہاں چھوڑ دیا جاتا ہے -

(فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ (٨٣) وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ (٨٤)(٧: ٨٣-٨٤)) "آخر کار ہم نے لوط اور اس کے گھر والوں کو ...... بجز اس کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی ..... بچاکر نکال دیا اور اس قوم پر برسائی ایک بارش' پھر دیکھو کہ ان مجرموں کا کیا انجام ہوا" اللہ کے نافرمان اللہ کے بندوں کے لئے خطرہ بن گئے تھے' تو اللہ نے اپنے بندوں کو نجات دی اور نافرمان طبقات اور فرمان برداروں کے درمیان نظریاتی تفریق کر دی گئی - حضرت لوط کی بیوی اگرچہ ان کی بیوی تھی لیکن وہ ہلاکت سے نہ بچ سکی کیونکہ اس کا نظریاتی اتحاد ان لوگوں کے ساتھ تھا جو ہلاک ہونے والے تھے -

ان لوگوں کو سخت بارشوں نے آلیا اور ان بارشوں میں زبردست طوفان تھے' یوں نظر آتا تھا کہ سب لوگ بارش میں غرق ہوگئے اور پانی اس طرح امڈ رہا تھا جس طرح موجیں اور یوں اس سرزمین کو ان ناپاک لوگوں سے پاک کر دیا گیا - کیونکہ وہ روحانی طور پر ناپاک ہوگئے تھے اور گندگیوں میں آلودہ ہوگئے تھے - چنانچہ وہ گندگی میں زندہ رہے اور گندگی کے اندر ہی ان کو موت نے آلیا -

---- O O O ----

اب تکذیب کرنے والی اقوام کی تاریخ کا آخری صفحہ الٹا جاتا ہے - یہ صفحہ اس دور کی اقوام میں سے قوم شعیب یعنی اہل مدین سے متعلق ہے -

---

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ۗ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ

وَتَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوا
إِذْ كُنْتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ ۖ وَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿٨٦﴾ وَ
إِنْ كَانَ طَائِفَةٌ مِنْكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَائِفَةٌ لَمْ يُؤْمِنُوا
فَاصْبِرُوا حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿٨٧﴾

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ
آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۚ قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِينَ ﴿٨٨﴾
قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ نَجَّانَا اللَّهُ مِنْهَا ۚ
وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا ۚ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ
شَيْءٍ عِلْمًا ۚ عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ
أَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ﴿٨٩﴾ وَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ
شُعَيْبًا إِنَّكُمْ إِذًا لَخَاسِرُونَ ﴿٩٠﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ
جَاثِمِينَ ﴿٩١﴾ الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَأَنْ لَمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۚ الَّذِينَ كَذَّبُوا
شُعَيْبًا كَانُوا هُمُ الْخَاسِرِينَ ﴿٩٢﴾ فَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا قَوْمِ لَقَدْ
أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۖ فَكَيْفَ آسَىٰ عَلَىٰ قَوْمٍ كَافِرِينَ ﴿٩٣﴾

”اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا ”اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو‘ اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی صاف راہنمائی آگئی ہے‘ لہٰذا وزن اور پیمانے پورے کرو‘ لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو‘ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے‘ اسی میں تمہاری بھلائی ہے اگر تم واقعی مومن ہو۔ اور (زندگی کے) ہر راستے پر رہزن بن کر نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوفزدہ کرنے اور ایمان لانے والوں کو خدا کے راستے سے روکنے لگو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔ یاد کرو وہ زمانہ جب کہ تم تھوڑے

تھے پھر اللہ نے تمہیں بہت کر دیا اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ دنیا میں مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے۔ اگر تم میں سے ایک گروہ اس تعلیم پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں' ایمان لاتا ہے اور دوسرا ایمان نہیں لاتا تو صبر کے ساتھ دیکھتے رہو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے' اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

اس کی قوم کے سرداروں نے جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے' اس سے کہا کہ "اے شعیب' ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں' اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہو گا۔" شعیب نے جواب دیا "کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں؟ ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے' اگر تمہاری ملت میں پلٹ آئیں جب کہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے۔ ہمارے لئے تو اس کی طرف پلٹنا اب کسی طرح ممکن نہیں الا یہ کہ خدا ہمارا رب ہی ایسا چاہے۔ ہمارے رب کا علم ہر چیز پر حاوی ہے' اسی پر ہم نے اعتماد کر لیا۔ اے رب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔"

اس کی قوم کے سرداروں نے' جو اس کی بات ماننے سے انکار کر چکے تھے آپس میں کہا "اگر تم نے شعیب کی پیروی قبول کر لی تو برباد ہو جاؤ گے۔" مگر ہوا یہ کہ ایک دہلا دینے والی آفت نے ان کو آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔ جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ ایسے مٹے کہ گویا کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے۔ شعیب کے جھٹلانے والے ہی آخر کار برباد ہو کر رہے اور شعیب یہ کہہ کر ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ "اے برادران قوم' میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اب میں اس قوم پر کیسے افسوس کروں جو قبول حق سے انکار کرتی ہے۔"

یہ قصہ دوسروں کے مقابلے میں قدرے طویل ہے' دوسرے قصص کی نسبت کیونکہ اس میں اسلامی نظریہ حیات کے علاوہ بعض دوسرے معاملات بھی موجود ہیں۔ اگرچہ اس میں بھی وہی طرز ادا اختیار کی گئی ہے جس طرح اس سے قبل دوسرے قصوں میں اختیار کی گئی ہے۔

(وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوْا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ

(۷:۸۵)) "اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔" یہ دعوت اسلامی کا بنیادی عقیدہ ہے اور یہ ہر پیغمبر کی دعوت کا اساسی کلمہ اور شعار رہا ہے۔ ہر پیغمبر اس سے دعوت کا آغاز کر کے پھر دوسری تفصیلات میں جاتا ہے۔

(قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۷:۸۵)) "تمہارے پاس تمہارے رب کی صاف رہنمائی آگئی ہے۔" سیاق کلام میں اس طرح شہادت اور راہنمائی کا ذکر نہیں ہے' جس طرح قصہ صالح میں شہادت کا ذکر موجود ہے۔ قرآن کی دوسری سورتوں میں بھی حضرت شعیب کی جانب سے کوئی معجزہ پیش کرنے کا ذکر نہیں ہوا لیکن یہاں اس آیت میں معجزے کی طرف اشارہ موجود ہے کہ حضرت شعیب نے بھی دوسرے انبیاء کی طرح کوئی معجزہ پیش کیا تھا۔ اس معجزے کے نتیجے میں اپنی قوم سے آپ کا مطالبہ یہ تھا کہ آپ ناپ اور تول میں کمی بیشی نہ کریں اور فساد فی الارض کے

تمام طریقوں سے بچیں نیز راہ زنی اور ڈاکہ زنی جیسے برے افعال سے باز رہیں۔ اور اہل دین کو محض ان کی دین داری کی وجہ سے فتنے میں نہ ڈالیں۔

(فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (٨٥) وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَاذْكُرُوْا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (٨٦)

(۷: ۸۵ - ۸۶)) "لہذا وزن اور پیمانے پورے کرو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو، اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے، اسی میں تمہاری بھلائی ہے اگر تم واقعی مومن ہو۔ اور (زندگی کے) ہر راستے پر رہزن بن کر نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوفزدہ کرنے اور ایمان لانے والوں کو خدا کے راستے سے روکنے لگو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔ یاد کرو وہ زمانہ جب کہ تم تھوڑے تھے پھر اللہ نے تمہیں بہت کر دیا اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ دنیا میں مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے۔" اس نہی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب کی قوم مشرک قوم تھی۔ وہ صرف اللہ وحدہ کی عبادت نہ کرتی تھی، وہ اللہ کے اقتدار اعلیٰ میں اللہ کے بندوں کو شریک کرتی تھی۔ یہ لوگ اپنے معاملات میں اللہ کے عادلانہ قانون کی پیروی نہ کرتے تھے بلکہ انہوں نے باہم معاملات طے کرنے کے لئے خود اپنی جانب سے قواعد گھڑ رکھے تھے۔ شاید اسی معاملے میں وہ شرک کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ بیع و شریٰ کے معاملات میں وہ بدمعاملہ تھے اور اس کے علاوہ فساد فی الارض، رہزنی اور ڈاکہ زنی کے معاملات بھی ان میں عام تھے۔ علاوہ ازیں جو لوگ دین دار اور پاکباز تھے ان کو بھی وہ ستاتے تھے اور اللہ کی سیدھی راہ سے انہیں روکتے تھے۔ اللہ کی راہ میں ہر قسم کی استقامت کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ غلط راہوں پر چلیں جس میں ان کے مالی مفادات تھے اور اسلامی نظام کو ترک کر دیں جس میں ان کا نقصان تھا۔

حضرت شعیب دعوت کا آغاز ہی اس کلمہ سے کرتے ہیں کہ صرف اللہ وحدہ کی بندگی اور غلامی کرو، اس کے اقتدار اعلیٰ کو دنیا میں قائم کرو اور زندگی کے تمام امور میں اس کے دین اور حکم کو نافذ کرو۔

حضرت شعیب اس اصولی اور بنیادی بات سے اپنی دعوت کا آغاز کرتے ہیں اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ زندگی کے تمام معاملات کا دارومدار اسی اصول پر ہے اور انسان کے اخلاق اور اس کا باہمی طرز عمل اسی قاعدے اور سرچشمے سے پھوٹتے ہیں اور جب تک یہ اصول قائم و استوار نہ ہو، انسان کا کوئی عمل قائم و استوار نہیں رہ سکتا۔

اللہ وحدہ کی بندگی کی دعوت اور اپنی پوری زندگی کو توحید کے جادۂ مستقیم پر قائم کرنے کی دعوت اور شریعت الہیہ کے نفاذ اور فساد فی الارض کو چھوڑنے کی دعوت کے ساتھ ساتھ ان کو حضرت شعیب اس طرف بھی متوجہ فرماتے ہیں کہ تم پر اللہ کا جو فضل و کرم ہے اور اس نے جو انعامات تم پر کیے ہیں ان پر اللہ کا شکر بجا لاؤ۔ "یاد کرو وہ زمانہ جب تم تھوڑے تھے پھر اللہ

نے تمہیں بہت کر دیا۔" ...... اگر تم ان انعامات پر شکر ادا نہیں کرتے اور بدستور آمادۂ فساد رہنے پر مصر ہو تو پھر .... "وہ آنکھیں کھول کر دیکھو کہ دنیا میں مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے۔"

حضرت شعیب چاہتے ہیں کہ ان کی قوم عدل و انصاف اور وسعت قلبی کا رویہ اختیار کرے۔ ان لوگوں کو فتنے میں نہ ڈالے جو ایمان لا کر اللہ کی ہدایت کے پیروکار بن گئے ہیں اور جن کو اللہ نے اپنے دین کی طرف ہدایت کر دی ہے۔ یہ لوگ ہر طرف سے ان لوگوں کی راہ روکنے کی کوشش نہ کریں۔ نہ ان پر زندگی کے دروازے بند کریں اور نہ ان کو ڈرائیں دھمکائیں۔ اگر وہ ایمان نہیں لاتے تو اہل ایمان اور اہل کفر کی اس کشمکش میں کم از کم غیر جانبدار ہو کر نتائج کا انتظار کریں۔

(وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ (۸۷:۷)) "اگر تم میں سے ایک گروہ اس تعلیم پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں' ایمان لاتا ہے اور دوسرا ایمان نہیں لاتا تو صبر کے ساتھ دیکھتے رہو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔" حضرت شعیب نے ان کو منصفانہ منصوبے کو اپنانے کا مشورہ دیا اور یہ آخری حد تھی جہاں تک وہ ان کو رعایت دے سکتے تھے' اس سے پیچھے وہ ایک قدم بھی نہ ہٹ سکتے تھے۔ وہ یہ کہ ان کی قوم کفر و اسلام کی اس کشمکش میں غیر جانبدار ہو کر انتظار کرے اور مسلمانوں کو اذیت نہ دے۔ قوم جس دین کو چاہے اختیار کرے یہاں تک کہ اللہ خود کوئی فیصلہ کر دے۔

لیکن طاغوتی قوتیں اس بات کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتیں کہ اس کرۂ ارض پر ایمان کا معمولی وجود بھی ہو اور وہ ایسی جماعت کی شکل میں ہو جو طاغوت کی اطاعت نہ کرتی ہو۔ اس کرۂ ارض پر ایسی جماعت مسلمہ' جو صرف اللہ کی غلام ہو' جو اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے سوا کسی اور اقتدار کو نہ تسلیم کرتی ہو' اپنی زندگی میں اللہ کے قانون کے سوا کسی اور کا قانون نہ مانتی ہو' اپنی اجتماعی زندگی میں اللہ کے نظام کے سوا کسی اور نظام کی قائل نہ ہو۔ ایسی جماعت کا مجرد پایا جانا ہی طاغوت کے وجود کے لئے خطرہ ہوتا ہے۔ اگرچہ اس قسم کی جماعت خود اپنے دائرے کے اندر ہی محدود کیوں نہ ہو' طاغوتی قوتوں کو فی الحال نہ بھی چھیڑتی ہو اور طاغوت کو وہ اپنے طبعی انجام تک پہنچنے کے لئے انتظار کر رہی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ طاغوتی قوتوں نے اپنے اوپر از خود یہ بات لازم کر لی ہے کہ وہ اسلامی قوتوں کے خلاف برسرجنگ رہیں گی اگرچہ اسلامی قوتیں جنگ سے بچنا چاہیں کیونکہ حق کا وجود ہی ان قوتوں کے لئے خوفناک ہوتا ہے اور طاغوت ہروقت حق سے کانپتا رہتا ہے۔ حق کا وجود ہی اس کشمکش کے آغاز کا باعث ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی سنت ہے۔ اگر کوئی سمجھے کہ حق ہے اور باطل اس کے خلاف نہ اٹھ رہا ہو' تو ایسے اہل حق کو غور کرنا چاہئے کہ وہ حق پر ہیں بھی کہ نہیں؟

(قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا (۸۸:۷)) اس کی قوم کے سرداروں نے' جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے' اس سے کہا کہ "اے شعیب' ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ تم

لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہو گا۔" یہ ہے طاغوت کی تنگی خود سری۔ اسے اصرار ہے کہ وہ حق کے ساتھ یہ معرکہ جاری رکھے گا اور یہ بات ممکن ہی نہیں ہے کہ حق اور باطل باہم زندہ رہ سکیں یا ان کے درمیان فائر بندی ہو سکے۔
لیکن نظریاتی قوتوں پر باطل کی دھمکیوں کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ حق کے پاؤں میں کوئی لغزش نہیں آتی اور وہ بات کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتا۔ حضرت شعیب علیہ السلام اس مقام سے پیچھے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ان کی جانب سے یہ آخری رعایت تھی کہ لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ جو عقیدہ چاہیں اختیار کریں' جس کے اقتدار میں چاہیں اپنے آپ کو داخل کر دیں اور دونوں حریف اللہ کے فیصلے کا انتظار کریں۔ یہ وہ مقام ہے جس سے مزید پیچھے کوئی حامل حق داعی نہیں ہٹ سکتا۔ چاہے طاغوتی قوتوں کی طرف سے شدید دباؤ کیوں نہ ہو۔ اگر کوئی داعی اس مقام سے پیچھے ہٹ جاتا ہے تو وہ گویا اس سچائی کو خیرباد کہہ دیتا ہے جس کا وہ نمائندہ ہے بلکہ اس سے خیانت کرتا ہے۔
جب حضرت شعیب کو ان مستکبرین کی طرف سے یہ دھمکی ملتی ہے کہ وہ یا تو اپنے نظریات کو ترک کر کے واپس ہماری ملت میں آجائیں ورنہ پھر ہمارے حلقے سے نکلنے کے لئے تیار ہو جائیں تو حضرت شعیب صاف اعلان فرما دیتے ہیں کہ وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ نے انہیں جس برے دین سے نجات دی وہ پھر اسی میں داخل ہو جائیں۔ اب وہ اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دست بدعا ہوتے ہیں کہ اے اللہ ہمارے اور ہمارے دشمنوں کے درمیان اب تو ہی فیصلہ کر دے۔ اور ہماری مدد فرما۔ کیونکہ تو ہی مدد کرنے والا ہے۔

(قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ (۸۸) قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ

(۸۹) (۷:۸۸-۸۹)) "شعیب نے جواب دیا "کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں؟ ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے' اگر تمہاری ملت میں پلٹ آئیں جب کہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے۔ ہمارے لئے تو اس کی طرف پلٹنا اب کسی طرح ممکن نہیں الا یہ کہ خدا ہمارا رب ہی ایسا چاہے۔ ہمارے رب کا علم ہرچیز پر حاوی ہے' اسی پر ہم نے اعتماد کر لیا۔ اے رب' ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔" یہ مختصر ترین چند کلمات ہیں' لیکن ان میں ایمان کی تجلیات واضح طور پر نظر آتی ہیں اور اہل ایمان کا ذوق و شوق ان سے عیاں ہے۔ اسی طرح ان کلمات سے جاہلیت کا مزاج اور اس کی بدذوقی کا اظہار بھی خوب ہوتا ہے۔ رسول وقت کے دل کے خوبصورت مناظر بھی چمکتے نظر آتے ہیں اور ان میں ربانی حقائق صاف نظر آتے ہیں۔

(قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ (۷:۸۸)) "شعیب نے کہا کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں؟" حضرت شعیب ان کی اس دھمکی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس میں انہوں نے کہا تھا "شعیب ہم تمہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے یا تمہیں ہمارے دین میں واپس آنا ہو گا۔" حضرت شعیب کا مطلب یہ ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم اس

صورت حال میں پھر داخل ہو جائیں جس سے اللہ نے ہمیں نجات دی ہے ۔ وہ تو ایک مکروہ اور ناپسندیدہ صورت حال ہے ۔
"وہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے اگر تمہاری ملت میں پلٹ آئیں جبکہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے ۔
جو شخص اس طاغوتی ملت کی طرف دوبارہ لوٹ جاتا ہے جس میں دین اللہ کے لئے خالص نہیں ہوتا' جس میں اطاعت صرف اللہ کی نہیں ہوتی' جس میں لوگ اللہ کے سواکچھ دوسری شخصیات کو رب بنالیتے ہیں اور ان کے اقتدار اعلیٰ کا اقرار کرتے ہیں وہ صراط مستقیم سے ہٹ جاتا ہے حالانکہ ایسے شخص کو اللہ نے ان تمام ملتوں سے نجات دے دی تھی ۔ وہ اللہ کی غلامی کے سوا تمام غلامیوں سے نکل آئے تھے اور اللہ نے انہیں راہ ہدایت بتا دی تھی ۔ ایسا شخص اگر پھر اسی ملت میں داخل ہوتا ہے تو وہ کلمہ شہادت جھوٹ موٹ پڑھ رہا ہے کیونکہ اس نے ملت ابراہیم کو ترک کر کے دوبارہ طاغوتی ملت میں داخلہ لے لیا ہے ۔
ایسی ملت میں دوبارہ جانے کا مدعا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ طاغوتی ملت کو حق سمجھتا ہے اور ایسے لوگوں کے اقتدار اعلیٰ کو جائز اور قانونی سمجھتا ہے ۔ ایسا شخص کلمہ شہادت ادا کرنے کے ساتھ ساتھ طاغوتی ملت کا بھی فرد بن جاتا ہے ۔ وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ طاغوتی نظام کا بھی یہ حق ہے کہ وہ اس دنیا میں قائم رہے' اور اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کر دے اور یہ کہ اس کا وجود ایمان کے منافی نہیں ہے ۔ ایسا شخص طاغوتی ملت میں داخل ہو کر اسے تسلیم کرتا ہے ۔ ایسے شخص کا یہ طرز عمل اس شخص سے زیادہ خطرناک ہے جو سرے سے ہدایت قبول ہی نہیں کرتا اور اسلام کے جھنڈے کو بلند ہی نہیں کرتا کیونکہ اس طرز عمل سے یہ شخص طاغوت کے اقتدار اعلیٰ کے جھنڈے کو بلند کرتا ہے اور طاغوت کا اقتدار اللہ کے اقتدار اعلیٰ پر دست درازی کے مترادف ہوتا ہے ۔..... حضرت شعیب فرماتے ہیں۔

(وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ (۷: ۸۹)) "ہمارے لئے یہ سزاوار ہی نہیں ہے کہ ہم طاغوتی ملت کی طرف لوٹ آئیں ۔" یہ دینی شان ہی کے متضاد ہے اور حضرت شعیب اس بات کا اعلان اس وقت کرتے ہیں جب کہ ان کو کھلی دھمکی دی جارہی ہے کہ تمہیں ایسا کرنا ہو گا ۔ ایسی دھمکی طاغوتی قوتیں ہر دور اور ہر زمانے میں ہر اسلامی جماعت کو دیتی چلی آئی ہیں ۔ ان تمام جماعتوں کو جو اپنے آپ کو طاغوتی نظام سے نکالنا چاہتی ہیں اور صرف اللہ کے دین اور نظام میں داخل ہونا چاہتی ہیں ہمیشہ ایسی دھمکیاں ملتی رہتی ہیں ۔
طاغوتی نظام اور اس کی اطاعت سے نکلنے کی مشکلات اگرچہ بہت ہی زیادہ نظر آئیں ان مشکلات اور مصائب کے مقابلے میں بہت کم ہیں جو انسانوں پر طاغوت کی غلامی کی صورت میں پڑتی ہیں ۔ طاغوتی نظام کی جانب سے آنے والی مشکلات نہایت ہی رسواکن ہوتی ہیں اگرچہ بظاہر طاغوتی نظام میں امن و سلامتی' اور اطمینان و سکون اور ہر چیز کی فراوانی نظر آئے ۔ طاغوتی نظام کی مشکلات نہایت ہی گہری اور دور رس ہوتی ہیں ۔ ان میں انسان کی انسانیت ختم ہو جاتی ہے ۔ جب انسان انسان کا غلام ہو تو اس کی انسانیت ختم ہو جاتی ہے ۔ اس سے بڑی اور کوئی غلامی نہیں ہو سکتی کہ کسی جگہ انسان' انسان کے لئے قانون بنائے اور دوسرا اس کا مطیع فرمان ہو ۔ اس سے بڑی غلامی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک انسان کا ارادہ اسی جیسے ایک دوسرے انسان کے تابع ہو اور وہ اس کی مرضی اور حکم کا پابند ہو یا اس سے اور بڑی غلامی اور معصیت کیا ہو سکتی ہے کہ انسان بعض انسانوں کی خواہشات اور رجحانات کے غلام ہوں اور ایک انسان کی لگام دوسرے انسانوں کے ہاتھ میں ہو ۔ وہ انہیں جس طرح چاہے چلائے اور جس طرف چاہے لے جائے ۔

لیکن طاغوتی نظام میں صرف اس قسم کی معنوی اور فلسفیانہ اعلیٰ اقدار ہی کو پامال نہیں کیا جاتا بلکہ لوگوں کے اموال اور اولاد بھی طاغوتی نظام کے اختیار میں چلے جاتے ہیں۔ وہ جس طرح چاہتا ہے لوگوں کے اموال میں تصرفات کرتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے ان کی اولاد کو بری یا اچھی تربیت دیتا ہے۔ انہیں اپنی مرضی کے تصورات و افکار اور مفہوم و اقدار عطا کرتا ہے۔ نیز ان کے اندر اخلاق اور عادت بھی اپنی مرضی کے مطابق رواج دیتا ہے۔ اس کے علاوہ طاغوت لوگوں کی روح اور ان کی زندگی پر بھی اثرانداز ہوتا ہے۔ وہ ارواح کو ذبح کرتا ہے' وہ لوگوں کے جسموں کو ذبح کر کے ان کی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرتا ہے۔ پھر ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کا بھی وہ سودا کرتا ہے اور حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ایک باپ اپنی بیٹی کو بھی بے راہ روی سے باز نہیں رکھ سکتا کیونکہ یہ بے راہ روی طاغوتی نظام کے اہلکاروں کے مفاد میں ہوتی ہے۔ طاغوتی نظام لوگوں کی عزت و آبرو کے ساتھ یا تو بطور ظلم کھیلتا ہے اور لوگوں کے ضمیر کو بدل کر خوشی خوشی ان سے ان کی عزتیں لٹاتا ہے۔ وہ تہذیب کے عنوان سے ان سے بے تہذیبی کراتا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ طاغوتی نظام میں رہتے ہوئے اپنا مال اور اپنی آبرو بچالے جائیں اور ان کا ایمان و نظریہ بھی محفوظ رہے وہ درحقیقت ایک بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں یا انہیں حقیقی صورت حال کا احساس ہی نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ طاغوت کی غلامی نفس انسانی' دولت انسانی اور عزت انسانی کو گہری مصیبت میں مبتلا کرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اللہ کی غلامی کے فرائض خواہ کتنے ہی زیادہ نظر آئیں' وہ بہرحال اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی کے لئے بہت ہی مفید ہے جبکہ آخرت میں اللہ کے ہاں اجر عظیم ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنے ایک مقالے "تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں" میں فرماتے ہیں :-

"انسانی زندگی کے مسائل میں جس کو تھوڑی سی بصیرت بھی حاصل ہو وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا کہ انسانی معاملات کے بناؤ اور بگاڑ کا آخری فیصلہ جس مسئلے پر منحصر ہے وہ یہ سوال ہے کہ معاملات انسانی کی زمام کار کس کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرح گاڑی ہمیشہ اسی سمت چلا کرتی ہے جس سمت پر ڈرائیور اس کو لے جانا چاہتا ہے اور دوسرے لوگ جو گاڑی میں بیٹھے ہوں خواستہ و ناخواستہ اسی سمت پر سفر کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں' اسی طرح انسانی تمدن کی گاڑی بھی اسی سمت پر سفر کیا کرتی ہے جس سمت پر وہ لوگ جانا چاہتے ہیں جن کے ہاتھ میں تمدن کی باگیں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ زمین کے سارے ذرائع جن کے قابو میں ہوں' قوت و اقتدار کی باگیں جن کے ہاتھ میں ہوں' عام انسانوں کی زندگی جن کے دامن سے وابستہ ہو' خیالات و افکار اور نظریات کو بنانے اور ڈھالنے کے وسائل جن کے قبضے میں ہوں' انفرادی سیرتوں کی تعمیر اور اجتماعی نظام کی تشکیل اور اخلاقی قدروں کی تعیین جن کے اختیار میں ہو' ان کی رہنمائی و فرماں روائی کے تحت رہتے ہوئے انسانیت بحیثیت مجموعی اس راہ پر چلنے سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتی جس پر وہ اسے چلانا چاہتے ہوں۔ یہ رہنما و فرمانروا اگر خدا پرست اور صالح لوگ ہوں تو لامحالہ زندگی کا سارا نظام خدا پرستی اور خیر و صلاح پر چلے گا۔ برے لوگ بھی اچھے بننے پر مجبور ہوں گے' بھلائیوں کو نشوونما نصیب ہو گا اور برائیاں اگر مٹیں گی نہیں تو کم از کم پروان بھی نہ چڑھ سکیں گی۔ لیکن اگر رہنمائی و قیادت اور فرمانروائی کا یہ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو خدا سے برگشتہ اور فسق و فجور میں سرگشتہ ہوں تو آپ سے آپ سارا نظام زندگی خدا سے بغاوت اور ظلم و بداخلاقی پر چلے گا۔ خیالات و نظریات' علوم و آداب' سیاست و معیشت' تہذیب و معاشرت' اخلاق و معاملات' عدل و قانون' سب کے سب بحیثیت مجموعی بگڑ

جائیں گے - برائیاں خوب نشو و نما پائیں گی -"

"اس تشریح کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ دین میں اس مسئلے کی کیا اہمیت ہے - ظاہر بات ہے کہ اللہ کا دین اول تو یہ چاہتا ہے کہ لوگ بالکلیہ بندۂ حق بن کر رہیں اور ان کی گردن میں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کا حلقہ نہ ہو۔ پھر وہ چاہتا ہے کہ اللہ ہی کا قانون لوگوں کی زندگی کا قانون بن کر رہے - پھر اس کا مطالبہ یہ ہے کہ زمین سے فساد مٹے - ان منکرات کا استیصال کیا جائے جو اہل زمین پر اللہ کے غضب کے موجب ہوتے ہیں اور ان خیرات و حسنات کو فروغ دیا جائے جو اللہ کو پسند ہیں - ان تمام مقاصد میں سے کوئی مقصد بھی اس طرح پورا نہیں ہو سکتا کہ نوع انسانی کی رہنمائی و قیادت اور معاملات انسانی کی سربراہ کاری ائمہ کفر و ضلال کے ہاتھوں میں ہو اور دین حق کے پیرو محض ان کے ماتحت رہ کر ان کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یاد خدا کرتے رہیں - یہ مقاصد تو لازمی طور پر اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ تمام اہل خیر و صلاح جو اللہ کی رضا کے طالب ہوں' اجتماعی قوت پیدا کریں اور سردھڑ کی بازی لگا کر ایک ایسا نظام حق قائم کرنے کی سعی کریں جس میں امامت و راہنمائی اور قیادت و فرماں روائی کا منصب مومنین و صالحین کے ہاتھوں میں ہو۔ اس چیز کے بغیر وہ مدعا حاصل ہی نہیں ہو سکتا جو دین کا اصل مدعا ہے -

اسی لئے دین میں امامت صالحہ کے قیام اور نظام حق کی اقامت کو مقصدی اہمیت حاصل ہے اور اس چیز سے غفلت برتنے کے بعد کوئی عمل ایسا نہیں ہو سکتا جس سے انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کو پہنچ سکے - غور کیجئے' آخر قرآن و حدیث میں التزام جماعت اور سمع و اطاعت پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص جماعت سے خروج اختیار کرلے تو اس سے قتال واجب ہے خواہ وہ کلمہ توحید کا قائل اور نماز روزے کا پابند ہی کیوں نہ ہو - کیا اس کی وجہ یہ اور صرف یہی نہیں ہے کہ امامت صالحہ اور نظام حق کا قیام و بقا دین کا حقیقی مقصود ہے' اور اس مقصد کا حصول اجتماعی طاقت پر موقوف ہے' لہٰذا جو شخص اجتماعی طاقت کو نقصان پہنچاتا ہے وہ اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کرتا ہے جس کی تلافی نہ نماز سے ہو سکتی ہے اور نہ اقرار توحید سے؟ پھر دیکھئے کہ آخر اس دین میں جہاد کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے کہ اس سے جی چرانے اور منہ موڑنے والوں پر قرآن مجید نفاق کا حکم لگاتا ہے؟ جہاد' نظام حق کی سعی کا ہی تو دوسرا نام ہے اور قرآن اسی جہاد کو وہ کسوٹی قرار دیتا ہے جس پر آدمی کا ایمان پرکھا جاتا ہے - بالفاظ دیگر جس کے دل میں ایمان ہو گا وہ نہ تو نظام باطل کے تسلط سے راضی ہو سکتا ہے اور نہ نظام حق کے قیام کی جدوجہد میں جان و مال سے دریغ کر سکتا ہے - اس معاملے میں جو شخص کمزوری دکھائے گا اس کا ایمان ہی مشتبہ ہے' پھر بھلا کوئی دوسرا عمل اسے کیا نفع پہنچا سکتا ہے؟"

"اس وقت اتنا موقع نہیں ہے کہ میں آپ کے سامنے اس مسئلے کی پوری تفصیل بیان کروں مگر جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لئے بالکل کافی ہے کہ اسلام کے نقطہ نظر سے امامت صالحہ کا قیام مرکزی اور مقصدی اہمیت رکھتا ہے - جو شخص اس دین پر ایمان لایا ہو اس کا کام صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا کہ اپنی زندگی کو حتی الامکان اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے بلکہ عین اس کے ایمان ہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی تمام سعی و جہد کو اس ایک مقصد پر مرکوز کر دے کہ زمام کار کفار و فساق کے ہاتھ سے نکل کر صالحین کے ہاتھ میں آئے اور وہ نظام حق قائم ہو جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق دنیا کے انتظام کو درست کرے اور درست رکھے۔

اسلام جب یہ دعوت دیتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ ان غاصبوں سے چھین لیا جائے اور اسے دوبارہ اللہ کے لئے مخصوص کر دیا جائے

تو اس دعوت کی اصل غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ انسانیت کو آزاد کیا جائے اور تمام انسانوں کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ وحدہ کی غلامی میں داخل کیا جائے۔ اسی طرح اسلام کی اس دعوت کا مقصد یہ بھی ہے کہ لوگوں کی روحانی و نظریاتی دنیا اور مالی اور مادی دنیا کو بھی ان طاغوتی طاقتوں کے عمل و دخل سے آزاد کیا جائے۔ اسی لئے اسلام اپنے جھنڈے کے نیچے لوگوں کے لئے فرض کرتا ہے کہ وہ ان طاغوتی قوتوں کے خلاف جدوجہد اور جہاد و قتال کریں اور ہر قسم کی قربانیاں دیں۔ لیکن اس راہ میں قربانیاں دے کر دراصل وہ مسلسل لمبی قربانیاں دینے سے نجات پاتے ہیں جو ان کے مقابلے میں ذلیل اور حقیر ہیں۔ اسلام تو لوگوں کو عزت اور شرف کے مقام کے لئے جدوجہد کرنے کی دعوت دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انہیں حضرت شعیب نے فرمایا:

(قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ ------ (۷: ۸۹)) "ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے' اگر تمہاری ملت میں پلٹ آئیں جبکہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے۔ ہمارے لئے تو اس کی طرف پلٹنا اب کسی طرح ممکن نہیں۔" لیکن حضرت شعیب جس قدر باطل کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں' اپنی پوری قوت سے آواز حق بلند کر رہے ہیں اور اپنی سوسائٹی کے کبراء کو چیلنج کر رہے ہیں' اسی قدر وہ اللہ کی مشیت اور رضا کے سامنے سرنگوں ہو رہے ہیں اور اللہ کی تقدیر کے سامنے راضی برضا ہو رہے ہیں اس لئے کہ اللہ کا علم وسیع اور حاوی ہے اور انسان کا علم محدود ہے۔ اللہ کے علم کے سامنے کوئی انسان عزم اور جزم اختیار نہیں کر سکتا۔ جہاں تک باری تعالیٰ کا تعلق ہے ایک مسلمان کے لئے اچھا رویہ یہی ہے کہ اس کے سامنے مکمل طور پر سر تسلیم خم کر دے۔ (اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۷: ۸۹)) "الا یہ کہ ہمارا رب ہی ایسا چاہے۔ ہمارے رب کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔" حضرت شعیب تمام امور کو اللہ کے سپرد فرماتے ہیں۔ مستقبل میں ان کے حالات جس رخ پر چلنے والے ہیں اور اہل ایمان کو جو کچھ پیش آنے والا ہے۔ وہ سب کے سب اللہ کے سپرد ہیں۔ وہ تو صرف یہ کر سکتے ہیں کہ تمام طاغوتی نظریات اور طاغوتی پیشکشوں کا انکار کر دیں' ملت طاغوتی میں واپس چلے جانے سے صاف صاف انکار کر دیں اور مسلمانوں کی جانب سے بھی عزم صمیم ظاہر کر دیں۔ اور اس بات کا اصولی طور پر قطعی انکار کر دیں' لیکن وہ مشیت الہیہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتے' کیونکہ معاملات کا دارومدار تو مشیت الہیہ پر ہے حضرت شعیب اور اہل ایمان کا علم محدود ہے اور رب ذوالجلال کا علم لامحدود ہے' لہٰذا وہ اللہ کے وسیع اور محیط علم اور اس کی مشیت کی طرف اپنے معاملات کو سپرد کرتے ہیں۔

یہ ہے اللہ کے ایک دوست کا طرز عمل' اللہ کے ساتھ۔ ان آداب کے ساتھ وہ اللہ کے اوامر و نواہی کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اللہ کی مشیت اور تقدیر پر کوئی احسان نہیں جتلاتے۔ نہ وہ اللہ کے ارادے اور مشیت میں سے کسی چیز کا انکار کرتے ہیں۔ دوست کی جانب سے جو پیش آئے منظور ہے۔

یہاں حضرت شعیب اپنی قوم کے طاغوتوں اور ان کے وعدو وعید اور دھمکیوں کو ایک طرف چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں نہایت ہی توکل اور نہایت ہی اعتماد کے ساتھ' اور دعا کرتے ہیں کہ اے رب' ہمارے اور ہماری اس طاغوتی قوم کے درمیان فیصلہ فرما دے' تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

(عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا (۷: ۸۹) "اللہ پر ہی ہم نے اعتماد کیا ہے۔ اے رب' ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان

ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔" یہاں ہم ایک خیرہ کن منظر دیکھتے ہیں۔ایک نبی اور خدا کے ایک دوست کے قلب میں حقیقت الٰہیہ کی تجلیات صاف نظر آتی ہیں۔نبی جانتے ہیں کہ قوت کا منبع کہاں ہے اور ایک مومن کے لئے آخری پناہ گاہ کونسی ہے۔وہ یہ بھی جانتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ آخری فیصلے اور فتح و شکست کا اختیار صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔اس لئے وہ رب واحد پر توکل کرتا ہے اور اس معرکے میں کود پڑتا ہے جو نبی اور اہل ایمان پر مسلط کر دیا گیا ہے اور جو حالات نے لابدی کر دیا ہے۔اب رب ذوالجلال کی جانب سے عطا کردہ فتح کے سوا یہ معرکہ سر نہیں کیا جاسکتا۔

یہ ہیں وہ حالات جن میں کفار اہل ایمان کو ڈراتے دھمکاتے ہیں اور ان کو اپنے دین سے دور کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

(وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَیْبًا اِنَّکُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ

(۷: ۹۰)) "اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اس کی بات ماننے سے انکار کر چکے تھے، آپس میں کہا "اگر تم نے شعیب کی پیروی قبول کر لی تو برباد ہو جاؤ گے۔" یہ ہیں خدوخال اس معرکے کے جو انسانی تاریخ میں بار بار دہرایا جاتا ہے اگرچہ اس کی نوعیت کبھی نہیں بدلتی۔ طاغوتی قوتیں سب سے پہلے داعی کی طرف متوجہ ہوتی ہیں کہ وہ دعوت کو بند کر دے لیکن جب وہ اپنی ایمانی قوت پر اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے ڈٹ جاتا ہے، دعوت کو جاری رکھتا ہے، اس راہ میں ہر قسم کی مشکلات کو انگیز کرتا ہے اور دھمکیوں اور طاغوتی قوتوں کے حجم سے مرعوب نہیں ہوتا، تو یہ قوتیں داعی کے متبعین کو اذیت دینا شروع کر دیتی ہے۔ان پر یہ مصائب محض ان کے دین کی وجہ سے توڑے جاتے ہیں۔ان ظالموں کے پاس اپنے ظلم کے لئے کوئی جواز نہیں ہوتا لیکن ان کے پاس مار دھاڑ اور پکڑ دھکڑ کی ظاہری قوتیں ہوتی ہیں۔ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی جس سے وہ اپنی جاہلیت پر عوام کو مطمئن کر سکیں۔خصوصاً ان لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتے جنہوں نے حق کو پہچان لیا اور جن کی نظروں میں باطل خفیف و حقیر ٹھہرا کیونکہ ان لوگوں نے اپنا دین اللہ کے لئے خالص کر دیا اور ہر قسم کا اقتدار اللہ کے حوالے کر دیا۔ان کی نظروں میں اس کے سوا کوئی مقتدر اعلیٰ ہوتا ہی نہیں ہے۔

یہ اللہ کی سنت جاریہ ہے کہ جب حق و باطل علیحدہ علیحدہ متمیز ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے بالمقابل آجاتے ہیں تو پھر ان کے درمیان فیصلہ کن معرکہ ہوتا ہے اور اللہ خود فیصلہ کر دیتا ہے۔چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔

(فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ (۷: ۹۱)) "مگر ہوا یہ کہ ایک دہلا دینے والی آفت نے ان کو آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔" رجفہ، ایسی آفت جو دہلا دیتی ہے اور اوندھا گرا دیتی ہے، اس لئے کہ انہیں اپنی دھمکیاں اور دست درازیاں یاد آجائیں کہ وہی تو تھے جو اہل ایمان کو اذیتیں دیتے تھے۔

اب اللہ تعالیٰ ان کے اس دعوے کا جواب انہی کے الفاظ میں دیتے ہیں۔وہ کہتے تھے (لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ ——— (۷: ۹۱)) "اگر تم نے شعیب کا اتباع کیا تو تم برباد ہو جاؤ گے۔" یہ بات وہ مومنین کو بطور تہدید کہتے تھے۔اس پر اللہ تعالیٰ ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہیں کہ جن لوگوں نے شعیب کی اطاعت کی وہ نہیں بلکہ وہ لوگ برباد ہوئے جنہوں نے مخالفت کی۔

(اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ

(۹۲:۷)) "جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ ایسے مٹے کہ گویا کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے ۔شعیب کے جھٹلانے والے ہی آخر کار برباد ہو کر رہے ۔" آنکھ جھپکتے ہی ہم نے دیکھا کہ وہ اپنے ہی گھروں میں اوندھے پڑے ہیں' بے حس و حرکت گویا انہوں نے ان گھروں کو تعمیر نہیں کیا اور گویا اب ان گھروں میں ان کے کچھ آثار بھی باقی نہیں ہیں۔

اب ان کی تاریخ کے ان صفحات کو اس طرح پست کر کے رکھ دیا جاتا ہے اور ان کو ذلیل و خوار کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے ۔وہ رسول جو ان کا بھائی ہے ان سے جدا ہو جاتا ہے' اس لئے کہ ان کی راہیں جدا ہیں' اور ان کے نظریات جدا ہیں۔اب اس منظر میں نظر آتا ہے کہ ان کے انجام بھی جدا ہیں اور اب ان کے اس انجام بد پر ان کے حقیقی بھائی کو بھی کوئی تاسف نہیں ہوتا کہ کس طرح انہیں نیست و نابود کر دیا گیا ہے۔

(فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ (۹۳:۷)) "اور شعیب یہ کہہ کر ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ "اے برادران قوم' میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔اب میں اس قوم پر کیسے افسوس کروں جو قبول حق سے انکار کرتی ہے ۔" اس لئے کہ وہ ایک ملت ہے اور یہ لوگ دوسری ملت ہیں۔اہل ایمان ایک قوم ہیں اور وہ دوسری قوم ہیں۔رہا سلسلہ نسب اور قوم تو اس دین میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔اللہ کے ہاں اس کا کوئی وزن نہیں ہے۔یہاں فلاں ابن فلاں کوئی چیز نہیں ہے۔اس دین میں واحد رابطہ عقیدہ و نظریہ ہے اور اسی پر اتحاد و انفعال کا مدار ہے۔

صدق اللہ العظیم

---ooo---